☆☆☆☆☆☆منٹو کے تمام افسانے☆☆☆☆☆☆

1. 1919ء کی ایک بات
2. اب اور کہنے کی ضرورت نہیں
3. ابجی ڈُڈُو
4. آخری سیلوٹ
5. آرٹسٹ لوگ
6. اُس کا پتی
7. آصف نے کہا۔
8. اصلی جن
9. افشائے راز
10. اللہ دِتّا
11. اُلو کا پٹھا
12. آم
13. آمنہ
14. انار کلی
15. انجام نجیر
16. انقلاب پسند
17. آنکھیں
18. اولاد
19. ایک خط
20. ایک زاہدہ، ایک فاحشہ
21. ایکٹریس کی آنکھ
22. بابو گوپی ناتھ
23. بادشاہت کا خاتمہ
24. باردہ شمالی
25. بارش
26. باسط
27. بانجھ
28. بائی بائی
29. بجلی پہلوان
30. بچنی
31. بد تمیزی
32. بدصورتی
33. بُڈّھا کھوسٹ
34. برف کا پانی
35. بُرقعے
36. برمی لڑکی
37. بس اسٹینڈ
38. بسم اللہ
39. بغیر اجازت
40. بلاؤز
41. بلونت سنگھ مجیٹھیا
42. بھنگن
43. بُو
44. بی زمانی بیگم
45. بیگو
46. بیمار
47. پانچ دن
48. پری
49. پریشانی کا سبب
50. پڑھے کلمہ
51. پسینہ
52. پشاور سے لاہور تک
53. پھاتو
54. پھاہا
55. پہچان
56. پھسپھسی کہانی
57. پُھندنے
58. پھوجا حرام دا
59. پُھولوں کی سازش
60. پیرن
61. تانگے والے کا بھائی
62. تصویر
63. تقی کاتب
64. تین موٹی عورتیں
65. تین میں، نہ تیرہ میں
66. ٹھنڈا گوشت
67. ٹوبہ ٹیک سنگھ
68. ٹُوٹُو
69. ٹیٹوال کا کتا
70. ٹیڑھی لکیر
71. جان محمد
72. جانکی
73. جاو حنیف جاو
74. جسم اور رُوح
75. جنٹلمینوں کا بُرش
76. جُھمکے
77. جُھوٹی کہانی
78. چغد
79. چند مکالمے
80. چودھویں کا چاند
81. چور
82. چوری
83. چوہے دان
84. حافظ حسین دین
85. حامد کا بچہ
86. حج اکبر
87. حجامت
88. حسن کی تخلیق
89. خالد میاں
90. خالی بوتلیں، خالی ڈبے
91. خدا کی قسم
92. خط اور اُس کا جواب
93. خوابِ خرگوش

94. خود فریب
95. خود کشی
96. خود کشی کا اقدام
97. خورشٹ
98. خوشبودار تیل
99. خوشیا
100. دس روپے
101. دُھواں
102. دودا پہلوان
103. دو قومیں
104. دیکھ کبیر ارویا
105. دیوالی کے دِیے
106. ڈارلنگ
107. ڈاکٹر شروڈکر
108. ڈائرکٹر کرپلانی
109. ڈرپوک
110. ڈھارس
111. راجو
112. رام کھلاون
113. رامیشگر
114. رَتی، ماشہ، تولہ
115. رحمتِ خداوندی کے پھول
116. رشوت
117. ساڑھے تین آنے
118. سبز سینڈل
119. سجدہ
120. سراج
121. سرکنڈوں کے پیچھے
122. سُرمہ
123. سڑک کے کنارے
124. سگریٹ اور فاؤنٹین پن
125. سنتر پنچ
126. سہائے
127. سو کینڈل پاور کا بلب
128. سودا بیچنے والی
129. سوراج کے لیے
130. سونورل
131. سونے کی انگوٹھی
132. شاداں
133. شادی
134. شاردا
135. شانتی
136. شاہ دولے کا چوہا
137. شراب
138. شریفن
139. شغل
140. شکاری عورتیں
141. شلجم
142. شہ نشین پر
143. شہید ساز
144. شوشو
145. شیدا
146. شیر آیا شیر آیا دوڑنا
147. شیرو
148. صاحب کرامت
149. عزت کے لیے
150. عِشق حقیقی
151. عشقیہ کہانی
152. عقل داڑھ
153. عورت ذات
154. غسل خانہ
155. فرشتہ
156. فوبھا بائی
157. قادرا قصائی
158. قاسم
159. قبض
160. قدرت کا اصول
161. قرض کی پیتے تھے۔
162. قیمے کی بجائے بوٹیاں
163. کالی شلوار
164. کالی کلی
165. کبوتروں والا سائیں
166. کتاب کا خلاصہ
167. کتے کی دعا
168. کھول دو
169. کوٹ پتلون
170. گرم سوٹ
171. گلگت خان
172. گھوگا
173. گورمکھ سنگھ کی وصیت
174. گولی
175. لال ٹین
176. لائسنس
177. لتیکا رانی
178. لعنت ہے ایسی دوا پر
179. ماتمی جلسہ
180. مائی جنتے
181. مائی نانکی
182. مجید کا ماضی
183. محمودہ
184. مرزا غالبؔ کی حشمت خاں کے گھر دعوت
185. مس اڈنا جیکسن
186. مس ٹین والا
187. مس فریا
188. مِس مالا
189. مسٹر حمیدہ
190. مسٹر معین الدین
191. مسز ڈی سلوا
192. مسز ڈی کوسٹا
193. مسز گل
194. مِصری کی ڈلی
195. ملاقاتی

196. ملاوٹ
197. ملبے کا ڈھیر
198. ممد بھائی
199. ممّی
200. منتر
201. منظور
202. مہتاب خاں
203. موتری
204. موج دِین
205. موچنا
206. موذیل
207. موسم کی شرارت
208. موم بتی کے آنسو
209. میرا اور اس کا انتقام
210. میرا نام رادھا ہے
211. میرا اہم سفر
212. نامکمل تحریر
213. نُطفہ
214. نعرہ
215. نفسیات شناس
216. نفسیاتی مطالعہ
217. نِکّی
218. ننگی آوازیں
219. نواب سلیم اللہ خان
220. نیا سال
221. نیا قانون
222. ہارتا چلا گیا
223. ہتک
224. ہرنام کور
225. والد صاحب
226. وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے
227. وہ لڑکی
228. یزید

1919ء کی ایک بات

یہ 1919ء کی بات ہے بھائی جان جب رولٹ ایکٹ کے خلاف سارے پنجاب میں ایجی ٹیشن ہو رہی تھی۔ میں امر تسر کی بات کر رہا ہوں۔ سر مائیکل اوڈوائر نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت گاندھی جی کا داخلہ پنجاب میں بند کر دیا تھا۔ وہ ادھر آ رہے تھے کہ پلوال کے مقام پر ان کو روک لیا گیا اور گرفتار کر کے واپس بمبئے بھیج دیا گیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں بھائی جان اگر انگریز یہ غلطی نہ کرتا تو جلیاں والا باغ کا حادثہ اس کی حکمرانی کی سیاہ تاریخ میں ایسے خونیں ورق کا اضافہ کبھی نہ کرتا۔ کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا سکھ، سب کے دل میں گاندھی جی کی بے حد عزت تھی۔ سب انھیں مہاتما مانتے تھے۔ جب ان کی گرفتاری کی خبر لاہور پہنچی تو سارا کاروبار ایک دم بند ہو گیا۔ یہاں سے امر تسر والوں کو معلوم ہوا، چنانچہ یوں چٹکیوں میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ نو اپریل کی شام کو ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی جلاوطنی کے احکام ڈپٹی کمشنر کو مل گئے تھے۔ وہ ان کی تعمیل کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کے خیال کے مطابق امر تسر میں کسی ہیجان خیز بات کا خطرہ نہیں تھا۔ لوگ پر امن طریقے پر احتجاجی جلسے وغیرہ کرتے تھے۔ جن سے تشدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہوں۔ نو کو رام نومی تھا۔ جلوس نکلا مگر مجال ہے جو کسی نے حکام کی مرضی کے خلاف ایک قدم اٹھایا ہو، لیکن بھائی جان سر مائیکل عجب اوندھی کھوپری کا انسان تھا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کی ایک نہ سنی۔ اس پر بس یہی خوف سوار تھا کہ یہ لیڈر مہاتما گاندھی کے اشارے پر سامراج کا تختہ الٹنے کے درپے ہیں، اور جو ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور جلسے منعقد ہوتے ہیں ان کے پس پردہ یہی سازش کام کر رہی ہے۔ ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی جلاوطنی کی خبر آناً فاناً شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دل ہر شخص کا مکدر تھا۔ ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ کوئی بہت بڑا حادثہ برپا ہونے والا ہے، لیکن بھائی جان جوش بہت زیادہ تھا۔ کاروبار بند تھے۔ شہر قبرستان بنا ہوا تھا، پر اس قبرستان کی خاموشی میں بھی ایک شور تھا۔ جب ڈاکٹو کچلو اور ستیہ پال کی گرفتاری کی خبر آئی تو لوگ ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہوئے کہ مل کر ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جائیں اور اپنے محبوب لیڈروں کی جلاوطنی کے احکام منسوخ کرانے کی درخواست کریں۔ مگر وہ زمانہ بھائی جان درخواستیں سننے کا نہیں تھا۔ سر مائیکل جیسا فرعون حاکمِ اعلیٰ تھا۔ اس نے درخواست سننا تو کجا لوگوں کے اس اجتماع ہی کو غیر قانونی قرار دیا۔ امر تسر۔ وہ امر تسر جو کبھی آزادی کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جس کے سینے پر جلیاں والا باغ جیسا قابل فخر زخم تھا۔ آج کس حالت میں ہے؟۔ لیکن چھوڑیئے اس قصے کو۔ دل کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس مقدس شہر میں جو کچھ آج سے پانچ برس پہلے ہوا اس کے ذمہ دار بھی انگریز ہیں۔ ہو گا بھائی جان، پر سچ پوچھیے تو اس لہو میں جو وہاں بہا ہے ہمارے اپنے ہی ہاتھ رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خیر! ڈپٹی کمشنر صاحب کا بنگلہ سول لائنز میں تھا۔ ہر بڑا افسر اور ہر بڑا ٹوڈی شہر کے اس الگ تھلگ حصے میں رہتا تھا۔ آپ نے امر تسر دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ شہر اور سول لائنز کو ملانے والا ایک پل ہے جس پر سے گزر کر آدمی ٹھنڈی سڑک پر پہنچتا ہے۔ جہاں حاکموں نے اپنے لیے یہ ارضی جنت بنائی ہوئی تھی۔ ہجوم جب ہال دروازے کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ پل پر گھڑ سوار گوروں کا پہرہ ہے۔ ہجوم بالکل نہ رکا اور بڑھتا گیا۔ بھائی جان میں اس میں شامل تھا۔ جوش کتنا تھا، میں بیان نہیں کر سکتا، لیکن سب نہتے تھے۔ کسی کے پاس ایک معمولی چھڑی تک بھی نہیں تھی۔ اصل میں وہ تو صرف اس غرض سے نکلے تھے کہ اجتماعی طور پر اپنی آواز حاکم شہر تک پہنچائیں اور اس سے درخواست کریں کہ ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے۔ ہجوم پل کی طرف بڑھتا رہا۔ لوگ قریب پہنچے تو گوروں نے فائر شروع کر دیے۔ اس سے بھگدڑ مچ گئی۔ وہ گنتی میں صرف بیس پچیس تھے اور ہجوم سینکڑوں پر مشتمل تھا، لیکن بھائی گولی کی دہشت بہت ہوتی ہے۔ ایسی افراتفری پھیلی کہ الاماں۔ کچھ گولیوں سے گھائل ہوئے اور

کچھ بھگدڑ میں زخمی ہوء۔ دائیں ہاتھ کو گندا نالا تھا۔ دھکا لگا تو میں اس میں گر پڑا۔ گولیاں چلنی بند ہوئیں تو میں نے اٹھ کر دیکھا۔ ہجوم تتر بتر ہو چکا تھا۔ زخمی سڑک پر پڑے تھے اور پل پر گورے کھڑے ہنس رہے تھے۔ بھائی جان مجھے قطعاً یاد نہیں کہ اس وقت میری دماغی حالت کس قسم کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میرے ہوش و حواس پوری طرح سلامت نہیں تھے۔ گندے نالے میں گرتے وقت تو قطعاً مجھے ہوش نہیں تھا۔ جب باہر نکلا تو جو حادثہ وقوع پذیر ہوا تھا، اس کے خدوخال آہستہ آہستہ دماغ میں ابھرنے شروع ہوئے۔ دور شور کی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے بہت سے لوگ غصے میں چیخ چلا رہے ہیں۔ میں گندا نالا عبور کر کے ظاہر اپیر کے تکیے سے ہوتا ہوا ہال دروازے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ تیس چالیس نوجوان جوش میں بھرے پتھر اٹھا اٹھا کر دروازے کے گھڑیال پر مار رہے ہیں۔ اس کا شیشہ ٹوٹ کر سڑک پر گرا تو ایک لڑکے نے باقیوں سے کہا۔

”چلو۔ ملکہ کا بت توڑیں“!

دوسرے نے کہا۔

”نہیں یار۔ کوتوالی کو آگ لگائیں“!

تیسرے نے کہا۔

”اور سارے بینکوں کو بھی“!

چوتھے نے ان کو روکا۔

”ٹھہرو۔ اس سے کیا فائدہ۔ چلو پل پر ان لوگوں کو ماریں۔“

میں نے اس کو پہچان لیا۔ یہ تھیلا کنجر تھا۔ نام محمد طفیل تھا مگر تھیلا کنجر کے نام سے مشہور تھا۔ اس لیے کہ ایک طوائف کے بطن سے تھا۔ بڑا آوارہ گرد تھا۔ چھوٹی عمر ہی میں اس کو جوئے اور شراب نوشی کی لت پڑ گئی تھی۔ اس ک دو بہنیں شمشاد اور الماس اپنے وقت کی حسین ترین طوائفیں تھیں۔ شمشاد کا گلا بہت اچھا تھا۔ اس کا مجرا سننے کے لیے رئیس بڑی بڑی دور سے آتے تھے۔ دونوں اپنے بھائی کے کرتوتوں سے بہت نالاں تھیں۔ شہر میں مشہور تھا کہ انھوں نے ایک قسم کا اس کو عاق کر رکھا ہے۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی حیلے اپنی ضروریات کے لیے ان سے کچھ نہ کچھ وصول کر ہی لیتا تھا۔ ویسے وہ بہت خوش پوش رہتا تھا۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پیتا تھا۔ بڑا نفاست پسند تھا۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی مزاج میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ میراثیوں اور بھانڈوں کے سوقیانہ پن سے بہت دور رہتا تھا۔ لمبا قد، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، مضبوط کسرتی بدن۔ ناک نقشے کا بھی خاصا تھا۔ پرجوش لڑکوں نے اس کی بات نہ سنی اور ملکہ کے بت کی طرف چلنے لگے۔ اس نے پھر ان سے کہا۔

”میں نے کہا مت ضائع کرو اپنا جوش۔ ادھر آؤ میرے ساتھ۔ چلو ان کو ماریں جنھوں نے ہمارے بے قصور آدمیوں کی جان لی ہے اور انھیں زخمی کیا ہے۔ خدا کی قسم ہم سب مل کر ان کی گردن مروڑ سکتے ہیں۔ چلو“!

کچھ روانہ ہو چکے تھے۔ باقی رک گئے۔ تھیلا پل کی طرف بڑھا تو اس کے پیچھے چلنے لگے۔ میں نے سوچا کہ ماؤں کے یہ لال بیکار موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ فوارے کے پاس دبکا کھڑا تھا۔ وہیں میں نے تھیلے کو آواز دی اور کا۔

”مت جاؤ یار۔ کیوں اپنی اور ان کی جان کے پیچھے پڑے ہو۔“

تھیلے نے یہ سن کر ایک عجیب سا قہقہہ بلند کیا اور مجھ سے کہا۔

”تھیلا صرف یہ بتانے چلا ہے کہ وہ گولیوں سے ڈرنے والا نہیں۔“

پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

”تم ڈرتے ہو تو واپس جا سکتے ہو۔“

ایسے موقعوں پر بڑھے ہوئے قدم الٹے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور پھر وہ بھی اس وقت جب لیڈر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آگے آگے جا رہا ہو۔ تھیلے نے قدم تیز کیے تو اس کے ساتھیوں کو بھی کرنے پڑے۔ ہال دروازے سے پل کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں۔ ہو گا کوئی ساٹھ ستر گز کے قریب۔ تھیلا سب سے آگے آگے تھا۔ جہاں سے پل کا دورویہ متوازی جنگلہ شروع ہوتا ہے، وہاں سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر دو گھڑ سوار گورے کھڑے تھے۔ تھیلا نعرے لگاتا جب بنگلے کے آغاز کے پاس پہنچا تو فائر ہوا۔ میں سمجھا کہ وہ گر پڑا ہے۔ لیکن دیکھا کہ وہ اسی طرح۔ زندہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے باقی ساتھی ڈر کے بھاگ اٹھے ہیں۔ مڑ کر اس نے پیچھے دیکھا اور چلایا۔

”بھاگو نہیں۔ آؤ“!

اس کا منہ میری طرف تھا کہ ایک اور فائر ہوا۔ پلٹ کر اس نے گوروں کی طرف دیکھا اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ بھائی جان نظر تو مجھے کچھ نہیں آنا چاہیے تھا، مگر میں نے دیکھا کہ اس کی سفید بوسکی کی قمیض پر لال لال دھبے تھے۔ وہ اور تیزی سے بڑھا، جیسے زخمی شیر۔ ایک اور فائر ہوا۔ وہ لڑکھڑایا مگر ایک دم قدم مضبوط کر کے وہ گھر سوار گورے پر لپکا اور چشم زدن میں

جانے کیا ہوا۔ گھوڑے کی پیٹھ خالی تھی۔ گورا زمین تھا اور تھیلا اس کے اوپر۔ دوسرے گورے نے جو قریب تھا اور پہلے بوکھلا گیا تھا، بِدکتے ہوئے گھوڑے کو روکا اور دھڑا دھڑ فائر شروع کر دیے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے معلوم نہیں۔ میں وہاں فوارے کے پاس بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بھائی جان جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں تھا۔ چند پہچان کے آدمی مجھے وہاں سے اٹھا لائے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ پل پر سے گولیاں کھا کر ہجوم مشتعل ہو گیا تھا۔ نتیجہ اس اشتعال کا یہ ہوا کہ ملکہ کے بت کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ ٹاؤن ہال اور تین بنکوں کو آگ لگی اور پانچ یا چھ یورپین مارے گئے۔ خوب لوٹ مچی۔ لوٹ کھسوٹ کا انگریز افسروں کو اتنا خیال نہیں تھا۔ پانچ یا چھ یورپین ہلاک ہوئے تھے اس کا بدلہ لینے کے لیے چنانچہ جلیاں والا باغ کا خونیں حادثہ رونما ہوا۔ ڈپٹی کمشنر بہادر نے شہر کی باگ دوڑ جنرل ڈائر کے سپرد کر دی۔ چنانچہ جنرل صاحب نے بارہ اپریل کو فوجیوں کے ساتھ شہر کے مختلف بازاروں میں مارچ کیا اور درجنوں بے گناہ آدمی گرفتار کیے۔ تیرہ کو جلیاں والا باغ میں جلسہ ہوا۔ قریب قریب پچیس ہزار کا مجمع تھا۔ شام کے قریب جنرل ڈائر مسلح گوروں اور سکھوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور نہتے آدمیوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ اس وقت تو کسی کو نقصان جان کا ٹھیک اندازہ نہیں تھا۔ بعد میں جب تحقیق ہوئی تو پتہ چلا کہ ایک ہزار ہلاک ہوئے ہیں اور تین یا چار ہزار کے قریب زخمی۔ لیکن میں تھیلے کی بات کر رہا تھا۔ بھائی جان آنکھوں دیکھی آپ کو بتا چکا ہوں۔ بے عیب ذات خدا کی ہے۔ مرحوم میں چاروں عیب شرعی تھے۔ ایک پیشہ طوائف کے بطن سے تھا مگر جیالا تھا۔ میں اب یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس ملعون گورے کی پہلی گولی بھی اس کے لگی تھی۔ آواز سن کر اس نے جب پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تھا، اور انھیں حوصلہ دلایا تھا جوش کی حالت میں اس کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ اسکی چھاتی میں گرم گرم سیسہ اتر چکا ہے۔ دوسری گولی اس کی پیٹھ میں لگی۔ تیسری پھر سینے میں۔ میں نے دیکھا نہیں، پر سنا ہے جب تھیلے کی لاش گورے سے جدا کی گئی تو اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں اس بری طرح پیوست تھے کہ علیحدہ نہیں ہوتے تھے۔ گورا جہنم واصل ہو چکا تھا۔ دوسرے روز جب تھیلے کی لاش کفن دفن کے لیے اس کے گھر والوں کے سپرد کی گئی تو اس کا بدن گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ دوسرے گورے نے تو اپنا پورا پستول اس پر خالی کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے اس وقت مرحوم کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اس شیطان کے بچے نے صرف اس کے مردہ جسم پر چاندماری کی تھی۔ کہتے ہیں جب تھیلے کی لاش محلے میں پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ اپنی برادری میں وہ اتنا مقبول نہیں تھا، لیکن اس کی قیمہ قیمہ لاش دیکھ کر سب دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اس کی بہنیں شمشاد اور الماس تو بے ہوش ہو گئیں۔ جب جنازہ اٹھا تو ان دونوں نے ایسے بین کیے کہ سننے والے لہو کے آنسو روتے رہے۔ بھائی جان، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ فرانس کے انقلاب میں پہلی گولی وہاں کی ایک ٹکھیائی کے لگی تھی۔ مرحوم محمد طفیل ایک طوائف کا لڑکا تھا۔ انقلاب کی اس جدوجہد میں اس کے جو پہلی گولی لگی تھی دسویں تھی یا پچاسویں۔ اس کے متعلق کسی نے بھی تحقیق نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ سوسائٹی میں اس غریب کا کوئی رتبہ نہیں تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں پنجاب کے اس خونیں غسل میں نہانے والوں کی فہرست میں تھیلے کنجر کا نام ونشان تک بھی نہیں ہو گا۔ اور یہ بھی کوئی پتہ نہیں کہ ایسی کوئی فہرست تیار بھی ہوئی تھی۔ سخت ہنگامی دن تھے۔ فوجی حکومت کا دور دورہ تھا۔ وہ دیو جسے مارشل لاء کہتے ہیں۔ شہر کے گلی گلی کوچے کوچے میں ڈکارتا پھرتا تھا۔ بہت افراتفری کے عالم میں اس غریب کو جلدی جلدی یوں دفن کیا گیا جیسے اس کی موت اس کے سوگوار عزیزوں کا ایک سنگین جرم تھی جس کے نشانات وہ مٹا دینا چاہتے تھے۔ بس بھائی جان تھیلا مر گیا۔ تھیلا دفنا دیا گیا اور۔ اور“

یہ کہہ کر میرا ہم سفر پہلی مرتبہ کچھ کہتے کہتے رکا اور خاموش ہو گیا۔ ٹرین دندناتی ہوئی جا رہی تھی۔ پٹڑیوں کی کھٹا کھٹ نے یہ کہنا شروع کر دیا۔

”تھیلا مر گیا۔ تھیلا دفنا دیا گیا۔ تھیلا مر گیا۔ تھیلا دفنا دیا گیا۔“

اس مرنے اور دفنانے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا، جیسے وہ اُدھر مرا اور اِدھر دفنا دیا گیا۔ اور کھٹ کھٹ کے ساتھ ان الفاظ کی ہم آہنگی کچھ اس قدر جذبات سے عاری تھی کہ مجھے اپنے دماغ سے ان دونوں کو جدا کرنا پڑا۔ چنانچہ میں نے اپنے ہم سفر سے کہا۔

”آپ کچھ اور بھی سنانے والے تھے؟“

چونک کر اس نے میری طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔ اس داستان کا ایک افسوسناک حصہ باقی ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا؟“

اس نے کہنا شروع کیا۔

”میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ تھیلے کی دو بہنیں تھیں۔ شمشاد اور الماس۔ بہت خوبصورت تھیں۔ شمشاد لمبی تھی۔ پتلے پتلے نقش۔ غلافی آنکھیں۔ ٹھمری بہت خوب گاتی تھی۔ سنا ہے خاں صاحب فتح علی خاں سے تعلیم لیتی رہی تھی۔ دوسری الماس تھی۔ اس کے گلے میں سُر نہیں تھا، لیکن بتاوے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ مجرا کرتی تھی تو ایسا لگتا تھا کہ اس کا انگ انگ بول رہا ہے۔ ہر بھاؤ میں ایک گھات ہوتی تھی۔ آنکھوں میں وہ جادو تھا جو ہر ایک کے سر پر چڑھ کے بولتا تھا۔“

میرے ہم سفر نے تعریف و توصیف میں کچھ ضرورت سے زیادہ وقت لیا۔ مگر میں نے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود اس لمبے چکر سے نکلا اور داستان کے افسوناک حصے کی طرف آیا۔

”قصہ یہ ہے بھائی جان کہ ان آفت کی پرکالہ دو بہنوں کے حسن و جمال کا ذکر کسی خوشامدی نے فوجی افسروں سے کر دیا۔ بلوے میں ایک میم۔ کیا نام تھا اس چڑیل کا؟۔ مس۔ مس شرو ڈماری گئی تھی۔ طے یہ ہوا کہ ان کو بلوایا جائے اور۔ اور۔ جی بھر کے انتقام لیا جائے۔ آپ سمجھ گئے نا بھائی جان؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں“!

میرے ہم سفر نے ایک آہ بھری

”ایسے نازک معاملوں میں طوائفیں اور کسبیاں بھی اپنی مائیں بہنیں ہوتی ہیں۔ مگر بھائی جان یہ ملک اپنی عزت و ناموس کو میرا خیال ہے پہچانتا ہی نہیں۔ جب اوپر سے علاقے کے تھانیدار کو آرڈر ملا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ چنانچہ وہ خود شمشاد اور الماس کے مکان پر گیا اور کہا کہ صاحب لوگوں نے یاد کیا ہے۔ وہ تمہارا مجرا سننا چاہتے ہیں۔ بھائی کی قبر کی مٹی بھی ابھی تک خشک نہیں ہوئی تھی۔ اللہ کو پیارا ہوئے اس غریب کو صرف دو دن ہوئے تھے کہ یہ حاضری کا حکم صادر ہوا کہ آؤ ہمارے حضور ناچو۔ اذیت کا اس سے بڑھ کر پُر اذیت طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔؟۔ مستبعد تمسخر کی ایسی مثال میرا خیال ہے شاید ہی کوئی اور مل سکے۔ کیا حکم دینے والوں کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ طوائف بھی غیرت مند ہوتی ہے؟۔ ہو سکتی ہے۔ کیوں نہیں ہو سکتی؟“

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا، لیکن مخاطب وہ مجھ سے تھا۔ میں نے کہا۔

”ہو سکتی ہے“!

”جی ہاں“

۔ تھیلا آخر ان کا بھائی تھا۔ اس نے کسی قمار خانے کی لڑائی بھڑائی میں اپنی جان نہیں دی تھی۔ وہ شراب پی کر دنگا فساد کرتے ہوئے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ اس نے وطن کی راہ میں بڑے بہادرانہ طریقے پر شہادت کا جام پیا تھا۔ وہ ایک طوائف کے بطن سے تھا۔ لیکن وہ طوائف ماں تھی اور شمشاد اور الماس اسی کی بیٹیاں تھیں اور یہ تھیلے کی بہنیں تھیں۔ طوائفیں بعد میں تھیں۔ اور وہ تھیلے کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جب اس کا جنازہ اٹھا تھا۔ تو انھوں نے ایسے بین کیے تھے کہ سن کر آدمی لہو روتا تھا۔“

میں نے پوچھا۔

”وہ گئیں؟“

میرے ہم سفر نے اس کا جواب تھوڑے وقفے کے بعد افسردگی سے دیا۔

”جی ہاں۔ جی ہاں گئیں۔ خوب سج بن کر۔“

ایک دم اس کی افسردگی تیکھا پن اختیار کر گئی۔

”سولہ سنگار کر کے اپنے بلانے والوں کے پاس گئیں۔ کہتے ہیں کہ خوب محفل جمی۔ دونوں بہنوں نے اپنے جوہر دکھائے۔ زرق برق پشوازوں میں ملبوس وہ کوہ قاف کی پریاں معلوم ہوتی تھیں۔ شراب کے دور چلتے رہے اور وہ ناچتی گاتی رہیں۔ یہ دونوں دور چلتے رہے۔ اور کہتے ہیں کہ۔ رات کے دو بجے ایک بڑے افسر کے اشارے پر محفل برخواست ہوئی۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر بھاگتے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگا۔ پہیوں اور پٹڑیوں کی آہنی گڑگڑاہٹ کی تال پر اس کے آخری دو لفظ ناچنے لگے۔

”برخواست ہوئی۔ برخواست ہوئی۔“

میں نے اپنے دماغ میں انھیں، آہنی گڑگڑاہٹ سے نوچ کر علیحدہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”پھر کیا ہوا؟“

بھاگتے ہوئے درختوں اور کھمبوں سے نظریں ہٹا کر اس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

”انھوں نے اپنی زرق برق پشوازیں نوچ ڈالیں اور الف ننگی ہو گئیں اور کہنے لگیں۔ لو دیکھ لو۔ ہم تھیلے کی بہنیں ہیں۔ اس شہید کی جس کے خوبصورت جسم کو تم نے صرف اس لیے اپنی گولیوں سے چھلنی چھلنی کیا تھا کہ اس میں وطن سے محبت کرنے والی روح تھی۔ ہم اسی کی خوبصورت بہنیں ہیں۔ آؤ، اپنی شہوت کے گرم گرم لوہے سے ہمارا خوشبوؤں میں بسا ہوا جسم داغدار کرو۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے صرف ہمیں ایک بار اپنے منہ پر تھوک لینے دو۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ اس طرح کہ اور نہیں بولے گا۔ میں نے فوراً ہی پوچھا۔

”پھر کیا ہوا؟“

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

”اُن کو۔ ان کو گولی سے اڑا دیا گیا۔“

میں نے کچھ نہ کہا۔ گاڑی آہستہ ہو کر اسٹیشن پر رکی تو اس نے قلی بلا کر اپنا اسباب اٹھوایا۔ جب جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

”آپ نے جو داستان سنائی، اس کا انجام مجھے آپ کا خود ساختہ معلوم ہوتا ہے۔“

ایک دم چونک کر اس نے میری طرف دیکھا۔

”یہ آپ نے کیسے جانا؟“

میں نے کہا۔

”آپ کے لہجے میں ایک ناقابل بیان کرب تھا۔“

میرے ہم سفر نے اپنے حلق کی تلخی تھوک کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔ اُن حرام۔“

وہ گالی دیتے دیتے رک گیا۔ انھوں نے اپنے شہید بھائی کے نام پر بٹا لگا دیا۔“

یہ کہہ کر وہ پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ 11-12 اکتوبر 1951ء

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں

یہ دنیا بھی عجیب و غریب ہے۔ خاص کر آج کا زمانہ۔ قانون کو جس طرح فریب دیا جاتا ہے' اس کے متعلق شاید آپ کو زیادہ علم نہ ہو۔ آج کل قانون ایک بے معنی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ادھر کوئی نیا قانون بنتا ہے' اُدھر یار لوگ اس کا توڑ سوچ لیتے ہیں' اس کے علاوہ اپنے بچاؤ کی کئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔ کسی اخبار پر آفت آنی ہو تو آیا کرے، اس کا مالک محفوظ و مامون رہے گا اس لیے کہ پرنٹ لائن میں کسی قصائی یا دھوبی کا نام بحیثیت پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر کے درج ہو گا۔ اگر اخبار میں کوئی ایسی تحریر چھپ گئی جس پر گورنمنٹ کو اعتراض ہو تو اصل مالک کے بجائے وہ دھوبی یا قصائی گرفت میں آ جائے گا۔ اس کو جرمانہ ہو گا یا قید۔ جرمانہ تو ظاہر ہے اخبار کا مالک ادا کر دے گا، مگر قید تو وہ ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن ان دو پارٹیوں کے درمیان اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر قید ہوئی تو وہ اس کے گھر اتنے روپے ماہوار پہنچا دیا کرے گا۔ ایسے معاہدے میں خلاف ورزی بہت کم ہوتی ہے۔ جو لوگ ناجائز طور پر شراب بیچتے ہیں، ان کے پاس دو تین آدمی ایسے ضرور موجود ہوتے ہیں جن کا صرف یہ کام ہے کہ اگر پولیس چھاپہ مارے تو وہ گرفتار ہو جائیں اور چند ماہ کی قید کاٹ کر واپس آ جائیں اس کا معاوضہ ان کو معقول مل جاتا ہے۔ چھاپہ مارنے والے بھی پہلے ہی سے مطلع کر دیتے ہیں کہ ہم آ رہے ہیں' تم اپنا انتظام کر لو۔ چنانچہ فوراً انتظام کر لیا جاتا ہے' یعنی مالک غائب غلہ ہو جاتا ہے اور وہ کرائے کے آدمی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی ملازمت ہے لیکن دنیا میں جتنی ملازمتیں ہیں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ میں جب امین پہلوان سے ملا تو وہ تین مہینے کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

”امین! اس دفعہ کیسے جیل میں گئے؟“

امین مسکرایا:

”اپنے کاروبار کے سلسلے میں“

”کیا کاروبار تھا؟“

”جو رہا، وہ ہے“

”بھئی بتاؤ تو۔

”بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں مگر خواہ مخواہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔“

میں نے تھوڑے سے توقف کے بعد اس سے کہا۔“

امین! تمہیں آئے دن جیل میں جانا کیا پسند ہے؟“

امین پہلوان مسکرایا:

”جناب۔ پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لوگ مجھے پہلوان کہتے ہیں، حالانکہ میں نے آج تک اکھاڑے کی شکل نہیں دیکھی۔ اَن پڑھ ہوں۔ کوئی اور ہنر بھی مجھے نہیں آتا۔ بس، جیل جانا آتا ہے۔ وہاں میں خوش رہتا ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ آپ ہر روز دفتر جاتے ہیں۔ کیا وہ جیل نہیں۔“

میں لاجواب ہو گیا:

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ امین لیکن دفتر جانے والوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ لوگ انہیں بُری نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔“

”کیوں نہیں دیکھتے! ضلع کچہری کے جتنے مُنشی اور کلرک ہیں، انہیں کون اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔ رشوتیں لیتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں اور پرلے درجے کے مکار ہوتے ہیں۔ مجھ میں ایسا کوئی عیب نہیں۔ میں اپنی روزی بڑی ایمانداری سے کماتا ہوں۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کس طرح؟“

اس نے جواب دیا:

”اس طرح کہ اگر کسی کا کام کرتا ہوں اور قید کاٹتا ہوں جیل میں محنت مشقت کرتا ہوں اور بعد میں اس شخص سے جس کی خاطر میں نے سزا بھگتی تھی، مجھے دو تین سو روپیہ ملتا ہے تو یہ میرا معاوضہ ہے، اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں رشوت تو نہیں لیتا۔ حلال کی کمائی کھاتا ہوں۔ لوگ مجھے غنڈا سمجھتے ہیں۔ بڑا خطرناک غنڈا۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے آج تک کسی کے تھپڑ بھی نہیں مارا۔ میری لائن بالکل الگ ہے۔“

اس کی لائن واقعی دوسروں سے الگ تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ تین چار مرتبہ قید کاٹنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہ بڑا سنجیدہ مگر گنوار قسم کا آدمی تھا جس کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ قید کاٹنے کے بعد جب بھی آتا تو اس کا وزن کم از کم دس پاؤنڈ زیادہ ہوتا۔ ایک دن میں نے اس سے پُوچھا۔

”امین کیا وہاں کا کھانا تمہیں راس آتا ہے؟“

اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا:

”کھانا کیسا بھی ہو، اس کو راس کرنا آدمی کا اپنا کام ہے۔ مجھے دال سے نفرت تھی، لیکن جب پہلی مرتبہ مجھے وہاں کنکروں بھری دال دی گئی اور ریت ملی روٹی تو میں نے کہا۔ امین یار۔ یہ سب سے اچھا کھانا ہے، کھاڈنڑ پیل اور خدا کا شکر بجالا۔ چنانچہ میں ایک دو روز ہی میں عادی ہو گیا۔ مشقت کرتا کھانا کھاتا اور یوں محسوس کرتا جیسے میں نے گنجے کے ہوٹل سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔“

میں نے ایک دن اس سے پوچھا:

”تم نے کبھی کسی عورت سے بھی محبت کی ہے؟“

اس نے اپنے دونوں کان پکڑے۔

”خدا بچائے اس محبت سے، مجھے صرف اپنی ماں سے محبت ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا:

”تمہاری ماں زندہ ہے؟“

”جی ہاں۔ خدا کے فضل و کرم سے۔ بہت بوڑھی ہے لیکن آپ کی دعا سے اس کا سایہ میرے سر پر دیر تک قائم رہے گا اور وہ تو ہر وقت میرے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا مجھے نیکی کی ہدایت کرے۔“

میں نے اُس سے کہا:

”خدا تمہاری ماں کو سلامت رکھے! پر میں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں کسی عورت سے محبت ہوئی یا نہیں دیکھو، جھوٹ نہیں بولنا“!

امین پہلوان نے بڑے تیز لہجے میں کہا:

”میں نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کسی عورت سے محبت نہیں کی۔“

میں نے پوچھا:

”کیوں“

اس نے جواب دیا:

”اس لیے کہ مجھے اس سے دلچسپی ہی نہیں۔“

میں خاموش ہو رہا۔ تیسرے روز اس کی ماں پر فالج گرا اور وہ راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔ امین پہلوان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ وہ سوگوار' مغموم اور دل شکستہ بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک رئیس کی طرف سے اسے بلاوا آیا۔ وہ اپنی عزیز ماں کی میّت چھوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا: کیوں میاں صاحب' آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“

میاں صاحب نے کہا:

”تمہیں کیوں بلایا جاتا ہے۔ ایک خاص کام ہے“

امین نے جس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کا کفن دفن تیر رہا تھا' پوچھا:

”حضور یہ خاص کام کیا ہے؟“

میاں صاحب نے سگریٹ سلگایا:

”بلیک مارکیٹ کا قصہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج میرے گودام پر چھاپہ مارا جائے گا سو میں نے سوچا کہ امین پہلوان بہترین آدمی ہے جو اسے نمٹا سکتا ہے۔“

امین نے بڑے مغموم اور زخمی انداز میں کہا:

”آپ فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”بھئی' خدمت و دمت کی بات تم مت کرو۔ بس صرف اتنی سی بات ہے کہ جب چھاپہ پڑے تو گودام کے مالک تم ہو گے۔ گرفتار ہو جاؤ گے۔ زیادہ سے زیادہ جرمانہ پانچ ہزار روپے ہو گا اور ایک دو برس کی قید“!

”مجھے کیا ملے گا؟“

”جب وہاں سے رہا ہو کر آؤ گے تو معاملہ طے کر لیا جائے گا۔“

امین نے میاں صاحب سے کہا:

”حضور' بہت دور کی بات ہے جرمانہ تو آپ ادا کر دیں گے، لیکن قید تو مجھے کاٹنی پڑے گی۔ آپ باقاعدہ سودا کریں۔“

میاں صاحب مسکرائے:

”تم سے آج تک میں نے کبھی وعدہ خلافی کی ہے۔ پچھلی دفعہ میں نے تم سے کام لیا اور تم کو تین مہینے کی قید ہوئی' تو کیا میں نے جیل خانے میں ہر قسم کی سہولت بہم نہ پہنچائی۔ تم نے باہر آکر مجھ سے کہا کہ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اگر تم کچھ عرصے کیلیے جیل چلے گئے تو وہاں تمہیں ہر آسائش ہو گی۔“

امین نے کہا:

”جی۔ یہ سب درست ہے۔ لیکن۔“

”لیکن کیا؟ امین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے:

”میاں صاحب! میری ماں مر گئی ہے۔“

”کب؟“

”آج صبح۔“

میاں صاحب نے افسوس کا اظہار کیا:

”کفنا دفنا دیا ہو گا۔“

امین کی آنکھوں میں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے

”میاں صاحب ابھی تو کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ میرے پاس تو افیم کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔“

میاں صاحب نے چند لمحات حالات پر غور کیا اور امین سے کہا:

”تو ایسا کرو۔ میرا مطلب ہے کہ تجہیز و تکفین کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔ تمہیں کسی قسم کا تردّد نہیں کرنا چاہیے۔ تم گودام پر جاؤ اور اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔“

امین نے اپنی میلی قمیص کی آستین سے آنسو پونچھے۔

”لیکن میاں صاحب میں۔ میں اپنی ماں کے جنازے کو کندھا بھی نہ دوں“!

میاں صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”یہ سب رسمی چیزیں ہیں، مرحومہ کو دفنانا ہے۔ سو یہ کام بڑی اچھی طرح سے ہو جائے گا تمھیں جنازے کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے ساتھ جانے سے مرحومہ کو کیا راحت پہنچے گی۔ وہ تو بے چاری اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ اس کے جنازے کے ساتھ کوئی بھی جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل میں تم لوگ جاہل ہو۔ میں اگر مر جاؤں تو مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے جنازے میں کس کس عزیز اور دوست نے شرکت کی تھی۔ مجھے اگر جلا بھی دیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میری لاش کو چیلوں اور گِدھوں کے حوالے کر دیا جائے تو مجھے اس کی کیا خبر ہو گی۔ تم زیادہ جذباتی نہ ہو‘ دنیا میں سب سے ضروری چیز یہ ہے۔ کہ اپنی ذات کے متعلق سوچا جائے۔ میں پوچھتا ہوں، تمہاری کمائی کے ذرائع کیا ہیں۔“

امین سوچنے لگا۔ چند لمحات اپنی بساط کے مطابق غور کرنے کے بعد اس نے جواب دیا

”حضور! میری کمائی کے ذرائع آپ کو معلوم ہیں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں۔“

”میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تمھیں میرا کام کرنے میں کیا حیل وحجت ہے۔ میں تمہاری ماں کی تجہیز و تکفین کا ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں‘ اور جب تم جیل سے واپس آؤ گے تو۔“

امین پہلوان نے بڑے بینڈے انداز میں پوچھا۔

”تو آپ میرا ابھی بندوبست کر دیں گے۔“

میاں صاحب بوکھلا گئے:

”تم کیسی باتیں کرتے ہو امین پہلوان“!

امین پہلوان نے ذرا درشت لہجے میں کہا:

”امین پہلوان کی ایسی کی تیسی۔ آپ یہ بتائیے کہ مجھے کتنے روپے ملیں گے۔ میں ایک ہزار سے کم نہیں لوں گا۔“

”ایک ہزار تو بہت زیادہ ہیں۔“

امین نے کہا:

”زیادہ ہے یا کم۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جب قید کاٹ کر آؤں گا تو اپنی ماں کی قبر پختہ بناؤں گا سنگِ مرمر کی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔“

میاں صاحب نے اس سے کہا

”اچھا بھئی‘ ایک ہزار ہی لے لینا۔“

امین نے میاں صاحب سے کہا:

”تو لائیے اتنے روپے دیجئے کہ میں کفن دفن کا انتظام کر لوں۔ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کیلیے حاضر ہو جاؤں گا۔“

میاں صاحب نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا۔

”لیکن تمہارا کیا بھروسا ہے“!

امین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کو کسی نے ماں بہن کی گالی دی ہے۔

”میاں صاحب! آپ مجھے بے ایمان سمجھتے ہیں۔ بے ایمان آپ ہیں۔ اس لیے کہ اپنے فعلوں کا بوجھ میرے سر پر ڈال رہے ہیں۔“

میاں صاحب موقع شناس تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ امین بگڑ گیا ہے‘ چنانچہ انہوں نے فوراً اپنی چرب زبانی سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن امین پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ غسّال اسکی ماں کو آخری غسل دے چکے ہیں۔ کفن بھی پہنایا جا چکا ہے۔ امین بہت متحیر ہوا کہ اس پر یہ مہربانی کس نے کی ہے۔ میاں صاحب نے۔ لیکن وہ تو سودا کرنا چاہتے تھے۔ اُس نے ایک آدمی سے جو تابوت کو سجانے کیلیے پھول گوندھ رہا تھا‘ پوچھا

”یہ کس آدمی نے اتنا اہتمام کیا ہے؟“

پھول والے نے جواب دیا:

”حضور! آپ کی بیوی نے۔“

امین چکرا گیا۔ وہ اپنے شدید تعجب کا مظاہرہ کرتا مگر خاموش رہا۔ پھول والے سے صرف اتنا پوچھا۔

”کہاں ہیں وہ۔“

پھول والے نے جواب دیا:

”جی اندر ہیں۔ آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔“

امین اندر گیا۔ تو دیکھا کہ ایک نوجوان، خوبصورت لڑکی اس کی چارپائی پر بیٹھی ہے۔ امین نے اس سے پوچھا۔

”آپ کون ہیں۔ یہاں کیوں آئی ہیں“

اُس لڑکی نے جواب دیا۔

”میں آپ کی بیوی ہوں، یہاں کیوں آئی ہوں، یہ آپ کا عجیب وغریب سوال ہے۔“

امین نے اس سے پوچھا:

”میری بیوی تو کوئی بھی نہیں۔ بتاؤ تم کون ہو۔“

لڑکی مسکرائی:

”میں۔ میاں۔ دین کی بیٹی ہوں۔ ان سے جو آپ کی گفتگو ہوئی، میں نے سب سُنی۔ اور۔ اور۔“

امین نے کہا:

”اب اور کہنے کی ضرورت نہیں۔“

ابجی ڈُڈُو

”مجھے مت ستایئے۔ خدا کی قسم، میں آپ سے کہتی ہوں، مجھے مت ستایئے“

”تم بہت ظلم کر رہی ہو آج کل“!

”جی ہاں بہت ظلم کر رہی ہوں“

”یہ تو کوئی جواب نہیں“

”میری طرف سے صاف جواب ہے اور یہ میں آپ سے کئی دفعہ کہہ چکی ہوں“

”آج میں کچھ نہیں سنوں گا“

”مجھے مت ستایئے۔ خدا کی قسم، میں آپ سے سچ کہتی ہوں، مجھے مت ستایئے میں چلانا شروع کر دوں گی۔“

”آہستہ بولو۔ بچیاں جاگ پڑیں گی“

”آپ تو بچیوں کے ڈھیر لگانا چاہتے ہیں۔“

”تم ہمیشہ مجھے یہی طعنہ دیتی ہو۔“

”آپ کو کچھ خیال تو ہونا چاہیے۔ میں تنگ آچکی ہوں۔“

”درست ہے۔ لیکن۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں“!

”تمہیں میرا کچھ خیال نہیں۔ اصل میں اب تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔ آج سے آٹھ برس پہلے جو بات تھی وہ اب نہیں رہی۔ تمہیں اب میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔“

”جی ہاں“

”وہ کیا دن تھے جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ تمہیں میری ہر بات کا کتنا خیال رہتا تھا۔ ہم باہم کس قدر شیر وشکر تھے۔ مگر اب تم کبھی سونے کا بہانہ کر دیتی ہو۔ کبھی تھکاوٹ کا عذر پیش کر دیتی اور کبھی دونوں کان بند کر لیتی ہو۔ کچھ سنتی ہی نہیں۔“

”میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں“!

”تم ظلم کی آخری حد تک پہنچ گئی۔“

”مجھے سونے دیجیے۔“

”سو جائیے۔ مگر میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہوں گا۔ آپ کی بلا سے“!

”آہستہ بولیے۔ ساتھ ہمسائے بھی ہیں“

”ہوا کریں“

”آپ کو تو کچھ خیال ہی نہیں۔ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔“

”کہیں گے کہ اس غریب آدمی کو کیسی کڑی بیوی ملی ہے۔“

”اوہ ہو“

”آہستہ بولو۔ دیکھو بچی جاگ پڑی“!

”اللہ اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ اللہ اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ سو جاؤ بیٹے سو جاؤ۔ اللہ، اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ خدا کی قسم آپ بہت تنگ کرتے ہیں، دن بھر کی تھکی ماندی کو سونے تو دیجیے“!

”اللہ، اللہ۔ اللہ جی، اللہ۔ اللہ اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ تمہیں اچھی طرح سلانا بھی نہیں آتا۔“

”آپ کو تو آتا ہے نا۔ سارا دن آپ گھر میں رہ کر یہی تو کرتے رہتے ہیں“

”بھئی میں سارا دن گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔ جب فرصت ملتی ہے آجاتا ہوں اور تمہارا ہاتھ بٹا دیتا ہوں۔“

”میرا ہاتھ بٹانے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں۔ آپ مہربانی کر کے گھر سے باہر اپنے دوستوں ہی کے ساتھ گلچھڑے اڑایا کریں۔“

”گل چھڑے؟“

”میں زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتی“

”اچھا دیکھو، میری ایک بات کا جواب دو۔“

”خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کیجیے۔“

”کمال ہے میں کہاں جاؤں“

”جہاں آپ کے سینگ سمائیں چلے جائیے“

”لو اب ہمارے سینگ بھی ہو گئے“

”آپ چپ نہیں کریں گے“

”نہیں۔ میں آج بولتا ہی رہوں گا۔ خود سوؤں گا نہ تمہیں سونے دونگا“

”سچ کہتی ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گی۔ لو گو یہ کیسا آدمی ہے۔ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ بس ہر وقت۔ ہر وقت۔ ہر وقت۔“

”تم ضرور تمام بچیوں کو جگا کر رہو گی۔“

”نہ پیدا کی ہوتیں اتنی“!

”پیدا کرنے والا میں تو نہیں ہوں۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ اللہ، اللہ۔ اللہ جی، اللہ، اللہ۔ اللہ جی، اللہ۔“

”بچی کو اب میں نے جگایا تھا؟“

”مجھے افسوس ہے“!

”افسوس ہے، کہہ دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمسائیگی کا کچھ خیال ہی نہیں لوگ کیا کہیں گے اسکی پرواہ ہی نہیں۔ خدا کی قسم میں عنقریب ہی دیوانی ہو جاؤں گی“!

”دیوانے ہوں تمہارے دشمن“

”میری جان کے دشمن تو آپ ہیں“

”تو خدا مجھے دیوانہ کرے“

”وہ تو آپ ہیں“!

”میں دیوانہ ہوں، مگر تمہارا“

”اب جو نچلے نہ بگھاریئے“

”تم تو نہ یوں مانتی ہو نہ ووں“

”میں سونا چاہتی ہوں“

”سو جاؤ، میں پڑا بکواس کرتا رہوں گا“

”یہ بکواس کیا اشد ضروری ہے“

”ہے تو سہی۔ ذرا ادھر دیکھو۔“

”میں کہتی ہوں، مجھے تنگ نہ کیجیے۔ میں رو دوں گی“

”تمہارے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا ہو گئی۔ میری ساری زندگی تمہارے لیے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو بتا دو۔“

”آپ کی تین خطائیں یہ سامنے پلنگ پر پڑی ہیں“

”یہ تمہارے کوسنے کبھی ختم نہیں ہوں گے“

”آپ کی ہٹ کب ختم ہو گی؟“

”لو بابا میں تم سے کچھ نہیں کہتا۔ سو جاؤ۔ میں نیچے چلا جاتا ہوں۔“

”کہاں؟“

”جہنم میں“

”یہ کیا پاگل پن ہے۔ نیچے اتنے مچھر ہیں، پنکھا بھی نہیں۔ سچ کہتی ہوں، آپ بالکل پاگل ہیں۔ میں نہیں جانے دونگی آپ کو“

”میں یہاں کیا کروں گا۔ مچھر ہیں پنکھا نہیں ہے، ٹھیک ہے۔ میں نے زندگی کے بُرے دن بھی گزارے بھی ہیں۔ تن آسان نہیں ہوں۔ سو جاؤں گا صوفے پر“

”سارا وقت جاگتے رہیں گے“

”تمہاری بلا سے‘

”میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں“

”میں مر نہیں جاؤں گا۔ مجھے جانے دو“

”کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں!۔ خبردار جو آپ گئے“!

”مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی“

”نہ آئے“

”یہ عجیب منطق ہے۔ میں کوئی لڑ جھگڑ کر تو نہیں جا رہا“

”لڑائی جھگڑا کیا ابھی باقی ہے۔ خدا کی قسم آپ کبھی کبھی بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اب یہ خبط سر میں سمایا ہے کہ میں نیچے گرمی اور مچھروں میں جا کر سوؤں گا۔ کوئی اور ہوتی تو پاگل ہو جاتی۔“

”تمہیں میرا بڑا خیال ہے“

”اچھا بابا نہیں ہے۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”اب سیدھے راستے پر آئی ہو“

”چلیے ہٹیے۔ میں کوئی راستہ واستہ نہیں جانتی۔ منہ دھو کے رکھیے اپنا“

”منہ صبح دھویا جاتا ہے۔ لو، اب من جاؤ“

”توبہ“!

”ساڑھی پر وہ بورڈر لگ کر آ گیا؟“

”نہیں“!

”عجب الو کا پٹھا ہے درزی۔ کہہ رہا تھا آج ضرور پہنچا دے گا۔“

”لے کر آیا تھا، مگر میں نے واپس کر دی۔“

”کیوں؟“

”ایک دو جگہ جھول تھے۔“

”اوہ۔ اچھا، میں نے کہا، کل

”برسات

دیکھنے چلیں گے۔ میں نے پاس کا بندوبست کر لیا ہے۔“

”کتنے آدمیوں کا؟“

”دو کا۔ کیوں؟“

”باجی بھی جانا چاہتی تھیں۔“

”ہٹاؤ باجی کو پہلے ہم دیکھیں گے پھر اس کو دکھا دیں گے۔ پہلے ہفتے میں پاس بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ چاندنی رات میں تمہارا بدن کتنا چمک رہا ہے“

”مجھے تو اس چاندنی سے نفرت ہے۔ کم بخت آنکھوں میں گھستی ہے۔ سونے نہیں دیتی“

”تمہیں تو بس ہر وقت سونے ہی کی پڑی رہتی ہے“

”آپ کو بچیوں کی دیکھ بھال کرنا پڑے تو پھر پتا چلے۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ ایک کے کپڑے بدلو، تو دوسری کے میلے ہو جاتے ہیں۔ ایک کو سلاؤ، دوسری جاگ پڑتی ہے، تیسری نعمت خانے کی غارتگری میں مصروف ہوتی ہے۔“

”دو نوکر گھر میں موجود ہیں“

”نوکر کچھ نہیں کرتے“

”لے آؤں، بچے سے؟“

”جلدی جایئے رونا شروع کر دیگی“

”جاتا ہوں“!

”میں نے کہا، سنئے۔ آگ جلا کر ذرا کنکنا کر لیجیے گا دودھ“

”اچھا، اچھا۔ سن لیا ہے“!

13جون1950ء

سعادت حسن منٹو

آخری سیلوٹ

یہ کشمیر کی لڑائی بھی عجیب و غریب تھی۔ صوبیدار رب نواز کا دماغ ایسی بندوق بن گیا تھا۔ جنگ کا گھوڑا خراب ہو گیا ہو۔ پچھلی بڑی جنگ میں وہ کئی محاذوں پر لڑ چکا تھا۔ مارنا اور مرنا جانتا تھا۔ چھوٹے بڑے افسروں کی نظروں میں اس کی بڑی توقیر تھی، اس لیے کہ وہ بڑا بہادر، نڈر اور سمجھدار سپاہی تھا۔ پلاٹون کمانڈر مشکل کام ہمیشہ اسے ہی سونپتے تھے اور وہ ان سے عہدہ بر آ ہوتا تھا۔ مگر اس لڑائی کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ دل میں بڑا ولولہ، بڑا جوش تھا۔ بھوک پیاس سے بے پروا صرف ایک ہی لگن تھی، دشمن کا صفایا کر دینے کی، مگر جب اس سے سامنا ہوتا، تو جانی پہچانی صورتیں نظر آتیں۔ بعض دوست دکھائی دیتے، بڑے بغلی قسم کے دوست، جو پچھلی لڑائی میں اس کے دوش بدوش، اتحادیوں کے دشمنوں سے لڑے تھے، پر اب جان کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔ صوبیدار رب نواز سوچتا تھا کہ یہ سب خواب تو نہیں۔ پچھلی بڑی جنگ کا اعلان۔ بھرتی، قدر آور چھاتیوں کی پیمائش، پی ٹی، چاندماری اور پھر محاذ۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، آخر جنگ کا خاتمہ۔ پھر ایک دم پاکستان کا قیام اور ساتھ ہی کشمیر کی لڑائی۔ اوپر تلے کتنی چیزیں۔ رب نواز سوچتا تھا کہ کرنے والے نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے تاکہ دوسرے بوکھلا جائیں اور سمجھ نہ سکیں۔ ورنہ یہ بھی کوئی بات تھی کہ اتنی جلدی اتنے بڑے انقلاب برپا ہو جائیں۔ اتنی بات تو صوبیدار رب نواز کی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ کشمیر حاصل کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ کشمیر کیوں حاصل کرنا ہے، یہ بھی وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے کہ پاکستان کی بقاء کے لیے اس کا الحاق اشد ضروری ہے، مگر نشانہ باندھتے

ہوئے اسے جب کوئی جانی پہچانی شکل نظر آجاتی تھی تو وہ کچھ دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ وہ کس غرض کے لیے لڑ رہا ہے، کس مقصد کے لیے اس نے بندوق اٹھائی ہے۔ اور وہ یہ غالباً اسی لیے بھولتا تھا کہ اسے بار بار خود کو یاد کرانا پڑ تھا کہ اب کی وہ صرف تنخواہ زمین کے مربعوں اور تمغوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے وطن کی خاطر لڑ رہا ہے۔ یہ وطن پہلے بھی اس کا وطن تھا، وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا جو اب پاکستان کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اب اسے اپنے اسی ہم وطن کے خلاف لڑنا تھا جو کبھی اس کا ہمسایہ ہوتا تھا، جس کے خاندان سے اس کے خاندان کے پشت ہا پشت کے دیرینہ مراسم تھے۔ اب اس کا وطن وہ تھا جس کا پانی تک بھی اس نے کبھی نہیں پیا تھا، پر اب اسکی خاطر، ایک دم اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ جاؤ، یہ جگہ جہاں تم نے ابھی اپنے گھر کے لیے دو اینٹیں بھی نہیں چنیں، جس کی ہوا اور جس کے پانی کا مزا ابھی تک تمہارے منہ میں ٹھیک طور پر نہیں بیٹھا، تمہارا وطن ہے۔ جاؤ اس کی خاطر پاکستان سے لڑو۔ اس پاکستان سے جس کے عین دل میں تم نے اپنی عمر کے اتنے برس گزارے ہیں۔ رب نواز سوچتا تھا کہ یہی دل ان مسلمان فوجیوں کا ہے جو ہندوستان میں اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ وہاں ان سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا یہاں آ کر انھیں اور تو کچھ نہیں ملا۔ البتہ بندوقیں ملی گئی ہیں۔ اسی وزن کی، اسی شکل کی، اسی مار کے اور چھاپ کی۔ پہلے سب مل کر ایک ایسے دشمن سے لڑتے تھے جن کو انھوں نے پیٹ اور انعام و اکرام کی خاطر اپنا دشمن یقین کر لیا تھا۔ اب وہ خود دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلے سب ہندوستانی فوجی کہلاتے تھے۔ اب ایک پاکستانی تھا اور دوسرا ہندوستانی۔ ادھر ہندوستان میں مسلمان ہندوستانی فوجی تھے۔ رب نواز جب ان کے متعلق سوچتا تو اس کے دماغ میں ایک عجیب گڑبڑ سی پیدا ہو جاتی۔ اور جب وہ کشمیر کے متعلق سوچتا تو اس کا دماغ بالکل جواب دے جاتا۔ پاکستانی فوجی کشمیر کے لیے لڑ رہے تھے یا کشمیر کے مسلمانوں کے لیے؟ اگر انھیں کشمیر کے مسلمانوں ہی کے لیے لڑایا جاتا تھا تو حیدر آباد، اور جونا گڑھ کے مسلمانوں کے لیے کیوں انھیں لڑنے کے لیے نہیں کہا جاتا تھا۔ اور اگر یہ جنگ ٹھیٹ اسلامی جنگ تھی تو دنیا میں دوسرے اسلامی ملک ہیں وہ اس میں کیوں حصہ نہیں لیتے۔ رب نواز اب بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ باریک باریک باتیں فوجی کو بالکل نہیں سوچنا چاہئیں۔ اس کی عقل موٹی ہونی چاہیے۔ کیونکہ موٹی عقل والا ہی اچھا سپاہی ہو سکتا ہے، مگر فطرت سے مجبور کبھی کبھی وہ چور دماغ سے ان پر غور کر ہی لیتا تھا اور بعد میں اپنی اس حرکت پر خوب ہنستا تھا۔ دریائے کشن گنگا کے کنارے اس سڑک کے لیے جو مظفر آباد سے کرن جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے لڑائی ہو رہی تھی۔ عجیب و غریب لڑائی تھی۔ رات کو بعض اوقات آس پاس کی پہاڑیاں فائروں کے بجائے گندی گندی گالیوں سے گونج اٹھتی تھیں۔ ایک مرتبہ صوبیدار رب نواز اپنی پلاٹوں کے جوانوں کے ساتھ شب خون مارنے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ دور نیچے ایک کھائی سے گالیوں کا شور اٹھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت سے بھوت مل کر ناچ رہے ہیں۔ اور زور زور کے قہقہے لگا رہے ہیں۔ وہ بڑبڑایا۔

”خنزیز کی دُم۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔“

ایک جوان نے گونجتی ہوئی آوازوں سے مخاطب ہو کر یہ بڑی گالی دی اور رب نواز سے کہا۔

”صوبیدار صاحب گالیاں دے رہے ہیں۔ اپنی ماں کے یار۔“

رب نواز یہ گالیاں سن رہا تھا جو بہت اکسانے والی تھیں۔ اس کے جی میں آئی کہ بزن بول دے مگر ایسا کرنا غلطی تھی، چنانچہ وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر جوان بھی چپ رہے، مگر جب پانی سر سے گزر گیا تو انھوں نے بھی گلا پھاڑ پھاڑ کے گالیاں لڑھکانا شروع کر دیں۔ رب نواز کے لیے اس قسم کی لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اس نے جوانوں کو دو تین مرتبہ خاموش رہنے کے لیے کہا، مگر گالیاں ہی کچھ ایسی تھیں کہ جواب دیے بنا انسان سے نہیں رہا جاتا تھا۔ دشمن کے سپاہی نظر سے اوجھل تھے۔ رات کو تو خیر اندھیرا تھا، مگر وہ دن کو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ صرف ان کی گالیاں نیچے پہاڑی کے قدموں سے اٹھتی تھیں اور پتھروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ہوا میں حل ہو جاتی تھیں۔ رب نواز کی پلاٹون کے جوان جب ان گالیوں کا جواب دیتے تھے تو اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ نیچے نہیں جاتیں، اوپر کو اڑ جاتی ہیں۔ اس سے اس کو خاصی کوفت ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے جھنجھلا کر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ رب نواز کو وہاں کی پہاڑیوں میں ایک عجیب بات نظر آئی تھی۔ چڑھائی کی طرف کوئی پہاڑی درختوں اور بوٹوں سے لدی پھندی ہوتی تھی اور اترائی کی طرف گنجی۔ کشمیری ہتو کے سر کی طرح۔ کسی کی چڑھائی کا حصہ گنجا ہوتا تھا اور اترائی کی طرف درخت ہی درخت ہوتے تھے۔ چیز کے لیے لمبے تناور درخت۔ جن کے بٹے ہوئے دھاگے جیسے پتوں پر فوجی بوٹ پھسل پھسل جاتے تھے۔ جس پہاڑی پر صوبیدار رب نواز کی پلاٹون تھی، اس کی اترائی درختوں اور جھاڑیوں سے بے نیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ حملہ بہت ہی خطرناک تھا مگر سب جوان حملے کے لیے بخوشی تیار تھے۔ گالیوں کا انتقام لینے کے لیے وہ بے تاب تھے۔ حملہ ہوا اور کامیاب رہا۔ دو جوان مارے گئے۔ چار زخمی ہوئے۔ دشمن کے تین آدمی کھیت رہے۔ باقی رسد کا کچھ سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ صوبیدار رب نواز اور اس کے جوانوں کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ دشمن کا کوئی زندہ سپاہی ان کے ہاتھ نہ آیا جس کو وہ خاطر خواہ گالیوں کا مزا چکھاتے۔ مگر یہ مورچہ فتح کرنے سے وہ ایک بڑی اہم پہاڑی پر قابض ہو گئے تھے۔ وائرلیس کے ذریعے سے صوبیدار رب نواز نے پلاٹون کمانڈر میجر اسلم کو فوراً ہی اپنے حملے کے اس نتیجے سے مطلع کر دیا تھا اور شاباش وصول کر لی تھی۔ قریب قریب ہر پہاڑی کی چوٹی پر پانی کا ایک تالاب سا ہوتا تھا۔ اس پہاڑی پر بھی تالاب تھا، مگر دوسری پہاڑیوں کے تالابوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا۔ اس کا پانی بھی بہت صاف اور شفاف تھا۔ گو موسم سخت سرد تھا، مگر سب نہائے۔ دانت بجتے رہے مگر انھوں نے کوئی پروا نہ کی۔ وہ ابھی اس شغل میں مصروف تھے کہ فائر کی آواز آئی۔ سب ننگے ہی لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار رب نواز خاں نے دوربین لگا کر نیچے ڈھلوانوں پر نظر دوڑائی، مگر اسے دشمن کے چھپنے کی جگہ کا پتا نہ چلا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ایک اور فائر ہوا۔ دور اترائی کے فوراً بعد ایک نسبتاً چھوٹی پہاڑی کی داڑھی سے اسے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ اس نے فوراً ہی اپنے جوانوں کو فائر کا حکم دیا۔ ادھر سے دھڑا دھڑ فائر ہوئے۔ ادھر سے بھی جواباً

گولیاں چلنے لگیں۔ صوبیدار رب نواز نے دوربین سے دشمن کی پوزیشن کا بغور مطالعہ کیا۔ وہ غالباً بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے محفوظ تھے۔ مگر یہ محافظ دیوار بہت ہی چھوٹی تھی۔ زیادہ دیر تک وہ جمے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان میں سے جو بھی اِدھر اُدھر ہٹتا، اس کا صوبیدار رب نواز کی زد میں آنا یقینی تھا۔ تھوڑی دیر فائر ہوتے رہے۔ اس کے بعد رب نواز نے اپنے جوانوں کو منع کر دیا کہ وہ گولیاں ضائع نہ کریں صرف تاک میں رہیں۔ جونہی دشمن کا کوئی سپاہی پتھروں کی دیوار سے نکل کر ادھر یا ادھر جانے کی کوشش کرے اس کو اڑا دیں۔ یہ حکم دے کر اس نے اپنے الف ننگے بدن کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔

"خنزیز کی دُم۔ کپڑوں کے بغیر آدمی حیوان معلوم ہوتا ہے۔"

لمبے لمبے وقفوں کے بعد دشمن کی طرف سے اِکا دُکا فائر ہوتا رہا۔ یہاں سے اس کا جواب کبھی کبھی دے دیا جاتا۔ یہ کھیل پورے دو دن جاری رہا۔ موسم یک لخت بہت سرد ہو گیا۔ اس قدر سرد کہ دن کو بھی خون منجمد ہونے لگتا تھا، چنانچہ صوبیدار رب نواز نے چائے کے دور شروع کرا دیے۔ ہر وقت آگ پر کیتلی دھری رہتی۔ جونہی سردی زیادہ ستاتی ایک دور اس گرم گرم مشروب کا ہو جاتا۔ ویسے دشمن پر برابر نگاہ تھی۔ ایک ہٹتا تو دوسرا اس کی جگہ دوربین لے کر بیٹھ جاتا۔ ہڈیوں تک اتر جانے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ جب اس جوان نے جو پہرے دار تھا، بتایا کہ پتھروں کی دیوار کے پیچھے کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ صوبیدار رب نواز نے اس سے دوربین لی اور غور سے دیکھا۔ اسے حرکت نظر نہ آئی لیکن فوراً ہی ایک آواز بلند ہوئی اور دیر تک اس کی گونج آس پاس کی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتی رہی۔ رب نواز اس کا مطلب نہ سمجھا۔ اس کے جواب میں اُس نے اپنی بندوق داغ دی۔ اس کی گونج دبی تو پھر ادھر سے آواز بلند ہوئی، جو صاف طور پر ان سے مخاطب تھی۔ رب نواز چلایا۔

"خنزیر کی دُم۔ بول کیا کہتا ہے تو! فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ رب نواز کے الفاظ دشمن تک پہنچ گئے، کیونکہ وہاں سے کسی نے کہا۔

"گالی نہ دے بھائی۔"

رب نواز نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا اور بڑے جھنجھلائے ہوئے تعجب کے ساتھ کہا۔

"بھائی؟۔"

پھر وہ اپنے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر چلایا۔

"بھائی ہو گا تیری ماں کا جنا۔ یہاں سب تیری ماں کے یار ہیں!"

ایک دم اُدھر سے ایک زخمی آواز بلند ہوئی۔

"رب نواز!"

رب نواز کانپ گیا۔ یہ آواز آس پاس کی پہاڑیوں سے سر پھوڑتی رہی اور مختلف انداز میں، رب نواز۔ رب نواز، دہراتی بالآخر خون منجمد کر دینے والی سرد ہوا کے ساتھ جانے کہاں اڑ گئی۔ رب نواز بہت دیر کے بعد چونکا۔

"یہ کون تھا۔"

پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

"خنزیر کی دم!"

اس کو اتنا معلوم تھا ٹیٹوال کے محاذ پر سپاہیوں کی اکثریت 6 /9 رجمنٹ کی ہے۔ وہ بھی اسی رجمنٹ میں تھا۔ مگر یہ آواز تھی کس کی؟ وہ ایسے بیشمار آدمیوں کو جانتا تھا۔ جو کبھی اس کے عزیز ترین دوست تھے۔ کچھ ایسے بھی جن سے اس کی دشمنی تھی، چند ذاتی اغراض کی بناء پر۔ لیکن یہ کون تھا جس نے اس کی گالی کا بُرا مان کر اسے چیخ کر پکارا تھا۔ رب نواز نے دوربین لگا کر دیکھا، مگر پہاڑی کی ہلتی ہوئی چھدری داڑھی میں اسے کوئی نظر نہ آیا۔ دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اس نے زور سے اپنی آواز ادھر پھینکی۔

"یہ کون تھا؟۔ رب نواب بول رہا ہے۔ رب نواز۔ رب نواز۔"

یہ رب نواز، بھی کچھ دیر تک پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتا رہا۔ رب نواز بڑبڑایا۔

"خنزیر کی دُم!"

فوراً ہی ادھر سے آواز بلند ہوئی۔

"میں ہوں۔ میں ہوں رام سنگھ!"

رب نواز یہ سن کر یوں اچھلا جیسے وہ چھلانگ لگا کر دوسری طرف جانا چاہتا ہے۔ پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"رام سنگھ؟"

پھر حلق پھاڑ کے چلایا۔

”رام سنگھ ؟۔ اوے رام سنگھا۔ خنزیر کی دُم!“

”خنزیر کی دم“

ابھی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر پوری طرح گم نہیں ہوئی تھی کہ رام سنگھ کی پھٹی پھٹی آواز بلند ہوئی۔

”اوے کمہار کے کھوتے!“

رب نواز پھوں پھوں کرنے لگا۔ جوانوں کی طرف رعب دار نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

”بکتا ہے۔ خنزیر کی دُم!“

پھر اس نے رام سنگھ کو جواب دیا۔

”اوئے بابا ٹل کے کڑاہ پرشاد۔ اوئے خنزیر کے جھٹکے۔“

رام سنگھ بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔ رب نواز بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پہاڑیاں یہ آوازیں بڑے کھلنڈرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف اچھالتی رہیں۔ صوبیدار رب نواز کے جو ان خاموش تھے۔ جب ہنسی کا دور ختم ہوا تو ادھر سے رام سنگھ کی آواز بلند ہوئی۔

”دیکھو یار۔ ہمیں چائے پینی ہے!“

رب نواز بولا۔

”پیو۔ عیش کرو۔“

رام سنگھ چلایا۔

”اوئے عیش کس طرح کریں۔ سامان تو ہمارا اُدھر پڑا ہے۔“

رب نواز نے پوچھا۔

”کدھر۔“

رام سنگھ کی آواز آئی۔

”اُدھر۔ جدھر تمہارا فائر ہمیں اڑا سکتا ہے۔“

رب نواز ہنسا۔

”تو کیا چاہتے ہو تم۔ خنزیر کی دُم!“

رام سنگھ بولا۔

”ہمیں سامان لے آنے دے۔“

”لے آ!“

یہ کہہ کر اس نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔ رام سنگھ کی تشویش بھری آواز بلند ہوئی۔

”تو اڑا دے گا، کمہار کے کھوتے!“

رب نواز نے بھنا کر کہا۔

”بک نہیں اوئے سنتو کھ سر کے کچھوے۔“

رام سنگھ ہنسا۔

”قسم کھا نہیں مارے گا!“

رب نواز نے پوچھا۔

”کس کی قسم کھاؤں!“

رام سنگھ نے کہا۔

”کسی کی بھی کھالے!“

رب نواز ہنسا۔

”اوئے جا۔ منگوالے اپنا سامان۔“

چند لمحات خاموش رہی۔ دور بین ایک جوان کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے معنی خیز نظروں سے صوبیدار رب نواز کی طرف دیکھا۔ بندوق چلانے ہی والا تھا کہ رب نواز نے اسے منع کیا۔

”نہیں۔ نہیں!“

پھر اس نے دور بین لے کر خود ہی دیکھا۔ ایک آدمی ڈرتے ڈرتے پنجوں کے بل پتھروں کے عقب سے نکل کر جارہا تھا۔ تھوڑی دور اس طرح چل کر وہ اٹھا اور تیزی سے بھاگا۔ اور کچھ دور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ ایک لحظے کے لیے وہ رکا۔ پھر تیزی سے اوجھل ہوا تو رب نواز نے اپنی بندوق چلا دی۔ تڑاخ کے ساتھ ہی رب نواز کا قہقہہ بلند ہوا۔ یہ دونوں آوازیں مل کر کچھ دیر جھنجھناتی رہیں۔ پھر رام سنگھ کی آواز آئی

”تھینک یو۔“

”نو مینشن۔“

رب نواز نے یہ کہہ کر جوانوں کی طرف دیکھا۔

”ایک راؤنڈ ہو جائے۔“

تفریح کے طور پر دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ پھر خاموشی ہو گئی۔ رب نواز نے دور بین لگا کر دیکھا۔ پہاڑی کی داڑھی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ پکارا۔

”چائے تیار کرلی رام سنگھا؟“

جواب آیا۔

”ابھی کہاں اوئے کمہار کے کھوتے!“

رب نواز ذات کا کمہار تھا۔ جب کوئی اس کی طرف اشارہ کرتا تھا تو غصے سے اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ ایک صرف رام سنگھ کے منہ سے وہ اسے برداشت کرلیتا تھا اس لیے کہ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ ایک ہی گاؤں میں وہ پل کر جوان ہوئے تھے۔ دونوں کی عمر میں صرف چند دن کا فرق تھا۔ دونوں کے باپ، پھر ان کے باپ بھی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک ہی اسکول میں پرائمری تک پڑھتے تھے اور ایک ہی دن فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور پچھلی بڑی جنگ میں کئی محاذوں پر اکٹھے لڑے تھے۔ رب نواز اپنے جوانوں کی نظروں میں خود کو خفیف محسوس کر کے بڑبڑایا

”خنزیر کی دم۔ اب بھی باز نہیں آتا۔“

پھر وہ رام سنگھ سے مخاطب ہوا۔

”بک نہیں اوئے کھوتے کی جُوں۔“

رام سنگھ کا قہقہہ بلند ہوا۔ رب نواز نے ایسے ہی شست باندھی ہوئی تھی۔ تفریحاً اس نے لبلبی دبادی۔ تڑاخ کے ساتھ ہی ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ رب نواز نے فوراً دور بین لگائی اور دیکھا کہ ایک آدمی، نہیں، رام سنگھ پیٹ پکڑے، پتھروں کی دیواروں سے ذراہٹ کر دوہرا ہوا اور گر پڑا۔ رب نواز زور سے چیخا۔

”رام سنگھ!“

اور اچھل کر کھڑا ہو گیا، اُدھر سے بیک وقت تین چار فائر ہوئے۔ ایک گولی رب نواز کا دایاں بازو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ فوراً ہی وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اب دونوں طرف سے فائر شروع ہو گئے۔ ادھر کچھ سپاہیوں نے گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر پتھروں کے عقب سے نکل کر بھاگنا چاہا۔ ادھر سے فائر جاری تھے۔ مگر نشانے پر کوئی نہ بیٹھا۔ رب نواز نے اپنے جوانوں کو اترنے کا حکم دیا۔ تین فوراً ہی مارے گئے، لیکن افتاں وخیزاں باقی جوان دوسری پہاڑی پر پہنچ گئے۔ رام سنگھ خون میں لت پت پتھریلی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں تمتا اٹھیں۔ مسکرا کر اس نے کہا۔

”اوئے کمہار کے کھوتے، یہ تُو نے کیا کیا۔“

رب نواز، رام سنگھ کا زخم اپنے پیٹ میں محسوس کر رہا تھا، لیکن وہ مسکرا کر اس پر جھکا اور دوزانو ہو کر اس کی پیٹی کھولنے لگا۔

”خنزیر کی دم۔“

تم سے کس نے باہر نکلنے کو کہا تھا۔“

پٹی اتارنے سے رام سنگھ کو سخت تکلف ہوئی۔ درد سے وہ چلا چلا پڑا۔ جب پٹی اتر گئی اور رب نواز نے زخم کا معائنہ کیا جو بہت خطرناک تھا تو رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ دبا کر کہا۔

”میں اپنا آپ دکھانے کے لیے باہر نکلا تھا کہ تُونے۔ اوئے رب کے پُتر۔ فائر کر دیا۔“

رب نواز کا گلا رندھ گیا۔

”قسم وحدہ لاشریک کی۔ میں نے ایسے ہی بندوق چلائی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تُو کھوتے کا سنگھ باہر نکل رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے!“

رام سنگھ کا خون کافی بہہ نکلا تھا۔ رب نواز اور اس کے ساتھی کئی گھنٹوں کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ اس عرصے تک تو ایک پوری مشک خون کی خالی ہو سکتی تھی۔ رب نواز کو حیرت تھی کہ اتنی دیر تک رام سنگھ زندہ رہ سکا ہے۔ اس کو امید نہیں تھی کہ وہ بچے گا۔ ہلانا جلانا غلط تھا، چنانچہ اس نے فوراً وائرلیس کے ذریعے سے پلاٹون کمانڈر سے درخواست کی کہ جلدی ایک ڈاکٹر روانہ کیا جائے۔ اس کا دوست رام سنگھ زخمی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا وہاں تک پہنچنا اور پھر وقت پر پہنچنا بالکل محال تھا۔ رب نواز کو یقین تھا کہ رام سنگھ صرف چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ پھر بھی وائرلیس پر پیغام پہنچا کر اس نے مسکرا کر رام سنگھ سے کہا۔

”ڈاکٹر آرہاہے۔ کوئی فکر نہ کر!“

رام سنگھ بڑی نحیف آواز میں سوچتے ہوئے بولا۔

”فکر کسی بات کی نہیں۔ یہ بتا میرے کتنے جوان مارے ہیں تم لوگوں نے؟“

رب نواز نے جواب دیا۔

”صرف ایک!“

رام سنگھ کی آواز اور زیادہ نحیف ہو گئی۔

”تیرے کتنے مارے گئے؟“

رب نواز نے جھوٹ بولا۔

”چھ!“

اور یہ کہہ کر اس نے معنی خیز نظروں سے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔

”چھ۔ چھ!“

رام سنگھ نے ایک ایک آدمی اپنے دل میں گنا۔

”میں زخمی ہوا تو وہ بہت بد دل ہو گئے تھے۔ پر میں نے کہا۔ کھیل جاؤ اپنی اور دشمن کی جان سے۔ چھ۔ ٹھیک ہے!“

وہ پھر ماضی کے دھندلکوں میں چلا گیا۔

”رب نواز۔ یاد ہیں وہ دن تمہیں۔“

اور رام سنگھ نے بیتے دن یاد کرنے شروع کر دیے۔ کھیتوں کھلیانوں کی باتیں۔ اسکول کے قصے 9/6 جاٹ رجمنٹ کی داستانیں۔ کمانڈنگ افسروں کے لطیفے اور باہر کے ملکوں میں اجنبی عورتوں سے معاشقے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے رام سنگھ کو کوئی بہت دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ہنسنے لگا تو اس کے ٹیس اٹھی مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زخم سے اوپر ہی اوپر ہنس کر کہنے لگا۔

”اوئے سؤر کے تل۔ یاد ہے تمہیں وہ مڈم۔“

رب نواز نے پوچھا۔

”کون؟“

رام سنگھ نے کہا۔

”وہ۔ اِٹلی کی۔ کیا نام رکھا تھا ہم نے اس کا۔ بڑی مارخور عورت تھی!“

رب نواز کو فوراً ہی وہ عورت یاد آگئی۔

”ہاں، ہاں۔ وہ۔ مڈم منیتا فنتو۔ پیسہ ختم، تماشا ختم۔ پر تجھ سے کبھی کبھی رعایت کر دیتی تھی مسولینی کی بچی!“

رام سنگھ زور سے ہنسا۔ اور اس کے زخم سے جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا باہر نکل آیا۔ سرسری طور پر رب نواز نے جو پٹی باندھی تھی۔ وہ کھسک گئی تھی۔ اسے ٹھیک کرکے اس نے رام سنگھ سے کہا۔

”اب خاموش رہو۔“

رام کو بہت تیز بخار تھا۔ اس کا دماغ اس کے باعث بہت تیز ہو گیا تھا۔ بولنے کی طاقت نہیں تھی مگر بولے چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی رک جاتا۔ جیسے یہ دیکھ رہا ہے کہ ٹینکی میں کتنا پٹرول باقی ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی، لیکن کچھ ایسے وقفے بھی آتے تھے کہ اس کے ہوش و حواس سلامت ہوتے تھے۔ انہی وقفوں میں اس نے ایک مرتبہ نواز سے سوال کیا۔

”یارا سچو سچ بتاؤ، کیا تم لوگوں کو واقعی کشمیر چاہیے!“

رب نواز نے پورے خلوص کے ساتھ کہا۔

”ہاں، رام سنگھا!“

رام سنگھ نے اپنا سر ہلایا۔

”نہیں۔ میں نہیں مان سکتا۔ تمہیں ورغلایا گیا ہے۔“

رب نواز نے اس کو یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

”تمہیں ورغلایا گیا ہے۔ قسم پنجتن پاک کی۔“

رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”قسم نہ کھا یارا۔ ٹھیک ہو گا۔“

لیکن اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کو رب نواز کی قسم کا یقین نہیں۔ دن ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے پلاٹون کمانڈنٹ میجر اسلم آیا۔ اس کے ساتھ چند سپاہی تھے، مگر ڈاکٹر نہیں تھا۔ رام سنگھ بے ہوشی اور نزع کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ مگر آواز اس قدر کمزور اور شکستہ تھی کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ میجر اسلم بھی6 / 9 جاٹ رجمنٹ کا تھا اور رام سنگھ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ رب نواز سے سارے حالات دریافت کرنے کے بعد اس نے رام سنگھ کو بلایا۔

”رام سنگھ۔ رام سنگھ!“

رام سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں لیٹے لیٹے اٹینشن ہو کر اس نے سیلوٹ کیا۔ لیکن پھر آنکھیں کھول کر اس نے ایک لحظے کے لیے غور سے میجر اسلم کی طرف دیکھا۔ اس کا سیلوٹ کرنے والا اکڑا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا۔ جھنجھلا کر اس نے بڑبڑانا شروع کیا۔

”کچھ نہیں اوئے رام سیاں۔ بھول ہی گیا تو سؤر کے نلا۔ کہ یہ لڑائی۔ یہ لڑائی؟“

رام سنگھ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اس نے رب نواز کی طرف نیم سوالیہ انداز میں دیکھا اور سرد ہو گیا۔ 7اکتوبر 1951ء

سعادت حسن منٹو

آرٹسٹ لوگ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوآرٹسٹ لوگ

جمیلہ کو پہلی بار محمود نے باغ جناح میں دیکھا۔ وہ اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی۔ سب نے کالے برقعے پہنے تھے۔ مگر نقابیں اُلٹی ہوئی تھیں۔ محمود سوچنے لگا۔ یہ کس قسم کا پردہ ہے کہ برقع اوڑھا ہوا ہے۔ مگر چہرہ ننگا ہے۔ آخری اس پردے کا مطلب کیا؟۔ محمود جمیلہ کے حسن سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی جا رہی تھی۔ محمود اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس کو اس بات کا قطعاً ہوش نہیں تھا کہ وہ ایک غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اُس نے سینکڑوں مرتبہ جمیلہ کو گھور گھور کے دیکھا۔ اس کے علاوہ ایک دو بار اُس کو اپنی آنکھوں سے اشارے بھی کیے۔ مگر جمیلہ نے اسے درخور اعتنانہ سمجھا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ اُس کی سہیلیاں بھی کافی خوبصورت تھیں۔ مگر محمود نے اُس میں ایک ایسی کشش پائی جو لوہے کے ساتھ مقناطیس کی ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا۔ ایک جگہ اُس نے جرأت سے کام لے کر جمیلہ سے کہا۔

”حضور اپنا نقاب تو سنبھالیے۔ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔“

جمیلہ نے یہ سُن کر شور مچانا شروع کر دیا۔ اس پر پولیس کے دو سپاہی جو اس وقت باغ میں ڈیوٹی پر تھے، دوڑتے آئے۔ اور جمیلہ سے پوچھا۔

”بہن کیا بات ہے؟“

جمیلہ نے محمود کی طرف دیکھا جو سہما کھڑا تھا اور کہا

”یہ لڑکا مجھ سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ جب سے میں اس باغ میں داخل ہوئی ہوں، یہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔ سپاہیوں نے محمود کا سرسری جائزہ لیا اور اس کو گرفتار کر کے حوالات میں داخل کر دیا۔ لیکن اُس کی ضمانت ہو گئی۔ اب مقدمہ شروع ہوا۔ اس کی روئداد میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ یہ تفصیل طلب ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ محمود کا جرم ثابت ہو گیا اور اُسے دو ماہ قید بامشقت کی سزا مل گئی۔ اُس کے والدین نادار تھے۔ اس لیے وہ سیشن کی عدالت میں اپیل نہ کر سکے۔ محمود سخت پریشان تھا کہ آخر اس کا قصور کیا ہے۔ اس کو اگر ایک لڑکی پسند آ گئی تھی اور اُس نے اُس سے چند باتیں کرنا چاہیں تو یہ کیا جرم ہے، جس کی پاداش میں وہ دو ماہ قید بامشقت بھگت رہا ہے۔ جیل خانے میں وہ کئی مرتبہ بچوں کی طرح رویا۔ اس کو مصوری کا شوق تھا، لیکن اس سے وہاں چکی پسوائی جاتی تھی۔ ابھی اُسے جیل خانے میں آئے بیس روز ہی ہوئے تھے کہ اُسے بتایا گیا کہ اُس کی ملاقات آئی ہے۔ محمود نے سوچا کہ یہ ملاقاتی کون ہے؟ اُس کے والد تو اُس سے سخت ناراض تھے۔ والدہ اپاہج تھیں اور کوئی رشتے دار بھی نہیں تھے۔ سپاہی اسے دروازے کے پاس لے گیا جو آہنی سلاخوں کا بنا ہوا تھا۔ ان سلاخوں کے پیچھے اُس نے دیکھا کہ جمیلہ کھڑی ہے۔ وہ بہت حیرت زدہ ہوا۔ اُس نے سمجھا کہ شاید کسی اور کو دیکھنے آئی ہو گی۔ مگر جمیلہ نے سلاخوں کے پاس آ کر اُس سے کہا

”میں آپ سے ملنے آئی ہوں“

محمود کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا

”مجھ سے۔“

”جی ہاں۔ میں معافی مانگنے آئی ہوں کہ میں نے جلد بازی کی۔ جس کی وجہ سے آپ کو یہاں آنا پڑا۔“

محمود مسکرایا۔

”ہائے اس زُودِ پشیماں کا پشیماں ہونا۔“

جمیلہ نے کہا۔

”یہ غالبؔ ہے۔؟“

”جی ہاں۔ غالبؔ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جو انسان کے جذبات کی۔ ترجمانی کر سکے۔ میں نے آپ کو معاف کر دیا۔ لیکن میں یہاں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ میرا گھر نہیں ہے سرکار کا ہے۔ اس کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔“

جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں آپ کی خادمہ ہوں۔“

چند منٹ ان کے درمیان اور باتیں ہوئیں، جو محبت کے عہد و پیمان تھیں۔ جمیلہ نے اُس کو صابن کی ایک ٹکیہ دی۔ مٹھائی بھی پیش کی اس کے بعد وہ ہر پندرہ دن کے بعد محمود سے ملاقات کرنے کے لیے آتی رہی۔ اس دوران میں ان دونوں کی محبت استوار ہو گئی۔ جمیلہ نے محمود کو ایک روز بتایا۔

”مجھے موسیقی سیکھنے کا شوق ہے۔ آج کل میں خاں صاحب سلام علی خاں سے سبق لے رہی ہوں“

محمود نے اُس سے کہا۔

”مجھے مصوری کا شوق ہے۔ مجھے یہاں جیل خانے میں اور کوئی تکلیف نہیں۔ مشقت سے میں گھبراتا نہیں۔ لیکن میری طبیعت جس فن کی طرف مائل ہے اُس کی تسکین نہیں ہوتی۔ یہاں کوئی رنگ ہے نہ روغن ہے۔ کوئی کاغذ ہے نہ پنسل۔ بس چکی پیستے رہو۔“

جمیلہ کی آنکھیں پھر آنسو بہانے لگیں۔

”بس اب تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ آپ باہر آئیں۔ تو سب کچھ ہو جائے گا۔ محمود دو ماہ کی قید کاٹنے کے بعد باہر آیا تو جمیلہ دروازے پر موجود تھی۔ اس کالے برقعے میں جو اب بھوسلا ہو گیا تھا اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ دونوں آرٹسٹ تھے۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ شادی کر لیں۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ جمیلہ کے ماں باپ کچھ اثاثہ چھوڑ گئے تھے اس سے انھوں نے ایک چھوٹا سا مکان بنایا اور پُر مسرت زندگی بسر کرنے لگے۔ محمود ایک آرٹ سٹوڈیو میں جانے لگا تا کہ اپنی مصوری کا شوق پورا کرے۔ جمیلہ خاں صاحب سلام علی خاں سے پھر تعلیم حاصل کرنے لگی۔ ایک برس تک وہ دونوں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ محمود مصوری سیکھتا رہا اور جمیلہ موسیقی۔ اس کے بعد سارا اثاثہ ختم ہو گیا اور نوبت فاقوں پر آ گئی۔ لیکن

دونوں آرٹ شیدائی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فاقے کرنے والے ہی صحیح طور پر اپنے آرٹ کی معراج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی اس مفلسی کے زمانے میں بھی خوش تھے۔ ایک دن جمیلہ نے اپنے شوہر کو یہ مژدہ سنایا کہ اسے ایک امیر گھرانے میں موسیقی سکھانے کی ٹیوشن مل رہی ہے۔ محمود نے یہ سُن کر اُس سے کہا۔

”نہیں ٹیوشن ویوشن بکواس ہے۔ ہم لوگ آرٹسٹ ہیں“

اس کی بیوی نے بڑے پیار کے ساتھ کہا

”لیکن میری جان گزارہ کیسے ہو گا؟“

محمود نے اپنے پھوسڑے نکلے ہوئے کوٹ کا کالر بڑے امیرانہ انداز میں درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

”آرٹسٹ کو ان فضول باتوں کا خیال نہیں رکھنا چاہیے۔ ہم آرٹ کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ آرٹ ہمارے لیے زندہ نہیں رہتا“

جمیلہ یہ سن کر خوش ہوئی،

”لیکن میری جان آپ مصوری سیکھ رہے ہیں۔ آپ کو ہر مہینے فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کا بندوبست بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ پھر کھانا پینا ہے۔ اس کا خرچ علیحدہ ہے۔“

”میں نے فی الحال موسیقی کی تعلیم لینا چھوڑ دی ہے۔ جب حالات موافق ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔“

دوسرے دن جمیلہ گھر آئی تو اُس کے پرس میں پندرہ روپے تھے جو اُس نے اپنے خاوند کے حوالے کر دیئے اور کہا

”میں نے آج سے ٹیوشن شروع کر دی ہے، یہ پندرہ روپے مجھے پیشگی ملے ہیں۔ آپ مصوری کا فن سیکھنے کا کام جاری رکھیں“

محمود کے مردانہ جذبات کو بڑی ٹھیس لگی۔

”میں نہیں چاہتا کہ تم ملازمت کرو۔ ملازمت مجھے کرنا چاہیے۔“

جمیلہ نے خاص انداز میں کہا۔

”ہائے۔ میں آپ کی غیر ہوں۔ میں نے اگر کہیں تھوڑی دیر کے لیے ملازمت کر لی ہے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ جس لڑکی کو میں موسیقی کی تعلیم دیتی ہوں، بہت پیاری اور ذہین ہے۔“

یہ سُن کر محمود خاموش ہو گیا۔ اس نے مزید گفتگو نہ کی۔ دوسرے ہفتے کے بعد وہ پچیس روپے لے کر آیا اور اپنی بیوی سے کہا

”میں نے آج اپنی ایک تصویر بیچی ہے خریدار نے اُسے بہت پسند کیا۔ لیکن خسیس تھا۔ صرف پچیس روپے دیئے۔ اب اُمید ہے کہ میری تصویروں کے لیے مارکیٹ چل نکلے گی۔ جمیلہ مسکرائی۔ تو پھر کافی امیر آدمی ہو جائیں گے“

محمود نے اُس سے کہا

”جب میری تصویریں بکنا شروع ہو جائیں گی تو میں تمھیں ٹیوشن نہیں کرنے دُوں گا۔“

جمیلہ نے اپنے خاوند کی ٹائی کی گرہ درست کی اور بڑے پیار سے کہا

”آپ میرے مالک ہیں جو بھی حکم دیں گے مجھے تسلیم ہو گا۔ دونوں بہت خوش تھے اس لیے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ محمود نے جمیلہ سے کہا۔

”اب تم کچھ فکر نہ کرو۔ میرا کام چل نکلا ہے۔ چار تصویریں کل پرسوں تک بک جائیں گی اور اچھے دام وصول ہو جائیں گے۔ پھر تم اپنی موسیقی کی تعلیم جاری رکھ سکو گی۔“

ایک دن جمیلہ جب شام کو گھر آئی تو اُس کے سر کے بالوں میں دُھنکی ہوئی رُوئی کا غبار اس طرح جما تھا جیسے کسی ادھیڑ عمر آدمی کی داڑھی میں سفید بال۔ محمود نے اُس سے استفسار کیا۔

”یہ تم نے اپنے بالوں کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ موسیقی سکھانے جاتی ہو یا کسی جننگ فیکٹری میں کام کرتی ہو“

جمیلہ نے، جو محمود کی نئی رضائی کی پرانی روئی کو دُھنک رہی تھی مسکرا کر کہا۔

”ہم آرٹسٹ لوگ ہیں۔ ہمیں کسی بات کا ہوش بھی نہیں رہتا۔“

محمود نے حقے کی نے منہ میں لے کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ہوش واقعی نہیں رہتا“

جمیلہ نے محمود کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

”یہ دُھنکی ہوئی رُوئی کا غبار آپ کے سر میں کیسے آ گیا؟“

۔ محمود نے حقے کا ایک کش لگایا۔

”جیسا کہ تمہارے سر میں موجود ہے۔ ہم دونوں ایک ہی جنگ فیکٹری میں کام کرتے ہیں صرف آرٹ کی خاطر۔“

سعادت حسن منٹو

اُس کا پتی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹواُس کا پتی

لوگ کہتے تھے کہ نتھو کا سر اس لیے گنجا ہوا ہے کہ وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے اس بیان میں کافی صداقت ہے۔ کیونکہ سوچتے وقت نتھو سر کھجلایا کرتا ہے۔ چونکہ اس کے بال بہت کھردرے اور خشک ہیں اور تیل نہ ملنے کے باعث بہت خستہ ہوگئے ہیں۔ اس لیے بار بار کھجلانے سے اُس کے سر کے درمیانی حصّہ بالوں سے بالکل بے نیاز ہو گیا ہے۔ اگر اس کا سر ہر روز دھویا جاتا تو یہ حصّہ ضرور چمکتا۔ مگر میل کی زیادتی کے باعث اس کی حالت بالکل اُس توے کی سی ہوگئی ہے جس پر ہر روز روٹیاں پکائی جائیں۔ مگر اسے صاف نہ کیا جائے۔ نتھو بھٹے پر اینٹیں بنانے کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنے خیالات کو کچی اینٹیں سمجھتا تھا اور کسی پر فوراً ہی ظاہر نہیں کیا کرتا تھا۔ اس کا یہ اصول تھا کہ خیال کو اچھی طرح پکا کر باہر نکالنا چاہیے تاکہ جس عمارت میں بھی وہ استعمال ہو اس کا ایک مضبوط حصّہ بن جائے۔ گاؤں والے اس کے خیالات کی قدر کرتے تھے۔ اور مشکل بات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ لیکن اس قدر حوصلہ افزائی سے نتھو اپنے آپ کو اہم نہیں سمجھنے لگا تھا۔ جس طرح گاؤں میں شمبھو کا کام ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہنا تھا۔ اسی طرح اُس کا کام ہر وقت دوسروں کو مشورہ دیتے رہنا تھا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ ہر شخص صرف ایک کام لیے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ شمبھو کے بارے میں چوپال پر جب کبھی ذکر چھڑتا۔ تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ کھاد کتنی بدبودار چیزوں سے بنتی ہے پر کھیتی باڑی اس کے بنا ہو ہی نہیں سکتی۔ شمبھو کے ہر سانس میں گالیوں کی باس آتی ہے، ٹھیک ہے، پر گاؤں کی چہل پہل اور رونق بھی اسی کے دم سے قائم ہے------ اگر وہ نہ ہو تو لوگوں کو کیسے معلوم ہو کہ گالیاں کیا ہوتی ہیں۔ اچھے بول جاننے کے ساتھ ساتھ بُرے بول بھی معلوم ہونے چاہئیں۔“

نتھو بھٹے سے واپس آرہا تھا۔ اور حسبِ معمول سر کھجلاتا گاؤں کے کسی مسئلے پر غور فکر کر رہا تھا۔ لالٹین کے کھمبے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ سر سے علیحدہ کیا۔ جس کی انگلیوں سے وہ بالوں کا ایک میل بھرا اچھا مروڑ رہا تھا۔ وہ اپنے جھونپڑے کے تازہ لپے ہُوئے چبوترے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ سامنے سے اُسے کسی نے آواز دی۔ نتھو پلٹا اور اپنے سامنے والے جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ جہاں مادھو اسے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا۔ جھونپڑے کے چھجے کے نیچے چبوترے پر مادھو۔ اس کا لنگڑا بھائی اور چوہدری بیٹھے تھے۔ اُن کے اندازِ نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم بات سوچ رہے ہیں۔ سب کے چہرے کچی اینٹوں کے مانند پیلے تھے۔ مادھو تو بہت دنوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ ایک کونے میں طاقچے کے نیچے رُوپا کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ غلیظ کپڑوں میں وہ میلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ نتھو نے دُور ہی سے معاملے کی نزاکت محسوس کی اور قدم تیز کر کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ مادھو نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ نتھو بیٹھ گیا۔ اور اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے بالوں کے اُس گچھے کی طرف بڑھ گیا جس کی جڑیں کافی ہل چکی تھیں۔ اب وہ ان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے بالکل تیار تھا۔ مادھو اُس کو اپنے پاس بٹھا کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن فوراً نہیں کہہ سکتا۔ مادھو کا لنگڑا بھائی بھی خاموش تھا۔ اور بار بار اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے آخری ٹنڈ منڈ حصّے پر جو گوشت کا ایک بد شکل لوتھڑا سا بنا ہوا تھا۔ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ رُوپا کی ماں طاقچے میں رکھی ہُوئی مورتی کے مانند گونگی بنی ہُوئی تھی۔ اور چوہدری اپنی مونچھوں کو تاؤ دینا بھول کر زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔ نتھو نے خود ہی بات شروع کی۔

”تو------“

مادھو بولا۔ نتھو بات یہ ہے کہ------ بات یہ ہے کہ------ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ بات کیا ہے------ میں کچھ کہنے کے قابل نہ رہا------ چوہدری! تم ہی جی کڑا کر کے سارا قصّہ سنا دو“

نتھو نے گردن اُٹھا کر چوہدری کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہ بولا۔ اور زمین پر لکیریں بناتا رہا۔ دوپہر کی اُداس فضا بالکل خاموش تھی۔ البتہ کبھی کبھی چیلوں کی چیخیں سُنائی دیتی تھیں۔ اور جھونپڑے کے داہنے ہاتھ گھُورے پر جو مُرغ کوڑے کو کُرید رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی مُرغی کو دیکھ کر بول اُٹھتا تھا۔ چند لمحات تک جھونپڑے کے چھجے کے نیچے سب خاموش رہے۔ اور نتھو معاملے کی نزاکت اچھی طرح سمجھ گیا------ رُوپا کی ماں نے رونی آواز میں کہا۔

”میرے پھوٹے بھاگ!------ اس کو تو جو کچھ اجڑنا تھا اُجڑی، مجھ ابھاگن کی ساری دنیا برباد ہو گئی------ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟“

مادھو نے کندھے ہلا دیئے اور نتھو سے مخاطب ہو کر کہا۔

”کیا ہو سکتا ہے؟------ بھئی میں یہ کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگانا نہیں چاہتا------ میں نے جب اپنے لالو کی بات رُوپا سے پکی کی تھی تو مجھے یہ قصّہ معلوم نہیں تھا------ اب تم لوگ خود ہی وچار کرو کہ سب کچھ جانتے ہُوئے میں اپنے بیٹے کا بیاہ رُوپا سے کیسے کر سکتا ہوں؟“

یہ سُن کر نتھو کی گردن اٹھی۔ وہ شاید یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ لالو کا بیاہ کیا ہو گیا۔ کہ رُوپا لالو کے قابل نہیں رہی وہ رُوپا اور لالو کو اچھی جانتا تھا۔ اور سچ پوچھو تو گاؤں میں ہر شخص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ کون سی بات تھی جو اسے ان دونوں کے بارے میں معلوم نہ تھی۔ رُوپا اس کی آنکھوں کے سامنے پھُولی پھلی، بڑھی اور جوان ہُوئی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اس نے اس کے گال پر ایک زور کا دھپّا بھی مارا تھا اور اس کو اتنی مجال نہ ہوئی تھی کہ چوں بھی کرے۔ حالانکہ گاؤں کے سب چھوکریاں چھوکرے گستاخ تھے اور بڑوں کا بالکل ادب نہ کرتے تھے۔ رُوپا تو بڑی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ باتیں بھی بہت کم کرتی تھی اور اس کے چہرے پر بھی کوئی ایسی علامت نہ تھی۔ جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ کوئی شرارت بھی کر سکتی ہے پھر آج اس کی بابت یہ باتیں کیوں ہو رہی تھیں۔ نتھو کو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اس کے اندر رہنے والوں کا حال معلوم تھا۔ مثال کے طور پر اُسے معلوم تھا کہ چوہدری کی گائے نے صبح سویرے ایک بچھڑا دیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی ہے۔ گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چن رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا۔ اور ایک سیر دودھ کے پیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے۔۔۔۔۔ اسے یہ بھی معلوم تھا۔ کہ دواپلوں پر پوسرام اور گنگو کی چخ پخ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ اور سالگ رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے۔ حالانکہ ویدجی نے منع کیا تھا کہ ان کو مرچوں والی کوئی چیز نہ دی جائے۔ نتھو حیران تھا کہ ایسی کونسی بات ہے جو اسے معلوم نہیں۔ یہ تمام خیالات اُس کے دماغ میں ایک دم آئے اور وہ مادھو کاکا سے اپنی حیرت دُور کرنے کی خاطر کوئی سوال کرنے ہی والا تھا کہ چوہدری نے زمین پر طوطے کی شکل بکرتے ہوئے کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔۔۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ بچے کی ماں بن جائے گی۔“

تو یہ بات تھی۔ نتھو کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اُڑنے والی ساری چیلیں اُس کے دماغ میں گھُس کر چیخنے لگی ہیں۔ اس نے اپنے بال زیادہ تیزی سے مروڑنے شروع کر دیئے۔ مادھو کاکا، نتھو کی طرف جھکا اور بڑے دُکھ بھرے لہجے میں اس سے کہنے لگا

”بیٹا تمھیں یہ بات تو معلوم ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کی بات رُوپا سے پکی کی تھی۔ اب میں تم سے کیا کہوں۔۔۔۔۔ ذرا کان ادھر لاؤ۔ اُس نے ہولے سے نتھو کے کان میں کچھ کہا۔ اور پھر اُسی لہجے میں کہنے لگا۔

”کتنی شرم کی بات ہے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا۔ یہ میرا بڑھاپا اور یہ جان لیوا دُکھ اور تو اور لالو کو بتاؤ کتنا دُکھ ہوا ہو گا۔۔۔۔۔ تمھیں انصاف کرو۔ کہ لالو کی شادی اب اس سے ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔۔ لالو کی شادی تو ایک طرف رہی، کیا ایسی لڑکی ہمارے گاؤں میں رہ سکتی ہے۔۔۔۔۔۔ کیا اس کے لیے ہمارے یہاں کوئی جگہ ہے؟“

نتھو نے سارے گاؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اور اُسے ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں رُوپا اپنے باپ سمیت رہ سکتی تھی۔ البتہ اس کا ایک جھونپڑا تھا جس میں وہ چاہے کسی کو بھی رکھتا۔ پچھلے برس اُس نے کوڑھی کو اس میں پناہ دی تھی۔ حالانکہ سارا گاؤں اُسے روک رہا تھا۔ اور اُسے ڈرا رہا تھا۔ کہ دیکھو یہ بیماری بڑی چھوت والی ہوتی ہے ایسی نہ ہو کہ تمھیں چمٹ جائے لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے من نے اچھا سمجھا۔ کوڑھی اس کے گھر میں پورے چھ مہینے رہ کر مر گئی لیکن اُسے بیماری ویماری بالکل نہ لگی۔ اگر گاؤں میں رُوپا کے لیے کوئی جگہ نہ رہے تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ اُسے ماری ماری پھرنے دیا جائے۔ ہر گز نہیں، نتھو اس بات کا قائل نہیں تھا کہ دُکھی پر۔۔۔۔ اور دُکھ لاد دیئے جائیں۔ اس کے جھونپڑے میں ہر وقت اُس کے لیے جگہ تھی۔ وہ چھ مہینے تک ایک کوڑھی کی تیمارداری کر سکتا تھا اور رُوپا کوڑھی تو نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ کوڑھی تو نہیں تھی، یہ سوچتے ہوئے نتھو کا دماغ ایک گہری بات سوچنے لگا۔۔۔۔ رُوپا کوڑھی نہیں تھی، اس لیے وہ ہمدردی کی زیادہ مستحق بھی نہیں تھی۔ اُسے کیا روگ تھا؟۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں جیسا کہ یہ لوگ کہہ رہے تھے وہ تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں بننے والی تھی، پر یہ بھی کوئی روگ ہے۔ اور کیا ماں بننا کوئی پاپ ہے؟ ہر لڑکی عورت بننا چاہتی ہے اور عورت ماں اُس کی اپنی استری ماں بننے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اور وہ خود یہ چاہتا تھا کہ وہ جلدی ماں بن جائے۔ اس لحاظ سے بھی رُوپا کا ماں بننا کوئی ایسا جُرم نہیں تھا جس پر اُسے کوئی سزا دی جائے یا پھر اسے رحم کا مستحق قرار دیا جائے۔ وہ ایک کے بجائے دو بچے جنے۔ اس سے کسی کا کیا بگڑتا تھا۔ وہ عورت ہی تو تھی۔ مندر میں گڑی ہُوئی دیوی تو تھی نہیں۔ اور پھر یہ لوگ خواہ مخواہ کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے تھے۔ مادھو کاکا کے لڑکے سے اس کی شادی ہوتی تو بھی کبھی نہ کبھی بچہ ضرور پیدا ہوتا۔ اب کونسی آفت آ گئی تھی۔ یہ بچہ جو اب اس کے پیٹ میں تھا۔ کہیں سے اُڑ کر تو نہیں آ گیا۔ شادی بیاہ ضرور ہوا ہو گا۔ یہ لوگ باہر بیٹھے آپ ہی فیصلہ کر رہے ہیں۔ اور جس کی بابت فیصلہ ہو رہا ہے۔ اُس سے کچھ پوچھتے ہی نہیں۔ گویا وہ بچہ نہیں۔ بلکہ یہ خود جن رہے ہیں۔ عجیب بات تھی۔ اور پھر ان کو بچے کی کیا فکر پڑ گئی تھی۔ بچے کی فکر یا تو ماں کرتی ہے یا اس کا باپ۔۔۔۔۔۔۔ باپ؟۔۔۔۔ اور مزہ دیکھیے کہ کوئی بچے کے باپ کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے نتھو کے دماغ میں ایک بات آئی۔ اور اُس نے مادھو کاکا سے کہا۔

”جو کچھ تم نے کہا۔ اُس سے مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ پر تم نے یہ کیسے کہہ دیا۔ کہ رُوپا کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔۔۔۔۔۔ ہم سب اپنے اپنے جھونپڑوں کو تالے لگا دیں تو بھی اس کے لیے ایک دروازہ کھُلا رہتا ہے۔“

چوہدری نے زمین پر طوطے کی آنکھ بناتے ہوئے کہا۔

”توبہ کا“!

نتھو نے جواب دیا۔

”اُن کے لیے جو پاپی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ رُوپا نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ وہ نر دوش ہے“!

چوہدری نے حیرت سے مادھو کاکا کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اس نے پوری بات نہیں سُنی۔“

مادھو کا لنگڑا بھائی اپنی کٹی ہوئی ٹانگ پر ہاتھ پھیر تا رہا۔ نتھو رُوپا کی ماں سے مخاطب ہوا۔

”ابھی سُن لیتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ رُوپا کہاں ہے؟“

رُوپا کی ماں نے اپنی کھُردری انگلیوں سے آنسو پونچھے اور کہا۔

”اندر بیٹھی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہے۔“

یہ سن کر نتھو نے اپنا سر ایک بار زور سے کھجلایا اور اُٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ رُوپا اندھیری کوٹھڑی کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میلے کچیلے کپڑوں میں اندھیرے کے اندر وہ گیلی مٹی کا ڈھیر سا دکھائی دے رہی تھی۔ جو باتیں باہر ہو رہی تھیں۔ ان کا ایک ایک لفظ اُس نے سُنا تھا حالانکہ اُس کے کان اُس کے اپنے دل کی باتیں سننے میں لگے ہوئے تھے۔ جو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ نتھو اندر آنے کے لیے اُٹھا۔ تو وہ دوڑ کر سامنے کی کھٹیا پر جا پڑی اور گدڑی میں اپنا سر منہ چھپا لیا۔ نتھو نے جب دیکھا کہ رُوپا چھُپ گئی ہے تو اسے بڑی حیرت ہُوئی۔ اُس نے پوچھا۔

”ارے مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟“

رُوپا رونے لگی اور اپنے آپ کو کپڑے میں اور لپیٹ لیا۔ وہ بغیر آواز کے رو رہی تھی۔ مگر نتھو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رُوپا کے آنسو اس کے تپتے ہوئے دل پر گر رہے ہیں۔ اس نے گدڑی کے اس حصّہ پر ہاتھ پھیرا جس کے نیچے رُوپا کا سر تھا۔ اور کہا۔ تم مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟ رُوپا نے سسکیوں میں جواب دیا رُوپا نہیں چھپتی نتھو!۔۔۔۔۔ وہ اپنے پاپ کو چھپا رہی ہے۔“

نتھو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا“

کیسا پاپ۔۔۔۔ تم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ اور اگر کیا بھی ہو تو اُسے چھپانا چاہئے۔ یہ تو خود ایک پاپ ہے۔۔۔۔۔۔ میں تم سے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ مجھے یہ بتا دو کہ کس نے تمہاری سدا ہنستی آنکھوں میں یہ آنسو بھر دیے ہیں۔ کس نے اس بالی عمر میں تمہیں پاپ اور پن کے جھگڑے میں پھنسا دیا ہے؟“

”میں کیا کہوں؟ رُوپا یہ کہہ کر گدڑی میں اور سمٹ گئی۔ نتھو بولتا تھا اور رُوپا کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اسے اکٹھا کر رہا ہے اُسے سکیڑ رہا ہے۔ نتھو نے بڑی مشکل سے رُوپا کے منہ سے کپڑا ہٹایا اور اُس کو اُٹھا کر بٹھا دیا۔ رُوپا نے دونوں ہاتھوں میں اپنے منہ کو چھپا لیا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس سے نتھو کو بہت دُکھ ہوا۔ ایک تو پہلے اُسے یہ چیز ستا رہی تھی کہ ساری بات اُس کے ذہن میں مکمل طور پر نہیں آتی۔ اور دوسرے رُوپا اُس کے سامنے رو رہی تھی۔ اگر اُسے ساری بات معلوم ہوتی تو وہ اُس کے یہ آنسو روکنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ جو میلی گدڑی میں جذب ہو رہے تھے۔ مگر اس کو سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں تھا۔ کہ رُوپا تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اُس نے پھر اُس سے کہا۔

”رُوپا تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو۔۔۔۔۔۔۔ نتھو بھیّا تم سے پوچھ رہا ہے اور وہ کوئی غیر تھوڑی ہے، جو تم یوں اپنے من کو چھپا رہی ہو۔۔۔۔ تم روتی کیوں ہو۔ غلطی ہو ہی جایا کرتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ لالو کی کسی اور سے شادی ہو جائے گی اور تم اپنی جگہ خوش رہو گی۔۔۔۔ تمہیں دنیا کا ڈر ہے تو میں کہوں گا کہ تم بالکل بیو قوف ہو، لوگوں کے جو جی میں آئے کہیں تمہیں اس سے کیا۔۔۔۔۔۔ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا رُوپا، آنسو بھری آنکھوں سے نہ تم مجھے ہی ٹھیک طور سے دیکھ سکتی ہو اور نہ اپنے آپ کو۔۔۔۔۔ رونا بند کرو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔“

رُوپا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے، وہ دل میں سوچتی تھی کہ اب ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جو دنیا کو معلوم نہیں۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے نتھو سے کہا۔

”نتھو بھیّا، مجھ سے زیادہ تو دوسروں کو معلوم ہے میں تو صرف اتنا جانتی ہُوں۔ کہ جو کچھ میں سوچتی تھی ایک سپنا تھا، یوں تو ہر چیز سُپنا ہوتی تھی۔ پر یہ سپنا بڑا ہی عجیب ہے۔ کیسے شروع ہوا۔ کیونکر ختم ہُوا۔ اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دن جو میں کبھی خوشی سے گزارتی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بننا شروع ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں گھڑا لے کر اچھلتی کودتی، گاتی کنوئیں پر پانی بھرنے گئی۔ پانی بھر کر جب واپس آنے لگی تو ٹھوکر لگی اور گھڑا اچکنا چور ہو گیا۔ مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ میں نے چاہا کہ اس ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑے اٹھا کر جھولی میں بھر لوں پر لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا، نقصان میرا ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ مجھ سے ہمدردی کرتے۔ پر انھوں نے الٹا مجھے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گویا گھڑا ان کا تھا اور توڑنے والی میں تھی اور اس روڑے کا کوئی قصور ہی نہ تھا جو راستے میں پڑا تھا۔ اور جس سے دوسرے بھی ٹھوکر کھا سکتے تھے۔۔۔۔۔ تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔“

نتھو کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں کا گچھا مروڑنے لگیں۔ اُس نے بڑے اضطراب سے کہا۔

”میں صرف پوچھتا ہوں کہ وہ ہے کون؟“

”کون؟“

”وہی------وہی------“

رُوپا اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ رُوپا کے سینے سے ایک بے اختیار آہ نکل گئی وہ پہلے جتنا نزدیک تھا اب اتنا ہی دُور ہے“!

”میں اُس کا نام پوچھتا ہُوں-----اور جانتی ہو میں تم سے اس کا نام کیوں پوچھتا ہوں؟------اس لیے کہ وہ تمہارا پتی ہے------اور تم اُس کی پتنی ہو------تم اُس کی ہو اور وہ تمہارا------یہ--------“

نتھو اُس کے آگے کچھ کہنے ہی والا ہے کہ رُوپا نے دیوانہ وار اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھٹے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”ہولے ہولے بولو نتھو۔ ہولے ہولے بولو، کہیں وہ---جو میرے ہردے میں نیا جیو ہے، نہ سن لے کہ اس کی ماں پاپن ہے---نتھو اسی ڈر کے مارے تو میں زیادہ سوچتی نہیں، زیادہ غم نہیں کرتی کہ اُس کو کچھ معلوم نہ ہو--------پر بیٹھے بیٹھے کبھی میرے من میں آتا ہے کہ ڈوب مروں اپنا گلا گھونٹ لوں، یا پھر زہر کھا کے مر جاؤں-------“

نتھو نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ایک دو سیکنڈ غور کرنے کے بعد اس نے کہا۔

”کبھی نہیں، میں تمہیں کبھی مرنے نہ دوں گا۔ تم کیوں مرو۔ یوں تو موت سے چھٹکارا نہیں، سب کو ایک دن مرنا ہے۔ پر اسی لیے تو جینا بھی ضروری ہے-------میں کچھ پڑھا نہیں، میں کوئی پنڈت نہیں، پر جو کچھ میں نے کہا ہے ٹھیک ہے، تم مجھے اس کا نام بتا دو۔ میں تمہیں اُس کے پاس لے چلوں گا۔ اور اسے مجبور کروں گا۔ کہ وہ تمہارے ساتھ بیاہ کر لے اور تمہیں اپنے پاس رکھے-----وہی تمہارا پتی ہے“!

نتھو پھر رُوپا کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

”لو میرے کان میں کہہ دو-------وہ کون ہے؟------رُوپا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، کیا تمہیں یقین نہیں آتا۔ کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں گا۔“

رُوپا نے جواب دیا۔

”تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو نتھو، پر جس آدمی کے پاس تم مجھے لے جانا چاہتے ہو۔ کیا وہ بھی کچھ کرے گا؟--------وہ مجھے بھول بھی چکا ہو گا۔“

نتھو نے کہا۔

”تمہیں دیکھتے ہی اُسے سب کچھ یاد آ جائے گا-------باقی چیزوں کی یاد اسے میں دلا دوں گا-----تم مجھے اُس کا نام تو بتاؤ-----------یہ ٹھیک ہے کہ استری اپنے پتی کا نام نہیں لیتی۔ پر ایسے موقع پر تمہیں کوئی لاج نہ آنی چاہیے۔“

رُوپا خاموش رہی، اس پر نتھو اور زیادہ مضطرب ہو گیا۔

”میں تمہیں ایک سیدھی سادی بات سمجھاتا ہوں اور تم سمجھتی ہی نہیں ہو، پگلی، جو تمہارے بچے کا باپ ہے وہی تمہارا پتی ہے-------اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تم تو بس آنسو بہائے جاتی ہو، کچھ سنتی ہی نہیں ہو-----میں پوچھتا ہوں، اس کا نام بتانے میں ہرج ہی کیا ہے------لو، تم نے اور رونا شروع کر دیا۔ اچھا بھئی میں زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ تم یہ بتا دو کہ وہ ہے کون--------تم مان لو۔ میں اس کا کان پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آؤں گا۔“

رُوپا نے سسکیوں میں کہا۔

”تم بار بار پتی نہ کہو نتھو----------میری جوانی میری آشا، میری دنیا، کبھی کی ودھوا ہو چکی ہے----تم میری مانگ میں سیندور بھرنا چاہتے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ سارے بال ہی نوچ ڈالوں------نتھو اب کچھ نہیں ہو سکے گا------میری جھولی کے بیر زمین پر گر کر-----سب کے سب موری میں جا پڑے ہیں۔ اب انھیں باہر نکالنے سے کیا فائدہ-------اس کا نام پوچھ کر تم کیا کرو گے-------لوگ تو میرا نام بھول جانا چاہتے ہیں۔“

نتھو تنگ آ گیا۔ اور تیز لہجے میں کہنے لگا۔

”تم-----تم بیوقوف ہو--------میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔“

وہ اُٹھ کر جانے لگا تو رُوپا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ نتھو نے اُس کی گیلی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

”بولو؟“

رُوپا بولی۔

”نتھو بھیّا، مجھے مارو، خوب پیٹو۔ شاید اس طرح میں اُس کا نام بتا دوں-----تمہیں یاد ہو گا۔ ایک بار میں نے بچپن میں مندر کے ایک پیڑ سے کچے آم توڑے تھے۔ اور تم نے ایک ہی چانٹا مار کر مجھ سے سچی بات کہلوائی تھی------آؤ مجھے مارو--------یہ چور جسے میں نے اپنے من میں پناہ دے رکھی ہے بغیر مار کے باہر نہیں نکلے گا۔“

نتھو خاموش رہا۔ ایک لحظے کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ پھر ایکا ایکی اس نے رُوپا کے پیلے گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ چھت کے چند سوکھے اور گرد سے اٹے تنکے دھمک کے مارے نیچے گر پڑے۔ نتھو کی سخت انگلیوں نے رُوپا کے گال پر کئی نہریں کھود دیں۔ نتھو نے گرج کر پوچھا۔

”بتاؤ وہ کون ہے ؟“

جھونپڑے کے باہر مادھو کے لنگڑے بھائی کی آدھی ٹانگ کانپی۔ چوہدری جس تنکے سے زمین پر ایک اور طوطے کی شکل بنا رہا تھا۔ ہاتھ کانپنے کے باعث دُہرا ہو گیا۔ مادھو کاکا نے کلنگ کی طرح اپنی گردن اونچی کر کے جھونپڑے کے اندر دیکھا۔ اندر سے نتھو کی خشم آلود آواز آ رہی تھی۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مادھو کاکا، چوہدری اور لنگڑے کیشو نے آپس میں کئی باتیں کیں۔ آخر میں مادھو کاکا کا بھائی بیساکھی ٹیک کر اٹھا۔ وہ جھونپڑے میں جانے ہی والا تھا کہ نتھو باہر نکلا۔ کیشو ایک طرف ہٹ گیا۔ نتھو نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا اور کہا کہ آؤ رُوپا

”پھر اُس نے رُوپا کی ماں سے کہا۔

”ماں تم بالکل چنتا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔“

کسی نے نتھو سے یہ نہ پوچھا کہ وہ رُوپا کو لے کر کدھر جا رہا ہے۔ مادھو کاکا کچھ پوچھنے ہی والا تھا۔ کہ نتھو اور رُوپا دونوں چبوترے پر سے اُتر کر موری کے اُس پار جا چکے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی مونچھ کے سفید بال نوچنے میں مصروف ہو گیا۔ اور چوہدری کُبڑے تنکے کو سیدھا کرنے لگا۔ بھٹے کے مالک لالہ گنیش داس کا لڑکا ستیش جسے بھٹے کے مزدور چھوٹے لالہ جی کہا کرتے تھے۔ اپنے کمرے میں اکیلا چائے پی رہا تھا۔ پاس ہی تپائی پر ایک کھلی ہُوئی کتاب رکھی تھی۔ جسے غالباً وہ پڑھ رہا تھا۔ کتاب کی جلد کی طرح اُس کا چہرہ بھی جذبات سے خالی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر غلاف چڑھا رکھا ہے، وہ ہر روز اپنے اندر ایک نیا ستیش پاتا تھا۔ وہ جاڑے اور گرمیوں کے درمیانی موسم کی طرح متغیر تھا۔ وہ گرم اور سرد لہروں کا ایک مجموعہ تھا۔ دوسرے دماغ سے سوچتے تھے لیکن وہ ہاتھوں اور پیروں سے سوچتا تھا۔ جہاں ہر شے کھیل نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کو گیند کی مانند اچھال رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھل کود ہی زندگی کا اصل مقصد ہے اُس کو مسلنے میں بہت زیادہ مزا آتا ہے۔ ہر شے کو وہ مسل کر دیکھتا تھا۔ عورتوں کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ مرد خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے مگر اُس کو عورت جوان ملنی چاہیے۔ عورت میں جوانی کو وہ اتنا ہی ضروری خیال کرتا تھا۔ جتنا اپنے ٹینس کھیلنے والے ریکٹ میں بنے ہوئے جال کے اندر تناؤ کو۔ دوستوں کو کہا کرتا تھا۔

”زندگی کے ساز کا ہر تار ہر وقت تنا ہونا چاہیے۔ تاکہ ذرا سی جنبش پر بھی وہ لرزنا شروع کر دے۔“

یہ لرزش، یہ کپکپاہٹ جس سے ستیش کو اس قدر پیار تھا۔ دراصل اُس کے گندے خون کے کھولاؤ کا نتیجہ تھی۔ جنسی خواہشات اُس کے اندر اس قدر زیادہ ہو گئی تھیں کہ جوان حیوانوں کو دیکھ کر بھی اُسے لذت محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب اپنی گھوڑی کے جوان بچے کے کپکپاتے ہوئے بدن کو دیکھتا تھا تو اسے ناقابلِ بیان مسّرت حاصل ہوتی تھی۔ اُس کو دیکھ کر کئی بار اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ اپنا بدن اس کے تر و تازہ بدن کے ساتھ گھسے۔ ستیش چائے پی رہا تھا اور دل ہی دل میں چائے دانی کی تعریف کر رہا تھا۔ جو بے داغ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی۔ ستیش کو داغ پسند نہیں تھے۔ وہ ہر شے میں ہمواری پسند کرتا تھا۔ صاف بدن عورتوں کو دیکھ کر وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

”میری نگاہیں اس عورت پر کئی گھنٹے تیرتی رہیں۔۔۔۔۔۔ وہ کس قدر ہموار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل ہے۔ یہ کمرہ جس میں اس وقت ستیش بیٹھا ہوا تھا خاص طور پر اس کے لیے بنوایا گیا تھا۔ کمرے کے سامنے ٹینس کورٹ تھا۔ یہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہر روز شام کو ٹینس کھیلتا تھا۔ آج اُس نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹینس کھیلنے نہیں آئے گا۔ کیونکہ اُسے آج ایک دلچسپ کھیل کھیلنا تھا۔ بھنگی کی نوجوان لڑکی جس کے متعلق اُس نے ایک روز اپنے دوست سے یہ کہا تھا۔

”تم اسے دیکھو۔۔۔۔۔ سچ کہتا ہوں تمہاری نگاہیں اس کے چہرے پر سے پھسل پھسل جائیں گی۔ میری نگاہیں اُس کو دیکھنے سے پہلے، اس کے کھردرے بالوں کو تھا لیتی ہیں تاکہ پھسل نہ جائیں“

۔۔۔۔۔۔۔ آج ایک مدت کے بعد ٹینس کورٹ میں اُس سے خفیہ ملاقات کرنے کے لیے آ رہی تھی۔ وہ چائے پی رہا تھا اور اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں اُس جوان لڑکی کے سانولے رنگ کا عکس پڑ رہا تھا۔ اُس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ باہر سوکھے پتے کھڑکے تو ستیش نے پیالی میں سے چائے کا آخری گھونٹ پیا۔ اور اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔۔۔۔۔! ایک لمبا سا سایہ ٹینس کورٹ کے جھاڑو دیئے ہُوئے سینے پر متحرک ہُوا۔ اور لڑکی کی بجائے نتھو نمودار ہوا۔ ستیش نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ آنے والا بھٹے کا ایک مزدور ہے نتھو اپنے بالوں کا ایک گچھا انگلیوں سے مروڑ رہا تھا اور ٹینس کورٹ کی طرف بڑھا رہا تھا۔ ستیش کی کُرسی برآمدے میں بچھی تھی۔ پاس پہنچ کر نتھو کھڑا ہو گیا اور ستیش کی طرف یوں دیکھنے لگا۔ گویا چھوٹے لالہ جی کو اُس کی آمد کی غرض و غایت اچھی طرح معلوم ہے۔ ستیش نے پوچھا

”کیا ہے ؟“

نتھو خاموشی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

”چھوٹے لالہ جی! میں اُسے لے کر آیا ہوں۔ اب آپ اُسے اپنے پاس رکھ لیجیے، گاؤں والے اُسے بہت تنگ کر رہے ہیں۔“

ستیش حیران ہو گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نتھو کیا کہہ رہا ہے۔ اُس نے پوچھا۔

"کسے؟------ کسے تنگ کر رہے ہیں۔"

نتھو نے جواب دیا۔

"آپ------ آپ-------- رُوپا کو------ آپ کی پتنی کو۔"

"میری پتنی؟"

ستیش چکرا گیا۔

"میری پتنی------ تیرا دماغ تو نہیں بہک گیا------ یہ کیا بک رہا ہے"

------ یہ کہتے ہی اُس کے اندر------ بہت اندر رُوپا کا خیال پیدا ہوا۔ اور اُسے یاد آیا۔ کہ پچھلے ساون میں وہ ایک موٹی موٹی آنکھوں اور گدرائے ہوئے جسم والی ایک لڑکی سے کچھ دنوں کھیلا تھا۔ وہ دودھ لے کر شہر میں جایا کرتی تھی۔ ایک بار اُس نے دودھ کی بوندیں اُس کے اُبھرتے ہوئے سینے پر ٹپکتی دیکھی تھیں اور-------- ہاں ہاں یہ رُوپا وہی لڑکی تھی۔ جس کے بارے میں اُس نے ایک بار یہ خیال کیا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ ملائم ہے۔ اس کو حیرت بھی ہوتی تھی کہ یہ اینٹیں بنانے والے ایسی نرم و نازک لڑکیاں کیسے پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بھنگی کی لڑکی کو بھول سکتا تھا۔ سوشیلا کو فراموش کر سکتا تھا، جو ہر روز اُس کے ساتھ ٹینس کھیلتی تھی۔ وہ ہسپتال کی نرس کو بھول سکتا تھا جس کے سفید کپڑوں کا وہ معترف تھا۔ وہ اس------ لیکن رُوپا کو نہیں بھول سکتا تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ دوسری یا تیسری ملاقات پر جب کہ رُوپا نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ تو اس کی ایک بات پر اُسے بہت ہنسی آئی تھی۔ رُوپا نے اس سے کہا تھا۔

"چھوٹے لالہ جی! کل سندری چمارن کہہ رہی تھی۔

"جلدی جلدی بیاہ کر لے ری۔ بڑا مزا آتا ہے------ اسے کیا پتہ کہ میں بیاہ کر بھی چکی ہوں"

-------- مگر رُوپا تھی کہاں؟ ستیش کی حیوانی حِس اس کا نام سنتے ہی بیدار ہو چکی تھی۔ گو ستیش کا دماغ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا۔ مگر اس کا جسم صرف اپنی دلچسپی کی طرف متوجہ تھا۔ ستیش نے پوچھا

"کہاں ہے رُوپا؟"

نتھو اُٹھ کھڑا ہوا۔

"باہر کھڑی ہے------ میں ابھی اُسے لاتا ہوں۔"

ستیش نے فوراً رُعب دار لہجے میں کہا۔

"خبر دار جو اُسے تو یہاں لایا--- جا بھاگ جا یہاں سے۔"

"پر---- پر------ چھوٹے لالہ جی وہ-------- وہ آپ کی پتنی ہو چکی ہے------ بچے کی ماں بننے والی ہے اور بچہ آپ ہی کا تو ہو گا------ آپ ہی کا تو ہو گا۔"

نتھو نے تتلاتے ہوئے کہا۔ تو رُوپا حاملہ ہو چکی تھی---- ستیش کو قدرت کی یہ ستم ظریفی سخت ناپسند تھی اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کے ساتھ ساتھ یہ حمل کا سلسلہ کیوں جوڑ دیا ہے۔ مرد جب کسی عورت کی خاص خوبی کا معترف ہوتا ہے تو اس کی سزا بچے کی شکل میں کیوں طرفین کو بھگتنا پڑتی ہے------ رُوپا بچے کے بغیر کتنی اچھی تھی۔ اور وہ خود اس بچے کے بغیر کتنے اچھے طریقے پر، رُوپا کے ساتھ تعلقات قائم رکھ سکتا تھا۔ اس سلسلہ تولید کی وجہ سے کئی بار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ عورت ایک بیکار شے ہے یعنی اس کو ہاتھ لگاؤ اور یہ بچہ پیدا ہو جاتا ہے یہ بھی کوئی بات ہے۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس بچے کا کیا کرے جو پیدا ہو رہا تھا تھوڑی دیر غور کر کے اُس نے نتھو کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے آرام سے کہا۔

"تم رُوپا کے کیا لگتے ہو------ خیر چھوڑو اس قصّے کو------ دیکھو، یہ بچے وچے کی بات مجھے پسند نہیں، مفت میں ہم دونوں بدنام ہو جائیں گے، تم ایسا کرو، رُوپا کو یہاں چھوڑ جاؤ------ میں اُسے آج ہی کسی ایسی جگہ بھجوا دوں گا جہاں یہ بچہ ضائع کر دیا جائے---- اور رُوپا کو میں کچھ روپے دے دوں گا۔ وہ خوش ہو جائے گی------ تمہارا انعام بھی تمہیں مل جائے گا------ ٹھہرو"

یہ کہہ کر ستیش نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا اور دس روپے کا نوٹ نتھو کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"یہ رہا تمہارا انعام---- جاؤ عیش کرو۔"

نھو چپکے سے اٹھا۔ دس روپے کا نوٹ اس نے اچھی طرح مٹھی میں دبالیا اور وہاں سے چل دیا۔ ستیش نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ اب وہ بھنگی کی لڑکی کی بابت سوچنے لگا کہ اگر اسے بھی------ مگر یہ کیا، نھو رُوپا کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ رُوپا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے اُسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ ستیش نے سوچا۔

”یہ بچہ پیدا کرنا بھی ایک اچھی خاصی مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ نھو اور رُوپا دونوں بر آمدے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ستیش نے رُوپا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”دیکھو رُوپا، میں نے------ اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا------ سمجھیں------- کیوں بھئی تم نے سب کچھ بتا دیا نا؟“

نھو نے دس روپے کا نوٹ خاموشی سے ستیش کی طرف بڑھایا اور کہا۔

”چھوٹے لالہ جی! کاغذ کے اس ٹکڑے سے آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو ایک بہت بڑا سودا کرنے آیا تھا۔“

ستیش نے سمجھا کہ نھو شاید دس روپے سے زیادہ مانگتا ہے۔

”کتنے چاہئیں تجھے------ میرے پاس اس وقت پچاس ہیں لینا ہو تو لے جاؤ۔“

نھو نے رُوپا کی طرف دیکھا۔ رُوپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سیمنٹ سے لپی ہُوئی سیڑھیوں پر ٹپک رہے تھے۔ اس کے دل پر یہ قطرے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گر رہے تھے۔ ستیش کی طرف اُس نے مڑ کر کہا۔

”چھوٹے لالہ جی، یہ آپ کی پتنی ہے، آپ اس کے بچے کے باپ ہیں------ جیسے بڑے لالہ جی آپکے پتا ہیں------ رُوپا کے لیے اور کوئی جگہ نہیں ہے وہ آپکے پاس رہے گی اور آپ اُسے پتنی بنا کر رکھیں گے------ سب گاؤں والے اسے دھتکار رہے ہیں، کس لیے------ اس لیے کہ وہ آپ کا بچہ اپنے پیٹ میں لیے پھرتی ہے------ آپ کو تھامنا پڑے گا۔ اس لڑکی کا ہاتھ جس نے آپ کو اپنا سب کچھ دے دیا------ آپ کا دل پتھر کا نہیں ہے چھوٹے لالہ جی! اور اس چھوکری کا دل بھی پتھر نہیں ہے------ آپ نے اس کو سہارا نہ دیا تو اور کون دے گا، یہ آتی نہیں تھی۔ رو رو کے اپنی جان ہلکان کر رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھایا اور کہا، پگلی تو کیوں روتی ہے، تیرا پتی جیتا ہے چل میں تجھے اُس کے پاس لے چلوں۔ ستیش کو پتی پتنی کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

”دیکھو بھائی! زیادہ بکواس نہ کرو، تم یوں ڈرا دھمکا کر مجھ سے زیادہ روپیہ وصول نہیں کر سکتے۔ میں ایک سو روپیہ دینے پر راضی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ بچہ ضائع کر دیا جائے۔ اور تم جو مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں اسے اپنے گھر میں بسالوں تو یہ ناممکن ہے------ میں اس کا پتی خواب میں بھی نہیں بنا اور نہ یہ میری کبھی پتنی بنی ہے------ سمجھے؟ سو روپیہ لینا ہو تو کل آ کے یہاں سے لے جانا، اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔“

نھو بھنّا گیا۔

”اور------ اور------ یہ بچہ کیا آسمان سے گرا ہے؟------ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھوت پریتوں نے بھر دیئے ہیں------ میرا دل------ میرا دل کون مسل رہا ہے------ یہ روپے------ یہ سو روپے کیا آپ خیرات کے طور پر دے رہے ہیں------ کچھ ہوا ہے تو یہ سب کچھ ہو رہا ہے------ کوئی بات ہے تو یہ ہلچل مچ رہی ہے------ آپ اس بچے کے باپ ہیں تو کیا اس کے پتی نہیں؟------ میری عقل کو کچھ ہو گیا ہے یا آپ کی سمجھ کو------“

ستیش یہ تقریر برداشت نہ کر سکا۔

”اُلّو کے پٹھے! تو جاتا ہے کہ نہیں یہاں سے کھڑا اپنی منطق چھانٹ رہا ہے، جا جو کرنا ہے کر لے------ دیکھوں تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔“

نھو نے ہولے سے کہا۔

”میں تو سنوارنے آیا تھا چھوٹے لالہ جی------ آپ ناحق کیوں بگڑ رہے ہیں، آپ کیوں نہیں اس کا ہاتھ تھام لیتے یہ آپ کی پتنی ہے۔“

”پتنی کے بچے اب تو اپنی بکواس بند کرے گا یا نہیں------ بچہ بچہ کیا بک رہا ہے------ جا لے جا اپنی اس کچھ لگتی کو، ورنہ یاد رکھ، کھال ادھیڑ دوں گا۔“

نھو کے سب پٹھے اکڑ گئے، بھگوان کی قسم، مجھ میں اتنی شکتی ہے کہ یوں ہاتھوں میں دبا کر تیرا سارا لہو نچوڑ دوں------ میری کھال تیرے ان نازک ہاتھوں سے نہیں ادھڑے گی------ میں تیری بوٹی بوٹی نوچ سکتا ہوں------ پر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تجھے ہاتھ تک نہیں لگانا چاہتا------ تو رُوپا کے بچے کا باپ ہے، تو رُوپا کا پتی ہے۔ اگر میں تجھ پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے ڈر ہے کہ رُوپا کے دل کو دھکا لگے گا------ تو عورتوں سے ملتا جلتا ہے پر تو عورت کا دل نہیں رکھتا۔“

ستیش آپے سے باہر ہو گیا۔ اور چیخنے لگا۔

”تیری اور تیری روپا کی ایسی تیسی------ نکل یہاں سے باہر۔“

نھو بڑھ کر رُوپا کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اور ستیش کے پاس------ بالکل پاس جا کر کہنے لگا۔

”چھوٹے لالہ جی مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں۔۔۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دیجیے مگر رُوپا کا ہاتھ تھام لیجیے۔۔۔۔۔۔ آپ اس کے پتی ہیں، اس کے بھاگ میں آپ کے بنا اور کوئی مرد نہیں لکھا گیا۔ یہ آپ کی ہے۔۔۔۔۔ اب آپ اسے اپنا بنالیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ دیکھیے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

”کیسے واہیات آدمی سے واسطہ پڑا ہے۔

”ستیش نے کمرے کے اندر جاتے ہوئے کہا۔ کہتا ہوں میں رُوپا وپا کو نہیں جانتا۔ مگر یہ خواہ مخواہ اسے میرے پلے باندھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ جاؤ جاؤ ہوش کی دوا کرو۔“

کمرے کا صرف ایک دروازہ کُھلا تھا۔ جس میں سے ستیش اندر داخل ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے یہ دروازہ بند کر دیا۔ نتھو نے دروازے کی لکڑی کی طرف دیکھا تو اسے ستیش کے چہرے اور اس میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ نتھو نے اپنے سر کے بال مروڑنے شروع کر دیئے اور جب پلٹ کر اُس نے رُوپا سے کچھ کہنا چاہا تو وہ جا چکی تھی۔۔۔۔۔۔ اور وہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھاگا۔ مگر وہ جا چکی تھی۔ باہر نکل کر اُس نے رُوپا کو بہت دُور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے یہ کہتا ہوا بھاگا۔

”رُوپا۔۔۔۔ رُوپا، ٹھہر جا۔۔۔۔۔۔ میں ایک بار پھر اُسے سمجھاؤں گا۔۔۔۔۔ وہی تیرا پتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس کا گھر ہی تیری اصل جگہ ہے۔ وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا۔ مگر رُوپا بہت دور نکل گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اُس روز سے آج تک نتھو، رُوپا کی تلاش میں سرگردان ہے مگر وہ اُسے نہیں ملتی۔ وہ لوگوں سے کہتا ہے۔

”میں رُوپا کے پتی کو جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ تم اسے ڈھونڈ کر لاؤ، میں اُسے اس کے پتی سے ملا دوں گا۔“

لوگ یہ سُن کر ہنس دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ بچے جب بھی نتھو کو دیکھتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں۔ اُس کا پتی کون ہے نتھو بھیّا۔“

تو نتھو ان کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے۔

سعادت حسن منٹو

آصف نے کہا۔

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوآصف نے کہا۔

”کام چور نوکر تو قریب قریب سبھی ہوتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر باقاعدہ چور ہوتے ہیں“

اور اس نے اپنے ایک نئے نوکر کی داستان سنائی جو بے حد مستعد تھا۔ اس قدر مستعد کہ بعض اوقات آصف کے آواز نہ دینے پر بھی بھاگا بھاگا آتا تھا اور اس سے پوچھتا۔

”کیوں صاحب آپ نے بلایا مجھے؟“

آصف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے نوکروں میں اس قدر پھرتی، چالاکی اور مستعدی پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب راجہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ آسو تم بہت خوش قسمت ہو کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں ایسا نوکر مل گیا تو۔“

راجہ غلام علی نے بات کاٹ کر کہا۔

”بخدا مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کم بخت چور ہو گا“!

آصف راجہ سے مخاطب ہوا۔

”میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ وہ یا تو چور ہے یا پہنچا ہوا ولی۔ اس کے بین بین وہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں نے راجہ صاحب سے کہا، قبلہ اگر آپ اس نوکر کو ایک ایسا دفینہ سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے مل گیا ہے تو میں آپ کی دوستی کی خاطر قربانی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بڑے شوق سے یہ سوغات اپنے گھر لے جاسکتے ہیں۔“

راجہ نے کہا۔

”میں نے انکار نہیں کیا تھا۔“

”درست ہے“!

آصف مسکرایا۔

”غلطی میری تھی، اگر میں نے اس وقت وہ نعمت غیر مترقبہ آپ کو سونپ دی ہوتی تو جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے چالیس روپے اور ایک عدد ریلوے پاس کا داغِ مفارقت برداشت نہ کرنا پڑتا۔“

راجہ ہم سے مخاطب ہوا۔

”آصف سے ذرا ساری داستان سنو۔ کافی دلچسپ ہے“!

آصف نے کہا

”معاف فرمائیے۔ مجھے یہ داستان غم سناتے کوئی فرحت حاصل نہیں ہوتی۔“

یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”بات یہ ہے منٹو۔ کہ چغد پن اصل میں میں نے کیا۔ وہ بہت چالاک تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن اپنی ہوشیاری مجھے کافی اعتماد تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر جب میں نے میز کی ٹرے دیکھی تو اس میں خلاف معمول میرا ریلوے پاس نہیں تھا۔ اس کے خانے میں دس دس کے چار نوٹ تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ساتھ ہی غائب تھے۔ نوکر میری توقع کے مطابق موجود تھا۔ چنانچہ میں نے اِدھر اُدھر تلاش شروع کی۔ میز کے نچلے دراز میں پاس مع روپوؤں کے فائلوں کے نیچے موجود تھا۔ میں نے اُسے وہیں رکھ دیا۔ یہ تم سمجھ سکتے ہو کیوں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بہت اچھی طرح۔“

راجہ مسکرانے لگا۔ آصف نے اس کی طرف دیکھا۔

”راجہ صاحب مسکرا رہے ہیں۔ اس لیے کہ میں نے خود کو چغد ثابت کیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔“

وہ مجھ سے مخاطب ہوا

”بات یہ ہوئی منٹو کہ میں نے ایک پلان بنایا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اس نوکر نے جس کا نام مومن تھا کس نیت سے وہ روپے فائلوں کے نیچے چھپائے تھے۔ اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بڑے اطمینان سے اپنا کام کرنا چاہتا تھا اور میں بھی اسے بڑے اطمینان سے رنگے ہاتھوں پکڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ پلان یہ تھا کہ میں حسب معمول نہانے کے لیے غسل خانے میں جاؤں اور تھوڑا سا دروازہ کھلا رکھوں اور اسے دیکھتا رہوں۔ غسل خانے سے اس کمرے پر جس میں وہ میز پڑا تھا بڑی آسانی سے نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ یہ پلان اس قدر واضح اور مکمل تھا کہ میں نے دل ہی دل میں اس مردِ مومن کو گرفتار کر کے بعد میں اپنی روایتی گناہ بخش طبیعت کے باعث اسے چھوڑ بھی دیا تھا۔“

راجہ ہنسا۔ آصف بھی ہنسا۔

”ہاں تو منٹو میں نہانے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا۔ دروازہ پلان کے مطابق میں نے تھوڑا سا کھلا رکھا۔ مگر نہانے میں کچھ ایسا مشغول ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ معلوم نہیں غسل خانے میں آدمی کام کی باتیں بھول کر کیوں ایسی دنیا میں کھو جاتا ہے جہاں اور سب کچھ ہوتا ہے مگر کوئی غسل خانہ نہیں ہوتا“!

میں نے مسکرا کر کہا۔

”فقرہ خوبصورت ہے، گو کچھ معنی نہیں رکھتا۔“

آصف نے ذرا تیزی سے کہا۔

”کیوں معنی نہیں رکھتا۔ اگر غسل خانے کے بجائے میں پینٹری میں گیا ہوتا یا دوسرے کمرے کو میں نے اپنا محاذ بنایا ہوتا تو یقیناً اپنے مجوزہ آپریشن میں کامیاب رہتا۔ بخدا مجھے تو اس دن سے نفرت ہو گئی ہے دنیا کے تمام غسل خانوں سے۔“

راجہ مسکرایا۔

”آج کل آپ غسل آفتابی فرماتے ہیں۔“

آصف بھی مسکرایا۔

”غسل آبی ہو، آفتابی ہو یا مہتابی۔ مجھے سب سے نفرت ہو گئی ہے۔ تو اس دن سے تیمم پر گزارہ کر رہا ہوں۔ باہر نکل کر کنگھی کرتے ہوئے جب مجھے اپنا پلان یاد آیا تو دوڑ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ فائلوں کے نیچے پاس غائب تھا۔ خدا کی قسم منٹو مجھے ان چالیس روپوں کا افسوس نہیں تھا۔ صدمہ اس بات کا تھا کہ سارا پلان غسل خانے کی بدولت غارت ہو گیا۔ اور پاس ضائع ہو گیا۔ خواجہ ظہیر جو اس وقت تک خاموش تھا بولا

”آصف صاحب نے اس روز جھنجھلاہٹ میں ٹکٹ کے بغیر سفر کیا اور دھر لیے گئے۔ واپسی پر آپ کا ارادہ تھا کہ چار پانچ دوستوں سمیت انتقام لینے کے لیے ٹکٹ کے بغیر سفر کریں مگر آپ کی روایتی دور اندیشی کام آ گئی اور آپ اس خطرناک عزم سے باز رہے۔“

راجہ نے سگرٹ سلگایا اور اپنے موٹے موٹے گد گدے گالوں پر ہاتھ پھیر کر ایک لمبی داستان سنانے کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”چور نوکروں کا ذکر آیا ہے تو مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔“

میں نے ان کی بات کاٹی

”اتفاق کی بات ہے کہ یہ دلچسپ واقعہ آپ اتنی مرتبہ اس قدر غیر دلچسپ طریقے پر بیان فرما چکے ہیں کہ اب اس غریب کی ساری وقوعیت ختم ہو چکی ہے۔ اور دلچسپی۔“

راجہ کے گال تھر تھرائے

”چلو ہٹاؤ۔“

خواجہ ظہیر نے مجھ سے اجازت لی

”اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک واقعہ سناؤں۔ ممکن ہے آپ کو اس میں دلچسپی کا کوئی پہلو مل جائے۔“

خواجہ ظہیر عام طور پر شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہونیوالی گفتگو میں حصہ نہیں لیا کرتا تھا اور اپنا وہی تجربہ معرض بیان میں لایا کرتا تھا۔ جو اس پر کافی اثر انداز ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا

”آپ تکلف سے کام نہ لیں خواجہ صاحب۔ بے تکلف ارشاد فرمائیں۔“

خواجہ ظہیر نے قدرے تکلف سے کہنا شروع کیا

”دس روپے کی چوری بظاہر بالکل معمولی چوری ہے۔ گھر میں آئے دن نوکر ایسی چوریوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ میں دہلی میں تھا۔ فتح پور میں میرا مکان تھا۔ میرا خیال ہے بمبئے جاتے ہوئے آپ ایک دفعہ وہاں ٹھہرے بھی تھے۔“

میں نے جواب دیا

”جی ہاں۔ ٹھہرا کیا تھا پورے دس روز قیام کیا تھا۔“

”تو آپ نے غلام قادر کو ضرور دیکھا ہو گا۔ ادھیڑ عمر کا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں۔“

مجھے یاد آگیا۔

”جی ہاں۔ جی ہاں میں اب اسکی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے لا سکتا ہوں۔ مگر وہ تو۔ وہ تو اچھا خاصا۔ میرا مطلب ہے ایماندار آدمی معلوم ہوتا تھا۔“

خواجہ ظہیر نے کہا

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ سارا واقعہ سن لیجیے اس لیے آپ یقیناً کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد کر لیں گے۔ واقعہ یوں ہے۔ میری بیوی کی عادت ہے کہ جب میں تنخواہ لا کر اس کے حوالے کرتا ہوں تو اس میں سے کچھ روپے نکال کر کسی کپڑے کی تہہ میں رکھ دیتی ہے یا کسی الماری کے کسی کونے میں چھپا دیتی ہے اور بھول جاتی ہے۔“

راجہ نے مسکرا کر کہا۔

”آپ تو عیش کرتے ہوں گے؟“

خواجہ ظہیر نے راجہ سے مختصراً

”جی نہیں“

کہا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

”وہ بھولتی نہیں۔ دل میں یہ فرض کر لیتی ہے کہ بھول گئی ہے۔ اس کو پس انداز کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ آتا ہے۔“

آصف نے میری طرف دیکھا۔

”منٹو۔ یوں کہیں خواجہ صاحب کہ ان کی بیگم صاحبہ پس انداز کا ترجمہ کر دیتی ہیں۔“

خواجہ ظہیر مسکرایا۔

”جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی سمجھیے۔ تو قصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ اس نے دس کا ایک نوٹ بک شیلف کے نیچے رکھ دیا اور بھول گئی۔“

”اپنے نہ بھولنے والے انداز میں“

آصف نے اپنا سگریٹ سلگایا اور ظہیر کو پیش کیا۔ ظہیر نے سگریٹ لے کر شکریہ ادا کیا اور واقعہ کی تفصیل بیان کرنے لگا۔

”اپنے نہ بھولنے والے انداز میں وہ دس روپے کے اس نوٹ کو بھول چکی تھی۔ دوہ کس پوزیشن میں پڑا ہے، کب سے پڑا ہے یہ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ اس لیے جب وہ غائب ہوا تو اس نے مجھ سے اس کے بارے میں استفسار کیا۔ آصف نے ازراہِ مذاق پوچھا

”کیا وہ ہر روز صبح اٹھ کر کونے کھدرے دیکھ لیا کرتی ہیں جہاں انھوں نے حسب توفیق کچھ نہ کچھ بھولا ہوتا ہے؟“

ظہیر نے جواب دیا۔

”ہر روز صبح اٹھ کر نہیں۔ لیکن دن میں ایک مرتبہ سرسری طور پر دیکھ لیا کرتی ہیں۔ چنانچہ جب ان کو اس نوٹ کی گمشدگی کا علم ہوا تو سب سے پہلے اُن کو مجھ پر شبہ ہوا۔“

راجہ نے پوچھا۔

”آپ کبھی کبھی خود کو یہ دھوکا دینے کے لیے آپ نے ایسی چوری کی ہے جس کا علم آپ کی بیگم صاحب کو۔ آپ۔ آپ خود کو یہ دھوکا۔“

منٹو صاحب نے فقرے کو صحیح اور بامطلب کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔

”منٹو۔ تم سمجھ گئے نا میرا مطلب؟“

میرے بجائے خواجہ ظہیر نے جواب دیا۔

”ایسی چوریاں کون خاوند نہیں کرتا۔ کبھی کبھی بوقت ضرورت اس جرم کا ارتکاب کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اس موقعہ اس کا شبہ غلط تھا۔ مجھے ضرورت تھی اس لیے کہ ایک دوست کو سینما لے جانا تھا۔ لیکن میں نے وہ نوٹ اٹھا کر پھر اس خیال سے وہیں رکھ دیا تھا کہ دو تین روز کے بعد اس کی شدید ضرورت پڑنے والی تھی۔ میں نے چنانچہ اپنی بیوی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے اس نوٹ کی چوری کا کوئی علم نہیں۔“

راجہ نے پوچھا

”ان کو یقین آگیا؟“

”جی نہیں“

آصف نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا

”وہ بیوی ہی نہیں جسے خاوند کی بات پر یقین آجائے۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنی سی کوشش کی اور بالآخر اس کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ نوٹ میں نے نہیں چرایا تھا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ چوری اگر میں نے نہیں کی تو کس نے کی تھی۔ کیونکہ یہ تو مسلمہ امر تھا کہ نوٹ خود بخود غائب نہیں ہوا۔ چرایا گیا ہے اور دو اور دو چار بنانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے دفتر جانے کے بعد کسی نے اس پر ہاتھ صاف کیا ہے کیونکہ دفتر جاتے ہوئے میں نے اسے چرانے کا خیال کیا تھا۔ اور اسے کسی دوسرے وقت پر اٹھا دیا تھا۔“

راجہ مسکرایا۔

”بزرگوں نے وہ ٹھیک کہا ہے۔ آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔“

خواجہ ظہیر نے راجہ کی بات سنی مگر بزرگوں کے اس کہے کے متعلق اپنے خیال کا اظہار نہ کیا

”گھر میں دو نوکر تھے، ایک ملازم قادر۔ دوسرا صادق۔ صادق دو دن سے چھٹی پر تھا۔ اس کی ماں بیمار تھی۔ بس ایک غلام قادر ہی تھا جس پر شک کیا جا سکتا تھا۔ مگر۔“

اس نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی فرمایا تھا وہ اچھا خاصا ایمان دار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اپنے شک کا اظہار کیسے کریں۔ نوکروں کو ڈانٹنے ڈپٹنے، مارنے پیٹنے اور ملازمت سے برطرف کرنے کا کام میرے ذمے ہے۔“

راجہ نے ازراہ مذاق کہا۔

”بڑا اہم پورٹ فولیو آپ کے ذمے ہے۔“

”جی ہاں، بہت اہم۔ لیکن بڑا نازک۔ وہ ملازم خود رکھتی ہیں لیکن برطرفی مجھ سے کراتی ہیں“

یہ کہہ کر خواجہ ظہیر مسکرایا۔ راجہ صاحب کے گال بھی مسکرائے

”جس کا کام اسی کو ساجھے۔ کوئی اور کرے تو خدا معلوم کیا باجے“

آصف نے کہا

”ڈنکا“

”ڈنکا ہی ہو گا۔“

جلدی سے کہہ کر وہ خواجہ ظہیر سے مخاطب ہوا

”آپ ذرا جلدی اپنی داستان ختم کیجیے۔ مجھے اپنی ڈنکا کے ساتھ ایک جگہ جانا ہے۔“

آصف بے تحاشا ہنسا۔

”اپنی ڈنکا کے ساتھ؟“

راجہ کے گال بوکھلا گئے۔

”آئی ایم سوری۔ اپنی بیوی کے ساتھ“!

سب ہنسنے لگے۔ میں نے خواجہ ظہیر سے کہا۔

”راجہ صاحب کو اپنی بیوی کے ساتھ جانا ہے۔ اس لیے آپ یہ داستان جلدی ختم کر دیجیے تا کہ یہ راستے میں اسے سنا سکیں“!

خواجہ مسکرایا۔

”بہت بہتر۔“

پھر تھوڑی دیر رک کر اس نے کہنا شروع کیا۔

”معاملہ بہت ٹیڑھا تھا۔ غلام قادر کو ملازم ہوئے صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ اس دوران میں اس نے مجھے اور میری بیوی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ بڑا اطاعت گزار قسم کا آدمی تھا۔ ان دنوں سخت گرمیوں کے باعث برف کی بہت قلت تھی۔ ملتی تھی تو آٹھ آنے سیر مگر غلام قادر دو آنے کی اتنی ساری لے آتا تھا۔ صادق کو بہت تاؤ آتا تھا۔ جب میری بیوی اس سے کہتی کہ دیکھو غلام قادر کتنا اچھا ہے۔ تم تو اول درجے کے چور ہو تو وہ بھنا جاتا اور اسے گالیاں دیتا کہ وہ یہ سب کچھ اسے نکلوانے کے لیے کرتا ہے۔ جب پہلی مرتبہ وہ دو آنے کی توقع سے بہت زیادہ برف لایا تو میں نے اس سے پوچھا کہ اتنی سستی تم کہاں سے لے آئے، تو اس نے جواب دیا کہ صاحب برف والا اپنی دکان بڑھا رہا تھا جتنی بچی تھی، سب کی سب اس نے مجھے دے دی۔ جواب معقول تھا۔ لیکن دوسرے روز وہ پھر دو آنے کی اتنی ہی برف لایا اور قریب قریب ہر روز لاتا رہا، کیونکہ میری بیوی نے اب سودا سلف لانے کا کام اسی کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کو میرے لڑکے سے بہت محبت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کو چاکلیٹ وغیرہ لے دیتا تھا۔ دو تین مرتبہ وہ میری بیوی کے لیے چنگیر بھر بھر کے موتیے کے پھول بھی لایا۔ اس پر چوری کا شک ہو سکتا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کا اظہار کیسے کیا جائے اور اس کی تصدیق کیونکر ہو۔ میں طبعاً بہت نرم ہوں، لیکن بیوی کی خاطر مجھے اکثر نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ جب چوری کا پتہ لگانے کے لیے مجھے بار بار اکسایا گیا تو میں نے ایک دن غلام قادر سے پوچھ گچھ کا تہیہ کر لیا۔“

خواجہ نے ڈبیا سے ایک سگریٹ نکالا۔ راجہ نے گھڑی میں وقت دیکھا اور کہا

”اللہ بیوی سے بچائے۔“

خواجہ نے سگریٹ سلگایا۔

”چنانچہ میں نے اُس کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا، دیکھو غلام قادر وہ دس روپے کا نوٹ جو تم نے بک شیلف کے نیچے سے اٹھایا تھا۔ واپس کر دو۔“

راجہ نے کہا۔

”یہ طریقہ خوب تھا۔“

خواجہ ظہیر نے راجہ کی بات کی طرف دھیان نہ دیا۔

”اس نے کسی قدر گھبرا کر جواب دیا۔ صاحب کون سا دس روپے کا نوٹ۔ مجھے بالکل معلوم نہیں۔ اس پر میں نے اس کو ڈانٹا۔ مگر وہ پھر بھی نہ بولا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ مجھے شکست ہو رہی ہے تو میں نے زور کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ یہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ ایک دو سیکنڈ کے لیے چنانچہ وہ بالکل مبہوت ہو گیا۔ میں نے ایک اور جڑ دیا اور بڑے سنگین لہجے میں اس سے کہا۔ دیکھو غلام قادر تم نے اگر سچ نہ بولا تو میں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اس نے جواب دیا۔ صاحب میں نے چوری نہیں کی۔ آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیجیے“!

راجہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”بڑا پکا چور تھا۔“

خواجہ ظہیر نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”جی نہیں۔ وہ پکا چور تھا نہ کچا۔ میں نے جب دیکھا کہ میر اوار خالی گیا ہے تو بڑی پریشانی ہوئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں۔ میں نے آغاز ہی انتہا سے کیا تھا۔ اب کیا کرتا۔ دو بڑے زناٹے کے تھپڑ میں نے اس کو مارے تھے۔ وہ بے گناہ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ چنانچہ میں نے صدق دل سے معافی مانگی۔ اور کہا دیکھو غلام قادر۔ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے لیکن بات یہ ہے کہ وہ دس روپے کا نوٹ غائب ضرور ہوا ہے۔ میں نے اٹھایا نہیں۔ تم انکار کرتے ہو۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ یا تو ہم دونوں سچے ہیں یا دونوں جھوٹے۔ بیگم صاحبہ تمہارا کہنا مان لیں گی۔ لیکن مجھ پر ان کا شک بہت مضبوط ہو جائیگا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری نیت تھی وہ نوٹ اٹھانے کی۔ بلکہ میں نے اٹھایا بھی تھا مگر پھر وہیں رکھ دیا تھا کہ جب بہت اشد ضرورت ہو گی تو لے لوں گا۔“

میں اسی جذباتی رو میں کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ غلام قادر مضبوط لہجے میں بولا۔

”وہ نوٹ میں نے اٹھایا تھا صاحب۔ ایک لحظے کے لیے میں چکرا گیا۔“

راجہ نے کہا۔

”بات چکرانے ہی والی تھی“!

خواجہ ظہیر نے سگریٹ فرش پر پھینک کر بوٹ کے تلے سے بجھایا۔

”جی ہاں۔ میں نے غلام قادر کی طرف دیکھا اور حیرت سے پوچھا، تم نے۔ تم نے یہ چوری کیوں کی؟۔ غلام قادر نے جواب دیا۔ کیا کرتا صاحب۔ بیگم صاحبہ نے تنخواہ نہیں دی۔ کہتی تھیں کہ میں ہمیشہ نوکر کی ایک مہینے کی تنخواہ دبا کر رکھا کرتی ہوں تا کہ وہ بھاگ نہ جائے۔ اور۔ اور۔ اس نے رُک رُک کر کہا۔ مجھے عادت ہے۔ مالکوں کی خدمت کرنے کی۔ ان کے سوا میرا کون ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میلے جھاڑن سے ان کو پونچھتے ہوئے وہ کمرے سے چلا گیا۔“

راجہ نے پوچھا۔

”پھر کیا ہوا؟“

خواجہ ظہیر نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں۔ وہ گھر ہی سے چلا گیا تھا“!

13اکتوبر1951ء

سعادت حسن منٹو

اصلی جن

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹواصلی جن

لکھنؤ کے پہلے دنوں کی یاد نواب نوازش علی اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کی اکلوتی لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ برس تھی۔ اکہرے جسم کی، بڑی دُبلی پتلی، نازک، پتلے پتلے نقشوں والی۔ گڑیا سی۔ نام اس کا فرخندہ تھا۔ اُس کو اپنے والد کی موت کا دُکھ ہوا۔ مگر عمر ایسی تھی کہ بہت جلد بھول گئی۔ لیکن اُس کو اپنے دُکھ کا شدید احساس اُس وقت ہوا جب اُس کو میٹھا برس لگا اور اُس کی ماں نے اُس کا باہر آنا جانا قطعی طور پر بند کر دیا اور اس پر کڑے پردے کی پابندی عائد کر دی۔ اس کو اب ہر وقت گھر کی چار دیواری میں رہنا پڑتا۔ اُس کا کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ اکثر تنہائی میں روتی اور خدا سے یہ گلہ کرتی کہ اُس نے بھائی سے اسے کیوں محروم رکھا اور پھر اس کا ابا میاں اُس سے کیوں چھین لیا۔ ماں سے اُس کو محبت تھی' مگر ہر وقت اُس کے پاس بیٹھی وہ کوئی تسکین محسوس نہیں کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کوئی اور ہو جس کے وجود سے اُس کی زندگی کی یک آہنگی دُور ہو سکے۔ وہ ہر وقت اُکتائی اُکتائی سی رہتی۔ اب اُس کو اٹھارواں برس لگ رہا تھا۔ سالگرہ میں دس بارہ روز باقی تھے کہ پڑوس کا مکان جو کچھ دیر سے خالی پڑا تھا پنجابیوں کے ایک خاندان نے کرائے پر اُٹھالیا۔ اُن کے آٹھ لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ آٹھ لڑکوں میں سے دو بیاہے جا چکے تھے۔ باقی اسکول اور کالج میں پڑھتے تھے۔ لڑکی ان چھیوں سے ایک برس بڑی تھی۔ بڑی تنومند' ہٹی کٹی' اپنی عمر سے دو اڑھائی برس زیادہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ انٹرنس پاس کر چکی تھی اُس کے بعد اس کے والدین نے یہ مناسب نہ سمجھا تھا کہ اسے مزید تعلیم دی جائے۔ معلوم نہیں کیوں؟ اُس لڑکی کا نام نسیمہ تھا۔ لیکن اپنے نام کی رعایت سے وہ نرم و نازک اور سست رفتار نہیں تھی۔ اُس میں بلا کی پھرتی اور گرمی تھی۔ فرخندہ کو اُس مہین مہین مونچھوں والی لڑکی نے کوٹھے پر سے دیکھا، جب کہ وہ بے حد اُکتا کر کوئی ناول پڑھنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔ دونوں کوٹھے ساتھ ساتھ تھے۔ چنانچہ چند جملوں ہی میں دونوں متعارف ہو گئیں۔ فرخندہ کو اُس کی شکل و صورت پہلی نظر میں قطعاً پر کشش معلوم نہ ہوئی لیکن جب اُس سے تھوڑی دیر گفتگو ہوئی تو اُسے اس کا ہر خدو خال پسند آیا۔ موٹے موٹے نقشوں والی تھی، جیسے کوئی جوان لڑکا ہے۔ جس کی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ بڑی صحت مند

بھرے بھرے ہاتھ پاؤں۔ کشادہ سینہ مگر اُبھاروں سے بہت حد تک خالی۔ فرخندہ کو اُس کے بالائی لب پر مہین مہین بالوں کا غبار خاص طور پر بہت پسند آیا۔ چنانچہ ان میں فوراً دوستی ہو گئی۔ نسیمہ نے اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو پوچھا

”یہ ناول کیسا ہے؟“

فرخندہ نے کہا

”بڑا ذلیل قسم کا ہے۔ ایسے ہی مل گیا تھا۔ میں تنہائی سے گھبرا گئی تھی۔ سوچا کہ چند صفحے پڑھ لُوں۔“

نسیمہ نے یہ ناول فرخندہ سے لیا واقعی بڑا گھٹیا سا تھا۔ مگر اس نے رات کو بہت دیر جاگ کر پڑھا۔ صبح نوکر کے ہاتھ فرخندہ کو واپس بھیج دیا۔ وہ ابھی تک تنہائی محسوس کر رہی تھی اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ چلو چند اوراق دیکھ لوں۔ کتاب کھولی تو اس میں سے ایک رقعہ نکلا جو اس کے نام تھا۔ یہ نسیمہ کا لکھا ہوا تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے فرخندہ کے تن بدن میں کپکپیاں دوڑتی رہیں۔ فوراً کوٹھے پر گئی۔ نسیمہ نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اسے بُلانا چاہے تو اینٹ جو منڈیر سے اکھڑی ہوئی تھی زور زور سے کسی اور اینٹ کے ساتھ بجا دیا کرے۔ وہ فوراً آ جائے گی۔ فرخندہ نے اینٹ بجائی تو نسیمہ سچ مچ ایک منٹ میں کوٹھے پر آ گئی۔ شاید وہ اپنے رقعے کے جواب کا انتظار کر رہی تھی آتے ہی وہ چار ساڑھے چار فٹ کی کی منڈیر پر مردانہ انداز میں چڑھی اور دوسری طرف کود کر فرخندہ سے لپٹ گئی اور چٹ سے اس کے ہونٹوں کا طول بوسہ لے لیا۔ فرخندہ بہت خوش ہوئی۔ دیر تک دونوں گل مل کے باتیں کرتی رہیں۔ نسیمہ اب اُسے اور زیادہ خوبصورت دکھائی دی۔ اس کی ہر ادا جو مردانہ طرز کی تھی اسے بے حد پسند آئی اور وہیں فیصلہ ہو گیا کہ وہ تا دم آخر سہیلیاں بنی رہیں گی۔ سالگرہ کا دن آیا تو فرخندہ نے اپنی ماں سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنی ہمسائی کو جو اس کی سہیلی بن چکی ہے بُلا سکتی ہے اس نے اپنے ٹھیٹ لکھنوی انداز میں کہا

”کوئی مضائقہ نہیں“

بلالو۔ لیکن وہ مجھے پسند نہیں۔ میں نے دیکھا ہے لونڈوں کی طرح کد کڑے لگاتی رہتی ہے۔“

فرخندہ نے وکالت کی

”نہیں امی جان۔ وہ تو بہت اچھی ہے۔ جب ملتی ہے بڑے اخلاق سے پیش آتی ہے“

نواب صاحب کی بیگم نے کہا

”ہو گا، مگر بھئی مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لڑکیوں کی کوئی نزاکت نہیں۔ لیکن تم اصرار کرتی ہو تو بلالو۔ لیکن اس سے زیادہ ربط نہیں ہونا چاہیے۔ فرخندہ اپنی ماں کے پاس تخت پر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ سے سروتا لے کر چھالیا کاٹنے لگی۔

”لیکن امی جان ہم دونوں تو قسم کھا چکی ہیں کہ ساری عمر سہیلیاں رہیں گی۔ انسان کو اپنے وعدے سے کبھی پھرنا نہیں چاہیے“

بیگم صاحبہ اصول کی پکی تھیں اس لیے انھوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں

”تم جانو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں“

سالگرہ کے دن نسیمہ آئی۔ اس کی قمیص دھاری دار پوپلین کی تھی۔ چست پائجامہ جس میں سے اس کی مضبوط پنڈلیاں اپنی تمام مضبوطی دکھا رہی تھیں۔ فرخندہ کو وہ اس لباس میں بہت پیاری لگی۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام نسوانی نزاکتوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس سے چند ناز نخرے بھی کیے۔ مثال کے طور پر جب میز پر چائے آئی تو اُس نے خود بنا کر نسیمہ کو پیش کی۔ اُس نے کہا

”میں نہیں پیتی، تو فرخندہ رونے لگی۔ بسکٹ اپنے دانتوں سے توڑا تو اُس کو مجبور کیا کہ وہ اس کا بقایا حصہ کھائے۔ سموسہ منہ میں رکھا تو اس سے کہا کہ وہ آدھا اس کے منہ کے ساتھ منہ لگا کر کھائے۔ ایک آدھ مرتبہ معمولی معمولی باتوں پر لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی، مگر فرخندہ خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نسیمہ ہر روز آئے۔ وہ اس سے چہل کرے اور ایسی نرم و نازک لڑائیاں ہوتی رہیں جن سے اس کی ٹھہرے پانی ایسی زندگی میں چند لہریں پیدا ہوتی رہیں۔ لہریں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ اور ان میں فرخندہ اور نسیمہ دونوں لہرانے لگیں۔ اب فرخندہ نے بھی اپنی امی سے اجازت لے کر نسیمہ کے گھر جانا شروع کر دیا۔ دونوں اُس کمرے میں جو نسیمہ کا تھا دروازے بند کر کے گھنٹوں بیٹھی رہتیں۔ جانے کیا باتیں کرتی تھیں؟ اُن کی محبت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ فرخندہ جب کوئی چیز خریدتی تو نسیمہ کا ضرور خیال رکھتی۔ اس کی اُمی اس کے خلاف تھی۔ چونکہ اکلوتی تھی اس لیے وہ اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دولت کافی تھی اس لیے کیا فرق پڑتا تھا کہ ایک کے بجائے دو قمیصوں کے لیے کپڑا خرید لیا جائے۔ فرخندہ کی دس شلواروں کے لیے سفید ساٹن لی تو نسیمہ کے لیے پانچ شلواروں کے لیے لٹھا لے لیا جائے۔ نسیمہ کو ریشمی ملبوس پسند نہیں تھے۔ اُس کو سوتی کپڑے پہننے کی عادت تھی۔ وہ فرخندہ سے یہ تمام چیزیں لیتی مگر شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔ صرف مسکرا دیتی اور یہ تحفے تحائف وصول کر کے فرخندہ کو اپنی بانھوں کی مضبوط گرفت میں بھینچ لیتی اور اس سے کہتی

”میرے ماں باپ غریب ہیں۔ اگر نہ ہوتے تو میں تمہارے خوبصورت بالوں میں ہر روز اپنے ہاتھوں سے سونے کی کنگھی کرتی۔ تمہاری سینڈلیں چاندی کی ہوتیں۔ تمہارے غسل کے لیے معطر پانی ہوتا۔ تمہاری بانھوں میں میری بانھیں ہوتیں اور ہم جنت کی تمام منزلیں طے کر کے دوزخ کے دہانے تک پہنچ جاتے۔“

معلوم نہیں وہ جنت سے جہنم تک کیوں پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ جب بھی فردوس کا ذکر کرتی تو دوزخ کا ذکر ضرور آتا۔ فرخندہ کو شروع شروع میں تھوڑی سی حیرت اس کے متعلق ضرور ہوئی مگر بعد میں جب وہ نسیمہ سے گھل مل گئی تو اس نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ سردی سے نکل اگر آدمی گرمی میں جائے تو اُسے ہر لحاظ سے راحت ملتی ہے اور فرخندہ کو یہ حاصل ہوتی تھی۔ ان کی دوستی دن بدن زیادہ استوار ہوتی گئی بلکہ یوں کہیے کہ بڑی شدت اختیار کر گئی جو نواب نوازش علی مرحوم کی بیگم کو بہت کھلتی تھی۔ بعض اوقات وہ یہ محسوس کرتی کہ نسیمہ اس کی موت ہے۔ لیکن یہ احساس اس کو باوقار معلوم نہ ہوتا۔ فرخندہ اب زیادہ تر نسیمہ ہی کے پاس رہتی۔ صبح اٹھ کر کوٹھے پر جاتی۔ نسیمہ اُسے اُٹھا کر منڈیر کے اُس طرف لے جاتی اور دونوں کمرے میں بند گھنٹوں جانے کن باتوں میں مشغول رہتیں۔ فرخندہ کی دو سہیلیاں اور بھی تھیں' بڑی مردار قسم کی۔ یوپی کی رہنے والی تھیں۔ جسم چھچھڑا سا۔ دو پلی ٹوپیاں سی معلوم ہوتی تھیں۔ پھونک مارو تو اُڑ جائیں۔ نسیمہ سے تعارف ہونے سے پہلے یہ دونوں اُس کی جان و جگر تھیں مگر اب فرخندہ کو ان سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ بلکہ چاہتی تھی کہ وہ نہ آیا کریں اس لیے کہ ان میں کوئی جان نہیں تھی۔ نسیمہ کے مقابلے میں وہ ننھی ننھی چوہیاں تھیں جو کُترنا بھی نہیں جانتیں۔ ایک بار اُسے مجبوراً اپنی ماں کے ساتھ کراچی جانا پڑا وہ بھی فوری طور پر نسیمہ گھر میں موجود نہیں تھی اُس کا فرخندہ کو بہت افسوس ہوا۔ چنانچہ کراچی پہنچتے ہی اس نے اُس کو ایک طویل معذرت نامہ لکھا۔ اُس سے پہلے وہ تار بھیج چکی تھی۔ اس نے خط میں سارے حالات درج کر دیئے اور لکھا کہ تمہارے بغیر میری زندگی یہاں بے کیف ہے۔ کاش تم بھی میرے ساتھ آتیں۔ اس کی والدہ کو کراچی میں بہت کام تھے۔ مگر اُس نے اُسے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔ دن میں کم از کم سو مرتبہ کہتی

”میں اُداس ہو گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی شہروں میں شہر ہے۔ یہاں کا پانی پی کر میرا ہاضمہ خراب ہو گیا ہے۔ اپنا کام جلدی ختم کیجیے اور چلیے لاہور“

نواب نوازش علی کی بیگم نے سارے کام ادھورے چھوڑے اور واپس چلنے پر رضامند ہو گئی۔ مگر اب فرخندہ نے کہا

”جانا ہے تو ذرا شاپنگ کر لیں۔ یہاں کپڑا اور دوسری چیزیں سستی اور اچھی ملتی ہیں“

شاپنگ ہوئی۔ فرخندہ نے اپنی سہیلی نسیمہ کے دس سلیکس کے لیے بہترین ڈیزائن کا کپڑا خریدا۔ واکنگ شُو لیے۔ ایک گھڑی خریدی جو نسیمہ کی چوڑی کلائی کے لیے مناسب و موزوں تھی۔ ماں خاموش رہی کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ کراچی سے لاہور پہنچی تو سفر کی تھکان کے باوجود فوراً نسیمہ سے ملی مگر اُس کا منہ سوجھا ہوا تھا۔ سخت ناراض تھی کہ وہ اس سے ملے بغیر چلی گئی۔ فرخندہ نے بڑی معافیاں مانگیں۔ ہر سطح سے اُس کی دلجوئی کی مگر وہ راضی نہ ہوئی اس پر فرخندہ نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور نسیمہ سے کہا کہ اگر وہ اسی طرح ناراض رہی تو وہ کچھ کھا کر مر جائے گی۔ اس کا فوری اثر ہوا اور نسیمہ نے اس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اُس کو چومنے پچکارنے لگی۔ دیر تک دونوں سہیلیاں کمرہ بند کر کے بیٹھی پیار محبت کی باتیں کرتی رہیں۔ اس دن کے بعد ان کی دوستی اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ مگر فرخندہ کی ماں نے محسوس کیا کہ اس کی اکلوتی بیٹی کی صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ چنانچہ اُس نے اُس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرخندہ پر ہسٹیریا ایسے دورے پڑنے لگے۔ بیگم صاحبہ نے اپنی جان پہچان والی عورتوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ لڑکی کو آسیب ہو گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی جن اس پر عاشق ہے جو اُس کو نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ فوراً ٹونے ٹوٹکے کیے گئے۔ جھاڑ پھونک کرنے والے بُلائے گئے۔ تعویز گنڈے ہوئے مگر بے سود۔ فرخندہ کی حالت دن بدن غیر ہوتی گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عارضہ کیا ہے۔ دن بدن دبلی ہو رہی تھی۔ کبھی گھنٹوں خاموش رہتی۔ کبھی زور زور سے چلانا شروع کر دیتی اور اپنی سہیلی نسیمہ کو یاد کر کے پہروں آنسو بہاتی۔ اس کی ماں جو زیادہ ضعیف الاعتقاد نہیں تھی۔ اپنی جان پہچان کی عورتوں کی اس بات پر یقین ہوا کہ لڑکی پر کوئی جن عاشق ہے۔ اس لیے کہ فرخندہ عشق و محبت کی بہت زیادہ باتیں کرتی تھی اور بڑے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرتی تھی۔ ایک مرتبہ پھر کوشش کی گئی۔ بڑی دُور دُور سے جھاڑنے والے بُلائے گئے دوا دارو بھی کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ فرخندہ بار بار التجا کرتی کہ اُس کی سہیلی نسیمہ کو بُلایا جائے مگر اس کی ماں ٹالتی رہی۔ آخر ایک روز فرخندہ کی حالت بہت بگڑ گئی۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی والدہ جو کبھی باہر نہیں نکلی تھی برقعہ اوڑھ کر ایک ہمسائی کے ہاں گئی اور اس سے کہا کہ کچھ کرے۔ دونوں بھاگم بھاگ فرخندہ کے کمرے میں پہنچیں مگر وہ موجود نہیں تھی۔

نواب نوازش علی مرحوم کی بیگم نے چیخنا چلانا اور دیوانہ وار

”فرخندہ بیٹی، فرخندہ بیٹی“

کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ سارا گھر چھان مارا مگر وہ نہ ملی اس پر وہ اپنے بال نوچنے لگی۔ ہمسائی نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے مگر وہ برابر واویلا کرتی رہی۔ فرخندہ نیم دیوانگی کے عالم میں اوپر کوٹھے پر کھڑی تھی۔ اس نے منڈیر کی اکھڑی ہوئی اینٹ اُٹھائی اور زور زور سے اُسے دوسری اینٹ کے ساتھ بجایا۔ کوئی نہ آیا۔ اُس نے پھر اینٹ کو دوسری اینٹ کے ساتھ ٹکرایا۔ چند لمحات کے بعد ایک خوبصورت نوجوان جو نسیمہ کے چھ کنوارے بھائیوں میں سے سب سے بڑا تھا اور برساتی میں بیٹھا بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا باہر نکلا اس نے دیکھا منڈیر کے اس طرف ایک دبلی پتی نازک اندام لڑکی کھڑی ہے۔ بڑی پریشان حال بال کھلے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ آنکھوں میں سینکڑوں زخمی اُمنگیں سمٹی ہیں۔ قریب آ کر اس نے فرخندہ سے پوچھا

”کسے بُلا رہی ہیں آپ“

فرخندہ نے اُس نوجوان کو بڑے گہرے اور دلچسپ غور سے دیکھا

”میں نسیمہ کو بلا رہی تھی“

نوجوان نے صرف اتنا کہا

”اوہ چلو آؤ“!

اور یہ کہہ کر منڈیر کے اُس طرف سے ہلکی پھلکی فرخندہ کو اُٹھایا اور برساتی میں لے گیا جہاں وہ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ دُوسرے دن جن غائب ہو گیا۔ فرخندہ بالکل ٹھیک تھی۔ اگلے مہینے اُس کی شادی نسیمہ کے اُس بھائی سے ہو گئی جس میں نسیمہ شریک نہ ہوئی۔ سعادت حسن منٹو ۲۶ مئی ۱۹۵۴ء

سعادت حسن منٹو

افشائے راز

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوافشائے راز

”میری لگدی کسے نہ ویکھی‘ تے ٹٹدی نوں جگ جاندا“

”یہ آپ نے گانا کیوں شروع کر دیا ہے“

”ہر آدمی گاتا اور روتا ہے۔ کونسا گناہ کیا ہے؟“

”کل آپ غسل خانے میں بھی یہی گیت گا رہے تھے“

”غسل خانے میں تو ہر شریف آدمی اپنی استطاعت کے مطابق گاتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں کوئی سننے والا نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے‘ تمھیں میری آواز پسند نہیں آتی“

”آپ کی آواز تو ماشاء اللہ بڑی اچھی ہے“

”مجھے بنا رہی ہو۔ مجھے اس کا علم ہے کہ میں کُن سرا ہوں‘ میری آواز میں کوئی کشش نہیں۔ کوئی بھی اسے پھٹے بانس کی آواز کہہ سکتا ہے“

”مجھے تو آپ کی آواز بڑی سریلی معلوم ہوتی ہے‘ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن میں پوچھتی ہوں‘ ہر وقت یہ پنجابی بولی وردِ زبان کیوں رہتی ہے“

”مجھے اچھی لگتی ہے۔ بیگم تم کو اگر ادب اور شعر سے ذرا سا بھی شغف ہو۔“

”یہ شغف کیا بلا ہے۔ آپ ہمیشہ ایسے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔“

”شغف کا مطلب۔ بس تم یہ سمجھ لو۔ کہ اس کا مطلب لگاؤ ہے“

”مجھے شاعری سے لگاؤ کیوں ہو۔ ایسی واہیات چیز ہے“

”یعنی شاعری بھی اک چیز ہو گئی۔ یہ تمہاری بڑی زیادتی ہے۔ فرصت کے لمحات میں اپنے اندر ذوق پیدا کیا کرو“

”چھ بچے پیدا کر چکی ہوں۔ اب میں اور کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی“

”میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا کہ معاملہ ختم ہونا چاہیے‘ پر تم ہی نہیں مانیں۔ چھ بچے پیدا کر کے تم تھک گئی ہو‘ تمہارے پڑوس میں مسز قیوم رہتی ہیں

”اس کے گیارہ بچے ہیں“

”اس کا مطلب ہے کہ میں بھی گیارہ ہی پیدا کروں“

”میں نے یہ کب کہا ہے۔ میں تو ایک کا بھی قائل نہیں تھا۔“

”میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ جب میرے بچہ نہ ہوتا تو آپ اسی بہانے سے دوسری شادی کر لیتے“

”میں تو ایک ہی شادی سے بھر پایا ہوں۔ تم ساری زندگی کے لیے کافی ہو۔ میں دوسری شادی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا“

”اور یہ پنجابی بولی کس لیے گائی جا رہی تھی“

”بھئی‘ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے یہ پسند ہے۔ تمھیں ناپسند ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری لگدی کسے نہ ویکھی۔ تے ٹٹدی نوں جگ جاندا“

”اس بولی میں آپ کو کیا لذت محسوس ہوتی ہے“

”میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا“

”آپ نے اب تک کوئی بات وقوث سے نہیں کہی“

”وقوث نہیں۔ وثوق۔ یعنی یقین کے ساتھ“

”آپ نے ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں کی جس میں یقین پایا جاتا ہو“

”لو‘ آج یہ نئی بات سُنی۔ میری باتوں پر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔

”مردوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا ہے؟“

”عورتوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ آپ ہی پھاڑتی ہیں‘ آپ ہی رفو کرتی ہیں‘ سمجھ میں نہیں آتا یہ آج کی برہمی کس بات پر ہے۔“

”آپ ایسے واہیات گیت گاتے رہیں اور میں چپ رہوں۔ اب سے دُور قرآن درمیان‘ آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے اعتنائی کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو غزلوں اور گیتوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ ابھی پچھلے دنوں آپ مسلسل یہ شعر گنگناتے رہے: سُنا ہے مہ جبینوں کو بھی کچھ کچھ مروّت کے قرینے آرہے ہیں مجھے اس پر سخت اعتراض ہے۔ کوئی شریف آدمی ایسے شعر نہیں گاتا۔ آپ: تیری ذات ہے اکبری سروری میری بار کیوں دیر اتنی کری نہیں گاتے“

”لاحول ولا۔ تم بھی کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہو“

”یہ باتیں گویا آپ کے نزدیک اوٹ پٹانگ ہیں؟۔ اس لیے کہ پاکیزہ ہیں؟“

”دنیا میں ہر چیز پاکیزہ ہے“

”آپ بھی؟“

”میں تو ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ہوں‘ تم نے کئی مرتبہ اس کی تعریف کی ہے‘ دن میں دو مرتبہ کپڑے بدلتا ہوں‘ سخت سردی بھی ہو غسل کرتا ہوں‘ تم تو تین چار دن چھوڑ کے نہاتی ہو‘ تمھیں پانی سے نفرت ہے“

”اجی واہ۔ میں تو ہر ہفتے باقاعدہ نہاتی ہوں“

ہر ہفتے کا نہانا تو سفید جھوٹ ہے۔ قرآن کی قسم کھا کے بتاؤ‘ تمھیں نہائے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں“

”میں قرآن کی قسم کھانے کے لیے تیار نہیں۔ آپ بتائیے کب غسل کیا تھا“

”آج صبح“

”جھوٹ۔ آپ کا اول جھوٹ‘ آخر جھوٹ۔ آج صبح تو نل میں پانی ہی نہیں تھا۔ میں نے ساڑھے نو بجے کے قریب دو مشکیں منگوائی تھیں“

”میں بھول گیا۔ واقعی آج میں نے غسل نہیں کیا“

”آپ کو بھول جانے کا مرض ہے“

”بھولنا انسان کی فطرت ہے۔ اس پر تمھیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ چند روز ہوئے تم دس کا نوٹ کہیں رکھ کے بھول گئی تھیں اور مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے چوری کر لیا ہے۔ یہ کتنی بڑی زیادتی تھی“

”جیسے آپ نے میرے روپے کبھی نہیں چُرائے۔ پچھلے مہینے میری الماری سے آپ نے سو روپے نکالے اور غائب کر گئے“

”ہو سکتا ہے وہ کسی اور نے چُرائے ہوں۔ اگر تمہیں مجھ پر شک تھا تو بتا دیا ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تُم نے وہ سو روپے کا نوٹ کسی محفوظ جگہ رکھا ہو اور بعد میں بُھول گئی ہو۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔“

”کب؟“

”پچھلے سال اسی مہینے تُم نے پانچ سو روپے کے نوٹ اپنے پلنگ کے بستر کے نیچے چھپا رکھے تھے اور تم اُن کے متعلق بالکل بُھول گئی تھیں۔ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ میں نے چرائے ہیں۔ آخر میں نے ہی تلاش کر کے نکالے اور تمھارے حوالے کر دیے“

”کیا پتا ہے کہ آپ نے چرائے ہوں اور بعد میں میرے شور مچانے پر اپنی جیب سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ دیے ہوں۔“

”میری سمجھ میں تمہاری یہ منطق نہیں آتی“

”آپ کی سمجھ میں تو کوئی چیز بھی نہیں آتی۔ کل میں نے آپ سے کہا تھا کہ دہی کھانا آپ کے لیے مفید ہے، لیکن آپ نے مجھے ایک لکچر پلا دیا کہ دہی فضول چیز ہے“

”دہی تو میں ہر روز کھاتا ہوں“

”کتنا کھاتے ہیں“

”یہی، کوئی آدھ سیر“

”میں ہر روز سیر منگواتی ہوں۔ باقی پڑا جھک مارتا رہتا ہے“

”دہی کو جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو بچ جاتا ہے اُس کی تم کڑھی بنا لیتی ہو“

”میں دہی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ کڑھی بناتی ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں سلیقہ شعار عورت ہوں۔ میں نے آپ سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ آپ آج کل ایک خاص پنجابی بولی کیوں ہر وقت گاتے رہتے ہیں۔“

”اس لیے کہ مجھے پسند ہے“

”کیوں پسند ہے؟۔ اس کی وجہ بھی تو ہونی چاہیے“

”تمہیں کالا رنگ کیوں پسند ہے۔ اس کی وجہ بتاؤ۔ تمھیں بھنڈیاں مرغوب ہیں۔ کیوں؟ تمھیں سینما دیکھنے کا شوق ہے۔ اس کا جواز پیش کرو۔ تم لٹھے کی بجائے ریشم کی شلواریں پہنتی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

”آپ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ مجھ سے اس قسم کے سوال کریں۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔“

”اپنی مرضی کا مالک میں بھی ہوں۔ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ جو شعر بھی مجھے پسند ہو، اپنی بھونڈی آواز میں دن رات گاتا رہوں۔“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں۔“

”رُک کیوں گئیں۔“

”دیکھیے۔ آپ میری زبان نہ کھلوائیے۔ میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں کہا‘ حالانکہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔“

”تم میرے متعلق کیا جانتی ہو“

”سب کچھ“

”کچھ مجھے بھی بتا دو، تاکہ میں اپنے متعلق کچھ جان سکوں۔ میں تو سالہا سال کے غور و فکر کے بعد بھی اپنے متعلق کچھ جان نہ سکا“

”آپ کو اُس پنجابی بولی میں جو آپ مسلسل گنگناتے رہتے ہیں۔ سب کچھ جان سکتے ہیں۔“

”تم اس قدر شاکی کیوں ہو“

”ہر مرد بے وفا ہوتا ہے“

میں نے تم سے کیا بیوفائی کی ہے۔ اصل میں عورتیں جا و بے جا اپنے شوہروں پر شک کرتی رہتی ہیں۔“

ٹھہریے۔ دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے ‘ڈاکیا ہے“

”یہ خط میرا ہے۔ لاؤ ادھر“

”میں کھولتی ہوں۔ پڑھ کے آپ کے حوالے کر دُوں گی“

”تمھیں میرے خط پڑھنے کا کوئی حق حاصل نہیں“

”میں ہمیشہ آپ کے خط پڑھتی رہی ہوں۔ یہ حق آپ نے کب سے چھین لیا؟“

”اچھا یہ بتا دو کہ خط کس کا ہے“

”آپ ہی کا ہے؟“

”کس نے لکھا ہے؟“

”آپ کی ایک سہیلی ہے۔ جس کا نام عذرا ہے۔ وہ پنجابی بولی جو آپ گاتے پھرتے ہیں اس کاغذ کی پیشانی پر لکھی ہے میری لگدی کسے نہ دیکھی وے۔ تے ٹُٹدی نوں جگ جاندا ایہ ٹوٹ ہی جائے تو بہتر ہے۔ ۱۵ مئی ۵۴ء

اللہ دِتّا

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو اللہ دِتّا

دو بھائی تھے۔ اللہ رکھا اور اللہ دتا۔ دوست ریاست پٹیالہ کے باشندے تھے۔ ان کے آباؤ اجاد البتہ لاہور کے تھے مگر جب ان دو بھائیوں کا دادا ملازمت کی تلاش میں پٹیالہ آیا تو وہیں کا ہو رہا۔ اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں سرکاری ملازم تھے۔ ایک چیف سیکرٹری صاحب بہادر کا اردلی تھا، دوسرا کنٹرولر آف اسٹورز کے دفتر کا چپڑاسی۔ دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تاکہ خرچ کم ہو۔ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ ایک صرف اللہ رکھا کو جو بڑا تھا، اپنے چھوٹے بھائی کے چال چلن کے متعلق شکایت تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ رشوت لیتا تھا اور کبھی کبھی کسی غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اللہ رکھا نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن و سکون درہم برہم نہ ہو۔ دونوں شادی شدہ تھے۔ اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک بیاہی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔ دوسری جس کا نام صغریٰ تھا، تیرہ برس کی تھی اور پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔ اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی۔ زینب۔ اس کی شادی ہو چکی تھی مگر اپنے گھر میں اتنی خوش نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس کا خاوند اوباش تھا۔ پھر بھی وہ جوں توں نبھائے جا رہی تھی۔ زینت اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی۔ اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی۔ وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام سیکھ رہا تھا۔ لڑکا ذہین تھا، چنانچہ کام سیکھنے کے دوران میں بھی پندرہ روپے ماہوار اسے مل جاتے تھے۔ دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، محنتی اور عبادت گزار عورتیں تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ ایکا ایکی ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ دونوں بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مال و جان اور عزت و آبرو پر حملہ ہو گا اور انھیں افراتفری اور کسمپرسی کے عالم میں ریاست پٹیالہ چھوڑنا پڑے گی۔ مگر ایسا ہوا۔ دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونیں طوفان میں کون سا درخت گرا، کون سے درخت سے کون سی ٹہنی ٹوٹی۔ جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو چند حقیقتیں سامنے آئیں اور وہ لرز گئے۔ اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کر دیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ اللہ دتا کی بیوی کو بھی سکھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا۔ اسکی لڑکی زینب۔ کا بدچلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ رونا دھونا بیکار تھا۔ صبر شکر کے بیٹھ رہے۔ پہلے تو کیمپوں میں گلتے سڑتے رہے۔ پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کیے۔ آخر خدا نے سنی۔ اللہ دتا کو گوجرانوالہ میں ایک چھوٹا سا شکستہ مکان سر چھپانے کو مل گیا۔ طفیل نے دوڑ دھوپ کی تو اسے کام مل گیا۔ اللہ رکھا لاہور ہی میں دیر تک دربدر پھرتا رہا۔ جوان لڑکی ساتھ تھی۔ گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر تھا۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزارا۔ بیوی اور بڑی لڑکی کا غم وہ بالکل بھول چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائے کہ اسے ریاست پٹیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے۔ اس نے ان کو اپنی حالت زار الف سے لے کر یے تک کہہ سنائی۔ آدمی رحم دل تھا۔ اس کو بڑی دقتوں کے بعد لاہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی، چنانچہ انھوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لیے دلوا دیا۔ اللہ رکھا نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں۔ اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا۔ صغریٰ بڑے سلیقے والی سگھڑ لڑکی تھی، سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ ادھر ادھر سے لکڑیاں چن کے لاتی۔ چولہا سلگاتی اور مٹی کی ہنڈیا میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو دو وقت کے لیے پورا ہو جائے۔ آٹا گوندھتی۔ پاس ہی تنور تھا، وہاں جا کر روٹیاں لگوا لیتی۔ تنہائی میں آدمی کیا کچھ نہیں سوچتا۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ صغریٰ عام طور پر دن میں تنہا ہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ اپنی آنکھوں میں سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تاکہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں۔ لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے۔ اس کا دل ہر وقت روتا رہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں۔ صغریٰ سے بھی اس نے کبھی اس کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔ زندگی افتاں و خیزاں گزر رہی تھی۔ ادھر گوجرانوالہ میں اللہ دتا اپنے بھائی کے مقابلے میں کسی قدر خوش حال تھا، کیوں کہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی تھی۔ مل ملا کے کوئی ایک سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لیے بہت کافی تھے۔ مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا۔ اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا، نچلی منزل میں زینب اور اس کا باپ۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دتا اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ چنانچہ منہ اندھیرے اٹھ کر وہ صحن میں جھاڑو دے کر چولہا سلگا دیتا تھا کہ زینت کا کام کچھ ہلکا ہو جائے۔ وقت ملتا تو دو تین گھڑے بھر کر گھڑونچی پر رکھ دیتا تھا۔ زینت نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ خوش تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بعض اوقات وہ اس سے لپٹ جاتی تھی۔ طفیل کے سامنے بھی۔ اور اس کو خوب چومتی تھی۔ صغریٰ اپنے باپ سے ایسے چہل نہیں کرتی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اس سے پردہ کرتی۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا۔ نہیں۔ صرف احترام کے لیے۔ اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا اٹھتی تھی۔

”یا پروردگار۔ میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے۔“

بعض اوقات کئی دعائیں الٹی ثابت ہوتی ہیں۔ جو خدا کو منظور تھا، وہی ہونا تھا۔ غریب صغریٰ کے سر پر غم واندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹنا تھا۔ جون کے مہینے دوپہر کو دفتر کے کسی کام پر جاتے ہوئے تپتی ہوئی سڑک پر اللہ رکھا کو ایسی لُو لگی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اٹھایا۔ ہسپتال پہنچایا مگر دوا دارو نے کوئی کام نہ کیا۔ صغریٰ باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہو گئی۔ اس نے قریب قریب آدھے بال نوچ ڈالے۔ ہمسایوں نے بہت دم دلاسا دیا مگر یہ کارگر کیسے ہوتا۔ وہ تو ایسی کشتی کے مانند تھی جو اس کا بادبان ہو نہ کوئی پتوار اور بیچ منجدھار کے آن پھنسی ہوئی۔ پٹیالہ کے وہ افسر جنہوں نے مرحوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی تھی، فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ ان کو جب اطلاع ملی تو دوڑے آئے۔ سب سے پہلے انھوں نے یہ کام کیا کہ صغریٰ کو موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے اور بیوی سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال میں جا کر انھوں نے اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کا وہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اس کو دفنا آئیں۔ اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی۔ بہر، وہ لاہور آیا اور پوچھتا پاچھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغریٰ تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی کو بہت دم دلاسا دیا، بہلایا۔ سینے کے ساتھ لگایا، پیار کیا۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا۔ بہادر بننے کو کہا، مگر صغریٰ کے پھٹے ہوئے دل پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ غریب خاموش اپنے آنسو دوپٹے میں خشک کرتی رہی۔ اللہ دتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا۔

”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ میری گردن آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ دبی رہے گی۔ مرحوم کی تجہیز و تکفین کا آپ نے بندوبست کیا۔ پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرا رہ گئی تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔ اب میں اسے اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔ میرے بھائی کی بڑی قیمتی نشانی ہے۔“

افسر صاحب نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن تم ابھی اسے کچھ دیر اور یہاں رہنے دو۔ طبیعت سنبھل جائے تو لے جانا۔“

اللہ دتا نے کہا۔

”حضور! میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلد“!

افسر صاحب بہت خوش ہوئے۔

”بڑا نیک ارادہ ہے۔ لیکن اس صورت میں جب کہ تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو، اس کا اس گھر میں رہنا مناسب نہیں۔ تم شادی کا بندوبست کرو۔ مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

بات درست تھی۔ اللہ دتا واپس گوجرانوالہ چلا گیا۔ زینب اس کی غیر موجودگی میں بڑی اداس ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو وہ اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی؟ اللہ دتا نے پیار سے اسے ایک طرف ہٹایا۔

”ارے بابا، آنا جانا کیا ہے۔ قبر پر فاتحہ پڑھنی تھی۔ صغریٰ سے ملنا تھا، اسے یہاں لانا تھا۔“

زینب نہ معلوم کیا سوچنے لگی۔

”صغریٰ کو یہاں لانا تھا۔“

ایک دم چونک کر۔

”ہاں۔ صغریٰ کو یہاں لانا تھا۔ پر وہ کہاں ہے؟“

”وہیں ہے۔ پٹیالے کے ایک بڑے نیک دل افسر ہیں، ان کے پاس ہے۔ انھوں نے کہا جب تم اس کی شادی کا بندوبست کر لو گے تو لے جانا“

یہ کہتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔ زینب نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی شادی کا بندوبست کر رہے ہو۔ کوئی لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟“

اللہ دتہ نے زور کا کش لگایا۔

”ارے بھئی، اپنا طفیل۔ میرے بڑے بھائی کی صرف ایک ہی نشانی تو ہے۔ میں اسے کیا غیروں کے حوالے کر دوں گا؟“

زینب نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”تو صغریٰ کی شادی تم طفیل سے کرو گے؟“

اللہ دتا نے جواب دیا۔

”ہاں۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

زینب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ اور تم جانتے ہو، کیوں ہے۔ یہ شادی ہرگز نہیں ہو گی“!

اللہ دتا مسکرایا۔ زینب کی ٹھوڑی پکڑ کر اس نے اس کا منہ چوما۔

”پگلی۔ ہر بات پر شک کرتی ہے۔ اور باتوں کو چھوڑ، آخر میں تمہارا باپ ہوں۔“

زینب نے بڑے زور سے ہونہہ کی۔

”باپ“!

اور اندر کمرے میں جا کر رونے لگی۔ اللہ دتا اس کے پیچھے گیا اور اس کو پچکارنے لگا۔ دن گزرتے گئے۔ طفیل فرمانبردار لڑکا تھا۔ جب اس کے باپ نے صغریٰ کی بات تو وہ فوراً مان گیا۔ آخر تین چار مہینے کے بعد تاریخ مقرر ہو گئی۔ افسر صاحب نے فوراً صغریٰ کے لیے ایک بہت اچھا جوڑا سلوایا جو اسے شادی کے دن پہننا تھا۔ ایک انگوٹھی بھی لے دی۔ پھر اس نے محلے والوں سے اپیل کی کہ وہ ایک یتیم لڑکی کی شادی کے لیے جو بالکل بے سہارا ہے، حسب توفیق کچھ دیں۔ صغریٰ کو قریب قریب سبھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انھوں نے مل ملا کر اس کے لیے بڑا اچھا جہیز تیار کر دیا۔ صغریٰ دلہن بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام دکھ جمع ہو گئے ہیں اور اس کو پیس رہے ہیں۔ بہر حال، وہ اپنے سسرال پہنچی جہاں اس کا استقبال زینب نے کیا، کچھ اس طرح کہ صغریٰ کو اسی وقت معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک نہیں کرے گی بلکہ ساس کی طرح پیش آئے گی۔ صغریٰ کا اندیشہ درست تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اترنے بھی نہ پائی تھی کہ زینب نے اس سے نوکروں کے کام لینے شروع کر دیے۔ جھاڑو وہ دیتی۔ برتن وہ مانجھتی۔ چولہا وہ جھونکتی۔ پانی وہ بھرتی۔ یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی، لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی۔ بات بات پر اس کو ڈانٹتی ڈپٹتی، جھڑکتی رہی۔ صغریٰ نے دل میں تہیہ کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے گی، کیوں کہ اگر اسے یہاں سے دھکّا مل گیا تو اس کے لیے اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اللہ دتا کا سلوک البتہ اس سے برا نہیں تھا۔ زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھار وہ اس کو پیار کر لیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ صغریٰ کو اس سے بہت ڈھارس ہوتی۔ زینب جب کبھی اپنی کسی سہیلی کے ہاں جاتی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو وہ اس سے دل کھول کر پیار کرتا۔ اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے کے ساتھ لگا کر اس سے کہا۔

”صغریٰ، تم بڑی پیاری ہو“!

صغریٰ جھینپ جاتی۔ دراصل وہ اتنے پُرجوش پیار کی عادی نہیں تھی۔ اس کا مرحوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرنا چاہتا تھا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا۔

”خدا میری بٹی کے نصیب اچھے کرے۔“

صغریٰ طفیل سے بہت خوش تھی۔ وہ بڑا اچھا خاوند تھا۔ جو کماتا تھا، اس کے حوالے کر دیتا تھا، مگر صغریٰ زینب کو دے دیتی تھی، اس لیے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔ طفیل سے صغریٰ نے زینت کی بدسلوکی اور اس کے ساس ایسے برتاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ صلح کل تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باعث گھر میں کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو جائے گا۔ اور تو اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنس جائے گی، اور اس کی تاب نہ لا سکے گی۔ یہ خاص باتیں اسے چند روز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرنا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی، یا دوڑ کر اوپر چلی جاتی، جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔ طفیل کو جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی۔ اللہ دتا کو اتوار کی۔ اگر زینب گھر پر ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کاج ختم کر کے اوپر چلی جاتی۔ اگر اتفاق سے اتوار کو زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بنی رہتی۔ ڈر کے مارے اس سے کام نہ ہوتا، لیکن زینب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کانپتے ہاتھوں سے دھڑکتے دل سے طوعاً و کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔ اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکا رہے کیوں کہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگرد روٹی کے بھیج دیتا تھا۔ ایک دن اتوار کو جب کہ زینب گھر پر نہیں تھی، اور وہ آٹا گوندھ رہی تھی، اللہ دتا پیچھے سے دبے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ تڑپ کر اٹھی، مگر اللہ دتا نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ صغریٰ نے چیخنا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ اللہ دتا نے کہا۔

”شور مت مچاؤ۔ یہ سب بے فائدہ ہے۔ چلو آؤ“!

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے۔ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ اللہ دتا کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کانپتی اوپر پہنچ گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد زینب آ گئی۔ اللہ دتا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اندر کمرے میں لیٹ کر اس نے زینب کو پکارا۔ وہ آئی تو اس سے کہا۔

”ادھر آؤ، میری ٹانگیں دباؤ۔ زینب اچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی ٹانگیں دبانے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔ زینب نے اللہ دتا سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ آج تم اپنے آپ میں نہیں ہو؟“

اللہ دتا نے سوچا کہ زینب سے چھپانا فضول ہے، چنانچہ اس نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ زینب آگ بگولا ہو گئی۔

”کیا ایک کافی نہیں تھی۔ تمہیں تو شرم نہ آئی، پر اب تو آنی چاہیے تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہو گا، اسی لیے میں شادی کے خلاف تھی۔ اب سن لو کہ صغریٰ اس گھر میں نہیں رہے گی“!

اللہ دتا نے بڑے مسکین لہجے میں پوچھا۔

”کیوں؟“

زینب نے کھلے طور پر کہا۔

”میں اس گھر میں اپنی سوتن دیکھتا نہیں چاہتی“!

اللہ دتا کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ زینب باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ صغریٰ صحن میں جھاڑو دے رہی ہے۔ چاہتی تھی کہ اس سے کچھ کہے مگر خاموش رہی۔ اس واقعے کو دو مہینے گزر گئے۔ صغریٰ نے محسوس کیا کہ طفیل اس سے کھچا کھچا رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ آخر ایک دن آیا کہ اس نے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دیا اور گھر سے باہر نکال دیا۔

سعادت حسن منٹو

اُلو کا پٹھا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹواُلو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرح چلا۔ راستے میں، یہ اسکو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو اُلو کا پٹھا کہے۔ بس صرف ایک بار غصے میں یا طنزیہ انداز میں کسی کو اُلو کا پٹھا کہہ دے۔ قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی بڑی انوکھی خواہشیں پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ رات اسکو بڑی پیاری نیند آئی تھی۔ وہ خود کو بہت ترو تازہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن پھر یہ خواہش کیسے اس کے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑے چھل گئے۔ دراصل وہ سوچتا رہا کہ یہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہُوئی۔ مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ بیوی سے وہ بہت خوش تھا۔ ان میں کبھی لڑائی نہ ہوئی تھی، نوکروں پر بھی وہ ناراض نہیں تھا۔ اس لیے کہ غلام محمد اور نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار تھا۔ فروری کے سُہانے دن تھے جن میں کنوارپنے کی تازگی تھی۔ ہوا خُنک اور ہلکی۔ دن چھوٹے نہ راتیں لمبی۔ نیچر کا توازن بالکل ٹھیک تھا اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے الو کا پٹھا کہنے کی خواہش اسکے دل میں کیونکر پیدا ہو گئی۔ قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو اُلو کا پٹھا کہا ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اس نے بعض موقعوں پر استعمال کیے ہوں اور گندی گالیاں بھی دی ہوں مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اب اچانک طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو اُلو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اس نے اگر کسی کو الو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا ہرج ہو جائے گا۔ دانت صاف کرنے کے بعد اس نے چھلے ہوئے مسوڑوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا۔ مگر دیر تک اُن کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی جو ایکا ایکی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا۔ وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا۔ آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔

”مان لیا کہ میرا کسی کو الو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر یہ کوئی بات تو نہ ہُوئی۔ میں کسی کو اُلو کا پٹھا کیوں کہوں؟۔ میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہُوں۔“

یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقے پر پڑی۔ ایک دم اس کے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں، عجیب واہیات نوکر ہے۔ دروازے کے عین بیچ میں یہ حقہ ٹِکا دیا ہے۔ میں ابھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں، اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو پا انداز جو کہ مونج کا بنا ہوا ہے جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی۔ اس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے۔ جب وہ بھاگا ہوا اس کے سامنے آ جائے تو وہ بھرے ہوئے حقّے کی طرف اشارہ کر کے اس سے صرف اتنا کہے

”تم نرے اُلو کے پٹھے ہو۔“

مگر اس نے تامل کیا اور سوچا یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر غلام محمد کو اب بلا کر اُلو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہو گی اور پھر۔ اور پھر اس بچارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے۔ میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقّہ پیتا ہُوں۔ چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحہ کے لیے قاسم کے دل میں پیدا ہُوئی تھی کہ اس نے اُلو کا پٹھا کہنے کے لیے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا، غائب ہو گئی۔ دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی۔ پورے دو گھنٹے پڑے تھے، دروازے کے پاس کرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقّہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کیے بغیر حقّے کا دُھواں پیتا رہا اور دھوئیں کے انتشار کو دیکھتا رہا۔ لیکن جونہی وہ حقّے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں گیا تو اس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔ قاسم گھبرا گیا۔ بھئی حد ہو گئی۔ اُلو کا پٹھا۔ میں کسی کو اُلو کا پٹھا کیوں کہوں اور بفرضِ محال میں نے کسی کو اُلو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہو گا۔ قاسم دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خواہش جو اس کے دل میں پیدا ہُوئی ہے بالکل بیہودہ اور بے سروپا ہے لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر وہ اور بھی زیادہ اُبھر آتی تھی۔ قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اُلو کا پٹھا نہ کہے گا۔ خواہ یہ خواہش صدیوں تک اس کے دل میں تلملاتی رہے، شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح اس کے روشن دل میں چلی آئی تھی۔ اس قدر تڑپ رہی تھی۔ پتلون کے بٹن بند کرتے وقت جب اس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلا اٹھا۔ بھئی ہو گا۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔ اُلو کا پٹھا کہو۔ اُلو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر سے بند کرنے پڑیں گے۔ لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا۔ اس کی بیوی نے چائے بنا کر پیالی اس کے سامنے رکھ دی اور توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا۔ روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی، توس اتنے اچھے سینکے ہُوئے تھے کہ بسکٹ کی طرح کِر کرے تھے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی۔ خمیر میں سے خوشبو آ رہی تھی۔ مکھن بھی صاف تھا، چائے کی کیتلی بے داغ تھی۔ اس کی ہتھی کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا۔ مگر آج وہ دھبہ بھی نہیں تھا۔ اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ اس کی طبیعت خوش ہو گئی۔ خالص دار جلنگ کی چائے تھی۔ جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی۔ دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔ قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا۔

”آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔“

بیوی تعریف سُن کر خوش ہُوئی۔ مگر اس نے منہ بنا کر ایک ادا سے کہا۔

”جی ہاں۔

بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھول کے پلائی جاتی ہے۔ مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے۔ سلیقے والیاں تو وہ موئی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں جن کے آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں۔“

یہ تقریر سن کر قاسم کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر اُلٹ دے اور وہ نیم جو اس نے اپنے بچے کی پھنسیاں دھونے کے لیے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے میں پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اس نے بُردباری سے کام لیا۔

”یہ عورت میری بیوی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بن کر ایسی بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں۔ اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سُنتی ہیں؟ بالکل ایسی ادنیٰ قسم کی باتیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں۔ میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہہ دیتی ہے، اس کی نیت نیک ہوتی ہے۔ بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں۔ یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں اس طاقچے پر سے ہٹالیں جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رخ بدل کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، آج نیم کے پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا۔ نیم زخموں کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ اور دیکھو، تم موسمبیوں کا رس ضرور پیا کرو۔ میں دفتر سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤں گا۔ یہ رس تمہاری صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔“

بیوی مسکرا دی۔

”آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے۔ اچھی بھلی تو ہُوں، کھاتی ہُوں، پیتی ہُوں، دوڑتی ہُوں، بھاگتی ہُوں۔ میں نے جو آپ کے لیے بادام منگوا کے رکھے ہیں۔ بھئی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے بغیر نہ رہوں گی۔ لیکن دفتر میں کہیں بانٹ نہ دیجیے گا۔“

قاسم خوش ہو گیا کہ چلو موسمبیوں کے رس اور باداموں نے اُسکی بیوی کے مصنوعی غصے کو دور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا۔ جو اس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے۔ اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق ان میں تھوڑا بہت ردّوبدل کر لیا تھا۔ چائے سے فارغ ہو کر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگایا اور اُٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خواہش نمودار ہو گئی۔ اس مرتبہ اس نے سوچا۔ اگر میں کسی کو اُلو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا ہرج ہے۔ زیرِلب بالکل ہولے سے کہہ دوں، اُلو۔ کا۔ پٹھا۔ تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی۔ یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے۔ کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں۔ دفتر میں۔ اس کو صحن میں بچے کا کموڈ نظر آیا۔ یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بدتمیزی تھی اور خصوصاً اس وقت جب کہ وہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار کُرکُرے توس اور تلے ہُوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اسکے منہ میں تھا۔ اس نے زور سے آواز دی

”غلام محمد۔“

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی۔

”غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے۔ کوئی کام تھا آپ کو اس سے؟“

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں کہہ دوں، یہ غلام محمد اُلو کا پٹھا ہے۔ اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں۔ نہیں۔ وہ خود تو موجود ہی نہیں، پھر۔ بالکل بیکار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بچارے غلام محمد ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے۔ اس کو تو میں ہر وقت اُلو کا پٹھا کہہ سکتا ہُوں۔ قاسم نے ادھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا۔

”کچھ نہیں میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے۔ تمہیں کھانا جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنا پڑتی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو فرش پر اس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی۔ قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔“

یہ سگریٹ اگر بُجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس کا بچہ رینگتا رینگتا آئے گا اور اسے اُٹھا کر منہ میں ڈال لے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ مچ جائے گی۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اُٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو اُلو کا پٹھا نہیں کہہ دیا۔ اس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی ابھی مجھ سے بھی تو ہُوئی تھی اور میں سمجھتا ہُوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی۔ قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور و فکر کرنے والا انسان ہے۔ مگر اس احساس نے اس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اسکی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ احساس برتری کو اپنے اندر دبا دیا کرتا تھا۔ موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اس نے بِلاضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ دراصل کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی ناشتہ کا آخری توس کھا چکی تھی۔ قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ۔“

قاسم چونک پڑا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟“

یہ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی اُلو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔ اس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور سنے گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو بیوی کا ساتھ دینا پڑے گا، چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں اُلو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ مگر اس نے غور کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بن جائے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کیا، ضرور ہو جائے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار ناخوشگواری پیدا ہو، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا اور ایک لمحہ تک اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا۔ بیوی نے بچے کا کموڈ اُٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا۔

”آج صبح آپ کے برخوردار نے وہ ستایا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اسے کموڈ پر بٹھایا۔ اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے۔ آخر لڑکا کس کا ہے؟“

۔ قاسم کو اس قسم کی چخ پسند تھی۔ ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاح کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اس نے بیوی سے کہا۔

”لڑکا میرا ہی ہے مگر۔ میں نے تو آج تک کبھی بستر خراب نہیں کیا۔ یہ عادت اس کی اپنی ہو گی۔“

بیوی نے اس کی بات کا مطلب نہ سمجھا۔ قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہُوا، اس لیے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ دُرست رکھنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئی۔

”اچھا، بھئی میں اب چلتا ہوں۔ خدا حافظ“!

یہ لفظ جو ہر روز اس کے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چل دیا۔ کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے ایک داڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کُھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اسکو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر اُلو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لو بھئی، یہ آدمی ہے جس کو اُلو کا پٹھا کہہ دینا چاہیے یعنی جو صحیح معنوں میں اُلو کا پٹھا ہے۔ ذرا انداز ملاحظہ ہو۔ کس انہماک سے ڈرائی کلین کیے جا رہا ہے۔ جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام پا رہا ہے۔ لعنت ہے۔ لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اس نے تعجیل سے کام نہ لیا اور تھوڑی دیر غور کیا۔ میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر، اگر میں نے بلند آواز میں بھی اس کو اُلو کا پٹھا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اس لیے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بُری طرح مصروف ہے۔ چاہیے تو یہ کہ اس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اٹھے تو اسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، قبلہ آپ اُلو کے پٹھے ہیں۔ لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو گا۔ چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی اثنا میں اس کے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہُوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اس پر سوار تھی۔ اس لیے کہ پیچھے بستہ بندھا تھا۔ آناً فاناً اس لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں میں پھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہُوئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔ قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا۔ اس لیے کہ اس نے حادثہ کے ردّعمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اس کا بورڈر

بہت بری طرح ان میں الجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پچھلا پہیہ ذرا اونچا اُٹھایا تاکہ اسے گھما کر ساڑی کو وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پہیہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں کی لپیٹ میں آئی کہ ادھر پیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی۔ قاسم بوکھلا گیا۔ اس کی اس بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا۔ زور سے اس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا۔ فری وہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑا رہ گیا اور ساڑھی باہر نکل آئی۔ لڑکی کا رنگ لال ہو گیا۔ قاسم کی طرف اس نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”اُلو کا پٹھا۔“

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا۔ اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا، نظروں سے غائب ہو گئی۔ قاسم کو لڑکی کی گالی سُن کر بہت دکھ ہُوا خاص کر اس لیے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ بہت صحیح الدماغ آدمی تھا۔ ٹھنڈے دل سے اس نے حادثہ پر غور کیا اور اس لڑکی کو معاف کر دیا۔ اس کو معاف ہی کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور ان عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہُوئی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس نے اپنی لمبی جُراب میں اُوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اڑس رکھے تھے؟

سعادت حسن منٹو

آم

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوآم

خزانے کے تمام کلرک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک بھی ہے۔ چنانچہ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ ہر مہینے پنشن کے کاغذ بھرنے اور روپیہ لینے کے لیے جب وہ خزانے میں آتا تو اس کا کام اسی وجہ سے جلد جلد کر دیا جاتا تھا۔ پچاس روپے اس کو اپنی تیس سالہ خدمات کے عوض ہر مہینے سرکار کی طرف سے ملتے تھے۔ ہر مہینے دس دس کے پانچ نوٹ وہ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑتا اور اپنے پرانے وضع کے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیتا۔ چشمے میں خزانچی کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا اور یہ کہہ کر

”اگر زندگی ہوئی تو اگلے مہینے پھر سلام کرنے کے لیے حاضر ہوں گا“

بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔ آٹھ برس سے اس کا یہی دستور تھا۔ خزانے کے قریب قریب ہر کلرک کو معلوم تھا کہ منشی کریم بخش جو مطالبات خفیفہ کی کچہری میں کبھی محافظ دفتر ہوا کرتا تھا بے حد وضعدار، شریف الطبع اور حلیم آدمی ہے۔ منشی کریم بخش واقعی ان صفات کا مالک تھا۔ کچہری میں اپنی طویل ملازمت کے دوران میں افسران بالا نے ہمیشہ اس کی تعریف کی ہے۔ بعض منصفوں کو تو منشی کریم بخش سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کے خلوص کا ہر شخص قائل تھا۔ اس وقت منشی کریم بخش کی عمر پینسٹھ سے کچھ اوپر تھی۔ بڑھاپے میں آدمی عموماً کم گو اور حلیم ہو جاتا ہے مگر وہ جوانی میں بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق اس عمر میں بھی ویسے کا ویسا ہی قائم تھا۔ خزانے کا بڑا افسر منشی کریم بخش کے ایک مربی اور مہربان جج کا لڑکا تھا۔ جج صاحب کی وفات پر اسے بہت صدمہ ہوا تھا اب وہ ہر مہینے ان کے لڑکے کو سلام کرنے کی غرض سے ضرور ملتا تھا۔ اس سے اُسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ منشی کریم بخش انھیں چھوٹے جج صاحب کہا کرتا تھا۔ پنشن کے پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہ برآمدہ طے کرتا اور چق لگے کمرے کے پاس جا کر اپنی آمد کی اطلاع کراتا۔ چھوٹے جج صاحب اس کو زیادہ دیر تک باہر کھڑا نہ رکھتے، فوراً اندر بلا لیتے اور سب کام چھوڑ کر اس سے باتیں شروع کر دیتے۔

”تشریف رکھیے منشی صاحب۔ فرمائیے مزاج کیسا ہے۔“

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ آپکی دعا سے بڑے مزے میں گزر رہی ہے، میرے لائق کوئی خدمت؟“

”آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے۔ خدمت گزاری تو بندے کا کام ہے۔“

”آپ کی بڑی نوازش ہے۔“

اس قسم کی رسمی گفتگو کے بعد منشی کریم جج صاحب کی مہربانیوں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ ان کے بلند کردار کی وضاحت بڑے فدویانہ انداز میں کرتا اور بار بار کہتا۔

”اللہ بخشے مرحوم فرشتہ خصلت انسان تھے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔“

منشی کریم بخش کے لہجے میں خوشامد وغیرہ کی ذرّہ بھر ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا۔ محسوس کر کے کہتا تھا۔ اس کے متعلق جج صاحب کے لڑکے کو جو اب خزانے کے بڑے افسر تھے اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتے تھے اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ہر مہینے دوسری باتوں کے علاوہ منشی کریم

بخش کے آم کے باغوں کا ذکر بھی آتا تھا۔ موسم آنے پر جج صاحب کے لڑکے کی کوٹھی پر آموں کا ایک ٹوکرا پہنچ جاتا تھا۔ منشی کریم بخش کو خوش کرنے کے لیے وہ ہر مہینے اس کو یاد دہانی کرا دیتے تھے۔

”منشی صاحب، دیکھیے اس موسم پر آموں کا ٹوکرا بھیجنا نہ بھول لیے گا۔ پچھلی بار آپ نے جو آم بھیجے تھے اس میں تو صرف دو میرے حصے میں آئے تھے۔“

کبھی یہ تین ہو جاتے تھے، کبھی چار اور کبھی صرف ایک ہی رہ جاتا تھا۔ منشی کریم بخش یہ سُن کر بہت خوش ہوتا تھا۔

”حضور ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ جونہی فصل تیار ہوئی میں فوراً ہی آپ کی خدمت میں ٹوکرا لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ دو کہیے دو حاضر کر دوں۔ یہ باغ کس کے ہیں۔ آپ ہی کے تو ہیں۔“

کبھی کبھی چھوٹے جج صاحب پوچھ لیا کرتے تھے۔

”منشی جی آپ کے باغ کہاں ہیں؟“

دنیا نگر میں حضور۔ زیادہ نہیں ہیں صرف دو ہیں۔ اس میں سے ایک تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو دے رکھا ہے جو ان دونوں کا انتظام وغیرہ کرتا ہے۔ مئی کی پنشن لینے کے لیے منشی کریم بخش جون کی دوسری تاریخ کو خزانے گیا دس دس کے پانچ نوٹ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر اس نے چھوٹے جج صاحب کے کمرہ کا رخ کیا۔ حسبِ معمول ان دونوں میں وہی رسمی باتیں ہُوئیں۔ آخر میں آموں کا ذکر بھی آیا۔ جس پر منشی کریم بخش نے کہا۔

”دنیا نگر سے چٹھی آئی ہے کہ ابھی آموں کے منہ پر چیپ نہیں آیا۔ جونہی چیپ آگیا اور فصل پک کر تیار ہو گئی میں فوراً پہلا ٹوکرا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ چھوٹے جج صاحب! اس دفعہ ایسے تحفہ آم ہوں گے کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ملائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہُوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ چھوٹے جج صاحب کے لیے ایک ٹوکرا خاص طور پر بھروا دیا جائے اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے تا کہ جلدی اور احتیاط سے پہنچے۔ دس پندرہ روز آپ کو اور انتظار کرنا پڑے گا۔“

چھوٹے جج صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ منشی کریم بخش نے اپنی چھتری اُٹھائی اور خوش خوش گھر واپس آگیا۔ گھر میں اس کی بیوی اور بڑی لڑکی تھی۔ بیاہ کے دوسرے سال جس کا خاوند مر گیا تھا۔ منشی کریم بخش کی اور کوئی اولاد نہیں تھی مگر اس مختصر سے کنبے کے باوجود پچاس روپوں میں اس کا گزر بہت ہی مشکل سے ہوتا تھا۔ اسی تنگی کے باعث اس کی بیوی کے تمام زیور ان آٹھ برسوں میں آہستہ آہستہ بِک گئے تھے۔ منشی کریم بخش فضول خرچ نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور وہ بڑے کفایت شعار تھے مگر اس کفایت شعاری کے باوصف تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی ان کے پاس نہ بچتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ منشی کریم بخش چند آدمیوں کی خدمت کرنے میں بے حد مسرت محسوس کرتا تھا ان چند خاص الخاص آدمیوں کی خدمت گزاری میں جن سے اسے دلی عقیدت تھی۔ ان خاص آدمیوں میں سے ایک تو جج صاحب کے لڑکے تھے۔ دوسرے ایک اور افسر تھے جو ریٹائر ہو کر اپنی زندگی کا بقایا حصہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں گزار رہے تھے۔ ان سے منشی کریم بخش کی ملاقات ہر روز صبح سویرے کمپنی باغ میں ہوتی تھی۔ باغ کی سیر کے دوران میں منشی کریم بخش ان سے ہر روز پچھلے دن کی خبریں سناتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ بیتے ہوئے دنوں کے تار چھیڑ دیتا تو ڈپٹی سپریٹنڈنٹ صاحب اپنی بہادری کے قصّے سنانا شروع کر دیتے تھے کہ کس طرح انھوں نے لائل پور کے جنگلی علاقے میں ایک خونخوار قاتل کو پستول، خنجر دکھائے بغیر گرفتار کیا اور کس طرح ان کے رعب سے ایک ڈاکو سارا مال چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کبھی کبھی منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا بھی ذکر آجاتا تھا۔ منشی صاحب کہیے۔ اب کی دفعہ فصل کیسی رہے گی۔

”پھر چلتے چلتے ڈپٹی سپریٹنڈنٹ صاحب یہ بھی کہتے۔ پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے بہت ہی اچھے تھے بے حد لذیذ تھے۔“

”انشاء اللہ خدا کے حکم سے اب کی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کروں گا۔ ایک ہی بوٹے کے ہوں گے۔ ویسے ہی لذیذ، بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہوں گے۔“

اس آدمی کو بھی منشی کریم بخش ہر سال موسم پر ایک ٹوکرا بھیجتا تھا۔ کوٹھی میں ٹوکرا نوکروں کے حوالے کر کے جب وہ ڈپٹی صاحب سے ملتا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو منشی کریم بخش نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتا

”ڈپٹی صاحب آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ اپنے باغ ہیں۔ اگر ایک ٹوکرا یہاں لے آیا تو کیا ہو گیا۔ بازار سے آپ ایک چھوڑ کئی ٹوکرے منگوا سکتے ہیں۔ یہ آم چونکہ اپنے باغ کے ہیں اور باغ میں صرف ایک بوٹا ہے جس کے سب دانے گھلاوٹ خوشبو اور مٹھاس میں ایک جیسے ہیں اس لیے یہ چند تحفے کے طور پر لے آیا۔“

آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے باہر نکلتا تو اس کے چہرے پر تمتماہٹ ہوتی تھی ایک عجیب قسم کی روحانی تسکین اسے محسوس ہوتی تھی جو کئی دنوں تک اس کو مسرور رکھتی تھی۔ منشی کریم بخش اکہرے جسم کا آدمی تھا۔ بڑھاپے نے اس کے بدن کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ مگر یہ ڈھیلا پن بدصورت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہاتھوں کی پھولی ہوئی رگیں سر کا خفیف سا ارتعاش اور چہرے کی گہری لکیریں اس کی متانت و سنجیدگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے اس کو نکھار دیا ہے۔ کپڑے بھی وہ صاف ستھرے پہنتا تھا جس سے یہ نکھار ابھر آتا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل زرد تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ جو دانت نکل جانے کے بعد اندر کی طرف سمٹے رہتے تھے، ہلکے سرخ تھے، خون کی اس کمی کے باعث اس کے چہرے پر ایسی صفائی پیدا ہو گئی تھی جو اچھی طرح منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک قائم رہا کرتی ہے۔ وہ کمزور ضرور تھا، پینسٹھ برس کی عمر میں کون کمزور نہیں ہو جاتا مگر اس کمزوری کے باوجود اس میں کئی کئی میل پیدل چلنے کی ہمت تھی۔ خاص طور پر جب آموں کا موسم آتا تو وہ ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو آموں کے ٹوکرے بھیجنے کے لیے اتنی

دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ بیس پچیس برس کے جوان آدمی بھی کیا کریں گے۔ بڑے اہتمام سے ٹوکرے کھولے جاتے تھے۔ ان کا گھاس پھوس الگ کیا جاتا تھا۔ داغی یا گلے سڑے دانے الگ کیے جاتے تھے۔ اور صاف ستھرے آم نئے ٹوکروں میں گن کر ڈالے جاتے تھے۔ منشی کریم بخش ایک بار پھر اطمینان کرنے کی خاطر ان کو گن لیتا تھا تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ آم نکالتے اور ٹوکروں میں ڈالتے وقت منشی کریم بخش کی بہن اور اسکی بیوی کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر وہ دونوں خاموش رہتیں۔ بڑے بڑے رس بھرے خوبصورت آموں کا ڈھیر دیکھ کر جب ان میں سے کوئی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتی۔

”کیا ہرج ہے اگر اس ٹوکرے میں سے دو آم نکال لیے جائیں۔“

تو منشی کریم بخش سے یہ جواب ملتا۔

”اور آجائیں گے اتنا بیتاب ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو جاتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔ جب منشی کریم بخش کے گھر میں آموں کے ٹوکرے آتے تھے تو گلی کے سارے آدمیوں کو اس کی خبر لگ جاتی تھی۔ عبداللہ نیچہ بند کا لڑکا جو کبوتر پالنے کا شوقین تھا دوسرے روز ہی آدھمکتا تھا اور منشی کریم بخش کی بیوی سے کہتا تھا۔

”خالہ میں گھاس لینے کے لیے آیا ہوں۔ کل خالو جان آموں کے دو ٹوکرے لائے تھے ان میں سے جتنی گھاس نکلی ہو مجھے دے دیجیے۔ ہمسائی نوراں جس نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں، اسی روز شام کو ملنے آجاتی تھی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کرتی تھی۔ پچھلے برس جو تم نے مجھے ایک ٹوکرہ دیا تھا بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ اب کے بھی ایک ٹوکرہ دیدو تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

دونوں ٹوکرے اور ان کی گھاس یوں چلی جاتی۔ حسب معمول اس دفعہ بھی آموں کے دو ٹوکرے آئے گلے سڑنے دانے الگ کیے گئے جو اچھے تھے ان کو منشی کریم بخش نے اپنی نگرانی میں گنوا کر نئے ٹوکروں میں رکھوایا۔ بارہ بجے پہلے پہل یہ کام ختم ہو گیا۔ چنانچہ دونوں ٹوکرے غسل خانے میں ٹھنڈی جگہ رکھ دیے گئے تاکہ آم خراب نہ ہو جائیں۔ ادھر سے مطمئن ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد منشی کریم بخش کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ جون کے آخری دن تھے۔ اس قدر گرمی تھی کہ دیواریں توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہ گرمیوں میں عام طور پر غسل خانے کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں موری کے رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آجاتی تھی لیکن اب کے اس میں دو بڑے بڑے ٹوکرے پڑے تھے۔ اس کو گرم کمرے ہی میں جو بالکل تنور بنا ہوا تھا چھ بجے تک وقت گزارنا تھا۔ ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب آموں کے یہ ٹوکرے آتے اسے ایک دن آگ کے بستر پر گزارنا پڑتا تھا مگر وہ اس تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے تک چھوٹا سا پنکھا بار بار پانی میں تر کر کے جھلتا رہتا۔ انتہائی کوشش کرتا کہ نیند آجائے مگر ایک پل کے لیے بھی اسے آرام نصیب نہ ہوتا۔ جون کی گرمی اور ضدی قسم کی مکھیاں کسے سونے دیتی ہیں۔ آموں کے ٹوکرے غسل خانے میں رکھوا کر جب وہ گرم کمرے میں لیٹا تو پنکھا جھلتے جھلتے ایک دم اس کا سر چکرایا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس اکھڑ رہا ہے اور وہ سارے کا سارا گہرائیوں میں اتر رہا ہے اس قسم کے دورے اسے کئی بار پڑ چکے تھے اس لیے کہ اس کا دل کمزور تھا مگر ایسا زبردست دورہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ سانس لینے میں اس کو بڑی دقت محسوس ہونے لگی، سر بہت زور سے چکرانے لگا۔ گھبرا کر اس نے آواز دی اور اپنی بیوی کو بلایا۔ یہ آواز سن کر اس کی بیوی اور بہن دونوں دوڑی دوڑی اندر آئیں دونوں جانتی تھیں کہ اسے اس قسم کے دورے کیوں پڑتے ہیں۔ فوراً ہی اس کی بہن نے عبداللہ نیچہ بند کے لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے تاکہ وہ طاقت کی سوئی لگا دے۔ لیکن چند منٹوں ہی میں منشی کریم بخش کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بیقراری اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چارپائی پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی بیوی اور بہن نے یہ دیکھ کر شور برپا کر دیا۔ جس کے باعث اس کے پاس کئی آدمی جمع ہو گئے۔ بہت کوشش کی گئی، اس کی حالت ٹھیک ہو جائے لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ڈاکٹر بلانے کے لیے تین چار آدمی دوڑائے گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی واپس آئے منشی کریم بخش زندگی کے آخری سانس لینے لگا۔ بڑی مشکل سے کروٹ بدل کر اس نے عبداللہ نیچہ بند کو جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا اپنی طرف متوجہ کیا اور ڈُوبتی ہُوئی آواز میں کہا۔ تم سب لوگ باہر چلے جاؤ۔

”میں اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

سب لوگ باہر چلے گئے اس کی بیوی اور لڑکی دونوں اندر داخل ہوئیں رو رو کر ان کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ منشی کریم بخش نے اشارے سے اپنی بیوی کو پاس بُلایا اور کہا۔

”دونوں ٹوکرے آج شام ہی ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کی کوٹھی پر ضرور پہنچ جانے چاہئیں۔ پڑے پڑے خراب ہو جائیں گے۔“

اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

”دیکھو تمہیں میری قسم ہے میری موت کے بعد بھی کسی کو آموں کا راز معلوم نہ ہو۔ کسی سے نہ کہنا کہ یہ آم ہم بازار سے خرید کر لوگوں کو بھیجتے تھے۔ کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ دنیا نگر میں ہمارے باغ ہیں۔ بس۔ اور دیکھو جب میں مر جاؤں تو چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو ضرور اطلاع بھیج دینا۔“

چند لمحات کے بعد مشنی کریم بخش مر گیا، اس کی موت سے ڈپٹی صاحب اور چھوٹے صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا۔ مگر دونوں چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔

سعادت حسن منٹو

آمنہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹو آمنہ

دُور تک دھان کے سنہرے کھیت پھیلے ہوئے تھے‘ جُمے کا نوجوان لڑکا بُندو کٹے ہوئے دھان کے پُولے اُٹھا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گا بھی رہا تھا۔ دھان کے پُولے دھر دھر کاندھے بھر بھر لائے کھیت سنہرا‘ دھن دولت رے بندو کا باپ جُما گاؤں میں بہت مقبول تھا۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اس کو اپنی بیوی سے بہت پیار ہے‘ ان دونوں کا عشق گاؤں کے ہر شخص کو معلوم تھا‘ ان کے دو بچے تھے‘ ایک بندو‘ جس کی عمر تیرہ برس کے قریب تھی‘ دوسرا چندو۔ سب خوش و خرم تھے مگر ایک روز اچانک جُمّے کی بیوی بیمار پڑ گئی‘ حالت بہت نازک ہو گئی‘ بہت علاج کیے‘ ٹونے ٹوٹکے آزمائے مگر اس کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ جب مرض مہلک شکل اختیار کر گیا تو اس نے اپنے شوہر سے نحیف لہجے میں کہا

”تم مجھے کبوتری کہا کرتے تھے اور خود کو کبوتر۔ ہم دونوں نے دو بچے پیدا کیے۔ اب یہ تمہاری کبوتری مر رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد تم کوئی اور کبوتری اپنے گھر لے آؤ“

تھوڑی دیر کے بعد اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی‘ جمّے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کی بیوی بولے چلی جا رہی تھی۔

”تم اور کبوتری لے آؤ گے۔ وہ سوچے گی کہ جب تک میرے بچے زندہ ہیں تم اس سے محبت نہیں کرو گے۔ چنانچہ وہ ان کو ذبح کر کے کھا جائے گی“

جمّے نے اپنی بیوی سے بڑے پیار کے ساتھ کہا

”سکینہ! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا‘ مگر تمہارے دشمن مریں تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی“

سکینہ کے ہونٹوں پر مُردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی‘ اس کے فوراً بعد اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جُمّا بہت رویا۔ جب اُس نے اپنے ہاتھوں سے اس کو دفن کیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے اپنی زندگی منوں مٹی کے نیچے گاڑ دی ہے۔ اب وہ ہر وقت مغموم رہتا‘ کام کاج میں اسے کوئی دلچسپی نہ رہی‘ ایک دن اس کے ایک وفادار مزارعہ نے اُس سے کہا۔

”سرکار! بہت دنوں سے میں آپ کی یہ حالت دیکھ رہا ہوں اور جی ہی جی میں کڑھتا رہا ہوں۔ آج مجھ سے نہیں رہا گیا تو آپ سے یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں‘ اپنی زمینوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ آپ کو اس کا علم بھی نہیں‘ کتنا نقصان ہو رہا ہے“

جمّے نے بڑی بے توجہی سے کہا:

”ہونے دو۔ مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں“

”سرکار۔ آپ ہوش میں آیئے۔ چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں‘ ایسا نہ ہو وہ آپ کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر آپ کی زمینوں پر قبضہ کر لیں‘ آپ سے مقدمہ بازی کیا ہو گی۔ میری تو یہی مخلصانہ رائے ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں۔ اس سے آپ کے غم کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور وہ آپ کے لڑکوں سے پیار محبت بھی کرے گی۔ جمّے کو بہت غصہ آیا

”بکواس نہ کرو رمضانی‘ تم سمجھتے نہیں کہ سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے‘ اس کے علاوہ تم یہ بھی تو سوچو‘ میری بیوی کی روح کو کتنا بڑا صدمہ پہنچے گا“

بہت دنوں کے اصرار کے بعد آخر رمضانی اپنے آقا کو دوسری شادی پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب شادی ہو گئی تو اس نے اپنے لڑکوں کو ایک علیحدہ مکان میں بھیج دیا۔ ہر روز وہاں کئی کئی گھنٹے رہتا اور بندو اور چندو کی دلجوئی کرتا رہتا۔ نئی بیوی کو یہ بات بہت ناگوار گزری‘ ایک بات اور بھی تھی کہ مکھن دودھ کا بیشتر حصہ اس کے سوتیلے بیٹوں کے پاس چلا جاتا تھا۔ اس سے وہ بہت جلتی‘ اس کا تو یہ مطلب تھا کہ گھر بار کے مالک وہی ہیں۔ ایک دن جمّا جب کھیتوں سے واپس آیا تو اس کی نئی بیوی زار و قطار رونے لگی‘ جمّے نے اس آہ و زاری کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا

”تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔ اسی لیے بچوں کو دوسرے مکان میں بھیج دیا۔ میں ان کی ماں ہوں‘ کوئی دشمن تو نہیں ہوں مجھے بہت دکھ ہوتا ہے جب میں سوچتی ہوں کہ بیچارے اکیلے رہتے ہیں“

جُمّا ان باتوں سے بہت متاثر ہوا اور دوسرے ہی دن بُندو اور چندو کو لے آیا اور ان کو سوتیلی ماں کے حوالے کر دیا جس نے ان کو اتنے پیار محبت سے رکھا کہ آس پاس کے تمام لوگ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ نئی بیوی نے جب اپنے خاوند کے دل کو پوری طرح موہ لیا تو ایک دن ایک مزارعہ کو بلا کر اکیلے میں اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا

"میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔ بولو کروگے"

اس مزارعہ نے جس کا نام شبراتی تھا، ہاتھ جوڑ کر کہا:

"سرکار! آپ مائی باپ ہیں۔ جان تک حاضر ہے"

نئی بیوی نے کہا

"دیکھو، کل دریا کے پاس بہت بڑا میلہ لگ رہا ہے۔ میں اپنے سوتیلے بچوں کو تمہارے ساتھ بھیجوں گی، ان کو کشتی کی سیر کرانا اور کسی نہ کسی طرح جب کوئی اور دیکھتا نہ ہو انھیں گہرے پانی میں ڈبو دینا"

شبراتی کی ذہنیت غلامانہ تھی، اس کے علاوہ اس کو بہت بڑے انعام کا لالچ دیا گیا تھا۔ وہ دوسرے روز بندو اور چندو کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انھیں کشتی میں بٹھایا" اس کو خود کھینا شروع کیا، دریا میں دور تک چلا گیا، جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اس نے چاہا کہ انھیں دھکا دے کر ڈبو دے مگر ایک دم اس کا ضمیر جاگ اُٹھا، اس نے سوچا ان بچوں کا کیا قصور ہے۔ سوائے اس کے کہ ان کی اپنی ماں مر چکی ہے اور اب یہ سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ میں انھیں کسی شخص کے حوالے کر دوں اور سوتیلی ماں سے جا کر کہہ دوں کہ دونوں ڈوب چکے ہیں۔ دریا کے دوسرے کنارے اُتر کر اُس نے بندو اور چندو کو ایک تاجر کے حوالے کر دیا۔ جس نے ان کو ملازم رکھ لیا۔ بڑا لڑکا بندو کھیل کود کا عادی، محنت مشقت سے بہت گھبراتا تھا۔ تاجر کے ہاں سے بھاگ نکلا اور پیدل چل کر دوسرے شہر میں پہنچا مگر وہاں اسے ایک دولت مند آدمی کے ہاں جس کا نام قلندر بیگ تھا، پناہ لینا پڑی۔ قلندر بیگ نیک دل آدمی تھا، اس نے چاہا کہ بندو کو اپنے ہاں نوکر رکھ لے، چنانچہ اُس نے اُس سے پوچھا:

"برخوردار! کیا تنخواہ لوگے"

بندو نے جواب دیا:

"جناب میں تنخواہ نہیں لوں گا"

قلندر بیگ کو کسی قدر حیرت ہوئی، لڑکا شکل و صورت کا اچھا تھا، اس میں گنوار پن بھی نہیں تھا، اُس نے پُوچھا

"تم کس خاندان کے ہو۔ کس شہر کے باشندے ہو؟"

بندو نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا، پھر رونے لگا۔ قلندر بیگ نے اس سے مزید استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا، جب بندو کو اس کے یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تو قلندر بیگ اس کی خوش اطواری سے بہت متاثر ہوا۔ ایک دن اُس نے اپنی بیوی سے کہا بندو مجھے بہت پسند ہے۔ میں تو سوچتا ہوں اس سے اپنی ایک لڑکی بیاہ دُوں۔"

بیوی کو اپنے خاوند کی یہ بات بُری لگی لیکن آخر اس نے کہا:

"آپ سے اس کے خاندان کے متعلق تو دریافت کیجیے"

قلندر بیگ نے کہا

"میں نے ایک مرتبہ اس سے اس کے خاندان کے متعلق پوچھا تو وہ زار و قطار رونے لگا۔

"پھر میں نے اس موضوع پر اس سے کبھی گفتگو نہیں کی"

بندو کئی برس قلندر بیگ کے ہاں رہا، جب بیس برس کا ہو گیا تو قلندر بیگ نے اپنا سارا کاروبار اس کے سپرد کر دیا۔ کافی عرصہ گزر گیا، ایک دن بندو نے بڑے ادب سے اپنے آقا سے درخواست کی

"دریا کے اُس پار دُور جو ایک گاؤں ہے وہاں میں چھوٹا مکان بنوانا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے آپ اتنا روپیہ مرحمت فرما سکتے ہیں کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے"

قلندر مسکرایا

"تم جتنا روپیہ چاہو لے سکتے ہو بیٹا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم دریا پار اتنی دُور مکان کیوں بنوانا چاہتے ہو۔ بندو نے جواب دیا

"یہ راز آپ پر عنقریب کھل جائے گا"

بندو اور چندو کا باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں گُھل گُھل کے مر چکا تھا، مزارعوں کی بڑی ابتر حالت تھی اس لیے کہ زمینوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ بندو، بہت سارا روپیہ لے کر اپنے گاؤں پہنچا، ایک پکّا مکان بنوایا اور مزارعوں کو خوشحال کر دیا۔ بندو کا بھائی چندو جس شخص کے ہاں ملازم ہوا تھا اس نے اُس کو بیٹا بنا لیا تھا، ایک دفعہ وہ خطرناک طور پر بیمار پڑ گیا تو اس شخص کی بیوی نے جس کا نام صمد خان تھا، اپنی بیٹی آمنہ سے کہا کہ وہ اس کی تیمار داری کرے۔ آمنہ بڑی نازک اندام حسین لڑکی تھی، دن رات اُس نے چندو کی خدمت کی، آخر وہ صحت مند ہو گیا، تیمار داری کے اس دور میں وہ کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ مگر چندو سوچتا تھا کہ آمنہ ایک دولت مند کی لڑکی ہے اور وہ

محض کنگلا۔ ان کا آپس میں کیا جوڑ ہے‘ اس کے والد بھلا کب ان کی شادی پر راضی ہوں گے لیکن آمنہ کو کسی قدر یقین تھا کہ اس کے والدین راضی ہو جائیں گے‘ اس لیے کہ وہ چندو کو بڑی اچھی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ایک دن چندو گائے بھینسوں کے ریوڑ کو جوہڑ پر پانی پلا رہا تھا کہ آمنہ دوڑتی ہوئی آئی اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی‘ ننھا سا سینہ دھڑک رہا تھا اُس نے خوش خوش چندو سے کہا

”ایک اچھی خبر لائی ہوں‘ آج میری ماں اور باپ میری شادی کی بات کر رہے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ تم بڑے اچھے لڑکے ہو‘ اس لیے تمھیں میرے ساتھ بیاہ دینا چاہیے“

چندو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے آمنہ کو اُٹھا کر ناچنا شروع کر دیا۔ اُن دونوں کی شادی ہو گئی‘ ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جمیل رکھا گیا۔ جب بندو اپنے گاؤں میں اچھی طرح جم گیا تو اس نے بھائی کا پتہ لیا۔ جا کے اُس سے ملا‘ دونوں بہت خوش ہوئے۔ بندو نے اس سے کہا اب اللہ کا فضل ہے چلو میرے ساتھ اور دیوانی سنبھالو‘ میں چاہتا ہوں تمہاری شادی اپنی سالی سے کرا دوں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے“

چندو نے اس کو بتایا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے‘ سارے حالات سُن کر بندو نے اس کو سمجھایا۔ قلندر بیگ بیحد دولتمند آدمی ہے‘ اس کی لڑکی سے شادی کر لو۔ ساری عمر عیش کرو گے۔ آمنہ کے باپ کے پاس کیا پڑا ہے“

چندو اپنے بھائی کی یہ باتیں سُن کر لالچ میں آ گیا‘ اور دولت مند آمنہ کو چھوڑ دیا۔ طلاق نامہ کسی کے ہاتھ بھجوا دیا اور اس سے ملے بغیر چلا گیا۔ چند روز کے بعد ہی بندو نے اپنے بھائی کی شادی قلندر بیگ کی چھوٹی لڑکی سے کرا دی‘ آمنہ حیران و پریشان تھی کہ اس کا پیارا چندو ایک دم کہاں غائب ہو گیا لیکن اُس کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ایک دن ضرور واپس آ جائے گا۔ بڑی دیر اُس نے اُس کی واپسی کا انتظار کیا اور اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ جب وہ نہ آیا تو آمنہ کے باپ نے جمیل کو ساتھ لیا اور بندو کے گاؤں پہنچا‘ اس کی ملاقات چندو سے ہوئی۔ وہ دولت کے نشے میں سب کو بھول چکا تھا۔ آمنہ کے باپ نے اُس کی بڑی منت سماجت کی اور اس سے کہا

”اور کچھ نہیں تو اپنے اس کمسن بیٹے کا خیال کرو‘ تمہارے بغیر اس بچے کی زندگی کیا ہے؟“

چندو نے یہ کورا جواب دیا

”میں اپنی دولت اور عزت اس بچے کے لیے چھوڑ سکتا ہوں؟۔ جاؤ اسے لے جاؤ اور میری نظروں سے دُور کر دو“

جب آمنہ کے باپ نے اور زیادہ منت سماجت کی تو چندو نے اس بڈّھے کو دھکّے دے کر باہر نکلوا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بچے کو بھی۔ بوڑھا باپ غم و اندوہ سے چور گھر پہنچا اور آمنہ کو ساری داستان سُنا دی۔ آمنہ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ پاگل ہو گئی۔ چندو پر پے در پے اتنے مصائب آئے کہ اس کی ساری دولت اجڑ گئی‘ بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ بیوی لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی گئی‘ اب اُس کو آمنہ یاد آئی‘ وہ اُس سے ملنے کے لیے گیا‘ اس کا بیٹا جمیل‘ ہڈیوں کا ڈھانچہ‘ اُس سے گھر کے باہر ملا‘ اُس نے اُس کو پیار کیا اور آمنہ کے متعلق اس سے پوچھا۔ جمیل نے اُس سے کہا

”آؤ تمھیں بتاتا ہوں‘ میری ماں آج کل کہاں رہتی ہے“

وہ اُسے دُور لے گیا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے

”یہاں رہتی ہے آمنہ امّاں“

۱۶، مئی ۱۹۵۴ء

انار کلی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوانار کلی

نام اُس کا سلیم تھا مگر اس کے یار دوست اسے شہزادہ سلیم کہتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ اس کے خدو خال مغلئی تھے خوبصورت تھا۔ چال ڈھال سے رعونت ٹپکتی تھی۔ اس کا باپ پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ سو روپے ہو گی مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا جیب خرچ بھی اُس کو کافی ملتا اس لیے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ جب کالج میں تھا تو کئی لڑکیاں اس پر جان چھڑکتیں تھیں۔ مگر وہ بے اعتنائی برتتا آخر اُس کی آنکھ ایک شوخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا، لڑ گئی۔ سلیم نے اُس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُس کی التفات حاصل کر لے گا۔ نہیں وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں پر گر پڑے گی اور اس کی ممنون و متشکر ہو گی کہ اُس نے محبت کی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ ایک دن کالج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا

”آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئی ہیں۔ لائیے مجھے دے دیجیے۔ میرا تانگہ باہر موجود ہے آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تک پہنچا دُوں گا۔ سیما نے اپنی بھاری بھر کم کتابیں بغل میں دابتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا

”آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ بہر حال شکریہ ادا کیے دیتی ہوں شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا۔ چند لمحات کے لیے وہ اپنی خفت مٹاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سیما سے کہا عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا؟“

سیما کا لہجہ اور زیادہ خشک ہو گیا

”عورتوں کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہو گی۔ مگر فی الحال مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں۔ اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟“

یہ کہہ کر سیما چلی گئی۔ شہزادہ سلیم جو انارکلی کے خواب دیکھ رہا تھا آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔ اُس نے بہت بُری طرح شکست کھائی تھی اس سے قبل اُس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آچکی تھیں جو اس کے ابرو کے اشارے پر چلتی تھیں۔ مگر یہ سیما کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت ہے۔ جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں اُن میں سب سے زیادہ حسین ہے مگر مجھے ٹھکرا دینا۔ یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ میں ضرور اس سے بدلہ لوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

شہزادہ سلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی اسکیمیں بنائیں مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں اُس نے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ یہ وہ جرم کر بیٹھتا مگر اسے سیما کے چہرے پر یہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا مصور بھی ایسی ناک کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ سلیم تو اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوا۔ مگر تقدیر نے اُس کی مدد کی اُس کی والدہ نے اُس کے لیے رشتہ ڈُھونڈنا شروع کیا نگاہِ انتخاب آخر سیما پر پڑی جو اس کی سہیلی کی سہیلی کی لڑکی تھی۔ بات پکی ہو گئی، مگر سلیم نے انکار کر دیا اس پر اُس کے والدین بہت ناراض ہوئے۔ گھر میں دس بارہ روز تک ہنگامہ مچا رہا سلیم کے والد ذرا سخت طبیعت کے تھے، انھوں نے اُس سے کہا

”دیکھو تمھیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہو گا“

سلیم ہٹ دھرم تھا جواب میں یہ کہا آپ کا فیصلہ کوئی ہائی کورٹ کا فیصلہ نہیں۔ پھر میں نے کیا جرم کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سنا رہے ہیں۔“

اُس کے والدین کو یہ سن کر طیش آگیا

”تمہارا جرم کہ تم ناخلف ہو۔ اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول حکمی کرتے ہو، میں تمھیں عاق کر دوں گا۔“

سلیم کا جوش ٹھنڈا ہو گیا

”لیکن ابا جان، میری شادی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے“

”بتاؤ، تمہاری مرضی کیا ہے“

اگر آپ ٹھنڈے دل سے سنیں تو میں عرض کروں۔“

میرا دل کافی ٹھنڈا ہے۔ تمھیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ ڈالو۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ سلیم نے رُک کے کہا مجھے۔ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہے“

”اس کا باپ گرجا

”کس لڑکی سے؟“

سلیم تھوڑی دیر ہچکچایا

”ایک لڑکی ہے“

”کون ہے وہ؟۔ کیا نام ہے اُس کا؟“

سیما۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی“

میاں افتخار الدین کی لڑکی؟ جی ہاں

”اُس کا نام سیما افتخار ہے۔ میرا خیال ہے وہی ہے“

اس کے والد بے تحاشہ ہنسنے لگے

”خیال کے بچے۔ تمہاری شادی اُسی لڑکی سے قرار پائی ہے۔ کیا وہ تمھیں پسند کرتی ہے؟“

سلیم بوکھلا سا گیا۔ یہ سلسلہ کیسے ہو گیا اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہیں اس کا باپ جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا۔ سلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اس کے والد کو نہیں ملا تھا، چنانچہ انھوں نے کڑک کے پوچھا

”سلیم مجھے بتاؤ کیا سیما تمھیں پسند کرتی ہے؟“

سلیم نے کہا

”جی نہیں“

”تم نے یہ کیسے جانا؟“

”اُس سے۔ اُس سے ایک بار میں نے مختصر الفاظ میں۔ محبت کا اظہار کیا۔ لیکن اُس نے مجھے۔“

تمھیں درخور اعتنانہ سمجھا۔“

جی ہاں۔ بڑی بے رخی برتی“

سلیم کے والد نے اپنے گنجے سر کو تھوڑی دیر کے لیے کھجلایا اور کہا

”تو پھر یہ رشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہاری ماں سے کہتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کے لڑکا رضامند نہیں“

سلیم ایک دم جذباتی ہو گیا نہیں ابا جان۔ ایسا نہ کیجیے گا شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ اور کسی کی محبت اکارت نہیں جاتی۔ لیکن آپ لوگوں کو۔ میرا مطلب ہے سیما کو یہ پتہ نہ لگنے دیجیے کہ اس کا بیاہ مجھ سے ہو رہا ہے جس سے وہ بے رخی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے“

اس کے باپ نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا“

میں اس کے متعلق سوچوں گا یہ کہہ کر وہ چلے گئے انھیں ایک ٹھیکیدار سے رشوت وصول کرنا تھی اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے سلسلے میں شہزادہ سلیم جب رات کو پلنگ پر سونے کے لیے لیٹا تو اسے انار کی کلیاں ہی کلیاں نظر آئیں ساری رات وہ اُن کے خواب دیکھتا رہا۔ گھوڑے پر سوار باغ میں آیا ہے۔ شاہانہ لباس پہنے۔ اسپ تازی سے اُتر کر باغ کی ایک روش پر جا رہا ہے کیا دیکھتا ہے کہ سیما انار کے بوٹے کی سب سے اُونچی شاخ سے ایک نوخیز کلی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی بھاری بھر کم کتابیں زمین پر بکھری پڑی ہیں۔ زُلفیں اُلجھی ہوئی ہیں اور وہ اُچک اُچک کر اُس شاخ تک اپنا ہاتھ پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے مگر ہر بار ناکام رہتی ہے۔ وہ اُس کی طرف بڑھا انار کی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر اس نے اُس شاخ کو پکڑا اور جھکا دیا سیما نے وہ کلی توڑ لی جس کے لیے وہ اتنی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن فوراً اُسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ شاخ نیچے کیسے جھک گئی۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ شزادہ سلیم اُس کے پاس پہنچ گیا سیما گھبرا گئی لیکن سنبھل کر اُس نے اپنی کتابیں اُٹھائیں اور بغل میں داب لیں انار کلی اپنے جوڑے میں اڑس لی اور یہ خشک الفاظ کہہ کر وہاں سے چلی گئی آپ کی امداد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ بحر حال شکریہ ادا کیے دیتی ہوں۔“

تمام رات وہ اسی قسم کے خواب دیکھتا رہا۔ سیما اُس کی بھاری بھر کم کتابیں، انار کی کلیاں اور شادی کی دُھوم دھام۔ شادی ہو گئی۔ شہزادہ سلیم نے اُس تقریب پر اپنی انار کلی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پائی تھی وہ اُس لمحے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ جب سیما اُس کی آغوش میں ہو گی۔ وہ اُس کے اتنے پیار لے گا کہ وہ تنگ آ کر رونا شروع کر دے گی۔ سلیم کو رونے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں اُس کا یہ فلسفہ تھا کہ عورت جب رو رہی ہو تو بہت حسین ہو جاتی ہے اُس کے آنسو شبنم کے قطروں کے مانند ہوتے ہیں جو مرد کے جذبات کے پھولوں پر ٹپکتے ہیں جن سے اُسے ایسی راحت، ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔ رات کے دس بجے دولہن کو حجلہ عروسی میں داخل کر دیا گیا۔ سلیم کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اُس کمرے میں جا سکتا ہے لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور رسم و رسوم سب ختم ہو گئی تھیں وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ پھولوں سے سجی ہوئی مسہری پر دولہن گھونگھٹ کاڑھے ریشم کی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ شہزادہ سلیم نے خاص اہتمام کر لیا تھا کہ پھول، انار کی کلیاں ہوں۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا اور دولہن کے پاس بیٹھ گیا کافی دیر تک وہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی بغل میں کتابیں ہوں گی جن کو وہ اُٹھانے نہیں دے گی آخر اُس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اُسے کہا

”سیما۔“

یہ نام لیتے ہی اُس کی زُبان خشک ہو گئی لیکن اُس نے پھر جرأت فراہم کی اور اپنی دولہن کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھایا اور بھونچکا رہ گیا۔ یہ سیما نہیں تھی کوئی اور ہی لڑکی تھی۔ انار کی ساری کلیاں اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ مرجھا گئی ہیں (یکم جون ۵۴ء(

انجام بخیر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوانجام نجیر

بٹوارے کے بعد جب فرقہ وارانہ فسادات شدت اختیار کر گئے اور جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون سے زمین رنگی جانے لگی تو نسیم اختر جو دہلی کی نو خیز طوائف تھی اپنی بوڑھی ماں سے کہا

”چلو ماں یہاں سے چلیں“

بوڑھی بائکہ نے اپنے پوپلے منہ میں پاندان سے چھالیہ کے باریک باریک ٹکڑے ڈالتے ہوئے اُس سے پوچھا

”کہاں جائیں گے بیٹا۔“

پاکستان۔ یہ کہہ کر وہ اپنے استاد خان صاحب اچھن خان سے مخاطب ہُوئی۔

”خان صاحب آپ کا کیا خیال ہے یہاں رہنا اب خطرے سے خالی نہیں۔“

خان صاحب نے نسیم اختر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تم کہتی ہو مگر بائی جی کو منالو تو سب چلیں گے۔ نسیم اختر نے اپنی ماں سے بہتر کہا۔ کہ چلو اب یہاں ہندوؤں کا راج ہو گا۔ کوئی مسلمان باقی نہیں چھوڑیں گے۔ بڑھیا نے کہا تو کیا ہوا۔ ہمارا دھندہ تو ہندوؤں کی بدولت ہی چلتا ہے اور تمہارے چاہنے والے بھی سب کے سب ہندو ہی ہیں مسلمانوں میں رکھا ہی کیا ہے“

”ایسا نہ کہو۔ ان کا مذہب اور ہمارا مذہب ایک ہے۔ قائد اعظم نے اتنی محنت سے مسلمانوں کے لیے پاکستان بنایا ہے ہمیں اب وہیں رہنا چاہیے۔“

مانڈو میراثی نے افیم کے نشہ میں اپنا سر ہلایا اور غنودگی بھری آواز میں کہا۔

”چھوٹی بائی۔ اللہ سلامت رکھے تمھیں کیا بات کہی ہے۔ میں تو ابھی چلنے کے لیے تیار ہوں میری قبر بھی بناؤ تو رُوح خوش رہے گی۔“

دوسرے میراثی تھے وہ بھی تیار ہو گئے لیکن بڑی بائی دلی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی بالا خانے پر اُسی کا حکم چلتا تھا۔ اس لیے سب خاموش ہو گئے۔ بڑی بائی نے سیٹھ گوبند پرکاش کی کوٹھی پر آدمی بھیجا اور اُس کو بُلا کر کہا:

”میری بچی آج کل بہت ڈری ہوئی ہے۔ پاکستان جانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے سمجھایا۔ وہاں کیا دھرا ہے۔ یہاں آپ ایسے مہربان سیٹھ لوگ موجود ہیں وہاں جا کر ہم اُپلے تھاپیں گے آپ ایک کرم کیجیے۔“

سیٹھ بڑی بائی کی باتیں سُن رہا تھا مگر اس کا دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ایک دم چونک کر اُس نے بڑی بائی سے پوچھا۔

”تو کیا چاہتی ہے“

ہمارے کوٹھے کے نیچے دو تین ہندوؤں والے سپاہیوں کا پہرا کھڑا کر دیجیے تاکہ بچی کا سہم دور ہو۔ سیٹھ گوبند پرکاش نے کہا۔ یہ کوئی مشکل نہیں۔ میں ابھی جا کر سپرینٹنڈنٹ پولیس سے ملتا ہوں شام سے پہلے پہلے سپاہی موجود ہوں گے۔ نسیم اختر کی ماں نے سیٹھ کو بہت دُعائیں دیں۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے کہا ہم آپ اپنی بائی کا مجرا سُننے آئیں گے۔ بڑھیا نے اُٹھ کر تعظیماً کہا“

ہائے جم جم آیئے آپ کا اپنا گھر ہے بچی کو آپ اپنی قمیص سمجھیے کھانا یہیں کھایئے گا۔

”نہیں میں آجکل پرہیزی کھانا کھا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا چلا گیا۔ شام کو نسیم کی ماں نے چاننیاں بدلوائیں گاؤ تکیوں پر نئے غلاف چڑھائے زیادہ روشنی کے بلب لگوائے اعلیٰ قسم کے سگرٹوں کا ڈبہ منگوانے بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد نوکر حواس باختہ ہانپتا کانپتا واپس آگیا۔ اُس کے منہ سے ایک بات نہ نکلتی تھی۔ آخر جب وہ کچھ دیر کے بعد سنبھلا تو اُس نے بتایا کہ چوک میں پانچ چھ سکھوں نے ایک مسلمان خوانچہ فروش کو کرپانوں سے اُس کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے جب اُس نے یہ دیکھا تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور یہاں آن کے دم لیا۔ نسیم اختر یہ خبر سُن کر بے ہوش ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے خان صاحب اچھن خان اُسے ہوش میں لائے مگر وہ بہت دیر تک نڈھال رہی اور خاموش خلا میں دیکھتی رہی۔ آخر اُس کی ماں نے کہا

”خون خرابے ہوتے ہی رہتے ہیں“

کیا اس سے پہلے قتل نہیں ہوتے تھے۔ دم دلاسہ دینے کے بعد نسیم اختر سنبھل گئی تو اُس کی ماں نے اُس سے بڑے دُلار اور پیار سے کہا۔

”اٹھو میری بچی جاؤ پشواز پہنو سیٹھ آتے ہی ہوں گے۔ نسیم نے بادل نخواستہ پشواز پہنی سولہ سنگھار کیے اور مسند پر بیٹھ گئی اُس کا جی بھاری بھاری تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اُس مقتول خوانچہ فروش کا سارا خون اُس کے دل و دماغ میں جم گیا ہے اُس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا وہ چاہتی تھی کہ زرق برق پشواز کی بجائے سادہ شلوار قمیص پہن لے اور اپنی ماں سے ہاتھ جوڑ کر بلکہ اُس کے پاؤں پڑ کر کہے کہ خدا کے لیے میری بات سُنو اور بھاگ چلو یہاں سے میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہم پر کوئی نہ کوئی آفت آنے والی ہے۔ بُڑھیا نے جھنجھلا کر کہا۔

ہم پر کیوں آفت آنے لگی ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔“

نسیم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا اس غریب خواچہ فروش نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو ظالموں نے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ بگاڑنے والے بچ جاتے ہیں۔ مارے جاتے ہیں جنہوں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہوتا۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں کس کا دماغ دُرست رہ سکتا ہے۔ چاروں طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں یہ کہہ کر وہ اُٹھی۔ بالکونی میں کھڑی ہو گئی اور نیچے بازار میں دیکھنے لگی۔ اسے بجلی کے کھمبے کے پاس چار آدمی کھڑے دکھائی دیے۔ جن کے پاس بندوقیں تھیں اُس نے خان اچھن کو بتایا اور وہ آدمی دکھائے ایسا لگتا تھا کہ وہی سپاہی ہیں جن کو سیٹھ نے بھیجا ہو گا۔ خان صاحب نے غور سے دیکھا۔

”نہیں یہ سپاہی نہیں۔ سپاہیوں کی تو وردی ہوتی ہے مجھے تو یہ گُنڈے معلوم ہوتے ہیں۔ نسیم اختر کا کلیجہ دھک سے رہ گیا

”گُنڈے“

اللہ بہتر جانتا ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا لو یہ تمہارے کوٹھے کی طرف آ رہے ہیں۔ دیکھ نسیم کسی بہانے سے اُوپر کوٹھے پر چلی جاؤ میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے۔ نسیم اختر چپکے سے باہر نکلی اور اپنی ماں سے نظر بچا کر اوپر کی منزل پر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد خان صاحب اچھن خان اپنی چندھی آنکھیں جھپکاتا اُوپر آیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ نسیم اختر جس کا دل جیسے ڈُوب رہا تھا۔ خانصاحب سے پوچھا۔

”کیا بات ہے“

وہی جو میں نے سمجھا تھا۔ تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے کہتے تھے سیٹھ گوبند پرکاش نے کار بھیجی ہے اور بلوایا ہے۔ تمہاری ماں بڑی خوش ہوئی بڑی مہربانی ہے اُن کی۔ میں دیکھتی ہوں کہاں ہے شاید غسل خانے میں ہو۔ اتنی دیر میں میں تیار ہو جاؤں“

ان گنڈوں میں سے ایک نے کہا

”تمھیں کیا شہد لگا کر چاٹیں گے بیٹھی رہو جہاں بیٹھی ہو خبردار جو تم وہاں سے ہلیں ہم خود تمہاری بیٹیوں کو ڈھونڈ نکالیں گے“

میں نے جب یہ باتیں سُنیں اور ان گُنڈوں کے بِگڑے ہوئے تیور دیکھے تو کھسکتا کھسکتا یہاں پہنچ گیا ہوں۔“

نسیم اختر حواس باختہ تھی۔ اب کیا کیا جائے۔؟ خان نے اپنا سر کھجایا اور جواب دیا۔

”دیکھو میں کوئی ترکیب سوچتا ہوں بس یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے۔ اور ماں۔“

اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا اس کو اللہ کے حوالے کر کے خود باہر نکلنا چاہیے اُوپر چارپائی پر دو چادریں پڑی ہوئی تھیں خان صاحب نے ان کو گانٹھ دے کر رسہ سا بنایا اور مضبوطی سے ایک گنڈے کے ساتھ باندھ کر دوسری طرف لٹکایا نیچے لانڈری کی چھت تھی وہاں اگر وہ پہنچ جائیں تو راستہ آگے صاف ہے لانڈری کی چھت کی سیڑھیاں دوسری طرف تھیں اُس کے ذریعے سے وہ طویلے میں پہنچ جاتے اور وہاں سائیں سے جو مسلمان تھا تانگہ لیتے اور اسٹیشن کا رُخ کرتے۔ نسیم اختر نے بڑی بہادری دکھائی۔ آرام آرام سے نیچے اُتر کر لانڈری کی چھت تک پہنچ گئی۔ خانصاحب اچھن خان بھی بحفاظت تمام اُتر گئے۔ اب وہ طویلے میں تھے سائیں اتفاق سے تانگے میں گھوڑا جوت رہا تھا دونوں اُس میں بیٹھے اور اسٹیشن کا رخ کیا مگر راستے میں ان کو ملٹری کا ٹرک مل گیا اُس میں مسلح فوجی مسلمان تھے جو ہندوؤں کے خطرناک محلوں سے مسلمانوں کو نکال نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچا رہے تھے جو پاکستان جانا چاہتے ان کو اسپیشل ٹرینوں میں جگہ دلوا دیتے۔ تانگہ سے اُتر کر نسیم اختر اور اُس کا اُستاد ٹرک میں بیٹھے اور چند ہی منٹوں میں اسٹیشن پر پہنچ گئے اسپیشل ٹرین اتفاق سے تیار تھی اس میں ان کو اچھی جگہ مل گئی اور وہ بخیریت لاہور پہنچ گئے یہاں وہ قریب قریب ایک مہینے تک والٹن کیمپ میں رہے۔ نہایت کسمپرسی کی حالت میں اس کے بعد وہ شہر چلے آئے نسیم اختر کے پاس کافی زیور تھا جو اُس نے اُس رات پہنا ہوا تھا جب سیٹھ گوبند پرکاش اُس کا مجرا سُننے آ رہا تھا یہ اُس نے اُتار کر خان صاحب اچھن خان کے حوالے کر دیا تھا ان زیوروں میں سے کچھ بیچ کر اُنھوں نے ہوسٹل میں رہنا شروع کر دیا لیکن مکان کی تلاش جاری رہی آخر بدقت تمام ہیرامنڈی میں ایک مکان مل گیا جو اچھا خاصہ تھا اب خانصاحب اچھن خان نے نسیم اختر سے کہا

”گدے اور چاندنیاں وغیرہ خرید لیں اور تم بسم اللہ کر کے مجرا شروع کر دو۔“

نسیم نے کہا۔

”نہیں خان صاحب میرا جی اکتا گیا ہے میں تو اس مکان میں بھی رہنا پسند نہیں کرتی کسی شریف محلے میں کوئی چھوٹا سا مکان تلاش کیجیے۔ کہ میں وہاں اُٹھ جاؤں میں اب خاموش زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ خان صاحب کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں“

بس جی اچاٹ ہو گیا ہے میں اس زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی ہوں دعا کیجیے خدا مجھے ثابت قدم رکھے

”یہ کہتے ہوئے نسیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خانصاحب نے اُس کو بہت ترغیب دی پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی ایک دن اُس نے اپنے اُستاد سے صاف کہہ دیا کہ وہ شادی کر لینا چاہتی ہے اگر کسی نے اسے قبول نہ کیا تو وہ کنواری رہے گی۔ خان صاحب بہت حیران تھا۔ کہ نسیم میں یہ تبدیلی کیسے آئی فسادات تو اس کا باعث نہیں ہو سکتے پھر کیا وجہ تھی کہ وہ پیشہ ترک کر

نے پر تُلی ہوئی ہے۔ جب وہ اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تو اسے ایک محلے میں جہاں شرفاء رہتے تھے ایک چھوٹا سا مکان لے دیا اور خود ہیرا منڈی کی ایک مالدار طوائف کو تعلیم دینے لگا۔ نسیم نے تھوڑے سے برتن خریدے ایک چارپائی اور بستر وغیرہ بھی ایک چھوٹا لڑکا نوکر رکھ لیا اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگی پانچوں نمازیں پڑھتی۔“

روزے آئے تو اس نے سارے کے سارے رکھے ایک دن وہ غسل خانے میں نہا رہی تھی کہ سب کچھ بھول کر اپنی سُریلی آواز میں گانے لگی اُس کے ہاں ایک اور عورت کا آنا جانا تھا نسیم اختر کو معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت شریفوں کے محلے کی بہت بڑی پھپھا کٹنی ہے شریفوں کے محلے میں کئی گھر تباہ و برباد کر چکی ہے کئی لڑکیوں کی عصمت اونے پونے داموں بِکوا چکی ہے کئی نوجوانوں کو غلط راستے پر لگا کر اپنا الو سیدھا کرتی رہتی ہے جب اُس عورت نے جس کا نام جنتے ہے نسیم کی سُریلی اور منجھی ہوئی آواز سُنی تو اُس کو فوراً خیال آیا کہ اس لڑکی کا آگا ہے نہ پیچھا بڑی معرکے کی طوائف بن سکتی ہے چنانچہ اُس نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے اس کو اس نے کئی سبز باغ دکھائے مگر وہ اس کے قابو میں نہ آئی آخر اُس نے ایک روز اس کو گلے لگایا اور چٹ چٹ اس کی بلائیں لینا شروع کر دیں۔ جیتی رہو بیٹا۔ میں تمہارا امتحان لے رہی تھی تم اس میں سولہ آنے پوری اُتری ہو۔ نسیم اختر اس کے فریب میں آگئی ایک دن اُس کو یہاں تک بتا دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے کیونکہ ایک یتیم کنواری لڑکی کا اکیلے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ جنتے کو موقع ہاتھ آیا۔ اُس نے نسیم سے کہا۔ بیٹا یہ کیا مشکل ہے میں نے یہاں شادیاں کرائی ہیں سب کی سب کامیاب رہی ہیں اللہ نے چاہا تو تمہارے حسب منشا میاں مل جائے گا جو تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔ جنتے کئی فرضی رشتے لائی مگر اُس نے ان کی کوئی زیادہ تعریف نہ کی آخر میں وہ ایک رشتہ لائی جو اس کے کہنے کے مطابق فرشتہ سیرت اور صاحب جائیداد تھا نسیم مان گئی تاریخ مقرر کی گئی اور اُس کی شادی انجام پا گئی۔ نسیم اختر خوش تھی کہ اس کا میاں بہت اچھا ہے اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا ہے لیکن اُس دن اُس کے ہوش و حواس گم ہو گئے جب اُس کو دوسرے کمرے سے عورتوں کی آوازیں سنائی دیں دروازے میں سے جھانک کر اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر دو بوڑھی طوائفوں سے اُس کے متعلق باتیں کر رہا ہے جنتے بھی پاس بیٹھی تھی۔ سب مل کر اس کا سودا طے کر رہے تھے اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے اور کیا نہ کرے بہت دیر روتی سوچتی رہی آخر اُٹھی اور اپنی پشواز نکال کر پہنی اور باہر نکل کر سیدھی اپنے اُستاد اچھن خان کے پاس پہنچی اور مجرے کے ساتھ ساتھ پیشہ بھی شروع کر دیا ایک انتقامی قسم کے جذبے کے تحت وہ کھیلنے لگی۔

انقلاب پسند

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوانقلاب پسند

میری اور سلیم کی دوستی کو پانچ سال کا عرصہ گُزر چکا ہے۔ اس زمانے میں ہم نے ایک ہی سکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا، ایک ہی کالج میں داخل ہُوئے اور ایک ہی ساتھ ایف۔ اے۔ کے امتحان میں شامل ہو کر فیل ہوئے۔ پھر پرانا کالج چھوڑ کر ایک نئے کالج میں داخل ہُوئے۔ اس سال میں تو پاس ہو گیا۔ مگر سلیم سُوئے قسمت سے پھر فیل ہو گیا۔ سلیم کی دوبارہ ناکامیابی سے لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ آوارہ مزاج اور نالائق ہے۔ یہ بالکل افترا ہے۔ سلیم کا بغلی دوست ہونے کی حیثیت سے میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ سلیم کا دماغ بہت روشن ہے۔ اگر وہ کالج کی پڑھائی کی طرف ذرا بھی توجہ دیتا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ وہ صوبہ بھر میں اول نہ رہتا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے پڑھائی کی طرف کیوں توجہ نہ دی؟ جہاں تک میرا ذہن کام دیتا ہے مجھے اُس کی تمام تر وجہ، وہ خیالات معلوم ہوتے ہیں جو ایک عرصے سے اُس کے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ چھا رہے تھے؟ دسویں جماعت اور کالج میں داخل ہوتے وقت سلیم کا دماغ ان تمام اُلجھنوں سے آزاد تھا۔ جنھوں نے اسے ان دنوں پاگل خانے کی چار دیواری میں قید کر رکھا ہے۔ ایام کالج میں وہ دیگر طلبہ کی طرح کھیل کود میں حصہ لیا کرتا تھا۔ سب لڑکوں میں ہر دلعزیز تھا۔ مگر یکایک اس کے والد کی ناگہانی موت نے اس کے متبسّم چہرے پر غم کی نقاب اوڑھا دی۔ اب کھیل کود کی جگہ غور و فکر نے لے لی۔ وہ کیا خیالات تھے، جو سلیم کے مضطرب دماغ میں پیدا ہُوئے؟۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ سلیم کی نفسیات کا مطالعہ کرنا بہت اہم کام ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود اپنی دلی آواز سے ناآشنا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ گفتگو کرتے وقت یا یونہی سیر کرتے ہُوئے اچانک میرا بازو پکڑ کر کہا ہے۔

”عباس جی چاہتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔“

”ہاں۔ ہاں۔ کیا جی چاہتا ہے۔ میں نے اس کی طرف تمام توجہ مبذول کر کے پوچھا ہے۔ مگر میرے اس استفسار پر اس کے چہرے کی غیر معمولی تبدیلی اور گلے میں سانس کے تصادم نے صاف طور پر ظاہر کیا کہ وہ اپنے دلی مدّعا کو خود نہ پہچانتے ہُوئے الفاظ میں صاف طور پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ وہ شخص جو اپنے احساسات کو کسی شکل میں پیش کر کے دوسرے ذہن پر منتقل کر سکتا ہے۔ وہ دراصل اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی قدرت کا مالک ہے۔ اور وہ شخص جو محسوس کرتا ہے۔ مگر اپنے احساس کو خود آپ اچھی طرح نہیں سمجھتا۔ اور پھر اس اضطراب کو بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اس شخص کے مترادف ہے۔ جو اپنے حلق میں ٹھنسی ہُوئی چیز کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر وہ گلے سے نیچے اُترتی چلی جا رہی ہو۔ یہ ایک ذہنی عذاب ہے۔ جس کی تفصیل لفظوں میں نہیں آسکتی۔ سلیم شروع ہی سے اپنی آواز سے ناآشنا رہا ہے۔ اور ہوتا بھی کیونکر جب اس کے سینے میں خیالات کا ایک ہجوم چھایا رہتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ بیٹھا بیٹھا اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور کمرے میں چکر لگا کر لمبے لمبے سانس بھرنے شروع کر دیے۔ غالباً وہ اپنے اندرونی انتشار سے تنگ آ کر ان خیالات کو جو اس

کے سینے میں بھاپ کے مانند چکر لگا رہے ہوتے۔ سانسوں کے ذریعے باہر نکالنے کا کوشاں ہوا کرتا تھا۔ اضطراب کے انہی تکلیف دہ لمحات میں اس نے اکثر اوقات مجھ سے مخاطب ہو کر کہا

”عباس! یہ خاکی کشتی کسی روز تُند موجوں کی تاب نہ لا کر چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔“

وہ اپنے اندیشے کو پوری طرح بیان نہیں کر سکتا تھا۔ سلیم کسی متوقع حادثے کا منتظر ضرور تھا۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ حادثہ کس شکل میں پردہ ظہور پر نمودار ہو گا۔ اس کی نگاہیں ایک عرصے سے دُھندلے خیالات کی صورت میں ایک موہوم سایہ دیکھ رہی تھیں۔ جو اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس تاریک شکل کے پردے میں کیا نہاں ہے۔ میں نے سلیم کی نفسیات سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے۔ مگر مجھے اس کی مُنقلب عادات کے ہوتے ہوئے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کن گہرائیوں میں غوطہ زن ہے۔ اور وہ اس دنیا میں رہ کر اپنے مستقبل کے لیے کیا کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ ہر قسم کے سرمائے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں ایک عرصے سے سلیم کو مُنقلب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی عادات دن بدن بدل رہی تھیں۔ کل کا کھلنڈر الڑکا، میر اہم جماعت ایک مفکّر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ یہ تبدیلی میرے لیے سخت باعث حیرت تھی۔ کچھ عرصے سے سلیم کی طبیعت پر ایک غیر معمولی سکون چھا گیا تھا۔ جب دیکھو اپنے گھر میں خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اور اپنے بھاری سر کو گھٹنوں میں تھامے کچھ سوچ رہا ہے۔ وہ کیا سوچ رہا ہوتا۔ یہ میری طرح خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ ان لمحات میں میں نے اسے اکثر اوقات اپنی گرم آنکھوں پر دوات کا آہنی ڈھکنا یا گلاس کا بیرونی حصّہ پھیرتے دیکھا ہے۔ شاید وہ اس عمل سے اپنی آنکھوں کی حرارت کم کرنا چاہتا تھا۔ سلیم نے کالج چھوڑتے ہی غیر ملکی مصنفّوں کی بھاری بھر کم تصانیف کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ شروع شروع میں مجھے اس کی میز پر ایک کتاب نظر آئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس الماری میں جس میں وہ شطرنج۔ تاش اور اسی قسم کی دیگر کھیلیں رکھا کرتا تھا۔ کتابیں ہی کتابیں نظر آنے لگیں۔ اس کے علاوہ وہ کئی کئی دنوں تک گھر سے کہیں باہر چلا جایا کرتا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے سلیم کی طبیعت کا غیر معمولی سکون ان کتابوں کے انتھک مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ جو اس نے بڑے قرینے سے الماری میں سجا رکھی تھیں۔ سلیم کا عزیز ترین دوست ہونے کی حیثیت میں مَیں اس کی طبیعت کے غیر معمولی سکون سے سخت پریشان تھا۔ مجھے اندیشہ تھا۔ کہ یہ سکون کسی وحشت خیز طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے سلیم کی صحت کا بھی خیال تھا۔ وہ پہلے ہی بہت کمزور جثّے کا واقع ہوا تھا۔ اس پر اس نے خوامخواہ اپنے آپ کو خدا معلوم کن کن الجھنوں میں پھنسا لیا تھا۔ سلیم کی عمر بمشکل بیس سال کی ہو گی۔ مگر اس کی آنکھوں کے نیچے شب بیداری کی وجہ سے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ پیشانی جو اس سے قبل بالکل ہموار تھی اب اس پر کئی شکن پڑے رہتے تھے۔ جو اس کی ذہنی پریشانی کو ظاہر کرتے تھے۔ چہرہ جو کچھ عرصہ پہلے بہت شگفتہ ہوا کرتا تھا۔ اب اس پر ناک اور لب کے درمیان گہری لکیریں پڑ گئی تھیں۔ جنھوں نے سلیم کو قبل از وقت معمّر بنا دیا تھا۔ اس غیر معمولی تبدیلی کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے۔ جو مجھے ایک شعبدے سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ یہ کیا تعجب کی بات ہے۔ کہ میری عمر کا لڑکا میری نظروں کے سامنے بوڑھا ہو جائے۔ سلیم پاگل خانے میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ سڑی اور دیوانہ ہے۔ اسے غالباً اس بنا پر پاگل خانے بھیجا گیا ہے کہ وہ بازاروں میں بلند بانگ تقریریں کرتا ہے۔ راہ گذروں کو پکڑ پکڑ کر انہیں زندگی کے مشکل مسائل بتا کر جواب طلب کرتا ہے۔ اور امرا کے حریر پوش بچوں کا لباس اتار کر ننگے بچوں کو پہنا دیتا ہے۔ ممکن ہے۔ یہ حرکات ڈاکٹروں کے نزدیک دیوانگی کی علامتیں ہوں۔ مگر میں یقین کے ساتھ کہَ سکتا ہوں کہ سلیم پاگل نہیں ہے۔ بلکہ وہ لوگ جنھوں نے اسے امن عامہ میں خلل ڈالنے والا تصور کرتے ہوئے آہنی سلاخوں کے پنجرے میں قید کر دیا ہے۔ کسی دیوانے حیوان سے کم نہیں ہیں! اگر وہ اپنی غیر مربوط تقریر کے ذریعے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔ تو کیا ان کا فرض نہیں کہ وہ اس کے ہر لفظ کو غور سے سنیں؟ اگر وہ راہ گذروں کے ساتھ فلسفۂ حیات پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہے۔ تو کیا اس کے یہ معنی لیے جائیں گے کہ اس کا وجود مجلسی دائرہ کے لیے نقصان دہ ہے؟۔ کیا زندگی کے حقیقی معنی سے باخبر ہونا ہر انسان کا فرض نہیں ہے؟ اگر وہ متمول اشخاص کے بچوں کا لباس اُتار کر غربا کے برہنہ بچوں کا تن ڈھانپنا چاہتا ہے تو کیا یہ عمل اُن افراد کو اُن کے فرائض سے آگاہ نہیں کرتا جو فلک بوس عمارتوں میں دوسرے لوگوں کے بل بوتے پر آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا ننگوں کی ستر پوشی کرنا ایسا فعل ہے کہ اسے دیوانگی پر محمول کیا جائے؟ سلیم ہر گز پاگل نہیں ہے۔ مگر مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس کے افکار نے اسے بے خود ضرور بنا رکھا ہے۔ دراصل وہ دُنیا کو کچھ پیغام دینا چاہتا ہے۔ مگر دے نہیں سکتا ایک کم سن بچے کی طرح وہ تُتلا تُتلا کر اپنے قلبی احساسات بیان کرنا چاہتا ہے۔ مگر الفاظ اسکی زبان پر آتے ہی بکھر جاتے ہیں۔ وہ اس سے قبل ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔ مگر اب اسے اور اذیت میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ پہلے ہی سے اپنے افکار کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ اور اب اسے زندان نما کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟ میں نے آج تک سلیم کی کوئی بھی ایسی حرکت نہیں دیکھی۔ جس سے میں یہ نتیجہ نکال سکوں۔ کہ وہ دیوانہ ہے۔ ہاں البتہ کچھ عرصے سے میں اس کے ذہنی انقلابات کا مشاہدہ ضرور کرتا رہا ہوں۔ شروع شروع میں جب میں نے اس کے کمرے کے تمام فرنیچر کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹا ہُوا پایا تو میں نے اس تبدیلی کی طرف خاص توجہ نہ دی دراصل میں نے اس وقت جو خیال کیا۔ کہ شاید سلیم نے فرنیچر کی موجودہ جگہ کو زیادہ موزوں خیال کیا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ میری نظروں کو جو کرسیوں اور میزوں کو کئی سالوں سے ایک جگہ دیکھنے کی عادی تھیں۔ وہ غیر متوقع تبدیلی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اس واقعے کے چند روز بعد جب میں کالج سے فارغ ہو کر سلیم کے کمرے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ فلمی ممثلوں کی دو تصاویر جو ایک عرصے سے کمرے کی دیواروں پر آویزاں تھیں اور جنھیں میں اور سلیم نے بہت مشکل کے بعد فراہم کیا تھا۔ باہر ٹوکری میں پھٹی پڑی ہیں اور ان کی جگہ انہی چوکھٹوں میں مختلف مصنفّوں کی تصویریں لٹک رہی ہیں۔ چونکہ میں خود ان تصاویر کا اتنا مشتاق نہ تھا۔ اس لیے مجھے سلیم کا یہ انخلاب بہت پسند آیا۔ چنانچہ ہم اس روز دیر تک ان

تصویروں کے متعلق گفتگو بھی کرتے رہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس واقعہ کے بعد سلیم کے کمرے میں ایک ماہ تک کوئی خاص قابل ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ مگر اس عرصے کے بعد میں نے ایک روز اچانک کمرے میں بڑا سا تخت پڑا پایا۔ جس پر سلیم نے کپڑا بچھا کر کتابیں چُن رکھیں تھیں اور آپ قریب ہی زمین پر ایک تکیہ کا سہارا لیے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں یہ دیکھ کر سخت متعجّب ہوا۔ اور کمرے میں داخل ہوتے ہی سلیم سے یہ سوال کیا۔ کیوں میاں! اس تخت کے کیا معنی؟ سلیم جیسا کہ اس کی عادت تھی مسکرایا اور کہنے لگا۔

”کرسیوں پر روزانہ بیٹھتے بیٹھتے طبیعت اُکتا گئی ہے۔ اب یہ فرش والا سلسلہ ہی رہے گا۔ بات معقول تھی۔ میں چپ رہا۔ واقعی روزانہ ایک ہی چیز کا استعمال کرتے کرتے طبیعت ضرور اچاٹ ہو جایا کرتی ہے۔ مگر جب پندرہ بیس روز کے بعد میں نے وہ تخت مع تکیے کے غائب پایا۔ تو میرے تعجّب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور مجھے شُبہ سا ہوا کہ کہیں میرا دوست واقعی خبطی تو نہیں ہو گیا ہے۔ سلیم سخت گرم مزاج واقع ہُوا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے وزنی افکار نے اسے معمول سے زیادہ چڑ چڑا بنا رکھا تھا۔ اس لیے میں عموماً اس سے ایسے سوالات نہیں کیا کرتا۔ جو اس کے دماغی توازن کو درہم برہم کر دیں یا جن سے وہ خوامخواہ کھج جائے۔ فرنیچر کی تبدیلی، تصویروں کا انخلاب، تخت کی آمد اور پھر اس کا غائب ہو جانا واقعی کسی حد تک تعجب خیز ضرور ہیں اور واجب تھا کہ میں ان اُمور کی وجہ دریافت کرتا۔ مگر چونکہ مجھے سلیم کو آزردہ خاطر کرنا، اور اس کے کام میں دخل دینا منظور نہ تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ تھوڑے عرصے کے بعد سلیم کے کمرے میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی تبدیلی دیکھنا میرا معمول ہو گیا۔ اگر آج کمرے میں تخت موجود ہے۔ تو ہفتے کے بعد وہاں سے اُٹھا دیا گیا ہے۔ اس کے دو روز بعد وہ میز جو کچھ عرصہ پہلے کمرے کے دائیں طرف پڑی تھی۔ رات رات میں وہاں سے اٹھا کر دوسری طرف رکھ دی گئی ہے۔ انگیٹھی پر رکھی ہُوئی تصاویر کے زاویے بدلے جا رہے ہیں۔ کپڑے لٹکانے کی کھونٹیاں ایک جگہ سے اُکھیڑ کر دوسری جگہ پر جڑ دی گئی ہیں۔ کرسیوں کے رُخ تبدیل کیے گئے ہیں۔ گویا کمرے کی ہر شے ایک قسم کی قواعد کرائی جاتی تھی۔ ایک روز جب میں نے کمرے کے تمام فرنیچر کو مخالف رخ میں پایا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے سلیم سے دریافت کر ہی لیا۔

”سلیم میں ایک عرصے سے اس کمرے کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا دیکھ رہا ہوں۔ آخر بتاؤ تو سہی یہ تمہارا کوئی نیا فلسفہ ہے۔؟“

”تم جانتے نہیں ہو، میں انقلاب پسند ہوں“

سلیم نے جواب دیا۔ یہ سن کر میں اور بھی متعجب ہوا۔ اگر سلیم نے یہ الفاظ اپنی حسبِ معمول مسکراہٹ کے ساتھ کہے ہوتے تو میں یقینی طور پر یہ خیال کرتا کہ وہ صرف مذاق کر رہا ہے۔ مگر یہ جواب دیتے وقت اس کا چہرہ اس امر کا شاہد تھا، کہ وہ سنجیدہ ہے۔ اور میرے سوال کا جواب وہ اِنہی الفاظ میں دینا چاہتا ہے لیکن پھر بھی میں تذبذب کی حالت میں تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

”مذاق کر رہے ہو یار؟“

”تمہاری قسم بہت بڑا انقلاب پسند“

یہ کہتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد اس نے ایسی گفتگو شروع کی تھی۔ مگر ہم دونوں کسی اور موضوع پر اظہار خیالات کرنے لگ گئے تھے۔ یہ سلیم کی عادت ہے کہ وہ بہت سی باتوں کو دلچسپ گفتگو کے پردے میں چُھپا لیا کرتا ہے۔ ان دنوں جب کبھی میں سلیم کے جواب پر غور کرتا ہُوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم درحقیقت انقلاب پسند واقع ہُوا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی سلطنت کا تختہ اُلٹنے کے درپے ہے۔ یا وہ دیگر انقلاب پسندوں کی طرح چوراہوں میں بم پھینک کر دہشت پھیلانا چاہتا ہے۔ بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ ہر چیز میں انقلاب دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظریں اپنے کمرے میں پڑی ہوئی اشیا کو ایک ہی جگہ پر نہ دیکھ سکتی تھیں۔ ممکن ہے میرا یہ قیافہ کس حد تک غلط ہو۔ مگر میں یہ وثوق سے کہَ سکتا ہوں کہ اس کی جستجو کسی ایسے انقلاب کی طرف رجوع کرتی ہے۔ جس کے آثار اس کے کمرے کی روزانہ تبدیلیوں سے ظاہر ہیں۔ بادی النظر میں کمرے کی اشیا کو روز الٹ پلٹ کرتے رہنا دیوانگی کے مترادف ہے۔ لیکن اگر سلیم کی ان بے معنی حرکات کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ امر روشن ہو جائیگا کہ ان کے پسِ پردہ ایک ایسی قوت کام کر رہی تھی۔ جس سے وہ خود نا آشنا تھا۔ اسی قوت نے جسے میں ذہنی تعصب کا نام دیتا ہوں۔ سلیم کے دماغ میں تلاطم بپا کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس طوفان کی تاب نہ لا کر ازخود رفتہ ہو گیا۔ اور پاگل خانے کی چار دیواری میں قید کر دیا گیا۔ پاگل خانے جانے سے کچھ روز پہلے سلیم مجھے اچانک شہر کے ایک ہوٹل میں چائے پیتا ہوا ملا۔ میں اور وہ دونوں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ اس لیے کہ میں اُس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بازار کے چند دکان داروں سے سنا تھا کہ اب سلیم ہوٹلوں میں پاگلوں کی طرح تقریریں کرتا ہے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اس سے فوراً مل کر اُسے اس قسم کی حرکات کرنے سے منع کر دوں۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ کہیں سچ مچ مخبوط الحواس ہی نہ ہو گیا ہو۔ چونکہ میں اس سے فوراً ہی بات کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے ہوٹل میں گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔ کرسی پر بیٹھتے وقت میں غور سے سلیم کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر سخت متعجب ہوا۔ وہ کہنے لگا۔۔۔۔۔

”شاید میں سلیم نہیں ہوں۔“

آواز میں کس قدر درد تھا۔ گو یہ جُملہ آپ کی نظروں میں بالکل سادہ معلوم ہو۔ مگر خدا گواہ ہے میری آنکھیں بے اختیار نمناک ہو گئیں۔ ”شاید میں سلیم نہیں ہُوں“

گویا وہ ہر وقت اس بات کا متوقع تھا کہ کسی روز اس کا بہترین دوست بھی اسے نہ پہچان سکے گا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ وہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ میں نے ضبط سے کام لیا۔ اور اپنے آنسوؤں کو رومال میں چھپا کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”سلیم میں نے سُنا ہے کہ تم نے میرے لاہور جانے کے بعد یہاں بازاروں میں تقریریں کرنی شروع کر دی ہیں۔ جانتے بھی ہو۔ اب تمہیں شہر کا بچہ بچہ پاگل کے نام سے پُکارتا ہے۔“

”پاگل! شہر کا بچہ بچہ مجھے پاگل کے نام سے پُکارتا ہے۔ پاگل!۔ ہاں عباس، میں پاگل ہُوں۔ پاگل۔ دیوانہ۔ خرد باختہ۔ لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں۔ معلوم ہے کیوں؟ یہاں تک کہ وہ میری طرف سرتاپا استفہام بن کر دیکھنے لگا۔ مگر میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”اس لیے کہ میں انہیں غریبوں کے ننگے بچے دِکھلا دِکھلا کر یہ پوچھتا ہُوں۔ کہ اس بڑھتی ہُوئی غربت کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟۔ وہ مجھے کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے وہ مجھے پاگل تصّور کرتے ہیں۔ آہ اگر مجھے صرف یہ معلوم ہو کہ ظلمت کے اس زمانے میں روشنی کی ایک شعاع کیونکر فراہم کی جا سکتی ہے۔ ہزاروں غریب بچوں کا تاریک مستقبل کیونکر منّور بنایا جا سکتا ہے۔ وہ مجھے پاگل کہتے ہیں۔ وہ جن کی نبضِ حیات دوسروں کے خون کی مرہون منّت ہے، وہ جن کا فردوس غربا کے جہنم کی مستعار اینٹوں سے استوار کیا گیا ہے، جن کے سازِ عشرت کے ہر تار کے ساتھ بیواؤں کی آہیں یتیموں کی عریانی، لاوارث بچوں کی صدائے گریہ لپٹی ہوئی ہے۔ کہیں، مگر ایک زمانہ آنے والا ہے جب یہی پروردہءِ غربت اپنے دلوں کے مشتر کہ لہو میں اُنگلیاں ڈبو ڈبو کر ان لوگوں کی پیشانیوں پر اپنی لعنتیں لکھیں گے۔ وہ وقت نزدیک ہے جب ارضی جنّت کے دروازے ہر شخص کے لیے وا ہوں گے۔ میں پوچھتا ہُوں کہ اگر میں آرام میں ہوں۔ تو کیا وجہ ہے کہ تم تکلیف کی زندگی بسر کرو؟۔ کیا یہی انسانیّت ہے کہ میں کارخانے کا مالک ہوتے ہُوئے ہر شب ایک نئی رقاصہ کا ناچ دیکھتا ہُوں، ہر روز کلب میں سینکڑوں روپے قمار بازی کی نذر کر دیتا ہوں۔ اور اپنی نکمی سے نکمی خواہش پر بے دریغ روپیہ بہا کر اپنا دل خوش کرتا ہُوں، اور میرے مزدوروں کو ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے بچے مٹی کے ایک کھلونے کے لیے ترستے ہیں۔ پھر لُطف یہ ہے کہ میں مُہذب ہوں، میری ہر جگہ عزت کی جاتی ہے، اور وہ لوگ جن کہ پسینہ میرے لیے گوہر تیار کرتا ہے۔ مجلسی دائرے میں حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں خود ان سے نفرت کرتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ، کیا یہ دونوں ظالم و مظلوم اپنے فرائض سے ناآشنا نہیں ہیں؟ میں ان دونوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کس طرح کروں؟۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔“

سلیم نے اس قدر کہہ کر ہانپتے ہوئے ٹھنڈی چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھے بغیر پھر بولنا شروع کر دیا۔

”میں پاگل نہیں ہُوں۔ مجھے ایک وکیل سمجھو۔ بغیر کسی اُمید کے، جو اس چیز کی وکالت کر رہا ہے۔ جو بالکل گم ہُو چکی ہے۔ میں ایک دبی ہوئی آواز ہوں۔ انسانیّت ایک منہ ہے۔ اور میں ایک چیخ۔ میں اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر وہ میرے خیالات کے بوجھ تلے دبی ہُوئی ہے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر اسی لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کہ مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں اپنا پیغام کہاں سے شروع کروں۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں اپنی آواز کے بکھرے ہوئے ٹکڑے فراہم کرتا ہوں ذہنی اذّیت کے دُھندلے غبار میں سے چند خیالات تمہید کے طور پر پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ اپنے احساسات کی عمیق گہرائیوں سے چند احساس سطح پر لاتا ہوں۔ کہ دوسرے اذہان پر منتقل کر سکوں مگر میری آواز کے ٹکڑے پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ خیالات پھر تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ احساسات پھر غوطہ لگا جاتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں۔ کہ میرے خیالات منتشر ہونے کے بعد پھر جمع ہو رہے ہیں۔ تو جہاں کہیں میری قوتِ گویائی کام دیتی ہے میں شہر کے رؤسا سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگ جاتا ہوں۔ مرمریں محلّات کے مکینو! تم اس وسیع کائنات میں صرف سورج کی روشنی دیکھتے ہو۔ مگر یقین جانو۔ اس کے سائے بھی ہوتے ہیں۔ تم مجھے سلیم کے نام سے جانتے ہو، یہ غلطی ہے۔ میں وہ کپکپی ہوں جو ایک کنواری لڑکی کے جسم پر طاری ہوتی ہے۔ جب وہ غربت سے تنگ آ کر پہلی دفعہ ایوانِ گناہ کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ آؤ ہم سب کانپیں! تم ہنستے ہو۔ مگر نہیں تمہیں مجھے ضرور سُننا ہو گا۔ میں ایک غوطہ خور ہُوں۔ قدرت نے مجھے تاریک سمندر کی گہرائیوں میں دبو دیا۔۔۔۔۔۔ کہ میں کچھ ڈھونڈھ کر لاؤں۔ میں ایک بے بہا موتی لایا ہُوں۔ وہ سچائی ہے۔ اس تلاش میں میں نے غربت دیکھی ہے، گرسنگی برداشت کی ہے۔ لوگوں کی نفرت سے دوچار ہُوا ہُوں۔ جاڑے میں غریبوں کی رگوں میں خون کو منجمد ہوتے دیکھا ہے، نوجوان لڑکیوں کو عشرت کدوں کی زینت بڑھاتے دیکھا ہے اس لیے کہ وہ مجبور تھیں۔ اب میں یہی کچھ تمہارے منہ پر قے کر دینا چاہتا ہوں کہ تمہیں تصویر زندگی کا تاریک پہلو نظر آ جائے۔ انسانیت ایک دل ہے۔ ہر شخص کے پہلو میں ایک ہی قسم کا دل موجود ہے۔ اگر تمہارے بوٹ غریب مزدوروں کے ننگے سینوں پر ٹھوکریں لگاتے ہیں۔ اگر تم اپنے شہوانی جذبات کی بھڑکتی ہُوئی آگ کسی ہمسایہ نادار لڑکی کی عصمت دری سے ٹھنڈی کرتے ہو۔ اگر تمہاری غفلت سے ہزارہا یتیم بچے گہوارہءِ جہالت میں پل کر جیلوں کو آباد کرتے ہیں۔ اگر تمہارا دل کاجل کے مانند سیاہ ہے۔ تو یہ تمہارا قصور نہیں۔ ایوان معاشرت ہی کچھ ایسے ڈھب پر استوار کیا گیا ہے۔ کہ اس کی ہر چھت اپنی ہمسایہ چھت کو دابے ہُوئے ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ کو۔ جانتے ہو، موجودہ نظام کے کیا معنی ہیں؟۔ یہ کہ لوگوں کے سینوں کو جہالت کدہ بنائے۔ انسانی تلذذ کی کشتی ہو اور ہوّس کی موجوں میں بہا دے، جوان لڑکیوں کی عصمت چھین کر انہیں ایوان تجارت میں کھلے بندوں حُسن فروشی پر مجبور کر دے غریبوں کا خون چُوس کر اُنہیں جلی ہوئی راکھ کے مانند قبر کی مٹی میں یکساں کر دے۔ کیا اسی کو تم تہذیب کا نام دیتے ہو۔ بھیانک قصابی!! تاریک شیطنیت!!! آہ اگر تم صرف وہ دیکھ سکو۔ جس کا میں نے مشاہدہ کیا ہے!۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں۔ جو قبر نما جھونپڑوں میں زندگی کے سانس پورے کر رہے ہیں۔ تمہاری نظروں کے سامنے ایسے افراد موجود ہیں۔ جو موت کے منہ میں جی رہے ہیں۔ ایسی لڑکیاں ہیں۔ جو بارہ سال کی عمر میں عصمت فروشی شروع کرتی ہیں۔ اور بیس سال کی عمر میں قبر کی سردی سے

لپٹ جاتی ہیں۔ مگر تم۔ ہاں تم، جو اپنے لباس کی تراش کے متعلق گھنٹوں غور کرتے رہتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے۔ بلکہ اُلٹا غریبوں سے چھین کر اُمراء کی دولتوں میں اضافہ کرتے ہو۔ مزدور سے لے کر کاہل کے حوالے کر دیتے ہو۔ ڈگری پہنے انسان کا لباس اُتار کر حریر پوش کے سُپرد کر دیتے ہو۔ تم غربا کے غیر مختتم مصائب پر ہنستے ہو۔ مگر تمہیں یہ معلوم نہیں۔ کہ اگر درخت کا نچلا حصہ لاغر مردہ ہو رہا ہے تو کسی روز وہ بالائی حصے کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے گر پڑے گا۔"

یہاں تک بول کر سلیم خاموش ہو گیا اور ٹھنڈی چائے کو آہستہ آہستہ پینے لگا۔ تقریر کے دوران میں میں سحر زدہ آدمی کی طرح چُپ چُپ بیٹھا اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ جو بارش کی طرح برس رہے تھے۔ بغور سنتا رہا۔ میں سخت حیران تھا۔ کہ وہ سلیم جو آج سے کچھ عرصہ پہلے بالکل خاموش ہوا کرتا تھا۔ اتنی طویل تقریر کیونکر جاری رکھ سکا ہے۔ اس کے علاوہ خیالات کس قدر حق پر مبنی تھے۔ اور آواز میں کتنا اثر تھا۔ میں ابھی اس کی تقریر کے متعلق کچھ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ وہ پھر بولا۔

"خاندان کے خاندان شہر کے یہ نہنگ نگل جاتے ہیں۔ عوام کے اخلاق قوانین سے مسخ کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کے زخم جُرمانوں سے کریدے جاتے ہیں۔ ٹیکسوں کے ذریعے دامنِ غربت کترا جاتا ہے۔ تباہ شدہ ذہنیت جہالت کی تاریکی سیاہ بنا دیتی ہے۔ ہر طرف حالت نزع کے سانس کی لرزاں آوازیں، عریانی، گناہ اور فریب ہے۔ مگر دعویٰ یہ ہے کہ عوام امن کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی جارہی ہے۔ ہمارے کانوں میں پگھلا ہُوا سیسہ اُتارا جا رہا ہے۔ ہمارے جسم مصائب کے کوڑے سے بے حس بنائے جارہے ہیں۔ تاکہ ہم نہ دیکھ سکیں۔ نہ سُن سکیں اور نہ محسوس کر سکیں!۔ انسان جسے بلندیوں پر پرواز کرنا تھا۔ کیا اس کے بال و پر نوچ کر اسے زمین پر رینگنے کے لیے مجبور نہیں کیا جارہا؟۔ کیا امرا کی نظر فریب عمارتیں مزدوروں کے گوشت پوست سے تیار نہیں کی جاتیں؟۔ کیا عوام کے مکتوبِ حیات پر جرائم کی مہر ثبت نہیں کی جاتی؟ کیا مجلسی بدن کی رگوں میں بدی کا خون موجزن نہیں ہے۔ کیا جمہور کی زندگی کشمکشِ پیہم، انتھک محنت اور قوتِ برداشت کا مرکب نہیں ہے؟۔ بتاؤ بتاؤ، بتاتے کیوں نہیں؟"

"درست ہے"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تو پھر اس کا علاج کرنا تمہارا فرض ہے۔ کیا تم کوئی طریقہ نہیں بتا سکتے۔ کہ اس انسانی تذلیل کو کیونکر روکا جا سکتا ہے۔ مگر آہ! تمہیں معلوم نہیں، مجھے خود معلوم نہیں"

تھوڑی دیر کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر رازدارانہ لہجے میں یوں کہنے لگا۔

"عباس! عوام سخت تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔ بعض اوقات جب کبھی میں کسی سوختہ حال انسان کے سینے سے آہ بلند ہوتے دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں شہر نہ جل جائے!۔ اچھا اب میں جاتا ہوں، تم لاہور واپس کب جارہے ہو؟"

"یہ کہہ کر وہ اُٹھا۔ اور ٹوپی سنبھال کر باہر چلنے لگا۔

"ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کہاں جاؤ گے اب؟"

اسے یک لخت کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر میں نے اسے فوراً ہی کہا۔

"مگر میں اکیلا جانا چاہتا ہوں۔ کسی باغ میں جاؤں گا"

میں خاموش ہو گیا۔ اور وہ ہوٹل سے نکل کر بازار کے ہجوم میں گم ہو گیا اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے لاہور میں اطلاع ملی کہ سلیم نے میرے جانے کے بعد بازاروں میں دیوانہ وار شور برپا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے اسے پاگل خانے میں داخل کر لیا گیا ہے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۳۵ء اشاعت اولیں، علی گڑھ میگزین

آنکھیں

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوآنکھیں

اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ یہ آنکھیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے اندھیری رات میں موٹر کار کی ہیڈ لائیٹس جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ بہت خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ہرگز نہیں۔ میں خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کر سکتا ہوں۔ لیکن معاف کیجیے گا، ان آنکھوں کے معاملے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوبصورت نہیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں بے پناہ کشش تھی۔ میری اور ان آنکھوں کی ملاقات ایک ہسپتال میں ہوئی۔ میں اس ہسپتال کا نام آپ کو بتانا نہیں چاہتا، اس لیے کہ اس سے میرے اس افسانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ بس آپ یہی سمجھ لیجیے کہ ایک ہسپتال تھا، جس میں میرا ایک عزیز آپریشن کرانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ یوں تو میں تیمارداری کا قائل نہیں، مریضوں کے پاس جا کر ان کو دم دلاسہ دینا بھی مجھے نہیں آتا۔ لیکن اپنی بیوی کے پیہم اصرار پر مجھے جانا پڑا تاکہ میں اپنے مرنے والے عزیز کو اپنے خلوص اور محبت کا ثبوت دے سکوں۔ یقین مانیے کہ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ ہسپتال کے نام ہی سے مجھے نفرت ہے، معلوم نہیں کیوں۔ شاید اس لیے کہ ایک

بار بمبئی میں اپنی بوڑھی ہمسائی کو جس کی کلائی میں موچ آگئی تھی، مجھے جے جے ہسپتال میں لے جانا پڑا تھا۔ وہاں کیوژوالٹی ڈیپارٹمنٹ میں مجھے کم از کم ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہاں میں جس آدمی سے بھی ملا، لوہے کے مانند سرد اور بے حس تھا۔ میں ان آنکھوں کا ذکر کر رہا تھا جو مجھے بے حد پسند تھیں۔ پسند کا معاملہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے اگر آپ یہ آنکھیں دیکھتے تو آپ کے دل و دماغ میں کوئی رد عمل پیدا نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ سے اگر ان کے بارے میں کوئی رائے طلب کی جاتی تو آپ کہہ دیتے۔

”نہایت واہیات آنکھیں ہیں۔“

لیکن جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو سب سے پہلے مجھے اس کی آنکھوں نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ برقع پہنے ہوئے تھی، مگر نقاب اٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوا کی بوتل تھی اور وہ جنرل وارڈ کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جو بڑی تھیں، نہ چھوٹی، سیاہ تھیں نہ بھوری، نیلی تھیں نہ سبز، ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ میرے قدم رک گئے۔ وہ بھی ٹھہر گئی۔ اس نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم سے چلا نہیں جاتا“!

لڑکے نے اپنی کلائی چھڑائی اور تیزی سے کہا۔

”چل تو رہا ہوں۔ تُو تو اندھی ہے“!

میں نے یہ سنا تو اس لڑکی کی آنکھوں کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اس کے سارے وجود میں صرف اس کی آنکھیں ہی تھیں جو پسند آئی تھیں۔ میں آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے پلکیں نہ جھپکنے والی آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا۔

”ایکسرے کہاں لیا جاتا ہے؟“

اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں ایکسرے ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک دوست کام کر رہا تھا، اور میں اسی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا۔

”آؤ، میں تمھیں وہاں لے چلتا ہوں، میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

لڑکی نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے ڈاکٹر صادق کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایکسرے لینے میں مصروف ہیں۔ دروازہ بند تھا اور باہر مریضوں کی بھیڑ لگی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے تیز و تند آواز آئی۔

”کون ہے۔ دروازہ موت ٹھوکو“!

لیکن میں نے پھر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صادق مجھے گالی دیتے دیتے رہ گی۔

”اوہ تم ہو“!

”ہاں بھئی۔ میں تم سے ملنے آیا تھا۔ دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو۔“

”آجاؤ اندر“

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے کہا

”آؤ۔ لیکن لڑکے کو باہر ہی رہنے دو“!

ڈاکٹر صادق نے ہولے سے مجھ سے پوچھا۔

”کون ہے یہ؟“

میں نے جواب دیا۔

”معلوم نہیں کون ہے۔ ایکسرے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا چلو، میں لیے چلتا ہوں۔“

ڈاکٹر صادق نے دروازہ اور زیادہ کھول دیا۔ میں اور وہ لڑکی اندر داخل ہو گئے۔ چار پانچ مریض تھے۔ ڈاکٹر صادق نے جلدی جلدی ان کی سکرینگ کی اور انھیں رخصت کیا۔ اس کے بعد کمرے میں ہم صرف دو رہ گئے۔ میں اور وہ لڑکی۔ ڈاکٹر صادق نے مجھ سے پوچھا۔

”انھیں کیا بیماری ہے؟“

میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔

”کیا بیماری ہے تمھیں۔ ایکسرے کے لیے تم سے کس ڈاکٹر نے کہا تھا؟“

اندھیرے کمرے میں لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جواب دیا۔

”مجھے معلوم نہیں کیا بیماری ہے۔ ہمارے محلے میں ایک ڈاکٹر ہے، اس نے کہا تھا کہ ایکسرے لو۔“

ڈاکٹر صادق نے اس سے کہا کہ مشین کی طرف آئے۔ وہ آگے بڑھی تو بڑے زور کے ساتھ اس سے ٹکرا گئی۔ ڈاکٹر نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔

”کیا تمہیں سجھائی نہیں دیتا۔“

لڑکی خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے اس کا برقع اتارا اور اسکرین کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے سوئچ اون کیا۔ میں نے شیشے میں دیکھا تو مجھے اس کی پسلیاں نظر آئیں۔ اس دل بھی ایک کونے میں کالے سے دھبے کی صورت میں دھڑک رہا تھا۔ ڈاکٹر صادق پانچ چھ منٹ تک اس کی پسلیوں اور ہڈیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سوئچ اوف کر دیا اور روشنی کر کے مجھ سے مخاطب ہوا۔

”چھاتی بالکل صاف ہے۔“

لڑکی نے معلوم نہیں کیا سمجھا کہ اپنی چھاتیوں پر جو کافی بڑی بڑی تھیں، دوپٹے کو درست کیا اور برقع ڈھونڈنے لگی۔ برقع ایک کونے میں میز پر پڑا تھا۔ میں نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اسکے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر صادق نے رپورٹ لکھی اور اس سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے برقع اوڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”جی میرا نام۔ میرا نام حنیفہ ہے۔“

”حنیفہ“!

ڈاکٹر صادق نے اس کا نام پرچی پر لکھا اور اس کو دے دی۔

”جاؤ، یہ اپنے ڈاکٹر کو دکھا دینا۔“

لڑکی نے پرچی لی اور قمیض کے اندر اپنی انگیا میں اڑس لی۔ جب وہ باہر نکل تو میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ لیکن مجھے اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ڈاکٹر صادق نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس بات کا یقین تھا کہ اس لڑکی سے میرا تعلق ہے، حالانکہ جیسا آپ جانتے ہیں، ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ مجھے اس کی آنکھیں پسند آ گئی تھیں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے اپنے ساتھی لڑکی کی انگلی پکڑی ہوئی تھی۔ جب وہ تانگوں کے اڈے پر پہنچے تو میں نے حنیفہ سے پوچھا۔

”تمہیں کہاں جانا ہے؟“

اس نے ایک گلی کا نام لیا تو میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہا۔

”مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا۔“

میں نے جب اس کا ہاتھ پکڑ کر تانگے میں بٹھایا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھیں ایکس ریز کا شیشہ بن گئی ہیں۔ مجھے اس کا گوشت پوست دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف ڈھانچہ نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں۔ وہ بالکل ثابت و سالم تھیں، جن میں بے پناہ کشش تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھوں لیکن یہ سوچ کر کوئی دیکھ لے گا، میں نے اس کے ساتھی لڑکے کو اس کے ساتھ بٹھا دیا اور آپ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

”میں۔ میں سعادت حسن منٹو ہوں۔“

”من ٹو۔ یہ من ٹو کیا ہوا؟“

”کشمیریوں کی ایک ذات ہے۔“

”ہم بھی کشمیری ہیں۔“

”اچھا“!

”ہم کنگ وائیں ہیں۔“

میں نے مڑ کر اس سے کہا۔

”یہ تو بہت اونچی ذات ہے۔“

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھیں اور زیادہ پر کشش ہو گئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ لیکن وہ آنکھیں جو حنیفہ کے چہرے پر تھیں، بے حد پر کشش تھیں۔ معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو کشش کا باعث تھی۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ قطعاً خوبصورت نہیں تھیں، لیکن اس کے باوجود میرے دل میں کھب

رہی تھیں۔ میں نے جسارت سے کام لیا اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کو جو اس کے ماتھے پر لٹک کر اس کی ایک آنکھ کو ڈھانپ رہی تھی، انگلی سے اٹھایا اور اسکے سر پر چسپاں کر دی۔ اس نے برا نہ مانا۔ میں نے اور جسارت کی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس پر بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اپنے ساتھی لڑکے سے مخاطب ہو۔

”تم میرا ہاتھ کیوں دبا رہے ہو؟“

میں نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لڑکے سے پوچھا۔

”تمہارا مکان کہاں ہے؟“

لڑکے نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

”اس بازار میں“!

تانگے نے ادھر کا رخ کیا، بازار میں بہت بھیڑ تھی، ٹریفک بھی معمول سے زیادہ۔ تانگہ رک رک کر چل رہا تھا۔ سڑک میں چونکہ گڑھے تھے، اس لیے زور کے دھچکے لگ رہے تھے، بار بار اس کا سر میرے کندھوں سے ٹکراتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسے اپنے زانو پر رکھ لوں اور اس کی آنکھیں دیکھتا رہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا گھر آ گیا۔ لڑکے نے تانگے والے سے رکنے کے لیے کہا۔ جب تانگہ رکا تو وہ نیچے اترا۔ حنیفہ بیٹھی رہی۔ میں نے اس سے کہا۔

”تمہارا گھر آ گیا ہے“!

حنیفہ نے مڑ کر میری طرف عجیب و غریب آنکھوں سے دیکھا۔

”بدرو کہاں ہے؟“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کون بدرو؟“

”وہ لڑکا جو میرے ساتھ تھا۔“

میں نے لڑکے کی طرف دیکھا جو تانگے کے پاس ہی تھا۔

”یہ کھڑا تو ہے“!

”اچھا۔“

یہ کہہ کر اس نے بدرو سے کہا۔

”بدرو! مجھے اتار تو دو۔“

بدرو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بڑی مشکل سے نیچے اتارا۔ میں سخت متحیر تھا۔ پچھلی نشست پر جاتے ہوئے میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔

”کیا بات ہے

”یہ خود نہیں اتر سکتیں؟“

بدرو نے جواب دیا۔

”جی نہیں۔ ان کی آنکھیں خراب ہیں۔ دکھائی نہیں دیتا۔“

اولاد

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹو اولاد

جب زبیدہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر پچیس برس کی تھی۔ اس کے ماں باپ تو یہ چاہتے تھے کہ سترہ برس کے ہوتے ہی اس کا بیاہ ہو جائے مگر کوئی مناسب و موزوں رشتہ ملتا ہی نہیں تھا۔ اگر کسی جگہ بات طے ہونے پاتی تو کوئی ایسی مشکل پیدا ہو جاتی کہ رشتہ عملی صورت اختیار نہ کر سکتا۔ آخر جب زبیدہ پچیس برس کی ہو گئی تو اس کے باپ نے ایک رنڈوے کا رشتہ قبول کر لیا۔ اس کی عمر پینتیس برس کے قریب قریب تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ صاحبِ روزگار تھا۔ مارکیٹ میں کپڑے کی تھوک فروشی کی دکان تھی۔ ہر ماہ پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا۔ زبیدہ بڑی فرماں بردار لڑکی تھی۔ اس نے اپنے والدین کا فیصلہ منظور کر لیا۔ چنانچہ شادی ہو گئی، اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ اس کا خاوند جس کا نام علم الدین تھا۔ بہت

شریف اور محبت کرنے والا ثابت ہوا۔ زبیدہ کی ہر آسائش کا خیال رکھتا۔ کپڑے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حالانکہ دوسرے لوگ اس کے لیے ترستے تھے۔ چالیس ہزار اور تھری بی کا لٹھا، شنوں اور دوگھوڑے کی بوسکی کے تھانوں کے تھان زبیدہ کے پاس موجود تھے۔ وہ اپنے میکے ہر ہفتے جاتی۔ ایک دن وہ گئی تو اس نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بین کرنے کی آواز سنی۔ اندر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کے باعث مر گیا ہے۔ اب زبیدہ کی ماں اکیلی رہ گئی تھی۔ گھر میں سوائے ایک نوکر کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ اسے اجازت دے کہ وہ اپنی بیوہ ماں کو اپنے پاس بُلا لے۔ علم الدین نے کہا

”اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تمہارا گھر ہے اور تمہاری ماں میری ماں۔ جاؤ انہیں لے آؤ۔ جو سامان وغیرہ ہو گا اس کو یہاں لانے کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں“

زبیدہ بہت خوش ہوئی۔ گھر کافی بڑا تھا۔ دو تین کمرے خالی پڑے تھے۔ وہ تانگے میں گئی اور اپنی ماں کو ساتھ لے آئی۔ علم الدین نے سامان اٹھوانے کا بندوبست کر دیا تھا، چنانچہ وہ بھی پہنچ گیا۔ زبیدہ کی ماں کے لیے کچھ سوچ بچار کے بعد ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔ وہ بہت ممنون و متشکر تھی۔ اپنے داماد کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر۔ اس کے جی میں کئی مرتبہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنا سارا زیور جو کئی ہزاروں کی مالیت کا تھا، اس کو دے دے کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائے اور زیادہ کمائے۔ مگر وہ طبعاً کنجوس تھی۔ ایک دن اس نے اپنی بیٹی سے کہا

”مجھے یہاں آئے دس مہینے ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ حالانکہ تمہارے مرحوم باپ کے چھوڑے ہوئے دس ہزار روپے میرے پاس موجود ہیں۔ اور زیور الگ“

زبیدہ انگیٹھی کے کوئلوں پر پھلکا سینک رہی تھی

”ماں، تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو“

”کیسی ویسی میں نہیں جانتی۔ میں نے یہ سب روپے علم الدین کو دے دیے ہوتے، مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کوئی بچہ پیدا ہو۔ تو یہ سارا روپیہ اس کو تحفے کے طور پر دُوں۔“

زبیدہ کی ماں کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا۔ شادی ہوئے قریب قریب دو برس ہو چکے تھے، مگر بچے کی پیدائش کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔ وہ اسے کئی حکیموں کے پاس لے گئی۔ کئی معجونیں، کئی سفوف، کئی قرص اس کو کھلوائے، مگر خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ آخر اس نے پیروں فقیروں سے رجوع کیا۔ ٹونے ٹوٹکے استعمال کیے گئے، تعویذ، دھاگے بھی۔ مگر مراد بر نہ آئی۔ زبیدہ۔ اس دوران میں تنگ آ گئی۔ ایک دن چنانچہ اس نے اُکتا کر اپنی ماں سے کہہ دیا

”چھوڑو اس قصّے کو۔ بچہ نہیں ہوتا تو نہ ہو۔“

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا

”بیٹا۔ یہ بہت بڑا قصّہ ہے۔ تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ اسی سے تو انسان کی زندگی کا باغ سدا ہرا بھرا رہتا ہے“

زبیدہ نے پھلکا چنگیر میں رکھا

”میں کیا کروں۔ بچہ پیدا نہیں ہوتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے“

بڑھیا نے کہا

”قصور کسی کا بھی نہیں بیٹی۔ بس صرف ایک اللہ کی مہربانی چاہیے“

زبیدہ اللہ میاں کے حضور ہزاروں مرتبہ دُعائیں مانگ چکی تھی کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس کی گود ہری کرے، مگر اس کی ان دُعاؤں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ جب اس کی ماں نے ہر روز اس سے بچے کی پیدائش کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں، تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ بنجر زمین ہے، جس میں کوئی پودا اُگ ہی نہیں سکتا۔ راتوں کو وہ عجیب عجیب سے خواب دیکھتی۔ بڑے اوٹ پٹانگ قسم کے۔ کبھی یہ دیکھتی کہ وہ لق و دق صحرا میں کھڑی ہے اس کی گود میں ایک گُل گوتھنا سا بچہ ہے، جسے وہ ہوا میں اتنے زور سے اچھالتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ دیکھتی کہ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہے جو ننھے منے بچوں کے زندہ اور متحرک گوشت سے بنا ہے۔ ایسے خواب دیکھ دیکھ کر اس کا دل و دماغ غیر متوازن ہو گیا۔ بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں بچوں کے رونے کی آواز آنے لگی، اور وہ اپنی ماں سے کہتی

”یہ کس کا بچہ رو رہا ہے؟“

اس کی ماں نے اپنے کانوں پر زور دے کر یہ آواز سننے کی کوشش کی، جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے کہا

”کوئی بچہ رو نہیں رہا۔“

”نہیں ماں۔ رو رہا ہے۔ بلکہ رو رو کے ہلکان ہوئے جا رہا ہے“

اس کی ماں نے کہا

”یا تو میں بہری ہو گئی ہوں، یا تمہارے کان بجنے لگے ہیں“

زبیدہ خاموش ہوگئی، لیکن اس کے کانوں میں دیر تک کسی نوزائیدہ بچے کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس کو کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر رہا ہے۔ اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے نہ کیا۔ لیکن جب وہ اندر اپنے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے گئی تو اس نے قمیص اٹھا کر دیکھا کہ اس کی چھاتیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ بچے کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں اکثر ٹپکتی رہی۔ لیکن وہ اب سمجھ گئی تھی کہ یہ سب واہمہ ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ پر مسلسل ہتھوڑے پڑتے رہے ہیں کہ اس کے بچہ کیوں نہیں ہوتا اور وہ خود بھی بڑی شدت سے وہ خلا محسوس کرتی ہے، جو کسی بیاہی عورت کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اب بہت اُداس رہنے لگی۔ محلے میں بچے شور مچاتے تو اس کے کان پھٹنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا کہ باہر نکل کر ان سب کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کے شوہر علم الدین کو اولاد و لاد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے بیوپار میں مگن تھا۔ کپڑے کے بھاؤ روز بروز چڑھ رہے تھے۔ آدمی چونکہ ہوشیار تھا، اس لیے اس نے کپڑے کا کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اب اس کی ماہانہ آمدن پہلے سے دوگنا ہوگئی تھی۔ مگر اس آمدن کی زیادتی سے زبیدہ کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جب اس کا شوہر نوٹوں کی گڈی اس کو دیتا، تو اسے اپنی جھولی میں ڈال کر دیر تک انہیں لوری دیتی رہتی۔ پھر وہ انہیں اٹھا کر کسی خیالی جھولنے میں بٹھا دیتی۔ ایک دن علم الدین نے دیکھا کہ وہ نوٹ جو اس نے اپنی بیوی کو لا کر دیے تھے، دودھ کی پتیلی میں پڑے ہیں۔ وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے یہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ اس نے زبیدہ سے پوچھا

”یہ نوٹ دودھ کی پتیلی میں کس نے ڈالے ہیں؟“

زبیدہ نے جواب دیا۔

”بچے بڑے شریر ہیں، یہ حرکت انہی کی ہوگی“

علم الدین بہت متحیر ہوا

”لیکن یہاں بچے کہاں ہیں؟“

زبیدہ اپنے خاوند سے کہیں زیادہ متحیر ہوئی

”کیا ہمارے ہاں بچے نہیں۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی اسکول سے واپس آتے ہوں گے۔ ان سے پوچھوں گی کہ یہ حرکت کس کی تھی“

علم الدین سمجھ گیا۔ اس کی بیوی کے دماغ کا توازن قائم نہیں۔ لیکن اس نے اپنی ساس سے اس کا ذکر نہ کیا کہ وہ بہت کمزور عورت تھی۔ وہ دل ہی دل میں زبیدہ کی دماغی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ مگر اس کا علاج اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ لیا۔ ان میں سے چند نے اس سے کہا کہ پاگل خانے میں داخل کرادو۔ مگر اس کے خیال ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔ اس نے دکان پر جانا چھوڑ دیا۔ سارا وقت گھر رہتا اور زبیدہ کی دیکھ بھال کرتا کہ مبادا وہ کسی روز کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔ اس کے گھر پر ہر وقت موجود رہنے سے زبیدہ کی حالت کسی قدر دُرست ہوگئی، لیکن اس کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ دُکان کا کاروبار کون چلا رہا ہے۔ کہیں وہ آدمی جس کو یہ کام سپرد کیا گیا ہے، غبن تو نہیں کر رہا۔ اس نے چنانچہ کئی مرتبہ اپنے خاوند سے کہا

”دکان پر تم کیوں نہیں جاتے؟“

علم الدین نے اس سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔

”جانم۔ میں کام کر کے تھک گیا ہوں، اب تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں“

”مگر دکان کس کے سپرد ہے؟“

”میرا نوکر ہے۔ وہ سب کام کرتا ہے“

”کیا ایماندار ہے؟“

”ہاں، ہاں۔ بہت ایماندار ہے۔ دمڑی دمڑی کا حساب دیتا ہے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو“

زبیدہ نے بہت متفکر ہو کر کہا

”مجھے کیوں فکر نہ ہوگی بال بچے دار ہوں۔ مجھے اپنا تو کچھ خیال نہیں، لیکن ان کا تو ہے۔ یہ آپ کا نوکر اگر آپ کا روپیہ مار گیا تو یہ سمجھیے کہ بچوں۔“

علم الدین کی آنکھوں میں آنسو آگئے

”زبیدہ۔ ان کا اللہ مالک ہے۔ ویسے میرا نوکر بہت وفادار ہے اور ایماندار ہے۔ تمہیں کوئی تردّد نہیں کرنا چاہیے۔“

”

مجھے تو کسی قسم کا تردّد نہیں ہے، لیکن بعض اوقات ماں کو اپنی اولاد کے متعلق سوچنا ہی پڑتا ہے“

علم الدین بہت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ زبیدہ سارا دن اپنے خیالی بچوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ ان کی جُرابیں دھوتی، ان کے لیے اُونی سویٹر بُنتی۔ کئی بار اس نے اپنے خاوند سے کہہ کر مختلف سائز کی چھوٹی چھوٹی سینڈلیں منگوائیں، جنہیں وہ ہر صبح پالش کرتی تھی۔ علم الدین یہ سب کچھ دیکھتا اور اس کا دل رونے لگتا۔ اور وہ سوچتا کہ شاید اس کے گناہوں کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ یہ گناہ کیا تھے، اس کا علم، علم الدین کو نہیں تھا۔ ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملا جو بہت پریشان تھا۔ علم الدین نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کیا، تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک لڑکی سے معاشقہ ہو گیا تھا۔ اب وہ حاملہ ہو گئی۔ اسقاط کے تمام ذرائع استعمال کیے گئے ہیں، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ علم الدین نے اس سے کہا

”دیکھو، اسقاط وسقاط کی کوشش نہ کرو۔ بچہ پیدا ہونے دو۔“

اس کے دوست نے جسے ہونے والے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، کہا

”میں بچے کا کیا کروں گا؟“

”تم مجھے دے دینا“

بچہ پیدا ہونے میں کچھ دیر تھی۔ اس دوران میں علم الدین نے اپنی بیوی زبیدہ کو یقین دلایا کہ وہ حاملہ ہے اور ایک ماہ کے بعد اس کے بچہ پیدا ہو جائے گا۔ زبیدہ بار بار کہتی

”مجھے اب زیادہ اولاد نہیں چاہیے، پہلے ہی کیا کم ہے“

علم الدین خاموش رہتا۔ اس کے دوست کی داشتہ کے لڑکا پیدا ہوا، جو علم الدین نے زبیدہ کے پاس، جو کہ سو رہی تھی، لٹا دیا۔ اور اُسے جگا کر کہا

”زبیدہ، تم کب تک بے ہوش پڑی رہو گی۔ یہ دیکھو، تمہارے پہلو میں کیا ہے“

”زبیدہ نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ننھا منا بچہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، علم الدین نے اس سے کہا

”لڑکا ہے۔ اب خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پانچ بچے ہو گئے ہیں“

زبیدہ بہت خوش ہوئی

”یہ لڑکا کب پیدا ہوا؟“

”صبح سات بجے“

”اور مجھے اس کا علم ہی نہیں۔ میرا خیال ہے، درد کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی ہوں گی“

علم الدین نے کہا

”ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو گیا“

دوسرے روز جب علم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ لہولہان ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس کا کٹ تھروٹ استرا ہے۔ وہ اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔ علم الدین نے اس کے ہاتھ سے اُسترا چھین لیا،

”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“

زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا

”ساری رات بلکتا رہا ہے، لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترا۔ لعنت ہے ایسی۔“

اس سے آگے، وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ خُون سے لتھڑی ہوئی ایک اُنگلی اس نے بچے کے منہ کے ساتھ لگا دی، اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

ایک خط

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوایک خط

تمہارا طویل خط ملا جسے میں نے دو مرتبہ پڑھا۔ دفتر میں اس کے ایک ایک لفظ پر میں نے غور کیا۔ اور غالباً اسی وجہ سے اس روز مجھے رات کے دس بجے تک کام کرنا پڑا، اس لیے کہ میں نے بہت سا وقت اس غور و فکر میں ضائع کر دیا تھا۔ تم جانتے ہو اس سرمایہ پرست دنیا میں اگر مزدور مقررہ وقت کے ایک ایک لمحے کے عوض اپنی جان کے ٹکڑے تول کر نہ دے تو اسے اپنے کام کی اُجرت نہیں مل سکتی۔ لیکن یہ رونا رونے سے کیا فائدہ! شام کو عزیز صاحب، جن کے یہاں میں آج کل ٹھہرا ہوں۔ دفتر میں تشریف لائے اور کمرے کی چابیاں دے کر کہنے لگا۔

”میں ذرا کام سے کہیں جا رہا ہوں۔ شاید دیر میں آنا ہو۔ اس لیے تم میرا انتظار کیے بغیر چلے جانا۔“

لیکن پھر فوراً ہی چابیاں جیب میں ڈالیں اور فرمانے لگے:

”نہیں، تم میرا انتظار کرنا۔ میں دس بجے تک واپس آ جاؤں گا۔“

دفتری کام سے فارغ ہوا تو دس بج چکے تھے۔ سخت نیند آ رہی تھی۔ آنکھوں میں بڑی پیاری گدگدی ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کرسی پر ہی سو جاؤں۔ نیند کے غلبے کے اثر میں میں نے گیارہ بجے تک عزیز صاحب کا انتظار کیا مگر وہ نہ آئے۔ آخر کار تھک کر میں نے گھر کی راہ لی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ادھر ہی ادھر گھر چلے گئے ہوں گے اور آرام سے سو رہے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں تیسری منزل پر چڑھا اور جب اندھیرے میں دروازے کی کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آہنی تالے کی ٹھنڈک نے مجھے بتایا کہ عزیز صاحب ابھی تشریف نہیں لائے۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت میرے تھکے ہوئے اعضا سکون بخش نیند کی قربت محسوس کر کے اور بھی ڈھیلے ہو گئے، اور جب مجھے نا امیدی کا سامنا کرنا پڑا تو مضمحل ہو گئے۔ دیر تک چوبی سیڑھی کے ایک زینے پر زانوؤں میں دبائے عزیز صاحب کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئے۔ آخر کار تھک ہار کر میں اٹھا اور تین منزلیں اتر کر نیچے بازار میں آیا اور ایسے ہی ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے پل پر جا نکلا جس کے نیچے سے ریل گاڑیاں گزرتی ہیں۔ اس پُل کے پاس ہی ایک بڑا چوک ہے۔ یہاں تقریباً آدھ گھنٹے تک میں بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا اور سامنے نیم روشن بازار کو اس امید پر دیکھتا رہا کہ عزیز صاحب گھر کی جانب لوٹتے نظر آ جائیں گے۔ آدھ گھنٹے کے اس انتظار کے بعد میں نے دفعتاً سر اٹھا کر کھمبے کے اوپر دیکھا، بجلی کا قمقمہ میری ہنسی اڑا رہا تھا۔ جانے کیوں! تھکاوٹ اور نیند کے شدید غلبے کے باعث میری کمر ٹوٹ رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤں۔ بند دو کانوں کے تھڑے مجھے نشست پیش کر رہے تھے مگر میں نے ان کی دعوت قبول نہ کی چلتا چلتا پُل کی سنگین منڈیر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ کشادہ بازار بالکل خاموش تھا۔ آمد و رفت قریب قریب بند تھی، البتہ کبھی کبھی دُور سے موٹر کے ہارن کی رونی آواز خاموش فضا میں لرزش پیدا کرتی ہوئی اوپر کی طرف اُڑ جاتی تھی۔ میرے سامنے سڑک کے دو رویہ بجلی کے بلند کھمبے دُور تک پھیلے چلے گئے تھے جو نیند اور اس کے احساس سے عاری معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے روس کے مشہور شاعر میاتلف کی نظم کے چند اشعار یاد آ گئے۔ یہ نظم چراغ ہائے سرِ راہ سے معنون کی گئی ہے۔ میاتلف، سڑک کے کنارے جھلملاتی روشنیوں کو دیکھ کر کہتا ہے یہ ننھے چراغ، یہ ننھے سردار صرف اپنے لیے چمکتے ہیں جو کچھ یہ دیکھتے ہیں، جو کچھ یہ سنتے ہیں کسی کو نہیں بتاتے روسی شاعر نے کچھ درست ہی کہا ہے۔ میرے پاس ہی ایک گز کے فاصلے پر بجلی کا کھمبا گڑا تھا اور اس کے اوپر بجلی کا ایک شوخ چشم قمقمہ نیچے جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں مگر وہ میرے سینے کے تلاطم سے بے خبر تھا۔ اسے کیا معلوم مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ سگریٹ سُلگانے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو تمہارے وزنی لفافے پر پڑا۔ ذہن میں تمہارا خط پہلے ہی سے موجود تھا۔ چنانچہ میں نے لفافہ کھول کر بسنتی رنگ کے کاغذ نکال کر انھیں پڑھنا شروع کیا۔ تم لکھتے ہو:

”کبھی تم شیطان بن جاتے ہو اور کبھی فرشتہ نظر آنے لگتے ہو۔“

یہاں بھی دو تین حضرات نے میرے متعلق یہی رائے قائم کی ہے اور مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ میں واقعی دو سیر توں کا مالک ہو۔ اس پر میں نے اچھی طرح غور کیا ہے اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے: بچپن اور لڑکپن میں مَیں نے جو کچھ چاہا، وہ پورا نہ ہونے دیا گیا، یوں کہو کہ میری خواہشات کچھ اس طرح پوری کی گئیں کہ ان کی تکمیل میرے آنسوؤں اور میری ہچکیوں سے لپی ہُوئی تھی۔ میں شروع ہی سے جلد باز اور زُود رنج رہا ہوں۔ اگر میرا جی کسی مٹھائی کھانے کو چاہا ہے اور یہ چاہ عین وقت پر پوری نہیں ہوئی تو بعد میں میرے لیے اس خاص مٹھائی میں کوئی لذت نہیں رہی۔ ان امور کی وجہ سے میں نے ہمیشہ اپنے حلق میں ایک تلخی سی محسوس کی ہے اور اس تلخی کی شدت بڑھانے میں اس افسوسناک حقیقت کا ہاتھ ہے کہ میں نے جس سے محبت کی، جس کو اپنے دل میں جگہ دی، اس نے نہ صرف میرے جذبات کو مجروح کیا بلکہ میری اس کمزوری

”محبت“

سے زبردستی ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا۔ وہ مجھ سے دغا فریب کرتے رہے، اور لُطف یہ ہے کہ میں ان تمام دغا بازیوں کے احساس کے باوجود ان سے محبت کرتا رہا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنی ہر نئی چال کی کامیابی پر بہت مسرور ہوتے تھے کہ انھوں نے مجھے بے وقوف بنا لیا اور میری بے وقوفی دیکھو کہ میں سب کچھ جانتے ہوئے بے وقوف بن جاتا تھا۔ جب اس ضمن میں مجھے ہر طرف سے نا امیدی ہوئی، یعنی جس کسی کو میں نے دل سے چاہا، اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا تو میری طبیعت بجھ گئی اور میں نے محسوس کیا کہ ریگستان میں ایک بھونرے کے مانند ہوں جسے رس چوسنے کے لیے حد نظر تک کوئی پھول نظر نہیں آ سکتا لیکن اس کے باوجود محبت کرنے سے باز نہ رہا اور حسبِ معمول کسی نے بھی میرے اس جذبے کی قدر نہ کی۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور مجھے اپنے نام نہاد دوستوں کی بے وفائیاں اور سرد مہریاں یاد آنے لگیں تو میرے سینے کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ میرے جذباتی، سرمدی اور ناطق وجود میں ایک جنگ سی چھڑ گئی۔ ناطق وجود ان لوگوں کو ملعون و مطعون گردانتے ہوئے اور گزشتہ واقعات کی افسوسناک تصویر دکھاتے ہوئے اس بات کا طالب تھا کہ میں آئندہ سے اپنا دل پتھر کا بنا لوں اور محبت کو ہمیشہ کے لیے باہر نکال پھینکوں، لیکن جذباتی وجود ان افسوسناک واقعات کو دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہوئے مجھے فخر کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ میں نے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کی نظر میں ناکامیاں ہی کامیابیاں تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں محبت کیے جاؤں کہ یہی کائنات کی روحِ رواں ہے۔ تحت الشعور وجود اس جھگڑے سے میں بالکل تھلگ رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک نہایت ہی عجیب و غریب نیند کا غلبہ طاری ہے۔ یہ جنگ خدا جانے کس نامبارک روز شروع ہوئی کہ اب میری زندگی کا ایک

جزو بن کے رہ گئی ہے۔ دن ہو یا رات جب کبھی مجھے فرصت کے چند لمحات میسر آتے ہیں، میرے سینے کے چٹیل میدان پر میرا ناطق وجود اور جذباتی وجود ہتھیار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان لمحات میں جب ان دونوں کے درمیان لڑائی زوروں پر ہو، اگر میرے ساتھ کوئی ہم کلام ہو تو میرا لہجہ یقیناً کچھ اور قسم کا ہوتا ہے۔ میرے حلق میں ایک ناقابل بیان تلخی گھل رہی ہوتی ہے۔ آنکھیں گرم ہوتی ہیں اور جسم کا ایک ایک عضو بے کل ہوتا ہے۔ میں بہت کوشش کیا کرتا ہوں کہ اپنے لہجے کو درشت نہ ہونے دوں، اور بعض اوقات میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں۔ لیکن اگر میرے کانوں کو کوئی چیز سُنائی دے یا میں کوئی ایسی چیز محسوس کروں جو میری طبیعت کے یکسر خلاف ہے تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے سینے کی گہرائیوں سے جو کچھ بھی اٹھے، زبان کے راستے باہر نکل جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات جو الفاظ بھی ایسے موقع پر میری زبان پر آتے ہیں، بے حد تلخ ہوتے ہیں۔ ان کی تلخی اور درشتی کا احساس مجھے اس وقت کبھی نہیں ہوا۔ اس لیے کہ میں اپنے اخلاص سے ہمیشہ اور ہر وقت باخبر رہتا ہوں اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں نے اپنے ملنے والوں میں سے یا کسی دوست کو ناخوش کیا ہے تو اس کا باعث میں نہیں ہوں بلکہ یہ خاص لمحات ہیں جب میں دیوانے سے کم نہیں ہوتا یا تمہارے الفاظ میں

”شیطان“

ہوتا ہوں، گو یہ لفظ بہت سخت ہے اور اس کا اطلاق میری دیوانگی پر نہیں ہو سکتا۔ جب تمہارا پچھلے سے پچھلا خط موصول ہوا تھا، اس وقت میرا ناطق وجود جذباتی وجود پر غالب تھا اور میں اپنے دل کے نرم و نازک گوشت کو پتھر میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پہلے ہی سے اپنے سینے کی آگ میں پھنکا جا رہا تھا کہ اوپر سے تمہارے خط نے تیل ڈال دیا۔ تم نے بالکل درست کہا ہے

”تم درد مند دل رکھتے ہو، گو اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔“

میں اس کو اچھا کیوں نہیں سمجھتا۔ اس سوال کا جواب ہندوستان کا موجودہ انسانیت کش نظام ہے جس میں لوگوں کی جوانی پر بڑھاپے کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ میرا دل درد سے بھرا ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ میں علیل ہوں اور علیل رہتا ہوں۔ جب تک درد مندی میرے سینے میں موجود ہے، میں ہمیشہ بے چین رہوں گا۔ تم شاید اسے مبالغہ یقین کرو مگر یہ واقعہ ہے کہ درد مندی میرے لہو کی بوندوں سے اپنی خوراک حاصل کر رہی ہے، اور ایک دن ایسا آئے گا جب درد ہی درد رہ جائے گا اور تمہارا دوست دنیا کی نظروں سے غائب ہو جائے گا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ درد مندی کے اس جذبے نے مجھے کیسے کیسے بھیانک دُکھ پہنچائے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ میری جوانی کے دن بڑھاپے کی راتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور جب یہ سوچتا ہوں تو اس بات کا تہیّہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ مجھے اپنا دل پتھر بنا لینا چاہیے۔ لیکن افسوس ہے اس درد مندی نے مجھے اتنا کمزور بنا دیا ہے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا، اور چونکہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا اس لیے میری طبیعت میں عجیب و غریب کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ شعر میں اب بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا، اس لیے کہ شاعری سے مجھے بہت کم دلچسپی رہی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا کامل طور پر احساس ہے کہ میری طبیعت شاعری کی طرف مائل ہے۔ شہر میں بسنے والے لوگوں کی

”وزنی شاعری“

مجھے پسند نہیں۔ دیہات کے ہلکے پھلکے نغمے مجھے بے حد بھاتے ہیں۔ یہ اس قدر شفاف ہوتے ہیں کہ ان کے پیچھے دل دھڑکتے ہوئے نظر آ سکتے ہیں۔ تمہیں حیرت ہے کہ میں

”رومانی حزنیہ“

کیوں کر لکھنے لگا اور میں اس بات پر خود حیران ہُوں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے محسوسات کو دوسروں کی زبان میں بیان کر کے اپنا سینہ خالی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ

”ذہنی مفلس“

ہیں اور مجھے ان پر ترس آتا ہے۔ یہ ذہنی افلاس مالی افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں مالی مُفلس ہوں مگر خدا کا شکر ہے ذہنی مفلس نہیں ہوں، ورنہ میری مصیبتوں کی کوئی حد نہ ہوتی۔ مجھے یہ کتنا بڑا اطمینان ہے کہ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں، وہی اپنی زبان میں بیان کر لیتا ہوں۔ میں نے اپنے افسانوں کے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔ اگر ان میں کوئی چیز بقول تمہارے

”جلوہ گر“

ہے تو میرا بے کل باطن۔ میرا ایمان نہ تشدد پر ہے اور نہ عدم تشدد پر۔ دونوں پر ہے اور دونوں پر نہیں۔ موجودہ تغیر پسند ماحول میں رہتے ہوئے میرے ایمان میں استقلال نہیں رہا۔ آج میں ایک چیز کو اچھا سمجھتا ہوں لیکن دوسرے روز سورج کی روشنی کے ساتھ ہی اس چیز کی ہئیت بدل جاتی ہے۔ اس کی تمام اچھائیاں برائیاں بن جاتی ہیں۔ انسان کا علم بہت محدود ہے اور میرا علم محدود ہونے کے علاوہ منتشر بھی ہے۔ ایسی صورت میں تمہارے اس سوال کا جواب میں کیوں کر دے سکتا ہوں!

”مجھ“

پر مضمون لکھ کر کیا کرو گے پیارے! میں اپنے قلم کی مقراض سے اپنا لباس پہلے ہی تار تار کر چکا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اور ننگا کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میرے چہرے سے اگر تم نے نقاب اٹھا دی تو تم دنیا کو ایک بہت ہی بھیانک شکل دکھاؤ گے۔ میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوں جس پر میرا قلم کبھی کبھی پتلی جھلی منڈھتا رہتا ہے۔ اگر تم نے جھلیوں کی یہ تہہ ادھیڑ ڈالی تو میرا خیال ہے جو ہیبت تمہیں منہ کھولے نظر آئے گی، اسے دیکھنے کی تاب تم خود میں نہ پاؤ گے۔ میری کشمیر کی زندگی، ہائے میری کشمیر کی زندگی! مجھے معلوم ہے تمہیں میری زندگی کے اس خوشگوار ٹکڑے کے متعلق مختلف قسم کی باتیں معلوم ہوتی رہی ہیں۔ یہ باتیں جن لوگوں کے ذریعے تم تک پہنچتی ہیں، ان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لیے تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کو سن کر ابھی تک کوئی صحیح رائے مرتب نہیں کر سکے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ کہنے کے باوجود تم نے ایک رائے مرتب کی اور ایسا کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔ اگر تم میری تمام تحریروں کو پیش نظر رکھ لیتے تو تمہیں یہ غلط فہمی ہر گز نہ ہوتی کہ میں کشمیر میں ایک سادہ لوح لڑکی سے کھیلتا رہا ہوں۔ میرے دوست تم نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے۔ وزیر کون تھی۔ اس کا جواب مختصر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دیہاتی لڑکی تھی۔ جوان اور پوری جوان! اس پہاڑی لڑکی کے متعلق جس نے میری کتاب زندگی کے کچھ اوراق پر چند حسین نقوش بنائے ہیں۔ میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ میں نے وزیر کو تباہ نہیں کیا۔ اگر

”تباہی“

سے تمہاری مراد

”جسمانی تباہی“

ہے تو وہ پہلے ہی سے تباہ شدہ تھی، اور وہ اسی تباہی میں اپنی مسرت کی جستجو کرتی تھی۔ جوانی کے نشے میں مخمور اس نے اس غلط خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دے رکھی تھی کہ زندگی کا اصل حظ اور لطف اپنا خون کھولانے میں ہے، اور وہ اس غرض کے لیے ہر وقت ایندھن چنتی رہتی تھی۔ یہ تباہ کن خیال اس کے دماغ میں کیسے پیدا ہوا اس کے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ ہماری صنف میں ایسے افراد کی کمی نہیں جن کا کام صرف بھولی بھالی لڑکیوں سے کھیلنا ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا اپنا خیال ہے وزیر اس چیز کا شکار تھی جسے تہذیب و تمدن کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے جو شہروں کے شور و شر سے بہت دور ہمالیہ کی گود میں آباد ہے، اور اب تہذیب و تمدن کی بدولت شہروں سے اس کا تعارف کرا دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں شہروں کی گندگی اس جگہ منتقل ہونا شروع ہو گئی ہے۔ خالی سلیٹ پر تم جو کچھ بھی لکھو گے، نمایاں طور نظر آئے گا۔ اور صاف پڑھا جائے گا۔ وزیر کا سینہ بالکل خالی تھا۔ دنیوی خیالات سے پاک اور صاف لیکن تہذیب کے کھردرے ہاتھوں نے اس پر نہایت بھدے نقش بنا دیے تھے جو مجھے اس کی غلط روش کا باعث نظر آتے ہیں۔ وزیر کا مکان یا جھونپڑا سڑک کے اوپر کی ڈھلان میں واقع تھا اور میں اس کی ماں کے کہنے پر ہر روز اس سے ذرا اوپر چیڑ کے درختوں کی چھاؤں میں زمین پر دری بچھا کر کچھ لکھا پڑھا کرتا تھا اور عام طور پر وزیر میرے پاس ہی اپنی بھینس چرایا کرتی تھی۔ چونکہ ہوٹل سے ہر روز دری اُٹھا کر لانا اور پھر اسے واپس لے جانا میرے جیسے آدمی کے لیے ایک عذاب تھا، اس لیے میں اسے ان کے مکان ہی میں چھوڑ جاتا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مجھے غسل کرنے میں دیر ہو گئی اور میں ٹہلتا ٹہلتا پہاڑی کے دشوار گزار راستوں کو طے کر کے جب ان کے گھر پہنچا اور دری طلب کی تو اس کی بڑی بہن کی زبانی معلوم ہوا کہ وزیر دری لے کر اوپر چلی گئی ہے۔ یہ سُن کر میں اور اوپر چڑھا اور جب اس بڑے پتھر کے قریب آیا جسے میں میز کے طور پر استعمال کرتا تھا تو میری نگاہیں وزیر پر پڑیں۔ دری اپنی جگہ بچھی ہوئی تھی اور وہ اپنا سبز کلف لگا دوپٹہ تانے سو رہی تھی۔ میں دیر تک پتھر پر بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ سونے کا بہانہ کر کے لیٹی ہے شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسے جگانے کی کوشش کروں گا اور وہ گہری نیند کا بہانہ کر کے جاگنے میں دیر کرے گی۔ لیکن میں خاموش بیٹھا رہا بلکہ اپنے چرمی تھیلے سے ایک کتاب نکال کر اس کی طرف پیٹھ کر کے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ جب نصف گھنٹہ اسی طرح گزر گیا تو وہ مجبور ہو کر بیدار ہُوئی۔ انگڑائی لے کر اس نے عجیب سی آواز منہ سے نکالی۔ میں نے کتاب بند کر دی اور مڑ کر اس سے کہا:

”میرے آنے سے تمہاری نیند تو خراب نہیں ہوئی؟“

وزیر نے آنکھیں مل کر لہجے کو خواب آلود بناتے ہوئے کہا:

”آپ کب آئے تھے؟“

”ابھی ابھی آ کے بیٹھا ہوں۔ سونا ہے تو سو جاؤ۔“

”نہیں۔ آج نگوڑی نیند کو جانے کیا ہو گیا۔ کمر سیدھی کرنے کے لیے یہاں ذری کی ذری لیٹی تھی کہ بس سو گئی۔ دو گھنٹے سے کیا کم سوئی ہوں گی۔“

اس کے گیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے جو کچھ باہر جھانک رہا تھا، اس کو میرا قلم بیان کرنے سے عاجز ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت اس کے دل میں یہ احساس کروٹیں لے رہا تھا کہ اس کے سامنے ایک مرد بیٹھا ہے اور وہ عورت ہے۔ جوان عورت۔ شباب کی امنگوں کا ابلتا ہوا چشمہ! تھوڑی دیر کے بعد وہ غیر معمولی باتونی بن گئی اور بہک سی گئی۔ مگر میں نے اس کی بھینس اور بچھڑے کا ذکر چھیڑنے کے بعد ایک دلچسپ کہانی سنائی جس میں ایک بچھڑے سے اس کی ماں کی الفت کا ذکر تھا۔ اس سے اس کی آنکھوں میں وہ شرارے سرد ہو گئے جو کچھ پہلے لپک رہے تھے۔ میں زاہد نہیں ہوں، اور نہ میں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا ہے۔ گناہ و ثواب اور سزا و جزا کے متعلق میرے خیالات دوسروں سے جدا ہیں

اور یقیناً تمہارے خیالات سے بھی بہت مختلف ہیں۔ میں اس وقت ان بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتا اس لیے کہ اس کے لیے سکون قلب اور وقت درکار ہے۔ بر سبیل تذکرہ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے تم میرے خیالات کے متعلق کچھ اندازہ لگا سکو گے۔ باتوں باتوں میں ایک مرتبہ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ حُسن اگر پورے شباب اور جوبن پر ہو تو وہ دلکشی کھو دیتا ہے۔ مجھے اب بھی اس خیال پر ایمان ہے۔ مگر میرے دوست نے اسے مہمل منطق قرار دیا۔ ممکن ہے تمہاری نگاہ میں بھی یہ مہمل ہو۔ مگر میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ اس حُسن نے میرے دل کو اپنی طرف راغب نہیں کیا جو پورے شباب پر ہو۔ اس کو دیکھ کر میری آنکھیں ضرور چندھیا جائیں گی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس حسن نے اپنی تمام کیفیتیں میرے دل و دماغ پر طاری کر دی ہیں۔ شوخ اور بھڑکیلے رنگ اس بلندی تک کبھی نہیں جا سکتے جو نرم و نازک الوان و خطوط کو حاصل ہے۔ وہ حسن یقیناً قابل احترام ہے جو آہستہ آہستہ نگاہوں میں جذب ہو کر دل میں اُتر جائے۔ روشنی کا خیرہ کن شعلہ دل کے بجائے اعصاب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن اس فضول بحث میں پڑنے سے کیا فائدہ۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں زاہد نہیں ہوں، یہ کہتے وقت میں دبی زبان میں بہت سی چیزوں کا اعتراف بھی کر رہا ہوں لیکن اس پہاڑی لڑکی سے جو جسمانی لذتوں کی دلدادہ تھی، میرے تعلقات صرف ذہنی اور روحانی تھے۔ میں نے شاید تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں اس بات کا قائل ہُوں کہ اگر عورت سے دوستی کی جائے تو اس کے اندر نُدرت ہونی چاہیے۔ اس سے اس طرح ملنا چاہیے کہ وہ تمہیں دوسروں سے بالکل علیحدہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے اسے تمہارے دل کی ہر دھڑکن میں ایسی صدا سُنائی دے جو اس کے کانوں کے لیے نئی ہو۔ عورت اور مرد۔ اور ان کا باہمی رشتہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ لیکن معاف کرنا یہ رشتہ میری نظروں میں فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس میں یکسر حیوانیت ہے۔ میں پوچھتا ہوں اگر مرد کو اپنی محبت کا مرکز کسی عورت ہی کو بنانا ہے تو وہ انسانیت کے اس مقدس جذبے میں حیوانیت کو کیوں داخل کرے۔ کیا اس کے بغیر محبت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ کیا جسم کی مشقت کا نام محبت ہے؟ وزیر اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ جسمانی لذتوں کا نام محبت ہے اور میرا خیال ہے جس مرد سے بھی وہ ملتی تھی، وہ محبت کی تعریف انہی الفاظ میں بیان کرتی تھی۔ میں اس سے ملا اور اس کے تمام خیالات کی ضد بن کر میں نے اس سے دوستی پیدا کی۔ اس نے اپنے شوخ رنگ خوابوں کی تعبیر میرے وجود میں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اسے مایوسی ہوئی۔ لیکن چونکہ وہ غلط کار ہونے کے ساتھ ساتھ معصوم تھی، میری سیدھی سادھی باتوں نے اس مایوسی کو حیرت میں تبدیل کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کی یہ حیرت اس خواہش کی شکل اختیار کر گئی کہ وہ اس نئی رسم و راہ کی گہرائیوں سے واقفیت حاصل کرے۔ یہ خواہش یقیناً ایک مقدس معصومیت میں تبدیل ہو جاتی اور وہ اپنی نسوانیت کا وقارِ رفتہ پھر سے حاصل کر لیتی جسے وہ غلط راستے پر چل کر کھو بیٹھی تھی، لیکن افسوس ہے مجھے اس پہاڑی گاؤں سے دفعتہً پُرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے شہر واپس آنا پڑا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتی ہے۔ کیوں۔ اس لیے کہ رخصت ہوتے وقت اس کی سدا متبسم آنکھوں میں دو چھلکتے آنسو بتا رہے تھے کہ وہ میرے جذبے سے کافی متاثر ہو چکی ہے اور حقیقی محبت کی ایک ننھی سی شعاع اس کے سینے کی تاریکی میں داخل ہو چکی ہے۔ کاش! میں وزیر کو محبت کی تمام عظمتوں سے روشناس کرا سکتا اور کیا پتہ ہے کہ یہ پہاڑی لڑکی مجھے وہ چیز عطا کر دیتی جس کی تلاش میں میری جوانی بڑھاپے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ ہے میری داستان جس میں بقول تمہارے لوگ اپنی دلچسپی کا سامان تلاش کرتے ہیں۔ تم نہیں سمجھتے، اور نہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں یہ داستانیں کیوں لکھتا ہوں۔ پھر کبھی سمجھاؤں گا۔

ایک زاہدہ، ایک فاحشہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوایک زاہدہ، ایک فاحشہ

جاوید مسعود سے میرا اتنا گہرا دوستانہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اُس کی مرضی کے خلاف اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ پر نثار تھا میں اُس پر ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ ساتھ رہتے۔ وہ اپنے رشتے داروں سے خوش نہیں تھا اس لیے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی بُرائی کرتا اور کہتا سگ باش برادر خورد باش۔ اور کبھی کبھی گھنٹوں خاموش رہتا، جیسے خلاء میں دیکھ رہا ہے میں اُس کے اِن لمحات سے تنگ آ کر جب زور سے پکارتا

”جاوید یہ کیا بے ہودگی ہے۔“

وہ ایک دم چونکتا اور معذرت کرتا اوہ۔ سعادت بھائی معاف کرنا۔ اچھا تو پھر کیا ہوا“

وہ اُس وقت بالکل خالی الذہن ہوتا۔ میں کہتا

”بھئی جاوید دیکھو۔ مجھے تمہارا یہ وقتاً فوقتاً معلوم نہیں کن گہرائیوں میں کھو جانا بالکل پسند نہیں۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ ایک دن تم پاگل ہو جاؤ گے۔ یہ سُن کر جاوید بہت ہنسا

”پاگل ہونا بہت مشکل ہے سعادت“

لیکن آہستہ آہستہ اُس کا خلائیں دیکھنا بڑھتا گیا اور اُس کی خاموشی طویل سکوت میں تبدیل ہو گئی اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت کھیلتی رہتی تھی بالکل پھیکی پڑ گئی۔ میں نے ایک دن اُس سے پوچھا آخر بات کیا ہے تم ٹھہرے پانی بن گئے ہو۔ ہوا کیا ہے تمھیں؟۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ خدا کے لیے مجھ سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ۔“

جاوید خاموش رہا۔ جب میں نے اُس کو بہت لعن طعن کی تو اُس نے اپنی زُبان کھولی۔

”میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔ اُس وقت تمھیں جو پوچھنا ہو گا بتا دوں گا۔ وعدے کے مطابق وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے حد خوبصورت۔ اُس میں نسوانیت کی جھلک تھی۔ پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے میں آوارہ گرد تھا لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا جب میں نے اُس کو سگریٹ پیش کیا تو اس نے مجھ سے کہا

”تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے؟ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں روگ ہے یا سوگ، بہر حال تم نارمل حالت میں نہیں ہو۔ تمھیں کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور ہے“

وہ مسکرایا،

”ہے۔ اس لیے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے“

محبت!۔ میں بوکھلا گیا۔ جاوید کی عمر بمشکل اٹھارہ برس کی ہو گی۔ خود ایک خوبرو لڑکی کے مانند اُس کو کس لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے، یا ہو گئی ہے، وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شرمیلا اور لچکیلا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا، تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک دہقانی دوشیزہ ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقیہ فلم دیکھا ہے۔ آج وہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے مگر اس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کر فکر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر میں نے پوچھا، کس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے تمھیں؟“

اُس نے کوئی جھینپ محسوس نہ کی

”ایک لڑکی ہے زاہدہ۔ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے، بس اُس سے محبت ہو گئی ہے عمر سولہ برس کے قریب ہے بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی۔ چوری چھپے اُس سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں اُس نے میری محبت قبول کر لی ہے“

میں نے اُس سے پوچھا

”تو پھر اس اُداسی کا مطلب کیا ہے جو تم پر ہر وقت چھائی رہتی ہے“

اُس نے مسکرا کر کہا

”سعادت تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو۔ محبت اُداسی کا دوسرا نام ہے۔ ہر وقت آدمی کھویا کھویا سا رہتا ہے اُس لیے کہ اس کے دل و دماغ میں صرف خیالِ یار ہوتا ہے۔ میں نے زاہدہ سے تمہارا ذکر کیا اور اُس سے کہا کہ تمہارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست سعادت ہے“

”یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بس، میں نے کہہ دیا۔ اور زاہدہ نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ میں تمھیں اُس سے ملاؤں۔ اُسے میری وہ چیز پسند ہے جسے میں پسند کرتا ہوں۔ بولو، چلو گے اپنی بھابی کو دیکھنے“

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں اُس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر لفظ بھابی سجتا نہیں تھا۔

”میری بات کا جواب دو“

میں نے سرسری طور پر کہہ دیا چلیں گے۔ ضرور چلیں گے۔ پر کہاں؟“

”اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ کل وہ شام کو پانچ بجے کسی بہانے سے لارنس گارڈن آئے گی۔ آپ اپنے پیارے دوست کو ضرور ساتھ لائیے گا۔ اب تم کل تیار رہنا۔ بلکہ خود ہی پانچ بجے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا۔ ہم جم خانہ کلب کے اُس طرف لان میں تمہارا انتظار کرتے ہوں گے۔“

میں انکار کیسے کرتا، اس لیے کہ مجھے جاوید سے بے حد پیار تھا میں نے وعدہ کر لیا لیکن مجھے اس پر کچھ ترس آ رہا تھا میں نے اُس سے اچانک پوچھا

”لڑکی شریف اور پاکباز ہے نا“

جاوید کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ میں زاہدہ کے بارے میں ایسی باتیں سوچ سکتا ہوں نہ سُن سکتا ہوں۔ تمھیں اگر اُس سے ملنا ہے تو کل شام کو ٹھیک پانچ بجے لارنس گارڈن پہنچ جانا۔ خدا حافظ“

جب وہ ایک دم اُٹھ کر چلا گیا تو میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے کیوں اُس سے ایسا سوال کیا جس سے اُس کے جذبات مجروح ہوئے۔ آخر وہ اُس سے محبت کرتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی کسی سے محبت کرے تو ضروری نہیں وہ بدکردار ہو۔ جاوید مجھے اپنا مخلص ترین دوست یقین کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود مجھ سے برہم نہ ہوا اور مجھ کو جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ شام کو لارنس گارڈن آئے۔ میں سوچتا تھا کہ زاہدہ سے مل کر میں اُس سے کس قسم کی باتیں کروں گا بے شمار باتیں میرے ذہن میں آئیں لیکن وہ اس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ سے کی جائیں میرے متعلق خدا معلوم وہ اس سے کیا کچھ کہہ چکا تھا۔ یقیناً اُس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ طور پر کیا ہو گا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زاہدہ کے دل میں میری طرف سے حسد پیدا ہو گیا ہو کیونکہ عورتیں اپنے عاشقوں کی محبت بٹتے نہیں دیکھ سکتیں۔ شاید میرا مذاق اڑنے کے لیے اس نے جاوید سے کہا ہو کہ

تم مجھے اپنے پیارے دوست سے ضرور ملاؤ۔ بہر حال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا۔ اُس تقریب پر میں نے سوچا، کوئی تحفہ تو لے جانا چاہیے۔ رات بھر غور کرتا رہا آخر ایک تحفہ سمجھ میں آیا کہ سونے کے ٹاپس ٹھیک رہیں گے انار کلی میں گیا تو سب دکانیں بند، معلوم ہوا کہ اتوار کی تعطیل ہے۔ لیکن ایک جوہری کی دکان کھلی تھی۔ اُس سے ٹاپس خریدے اور واپس گھر آیا۔ چار بجے تک شش و پنج میں مبتلا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکیوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا میں عادی نہیں تھا، اس لیے مجھ پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر سونا چاہا مگر کروٹیں بدلتا رہا ٹاپس میرے تکیے کے نیچے پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں۔ اُٹھا۔ غسل کیا۔ اس کے بعد شیو۔ پھر نہایا اور کپڑے بدل کر بڑے کمرے میں کلاک کی ٹک ٹک سننے لگا۔ تین بج چکے تھے۔ اخبار اُٹھایا۔ مگر اُس کی ایک خبر بھی نہ پڑھ سکا۔ عجب مصیبت تھی۔ عشق میرا دوست جاوید کر رہا تھا اور میں ایک قسم کا مجنوں بن گیا تھا۔ میرا بہترین سُوٹ رینکن کا سِلا ہوا میرے بدن پر تھا۔ رومال نیا۔ شو بھی نئے۔ میں نے یہ سنگھار اس لیے کیا تھا کہ جاوید نے جو تعریف کے پل زاہدہ کے سامنے باندھے ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ ساڑھے چار بجے میں اُٹھا اپنی ریلے کی سبز سائیکل لی اور آہستہ آہستہ لارنس گارڈن روانہ ہو گیا جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں مجھے جاوید دکھائی دیا وہ اکیلا تھا اُس نے زور کا نعرہ بلند کیا میں جب سائیکل پر سے اُترا تو وہ میرے ساتھ چمٹ گیا، کہنے لگا

”تم پہلے ہی پہنچ گئے بہت اچھا کیا۔ زاہدہ اب آتی ہی ہو گی۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ میں اپنی کار بھیج دُوں گا مگر وہ رضا مند نہ ہوئی۔ تانگے میں آئے گی۔ جاوید کے باپ کی ایک کار تھی۔ بے بی آسٹن، خدا معلوم کس صدی کا موڈل تھا زیادہ تر یہ جاوید ہی کے استعمال میں آتی تھی۔ لارنس گارڈن میں داخل ہوتے وقت یہ عجوبۂ روز گار موٹر دیکھ لی تھی۔ میں نے اُس سے کہا

”آؤ بیٹھ جائیں“

لیکن وہ رضا مند نہ ہوا مجھ سے کہنے لگا

”تم ایسا کرو۔ باہر گیٹ پر جاؤ۔ ایک تانگہ آئے گا جس میں ایک دبلی پتلی لڑکی سیاہ برقع پہنے ہو گی تم تانگے والے کو ٹھہرا لینا اور اُس سے کہنا جاوید کا دوست سعادت ہوں۔ اُس نے مجھے تمہارے استقبال کے لیے بھیجا ہے۔“

نہیں جاوید۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں“

”لاحول ولا۔ جب تم نام بتا دو گے تو اُسے چوں کرنے کی بھی جرأت نہیں ہو گی۔ تمہاری جرأت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ یار، زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جسے بعد میں یاد کر کے آدمی محظوظ ہو سکے۔ جب زاہدہ سے میری شادی ہو جائے گی تو ہم آج کے اس واقعے کو یاد کر کے خوب ہنسا کریں گے۔ جاؤ میرے بھائی۔ وہ بس اب آتی ہی ہو گی“

میں جاوید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادل نخواستہ چلا گیا اور گیٹ سے کچھ دُور کھڑا رہ کر اُس تانگے کا انتظار کرنے لگا جس میں زاہدہ اکیلی کالے برقعے میں ہو۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک تانگہ اندر داخل ہوا جس میں ایک لڑکی کالے ریشمی برقعے میں ملبوس پچھلی نشست پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ میں جھینپتا، سمٹتا ڈرتا آگے بڑھا اور تانگے والے کو روکا اُس نے فوراً اپنا تانگہ روک لیا میں نے اُس سے کہا یہ سواری کہاں سے آئی ہے“

تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا

”تمھیں اس سے کیا مطلب۔ جاؤ اپنا کام کرو“

برقع پوش لڑکی نے مہین سے آواز میں تانگے والے کو ڈانٹا

”تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی آپ نے تانگہ کیوں روکا تھا جناب“

میں ہلکا کے جواب دیا

”جاوید۔ جاوید۔ میں جاوید کا دوست سعادت ہوں۔ آپ کا نام زاہدہ ہے نا۔“

اُس نے بڑی نرمی سے جواب دیا جی ہاں!۔ میں آپ کے متعلق ان سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں۔ وہ اُدھر جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے تختے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے“

اُس نے اپنی نقاب اُٹھائی اچھی خاصی شکل صورت تھی مسکرا کر مجھ سے کہا

”آپ اگلی نشست پر بیٹھ جایئے مجھے ایک ضروری کام ہے ابھی چند منٹوں میں لوٹ آئیں گے آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس پر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا تانگہ اسمبلی ہال کے پاس سے گزرا تو میں نے تانگے والے سے کہا

”بھائی صاحب یہاں کوئی سگرٹ والے کی دُکان ہو تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر جانا میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ ذرا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگریٹ پان والا بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا۔ میں اُترا۔ تو زاہدہ نے کہا آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ یہ تانگے والا لے آئے گا۔“

میں نے کہا

”اس میں تکلیف کی کیا بات ہے

”اور اُس پان سگریٹ والے کے پاس پہنچ گیا ایک ڈبیہ گولڈ فلیک کی لی ایک ماچس اور دو پان جب پانچ کے نوٹ سے باقی پیسے لے کر مڑا تو کوچوان میرے پیچھے کھڑا تھا اُس نے دبی زبان میں مجھ سے کہا حضور اس عورت سے بچ کے رہیے گا۔“

میں بڑا حیران ہوا

”کیوں؟“

کوچوان نے بڑے وثوق سے کہا

”فاحشہ ہے۔ اس کا کام ہی یہی ہے کہ شریف اور نوجوان لڑکوں کو پھانستی رہے۔ میرے تانگے میں اکثر بیٹھتی ہے۔“

یہ سُن کر میرے اوسان خطا ہو گئے میں نے تانگے والے سے کہا

”خدا کے لیے تم اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے ہو کہہ دینا کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا اس لیے کہ میرا دوست وہاں لارنس گارڈن میں انتظار کر رہا ہے“

تانگے والا چلا گیا۔ معلوم نہیں اُس نے زاہدہ سے کیا کہا میں نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور سیدھا لارنس گارڈن پہنچا، دیکھا جاوید ایک خوبصورت لڑکی سے محو گفتگو ہے۔ بڑی شرمیلی اور لجیلی تھی میں جب پاس آیا تو اُس نے فوراً اپنے دوپٹہ سے منہ چھپا لیا۔ جاوید نے بڑی خفگی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا تم کہاں غارت ہو گئے تھے۔ تمہاری بھابی کب کی آئی بیٹھی ہیں۔“

سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں سخت بوکھلا گیا۔ اس بوکھلاہٹ میں یہ کہہ گیا

”تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں؟“

جاوید ہنسا مذاق نہ کرو مجھ سے۔ بیٹھ جاؤ اور اپنی بھابی سے باتیں کرو یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔“

میں بیٹھ گیا اور کوئی سلیقے کی بات نہ کر سکا اس لیے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت مسلط ہو گئی تھی جس کے متعلق تانگے والے نے مجھے بڑے خلوص سے بتا دیا تھا کہ فاحشہ ہے۔

(۲۸، مئی ۱۹۵۴ء(

ایکٹریس کی آنکھ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوایکٹریس کی آنکھ

”پاپوں کی گٹھڑی“

کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی، رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لیے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹریسیں سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دُور کرنے کے لیے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ ان پیالوں پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سُن کر کسی نووارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔ دراز قد وِلن جو شکل و صورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا، ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور منہ بھی نیم وا تھا۔ مگر وہ سو رہا تھا۔ اسی طرح اس کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا ایکٹر اونگھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کمپنی کے مکالمہ نویس یعنی منشی صاحب ہونٹوں میں بیڑی دبائے اور ٹانگیں، میک اپ ٹیبل پر رکھے، شاید وہ گیت بنانے میں مصروف تھے جو انھیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا۔

”اُوئی،

”اُوئی۔ ہائے۔ ہائے۔“

دفعتاً یہ آواز باہر سے اس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہُوئی۔ ولن صاحب جھٹ سے اُٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگی۔ مونچھوں والے ایکٹر کے لمبے لمبے کان ایک ارتعاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لیے تیار ہُوئے۔ منشی صاحب نے میک اپ ٹیبل پر سے اپنی ٹانگیں اُٹھالیں اور ولن صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

”اُوئی، اُوئی، اُوئی۔ ہائے۔ ہائے۔“

اس پر، ولن، منشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے، سب نے کاٹھ کے اس بکس نما کمرے سے اپنی گردنیں باہر نکالیں۔

”ارے، کیا ہے بھئی۔“

”خیر تو ہے“!

”کیا ہُوا؟“

”اماں، یہ تو۔ دیوی ہیں“!

”کیا بات ہے! دیوی؟“

جتنے منہ اتنی باتیں۔ کھڑکی میں سے نکلی ہُوئی ہر گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہُوئی اور ہر ایک کے منہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور استفسار کے ملے جلے جذبات کا اظہار ہوا۔

”ہائے، ہائے، ہائے۔ اُوئی۔ اُوئی“!

۔ دیوی، کمپنی کی ہر دلعزیز ہیروئن کے چھوٹے سے منہ سے چیخیں نکلیں اور باہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اس نے اپنے چپل پہنے پاؤں کو زور زور سے اسٹوڈیو کی پتھریلی زمین پر مارتے ہوئے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہُوا ڈیل، کھلتی ہوئی گندمی رنگت خوب خوب کالی کالی تیکھی بھنویں، کھلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکا۔ بال کالے بھونرا سے جو سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کنگھی کیے ہوئے تھے، ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے شہد کی بہت سی مکھیاں چھتے پر بیٹھی ہُوئی ہیں۔ کنارے دار سفید سوتی ساڑھی میں لپٹی ہُوئی، چولی گجراتی تراش کی تھی، بغیر آستینوں کے، جن میں سے جوبن پھٹا پڑتا تھا، ساڑھی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا۔ گول گول کلائیاں جن میں کھلی کھلی جاپانی ریشمین چوڑیاں کھنکنا رہی تھیں۔ ان ریشمین چوڑیوں میں ملی ہوئی ادھر ادھر ولایتی سونے کی پتلی پتلی کنگنیاں جھم جھم کر رہی تھیں، کان موزوں اور لویں بڑی خوبصورت کے ساتھ نیچے جھکی ہوئیں، جن میں ہیرے کے آویزے، شبنم کی دو تھراتی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔ چیختی چلاتی، اور زمین کو چپل پہنے پیروں سے کوٹتی، دیوی نے داہنی آنکھ کو ننھے سے سفید رومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

”ہائے میری آنکھ۔ ہائے میری آنکھ۔ ہائے“!

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں، پھر سے ہلنے لگیں۔

”آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے؟“

”یہاں کنکر بھی تو بیشمار ہیں۔ ہَوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔“

”یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے۔“

”اندر آجاؤ، دیوی۔“

”ہاں، ہاں، آؤ۔ آنکھ کو اس طرح نہ ملو۔“

”ارے بابا۔ بولا نہ تکلیف ہو جائیگی۔ تم اندر تو آؤ۔“

آنکھ ملتی ملتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی۔ ولن نے لپک کر تپائی پر سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں اور اپنی پُرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر جما دیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پھینک کر جیب سے ایک سگرٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔ دیوی اندر آئی۔ صوفے پر سے منشی صاحب اور ولن اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ منشی صاحب نے بڑھ کر کہا۔

”آؤ، دیوی یہاں بیٹھو۔“

دروازے کے پاس بڑی بڑی سیاہ و سفید مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے، ان کی مونچھوں کے لٹکے اور بڑھے ہوئے بال تھرتھرائے اور انھوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجہ میں کہا۔

”ادھر بیسو۔ “

دیوی ان کی تھرتھراتی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دیئے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی۔ ایک نوجوان نے جو ہیرو سے معلوم ہو رہے تھے اور پھنسی پھنسی قمیض پہنے ہوئے تھے، جھٹ سے ایک چوکی نما کرسی سرکا کر آگے بڑھادی اور دیوی نے اس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔ سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ منشی صاحب کی قوتِ احساس چونکہ دوسرے مردوں سے زیادہ تھی، اس لیے چشمہ ہٹا کر انھوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع کر دی تھی۔ جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی، اس نے جُھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے مفکرانہ انداز میں کہا۔

”آنکھ کی سرخی بتا رہی ہے کہ تکلیف ضرور ہے۔ “

ان کا لہجہ پھٹا ہوا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اٹھا۔ یہ کہنا تھا کہ دیوی نے اور زور زور سے چلانا شرع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔ ولن صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جُھکا کر دیوی سے پوچھا۔

”جلن محسوس ہوتی ہے یا چُبھن“!

ایک اور صاحب جو اپنے سولا ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے، آگے بڑھ کے پوچھنے لگے۔

”پپوٹوں کے نیچے رگڑ سی محسوس تو نہیں ہوتی۔ “

دیوی کی آنکھ سرخ ہو رہی تھی۔ پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث مَیلے مَیلے نظر آ رہے تھے۔ چتونوں میں سے لال لال ڈوروں کی جھلک چک میں سے غروبِ آفتاب کا سرخ سرخ منظر پیش کر رہی تھی۔ داہنی آنکھ کی پلکیں نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں، جس سے ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دکھتی آنکھ کی پتلی نچاتے ہوئے کہا۔

”آں۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ہائے۔ اُوئی“!

اور پھر سے آنکھ کو گیلے رومال سے ملنا شروع کر دیا۔ سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے، بلند آواز میں کہا۔

”اس طرح آنکھ نہ رگڑو، خالی پیلی کوئی اور تکلیف ہو جائے گا۔ “

”ہاں، ہاں۔ ارے، تم پھر وہی کر رہی ہو۔ “

پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا۔ ولن جو فوراً ہی دیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت میں دیکھنا چاہتے تھے، بگڑ کر بولے۔

”تم سب بیکار باتیں بنا رہے ہو۔ کسی سے ابھی تک یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بُلا لائے۔ اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے۔ “

یہ کہہ کر انھوں نے مڑ کر کھڑکی میں سے باہر گردن نکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا۔

”ارے۔ کوئی ہے۔ کوئی ہے؟ گُلاب؟ گُلاب“!

جب ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہُوئی تو انھوں نے گردن اندر کو کر لی اور بڑبڑانا شروع کر دیا۔

”خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھوکرا کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ پڑا اونگھ رہا ہو گا اسٹوڈیو میں کسی تختے پر۔ مردُود نابکار۔ “

پھر فوراً ہی دُور اسٹوڈیو کے اس طرح گلاب کو دیکھ کر چلائے، جو انگلیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے چلا آ رہا ہے۔

”ارے گلاب۔ گلاب“!

گلاب بھاگتا ہُوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ولن صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں اس سے کہا۔

”دیکھو! ایک گلاس میں پانی لاؤ۔ جلدی سے۔ بھاگو“!

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا، دیکھنے کے لیے کہ یہاں گڑبڑ کیا ہے۔ اس پر ہیرو صاحب للکارے

”ارے دیکھتا کیا ہے۔ لا، نا کلاس میں تھوڑا سا پانی۔ بھاگ کے جا، بھاگ کے“!

گلاب سامنے، ٹین کی چھت والے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیوی کی آنکھ میں چبھن اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور اس کی بنارسی لنگڑے کی کیری ایسی ننھی منی ٹھوڑی روتے بچے کی طرح کانپنے لگی اور وہ اُٹھ کر درد کی شدت سے کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ دستی بٹوے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اس نے اپنی دُکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اتنے میں منشی صاحب بولے۔

”گلاب سے کہہ دیا ہوتا۔ پانی میں تھوڑی سی برف بھی ڈالتا لائے“!

”ہاں، ہاں، سرد پانی اچھا رہے گا۔“

یہ کہہ کر ولن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے۔

”گلاب۔ ارے گلاب۔ پانی میں تھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا۔“

اس دوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے، کہنے لگے

”میں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھانپ سے گرم کرو اور اس سے آنکھ کو سینک دو۔ کیوں دادا؟“

”ایک دم ٹھیک رہے گا“!

سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اثبات میں بڑے زور سے ہلاتے ہُوئے کہا۔ ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے۔ اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ دیوی نے رومال لے لیا اور اسے منہ کے پاس لے جا کر گال پُھلا پُھلا کر سانس کی گرمی پہنچائی، آنکھ کو ٹکور دی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

”کچھ آرام آیا؟“

سولا ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا۔ دیوی نے رونی آواز میں جواب دیا۔

”نہیں۔ نہیں۔ ابھی نہیں نکلا۔ میں مر گئی!۔“

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ ہیرو اور ولن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے مل کر دیوی کی آنکھ میں پانی چوایا۔ جب گلاس کا اپنی آنکھ کو غسل دینے میں ختم ہو گیا، تو دیوی پھر پانی جگہ پر بیٹھ گئی اور آنکھ جھپکانے لگی۔

”کچھ افاقہ ہُوا۔“

”اب تکلیف تو نہیں ہے؟“

”کنکری نکل گئی ہو گی۔“

”بس تھوڑی دیر کے بعد آرام آ جائے گا“!

آنکھ دھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کے لیے دیوی کی آنکھ میں چُبھن رفع کر دی، مگر فوراً ہی پھر سے اس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔

”کیا بات ہے؟“

یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔ نووارد کُہنہ سال ہونے کے باوجود چُست و چالاک معلوم ہوتے تھے۔ مونچھیں سفید تھیں، جو بیڑی کے دھوئیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں، ان کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ فوج میں رہ چکے ہیں۔ سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اس طرف ترچھی پہنے ہُوئے تھے۔ پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا۔ کولھوں اور رانوں کے اُوپر پتلون میں پڑے ہُوئے جھول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ ان کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی میلی نکٹائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، وہ ان سے روٹھی ہُوئی ہے، پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر کھچ کر آگے بڑھا ہُوا تھا، جو یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس بے جان چیز سے بہت کڑا کام لیتے رہے ہیں، گال بڑھاپے کے باعث بہ پچکے ہوئے، آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہُوئیں، جو بار بار شانوں کی عجیب جنبش کے ساتھ سکیڑ لی جاتی تھیں۔ آپ نے کاندھوں کو جنبش دی اور ایک قدم آگے بڑھ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا

”کنکر پڑ گیا ہے کیا؟“

اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے۔ ہیرو اور ولن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کر کے آپ نے کہا۔“

پانی سے آرام نہیں آیا۔ خیر۔ رومال ہے کسی کے پاس؟“

نصف درجن رومال ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ بڑے ڈرامائی انداز میں آپ نے ان پیش کردہ رومالوں میں سے ایک منتخب کیا، اور اس کا ایک کنارہ پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ ہٹا لینے کا حکم دیا۔ جب دیوی نے ان کے حکم کی تعمیل کی، تو انھوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چرمی بٹوا نکالا اور اس میں سے اپنا چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھا لیا۔ پھر چشمے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھ کا دور ہی سے اکڑ کر معائنہ کیا۔ پھر دفعتاً فوٹو گرافر کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں چوڑی کیں اور جب انھوں نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے دیوی کے پپوٹوں کو وا کرنا چاہا تو ایسا معلوم ہُوا کہ وہ فوٹو لیتے وقت کیمرے کا لینس بند کر رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوبابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہُوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبد الرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہُوا۔ میں اس وقت لیڈ لکھ رہا تھا۔ سنیڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔

”منٹو صاحب! بابو گوپی ناتھ سے ملیے۔“

میں نے اُٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیے۔ بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیو ٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب؟ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ، ہے اینٹی کی پینٹی پو؟“

عبد الرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا اندازہ بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیو ٹلی۔ دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میر اتعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہُوا جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔

”آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔“

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔ عبد الرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا۔

”نمبر ون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منٹو صاحب یہ سمجھ لیجیے کہ بڑے انٹی فلو جسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔“

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا، چونک کر کہا۔

”ہاں ہاں، ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔“

پھر سینڈو سے پوچھا۔

”کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں؟“

عبد الرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔

”اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آیئے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے، اس لیے کہ مفت ملتی ہے۔“

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتا لکھا دیا جہاں میں حسب وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔ ایک تھا غفار سائیں، تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا۔

”آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میر امطلب سمجھ جایئے۔ جس آدمی کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ میں سے لعاب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کو پہنچا ہو ادرویش بن جاتا ہے یہ بھی بس پہنچے ہُوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں کیونکہ انھیں وہاں کوئی اور بے وقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی کے پیگ پی کر دُعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو۔“

غفار سائیں یہ سُن کر مسکراتا رہا۔ دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان، کسرتی بدن، منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا۔

”یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کنٹی نیوٹلیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لیے، مگر اس نے کہا ڈو اور ڈائی، میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکیے میں بات چیت پیتے کرتے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی۔ بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔“

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔ گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں مگر در حقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الہڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے۔ دھڑن تختہ“!

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اور سینڈو سے کہا۔

”اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔“

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا۔

”جناب یہ ہے ٹین پوٹی، فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم۔ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجیکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔“

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا۔

”بکواس نہ کر“!

اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔ سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیے۔ میں نے کہا۔

”چھوڑو یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔“

سینڈو چلایا۔

”بوائے۔ وسکی اینڈ سوڈا۔ بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سبزے کو۔“

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑ کھڑا کر کہا۔

”او گوڈ۔ او میرے رب العالمین۔ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا۔ جاؤ بھئی غلام علی۔ دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔“

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا۔

”دھڑن تختہ! منٹو صاحب، وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اُتر کر پیٹ میں

”انقلاب، زندہ باد“

لکھتی چلی گئی ہے۔ جیو بابو گوپی ناتھ! جیو۔“

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے، مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا، جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا۔

”بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

وہ چونک پڑا۔

”جی میں۔ میں۔ کچھ نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔

”ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ اور ہمیں کیا سوچ ہو گی۔“

سینڈو نے کہا۔

’’بڑے خانہ خراب ہیں، یہ منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں۔ لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیوٹلی نہ رہ چکی ہو۔‘‘

بابو گوپی ناتھ نے یہ سُن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا۔

’’اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔‘‘

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی، کون نٹنی تھی، کون کس کی نوچی تھی، نتھنی اُتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی، ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔ زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی نہیں پیا۔ بغیر کسی دلچسپی کے سگریٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اسے تمباکو اور اس کے دھویں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگریٹ اسی نے پیے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی، اس کا پتا مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لیے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔ آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اُٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لیے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لیے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا، زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا: منٹو! میری زینت کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے؟ میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا:

’’بڑا نیک خیال ہے۔‘‘

بابو گوپی ناتھ ہو گیا۔

’’منٹو صاحب! ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا جان من مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا، معلوم ہے آپ کو؟ کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے۔ منٹو صاحب موٹر کتنے میں آجائے گی۔‘‘

میں نے کہا

’’مجھے معلوم نہیں۔‘‘

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا۔

’’کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب۔ آپ کو، اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلیے میرے ساتھ، زینو کے لیے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہیے۔‘‘

زینت کا چہرہ ردعمل سے خالی رہا۔ بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا:

’’منٹو صاحب! آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں۔ لیکن آپ مجھے بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ بہت گنہ گار آدمی ہوں۔ وسکی منگاؤں آپ کے لیے اور؟‘‘

میں نے کہا۔

’’نہیں نہیں۔ بہت پی چکے ہیں۔‘‘

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا:

’’اور پیجیے منٹو صاحب‘‘!

یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندا نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لیے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیے:

’’سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟‘‘

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔

’’منٹو صاحب! اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا، وہ یا تو غلام کی جیب سے گر پڑے گا یا۔‘‘

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرام زادے نے اس کی جیب سے سارے روپے نکال لیے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر غلام علی کو دے کر کہا۔

”جلدی کھانا لے آؤ۔“

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔ پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے، غلط ثابت ہُوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے، مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں، گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا:

”منٹو صاحب! میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے، میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انھیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لیے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جن سے ان کا اُلو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار میں چلا جاؤں گا۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟“

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا۔

”اس لیے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکہ ہی دھوکہ ہوتا ہے جو آدمی خود کو دھوکہ دینا چاہتا ہے اُس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔“

میں نے ایک اور سوال کیا۔

”آپ کو طوائفوں کا گانا سُننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں۔“

اس نے جواب دیا۔

”بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں۔ منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لیے ایک ادا سے اُٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر اسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔“

بابو گوپی ناتھ کا شجرہ نسب تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنیے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائیداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں، لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ زینو کے لیے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا، لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی، لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصّہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق اس کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی، اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔ عورتوں کے لیے، خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں، اس کی بذلہ سنج طبیعت جس میں میراثیوں کے مزاح کی ایک جھلک تھی۔ بہت ہی جاذب نظر تھی وہ کوشش کے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ میں نے جب اسے زینت سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہو، میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا۔

ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا، وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا، جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا:

”او بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گزر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟“

سینڈو نے کہا:

”تشریف لے آیئے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ“

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار، دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے سے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔ اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔ شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ۔ کچھ یوں کہیے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اُٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا، اُٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور

”آیئے منٹو صاحب“

کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ، دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

”منٹو صاحب! مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہُوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لُوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارا کیا میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو جو کچھ وہ کرتی ہیں، سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہی ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹرسیں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بُلایا ہے کہ اس کو سب گُر سکھائے غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو۔ منٹو صاحب! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہو گی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی۔ آپ بھی اسے سمجھایئے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے، سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟“

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا، لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا۔

”اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ کیوں زینو جانی۔ پسند ہے تمہیں؟“

زینو خاموش رہی۔ بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہُوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دُور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مال دار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔ زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا چونکہ اس کی نیت نیک تھی، اس لیے اس نے زینت کے مستقبل کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹرس بنانے کے لیے اس نے کئی جعلی ڈائریکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلی فون لگوایا۔

لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔ محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا۔

”شفیق صاحب تو خالی خالی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھیے، بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔“

یہ درست تھا۔ الماس، نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لیے تھے مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھالیا تھا۔ محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لایئے۔ میں نے اسے تلاش کیا، لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا۔

”مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے، آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے۔ ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

شفیق سے مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا، زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔ ایک روز میں جانے کس کام سے ہاربنی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یاسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟“

یاسین مسکرایا۔

”تم جانتے ہو موٹر والی کو۔“

میں نے کہا۔

”جانتا ہوں۔“

”تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی۔ اچھی لڑکی ہے یار“!

یاسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرا دیا۔ اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یاسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑا کر چلا گیا لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔ بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یاسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گزر جائیں، زینت اور یاسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میموریل سے یاسین کی آنکھ لڑ گئی۔ چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یاسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر دُکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔“

اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی، میاں! اگر تم نے اس کرسٹان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کار کا بندوبست کرو، میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو۔ میں کیا کروں منٹو صاحب! بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے۔“

یاسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔ بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا، روپے کا بندوبست کرنے، کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو گئے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔ سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن کی۔ چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ، واپس نہیں آئے گا، اس لیے اسے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔ میں نے ایک دن زینت سے کہا یہ تم کیا کر رہی ہو۔ اس نے بڑے الھڑپن سے کہا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔“

جی چاہا کہ بہت دیر پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو، ٹھیک نہیں، سینڈو اور سردار اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے امنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی قدر قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر سگریٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلی فون سے، حتیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی، اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ وہاں گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔ بابو گوپی ناتھ اب کہ دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ بالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا۔

”سینڈو“!

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ دھڑن تختہ۔ بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو، لیکن سینڈو نے کہا ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیے، مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔ ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا

”واپس لے چلو“!

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا۔

”منٹو صاحب! زینو کی شادی ہونے والی ہے۔“

میں نے حیرت سے کہا۔

”کس سے؟“

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا۔

”حیدر آباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کرے وہ خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں، ان سے زینو کا زیور بن جائے گا۔ کیوں، کیا خیال ہے آپ؟“

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے، سینڈو اور سردار کی کوئی جعلسازی تو نہیں، لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدر آباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔ بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دگنی ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا۔

”منٹو صاحب! خوبصورت، نوجوان اور بڑا لائق آدمی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخشؒ کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں“!

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیے اور پانچ ہزار نقد دیے۔ محمد شفیق طوسی، محمد یاسین پروپرائیٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے دلہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھے۔ ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا

”دھڑن تختہ۔“

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھے۔ سب نے اس کو مبارک باد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں اس کے سامنے چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔ شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے، بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے انداز سے کہا۔

”منٹو صاحب! ذرا اندر جائیے اور دیکھیے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔“

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی۔ دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بُری معلوم ہوتی ہے مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا یہ کیا مسخرہ پن ہے۔ زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔

”آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان“!

اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا۔

”منٹو صاحب! میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں۔ زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔“

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی، زخمی نظر آئی لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

”خدا تمہیں خوش رکھے“!

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی۔ بہت ہی دُکھ بھری ملامت۔ اور چلا گیا۔

بادشاہت کا خاتمہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبادشاہت کا خاتمہ

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا

”ہیلو۔ فور فور فور فائیو سیون دوسری طرف سے پتلی سی نسوانی آواز آئی۔

”سوری۔ رونگ نمبر“

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ یہ کتاب وہ تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی خاص بات تھی۔ دفتر میں جو ویران پڑا تھا۔ ایک صرف یہی کتاب تھی جس کے آخری اوراق کرم خوردہ تھے۔ ایک ہفتے سے دفتر من موہن کی تحویل میں تھا کیونکہ اس کا مالک جو کہ اس کا دوست تھا۔ کچھ روپیہ قرض لینے کے لیے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ من موہن کے پاس چونک رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے فٹ پاتھ سے عارضی طور پر وہ اس دفتر میں منتقل ہو گیا تھا۔ اور اس ایک ہفتے میں وہ دفتر کی اکلوتی کتاب تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ دفتر میں وہ اکیلا پڑا رہتا۔ نوکری سے اسے نفرت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بھی فلم کمپنی میں بطور فلم ڈائریکٹر کے ملازم ہو سکتا تھا۔ مگر وہ غلامی نہیں چاہتا تھا۔ نہایت ہی بے ضرر اور مخلص آدمی تھا۔ اس لیے دوست یار اسکے روزانہ اخراجات کا بندوبست کر دیتے تھے۔ یہ اخراجات بہت ہی کم تھے۔ صبح کو چائے کی پیالی اور دو توس۔ دوپہر کو دو پھلکے اور تھوڑا سا سالن سارے دن میں ایک پیکٹ سگریٹ اور بس! من موہن کا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں تھا۔ بے حد خاموشی پسند تھا۔ جفاکش تھا۔ کئی کئی دن فاقے سے رہ سکتا تھا۔ اس کے متعلق اسکے دوست اور تو کچھ نہیں لیکن اتنا جانتے تھے کہ وہ بچپن ہی سے گھر چھوڑ چھاڑ کے نکل آیا تھا اور ایک مدت سے بمبئی کے فٹ پاتھوں پر آباد تھا۔ زندگی میں صرف اس کو ایک چیز کی حسرت تھی عورت کی محبت کی۔

”اگر مجھے کسی عورت کی محبت مل گئی تو میری ساری زندگی بدل جائے گی۔“

دوست اس سے کہتے۔

”تم کام پھر بھی نہ کرو گے۔“

من موہن آہ بھر کا جواب دیتا۔

”کام؟۔ میں مجسم کام بن جاؤں گا۔“

دوست اس سے کہتے

”تو شروع کر دو کسی سے عشق۔“

من موہن جواب دیتا۔

”نہیں۔ میں ایسے عشق کا قائل نہیں جو مرد کی طرف سے شروع ہو۔“

دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آرہا تھا۔ من موہن نے سامنے دیوار پر کلاک کی طرف دیکھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا

”ہیلو۔ فور فور فور فائیو سیون۔“

دوسری طرف سے پتلی سی آواز آئی

”فور فور فور فائیو سیون؟“

برج موہن نے جواب دیا۔

”جی ہاں“!

نسوانی آواز نے پوچھا۔

”آپ کون ہیں؟“

”من موہن“

!۔ فرمایئے! دوسری طرف سے آواز آئی تو من موہن نے کہا۔

”فرمایئے کس سے بات کرنا چاہتی ہیں آپ؟“

آواز نے جواب دیا۔

”آپ سے“!

من موہن نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

”مجھ سے؟“

”جی ہاں۔ آپ سے کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“

من موہن سٹپٹا سا گیا۔

”جی؟۔ جی نہیں“!

آواز مسکرائی

”آپ نے اپنا نام مدن موہن بتایا تھا۔“

جی نہیں۔ من موہن

”من موہن؟“

چند لمحات خاموشی میں گزر گئے تو من موہن نے کہا

”آپ باتیں کرنا چاہتی تھیں مجھ سے؟“

آواز آئی

”جی ہاں“

”تو کیجیے“!

تھوڑے وقفے کے بعد آواز آئی۔

”سمجھ میں نہیں آتا کیا بات کروں۔ آپ ہی شروع کیجیے نہ کوئی بات۔“

”بہت بہتر“

یہ کہہ کر من موہن نے تھوڑی دیر سوچا

”نام اپنا بتا چکا ہوں۔ عارضی طور پر ٹھکانہ میرا یہ دفتر ہے۔ پہلے فٹ پاتھ پر سوتا تھا۔ اب ایک ہفتہ سے اس دفتر کے بڑے میز پر سوتا ہوں۔“

آواز مسکرائی

”فٹ پاتھ پر آپ مسہری لگا کر سوتے تھے؟“

من موہن ہنسا

”اس سے پہلے کہ میں آپ سے مزید گفتگو کروں۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ فٹ پاتھوں پر سوتے مجھے ایک زمانہ ہو گیا ہے یہ دفتر تقریباً ایک ہفتے سے میرے قبضے میں ہے۔ آج کل عیش کر رہا ہوں۔“

آواز مسکرائی۔

”کیسے عیش؟“

من موہن نے جواب دیا۔

”ایک کتاب مل گئی تھی یہاں سے۔ آخری اوراق گم ہیں لیکن میں اسے بیس مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ سالم کتاب کبھی ہاتھ لگی تو معلوم ہو گا ہیرو ہیروئن کے عشق کا انجام کیا ہوا۔“

آواز ہنسی۔

”آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔“

من موہن نے تکلف سے کہا۔

”آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“

آواز نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا۔

”آپ کا شغل کیا ہے؟“

”شغل؟“

”میرا مطلب ہے آپ کرتے کیا ہیں؟“

”کیا کرتا ہوں؟۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک بیکار انسان کیا کر سکتا ہے۔ ساری دن آوارہ گردی کرتا ہوں۔ رات کو سو جاتا ہوں۔“

آواز نے پوچھا۔

”یہ زندگی آپ کو اچھی لگتی ہے۔“

من موہن سوچنے لگا۔

”ٹھہریئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔ اب آپ نے پوچھا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ زندگی تمہیں اچھی لگتی ہے یا نہیں؟“

”کوئی جواب ملا؟“

تھوڑے وقفے کے بعد من موہن نے جواب دیا۔

”جی نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی زندگی مجھے اچھی لگتی ہی ہو گی۔ جب کہ ایک عرصے سے بسر کر رہا ہوں۔“

آواز ہنسی۔ من موہن نے کہا۔

”آپ کی ہنسی بڑی مترنم ہے۔“

آواز شرما گئی۔

”شکریہ“!

اور سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا۔ من موہن تھوڑی دیر ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ پھر مسکرا کر اسے رکھ دیا اور دفتر بند کر کے چلا گیا۔ دوسرے روز صبح آٹھ بجے جب کہ من موہن دفتر کے بڑے میز پر سو رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ جمایاں لیتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔ ہلو فور فور فائیو سیون۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”آداب عرض من موہن صاحب“!

”آداب عرض“!

من موہن ایک دم چونکا۔

”اوہ، آپ۔ آداب عرض۔“

”تسلیمات“!

آواز آئی۔

”آپ غالباً سو رہے تھے؟“

”جی ہاں۔ یہاں آ کر میری عادات کچھ بگڑ رہی ہیں۔ واپس فٹ پاتھ پر گیا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔“

آواز مسکرائی۔

”کیوں“

”وہاں صبح پانچ بجے سے پہلے پہلے اٹھنا پڑتا ہے۔“

آواز ہنسی من موہن نے پوچھا۔

”کل آپ نے ایک دم ٹیلی فون بند کر دیا۔“

آواز شرمائی۔

”آپ نے میری ہنسی کی تعریف کیوں کی تھی۔“

من موہن نے کہا

”لو صاحب، یہ بھی عجیب بات کہی آپ نے۔ کوئی چیز جو خوبصورت ہو تو اسکی تعریف نہیں کرنی چاہیے؟“

”بالکل نہیں“!

”یہ شرط آپ مجھ پر عائد نہیں کر سکتیں۔ میں نے آج تک کوئی شرط اپنے اوپر عائد نہیں ہونے دی۔ آپ ہنسیں گی تو میں ضرور تعریف کروں گا۔“

”میں ٹیلی فون بند کر دوں گی۔“

”بڑے شوق سے۔“

”آپ کو میری ناراضگی کا کوئی خیال نہیں۔“

”میں سب سے پہلے اپنے آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں آپ کی ہنسی کی تعریف نہ کروں تو میرا ذوق مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ یہ ذوق مجھے بہت عزیز ہے“!

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔

”معاف کیجیے گا، میں ملازمہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ آپ کا ذوق آپ کو بہت عزیز ہے۔ ہاں یہ تو بتایئے آپ کو شوق کس چیز کا ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”یعنی۔ کوئی شغل۔ کوئی کام۔ میرا مطلب ہے آپ کو آتا کیا ہے؟“

من موہن ہنسا

”کوئی کام نہیں آتا۔ فوٹو گرافی کا تھوڑا سا شوق ہے۔“

”یہ بہت اچھا شوق ہے۔“

”اس کی اچھائی یا برائی کا میں نے کبھی نہیں سوچا۔“

آواز نے پوچھا۔

”کیمرہ تو آپ کے پاس بہت اچھا ہو گا؟“

من موہن ہنسا۔

”میرے پاس اپنا کوئی کیمرہ نہیں۔ دوست سے مانگ کر شوق پورا کر لیتا ہوں۔ اگر میں نے کبھی کچھ کمایا تو ایک کیمرہ میری نظر میں ہے۔ وہ خریدوں گا۔“

آواز نے پوچھا۔

”کون سا کیمرہ؟“

من موہن نے جواب دیا

”ایگزکٹا۔ ریفلکس کیمرہ ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد آوا� آئی۔

”میں کچھ سوچ رہی تھی۔“

”کیا؟“

”آپ نے میرا نام پوچھا نہ ٹیلی فون نمبر دریافت کیا۔“

”مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی؟“

”کیوں؟“

”نام آپ کا کچھ بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کو میرا نمبر معلوم ہے بس ٹھیک ہے۔ آپ گر چاہیں گی تو میں آپ کو ٹیلی فون کروں تو نام اور نمبر بتا دیجیے گا۔“

”میں نہیں بتاؤں گی۔“

”لو صاحب یہ بھی خوب رہا۔ میں جب آپ سے پوچھوں گا ہی نہیں تو بتانے نہ بتانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔“

آواز مسکرائی۔

”آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔“

من موہن مسکرا دیا۔

”جی ہاں کچھ ایسا ہی آدمی ہوں۔“

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔

”آپ پھر سوچنے لگیں۔“

”جی ہاں، کوئی اور بات اس وقت سوجھ نہیں رہی تھی۔“

”تو ٹیلی فون بند کر دیجیے۔ پھر سہی۔“

آواز کسی قدر تیکھی ہو گئی۔

”آپ بہت روکھے آدمی ہیں۔ ٹیلی فون بند کر دیجیے۔ لیجیے میں بند کرتی ہوں۔“

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور مسکرانے لگا۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب من موہن ہاتھ دھو کر کپڑے پہن کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔

”فور فور فور فائیو سیون“!

آواز آئی۔

”مسٹر من موہن؟“

من موہن نے جواب دیا۔

”جی ہاں من موہن۔ ارشاد؟“

آواز مسکرائی۔

”ارشاد یہ ہے کہ میری ناراضگی دور ہو گئی ہے۔“

من موہن نے بڑی شگفتگی سے کہا۔

”مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔“

”ناشتہ کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آپ کے ساتھ بگاڑنی نہیں چاہیے۔ ہاں آپ نے ناشتہ کر لیا۔“

”جی نہیں باہر نکلنے ہی والا تھا کہ آپ نے ٹیلی فون کیا۔“

”اوہ۔ تو آپ جائیے۔“

”جی نہیں، مجھے کوئی جلدی نہیں، میرے پاس آج پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ آج ناشتہ نہیں ہو گا۔“

”آپ کی باتیں سن کر۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ایسی باتیں آپ اس لیے کرتے ہیں کہ آپ کو دکھ ہوتا ہے؟“

من موہن نے ایک لمحہ سوچا

”جی نہیں۔ میرا اگر کوئی دکھ درد ہے تو میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔“

آواز نے پوچھا۔

”میں کچھ روپے آپ کو بھیج دوں؟“

من موہن نے جواب دیا۔

”بھیج دیجیے۔ میرے فنانسروں میں ایک آپ کا بھی اضافہ ہو جائے گا“!

”نہیں میں نہیں بھیجوں گی“!

”آپ کی مرضی“!

”میں ٹیلی فون بند کرتی ہوں۔“

”بہتر“

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور مسکراتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔ رات کو دس بجے کے قریب واپس آیا اور کپڑے بدل کر میز پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ یہ کون ہے جو اسے فون کرتی ہے آواز سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ جوان ہے۔ ہنسی بہت ہی مترنم تھی۔ گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہے۔ بہت دیر تک وہ اس کے متعلق سوچتا رہا۔ ادھر کلاک نے گیارہ بجائے ادھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن نے ریسیور اٹھایا۔

”ہلو۔“

دوسری طرف سے وہی آواز آئی۔

”مسٹر من موہن۔“

”جی ہاں۔ من موہن۔ ارشاد۔“

”ارشاد یہ ہے کہ میں نے آج دن میں کئی مرتبہ رِنگ کیا۔ آپ کہاں غائب تھے؟“

”صاحب بیکار ہوں، لیکن پھر بھی کام پر جاتا ہوں۔“

”کِس کام پر“

”آوارہ گردی“

”واپس کب آئے؟“

”دس بجے“

”اب کیا کر رہے تھے؟“

”میز پر لیٹا آپ کی آواز سے آپ کی تصویر بنا رہا تھا“

”بنی؟“

”جی نہیں“

”بنانے کی کوشش نہ کیجیے۔ میں بڑی بدصورت ہوں۔“

”معاف کیجیے گا، اگر آپ واقعی بدصورت ہیں تو ٹیلی فون بند کر دیجیے، بدصورتی سے مجھے نفرت ہے۔“

آواز مسکرائی

”ایسا ہے تو چلیے میں خوبصورت ہوں، میں آپ کے دل میں نفرت نہیں پیدا کرنا چاہتی۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ من موہن نے پوچھا

”کچھ سوچنے لگیں؟“

آواز چونکی

”جی نہیں۔ میں آپ سے پوچھنے والی تھی کہ۔“

”سوچ لیجیے اچھی طرح“

آواز ہنس پڑی۔

”آپ کو گانا سناؤں؟“

”ضرور“

”ٹھہریئے“

گلہ صاف کرنے کی آواز آئی۔ پھر غالب کی یہ غزل شروع ہوئی نکتہ چیں ہے غمِ دل۔ سہگل والی نئی دھن تھی۔ آواز میں درد اور خلوص تھا۔ جب غزل ختم ہوئی تو من موہن نے داد دی۔

”بہت خوب۔ زندہ رہو۔“

آواز شرما گئی۔

”شکریہ“

اور ٹیلی فون بند کر دیا۔ دفتر کے بڑے میز پر من موہن کے دل و دماغ میں ساری رات غالب کی غزل گونجتی رہی۔ صبح جلدی اٹھا اور ٹیلی فون کا انتظار کرنے لگے۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کرسی پر بیٹھا رہا مگر ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجی۔ جب مایوس ہو گیا تو ایک عجیب سی تلخی اس نے اپنے حلق میں محسوس کی اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے بعد میز پر لیٹ گیا اور کڑھنے لگا۔ وہی کتاب جس کو وہ متعدد مرتبہ پڑھ چکا تھا اٹھائی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ یونہی لیٹے لیٹے شام ہو گئی۔ تقریباً سات بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن نے ریسیور اٹھایا اور تیزی سے پوچھا کون ہے؟“

وہی آواز آئی

”میں“!

من موہن کا لہجہ تیز رہا

”اتنی دیر تم کہاں تھیں“

آواز لرزی

”کیوں؟“

”میں صبح سے یہاں جھک مار رہا ہوں۔ ناشتہ کیا ہے نہ دوپہر کا کھانا کھایا ہے حالانکہ میرے پاس پیسے موجود تھے۔“

آواز آئی

”میری جب مرضی ہو گی ٹیلی فون کروں گی۔ آپ۔“

من موہن نے بات کاٹ کر کہا۔

”دیکھو جی یہ سلسلہ بند کرو۔ ٹیلی فون کرنا ہے تو ایک وقت مقرر کرو۔ مجھ سے انتظار برداشت نہیں ہوتا۔“

آواز مسکرائی۔

”آج کی معافی چاہتی ہوں۔ کل سے باقاعدہ صبح اور شام فون آیا کرے گا آپ کو“

”یہ ٹھیک ہے“!

آواز ہنسی

”مجھے معلوم نہیں تھا آپ اس قدر بگڑے دل ہیں۔“

من موہن مسکرایا۔

”معاف کرنا۔ انتظار سے مجھے بہت کوفت ہوتی ہے اور جب مجھے کسی بات سے کوفت ہوتی ہے تو اپنے آپ کو سزا دینا شروع کر دیتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”صبح تمہارا ٹیلی فون نہ آیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں چلا جاتا۔ لیکن بیٹھا دن بھر اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ بچپنا ہے صاف۔“

آواز ہمدردی میں ڈوب گئی

”کاش مجھ سے یہ غلطی نہ ہوتی۔ میں نے قصداً صبح ٹیلی فون نہ کیا“!

”کیوں؟“

”یہ معلوم کرنے کے لیے آپ انتظار کریں گے یا نہیں؟“

من موہن ہنسا۔

”بہت شریر ہو تم۔ اچھا اب ٹیلی فون بند کرو۔ میں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔“

”بہتر کب تک لوٹیے گا؟“

”آدھے گھنٹے تک“

من موہن آدھے گھنٹے کے بعد کھانا کھا کر لوٹا تو اس نے فون کیا۔ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے غالب کی ایک غزل سنائی۔ من موہن نے دل سے داد دی۔ پھر ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب ہر روز صبح اور شام من موہن کو اس کا ٹیلی فون آتا۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ بعض اوقات گھنٹوں باتیں جاری رہتیں۔ اس دوران میں من موہن نے اس سے ٹیلی فون کا نمبر پوچھا نہ اس کا نام شروع شروع میں اس نے اس کی آواز کی مدد سے تخیل کے پردے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اب وہ جیسے آواز ہی سے مطمئن ہو گیا تھا۔ آواز ہی شکل تھی۔ آواز ہی صورت تھی۔ آواز ہی جسم تھا۔ آواز ہی روح تھی۔ ایک دن اس نے پوچھا۔

”موہن۔ تم میرا نام کیوں نہیں پوچھتے؟“

من موہن نے مسکرا کر کہا۔

”تمہارا نام تمہاری آواز ہے۔“

”جو کہ بہت مترنم ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے؟“

ایک دن وہ بڑا ٹیڑھا سوال کر بیٹھی۔

”موہن تم نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟“

من موہن نے جواب دیا۔

”نہیں“

”کیوں؟“

موہن ایک دم اداس ہو گیا

”اس کیوں کا جواب چند لفظوں میں نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی زندگی کا سارا ملبہ اٹھانا پڑے گا۔ اگر کوئی جواب نہ ملے تو بڑی کوفت ہو گی۔“

”جانے دیجیے۔“

ٹیلی فون کا رشتہ قائم ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا۔ بلا ناغہ دن میں دو مرتبہ اس کا فون آتا۔ من موہن کو اپنے دوست کا خط آیا کہ قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ سات آٹھ روز میں وہ بمبئی پہنچنے والا ہے۔ من موہن یہ خط پڑھ کر افسردہ ہو گیا۔ اس کا ٹیلیفون آیا تو من موہن نے اس سے کہا میری دفتر کی بادشاہی اب چند دنوں کی مہمان ہے۔ اس نے پوچھا۔

”کیوں؟“

من موہن نے جواب دیا۔

”قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ دفتر آباد ہونے والا ہے۔“

”تمہارے کسی اور دوست کے گھر میں ٹیلی فون نہیں۔“

”کئی دوست ہیں جن کے ٹیلی فون ہیں۔ مگر میں تمہیں ان کا نمبر نہیں دے سکتا۔“

”کیوں ؟“

”میں نہیں چاہتا تمہاری آواز کوئی اور سنے۔“

”وجہ ؟“

”میں بہت حاسد ہوں۔“

”وہ مسکرائی۔ یہ تو بڑی مصیبت ہوئی۔“

”کیا کیا جائے ؟“

”آخری دن جب تمہاری بادشاہت ختم ہونے والی ہو گی۔ میں تمہیں اپنا نمبر دوں گی۔

”یہ ٹھیک ہے“!

من موہن کی ساری افسردگی دور ہو گئی۔ وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا کہ دفتر میں اسکی بادشاہت ختم ہو۔ اب پھر اس نے اسکی آواز کی مدد سے اپنے تخیل کے پردے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش شروع کی۔ کئی تصویریں بنیں مگر وہ مطمئن نہ ہوا۔ اس نے سوچا چند دنوں کی بات ہے۔ اس نے ٹیلی فون نمبر بتا دیا تو وہ اسے دیکھ بھی سکے گا۔ اس کا خیال آتے ہی اس کا دل و دماغ سُن ہو جاتا۔

”میری زندگی کا وہ لمحہ کتنا بڑا لمحہ ہو گا جب میں اسکو دیکھوں گا۔“

دوسرے روز جب اس کا ٹیلی فون آیا تو من موہن نے اس سے کہا۔

”تمہیں دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔“

”کیوں ؟“

”تم نے کہا تھا کہ آخری دن جب یہاں میری بادشاہت ختم ہونے والی ہو گی تو تم مجھے اپنا نمبر بتا دو گی۔“

”کہا تھا“

”اس کا یہ مطلب ہے تم مجھے اپنا ایڈریس دیدو گی۔ میں تمہیں دیکھ سکوں گا۔“

”تم مجھے جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ آج ہی دیکھ لو۔“

نہیں نہیں۔ پھر کچھ سوچ کر کہا۔

”میں ذرا اچھے لباس میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ آج ہی ایک دوست سے کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھے سوٹ دلوا دے گا۔“

وہ ہنس پڑی۔

”بالکل بچے ہو تم۔ سنو۔ جب تم مجھ سے ملو گے تو میں تمہیں ایک تحفہ دوں گی۔“

من موہن نے جذباتی انداز میں کہا

”تمہاری ملاقات سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے ؟“

”میں نے تمہارے لیے ایگزکٹا کیمرہ خرید لیا ہے۔“

”اوہ“!

”اس شرط پر دوں گی کہ پہلے میرا فوٹو اتارو۔“

من موہن مسکرایا۔

”اس شرط کا فیصلہ ملاقات پر کروں گا۔“

تھوڑی دیر اور گفتگو ہوئی اس کے بعد ادھر سے وہ بولی

”میں کل اور پرسوں تمہیں ٹیلی فون نہیں کر سکوں گی۔“

من موہن نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کیوں ؟“

”میں اپنے عزیزوں کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہوں۔ صرف دو دن غیر حاضر رہوں گی۔ مجھے معاف کر دینا۔“

یہ سننے کے بعد من موہن سارا دن دفتر ہی میں رہا۔ دوسرے دن صبح اٹھا تو اس نے حرارت محسوس کی۔ سوچا کہ یہ اضمحلال شاید اس لیے ہے کہ اس کا ٹیلی فون نہیں آئیگا لیکن دوپہر تک حرارت تیز ہو گئی۔ بدن تپنے لگا۔ آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔ من موہن میز پر لیٹ گیا۔ پیاس بار بار ستاتی تھی۔ اٹھتا اور نل سے منہ لگا کر پانی پیتا۔ شام کے قریب اسے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ دوسرے روز وہ بالکل نڈھال تھا۔ سانس بڑی دقت سے آتا تھا۔ سینے کی دکھن بہت بڑھ گئی تھی۔ کئی بار اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوئی۔ بخار کی شدت میں وہ گھنٹوں ٹیلی فون پر اپنی محبوب آواز کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ شام کو اسکی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے کلاک کی طرف دیکھا، اس کے کانوں میں عجیب و غریب آوازیں گونج رہی تھیں۔ جیسے ہزار ہا ٹیلی فون بول رہے ہیں سینے میں گھنگھرو بج رہے تھے۔ چاروں طرف آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ چنانچہ جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس کے کانوں تک اس کی آواز نہ پہنچی۔ بہت دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ ایک دم من موہن چونکا۔ اس کے کان اب سُن رہے تھے۔ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور ٹیلی فون تک گیا۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا اور خشک ہونٹوں پر لڑکی جیسی زبان پھیر کر کہا۔

”ہلو“

دوسری طرف سے وہ لڑکی بول۔

”ہلو۔ موہن ؟“

من موہن کی آواز لڑکھڑائی۔

”ہاں موہن“!

”ذرا اونچی بولو۔“

من موہن نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ اس کے حلق ہی میں خشک ہو گیا۔ آواز آئی۔

”میں جلدی آ گئی۔ بڑی دیر سے تمہیں رنگ کر رہی ہوں۔ کہاں تھے تم ؟“

من موہن کا سر گھومنے لگا۔

”آواز آئی کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟“

من موہن نے بڑی مشکل سے اتنا کہا۔

”میری بادشاہت ختم ہو گئی ہے آج۔“

اس کے منہ سے خون نکلا اور ایک پتلی لکیر کی صورت میں گردن تک دوڑتا چلا گیا۔ آواز آئی۔

”میرا نمبر نوٹ کر لو۔ فائیو نوٹ تھری ون فور، فاؤنوٹ تھری ون فور۔ صبح فون کرنا۔

”یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ من موہن اوندھے منہ ٹیلی فون پر گرا۔ اسکے منہ سے خون کے بلبلے پھُوٹنے لگا۔ 14 جون 1950ء

بارده شمالی

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوبارده شمالی

دو گوگلز آئیں۔ تین بش شرٹوں نے ان کا استقبال کیا۔ بش شرٹیں دنیا کے نقشے بنی ہوئی تھیں، ان پر پرندے، چرندے، درندے، پھول بُوٹے اور کئی ملکوں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ دونوں گوگلز نے اپنی کتابیں میز پر رکھیں۔ اپنے ڈسٹ کور اتارے اور بش شرٹوں کے بٹن بن گئیں۔ ایک گوگل نے اس بش شرٹ سے جو خالص امریکی تھی، کہا

”آپ کا لباس بڑا واہیات ہے۔“

وہ بش شرٹ ہنسا۔

”تمہارے گوگلز بڑے واہیات ہیں۔ اسے لگا کر تم ایسی دکھائی دیتی ہو جیسے روشن دِن اندھیری رات بن گیا ہے۔“

اس اندھیری رات نے اس بش شرٹ سے کہا۔

”میں تو چاندنی رات ہوں۔“

امریکی بش شرٹ نے اس کو ایک کوہ ہمالہ پیش کیا جو بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اس نے چمچ سے اس کوہ ہمالہ کو سر کر لیا۔ لیکن اس مہم کے دوران میں اس کو بڑی کوفت ہوئی۔ وہ برفوں کی عادی نہیں تھی۔ وہ مجبوراً اپنی سہیلی دوسری گوگلز کے ساتھ آ گئی تھی کہ وہاں اس کا چہیتا بش شرٹ مل گیا۔ دوسری گوگلز اپنے بش شرٹ سے علیحدہ باتیں کر رہی تھی۔

”آج تم اتنی حسین کیوں دکھائی دے رہی ہو“

”مجھے کیا معلوم“

”اپنی چقیں اتار دو“

”کیوں؟“

”مجھے تمہاری آنکھیں نظر نہیں آتیں۔“

”میرا دل تو تمہیں نظر آ رہا ہو گا۔“

”نظر آ تا رہا ہے۔ نظر آتا رہے گا۔ لیکن مجھے تمہاری آنکھوں پر یہ غلاف پسند نہیں۔“

”تیز روشنی مجھے پسند نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس نہیں۔ تمہاری بش شرٹ بھی مجھے پسند نہیں۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ اس کا ڈیزائن بہت بے ہودہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئس کریم میں کیڑے مکوڑے چل رہے ہیں۔“

”تم کھا تو چکی ہو۔“

”میں نے تو صرف چکھی ہے، کھائی کب ہے؟“

”آپ 'باردہ شمالی' میں صرف آئس کریم چکھنے کے لیے ہی آتی ہیں“

”آپ مجبور کرتے ہیں تو میں آتی ہوں، ورنہ مجھے اس جگہ سے کوئی رغبت نہیں۔“

”میں یہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں مل کر کوئی مہم سر کریں۔“

”کون سی مہم؟“

”بے شمار مہمیں ہیں۔ لیکن ایک سب سے بڑی ہے۔“

”کون سی؟“

”کسی آتش فشاں پہاڑ کے اندر کود جائیں اور وہاں کے حالات معلوم کریں۔“

”میں تیار ہوں۔ لیکن پھر میں یہاں آ کر آئس کریم ضرور کھاؤں گی۔“

”میں کھلاؤں گا تمہیں“

دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک ایسی دوزخ میں چلے گئے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی گئی۔ اس گوگلز کی ساری کتابیں اس بش شرٹ کی لائبریری میں داخل ہو گئیں۔ دوسری گوگلز نے اپنی بش شرٹ کو اپنے بلاؤز کی ساری کتابیں پڑھائیں مگر اس کی سمجھ میں نہ آئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بش شرٹ کسی گھٹیا قسم کے درزی کی سلی ہوئی ہے۔ اس نے

”باردہ شمالی“

میں اس سے کہا۔

”تم آئس کریم نہ کھایا کرو۔ ہم آئندہ

”آتشیں ہاؤس“

میں جایا کریں گے۔“

دوسری گوگلز گلگلبانے لگی۔ اس گلگاہٹ میں اس نے اپنی بش شرٹ کے کاج بنانے شروع کر دیے اور ان میں کئی پھول ٹانک دیئے۔ یہ بش شرٹ گھٹیا قسم کے درزی کی سلی ہوئی نہیں تھی، اصل میں اس کا کپڑا کھردرا تھا، جیسے ٹاٹ ہو، اس میں دوسری گوگلز نے اپنی مخمل کے کئی پیوند لگائے، مگر خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ وہ

”آتشیں ہاؤس“

میں بھی کئی مرتبہ گئے، وہاں انہوں نے کئی گلاس پگھلی ہوئی آگ کے پیئے۔ مگر کوئی تسکین نہ ہوئی۔ دوسری گوگلز حیران تھی کہ اس کا بش شرٹ جس کے لیے اس نے اپنے بلاؤز کے تمام بخیے ادھیڑ دیے، اس سے ملتفت کیوں نہیں ہوتا۔ وہ اس کی ہر سلوٹ سے پیار کرتی تھی۔ لیکن وہ

”بارد ہ شمالی“

میں اور

”آتشیں ہاؤس“

میں اس کے خوبصورت فریم سے کوئی دلچسپی لیتا ہی نہیں تھا۔ عجیب بات ہے کہ وہ بارد ہ شمالی میں گرم ہو جاتا اور آتشیں ہاؤس میں اولا سا بن جاتا۔ دوسری بش شرٹ بہت حیران تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے! اس نے پہلی گوگلز کو جو اس کی سہیلی تھی، ایک خط لکھا اور اس کو اپنا سارا دُکھ بتایا۔ اس نے جواب میں یہ لکھا۔

”تم کچھ فکر نہ کرو۔ یہ بش شرٹ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی سکڑ جاتے ہیں۔ کبھی پھیل جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری لانڈری میں بھی کوئی نقص ہے۔ اِسے دُور کرنے کی کوشش کرو۔ تمہاری استری بھی ایسا معلوم ہوتا ہے، خراب ہو گئی ہے، اسے ٹھیک کراؤ۔ کہیں کرنٹ تو نہیں مارتی؟ دوسری گوگلز نے اسے لکھا۔

”کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری استری کرنٹ مارتی ہے۔ میرا بش شرٹ گیلا ہو چکا ہوتا ہے کہ میری استری گرم ہوتی ہے، میں جب اس پر پھیرتی ہوں تو مجھے بجلی کے دھچکے لگتے ہیں۔“

جواب میں اس کی سہیلی نے لکھا۔

”میں تمہاری استری کی خرابی سمجھ گئی ہوں۔ نیا پلگ بھیج رہی ہوں، اس کو لگا کر دیکھو، شاید یہ خرابی دور ہو جائے۔“

وہ پلگ آیا۔ بڑا خوبصورت تھا۔ مگر جب اس نے اپنی استری میں لگانا چاہا تو فٹ نہ ہوا۔ کنڈم کر کے اُس نے واپس کر دیا، اور اپنے بش شرٹ کی رفوگری شروع کر دی۔ یہ کام بڑا نازک تھا مگر اس دوسری گوگلز نے بڑی محنت سے کیا پر نتیجہ پھر بھی صفر رہا۔ وہ

”بارد ہ شمالی“

میں گئی۔ وہاں اس نے پانچ کوہ ہمالہ چمچوں سے سر کیے۔ وہاں سے یخ بستہ ہو کے اٹھی اور ایک نہایت واہیات بش شرٹ کے ساتھ

”آتشیں ہاؤس“

جا کر اس نے دس جوالا مکھی نگلے اور واپس اپنے چمڑے کے تھیلے میں آ گئی۔ دوسرے دن وہ پھر اپنے چہیتے بش شرٹ سے ملی۔ اس کو اس نے بتایا کہ وہ رات ایک نہایت لغو قسم کے بش شرٹ کے ساتھ

”آتشیں ہاؤس“

گئی تھی، اس نے قطعاً بُرا نہ مانا، وہ سوچنے لگی کہ یہ کیسا کلف لگا بش شرٹ ہے جس کی جیبوں میں رشک اور حسد کے سکے کھنکھناتے ہی نہیں۔ اس نے پھر اپنی سہیلی گوگلز کو خط لکھا اور سنایا۔

”تمہارا بھیجا ہوا پلگ میری استری میں لگا ہی نہیں۔ میں نے واپس بھیج دیا تھا۔ امید ہے کہ تمہیں مل گیا ہو گا۔ اب مجھے تم سے یہ پوچھنا ہے کہ میں کیا کروں۔ وہ میرا بش شرٹ۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا شے ہے۔ خدا کے لیے آؤ۔ میں بہت پریشان ہوں، اپنے بش شرٹ کو میرا اسلام کہنا، میرا خیال ہے کہ تم اس کو ہر رات پہنتی ہو۔ اس کا کپڑا بڑا ملائم ہے۔“

اس کی سہیلی، اس کے بُلاوے پر آ گئی، اس کے ساتھ کا اپنا بش شرٹ نہیں تھا۔ دونوں بہت خوش تھیں، ان کے شیشے آپس میں ٹکرائے۔ بڑی کھنکیں پیدا ہوئیں، جیسے کئی کانچ کی چوڑیاں ایک کلائی میں پڑی بج رہی ہیں۔ اس کی سہیلی گوگلز کا فریم سنہرا تھا۔ اسے دیکھ کر دوسری کو تھوڑا سا رشک ہوا، مگر اس نے اس جذبے کو فوراً دُور کر دیا اور اس سنہرے فریم کا تعارف اپنے

”بش شرٹ“

سے کرایا تاکہ وہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرئے اور بتائے کہ اس پر استری کس طرح کرنی چاہیے۔ تاکہ اس کی سلوٹیں دُور ہو جائیں۔ وہ اپنی سہیلی کے بش شرٹ سے بڑے تپاک سے ملی، اس نے بڑے غور سے اس کا ٹانکہ ٹانکہ دیکھا، مگر اسے کوئی عیب نظر نہ آیا وہ اس کے اپنے بش شرٹ کے مقابلے میں کئی درجے اچھا سلا ہوا تھا۔ ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں، آخر ایک دن انہوں نے

"بار دہ شمالی"

جانے کا پروگرام بنایا وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس بش شرٹ کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی سہیلی گوگلز سے کہہ گئی تھی کہ وہ اپنے شیشوں میں سے اس کے بش شرٹ کو دیکھنا چاہتی ہے۔ جب وہ

"بار دہ شمالی"

میں گئے تو وہاں اس بش شرٹ کو آگ لگ گئی جس میں اس نے اپنی ساتھی گوگلز کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ دونوں دیر تک اس آگ میں جلتے رہے۔ اور اسے بجھانے کے لیے

"آتشیں ہاؤس"

میں چلے گئے۔ چونکہ آبلے زیادہ پڑ گئے تھے، اس لیے وہ کئی دن ان کا علاج باہر ہی باہر کرتے رہے۔ دوسری گوگلز حیران تھی کہ یہ دونوں کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ اس کے دونوں شیشے دُھندلے ہوتے جا رہے تھے کہ اچانک اس کی سہیلی کا بش شرٹ آ گیا۔ اس نے اس کو نہ پہچانا اور کہا۔

"معاف کیجیے گا میرے شیشے دھندلے ہو گئے ہیں۔"

اس نے فوراً اس کے شیشے نکالے، ان کو اپنی سانسوں سے پہلے گرم، پھر نم آلود کیا، اور اپنے دامن سے پونچھ کر صاف کر دیا۔ وہ حیرت زدہ ہو گئی۔ اس کی زندگی میں اس کے شیشے کبھی اتنے صاف نہیں ہوئے تھے۔ دونوں

"بار دہ شمالی"

میں کوہ ہمالہ کھانے کے لیے گئے۔ وہ یہ کھا ہی رہے تھے کہ پہلا بش شرٹ دوسری گوگلز کے ساتھ آ گیا۔ دونوں خاموش رہے۔ انہوں نے دل ہی دل میں محسوس کر لیا کہ وہ غلط چوٹیوں پر چڑھ رہے تھے۔

بارش

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبارش

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھا جل تھل دیکھ رہا تھا۔ باہر بہت بڑا لان تھا، جس میں دو درخت تھے۔ ان کے سبز پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ اُس کو محسوس ہوا کہ وہ پانی کی اس یورش سے خوش ہو کر ناچ رہے ہیں۔ ادھر ٹیلی فون کا ایک کھمبا گڑا تھا۔ اُس کے فلیٹ کے عین سامنے۔ یہ بھی بڑا مسرور نظر آتا تھا، حالانکہ اس کی مسرت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس بے جان شے کو بھلا مسرور کیا ہونا تھا' لیکن تنویر نے جو کہ بہت مغموم تھا، یہی محسوس کیا کہ اُس کے آس پاس جو بھی شے ہے، خوشی سے ناچ گا رہی ہے۔ ساون گزر چکا تھا اور باران رحمت نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں نے مسجدوں میں اکٹھے ہو کر دعائیں مانگیں۔ مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ بادل آتے اور جاتے رہے، مگر اُن کے تھنوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ آخر ایک دن اچانک کالے کالے بادل آسمان پر گھر آئے اور چھاجوں پانی برسنے لگا۔ تنویر کو بادلوں اور بارشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کی زندگی چٹیل میدان بن چکی تھی جس کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ بھی کسی نے نہ ٹپکایا ہو۔ دو برس پہلے، اُس نے ایک لڑکی سے جس کا نام ثریا تھا، محبت کرنا شروع کی۔ مگر یکطرفہ محبت تھی۔ ثریا نے اُسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا۔ ساون کے دن تھے، بارش ہو رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی سے باہر نکلا۔ جانگیہ پہن کر' کہ نہائے اور بارش کا لُطف اُٹھائے۔ آم بالٹی میں پڑے تھے۔ وہ اکیلا بیٹھا انھیں چُوس رہا تھا کہ اچانک اُسے چیخیں اور قہقہے سنائی دیے۔ اُس نے دیکھا کہ ساتھ والی کوٹھی کے لان میں دو لڑکیاں بارش میں نہا رہی ہیں اور خوشی میں شور مچا رہی ہیں۔ اُس کی کوٹھی اور ساتھ والی کوٹھی کے درمیان صرف ایک جھاڑیوں کی دیوار حائل تھی۔ تنویر اُٹھا۔ آم کا رس چُوستے ہوئے وہ باڑ کے پاس گیا اور غور سے ان دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ دونوں مہین ململ کے کُرتے پہنے تھیں، جو ان کے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ شلوار چونکہ لٹھے کی تھیں' اس لیے تنویر کو اُن کے بدن کے نچلے حصے کے صحیح خدوخال کا پتہ نہ چل سکا۔ اُس نے پہلے کسی عورت کو ایسی نظروں سے کبھی نہیں دیکھا تھا، جیسا کہ اُس روز جب کہ بارش ہو رہی تھی، اُس نے اُن دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ دیر تک وہ ان کو دیکھتا رہا جو بارش میں بھیگ بھیگ کر خوشی کے نعرے بلند کر رہی تھیں۔ تنویر نے اُن کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ وہ طبعاً کچھ اس قسم کا لڑکا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو بُری نظروں سے دیکھنا گناہ سمجھتا تھا' مگر اُس نے اُس روز بڑی للچائی نظروں سے اُن کو دیکھا۔ دیکھا ہی نہیں، بلکہ اُن کے گیلے بدن میں انگارہ بن کر برمے کی طرح چھید کرتا رہا۔ تنویر کی عمر اُس وقت بیس برس کے قریب ہو گی۔ ناتجربہ

کار تھا۔ زندگی میں اُس نے پہلی مرتبہ جوان لڑکیوں کے شباب کو گیلی ململ میں لپٹے دیکھا، تو اس نے یوں محسوس کیا کہ اُس کے خون میں چنگاریاں دوڑ رہی ہیں۔ اس نے اُن لڑکیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا چاہا۔ دیر تک وہ غور کرتا رہا۔ ایک لڑکی بڑی شریر تھی۔ دوسری اُس سے کم۔ اُس نے سوچا شریر اچھی رہے گی جو اُس کو شرارتوں کا سبق دے سکے۔ یہ شریر لڑکی خوبصورت تھی، اُس کے بدن کے اعضا بھی بہت مناسب تھے۔ بارش میں نہاتی جل پری معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے تنویر شاعر بن گیا۔ اُس نے کبھی اس طور پر نہیں سوچا تھا۔ لیکن اس لڑکی نے جس کا کُرتہ دوسری کے مقابلے میں بہت زیادہ مہین تھا، اُس کو ایسے ایسے شعر یاد کرا دیے جن کو عرصہ ہوا بھول چکا تھا۔ اس کے علاوہ ریڈیو پر سُنے ہوئے فلمی گانوں کی دُھنیں بھی اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں اور اُس نے باڑ کے پیچھے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اشوک کمار ہے۔ دلیپ کمار ہے۔ پھر اُسے کامنی کوشل اور نلنی جیونت کا خیال آیا۔ مگر اس نے جب اُس لڑکی کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ اُس میں کامنی کوشل اور نلنی جیونت کے خدوخال نظر آ جائیں تو اس نے ان دونوں ایکٹرسوں پر لعنت بھیجی۔ وہ ان سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اس کے ململ کے کُرتے میں جو شباب تھا، اس کا مقابلہ ءِ اس نے سوچا، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ تنویر نے آم چوسنے بند کر دیے اور اس لڑکی سے جس کا نام پروین تھا، عشق لڑانا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں اُسے بڑی مشکلات پیش آئیں، اس لیے کہ اُس لڑکی تک رسائی تنویر کو آسان نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر اُسے اپنے والدین کا بھی ڈر تھا۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ اس سے مُلتفت ہو گی یا نہیں؟ بہت دیر تک وہ انہی اُلجھنوں میں گرفتار رہا۔ راتیں جاگتا۔ جھاڑیوں کی پست قد جھاڑ کے پاس جاتا مگر وہ نظر نہ آتی۔ گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا، اور وہ بارش والا منظر جو اس نے دیکھا تھا، آنکھیں بند کر کے ذہن میں دہراتا رہتا۔ بہت دنوں کے بعد آخر اُس کو ایک روز اس سے ملاقات کا موقع مل گیا، وہ اپنے باپ کی کار میں گھر کے کسی کام کی غرض سے جا رہا تھا کہ پروین سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ کار اسٹارٹ کر چکا تھا کہ ساتھ والی کوٹھی میں تنویر کے خوابوں کی شہزادی نکلی۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ موٹر روک لے۔ تنویر گھبرا گیا۔ ہر عاشق ایسے موقعوں پر گھبرا ہی جایا کرتا ہے۔ اُس نے موٹر کچھ ایسے بینڈے انداز میں روکی کہ اُس کو زبردست دھچکا لگا۔ اس کا سر زور سے اسٹیرنگ وہیل کے ساتھ ٹکرایا، مگر اُس وقت وہ شراب کے نشے سے زیادہ مخمور تھا۔ اُس کو اُس کی محبوبہ نے خود مخاطب کیا تھا۔ پروین کے ہونٹوں پر گہرے سُرخ رنگ کی لپ اسٹک تھپی ہوئی تھی۔ اس نے سُرخ مسکراہٹ سے کہا۔

”معاف فرمایئے گا‘ میں نے آپ کو تکلیف دی۔ بارش ہو رہی ہے۔ تانگہ اس دُور دراز جگہ ملنا محال ہے۔ اور مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ آپ میرے ہمسائے ہیں اسی لیے آپ کو یہ زحمت دی۔“

تنویر نے کہا

”زحمت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ میں تو۔ میں تو۔

”اس کی زبان لڑکھڑا گئی“

آپ سے میرا تعارف تو نہیں لیکن آپ کو ایک بار دیکھا تھا۔“

پروین اپنی سرخ مسکراہٹوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اور تنویر سے پوچھا

”آپ نے مجھے کب دیکھا تھا۔“

تنویر نے جواب دیا

”آپ کی کوٹھی کے لان میں۔ جب آپ۔ جب آپ اور آپ کے ساتھ ایک اور لڑکی بارش میں نہا رہی تھی۔“

پروین نے اپنے گہرے سُرخ لبوں میں سے چیخ نما آواز نکالی

”ہائے۔ آپ دیکھ رہے تھے؟“

”یہ گستاخی میں نے ضرور کی۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں“

پروین نے ایک ادا کے ساتھ اس سے پوچھا:

”آپ نے دیکھا کیا تھا؟“

یہ سوال ایسا تھا کہ تنویر اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا‘ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا

”جی کچھ نہیں۔ بس آپ کو۔ میرا مطلب ہے کہ دو لڑکیاں تھیں جو بارش میں نہا رہی تھیں اور۔ اور خوش ہو رہی تھیں۔ میں اُس وقت آم چوس رہا تھا۔“

پروین کے گہرے سُرخ لبوں پر شریر مسکراہٹ پیدا ہوئی

”آپ آم چوستے کیوں ہیں۔ کاٹ کر کیوں نہیں کھاتے؟“

تنویر نے موٹر اسٹارٹ کر دی‘ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سوال کا جواب کیا دے‘ چنانچہ وہ گول کر گیا

”آپ کو میں کہاں ڈراپ کر دوں۔“

پروین مسکرائی‘آپ مجھے کہیں بھی ڈراپ کر دیں‘وہی میری منزل ہو گی“

تنویر نے یوں محسوس کیا کہ اسے اپنی منزل مل گئی ہے‘لڑکی جو اُس کے پہلو میں بیٹھی ہے‘اب اُسی کی ہے لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کا ہاتھ دبائے‘یا اس کی کمر میں ایک دو سیکنڈ کے لیے اپنا بازو حمائل کر دے۔ بارش ہو رہی تھی‘موسم بہت خوشگوار تھا‘اس نے کافی دیر سوچا موٹر کی رفتار اس کے خیالات کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی۔ آخر اس نے ایک جگہ اسے روک لیا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اس کو اپنے ساتھ چمٹا لیا‘اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیے۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی لذیذ آم چوس رہا ہے‘پروین نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ لیکن فوراً تنویر کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ اُس نے بڑی ناشائستہ حرکت کی ہے اور غالباً پروین کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی‘چنانچہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اس نے کہا

”آپ کو کہاں جانا ہے؟“

پروین کے چہرے پر یوں خفگی کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن تنویر یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اس کے خون کی پیاسی ہے۔ پروین نے اسے بتا دیا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ جب وہ اس جگہ پہنچا تو اُسے معلوم ہوا وہ رنڈیوں کا چکلہ ہے۔ جب اس نے پروین کو موٹر سے اُتارا تو اُس کے ہونٹوں پر گہرے لال رنگ کی مسکراہٹ بکھر رہی تھی۔ اس نے کولہے مٹکا کر ٹھیٹ کسبیوں کے انداز میں اس سے کہا

”شام کو میں یہاں ہوتی ہوں۔ آپ کبھی ضرور تشریف لائیے“

تنویر جب بھونچکا ہو کر اپنی موٹر کی طرف بڑھا تو اسے ایسا لگا کہ وہ بھی ایک کسبی عورت ہے جسے وہ ہر روز چلاتا ہے‘اُس کی لال بتی لپ اسٹک ہے جو پروین نے ہونٹوں پر تھپی ہوئی تھی۔ وہ واپس اپنی کوٹھی چلا آیا۔ بارش ہو رہی تھی۔ اور تنویر بیحد مغموم تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھوں کے آنسو بارش کے قطرے بن کر ٹپک رہے ہیں۔ ۱۴، مئی ۵۴ء

باسط

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوباسط

باسط بالکل رضامند نہیں تھا، لیکن ماں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ اول اول تو اس کو اتنی جلدی شادی کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی، اس کے علاوہ وہ لڑکی بھی اسے پسند نہیں تھی جس سے اس کی ماں اس کی شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک ٹالتا رہا۔ جتنے بہانے بنا سکتا تھا۔ اس نے بنائے، لیکن آخر ایک روز اُس کو ماں کی اٹل خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ دراصل انکار کرتے کرتے وہ بھی تنگ آ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے دل میں سوچا۔

”یہ بک بک ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے ہونے دو شادی۔ کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ میں نبھالوں گا۔“

اس کی ماں بہت خوش ہوئی۔ لڑکی والے اس کے عزیز تھے اور وہ عرصہ ہوا اُن کو زبان دے چکی تھی۔ جب باسط نے ہاں کی تو وہ تاریخ۔ پکی کرنے کے لیے لڑکی والوں کے ہاں گئی۔ انھوں نے ٹال مٹول کی تو باسط کی ماں کو بہت غصہ آیا۔ سعیدہ کی ماں، میں نے اتنی مشکلوں سے باسط کو رضامند کیا ہے، اب تم تاریخ پکی نہیں کر رہی ہو۔ شادی ہو گی تو اسی مہینے کی بیس کو ہو گی۔ نہیں تو نہیں ہو گی۔ اور یہ بات سولہ آنے پکی ہے۔ سمجھ لیا۔“

دھمکی نے کام کیا۔ لڑکی کی ماں بالآخر راضی ہو گئی۔ سب تیاریاں مکمل ہوئیں۔ بیس کو دلہن گھر میں تھی۔ باسط کو گو وہ پسند نہیں تھی، لیکن وہ اس کے ساتھ نبھانے کا فیصلہ کر چکا تھا، چنانچہ وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ اس پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہ کہ وہ زبردستی اس کے سر منڈھ دی گئی ہے۔ نئی دلہنیں عام طور پر بہت شرمیلی ہوتی ہیں لیکن باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ ضرورت سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اس کے اس شرمیلے پن میں کچھ خوف بھی تھا جیسے وہ باسط سے ڈرتی ہے۔ شروع شروع میں باسط نے سوچا کہ یہ چیز دور ہو جائیگی مگر وہ بڑھتی ہی گئی۔ باسط نے اس کو چند روز کے لیے میکے بھیج دیا۔ واپس آئی تو اس کا خوف آلود شرمیلا پن ایک حد تک دور ہو چکا تھا۔ باسط نے سوچا ایک دو مرتبہ اور میکے جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر اس کا یہ قیاس غلط نکلا۔ سعیدہ پھر خوف زدہ رہنے لگی۔ باسط نے ایک روز اس سے پوچھا۔

”سعیدہ تم ڈری ڈری کیوں رہتی؟“

سعیدہ یہ سن کر چونکی۔

”نہیں تو۔ نہیں تو“

باسط نے اس سے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"آخر بات کیا ہے۔ خدا کی قسم مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ کس بات کا ڈر ہے تمہیں۔ میری ماں اتنی اچھی ہے۔ وہ تم سے ساسوں کا سا سلوک نہیں کرتی۔ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔ پھر تم ایسی صورت کیوں بنائے رکھتی ہو کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں یہ خوف ہے کہ کوئی تمہیں پیٹے گا۔

"یہ کہہ کر اس نے سعیدہ کا منہ چوما۔"

سعیدہ خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں البتہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئیں۔ باسط نے اس کو اور پیار کیا اور کہا۔

"تمہیں ہر وقت ہنستی رہنا چاہیے۔ لو، اب ذرا ہنسو۔ ہنسو میری جان۔"

سعیدہ نے ہنسنے کی کوشش کی۔ باسط نے پیار سے اس کو تھپکی دی۔

"شاباش!۔ اسی طرح مسکراتا چہرہ ہونا چاہیے ہر وقت! باسط کی یہ محبت ظاہر ہے کہ بالکل مصنوعی تھی، کیونکہ سعیدہ کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن وہ صرف اپنی ماں کی خاطر چاہتا تھا کہ سعیدہ سے اس کا رشتہ ناکام ثابت نہ ہو۔ اس کی ماں اپنی شکست کبھی برداشت نہ کر سکتی۔ اس نے اپنی زندگی میں شکست کا منہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لیے باسط کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ سعیدہ سے اس کی نبھ جائے، چنانچہ اپنے دل میں سعیدہ کے لیے اس نے بڑے خلوص کے ساتھ مصنوعی محبت پیدا کر لی تھی۔ اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا۔ اپنی ماں سے سعیدہ کی چھوٹی سی بات کی بھی تعریف کرتا تھا۔ جب وہ یہ محسوس کرتا کہ اس کی ماں بہت مطمئن ہے، اس بات سے مطمئن ہے کہ اس نے باسط کا رشتہ ٹھیک جگہ ہے تو اس کو دلی خوشی ہوتی۔ شادی کو ایک مہینہ ہو گیا۔ اس دوران میں سعیدہ کئی مرتبہ میکے گئے۔ باسط کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یوں اس کا خوف آلود شرمیلا پن دور ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ یہ دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو سعیدہ وحشت زدہ دکھائی دیتی تھی۔ باسط حیران تھا کہ بات کیا ہے۔ اس کے بارے میں اس نے ماں سے کوئی بات نہ کی اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کو ڈانٹ پلاتیں۔

"بکواس نہ کرو۔ مجھے معلوم تھا تم ضرور ایک روز اس میں کیڑے ڈالو گے۔"

باسط نے سعیدہ ہی سے کہا۔

"میری جان، تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو۔"

سعیدہ چونک اٹھی۔

"جی؟"

اس کے چونکنے پر باسط نے یوں محسوس کیا جیسے اس نے سعیدہ کی کسی دکھتی رگ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ لہجے میں اور زیادہ پیار بھر کے اس نے کہا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ اب تم اور زیادہ خوف زدہ رہنے لگی ہو۔ آخر بات کیا ہے۔"

سعیدہ نے تھوڑے توقف کے بعد جواب دیا۔

"بات تو کچھ بھی نہیں۔ میں ذرا بیمار ہوں۔"

"کیا بیماری ہے۔ تم نے مجھ سے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔"

سعیدہ نے دوپٹے کے کنارے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"امی جان علاج کرا رہی ہے میرا۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

باسط نے سعیدہ سے اور زیادہ دلچسپی لینا شروع کی تو اس نے دیکھا کہ وہ ہر روز چھپ کر کوئی دوا کھاتی ہے۔ ایک دن جب کہ وہ اپنے قفل لگے ٹرنک سے دوا نکال کر کھانے والی تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ زور سے چونکی۔ سفوف کی کھلی ہوئی پڑیا اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ باسط نے اس سے پوچھا۔

"یہ دوا کھاتی ہو۔"

سعیدہ نے تھوک نگل کر جواب دیا۔

"جی ہاں۔ امی جان نے حکیم صاحب سے منگوائی تھی۔"

"کچھ افاقہ ہے اس سے۔"

"جی ہاں"!

"تو کھاؤ۔ اگر آرام نہ آئے تو مجھ سے کہنا۔ میں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔"

سعیدہ نے پڑیا فرش پر سے اٹھائی اور سر ہلا کر کہا۔

”جی اچھا۔“

باسط چلا گیا، اس نے سوچا۔

”اچھا ہے، کوئی علاج تو ہو رہا ہے۔ خدا کرے اچھی ہو جائے۔ میرا خیال ہے یہ ڈر ور کچھ نہیں۔ بیماری ہے۔ دور ہو جائیگی انشاء اللہ“!

اس نے سعیدہ کی اس بیماری کا اپنی ماں سے پہلی بار ذکر کیا تو کہنے لگی۔

”بکواس ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے اچھی بھلی ہے۔ کیا بیماری ہے اسے ؟“

باسط نے کہا۔

”مجھے کیا معلوم امی جان ؟۔ یہ تو سعیدہ ہی بتا سکتی ہے آپ کو۔“

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

”میں پوچھوں گی اس سے“

۔جب سعیدہ سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔

”کچھ نہیں خالہ جان، سر میں درد رہتا تھا۔ امی جان نے حکیم صاحب سے دوا منگا دی تھی۔ اصل میں باسط صاحب بڑے وہمی ہیں۔ ہر وقت کہتے رہتے ہیں تم ڈری ڈری سی دکھائی دیتی ہو۔ مجھے ڈر کس بات کا ہو گا بھلا۔“

باسط کی ماں نے کہا۔

”بکواس کرتا ہے۔ تم اس کی فضول باتوں کا خیال نہ کرو۔“

چندروز کے بعد باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ بہت ہی زیادہ گھبرائی ہوئی ہے۔ اس کا اضطراب اس کے روئیں روئیں سے ظاہر ہوتا تھا۔ شام کے قریب اس نے باسط سے کہا۔

”امی جان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے وہاں چھوڑ آیئے۔“

باسط نے جواب دیا۔

”نہیں سعیدہ۔ آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

سعیدہ نے اصرار کیا۔

”آپ مجھے وہاں چھوڑ آیئے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

باسط نے انکار کر دیا۔

”وہاں طبیعت ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہاں بھی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ جاؤ آرام سے لیٹ جاؤ۔“

باسط کی ماں آگئی۔ باسط نے اس سے کہا۔

”امی جان، دیکھیے سعیدہ ضد کر رہی ہے طبیعت اس کی ٹھیک نہیں، کہتی ہے مجھے امی جان کے پاس لے چلو۔“

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

”کل چلی جانا سعیدہ۔“

سعیدہ نے اور کچھ نہ کہا۔ خاموش ہو کر باہر صحن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد باسط باہر نکلا۔ سعیدہ صحن میں نہیں تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ مگر وہ نہ ملی۔ باسط نے سوچا اوپر کوٹھے پر ہو گی۔ اوپر گیا تو غسل خانے کا دروازہ بند تھا۔ کھٹکھٹا کر اس نے آواز دی۔

”سعیدہ“!

کوئی جواب نہ ملا تو پھر پکارا۔

”سعیدہ“!

اندر سے بڑی نحیف آواز آئی۔

”جی“!

باسط نے پوچھا۔

”کیا کر رہی ہو۔“

اور زیادہ نحیف آواز آئی۔

”نہا رہی ہوں۔“

باسط نیچے آگیا۔ سعیدہ کے بارے میں سوچتا سوچتا باہر گلی میں نکلا۔ موری کی طرف نظر پڑی تو اس میں خون ہی خون تھا اور یہ خون اس غسل خانے سے آرہا تھا۔ جس میں سعیدہ نہا رہی تھی۔ باسط کے ذہن میں تلے اوپر کئی خیالات اوندھے سیدھے گرے۔ پھر یہ گردان شروع ہوگئی۔

”دوا۔ خون۔ خون۔ دوا۔ ڈر۔ دوا۔ خون۔ ڈر“!

پھر اس نے آہستہ آہستہ سوچنا شروع کیا۔ سعیدہ کی ماں شادی کی تاریخ کی پکی نہیں کرتی تھی۔ اس نے کہا تھا ایک دو مہینے ٹھہر جاؤ۔ سعیدہ کا بار بار اپنی ماں سے ملنے جانا۔ اس کا ہر وقت خوفزدہ رہنا۔ دوا کھانا۔ اور خاص طور پر آج بہت ہی زیادہ وحشت زدہ رہنا۔ باسط سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سعیدہ پیٹ سے تھی۔ جب وہ دلہن بن کر اس کے پاس آئی تھی۔ اس کی ماں کی یہ کوشش تھی کہ حمل گر جائے۔ چنانچہ آج وہ چیز ہوگئی۔ باسط نے سوچا۔

”کیا میں اوپر جاؤں۔ جاکر سعیدہ کو دیکھوں۔ اپنی ماں سے بات کرو۔“

ماں کا سوچا تو اس کو خیال آیا کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ذلیل ہونا کبھی گوارا نہیں کرے گی۔ ضرور کچھ کھا کر مر جائے گی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اپنے کمرے میں گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کئی بار اس کو سعیدہ کا خیال آیا کہ وہ خدا معلوم کس حالت میں ہوگی۔ اس کے جسم پر، اس کے دل و دماغ پر کیا کچھ بیتا ہوگیا اور کیا بیت رہا ہوگا۔ کیسے اتنا بڑا راز چھپائے گی۔ کیا لوگ پہچان نہیں جائیں گے۔ جوں جوں وہ سعیدہ کے بارے میں سوچتا اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جاتا۔ اس کو سعیدہ پر ترس آنے لگا۔

”بے چاری، معلوم نہیں بے ہوش پڑی ہے یا ہوش میں ہے۔ ہوش میں بھی اس پر جانے کیا گزر رہی ہوگی۔ کیا وہ نیچے آسکے گی؟“

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر صحن میں گیا تو سعیدہ نیچے آئی۔ اس کا رنگ بے حد زرد تھا، اتنا زرد کہ وہ بالکل مردہ معلوم ہوتی تھی۔ اس سے بمشکل چلا جاتا تھا۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ کمر میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ باسط نے اس کو دیکھا تو اس پر بہت ترس آیا۔ اندر سے برقع اٹھایا اور اس سے کہا۔

”چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

سعیدہ نے بہت ہمت سے کام لیا۔ باسط کے ساتھ چل کر باہر سڑک تک گئی باسط نے ٹانگہ لیا اور اس کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا۔ ماں نے اس سے پوچھا۔

”سعیدہ کہاں ہے؟“

باسط نے جواب دیا۔

”ضد کرتی تھی۔ میں اسے چھوڑ آیا ہوں۔“

باسط کی ماں نے اس کو ڈانٹا۔

”بکواس کرتے ہو۔ ضد کرنے دی ہوتی۔ تم اسی طرح اس کی عادتیں خراب کروگے اور پھر مجھ سے کہو کہ میں نے غلط جگہ تمہارا رشتہ کیا تھا۔“

باسط نے کہا۔

”نہیں امی جان۔ سعیدہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔“

اس کی ماں مسکرائی۔

”میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ وہ بہت نیک لڑکی ہے تم اسے ضرور پسند کروگے۔“

پھر تھوڑی دیر چھالیا کاٹنے کے بعد ایک دم باسط سے مخاطب ہوئی۔

”اور ہاں باسط یہ اوپر غسل خانے میں خون کیسا تھا۔“

باسط سٹپٹا سا گیا۔

”وہ۔ کچھ نہیں امی جان۔ میری نکسیر پھوٹی تھی۔“

ماں نے بڑے غصے کے ساتھ کہا۔

”کم بخت گرم چیزیں نہ کھایا کرو۔ جب دیکھو جیبیں مونگ پھلی سے بھری ہیں۔“

باسط کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ اٹھ کر کہیں گئی تو باسط اوپر غسل خانے میں گیا۔ پانی ڈال کر اس کو اچھی طرح صاف کیا۔ اس کے دل کو اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ اس نے اپنی ماں سے سعیدہ کے متعلق کوئی بات نہیں کی اور نہ اس نے سعیدہ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کا راز جانتا ہے۔ وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ سعیدہ کا راز ہمیشہ اس کے سینے میں دفن رہیگا۔ وہ کافی تکلیف اٹھا چکی تھی۔ باسط کے خیال کے مطابق اس کو اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ مزید سزا دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”خدا کرے وہ جلد تندرست ہو جائے۔ اب اس کے چہرے پر وہ الجھن پیدا کرنے والا خوف نہیں رہے گا۔“

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے اس کی ماں کی چیخ کی آواز آئی۔ باسط لوٹا رکھ کر دوڑا نیچے گیا۔ سب کمرے دیکھے۔ ڈیوڑھی میں گیا تو اس کی ماں فرش پر اوندھی پڑی تھی، مردہ۔ اس کے سامنے کوڑے والے لکڑی کے بکس میں ایک چھوٹا بہت ہی چھوٹا سا نامکمل بچہ کپڑے میں لپٹا پڑا تھا۔ باسط کو بے حد صدمہ ہوا۔ اس نے پہلے اس بچے کو اٹھایا۔ کپڑے میں اچھی طرح لپیٹا اور اندر جا کر بوٹ کے خالی ڈبے میں بند کر دیا۔ پھر ماں کو اٹھا کر اندر چارپائی پر لٹایا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر دیر تک روتا رہا۔ سعیدہ کو اطلاع پہنچی تو اس کو اپنی ماں کے ساتھ آنا پڑا۔ وہ اسی طرح زرد تھی۔ پہلے سے زیادہ نڈھال۔ باسط کو بہت ترس آیا۔ اس سے کہا۔

”سعیدہ جو اللہ کو منظور ہو گیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ رونا بند کرو اور جاؤ اندر لیٹ جاؤ۔“

اندر جانے کے بجائے سعیدہ ڈیوڑھی میں گئی۔ جب واپس آئی تو اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ باسط خاموش رہا۔ سعیدہ نے اس کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو صاف بتا رہے تھے کہ وہ باسط کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ باسط نے اس سے بڑے پیار سے کہا۔

”زیادہ رونا اچھا نہیں سعیدہ۔ جو خدا کو منظور تھا ہو گیا۔“

دوسرے رز اس نے بچے کو نہر کے کنارے گڑھا کھود کر دفنا دیا۔ 29 جولائی 1950ء

بانجھ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبانجھ

میری اور اُس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہُوئی شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی اُن دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھی۔ جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا۔ دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا۔ اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور بہت دُور جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے۔ بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ بہت بڑا گدلے رنگ کا قالین ہے۔ جسے ادھر سے اُدھر سمیٹا جا رہا ہے۔ ساحل کے سب قمقمے روشن تھے جن کا عکس کنارے کے لرزاں پانی پر کپکپاتی ہوئی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رینگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھریلی دیوار کے نیچے کئی کشتیوں کے لپٹے ہوئے بادبان اور بانس ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔ سمندر کی لہریں اور تماشائیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر فضا میں گھلی ہُوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے

”ہوں“

کی ہے۔ ایسے ماحول میں سگریٹ پینے کا بہت مزہ آتا ہے میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ مگر ماچس نہ ملی۔ جانے کہاں بھول آیا تھا۔ سگریٹ کی ڈبیا واپس جیب میں رکھنا ہی والا تھا۔ کہ پاس سے کسی نے کہا۔

”ماچس لیجیے گا۔“

میں نے مڑ کر دیکھا۔ بنچ کے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ یوں تو بمبئی کے عام باشندوں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ لیکن اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”آپ کی بڑی عنایت ہے۔“

اُس نے جواب دیا۔ آپ سگریٹ سلگا لیجیے۔ مجھے جانا ہے“

مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ اُس نے جھوٹ بولا ہے۔ کیونکہ اس کے لہجے سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اُسے کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ اسے کہیں جانا ہے۔ آپ کہیں گے کہ لہجے سے ایسی باتوں کا کس طرح پتہ چل سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہا۔

”ایسی جلدی کیا ہے------ تشریف رکھیے۔ اور یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔ شوق فرمائیے۔“

اُس نے سگریٹ کی چھاپ کی طرف دیکھا۔ اور جواب دیا۔ شکریہ، میں صرف برانڈ پیا کرتا ہوں۔“

آپ مانیں نہ مانیں۔ مگر میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اس بار اُس نے پھر جھوٹ بولا۔ اس مرتبہ پھر اُس کے لہجے نے چغلی کھائی۔ اور مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس لیے کہ میں نے اپنے دل میں قصد کر لیا تھا۔ کہ اسے ضرور اپنے پاس بٹھاؤں گا۔ اور اپنا سگریٹ پلواؤں گا۔ میرے خیال کے مطابق اس میں مشکل کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے دو جملوں ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اُس کا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس بیٹھے اور سگریٹ پیے۔ لیکن بیک وقت اُس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا تھا کہ میرے پاس نہ بیٹھے اور میرا سگریٹ نہ پیے چنانچہ ہاں اور نہ کا یہ تصادم اُس کے لہجے میں صاف طور پر مجھے نظر آیا تھا۔ آپ یقین جانیے کہ اس کا وجود بھی ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں لٹکا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں بے حد پیلا تھا۔ اس پر اُس کی ناک آنکھوں اور منہ کے خطوط اس قدر مدھم تھے جیسے کسی نے تصویر بنائی ہے اور اس کو پانی سے دھو ڈالا ہے۔ کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ اُبھر سے آتے لیکن پھر راکھ میں لپٹی ہوئی چنگاری کے مانند سو جاتے۔ اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کا بھی یہی حال تھا۔ آنکھیں گدلے پانی کی دو بڑی بڑی بوندیں تھیں جن پر اس کی چھوری پلکیں جھُکی ہوئی تھیں۔ بال کالے تھے۔ مگر اُن کی سیاہی جلے ہوئے کاغذ کے مانند تھی جن میں بھوسلا پن ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اُس کی ناک کا صحیح نقشہ معلوم ہو سکتا تھا۔ مگر دور سے دیکھنے پر وہ بالکل چپٹی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ جیسا کہ میں اس سے پیشتر بیان کر چکا ہوں۔ اُس کے چہرے کے خطوط بالکل ہی مدھم تھے۔ اس کا قد عام لوگوں جتنا تھا۔ یعنی نہ چھوٹا نہ بڑا۔ البتہ جب وہ ایک خاص انداز سے یعنی اپنی کمر کی ہڈی کو ڈھیلا چھوڑ کے کھڑا ہوتا۔ تو اس کے قد میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا۔ اس طرح جب کہ وہ ایک دم کھڑا ہوتا۔ تو اُس کا قد جسم کے مقابلے میں بہت بڑا دکھائی دیتا۔ کپڑے اُس کے خستہ حالت میں تھے۔ لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے آخری حصّے کثرتِ استعمال کے باعث گھِس گئے تھے اور پھُوسڑے نکل آئے تھے۔ کالر کھلا تھا۔ اور قمیض بس ایک اور دھلائی کی مار تھی۔ مگر ان کپڑوں میں بھی وہ خود کو ایک باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ میں نے سعی کر رہا تھا! اس لیے کہا۔ کیونکہ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ تو اس کے سارے وجود میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ سلگا کر اس کی طرف ڈبیا بڑھا دی۔

”شوق فرمایئے۔“

یہ میں نے کچھ اس طریقے سے کہا۔ اور فوراً ماچس سُلگا کر اس انداز سے پیش کی کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اُس نے ڈبیا میں سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبا لیا۔ اور اُسے سلگا کر پینا بھی شروع کر دیا۔ لیکن ایکا ایکی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور منہ میں سے سگریٹ نکال کر مصنوعی کھانسی کے آثار حلق میں پیدا کرتے ہُوئے اُس نے کہا۔

”کیونڈر مجھے راس نہیں آتے ان کا تمباکو بہت تیز ہے۔ میرے گلے میں فوراً خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”آپ کون سے سگریٹ پسند کرتے ہیں؟“

اُس نے تتلا کر جواب دیا۔

”میں۔۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔۔دراصل سگریٹ بہت کم پیتا ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر اروکر نے منع کر رکھا ہے۔ ویسے میں تھری فالُو پیتا ہوں جن کا تمباکو تیز نہیں ہوتا۔ اس نے جس ڈاکٹر کا نام لیا۔ وہ بمبئی کا بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کی فیس دس روپے ہے۔ اور جن سگریٹوں کا اس نے حوالہ دیا۔ اس کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ بہت مہنگے داموں پر ملتے ہیں۔ اس نے ایک ہی سانس میں دو جھوٹ بولے۔ جو مجھے ہضم نہ ہوئے۔ مگر میں خاموش رہا۔ حالانکہ سچ عرض کرتا ہوں۔ اُس وقت میرے دل میں یہی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی۔ کہ اس کا غلاف اتار دوں اور اس کی دروغ گوئی کو بے نقاب کر دوں۔ اور اسے کچھ اس طرح شرمندہ کروں کہ وہ مجھ سے معافی مانگے۔ مگر میں نے جب اُس کی طرف دیکھا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا جزو بن کر رہ گیا ہے۔ جھوٹ بول کر چہرے پر جو ایک سُرخی سی دوڑ جایا کرتی ہے۔ مجھے نظر نہ آئی بلکہ میں نے یہ دیکھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا ہے۔ اس کو حقیقت سمجھتا ہے۔ اُس کے جھوٹ میں اس قدر اخلاص تھا۔ یعنی اس نے اتنے پُر خلوص طریقے پر جھوٹ بولا تھا۔ کہ اس کی میزانِ احساس میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ خیر اس قصّے کو چھوڑیے۔ ایسی باریکیاں میں آپ کو بتانے لگوں تو صفحوں کے صفحے کالے ہو جائیں گے۔ اور افسانہ بہت خشک ہو جائے گا۔ تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے اس کو راہ پر لگایا۔ اور ایک اور سگریٹ پیش کر کے سمندر کے دلفریب منظر کی بات چھیڑ دی۔ چونکہ افسانہ نگار ہوں۔ اس لیے کچھ اس دلچسپ طریقے پر اُسے سمندر، اپولُو بندر اور وہاں آنے جانے والے تماشائیوں کے بارے میں چند باتیں سنائیں۔ کہ چھ سگریٹ پینے پر بھی اُس کے حلق میں خرخراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتایا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

”آپ مسٹر۔۔۔۔۔۔ہیں۔۔۔۔۔۔میں آپ کے کئی افسانے پڑھ چکا ہوں۔ مجھے۔۔۔۔۔۔مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ آپ۔ ہیں۔۔۔۔۔۔مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے واللہ بہت خوشی ہوئی ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ مگر اُس نے اپنی بات شروع کر دی۔۔۔۔۔۔

”ہاں خوب یاد آیا ابھی حال ہی میں آپ کا ایک افسانہ میں نے پڑھا ہے------ عنوان بھول گیا ہوں------ اس میں آپ نے ایک لڑکی پیش کی ہے۔ جو کسی مرد سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ اُسے دھوکہ دے گیا۔ اسی لڑکی سے ایک اور مرد بھی محبت کرتا تھا۔ جو افسانہ سناتا ہے جب اس کو لڑکی کی افتاد کا پتہ چلتا ہے۔ تو وہ اس سے ملتا ہے اور اس سے کہتا ہے۔ زندہ رہو------ ان چند گھڑیوں کی یاد میں اپنی زندگی کی بنیادیں کھڑی کرو۔ جو تم نے اس کی محبت میں گزاری ہیں۔ اُس مسّرت کی یاد میں جو تم نے چند لمحات کے لیے حاصل کی تھی“ ------ مجھے اصل عبارت یاد نہیں رہی۔ لیکن مجھے بتایئے۔ کیا ایسا ممکن ہے----- ممکن کو چھوڑیے۔ آپ یہ بتایئے کہ وہ آدمی آپ تو نہیں تھے؟------ مگر کیا آپ ہی نے اس سے کوٹھے پر ملاقات کی تھی اور اس کی تھکی ہوئی جوانی کو اُونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر نیچے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے آئے تھے------“

یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ٹھہر گیا۔

”مگر مجھے ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔ اپنے دل کا حال کون بتاتا ہے۔“

اس پر میں نے کہا۔

”میں آپ کو بتاؤں گا۔ لیکن پہلی ملاقات میں سب کچھ پوچھ لینا۔ اور سب کچھ بتا دینا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

وہ جوش جو گفتگو کرتے وقت اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”آپ کا فرمانا بالکل درست ہے مگر کیا پتہ ہے کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔“

اس پر میں نے کہا۔

”اس میں شک نہیں بمبئی بہت بڑا شہر ہے لیکن ہماری ایک نہیں بہت سی ملاقاتیں ہو سکتی ہیں بیکار آدمی ہوں یعنی افسانہ نگار------ شام کو ہر روز اسی وقت بشرطیکہ بیمار نہ ہو جاؤں آپ مجھے ہمیشہ اسی جگہ پر پائیں گے۔ یہاں بے شمار لڑکیاں سیر کو آتی ہیں۔ اور میں اس لیے آتا ہوں کہ خود کو کسی کی محبت میں گرفتار کر سکوں-------- محبت بُری چیز نہیں ہے“!

”محبت------ محبت------!اُس نے اس سے آگے کچھ کہنا چاہا۔ مگر نہ کہہ سکا۔ اور جلتی ہوئی رسّی کی طرح آخری بل کھا کر خاموش ہو گیا۔ میں نے ازراہِ مذاق اُس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اس وقت فضا ایسی دلفریب تھی۔ کہ اگر کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں۔ نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے قطار اندر قطار آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کی قربت کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ ایک ایسی جس کا احساس تحت شعور میں چھپا رہتا ہے۔ خدا معلوم اُس نے کس افسانے کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا۔ مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں۔ اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں۔ وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں۔ یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں۔ یا محض دماغی عیاشی کے لیے میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے۔ اس لیے میں نے کبھی اُن کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں۔ اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں۔ مگر وہ رومان نہیں ہیں۔ اُس نے جس افسانے کا ذکر کیا تھا۔ وہ یقیناً کوئی ادنیٰ درجے کا رومان تھا۔ جو میں نے اپنے چند جذبات کی پیاس بجھانے کے لیے لکھا ہو گا------ لیکن میں نے تو اپنا افسانہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ ہاں تو جب وہ محبت کہہ کر خاموش ہو گیا۔ تو میرے دل میں خواہش پیدا ہُوئی کہ محبت کے بارے میں کچھ اور کہوں۔

چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا۔

”محبت کی یُوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں۔ کہ محبت خواہ ملتان میں ہو یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں۔ سردیوں میں پیدا ہو یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں------ محبت خوبصورت کرے یا بدصورت بدکردار کرے یا نیکوکار------- محبت محبت ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ہی ایک سی چلی آرہی ہے۔ اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور راجکماری جنگل میں۔ غلام محمدؐ کے دل میں بھنگن محبت پیدا کر دے، اور نٹورلال کے دل میں کوئی رانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح عورتوں کا حمل گر جاتا ہے۔ اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں------ اس کا مطلب یہ نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش اُن کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے، یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا، نہیں، یہ خواہش اُن کے دل میں موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں۔ جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے------ محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے------“

مجھے اپنی گفتگو دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں اس کی طرف دیکھے بغیر لیکچر دیے جا رہا تھا۔ لیکن جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ تو وہ سمندر کے اُس پار خلا میں دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے خیالات میں گم تھا میں خاموش ہو گیا۔ جب دُور سے کسی موٹر کا ہارن بجا تو وہ چونکا اور خالی الذہن ہو کر کہنے لگا۔

”جی۔۔۔۔۔۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے“!

میرے جی میں آئی۔ کہ اس سے پوچھوں۔۔۔۔۔۔ درست فرمایا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔ اس کو چھوڑیے آپ یہ بتائیے کہ میں نے کیا کہا ہے؟“

لیکن میں خاموش رہا۔ اور اس کو موقع دیا کہ اپنے وزنی خیالات دماغ سے جھٹک دے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد اُس نے پھر کہا۔

”آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ خیر چھوڑیئے اس قصّے کو۔“

مجھے اپنی گفتگو بہت اچھی معلوم ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ کوئی میری باتیں سُنتا چلا جائے۔ چنانچہ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

”تو میں عرض کر رہا تھا کہ بعض آدمی بھی محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے دل میں محبت کرنے کی خواہش تو موجود ہوتی ہے لیکن ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بانجھ پن کا باعث روحانی نقائص ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

اس کا رنگ اور بھی زرد پڑ گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ یہ تبدیلی اُس کے اندر اتنی جلدی پیدا ہوئی کہ میں نے گھبرا کر اُس سے پوچھا۔

”خیریت تو ہے۔۔۔۔۔ آپ بیمار ہیں۔“

”نہیں تو۔ نہیں تو“

اُس کی پریشانی اور بھی زیادہ ہو گئی۔

”مجھے کوئی بیماری ویماری نہیں ہے۔ لیکن آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں بیمار ہوں۔“

میں نے جواب دیا۔ اس وقت آپ کو جو کوئی بھی دیکھے گا۔ یہی کہے گا۔ کہ آپ بہت بیمار ہیں۔ آپ کا رنگ خوفناک طور پر زرد ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے آپ کو گھر چلے جانا چاہیے۔ آیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔“

”نہیں میں چلا جاؤں گا۔ مگر میں بیمار نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔ کبھی کبھی میرے دل میں معمولی سا درد پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ شاید وہی ہو۔۔۔۔۔ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا آپ اپنی گفتگو جاری رکھیے۔“

میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ کیونکہ وہ ایسی حالت میں نہیں تھا کہ میری بات غور سے سُن سکتا۔ لیکن جب اُس نے اصرار کیا۔ تو میں نے کہنا شروع کیا۔

”میں آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔۔۔۔ میں ایسے آدمیوں کے جذبات اور اُن کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن جب میں اس بانجھ عورت کا تصور کرتا ہوں۔ جو صرف ایک بیٹی یا بیٹا حاصل کرنے کے لیے دعائیں مانگتی ہے۔ خدا کے حضور میں گڑگڑاتی ہے اور جب وہاں سے کچھ نہیں ملتا تو ٹونے ٹوٹکوں میں اپنا گوہر مقصود ڈھونڈتی ہے۔ شمشانوں سے راکھ لاتی ہے کئی کئی راتیں جاگ کر سادھوؤں کے بتائے ہوئے منتر پڑھتی ہے۔ منّتیں مانتی ہے۔ چڑھاوے چڑھاتی ہے۔ تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس آدمی کی بھی یہی حالت ہوتی ہو گی۔ جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہو۔۔۔۔۔ ایسے لوگ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں۔ مجھے اندھوں پر اتنا رحم نہیں آتا جتنا ان لوگوں پر آتا ہے“

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ تھوک نگل کر دفعتہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور پرلی طرف منہ کر کے کہنے لگا۔

”اوہ بہت دیر ہو گئی۔ مجھے ضروری کام کے لیے جانا تھا یہاں باتوں باتوں میں کتنا وقت گزر گیا“

میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پلٹا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر لیکن میری طرف دیکھے بغیر اُس نے

”اب رخصت چاہتا ہوا“

کہا اور چل دیا۔۔ دوسری مرتبہ اس سے میری ملاقات پھر اپولو بندر ہی پر ہوئی۔ میں سیر کا عادی نہیں ہوں۔ مگر اس زمانے میں ہر شام اپولو بندر پر جانا میرا دستور ہو گیا تھا۔ ایک مہینے کے بعد جب مجھے آگرہ کے ایک شاعر نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں اُس نے نہایت ہی حریصانہ طور پر اپولو بندر اور وہاں جمع ہونے والی پریوں کا ذکر کیا۔ اور مجھے اس لحاظ سے بہت خوش قسمت کہا۔ کہ میں بمبئی میں ہوں۔ تو اپالو بندر سے میری دلچسپی ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئی۔ اب جب کبھی کوئی مجھے اپولو بندر جانے کو کہتا ہے تو مجھے آگرے کے شاعر کا خط یاد آ جاتا ہے اور میری طبیعت متلا جاتی ہے۔ لیکن میں اُس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں۔ جب خط مجھے نہیں ملا تھا۔ اور میں ہر روز جا کر شام کو اپولو بندر کے اس بنچ پر بیٹھا کرتا تھا۔ جس کے اُس طرف کئی آدمی چمپی والوں سے اپنی کھوپڑیوں کی مرمت کراتے رہتے ہیں۔ دن پوری طرح ڈھل چکا تھا۔ اور اُجالے کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ اکتوبر کی گرمی میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔۔۔۔۔۔ تھکے ہوئے مسافر کی طرح۔ سیر کرنے والوں کا ہجوم زیادہ تھا۔ میرے پیچھے موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ بنچ بھی سب کے سب پُر تھے۔ جہاں بیٹھا کرتا تھا۔ وہاں دو باتونی ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جمے ہُوئے تھے۔ دونوں گجراتی بولتے تھے۔ مگر مختلف لب ولہجہ سے۔ پارسی کی آواز میں دو سُر تھے۔ وہ کبھی باریک سُر میں بات کرتا تھا کبھی موٹے سُر میں۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے۔ تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے۔ میں ان کی لامتناہی گفتگو سے تنگ آ کر اُٹھا اور

ٹہلنے کی خاطر تاج محل ہوٹل کا رُخ کرنے ہی والا تھا کہ سامنے سے مجھے وہ آتا دکھائی دیا۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس لیے میں اسے پکار نہ سکا۔ لیکن جب اُس نے مجھے دیکھا۔ تو اس کی نگاہیں ساکن ہو گئیں۔ جیسے اُسے وہ چیز مل گئی ہو جس کی اُسے تلاش تھی۔ کوئی بنچ خالی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔

”آپ سے بہت دیر کے بعد ملاقات ہوئی۔۔۔۔۔ چلیے سامنے ریستوران میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں کوئی بنچ خالی نہیں۔“

اُس نے رسمی طور پر چند باتیں کیں اور میرے ساتھ ہو لیا۔ چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم دونوں ریستوران میں بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے کا آرڈر دیکر میں نے اس کی طرف سگرٹوں کا ٹین بڑھا دیا۔ اتفاق کی بات ہے۔ میں نے اسی روز دس روپے دے کر ڈاکٹر ارولکر سے مشورہ لیا تھا۔ اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اوّل تو سگریٹ پینا ہی موقوف کر دو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تو اچھے سگریٹ پیا کرو۔ مثال کے طور پر پانچ سو پچپن۔۔۔۔۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ ٹین اُسی شام خریدا تھا۔ اُس نے ڈبے کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں، کچھ کہنا چاہا مگر خاموش رہا۔ میں ہنس پڑا۔

”آپ یہ نہ سمجھیے گا۔ کہ میں نے آپ کے کہنے پر یہ سگریٹ پینا شروع کیے ہیں۔۔۔۔۔ اتفاق کی بات ہے۔ کہ آج مجھے بھی ڈاکٹر ارولکر کے پاس جانا پڑا۔ کیونکہ کچھ دنوں سے میرے سینے میں درد ہو رہا ہے چنانچہ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ سگریٹ پیا کرو لیکن بہت کم۔۔۔۔۔“

میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کو میری یہ باتیں ناگوار معلوم ہوئی ہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً جیب سے وہ نسخہ نکالا۔ جو ڈاکٹر ارولکر نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ یہ کاغذ میز پر میں نے اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ عبارت مجھ سے پڑھی تو نہیں جاتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے وٹامن کا سارا خاندان اس نسخے میں جمع کر دیا ہے۔“

اُس کاغذ کو جس پر اُبھرے ہُوے کالے حروف میں ڈاکٹر ارولکر کا نام اور پتہ مندرج تھا اور تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔ اُس نے چور نگاہوں سے دیکھا اور وہ اضطراب جو اس کے چہرے پر پیدا ہو گیا تھا فوراً دُور ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مُسکرا کر کہا“

کیا وجہ ہے کہ اکثر لکھنے والوں کے اندر وٹامنز ختم ہو جاتی ہیں؟“

”میں نے جواب دیا۔ اس لیے کہ انھیں کھانے کو کافی نہیں ملتا۔ کام زیادہ کرتے ہیں۔ لیکن اُجرت بہت کم ملتی ہے“

اس کے بعد چائے آ گئی اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔ پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں غالباً ڈھائی مہینے کا فاصلہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے سے زیادہ پیلا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیدا ہو رہے تھے۔ اُسے غالباً کوئی تکلیف تھی جس کا احساس اُسے ہر وقت رہتا تھا۔ کیونکہ باتیں کرتے کرتے بعض اوقات وہ ٹھہر جاتا۔ اور اس کے ہونٹوں میں سے غیر ارادی طور پر آہ نکل جاتی۔ اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتا۔ تو اس کے ہونٹوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اس سے اچانک طور پر پوچھا۔

”آپ اداس کیوں ہیں؟“

”اُداس۔۔۔۔۔ اُداس“

ایک پھیکی سی مسکراہٹ جو ان مرنے والوں کے لبوں پر پیدا ہوا کرتی ہے جو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ موت سے خائف نہیں۔ اُس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ میں اُداس نہیں ہوں۔ آپ کی طبیعت اداس ہو گی۔“

یہ کہہ کر اُس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“

مجھے یقین تھا کہ اسے کسی ضروری کام سے نہیں جانا ہے۔ مگر میں نے اسے نہ روکا اور جانے دیا۔ اس دفعہ پھر اُس کا نام دریافت نہ کر سکا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بے حد پریشان تھا۔ وہ اداس تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اُداسی اُس کی رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ مگر وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ اس کی اُداسی کا دوسروں کو علم ہو۔ وہ دو زندگیاں بسر کرنا چاہتا تھا۔ ایک وہ جو حقیقت تھی اور ایک وہ جس کی تخلیق میں ہر گھڑی، ہر لمحہ مصروف رہتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کے یہ دونوں پہلو ناکام تھے۔ کیوں؟۔۔۔۔۔۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ اُس سے تیسری مرتبہ میری ملاقات پھر اپولو بندر پر ہُوئی۔ اس دفعہ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں ہماری کوئی بات چیت نہ ہوئی لیکن گھر پر اس کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ تو اس کے چہرے پر چند لمحات کے لیے اداسی چھا گئی۔ مگر وہ فوراً سنبھل گیا۔ اور اس نے اپنی عادت کے خلاف اپنے آپ کو بہت تر و تازہ اور باتونی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اُس پر اور بھی ترس آ گیا۔ وہ ایک موت جیسی یقینی حقیقت کو جھٹلا رہا تھا۔ اور مزا یہ ہے کہ اس خود فریبی سے کبھی کبھی وہ مطمئن بھی نظر آتا تھا۔ باتوں کے دوران میں اس کی نظر میرے میز پر پڑی۔ شیشے کے فریم میں اس کو ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ اٹھ کر اس نے تصویر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”کیا میں آپ کی اجازت سے یہ تصویر دیکھ سکتا ہوں۔“

میں نے کہا۔

”بصد شوق۔“

اُس نے تصویر کو ایک نظر دیکھا۔ اور دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچھی خوبصورت لڑکی ہے-----۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی------“

”جی نہیں--------۔ ایک زمانہ ہوا۔ اس سے محبت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہُوا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ تھوڑی سی محبت میرے دل میں پیدا بھی ہو گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس کو اس کی خبر تک نہ ہُوئی۔ اور میں------ میں---------- نہیں۔ بلکہ وہ بیاہ دی گئی---------- یہ تصویر میری پہلی محبت کی یاد گار ہے۔ جو اچھی طرح پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی------“

”یہ آپ کی محبت کی یاد گار ہے------۔ اس کے بعد تو آپ نے اور بھی بہت سی رومان لڑائے ہوں گے۔“

اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری“

یعنی آپ کی زندگی میں تو کئی ایسی نامکمل اور مکمل محبتیں موجود ہوں گی۔“

میں کہنے ہی والا تھا کہ جی نہیں خاکسار بھی محبت کے معاملے میں آپ جیسا بنجر ہے۔ مگر جانے کیوں یہ کہتا کہتا رک گیا۔ اور خواہ مخواہ جھوٹ بول دیا۔

”جی ہاں-----۔ ایسے سلسلے ہوتے رہتے ہیں------۔ آپ کی کتابِ زندگی بھی تو ایسے واقعات سے بھرپور ہو گی“

وہ کچھ نہ بولا۔ اور بالکل خاموش ہو گیا۔ جیسے کسی گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا ہے۔ دیر تک جب وہ اپنے خیالات میں غرق رہا اور میں اس کی خاموشی سے اداس ہونے لگا۔ تو میں نے کہا۔

”اجی حضرت! آپ کن خیالات میں کھو گئے؟“

وہ چونک پڑا۔

”میں-------- میں------۔ کچھ نہیں میں ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا“

میں نے پوچھا۔

”کوئی بیتی کہانی یاد آ گئی------۔ کوئی بچھڑا ہوا سپنا مل گیا--------۔ پرانے زخم ہرے ہو گئے۔“

”زخم-----۔ پرانے------۔ زخم-----۔ کئی زخم نہیں-----۔ صرف ایک ہی ہے، بہت گہرا، بہت کاری-----۔ اور زخم میں چاہتا بھی نہیں۔ ایک ہی زخم کافی ہے“

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور میرے کمرے میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ اُس چھوٹی سی جگہ میں جہاں کرسیاں، میز اور چارپائی سب کچھ پڑا تھا۔ ٹہلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میز کے پاس اُسے رکنا پڑا۔ تصویر کو اب کی دفعہ گہری نظروں سے دیکھا اور کہا“

اس میں اور اس میں کتنی مشابہت ہے-------۔ مگر اس کے چہرے پر ایسی شوخی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی تھیں۔ مگر ان آنکھوں کی طرح ان میں شرارت نہیں تھی۔ وہ فکر مند آنکھیں تھی۔ ایسی آنکھیں جو دیکھتی بھی ہیں اور سمجھتی بھی ہیں“

-------۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ موت بالکل ناقابلِ فہم چیز ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ یہ جوانی میں آئے------۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے علاوہ ایک طاقت اور بھی ہے جو بڑی حاسد ہے۔ جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی-----۔ مگر چھوڑیے اس قصّے کو۔“

میں نے اس سے کہا۔

”نہیں نہیں، آپ سناتے جایئے-----۔ لیکن اگر آپ ایسا مناسب سمجھیں-----۔ سچ پوچھیے تو میں یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ آپ نے کبھی محبت کی ہی نہ ہو گی۔“

”یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں اور ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میری کتاب زندگی ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہو گی“

یہ کہہ کر اُس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا“

میں نے اگر محبت نہیں کی تو یہ دکھ میرے دل میں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟--------۔ میں نے اگر محبت نہیں کی۔ تو میری زندگی کو یہ روگ کہاں سے چمٹ گیا ہے؟-------- میں روز بروز موم کی طرح کیوں پگھلا جا رہا ہوں؟ بظاہر یہ تمام سوال وہ مجھ سے کر رہا تھا۔ مگر دراصل وہ سب کچھ اپنے آپ ہی سے پُوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ کہ آپ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوں گے۔ مگر آپ نے بھی جھوٹ بولا تھا کہ میں اداس نہیں ہوں اور مجھے کوئی روگ نہیں ہے-----۔ کسی کے دل کا حال جاننا آسان بات نہیں ہے، آپ کی اُداسی کی اور بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ مگر جب تک مجھے آپ خود نہ بتائیں میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں--------۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو یقیناً بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے اور-----۔ اور---------۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔

”ہمدردی۔۔۔۔۔“

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ہمدردی اُسے واپس نہیں لا سکتی۔۔۔۔ اس عورت کو موت کی گہرائیوں سے نکال کر میرے حوالے نہیں کر سکتی جس سے مجھے پیار تھا۔۔۔۔۔۔ آپ نے محبت نہیں کی۔۔۔۔ مجھے یقین ہے، آپ نے محبت نہیں کی، اس لیے کہ اس کی ناکامی نے آپ پر کوئی داغ نہیں چھوڑا۔۔۔۔۔ میری طرف دیکھیے“

یہ کہہ کر اُس نے خود اپنے آپ کو دیکھا۔“

کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی۔ جہاں میری محبت کے نقش موجود نہ ہوں۔۔۔۔۔۔ میرا وجود خود اس محبت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ملبہ ہے۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو یہ داستان کیسے سناؤں اور کیوں سناؤں جب کہ آپ اسے سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔۔۔۔۔۔۔ کسی کا یہ کہہ دینا کہ میری ماں مر گئی ہے۔ آپ کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ جو موت نے بیٹے پر کیا تھا۔۔۔۔ میری داستان محبت آپ کو۔۔۔۔۔۔ کسی کو بھی بالکل معمولی معلوم ہو گی۔ مگر مجھ پر جو اثر ہوا ہے۔ اس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ محبت میں نے کی ہے۔ اور سب کچھ صرف مجھی پر گزرا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے حلق میں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا وہ آپ کو دھوکہ دے گئی“

میں نے اس سے پوچھا۔“

یا کچھ اور حالات تھے؟“

”دھوکا۔۔۔۔۔۔ وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی تھی۔ خدا کے لیے دھوکا نہ کہیے۔ وہ عورت نہیں فرشتہ تھی۔ مگر بُرا ہو اس موت کا جو ہمیں خوش نہ دیکھ سکی۔ اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پروں میں سمیٹ کر لے گئی۔۔۔۔۔ آہ!۔۔۔۔۔۔ آپ نے میرے دل پر خراشیں پیدا کر دی ہیں۔ سُنیے۔۔۔ سُنیے، میں آپ کو دردناک داستان کا کچھ حصّہ سناتا ہوں۔۔۔۔۔ وہ ایک بڑے اور امیر گھیرانے کی لڑکی تھی جس زمانے میں اس کی اور میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میں اپنے باپ دادا کی ساری جائیداد عیاشیوں میں برباد کر چکا تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ پھر بمبئی چھوڑ کر میں لکھنو چلا آیا۔ اپنی موٹر چونکہ میرے پاس ہُوا کرتی تھی۔ اس لیے میں صرف موٹر چلانے کا کام جانتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی کو اپنا پیشہ قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ پہلی ملازمت مجھے ڈپٹی صاحب کے یہاں ملی۔ جن کی اکلوتی لڑکی تھی۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔ اور دفعتہ خاموش رہا۔ میں بھی چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر چونکا اور کہنے لگا۔

”میں کیا کہہ رہا تھا؟“

”آپ ڈپٹی صاحب کے یہاں ملازم ہو گئے۔“

ہاں وہ انہی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی ہر روز صبح نو بجے میں زہرہ کو موٹر میں سکول لے جایا کرتا تھا۔ وہ پردہ کرتی تھی مگر موٹر ڈرائیور سے کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ میں نے اسے دوسرے روز ہی دیکھ لیا۔۔۔۔۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی۔ اس میں ایک خاص بات بھی تھی۔۔۔۔۔۔ بڑی سنجیدہ اور متین لڑکی تھی۔ اس کی سیدھی مانگ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ میں کیا عرض کروں وہ کیا تھی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اس کی صورت اور سیرت بیان کر سکوں۔۔۔۔۔۔۔“

بہت دیر تک وہ اپنی زہرہ کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے کئی مرتبہ اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں ضرورت سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اُس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔ لیکن پھر اداسی چھا جاتی۔ اور وہ آہوں میں گفتگو کرنا شروع کر دیتا وہ اپنی داستان بہت آہستہ آہستہ سنا رہا تھا۔ جیسے خود بھی مزا لے رہا ہو۔ ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر اس نے ساری کہانی پوری کی جس کا ماحصل یہ تھا۔ زہرہ سے اسے بے پناہ محبت ہو گئی۔ کچھ دن تو موقع پا کر اس کا دیدار کرنے اور طرح طرح کے منصوبے باندھنے میں گزر گئے۔ مگر جب اس نے سنجیدگی سے اس محبت پر غور کیا۔ تو خود کو زہرہ سے بہت دُور پایا۔ ایک موٹر ڈرائیور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کیسے کر سکتا ہے۔؟ چنانچہ جب اُس تلخ حقیقت کا احساس اس کے دل میں پیدا ہوا تو وہ مغموم رہنے لگا۔ لیکن ایک دِن اس نے بڑی جرات سے کام لیا کاغذ کے ایک پُرزے پر اُس نے زہرہ کو چند سطریں لکھیں۔۔۔۔۔۔ یہ سطریں مجھے یاد ہیں۔

”زہرہ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارا نوکر ہوں! تمہارے والد صاحب مجھے تیس روپے ماہوار دیتے ہیں۔ مگر میں تم سے محبت کرتا ہُوں۔۔۔۔ میں کیا کروں، کیا نہ کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔۔“

یہ سطریں کاغذ پر لکھ کر اس نے کاغذ اس کی کتاب میں رکھ دیا۔ دوسرے روز جب وہ اُسے موٹر میں اسکول لے گیا۔ تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہینڈل کئی بار اس کی گرفت سے نکل نکل گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے۔ کہ کوئی ایکسی ڈنٹ نہ ہُوا۔ اس روز اس کی کیفیت عجیب رہی۔ شام کو جب وہ زہرہ کو اسکول سے واپس لا رہا تھا۔ تو راستے میں اس لڑکی نے موٹر روکنے کے لیے کہا۔ اُس نے جب موٹر روک لی۔ تو زہرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا“

دیکھو نعیم آئندہ تم ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔ میں نے ابھی تک ابّا جی سے تمہارے اُس خط کا ذکر نہیں کیا۔ جو تم نے میرے کتاب میں رکھ دیا تھا۔ لیکن اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی۔ تو مجبوراً اُن سے شکایت کرنا پڑے گی۔ سمجھے۔۔۔۔۔ چلو اب موٹر چلاؤ۔“

اس گفتگو کے بعد اُس نے بہت کوشش کی کہ ڈپٹی صاحب کی نوکری چھوڑ دے اور زہرہ کی محبت کو اپنے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک مہینہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ ایک روز اس نے پھر جرأت سے کام لے کر خط لکھا اور زہرہ کی ایک کتاب میں رکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ دوسرے روز صبح کو اُسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ شام کو اسکول سے واپس آتے ہُوئے زہرہ اس سے ہم کلام ہُوئی ایک بار پھر اُس کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کے لیے کہا۔

”اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو کچھ خیال تمہیں ہونا چاہیے“

یہ اس نے ایک بار پھر اُسے کچھ سنجیدگی اور متانت سے کہا۔ کہ نعیم کی ساری امیدیں فنا ہو گئیں۔ اور اس نے قصد کر لیا کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا۔ اور لکھنؤ سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔ مہینے کے اخیر میں نوکری چھوڑنے سے پہلے اُس نے اپنی کوٹھڑی میں لالٹین کی مدھم روشنی میں زہرہ کو آخری خط لکھا۔ اس میں اُس نے نہایت درد بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

”زہرہ! میں نے بہت کوشش کی کہ میں تمہارے کہے پر عمل کر سکوں مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ کل شام کو میں لکھنؤ چھوڑ دوں گا۔ اس لیے تمہیں اپنے والد صاحب سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ تم سے دُور رہ کر تم سے محبت نہیں کروں گا۔ میں جہاں کہیں بھی رہوں گا۔ میرا دل تمہارے قدموں میں ہو گا۔۔۔۔ میں ہمیشہ اُن دنوں کو یاد کرتا رہوں گا۔ جب میں موٹر آہستہ آہستہ چلاتا تھا کہ تمہیں دھکا نہ لگے۔۔۔۔۔ میں اس کے سوا اور تمہارے لیے کر ہی کیا سکتا تھا۔۔۔۔“

یہ خط بھی اُس نے موقع پا کر اُس کتاب میں رکھ دیا۔ صبح کو زہرہ نے اسکول جاتے ہوئے اُس سے کوئی بات نہ کی۔ اور شام کو بھی راستے میں اُس نے کچھ نہ کہا۔ چنانچہ وہ بالکل ناامید ہو کر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ جو تھوڑا بہت اسباب اس کے پاس تھا باندھ کر اُس نے ایک طرف رکھ دیا۔ اور لالٹین کی اندھی روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کہ زہرہ اور اس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔ وہ بے حد مغموم تھا۔ اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک ادنیٰ درجے کا ملازم ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی بے اختیار اس سے محبت کرتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ آدھی رات کے قریب اس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہُوئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن پھر اُس نے خیال کیا۔ کہ مالی ہو گا ممکن ہے اس کے گھر میں کوئی ایکا ایکی بیمار پڑ گیا ہو۔ اور وہ اس سے مدد لینے کے لیے آیا ہو۔ لیکن جب اُس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی۔۔۔۔۔ جی ہاں زہرہ۔۔۔۔۔ دسمبر کی سردی میں شال کے بغیر وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کہے، چند لمحات قبر کی سی خاموشی میں گزر گئے۔ آخر زہرہ کے ہونٹ وا ہُوئے اور تھرتھراتے ہوئے لہجے میں اُس نے کہا۔

”نعیم میں تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو۔۔۔۔ لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھڑی میں داخل ہوں۔ میں تم سے چند سوال کرنا چاہتی ہوں۔“

نعیم خاموش رہا۔ لیکن زہرہ اس سے پوچھنے لگی۔

”کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“

نعیم کو جیسے ٹھیس سی لگی۔ اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

”زہرہ تم نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب اگر میں دوں تو میری محبت کی توہین ہو گی۔۔۔۔۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔

کیا میں محبت نہیں کرتا؟“

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال

”میرے باپ کے پاس دولت ہے، مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں، جو کچھ میرا کہا جاتا ہے میرا نہیں ہے، ان کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی ویسا ہی عزیز سمجھو گے؟“

نعیم بہت جذباتی آدمی تھا۔ چنانچہ اس سوال نے بھی اُس کے وقار کو زخمی کیا بڑے دُکھ بھرے لہجے میں اُس نے زہرہ سے کہا۔

”زہرہ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھو جن کا جواب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ناولوں میں بھی مل سکتا ہے“

زہرہ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگی۔

”میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔“

زہرہ نے اپنا قول پورا کیا جب دونوں لکھنو چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور شادی کر کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے۔ تو ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے۔ نعیم کو نوکری مل گئی تھی۔ اس لیے وہ گھر میں نہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب نے زہرہ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ ان کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ زہرہ نعیم کو چھوڑ دے اور جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھولا جائے۔ وہ نعیم کو دو تین ہزار روپیہ دینے کے لیے بھی تیار تھے۔ مگر انھیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لیے کہ زہرہ نعیم کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ اس نے اپنے باپ سے کہا۔

”ابّا جی! میں نعیم (کے) ساتھ بہت خوش ہوں۔ آپ اس سے اچھا شوہر میرے لیے کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔ میں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے۔ اگر آپ ہمیں دعائیں دے سکیں۔ تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔“

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سُنی تو بہت خشم آلود ہُوئے۔ انھوں نے نعیم کو قید کرا دینے کی دھمکی بھی دی مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا۔ ابّا جی! اس میں نعیم کا کیا قصور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں اور وہ میرا شوہر ہے۔۔۔ یہ کوئی قصور نہیں ہے میں نابالغ نہیں ہوں۔“

ڈپٹی صاحب عقلمند تھے، فوراً سمجھ گئے کہ جب ان کی بیٹی ہی رضامند ہے تو نعیم پر کیسے جُرم عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے سے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اس کو روپے پیسے سے لالچ دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ گو نعیم کی آمدن بہت ہی کم تھی۔ اور زہرہ کو جو ناز و نعم میں پلی تھی۔ بدن پر کھُردرے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے۔ مگر وہ خوش تھی۔ اور خود کو ایک نئی دنیا میں پاتی تھی۔ وہ بہت سکھی تھی۔۔۔۔۔ بہت سکھی۔ نعیم بھی بہت خوش تھا۔ لیکن ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ زہرہ کے سینے میں موذی درد اٹھا اور پیشتر اس کے کہ نعیم اس کے لیے کچھ کر سکے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور نعیم کی دنیا ہمیشہ کے لیے تاریک ہو گئی۔ یہ داستان اُس نے رُک رُک کر اور خود مزے لے لے کر قریباً چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حال دل سنا چکا۔ تو اس کا چہرہ بجائے زرد ہونے کے تمتما اُٹھا جیسے اُس کے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خون داخل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔ داستان جب ختم ہوئی۔ تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے اسے بہت جلدی ہے اور کہنے لگا۔

”میں نے بہت غلطی کی۔۔۔۔۔ جو آپ کو اپنی داستانِ محبت سنا دی۔۔۔۔۔ میں نے بہت غلطی کی۔۔۔۔۔ زہرہ کا ذکر صرف مجھی تک محدود رہنا چاہیے تھا۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ اُس کی آواز بھرّا گئی۔۔۔۔ میں زندہ ہُوں اور وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ نعیم سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی۔ اپولو بندر پر کئی مرتبہ اس کی تلاش میں گیا۔ مگر وہ نہ ملا چھ یا سات مہینے کے بعد اُس کا ایک خط مجھے ملا۔ جو میں یہاں پر نقل کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ صاحب! آپ کو یاد ہو گا۔ میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستانِ محبت سنائی تھی۔ وہ محض فسانہ تھا۔ ایک جھوٹا فسانہ کوئی زہرہ ہے نہ نعیم۔۔۔۔ میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہرہ سے محبت کی تھی۔ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ میں بھی ان بدقسمت آدمیوں میں سے ایک ہُوں جس کی ساری جوانی اپنا دل پرچانے میں گزر گئی۔ زہرہ سے نعیم کی محبت ایک دلی بہلاوا تھا اور زہرہ کی موت۔۔۔۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ کہ میں نے اسے کیوں مار دیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی میری زندگی کی سیاہی کا دخل ہو۔ مجھے معلوم نہیں۔ آپ نے میرے افسانے کو جھوٹا سمجھا یا سچا لیکن میں آپ کو ایک عجیب و غریب بات بتاتا ہوں کہ میں نے۔۔۔۔ یعنی اُس جھوٹے افسانے کے خالق نے اس کو بالکل سچا سمجھا۔ سو فیصدی حقیقت پر مبنی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے واقعی زہرہ سے محبت کی ہے۔ اور وہ سچ مچ مر چکی ہے۔ آپ کو یہ سُن کر اور بھی تعجب ہو گا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اُس افسانے کے اندر حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ اور زہرہ کی آواز، اُس کی ہنسی بھی میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں اُس کے سانس کی گرمی تک محسوس کرنے لگا۔ افسانے کا ہر ذرہ جاندار ہو گیا اور میں نے۔۔۔۔۔ اور میں نے یوں اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی۔۔۔۔ زہرہ فسانہ نہ سہی مگر میں تو فسانہ ہوں۔ وہ مر چکی ہے۔ اس لیے مجھے بھی مر جانا چاہیے۔ یہ خط آپ کو میری موت کے بعد ملے گا۔۔۔۔۔ الوداع۔۔۔۔۔ زہرہ مجھے ضرور ملے گی۔۔۔۔ کہاں!۔۔۔۔۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں نے یہ چند سطور صرف اس لیے آپ کو لکھ دیے ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں اگر اس سے آپ افسانہ تیار کر لیں تو آپ کو سات آٹھ روپے مل جائیں گے۔ کیونکہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ افسانے کا معاوضہ آپ کو سات سے دس روپے تک مل جایا کرتا ہے۔ یہ میرا تحفہ ہو گا۔ اچھا الوداع۔“

آپ کا ملاقاتی۔

”نعیم“

نعیم نے اپنے لیے زہرہ بنائی اور مر گیا۔۔۔۔ میں نے اپنے لیے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے اور زندہ ہوں۔۔۔۔ یہ میری زیادتی ہے۔

بائی بائی

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو بائی بائی

نام اس کا فاطمہ تھا‘ پر سب اسے پھاتو کہتے تھے‘ بانہال کے درّے کے اُس طرف اُس کے باپ کی پن چکّی تھی جو بڑا سادہ لوح معمّر آدمی تھا۔ دن بھر وہ اس پن چکّی کے پاس بیٹھی رہتی۔ پہاڑ کے دامن میں چھوٹی سی جگہ تھی جس میں یہ پن چکّی لگائی گئی تھی۔ پھاتو کے باپ کو دو تین روپے روزانہ مل جاتے جو اس کے لیے کافی تھے۔ پھاتو البتہ ان کو ناکافی سمجھتی تھی اس لیے کہ اس کو بناؤ سنگھار کا شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ امیروں کی طرح زندگی بسر کرے۔ کام کاج کچھ نہیں کرتی تھی‘ بس کبھی کبھی اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ اس کو آٹے سے نفرت تھی۔ اس لیے کہ وہ اُڑ اُڑ کر اس کی ناک میں گھس جاتا تھا۔ وہ بہت جھنجھلاتی اور باہر نکل کر کھلی ہوا میں گھومنا شروع کر دیتی‘ یا چناب کے کنارے جا کر اپنا منہ ہاتھ دھوتی اور عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتی۔ اس کو چناب سے پیار تھا‘ اُس نے اپنی سہیلیوں سے سُن رکھا تھا کہ یہ دریا عشق کا دریا ہے جہاں سوہنی مہینوال‘ ہیر رانجھا کا عشق مشہور ہوا۔ بہت خوبصورت تھی اور بڑی مضبوط جسم کی جوان لڑکی۔ ایک پن چکی والے کی بیٹی شاندار لباس تو پہن نہیں سکتی‘ میلی شلوار اوپر ’پھرن‘ کُرتہ۔ دوپٹہ ندارد۔ نذیر سچیت گڑھ سے لے کر بانہال تک اور بھدرواسے کشتواڑ تک خوب گھوما پھرا تھا۔ اس نے جب پہلی بار پھاتو کو دیکھا تو اسے کوئی حیرت نہ ہوئی جب اُس نے دیکھا کہ پھاتو کے کرتے کے نچلے تین بٹن نہیں ہیں اور اس کی جوان چھاتیاں باہر جھانک رہی ہیں۔ نذیر نے اُس علاقے میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ وہاں کی عورتیں ایسی قمیصیں یا کُرتے پہنتی ہیں جن کے نچلے بٹن غائب ہوتے ہیں‘ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا یہ دانستہ ہٹا دیے جاتے ہیں یا وہاں کے دھوبی ہی ایسے ہیں جو ان کو اُتار لیتے ہیں۔ نذیر نے جب پہلی بار سیر کرتے ہوئے پھاتو کو اپنی تین کم بٹنوں والی قمیص میں دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ حسین تھی‘ ناک نقشہ بہت اچھا تھا‘ تعجب ہے کہ وہ میلی ہونے کے باوجود چمکتی تھی‘ اس کا لباس بہت گندا تھا مگر نذیر کو ایسا محسوس ہوا کہ یہی اس کی خوبصورتی کو نکھار رہا ہے۔ نذیر وہاں ایک آوارہ گرد کی حیثیت رکھتا تھا‘ وہ صرف کشمیر کے دیہات دیکھنے اور ان کی سیاحت کرنے آیا تھا اور قریب قریب تین مہینے سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا۔ اُس نے کشتواڑ دیکھا‘ بھدرواد دیکھا‘ کُد اور بٹوت میں کئی مہینے گزارے مگر اسے پھاتو ایسا حسن کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ بانہال میں پن چکی کے باہر جب اس نے پھاتو کو تین بٹنوں سے بے نیاز کرتے میں دیکھا تو اس کے جی میں آیا کہ اپنی قمیص کے سارے بٹن علیحدہ کر دے اور اُس کی قمیص اور پھاتو کا کُرتہ آپس میں خلط ملط ہو جائیں۔ کچھ اس طرح کہ دونوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے۔ اُس سے ملنا نذیر کے لیے مشکل نہیں تھا‘ اس لیے کہ اس کا باپ دن بھر گندم‘ مکئی اور جوار پیسنے میں مشغول رہتا تھا اور وہ تھی ہنس مکھ‘ ہر آدمی سے کھل کر بات کرنے والی۔ بہت جلد گھلو مٹھو ہو جاتی تھی چنانچہ نذیر کو اس کی قربت حاصل کرنے میں کوئی دقّت محسوس نہ ہوئی۔ چند ہی دنوں میں اس نے اس سے راہ و رسم پیدا کر لی۔ یہ راہ و رسم تھوڑی دیر میں محبت میں تبدیل ہو گئی‘ پاس ہی چناب جسے عشق کا دریا کہتے ہیں اور جس کے پانی سے پھاتو کے باپ کی پن چکی چلتی تھی‘ اس دریا کے کنارے بیٹھ کر نذیر اس کو اپنا دل نکال کر دکھاتا تھا جس میں سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پھاتو سنتی۔ اس لیے کہ وہ اس کے جذبات کا مذاق اُڑانا چاہتی تھی۔ اصل میں وہ تھی ہی ہنسوڑ۔ ساری زندگی وہ کبھی روئی نہ تھی‘ اس کے ماں باپ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بچی بچپن میں کبھی نہیں روئی۔ نذیر اور پھاتو میں محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ نذیر پھاتو کو دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ اُس نے اپنی روح کا عکس آئینے میں دیکھ لیا ہے اور پھاتو تو اس کی گرویدہ تھی اس لیے کہ وہ اس کی بڑی خاطر داری کرتا تھا اُس کو یہ چیز۔ جسے محبت کہتے ہیں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی‘ اس لیے وہ خوش تھی۔ بانہال میں تو کوئی اخبار ملتا نہیں تھا اس لیے نذیر کو بٹوت جانا پڑتا تھا۔ وہاں وہ دیر تک ڈاک خانہ کے اندر بیٹھا رہتا‘ ڈاک آتی تو اخبار پڑھ کے پن چکی پر چلا آتا۔ قریب قریب چھ میل کا فاصلہ تھا مگر نذیر اس کا کوئی خیال نہ کرتا۔ یہ سمجھتا کہ چلو ورزش ہی ہو گئی ہے۔ جب وہ پن چکی کے پاس پہنچتا تو پھاتو کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل آتی اور دونوں چناب کے پاس پہنچ جاتے اور پتھروں پر بیٹھ جاتے۔ پھاتو اس سے کہتی

”بجیر۔ آج کی خبریں سناؤ“

اس کو خبریں سننے کا خبط تھا۔ نذیر اخبار کھولتا اور اس کو خبریں سُنانا شروع کر دیتا۔ ان دنوں فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ امرتسر سے یہ قصہ شروع ہوا تھا جہاں سکھوں نے مسلمانوں کے کئی محلے جلا کر راکھ کر دیے تھے۔ وہ یہ سب خبریں اس کو سناتا‘ وہ سکھوں کو اپنی گنوار زبان میں برا بھلا کہتی۔ نذیر خاموش رہتا۔ ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے اور ہندوستان علیحدہ ہو گیا ہے۔ نذیر کو تمام واقعات کا علم تھا مگر جب اس نے پڑھا کہ ہندوستان نے ریاست مانگرول اور ماناوادار پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا مگر اس نے اپنی اس پریشانی کو پھاتو پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ دونوں کا عشق اب بہت استوار ہو چکا تھا اس کا علم پھاتو کے باپ کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ میری لڑکی ایک معزز اور شریف گھرانے میں جائے گی مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی سیالکوٹ نہ جائے جہاں کا نذیر رہنے والا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ نذیر اس کے پاس رہے۔ دولت مند کا بیٹا ہے۔ پن چکی کے پاس کافی زمین پڑی ہے‘ اس پر ایک چھوٹا سا مکان بنوا لے اور دونوں میاں بیوی اس میں رہیں‘ جب چاہا پلک جھپکتے سرینگر پہنچ گئے‘ وہاں ایک دو مہینے رہے‘ پھر واپس آ گئے‘ کبھی کبھار سیالکوٹ بھی چلے گئے کہ وہ بھی اتنی دُور نہیں۔ پھاتو کے باپ سے مفصل گفتگو کی‘ وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ نذیر اور پھاتو بہت خوش ہوئے‘ اس روز پہلی مرتبہ نذیر

نے اس کے ہونٹوں کو چوما اور خود اپنے ہاتھ سے اس کے کرتے میں تین بٹن لگائے۔ دوسرے دن نذیر نے اپنے والدین کو لکھ دیا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی ہے جس سے اُس کی محبت ہو گئی ہے' ایک ماہ تک خط و کتابت ہوتی رہی' آدمی روشن خیال تھے' اس لیے وہ مان گئے حالانکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ اس کے والد نے جو آخری خط لکھا اس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ نذیر فاطمہ کا فوٹو بھیجے تاکہ وہ اپنے رشتہ داروں کو دکھائیں اس لیے کہ وہ اس کے حسن کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔ لیکن بانہال جیسے دُور افتادہ علاقے میں وہ پھاتو کی تصویر کیسے حاصل کرتا اس کے پاس کوئی کیمرہ نہیں تھا نہ وہاں کوئی فوٹو گرافر' بٹوت اور کُدمیں بھی ان کا نام و نشان نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک دن سر نگر سے موٹر آئی' نذیر سڑک پر کھڑا تھا اس نے دیکھا کہ اس کا دوست رنبیر سنگھ ڈرائیو کر رہا ہے' اس نے بلند آواز میں کہا:

"رنبیر یار۔ ٹھہرو"

موٹر ٹھہر گئی' دونوں دوست ایک دوسرے کو گلے ملے۔ نذیر نے دیکھا کہ اس کی موٹر میں کیمرہ پڑا ہے' رولی فیکس۔ نذیر نے اس سے کچھ دیر باتیں کیں' پھر پوچھا

"تمہارے کیمرے میں فلم ہے؟"

رنبیر نے ہنس کر کہا

"خالی کیمرہ اور خالی بندوق کس کام کی ہوتی ہے' میرے کیمرے میں سولہ ایکسپوزیر موجود ہیں"

نذیر نے فوراً پھاتو کو ٹھہرایا اور اپنے دوست رنبیر سے کہا:

"یار اس کے تین چار اچھے پوز لے لو اور تم میرا خیال ہے سیالکوٹ جا رہے ہو' وہاں سے ڈیویلپ اور پرنٹ کرا کے مجھے دو دو کاپیاں بٹوت کے ڈاکخانے کی معرفت بھجوا دینا"

رنبیر نے بڑے غور اور دلچسپی سے پھاتو کو دیکھا اُس کی موٹر میں ڈوگرہ فوج کے تین چار سپاہی تھے' تھری ناٹ تھری بندوقیں لیے۔ رنبیر جو مقام فوٹو لینے کے لیے پسند کرتا یہ مسلح فوجی اس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ نذیر اس کے ہمراہ ہونا چاہتا تو یہ ڈوگرے اسے روک دیتے۔ کشمیر میں ہلڑ مچ رہا تھا اس کے متعلق نذیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان اس پر قابض ہونا چاہتا ہے مگر پاکستانی اس کی مدافعت کر رہے ہیں۔ فوٹو لے کر جب نذیر کا دوست رنبیر اپنی موٹر کے پاس آیا تو اس نے نذیر کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا' پھاتو ڈوگرے فوجیوں کی گرفت میں تھی' انھوں نے زبردستی موٹر میں ڈالا' وہ چیخی چلائی۔ نذیر کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ مگر وہ عاجز تھا۔ ڈوگرے فوجی سنگینیں تانے کھڑے تھے۔ جب موٹر اسٹارٹ ہوئی تو نذیر نے اپنے دوست رنبیر سے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا:

"یار رنبیر! یہ کیا ہو رہا ہے"

رنبیر سنگھ نے جو کہ موٹر چلا رہا تھا' نذیر کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کہ صرف اتنا کہا:

"بائی بائی"

۱۱، مئی ۴۵ء

بجلی پہلوان

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبجلی پہلوان

بجلی پہلوان کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں' کہتے ہیں کہ وہ برق رفتار تھا۔ بجلی کی مانند اپنے دشمنوں پر گرتا تھا اور انھیں بھسم کر دیتا تھا لیکن جب میں نے اسے مغل بازار میں دیکھا تو وہ مجھے بے ضرر کدّو کے مانند نظر آیا' بڑا پھسپھس سا' توند باہر نکلی ہوئی' بند بند ڈھیلے' گال لٹکے ہوئے' البتہ اس کا رنگ سُرخ و سفید تھا۔ وہ مغل بازار میں ایک بزاز کی دُکان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا' میں نے اُس کو غور سے دیکھا' مجھے اس میں کوئی غنڈہ پن نظر نہ آیا' حالانکہ اُس کے متعلق مشہور یہی تھا کہ ہندوؤں کا وہ سب سے بڑا غنڈہ ہے۔ وہ غنڈہ ہو ہی نہیں سکتا تھا' اس لیے کہ اُس کے خدوخال اُس کی نفی کرتے تھے۔ میں تھوڑی دیر سامنے والی کتابوں کی دکان کے پاس کھڑا اُس کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک مسلمان عورت جو بڑی مفلس دکھائی دیتی تھی' بزاز کی دکان کے پاس پہنچی' بجلی پہلوان سے اس نے کہا

"مجھے بجلی پہلوان سے ملنا ہے"

بجلی پہلوان نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا

"ماتا' میں ہی بجلی پہلوان ہوں"

اس عورت نے اُس کو سلام کیا

”خدا تمھیں سلامت رکھے۔ میں نے سنا ہے کہ تم بڑے دیالو ہو

“بجلی نے بڑی انکساری سے کہا:

”ماتا‘ دیالو پرمیشور ہے۔ میں کیا دیا کر سکتا ہوں‘ لیکن مجھے بتاؤ کہ میں کیا سیوا کر سکتا ہوں“

”بیٹا‘ مجھے اپنی جوان لڑکی کا بیاہ کرنا ہے۔ تم اگر میری کچھ مدد کر سکو تو میں ساری عمر تمھیں دعائیں دوں گی“

بجلی نے اُس عورت سے پوچھا:

”کتنے روپوں میں کام چل جائے گا“

عورت نے جواب دیا: بیٹا! تم خود ہی سمجھ لو۔ میں تو ایک بھکارن بن کر تمہارے پاس آئی ہوں“

بجلی نے کہا بھکارن منہ سے نہ کہو۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری مدد کروں“

اس کے بعد اس نے بزاز سے جو تھان تہہ کر رہا تھا کہا

”لالہ جی۔ دو ہزار روپے نکالیے“

لالہ جی نے دو ہزار رُوپے فوراً اپنی صندوقچی سے نکالے اور گن کر بجلی کو دے دیے۔ یہ روپے اُس نے اس عورت کو پیش کر دیے۔

”ماتا۔ بھگوان کرے کہ تمہاری بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں“

وہ عورت چند لمحات کے لیے نوٹ ہاتھ میں لیے بُت بنی کھڑی رہی۔ غالباً اُس کو اتنے روپے ایک دم مل جانے کی توقع ہی نہیں تھی۔ جب وہ سنبھلی تو اُس نے بجلی پہلوان پر دُعاؤں کی بوچھاڑ کر دی‘ میں نے دیکھا کہ پہلوان بڑی اُلجھن محسوس کر رہا تھا‘ آخر اُس نے اس عورت سے کہا:

”ماتا‘ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ جاؤ‘ اپنی بیٹی کے دان، جہیز کا انتظام کرو۔ اس کو میری اشیر باد دینا“

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا غنڈہ اور بدمعاش ہے جو دو ہزار روپے ایک ایسی عورت کو جو مسلمان ہے اور جسے وہ جانتا بھی نہیں (دو ہزار روپے) پکڑا دیتا ہے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا مخیّر ہے‘ ہر مہینے ہزاروں روپے دان کے طور پر دیتا ہے۔ مجھے چونکہ اس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی‘ اس لیے میں نے کافی چھان بین کے بعد بجلی پہلوان کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں۔ مغل بازار کی اکثر دکانیں اُس کی تھیں‘ حلوائی کی دکان ہے‘ بزاز کی دُکان ہے‘ شربت بیچنے والا ہے‘ شیشے فروخت کرنے والا ہے‘ پنساری ہے۔ غرضیکہ اِس سرے سے اُس سرے تک جہاں وہ بزاز کی دُکان میں بیٹھا تھا اُس نے ایک

”لائن آف کمیونیکیشن“

قائم کر رکھی تھی تاکہ اگر پولس چھاپہ مارنے کی غرض سے آئے تو اسے فوراً اطلاع مل جائے۔ دراصل اُس کی دو بیٹھکوں میں جو بزاز کی دُکان کے بالکل سامنے تھیں‘ بہت بھاری جوا ہوتا تھا‘ ہر روز ہزاروں روپے نال کی صورت میں اُسے وصول ہو جاتے تھے۔ وہ خود جوا نہیں کھیلتا تھا‘ نہ شراب پیتا تھا مگر اس کی بیٹھکوں میں شراب ہر وقت مل سکتی تھی‘ اس سے بھی اس کی آمدن کافی تھی۔ شہر کے جتنے بڑے بڑے غنڈے تھے‘ ان کو اُس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا‘ یعنی ہفتہ وار انھیں ان کے مرتبے کے مطابق تنخواہ مل جاتی تھی۔ میرا خیال ہے اس نے یہ سلسلہ بطور حفظ ماتقدم شروع کیا تھا کہ وہ غنڈے بڑی خطرناک قسم کے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ غنڈے سب کے سب مسلمان تھے زیادہ تر ہاتھی دروازے کے۔ ہر ہفتے بجلی پہلوان کے پاس جاتے اور اپنی تنخواہ صول کر لیتے۔ وہ ان کو کبھی نااُمید نہ لوٹاتا۔ اس لیے کہ اس کے پاس روپیہ عام تھا۔ میں نے سُنا کہ ایک دن وہ بزاز کی دکان پر حسبِ معمول بیٹھا تھا کہ ایک ہندو بنیا جو کافی مالدار تھا‘ اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی

”پہلوان جی! میرا لڑکا خراب ہو گیا ہے۔ اس کو ٹھیک کر دیجیے۔ پہلوان نے مسکرا کر اس سے کہا

”میرے دو لڑکے ہیں۔ بہت شریف‘ لوگ مجھے غنڈہ اور بدمعاش کہتے ہیں لیکن میں نے انھیں اس طرح پالا پوسا ہے کہ وہ کوئی بُری حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ مہاشہ جی یہ آپ کا قصور ہے‘ آپ کے بڑے لڑکے کا نہیں“

بنیے نے ہاتھ جوڑ کر کہا

”پہلوان جی۔ میں نے بھی اس کو اچھی طرح پالا پوسا ہے‘ پر اُس نے اب چوری چوری بہت بُرے کام شروع کر دیے ہیں“

بجلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا

”اس کی شادی کر دو“

اس واقعے کو دس روز گزرے تھے کہ بجلی پہلوان ایک نوجوان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا حالانکہ اس سے اس قسم کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ ہو گی اور بجلی پچاس سے اُوپر ہو گا۔ آدمی بااثر اور مالدار تھا۔ لڑکی کے والدین راضی ہو گئے' چنانچہ شادی ہو گئی۔ اس نے شہر کے باہر ایک عالی شان کوٹھی بنائی تھی' دولہن کو وہ جب اس میں لے کر گیا تو اُسے محسوس ہوا کہ تمام جھالر اور فانوس ماند پڑ گئے ہیں۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی' پہلی رات بجلی پہلوان نے کسرت کرنا چاہی مگر نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اس کے دماغ میں اپنی پہلی بیوی کا خیال کروٹیں لے رہا تھا' اس کے دو جوان لڑکے تھے جو اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ اس نے اپنی پہلی بیوی کو کہیں باہر بھیج دیا تھا' اس کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کے پتی نے دوسری شادی کر لی ہے۔ بجلی پہلوان سوچتا تھا کہ اسے اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی بیوی کو مطلع کر دینا چاہیے تھا۔ ساری رات نئی نویلی دولہن جس کی عمر سولہ سترہ برس کے قریب تھی' چوڑے چکلے پلنگ پر بیٹھی بجلی پہلوان کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتی رہی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شادی کیا ہے' کیا اسے ہر روز اسی قسم کی باتیں سننا ہوں گی۔

”کل میں تمہارے لیے دس ہزار کے زیور اور لاؤں گا“

”تم بڑی سندر ہو“

”برفی کھاؤ گی یا پیڑے“

”یہ سارا شہر سمجھو کہ تمہارا ہے“

”یہ کوٹھی میں تمہارے نام لکھ دُوں گا“

کتنے نوکر چاہئیں تمھیں۔ مجھے بتا دو ایک منٹ میں انتظام ہو جائے گا۔

”میرے دو جوان لڑکے ہیں' بہت شریف۔ تم ان سے جو کام لینا چاہو لے سکتی ہو' وہ تمہارا حکم مانیں گے“

دولہن ہر روز اسی قسم کی باتیں سنتی رہی' حتیٰ کہ چھ مہینے گزر گئے' بجلی پہلوان دن بدن اُس کی محبت میں غرق ہوتا گیا' وہ اس کے تیکھے تیکھے نقش دیکھتا تو اپنی ساری پہلوانی بھول جاتا۔ اس کی پہلی بیوی بدشکل تھی۔ ان معنوں میں کہ اس میں کوئی کشش نہیں تھی' وہ ایک عام کھترانی تھی جو ایک بچہ جننے کے بعد ہی بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن اس کی یہ دوسری بیوی بڑی ٹھوس تھی' دس بچے پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ثابت و سالم رہ سکتی تھی۔ بجلی پہلوان کا ایک وید دوست تھا اس کے پاس وہ کئی دنوں سے جا رہا تھا اُس نے بجلی کو یقین دلایا کہ اب کسی قسم کے تردّد کی ضرورت نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلوان خوش تھا۔ وید کے ہاں سے آتے ہوئے اس نے کئی سکیمیں تیار کیں' راستے میں مٹھائی خریدی' سونے کے دو بڑے بڑے خوشنما کڑے لیے' بارہ قمیصوں اور بارہ شلواروں کے لیے بہترین کپڑا قیمت ادا کیے بغیر حاصل کیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ جو دُکان کے مالک تھے اس سے مرعوب تھے اور قیمت لینے سے انکاری تھے۔ شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا' آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں گیا' دیکھا تو وہاں اس کی دوسری بیوی نہیں تھی' اس نے سوچا شاید غسل خانے میں ہو گی چنانچہ اس نے اپنا بوجھ' میرا مطلب ہے وہ تھان وغیرہ پلنگ پر رکھ کر غسل خانے کا رخ کیا' مگر وہ خالی تھا۔ بجلی پہلوان بڑا متحیر ہوا کہ اس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آئے مگر وہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا اس نے وید کی دی ہوئی گولیاں کھائیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا کہ اس کی بیوی آ جائے گی آخر اسے جانا کہاں ہے؟ وہ گولیاں کھا کر پلنگ پر بیٹھا قمیصوں کے کپڑوں کو اُنگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سنائی دی وہ چونکا اُٹھ کر اُس کمرے میں گیا جو اُس نے اپنے بڑے لڑکے کو دے رکھا تھا اندر سے اس کی بیوی اور اس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔ اُس نے دستک دی۔ لیکن دروازہ نہ کھلا پھر بڑے زور سے چلانا شروع کیا کہ دروازہ کھولو۔ اس وقت اس کا خون کھول رہا تھا۔ دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کمرے کے اندر اس کی بیوی اور اس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کر دیا ہے۔ بجلی پہلوان نے بڑے کمرے میں جا کر گورمکھی زُبان میں ایک رقعہ لکھا جس کی عبارت اُردو میں کچھ یوں ہو سکتی ہے“

یہ کوٹھی اب تمہاری ہے۔ میری بیوی بھی اب تمہاری بیوی ہے خوش رہو۔ ۔ تمہارے لیے کچھ تحفے لایا تھا۔ وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔ یہ رقعہ لکھ اس نے ساٹن کے تھان کے ساتھ ٹانک دیا۔ (۲۷ مئی ۵۴ء(

بچنی

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوبچنی

بھنگنوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ خاص طور پر ان کی جو بٹوارے سے پہلے امرتسر میں رہتی تھیں۔ مجید کا یہ ایمان تھا کہ امرتسر کی بھنگنوں جیسی کراری چھوکریاں اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔ خدا معلوم تقسیم کے بعد وہ کہاں تتر بتر ہو گئی تھیں۔ رشید ان کے مقابلے میں گجریوں کی تعریف کرتا تھا۔ اس نے مجید سے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو کہ امر تسری بھنگنیں اپنی جوانی کے زمانے میں بڑی پر کشش ہوتی ہیں، لیکن ان کی یہ جوانی کھترانیوں کی طرح زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ بس ایک دن جوان ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ادھیڑ ہو جاتی ہیں۔ ان کی جوانی معلوم نہیں کون ساچور چرا کے لے جاتا ہے۔ خدا کی قسم۔ ہمارے ہاں ایک بھنگن کوٹھا کمانے آتی تھی۔ اتنی کڑیل جوانی تھی کہ میں اپنی کمزور جوانی کو محسوس کرکے اس سے کبھی بات نہ کر سکا۔ عیسائی مشنریوں نے اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا۔ نام اس کا فاطمہ تھا۔ پہلے گھر والے اسے پھاتو کہتے تھے۔ مگر جب وہ عیسائی ہوئی تو اسے مس پھاتو کے نام سے پکارا جانے لگا۔ صبح کو وہ بریک فاسٹ کرتی تھی، دوپہر کو لنچ اور شام کو ڈنر۔ لیکن چند مہینوں کے بعد میں نے اسے دیکھا کہ اس کی ساری کڑیل جوانی جیسے پگھل گئی ہے۔ اس کی چھاتیاں جو بڑی تند خو تھیں اور اس طرح اوپر اٹھتی رہتی تھیں جیسے ابھی اپنا سارا جوان بدن آپ پر داغ دیں گی، اس قدر نیچے ڈھلک گئی تھیں کہ ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں ہمارے گھر میں وہ گجری جو اُپلے لے کر آتی تھی، تیر کی طرح سیدھی تھی۔ اس کی عمر بھی اتنی ہو گی جتنی اس بھنگن کی تھی۔ مگر وہ تین برس کے بعد بھی ویسی ہی جوان تھی۔ سرو قد۔ اُپلوں کا ٹوکرا اس کے سر پر ہوتا تھا۔ ایک پہاڑ سا بنا ہوا۔ مگر مجال ہے کہ اس کی گردن میں ہلکی سی جنبش آجائے یا اس کی کمر میں خفیف سا خم آجائے۔ تین برس وہ ہمارے یہاں آتی رہی۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔ اس کے یکے بعد دیگرے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ اور مجید! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کی کمر ویسی ہی مضبوط تھی۔ تم میری مان لو کہ بھنگنیں، گوجریوں کا مقابلہ کسی صورت بھی نہیں کر سکتیں۔“

مجید تلملا رہا تھا۔ اس نے پان کی گلوری چُندنیا میں سے نکال کر اپنے کلّے میں دبائی۔ چھوٹی ڈبیا سے ماچس کی تیلی کی مدد سے تھوڑا سا قوام نکالا اور منہ میں ڈال کر بڑے تحمل سے کہا۔

”رشید بھائی۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن جس بھنگن کا تصور میرے دماغ میں ہے، اور جس کی دراصل میں بات کرنا چاہتا تھا۔ ایک فتنہ تھا۔ اب تم ایسا کرو کہ میری ساری داستان سُن لو تا کہ تمہیں اس فتنہ و قیامت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ جوبن ڈھلنے کی تم جو بات کرتے ہو، اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ گجریوں کا قد لمبا ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر انھیں جلدی ڈھلنا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ ننگے پاؤں رہتی ہیں اور اپنے سر پر بقول تمہارے پہاڑ سا اُپلوں کا ٹوکرا اٹھائے اٹھائے پھرتی ہیں۔ لیکن لعنت بھیجو فی الحال گجریوں پر، کیوں کہ مجھے بچنی کی بات کرنا ہے جو ہمارے محلے کی بڑی کراری بھنگن تھی۔ اس کا قد تو انگشتانہ بھر کا تھا مگر زبان اسکندری گز تھی۔ شادی شدہ تھی، مگر خاوند سے ہر روز لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ ہمارے کمپاؤنڈ میں یہ دونوں میاں بیوی ہر روز صبح سویرے آتے اور ایک بڑ کے درخت کے ساتھ جھولا لٹکا دیتے۔ اس میں وہ اپنا لڑکا ڈال دیتے تھے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کو جھلانے والا کوئی نہیں تھا، چنانچہ دونوں میاں بیوی جھاڑو چھوڑ کر اسے جھولا جھلاتے یا گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔“

رشید نے مجید سے کہا۔

”یہ جھولے کی بات کہاں سے آگئی۔ تم تو ایک کراری بھنگن کی بات کر رہے تھے۔ جو بقول تمہارے بہت خوبصورت تھی۔“

مجید نے فوراً کہا۔

”یار تم جھولے کے ساتھ کیوں اٹک گئے۔ میری پوری کہانی تو سن لو۔ یہ جھولے کی نہیں بچنی کی بات ہے۔ اس بچنی کی جسے میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ ایک آفت تھی۔ صبح اپنے خاوند کے ساتھ آتی تھی۔ ہاتھ میں لمبی سی جھاڑو لیے۔ ماتھے پر سینکڑوں تیوریاں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی جھاڑو آپ کے سر پر دے مارے گی۔ مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔ میں نے ہزاروں بار اس کو گھورا، لیکن اس نے میرے سر پر جھاڑو نہیں ماری۔ اس کی تیوریاں اس کے ماتھے پر بدستور قائم رہیں اور وہ حسب سابق اپنا کام کرتی رہیں۔ اس کا خاوند جس کا نام معلوم نہیں کیا تھا، اول درجے کا زن مرید تھا۔ اس کا قد اپنی بیوی سے بھی چھوٹا تھا۔ وہ اس کو کام کے دوران میں ہمیشہ گالیاں دیا کرتی تھی۔ محلے کے سب لوگ سنتے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کرتے تھے۔“

رشید اتنی لمبی داستان سن کر بھنا گیا۔

”تم اصل بات کی طرف آؤ۔ یہ کیا چہ مے گوئیاں بک رہے ہو۔ بچنی نام بڑا اچھا ہے، ورنہ خدا کی قسم! میں تمہاری یہ خرافات کبھی نہ سنتا۔ معلوم نہیں یہ تمہاری جوڑی ہوئی کہانی ہے۔ بہر حال، تمہیں چند منٹ دیتا ہوں۔ سنالو۔“

مجید تاؤ میں آگیا۔

”الو کے پٹھے۔ تم نے صرف بچنی کا نام سنا ہے، کبھی تم نے اسے دیکھا ہوتا تو دل نکال کر اس کے ٹوکرے میں ڈال دیا ہوتا۔ میں تم سے اگر ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں تو اس میں نمک مرچ لگانے کی مجھے اجازت ہونی چاہیے۔ تم اگر اکتا گئے ہو تو جہنم میں جاؤ۔“

رشید کو اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ کسی سینما میں چلا جاتا، اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ مجید کی داستان سن لے۔

”جہنم میں جانے کا سوال نہیں۔ تم ذرا اختصار سے کام لو۔ اصل میں مجھے بچنی سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔“

مجید غصے میں آگیا۔

”تمہاری دلچسپی کی ایسی کی تیسی۔ سالے، تم کون ہوتے ہو اس میں دلچسپی لینے والے۔ اس میں دلچسپی لینے والے تم ایسے ہزاروں تھے، مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ میں تم سے کروڑ مرتبہ زیادہ خوبصورت ہوں، لیکن میں اس نگہ التفات کا ہر وقت منتظر رہتا تھا۔ وہ بڑی ہٹیلی تھی۔ میرے دوست رشید خدا کی قسم! اس جیسی لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ نام اس کا بچنی تھا۔ یعنی بچن سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر وہ تو پھاپھا کٹنی تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو اپنے قبضے میں لے آؤں، پر ناکام رہا۔ وہ پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی تھی۔“

یہ سن کر رشید بولا۔

”تم یار ہمیشہ ایسے معاملوں میں کورے رہے ہو۔“

مجید کے گہری چوٹ لگی۔

”بکواس کرتے ہو۔ میں نے ایک روز اسے پکڑ لیا۔ میرے گھر کے باہر وہ جھاڑو دے رہی تھی کہ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ چمٹا لیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

رشید نے ازراہ مذاق سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی بجھا کر اس کے کئی ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیے۔ مجید کو ایسا محسوس ہوا کہ رشید نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ بہت جز بز ہوا، لیکن آدمی سچا تھا اس لیے جھوٹ نہ بول سکا۔

”یار رشید! تم مذاق اڑاتے ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ اس روز ہوا، اس کا مذاق اڑانا ہی چاہیے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ لیکن اس حرامزادی نے کھینچ کے اپنی جھاڑو میرے منہ پر دے ماری۔ میں شرم کے مارے اندر بھاگ گیا۔ لیکن فوراً باہر نکلا۔ دیکھا کہ وہ میرے مکان کے باہر جھاڑو دے رہی ہے۔ میں نے اسے پھر پکڑا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میں نے سوچا۔“

رشید نے مجید کا فقرہ مکمل کر دیا۔

”کہ معاملہ درست ہو گیا ہے۔“

مجید بوکھلا گیا:

”خاک درست ہوا۔ وہ میری گرفت سے نکل کر سیدھی میری بیوی کے پاس چلی گئی۔ لیکن اس سے کوئی شکایت نہ کی۔ میں ڈر کے مارے دبکا ہوا تھا۔ میں نے صرف یہ سنا اور میری جان کا بوجھ ہلکا ہوا۔

”بی بی جی آج پانی نہیں آیا۔ یہ ان لوگوں کو جو آپ سے ہر مہینے دس روپے وصول کرتے ہیں، کیا ہو گیا ہے۔ کیوں وہ اتنا خیال نہیں کرتے کہ آپ کو ہر روز ماشکی کو دس مشکوں کے چار آنے فی مشک کے حساب دو روپے آٹھ آنے دینا پڑیں۔“

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے میری عزت و آبرو رکھ لی۔ لیکن میں نے بعد میں سوچا کہ میری عزت و آبرو رکھنے والی اصل میں بچنی۔ لیکن جب زیادہ سوچا تو احساس ہوا کہ ایسا سوچنا کفر ہے۔“

رشید قریب قریب تنگ آ چکا تھا۔ اس نے اپنے دوست کی خاطر آواز دبا کر کہا۔

”کافر کے بچے۔ بات تو کر کہ تیرا اس بچنی کی بچنی سے کیا ہوا۔ کیا تم نے اسے پٹا لیا؟“

مجید نے رشید کی چندنیا میں سے ایک گلوری لی اور کہا۔

”دیکھو رشید۔ تم بچنی کو جانتے نہیں۔ افسوس ہے کہ میں افسانہ نگار نہیں ورنہ میں اس کا کردار بہت اچھی طرح۔ جیتا جاگتا پیش کر سکتا۔ وہ معلوم نہیں شے کیا تھی۔ عمر اس کی زیادہ سے زیادہ۔ یہ سمجھو کہ سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہو گی۔ قد اس کا ساڑھے چار فٹ ہو گا۔ چھاتی ایسی تھی جیسے لوہے کی بنی ہے، حالانکہ ایک بچے کی ماں تھی۔“

رشید بہت تنگ آ گیا۔

”ایک بچے کی ماں کے بچے۔ تو اپنی داستان کے انجام کو پہنچ۔ مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔ ساڑھے سات بج چکے ہیں، لیکن تمہاری داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔“!

مجید سنجیدہ رہا۔

”رشید لالے۔ معاملہ بڑا نازک ہے۔“

”کس کا۔ تمہارا یا میرا؟“

”میں نہیں کہہ سکتا، لیکن جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اس وقت معاملہ میرا تو بہت نازک تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں، کیا نہ کروں۔ اب تم یہ خیال کرو کہ میں ہزاروں کا مالک تھا۔ تم جانتے ہو کہ ماں باپ مر کھپ چکے تھے۔ ساری جائیداد کا میں وارث تھا۔ جہاں چاہتا، لٹا دیتا۔ اس روز جب میں نے بچنی کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچا اور وہ میری گرفت سے یوں الگ ہٹی جیسے میرا کام تمام کر دے گی، لیکن میری بیوی سے اس نے اس سلسلے کا ذکر تک نہ کیا تو مجھے امید ہو گئی کہ چند ایسے معاملوں کے بعد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

رشید نے اس سے پوچھا۔

”تجھے کامیابی ہوئی؟“

”خاک۔ تم اسے جانتے ہی نہیں۔ بڑی تیز خو لڑکی ہے۔ اپنے خاوند کو کچھ نہیں سمجھتی۔ لیکن ایک عجیب بات ہے کہ میں نے اس سے اتنی چھیڑ خانی کی، لیکن اس نے کسی سے بات تک نہ کی، ورنہ اگر چاہتی تو میرا گھر نکالا کر سکتی تھی۔“

رشید مسکرایا۔

”میں تمہاری بچنی کو جانتا ہوں“!

مجید نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

”تم کیسے جانتے ہو اس کو؟“

”جس طرح تم جانتے ہو۔ کیا تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہارے ہی محلے کے کام کیا کرے۔ میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

مجید کو یقین نہ آیا۔

”بکواس کرتے ہو۔ اس کی عمر ہی کتنی ہے کہ تم اسے جانو۔ دو برس سے کچھ مہینے اوپر ہو گئے ہیں کہ وہ ہمارے محلے میں بلا ناغہ آتی ہے۔ اس کے لڑکے کی عمر بھی دو سال کے قریب ہو گی۔ یعنی جب وہ ہمارے ہاں ملازم ہوئی تو اس کے کوئی بچہ نہیں تھا۔ لیکن دو تین مہینے کے بعد اس کی گود میں ایک لڑکا تھا۔“

رشید پھر مسکرایا۔

”تمہارا؟“

”میرا“!

مجید گھبرا گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا۔

”میرا ہوتا تو کیا کہنے تھے۔ کم از کم میں یہ تو کہنے کے قابل ہو جاتا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

رشید کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب رنگ اختیار کر گئی۔

”تمہیں اپنی بچنی کے شوہر کا نام معلوم نہیں؟“

”نہیں“!

”میں بتاتا ہوں تمہیں۔ اس کے شوہر کا نام رشید ہے۔“

مجید بوکھلا گیا۔

”رشید۔ کیا اس کا نام رشید ہے؟“

رشید نے بڑے وثوق اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ہاں۔ اس کا نام رشید ہے۔ اصل میں وہی اس کا شوہر ہے۔“

”وہ جو اس کے ساتھ ہمارے محلے میں جھاڑو دیتا ہے اور اپنے بچے کو جھولا جھلاتا ہے؟“

مجید کی بوکھلاہٹ اسی طرح قائم تھی۔ رشید کی سنجیدگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

”وہ الو کا پٹھا اپنے بچے کو جھولا نہیں جھلاتا“!

”تو کسے جھلاتا ہے۔ کیا وہ اس رشید کا بچہ نہیں؟“

”نہیں“!

”تو کس کا بچہ؟“

”ایک غریب اور نادار آدمی کا۔ جو خوبصورت بھی نہیں۔ تم سے ہزاروں درجے نیچے ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”پوچھ کے کیا کرو گے؟“

”کروں گا کیا۔ بس ایسے ہی جاننا چاہتا ہوں۔“

رشید نے ایک سگریٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے کہا۔

”جاننا چاہتے ہو تو جان لو۔ وہ رشید میں ہوں۔ تمہاری بچّنی سے میری آشنائی بچپن کی ہے۔ وہ گیارہ برس کی تھی۔ میں تیرہ برس کا۔ جب سے میرا اس کا معاملہ چل رہا ہے۔ وہ لڑکا جو تم اس کی گود میں دیکھتے ہو اور جسے اس کا الو کا پٹھا شوہر ہر روز جھولا جھلاتا ہے، اس خاکسار کی اولاد ہے۔ شکر ہے خداوند کریم کا کہ لڑکی نہ ہوئی، ورنہ میں تو اسے دوسرے ہی روز مار ڈالتا۔“

یہ کہہ کر رشید فوراً اٹھا اور چلا گیا۔ مجید سوچتا رہ گیا کہ خداوند کریم نے اس پر کون سا کرم کیا تھا جو وہ اس کا شکر گزار تھا!

بدتمیزی

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں“

”جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے“

”آپ تو بس ہر بات پر گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہوتا کہ میں آپ سے کیا کہنا چاہتی ہوں“

”اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بس فقط لڑائی مول لینا چاہتی ہو“

”لڑائی میں مول لینا چاہتی ہوں کہ آپ۔ سارے ہمسائے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

”خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک برس تک میں تم سے کوئی تلخ بات کی ہے نہ شیریں“

”شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی کہاں آتا ہے۔ نوکر کو آواز دے کر بلوائیں گے تو سارے محلے کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اسے گولی سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں“

”میرے پاس بندوق ہی نہیں۔ ویسے میں خرید سکتا ہوں مگر اس کو چلائے گا کون؟۔ میں تو پٹاخے سے ڈرتا ہوں“

آپ بنیئے نہیں۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ فراڈ میرے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا“

”اب میں فراڈ بن گیا؟“

”آپ ہمیشہ سے فراڈ تھے۔“

”یہ فیصلہ آپ نے کن وجوہ پر قائم کیا“

”آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو کیا آپ نے ابّا جی کی جیب سے دو روپے نہیں نکالے تھے؟“

”نکالے تھے“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ بھنگی کی لڑکی کو ضرورت تھی“

”اس لیے کہ وہ بھنگی کی لڑکی تھی۔ بہت بیمار۔ والد صاحب سے اگر کہا جاتا تو وہ کبھی ایک پیسہ بھی اسے نہ دیتے‘ میں نے اسی لیے مناسب سمجھا کہ ان کے کوٹ سے دو روپے نکال کر اس کو دے دُوں۔ یہ کوئی گناہ نہیں“

”جی ہاں۔ بہت بڑا ثواب ہے۔ باپ کے کوٹ پر چھاپہ مار کر آپ تو اپنے خیال کے مطابق جنت میں اپنی سیٹ بک کر چکے ہوں گے لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں کہ اس کی سزا آپ کو اتنی کڑی ملے گی کہ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی“

”طبیعت تو میری ہر روز صاف کی جاتی ہے۔ اب اتنی صاف ہو گئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس طبیعت کو کیچڑ میں لت پت کر دوں تا کہ تمہارا مشغلہ جاری رہ سکے“

”یہ کیچڑ میں تو آپ ہر وقت لتھڑے رہتے ہیں“

”یہ سراسر بہتان ہے“

”بہتان کیا ہے۔ حقیقت ہے۔ آپ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہیں۔ آپ کو کسی نفیس چیز سے دلچسپی ہی نہیں' بات کریں گے تو غلاظت کی۔ نہاتے آپ نہیں“

”غضب خدا کا۔ میں تو دن میں تین مرتبہ نہاتا ہوں“

وہ بھی کوئی نہانا ہے۔ بدن پر دو ڈونگے پانی کے ڈالے۔ تولیے سے اپنا نیم خشک جسم پونچھا اور غسل خانے سے باہر نکل آئے۔“

”دو ڈونگے تو نہیں' کم از کم بیس ہوتے ہیں“

”تو ان سے بھی کیا ہوتا ہے۔ کیا آپ نے آج تک کبھی صابن استعمال کیا ہے؟“

”میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ صابن جلد کے لیے بہت مضر ہے'

”کیوں؟“

”اس لیے کہ اس میں ایسے تیزابی مادے ہوتے ہیں جو جلد کا ستیاناس کر دیتے ہیں“

”میری جلد تو آج تک ستیاناس نہیں ہوئی۔ آپ کی جلد بہت ہی نازک ہو گی

”

”نازک ہونے کا سوال نہیں۔ یہ ایک سائینٹیفک بحث ہے“

”میں سائنٹیفک وائینٹیفک کچھ نہیں جانتی۔ بس میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟“

”بھئی' تمھیں بتا تو چکا ہوں کہ یہ مضر ہے“

”تو آپ نہاتے کس طرح ہیں“

”نہانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ پانی ڈالتے گئے اور نہاتے گئے“

”جسم پر آپ کوئی چیز نہیں ملتے۔ میرا مطلب ہے' صابن نہیں تو کوئی اور چیز“

”ملا کرتا ہوں“

”کیا؟“

”بیسن“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”ارے' بھئی' چنے کا آٹا“

آپ کی جو بات ہے، نرالی ہے۔ میں تو آپ ایسے سنکی سے خدا قسم تنگ آ گئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، کہاں جاؤں۔“

”اپنے میکے چلی جاؤ۔ وہاں تمھیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔“

”میں کیوں جاؤں وہاں۔ میں یہیں رہوں گی۔“

”میں نے تم سے آج ہی کہا۔ اس لیے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھے دھمکی دیتی رہی ہو کہ میں چلی جاؤں گی اپنے میکے۔“

”مجھے جب جانا ہو گا چلی جاؤں گی۔“

”آج تمھاری طبعیت نہیں چاہتی؟“

”آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟“

”میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں، تو یقین مانو، تم ابھی تانگہ لے کر اسٹیشن پہنچ جاؤ گی۔“

”کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔ میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہٹوں گی۔ یہ میرا گھر ہے۔“

”آپ کا ہے۔ آپ کے باپ دادا کا ہے۔ لیکن یہ تو بتائیے۔“

”میرے باپ دادا کا نام مت لیجیے۔ اُن بیچاروں کا کیا قصور تھا؟“

”'قصور تو سارا میرا ہے۔ لیکن بیگم، تم کبھی کبھی اتنا غور کر لیا کرو کہ میں نے آخر تمھیں کون سا جانی نقصان پہنچایا ہے کہ تم لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔“

”لٹھ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے۔ میں تو اُسے اٹھا بھی نہیں سکتی۔“

”تم بڑے سے بڑا گرز اُٹھا سکتی ہو۔ تم ایسی عورتوں میں بلا کی قوت ہوتی ہے۔ تم عقاب ہو۔ تمہارے سامنے تو میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔“

”باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ آپ چڑیا ہیں۔ سبحان اللہ۔ جب کڑکتے اور گرجتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔“

”اس شیر کو پہلے ایک نظر دیکھ لو۔“

”کیا دیکھوں؟۔ پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔“

”یہ خاکسار شیر ہے کیا؟

”شیر ہے، مگر خاک میں لپٹا ہوا۔“

”اس تعریف کا شکریہ۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کہنا کیا چاہتی تھیں۔“

”آپ اتنے لائق فائق بنے پھرتے ہیں۔ سمجھیے کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔“

”تمھاری باتیں تو صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے۔ میں کیا سمجھوں گا۔“

خدا کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔“

”خدا کو اگر بیچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔“

”بڑے آئے ہیں آپ خدا کو ماننے والے۔“

”خدا کو تو میں ہمیشہ سے مانتا آیا ہوں۔ وہ طاقت جو دُنیا پر کنٹرول کرتی ہے۔“

”کنٹرول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں۔“

”کس قسم کا؟“

”ہر قسم کا۔ میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکتی کپڑے لیتی ہوں، تو اُس میں آپ کی مرضی کا دخل ہوتا ہے۔ کھانے کے بارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے۔ آج یہ پکے، کل وہ پکے۔“

”اس میں تمھیں اعتراض ہے؟“

”اعتراض کیوں نہیں۔ میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ اوجھڑی کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔“

”اوجھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے۔“

”آپ کیا جانیں، کتنی مزیدار ہوتی ہے۔ چُونے میں ڈال کر اُسے صاف کر لیا جاتا ہے، اُس کے بعد اچھی طرح گھی میں تلا جاتا ہے۔ اللہ قسم مزا آجاتا ہے۔“

”لاحول ولا۔ میں ایسی غلط چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔“

”اور ٹینڈے؟“

”بکواس ہیں۔ سبزی کی سب سے بڑی توہین ہیں۔ اُن میں کوئی رس ہوتا ہے نہ لذت۔ بس فقط ٹینڈے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پیدا کس غرض کے لیے کیے گئے تھے۔ نہایت واہیات ہوتے ہیں۔ میں تو اکثر یہ دُعا مانگتا ہوں کہ اُن کا وجود سرے ہی سے غائب ہو جائے۔ بڑے بے جان ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کدّو بدرجہا بہتر ہے‘ حالانکہ وہ بھی مجھے سخت ناپسند ہے۔“

”آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟۔ ہر اچھی چیز میں آپ کیڑے ڈالتے ہیں۔ بھنڈی آپ کو پسند نہیں کہ اُس میں لیس ہوتی ہے۔ گوبھی آپ کو نہیں بھاتی کہ اُس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبُو ہوتی ہے۔ ٹماٹر آپ کو اچھے نہیں لگتے، اس لیے کہ اُس کے چھلکے ہضم نہیں ہوتے۔“

”تم ان باتوں کو چھوڑو۔ ٹینڈے، گوبھی اور ٹماٹر جائیں جہنم میں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں۔“

”کچھ بھی نہیں۔ بس ایسے ہی آگئی۔ میں نے دیکھا کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے، تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔“

”بڑی نوازش ہے آپ کی۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا ہو گا آپ کو۔“

”آپ سے اگر کچھ کہہ بھی دیا تو اُس کا حاصل کیا ہو گا۔“

”جو آگے آپ کو حاصل ہوتا رہا ہے، اُسی حساب سے آج بھی حاصل ہو جائے گا۔ آپ یہاں سے کچھ حاصل کیے بغیر ٹلیں گی کیسے؟“

”میں آپ سے ایک خاص بات کرنے آئی تھی۔“

”کیا؟“

”میں۔ میں یہ کہنے آئی تھی، کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟“

”آپ کیا سمجھانے آئی تھیں مجھے۔“

”آپ کو تو خدا سمجھائے گا۔ میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتلون پہن کر اُس کے بٹن بالکنی میں بند نہ کیا کریں۔ ہمسایوں کو سخت اعتراض ہے۔ یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے۔“

۲۲، مئی ۱۹۵۴ء

بدصورتی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبدصورتی

ساجدہ اور حامدہ دو بہنیں تھیں۔ ساجدہ چھوٹی اور حامدہ بڑی۔ ساجدہ خوش شکل تھی۔ ان کے ماں باپ کو یہ مشکل درپیش تھی کہ ساجدہ کے رشتے آتے مگر حامدہ کے متعلق کوئی بات نہ کرتا۔ ساجدہ خوش شکل تھی مگر اس کے ساتھ اسے بننا سنورنا بھی آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں حامدہ بہت سیدھی سادھی تھی۔ اس کے خدوخال بھی پرکشش نہ تھے۔ ساجدہ بڑی چنچل تھی۔ دونوں جب کالج میں پڑھتی تھیں تو ساجدہ ڈراموں میں حصہ لیتی۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی، سر میں گا سکتی تھی۔ حامدہ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ کالج کی تعلیم سے فراغت ہوئی تو ان کے والدین نے ان کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ ساجدہ کے لیے کئی رشتے تو آ چکے تھے، مگر حامدہ بڑی تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ پہلے اس کی شادی ہو۔ اسی دوران میں ساجدہ کی ایک خوبصورت لڑکے سے خط و کتابت شروع ہو گئی جو اس پر بہت دنوں سے مرتا تھا۔ یہ لڑکا امیر گھرانے کا تھا۔ ایم اے کر چکا تھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کے ماں باپ چاہتے تھے کہ اس کی شادی ہو جائے تاکہ وہ بیوی کو اپنے ساتھ لے جائے۔ حامدہ کو معلوم تھا کہ اس کی چھوٹی بہن سے وہ لڑکا بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ایک دن جب ساجدہ نے اسے اس لڑکے کا عشقیہ جذبات سے لبریز خط دکھایا تو وہ دل ہی دل میں بہت کُڑھی، اس لیے کہ اس کا چاہنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اس خط کا ہر لفظ بار بار پڑھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں سوئیاں چبھ رہی ہیں، مگر اس نے اس درد و کرب میں بھی ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی، لیکن وہ اپنی چھوٹی بہن پر برس پڑی:

”تمہیں شرم نہیں آتی کہ غیر مردوں سے خط و کتابت کرتی ہو“!

ساجدہ نے کہا۔

”باجی۔ اس میں کیا عیب ہے“!

”عیب!۔ سراسر عیب ہے۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں کبھی ایسی بے ہودہ حرکتیں نہیں کرتیں۔ تم اس لڑکے حامد سے محبت کرتی ہو؟“

”ہاں“

”لعنت ہے تم پر“

ساجدہ بھنا گئی۔

”دیکھو باجی مجھ پر لعنتیں نہ بھیجو۔ محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔“

حامدہ چلائی۔

”محبت محبت۔ آخر یہ کیا بکواس ہے۔“

ساجدہ نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔

”جو آپ کو نصیب نہیں۔“

حامدہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ چنانچہ کھوکھلے غصے میں آ کر اس نے چھوٹی بہن کے منہ پر زور کا تھپڑ مار دیا۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئیں۔ دیر تک ان میں ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ حامدہ اس کو یہ کوسنے دیتی رہی کہ وہ ایک نامحرم مرد سے عشق لڑا رہی ہے، اور ساجدہ اس سے یہ کہتی رہی کہ وہ جلتی ہے اس لیے کہ اس کی طرف کوئی مرد آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ حامدہ ڈیل ڈول کے لحاظ سے اپنی چھوٹی بہن کے مقابلے میں کافی تگڑی تھی، اس کے علاوہ اسے خار بھی تھی جس نے اس کے اندر اور بھی قوت پیدا کر دی تھی۔ اس نے ساجدہ کو خوب پیٹا۔ اس کے گھنے بالوں کی کئی خوبصورت لٹیں نوچ ڈالیں اور خود ہانپتی ہانپتی اپنے کمرے میں جا کر زار و قطار رونے لگی۔ ساجدہ نے گھر میں اس حادثے کے بارے میں

کچھ نہ کہا۔ حامدہ شام تک روتی رہی۔ بے شمار خیالات اس کے دماغ میں آئے۔ وہ نادم تھی کہ اس نے محض اس لیے کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا اپنی بہن کو، جو بڑی نازک ہے، پیٹ ڈالا۔ وہ ساجدہ کے کمرے میں گئی۔ دروازے پر دستک دی اور کہا۔

”ساجدہ“!

ساجدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ حامدہ نے پھر زور سے دستک دی اور رونی آواز میں پکاری۔

”ساجی! میں معافی مانگنے آئی ہوں۔ خدا کے لیے دروازہ کھولو۔“

حامدہ دس پندرہ منٹ تک دہلیز کے پاس آنکھوں میں ڈبڈبائے آنسو لیے کھڑی رہی، اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی بہن دروازہ کھولے گی، مگر وہ کُھل گیا۔ ساجدہ باہر نکلی اور اپنی بڑی بہن سے ہم آغوش ہوگئی۔

”کیوں باجی۔ آپ رو کیوں رہی ہیں؟“

حامدہ کی آنکھوں میں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم سے آج بیکار لڑائی ہوگئی۔“

”باجی۔ میں بہت نادم ہوں کہ میں نے آپ کے متعلق ایسی بات کہہ دی جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی۔“

”تم نے اچھا کیا ساجدہ۔ میں جانتی ہوں کہ میری شکل وصورت میں کوئی کشش نہیں۔ خدا کرے تمہارا احسن قائم رہے۔“

”باجی!۔ میں قطعاً حسین نہیں ہوں۔ اگر مجھ میں کوئی خوبصورتی ہے تو میں دعا کرتی ہوں کہ خدا اسے مٹا دے۔ میں آپ کی بہن ہوں۔ اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں اپنے چہرے پر تیزاب ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔“

”کیسی فضول باتیں کرتی ہو۔ کیا بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ تمہیں حامد قبول کرلے گا؟“

”مجھے یقین ہے۔“

”کس بات کا؟“

”وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اگر میں مرجاؤں تو وہ میری لاش سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوگا۔“

”یہ محض بکواس ہے“

”ہو گی۔ لیکن مجھے اس کا یقین ہے۔ آپ اس کے سارے خط پڑھتی رہی ہیں۔ کیا ان سے آپ کو یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ مجھ سے کیا کیا پیمان کر چکا ہے۔“

”ساجی۔“

یہ کہہ کر حامدہ رک گئی۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس نے لرزاں آواز میں کہا۔

”میں عہد وپیمان کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔“

اور رونا شروع کردیا۔ اس کی چھوٹی بہن نے اسے گلے سے لگایا۔ اس کو پیار کیا اور کہا

”باجی۔ آپ اگر چاہیں تو میری زندگی سنور سکتی ہے۔“

”کیسے؟“

”مجھے حامد سے محبت ہے۔ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اگر میری کہیں شادی ہوگی تو تمہیں سے ہوگی۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”میں یہ چاہتی ہوں۔ کہ آپ اس معاملے میں میری مدد کریں۔ اگر وہاں سے پیغام آئے تو آپ اس کے حق میں گفتگو کیجیے۔ امی اور ابا آپ کی ہر بات مانتے ہیں۔“

”میں انشاء اللہ تمہیں ناامید نہیں کروں گی۔“

ساجدہ کی شادی ہوگئی، حالانکہ اس کے والدین پہلے حامدہ کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ مجبوری تھی، کیا کرتے۔ ساجدہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس نے اپنی بڑی بہن کو شادی کے دوسرے دن خط لکھا جس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا:

”میں بہت خوش ہوں۔ حامد مجھ سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ باجی۔ محبت عجیب وغریب چیز ہے۔ میں بے حد مسرور ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا صحیح مطلب اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ خدا کرے کہ آپ بھی اس مسرت سے محظوظ ہوں۔“

اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں اس خط میں تھیں جو ایک بہن اپنی بہن کو لکھ سکتی ہے۔ حامدہ نے یہ پہلا خط پڑھا اور بہت روئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اسکا ہر لفظ ایک ہتھوڑا ہے جو اس کے دل پر ضرب لگا رہا ہے اس کے بعد اس کو اور بھی خط آئے جن کو پڑھ پڑھ کے اس کے دل پر چھریاں چلتی رہیں۔ رو رو کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ کوئی راہ چلتا جوان لڑکا اس کی طرف متوجہ ہو، مگر ناکام رہی۔ اسے اس عرصے میں ایک ادھیڑ عمر کا مرد ملا۔ بس میں مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ اس سے مراسم قائم کرنا چاہتا تھا مگر حامدہ نے اسے پسند نہ کیا۔ وہ بہت بدصورت تھا۔ دو برس کے بعد اس کی بہن ساجدہ کا خط آیا کہ وہ اور اس کا خاوند آ رہے ہیں۔ وہ آئے۔ حامدہ نے مناسب و موزوں طریق پر ان کا خیر مقدم کیا۔ ساجدہ کے خاوند کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک ہفتے تک قیام کرنا تھا۔ ساجدہ سے مل کر اس کی بڑی بہن بہت خوش ہوئی۔ حامد بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ وہ اس سے بھی متاثر ہوئی۔ وہ گھر میں اکیلی تھی، اس لیے کہ اس کے والدین کسی کام سے سرگودھا چلے گئے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ حامدہ نے نوکروں سے کہا کہ وہ بستروں کا انتظام صحن میں کر دے اور بڑا پنکھا لگا دیا جائے۔ یہ سب کچھ ہو گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ ساجدہ کسی حاجت کے تحت اوپر کوٹھے پر گئی اور دیر تک وہیں رہی۔ حامد کوئی ارادہ کر چکا تھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ اٹھ کر

”ساجدہ“

کے پاس گیا اور اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ غیر سی کیوں لگتی ہے۔ کیوں کہ وہ شروع شروع میں بے اعتنائی برتتی رہی۔ آخر میں وہ ٹھیک ہو گئی۔ ساجدہ کوٹھے سے اتر کر نیچے آئی اور اس نے دیکھا۔ صبح کو دونوں بہنوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ حامد بھی اس میں شامل تھا۔ اس نے گرما گرمی میں کہا:

”تمہاری بہن، میری بہن ہے۔ تم کیوں مجھ پر شک کرتی ہو۔“

حامد نے دوسرے روز اپنی بیوی ساجدہ کو طلاق دے دی اور دو تین مہینوں کے بعد حامدہ سے شادی کر لی۔ اس نے اپنے ایک دوست سے جس کو اس پر اعتراض تھا، صرف اتنا کہا۔

”خوبصورتی میں خلوص ہونا ناممکن ہے۔ بدصورتی ہمیشہ پر خلوص ہوتی ہے۔“

بُڈّھا کھوسٹ

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوبُڈّھا کھوسٹ

یہ جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کی بات ہے جب میرا عزیز ترین دوست لیفٹیننٹ کرنل محمد سلیم شیخ (اب) ایران‘ عراق اور دوسرے محاذوں سے ہوتا ہوا بمبئے پہنچا۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا، میرا فلیٹ کہاں ہے۔ ہم میں گاہے گاہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی لیکن اس سے کچھ مزا نہیں آتا تھا اس لیے کہ ہر خط سنسر ہوتا ہے۔ ادھر سے جائے یا اُدھر سے آئے عجیب مصیبت تھی۔ مگر اب ان مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا۔ اس کی بمبئی کے بی بی اینڈ سی آئی اے کے ٹریسینس پر پوسٹنگ ہوئی۔ اُس وقت وہ صرف لیفٹیننٹ تھا ہم دونوں وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن کے بُوفے میں بیٹھ گئے اور دوپہر کے بارہ ایک بجے تک ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر پیتے رہے اُس نے اُس دوران میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں جن میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُس نے ایران، عراق اور خدا معلوم کن کن ملکوں کے اپنے معاشقے سنائے، میں سنتا رہا پیشہ ور عاشق تو کالج کے زمانے سے تھا اُس کی داستانیں اگر میں سُناؤں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ بہر حال آپ کو اتنا بتانا ضروری ہے کہ اسے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گر معلوم تھا۔ گورڈن کالج راولپنڈی میں وہ راجہ اندر تھا۔ اس کے دربار میں وہاں کی تمام پریاں مجرا عرض کرتی تھیں۔ خوبصورت تھا کافی خوبصورت مگر اُس کا حسن مردانہ حسن تھا۔ پتلی نوکیلی ناک جو یقیناً اپنا کام کر جاتی ہو گی چھوٹی چھوٹی گہرے بھوسلے رنگ کی آنکھیں جو اُس کے چہرے پر سج گئی تھیں بڑی ہوتیں تو شاید اس کے چہرے کی ساری کشش ماری جاتی۔ وہ کھلنڈرا تھا جس طرح لارڈ بائرن صرف کچھ عرصے کے لیے کسی سے دلچسپی لیتا تھا اور اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا، جیسے وہ اُس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں اسی طرح کا سلوک وہ اپنے جال میں پھنسی ہوئی لڑکیوں سے کرتا، مجھے اُس کا یہ روّیہ پسند نہیں تھا کہ یہ میری نظر میں بہت ظالمانہ ہے مگر وہ بے پروا تھا کہا کرتا اُلو کے پٹھے۔ غالب پڑھو وہ کیا کہتا۔ اسے متن یاد کبھی نہیں رہتا تھا مگر اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں ادا کر دیا کرتا۔ وہ کہتا ہے، وہی شاخِ طوبیٰ اور جنت میں وہی ایک حور۔ واللہ زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ شہد کی مکھی بنو کلی کلی کا رس چوسو۔ مکھی لکھی مصری کی نہ بنو جو وہیں چپک کر رہ جائے

”پھر اُس نے اقبال کے ایک شعر کا حوالہ اپنا بیئر کا گلاس خالی کرتے ہوئے دیا

”کیا کہا ہے اقبال نے تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا ثابت ہوا کہ تم نہ صرف ناداں ہو بلکہ درجہ اوّل بناسپتی گھی کی طرح درجہ اوّل چغد بھی ہو۔ اب ہٹاؤ اس بکواس کو۔“

میں نے یہ بکواس اس طرح ہٹائی جس طرح بیرے نے میری بیئر کی خالی بوتل پیشتر اس کے کہ میں اصل کہانی کی طرف آؤں۔ میں آپ کو شیخ سلیم سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہم گورڈن کالج میں بی اے فائنل میں پڑھتے تھے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں ایک رکمنی کی شادی کی اُڑتی اُڑتی افواہ ہمیں ملی۔ یہ رکمنی ہماری ہی کسی کلاس میں پڑھتی تھی اور

کچھ عرصہ پہلے بُری طرح شیخ سلیم پر فریفتہ شکل صورت اُس کی واجبی تھی مگر میرا دوست شہد کی مکھی تھا چنانچہ دو مہینے ان کا معاشقہ چلتا رہا اُس کے بعد وہ اس سے بالکل اجنبی ہو گیا۔ جب اُس کو بتایا گیا کہ رکمنی جو تمہاری محبوبہ تھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے جھگڑے اپنی کلاس کے طالب علموں سے کیے

”وہ اگر دوسری جگہ بیاہی جائے تو ڈوب مرو۔ لیکن تم تیرنا جانتے ہو۔ ڈوبنے کا کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں“

شیخ سلیم کو اس قسم کی باتیں عموماً کھا جاتی تھیں۔ اس نے اپنی مہین مہین مونچھوں کو تاؤ دینے کی کوشش کی اور کہا

”اچھا، تم دیکھ لینا کیا ہو گا“

اُس کی پارٹی کے ایک قوی ہیکل لڑکے نے پوچھا کیا ہو گا؟“

شیخ سلیم نے اس کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا

”ہو گا تمہاری ماں کا سر۔ جب شادی کا دن آئے گا، دیکھ لینا۔ چلو آؤ میرے ساتھ مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں۔“

شادی کا دن آگیا۔ بارات جب دولہا والوں کے گھر کے پاس پہنچی تو کوئی شخص سر پر سہرے باندھے بڑے اچھے گھوڑے پر سوار اندر داخل ہو گیا دولہا موٹر میں جس پر پھولوں کا جال بنا ہوا تھا۔ گھوڑا سوار سہرے سے لدا پھندا شامیانے کے پاس تھا۔ گھوڑا خود دولہا بنا ہوا تھا۔ دولہن کا باپ اور اس کے رشتہ دار آگے بڑھے۔ گھوڑے کا مالک بھاگا بھاگا آگیا تھا اس سہرے سے لدے ہوئے آدمی کو اس جگہ بٹھا دیا گیا، جہاں دولہن کو بھی ساتھ بیٹھا تھا۔ بیچ میں ہون کنڈ تھا جس میں چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے ٹکڑے جل رہے تھے۔ انھوں نے ننگے بدن اُٹھ کر دلہن کو اشیر وادی اور دولہن سے کہا

”سردار جی دولہن کو جلد بُلایئے مہورت ہو گیا ہے“

فوراً رکمنی پہنچ گئی اور کچھ عرصے کے لیے دولہا کے ساتھ بٹھا دی گئی۔ پنڈت جی نے کچھ پڑھا جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن ایک دم شادی کے اُس جلسے میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی جب کار سے ایک دولہا نکل کر سامنے آگیا اور بلند آواز میں تمام حاضرین کو مخاطب کیا میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں دعویٰ دائر کروں گا“

وہ دولہا جو ہاتھ پکڑ کر دُولہن کو اُٹھا رہا تھا بڑی خوفناک آواز میں چلایا

”ابے، جا بے دعوٰے دائر کرنے کے کچھ لگتے“

یہ کہہ کر اُس نے اپنے پھولوں کا گھونگھٹ اُٹھا دیا اور ان ہزار کے قریب آدمیوں سے جو شامیانے کے نیچے تھے کچھ کہنا چاہا۔ مگر قہقہوں کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا۔ دوسری پارٹی کے آدمی بھی ان قہقہوں میں شریک ہوئے کیونکہ جب یہ پھولوں کا پردہ علیحدہ ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ سلیم ہے۔ رکمنی بڑی خفیف ہوئی، مگر شیخ سلیم نے بڑی جرأت سے کام لے کر اُس سے بلند آواز میں پوچھا

”تم اس چغد کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو“

رکمنی خاموش رہی۔

”اچھا جاؤ جہنم میں۔ لیکن ایک دن نہیں پورے تین مہینے تم ہمیں پوجتی رہی ہو“

یہ کہہ کر وہ صحیح دولہا کی طرف بڑھا جس کے منہ سے غصے کے مارے جھاگ نکل رہے تھے آگے بڑھ کر اُس نے اپنے سارے ہار اُس کے گلے میں ڈال دیے۔ سب براتی بُت بنے بیٹھے تھے۔ ہنستا، قہقہے لگاتا وہ اپنے گھوڑے پر بڑی صفائی سے سوار ہوا اور ایڑھ لگا کر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ گھوڑے سے اُتر کر (ہم دُور نکل گئے تھے۔ اس لیے کہ میں اس کے پیچھے گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے بھاگا تھا) اُس نے میرا کاندھا بڑے زور سے ہلایا کیوں بیٹے میں نے تم سے کیا کہا تھا اب دیکھ لیا؟“

ہوا تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر مجھے ڈر تھا کہیں شیخ سلیم گرفتار نہ ہو جائے میں نے اُس سے کہا

”جو تم نے کیا وہ اور کوئی نہیں کر سکتا، لیکن بھائی میرے کہیں ہنسی میں پھنسی نہ ہو جائے فرض کرو اگر رکمنی کے باپ نے تمھیں گرفتار کرا دیا؟“

وہ اکڑ کر بولا

”اس کے باپ کا باپ بھی نہیں کر سکتا۔ کون اپنی بیٹی کو عدالت چڑھائے گا۔ میں تو اسی وقت گرفتار ہونے کے لیے تیار ہوں۔ لے جائے مجھے تھانے۔ اس سالی کے سارے پول کھول دُوں گا۔ میرے پاس اس کے درجنوں خطوط پڑے ہیں“

سارے شہر میں یہی افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ رکمنی کا باپ شیخ سلیم کو ضرور اُس کی گستاخی کی سزا دلوائے گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے مگر کچھ نہ ہوا جب کئی دن گزر گئے تو میرے پاس گاتا ہوا آیا۔ تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ تماشا نہ ہوا اب میں اصل کہانی کی طرف پلٹتا ہوں، جو اس واقعے سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ یہ خود اُس نے مجھے سُنائی جس کی صداقت پر مجھے سو فیصد یقین ہے۔ اس لیے کہ شیخ سلیم جھوٹا کبھی نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا

”میں ایران میں تھا۔ وہاں کی لڑکیاں عام یورپین لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں وہی لباس وہی وضع قطع، البتہ ناک نقشے کے لحاظ سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔ جتنی خرافات وہاں ہوتی ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہوتی ہے۔ میں نے وہاں کئی شکار کیں۔ وہاں میرے ایک بڑے افسر کرنل عثمانی تھے۔ حالانکہ اُن کا عہدہ جیسا کہ ظاہر ہے مجھ سے بہت بڑا تھا۔ لیکن وہ میرے بڑے مہربان تھے۔ میس میں جب بھی مجھے دیکھتے، زور سے پکارتے۔ ادھر آؤ شیخ، میرے پاس بیٹھو، اور وہ میرے لیے ایک کرسی منگواتے۔ وسکی کا دور چلتا تو اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے، کرنل عثمان کو مجھ سے چھیڑ خانی کرنے میں خاص مزا آتا۔ جب وہ کوئی فقرہ مجھ پر چست کرتے تو بہت خوش ہوتے۔ کافی معمر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ بڑا افسر، میں خاموش رہتا۔ ان کو ان پولستانی نرسوں سے بڑی دلچسپی تھی جو وہاں ایمبولنس کور میں کام کرتی تھیں۔ یہ پولستانی لڑکیاں بلا کی تنومند ہوتی ہیں۔ یہ موٹی موٹی سفید پنڈلیاں۔ بڑی مضبوط چھاتیاں بڑی بڑی اور صحت مند کولھے چوڑے اور گوشت سے بھرے ہوئے جن میں سختی ہو۔ لوہے ایسی سخت۔ میری کئی دوست تھیں۔ پر جب میں آئرن سے ملا تو سب کو بھول گیا۔ سارے ایران کو بھول گیا۔ بڑی صفتیں تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے اگر تم اُس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیشِ نظر رکھتے تو یہی سمجھتے کہ اس کے ہاتھ ڈبل روٹی کے مانند ہوں گے۔ اُس کی اُنگلیاں اتنی موٹی ہوں گی جیسے کسی درخت کی ٹہنی۔ مگر نہیں دوست، اس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور اُس کی اُنگلیاں تم یہ سمجھ لو کہ چغتائی کی بنائی تصویروں کی مخروطی لانبی نہیں، مگر پتلی پتلی تھیں۔ میں تو اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ چند روز کی ملاقاتوں ہی میں اُس کے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئے۔ یہاں تک پہنچ کر شیخ رُک گیا ایک نیا پیگ گلاس میں ڈالا اور سوڈا ملا کر غٹاغٹ پی گیا

”نہ یاد کراؤ یہ قصہ“

میں نے اُس سے کہا

”لیفٹیننٹ صاحب، آپ نے خود ہی تو شروع کیا تھا“

اُس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا اور ایک پیگ اپنے گلاس میں تین چار پیگ جو بوتل میں باقی بچ گئے تھے انتقاماً میرے گلاس میں ڈالے اور خود سوکھی جسے انگریزی میں نِیٹ کہتے ہیں پی گیا اور کھانس کھانس کر اپنا بُرا حال کر لیا

”لعنت ہو تم پر“!

”یعنی یہ کیا موقعہ تھا مجھ پر لعنت بھیجنے کا“

اُس کی کھانسی اب بند ہو گئی تھی اور وہ رومال سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا کہ نہ پوچھو میری جان۔ دوسرے روز رات کو کرنل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے طنز سے کہا کہو صاحبزادے مجھے بُڈھا سمجھتے ہو۔ وہ تم نے ضرب المثل نہیں سُنی۔ نیا ایک دن پُرانا سو دن۔ میں نے اُن سے عرض کی کرنل صاحب آپ کا میرا کیا مقابلہ۔ مگر میں دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کمبخت اس حقیقت سے اب تک غافل ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور عشق فرما رہا ہے۔

”میں تو خدا کی قسم جب اس عمر کو پہنچوں گا تو خودکشی کر لوں گا۔ اُس منہ کے ساتھ جس میں آدھے دانت مصنوعی ہیں میری آئرن پر نگاہیں لگائے بیٹھا ہے۔ کرنل ہو گا تو اپنے گھر میں اُس نے کبھی پھر اُس کی بات کی تو ایک ایسا گھونسہ جماؤں گا اس کی سُوکھی گردن پر کہ منکا باہر آ جائے گا۔ دیر تک اس بڈھے کھوسٹ سے آئرن۔ نہایت ہی پیاری آئرن کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔ وسکی کا چوتھا دور چل رہا تھا میں نے اپنے ہونٹوں پر بڑی فرمانبردار قسم کی مسکراہٹ پیدا کیا اور اُس سے کہا کرنل صاحب جو آپ کو بڈھا کہے وہ خود بڈھا ہے آپ تو ماشاء اللہ دھان پان ہیں“

یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ آئرن نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے روز فلاں فلاں ہوٹل میں شام کو سات بجے ملے گی اُس میں فوجیوں کو اجازت تھی اتوار تھا اس لیے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ سوٹ پہن کر وہاں پہنچا سات بجنے میں ابھی نو منٹ باقی تھے میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔ کرنل عثمانی صاحب آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آئرن کا بڑا لمبا بوسہ لے رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اُس کرنل سے کہیں زیادہ بڈھا کھوسٹ بن گیا ہوں۔ (۳۱/ مئی ۵۴ء(

برف کا پانی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبرف کا پانی

”یہ آپ کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں“

”میری عقل پر تو اُسی وقت پتھر پڑ گئے تھے جب میں نے تم سے شادی کی بھلا اس کی ضرورت ہی کیا تھی اپنی ساری آزادی سلب کرا لی۔

”جی ہاں آزادی تو آپ کی یقیناً سلب ہُوئی اس لیے کہ اگر آپ اب کھلے بندوں عیاشی نہیں کر سکتے شادی سے پہلے آپ کو کون پوچھنے والا تھا جدھر منہ اُٹھایا چل دیئے جھک مارتے رہے“

“دیکھو میں تم سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے جو کچھ کہنا ہو چند لفظوں میں صاف صاف کہہ دیا کرو مجھے یہ جھک جھک پسند نہیں۔ جس طرح میں صاف گو ہوں اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی صاف گو ہوں”

“آپ کی صافگوئی تو ضرب المثل بن چکی ہے”

“تمہاری یہ طنز خدا معلوم تم سے کب جدا ہو گی اتنی بھونڈی ہوتی ہے کہ طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔

“آپ کی طبیعت تو شگفتہ گفتگو سُن کر بھی خراب ہو جاتی ہے اب اس کا کیا علاج ہے اصل میں آپ کو میری کوئی چیز بھی پسند نہیں۔ ہر وقت مجھ میں کیڑے ڈالنا آپ کا شغل ہو گیا ہے اگر میں آپ کے دل سے اُتر گئی ہوں تو صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے بڑے صاف گو بنے پھرتے ہیں آپ ایسا ریاکار شاید ہی دنیا کے تختے پر ہو۔”

“اب میں ریاکار بھی ہو گیا کیا ریاکاری کی ہے میں نے تم سے یہی کہ تمہاری نوکروں کی طرح خدمت کرتا ہوں۔”

“بڑی خدمت کی ہے آپ نے میری۔”

“سر پر قرآن اُٹھاؤ اور بتاؤ کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے کبھی تم نے میرا سر تک سہلایا ہے میں بُخار میں پھنکتا رہا ہوں کبھی تم نے میری تیمار داری کی۔ پچھلے دنوں میرے سر میں شدت کا درد تھا میں نے رات کو تمھیں آواز دی اور کہا مجھے بام دے دو مگر تم نے کروٹ بدل کر کہا۔ میری نیند نہ خراب کیجیے' آپ اُٹھ کر ڈھونڈ لیجیے کہاں ہے۔ اور یاد ہے جب تمھیں نمونیہ ہو گیا تھا تو میں نے سات راتیں جاگ کر کاٹی تھیں دن اور رات مجھے پل بھر کا چین نصیب نہیں تھا۔

“دن بھر سوئے رہتے تھے آپ میری بیماری کا ایک بہانہ مل گیا تھا سات چھٹیاں لیں اور دفتر کے کام سے نجات پا کر آرام کرتے رہے ہیں آپ کے سارے حیلے بہانے جانتی ہوں میرا علاج آپ نے کیا تھا یا ڈاکٹروں نے۔”

ان ڈاکٹروں کو تم بُلا کر لائی تھیں کیا۔ اور دوائیں بھی کیا تم نے خود جا کر خریدی تھیں اور جو روپیہ خرچ ہوا کیا فرشتوں نے اوپر سے پھینک دیا تھا کتنے سفید جھوٹ بولتی ہو کہ میں دن کو سویا رہتا تھا قسم خدا کی جو ایک لمحے کے لیے بھی ان دنوں سویا ہوں تم بیمار ہو جاؤ تو گھر کی اینٹیں بھی جاگتی رہتی ہیں تم اُس وقت کس کو سونے دیتی ہو۔ آہ و پُکار کا تانتا بندھا رہتا ہے جیسے کسی پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔

“جناب بیماریاں ظلم نہیں ہوتیں تو کیا ہوتی ہیں جو میں نے برداشت کیا ہے وہ آپ کبھی نہ کر سکتے۔ اور نہ کبھی کر سکتے ہیں میں نے کتنی بیماریاں خندہ پیشانی سے سہی ہیں آپ کو تو خیر اس وقت کچھ یاد نہیں آئے گا۔ اس لیے کہ آپ میرے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔”

“دن ہی کو میں تمہارا دشمن بن جاتا ہوں رات کو تو تم نے ہمیشہ بہترین دوست سمجھا ہے”

“شرم نہیں آتی آپ کو ایسی باتیں کرتے رات اور دن میں فرق ہی کیا ہے”

“اللہ ہی بہتر جانتا ہے”

کہہ کر آپ نے میرا گلا گھونٹ دیا کہ میں آپ سے کچھ اور نہ کہہ سکوں”

“لو بھئی اب میں اطمینان سے یہاں بیٹھ جاتا ہوں آرام جائے جہنم میں تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو ایک ہی سانس میں کہتی چلی جاؤ۔”

“میری سانس اتنی لمبی نہیں۔”

“عورتوں کو سانس کے متعلق تو یہی سُنا تھا کہ بہت لمبی ہوتی ہے اور زبان بھی ماشاء اللہ کافی دراز۔”

“آپ یہ مہین مہین چٹکیاں نہ لیجیے میں نے اگر کچھ کہہ دیا تو آپ کے تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔”

“اس تن بدن میں کئی بار آگ لگ چکی ہے چلو ایک فائر کرو اور قصہ تمام کر دو”

“قصہ تو آپ میرا تمام کر کے رہیں گے۔”

“کس لیے۔ مجھے تم سے کیا بغض ہے اللہ کے واسطے کا بیر تو نہیں مجھ سے ہے۔”

“محبت اور اطاعت کو آپ بیر سمجھتے ہیں اس لیے تو میں نے کہا تھا کہ آپ کی عقل پر پتھر پتھر پڑ گئے ہیں۔

“میری عقل پر پتھر پڑیں یا کوہ ہمالیہ کا پہاڑ لیکن تمہاری محبت اور اطاعت میری سمجھ میں نہیں آئی اطاعت کو فی الحال چھوڑو۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہُوں کہ اب تک تم محبت بھری گفتگو کر رہی تھیں”

“تو میں نے آپ کو کون سی گالی دی ہے”

“گالی دینے میں تم نے کوئی کسر تو اٹھا نہیں رکھی ریاکار تک تو بتا دیا مجھ کو اس سے بد تر گالی اور کیا ہو سکتی ہے۔”

”یہ لو کھلا گریبان ہے میں نے اپنا سارا سر اس میں ڈال دیا اب تم بتاؤ۔ صرف تمہاری شکل نظر آتی ہے۔ خوفناک' بڑی ہیبت ناک“

”تو کوئی دوسری کر لیجیے جو خوش شکل ہو۔“

”ایک ہی کر کے میں نے بھر پایا ہے۔ خدا نہ کرے زندگی میں دوسری آئے۔“

”آپ مجھ سے اس قدر تنگ کیوں آ گئے ہیں۔“

”میں قطعاً تنگ نہیں آیا۔ بس تم دل جلاتی رہتی ہو۔“

”میرا دل تو جل کر کوئلہ ہو چکا ہے سچ پوچھیے تو میں چاہتی ہوں کہ کچھ کھا کے مر جاؤں۔ میں جا رہی ہوں“

”کہاں۔“

”میں نے ایک من برف منگوائی ہے اسے چار بالٹیوں میں پانی کے اندر ڈال رکھا ہے اس ٹھنڈے پانی سے نہاؤں گی اور پنکھے کے نیچے بیٹھ جاؤں گی ایک مرتبہ مجھے پہلے نمونیہ تو ہو ہی چکا ہے اب ہو گا تو پھیپھڑے یقیناً جواب دے جائیں گے۔“

”خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔ خودکشی کا یہ طریقہ تم نے بہت اچھا ڈھونڈا ہے جو آج تک کسی کو سوجھا نہیں ہو گا۔“

”آپ کے پہلو میں تو دل ہی نہیں“

”جو کچھ بھی ہے بہر حال موجود ہے اور دھڑکتا بھی ہے۔ جاؤ یخ آلود پانی سے نہا کر پنکھے کے نیچے بیٹھ جاؤ۔“

”جا رہی ہوں۔ آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔“

”ضرور کرو۔“

”میرے بچوں کا آپ ضرور خیال رکھیئے گا۔“

”کیا وہ میرے بچے نہیں ہیں۔“

”ہیں۔ لیکن شاید میری وجہ سے اچھا سلوک نہ کرو“

”نہیں نہیں۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ میں انھیں بورڈنگ میں داخل کرانے لے جاتا ہوں۔ خدا حافظ“

”خدا تمہارا حافظ ہو مجھے تو فی الحال خودکشی نہیں کرنی لیکن سنو نمونیہ ہو تو ڈاکٹر کو بُلا لاؤں۔“

”ہرگز نہیں۔ میں مرنا چاہتی ہوں“

”تو میں نہیں بُلاؤں گا۔ لیکن نمونیہ کے مریض فوراً نہیں مرتے پانچ چھ روز تو لگاتے ہیں۔“

”آپ اس عرصہ تک انتظار کیجیے گا۔“

”بہت بہتر۔“

”میری کہی سُنی معاف کر دیجیے گا۔“

”وہ تو میں نے اُسی روز کر دی تھی جب تم سے نکاح ہوا تھا۔“

”میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کی عقل پر جو پتھر پڑ گئے ہیں انھیں دُور کر دیجیے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں اگر تم کہو تو قسم اٹھانے کے لیے تیار ہوں اچھا تو میں چلا بچے باہر کھیل رہے ہیں انھیں ہوسٹل لے جاتا ہوں واپس دو تین گھنٹے میں آ جاؤں گا۔ اگر اس دوران میں تم مر گئیں تو بہت اچھا تجہیز و تکفین کا سامان کر دُوں گا مجھے ابھی کل ہی تنخواہ ملی ہے۔“

”جایئے میں بھی چلی۔“

”الوداع۔“

”الوداع۔“

”کبھی کبھی مجھ نابکار کو یاد کر لیا کیجیے“

”ضرور ضرور تم نابکار کیوں کہتی ہو خود کو“

”میں کس کام کی ہوں“

”خیر چھوڑو۔ بحث اس پر الگ شروع ہو جائے گی۔ اور تمہاری خریدی ہُوئی ایک من برف پگھل کر گرم پانی میں تبدیل ہو جائے گی۔“

”یہ تو آپ نے درست کہا۔ اچھا۔ میں چلی۔“

میں آگیاہوں بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا کے تم غسلخانے میں ابھی تک کیا کر رہی ہو۔

”کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔“

”کیاسوچ رہی تھیں“

”میں نے وہ خط دوبارہ پڑھا“

”کونسا خط۔“

”جو آپ کی میز کی دراز میں پڑا تھا کسی لڑکی کی طرف سے تھا۔ اب میں نے جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کے نام نہیں بلکہ اُس اخبار کے ایڈیٹر کے نام ہے جہاں آپ کام کرتے ہیں مجھے افسوس ہے میں نے آپ پر شک کیا۔“

”تم ہمیشہ شک کیا کرتی ہو۔ اب تو میری عقل کے پتھر ہٹ گئے۔ وہ لڑکی نہیں کوئی مرد ہے اسی لیے میں تفتیش کی غرض سے اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا خیر چھوڑو ٹھنڈا پانی تو پلاؤ ایک من برف تم نے منگوائی تھی۔“

”اُس کا سب پانی میں نے غسل خانے میں ڈال دیا۔ بڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے آپ بھی یہاں آجایئے۔“

بُرقعے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبُرقعے

ظہیر جب تھرڈ ایئر میں داخل ہوا تو ایک اس نے محسوس کیا کہ اسے عشق ہو گیا ہے۔ اور عشق بھی بہت اشد قسم کا۔ جس میں اکثر انسان اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ وہ کالج سے خوش خوش واپس آیا کہ تھرڈ ایئر میں یہ اس کا پہلا دن تھا۔ جونہی وہ اپنے گھر میں داخل ہونے لگا، اس نے ایک برقع پوش لڑکی دیکھی جو ٹانگے میں سے اتر رہی تھی۔ اس نے ٹانگے میں سے اترتی ہوئی ہزار ہا لڑکیاں دیکھی تھیں۔ مگر وہ لڑکی جس کے ہاتھ میں چند کتابیں تھیں، سیدھی اس کے دل اتر گئی۔ لڑکی نے ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا اور ظہیر کے ساتھ والے مکان میں چلی گئی۔ ظہیر نے سوچنا شروع کر دیا کہ اتنی دیر وہ اس کی موجودگی سے غافل کیسے رہا؟ اصل میں ظہیر آوارہ منش نوجوان نہیں تھا، اس کو صرف اپنی ذات سے دلچسپی تھی۔ صبح اٹھے، کالج گئے، لیکچر سُنے، گھر واپس آئے، کھانا کھایا، تھوڑی دیر آرام کیا، اور آموختہ دہرانے میں مصروف ہو گئے۔ یوں تو کالج میں کئی لڑکیاں تھیں، اس کی ہم جماعت، مگر ظہیر نے کبھی ان سے بات چیت نہیں کی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ بڑا رُوکھا پھیکا انسان تھا۔ اصل میں وہ ہر وقت اپنی پڑھائی میں مشغول رہتا تھا۔ مگر اس روز جب اس نے اس لڑکی کو ٹانگے پر سے اترتے دیکھا تو وہ پولیٹیکل سائنس کا تازہ سبق بالکل بھول گیا۔ خواجہ حافظ کے تمام نئے اشعار کے معانی اس کے ذہن سے پھسل گئے اور وہ ان ہاتھوں کے متعلق سوچنے لگا جن میں کتابیں تھیں۔ پتلی پتلی سفید انگلیاں۔ ایک انگلی میں انگوٹھی۔ دوسرا ہاتھ جس نے ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا وہ بھی ویسا ہی خوبصورت تھا۔ ظہیر نے اس کی شکل دیکھنے کی کوشش کی، مگر نقاب اتنی موٹی تھی کہ اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی، اس کے ساتھ والے مکان میں داخل ہو گئی اور ظہیر کھڑا دیر تک سوچتا رہا کہ اتنا کم فاصلہ ہونے کے باوجود وہ کیوں اس کی موجودگی سے غافل رہا۔ اپنے گھر میں جا کر اس نے پہلا سوال اپنی ماں سے یہ کیا۔

”ہمارے پڑوس میں کون رہتے ہیں؟“

اس کی ماں کے لیے یہ سوال بہت تعجب خیز تھا۔

”کیوں؟“

”میں نے ایسے ہی پوچھا ہے۔“

اس کی ماں نے کہا۔

”مہاجر ہیں، ہماری طرح۔“

ظہیر نے پوچھا۔

”کون ہیں، کیا کرتے ہیں؟“

ماں نے جواب دیا۔

”باپ بیچاروں کا مر چکا ہے۔ ماں تھی، وہ عمر کے ہاتھوں معذور تھی۔ اب تین بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ بھائی سب سے بڑا ہے۔ وہی باپ سمجھو، وہی ماں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس نے اپنی شادی بھی اس لیے نہیں کہ اتنا بوجھ اس کے کاندھوں پر ہے“!

ظہیر کو تین بہنوں کے اس بوجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو اس کے اکلوتے بھائی کے کاندھوں پر تھا۔ وہ صرف اس لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو ہاتھ میں کتابیں لیے ساتھ والے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ ان تین بہنوں میں سے ایک تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ پنکھے کے نیچے لیٹ گیا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ گرمیوں میں کھانے کے بعد ایک گھنٹے تک ضرور سویا کرتا تھا۔ مگر اس روز اسے نیند نہ آئی۔ وہ اس لڑکی کے متعلق سوچتا رہا جو اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ کئی دن گزر گئے، مگر ان کی مڈ بھیڑ نہ ہوئی۔ کالج سے آکر اس نے سینکڑوں مرتبہ کوٹھے پر گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہ کر اس کی آمد کا انتظار کیا۔ مگر وہ نہ آئی۔ ظہیر مایوس ہو گیا۔ وہ بہت جلد مایوس ہو جانے والا آدمی تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب بیکار ہے۔ مگر عشق کہتا تھا کہ یہ بیکاری ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ عشق میں سب سے پہلے عاشق کو اس چیز سے واسطہ پڑتا ہے، جو گھبرایا، وہ گیا۔ چنانچہ ظہیر نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ پہاڑ بھی ٹوٹ پڑیں تو وہ گھبرائے گا نہیں، اپنے عشق میں ثابت قدم رہے گا۔ بہت دنوں کے بعد جب وہ سائیکل پر کالج سے واپس آرہا تھا، اس نے اپنے آگے ایک ٹانگہ دیکھا، جس میں ایک بُرقع پوش لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا قیاس بالکل درست نکلا، کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی۔ ٹانگہ رُکا۔ ظہیر سائیکل پر سے اتر پڑا۔ لڑکی کے ایک ہاتھ میں کتابیں تھیں، دوسرے ہاتھ سے اس نے ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا اور چل پڑی۔ مگر ٹانگے والا پکارا۔

”اے بی بی جی۔ یہ کیا دیا تم نے؟“

اس کے لہجے میں بدتمیزی تھی۔ لڑکی رکی، پلٹ کر اس نے ٹانگے والے کو اپنے برقعے کی نقاب میں سے دیکھا۔

”کیوں، کیا بات ہے؟“

ٹانگے والا نیچے اتر آیا اور ہتھیلی پر اٹھنی دکھا کر کہنے لگا۔

”یہ آٹھ آنے نہیں چلیں گے۔“

لڑکی نے مہین لرزاں آواز میں کہا۔

”میں ہمیشہ آٹھ آنے ہی دیا کرتی ہوں۔“

ٹانگے والا بڑا واہیات قسم کا آدمی تھا، بولا۔

”وہ آپ سے رعایت کرتے ہوں گے۔ مگر۔“

یہ سن کر ظہیر کو طیش آگیا، سائیکل چھوڑ کر آگے بڑھا، آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک مُکا ٹانگے والے کی تھوڑی کے نیچے جما دیا، وہ ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ایک اور اس کی داہنی کنپٹی پر۔ اس زور کا کہ وہ بلبلا اٹھا۔ اس کے بعد ظہیر اس لڑکی سے جو ظاہر ہے کہ گھبرا گئی تھی، مخاطب ہوا۔

”آپ تشریف لے جائیے، میں اس حرامزادے سے نبٹ لوں گا۔“

لڑکی نے کچھ کہنا چاہا، شاید شکریے کے الفاظ تھے جو اُس کی زبان کی نوک پر آکر واپس چلے گئے۔ وہ چلی گئی۔ دس قدم ہی تو تھے، مگر ظہیر کو پورے بیس منٹ اس ٹانگے والے سے نبٹنے میں لگے۔ وہ بڑا ہی لیچڑ قسم کا ٹانگے والا تھا۔ ظہیر بہت خوش تھا کہ اس نے اپنی محبوبہ کے سامنے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ٹانگے والے کو خوب پیٹا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ برقع پوش لڑکی اپنے گھر سے، چق لگی کھڑکی کے پیچھے سے اس کو دیکھ رہی ہے۔ یہ دیکھ کر ظہیر نے دو گھونسے اور اس کوچوان کی تھوڑی کے نیچے جما دیے تھے۔ اس کے بعد ظہیر سر سے پیر تک اس برقع پوش کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے اپنی والدہ سے مزید استفسار کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام یاسمین ہے۔ تین بہنیں ہیں، باپ ان کا مر چکا ہے، ماں زندہ ہے، معمولی سی جائیداد ہے جس کے کرائے پر ان سب کا گزارہ ہو رہا ہے۔ ظہیر کو اب اپنی معشوقہ کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے یاسمین کے نام کئی خط کالج میں بیٹھ کر لکھے، مگر پھاڑ ڈالے۔ لیکن ایک روز اس نے ایک طویل خط لکھا اور تہیہ کر لیا کہ وہ اس تک ضرور پہنچا دے گا۔ بہت دنوں کے بعد جب کہ ظہیر سائیکل پر کالج سے واپس آرہا تھا اس نے یاسمین کو ٹانگے میں دیکھا۔ وہ اتر کر جا رہی تھی، لپک کر وہ آگے بڑھا، جیب سے خط نکالا اور ہمت اور جرأت سے کام لے کر اس نے کاغذ اس کی طرف بڑھا دیے۔

”یہ آپ کے کچھ کاغذ ٹانگے میں رہ گئے تھے۔“

یاسمین نے وہ کاغذ لے لیے۔ نقاب کا کپڑا سرسرایا۔

”شکریہ“!

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس لیے کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے خط کا کیا حشر ہونے والا ہے، وہ ابھی اس حشر کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور ٹانگہ اس کی سائیکل کے پاس رکا، اس میں سے ایک برقع پوش لڑکی اتری۔ اس نے ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ یہ ہاتھ جس سے کرایہ ادا کیا گیا تھا، ویسا ہی تھا، جیسا اس لڑکی کا تھا، جس کو پہلی مرتبہ ظہیر نے دیکھا تھا۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد، یہ لڑکی اس مکان میں چلی گئی جہاں یاسمین گئی تھی۔ ظہیر سوچتا رہ گیا۔ لیکن اس کو معلوم تھا کہ تین بہنیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکی یاسمین کی چھوٹی بہن ہو۔ خط دے کر ظہیر نے یہ سمجھا تھا کہ آدھا میدان مار لیا ہے۔ پر جب دوسرے روز اسے کالج جاتے وقت ایک چھوٹے سے لڑکے نے کاغذ کا ایک پُرزہ دیا تو اسے یقین ہو گیا کہ پورا میدان مار لیا گیا ہے۔ لکھا تھا:

“آپ کا محبت نامہ ملا۔ جن جذبات کا اظہار آپ نے کیا ہے، اس کے متعلق میں آپ سے کیا کہوں۔ میں۔ میں۔ میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے اپنی لونڈی سمجھیے۔”

یہ رقعہ پڑھ کر ظہیر کی باچھیں کِھل گئیں۔ کالج میں کوئی پیریڈ اٹنڈ نہ کیا۔ بس سارا وقت باغ میں گھومتا اور اس رقعے کو پڑھتا رہا۔ دو دن گزر گئے، مگر یاسمین کی مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ اس کو بہت کوفت ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ اس نے ایک لمبا چوڑا محبت بھرا خط لکھ دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس تک پہنچا دے۔ تیسرے روز آخر کار وہ ظہیر کو ٹانگے میں نظر آئی۔ جب وہ کرایہ ادا کر رہی تھی، سائیکل ایک طرف گرا کر وہ آگے بڑھا، اور یاسمین کا ہاتھ پکڑ لیا۔

“حضور! یہ آپ کے چند کاغذات ٹانگے میں رہ گئے تھے”!

یاسمین نے ایک جھٹکے۔ غصے سے بھرے ہوئے جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیز لہجے میں کہا۔

“بدتمیز کہیں کے۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟”

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اور ظہیر کے محبت بھرے خط کے کاغذ سڑک پر پھڑپھڑانے لگے۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا کہ وہ لڑکی جس نے یہ کہا تھا کہ مجھے اپنی لونڈی سمجھیے، اتنی رعونت سے کیوں پیش آتی ہے۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ شاید یہ بھی اندازِ دلربانہ ہے۔ دن گزرتے گئے، مگر ظہیر کے دل و دماغ میں یاسمین کے یہ الفاظ ہر وقت گونجتے رہتے تھے۔

“بدتمیز کہیں کے۔ شرم نہیں آتی تمہیں”

۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس رقعے کے الفاظ یاد آتے جس میں یہ لکھا تھا۔

“مجھے اپنی لونڈی سمجھیے۔”

ظہیر نے اس دوران میں کئی خط لکھے اور پھاڑ ڈالے، وہ چاہتا تھا کہ مناسب و موزوں الفاظ میں یاسمین سے کہے کہ اس نے بدتمیز کہہ کر اس کی اور اس کی محبت کی توہین کی ہے۔ مگر اُسے ایسے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ وہ خط لکھتا تھا، مگر جب اسے پڑھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ غیر معمولی طور پر درشت ہے۔ ایک دن جب کہ وہ باہر سڑک پر اپنی سائیکل کے اگلے پہیے میں ہوا بھر رہا تھا۔ ایک لڑکا آیا، اور اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دے کر بھاگ گیا۔ ہوا بھرنے کا پمپ ایک طرف رکھ کر اس نے لفافہ کھولا، ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔ جس میں یہ چند سطریں مرقوم تھیں:

“آپ اتنی جلدی مجھے بھول گئے۔ محبت کے اتنے بڑے دعوے کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ خیر۔ آپ بھول جائیں تو بھول جائیں۔ آپ کی کنیز آپ کو کبھی بھول نہیں سکتی۔”

ظہیر چکرا گیا۔ اس نے یہ رقعہ بار بار پڑھا۔ سامنے دیکھا تو یاسمین ٹانگے میں سوار ہو رہی تھی۔ سائیکل وہیں لٹا کر وہ اس کی طرف بھاگا۔ ٹانگہ چلنے ہی والا تھا کہ اس نے پاس پہنچ کر یاسمین سے کہا:

“تمہارا رقعہ ملا ہے۔ خدا کے لیے تم اپنے کو کنیز اور لونڈی نہ کہا کرو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔”

یاسمین کے برقعے کی نقاب اچھلی۔ بڑے غصے سے اس نے ظہیر سے کہا۔

“بدتمیز کہیں کے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں آج ہی تمہاری ماں سے کہوں گی کہ تم مجھے چھیڑتے ہو۔”

ٹانگہ چل ہی رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ظہیر رقعہ ہاتھ میں پکڑے سوچتا رہ گیا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ مگر پھر اسے خیال آیا کہ معشوقوں کا رویہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے وہ سربازار اس قسم کے مظاہروں کو پسند نہیں کرتے۔ خط و کتابت کے ذریعے ہی سے، کہ یہ ایک خاموش طریقہ ہے۔ ساری باتیں طے ہو جایا کرتی ہیں۔ چنانچہ اس نے دوسرے روز ایک طویل خط لکھا اور جب وہ کالج سے واپس آ رہا تھا، ٹانگے میں یاسمین کو دیکھا۔ وہ اتر کر کرایہ ادا کر چکی تھی اور گھر کی جانب جا رہی تھی خط اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ ایک نظر اس نے اپنے برقعے کی نقاب میں سے ظہیر کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔ ظہیر نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی نقاب کے اندر مسکرا رہی تھی۔ اور یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ چنانچہ دوسرے روز صبح جب وہ سائیکل نکال کر کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا، اس نے یاسمین کو دیکھا۔ شاید وہ ٹانگے والے کا انتظار کر رہی تھی۔ داہنے ہاتھ میں کتابیں پکڑے تھی۔ بایاں ہاتھ جھول رہا تھا۔ میدان خالی تھا، یعنی اس وقت بازار میں کوئی آمد و رفت نہ تھی۔ ظہیر نے موقعہ غنیمت سمجھا، جرأت سے کام لے کر اس کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ جو کہ جھول رہا تھا، پکڑ لیا اور بڑے رومانی انداز میں اس سے کہا۔

”تم بھی عجیب لڑکی ہو۔ خطوں میں محبت کا اظہار کرتی ہو اور بات کریں تو گالیاں دیتی ہو۔“

ظہیر نے بمشکل یہ الفاظ ختم کیے ہوں گے کہ یاسمین نے اپنی سینڈل اتار کر اس کے سر پر دھڑادھڑ مارنا شروع کر دی۔ ظہیر بوکھلا گیا۔ یاسمین نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔ مگر وہ بوکھلاہٹ کے باعث سن نہ سکا۔ اس خیال سے کہ کوئی دیکھ نہ لے، وہ فوراً اپنے گھر کی طرف پلٹا۔ سائیکل اٹھائی اور قریب تھا کہ اپنی کتابیں وغیرہ اسٹینڈ کے ساتھ جما کر کالج کا رخ کرے کہ ٹانگہ آیا۔ یاسمین اس میں بیٹھی اور چلی گئی۔ ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنے میں ایک اور برقع پوش لڑکی نمودار ہوئی، اسی گھر میں سے جس میں سے یاسمین نکلی تھی۔ اس نے ظہیر کی طرف دیکھا اور اس کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مگر ظہیر ڈرا ہوا تھا۔ جب لڑکی نے دیکھا کہ ظہیر نے اس کا اشارہ نہیں سمجھا تو وہ اس سے قریب ہو کے گزری اور ایک رقعہ گرا کر چلی گئی۔ ظہیر نے کاغذ کا وہ پُرزہ اٹھایا، اس پر لکھا تھا:

”تم کب تک مجھے یونہی بے وقوف بناتے رہو گے؟۔ تمہاری ماں میری ماں سے کیوں نہیں ملتیں۔ آج پلازا سینما پر ملو۔ پہلا شو۔ تین بجے۔ پروین۔“!

برمی لڑکی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبرمی لڑکی

گیان کی شوٹنگ تھی۔ اس لیے کفایت جلدی سو گیا۔ فلیٹ میں اور کوئی نہیں تھا بیوی بچے راولپنڈی چلے گئے تھے ہمسایوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یوں بھی بمبئی میں لوگوں کو اپنے ہمسایوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کفایت نے اکیلے برانڈی کے چار پیگ پیے۔ کھانا کھایا۔ نوکروں کو رخصت کیا اور دروازہ بند کر کے سو گیا۔ رات کے پانچ بجے کے قریب کفایت کے خمار آلود کانوں کو دھک کی آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ نیچے بازار میں ایک ٹریم دندناتی ہوئی گزری۔ چند لمحات کے بعد دروازے پر بڑے زوروں کی دستک ہوئی۔ کفایت اٹھا۔ پلنگ پر اترا تو اس کے ننگے پیر ٹخنوں تک پانی میں چلے گئے اس کو سخت حیرت ہوئی کہ کمرے میں اتنا پانی کہاں سے آیا اور باہر کوری ڈور میں اس سے بھی زیادہ پانی تھا۔ دروازے پر دستک جاری تھا اس نے پانی کے متعلق سوچنا چھوڑا اور دروازہ کھولا۔ گیان نے زور سے کہا

”یہ کیا ہے؟“

کفایت نے جواب دیا۔

”پانی“

”پانی نہیں۔ عورت“!

یہ کہہ کر گیان نیم اندھیرے کوری ڈور میں داخل ہوا اس کے پیچھے ایک چھوٹے سے قد کی لڑکی تھی۔ گیان کو فرش پر پھیلے ہوئے پانی کا کچھ احساس نہ ہوا۔ لڑکی نے پائجامہ اوپر اٹھا لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گیان کے پیچھے چلی گئی۔ کفایت کے ذہن میں پہلے پانی تھا۔ اب یہ لڑکی اس میں داخل ہو گئی اور ڈبکیاں لگانے لگی سب سے پہلے اس نے سوچا کہ یہ کون ہے شکل صورت اور لباس کے اعتبار سے برمی معلوم ہوتی۔ لیکن گیان اسے کہاں سے لے آیا؟۔ گیان اندر کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے بغیر پلنگ پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی مگر اس نے صرف ہوں ہاں میں جواب دیا اور آنکھیں نہ کھولیں۔ کفایت نے اس لڑکی کی طرف ایک نظر دیکھا جو سامنے والے پلنگ پر بیٹھی تھی اور باہر نکل گیا۔ باورچی خانے میں جا کر اسے معلوم ہوا کہ ربڑ کا وہ پائپ جو رات کو بڑا ڈرم بھرا کرتا تھا باہر نکلا ہوا ہے۔ تین بجے جب نل میں پانی آیا تو اس نے تمام کمرے سیر آب کر دیے۔ تینوں نوکر باہر گلی میں سو رہے تھے کفایت نے ان کو جگا دیا اور پانی خارج کرنے کے کام پر لگا دیا وہ خود بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ سب چلووؤں سے پانی اٹھاتے تھے اور بالٹیوں میں ڈالتے جاتے تھے اس برمی لڑکی نے جب ان کو یہ کام کرتے دیکھا تو جھٹ پٹ۔ سینڈل اتار کر ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گورے ہاتھ انگلیوں کے ناخن بڑھائے ہوئے اور سرخی لگے نہیں تھے چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے بال تھے جن میں ہلکی ہلکی لہریں تھیں۔ مردار موضع کا مگر کھلا ریشمی پاجامہ پہنے تھی۔ اس پر سیاہ رنگ کا ریشمی کرتا تھا جس میں اسکی چھوٹی چھوٹی چھاتیاں چھپی ہوئی تھیں۔ جب اس نے ان لوگوں کا ہاتھ بنانا شروع کیا تو کفایت نے اسے منع کیا۔

”آپ تکلیف نہ کیجیے یہ کام ہو جائے گا۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چھوٹے چھوٹے سرخی لگے ہونٹوں سے مسکرائی اور کام میں لگی رہی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تینوں کمروں سے پانی نکل گیا۔ کفایت نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا اسی بہانے سارا گھر دھل کر صاف ہو گیا۔“

وہ برمی لڑکی ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں چلی گئی کفایت کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر لیٹا نیند پوری نہیں ہوئی تھی، سو گیا۔ تقریباً نو بجے وہ جاگا اور جاگتے ہی اسے سب سے پہلے پانی کا خیال آیا۔ پھر اس نے برمی لڑکی کے متعلق سوچا جو گیان کے ساتھ آئی تھی۔

”کہیں خواب تو نہیں تھا لیکن یہ سامنے گیان سو رہا ہے اور فرش بھی دھلا ہوا ہے۔ “

کفایت نے غور سے گیان کی طرف دیکھا۔ وہ پتلون کوٹ بلکہ جوتے سمیت اوندھا سو رہا تھا۔ کفایت نے اس کو جگایا اس نے ایک آنکھ کھولی اور پوچھا

”کیا ہے؟“

”یہ لڑکی کون ہے؟“

گیان ایک دم چونکا

”لڑکی۔ کہاں ہے“

پھر فوراً ہی چت لیٹ گیا۔ اوہ۔ بکواس نہ کرو۔ ٹھیک ہے۔ “

کفایت نے اسے پھر جگانے کی کوشش کی مگر وہ خاموش سویا رہا۔ اسکو ساڑھے نو بجے اپنے کام پر جانا تھا اس نے جلدی جلدی غسل کیا۔ شیو بھی غسل خانے کے اندر ہی کر لیا۔ باہر نکل کر ڈرائنگ روم میں گیا تو اس کو میز سجی ہوئی نظر آئی۔ صبح ناشتہ پر عام طور پر کفایت کے ہاں بہت سی مختصر چیزیں ہوتی تھیں۔ دو ابلے ہوئے انڈے۔ دو توس۔ مکھن اور چار۔ مگر آج میز رنگین تھی اس غور سے دیکھا چھلے ہوئے انڈے عجیب و غریب انداز میں کٹے ہوئے تھے کہ پھول معلوم ہوتے تھے۔ سلاد تھا بڑے خوبصورت طریقے سے پلیٹ میں سجا ہوا۔ توسوں پر بھی میناکاری کی ہوئی تھی۔ کفایت چکرا گیا۔ باورچی خانے میں گیا تو وہ برمی لڑکی چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے کہہ رہی تھی تینوں نوکر اس کے ارد گرد تھے اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کفایت کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ برمی لڑکی نے آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی لیکن وہ کیسے کرتا۔ اس سے کیا کہتا وہ اس کو جانتا تک نہیں تھا اس نے اپنے ایک نوکر سے صرف اتنا پوچھا

”یہ ناشتہ آج کس نے تیار کیا ہے بشیر؟“

بشیر نے اس برمی لڑکی کی اشارہ کیا۔

”بائی جی نے“

وقت بہت کم تھا۔ کفایت نے جلدی بانکا سجیلا ناشتہ کھایا اور کپڑے پہن کر اپنے دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو واپس آیا تو وہ برمی لڑکی اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پاجامہ پہنے اپنا کرتہ استری کر رہی تھی۔ کفایت پیچھے ہٹ گیا، کیونکہ وہ صرف پائجامہ پہنے تھی۔

”آجایئے۔ “

لہجہ بڑا صاف ستھرا تھا۔ کفایت نے سوچا کہ برمی لڑکی کی بجائے شاید کوئی اور بولا ہے۔ جب وہ اندر گیا تو اس لڑکی نے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے اس کو سلام کیا۔ کفایت کی موجودگی میں اس نے کوئی حجاب محسوس نہ کیا۔ بڑے سکون سے وہ اپنا سیاہ کرتا استری کرتی رہی۔ کفایت نے دیکھا اسکی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیوں کے درمیانی حصے میں استری کی گرمی کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جمع ہو گئی تھیں۔ کفایت نے گیان کے بارے میں پوچھنے کے لیے بشیر کو آواز دینا چاہی مگر رک گیا۔ اس نے مناسب خیال نہ کیا کیونکہ وہ لڑکی آدھی ننگی تھی اس نے ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھا۔ تھوڑی دیر اس نیم عریانی کو دیکھا مگر کوئی ہیجان محسوس نہ کیا۔ لڑکی کا بدن بے داغ تھا۔ جلد نہایت ہی ملائم تھی اتنی ملائم کہ نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ کرتا استری ہو گیا تو اس نے سوئچ اوف کیا ایک کرتا اور بھی تھا سفید بوسکی کا جو تہہ کیا ہوا استری شدہ پائجامے پر رکھا اس نے یہ سب کپڑے اٹھائے اور کفایت سے مخاطب ہوئی

”میں نہانے چلی ہوں۔ “

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ کفایت ٹوپی اتار کر سر کھجلانے لگا۔

”کون ہے یہ؟“

اس کے دماغ میں بڑی کُھد بُد ہو رہی تھی جب وہ اس لڑکی کے متعلق سوچتا سارا واقعہ اسکے سامنے آجاتا۔ رات کو اس کا اٹھنا۔ پانی ہی پانی۔ اس کا دروازہ کھولا اور

”کہنا پانی“

اور گیان کا یہ جواب دینا ’پانی نہیں عورت“

اور ایک ننھی سی گڑیا کا چھم سے اندر آجانا۔ کفایت نے دل میں کہا

”ہٹاؤ جی۔ گیان آئے گا تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ لونڈیا ہے دلچسپ۔ اتنی چھوٹی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ آدمی جیب میں رکھ لے۔ چلو برانڈی پیئیں۔ بشیر نے گلاس، برانڈی اور برف وغیرہ سب کچھ علاقائی کمرے میں تپائی پر رکھ دیا تھا۔ کفایت نے کپڑے بدلے اور پینا شروع کر دی۔ پہلا پیگ ختم کیا تو اسے غسل خانے کا دروازہ کھلنے کی

”چوں“

سنائی دی۔ دوسرا پیگ ڈال کر وہ انتظار کرنے لگا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ برمی لڑکی ضرور ادھر آئے گی۔ اس کے مقررہ چار پیگ ختم ہوگئے مگر وہ نہ آئی۔ گیان بھی نہ آیا۔ کفایت جھنجھلا گیا۔ اندر بیڈ روم میں جا کر اس نے دیکھا وہ لڑکی استری کیے ہوئے کپڑے پہنے اپنی گول گول چھاتیوں پر ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ استری والی میز پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پائجامہ بڑی اچھی طرح تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ کفایت نے واپس جا کر برانڈی کا ایک ڈبل پیگ گلاس میں ڈالا اور نیٹ ہی چڑھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے برمی لڑکی کے متعلق سوچنے کی کوشش کی مگر اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ چلوؤں میں پانی بھر بھر کے اس کے دماغ میں ڈال رہی ہے کھانا کھائے بغیر وہ صوفے پر لیٹ گیا اور اس برمی لڑکی کے متعلق کچھ سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے سو گیا۔ صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ صوفے کی بجائے اندر اپنے پلنگ پر ہے اس نے حافظے پر زور دیا۔

”میں رات کب آیا یہاں۔ کیا میں نے کھانا کھایا تھا؟“

کفایت کو کوئی جواب نہ ملا۔ سامنے والا پلنگ خالی تھا۔ اس نے زور سے بشیر کو آواز دی۔ وہ بھاگا اندر آیا۔ کفایت نے اس سے پوچھا

”گیان صاحب کہاں ہیں؟“

بشیر نے جواب دیا

”رات کو نہیں آئے“

”کیوں؟“

”معلوم نہیں صاحب“

”وہ بائی جی کہاں ہیں“

”مچھی تل رہی ہیں“

کفایت کے دماغ میں مچھلیاں تلی جانے لگیں اٹھ کر باورچی خانے میں گیا تو وہ چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے مچھی تل رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر اسکے ہونٹوں پر ایک چھوٹی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے سلام کیا اور اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ کفایت نے دیکھا تینوں نوکر بے حد مسرور تھے اور بڑی مستعدی سے اس لڑکی کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ بشیر کو کچھ دنوں کی چھٹی پر اپنے وطن جانا تھا کئی دنوں سے وہ بار بار کہتا تھا کہ صاحب مجھے تنخواہ دے دیجیے، مجھے گھر سے کئی خط آ چکے ہیں۔ والدہ بیمار ہے۔ رات کو وہ اُسے تنخواہ دینا بھول گیا تھا اب اُسے یاد آیا تو اس نے بشیر سے کہا

”ادھر آؤ بشیر۔ اپنی تنخواہ لے لو۔ میں کل دفتر سے روپے لے آیا تھا۔ بشیر نے تنخواہ لے لی۔ کفایت نے اس سے پوچھا

”نو بجے گاڑی جاتی ہے۔ اُس سے چلے جاؤ۔“

”اچھا جی“!

یہ کہہ کر بشیر چلا گیا۔ ناشتہ بے حد لذیذ تھا خاص طور پر مچھی کے ٹکڑے۔ اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے بشیر کے ذریعہ سے اس برمی لڑکی کو بلا بھیجا مگر وہ نہ آئی۔ بشیر نے کہا

”جی وہ کہتی ہیں کہ بعد میں کریں گی وہ ناشتہ“

کفایت کی مالی حالت بہت پتلی تھی۔ گیان بھی آسودہ حال نہیں تھا دونوں ادھر ادھر سے پکڑ کر گزارہ کر رہے تھے۔ برانڈی کا بندوبست گیان کر دیتا تھا باقی کھانے پینے کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا۔ جس فلم کمپنی میں گیان کام کر رہا تھا اسکا دیوالہ نکلنے کے قریب تھا مگر اس کو یقین تھا کہ کوئی معجزہ ضرور رونما ہوگا اور اسکی کمپنی سنبھل جائے گی۔ شوٹنگ ہو رہی تھی غالباً اسی لیے گیان رات کو نہ آ سکا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد کفایت نے جھانک کر باورچی خانے میں دیکھا۔ لڑکی اپنے کام میں مشغول تھی۔ تینوں ملازم لڑکے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ کفایت نے بشیر نے سے کہا۔

”مچھلی بہت اچھی تھی۔“

لڑکی نے مڑ کر دیکھا اس کے ہونٹوں پر چھوٹی سی مسکراہٹ تھی۔ کفایت دفتر چلا گیا اس کو امید تھی کہ کچھ روپوں کا بندوبست ہو جائے گا لیکن خالی جیب واپس آیا۔ برمی لڑکی اندر بیڈ روم میں لیٹی تصویروں والا رسالہ دیکھ رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر بیٹھ گئی اور سلام کیا۔ کفایت نے سلام کا جواب دیا اور اس سے پوچھا

”گیان صاحب آئے تھے“

”آئے تھے دوپہر کو۔ کھانا کھا کر چلے گئے۔ پھر شام کو آئے چند منٹوں کے لیے

”یہ کہہ کر اس نے ایک طرف ہٹ کر تکیہ اٹھایا اور کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل نکالی“

یہ دے گئے تھے کہ میں آپ کو دیدوں“

میں نے بوتل پکڑی۔ کاغذ پر گیان کے یہ چند الفاظ تھے

”کم بخت یہ چیز کسی نہ کسی طرح مل جاتی ہے لیکن پیسہ نہیں ملتا۔ بہر حال عیش کرو۔ تمہارا گیان“

اس نے کاغذ کھولا۔ برانڈی کی بوتل تھی۔ برمی لڑکی نے کفایت کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ کفایت بھی مسکرا دیا۔

”آپ پیتی ہیں؟“

لڑکی نے زور سے اپنا سر ہلایا۔

”نہیں“!

کفایت نے نظر بھر کر اس کو دیکھا اور سوچا

”کیا چھوٹی سی ننھی منھی گڑیا ہے“!

اس کا جی چاہا کہ وہ اسکے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے چنانچہ اس سے مخاطب ہوا

”آیئے، ادھر دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں“

”نہیں۔ میں کپڑے دھوؤں گی۔“

”اس وقت؟“

”اسوقت اچھا ہوتا ہے۔ رات دھوئے، صبح سوکھ گئے۔ اٹھتے ہی استری کر لیے۔“

کفایت تھوڑی دیر کھڑا رہا اسے کوئی بات نہ سوجھی تو ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینا شروع کر دی۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ اس نے برمی لڑکی کو بلایا مگر اس نے کہا

”میں گیان صاحب کے ساتھ کھاؤں گی۔“

کفایت نے کھانا کھایا اور اپنے پلنگ پر سو گیا۔ رات کے تقریباً ایک بجے اسکی آنکھ کھلی چاندنی رات تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا بھی بڑے مزے کی چل رہی تھی۔ کروٹ بدلی تو دیکھا سامنے پلنگ پر ایک چھوٹی سی سڈول گڑیا گیان کے چوڑے بالوں بھرے سینے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے کفایت نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد گیان کی آواز آئی

”جاؤ اب مجھے سونے دو۔ کپڑے پہن لو۔“

اسپرنگوں والے پلنگ کی آواز کے ساتھ ساتھ ریشم کی سراہٹیں کفایت کے کانوں میں داخل ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کفایت سو گیا۔ صبح چھ بجے اٹھا، کیونکہ وہ رات کو یہ سوچ کر سویا تھا کہ صبح جلدی اٹھے گا اسے ٹرام کا بہت لمبا سفر طے کر کے ایک آدمی کے پاس جانا تھا جس سے اُسے کچھ ملنے کی امید تھی۔ پلنگ پر سے اترا تو اس دیکھا کہ برمی ننگے فرش پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پائجامہ پہنے اپنے چھوٹے سے سڈول بازو کو سر کے نیچے رکھے بڑے سکون سے سو رہی ہے۔ کفایت نے اس کو جگایا۔ اس نے اپنی کالی کالی آنکھیں کھولیں۔ کفایت نے اس سے کہا

”آپ یہاں کیوں لیٹی ہیں“

اسکے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر ننھی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اٹھ کر اس نے جواب دیا۔

”گیان کو عادت نہیں کسی کو اپنے ساتھ سلانے کی۔“

کفایت کو گیان کی اس عادت کا علم تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا

”جایئے میرے پلنگ پر لیٹ جایئے۔“

لڑکی اٹھی اور کفایت کے پلنگ پر لیٹ گئی۔ کفایت غسل خانے میں گیا وہاں رسی پر برمی لڑکی کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ کفایت صابن مل کر نہانے لگا تو اس کا خیال اس لڑکی کے ملائم جسم کی طرف چلا گیا۔ جس پر سے نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ غسل سے فارغ ہو کر کفایت نے کپڑے پہنے چونکہ جلدی میں تھا اس لیے گیان کو جگا کر اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔ صبح کا نکلا رات کے گیارہ بجے واپس آیا۔ جیبیں خالی تھیں۔ بیڈ روم میں گیا تو گیان اور برمی لڑکی دونوں اکٹھے لیٹے ہوئے تھے۔ کفایت نے ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینی شروع کر دی بہت تھکا ہوا تھا۔ مایوس واپس آیا تھا۔ برمی لڑکی کے متعلق سوچتے سوچتے وہیں صوفے پر سو گیا۔ صبح پانچ بجے اٹھا۔ تپائی پر اس کا چوتھا پیگ پانی میں پڑا باسی ہو رہا تھا۔ کفایت اٹھا بیڈ

روم کے ننگے فرش پر برمی لڑکی سو رہی تھی۔ گیان الماری کے آئینے کے ساتھ کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا۔ ٹائی کی گرہ ٹھیک کر کے اس نے دونوں ہاتھوں میں لڑکی کو اٹھایا اور اپنے پلنگ پر لٹا دیا۔ مڑا تو اس نے کفایت کو دیکھا

”کیوں بھئی۔ کچھ بندوبست ہوا روپوں کا“

کفایت نے بڑی مایوسی سے کہا

”نہیں“

”تو میں جاتا ہوں۔ دیکھو شاید کچھ ہو جائے۔“

پیشتر اس کے کہ کفایت اسے روکے گیان تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ کھلا تو اسکی آواز ئی

”تم بھی کوشش کرنا کفایت“

کفایت نے پلٹ کر پلنگ کی طرف دیکھا۔ لڑکی بڑے سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اسکے ننھے سے سینے پر چھوٹی چھوٹی گول چھاتیاں چمک رہی تھیں۔ کفایت کمرے سے نکل کر غسل خانے میں چلا گیا۔ اندر رسی پر لڑکی کے دھلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے۔ غسل خانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی نوکروں کے ساتھ ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ناشتہ کر کے باہر نکل گیا۔ چار روز اسی طرح گزر گئے۔ کفایت کو اس لڑکی کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گیان کبھی رات کو دیر سے آتا تھا۔ کبھی دن کو بہت جلدی نکل جاتا تھا۔ یہی حال کفایت کا تھا۔ دونوں پریشان تھے۔ پانچویں روز جب وہ صبح اٹھا تو بشیر نے کفایت کو گیان کا رقعہ دیا۔ اس میں لکھا تھا

”خدا کے لیے کسی نہ کسی طرح دس روپے پیدا کر کے برمی لڑکی کو دیدو“

لڑکی کھڑی استری کر رہی تھی۔ بلاؤز کی صرف ایک آستین باقی رہ گئی تھی جس پر وہ بڑے سلیقے سے استری پھیر رہی تھی۔ کفایت نے اس کی طرف دیکھا جب اس کی نگاہیں چار ہوئیں تو لڑکی مسکرا دی۔ کفایت سوچنے لگا کہ وہ دس روپے کہاں سے پیدا کرے۔ بشیر پاس کھڑا تھا۔ اس نے کفایت سے صاحب

”صاحب ادھر آیئے“

کفایت نے پوچھا

”کیا بات ہے“

”جی کچھ کہنا ہے“

بشیر نے ایک طرف ہٹ کر دس روپے کا نوٹ نکالا اور کفایت کو دیدیا۔

”میں نہیں گیا ابھی تک صاحب۔“

کفایت نوٹ لے کر سوچنے لگا۔

”نہیں نہیں۔ تم رکھو۔ لیکن تم گئے کیوں نہیں ابھی تک“!

”صاحب چلا جاؤں گا کل پرسوں۔ آپ رکھیے یہ روپے“

کفایت نے نوٹ جیب میں ڈال لیا۔

”اچھا میں شام کو لوٹا دوں گا تمہیں“

کپڑے وپڑے پہن کر جب برمی لڑکی ناشتہ کر چکی تو کفایت نے اس کو دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا

”گیان صاحب نے دیا تھا کہ آپ کو دیدوں“

لڑکی نے نوٹ لے لیا اور بشیر کو آواز دی۔ بشیر آیا تو اس سے کہا

”جاؤ ٹیکسی لے آؤ۔“

بشیر چلا گیا تو کفایت نے اس سے پوچھا۔

”آپ جا رہی ہیں؟“

”جی ہاں“!

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور بیڈ روم میں چلی گئی وہ اپنا رومال استری کرنا بھول گئی تھی کفایت نے اس سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تو ٹیکسی آگئی رومال ہاتھ میں لے کر وہ روانہ ہونے لگی۔ کفایت کو سلام کیا اور کہا

“اچھا جی۔ میں چلتی ہوں۔ گیان کو میر اسلام بول دینا۔”

پھر اس نے تینوں نوکروں سے ہاتھ ملایا اور چلی گئی۔ سب کے چہروں پر اُداسی چھاگئی۔ پونے گھنٹے کے بعد گیان آیا۔ وہ کچھ لے کر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے کفایت سے پوچھا

“کہاں ہے وہ برمی لڑکی؟”

“چلی گئی”

“کیسے؟ دس روپے دیے تھے تم نے اسے؟”

“ہاں”

“توٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے”!

گیان کرسی پر بیٹھ گیا۔ کفایت نے پوچھا

“کون تھی یہ لڑکی”

“معلوم نہیں”

کفایت سر تاپا حیرت بن گیا

“کیا مطلب؟”

گیان نے جواب دیا

“مطلب یہ کہ میں نہیں جانتا کون تھی”

“جھوٹ”!

“تمہاری قسم سچ کہتا ہوں”

کفایت نے پوچھا

“کہاں سے مل گئی تمہیں”

گیان نے ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور مسکرایا

“عجیب داستان ہے یار۔ پانی کا سیلاب آنے والی رات میں شنکر کے ہاں چلا گیا۔ وہاں بہت پی۔ اندھیری اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا تو سو گیا۔ گاڑی مجھے سیدھی چرچ گیٹ لے گئی وہاں مجھے چوکیدار نے جگایا کہ اٹھو۔ میں نے کہا بھئی مجھے گرانٹ روڈ جانا ہے۔ چوکیدار ہنسا آپ پانچ اسٹیشن آگے چلے آئے ہیں۔ اترا دوسرا پلیٹ فارم پر اندھیری جانے والی آخری گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی چلی تو پھر مجھے نیند آگئی۔ سیدھی اندھیری پہنچ گئی۔”

کفایت نے پوچھا

“مگر اس سے لڑکی کا کیا تعلق”

تم سن تو لو، گیان نے سگریٹ سلگایا

“اندھیری پہنچا یعنی جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں میں ایک چھوٹی سی لونڈیا کے ساتھ چمٹا ہوں۔ پہلے تو میں ڈرا وہ جاگ رہی تھی میں نے پوچھا، کون ہو تم؟۔ وہ مسکرائی۔ میں نے پھر پوچھا، کون ہو بھئی تم۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی لو اتنی دیر سے مجھے چومتے اور اب پوچھتے ہو، میں کون ہوں۔ میں نے حیرت سے کہا، اچھا۔ وہ ہنسنے لگی میں نے دماغ پر زور دیکر سوچنا مناسب خیال نہ کیا اور اس کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ صبح تین بجے تک ہم دونوں۔ پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر سوئے رہے ساڑھے تین کی پہلی گاڑی آئی تو اس میں سوار ہو گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ بندوبست کر کے اس کو کچھ روپے دوں گا۔ یہاں پہنچے تو پانی کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ہے نا دلچسپ داستان۔”

کفایت نے کہا

“خاصی دلچسپی ہے۔ مگر وہ اتنے دن کیوں رہی یہاں؟”

گیان نے سگریٹ فرش پر پھینکا

”وہ کہاں رہی۔ میں نے اسے رکھا۔ اصل میں وہ یوں رہی کہ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو اسے دیتا۔ بس دن گزرتے تھے۔ میں بے حد شرمندہ تھا کل رات میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ دیکھو بھئی، دن بڑھتے جارہے ہیں۔ تم ایسا کرو مجھے اپنا ایڈریس دے دو، میں تمہارا حق وہاں پہنچادوں گا۔ آج کل میرا حال بہت پتلا ہے۔“

کفایت نے پوچھا

”یہ سن کر اس نے کیا کہا؟“

گیان نے سر کو جنبش دی

”عجیب ہی لڑکی تھی۔ کہنے لگی، یہ کیا کہتے ہو۔ میں نے تم سے کب مانگا ہے۔ لیکن دس روپے مجھے دیدینا۔ میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے ٹیکسی میں جاؤ نگی۔ میرے پاس ایک بھی پیسہ نہیں“

کفایت نے سوال کیا

”نام کیا تھا اس کا؟“

گیان سوچنے لگا۔

”بھول گئے؟“

گیان نے اپنی ٹانگیں میز پر سے ہٹائیں

”نہیں یار۔ میں نے اس سے نام نہیں پوچھا۔ حد ہو گئی۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔10 جون 1950ء

بس اسٹینڈ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبس اسٹینڈ

وہ بس اسٹینڈ کے پاس کھڑی اے روٹ والی بس کا انتظار کر رہی تھی‘ اس کے پاس کئی مرد کھڑے تھے‘ ان میں ایک اسے بہت بُری طرح گھور رہا تھا‘ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ شخص برمے سے اس کے دل و دماغ میں چھید بنا رہا ہے۔ اس کی عمر یہی بیس بائیس برس کی ہو گی لیکن اس پختہ سالی کے باوجود وہ بہت گھبرا رہی تھی‘ جاڑوں کے دن تھے‘ پر اس کے باوجود اس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا‘ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے‘ بس سٹینڈ سے چلی جائے‘ کوئی تانگہ لے لے یا واپس اپنی سہیلی کے پاس چلی جائے۔ اس کی یہ سہیلی نئی نئی بنی تھی‘ ایک پارٹی میں ان کی ملاقات ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی گرویدہ ہو گئیں۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ اپنی اس نئی سہیلی کے بُلاوے پر اس کے گھر آئی تھی۔ نوکر بیمار تھا مگر جب اس سہیلی نے اتنا اصرار کیا تھا تو وہ اکیلی ہی اس کے ہاں چلی گئی‘ دو گھنٹے میں گپ لڑاتی رہیں۔ یہ وقت بڑے مزے میں کٹا‘ اُس کی سہیلی جس کا نام شاہدہ تھا اس سے جاتے وقت کہا:

”سلمیٰ! اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے“

سلمیٰ شرما سی گئی‘ کیسی باتیں کرتی ہو شاہدہ۔ مجھے شادی نہیں کرانا ہے“

”تو کیا ساری عمر کنواری رہو گی“

”کنواری رہنے میں کیا حرج ہے“

شاہدہ مسکرائی

”میں بھی یہی کہا کرتی تھی۔ لیکن جب شادی ہو گئی تو دنیا کی تمام لذتیں مجھ پر آشکارا ہو گئیں۔ یہی تو عمر ہے جب آدمی پوری طرح شادی کی لطافتوں سے حظ اندوز ہو سکتا ہے۔ تم میرا کہا مانو۔ بس ایک دو مہینے کے اندر دلہن بن جاؤ۔ تمہارے ہاتھوں میں مہندی میں خود لگاؤں گی“

”’ہٹاؤ‘ اس چھیڑ خانی کو“

شاہدہ نے سلمیٰ کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی

”یہ چھیڑ خانی ہے؟۔ اگر یہ چھیڑ خوانی ہے تو ساری دنیا چھیڑ خانی ہے۔ مرد اور عورت کا رشتہ بھی فضول ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ایک ازلی اور ابدی رشتے سے منکر کیوں ہو؟۔ دیکھوں گی کہ تم مرد کے بغیر کیسے زندہ رہو گی۔ خدا کی قسم پاگل ہو جاؤ گی۔ پاگل“!

”اچھا ہے‘ جو پاگل ہو جاؤں۔ کیا پاگلوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ اتنے سارے پاگل ہیں‘ آخر وہ جوں توں جی ہی رہے ہیں“

”جوں توں جینے میں کیا مزا ہے‘ پیاری سلمٰی۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ جب سے میری شادی ہوئی ہے‘ میری کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ میرا خاوند بہت پیار کرنے والا ہے“

”کیا کام کرتے ہیں؟“

”مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ یہی ان کا کام ہے۔ ویسے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ میرا ہاتھ انھوں نے کبھی تنگ ہونے نہیں دیا“

سلمٰی نے یوں محسوس کیا کہ اس کا دل تنگ ہو گیا ہے۔

”شاہدہ مجھے تنگ نہ کرو‘ مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ مجھے مردوں سے نفرت ہے“

”کیوں؟“

”بس ہے“!

”اب میں تم سے کیا کہوں۔ مردوں سے مجھے بھی نفرت تھی لیکن جب میری شادی ہوئی اور مجھ سے میرے خاوند نے پیار محبت کیا تو میں نے پہلی مرتبہ جانا کہ مرد‘ عورت کے لیے کتنا لازمی ہے“

”ہوا کرے۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں“

شاہدہ ہنسی‘ سلمٰی! ایک دن تم ضرور اس بات کی قائل ہو جاؤ گی کہ مرد عورت کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بغیر وہ ایسی گاڑی ہے جس کے پہیے نہ ہوں۔ میری شادی کو ایک برس ہوا ہے‘ اس ایک برس میں مجھے جتنی مسرتیں اور راحتیں میرے خاوند نے پہنچائی ہیں‘ میں بیان نہیں کر سکتی۔ خدا کی قسم وہ فرشتہ ہے۔ فرشتہ‘ مجھ پر جان چھڑکتا ہے“

سلمٰی نے یہ سُن کر یوں محسوس کیا کہ جیسے اس کے سر پر فرشتوں کے پر پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ شاید مرد عورت کے لیے لازمی ہی ہو۔ لیکن فوراً بعد اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اس کی عقل نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ مرد کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ کیا عورت اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جیسا کہ شاہدہ نے اس کو بتایا تھا کہ اس کا شوہر بہت پیار کرنے والا ہے‘ بہت نیک خصلت ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا کہ وہ شاہدہ کے لیے لازمی تھا۔ سلمٰی حسین تھی‘ اُبھرا اُبھرا جوبن‘ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں‘ کشادہ پیشانی‘ گھٹنوں تک لمبے کالے بال‘ ستواں ناک اور اس کی ٹھنگ پر ایک تل۔ جب وہ اپنی سہیلی سے اجازت مانگ کر غسل خانے میں گئی تو اُس نے آئینے میں خود کو بڑے غور سے دیکھا اور اُسے بڑی اُلجھن محسوس ہوئی‘ جب اس نے سوچا کہ آخر یہ جسم‘ یہ حسن‘ یہ ابھار کس لیے ہوتے ہیں۔ قدرت کی ساری کاریگری اکارت جا رہی ہے۔

”گندم پیدا ہوتا ہے تو آدمی اس سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اس کی جوانی بھی تو کسی کھیت میں اُگی تھی۔ اگر اسے کوئی کھائے گا نہیں تو گل سڑ نہیں جائے گی؟“

وہ بہت دیر تک غسل خانے میں آئینے کے سامنے سوچتی رہی‘ اس کے ذہن میں اس کی سہیلی کی تمام باتیں گونج رہی تھیں۔ مرد‘ عورت کے لیے بہت ضروری ہے۔! اس کا خاوند اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ فرشتہ ہے۔ سلمٰی نے ایک لمحے کے لیے محسوس کیا کہ اس کی شلوار اور اس کا دوپٹہ فرشتوں کے پَر بن گئے ہیں۔ وہ گھبرا گئی اور جلدی فارغ ہو کر باہر نکل آئی‘ باہر برآمدے میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں‘ سلمٰی کو ایسا لگا کہ یہ بھی فرشتے ہیں جو بھیس بدل کر آئے ہیں۔ پھر جب اس کی سہیلی اپنی کوٹھی سے ملحقہ باغ میں اسے لے گئی اور وہاں اس نے چند تتلیاں دیکھیں تو وہ بھی اسے فرشتے دکھائی دیے۔ لیکن اُس نے کئی مرتبہ سوچا کہ ایسے رنگین اور ایسے ننھے منے فرشتے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسے بہت دیر تک فرشتے ہی فرشتے دکھائی دیتے رہے جو اس کے قریب آتے اس سے پیار کرتے‘ اس کا منہ چومتے‘ اس کے سینے پر ہاتھ پھیرتے‘ جس سے اس کو بڑی راحت ملتی لیکن ان فرشتوں کے ہاتھ بڑی تندہی سے ایک طرف جھٹک دیتی اور ان سے کہتی:

”جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ تمہارا گھر تو آسمان پر ہے۔ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“

وہ فرشتے اس سے کہتے

”ہم فرشتے نہیں حضرتِ آدمؑ کی اولاد ہیں۔ وہی بزرگ جو جنت سے نکالے گئے تھے۔ پر ہم تمھیں پھر جنت میں پہنچا دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ‘ وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں اور شہد کی بھی“

سلمٰی نے یوں محسوس کیا کہ اس کے سینے میں سے دودھ کے ننھے منے قطرے نکلنے شروع ہو گئے ہیں اور اس کے ہونٹ مٹھاس میں لپٹے ہوئے ہیں۔ شاہدہ‘ اُس سے بار بار اپنے خاوند کی تعریف کرتی‘ اصل میں اُس کا مدعا یہ تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ سلمٰی کا رشتہ قائم کر دے۔ مگر گھر پر یہ پہلی ملاقات تھی‘ اس لیے وہ کھل کے بات نہ کر سکی۔ بہر حال اس نے اشاروں کنایوں میں سلمٰی پر یہ واضح کر دیا کہ اس کا خاوند جو بہت شریف اور محبت کرنے والا آدمی ہے اُس کا بھائی اُس سے بھی کہیں زیادہ شریف النفس ہے۔ سلمٰی نے یہ اشارہ نہ سمجھا‘ اس لیے کہ وہ بہت سادہ لوح تھی‘ اُس نے صرف اتنا کہہ دیا

”آج کل کے زمانے میں شریف آدمیوں کا ملنا محال ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمھیں ایسا خاندان مل گیا جہاں ہر آدمی نیک اور شریف ہے“

”افسوس ہے کہ اس وقت میرے خاوند گھر میں موجود نہیں ورنہ میں تم سے انھیں ضرور ملاتی“

”کبھی پھر سہی۔ کیا کام کرتے ہیں“

”ہائے، انھیں کیا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ لاکھوں روپے کی جائیداد ہے۔ مکانوں اور دکانوں سے کرایہ ہی ہر مہینے دو ہزار کے قریب وصول ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ماشاء اللہ زمینیں ہیں، وہاں کی آمدن الگ ہے۔ اناج کی کوئی دقّت نہیں۔ منوں گندم گھر میں پڑا رہتا ہے۔ چاول بھی۔ ہر قسم کی ترکاری بھی ہر وقت میسر ہو سکتی ہے۔ اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے۔ ان کا چھوٹا بھائی جو آج کل لندن میں ہے، زراعت کے متعلق جانے کیا سیکھ رہا ہے۔ ایک مہینے تک واپس آ رہا ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہے۔ تم اُسے دیکھو گی۔ تو۔“

سلمٰی نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا

”ہاں، ہاں۔ جب وہ آئیں گے تو ان سے ملنے کا اتفاق ہو جائے گا“

شاہدہ نے کہا

”بڑا شریف لڑکا ہے۔ بالکل اپنے بڑے بھائی کی مانند“

”جی ہاں۔ ضرور ہو گا، آخر شریف خاندان سے تعلق ہے“

”وہ بس آنے ہی والا ہے۔ تم مجھے اپنی ایک تصویر دے دو“

”کیا کرو گی“

”بس شہد لگا کے چاٹا کروں گی“

یہ کہہ کر شاہدہ نے سلمٰی کا منہ چوم لیا، اور پھر اپنے خاوند کی تعریفیں شروع کر دیں۔ سلمٰی تنگ آ گئی، اُس نے تھوڑی دیر کے بعد کوئی بہانہ بنا کر رخصت چاہی اور بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی، جہاں اسے

”اے روٹ“

کی بس پکڑنا تھی۔ وہ جب وہاں پہنچی تو ایک مرد نے اُسے بہت بُری نگاہوں سے گھورنا شروع کر دیا۔ وہ پریشان ہو گئی، جاڑوں کے دن تھے مگر اس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اسٹینڈ پر ایک بس آئی، اس نے اس کا نمبر نہ دیکھا اور جب چند مسافر اُترے تو وہ فوراً اس میں سوار ہو گئی۔ وہ آدمی بھی اس بس میں داخل ہو گیا، اس کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ بس کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی، جس کے باعث اسے رکنا پڑا، سب مسافروں سے کہہ دیا گیا کہ وہ اُتر جائیں کیونکہ کافی دیر تک یہ بس نہیں چل سکے گی۔ سلمٰی نیچے اُتری تو وہ آدمی جو اُسے بہت بری طرح گھور رہا تھا وہ بھی اس کے ساتھ باہر نکلا۔ سڑک پر ایک کار جا رہی تھی اُس نے اس کے ڈرائیور کو آواز دی

”امام دین“

امام دین نے موٹر ایک دم روک لی۔ اس آدمی نے سلمٰی کا ہاتھ پکڑا اور اس سے کہا: چلیے۔ یہ میری کار ہے۔ جہاں بھی آپ جانا چاہتی ہیں، آپ کو چھوڑ آؤں گا“

سلمٰی انکار نہ کر سکی، موٹر میں بیٹھ گئی، اُس کو ماڈل ٹاؤن جانا تھا مگر وہ اسے کہیں اور لے گیا۔ اور۔! سلمٰی نے محسوس کیا کہ مرد واقعی عورت کے لیے لازم ہوتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا بہترین دن گزارا۔ گو اُس نے پہلے بہت حیل و حجت اور احتجاج کیا مگر اُس آدمی نے اسے رام کر ہی لیا۔ تین چار گھنٹوں کے بعد جب سلمٰی نے اُس شخص کا بٹوہ کھول کر یونہی دیکھا تو اُس میں ایک طرف شاہدہ کا فوٹو تھا۔ اُس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا:

”یہ۔ یہ۔ عورت کون ہے؟“

”اُس شخص نے جواب دیا:

”میری بیوی“

سلمٰی کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، ”آپ کی بیوی؟“

شاہدہ کا خاوند مسکرایا

”کیا مردوں کی بیویاں نہیں ہوتیں؟“

۲۰، مئی ۵۴ء

بسم اللہ

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو بسم اللہ

فلم بنانے کے سلسلے میں ظہیر سے سعید کی ملاقات ہوئی۔ سعید بہت متاثر ہوا۔ بمبئی میں اس نے ظہیر کو سنٹرل اسٹوڈیوز میں ایک دو مرتبہ دیکھا تھا اور شاید چند باتیں بھی کی تھیں مگر مفصل ملاقات پہلی مرتبہ لاہور میں ہوئی۔ لاہور میں یوں تو بے شمار فلم کمپنیاں تھیں مگر سعید کو اس تلخ حقیقت کا علم تھا کہ ان میں سے اکثر کا وجود صرف ان کے نام کے بورڈوں تک ہی محدود ہے۔ ظہیر نے جب اس کو اکرم کی معرفت بلایا تو اس کو سو فیصدی یقین تھا کہ ظہیر بھی دوسرے فلم پروڈیوسروں کی طرح کھوکھلا ہے جو لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں۔ آفس قائم کرتے ہیں۔ کرائے پر فرنیچر لاتے ہیں اور آخر میں آس پاس کے ہوٹلوں کے بل مار کر بھاگ جاتے ہیں۔ ظہیر نے بڑی سادگی سے سعید کو بتایا کہ وہ کم سے کم سرمائے سے فلم بنانا چاہتا ہے۔ بمبئی میں وہ اسٹنٹ فلم بنانے والے ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ پانچ برس تک وہ اس کے ماتحت کام کرتا رہا۔ اس کو خود فلم بنانے کا موقعہ ملنے ہی والا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا اور اسے پاکستان آنا پڑا۔ یہاں وہ تقریباً ڈھائی سال بیکار رہا مگر اس دوران میں اس نے چند آدمی ایسے تیار کر لیے جو روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے سعید سے کہا

”دیکھیے جناب میں کوئی فرسٹ کلاس فلم بنانا نہیں چاہتا۔ کم فلم آدمی ہوں۔ اسٹنٹ فلم بنا سکتا ہوں اور انشاء اللہ اچھا اسٹنٹ فلم بناؤں گا۔ پچاس ہزار روپوں کے اندر اندر سو فیصدی نفع تو یقینی ہے۔ آپ کا خیال ہے؟“

سعید نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔

”ہاں، اتنا نفع تو ہونا چاہیے۔“

ظہیر نے کہا

”جو آدمی روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ حساب کتاب سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہو گا۔ یہ آپ کا کام ہے۔ باقی سب چیزیں میں سنبھال لوں گا۔“

سعید نے پوچھا

”مجھ سے آپ کیا خدمت چاہتے ہیں؟“

ظہیر نے بڑی سادگی سے کہا۔

”پاکستان کے تقریباً تمام ڈسٹری بیوٹر آپ کو جانتے ہیں۔ میری یہاں ان لوگوں سے واقفیت نہیں۔ بڑی نوازش ہو گی اگر آپ میری فلم کی ڈسٹری بیوشن کا بندوبست کر دیں۔“

سعید نے کہا۔

”آپ فلم تیار کر لیں۔ انشاء اللہ ہو جائے گا۔“

”آپ کی بڑی مہربانی ہے۔“

یہ کہہ کر ظہیر نے میز پر پڑے ہوئے پیڈ پر پنسل سے ایک پھول سا بنایا

”سعید صاحب، مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ میں کامیاب رہوں گا۔ ہیروئن میری بیوی ہو گی۔“

سعید نے پوچھا۔

”آپ کی بیوی؟“

”جی ہاں“!

”پہلے کسی فلم میں کام کر چکی ہیں؟“

”جی نہیں۔“

ظہیر نے پیڈ پر پھول کے ساتھ شاخ بناتے ہوئے کہا۔

”میں نے شادی یہاں لاہور میں آ کر کی ہے۔ میرا ارادہ تو نہیں تھا کہ اسے فلم لائن میں لاؤں مگر اس کو شوق ہے۔ بہت شوق ہے۔ ہر روز ایک فلم دیکھتی ہے۔ میں آپ کو اس کا فوٹو دکھاتا ہوں۔“

ظہیر نے میز کا دروازہ کھول کر ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے اپنی بیوی کا فوٹو سرکا کر سعید کی طرف بڑھا دیا۔ سعید نے فوٹو دیکھا۔ معمولی خدوخال کی جوان عورت تھی۔ تنگ ماتھا۔ باریک ناک موٹے موٹے ہونٹ۔ آنکھیں بڑی بڑی اور اداس۔ یہ آنکھیں ہی تھیں جو اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کے مقابلے میں سب سے نمایاں تھیں۔ سعید نے غور سے ان کو دیکھنا چاہا مگر معیوب سمجھا اور فوٹو میز پر رکھ دیا۔ ظہیر نے پوچھا۔

”کیا خیال ہے آپ کا؟“

سعید کے پاس اس سوال کا جواب تیار نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پر دراصل وہ آنکھیں چھائی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی اداس آنکھیں۔ غیر ارادی طور پر اس نے میز پر سے فوٹو اٹھایا اور ایک نظر دیکھ کر پھر وہیں رکھ دیا۔ اور کہا

”آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

ظہیر نے پیڈ پر ایک اور پھول بنانا شروع کیا۔

”یہ فوٹو اچھی نہیں۔ ذرا سی ہلی ہوئی ہے۔“

اتنے میں پچھلے دروازے کا پردہ ہلا اور ظہیر کی بیوی داخل ہوئی۔ وہی بڑی بڑی اداس آنکھیں۔ ظہیر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”عجیب و غریب نام ہے اس کا۔ بسم اللہ“!

پھر سعید کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میرے دوست سعید صاحب۔“

بسم نے کہا۔

”آداب عرض۔“

سعید نے اس کا جواب اٹھ کر دیا۔

”تشریف رکھیے۔“

بسم اللہ دوپٹہ ٹھیک کرتی سعید کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار چغلیاں کھا رہا تھا۔ سعید نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ ظہیر نے فوٹو واپس لفافے میں رکھا اور سعید سے کہا۔

”مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ بسم اللہ پہلے ہی فلم میں کامیاب ثابت ہو گی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا فلمی نام کیا رکھوں۔ بسم اللہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

سعید نے بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ ایک لحظے کے لیے جیسے ڈوب سا گیا۔ فوراً ہی نگاہ اس طرف سے ہٹا کر اس نے ظہیر سے کہا۔

”جی ہاں۔ بسم اللہ ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی اور نام ہونا چاہیے۔“

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بسم اللہ خاموش تھی۔ اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں بھی خاموش تھیں۔ سعید نے اس دوران میں ان آنکھوں کے اندر کئی بار ڈبکیاں لگائیں۔ ظہیر اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ بسم اللہ خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی اداس آنکھوں پر چھائی ہوئی سیاہ پلکیں جھپکاتی۔ اس کے ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار برابر چغلیاں کھاتا رہا۔ سعید ادھر دیکھتا تو ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں دوسری طرف پلٹ جاتیں۔ بسم اللہ کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ فوٹو میں اس رنگت کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس گہرے سانولے رنگ پر اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں اور بھی زیادہ اداس ہو گئی تھیں۔ سعید نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس اداسی کا باعث کیا ہے؟۔ اس کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اداس دکھائی دیتی ہیں یا کوئی اور وجہ ہے۔ کوئی معقول بات سعید کے ذہن میں نہ آئی۔ ظہیر بمبئی کی باتیں شروع کرنے والا تھا کہ بسم اللہ اٹھی اور چلی گئی۔ اس کی چال میں بے ڈھنگا پن تھا، جیسے اس نے اونچی ایڑھی کے چپل نئے نئے استعمال کرنے شروع کیے۔ غرارے کی نشست بھی ٹھیک نہیں تھی۔ سلوٹوں کا گراؤ بھدا تھا۔ اس کے علاوہ سعید نے یہ بھی محسوس کیا کہ ادب آداب سے بسم اللہ محض کر رہی ہے۔ لیکن اس کے گہرے سانولے چہرے پر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، اداس ہونے کے باوجود کس قدر جذبات انگیز تھیں! چند ہی ملاقاتوں میں ظہیر سے سعید کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ ظہیر بے حد سادہ دل تھا۔ اس خاص چیز سے سعید بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کی کسی بھی بات میں بناوٹ نہیں ہوتی تھی۔ خیال جس شکل میں پیدا ہوتا تھا سادہ الفاظ میں تبدیل ہو کر اس کی زبان پر آ جاتا تھا۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے معاملے میں بھی وہ سادگی پسند تھا۔ جب بھی سعید اس کے یہاں جاتا۔ ظہیر اس کی خاطر تواضع کرتا۔ سعید نے اس سے کئی بار کہا کہ تم یہ تکلیف نہ کیا کرو مگر وہ نہ مانا۔ وہ اکثر کہا کرتا

”اس میں کیا تکلیف ہے، آپ کا اپنا گھر ہے۔“

سعید نے جب تقریباً ہر روز ظہیر کے ہاں جانا شروع کیا تو اس نے سوچا کہ یہ بہت بُری بات ہے۔ وہ میری اتنی عزت کرتا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے اور میں اس سے صرف اس لیے ملتا ہوں کہ مجھے اس کی بیوی سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ اس کے ضمیر نے کئی دفعہ اسے ٹوکا مگر وہ برابر ظہیر کے ہاں جاتا رہا۔ بسم اللہ اکثر آجاتی تھی۔ شروع شروع میں وہ خاموش بیٹھی رہتی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے باتوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن گفتگو کے لحاظ سے وہ خام تھی۔ سعید کو دکھ ہوتا تھا کہ وہ اچھی اچھی باتیں کرنا کیوں نہیں جانتی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ظہیر گھر سے باہر تھا۔ سعید نے آواز دی تو بسم اللہ بولی۔

”باہر گئے ہوئے ہیں۔“

یہ سن کر سعید کچھ دیر کھڑا رہا کہ شاید وہ اس سے کہے، اندر آجایئے۔ ابھی آتے ہیں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ظہیر کے فلم کا چکر چل رہا تھا۔ اس کا ذکر قریب قریب ہر روز ہوتا۔ ظہیر کہتا مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ ہر ایک چیز آرام سے ہو گی۔ اور اپنے وقت پر ہو گی۔ سعید کو ظہیر کے فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کو اگر دلچسپی تھی تو بسم اللہ سے جس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ کئی بار غوطے لگا چکا تھا۔ اور اس کی یہ دلچسپی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ جس کا احساس اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ وہ اپنے دوست ظہیر کی بیوی سے جسمانی رشتہ پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔ دن گزرتے گئے۔ ظہیر کے فلم کا کام وہیں کا وہیں تھا۔ سعید ایک دن اس سے ملنے گیا تو وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ چلنے ہی والا تھا کہ بسم اللہ نے کہا۔

”اندر آجایئے وہ کہیں دور نہیں گئے۔“

سعید کا دل دھڑکنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بسم اللہ میز کے پاس کھڑی تھی۔ سعید نے جرأت سے کام لے کر اس سے کہا۔

”بیٹھیے۔“

بسم اللہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر خاموش رہی اس کے بعد سعید نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ظہیر آئے نہیں ابھی تک؟“

بسم اللہ نے مختصر جواب دیا۔

”آجائیں گے۔“

تھوڑی دیر پھر خاموش رہی۔ اس دوران میں کئی مرتبہ سعید نے بسم اللہ کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اٹھ کر ان کو چومنا شروع کر دے۔ اس قدر چومے کہ ان کی ساری اداسی دھل جائے مگر سعید نے اس خواہش پر قابو پا کر اس سے کہا۔

”آپ کو فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے؟“

بسم اللہ نے ایک جمائی لی اور جواب۔

”ہے تو سہی۔“

سعید ناصح بن گیا۔

”یہ لائن اچھی نہیں۔ میرا مطلب ہے بڑی بدنام ہے۔“

اس کے بعد اس نے فلم لائن کی تمام برائیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ ظہیر کا خیال آیا تو اس نے رخ بدل لیا۔

”آپ کو شوق ہے تو خیر دوسری بات ہے۔ کیریکٹر مضبوط ہو تو آدمی کسی بھی لائن میں ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ پھر ظہیر خود اپنا فلم بنا رہا ہے لیکن آپ کسی دوسرے کے فلم میں کام ہرگز نہ کیجیے گا۔“

بسم اللہ خاموش رہی۔ سعید کو اس کی یہ خاموشی بہت بری معلوم ہوئی۔ پہلی مرتبہ اس کو تنہائی میں اس سے ملنے کا موقعہ ملا تھا مگر وہ بولتی ہی نہیں تھی۔ سعید نے ایک دو مرتبہ ڈرتے ڈرتے ٹوہ لینے والی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر کوئی ردعمل پیدا نہ ہوا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”اچھا تو پان ہی کھلایئے۔“

بسم اللہ اٹھی۔ ریشمی قمیض کے پیچھے اس کے سینے کا نمایاں ابھار ہلا۔ سعید کی نگاہوں کو دھکا سا لگا۔ بسم اللہ دوسرے کمرے میں گئی تو وہ ڈر ڈر کے تیکھی تیکھی باتیں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پان لے کر آئی اور سعید کے پاس کھڑی ہو گئی۔

”لیجیے۔“

سعید نے شکریہ کہہ کر پان لیا تو اس کی انگلیاں بسم اللہ کی انگلیوں سے چھوئیں اس کے سارے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ضمیر کا کانٹا اس کے دل میں چُھبا۔ بسم اللہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے گہرے سانولے چہرے سے سعید کو کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ سعید نے سوچا

”کوئی اور عورت ہوتی تو فوراً سمجھ جاتی کہ میں اسے کن آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ شاید سمجھ گئی ہو۔ شاید نہ بھی سمجھی ہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

سعید کا دماغ بے حد مضطرب تھا۔ ایک طرف بسم اللہ کا ستانے والا وجود تھا۔ اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں۔ اس کے سینے کا نمایاں ابھار۔ دوسری طرف ظہیر کا خیال، اس کے ضمیر کا کانٹا۔ سعید عجب الجھن میں پھنس گیا تھا۔ بسم اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ جو چیز سعید سوچ رہا ہے ناممکن ہے۔ مگر وہ پھر اس کو انہی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”ظہیر نہیں آئے میرا خیال ہے۔ میں چلتا ہوں۔“

بسم اللہ نے خلافِ توقع کہا۔

”نہیں نہیں بیٹھیے۔“

”آپ تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں۔“

یہ کہہ کر سعید اٹھا۔ بسم اللہ نے پوچھا۔

”چلے؟“

سعید نے اس کی طرف ٹوہ لینے والی نگاہوں سے دیکھا۔

”جی نہیں، بیٹھتا ہوں۔ آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو۔“

بسم اللہ نے ایک جمائی لی۔

”مجھے کیا اعتراض ہو گا۔“

بسم اللہ کی آنکھوں میں خمار سا پیدا ہو گیا۔ سعید نے کہا۔

”آپ کو شاید نیند آ رہی ہے۔“

”جی ہاں رات جاگتی رہی۔“

سعید نے ذرا بے تکلفی سے پوچھا۔

”کیوں“!

بسم اللہ نے ایک اور جمائی لی۔

”کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔“

سعید بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بسم اللہ سو گئی۔ اس کے سینے کا نمایاں ابھار ریشمی قمیض کے پیچھے سانس کے زیر و بم سے ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ بڑی بڑی اداس آنکھیں اب بند تھیں۔ دایاں بازو ایک طرف ڈھک گیا تھا۔ آستین اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ سعید نے دیکھا گہرے سانولے رنگ کی کلائی پر ہندی کے حروف کھدے ہوئے تھے۔ اتنے میں ظہیر آ گیا۔ سعید اس کی آمد پر سٹپٹا سا گیا۔ ظہیر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اپنی بیوی بسم اللہ کی طرف دکھا۔

”ارے سو رہی ہے۔“

سعید نے کہا۔

”میں جا رہا تھا۔ کہنے لگیں ظہیر صاحب ابھی آ جائیں گے۔ آپ بیٹھیے۔ میں بیٹھا تو آپ سو گئیں۔“

ظہیر ہنسا۔ سعید بھی ہنسنے لگا۔

”بھئی واہ، اٹھو اٹھو۔“

ظہیر نے بسم اللہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بسم اللہ نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی بڑی بڑی اداس آنکھیں کھول دیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اب ان میں ویرانی سی بھی تھی۔

”چلو چلو، اٹھو۔ ایک ضروری کام پر جانا ہے۔“

بسم اللہ سے یہ کہہ کر ظہیر سعید سے مخاطب ہوا۔

”معاف کیجیے گا سعید صاحب، میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ کل ملاقات ہو گی۔“

سعید چلا گیا۔ دوسرے روز اس نے ظہیر کے ہاں جانے سے پہلے یہ دعا مانگی کہ وہ گھر پر نہ ہو۔ وہاں پہنچا تو باہر کئی آدمی جمع تھے۔ سعید کو ان سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ ظہیر کی بیوی نہیں تھیں۔ وہ ایک ہندو لڑکی تھی جو فسادوں میں یہاں رہ گئی تھی۔ ظہیر اس سے پیشہ کراتا تھا۔ پولیس ابھی ابھی اسے برآمد کر کے لے گئی ہے۔ وہ بڑی بڑی سیاہ اور اداس آنکھیں اب سعید کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

بغیر اجازت

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوبغیر اجازت

نعیم ٹہلتا ٹہلتا ایک باغ کے اندر چلا گیا۔ اس کو وہاں کی فضا بہت پسند آئی۔ گھاس کے ایک تختے پر لیٹ کر اس نے خود کلامی شروع کر دی۔ کیسی پُر فضا جگہ ہے۔ حیرت ہے کہ آج تک میری نظروں سے اوجھل رہی۔ نظریں۔ اوجھل۔ اتنا کہہ کر وہ مسکرایا۔ نظر ہو تو چیزیں نظر بھی نہیں آتیں۔ آہ کہ نظر کی بے نظری! دیر تک وہ گھاس کے اس تختے پر لیٹا اور ٹھنڈک محسوس کرتا رہا۔ لیکن اس کی خود کلامی جاری تھی۔

”یہ نرم نرم گھاس کتنی فرحت ناک ہے! آنکھیں پاؤں کے تلووں میں چلی آئیں۔ اور یہ پھول۔ یہ پھول اتنے خوبصورت نہیں جتنی ان کی ہرجائی خوشبو ہے۔ ہر شے جو ہرجائی ہو۔ خوبصورت ہوتی ہے۔ ہرجائی عورت۔ ہرجائی مرد۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ خوبصورت چیزیں پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ یا خوبصورت خیال۔ ہر خیال خوبصورت ہوتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر پھول خوبصورت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہ پھول۔ اس نے اٹھ کر ایک پھول کی طرف دیکھا اور اپنی خود کلامی جاری رکھی۔ یہ اس ٹہنی پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ کتنا سفلہ دکھائی دیتا ہے بہرحال، یہ جگہ خوب ہے۔ ایک بہت بڑا دماغ معلوم ہوتی ہے۔ روشنی بھی ہے۔ سائے بھی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں نہیں بلکہ یہ جگہ سوچ رہی ہے۔ یہ پُر فضا جگہ جو اتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہی۔ اس کے بعد نعیم فرطِ مُسرت میں کوئی غزل گانا شروع کر دیتا ہے۔ کہ اچانک موٹر کے ہارن کی کرخت آواز اس کے سازِ دل کے سارے تار جھنجھوڑ دیتی ہے۔ وہ چونک کر اٹھتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ایک موٹر پاس کی روش پر کھڑی ہے اور ایک لمبی لمبی مونچھوں والا آدمی اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

اس مونچھوں والے آدمی نے گرج کر کہا:

”اے تم کون ہو۔“

نعیم جو اپنے ہی نشے میں سرشار تھا، چونکا۔

”یہ موٹر اس باغ میں کہاں سے آ گئی۔“

مونچھوں والا جو اس باغ کا مالک تھا بڑبڑایا۔

”وضع قطع سے تو آدمی شریف معلوم ہوتا ہے مگر یہاں کیسے گھس آیا۔ کس اطمینان سے لیٹا تھا جیسے اس کے باوا کا باغ ہے۔“

پھر اس نے بلند آواز میں للکار کے نعیم سے کہا:

”اماں۔ کچھ سنتے ہو۔“

نعیم نے جواب دیا:

”حضور سن رہا ہوں۔ تشریف لے آیئے۔ یہاں بہت پُر فضا جگہ ہے۔“

باغ کا مالک بھنّا گیا:

”تشریف کا بچہ۔ اِدھر آؤ۔“

نعیم لیٹ گیا۔

”بھئی مجھ سے نہ آیا جائے گا تم خود ہی چلے آؤ۔ واللہ! بڑی دلفریب جگہ ہے تمہاری سب کوفت دُور ہو جائے گی۔“

باغ کا مالک موٹر سے نکلا۔ اور غصے میں بھرا ہوا نعیم کے پاس آیا:

”اُٹھو یہاں سے۔“

نعیم کے کانوں میں اس کی تیکھی آواز بہت ناگوار گزری۔“

اتنے اونچے نہ بولو۔ آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔ بالکل خاموش جس طرح کہ میں لیٹا ہوا ہوں۔ آنکھیں بند کر لو۔ اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ دو۔ دماغ کی ساری بتیاں گل کر دو۔ پھر جب تم اس اندھیرے میں چلو گے تو ٹٹولتی ہوئی تمہاری انگلیاں غیر ارادی طور پر ایسے قمقمے روشن کریں گی جن کے وجود سے تم بالکل غافل تھے۔ آؤ میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔“

باغ کے مالک نے ایک لحظہ سوچا۔ نعیم سے کہا

”دیوانے معلوم ہوتے ہو۔“

نعیم مسکرایا:

”نہیں۔ تم نے کبھی دیوانے دیکھے ہی نہیں۔ میری جگہ یہاں اگر کوئی دیوانہ ہوتا تو وہ ان بکھری ہوئی جھاڑیوں اور ٹہنیوں پر بچوں کے گالوں کے مانند لٹکے ہوئے پھولوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا۔ دیوانگی اطمینان کا نام نہیں میرے دوست۔ لیکن آؤ! دیوانگی کی باتیں کریں۔“

”بکواس بند کرو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔“

باغ کے مالک کو طیش آگیا۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا اور کہا کہ نعیم کو دھکے مار کر باہر نکال دے۔

”ارے تم کون ہو، بڑے بد تمیز معلوم ہوتے ہو۔“

جب نعیم باہر جا رہا تھا تو اس نے گیٹ پر ایک بورڈ دیکھا جس پر یہ لکھا تھا

”بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔“

وہ مسکرایا۔ حیرت ہے کہ یہ میری نظروں سے اوجھل رہا۔ نظر ہو تو بعض چیزیں نظر نہیں بھی آتیں۔ آہ نظر کی یہ بے نظری۔ یہاں سے نکل کر وہ ایک آرٹ کی نمائش میں چلا گیا تا کہ اپنا ذہنی تکدر دور کر سکے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اس کو عورتوں اور مردوں کا جھرمٹ نظر آیا جو دیواروں پر لگی پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔ ایک مرد کسی پارسی عورت سے کہہ رہا تھا:

”مسز فوجدار۔ یہ پینٹنگ دیکھی آپ نے۔“

مسز فوجدار نے تصویر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک عورت شیریں کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور اس مرد سے جو غالباً اس کا ہونے والا شوہر تھا کہا:

”تم نے دیکھا، شیریں کتنی سج بن کر آئی ہے“!

ایک نوجوان عورت ایک نو عمر لڑکی سے کہہ رہی تھی:

”ثریا! ادھر آ کے تصویریں دیکھ۔ تو وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے۔“

ثریا کو تصویروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اصل میں اس کو ایک بوائے فرینڈ سے ملنا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا مرد جسے پینٹنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اپنے ادھیڑ عمر کے دوست سے کہہ رہا تھا:

”زکام کی وجہ سے نڈھال ہے، ورنہ ضرور آتی۔ آپ جانتے ہی ہیں پینٹنگز سے اسے کتنی دلچسپی ہے، اب تو وہ بہت اچھی تصویریں بنا لیتی ہے، پرسوں اس نے پنسل کاغذ لے کر اپنے چھوٹے بھائی کی سائیکل کی تصویر اتاری۔ میں تو دنگ رہ گیا۔“

نعیم پاس کھڑا تھا۔ اس نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا:

”ہو بہو سائیکل معلوم ہوتی ہو گی“!

دونوں دوست بھونچکے سے ہو کر رہ گئے کہ یہ کون بد تمیز ہے، چنانچہ ان میں سے ایک نے نعیم سے پوچھا:

”آپ کون۔“

نعیم بوکھلا گیا

”میں۔ میں۔“

”میں میں کیا کرتے ہو۔ بتاؤ تم کون ہو“!

نعیم نے سنبھل کر کہا: آپ ذرا آرام سے پوچھیے۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔“

”تم یہاں آئے کیسے“!

نعیم کا جواب بڑا مختصر تھا،

”جی پیدل۔“

عورتوں اور مردوں نے جو آس پاس کھڑے تصویریں دیکھنے کی بجائے خدا معلوم کن کن چیزوں پر تبصرہ کر رہے تھے ہنسنا شروع کر دیا۔ اتنے میں اس نمائش کا ناظم آیا۔ اس کو نعیم کی گستاخی کے متعلق بتایا گیا تو اس نے بڑے کڑے انداز میں اس سے پوچھا

”تمہارے پاس کارڈ ہے؟“

”بغیر اجازت تم اندر چلے آئے۔ جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے“!

نعیم ایک تصویر کو دیر تک دیکھنا چاہتا تھا مگر اسے بادل نخواستہ وہاں سے نکلنا پڑا۔ سیدھا اپنے گھر گیا دروازے پر دستک دی اس کا نوکر فضلو باہر نکلا نعیم نے اس سے درخواست کی:

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“

فضلو بوکھلا گیا۔

”حضور۔ حضور۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اجازت کیسی“

نعیم نے کہا:

”نہیں فضلو۔ یہ میرا گھر نہیں۔ یہ گھر جو مجھے راحت بخشتا ہے‘ کیسے میرا ہو سکتا ہے۔ مجھے اب ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے۔“

فضلو نے بڑے ادب سے پوچھا:

”کیا سرکار؟“

نعیم نے کہا:

”یہی کہ یہ میرا گھر نہیں۔ البتہ اس کا گرد و غبار۔ اس کی تمام غلاظتیں میری ہیں۔ وہ تمام چیزیں جن سے مجھے کوفت ہوتی ہے میری ہیں لیکن وہ تمام چیزیں جن سے مجھے راحت پہنچتی ہے کسی اور کی۔ خدا جانے کس کی۔ میں اب ڈرتا ہوں۔ کسی اچھی چیز کو اپنانے سے خوف لگتا ہے۔ یہ پانی میرا نہیں۔ یہ ہوا میری نہیں۔ یہ آسمان میرا نہیں۔ وہ لحاف جو میں سردیوں میں اوڑھتا ہوں‘ میرا نہیں۔ اس لیے کہ میں اس سے راحت طلب کرتا تھا۔ فضلو جاؤ۔ تم بھی میرے نہیں۔“

نعیم نے فضلو کو کوئی بات کرنے نہ دی۔ وہ چلا گیا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے سے

”پیا بن ناہیں آوت چین“

کے بول باہر اڑ اڑ کے آ رہے تھے نعیم اس کوٹھے پر چلا گیا۔ اندر مجرا سننے والے تین چار مردوں کی طرف دیکھا۔ اور طوائف سے کہا

”ان اصحاب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔“

طوائف مسکرائی:

”انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ادھر مسند پر بیٹھیے گاؤ تکیہ لے لیجیے“!

نعیم بیٹھ گیا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس طوائف سے کہا:

”یہ کتنی اچھی جگہ ہے“!

طوائف سنجیدہ ہو گئی:

”آپ کیا میرا مذاق اُڑانے آئے ہیں۔ یہ اچھی جگہ ہے۔ جسے تمام شرفا حد سے زیادہ گندی جگہ سمجھتے ہیں۔“

نعیم نے اس سے کہا:

”یہ اچھی جگہ اس لیے ہے کہ یہاں

”بغیر اجازت کے آنا منع ہے“

کا بورڈ آویزاں نہیں ہے۔“

یہ سُن کر طوائف اور اس کا مُجرا سننے والے تماش بین ہنسنے لگے۔ نعیم نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا ایک اس قسم کی طوائف ہے جس کا مُجرا سننے کے لیے اس قسم کے چغد آتے ہیں۔

بلاؤز

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوبلاؤز

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا وجود کچّا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اُسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا۔ تو نہ کر سکتا۔ بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دُھندلے دُھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں۔ مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے اور شور ہی کے ساتھ پھٹتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر ہر وقت جیسے خار دار پاؤں والی چیونٹیاں سی رینگتی تھیں۔ ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضاء میں پیدا ہو گیا تھا۔ جس کے باعث اُسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس تکلیف کی شدّت جب بڑھ جاتی تو اس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے ہاون میں ڈال دے اور کسی سے کہے۔

”مجھے کوٹنا شروع کر دو۔“

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی۔ تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اُس کی تنی ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی، جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیے کی طرح کانپنا شروع کر دیتا۔ مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ شاید سولھواں بھی لگا ہو۔ اُسے اپنی عمر کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تندرست لڑکا تھا۔ جس کا لڑکپن تیز قدمی سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی دوڑ نے جس سے مومن بالکل غافل تھا۔ اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ناکام رہتا تھا۔ اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے پتلی تھی۔ اب موٹی ہو گئی تھی۔ انھوں کے پٹھوں میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہ موٹی ہو گئی تھی۔ اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سی پڑ گئی تھیں۔ جگہ اُبھر آئی تھی۔ جیسے کسی نے ایک ایک بنٹا اندر داخل کر دیا ہے۔ ان ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھُو جاتا۔ تو وہ تڑپ اٹھتا۔ قمیض کے موٹے اور کھُردرے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ غسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانہ میں جب کوئی اور موجود نہ ہو مومن اپنی قمیض کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا تھا۔ ہاتھوں سے مسلتا تھا۔ درد ہوتا ٹیسیں اٹھتیں۔ اس کا سارا جسم پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ کی طرح جسے زور سے ہلایا گیا ہو کانپ کانپ جاتا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا تھا کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے لیسدار لعاب نکل آتا۔ اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو جاتا۔ وہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسانوں کے سامنے نہ کر سکتا ہو۔ اس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو جاتا۔ تو وہ جھٹ سے اپنی قمیض کے بٹن بند کر لیتا۔ کہ آئندہ ایسی فضول حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن اس عہد کے باوجود دوسرے تیسرے روز تخلیے میں وہ پھر اس کھیل میں مشغول ہو جاتا۔ مومن سے گھر والے سب خوش تھے۔ وہ بڑا محنتی لڑکا تھا۔ سب ہر کام وقت پر کر دیتا تھا اور کسی شکایت کا موقعہ نہ دیتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اُسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے لیکن اس قلیل عرصے میں اُس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا تھا۔ چھ روپے مہینے پر وہ نوکر ہوا تھا۔ مگر دوسرے مہینے ہی اس کی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی۔ مگر وہ اب کچھ دنوں سے وہ بے قرار تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے۔ یا کسی سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔ اب کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں برتتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر باجہ بجانے نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہیں کی تھی۔ شکیلہ البتہ مومن سے ادھر اُدھر کے کام لیتی تھی۔ اور کبھی کبھی اُسے ڈانٹتی بھی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ بھی چند بلاؤزوں کے نمونے اتارنے میں بے طرح مشغول تھی۔ یہ بلاؤز اس کی ایک سہیلی کے تھے۔ جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ شکیلہ اُس سے آٹھ بلاؤز مانگ کر لائی تھی۔ اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی۔ چنانچہ اُس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے۔ یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی۔ زیادہ تر باورچی خانے کا کام یہی کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اُس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو۔ مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور وہ انقلاب جس میں سے مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا۔ اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی اور پھر مومن نوکر تھا۔۔۔۔۔۔۔ نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا زندگی کے ایک ایسے راستے پر آنکلا تھا۔ جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا۔ مگر بے حد پُر خطر تھا۔ اس راستے پر اُس کے قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے۔ کبھی ہولے ہولے۔ وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہیے۔ انھیں جلدی طے کر جانا چاہیے۔ یا کچھ وقت لے کر آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کی چیزوں کا سہارا لے کر طے کرنا چاہیے۔ مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنیوالے شباب کی گول گول چکنی بٹیاں پھسل رہی تھیں۔

وہ اپنا توازن بر قرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اسی اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیر ارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا۔ اور اُس کے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اُسے کوئی، اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوتی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ غیر شعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو۔۔۔۔۔ کیا ہو؟۔۔۔۔۔۔ بس کچھ ہو۔ میز پر قرینے سے چُنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اُچھلنا شروع کر دیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی اُبال سے اُوپر کو اڑ جائے۔ نل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے۔ تو وہ دُہری ہو جائے۔ اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ سا پھُوٹ نکلے۔ اُسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے کہ اس کے سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے۔۔۔۔۔ کوئی ایسی بات وقوع پزیر ہو۔ جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ مومن بہت بے قرار تھا۔ رضیہ نئی فلمی طرزیں سیکھنے میں مشغول تھی۔ اور شکیلہ کاغذوں پر بلاؤزوں کے نمونے اتار رہی تھی۔ اور جب اس نے یہ کام ختم کر لیا۔ تو وہ نمونہ جو ان میں سب سے اچھا تھا۔ سامنے رکھ کر اپنے لیے اودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا باجا اور فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پرونے بیٹھتی تو اس کی نشست بڑی پُر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتفری پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تا کہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیائش بھی اس کی بہت صحیح ہوتی تھی۔ اس لیے کہ وہ پہلے کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا تھا۔ مگر چیز بالکل فٹ تیار ہوتی تھی۔ شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی۔ اُس کے ہاتھ بہت گدگدے تھے گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ننھا گڑھا تھا۔ جب وہ مشین چلاتی تھی یہ ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتے تھے۔ شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی دو یا تین انگلیاں بڑی رعنائی کے ساتھ مشین کی ہتھی کو گھماتی تھی اُس کی کلائی میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف کو جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لِٹ جسے شاید اپنے لیے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی نیچے پھسل آتی تھی۔ شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک رہتی کہ اسے ہٹانے یا جمانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ جب شکیلہ اودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ماپ کا بلاؤز تراشنے لگی تو اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان کا اپنا ٹیپ گھِس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا۔ مگر اس سے کمر اور سینے کی پیائش کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی اس لیے ساری پیائشیں دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔ قمیض اتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا۔

”جاؤ مومن دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔“

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا مگر آج اسے ایک قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رُخ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور گھبراہٹ میں کہا۔

”کیسا گز بی بی جی“

شکیلہ نے جواب دیا۔

”کپڑے کا گز۔۔۔۔۔۔ ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے یہ لوہے کا ہے۔ ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے جو کپڑے کا بنا ہوتا ہے۔ جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔“

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لے کر آ گیا۔ شکیلہ نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا۔

”یہیں ٹھیر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے جانا“

پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی۔

”ان لوگوں کی کوئی چیز زیادہ دیر اپنے پاس رکھ لی جائے تو وہ بڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ادھر آؤ اور یہ گز لو اور یہاں سے میرا ناپ لو“

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ناپ لینا شروع کیا۔ تو ان کے درمیان کئی باتیں ہوئی۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔ رضیہ تم گز کو کھینچ کر ناپ کیوں نہیں لیتیں۔۔۔۔۔۔ پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا۔ تم نے ناپ لیا اور میرے بلاؤز کا ستیاناس ہو گیا۔ اوپر کے حصّہ پر اگر کپڑا فِٹ نہ آئے تو ادھر اُدھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔“

”کہاں کا لوں، کہاں کا نہ لوں۔ تم تو عجب مخمصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ناپ لینا شروع کیا تھا تو تم نے کہا ذرا اور نیچے کر لو۔۔۔۔۔۔۔ ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کون سی آفت آ جائے گی“

”بھئی واہ۔۔۔۔۔۔ چیز کے فٹ ہونے میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے۔ مجال ہے جو کہیں شکن پڑے، کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے۔۔۔۔۔۔۔ لو اب تم ناپ کو۔۔۔۔۔۔“

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے سے اپنا سینہ پھلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھُول گیا۔ تو سانس روک کر اُس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”لو اب جلدی کرو“

جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا۔ اس کے اندر کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ گز لائیے بی بی جی۔۔۔۔۔ میں دے آؤں“

شکیلہ نے اسے جھڑک دیا۔

”ذرا ٹھہر جاؤ۔“

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز اس کے ننگے بازو سے لپٹ گیا۔ جب شکیلہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بال اُگ رہے تھے۔ مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اُس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ کہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہرے بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا۔ ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو اُسے سرسراہٹ اُسے محسوس ہوا کرتی تھی۔ اُسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کر دی۔ شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا۔ اور اُس کی بغل چھُپ گئی تھی۔ مگر مومن اب بھی کالے کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھا رہا۔ اور بغل میں اُس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دے دیا اور کہا۔

”جاؤ، اُسے واپس دے آؤ۔ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے“

مومن گز واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اُس کے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے سے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو اُس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک کھولا جس میں اُس نے عید کے لیے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔ جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا۔ اور نئے لٹھے کی بو اس کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلہ بی بی کے پاس جائے اور اسے سلام کرے۔۔۔۔۔ اُس کی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کرے گی۔ اور اس کی رومی ٹوپی۔۔۔۔۔۔“

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پھندنا آ گیا۔ اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا۔ جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور لچکیلے پھندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا۔ کہ اندر سے شکیلہ بی بی کی آواز آئی۔

”مومن۔“

مومن نے ٹوپی ٹرنک میں رکھی، ڈھکنا بند کیا۔ اور اندر چلا گیا۔ جہاں شکیلہ نمونے کے مطابق اودی ساٹن کے کئی ٹکڑے کاٹ چکی تھی۔ ان چمکیلے اور پھسل پھسل جانے والے ٹکڑوں کو ایک جگہ رکھ کر وہ مومن کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں نے تمہیں اتنی آوازیں دیں۔ سو گئے تھے کیا؟“

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔

”نہیں بی بی جی۔“

”تو کیا کر رہے تھے؟“

”کچھ۔۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں؟“

”کچھ تو ضرور کرتے ہو گے

”شکیلہ یہ سوال کیے جا رہی تھی۔ مگر اس کا دھیان اصل میں بلاؤز کی طرف تھا۔ جسے اب اُسے کچّا کرنا تھا۔ مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

”ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔ شکیلہ کھکھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ شکیلہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین ہوئی۔ اور اس تسکین نے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مضحکہ خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے شکیلہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے۔ چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں شرماہٹ پیدا کر کے اُس نے کہا۔

”بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا“

شکیلہ نے ہنستے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”کیا کرو گے اس رومال کو؟“

مومن نے جھینپ کر جواب دیا۔

”گلے میں باندھ لوں گا بی بی جی۔۔۔۔۔ بڑا اچھا معلوم ہو گا۔“

یہ سن کر شکیلہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

”گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا میں اسی سے پھانسی دے دوں گی تمھیں۔“

یہ کہہ کر شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی۔ اور رضیہ سے کہا

”کمبخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا۔ رضیہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا؟“

رضیہ نے جواب نہ دیا۔ اور وہ نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کی جو وہ دو روز سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں شکیلہ کو خود ہی یاد آگیا۔ کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔ دیکھو مومن۔ میں تمھیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں۔ دوائیوں کی دوکان کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی جہاں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے۔ وہاں جاؤ اور پوچھ کے آؤ کہ ایسی چھ بنیانوں کا وہ کیا لے گا۔۔۔۔۔۔ کہنا ہم پوری چھ لیں گے۔ اس لیے کچھ رعایت ضرور کرے۔۔۔۔۔ سمجھ لیا نا؟“

مومن نے جواب دیا۔

”جی ہاں۔“

”اب تم پرے ہٹ جاؤ۔“

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آکر گرا اور اندر سے شکیلہ کی آواز آئی۔

”کہنا ہم اسی قسم، اسی ڈیزائن کی بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیے۔“

مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھالیا۔ جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹالیا ہو۔ بدن کی بُو بھی اس میں بسی ہوئی تھی۔ میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔ وہ اس بنیان کو جو بلّی کے بچے کی طرح ملائم تھا۔ اپنے ہاتھوں میں مسلتا باہر چلا گیا۔ جب بھاؤ واؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی۔ اس سیاہی مائل ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی رومی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچکدار تھی۔ یہ بلاؤز شاید عید کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ عید اب بالکل قریب آگئی تھی۔ مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کے لیے، استری نکالنے کے لیے۔ سُوئی ٹوٹی تو نئی سوئی لانے کے لیے۔ شام کے قریب جب شکیلہ نے دوسرے روز پر باقی کام اٹھا دیا تو دھاگے کے ٹکڑے اور اُودی ساٹن کی بیکار کترین اٹھانے کے لیے بھی اُسے بلایا گیا۔ مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ مگر اودی ساٹن کی چمکدار کترین اپنی جیب میں رکھ لیں۔۔۔۔۔۔ بالکل بے مطلب کیونکہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کو کیا کرے گا؟! دوسرے روز اس نے جیب سے کترین نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی۔ جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا چھوٹا سا گُچھا دیکھا تھا۔ اُس دن بھی اُسے شکیلہ نے اُسے کئی بار بلایا۔۔۔۔ کالی ساٹن کے بلاؤز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اُسے کچّا کیا گیا تھا تو اس پر سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جابجا پھیلے ہوئے تھے۔ پھر اس پر استری کی گئی۔ جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں۔ اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچی حالت ہی میں شکیلہ نے اسے پہن کر رضیہ کو دکھایا۔ دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس جا کر آئینے میں خود اس کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا۔ جب پورا اطمینان ہو گیا تو اسے اتارا، جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا۔ وہاں نشان بنائے، اور اس کی ساری خامیاں دور کیں۔ ایک بار پھر پہن کر دیکھا۔ جب بالکل فِٹ ہو گیا تو پکّی سلائی شروع کی۔ ادھر اودی ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا۔ ادھر مومن کے دماغ میں عجیب وغریب خیالوں کے جیسے ٹانکے سے ادھڑ رہے تھے۔۔۔۔ جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھُو کر اُسے دیکھے۔ صرف چھُو کر ہی نہیں دیکھے۔۔۔۔ بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے۔۔۔۔۔ اپنے کھُردرے ہاتھ۔ اس نے ان ساٹن کے ٹکڑوں سے اس کی ملائمی کا اندازہ کر لیا تھا۔ دھاگے جو اس نے ان ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے۔ جب اُس نے ان کا گُچھا بنایا تھا تو دباتے وقت اُسے معلوم ہوا کہ ان میں ربڑ سی لچک بھی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ جب اندر آکر بلاؤز کو دیکھتا اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال مومن سوچتا تھا۔ کیا وہ بھی اس ساٹن ہ کی طرح ملائم ہوں گے۔ بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا۔۔۔۔۔۔ مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا کہ شکیلہ اندر آئی۔ قمیض اتار کر اس نے پلنگ پر رکھی۔ اس کے نیچے اسی قسم کا سفید بنیان تھا۔ جس کا نمونہ لے کر مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سِلا ہوا بلاؤز پہنا۔ سامنے کے ہُک لگائے اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مومن نے فرش صاف کرتے کرتے آئینہ کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔۔۔۔۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہو گیا ہے۔۔۔۔ شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی۔ جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری۔ بلاؤز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھی مومن سے نہ رہا گیا۔ چنانچہ اُس نے کہا۔

”بی بی جی۔ آپ نے تو درزیوں کو بھی مات کر دیا“!

شکیلہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہوئی۔ مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس لیے وہ صرف اچھا سِلا ہے نا؟“

کہہ کر باہر دوڑ گئی۔۔۔۔۔۔ مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا جس میں بلاؤز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔ رات کو جب وہ پھر اُس کمرے میں صُراحی رکھنے کے لیے آیا۔ تو اُس نے کھونٹی پر لکڑی کے ہینگر میں اس بلاؤز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اُس نے غور سے دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے یہ محسوس ہوا۔ کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے۔ رات کو جب وہ سویا تو اُس نے کئی اُوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔۔۔۔۔۔ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اُسے کوٹنے کو کہا۔ جب اُس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ایک ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔۔۔۔۔۔ یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولہ بنا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے۔۔۔۔۔۔ بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے۔۔۔۔۔۔ پھر آندھی آگئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا۔۔۔۔۔۔ پھندنے کی تلاش میں وہ نکلا۔۔۔۔۔۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا۔۔۔۔۔۔ نئے لٹھے کی بُو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا۔۔۔۔۔۔ کچھ دیر وہ اس دھڑکتی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اُسے خوف، تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا۔ اس کی حالت اس وقت عجیب وغریب تھی۔۔۔۔۔۔ پہلے اُسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوئی تھی۔ مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اُس کے جسم پر رینگنے لگی۔

بلونت سنگھ مجیٹھیا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبلونت سنگھ مجیٹھیا

شاہ صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو ہم فوراً بے تکلف ہو گئے۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ سیّد ہیں اور میرے دور دراز کے رشتہ دار بھی ہیں۔ وہ میرے دور یا قریب کے رشتہ دار کیسے ہو سکتے تھے، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ سیّد تھے اور میں ایک محض کشمیری۔ بہر حال، ان سے میری بے تکلفی بہت بڑھ گئی۔ ان کو ادب سے کوئی شغف نہیں تھا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں افسانہ نگار ہوں تو انھوں نے مجھ سے میری چند کتابیں مستعار لیں اور پڑھیں۔ یہ کتابیں جو افسانوں کے مجموعے تھیں، انھوں نے پڑھیں، اور مجھے بہت تعجب ہوا کہ انھوں نے چند افسانوں کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے یہ افسانے ایسے تھے جو دنیا میں شاہکار تسلیم کیے جا چکے تھے۔ شاہ صاحب میرے پڑوسی تھے۔ انھوں نے ایک مکان الاٹ کرا رکھا تھا، لیکن خاندان کے افراد چونکہ زیادہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے فلیٹ کے نیچے موٹر گیراج پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنی بیٹھک کا انتظام کیا تھا۔ اوپر زنانہ تھا۔ شاہ صاحب کے دوست بے شمار تھے اس لیے اس گیراج میں وہ ان کی خاطر مدارت کرتے تھے۔ ایک دن ان سے افسانوں کے بارے میں باتیں ہوئیں تو انھوں نے مجھ سے کہا:

”میری زندگی میں ایسی کئی حقیقتیں ہیں جن کو تم افسانے بنا کر پیش کر سکتے ہوں۔“

میں ہر وقت افسانوں کی تلاش میں رہتا ہوں، چنانچہ میں فوراً متوجہ ہوا اور شاہ صاحب سے کہا:

”مجھے امید ہے کہ آپ اچھا مواد دیں گے۔“

شاہ صاحب نے جواباً کہا:

”میں افسانہ نگار نہیں۔ لیکن میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہوا ہے جو قابل ذکر ہے۔ میں نے قابل ذکر اس لیے کہا ہے کہ آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں، ورنہ یہ واقعہ جو اب میں بیان کرنے والا ہوں، میرے نزدیک بے حد حیرت انگیز ہے۔“

میں نے شاہ صاحب سے کہا:

”ایسا بھی کیا حیرت انگیز ہو گا“!

پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اس میں تھوڑی سی اصلاح کی:

”لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ کے لیے وہ واقعی حیرت انگیز ہو۔“

شاہ صاحب نے کہا۔

”جی! میں نہیں کہہ سکتا کہ جو واقعہ میں آپ کو سنانے والا ہوں، ہر شخص کے لیے حیرت کا باعث ہو گا۔ میں اپنی ذات کے متعلق آپ سے عرض کر رہا ہوں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں جو داستان آپ کو سناؤں گا، اس وقت تک میری زندگی میں محیر العقول حیثیت رکھتی ہے۔“

شاہ صاحب نے

”نیل کٹر“

سے اپنے ناخن کاٹنے شروع کیے۔ میں ان کی داستان سننے کے لیے بے تاب تھا، مگر شاید وہ آغاز کے متعلق سوچ رہے تھے کہ اپنی داستان کو کہاں سے شروع کریں۔ میرا خیال درست تھا کہ جو کچھ ان پر بیتا تھا، اس کو کئی برس ہو چکے تھے۔ وہ تمام واقعات کی یاد اپنے ذہن میں تازہ کر رہے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ انھوں نے اپنی دس انگلیوں کے ناخن کاٹ کر

”نیل کٹر“

تپائی پر رکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”میں ان دنوں کابل میں تھا۔“

یہ کہہ کر چند لمحات خاموش رہے، اس کے بعد بولے۔

”میری وہاں بہت بڑی دکان تھی جس میں بڑھیا سے بڑھیا سامان موجود رہتا تھا۔“

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔

”آپ جنرل مرچنٹ تھے؟“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔

”جی ہاں۔ کابل کا سب سے بڑا جنرل مرچنٹ۔ میری دکان میں کابل کی قریب قریب ہر عورت سودا لینے آتی تھی۔ آپ سے ایک بات عرض کروں۔ ساتھ کے دکاندار جب یہ دیکھتے تھے کہ کسی روز عورتوں کی بجائے میری دکان میں مرد گاہک آئے ہیں تو وہ مجھ سے فارسی زبان میں افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ آغا آج یہ کیا ہوا۔ کابل کی عورتیں اور لڑکیاں مر گئیں یا تمہارے نصیب سو گئے۔“

شاہ صاحب مسکرا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اور وہ کیا جواب دے سکتے تھے۔ لیکن ان کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ ان کی دکان میں گاہکوں کی اکثریت عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی ہے، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سب ان کی چرب زبانی کا معجزہ ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا۔

”منٹو صاحب! میں بہترین سیلز مین ہوں۔ خاص طور پر عورتوں کے ساتھ تو میں اس طرح سودا کر سکتا ہوں کہ یہاں لاہور میں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ بی اے ہوں۔ تھوڑی بہت سائیکالوجی بھی میں نے پڑھی ہے، اس لیے مجھے معلوم ہے کہ عورتوں سے کس طرح

”ڈیل“

کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سارے کابل میں ایک میری دکان ہی ایسی تھی جس میں ہر وقت کوئی نہ کوئی گاہک موجود ہوتا تھا۔“

میں نے شاہ صاحب کی یہ خود تعریفی سنی اور ان سے کہا۔

”یقیناً آپ بہترین سیلز مین ہیں کہ آپ کی گفتگو کا انداز ہی اس کا ثبوت ہے۔“

شاہ صاحب مسکرائے۔

”مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی داستان بہترین سیلز مین کے انداز بیان میں بیان نہیں کر سکوں گا۔“

میں نے ان سے کہا۔

”آپ شروع تو کیجیے“!

شاہ صاحب نے چند لمحات اپنے حافظے کو پھر ٹٹولا اور اپنی داستان شروع کی

”منٹو صاحب! جیسا کہ میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں کابل میں تھا۔ یہ کوئی دس برس پہلے کی بات ہے جب میری صحت بہت اچھی تھی۔ یوں تو میں اب بھی تنومند کہلاتا ہوں، مگر اس زمانے میں میرا جسم آج مقابلے میں دگنا تھا۔ ہر روز ورزش کرتا تھا سینکڑوں ڈنڈ پیلتا تھا، مگدر گھماتا تھا۔ سگریٹ پیتا تھا نہ شراب، بس ایک اچھا کھانے کی عادت تھی۔ افغانی نہیں، ہندوستانی۔ چنانچہ میں امرتسر سے اپنے ساتھ ایک بہت اچھا کشمیری باورچی لے گیا تھا جو ہر روز میرے لیے لذیذ سے لذیذ کھانے تیار کر کے میز پر رکھتا تھا۔ میری زندگی بڑی ہموار گزرتی تھی۔ آمدن بہت معقول تھی۔ بینک میں لاکھوں افغانی روپے جمع تھے۔ لیکن۔“

شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

”لیکن کہہ کر آپ چپ ہو گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ آپ پھر بھی ناخوش تھے۔“

شاہ صاحب نے اعتراف کیا

"جی ہاں! میں ان تمام آسائشوں کے باوجود ناخوش تھا۔ اس لیے کہ میں اکیلا تھا۔ مجرد تھا۔ اگر میری دکان میں عورتیں اور لڑکیاں زیادہ نہ آتیں تو بہت ممکن ہے کہ مجھے اپنے تجرد کا احساس نہ ہوتا۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ کابل کی ہر صاحب ثروت عورت میری دکان میں آتی تھی۔ دکان میں داخل ہوتے ہی یہ عورتیں اور لڑکیاں اپنا برقع اتار کر ایک طرف رکھتیں اور سودا خریدنے میں مصروف ہو جاتیں۔ منٹو صاحب! آپ کا شاید یہ خیال ہو کہ وہ بڑا شرعی قسم کا لباس پہنتی ہوں گی، مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یوں تو وہاں کی عورتیں اور لڑکیاں پردہ کرتی ہیں مگر لباس ٹھیٹ یورپین پہنتی ہیں۔ سکرٹ، کٹے ہوئے بال، رنگے ہوئے ناخن، پنڈلیاں ننگی۔ جب وہ میری دکان میں آتی تھیں تو اپنے برقعے اتار کر ایک طرف رکھ دیتی تھیں اور مال دیکھنے میں مصروف ہو جاتی تھیں۔"

شاہ صاحب نے بولنا بند کیا تو میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ کو ان میں سے کسی سے محبت تو یقیناً ہو گئی ہو گی؟"

شاہ صاحب بہت سنجیدہ ہو گئے۔

"جی ہاں! ایک لڑکی سے ہو گئی تھی جو اپنا برقع نہیں اتارتی تھی، حتیٰ کہ نقاب بھی نہیں اٹھاتی تھی۔"

میں نے ان سے پوچھا۔

"کون تھی وہ؟"

انھوں نے جواب دیا۔

"ایک بہت بڑے گھرانے سے متعلق تھی۔ اس کا باپ فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ بڑا سخت گیر۔ مجھے اس سے صرف اس لیے محبت ہوئی کہ وہ ہاتھوں کے علاوہ اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں دکھاتی تھی۔"

میں نے پوچھا۔

"اس کی کیا وجہ؟"

شاہ صاحب نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں، اور نہ میں نے اس سے کبھی اس بارے میں استفسار ہی کیا۔ لیکن میرے تصور میں وہ انتہا درجے کی حسین تھی۔ گوری چٹی۔ جسم خواہ برقع میں لپٹا ہو، لیکن اس کے تناسب کے متعلق اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں نے چور آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ جوانی کا آدرش مجسمہ ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ چند منٹوں کے لیے میری دکان میں آتی تھی۔ چیزیں خریدنے اور ان کی قیمتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں چند منٹ صرف کرتی تھی اور چلی جاتی تھی۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا۔

"یہ سلسلہ کب تک جاری رہا۔"

قریب کے چھ مہینے تک مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں۔ میں اس سے بہت مرعوب تھا اس لیے وہ دوسروں سے مختلف تھی۔ اس میں ایک عجیب قسم کی رعونت تھی۔ میں اس کو بے طرح گھورتا تھا، حالانکہ یہ شائستگی نہیں تھی لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ منٹو صاحب! ایک دن میں دکان میں بیٹھا تھا اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے ریسیور اٹھایا اور مجھ سے کہا کہ کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ کوئی گاہک ہو گی اور نئے مال کے متعلق پوچھنا چاہتی ہو گی۔ اٹھ کر میں نے ریسیور ہاتھ میں لیا اور پوچھا۔ مادام! آپ کیا چاہتی ہیں؟ ادھر سے آواز آئی کیا آپ سید مظفر علی ہیں؟ میں نے جواب دیا، جی ہاں۔ ارشاد! اب میں نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ اسی کی تھی۔ اسی کی جو میری دکان میں برقع نہیں اتارتی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ منٹو صاحب! یہ عاشق ہونا بھی ایک عجیب لعنت ہے۔"

یہ سن کر میں مسکرا دیا۔

"آپ ٹھیک فرماتے ہیں شاہ صاحب۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اس لعنت میں ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔"

شاہ صاحب کو بہت افسوس ہوا۔

"حد ہو گئی۔ انسان اپنی جوانی میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور عشق میں گرفتار ہوتا ہے۔ خیر، آپ کو ابھی تک عشق نہیں ہوا تو خدا کرے کہ بہت جلد ہو جائے، کیوں کہ یہ مرض بہت دلچسپ ہے۔"

میں نے مسکرا کر شاہ صاحب سے کہا۔

"آپ اپنی داستان بیان کیجیے۔ مجھے عشق ہو گا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اس کی پوری روداد سنا دوں گا۔"

شاہ صاحب کرسی پر سے اٹھ کر پلنگڑی پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

”منٹو صاحب۔ میں اس لڑکی کے عشق میں اس بری طرح گرفتار ہوا کہ ورزش کرنا بھول گیا۔ وہ میری دکان پر اکثر آتی تھی۔ میں اس کو گھورتا تھا۔ لیکن دیکھیے میرا دماغ کتنا خراب ہو گیا ہے، یہ اسی عشق خانہ خراب کا باعث ہے۔ میں آپ سے اس کے ٹیلی فون کی بات کر رہا تھا۔ جب میں نے ریسیور اٹھایا اور اس کی آواز پہچان لی تو اس نے مجھ سے کہا۔

”دیکھو میں جب بھی تمہاری دکان پر آتی ہوں، تم مجھے گھورتے ہو۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو، تو ٹھیک ہو جاؤ ورنہ تمہارے حق میں برا ہو گا۔ منٹو صاحب! میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں دیر تک گونگے ریسیور کو کان کے ساتھ لگائے کھڑا رہا، اور سوچتا رہا کہ اس دھمکی کا مطلب کیا ہے؟“

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔

”کیا وہ دھمکی اصلی تھی؟“

”جی ہاں۔ چوتھے روز وہ میری دکان میں آئی تو میں نے اس کی نقاب کی طرف پھر انہی نگاہوں سے دیکھا تو اس نے جھنجھلا کر میرے ملازموں کے سامنے مجھ سے کہا۔

”تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم مجھے اس طرح دیکھتے ہو“

۔ میں سُن ہو گیا۔ لیکن اس نے چند چیزیں خریدیں۔ دام دیے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی۔“

میں شاہ صاحب کی داستان میں کافی دلچسپی لے رہا تھا۔

”عجیب لڑکی تھی۔ آپ سے اسے نفرت بھی تھی، مگر اس کے باوجود آپ کی دکان میں آتی تھی۔“

شاہ صاحب نے آنکھیں کھولیں۔

”منٹو صاحب! یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی نفرت و حقارت مصنوعی ہے دراصل وہ میری محبت سے متاثر ہو چکی ہے اور محض بناوٹ کے طور پر غصے کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن جب ایک روز اس نے مجھے بہت زور سے لعن طعن کی تو میں سرد ہو گیا۔ پر اس کی محبت تھی جو میرے دل سے جاتی ہی نہیں تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ تم عجیب بے وقوف ہو۔ ایک لڑکی جس کی تم نے شکل نہیں دیکھی۔ جو تم سے نفرت کرتی ہے، تم اس سے عشق فرما رہے ہو۔ باز آؤ، تمہارا کاروبار ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔ سارے افغانستان میں تمہاری ساکھ ہے۔ یہ کیا جھک مار رہے ہو۔ لیکن منٹو صاحب! عشق بہت بری بلا ہے۔ میں اس سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکا۔“

میں نے ان سے کہا۔

”آپ خواہ مخواہ داستان طویل بناتے جا رہے ہیں۔ انجام پر پہنچیے۔“

شاہ صاحب پلنگڑی پر سے اٹھے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

”حضرت! ایسی داستانیں اکثر طویل ہوا کرتی ہیں۔ عشق ایک مرض ہے اور جب تک طول نہ پکڑے، مرض نہیں ہوتا۔ محض ایک مذاق ہوتا ہے۔ خیر! اب جب کہ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی داستان طویل نہ بناؤں تو مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ میرا عشق جب بہت شدت اختیار کر گیا تو ایک روز میں بے اختیار رونے لگا۔ میرے شہر امرتسر کا ایک باشندہ سردار بلونت سنگھ تھا جو مجیٹھ کے ایک اچھے خاندان کا فرد تھا۔ وہ کابل میں ایک انجینئرنگ فرم میں ملازم تھا۔ کھانے پینے والا آدمی تھا، اس لیے وہ ہر مہینے مجھ سے پچاس ساٹھ روپے قرض لے جاتا تھا۔ مزید قرض لینے کی غرض ہی سے وہ اس وقت میری دکان میں آیا، جب کہ میری آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ میرے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے معلوم نہیں مجھ سے کیا پوچھا اور میں نے جانے کیا جواب دیا۔ لیکن جب اس نے مجھ سے یہ کہا۔

”دوست! تم کو کوئی روگ لگ گیا ہے۔“

تو میں چونک پڑا، نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا اپنی گھنی مونچھوں کے اندر مسکرایا۔ تم جھوٹ بولتے ہو، صاف صاف بتاؤ، تمہیں یہاں کسی سے عشق ہوا ہے۔ میں خاموش رہا تو وہ پھر بولا، دیکھو اگر کوئی مشکل درپیش ہے تو ہم سب ٹھیک کر دیں گے۔ جب اس نے اسی قسم کی چند اور باتیں کیں تو میں نے سارا معاملہ اس کو بتا دیا۔“

میں نے پوچھا۔

”تو اس نے مشکل آسان کرنے کا کیا گُر بتایا؟“

شاہ صاحب نے کہا۔

”اس نے مجھے ایک منتر بتایا۔“

”منتر“!

”جی ہاں۔“

”آپ سیّد ہیں۔ کیا آپ منتر جنتر پر ایمان لا سکتے ہیں؟“

شاہ صاحب نے کہا۔

”لانا تو نہیں چاہیے تھا کہ یہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن اس وقت سردار بلونت سنگھ کا مشورہ ماننا ہی پڑا، اس لیے کہ عشق بری بلا ہے۔ اس نے مجھے ایک منتر بتایا کہ سات رنگوں کے پھول لو۔ ان میں سے ہر ایک پر یہ منتر پڑھ کر پھونکو اور منگل کے روز اسی لڑکی کو کسی نہ کسی طریقے سے سنگھا دو۔ یہ منتر مجھے ابھی تک یاد ہے۔“

میں نے ان سے کہا۔

”ذرا سنایئے تو“!

شاہ صاحب نے ایک لحظے کے لیے اپنے حافظے کو ٹٹولا اور کہا: کورو دس مکھیا دیوی پُھل کھڑے پُھل ہسے پُھل چگے ناہر سنگھ پیارے جو کوئی لے پھولوں کی باس کبھی نہ چھوڑے ہمارا ساتھ ہمیں چھوڑا کسی اور کو کرے پیٹ پُھول بھسم ہو مرے دہائی سلیمان پیر پیغمبر کی! میں نے یہ منتر سنا تو مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا جب میں نے منتروں کی ایک کتاب خریدی تھی اور اس میں سے ایک منتر ازبر اس غرض سے کیا تھا کہ میں اسکول کے تمام امتحانوں میں پاس ہوتا چلا جاؤں۔ یہ منتر مجھے اب تک یاد ہے۔ اونگ نما کا مشیری اُتما دے بھرینگ پر اسواہ۔ لیکن اس کے پڑھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ میں نے اس منتر کا ذکر شاہ صاحب سے نہ کیا اور ان سے پوچھا۔

”تو آپ نے سات رنگ کے پھولوں پر یہ منتر پڑھا؟“

”جی ہاں۔ میں نے سات رنگ کے پھول سوموار کو اکٹھے کیے۔ ان پر یہ منتر پڑھا اور اس لڑکی کو ٹیلی فون کیا کہ میری دکان میں چیکوسلواکیا سے بہت اچھا مال آیا ہے۔ منگل کو وہ آ کے دیکھ لے۔“

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔

”کیا وہ آئی؟“

”جی ہاں۔ وہ آئی۔ اس نے مجھے ٹیلی فون پر کہہ دیا تھا کہ وہ آئے گی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ ٹھیک پانچ بج کر پانچ منٹ پر آئی اور اس نے چیکوسلواکیا کے مال کے متعلق استفسار کیا۔ غرض یہ ہے کہ مال وال کا قصہ بالکل فراڈ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ملازموں نے ابھی تک پیٹیاں نہیں کھولیں، آپ کل تشریف لایئے گا۔ وہ بہت جز بز ہوئی۔ میں منتر پڑھے پھولوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتفاق کی بات کہ اس نے بھی ان پھولوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا یہ پھول تمہاری میز پر کہاں سے آ گئے؟۔ میں نے جواب دیا یہ میں نے آپ کے لیے خریدے تھے۔ اگر آپ کو پسند ہوں۔ میرا مطلب ہے اگر آپ کو ان کی خوشبو پسند ہو تو آپ انھیں قبول فرمائیں۔ اس نے وہ سات پھول اٹھائے اور انھیں سونگھا۔“

میں نے ان سے پوچھا۔

”اس لڑکی کا ردعمل کیا تھا؟“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔

”اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ یہ پھول ہیں؟ ان میں نہ تو خوشبو ہے نہ بدبو۔ بہر حال، اس نے وہ پھول سونگھے۔ چند چیزیں خریدیں اور چلی گئی۔ شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا میری دکان پر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہو، وہ پھول سنگھا دیے؟۔ میں نے اس سے کہا سنگھا تو دیے لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ سردار بلونت سنگھ ہنسا۔ اس نے بڑے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا دوست! اب تمہارا کام سمجھو کہ پندرہ آنے ہو گیا ہے۔“

مجھے بڑی حیرت تھی کہ منتر کے ذریعے ایسا کام پندرہ آنے کیوں کر ہو سکتا ہے، مگر سیّد صاحب نے کہنا شروع کیا۔

”منٹو صاحب! آپ یقین مانیے کہ میرا کام پندرہ آنے مکمل ہو گیا۔ دوسرے دن کوکو جان کا ٹیلی فون آیا کہ وہ کچھ چیزیں خریدنے کے لیے آ رہی ہے۔ میں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ کوئی چیز خریدنا نہیں چاہتی تھی۔ بہت دیر تک وہ میری دکان میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی، تم سے میں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے گھورا نہ کرو۔ اور وہ جو تم نے پھول سنگھائے تھے، اس کا کیا مطلب تھا۔؟“

میں نے کوکو جان سے لکنت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں۔ میں۔ وہ پھول جو تھے۔ پھول تھے۔ میں نے۔ میں نے۔ مال جو چیکوسلواکیہ سے آیا تھا، کھلا ہوا نہیں تھا، اس لیے میں نے وہ پھول آپ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ کوکو جان برقع میں سخت مضطرب تھی۔ اس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا۔

”تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے؟“

۔میں نے اس سے بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

”کیا آپ کو اس سے کوئی تکلیف ہوئی۔“

وہ بڑے گرم انداز میں بولی

”تکلیف۔؟ میں ساری رات وہ سات پھول دیکھتی رہی ہوں۔ پھول آتے تھے اور جب میں انھیں حاصل کرنا چاہتی تھی تو وہ مجھ سے پرے ہٹ جاتے تھے۔ یہ کیسے پھول تھے؟“

میں نے جواب دیا۔

”میرے وطن کے تھے۔ چونکہ میرے وطن کے تھے، اس لیے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ رات بھر آپ کو کیوں نظر آتے اور ستاتے رہے۔“

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔

”یہ پھول آپ نے کہاں سے منگوائے تھے؟“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔

”جی! منگوائے کہاں سے تھے، وہیں افغانستان کے تھے۔ نہایت واہیات قسم کے پھول جن میں خوشبو نام کو بھی نہیں تھی۔ شام کو سردار بلونت سنگھ آیا، مزید قرض لینے کے لیے۔ اس نے مجھ سے قرض لینے سے پہلے دریافت کیا۔

”کہیے شاہ صاحب! اس معاملے کا کیا ہوا؟“

میں نے اس کو ساری بات بتادی۔ وہ قرض لینا بھول گیا۔ اپنا بالوں بھرا ہاتھ میرے کندھے پر زور سے مار کر چلایا۔

”شاہ جی! آپ کا کام سولہ آنے ہو گیا ہے۔ وسکی کی ایک بوتل منگائیے۔“

شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انھوں نے وسکی کی بوتل کے علاوہ ایک ڈبہ سگریٹوں کا بھی منگوایا، جس میں سے سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا تمباکو نوشوں کے ٹھیٹ انداز میں پے در پے کئی سگریٹ پھونکتے رہے۔ جب جانے لگے تو انھوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ دیکھو ابھی توڑی سی کسر باقی ہے۔ اگلے منگل کو تم اور سات پھول لو اور ان پر وہی منتر پڑھ کر اس لڑکی کو سنگھا دو۔ بیڑا پار ہو جائے گا۔ شاہ صاحب بہت پریشان ہوئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اب کی کوکو جان کو پھول کیسے سنگھا سکیں گے جب کہ وہ اس معاملے کے متعلق شاکی تھی۔ لیکن معاملہ عشق کا تھا، اس لیے شاہ صاحب موت کے منہ میں جانے کے لیے بھی تیار تھے۔ شاہ صاحب نے پشاور سے پھول منگوائے۔ ان میں سے سات منتخب کیے اور ہر ایک پر منتر پڑھا اور اپنے میز کے گلدان میں رکھ دیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی دکان میں جابجا گلدان رکھوائے اور ان میں پھول سجا دیے۔ پیر کو صاحب نے کوکو جان کو ٹیلی فون کیا اور اس سے پھر جھوٹ بولا کہ چیکوسلواکیہ کا مال کھل گیا ہے۔ آپ آیئے اور دیکھ لیجیے۔ کوکو جان آئی، مگر مال وال موجود نہیں تھا۔ شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے بوکھلائے، پھر ذرا ہوش سنبھال کر اپنے نوکروں کو لعن طعن کی کہ تم نے ابھی تک مال کیوں نہیں کھولا۔

”کوکو جان کے ساتھ اس کی والدہ بوبو جان بھی تھی۔ وہ ایک طرف ٹائلٹ کا سامان دیکھنے میں مصروف تھی۔ کوکو جان نے جب دکان میں جابجا پھول دیکھے تو وہ متعجب ہونے کے علاوہ مضطرب بھی ہوئی۔“

میری میز پر وہ خاص پھول پڑے تھے۔ وہ ان کے پاس آئی، گلدان میں سے اٹھا کر اس نے انھیں سونگھا اور مجھ سے کہا۔

”یہ افغانستان کے پھول نہیں۔“

میں نے جواب دیا۔

”جی ہاں۔ یہ میرے وطن کے ہیں۔ اور میں نے خاص آپ کے لیے منگوائے ہیں۔ بوبو جان خرید و فروخت میں مشغول تھی۔ اس دوران میں کوکو جان سے میں نے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ وہ سخت ناراض ہوئی اور اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی۔ شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا آیا۔ اس سے بات چیت ہوئی۔ میں نے اس کو دس روپے قرض دیے۔ جب اس نے روپے اپنی جیب میں ڈالے تو مجھ سے پوچھا آج منگل ہے۔ وہ پھول سنگھا دیے تھے آپ نے؟ میں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ سردار بلونت سنگھ نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ زور سے میرے ہاتھ پر مارا اور کہا شاہ جی، اب کام سترہ آنے پورا ہو گیا ہے۔ وسکی کی ایک بوتل منگاؤ۔“

شاہ صاحب نے وسکی کی بوتل منگوائی۔ سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا نے آدھی دکان میں پی اور آدھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔

”دوسری دفعہ پھول سنگھانے سے کیا نتیجہ برآمد ہوا؟“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔

”وہ بہت بے چین ہو گئی۔ اسے دن رات اتنے پھول نظر آنے لگے کہ ایک دن وہ سخت اضطراب کی حالت میں آئی۔ برقع جو اس نے کبھی اتارا نہیں تھا، کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”دیکھو شاہ! تم نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا ہے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو مجھے پہلی بار نظر آیا تھا منٹو صاحب! میں نے اپنی زندگی میں اس جیسی حسین لڑکی اب تک نہیں دیکھی۔ میں اس کو دیکھتا رہا۔ اس نے بڑے تیز و تند لہجے میں کہا۔

”تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے تھے۔ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔ دن ہو یا رات، ہر وقت مجھے وہ تمہارے پھول دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہوں۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میرے والدین عنقریب میری شادی کر رہے ہیں۔ تم نے مجھ پر کیا جادو پھونکا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے میرے میز پر سے گلدان میں سے پھول نکالے اور فرش پر پھینک کر اپنی سینڈل سے مسل دیے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ناراض ہونے کے باوجود ناراض نہیں تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس سے باتیں کروں۔ لیکن مجھے اس کا یقین نہیں تھا اس لیے خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر غصے کی حالت میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد اس نے برقع پہنا اور چلی گئی۔
“

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔

”تو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا کا منتر کام کر گیا“!

”جی ہاں، کام کر گیا۔ اس کو پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ یہ سب بکواس ہے، مگر کوکو جان کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ منتر اپنا اثر کر گیا ہے، حالانکہ جو منتر آپ سن چکے ہیں، اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ اثر کرے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ جب پھر میری دکان میں آئی تو برقع اتار کر مجھ سے بغل گیر ہو گئی اور رونا شروع کر دیا۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ چوما۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری میز پر گلدان میں جو پھول پڑے تھے، اس نے نکالے اور انھیں نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ برقع پہن کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ داستان کافی طوالت پکڑ رہی تھی۔ میں نے صاحب سے کہا۔

”آپ مختصر فرمایئے کہ انجام کیا ہوا۔ کیا وہ لڑکی آپ کو مل گئی؟“

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری۔

”جی نہیں۔ اس کی شادی ہو گئی۔ مگر حجلہ ء عروسی میں داخل ہوتے ہی معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ گری اور گرتے ہی مر گئی۔ اس کے ہاتھ میں سات پھول تھے مختلف رنگوں کے۔ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی پلنگڑی کے ساتھ تپائی پر پیتل کے پھولدان میں سات مختلف رنگوں کے پھول اڑسے ہوئے تھے۔

بھنگن

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوبھنگن

”پرے ہٹیے۔“

”کیوں؟“

”مجھے آپ سے بو آتی ہے۔“

”ہر انسان کے جسم کی ایک خاص بو ہوتی ہے۔ آج بیس برسوں کے بعد تمہیں اس سے تنفر کیوں محسوس ہونے لگا؟“

”بیس برس۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ میں نے اتنا طویل عرصہ کیسے بسر کیا ہے۔“

”میں نے کبھی آپ کو اس عرصے میں تکلیف پہنچائی؟“

”جی کبھی نہیں۔“

”تو پھر آج اچانک آپ کو مجھ سے ایسی بو کیوں آنے لگی جس سے آپ کی ناک جو ماشاء اللہ کافی بڑی ہے، اتنی غضب ناک ہو رہی ہے؟“

”آپ اپنی ناک تو دیکھیے۔ پکوڑا سی ہے۔“

”میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ پکوڑے، تم جانتی ہو، مجھے بہت پسند ہیں۔“

”آپ کو تو ہر واہیات چیز پسند ہوتی ہے۔ کوڑے کرکٹ میں بھی آپ دلچسپی لیتے ہیں۔“

”کوڑا کرکٹ ہمارا ہی تو پھیلایا ہوا ہوتا ہے۔ اس سے آدمی دلچسپی کیوں نہ لے۔ اور تم جانتی ہو، آج سے دس سال پہلے جب تمہاری ہیرے کی انگوٹھی گم ہوگئی تھی تو اسی کوڑے کے ڈھیر سے میں نے تمہیں تلاش کر کے دی تھی۔“

”بڑا کرم کیا تھا آپ نے مجھ پر۔“

”بھئی کرم کا سوال نہیں۔ فارسی کا ایک شعر ہے خاکساراں را بہ حقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشند

”میں خاک بھی نہیں سمجھی۔“

”یہی وجہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا۔ ورنہ بیس برس ایک آدمی کو پہچاننے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔“

”ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟“

”تم دکھ کی بات کرو۔ بتاؤ میں نے کون سا دکھ تمہیں اس عرصے میں پہنچایا؟“

”ایک بھی نہیں۔“

”تو پھر یہ کہنے کا کیا مطلب تھا۔ ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟“

”آپ میرے قریب نہ آیئے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔“

”اس غصے میں نیند آجائے گی تمہیں؟“

”خاک آئے گی۔ بہر حال۔ آنکھیں بند کر کے لیٹی رہوں گی اور۔“

”اور کیا کریں گی؟“

”لیٹی اس روز پر آنسو بہاؤں گی جب میں آپ کے پلّے باندھی گئی۔“

”تمہیں یاد ہے وہ دن کیا تھا۔ سن کیا تھا۔ وقت کیا تھا؟“

”میں کبھی وہ دن بھول سکتی ہوں۔ خدا کرے وہ کسی لڑکی پر نہ آئے۔“

”تم بتا تو دو۔ میں تمہاری یادداشت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔“

”اب آپ میرا امتحان کیا لیں گے۔ پرے ہٹیے۔ مجھے آپ سے بو آرہی ہے۔“

”بھی حد ہوگئی ہے۔ تمہاری اتنی لمبی ناک جو کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی، اس کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے تو اس کو بڑی بھینی بھینی خوشبو آنا چاہیے۔ تم نے مجھ سے ان بیس برسوں میں ہزاروں مرتبہ کہا کہ آپ جب کسی کمرے میں داخل ہوں اور وہاں سے نکل جائیں تو میں پہچان جایا کرتی ہوں کہ آپ وہاں آئے تھے۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”دیکھو۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ تم مجھ پر یہ الزام نہ دھرو۔“

”واہ جی واہ، بڑے آئے آپ کہیں کے سچے۔ میرا سو روپے کا نوٹ آپ نے چرایا اور صاف مکر گئے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”دو جون سن انیس سو بیالیس کو۔ جب سلمیٰ میرے پیٹ میں تھی۔“

”یہ تاریخ تمہیں خوب یاد رہی۔“

”کیوں یاد نہ رہتی۔ جب آپ سے میری اتنی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ میں اندر کمرے میں پڑی تھی۔ آپ نے چابی بڑی صفائی سے میرے تکیے کے نیچے سے نکالی۔ دوسرے کمرے میں جا کر الماری کھولی اور اس میں جو سات سو پڑے تھے، ان میں سے ایک نوٹ اڑا کر لے گئے۔ میں نے جب دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد اٹھ کر دیکھا تو آپ سے چخ ہوئی، مگر آپ تھے کہ پروں پر پانی ہی نہیں لیتے تھے۔ آخر میں خاموش ہوگئی۔“

”یہ دو جون سن انیس سو بیالیس کی بات ہے۔ آج کل سن چون چل رہا ہے۔ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟“

”فائدہ تو ہر حالت میں آپ ہی کا رہتا ہے۔ میری ایک نیلم کی انگوٹھی بھی آپ نے غائب کر دی تھی، لیکن میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا تھا۔“

”دیکھو، میں تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اس نیلم کی انگوٹھی کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

”اور اس سو روپے کے نوٹ کے متعلق۔“

”اب تمہاری جان کی قسم کھائی تو سچ بتانا ہی پڑے گا۔ میں نے۔ میں نے چرایا ضرور تھا، مگر صرف اس لیے کہ اس مہینے مجھے تنخواہ دیر سے ملنے والی تھی اور تمہاری سالگرہ تھی۔ تمہیں کوئی تحفہ تو دینا تھا۔ ان بیس برسوں میں تمہاری ہر سالگرہ پر میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتا رہا ہوں۔“

”بڑے تحفے تحائف دیے ہیں آپ نے مجھے۔“

”ناشکری تو نہ بنو“!

”میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں، آپ پرے ہٹ جائیے۔ مجھے آپ سے بو آتی ہے۔“

”کس کی؟“

”یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

”میں نے خود کو کئی مرتبہ سونگھا ہے، مگر میری پکوڑا ایسی ناک میں ایسی کوئی بُو نہیں گھسی جس پر کسی بیوی کو اعتراض ہو سکے۔“

”آپ باتیں بنانا خوب جانتے ہیں۔“

”اور باتیں بگاڑنا تم۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، آج تم اس قدر ناراض کیوں ہو۔“

”اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے“!

”میں اس وقت قمیض پہنے نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“

”سخت گرمی ہے۔“

”سخت گرمی ہو یا نرم۔ آپ کو قمیض تو نہیں اتارنا چاہیے تھی۔ یہ کوئی شرافت نہیں۔“

”محترمہ! آپ نے بھی تو قمیض اتار رکھی ہے۔ اپنے ننگے بدن کو ملاحظہ فرمائیے۔“

”اوہ۔ یہ میں نے کیا واہیات پن کیا ہے“!

”یہ واہیات پن تو آپ گرمیوں میں بیس برس سے کر رہی ہوں۔“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں۔“

”خیر، جھوٹ تو ہر مرد کی عادت ہوتی ہے۔“

”آپ مجھ سے دور ہی رہیں۔“

”کیوں؟“

”توبہ۔ لاکھ بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے بہت گندی بو آ رہی ہے۔“

”پہلے صرف بو تھی۔ اب گندی ہو گئی۔“

”خبردار! جو آپ نے مجھے ہاتھ لگایا“!

”اس قدر بیزاری آخر کیوں؟“

”میں اب آپ سے قطعاً بیزار ہو چکی ہوں۔“

”ان بیس برسوں میں تم نے کبھی ایسی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔“

”اب تو کر دیا ہے“!

”لیکن مجھے معلوم تو ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟“

”میں کہتی ہوں، مجھے مت چھوئیے“!

”تمہیں مجھ سے اتنی کراہت کیوں ہو رہی ہے؟“

”آپ ناپاک ہیں۔ بے حد ذلیل ہیں۔“

”دیکھو، تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔“

”آپ نے کم کی ہے۔ کوئی شریف آدمی آپ کی طرح ایسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔“

”کون سی؟“

”آج صبح کیا ہوا تھا؟“

”آج صبح۔ بارش ہوئی تھی۔“

”بارش ہوئی تھی۔ لیکن اس بارش میں آپ نے کس کو اپنی آغوش میں دبایا ہوا تھا؟“

”اوہ“

”بس اس کا جواب اب ’اوہ‘ ہی ہو گا۔ میں نے پکڑ جو لیا تھا آپ کو۔“

”دیکھو میری جان۔“

”مجھے اپنی جان وان مت کہیے۔ آپ کو شرم آنی چاہیے۔“

”کس بات پر۔ کس گناہ پر؟“

”میں کہتی ہوں آدمی گناہ کرے۔ لیکن ایسی گندگی میں نہ کرے۔“

”میں کس گندگی میں گرا ہوں؟“

آج صبح آپ نے اس۔ اس۔“

”کیا؟“

”اس بھنگن کو۔ جوان بھنگن کو جو مٹھائی والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“

”لاحول ولا۔ تم بھی عجیب عورت ہو۔ وہ غریب حاملہ ہے۔ بارش میں جھاڑو دیتے ہوئے اس کو غش آیا اور گر پڑی۔ میں نے اس کو اٹھایا اور اس کے کوارٹر میں لے گیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مر گئی؟“

”ہائے۔ بے چاری۔ میں تو ٹھنڈی برف ہو گئی ہوں۔“

”میرے قریب آجاؤ۔ میں قمیض پہن لوں؟“

”اس کی کیا ضرورت ہے، تمہاری قمیض میں ہوں۔“

بُو

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبُو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ساگوان کے اس اسپرنگ دار پلنگ پر جو اب کھڑکی کے پاس سے تھوڑا ادھر سرکا دیا گیا تھا ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چپٹی ہُوئی تھی۔ کھڑکی کے پاس باہر پیپل کے نہائے ہُوئے پتے رات کے دودھیا اندھیرے میں جھومروں کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ اور شام کے وقت جب دن بھر ایک انگریزی اخبار کی ساری خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد کچھ سُنانے کے لیے وہ بالکنی میں آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لیے املی کے پیڑ کے نیچے کھڑی تھی، کھانس کھانس کر اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اس کے بعد ہاتھ کے اشارے سے اوپر بُلا لیا تھا۔ وہ کئی دن سے شدید قسم کی تنہائی سے اُکتا گیا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی تقریباً تمام کرسچین چھوکریاں جو سستے داموں مل جایا کرتی تھیں عورتوں کی انگریزی فوج میں بھرتی ہو گئی تھیں، ان میں سے کئی ایک نے فورٹ کے علاقے میں ڈانس اسکول کھول لیے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی۔ رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی کا سبب تو یہ تھا کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں اور دوسرا یہ کہ فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ اور خوبصورت نوجوان اس پر فورٹ کے لگ بھگ تمام کلبوں کے دروازے بند کر دیے تھے۔ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔ جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج محل ہوٹل کی کئی مشہور و معروف کرسچین لڑکیوں سے جسمانی تعلقات قائم کر چکا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اس قسم کے تعلقات کی کرسچین لڑکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ معلومات رکھتا تھا جن سے یہ چھوکریاں عام طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی بیوقوف سے شادی کر لیتی

ہیں۔ رندھیر نے بس یوں ہی ہیجل سے بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے پر بلایا تھا۔ ہیجل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح وردی پہن کر کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویئے سے جما کر باہر نکلتی تھی اور لڑکپن سے چلتی تھی جیسے فٹ پاتھ پر چلنے والے سبھی لوگ ٹاٹ کی طرح اس کے راستے میں بچھے چلے جائیں گے۔ رندھیر سوچتا تھا کہ آخر کیوں وہ ان کرسچین چھوکریوں کی طرف اتنا زیادہ مائل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام دکھائی جاسکنے والی اشیا کو نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کیے بغیر اپنے کارناموں کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے بیتے پرانے رومانسوں کا حال سُنا دیتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن کسی دوسری لڑکی میں بھی تو یہ خاصیتیں ہو سکتی ہیں۔ رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بُلایا تو اسے کسی طرح بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ سُلالے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچاری کو نمونیا ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا۔

”یہ کپڑے اُتار دو۔ سردی لگ جائے گی۔“

وہ رندھیر کی اس بات کا مطلب سمجھ گئی تھی کیوں کہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے لیکن بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا لہنگا اتار دیا۔ جس پر میل بھیگنے کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ لہنگا اتار کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی تنگ بھنچی بھنچی چولی اتارنے کی کوشش کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ وہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے لیکن سمٹیلے گڑھے میں چھپ گئی تھی۔ دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بھیگنے کی وجہ سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک ہار کر بیٹھ گئی تو اس نے مراٹھی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا۔

”میں کیا کروں۔ نہیں نکلتی۔“

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گانٹھ کھولنے لگا۔ جب نہیں کھلی تو اس نے چولی کے دونوں سروں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ گانٹھ سراسر پھیل گئی اور اس کے ساتھ ہی دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں ایک دم سے نمایاں ہو گئیں۔ لمحہ بھر کے لیے رندھیر نے سوچا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر، نرم نرم گندھی ہُوئی مٹی کو ماہر کمھار کی طرح دو پیالوں کی شکل بنا دی ہے۔ اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدگداہٹ، وہی دھڑکن، وہی گولائی، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمھار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ برتنوں میں ہوتی ہے۔ مٹمیلے رنگ کی جوان چھاتیوں میں جو بالکل کنواری تھیں۔ ایک عجیب و غریب قسم کی چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہوتے ہُوئے بھی چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر یہ ایسے دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی پر جل رہے تھے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح کپکپا رہے تھے۔ لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی میں شرابور ہو چکے تھے ایک گدلے ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چپٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے بدن کی گرمی اس کے جسم میں ایسی ہلچل سی پیدا کر رہی تھی جو سخت جاڑے کے دنوں میں نائیوں کے گرم حماموں میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔ دن بھر وہ رندھیر کے ساتھ چپٹی رہی۔ دونوں جیسے ایک دوسرے کے مڈ ہو گئے تھے۔ انھوں نے بہ مشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیوں کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہو رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری کی چھاتیوں پر ہوا کے جھونکوں کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور موٹے موٹے گول دانے جو چاروں طرف ایک سیاہ دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے ہوائی جھونکوں سے جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے پورے بدن میں ایک سرسراہٹ پیدا ہو جاتی کہ خود رندھیر بھی کپکپا اٹھتا۔ ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ ان کو بخوبی جانتا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم و نازک اور سخت سینوں سے اپنا سینہ ملا کر کئی کئی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ ساری باتیں سُنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کے لیے نہیں ہوتیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی تعلق قائم کر چکا تھا جو ساری محنت کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔ لیکن یہ گھاٹن لڑکی جو پیڑ کے نیچے بھیگی ہُوئی کھڑی تھی اور جسے اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا۔ مختلف قسم کی لڑکی تھی۔ ساری رات رندھیر کو اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بُو آتی رہی تھی۔ اس بُو کو جو بیک وقت خوشبو بھی تھی اور بدبُو بھی۔ وہ ساری رات پیتا رہا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، جسم کے ہر حصّے سے یہ جو بدبُو بھی تھی اور خوشبو بھی، رندھیر کے پورے سراپا میں بس گئی تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز اتنی قریب نہ ہوتی اگر اس کے جسم سے یہ بُو نہ اُڑتی۔ یہ بو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ رہی تھی۔ اس کے تمام نئے پرانے محسوسات میں رچ گئی تھی۔ اس بُو نے اس لڑکی اور رندھیر کو جیسے ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ ان بیکراں گہرائیوں میں اُتر گئے تھے جہاں پہنچ کر انسان ایک خالص انسانی تسکین سے محظوظ ہوتا ہے۔ ایسی تسکین جو لمحاتی ہونے پر بھی جاوداں تھی۔ مسلسل تغیر پذیر ہونے پر بھی مضبوط اور مستحکم تھی۔ دونوں ایک ایسا جواب بن گئے تھے جو آسمان کے نیلے خلا میں مائل پرواز رہنے پر بھی دکھائی دیتا رہے۔ اس بُو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی رندھیر بخوبی سمجھتا تھا لیکن سمجھتے ہُوئے بھی وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح کبھی مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی بُو نکلتی ہے۔ لیکن نہیں، وہ بُو کچھ اور طرح کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کی آمیزش نہیں تھی، وہ بالکل اصلی تھی۔ عورت اور مرد کے جسمانی تعلقات کی طرح اصلی اور مقدس۔ رندھیر کو پسینے کی بُو سے سخت نفرت تھی۔ نہانے کے بعد وہ ہمیشہ بغلوں وغیرہ میں پاوڈر چھڑکتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے وہ بدبو جاتی رہے لیکن تعجب ہے کہ اس نے کئی بار۔ ہاں

کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہیں آئی بلکہ عجیب قسم کی تسکین کا احساس ہوا۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اسے پہچانتا ہے۔ اس کے معنی بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو نہیں سمجھا سکتا۔ برسات کے یہی دن تھے۔ یوں ہی کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تو پیپل اسی طرح نہارہے تھے۔ ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہُوئی تھیں۔ اس میں دبی دبی دُھندلی سی روشنی سمائی ہُوئی تھی۔ جیسے بارش کی بوندوں کا ہلکا پھلکا غبار نیچے اُتر آیا ہو۔ برسات کے یہی دن تھے جب میرے کمرے میں ساگوان کا صرف ایک ہی پلنگ تھا۔ لیکن اب اس کے ساتھ ایک اور پلنگ بھی تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن لمبے تھے۔ موسم بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ بارش کی بوندوں کے ہمراہ ستاروں کی طرح اس کا غبار سا اسی طرح اتر رہا تھا لیکن فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔ دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے پتوں پر بارش کی بوندوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ایک گوری چٹی لڑکی جسم کو چادر میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے قریب قریب سو گئی۔ اس کی سرخ ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی جس کے گہرے سرخ رنگ کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ پلنگ پر اس کے دوسرے اُتارے کپڑے بھی پڑے تھے۔ سنہری پھول دار جمپر، انگیا، جانگیا اور دوپٹہ۔ سرخ تھا۔ گہرا سرخ اور ان سب میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہُوئی تھی۔ لڑکی کے سیاہ بالوں میں مکیش کے ذرّے دُھول کے ذرّوں کی طرح جمے ہُوئے تھے۔ چہرے پر پاؤڈر، سرخی اور مکیش کے ان ذرّوں نے مل جل کر ایک عجیب رنگ بکھر دیا تھا۔ بے نام سا اُڑا اُڑا رنگ اور اس کے گورے سینے پر کچے رنگ کے جگہ جگہ سرخ دھبے بنا دیے تھے۔ چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں۔ ان میں ہلکا ہلکا نیلا پن بھی تھا۔ بغلوں کے بال منڈے ہُوئے تھے جس کی وجہ سے وہاں سرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر اس لڑکی کی طرف دیکھ دیکھ کر کئی بار سوچ چکا تھا۔ کیا ایسا نہیں لگتا جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اس کو لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہو۔ کتابوں اور چینی کے برتنوں پر ہلکی ہلکی خراشیں پڑ جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے جسم پر بھی کئی نشان تھے۔ جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو اس کی پیٹھ پر اور سامنے سینے پر نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے چاروں طرف کس کر باندھے ہوئے ازار بند کا نشان۔ وزنی اور نکیلے جڑاؤ نیکلس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ جیسے ناخنوں سے بڑے زور سے کھجایا گیا ہو۔ برسات کے وہی دن تھے۔ پیپل کے نرم نرم پتوں پر بارش کی بوندیں گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی رندھیر اس دن ساری رات سنتا رہا تھا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہُوئی تھی۔ رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ کی طرح سفید سینے پر ہُوا کے جھونکوں کی طرح پھرتے رہے تھے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے بدن میں کئی چنگاریاں دوڑتی ہُوئی محسوس کی تھیں۔ اس نازک بدن میں کئی جگہوں پر سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی اسے پتہ چلا تھا جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر رونگٹے نے اس لڑکی کے بدن کے چھڑے ہُوئے تاروں کی بھی آواز سُنی تھی۔ مگر وہ آواز کہاں تھی؟ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے بدن میں دیکھی تھی۔ وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے زیادہ ہوتی ہے، وہ پکار جو حلقۂ خواب سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔ رندھیر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بالکل قریب ہی پیپل کے نہاتے ہُوئے پتے تھرتھرا رہے تھے۔ وہ ان کی مستی بھر کپکپاہٹوں کے اس پار کہیں بہت دُور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں مٹھیلے بادلوں میں عجیب و غریب قسم کی روشنی گھلی ہُوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ٹھیک ویسے ہی جیسی اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اُسے نظر آتی تھی۔ ایسی پر اسرار گفتگو کی طرح دبی لیکن واضح تھی۔ رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی۔ جس کا جسم دودھ اور گھی میں گندھے میدے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی۔ اس کے نیند سے ماتے بدن سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ جو اب تھکی تھکی سی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور جنوں کی ہوئی خوشبو بہت بُری معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس تھی۔ ایک عجیب قسم کی جیسی بدہضمی کے ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداس۔ بے رنگ۔ بے چین۔ رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہُوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ جس طرح پھوٹے ہُوئے دودھ کے بے رنگ پانی میں سفید مردہ پھٹکیاں تیرنے لگتی ہیں اسی طرح اس لڑکی کے جسم پر خراشیں اور دھبے تیر رہے تھے اور وہ حنا کے عطر کی اوٹ پٹانگ خوشبو۔ رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بُو بسی ہُوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بنا کسی کوشش کے از خود نکل رہی تھی۔ وہ بو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دبی ہوئی تھی۔ جس میں سونگھے جانے کی کوشش شامل نہیں تھی۔ وہ خود بخود ناک کے اندر گھس کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ جاتی تھی۔ رندھیر نے آخری کوشش کے طور پر اس لڑکی کے دودھیا جسم پر ہاتھ پھیرا لیکن کپکپی محسوس نہ ہُوئی۔ اس کی نئی نویلی بیوی جو ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی بیوی تھی، جس نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور جو اپنے کالج کے سینکڑوں لڑکوں کے دلوں کی دھڑکن تھی۔ رندھیر کی کسی بھی حسّ کو نہ چھو سکی۔ وہ حنا کی خوشبو میں اُس بُو کو تلاش کر رہا تھا جو انھیں دنوں میں جب کہ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے میلے بدن سے آئی تھی۔

بی زمانی بیگم

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوبی زمانی بیگم

زمین شق ہو رہی ہے۔ آسمان کانپ رہا ہے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ آگ کے شعلوں میں دنیا ابل رہی ہے۔ زلزلے پر زلزلے آ رہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

”تمہیں معلوم نہیں؟“

”نہیں تو۔“

”لو سنو۔ دنیا بھر کو معلوم ہے۔“

”کیا؟“

”وہی زمانی بیگم۔ وہ موٹی چڈر۔“

”ہاں ہاں، کیا ہوا اسے“!

”وہی جو ہوتا ہے لیکن اس عمر میں شرم نہیں آئی بدبخت کو۔“

”یہ بدبخت زمانی بیگم ہے کون؟“

”ہائیں وہی اسکندر کی ہوتی سوتی۔ موئی نکھیائی چنگیز کے پاس رہی۔ ہلاکو کی داشتہ بنی۔ کچھ دن اس لنگڑے تیمور کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی۔ وہاں سے نکلی تو نپولین کی بغل میں جا گھسی۔ اب یہ موا ہٹلر باقی رہ گیا تھا۔“

”تو کیا اب ہٹلر کے گھر ہے؟“

”ہوا گھر گھاٹ کیسا۔ نباہ ہو سکتا ہے کبھی ایسی عورت کا۔“

”طلاق ہو گئی ہے کیا؟“

”تم کیسی باتیں کرتی ہو بُوا۔ طلاق تو وہاں ہو جو سہرے جلوؤں کی بیاہی ہو اور پھر ایسے مردوں کا کیا اعتبار ہے۔ دو دن مزے کیے اور چلو چھٹی۔“

”تو اب ہو کیا رہا ہے۔ یہ فضیحتہ کس بات کا۔“

”فضیحتہ کیا ہے پورے دنوں سے ہے۔ بچہ پیدا ہونے والا ہے۔“

”تو ہو کیوں نہیں چکتا۔“

”ہاں سچ تو یہ کوئی پلوٹھی کا تو ہے نہیں۔“

”ڈاکٹر آ رہے ہیں۔ دیکھو آج نہ کل ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر آتے رہے۔ لیکن بی زمانی کے بچہ پیدا نہ ہوا۔ درد و کرب کی لہروں میں اضافہ ہو گیا۔ زلزلے اور زیادہ زور سے آنے لگے۔ شعلوں کی زبانیں اور زیادہ تیز ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے کانفرنس کی۔ حکمت کی ساری کتابیں چھانی گئیں۔ طے ہوا کہ حاملہ کو طہران لے جائیں۔ وہاں روس کے ماہر ڈاکٹر کو بلایا جائے اور اس سے مشورہ کیا جائے۔ طہران میں خاص طور پر جلدی جلدی ایک میٹرنٹی ہوم تیار کیا گیا۔ بی زمانی بیگم درد سے تڑپتی رہی اور دنیا کے تین بڑے ڈاکٹر مشورہ کرتے رہے۔ ایک بولا۔

”صاحبان اس میں کوئی شک نہیں کہ ہونے والا بچہ ہمارا نہیں لیکن انسانیت کے نام پر ہمیں مریضہ کو اس مشکل سے نجات دلانا ہی پڑے گی۔“

دوسرا بولا۔

”ہم تین بڑے ڈاکٹر تین قسم کے طریقہ علاج کے ماہر ہیں۔ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک طریقہ علاج پر متفق ہوں۔ اگر ایسا ہو گیا تو بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا ہونا کوئی مشکل کام نہیں۔“

تیسرا بولا۔

”بالکل درست ہے۔ آیئے ہم فوراً یہ نیک کام شروع کر دیں۔“

تینوں طریقے ملا کر ایک اور طریقہ بنایا گیا۔ جس پر تینوں بڑے ڈاکٹر متفق ہو گئے۔ دنیا کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ مگر بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا نہ ہوا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔ بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا ابھی تک۔“

”بچہ تو پیدا ہو رہا تھا مگر اسے روک دیا گیا ہے۔“

”کیوں؟“

”ڈاکٹر سوچ رہے ہیں کہ اسے گود کون لے گا۔“

”ہوں“!

”تو فیصلہ کیا ہوا؟“

”تم کیسی باتیں کرتی ہو بُوا۔ ایسے معاملوں کا اتنی جلدی فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خیر چھوڑو اس قصے کو۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ جس کے ہاں اولاد نہیں وہ غریب گود لے لے گا۔ اولاد ہر ایک کے تھی۔ کسی کے ہاں چار بچے تھے۔ کسی کے ہاں پانچ اور کسی کے ہاں سات۔ اب فیصلہ کیسے ہو۔ ایک اور کانفرنس ہوئی۔ ڈمبارٹن اوکس میں ایک اور میٹرنٹی ہوم افراتفری میں بنایا گیا۔ تینوں بڑے ڈاکٹر وہاں جمع ہوئے۔ ہر ایک نے سوچا۔ ہر ایک نے معاملہ کی اہمیت سمجھنے کی کوشش کی۔ اور بی زمانی بیگم بستر پر پڑی درد سے کراہتی رہی۔ ایک بولا۔

”صاحبان۔ ہم صاحب اولاد ہیں۔ اس بچے کے وجود کے ہم ذمہ دار نہیں۔ لیکن انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم اس کی پیدائش میں ہر ممکن طریقے سے مدد کریں۔ آخر اس میں ہونے والے بچے کا کیا قصور ہے۔“

دوسرا۔

”ہم ڈاکٹر ہیں۔ ہمارا مذہب دوا ہے۔ ہم چاہیں تو اس ہونے والے ناخلف بچے ہی کو جس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ ایک فرمانبردار۔ اطاعت شعار۔ آزادی پسند اور انسانیت دوست نوجوان بنا سکتے ہیں۔“

تیسرا بولا۔ ’بالکل درست ہے۔ اس بچے کی پیدائش سے دنیا کا ایک بہت بڑا بوجھ دور ہو جائے گا۔ ہم ڈاکٹر ہیں۔ اپنے فرض سے ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔“

طے ہو گیا۔ ایک دستاویز پر انگوٹھے لگا دیے گئے کہ ہونے والے بچے کو یہ تینوں ڈاکٹر گود لیں گے۔ تینوں ملکر اس کی پرورش کریں گے۔ لیکن بی زمانی بیگم کی تکلیف پھر بھی رفع نہ ہوئی۔ وہ پڑی درد سے کراہتی رہی۔

”آخر یہ مصیبت کیا ہے؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”قصہ یہ ہے کہ بچے کو گود لینے کا تو فیصلہ ہو گیا ہے لیکن اس بی زمانی کا بھی تو کچھ بندوبست ہونا چاہیے۔“

”میں تو کہتی ہوں۔ سات جھاڑو اور حقہ کا پانی۔“

”لعنت بھیجیں موئی حرافہ پر۔“

”نہیں بوا۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ یہ کم بخت کہیں پھر“

”اوہ۔“

ایک اور کانفرنس ہوئی۔ تینوں بڑے ڈاکٹر آخری بار پوٹسڈم میں جمع ہوئے۔ جلدی جلدی ایک میٹرنٹی ہوم تیار کیا گیا۔ بی زمانی بیگم درد سے پیچ و تاب کھاتی رہی اور ادھر کانفرنس ہوتی رہی۔ ایک بولا۔

”صاحبان“

دنیا کی فلاح اور بہبودی کے لیے آج اس بات کا قطعی طور پر فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ بی زمانی بیگم کا یہ بچہ اس کا آخری بچہ ہو۔“

دوسرا بولا۔

”دنیا کے تھن اس عورت کے لاتعداد حرامی بچوں کو دودھ پلا پلا کر سوکھ گئے ہیں۔ اب ہمیں اس کو بانجھ کرنا ہی پڑے گا۔“

تیسرا بولا۔

”بالکل درست ہے۔ ہونے والے بچے کی صحت اور تندرستی کا خیال رکھتے ہوئے بھی ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

طے ہو گیا کہ بچہ فوراً پیدا کیا جائے اور بی زمانی بیگم کو ہمیشہ کے لیے بانجھ کر دیا جائے۔ عمل جراحی شروع ہوا۔ میٹرنٹی ہوم کے باہر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو گئیں۔ بہت دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ اس کے بعد میٹرنٹی ہوم کا دروازہ پھٹ سے کھلا۔ ایک سفید پوش نرس باہر نکلی اور اس نے اپنی باریک آواز میں اعلان کیا۔

”مبارک ہو بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ زچہ اور بچہ دونوں بیہوش ہیں۔“

دنیا کی ساری قومیں فکر و تردد میں غرق ہو گئیں۔ ایک بوڑھا لنگوٹی پہنے کھانستا کھنکارتا نرس کی طرف بڑھا۔ نرس نے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

۔بوڑھے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور لرزاں آواز کہا۔

”میرا نام ہندوستان ہے۔“

”اوہ۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ لڑکا ہوا ہے یا لڑکی؟“
دنیا کی ساری قومیں بے اختیار کھکھلا کر ہنس پڑیں۔ (اے۔ آئی۔ آر۔ بمبئی سے منشور (

بیگو

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبیگو

”تسلیاں اور دلاسے بیکار ہیں۔ لوہے اور سونے کے یہ مرکب میں چھٹانکوں پھانک چکا ہُوں۔ کون سی دوا ہے جو میرے حلق سے نہیں اتاری گئی میں آپ کے اخلاق کا ممنون ہوں مگر ڈاکٹر صاحب میری موت یقینی ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں دق کا مریض نہیں۔ کیا میں ہر روز خون نہیں تھوکتا؟ آپ یہی کہیں گے کہ میرے گلے اور دانتوں کی خرابی کا نتیجہ ہے مگر میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میرے دونوں پھیپھڑے خانہء زنبور کی طرح مشبک ہو چکے ہیں۔ آپ کے انجکشن مجھے دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتے۔ دیکھیے میں اس وقت آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ مگر سینے پر ایک وزنی انجن دوڑتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک تاریک گڑھے میں اتر رہا ہوں۔ قبر بھی تو ایک تاریک گڑھا ہے۔ آپ میری طرف اس طرح نہ دیکھیے ڈاکٹر صاحب، مجھے اس چیز کا کامل احساس ہے کہ آپ اپنے ہسپتال میں کسی مریض کا مرنا پسند نہیں کرتے مگر جو چیز اٹل ہے وہ ہو کے رہے گی۔ آپ ایسا کیجیے کہ مجھے یہاں سے رخصت کر دیجیے۔ میری ٹانگوں میں تین چار میل چلنے کی قوت ابھی باقی ہے کسی قریب کے گاؤں میں چلا جاؤں گا۔ اور۔ مگر میں تو رو رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجیے۔ میں موت سے خائف نہیں۔ یہ میرے جذبات ہیں، جو آنسوؤں کی شکل میں باہر نکل رہے ہیں۔ آہ! آپ کیا جانیں۔ اس مدقوق کے سینے سے کیا کچھ باہر نکلنے کو مچل رہا ہے۔ میں اپنے انجام سے باخبر ہوں۔ آج سے پانچ برس پہلے بھی میں اس وحشت ناک انجام سے باخبر تھا۔ جانتا تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد میری زندگی کی دوڑ ختم ہو جائے گی۔ میں نے اس گیند کو جسے آپ زندگی کے نام سے پکارتے ہیں، خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر کاٹا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کھیل میں لذت محسوس کر رہا ہوں۔ لذت۔ ہاں لذت۔ میں نے اپنی زندگی کی کئی راتیں حسن فروش عورتوں کے تاریک اڈوں پر گزاری ہیں۔ شراب کے نشے میں چور میں نے کس بیدردی سے خود کو اس حالت میں پہنچایا۔ مجھے یاد ہے، انہی اڈوں کی سیاہ پیشہ عورت۔ کیا نام تھا اس کا؟۔ ہاں گلزار، مجھے اس بُری طرح اپنی جوانی کو کیچڑ میں لت پت کرتے دیکھ کر مجھ سے ہمدردی کرنے لگ گئی تھی۔ بیوقوف عورت، اس کو کیا بتاتا کہ میں اس کیچڑ میں کس کا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے گلزار اور اس کی دیگر ہم پیشہ عورتوں سے نفرت تھی اور اب بھی ہے لیکن کیا آپ مریضوں کو زہر نہیں کھلاتے اگر اس سے اچھے نتائج کی اُمید ہو۔ میرے درد کی دوا ہی تاریک زندگی تھی۔ میں نے بڑی کوشش اور مصیبتوں کے بعد اس انجام کو بُلایا ہے جس کی کچھ روئداد آپ نے میرے سرہانے ایک تختی پر لکھ کر لٹکا رکھی ہے۔ میں نے اس کے انتظار میں ایک ایک گھڑی کس بیتابی سے کاٹی ہے، آہ! کچھ نہ پوچھیے! لیکن اب مجھے دِلی تسکین حاصل ہو چکی ہے۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ میں دِق اور سِل کا مریض ہُوں اس مرض نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔ آپ حقیقت کا اظہار کیوں نہیں کر دیتے۔ بخدا اس سے مجھے اور تسکین حاصل ہو گی۔ میرا آخری سانس آرام سے نکلے گا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب یہ تو بتائیے، کیا آخری لمحات واقعی تکلیف دہ ہوتے ہیں؟ میں چاہتا ہوں میری جان آرام سے نکلے۔ آج میں واقعی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہوں۔ آپ اپنے دل میں یقیناً مسکراتے ہوں گے کہ میں آج معمول سے بہت زیادہ باتونی ہو گیا ہُوں۔ دیا جب بجھنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کی روشنی تیز ہو جایا کرتی ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟۔ آپ تو بولتے ہی نہیں اور میں ہوں کہ بولے جا رہا ہوں۔ ہاں ہاں۔ بیٹھیے میرا جی چاہتا ہے۔ آج کسی سے باتیں کیے جاؤں۔ آپ نہ آتے تو خدا معلوم میری کیا حالت ہوتی۔ آپ کا سفید سُوٹ آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ کفن بھی اسی طرح صاف ستھرا ہوتا ہے پھر آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں مرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ اگر مرنے والوں کو کفن خود پہننا ہو تو آپ دیکھتے میں اس کو کتنی جلدی اپنے گرد لپیٹ لیتا۔ میں کچھ عرصہ اور زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ جب کہ وہ مر چکی ہے۔ میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ میں نے اس موت کو بہت مشکلوں کے بعد اپنی طرف آمادہ کیا ہے اور اب میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔ وہ مر چکی ہے اور اب میں بھی مر رہا ہوں۔ میں نے اپنی سنگدلی۔ وہ مجھے سنگدل کے نام سے پکارا کرتی تھی، کی قیمت ادا کر دی ہے۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس کا کوئی بھی سکہ کھوٹا نہیں۔ میں پانچ سال تک ان کو پرکھتا رہا ہوں، میری عمر اس وقت پچیس برس کی ہے۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ آہ ان سات برسوں کی روئداد کتنی حیرت افزا ہے اگر کوئی شخص اس کی تفصیل کاغذوں پر پھیلا دے تو انسانی دلوں کی داستانوں میں کیسا دلچسپ اضافہ ہو۔ دنیا ایک ایسے دل کی دھڑکن سے آشنا ہو گی۔ جس نے اپنی غلطی کی قیمت خون کی ان تھوکوں میں ادا کی ہے۔ جنہیں آپ ہر روز جلاتے رہتے ہیں کہ ان کے جراثیم دوسروں تک نہ پہنچیں۔ آپ میری بکواس سُنتے سُنتے کیا تنگ تو نہیں آ گئے۔ خدا معلوم کیا کیا کچھ بکتا رہا ہوں۔ تکلف سے کام نہ لیجیے، آپ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتے، میں خود نہیں سمجھ سکا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ بٹوت سے واپس آ کر میرے دل و دماغ کا ہر جوڑ ہل گیا تھا۔ اب یعنی آج جب کہ میرے جنون کا دورہ ختم ہو چکا ہے اور موت کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ وزن جو میری چھاتی کو دابے ہوئے تھا ہلکا ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں۔ موت میں زندگی۔ کیسی دلچسپ چیز ہے! آج میرے ذہن سے دُھند کے تمام بادل اُٹھ گئے ہیں میں ہر چیز کو روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ سات

برس پہلے کے تمام واقعات اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں۔ دیکھیے۔ میں لاہور سے گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ سوٹ سلوائے جا رہے ہیں۔ بوٹ ڈبوں میں بند کیے جا رہے ہیں۔ ہولڈرال اور ٹرنک کپڑوں سے پُر کیے جا رہے ہیں۔ میں رات کی گاڑی سے جموں روانہ ہوتا ہوں۔ شمیم میرے ساتھ ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ کر ہم عرصہ تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ شمیم چلا جاتا ہے۔ میں سو جاتا ہوں۔ دماغ ہر قسم کے فکر سے آزاد ہے۔ صبح جموں کی اسٹیشن پر جاگتا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادی کی ہونے والی سیر کے خیالات میں مگن لاری پر سوار ہوتا ہوں۔ بٹوت سے ایک میل کے فاصلے پر لاری کا پہیہ پنکچر ہو جاتا ہے۔ شام کا وقت ہے اس لیے رات بٹوت کے ہوٹل میں کاٹنی پڑتی ہے۔ اس ہوٹل کا کمرہ بے حد غلیظ معلوم ہوتا ہے مگر کیا معلوم تھا کہ مجھے وہاں پورے دو مہینے رہنا پڑے گا۔ صبح سویرے اُٹھتا ہُوں تو معلوم ہوتا ہے کہ لاری کے انجن کا ایک پرزہ بھی خراب ہو گیا ہے۔ اس لیے مجبوراً ایک دن اور بٹوت میں ٹھہرنا پڑے گا۔ یہ سُن کر میری طبیعت کس قدر افسردہ ہو گئی تھی! اس افسردگی کو دُور کرنے کے لیے میں۔ میں اس روز شام کو سیر کے لیے نکلتا ہوں۔ چیڑ کے درختوں کا تنفس، جنگلی پرندوں کی نغمہ سرائیاں سیب کے لدے ہُوئے درختوں کا حسن اور غروب ہوتے ہوئے سورج کا دلکش سماں، لاری والے کی بے احتیاطی اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والی تقدیر کی گستاخی کا رنج افزا خیال محو کر دیتا ہے۔ میں نیچر کے مسرت افزا مناظر سے لطف اندوز ہوتا سڑک کے ایک موڑ پر پہنچتا ہوں۔ دفعتہً میری نگاہیں اس سے دوچار ہوتی ہیں۔ بیگو مجھ سے بیس قدم کے فاصلے پر اپنی بھینس کے ساتھ کھڑی ہے۔ جس داستان کا انجام اس وقت آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ وہ جوان تھی۔ اس کی جوانی پر بٹوت کی فضا پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ سبز لباس میں ملبوس وہ سڑک کے درمیان مکئی کا ایک دراز قد بوٹا معلوم ہو رہی تھی چہرے کے تانبے ایسے تاباں رنگ پر اس کی آنکھوں کی چمک نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جو چشمے کے پانی کی طرف صاف اور شفاف تھیں۔ میں اس کو کتنا عرصہ دیکھتا رہا۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے دفعتاً اپنا سینہ موسیقی سے لبریز پایا۔ اور پھر میں مسکرا دیا۔ اس کی بہکی ہوئی نگاہوں کی توجہ بھنیس سے ہٹ کر میرے تبسم سے ٹکرائی۔ میں گھبرا گیا۔ اس نے ایک تیز تجسس سے میری طرف دیکھا۔ جیسے وہ کسی بھولے ہوئے خواب کو یاد کر رہی ہے۔ پھر اس نے اپنی چھڑی کو دانتوں میں دبا کر کچھ سوچا اور مسکرا دی، اس کا سینہ چشمے کے پانی کی طرح دھڑک رہا تھا۔ میرا دل بھی میرے پہلو میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اور یہ پہلی ملاقات کس قدر لذیذ تھی۔ اس کا ذائقہ ابھی میرے جسم کی ہر رگ میں موجود ہے۔ وہ چلی گئی۔ میں اس کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ اس انداز سے چل رہی تھی جیسے کچھ یاد کر رہی ہے۔ کچھ یاد کرتی ہے مگر پھر بھول جاتی ہے۔ اس نے جاتے ہوئے پانچ چھ مرتبہ میری طرف مڑ کر دیکھا۔ لیکن فوراً سر پھیر لیا۔ جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی جو سڑک کے نیچے مکئی کے چھوٹے سے کھیت کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ میں اپنی طرف متوجہ ہوا۔ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس احساس نے مجھے سخت متحیر کیا۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی۔ کالج میں اپنے ہم جماعت طلبہ کی زبانی میں محبت کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ عشقیہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ مگر محبت کے حقیقی معانی میری نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے ایک ناقابل بیان تلخی اپنے دل کی دھڑکنوں میں حل ہوتی ہوئی محسوس کی تو میں نے خیال کہ شاید اسی کا نام محبت ہے۔ یہ محبت ہی تھی۔ عورت سے محبت کرنے کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد کی ہو جائے یعنی وہ اس سے شادی کر لے اور آرام سے اپنی بقایا زندگی گزار دے۔ شادی کے بعد یہ محبت کروٹ بدلتی ہے۔ پھر مرد اپنی محبوبہ کے کاندھوں پر ایک گھر تعمیر کرتا ہے۔ میں نے جب بیگو سے اپنے دل کو وابستہ ہوتے محسوس کیا تو فطری طور پر میرے دل میں اس رفیقہ حیات کا خیال پیدا ہوا جس کے متعلق میں اپنے کمرے کی چار دیواری میں کئی خواب دیکھ چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل سے یہ صدا اٹھی۔

"دیکھو سعید یہ لڑکی ہی تمہارے خوابوں کی پری ہے۔"

چنانچہ میں تمام واقعے پر غور کرتا ہوا ہوٹل واپس آیا اور ایک ماہ کے لیے ہوٹل کا وہ کمرہ کرائے پر اٹھا لیا جو مجھے بے حد غلیظ محسوس ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوٹل کا مالک میرے اس ارادے کو سن کر بہت متحیر ہوا تھا۔ اس لیے کہ میں صبح اس کی غلاظت پسندی پر ایک طویل لیکچر دے چکا تھا۔ داستان کتنی طویل ہوتی جا رہی ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ اُسے غور سے سن رہے ہیں۔ ہاں ہاں آپ سگریٹ سلگا سکتے ہیں۔ میرے گلے میں آج کھانسی کے آثار محسوس نہیں ہوتے۔ آپ کی ڈبیا دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ بیگو بھی سگریٹ پیا کرتی تھی میں نے کئی بار اسے گولڈ فلیک کی ڈبیاں لا کر دی تھیں۔ وہ بڑے شوق سے ان کو منہ میں دبا کر دھوئیں کے بادل اڑایا کرتی تھیں۔ دُھواں۔! میں اس نیلے نیلے دُھوئیں کو اب بھی دیکھ رہا ہوں جو اس کے گیلے ہونٹوں پر رقص کیا کرتا تھا۔ ہاں تو دوسرے روز میں شام کو اسی وقت ادھر سیر کو گیا۔ جہاں مجھے وہ سڑک پر ملی تھی۔ دیر تک سڑک کے ایک کنارے پتھروں کی دیوار پر بیٹھا رہا مگر وہ نظر نہ آئی۔ اٹھا اور ٹہلتا ٹہلتا آگے نکل گیا۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی۔ جس پر چیڑ کے درخت اُگے ہُوئے تھے۔ بائیں ہاتھ بڑے بڑے پتھروں کے کٹے پھٹے سر اُبھر رہے تھے۔ ان پر جمی ہوئی مٹی کے ڈھیلوں میں گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ چیڑ کے تاگا نما پتوں کی سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جب موڑ مڑا تو دفعتہً میری نگاہیں سامنے اُٹھیں مجھ سے سو قدم کے فاصلے پر وہ اپنی بھینس کو ایک سنگین حوض سے پانی پلا رہی تھی۔ میں قریب پہنچا مگر اس کو نظر بھر کے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اور آگے نکل گیا اور جب واپس مڑا تو وہ گھر جا چکی تھی۔ اب ہر روز اس طرف سیر کو جانا میرا معمول ہو گیا مگر بیس روز تک میں اس سے ملاقات نہ کر سکا۔ میں نے کئی بار باؤلی پر پانی پیتے وقت اس سے ہم کلام ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر زبان گنگ ہو گئی۔ کچھ بول نہ سکا۔ قریباً ہر روز میں اس کو دیکھتا۔ مگر رات کو جب میں تصور میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا۔ تو ایک دھندسی چھا جاتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں اس کی شکل کو اس کے باوجود کہ اسے ہر روز دیکھتا تھا بھول جاتا تھا۔ بیس دنوں کے بعد ایک روز چار بجے

کے قریب جب کہ میں ایک باؤلی کے اوپر چیڑ کے سائے میں لیٹا تھا۔ وہ خورد سال لڑکے کو لے کر اُوپر چڑھی۔ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں سخت گھبرا گیا۔ دل میں یہی آئی کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن اس کی سکت بھی نہ رہی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے نکل گئی۔ چونکہ اس کے قدم تیز تھے۔ اس لیے لڑکا پیچھے رہ گیا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ دفعتہً لڑکے نے ایک چیخ ماری اور چشم زدن میں چیڑ کے خشک پتوں پر سے پھسل کر نیچے آرہا۔ میں فوراً اُٹھا اور بھاگ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ چیخ سن کر وہ مڑی اور دوڑنے کے لیے بڑھے ہوئے قدم روک کر آہستہ آہستہ میری طرف آئی۔ اپنی جوان آنکھوں سے مجھے دیکھا اور لڑکے سے یہ کہا۔

”خدا جانے تم کیوں گر پڑتے ہو؟“

میں نے گفتگو شروع کرنے کا ایک موقع پا کر اس سے کہا۔

”بچہ ہے اس کی انگلی پکڑ لیجیے۔ ان پتوں نے خود مجھے کئی بار اوندھے منہ گرا دیا ہے۔“

یہ سُن کر وہ کھکھلا کر ہنسی پڑی۔

”آپ کے ہیٹ نے تو خوب لڑھکنیاں کھائی ہوں گی۔“

”آپ ہنستی کیوں ہیں؟ کسی کو گرتے دیکھ کر آپ کی طبیعت اتنی شاد کیوں ہوتی ہے اور جو کسی روز آپ گر پڑیں تو۔ وہ گھڑا جو ہر روز شام کے وقت آپ گھر لے جاتی ہے کس بری طرح زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔“

”میں نہیں گر سکتی۔“

یہ کہتے ہُوئے اس نے دفعتہً نیچے باؤلی کی طرف دیکھا۔ اس کی بھینس نالے پر بندھے ہوئے پل کی طرف خراماں خراماں جا رہی تھی یہ دیکھ کر اس نے اپنے حلق سے ایک عجیب قسم کی آواز نکالی۔ اس کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ کس قدر جوان تھی یہ آواز۔ اس نے بڑھ کر لڑکے کو کاندھے پر اُٹھا لیا۔ اور بھینس کو

”اے چھلاں، اے چھلاں“

کے نام سے پکارتی ہوئی چشم زدن میں نیچے اتر گئی۔ بھینس کو واپس موڑ کر اس نے میری طرف دیکھا اور گھر کو چل دی۔ اس ملاقات کے بعد اس سے ہم کلام ہونے کی جھجھک دُور ہو گئی۔ ہر روز شام کے وقت باؤلی پر یا چیڑ کے درختوں تلے میں اس سے کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتا۔ شروع شروع میں ہماری گفتگو کا موضوع بھینس تھا۔ پھر میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا اور اس نے میرا۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ اصل مطلب کی طرف آگیا۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ نالے میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی اپنے کپڑے دھو رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے کسی خاص بات کا اظہار کرنے پر تیار دیکھ کر اس نے جنگلی بلی کی طرح میری طرف گھور کر دیکھا۔ اور زور زور سے اپنی شلوار کو پتھر پر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”آپ کشمیر کب جا رہے ہیں۔ یہاں بٹوت میں کیا دھرا ہے جو آپ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

یہ سُن کر میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا میں اس کے سوال کا جواب خود اس کی زبان سے چاہتا ہُوں۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ سیر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کشمیر میں بہت سے باغ ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟“

موقع اچھا تھا۔ چنانچہ میں نے دل کے تمام دروازے کھول دیئے۔ وہ میرے جذبات کے بہتے ہوئے دھارے کا شور خاموشی سے سُنتی رہی۔ میری آواز نالے کے پانی کی گنگناہٹ میں جو ننھے ننھے سنگریزوں سے کھیلتا ہوا بہہ رہا تھا ڈوب ڈوب کر اُبھر رہی تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر اخروٹ کے گھنے درخت میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ہوا اس قدر تر و تازہ اور لطیف تھی کہ اس کا ہر جھونکا بدن پر ایک خوشگوار کپکپی طاری کر دیتا تھا۔ میں اس سے پورا ایک گھنٹہ گفتگو کرتا رہا اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کا خواہشمند ہوں یہ سُن کر وہ بالکل متحیر نہ ہوئی۔ لیکن اس کی نگاہیں جو دُور پہاڑیوں کی سیاہی اور آسمان کی نیلاہٹ کو آپس میں ملتا ہوا دیکھ رہی تھیں اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہے۔ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد اس نے میرے اصرار پر صرف اتنا جواب دیا۔

”اچھا آپ کشمیر نہ جائیں۔“

یہ جواب اختصار کے باوجود حوصلہ افزا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ہم دونوں بے تکلف ہو گئے۔ اب پہلا سا حجاب نہ رہا۔ ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ ایک روز میں نے اس سے نشانی کے طور پر کچھ مانگا تو اس نے بڑے بھولے انداز میں اپنے سر کے کلپ اتار کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور مسکرا کر کہا۔

”میرے پاس یہی کچھ ہے۔“

یہ کلپ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔ خیر کچھ دنوں کی طول طویل گفتگوؤں کے بعد میں نے اس کی زبان سے کہلوا لیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اس روز شام کو اس نے اپنے گھڑے کو سر پر سنبھالتے ہُوئے اپنی رضامندی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ

”ہاں میں چاہتی ہوں۔“

تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہوٹل کو واپس آتے ہوئے میں کچھ گایا بھی تھا۔ اس پُر مسرت شام کے چوتھے روز جب کہ میں آنے والی ساعتِ سعید کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یکایک اس مکان کی تمام دیواریں گر پڑیں جن کو میں نے بڑے پیار سے استوار کیا تھا۔ بستر میں پڑا تھا کہ صبح سیالکوٹ کے ایک صاحب جو بغرض تبدیلی آب و ہوا بٹوت میں قیام پذیر تھے۔ اور ایک حد تک بیگو سے میری محبت کو جانتے تھے۔ میری۔ چارپائی پر بیٹھ گئے اور نہایت ہی مفکرانہ لہجہ میں کہنے لگے۔

”وزیر بیگم سے آپ کی ملاقاتوں کا ذکر آج بٹوت کے ہر بچے کی زبان پر ہے۔ میں وزیر بیگم کے کیریکٹر سے ایک حد تک واقف تھا۔ اس لیے کہ سیالکوٹ میں اس لڑکی کے متعلق بہت کچھ سُن چکا ہوں۔ مگر یہاں بٹوت میں اس کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے یہاں کا قصائی اس کے متعلق ایک طویل حکایت سُنا رہا تھا۔ پرسوں پان والا آپ سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا کہ آپ عصمت باختہ لڑکی کے دام میں پھنس گئے ہیں۔ کل شام کو ایک اور صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ ٹوٹی ہوئی ہنڈیا خرید رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ بعض لوگ اس سے آپ کی گفتگو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ جب سے۔ آپ بٹوت میں آئے ہیں وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ میں نے آپ سے حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ اب آپ بہتر سوچ سکتے ہیں۔ عصمت باختہ لڑکی، ٹُوٹی ہوئی ہنڈیا، لوگ اس سے میری گفتگو کو پسند نہیں کرتے، مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آتا تھا۔ بیگو اور۔ اس کا خیال ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر جب دوسرے روز مجھے ہوٹل والے نے نہایت ہی رازدارانہ لہجے میں چند باتیں کہیں تو میری آنکھوں کے سامنے تاریک دُھند سی چھا گئی۔

”بابوجی، آپ بٹوت میں سیر کے لیے آئے ہیں مگر دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں کی ایک حسن فروش لڑکی کی محبت میں گرفتار ہیں اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔ میرا اس لڑکی کے گھر آنا جانا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس کو کچھ کپڑے بھی خرید دیئے ہیں۔ آپ نے یقیناً اور بھی کئی روپے خرچ کیے ہونگے معاف کیجیے مگر یہ سراسر حماقت ہے۔ میں آپ سے یہ باتیں ہرگز نہ کرتا کیونکہ یہاں بیسیوں عیش پسند مسافر آتے ہیں مگر آپکا دل ان سیاہیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ آپ بٹوت سے چلے جائیں اس قماش کی لڑکی سے گفتگو کرنا اپنی عزت خطرے میں ڈالنا ہے۔“

ظاہر ہے کہ ان باتوں نے مجھے بے حد افسردہ بنا دیا تھا وہ مجھ سے سگریٹ، مٹھائی اور اسی قسم کی دوسری معمولی اشیا طلب کیا کرتی تھی اور میں بڑے شوق اور محبت سے اس کی یہ خواہش پوری کیا کرتا تھا۔ اس میں ایک خاص لطف تھا۔ مگر اب ہوٹل والے کی بات نے میرے ذہن میں مہیب خیالات کا ایک تلاطم برپا کر دیا۔ گزشتہ ملاقاتوں کے جتنے نقوش میرے دل و دماغ میں محفوظ تھے اور جنھیں میں ہر روز بڑے پیار سے اپنے تصور میں لا کر ایک خاص قسم کی مٹھاس محسوس کیا کرتا تھا دفعتہً تاریک شکل اختیار کر گئے مجھے اس کے نام ہی سے عفونت آنے لگی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ میرا دل جو ایک کالج کے طالب علم کے سینے میں دھڑکتا تھا، اپنے خوابوں کی یہ بُری اور بھیانک تعمیر دیکھ کر چلا اٹھا۔ اس کی باتیں جو کچھ عرصہ پہلے بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں ریاکاری میں ڈُوبی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ میں نے گزشتہ واقعات، بیگو کی نقل و حرکت، اس کی جنبش اور اپنے گردوپیش کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر عمیق مطالعہ کیا تو تمام چیزیں روشن ہو گئیں، اس کا ہر شام کو ایک مریض کے ہاں دودھ لیکر جانا اور وہاں ایک عرصہ تک بیٹھی رہنا۔ باؤلی پر ہر کس و ناکس سے بیباکانہ گفتگو، دوپٹے کے بغیر ایک پتھر سے دوسرے پر اچھل کود، اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کہیں زیادہ شوخ اور آزاد روی۔ وہ یقیناً عصمت باختہ لڑکی ہے۔“

میں نے یہ رائے مرتب تو کر لی۔ مگر آنسوؤں سے میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ خوب رویا مگر دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک بار آخری بار اس سے ملوں اور اس کے منہ پر اپنے تمام غصے کو تھوک دُوں یہی صورت تھی جس سے مجھے کچھ سکون حاصل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں شام کو باؤلی کی طرف گیا۔ وہ پگڈنڈی پر انار کی جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرا دل کسی قدر کڑھا۔ میرا حلق اس روز کی تلخی کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کے قریب پہنچا اور پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چھلاں اس کی بھینس اور اس کا بچھڑا چند گزوں کے فاصلے پر بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ میں گفتگو کا آغاز کرنا چاہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ غصے اور افسردگی نے میری زبان پر قفل لگا دیا تھا مجھے خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی، جیسے چشمے کے پانی میں کسی نے اپنے مٹی بھرے ہاتھ دھو دیئے ہیں۔ پھر وہ مسکرائی، یہ مسکراہٹ مجھے کسی قدر مصنوعی اور پھیکی معلوم ہُوئی۔ میں نے سر جھکا لیا اور سگریزوں سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ شاید میرا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا

”آپ بیمار ہیں؟“

اس کا یہ کہنا تھا کہ میں برس پڑا

”ہاں بیمار ہوں، اور یہ بیماری تمہاری دی ہُوئی ہے، تمہیں نے یہ روگ لگایا ہے بیگو! میں تمہارے چال چلن کی سب کہانی سُن چکا ہوں اور تمہارے سارے حالات سے باخبر ہوں۔“

میری چبھتی ہُوئی باتیں سُن کر اور بدلے ہوئے تیور دیکھ کر وہ بھونچکا سی رہ گئی اور کہنے لگی۔

”اچھا تو میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ کو میرے چال چلن کے متعلق سب کچھ معلوم ہو چکا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آپ کیسی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔“

میں چلایا۔

”گویا تم کو معلوم ہی نہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو تو اپنی سیہ کاریوں کا سارا نقشہ تمہاری آنکھوں تلے گھوم جائے گا۔“

میں طیش میں آ گیا۔ کتنی بھولی بنتی ہو۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ پروں پر پانی پڑنے ہی نہیں دیتیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں بھلا تم کیا سمجھو جاؤ جاؤ بیگو، تم نے مجھے سخت دُکھ پہنچایا ہے۔ یہ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ وہ بھی سخت مضطرب ہو گئی اور جل کر بول اٹھی۔

”آخر میں بھی تو سنوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا کیا سُنا ہے۔ پر آپ تو رو رہے ہیں۔

”ہاں۔ رو رہا ہُوں۔ اس لیے کہ تمہارے افعال ہی اتنے سیاہ ہیں کہ ان پر ماتم کیا جائے۔ تم پاکبازوں کی قدر کیا جانو۔ اپنا جسم بیچنے والی لڑکی محبت کیا جانے۔ تم صرف اتنا جانتی ہو کہ کوئی مرد آئے اور تمہیں اپنی چھاتی سے بھینچ کر چومنا چاٹنا شروع کر دے اور جب سیر ہو جائے تو اپنی راہ لے۔ کیا یہی تمہاری زندگی ہے۔“

میں غصے کی شدت سے دیوانہ ہو گیا تھا جب اس نے میری زبان سے اس قسم کے سخت کلمات سنے تو اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی نظر میں یہ سب گفتگو ایک معمہ ہے۔ اس وقت طیش کی حالت میں میں نے اس کی حالت کو نمائشی خیال کیا اور ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”جاؤ! میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔ تم ناپاک ہو۔“

یہ سُن کر اس نے ڈری ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“

مجھے کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا ہے۔

”میں پھر برس پڑا۔“

اپنی زندگی کی سیاہ کاریوں پر نظر دوڑاؤ۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تم میری بات اس لیے نہیں سمجھتی ہو کہ میں تم سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس لیے کہ میرے سینے میں شہوانی خیالات نہیں، اس لیے کہ میں تم سے صرف محبت کرتا ہُوں۔ جاؤ مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔“

جب میں بول چکا۔ تو اس نے تھوک نگل کر اپنے حلق کو صاف کیا اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ شاید آپ یہ خیال کرتے ہونگے کہ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہوں۔ مگر سچ جانیے مجھے کچھ معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام آپ سڑک پر سے گزر رہے تھے آپ نے میری طرف دیکھا تھا اور مسکرا دیئے تھے۔ یہاں بیسیوں لوگ ہم لڑکیوں کو دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چلے جاتے ہیں۔ پھر آپ متواتر باؤلی کی طرف آتے رہے۔ مجھے معلوم تھا آپ میرے لیے آتے ہیں مگر اسی قسم کے کئی واقعے میرے ساتھ گزر چکے ہیں۔ ایک روز آپ نے میرے ساتھ باتیں کیں اور اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ آپ نے شادی کے لیے کہا میں۔ مان گئی۔ مگر اسی سے پہلے اس قسم کی کئی درخواستیں سُن چکی ہوں۔ جو مرد بھی مجھ سے ملتا ہے دوسرے تیسرے روز میرے کان میں کہتا ہے۔

”بیگو دیکھ میں تیری محبت میں گرفتار ہوں۔ رات دن تو ہی میرے دل و دماغ میں بستی رہتی ہے۔ آپ نے بھی مجھ سے یہی کہا۔ اب بتایئے محبت کیا چیز ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ آپ نے دل میں کیا چھپا رکھا ہے۔ یہاں آپ جیسے کئی لوگ ہیں جو مجھ سے یہی کہتے ہیں۔“

بیگو تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں جی چاہتا ہے کہ صدقے ہو جاؤں۔ تمہارے ہونٹ کس قدر پیارے ہیں جی چاہتا ہے ان کو چوم لُوں۔ وہ مجھے چومتے رہے ہیں کیا یہ محبت نہیں ہے؟ کئی بار میرے دل میں خیال آیا ہے کہ محبت کچھ اور ہی چیز ہے مگر میں پڑھی لکھی نہیں، اس لیے مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے قاعدہ پڑھنا شروع کیا مگر چھوڑ دیا۔ اگر میں پڑھوں تو پھر چھلاں اور اس کے بچھڑے کا پیٹ کون بھرے آپ اخبار پڑھ لیتے ہیں اس لیے آپکی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکتی چھوڑیئے اس قصے کو آیئے کچھ اور باتیں کریں مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہُوئی ہے۔ میری ماں کہہ رہی تھیں کہ بیگو تو ہیٹ والے بابو کے پیچھے دیوانی ہو گئی ہے۔“

میری نظروں کے سامنے سے وہ تاریک پردہ اٹھنے لگا تھا جو اس انجام کا باعث تھا۔ مگر دفعتہً میرے جوش اور غصے نے پھر اسے گرا دیا۔ بیگو کی گفتگو بے حد سادہ اور معصومیت سے پُر تھی مگر مجھے اس کا ہر لفظ بناوٹ میں لپٹا نظر آیا۔ میں ایک لمحہ بھی اس کی اہمیت پر غور نہ کیا۔

”بیگو، میں بچہ نہیں ہُوں کہ تم مجھے چکنی چپڑی باتوں سے بیوقوف بنا لو گی“

میں نے غصہ میں اس سے کہا۔

”یہ فریب کسی اور کو دینا۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تم نے ابھی ابھی اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کیا ہے اب میں کیا کہوں۔“

”نہیں نہیں کہیے“!

اُس نے کہا۔

”کئی لوگ تمہارے منہ کو چومتے رہے ہیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے“!

”ہاں آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ اب میں کیا جھوٹ بولتی ہُوں۔ میں خود تھوڑا ہی ان کے پاس جاتی ہوں اور منہ بڑھا کر چومنے کو کہتی ہُوں۔ اگر آپ اس روز میرے بالوں کو چومنا چاہتے جبکہ آپ ان کی تعریف کر رہے تھے، تو کیا میں انکار کر دیتی! میں کس طرح انکار کر سکتی ہوں مجھے چھلاں بہت پیاری لگتی ہے اور میں ہر روز اس کو چومتی ہوں اس میں کیا ہرج ہے میں چاہتی ہوں کہ لوگ میرے بالوں، میرے ہونٹوں اور میرے گالوں کی تعریف کریں اس سے مجھے خوشی ہوتی ہے خبر نہیں کیوں؟ میں صبح سویرے اُٹھتی ہُوں اور چھلاں کو لے کر گھاس چرانے کے لیے باہر چلی جاتی ہوں، دوپہر کو روٹی کھا کر پھر گھر سے نکل آتی ہوں۔ شام کو پانی بھرتی ہُوں۔ ہر روز میرا یہی کام ہے، مجھے یاد ہے کہ آپ نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ میں پانی بھرنے نہ آیا کروں۔ بھینس نہ چرایا کروں۔ شاید آپ اسی وجہ سے ناراض ہو رہے ہیں۔ مگر یہ تو بتایئے کہ میں گھر پر رہوں تو پھر آپ ملاقات کیونکر کر سکیں گے؟ میں نے سُنا ہے کہ پنجاب میں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلتیں مگر ہم پہاڑی لوگ ہیں ہمارا یہی کام ہے۔

”تمہارا یہی کام ہے کہ ہر رہگذر سے لپٹنا شروع کر دو۔ تم پہاڑی لوگوں کے چلن مجھ سے چھپے ہوئے نہیں، یہ تقریر کسی اور کو سُنانا۔ گھر پر رہو یا باہر رہو۔ اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان پہاڑیوں میں رہ کر جو سبق تم نے سیکھا ہے وہ مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کرو“

”آپ بہت تیز ہو جاتے جا رہے ہیں بہت چل نکلے ہیں۔“

اس نے قدرے بگڑ کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے لوگوں نے آپ کے بہت کان بھرے ہیں۔ مجھے بھی تو پتہ لگے کہ وہ کون

”مرن جوگے“

ہیں جو میرے متعلق آپ کو ایسی باتیں سناتے رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اتنے گرم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں مردوں کے ساتھ باتیں کرتی ہوں ملتی ہوں مگر۔ یہ کہتے ہوئے اس کے گال سرخ ہو گئے۔ مگر میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ آپ کہتے ہیں کہ میں بُری لڑکی ہوں یہ غلط ہے۔ میں پگلی ہوں۔ سچ مچ پگلی ہوں۔ کل آپکے چلے جانے کے بعد میں پتھر پر بیٹھ کر دیر تک روتی رہی۔ جانے کیوں۔ ایسا کئی دفعہ ہوا ہے کہ میں گھنٹوں رویا کرتی ہُوں۔ آپ ہنسیں گے مگر اس وقت بھی میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں سے اُٹھ بھاگوں اور اس پہاڑی کی چوٹی پر بھاگتی ہوئی چڑھ جاؤں اور پھر کودتی پھاندتی نیچے اُتر جاؤں۔ میرے دل میں ہر وقت ایک بے چینی سی رہتی ہے۔ بھینس چراتی ہوں پانی بھرتی ہوں۔ لکڑیاں کاٹتی ہوں۔ لیکن یہ سب کام میں اوپرے دل سے کرتی ہوں۔ میرا جی کسی کو ڈھونڈتا ہے۔ معلوم نہیں کس کو۔ میں دیوانی ہوں۔“

بیگو کی یہ عجیب و غریب باتیں جو در حقیقت اس کی زندگی کا ایک نہایت اُلجھا ہوا باب تھیں اور جسے بغور مطالعہ کرنے کے بعد سب راز حل ہو سکتے تھے اس وقت مجھے کسی مجرم کا غیر مربوط بیان معلوم ہُوئیں، بیگو اور میرے درمیان اس قدر تاریک اور موٹا پردہ حائل ہو گیا تھا کہ حقیقت کی نقاب کشائی بہت مشکل تھی۔

”تم دیوانی ہو۔“

میں نے اس سے کہا۔

”کیا مردوں کے ساتھ بیٹھ کر جھاڑیوں کے پیچھے پہروں باتیں کرتے رہنا بھی اس دیوانگی ہی کی ایک شاخ ہے؟۔ بیگو، تم پگلی ہو مگر اپنے کام میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار“!

”میں باتیں کرتی ہُوں، ان سے ملتی ہُوں، میں نے اس سے کب انکار کیا ہے ابھی ابھی میں نے آپ سے اپنے دل کی سچی بات کہی تو آپ نے مذاق اُڑانا شروع کر دیا اب اگر میں کچھ اور کہوں تو اس سے کیا فائدہ ہو گا۔ آپ کبھی مانیں گے ہی نہیں۔“

”نہیں، نہیں، کہو، کیا کہتی ہو، تمہارا نیا فلسفہ بھی سن لوں۔“

”سُنیے پھر“

یہ کہہ کر اس نے تھکی ہوئی ہرنی کی طرح میری طرف دیکھا اور آہ بھر کر بولی۔

”یہ باتیں جو میں آج آپ کو سُنانے لگی ہوں میری زبان سے پہلے کبھی نہیں نکلیں میں یہ آپ کو بھی نہ سُناتی۔ مگر مجبوری ہے۔ آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔ میں بہت سے لوگوں سے ملتی رہی ہوں۔ مگر آپ بالکل نرالے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ سے۔

”وہ ہچکچائی۔“

ہاں آپ سے پیار ہو گیا ہے۔ آپ نے کبھی مجھ سے غیر بات نہیں کہی۔ حالانکہ میں جس سے ملتی رہی ہُوں وہ مجھ سے کچھ اور ہی کہتا تھا۔ میری اماں جانتی ہے کہ میں گھر میں ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتی رہتی ہوں میرا منہ تھکتا ہی نہیں۔ آپ نے نہیں کہا۔ پر میں نے گاہکوں کے پاس دُودھ لے جانا چھوڑ دیا۔ لوگوں سے باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ پانی بھرنے کے لیے بھی زیادہ چھوٹی بہن ہی کو بھیجتی رہی ہُوں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں لوگوں سے ملتی رہی ہوں۔ اب میں آپ کو بتاؤں کہ میں ان سے کیوں ملتی تھی۔ مجھے کوئی مرد بھی بلاتا تو میں اسی سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ اس لیے۔ نہیں نہیں میں نہیں بتاؤں گی۔ میرا دل جو چاہتا تھا وہ ان لوگوں کے پاس نہیں تھا، میں بُری نہیں، اللہ کی قسم، بے گناہ ہُوں، خدا معلوم لوگ مجھے بُرا کیوں کہتے ہیں۔ آپ بھی مجھے بُرا کہتے ہیں جس طرح آپ نے آج میرے منہ پر اتنی گالیاں دی ہیں اگر آپ کے بجائے کوئی اور ہوتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی مگر آپ۔ اب میں کیا

کہوں، میں بہت بدل گئی ہوں، آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں خیال کرتی تھی کہ آپ مجھے کچھ سکھائیں گے مجھے اچھی اچھی باتیں بتائیں گے۔ لیکن آپ مجھ سے خواہ مخواہ لڑ رہے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں آپ کی کتنی عزت کرتی ہُوں۔ میں نے آپ کے سامنے کبھی گالی نہیں دی۔ حالانکہ ہمارے گھر سارا دن گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے۔“

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے ڈاکٹر صاحب! اس پہاڑی لڑکی کی گفتگو کس قدر سادہ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت میرے کانوں میں روئی ٹھنسی ہُوئی تھی۔ اس کے ہر لفظ سے مجھے عصمت فروشی کی بو آ رہی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

”بیگو! تم ہزار قسمیں کھاؤ۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اب جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ میں کل بٹوت چھوڑ کر جا رہا ہوں میں نے تم سے محبت کی، مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ تم نے میرے دل کو بہت دُکھ دیا ہے۔ خیر اب جاتا ہوں، مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔“

مجھے جاتا دیکھ کر وہ سخت مضطرب ہو گئی اور میرا بازو پکڑ کر اور پھر اسے فوراً ڈرتے ہوئے چھوڑ کر تھرائی ہُوئی آواز میں صرف اس قدر کہا۔

”آپ جا رہے ہیں؟“

میں نے جواب دیا

”ہاں جا رہا ہوں تاکہ تمہارے چاہنے والوں کے لیے میدان صاف ہو جائے“

آپ نہ جائیے، اللہ کی قسم میرا کوئی چاہنے والا نہیں۔

”یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھیں نمناک ہو گئیں نہ جائیے، نہ جائیے نہ۔“

آخری الفاظ اس کی گلوگیر آواز میں دب گئے۔ اس کا رونا میرے دل پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ میں چل پڑا۔ مگر اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور روتی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ خفا کیوں ہو گئے ہیں۔ میں آئندہ کسی آدمی سے بات نہ کرونگی۔ اگر آپ نے مجھے کسی مرد کے ساتھ دیکھا تو آپ اس چھڑی سے جتنا چاہیے پیٹ لیجیے گا۔ آئیے گھر چلیں۔ میں آپ کے لیے حقہ تازہ کر کے لاؤں گی۔“

میں خاموش رہا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھر چل پڑا۔ اسوقت بیگو سے ایک منٹ کی گفتگو کرنا بھی مجھے گراں گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لڑکی میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے میں نے بمشکل دو گز کا فاصلے طے ہو گا کہ وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے بال پریشان تھے آنکھوں کے ڈورے سرخ اور ابھرے ہوئے تھے سینہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”کیا آپ واقعی جا رہے ہیں؟“

میں نے تیزی سے جواب دیا۔

”تو اور کیا جھوٹ بک رہا ہوں۔“

”جائیے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور گال آنسوؤں کی وجہ سے میلے ہو رہے تھے مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک ناچ رہی تھی۔

”جائیے“

یہ کہہ کر وہ اُلٹے پاؤں مڑی۔ اس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا۔ میں نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے رونے کی آواز سنی۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ تھرائی ہوئی آواز ابھی تک میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ یہ ہے میری داستان ڈاکٹر صاحب، میں نے اس پہاڑی لڑکی کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اس غلطی کا احساس مجھے پورے دو سال بعد ہُوا۔ جب میرے ایک دوست نے مجھے یہ بتایا کہ بیگو نے میرے جانے کے بعد اپنے شباب کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا اور دق کے مریضوں سے ملنے کی وجہ سے وہ خود اس کا شکار ہو گئی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس مرض نے بالآخر اسے قبر کی گود میں سُلا دیا۔ اس کی موت کا باعث میرے سوا اور کون ہو سکتا ہے وہ زندگی کی شاہراہ پر اپنا راستہ تلاش کرتی تھی مگر میں اسکو بھول بھلیوں میں چھوڑ کر بھاگ آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھٹک گئی میں مجرم تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے وہی موت تجویز کی جس سے وہ دوچار ہوئی۔ وہ وزن جو میں پانچ سال اپنی چھاتی پر اٹھائے پھرتا رہا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ اب ہلکا ہو گیا ہے۔ میں مریض کی داستان خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ بول چکا تو پھر بھی خاموش رہا میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جذبات پر رائے زنی کروں۔ چنانچہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ مجھے کئی مریضوں کی داستانیں سننے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ نہایت عجیب و غریب اور پر اثر۔ داستان تھی گو مریض بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس نے اپنے طویل بیان کو کس طرح جاری رکھا۔ صبح کے وقت میں اس کا ٹمپریچر دیکھنے کے لیے آیا۔ مگر وہ مر چکا تھا۔ سفید چادر اوڑھے وہ بڑے سکون سے سو رہا تھا۔ جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بُلایا۔

”ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں کچھ ہے“

میں نے اس کی بند مٹھی کو آدھا کھول کر دیکھا، لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگو کی یادگار!

”ان کو نکالنا نہیں، یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔ میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔“

بیمار

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوبیمار

عجب بات ہے کہ جب بھی کسی لڑکی یا عورت نے مجھے خط لکھا بھائی سے مخاطب کیا اور بے ربط تحریر میں اس بات کا ضرور ذکر کیا کہ وہ شدید طور پر علیل ہے۔ میری تصانیف کی بہت تعریفیں کیں۔ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکیاں اور عورتیں جو مجھے خط لکھتی ہیں بیمار کیوں ہوتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ میں خود اکثر بیمار رہتا ہوں۔ یا کوئی اور وجہ ہو گی۔ جو اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ میری ہمدردی چاہتی ہیں۔ میں ایسی لڑکیوں اور عورتوں کے خطوط کا عموماً جواب نہیں دیا کرتا، لیکن بعض اوقات دے بھی دیا کرتا ہوں آخر انسان ہوں۔ خط اگر بہت ہی دردناک ہو تو اس کا جواب دینا انسانی فرائض میں شامل ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ایک خط موصول ہوا، جو کافی لمبا تھا۔ اس میں بھی ایک خاتون نے جس کا نام میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا یہ لکھا تھا کہ وہ میری تحریروں کی شیدائی ہے لیکن ایک عرصے سے بیمار ہے۔ اس کا خاوند بھی دائم المریض ہے۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ جو بیماری اسے لگی ہے اس کے خاوند کی وجہ سے ہے۔ میں نے اس خط کا جواب نہ دیا لیکن اس کی طرف سے دوسرا خط آیا جس میں یہ گلہ تھا کہ میں نے اُس کے پہلے خط کی رسید تک نہ بھیجی۔ چنانچہ مجھے مجبوراً اس کو خط لکھنا پڑا۔ مگر بڑی احتیاط کے ساتھ۔ میں نے اس خط میں اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اور بھی زیادہ علیل ہو گئی ہے اور مرنے کے قریب ہے۔ یہ پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ اسی تاثر کے ماتحت میں نے بڑے جذباتی انداز میں اُسے یہ خط لکھا اور اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی زندہ رہنے کے لیے ہے اس سے مایوس ہو جانا موت ہے اگر تم خود میں اتنی قوت ارادی پیدا کر لو تو بیماری کا نام و نشان تک نہ رہے گا میں پچھلے دنوں موت کے منہ میں تھا۔ سب ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ لیکن میں نے کبھی موت کا خیال بھی نہیں کیا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ڈاکٹر حیرت میں گُم ہو کے رہ گئے اور میں ہسپتال سے باہر نکل آیا۔ میں نے اُس کو یہ بھی لکھا کہ قوتِ ارادی ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہر ناممکن چیز کو ممکن بنا دیتی ہے۔ تم اگر بیمار ہو تو خود کو یقین دلا دو کہ نہیں تم بیمار نہیں اچھی بھلی تندرست ہو۔ میرے اس خط کے جواب میں اُس نے جو کچھ لکھا اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس پر میرے وعظ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بڑا طویل خط تھا۔ پانچ صفحوں پر مشتمل۔ اس کی منطق اور اس کا فلسفہ عجیب قسم کا تھا۔ وہ اس بات پر مصر تھی کہ خدا کو یہ منظور نہیں کہ وہ زیادہ دیر تک اس دنیا میں زندہ رہے۔ اُس کے علاوہ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اپنی تازہ کتابیں اُسے بھیجوں۔ میں نے دو نئی کتابیں اس کو بھیج دیں۔ ان کی رسید آ گئی۔ بہت بہت شکریہ ادا کیا گیا تھا اور میری تعریفیں ہی تعریفیں تھیں۔ مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ جو کتابیں میں نے اس کو بھیجی تھیں، میری نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ صرف ہر روز کچھ کمانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ چنانچہ میں نے اُسے لکھا کہ تم نے میری دو کتابوں کی جو اتنی تعریف کی ہے، غلط ہے۔ یہ کتابیں محض بکواس ہیں تم میری پرانی کتابیں پڑھو۔ اس میں تم پوری طرح مجھے جلوہ گر پاؤ گی۔ میں نے اس خط میں افسانہ نویسی کے فن پر بہت کچھ لکھ دیا تھا۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ میں نے یہ جھک کیوں ماری۔ اگر لکھنا ہی تھا تو کسی رسالے یا پرچے کے لیے لکھتا۔ یہ کیا ہے ایک عورت کو جس کے تم صورت آشنا بھی نہیں اتنا طویل اور پُر مغز خط لکھ دیا ہے۔ بہر حال جب لکھ دیا تھا تو اُسے پوسٹ کرنا ہی تھا۔ اس کا جواب تیسرے روز آ گیا۔ اب کے مجھے پیارے بھائی جان سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اُس نے میری پرانی تصنیفات منگوا لی تھیں اور وہ انھیں پڑھ رہی تھی۔ لیکن بیماری روز بروز بڑھ رہی تھی اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کسی حکیم کا علاج کیوں نہ کرائے، کیونکہ وہ ڈاکٹروں سے بالکل نا اُمید ہو چکی تھی۔ میں نے اُسے جواب میں لکھا، علاج تم کسی سے بھی کراؤ۔ خواہ وہ ڈاکٹر ہو یا حکیم۔ لیکن یاد رکھو سب سے زیادہ اچھا معالج خود آدمی آپ ہوتا ہے۔ اگر تم اپنی ذہنی پریشانیاں دُور کر دو تو چند روز میں تندرست ہو جاؤ گی۔ میں نے اس موضوع پر ایک طویل لیکچر لکھ کر اُس کو بھیجا۔ ایک مہینے کے بعد اس کی رسید پہنچی، جس میں یہ لکھا تھا کہ اُس نے میری نصیحت پر عمل کیا۔ لیکن خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوا اور یہ کہ وہ مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔ دو تین روز میں حیدر آباد سے بمبئی پہنچ جائے گی اور چند روز میرے ہاں ٹھہرے گی۔ میں بہت پریشان ہوا، چھڑا چھٹانک تھا۔ مگر ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ جس میں دو کمرے تھے۔ میں نے سوچا اگر یہ محترمہ آ گئیں تو میں ایک کمرہ اُن کو دے دوں گا۔ اس میں وہ چند دن گزارنا چاہیں گزار لیں۔ علاج کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اس لیے کہ وہاں کا ایک بڑا حکیم میرا بڑا مہربان تھا۔ چھ روز تک آپ یہ سمجھیے کہ میں سولی پر لٹکا رہا۔ اخبار والے نے دروازے پر دستک دی تو میں یہ سمجھا کہ وہ محترمہ تشریف لے آئیں۔ باورچی خانے میں نوکر نے اگر کسی برتن پر راکھ ملنا شروع کی تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا کہ شاید یہ آواز اس عورت کے سینڈلوں کی ہے۔ میں ہندو مسلم فسادات کی خبریں پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں یہ سمجھا کہ دُودھ والا ہے۔ چنانچہ میں نے نوکر کو آواز دی

”دیکھو رحیم کون ہے؟“

رحیم چائے بنا رہا تھا۔ وہ اُبلتی ہوئی کیتلی کو وہیں چولھے پر چھوڑ کر باہر نکلا اور دروازہ کھولا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے کمرے میں آیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا

”ایک عورت آئی ہے“

میں حیرت زدہ ہو گیا

”عورت؟“

”جی ہاں۔ ایک عورت باہر کھڑی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے“

میں سمجھ گیا کہ یہ عورت وہی ہو گی۔ بیمار، جو مجھے خط لکھتی رہی ہے چنانچہ میں نے رحیم سے کہا اُس کو اندر لے آؤ اور بڑے کمرے میں بٹھا دو اور کہہ دو کہ صاحب ابھی آجائیں گے۔“

جی اچھا یہ کہہ کر رحیم چلا گیا۔ میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ یہ عورت کس قسم کی ہو گی۔ دق کی ماری ہوئی یا فالج زدہ۔ میرے پاس کیوں آئی ہے؟۔ نہیں مجھ سے ملنے آئی ہے، غالباً یہاں کسی طبیب سے اپنا علاج کرانے آئی ہے۔ میں اُٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ وہاں دیر تک نہاتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ عورت جو اُس کو اتنے لمبے چوڑے خط لکھتی رہی اور جس کو کوئی خطرناک بیماری چمٹی ہوئی ہے کس شکل و صورت کی ہو گی؟ بے شمار شکلیں میرے تصور میں آئیں۔ پہلے میں نے سوچا اپاہج ہو گی اور مجھے اس کو کچھ دینا پڑے گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ تین تاریخ تھی جب وہ آئی۔ میرے پاس تنخواہ کے تین سو روپے تھے جو اِدھر اُدھر کے بِل ادا کرنے کے بعد بچ گئے تھے۔ اس لیے میری پریشانی میں اضافہ نہ ہوا۔ میں نے نہاتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر اسے مدد کی ضرورت ہے تو میں اُسے ایک سو روپے دے دُوں گا۔ لیکن فوراً مجھے خیال آیا کہ شاید اس کو دق ہو اور مجھے اس کو ہسپتال میں داخل کرانا پڑے۔ یہ کام کوئی مشکل نہیں تھا اس لیے کہ میرے کئی دوست جے جے ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ میں ان میں کسی ایک سے بھی کہہ دُوں کہ اس معذور عورت کو داخل کر لو تو وہ کبھی انکار نہ کریں گے۔ میں کافی دیر تک نہاتا اور اس عورت کے متعلق سوچتا رہا۔ عورتوں سے ملتے ہوئے بڑی اُلجھن محسوس ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک جگہ نکاح تو کر لیا لیکن ڈیڑھ برس تک یہی سوچتا رہا کہ اُسے اگر اپنے گھر لے آؤں تو کیا ہو گا؟“

جو ہونا تھا وہ تو خیر ہو ہی جاتا اگر سب سے بڑا مسئلہ جو مجھے پریشان کیے ہوئے تھا یہ تھا کہ جس نے ساری زندگی میں کسی عورت کی قربت حاصل نہیں کی تھی اپنی بیوی سے کس طرح پیش آتا۔ اب ایک عورت ساتھ والے کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی اور میں ڈونگے پہ ڈونگے بھر کے اپنے بدن پر بیکار ڈال رہا تھا میں اصل میں خود کو اس عورت سے ملاقات کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ کافی دیر نہانے کے بعد میں غسل خانے سے باہر نکلا۔ کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ بالوں میں تیل لگایا۔ کنگھی کی اور سوچتے سوچتے پلنگ پر لیٹ گیا۔

چند لمحات کے بعد رحیم آیا اور اُس نے مجھ سے کہا

”وہ عورت پوچھتی ہے کہ آپ کب فارغ ہوں گے؟“

میں نے رحیم سے کہا

”ان سے کہہ دو بس پانچ منٹ میں آتے ہیں۔ کپڑے تبدیل کر رہے ہیں“

رحیم

”جی اچھا“

کہہ کر چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ اب اور زیادہ سوچنا فضول ہے۔ چلو اُس سے مل ہی لیں۔ اتنی خط و کتابت ہوتی رہی ہے اور پھر وہ اتنی دُور سے ملنے آئی ہے بیمار ہے۔ انسانی شرافت کا تقاضا ہے کہ اس کی خاطر داری اور دل جوئی کی جائے۔ میں نے پلنگ پر سے اُٹھ کر سلیپر پہنے اور دوسرے کمرے میں جہاں وہ عورت تھی داخل ہوا۔ وہ برقع پہنے تھی میں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ مجھے اس کے بُرقعے کے سیاہ نقاب میں صرف اس کی ناک دکھائی دی جو کافی تیکھی تھی۔ میں بہت اُلجھن محسوس کر رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ بہر حال میں نے گفتگو کا آغاز کیا

”مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔ در اصل میں اپنی عادت کی وجہ سے۔“

اُس عورت نے میری بات کاٹ کر کہا

”جی کوئی بات نہیں۔ آپ خواہ مخواہ تکلیف کرتے ہیں۔ میں تو انتظار کی عادی ہو چکی ہوں۔“

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا میں کیا کہوں۔ بس جو لفظ زبان پر آئے اُگل دیے آپ کس کا انتظار کرتی رہی ہیں اُس نے اپنے چہرے پر نقاب تھوڑی سی اُٹھائی۔ اس لیے کہ وہ اپنے ننھے سے رومال سے اپنے آنسو پونچھنا چاہتی تھی۔ آنسو پونچھنے کے بعد اُس نے مجھ سے پوچھا

”آپ نے کیا کہا تھا مجھ سے؟“

اُس کی ٹھوڑی بڑی پیاری تھی جیسے بنارسی آم کی کیسری۔ جب اس کی نقاب اُٹھی تھی تو میں نے اُس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ میں تو اس کے سوال کا جواب نہ دے سکا اس لیے کہ میں اس کی ٹھوڑی میں گم ہو گیا تھا۔ آخر اُسے ہی بولنا پڑا

”آپ نے پوچھا تھا تم کس کا انتظار کرتی رہی ہو۔ جواب سننا چاہتے ہیں آپ؟“

”جی ہاں۔ فرمایئے۔ لیکن دیکھیے کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے قنوطیت کا اظہار ہو“

اُس عورت نے اپنی نقاب اُلٹ دی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کالی بدلیوں میں چاند نکل آیا ہے۔ اس نے نیچی نگاہوں سے مجھ سے کہا

”جانتے ہیں آپ میں کون ہوں“

میں نے جواب دیا

”جی نہیں“

اُس نے کہا

”میں آپ کی بیوی ہوں۔ جس سے آپ نے آج سے ڈیڑھ برس پہلے نکاح کیا تھا۔ میں آپ کو لکھتی رہی ہوں کہ میں بیمار ہوں۔ میں بیمار نہیں لیکن اگر آپ نے اسی طرح مجھے انتظار میں رکھا تو یقیناً مر بھی جاؤں گی۔“

میں دوسرے روز ہی اُس کو گھر لے آیا بڑے ٹھاٹ سے۔ اب میں بہت خوش ہوں۔ یہ واقعہ مجھے میرے ایک دوست نے جو افسانہ نگار اور شاعر ہے سُنایا تھا جسے میں نے اپنے انداز میں رقم کر دیا۔ سعادت حسن منٹو۱۶ اکتوبر۱۹۵۴ء

پانچ دن

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوپانچ دن

جموں توی کے راستے کشمیر جایئے تو کد کے آگے ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں بٹوت آتا ہے۔ بڑی پر فضا جگہ ہے۔ یہاں دق کے مریضوں کے لیے ایک چھوٹا سا سینے ٹوریم ہے۔ یوں تو آج سے آٹھ نو برس پہلے بٹوت میں پورے تین مہینے گزار چکا ہوں، اور اس صحت افزا مقام سے میری جوانی کا ایک ناپختہ رومان بھی وابستہ ہے مگر اس کہانی سے میری کسی بھی کمزوری کا تعلق نہیں۔ چھ سات مہینے ہوئے مجھے بٹوت میں اپنے ایک دوست کی بیوی کو دیکھنے کے لیے جانا پڑا جو وہاں سینے ٹوریم میں زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ایک مریض چل بسا اور بے چاری پدما کے سانس جو پہلے اکھڑے ہوئے تھے اور بھی غیر یقینی ہو گئے۔ میں نہیں کہہ سکتا وجہ کیا تھی لیکن میرا خیال ہے کہ محض اتفاق تھا کہ چار روز کے اندر اندر اس چھوٹے سے سینے ٹوریم میں تین مریض اوپر تلے مر گئے جونہی کوئی بستر خالی ہوتا یا تیمار داری کرتے کرتے تھکے ہوئے انسانوں کی تھکی ہوئی چیخ پکار سنائی دیتی، سارے سینی ٹوریم پر ایک عجیب قسم کی خاکستری اداسی چھا جاتی اور وہ مریض جو امید کے پتلے دھاگے کے ساتھ چمٹے ہوتے تھے، یاس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتے۔ میرے دوست کی بیوی تو پدما بالکل دم بخود ہو جاتی۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر موت کی زردیاں کانپنے لگتیں اور اس کی گہری آنکھوں میں ایک نہایت ہی رحم انگیز استفسار پیدا ہو جاتا۔ سب سے آگے ایک

”خوف زدہ کیوں؟“

اور اس کے پیچھے بہت سے ڈرپوک

”نہیں“

تیسرے مریض کی موت کے بعد میں باہر برآمدے میں بیٹھ کر زندگی اور موت کے متعلق سوچنے لگا۔ سینے ٹوریم ایک مرتبان سا لگتا ہے جس میں یہ مریض پیاز کی طرح سرکے میں ڈلے ہُوئے ہیں۔ ایک کانٹا آتا ہے اور جو پیاز اچھی طرح گل گئی ہے، اسے ڈھونڈتا ہے اور نکال کر لے جاتا ہے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز تشبیہ تھی۔ لیکن جانے کیوں بار بار یہی میرے ذہن میں آئی۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ سوچ سکا کہ موت ایک بہت ہی بھونڈی چیز ہے۔ یعنی آپ اچھے بھلے جی رہے ہیں، ایک مرض کہیں سے آن چمٹتا ہے اور مر جاتے ہیں۔ افسانوی نقطہ نظر سے بھی زندگی کی کہانی کا یہ انجام کچھ چست معلوم نہیں ہوتا۔ برآمدے سے اٹھ کر اندر داخل ہُوا۔ دس پندرہ قدم اٹھائے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”دفنا آئے آپ نمبر بائیس کو“!

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سفید بستر پر دو کالی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ یہ آنکھیں جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ ایک بنگالی عورت کی تھیں جو دوسرے مریضوں سے بالکل الگ طریقے پر اپنی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جب یہ کہا

”دفنا آئے آپ نمبر بائیس کو؟“

تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم انسان کو نہیں بلکہ ایک عدد دفنا کر آرہے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو اس مریض کو قبر کے سپرد کرتے ہوئے میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں بھی یہ احساس پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک انسان تھا، اور اس کی موت سے دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ میں جب مزید گفتگو کرنے کے لیے اس بنگالی عورت کے پاس بیٹھا جس کی سیاہ فام آنکھیں ایسی ہولناک بیماری کے باوجود تروتازہ اور چمکیلی تھیں تو اس نے ٹھیک اسی طرح مسکرا کر کہا۔

”میرا نمبر چار ہے۔“

پھر اس نے اپنی سفید چادر کی چند سلوٹیں اپنے استخوانی ہاتھ سے درست کیں اور بڑے بے تکلف انداز میں کہا۔

”آپ مردوں کو جلانے دفنانے میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔“

میں نے یونہی سا جواب دیا۔

”نہیں تو“

۔ اس کے بعد یہ مختصر گفتگو ختم ہو گئی اور میں اپنے دوست کے پاس چلا گیا۔ دوسرے روز میں حسب معمول سیر کو نکلا۔ ہلکی ہلکی پھوار گر رہی تھی۔ جس سے فضا بہت ہی پیاری اور معصوم ہو گئی تھی، یعنی جیسے اس کو ان مریضوں سے کوئی سروکار ہی نہیں جو اس میں جراثیم بھرے سانس لے رہے تھے۔ چیڑ کے لانبے لانبے درخت، نیلی نیلی دُھند میں لپٹی ہوئی پہاڑیاں، سڑک پر لڑھکتے ہُوئے پتھر۔ پست قد مگر صحت مند بھینسیں۔ ہر طرف خوبصورتی تھی۔ ایک پر اعتماد خوبصورتی جسے کسی چور کا کھٹکا نہیں تھا۔ میں سیر سے لوٹ کر سینے ٹوریم میں داخل ہوا تو مریضوں کے اترے ہوئے چہروں ہی سے مجھے معلوم ہو گیا کہ ایک اور عدد چل بسا ہے۔ گیارہ نمبر، یعنی پدما۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں جو کھلی رہ گئی تھیں میں نے بہت سے خوفزدہ

”کیوں“

اور ان کے پیچھے بے شمار ڈرپوک

”نہیں“

منجمد پائے۔ بے چاری! پانی برس رہا تھا، اس لیے خشک ایندھن جمع کرنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال، اس غریب کی لاش کو آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ میرا دوست وہیں چتا کے پاس بیٹھا رہا اور میں اس کا سامان ٹھیک کرنے کے لیے سینے ٹوریم آگیا۔ اندر داخل ہوتے ہُوئے مجھے پھر اس بنگالی عورت کی آواز آئی۔

”بہت دیر لگ گئی آپ کو“!

”جی ہاں بارش کی وجہ سے خشک ایندھن نہیں مل رہا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔“

”اور جگہوں پر تو ایندھن کی دکانیں ہوتی ہیں، پر میں نے سنا ہے یہاں اِدھر اُدھر سے خود ہی لکڑیاں کاٹنی اور چننی پڑتی ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”ذرا بیٹھ جایئے۔“

میں اس کے پاس اسٹول پر بیٹھ گیا۔ تو اس نے ایک عجیب سا سوال کیا۔

”تلاش کرتے کرتے جب آپ کو خشک لکڑی کا ٹکرا مل جاتا ہو گا تو آپ بہت خوش ہوتے ہوں گے؟“

اس نے میرے جواب کا انتظار نہ کیا اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”موت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں نے کئی بار سوچا ہے لیکن سمجھ نہیں سکا۔“

وہ داناؤں کی طرح مسکرائی اور بچوں کے سے انداز میں کہنے لگی۔

”میں کچھ کچھ سمجھ سکی ہوں۔ اس لیے کہ بہت موتیں دیکھ چکی ہوں۔ اتنی کہ آپ شاید ہزار برس بھی زندہ رہ کر نہ دیکھ سکیں۔ میں بنگال کی رہنے والی ہوں جہاں کا قحط آج کل بہت مشہور ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہو گا۔ لاکھوں آدمی وہاں مر چکے ہیں۔ بہت سی کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ سینکڑوں مضمون لکھے جا چکے ہیں۔ پھر بھی سنا ہے کہ انسان کی اس بپتا کا اچھی طرح نقشہ نہیں کھینچا جا سکا۔ موت کی اسی منڈی میں موت کے متعلق میں نے سوچا۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا؟“

اس نے اسی انداز سے جواب دیا۔

”میں نے سوچا کہ ایک آدمی کا مرنا موت ہے۔ ایک لاکھ آدمیوں کا مرنا تماشا ہے۔ سچ کہتی ہوں موت کا وہ خوف جو کبھی مرے دل پر ہُوا کرتا تھا، بالکل دور ہو گیا۔ ہر بازار میں دس بیس ارتھیاں اور جنازے نظر آئیں تو کیا موت کا اصلی مطلب فوت نہیں ہو جائے گا۔ میں صرف اتنا سمجھ سکی ہُوں کہ ایسی بے تحاشا موتوں پر رونا بیکار ہے۔ بیوقوفی ہے۔ اوّل تو اتنے آدمیوں کا مرنا ہی سب سے بڑی حماقت ہے۔“

میں نے فوراً ہی پوچھا۔

”کس کی۔“

”کسی کی بھی ہو۔ حماقت، حماقت ہے۔ ایک بھرے شہر پر آپ اوپر سے بم گرا دیجیے۔ لوگ مر جائیں گے۔ کنوؤں میں زہر ڈال دیجیے۔۔ جو بھی ان کا پانی پیے گا۔ مر جائے گا۔ یہ کال، قحط، جنگ اور بیماریاں سب واہیات ہیں۔ ان سے مر جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اوپر سے چھت آ گرے۔ لیکن دل کی ایک جائز خواہش کی موت بہت بڑی موت ہے۔ انسان کو مارنا کچھ نہیں، لیکن اس کی فطرت کو ہلاک کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ لیکن پھر کروٹ بدل کر کہنے لگی۔

”میرے خیالات پہلے ایسے نہیں تھے۔ سچ پوچھیے تو مجھے سوچنے کا وقوف ہی نہیں تھا۔ لیکن اس قحط نے مجھے ایک بالکل نئی دنیا میں پھینک دیا۔“

رک کر ایک دم وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ میں اپنی کاپی میں یاداشت کے طور پر اس کی چند باتیں نوٹ کر رہا تھا۔

”یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟“

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور کہا۔

”میں افسانہ نگار ہوں۔ جو باتیں مجھے دلچسپ معلوم ہوں، نوٹ کر لیا کرتا ہوں۔“

”اوہ! تو پھر میں آپ کو اپنی پوری کہانی سناؤں گی۔“

تین گھنٹے تک نحیف آواز میں وہ مجھے اپنی کہانی سناتی رہی۔ میں اب اپنے الفاظ میں اسے بیان کرتا ہوں۔ غیر ضروری تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بنگال میں جب قحط پھیلا اور لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگے تو سکینہ کو اس کے چچا نے ایک اوباش آدمی کے پاس پانچ سو روپے میں بیچ دیا جو اسے لاہور لے آیا۔ اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا کر اس سے روپیہ کمانے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلا آدمی جو اس کے پاس اس غرض سے لایا گیا ایک خوبصورت اور تندرست نوجوان تھا۔ قحط سے پہلے جب روٹی کپڑے کی فکر نہیں تھی، وہ ایسے ہی نوجوان کے خواب دیکھا کرتی تھی جو اس کا شوہر بنے۔ مگر یہاں اس کا سودا کیا جا رہا تھا۔ ایک ایسے فعل کے لیے اسے مجبور کیا جا رہا تھا جس کے تصور ہی سے وہ کانپ کانپ اٹھتی تھی۔ جب وہ کلکتہ سے لاہور لائی گئی تو اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ وہ باشعور لڑکی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ چند ہی روز میں اسے ایک سکہ بنا کر جگہ جگہ بھنایا جائے گا۔ اس کو یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن اس قیدی کی طرح جو رحم کی امید نہ ہونے پر بھی آس لگائے رہتا ہے، وہ کسی ناممکن حادثے کی متوقع تھی۔ یہ حادثہ تو نہ ہوا لیکن خود اس میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ وہ رات کو کچھ اپنی ہوشیاری سے اور کچھ اس نوجوان کی خامکاری کی بدولت ہوٹل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اب لاہور کی سڑکیں تھیں اور ان کے نئے خطر۔ قدم قدم پر ایسا لگتا تھا کہ لوگوں کی نظریں اسے کھا جائیں گی۔ لوگ اسے کم دیکھتے تھے، لیکن اس کی جوانی کو جو چھپنے والی چیز نہیں تھی، کچھ اتنا زیادہ گھورتے تھے، جیسے برمے سے اس کے اندر سوراخ کر رہے ہیں۔ سونے چاندی کا کوئی زیور یا موتی ہوتا تو وہ شاید لوگوں کی نظروں سے بچا لیتی۔ مگر وہ ایک ایسی چیز کی حفاظت کر رہی تھی جس پر کوئی بھی آسانی کے ساتھ ہاتھ مار سکتا تھا۔ تین دن اور تین راتیں وہ کبھی ادھر کبھی ادھر گھومتی بھٹکتی رہی۔ بھوک کے مارے اس کا بُرا حال تھا مگر اس نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کا یہ پھیلا ہوا ہاتھ اس کی عصمت سمیت کسی اندھیری کوٹھری میں کھینچ لیا جائے گا۔ دکانوں میں سجی ہوئی مٹھائیاں دیکھتی تھی۔ بھٹیار خانوں میں لوگ بڑے بڑے نوالے اٹھاتے تھے۔ اس کے ہر طرف کھانے پینے کی چیزوں کا بڑی بیدردی سے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن جیسے دنیا میں اس کے مقسوم کا کوئی دانہ ہی نہیں رہا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار کھانے کی اہمیت معلوم ہوئی۔ پہلے اس کو کھانا ملتا تھا، اب وہ کھانے سے ملنا چاہتی تھی۔ چار روز کے فاقوں نے اسے اپنی ہی نظروں میں ایک بہت بڑا شہید تو بنا دیا۔ لیکن اس کے جسم کی ساری بنیادیں ہل گئیں۔ وہ جو روحانی تسکین ہوتی ہے ایک وقت آ گیا کہ وہ بھی سکڑنے لگی۔ چوتھے روز شام کو وہ ایک گلی میں سے گزر رہی تھی۔ جانے کیا جی میں آئی کہ ایک مکان کے اندر گھس گئی۔ اندر چل کر خیال آیا کہ نہیں، کوئی پکڑ لے گا۔ اور تمام کیے کرائے پر پانی پھر جائیگا۔ اب اس میں اتنی طاقت بھی تو نہیں۔ لیکن سوچتے سوچتے وہ صحن کے پاس پہنچ چکی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں اس نے گھڑونچیوں پر دو صاف گھڑے دیکھے۔ اور انکے ساتھ ہی پھلوں سے بھرے ہوئے دو تھال۔ سیب۔ ناشپاتیاں۔ انار۔ اس نے سوچا انار بکواس ہے۔ سیب اور ناشپاتیاں ٹھیک ہیں۔ گھڑے کے اوپر چینی کے بجائے ایک پیالہ پڑا تھا۔ اس نے طشتری اٹھا کر دیکھا تو ملائی سے پُر تھا۔ اس نے اٹھا لیا اور بیشتر اس کے کہ وہ کچھ سوچ سکے، جلدی جلدی اس نے نوالے اٹھانے شروع کیے ساری ملائی اس کے پیٹ میں تھی۔ کتنا راحت بخش لمحہ تھا۔ بھول گئی کہ کسی غیر کے مکان میں ہے۔ وہیں بیٹھ کر اس نے سیب اور ناشپاتیاں کھانا شروع کر دیں۔

گھڑونچی کے نیچے کچھ اور بھی تھا۔ یخنی۔ ٹھنڈی تھی لیکن اس نے ساری پتیلی ختم کر دی۔ ایک دم جانے کیا ہوا۔ پیٹ کی گہرائیوں سے غبار سا اٹھا اور اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کہیں سے کھانسی کی آواز آئی۔ بھاگنے کی کوشش کی مگر چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو وہ ایک صاف ستھرے بستر میں لیٹی تھی۔ سب سے پہلے اسے خیال آیا۔ کہیں میں لوٹی تو نہیں گئی۔ لیکن فوراً ہی اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ صحیح سلامت تھی۔ کچھ اور سوچنے ہی لگی تھی کہ پتلی پتلی کھانسی کی آواز آئی۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ کمرے میں داخل ہوا۔ سکینہ نے اپنے گاؤں میں بہت سے قحط کے مارے انسان دیکھے تھے مگر یہ انسان ان سے بہت مختلف تھا۔ بے چارگی اس کی آنکھوں میں بھی تھی مگر اس میں وہ اناج کی ترسی ہوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے پیٹ کے بھوکے دیکھے تھے جن کی نگاہوں میں ایک ننگی اور بھونڈی للچاہٹ تھی لیکن اس کی مرد کی نگاہوں میں اسے ایک چلمن سی نظر آئی۔ ایک دھندلا پردہ جس کے پیچھے سے وہ ڈر ڈر کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خوفزدہ سکینہ کو ہونا چاہیے لیکن سہما ہوا وہ تھا۔ اس نے رک رک کر کچھ جھینپتے ہوئے عجیب قسم کا حجاب محسوس کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”جب تم کھا رہی تھیں تو میں تم سے دور کھڑا تھا۔ اف! میں نے کن مشکلوں سے اپنی کھانسی روکے رکھی کہ تم آرام سے کھا سکو اور میں یہ خوبصورت منظر زیادہ دیر تک دیکھ سکوں۔ بھوک بڑی پیاری چیز ہے۔ لیکن ایک میں ہوں کہ اس نعمت سے محروم ہُوں۔ نہیں، محروم نہیں کہنا چاہیے کیونکہ میں نے خود اس کو ہلاک کیا ہے۔ سکینہ کچھ بھی سمجھ نہ سکی۔ وہ ایک پہیلی تھی۔ جو بوجھتے بوجھتے ایک اور پہیلی بن جاتی تھی لیکن اس کے باوجود سکینہ کو اس کی باتیں اچھی لگیں جن میں انسانیت کی گرمی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ساری آپ بیتی اسکو سنادی۔ وہ خاموش سنتا رہا جیسے اس پر اثر ہی نہیں ہوا۔ لیکن جب سکینہ اس کا شکریہ ادا کرنے لگی تو اس کی آنکھیں جو آنسوؤں سے بے نیاز معلوم ہوتی تھیں ایک دم نمناک ہو گئیں اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”یہیں رہ جاؤ سکینہ۔ میں دق کا بیمار ہوں۔ مجھے کوئی کھانا۔ کوئی پھل اچھا نہیں لگتا۔ تم کھایا کرنا اور میں تمہیں دیکھا کروں گا۔“

لیکن فوراً ہی وہ مسکرانے لگا۔

”کیا حماقت ہے۔ کوئی اور سنتا تو کیا کہتا۔ یعنی دوسرا کھایا کرے اور میں دیکھا کروں گا۔ نہیں سکینہ۔ ویسے میری دلی خواہش ہے کہ تم یہیں رہو۔“

سکینہ کچھ سوچنے لگی۔

”جی نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ اس گھر میں اکیلے ہیں اور میں۔ نہیں نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں۔“

یہ سن کر اس کو کچھ ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ تھوڑی دیر کے بالکل کھو سا گیا۔ جب بولا تو اس کی آواز کھوکھلی تھی۔

”میں دس برس تک سکول میں لڑکیاں پڑھاتا رہا ہُوں ہمیشہ میں نے ان کو اپنی بچیاں سمجھا۔ تم۔ تم ایک اور ہو جاؤ گی۔“

سکینہ کے لیے کوئی اور جگہ ہی نہیں تھی! چنانچہ اس پروفیسر کے ہاں ٹھہر گئی۔ وہ ایک برس اور چند مہینے زندہ رہا۔ اس دوران میں بجائے اس کے کہ سکینہ اس کی خبر گیری کرتی، الٹا وہ جو کہ بیمار تھا، اس کی آرائش و آرام پہنچانے میں کچھ اس بے کلی سے مصروف رہا جیسے ڈاک جانے والی ہے اور وہ جلدی جلدی ایک خط میں جو بات اس کے ذہن میں آتی ہے لکھتا جا رہا ہے۔ اس کی اس توجہ نے سکینہ کو جسے توجہ کی ضرورت تھی۔ چند مہینوں میں نکھار دیا۔ اب پروفیسر اس سے کچھ دور رہنے لگا۔ مگر اس کی توجہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخری دنوں میں اچانک اس کی حالت خراب ہو گئی۔ ایک رات جب کہ سکینہ اس کے پاس ہی سو رہی تھی، وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور زور سے چلانے لگا۔

”سکینہ سکینہ۔“

یہ چیخیں سُن کر سکینہ گھبرا گئی۔ پروفیسر کی دھنسی ہوئی آنکھوں جو چلمن سی ہوا کرتی تھی موجود نہیں تھی۔ اب ایک اتھاہ دکھ سکینہ کو ان میں نظر آیا۔ پروفیسر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سکینہ کے ہاتھ پکڑے اور کہا۔

”میں مر رہا ہوں۔ لیکن اس موت کا مجھے دُکھ نہیں۔ کیونکہ بہت سی موتیں میرے اندر واقع ہو چکی ہیں۔ تم سُننا چاہتی ہو میری داستان۔ جاننا چاہتی ہو میں کیا ہوں۔ سنو۔ ایک جھوٹ ہوں۔ بہت بڑا جھوٹ۔ میری ساری زندگی اپنے آپ سے جھوٹ بولنے اور پھر اسے سچ بنانے میں گزری ہے۔ اف کتنا تکلف دہ غیر فطری اور غیر انسانی کام تھا۔ میں نے ایک خواہش کو مارا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس قتل کے بعد مجھے اور بہت سے خون کرنے پڑیں گے۔ سکینہ! یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہُوں فلسفیانہ بکواس ہے، سیدھی بات یہ ہے کہ میں اپنا کیریکٹر اونچا کرتا رہا اور خود انتہائی پستیوں کے دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ میں مر جاؤں گا اور یہ کیریکٹر۔ یہ بے رنگ پھریرا میری خاک پر اُڑتا رہے گا۔ وہ تمام لڑکیاں جنہیں میں سکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ کبھی مجھے یاد کریں گی تو کہیں گی ایک فرشتہ تھا جو انسانوں میں چلا آیا تھا۔ تم بھی میری نیکیوں کو نہیں بھولو گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سے تم اس گھر میں آئی ہو۔ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے تمہاری جوانی کو دزدیدہ نگاہوں سے نہ دیکھا ہو۔ میں نے تصور میں کئی بار تمہارے ہونٹوں کو چوما ہے۔ کئی بار میں نے تمہاری انھوں پر اپنا سر رکھا ہے۔ لیکن ہر بار مجھے ان تصویروں کو پُرزے پُرزے کرنا پڑا۔ پھر ان پرزوں کو جلا کر میں نے راکھ بنائی کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ میں مر جاؤں گا۔ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اپنے اس اونچے کیریکٹر کو ایک لمبے بانس پر لنگور کی طرح بٹھا دیتا۔ اور ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کرتا کہ آؤ دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔“

اس واقعہ کے بعد پروفیسر صرف پانچ روز زندہ رہا۔ سکینہ کا بیان ہے کہ مرنے سے پہلے وہ بہت خوش تھا۔ جب وہ آخری سانس لے رہا تھا تو اس نے سکینہ سے صرف اتنا کہا۔

”سکینہ! میں لالچی نہیں۔ زندگی کے یہ آخری پانچ دن میرے لیے بہت ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“

پری

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپری

کشمیری گیٹ دہلی کے ایک فلیٹ میں انور کی ملاقات پرویز سے ہوئی۔ وہ قطعاً متاثر نہ ہوا۔ پرویز نہایت ہی بے جان چیز تھی۔ انور نے جب اس کی طرف دیکھا اور اس کو آداب عرض کہا تو اس نے سوچا

”یہ کیا ہے عورت ہے یا مولی“

پرویز اتنی سفید تھی کہ اس کی سفیدی بے جان سی ہوگئی تھی جس طرح مولی ٹھنڈی ہوتی ہے اسی طرح اس کا سفید رنگ بھی ٹھنڈا تھا۔ کمر میں ہلکا سا خم تھا جیسا کہ اکثر مولیوں میں ہوتا ہے۔ انور نے جب اس کو دیکھا تو اس نے سبز دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کو پرویز ہو بہو مولی نظر آئی جس کے ساتھ سبز پتے لگے ہوں۔ انور سے ہاتھ ملا کر پرویز اپنے ننھے سے کتے کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سرخی لگے ہونٹوں پر جو اس کے سفید ٹھنڈے چہرے پر ایک دہکتا ہوا انگارہ سا لگتے تھے۔ ضعیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی کتے کے بالوں میں اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس نے دیوار کے ساتھ لٹکتی ہوئی انور کے دوست جمیل کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“

انور کو اس کے ساتھ مل کر قطعاً خوشی نہیں ہوئی تھی۔ رنج بھی نہیں ہوا۔ اگر وہ سوچتا تو یقینی طور پر اپنے صحیح رد عمل کو بیان نہ کر سکا۔ دراصل پرویز سے مل کر وہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے ملا ہے یا اسکی ملاقات کسی لڑکے سے ہوئی ہے۔ یا سردیوں میں کرکٹ کے میچ دیکھتے ہوئے اس نے ایک مولی خرید لی ہے۔ انور نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں۔ بس ایک صرف یہی چیز تھی۔ جس کے متعلق تعریفی الفاظ میں کچھ کہا جا سکتا تھا۔ ان آنکھوں کے علاوہ پرویز کے جسم کے ہر حصے پر نکتہ چینی ہو سکتی تھی۔ باہیں بہت پتلی تھیں۔ جو چھوٹی آستینوں والی قمیض میں سے بہت ہی یخ آلود انداز میں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اگر اس کے سر پر سبز ڈوپٹہ نہ ہوتا تو انور نے یقیناً اس کو فرجڈیر سمجھا ہوتا جس کا رنگ عام طور پر اکتا دینے والا سفید ہوتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر جیتے جیتے لہو جیسی سرخی بہت گھل رہی تھی۔ برف کے ساتھ آگ کا کیا جوڑ؟۔ اس کی چھوٹی آستینوں والی قمیض سفید کمبرک کی تھی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ سینڈل بھی سفید تھے۔ اس تمام سفیدی پر اس کا سبز ڈوپٹہ اتنا انقلاب انگیز نہیں تھا۔ مگر اس کے سرخی لگے ہونٹ ایک عجیب سا ہنگامہ خیز تضاد بن کر اسکے چہرے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ صحن میں جب وہ چند قدم چل کر جمیل کی طرف اپنے ننھے سے کتے کو دیکھتی ہوئی بڑھی تھی۔ تو انور نے محسوس کیا تھا کہ یہ عورت جو کہ آ رہی ہے عورت نہیں ننکاری ہے۔ اس سے ہاتھ ملاتے وقت اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی لاش نے پکڑ لیا ہے۔ مگر جب اس نے باتیں شروع کیں تو وہ ٹھنڈی گرنت جو اس کے ہاتھ کے ساتھ چھٹی ہوئی تھی کچھ گرم ہونے لگی۔ وہ آوارہ خیال تھی۔ اس کی باتیں سب کی سب بے جوڑ تھیں۔ موسم کا ذکر کرتے کرتے وہ اپنے درزی کی طرف لڑھک گئی۔ درزی کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ اس کو اپنے کتے کی چھینکوں کا خیال آ گیا۔ کتے نے چھینکا تو اس نے اپنے خاوند کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا۔

”وہ بالکل میرا خیال نہیں رکھتے۔ دیکھیے ابھی تک دفتر سے نہیں آئے۔“

انور کے لیے پرویز اور اس کا خاوند دونوں بالکل نئے تھے۔ وہ پرویز کو جانتا تھا نہ اسکے خاوند کو۔ گفتگو کے دوران میں صرف اس کو اس قدر معلوم ہوا کہ پرویز کا خاوند جمیل کا پڑوسی ہے اور ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے البتہ اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ پرویز گفتگو کے آغاز سے گفتگو کے اختتام تک اس کو ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جن میں جنسی بلاوا تھا۔ انور کو حیرت تھی کہ ایک ٹھنڈی مولی میں یہ بلاوا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ اٹھ کر جانے لگ تو اس نے گود سے اپنے ننھے کتے کو اتارا اور اس سے کہا

”چلو ٹینی چلیں“

پھر مسز جمیل سے جیگروول کے بارے میں کچھ پوچھ کر اپنے سرخ ہونٹوں پر چھدری سی مسکراہٹ پیدا کر کے انور کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس نے کہا۔

”میرے ہزبنڈ سے مل کر آپ کو بہت خوشی ہوگی۔“

ایک بار پھر انور نے فرجڈیٹر میں اپنا ہاتھ دھویا اور سوچا

”مجھے اس کے ہزبنڈ سے مل کر کیا خوشی ہوگی۔ جب کہ یہ خود اس سے ناخوش ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ میرا بالکل خیال نہیں رکھتے۔“

دیر تک وہ جمیل اور اس کی بیوی سے باتیں کرتا رہا۔ کہ شاید ان میں سے کوئی پرویز کے متعلق بات کرے گا اور اس کو اس عورت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوں گی جس کو اس نے ٹھنڈی مولی سمجھا تھا۔ مگر کوئی ایسی بات نہ ہوئی۔ جو پرویز کی شخصیت پر روشنی ڈالتی۔ جیگر ودل کا ذکر آیا تو مسز جمیل نے صرف اتنا کہا۔

”صرف کا ٹیسٹ رنگوں کے بارے میں بہت اچھا ہے۔“

”پرویز۔ پری“

انور نے سوچا

”کتنی غلط تخفیف ہے یہ خستہ سی ریڑھ کی ہڈی والی عورت جس کا رنگ اکتا دینے والی حد تک سفید ہے۔ اس کو پری کہا جائے کیا یہ کوہ قاف کی توہین نہیں؟“

جب پرویز کے متعلق اور کوئی بات نہ ہوئی تو انور نے جمیل سے رخصت چاہی

”اچھا بھائی میں چلتا ہوں“

پھر وہ مسز جمیل سے مخاطب ہوا۔

”بھابھی آپ کی پری بڑی دلچسپ چیز ہے۔“

مسز جمیل مسکرائی۔

”کیوں“

انور نے یونہی کہہ دیا تھا۔ مسز جمیل نے کیوں کہا تو اس کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ مسکرایا۔

”کیا آپ کے نزدیک وہ دلچسپ نہیں؟ کون ہیں یہ محترمہ؟“

مسز جمیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جمیل نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ جمیل مسکرا کر اٹھا اور انور کے کاندھے کو دبا کر اس نے گٹک کر کہا۔ چلو تمہیں بتاتا ہوں کون ہیں یہ محترمہ۔ بڑی واجبِ تعظیم ہستی ہیں“

”آپ کو تو بس کوئی موقعہ ملنا چاہیے“

مسز جمیل کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ جمیل ہنسا۔

”کیا میں غلط کہتا ہوں کہ پری واجبِ تعظیم ہستی نہیں“

”میں نہیں جانتی“

یہ کہہ کر مسز جمیل اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ جمیل نے پھر انور کا کندھا دبایا اور اس سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔ تمہاری بھابھی نے ہمیں پری کے متعلق باتیں کرنے کا موقعہ دے دیا ہے۔“

انور بیٹھ گیا۔ جمیل نے سگریٹ سلگایا اور اس سے پوچھا۔

”تمہیں پری میں کیا دلچسپی نظر آئی؟“

انور نے کچھ دیر اپنے دماغ کو کریدا

”دلچسپی؟۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا میرا خیال ہے اس کا غیر دلچسپ ہونا ہی شاید اس دلچسپی کا باعث ہے۔“

جمیل نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

”لفظوں کا اُلٹ پھیر نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتاؤ تمہیں اس میں کیا دلچسپی نظر ائی؟“

انور کو یہ جرح پسند نہ آئی

”مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ میں نے کہہ دیا ہے۔“

جمیل ہنسا، پھر ایک دم سنجیدہ کر اس نے سامنے کمرے کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہا۔

”بڑی خطرناک عورت ہے انور“

انور نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ محترمہ دو آدمیوں کا خون کرا چکی ہے۔“

انور کی آنکھوں کے سامنے معاًپرویز کا سفید رنگ آ گیا۔ مسکرا کر کہنے لگا۔

”اسکے باوجود لہو کی ایک چھینٹ بھی نہیں اس میں“

لیکن فوراًہی اس کو معاملے کی سنگینی کا خیال آیا تو اس نے سنجیدہ ہو کر جمیل سے پوچھا

”کیا کہا تم نے؟۔ دو آدمیوں کا خون؟“

انور نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی

”جی ہاں۔ ایک کیپٹن تھا۔ دوسرا سر بہاؤالدین کا لڑکا“

”کون سر بہاؤالدین؟“

”اماں وہی۔ جو ایگریکلچرل ڈیپارٹمنٹ میں خدا معلوم کیا تھے“

انور کو کچھ پتہ نہ چلا۔ بہاؤالدین کو چھوڑ کر اس نے جمیل سے پوچھا۔

”کیسے خون ہوا ان دونوں کا؟“

”جیسے ہوا کرتا ہے۔ کالج میں کیپٹن صاحب سے پری کا یارانہ تھا۔ شادی کر کے جب وہ بمبئی گئی تو وہاں سر بہاؤالدین کے لڑکے سے راہ ورسم پیدا ہو گئی۔ اتفاق سے ٹریننگ کے سلسلے میں کپتان صاحب وہاں پہنچے۔ پرانے تعلقات قائم کرنا چاہے تو سر بہاؤالدین کے لڑکے آڑے آئے۔ ایک پارٹی میں دونوں کی چخ ہوئی۔ دوسرے روز کپتان صاحب نے پستول داغ دیا۔ رقیب وہیں ڈھیر ہو گئے پری کو بہت افسوس ہوا۔ سر بہاؤالدین کے لڑکے کی موت کے غم میں اس نے کئی دن سوگ میں کاٹے۔ جب کپتان صاحب کو پھانسی ہوئی تو لوگ کہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں نے ہزار ہا اصلی آنسو بہائے۔ اس کے بعد ایک نوجوان پارسی اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وصل کی رات جب اُسے پتہ چلا کہ اس کی محبوبہ شادی شدہ ہے تو اس نے اپنے باپ کی ڈسپنسری سے زہر لے کرر کھا لیا“

انور نے کہا

”یہ تین خون ہوئے“

جمیل مسکرایا۔

”نوجوان پارسی خوش قسمت تھا اس کے باپ نے اسے موت کے منہ سے بچا لیا۔“

”بڑی عجیب وغریب عورت ہے“

یہ کہہ کر انور سوچنے لگا کہ پرویز جس میں کشش نام کو بھی نہیں کیسے ان ہنگاموں کا باعث ہوئی۔ کپتان نے اس میں کیا دیکھا۔ سر بہاؤالدین کے لڑکے کو اس میں کیا چیز نظر آئی؟۔ اور اس نوجوان پارٹی نے اس ڈھیلی ڈھالی عورت میں کیا دلکشی دیکھی؟ انور نے پرویز کو تصور میں ننگا کر کے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر سفید سفید گوشت منڈھا ہوا تھا۔ خون کے بغیر کو ملے دبلے پتلے لڑکے کے کولہوں جیسے تھے۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی دم نہیں تھا۔ ایسا معلوم تھا کہ اگر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کسی نے دبایا تو وہ دونیم ہو جائے گی۔ بال کٹے ہوئے تھے جو ہائیڈروجن پر اکسائڈ کے استعمال سے اپنا قدرتی رنگ کھو چکے تھے۔ کیا تھا اس کے سراپا میں؟۔ ایک فقط اس کی آنکھیں کچھ غنیمت تھیں۔ انور نے سوچا۔ صرف آنکھیں کون چاٹتا پھرتا ہے۔ کوئی بات ہونی چاہیے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس ٹھنڈی مولی نے اتنے بڑے ہنگامے پیدا کیے۔ مجھ سے تو جب اس نے ہاتھ ملایا تھا۔ تو میں نے خیال کیا تھا کہ مجھے بدبو دار ڈکاریں آنی شروع ہو جائیں گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن کچھ نہ کچھ ہے ضرور اس پری میں“

جمیل نے اسے بتایا کہ راولپنڈی میں پرویز کے کالج کے رومانس مشہور ہیں۔ اس زمانے میں اس کے بیک وقت تین تین چار چار لڑکوں سے رومان چلتے تھے۔ چھ لڑکے اسی کے باعث کالج بدر ہوئے۔ ایک کو بیمار ہو کر سینے ٹوریم میں داخل ہونا پڑا۔ انور کی حیرت بڑھ گئی۔ اس نے جمیل سے پوچھا۔ کون ہے اس کا خاوند؟۔ اور خود کس کی لڑکی ہے؟“

جمیل نے جواب دیا۔

”بہت بڑے باپ کی۔ کسی زمانے میں احمد آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، آجکل ریٹائرڈ ہیں۔ خاوند اس کا ہندو ہے۔“

”ہندو؟“

”نہیں، اب عیسائی ہو چکا ہے؟“

”کیا کرتا ہے؟“

“میرا خیال ہے شروع میں اس کا ذکر آیا تھا۔ کہ ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے۔”

انور کو یاد آ گیا۔

“ہاں، ہاں کچھ ایسی بات ہوئی تھی۔ شاید بھابی جان نے بتایا تھا؟”

جمیل اور انور تھوڑی دیر خاموش رہے۔ جمیل نے سگریٹ سلگایا اور ادھر ادھر دیکھ کر اسکی بیوی نہ سن رہی ہو۔ انور کا کاندھا دبا کر سرگوشی میں کہا۔

“تم پری سے ضرور ملو۔ دیکھنا کیا ہوتا ہے؟”

انور نے خود سے پوچھا مگر جمیل سے کہا

“کیا ہو گا؟”

جمیل کے ہونٹوں میں ایک شریر سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

“وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا”

پھر اس نے آواز دبا کر کہا۔

“کل شام چائے وہیں پئیں گے۔ اس کا خاوند رات کو آتا ہے۔”

پروگرام طے ہو گیا۔ پرویز کے متعلق اتنی باتیں سن کر اسکے دماغ میں کھدبد سی ہو رہی ہے۔ وہ بار بار سوچتا تھا۔ ملاقات پر کیا ہو گا۔ کوئی غیر معمولی چیز وقوع پذیر ہو گی۔ ہو سکتا ہے جمیل نے مذاق کیا ہو۔ ہو سکتا ہے جمیل نے جو کچھ بھی اسکے بارے میں کہا سرتاپا غلط ہو۔ لیکن پھر اسے خیال آتا۔ جمیل کو خواہ مخواہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔”

دوسرے روز شام کو جمیل اور وہ دونوں پری کے ہاں آ گئے وہ غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ نوکر نے ان کو بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ انور ووگ کی ورق گردانی کرنے لگا۔ دفعتہً جمیل اٹھا۔

“میں سگریٹ بھول آیا۔ ابھی آتا ہوں”

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ انور

“ووگ”

میں چھپی ہوئی ایک تصویر دیکھ رہا تھا کہ اسے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا تو پرویز تھی۔ انور سٹ پٹا گیا۔ اس نے سفید پاجامہ پہنا ہوا تھا جو جا بجا گیلا تھا۔ ململ کا کرتہ اس کے پانی سے تربدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ مسکرا کر اس نے انور سے کہا۔

“آپ بڑے انہماک سے تصویریں دیکھ رہے تھے۔”

پرچہ چھوڑ کر انور اٹھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر پرویز اسکے پاس آ گئی۔ پرچہ اٹھا کر اس نے ایک ہاتھ سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک طرف کیا۔ اور مسکرا کر کہا

“مجھے معلوم ہے کہ آپ آئے ہیں تو میں ایسے ہی چلی آئی”

یہ کہہ کر اس نے اپنے ململ کے گیلے کرتے کو دیکھا۔ جس میں دو کالے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پھر اس نے انور کا ہاتھ پکڑا

“چلیے اندر چلیں۔”

انور منمنایا

“جمیل۔ جمیل بھی ساتھ تھا میرے۔ سگریٹ بھول آیا تھا۔ لینے گیا ہے۔”

پرویز نے انور کو کھینچا۔

“وہ آ جائے گا۔ چلیے۔”

انور کو جانا ہی پڑا۔ جس کمرے میں وہ داخل ہوئے اس میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ دو اسپرنگوں والے ساگوانی پلنگ تھے۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اسکے ساتھ ایک اسٹول پڑا تھا۔ پری اس اسٹول پر بیٹھ گئی اور ایک پلنگ کی طرف اشارہ کرکے انور سے کہا۔

“بیٹھیے”

انور ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس نے چاہا کہ جمیل آ جائے کیونکہ اسے بے حد الجھن ہو رہی تھی۔ پرویز کے گیلے کرتے کے ساتھ چمٹے ہوئے دو کالے دھبے اس کو دو اندھی آنکھیں لگتے تھے جو اس کے سینے کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ انور نے اٹھ کر جانا چاہا

”میرا خیال ہے میں جمیل کو بلا لاؤں“

مگر وہ اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ڈرسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے فریم کی طرف اشارہ کر کے اس نے انور سے کہا۔

”یہ میرے ہذبنڈ ہیں۔ بہت ظالم آدمی ہے جمیل صاحب۔“

انور منمنایا۔

”آپ مذاق کرتی ہیں۔“

”جی نہیں۔ میرے اور اس کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اصل میں شادی سے پہلے مجھے دیکھ لینا چاہیے تھا کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہیں۔ جس چیز کا مجھے شوق ہو اُسے بالکل پسند نہیں ہوتی۔ آپ بتایئے یہ کہتی ہوئی وہ اوٹ لگا کر پلنگ پر اوندھی لیٹ گئی۔

”اس طرح لیٹنے میں کیا ہرج ہے۔“

انور ایک کونے میں سرک گیا۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے صرف اتنا سوچا

”اس کا درمیانی حصہ کتنا غیر نسوانی ہے۔“

پرویز اوندھی لیٹی رہی

”آپ نے جواب نہیں دیا مجھے۔ بتایئے اس طرح لیٹنے میں کیا حرج ہے؟“

انور کا حلق سوکھنے لگا۔

”کوئی حرج نہیں۔“

”لیکن اس کو ناپسند ہے۔ خدا معلوم کیوں“

یہ کہہ کر پرویز نے گردن ٹیڑھی کر کے انور کی طرف دیکھا۔

”آدمی اس طرح لیٹتے تو معلوم ہوا ہے تیر رہا ہے۔ میں لیٹوں تو اوپر بڑا تکیہ رکھ لیا کرتی ہوں۔ ذرا اٹھایئے نا وہ تکیہ اور میرے اوپر رکھ دیجیے۔“

انور کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اسکی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے۔ اٹھنے لگا تو پرویز نے اپنی پتلی ٹانگ سے اس کو روکا

”بیٹھ جایئے نا“

”جی میں جمیل۔“

وہ مسکرائی

”جمیل بے وقوف ہے ایک دن مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا

”اپنے خاوند کے سوا میرا اور کسی سے وہ تعلق نہیں رہا جو ایک مرد اور عورت میں ہوتا ہے۔ تو وہ ہنسنے لگا۔ مجھے تو ویسے بھی اس کا تعلق سے نفرت ہے“

۔ذرا تکیہ اٹھا کر رکھ دیجیے نا میرے اوپر“!

انور اسی بہانے اٹھا۔ تکیہ دوسرے کونے میں پڑا تھا۔ اُسے اٹھایا اور پرویز کے درمیانی حصہ پر جو کہ بہت ہی غیر نسوانی تھا رکھ دیا۔ پرویز مسکرائی

”شکریہ۔ بیٹھیے اب باتیں کریں۔“

”جی نہیں۔ آپ تکیے سے باتیں کریں۔ میں چلا۔“

یہ کہہ کر انور پسینہ پونچھتا باہر نکل گیا۔ 7جون 1950ء

پریشانی کا سبب

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوپریشانی کا سبب

نعیم میرے کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور اخبار کی آخری کاپی کے لیے جو مضمون لکھ رہا تھا اسکو جاری رکھنے ہی والا تھا کہ معاً مجھے نعیم کے چہرے پر ایک غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے چشمہ اتار کر اس کی طرف پھر دیکھا اور کہا۔

”کیا بات ہے نعیم۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری طبیعت ناساز ہے۔“

نعیم نے اپنے خُشک لبوں پر زبان پھیری اور جواب دیا۔

”کیا بتاؤں، عجیب مشکل میں جان پھنس گئی ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک ایسی بات ہوئی ہے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔“

میں نے کاغذ کی جتنی پرچیاں لکھی تھیں جمع کر کے ایک طرف رکھ دیں اور زیادہ دلچسپی لے کر اس سے پوچھا۔

”کوئی حادثہ پیش آ گیا۔ فلم کمپنی میں کسی ایکٹرس سے۔“

نعیم نے فوراً ہی کہا۔

”نہیں بھائی، ایکٹرس ویکٹرس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک اور ہی مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔ تمہیں فرصت ہو تو میں ساری داستان سناؤں۔“

نعیم میرا دوست ہے۔ جب سے وہ بمبئی سے آیا ہے اس سے میری دوستی چلی آ رہی ہے۔ وہ یوں کہ بمبئی آتے ہی اس نے میرے اخبار میں کام کیا اور خود کو بہت سی اہلیتوں کا مالک ثابت کیا۔ پھر آہستہ آہستہ جب مجھے اس کے اعلیٰ خاندان کا پتا چلا اور اسی قسم کی دوسری واقفیتیں نکلتی آئیں تو میرے دل میں اسکی عزت اور بھی زیادہ ہو گئی، چنانچہ چھ مہینے کے مختصر عرصے ہی میں وہ میرا بے تکلف دوست بن گیا۔ نعیم نے میرے اخبار کو دلچسپ بنانے کے لیے مجھ سے زیادہ کوششیں کیں۔ ہر ہفتے جب اس نے ایک نئی کہانی لکھنا شروع کی اور میں نے اس کی تیار چار کہانیاں پڑھیں تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اخبار میں اگر نعیم پڑا رہا تو اس کی تمام ذکاوتیں تباہ ہو جائیں گی، چنانچہ میں نے موقعہ ملتے ہی ایک فلم کمپنی میں اسکی سفارش کی اور وہ مکالمہ نگار کی حیثیت سے فوراً ہی وہاں ملازم ہو گیا۔ فلم کمپنی کی ملازمت کے دوران میں نعیم نے وہاں کے سیٹھوں اور ڈائریکٹروں پر کیسا اثر ڈالا، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ میں بے حد مصروف آدمی ہوں۔ لیکن نعیم سے ایک دو بار مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہاں اس کا کام پسند کیا گیا ہے۔ اب ایکا ایکی نہ جانے کیا حادثہ پیش آیا تھا جو اس کا رنگ یوں ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ نعیم بے حد شریف آدمی ہے۔ اس سے کسی نامعقول حرکت کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی، میں سخت متحیر ہوا کہ ایسی کون سی افتاد پڑی جو نعیم کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اُس سے اجازت لیکر جلدی جلدی آخری کاپی کے لیے مضمون کا بقایا حصہ مکمل کیا اور تمام پرچیاں کاتب کو دیکر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”بھئی معاف کرنا میں فوراً ہی تمہاری داستان نہ سُن سکا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں یہ داستان آخر بنی کیسے۔ تم۔ تم۔ خیر چھوڑو اس قصّے کو، تم مجھے سارا واقعہ سناؤ۔“

نعیم نے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔

”اب میں تمہیں کیا بتاؤں، جو کچھ ہُوا، میری اپنی بیوقوفی کی بدولت ہوا۔ ہماری فلم کمپنی میں ایک ایکٹر ہے۔ عاشق حسین اوّل درجے کا چُغد ہے۔ چونکہ دوسروں کی طرح میں اسے ستاتا نہیں ہُوں اس لیے وہ مجھ پر بُری طرح فریفتہ ہے، یہ فریفتہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ مجھ سے اسی طرح باتیں کرتا ہے جس طرح خوبصورت عورتوں سے کی جاتی ہیں۔“

میں ہنس پڑا۔

”پر تم اتنے خوبصورت تو نہیں ہو۔“

نعیم کے پیلے چہرے پر بھی ہنسی کی لال لال دھاریاں پھیل گئی۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہے۔ دراصل وہ اپنے اخلاص اور اپنی بے لوث محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور چونکہ اسے ایسا کرنے کا طریقہ نہیں آتا اس لیے اسکا پیار وہی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اس کو غالباً اپنی بیوی سے ہو گا۔ ہاں تو یہ عاشق حسین صاحب جو اوّل درجے کے رقاص ہیں اور رقص کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتے۔ پرسوں شوٹنگ کے بعد مجھے ملے۔ سیٹ پر میں نے اُن کے مکالمے درست کرنے میں کافی محنت کی تھی۔ اس کا حق ادا کرنے کے لیے انھوں نے فوراً ہی کچھ سوچا اور کہا۔

”نعیم صاحب، میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہُوں۔“

میں نے کہا۔

”فرمایئے۔“

انھوں نے پھر کچھ سوچا اور کہا۔

”دن بھر کام کرنے کے بعد میں تھک گیا ہوں آپ بھی ضرور تھک گئے ہوں گے۔ چلیے، کہیں گھوم آئیں“

۔ اب میں یہاں اپنی ایک کمزوری بتا دوں۔ موسم اگر خوشگوار ہو تو میں عموماً بہک جاتا ہوں۔ شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ جوان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اداسی ضرور موجود ہوتی ہے جو پھیل کر ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی جب میں نے جوہو کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نم آلود ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی ہیں۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔

”چلیے، مگر کہاں جایئے گا۔“

اب عاشق حسین نے پھر سوچا اور کہا۔

”کہیں بھی چلے چلیں گے۔ یہاں سے باہر تو نکلیں“

۔ ہم دونوں گیٹ سے باہر نکلے اور موڑ پر بَس کا انتظار کرنے لگے۔“

یہاں تک کہہ کر نعیم رک گیا۔ اس کے چہرے کی زردی اب دُور ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے پیکٹ سے ایک سگرٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔

”تم دونوں گیٹ سے باہر نکل کر بَس کا انتظار کرنے لگے۔“

نعیم نے سر ہلایا

”اور شامتِ اعمال اُدھر سے عاشق حسین کے ایک مارواڑی دوست کا گُزر ہوا۔ وہ موٹر میں جا رہا تھا کہ اچانک عاشق حسین کی نظر اس پر پڑی۔ فوراً ہی اس نے مارواڑی زبان میں اپنے دوست کو ٹھہرنے کے لیے کہا۔ موٹر رُکی عاشق حسین نے اس سے مارواڑی زبان میں چند باتیں کیں پھر دوڑ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا

”چلیے، کام بن گیا۔ موٹر مل گئی اسی میں چلتے ہیں۔“

میں چل پڑا۔ موٹر میں داخل ہونے سے پہلے عاشق نے اپنے مارواڑی دوست سے جو شکل و صورت کے اعتبار سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا تعارف کرایا اور حسبِ معمول مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”یہ مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ یہاں ایک کاروبار کے سلسلے میں آئے ہیں۔ میرے بہت مہربان دوست ہیں۔“

اور میرے متعلق اپنے دوست سے کہا۔

”یہ ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائیٹر ہیں۔“

ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائیٹر اور مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ نے ہاتھ ملائے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ رسمی طور پر خوش ہُوئے اور موٹر چلی۔“

یہ سُن کر میں مسکرایا۔

”نعیم، اس مارواڑی سیٹھ کے متعلق تمہاری رائے بہت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کیا آگے چل کر یہ ولن کا پارٹ ادا تو نہیں کرے گا۔“

”تم پہلے پوری داستان سُن لو۔ پھر سوچنا کہ ولن کون ہے اور ہیرو کون۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کہانی کی ہیروئن زہرہ ہے۔ زہرہ جس کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کل۔ داور کی ایک فوجداری عدالت میں دیکھا ہے۔ ایک مجرم کی حیثیت میں۔“

یہ کہتے ہوئے نعیم کے کان کی لویں شرم کے باعث سرخ ہو گئیں۔ داستان سُننے کے دوران میں پہلی مرتبہ زہرہ کے اچانک ذکر سے مجھے سخت تعجب ہوا۔ میں نے کہا۔

”نعیم۔ یہ تو بالکل الگزنڈر پو کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ زہرہ بالکل پو کے افسانوں کے غیر متوقع انجام کی طرح اس داستان میں آئی ہے۔ یہ عورت کون ہے۔؟“

”میں قطعاً نہیں جانتا، یعنی اگر مجھے اس عورت کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھ پر لعنت۔ خدا معلوم کون ہے، پر اب میں اتنا جانتا ہوں کہ اس نے ہم لوگوں پر فوجداری مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ جرم ڈاکہ اور چوری ہے۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ڈاکہ اور چوری۔“

نعیم کے لہجہ نے ایسی متانت اختیار کر لی جس میں روحانی اذّیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگا۔

”ہاں، ڈاکہ اور چوری۔ مجھے دفعات اچھی طرح یاد نہیں مگر ان کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے مداخلت بیجا کی، زہرہ کے گھر پر ڈاکہ ڈالا۔ اور اس کی چند قیمتی اشیا چرا کر لے گئے، لیکن یہ تو داستان کا انجام ہے۔ پہلے کے واقعات تمہیں سُنا لوں پھر اس طرف آتا ہُوں۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟“

میں نے جواب دیا۔

”یہ کہ تم اس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گئے۔“

”ہاں میں عاشق حسین کے کہنے پر اس منحوس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر وہ خود چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر ایک اور آدمی بیٹھا تھا جو اس سے کم منحوس نہیں تھا۔ عاشق حسین نے شاید اسکے متعلق کہا تھا کہ وہ موٹریں بنانے کا کام کرتا ہے۔ خیر موٹر مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی داور کی طرف جا نکلی۔ ظاہر تھا کہ ہم جوہو جائیں گے، چنانچہ میں بہت خوش تھا۔ جوہو کی گیلی گیلی ریت سے مجھے بے حد پیار ہے کبھی کبھی اُدھر جا کر میں گیلی ریت پر ضرور لیٹا کرتا ہُوں اور دیر تک کھلے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہوں جو اتنا ہی پر اسرار اور نا قابلِ رسا دکھائی دیتا ہے جتنا کہ ایک اجنبی عورت کا تصور۔ سامنے رات کی سرمئی روشنی میں سمندر کروٹیں لیتا ہے، اوپر گدلے آسمان پر تارے یوں چمکتے ہیں جیسے انہوئی باتیں کسی جوان

آدمی کے دل میں ٹمٹمار ہی ہیں۔ ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ دُور، اس پار جہاں آسمان اور سمندر کوئی واضح خط بنائے بغیر آپس میں گھل مل جاتے ہیں، ایک ایسی دُھندلی روشنی نظر آیا کرتی ہے جو خوبصورت شعروں کی طرح مصنوعی ہوتی ہے۔ میں جوہو کی سیر کے خیال میں مگن تھا کہ عاشق حسین نے موٹر کو داور ہی میں ایک جگہ ٹھہرالیا اور مجھ سے کہا۔

”چلیے، کچھ پی لیں“

جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، بیئر مجھے پیاری ہے۔ عاشق حسین کو خدا معلوم کہاں سے اس بات کا پتا چلا تھا کہ میں پیا کرتا ہُوں۔ خیر، ہم چاروں یار بار میں داخل ہُوئے۔ ایک بوتل بیئر کی میں نے پی اور ایک عاشق حسین نے۔ مارواڑی سیٹھ اور موٹریں بنانے والے نے کچھ نہ پیا۔ ہم جلدی ہی فارغ ہو گئے۔ پھر موٹر میں بیٹھے اور جوہو کا رخ کیا مگر فوراً ہی عاشق حسین کو ایک کام یاد آگیا۔

”اوہ مجھے تو اپنی شاگرد زہرہ کے ہاں جانا ہے۔ آج اُس سے ملنے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ نعیم صاحب اگر آپکو اعتراض نہ ہو تو پانچ منٹ لگیں گے۔ اس کا مکان بالکل قریب ہے۔“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے موٹر ایک گلی میں ٹھہرالی اور اکیلا سامنے والے مکان کی طرف بڑھا۔“

میں نے پوچھا۔

”یہ گلی کس طرف ہے۔“

نعیم نے جواب دیا۔

”داور ہی میں ہے۔ اُدھر جہاں پارسیوں کے بے شمار مکان ہیں، غالباً اس محلے کو پارسی کالونی کہتے ہیں۔۔ ہاں تو عاشق حسین موٹر سے نکل کر سامنے مکان کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹا سا دومنزلہ مکان تھا۔ بغیچہ طے کر کے عاشق نے دروازہ پر دستک دی۔ جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو عاشق نے دوسری بار زور سے دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی کون ہے۔“

عاشق حسین نے بلند آواز میں جواب دیا۔

”عاشق۔“

اندر سے خشم آلود آواز آئی۔

”عاشق کی۔“

عاشق حسین نے یہ گالی سُن کر ہماری طرف دیکھا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا اور یہ کہنا شروع کیا۔

”دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔“

یہ سن کر میں نے کہا۔

”اس عورت نے شاید عاشق کا غلط مطلب سمجھا، ورنہ جیسا کہ تم ابھی کہہ چکے ہو وہ عاشق کی شاگرد تھی۔“

”جانے بلا، کیا تھی اور کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عاشق حسین نے جھوٹ ہی بولا ہو اور بیئر کی ایک بوتل پینے کے بعد زہرہ کا خیال اسکے دماغ میں آگیا ہو۔ کسی نے اس سے کبھی کہا ہو گا کہ فلاں نمبر کے فلیٹ میں ایک عورت زہرہ رہتی ہے۔ لیکن اس سے کیا بحث ہے۔ عاشق حسین نے اودھم مچانا شروع کر دی۔ اندر سے گالیاں آتی رہیں اور پیشتر اس کے کہ میں اسے منع کر سکتا، تین چار دھکے مار اس نے دروازہ توڑا اور زبردستی اندر داخل ہو گیا۔ جب یہ شور ہوا تو آس پاس کے رہنے والے پارسی اکٹھے ہو گئے۔ میں بے حد پریشان ہوا، چنانچہ اسی پریشانی میں موٹر سے باہر نکلا اور عاشق کو باہر لانے کی خاطر اس مکان میں داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے پیچھے عاشق کے دونوں ساتھی بھی چلے آئے۔ میں نے اس فلیٹ کے تینوں کمرے دیکھے مگر نہ عاشق نظر آیا نہ اسکی شاگرد زہرہ۔ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ گھر کے پرلی طرف دوسرا راستہ تھا، ممکن ہے وہ اُدھر سے باہر نکل گئے ہوں۔ میں چند منٹ ان تین کمروں میں رہا۔ جب کوئی سراغ نہ ملا تو باہر نکل کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ وہ پارسی جو گلی میں جمع ہو گئے تھے گُھور گُھور کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ بیئر کا سارا نشہ جو دماغ میں تھا اُتر کر میری ٹانگوں میں چلا آیا۔ میرے جی میں آئی کہ عاشق اس کے ساتھیوں اور ان کی موٹر کو وہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں مگر۔ عجب مشکل میں میری جان پھنس گئی تھی۔ اگر بھاگنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ پارسی جو مجھے چڑیا گھر کا بندر سمجھ کر گُھور رہے تھے پکڑ لیتے۔ دس بارہ منٹ اسی شش و پنج میں گزرے۔ اس کے بعد عاشق اور اسکے دونوں دوست مکان میں سے باہر نکلے اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ میں نے عاشق سے کوئی بات نہ پوچھی۔ موٹر چلی اور جب دادر کا حلقہ آیا تو میں نے اس سے کہا۔

”مجھے یہیں اتار دو، میں بس میں گھر چلا جاؤں گا۔“

عاشق کے دماغ سے جوہو کی سیر کا خیال نکل گیا تھا، اس نے اپنے مارواڑی دوست سے موٹر روکنے کے لیے کہا، چنانچہ میں ان سے رخصت لے کر گھر چلا آیا اور اس واقعہ کو بھول گیا۔“

نعیم نے ایک سگرٹ اور سلگایا اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”مجھے گرفتار کر لیا گیا۔“

نعیم نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا۔

”اس بیوقوف کے بچے عاشق حسین سے جب پولیس والوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا تو اس نے اپنے مارواڑی دوست، اس موٹر بنانے والے کا اور میرا نام لے دیا۔ ہم تینوں ایک گھنٹے کے اندر اندر گرفتار کر لیے گئے۔“

میں نے پوچھا۔

”یہ کب کی بات ہے؟۔ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔“

نعیم نے جواب دیا۔

”کل دو ڈھائی بجے کے قریب ہماری گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ میں نے تمہیں ٹیلی فون پر ضرور مطلع کیا ہوتا اگر میرے حواس بجا ہوتے۔ بخدا میں سخت پریشان تھا۔ پولیس انسپکٹر ٹیکسی میں ہم سب کو تھانے میں لے گیا۔ وہاں بیانات قلم بند ہُوئے تو مجھے پتلا چلا کہ عاشق حسین کے وہ مارواڑی دوست جو کسی کاروبار کے سلسلے میں یہاں آئے تھے زہرہ کا پنکھا اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ بجلی کا یہ پنکھا پولیس نے ان سے حاصل کر لیا تھا۔“

یہ سن کر میں نے تشویشناک لہجہ میں کہا۔

”اس سے تو چوری صاف ثابت ہوتی ہے۔“

”چوری ثابت ہوتی ہے جبھی تو میں اس قدر پریشان ہوں اور سچ پوچھو تو اگر یہ ثابت نہ بھی ہوتی تو میری پریشانی اسی قدر رہتی۔ تھانے اور عدالت میں جانا بے حد شرمناک ہے، پر اب کیا کیا جائے۔ جو ہونا ہے ہو چکا ہے۔ اس خفت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا جو مجھے اٹھانا پڑے گی اور اٹھانا پڑ رہی ہے۔ میں بالکل بے گناہ ہوں یعنی ظاہر ہے کہ زہرہ کو میں بالکل نہیں جانتا، اس کے مکان پر میں اگر گیا تو محض عاشق حسین کی وجہ سے، اس چُغد کے کہنے پر جو ایک بوتل بیئر بھی ہضم نہیں کر سکتا۔“

نعیم کے چہرے پر نفرت اور غصے کے مِلے جُلے جذبات دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”بھئی، بہت بُرے پھنسے۔“

نعیم نے اسی انداز میں کہا۔

”ہنسی میں پھنسی اسی کو کہتے ہیں۔ کل۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے عدالت کا منہ دیکھا اور زہرہ بھی پہلی مرتبہ مجھے نظر آئی۔“

میں نے فوراً ہی پوچھا۔

”کیسی ہے؟“

نعیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”بُری نہیں، یعنی شکل صورت کے اعتبار سے خاصی ہے۔ بیضوی چہرہ ہے جس پر کیلوں اور مہاسوں کے داغ نظر آتے ہیں۔ لمبے لمبے کالے بال ہیں۔ پیشانی تنگ ہے۔ جوان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حال ہی میں اس نے یہ دھندا شروع کیا ہے۔“

میں نے بغیر کسی مطلب کے یوں ہی پوچھا۔

”کیسا دھندا؟“

نعیم شرما سا گیا۔

”ارے بھئی، وہی جو عورتیں کرتی ہیں۔ زہرہ کے چہرے پر اس کی چھاپ دُور سے نظر آ سکتی ہے۔ مجھے اس عورت پر اتنا غصہ کبھی نہ آتا مگر جب مجسٹریٹ نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”تم اسکو پہچانتی ہو۔“

تو زہرہ نے میری طرف اپنی بڑی بڑی ڈھلی ہُوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

”ہاں صاحب پہچانتی ہوں۔ اسی نے میرا چاندی کا ٹی سیٹ اٹھایا تھا۔“

جب اس نے یہ جھوٹ بولا تو خدا کی قسم جی میں آئی ملعونہ کے حلق میں کٹہرے کا ایک ڈنڈا نکال کر ٹھونس دوں۔ اتنا بڑا جھوٹ“!!

اس پر میں نے کہا۔

”بھئی جھوٹ تو بولے گی۔ اس کے بغیر کام کیسے چلے گا اسے اپنا کیس مضبوط بھی تو بنانا ہے۔ اب تو تمھیں قہر درویش بر جاں درویش سب کچھ سننا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

نعیم نے بڑی پریشانی کے ساتھ کہا۔

”جو کچھ ہو گا اسے ہر حالت میں سہنا ہی پڑے گا مگر۔ مگر۔ میں کیا بتاؤں میں کس قدر پریشان ہو گیا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کسی مرد نے مجھ پر ایسا مقدمہ دائر کیا ہوتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی مگر ذرا غور تو کرو، وہ عورت ہے۔ اور میں عورتوں کی تعظیم کرتا ہُوں۔“

میں نے پوچھا۔ کیوں؟ نعیم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

”اس لیے کہ میں عورتوں کو جانتا ہی نہیں۔ کسی عورت سے ملنے اور اس سے کھل کر بات چیت کرنے کا مجھے کبھی موقعہ ہی نہیں ملا۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ عورت آئی ہے تو مدعی بن کر۔“

میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ نعیم نے اس پر بگڑ کر کہا۔

”تم ہنستے ہو مگر یہاں میری جان پر بنی ہے۔ دو دن سے میں کمپنی نہیں جا رہا۔ وہاں یہ بات ضرور پہنچ چکی ہو گی۔ سیٹھ صاحب کے سامنے میں کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ انھوں نے اگر کچھ پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا۔“

میں نے کہا۔

”جو اصل بات ہے اُن کو بتا دینا۔“

”وہ تو میں بتا ہی دوں گا مگر خدا کے لیے سوچو تو سہی کہ میری پوزیشن کیا ہے۔ میں سیٹھ صاحب کی بے حد عزت کرتا ہُوں اس لیے کہ وہ میرے آقا ہیں، اگر انھوں نے مجھے بدکردار سمجھ کر برطرف کر دیا تو عمر بھر کے لیے میں داغدار ہو جاؤں گا۔ ملازمت کھونے کا مجھے اتنا افسوس نہیں ہو گا مگر یہاں سوال عزت و ناموس کا ہے۔ وہ ضرور بدگمان ہو جائیں گے۔ میں ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہُوں، میری سچی باتوں کو بھی وہ جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ فلم کمپنی میں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ وہ خود بھی ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اب میں کیا کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

میں نے ہر ممکن طریقے سے نعیم کی اخلاقی جرأت بڑھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ بے حد ڈرپوک ہے۔ خاص کر عورتوں کے معاملے میں تو اس کی بزدلی بہت ہی زیادہ ہے۔ دراصل معاملہ بھی سنگین تھا، اگر برقی پنکھا برآمد نہ ہوتا تو کیس بالکل معمولی رہ جاتا۔ مگر پولیس اس مارواڑی سے پنکھا حاصل کر چکی تھی اس لیے ظاہر ہے کہ زہرہ ایک حد تک سچی تھی۔

نعیم زیادہ دیر تک میرے پاس نہ ٹھہرا اور چلا گیا۔ دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ اُس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی ہُوئی تھی۔ آتے ہی کہنے لگا۔

”بھائی ایک مصیبت میں تو جان پھنسی تھی، اب ایک اور آفت گلے پڑ گئی ہے۔“

میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

”کیا ہوا! کیا کوئی اور کیس کھڑا ہو گیا۔“

”نہیں، کیس وہی ہے، مگر ایک ایسی بات ہُوئی ہے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔“

نعیم نے کرسی پر بیٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹانگ ہلانا شروع کی۔

”آج صبح سیٹھ صاحب نے مجھے بُلانے کے لیے موٹر بھیجی۔ مجھے جانا ہی پڑا حالانکہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ کبھی نہیں جاؤں گا۔ بخدا فلم کمپنی میں داخل ہوتے وقت میری حالت وہی تھی جو حساس مُلزموں کی ہوتی ہے۔ شرم کے مارے میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ سر بھاری ہو گیا تھا۔ نیچی نظریں کیے جب میں سیٹھ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ بڑے تپاک کے ساتھ انھوں نے پہلی مرتبہ میرے ساتھ ہینڈ شیک کیا اور ہنس کر کہنے لگے۔

”منشی صاحب، آپ نے کمال کر دیا۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ بیٹھیے تشریف رکھیے۔“

میں ندامت میں غرق کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئے۔ پھر انھوں نے ایسی باتیں شروع کیں کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کہنے لگے۔

”آپ گھبراتے کیوں ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا آپ بتائیے کہ یہ زہرہ ہے کیسی؟۔ کچھ اچھی ہے؟۔ بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔ میں سنتا ہوں کہ آپ نے پی کر وہ دھمال مچائی کہ پارسی کالونی کے سب آدمی اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ زہرہ کی ساڑھی اتار کر لے گئے۔ پہلے بھی تو آپ اس کے ہاں آتے جاتے ہوں گے، پھر حرامزادی نے پولیس میں رپورٹ کیوں لکھوائی، پر کیا پتا ہے آپ نے بہت زیادہ شرارتیں کی ہوں“

۔ ایسی ہی بے شمار باتیں انھوں نے مجھ سے کیں۔ میں خاموش رہا۔ اس کے بعد انھوں نے چائے منگوائی۔ ایک پیالہ میرے لیے بنایا اور پھر وہی گفتگو شروع کر دی۔

”چاندی کا ٹی سٹ جو آپ اُٹھا کر لے گئے تھے، مجھے اگر آپ پریزنٹ کر دیں تو میں ابھی آپ کو اپنے وکیل کے پاس لے چلتا ہوں، ایسی اچھی وکالت کرے گا کہ زہرہ کی طبیعت صاف ہو جائے گا۔ میں سُنتا ہوں زہرہ شکل صورت کی اچھی ہے، تو بھئی اس مقدمے کے بعد اسے لے آؤ نا اپنی فلم میں اسے کوئی چھوٹا سال رول دے دیں گے۔ اور ہاں، یہ آپ نے اچھا کیا کہ اسی کی شراب پی اور اسی کی چیزیں اُڑا کر لے گئے!۔ پر آپ ایک درجن آدمی اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے؟ بیچاری اتنے آدمی دیکھ کر گھبرا گئی ہو گی۔“

بات بات پر وہ ہنستے تھے جیسے گفتگو کے لیے انھیں ایک نہایت ہی دلچسپ موضوع مل گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس سے پہلے انھوں نے کبھی میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔“

میں نے کہا۔

”تو کیا ہوا۔ تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ تم پر ناراض نہ ہُوئے۔“

نعیم بگڑ کر کہنے لگا۔

”یہ بھی تم نے خوب کہا کہ مجھے خوش ہونا چاہیے۔ وہ مجھے مُجرم سمجھ رہے تھے جو کہ میں نہیں ہُوں۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے خزانچی کو بُلایا اور مجھے سو روپے ایڈوانس دلوائے حالانکہ دو مہینے سے کسی ملازم کو تنخواہ نہیں مل رہی۔“

میں نے کہا۔

”تو کیا بُرا ہُوا؟“

”ارے بھئی تم ساری بات تو سُن لو۔

”نعیم کھِچ گیا۔

”سو روپے دلوا کر انھوں نے کہا یہ آپ اپنے پاس رکھیے آپ کو مقدمہ کے لیے ضرورت ہو گی۔ وکیل کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔“

ٹیلی فون پر انھوں نے فوراً ہی وکیل سے بات کی۔ پھر مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر اسکے پاس لے گئے۔ ساری باتیں اس کو سمجھائیں اور کہا۔

”دیکھیے، اس مقدمہ میں جان لڑا دیجیے گا۔ بات بالکل معمولی ہے، اس لیے کہ منشی صاحب سے زہرہ کے تعلقات بہت پُرانے ہیں“

۔ میں کیا کہتا۔ وہاں بھی خاموش رہا۔

”میں نے ہنس کر نعیم سے کہا۔

”اب بھی خاموش رہو۔ تمہارا کیا بگڑ گیا ہے؟“

نعیم اُٹھ کھڑا ہُوا اور اضطراب کے ساتھ ٹہلنے لگا۔

”ابھی کچھ بگڑا ہی نہیں۔ عدالت میں مجھے بیان دینا پڑے گا کہ زہرہ میری داشتہ ہے اور میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں۔ اور۔ اور۔ سیٹھ صاحب نے آج شام مجھے مدعو کیا ہے۔ کہتے تھے گرین چلیں گے۔ وہاں کچھ شغل رہے گا۔ میری جان عجب مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو رہا ہے۔“

پڑھیے کلمہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپڑھیے کلمہ

لا الہٰ الاّ اللہ محمد رسول اللہ۔ آپ مسلمان ہیں یقین کریں میں جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔ پاکستان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ قائد اعظم جناح کے لیے میں جان دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں اس معاملے سے پاکستان کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ اتنی جلدی نہ کیجیے۔ مانتا ہوں۔ ان دنوں ہلڑ کے زمانے میں آپ کو فرصت نہیں، لیکن آپ خدا کے لیے میری پوری بات تو سن لیجیے۔ میں نے تکارام کو ضرور مارا ہے، اور جیسا کہ آپ کہتے ہیں تیز چھری سے اس کا پیٹ چاک کیا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ وہ ہندو تھا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تم نے اس لیے نہیں مارا تو پھر کس لیے مارا۔ لیجیے میں ساری داستان ہی آپ کو سُنا دیتا ہوں۔ پڑھیے کلمہ، لا الہٰ الاّ اللہ محمد رسول اللہ۔ کس کافر کو معلوم تھا کہ میں اس لفڑے میں پھنس جاؤں گا۔ پچھلے ہندو مسلم فساد میں میں نے تین ہندو مارے تھے۔ لیکن آپ یقین مانئے وہ مارنا کچھ اور ہے، اور یہ مارنا کچھ اور ہیے۔ خیر، آپ سنئے کہ ہوا کیا، میں نے اس تکارام کو کیوں مارا۔ کیوں صاحب عورت ذات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ میں سمجھتا ہوں بزرگوں نے ٹھیک کہا ہے۔ اس کے چلتروں سے خدا ہی بچائے۔ پھانسی سے بچ گیا تو دیکھیے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ پھر کبھی کسی عورت کے نزدیک نہیں جاؤں گا۔ لیکن صاحب عورت بھی اکیلی سزاوار نہیں۔ مرد سالے بھی کم نہیں ہوتے۔ بس، کسی عورت کو دیکھا اور ریشہ خطمی ہو گئے۔

خدا کو جان دینی ہے۔ انسپکٹر صاحب! رکما کو دیکھ کر میرا بھی یہی حال ہوا تھا۔ اب کوئی مجھ سے پوچھے۔ بندہ خدا تو ایک پینتیس روپے کا ملازم، تجھے بھلا عشق سے کیا کام۔ کرایہ وصول کر اور چلتا بن۔ لیکن آفت یہ ہوئی صاحب کہ ایک دن جب میں سولہ نمبر کی کھولی کا کرایہ وصول کرنے گیا اور دروازہ ٹھوکا تو اندر سے رکما بائی نکلی۔ یوں تو میں رکما بائی کو کئی دفعہ دیکھ چکا تھا لیکن اس دن کم بخت نے بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور ایک پتلی دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ جانے کیا ہوا مجھے، جی چاہا اس کی دھوتی اتار کر زور زور سے مالش کر دوں۔ بس صاحب اسی روز سے اس بندہ نابکار نے اپنا دل، دماغ سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔ کیا عورت تھی۔ بدن تھا پتھر کی طرح سخت مالش کرتے کرتے ہانپنے لگ گیا تھا مگر وہ اپنے باپ کی بیٹی یہی کہتی رہی

”تھوڑی دیر اور“

شادی شدہ۔ جی ہاں شادی شدہ تھی اور خان چوکیدار نے کہا تھا کہ اس کا ایک یار بھی ہے۔ لیکن آپ سارا قصہ سُن لیجیے۔ یار وار سب ہی اس میں آ جائیں گے۔ جی ہاں، بس اس روز سے عشق کا بھوت میرے سر پر سوار ہو گیا۔ وہ بھی کچھ کچھ سمجھ گئی تھی کیونکہ کبھی کبھی کن اکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ لیکن خدا گواہ ہے جب بھی وہ مسکرائی، میرے بدن میں خوف کی ایک تھرتھری سی دوڑ گئی۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہ معشوق کو پاس دیکھنے کا۔ وہ۔ ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا۔ لیکن آپ شروع ہی سے سُنیے۔ وہ تو میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ رکما بائی سے میری آنکھ لڑ گئی تھی۔ اب دن رات میں سوچتا تھا کہ اسے پٹایا کیسے جائے۔ کم بخت، اس کا خاوند ہر وقت کھولی میں بیٹھا لکڑی کے کھلونے بناتا رہتا، کوئی چانس ملتا ہی نہیں تھا۔ ایک دن بازار میں نے اس کے خاوند کو جس کا نام۔ خدا آپ کا بھلا کرے کیا تھا جی ہاں۔ گردھاری۔ لکڑی کے کھلونے چادر میں باندھے لے جاتے دیکھا تو میں نے جھٹ سے سولہ نمبر کی کھولی کا رخ کیا۔ دھڑکتے دل سے میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولا۔ رکما بائی نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ خدا کی قسم میری روح لرز گئی۔ بھاگ گیا ہوتا وہاں سے، لیکن اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جب اندر گیا تو اس نے کھولی کا دروازہ بند کر کے مجھ سے کہا۔

”بیٹھ جاؤ“!

میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے پاس آ کر کہا۔

”دیکھو میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن جب تک گردھاری زندہ ہے، تمہاری مراد پوری نہیں ہو سکتی۔“

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے پاس دیکھ کر میرا خون گرم ہو گیا تھا۔ کنپٹیاں ٹھک ٹھک کر رہی تھیں۔ کم بخت نے آج بھی بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور وہی پتلی دھوتی لپیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور دبا کر کہا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔“

اف! اس کے بازوؤں کے پٹھے کس قدر سخت تھے۔ عرض کرتا ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کس قسم کی عورت تھی۔ خیر، آپ داستان سنیے۔ میں اور زیادہ گرم ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

”گردھاری جائے جہنم میں۔ تمہیں میری بننا ہو گا۔“

رکما نے مجھے اپنے جسم سے الگ کیا اور کہا۔

”دیکھو تیل لگ جائے گا۔“

میں نے کہا۔

”لگنے دو۔“

اور پھر اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ یقین مانیے اگر اس وقت آپ مارے کوڑوں کے میری پیٹھ کی چمڑی ادھیڑ دیتے، تب بھی میں اسے علیحدہ نہ کرتا۔ لیکن کم بخت نے ایسا پچکارا کہ جہاں اس نے مجھے پہلے بیٹھایا تھا، خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ سوچ کیا رہی ہے۔ گردھاری سالا باہر ہے، ڈر کس بات کا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے اس سے کہا۔

”رکما! ایسا اچھا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔“

اس نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا۔

”اس سے بھی اچھا موقع ملے گا۔ لیکن تم یہ بتاؤ جو کچھ میں کہوں گی کرو گے۔“

۔ صاحب میرے سر پر تو بھوت سوار تھا۔ میں نے جوش میں آ کر جواب دیا۔

”تمہارے لیے میں پندرہ آدمی قتل کرنے کو تیار ہوں۔“

یہ سن کر وہ مسکرائی۔

”مجھے وشواس ہے۔“

خدا کی قسم ایک بار پھر میری روح لرز گئی۔ لیکن میں نے سوچا شاید زیادہ جوش آنے پر ایسا ہوا ہے۔ بس وہاں میں تھوڑی دیر اور بیٹھا، پیار اور محبت کی باتیں کیں، اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے بھجئے کھائے اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ گو وہ سلسلہ نہ ہوا، لیکن صاحب ایسے سلسلے پہلے ہی دن تھوڑے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا، پھر سہی! دس دن گزر گئے۔ ٹھیک گیارہویں دن، رات کے دو بجے ہاں دو ہی کا عمل تھا۔ کسی نے مجھے آہستہ سے جگایا۔ میں نیچے سیڑھیوں کے پاس جو جگہ ہے نا، وہاں سوتا ہوں۔ آنکھیں کھول میں نے دیکھا۔ ارے رکما بائی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا ہے۔“

اس نے ہولے کہا۔

”آؤ میرے ساتھ“

۔ میں ننگے پاؤں اس کے ساتھ ہولیا۔ میں نے اور کچھ نہ سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس نے میرے کان میں کہا۔

”ابھی ٹھہرو۔“

پھر بتی روشن کی میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے چٹائی پر کوئی سو رہا ہے۔ منہ پر کپڑا ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا۔

”یہ کیا؟“

رکمانے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔“

میں الو کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آئی اور بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر اس نے ایسی بات کہی جس کو سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بالکل برف ہو گیا۔ صاحب۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ جانتے ہیں رکمانے مجھ سے کیا کہا۔ پڑھیے کلمہ! لا الہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی عورت نہیں دیکھی۔ کم بخت نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”میں نے گردھاری کو مار ڈالا ہے۔“

۔ آپ یقین کیجیے اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ہٹے کٹے آدمی کو قتل کیا تھا۔ کیا عورت تھی صاحب۔ مجھے جب بھی وہ رات یاد آتی ہے، قسم خداوند پاک کی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے مجھے وہ چیز دکھائی جس سے اس ظالم نے گردھاری کا گلا گھونٹا تھا۔ بجلی کے تاروں کی گندھی ہوئی ایک مضبوط رسی سی تھی۔ لکڑی پھنسا کر اس نے زور سے کچھ ایسے پیچ دیے تھے کہ بے چارے کی زبان اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ کہتی تھی بس یوں چٹکیوں میں کام تمام ہو گیا تھا۔ کپڑا اُٹھا کر جب اس نے گردھاری کی شکل دکھائی تو میری ہڈیاں تک برف ہو گئیں۔ لیکن وہ عورت جانے کیا تھی۔ وہیں لاش کے سامنے اس نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ قرآن کی قسم! میرا خیال تھا کہ ساری عمر کے لیے نامرد ہو گیا ہوں۔ مگر صاحب جب اس کا گرم گرم پنڈا میرے بدن کے ساتھ لگا اور اس نے ایک عجیب و غریب قسم کا پیار کیا تو اللہ جانتا ہے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ زندگی بھر وہ رات مجھے یاد رہے گی۔ سامنے لاش پڑی تھی لیکن رکما اور میں دونوں اس سے غافل ایک دوسرے کے اندر دھنسے ہُوئے تھے۔ صبح ہُوئی تو ہم دونوں نے مل کر گردھاری کی لاش کے تین ٹکڑے کیے اوزار اس کے موجود تھے، اس لیے زیادہ تکلیف نہ ہُوئی۔ ٹھک ٹھک کافی ہُوئی تھی پر لوگوں نے سمجھا ہو گا گردھاری کھلونے بنا رہا ہے۔ آپ پوچھیں گے بندۂ خدا تم نے ایسے گھناؤنے کام میں کیوں حصہ لیا۔ پولیس میں رپٹ کیوں نہ لکھوائی۔ صاحب، عرض یہ ہے کہ اس کم بخت نے مجھے ایک ہی رات میں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کہتی تو شاید میں نے پندرہ آدمیوں کا خون بھی کر ہی دیا ہوتا۔ یاد ہے نا! میں نے ایک دفعہ اس سے جوش میں آکر کیا کہا تھا۔ اب مصیبت یہ تھی کہ لاش کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے۔ رکما کچھ بھی ہو، آخر عورت ذات تھی۔ میں نے اس سے کہا جان من تم کچھ فکر نہ کرو۔ فی الحال ان ٹکڑوں کو ٹرنک میں بند کر دیتے ہیں۔ جب رات آئے گی تو میں اُٹھا کر لے جاؤں گا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا صاحب کہ اس روز ہلڑ ہوا۔ پانچ چھ علاقوں میں خوب مارا ماری ہوئی۔ گورنمنٹ نے چھتیس گھنٹے کا کرفیو لگا دیا۔ میں نے کہا عبد الکریم! کچھ بھی ہو، لاش آج ہی ٹھکانے لگا دو۔ چنانچہ دو بجے اُٹھا۔ اوپر سے ٹرنک لیا۔ خدا کی پناہ! کتنا وزن تھا۔ مجھے ڈر تھا رستے میں کوئی پیلی پگڑی والا ضرور ملے گا اور کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی میں دھر لے گا۔ مگر صاحب، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے جس بازار سے گزرا، اس میں سناٹا تھا۔ ایک جگہ۔ بازار کے پاس مجھے ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ میں نے ٹرنک کھولا اور لاش کے ٹکڑے نکال کر اندر ڈیوڑھی میں ڈال دیے اور واپس چلا آیا۔ قربان اس کی قدرت کے صبح پتہ چلا کہ ہندوؤں نے اس مسجد کو آگ لگا دی۔ میرا خیال ہے گردھاری اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ اخباروں میں کسی لاش کا ذکر نہیں تھا۔ اب صاحب، بقول شخصے میدان خالی تھا۔ میں نے رکما سے کہا چالی میں مشہور کر دو کہ گردھاری باہر کام گیا ہے۔ میں رات کو دو ڈھائی بجے آجایا کروں گا اور عیش کیا کریں گے۔ مگر اس نے کہا نہیں عبدل، اتنی جلدی نہیں۔ ابھی ہم کو کم از کم پندرہ بیس روز تک نہیں ملنا چاہیے۔ بات معقول تھی، اس لیے میں خاموش رہا۔ سترہ روز گزر گئے۔ کئی بار ڈراؤنے خوابوں میں گردھاری آیا۔ لیکن میں

نے کہا۔ سالے مر کھپ چکا ہے۔ اب میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اٹھارہویں روز صاحب میں اسی طرح سیڑھیوں کے پاس چارپائی پر سو رہا تھا کہ رکما رات کے بارہ۔ بارہ نہیں تو ایک ہو گا۔ آئی اور مجھے اوپر لے گئی۔ چٹائی پر ننگی لیٹ کر اس نے مجھ سے کہا۔

”عبدل میرا بدن دُکھ رہا ہے، ذرا چمپی کر دو۔ میں نے فوراً تیل لیا اور مالش کرنے لگا لیکن آدھے گھنٹے میں ہی ہانپنے لگا۔ میرے پسینے کی کئی بوندیں اس کے چکنے بدن پر گریں۔ لیکن اس نے یہ نہ کہا، بس کر عبدل۔ تم تھک گئے ہو۔ آخر مجھے ہی کہنا پڑا۔

”رکما بھئی، اب خلاص۔“

وہ مسکرائی۔ میرے خدا کیا مسکراہٹ تھی۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اٹھ کر بتی بجھائی اور میرے ساتھ لیٹ گئی۔ چمپی کر کر کے میں اس قدر تھک گیا تھا کہ کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ رکما کے سینے پر ہاتھ رکھا اور سو گیا۔ جانے کیا بجا تھا۔ میں ایک دم ہڑبڑا کے اٹھا۔ گردن میں کوئی سخت سخت سی چیز دھنس رہی تھی۔ فوراً مجھے اس تار والی رسی کا خیال آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر سکوں، رکما میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ ایک دو ایسے مروڑے دیے کہ میری گردن کڑ کڑ کر بول اُٹھی۔ میں نے شور مچانا چاہا، لیکن آواز میرے پیٹ میں رہی۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔ میرا خیال ہے چار بجے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنا شروع ہوا۔ گردن میں بہت زور کا درد تھا۔ میں ویسے ہی دم سادھے پڑا رہا اور ہولے ہولے ہاتھ سے رسی کے مروڑے کھولنے شروع کیے۔ ایک دم آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سانس روک لیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی پر کچھ نظر نہ آیا۔ جو آوازیں آ رہی تھیں، ان سے معلوم ہوتا تھا دو آدمی کشتی لڑ رہے ہیں۔ رکما ہانپ رہی تھی۔ ہانپتے ہانپتے اس نے کہا۔

”تکارام! بتی جلا دو“

۔ تکارام نے ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں، رکما نہیں۔“

رکما بولی۔ بڑے ڈرپوک ہو۔ صبح اس کے تین ٹکڑے کر کے لے جاؤ گے کیسے“!

۔ میرا بدن بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ تکارام نے کیا جواب دیا۔ رکما نے پھر کیا کہا۔ اس کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ پتہ نہیں کب ایک دم روشنی ہوئی اور میں آنکھیں جھپکتا اٹھ بیٹھا۔ تکارام کے منہ سے زور کی چیخ نکلی اور وہ دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔ رکما نے جلدی سے کواڑ بند کیے اور کنڈی چڑھا دی۔ صاحب میں آپ سے کیا بیان کروں، میری حالت کیا تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا لیکن ہلنے جلنے کی بالکل سکت نہیں تھی۔ یہ تکارام میرے لیے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ ہماری چالی میں اکثر آم بیچنے آیا کرتا تھا۔ رکما نے اس کو کیسے پھنسایا، اس کا مجھے علم نہیں۔ رکما میری طرف گھور گھور کے دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں۔ وہ مجھے مار چکی تھی۔ لیکن میں اس کے سامنے زندہ بیٹھا تھا۔ خیر وہ مجھ پر جھپٹنے کو تھی کہ دروازے پر دستک ہُوئی اور بہت سے آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ رکما نے جھٹ سے میرا بازو پکڑا اور گھسیٹ کر مجھے غسل خانے کے اندر ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا، پڑوس کے آدمی تھے۔ انھوں نے رکما سے پوچھا۔

”خیریت ہے۔ ابھی ابھی ہم نے چیخ کی آواز سُنی تھی۔“

رکما نے جواب دیا۔

”خیریت ہے۔ مجھے سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دیوار کے ساتھ ٹکرا گئی اور ڈر کر منہ سے چیخ نکل گئی۔“

پڑوس کے آدمی یہ سن کر چلے گئے۔ رکما نے کواڑ بند کیے اور کنڈی چڑھا دی۔ اب مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی۔ آپ یقین مانئے یہ سوچ کر کہ وہ ظالم مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی، ایک دم میرے اندر مقابلے کی بے پناہ طاقت آ گئی۔ بلکہ میں نے ارادہ کر لیا کہ رکما کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ غسل خانے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ بڑی کھڑکی کے پٹ کھولے باہر جھانک رہی ہے۔ میں ایک دم لپکا۔ چوتڑوں پر سے اُوپر اُٹھایا اور باہر دھکیل دیا۔ یہ سب یوں چٹکیوں میں ہوا۔ دھپ سی آواز آئی اور میں دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ ساری رات میں چارپائی پر لیٹا اپنی گردن پر جو بہت بُری طرح زخمی ہو رہی تھی۔ آپ نشان دیکھ سکتے ہیں۔ تیل مل مل کر سوچتا رہا کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ اس نے پڑوسیوں سے کہا تھا کہ اسے سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔ مکان کے اس طرف جہاں میں نے اسے گرایا تھا جب اس کی لاش دیکھی جائے گی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ سوتے میں چلی ہے اور کھڑکی سے باہر گر پڑی ہے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ گردن پر میں نے رومال باندھ لیا تاکہ زخم دکھائی نہ دیں۔ نو بج گئے بارہ ہو گئے مگر رکما کی لاش کی کوئی بات ہی نہ ہُوئی۔ جدھر میں نے اس کو گرایا تھا۔ ایک تنگ گلی ہے۔ دو بلڈنگوں کے درمیان دو طرف دروازے ہیں تاکہ لوگ اندر داخل ہو کر پیشاب پاخانہ نہ کریں۔ پھر بھی دو بلڈنگوں کی کھڑکیوں میں سے پھینکا ہوا کچرا کافی جمع ہوتا ہے جو ہر روز صبح سویرے بھنگن اُٹھا کر لے جاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید بھنگن نہیں آئی، آئی ہوتی تو اس نے دروازہ کھولتے ہی رکما کی لاش دیکھی ہوتی اور شور برپا کر دیا ہوتا۔ قصّہ کیا تھا! میں چاہتا تھا کہ لوگوں کو جلد اس بات کا پتہ چل جائے۔ دو بج گئے تو میں نے جی کڑا کرا کے خود ہی دروازہ کھولا۔ لاش تھی نہ کچرا یا مظہر العجائب! رکما گئی کہاں۔ قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے اس پھانسی کے پھندے سے بچ نکلنے کا اتنا تعجب نہیں ہو گا جتنا کہ رکما کے غائب ہونے کا ہے۔ تیسری منزل سے میں نے اُسے گرایا تھا، پتھروں کے فرش پر۔ بچی کیسے ہو گی۔ لیکن پھر سوال

ہے کہ اس کی لاش کون اُٹھا کرلے گیا۔ عقل نہیں مانتی، لیکن صاحب کچھ پتہ نہیں وہ ڈائن زندہ ہو۔ چالی میں تو یہی مشہور ہے کہ یا تو کسی مسلمان نے گھر ڈال لیا ہے یا مار ڈالا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مار ڈالا ہے تو اچھا کیا ہے۔ گھر ڈال لیا ہے تو جو حشر اس غریب کا ہو گا آپ جانتے ہی ہیں۔ خدا بچائے صاحب۔ اب تکارام کی بات سنئے۔ اس واقعے کے ٹھیک بیس روز بعد وہ مجھ سے ملا اور پوچھنے لگا۔

”بتاؤ! رکما کہاں ہے“

۔ میں نے کہا۔

”مجھے کچھ علم نہیں۔“

کہنے لگا۔

”نہیں، تم جانتے ہو۔“

۔ میں نے جواب دیا۔

”بھائی قرآن مجید کی قسم! مجھے کچھ معلوم نہیں“

۔ بولا

”نہیں، تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے اُسے مار ڈالا ہے۔ میں پولیس میں رپٹ لکھوانے والا ہوں کہ پہلے تم نے گردھاری کو مارا پھر رکما کو“

۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا۔ لیکن صاحب میرے پسینے چھوٹ گئے۔ بہت دیر تک کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ ایک ہی بات سوجھی کہ اس کو ٹھکانے لگا دوں۔ آپ ہی سوچیے اس کے علاوہ اور علاج بھی کیا تھا۔ چنانچہ صاحب اسی وقت چھپ کر چھری تیز کی اور تکارام کو ڈھونڈنے نکل پڑا۔ اتفاق کی بات ہے شام کو چھ بجے وہ مجھے۔ اسٹریٹ کے ناکے پر موتری کے پاس مل گیا۔ موسمبیوں کی خالی ٹوکری باہر رکھ کر وہ پیشاب کرنے کے لیے اندر گیا۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے۔ دھوتی کھول ہی رہا تھا کہ میں نے زور سے پکارا۔

”تکارام“

۔ پلٹ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ چھری میرے ہاتھ ہی میں تھی۔ ایک دم اس کے پیٹ میں بھونک دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی باہر نکلتی ہوئی انتڑیاں تھامیں اور دوہرا ہو گر پڑا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ باہر نکل کر نو دو گیارہ ہو جاتا مگر بے وقوفی دیکھئے بیٹھ کر اس کی نبض دیکھنے لگا کہ آیا مرا ہے یا نہیں۔ میں نے اتنا سنا تھا کہ نبض ہوتی ہے، انگوٹھے کی طرف یا دوسری طرف، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر لگ گئی۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل پتلون کے بٹن کھولتے کھولتے اندر آیا اور میں دھر لیا گیا۔ بس صاحب یہ ہے پوری داستان۔ پڑھیے کلمہ، لا الہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ! جو میں نے رتی بھر بھی جھوٹ بولا ہو۔

پسینہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپسینہ

”میرے اللہ! ۔ آپ تو پسینے میں شرابور ہو رہے ہیں۔“

”نہیں۔ کوئی اتنا زیادہ تو پسینہ نہیں آیا۔“

”ٹھہریے میں تولیہ لے کر آؤں۔“

”تولیے تو سارے دھوبی کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔“

”تو میں اپنے دوپٹے ہی سے آپ کا پسینہ پونچھ دیتی ہوں۔“

”تمہارا دوپٹہ ریشمیں ہے۔ پسینہ جذب نہیں کر سکے گا۔“

”پسینے کے یہ قطرے مجھ سے نہیں دیکھے جاتے۔ آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ریشمیں کپڑا پانی جذب نہیں کر سکتا۔ لیکن میں آپ کا تولیہ ہوں۔ کیا میں آپ کا پسینہ خشک نہیں کر سکتی۔“

”آج گرمی زیادہ تھی۔ سائیکل پر یہاں آتے آتے میں قریب قریب بیہوش ہو گیا تھا۔“

”ہائے اللہ“!

”نہیں۔ بس میں چند منٹوں میں ٹھیک ہو گیا۔ ایک دوست تھا، اس نے مجھے آموں کا شربت پلا دیا۔“

“آموں کا شربت بھی ہوتا ہے؟”

“ہر شے کا شربت بنایا جا سکتا ہے۔”

“میرا بھی؟”

“تمہارا شربت تو میں ہر روز پیتا ہوں۔ لیکن اس کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔”

“شریر کہیں کے۔”

“شرارت تو تمہاری ہوتی ہے کہ تم مٹھاس میں کھٹائی ڈال دیتی ہو۔”

“کھٹائی تو آپ ڈالتے ہیں۔ میں تو مصری کی ڈلی ہوں۔”

“مانتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی۔”

“آپ مجھ سے وہ زیادہ نہ کیجیے۔ اِدھر آیئے، میں آپ کی ٹائی اُتاروں۔”

“آج اتنا تکلف کیوں کیا جا رہا ہے؟”

“آپ محبت کو تکلف کہتے ہیں؟”

“اس کے متعلق میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ ویسے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اتنی محبت کا اظہار تم نے پہلے کبھی نہیں کیا۔”

“آپ محبت کو کیا جانیں۔”

“انسان اگر محبت ہی کو جان پہچان نہیں سکتا تو میں سمجھتا ہوں وہ حیوان بھی نہیں۔ کوئی بے حِس چیز ہے۔ پتھر ہے۔ سڑک پر گرا ہوا روڑا ہے۔”

“اِدھر آیئے، میں آپ کی ٹائی اتاروں۔”

“اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟”

“میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ تکلف کی بات کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کبھی آپ سے تکلف برتا ہے؟”

“آج پہلی مرتبہ۔”

“آپ اتنے ذہین ہیں۔ بتایئے اس تکلف کی وجہ کیا ہے؟”

“میں اتنا ذہین نہیں ہوں۔”

“آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔”

“جناب میں کسر نفسی سے کام نہیں لے رہا۔ ایک حقیقت تھی جو میں نے بیان کر دی؟”

“میرے پاس تو آیئے، میں آپ کا پسینہ پونچھ دوں۔ گرمی میں بے حال ہو کے آ رہے ہیں۔”

“کوئی اتنی زیادہ بے حالی نہیں۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ آج درجہ حرارت بہت بڑھا ہوا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ آج دس آدمی اس حدت کے باعث مر گئے ہیں۔”

“میں کہتی ہوں، آپ اتنے روپے خرچ کرتے ہیں۔ کیوں نہیں گھر میں ایک
“کولر”
لے آتے۔”

“کولر کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود بہت بڑی کولر ہو۔ اتنی گرمی میں گھر آیا ہوں۔ تمہاری باتوں ہی نے مجھے ایسی ٹھنڈک پہنچا دی ہے جو سب سے بڑا کولر بھی نہیں پہنچا سکتا۔”

“آپ نے اب میرا مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔”

“تمہاری قسم۔ میں ایسی گستاخی کبھی نہیں کر سکتا۔”

“میری قسم آپ نے کیوں کھائی ہے؟”

“اس لیے کہ بڑی لذیذ ہے۔”

“یعنی آدمی کو وہی قسمیں کھانی چاہئیں جو مزیدار ہوں۔”

“یقیناً”

”آپ سے میں کبھی جیت نہیں سکتی۔“

”میں تو ہمیشہ ہار تا رہا ہوں۔“

”آپ کب ہارے ہیں۔ ہار تو ہمیشہ میری ہی ہوتی رہی ہے۔“

”اچھا، اب ذرا میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میری شلوار قمیص نکال دو“

”الماری میں صرف ایک پائجامہ موجود ہے“

”بنیان ہو گی“

”جی نہیں۔ تین میلی پڑی ہیں جو نوکر نے ابھی تک نہیں دھوئیں“

”ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں تو تمہیں خود دھولینا چاہئیں“

”آپ کو کیا معلوم کہ صابن کتنا واہیات ہوتا ہے؟۔ چھالے پڑ جاتے ہیں ہاتھوں میں۔“

”نوکروں کے ہاتھوں میں بھی یقیناً چھالے پڑتے ہوں گے۔“

”آپ ہمیشہ نوکروں کی طرف داری کرتے ہیں۔“

”کیا وہ انسان نہیں؟“

”خیر چھوڑیئے اس قصّے کو۔ اِدھر آیئے۔ میں آپ کی ٹائی اُتار دوں۔“

”یہ کون سی اتنی بڑی مہم ہے، جو آپ سر کرنا چاہتی ہیں۔“

”میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ یہ بتایئے کہ آپ کو چلنے میں تکلیف کیوں محسوس ہو رہی ہے؟“

”جوتا ذرا تنگ ہے؟“

”یہ وہی ہے نا جو آپ نے پچھلے مہینے لیا تھا۔“

”ہاں، وہی ہے۔ آج پہلی مرتبہ پہنا ہے۔“

”دیکھ کے نہیں لیا تھا۔“

”دیکھ کر ہی لیا تھا۔ پہنا بھی تھا۔ پر۔“

”چھوٹا کیسے ہو گیا۔“

”جو چیز استعمال نہ کی جائے، سکڑ جاتی ہے۔“

”یہ عجیب منطق ہے۔“

”عورتوں کو اپنے خاوندوں کی ہر بات عجیب منطق معلوم ہوتی ہے۔“

”میں نے کہا: اِدھر آیئے، آپ کی ٹائی اُتار دوں۔“

”پہلے تو میں یہ تکلیف دہ جوتے اُتارنا چاہتا ہوں۔“

”بیٹھ جایئے۔ میں اُتار دیتی ہوں۔“

”آج تم اتنی مہربان کیوں ہو؟۔ پہلے تو۔“

”اب نخرے نہ بگھاریے۔ بیٹھیے کرسی پر۔“

”یہاں سب کرسیاں اس قابل کہاں ہیں کہ اُن پر آدمی بیٹھے۔“

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب ان کا بید بالکل ناکارہ ہو جائے گا تو میں سب کی سب ٹھیک کرا دوں گی۔“

”یہ تمہاری عجیب منطق تھی جس کے متعلق میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ مبادا تم ناراض ہو جاؤ۔“

”بات دراصل یہ ہے کہ میں چاہتی تھی کہ جب تک یہ کرسیاں کام دیتی ہیں، ان کی مرمت نہ کرائی جائے۔ کیونکہ انہیں مقررہ وقت پر پھر مرمت طلب ہونا ہے۔ جتنے دن نکل جائیں ٹھیک ہے۔“

”میرا خیال ہے، تم بھی مرمت طلب ہو۔“

”دیکھیے۔ میں ایسی باتیں پسند نہیں کرتی۔ آپ بڑے بے لگام ہوتے جارہے ہیں۔“

”چلیے۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں۔“

”آپ خاموش ہی اچھے لگتے ہیں۔“

”“

”“

”“

”آپ خاموش کیوں ہو گئے ؟“

”تم ہی نے تو مجھ سے کہا تھا کہ آپ خاموش ہی اچھے لگتے ہیں۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ آپ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کے بیٹھ رہیں۔“

”تم مجھے کچھ کھانے کے لیے دو“

”میں کیا دُوں۔ آپ باہر سے کھا کر آرہے ہیں۔“

”تم نے کیسے جانا؟“

”آپ کی پتلون بتا رہی ہے۔ سالن کے داغ لگے ہیں۔ ضرور آپ نے کسی ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ عیاشی کی ہو گی۔“

”عیاشی تو خیر نہیں کی، لیکن مجبوراً اپنے افسر کے ساتھ ایک دعوت میں شریک ہونا پڑا۔ اور تم جانتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں صرف اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا پسند کرتا ہوں۔ وہاں میں نے صرف چند لقمے منہ میں ڈالے اور ہاتھ اٹھالیا۔ اس لیے کہ کھانا بڑا واہیات تھا۔ اس میں تمہارے ہاتھوں کا نمک نہیں تھا۔“

”لیکن یہ پتلون پر دھبے کیسے پڑے ؟“

”اس لیے کہ سالن واہیات تھا۔ مجھ سے دو مرتبہ چاول نیچے گر گئے۔“

”چاول تو آپ سے ہمیشہ نیچے گرتے رہتے ہیں۔“

”اس کو چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ فرش پر شربت کِس نے گرایا تھا۔ اور۔ اور۔ یہ گلاس۔ جگ۔ کوئی مہمان آیا تھا؟“

”ہاں۔ میری ایک سہیلی آئی تھی۔“

”کون ؟“

”آپ اسے نہیں جانتے۔ کوئٹے کی تھی، جو میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ اس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ مجھ سے ملنے آئی تھی۔“

”اس سے کیا باتیں ہوئیں ؟“

”میں آپ کو کیوں بتاؤں۔ ویسے وہ اپنے خاوند سے بہت خوش تھی۔“

”ہر عورت کو اپنے خاوند سے خوش ہونا چاہیے۔ اس میں اس کی کیا برتری ہے ؟“

”نہیں۔ وہ۔“

”کیا؟“

”ایسی ایسی باتیں سُنائیں جو۔ جو مجھے معلوم ہی نہیں تھیں۔ شاید آپ کو بھی معلوم نہ ہوں۔“

”اس گفتگو کو چھوڑیے۔ آیئے میں آپ کے جوتے اتار دوں۔“

”یہ کام میں خود بھی کر سکتا ہوں۔“

”نہیں میں آج خود کروں گی۔ پہلے ٹائی اتارنے دیجیے۔“

”اتار لیجیے۔“

”آپ آج کتنے اچھے لگتے ہیں۔“

”اس کی وجہ کیا ہے؟۔ پہلے تو میں تمہیں کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ آج یک بیک یہ انقلاب کیسے پیدا ہو گیا؟“

”انقلاب کیسا؟۔ میں شروع ہی سے آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میرا سارا دوپٹہ گیلا ہو گیا ہے۔ توبہ، آپ کو اتنا پسینہ کیوں آرہا ہے؟“

”چلیے اندر“

”چلو“

”یہاں باہر کی بہ نسبت گرمی کس قدر کم ہے؟“

”ہاں۔“!

”اس شُو نے تو آپ کے پاؤں کی انگلیوں پر چنڈیاں ڈال دی ہیں۔“

”ہر تنگ چیز راحت کا باعث ہوتی ہے۔“

”میں بھی آج سے تنگ ہو گئی ہوں۔“

”مجھ سے“

”نہیں۔ میری سہیلی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا خاوند۔ خیر آپ اس قصے کو چھوڑیے۔ اس نے بڑی تنگ اور چُست چولی پہنی ہوئی تھی۔“

”میں نے اب دیکھا ہے کہ تم بھی اسی قسم کا بلاؤز پہنے ہو۔ کہاں سے لیا تم نے؟“

”آج ہی اس کے درزی سے سلوایا ہے۔“

”اور میں جو ساڑھی لایا ہوں۔“

”وہ اس سے میچ نہیں کرتی۔ خیر میں آپ کے ساتھ چلوں گی اور اس دکان میں کوئی اور ساڑھی پسند کر لوں گی۔“

”اُس سہیلی سے تم نے کیا باتیں کیں؟“

”آپ لیٹ جایئے،۔ پھر آپ کو پسینہ آرہا ہے۔ میں آپ کو اس کی تمام باتیں سنا دوں گی۔“

235 235 235 235

”تم اپنی سہیلی سے ایسی باتیں ہر روز سنا کرو۔ تاکہ ہماری زندگی خوشگوار رہے۔ اور تم میرے پسینے کو اپنے دوپٹے سے اسی طرح پونچھتی رہو۔“

”آپ کا پسینہ تو اب میرا لہو بن گیا ہے۔“

پشاور سے لاہور تک

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپشاور سے لاہور تک

وہ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے سے نکلی‘ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ جاوید پشاور سے اُسے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زنانہ ڈبے کے پاس سے کئی مرتبہ گزرا۔ لڑکی حسین تھی‘ جاوید اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا‘ اس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹا سا تل تھا‘ گالوں میں ننھے ننھے گڑھے تھے جو اس کے چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے۔ راولپنڈی اسٹیشن پر اُس لڑکی نے کھانا منگوایا‘ بڑے اطمینان سے ایک ایک نوالہ اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا‘ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھائیں۔ وہ یقیناً اُس کے پاس پہنچ جاتا مگر مصیبت یہ تھی کہ ڈبہ زنانہ تھا۔ عورتوں سے بھرا ہوا‘ یہی وجہ ہے کہ جرأت نہ کر سکا۔ لڑکی نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے جو بہت نازک تھے۔ لمبی لمبی مخروطی اُنگلیاں جن کو اس نے اچھی طرح صاف کیا اور اٹیچی کیس سے تولیہ نکال کر اپنے ہاتھ پونچھے‘ پھر اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جاوید گاڑی چلنے تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا اور اُسی لڑکی کے خیالوں میں غرق ہو گیا۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ بڑے اچھے گھرانے کی ہے۔ دونوں کلائیوں میں قریب قریب بارہ بارہ سونے کی چوڑیاں ہوں گی۔ کانوں میں ٹاپس بھی تھے‘ دو انگلیوں میں‘ اگر میرا اندازہ غلط نہیں‘ ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں‘ لباس بہت عمدہ‘ ساٹن کی شلوار‘ ٹفتیا کی قمیص‘ شنون کا دوپٹہ۔ حیرت ہے کہ گھٹیا درجے میں کیوں سفر کر رہی ہے؟ پشاور سے آئی ہے۔ وہاں کی عورتیں تو سخت پردہ کرتی ہیں۔ لیکن یہ برقعے کے بغیر وہاں سے گاڑی میں سوار ہوئی اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں۔ نہ کوئی عورت‘ اکیلی سفر کر رہی ہے‘ آخر یہ قصہ کیا ہے؟ میرا خیال ہے پشاور کی رہنے والی نہیں۔ وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہو گی۔ مگر اکیلی کیوں؟ کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اُٹھا کر لے جائے گا کوئی۔ ایسے تنہا حسن پر تو ہر مرد جھپٹا مارنا چاہتا ہے۔ پھر جاوید کو ایک اندیشہ ہوا کہ شادی شدہ

تو نہیں؟ وہ دراصل دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس لڑکی کا پیچھا کرے گا اور رومان لڑا کر اُس سے شادی کرے گا' وہ حرام کاری کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کئی سٹیشن آئے اور گزر گئے۔ اُسے صرف راولپنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اُس کا گھر تھا مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔ ایک اسٹیشن پر چیکنگ ہوئی جس کے باعث اُسے جرمانہ ادا کرنا پڑا مگر اُس نے اس کی کوئی پروانہ کی۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا

“آپ کو کہاں تک جانا ہے”

جاوید مسکرایا

“جی' ابھی تک معلوم نہیں۔ آپ لاہور کا ٹکٹ بنا دیجیے کہ وہی آخری سٹیشن ہے”

ٹکٹ چیکر نے اُسے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا' روپے وصول کیے اور دوسرے سٹیشن پر اُتر گیا' جاوید بھی اُترا کہ ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرنا تھا۔ ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا' وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں خلال کر رہی تھی' جاوید کی طرف جب اُس نے دیکھا تو اس کے دل و دماغ میں چیونٹیاں دوڑنے لگیں' اُس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے' سمجھ گئی ہے کہ وہ بار بار صرف اُسے ہی دیکھنے آتا ہے۔ جاوید کو دیکھ کر وہ مسکرائی' اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر جاوید فرط جذبات کی وجہ سے فوراً وہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور رومانوں کی دنیا کی سیر کرنے لگا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے آس پاس کی تمام چیزیں مسکرا رہی ہیں۔ ٹرین کا پنکھا مسکرا رہا ہے۔ کھڑکی سے باہر تار کے کھمبے مسکرا رہے ہیں۔ انجن کی سیٹی مسکرا رہی ہے' اور وہ بدصورت مسافر جو اُس کے ساتھ بیٹھا تھا' اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ہے۔ اس کے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی لیکن اس کا دل مسکرا رہا تھا۔ اگلے اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا' کہاں چلی گئی؟ کہیں پچھلے اسٹیشن پر تو نہیں اُتر گئی جہاں اُس نے ایک مسکراہٹ سے مجھے نوازا تھا؟ نہیں نہیں غسل خانے میں ہو گی۔ وہ واقعی غسل خانے ہی میں تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاوید کو دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اُس کو بلایا۔ جاوید کانپتا لرزتا کھڑکی کے پاس پہنچا اُس لڑکی نے بڑی مہین اور سریلی آواز میں کہا

“ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں آپ کو۔

“مجھے دو سیب لا دیجیے”

یہ کہہ کر اُس نے اپنا پرس نکالا اور ایک روپے کا نوٹ جاوید کی طرف بڑھا دیا۔ جاوید نے جو اس غیر متوقع بلاوے سے قریب قریب برق زدہ تھا' ایک روپے کا نوٹ پکڑ لیا لیکن فوراً اُس کے ہوش و حواس برقرار ہو گئے۔ نوٹ واپس دے کر اُس نے اُس لڑکی سے کہا

“آپ یہ رکھیے۔ میں سیب لے آتا ہوں”

اور پلیٹ فارم پر اُس ریڑھی کی طرف دوڑا جس میں پھل بیچے جاتے تھے' اُس نے جلدی جلدی چھ سیب خریدے کیونکہ وسل ہو چکی تھی۔ دوڑا دوڑا وہ اُس لڑکی کے پاس آیا' اُس کو سیب دیے اور کہا

“معاف کیجیے گا۔ وسل ہو رہی تھی اس لیے میں اچھے سیب چن نہ سکا”

لڑکی مسکرائی۔ وہی دلفریب مسکراہٹ۔ گاڑی حرکت میں آئی۔ جاوید اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے کانپ رہا تھا لیکن بہت خوش تھا' اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کو دونوں جہان مل گئے ہیں' اُس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی' لیکن اب وہ اس کی لذّت سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی' اُس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خشک رہا ہوں۔ آج معلوم ہوا ہے کہ محبت انسان کو کتنی تروتازہ بنا دیتی ہے۔ وہ سیب کھا رہی ہو گی۔ لیکن اُس کے گال تو خود سیب ہیں' میں نے جو سیب اُس کو دیے ہیں کیا وہ اُن کو دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔ وہ میری محبت کے اشاروں کو سمجھ گئی جب ہی تو وہ مسکرائی اور اُس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بُلایا اور کہا کہ میں اسے سیب لا دُوں۔ مجھ سے اگر وہ کہتی کہ گاڑی کا رخ پلٹ دُوں تو اُس کی خاطر یہ بھی کر دیتا۔ گو مجھ میں اتنی طاقت نہیں لیکن محبت میں آدمی بہت بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ فرہاد نے شیریں کے لیے پہاڑ کاٹ کر نہر نہیں کھودی تھی؟ میں بھی کتنا بیوقوف ہوں اُس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی پوچھ لیا ہوتا کہ تمھیں کہاں تک جانا ہے۔ خیر میں لاہور تک کا ٹکٹ تو بنوا چکا ہوں۔ ہر اسٹیشن پر دیکھ لیا کروں گا۔ ویسے وہ اب مجھے بن بتائے جائے گی بھی نہیں۔ شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ میرے جذبہ محبت نے اُسے کافی متاثر کیا ہے۔ سیب کھا رہی ہے' کاش کہ میں اُس کے پاس بیٹھا ہوتا' ہم دونوں ایک سیب کو بیک وقت اپنے دانتوں سے کاٹتے۔ اُس کا منہ میرے منہ سے کتنا قریب ہوتا۔ میں اس کے گھر کا پتہ لُوں گا۔ ذرا اور باتیں کر لوں' پھر راولپنڈی پہنچ کر امّی سے کہوں گا کہ میں نے ایک لڑکی دیکھ لی ہے اُس سے میری شادی کر دیجیے' وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔ بس ایک دو مہینے کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔

اگلے سٹیشن پر جب جاوید اُسے دیکھنے گیا تو وہ پانی پی رہی تھی' وہ جرأت کر کے آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا

“آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو فرمایئے”

لڑکی مسکرائی۔ دلفریب مسکراہٹ

”مجھے سگریٹ لادیجیے“

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا

”آپ سگریٹ پیتی ہیں“

”وہ لڑکی پھر مسکرائی“

جی نہیں۔ یہاں ایک عورت ہے‘ پردہ دار‘ اُس کو سگریٹ پینے کی عادت ہے“

”اوہ! ۔ میں ابھی لایا۔ کس برانڈ کے سگریٹ ہوں؟“

”میراخیال ہے وہ گولڈ فلیگ پیتی ہے“

”میں ابھی حاضر کیے دیتاہوں“

یہ کہہ کر جاوید اسٹال کی طرف دوڑا‘ وہاں سے اُس نے دو پیکٹ لیے اور اُس لڑکی کے حوالے کردیے‘ اُس نے شکریہ اُس عورت کی طرف سے ادا کیاجو سگریٹ پینے کی عادی تھی۔ جاوید اب اور بھی خوش تھا کہ اس لڑکی سے ایک اور ملاقات ہوگئی مگر اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا‘ اُس نے کئی مرتبہ خود کو کوسا کہ اُس نے نام کیوں نہ پوچھا‘ اتنی باتیں ہوتی رہیں لیکن وہ اُس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا

”آپ کانام؟“

اُس نے ارادہ کرلیا کہ اگلے سٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اُس سے نام ضرور پوچھے گا اُسے یقین تھا کہ وہ فوراًبتادے گی کیونکہ اس میں قباحت ہی کیا تھی۔ اگلا سٹیشن بہت دیر کے بعد آیا‘ اس لیے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بہت کوفت ہورہی تھی‘ اُس نے کئی مرتبہ ٹائم ٹیبل دیکھا‘ گھڑی بار بار دیکھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ انجن کو پر لگ جائیں تاکہ وہ اُڑ کر جلدی اگلے اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ گاڑی ایک دم رُک گئی‘ معلوم ہوا کہ انجن کے ساتھ ایک بھینس ٹکراگئی ہے۔ وہ اپنے کمپارٹمنٹ سے اُتر کر ساتھ والے ڈبے کے پاس پہنچا مگر لڑکی اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔ مسافروں نے مری کٹی ہوئی بھینس کو پٹڑی سے ہٹانے میں کافی دیر لگادی۔ اتنے میں وہ لڑکی جو غالباًدوسری طرف تماشا دیکھنے میں مشغول تھی‘ آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی‘ جاوید پر جب اُس کی نظر پڑی تو مسکرائی۔ وہی دلفریب مسکراہٹ۔ جاوید کھڑکی کے پاس گیا‘ مگر اس کانام پوچھ نہ سکا۔ لڑکی نے اُس سے کہا

”یہ بھینسیں کیوں گاڑی کے نیچے آجاتی ہیں؟“

جاوید کو کوئی جواب نہ سوجھا‘ گاڑی چلنے والی تھی‘ اس لیے وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ کئی اسٹیشن آئے مگر وہ نہ اُترا۔ آخر لاہور آگیا‘ پلیٹ فارم پر جب گاڑی رُکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا‘ لڑکی موجود تھی‘ جاوید نے اپنا سامان نکلوایا اور اُس سے جس نے ہاتھ میں اٹیچی کیس پکڑاہوا تھا‘ کہا

”لائیے! یہ اٹیچی کیس مجھے دے دیجیے“

اُس لڑکی نے اٹیچی کیس جاوید کے حوالے کردیا۔ قلی نے جاوید کا سامان اٹھایا اور دونوں باہر نکلے‘ تانگہ لیا۔ جاوید نے اُس سے پوچھا

”آپ کو کہاں جاناہے“

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ پیداہوئی

”جی ہیرامنڈی“

جاوید بوکھلاسا گیا

”کیا آپ وہاں رہتی ہیں؟“

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ جی ہاں۔ میرامکان دیکھ لیں‘ آج رات میرامجرا سننے ضرور آیئے گا“

جاوید پشاور سے لے کر لاہور تک اپنا مجرا سُن چکا تھا‘ اُس نے اس طوائف کو اُس کے گھر چھوڑا اور اس تانگے میں سیدھا لاریوں کے اڈے پہنچا اور راولپنڈی روانہ ہوگیا۔ ۲۶، مئی ۵۴ء

پھاتو

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپھاتو

تیز بخار کی حالت میں اُسے اپنی چھاتی پر کوئی ٹھنڈی چیز رینگتی محسوس ہوئی۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹُوٹ گیا۔ جب وہ مکمل طور پر بیدار ہوا تو اُس کا چہرہ بخار کی شدت کے باعث تمتما رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا پھاتو فرش پر بیٹھی، پانی میں کپڑا بھگو کر اس کے ماتھے پر لگا رہی ہے۔ جب پھاتو نے اُس کے ماتھے سے کپڑا اُتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے اُسے پکڑ لیا۔ اور اپنے سینے پر رکھ کر ہولے ہولے پیار سے اپنا ہاتھ اس پر پھیرنا شروع کر دیا۔ اُس کی سُرخ آنکھیں دو انگارے بن کر دیر تک پھاتو کو دیکھتی رہیں۔ وہ اس دہکتی ہوئی ٹکٹکی کی تاب نہ لا سکی اور ہاتھ چھڑا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس پر وہ اُٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا۔ پھاتو سے، جس کا اصل نام فاطمہ تھا، اُس کو غیر محسوس طور پر محبت ہو گئی تھی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کردار واطوار کی اچھی نہیں۔ محلے میں جتنے لونڈے ہیں اُس سے عشق لڑا چکے ہیں۔ لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی اُس کو پھاتو سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اگر بخار میں مبتلا نہ ہوتا تو یقیناً اُس سے اپنے اس جذبے کا اظہار کبھی نہ کیا ہوتا۔ مگر تیز بخار کے باعث اُس کو اپنے دل و دماغ پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے اونچی آواز میں پھاتو کو پکارنا شروع کیا۔

”اِدھر آؤ۔ میری طرف دیکھو۔ جانتی ہو، میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں، بہت بُری طرح تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ اس طرح تمہاری محبت میں پھنس گیا ہوں، جیسے کوئی دلدل میں پھنس جائے۔ میں جانتا ہوں تم کیا ہو۔ میں جانتا ہوں تم اس قابل نہیں ہو کہ تم سے محبت کی جائے۔ مگر یہ سب کچھ جانتے بھوجھتے تم سے محبت کرتا ہوں۔ لعنت ہو مجھ پر۔ لیکن چھوڑ ان باتوں کو۔ اور میری طرف دیکھو۔ میں بخار کے علاوہ تمہاری محبت میں بھی پھنکا جا رہا ہوں۔ پھاتو۔ پھاتو۔ میں۔ میں“

اس کے خیالات کا سلسلہ ٹُوٹ گیا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے ڈاکٹر مکند لال بھاٹیہ سے کونین کے نقصانات پر بحث شروع کر دی۔ چند لمحات کے بعد وہ اپنی ماں سے جو وہاں موجود نہیں تھی، مخاطب ہوا

”بی بی جی میرے دماغ میں بے شمار خیالات آ رہے ہیں۔ آپ حیران کیوں ہوتی ہیں۔ مجھے پھاتو سے محبت ہے، اسی پھاتو سے جو ہمارے پڑوس میں پنج بندوں کے ہاں ملازم تھی اور جواب آپ کی ملازم ہے۔ آپ نہیں جانتیں اس لڑکی نے مجھے کتنا ذلیل کرا دیا ہے۔ یہ محبت نہیں خسرہ ہے، نہیں خسرے سے بڑھ چڑھ کر۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ مجھے تمام ذلتیں برداشت کرنی ہوں گی۔ ساری گلی کا کوڑا کرکٹ اپنے سر پر اُٹھانا ہو گا۔ یہ سب کچھ ہو کے رہے گا، یہ سب کچھ ہو کے رہے گا۔“

آہستہ آہستہ اُس کی آواز کمزور ہوتی گئی اور اُس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کی پلکوں پر بوجھ سا آن پڑا ہے۔ پھاتو پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھی اس کی بے جوڑ ہذیانی گفتگو سُنتی رہی۔ مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ایسے بیماروں کی کئی مرتبہ تیمارداری کر چکی تھی۔ بخار کی حالت میں جب اُس نے اپنی محبت کا اعتراف کیا تو پھاتو نے اُس کے متعلق کیا محسوس کیا، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کا گوشت بھرا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ ممکن ہے کہ اُس کے دل کے کسی گوشے میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی ہو۔ مگر یہ چربی کی تہوں سے نکل کر باہر نہ آ سکی۔ پھاتو نے رومال نچوڑ کر تازہ پانی میں بھگویا اور اس کے ماتھے پر رکھنے کے لیے اُٹھی۔ اب کی بار اُسے اس لیے اُٹھنا پڑا کہ اُس نے کروٹ بدلی تھی۔ جب اُس نے آہستہ سے اُدھر سے مڑ کر اُس کے ماتے پر گیلا رومال جمایا تو اُس کی نیم وا آنکھیں یُوں کھلیں جیسے لال لال زخموں کے منہ ٹانکے ادھڑ جانے سے کھل جاتے ہیں۔ اس نے ایک لمحے کے لیے پھاتو کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے گال تھوڑے سے نیچے لٹک آئے تھے پھر ایک دم جانے اُس پر کیا وحشت سوار ہوئی اُس نے پھاتو کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر اس زور سے اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچا کہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی کڑ کڑ بول اُٹھی۔ پھر اُس نے اُس کو اپنی رانوں پر لٹا کر اُس کے موٹے اور گدگدے ہونٹوں پر اس زور سے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ پیوست کیے جیسے وہ انھیں داغنا چاہتا ہے۔ اُس کی گرفت اس قدر زبردست تھی کہ پھاتو کوشش کے باوجود خود کو آزاد نہ کر سکی۔ اُس کے ہونٹ دیر تک اُس کے ہونٹوں پر استری کرتے رہے۔ پھر اچانک ہانپتے ہوئے اُس نے پھاتو کو ایک جھٹکے سے الگ کر دیا اور اُٹھ کر بستر میں یوں بیٹھ گیا جیسے اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ پھاتو ایک طرف سمٹ گئی۔ وہ سہم گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ابھی تک اس کی پپڑی جمے ہونٹ سرک رہے تھے۔ جب پھاتو نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا تو اُس پر برس پڑا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہوں۔ تم بھوتنی ہو۔ ڈائن ہو۔ میرا کلیجہ نکال کر چبانا چاہتی ہو۔ جاؤ۔ جاؤ۔“

یہ کہتے کہتے اُس نے اپنے وزنی سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، جیسے وہ گر پڑے گا۔ اور ہولے ہولے بڑبڑانے لگا۔

”پھاتو مجھے معاف کر دو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں بس صرف ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے تم سے دیوانگی کی حد تک محبت ہے، اس لیے کہ تم سے محبت کی جائے، میں تم سے محبت کرتا ہوں اس لیے کہ تم نفرت کے قابل ہو۔ تم عورت نہیں ہو۔ ایک سالم مکان ہو۔ ایک بہت بڑی بلڈنگ ہو۔ مجھے تمہارے سب کمروں سے محبت ہے۔ اس لیے کہ وہ غلیظ ہیں۔ شکستہ ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں؟“

پھاتو خاموش رہی اُس پر ابھی تک اُس آہنی گرفت اور اُس کے خوفناک بوسے کا اثر موجود تھا۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اُس نے پھر ہذیانی کیفیت سے میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ پھاتو نے اُس کی طرف دیکھا اور وہ کسی غیر مرئی آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔ بستر پر اس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی، پھاتو کو اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا۔

”کیا کہہ رہی ہو تم۔“

اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس لیے وہ خاموش رہی۔ پھاتو کی خاموشی سے اُسے خیال آیا کہ ہذیانی کیفیت میں وہ بے شمار باتیں کر چکا ہے۔ جب اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اپنی محبت کا اظہار بھی اس سے کر چکا ہے تو اسے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا۔ اسی غصے میں وہ پھاتو سے مخاطب ہوا۔

”میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل غلط ہے۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔“

پھاتو نے صرف اتنا کہا۔

”جی ٹھیک ہو گا“

وہ کڑکا

”صرف ٹھیک ہی نہیں۔ سو فیصد حقیقت ہے۔ مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔ جاؤ، چلی جاؤ میرے کمرے سے۔ خبر دار جو کبھی ادھر کا رُخ کیا۔“

پھاتو نے حسبِ معمول نرم لہجے میں جواب دیا۔

”جی اچھا۔“

یہ کہہ کر وہ جانے لگی کہ اُس نے اُسے روک لیا۔

”ٹھہرو۔ ایک بات سنتی جاؤ۔“

”فرمائیے۔“

”نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ تم جا سکتی ہو۔“

پھاتو نے کہا۔

”میں جا تو رہی تھی۔ آپ نے خود مجھے روکا“

۔ یہ کہہ اُس نے برتن اُٹھائے اور کمرے سے نکلنے لگی۔ مگر اُس نے پھر اُسے آواز دے کر روکا۔

”ٹھہرو۔ میں ایک بات تم سے کہنا بھول گیا ہوں۔“

پھاتو نے برتن تپائی پر رکھے اور اُس سے کہا۔

”کیا بات ہے۔ بتا دیجیے۔ مجھے اور کام کرنے ہیں۔“

وہ سوچنے لگا کہ اُس نے پھاتو کو روکا کیوں تھا۔ اُسے اس سے ایسی کون سی اہم بات کرنا تھی۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ پھاتو نے اُس سے کہا۔

”میاں صاحب میں کھڑی انتظار کر رہی ہوں۔۔ آپ کو مجھ سے کیا کہنا ہے۔“

وہ بوکھلا گیا۔

”مجھے کیا کہنا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں کہنا تھا۔ میرا مطلب ہے‘ کہنا تو کچھ تھا مگر بھول گیا ہوں۔“

پھاتو نے برتن تپائی پر رکھے۔

”آپ یاد کر لیجیے۔ میں یہاں کھڑی ہوں۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور یاد کرنے لگا۔ اسے پھاتو سے یہ کہنا تھا۔ اس کے دماغ میں بے شمار خیالات تھے۔ دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ پھاتو اس کے گھر سے چلی جائے۔ اس لیے کہ وہ اس سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ وہ نفرت بے پناہ محبت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اُس نے تھوڑے عرصہ کے بعد آنکھیں کھولیں۔ پھاتو تپائی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اُس نے سمجھا کہ شاید یہ سب خواب ہے، پر جب اُس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا تو اُسے معلوم ہوا کہ خواب نہیں حقیقت ہے، لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پھاتو کیوں بُت کی مانند اس کی چارپائی کے ساتھ کھڑی ہے۔ اس نے کہا۔

”تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے۔“

پھاتو نے جواب دیا۔

”آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی ضروری بات کہنی ہے۔“

وہ چڑ گیا، جھنجھلا کر بولا۔

”تم سے مجھے کون سی ضروری بات کہنا تھی۔ جاؤ۔ دور ہٹ جاؤ میری نظروں سے۔“

پھاتو نے تشویش ناک نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”ایسا لگتا ہے آپ کا بخار تیز ہو گیا ہے۔ میں بی بی جی سے کہتی ہوں کہ ڈاکٹر کو بُلا لیں۔“

وہ اور زیادہ چڑ گیا۔

”ڈاکٹر آیا تو میں اُسے گولی مار دوں گا۔ اور تمہارا تو میں ان دو ہاتھوں سے گلا گھونٹ دُوں گا۔“

پھاتو نے اپنے لہجے کو اور زیادہ نرم بنا کر کہا۔

”آپ ابھی گھونٹ ڈالیے۔ میں اپنی زندگی سے اُکتا چکی ہوں۔“

اُس نے پوچھا

”کیوں؟“

”بس اب جی نہیں چاہتا زندہ رہنے کو۔ میاں صاحب آپ کو معلوم نہیں میں یہ دن کیسے گزار رہی ہوں۔ اللہ کی قسم۔ ایک ایک پل زہر کا گھونٹ ہے۔۔ خدا کے لیے آپ میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار دیجیے“!

وہ لحاف کے اندر کانپنے لگا۔

”پھاتو۔ جاؤ مجھے تم سے نفرت ہے۔“

پھاتو نے بڑی معصومیت سے کہا۔

”میں جانے لگتی ہوں۔ پر آپ مجھے روک لیتے ہیں۔“

اُس نے بھنا کر کہا۔

”کون حرامزادہ تجھے روکتا ہے۔ جا۔ دُور ہو جا۔“

پھاتو جانے لگی تو اُس نے اُسے پھر روک لیا۔

”ٹھہرو“

”وہ ٹھہر گئی۔

”فرمایئے۔“

”تم نہایت واہیات عورت ہو۔ خدا تمیں غارت کرے۔ جاؤ اب میری نظروں سے غائب ہو جاؤ“

۔ پھاتو برتن اُٹھا کر چلی گئی۔ ایک مہینے بعد محلے میں شور مچا کہ پھاتو کسی کے ساتھ بھاگ گی ہے۔ سب اُس کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ عورتیں خاص طور پر اُس کے کردار میں کیڑے ڈال رہی تھیں اور پھاتو اپنے میاں صاحب کے ساتھ کلکتے میں ازدواجی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اُس کا شوہر ہر روز اُس سے کہتا تھا۔

”فاطمہ، مجھے تم سے نفرت ہے۔“

اور وہ مسکرا کر جواب دیتی۔

”یہ نفرت اگر نہ ہوتی تو میری زندگی کیسے سنورتی۔ آپ مجھ سے ساری عمر نفرت ہی کرتے رہیئے۔“

پھاہا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپھاہا

گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ آم خُوب ہُوئے تھے۔ بازاروں میں، گلیوں میں، دکانداروں کے پاس، پھیری والوں کے پاس، جدھر دیکھو، آم ہی آم نظر آتے۔ لال، پیلے، سبز، رنگا رنگ کے۔۔۔۔۔۔ سبزی منڈی میں کھول کے حساب سے ہر قسم کے آم آتے تھے۔ اور نہایت سستے داموں فروخت ہو رہے تھے۔ یوں سمجھیے کہ پچھلے برس کی کسر پوری ہو رہی تھی۔ اسکول کے باہر چھوٹو رام پھل فروش سے گوپال نے ایک روز خوب جی بھر کے آم کھائے۔ اور جیب میں سے ایک مہینے کے بچائے ہوئے جتنے پیسے جمع تھے سب کے سب ان آموں پر خرچ کر دیے۔ جن کے گودے اور رس میں شہد گھلا ہوا تھا۔ اس روز چھٹی کے وقت آم کھانے کے بعد انگلیاں چاٹتے ہوئے

گوپال کو اسکول کے حلوائی سے دودھ کی لسّی پینے کا خیال آیا تھا۔ اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اس نے گنڈارام حلوائی سے پاؤ بھر دودھ کی لسّی بنانے کو کہا بھی تھا۔ مگر حلوائی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا۔

”بابو گوپال، پہلا حساب چکادو تو اور اُدھار دوں گا، ورنہ نہیں۔“

گوپال نے اگر آم نہ کھائے ہوتے، یا اگر اس کی جیب میں تھوڑے بہت پیسے ہوتے۔ تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گنڈارام کا حساب چکا دیتا۔ اور کچھ نہیں تو نقد دام دے کر لسّی کا وہ گلاس لے لیتا جس میں برف کا ٹکڑا اڈبکیاں لگا رہا تھا۔ اور جسے حلوائی نے بُرا سا منہ بنا کر اپنے پیچھے لوہے کے تھال پر رکھ دیا تھا۔ مگر گوپال کچھ بھی نہ کر سکا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھے روز اس کی ران پر یہ بڑا پھوڑا نکل آیا۔ اور تین چار روز تک اُبھرتا رہا۔ گوپال کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کرے۔ وہ پھوڑے سے اتنا پریشان نہیں تھا۔ جتنا اس کے درد سے۔۔۔۔۔۔ اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پھوڑا دن بدن لال ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے منہ پر بدن کی جھلی پھٹنا شروع ہو گئی تھی۔ بعض اوقات گوپال کو یہ معلوم ہوتا کہ پھوڑے کے اندر کوئی ہنڈیا اُبل رہی ہے۔ اور اس کے اندر سب کچھ ایک ہی اُبال میں نکلنا چاہتا ہے۔ یہ چیز اسے بہت پریشان کر رہی تھی۔ اور پھوڑے کی جسامت دیکھ کر ایک مرتبہ تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کی جیب میں سے کانچ کی گولی نکل کر اس کی ران میں گھس گئی ہے۔ گوپال نے گھر میں پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر پتاجی کو اس کا پتہ چل گیا۔ تو وہ اپنے تھانے کی مکھیوں کا سارا غصہ اسی پر نکالیں گے۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ اُسے اس چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیں۔ جو تھوڑے روز ہوئے گردھاری وکیل کے منشی نے وزیر آباد سے انھیں تحفے کے طور پر لا کر دی تھی۔ ماں کا مزاج بھی کم گرم نہ تھا۔ وہ اگر اسے آم کھانے کے جُرم کی سزا نہ دیتی تو اس غلطی پر اس کے کان کھینچ کھینچ کر ضرور لال کر دیتی کہ اس نے گھر کے باہر اکیلے اکیلے آم کیوں اڑائے۔ اس کی ماں کا اصول تھا۔ کہ

”گوپال اگر تجھے زہر بھی کھانا ہو تو گھر میں کھانا“

گوپال اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اصول کے پیچھے اس کی ماں کی صرف یہ خواہش تھی کہ گوپال کے منہ کے ساتھ اس کا منہ بھی چلتا رہے۔ کچھ بھی ہو گوپال کی ران پر پھوڑا نکلنا تھا، نکل آیا۔ اس کا باعث جہاں تک گوپال سمجھ سکا تھا، وہی آم تھے۔ اس نے پھوڑے کی بابت گھر میں کسی سے ذکر نہ کیا تھا۔ اس کو اپنے پتاجی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی جو غسل خانے کے اندر بتائی گئی تھی۔ اس کے پتاجی لالہ پرشوتم داس تھانے دار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے جو انھوں نے صبح سویرے ایک ٹھیلے والے سے اس کا چالان کاٹ کر حاصل کیے تھے۔ گوپال باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مروڑیاں بنا رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لیے بالٹی میں ڈالے تھے۔ اور چپکے سے ایک آم اڑانا چاہا تھا۔ تو لالہ جی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو مونچھوں سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

”بے شرم۔۔۔۔۔۔ تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا، جانے کب آئے گا؟“

اور جب گوپال نے رونی صورت بنا کر کہا تھا۔“

پتاجی۔۔۔۔ آم کھانے کو میرا بھی تو جی چاہتا ہے۔“

تو تھانیدار صاحب نے آم کی گٹھلی چُوس کر موری میں پھینکتے ہوئے کہا تھا۔“

گوپو، تیرے لیے یہ آم بہت گرم تھا۔ پھوڑے پھنسیاں چاہتا ہے تو بیشک کھالے۔۔۔۔۔۔۔ دو تین بارشیں اور ہو لینے دے، پھر خوب ٹھاٹ سے کھائیو تیری ماں سے کہوں گا وہ لسّی بنا دے گی۔۔۔۔۔۔۔ چل اب پیٹھ مل اور گوپال نے یہ رکاوٹ کی بات سُن کر خاموشی سے اپنے پتا کی پیٹھ ملنا شروع کر دی تھی اور آم کی مٹھاس نے جو پانی اس کے منہ میں بھر دیا تھا۔ اسے دیر تک نگلتا رہا تھا۔ اس کے دوسرے روز اس نے آم کھائے اور چوتھے روز اس کی ران پر پھوڑا نکل آیا۔ اس کے پتا کی بات سچی ثابت ہُوئی۔ اب اگر گوپال گھر میں کسی سے اس پھوڑے کی بات کرتا تو ظاہر ہے کہ خوب پٹتا، یہی وجہ ہے کہ خاموش رہا۔ اور پھوڑے کا بڑھاؤ بند کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ ایک روز اس کے پتاجی تھانے سے واپسی پر جب گھر آئے۔ تو ان کے ہاتھ میں ایک لمبی سی بتّی تھی۔ گوپال کی ماں کو آواز دے کر انھوں نے یہ بتّی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔“

لے آج بڑے کام کی چیز لایا ہوں۔ بمبئی کا مرہم ہے سو دوائیوں کی ایک دوا ہے۔۔۔۔ پھوڑے پھنسی کی بہار ہے۔ ذرا سا پھاہا پھوڑے پر لگا دو گی۔ یوں آرام آ جائے گا۔۔۔۔۔۔ یوں۔۔۔۔۔۔۔ بمبئی کا خالص مرہم ہے۔ سنبھال کے رکھ۔“

گوپال اپنی بہن نرملا کے ساتھ صحن میں گیند بلا کھیل رہا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب تھانیدار جی مرہم دے کر اپنی پتنی کو کچھ سمجھا رہے تھے۔ تو نرملا نے زور سے گیند پھینکی۔ گوپال کا دھیان باپ کی طرف تھا۔ گیند پھوڑے پر زور سے لگی۔ گوپال بلبلا اٹھا۔ لیکن درد کو اندر ہی اندر پی گیا۔ وہ اسکول میں ماسٹر ہری رام کے مشہور بید کی مار کھا کر درد سہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ ادھر گوپال کے پھوڑے پر گیند لگی۔ ادھر اس کے باپ کی آواز بلند ہوئی۔

”ذرا سا پھاہے پر لیپ کر کے لگا دو گی۔۔۔۔۔ یوں آرام آ جائے گا۔۔۔۔۔۔۔ یوں“

اوریوں کے ساتھ اس کے باپ کی چٹکی نے گویا گوپال کے سوئے ہوئے دماغ کی چٹکی بھرلی۔ اس کو اپنے درد کا علاج معلوم ہو گیا۔ اس کی ماں نے مرہم کی بتّی سامنے دالان میں سلائی کی پٹاری میں رکھ دی۔ گوپال کو اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ اس کی ماں عام طور پر سلائی کی پٹاری ہی میں سب سنبھالنے والی چیزیں رکھا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ سنبھالنے والی چیز وہ موچنا تھا۔ جس سے اس کی ماں ہر دسویں پندرھویں روز اپنے تنگ ماتھے کے بال صاف کیا کرتی تھی۔ یہ بلاشک وشبہ سلائی کی پٹاری میں اس پڑیا سمیت موجود تھا جس میں کوئلوں کی سفید راکھ جمع رہتی تھی۔ جو اس کی ماں بال نوچ کر ماتھے پر لگایا کرتی تھی۔ تاہم گوپال نے اپنا اطمیان کرنے کے لیے گیند دالان میں پھینک دی اور اس کو پلنگ کے نیچے سے نکالتے ہوئے اپنی ماں کو سلائی کی پٹاری میں مرہم رکھتے دیکھ لیا۔ دوپہر کو اس نے اپنی بہن نرملا کو ساتھ مِلا کر چھوٹی قینچی جس سے اُس کا باپ انگلیوں کے ناخن کاٹتا تھا، مرہم کی بتّی اور اپنے باپ کے پاجامے سے بچا ہوا لٹھے کا وہ ٹکڑا حاصل کرلیا جس سے اس کی ماں ایک اور ٹکڑے کو ساتھ ملا کر شلوار کی میانی بنانا چاہتی تھی۔ دونوں یہ چیزیں لے کر اوپر کوٹھے پر چلے گئے۔ اور برساتی کے نیچے کوئلوں کی بوریوں کے پاس بیٹھ گئے۔ نرملا نے اپنی جیب سے لٹھے کا ٹکڑا نکال کر اپنی ران پر شلوار کے پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے پر پھیلا کر جب گوپال کی طرف اپنی ناچتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ تو اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ گیارہ برس کی یہ کمسن لڑکی جو دریائی سرکنڈے کی طرح نازک اور لچکیلی تھی۔ ایک بہت بڑے کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی ہے۔ اس کا ننھا سا دل جو اس وقت تک صرف ماں باپ کی جھڑکیوں اور اپنی گڑیوں کے میلے ہوتے ہوئے چہروں کی فکر سے دھڑکا کرتا تھا۔ اب اپنے بھائی کی ران پر پھوڑا دیکھنے کے خیال سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے کان کی لویں لال اور گرم ہو گئی تھیں۔ گوپال نے گھر میں اپنے پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا تھا۔ لیکن اب اُسے نرملا کو ساری بات سُنانا پڑی۔ کہ کس طرح اس نے چوری چوری آم کھائے اور لسّی پینا بھول گیا۔ اور اس کی ران پر پیسے کے برابر پھوڑا نکل آیا۔ جب اس نے اپنی رام کہانی سنا کر نرملا سے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔

”دیکھ نرملا! گھر میں یہ بات کسی سے نہ کہیو۔“

تو نرملا نے بڑی متین صورت بنا کر جواب دیا تھا کہ میں پاگل تھوڑی ہوں“

گوپال کو یقین تھا کہ نرملا یہ بات اپنے تک ہی رکھے گی۔ چنانچہ اس نے پاجامے کو اوپر اڑس لیا، نرملا کا دل دھک دھک کرنے لگا، جب گوپال نے بیٹھ کر اپنا پھوڑا دکھایا۔ اور نرملا نے دور ہی سے اپنی انگلی سے اسے چُھوا تو ان کے بدن پر ایک جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ سی سی کرتے ہوئے اس نے اُبھرے لال پھوڑے کی طرف دیکھا اور کہا۔ کتنا لال ہے۔“

”ابھی تو اور ہو گا۔“

گوپال نے اپنے مردانہ حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ نرملا نے حیرت سے کہا۔“

سچ؟“

”ابھی تو کچھ لال نہیں ہے، جو پھوڑا میں نے چرنجی کے منہ پر دیکھا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ بڑا اور لال تھا“

گوپال نے پھوڑے پر دو انگلیاں پھیریں۔

”تو ابھی اور بڑھے گا؟“

نرملا آگے سرک آئی۔

”کیا پتا ہے۔۔۔۔۔۔ابھی تو اور بڑھتا چلا جا رہا ہے“

گوپال نے جیب میں سے مرہم کی بتّی نکال کر کہا، نرملا سہم سی گئی۔“

اس مرہم سے تو آرام آجائے گا نا؟“

گوپال نے بتّی کے ایک سرے پر سے کاغذ کی تہ جدا کی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اس کا پھاہا لگانے ہی سے پھٹ جائے گا۔“

”پھٹ جائے گا۔“

نرملا کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے کان کے پاس ربڑ کا غبارہ پھٹ گیا ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

”اور اس کے اندر جو کچھ ہے پُھوٹ بہے گا! گوپال نے مرہم کو انگلی پر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ نرملا کا گلابی رنگ اب بمبئی کی مرہم کی طرح پیلا پڑ گیا تھا، اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ مگر یہ پھوڑے کیوں نکلتے ہیں بھیّا؟“

”گرم چیزیں کھانے سے“!

گوپال نے ایک ماہر طبیب کے سے انداز میں جواب دیا۔ نرملا کو وہ دو انڈے یاد آ گئے۔ جو اس نے دو ماہ پہلے کھائے تھے۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ گوپال اور نرملا کے درمیان چند باتیں اور ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اصلی کام کی طرف متوجہ ہوئے، نرملا نے لٹھے کا ایک گول پھاہا کاٹا، بڑی نفاست سے، یہ روپے کے برابر تھا۔ اور اس کی گولائی میں مجال ہے ذرا سا نقص بھی ہو، اسی

طرح گول تھا جس طرح نرملا کی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی روٹی گول ہوتی تھی۔ گوپال نے اس پھاہے پر تھوڑا سا مرہم لگا دیا۔ اور اسے اچھی طرح پھیلانے کے بعد پھوڑے کی طرف غور سے دیکھا۔ نرملا گوپال کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اور گوپال کی ہر حرکت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ گوپال نے جب پھاہا اپنے پھوڑے کے اُوپر جما دیا۔ تو وہ کانپ گئی جیسے اس کے بدن پر کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہے۔

”اب آرام آجائے گانا؟“

نرملا نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔ گوپال جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ برساتی کے برابر والی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ یہ ان کی ماں تھی۔ جو غالباً کوئلے لینے کے لیے آ رہی تھی۔ گوپال اور نرملا نے بیک وقت ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے سُنے بغیر سب چیزیں اکٹھی کرکے اس پرانے صندوق کے پیچھے چھپا دیں جہاں ان کی بلی سندری بچے دیا کرتی تھی۔ اور چپکے سے بھاگ گئے۔ یہاں سے بھاگ کر گوپال نیچے گیا۔ تو اس کے باپ نے اُسے باہر فالودہ لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب واپس آیا تو اسے گلی میں نرملا ملی، فالودے کا گلاس اس کے حوالے کرکے وہ چرنجی کے گھر چلا گیا۔ اور اس طرح ان چیزوں کو اپنی جگہ پر رکھنا بھول گیا۔ جو ماں کے اچانک آجانے سے اس نے اور نرملا نے صندوق کے پیچھے چھپا دی تھیں۔ چرنجی کے یہاں وہ دیر تک تاش کھیلتا رہا۔ کھیل سے فارغ ہو کر جب وہ چرنجی کی بغل میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ تو کسی بات پر اس کا دوست ہنسا اور اس کے داہنے گال پر پھوڑے کا نشان لمبی سی لکیر بن گیا۔ اُس کو دیکھ کر فوراً ہی اپنے پھوڑے کا گوپال کو خیال آیا اور اس خیال کے ساتھ ہی اُسے وہ چیزیں یاد آگئیں جو صندوق کے پیچھے پڑی تھیں۔ چرنجی کی بغل سے ہاتھ نکال کر وہ بھاگا۔ گھر پہنچ کر اُس نے وہاں کی فضا دیکھی، اس کی ماں صحن میں بیٹھی اس کے باپ سے

”ملاپ“

اخبار کی خبریں سُن رہی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ گوپال ان کے پاس سے گزرا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا، مگر اس سے کوئی بات نہ کی، گوپال کو اطمینان ہو گیا کہ ابھی تک اس کی ماں نے اپنی سلائی کی پٹاری نہیں دیکھی۔ چنانچہ وہ چپکے سے کوٹھے پر چلا گیا۔ بڑے کوٹھے کو طے کرکے دروازے کے اندر داخل ہونے والا ہی تھا۔ کہ اس کے قدم رُک گئے۔ صندوق کے پاس بیٹھی نرملا کچھ کر رہی تھی۔ گوپال پیچھے ہٹ گیا۔ اور چھُپ کر دیکھنے لگا۔ نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کُرتے کے بٹن کھولے، سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا ابھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نلکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بُلبلہ اٹکا ہوا ہے۔ نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اسے اس ننھے سے اُبھار پر جما دیا۔

پہچان

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپہچان

ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وسکی کے پیدا کردہ تکدّر کو دُور کر سکے۔ کوئی ایسی عورت ڈھونڈی جائے جو ہوٹل کی کثافت کے مقابلے میں نفاست پسند اور بدذائقہ وسکی کے مقابلہ میں لذیذ ہو۔ فخر نے ہوٹل کی غلیظ فضا سے باہر نکلتے ہی مجھ سے اور مسعود سے کہا۔

”کوئی دانے دار عورت ہو۔۔۔۔۔۔ اچھے گویّے کے گلے کی طرح اس میں بڑے بڑے دانے ہوں۔۔۔۔ خدا کی قسم طبیعت صاف ہو جائے۔“

وسکی دانوں سے بالکل خالی تھی۔ سوڈا بھی بالکل بے جان تھا۔ غالباً اسی وجہ سے فخر دانے دار عورت کا قائل ہو رہا تھا۔ ہم تینوں عورت چاہتے تھے۔ فخر دانے دار عورت چاہتا تھا۔ مجھے ایسی عورت مطلوب تھی جو بڑے سلیقے سے واہیات باتیں کرے۔۔۔۔۔۔ اور مسعود کو ایسی عورت کی ضرورت تھی۔ جس میں بنیا پن نہ ہو۔ اپنی فیس کے روپے لے کر ٹرنک میں جہاں اس کا جی چاہے رکھے اور کچھ عرصے کے لیے بھول جائے کہ سودا کر رہی ہے۔ اس بازار کا راستہ ہم جانتے تھے۔ جہاں عورتیں مل سکتی ہیں۔ کالی، نیلی پیلی، لال اور جامنی رنگ کی عورتیں۔ پیڑوں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں دُور تک دوڑتے چلے گئے ہیں۔ یہ رنگ برنگی عورتیں ان پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ڈھیلا مار کر اسے گرا سکتے ہیں۔ ہمیں یہ عورتیں مطلوب نہیں تھیں۔ دراصل ہم اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتے تھے۔ ہم ایسی عورت یا عورتیں چاہتے تھے۔ جو عرفِ عام میں پرائیویٹ ہوں یعنی جو منڈی کے ہجوم سے نکل کر علیحدہ شریف محلوں میں اپنا کاروبار چلا رہی ہوں۔ ہم تینوں میں فخر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ قوتِ ارادی بھی اس میں ہم سب سے زیادہ تھی۔ ایک تانگے والا جب ہمارے پاس سے گزرا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ اور بغیر کسی جھجک کے معنی خیز لہجے میں اُس سے کہا ہم سیر کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ چلو گے؟“

تانگے والے نے جو سنجیدہ اور متین آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ میں جھینپ سا گیا۔ خاموشی ہی خاموشی میں وہ ہم سے کہہ گیا تھا۔

”تم جوانوں کو شراب پی کر یہ کیا ہو جاتا ہے؟“

”فخر نے دوبارہ اس سے کہا: ہم سیر کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ چلو گے؟ پھر تو واقعی اسے کچھ خیال آیا اور اپنا مطلب اور زیادہ واضح کر دیا۔

”کوئی مال وال ہے تمہاری نگاہ میں؟“

مسعود اور میں دونوں ایک طرف کھسک گئے مسعود نے گھبرا کر مجھ سے کہا۔

”یہ فخر کیسا آدمی ہے اسے کچھ سمجھاؤ۔“

مسعود سے میں کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ فخر نے آواز دی۔

”آؤ بھئی آؤ۔۔۔۔۔۔۔ بیٹھو تانگے میں۔“

ہم تینوں تانگے میں بیٹھ گئے۔ مجھے اگلی نشست پر جگہ ملی۔ دسمبر کے آخری دن تھے۔ وقت کے آٹھ بج چکے تھے۔ وسکی پینے کے باوجود ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ (میں) چونکہ اگلی نشست پر تھا۔ اور تینوں میں سے سب سے کمزور تھا۔ اس لیے میرے کان سُن ہو رہے تھے۔ جب تانگہ ڈفرن برج کے نیچے اُترا تو میں نے مفلر نکال کر کانوں اور سر پر لپیٹ لیا۔ اور اوور کوٹ کا کالر بھی اونچا کر لیا۔ سانس گھوڑے کے نتھنوں سے بھاپ بن کر باہر نکل رہا تھا ہم تینوں خاموش تھے۔ تانگے والا موٹے اور کُھردرے کمبل میں لپٹا خاموشی سے اپنا تانگہ چلا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سنجیدگی اس کے چہرے پر ٹھٹھر سی رہی تھی۔ جو مجھے بہت بُری معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے فخر سے کہا۔ فخر یہ آدمی کیسا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کاسٹر ول پی کر بیٹھا ہے۔“

تانگے والا میرے اس ریمارک پر بھی خاموش رہا۔ فخر نے کہا۔ زیادہ باتیں کرنے والے آدمی ٹھیک نہیں ہوتے۔ ہمارا مطلب سمجھ گیا ہے۔ لے چلے گا۔ جہاں اچھی چیز ہوئی۔“

مسعود سگریٹ سُلگا رہا تھا۔ ایک دم بولا۔“

واللہ عورت کتنی اچھی چیز ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ عورت عورت کم ہے چیز زیادہ ہے۔ میں نے اس کو ذرا اور خوبصورت بنا کر کہا۔

”مسعود چیز نہیں۔۔۔۔۔۔ چیز سی۔“

شاعر آدمی تھا بھڑک اُٹھا۔ واللہ کیا بات پیدا کی ہے۔ چیز نہیں چیز سی۔۔۔۔ سو میاں تانگے والے چیز اور چیز سی میں جو فرق ہے۔ اس کا دھیان رکھنا۔“

تانگے والا خاموش رہا۔ اب میں نے اس کی طرف زیادہ غور سے دیکھا۔ مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ پتلی پتلی مونچھیں تھیں۔ جن کے بال نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ سردی کے باعث چونکہ اس نے کمبل کا ڈھاٹا سا بنا رکھا تھا۔ اس لیے اس کا پورا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر فخر سے پوچھا۔ کہاں لے جا رہا ہے ہمیں؟“

فخر نے جو زیادہ سوچ بچار کا عادی نہیں تھا۔ جواب دیا۔ اتنے بیتاب کیوں ہوتے ہو؟۔۔۔۔۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد چیز تمہارے سامنے آجائے گی۔“

مسعود نے اس پر فخر سے کہا۔

”تم سے کیا بات ہوئی ہے اس کی؟“

فخر نے جواب دیا۔

”روشن آرا روڈ پر۔۔۔۔۔۔۔ کچھ میمیں رہتی ہیں۔ کہتا ہے ہمارے کام کی ہیں۔“

میموں کا نام سُن کر مسعود کو اپنے ایک دوست کی نظم یاد آ گئی۔ اس کا حوالہ دیکر اُس نے کہا۔ تو چلو آج لگے ہاتھوں اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام بھی لے لیا جائے گا۔ واللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانگے والا صاحبِ ذوق ہے۔ وہ نظم ضرور پڑھی ہو گئی اُس نے۔“

اس کے بعد دیر تک میموں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں اور مسعود میموں کے بالکل قائل نہیں تھے۔ لیکن فخر کو عورتوں کی یہ قسم پسند تھی“

ان کا علم سائنٹیفک ہوتا ہے یعنی یہ عورتیں بڑے سائنٹیفک طریقے پر اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں مشرقی عورتوں کو رکھیے تو وہی نظر آئے گا جو ہمارے یہاں کی ریوڑی اور وہاں کی ٹافی میں ہے۔ بھئی دراصل بات یہ ہے کہ ان میموں کا پیکنگ بڑا اچھا ہوتا ہے“

میں نے کہا۔ فخر! ممکن ہے تمہارا نظریہ درست ہو مگر بھائی میں ایسے موقعوں پر زبان کی مشکلات برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دفتر میں بڑے صاحب کے ساتھ انگریزی بول سکتا ہوں۔ میں یہاں دہلی میں رہ کر اس تانگے والے سے اُردو میں بات چیت کرنا گوارہ کر سکتا ہوں۔ مگر اس موقعہ پر انگریزی میں گفتگو نہیں کر سکتا۔ میری پتلون انگریزی، میری ٹائی انگریزی، میرا شوا انگریزی۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب چیزیں انگریزی میں ہو سکتی ہیں۔ مگر خدا کے لیے وہ چیز مجھ سے انگریزی میں کیسے ہو سکتی ہے“

فخر اپنا نظریہ بھول کر ہنسنے لگا۔ مسعود شاید ابھی تک اپنے دوست کی لکھی ہوئی نظم پر غور کر رہا تھا۔ جس میں شاعر نے ایک فرنگی عورت کے ہونٹ چُوس کر اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ دفعتہ چونک کر اُس نے کہا۔“

کیوں بھئی یہ تانگہ کب تک چلتا رہے گا؟“

تانگے والے نے ایک دم باگیں کھینچ کر تانگہ ٹھہرا دیا۔ اور فخر سے کہا“

وہ جگہ آگئی صاحب۔ آپ اکیلے چلیے گا یا۔۔۔۔۔۔“

ہم تینوں تانگے والے کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ ایک نیم روشن گلی میں وہ ہمیں لے گیا۔ دلی کی دوسری گلیوں سے یہ گلی کچھ مختلف تھی۔ اس لیے کہ بہت چوڑی تھی۔ دائیں ہاتھ کو ایک منزلہ مکان تھا۔ جس کی کھڑکیوں، دروازوں پر چقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک دروازے کی چق اٹھا کر تانگے والا اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد باہر آیا۔ اور ہمیں اندر لے گیا۔ کمرے میں گُھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جب کہا۔

”بھائی ہم کہیں اوندھے منہ نہ گر پڑیں“

تو دوسرے کمرے سے کسی عورت کی بھدّی آواز سنائی دی۔ لالٹین تو لے گیا ہوتا تو“

اور تھوڑی ہی دیر کے بعد تانگے والا ایک اندھی سی لالٹین لے کر نمودار ہوا۔ چلیے اندر تشریف لے چلیے۔“

ہم تینوں اندر تشریف لے گئے۔ دو کالی بھجنگی انتہائی بدصورت عورتیں نظر آئیں۔ جنہوں نے ڈھیلے ڈھیلے فراک پہن رکھے تھے۔۔۔۔ یہ میمیں تھیں۔ میں نے اپنی ہنسی روک کر فخر سے کہا۔

”کیا لذیذ ٹافیاں ہیں“

میری یہ بات سن کر ان میموں میں سے ایک جس کا سیاہ چہرہ سُرخی لگانے کے باعث زیادہ پکّی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ہنسی۔۔۔۔ میں بھی ہنس دیا اور بڑے پیار سے پوچھا

”کیا نام ہے آپ کا؟“

بولی۔

”لوسی“

شاعر مسعود نے آگے بڑھ کر دوسری سے پوچھا۔

”آپ کا؟“

اس نے جواب دیا۔

”میرؔی۔“

فخر بھی آگے بڑھ آیا۔

”کیوں صاحب آپ کام کیا کرتی ہیں؟“

دونوں لجا گئیں۔ ایک نے ادا سے کہا۔

”کیسا بات کرتا ہے تم؟“

دوسری نے کہا۔ چلو جلدی کرو۔ رہنا مانگتا ہے یا نہیں ہمیں روٹی پکانا ہے“

میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ تو گیلے آٹے سے بھرے ہوئے تھے۔ اور وہ اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی۔ تانگے والا قطعی طور ہمیں غلط جگہ لے آیا تھا مروڑیاں اس کے ہاتھوں سے کچّے فرش پر گر رہی تھیں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔ ہم تینوں کے تینوں اس مکان میں آکر سخت پریشان ہو گئے۔ مگر ہم اپنی پریشانی ان دو عورتوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں سخت نااُمیدی ہوئی تھی۔ اگر ہم ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ تم ہمارے مطلب کی نہیں ہو تو ضرور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ عورت جس کے ہاتھ آٹے سے لتھڑے ہوں ایسے جذبات سے عاری نہیں ہو سکتی۔ میں نے اُن دونوں کی تعریف کی۔ فخر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ پھر ہم تینوں جلد واپس آنے کا وعدہ کرکے وہاں سے نکل آئے۔ تانگے والا ہمارا مطلب سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ اسے چند لمحات کے لیے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ باہر نکلا۔ تو فخر نے اس سے کہا۔

”تم انھیں میمیں کہتے ہو؟“

تانگے والے نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔

”لوگ یہی کہتے ہیں صاحب“

لوگ جھک مارتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں نے خیال کیا تھا کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اب خدا کے لیے کسی ایسی جگہ لے چلو، جہاں ہم چند گھڑیاں اپنا دل بہلا سکیں۔
”

مسعود نے تینوں کا اجتماعی مقصد اور زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ دیکھو ہم ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں۔ جہاں کچھ عرصے کے لیے بیٹھ سکیں۔۔۔۔ ہمیں ایسی عورت کے پاس لے چلو جو باتیں کرنے کا سلیقہ رکھتی ہو۔۔۔۔۔۔ بھائی ہم کورے نہیں ہیں کسی فوج کے سپاہی نہیں ہیں۔ تین شریف آدمی ہیں۔ جنہیں عورت سے بات چیت کیے برسوں گزر چکے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ سمجھے؟“

تانگے والے نے اثبات میں سرہلا دیا۔

”تو چلیے بیٹھیے آپ کو صدر بازار لے چلتا ہوں۔۔۔۔۔“

فخر نے پوچھا

”کون ہے وہاں؟“

تانگے والے نے گھوڑے کی باگیں تھام کر جواب دیا۔ ایک پنجابن ہے بہت لوگ آتے ہیں اُس کے پاس۔“

تانگے نے پنجابن کے گھر کا رُخ کیا۔ راستے میں ان دو میموں کا ذکر چھڑ گیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو وہاں جانے کا افسوس تھا۔ اس لیے کہ ہم سب سے زیادہ وہ نااُمید ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو کچھ روپے دے دیئے ہوتے۔ مگر یہ بھیک ہو جاتی۔۔۔۔ فخر نے ہماری اس گفتگو میں زیادہ حصّہ نہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ لیکن جب تک تانگہ پنجابن کے گھر تک، نہ پہنچا ان کا ذکر ہوتا رہا۔ تانگہ ایک فراخ بازار میں فٹ پاتھ کے پاس رُکا۔ طویلے کے ساتھ والا مکان تھا۔ جدھر کا ہم چاروں نے رُخ کیا۔ زینہ طے کر کے ہم اوپر پہنچے۔ سامنے پیخانہ تھا۔ دروازے سے بے نیاز۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی پرانی وضع کا مغلئی کمرہ تھا۔ جس میں ہم چاروں داخل ہوئے۔ اس کمرے کے آخری سرے پر چار آدمی بیٹھے فلاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جو ہماری آمد سے غافل رہے۔ البتہ وہ عورت جو ان کے پاس کھڑی تھی۔ اور ایک آدمی کے پتّوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔ آہٹ پا کر ہماری طرف آئی۔ یہاں بھی لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ جس کو فلاش کھیلنے والے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ جب وہ فخر کے پاس آئی اور کولھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ تو میں نے غور سے اسے دیکھا۔۔۔۔۔ اُس کی عمر کم از کم پینتیس برس کے قریب تھی۔ چھاتیاں بڑی بڑی تھیں۔ جو اس نے بیہودہ اور فحش انداز سے اوپر کو اٹھا رکھی تھیں۔ تنگ ماتھے پر نیلے رنگ کا چاند کھُدا ہوا تھا جب وہ مسعود کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ تو مجھے اس کے سامنے کے دو دانتوں میں سونے کی کیلیں نظر آئیں۔۔۔۔ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا۔ جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔ اس نے فخر کو آنکھ ماری اور پوچھا۔

”کہو کیا بات ہے؟“

فخر نے بچے کی طرح کہا۔

”آپ کا نام؟“

اس نے کولھے پر ہاتھ رکھے ہم تینوں کو باری باری دیکھا۔

”گلزار“

فخر نے فوراً ہی معذرت کی۔

”ہم گلاب کے یہاں آئے تھے۔ غلطی سے ادھر چلے آئے۔ معاف کر دیجیے گا۔“

یہ سُن کر وہ فخر کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر کش لگاتی فلاش کھیلنے والوں کے پاس چلی گئی۔ جو ابھی تک ہماری آمد سے غافل تھے۔ نیچے اتر کر ہم تینوں نے تانگے والے کو پھر اپنا مطلب سمجھایا اور اس کو بتایا کہ ہم کس قسم کی عورت چاہتے ہیں۔ اس نے ہم تینوں کا لکچر سُنا اور کہا۔

”آپ تھوڑے لفظوں میں مجھے بتایئے کہ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟“

میں نے تنگ آ کر فخر سے کہا۔

”بھئی تم ہی اُسے ان تھوڑے لفظوں میں سمجھاؤ جو تمہارے پاس باقی رہ گئے ہیں۔“

فخر نے اسے سمجھایا

”دیکھو ہمیں کسی لڑکی کے پاس لے چلو۔۔۔ ایسی عورت کے پاس جو سولہ سترہ برس کی ہو۔ اس سے زیادہ ہرگز نہ ہو۔ سمجھے؟“

تانگے والے نے کمبل کی بُکل مار کے باگیں تھامیں اور کہا۔

”آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ چلیے۔۔۔۔ اب آپ کو ٹھیک جگہ پر لے چلوں گا۔“

آدھے گھنٹے کے بعد وہ ٹھیک جگہ بھی آگئی۔۔۔۔۔۔ خدا معلوم کونسا بازار تھا دوسری منزل پر ایک بیٹھک سی تھی جس کے دروازے پر موٹا اور میلا ٹاٹ لٹک رہا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہُوئے تو سامنے آنگن میں ایک دیہاتی بڑھیا چولھا جھونک رہی تھی۔۔۔۔۔۔ مٹی کے کُونڈے میں گُندھا ہوا آٹا پاس ہی پڑا تھا۔ دُھواں اس قدر تھا۔ کہ اندر داخل ہوتے ہی ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بڑھیا نے چولھے میں لکڑیاں جھاڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ اور تانگے والے سے دیہاتی لہجے میں کہا۔

”انھیں اندر لے جاؤ۔“

تانگے والے نے اندھیرے کمرے میں دیا سلائی جلا کر ہمیں داخل کیا اور کیل سے لٹکی ہوئی لالٹین کو روشن کر کے باہر چلا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ بھی پڑا تھا۔ جس پر سُرخ رنگ کے پُھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کانس پر ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں پر سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہُوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹُوٹا ہوا ٹرنک تھا۔ جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی۔ مسعود اور فخر دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پست قد لڑکی اپنے سے دوگنا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کرتی اندر داخل ہوئی۔ فخر اور مسعود اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ جب وہ لالٹین کی روشنی میں آئی۔ تو میں نے اسے دیکھا۔ اس کی عمر بمشکل چودہ برس کے قریب ہو گی۔ چھاتیاں آڑو کے برابر تھیں مگر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسم کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل چکی ہے، بہت آگے۔ جہاں شاید اس کی ماں بھی نہیں پہنچ سکی۔ جو باہر آنگن میں چولھا جھونک رہی تھی۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اور اس انداز سے اپنا ایک ہاتھ ہلا رہی تھی۔ جیسے مکار دوکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی۔ اور کبھی پورا تول نہیں تولے گی۔ ہم تینوں اُس کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ فخر شرم بھی محسوس کر رہا تھا۔ مسعود کی ساری شاعری سمٹ کر شاید اُس کے ناخنوں میں چلی آئی۔ کیونکہ وہ بُری طرح انھیں دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ جیسے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ٹھنگنی سی لڑکی تھی۔ جو ایک بہت بڑا میلا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رنگ گہرا سانولا۔ بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے۔ جو اب ایک دم رُک گئی ہے۔ اس پہّیوں میں بریک لگ گئے ہیں۔ اور وہیں کھڑے کھڑے اس کا رنگ و روغن دُھوپ اور بارش میں اُڑ گیا ہے۔ اس عمر میں بھدّی سے بھدّی لڑکی کے جسم پر جو ایک قسم کی شوخ جاذبیت ہوتی ہے اس میں بالکل نہیں تھی۔ کپڑوں کے باوجود وہ ننگی دکھائی دیتی تھی۔ بہت ہی بیہودہ اور ناواجب طریقے پر ننگی۔۔۔۔۔۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا۔ میں اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے عقب سے ایک بڈھا نمودار ہوا۔ بالکل سفید داڑھی۔ سر ضعف کے باعث ہل رہا تھا۔ لڑکی نے دیہاتی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ جس کا مطلب میں صرف اس قدر سمجھا کہ وہ بڈھا اس کا نانا ہے۔ ہم تینوں صحیح معنوں میں اُٹھ بھاگے۔ نیچے بازار میں پہنچے تو ہمارا تکدّر کچھ دُور ہُوا۔ بڈھے اور لڑکی کو دیکھ کر ہمارے جمالیاتی ذوق کو بہت ہی شدید صدمہ پہنچا تھا۔ دیر تک ہم چُپ چاپ رہے۔ فخر ٹہلتا رہا۔ مسعود ایک کونے میں پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میں اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اوپر آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں نامکمل چاند بالکل اس زرد بیسوا لونڈیا کی طرح جس کے جسم کا نچلا حصّہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا۔ بادل کے ایک بہت بڑے ٹکڑے کا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اس سے کچھ دور چھوٹا سفید ٹکڑا اس کے نانا کے ضعیف سر کی طرح لرز رہا تھا۔۔۔۔۔۔! میرے بدن پر جھر جھری طاری ہو گئی۔ ہم غالباً دس بارہ منٹ تک بازار میں کھڑے رہے۔ اس کے بعد تانگے والا نیچے اُترا۔ فخر کے پاس جا کر اس نے کہا۔

”آپ نے آٹھ بجے تانگہ لیا تھا۔۔۔۔۔۔ اب گیارہ بج چکے ہیں۔ تین گھنٹوں کے پیسے دے دیجیے۔“

فخر نے کچھ کہے بغیر دو روپے اُس کو دے دیئے۔ روپے لے کر وہ مُسکرایا

”بابو جی آپ کو کچھ پہچان نہیں۔۔۔۔۔۔۔ ایسی کراری لونڈیا تو شہر بھر میں نہیں ملے گی آپ کو۔۔۔۔۔۔ خیر آپ کو اختیار۔۔۔۔۔۔ تانگے میں بیٹھیے میں ابھی آیا۔“

اُس کو اوپر جانے کی زحمت نہ اُٹھانا پڑی۔ کیونکہ سفید ریش بڈھا اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ اور موری کے پاس کھڑا اپنا ضعیف سر ہلا رہا تھا۔ اُس کو دو روپے دے کر جب ٹانگے والے نے باگیں تھامیں تو اس کی سنجیدگی غائب تھی۔“

چل بیٹا۔ کہہ کر اس نے اپنی بھدّی مگر مسّرت بھری آواز میں گانا شروع کر دیا۔

”ساون کے نظارے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ لالا۔“

پھسپھسی کہانی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپھسپھسی کہانی

سخت سردی تھی۔ رات کے دس بجے تھے۔ شالامار باغ سے وہ سڑک جو ادھر لاہور کو آتی ہے، سنسان اور تاریک تھی۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ہوا تیز چل رہی تھی۔ گردوپیش کی ہر چیز ٹھٹھری ہوئی تھی۔ سڑک کے دورویہ پست قد مکان اور درخت دھندلی دھندلی روشنی میں سکڑے سکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے ایک دوسرے سے دور دور ہٹے، روٹھے اور اکتائے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔ ساری فضا میں بدمزگی کی کیفیت تھی۔ ایک صرف تیز ہوا تھی جو اپنی موجودگی منوانے کی بیکار کوشش میں مصروف تھی۔ جب دو سائیکل سوار نمودار ہوئے اور ہوا کے تیز و تند جھونکے ان کے کانوں سے ٹکرائے تو انھوں نے اپنے اپنے اوور کوٹ کا کالر اونچا کر لیا۔ دونوں خاموش تھے۔ مخالف ہوا کے باعث انھیں پیڈل چلانے میں کافی زور صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ اس کے احساس سے غافل ایک دوسرے کا سایہ بنے شالامار باغ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگر کوئی انھیں دور سے دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ سڑک جو لوہے کی زنگ آلود چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی، ان کی سائیکلوں کے ساکت پہیوں کے نیچے ہولے ہولے کھسک رہی ہے۔ بہت دیر تک وہ دونوں سنسان فاصلہ خاموشی میں طے کرتے رہے۔ آخر ان میں سے سائیکل سے اتر کر اپنے سرد ہاتھ منہ کی بھاپ سے گرم کرنے لگا۔

”سخت سردی ہے۔“

اس کے ساتھی نے بریک لگائی اور ہنسنے لگا۔

”بھائی جان! وہ۔ وہ وہسکی کہاں گئی؟“

”جہنم میں۔ جہاں ساری شام غارت ہوئی، وہاں وہ بھی نہ ہوئی۔“

دونوں بھائی تھے، مگر ایسے بھائی جو چاروں عیب شرعی اکٹھے مل جل کے کرتے تھے۔ دونوں نے صبح یہ پروگرام بنایا تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر رشوت کے اس روپے کا جو انہیں دو بجے کے قریب ملنا تھا، جائز استعمال سوچیں گے۔ روپیہ انھیں دو بجے سے پہلے ہی مل گیا تھا، اس لیے کہ رشوت دینے والا بہت بے قرار تھا۔ بڑے بھائی نے روپیہ جیب میں رکھنے سے پہلے تمام نوٹ اچھی طرح دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ وہ نشان زدہ نہیں تھے۔ رقم زیادہ نہیں تھی۔ دو سو ایک روپے تھے۔ انھوں نے دو سو طلب کیے تھے مگر ایک کا اضافہ رشوت دینے والے نے شگن کے لیے تھا جو بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے مشورہ کر کے ایک اندھے بھکاری کو دے دیا تھا۔ اب وہ دونوں ہیرا منڈی کی طرف جا رہے تھے۔ چھوٹے بھائی کی جیب میں اسکاچ کی بوتل تھی۔ بڑے کی جیب میں تھری فائیو کے دو ڈبے عام طور پر دونوں گولڈ فلیک پیتے تھے، مگر جب رشوت ملتی تو ایسا برانڈ پیتے تھے جس کے دام زیادہ ہوں۔ ہیرا منڈی میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ بادشاہی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ بڑے نے چھوٹے سے کہا۔

”چلو یار، نماز پڑھ لیں“!

چھوٹے نے اپنی پھولی ہوئی جیب کی طرف دیکھا۔

”اس کا کیا کریں بھائی جان؟“

بڑے نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا۔

”اس کا انتظام کر لیتے ہیں۔ اپنا یار بٹ جو ہے“!

بٹ پان فروش کی دکان قریب ہی تھی۔ چھوٹے نے مہین کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل اس کے حوالے کی۔ بڑے نے اپنی اور اپنے بھائی کی سائیکل دکان کے تھڑے کے ساتھ ٹکائی اور بٹ سے کہا۔

”ہم ابھی آئے نماز پڑھ کے“!

بٹ نے قہقہہ لگایا۔

”دو نفل شکرانے کے بھی“!

دونوں بھائیوں نے بادشاہی مسجد میں نماز ادا کی اور دو نفل شکرانے کے بھی پڑھے۔ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بٹ کی دکان بند ہے۔ ساتھ والے دکاندار سے پوچھا تو اس نے کہا۔“

نماز پڑھنے گیا ہے۔“

دونوں بھائیوں کو سخت تعجب ہوا۔

”نماز“!

دکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سال چھ ماہ ہی میں کبھی کبھی پڑھ لیا کرتا ہے۔“

دونوں بہت دیر تک بٹ کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ نہ آیا تو بڑے نے چھوٹے سے کہا۔

”جاؤ یار۔ ایک بوتل اور لے آؤ۔ میں نے خواہ مخواہ اس حرامزادے بٹ پر اعتبار کیا۔“

چھوٹے نے روپے لیے اور بڑے سے کہا۔

”جیب ہی میں پڑی رہتی تو کیا حرج تھی؟“

”چھوڑو یار۔ ہٹاؤ اس قصے کو۔ مجھے بوتل جانے کا اتنا افسوس نہیں۔ کہیں گر کر بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بڑی بے دردی سے پی رہا ہوگا کم بخت۔“

چھوٹے نے پیڈل پر پاؤں رکھا اور پوچھا۔

”آپ یہیں ہوں گے؟“

بڑے نے بڑے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”ہاں بھئی، یہیں کھڑا رہوں گا۔ شاید بہک کر ادھر آنکلے۔ لیکن تم جلدی آجانا“!

چھوٹا جلدی واپس آگیا مگر اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو کیریئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا تاڑ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن اسے زیادہ دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا نہ رہنا پڑا کیوں کہ چھوٹے نے سائیکل سے اترتے ہی اس کو سارا قصہ سنا دیا۔ شراب کی دکان سے دوسری بوتل لے کر جونہی وہ باہر نکلا تو بارش ہو چکی تھی۔ اسے جلد واپس پہنچنا تھا۔ افراتفری میں اس نے سائیکل پر سوار ہونے کی کوشش کی مگر وہ ایسی پھسلی کہ سنبھالے نہ سنبھلی۔ سڑک پر اوندھے منہ گرا اور دوسری بوتل بھی جہنم میں چلی گئی۔ چھوٹے نے ساری داستان تفصیل کے ساتھ سنا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

”میں بچ گیا بھائی جان۔ بوتل کا کوئی ٹکڑا اگر کپڑے چیر کر گوشت تک پہنچ جاتا تو اس وقت کسی ہسپتال میں پڑا ہوتا۔“

بڑے نے اللہ کا شکر ادا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ شراب کی دکان سے جو آدمی اس کے بھائی کے ساتھ آیا تھا، اس کو تیسری بوتل کے پیسے دے کر اس نے بٹ پان فروش کی بند دکان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں ایک بہت ہولناک قسم کی گالی دے کر اس کی دکان کو بھسم کر ڈالا۔ دونوں کو معلوم تھا کہ انھیں کہاں جانا ہے۔ چوک کے اس طرف نان کباب والے کے اوپر جو بالاخانہ تھا، اسی میں ان دونوں بھائیوں کی بالائی آمدنی کا جائز نکاس تھا، لونڈیا کم گو تھی۔ کھانے پینے والی تھی۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے طوائف کم اور کلرک زیادہ تھی۔ اسی لیے ان کو پسند تھی کہ وہ خود بھی کلرک تھے۔ جب دونوں خوب پی جاتے تو دفتری گفتگو شروع کر دیتے۔ ہیڈ کلرک کیسا ہے، صاحب کیسا ہے، اس کی گھر والی کی طبیعت کیسی ہے۔ گھنٹوں اپنے اپنے ماتحتوں اور اپنے افسروں کے ماضی اور حال پر تبصرہ کرتے رہتے۔ اور وہ بڑے انہاک سے سنتی رہتی۔ بہت کن سری تھی، مگر دونوں بھائی اس کا گانا سن کر یوں جھومتے تھے جیسے وہ ان کے کانوں میں شہد ٹپکا رہی ہے۔ لیکن آج جب وہ گانے لگی تو ان کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ وہ سر میں ہے نہ تال میں۔ چنانچہ اس کا گانا بند کرا کے انھوں نے باقی بچی ہوئی شراب پینا شروع کر دی۔ طوائف کا نام شیداں تھا، بہت کم پینے والی، مگر جانے اسے کیا ہوا کہ جب دونوں بھائیوں نے اس کا گانا بند کرا کے پینا شروع کیا تو وہ بہک گئی اور ایسی بہکی کہ بوتل اٹھا کر ساری کی ساری سوکھی پی گئی۔ بڑے کو بہت غصہ آیا، مگر وہ اسے پی گیا کیوں کہ چھوٹا مزے میں تھا۔ لیکن زیادہ دیر تک اس پر یہ کیف طاری نہ رہا کیوں کہ جب اس نے اور پینے کے لیے بوتل اٹھائی تو وہ خالی تھی۔ اب دونوں یکساں طور پر بے مزا تھے۔ بڑے نے چھوٹے سے مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ شیداں کے استاد مانڈو کو روپے دے کر اس نے کہا۔

”جاؤ، بھاگ کر جاؤ اور ایک بوتل جمخانہ وسکی لے آؤ“!

استاد نے روپے گن کر جیب میں رکھے اور کہا۔

”سرکار! بلیک میں ملے گی۔“

بڑا جو پہلے ہی بھنایا ہوا تھا، چلا کر بولا۔

”ہاں، ہاں۔ جانتا ہوں۔ اسی لیے تو میں نے پانچ زیادہ دیے ہیں۔“

جمخانہ آئی۔ دو دور چلے تو بڑے نے محسوس کیا کہ پانی ملی ہے۔ امتحان لینے کی خاطر اس نے تھوڑی سی رکابی میں ڈالی اور اس کو دیا سلائی دکھائی۔ ایک لحظہ کے لیے نیم جان نیلگوں سا دھواں اٹھا اور دیا سلائی شوں کر کے رکابی میں بجھ گئی۔ دونوں بھائیوں کو اس قدر کوفت ہوئی کہ غصے میں بھرے ہوئے اٹھے۔ بڑے نے پانی ملی بوتل ہاتھ میں لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ وہ اس شراب فروش کے سر پر دے مارے گا جس نے بے ایمانی کی تھی۔ مگر فوراً اسے خیال آیا کہ ان کے پاس پرمٹ نہیں تھا، اس لیے مجبوراً گالیاں دے کر خاموش ہو گئے۔ چھوٹے کی کوششوں سے بدمزگی کسی حد تک دور ہو گئی تھی کہ شیداں نے جو اس کی مدد کر رہی تھی، سب کھایا پیا اگلنا شروع کر دیا۔ اب دونوں بھائیوں نے مناسب خیال کیا کہ چلا جائے۔ چنانچہ استاد کی تحویل سے سائیکلیں لے کر وہ ہیرا منڈی کی گلیوں میں دیر تک بے مقصد گھومتے رہے۔ مگر اس آوارہ گردی کے باعث ان کی کوفت دور نہ ہوئی۔ واپس گھر جانے کا ارادہ ہی

کر رہے تھے کہ انھیں بٹ دکھائی دیا۔ نشے میں دھت تھا اور کوٹھوں کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر واہی تباہی بک رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبا دیں۔ مگر ان سے پہلے ایک سپاہی نے اس کو پکڑ لیا اور تھانے لے لیا۔ چھوٹے نے بڑے سے کہا۔

”چلیے بھائی جان۔ ذرا تماشہ دیکھیں۔“

بڑے نے پوچھا۔

”کس کا؟“

”بٹ اور کس کا“!

بڑے کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”پاگل ہوئے ہو۔ تھانے میں اگر اس نے ہمیں پہچان لیا یا کسی نے ہمارے منہ کی بو سونگھ لی تو ہمیں اپنا تماشہ بھی ساتھ ساتھ دیکھنا پڑے گا۔“

چھوٹے نے دل ہی دل میں بڑے کی دور اندیشی کی داد دی اور کہا۔

”تو چلیے۔ گھر چلیں۔“

دونوں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہوئے۔ بارش تھم چکی تھی۔ لیکن سرد ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ ابھی وہ ہیرا منڈی سے باہر نکلے تھے کہ انھیں اس تانگے میں جو ان کے آگے آگے چل رہا تھا، اپنے دفتر کا بڑا افسر نظر آیا۔ دونوں نے ایک دم اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ کیوں کہ وہ انھیں دیکھ چکا تھا۔

”ہلو“!

انھوں نے اس ہلو کا جواب نہ دیا۔

”ہلو“!

اس ہلو کے جواب میں انھوں نے اپنی اپنی سائیکل روک لی۔ افسر نے تانگہ ٹھہرا لیا اور ان سے بڑے مربّیانہ انداز میں کہا۔

”کہو مسٹر! عیش ہو رہے ہیں؟“

چھوٹے نے

”جی ہاں“!

اور بڑے نے

”جی نہیں“!

میں جواب دیا۔ اس پر افسر نے قہقہہ لگایا۔

”میرا عیش تو ادھورا رہا۔“

پھر اس نے افسرانہ انداز میں پوچھا۔

”تمہارے پاس کچھ روپے ہیں؟“

اس مرتبہ بڑے نے

”جی ہاں“!

اور چھوٹے نے

”جی نہیں“!

میں جواب دیا جس پر افسر نے دوسرا قہقہہ بلند کیا جو ٹھیٹ افسرانہ تھا۔

”ایک سو روپے کافی ہوں گے اس وقت“!

بڑے نے بڑے میکانکی انداز میں اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور اپنے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ چھوٹے نے پکڑ کر افسر کے حوالے کر دیا جس نے

”تھینک یو“!

کہا اور تانگے سے اتر کر لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ دونوں بھائی تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ بڑے نے تمام حالات پیش نظر رکھ کر اپنے سر کو زور سے جنبش دی۔

”معلوم نہیں آج صبح صبح کس کا منہ دیکھا تھا۔“

چھوٹے کے منہ سے یہ بڑی گالی نکلی۔

”اسی۔ کا، جس نے دو سو ایک روپے دیے۔“

بڑے نے بھی اس کو مناسب و موزوں گالی سے یاد کیا۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں سارا قصور اس فالتو روپے کا ہے جو اس نے اپنی ماں کی رواں سے شگن کے طور پر دیا تھا۔“

”اس نماز کا بھی جو ہم نے پڑھی“!

”اور اس حرامی بٹ کا بھی“!

”میں تو شکر کرتا ہوں کہ پولیس نے اس کو پکڑ لیا، ورنہ میں نے آج ضرور اس کا خون کر دیا ہوتا۔“

”اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔“

”لینے کے دینے تو پڑ ہی گئے۔ خدا معلوم یہ ہمارا افسر کہاں سے آن ٹپکا۔“

”لیکن میں سمجھتا ہوں اچھا ہی ہوا۔ سو روپے میں سالا کانا تو ہو گیا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آج کی شام بہت بری طرح غارت ہوئی۔“

”چلو چلیں۔ ایسا نہ ہو کوئی اور آفت آ جائے۔“

دونوں پھر اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہوئے اور ہیرا منڈی سے نکل آئے۔ بڑے نے دفتر سے نکلتے ہی یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اسکاچ کے دو تین دور ہونے کے بعد وہ شیداں سے کہے گا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کو بلائے۔ اس کی وہ بہت تعریفیں کیا کرتی تھی۔ کم عمر اور الہڑ تھی۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے گاؤں کی صحت مند فضا میں گزارا تھا اور دھندا شروع کیے اسے بمشکل چند مہینے ہوئے تھے۔ اسکاچ وسکی اور شیداں کی چھوٹی اور طبیعت اس سے بڑھ کر اور کیا عیاشی ہو سکتی تھی۔ مگر اس کا یہ سارا منصوبہ خاک میں مل گیا اور صرف کوفت باقی رہ گئی۔ چھوٹے نے بھی کُھل کھیلنے کی سوچی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ وسکی اور شیداں یقینی طور پر اسے اور بھی خوشگوار بنا دیتے اور وہ اس قدر محظوظ ہوتا کہ پندرہ بیس روز تک اسے اور کسی عیش کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مگر سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ دونوں کے سر بھاری اور دل کڑوے کسیلے تھے۔ دونوں کی ہر بات الٹی ثابت ہوئی تھی۔ اسکاچ کی پہلی بوتل بٹ پان فروش لے اڑا۔ دوسری سڑک کے پتھروں پر ٹوٹ کر بہہ گئی۔ تیسری عین اس وقت داغ مفارقت دے گئی جب کہ سرور گٹھ رہے تھے۔ چوتھی کفایت کی خاطر دیسی منگوائی تو اس میں آدھا پانی نکلا اور سو کا آخری نوٹ افسر نے ہتھیا لیا۔ بڑے کی کوفت زیادہ تھی، یہی وجہ تھی کہ اس کے دماغ میں عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اور بھی کچھ ہو۔ کوئی ایسی بات ہو کہ وہ کتوں کی طرح زور زور سے بھونکنا شروع کر دے۔ یا ایسا زچ ہو کہ اپنی سائیکل کے پرزے اڑا دے، اپنے تمام کپڑے اتار کر پھینک دے اور ننگ دھڑنگ کسی کنویں میں چھلانگ لگا دے۔ جس طرح حالات نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا، اسی طرح وہ ان کا مضحکہ اڑانا چاہتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ حالات پیدا ہو کر وہیں ہیرا منڈی میں وفات پا گئے تھے۔ اب نئے حالات اور وہ بھی ایسے حالات پیدا ہوں جن کا وہ حسب منشا مضحکہ اڑا سکے۔ اس کے متعلق سوچنے سے وہ خود کو عاری پاتا تھا۔ ایک صرف گھر تھا جہاں لحاف اوڑھ کر سو سکتے تھے۔ مگر خالی خولی لحاف اوڑھ کر سو جانے میں کیا رکھا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ سو سو کے دو نوٹوں میں چرس ملا تمباکو کو بھرتے اور پی کر انٹا غفیل ہو جاتے اور صبح اٹھ کر شگن کے ایک روپے کا کسی پیر فقیر کے مزار پر چڑھاوا چڑھا دیتے۔ سوچتے سوچتے بڑے نے زور کا نعرہ بلند کیا۔

”ہٹ تیری ایسی کی تیسی“!

چھوٹے نے گھبرا کر پوچھا۔

”پنکچر ہو گیا؟“

بڑے نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

”نہیں یار۔ میں نے اپنا دماغ پنکچر کرنے کی کوشش کی تھی۔“

چھوٹا سمجھ گیا۔

”اب جلدی گھر پہنچ جائیں۔“

بڑے کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

”وہاں کیا کریں گے۔ بطخوں کے بال مونڈیں گے؟“

چھوٹا بے اختیار ہنسنے لگا۔ بڑے کو یہ ہنسی بہت ناگوار گزری۔

“خاموش رہو جی”!

دیر تک دونوں خاموشی سے گھر کا فاصلے طے کرتے رہے۔ اب وہ اس سڑک پر تھے جو لوہے کی زنگ آلود چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ ان کی سائیکلوں کے پہیوں کے نیچے ہولے ہولے کھسک رہی ہے۔ بڑے نے جب اپنے سرد ہاتھ منہ کی بھاپ سے گرم کیے اور کہا۔

“سخت سردی ہے۔”

تو چھوٹے نے ازارہ مذاق پوچھا۔

“بھائی جان! وہ۔ وہ وسکی کہاں گئی؟”

بڑے کے جی میں آئی کہ چھوٹے کو سائیکل سمیت اٹھا کر سڑک پر پٹک دے، مگر اس قدر کہہ سکا۔

“جہنم میں۔ جہاں ساری شام غارت ہوئی، وہاں وہ بھی ہوئی۔”

یہ کہہ وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ اتنے میں چھوٹے نے آواز دی

“بھائی جان! وہ دیکھیے کون آ رہا ہے۔”

بڑے نے مڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکی تھی جو سردی میں ٹھٹھرتی، کانپتی، قدموں سے راستہ ٹٹولتے ان کی جانب آ رہی تھی۔ جب پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اندھی ہے، آنکھیں کھلی تھیں مگر اس کو سجھائی نہیں دیتا تھا کیوں کہ کھمبے کے ساتھ وہ ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ بڑے نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ جوان تھی۔ عمر یہی سولہ سترہ بس کے قریب ہو گی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی اس کا سڈول بدن جاذب توجہ تھا۔ چھوٹے نے اس سے پوچھا۔

“کہاں جا رہی ہے تو؟”

اندھی نے ٹھٹھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

“راستہ بھول گئی ہوں۔ گھر سے آگ لینے کے لیے نکلی تھی۔”

بڑے نے پوچھا۔

“تیرا گھر کہاں ہے؟”

اندھی بولی۔

“پتہ نہیں۔ کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔”

بڑے نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

“چل میرے ساتھ”!

اور وہ اسے سڑک کے اس پار لے گیا جہاں اینٹوں کا پرانا بھٹہ تھا جو ویرانے کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔ اندھی سمجھ گئی کہ اس کو راستہ بتانے والا اسے کس راستے پر لے جا رہا ہے، مگر اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ شاید وہ ایسے راستوں پر کئی مرتبہ چل چکی تھی۔ بڑا خوش تھا کہ چلو کوفت دور کرنے کا سامان مل گیا۔ کسی مداخلت کا کھٹکا بھی نہیں تھا۔ اوور کوٹ اتار کر اس نے زمین پر بچھایا وہ اور اندھی دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اندھی جنم کی اندھی نہیں تھی۔ فسادات سے پہلے وہ اچھی بھلی تھی۔ لیکن جب سکھوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تو بھگدڑ میں اس کے سر پر گہری چوٹ لگی جس کے باعث اس کی بصارت چلی گئی۔ بڑے نے اوپرے دل سے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کو اس کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دو روپے جیب سے نکال کر اس نے اس کی ہتھیلی پر رکھے اور کہا۔

“کبھی کبھی ملتی رہا کرنا۔ میں تمہیں کپڑے بھی بنوا دوں گا۔”

اندھی بہت خوش ہوئی۔ بڑے نے جب اس کو روشن آنکھوں اور پھرتیلے ہاتھوں سے اچھی طرح ٹٹولا تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس کی کوفت کافی حد تک دور ہو گئی، لیکن ایک دم اسے اپنے چھوٹے بھائی کی بھنچی ہوئی آواز سنائی دی۔

“بھائی جان۔ بھائی جان”!

بڑے نے پوچھا۔

“کیا ہے؟”

چھوٹا سامنے آیا۔ بڑے خوف زدہ لہجے میں اس نے کہا۔

”دو سپاہی آ رہے ہیں“!

بڑے نے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اپنا اوور کوٹ کھینچا جس پر اندھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جھٹکے سے وہ اس خندق میں گر پڑی جس میں سے پکی ہوئی اینٹیں نکال لی گئی تھیں۔ گرتے وقت اس کے منہ سے بلند چیخ نکلی۔ مگر دونوں بھائی وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ چیخ سن کر سپاہی آئے تو انھوں نے بے ہوش اندھی کو خندق سے باہر نکالا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو اس نے سپاہیوں کو یوں دیکھنا شروع کیا جیسے وہ بھوت ہیں۔ پھر ایک دم دیوانہ وار چلانے لگی۔

”میں دیکھ سکتی ہوں۔ میں دیکھ سکتی ہوں۔ میری نظر واپس آ گئی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔ اس کے ہاتھ سے جو دو روپے گرے، وہ سپاہیوں نے اٹھا لیے۔

پُھندنے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپُھندنے

کوٹھی سے ملحقہ وسیع و عریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلی نے بچے دیے تھے، جو بِلّا کھا گیا تھا۔ پھر ایک کتیا نے بچے دیے تھے جو بڑے بڑے ہو گئے تھے اور دن رات کوٹھی کے اندر باہر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے رہتے تھے۔ ان کو زہر دے دیا گیا۔ ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ان کی ماں بھی۔ ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی۔ جانے کتنے برس گزر چکے تھے۔ کوٹھی سے ملحقہ باغ کی جھاڑیاں سینکڑوں ہزاروں مرتبہ کتری بیونتی، کاٹی چھانٹی جا چکی تھیں۔ کئی بلیوں اور کتیوں نے ان کے پیچھے بچے دیے تھے جن کا نام و نشان بھی نہ رہا تھا۔ اس کی اکثر بد عادت مرغیاں وہاں انڈے دے دیا کرتی تھیں جن کو ہر صبح اٹھا کر وہ اندر لے جاتی تھی۔ اسی باغ میں کسی آدمی نے ان کی نوجوان ملازمہ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ اس کے گلے میں اس کا پھندنوں والا سرخ ریشمی ازار بند جو اس نے دو روز پہلے پھیری والے سے آٹھ آنے میں خریدا تھا، پھنسا ہوا تھا۔ اس زور سے قاتل نے پیچ دیے تھے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ اس کو دیکھ کر اس کو اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور شاید ابھی تک بے ہوش تھی۔ لیکن نہیں، ایسا کیوں کر ہو سکتا تھا، اس لیے کہ اس قتل کے دیر بعد مرغیوں نے انڈے، نہ ہی بلیوں نے بچے دیے تھے اور ایک شادی ہوئی تھی۔ کتیا تھی جس کے گلے میں لال دوپٹہ تھا۔ مکیشی۔ جھلمل جھلمل کرتا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی نہیں تھیں، اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ باغ میں بینڈ بجا تھا۔ سرخ وردیوں والے سپاہی آئے تھے جو رنگ برنگی مشکیں بغلوں میں دبا کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی وردیوں کے ساتھ کئی پھندنے لگے تھے۔ جنھیں اٹھا اٹھا کر لوگ اپنے ازار بندوں میں لگاتے جاتے تھے۔ پر جب صبح ہوئی تھی تو ان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ سب کو زہر دے دیا گیا تھا۔ دلہن کو جانے کیا سوجھی، کم بخت نے جھاڑیوں کے پیچھے نہیں، اپنے بستر پر صرف ایک بچہ دیا۔ جو بڑا اگل گوتھنا، لال پھندنا تھا۔ اس کی ماں مر گئی۔ باپ بھی۔ دونوں کو بچے نے مارا۔ اس کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتی۔ سرخ وردیوں والے سپاہی بڑے بڑے پھندنے لٹکائے جانے کہاں غائب ہوئے کہ پھر نہ آئے۔ باغ میں بلے گھومتے تھے، جو اسے گھورتے تھے، اس کو چھیچھڑوں کی بھری ہوئی ٹوکری سمجھتے تھے حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔ ایک دن اس نے اپنی دو نارنگیاں نکال کر آئینے کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے پیچھے ہو کے اس نے ان کو دیکھا مگر نظر نہ آئیں۔ اس نے سوچا اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی ہیں۔ مگر وہ اس کے سوچتے سوچتے ہی بڑی ہو گئیں اور اس نے ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر آتش دان پر رکھ دیں۔ اب کتے بھونکنے لگے۔ نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں۔ کوٹھی کے فرش پر اچھلیں، ہر کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگنے دوڑنے لگیں۔ کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ جانے کیا ہوا، ان کتوں میں دو زہر کھا کے مر گئے۔ جو باقی بچے وہ ان کی ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کھا گئی۔ یہ اس نوجوان ملازمہ کی جگہ آئی تھی، جس کو کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا، گل میں اس کے پھندنوں والے ازار بند کا پھندا ڈال کر۔ اس کی ماں تھی۔ ادھیڑ عمر کی ملازمہ سے عمر میں چھ سات بڑی بڑی۔ اس کی طرح ہٹی کٹی نہیں تھی۔ ہر روز صبح شام موٹر میں سیر کو جاتی تھی۔ اور بد عادت مرغیوں کی طرح دور دراز باغوں میں جھاڑیوں کے پیچھے انڈے دیتی تھی۔ ان کو وہ خود اٹھا کر لاتی تھی نہ ڈرائیور۔ اوملیٹ بناتی تھی۔ جس کے داغ کپڑوں پر پڑ جاتے تھے۔ سوکھ جاتے تو ان کو باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے پھینک دیتی تھی جہاں سے چیلیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔ ایک دن اس کی سہیلی آئی۔ پاکستان میل، موٹر نمبر 9612 پی ایل بڑی گرمی تھی۔ ڈیڈی پہاڑ پر تھے۔ ممی سیر کرنے گئی ہوئی تھیں۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا بلاؤز اتارا اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے دودھ ابلے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو گئے۔ اس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ ابلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ ہل ہل کے کنگنے ہو گئے اور کھٹی لسی بن گئی۔ اس سہیلی کا بینڈ بج گیا۔ مگر وہ وردی والے سپاہی پھندنے نچانے نہ آئے۔ اس کی جگہ پیتل کے برتن تھے، چھوٹے اور بڑے، جن سے آوازیں نکلتی تھیں۔ گرجدار اور دھیمی۔ دھیمی اور گرجدار۔ یہ سہیلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مچ بدل گئی تھی۔ اس کے اب دو پیٹ تھے۔ ایک پرانا، دوسرا نیا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے۔ پھر اس کے بھائی کا بینڈ بجا۔ ادھیڑ عمر کی

ہٹی کٹی ملازمہ بہت روئی۔ اس کے بھائی نے اس کو بہت دلاسا دیا۔ بیچاری کو اپنی شادی یاد آگئی تھی۔ رات بھر اس کے بھائی اور اس کی دلہن کی لڑائی ہوتی رہی۔ وہ روتی رہی، وہ ہنستا رہا۔ صبح ہوئی تو ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ اس کے بھائی کو دلاسا دینے کے لیے اپنے ساتھ لے گئی۔ دلہن کو نہلایا گیا۔ اس کی شلوار میں اس کا لال پھندنوں والا ازار بند پڑا تھا۔ معلوم نہیں یہ دلہن کے گلے میں کیوں نہ باندھا گیا۔ اس کی آنکھیں بہت موٹی تھیں۔ اگر گلا زور سے گھونٹا جاتا تو وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی آنکھوں کی طرح باہر نکل آتیں۔ اور اس کو بہت تیز بخار چڑھتا۔ مگر پہلا تو ابھی تک اترا نہیں۔ ہو سکتا ہے اتر گیا ہو اور یہ نیا بخار ہو جس میں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ اس کی ماں موٹر ڈرائیوری سیکھ رہی ہے۔ باپ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے اور اپنے لڑکے سے مل کر چلا جاتا ہے۔ لڑکا کبھی کبھی اپنی بیوی کو گھر بلا لیتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کو دو تین روز کے بعد کوئی یاد ستاتی ہے تو رونا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اسے دلاسا دیتا ہے، وہ اسے پچکارتی ہے اور دلہن چلی جاتی ہے۔ اب وہ اور دلہن بھابھی، دونوں سیر کو جاتی ہیں۔ سہیلی بھی، پاکستان میل۔ موٹر نمبر 9612 پی ایل۔ سیر کرتے کرتے اجنتا جا نکلتی ہیں، جہاں تصویریں بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ تصویریں دیکھ کر تینوں تصویر بن جاتے ہیں۔ رنگ ہی رنگ، لال، پیلے، ہرے، نیلے۔ سب کے سب چیخنے والے ہیں۔ ان کو رنگوں کا خالق چپ کراتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔ سردیوں اور گرمیوں میں اوورکوٹ پہنتا ہے۔ اچھی شکل و صورت کا ہے۔ اندر باہر ہمیشہ کھڑاؤں استعمال کرتا ہے۔ اپنے رنگوں کو چپ کرانے کے بعد خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو یہ تینوں چپ کراتی ہیں اور بعد میں خود چلانے لگتی ہیں۔ تینوں اجنتا میں مجرد آرٹ کے سینکڑوں نمونے بناتی رہیں۔ ایک کی ہر تصویر میں عورت کے دو پیٹ ہوتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے۔ دوسری کی تصویروں میں عورت ادھیڑ عمر کی ہوتی ہے۔ ہٹی کٹی۔ تیسری کی تصویروں میں پھندنے ہی پھندنے۔ ازار بندوں کا گچھا۔ مجرد تصویریں بنتی رہیں۔ مگر تینوں کے دودھ سوکھتے رہے۔ بڑی گرمی تھی، اتنی کہ تینوں پسینے میں شرابور تھیں۔ خس لگے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی انھوں نے اپنے بلاؤز اتارے اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ پنکھا چلتا رہا۔ دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔ اس کی ممی دوسرے کمرے میں تھی۔ ڈرائیور اس کے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا تھا۔ ڈیڈی ہوٹل میں تھا جہاں اس کی لیڈی سٹینو گرافر اس کے ماتھے پر یوڈی کلون مل رہی تھی۔ ایک دن اس کا بھی بینڈ بج گیا۔ اجاڑ باغ پھر بارونق ہو گیا۔ گملوں اور دروازوں کی آرائش اجنتا اسٹوڈیو کے مالک نے کی تھی۔ بڑی بڑی گہری لپ اسٹکیں اس کے بکھرے ہوئے رنگ دیکھ کر اڑ گئیں۔ ایک جو زیادہ سیاہی مائل تھی، اتنی اڑی کہ وہیں گر کر اس کی شاگرد ہو گئی۔ اس کے عروسی لباس کا ڈیزائن بھی اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے اس کی ہزاروں کی سمتیں پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف رنگ کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہو جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا پھلکاری کا پردہ۔ عقب میں چلے جاؤ۔ کچلے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر۔ ذرا زاویہ بدل کر دیکھو ٹماٹو ساس سے بھرا ہوا امرتبان۔ اوپر سے دیکھو تو یگانہ آرٹ۔ نیچے سے دیکھو تو میرا جی کی مبہم شاعری۔ فن شناس نگاہیں عش عش کر اٹھیں۔ دولہا اس قدر متاثر ہوا تھا کہ شادی کے دوسرے روز ہی اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی مجرد آرٹسٹ بن جائے گا۔ چنانچہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ اجنتا گیا۔ جہاں انھیں معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ چند روز سے اپنی ہونے والی دلہن ہی کے پاس رہتا ہے۔ اس کی ہونے والی دلہن وہی گہرے رنگ کی لپ اسٹک تھی جو دوسری لپ اسٹکوں کے مقابلے میں زیادہ سیاہی مائل تھی۔ شروع شروع میں چند مہینے تک اس کے شوہر کو اس سے اور مجرد آرٹ سے دلچسپی رہی، لیکن جب اجنتا اسٹوڈیو بن ہو گیا اور اس کے مالک کی کہیں سے بھی سن گن نہ ملی تو اس نے نمک کا کاروبار شروع کر دیا۔ جو بہت نفع بخش تھا۔ اس کا کاروبار کے دوران میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ جس کے دودھ سوکھے ہوئے نہیں تھے۔ یہ اس کو پسند آ گئے۔ بینڈ نہ بجا لیکن شادی ہو گئی۔ پہلی اپنے برش اٹھا کر لے گئی اور الگ رہنے لگی۔ یہ ناچاقی پہلے تو دونوں کے لیے تلخی کا موجب ہوئی لیکن بعد میں ایک عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی سہیلی نے جو دوسرا شوہر تبدیل کرنے کے بعد سارے یورپ کا چکر لگا کر آئی تھی اور اب دق کی مریض تھی، اس مٹھاس کو کیوبک آرٹ میں پینٹ کیا۔ صاف شفاف چینی کے بے شمار کیوب تھے جو تھوہر کے پودوں کے درمیان اس انداز سے اوپر تلے رکھے تھے کہ ان سے دو شکلیں بن گئیں تھی۔ اس پر شہید کی مکھیاں بیٹھی رس چوس رہی تھیں۔ اس کی دوسری سہیلی نے زہر کھا کر خود کشی کر لی۔ جب اس کو یہ المناک خبر ملی تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ معلوم نہیں بے ہوشی نئی تھی یا وہی پرانی جو بڑے تیز بخار کے بعد ظہور میں آئی تھی۔ اس کا باپ یوڈی کلون میں تھا۔ جہاں اس کا ہوٹل اس کی لیڈی سٹینو گرافر کا سر سہلاتا تھا۔ اس کی ممی نے گھر کا سارا حساب کتاب ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اس کو ڈرائیونگ آ گئی تھی مگر بہت بیمار ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کو ڈرائیور کے بن ماں کے پلے کا بہت خیال تھا۔ وہ اس کو اپنا موبل آئل پلاتی تھی۔ اس کی بھابھی اور اس کے بھائی کی زندگی بہت ادھیڑ اور ہٹی کٹی ہو گئی تھی۔ دونوں آپس میں بڑے پیار سے ملتے تھے کہ اچانک ایک رات جب کہ ملازمہ اور اس کا بھائی گھر کا حساب کتاب کر رہے تھے، اس کی بھابھی نمودار ہوئی، وہ مجرد تھی۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا نہ برش۔ لیکن اس نے دونوں کا حساب صاف کر دیا۔ صبح کمرے میں سے جمے ہوئے لہو کے دو بڑے بڑے پھندنے نکلے جو اس کی بھابھی کے گلے میں لگا دیے گئے۔ اب وہ قدرے ہوش میں آئی۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث اس کی زندگی تلخ ہو کر بعد میں عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے اس کو تھوڑا سا تلخ بنانے کی کوشش کی اور شراب پینا شروع کی، مگر ناکام رہی۔ اس لیے کہ مقدار کم تھی۔ اس نے مقدار بڑھا دی حتیٰ کہ وہ اس میں ڈبکیاں لینے لگی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اب غرق ہوئی مگر وہ سطح پر ابھر آتی تھی۔ منہ سے شراب پونچھتی ہوئی اور قہقہے لگاتی ہوئی۔ صبح کو جب اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ رات بھر اس کے جم کا ذرہ ذرہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہا ہے۔ اس کے وہ سب بچے جو پیدا ہو سکتے تھے، ان قبروں میں جو ان کے لیے بن سکتی تھیں، اس دودھ کے لیے جو ان کا ہو سکتا تھا، بلک بلک کر رو رہے ہیں۔ مگر اس کے دودھ کہاں تھے۔ وہ تو جنگلی بلے پی چکے تھے۔ وہ زیادہ پیتی کہ اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ذہین تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ

جسمانی رشتہ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی، مگر پھر بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کسی بدعادت مرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈہ دے آئے۔ بالکل کھوکھلی ہو گئی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تو اس سے لوگ دور رہنے لگے۔ وہ سمجھ گئی، چنانچہ وہ ان کے پیچھے نہ بھاگی اور اکیلی گھر میں رہنے لگی۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتی، شراب پیتی اور جانے کیا سوچتی رہتی۔ رات کو بہت کم سوتی تھی۔ کوٹھی کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔ سامنے کوارٹر میں ڈرائیور کا بن ماں کا بچہ موبل آئل کے لیے روتا رہتا تھا مگر اس کی ماں کے پاس ختم ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کر دیا تھا۔ موٹر گیراج میں اور اسکی ماں ہسپتال میں پڑی تھی۔ جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی، دوسری کاٹی جانے والی تھی۔ وہ کبھی کبھی کوارٹر کے اندر جھانک کر دیکھتی تو اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے دودھوں کی تلچھٹ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی ہے، مگر اس بدذائقہ سے تو اس کے بچے کے ہونٹ بھی تر نہ ہوتے۔ اس کے بھائی نے کچھ عرصے سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس کا خط سوئیٹزرلینڈ سے آیا کہ وہ وہاں اپنا علاج کرا رہا ہے، نرس بہت اچھی ہے۔ ہسپتال سے نکلتے ہی وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔ ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ نے تھوڑا زیور، کچھ نقدی اور بہت سے کپڑے جو اس کی ممی کے تھے، چرائے اور چند روز کے بعد غائب ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی ماں آپریشن ناکام ہونے کے باعث ہسپتال میں مر گئی۔ اس کا باپ جنازے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد اس نے اس کی صورت نہ دیکھی۔ اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکر تھے، اس نے علیحدہ کر دیے، ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لیے اس نے ایک آیا رکھ دی۔ کوئی بوجھ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ کبھی کبھار اگر کوئی اس سے ملنا آتا تو وہ اندر سے چلا اٹھی تھی۔

”چلے جاؤ۔ جو کوئی بھی تم ہو، چلے جاؤ۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔“

سیف میں اس کو اپنی ماں کے بے شمار قیمتی زیورات ملے تھے۔ اس کے اپنے بھی تھے جن سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی۔ مگر اب وہ رات کو گھنٹوں آئینے کے سامنے ننگی بیٹھ کر یہ تمام زیور اپنے بدن پر سجاتی اور شراب پی کر کن سری آواز میں فحش گانے گاتی تھی۔ آس پاس اور کوئی کوٹھی نہیں تھی اس لے اسے مکمل آزادی تھی۔ اپنے جسم کو تو وہ کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اپنی روح کو بھی ننگا کر دے۔ مگر اس میں وہ زبردست حجاب محسوس کرتی تھی۔ اس حجاب کو دبانے کے لیے صرف ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ پیے اور خوب پیے اور اس حالت میں اپنے ننگے بدن سے مدد لے۔ مگر یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ وہ آخری حد تک ننگا ہو کر ستر پوش ہو گیا تھا۔ تصویریں بنا بنا کر وہ تھک چکی تھی۔ ایک عرصے سے اس کا پینٹنگ کا سامان صندوقچے میں بند پڑا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے سب رنگ نکالے اور بڑے بڑے پیالوں میں گھولے۔ تمام برش دھو دھا کر ایک طرف رکھے اور آئینے کے سامنے ننگی کھڑی ہو گئی اور انے جسم پر نئے نئے خدوخال بنانے شروع کیے۔ اس کی یہ کوشش اپنے وجود کو مکمل طور پر عریاں کرنے کی تھی۔ وہ اپنا سامنا حصہ ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اس میں مصروف رہی۔ بن کھائے پیے، آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنگے خطوط بناتی رہی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا۔ آدھی رات کے قریب اس نے دور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے رنگوں سے لتھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک آدمی چھرا ہاتھ میں لیے، منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب وہ مڑی تو حملہ آور کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ چھرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر کا رخ کیا کبھی ادھر۔ آخر جو رستہ ملا، اس میں سے بھاگ نکلا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ چیختی، پکارتی۔

”ٹھہرو۔ ٹھہرو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ٹھہرو“!

مگر چور نے اس کی ایک نہ سنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آئی۔ دروازے کی دہلیز کے پاس چور کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اٹھا لیا اور اندر چلی گئی۔ اچانک اس کی نظریں آئینے سے دوچار ہوئیں۔ جہاں اس کا دل تھا، وہاں اس نے میان نما چمڑے کے رنگ کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے اس پر خنجر رکھ کر دیکھا۔ خول بہت چھوٹا تھا۔ اس نے خنجر پھینک دیا اور بوتل میں سے شراب کے چار پانچ بڑے بڑے گھونٹ پی کر ادھر ٹہلنے لگی۔ وہ کئی بوتلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔ دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ پھر آئینے کے سامنے آئی۔ اس کے گلے میں ازار بند نما گلوبند تھا جس کے بڑے بڑے پھندنے تھے۔ یہ اس نے برش سے بنایا تھا۔ دفعتاً اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ گلوبند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھنستا جا رہا ہے۔ وہ خاموش کھڑی آئینے میں آنکھیں گاڑی رہی جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چیخ ماری اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔

پھوجا حرام دا

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوپھوجا حرام دا

ٹی ہاؤس میں حرامیوں کی باتیں شروع ہوئیں تو یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ ہر ایک نے کم از کم ایک حرامی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے جس سے اس کو اپنی زندگی میں واسطہ پڑ چکا تھا۔ کوئی جالندھر کا تھا۔ کوئی لدھیانے کا اور کوئی لاہور کا۔ مگر سب کے سب اسکول یا کالج کی زندگی کے متعلق تھے۔ مہر فیروز صاحب سب سے آخر میں بولے۔ آپ نے کہ۔ امرت سر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو پھوجے حرامدے کے نام سے ناواقف ہو۔ یوں تو اس شہر میں اور بھی کئی حرام زادے تھے مگر اس کے پلے کے نہیں تھے۔ وہ نمبر ایک حرام زادہ تھا۔ اسکول میں اُس نے تمام ماسٹروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا ہیڈ ماسٹر جس کو دیکھتے ہی بڑے بڑے شیطان لڑکوں کا پیشاب خطا ہو جاتا پھوجے سے بہت گھبراتا تھا اس لیے کہ اس پر اُن کے مشہور بید کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تنگ آکر انھوں نے اُس کو مارنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ دسویں جماعت کی بات ہے۔ ایک دن یار لوگوں نے اُس سے کہا دیکھو پھوجے! اگر تم کپڑے اتار کر ننگ دھڑنگ اسکول کا ایک چکر لگاؤ تو ہم تمھیں ایک روپیہ دیں گے۔ پھوجے نے روپیہ لے کر کان میں اڑسا کپڑے اُتار کر بستے میں باندھے اور سب کے سامنے چلنا شروع کر دیا، جس کلاس کے پاس سے گزرتا وہ زعفران زار بن جاتا۔ چلتے چلتے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے پاس پہنچ گیا پتی اُٹھائی اور غڑاپ سے اندر۔ معلوم نہیں کیا ہوا ہیڈ ماسٹر صاحب سخت بوکھلائے ہوئے باہر نکلے اور چپڑاسی کو بُلا کر اُس سے کہا جاؤ بھاگ کے جاؤ پھوجے حرامدے کے گھر، وہاں سے کپڑے لاؤ اُس کے لیے۔ کہتا ہے میں مسجد کے سقاوے میں نہا رہا تھا کہ میرے کپڑے کوئی چور اُٹھا کر لے گیا۔ دینیات کے ماسٹر مولوی پوٹیٹو تھے۔ معلوم نہیں انھیں پوٹیٹو کس رعایت سے کہتے تھے، کیونکہ آلوؤں کے تو داڑھی نہیں ہوتی۔ ان سے پھوجا ذرا دبتا تھا مگر ایک دن ایسا آیا کہ انجمن کے ممبروں کے سامنے مولوی صاحب نے غلطی سے اس سے ایک آیت کا ترجمہ پوچھ لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ خاموش رہتا مگر پھوجا حرامدا کیسے پہچانا جاتا۔ جو منہ میں آیا اول جلول بک دیا۔ مولوی پوٹیٹو کے پسینے چھوٹ گئے ممبر باہر نکلے تو انھوں نے غصہ میں تھر تھر کانپتے ہوئے اپنا عصا اٹھایا اور پھوجے کو دو چار چور کی مار دی کہ بلبلا اُٹھا مگر بڑے ادب سے کہتا رہا کہ مولوی صاحب میرا قصور نہیں مجھے کلمہ ٹھیک سے نہیں آتا اور آپ نے ایک پوری آیت کا مطلب پوچھ لیا۔ مارنے سے بھی مولوی پوٹیٹو صاحب کا جی ہلکا نہ ہوا۔ چنانچہ وہ پھوجے کے باپ کے پاس گئے اور اس سے شکایت کی پھوجے کے باپ نے اُن کی سب باتیں سنیں اور بڑے رحم ناک لہجے میں کہا

”مولوی صاحب! میں خود اس سے عاجز آ گیا ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے میں پاخانے گیا تو اس نے باہر سے کنڈی چڑھا دی میں بہت گرجا بے شمار گالیاں دیں مگر اُس نے کہا

”اٹھنی دینے کا وعدہ کرتے ہو تو دروازہ کھلے گا اور دیکھو اگر وعدہ کر کے پھر گئے تو دوسری مرتبہ کنڈی میں تالا بھی ہو گا“

ناچار اٹھنی دینی پڑی اب بتایئے میں ایسے نابکار لڑکے کا کیا کروں۔“

اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ اس کا کیا ہو گا۔ پڑھتا وڑھتا خاک بھی نہیں تھا انٹرنس کے امتحان ہوئے تو سب کو یقین تھا کہ بہت بری طرح فیل ہو گا مگر نتیجہ نکلا تو سکول میں اس کے سب سے زیادہ نمبر تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کالج میں داخل ہو مگر باپ کی خواہش تھی کہ کوئی ہنر سیکھے، چنانچہ یہ نتیجہ نکلا کہ وہ دو برس تک آوارہ پھرتا رہا اس دوران اُس نے جو حرامزدگیاں کیں ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔ تنگ آ کر اُس کے باپ نے بالآخر اُسے کالج میں داخل کروا دیا پہلے دن ہی اُس نے یہ شرارت کی کہ میتھے میٹکس کے پروفیسر کی سائیکل اُٹھا کر درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر لٹکا دی۔ سب حیران کہ سائیکل وہاں پہنچی کیونکر۔ مگر وہ لڑکے جو اسکول میں پھوجے کے ساتھ پڑھ چکے تھے۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کارستانی اس کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی، چنانچہ اس ایک شرارت ہی سے اُس کا پورے کالج سے تعارف ہو گیا۔ اسکول میں اُس کی سرگرمیوں کا میدان محدود تھا۔ مگر کالج میں یہ بہت وسیع ہو گیا۔ پڑھائی میں کھیلوں میں مشاعروں میں اور مباحثوں میں ہر جگہ پھوجے کا نام روشن تھا اور تھوڑی دیر میں اتنا روشن ہوا کہ شہر میں اس کے گنڈپنے کی دھاک بیٹھ گئی۔ بڑے بڑے جگادری بدمعاشوں کے کان کاٹنے لگا۔ ناٹا قد مگر بدن کستری تھا اُس کی بھیڈو ٹکر بہت مشہور تھی۔ ایسے زور سے مدمقابل کے سینے میں یا پیٹ میں اپنے سر ٹکر مارتا کہ اُس کے سارے وجود میں زلزلہ سا آ جاتا۔ ایف۔ اے کے دوسرے سال میں اُس نے تفریحاً پرنسپل کی نئی موٹر کے پٹرول ٹینک میں چار آنے کی شکر ڈال دی جس نے کاربن بن کر سارے انجن کو غارت کر دیا پرنسپل کو کسی نہ کسی طریقے سے معلوم ہو گیا کہ یہ خطرناک شرارت پھوجے کی ہے مگر حیرت ہے کہ اُنھوں نے اس کو معاف کر دیا بعد میں معلوم ہوا کہ پھوجے کو اُن کے بہت سے راز معلوم تھے۔ ویسے وہ قسمیں کھاتا کہ اس نے ان کو دھمکی وغیرہ بالکل نہیں دی تھی کہ انھوں نے سزا دی تو وہ انھیں فاش کر دے گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کا بہت زور تھا۔ انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا جلسے ہوتے تھے۔ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کئی ناکام سازشیں ہو چکی تھی۔ گرفتاریوں کی بھرمار تھی۔ سب جیل باغیوں سے پُر تھے۔ آئے دن ریل کی پٹڑیاں اُکھاڑی جاتی تھیں۔ خطوں کے بھبکوں میں آتش گیر مادہ ڈالا جاتا تھا۔ بم بنائے جا رہے تھے پستول برآمد ہوتے تھے غرض کہ ایک ہنگامہ برپا تھا اور اس میں اسکول اور کالجوں کے طالب علم بھی شامل تھے۔ پھوجا سیاسی آدمی بالکل نہیں تھا۔ میرا خیال ہے اُس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مہاتما گاندھی کون ہے۔ لیکن جب اچانک ایک روز اُسے پولیس نے گرفتار کیا اور وہ بھی ایک سازش کے سلسلے میں تو سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے کئی سازشیں پکڑی جا چکی تھیں۔ سانڈرس کے قتل کے سلسلے میں بھگت سنگھ اور دت کو پھانسی بھی ہو چکی تھی اس لیے یہ نیا معاملہ بھی کچھ سنگین ہی معلوم ہوتا تھا الزام یہ تھا کہ مختلف کالجوں کے لڑکوں نے مل کر ایک خفیہ جماعت بنا لی تھی جس کا مقصد ملک معظم کی سلطنت کا تختہ اُلٹنا تھا۔ ان میں سے کچھ لڑکوں نے کالج کی لیبارٹری سے پکرک ایسڈ چرایا تھا جو بم بنانے کے کام آتا ہے۔ پھوجے کے بارے میں شُبہ تھا کہ وہ ان کا سرغنہ تھا اور اس کو تمام خفیہ باتوں کا علم تھا۔! اس کے ساتھ کالج کے دو اور لڑکے بھی پکڑے گئے تھے ان میں ایک مشہور بیرسٹر کا لڑکا تھا اور دوسرا رئیس زادہ۔ ان کا ڈاکٹری معائنہ کرایا گیا تھا اس لیے پولیس کی مار پیٹ سے بچ گئے مگر شامت غریب

پھوجے حرامدے کی آئی۔ تھانے میں اُس کو الٹالٹکا کر پیٹا گیا۔ برف کی سلوں پر کھڑا کیا گیا۔ غرض کہ ہر قسم کی جسمانی اذّیت اُسے پہنچائی گئی کہ راز کی باتیں اُگل دے مگر وہ بھی ایک کتے کی ہڈی تھا، ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ یہاں بھی کم بخت اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا۔ ایک مرتبہ جب وہ مار برداشت نہ کر سکتا اُس نے تھانے دار سے ہاتھ روک لینے کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ وہ سب کچھ بتادے گا۔ بالکل نڈھال تھا اس کے لیے اُس نے گرم گرم دُودھ اور جلیبیاں مانگیں۔ طبیعت قدرے بحال ہوئی تو تھانیدار نے کاغذ قلم سنبھالا اور اُس سے کہا لو بھئی بتاؤ۔ پھوجے نے اپنے مار کھائے ہوے اعضاء کا جائزہ انگڑائی لے کر کیا اور جواب دیا

”اب کیا بتاؤں طاقت آگئی ہے چڑھالو پھر مجھے اپنی ٹکٹکی پر۔“

ایسے اور بھی کئی قصے ہیں جو مجھے یاد نہیں رہے مگر وہ بہت پُر لطف تھے۔ ملک حفیظ ہمارا ہم جماعت تھا، اُس کی زبان سے آپ سُنتے تو اور ہی مزا آتا۔ ایک دن پولیس کے دو سپاہی پھوجے کو عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہے تھے۔ ضلع کچہری میں اُس کی نظر ملک حفیظ پر پڑی، جو معلوم نہیں کس کام سے وہاں آیا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی وہ پکارا۔

”السلام علیکم ملک صاحب۔“

ملک صاحب چونکے۔ پھوجا ہتھکڑیوں میں اُن کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”ملک صاحب بہت اُداس ہو گیا ہوں، جی چاہتا ہے آپ بھی آجائیں میرے پاس۔ بس میرا نام لے دینا کافی ہے۔“

ملک حفیظ نے جب یہ سُنا تو اُس کی رُوح قبض ہو گئی۔ پھوجے نے اُس کو ڈھارس دی۔

”گھبراؤ نہیں ملک، میں تو مذاق کر رہا ہوں۔ ویسے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔“

اب آپ ہی بتائیے کہ وہ کس لائق تھا۔ ملک حفیظ گھبرا رہا تھا۔ کنی کترا کے بھاگنے ہی والا تھا کہ پھوجے نے کہا

”بھئی اور تو ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا کہو تو تمہارے بدبودار کنویں کی گار نکلوا دیں۔“

ملک حفیظ ہی آپ کو بتا سکتا ہے کہ پھوجے کو اس کنوئیں سے کتنی نفرت تھی۔ اس کے پانی سے ایسی بساند آتی تھی جیسے مرنے ہوئے چوہے سے۔ معلوم نہیں لوگ اسے صاف کیوں نہیں کراتے تھے۔ ایک ہفتے کے بعد جیسا کے ملک حفیظ کا بیان ہے وہ باہر نہانے کے لیے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو تین ٹوبے کنوئیں کی گندگی نکالنے میں مصروف ہیں۔ بہت حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے۔ اُنھیں بلایا کس نے ہے؟ پڑوسیوں کا یہ خیال تھا کہ بڑے ملک صاحب کو بیٹھے بیٹھے خیال آگیا ہو گا کہ چلو کنوئیں کی صفائی ہو جائے، یہ لوگ بھی کیا یاد رکھیں گے لیکن جب اُنھیں معلوم ہوا کہ چھوٹے ملک کو اس بارے میں کچھ علم نہیں اور یہ کہ بڑے تو شکار پر گئے ہوئے ہیں تو انھیں حیرت ہوئی۔ پولیس کے بے وردی سپاہی دیکھے تو معلوم ہوا کہ پھوجے حرامدے کی نشاندہی پر وہ کنویں میں سے بم نکال رہے ہیں۔ بہت دیر تک گندگی نکلتی رہی۔ پانی صاف شفاف ہو گیا مگر بم کیا ایک چھوٹا سا پٹاخہ بھی برآمد نہ ہو گا۔ پولیس بہت بھنائی چنانچہ پھوجے سے باز پُرس ہوئی۔ اُس نے مسکرا کر تھانیدار سے کہا

”بھولے بادشاہو! ہمیں تو اپنے یار کا کنواں صاف کرانا تھا سو کرا لیا۔“

بڑی معصوم سی شرارت تھی مگر پولیس نے اسے وہ مارا وہ مارا کہ مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اور ایک دن یہ خبر آئی کہ پھوجا سلطانی گواہ بن گیا ہے اُس نے وعدہ کر لیا ہے کہ سب کچھ بک دے گا۔ کہتے ہیں اس پر بڑی لعن طعن ہوئی اُس کے دوست ملک حفیظ نے بھی جو حکومت سے بہت ڈرتا تھا اُس کو بہت گالیاں دیں کہ حرام زادہ ڈر کے غدار بن گیا ہے معلوم نہیں اب کس کس کو پھنسائے گا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ وہ مار کھا کھا کے تھک گیا۔ جیل میں اُس سے کسی کو ملنے نہیں دیا جاتا تھا، مرغن غذائیں کھانے کو دی جاتی تھیں مگر سونے نہیں دیا جاتا تھا۔ کم بخت کو نیند بہت پیاری تھی اس لیے تنگ آکر اُس نے سچے دل سے وعدہ کر لیا کہ بم بنانے کی سازش کے جملہ حالات بتادے گا۔ یوں تو وہ جیل ہی میں تھا مگر اب اس پر کوئی سختی نہ تھی کئی دن تو اُس نے آرام کیا کہ اُس کے بند بند ڈھیلے ہو چکے تھے اچھی خوراک ملی بدن پر مالشیں ہوئیں تو وہ بیان لکھوانے کے قابل ہو گیا۔ صبح لسی کے دو گلاس پی کر وہ اپنی داستان شروع کر دیتا تھوڑی دیر کے بعد ناشتا آتا۔ اس سے فارغ ہو کر پندرہ بیس منٹ آرام کرتا اور کڑی سے کڑی ملا کر اپنا بیان جاری رکھتا۔ آپ محمد حسین اسٹینو گرافر سے پوچھیے جس نے اس کا بیان ٹائپ کیا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ پھوجے حرامدے نے پورا ایک مہینہ لیا اور وہ سارا جال کھول کر رکھ دیا جو سازشیوں نے ملک کے اس کونے سے اُس کونے تک بچھایا تھا یا بچھانے کا ارادہ رکھتے تھے اس نے سینکڑوں آدمیوں کے نام لیے۔ ایسی ہزاروں جگہوں کا پتا بتایا جہاں سازشی لوگ چھپ کے ملتے تھے اور حکومت کا تختہ اُلٹنے کی ترکیبیں سوچتے تھے۔ یہ بیان محمد حسین اسٹینو گرافر کہتا ہے فل اسکیپ کے ڈھائی سو صفحوں پر پھیلا ہوا تھا جب یہ ختم ہوا تھا تو پولیس نے اُسے سامنے رکھ کر پلان بنایا۔ چنانچہ فوراً نئی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور ایک بار پھر پھوجے کی ماں بہن پُنی جانے لگی۔ اخباروں نے بھی دبی زبان میں پھوجے کے خلاف کافی زہر اُگلا۔ اکثر حکام کے خلاف تھی اس لیے اُس کی غداری کی ہر جگہ مذمت ہوتی تھی۔ وہ جیل میں تھا جہاں اُس کی خوب خاطر تواضع ہو رہی تھی۔ بڑی طرّے والی کلف لگی پگڑی سر پر باندھے دو گھوڑے بوسکی کی قمیص اور چالیس ہزار لٹھے کی گھیرے دار شلوار پہنے وہ جیل میں یوں ٹہلتا تھا جیسے کوئی افسر معائنہ کر رہا ہے۔ جب ساری گرفتاریاں عمل میں آگئیں اور پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تو، سازش کا یہ معرکہ انگیز کیس عدالت میں پیش ہوا۔ لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ پولیس کی حفاظت میں جب پھوجا نمودار ہوا تو غصے سے بھرے ہوئے نعرے بلند ہوئے۔

”پھوجا حرام دا امر دہ باد۔ پھوجا غدار مر دہ باد۔“

ہجوم بہت مشتعل تھا خطرہ تھا کہ پھوجے پر نہ ٹُوٹ پڑے اس لیے پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا جس کے باعث کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ پھوجے سے جب یہ پوچھا گیا کہ وہ اس بیان کے متعلق کیا کہنا چاہتا ہے جو اُس نے پولیس کو دیا تھا تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”جناب میں نے کوئی بیان ویان نہیں دیا۔ ان لوگوں نے ایک پلندہ سا تیار کیا تھا جس پر میرے دستخط کروا لیے تھے۔“

یہ سُن کر انسپکٹر پولیس کی بقول پھوجے کے

”بھنبھیری بھول گئی“

اور جب یہ خبر اخباروں میں چھپی تو سب چکرا گئے کہ پھوجے حرامدے نے یہ کیا نیا چکر چلایا ہے۔ چکر نیا ہی تھا کیونکہ عدالت میں اُس نے ایک نیا بیان لکھوانا شروع کیا جو پہلے بیان سے بالکل مختلف تھا یہ قریب قریب پندرہ دن جاری رہا جب ختم ہوا۔ تو فل اسکیپ کے ۱۵۸ صفحے کالے ہو چکے تھے۔ پھوجے کا کہنا ہے کہ اس بیان سے جو حالت پولیس والوں کی ہوئی نا قابلِ بیان ہے۔ انھوں نے جو عمارت کھڑی کی تھی کم بخت نے اُس کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر رکھ دی۔ سارا کیس چوپٹ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سازش میں جتنے گرفتار ہوئے تھے ان میں سے اکثر بری ہو گئے۔ دو تین کو تین تین برس کی اور چار پانچ کو چھے چھے مہینے کی سزائے قید ہوئی۔ جو سُن رہے تھے ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”اور پھوجے کو؟“

مہر فیروز نے کہا۔

”پھوجے کو کیا ہونا تھا وہ تو وعدہ معاف یعنی سلطانی گواہ تھا“

سب نے پھوجے کی حیرت انگیز ذہانت کو سراہا کہ اُس نے پولیس کو کس صفائی سے غچہ دیا۔ ایک نے جس کے دل و دماغ کو اس کی شخصیت نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا مہر فیروز سے پوچھا

”آج کل کہاں ہوتا ہے؟“

”یہیں لاہور میں۔ آڑھت کی دُکان ہے“

اتنے میں بیرہ بل لے کر آیا اور پلیٹ بھر فیروز کے سامنے رکھ دی، کیونکہ چائے وغیرہ کا آرڈر اُسی نے دیا تھا۔ پھوجے کی شخصیت سے متاثر شدہ صاحب نے بل دیکھا اور اُن کا آگے بڑھنے والا ہاتھ رُک گیا کیونکہ رقم زیادہ تھی چنانچہ ایسے ہی مہر فیروز سے مخاطب ہوئے۔

”آپ کے اس پھوجے حرامدے سے کبھی ملنا چاہیے“

مہر فیروز اُٹھا

”آپ اس سے مل چکے ہیں۔ یہ خاکسار ہی پھوجا حرامدا ہے۔ بل آپ ادا کر دیجیے گا۔ السلام علیکم“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

پھُولوں کی سازش

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپُھولوں کی سازش

باغ میں جتنے پھول تھے۔ سب کے سب باغی ہو گئے۔ گلاب کے سینے میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کی ایک ایک رگ آتشیں جذبہ کے تحت پھڑک رہی تھی۔ ایک روز اس نے اپنی کانٹوں بھری گردن اٹھائی اور غور و فکر کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا:۔

”کسی کو کوئی حق حاصل نہیں کہ ہمارے پسینے سے اپنے عیش کا سامان مہیا کرے۔ ہماری زندگی کی بہاریں ہمارے لیے ہیں اور ہم اس میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کر سکتے“!

گلاب کا منہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔ اس کی پنکھڑیاں تھر تھرا رہی تھیں۔ چنبلی کی جھاڑی میں تمام کلیاں یہ شور سن کر جاگ اٹھیں اور حیرت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ گلاب کی مردانہ آواز پھر بلند ہوئی۔

”ہر ذی روح کو اپنے حقوق کی نگرانی کا حق حاصل ہے اور ہم پھول اس سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ ہمارے قلوب زیادہ نازک اور حساس ہیں۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا ہماری دنیائے رنگ و بو کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے اور شبنم کا ایک بے معنی قطرہ ہماری پیاس بجھا سکتا ہے۔ کیا ہم اس کانے مالی کے کھردرے ہاتھوں کو برداشت کر سکتے ہیں جس پر موسموں کے تغیر و تبدل کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا؟“

موتیا کے پھول چلائے

“ہرگز نہیں”

لالہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور کہنے لگا اس کے ظلم سے میرا سینہ داغدار ہو رہا ہے۔ میں پہلا پھول ہوں گا جو اس جلاد کے خلاف بغاوت کا سُرخ جھنڈا بلند کرے گا۔”

یہ کہہ کر وہ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔ چنبیلی کی کلیاں متحیر تھیں کہ یہ شور کیوں بلند ہو رہا ہے۔ ایک کلی ناز کے ساتھ گلاب کے پودے کی طرف جھکی اور کہنے لگی

“تم نے میری نیند خراب کر دی ہے۔ آخر گلا پھلا پھلا کر کیوں چلاّ رہے ہو؟”

گلِ خیرا جو دُور کھڑا گلاب کی قائدانہ تقریر پر غور کر رہا تھا بولا۔

“قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔ گو ہم ناتواں پھول ہیں لیکن اگر ہم سب مل جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی جان کے دشمن کو پیس کر نہ رکھ دیں۔ ہماری پتیاں اگر خوشبو پیدا کرتی ہیں تو زہریلی گیس بھی تیار کر سکتی ہیں۔ بھائیو! گلاب کا ساتھ دو اور اپنی فتح سمجھو۔”

یہ کہہ کر اس نے اخوت کے جذبے کے ساتھ ہر پھول کی طرف دیکھا۔ گلاب کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چنبیلی کی کلی نے اپنے مرمریں جسم پر ایک تھر تھری پیدا کرتے ہوئے کہا۔

“یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ آؤ تم مجھے شعر سناؤ، میں آج تمہاری گود میں سونا چاہتی ہوں۔ تم شاعر ہو، میرے پیارے آؤ ہم بہار کے ان خوشگوار دنوں کو ایسی فضول باتوں میں ضائع نہ کریں اور اس دنیا میں جائیں جہاں نیند ہی نیند ہے۔ میٹھی اور راحت بخش نیند”!

گُلاب کے سینے میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اس کی نبض کی دھڑکن تیز ہو گئی اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی اتھاہ گہرائی میں اُتر رہا ہے۔ اسی نے کلی کی گفتگو کے اثر کو دور کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

“نہیں میں میدانِ جنگ میں اُترنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ اب یہ تمام رومان میرے لیے مہمل ہیں۔”

کلی نے اپنے لچکیلے جسم کو بل دے کر خواب گوں لہجہ میں کہا۔

“آہ، میرے پیارے گلاب ایسی باتیں نہ کرو، مجھے وحشت ہوتی ہے۔ چاندنی راتوں کا خیال کرو۔ جب میں اپنا لباس اتار کر اس نورانی فوارے کے نیچے نہاؤں گی تو تمہارے گالوں پر سُرخی کا اُتار چڑھاؤ مجھے کتنا پیارا معلوم ہو گا اور تم میرے سیمیں لب کس طرح دیوانہ وار چومو گے۔ چھوڑو ان فضول باتوں کو میں تمہارے کاندھے پر سر رکھ کر سونا چاہتی ہُوں۔”

اور چنبیلی کی نازک ادا کلی گُلاب کے تھرّاتے ہُوئے گال کے ساتھ لگ کر سو گئی۔ گلاب مدہوش ہو گیا۔ چاروں طرف سے ایک عرصہ تک دوسرے پھولوں کی صدائیں بُلند ہوتی رہیں مگر گُلاب نہ جاگا۔ ساری رات وہ مخمور رہا۔ صبح کا نا مالی آیا۔ اس نے گلاب کے پھول کی ٹہنی کے ساتھ چنبیلی کی کلی چمٹی ہُوئی پائی۔ اس نے اپنا کُھردرا ہاتھ بڑھایا اور دونوں کو توڑ لیا۔

پیرن

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوپیرن

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بے حد مفلس تھا۔ بمبئی میں نو روپے ماہوار کی ایک کھولی میں رہتا تھا جس میں پانی کا نل تھا نہ بجلی۔ ایک نہایت ہی غلیظ کوٹھڑی تھی جس کی چھت پر سے ہزار ہا کھٹمل میرے اوپر گرا کرتے تھے۔ چوہوں کی بھی کافی بہتات تھی۔ اتنے بڑے چوہے میں نے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ بلیلاں ان سے ڈرتی تھیں۔ چالی یعنی بلڈنگ میں صرف ایک غسل خانہ تھا۔ جس کے دروازے کی کنڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ صبح سویرے چالی کی عورتیں پانی بھرنے کے لیے اس غسل خانے میں جمع ہوتی تھیں۔ یہودی، مرہٹی، گجراتی، کرسچین۔ بھانت بھانت کی عورتیں۔ میرا یہ معمول تھا کہ ان عورتوں کے اجتماع سے بہت پہلے غسل خانے میں جاتا، دروازہ بھیڑتا اور نہانا شروع کر دیتا۔ ایک روز میں دیر سے اٹھا۔ غسل خانے میں پہنچ کر نہانا شروع کیا تو تھوڑی دیر کے بعد کھٹ سے دروازہ کھلا۔ میری پڑوسن تھی۔ بغل میں گاگر دبائے اس نے معلوم نہیں کیوں ایک لحظے کے لیے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر ایک دم پلٹی۔ گاگر اس کی بغل سے پھسلی اور فرش پر لڑھکنے لگی۔ ایسی بھاگی جیسے کوئی شیر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ میں بہت ہنسا، اٹھ کر دروازہ بند کیا اور نہانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازہ کھلا۔ برج موہن تھا۔ میں نہا کے فارغ ہو چکا تھا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

“بھئی منٹو آج اتوار ہے۔”

مجھے یاد آگیا کہ برج موہن کو باندرہ جانا تھا، اپنی دوست پیرن سے ملنے کے لیے۔ وہ ہر اتوار کو اس سے ملنے جاتا تھا۔ وہ ایک معمولی سی شکل وصورت کی پارسی لڑکی تھی جس سے برج موہن کا معاشقہ قریباً تین برس سے چل رہا تھا۔ ہر اتوار کو برج موہن مجھ سے آٹھ آنے ٹرین کے کرائے کے لیے لیتا۔ پیرن کے گھر پہنچتا۔ دونوں آدھے گھنٹے تک آپس میں باتیں کرتے برج موہن اسٹرٹیڈ ویکلی کے کراس ورڈ پزل کے حل اس کو دیتا اور چلا آتا۔ وہ بیکار تھا۔ سارا دن سر نیوڑھائے یہ پزل اپنی دوست پیرن کے لیے حل کرتا رہتا تھا۔ اس کو چھوٹے

چھوٹے کئی انعام مل چکے تھے مگر وہ سب پیرن نے وصول کیے تھے۔ برج موہن نے ان میں سے ایک دمڑی بھی اس سے نہ مانگی تھی۔ برج موہن کے پاس پیرن کی بے شمار تصویریں تھیں۔ شلوار قمیض میں چست پاجامے میں، ساڑھی میں، فراک میں، بیڈنگ کسٹیوم میں، فینسی ڈریس میں۔ غالباً سو سے اوپر ہو گی۔ پیرن قطعاً خوبصورت نہیں تھی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بہت ہی ادنیٰ شکل وصورت کی تھی لیکن میں نے اپنی اس رائے کا اظہار برج موہن سے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پیرن کے متعلق کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیا کرتی ہے، برج موہن سے اس کی ملاقات کیسے ہوئی، عشق کی ابتدا کیوں کر ہوئی۔ کیا وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟۔ برج موہن نے بھی اس کے بارے میں مجھ سے کبھی بات چیت نہ کی تھی۔ بس ہر اتوار کو وہ ناشتے کے بعد مجھ سے آٹھ آنے کرائے کے لیتا اور اس سے ملنے کے لیے باندرہ روانہ ہو جاتا اور دوپہر تک لوٹ آتا۔ میں نے کھولی میں جا کر اس کو آٹھ آنے دیے، وہ چلا گیا۔ دوپہر کو لوٹا تو اس نے خلافِ معمول مجھ سے کہا۔

”آج معاملہ ختم ہو گیا۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کونسا معاملہ ؟“

مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس معاملے کی بات کر رہا ہے۔ برج موہن نے سوچا جیسے اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

”مجھ سے کہا۔ پیرن سے آج دوٹوک فیصلہ ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ جب بھی تم سے ملنا شروع کرتا ہوں مجھے کام نہیں ملتا۔ تم بہت منحوس ہو۔ اس نے کہا بہتر ہے، ملنا چھوڑ دو۔ دیکھوں گی تمہیں کیسے کام ملتا ہے۔ میں منحوس ہوں، مگر تم اول درجے کے نکھٹو اور کام چور ہو۔ سو اب یہ قصہ ختم ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے انشاء اللہ کل ہی مجھے کام مل جائے گا۔ صبح تم مجھے چار آنے دینا۔ میں سیٹھ نانو بھائی سے ملوں گا، وہ مجھے ضرور اپنا اسسٹنٹ رکھ لے گا۔“

یہ سیٹھ نانو بھائی جو فلم ڈائریکٹر تھا متعدد مرتبہ برج موہن کو ملازمت دینے سے انکار کر چکا تھا۔ کیونکہ اس کا بھی پیرن کی طرح یہی خیال تھا کہ وہ کام چور اور نکما ہے لیکن دوسرے روز جب برج موہن مجھ سے چار آنے لے کر گیا تو دوپہر کو اس نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ سیٹھ نانو بھائی نے بہت خوش ہو کر اسے ڈھائی سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا ہے۔ کنٹریکٹ ایک برس کا ہے جس پر دستخط ہو چکے ہیں پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے نکالے اور مجھے دکھائے۔

”یہ ایڈوانس ہے۔ جی تو میرا چاہتا ہے کنٹریکٹ اور سو روپے لے کر باندرہ جاؤں اور پیرون سے کہوں کہ لو دیکھو، مجھے کام مل گیا ہے، لیکن ڈر ہے کہ نانو بھائی مجھے فوراً جواب دے دے گا۔ میرے ساتھ ایک نہیں کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ ادھر ملازمت ملی، ادھر پیرن سے ملاقات ہوئی۔ معاملہ صاف۔ کسی نہ کسی بہانے مجھے نکال باہر کیا گیا۔ خدا معلوم اس لڑکی میں یہ نحوست کہاں سے آگئی۔ اب میں کم از کم ایک برس تک اس کا منہ نہیں دیکھوں گا۔ میرے پاس کپڑے بہت کم رہ گئے ہیں۔ ایک برس لگا کر کچھ بنوالوں تو پھر دیکھا جائے گا۔“

چھ مہینے گزر گئے۔ برج موہن برابر کام پر جا رہا تھا۔ اس نے کئی نئے کپڑے بنوا لیے تھے۔ ایک درجن رومال بھی خرید لیے تھے۔ اب وہ تمام چیزیں اس کے پاس تھیں جو ایک کنوارے آدمی کے آرام و آسائش کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک روز وہ اسٹوڈیو گیا ہوا تھا کہ اس کے نام ایک خط آیا۔ شام کو جب وہ لوٹا تو میں اسے یہ خط دینا بھول گیا۔ صبح ناشتے پر مجھے یاد آیا تو میں نے یہ خط اس کے حوالے کر دیا۔ لفافہ پکڑتے ہی وہ زور سے چیخا۔

”لعنت“!

میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

وہی پیرن۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی۔“

یہ کہہ کر اس نے چیچ سے لفافہ کھول کر خط کا کاغذ نکالا اور مجھ سے کہا۔

”وہی کم بخت ہے۔ میں کبھی اس کا ہینڈ رائٹنگ بھول سکتا ہوں۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا لکھتی ہے؟“

”میرا سر۔ کہتی ہے مجھ سے اس اتوار کو ضرور ملو۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔

”یہ کہہ کر برج موہن نے خط لفافے میں ڈالا اور جیب میں رکھ لیا۔ لو بھئی منٹو، نوکری سے انشاء اللہ کل ہی جواب مل جائے گا۔“

”کیا بکواس کرتے ہو۔“

موہن نے بڑے وثوق سے کہا۔

”نہیں منٹو تم دیکھ لینا۔ کل اتوار ہے۔ پرسوں منٹو بھائی کو ضرور مجھ سے کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہوگی اور وہ مجھے فوراً نکال باہر کرے گا۔“

میں نے اس سے کہا۔

”اگر تمہیں اتنا وثوق ہے تو مت جاؤ اس سے ملنے۔“

”یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ بلائے تو مجھے جانا ہی پڑتا ہے۔“

”کیوں؟“

”ملازمت کرتے کرتے کچھ میں بھی اکتا چکا ہوں۔ چھ مہینے سے اوپر ہوگئے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور چلا گیا۔ دوسرے روز ناشتہ کرکے وہ باندرہ چلا گیا۔ پیرن سے ملاقات کرکے لوٹا۔ تو اس نے اس ملاقات کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”مل آئے اپنے منحوس ستارے سے؟“

”ہاں بھئی۔ اس سے کہہ دیا کہ ملازمت سے بہت جلد جواب مل جائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ کھاٹ پر سے اٹھا۔

”چلو آؤ کھانا کھائیں۔“

ہم دونوں نے حاجی کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس دوران میں پیرن کی کوئی بات نہ ہوئی۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے صرف اتنا کہا۔

”اب دیکھیے کل کیا گل کھلتا ہے۔“

میرا خیال تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ مگر دوسرے روز برج موہن خلافِ معمول اسٹوڈیو سے جلدی لوٹ آیا مجھ سے ملا تو خوب زور سے ہنسا

”اور دونوں بھائی۔ میں نے سمجھا مذاق کر رہا ہے۔

”ہٹاؤ جی۔“

”جو ہٹنا تھا وہ تو ہٹ گیا۔ اب میں کیسے ہٹاؤں۔ سیٹھ نانو بھائی پر ٹانچ آگئی ہے۔ اسٹوڈیو سیل ہوگیا ہے۔ میری وجہ سے خواہ مخواہ بیچارے نانو بھائی پر بھی آفت آئی۔“

یہ کہہ کر برج موہن پھر ہنسنے لگا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔

”یہ عجیب سلسلہ ہے“!

”دیکھ لو۔ اسے کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔“

برج موہن نے سگریٹ سلگایا اور کیمرہ اٹھا کر باہر گھومنے چلا گیا۔ برج موہن اب بیکار تھا۔ جب اس کی جمع پونجی ختم ہوگئی تو اس نے ہر اتوار کو پھر مجھ سے باندرہ جانے کے لیے آٹھ آنے مانگنے شروع کر دیے۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں آدھ پون گھنٹے میں وہ پیرن سے کیا باتیں کرتا تھا۔ ویسے وہ بہت اچھی گفتگو کرنے والا تھا۔ مگر اس لڑکی سے جس کی نحوست کا اس کو مکمل طور پر یقین تھا وہ کس قسم کی باتیں کرتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔

”برج، کیا پیرن کو بھی تم سے محبت ہے؟“

”نہیں، وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔“

”تم سے کیوں ملتی ہے؟“

”اس لیے کہ میں ذہین ہوں، اس کے بھدے چہرے کو خوبصورت بنا کر پیش کرسکتا ہوں۔ اس کے لیے کراس ورڈ پزل حل کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اس کو انعام بھی دلوا دیتا ہوں۔ منٹو، تم نہیں جانتے ان لڑکیوں کو۔ میں خوب پہچانتا ہوں انھیں۔ جس سے وہ محبت کرتی ہے، اس میں جو کمی ہے، مجھ سے مل کر پوری کر لیتی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

”بڑی چار سو بیس ہے“!

میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”مگر تم کیوں اس سے ملتے ہو؟“

برج موہن ہنسا، چشمے کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑ کر اس نے کہا۔

”مجھے مزا آتا ہے۔“

"کس بات کا۔"

"اس نحوست کا۔ میں اس کا امتحان لے رہا ہوں۔ اس کی نحوست کا امتحان۔ یہ نحوست اپنے امتحان میں پوری اتری ہے۔ میں نے جب بھی اس سے ملنا شروع کیا، مجھے اپنے کام سے جواب ملا۔ اب میری ایک خواہش ہے کہ اس کے منحوس اثر کو چکمہ دے جاؤں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

برج موہن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ملازمت سے جواب ملنے سے پہلے ملازمت سے علیحدہ ہو جاؤں، یعنی خود اپنے آقا کو جواب دے دوں اس سے بعد میں کہوں، جناب مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے برطرف کرنے والے ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کو زحمت نہ دی اور خود علیحدہ ہو گیا اور آپ مجھے برطرف نہیں کر رہے تھے، یہ میری دوست پیرن تھی جس کی ناک کیمرے میں اس طرح گھستی ہے جیسے تیر"!

برج موہن مسکرایا۔

"یہ میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے، دیکھو پوری ہوتی ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا۔

"عجیب و غریب خواہش ہے۔"

"میری ہر چیز عجیب و غریب ہوتی ہے۔ پچھلے اتوار میں نے پیرن کے اس دوست کے لیے جس سے وہ محبت کرتی ہے، ایک فوٹو تیار کر کے دیا۔ الو کی دم اسے کمپی ٹیشن میں بھیجے گا۔ یقینی طور پر انعام ملے گا اسے۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ برج موہن واقعی عجیب و غریب آدمی تھا۔ وہ پیرن کے دوست کو کئی بار فوٹو تیار کر کے دے چکا ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی میں یہ فوٹو اس کے نام سے چھپتے تھے اور پیرن بہت خوش ہوتی تھی۔ برج موہن ان کو دیکھتا تھا تو مسکرا دیتا تھا۔ وہ پیرن کے دوست کی شکل صورت سے نا آشنا تھا، پیرن نے برج موہن سے اس کی ملاقات تک نہ کرائی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کسی مل میں کام کرتا ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ ایک اتوار کو برج باندرہ سے واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔

"لو بھئی منٹو، آج معاملہ ختم ہو گیا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"پیرن والا؟"

"ہاں بھئی۔ کپڑے ختم ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ یہ سلسلہ ختم کرو۔ اب انشاء اللہ دنوں ہی میں کوئی نہ کوئی ملازمت مل جائے گی۔ میرا خیال ہے سیٹھ نیاز علی سے ملوں۔ اس نے ایک فلم بنانے کا اعلان کیا ہے۔ کل ہی جاؤں گا۔ تم یار ذرا اس کے دفتر کا پتا لگا لینا۔ میں نے اس کے دفتر کا نیا فون ایک دوست سے پوچھ کر برج موہن کو بتا دیا۔ وہ دوسرے روز وہاں گیا۔ شام کو لوٹا۔ اس کے مطمئن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"لو بھئی منٹو۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ٹائپ شدہ کاغذ نکالا اور میری طرف پھینک دیا۔

"ایک پکچر کا کنٹریکٹ۔ تنخواہ دو سو روپے ماہوار۔ کم ہے۔ لیکن سیٹھ نیاز علی نے کہا ہے، بڑھا دوں گا۔ ٹھیک ہے"!

میں ہنسا۔

"اب پیرن سے کب ملو گے؟"

برج موہن مسکرایا۔

"کب ملوں گا؟"

میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اس سے کب ملنا چاہیے۔ منٹو یار، میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک میری چھوی سی خواہش ہے، بس وہ پوری ہو جائے۔ میرا خیال ہے مجھے اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ذرا میرے تین چار جوڑے بن جائیں۔ پچاس روپے ایڈوانس لے کر آیا ہوں پچیس تم رکھ لو۔"

پچیس میں نے لیے۔ ہوٹل والے کا قرض تھا جو فوراً چکا دیا گیا۔ ہمارے دن بڑی خوشحالی میں گزرنے لگے۔ سو روپیہ ماہوار میں کما لیتا تھا۔ دو سو روپے ماہانہ برج موہن لے آتا تھا۔ بڑے عیش تھے۔ پانچ مہینے گزر گئے کہ اچانک ایک روز پیرن کا خط برج موہن کو وصول ہوا۔

”لو بھئی منٹو، عزرائیل صاحب تشریف لے آئے۔“

صحیح بات ہے کہ میں نے اس وقت خط دیکھ کر خوف سا محسوس کیا مگر برج موہن نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ خط کا کاغذ نکال کر پڑھا۔ بالکل مختصر تحریر تھی۔ میں نے برج سے پوچھا۔

”کیا فرماتی ہیں؟“

”فرماتی ہیں، اتوار کو مجھ سے ضرور ملو۔ ایک اشد ضروری کام ہے۔“

برج موہن نے خط لفافے میں واپس ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”جاؤ گے؟“

”جانا ہی پڑے گا۔“

پھر اس نے یہ فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔

”مت بھول مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا“!

مت نے اس سے کہا۔

”برج مت جاؤ اس سے ملنے۔ بڑے اچھے دن گزر رہے ہیں ہمارے۔ تم نہیں جانتے، میں خدا معلوم کس طرح تمہیں آٹھ آنے دیا کرتا تھا۔“

برج موہن مسکرایا۔

”مجھے سب معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ اب وہ دن پھر آنے والے ہیں۔ جب تم خدا معلوم کس طرح مجھے ہر اتوار آٹھ آنے دیا کرو گے“!

اتوار کو برج، پیرن سے ملنے باندرہ گیا۔ واپس آیا تو اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔

”میں نے اس سے کہا، یہ بارھویں مرتبہ ہے مجھے تمہاری نحوست کی وجہ سے برطرف ہونا پڑے گا۔ تم پر زحمت ہو زرتشت کی“!

میں نے پوچھا۔

”اس نے یہ سن کر کچھ کہا۔“

برج نے جواب دیا۔

”فقط یہ۔ تم سلی ایڈیٹ ہو“!

”تم ہو؟“

”سو فی صدی“!

یہ کہہ کر برج ہنسا۔

”اب میں کل صبح دفتر جاتے ہی استعفیٰ پیش کر دینے والا ہوں۔ میں نے وہیں پیرن کے ہاں لکھ لیا تھا۔“

برج موہن نے مجھے استعفے کا کاغذ دکھایا۔ دوسرے روز خلافِ معمول اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو لوٹا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے ہی بالآخر اس سے پوچھنا پڑا۔

”کیوں برج، کیا ہوا؟“

اس نے بڑی امیدی سے سر ہلایا،

”کچھ نہیں۔ سارا قصہ ہی ختم ہو گیا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے سیٹھ نیاز علی کو اپنا استعفےٰ پیش کیا تو اس نے مسکرا کر مجھے ایک آفیشل خط دیا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ میری تنخواہ پچھلے مہینے سے دو سو کے بجائے تین سو روپے ماہوار کر دی گئی ہے؟“

پیرن سے برج موہن کی دلچسپی ختم ہو گئی اس نے مجھ سے ایک روز کہا

”پیرن کی نحوست ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور میرا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب کون مجھے بیکار رکھنے کا موجب ہو گا“!

27جولائی1950ء

تانگے والے کا بھائی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوتانگے والے کا بھائی

سید غلام مرتضیٰ جیلانی میرے دوست ہیں۔ میرے ہاں اکثر آتے ہیں۔ گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ کافی پڑھے لکھے ہیں۔ ان سے میں نے ایک روز کہا!

”شاہ صاحب! آپ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ تو سنایئے“!

شاہ صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔

”منٹو صاحب۔ میری زندگی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کون سا واقعہ آپ کو سناؤں۔“

میں نے ان سے کہا!

”جو بھی آپ کے ذہن میں آجائے۔“

شاہ صاحب مسکرائے۔

”آپ مجھے بڑا پرہیز گار آدمی سمجھتے ہوں گے۔ آپ کو معلوم نہیں میں نے دس برس تک دن رات شراب پی ہے اور خوب کھل کھیلا ہوں۔ اب چونکہ دل اچاٹ ہو گیا ہے اس لیے میں نے شغل چھوڑ رکھے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”کہیں آپ نے شادی تو نہیں کر لی؟“

”حضرت، میں پانچ برس سے لاہور میں ہوں۔ اگر میں نے شادی کی ہوتی تو آپ کو اس کی اطلاع مل جاتی۔“

”تو کیا آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”بڑے تعجب کی بات ہے“!

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری۔

”چلیے۔ آپ کو ایک داستان سنا دوں۔ آپ اسے لکھ کر اپنے پیسے کھرے کر لیجیے گا“

مجھے پیسے کھرے کرنے تو تھے، پھر بھی میں نے ان سے کہا:

”نہیں شاہ صاحب۔ آپ اپنی داستان سنایئے، دیکھیں اس کا افسانہ بنتا بھی ہے کہ نہیں۔ ویسے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں نے آپ کی داستان کو افسانے میں ڈھال لیا تو مجھے جو معاوضہ ملے گا، سب کا سب آپ کا ہو گا۔“

شاہ صاحب ہنسے۔

”چھوڑو یار۔ میں اپنی بیتی ہوئی زندگی کے ٹکڑوں کی قیمت وصول نہیں کرنا چاہتا۔ تم افسانہ نگار لوگ عجیب ذہن کے ہوتے ہو۔ داستان سن لو۔ باقی تم جانو۔ مجھے معاوضے وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں۔“

شاہ صاحب کے لب ولہجہ سے یہ صاف ظاہر تھا کہ انہیں میری بات پسند نہیں آئی اس لیے میں نے اس کے بارے میں مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھی اور ان سے کہا:

”آپ اپنی داستان بیان کرنا شروع کر دیں۔“

شاہ صاحب نے میرے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا اس لیے کہ میں نے انہیں چار پانچ برس کے عرصے میں کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے کہا:

”شاہ صاحب آپ سگریٹ پیتے ہیں“!

شاہ صاحب کے ہونٹوں پر جن میں سگریٹ اٹکا ہوا تھا عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”منٹو صاحب! آپ نے اپنی زندگی میں اتنے سگریٹ نہیں پیے ہوں گے۔ جتنے میں پی چکا ہوں۔ آج آپ نے ایسی بات چھیڑ دی کہ خود بخود میرے ہاتھ آپ کے سگریٹ کیس کی طرف اٹھ گئے۔ وِسکی ہے آپ کے پاس؟“

میں نے جواب دیا:

”جی ہاں۔ ہے۔“

”تو لاؤ۔ ایک پٹیالہ پیگ۔ میں دس برس کا رکھا ہوا روزہ توڑوں گا۔ تم نے آج ایسی باتیں کی ہیں کہ میرا سارا جسم ماضی میں چلا گیا ہے۔“

میں نے اپنی الماری سے وسکی کی بوتل نکالی اور شاہ صاحب کے لیے ایک پٹیالہ پیگ بنا کر حاضر کر دیا۔ انہوں نے ایک ہی جُرعے میں گلاس خالی کر دیا۔ آستین سے ہونٹ صاف کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے

”ہاں تو اب کہانی سنو۔ لیکن یہ بوتل یہاں سے غائب کر دو۔“

میں نے وسکی کی بوتل اٹھائی اور اندر جا کر الماری میں رکھ دی۔ واپس آیا تو دیکھا شاہ صاحب دوسرا سگریٹ سلگا رہے ہیں۔ میں کرسی اٹھا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ مسکرائے۔ لیکن یہ مسکراہٹ کچھ زخمی سی تھی۔ انھوں نے اسی زخمی مسکراہٹ سے کہنا شروع کیا۔

”جو واقعہ میں اب بیان کرنے والا ہوں۔ آج سے قریب قریب دس برس پہلے کا ہے۔ ہمارا حلقۂ احباب زیادہ تر کھاتے پیتے اور کافی مالدار ہندوؤں کا تھا۔ بڑے اچھے لوگ تھے۔ ہر روز پینے پلانے کا شغل رہتا۔ اس حلقے میں میرے علاوہ کئی اور دوستوں کو شراب کے علاوہ عورتوں کی بھی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی ضرورت پوری کرتے۔ مجھ سے کہتے کہ تم بھی آؤ۔ مگر میں انکار کر دیتا۔ اپنی مرضی کے خلاف۔ میرا دل ویسے چاہتا تھا کہ کسی عورت کی قربت نصیب ہو۔“

میں نے شاہ صاحب سے کہا:

”آپ نے شادی کیوں نہ کر لی۔“

”شاہ صاحب نے جواب دیا:

”میں نے۔ سچ پوچھو تو اس کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔“

”کیوں۔“

”کبھی خیال ہی نہ آیا۔“

”خیر۔ آپ اپنی داستان جاری رکھیے“!

شاہ صاحب نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں دبایا۔

”پیارے منٹو! میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کے سوا کسی اور شغل میں نہ پھنسوں۔ لیکن ان کم بختوں نے آخر ایک دن مجھے آمادہ کر ہی لیا اور یہ طے پایا کہ کسی دلال کے ذریعے خوش شکل لونڈیا منگوائی جائے۔ ہم چار دوست فلیٹ سے باہر نکلے تو ایک تانگے والا جو کہ میرا واقف تھا مجھے دیکھ کر پکار اٹھا۔

”شاہ جی۔ شاہ جی۔ آؤ۔ آؤ“:

ہم چاروں دوست اس کے تانگے بیٹھ گئے۔ اس وقت میں پورا پورا قائل ہو چکا تھا کہ شراب کے ساتھ عورت ضرور ہونی چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنی ساری شرافت اپنی جیب میں ڈال کے اس کے کان میں کہا کہ وہ کسی لونڈیا کا بندوبست کر دے۔ جب اس نے یہ سنا تو وہ بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں کبھی ایسی واہیات بات کروں گا۔ لیکن جب میں نے اس کے کان میں پھر کہا کہ مجھے واقعی ایک لڑکی کی اشد ضرورت ہے تو اس نے بڑے ادب سے کہا:

”شاہ جی: تُسیں جو حکم دیو۔ بندہ حاضر اے۔ ایسی تگڑی کُڑی لے کے آواں گا کہ ساری عمر یاد رکھوگے۔“

تانگے والا چلا گیا اور ہم واپس اپنے فلیٹ میں آ گئے۔ شام کا وقت تھا جب وہ یہ مہم سر کرنے کے لیے گیا تھا۔ ہم دیر تک انتظار کرتے رہے۔ طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آتے تھے وہ لڑکی کس قسم کی ہو گی' کہیں کوئی بازاری عورت تو نہ نکل آئے گی۔ ہم جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو تاش کھیلنا شروع کر دی۔ رات کے بارہ بج گئے۔ ہم مایوس ہو کر باہر نکلے تو دیکھا کہ تانگے والا گھوڑے کے چابک لگاتا چلا آ رہا ہے۔ پچھلی نشست پر ایک برقع پوش عورت بیٹھی تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ تانگے والے نے مجھ سے کہا:

”شاہ جی! جو مال میں لینے گیا تھا وہ دِساور چلا گیا ہے۔ اب یہ دوسرا مال بڑی کوششوں سے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔“

میں نے اس کو پانچ روپے دیے۔ پھر ہم چاروں دوست سوچنے لگے کہ اس برقع پوش عورت کو کہاں لے جائیں۔ اپنے فلیٹ میں لے جانا ٹھیک نہیں تھا اس لیے کہ ذمہ داری تھی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا۔ خواہ مخواہ ایک فضیحتا ہو جاتا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے دوست رحمان کے پاس چلیں۔ رات کے ایک بجے کے قریب ہم اس برقع پوش عورت کے ہمراہ رحمن کے مکان پر پہنچے۔ بہت دیر تک دستک دینے کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ کمبل اوڑھے تھا اسے غالباً بخار تھا۔ میں نے ساری بات دبی زبان میں بتائی تو اس نے بھی دبی زبان ہی میں کہا:

”شاہ جی۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ میرا مکان حاضر ہے‘ لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اس مہینے کی بیس تاریخ کو میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا سالا اندر ہے۔ اس کی موجودگی میں یہ سلسلہ جو آپ چاہتے ہیں‘ کیسے ہو سکتا ہے۔“

کچھ دیر۔ میری سمجھ میں نہ آیا اس سے کیا کہوں۔ لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس کو ڈانٹا۔

”یار! تم نرے کھرے بے وقوف ہو۔ اپنے سالے کو چلتا کرو۔ ہم اتنی دور سے تمہارے پاس آئے ہیں۔ کیا تم میں اتنی مروّت بھی باقی نہیں رہی۔ بیس تاریخ کو تمہاری شادی آ رہی ہے‘ ٹھیک ہے۔ لیکن آج میری شادی ہے۔ یہ میری دلہن برقع پہنے تانگے میں بیٹھی ہے۔ تمہیں اپنے دوستوں کا کچھ تو خیال آنا چاہیے۔“

رحمان کو میری حالت پر کچھ ترس آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے سالے کو جگایا اور اس کو اپنے بخار کیلیے کوئی ضروری دوا لینے کے لیے باہر بھیج دیا‘ شہر میں قریب قریب کیمسٹوں کی سب دکانیں بند تھیں۔ لیکن اس نے اپنے سالے سے کہا:

”شہر کی دکانیں دیکھو جہاں سے بھی تمہیں یہ دوا ملے لے کر آؤ“!

لڑکا برخوردار قسم کا تھا۔ نسخہ لے کر آنکھیں ملتا چلا گیا! اس غریب کو تانگہ بھی شاید نظر نہ آیا۔ جس میں برقع پوش عورت بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا۔ کہ ہجوم ٹھیک نہیں ہو گا۔ معلوم نہیں میرے دوست کیا حرکتیں کریں‘ چنانچہ میں نے ان کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا کہ وہ تانگے میں واپس چلے جائیں۔ پانچ روپے تانگے والے کو اور دے دیئے مگر اس نے برقع پوش سواری اتاری تو کہا:

”حضور: اس کی فیس تو دیتے جایئے۔“

میں نے پوچھا کتنی ہے۔

”پچیس روپے“

میں نے جیب سے نوٹ نکالے اور گن کر پانچ پانچ کے پانچ نوٹ اس کے حوالے کر دیئے اور اس برقع پوش عورت کو اپنے دوست کے مکان میں لے آیا۔“

رحمان کو بخار تھا۔ وہ علیحدہ کمرے میں جا کر لیٹ گیا میں بہت دیر تک اس برقع پوش عورت سے گفتگو کرتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ اپنے چہرے سے نقاب ہی ہٹایا۔ میں تنگ آ گیا۔ اس کو ٹٹولا۔ تو وہ بالکل سپاٹ تھی۔ آخر میں نے زبردستی اس کا برقع الٹ دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب دیکھا کہ وہ عورت نہیں۔ ہیجڑا تھا۔ نہایت مکروہ قسم کا۔! مجھے سخت غصّہ آیا۔ میں نے اس سے پوچھا

”یہ کیا واہیات پن ہے۔“

اس ہیجڑے نے جس کے چہرے پر روؤں کا نیلا نیلا غبار موجود تھا‘ بڑے نسوانی انداز میں جواب دیا‘

”میں۔ تانگے والے کا بھائی ہوں۔“

شاہ صاحب نے اس کے بعد مجھ سے کہا۔

”منٹو صاحب! اس دن کے بعد مجھے اس سلسلے سے کوئی رغبت نہیں رہی۔“

تصویر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوتصویر

”بچے کہاں ہیں؟“

”مر گئے ہیں“

سب کے سب؟“

”ہاں، سب کے سب۔ آپ کو آج ان کے متعلق پوچھنے کا کیا خیال آگیا۔ میں اُن کا باپ ہوں“

”آپ ایسا باپ خدا کرے کبھی پیدا ہی نہ ہو“

”تم آج اتنی خفا کیوں ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا‘ گھڑی میں رتی گھڑی میں ماشہ ہو جاتی ہو۔ دفتر سے تھک کر آیا ہوں اور تم نے یہ چخ چخ شروع کر دی ہے۔ بہتر تھا کہ میں وہاں دفتر ہی میں پنکھے کے نیچے آرام کرتا۔“

”پنکھا یہاں بھی ہے۔ آپ آرام طلب ہیں۔ یہیں آرام فرما سکتے ہیں“

”تمہارا طنز کبھی نہیں جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ چیز تمہیں جہیز میں ملی تھی“

”میں کہتی ہوں، کہ آپ مجھ سے اس قسم کی خرافات نہ بکا کیجیے۔ آپ کے دیدوں کا تو پانی ہی ڈھل گیا ہے“

”یہاں تو سب کچھ ڈھل گیا ہے۔ تمہاری وہ جوانی کہاں گئی؟۔ میں تو اب ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے سو برس کا بڈھا ہوں“

”یہ آپ کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ میں نے تو خود کو کبھی عمر رسیدہ محسوس نہیں کیا“

”میرے اعمال اتنے سیاہ تو نہیں۔ اور پھر میں تمہارا شوہر ہوتے ہوئے کیا اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ تمہارا شباب اب روبہ تنزل ہے“

”مجھ سے ایسی زبان میں گفتگو کیجیے جس کو میں سمجھ سکوں۔ یہ تروبہ نزل کیا ہوا“

چھوڑو اسے۔ آؤ محبت پیار کی باتیں کریں“!

آپ نے ابھی ابھی تو کہا تھا کہ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سو برس کے بڈھے ہیں“

بھئی دل تو جوان ہے“

آپ کے دل کو میں کیا کہوں۔ آپ اسے دل کہتے ہیں مجھ سے کوئی پوچھے تو میں یہی کہوں گی کہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جو اس شخص نے اپنے پہلو میں دبا رکھا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس میں محبت بھری ہوئی ہے۔ آپ محبت کرنا کیا جانیں۔ محبت تو صرف عورت ہی کر سکتی ہے“

”آج تک کتنی عورتوں نے مردوں سے محبت کی ہے۔ ذرا تاریخ کا مطالعہ کرو۔ ہمیشہ مردوں ہی نے عورتوں سے محبت کی اور اسے نبھایا۔ عورتیں تو ہمیشہ بے وفا رہی ہیں“

”جھوٹ۔ اس کا اوّل جھوٹ‘ اس کا آخر جھوٹ۔ بیوفائی تو ہمیشہ مردوں نے کی ہے“

اور وہ جو انگلستان کے بادشاہ نے ایک معمولی عورت کے لیے تخت و تاج چھوڑ دیا تھا؟۔ وہ کیا جھوٹی اور فرضی داستان ہے“

”بس ایک مثال پیش کر دی اور مجھ پر رعب ڈال دیا“

”بھئی تاریخ میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ مرد جب کسی عورت سے عشق کرتا ہے تو وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتا‘ کم بخت اپنی جان قربان کر دیگا مگر اپنی محبوبہ کو ذرا سی بھی ایذا پہنچنے نہیں دے گا‘ تم نہیں جانتی ہو مرد میں جبکہ وہ محبت میں گرفتار ہو کتنی طاقت ہوتی ہے“

”سب جانتی ہوں۔ آپ سے تو کل الماری کا جما ہوا دروازہ بھی نہیں کھل سکا۔ آخر مجھے ہی زور لگا کر کھولنا پڑا“

”دیکھو‘ جانم۔ تم زیادتی کر رہی ہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ میرے داہنے بازو میں ریح کا درد تھا‘ میں اُس دن دفتر بھی نہیں گیا تھا اور سارا دن اور ساری رات پڑا کراہتا رہا تھا۔ تم نے میرا کوئی خیال نہ کیا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ سنیما دیکھنے چلی گئیں“

”آپ تو بہانہ کر رہے تھے“

”لاحول ولا۔ یعنی میں بہانہ کر رہا تھا‘ درد کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ میں بہانہ کر رہا تھا۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر“

”یہ لعنت مجھ پر بھیجی گئی ہے“!

”تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ میں اپنی زندگی کا رونا رو رہا تھا“

”آپ تو ہر وقت روتے ہی رہتے ہیں“

”تم تو ہنستی رہتی ہو۔ اس لیے کہ تمھیں کسی کی پرواہ ہی نہیں۔ بچے جائیں جہنم میں‘ میرا جنازہ نکل جائے۔ یہ مکان جل کر راکھ ہو جائے مگر تم ہنستی رہو گی۔ ایسی بے دل عورت میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی“

”کتنی عورتیں دیکھی ہیں آپ نے اب تک؟“

”ہزاروں‘ لاکھوں۔ سڑکوں پر تو آج کل عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں“

”جھوٹ نہ بولیے۔ آپ نے کوئی نہ کوئی عورت خاص طور پر دیکھی ہے“

”خاص طور پر سے تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”میں آپ کے راز کھولنا نہیں چاہتی۔ میں اب چلتی ہوں“

”کہاں؟“

”ایک سہیلی کے یہاں۔ اس سے اپنا دکھڑا بیان کروں گی‘ خود روؤں گی‘ اُس کو بھی رلاؤں گی۔ اس طرح کچھ جی ہلکا ہو جائے گا“

وہ دکھڑا جو تمھیں اپنی سہیلی سے بیان کرنا ہے‘ مجھے ہی بتا دو۔ میں تمہارے غم میں شریک ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔

”آپ کے وعدے؟۔ کبھی ایفا ہوئے ہیں؟“

”تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔ میں نے آج تک تم سے جو بھی وعدہ کیا پورا کیا۔ ابھی پچھلے دنوں تم نے مجھ سے کہا کہ چائے کا ایک سیٹ لا دو۔ میں نے ایک دوست سے روپے قرض لے کر بہت عمدہ سیٹ خرید کر تمھیں لا دیا۔

”بڑا احسان کیا مجھ پر۔ وہ تو دراصل آپ اپنے دوستوں کے لیے لائے تھے۔ اس میں سے دو پیالے کس نے توڑے تھے؟ ذرا یہ تو بتائیے؟“

”ایک پیالہ تمہارے بڑے لڑکے نے توڑا۔ دوسرا تمہاری چھوٹی بچی نے“

”سارا الزام آپ ہمیشہ انھیں پر دھرتے ہیں۔ اچھا اب یہ بحث بند ہو۔ مجھے نہا دھو کر کپڑے پہننا اور جُوڑا کرنا ہے۔

”دیکھو‘ میں نے آج تک کبھی سخت گیری نہیں کی‘ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آتا رہا ہوں مگر آج میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ باہر نہیں جا سکتیں“

”اجی واہ۔ بڑے آئے‘ مجھ پر حکم چلانے والے۔ آپ ہیں کون؟“

”اتنی جلدی بھول گئی ہو۔ میں تمہارا خاوند ہوں“

”میں نہیں جانتی‘ خاوند کیا ہوتا ہے۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ میں باہر جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی‘ دیکھتی ہوں‘ مجھے کون روکتا ہے“

”تم نہیں جاؤ گی۔ بس یہ میرا فیصلہ ہے“

”فیصلہ اب عدالت ہی کرے گی“

”عدالت کا یہاں کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آج تم کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو‘ تک کی بات کرو۔ جاؤ نہالو تاکہ تمہارا دماغ کسی حد تک ٹھنڈا ہو جائے“

”آپ کے ساتھ رہ کر میں تو سر سے پیر تک برف ہو چکی ہوں“

کوئی عورت اپنے خاوند سے خوش نہیں ہوتی‘ خواہ وہ بیچارہ کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو۔ اس میں کیڑے ڈالنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ میں نے تمہاری کئی خطائیں اور غلطیاں معاف کی ہیں“

”میں نے خدانخواستہ کون سی خطا کی ہے؟“

”پچھلے برس تم نے شلجم کی شب دیگ بڑے ٹھاٹ سے پکانے کا ارادہ کیا۔ شام کو چولہے پر ہنڈیا رکھ کر تم ایسی سوئیں کہ اُٹھ کر جب میں باورچی خانے میں گیا تو دیکھا کہ دیگچی میں سارے شلجم کوئلے بنے ہوئے ہیں۔ ان کو نکال کر میں نے انگیٹھی سلگائی اور چائے تیار کی۔ تم سو رہی تھیں“

”میں یہ بکواس سننے کے لیے تیار نہیں“

”اس لیے کہ اس میں جھوٹ کا ایک ذرّہ بھی نہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ عورت کو سچ اور حقیقت سے کیوں چڑ ہے۔ میں اگر کہہ دُوں کہ تمہارا بایاں گال تمہارے دائیں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ موٹا ہے تو شاید تم مجھے ساری عمر نہ بخشو۔ مگر یہ حقیقت ہے جسے شاید تم بھی اچھی طرح محسوس کرتی ہو۔ دیکھو یہ پیپر ویٹ وہیں رکھ دو۔ اٹھا کے میرے سر پر دے مارا تو تھانہ تھنول ہو جائے گا“

”میں نے پیپر ویٹ اس لیے اُٹھایا تھا کہ یہ آپ کے چہرے کے عین مطابق ہے۔ اس کے اندر جو ہوا کے بلبلے سے ہیں وہ آپ کی آنکھیں ہیں۔ اور یہ جو لال سی چیز ہے وہ آپ کی ناک ہے جو ہمیشہ سُرخ رہتی ہے۔ میں نے جب آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے آپ کی آنکھوں کے نیچے جو گائے کی آنکھیں ہیں‘ ایک کاکروچ اوندھے منہ بیٹھا ہے“

”تمہارا جی ہلکا ہو گیا؟“

”میرا جی کبھی ہلکا نہیں ہو گا۔ مجھے آپ جانے دیجیے۔ نہا دھو کر میں شاید یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں“

”جانے سے پہلے یہ تو بتا جاؤ کہ یہ جانا کس بنا پر ہے؟“

”میں بتانا نہیں چاہتی۔ آپ تو اوّل درجے کے بے شرم ہیں“

”بھئی، تمہاری اس ساری گفتگو کا مطلب ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ معلوم نہیں، تمھیں مجھ سے کیا شکایت ایک دم پیدا ہو گئی ہے“

”ذرا اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالیے“

”میرا کوٹ کہاں ہے؟“

”لاتی ہوں۔ لاتی ہوں“

”میرے کوٹ میں کیا ہو سکتا ہے۔ وہسکی کی بوتل تھی۔ وہ تو میں نے باہر ہی ختم کر کے پھینک دی تھی۔ لیکن ہو سکتا ہے رہ گئی ہو“

”لیجیے، آپ کا کوٹ یہ رہا“

”اب میں کیا کروں؟“

”اس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالیے۔ اور اُس لڑکی کی تصویر نکالیے جس سے آپ آج کل عشق لڑا رہے ہیں“

”لاحول ولا“

تم نے میرے اوسان خطا کر دیے تھے۔ یہ تصویر، میری جان، میری بہن کی ہے جس کو تم نے ابھی تک نہیں دیکھا، افریقہ میں ہے۔ تم نے یہ خط نہیں دیکھا۔ ساتھ ہی تو تھا۔ یہ لو“

”ہائے، کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔ میرے بھائی جان کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی“

۱۸، مئی ۵۴ء

تقی کاتب

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوتقی کاتب

ولی محمد جب تقی کو پہلی مرتبہ دفتر میں لایا تو اس نے مجھے قطعاً متاثر نہ کیا۔ لکھنو اور ولی کے جاہل اور خود سر کاتبوں سے میرا جی جلا ہوا تھا۔ ایک تھا اس کو جا و بے جا پیش ڈالنے کی بُری عادت تھی۔ موت کو مُوت اور سوت کو سُوت بنا دیتا تھا۔ میں نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ سمجھا۔ اسکو اپنے اہل زبان ہونے کا بہت زعم تھا۔ میں نے جب بھی اس کو پیش کے معاملہ میں ٹوکا اس نے اپنی داڑھی کو تاؤ دے کر کہا۔

”میں اہلِ زبان ہوں صاحب۔ اسکے تیس سپاروں کا حافظ ہوں۔ اعراب کے معاملہ میں آپ مجھ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

میں نے اسے اور کچھ نہ کہا اور رخصت کر دیا۔ اسکی جگہ ایک دلی کے کاتب نے لے لی۔ اور سب ٹھیک ہو گیا مگر اس کو اصلاح کرنے کا خبط تھا، اور اصلاح بھی ایسی کہ میری آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ کوئی مضمون تھا۔ میں نے اس میں یہ لکھا۔

”اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اس نے یہ اصلاح فرمائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کے طوطے اڑ گئے۔“

میں نے اس کا مذاق اڑایا تو وہ خالص دہلوی لب و لہجہ میں بڑبڑاتا ملازمت سے علیحدہ ہو گیا۔ رام پور کا ایک کاتب تھا۔ بہت ہی خوش خط تھا مگر اس کو اختصار کے دورے پڑتے تھے۔ سطریں کی سطریں اور پیرے کے پیرے غائب کر تا تھا۔ جب اسکو پورا صفحہ دوبارہ لکھنے کو کہتا تو وہ جواب دیتا۔

”اتنی محنت مجھ سے نہ ہو گی صاحب۔ پوٹ میں لکھ دوں گا“

پوٹ میں لکھوانا مجھے سخت ناپسند تھا چنانچہ رام پوری کاتب بھی زیادہ دن دفتر میں نہ ٹِک سکے۔ ولی محمد ہیڈ کاتب جب تقی کو پہلی مرتبہ دفتر میں لایا تو اس نے مجھے قطعاً متاثر نہ کیا۔ خط کا نمونہ دیکھا۔ خاص اچھا نہیں تھا۔ دائروں میں پختگی ہی نہیں تھی۔ میں گنجان لکھائی کا قائل ہوں۔ وہ چھدرا لکھتا تھا۔ کم عمر تھا۔ اندازِ گفتگو میں عجیب قسم کی بوکھلاہٹ تھی بات کرتے وقت اس کا ایک بازو ہلتا رہتا تھا۔ جیسے کلاک کا پنڈولم۔ رنگ سفید تھا۔ بالائی ہونٹ پر بھورے بھورے مہین بال تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے خود کتابت کی سیاہی سے یہ ہلکی ہلکی مونچھیں بنائی ہیں۔ میں نے اسے چند روز کے لیے رکھا۔ مگر اس نے اپنی شرافت، محنت اور تابعداری سے دفتر میں اپنے لیے مستقل جگہ پیدا کر لی۔ ولی محمد سے میرے تعلقات بہت بے تکلف تھے۔ جنسیات کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے وہ اکثر مجھ سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس دوران میں محمد نقی خاموش رہتا۔ عورت اور مرد کے جنسی تعلق کا ذکر کھلے الفاظ میں آتا تو اسکے کان کی لویں سرخ ہو جاتیں۔ ولی محمد جو کہ شادی شدہ تھا، اس کو خالص پنجابی انداز میں چھیڑتا۔

”منٹو صاحب اس کا مردہ خراب ہو رہا ہے اس سے کہیے کہ شادی کر لے۔ جب بھی کوئی فلم دیکھ کر آتا ہے۔ ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔“

تقی عام طور پر جھینپتے ہوئے کہتا

”منٹو صاحب جھوٹ بولتا ہے۔“

ولی محمد کی سیاہ نوکیلی مونچھیں تھرکنے لگیں

”اور یہ بھی جھوٹ ہے منٹو صاحب کہ یہ چالی بلڈنگ کی یہودی چھوکریوں کی ننگی ٹانگیں دیکھ کر ان کی نقشہ کشی کیا کرتا ہے۔“

تقی کی ناک کی چونچ پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے

”میں تو۔ میں تو ڈرائنگ سیکھ رہا ہوں۔“

ولی محمد اسے اور چھیڑتا

”ڈرائنگ چہرے کی سیکھو۔ یہ کس ڈرائنگ ہسٹر نے تم سے کہا کہ پہلے ننگی ٹانگوں سے شروع کرو۔“

محمد تقی قریب قریب رو دیتا، چنانچہ میں ولی محمد کو منع کرتا کہ وہ اسے نہ چھیڑا کرے۔ اس پر ولی محمد کہتا۔

”منٹو صاحب، میں اس کے والد صاحب سے کہہ چکا ہوں آپ سے بھی کہتا ہوں کہ اس لونڈے کی شادی کرا دیجیے، ورنہ اس کا مردہ بالکل خراب ہو جائے گا۔“

محمد تقی کے باپ سے میری ملاقات ہوئی۔ داڑھی والے بزرگ تھے۔ نماز روزے کے پابند۔ ماتھے پر محراب۔ جھنڈی بازار میں ولی محمد کی شراکت میں گھی کی ایک چھوٹی سی دکان کرتے تھے۔ محمد تقی سے ان کو بہت محبت تھی۔ باتیں کرتے ہوئے آپ نے مجھ سے کہا

” تقی دو برس کا تھا کہ اسکی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ خدا اسکو غریقِ رحمت کرے۔ بہت ہی نیک بی بی تھی۔ منٹو صاحب یقین جانیے اس کی موت کے بعد عزیزوں اور دوستوں نے بہت زور دیا کہ میں دوسری شادی کر لوں مگر مجھے تقی کا خیال تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ میں اسکی طرف سے غافل ہو جاؤں۔ چنانچہ دوسری شادی کے خیال کو میں نے اپنے قریب تک نہ آنے دیا اور اسکی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے مجھ گنہگار کو سرخرو کیا۔ خدا اس کو زندگی اور نیکی کی ہدایت دے“!

محمد تقی اپنے باپ کے اس ایثار کی ہمیشہ تعریف کیا کرتا۔

”بہت کم باپ اتنی بڑی قربانی کر سکتے ہیں۔ ابّا جوان تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ چاہتے تو چٹکیوں میں ان کو اچھی سے اچھی بیوی مل جاتی، لیکن میری خاطر انھوں نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ اتنی محبت اور اتنے پیار سے میری پرورش کی کہ مجھے ماں کی کمی محسوس ہی نہ ہونے دی۔“

ولی محمد بھی تقی کے باپ کا معترف تھا۔ مگر اسے صرف یہ شکایت تھی کہ مولانا ذرا سنکی ہیں۔

”منٹو صاحب آدمی بہت اچھا ہے کاروبار میں سولہ آنے کھرا ہے۔ تقی سے بہت پیار کرتا ہے۔ لیکن یہ پیار۔ میں اب اپنے احساسات کن الفاظ میں پیش کروں۔ اس کا پیار حد سے بڑھا ہوا ہے۔ یعنی وہ اس طرح پیار کرتا ہے جس طرح کوئی حاسد عاشق اپنے معشوق سے کرتا ہے۔“

میں نے ولی محمد سے پوچھا۔

”تمہارا مطلب ؟“

ولی محمد نے اپنی مونچھوں کی نوکیں درست کیں

”مطلب وطلب میں نہیں سمجھا سکتا۔ آپ خود سمجھ لیجیے۔“

میں نے مسکرا کہا۔

”بھائی تم ذرا وضاحت سے کام لو، تو میں سمجھ جاؤں گا۔“

ولی محمد نے سرخیاں لکھنے والے قلم کو کپڑے کے چیتھڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”مولانا سنکی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کیوں۔ تقی کہتا ہے کہ پہلے ان کے پیار اور ان کی شفقت کا یہ رنگ نہیں تھا جو اب ہے۔ یعنی پچھلے چند برسوں سے آپ نے اپنے فرزند ارجمند سے پوچھ گچھ کا لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ متناہی ٹھیک استعمال ہے نا منٹو صاحب ؟“

”ٹھیک استعمال ہوا ہے۔ ہاں یہ پوچھ گچھ کا سلسلہ کیا ہے ؟“

”یہی تم رات کو دیر سے کیوں آئے ؟۔ سفید گلی میں کیا کرنے گئے تھے۔ وہ یہودن تم سے کیا بات کر رہی تھی ؟۔ اتنے فلم کیوں دیکھتے ہو۔ پچھلے ہفتے تم نے کتابت کی اجرت میں سے چار آنے کہاں رکھے ؟۔ ولی محمد سے تم بائی کلمہ کے پل پر بیٹھے کیا باتیں کر رہے تھے ؟۔ کیا وہ تمہیں ورغلا تو نہیں رہا تھا کہ شادی کر لو۔“

میں نے ولی محمد سے پوچھا۔

”ورغلانا کیا ہوا؟“

”معلوم نہیں۔ لیکن مولانا سمجھتے ہیں کہ تقی کا ہر دوست اسے شادی کے لیے ورغلاتا ہے۔ میں اس کو ورغلاتا تو نہیں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں اور اکثر کہتا ہوں کہ جانِ من شادی کر لو ورنہ تمہارا مردہ خراب ہو جائے گا۔ اور منٹو صاحب میں آپ کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ لڑکے کو ایک عدد بیوی کی اشد ضرورت ہے۔“

چار پانچ برس گزر چکے تھے۔ محمد تقی کی مونچھوں کے بھورے بال اب مہین نہیں تھے ہر روز داڑھی مونڈتا تھا۔ ٹیڑھی مانگ بھی نکالتا تھا اور دفتر میں جب جذبات کے متعلق گفتگو چھڑتی تو وہ قلم دانتوں میں دبا کر غور سے سنتا۔ عورت اور مرد کے جنسی تعلق کا ذکر کھلے الفاظ میں ہوتا تو اسکے کانوں کی لویں سرخ نہ ہوتیں۔ محمد تقی کو بیوی کی ضرورت ہو سکتی تھی۔

ایک دن جبکہ اور کوئی دفتر میں نہیں تھا اور اکیلا تقی تخت پر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے پرچے کی آخری کاپی مکمل کر رہا تھا۔ میں نے اس کے خدوخال کا غور سے معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”تقی تم شادی کیوں نہیں کرتے؟“

سوال اچانک کیا گیا تھا۔ تقی چونک پڑا۔

”جی؟“

”میرا خیال ہے تم شادی کر لو۔“

تقی نے قلم کان میں اڑسا اور کسی قدر شرما کر کہا۔

”میں نے ابا سے بات کی ہے۔“

”کیا کہا انھوں نے؟“

تقی تفصیل سے کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر نہ کہہ سکا

”جی وہ۔ کچھ نہیں۔ وہ کہتے ہیں ابھی اتنی جلدی کیا ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”جو اُن کا ہے۔“

اس جواب کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تقی نے پرچے کی آخری کاپی مکمل کی اور اسے جوڑ کر چلا گیا۔ چند دن کے بعد ولی محمد نے تقی کی موجودگی میں مجھ سے کہا۔ منٹو صاحب۔ کل بڑا الفڑا ہوا۔ مولانا اور تقی میں دھیں پٹاس ہوتے ہوتے رہ گئی۔“

ولی محمد یوں تو اردو بولتا تھا۔ لیکن پنجابی اور بمبئی کی اردو کے کئی الفاظ مزاح پیدا کرنے کے لیے استعمال کرنے کا عادی تھا۔ تقی نے اسکی بات سنی اور خاموش رہا۔ ولی محمد نے اپنی تھرکتی ہوئی نوکیلی مونچھوں کو آنکھوں کا زاویہ بدل کر دیکھا، پھر اس زاویے کو بدل اس نے تقی کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا

”لڑکے کو ایک عدد بیوی کی اشد ضرورت ہے، لیکن باپ اس ضرورت کو مانتا ہی نہیں۔ اس نے بہت سمجھایا منٹو صاحب مگر مولانا نے ایک نہ سنی۔ منٹو صاحب یہ کیا محاورہ ہے ایک نہ سنی۔ مولانا نے سنی تو ہزار تھیں۔ لیکن سنی ان سنی کر دیں۔ یہ محاورے بھی خوب چیز ہیں!۔ اور مولانا بھی۔ اپنے وقت کے ایک لاجواب محاورے ہیں۔“

تقی بھنا کر مجھ سے مخاطب ہوا

”منٹو صاحب اس سے کہیے خاموش رہے۔“

ولی محمد بولا۔

”منٹو صاحب اس سے کہیے کہ مولانا کے سامنے خاموش رہا کرے۔ وہ شادی کی اجازت نہیں دیتے۔ ٹھیک ہے۔ باپ ہیں وہ اس کا نفع نقصان سوچ سکتے ہیں۔“

باپ بیٹے کی چخ ضرور ہوئی تھی۔ تقی نے مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ اسکی شادی کسی اچھے گھرانے میں کر دیں یہ سُن کر وہ چڑ گئے اور تقی کو دوستوں پر برسنے لگے۔

”تمہارے دوستوں نے تمہاری جڑوں میں پانی پھیر دیا ہے۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ شادی بیاہ کس جانور کا نام ہے؟“

یہ سن کر تقی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”لیں۔ آپ کی شادی تو چودہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔“

مولانا نے اسے ڈانٹا

”تمہیں کیا معلوم ہے؟“

تقی خاموش ہو گیا۔ وہ بہت ہی کم گو اور فرمانبردار قسم کا لڑکا تھا۔ دو چار مرتبہ اس نے بے تکلف گفتگو کی اور اس کے کھلنے کا موقع دیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اسکو بیوی کی واقعتاً ضرورت ہے۔ اس نے مجھ سے ایک روز جھینپتے ہوئے کہا میرے خیالات آج کل بہت پراگندے رہتے ہیں۔ ولی محمد شادی شدہ ہے۔ وہ جب اپنی بیوی کے ساتھ باہر جاتا ہے تو میرے دل کو جانے کیا ہوتا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ احساس کمتری کے متعلق باتیں کی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عنقریب اس کا شکار ہونے والا ہوں۔ مگر کیا کروں۔ ابا مانتے ہی نہیں۔ میں شادی کی بات کرتا ہوں تو وہ چڑ جاتے ہیں۔ جیسے۔ جیسے شادی کرنا کوئی گناہ ہے۔ وہ اپنی مثال دیتے ہیں کہ دیکھو تمہاری ماں کے مرنے کے بعد اب تک میں نے شادی نہیں کی۔ لیکن منٹو صاحب۔ اس مثال کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے۔ انھوں نے شادی کی اللہ کو یہ منظور نہیں تھا۔ کہ ان کی بیوی زندہ رہتی انھوں نے بہت بڑی قربانی کی جو میری خاطر دوسری شادی نہ کی۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ میں کنوارا ہی رہوں“

میں نے پوچھا

”کیوں؟“

تقی نے جواب دیا

”معلوم نہیں منٹو صاحب۔ وہ میری شادی کے بارے میں کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ لیکن کل باتوں باتوں میں جذبات سے مغلوب ہو کر میں گستاخی کر بیٹھا۔“

”کیا؟“

تقی نے انتہائی ندامت کے ساتھ کہا۔

”میں منت سماجت کرتے کرتے اور سمجھاتے سمجھاتے تنگ آگیا تھا۔ کل جب انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ میری شادی کے متعلق کچھ سننے کو تیار نہیں تو میں نے غصے میں آکر ان سے کہہ دیا۔ آپ نہیں سنیں گے تو میں اپنی شادی کا بندوبست خود کر لوں گا۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ سن کر انھوں نے کیا کہا۔“

ابھی ابھی گھر سے نکل جاؤ۔ چنانچہ کل رات میں یہاں دفتر ہی میں سویا۔ میں نے شام کو ولی محمد کے ذریعے سے مولانا کو بلوایا۔ چند جذباتی باتیں ہوئیں تو انھوں نے تقی کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا۔ پھر شکوے ہونے لگے۔ مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ لڑکا جس کی خاطر میں نے تجرد برداشت کیا ایک روز میرے ساتھ ایسی گستاخی سے پیش آئے گا۔ میں نے ماؤں کی طرح اسے پالا پوسا آپ سوکھی کھائی پر اس کے لیے خود اپنے ہاتھوں گھی میں گوندھ گوندھ کر پراٹھے پکائے۔“

میں نے بات کاٹ کر کہا۔

”مولانا، یہ کب آپ کے ان احسانات کو نہیں مانتا۔ آپ کی تمام قربانیاں اس کے دل و دماغ پر نقش ہیں۔ آپ نے اتنا کچھ کیا۔ کیا آپ اس کی شادی نہیں کر سکتے۔ ماں باپ کی تو سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھیں۔ آپ کے گھر میں بہو آئے گی۔ بال بچے ہوں گے۔ دادا جان بن کر آپ کو پُر فخر مسرت نہ ہو گی؟۔ میرا خیال ہے تقی کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ آپ شادی کے خلاف ہیں۔“

مولانا لاجواب ہو گئے۔ رومال سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگے۔ تھوڑے توقف کے بعد بولے۔

”پر کوئی ایسا رشتہ ہو تو۔“

”آپ ہاں کر دیجیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ولی محمد نے یہ کچھ ایسے انداز میں کہا۔

”چلیے انگوٹھا لگائیے۔“

مولانا بدل گئے۔

”لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے؟“

اس پر میں نے بزرگوں کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”کار خیر میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ آپ اوروں کو چھوڑیئے، خود اپنی پسند کا رشتہ ڈھونڈھیے۔ ماشاء اللہ ڈونگری میں سب لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ یہاں بمبئی میں پسند نہ ہو تو اپنے پنجاب میں سہی۔ کون سا گالے کوسوں دور ہے۔“

مولانا نے سر ہلا کر صرف اتنا کہا۔

”جی ہاں“!

میں نے تقی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا

”لو بھئی تقی۔ فیصلہ ہو گیا۔ مولانا کو تم ضدی بچوں کی طرح اب تنگ نہ کرنا۔ میں خود اس معاملے میں ان کی مدد کروں گا۔“

یہ کہہ کر میں مولانا سے مخاطب ہوا۔

”یہاں کچھ خاندان ہیں۔ ان سے میری جان پہچان ہے۔ میں اپنی بیوی سے کہوں گا وہ لڑکیاں دیکھ لے گی۔“

تقی نے ہولے سے کہا۔

”آپ کی بہت مہربانی۔“

کئی مہینے گزر گئے مگر تقی کی شادی کی بات چیت کہیں بھی شروع نہ ہوئی۔ ولی محمد اس دوران میں اسے برابر اکساتا رہا۔ وہ اپنے باپ کے پیچھے پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز مولانا میرے پاس آئے اور کہا

”سانگٹی اسٹریٹ کی تیسری گلی میں نکڑ کی بلڈنگ میں۔ شاید آپ جانتے ہی ہوں۔ یوپی کا ایک خاندان رہتا ہے۔“

میں نے فوراً کہا۔

”آپ کہیے۔ میں جانتا ہوں“!

مولانا نے پوچھا

”کیسے لوگ ہیں؟“

”بے حد شریف“

”جو سب سے بڑا بھائی ہے۔ اسکی بڑی لڑکی۔“

میں نے سنا ہے خاصی اچھی ہے!

”میں پیغام بھجوا دیتا ہوں۔“

مولانا گھبرا گئے نہیں نہیں۔ اتنی جلدی نہیں۔ یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ لڑکی شکل و صورت کی کیسی ہے؟“

”میں اپنی بیوی کے ذریعہ سے معلوم کر لوں گا۔“

میری بیوی نے اس لڑکی کو دیکھا تو پسند کیا۔ قبول صورت تھی۔ تعلیم انٹرنس تک تھی طبیعت کی بہت ہی اچھی تھی۔ یہ سب خوبیاں مولانا سے بیان کر دی گئیں۔ وہ لڑکی کے باپ سے ملے جہیز اور حق مہر کے متعلق بات چیت ہوئی۔ یہ ابتدائی مراحل بخیر و خوبی طے ہو گئے۔ تقی بہت خوش تھا۔ لیکن تین مہینے گزر گئے اور بات وہیں کی وہیں رہی۔ آخر ایک روز معلوم ہوا کہ لڑکی والوں نے مزید گفتگو سے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ تقی کے باپ کی مین میخ سے تنگ آ چکے ہیں۔ بار بار وہ ان سے جا جا کر یہ کہتا تھا۔ دیکھیے لڑکی کے جہیز میں اتنے جوڑے ہوں برتنوں کی تعداد یہ ہو۔ لڑکی نے اگر میری حکم عدولی کی تو اس کی سزا طلاق ہو گی۔ فلم دیکھنے ہر گز نہ جائے گی۔ پردے میں رہے گی۔ میں نے جب ان بے جا باتوں کا ذکر تقی سے کیا۔ تو وہ اپنے باپ کی طرف ہو گیا۔

”نہیں منٹو صاحب۔ لڑکی والے ٹھیک نہیں۔ ابا کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ وہ مجھے رن مُرید بنانا چاہتے ہیں۔“

میں نے کہا

”ایسا ہے تو چھوڑو۔ کسی اور جگہ سہی۔“

تقی نے کہا۔

”ابا کوشش کر رہے ہیں۔“

مولانا نے ڈونگری میں اپنے ایک واقف کار کے ذریعے سے بات چیت شروع کی سب کچھ طے ہو گیا۔ نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ مگر ایک دم کچھ ہوا اور سب کچھ ڈھے گیا۔ لڑکی والوں کو تقی پسند تھا، لیکن جب مولانا سے اچھی طرح ملنے جلنے کا اتفاق ہوا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اور لڑکی کا رشتہ کسی اور جگہ پکا کر دیا۔ تقی نے پھر اپنے باپ کی طرفداری کی اور مجھ سے کہا۔

”یہ لوگ بڑے لالچی تھے منٹو صاحب۔ ایک دولت مند کا لڑکا مل گیا تو اپنی بات سے پھر گئے۔ ابا شروع ہی سے کہتے تھے کہ یہ لوگ مجھے ایماندار معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن میں خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑا رہا۔ کہ جلدی معاملہ طے کیجیے۔“

کچھ عرصے کے بعد تیسری جگہ کوشش شروع ہوئی۔ یہاں بھی نتیجہ صفر۔ چوتھی جگہ بات چیت شروع ہوئی تو تقی نے مجھ سے کہا۔

”منٹو صاحب، وہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”بڑے شوق سے ملیں۔“

میں ان سے ملا۔ آدمی شریف تھے۔ مولانا سے ان کی چند مختصر باتیں ہوئیں۔ میں نے تقی کی تعریف کی۔ معاملے طے ہو گیا۔ لیکن چند ہی دنوں میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ لڑکی کے بڑے بھائی نے کسی سے سنا کہ مولانا دکان پر اپنے ایک دوست سے کہہ رہے تھے۔ لڑکی میرے کہنے پر نہ چلی تو میں تقی کی دوسری شادی کر دوں گا۔“

وہ یہ سن کر میرے پاس آیا۔ میں نے مولانا کو بلوایا۔ ان سے پوچھا تو داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔

”میں نے کیا برا کہا۔ میں ایسی بہو گھر میں نہیں لانا چاہتا جو میرا کہنا مانے۔ میں تقی کی شادی اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے آرام پہنچے۔“

عجیب و غریب منطق تھی۔ میں نے پوچھا

”آپ کو آرام ضرور پہنچنا چاہیے۔ مگر آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی کا رشتہ آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔“

مولانا نے کسی قدر خفگی کے ساتھ کہا

”میں خاوند رہ چکا ہوں منٹو صاحب۔ آپ کے خیالات میرے خیالات سے بہت مختلف ہیں۔ آپ کے ساتھ کام کر کے مجھے افسوس ہے میرے لڑکے کے خیالات بھی بدل گئے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ تقی سے مخاطب ہوئے۔

”سنا تم نے۔ میں ایسی لڑکی گھر میں لانا چاہتا ہوں جو میری اور تمہاری خدمت کرے۔“

اس کے بعد دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان سے جو میں نے نتیجہ نکالا وہ میں نے تقی کو بتا یا دیا۔

”دیکھو بھئی۔ بات یہ ہے کہ تمہارے والد صاحب تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر بار کوئی نہ کوئی شوشہ چھیڑ دیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالتے ہیں تاکہ معاملہ آگے نہ بڑھنے پائے۔“

مولانا خاموش اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ تقی نے مجھ سے پوچھا

”کیوں۔ یہ میری شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے۔“

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”مولانا کا دماغ خراب ہے۔“

مولانا کو اس قدر طیش آیا کہ منہ میں جھاگ بھر کر واہی تباہی بکنے لگے۔ میں نے تقی سے کہا

”جاؤ، مولانا کو کسی ذہنی شفاخانہ میں لے جاؤ۔ اور میری یہ بات یاد رکھو۔ جب تک ان کا دماغ درست نہیں ہو گا۔ تمہاری شادی ہرگز ہرگز نہیں کریں گے۔ ان کے دماغ کی خرابی کا باعث وہ قربانی ہے جو انھوں نے تمہارے لیے کی۔“

مولانا نے تقی کا بازو زور سے پکڑا اور مجھے صلواتیں سناتے چلے گئے۔ ولی محمد میرے پاس بیٹھا سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا۔ اتنی دیر وہ اپنی نوکیلی مونچھوں کے وجود سے بالکل غافل رہا۔ جب مولانا اور تقی چلے گئے تو اس نے آنکھوں کا زاویہ درست کر کے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

”مردہ خراب ہو رہا ہے بیچارے کا۔ لیکن منٹو صاحب آپ نے باون تولہ اور پاؤرتی کی بات کہی۔ محاورہ درست استعمال ہوا ہے نا؟“

”تم نے محاورہ درست استعمال ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کی طبیعت صاف کرتے ہوئے میں نے مناسب و موزوں الفاظ استعمال نہیں کیے۔“

”بڑا ملعون آدمی ہے“!

ولی محمد نے یہ کہہ کر اپنی مونچھ کا ہٹیلا بال بڑے زور سے اکھیڑا اور بڑی سنجیدگی اختیار کر کے مجھ سے پوچھا۔

”منٹو صاحب، کیا مطلب تھا آپ کا اس سے کہ مولانا کے دماغ کی خرابی کا باعث وہ قربانی ہے جو اس نے تقی کے لیے کی۔ بات ضرور باون تولہ اور پاؤرتی کی ہے لیکن پوری طرح میرے ذہن میں بیٹھی نہیں۔“

میں نے اس کو سمجھایا

”بیوی کی موت کے بعد ایک وقتی جذبہ تھا جس کے تحت مولانا نے تجرد کے دن گزارنے کا تہیہ کیا۔ یہ جذبہ اپنی طبعی موت مرا تو آپ کے لیے دو سوگ ہو گئے، ایک بیوی کی موت کا، دوسرا اس جذبے کی موت کا۔ وقت گزرتا گیا اور مولانا نیم کے کریلے بنتے گئے۔ مجھے تو بھئی ولی محمد بہت ترس آتا ہے غریب پر۔ ایک شخص جس نے پچیس برس تک اپنے اور عورت کے درمیان ایک دیوار حائل رکھی ہو، وہ کس طرح اپنے جوان بیٹے کے پہلو میں ایک جوان عورت دیکھ سکتا ہے۔ اور وہ بھی نظروں کے بہت قریب“!

دوسرے دن تقی نہ آیا۔ ولی محمد کے ہاتھ اُس نے کتابت کا بل بھجوا دیا جو ادا کر دیا گیا۔ تقی کو بہت افسوس تھا کہ میں نے اسکے باپ کو بُرا بھلا کہا۔ میں نے ولی محمد سے کہہ دیا

”مجھے کوئی افسوس نہیں۔ تقی کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس کا باپ ذہنی اور روحانی طور پر بیمار ہے۔ لیکن مجھے یہ افسوس ضرور ہے کہ اس نے کام چھوڑ دیا ہے۔“

ولی محمد نے تقی سے واپس آنے کو کہا۔ مگر وہ نہ مانا۔ اس نے کسی اور دفتر میں ملازمت نہ کی اور دکان پر بیٹھ کر گھی بیچنے لگا۔ ولی محمد نے جب زور دیا تو اس نے وہیں کتابت کا کام بھی شروع کر دیا۔ میں ایک کام سے دہلی چلا گیا۔ تین چار مہینے وہاں رہ کر بمبئی لوٹا۔ تو ولی محمد نے پلیٹ فارم ہی پر یہ خبر سنائی کہ تقی کی شادی ایک ہفتہ پہلے بخیر و خوبی ہو چکی ہے۔ مجھے یقین نہ آیا لیکن ولی محمد نے قرآن کی قسم کھا کر کہا

”منٹو صاحب، میں جھوٹ نہیں کہتا۔ نکاح کے چھوارے میں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ جس کی شادی نہ ہوتی ہو۔ اس کے لیے اکسیر ثابت ہوں گے“

میں نے تقی کو بلایا، مگر وہ نہ آیا۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک دن علی الصبح ولی محمد آیا۔ اسکی نوکیلی مونچھیں تھرک رہی تھیں۔ کہنے لگا منٹو صاحب۔ کل دھیں پٹاس ہو گئی باپ بیٹے میں۔ تقی اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا کہیں۔

”کہاں؟“

”معلوم نہیں“

یہ کہہ کر آنکھوں کا زاویہ بدل کر ولی محمد نے اپنی نوکیلی مونچھوں کو دیکھا

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا منٹو صاحب۔ لڑائی کا باعث معلوم نہیں ہو سکا۔ مولانا بالکل خاموش ہیں۔“

مولانا بہت دیر تک خاموش رہے اور ان کا بیٹا محمد تقی بھی۔ بمبئی میں ولی محمد اور اس کے ساتھیوں نے تقی کو بہت تلاش کیا۔ مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بہت دنوں کے بعد دلی سے مجھے تقی کا ایک خط وصول ہوا۔ لکھا تھا

”۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں اور حالات سے آگاہ کروں۔ مگر جرأت ساتھ نہ دیتی تھی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ خط کسی اور کو نہ دکھایئے گا۔ آپ نے میرے والد کے متعلق جو کچھ کہا تھا ٹھیک نکلا۔ میں نے آپکی باتوں کا برا مانا تھا۔ اس لیے کہ مجھے اصلیت کا علم نہیں تھا جو مجھے شادی کے بعد معلوم ہوئی۔ میرے والد کا دماغ واقعی درست نہیں۔ ہو سکتا ہے پہلے ٹھیک ہو۔ لیکن میری شادی کے بعد تو قطعاً انکی دماغی حالت درست نہ تھی۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ میں اپنی بیوی سے دور رہوں۔ مجھ اور اس میں دوری پیدا کرنے کے لیے وہ عجیب و غریب طریقے ایجاد کرتے تھے۔ جو ایک دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔ میں نے بہت دیر تک برداشت کیا۔ مجھے تمام واقعات بیان کرتے ہوئے بہت شرم محسوس ہوتی ہے۔ ایک روز میری بیوی غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ آپ نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھنا شروع کر دیا۔ میں اور کیا لکھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔ خدا ان کی حالت پر رحم کرے۔“

”میں یہاں دہلی میں ہوں اور بہت خوش ہوں۔“

میں یہ خط پڑھ رہا تھا کہ ولی محمد آیا۔ اس کے پاس تقی کا ایک خط تھا۔ میری طرف بڑھا کر اس نے کہا۔

”یہ خط تقی نے دہلی سے اپنے باپ کو لکھا ہے۔ صرف چند الفاظ ہیں۔“

”میں نے پوچھا کیا؟“

”ولی محمد نے کہا پڑھ لیجیے۔“

میں نے یہ الفاظ پڑھے۔

”قبلہ والد صاحب۔ میں یہاں خیریت سے ہوں۔ آپ نے میرا گھر آباد ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ بھی اپنا گھر آباد کر لیں۔“

۔ولی محمد نے آنکھوں کا زاویہ بدل کر اپنی نوکیلی مونچھوں کو دیکھا اور کہا۔

”منٹو صاحب۔ لڑکا ہوشیار ہو گیا ہے۔ لیکن مولانا تو اپنی بات پکی کر چکے ہیں۔“

”کہاں“

ولی محمد کی مونچھیں تھرکیں

”ایک گھی بیچنے والی سے۔ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ محاورہ ٹھیک استعمال کیا نہ منٹو صاحب“ میں ہنس پڑا۔ یکم جولائی 1950ء

تین موٹی عورتیں

ایک کا نام مسز رچمین اور دوسری کا نام مسز ستلف تھا۔ ایک بیوہ تھی تو دوسری دو شوہروں کو طلاق دے چکی تھی۔ تیسری کا نام مس ہیکن تھا۔ وہ ابھی ناکتخدا تھی۔ ان تینوں کی عُمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اور زندگی کے دن مزے سے کٹ رہے تھے۔ مسز ستلف کے خدوخال موٹاپے کی وجہ سے بھدے پڑ گئے تھے۔ اس کی باہیں کندھے اور کولھے بھاری معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس ادھیڑ عمر میں بھی وہ بن سنور کر رہتی تھی۔ وہ نیلا لباس صرف اس لیے پہنتی تھی کہ اُس کی آنکھوں کی چمک نمایاں ہو اور بناوٹی طریقوں سے اس نے اپنے بالوں کی خوبصورتی بھی قائم رکھی تھیں۔ اسے مسز رچمین اور مس ہیکن اس لیے پسند تھیں کہ وہ دونوں اس کی نسبت موٹی تھیں۔ اور چونکہ وہ عمر میں بھی ان سے قدرے چھوٹی تھی اس لیے وہ اسے اپنی بچی کی طرح خیال کرتیں۔ یہ کوئی ناپسندیدہ بات نہ تھی۔ وہ دونوں خوش طبیعت تھیں۔ اکثر تفریحاً اس کے ہونے والے منگیتر کا ذکر چھیڑ دیتی۔ وہ خود تو اس عشق و محبت کی اُلجھن سے کوسوں دُور تھیں۔ لیکن اس معاملے میں انھیں مسز ستلف سے پوری ہمدردی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ وہ دنوں ہی میں کوئی نیا گل کھلانے والی ہے۔ وہ اس کے لیے کسی اچھے بر کی تلاش میں تھیں۔ کوئی پنشن یافتہ ایڈمیرل جو گاف بھی کھیلنا جانتا ہو یا کوئی ایسا رنڈوا جو گھر بار کے جنجال سے آزاد ہو۔ بہر حال یہ ضروری تھا کہ اس کی آمدنی معقول ہو۔ وہ بڑے غور سے اُن کی باتیں سنتی اور دل ہی دل میں ہنس دیتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بار پھر شادی کا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن شوہر کے انتخاب میں اُس کا مزاج مختلف تھا۔ اُسے کسی سیاہ رنگ چھریرے بدن کے اطالوی کی چاہت تھی، جس کی آنکھیں حد درجہ چمکیلی ہوں یا کوئی ہسپانوی جو اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اور اُس کی عمر کسی صورت میں تیس برس سے ایک دن بھی زیادہ نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ تینوں ایک دوسری پر جان دیتی تھیں۔ اور اُن کی آپس میں محبت کی وجہ صرف موٹاپا تھا۔ اور متواتر اکٹھے برج کھیلنے سے دوستی اور گہری ہو گئی تھی۔ اُن کی پہلی ملاقات کربساد میں ہوئی، جہاں یہ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہری تھیں اور ایک ڈاکٹر کے زیرِ علاج تھیں مسز رچمین خوش شکل بھی تھی۔ اُس کی نشیلی آنکھیں، کھردرے گال اور رنگین ہونٹ بہت ہی دلفریب اور دلکشی تھے۔ اُسے ہر وقت کھانے پینے کی فکر رہتی۔ مکھن، بالائی، آلو اور چربی ملی پڈنگ اُس کا من بھاتا کھانا تھا وہ سال میں گیارہ مہینے تو جی بھر کر کافی کھاتی اور پھر علاج کے ذریعے دُبلی ہونے کے لیے ایک مہینہ کربساد چلی جاتی۔ وہ دن بہ دن پھولتی جا رہی تھی۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ اگر اُسے من مرضی کی خوراک کھانے کو نہ ملے تو زندگی بے کار ہے۔ مگر اُس کے ڈاکٹروں کو اس بات سے اتفاق نہ تھا۔ مسز رچمین کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کچھ ایسا قابل نہیں ورنہ کیا عجیب تھا کہ وہ ذرا دُبلی ہو جاتی۔ اُس نے مس ہیکن سے اس بات کا ذکر کیا۔ وہ بس ایک قہقہہ لگا کر خاموشی ہو گئی۔ اس کی آواز بہت گہری تھی۔ اور چپٹا سا چہرہ! اس کی دونوں آنکھوں میں بلی کی آنکھوں ایسی چمک تھی۔ اُسے مردانہ پوشاک زیادہ پسند تھی۔ اور صرف اُس کی خوش مزاجی کی وجہ سے تینوں سہلیاں ایک دوسری سے بہت قریب ہو گئی تھیں۔ وہ تینوں ایک ہی وقت پر کھانا کھاتیں، اکٹھی سیر کو جاتیں اور ٹینس کھیلنے کے وقت بھی ایک دوسری سے کبھی جدا نہ ہوتیں۔ اُس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا وزن کرتیں تو اپنے موٹاپے میں کوئی فرق نہ پا کر اُداس سی ہو جاتیں۔ مس ہیکن کو یہ بات بہت ہی ناگوار گزری کہ بیئرس رچمین طبی علاج سے اپنا وزن بیس پاؤنڈ گھٹا کر بدپرہیزی کی وجہ سے دنوں میں پھر اُسی طرح موٹی ہو جائے اور اُس کے کہنے پر تینوں کربساد چھوڑ کر چند ہفتوں کے لیے کہیں اور چلی جائیں۔ بیئرس کمزور طبیعت تھی اور اُسے ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو اُسے بداعتدالی سے بچا سکے۔ اُسے یقین تھا کہ اب اُسے ورزش کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہاں گھر میں اپنی باورچن رکھ لینے سے اُسے چربی ملی چیزیں کھانے سے نجات مل جائے گی۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان سب کا وزن دنوں میں کم ہو جائے۔ مسز ستلف اپنے گھر میں انوکھے ارادے باندھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہاں دنوں میں اُس کا رنگ نکھر جائے گا۔ اور اپنے لیے کوئی چھیلا بانکا اطالوی فرانسیسی یا انگریز تلاش کرے گی۔ وہ تینوں ہفتہ میں صرف دو دن اُبلے ہوئے انڈے اور ٹماٹر کھاتیں اور ہر صبح اُٹھ کر اپنا وزن کرتیں۔ مسز ستلف کا وزن ابھی صرف ۱۵۴ پونڈ رہ گیا اور وہ تو گویا اپنے آپ کو ایک جواں سال لڑکی سمجھنے لگی۔ مسز ہیکن اور مسز رچمین کے موٹاپے میں بھی کافی فرق پڑ گیا۔ وہ تینوں مطمئن نظر آتی تھیں۔ لیکن برج کھیلنے کے لیے ایک چوتھے کھلاڑی کی ضرورت نے اُنھیں ایک حد تک پریشان سا کر دیا۔ وہ صبح سویرے ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنے چبوترے پر بیٹھی دودھ میں کھانڈ ملائے بغیر چائے پی رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ڈاکٹر برٹ کے تیار کیے ہوئے بسکٹ بھی کھا رہی تھیں، جن کے متعلق یہ گارنٹی دی گئی تھی کہ وہ چربی سے بالکل پاک ہیں۔ ناشتے کے وقت مس ہیکن نے اتفاقاً لینا کا ذکر کیا۔

”وہ کون ہے۔؟ مسز ستلف نے پوچھا۔

”وہ میرے اس چچیرے بھائی کی بیوی ہے، جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ وہ گزشتہ دنوں اعصاب شکنی کا شکار رہی۔ کیوں نہ اُسے دو ہفتے کے لیے یہاں بُلا لیں؟“

”کیا وہ برج کھیلنا جانتی ہے۔؟“

”کیوں نہیں۔ اس کے یہاں آنے سے کسی دوسرے کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔“

بات طے ہو گئی۔ لینا کو بلانے کے لیے تار بھیجا گیا اور وہ تیسرے دن آ پہنچی۔ مس ہیکن اُسے سٹیشن پر لینے گئی۔ شوہر کی موت کی وجہ سے لینا کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے۔ مس ہیکن نے اسے دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے بڑی گرم جوشی سے اُس کا منہ چوم لیا۔

”تم بہت دُبلی ہو۔“

اس نے کہا۔ لینا مسکرا دی۔

”گزشتہ دنوں میری طبیعت علیل رہی۔ اور اب تو وزن بھی بہت کم ہو گیا ہے۔ ‘مس ہیکن نے ایک سرد آہ بھری، لیکن یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ اس کی وجہ رشک تھی یا لینا سے ہمدردی۔ وہ اُسے ایک پُر فضا ہوٹل میں لے گئی۔ جہاں دونوں سہیلیوں سے اُس کا تعارف کرایا گیا۔ اُس کی بیکسی دیکھ کر مسز رچمین کا دل بھر آیا۔ اور اُس کے چہرے کی زردی نے مسز ستلف کو بھی بہت متاثر کیا۔ ہوٹل میں تھوڑی دیر تفریح کے بعد وہ لنچ کے لیے اپنی قیام گاہ کو چل دیں۔

”مجھے کچھ روٹی چاہیے۔“

لینا کے یہ الفاظ سہیلیوں کے کانوں پر بہت گراں گزرے۔ وہ تو دس سال ہوئے اُسے چھوڑ چکی تھی حالانکہ مسز رچمین ایسی لالچی عورت بھی روٹی سے پرہیز کرتی تھی۔ مسز ہیکن نے ازراہ مہمان نوازی خانساماں سے کہا کہ فوراً حکم کی تعمیل کرے۔

”تھوڑا مکھن بھی۔“

کسی غیر مرئی قوت نے ایک لمحے کے لیے ان سب کے ہونٹ سی دیے۔

”غالباً گھر میں مکھن موجود نہیں۔ ابھی خانساماں سے پوچھتی ہوں۔“

مس ہیکن نے کسی قدر توقف سے جواب دیا۔

”مکھن روٹی بہت پسند ہے۔“

لینا نے مسز رچمین سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور خانساماں سے روٹی لے کر بڑے اطمینان سے اس پر مکھن لگایا۔ مس ہیکن بولی۔

”ہم یہاں بہت سادہ غذا کی عادی ہیں۔“

لینا نے مچھلی کے ٹکڑے پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

”مجھے جب تک مکھن، روٹی آلو اور بالائی ملتی رہے بہت مطمئن رہتی ہوں۔

”افسوس کہ یہاں کہیں بالائی نہیں ملتی۔“

مسز رچمین نے کہا۔

”اوہ۔“

لینا بولی۔ لنچ پر بغیر چربی کے کباب چنے گئے۔ اس کے علاوہ پالک تھی اور دم بخت ناشپاتیاں بھی۔ ناشپاتی کھاتے ہی لینا نے متجسس نظروں سے خانساماں کی طرف دیکھا اور اشارہ پاتے ہی خانساماں کھانڈ لے کر حاضر ہو گیا۔ اُس نے اپنی قہوہ کی پیالی میں تین چمچے کھانڈ ڈال دی۔

”تمھیں کھانڈ بہت پسند ہے۔“

مسز ستلف نے کہا۔

”ہمیں تو سکرین زیادہ مرغوب ہے۔“

مس ہیکن نے ایک ٹکیہ اپنی پیالی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ایک بے لذت شے ہے۔“

لینا نے جواب دیا۔ مسز رچمین منہ بنا کر اور للچائی ہوئی نظروں سے کھانڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ مس ہیکن نے اُسے زور سے پکارا اور ایک سرد آہ بھر کر اس نے بھی مجبوراً سکرین کی ٹکیہ اُٹھا لی۔ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد وہ برج کھیلنے لگیں۔ لینا خوب کھیلی۔ سب نے کھیل کا لطف اٹھایا۔ مسز ستلف اور مسز رچمین کے دل میں معزز مہمان کے لیے گہری ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ مس ہیکن کے دل کی مراد بھی بر آئی۔ اور وہ یہی تو چاہتی تھی کہ لینا ان کے ساتھ دو ہفتے خوشی سے بسر کرے۔ چند ساعت بعد مس ہیکن اور مسز رچمین گالف کھیلنے چلی گئیں اور مسز ستلف ایک جوان سال، خوش شکل پرنس روکامیر کے ساتھ سیر کو نکل گئی۔ لیکن کچھ دیر ستانے کے خیال سے لیٹ گئی۔ ڈنر سے تھوڑا سا وقت پہلے سب لوٹ آئیں۔

”لینا پیاری کہو وقت کیسے گزرا۔

”مس، ہیکن نے کہا۔

”گاف کھیلتے وقت دھیان تمہاری ہی طرف تھا۔“

”اوہ میں تو بڑے مرے سے بستر پر ہی پڑی رہی اور جا کر کاک ٹیل بھی پی اور سنو۔ آج ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ میری نظر پڑا۔ جہاں بڑی اچھی بالائی بھی مل سکتی ہے۔ میں نے روزانہ مکان پر بالائی منگوانے کا انتظام کر لیا ہے۔“

اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اُسے یقین تھا کہ وہ تینوں اُس کی بات کو سراہیں گی۔

”تم کتنی اچھی ہو۔ لینا“

مسز، ہیکن نے کہا۔

”لیکن افسوس کہ ہمیں بالائی پسند نہیں۔ ایسی آب وہوا میں یہ ہمیں راس نہیں آسکتی۔“

”نہ سہی، میں جو سلامت ہوں۔“

لینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمھیں کیا اپنی شکل وصورت کی کوئی پروا نہیں۔“

مسز ستلف نے منہ بنا کر کہا۔

”مجھے تو ڈاکٹر نے بالائی کھانے کو کہا ہے۔“

”کیا اُس نے مکھن، روٹی، آلو اور چاروں ہی چیزیں تجویز کی ہیں؟“

”بے شک، تمہاری سادی غذا سے میں یہی مُراد لیتی ہوں۔“

”تم یقیناً بہت موٹی ہو جاؤ گی۔“

لینا کھکھلا کر ہنس دی۔ رات کو اُس کے سو جانے پر دیر تک تینوں نکتہ چینی کرتی رہیں۔ آج شام اُن کی طبیعت کتنی شگفتہ تھی لیکن اب مسز رچمین بیزار سی نظر آنے لگی۔ مسز ستلف الگ جلی بیٹھی تھی۔ اور مس، ہیکن کا مزاج بھی برہم ہو چکا تھا۔

”میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ میرا من بھاتا کھانا میری آنکھوں کے سامنے بیٹھ کر اُڑائے۔“

مسز رچمین نے ذرا تلخی سے کہا۔

”یہ تو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

مس، ہیکن نے جواب دیا۔

”آخر تم نے اُسے یہاں بُلایا ہی کیوں۔؟

”مجھے اس بات کی کیا خبر تھی۔“

”اگر اس کے دل میں اپنے مرحوم شوہر کا ذرا بھی خیال ہوتا تو وہ کبھی پیٹ بھر کر نہ کھاتی۔ اُسے فوت ہوئے ابھی دو مہینے تو گزرے ہیں۔“

”عجیب مہمان ہے کہ اسے ہماری مرضی کا کھانا ہی پسند نہیں۔“

”سُنا، وہ کل کیا کہہ رہی تھی اُسے ڈاکٹر نے مکھن روٹی، آلو اور بالائی کھانے کو کہا ہے۔“

”اسے تو پھر کسی سینوٹوریم کا رُخ کرنا چاہیے۔“

”وہ مہمان ہے تو تمہاری۔ ہمارا تو اس سے کوئی رشتہ نہیں۔ میں تو متواتر دو ہفتے تک اُس پیٹو کا تماشا دیکھتی رہی ہوں۔“

”صرف کھانے پینے کو زندگی کا مقصد سمجھ لینا بڑی بے ہودگی ہے۔“

”تم کیا مجھے بیہودہ پکار رہی ہو۔“

مسز ستلف نے کہا۔

”آپس میں بدگمانی سے فائدہ۔؟“

مسز رچمین نے بات کاٹ کر کہا۔

”میں ہرگز برداشت نہیں کرسکتی کہ تم ہمارے سوتے میں باورچی خانہ میں گھس کر کھاتی پیتی رہو۔“

ان الفاظ نے مس ہیکن کے تن بدن میں ایک آگ لگادی۔ وہ اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”مسز ستلف اپنی زبان سنبھالو۔ تم کیا مجھے اتنا ہی کمینہ خیال کرتی ہو۔“

”آخر تمہارا وزن کیوں نہیں کم ہوتا۔“

”بالکل غلط، میرا تو سیروں وزن کم ہو گیا ہے۔“

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر چھاتی پر گرنے لگے۔

”پیاری تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔“

یہ کہہ کر مسز ستلف گھٹنوں کے بل جھکی اور اُس کے جسم کو اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کی۔ اُس کا بھی دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔

”تو کیا میں دُبلی دکھائی نہیں دیتی۔“

مس ہیکن نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں بے شک۔“

مسز ستلف نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ مسز رچمین بھی جو فطرتاً نہایت کمزور طبعیت واقع ہوئی تھی، اب رونے لگیں۔ یہ منظر بہت رقت خیز تھا۔ مس ہیکن ایسی عورت کو آنسو بہاتے دیکھ کر سنگ دل انسان بھی موم ہو جاتا۔ بالآخر اُنھوں نے اپنے آنسو پونچھے اور ایک نے برانڈی اور پانی کے چند گھونٹ پیے۔ وہ اب اس بات پر متفق تھیں کہ لینا ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اپنی من مرضی کی غذا کھائے۔ آخر وہ ان کی مہمان ٹھہری۔ ان کا فرض تھا کہ ہر طرح اس کا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ انھوں نے ایک دوسری کا گرم جوشی سے منہ چوما اور اپنی اپنی خوابگاہوں میں چلی گئیں۔ یہ سچ ہے کہ انسانی فطرت بہت کمزور ہے اور اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں۔ غذا کے معاملے میں اب ہر ایک اپنی مرضی کی مالک تھی۔ اُنھوں نے مچھلی کے کباب شروع کیے تو لینا کی سویاں مکھن اور پنیر پر بسر ہونے لگی۔ وہ ہفتے میں دو بار اُبلے ہوئے انڈے اور کچے ٹماٹر کھاتیں۔ لینا مٹر کے دانے بالائی میں ملا کر کھاتی۔ اسے اُب ٹماٹر کو مختلف مسالوں میں پکا کر کھانے کا شوق چرایا تھا۔ اُس کا خانساماں بھی بڑا با مذاق تھا۔ وہ ہر بار ایک بہتر چیز تیار کر کے میز پر چن دیتا۔ لینا نے ایک موقع پر یہ بھی کہا۔ کہ ڈاکٹر نے اُسے لنچ پر برگنڈی کی ارغوانی شراب اور ڈنر پر شمپئن استعمال کرنے کو کہا ہے۔ ان الفاظ نے تینوں سہلیوں کو دم بخود کر دیا۔ وہ ابھی ابھی ہنس کھیل رہی تھیں۔ لیکن یکایک کیفیت بدل گئی۔ مسز رچمین کا تو گویا رنگ زرد پڑ گیا۔ مسز ستلف کی نیلی آنکھوں میں ایک خوفناک سی چمک پیدا ہو گئی۔ اور مس ہیکن کی آواز بھر اگئی۔ برج کھیلتے وقت وہ بڑے نرم لہجے میں ایک دوسرے سے بات کیا کرتیں۔ لیکن اب بات بات پر بگڑنے لگیں۔ لینا نے انھیں بہتیرا سمجھایا بجھایا کہ کھیل کے وقت آپس میں تکرار مناسب نہیں۔ لیکن بے سُود۔ وہ خوش تھی کہ کھیل میں شروع ہی سے اس کا پلہ بھاری رہا ہے۔ اور دنوں میں اس نے ایک بڑی رقم جیت لی ہے۔ تینوں موٹی سہیلیوں کو اب ایک دوسری سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اپنے مہمان سے بھی بدظن ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود اکثر ایک دوسری کے خلاف کان بھرتیں۔ لینا کے سامنے وہ ایک دوسری سے ظاہر اً ملتی رہیں، لیکن پھر یہ بات بھی نہ رہی۔ وہ ایک دوسری سے بہت مایوس ہو چکی تھیں مس ہیکن لینا کو رخصت کرنے سٹیشن پر گئی۔ گاڑی پر سوار ہوتے وقت وہ بولی۔

”میرے پاس الفاظ نہیں کہ تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرسکوں۔“

”تمہاری صحبت بہت پُر لُطف رہی۔“

مس ہیکن نے جواب دیا۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو اُس نے اس زور سے آہ بھری کہ پلیٹ فارم اُس کے پاؤں کے نیچے کانپ کانپ گیا۔ اور وہ

”اُف اُف“

کا شور بُلند کرتی گھر لوٹی۔ اس نے غسل کرنے کا لباس پہنا اور ہوٹل کی طرف آنکلی۔ ایکا ایکی وہ مچل سی گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مسز رچمین نیا پائجامہ اور گلے میں موتیوں کی مالا پہنے، بناؤ سنگھار کیے بیٹھی تھی۔ وہ اُس کی طرف بڑھی۔

”کیا کر رہی ہو؟“

اس کے یہ الفاظ دو پہاڑوں میں بادل کی گرج کی طرح سنائی دیے۔

”کچھ کھا رہی ہوں۔“

اس کے سامنے مکھن، سیب کا مربہ قہوہ اور بالائی وغیرہ چنے ہوئے تھے، وہ گرم روٹی پر مکھن کی موٹی تہ جما کر اس پر مربہ اور بالائی ڈال رہی تھی۔

”تم کھانے کی لالچ میں اپنی جان دے دو گی۔“

”کوئی پروانھیں۔“

مسز رچمین نے ایک بڑا لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

”تم اور بھی موٹی ہو جاؤ گی۔“

بس خاموش، اُس نابکار کو خدا سمجھے جسے میں متواتر دو ہفتے سے حلق میں رنگارنگ کے نوالے ٹھونستے دیکھتی رہی ہوں۔ ایک انسان تو اتنا ہضم نہیں کر سکتا۔“

مس ہیکن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بالکل بے جان سی ہو گئی۔ اُسے اس وقت شاید ایک مضبوط مرد کی ضرورت تھی جو اُسے گھٹنے پر لگا کر پچکارے۔ وہ خاموشی سے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ خادم حاضر ہوا۔ اور اُس نے قہوے کی طرف اشارہ کر کے اُسے لانے کو کہا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر کریم رول اٹھانے لگی۔ لیکن مسز رچمین نے رکابی ایک طرف رکھ دی۔ مس ہیکن جل بھن گئی اور اُسے ایک ایسے نام سے مخاطب کیا جو خاص طور پر عورتوں کے شایان شان نہ تھا۔ اتنے میں خادم اُس کے لیے مکھن، مربہ اور قہوہ لیے آیا۔

”پگلے بالائی لانا بھول گیا“

۔ وہ شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔ اُس نے کھانا شروع کیا اور حلق میں مکھن، مربہ ٹھونسنے لگی۔ ہوٹل میں اب رنگارنگ کے انسانوں کی چہل پہل نظر آنے لگی۔ مسز ستلف بھی پرنس روکا میر کے ساتھ چہل قدمی کرتی ادھر آ نکلی۔ وہ پہلے اپنے گرد ایک ریشمی لبادہ مضبوطی سے لپیٹے ہوئی تھی۔ تا کہ اس طرح وہ کچھ دبلی دکھائی دے۔ اپنی ٹھوڑی کا نقص چھپانے کے لیے اُس نے سر کو اُوپر اُٹھایا ہوا تھا۔ وہ بہت مسرور تھی۔ ایک دوشیزہ کی طرح۔ پرنس اس سے اجازت لے کر پانچ منٹ کے لیے مردانہ کمرے میں اپنے بال سنوارنے گیا اور وہ بھی اپنے رخساروں کو غازہ چمکانے کے لیے زنانہ کمرے کی طرف آئی۔ ایکا ایکی اُس کی نظر اپنی دونوں سہلیوں پر پڑی وہ رُک گئی۔

”تم پیٹو حیوان۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور خادم کو آواز دی۔ اس کے ذہن سے اب پرنس کا خیال بھی اُتر چکا تھا۔ آنکھ جھپکتے میں خادم حاضر ہو گیا۔

”میرے کھانے کو بھی یہی لاؤ۔“

”اور میرے لیے سویاں۔“

”مس ہیکن !۔“

مسز رچمین پکار اُٹھی۔

”بس خاموش۔“

تو میں بھی یہی کھاؤں گی۔“

قہوہ لایا گیا اور کریم رول اور بالائی بھی۔ وہ گرم روٹی پر بالائی تہ جما کر کھانے لگیں۔ مربے کے بڑے چمچے حلق میں ٹھونس لیے۔ وہ گویا ایک خاص اہتمام سے کھا رہی تھیں۔ ایسے موقع پر مسز ستلف کے لیے پرنس سے لگاؤ ایک بے معنی بات تھی۔

”میں نے پچیس سال سے آلو نہیں کھائے“

مس ہیکن نے دھیمی آواز میں کہا۔ مسز رچمین نے فوراً خادم کو تینوں کے لیے بھنے ہوئے آلو لانے کو کہا۔ ایک لمحہ کے بعد بھنے ہوئے آلو اُن کے سامنے تھے اور وہ بڑے چٹخارے لے کر کھانے لگیں تینوں سہیلیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سرد آہیں بھرنے لگیں۔ اب اِن کے درمیان غلط فہمی رفع ہو چکی تھی۔ اور دلوں میں انتہائی محبت کا جذبہ موجزن تھا۔ انھیں یقین نہ آتا تھا کہ آج سے پہلے وہ ایک دوسرے سے قطع تعلق پر آمادہ ہو چکی تھیں۔ آلو اب ختم ہو چکے تھے۔

”ہوٹل میں چاکلیٹ تو ضرور ہونگے۔“

مسز رچمین نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“

ایک لمحہ بعد مس ہیکن اپنا منہ کھولے حلق میں چاکلیٹ ٹھونس رہی تھی۔ اُس نے دوسرے پر ہاتھ ڈالا۔ اور منہ میں ڈالنے سے پہلے دونوں سہلیوں کی طرف نظر اُٹھائے نابکار لینا کو کوسنے لگی۔ ”تم جو چاہو کہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ برج کھیلنا نہیں جانتی۔“

”بے شک۔“

مسز ستلف نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ مسز رچمین کا ذہن اس وقت کسی لذیذ کیک کی فکر میں تھا۔

تین میں، نہ تیرہ میں

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوتین میں، نہ تیرہ میں

”میں تین میں ہوں نہ تیرہ میں، نہ سُتلی کی گرہ میں“

”اب تم نے اُردو کے محاورے بھی سیکھ لیے۔“

”آپ میرا مذاق کیوں اُڑاتے ہیں۔ اردو میری مادری زبان ہے“

”پدری کیا تھی؟ تمہارے والد بزرگوار تو ٹھیٹھ پنجابی تھے۔ اللہ اُنھیں جنت نصیب کرے بڑے مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ اتنی دیر لکھنؤ میں رہے، وہاں پچیس برس اُردو بولتے رہے لیکن مجھ سے ہمیشہ انھوں نے پنجابی ہی میں گفتگو کی۔ کہا کرتے تھے اُردو بولتے بولتے میرے جبڑے تھک گئے ہیں اب ان میں کوئی سکت باقی نہیں رہی۔“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں“

”میں تو ہمیشہ جھوٹ بولتا ہوں۔ کوئی بات بھی تم سے کہوں تم یہی سمجھو گی کہ جھوٹ ہے حالانکہ جھوٹ بولنا عورت کی فطرت ہے۔“

”آپ عورت ذات پر ایسے رکیک حملے نہ کیا کریں۔ مجھے بڑی ہی کوفت ہوتی ہے۔“

”بہت بہتر آئندہ محتاط رہنے کی کوشش کروں گا۔“

”صرف کوشش کریں گے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ اپنی زبان ایسے معاملوں میں قطعی طور پر بند رکھیں گے۔“

”یہ وعدہ میں نہیں کر سکتا۔ بندہ بشر ہے۔ ہو سکتا ہے سہواً میرے منہ سے کچھ نکل جائے جسے تم حملہ قرار دے دو۔“

”میں یہ سوچتی ہوں آپ۔ آپ کس قسم کے شوہر ہیں بس ہر بات کو مذاق میں اُڑا دیتے ہیں۔ پرسوں میں نے آپ سے کہا کہ منجھلی کو ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے تو آپ نے مسکرا کر کہا فکر نہ کرو ٹھیک ہو جائے گی۔ لڑکا ہوتا تو فکر و تردّد کی بات تھی، لڑکیاں نہیں مرا کرتیں۔“

”میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔ سب سے چھوٹی اُوپر کی منزل سے نیچے گری اور بچ گئی۔ دو مرتبہ اسے ہیضہ ہوا، چیچک نکلی، نمونیا ہوا مگر وہ زندہ ہے اور اپنی بڑی بہنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تندرست ہے۔“

”آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی“

”یہ میری منطق نہیں میری جان۔ قدرت کو یہی منظور ہے کہ مرد دُنیا میں کم ہو جائیں اور عورتیں زیادہ۔ تمھارا پہلا بچہ جو لڑکا تھا، اسے معمولی ساز کام ہوا اور وہ دوسرے دن اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تمھاری بڑی لڑکی کو تو تین بار ٹائیفائیڈ ہوا لیکن وہ زندہ ہے۔ میرا خیال ہے وہ وقت آنے والا ہے جب اس دنیا میں کوئی مرد نہیں رہے گا صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں گی۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ مردوں کے بغیر تم عورتوں کا گزارا کیسے ہو گا۔“

”یعنی جیسے آپ لوگوں کے بغیر ہمارا گزارا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم بہت خوش رہیں گی۔ مردوں کا خاتمہ ہو گیا تو یہ سمجھیے کہ ہمارے تمام دُکھ درد کا خاتمہ ہو گیا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔“

”تم آج محاوروں کو بہت استعمال کر رہی ہو۔“

”آپ کو کیا اعتراض ہے؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض ہو بھی کیا سکتا ہے۔ محاورے میری املاک نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا کہ تم آج محاورے زیادہ استعمال کر رہی ہو۔“

”دو ہی تو کیے ہیں، یہ زیادہ ہیں کیا؟“

”زیادہ تو نہیں۔ لیکن اندیشہ ہے کہ تم دس پندرہ اور مجھ پر ضرور لڑھکا دو گی۔“

”تھوتھا چنا باجے گھنا۔ آج اتنا کیوں گرج رہے ہو۔ آپ کو معلوم نہیں کہ جو گرجتے ہیں برستے نہیں۔“

”دو محاورے اور آ گئے۔ خدا کے لیے ان کو چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ آج ناراضی کی وجہ کیا ہے؟“

”ناراضی کا باعث آپ کا وجود ہے۔ مجھے آپ کی ہر حرکت بُری معلوم ہوتی ہے۔“

”میں اگر تم سے پیار محبت کی باتیں کرتا ہوں تو وہ بھی تمھیں بُری لگتی ہیں۔“

”مجھے آپ کی پیار محبت کی باتیں نہیں چاہئیں۔“

”تو اور کیا چاہیے“

”یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ میں کیا جانوں۔ شوہر کو اپنی بیوی کو سمجھنا چاہیے۔ وہ کیا چاہتی ہے، کیا نہیں چاہتی۔ اس کو اس کا علم پوری طرح ہونا چاہیے۔ آپ تو بالکل غافل ہیں۔“

”میں کوئی قیافہ گیر، رمز شناس اور نفسیات کا ماہر نہیں کہ تمھیں پوری طرح سمجھ سکوں۔ اور تمھارے دماغ کے تلوّن کی ہر سلوٹ کے معنی نکال سکوں۔ میں اس معاملے میں گدھا ہوں۔“

”آپ اونٹ ہیں اونٹ“

”کس لحاظ سے؟“

”اس لیے کہ آپ کی کوئی کل سیدھی نہیں۔“

”اچھا بھلا ہوں۔ میری کل سیدھی ہے۔ ابھی تم نے مجھ سے پرسوں کہا تھا کہ آپ چالیس برس کے ہونے کے باوجود ماشاء اللہ جوان دکھائی دیتے ہیں۔ تم نے میرے بدن کی بھی بہت تعریف کی تھی۔“

”وہ تو میں نے مذاق کیا تھا۔ ورنہ آپ تو ایسا جھڑوس ہو چکے ہیں۔“

”دیکھو ایسی بدزبانی مجھے پسند نہیں۔ تم بعض اوقات ایسی بکواس شروع کر دیتی ہو، جو کوئی شریف عورت نہیں کر سکتی۔“

”تو گویا میں شریف نہیں۔ فاحشہ ہوں۔ بازاری عورت ہوں۔ میں نے آپ کو کیا گالی دی جس پر آپ کو اتنا طیش آ گیا کہ آپ نے مجھ کو بدزبان کہہ دیا۔“

”بھئی، میں اب جھڑوس ہو چکا ہوں۔ مجھ سے بات نہ کرو۔“

”میں آپ سے بات نہ کروں گی تو اور کس سے کروں گی۔“

”میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم اپنے بھنگی سے گفتگو کر سکتی ہو۔ اس سے یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ میں جھڑوس ہو گیا ہوں۔“

”آپ کو شرم نہیں آتی۔ آپ نے یہ کیسی بات کہی ہے؟“

”بھنگی اور مجھ میں کیا فرق ہے! جس طرح تم اس غریب سے پیش آتی ہو، اسی طرح کا سلوک مجھ سے کرتی ہو۔“

”بڑے بیچارے غریب بنے پھرتے ہیں اور اب مجھ سے کہتے ہیں کہ میں بھنگی کے ساتھ بات کیا کروں۔ غیرت کا مادہ تو آپ میں رہا ہی نہیں۔“

”میں نر ہوں۔ مادہ تم ہو۔“

”اس سے کیا ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد عورتوں کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں۔ ہم میں کیا برائی ہے۔ کیا عیب ہے۔ یہی نا کہ ہمارے والدین نے غلطی سے آپ کے ساتھ میری شادی کر دی۔“

”شادی تو آخر کسی جگہ ہونی ہی تھی۔ تم کیا کرتیں اگر نہ ہوتی؟“

”میں بہت خوش رہتی۔ شادی میں آخر پڑا ہی کیا ہے؟“

”کیا پڑا ہے۔ خاک!۔ میں تو کنواری رہتی تو اچھا تھا۔ اس بک بک میں تو نہ پڑتی۔“

”کس بک بک میں؟“

”یہی جو آئے دن ہوتی رہتی ہے۔“

”نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ روز روز کی چخ صرف تمھاری وجہ سے ہوتی ہے ورنہ میں نے ان پندرہ برسوں میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی کہ تمھاری خدمت کروں۔“

”خدمت؟“

”خدمت نہ کہو، میں اپنا فرض ادا کرتا رہا ہوں۔ خاوند کو یہی کرنا چاہیے۔ تمھیں مجھ سے کس بات کا گلہ ہے؟“

”ہزار گلے ہیں، ایک ہو تو بتاؤں“

”ان ہزار گلوں میں سے ایک گلہ تو مجھے بتا دو تا کہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔“

”آپ کی اصلاح اب ہو چکی۔ آپ تو ازل سے بگڑے ہوئے ہیں۔“

”یہ اطلاع تمھیں کہاں سے ملی تھی؟۔ میں تو اس سے بالکل بے خبر ہوں۔“

”آپ کی بے خبری کا تو یہ عالم ہے کہ آپ کو خود اپنی خبر نہیں ہوتی۔“

”غالب کا ایک شعر ہے: ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی خود اپنی خبر نہیں آتی“!

”غالب جائے جہنم میں۔ اس وقت تو آپ مجھ پر غالب ہیں۔“

”لاحول ولا۔ میں تو جھڑوس ہو چکا ہوں۔ ازل سے بگڑا ہوا ہوں۔“

”آپ میری ہر بات کا مذاق اڑاتے ہیں۔“

”میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں مجھ میں اتنی طاقت ہے نہ مجال۔ لیکن میں کیا پوچھ سکتا ہوں کہ آج آپ کی ناراضی کا باعث کیا ہے؟“

”میری ناراضگی کا باعث کیا ہو سکتا ہے، یہی کہ آپ۔“

”کیا؟“

”آپ خود سوچیے۔ بڑے سمجھدار ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں؟“

”میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے کانوں کے لیے ’ٹوپس‘ لے کر آؤں گا۔ مگر میں جس دوکان میں گیا وہاں مجھے دل پسند ٹوپس نہ ملے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ لٹھے کا ایک تھان لے کر آؤ۔ میں نے شہر بھر میں ہر جگہ کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تمہارے ریشمی کپڑے جو لانڈری میں دُھلنے کے لیے گئے تھے۔ میں ان کو وصول کرنے گیا۔ مگر لانڈری والے نے کہا کہ اُس کے دھوبی بیمار ہیں، اس لیے دو دن انتظار کیجیے۔ تمہاری گھڑی جو خراب ہو گئی تھی۔ اس کے متعلق بھی میں نے پوچھا۔ گھڑی ساز نے کہا کہ اس کا ایک پرزہ بنانا پڑے گا جو وہ بنا رہا ہے۔ “

”آپ بہانے بنانا خوب جانتے ہیں۔“

”خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہاری قمیضیں کل درزی سے آ جائیں گی، اس کو میں نے بہت ڈانٹا کہ تم نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ اس نے کہا، حضور کل لے جائیے گا۔“

”قمیصیں جائیں بھاڑ میں۔“

”وہ کیوں؟“

”آپ کو تو کچھ ہوش ہی نہیں“

”میں کیا بے ہوش رہتا ہوں۔ تمھیں جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت اس لیے تھی کہ آپ پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اگر میں نے ایک جملے میں اپنا مدعا بیان کیا ہوتا۔“

”تو ازراہِ کرم اب تم ایک جملے میں اپنا مدعا بیان کر دو تا کہ میری خلاصی ہو۔“

”میری داڑھ اتنی تکلیف دے رہی ہے۔ کئی مرتبہ سے آپ سے کہہ چکی ہوں۔ کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیے مجھے، مگر۔“

”ابھی چلو! داڑھ کیا، تم چاہو تو میں سب دانت نکلوا دوں گا۔“

ٹھنڈا گوشت

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا۔ کلونت کور پلنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پر اسرار خاموشی میں غرق تھا۔ کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے الجھے ہوئے دھاگے کھول رہا، ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور وہ دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولہے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں۔ بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔ ایشر سنگھ گو سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے، گمڑی اس کے قد و قامت اور خدوخال

سے پتہ چلتا تھا کہ کلونت کور جیسی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔ چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی سے گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو بچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔

"ایشر سیاں۔"

ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ کلونت کور چلائی۔

"ایشر سیاں۔"

لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی۔

"کہاں رہے تم اتنے دن؟"

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"مجھے معلوم نہیں۔"

کلونت کور بھنا گئی۔

"یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے؟"

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ جو اب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟"

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔

"کلونت"!

آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔

"ہاں جانی"

کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔ ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولھے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا۔

"یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے۔"

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟"

"بُرے کی ماں کے گھر۔"

ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔

"قسم واہگورو کی بڑی جاندار عورت ہے۔"

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیے اور پوچھا۔

"تمہیں میری قسم بتاؤ، کہاں رہے؟۔ شہر گئے تھے؟"

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں۔"

کلونت کور چڑ گئی۔

"نہیں تم ضرور شہر گئے تھے۔ اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔"

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی۔

”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں کیا ہوا؟۔ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کر لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔“

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا۔

”دیکھا کیسے رنگ نیلا پڑ گیا۔ ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟“

”تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔“

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا، بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ایشر سیاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟“

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔

”جانی میں وہی ہوں۔ گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی۔“

کلونت کور نے مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔

”تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟“

”برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔“

”بتاؤ گے نہیں؟“

”کوئی بات ہو تو بتاؤں۔“

”مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔“

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آ گئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

”آ جاؤ، ایک بازی تاش کی ہو جائے“!

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں، ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا۔

”چل دفان ہو۔“

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولہے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔

”نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے۔“

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونٹ کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اتار کے پھینک دیا اور کہا۔

”لو، پھر ہو جائے تُرپ چال۔“

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا، پھر اس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

”کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو۔“

کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی۔

”بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں۔“

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا۔

”ہونے دے آج ظلم؟“

اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے۔ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا۔ کان کی لووں کو کاٹا، ابھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، ابھرے ہوئے کولہوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے۔ گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے۔ چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی۔ لیکن

ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے۔ سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیے۔ پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے۔ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا۔

”ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک“!

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہی، اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا

”ایشر سیاں، وہ کون حرامزادی ہے، جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے۔ جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟“

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کلونت کور غصے سے ابلنے لگی۔

”میں پوچھتی ہوں؟ کون ہے چڈو۔ کون ہے وہ الفتی۔ کون ہے وہ چور پتا؟“

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کوئی بھی نہیں کلونت، کوئی بھی نہیں۔“

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی۔ کھا واہگورو جی کی قسم۔ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا، مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔

”قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں۔ تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا۔ لے اب کھا واہگورو جی کی قسم۔ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا، کلونت کور بالکل دوانی ہو گئی۔ لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔ آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہیں۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی۔

”جانے دے اب کلونت! جانے دے۔“

آواز میں بلا کا درد تھا، کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔ خون، ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا، اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔

”میری جان! تم نے بہت جلدی کی۔ لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔“

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا۔

”مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟“

لہو، ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا، جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔

”اور میں۔ اور میں۔ بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔ اسی کرپان سے۔“

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔

”میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟“

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔

”گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔“

کلونت چلائی۔

”میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟“

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی۔

”بتاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔

”انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔“

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر۔“

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی۔

”مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں۔ گلا چرا ہے ماں یا میرا۔ اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔“

اور جب وہ بات بنانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت! میری جان۔ میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا!؟۔ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔ شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دے دیے۔ لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔“

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔

”کون سی بات؟“

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا۔ جس مکان پر۔ میں نے دھاوا بولا تھا۔ اس میں سات۔ اس میں سات آدمی تھے۔ چھ میں نے۔ قتل کر دیے۔ اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے۔ چھوڑ اسے۔ سن۔ ایک لڑکی تھی بہت سندر۔ اس کو اٹھا میں اپنے ساتھ لے آیا۔“

کلونت کور، خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اڑایا۔

”کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی۔ میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا۔

”نہیں، ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ۔“

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا۔

”ہوں۔“!

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔ راستے میں۔ کیا کہہ رہا تھا میں؟۔ ہاں راستے میں۔ نہر کی پٹڑی کے پاس، تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا۔ پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں

”۔ یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔ کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا۔

”پھر کیا ہوا؟“

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔

”میں نے۔ میں نے پتا پھینکا۔ لیکن۔ لیکن۔“

اس کی آواز ڈوب گئی۔ کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا۔

”پھر کیا ہوا؟“

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کیجسم یک طرف دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔

”وہ۔ وہ مری ہوئی تھی۔ لاش تھی۔ بالکل ٹھنڈا گوشت۔ جانی مجھے اپنا ہاتھ دے۔“

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا، جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ، پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔ معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال

دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے۔ وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ جو باقی تھے، ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو، سکھ جا چکے تھے اسی لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو، سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بارڈر پر پہنچا دیے گئے۔ ادھر کا معلوم نہیں، لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ مے گوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ

”زمیندار“

پڑھتا تھا، اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا۔

”مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟“

تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔

”ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔“

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔ اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا۔

”سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا رہا ہے۔ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔“

دوسرا مسکرایا۔

”مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے۔ ہندوستانی بڑے شیطانی، اکڑ اکڑ پھرتے ہیں۔“

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے

”پاکستان زندہ باد“

کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر، پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگوؤں سے بھی وہ کوئی نتیجہ بر آمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے، اس کا محل وقوع کیا ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا، اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے! اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے! ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا جھاڑو دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا۔

”میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔ میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔“

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔ ایک ایم۔ ایس۔ سی پاس ریڈیو انجنیئر میں جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ، باغ کی ایک خاص روش پر، سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سو مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔ لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امر تسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا، مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنھوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔ جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے، اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امر تسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔ یورپین وارڈ میں اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے

پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔ ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔

”اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال اف دی لالٹین۔“

دیکھتا تھا رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔ ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں، مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا تھا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔

”اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔“

لیکن بعد میں

”آف دی پاکستان گورنمنٹ“

کی جگہ

”اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ“

نے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے، خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے، کیا پتہ ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا، اس لیے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے، جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے، وہ اس کے متعلق جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔ مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔ اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا، نکلوا کے پہنتا اور یوں سج کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار

”اوپر دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین“

کہہ دیتا۔ اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ تو وہ اسے یقیناً بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں، جہاں اس کی زمینیں ہیں۔ پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا

”وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔“

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دیدے تا کہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا:

”اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح۔ جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔“

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمان کے خدا ہو۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔ تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا، مگر سپاہیوں نے اسے روکا۔

”یہ تم سے ملنے آیا ہے۔ تمہارا دوست فضل دین ہے۔“

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا“

میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی۔ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے۔ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی، میں نے کی۔ تمہاری بیٹی روپ کور۔
“

وہ کچھ کہتے کہتے روک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔

”بیٹی روپ کور“!

فضل دین نے رک رک کر کہا

”ہاں۔ وہ۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔“

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا

”انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو۔ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میر اسلام کہنا۔ اور بہن امرت کور سے بھی۔ بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔ دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔ اور دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی۔ اور۔ میرے لائق جو خدمت ہو کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں۔ اور یہ تمہارے لیے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔“

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا۔

”ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟“

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا۔

”کہاں ہے۔ وہیں ہے جہاں تھا۔“

بشن سنگھ نے پھر پوچھا۔

”پاکستان میں یا ہندوستان میں؟“

”ہندوستان میں۔ نہیں نہیں، پاکستان میں۔“

فضل دین بوکھلا سا گیا۔ بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

”اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی در فٹے منہ۔“

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔ سخت سردیاں تھیں، جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو، سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔ پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوئے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیوں کہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے، جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر یہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے۔

”پاکستان زندہ باد“

اور

”پاکستان مردہ باد“

کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیوں کہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرہ سن کر طیش آ گیا تھا۔ جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا۔

”ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟“

متعلقہ افسر ہنسا۔

”پاکستان میں۔“

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا:

”ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔“

اور زور زور سے چلانے لگا۔

”اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔“

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔ آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا!

ٹُوٹُو

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوٹُوٹُو

میں سوچ رہا تھا۔ دنیا کی سب سے پہلی عورت جب ماں بنی تو کائنات کا ردِعمل کیا تھا؟ دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تمتماتی آنکھوں سے دیکھ کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا۔

”میں بھی خالق ہوں۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ میرے آوارہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بالکنی سے اٹھ کر میں اندر کمرے میں آیا۔ ٹیلی فون ضدی بچے کی طرح چلائے جا رہا تھا۔ ٹیلی فون بڑی مفید چیز ہے، مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس لیے کہ یہ وقت بے وقت بجنے لگتا ہے۔ چنانچہ بہت ہی بددلی سے میں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر بتایا

”فور فور فائیو سیون۔“

دوسرے سرے سے ہیلو ہیلو شروع ہوئی۔ میں جھنجھلا گیا۔

”کون ہے“

جواب ملا۔

”آیا۔“

میں نے آیاؤں کے طرزِ گفتگو میں پوچھا۔

”کس کو مانگتا ہے؟“

”میم صاحب ہے۔“

”ہے۔ ٹھہرو۔“

ٹیلی فون کا ریسیور ایک طرف رکھ کر میں نے اپنی بیوی کو جو غالباً اندر سو رہی تھی، آواز دی

”میم صاحب۔ میم صاحب۔“

آواز سن کر میری بیوی اٹھی اور جمائیاں لیتی ہوئی آئی۔

”یہ کیا مذاق ہے۔ میم صاحب، میم صاحب“!

میں نے مسکرا کہا۔

”میم صاحب ٹھیک ہے۔ یاد ہے، تم نے اپنی پہلی آیا سے کہا تھا کہ مجھے میم صاحب کے بدلے بیگم صاحبہ کہا کرو تو اس نے بیگم صاحبہ کو بینگن صاحبہ بنا دیا تھا“!

ایک مسکراتی ہوئی جمائی لے کر میری بیوی نے پوچھا۔

”کون ہے۔“

”دریافت کرلو۔“

میری بیوی نے ٹیلی فون اٹھایا اور ہیلو ہیلو شروع کر دیا۔ میں باہر بالکنی میں چلا گیا۔ عورتیں ٹیلی فون کے معاملے میں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ تک ہیلو ہیلو ہوتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا۔ ٹیلی فون ہر دو تین الفاظ کے بعد ہیلو کیوں کہا جاتا ہے؟ کیا اس ہلو ہلو کے عقب میں احساس کمتری تو نہیں؟۔ بار بار ہلو صرف اسے کرنی چاہیے جسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کی مہمل گفتگو سے تنگ آکر سننے والا ٹیلی فون چھوڑ دے گا۔ یا ہو سکتا ہے یہ محض عادت ہو۔ دفعتاً میری بیوی گھبرائی ہوئی آئی۔

”سعادت صاحب، اس دفعہ معاملہ بہت ہی سیریس معلوم ہوتا ہے۔“

”کون سا معاملہ۔“

معاملے کی نوعیت بتائے بغیر میری بیوی نے کہنا شروع کر دیا۔

”بات بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی ہے۔ پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ بات کچھ بھی نہیں ہو گی۔ بس پُھسری کا بھگندر بنا ہو گا۔ دونوں سر پھرے ہیں۔“

”اجی حضرت کون؟“

”میں نے بتایا نہیں آپ کو؟۔ اوہ۔ ٹیلی فون، طاہرہ کا تھا“!

”طاہرہ۔ کون طاہرہ؟“

”مسز یزدانی۔“

”اوہ“!

میں سارا معاملہ سمجھ گیا

”کوئی نیا جھگڑا ہوا ہے؟“

نیا اور بہت بڑا۔ جایئے یزدانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

”مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟“

”معلوم نہیں۔ طاہرہ سے ٹیلی فون چھین کر مجھ سے فقط یہ کہا۔ بھابی جان، ذرا منٹو صاحب کو بلایئے“!

”خواہ مخواہ میر مغز چاٹے گا“

یہ کہہ کر میں اٹھا اور ٹیلی فون پر یزدانی سے مخاطب ہوا۔ اس نے صرف اتنا کہا

”معاملہ بے حد نازک ہو گیا ہے۔ تم اور بھابی جان ٹیکسی میں فوراً یہاں آجاؤ۔“

میں اور میری بیوی جلدی کپڑے تبدیل کرکے یزدانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہم دونوں نے یزدانی اور طاہرہ کے متعلق بے شمار باتیں کیں۔ طاہرہ ایک مشہور عشق پیشہ موسیقار کی خوبصورت لڑکی تھی۔ عطا یزدانی ایک پٹھان آڑھتی کا لڑکا تھا۔ پہلے شاعری شروع کی، پھر ڈرامہ نگاری، اس کے بعد آہستہ آہستہ فلمی کہانیاں لکھنے لگا۔ طاہرہ کا باپ اپنے آٹھویں عشق میں مشغول تھا اور عطا یزدانی علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے لیے

”بیلچہ“

نامی ڈرامہ لکھنے میں۔ ایک شام پریڈ کرتے ہوئے عطایزدانی کی آنکھیں طاہرہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ساری رات جاگ کر اس نے ایک خط لکھا اور طاہرہ تک پہنچا دیا۔ چند ماہ تک دونوں میں نامہ وپیام جاری رہا اور آخر کار دونوں کی شادی بغیر کسی حیل حجت ہو گئی۔ عطایزدانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ان کا عشق ڈرامے سے محروم رہا۔ طاہرہ بھی طبعاً ڈرامہ پسند تھی۔ عشق اور شادی سے پہلے سہیلیوں کے ساتھ باہر شوپنگ کو جاتی تو ان کے لیے مصیبت بن جاتی۔ گنجے آدمی کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھجلی شروع ہو جاتی

”میں اس کے سر پر ایک دھول تو ضرور جماؤں گی، چاہے تم کچھ ہی کرو۔“

ذہین تھی۔ ایک دفعہ اس کے پاس کوئی پیٹی کوٹ نہیں تھا۔ اس نے کمر کے گرد ازار بند باندھا اور اس میں ساڑھی اڑس کر سہیلیوں کے ساتھ چل دی۔ کیا طاہرہ واقعی عطایزدانی کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی؟ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یزدانی کا پہلا عشقیہ خط ملنے پر اس کا ردعمل غالباً یہ تھا کہ کھیل دلچسپ ہے کیا ہرج ہے، کھیل لیا جائے۔ شادی پر بھی اس کا ردعمل کچھ اسی قسم کا تھا۔ یوں تو مضبوط کردار کی لڑکی تھی، یعنی جہاں تک باعصمت ہونے کا تعلق ہے، لیکن تھی کھلنڈری۔ اور یہ جو آئے دن اس کا اپنے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا تھا، میں سمجھتا ہوں ایک کھیل ہی تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے اور حالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ کھیل بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہمارے داخل ہوتے ہی وہ شور برپا ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ طاہرہ اور یزدانی دونوں اونچے اونچے سروں میں بولنے لگے۔ گلے، شکوے، طعنے منے‘۔ پرانے مردوں پر نئی لاشیں، نئی لاشوں پر پرانے مردے۔ جب دونوں تھک گئے تو آہستہ آہستہ لڑائی کی نوک پلک نکلنے لگی۔ طاہرہ کو شکایت تھی کہ عطا اسٹوڈیو کی ایک واہیات ایکٹرس کو ٹیکسیوں میں لیے لیے پھرتا ہے۔ یزدانی کا بیان تھا کہ یہ سراسر بہتان ہے۔ طاہرہ قرآن اٹھانے کے لیے تیار تھی عطا کا اس ایکٹرس سے ناجائز تعلق ہے۔ جب وہ صاف انکاری ہوا تو طاہرہ نے بڑی تیزی کے ساتھ کہا۔

”کتنے پارسا بنتے ہو۔ یہ آیا جو کھڑی ہے۔ کیا تم نے اسے چومنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو میں اوپر سے آ گئی۔“

یزدانی گرجا

”بکواس بند کرو۔“

اس کے بعد پھر وہی شور برپا ہو گیا۔ میں نے سمجھایا۔ میری بیوی نے سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ عطا کو تو میں نے ڈانٹا بھی

”زیادتی سراسر تمہاری ہے۔ معافی مانگو اور یہ قصہ ختم کرو۔“

عطا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا

”سعادت، یہ قصہ یوں ختم نہیں ہو گا۔ میرے متعلق یہ عورت بہت کچھ کہہ چکی ہے، لیکن میں نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ عنایت کو جانتے ہو تم؟“

”عنایت؟“

”پلے بیک سنگر۔ اس کے باپ کا شاگرد“!

”ہاں ہاں“

”اول درجے کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ مگر یہ عورت ہر روز اسے یہاں بلاتی ہے۔ بہانہ یہ ہے کہ۔“

طاہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”بہانہ وہانہ کچھ نہیں۔ بولو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

عطا نے انتہائی نفرت کے ساتھ کہا۔

”کچھ نہیں۔“

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی۔

”عنایت میرا چاہنے والا ہے۔ بس“!

عطا نے گالی دی۔ عنایت کو موٹی اور طاہرہ کو چھوٹی۔ پھر شور برپا ہو گیا۔ ایک بار پھر وہی کچھ دہرایا گیا۔ جو پہلے کئی بار کہا جا چکا تھا۔ میں نے اور میری بیوی نے بہت ثالثی کی مگر نتیجہ وہی صفر۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے عطا اور طاہرہ دونوں اپنے جھگڑے سے مطمئن نہیں۔ لڑائی کے شعلے ایک دم بھڑکتے تھے اور کوئی مرئی نتیجہ کیے بغیر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ پھر بھڑکائے جاتے تھے، لیکن ہوتا ہوتا کچھ نہیں تھا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ عطا اور طاہرہ چاہتے کیا ہیں مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے بک بک اور جھک جھک جاری تھی۔ لیکن انجام خدا معلوم کہاں بھٹک رہا تھا۔ تنگ آ کر میں نے کہا

”بھئی، اگر تم دونوں کی آپس میں نہیں نبھ سکتی تو بہتر یہی ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ۔“

طاہرہ خاموش رہی، لیکن عطا نے چند لمحات غور کرنے کے بعد کہا۔

”علیحد گی نہیں۔ طلاق“!

طاہرہ چلائی

”طلاق، طلاق، طلاق۔ دیتے کیوں نہیں طلاق۔ میں کب تمہارے پاؤں پڑی ہوں کہ طلاق نہ دو۔“

عطا نے بڑی مضبوط لہجے میں کہا۔

”دے دوں گا اور بہت جلد۔“

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر سے بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی۔

”آج ہی دو۔“

عطا اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

”میں قاضی سے بات کرتا ہوں۔“

جب میں نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے تو اٹھ کر عطا کو روکا

”بے وقوف نہ بنو۔ بیٹھو آرام سے“!

طاہرہ نے کہا۔

”نہیں بھائی جان، آپ مت روکیے۔“

میری بیوی نے طاہرہ کو ڈانٹا۔

”بکواس بند کرو۔“

”یہ بکواس صرف طلاق ہی سے بند ہو گی۔“

یہ کہہ کر طاہرہ ٹانگ ہلانے لگی۔

”سن لیا تم نے“

عطا مجھ سے مخاطب ہو کر پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھا، لیکن میں درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ طاہرہ میری بیوی سے مخاطب ہوئی

”مجھے طلاق دے کر اس چڑ دا ایکٹرس سے بیاہ رچائے گا۔“

عطا نے طاہرہ سے پوچھا۔

”اور تو؟“

طاہرہ نے ماتھے پر بالوں کے پسینے میں بھیگی ہوئی جھالر ہاتھ سے اوپر کی۔

”میں۔ تمہارے اس یوسفِ ثانی عنایت خان سے“!

”بس اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ حد ہو گئی ہے۔ تم ہٹ جاؤ ایک طرف“

عطا نے ڈائرکٹری اٹھائی اور نمبر دیکھنے لگا۔ جب وہ ٹیلی فون کرنے لگا تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ڈائل کیا۔ لیکن نمبر نہ ملا۔ مجھے موقعہ ملا تو میں نے اسے پرزور الفاظ میں کہا کہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ اس پر طاہرہ نے کہا۔

”صفیہ۔“

تم کچھ نہ کہو۔ اس آدمی کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے۔ میں تمہیں وہ خط دکھاؤں گی جو شادی سے پہلے اس نے مجھے لکھے تھے۔ اس وقت میں اس کے دل کا قرار اس کی آنکھوں کا نور تھی۔ میری زبان سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ اس کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ میرے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھ کر یہ بخوشی مرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن آج اسے میری ذرہ برابر پروا نہیں۔“

عطا نے ایک بار پھر نمبر ملانے کی کوشش کی۔ طاہرہ بولتی رہی

”میرے باپ کی موسیقی سے بھی اسے عشق تھا۔ اس کو فخر تھا کہ اتنا بڑا آرٹسٹ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر رہا ہے۔ شادی کی منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے ان کے پاؤں تک دابے، پر آج اسے ان کا کوئی خیال نہں۔“

عطا ڈائل گھماتا رہا۔ طاہرہ مجھ سے مخاطب ہو۔

”آپ کو یہ بھائی کہتا ہے، آپ کی عزت کرتا ہے۔ کہتا تھا جو کچھ بھائی جان کہیں گے میں مانوں گا۔ لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ٹیلی فون کر رہا ہے قاضی کو۔ مجھے طلاق دینے کے لیے۔“

میں نے ٹیلی فون ایک طرف ہٹا دیا۔

”عطا، اب چھوڑو بھی۔“

”نہیں“

یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ طاہرہ بولی

”جانے دیجیے بھائی جان۔ اس کے دل میں میرا کیا، ٹُوٹُو کا بھی کچھ خیال نہیں“!

عطا تیزی سے پلٹا۔

”نام نہ لو ٹُوٹُو کا“!

طاہرہ نے نتھنے پھلا کر کہا۔

”کیوں نام نہ لوں اس کا۔“

عطا نے ریسیور رکھ دیا۔

”وہ میرا ہے“!

طاہرہ اٹھی کھڑی ہوئی۔

”جب میں تمہاری نہیں ہوں تو وہ کیسے تمہارا ہو سکتا ہے۔ تم تو اس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔“

عطا نے کچھ دیر سوچا۔

”میں سب بندوبست کر لوں گا۔“

طاہرہ کے چہرے پر ایک دم زردی چھا گئی۔

”ٹُوٹُو کو چھین لو گے مجھ سے؟“

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

”ہاں۔“

”ظالم۔“

طاہرہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ بے ہوش کر گرنے والی ہی تھی کہ میری بیوی نے اسے تھام لیا۔ عطا پریشان ہو گیا۔ پانی کے چھینٹے۔ یوڈی کلونم۔ سملنگ سالٹ۔ ڈاکٹروں کو ٹیلی فون۔ اپنے بال نوچ ڈالے، قمیض پھاڑ ڈالی۔ طاہرہ ہوش میں آئی تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکنے لگا۔

”جانم ٹوٹو تمہارا ہے۔ ٹوٹو تمہارا ہے۔“

طاہرہ نے رونا شروع کر دیا۔

”نہیں وہ تمہارا ہے۔“

عطا نے طاہرہ کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا۔

”میں تمہارا ہوں۔ تم میری ہو۔ ٹوٹو تمہارا بھی ہے، میرا بھی ہے“!

میں نے اپنی بیوی سے اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی تھوڑی دیر کے بعد چل دیا۔ ٹیکسی کھڑی تھی، ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میری بیوی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا

”یہ ٹوٹو کون ہے؟“

میری بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ان کا لڑکا“

میں نے حیرت سے پوچھا۔

”لڑکا؟“

میری بیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا

”کب پیدا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے۔

”ابھی پیدا نہیں ہوا۔ چوتھے مہینے میں ہے۔“

چوتھے مہینے، یعنی اس واقعے کے چار مہینے بعد، میں باہر بالکنی میں بالکل خالی الذہن بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ بڑی بے دلی سے اٹھنے والا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کون تھا۔“

”یزدانی صاحب۔“

”کوئی نئی لڑائی تھی؟“

”نہیں۔ طاہرہ کے لڑکی ہوئی ہے۔ مری ہوئی“

یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں سوچنے لگا۔

”اگر اب طاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہوا تو اسے کون ٹُوٹُو چکائے گا۔؟“

ٹیٹوال کا کتا

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوٹیٹوال کا کتا

کئی دن سے طرفین اپنے اپنے مورچے پر جمے ہوئے تھے۔ دن میں ادھر اور ادھر سے دس بارہ فائر کیے جاتے جن کی آواز کے ساتھ کوئی انسانی چیخ بلند نہیں ہوتی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہوا خودرو پھولوں کی مہک میں بسی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی اونچائیوں اور ڈھلوانوں پر جنگ سے بے خبر قدرت اپنے مقررہ اشغال میں مصروف تھی۔ پرندے اسی طرح چہچہاتے تھے۔ پھول اسی طرح کھل رہے تھے اور شہد کی سست رو مکھیاں اسی پرانے ڈھنگ سے ان پر اونگھ اونگھ کر رس چوستی تھیں۔ جب پہاڑیوں میں کسی فائر کی آواز گونجتی تو چہچہاتے ہوئے پرندے چونک کر اڑنے لگتے، جیسے کسی کا ہاتھ ساز کے غلط تار سے جا ٹکرایا ہے۔ اور ان کی سماعت کو صدمہ پہنچانے کا موجب ہوا ہے۔ ستمبر کا انجام اکتوبر کے آغاز سے بڑے گلابی انداز میں بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ موسمِ سرما اور گرما میں صلح صفائی ہو رہی ہے۔ نیلے نیلے آسمان پر دھنکی ہوئی روئی ایسے پتلے پتلے اور ہلکے ہلکے بادل یوں تیرتے تھے جیسے اپنے سفید بجروں میں تفریح کر رہے ہیں۔ پہاڑی مورچوں میں دونوں طرف کے سپاہی کئی دن سے بڑی کوفت محسوس کر رہے تھے کہ کوئی فیصلہ کن بال کیوں وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ اکتا کر ان کا جی چاہتا تھا کہ موقع بے موقع ایک دوسرے کو شعر سنائیں۔ کوئی نہ سنے تو ایسے ہی گنگناتے رہیں۔ پتھریلی زمین پر اوندھے یا سیدھے لیٹے رہتے تھے۔ اور جب حکم ملتا تھا ایک دو فائر کر دیتے تھے۔ دونوں کے مورچے بڑی محفوظ جگہ تھے۔ گولیاں پوری رفتار سے آتی تھیں اور پتھروں کی ڈھال کے ساتھ ٹکرا کر وہیں چت ہو جاتی تھیں۔ دونوں پہاڑیاں جن پر یہ مورچے تھے۔ قریب قریب ایک قد کی تھیں۔ درمیان میں چھوٹی سی سبز پوش وادی تھی جس کے سینے پر ایک نالہ موٹے سانپ کی طرح لوٹتا رہتا تھا۔ ہوائی جہازوں کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ توپیں ان کے پاس تھیں نہ ان کے پاس، اس لیے دونوں طرف بے خوف و خطر آگ جلائی جاتی تھیں۔ ان سے دھوئیں اٹھتے اور ہواؤں میں گھل مل جاتے۔ رات کو چونکہ بالکل خاموشی ہوتی تھی، اس لیے کبھی کبھی دونوں مورچوں کے سپاہیوں کو ایک دوسرے کے کسی بات پر لگائے ہوئے قہقہے سنائی دے جاتے تھے۔ کبھی کوئی لہر میں آ کے گانے لگتا تو اس کی آواز رات کے سناٹے کو جگا دیتی۔ ایک کے پیچھے ایک بازگشت صدائیں گونجتیں تو ایسا لگتا کہ پہاڑیاں آموختہ دہرا رہی ہیں۔ چائے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ پتھروں کے چولھے میں چیڑ کے ہلکے پھلکے کوئلے قریب قریب سرد ہو چکے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ موسم میں خنکی تھا۔ ہوا میں پھولوں کی مہک نہیں تھی جیسے رات کو انھوں نے اپنے عطردان بند کر لیے تھے، البتہ چیڑ کے پسینے یعنی بروزے کی بو تھی مگر یہ بھی کچھ ایسی ناگوار نہیں تھی۔ سب کمبل اوڑھے سو رہے تھے، مگر کچھ اس طرح کہ ہلکے سے اشارے پر اٹھ کر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ جمعدار ہرنام سنگھ خود پہرے پر تھا۔ اس کی راسکوپ گھڑی میں دو بجے تو اس نے گنڈا سنگھ کو جگایا اور پہرے پر متعین کر دیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سو جائے، پر جب لیٹا تو آنکھوں سے نیند کو اتنا دور پایا جتنے کہ آسمان کے ستارے تھے۔ جمعدار ہرنام سنگھ چت لیٹا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ اور گنگنانے لگا۔ جُتّی لینی آں ستاریاں والی۔ ستاریاں والی۔ وے ہرنام سنگھا ہو یارا، بھاویں تیری مہیں وک جائے اور ہرنام سنگھ کو آسمان ہر طرف ستاروں والے جوتے بکھرے نظر آئے۔ جو جھلمل جھلمل کر رہے تھے جتی لے دوں ستاریاں والی۔ ستاریاں والی۔ نی ہرنام کورے ہو نارے، بھاویں میری مَہیں وک جائے یہ گا کر وہ مسکرایا، پھر یہ سوچ کر کہ نیند نہیں آئے گی، اس نے اٹھ کر سب کو جگا دیا۔ نار کے ذکر نے اس کے دماغ میں

ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اوٹ پٹانگ گفتگو ہو، جس سے اس بولی کی ہرنام کوری کیفیت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ باتیں شروع ہوئیں مگر اُکھڑی اُکھڑی رہیں۔ بنتا سنگھ جو ان سب میں کم عمر اور خوش آواز تھا، ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ باقی اپنی بظاہر پر لطف باتیں کرتے اور جمائیاں لیتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بنتا سنگھ نے ایک دم اپنی پر سوز آواز میں ہیر گانا شروع کر دی۔ ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں، کون روٹھڑے یار مناؤندائی ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاؤندائی اک باز تو کانگ نے کونج کھوئی دیکھاں چپ ہے کہ کرلاؤندائی دکھاں والیاں نوں گلاں سکھدیاں نی قصے جوڑ جہان سناؤندائی پھر تھوڑے وقفے کے بعد اس نے ہیر کی ان باتوں کا جواب رانجھے کی زبان میں گایا جیہڑے بازتوں کانگ نے کونج کھوئی صبر شکر کر باز فناہ ہویا اینویں حال ہے اس فقیر دانی دھن مال گیا تے تباہ ہویا کریں صدق تے کم معلوم ہووے تیرا رب رسول گواہ ہویا دنیا چھڈ اداسیاں پہن لیاں سید وارثوں ہن وارث شاہ ہویا بنتا سنگھ نے جس طرح ایک دم گانا شروع کیا تھا، اسی طرح وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری پہاڑیوں نے بھی اداسیاں پہن لی ہیں۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد کسی غیر مرئی چیز کو موٹی سی گالی دی اور لیٹ گیا۔ دفعتہً رات کے آخری پہر کی اس اداس فضا میں کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ سب چونک پڑے۔ آواز قریب سے آئی تھی۔ صوبیدار ہرنام سنگھ نے بیٹھ کر کہا۔

”یہ کہاں سے آگیا بھونکو؟“

کتا پھر بھونکا۔ اب اس کی آواز اور بھی نزدیک سے آئی تھی۔ چند لمحات کے بعد دور جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ بنتا سنگھ اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آوارہ سا کتا تھا جس کی دم ہل رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔

”جمعدار صاحب۔ میں ہو کمر ادھر بولا تو کہنے لگا، میں ہوں چپڑ جُھن جُھن“!

سب ہنسنے لگے۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے کتے کو پچکارا۔

”ادھر آ چپڑ جُھن جُھن۔“

کتا دم ہلاتا ہرنام سنگھ کے پاس چلا گیا اور یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، زمین کے پتھر سونگھنے لگا۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے تھیلا کھول کر ایک بسکٹ نکالا اور اس کی طرف پھینکا۔ کتے نے اسے سونگھ کر منہ کھولا، لیکن ہرنام سنگھ نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔

”ٹھہر۔ کہیں پاکستانی تو نہیں“!

سب ہنسنے لگے۔ سردار بنتا سنگھ نے آگے بڑھ کر کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور جمعدار ہرنام سنگھ سے کہا۔

”نہیں جمعدار صاحب، چپڑ جُھن جُھن ہندوستانی ہے۔“

جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا اور کتے سے مخاطب ہوا۔

”نشانی دکھا اوئے؟“

کتا دم ہلانے لگا۔ ہرنام سنگھ ذرا کھل کے ہنسا۔

”یہ کوئی نشانی نہیں۔ دم تو سارے کتے ہلاتے ہیں۔“

بنتا سنگھ نے کتے کی لرزاں دم پکڑ لی۔

”شرنارتھی ہے بے چارہ“!

جمعدار ہرنام سنگھ نے بسکٹ پھینکا جو کتے نے فوراً دبوچ لیا۔ ایک جوان نے اپنے بوٹ کی ایڑھی سے زمین کھودتے ہوئے کہا۔

”اب کتوں کو بھی یا تو ہندوستانی ہونا پڑے گا یا پاکستانی“!

جمعدار نے اپنے تھیلے سے ایک بسکٹ نکالا اور پھینکا۔

”پاکستانیوں کی طرح پاکستانی کتے بھی گولی سے اڑا دیے جائیں گے“!

ایک نے زور سے نعرہ بلند کیا۔

”ہندوستان زندہ باد“!

کتا جو بسکٹ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تھا ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دم ٹانگوں کے اندر گھس گئی۔ جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا۔

”اپنے نعرے سے کیوں ڈرتا ہے چپڑ جُھن جُھن۔ کھا۔ لے ایک اور لے۔“

اس نے تھیلے سے ایک اور بسکٹ نکال کر اسے دیا۔ باتوں باتوں میں صبح ہو گئی۔ سورج ابھی نکلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ چار سو اجالا ہو گیا۔ جس طرح بٹن دبانے سے ایک دم بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح سورج کی شعاعیں دیکھتے ہی دیکھتے ہی اس پہاڑی علاقے میں پھیل گئی جس کا نام ٹیٹوال تھا۔ اس علاقے میں کافی دیر سے لڑائی جاری تھی۔ ایک ایک پہاڑی کے لیے درجنوں جوانوں کی جان جاتی تھی، پھر بھی قبضہ غیر یقینی ہو تا تھا۔ آج یہ پہاڑی ان کے پاس ہے، کل دشمن کے پاس، پرسوں پھر ان کے قبضے میں اس سے دوسرے روز وہ پھر دوسروں کے پاس چلی جاتی تھی۔ صوبیدار ہرنام سنگھ نے دوربین لگا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ سامنے پہاڑی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ چائے وغیرہ تیار ہو رہی ہے ادھر بھی ناشتے کی فکر ہو رہی تھی۔ آگ سلگائی جا رہی تھی۔ ادھر والوں کو بھی یقیناً ادھر سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ناشتے پر سب جوانوں نے تھوڑا تھوڑا کتے کو دیا جس کو اس نے خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ سب اس سے دلچسپی لے رہے تھے جیسے وہ اس کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے آنے سے کافی چہل پہل ہو گئی تھی۔ ہر ایک اس کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پچکار کر

"چپڑ جُھن جُھن"

کے نام سے پکارتا اور اسے پیار کرتا۔ شام کے قریب دوسری طرف پاکستانی مورچے میں صوبیدار ہمت خان اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو جن سے بے شمار کہانیاں وابستہ تھیں، مروڑے دے کر ٹیٹوال کے نقشے کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وائرلیس آپریٹر بیٹھا تھا اور صوبیدار ہمت خاں کے لیے پلاٹون کمانڈر سے ہدایات وصول کر رہا تھا۔ کچھ دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے اور اپنی بندوق لیے بشیر ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔ چن کتھے گوائی آئی رات وے۔ چن کتھے گوائی آئی بشیر نے مزے میں آ کر ذرا اونچی آواز کی تو صوبیدار ہمت خان کی کڑک بلند ہوئی۔

"اوئے کہاں رہا ہے تو رات بھر؟"

بشیر نے سوالیہ نظروں سے ہمت خان کو دیکھنا شروع کیا۔ جو بشیر کے بجائے کسی اور سے مخاطب تھا۔

"بتا اوئے۔"

بشیر نے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر وہ آوارہ کتا بیٹھا تھا جو کچھ دن ہوئے ان کے مورچے میں بن بلائے مہمان کی طرح آیا تھا اور وہیں ٹک گیا تھا۔ بشیر مسکرایا اور کتے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"چن کتھے گوائی آئی رات وے۔ چن کتھے گوائی آئی؟ کتے نے زور سے دم ہلانا شروع کر دی جس سے پتھریلی زمین پر جھاڑو سی پھرنے لگی۔ صوبیدار ہمت خاں نے ایک کنکر اٹھا کر کتے کی طرف پھینکا۔

"سالے کو دم ہلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا"!

بشیر نے ایک دم کتے کی طرف غور سے دیکھا۔

"اس کی گردن میں کیا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ اٹھا، مگر اس سے پہلے ایک اور جوان نے کتے کو پکڑ کر اس کی گردن میں بندھی ہوئی رسی اتاری۔ اس میں گتے کا ایک ٹکڑا پرویا ہوا تھا۔ جس پر کچھ لکھا تھا۔ صوبیدار ہمت خاں نے یہ ٹکڑا لیا اور اپنے جوانوں سے پوچھا۔

"لنڈے ہیں۔ جانتا ہے تم میں سے کوئی پڑھنا۔"

بشیر نے آگے بڑھ کر گتے کا ٹکڑا لیا۔

"ہاں۔ کچھ کچھ پڑھ لیتا ہوں۔"

اور اس نے بڑی مشکل سے حرف جوڑ جوڑ کر یہ پڑھا۔

"چپ۔ چپڑ۔ جُھن جُھن۔ چپڑ جُھن جُھن۔ یہ کیا ہوا؟"

صوبیدار ہمت خاں نے اپنی بڑی بڑی تاریخی مونچھوں کو زبردست مروڑا دیا۔

"کوڈورڈ ہو گا کوئی۔"

پھر اس نے بشیر سے پوچھا۔

"کچھ اور لکھا ہے بشیرے۔"

بشیر نے جو حروف شناسی میں مشغول تھا۔ جواب دیا۔

"جی ہاں۔ یہ۔ ہند۔ ہند۔ ہندوستانی۔ یہ ہندوستانی کتا ہے"!

صوبیدار ہمت خاں نے سوچنا شروع کیا۔

”مطلب کیا ہوا اس کا؟۔ کیا پڑھا تھا تم نے۔ چپڑ؟؟“

بشیر نے جواب دیا۔

”چپڑ جُھن جُھن“!

ایک جوان نے بڑے عاقلانہ انداز میں کہا۔

”جو بات ہے اسی میں ہے۔“

صوبیدار ہمت خان کو یہ بات معقول معلوم ہوئی۔

”ہاں کچھ ایسا لگتا ہے۔“

بشیر نے گتے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی۔

”چپڑ جھن جھن۔ یہ ہندوستانی کتا ہے“!

صوبیدار ہمت خان نے وائرلیس سیٹ لیا اور کانوں پر ہیڈ فون جما کر پلاٹوں کمانڈر سے خود اس کتے کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ کیسے آیا تھا۔ کس طرح ان کے پاس کئی دن پڑا۔ پھر ایکا ایکی غائب ہو گیا اور رات بھر غائب رہا۔ اب آیا ہے تو اس کے گلے میں رسی نظر آئی جس میں گتے کا ایک ٹکرا تھا۔ اس پر جو عبارت لکھی تھی وہ اس نے تین چار مرتبہ دہرا کر پلاٹون کمانڈر کو سنائی مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ بشیر الگ کتے کے پاس بیٹھ کر اسے کبھی پچکار کر، کبھی ڈرا دھمکا کر پوچھتا رہا کہ وہ رات کہاں غائب رہا تھا اور اسکے گلے میں وہ رسی اور گتے کا ٹکڑا کس نے باندھا تھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ وہ جو سوال کرتا، اس کے جواب میں کتا اپنی دم ہلا دیتا۔ آخر غصے میں آکر بشیر نے اسے پکڑ لیا اور زور سے جھٹکا دیا۔ کتا تکلیف کے باعث چاؤں چاؤں کرنے لگا۔ وائرلیس سے فارغ ہو کر صوبیدار ہمت خان نے کچھ دیر نقشے کا بغور مطالعہ کیا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور سگریٹ کی ڈبیا کا ڈھکنا کھول کر بشیر کو دیا۔

”بشیرے، لکھ اس پر گورمکھی میں۔ ان کیڑے مکوڑوں میں۔“

بشیر نے سگرٹ کی ڈبیا کا گتا لیا اور پوچھا۔

”کیا لکھوں صوبیدار صاحب۔“

صوبیدار ہمت خاں نے مونچھوں کو مروڑے دے کر سوچنا شروع کیا۔

”لکھ دے۔ بس لکھ دے“!

یہ کہہ اس نے جیب سے پنسل نکال کر بشیر کو دی

”کیا لکھنا چاہیے؟“

بشیر پنسل کے منہ کو لب لگا کر سوچنے لگا! پھر ایک دم سوالیہ انداز میں بولا

”سپڑ سُن سُن ؟۔“

لیکن فوراً ہی مطمئن ہو کر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

”ٹھیک ہے۔ چپڑ جُھن جُھن کا جواب سپڑ سُن سُن ہی ہو سکتا ہے۔ کیا یاد رکھیں گے اپنی ماں کے سکھڑے۔“

بشیر نے پنسل سگرٹ کی ڈبیا پر جمائی۔

”سپر سن سن ؟“

”سولہ آنے۔ لکھ۔ سب۔ سپر۔ سن سن“!

یہ کہہ کر صوبیدار ہمت خاں نے زور کا قہقہہ لگایا۔

”اور آگے لکھ۔ یہ پاکستانی کتا ہے“!

صوبیدار ہمت خاں نے کتا بشیر کے ہاتھ سے لیا۔ پنسل سے اس میں ایک طرف چھید کیا اور رسی میں پرو کر کتے کی طرف بڑھا۔

”لے جا، یہ اپنی اولاد کے پاس“!

یہ سن کر سب خوب ہنسے۔ صوبیدار ہمت خاں نے کتے کے گلے میں رسی باندھ دی۔ وہ اس دوران میں اپنی دم ہلاتا رہا۔ اس کے بعد صوبیدار نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہا۔

“دیکھو دوست غداری مت کرنا۔ یاد رکھو غدار کی سزا موت ہوتی ہے”!

کتا دم ہلاتا رہا۔ جب وہ اچھی طرح کھا چکا تو صوبیدار ہمت خاں نے رسی سے پکڑ کر اس کا رخ پہاڑی کی اکلوتی پگڈنڈی کی طرف پھیراا اور کہا۔

“جاؤ۔ ہمارا خط دشمنوں تک پہنچا دو۔ مگر دیکھو واپس آجانا۔ یہ تمہارے افسر کا حکم ہے سمجھے؟”

کتے نے اپنی دم ہلائی اور آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر جو بل کھاتی ہوئے نیچے پہاڑی کے دامن میں جاتی تھی چلنے لگا۔ صوبیدار ہمت خاں نے اپنی بندوق اٹھائی اور ہوا میں ایک فائر کیا۔ فائر اور اس کی بازگشت دوسری طرف ہندوستانیوں کے مورچے میں سنی گئی۔ اس کا مطلب اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ جمعدار ہرنام سنگھ معلوم نہیں کس بات پر چڑچڑا ہو رہا تھا، یہ آواز سن کر اور بھی چڑچڑا ہو گیا۔ اس نے فائر کا حکم دے دیا۔ آدھے گھنٹے تک چنانچہ دونوں مورچوں سے گولیوں کی بیکار بارش ہوتی رہی۔ جب اس شغل سے اکتا گیا تو جمعدار ہرنام سنگھ نے فائر بند کرا دیا اور داڑھی میں کنگھا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے جالی کے اندر سارے بال بڑے سلیقے سے جمائے اور بنتا سنگھ سے پوچھا۔

“اوئے بنتاں سیاں! چپڑ جُھن جُھن کہاں گیا؟”

بنتا سنگھ نے چیڑ کی خشک لکڑی سے بروزہ اپنے ناخنوں سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

“کتے کو گھی ہضم نہیں ہوا؟”

بنتا سنگھ اس محاورے کا مطلب نہ سمجھا۔

“ہم نے تو اسے گھی کی کوئی چیز نہیں کھلائی تھی۔”

یہ سن کر جمعدار ہرنام سنگھ بڑے زور سے ہنسا۔

“اوئے ان پڑھ۔ تیرے ساتھ تو بات کرنا پچانویں کا گھاٹا ہے”!

اتنے میں وہ سپاہی جو پہرے پر تھا اور دوربین لگائے اِدھر سے اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک دم چلایا۔

“وہ۔ وہ آرہا ہے”!

سب چونک پڑے۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے پوچھا۔

“کون؟”

پہرے کے سپاہی نے کہا۔

“کیا نام تھا اس کا؟۔ چپڑ جُھن جُھن”!

“چپڑ جُھن جُھن؟”

یہ کہہ کر جمعدار ہرنام سنگھ اٹھا۔

“کیا کر رہا ہے۔”

پہرے کے سپاہی نے جواب دیا۔

“آرہا ہے۔”

جمعدار ہرنام سنگھ نے دوربین اس کے ہاتھ میں لی اور دیکھنا شروع کیا۔

“ادھر ہی آرہا ہے۔ رسی بندھی ہوئی ہے گلے میں۔ لیکن۔ یہ تو اُدھر سے آرہا ہے دشمن کے مورچے سے۔”

یہ کہہ کر اس نے کتے کی ماں کو بہت بڑی گالی دی۔ اس کے بعد اس نے بندوق اٹھائی اور شست باندھ کر فائر کیا۔ نشانہ چُوک گیا۔ گولی کتے سے کچھ فاصلے پر پتھروں کی کرچیں اڑاتی زمین میں دفن ہو گئی۔ وہ سہم کر رُک گیا۔ دوسرے مورچے میں صوبیدار ہمت خاں نے دوربین میں سے دیکھا کہ کتا پگڈنڈی پر کھڑا ہے۔ ایک اور فائر ہوا تو وہ دم دبا کر الٹی طرف بھاگا۔ صوبیدار ہمت خاں کے مورچے کی طرف۔ وہ زور سے پکارا۔

“بہادر ڈرا نہیں کرتے۔ چل واپس”

اور اس نے ڈرانے کے لیے ایک فائر کیا۔ کتا رک گیا۔ ادھر سے جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق چلائی۔ گولی کتے کے کان سے سنساتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اچھل کر زور زور سے دونوں کان پھڑ پھڑانے شروع کیے۔ ادھر سے صوبیدار ہمت خاں نے دوسرا فائر کیا جو اس کے اگلے پنجوں کے پاس پتھروں میں پیوست ہو گیا۔ بوکھلا کر کبھی وہ ادھر دوڑا، کبھی ادھر۔ اس کی اس بوکھلاہٹ سے ہمت خاں اور ہرنام دونوں مسرور ہوئے اور خوب قہقہے لگاتے رہے۔ کتے نے جمعدار ہرنام سنگھ کے مورچے کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ اس نے یہ دیکھا تو بڑے تاؤ میں آکر موٹی سی گالی دی اور اچھی طرح شِست باندھ کر فائر کیا۔ گولی کتے کی ٹانگ میں لگی۔ ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ اس نے اپنا رخ بدلا۔ لنگڑا لنگڑا کر صوبیدار ہمت خاں کے مورچے کی طرف دوڑنے لگا تو اُدھر سے بھی فائر ہوا، مگر وہ صرف ڈرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ ہمت خاں فائر کرنے ہی چلایا۔

”بہادر پروا نہیں کیا کرتے زخموں کی۔ کھیل جاؤ اپنی جان پر۔ جاؤ۔ جاؤ“!

کتا فائر سے گھبرا کر مڑا۔ ایک ٹانگ اس کی بالکل بیکار ہو گئی تھی۔ باقی تین ٹانگوں کی مدد سے اس نے خود کو چند قدم دوسری جانب گھسیٹا کہ جمعدار ہرنام سنگھ نے نشانہ تاک کر گولی چلائی جس نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ صوبیدار ہمت خاں نے افسوس کے ساتھ کہا۔

”چچ چچ۔ شہید ہو گیا بے چارہ“!

جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق کی گرم گرم نالی اپنے ہاتھ میں لی اور کہا۔

”وہی موت مرا جو کتے کی ہوتی ہے“!

11-10 اکتوبر 1951ء

ٹیڑھی لکیر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوٹیڑھی لکیر

اگر سڑک سیدھی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ بالکل سیدھی تو اس پر اس کے قدم منوں بھاری ہو جاتے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ یہ زندگی کے خلاف ہے۔ جو پیچ در پیچ راستوں سے بھری ہے۔ جب ہم دونوں باہر سیر کو نکلتے تو اس دوران میں وہ کبھی سیدھے راستے پر نہ چلتا۔ اسے باغ کا وہ کونہ بہت پسند تھا۔ جہاں لہراتی ہوئی روشیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک بار اس نے اپنی ٹانگوں کو سینے کے ساتھ جوڑ کر بڑے دلکش انداز میں مجھ سے کہا تھا۔

”عباس اگر مجھے اور کوئی کام نہ ہو۔ تو بخدا میں اپنی ساری زندگی کشمیر کی پہاڑی سڑکوں پر چڑھنے اُترنے میں گزار دُوں۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا پیچ ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ابھی تم مجھے نظر آرہے ہو اور ایک موڑ مڑنے کے بعد میری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہو۔۔۔۔۔۔۔ کتنی پُر اسرار چیز ہے۔۔۔۔۔۔۔ سیدھے راستے پر تم ہر آنے والی چیز دیکھ سکتے ہو، مگر یہاں آنے والی چیزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے بالکل اچانک آجائیں گی۔۔۔۔۔۔۔ موت کی طرح اچانک۔۔۔۔۔۔۔ اس میں کتنا مزا ہے“!

وہ ایک دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ بے حد دُبلا۔ اس کو ایک نظر دیکھنے سے اکثر اوقات معلوم ہوتا کہ ہسپتال کے کسی بستر سے کوئی زرد رُو بیمار اُٹھ کر چلا آیا ہے۔ اُس کی عمر بمشکل بائیس برس کے قریب ہو گی۔ مگر بعض اوقات وہ اس سے بہت زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اس کو دیکھ کر میں یہ خیال کرنے لگتا کہ وہ بچہ بن گیا ہے۔ اس میں ایکا ایکی اس قدر تبدیلی ہو جایا کرتی تھی کہ مجھے اپنی نگاہوں کی صحت پر شبہ ہونے لگ جاتا تھا۔ آخری ملاقات سے دس روز پہلے جب وہ مجھے بازار میں ملا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ہاتھ میں ایک بڑا سیب لیے اُسے دانتوں سے کاٹ کر کھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بچوں کی مانند ایک ناقابلِ بیان خوشی کے باعث تمتمایا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ سیب بہت لذیذ ہے۔ سیب کے رس سے بھرے ہوئے ہاتھوں کو بچوں کی مانند اپنی پتلون سے صاف کر کے اس نے میرا ہاتھ بڑے جوش سے دبایا اور کہا۔۔۔۔۔۔ عباس وہ دو آنے مانگتا تھا، مگر میں نے بھی ایک ہی آنے میں خریدا۔“

اس کے ہونٹ ظفر مندانہ ہنسی کے باعث تھر تھرانے لگتے، پھر اس نے جیب سے ایک چیز نکالی۔ اور میرے ہاتھ میں دے کر کہا۔

”تم نے لٹو تو بہت دیکھے ہوں گے۔ پر ایسا لٹو کبھی دیکھنے میں نہ آیا ہو گا۔۔۔۔۔ اوپر کا بٹن دباؤ۔۔۔۔۔۔۔ دباؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ارے دباؤ“!

میں سخت متحیّر ہو رہا تھا۔ لیکن اُس نے میری طرف دیکھے بغیر لٹو کا بٹن دبا دیا جو میری ہتھیلی پر سے اُچھل کر سڑک پر لنگڑانے لگا۔۔۔۔ اس پر خوشی کے مارے میرے دوست نے اُچھلنا شروع کر دیا۔

”دیکھو، عباس، دیکھو، اس کا ناچ۔“

میں نے لٹو کی طرف دیکھا۔ جو میرے سر کے مانند گھوم رہا تھا۔ ہمارے ارد گرد بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے۔ شائد وہ یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ میرا دوست دوائیاں بیچے گا۔

"لٹو اٹھاؤ اور چلیں۔۔۔۔۔۔۔ لوگ ہمارا تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں"!

میرے لہجے میں شاید تھوڑی سی تیزی تھی۔ کیونکہ اس کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔ اور اس کے چہرے کی تمتماہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اُٹھا اور اس نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے ایک ننھا سا بچہ رونی صورت بنا کر کہہ رہا ہے۔ میں نے تو کوئی بُری بات نہیں کی پھر مجھے کیوں جھڑکا گیا ہے؟ اس نے لٹّو وہیں سڑک پر چھوڑ دیا۔ اور میرے ساتھ چل پڑا، گھر تک میں نے اور اس نے کوئی بات نہ کی۔ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ اس قلیل عرصے میں اس کے چہرے پر انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ایک تفکر زدہ بوڑھا نظر آیا۔ میں نے پوچھا۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں۔ اگر خدا کو انسان کی زندگی بسر کرنی پڑ جائے تو کیا ہو؟"

وہ اسی قسم کی بے ڈھنگی باتیں سوچا کرتا تھا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو نرالا ظاہر کرنے کے لیے ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ بات غلط تھی۔ دراصل اس کی طبیعت کا رجحان ہی ایسی چیزوں کی طرف رہتا تھا جو کسی اور دماغ میں نہیں آتی تھیں۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر اس کو اپنے جسم پر رستا ہوا زخم بہت پسند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ اگر میرے جسم پر ہمیشہ کے لیے کوئی زخم بن جائے تو کتنا اچھا ہو۔۔۔۔۔ مجھے درد میں بڑا مزا آتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسکول میں ایک روز اس نے میرے سامنے اپنے بازو کو اُسترے کے تیز بلیڈ سے زخمی کیا۔ صرف اس لیے کہ کچھ روز اس میں درد ہوتا رہے ٹیکہ اس نے کبھی۔۔۔۔۔۔ اس خیال سے نہیں لگوایا تھا۔ کہ اس سے ہیضے، پلیگ یا ملیریا کا خوف نہیں رہتا۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی۔ کہ دو تین روز اس کا بدن بخار کے باعث تپتا رہے۔ چنانچہ جب کبھی وہ بخار کو دعوت دیا کرتا تھا۔ تو مجھ سے کہا کرتا تھا۔ عباس، میرے گھر میں ایک مہمان آنے والا ہے۔ اس لیے تین روز تک مجھے فرصت نہیں ملے گی۔"

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ تم آئے دن ٹیکہ کیوں لگواتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ عباس، میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ ٹیکہ لگوانے سے جو بخار چڑھتا ہے اس میں کتنی شاعری ہوتی ہے۔ جب جوڑ جوڑ میں درد ہوتا ہے۔ اور اعضا شکنی ہوتی ہے تو بخدا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم کسی نہایت ہی ضدی آدمی کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔۔۔۔۔ اور پھر بخار بڑھ جانے سے جو خواب آتے ہیں۔۔۔۔۔ اللہ کس قدر بے ربط ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ بالکل ہماری زندگی کی مانند!۔۔۔۔۔ ابھی تم یہ دیکھتے ہو کہ تمہاری شادی کسی نہایت حسین عورت سے ہو رہی ہے۔ دوسرے لمحے یہی عورت تمہاری آغوش میں ایک قوی ہیکل پہلوان بن جاتی ہے۔"

میں اس کی ان عجیب و غریب باتوں کا عادی ہو گیا تھا، لیکن اس کے باوجود ایک روز مجھے اس کے دماغی توازن پر شبہ ہونے لگا۔ گزشتہ مئی میں مَیں نے اس سے اپنے استاد کا تعارف کرایا جس کی میں بے حد عزت کرتا تھا۔ ڈاکٹر شاکر نے اس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دبایا اور کہا۔

"میں آپ سے مل کر بہت خوش ہُوا ہُوں۔"

"اس کے برعکس، مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔"

یہ میرے دوست کا جواب تھا۔ جس نے مجھے بیحد شرمندہ کیا، آپ قیاس فرمائیے کی اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہو گی۔ شرم کے مارے میں اپنے استاد کے سامنے گڑا جا رہا تھا۔ اور وہ بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا کر ہال میں ایک تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر شاکر نے میرے دوست کی اس حرکت کو بُرا سمجھا اور تخلیے میں مجھ سے بڑے تیز لہجے میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے دوست کا دماغ ٹھکانے نہیں۔"

میں نے اس کی طرف سے معذرت طلب کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا، میں واقعی بے حد شرمندہ تھا کہ ڈاکٹر شاکر کو میری وجہ سے ایسا سخت فقرہ سننا پڑا۔ شام کو میں اپنے دوست کے پاس گیا۔ اس ارادے کے ساتھ کہ اس سے اچھی طرح باز پُرس کروں گا۔ اور اپنے دل کی بھڑاس نکالوں گا۔ وہ مجھے لائبریری کے باہر ملا۔ میں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا۔

"تم نے آج ڈاکٹر شاکر کی بہت بے عزتی کی۔۔۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے تم نے مجلسی آداب کو خیر باد کہہ دیا ہے۔"

وہ مسکرایا

"ارے چھوڑو اس قصّے کو۔۔۔۔۔ آؤ کوئی اور کام کی بات کریں۔"

یہ سن کر میں اس پر برس پڑا۔ خاموشی سے میری تمام باتیں سن کر اس نے صاف صاف کہہ دیا۔۔۔۔ اگر مجھ سے مل کر کسی شخص کو خوشی حاصل ہوتی ہے تو ضروری نہیں کہ اس سے مل کر مجھے بھی خوشی حاصل ہو۔۔۔۔۔ اور پھر پہلی ملاقات پر صرف ہاتھ ملانے سے میں نے اس کے دل میں خوشی پیدا کر دی۔۔۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔۔۔ تمہارے ڈاکٹر صاحب نے اس روز پچیس آدمیوں سے تعارف کیا۔ اور ہر شخص سے انھوں نے یہی کہا، کہ آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرّت حاصل ہوئی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہر شخص ایک ہی قسم کے تاثرات پیدا کرے۔۔۔۔۔۔ تم مجھ سے فضول باتیں نہ کرو۔۔۔۔ آؤ اندر چلیں"!

میں ایک سحر زدہ آدمی کی طرح اس کے ساتھ ہو لیا۔ اور لائبریری کے اندر جا کر اپنا سب غصہ بھول گیا۔ بلکہ یہ سوچنے لگا۔ کہ میرے دوست نے جو کچھ کہا تھا۔ صحیح ہے لیکن فوراً ہی میرے دل میں ایک حسد سا پیدا ہوا کہ اس شخص میں اتنی قوت کیوں ہے۔ کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار بے دھڑک کر دیتا ہے۔ پچھلے دنوں میرے ایک افسر کی دادی مر گئی تھی۔ اور مجھے اس کے سامنے مجبوراً اپنے اوپر غم کی کیفیت طاری کرنی پڑی تھی۔ اور اس سے اپنی مرضی کے خلاف دس پندرہ منٹ تک افسوس ظاہر کرنا پڑا تھا۔ اس کی دادی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی موت کی خبر نے میرے دل پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے نقلی جذبات تیار کرنے پڑے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میرا کریکٹر اپنے دوست کے مقابلے میں بہت کمزور ہے، اس خیال ہی نے میرے دل میں حسد کی چنگاری پیدا کی تھی۔ اور میں اپنے حلق میں ایک ناقابلِ برداشت تلخی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن یہ ایک وقتی اور ہنگامی جذبہ تھا جو ہوا کے ایک تیز جھونکے کے مانند آیا اور گزر گیا۔ میں بعد میں اس پر بھی نادم ہوا۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔ لیکن اس محبت میں غیر ارادی طور پر کبھی کبھی نفرت کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

”یہ کیابات ہے کہ بعض اوقات میں تم سے نفرت کرنے لگتاہوں“

اور اس نے مجھے یہ جواب دے کر مطمئن کر دیا تھا۔

”تمہارا دل جو میری محبت سے بھرا ہوا ہے ایک ہی چیز کو بار بار دیکھ کر کبھی کبھی تنگ آ جاتا ہے۔ اور کسی دوسری شے کی خواہش کرنے لگ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور پھر اگر تم مجھ سے کبھی کبھی نفرت نہ کرو۔ تو مجھ سے ہمیشہ محبت بھی نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔۔ انسان اسی قسم کی الجھنوں کا مجموعہ ہے۔“

میں اور وہ اپنے وطن سے بہت دُور تھے۔ ایک ایسے بڑے شہر میں جہاں زندگی تاریک قبر سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسے کبھی ان گلیوں کی یاد نہ ستاتی تھی۔ جہاں اس نے اپنا بچپن اور اپنے شباب کا زمانۂ آغاز گزارا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اسی شہر میں پیدا ہوا ہے۔ میرے چہرے سے ہر شخص یہ معلوم کر سکتا ہے کہ میں غریب الوطن ہوں۔ مگر میرا دوست ان جذبات سے یکسر عاری ہے۔ وہ کہا کرتا ہے۔ وطن کی یاد بہت بڑی کمزوری ہے ایک جگہ سے خود کو چپک دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک آزادی پسند سانڈ کو کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ اس قسم کے خیالات کے مالک کی جو ہر شے کو ٹیڑھی عینک سے دیکھتا ہو۔ اور مروّجہ رسوم کے خلاف چلتا ہو باقاعدہ نکاح خوانی ہو، یعنی پرانی رسوم کے مطابق۔ اس کا عقد عمل میں آئے۔ تو کیا آپ کو تعجب نہ ہو گا؟۔۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ ضرور ہو گا۔ ایک روز شام کو جب وہ میرے پاس آیا۔ اور بڑے سنجیدہ انداز میں اس نے مجھے اپنے نکاح کی خبر سنائی۔ تو آپ یقین کریں میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اس حیرت کا باعث یہ چیز تھی کہ وہ شادی کر رہا ہے نہیں، مجھے تعجب اس بات پر تھا۔ کہ اس نے لڑکی بغیر دیکھے، پرانے خطوط کے مطابق نکاح کی رسم میں شامل ہونا قبول کیسے کر لیا۔ جب کہ وہ ہمیشہ ان مولویوں کا مضحکہ اڑایا کرتا تھا۔ جو لڑکی اور لڑکے کو رشتہ ازدواج میں باندھتے ہیں؟ وہ کہا کرتا تھا۔

”یہ مولوی مجھے بڈھے اور گنٹھیا کے مارے پہلوان معلوم ہوتے ہیں۔ جو اپنے اکھاڑے میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی کشتیاں دیکھ کر اپنی حرص پوری کرتے ہیں۔“

اور پھر وہ شادی یا نکاح پر لوگوں کے جمگھٹے کا بھی تو قائل نہ تھا مگر۔۔۔۔۔۔ اس کا نکاح پڑھا گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے مولوی نے۔۔۔۔۔۔ اس مولوی نے جس سے اس کو سخت چڑ تھی۔ اور جس کو وہ بوڑھا طوطا کہا کرتا تھا۔ اس کا نکاح پڑھا۔ چھوہارے بانٹے گئے۔ اور میں ساری کارروائی یوں دیکھ رہا تھا گویا سوتے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔ نکاح ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں ان ہونی بات ہو گئی۔ اور جو تعجب مجھے پہلے پیدا ہوا تھا۔ بعد میں بھی برقرار رہا۔ مگر میں نے اس کے متعلق اپنے دوست سے ذکر نہ کیا۔ اس خیال سے کہ شاید اسے ناگوار گزرے۔ لیکن دل ہی دل میں اس بات پر خوش تھا۔ کہ آخر کار اسے اس دائرے میں لوٹنا پڑا۔ جس میں دوسرے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نکاح کر کے میرا دوست اپنے اصولوں کے ٹیڑھے منار سے بہت بُرح طرح پھسلا تھا۔ اور اس گڑھے میں سر کے بل آ گرا تھا۔ جس کو وہ بے حد غلیظ کہا کرتا تھا۔ جب میں نے یہ سوچا تو میرے جی میں آئی۔ کہ اپنے کج رفتار دوست کے پاس جاؤں۔ اور اتنا ہنسوں اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ مگر جس روز میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ اسی روز وہ دوپہر کو میرے گھر آیا۔ نکاح کو تین مہینے گزر گئے تھے اور اس دوران میں وہ ہمیشہ اُداس اُداس رہتا تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اور ناک جو چند روز پہلے بھدّی نیام کے اندر چھپی ہوئی تلوار کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس پر سب سے نمایاں نظر آ رہی تھی۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اور سگریٹ سلگا کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں کے اختتامی کونے کپکپا رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی بڑی اہم بات سنانے والا ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کے دھوئیں سے چھلا بنایا۔ اور اس میں اپنی اُنگلی گاڑتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”عباس! میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔“

”جا رہے ہو؟“

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

”میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔ میں اس خبر سے تمہیں مطلع کرنے کے لیے نہ آتا۔ مگر مجھے تم سے کچھ روپے لینا ہیں۔ جو تم نے مجھ سے قرض لے رکھے ہیں۔۔۔۔۔ کیا تمہیں یاد ہے؟“

میں نے جواب دیا۔

”یاد ہے، پر تم جا کہاں رہے ہو؟۔۔۔۔۔۔اور پھر ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔۔؟“

”بات یہ ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے عشق ہو گیا ہے۔ اور کل رات میں اسے بھگا کر اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔وہ تیار ہو گئی ہے“!

یہ سُن کر مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ میں بیو قوفوں کی مانند ہنسنے لگا۔ اور دیر تک ہنستا رہا۔ وہ اپنی منکوحہ بیوی کو جسے وہ جب چاہتا انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لا سکتا تھا، اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔۔۔۔۔بھگا کر لے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے۔۔۔۔۔۔۔۔میں کیا کہوں کہ اس وقت میں نے کیا سوچا۔۔۔۔۔۔ دراصل میں کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر اس نے ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”عباس! یہ ہنسنے کا موقع نہیں۔ کل رات وہ اپنے مکان کے ساتھ والے باغ میں میرا انتظار کرے گی، اور مجھے سفر کے لیے کچھ روپیہ فراہم کر کے اس کے پاس ضرور پہنچنا چاہیے۔ وہ کیا کہے گی۔ اگر میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہا۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں کیا معلوم، میں نے کن کن مشکلوں کے بعد رسائی حاصل کر کے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے“!

میں نے پھر ہنسنا چاہا۔ مگر اس کو غایت درجہ سنجیدہ و متین دیکھ کر میری ہنسی دب گئی اور مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا۔ کہ وہ واقعی اپنی منکوحہ بیوی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔ کہاں؟۔۔۔۔۔۔۔یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہ گیا۔ اور اسے وہ روپے ادا کر دیئے۔ جو میں نے عرصہ ہوا اس سے قرض لیے تھے۔ اور یہ سمجھ کر ابھی تک نہ دیے تھے کہ وہ نہ لے گا۔ مگر اس نے خاموشی سے نوٹ گن کر اپنی جیب میں ڈالے اور بغیر ہاتھ ملائے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔ تم جا رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے بھلا نہ دینا“!

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

”میں کوشش کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں بہت دیر تک جہاں کھڑا تھا بُت بنا رہا۔ جب اُدھر اس کے سُسرال والوں کو پتہ چلا۔ کہ ان کی لڑکی رات رات میں کہیں غائب ہو گئی ہے۔ تو ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ ایک ہفتے تک انھوں نے اسے ادھر اُدھر تلاش کیا۔ اور کسی کو اس واقعہ کی خبر تک نہ ہونے دی۔ مگر بعد میں لڑکی کے بھائی کو میرے پاس آنا پڑا۔ اور مجھے اپنا ہمراز بنا کر اسے ساری رام کہانی سنانی پڑی۔ وہ بے چارے یہ خیال کر رہے تھے کہ لڑکی کسی اور آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور لڑکی کا بھائی میرے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ ان کی طرف سے میں اپنے دوست کو اس تلخ واقعے سے آگاہ کروں وہ بیچارہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ جب میں نے اس کو اصل واقعہ سے آگاہ کیا تو حیرت کے باعث اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس بات سے تو اسے بہت ڈھارس ہوئی کہ اس کی بہن کسی غیر مرد کے ساتھ نہیں گئی۔ بلکہ اپنے شوہر کے پاس ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے دوست نے یہ فضول اور نازیبا حرکت کیوں کی؟

”بیوی اسی کی تھی جب چاہتا لے جاتا۔ مگر اس حرکت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے۔۔۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔۔“

وہ کوئی مثال پیش نہ کر سکا اور میں بھی اسے کوئی اطمینان دہ جواب نہ دے سکا کل صبح کی ڈاک سے مجھے اس کا خط ملا جس کو میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لفافے میں ایک کاغذ تھا جس پر ایک ٹیڑھی لکیر کھینچی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔خالی لفافہ ایک طرف رکھ کر میں اس عمود کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔۔۔۔۔جو میں نے بورڈ پر چپکے ہوئے کاغذ پر گرایا تھا۔

جان محمد

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوجان محمد

میرے دوست جان محمد نے، جب میں بیمار تھا‘ میری بڑی خدمت کی۔ میں تین مہینے ہسپتال میں رہا۔ اس دوران میں وہ باقاعدہ شام کو آتا رہا‘ بعض اوقات جب میرے نوکر علیل ہوتے تو وہ رات کو بھی وہیں ٹھہرتا‘ تاکہ میری خبر گیری میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ جان محمد بہت مخلص دوست ہے‘ میں قریب قریب بیس روز تک بیہوش رہا تھا‘ اس دوران میں وہ آتا۔ لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا‘ جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان تھا‘ روتا بھی تھا‘ اس لیے کہ میری حالت بہت نازک تھی۔ جب میں اس قابل ہو گیا کہ بات چیت کر سکوں تو اس نے مجھ سے پوچھا

”آپ کو تھکاوٹ تو محسوس نہیں ہوتی۔“

میرے اعضا بالکل مفلوج ہو چکے تھے‘ معلوم نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی مجھے بستر پر پڑے ہوئے۔ میں نے اس سے کہا

”جان محمد۔ میرا انگ انگ دُکھتا ہے“

اس نے فوراً میری بیوی سے کہا

”کل زیتون کا تیل منگوا دیجیے۔ میں صبح آ کے مالش کر دیا کروں گا“

زیتون کا تیل آ گیا اور جان محمد بھی۔ اُس نے میرے سارے بدن پر مالش کی‘ قریب قریب آدھ گھنٹا اس کا اس مشقت میں صرف ہوا‘ مجھے بڑی راحت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ ہر روز دفتر جانے سے پہلے ہسپتال میں آتا اور میرے بدن پر مالش کرتا۔ مجھے راحت ضرور ہوتی تھی لیکن وہ اس زور سے اپنے ہاتھ چلاتا کہ میری ہڈیاں تک دُکھنے لگتیں۔ چنانچہ میں اس سے اکثر بڑے درشت لہجے میں کہتا:

”جان محمد! تم تو میر جان لے لو گے“

یہ سن کر وہ مسکرا دیتا:

”منٹو صاحب! آپ تو بڑے سخت جان ہیں۔ اس مٹھی چاپی سے گھبرا گئے؟“

میں خاموش ہو جاتا‘ اس لیے اس کی مٹھی چاپی میں کوئی جارحانہ چیز نہیں تھی‘ بلکہ سر تا پا خلوص تھا۔ تین مہینے ہسپتال میں کاٹنے کے بعد گھر آ گیا۔ جان محمد بدستور ہر روز آتا رہا۔ میری اس کی دوستی اتفاقاً ہو گئی تھی۔ ایک روز میں گھر میں بیٹھا تھا کہ ایک ناٹے قد کے چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے جواں سال مرد نے دروازے پر دستک دی۔ میں جب اس کو اندر کمرے میں داخل کیا تو اُس نے مجھے بتایا کہ وہ میر امدّاح ہے۔

”منٹو صاحب۔ میں نے آپ کو صرف اس لیے تکلیف دی ہے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے قریب قریب آپ کی سب تصانیف پڑھی ہیں“

میں نے اس کا مناسب و موزوں الفاظ میں رسمی طور پر شکریہ ادا کیا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی‘

”منٹو صاحب۔ آپ تو رسوم و قیود کے قائل ہی نہیں‘ پھر یہ تکلّف کیوں؟“

میں نے کہا

”نوواردوں سے بعض اوقات یہ تکلف برتنا ہی پڑتا ہے“

جان محمد کی مہین مونچھوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی

”مجھ سے آپ یہ تکلّف نہ برتیے“

چنانچہ یہ تکلّف فوراً دُور ہو گیا۔ اس کے بعد جان محمد نے ہر روز میرے گھر آنا شروع کر دیا۔ شام کو وہ جب دفتر سے فارغ ہوتا تو سیدھا میرے یہاں چلا آتا۔ میری عادت ہے کہ میں کسی دوست کا حسب نسب دریافت نہیں کرتا‘ اس لیے کہ میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں تو کسی سے ملوں تو اس سے اس کا نام بھی نہیں پوچھتا۔ یہ تمہید کافی لمبی ہو گئی‘ حالانکہ میں اختصار پسند ہوں۔ جان محمد دیر تک میرے یہاں آتا رہا‘ اس کی معلومات خاصی اچھی تھیں۔ ادب سے بھی اسے خاصا شغف ہے مگر میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ زندگی سے کسی قدر بیزار ہے۔ مجھے زندگی سے پیار ہے لیکن اس کو اس سے کوئی رغبت نہیں تھی‘ ہم دونوں جب باتیں کرتے تو وہ کہتا:

”منٹو صاحب! آپ میرے لباس کو دیکھتے ہیں‘ یہ شلوار اور قمیص جو ملیشیا کی ہے‘ آپ یقیناً نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں گے۔ مگر مجھے اچھے لباس کی کوئی خواہش نہیں۔ مجھے کسی خوبصورت چیز کی خواہش نہیں“

میں نے اس سے پوچھا:

”کیوں؟“

”بس۔ میرے اندر یہ حسؔ ہی نہیں رہی۔ میں ننگے فرش پر سوتا ہوں۔ نہایت واہیات ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہوں۔ یہ دیکھیے۔ میرے ناخن اتنے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں کتنا میل بھرا ہوا ہے۔ میرے پاؤں ملاحظہ فرمائیے۔ ایسا نہیں لگتا کہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ مگر مجھے ان غلاظتوں کی کچھ پروا نہیں۔“

میں نے اُس کی غلاظتوں کے متعلق اُس سے کچھ نہ کہا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت میلا کچیلا رہتا تھا۔ اُس کو صفائی کے متعلق کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا۔ ایک دن حسبِ معمول جب وہ شام کو میرے پاس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اُس کی طبیعت مضمحل ہے۔ میں نے اُس سے پُوچھا کیوں جان محمد! کیا بات ہے آج۔ تھکے تھکے سے معلوم ہوتے ہو“

اُس نے اپنی جیب سے ’بگلے‘ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ سُلگا کر جواب دیا

”تھکاوٹ ہو ہی جاتی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں“

اس کے بعد ہم دیر تک غالبؔ کی شاعری پر گفتگو کرتے رہے۔ اُس کو یہ فارسی کا شعر بہت پسند آیا۔ مابنوویم بدیں مرتبہ راضی غالب شعر خود خواہش آں کرد کہ گردوفن ماہم غالبؔ کی شاعری پر تبصرہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے ایک ہمسائے کی لڑکی میری بیوی سے ملنے چلی آئی۔ چونکہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی اس لیے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئی۔ جان محمد نے آنکھیں جھکا لیں اور خاموش ہو گیا۔ اس لڑکی کا نام شمیم تھا۔ دیر تک وہ بیٹھی میری بیوی اور مجھ سے باتیں کرتی رہی، لیکن اس دوران میں جان محمد اُسی طرح آنکھیں جھکائے خاموش رہا۔

کچھ اس طرح کہ اُسے کوئی پہچان نہ لے۔ اس کے بعد دوسرے دن رات کے دس بجے میرے دروازے پر دستک ہوئی‘ نوکر اُوپر سو رہا تھا‘ میں دروازہ کھولا تو دیکھا کہ جان محمد ہے۔ نہایت خستہ حالت میں۔ میں بہت پریشان ہوا اور اُس سے پوچھا:

”کیوں جان محمد۔ خیریت تو ہے“

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، جس سے میں بالکل ناآشنا تھا، خیریت ہے۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لیے میں آپ کے پاس چلا آیا“

مجھے سخت نیند آرہی تھی‘ مگر جان محمد ایسے مخلص دوست کے لیے میں اِسے قربان کرنے کے لیے تیار تھا‘ مگر جب اُس نے اوٹ پٹانگ باتیں شروع کیں تو مجھے وحشت ہونے لگی۔ اس کا دماغ غیر متوازن تھا‘ کبھی وہ آسمان کی بات کرتا‘ کبھی زمین کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اچانک اسے ہو کیا گیا۔ ایک دن پہلے جب وہ مجھ سے ملا تو اچھا بھلا تھا۔ ایک دم اس میں اتنی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟ ساری رات اُس نے مجھے جگائے رکھا۔ آخر صبح میں نے اُس کو غسل کرنے کے لیے کہا۔ اپنے کپڑے اُسے پہننے کے لیے دیے کہ اُس کے میلے چکٹ تھے۔ پھر اُس کو لاریوں کے اڈے پر لے گیا کہ وہ سیالکوٹ اپنے والدین کے پاس چلا جائے۔ غلطی میں نے یہ کی کہ اُس کو لاری میں نہ بٹھایا۔ کرایہ وغیرہ میں نے اُسے دے دیا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے گا، مگر اُسی دن رات کے تین بجے دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔ میں باہر صحن میں سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھا، سوچا کہ شاید کوئی تار آیا ہو۔ دروازہ کھولا تو سامنے جان محمد۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ سیالکوٹ کیوں نہیں گیا۔ اُس نے اِس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دیا۔ اُس کا دماغ پہلے سے زیادہ غیر متوازن تھا۔ فرش پر لیٹ کر اپنی کنپٹیوں پر زور زور سے گھونسے مارنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کروں۔ وہ یقیناً جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے سوچا، پیار محبت سے کام لینا چاہیے، چنانچہ بہت دیر تک میں اُس کا سر سہلاتا رہا۔ اس کے بعد اُس سے پوچھا،

”جان محمد تمھیں کیا تکلیف ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور فرش پر میری بچیوں کے جو ماربل پڑے ہوئے تھے‘ اُن سے کھیلنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے ہر ماربل کو سجدہ کیا اور رونے لگا۔ میں نے پھر اُس سے بڑی محبت سے پوچھا،

”جان محمد! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے“

اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں جیسے کئی دنوں سے شراب کے نشے میں دُھت ہے۔ اس نے مجھے ان آنکھوں سے دیکھا اور پُوچھا،

”تم اتنے بڑے نفسیات نگار بنتے ہو۔ کیا یہ نہیں جان سکتے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

”میں اپنی کم مائیگی تسلیم کرتا ہوں۔ اب تم خود بتادو“

جان محمد مسکرایا

”مجھے شمیم ہو گیا ہے“

”کیا مطلب؟“

”اب بھی مطلب پوچھتے ہیں آپ“

میں نے اُس سے کہا

”بھئی شمیم کوئی بیماری تو نہیں“

جان محمد ہنسا

”بہت بڑی بیماری ہے منٹو صاحب۔ یہ کئی لوگوں کو ہو چکی ہے۔ اُن میں سے میں بھی ایک ہوں۔ پہلے ڈلہوزی میں ہوتی تھی۔ اب یہاں لاہور چلی آئی ہے“

میں سمجھ گیا۔ جان محمد کئی برس ڈلہوزی میں رہ چکا تھا اور شمیم بھی‘ لیکن میں نے اُس سے کہا۔

”میں ابھی تک نہیں سمجھا۔ تم اب سو جاؤ۔ چلو آؤ۔ اندر صوفے پر لیٹ جاؤ۔ خبر دار جو تم نے شور مچایا“

وہ اندر چلا آیا اور صوفے پر لیٹ گیا۔ میں صبح جلدی اُٹھنے کا عادی ہوں۔ ساڑھے چار بجے کے قریب اُٹھا تو دیکھا کہ جان محمد غائب ہے۔ سات بجے پتہ چلا کہ شمیم بھی اپنے فلیٹ میں نہیں ہے۔ کہیں غائب ہو گئی۔ ۱۳ مئی ۵۴ء

جانکی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوجانکی

پونہ میں ریسوں کا موسم شروع ہونے والا تھا کہ پشاور سے عزیز نے لکھا کہ میں اپنی ایک جان پہچان کی عورت جانکی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، اس کو یا تو پونہ میں یا بمبئی میں کسی فلم کمپنی میں ملازمت کرا دو۔ تمہاری واقفیت کافی ہے، امید ہے تمہیں زیادہ دقت نہیں ہو گی۔ وقت کا تو اتنا زیادہ سوال نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ فلم کمپنیوں میں اکثر وہی آدمی عورتیں لے کر آتے ہیں جنہیں ان کی کمائی کھانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں بہت گھبرایا لیکن پھر میں نے سوچا عزیز اتنا پرانا دوست ہے، جانے کس یقین کے ساتھ بھیجا ہے، اس کو مایوس نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر بھی ایک گونہ تسکین ہوئی کہ عورت کے لیے، اگر وہ جوان ہو، ہر فلم کمپنی کے دروازے کھلے ہیں۔ اتنی تردّد کی بات ہی کیا ہے، میری مدد کے بغیر ہی اسے کسی نہ کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے گی۔ خط ملنے کے چوتھے روز وہ پونہ پہنچ گئی۔ کتنا لمبا سفر طے کر کے آئی تھی، پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پونہ۔ پلیٹ فارم پر چونکہ اس کو مجھے پہچاننا تھا، اس لیے گاڑی آنے پر میں نے ایک سرے سے ڈبوں کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ مجھے زیادہ دُور نہ چلنا پڑا کیونکہ سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک متوسط قد کی عورت جس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی اُتری۔ میری طرف وہ پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی اور ایڑیاں اونچی کر کے مجھے ہجوم میں تلاش کرنے لگی۔ میں نے قریب جا کر کہا، جسے آپ ڈھونڈ رہی ہیں وہ غالباً میں ہی ہُوں۔ وہ پلٹی۔

”اوہ، آپ“!

ایک نظر میری تصویر کی طرف دیکھا اور بڑے بے تکلّف انداز میں کہا۔

”سعادت صاحب! سفر بہت ہی لمبا تھا۔ بمبئی میں فرنٹیر میل سے اُتر کر اس گاڑی کے انتظار میں جو وقت کاٹا۔ اس نے طبیعت صاف کر دی۔“

میں نے کہا۔

”اسباب کہاں ہے آپ کا؟“

”لاتی ہُوں۔“

یہ کہہ کر وہ ڈبے کے اندر داخل ہوئی۔ دو سوٹ کیس اور ایک بستر نکالا۔ میں نے قُلی بلوایا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

”میں ہوٹل میں ٹھہروں گی۔“

میں نے اسٹیشن کے سامنے ہی اس کے لیے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا۔ اسے غسل وسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے تھے اور آرام کرنا تھا، اس لیے میں نے اسے اپنا ایڈریس دیا اور یہ کہہ کر کہ صبح دس بجے مجھ سے ملے، ہوٹل سے چل دیا۔ صبح ساڑھے دس بجے وہ پربھات نگر، جہاں میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، آئی جگہ تلاش کرتے ہوئے اسے دیر ہو گئی تھی۔ میرا دوست اس چھوٹے سے فلیٹ میں، جو نیا نیا تھا موجود نہیں تھا۔ میں رات دیر تک لکھنے کا کام کرنے کے باعث صبح دیر سے جاگا تھا، اس لیے ساڑھے دس بجے نہا دھو کر چائے پی رہا تھا کہ وہ اچانک اندر داخل ہُوئی۔ پلیٹ فارم پر اور ہوٹل میں تھکاوٹ کے باوجود وہ جاندار عورت تھی مگر جونہی وہ اس کمرے میں جہاں میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے چائے پی رہا تھا داخل ہُوئی تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت ہی پریشان اور خستہ حال عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔ جب میں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا تو وہ زندگی سے بھرپور تھی لیکن جب پربھات نگر کے نمبر گیارہ فلیٹ میں آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دے دیا ہے یا اس کا اسقاط ہو گیا ہے۔ جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں، گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا، سوائے ایک بے وقوف نوکر کے۔ میرے دوست کا گھر جس میں ایک فلمی کہانی لکھنے کے لیے میں ٹھہرا ہوا تھا، بالکل سنسان تھا اور مجید ایک ایسا نوکر تھا جس کی موجودگی ویرانی میں اضافہ کرتی تھی۔ میں نے چائے کی ایک پیالی بنا کر جانکی کو دی اور کہا۔

”ہوٹل سے تو آپ ناشتہ کر کے آئی ہوں گی، پھر بھی شوق فرمائیے“!

اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہُوئے چائے کی پیالی اُٹھائی اور پینا شروع کی اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مجھے معلوم ہُوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن ہچکچاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کو کسی مسافر نے اسے چھیڑا ہے چنانچہ میں نے کہا۔

”آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہُوئی ہوٹل میں؟“

”جی، جی نہیں“!

میں یہ مختصر جواب سُن کر خاموش رہا۔ چائے ختم ہُوئی تو میں نے سوچا اب کوئی بات کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے پوچھا۔

”عزیز صاحب کیسے ہیں؟“

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اُٹھ کھڑی ہُوئی اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا۔

”منٹو صاحب آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں؟“

میں نے جواب دیا۔

”پونہ میں تو میں کسی کو نہیں جانتا۔“

”اوہ“!

میں نے پوچھا۔

”کیوں، بیمار ہیں آپ؟“

”جی ہاں۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے دریافت کیا۔

”کیا تکلیف ہے؟“

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے وقت سکڑ جاتے تھے یا سکیڑ لیے جاتے تھے وا ہوئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی اور اُٹھ کھڑی ہوئی پھر میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر کہا۔

”معاف کیجیے گا میں سگریٹ پیا کرتی ہُوں۔“

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف سگریٹ پیا ہی نہیں کرتی بلکہ پھونکا کرتی تھی۔ بالکل مردوں کی طرح سگریٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی اور ایک دن میں تقریباً پچھتر سگریٹوں کا دھواں کھینچتی تھی۔ میں نے کہا۔

”آپ بتاتی کیوں نہیں کہ آپ کو تکلیف کیا ہے؟“

اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجھلا کر اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا۔

”ہائے اللہ! میں کیسے بتاؤں آپ کو“

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ مسکراتے ہوئے تیکھے ہونٹوں کی محراب میں سے مجھے اس کے دانت نظر آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے۔ وہ بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں اپنی ڈگمگاتی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”بات یہ ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ۔“

پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا لیکن جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا

”ایسا اکثر ہوتا ہے۔“

اس نے زور سے کش لیا اور مردوں کی طرح زور سے دھوئیں کو باہر نکالتے ہُوئے کہا۔

”نہیں۔ یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ ٹھہر نہ گیا ہو۔“

میں نے کہا۔

”اوہ“!

اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردن چائے کی طشتری میں دبائی۔

”اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہو گی۔ ایک دفعہ پشاور میں ایسی ہی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ لیکن عزیز صاحب اپنے ایک حکیم دوست سے ایسی دوا لائے تھے جس سے چند دن ہی میں سب صاف ہو گیا تھا۔“

میں نے پوچھا۔

”آپ کو بچے پسند نہیں؟“

وہ مسکرائی۔

”پسند ہیں۔ لیکن کون پالتا پھرے۔“

میں نے کہا۔

”آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے۔“

وہ ایک سنجیدہ ہوگئی۔ پھر اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن سعادت صاحب میں پوچھتی ہُوں اس میں جرم کی کونسی بات ہے۔ اپنی ہی تو چیز ہے اور ان قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف کتنی ہوتی ہے۔ بڑا جرم ہے“!

میں بے اختیار ہنس پڑا۔

”عجیب و غریب عورت ہو تم جانکی“!

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔

”عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے ہیں۔“

ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا مشاہدہ ہے جو آدمی پُر خلوص ہوں۔ ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ضرور آجاتے ہیں۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا اور آنکھیں خشک کر کے بھولے بچوں کے انداز میں پوچھا۔

”سعادت صاحب! بتائیے، کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں؟“

میں نے کہا۔

”بہت۔“

”جھوٹ“!

”اس کا ثبوت؟“

اس نے سگریٹ سلگانا شروع کر دیا۔

”بھئی شاید ایسا ہو۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کچھ کچھ بے قوف ہوں۔ زیادہ کھاتی ہوں، زیادہ بولتی ہوں، زیادہ ہنستی ہوں۔ اب آپ ہی دیکھیے نا زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے۔ عزیز صاحب ہمیشہ کہتے رہے جانکی کم کھایا کرو پر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ سعادت صاحب بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں۔“

اس نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ اس کی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھیں۔ بیچ بیچ میں گھنگھرو سے بجتے تھے۔ پھر وہ اسقاط حمل کے متعلق باتیں کرنے ہی والی تھی کہ میرا دوست، جس کے یہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، آگیا۔ میں نے جانکی سے اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ فلم لائن میں آنے کا شوق رکھتی ہے۔ میرا دوست اسے اسٹوڈیو لے گیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ ڈائریکٹر جس کے ساتھ وہ بحیثیت اسسٹنٹ کے کام کر رہا تھا، اپنے نئے فلم میں جانکی کو ایک خاص رول کے لیے ضرور لے لے گا۔ پونہ میں جتنے سٹوڈیو تھے، میں نے مختلف ذرائع سے جانکی کے لیے کوشش کی۔ کسی نے اس کا ساؤنڈ ٹسٹ لیا، کسی نے کیمرہ ٹسٹ۔ ایک فلم کمپنی میں اس کو مختلف قسم کے لباس پہنا کر دیکھا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ایک تو جانکی ویسے ہی دن اوپر ہو جانے کے باعث پریشان تھی، چار پانچ روز متواتر جب اسے مختلف فلم کمپنیوں کے اکتا دینے والے ماحول میں بے نتیجہ گزارنے پڑے تو وہ اور زیادہ پریشان ہوگئی۔ بچہ ضائع کرنے کے لیے وہ ہر روز بیس بیس گرین کونین کھاتی تھی۔ اس سے بھی اس کی طبیعت پر گرانی سی رہتی تھی۔ عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گزرتے ہیں، اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی۔ پونہ پہنچتے ہی اس نے ایک تار بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ بلاناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔ عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی، اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے، اس لیے وہ فوراً اس کا کہنا مان لیتے ہیں گھر میں کئی بار بیوی سے اس کا جھگڑا ہوا کہ وہ دوا نہیں پیتے لیکن جانکی سے اس معاملے میں انھوں نے کبھی چوں بھی نہ کی۔ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکرمند رہتی ہے، محض بکواس ہے، بناوٹ ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔ اس کا جب خط آیا، جانکی پڑھ کر ضرور روئی۔ فلم کمپنیوں کے طواف کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن ایک روز جانکی کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا اندیشہ غلط تھا۔ دن واقعی اوپر ہو گئے تھے لیکن وہ بات جس کا اسے کھٹکا تھا، نہیں تھی۔ جانکی کو پونہ آئے بیس روز ہو چلے تھے۔ عزیز کو وہ خط پر خط لکھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے بھی لمبے لمبے محبت نامے آتے تھے۔ ایک خط میں عزیز نے مجھ سے کہا تھا کہ پونہ میں اگر جانکی کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو میں بمبئی میں کوشش کروں کیونکہ وہاں بے شمار اسٹوڈیو ہیں۔ بات معقول تھی لیکن میں سیزیو لکھنے میں مصروف تھا، اس لیے جانکی کے ساتھ بمبئی جانا مشکل تھا، لیکن میں نے پونہ سے اپنے دوست سعید جو کو ایک فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا، ٹیلی فون کیا اتفاق سے وہ اس وقت اسٹوڈیو میں موجود نہ تھا۔ آفس میں نرائن کھڑا تھا اسے جب معلوم ہوا کہ میں پونہ سے بول رہا ہوں تو ٹیلی فون لے لیا اور زور سے چلایا۔

”ہلو، منٹو۔ نرائن اسپیکنگ فرام دس انڈ۔ کہو، بات کیا ہے۔ سعید اس وقت اسٹوڈیو میں نہیں ہے۔ گھر میں بیٹھا رضیہ سے آخری حساب کتاب کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا

”کیا مطلب؟“

نرائن نے ادھر سے جواب دیا، کھٹ پٹ ہو گئی ہے اصل میں رضیہ نے ایک اور آدمی سے ٹانکا ملا لیا ہے۔ میں نے کہا۔

”لیکن یہ حساب کتاب کیسا ہو رہا ہے؟“

نرائن بولا۔

”بڑا کمینہ ہے یار، سعید۔ اس سے کپڑے لے رہے ہیں جو اس نے خرید کر دیے تھے۔“

بات یہ ہے کہ پشاور سے میرے ایک عزیز نے ایک عورت یہاں بھیجی ہے۔ جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔“

جانکی میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے مناسب و موزوں لفظوں میں اپنا مدعا بیان نہیں کیا۔ میں تصحیح کرنے ہی والا تھا کہ نرائن کی بلند آواز کانوں کے اندر گھسی۔

”عورت! پشاور کی عورت خو، بیجو اس کو جلدی۔ خو ہم بھی قصور کا پٹھان ہے۔ میں نے کہا

”بکواس نہ کرو نرائن سنو، کل دکن کوئن سے میں انھیں بمبئی بھیج رہا ہوں۔ سعید یا تم کوئی بھی اسے اسٹیشن پر لینے کے لیے آ جانا، کل دکن کوئن سے۔ یاد رہے۔ نرائن کی آواز آئی۔

”پر ہم اسے پہچانیں گے کیسے؟“

میں نے جوابدیا۔

”وہ خود تمھیں پہچان لے گی۔ لیکن دیکھو کوشش کر کے اسے کسی نہ کسی جگہ ضرور رکھوا دینا۔“

تین منٹ گزر گئے۔ میں نے ٹیلی فون بند کیا اور جانکی سے کہا۔

”کل دکن کوئن سے تم بمبئی چلی جانا۔ سعید اور نرائن دونوں کی تصویریں دکھاتا ہوں۔ لمبے ترنگے خوبصورت جوان ہیں۔ تمھیں پہچاننے میں دقت نہیں ہو گی۔“

میں نے البم میں جانکی کو سعید اور نرائن کے مختلف فوٹو دکھائے۔ دیر تک وہ انھیں دیکھتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ سعید کا فوٹو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔ البم ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنے کی ڈگمگاتی کوشش کرتے ہوئے، اس نے مجھ سے پوچھا۔

”دونوں کیسے آدمی ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ دونوں کیسے آدمی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ فلموں میں اکثر آدمی بُرے ہوتے ہیں۔“

اس کے لہجے میں ایک ٹوہ لینے والی سنجیدگی تھی۔ میں نے کہا۔

”یہ تو دُرست ہے لیکن فلموں میں نیک آدمیوں کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے“!

”کیوں؟“

”دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک قسم ان انسانوں کی ہے جو اپنے زخموں سے درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی ہے جو دوسروں کے زخم دیکھ کر درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ تمہارا خیال ہے، کون سی قسم کے انسان زخم کے درد اور اس کی تہ کی جلن کو صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں۔“

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

”وہ جن کے زخم لگے ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”بالکل درست۔ فلموں میں اصل کی اچھی نقل وہی اتار سکتا ہے جسے اصل کی واقفیت ہو۔ ناکام محبت میں دل کیسے ٹوٹتا ہے، یہ ناکام محبت ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے۔ وہ عورت جو پانچ وقت جانماز بچھا کر نماز پڑھتی ہے اور عشق و محبت کو سُور کے برابر سمجھتی ہے، کیمرے کے سامنے کسی مرد کے ساتھ اظہارِ محبت کیا خاک کرے گی“!

اس نے پھر سوچا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلم لائن میں داخل ہونے سے پہلے عورت کو سب چیزیں جاننی چاہئیں۔“

میں نے کہا۔

”یہ ضروری نہیں۔ فلم لائن میں آ کر بھی وہ چیزیں جان سکتی ہے۔“

اس نے میری بات پر غور نہ کیا اور جو پہلا سوال کیا تھا، پھر اسے دہرایا۔

”سعید صاحب اور نرائن صاحب کیسے آدمی ہیں؟“

”تم تفصیل سے پوچھنا چاہتی ہو؟“

”تفصیل سے آپ کا کیا مطلب؟“

”یہ کہ دونوں میں سے آپ کے لیے کون بہتر رہے گا“!

جانکی کو میری یہ بات ناگوار گزری۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟“

”جیسی تم چاہتی ہو۔“

”ہٹائیے بھی۔“

یہ کہہ وہ مسکرائی۔

”میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔“

میں نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

”جب پوچھو گی تو میں نرائن کی سفارش کروں گا۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ سعید کے مقابلے میں بہتر انسان ہے۔“

میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ سعید شاعر ہے، ایک بہت بے رحم قسم کا شاعر۔ مرغی پکڑے گا تو ذبح کرنے کی بجائے اس کی گردن مروڑ دے گا۔ گردن مروڑ کر اس کے پر نوچے گا۔ پر نوچنے کے بعد اس کی یخنی نکالے گا۔ یخنی پی کر اور ہڈیاں چبا کر وہ بڑے آرام اور سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر اس کی مرغی کی موت پر ایک نظم لکھے گا جو اس کے آنسوؤں میں بھیگی ہو گی۔ شراب پیے گا تو کبھی بہکے گا نہیں۔ مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ شراب کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ صبح بہت آہستہ آہستہ بستر پر سے اُٹھے گا۔ نوکر چائے کی پیالی بنا کر لائے گا۔ اگر رات کی بچی ہُوئی رم سرہانے پڑی ہے تو اسے چائے میں انڈیل لے گا اور اس مکسچر کو ایک ایک گھونٹ کر کے ایسے پیے گا جیسے اس میں ذائقے کی کوئی حس ہی نہیں۔ بدن پر کوئی پھوڑا نکلا ہے۔ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے، مگر مجال ہے جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو۔ پیپ نکل رہی ہے، گل سڑ گیا ہے، ناسور بننے کا خطرہ ہے، لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا۔ آپ اس سے کچھ کہیں گے تو یہ جواب ملے گا۔

”اکثر اوقات بیماریاں انسان کی جزو بدن ہو جاتی ہیں۔ جب مجھے یہ زخم تکلیف نہیں دیتا تو علاج کی کیا ضرورت ہے۔“

اور یہ کہتے ہوئے وہ زخم کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے کوئی اچھا شعر نظر آ گیا ہے۔ ایکٹنگ وہ ساری عمر نہیں کر سکے گا، اس لیے کہ وہ لطیف جذبات سے قریب قریب عاری ہے۔ میں نے اسے ایک فلم میں دیکھا جو ہیروئن کے گانوں کے باعث بہت مقبول ہوا تھا۔ ایک جگہ اس نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت کا اظہار کرنا تھا۔ خدا کی قسم اس نے ہیروئن کا ہاتھ کچھ اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا جیسے کتے کا پنجہ پکڑا جاتا ہے۔ میں اس سے کئی بار کہہ چکا ہوں ایکٹر بننے کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اچھے شاعر ہو، گھر بیٹھو اور نظمیں لکھا کرو۔ مگر اس کے دماغ پر ابھی تک ایکٹنگ کی دُھن سوار ہے۔ نرائن مجھے بہت پسند ہے۔ اسٹوڈیو کی زندگی کے جو اصول اس نے اپنے لیے وضع کر رکھے ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں۔ 1۔ ایکٹر جب تک ایکٹر ہے، اسے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ شادی کر لے تو فوراً فلم کو طلاق دے کر دودھ دہی کی دکان کھول لے۔ اگر مشہور ایکٹر رہا تو کافی آمدنی ہو جایا کرے گی۔ 2۔ کوئی ایکٹرس تمہیں بھیا یا بھائی صاحب کہے تو فوراً اس کے کان میں کہو، آپ کی انگیا کا سائز کیا ہے۔ 3۔ کسی ایکٹرس پر اگر تمہاری طبیعت آ گئی ہے تو تمہیدیں باندھنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اس سے تخلیے میں ملو اور کہو کہ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں، اس کا یقین نہ آئے تو پوری جیب باہر نکال کر دکھا دو۔ 4۔ اگر کوئی ایکٹرس تمہارے حصے میں آ جائے تو اس کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی نہ لو ایکٹرسوں کے شوہروں اور بھائیوں کے لیے یہ پیسہ حلال ہے۔ 5۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ ایکٹرس کے بطن سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔ سوراج ملنے کے بعد البتہ تم اس کی اولاد پیدا کر سکتے ہو۔ 6۔ یاد رکھو کہ ایکٹر کی بھی عاقبت ہوتی ہے۔ اسے ریزر اور کنگھی سے سنوارنے کے بجائے کبھی کبھی غیر مہذب طریقے سے بھی سنوارنے کی کوشش کیا کرو، مثال کے طور پر کوئی نیک کام کر کے۔ 7۔ اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ احترام پٹھان چوکیدار کا کرو۔ صبح اسٹوڈیو میں آتے وقت اسے سلام کرنے سے تمہیں فائدہ ہو گا۔ یہاں نہیں تو دوسری دنیا میں، جہاں فلم کمپنیاں نہیں ہوں گی۔ 8۔ شراب اور ایکٹرس کی عادت ہرگز نہ ڈالو۔ بہت ممکن ہے کہ کسی روز کانگرس گورنمنٹ لہر میں آ کر یہ دونوں چیزیں ممنوع قرار دے دے۔ 9۔ سوداگر، مسلمان سوداگر ہو سکتا ہے۔ لیکن ایکٹر ہندو ایکٹر، یا مسلم ایکٹر نہیں ہو سکتا۔ 10۔ جھوٹ نہ بولو۔ یہ سب باتیں

”نرائن کے دس احکام“

کے عنوان تلے اس نے اپنی ایک نوٹ بک میں لکھ رکھی ہیں جن سے اس کے کیریکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ان سب پر عمل نہیں کرتا۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔ سعید اور نرائن کے متعلق جو میرے خیالات تھے۔ میں نے جانکی کے پوچھے بغیر اشارۃً بتادیے اور آخر میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر تم اس لائن میں آگئیں تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمہیں لینا پڑے گا۔ نرائن کے متعلق میرا خیال ہے کہ اچھا دوست ثابت ہو گا۔ میرا مشورہ اس نے سُن لیا اور بمبئی چلی گئی۔ دوسرے روز خوش خوش واپس آئی کیونکہ نرائن نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک سال کے لیے پانچ سو روپے ماہوار پر اسے ملازم کرا دیا تھا۔ یہ ملازمت اسے کیسی ملی، دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئیں۔ جب اور کچھ سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"سعید اور نرائن، دونوں سے تمہاری ملاقات ہوئی، ان میں سے کس نے تم کو زیادہ پسند کیا؟"

جانکی کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہُوئے اس نے کہا۔

"سعید صاحب"!

یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"سعادت صاحب آپ نے کیوں اتنے پُل باندھے تھے۔ نرائن کی تعریفوں کے؟"

میں نے پوچھا۔

"کیوں"

"بڑا ہی واہیات آدمی ہے۔ شام کو باہر کرسیاں بچھا کر سعید صاحب اور وہ شراب پینے کے لیے بیٹھے تو باتوں باتوں میں میں نے نرائن بھیا کہا۔ اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر پوچھا۔

"تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے۔"

"بھگوان جانتا ہے میرے تن بدن میں تو آگ ہی لگ گئی کیسا لچر آدمی ہے۔"

جانکی کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ میں زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے تیزی سے کہا۔

"آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟"

"اس کی بے وقوفی پر۔"

یہ کہہ کر میں نے ہنسنا بند کر دیا۔ تھوڑی دیر نرائن کو برا بھلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکر مند لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ اس لیے طرح طرح کے خیال اسے ستا رہے تھے۔ کہیں انھیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو۔ اندھا دھند سائیکل چلاتے ہیں، کہیں حادثہ ہی نہ ہو گیا ہو۔ پونہ ہی نہ آرہے ہوں، کیونکہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انھوں نے کہا تھا ایک روز میں چپ چاپ تمہارے پاس چلا آؤں گا۔ باتیں کرنے کے بعد اس کا تردّد کم ہوا تو اس نے عزیز کی تعریفیں شروع کر دیں۔ گھر میں بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہر روز صبح ان کو ورزش کراتے ہیں اور نہلا دھلا کر سکول چھوڑنے جاتے ہیں۔ بیوی بالکل پھوہڑ ہے، اس لیے رشتہ داروں سے سارا رکھ رکھاؤ خود انہی کو کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ جانکی کو ٹائی فائڈ ہو گیا تھا تو بیس دن تک متواتر نرسوں کی طرح اس کی تیمارداری کرتے رہے، وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے روز مناسب و موزوں الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی۔ جہاں اس کے لیے ایک نئی اور چمکیلی دنیا کے دروازے کھل گئے تھے۔ پونہ میں مجھے تقریباً دو مہینے کہانی کا منظر نامہ تیار کرنے میں لگے۔ حقِ خدمت وصول کر کے میں نے بمبئی کا رخ کیا جہاں مجھے ایک نیا کنٹریکٹ مل رہا تھا۔ میں صبح پانچ بجے کے قریب اندھیری پہنچا جہاں ایک معمولی بنگلے میں سعید اور نرائن دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ برآمدے میں داخل ہوا تو دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سو رہے ہوں گے، تکلیف نہیں دینا چاہیے۔ پچھلی طرف ایک دروازہ ہے۔ جو نوکروں کے لیے اکثر کھلا رہتا ہے، میں اس میں سے اندر داخل ہُوا۔ باورچی خانہ اور ساتھ والا کمرہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہے، حسبِ معمول بے حد غلیظ تھے۔ سامنے والا کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر سعید اور اسکے ساتھ کوئی اور لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ مجھے سخت نیند آرہی تھی۔ دوسرے پلنگ پر میں کپڑے اُتارے بغیر لیٹ گیا پائنتی پر کمبل پڑا تھا، یہ میں نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سعید کے پیچھے سے ایک چوڑیوں والا ہاتھ نکلا اور پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔ کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سعید کے ساتھ جانکی لیٹی تھی۔ میں نے کرسی پر سے شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔ نرائن کے کمرے میں جا کر میں نے اسے جگایا۔ رات کے دو بجے اس کی شوٹنگ ختم ہوئی تھی، مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اس غریب کو جگایا۔ لیکن وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی خاص موضوع پر نہیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر بقول اس کے وہ کچھ بے ہودہ بکواس کرنا چاہتا تھا، چنانچہ صبح نو بجے تک ہم بے ہودہ بکواس میں مشغول رہے جس میں بار بار جانکی کا بھی ذکر آیا۔ جب میں نے انگیا والی بات چھیڑی تو نرائن بہت ہنسا۔ ہنستے ہنستے اس نے کہا سب سے مزے دار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا۔ تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے تو اس نے بتا دیا کہا۔

"چوبیس۔"

اس کے بعد اچانک اسے میرے سوال کی بے ہودگی کا احساس ہوا۔ مجھے کوسنا شروع کر دیا۔ بالکل بچی ہے۔ جب کبھی مجھ سے مڈ بھیڑ ہوتی ہے تو سینے پر دوپٹہ رکھ لیتی ہے۔ لیکن منٹو! بڑی وفادار عورت ہے۔ میں نے پوچھا۔

”یہ تم نے کیسے جانا؟“

نرائن مسکرایا۔

”عورت، جو ایک بالکل اجنبی آدمی کو اپنی انگیا کا صحیح سائز بتادے، دھوکے باز ہرگز نہیں ہو سکتی۔“

عجیب و غریب منطق تھی۔ لیکن نرائن نے مجھے بڑی سنجیدگی سے یقین دلایا کہ جانکی بڑی پُر خلوص عورت ہے۔ اس نے کہا منٹو۔

”تمہیں معلوم نہیں سعید کی کتنی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبر گیری جو پرلے درجے کا بے پرواہو آسان کام نہیں۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کو بڑی آسانی سے نبھا رہی ہے۔ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پر خلوص اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صبح اٹھ کر اس خر ذات کو جگانے میں آدھ گھنٹہ صرف کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کراتی ہے، کپڑے پہناتی ہے، ناشتہ کراتی ہے اور رات کو جب وہ رم پی کر بستر پر لیٹتا ہے تو سب دروازے بند کر کے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے اور جب اسٹوڈیو میں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید کی باتیں کرتی ہیں۔ سعید صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ سعید صاحب بہت اچھا گاتے ہیں۔ سعید صاحب کا وزن بڑھ گیا ہے۔ سعید صاحب کا پل اوور تیار ہو گیا ہے۔ سعید صاحب کے لیے پشاور سے پوٹھوہاری سینڈل منگوائی ہے۔ سعید صاحب کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہے۔ اسپر و لینے جا رہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر ایک شعر کہا۔ اور جب مجھ سے مڈ بھیڑ ہوتی ہے تو انگیا والی بات یاد کر کے تیوری چڑھا لیتی ہے۔“

میں تقریباً دس دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا۔ اس دوران میں سعید نے جانکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ ان کا معاملہ کافی پرانا ہو چکا تھا۔ جانکی سے البتہ کافی باتیں ہوئیں۔ وہ سعید سے بہت خوش تھی لیکن اسے اس کی بے پرواطبعیت کا بہت گلہ تھا۔

”سعادت صاحب! اپنی صحت کا بالکل ہی خیال نہیں رکھتے۔ بہت بے پرواہ ہیں۔ ہر وقت سوچنا، جو ہوا اس لیے کسی بات کا خیال ہی نہیں رہتا۔ آپ ہنسنے لگے، لیکن مجھے ہر روز ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ سنڈاس گئے تھے یا نہیں۔“

نرائن نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک نکلا۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری میں منہمک رہتی تھی۔ میں دس دن اندھیری کے بنگلے میں رہا۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کو کیا ہوا۔ جانکی کو اس کا بھی تو بہت خیال رہتا ہے۔ کیا سعید کو پا کر وہ اس کو بھول چکی تھی۔ میں نے اس سوال کا جواب جانکی ہی سے پوچھ لیا ہوتا اگر میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا۔ جس کمپنی سے میرا کنٹریکٹ ہونے والا تھا، اس کے مالک سے میری کسی بات پر چخ ہو گئی اور میں دماغی تکدر دُور کرنے کے لیے پونہ چلا گیا۔ دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ بمبئی سے عزیز کا تار آیا کہ میں آرہا ہوں۔ پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پر دستک دے رہی تھی۔ عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انھوں نے دیر سے بچھڑے ہُوئے عاشق معشوق کی سرگرمی ظاہر نہ کی۔ میرے اور عزیز کے تعلقات شروع سے بہت سنجیدہ اور متین رہے ہیں، شاید اسی وجہ سے وہ دونوں معتدل رہے۔ عزیز کا خیال تھا ہوٹل میں اُٹھ جائے لیکن میرا دوست جس کے یہاں میں ٹھہرا تھا آوٹ ڈور شوٹنگ کے لیے کولہاپور گیا تھا، اس لیے میں نے عزیز اور جانکی کو اپنے پاس ہی رکھا۔ تین کمرے تھے۔ ایک میں جانکی سو سکتی تھی دوسرے میں عزیز۔ یوں تو مجھے ان دونوں کو ایک ہی کمرہ دینا چاہیے تھا لیکن عزیز سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس نے جانکی سے اپنے تعلق کو مجھ پر ظاہر بھی نہیں کیا تھا۔ رات کو دونوں سینما دیکھنے چلے گئے۔ میں ساتھ نہ گیا، اس لیے کہ میں فلم کے لیے ایک نئی کہانی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دو بجے تک میں جاگتا رہا۔ اس کے بعد سو گیا۔ ایک چابی میں نے عزیز کو دے دی تھی۔ اس لیے مجھے ان کی طرف سے اطمینان تھا۔ رات کو میں چاہے بہت دیر تک کام کروں، ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک دفعہ ضرور جاگتا ہوں اور اٹھ کر پانی پیتا ہوں۔ حسب عادت اس رات کو بھی میں پانی پینے کے لیے اٹھا۔ اتفاق سے جو کمرہ میرا تھا، یعنی جس میں میں نے اپنا بستر جمایا ہوا تھا، عزیز کے پاس تھا اور اس میں میری صراحی پڑی تھی۔ اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا۔ لیکن زیادہ وسکی پینے کے باعث میرا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا، اس لیے مجھے دستک دینی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا اور کہا

”سعید صاحب“!

اور جب مجھے دیکھا تو ایک ہلکی سی

”اوہ“

اس کے منہ سے نکل گئی۔ اندر کے پلنگ پر عزیز سو رہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرایا۔ جانکی بھی مسکرائی اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے۔ میں نے پانی کی صراحی لی اور چلا آیا۔ صبح اُٹھا تو کمرے میں دُھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کاغذ جلا جلا کر عزیز کے غسل کے لیے پانی گرم کر رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگیٹھی میں پھونکیں مارتی ہوئی کہنے لگی۔

”عزیز صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انھیں زکام ہو جاتا ہے۔ میں نہیں تھی پشاور میں تو ایک مہینہ بیمار رہے، اور رہتے بھی کیوں نہیں جب دوا پینی ہی چھوڑ دی تھی۔ آپ نے دیکھا نہیں کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔“

اور عزیز نہا دھو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھ سے سعید کے نام تار لکھنے کے لیے کہا۔

”مجھے کل یہاں پہنچتے ہی انھیں تار بھیجنا چاہیے تھا۔ کتنی غلطی ہوئی مجھ سے انھیں بہت تشویش ہو رہی ہو گی۔“

اس نے مجھ سے تار کا مضمون بنوایا جس میں اپنی بخیریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ انجکشن لگوانے کی تاکید بھی تھی۔ چار روز گزر گئے۔ سعید کو جانکی نے پانچ تار روانہ کیے پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بمبئی جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک شام کو عزیز کی طبیعت خراب ہو گئی۔ مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیز کی تیمار داری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔ میرا خیال ہے اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کردہ وہ اضطراب بھی شامل تھا۔ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی بار کہہ چکی تھی۔

”سعادت صاحب میرا خیال ہے سعید صاحب ضرور بیمار ہیں ورنہ وہ مجھے میرے تاروں اور خطوط کا جواب ضرور لکھتے۔“

پانچویں روز شام کو عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا جس میں لکھا تھا میں بہت بیمار ہُوں فوراً چلی آؤ۔ تار آنے سے پہلے جانکی میری کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سنی تو ایک دم خاموش ہو گئی۔ عزیز کو یہ خاموشی بہت ناگوار معلوم ہوئی کیونکہ جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ میں اُٹھ کر چلا گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیز کچھ اس طرح علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی جھگڑا ہوا تھا۔ جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عزیز سے کہا۔

”میں جاتی ہُوں، لیکن بہت جلد واپس آ جاؤں گی۔“

پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”سعادت صاحب ان کا خیال رکھیے، ابھی تک بخار دُور نہیں ہُوا۔“

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا۔ بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی پر بٹھایا اور گھر چلا آیا۔ عزیز کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن جانکی کا ذکر نہ آیا۔ تیسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد جانکی کی۔ لفظوں کو اوپر تلے کرتی ہُوئی وہ عزیز سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت اب کیسی ہے اور کیا اس کی غیر موجودگی میں اس نے باقاعدہ دوا پی تھی یا نہیں۔ عزیز کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی لیکن آدھ گھنٹے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مند رہی تھیں، عزیز کی خفگی آمیز باتوں کا دبا دبا شور سُنائی دیا۔ سمجھ میں تو کچھ نہ آیا لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ جانکی سے اپنی ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔ صبح دس بجے عزیز نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جانکی کا گرم کیا ہوا پانی ویسے ہی غسل خانے میں پڑا رہا۔ جب میں نے جانکی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نہا دھو کر عزیز باہر چلا گیا۔ جانکی کمرے میں پلنگ پر لیٹی رہی۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب جب میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر بلانے کے لیے باہر نکلا تو عزیز تانگے میں اسباب رکھوا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ کہا جا رہے ہو۔ تو اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا، بمبئی! انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔ یہ کہہ کر وہ اکے میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مجھے یہ بتانے کا موقع ہی نہ ملا کہ جانکی کو بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر نے جانکی کو اچھی طرح دیکھا اور مجھے بتایا کہ اسے برونکائٹس ہے، اگر احتیاط نہ برتی تو نمونیا ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر نسخہ دے کر چلا گیا تو جانکی نے عزیز کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے نہ بتاؤں لیکن چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا، اس لیے میں نے کہہ دیا کہ چلا گیا ہے۔ یہ سُن کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ دیر تک وہ تکیے میں سر دے کر روتی رہی۔ دوسرے روز صبح گیارہ بجے کے قریب جب کہ جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور طبیعت بھی کسی قدر درست تھی، بمبئی سے سعید کا تار آیا جس میں بڑے درشت لفظوں میں لکھا تھا

”یاد رہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔“

میں بہت منع کرتا رہا لیکن وہ تیز بخار ہی میں پونہ ایکسپریس سے بمبئی روانہ ہو گئی۔ پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن کا تار آیا

”ایک ضروری کام ہے، فوراً بمبئی چلے آؤ۔“

میرا خیال تھا کہ کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کنٹریکٹ کی بات کی ہو گی، لیکن بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جانکی کی حالت بہت نازک ہے۔ برونکائٹس بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ پونہ سے بمبئی پہنچی تھی تو اندھیری جانے کے لیے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی جس کے باعث اس کی دونوں رانیں بہت بری طرح چھل گئی تھیں۔ جانکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا۔ لیکن جب وہ اندھیری پہنچی اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کر کے کہا

”مہربانی کر کے یہاں سے چلو جاؤ“

تو اسے بہت روحانی تکلیف ہوئی۔ نرائن نے مجھے بتایا!

”سعید کے منہ سے یہ برف جیسے ٹھنڈے لفظ سن کر وہ ایک لحظے کے لیے بالکل پتھر ہو گئی میرا خیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے بعد یہ ضرور سوچا ہو گا میں گاڑی کے نیچے آ کر کیوں نہ مر گئی۔ سعادت تم کچھ بھی کہو مگر سعید عورتوں سے جیسا سلوک کرتا ہے بہت ہی نامردانہ ہے۔ بے چاری کو بخار تھا۔ چلتی ریل سے گر پڑی تھی اور وہ بھی اس خرذات کے پاس جلدی پہنچنے کے باعث۔ لیکن اس نے ان باتوں کا خیال ہی نہ کیا اور ایک بار پھر اس سے کہا۔ مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ۔ اس کے لہجے میں منٹو کسی جذبے کا اظہار نہیں تھا۔ بس ایسا تھا جیسے لنوٹائپ مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر باہر نکل آئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا، چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو جانکی موجود نہیں تھی لیکن سعید پلنگ پر بیٹھا، رم کا گلاس سامنے رکھے ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا دوسرے روز اسٹوڈیو سے معلوم ہوا کہ جانکی ایک اکسٹرا لڑکی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ میں نے اسٹوڈیو کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوا دیا۔ کل سے وہیں ہے، بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ میں تو اسے دیکھنے جا نہیں سکتا اس لیے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ تم جاؤ اور دیکھ کر آؤ کس حالت میں ہے۔ میں ہسپتال گیا تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا۔ جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد اس کے پر خلوص استفسار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ دونوں پھیپھڑوں پر ورم ہے اور جان کا خطرہ ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ جانکی اتنی بڑی تکلیف مردانہ وار برداشت کر رہی تھی۔ ہسپتال سے لوٹا اور اسٹوڈیو میں نرائن کو تلاش کیا تو معلوم ہوا وہ صبح ہی سے غائب ہے۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے مجھے تین چھوٹی چھوٹی شیشیاں دکھائیں جن کا منہ ربڑ سے بند تھا۔

”جانتے ہو یہ کیا ہے؟“

میں نے کہا۔

”معلوم نہیں۔ انجکشن سے لگتے ہیں۔“

نرائن مسکرایا۔

”انجکشن ہی ہیں لیکن پنسلین کے۔“

مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ پنسلین اس وقت بہت ہی قلیل مقدار میں تیار ہوتی تھی۔ امریکہ اور انگلستان میں جتنی بنتی ہے، تھوڑی تھوڑی ملٹری ہسپتالوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔

چنانچہ میں نے نرائن سے پوچھا۔

”یہ تو بالکل نایاب چیز ہے، تمہیں کیسے مل گئی؟“

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بچپن میں گھر کی تجوری کھول کر روپے چرانا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ آج دائیں ہاتھ سے ملٹری ہوسپٹل کا ریفریجریٹر کھول کر میں نے یہ تین بلب چرائے ہیں۔ چلو جلدی کرو جانکی کو ہسپتال سے ہوٹل میں لے چلیں۔“

ٹیکسی لے کر میں ہسپتال گیا اور جانکی کو اس ہوٹل میں لے گیا جس میں نرائن دو کمروں کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔ جانکی نے مجھ سے کئی بار نحیف آواز میں پوچھا کہ میں اسے ہوٹل میں کیوں لایا ہوں۔ ہر بار میں نے یہی جواب دیا۔

”تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“

اور جب اسے معلوم ہوا۔ یعنی جب نرائن سرنج ہاتھ میں لیے اسے ٹیکہ لگانے کے لیے اس کمرے میں آیا تو نفرت سے ایک طرف اس نے منہ پھیر لیا اور مجھ سے کہا۔

”سعادت صاحب اس سے کہئے چلا جائے یہاں سے۔“

نرائن مسکرایا۔

”جانِ من غصّہ تھوک دو۔ یہاں تمہاری جان کا سوال ہے۔“

جانکی کو طیش آ گیا۔ نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”سعادت صاحب! میں جاتی ہوں یہاں سے یا آپ اس حرام خور کو نکالیے باہر۔“

نرائن نے دھکا دے کر اسے الٹا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ حرام زادہ تمہیں انجکشن لگا کر ہی رہے گا۔ خبردار جو تم نے مزاحمت کی۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ جانکی کا بازو پکڑا، سرنج مجھے دے کر اس نے اسپرٹ میں روئی بھگوئی اور اس کا ڈنڑ صاف کیا۔ اس کے بعد روئی مجھے دے کر اس نے سرنج کی سوئی اس کے بازو کی مچھلی میں داخل کر دی وہ چیخی، لیکن پنسلین اس کے جسم میں جا چکی تھی۔ جب نرائن نے جانکی کا بازو اپنی مضبوط گرفت سے علیحدہ کیا تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ نرائن نے اس کی بالکل پروانہ کی اور اسپرٹ لگی روئی سے انجکشن والا حصّہ پونچھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پہلا انجکشن رات کے نو بجے دیا تھا۔ دوسرا تین گھنٹے بعد دینا تھا۔ نرائن نے مجھے بتایا اگر تین کے ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تو پنسلین کا اثر بالکل زائل ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ جاگتا رہا تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے اسٹوو جلایا، سرنج ابالی اور اس میں دوا بھری۔ جانکی خرخراہٹ بھرے سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ نرائن نے دوسرے بازو کو اسپرٹ سے صاف کیا اور سرنج کی سوئی اندر کھبو دی۔ جانکی کے ہونٹوں سے پتلی سی چیخ نکلی۔ نرائن نے دوا جسم کے اندر بھیج کر سوئی باہر نکالی اور اسپرٹ سے انجکشن والی جگہ صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”اب تیسرا تین بجے۔“

مجھے معلوم نہیں اس نے تیسرا چوتھا انجکشن کب دیا۔ لیکن جب بیدار ہوا تو اسٹوو جلنے کی آواز آ رہی تھی اور نرائن ہوٹل کے بیرے سے برف کے لیے کہہ رہا تھا کیونکہ اسے پنسلین کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔ نو بجے پانچواں انجکشن دینے کے لیے جب ہم دونوں جانکی کے کمرے میں گئے تو وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے نرائن کی دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ نرائن مسکرایا۔

”کیوں جان من! کیا حال ہے؟“

جانکی خاموش رہی۔ نرائن اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

”یہ انجکشن جو میں تمہیں دے رہا ہوں عشق کے انجکشن نہیں۔ تمہارا نمونیہ دُور کرنے کے انجکشن ہیں جو میں نے ملٹری ہوسپٹل سے بڑی صفائی کے ساتھ چرائے ہیں۔ لو، اب ذرا الٹی لیٹ جاؤ اور کولہے پر سے شلوار کو ذرا نیچے کھسکا دو۔ کبھی لیا ہے یہاں انجکشن؟“

یہ کہہ کر اس نے جانکی کے کولہے پر ایک جگہ گوشت کے اندر انگلی کھبوئی جانکی کی آنکھوں میں مرعوب سی نفرت پیدا ہُوئی۔ جب اس نے کروٹ بدلی تو نرائن نے کہا۔

”شاباش“!

پیشتر اس کے کہ جانکی کوئی مزاحمت کرے نرائن نے ایک ہاتھ سے اس کی شلوار نیچے کھسکائی اور مجھ سے کہا۔

”اسپرٹ لگاؤ“!

جانکی نے ٹانگیں چلانا شروع کیں تو نرائن نے کہا۔

”جانکی! ٹانگیں وانگیں مت چلاؤ۔ میں انجکشن لگا کے رہوں گا۔“

غرض کہ پانچواں انجکشن دے دیا گیا۔ پندرہ اور باقی تھے جو نرائن کو ہر تین گھنٹے کے بعد دینے تھے اور یہ پینتالیس گھنٹے کا کام تھا۔ پانچ انجکشن سے گو جانکی کو بظاہر کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ لیکن نرائن کو پنسلین کے اعجاز کا یقین تھا اور اسے پوری پوری امید تھی کہ وہ بچ جائے گی۔ ہم دونوں بہت دیر تک اس نئی دوا کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب نرائن کا نوکر میرے نام ایک تار لے کر آیا۔ پونہ سے تھا۔ ایک فلم کمپنی نے مجھے فوراً بلایا تھا اس لیے مجھے جانا پڑا۔ دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی ہی کے کام سے میں بمبئی آیا۔ کام ختم کر کے جب میں اندھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہوٹل ہی میں ہے۔ ہوٹل بہت دور، شہر میں تھا اس لیے رات میں وہیں اندھیری میں رہا۔ صبح آٹھ بجے وہاں پہنچا تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک دم آنکھوں کے سامنے کچھ ہوا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس گئی۔ اور نرائن جو اس کے ساتھ لیٹا تھا، مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا۔

”آؤ منٹو آؤ۔ میں ہمیشہ دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں۔ آؤ یار۔ بیٹھو اس کرسی پر، لیکن یہ جانکی کی شلوار دے دینا“!

جاو حنیف جاو

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوجاو حنیف جاو

چودھری غلام عباس کی تازہ ترین تقریر و تبادلہ خیالات ہو رہا تھا۔ ٹی ہاؤس کی فضا وہاں کی چائے کی طرح گرم تھی۔ سب اس بات پر متفق تھے کہ ہم کشمیر لے کر رہیں گے، اور یہ کہ ڈوگرہ راج کا فی الفور خاتمہ ہونا چاہیے۔ سب کے سب مجاہد تھے۔ لڑائی کے فن سے نابلد تھے، مگر میدان جنگ میں جانے کے لیے سر بکف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایک دم ہلہ بول دیا جائے تو یوں چٹکیوں میں کشمیر سر ہو جائیگا، پھر ڈاکٹر گراہموں کی کوئی ضرورت نہ رہے گی، نہ یو این او میں ہر چھٹے مہینے گڑگڑانا پڑے گا۔ ان مجاہدوں میں، میں بھی تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ

پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح میں بھی کشمیری ہوں، اس لیے کشمیر میری زبردست کمزوری ہے۔ چنانچہ میں نے باقی مجاہدوں کی ہاں میں ہاں ملائی اور آخر میں طے یہ ہوا کہ جب لڑائی شروع ہو تو ہم سب اس میں شامل ہوں اور صف اول میں نظر آئیں۔ حنیف نے یوں تو کافی گرم جوشی کا اظہار کیا، مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ افسردہ سا ہے۔ میں نے بہت سوچا مگر مجھے اس افسردگی کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ چائے پی کر باقی سب چلے گئے، لیکن میں اور حنیف بیٹھے رہے۔ اب ٹی ہاؤس قریب قریب خالی تھا۔ ہم سے بہت دور ایک کونے میں دو لڑکے ناشتہ کر رہے تھے۔ حنیف کو ایک عرصے سے جانتا تھا۔ مجھ سے قریب قریب دس برس چھوٹا تھا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد سوچ رہا تھا کہ اردو کا ایم۔ اے کروں یا انگریزی کا۔ کبھی کبھی اس کے دماغ پر یہ سنک بھی سوار ہو جاتی کہ ہٹاؤ پڑھائی کو، سیاحی کرنی چاہیے۔ میں نے حنیف کو غور سے دیکھا۔ وہ ایش ٹرے میں سے ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں اٹھا اٹھا کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، وہ افسردہ تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر وہی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا موقع اچھا ہے، اس سے دریافت کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

”تم خاموش کیوں ہو؟“

حنیف نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ماچس کی تیلی کے ٹکڑے کر کے ایک طرف پھینکے اور جواب دیا۔

”ایسے ہی۔“

میں نے سگریٹ سلگایا۔

”ایسے ہی، تو ٹھیک جواب نہیں۔ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ تم غالباً کسی بیتے ہوئے واقعات کے متعلق سوچ رہے ہو“!

حنیف نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں“!

”اور وہ واقعہ کشمیر کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے۔“

حنیف چونکا۔

”آپ نے کیسے جانا؟“

میں نے مسکرا کر کہا۔

”شرلک ہومز ہوں میں بھی۔ ارے بھئی کشمیر کی باتیں جو ہو رہی تھیں۔ جب تم نے مان لیا کہ سوچ رہے ہو۔ کسی بیتے ہوئے واقعے کے متعلق سوچ رہے ہو تو میں فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اس بیتے ہوئے واقعے کا تعلق کشمیر کے سوا اور کسی سرزمین سے نہیں ہو سکتا۔ کیا وہاں کوئی رومان لڑا تھا تمہارا؟“

”رومان۔ معلوم نہیں۔ جانے کیا تھا؟۔ بہر حال، کچھ نہ کچھ ہوا تھا جس کی یاد اب تک باقی ہے۔“

میری خواہش تھی کہ میں حنیف سے اس کی داستان سنوں۔

”اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وہ کچھ نہ کچھ کیا تھا؟“

حنیف نے مجھ سے سگریٹ مانگ کر سلگایا اور کہا۔

”منٹو صاحب! کوئی خاص دلچسپ واقعہ نہیں۔ لیکن اگر آپ خاموشی سے سنتے رہیں گے اور مجھے ٹوکیں گے نہیں تو میں آج سے تین برس پہلے جو کچھ ہوا، آپ کو من و عن بتا دوں گا۔ میں افسانہ گو نہیں۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔“

میں نے وعدہ کیا کہ میں اس کے تسلسل کو نہیں توڑوں گا۔ اصل میں وہ اب دل و دماغ کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنی داستان بیان کرنا چاہتا تھا۔ حنیف نے تھوڑے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔

”منٹو صاحب! آج سے دو برس پہلے کی بات ہے جب کہ بٹوارہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میری طبیعت اداس تھی۔ معلوم نہیں کیوں۔ میرا خیال ہے کہ ہر کنوارا نوجوان اس قسم کے موسم میں ضرور اداسی محسوس کرتا ہے۔ خیر۔ میں نے ایک روز کشمیر جانے کا ارادہ کر لیا۔ مختصر سا سامان لیا اور لاریوں کے اڈے پر جا پہنچا۔ لاری جب کد پہنچی تو میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے سوچا سری نگر میں کیا دھرا ہے، بیسیوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ اگلے اسٹیشن بٹوت پر اتر جاؤں گا۔ سنا ہے بڑا صحت افزا مقام ہے۔ تپ دق کے مریض یہیں آتے ہیں اور صحت یاب ہو کر جاتے ہیں۔ چنانچہ میں بٹوت اتر گیا اور وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ ہوٹل بس ایک ہی واجبی سا تھا۔ بہر حال، ٹھیک تھا۔۔ مجھے بٹوت پسند آ گیا۔ صبح چڑھائی کی سیر کو نکل جاتا۔ واپس آ کر خالص مکھن اور ڈبل روٹی کا ناشتہ کرتا اور لیٹ کر کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو جاتا۔ دن اس صحت افزا فضا میں بڑی اچھی طرح گزر رہے تھے۔ آس پاس جتنے دکاندار تھے سب میرے دوست بن گئے تھے، خاص طور پر سردار لہنا سنگھ جو درزیوں کا کام کرتا تھا۔ میں اس کی دکان پر گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ عشق و محبت کے

افسانے سننے اور سنانے کا اسے قریب قریب خبط تھا۔ مشین چلتی رہتی تھی اور وہ یا تو کوئی داستان عشق سنتا رہتا تھا یا سناتا رہتا تھا۔ اس کو بٹوت سے متعلق ہر چیز کا علم تھا۔ کون کس سے عشق لڑا رہا ہے۔ کس کس کی آپس میں کھٹ پٹ ہوئی۔ کون کون سی لونڈیا پر پرزے نکال رہی ہے۔ ایسی تمام باتیں اس کی جیب میں ٹھنسی رہتی تھیں۔ شام کو میں اور وہ اترائی کی طرف سیر کو جاتے تھے اور بانہال کے درے تک پہنچ کر پھر آہستہ آہستہ واپس چلے آتے تھے۔ ہوٹل سے اترائی کی طرف پہلے موڑ پر سڑک کے داہنے ہاتھ مٹی کے بنے ہوئے کوارٹر سے تھے۔ میں نے ایک دن سردار سے پوچھا کہ یہ کوارٹر کیا رہائش کے لیے ہیں؟ یہ میں نے اس لیے دریافت کیا تھا کہ مجھے وہ پسند آگئے تھے۔ سردار جی نے مجھے بتایا کہ ہاں، رہائش ہی کے لیے ہیں۔ آج کل اس میں سرگودھے کے ایک ریلوے بابو ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی دھرم پتنی بیمار ہے۔ میں سمجھ گیا کہ دق ہو گی۔ خدا معلوم میں دق سے اتنا کیوں ڈرتا ہوں۔ اس دن کے بعد جب کبھی میں ادھر سے گزرا، ناک اور منہ پر رومال رکھ کے گزرا۔ میں داستان کو طویل نہیں کرنا چاہتا۔ قصہ مختصر یہ کہ ریلوے بابا جن کا نام کندن لال تھا، سے میری دوستی ہو گئی اور میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی بیمار بیوی کی کوئی پرواہ نہیں۔ وہ اس فرض کو محض ایک فرض سمجھ کر ادا کر رہا ہے۔ وہ اس کے پاس بہت کم جاتا تھا اور دوسرے کوارٹر میں رہتا تھا جس میں وہ دن میں تین مرتبہ فنائل چھڑکتا تھا۔ مریضہ کی دیکھ بھال اس کی چھوٹی بہن سمتری کرتی تھی۔ دن رات یہ لڑکی جس کی عمر بمشکل چودہ برس کی ہو گی اپنی بہن کی خدمت میں مصروف رہتی تھی۔ میں نے سمتری کو پہلی مرتبہ مگونالے پر دیکھا۔ میلے کپڑوں کا بڑا انبار پاس رکھے وہ نالے کے پانی سے غالباً شلوار دھو رہی تھی کہ میں پاس سے گزرا۔ آہٹ سن کر وہ چونکی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ میں نے اس کا جواب دیا اور اس سے پوچھا۔ تم مجھے جانتی ہو؟ سمتری نے باریک آواز میں کہا۔ جی ہاں۔ آپ بابو جی کے دوست ہیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ مظلومیت جو سکڑ کر سمتری کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس سے باتیں کروں اور کچھ کپڑے دھو ڈالوں تاکہ اس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔ مگر پہلی ملاقات میں ایسی بے تکلفی نامناسب تھی۔ دوسری ملاقات بھی اسی نالے پر ہوئی۔ وہ کپڑوں پر صابن لگا رہی تھی تو میں نے اس کو نمستے کی اور چھوٹی چھوٹی بٹیوں کے بستر پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ کسی قدر گھبرائی لیکن جب باتیں شروع ہوئیں تو اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور اتنی بے تکلف ہو گئی کہ اس نے مجھے اپنے گھر کے تمام معاملات سنانے شروع کر دیے۔ بابو جی یعنی کندن لال سے اس کی بڑی بہن کی شادی ہوئے پانچ برس ہو چلے تھے۔ پہلے برس میں بابو جی کا سلوک اپنی بیوی سے ٹھیک رہا، لیکن جب رشوت کے الزام میں وہ نوکری سے معطل ہوا تو اس نے اپنی بیوی کا زیور بیچنا چاہا۔ زیور بیچ کر وہ جوا کھیلنا چاہتا تھا کہ دگنے روپے ہو جائیں گے۔ بیوی نہ مانی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس نے اس کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ سارا دن ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند رکھتا اور کھانے کو کچھ نہ دیتا۔ اس نے مہینوں ایسا کیا۔ آخر ایک دن عاجز آکر اس کی بیوی نے اپنے زیور اس کے حوالے کر دیے۔ لیکن زیور لے کر وہ ایسا غائب ہوا کہ چھ مہینے تک اس کی شکل نظر نہ آئی۔ اس دوران میں سمتری کی بہن فاقہ کشی کرتی رہی۔ وہ اگر چاہتی تو اپنے میکے جاسکتی تھی۔ اس کا باپ مالدار تھا اور اس سے بہت پیار کرتا تھا، مگر اس نے مناسب نہ سمجھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کو دق ہو گئی۔ کندن لال چھ مہینے کے بعد اچانک گھر آیا تو اس کی بیوی بستر پر پڑی تھی۔ کندن لال اب نوکری پر بحال ہو چکا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ اتنی دیر کہاں رہا تو وہ گول کر گیا۔ سمتری کی بہن نے اس سے زیوروں کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس کا پتی گھر واپس آگیا تھا، وہ بہت خوش تھی کہ بھگوان نے اس کی سن لی۔ اس کی صحت کسی قدر بہتر ہو گئی، مگر یہ، ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق، والا معاملہ تھا۔ ایک مہینے کے بعد اس کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ اس اثناء میں سمتری کے ماں باپ کو پتہ چل گیا۔ وہ فوراً وہاں پہنچے اور کندن لال کو مجبور کیا کہ وہ اپنی بیوی کو فوراً کسی پہاڑ پر لے جائے۔ خرچ وغیرہ کا ذمہ انھوں نے کہا، ہمارا ہے۔ کندن لال نے کہا چلو سیر ہی سہی، سمتری کو دل بہلاوے کے لیے ساتھ لیا اور بٹوت پہنچ گیا۔ یہاں وہ اپنی بیوی کی قطعاً دیکھ بھال نہیں کرتا تھا۔ سارا دن باہر تاش کھیلتا رہتا۔ سمتری پرہیزی کھانا پکاتی تھی، اس لیے وہ صبح شام ہوٹل سے کھانا کھاتا۔ ہر مہینے سسرال لکھ دیتا کہ خرچ زیادہ ہو رہا ہے، چنانچہ وہاں سے رقم میں اضافہ کر دیا جاتا۔ میں داستان لمبی نہیں کرنا چاہتا۔ سمتری سے میری ملاقات اب ہر روز ہونے لگی۔ نالے پر وہ جگہ جہاں وہ کپڑے دھوتی تھی۔ بڑی ٹھنڈی تھی۔ نالے کا پانی بھی ٹھنڈا تھا۔ سیب کے درخت کی چھاؤں بہت پیاری تھی اور گول گول بٹیاں، جی چاہتا تھا کہ سارا دن انھیں اٹھا اٹھا کر نالے کے شفاف پانی میں پھینکتا رہوں۔ یہ تھوڑی سی بھونڈی شاعری میں نے اس لیے کی ہے کہ مجھے سمتری سے محبت ہو گئی تھی، اور مجھے یہ معلوم تھا کہ اس نے اسے قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ ایک دن جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ سیب کے درختوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور مگونالے کا پانی گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ وہ خوبصورت تھی، گو دبلی تھی مگر اس طور پر کہ غور کرنے پر آدمی اس نتیجے پر پہنچتا تھا کہ اسے دبلی ہی ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ ذرا موٹی ہوتی تو اتنی خطرناک طور پر خوبصورت نہ ہوتی۔ اس کی آنکھیں غزالی تھیں۔ جن میں قدرتی سرمہ لگا رہتا تھا۔ ٹھمکا سا قد۔ گھنے سیاہ بال جو اس کی کمر تک آتے تھے۔ چھوٹا سا کنوارا جوبن۔ منٹو صاحب! میں اس کی محبت میں سر تاپا غرق ہو گیا۔ ایک دن جب وہ اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی، میں نے وہ بات جو بڑے دنوں سے میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی، اس سے کہی کہ دیکھو سمتری! میں مسلمان ہوں، تم ہندو۔ بتاؤ انجام کیا ہو گا۔ میں کوئی اوباش نہیں کہ تمھیں خراب کر کے چلتا بنوں۔ میں تمھیں اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ سمتری نے میرے گلے میں بانہیں ڈالیں اور بڑے مضبوط لہجے میں کہا حنیف! میں مسلمان ہو جاؤں گی۔ میرے سینے کا بوجھ اتر گیا۔ طے ہوا کہ جونہی اس کی بہن اچھی ہو گی، وہ میرے ساتھ چل دے گی۔ اس کی بہن کو کہاں اچھا ہونا تھا۔ کندن لال نے مجھے بتایا کہ وہ اس کی موت کا منتظر ہے۔ یہ بات ٹھیک بھی تھی، گو اس طرح سوچنا اور اس کا علاج کرنا کچھ مناسب نہیں تھا۔ بہر حال، حقیقت سامنے تھی۔ کم بخت مرض ہی ایسا تھا کہ بچنا محال تھا۔ سمتری کی بہن کی طبیعت دن بدن گرتی گئی۔ کندن لال کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ چونکہ اب سسرال سے روپے زیادہ آنے لگے تھے اور خرچ کم ہو گیا تھا یا خود کم کر دیا گیا تھا، اس نے ڈالے بنگلے جا کر

شراب پینا شروع کر دی اور سمتری سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ منٹو صاحب! جب میں نے یہ سنا تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اتنی جرأت نہیں تھی ورنہ میں بیچ سڑک کے اس کی مرمت جوتوں سے کرتا۔ میں نے سمتری کو اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے آنسو پونچھے اور دوسری باتیں شروع کر دیں جو پیار محبت کی تھیں۔ ایک دن میں صبح سویرے نکلا۔ جب ان کوارٹروں کے پاس پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ سمتری کی بہن اللہ کو پیاری ہو چکی ہے، چنانچہ میں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر کندن لال کو آواز دی۔ میرا خیال درست تھا۔ بے چاری نے رات گیارہ بجے آخری سانس لیا تھا۔ کندن لال نے مجھ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہوں تاکہ وہ کریا کرم کے لیے بندوبست کر آئے۔ وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سمتری کا خیال آیا۔ وہ کہاں تھی۔ جس کمرے میں اس کی بہن کی لاش تھی، بالکل خاموش تھا۔ میں ساتھ والے کوارٹر کی طرف بڑھا۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ سمتری چارپائی پر گٹھڑی بنی لیٹی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ اس کا کندھا ہلا کر میں نے کہا، سمتری! سمتری۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی شلوار بڑے بڑے دھبوں سے بھری ہوئی ہے۔ میں نے پھر اس کا کندھا ہلایا مگر وہ خاموش رہی۔ میں نے بڑے پیار سے پوچھا، کیا بات ہے سمتری۔ سمتری نے رونا شروع کر دیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ کیا بتا ہے سمتری۔ سمتری سسکیوں بھری آواز میں بولی۔ جاؤ، حنیف۔ جاؤ۔ میں نے کہا، کیوں۔ افسوس ہے کہ تمہاری بہن کا انتقال ہو گیا ہے، مگر تم تو اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ وہ مر گئی ہے، پر میں اس کا غم نہیں کر سکتی۔ میں خود مر چکی ہوں۔ اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ تم کیوں مرو۔ تمہیں تو میرا جیون ساتھی بننا ہے۔ یہ سن کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جاؤ حنیف جاؤ۔ میں اب کسی کام کی نہیں رہی۔ کل رات۔ کل رات بابو جی نے میرا خاتمہ کر دیا۔ میں چیخی۔ ادھر دوسرے سے کوارٹر سے جیجی چیخی اور مر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ ہائے، کاش! میں نہ چیختی ہوتی۔ وہ مجھے کیا بچا سکتی تھی۔ جاؤ، حنیف جاؤ۔ یہ کہہ کر وہ اٹھی، دیوانہ وار میرا بازو پکڑا اور گھسیٹتی باہر لے گئی۔ پھر دوڑ کر کواٹر میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ حرامزادہ کندن لال آیا۔ اس کے ساتھ چار پانچ آدمی تھے خدا کی قسم! اکیلا ہوتا تو میں پتھر مار مار کر اسے جہنم واصل کر دیتا۔ بس یہ ہے میری کہانی۔ سمتری کی کہانی، جس کے یہ الفاظ ہر وقت میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں، جاؤ حنیف جاؤ۔ کس قدر دکھ ہے ان تین لفظوں میں۔ حنیف کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا تھا۔ تم نے سمتری کو قبول کیوں نہ کیا؟“

حنیف نے آنکھیں جھکا لیں۔ خود کو ایک موٹی گالی دے کر اس نے کہا۔

”کمزوری۔ مرد عموماً ایسے معاملوں میں بڑا کمزور ہوتا ہے۔ لعنت ہے اس پر۔“

جسم اور رُوح

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوجسم اور رُوح

مجیب نے اچانک مجھ سے سوال کیا:

”کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟“

گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ دنیا میں ایسے کئی اشخاص موجود ہیں جو ایک منٹ کے اندر اندر لاکھوں اور کروڑوں کو ضرب دے سکتے ہیں، ان کی تقسیم کر سکتے ہیں۔ آنے پائی کا حساب چشم زدن میں آپ کو بتا سکتے ہیں۔ اس گفتگو کے دوران میں مغنی یہ کہہ رہا تھا:

”انگلستان میں ایک آدمی ہے جو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد فوراً بتا دیتا ہے کہ اس قطعہ زمین کا طول و عرض کیا ہے۔ رقبہ کتنا ہے۔ اس نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ وہ اپنی اس خداداد صلاحیت سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ جب بھی کہیں باہر‘ کھلے کھیتوں میں نکلتا ہے تو ان کی ہریالی اور ان کا حسن اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ اس قطعہ زمین کی پیمائش اپنی آنکھوں کے ذریعے شروع کر دیتا ہے۔ ایک منٹ کے اندر وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا کتنا رقبہ رکھتا ہے‘ اس کی لمبائی کتنی ہے چوڑائی کتنی ہے‘ پھر اسے مجبوراً اپنے اندازے کا امتحان لینا پڑتا ہے۔ فیتر سٹیپ کے ذریعے سے اس خطہء زمین کو ماپتا اور وہ اس کے اندازے کے عین مطابق نکلتا۔ اگر اس کا اندازہ غلط ہوتا تو اسے بہت تسکین ہوتی۔ بعض اوقات فاتح اپنی شکست سے بھی ایسی لذت محسوس کرتا ہے جو اسے فتح سے نہیں ملتی۔ اصل میں شکست دوسری شاندار فتح کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں نے مغنی سے کہا:

”تم درست کہتے ہو۔ دنیا میں ہر قسم کے عجائبات موجود ہیں۔“

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مجیب نے جو اس گفتگو کے دوران کافی پی رہا تھا، اچانک مجھ سے سوال کیا:

”کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟“

میں سوچنے لگا کہ مجیب کس آدمی کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے، حامد۔ نہیں، وہ آدمی نہیں میرا دوست ہے۔ عباس، اس کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔ شبیر، اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ آخر یہ کس آدمی کا حوالہ دیا گیا تھا۔ میں نے مجیب سے کہا:

”تم کس آدمی کا حوالہ دے رہے ہو؟“

مجیب مسکرایا:

”تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے۔“

”بھئی، میرا حافظہ تو بچپن سے ہی کمزور رہا ہے۔ تم پہیلیوں میں باتیں نہ کرو۔ بتاؤ وہ کون آدمی ہے جس سے تم میرا تعارف کرانا چاہتے ہو۔“

مجیب کی مسکراہٹ میں اب ایک طرح کا اسرار تھا۔

”بوجھ لو“!

”میں کیا بوجھوں گا جبکہ وہ آدمی تمہارے پیٹ میں ہے۔“

عارف، اصغر اور مسعود بے اختیار ہنس پڑے۔ عارف نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

”وہ آدمی اگر مجیب کے پیٹ میں ہے تو آپ کو اس کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

میں نے مجیب کی طرف ایک نظر دیکھا اور عارف سے مخاطب ہوا: میں اپنی ساری عمر اس مہدی کی ولادت کا انتظار نہیں کر سکتا ہوں۔“

مسعود نے اپنے سگریٹ کو ایش ٹرے کے قبرستان میں دفن کرتے ہوئے کہا:

”دیکھیے صاحبان! ہمیں اپنے دوست مسٹر مجیب کی بات کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے“

یہ کہہ کر وہ مجیب سے مخاطب ہوا

”مجیب صاحب فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے۔ ہم سب بڑے غور سے سنیں گے۔“

مجیب تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اپنا بُجھا ہوا چرٹ سُلگا کر بولا:

”معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے اس آدمی کے متعلق آپ سے پوچھا جسے آپ جانتے نہیں۔“

میں نے کہا:

”مجیب تم کیسی باتیں کرتے ہو، بہر حال، تم اس آدمی کو جانتے ہو۔“

مجیب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا!

”بہت اچھی طرح۔ جب ہم دونوں برما میں تھے تو دن رات اکٹھے رہتے تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھا۔“

مسعود نے پوچھا!

”کس لحاظ سے؟“

مجیب نے جواب دیا:

”ہر لحاظ سے۔ اس جیسا آدمی آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔“

میں نے کہا:

”بھئی مجیب اب بتا بھی دو وہ کون حضرت تھے۔“

”بس حضرت ہی تھے۔“

عارف مسکرایا: چلو، قصہ ختم ہوا۔ وہ حضرت تھے، اور بس۔“

مسعود یہ جاننے کیلیے بیتاب تھا کہ وہ حضرت کون تھا۔

”بھئی مجیب، تمہاری ہر بات نرالی ہوتی ہے۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ وہ کون آدمی تھا جس کا ذکر تم نے اچانک چھیڑ دیا“!

مجیب طبعاً خاموشی پسند تھا۔ اس کے دوست احباب ہمیشہ اس کی طبیعت سے نالاں رہتے۔ لیکن اس کی باتیں جچی تلی ہوتی تھیں۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا:

”معذرت خواہ ہوں کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کو اس مخمصے میں گرفتار کر دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب یہ گفتگو شروع ہوئی تو میں کھو گیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔“

میں نے پوچھا:

”وہ ایسا زمانہ کونسا تھا؟“

مجیب نے ایک لمبی کہانی بیان کرنا شروع کر دی:

”اگر آپ سمجھتے ہوں کہ اس زمانے سے میری زندگی کے کسی رومان کا تعلق ہے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کم فہم ہیں۔“

میں نے مجیب سے کہا:

”ہم تو آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کم فہم ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن وہ آدمی۔“

مجیب مسکرایا:

”وہ آدمی آدمی تھا۔ لیکن اس میں خدا نے بہت سی قوتیں بخشی تھیں۔“

مسعود نے پوچھا:

”مثال کے طور پر۔“

”مثال کے طور پر یہ کہ وہ ایک نظر دیکھنے کے بعد بتا سکتا تھا کہ آپ نے کس رنگ کا سوٹ پہنا تھا‘ ٹائی کیسی تھی۔ آپ کی ناک ٹیڑھی تھی یا سیدھی۔ آپ کے کس گال پر کہاں اور کس جگہ تل تھا۔ آپ کے ناخن کیسے ہیں۔ آپ کی داہنی آنکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے۔ آپ کی بھنویں منڈی ہوئی ہیں۔ موزے فلاں ساخت کے پہنے ہوئے تھے‘ قمیص پوپلین کی تھی مگر گھر میں دُھلی ہوئی۔“

یہ سن کر میں نے واقعتاً محسوس کیا کہ جس شخص کا ذکر مجیب کر رہا ہے عجیب و غریب ہستی کا مالک ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا:

”بڑا معرکہ خیز آدمی تھا۔“

”جی ہاں‘ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اس کو اس بات کا زعم تھا کہ اگر وہ کوئی منظر کوئی مرد‘ کوئی عورت صرف ایک نظر دیکھ لے تو اسے من و عن اپنے الفاظ میں بیان کر سکتا ہے جو کبھی غلط نہیں ہوں گے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اندازہ ہمیشہ درست ثابت ہوتا تھا۔“

میں نے پوچھا کیا یہ واقعی درست تھا۔

”سو فیصد۔“

ایک مرتبہ میں نے اس سے بازار میں پوچھا یہ لڑکی جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے گزری ہے‘ کیا تم اس کے متعلق بھی تفصیلات بیان کر سکتے ہو؟“

میں اس لڑکی سے ایک گھنٹہ پہلے مل چکا تھا۔ وہ ہمارے ہمسائے مسٹر لوجوائے کی بیٹی تھی۔ اور میری بیوی سے سلائی کے مستعار لینے آئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اس لیے بغرض امتحان میں نے مجیب سے یہ سوال کیا تھا۔ مجیب مسکرایا:۔

”تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔“

”نہیں۔ نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں۔ میں۔“

”نہیں تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔ خیر‘ سنو! وہ لڑکی جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے گزری ہے اور جسے میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا، مگر لباس کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے اس لیے کہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں سلامت ہوں اور ہوش و حواس درست ہوں کہہ سکتا ہے کہ وہ کس قسم کا تھا۔ ویسے ایک چیز جو مجھے اس میں خاص طور پر دکھائی دی‘ وہ اس کے داہنے ہاتھ کی چھنگلیا تھی۔ اس میں کسی قدر خم ہے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن مضروب تھا۔ اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرائش کے فن سے محض کوری ہے۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے ایک معمولی سی نظر میں یہ سب چیزیں کیسے بھانپ لیں۔ میں ابھی اس حیرت میں غرق تھا کہ مجیب نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

”اس میں جو خاص چیز مجھے نظر آئی وہ اس کے داہنے گال کا داغ تھا۔ غالباً کسی پھوڑے کا ہے۔“

مجیب کا کہنا درست تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ سب باتیں جو تم اتنے وثوق سے کہتے ہو‘ تمہیں کیونکر معلوم ہو جاتی ہیں؟“

مجیب مسکرایا:

”میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں ہر آدمی کو صاحبِ نظر ہونا چاہیے۔ صاحبِ نظر سے میری مراد ہر اس شخص سے ہے جو ایک ہی نظر میں دوسرے آدمی کے تمام خدوخال دیکھ لے۔“

میں نے اس سے پوچھا:

”خدوخال دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟“

”بہت کچھ ہوتا ہے۔ خدوخال ہی تو انسان کا صحیح کردار بیان کرتے ہیں“

”کرتے ہوں گے۔ میں تمہارے اس نظریے سے متفق نہیں ہوں۔“

”نہ ہو۔ مگر میرا نظریہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔“

”رہے۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بہرحال، میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان غلطی کا پُتلا ہے۔ ہو سکتا ہے تم غلطی پر ہو۔“

”یار، غلطیاں درستیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں“

”یہ تمہارا عجیب فلسفہ ہے۔“

”فلسفہ گائے کا گوبر ہے۔“

”اور گوبر؟“

مجیب مسکرایا:

”وہ۔ وہ۔ اُپلا کہہ لیجیے، جو ایندھن کے کام آتا ہے۔“

ہمیں معلوم ہوا کہ مجیب ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے پہلی ہی نگاہ میں اس نے اس کے جسم کے ہر خدوخال کا صحیح جائزہ لے لیا تھا۔ وہ لڑکی بہت متاثر ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی موجود ہیں جو صرف ایک نظر میں سب چیزیں دیکھ جاتے ہیں تو وہ مجیب سے شادی کرنے کیلیے رضامند ہو گئی۔ ان کی شادی ہو گئی۔ دلہن نے کیسے کپڑے پہنے تھے، اس کی دائیں کلائی میں کس ڈیزائن کی دست پچھی تھی۔ اس میں کتنے نگینے تھے۔ یہ سب تفصیلات اس نے ہمیں بتائیں۔ ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں میں طلاق ہو گئی۔

جنٹلمینوں کا بُرش

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوجنٹلمینوں کا بُرش

یہ غالباً آج سے بیس برس پیچھے کی بات ہے۔ میری عمر یہی کوئی بائیس برس کے قریب ہو گی، یا شاید اس سے دو برس کم۔ کیونکہ تاریخوں اور سنوں کے معاملے میں میرا حافظہ بالکل صفر ہے۔ میری دوستی کا حلقہ ان نوجوان پر مشتمل تھا جو عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔ حفیظ پینٹر کی دُکان میں جو بجلی والے چوک سے بائیں ہاتھ ہال بازار کے پاس ہی واقع تھی، ہم سب بیٹھتے اور گھنٹوں گپ بازی ہوتی رہتی۔ میں پڑھائی وڑھائی قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اسی طرح مبارک اپنی ملازمت پر لات مار کر امرتسر واپس چلا آیا تھا۔ وہ کسی ریاست میں ملازم تھا۔ حفیظ پینٹر کی اپنے باپ سے چخ ہو گئی تھی، اس لیے اس نے علیحدہ ایک بڑی دُکان لے لی جس میں کچھ عرصہ پہلے ایک کمیونسٹ سکھ کی دکان تھی، جو گراموفون ڈیلر تھا۔ خیر دین کی مسجد سے ملحقہ دکان ہال بازار میں تھی مگر اچھے موقع پر تھی۔ یعنی عین ہال بازار کے وسط میں اور مسجد کے زیر سایہ خرابات مروجہ اصولوں کے ماتحت ہونی ہی چاہیے۔ اس لیے وہ اسے بہت پسند آ گئی تھی۔ ادھر اذان ہوتی تو ادھر ریکارڈ بجتے۔ لیکن کوئی دنگا فساد اس بات پر وہاں کبھی نہ ہوا۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سینکڑوں خون ہوتے رہتے۔ امرو پرستی غنڈوں، رنڈی بازی پر، گنڈوں کی دو مخالف پارٹیوں پر، ایسے مسلم مسلم اور مسلم ہندو فساد عام تھے۔ جو ایک دو دن اپنی دھاک بٹھا کر جھاگ کے مانند غائب ہو جاتے۔ گرمی کی پہلی پیلی بھڑوں کے مانند جو اپنے اردگرد جالا تن لیتی ہیں اور بظاہر بالکل مردہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن معلوم نہیں پھر موافق موسم آنے پر زندہ ہو جاتی ہیں، اور بے قصور آدمیوں کو کاٹنے کے شغل میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ امرتسر ایک عجیب و غریب شہر ہے۔ یہاں ہر ایک قسم کی شے اس زمانے میں پائی جاتی تھی۔ بھنگوں کی لڑائی سے لے کر گورنمنٹ سے پنجہ کشی کرنے تک۔ لوگ بھی بھانت بھانت کے تھے۔ لالے جو اپنی بزازی کی دکانوں پر پادتے رہتے اور کچھ ایسے من چلے بھی تھے جو چھوٹے چھوٹے پٹاخے بنا کر چلاتے تھے کہ لوگوں کے دل ایک لحظے کے لیے دہل جاتے۔ دہشت پسند بھی تھے اور امن پسند بھی۔ نمازی اور پرہیزگار بھی تھے اور اول درجے کے اوباش اور گناہ گار بھی۔ مسجدیں تھیں اور مندر بھی۔ ان میں گناہ کے کام بھی ہوتے تھے اور ثواب کے بھی۔ غرضیکہ انسانی زندگی کے یہ سب دھارے ساتھ ساتھ متواتر بہا کرتے تھے۔ کئی سیاسی تحریکیں ہوئیں۔ کئی غنڈوں کا آپس میں کشت و خون ہوا۔ مسلمانوں اور

قادیانیوں میں کئی مباہلے ہوئے، جن میں بڑے جغادری علمائے کرام نے حصہ لیا۔ قحط پڑے، وبائیں آئیں۔ جلیاں والا کا تاریخی حادثہ ہوا، ہزاروں انسان، جن میں مسلمان، سکھ، ہندو سب شامل تھے، موت کے گھاٹ اتارے گئے، لیکن امر تسر جوں کا توں رہا۔ حفیظ پینٹر کی دکان پر یوں تو دنیا بھر کے سیاسی، مجلسی اور معاشی مسائل پر تبادلہ خیالات اور بحث ہوتی رہتی، مگر بڑے خام انداز میں۔ اصل میں وہ سب کے سب آرٹسٹ تھے۔ گو نیم رس۔ ان کو دراصل موسیقی سے شغف تھا۔ کوئی طبلے کی جوڑی اٹھالیتا، کوئی ستار، کوئی سارنگی اور کوئی تانبورہ ہاتھ میں لے کر میاں کی ٹوڈی، مالکونس یا بھاگیری کا الاپ شروع کر دیتا۔ یہاں بھانگ بھی گھوٹی جاتی، چرس بھرے سگریٹ بھی پِیے جاتے، شراب کے دور اکثر چلتے۔ اس لیے کہ دن اتنا بڑا بے باک نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ روپے میں ایک پوری بوتل بڑھیا سے بڑھیا اسکاچ وسکی کی آجاتی تھی۔ حفیظ شام کو اپنی دکان کے بھاری بھر کم کواڑ بند کر دیتا اور ہم چٹائیوں پر بیٹھ کر اس مشروب سے آہستہ آہستہ لطف اندوز ہوتے۔ پھر آدھی رات کو جب آس پاس کی ساری دکانیں بند ہوتیں، ہم موسیقی کا دور شروع کر دیتے۔ یہاں قریب قریب سب گوّیے، بڑے اور چھوٹے فن کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس لیے کہ زندہ دل نوجوانوں کی محفل تھی۔ پھکڑ بازی بھی ہوتی تو کوئی برا نہ مانتا تھا۔ ایک دن میں صبح دس بجے کے قریب حفیظ پینٹر کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس لیے کہ مجھے ذرا آگے چل کر ایک کیمسٹ کی دکان سے اپنے کان کے لیے دوا لینی تھی کہ حفیظ نے برش کان میں اڑس کر مجھے باآواز بلند پکارا اور اسی کان میں اڑے ہوئے برش کو نکال کر اس سے مجھے اشارہ کیا، جس کا یہ مطلب تھا کہ میں اس کی بات سنتا جاؤں۔ میں اس کی دکان کے تھڑے کے پاس کھڑا ہو گیا، اور اس سے پوچھا

”کیا بات ہے حفیظ صاحب؟“

حفیظ نے برش پھر کان میں اڑس لیا اور جواب دیا

”بات یہ ہے میری جان کہ آج توکل کا گانا ہو گا۔ اس کے ساتھ مچھر خان اور بسے خان بھی ہوں گے۔ وہ معاملہ بھی ہو گا۔ چھ بجے سے پہلے پہلے ہی آجانا۔ میں نے تمام دوستوں کو اطلاع دے دی ہے۔ توکل کو میں نے سنا تو نہیں لیکن نئے خیال کے لوگ اسے بہت پسند کر رہے ہیں۔ نوجوان ہے۔ کہتے ہیں کہ خاں صاحب عاشق کے مانند بے ڈار گاتا ہے اور حق ادا کرتا ہے۔“

میں بہت خوش ہوا

”آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ مگر یہ مچھر خان کیا بلا ہے۔ کیا تم اسے کسی مچھر دانی کے اندر بٹھاؤ گے؟“

حفیظ پینٹر کھکھلا کر ہنسا

”ارے نہیں یار، اس کی عادت ہے کہ جب کوئی تان لیتا ہے اور واپس سم پر آتا ہے اور بڑے زور سے اپنی رانوں پر دوہتڑ مارتا ہے۔ اس لیے اس کا نام مچھر خان پڑ گیا ہے۔ جیسے وہ گا نہیں رہا، بلکہ اپنے بدن پر کاٹنے والے مچھر مار رہا ہے۔“

میں نے اس سے کہا

”چلو، اس کا تماشا بھی دیکھ لیں گے۔ پر اگر اس نے آج رات کوئی مچھر نہ مارا تو یہ طے ہے کہ تمہارے آرٹ اسٹوڈیو سے وہ زندہ باہر نہیں نکلے گا۔“

حفیظ کھکھلا کر ہنسا، کان میں سے اُڑسا ہوا برش نکالا اور سائن بورڈ پینٹ کرنے لگا

”جاؤ یار جاؤ۔ میرا وقت ہرج کر رہے ہو۔ مجھے یہ کام وقت پر مکمل کرنا ہے۔“

میں وہاں سے چلا گیا۔ کیمسٹ کی دکان سے دوائی لی۔ باہر نکلا تو شیخ صاحب جو وہاں کے بہت بڑے رئیس تھے، ان سے دو آدمی دکان کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے شیخ صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے جیسا کہ ان کی عادت تھی، چھڑی بجلی کے کھمبے کے ساتھ ماری۔ جب آواز پیدا ہوئی تو ان کا اطمینان ہو گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”کہو بھئی سعادت کیا حال ہے۔“

میں نے عرض کی

”جناب کی دُعا سے سب ٹھیک ہے۔“

جن دو آدمیوں سے شیخ صاحب باتیں کر رہے تھے، وہ سیاہ فام تھے، لیکن اچکن کا رنگ ان کے رنگ سے کہیں زیادہ کالا۔ دبلا پتلا، لیکن چہرے کے نقش تیکھے۔ شیخ صاحب چلنے لگے تو اس آبنوسی گوشت پوست کے ٹکڑے نے تیزی سے بڑھ کر شیخ صاحب کے کوٹ کی پیٹھ جھاڑنی شروع کی، بڑی نفاست سے، شیخ صاحب نے گرما کر اس سے پوچھا

”کیا بات تھی؟“

اس آبنوسی آدمی نے بڑی پتلی آواز میں جواب دیا

”چند بال تھے اور تھوڑی سی گرد۔“

شیخ صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا

”اچھا تم کل صبح گھر پہ آنا“

اور وہ پھر بجلی کے کھمبے کو اپنی چھڑی سے بجاتے ہوئے غالباً کمپنی باغ کی طرف نکل گئے۔ ایک دن میں نے پھر اسے دیکھا۔ اپنے کٹڑے کے بازار میں وہ دولالوں کی مصاحبی میں مصروف تھا۔ اس نے صاف ستھرے کوٹوں پر سے کئی مرتبہ غیر مرئی چیزیں جدا کیں۔ اس دن بھی وہ اپنی کالی اچکن پہنے تھا۔ حالانکہ کالے کپڑے پر گرد و غبار فوراً نمایاں ہوتا ہے، مگر میں نے غور سے دیکھا، کہ اس پر ایسی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ جنٹل مینوں کے برش کے علاوہ اپنا برش خود بھی تھا۔ مجھے راستے میں ایک دوست مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا

”یہ آبنوسی آدمی کون ہے؟“

اس نے حیرت سے پوچھا

”کون سا آبنوسی آدمی۔ بن مانس سنے تھے، مگر آبنوسی کہاں سے تم نے گھڑ لیا۔“

میں نے اس سے ذرا تیز لہجے میں کہا

”ارے یہ آدمی جو ہمارے آگے آگے جا رہا ہے۔ چغد ہو پرلے درجے کے۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آبنوس ایک لکڑی ہوتی ہے۔“

”تو کیا یہ لکڑی ہے جو چل پھر رہی ہے؟“

”ابے نہیں۔ آبنوس کا رنگ کالا ہوتا ہے، چونکہ اس نے کالی اچکن پہنی ہے اور رنگ بھی اس کا خدا کے فضل و کرم سے خاصا کالا ہے، تو میں نے اسے آبنوسی کہہ دیا۔“

میرا دوست ہنسا

”ارے، تم اسے نہیں جانتے، اس کا نام جنٹل مینوں کا برش ہے۔“

”اتنا تو میں جانتا ہوں۔“

”تو اس سے زیادہ تم اور کیا جاننا چاہتے ہو؟“

میں نے چڑ کر کہا

”یہی کہ اس کا محل وقوع کیا ہے۔ اس کا پیشہ کیا ہے؟“

میرا دوست مسکرایا

”یہ ذات کا رُبابی ہے، جو دربار صاحب میں چوکی کرتے ہیں۔ مگر یہ وہاں نہیں جاتا۔“

”کیوں؟“

”بس اس کو امیروں کی صحبت حاصل ہے۔ ان ہی میں اٹھتا بیٹھتا ہے، اور ان کے کوٹوں پر برش کرتا رہتا ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا

”کھاتا پیتا کہاں سے ہے؟“

جواب ملا

”جن کی مصاحب داری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ گاتا بہت اچھا ہے۔“

میں نے پوچھا

”تم نے کبھی سنا ہے اس کو؟“

”نہیں، البتہ تعریف بہت سنی ہے۔“

ہم باتوں میں مشغول پیچھے رہ گئے اور وہ جنٹل مینوں کا آبنوسی برش ان دولالوں کے کوٹ جھاڑتا بہت دور نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا دوست بھی مجھ سے جدا ہو گیا۔ اس کو کوئی ضروری کام تھا ورنہ میں اس شخص کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرتا۔ اتفاق سے مجھے اپنے بہنوئی (جو امرتسر کے آنریری مجسٹریٹ تھے اور خدا معلوم کیا کیا تھے) کے ساتھ ایک تقریب پر جانا پڑا۔ اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ تقریب تھی جو نئے ڈپٹی کمشنر کے تقرر کے سلسلے میں تھی۔ وہ شخص وہی کالی اچکن پہنے معزز اور رئیس لوگوں کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ اس نے بلا مبالغہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر چن چن کر کئی رؤسا کے کوٹ صاف کیے۔ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے۔ کسی کے کالر پر سے اس نے بال اٹھائے، کس کے کوٹ کی پیٹھ پر سے۔ بعضوں کے کوٹوں کو، جب اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ گرد اپنے رومال سے جھاڑ دی اور ہر ایک سے شکریہ وصول کیا۔ بڑی جرأت سے کام لے کر وہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس بھی جا

پہنچا، اور اس کی پتلون صاف کر دی۔ وہ انگریز تھا۔ اس نے جنٹل مینوں کے برش کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ایک رات جب کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی اور حفیظ پینٹر کی دکان میں ہم معشوق علی فوٹو گرافر سے اس کا گانا سن کر محظوظ ہو رہے تھے، اور ساتھ ساتھ وسکی بھی پی رہے تھے، کہ اچانک دکان کا پھاٹک نما دروازہ کھلا اور جنٹل مینوں کا برش نمودار ہوا۔ اس نے ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا

”میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ گانے کی آواز سنائی دی۔ ماشاء اللہ بڑی سریلی تھی۔ ہے تو یہ تہذیب کے خلاف کہ میں بن بُلائے چلا آیا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا تھوڑی دیر کے لیے آپ کی محفل میں شریک ہو سکتا ہوں۔“

حفیظ پینٹر اور معشوق علی فوٹو گرافر بیک وقت بولے

”ہاں، ہاں تشریف رکھیے۔“

مبارک نے کہا،

”سر آنکھوں پر۔ یہاں میرے پاس بیٹھیے۔ آپ تو خود بڑے معرکے کے گانے والے ہیں۔ کچھ نوش فرمائیے گا۔“

مبارک کی مراد وسکی سے تھی، مگر جنٹل مینوں کے بُرس نے بڑی شائستگی سے کہا

”جی نہیں۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔“

سب کے اصرار پر اس نے گانا شروع کیا۔ میاں کی ٹوڈی تھی جو اس نے ایسی خوش الحانی سے گائی کہ مزے آ گئے۔ اس کے بعد اس نے اجازت چاہی۔ سب نشے میں چور تھے، اس لیے ان کو یہ خبر نہیں تھی کہ باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔ لیکن جب جنٹل مینوں کے برش نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا

”حضور، باہر بہت بارش ہو رہی ہے، کیسے جائیے گا۔“

آبنوسی برش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”آپ فکر نہ کریں، ابھی لالہ جگت نارائن کمبل والے کی گاڑی مجھے لینے کے لیے آ جائے گی۔ آپ اپنا شغل جاری رکھیے۔ شکریہ“!

یہ کہہ کر اس نے دکان کا پھاٹک نما دروازہ بند کر دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد بارش تھمی تو محفل برخاست کر دی گئی۔ باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ کوئی آدمی بدرو میں اوندھے گرا پڑا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو چلایا

”ارے یہ تو وہی جنٹل مینوں کا برش ہے۔“

حفیظ نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا

”جنٹل مینوں کی ایسی تیسی۔ چلو اپنے اپنے گھر۔“

سب نے اس فیصلے پر صاد کیا۔ جب وہ چلے گئے تو تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص جو بے داغ کالی اچکن پہنتا تھا اور رؤسا کے کوٹ صاف کیا کرتا ہے، ہوش میں آیا۔ اس کی اچکن کیچڑ سے اٹی ہوئی تھی، مگر اسے صاف کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

جُھمکے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوجُھمکے

سُنار کی اُنگلیاں جھمکوں کو برش سے پالش کر رہی ہیں جھمکے چمکنے لگتے ہیں سنار کے پاس ہی ایک آدمی بیٹھا ہے جھمکوں کی چمک دیکھ کر اس کی آنکھیں تمتما اُٹھتی ہیں بڑی بے تابی سے وہ اپنے ہاتھ ان جھمکوں کی طرف بڑھاتا ہے اور سُنار کہتا ہے

”بس اب رہنے دو مجھے“

سُنار اپنے گاہک کو اپنی ٹُوٹی ہوئی عینک میں سے دیکھتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے

”چھ مہینے سے الماری میں بنے پڑے تھے آج آئے ہو تو کہتے ہو کہ ہاتھوں پر سرسوں جما دُوں“

گاہک جس کا نام چرنجی ہے کچھ شرمندہ ہو کر کہتا ہے

”کیا بتاؤں لالہ کروڑی مل۔ اتنی رقم جمع ہونے میں آتی ہی نہیں تھی تم سے الگ شرمندہ جورو سے الگ شرمندہ عجب آفت میں جان پھنسی ہوئی تھی۔ جانے اس سونے میں کیا کشش ہے کہ عورتیں اس پر جان دیتی ہیں۔ سُنار پالش کرنے کے بعد جھمکے بڑی صفائی سے کاغذ میں لپیٹتا ہے اور چرنجی کے ہاتھوں میں رکھ دیتا ہے۔ چرنجی کاغذ کھول کر جھمکے نکالتا ہے جب وہ جھُمر جھمر کرتے ہیں تو وہ مسکراتا ہے۔ بھئی کیا کاریگری کی ہے لالہ کروڑی مل۔ دیکھے گی تو پھڑک اُٹھے گی۔ یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالتا ہے اور سُنار سے یہ کہہ کر

”کھرے کر لو بھائی“

دکان سے باہر نکلتا ہے۔۔ دکان کے باہر ایک تانگہ کھڑا ہے گھوڑا ہنہناتا ہے تو چرنجی اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتا ہے“

تمھیں بھی دو جھمکے بنوا دُوں گا میری جان فکر مت کرو“

یہ کہہ کر وہ خوش خوش گھوڑے کی باگیں تھامتا ہے

”چل میری جان ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے“

چرنجی خوش خوش اپنے طویلے پہنچتا ہے دھیمے دھیمے سروں میں کوئی گیت گنگناتا اور یُوں اپنی خوشی کا اظہار کرتا وہ گھوڑے کو تھپکی دیتا اور کہتا ہے:

”ابھی چھٹی نہیں ملے گی میری جان تیری مالکن یہ جھُمکے پہن کر کیا باغ کی سیر کو نہیں جائے گی۔“

چرنجی جلدی جلدی گھر کا زینہ طے کرتا ہے اور زور سے آواز دیتا ہے۔ مُنی مُنی ایک چھوٹی سی لڑکی بھاگتی ہوئی اندر سے نکلتی ہے اور چرنجی کے ساتھ لپٹ جاتی ہے چرنجی جھمکے نکال کر اس کی کان کی لوؤں کے ساتھ لگاتا ہے اور کہتا ہے“

ماں کہاں ہے تیری۔ جواب کا انتظار کیے بغیر وہ گھر کے سارے کمروں میں ہاتھ میں جھمکے لیے پھرتا ہے مُنی کی ماں۔ مُنی کی ماں کہتا۔ لڑکی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔

”مُنی ماں کہاں ہے تیری۔ لڑکی جواب دیتی ہے۔ وہاں گئی ہے: لڑکی کا اشارہ سامنے بلڈنگ کی طرف تھا۔ چرنجی اُدھر دیکھتا ہے کھڑکی کے شیشوں میں سے ایک مرد اور ایک عورت کا سایہ نظر آتا ہے مرد عورت کے کانوں میں بُندے پہنا رہا ہے لمبے لمبے بُندے یہ منظر دیکھ کر چرنجی کے منہ سے دبی ہوئی چیخ سی نکلتی ہے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی ننھی بچی کو اُٹھا کر سینے کے ساتھ بھینچ لیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے جیسے وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بچی اس خوفناک سائے کو دیکھے سینے کے ساتھ اس طرح اپنی بچی کو بھینچے وہ آہستہ آہستہ نیچے اُترتا ہے وہ جھمکے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس کے ہاتھوں سے فرش پر گر پڑتے ہیں۔ نیچے طویلے میں آ کر وہ اپنی بچی کو جو کہ سخت پریشان ہو رہی ہے تانگے میں بٹھاتا ہے اور خود گھوڑے کی باگیں تھام کر تانگے کو باہر نکالتا ہے۔ چرنجی بالکل خاموش ہے جیسے اسے سانپ سُونگھ گیا ہے اُس کی ننھی بچی سہمے ہُوئے لہجے میں بار بار پوچھتی ہے

”ماتاجی کے جھمکے کہاں ہیں پِتاجی۔ ماتاجی کے جھمکے کہاں ہیں پتاجی۔؟ چرنجی کی بیوی اپنے گھر واپس آ گئی ہے اور ایک آئینہ سامنے رکھے اپنے جھمکوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی ہے اور گا رہی ہے۔ آئینہ دیکھتے دیکھتے وہ اپنی بچی کو آواز دیتی ہے مُنی ادھر آ تجھے ایک چیز دکھاؤں۔ کوئی جواب نہیں ملتا کہاں چلی گئی تو۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھتی ہے اور اِدھر اُدھر اُسے ڈھونڈتی ہے جب وہ نہیں ملتی تو باہر نکلتی ہے سیڑھیوں کے اختتامی سرے پر جو چبوترہ سا بنا ہے اس پر کھلے ہوئے کاغذ میں دو جھمکے دکھائی دیتے ہیں چرنجی کی بیوی ان کو اُٹھاتی ہے ایک دم اسے خوفناک حقیقت کا احساس ہوتا ہے۔ اِن جھمکوں کو مٹھی میں بھینچ کر وہ چیختی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے دیوانوں کی طرح دوڑی دوڑی اندر جاتی ہے سب کمروں میں پاگلوں کی طرح چکراتی ہے اور مُنی کو آوازیں دیتی ہے جب اس کے دماغ کا طوفان کچھ کم ہوتا ہے تو وہ وہیں بیٹھ جاتی ہے جہاں پہلے بیٹھی تھی۔ سامنے اس کے سامنے آئینہ پڑا ہے اس میں وہ غیر ارادی طور پر اپنی شکل دیکھتی ہے۔ پرنجی کی بیوی جب اپنی شکل اس زاویے میں دیکھتی ہے تو اس سے متنفر ہو کر آئینہ اُٹھاتی ہے اور زمین پر پٹک دیتی ہے آئینہ چکنا چور ہو جاتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی باہر نکلتی ہے۔۔ سامنے والی بلڈنگ کا ایک کمرہ۔ یہ کمرہ پُر تکلف طریقے سے سجا ہوا ہے ایک لڑکی اور ایک لڑکا جس کی عُمر میں تقریباً دو برس کا فرق ہے لڑکی چھ برس کی اور لڑکا آٹھ برس کا ہے دونوں اپنے باپ کے پاس بیٹھے ہیں اور اس سے کھیل رہے ہیں اتنے میں دروازے پر ہولے ہولے دستک ہوتی ہے پہلی بار جب دستک ہوتی ہے تو بچوں کا باپ نہیں سنتا۔ جب دوسری بار پھر ہوتی ہے تو وہ چونکتا ہے بچوں کی طرف دیکھتا ہے پھر ان کی آیا کی طرف اور کہتا ہے ان کو باہر لے جاؤ۔ کوئی میرا ملنے والا آیا ہے‘ جلدی جلدی بچوں کو نکال کر دروازہ بند کرتا ہے دوسرے دروازے کی طرف بڑھتا ہے جب دروازہ کھلتا ہے تو چرنجی کی بیوی اندر داخل ہوتی ہے اس کو دیکھ کر بچوں کے باپ کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے

”تم تو کہہ رہی تھیں مجھے جلدی گھر جانا ہے اب واپس کیسے آ گئیں۔ چرنجی کی بیوی کچھ جواب نہیں دیتی۔ ساکت جامد کھڑی رہتی ہے اُس کو خاموش دیکھ کر وہ پھر اُس سے پوچھتا ہے“

وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔“

چرنجی کی بیوی کچھ جواب نہیں دیتی وہ پھر اس سے سوال کرتا ہے۔ تم خاموش کیوں ہو۔ جُھمکے پسند نہیں آئے۔ چرنجی کی بیوی کے ہونٹ کھلتے ہیں۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی ہے کیوں نہیں آئے۔ بہت پسند آئے۔ کیا اور لا دو گے مجھے۔؟ بچوں کا باپ مسکراتا ہے جتنے کہو‘ بس یہی بات تھی۔

”بڑے تلخ لہجے میں چرنجی کی بیوی کہتی ہے بس یہی بات تھی لیکن مجھے صرف جھُمکے ہی نہیں چاہئیں ناک کے لیے کیل۔ ہاتھوں کے لیے کنگنیاں کڑے گلے کے لیے ہار ماتھے کے لیے جھومر پاؤں کے لیے پازیب مجھے اتنے زیور چاہئیں کہ میرا پاپ ان کے بوجھ تلے دب جائے اپنی عصمت کا زیور تو اُتار چکی ہُوں اب یہ گہنے نہ پہنوں گی تو لوگ کیا کہیں گے۔ بچوں کا باپ یہ گفتگو سن کر سخت متحیر ہوتا ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ چرنجی کی بیوی سے کہتا ہے۔ یہ تو کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ چرنجی کی بیوی جواب دیتی ہے۔ بہکی پہلے تھے اب تو ہوش کی باتیں کر رہی ہوں سنو۔ میں تمہارے پاس اس لیے آئی ہوں کہ وہ چلا گیا ہے میری بچی کو بھی ساتھ لے گیا ہے اُسے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا جس طرح میری لٹی ہوئی آبرو واپس نہیں آئے گی۔ بولو مجھے پناہ دیتے ہو۔ میں تمھیں اس پاپ کا واسطہ دے کر اِلتجا کرتی ہوں کہ جو تم نے اور میں نے مل کر لیا ہے کہ مجھے پناہ دو۔ بچوں کا باپ چرنجی کی بیوی کی سب التجائیں سنتا ہے مگر وہ کیسے اس عورت کو پناہ دے سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو جھُمکے کے بدلے بیچا۔ ایک سودا تھا جو ختم ہو گیا چرنجی کی بیوی کو یہ سُن کر بہت صدمہ ہوتا ہے ناکام اور مایوس ہو کر وہ چلی جاتی ہے۔ چرنجی اب ایک نئے گھر میں ہے رات کا وقت ہے۔ وہ اپنی بچی مُنی کو سُلانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ سوتی نہیں بار بار اپنی ماں کے بارے میں پوچھتی ہے چرنجی اس کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہے مگر بچی کی معصوم باتیں اُسے پریشان کر دیتی ہیں آخر میں گھبرا کر اُس کے منہ سے یہ نکلتا ہے

”مُنی تمہاری ماتا جی مر گئی ہیں راستہ بھول کر وہ ایسی جگہ چلی گئی ہیں جہاں سے واپس آنا بڑا مشکل ہوتا ہے دروازہ کھلتا ہے۔ چرنجی فوراً منی کا چہرہ کمبل سے ڈھانپ دیتا ہے چرنجی کی بیوی داخل ہوتی ہے چرنجی اُٹھتا ہے اور اسے باہر دھکیل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیتا ہے

”چلی جاؤ یہاں سے۔“

وہ اُس سے کہتا ہے چرنجی کی بیوی جواب دیتی ہے۔

”چلی جاتی ہوں میری بچی مجھے دیدو“

چرنجی غصے اور نفرت بھرے لہجے میں اُس سے کہتا ہے وہ عورت جو مرد کی بیوی نہیں بن سکتی اولاد کی ماں کیسے ہو سکتی ہے اپنے پاپ بھرے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہو کیا تمھیں منی کی ماں کہلانے کا حق حاصل ہے کیا اس دن کے بعد جب تم نے یہ جھمکے لے کر ایک غیر مرد تو ہاتھ لگانے دیا تم اپنی اولاد کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر سکتی ہو کیا تمہاری ممتا اُس دن جل کر راکھ نہیں ہو گئی تھی جب تمہارے قدم ڈگمگائے تھے اپنی بچی لینے آئی ہو وہ جھمکے پہن کر جنہوں نے تمہاری زندگی کے سب سے قیمتی زیور کو اُتار کر گندی موری میں پھینک دیا ہے۔ میں یہ پوچھتا ہوں جب یہ جھمکے ہلتے ہیں تو تمہارے کانوں میں یہ آواز نہیں آتی کہ نہ تم ماں رہی ہو نہ بیوی۔ جاؤ تمہاری مانگ سیندور سے اور تمہاری گود اولاد سے ہمیشہ خالی رہے گی۔ جن قدموں سے آئی ہو انہی قدموں سے واپس چلی جاؤ۔ چرنجی اپنی بیوی کی التجاؤں کو ٹھکرا دیتا ہے تو وہ چلی جاتی ہے افسردہ اور خاموش۔۔ تانگے کا پہیہ گھوم رہا ہے یہ بتانے کے لیے کہ وقت گزر رہا ہے اور کئی سال بیت رہے ہیں تانگے کا پہیہ مڑتا ہے اور بڑے دروازے میں داخل ہوتا ہے یہ دروازہ گورنمنٹ کالج کا ہے جس میں کئی لڑکے اور لڑکیاں گزر رہی ہیں تانگہ کالج کے کمپاؤنڈ میں ٹھہرتا ہے چرنجی اب کافی بڈھا ہو چکا ہے۔ تقریباً آدھے بال سفید ہیں۔ اس کی ننھی بچی اب جوان ہے تانگے کی پچھلی نشست پر سے جب اُٹھتی ہے تو چرنجی اس کو بہت نصیحتیں کرتا ہے۔ بڑے صاحب کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کہنا جو سوال پوچھیں ان کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ وغیرہ وغیرہ لڑکی اپنے باپ کی ان باتوں سے پریشان ہو جاتی ہے اور اچھا اچھا کہتی وہاں سے چلتی ہے لیکن فوراً ہی چرنجی اس کو روکتا ہے اور جیب سے برفی نکال کر اس کو دیتا ہے اور کہتا ہے۔ پہلا دن ہے منہ میٹھا کر لو زبردستی وہ اپنی لڑکی کے ہاتھ میں برفی رکھ دیتا ہے۔ ۔ سامنے کالج کے برآمدے میں دو تین لڑکے کھڑے ہیں جو آنے جانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو گھور رہے ہیں جب کرشنا کماری (چرنجی کی بیٹی) برآمدے کی طرف آتی ہے تو ایک لڑکا جس کا نام جگدیش ہے اپنے ساتھی کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھونکا دیتا ہے اور کہتا ہے۔

”لو بھئی ایک فرسٹ کلاس چیز آئی ہے۔ طبیعت صاف ہو جائے گی تمہاری۔ یہ کہہ کر جب وہ کرشنا کماری کی طرف اشارہ کرتا ہے تو اُس کے دوست سب اُدھر متوجہ ہوتے ہیں مگر انھیں بجائے ایک دیہاتی لڑکا نظر آتا ہے جو بڑا انہماک سے اپنے فارم کا مطالعہ کرتا ہوا ان کی طرف چلا آ رہا ہے سب لڑکے اس دیہاتی کو دیکھ کر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں۔ بھئی کیا چیز ہے طبیعت واقعی صاف ہو گئی۔ کرشنا کماری اس دوران میں ایک طرف ہو گئی تھی۔ یہ دیہاتی لڑکا جس کا نام کرشن کمار ہے کالج کے اِن پرانے شریر طالبعلموں کی طرف بڑھتا ہے جگدیش سے وہ بڑے سادہ لہجے میں پوچھتا ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے جگدیش ذرا پیچھے ہٹ کر اسے بڑے پیار سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے چڑیا گھر۔“

کرشن کمار اسی طرح سادہ لوحی سے جواب دیتا ہے جی نہیں چڑیا گھر میں کل جاؤں گا میں یہاں داخل ہونے آیا ہوں۔ سب لڑکے بے چارے کرشن کمار کا مذاق اُڑاتے ہیں اُسے چھیڑتے ہیں اتنے میں ایک لڑکی کرشنا کماری کو ساتھ لیے ان لڑکوں کے پاس آتی ہے اور ان میں سے ایک لڑکے کو جس کا نام ستیش ہے مخاطب کر کے کہتی ہے ستیش میرا پیریڈ خالی نہیں تم انھیں بتا دو کہ کہاں داخلہ ہو رہا ہے کرشنا کماری کا فارم ستیش کو دے کر وہ تیز قدمی سے چلی جاتی ہے ستیش فارم دیکھتا ہے اور کہتا ہے آپ کا نام کرشنا کماری ہے۔ کرشن کمار بول اُٹھتا ہے جی نہیں میرا نام کرشن کمار ہے سب ہنستے ہیں ستیش کرشن کمار کا فارم بھی لے لیتا ہے اور دونوں سے کہتا ہے آیئے کمار اور کماری صاحبہ میں آپ کو راستہ بتا دوں سب چلتے ہیں۔ اس کمرے کے باہر جہاں داخلہ ہو رہا ہے ستیش ٹھہر جاتا ہے اور ایک فارم کرشن کمار اور دوسرا کرشنا کو دے کر کہتا ہے۔

”اندر چلے جائیں۔“

کرشن کماری اور کرشنا کمار دونوں اندر داخل ہوتے ہیں کرشن کمار ایک میز کی طرف بڑھتا ہے کرشن کماری دوسرے میز کی طرف اِدھر کرشنا کماری کا انٹرویو شروع ہوتا ہے اُدھر کرشن کمار کا۔ کرشن کماری کا نام پڑھ کر پروفیسر کہتا ہے آپ کبڈی کھیلتے ہیں۔ کشتی لڑتے ہیں، گولہ پھینکتے ہیں۔ ادھر دوسرا پروفیسر کرشن کمار سے کہتا ہے

”آپ کو کشیدہ کاری کروشیئے اور سلائی کے کام کا شوق ہے کرشن کمار اور کرشنا حیران رہ جاتے ہیں کرشن کماری پروفیسر سے کہتی ہے جی نہیں مجھے تو کشیدہ کاری کروشیئے اور سلائیوں کا شوق ہے اُدھر کرشن کمار پریشان ہو کر پروفیسر سے کہتا ہے جی نہیں مجھے تو کبڈی کھیلنے گولہ پھینکنے اور کشتی لڑنے کا شوق ہے دونوں کے فارم تبدیل ہو گئے تھے ہال میں قہقہے بلند ہوتے ہیں ہال کی کھڑکیوں کے باہر جگدیش اور ستیش اور ان کی پارٹی کھڑی یہ سب تماشا دیکھتی رہتی ہے۔۔ بازار میں تانگہ کھڑا ہے چرنجی اس کو صاف کر رہا ہے اتنے میں ایک پٹھان آتا ہے اور چرنجی سے ان دو سو روپوں کا تقاضہ شروع کر دیتا ہے جو اُس نے قرض لے رکھے ہیں پٹھان روز روز کے وعدوں سے تنگ آیا ہوا ہے چنانچہ وہ چرنجی سے بڑے دُرشت لہجے میں باتیں کرتا ہے چرنجی پٹھان سے معافی مانگتا ہے اور کہتا کہ وہ بہت جلد اس کا قرضہ ادا کر دے گا پٹھان چرنجی سے کہتا ہے کہ وہ تانگہ گھوڑا بیچ کر قرض ادا کر دے گا اس سے چرنجی کو صدمہ ہوتا ہے تانگہ گھوڑا وہ کبھی بیچنے کے لیے تیار نہیں اس لیے کہ وہ اسے بہت عزیز ہے اتنے میں کرشنا کماری کی آواز آتی ہے

”پتاجی“

میری کتابیں آپ ساتھ لے گئے ہیں نا۔ چرنجی اپنی لڑکی جواب دیتا ہے۔ ہاں بیٹی لے آیا ہوں اپنے ساتھ۔ یہ کہہ کر وہ پٹھان کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگاتا ہے اور کہتا ہے خان میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے میری لڑکی کے سامنے اپنے روپوں کا تقاضہ نہ کرنا۔ خان کا دل کچھ پسیجتا ہے چنانچہ جب کرشن کماری آتی ہے اور تانگے میں بیٹھتی ہے تو چرنجی سے کچھ نہیں کہتا خان کو سلام کر کے چرنجی تانگہ چلاتا ہے۔۔ دیہاتی لڑکے کرشن کمار کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے، جگدیش نے اس کے پرانی وضع کے کوٹ کے ساتھ فرسٹ ایئر فول کی چٹ لگا رکھی ہے جدھر سے وہ بے چارہ گزرتا ہے لڑکے اُس کی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں کرشن کمار جب سب کو ہنستے دیکھتا ہے تو خود بھی ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔ اس دوران میں چرنجی کا تانگہ اور ایک موٹر آتی ہے اس میں سے ستیش اور اس کی بہن آنکلتی ہے یہ وہ لڑکی ہے جس نے کرشنا کماری کا فارم ستیش کو دیا تھا کرشن کماری جب ستیش کی بہن نرملا کو دیکھتی ہے تو اُن کو نمستے کرتی ہے نرملا نمستے کا جواب دیتی ہے اور اپنے بھائی کا تعارف کراتے ہوئے کہتی ہے یہ میرے بھائی ستیش ہیں مگر آپ کی ایک بار پہلے ملاقات ہو چکی ہے ستیش کرشنا کماری کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے اور کہتا ہے آپ کبڈی کھیلتی ہیں، کشتی لڑتی ہیں اور گولہ پھینکتی ہیں، کرشنا کماری اس روز کا واقعہ یاد کر کے شرما جاتی ہے مگر ساتھ ہی ہنس پڑتی ہے تینوں کالج کی طرف بڑھتے ہیں کچھ دُور جاتے ہیں تو ایک شور سُنائی دیتا ہے۔ جگدیش اور اُس کے ساتھیوں نے کرشن کمار کو کیچڑ بھرے گڑھے میں دھکا دیکر گرا دیا تھا کیچڑ میں بے چارہ لت پت ہے لڑکے چھیڑ رہے ہیں جگدیش آگے بڑھ کر جب اُسے اُٹھانے لگتا ہے تو اُس کا کوٹ پھٹ جاتا ہے کرشن کمار سے اب برداشت نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کوٹ اسے بے حد عزیز ہے یہ اُس کے مرحوم باپ کا تھا جو اُس کی ماں نے سنبھال کر اُس کے لیے رکھا ہوا تھا جب اُس کا کوٹ پھٹ جاتا ہے تو وہ دیوانوں کی طرح اُٹھتا ہے اور جگدیش کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے کالج میں جگدیشن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ بہت لڑاکا ہے کوئی اس کے مقابل میں نہیں ٹھہر سکتا مگر جب کرشن کمار اسے بری طرح لتاڑتا ہے تو سب لڑکے حیران رہ جاتے ہیں اور جگدیش اور کرشن کمار دونوں کشتی لڑتے لڑتے ستیش کرشنا کماری اور نرملا کے پاس آجاتے ہیں تو زبردست گھونسہ مار کر جب کرشن کمار جگدیش کو گراتا ہے تو بے اختیار کرشنا کماری کے منہ سے نکلتا ہے

”یہ کیا وحشیانہ پن ہے“

کرشن کمار یہ آواز سنتا ہے اور اپنا ہاتھ روک لیتا ہے ستیش جگدیشن کو اُٹھا کر ایک طرف لے جاتا ہے اتنے میں گھنٹی بجتی ہے سب لوگ چلے جاتے ہیں صرف کرشن کمار۔ کرشنا کماری اکیلے رہ جاتے ہیں دونوں چند لمحات خاموش کھڑے رہتے ہیں آخر میں کرشن کمار ندامت بھرے لہجے میں کرشنا کماری سے کہتا ہے

”مجھے معاف کر دو۔ آئندہ مجھ سے کبھی ایسی وحشیانہ حرکت نہیں ہو گی کرشنا کماری اس کی سادگی سے بہت متاثر ہوتی ہے جب وہ اس سے کہتا ہے میں کسی سے کچھ نہیں کہتا لیکن یہ لڑکے میری طرف دیکھ دیکھ کر کیوں ہنستے ہیں۔ کیوں چھیڑتے ہیں کیوں تنگ کرتے ہیں۔ مجھے کیچڑ میں لت پت کر دیا ہے۔ یہ میرا کوٹ پھاڑ دیا ہے۔ جو میرے باپ کا ہے۔ کرشنا کماری اُس سے ہمدردی کرتی ہے اور اُسے بتاتی ہے کہ لڑکے اس کو صرف اس لیے چھیڑتے ہیں کہ اس کا لباس پرانی وضع کا ہے۔ اگر وہ اس طرح کا لباس پہننا شروع کر دے جیسا کہ دوسرے پہنتے ہیں تو اسے کوئی نہیں ستائے گا۔ کرشنا کماری کی باتیں کرشن کمار کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں جگدیش اور اُس کے ساتھی جھاڑیوں کے پیچھے سے ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ لیتے ہیں۔۔ ہوسٹل۔ کرشن کمار اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑا ہے اور سُوٹ کا معائنہ کر رہا ہے اس دوران میں وہ ایک گانا گاتا ہے بڑے جذبات بھرے انداز میں، اُس کے گانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ ساتھ والے کمرے میں جگدیش ڈنٹر پیل رہا ہے اور ڈسیل پھیر رہا ہے جب اُسے گانے کی آواز آتی ہے تو وہ بہت حیران ہوتا ہے۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلتا ہے اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ساتھ والے کمرے میں کوئی گا رہا ہے باہر نکلتا ہے اور کمرے کے دروازے پر دستک دیتا ہے اندر سے آواز آتی ہے آجاؤ۔

”جگدیش دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ کرشن کمار نیا سوٹ پہنے کھڑا ہے جب دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں تو کرشن کمار کہتا ہے۔ آپ لڑنے آئے ہیں تو مہربانی کر کے یہاں سے چلے جایئے کیونکہ میں اب کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔ جگدیش مسکراتا ہے اور اپنے تیل لگے بدن کی طرف دیکھتا ہے۔ نہیں نہیں میں لڑنے نہیں آیا صلح کرنے آیا

ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ بڑھاتا ہے جسے کرشن کمار قبول کر لیتا ہے اس کے بعد جگدیش اس کے گانے کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے دوست ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دل کو لگی ہے آواز میں بہت درد ایسے ہی پیدا نہیں ہوا ضرور کسی کی ترچھی نظر نے تمھیں گھائل کیا ہے۔ کرشن کمار بہت سادہ لوح ہے فوراً ہی اپنے دل کا راز جگدیش کو بتا دیتا ہے

”اب تم نے دوست کہا ہے تو تم سے پردہ۔ اُس لڑکی کرشنا کماری نے ایسی پیاری پیاری باتیں کی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے دل کو کیا ہو گیا ہے بڑی شریف اور بڑی ہمدرد لڑکی ہے اُس نے مجھے بتایا کہ تم لوگ مجھے کیوں چھیڑتے ہو اب دیکھ لو اُس کے کہنے پر میں نے تین سُوٹ بنوا لیے ہیں۔ جُگدیش اس کا ہمراز بن جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے تمھیں عشق ہو گیا ہے سمجھے یعنی تمہارا دل جو ہے نا وہ اس لڑکی پر آ گیا ہے اب تمھیں یہ چاہیئے کہ تم اس لڑکی پر اپنے عشق کا اظہار کر دو اگر تم نے اپنی محبت کو اپنے پہلو میں دبائے رکھا تو اسے زنگ لگ جائے گا اور دیکھو عورت کو اپنی طرف مائل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ تم اُسے کوئی تحفہ دو انگوٹھی بُندے جھمکے کچھ بھی۔ سادہ لوح کرشن کمار جگدیش کی یہ سب باتیں اپنے پلے باندھ لیتا ہے۔۔ کالج کے باغیچے میں کرشنا کماری ایک بنچ پر بیٹھی ہے کرشن کمار آہستہ آہستہ اُس کے پاس جاتا ہے جس طرح جگدیش نے کہا تھا اس طرح وہ اس پر اپنے عشق کا اظہار کرتا ہے بڑے خام انداز میں۔ اس کے بعد وہ اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالتا ہے اور کرشنا کماری کو سونے کے جھمکے تحفے کے طور پر پیش کرتا ہے کرشنا کماری یہ ڈبیا غصے میں آ کر ایک طرف پھینک دیتی ہے۔ کرشن کمار کو صدمہ پہنچتا ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے چونکہ وہ بے حد سادہ لوح ہے اس لیے وہ ساری بات کرشنا کو بتا دیتا ہے مجھے جُگدیش نے کہا تھا کہ دل میں کوئی بات نہیں رکھنی چاہیے، مجھے کئی راتوں سے نیند نہیں آئی میں ہر وقت تمہارے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ تم نے کیوں مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا اگر میرے دل میں تمہارے لیے محبت پیدا ہوئی ہے تو یہ تمہارا قصور ہے میرا نہیں۔ یہ جھمکے تو میں نے تمھیں دینے ہیں ان سے میری محبت ظاہر نہیں ہوتی یہ تو مجھ سے جُگدیش نے کہا تھا کہ ایسے موقوں پر تحفہ ضرور دینا چاہیے میں تو اپنی ساری زندگی تمھیں تحفے کے طور پر دینے کے لیے تیار ہوں۔ جب کرشنا کماری کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے اسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی اور وہ کرشن کمار کی صاف گوئی سے متاثر ہوتی ہے تو وہ جھمکوں کی ڈبیا اُٹھا لیتی ہے اور اپنے پاس رکھ لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے مجھے تمہارا یہ تحفہ قبول ہے۔

”کرشن کمار بہت خوش ہوتا ہے جھمکے لے کر کرشن کماری کچھ اور کہے سُنے بغیر چلی جاتی ہے کرشن کمار چند لمحات خاموش کھڑا رہتا ہے اتنے میں جُگدیش اور ستیش دونوں جھاڑیوں کے پیچھے سے نکلتے ہیں اور کرشن کمار کو مبارکباد دیتے ہیں کرشن کمار بہت جھینپتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ جُگدیش سے کہتا ہے۔ مگر یار تم نے تو کہا تھا کہ میں یہ بات کسی کو نہیں بتلاؤں گا۔ ستیش کی طرف دیکھ کر وہ پھر کہتا ہے ان کو بھی پتہ لگ گیا ہے جُگدیش کرشن کمار کو تسلی دیتا ہے کہ ستیش اپنا آدمی ہے وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا چنانچہ ستیش بھی کرشن کمار کو ہر ممکن تسلی دیتا ہے کہ وہ اس کے عشق کا راز کسی کو نہیں بتائے گا۔ طویلے میں چرنجی ساز پالش کر رہا ہے۔ تانگے کی پیتل کی چیزیں پالش کر رہا ہے گھوڑے کو مالش کر رہا ہے جب مالش کرتا ہے تو اُس سے پیار و محبت کی باتیں کرتا ہے۔ دوست تم نے میری بہت خدمت کی ہے اگر تم نہ ہوتے تو جانے زندگی کتنی کٹھن ہو جاتی تم نے اور میں نے دونوں نے مل کر مُنی کو پڑھایا ہے اتنے میں اس کے دو تین دوست جو تانگے والے ہیں، آتے ہیں ان میں ایک چرنجی سے کہتا ہے یہ تم گھوڑے سے کیا باتیں کر رہے ہو جیسے یہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ چرنجی گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دیتا ہے اور کہتا ہے انسانوں سے حیوانوں کی دوستی اچھی میرے بھائی۔ انھیں کوئی ورغلا تو نہیں سکتا۔ غلام محمد تیری جان کی قسم سچ کہتا ہوں اس جانور نے میری بڑی خدمت کی ہے تانگے میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے جوتے رکھا ہے غریب۔ اتنے میں پٹھان آتا ہے چرنجی اس کو سلام کرتا ہے اور اپنے تہمند کے ڈب سے نوٹ نکالتا ہے اور کہتا ہے۔

”خان صاحب یہ رہے آپ کے سو روپے کھرے کر لیجیے۔ باقی رہے سو اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ یہ میرا گھوڑا سلامت رہے۔“

یہ کہہ کر وہ بڑے فخر سے اپنے گھوڑے کی طرف دیکھتا ہے پٹھان نوٹ لے کر چلا جاتا ہے اتنے میں ایک تانگے والا چرن جی سے کہتا ہے تم لڑکی کو پڑھانا شروع کر کے خواہ مخواہ ایک جنجال میں پھنس گئے ہو۔ کوئی نہ کوئی قرض خواہ تمہارے پیچھے لگا ہی رہتا ہے۔ چرنجی ہنستا ہے سب سے بڑی قرض خواہ میری بیٹی ہے اس کا قرض ادا ہو جائے تو ایسے لاکھ قرض لینے والے میرے پیچھے پھرتے ہیں مجھے کوئی پروانہ نہیں تم میں سے کوئی افیم کا نشہ کرتا ہے کوئی شراب کا مجھے بھی ایک نشہ ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میری لڑکی دولت مند آدمیوں کی لڑکیوں کی طرح پڑھ رہی ہے تو میرا دل و دماغ ایک عجیب نشے سے جھومنے لگتا ہے عورت کو ضرور تعلیم حاصل کرنی چاہیے میرے بھائی اس کے قدم مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑے کو تھپکی دیتا ہے اور خوش خوش باہر نکلتا ہے تاکہ گھر جائے۔ اندر آئینہ سامنے رکھے کرشنا کماری اپنے کانوں میں کرشن کمار کے دیئے ہوئے جھمکے پہنے بیٹھی ہے اور انھیں پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی ہے گیت گا رہی ہے اور جیسے بے خود سی ہو رہی ہے جھمکے اسے بہت پسند آئے ہیں اس پسندیدگی کا اظہار اُس کی ہر حرکت سے معلوم ہوتا ہے۔۔ چرنجی آتا ہے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ گانے کی آواز سنتا ہے۔۔ کرشنا کماری بدستور گانے میں مشغول ہے۔ دفعتاً پاگلوں کی طرح چرنجی اندر داخل ہوتا ہے کرشن کماری ایک دم گانا بند کر کے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو ڈھانپ لیتی ہے چرنجی آگے بڑھتا ہے زور سے کرشنا کماری کے دونوں ہاتھ نیچے جھٹک دیتا ہے۔ قریب ہے کہ جھمکوں کو اس کے کانوں سے نوچ لے۔ کرشن کماری خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹتی ہے چرنجی پاگلوں کی طرح اُس کی طرف بڑھتا ہے اور چلانا شروع کر دیتا ہے کہاں سے لیے ہیں تو نے جھمکے۔ کہاں سے لیے ہیں یہ جھمکے۔

”وہ اس قدر زور سے چلاتا ہے کہ ایک دم اسے چکر آ جاتا ہے۔ جذبات سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا جاتا ہے اس کی بلند آواز بالکل دھیمی ہو جاتی ہے کہاں سے لیے ہیں یہ جھمکے۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے اس کی لڑکی فوراً پنکھا لے کر جھلنا شروع کر دیتی ہے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ ایک گلاس پانی مانگتا ہے۔ کرشن

کماری اس کو پانی پلاتی ہے پانی پینے کے بعد وہ کرشنا کماری سے پھر پوچھتا ہے منی یہ جھمکے تو نے کہاں سے لیے ہیں کرشنا کماری تھوڑے سے توقف کے بعد ذرا حکمت سے جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیتی ہے

”کالج کی ایک سہیلی نے دیئے ہیں۔ چرنجی اپنی لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے اپنی سہیلی کو واپس دے آؤ۔ لڑکی پوچھتی ہے کیوں پتاجی چرنجی جواب دیتا ہے۔ تمہاری ماں کو یہ زیور پسند نہیں تھا یہ کہہ کر وہ اُٹھتا ہے اور بیماروں کی طرح قدم اُٹھاتا باہر چلا جاتا ہے اُس کی لڑکی اُس سے پوچھتی ہے۔

”کھانا نہیں کھائیں گے آپ؟“

چرنجی جواب دیتا ہے۔

”نہیں۔“

باہر نکل کر چرنجی گھوڑے کی باگیں تھامتا ہے۔ اور تانگہ چلاتا ہے اور (گھوڑے کو) مخاطب کر کے اُس سے کہتا ہے آج میری لڑکی نے پہلی بار جھوٹ بولا ہے اور افسردگی کے عالم میں وہ تانگے پر کئی بازاروں کے چکر لگاتا ہے حتیٰ کہ رات ہو جاتی ہے۔ ایک نیم روشن بازار میں سے اُس کا تانگہ گزر رہا ہے اچانک ایک عورت چند مردوں کی جھپٹ سے نکل کر تیزی سے چرنجی کے تانگے کی جانب بڑھتی ہے وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بھاگتی تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتی ہے یہ عورت شراب کے نشے میں چور ہے۔ زیورات سے لدی ہوئی ہے تانگے میں بیٹھتے ہی وہ چرنجی سے باتیں شروع کر دیتی ہے۔“

مجھے چھیڑتے تھے اُلو کے پٹھے پر میں دام لیے بغیر کسی کو ہاتھ لگانے دیتی ہوں۔ کیوں تانگے والے تمہارا کیا خیال ہے۔ دنیا میں پیسہ ہی تو ہے تم کچھ بولتے نہیں۔ مجھے یاد آیا میرا پتی ایک تانگے والا ہی تھا پر اُس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ مجھے نگوڑے جھمکے لا دیتا لیکن اب دیکھو میری طرف یہ کڑے' یہ گلوبند' یہ انگوٹھیاں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ یہ کہہ کر وہ درد بھرے انداز میں ہنستی ہے۔ عصمت کا گہنا اتر جائے تو یہ زیور پہننے ہی چاہئیں۔ چرنجی پہچان لیتا ہے کہ یہ عورت کون ہے اُس کی بیوی تھی جو اس حالت کو پہنچ چکی تھی۔ چرنجی کمبل سے اپنا چہرہ قریب قریب چھپا لیتا ہے اس پر طوائف اُس سے کہتی ہے تم کیوں اپنا چہرہ چھپاتے ہو چھپانا تو مجھے چاہیے یہ چہرہ جس پر کئی پھٹکاریں پڑی ہیں یہ کہہ کر وہ پھر ہنستی ہے تم خاموش کیوں ہو تانگہ روک دو میرا گھر آ گیا ہے چرنجی تانگہ روک دیتا ہے طوائف پائیدان پر پاؤں رکھ کر اُترنے لگتی ہے کہ لڑکھڑا کر گرتی ہے اوندھے منہ چرنجی دوڑ کر اُسے اُٹھاتا ہے طوائف ہنستی ہے گرنے والوں کو اُٹھایا نہیں کرتے میری جان یہ کہہ کر جب وہ گھر کی طرف چلنے لگتی ہے تو لڑکھڑا کر پھر گرتی ہے۔ چرنجی اس کو تھام لیتا ہے اور اُس کو اُس کے گھر تک چھوڑ آتا ہے جب چلنے لگتا ہے تو طوائف اس کو کرایہ دیتی ہے چرنجی کرایہ لے لیتا ہے طوائف اس کا بازو پکڑ کر اندر گھسیٹتی ہے

”آؤ میری جان آؤ۔ آج کی رات میرے مہمان رہو۔ میں تم سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی۔ آؤ شراب کی پوری بوتل پڑی ہے اوپر۔ آؤ۔“

چرنجی تانگے میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ طوائف ہنستی ہے اور کہتی ہے بیوقوف کہیں کا۔ مفت کی قاضی بھی نہیں چھوڑتا۔ - چرنجی گھر پہنچتا ہے جب اندر داخل ہوتا ہے تو اُسے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے کمرے میں جا کر دیکھتا ہے کہ اس کی لڑکی بستر پر اوندھے منہ لیٹی ہے اور زار زار رو رہی ہے چرنجی اُس کے پاس جاتا ہے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور رونے کا سبب پوچھتا ہے اس کی لڑکی اور زیادہ رونا شروع کر دیتی ہے جب چرنجی دوبارہ اس سے رونے کا سبب پوچھتا ہے تو وہ کہتی ہے مجھے ماں یاد آ رہی ہے اگر وہ آج زندہ ہوتیں تو میں۔ میں۔ وہ اس کے آگے کچھ نہیں کہہ سکی اور باپ کے پاؤں پکڑ کر کہتی ہے مجھے معاف کر دیجیے پتاجی میں نے آج آپ سے جھوٹ بولا ہے۔ چرنجی کہتا ہے مجھے معلوم ہے۔ اس پر اس کی لڑکی کہتی ہے اگر آج میری ماتاجی ہوتیں تو میں نے یہ جھوٹ کبھی نہ بولا ہوتا بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو لڑکیاں صرف اپنی ماؤں کو ہی بتا سکتی ہیں۔ چرنجی اپنی لڑکی کو اُٹھاتا ہے اور اپنے پاس بٹھاتا ہے میں تمہاری ماں ہوں۔

”بولو کیا بات ہے۔ شرماؤ نہیں۔ کرشنا کماری جھینپ جاتی ہے اور شرما کر کہتی ہے

”یہ جھمکے مجھے کالج کے ایک لڑکے نے دیئے ہیں پتاجی۔ وہ بہت ہی اچھا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل جاتی ہے سسکیاں لیتی ہوئی۔ چرنجی بستر پر پڑے ہوئے جھمکوں کو اُٹھاتا ہے اور اُن کی طرف دیکھتا ہے۔ - چرنجی کا تانگہ کالج کے دروازے میں داخل ہوتا ہے کرشنا کماری اپنی کتابیں لے کر نیچے اُترتی ہے چرنجی اپنی جیب سے جھمکوں کی ڈبیا نکالتا ہے اور لڑکی کو دے کر کہتا ہے اسے آج واپس کر دینا

”کرشنا کماری ڈبیا لے کر خاموشی سے چلی جاتی ہے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی وہ کالج کے باغیچے کی طرف بڑھتی ہے۔ باغیچے میں ایک بنچ پر کرشن کمار بیٹھا ہے اور ایک خط پڑھ رہا ہے کرشنا کماری کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔ ماتاجی کا خط آیا ہے لو پڑھو۔ نہیں ٹھہرو۔ میں پڑھ کے سُناتا ہوں۔ پر تم ہنسنا نہیں، میری ماں بے چاری سیدھی سادی دیہاتی ہے میں نے ان کو تمہاری بات لکھی ہے میں اُن سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتا سُنو انھوں نے کیا لکھا ہے۔ بیٹا کمار۔ ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے اس لڑکی کی بدنامی ہو اس کے ماں باپ سے ملو اور کہو جیسی وہ ان کی بیٹی ہے ویسے ہی تم ان کے بیٹے ہو میری طرف سے اُس کو آشیرواد دینا تم جُگ جُگ جیو۔ اور باقی احوال یہ ہے کہ میں نے خالص گھی کی اپنے ہاتھ سے یہ مٹھائی بنائی ہے جو تمھیں بھیج رہی ہوں اس میں آدھا حصہ تمہاری کرشنا کماری کا ہے۔ کہنا تمہاری ماتاجی نے بھیجا ہے۔ کرشنا کماری دم بخود یہ باتیں سنتی رہتی ہے کرشن کمار اس رو

میں باتیں کرتا رہتا ہے اور کرشنا کماری کو موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ کچھ کہہ سکے۔ دیکھا میری ماں کتنی سیدھی سادھی ہے انھوں نے مٹھائی بھیجی ہے بالکل خراب تھی۔ پر میں ساری کی ساری کھا گیا ہوں۔ کیا کرتا اگر نہ کھاتا تو ناراض ہو جاتیں۔ میں بھی بالکل ان جیسا ہوں۔ اگر تم نے اس روز میرا تحفہ قبول نہ کیا ہوتا تو میرا دل ٹوٹ جاتا جانے میں کیا کر بیٹھتا۔ کرشنا کماری کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اس کی آواز رندھ جاتی ہے جھمکے واپس دینا چاہتی ہے نہیں دے سکتی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں ایک دم تیزی سے مڑتی ہے اور کرشن کمار کو وہیں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ کرشنا کماری تیزی سے جا رہی ہے کہ اس کی مڈ بھیڑ جُگدیش اور ستیش سے ہوتی ہے دونوں اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں کرشنا کماری چلی جاتی ہے جگدیش اور ستیش ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس طرف بڑھتے ہیں جدھر کرشن کمار بیٹھا ہے۔۔ جُگدیش اور ستیش دونوں کمار سے ملتے ہیں جُگدیش اُس سے کہتا ہے

”کمار۔ تم نے یہ کیا غضب کر دیا بے چاری رو رہی تھی۔ بھئی یہ رومانس اچھا رہا مار اوار اتو نہیں تم نے۔“

کرشن کمار سادہ لوحی کے ساتھ مسکراتا ہے اور کہتا ہے ایک خاص بات تھی جُگدیش نے اُس سے یہ خاص بات دریافت کی تو کرشن کمار کہتا ہے ایک خاص بات تھی۔ جگدیش پھر اُس سے یہ خاص بات دریافت کرتا ہے کرشن کمار کہتا ہے۔ بھئی سب باتیں تمھیں نہیں بتا سکتا۔ کہہ جو دیا ایک خاص بات تھی یہ کہہ کر وہ چلا جاتا ہے جگدیش اور ستیش دونوں اکیلے رہ جاتے ہیں دونوں بینچ پر بیٹھ جاتے ہیں اور کرشنا کماری کے متعلق باتیں شروع کر دیتے ہیں جُگدیش کہتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ فلرٹ ہے اُس کو حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ تانگے والے سے بات چیت کی جائے وہ اُس کے سارے بھید جانتا ہو گا باہر ہی باہر معاملہ طے ہو جائے گا اور یہاں کالج میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ ستیش کو یہ بات پسند آتی ہے چنانچہ طے ہوتا ہے کہ جگدیشن تانگے والے سے بات چیت کرے۔ چرنجی کالج کے باہر تانگہ لیے کھڑا ہے پاس ہی پان سگریٹ والے کی دُوکان ہے یہاں جُگدیش کھڑا ہے پان والے سے پان اور سگریٹ لیتا ہے اور چرنجی کی طرف بڑھتا ہے گھوڑے کو تھپکی دیتا ہے پھر اس کی تعریف کرتا ہے اس طرح وہ چرنجی سے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کر دیتا ہے آخر میں وہ باتوں باتوں میں چرنجی سے کہتا ہے

”استاد ہر عیش کرتے ہو ہر روز ایک پٹاخہ سی لونڈیا اس تانگے میں بٹھا کر لاتے ہو اور لے جاتے ہو۔ اچھا میں نے کہا۔ کچھ ہماری دال گل سکتی ہے اور اُستاد تم چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو تمہارے دائیں ہاتھ کا کام ہے ایسا ہی ایک تانگہ گھوڑا بن جائے گا۔ اگر ہمارا کام ہو جائے، چرنجی ہنستا رہتا ہے جگدیش کو اور شہہ ملتی ہے

”اماں ہم سب جانتے ہیں کہ لونڈیا ایسی نہیں کہ ہاتھ نہ آ سکے۔ کالج میں اس کا ایک لڑکے سے سلسلہ جاری ہے۔ چرنجی اب کچھ دلچسپی لیتا ہے اور جگدیش سے چند باتیں دریافت کرتا ہے جگدیش اسے بتاتا ہے کہ اس لڑکی کرشنا کماری پر کالج میں ایک لڑکا جو بہت بد معاش ہے ڈورے ڈال رہا ہے اور اُس لڑکے سے وہ کانوں کے جھمکے بھی لے چکی ہے۔ یہ سب باتیں بتانے کے بعد جگدیش چرنجی سے کہتا ہے“

دیکھو اگر اس کو زیوروں کا ہی شوق ہے تو ہم بڑھیا بڑھیا چیز دے سکتے ہیں تم یہ باتیں اپنے طور سے اس کے ساتھ کرنا سمجھے۔ اس قسم کی چند باتیں ہونے کے بعد طے ہوتا ہے کہ جگدیش شام کو کمپنی باغ کے پاس فلاں فلاں مقام پر چرنجی کا انتظار کرے جب لڑکی جھٹ مان جانے والی ہے تو چرنجی سارا معاملہ ٹھیک کر دے گا۔۔ اسی روز شام کو جُگدیش مقررہ جگہ پر پہنچ جاتا ہے کھمبے کے ساتھ کھڑا سگریٹ پی رہا ہے اتنے میں عین وقت پر چرنجی کا ٹانگہ سڑک پر نمودار ہوتا ہے چرنجی کھمبے کے پاس اپنا تانگہ روکتا ہے جگدیش بہت خوش ہو کر چرنجی سے کہتا ہے۔“

بھئی بالکل انگریز ہو۔ ٹھیک وقت پر آئے ہو نہ ایک منٹ اُدھر نہ ایک منٹ ادھر۔ چرنجی مسکراتا ہے اور کہتا ہے، اب آپ وقت ضائع نہ کیجیے اور بیٹھ جائیے تانگے میں میں آپ کو سیدھا راستہ بتا دُوں جُگدیش خوش خوش تانگے میں بیٹھ جاتا ہے اور چرنجی کو ایک سگریٹ پیش کرتا ہے تانگہ چلتا ہے۔ جُگدیش چرنجی کے ساتھ لڑکی کی باتیں کرتا رہتا ہے تانگہ مختلف سڑکیں طے کرنے کے بعد ایک ویران سی جگہ پر پہنچتا ہے چرنجی باگیں کھینچ کر گھوڑا ٹھہراتا ہے بڑے اطمینان سے اپنا کمبل اور پگڑی اتار کر اگلی نشست پر رکھتا ہے اور آستینیں چڑھا کر جگدیش سے کہتا ہے آیئے آپ کی لڑکی سے ملاقات کرا دوں

”جُگدیش چرنجی کی طرف شک کی نظروں سے دیکھتا ہے مگر چرنجی اس کا بازو پکڑتا ہے اور کھینچ کر جھاڑیوں کے پیچھے لے جاتا ہے چند لمحوں کے بعد جُگدیش کا ہیٹ سڑک پر آ گرتا ہے۔

۔ کالج کا ہوسٹل۔ جُگدیش کا کمرہ۔ باہر دروازے پر جُگدیش کا نام پیتل کے بورڈ پر لکھا ہوا ہے ستیش آتا ہے اور دروازے پر دستک دیتا ہے دروازہ کھلتا ہے ستیش اندر داخل ہوتا ہے کیا دیکھتا ہے کہ جُگدیش کا سر منہ سُوجا ہوا ہے اور کئی پٹیاں اس کے جسم پر بندھی ہیں۔ ستیش اس سے پوچھتا ہے یہ کیا ہو گیا ہے تمھیں۔ جُگدیش اسے کرسی پر بٹھاتا ہے اور سارا قصہ سُناتا ہے بھئی یہ تو برسوں کی ورزش کام آ گئی ورنہ بندے کا تو کل کام تمام ہو گیا ہوتا۔ میں نے تانگے والے سے تمام معاملہ طے کر لیا چنانچہ وہ مجھے کمپنی باغ میں ملا لڑکی وہاں موجود تھی اُس سے باتیں بھی ہوئیں لیکن ستیش کے ہمراہ وہاں تین چار اور چاہنے والے آ گئے۔ مجھے اُس کے ساتھ دیکھ کر جل ہی تو گئے اُن میں سے ایک نے مجھ پر کوئی ریمارک کسا۔ لڑکی میرے ساتھ تھی میں نے دل میں کہا جُگدیش یہاں خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ میں اُٹھا اور ایک ایسا گھونسہ اُس سالے کی ٹھوڑی کے نیچے جمایا کہ دن کو تارے ہی نظر آ گئے ہوں گے۔ بچہ جی کو بُس پھر کیا تھا۔ باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ چاروں مجھ پر پل پڑے مگر ستیش میں نے بھی وہ ہاتھ دکھائے کہ یاد ہی کرتے ہوں گے ایک ایک کو فرش کر کے رکھ دیا۔ کچھ چوٹیں

مجھے بھی آگئیں ساتھ والے کمرے میں یہ سب باتیں کرشن کمار سنتا ہے کیونکہ دونوں کمروں کے درمیان لکڑی کا ایک پردہ ہے جو اوپر سے خالی ہے ستیش جُگدیش کی سب باتیں سُن کر کہتا ہے اور بھائی ایسے موقعوں پر کون کس کی مدد کرتا ہے تم کیا بچوں ایسی باتیں کرتے ہو اتنے میں جُگدیش کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور کرشن کمار غصے میں بھرا ہوا داخل ہوتا ہے جُگدیش سے کہتا ہے۔

”تم نے جو کچھ کہا ہے جھوٹ ہے تم ایک شریف لڑکی پر بہتان باندھ رہے ہو جُگدیش سنتا ہے اور کہتا ہے

”میرا کچومر نکل گیا ہے اور تم کہتے ہو بہتان باندھ رہا ہوں۔ یقین نہ ہو تو تانگے والے سے پوچھ لو جو مجھے لے گیا تھا غصے میں آکر چونکہ اُس کی محبوبہ کی عزت پر حملہ کیا گیا ہے کرشن کمار زور سے ایک چانٹا جُگدیش کے منہ پر مارتا ہے اور کہتا ہے بکواس مت کرو۔ لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے

”مجھے معاف کردو جُگدیش یہ چانٹا تمہارے منہ پر نہیں اس تانگے والے کے منہ پر مارنا چاہیے تھا جو اس کی زندگی تباہ کر رہا ہے۔ یہ کہہ کر چلا جاتا ہے۔“

کرشن کمار اپنے کمرے میں آتا ہے میز پر بیٹھتا ہے کاغذ لے کر خط لکھنا شروع کر دیتا ہے مگر چند سطریں لکھ کر کاغذ پھاڑ دیتا ہے کرسی پر سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کمرے میں اضطراب کے ساتھ ادھر ادھر زور سے ٹہلتا ہے سامنے کھونٹی پر اپنا سُوٹ دیکھتا ہے اُسے اُتار کر اپنے پیروں میں روند دیتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تو پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ جاتا ہے پھر اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے اور کھڑکی کے پاس جاکر درد بھری دھن میں کوئی گیت گاتا ہے چرنجی کھانا کھا رہا ہے پاس ہی اس کے اس کی لڑکی بیٹھی ہے چرنجی منہ میں نوالہ ڈالنے ہی والا تھا کہ اسے کوئی بات یاد آتی ہے چنانچہ وہ اپنی لڑکی سے پوچھتا ہے

”مُنی تم نے جھمکے واپس کیے، کرشنا کماری جھوٹ نہیں بولتی“

پتاجی میں اس کو واپس دینے گئی پر دے نہ سکی۔ چرنجی نوالہ وہیں تھال میں رکھ دیتا ہے اور پوچھتا ہے

”کیوں؟ کرشنا کماری کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں وہ صرف اتنا کہہ سکتی ہے مجھے معلوم نہیں

”چرنجی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کھانا کھائے بغیر باہر چلا جاتا ہے۔ ایک آدمی عینک لگائے ڈیسک کے ساتھ بیٹھا ہے چرنجی سے کہتا ہے یہاں انگوٹھا لگاؤ۔ چرنجی اپنا انگوٹھا آگے بڑھا دیتا ہے اس پر وہ آدمی سیاہی لگاتا ہے اور پکڑ کر کاغذ پر جما دیتا ہے انگوٹھا لگانے کے بعد وہ ڈیسک سے نوٹ نکالتا ہے اور چرنجی کے حوالے کر دیتا ہے چرنجی نوٹ لے کر باہر نکلتا ہے۔۔ باہر ایک شیڈ کے نیچے اس کا ایک تانگہ گھوڑا کھڑا ہے چرنجی اپنے انگوٹھے کی سیاہی دیکھتا اس کی جانب بڑھتا ہے ایک ہاتھ میں اس نے نوٹ پکڑے ہوئے ہیں آہستہ آہستہ گھوڑے کے پاس جاتا ہے اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر گلوگیر آواز میں کہتا ہے

”بیچ آیا ہوں تجھے دوست۔ یہ دیکھ اپنی قیمت“

یہ کہہ کر وہ گھوڑے کے منہ کے آگے اپنا وہ ہاتھ پھیلا دیتا ہے جس میں نوٹ ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ہیں لوگ اپنا ایمان بیچتے ہیں میں تجھے بیچ آیا ہوں تو جو کہ میرا سچا دوست تھا آواز چرنجی کے گلے میں رندھ جاتی ہے تو بول نہیں سکتا تو تیری زبان ہوتی تو میں تیرے منہ سے سُنے بغیر کبھی نہ جاتا کہ چرنجی تو جھوٹا ہے مطلبی ہے۔ دغاباز ہے جس طرح وقت پڑنے پر لوگ گلے کا کنٹھا اُنگلی کی انگوٹھی بیچ دیتے ہیں اس طرح تو نے مجھے بیچ دیا ہے لعنت ہے تجھ پر یہ کہہ کر وہ اپنا انگوٹھا دیکھتا ہے اور گھوڑے سے کہتا ہے یہ سیاہی دیکھی تم نے اس سودے کی مالک ہے مگر میں تیرے ساتھ کیوں باتیں کروں تو اب میرا نہیں مجھے تجھ پر کوئی حق نہیں رہا۔ آخری بار چرنجی منہ پرے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دیتا ہے۔ رات کا وقت ہے چرنجی کمبل اوڑھے پیدل چلا آرہا ہے راستے میں ایک تانگے والا تانگہ ٹھہرا کر اس سے پوچھتا ہے

”آج تانگہ گھوڑا نہیں جوتا چرنجی۔ چرنجی جواب دیتا ہے آج نہیں جوتا۔ میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔ یہ کہہ کر وہ چلنا شروع کر دیتا ہے۔ گھر میں چرنجی کی لڑکی کرشنا کماری لالٹین جلائے انتظار کر رہی ہے۔ کبھی اُٹھتی ہے کبھی بیٹھتی ہے اسے کسی پہلو چین نہیں اتنے میں دروازہ پر دستک ہوتی ہے وہ اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے چرنجی اندر داخل ہوتا ہے کرشنا کماری اُس سے پوچھتی ہے پتاجی آج آپ اتنی دیر سے آئے ہیں کہاں چلے گئے تھے۔ چرنجی اپنے کمبل سے ایک پوٹلی نکالتا ہے اور اُسے کھول کر اپنی لڑکی کو دیتا ہے یہ زیور لانے گیا تھا تیرے لیے تجھے شوق جو ہے ان کا اب تو تیرا دل نہیں للچائے گا تو کہے گی تو میں ایسے اور زیور بھی لادوں گا اپنا آپ بھی بیچ ڈالوں گا تیرے دل میں للچاہٹ پیدا نہ ہونے دُوں گا۔ کرشنا کماری کبھی زیوروں کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے باپ کی طرف۔ آخر میں کہتی ہے کوئی چیز بیچی ہے آپ نے یہ گہنے خریدنے کے لیے اگر آپ نے ایسا کیا ہے تو سخت غلطی کی ہے یہ کہتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے زیور فرش پر گر پڑتے ہیں پتاجی میں نے کبھی ان چیزوں کو للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے ان چیزوں کا شوق ہے چرنجی اُس سے کہتا ہے تو نے وہ جھمکے واپس کیوں نہیں کیے۔“

کرشنا کماری کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کاش میری ماں ہوتی اور میری بات سمجھ سکتیں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ میں سونے چاندی کے لیے اپنا آپ بیچ دُوں گی آپ نے مجھے تعلیم دی ہے میرے قدم مضبوط کیے ہیں پتاجی میں آپ کی بیٹی ہُوں آپ نے میرا نہیں اپنا اپمان کیا ہے یہ کہہ کر وہ روتی روتی پاس پڑے ہوئے صندوقچے سے جھمکوں کی ڈبیا نکالتی ہے اور اپنے باپ کو دے کر کہتی ہے

”لیجیے یہ جھمکے جس نے مجھے دیے تھے اُس کو آپ ہی واپس دے آیئے اگر آپ کہیں گے تو میں اُس کی یاد کو بھی اپنے دل سے نکال کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گی یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ چرنجی فرش پر پڑے ہوئے زیوروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔۔ کالج کا صدر دروازہ کرشن کمار خاموشی سے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اُس کی نظریں دروازہ پر جمی ہوئی ہیں جُگدیش اور ستیش آتے ہیں ستیش اس سے پوچھتا ہے بڑی دیر سے یہاں خاموش کھڑے ہو کیا بات ہے۔ کرشن کمار ایک عزم کے ساتھ جواب دیتا ہے اُس بدمعاش تانگے والے کا انتظار کر رہا ہوں آج اُس کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ساری عُمر یاد رکھے گا۔ جُگدیش کرشن کمار کو تانگے والے کے خلاف اور زیادہ مشتعل کرتا ہے دفعتاً سب کی نظریں دروازے کی طرف اُٹھتی ہیں تانگے والا چرنجی کرشنا کماری دونوں پیدل اندر داخل ہوتے ہیں جُگدیش یہ دیکھ کر کہتا ہے آج تانگہ کہاں گیا اور کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر چرنجی اپنی لڑکی کو کتابیں دیتا ہے کرشنا کماری دُور سے کرشن کمار کو دیکھتی ہے اور اُس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چرنجی سر ہلا دیتا ہے کرشن کمار کرشنا کماری کا اشارہ دیکھ لیتا ہے کرشنا کماری ایک طرف چلی جاتی ہے کرشن کمار غصے میں بھرا سیدھا تانگے والے کی طرف بڑھتا ہے چرنجی بھی اُس کی طرف آ رہا ہوتا ہے چرنجی کے پاس پہنچ کر کرشن کمار نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ کھینچ کر ایک چانٹا چرن جی کے منہ پر مارتا ہے اور کہتا ہے کہ اشارے ہو رہے تھے میری طرف کیا مجھے بھی تم اپنے جیسا بدمعاش سمجھتے ہو۔ ایک چانٹا وہ چرنجی کے منہ پر جما دیتا ہے۔ اُلو کے پٹھے۔ شرم نہیں آتی تجھے پرائی لڑکیوں کو بُرے راستے پر لگاتے ہوئے کیا تیری کوئی لڑکی نہیں جو پیسے کے لالچ میں آ کر بھڑوے بنے ہوئے ہو چرنجی کے منہ سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے کرشن کمار یہ سمجھ کر کہ وہ اُسے مارنا چاہتا ہے گھونسے بازی شروع کر دیتا ہے چرنجی اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیتا ہے کرشن کمار گھونسے چلاتا رہتا ہے اتنے میں بہت سے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں جن میں جُگدیش بھی شامل ہے ایک دو پٹیاں ابھی تک اسی کے سر پر بندھی ہوئی ہیں کرشنا کماری چیختی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور کرشن کمار سے کہتی ہے

”کمار۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ میرے پتاجی ہیں

”کرشن کمار متحیر ہو کر کہتا ہے

”پتاجی۔ چرنجی کے منہ سے خون جاری ہے وہ مسکراتا ہے ہاں بیٹا میں اس کا پِتا ہوں اور تمہارا ابھی یہ کہہ کر وہ کرشن کمار کو سینے سے لگا لیتا ہے جیتے رہو۔ میں نے تم سے مار کھائی ہے لیکن اس جوان سے پوچھو کہ وہ جُگدیش کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میرے بازوؤں میں کتنا بل ہے جُگدیش وہاں سے کھسک جاتا ہے کرشن کمار ندامت بھرے لہجے میں چرنجی سے معافی مانگتا ہے اپنی لڑکی اور کرشن کمار کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیر کر چرنجی جیب سے جھمکوں کی ڈبیا نکالتا ہے اور کرشنا کماری کو دے کر کہتا ہے لو اسے اپنے پاس رکھو۔“

شہنائیاں بج رہی ہیں کرشنا کماری اور کرشن کمار کی شادی ہو چکی ہے چرن جی اپنی لڑکی اور کرشن کمار کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر رہا ہے اپنی لڑکی سے کہتا ہے تم اپنی ماں کو یاد کیا کرتی تھیں تمھیں ماں بھی مل گئی ہے یہ کہہ کر وہ کرشنا کماری کی ماں کی طرف دیکھتا ہے جو ایک سیدھی سادھی دیہاتن ہے وہ مسکراتی ہے اور کرشنا کماری کی طرف ہاتھ بڑھا کر سر پر ہاتھ پھیرتی ہے اور بڑی سادہ لوحی کے ساتھ کہتی ہے بیٹی میں نے تیرے لیے اپنے ہاتھ سے مٹھائی بنا کر بھیجی تھی کیا تو نے کھائی تھی۔ کرشنا کماری ذرا جھینپ کر کہتی ہے کھائی تھی ماتا جی۔ بہت ہی مزے دار تھی۔ ایک تانگے میں چرنجی کی بیوی شراب کے نشے میں دُھت بیٹھی ہے تانگہ چل رہا ہے اُس کے ساتھ ہی ایک مرد بیٹھا ہے۔ چرنجی کی بیوی پان تھوک دیتی ہے بہت بدمزہ ہے۔ اتنے میں تانگہ وہاں پہنچتا ہے جہاں کرشنا کماری اور کرشن کمار کی شادی ہو رہی ہے۔ تانگے والا تانگہ ٹھہرا دیتا ہے اور اپنے گاہک سے کہتا ہے معاف کیجیے گا میں ابھی حاضر ہوا۔ چرن جی کی بیوی پوچھتی ہے کہاں جا رہے ہو تم تانگے والا کہتا ہے جرنجی تانگے والے کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے میں اُسے مبارکباد دے آؤں۔ یوں چٹکیوں میں آیا۔ یہ کہہ کر تانگے والا چلا جاتا ہے۔ چرنجی کی بیوی چند لمحات کے لیے پتھر کی مورتی سی بن جاتی ہے لیکن لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھتی ہے اور تانگے سے اُتر کر اُدھر جاتی ہے جہاں سے شہنائیوں کی آواز آتی ہے۔ بارش ہو رہی ہے چرنجی کی بیوی جو شراب کے نشے میں مدہوش ہے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے شادی منڈل کی طرف بڑھتی ہے بارش ہو رہی ہے باہر تماشائیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر وہ دولہا دُلہن کو دیکھتی ہے اچھی طرح دیکھنے کے لیے جب وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے تو ایک آدمی اسے پیچھے ہٹا دیتا ہے اور کہتا ہے اے کیا دیکھ رہی ہے تُو۔ تیری ماں نے کبھی شادی نہیں کی ہو گی۔ چرنجی کی بیوی اس آدمی سے جھگڑنا شروع کر دیتی ہے۔ میں ماں ہوں۔ تو نہیں جانتا میں ماں ہوں۔ سارے تماشائی ہنستے ہیں چرنجی کی بیوی دیکھ رہی ہے کرشنا کماری بھی کسی بات پر ہنس رہی ہے چرنجی کی بیوی کی ممتا جاگ اُٹھتی ہے وہ چلانا شروع کر دیتی ہے مجھے اندر جانے دو مجھے اندر جانے دو۔ کچھ گڑبڑ ہوتی ہے اتنے میں چرنجی باہر نکلتا ہے اور اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے اور اُس سے کہتا ہے کیا چاہتی ہو۔ تم چرنجی کی بیوی کہتی ہے میں اپنی لڑکی سے ملنا چاہتی ہوں چرنجی کہتا ہے آؤ میں تمھیں اُس سے ملا دیتا ہوں یہ کہہ کر وہ اُسے ایک طرف لے جاتا ہے جہاں اس کا تانگہ کھڑا ہے چرنجی اسے تانگے تک لے جاتا ہے۔۔ تانگہ چلا جا رہا۔ چرنجی کی بیوی شراب کے نشے میں بار بار چرنجی سے پوچھتی ہے مجھے میری بیٹی سے مِلاؤ۔ مجھے میری بیٹی سے مِلاؤ۔ میں اُس کی ماں ہوں میں اُسے ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ چرنجی خاموش رہتا ہے تانگے کی رفتار تیز ہوتی رہتی ہے ایک بار تنگ آ کر وہ چرنجی سے پوچھتی ہے کہاں لے جا رہے ہو مجھے“

چرنجی جواب دیتا ہے جہاں پتی اور پتنی کو جانا چاہیے، گھوڑا سرپٹ دوڑتا ایک کھائی میں گرتا ہے۔۔ تانگے کے پُرزے اُڑ جاتے ہیں کھائی کے نیچے چرنجی اور اس کی بیوی پڑے ہیں اور دونوں بُری طرح زخمی ہوئے ہیں چرنجی مر چکا ہے مگر اُس کی بیوی ابھی زندہ ہے وہ اپنی آنکھیں کھولتی ہے اُسے اپنی جوانی کا وہ دن یاد آتا ہے جب جھمکے پہنے گا رہی تھی۔ وہ جوان ہے اور

جھمکے اپنے کانوں میں دیکھ دیکھ کر خوش ہورہی ہے اور گا رہی ہے اپنی بچی کو آواز دیتی ہے۔ اور کہتی ہے مُنی۔ منی آ تجھے ایک چیز دیکھاؤں۔ اس کی بند مُٹھی کھلتی ہے اُس کی ہتھیلی پر وہی جھمکے نظر آتے ہیں جو چر نجی اس کے لیے لایا تھا۔

جُھوٹی کہانی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوجُھوٹی کہانی

کچھ عرصے سے اقلیتیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے بیدار ہورہی تھیں۔ ان کو خوابِ گراں سے جگانے والی اکثریتیں تھیں جو ایک مدت سے اپنے ذاتی فائدے کے لیے ان پر دباؤ ڈالتی رہی تھیں۔ اس بیداری کی لہر نے کئی انجمنیں پیدا کردی تھیں۔ ہوٹل کے بیروں کی انجمن۔ حجاموں کی انجمن۔ کلرکوں کی انجمن۔ اخبار میں کام کرنے والے صحافیوں کی انجمن۔ ہر اقلیت اپنی انجمن یا تو بنا چکی تھی یا بنا رہی تھی تاکہ اپنے حقوق کی حفاظت کرسکے۔ ایسی ہر انجمن کے قیام پر اخباروں میں تبصرے ہوتے تھے۔ اکثریت کے حمایتی ان کی مخالفت کرتے تھے اور اقلیت کے طرف دار موافقت۔ غرضیکہ کچھ عرصے سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا جس سے رونق لگی رہتی تھی، مگر ایک روز جب اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ملک کے دس نمبریے گنڈوں نے اپنی انجمن قائم کی ہے تو اکثریتیں اور اقلیتیں دونوں سنسنی زدہ ہوگئیں۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے خیال کہ بے پر کی اڑادی ہے کسی نے۔ پر جب بعد میں اس انجمن نے اپنے اغراض و مقاصد شائع کیے اور ایک باقاعدہ منشور ترتیب دیا تو پتا چلا کہ یہ کوئی مذاق نہیں۔ گنڈے اور بدمعاش واقعی خود کو اس انجمن کے سائے تلے متحد اور منظم کرنے کا پورا پورا تہیہ کرچکے ہیں۔ اس انجمن کی ایک دو میٹنگیں ہوچکی تھیں، ان کو روداد اخباروں میں شائع ہوچکی تھی۔ لوگ پڑھتے اور دم بخود ہوجاتے۔ بعض کہتے کہ بس اب قیامت آنے میں زیادہ دیر باقی نہیں۔ اغراض و مقاصد کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھی۔ جس میں یہ کہا گیا تھا کہ گنڈوں اور بدمعاشوں کی یہ انجمن سب سے پہلے تو اس بات پر صدائے احتجاج بلند کرے گی۔ کہ معاشرے میں ان کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ بھی دوسروں کی طرح بلکہ ان کے مقابلے میں کچھ زیادہ امن پسند شہری ہیں۔ ان کو گنڈے اور بدمعاش نہ کہا جائے اس لیے کہ اس سے ان کی ذلیل و توہین ہوتی ہے۔ وہ خود اپنے لیے کوئی مناسب اور معزز نام تجویز کرلیتے۔ مگر اس خیال کہ اپنے منہ میاں مٹھو کی کہاوت ان پر چسپاں نہ ہو، وہ اس کا فیصلہ عوام و خواص پر چھوڑتے ہیں۔ چوری چکاری، ڈکیتی اور رہزنی، جیب تراشی اور جعل سازی، پتے بازی اور بلیک مارکیٹنگ وغیرہ، افعال قبیحہ کے بجائے فنونِ لطیفہ میں شمار ہونے چاہئیں۔ ان لطیف فنون کے ساتھ اب تک جو برا سلوک روا رکھا گیا ہے اس کی مکمل تلافی اس یونین کا نصب العین ہے۔ ایسے ہی کئی اور اغراض و مقاصد تھے جو سننے اور پڑھنے والوں کو بڑے عجیب و غریب معلوم ہوتے تھے۔ بظاہر ایسا تھا کہ چند بے فکر ظریفوں نے لوگوں کی تفریح کے لیے یہ سب باتیں گھڑی ہیں۔ یہ چٹکلہ ہی تو معلوم ہوتا تھا کہ یونین اپنے ممبروں کی قانونی حفاظت کا ذمہ لے گی اور ان کی سرگرمیوں کے لیے سازگار اور خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لیے پوری پوری جدوجہد کرے گی۔ وہ حکامِ وقت پر زور دے گی کہ یونین کے ہر رکن پر اس کے مقام اور رتبے کے لحاظ سے مقدمہ چلایا جائے اور سزا دیتے وقت بھی اس کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ حکومت لوگوں کو اپنے گھروں میں چوروں کا برقی الارم نہ لگانے دے اس لیے کہ بعض اوقات یہ ہلاکت خیز ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح سیاسی قیدیوں کو جیل میں اے اور بی کلاس کی مراعات دی جاتی ہیں، اسی طرح یونین کے ممبروں کو دی جائیں۔ یونین اس بات کا بھی ذمہ لیتی تھی کہ وہ اپنے ممبروں کو ضعیف اور ناکارہ یا کسی حادثے کا شکار ہوجانے کی صورت میں ہر ماہ گزارے کے لیے معقول رقم دے گی۔ جو ممبر کسی خاص شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے باہر کے ممالک میں جانا چاہے گا اسے وظیفہ دے گی وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اخباروں میں اس یونین کے قیام پر خوب تبصرہ بازی ہوئی۔ قریب قریب سب اس کے خلاف تھے۔ بعض رجعت پسند کہتے تھے کہ یہ کمیونزم کی انتہائی شکل ہے اور اس کے بانیوں کے ڈانڈے کریملن سے ملاتے تھے۔ حکومت سے چنانچہ بار بار درخواست کی جاتی کہ وہ اس فتنے کو فوراً کچل دے، کیونکہ اگر اس کو ذرا بھی پنپنے کا موقعہ دیا گیا تو معاشرے میں ایسا زہر پھیلے گا کہ اس کا تریاق ملنا مشکل ہوجائے گا۔ خیال تھا کہ ترقی پسند اس یونین کی طرف داری کریں گے کہ اس میں ایک جدت تھی اور پرانی قدروں سے ہٹ کر اس نے اپنے لیے ایک بالکل نیا راستہ تلاش کیا تھا۔ اور پھر یہ کہ رجعت پسند اسے کمیونسٹوں کی اختراع سمجھتے تھے مگر حیرت یہ کہ اقلیتوں کے یہ سب سے بڑے طرفدار پہلے تو اس معاملے میں خاموش رہے اور بعد میں دوسروں کے ہم نوا ہوگئے اور اس یونین کی بیخ کنی پر زور دینے لگے۔ اخباروں میں ہنگامہ برپا ہوا تو ملک کے گوشے گوشے میں اس یونین کے قیام کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ قریب قریب ہر پارٹی کے نامی و گرامی لیڈروں نے پلیٹ فارم پر آکر اس ننگِ تہذیب و تمدن جماعت کو ملعون قرار دیا اور کہا کہ یہی وقت ہے جب تمام لوگوں کو اپنے آپس کے جھگڑے چھوڑ کر اس فتنہ عظیم کا مقابلہ کرنے کے لیے اتحاد، نظم اور یقین محکم کو اپنا موٹو بنا کر ڈٹ جانا چاہیے۔ اس سارے ہنگامے کا جواب یونین کی طرف سے ایک پوسٹر کے ذریعے سے دیا گیا جس میں بڑے اختصار کے ساتھ یہ کہا گیا کہ پریس اکثریت کے ہاتھ میں ہے۔ قانون اس کی پشت پر ہے، مگر انجمن کے حوصلے اور ارادے پست نہیں ہوئے وہ کوشش کررہی ہے کہ بہت سی رقم دے کر کچھ اخبار خرید لے اور ان کو اپنے حق میں کرلے۔ یہ پوسٹر ملک کے در و دیوار پر نمودار ہوا، تو فوراً بعد کئی شہروں سے بڑی بڑی چوریوں اور ڈکیتیوں کی اطلاعیں وصول ہوئیں۔ اور اس کے چند روز بعد جب اکا دکا دو اخباروں نے دبی زبان میں گنڈوں اور بدکاروں کی یونین کے اغراض و مقاصد میں اصلاحی پہلو کریدنا شروع کیا تو لوگ سمجھ گئے کہ پس پردہ کیا ہوا ہے۔ پہلے ان دو اخباروں کی اشاعت

ہونے نہ ہونے کے برابر تھی۔ نہایت ہی گھٹیا کاغذ پر چھپتے تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسی کایا کلپ ہوئی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ سب سے اچھا ایڈیٹوریل اسٹاف ان دو پرچوں کے پاس تھا۔ دفتر میں ایک کے بجائے دو دو ٹیلی پرنٹر تھے۔ تنخواہ مقررہ وقت سے پہلے مل جاتی تھی۔ بونس الگ ملتا تھا۔ گھر کا الاؤنس، ٹانگے کا الاؤنس، سگرٹوں کا الاؤنس، چائے کا الاؤنس، مہنگائی الاؤنس۔ یہ سب الاؤنس مل کر تنخواہ سے دوگنے ہو جاتے تھے۔ جو دُختِ رز کے رسیا تھے، ان کو مفت پرمٹ ملتا تھا اور بہترین سکاچ وسکی کنٹرولڈ قیمت پر دستیاب ہوتی تھی۔ عملے کے ہر آدمی سے باقاعدہ کنٹریکٹ کیا گیا تھا جس میں مالک کی طرف سے یہ اقرار تھا کہ اس کے گھر میں کبھی چوری ہوئی، یا اس کی جیب کاٹ لی گئی تو اسے نقصان کے علاوہ ہرجانہ بھی ادا کیا جائے گا۔ ان دو اخباروں کی اشاعت سے دیکھتے دیکھتے ہزاروں تک پہنچ گئے۔ تعجب ہے کہ پہلے جب ان کی اشاعت کچھ بھی نہیں تھی تو یہ ہر روز کثیر الاشاعت ہونے کے بلند بانگ دعوے کرتے تھے، مگر جب ان کی کایا کلپ ہوئی تو اس معاملے میں بالکل خاموش ہو گئے۔ بیک وقت البتہ ان دونوں اخباروں نے کچھ عرصے کے بعد یہ اعلان چھاپا کہ ہماری اشاعت اس حد تک جا پہنچی ہے کہ اگر ہم نے اس سے تجاوز کیا تو تجارتی نقطہ نظر سے نقصان ہی نقصان ہے۔ ان کے علمی و ادبی اڈیشنوں میں عجیب و غریب موضوعات پر مضمون شائع ہوتے تھے، یہ چار پانچ تو بڑے ہی سنسنی خیز تھے۔ بلیک مارکیٹ کے فوائد۔ معاشیات کی روشنی میں معاشرتی اور مجلسی دائرے میں قحبہ خانوں کی اہمیت۔ دروغ گو را حافظہ باشد۔ جدید سائنٹفک تحقیق بچوں میں قتل و غارت گری کے فطری رجحانات۔ سیادت پر سیر حاصل تبرہ دنیا کے خوف ناک ڈاکو اور تقدیسِ مذہب اشتہار بھی کم عجیب و غریب نہیں تھے۔ ان میں مشتہر کا نام اور پتا نہیں ہوتا تھا۔ سرخیاں دے کر مطلب کی مختصر لفظوں میں ادا کر دی جاتی تھی۔ چند سرخیاں ملاحظہ ہوں۔ چوری کے زیورات خریدنے سے پہلے ہمارا نشان ضرور دیکھ لیا کریں۔ جو کھرے مال کی ضمانت ہے۔ بلیک مارکیٹ میں صرف اسی فلم کے ٹکٹ فروخت کیے جاتے ہیں۔ جو تفریح کا بہترین سامان پیش کرتا ہے۔ دودھ میں کن طریقوں سے ملاوٹ کی جاتی ہے۔ رسالہ دودھ کا دودھ کا پانی کا پانی مطالعہ فرمائیے۔ ٹونے، ٹوٹکے، گنڈے اور تعویذ، عملِ ہمزاد اور تسخیر محبوب کے جنتر منتر سب جھوٹے ہیں۔ خود کو دھوکا دینے کے بجائے معشوق کو دھوکا دیجیے۔ کھانے پینے کی صرف وہ چیزیں خریدیے جن میں ضرر رساں چیزوں کی ملاوٹ نہ ہوا۔ ایک الگ کالم میں

”بلیک مارکیٹ کے آج کے بھاؤ“

کے عنوان تلے ان تمام چیزوں کی کنٹرولڈ قیمت درج ہوتی تھی جو صرف بلیک مارکیٹ سے دستیاب ہوتی تھیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان قیمتوں میں ایک پائی کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ جو چھپے چوری، چوری کا خاص نشان لگا یا ہوا مال خریدتے تھے انھیں ارزاں قیمت پر سولہ آنے کھرا مال ملتا تھا۔ گنڈوں، چوروں اور بدکاروں کی انجمن جب آہستہ آہستہ نیک نامی حاصل کرنے لگی تو اربابِ بست و کشاد کی تشویش دوچند ہو گئی۔ حکومت نے اپنی طرف سے خفیہ طور پر بہت کوشش کی کہ اس کے اڈے کا سراغ لگائے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ یونین کی تمام سرگرمیاں زیرِ زمین یعنی انڈر گراؤنڈ تھیں۔ اونچی سوسائٹی کے چند اراکین کا خیال تھا کہ پولیس کے بعض بدقماش افسر اس یونین سے ملے ہوئے ہیں بلکہ اس کے باقاعدہ ممبر ہیں اور ہر ماہ اپنی ناجائز ذرائع سے پیدا کی ہوئی آمدن کا بیشتر حصہ بطور جزیے کے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قانون کا نشتر معاشرے کے اس نہایت ہی مہلک پھوڑے تک نہیں پہنچ سکا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر یہ بات قابل غور تھی کہ عوام میں جو اس یونین کے قیام سے بے چینی پھیلی تھی اب بالکل مفقود تھی۔ متوسط طبقہ اسکی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ صرف اونچی سوسائٹی تھی جو دن بدن خائف ہوتی جا رہی تھی۔ اس یونین کے خلاف یوں تو آئے دن تقریریں ہوتی تھیں اور جگہ جگہ جلسے منعقد ہوئے تھے، مگر اب وہ پہلا سا جوش و خروش نہیں تھا۔ چنانچہ اس کو از سرِ نو شدید بنانے کے لیے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ قریب قریب ہر شہر کی معزز ہستیوں کو نمائندگی کے لیے مدعو کیا گیا۔ مقصد اس جلسے کا یہ تھا کہ اتفاق رائے سے گنڈوں، شُہدوں اور بدکاروں کی اس یونین کے خلاف مذمت کا ووٹ پاس کیا جائے اور عوام الناس کو ان خوفناک جراثیم سے کماحقہ، آگاہ کیا جائے جو اس کے وجود سے معاشرتی و مجلسی دائرے میں پھیل چکے ہیں اور بڑی سرعت سے پھیل رہے ہیں۔ جلسے کی تیاری پر ہزاروں روپے خرچ کیے گئے۔ مجلس انتظامیہ اور مجلس استقبالیہ نے مندوبین کے آرام و آسائش کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا کی۔ کئی اجلاس ہوئے اور بڑے کامیاب رہے۔ ان کی رپورٹ یونین کے پرچوں میں من و عن شائع ہوتی رہی۔ مذمت کے جتنے ووٹ پاس ہوئے بلا تبصرہ چھپتے رہے۔ دونوں اخباروں میں ان کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ آخری اجلاس بہت اہم تھا۔ ملک کی تمام مکرم و معظم ہستیاں جمع تھیں۔ امراء و وزراء سب موجود تھے۔ حکومت کے اعلیٰ اعلیٰ افسر بھی مدعو تھے۔ بڑے زوردار الفاظ میں تقریریں ہوئیں اور مذہبی، مجلسی، معاشی، جمالیاتی اور نفسیاتی، غرض کہ ہر ممکن نقہ نظر سے گنڈوں اور بدمعاشوں کی تنظیم کے خلاف دلائل و براہین پیش کیے گئے اور ثابت کر دیا گیا کہ اس طبقہ اسفل کا وجود حیاتِ انسانی کے حق میں زہر قاتل ہے۔ مذمت کا آخری ریزولیشن جو بڑے باثر الفاظ پر مشتمل تھا اتفاق رائے سے پاس ہوا تو ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ جب تھوڑا سکون ہوا تو پچھلے بنچوں میں ایک شخص کھڑا ہوا۔ اس نے صدر سے مخاطب ہو کر کہا۔

”صاحبِ صدر، اجازت ہو تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

سارے ہال کی نگاہیں اس آدمی پر جم گئیں۔ صدر نے بڑی تمکنت سے پوچھا

”میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں؟“

اس شخص نے جو بڑے سادہ مگر خوش وضع کپڑوں میں ملبوس تھا۔ تعظیم کے ساتھ کہا۔

”ملک وملت کا ایک ادنیٰ ترین خادم“

اور کورنش بجالایا۔ صدر نے چشمہ لگا کر اسے غور سے دیکھا اور پوچھا۔

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

اس معمانما مرد نے مسکرا کر کہا۔

”کہ۔ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔“

اس پر سارے ہال میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ڈائس پر خصوصاًسب کے سب معززین اور قائدین سوالیہ نشان بن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ صدر نے اپنی تمکنت کو ذرا اور تمکین بنا کر پوچھا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”میں ابھی عرض کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک بے داغ سفید رومال نکالا۔ اپنا منہ صاف کیا اور اسے واپس جیب میں رکھ کر بڑے پارلیمانی انداز میں گویا ہوا۔

”صاحب صدر اور معزز حضرات“

۔ ڈائس کے ایک طرف دیکھ کر وہ رک گیا۔

”معافی کا طلبگار ہوں۔ محترمہ بیگم مرزبان خلافِ معمول آج پچھلے صوفے پر تشریف فرماہیں۔ صاحب صدر، خاتون مکرم اور معزز حضرات“!

بیگم مرزبان نے دے نیسٹی بیگ میں سے آئینہ نکال کر اپنا میک اپ دیکھا اور غور سے سننے لگی۔ باقی بھی ہمہ تن گوش تھے۔

”حریفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز کچھ دیر رک کر وہ ایک ادا سے مسکرایا۔

”حضرت غالب!۔ اس اجلاس میں اور اس سے پہلے مجلسی دائرے کے ایک مفروضہ طبقہ اسفل کے بارے میں جو زہر فشانی کی گئی ہے، آپ کے اس خاکسار نے بڑے غور سے سنی ہے۔
“

سارے ہال میں کُھسر پُھسر ہونے لگی۔ صدر کی ناک کے بانسے پر چشمہ پھسل گیا۔

”آپ ہیں کون؟“

سر کے ایک ہلکے سے خم کے ساتھ اس شخص نے جواب دیا۔

”ملک وملت کا ایک ادنیٰ خادم۔ مجلسی دائرے کے مفروضہ طبقہ اسفل کی جماعت کا ایک رکن جسے اس کی نمائندگی کا فخر حاصل ہے“!

ہال میں کسی نے زور سے

”واہ“

کہا اور تالی بجائی۔ چوروں، اچکوں اور گنڈوں کی یونین کے نمائندے نے سر کو پھر ہلکی سی جنبش دی اور کہنا شروع کیا۔

”کیا عرض کروں۔ کچھ کہا نہیں جاتا۔ واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں اس اجلاس میں اس جماعت کے خلاف جس کا یہ خاکسار نمائندہ ہے اس قدر گالیاں دی گئی ہیں۔ اس قدر لعنت ملامت کی گئی ہے کہ صرف اتنا کہنے کو جی چاہتا ہے لو وہ بھی کہتے ہیں یہ بے ننگ ونام ہے صاحبِ صدر، محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات! بیگم مرزبان کی لپ اسٹک مسکرائی۔ بولنے والے نے آنکھیں اور سر جھکا کر تسلیم عرض کیا۔

”محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں میری جماعت کا کوئی ہمدرد موجود نہیں۔ آپ میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو ہمارا طرف دار ہو۔ دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری نہ سہی ایک تمنائے دوا ہے تو سہی ڈائس پر ایک اچکن پوش رئیس گلے میں پان دبا کر بولے۔

”مکرر“!

صدر نے جب ان کی طرف سرزنش بھری نظروں سے دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے۔ چوروں اور بدکاروں کی یونین کے نمائندے کے پتلے پتلے ہونٹوں پر شفاف مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”میں اپنی مختصر یر تقریر میں جو شعر بھی استعمال کروں گا۔ حضرت غالب کا ہو گا“!

بیگم مرزبان نے بڑے بھولپن سے کہا۔

”آپ تو بڑے لائق معلوم ہوتے ہیں۔“

بولنے والا کورنش بجا یا لیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔

”سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے“!

سارا ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ بیگم مرزبان نے اٹھ کر صدر کے کان میں کچھ کہا جس نے حاضرین کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ خاموشی ہوئی تو چوروں اور لفنگوں کی یونین کے نمائندے پھر بولنا شروع کیا۔

”صاحب صدر، محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات گرچہ ہے کس کس برائی سے دلے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اس سے تسلی نہیں ہوتی۔ میں تاسف کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس طبقے کے ساتھ جس کی نمائندگی میری جماعت کرتی ہے نہایت بے انصافی ہوئی ہے۔ اس کو اب تک بالکل غلط رنگ میں دیکھا جاتا رہا ہے اور یہی کوشش کی جاتی رہی کہ اسے معلون و مطعون قرار دے کر خارج از سماج کر دیا جائے۔ میں ان مطہر ہستیوں کو کیا کہوں جنھوں نے اس شریف اور معزز طبقے کو سنگسار کرنے کے لیے پتھر اٹھائے ہیں۔

”آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے“

صدر نے دفعتہً گرج کر کہا۔

”خاموش۔ بس اب آپ کو مزید بولنے کی اجازت نہیں ہے۔“

مقرر نے مسکرا کر کہا۔

”حضرت غالب کی اسی غزل کا ایک شعر ہے دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ صدر نے اجلاس برخاست کرنا چاہا مگر لوگوں نے کہا کہ نہیں چوروں اور گنڈوں کی یونین کے نمائندے کی تقریر ختم ہو جائے تو کارروائی بند کی جائے۔ صدر اور دوسرے اراکین اجلاس نے پہلے آمادگی ظاہر نہ کی لیکن مبں رائے عامہ کے سامنے انھیں جھکنا پڑا۔ مقرر کو بولنے کی اجازت مل گئی۔ اس نے صاحب صدر کا مناسب و موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور کہنا شروع کیا۔

”ہماری یونین کو صرف اس لیے نفرت و تحقیر کی طرف سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ چوروں، اٹھائی گیروں، رہزنوں اور ڈاکوؤں کی انجمن ہے جو ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے قائم کی گئی ہے۔ میں آپ لوگوں کے جذبات بخوبی سمجھتا ہوں۔ آپ کا فوری ردعمل کس قسم کا تھا، میں اس کا تصور بھی کر سکتا ہوں، مگر چوروں، ڈاکوؤں اور رہزنوں کے حقوق کیا نہیں ہوتے؟ یا نہیں ہو سکتے؟ میں سمجھتا ہوں کوئی سلیم الدماغ آدمی ایسا نہیں سوچ سکتا۔ جس طرح سب سے پہلے انسان ہیں، بعد میں سیٹھ ہیں، رئیس اعظم ہیں، میونسپل کمشنر ہیں، وزیر داخلہ ہیں یا خارجہ۔ اسی طرح وہ بھی سب سے پہلے آپ ہی کی طرح انسان ہے۔ چور، ڈاکو، اٹھائی گیرا، جیب کترا اور بلیک مارکیٹر بعد میں ہے۔ جو حقوق دوسرے انسانوں کو اس سقفِ نیلوفری کے نیچے مہیا ہیں، وہ اسے بھی مہیا اور ہونے چاہئیں۔ جن نعمتوں سے دوسرے انسان متمتع ہوتے ہیں ان سے وہ بھی مستفیض ہونے کا حق رکھتا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک چور یا ڈاکو کیوں شے لطیف سے خالی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں اسے ایک ایسا شخص متصور کیا جاتا ہے جو معمولی حسیات سے بھی عاری ہے۔ معاف فرمایئے وہ اچھا شعر سن کر اسی طرح پھڑک اٹھتا ہے جس طرح کوئی دوسرا سخن فہم۔ صبحِ بناس اور شامِ اودھ سے صرف آپ ہی لطف اندوز نہیں ہوتے۔ وہ بھی ہوتا ہے۔ سر تال کی اس کو بھی خبر ہے۔ وہ صرف پولیس کے ہاتھوں ہی گرفتار ہونا نہیں جانتا۔ کسی حسینہ کے دامِ الفت میں گرفتار ہونے کا سلیقہ بھی جانتا ہے۔ شادی کرتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے۔ ان کو چوری سے منع کرتا ہے۔ جھوٹ بولنے سے روکتا ہے۔ خدانخواستہ اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کے دل کو بھی صدمہ پہنچتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کسی قدر گلو گیر ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی اس نے رخ بدلا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”حضرت غالب کے اس شعر کا جو مزا وہ لے سکتا ہے، معاف کیجیے آپ میں سے کوئی بھی نہیں لے سکتا۔

”نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو“!

سارا ہال شگفتہ ہو کر ہنسنے لگا۔ بیگم مرزبان بھی جو تقریر کے آخری حصے پر کچھ افسردہ سی ہو گئی تھیں مسکرائیں۔ مقرر نے اسی طرح تپلی تپلی شفاف مسکراہٹ کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

”مگر اب ایسے دعا دینے والے کہاں“!

بیگم مرزبان نے بڑے بھولپن کے ساتھ آہ بھر کر کہا۔

”اور وہ رہزن بھی کہاں؟“

مقرر نے تسلیم کیا۔

”آپ نے بجا ارشاد فرمایا بیگم مرزبان۔ ہمیں اس افسوسناک حقیقت کا کامل احساس ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے مل کر اپنی انجمن بنا ڈالی ہے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ رہزن، چور اور کیب کترے قریب قریب سب اپنی پرانی روش اور وضعداری بھول گئے ہیں۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ وہ اب بہت تیزی سے اپنے اصل مقام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ لیکن میں ان

حضرات سے جو ان غریبوں کی بیخ کنی میں مصروف ہیں یہ گستاخانہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی اصلاح کے لیے اب تک انھوں نے کیا کیا ہے۔ مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر تقابل کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں نہایت ذلیل، چوری اور سفاک ڈاکو کہا جاتا ہے، مگر وہ لوگ کیا ہیں۔ کچھ اس عالت مرتبت ڈائس پر بھی بیٹھے ہیں جو عوام کا مال و متاع دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہے ہیں۔“

ہال میں

”شیم شیم“

کے نعرے بلند ہوئے۔ مقرر نے کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔

”ہم چوری کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، مگر اسے کوئی اور نام نہیں دیتے۔ یہ معزز ہستیاں بدتریں قسم کی ڈاکہ زنی کرتی ہیں مگر یہ جائز سمجھتی ہے۔ اپنی آنکھ کے اس طویل و عریض اور بھاری بھرکم شہتیر کو کوئی نہیں دیکھتا اور نہ دیکھنا چاہتا ہے۔ کیوں؟۔ یہ بڑا گستاخ سوال ہے۔ میں اس کا جواب سننا چاہتا ہوں چاہے وہ اس سے بھی زیادہ گستاخ ہو۔“

تھوڑے توقف کے بعد وہ مسکرایا۔

”وزیر صاحبان اپنی مسندِ وزارت کی سان پر اُسترا تیز کر کے ملک کی ہر روز حجامت کرتے رہیں۔ یہ کوئی جرم نہیں، لیکن کسی کی جیب سے بڑی صفائی کے ساتھ بٹوہ چرانے والا قابل تعزیر ہے۔ تعزیر کو چھوڑیئے مجھے اس پر کوئی زیادہ اعتراض نہیں۔ وہ آپ کی نظروں میں گردن زدنی ہے۔“

ڈائس پر بہت سے حضرات بے چینی اور اضطراب محسوس کرنے لگا۔ بیگم مرزبان مسرور تھیں۔ مقرر نے اپنا گلا صاف کیا، پھر کہنا شروع کیا۔

”تمام محکموں میں اوپر سے لے کر نیچے تک رشوت ستانی کا سلسلہ قائم ہے۔ یہ کسے معلوم نہیں۔ کیا یہ کبھی کوئی راز ہے جس کے انکشاف کی ضرورت ہے کہ خویش پروری اور کنبہ نوازی کی بدولت سخت نااہل، خر دماغ اور بد قماش بڑے بڑے عہدے سنبھالے بیٹھے ہیں۔ معاف فرمایئے گا ادھر ہمارے طبقے میں ایسے افسوسناک حالات موجود نہیں کوئی چور اپنے کسی عزیز کو بڑی چوری کے لیے منتخب کریگا۔ ہمارے ہاں لوگ اس قسم کی رعائتوں سے فائدہ اٹھانا بھی چاہیں تو نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے کہ چوری کرنے، جیب کاٹنے یا ڈاکہ ڈالنے کے لیے دل گردے اور مہارت و قابلیت کی ضرورت ہے۔ یہاں کوئی سفارش کام نہیں آتی۔ ہر شخص کا کام ہی خود اُس کا امتحان ہے جو اس کو فوراً نتیجے سے باخبر کر دیتا ہے۔“

ہال میں سب خاموش تھے اور بڑے غور سے تقریر سن رہے تھے۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد مقرر کی آواز پھر بلند ہوئی۔

”میں بدکاری معاف کر سکتا ہوں۔ لیکن خامکاری ہرگز ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ وہ لوگ یقیناً قابل مواخذہ ہیں جو نہایت ہی بھونڈے طریقے پر ملک کی دولت کو لوٹتے ہیں۔ ایسے بھونڈے طریقے پر کہ ان کے کرتوتوں کے بھانڈے ہر دوسرے روز چوراہوں میں پھوٹتے ہیں۔ وہ پکڑے جاتے ہیں مگر بچ نکلتے ہیں کہ ان کے نام دس نمبر کے بستہ الف میں درج ہیں نہ بستہ ب میں۔ یہ کس قدر ناانصافی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں بیچارے انصاف کا۔ اندھے انصاف کا خون یہیں پر ہوتا ہے۔ نہیں ایسے اور بھی کئی مقتل ہیں۔ جہاں انصاف، انسانیت، شرافت و نجابت، تقدیس و طہارت، دین و نیا، سب کو ایک پھندے میں ڈال کر ہر روز پھانسی دی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں انسانوں کی خام کھالوں کی تجارت کرنے والے ہم ہیں یا آپ۔ میں سوال کرتا ہوں، ازمنہ، عتیق کی بربریت کی طرف امن پسند انسانوں کو کشاں کشاں کھینچ کر لے جانے والے ہم ہیں یا آپ۔ اور استفسار کرتا ہوں کہ دوسری اجناس کی طرح ملاوٹ کر کے اپنے ایمان کو آپ بیچتے ہیں یا ہم؟“

ہال پر قبر کی سی خاموشی طاری تھی۔ مقرر نے جیب سے اپنا سفید رومال نکال کر منہ صاف کیا اور اسے ہوا میں لہرا کر کہا۔

”صاحب صدر، خاتون مکرم اور معزز حضرات مجھے معاف فرمایئے کہ میں ذرا جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ عرض ہے کہ جدھر نظر اٹھائی جائے۔ ایمان فروش ہوتا ہے یا ضمیر فروش، وطن فروش ہوتا یا ہے ملت فروش۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھی کوئی فروخت کرنے کی چیزیں ہیں۔ انسان تو انھیں نہایت ہی مشکل وقت میں ایک لمحے کے لیے گروی نہیں رکھ سکتا۔ مگر میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔ معاف کیجیے۔ میرے لہجے میں پھر تلخی پیدا ہو گئی۔

”رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے“

یہ کہتا وہ ڈائس کی طرف بڑھا۔

”صاحب صدر، محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات! میں اپنی یونین کی طرف سے آپ کا سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے لب کشائی کا موقعہ دیا۔“

ڈائس کے پاس پہنچ کر اس نے صدر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”میں اب ایک دوست کی حیثیت سے رخصت چاہتا ہوں۔“

صدر نے ہچکچاتے ہوئے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد اُس نے بیگم مرزبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“

بیگم مرزبان نے بڑے بھولپن سے اپنا ہاتھ پیش کر دیا۔ باقی معززین اور رؤسا سے ہاتھ ملا کر جب فارغ ہوا تو خدا حافظ کہہ کر چلنے لگا۔ لیکن فوراً ہی رک گیا۔ اپنی دونوں جیبوں سے اس نے بہت سی چیزیں نکالیں اور صدر کی میز پر ایک ایک کر کے رکھ دیں۔ پھر وہ مسکرایا۔

”ایک عرصے سے جیب تراشی چھوڑ چکا ہوں آج کل سیف توڑنا میرا پیشہ ہے۔ آج صرف ازراہِ تفریح آپ لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر دیا۔“

یہ کہہ کر وہ بیگم مرزبان سے مخاطب ہوا۔

”خاتون مکرم معاف کیجیے۔ آپ کے وینسیٹی بیگ سے بھی میں نے ایک چیز نکالی تھی۔ مگر وہ ایسی ہے کہ سب کے سامنے آپ کو واپس نہیں کر سکتا۔“

اور وہ تیزی کے ساتھ ہال سے باہر نکل گیا۔

چغد

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوچغد

لڑکوں اور لڑکیوں کے معاشقوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ پرکاش جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا اندر ہی اندر بہت شدت سے سوچ رہا تھا، ایک دم پھٹ پڑا۔

”سب بکواس ہے، سو میں سے ننانوے معاشقے نہایت ہی بھونڈے اور لچر اور بے ہودہ طریقوں سے عمل میں آتے ہیں۔ ایک باقی رہ جاتا ہے، اس میں آپ اپنی شاعری رکھ لیجیے یا اپنی ذہانت اور ذکاوت بھر دیجیے۔ مجھے حیرت ہے۔ تم سب تجربہ کار ہو۔ اوسط آدمی کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار ہو۔ جو حقیقت ہے، تمہاری آنکھوں سے اوجھل بھی نہیں۔ پھر یہ کیا حماقت ہے کہ تم برابر اس بات پر زور دیے جا رہے ہو کہ عورت کو راغب کرنے کے لیے نرم و نازک شاعری، حسین و جمیل شکل اور خوش وضع لباس، عطر، لونڈر اور جانے کس کس خرافات کی ضرورت ہے اور میری سمجھ سے یہ چیز تو بالکل بالاتر ہے کہ عورت سے عشق لڑانے سے پہلے تمام پہلو سوچ کر ایک اسکیم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔“

چودھری نے جواب دیا۔

”ہر کام کرنے سے پہلے آدمی کو سوچنا پڑتا ہے۔“

پرکاش نے فوراً ہی کہا۔

”مانتا ہوں۔ لیکن یہ عشق لڑانا میرے نزدیک بالکل کام نہیں۔ یہ ایک۔ بھئی تم کیوں غور نہیں کرتے۔ کہانی لکھنا ایک کام ہے۔ اسے شروع کرنے سے پہلے سوچنا ضروری ہے لیکن عشق کو آپ کام کیسے کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک۔ یہ ایک۔ یہ ایک۔۔ میرا مطلب ہے۔ عشق مکان بنانا نہیں جو آپ کو پہلے نقشہ بنوانا پڑے۔ ایک لڑکی یا عورت اچانک آپ کے سامنے آتی ہے۔ آپ کے دل میں کچھ گڑبڑ سی ہوتی ہے۔ پھر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ ساتھ لیٹی ہو۔ اسے آپ کام کہتے ہیں۔ یہ ایک۔ یہ ایک حیوانی طلب ہے جسے پورا کرنے کے لیے حیوانی طریقے ہی استعمال کرنے چاہئیں۔ جب ایک کتا کتیا سے عشق لڑانا چاہتا ہے تو وہ بیٹھ کر اسکیم تیار نہیں کرتا۔ اسی طرح سانڈ جب بُو سُونگھ کر گائے کے پاس جاتا ہے تو اسے بدن پر عطر لگانا نہیں پڑتا۔ بنیادی طور پر ہم سب حیوان ہیں۔ اس لیے عشق و محبت میں جو دنیا کی سب سے پرانی طلب ہے، انسانیت کا زیادہ دخل نہیں ہونا چاہیے۔“

میں نے کہا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ شعر و شاعری، مصوری، صنم تراشی یہ سب فنون لطیفہ محض بے کار ہیں؟“

پرکاش نے سگریٹ سلگایا اور اپنا جوش بقدر کفایت استعمال کرتے ہوئے کہا۔

”محض بے کار نہیں۔ میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو، تمہارا مطلب یہ تھا کہ فنون لطیفہ کے وجود کا باعث عورت ہے، پھر یہ بے کار کیسے ہُوئے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے وجود کا باعث خود عورت نہیں ہے، بلکہ مرد کی عورت کے متعلق حد سے بڑھی ہُوئی خوش فہمی ہے۔ مرد جب عورت کے متعلق سوچتا ہے تو اور سب کچھ بھول جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت کو عورت نہ سمجھے۔ عورت کو محض عورت سمجھنے سے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے! چنانچہ وہ چاہتا ہے اسے خوبصورت سے خوبصورت روپ میں دیکھے۔ یورپی ممالک میں جہاں عورتیں فیشن کی دلدادہ ہیں، ان سے جا کر پوچھو کہ ان کے بالوں، ان کے کپڑوں، ان کے جوتوں کے نت نئے فیشن کون ایجاد کرتا ہے۔“

چودھری نے اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں پرکاش کے کاندھے پر ہولے سے طمانچہ مارا۔

”تم بہک ہو گئے ہو یار۔ جوتوں کے ڈیزائن کون بناتا ہے، سانڈ گائے کے پاس جاتا ہے تو اسے لونڈر لگانا نہیں پڑتا۔ یہاں باتیں ہو رہی تھیں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے وہی رومان کامیاب ہوتے ہیں جو شریفانہ خطوط پر شروع ہوں۔“

پرکاش کے ہونٹوں کے کونے طنز سے سکڑ گئے۔

”چودھری صاحب قبلہ! آپ بالکل بکواس کرتے ہیں۔ شرافت کو رکھیے آپ اپنے سگریٹ کے ڈبے میں، اور ایمان سے کہیے وہ لونڈیا جس کے لیے آپ پورا ایک برس رومالوں کو بہترین لونڈر لگا کر اسکیمیں بناتے رہے، کیا آپ کو مل گئی تھی؟“

چودھری صاحب نے کسی قدر کھسیانہ ہو کر جواب دیا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔“

”کس سے۔ کس اُلو کے پٹھے سے۔ ایک پھیری والے بزار سے جس کو نہ تو غالب کے شعر یاد تھے نہ کرشن چندر کے افسانے۔ جو آپ کے مقابلے میں لونڈر لگے رومال سے نہیں بلکہ اپنے میلے تہمد سے ناک صاف کرتا تھا۔“

پرکاش ہنسا۔

”چودھری صاحب قبلہ، مجھے یاد ہے آپ بڑی محبت سے اسے خط لکھا کرتے تھے۔ ان میں آسمان کے تمام تارے نوچ کر آپ نے چپکا دیے۔ چاند کی ساری چاندنی سمیٹ کر ان میں پھیلا دی مگر اس پھیری والے بزار نے آپ کی لونڈیا کو جس کی ذہنی رفعت کے آپ ہر وقت گیت گاتے تھے، جس کی نفاست پسند طبیعت پر آپ مرمٹے تھے، ایک آنکھ مار کر اپنے تھانوں کی گٹھڑی میں باندھا اور چلتا بنا۔ اس کا جواب ہے آپ کے پاس؟؟ چودھری منمنایا:

”میرا خیال ہے جن خطوط پر میں چل رہا تھا، غلط تھے۔ اس کا نفسیاتی مطالعہ بھی جو میں نے کیا تھا درست ثابت نہ ہوا۔“

پرکاش مسکرایا:

”چودھری صاحب قبلہ! جن خطوط پر آپ چل رہے تھے، یقیناً غلط تھے۔ اس کا نفسیاتی مطالعہ بھی جو آپ نے کیا تھا، سو فیصد نادرست تھا اور جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ کو خط کشی اور نفسیاتی مطالعے کی زحمت اٹھانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ نوٹ بک نکال کر اس میں لکھ لیجیے کہ سو میں سو مکھیاں شہد کی طرف بھاگی آئیں گی اور سو میں ننانوے لڑکیاں بھونڈے پن سے مائل ہوں گی۔“

پرکاش کے لہجے میں ایک ایسا طنز تھا جس کا رخ چودھری کی طرح اتنا نہیں تھا جتنا خود پرکاش کی طرف تھا۔ چودھری نے سر کو جنبش دی اور کہا:

”تمہارا فلسفہ میں کبھی نہیں سمجھ سکتا۔“

آسان بات کو تم نے مشکل بنا دیا ہے۔ تم آرٹسٹ ہو اور نوٹ بک نکال کر یہ بھی لکھ لو کہ آرٹسٹ اوّل درجے کے بے وقوف ہوتے ہیں۔ مجھے بہت ترس آتا ہے ان پر کم بختوں کی بے وقوفی میں بھی خلوص ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے مسئلے حل کر دیں گے پر جب کسی عورت سے مڈبھیڑ ہو گی تو جناب ایسے چکر میں پھنس جائیں گے کہ ایک گز دُور کھڑی عورت تک پہنچنے کے لیے پشاور کا ٹکٹ لیں گے اور وہاں پہنچ کر سوچیں گے وہ عورت آنکھوں سے اوجھل کیسے ہو گئی۔ چودھری صاحب قبلہ، نکالیے اپنی نوٹ بک اور یہ لکھ لیجیے کہ آپ اوّل درجے کے چغد ہیں۔“

چودھری خاموش رہا اور مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ پرکاش، چودھری کو آئینہ بنا کر اس میں اپنی شکل دیکھ رہا ہے اور خود کو گالیاں دے رہا ہے۔ میں نے اسے کہا۔

”پرکاش ایسا لگتا ہے چودھری کے بجائے تم اپنے آپ کو گالیاں دے رہے ہو۔“

خلاف توقع اس نے جواب دیا۔

”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اس لیے کہ میں بھی ایک آرٹسٹ ہوں، یعنی میں بھی۔ جب دو اور دو چار بنتے ہیں تو خوش نہیں ہوتا۔ میں بھی قبلہ چودھری صاحب کی طرح امرتسر کے کمپنی باغ میں عورت سے مل کر فرنٹیئر میل سے پشاور جاتا ہوں اور وہاں آنکھیں مل مل کر سوچتا ہوں میری محبوبہ غائب کہاں ہو گئی۔“

یہ کہہ کر پرکاش خوب ہنسا۔ پھر چودھری سے مخاطب ہوا۔

”چودھری صاحب قبلہ، ہاتھ ملایئے۔ ہم دونوں پھسڈی گھوڑے ہیں۔ اس دوڑ میں صرف وہی کامیاب ہو گا جس کے ذہن میں صرف ایک ہی چیز ہو کہ اسے دوڑنا ہے، یہ نہیں کہ کام اور وقت کا سوال حل کرنے بیٹھ جائے۔ اتنے قدموں میں اتنا فاصلہ طے ہوتا ہے تو اتنے قدموں میں کتنا فاصلہ طے ہو گا۔ عشق جومیٹری ہے نہ الجبرا۔ پس بکواس ہے۔ چونکہ بکواس ہے اس لیے اس میں گرفتار ہونے والے کو بکواس ہی سے مدد لینی چاہیے۔“

”چودھری نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا بکواس کرتے ہو؟“

”تو سنو“!

پرکاش جم کر بیٹھ گیا۔

”میں تمہیں ایک سچا واقعہ سُناتا ہوں۔ میرا ایک دوست ہے، میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ دو برس ہُوئے وہ ایک ضروری کام سے چمبہ گیا۔ دو روز کے بعد لوٹ کر اسے ڈلہوزی چلا آنا تھا۔ اس کے فوراً بعد امرتسر پہنچنا تھا مگر تین مہینے تک وہ لاپتہ رہا۔ نہ اس نے گھر خط لکھا نہ مجھے جب واپس آیا تو اس کی زبانی معلوم ہُوا کہ وہ تین مہینے چمبہ ہی میں تھا۔ وہاں کی ایک خوبصورت لڑکی سے اسے عشق ہو گیا تھا۔“

چودھری نے پوچھا۔

”ناکام رہا ہو گا۔“

پرکاش کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”نہیں، نہیں۔ وہ کامیاب رہا۔ زندگی میں اسے ایک شاندار تجربہ حاصل ہوا۔ تین مہینے وہ چمبہ کی سردیوں میں ٹھٹھرتا اور اس لڑکی سے عشق کرتا رہا۔ واپس ڈلہوزی آنے والا تھا کہ پہاڑی کی ایک پگڈنڈی پر اس کافر جمال حسینہ سے اس کی مڈبھیڑ ہُوئی۔ تمام کائنات سکڑ کر اس کی لڑکی میں سما گئی اور وہ لڑکی پھیل کر والہانہ وسعت اختیار کر گئی۔ اس کو محبت ہو گئی تھی۔ قبلہ چودھری صاحب! سُنیئے۔ پندرہ دنوں تک متواتر وہ غریب اپنی محبت کو چمبہ کی یخ بستہ فضا میں دل کے اندر دبائے چھپ چھپ کر دور سے اس لڑکی کو دیکھتا رہا مگر اس کے پاس جا کر اس سے ہم کلام ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔ ہر دن گزرنے پر وہ سوچتا کہ دوری کتنی اچھی چیز ہے۔ اونچی پہاڑی پر وہ بکریاں چرا رہی ہے۔ نیچے سڑک پر اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے یہ شاعرانہ منظر لایئے اور داد دیجیے۔ اس پہاڑی پر عاشق صادق کھڑا ہے۔ دوسری پہاڑی پر اس کی سیمیں بدن محبوبہ۔ درمیان میں شفاف پانی کا نالہ بہہ رہا ہے۔ سبحان اللہ کیسا دلکش منظر ہے، چودھری صاحب قبلہ۔“

چودھری نے ٹوکا۔

”بکواس مت کرو جو واقعہ ہے، اسے بیان کرو۔“

پرکاش مسکرایا۔ تو سنیے۔ پندرہ دن تک میرا دوست عشق کے زبردست حملے کے اثرات دُور کرنے میں مصروف رہا اور سوچتا رہا کہ اسے جلدی واپس چلا جانا چاہیے۔ ان پندرہ دنوں میں اس نے کاغذ پنسل لے کر تو نہیں لیکن دماغ ہی دماغ میں اس لڑکی سے اپنی محبت کا کئی بار جائزہ لیا۔ لڑکی کے جسم کی ہر چیز اسے پسند تھی۔ لیکن یہ سوال درپیش تھا کہ اسے حاصل کیسے کیا جائے۔ کیا ایک دم بغیر کسی تعارف کے وہ اس سے باتیں کرنا شروع کر دے؟ بالکل نہیں، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کیوں، ہو کیسے نہیں سکتا۔ مگر فرض کر لیا جائے اس نے منہ پھیر لیا۔ جواب دیے بغیر اپنی بکریوں کو ہانکتی، پاس سے گزر گئی۔ جلد بازی کبھی بار آور نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے بات کیے بغیر اسے حاصل کیے کیا جا سکتا ہے؟ ایک طریقہ ہے، وہ یہ کہ اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کی جائے۔ اس کو اپنی طرف راغب کیا جائے۔ ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ لیکن سوال یہ ہے راغب کیسے کیا جائے۔ ہاتھ سے، اشارہ۔ نہیں، بالکل پوچ ہے۔ سو قبلہ چودھری صاحب! ہمارا ہیرو ان پندرہ دنوں میں یہی سوچتا رہا۔ سولہویں دن اچانک باؤلی پر اس لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ ہمارے ہیرو کے دل کی باچھیں کھل گئیں، لیکن ٹانگیں کانپنے لگیں۔ آپ نے اب ٹانگوں کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ لیکن جب مسکراہٹ کا خیال آیا تو اپنی ٹانگیں الگ کر دیں اور اس لڑکی کی پنڈلیوں کے متعلق سوچنے لگا جو اٹھی ہوئی گھگھری میں سے اسے نظر آئی تھیں۔ کتنی سڈول تھیں۔ لیکن وہ دن دُور نہیں جب وہ ان پر بہت آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر سکے گا۔ پندرہ دن اور گزر گئے۔ ادھر وہ مسکرا کر پاس سے گزرتی رہی۔ ادھر ہمارے ہیرو صاحب جوابی مسکراہٹ کی ریہرسل کرتے رہے۔ سوا مہینہ ہو گیا اور ان کا عشق صرف ہونٹوں پر ہی مسکراتا رہا۔ آخر ایک دن خود اس لڑکی نے مہر خاموشی توڑی اور بڑی ادا سے ایک سگریٹ مانگا۔ آپ نے ساری ڈبیا حوالے کر دی اور گھر آ کر ساری رات کپکپاہٹ پیدا کرنے والے خواب دیکھتے رہے۔ دوسرے دن ایک آدمی کو ڈلہوزی بھیجا اور وہاں سے سگریٹوں کے پندرہ پیکٹ منگوا کر ایک چھوٹے سے لڑکے کے ہاتھ اپنی محبوبہ کو بھجوا دیے۔ جب اس نے اپنی جھولی میں ڈالے تو آپ کے دل کو دور کھڑے بہت مسرت محسوس ہوئی۔ ہوتے ہوتے وہ دن بھی آ گیا۔ جب دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ کیسی باتیں؟ قبلہ چودھری صاحب بتایئے، ہمارا ہیرو کیا باتیں کرتا تھا اس سے؟“

چودھری نے اس کو اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے کیا معلوم۔“

پرکاش مسکرایا۔

”مجھے معلوم ہے قبلہ چودھری صاحب۔ گھر سے چلتے وقت وہ باتوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کرتا تھا۔ میں اس سے یہ کہوں گا، میں اس سے یہ کہوں گا جب وہ نالے کے پاس کپڑے دھوتی ہو گی تو میں آہستہ آہستہ جا کر اس کی آنکھیں میچ لوں گا پھر اس کی بغلوں میں گدگدی کروں گا لیکن جب اس کے پاس پہنچتا اور آنکھیں میچنے اور گدگدی کرنے کا خیال آتا تو اسے شرم آ جاتی۔ کیا بچپنا ہے۔ اور وہ اس سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ جاتا اور بھیڑ بکریوں کی باتیں کرتا رہتا۔ کئی دفعہ اسے خیال آیا کب تک یہ بھیڑ بکریاں اس کی محبت چرتی رہیں گی۔ دو

مہینے سے کچھ دن اوپر ہو گئے اور ابھی تک وہ اس کے ہاتھ تک نہیں لگا سکا۔ مگر وہ سوچتا کہ ہاتھ لگائے کیسے، کوئی بہانہ تو ہونا چاہیے لیکن پھر اسے خیال آتا بہانے سے ہاتھ لگانا بالکل بکواس ہے، لڑکی کی طرف سے اسے خاموش اجازت ملنی چاہیے کہ وہ اس کے بدن کے جس حصے کو بھی چاہے ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اب خاموش اجازت کا سوال آجاتا۔ اسے کیسے پتہ چل سکتا ہے اس نے خاموش اجازت دے دی ہے۔ قبلہ چودھری صاحب، اس کا کھوج لگاتے لگاتے پندرہ دن اور گزر گئے۔“

پرکاش نے سگریٹ سلگایا اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے کہنے لگا۔

”اس دوران میں وہ کافی گھل مل گئے تھے۔ لیکن اس کا اثر ہمارے ہیرو کے حق میں بُرا ہوا۔ دوران گفتگو میں اس نے لڑکی سے اپنے اونچے خاندان کا کئی بار ذکر کیا تھا، اپنے اوباش دوستوں پر کئی بار لعنتیں بھیجی تھیں جو پہاڑی دیہاتوں میں جا کر غریب لڑکیوں کو خراب کرتے تھے۔ کبھی دبی زبان میں، کبھی بلند بانگ اپنی تعریف بھی کی تھی۔ اب وہ کیسے اس لڑکی پر اپنی شہوانی خواہش ظاہر کرتا۔ ظاہر تھا کہ معاملہ بہت ٹیڑھا اور پیچدار ہو گیا ہے۔ مگر اس کا جذبہ عشق سلامت تھا اس لیے اسے اُمید تھی کہ ایک روز خود لڑکی ہی اپنا آپ تھالی میں ڈال کر اس کے حوالے کر دے گی۔ اس اُمید میں چنانچہ کچھ دن اور بیت گئے ایک روز کپڑے دھوتے دھوتے لڑکی نے جب کہ ہاتھ صابن سے بھرے ہوئے تھے اس سے کہا۔

”تمہاری ماچس ختم ہو گئی ہے میری جیب سے نکال لو۔ یہ جیب عین اس کی چھاتی کے ابھار کے اوپر تھی۔ ہمارا ہیرو جھینپ گیا۔ لڑکی نے کہا۔

”نکال لو نا“

۔ تھوڑی سی ہمت کر کے اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھایا اور دو انگلیاں بڑی احتیاط سے اس کی جیب میں ڈالیں۔ ماچس بہت نیچے تھی۔ گھبرایا۔ کہیں اور نہ جا ٹکرائیں۔ چنانچہ باہر نکال لیں اور اپنی خالی ماچس سے تیلی نکال کر سگریٹ سلگایا اور لڑکی سے کہا

”تمہاری جیب سے ماچس پھر کبھی نکالوں گا۔“

یہ سن کر لڑکی نے شریر شریر نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ ہمارے ہیرو نے آدھا میدان مار لیا۔ دوسرا آدھا مارنے کے لیے وہ اسکیمیں سوچنے لگا۔ ایک روز صبح سویرے نالے کے اس طرف بیٹھا، دوسری طرف ندی پر اس لڑکی کو بکریاں چراتے دیکھ رہا تھا اور اس کی اُبھری ہوئی جیب کے مال پر غور کر رہا تھا کہ نیچے سڑک پر باؤلی کے پاس ایک موٹر لاری رکی۔ سکھ ڈرائیور نے باہر نکل کر پانی پیا اور اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

”میرے دل میں ایک جلن سی پیدا ہوئی۔ باؤلی کی منڈیر پر کھڑے ہو کر اس موبل آئل سے لتھڑے ہوئے سکھ ڈرائیور نے پھر ایک بار ساوتری کی طرف دیکھا اور اپنا غلیظ ہاتھ اٹھا کر اسے اشارہ کیا۔ میرے جی میں آئی پاس پڑا ہوا پتھر اس پر لڑھکا دوں۔ اشارہ کرنے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ منہ کے ادھر ادھر رکھ کر نہایت ہی بھونڈے طریقے سے پکارا۔

”او جانی۔ میں صدقے۔ آؤں؟۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سکھ ڈرائیور نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ میرا دل گھٹنے لگا۔ چند منٹوں ہی میں وہ حرام زادہ اس کے پاس کھڑا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر اس نے کوئی بدتمیزی کی تو وہ چھڑی سے اس کی ایسی مرمت کرے گی کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔ میں ادھر سے نگاہ ہٹا کر اس مرمت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک دم دونوں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں بھاگا نیچے، سڑک کی طرف باؤلی کے پاس پہنچ کر سوچا کیا حماقت ہے۔ تشویش کیسی؟ لیکن پھر خیال آیا کہیں وہ الو کا پٹھا دراز دستی نہ کر بیٹھے۔ اس لیے پہاڑی پر تیزی سے چڑھنا شروع کیا۔ بڑی مشکل چڑھائی تھی۔ جگہ جگہ خار دار جھاڑیاں تھیں۔ ان کو پکڑ کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ بہت دُور اوپر چلا گیا پر وہ دونوں کہیں نظر نہ آئے۔ ہانپتے ہانپتے میں نے اپنے سامنے کی جھاڑی پکڑ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ کیا دیکھتا ہوں جھاڑی کے دوسری طرف پتھروں پر ساوتری لیٹی ہے اور اس غلیظ ڈرائیور کی داڑھی اس کے چہرے پر بکھری ہوئی ہے۔ میری۔ میرے جسم کے سارے بال جل گئے۔ ایک کروڑ گالیاں ان دونوں کے لیے میرے دل میں پیدا ہوئیں۔ لیکن ایک لحظے کے لیے سوچا تو محسوس ہوا کہ دنیا کا سب سے بڑا چغد میں ہوں۔۔ اسی وقت نیچے اترا اور سیدھا لاریوں کے اڈے کا رخ کیا۔“

پرکاش کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں۔

چند مکالمے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوچند مکالمے

”السلام و علیکم“

”و علیکم السلام“

”کہیے مولانا کیا حال ہے“

”اللہ کا فضل و کرم ہے ہر حال میں گزر رہی ہے“

”حج سے کب واپس تشریف لائے“

”جی آپ کی دُعا سے ایک ہفتہ ہو گیا ہے“

”اللہ اللہ ہے آپ نے ہمت کی تو خانہ کعبہ کی زیارت کر لی۔ ہماری تمنا دل ہی میں رہ جائے گی دُعا کیجیے یہ سعادت ہمیں بھی نصیب ہو۔“

”انشاء اللہ ورنہ میں گنہگار کس قابل ہوں۔“

”میرے لائق کوئی خدمت“

”کسی تکلیف کی ضرورت نہیں ہاں دیکھیے ذرا کان کیجیے ادھر میرے ہاں کھانڈ کی دو بوریاں ہیں۔ میری بے شمار لوگوں سے جان پہچان ہے کسی کو ضرورت ہو تو مجھ سے فرما دیجیے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ دام واجبی ہوں گے“

”لیجیے جناب ہماری خدمات کا صِلہ مل گیا“

”کیا۔ ویسے مبارک ہو“

”سو سو مبارک۔ کمپنی نے نوکری سے جواب دیا۔“

”ہائیں۔ یہ کب کی بات ہے“

”ایک مہینہ ہو گیا ہے“

”لاحول ولا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔“

”دو سو ملازموں کی چھانٹی ہوئی تھی نا۔“

”بہت افسوس کی بات ہے کوئی احتجاج وغیرہ ہوا تھا۔“

”سینکڑوں ہڑتالیں ہوئیں جلوس نکلے کئی مرتبہ لوگوں نے بھوک ہڑتال کی، وعدے ہوئے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔“

”تعجب ہے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی“

”اللہ رحم کرے۔“

”اللہ رحم نہیں کرے گا۔ وہ دن لد گئے۔ جب وہ مائل بہ کرم ہوا کرتا تھا۔ اتنے آدمی ہیں وہ کس کس کی حاجت روائی کرے۔ میرا تو خیال ہے اُوپر آسمانوں پر بھی راشننگ سسٹم ہو گیا ہے“

”میں اس بدذات سے کیا کہوں صاف مجھے دغا دے گیا۔“

”کیسے۔؟“

”حرامزادے نے وعدہ کیا۔ اور دونوں گاڑیاں ٹھکانے لگا دیں۔“

”اس کی وجہ“

”میں نے اُس کا ایک کام کیا تھا اس کے عوض میں اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے ایک بیوک کار جو اس کے پاس آنے والی تھی آدھی قیمت پر دے دے گا“

”اور جو تم نے اُس کا کام کیا تھا وہ لاکھوں کا تھا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں بلڈی سوائن نے میرے ساتھ دھوکا کیا لیکن میں اس سے بدلہ لوں گا۔ خود بیوک میرے گھر پہنچا کے جائے گا۔“

”باورچی کو بلاؤ۔ جلدی بلاؤ۔ ہم اس سے بات کرنا مانگتا ہے۔“

”حضور حاضر ہوں“

”یہ تم نے آج کیسے واہیات کھانے پکائے ہیں“

”حضور۔“

”حضور کے بچے اس پلیٹ سے بیگم صاحب نے ایک ہی نوالہ اُٹھایا تھا کہ انھیں متلی آگئی۔ “

”حضور ممکن ہے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو۔ معافی چاہتا ہوں“

”معافی کے بچے۔ اُٹھاؤ سالن باہر پھینک آؤ۔ “

”ہم نوکر کھالیں گے سرکار۔ “

”نہیں باہر ڈسٹ بن میں ڈال دو۔ اور تم سزا کے طور پر بھوکے رہو۔ “

”اٹھیے بیگم ہم کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔ “

”اماں۔ اب گزارا کیسے ہو گا یہاں لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آگیا ہے۔ “

”تو ٹھیک کہتی ہے بیٹا“

”سارا بازار ہی مندا ہے“

”کیوں۔ ؟“

”لوگوں کے پاس روپیہ جو نہیں“

”لیکن جو سڑکوں پر اتنی شاندار موٹریں چلتی ہیں۔ یہ جو عورتیں تن پر زرق برق لباس پہنے ہوتی ہیں یہ کہاں سے آتا ہے (اماں“(

”ان لوگوں کے پاس ہے“

”تو پھر بازار کیوں مندا ہے“

”اب ان لوگوں نے اپنے آپس ہی میں ہمارا دھندا شروع کر دیا ہے۔ “

”ڈارلنگ۔ “

”جی۔ “

”ساری دکانیں چھان ماریں مگر تمہارے سائز کی میدم فورم بریزر نہ مل سکی“

”اوہ! ہاؤ سیڈ۔ میرا سائز ہی کیا واہیات سا ہے۔ “

”دعوت تو جناب ایسی ہو گی کہ یہاں کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ لیکن ایک افسوس ہے کہ فرانس سے جو میں نے شمپیئن منگوائی تھی وقت پر نہ پہنچ سکے گی“

”اجی سُنیے تو۔ “

”اوہ آپ۔ مجھے بڑا ضروری کام ہے۔ معاف فرمایئے۔ “

”معافیاں تم لاکھ مرتبہ مانگ چکے ہو۔ وہ میرا سو روپے کا قرض ادا کرو جو تم نے آج سے قریب قریب ایک سال ہوا لیا تھا۔ “

”میں پھر معافی چاہتا ہوں میری بیوی بیمار ہے دوا لینے جا رہا ہوں“

”میں ان گھسوں میں آنے والا نہیں خدا کی قسم اگر آج میرا قرض ادا نہ ہوا تو سر پھوڑ دوں گا تمہارا۔ “

”آپ کیوں اتنی زحمت اُٹھائیں میں خود ہی اس دیوار کے ساتھ ٹکر مار کے اپنا سر پھوڑے لیتا ہوں۔ یہ لیجیے۔ “

”یہ چرس کی لت تمھیں کہاں سے پڑی“

”کیا بتاؤں یار اب تو اس کے بغیر رہا ہی نہیں جاتا۔ “

”میں نے تم سے پوچھا تھا کہ لت کہاں سے پڑی تم نے کچھ اور ہی ہانکنا شروع کر دیا ہے“

”بھائی یہ لت مجھے جیل میں لگی“

”جیل میں۔ وہاں تو ایک مکھی بھی اندر نہیں جا سکتی“

”بھائی میرے وہاں مگر مچھ بھی جا سکتے ہیں ہاتھی بھی جا سکتے ہیں اگر تمہارے پاس دولت ہے تو آپ وہاں ایک دو ہاتھی بھی ساتھ رکھ سکتے ہیں“

”پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ بتاؤ یہ چرس وہاں کیسے پہنچ سکتی ہے“

”ویسے ہی جیسے ہم وہاں پہنچ سکتے ہیں میرے عزیز جیل خانہ صرف اُن لوگوں کے لیے جیل خانہ ہے جو صاحبِ استطاعت نہیں جو دولت مند مجرم ہیں اُن کو وہاں ہر قسم کی مراعات مل سکتی ہیں اور ملتی ہیں“

”اگر تم چاہو تو تمھیں وہاں شراب مل سکتی ہے گانجہ مل سکتا ہے افیون دستیاب ہو سکتی ہے۔ اگر تم بڑے رئیس ہو تو اپنی بیوی کو بھی وہاں بُلا سکتے ہو۔ جو رات بھر تمہاری مٹھی چاپی کرتی رہے گی۔“

”جیل خانوں میں ایک

”خاکی“

مارکیٹ ہوتی ہے جو بلیک مارکیٹ سے زیادہ ایماندار ہے۔“

”کرنل صاحب آپ کی عمر کتنی ہو گی۔“

”میرا خیال ہے پینسٹھ کے قریب ہو گی۔ آپ کی“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں ماشاء اللہ ابھی جوان ہیں۔ میری عُمر۔ میری عمر یہی پچیس چھبیس برس کے قریب ہو گی۔“

”تو ہم دونوں سچ بول رہے ہیں“

مجھے لپ اسٹک سے نفرت ہے معلوم نہیں عورتیں اسے کیوں استعمال کرتی ہیں اس سے ہونٹوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔

”مجھے خود اس سے نفرت ہے“

”لیکن تمہارے ہونٹوں پر تو یہ واہیات چیز موجود ہے خون کی طرح سُرخ ہو رہے ہیں۔“

”یہ سرخی میرے اپنے ہونٹوں کی ہے۔ یعنی مصنوعی نہیں“

”تو آؤ ایک بوسہ لے لُوں۔“

”بڑے شوق سے“

”پرے ہٹیے اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ مرد بھی لپ اسٹک استعمال کرتے ہیں۔“

”وہ کیسے“

”ذرا آئینے میں اپنے ہونٹ ملاحظہ فرمایئے“

”صاحب آپ سے کوئی ملنے آیا ہے“

”کہہ دو صاحب گھر میں نہیں ہیں“

”بہت اچھا جناب۔“

چلا گیا۔“

”جی نہیں چلی گئی۔“

”کیا مطلب۔“

”جی وہ ایک ایکٹریس تھی جس کا نام۔“

”بھاگو بھاگو جلدی اُس کو بُلا کے لاؤ اور کہو تم نے جھوٹ بولا تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔“

”آپ آج کل کہاں غائب رہتے ہیں“

”بیگم ایک یتیم بچہ ہے اُس کو دیکھنے کبھی کبھی چلا جاتا ہوں“

”اُس یتیم بچے سے آپ کو اتنی دلچسپی کیوں ہے“

”یتیم جو ہوا۔“

”آپ کی جیب میں اس کا فوٹو بھی موجود رہتا ہے“

”اس لیے۔ اس لیے۔“

”کہ وہ آپ کا یتیم بچہ ہے“

”نون سنس۔“

”آپ کی قمیص پر سرخ دھبہ کیسے لگا۔“

”میری قمیص پر۔ کہاں ہے“

”داہنے ہاتھ۔ گریبان کے قریب۔“

”اوہ۔ میں جب دفتر میں کسی ضروری مسئلے پر غور کر رہا ہوتا ہوں“

تو مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا یہ لال پنسل کا نشان ہے جس سے میں نے کھجلا لیا ہو گا۔

”جی ہاں لیکن اس میں سے تو میکس فیکٹر کی خوشبو آرہی ہے۔“

”تم آج کل کس کی بیوی ہو“

”کل تو مسٹر۔ کی تھی آج چھٹی پر ہوں“

”آپ میدان جنگ میں جارہے ہیں خدا آپ کا حافظ و ناصر ہو لیکن مجھے کوئی نشانی دیتے جائیے۔“

”میری نشانی تو تم خود ہو“

”نہیں کوئی ایسی چیز دیتے جائیے جس کو دیکھ کر اپنا دل بہلاتی رہوں“

”میں وہاں سے بھیج دُوں گا۔“

”کیا چیز۔“

”وہ زخم جو مجھے لڑنے کے دوران آئیں گے“

”آپ کی بیگم کیسی ہیں“

”یہ تو آپ کو معلوم ہو گا۔ اپنی بیگم کے بارے میں مجھ سے دریافت فرماسکتے ہیں“

”وہ کیسی ہیں“

”پہلے سے بہتر اور خوش ہیں۔ اُن کی طبیعت بہت پسند آئی۔“

”یار تم اتنی عورتوں سے یارانہ کیسے گانٹھ لیتے ہو“

”یارانہ کہاں گانٹھتا ہوں باقاعدہ شادی کرتا ہوں“

”شادی کرتے ہو“

”ہاں بھائی میں حرام کاری کا قائل نہیں شادی کرتا ہوں اور جب اُکتا جاتا ہوں تو حقِ مہر ادا کر کے اُس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہوں“

”اسلام زندہ باد۔“!

چودھویں کا چاند

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوچودھویں کا چاند

اکثر لوگوں کا طرزِ زندگی، ان کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ اور بعض بیکار اپنی تقدیر کا رونا روتے ہیں۔ حالانکہ اس سے حاصل وصول کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں اگر حالات بہتر ہوتے تو وہ ضرور دنیا میں کچھ کر دکھاتے۔ بیشتر ایسے بھی ہیں جو مجبوریوں کے باعث قسمت پر شاکر رہتے ہیں۔ ان کی زندگی ان ٹرام کاروں کی طرح ہے جو ہمیشہ ایک ہی پٹڑی پر چلتی رہتی ہیں۔ جب کنڈم ہو جاتی ہیں تو انہیں محض لوہا سمجھ کر کسی کباڑی کے پاس فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ایسے انسان بہت کم ہیں۔ جنہوں نے حالات کی پروانہ کرتے ہوئے زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لی۔ ٹامسن ولسن بھی اسی قبیل سے تھا۔ اس نے اپنی زندگی بدلنے کیلیے انوکھا قدم اُٹھایا۔ پر اُس کی منزل کا چونکہ کوئی پتا نہیں تھا، اس لیے اس کی کامیابی کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کے اس انوکھے پن کے متعلق میں نے بہت کچھ سنا۔ سب سے پہلے لوگ یہی کہتے کہ وہ خلوت پسند ہے لیکن میں نے دل میں تہیّہ کر لیا کہ کسی نہ کسی

حیلے اُسے اپنی داستانِ زندگی بیان کرنے پر آمادہ کرلوں گا کیونکہ مجھے دوسرے آدمیوں کے بیان کی صداقت پر اعتماد نہیں تھا۔ میں چند روز کے لیے ایک صحت افزا مقام پر گیا، وہیں اس سے ملاقات ہوئی۔ میں دریا کنارے اپنے میزبان کے ساتھ کھڑا تھا کہ وہ ایک دم پکار اُٹھا۔

”ولسن“

میں نے پوچھا۔

”کہاں ہے؟“

میرے میزبان نے جواب دیا۔

”ارے بھئی! وہی جو منڈیر پر نیلی قمیص پہنے ہماری طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور مجھے نیلی قمیص اور سفید بالوں والا سر نظر آیا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ وہ مڑ کر دیکھے اور ہم اسے سیر و تفریح کے لیے ساتھ لے جائیں۔ اُس وقت سورج کا عکس دریا میں ڈُوب رہا تھا۔ سیر کرنے والے چہچہا رہے تھے۔ اتنے میں گرجے کی یک آہنگ گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں اُس وقت قدرت کی دل فریبیوں سے اس قدر مسحور ہو چکا تھا کہ ولسن کو اپنی طرف آتے نہ دیکھ سکا۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میرے دوست نے اسے روک لیا اور اس کا مجھ سے تعارف کرایا۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا، لیکن کسی قدر بے اعتنائی سے۔ میرے دوست نے اس کو محسوس کیا اور اس کو شراب کی دعوت دی۔ مدعو کیے جانے پر وہ مسکرایا۔ اگرچہ اس کے دانت خوبصورت نہ تھے پھر بھی اس کی مسکراہٹ دلکش تھی۔ وہ نیلی قمیص اور خاکستری پتلون پہنے تھا جو کسی حد تک میلی تھی۔ اس کے لباس کو اس کے جسم کی ساخت سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ لمبوترا، پتلے ہونٹ اور آنکھیں بھورے رنگ کی تھیں۔ چہرے کے خطوط نمایاں، جن سے نمایاں تھا کہ جوانی میں وہ ضرور قبول صورت ہو گا۔ وضع قطع کے اعتبار سے وہ کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔ ہم چہل قدمی کرتے، ایک ریستوران میں پہنچ کر، اس سے ملحقہ باغیچے میں بیٹھ گئے اور بیرے کو شراب لانے کے لیے کہا۔ ہوٹل والے کی بیوی بھی وہاں موجود تھی۔ ادھیڑپن کی وجہ سے اب اس میں وہ بات نہیں رہی تھی لیکن چہرے کا نکھار اب بھی گزری ہوئی کراری جوانی کی چغلیاں کھا رہا تھا۔ تیس سال پہلے بڑے بڑے آرٹسٹ اس کے دیوانے تھے، اس کی بڑی بڑی شرابی آنکھوں اور شہد بھری مسکراہٹوں میں عجب دل کشی تھی۔ ہم تینوں بیٹھے یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ چونکہ موضوع دلچسپ نہیں تھے۔ اس لیے ولسن تھوڑی دیر کے بعد رخصت مانگ کر چلا گیا۔ ہم بھی اس کے رخصت ہونے پر اداس ہو گئے۔ راستے میں میرے دوست نے ولسن کے بارے میں کہا۔

”مجھے تو تمہاری سنائی ہوئی کہانی بے سر وپا معلوم ہوتی ہے۔“

”کیوں؟“

”وہ اس قسم کی حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔“

اس نے کہا

”کوئی شخص کسی کی فطرت کے متعلق صحیح اندازہ کیسے لگا سکتا ہے؟“

”مجھے تو وہ عام انسان دکھائی دیتا ہے۔ جو چند محفوظ کفالتوں کے سہارے کاروبار سے علیحدہ ہو چکا ہے۔“

”تم یہی سمجھو، ٹھیک ہے۔“

دوسرے دن دریا کنارے ولسن ہمیں پھر دکھائی دیا۔ بھورے رنگ کا لباس پہنے، دانتوں میں پائپ دبائے کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کی جھریوں اور سفید بالوں سے بھی جوانی پھوٹ رہی ہے۔ ہم کپڑے اتار کر پانی کے اندر چلے گئے۔ جب میں نہا کر باہر نکلا تو ولسن زمین پر اوندھے منہ لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں سگریٹ سلگا کر اس کے پاس گیا۔ اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا

”بس، نہا چکے۔“

میں نے جواب دیا۔

”ہاں۔ آج تو لُطف آ گیا۔ دُنیا میں اس سے بہتر نہانے کی اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ تم یہاں کتنی مدت سے ہو۔“

اُس نے جواب دیا۔

”پندرہ برس سے۔“

یہ کہہ کر وہ دریا کی مچلتی ہوئی نیلی لہروں کی طرف دیکھنے لگا، اس کے باریک ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”پہلی بار یہاں آتے ہی مجھے اس جگہ سے محبت ہو گئی۔ تمہیں اس جرمن کا قصّہ معلوم ہے، جو ایک بار یہاں لنچ کھانے آیا اور یہیں کا ہو کے رہ گیا۔ وہ چالیس سال یہاں رہا۔ میرا بھی یہی حال ہو گا۔ چالیس برس نہیں تو پچیس تو کہیں نہیں گئے۔“

میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی گفتگو جاری رکھے۔ اس کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اس کے افسانے کی حقیقت ضرور کچھ ہے۔ اتنے میں میرا دوست بھیگا ہوا ہماری طرف آیا۔ بہت خوش تھا کیونکہ وہ دریا میں ایک میل تیر کر آ رہا تھا۔ اس کے آتے ہی ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اور بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے بعد ولسن سے متعدد بار ملاقات ہوئی، اس کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں۔ وہ اس جزیرے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ایک دن چاندنی رات کا لُطف اٹھانے کے بعد، میں نے اور میرے دوست نے سوچا کہ چلو مونٹی سلارو کی پہاڑی کی سیر کریں۔ میں نے ولسن سے کہا کہ

”آؤ یار تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

ولسن نے میری دعوت قبول کرلی۔ لیکن میرا دوست ناسازی طبع کا بہانہ کر کے ہم سے جدا ہو گیا۔ خیر، ہم دونوں پہاڑی کی جانب چل دیے اور اس سیر کا خوب لُطف اُٹھایا۔ شام کے دُھندلکے میں تھکے ماندے، بھوکے سرائے میں آئے۔ کھانے کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا جو بہت لذیذ ثابت ہوا۔ شراب، انگور کی تھی۔ پہلی بوتل تو سویاں کھانے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ دوسری کے آخری جام پینے کے بعد میرے اور ولسن کے دماغ میں بیک وقت یہ خیال سمانے لگا کہ زندگی کچھ ایسی دشوار نہیں۔ ہم اس وقت باغیچے میں انگوروں سے لدی ہوئی بیل کے نیچے بیٹھے تھے۔ رات کی خاموش فضا میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سرائے کی خادمہ ہمارے لیے پنیر اور انجیریں لے آئی۔ ولسن تھوڑے سے وقفے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔

”ہمارے چلنے میں ابھی کافی دیر ہے۔ چاند کم از کم ایک گھنٹے تک پہاڑی کے اوپر آئے گا۔“

میں نے کہا۔

”ہمارے پاس فرصت ہی فرصت ہے۔ یہاں آ کر کوئی انسان بھی عجلت کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔“

ولسن مسکرایا۔

”فرصت۔ کاش لوگ اس سے واقف ہوتے۔ ہر انسان کو یہ چیز مفت میسر ہو سکتی ہے۔ لیکن لوگ کچھ ایسے بے وقوف ہیں کہ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ کام؟۔ کم بخت، اتنا سمجھنے کے بھی اہل نہیں کہ کام کرنے سے غرض صرف فرصت حاصل کرنا ہے۔“

شراب کا اثر عموماً بعض لوگوں کو غور و فکر کی طرف لے جاتا ہے۔ ولسن کا خیال اپنی جگہ درست تھا۔ مگر کوئی اچھوتی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور کہنے لگا۔

”جب میں پہلی بار یہاں آیا، تو چاندنی رات کا سماں تھا۔ آج بھی وہی چودھویں کا چاند آسمان پر نظر آئے گا۔“

میں مسکرا دیا۔

”ضرور نظر آئے گا“

وہ بولا۔

”دوست، میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ جب میں اپنی زندگی کے پچھلے پندرہ برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ طویل عرصہ ایک مہینے کا دُھندلکا وقفہ سا لگتا ہے۔ آہ، وہ رات، جب پہلی بار، میں نے چبوترے پر بیٹھ کر چاند کا نظارہ کیا۔ کرنیں دریا کی سطح پر چاندی کے پترے چڑھا رہی تھیں۔ میں نے اس وقت شراب ضرور پی رکھی تھی۔ لیکن دریا کے نظارے اور آس پاس کی فضا نے جو نشہ پیدا کیا۔ وہ شراب کبھی پیدا نہ کر سکتی۔“

اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے۔ اس نے اپنا گلاس اُٹھایا، مگر وہ خالی تھا، ایک بوتل منگوائی گئی، ولسن نے دو چار بڑے بڑے گھونٹ پیے اور کہنے لگا۔

”اگلے دن میں دریا کنارے نہایا اور جزیرے میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ بڑی رونق تھی۔ معلوم ہوا کہ حسن و عشق کی دیوی افروڈائٹ کا تیوہار ہے۔ مگر میری تقدیر میں سدا بینک کا منتظم ہونا ہی لکھا ہوتا تو یقیناً مجھے ایسی سیر کبھی نصیب نہ ہوتی۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا تم کسی بینک کے منیجر تھے؟“

”ہاں بھائی تھا۔ وہ رات میرے قیام کی آخری رات تھی کیونکہ پیر کی صبح مجھے بینک میں حاضر ہونا تھا۔ پر جب میں نے چاند دریا اور کشتیوں کو دیکھا تو ایسا بے خود ہوا کہ واپس جانے کا خیال میرے ذہن سے اتر گیا۔“

اس کے بعد اس نے اپنے گزشتہ واقعات تفصیل سے بتائے اور کہا کہ وہ جزیرے میں پندرہ سال سے مقیم ہے اور اب اس کی عمر انچاس برس کی تھی۔ پہلی بار جب وہ یہاں آیا تو اس نے سوچا کہ ملازمت کا طوق گلے سے اُتار دینا چاہیے اور زندگی کے باقی ایام یہاں کی مسحور کن فضاؤں میں گزارنے چاہئیں۔ جزیرے کی فضا اور چاند کی روشنی ولسن کے دماغ پر اس قدر

غالب آئی کہ اس نے بینک کی ملازمت ترک کر دی۔ اگر وہ چند برس اور وہاں رہتا تو اسے معقول پنشن مل جاتی۔ مگر اس نے اس کی مطلق پروانہ کی۔ البتہ بینک والوں نے اسے اس کی خدمات کے عوض انعام دیا۔ ولسن نے اپنا گھر بیچا اور جزیرے کا رخ کیا۔ اس کے اپنے حساب کے مطابق وہ پچیس برس تک زندگی بسر کر سکتا تھا۔ میری اس سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا اعتدال پسند ہے۔ اسے کوئی ایسی بات گوارا نہیں جو اس کی آزادی میں خلل ڈالے، اسی وجہ سے عورت بھی اس کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ صرف قدرتی مناظر کا پرستار تھا۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد صرف اپنے لیے خوشی تلاش کرنا تھا اور اسے یہ نایاب چیز مل گئی تھی۔ بہت کم انسان خوشی کی تلاش کرنا جانتے ہیں، میں نہیں کہہ سکتا وہ سمجھدار تھا یا بے وقوف۔ اتنا ضرور ہے کہ اپنی ذات کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔ آخری ملاقات کے بعد میں نے اپنے میزبان دوست سے رخصت چاہی اور اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں جنگ چھڑ گئی اور میں تیرہ برس تک اس جزیرے پر نہ جا سکا۔ تیرہ برس کے بعد جب میں جزیرے پر پہنچا تو میرے دوست کی حالت بہت خستہ ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ہوٹل میں کمرے کرائے پر لیا کھانے پر اپنے دوست سے ولسن کے متعلق بات ہوئی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی یہ خاموشی بڑی افسردہ تھی۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"کہیں اس نے خودکشی تو نہیں کر لی۔"

میرے دوست نے آہ بھری۔

"یہ درد بھری داستان میں تمھیں کیا سناؤں۔ ولسن کی اسکیم معقول تھی کہ وہ پچیس برس آرام سے گزار سکتا ہے۔ پر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آرام کے پچیس برس گزارنے کے ساتھ ہی اس کی قوتِ ارادی ختم ہو جائے گی۔ قوتِ ارادی کو زندہ رکھنے کے لیے کشمکش ضروری ہے۔ ہموار زمین پر چلنے والے پہاڑیوں پر نہیں چڑھ سکتے۔ اس کا تمام روپیہ ختم ہو گیا۔ ادھار لیتا رہا۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا۔ قرض خواہوں نے اسے تنگ کرنا شروع کیا۔ آخر ایک روز اس نے اپنی جھونپڑی کے اس کمرے میں جہاں وہ سوتا تھا، بہت سے کوئلے جلائے اور دروازہ بند کر دیا۔ صبح جب اس کی نوکرانی ناشتہ تیار کرنے آئی تو اسے بے ہوش پایا۔ لوگ اسے ہسپتال لے گئے۔ بچ گیا پر اس کا دماغ قریب قریب ماؤف ہو گیا۔ میں اس سے ملنے گیا لیکن وہ کچھ اس طرح حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے مجھے پہچان نہیں سکا۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"اب کہاں رہتا ہے۔"

"گھر بار تو اس کا نیلام ہو گیا ہے۔ پہاڑیوں پر آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ اسے پکارا، مگر وہ میری شکل دیکھتے ہی جنگلی ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرتا دوڑ گیا۔"

دو تین دن کے بعد جب میں اور میرا دوست چہل قدمی کر رہے تھے کہ میرا دوست زور سے پکارا۔

"ولسن"

میری نگاہوں نے اسے زیتون کے درخت کے پیچھے چھپتا دیکھا۔ ہمارے قریب پہنچنے پر اس نے کوئی حرکت نہ کی، بس ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر ایکا ایکی جوانوں کے مانند بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے پھر اس کو کبھی نہ دیکھا۔ گھر واپس آیا تو ایک برس کے بعد میرے دوست کا خط آیا کہ ولسن مر گیا۔ اس کی لاش پہاڑی کے کنارے پڑی تھی۔ چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ سوتے میں دم نکل گیا ہے۔ اس رات چودھویں کا چاند تھا۔ میرا خیال ہے، شاید یہ چودھویں کا چاند ہی اس کی موت کا سبب ہو۔

چور

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوچور

مجھے بے شمار لوگوں کا قرض ادا کرنا تھا اور یہ سب شراب نوشی کی بدولت تھا۔ رات کو جب میں سونے کے لیے چارپائی پر لیٹتا تو میرا ہر قرض خوا میرے سرہانے موجود ہوتا۔ کہتے ہیں کہ شرابی کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ میرے ضمیر کا معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ ہر روز مجھے سرزنش کرتا اور میں خفیف ہو کے رہ جاتا۔ واقعی میں نے بیسیوں آدمیوں سے قرض لیا تھا۔ میں نے ایک رات سونے سے پہلے بلکہ یوں کہیے کہ سونے کی ناکام کوشش کرنے سے پہلے حساب لگایا تو قریب قریب ڈیڑھ ہزار روپے میرے ذمے نکلے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے سوچا یہ ڈیڑھ ہزار روپے کیسے ادا ہوں گے۔ بیس پچیس روزانہ کی آمدن ہے لیکن وہ میری شراب کے لیے بمشکل کافی ہوتے ہیں۔ آپ یوں سمجھیے کہ ہر روز کی ایک بوتل۔ تھرڈ کلاس رم کی۔ دام ملاحظہ ہوں۔ سولہ روپے۔ سولہ روپے تو ایک طرف رہے، ان کے حاصل کرنے میں کم از کم تین روپے ٹانگے پر صرف ہو جاتے تھے۔ کام ہوتا نہیں تھا، بس پیشگی پر گزارہ تھا۔ لیکن جب پیشگی دینے والے تنگ آ گئے تو اُنھوں نے میری شکل دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیا یا اس سے پیشتر کہ میں ان سے ملوں کہیں غائب ہو گئے۔ آخر کب تک وہ مجھے پیشگی دیتے رہتے۔ لیکن میں مایوس نہ ہوتا اور خدا پر بھروسہ رکھ کر کسی نہ کسی حیلے سے دس پندرہ روپے اُدھار لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ لوگ میری عزت کرتے تھے مگر اب وہ میری شکل دیکھتے ہی بھاگ جاتے تھے۔ سب کو افسوس تھا کہ اتنا اچھا مکینک تباہ ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت اچھا مکینک تھا۔ مجھے کوئی بگڑی مشین دے دی جاتی تو میں اُس کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد یوں چٹکیوں میں ٹھیک کر دیتا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری یہ

ذہانت صرف شراب ملنے کی اُمید پر قائم تھی، اس لیے کہ میں پہلے طے کرلیا کرتا تھا کہ اگر کام ٹھیک ہو گیا تو وہ مجھے اتنے روپے ادا کر دیں گے جن سے میرے دو روز کی شراب چل سکے۔ وہ لوگ خوش تھے۔ مجھے وہ تین روز کی شراب کے دام ادا کر دیتے۔ اس لیے کہ جو کام میں کر دیتا وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگ مجھے لُوٹ رہے تھے۔ میری ذہانت وذکاوت پر میری اجازت سے ڈاکے ڈال رہے تھے۔ اور لُطف یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ میں اُنھیں لُوٹ رہا ہوں۔ اُن کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہوں۔ اصل میں مجھے اپنی صلاحتیوں کی کوئی قدر نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ میکنزم بالکل ایسی ہے جیسے کھانا کھانا یا شراب پینا۔ میں نے جب بھی کوئی کام ہاتھ میں لیا مجھے کوفت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ جب شام کے چھ بجنے لگتے تو میری طبیعت بے چین ہو جاتی۔ کام مکمل ہو چکا ہوتا مگر میں ایک دو پیچ غائب کر دیتا تاکہ دوسرے روز بھی آمدن کا سلسلہ قائم رہے۔ یہ شراب حرامزادی کتنی بُری چیز ہے کہ آدمی کو بے ایمان بھی بنا دیتی ہے۔ میں قریب قریب ہر روز کام کرتا تھا۔ میری مانگ بہت زیادہ تھی اس لیے کہ مجھ ایسا کاریگر ملک بھر میں نایاب تھا۔ تار باجا اور راگ بوجھا والا حساب تھا۔ میں مشین دیکھتے ہی سمجھ جاتا تھا کہ اس میں کیا قصور ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں۔ مشینری کتنی ہی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو اُس کو ٹھیک کرنے میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگنا چاہیے۔ لیکن اگر اس میں نئے پرزوں کی ضرورت ہو اور آسانی سے دستیاب نہ ہو رہے ہوں تو اُس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں بلاناغہ شراب پیتا تھا اور سوتے وقت بلاناغہ اپنے قرض کے متعلق سوچتا تھا، جو مجھے مختلف آدمیوں کو ادا کرنا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا عذاب تھا۔ پینے کے باوجود اضطراب کے باعث مجھے نیند نہ آتی۔ دماغ میں سینکڑوں اسکیمیں آتی تھیں۔ بس میری یہ خواہش تھی کہ کہیں سے دس ہزار روپے آجائیں تو میری جان میں جان آئے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ قرض کا فی الفور ادا کر دُوں۔ ایک ٹیکسی لُوں اور ہر قرض خواہ کے پاس جا کر معذرت طلب کروں اور جیب سے روپے نکال کر اُن کو دے دُوں۔ جو روپے باقی بچیں اُن سے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خرید لوں اور شراب پینا چھوڑ دُوں۔ پھر یہ خیال آتا کہ نہیں دس ہزار سے کام نہیں چلے گا۔ کم از کم پچاس ہزار ہونے چاہئیں۔ میں سوچنے لگتا کہ اگر اتنے روپے آجائیں، جو یقیناً آنے چاہئیں تو سب سے پہلے میں ایک ہزار نادار لوگوں میں تقسیم کر دُوں گا۔ ایسے لوگوں میں جو روپیہ لے کر کچھ کاروبار کر سکیں۔ باقی رہے انچاس ہزار۔ اس رقم میں سے میں نے دس ہزار اپنی بیوی کو دینے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ فکسڈ ڈیپازٹ ہونا چاہیے۔ گیارہ ہزار ہوئے باقی رہے انتالیس ہزار۔ میرے لیے بہت کافی تھے۔ میں نے سوچا یہ میری زیادتی ہے چنانچہ میں نے بیوی کا حصّہ دوگنا کر دیا، یعنی بیس ہزار۔ اب بچے انتیس ہزار۔ میں نے سوچا کہ پندرہ ہزار اپنی بیوہ بہن کو دے دُوں گا۔ اب میرے پاس چودہ ہزار رہے۔ ان میں سے آپ سمجھیے کہ دو ہزار قرض کے نکل گئے۔ باقی بچے بارہ ہزار۔ ایک ہزار رُوپے کی اچھی شراب آنی چاہیے۔ لیکن میں نے فوراً تھو کر دیا اور یہ سوچا کہ پہاڑ پر چلا جاؤں گا اور کم از کم چھ مہینے رہوں گا تاکہ صحت درست ہو جائے۔ شراب کے بجائے دُودھ پیا کروں گا۔ بس ایسے ہی خیالات میں دن رات گزر رہے تھے۔ پچاس ہزار کہاں سے آئیں گے یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ویسے دو تین اسکیمیں ذہن میں تھیں۔ شمع دہلی کے معمے حل کروں اور پہلا انعام حاصل کر لُوں۔ ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ خرید لُوں۔ چوری کروں اور بڑی صفائی سے۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کون سا قدم اُٹھانا چاہیے۔ بہر حال یہ طے تھا کہ مجھے پچاس ہزار روپے حاصل کرنا ہیں۔ یُوں ملیں یا وُوں ملیں۔ اسکیمیں سوچ سوچ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی جو بہت بڑا عذاب تھا۔ قرض خواہ بے چارے تقاضا نہیں کرتے تھے لیکن جب اُن کی شکل دیکھتا تو ندامت کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ بعض اوقات تو میرا سانس رُکنے لگتا اور میرا جی چاہتا کہ خودکشی کر لُوں اور اس عذاب سے نجات پاؤں۔ مجھے معلوم نہیں کیسے اور کب میں نے تہیہ کر لیا کہ چوری کروں گا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا کہ۔ محلے میں ایک بیوہ عورت رہتی ہے جس کے پاس بے اندازہ دولت ہے۔ اکیلی رہتی ہے۔ میں وہاں رات کے دو بجے پہنچا۔ یہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا وہ دوسری منزل پر رہتی ہے۔ نیچے پٹھان کا پہرہ تھا میں نے سوچا کوئی اور ترکیب سوچنی چاہیے اوپر جانے کے لیے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے خود کو اس پارسی لیڈی کے فلیٹ کے اندر پایا۔ میرا خیال ہے کہ میں پائپ کے ذریعے اُوپر چڑھ گیا تھا۔ ٹارچ میرے پاس تھی۔ اُس کی روشنی میں میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بہت بڑا سیف تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی سیف کھولا تھا نہ بند کیا تھا لیکن اس وقت جانے مجھے کہاں سے ہدایت ملی کہ میں نے ایک معمولی تار سے اُسے کھول ڈالا۔ اندر زیور ہی زیور تھے۔ بہت بیش قیمت۔ میں نے سب سمیٹے اور مکے مدینے والے زرد رومال میں باندھ لیے۔ پچاس ساٹھ ہزار روپے کا مال ہو گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اتنا ہی چاہیے تھا۔ کہ اچانک دوسرے کمرے سے ایک بُڑھیا پارسی عورت نمودار ہوئی۔ اُس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر پوپلی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول نکال کر تان لیا۔ اس کی پوپلی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔ اُس نے مجھے بڑے پیار سے پوچھا۔

”آپ یہاں کیسے آئے؟“

میں نے سیدھا سا جواب دیا۔

”چوری کرنے۔“

”اوہ“!

بُڑھیا کے چہرے کی جھریاں مسکرانے لگیں۔

”تو بیٹھو۔ میرے گھر میں تو نقدی کی صورت میں صرف ڈیڑھ روپیہ ہے۔ تم نے زیور چرایا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم پکڑے جاؤ گے کیونکہ ان زیوروں کو صرف کوئی بڑا جوہری ہی لے سکتا ہے۔ اور ہر بڑا جوہری انھیں پہچانتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کُرسی پر بیٹھ گئی۔ میں بہت پریشان تھا کہ یا الٰہی یہ سلسلہ کیا ہے۔ میں نے چوری کی ہے اور بڑی بی مسکرا مسکرا کر مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ کیوں؟ لیکن فوراً اس کیوں کا مطلب سمجھ میں آ گیا جب ماتا جی نے آگے بڑھ کر میرے پستول کی پروانہ کرتے ہُوئے میرے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا اور اپنی بانھیں میری گردن میں ڈال دیں۔ اس وقت خدا کی قسم میرا جی چاہا کہ گٹھڑی ایک طرف پھینکوں اور وہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر وہ تسمہ پا عورت نکلی اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں مطلقاً ہل جل نہ سکا۔ اصل میں میرے ہر رگ و ریشے میں ایک عجیب و غریب قسم کا خوف سرایت کر گیا تھا۔ میں اسے ڈائن سمجھنے لگا تھا جو میرا کلیجہ نکال کر کھانا چاہتی تھی۔ میری زندگی میں کسی عورت کا دخل نہیں تھا۔ میں غیر شادی شدہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے تیس برسوں میں کسی عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر پہلی رات جب کہ میں چوری کرنے کے لیے نکلا تو مجھے یہ پھپھا کُٹنی مل گئی جس نے مجھ سے عشق کرنا شروع کر دیا۔ آپ کی جان کی قسم میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ وہ بہت ہی کریہہ المنظر تھی میں نے اُس سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”ماتا جی مجھے بخشو۔ یہ پڑے ہیں آپ کے زیور۔ مجھے اجازت دیجیے۔“

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”تم نہیں جاسکتے۔ تمہارا پستول میرے پاس ہے۔ اگر تم نے ذرا سی بھی جنبش کی تو ڈز کر دوں گی۔ یا ٹیلی فون کر کے پولیس کو اطلاع دے دُوں گی کہ وہ آ کر تمھیں گرفتار کر لے۔ لیکن جانِ من میں ایسا نہیں کروں گی۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں ابھی تک کنواری رہی ہوں۔ اب تم یہاں سے نہیں جاسکتے۔“

یہ سُن کر قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں کہ ٹن ٹن شروع ہوئی۔ دُور کوئی کلاک صبح کے پانچ بجنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ میں نے بڑی بی کی ٹھوڑی پکڑی اور اُس کے مُرجھائے ہوئے ہونٹوں کا بوسہ لے کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

”میں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں عورتیں دیکھی ہیں لیکن خدا واحد شاہد ہے کے تم ایسی عورت سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ تم کسی بھی مرد کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی پہلی چوری تمہارے مکان سے شروع کی۔ یہ زیور پڑے ہیں۔ میں کل آؤں گا بشرطیکہ تم وعدہ کرو کہ مکان میں اور کوئی نہیں ہو گا۔“

بڑھیا یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔

”ضرور آؤ۔ تم اگر چاہو گے تو گھر میں ایک مچھر تک بھی نہیں ہو گا جو تمہارے کانوں کو تکلیف دے۔ مجھے افسوس ہے کہ گھر میں صرف ایک روپیہ اور آٹھ آنے تھے۔ کل تم آؤ گے تو میں تمہارے لیے بیس پچیس ہزار بنک سے نکلوا لوں گی۔ یہ لو اپنا پستول۔“

میں نے اپنا پستول لیا اور وہاں سے دُم دبا کر بھاگا۔ پہلا وار خالی گیا تھا۔ میں نے سوچا کہیں اور کوشش کرنی چاہیے۔ قرض ادا کرنے ہیں اور جو میں نے پلان بنایا ہے اُس کی تکمیل بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ایک جگہ اور کوشش کی۔ سردیوں کے دن تھے صبح کے چھ بجنے والے تھے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب سب گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک مکان کا پتہ تھا کہ اس کا جو مالک ہے بڑا مالدار ہے۔ بہت کنجوس ہے۔ اپنا روپیہ بینک میں نہیں رکھتا۔ گھر میں رکھتا ہے۔ میں نے سوچا اُس کے ہاں چلنا چاہئے۔ میں وہاں کن مشکلوں سے اندر داخل ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال پہنچ گیا۔ صاحب خانہ جو ماشاء اللہ جوان تھے۔ سو رہے تھے۔ میں نے اُن کے سرہانے سے چابیاں نکالیں اور الماریاں کھولنا شروع کر دیں۔ ایک الماری میں کاغذات تھے اور کچھ فرنچ لیدر۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص جو کنوارا ہے فرنچ لیدر کہاں استعمال کرتا ہے۔ دوسری الماری میں کپڑے تھے۔ تیسری بالکل خالی تھی معلوم نہیں اس میں تالا کیوں پڑا ہوا تھا۔ اور کوئی الماری نہیں تھی۔ میں نے تمام مکان کی تلاشی لی لیکن مجھے ایک پیسہ بھی نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا اس شخص نے ضرور اپنی دولت کہیں دبا رکھی ہو گی۔ چنانچہ میں نے اس کے سینے پر بھرا ہوا پستول رکھ کر اُسے جگایا۔ وہ ایسا چونکا اور بدکا کہ میرا پستول فرش پر جا پڑا۔ میں نے ایک دم پسول اٹھایا اور اُس سے کہا۔

”میں چور ہوں۔ یہاں چوری کرنے آیا ہوں۔ لیکن تمہاری تین الماریوں سے مجھے ایک دمڑی بھی نہیں ملی۔ حالانکہ میں نے سُنا تھا کہ تم بڑے مالدار آدمی ہو۔“

وہ شخص جس کا نام مجھے اب یاد نہیں مسکرایا۔ انگڑائی لے کر اُٹھا اور مجھ سے کہنے لگا۔

”یار تم چور ہو تو تم نے مجھے پہلے اطلاع دی ہوتی۔ مجھے چوروں سے بہت پیار ہے۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ خود کو بڑا شریف آدمی کہتا ہے حالانکہ وہ اوّل درجے کا کالا چور ہوتا ہے۔ مگر تم چور ہو۔ تم نے اپنے آپ کو چھپایا نہیں ہے۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔“

یہ کہہ کر اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد ریفریجریٹر کھولا۔ میں سمجھا شاید میری تواضع شربت وغیرہ سے کرے گا۔ لیکن اُس نے مجھے بُلایا اور کھلے ہوئے ریفریجریٹر کے پاس لے جا کر کہا۔

”دوست میں اپنا سارا روپیہ اس میں رکھتا ہوں۔ یہ صندوقچی دیکھتے ہو۔ اس میں قریب قریب ایک لاکھ روپیہ پڑا ہے۔ تمھیں کتنا چاہیے؟“

اُس نے صندوقچی باہر نکالی جو یخ بستہ تھی۔ اُسے کھولا۔ اندر سبز رنگ کے نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں۔ ایک گڈی نکال کر اس نے میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا۔

”بس اتنے کافی ہوں گے۔ دس ہزار ہیں۔“

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اُسے کیا جواب دُوں۔ میں تو چوری کرنے آیا تھا۔ میں نے گڈی اُس کو واپس دی اور کہا۔

”صاحب! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے معافی دیجیے۔ پھر کبھی حاضر ہوں گا۔“

میں وہاں سے آپ سمجھیے کہ دُم دبا کر بھاگا گھر پہنچا تو سورج نکل چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ چوری کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے۔ دو جگہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ دوسری رات کو کوشش کرتا تو کامیابی یقینی نہیں تھی۔ لیکن قرض بدستور اپنی جگہ پر موجود تھا جو مجھے بہت تنگ کر رہا تھا۔ حلق میں یوں سمجھیے کہ ایک پھانس سی اٹک گئی تھی۔ میں نے بالآخر یہ ارادہ کر لیا کہ جب اچھی طرح سوچکوں گا تو اُٹھ کر خودکشی کر لُوں گا۔ سو رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اُٹھا۔ دروازہ کھولا۔ ایک بزرگ آدمی کھڑے تھے۔ میں نے اُن کو آداب عرض کیا۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا۔

”لفافہ دینا تھا اس لیے آپ کو تکلیف دی۔ معاف فرمائے گا، آپ سو رہے تھے۔“

میں نے اُس سے لفافہ لیا۔ وہ سلام کر کے چلے گئے۔ میں نے درواز بند کیا۔ لفافہ کافی وزنی تھا۔ میں نے اُسے کھولا اور دیکھا کہ سو سو روپے کے بے شمار نوٹ ہیں۔ گنے تو پچاس ہزار نکلے۔ ایک مختصر سا رقعہ تھا، جس میں لکھا تھا کہ آپ کے یہ روپے مجھے بہت دیر پہلے ادا کرنے تھے۔ افسوس ہے کہ میں اب ادا کرنے کے قابل ہوا ہوں“

میں نے بہت غور کیا کہ یہ صاحب کون ہو سکتے ہیں جنھوں نے مجھ سے قرض لیا۔ سوچتے سوچتے میں نے آخر سوچا کہ ہو سکتا ہے کسی نے مجھ سے قرض لیا ہو جو مجھے یاد نہ رہا ہو۔ بیس ہزار اپنی بیوی کو۔ پندرہ ہزار اپنی بیوہ بہن کو۔ دو ہزار قرض کے۔ باقی بچے تیرہ ہزار۔ ایک ہزار میں اچھی شراب کے لیے رکھ لیے۔ پہاڑ پر جانے اور دُودھ پینے کا خیال میں نے چھوڑ دیا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اُٹھ کر باہر گیا۔ دروزہ کھولا تو میرا ایک قرض خواہ کھڑا تھا۔ اُس نے مجھ سے پانچ سو روپے لینا تھے۔ میں لپک کر اندر گیا۔ تکیے کے نیچے نوٹوں کا لفافہ دیکھا مگر وہاں کچھ موجود ہی نہیں تھا۔

چوری

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو چوری

سکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور اس بوڑھے آدمی سے جو ٹاٹ پر بیٹھا اپنے استخوانی ہاتھ تاپنے کی خاطر الاؤ کی طرف بڑھائے تھا کہنے لگے

”بابا جی کوئی کہانی سنایئے؟“

مردِ معمر نے جو غالباً کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اپنا بھاری سر اٹھایا جو گردن کی لاغری کی وجہ سے نیچے کو جھکا ہوا تھا۔

”کہانی!۔ میں خود ایک کہانی ہُوں مگر۔“

اس کے بعد کے الفاظ اس نے اپنے پوپلے منہ ہی میں بڑبڑائے۔ شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی کہ وہ فلسفیانہ نکات حل کر سکیں۔ لکڑی کے ٹکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر آتشیں شکم کو پُر کر رہے تھے۔ شعلوں کی عنابی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ ننھی ننھی چنگاریاں سپید راکھ کی نقاب اُلٹ اُلٹ کر حیرت میں سربُلند شعلوں کا منہ تک رہی تھیں۔ بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں سے لڑکوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا۔

”کہانی۔ ہر روز کہانی!۔ کل سناؤں گا۔“

لڑکوں کے تمتماتے ہُوئے چہروں پر افسردگی چھاگئی۔ ناامیدی کے عالم میں وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے۔

”آج رات کہانی سنے بغیر سونا ہو گا۔“

یکایک ان میں سے ایک لڑکا جو دوسروں کی بہ نسبت بہت ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا الاؤ کے قریب سرک کر بلند آواز میں بولا۔ مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا اور وعدہ خلافی کرنا درست نہیں۔ کیا آپ کو کل والے حامد کا انجام یاد نہیں ہے جو ہمیشہ اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا۔“

”درست!۔ میں بھول گیا تھا۔“

بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکا لیا۔ جیسے وہ اپنی بھول پر نادم ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس دلیر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرایا۔

”میرے بچے! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ مگر میں کون سی کہانی سُناؤں؟۔ ٹھہرو۔ مجھے یاد کر لینے دو۔“

یہ کہتے ہوئے وہ سر جُھکا کر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ اسے جِن اور پریوں کی لایعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ بچوں کو ایسی کہانیاں سُنایا کرتا تھا۔ جو ان کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں۔ اسے بہت سے فضول قصے یاد تھے جو اس نے بچپن میں سُنے تھے۔ یا کتابوں میں پڑھے تھے۔ مگر اس وقت وہ اپنے بربط پیری کے بوسیدہ تار چھیڑ رہا تھا کہ شاید ان میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اٹھے۔ لڑکے باباجی کو خاموش دیکھ کر آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ غالباً اس لڑکے کی بابت جسے کتاب چُرانے پر بید کی سزا ملی تھی۔ باتوں باتوں میں ان میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔

”ماسٹر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چُرالی تھی۔ مگر اسے سزا ذرا نہ ملی۔“

”کتاب چُرالی تھی۔“

ان چار لفظوں نے جو بلند آواز میں ادا کیے گئے تھے۔ بوڑھے کی خفتہ یاد میں ایک واقعہ کو جگادیا۔ اس نے اپنا سپید سر اٹھایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے بُھولی بسری داستان کو انگڑائیاں لیتے پایا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہُوئی۔ مگر وہیں غرق ہو گئی۔ اضطراب کی حالت میں اس نے اپنے نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب کیا۔ اس کے چہرے کے تغیر و تبدل سے صاف طور پر عیاں تھا۔ کہ وہ کسی واقعہ کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔ الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا:

”بچو! آج میں اپنی کہانی سُناؤں گا۔“

لڑکے فوراً اپنی باتیں چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ الاؤ کی چٹختی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ابھر کر خاموش ہو گئیں۔ ایک لمحہ کے لیے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا۔

”باباجی اپنی کہانی سنائیں گے؟“

ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ باقی سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

”ہاں، اپنی کہانی۔“

یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہُوئی گھنی بھوؤں میں سے کوٹھڑی کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکوں سے پھر مخاطب ہُوا۔

”میں آج تمھیں اپنی پہلی چوری کی داستان سُناؤں گا۔“

لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انھیں اِس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ باباجی کسی زمانہ میں چوری بھی کرتے رہے ہیں۔ باباجی جو ہر وقت انھیں بُرے کاموں سے بچنے کے لیے نصیحت کیا کرتے ہیں۔ لڑکا جو اِن میں دلیر تھا۔ اپنی حیرت نہ چُھپا سکا۔

”پر کیا آپ نے واقعی چوری کی؟“

”واقعی“!

”آپ اُس وقت کس جماعت میں پڑھا کرتے تھے؟“

”نویں میں۔“

یہ سُن کر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ اسے اپنے بھائی کا خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا وہ اس سے عمر میں دوگنا بڑا تھا۔ اس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ اور اسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس عمر کا اور اچھا پڑھا لکھا لڑکا چوری کرے؟۔ اس کی عقل اس معمہ کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ اس نے پھر سوال کیا۔

”آپ نے چوری کیوں کی؟“

اس مشکل سوال نے بڈھے کو تھوڑی دیر کے لیے گھبرادیا۔ آخر وہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا کہ فلاں کام اس نے کیوں کیا؟ بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا۔

”اس لیے کہ اس وقت اس کے دماغ میں یہی خیال آیا۔“

اس نے دل میں یہی جواب سوچا۔ مگر اس نے مطمئن نہ ہو کر یہ بہتر خیال کیا کہ تمام داستان من و عن بیان کر دے۔

”اس کا جواب میری کہانی ہے۔ جو میں اب تمھیں سنانے والا ہوں۔“

”سُنایئے؟“

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سننے کے لیے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے۔ جو الاؤ کے سامنے اپنے سپید بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔ اور جیسے وہ ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔ بڈھا کچھ عرصے تک اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اس بُھولے ہوئے واقعہ کے تمام منتشر ٹکڑے فراہم کر کے بولا:

”ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا ہے جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے۔ میری زندگی میں سب سے بُرا فعل ایک کتاب کی چوری ہے۔“

یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ اس کی آنکھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں۔ دُھندلی پڑ گئیں۔ اس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہُوئے زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر بولا:۔

”سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے۔ یہ میں نے ایک کتب فروش کی دکان سے چُرائی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ قدرتی طور پر جیسا کہ اب تمھیں کہانی سننے کا شوق ہے مجھے افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر میں ہر ہفتے ایک نہ ایک کتاب ضرور پڑھا کرتا تھا۔ وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کی بے معنی داستانیں یا فضول جاسوسی قصے ہُوا کرتے تھے۔ یہ کتابیں میں ہمیشہ چھپ چھپ کر پڑھا کرتا تھا۔ والدین کو اس بات کا علم نہ تھا۔ اگر انھیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے ایسا ہرگز ہرگز نہ کرنے دیتے۔ اس لیے کہ اس قسم کی کتابیں اسکول کے لڑکے کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میں ان کے مہلک نقصان سے غافل تھا۔ چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ میں نے چوری کی اور پکڑا گیا۔“

ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”آپ پکڑے گئے؟“

”ہاں پکڑا گیا۔ چونکہ میرے والدین اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ عادت پکتے پکتے میری طبیعت بن گئی۔ گھر سے جتنے پیسے ملتے ہیں انھیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا۔ اسکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی۔ ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سمایا رہتا کہ فلاں کتاب جو فلاں ناول نویس نے لکھی ہے ضرور پڑھنی چاہیے۔ یا فلاں کتب فروش کے پاس نئی ناولوں کا جو ذخیرہ موجود ہے۔ ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیے۔ شوق کی یہ انتہا دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے۔ اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا۔ کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ یا کیا کر رہا ہے۔ اس وقت وہ بے عقل بچے کے مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرنے یا شوق پورا کرنے کے لیے جلتی ہوئی آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ چمکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے اس کا ہاتھ جلا دے گی۔ ٹھیک یہی حالت میری تھی۔ فرق اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بغیر سمجھے بُوجھے بُری سے بُری حرکت کر بیٹھتا ہے مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہُوئے چوری ایسے مکروہ جُرم کا ارتکاب کیا۔ یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل ہے۔ میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا۔ اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی۔ ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً اسے بُرے کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ یہ شیطان مجھ پر اس وقت غالب آیا جبکہ سوچنے کے لیے میرے پاس بہت کم وقت تھا۔ خیر“

لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ہلتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑے ان کی داستان سن رہے تھے۔ داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹتا دیکھ کر جب کہ اصل مقصد بیان کیا جانے والا تھا۔ وہ بڑی بے قراری سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

”مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کر دینا۔ سرد ہوا آ رہی ہے۔“

بوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈال لیا۔ مسعود،

”اچھا بابا جی۔“

کہہ کر اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”ہاں تو ایک دن جبکہ والد گھر سے باہر تھے۔“

بوڑھے نے اپنی داستان کا بقایا حصہ شروع کیا۔

”مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ اور وہ کتاب جو میں ان دنوں پڑھ رہا تھا ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس لیے میرے جی میں آئی کہ چلو اس کتب فروش تک ہو آئیں۔ جس کے پاس بہت سی جاسوسی ناولیں پڑی تھیں۔ میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے موجود تھے۔ جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لیے کافی ہوں۔ چنانچہ میں گھر سے سیدھا اس کتب فروش کی دکان پر گیا۔ یوں تو اس دکان پر ہر وقت بہت سی اچھی اچھی ناولیں موجود رہتی تھیں۔ مگر اس دن خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تختے پر رکھا تھا۔ ان کتابوں کے رنگ برنگ سرورق دیکھ کر میری طبیعت میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔ دل میں اس خواہش نے گدگدی کی کہ وہ تمام میری ہو جائیں۔ میں دکاندار سے اجازت لے کر ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ہر کتاب کے شوخ رنگ سرورق پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہُوئی تھی۔

”ناممکن ہے کہ اس کا مطالعہ آپ پر سنسنی طاری نہ کر دے۔“

”مصور اسرار کا لاثانی شاہکار۔“

”تمثیل! ہیجان!! رومان!!!۔ سب یکجا۔“

اس قسم کی عبارتیں شوق بڑھانے کے لیے کافی تھیں۔ مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس لیے کہ میری نظروں سے اکثر ایسے الفاظ گزر چکے تھے۔ میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس وقت میرے دل میں چوری کرنے کا خیال مطلقاً نہ تھا۔ بلکہ میں نے خریدنے کے لیے ایک کم قیمت کی ناول چن کر الگ بھی رکھ لی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے میں دوسرے ہفتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا۔ میں نے اپنی چُنی ہُوئی کتاب اُٹھائی۔ کتاب کا اٹھانا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گڑ گئیں۔ سرِورق کے کونے پر میرے محبوب ناولسٹ کا نام سُرخ لفظوں میں چھپا تھا۔ اس کے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا۔

”منتقم شعاعیں۔ کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا۔“

یہ سطور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں طغیانی سی آ گئی۔ کتاب کا مصنف وہی تھا۔ جس نے اس سے پیشتر مجھ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک گروہ داخل ہو گیا۔

”منتقم شعاعیں۔ دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد۔ کیسا دلچسپ افسانہ ہو گا“!

”لندن تباہ کرنے کا ارادہ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“

”اس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں“!

”یہ کتاب ضرور ان سب سے بہتر ہو گی“!

میں خاموش اشتیاق کے ساتھ اس کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہے تھے۔ میں نے اس کتاب کو اُٹھایا اور کھول کر دیکھا تو پہلے ورق پر یہ عبارت نظر آئی۔

”مصنف اس کتاب کو اپنی بہترین تصنیف قرار دیتا ہے۔“

”ان الفاظ نے میرے اشتیاق میں آگ پر ایندھن کا کام دیا۔ ایکا ایکی میرے دماغ کے خدا معلوم کس گوشے سے ایک خیال کود پڑا۔ وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں۔ میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی طرف مڑیں۔ جو کاغذ پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ دوکان کی دوسری طرف دو نوجوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے۔ میں سر سے پیر تک لرز گیا۔“

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا نحیف جسم اس واقعہ کی یاد سے کانپا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اس نے پھر اپنی داستان شروع کر دی۔

”ایک لحظہ کے لیے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت بُرا کام ہے مگر ضمیر کی آواز سرورق پر بنی ہوئی لانبی لانبی شعاعوں میں غرق ہو گئی۔ میرا دماغ

”منتقم شعاعیں“

”منتقم شعاعیں“

کی گردان کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانکا اور جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبالی مگر میں کانپنے لگا۔ اس حالت پر قابو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا۔ اور اُس کتاب کے دام ادا کر دیئے۔ جو میں نے پہلے خریدی تھی۔ قیمت لیتے وقت اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اس نے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا۔ میری طرف اس نے گُھور کر بھی دیکھا۔ جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہو گئی۔ جی میں بھی آئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔ میں نے اس دوران میں کئی بار اس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے اُبھری ہُوئی تھی نگاہ ڈالی۔ اور شاید اسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میری ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ کر اسے شک ضرور ہُوا۔ اسے لیے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر کے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔ میں نے باقی پیسے جلدی سے لیے اور وہاں سے چل دیا۔ دو سو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو کتب فروش ننگے پاؤں چلا آ رہا تھا اور مجھے ٹھہرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم نہ تھا میں کدھر بھاگ رہا ہوں۔ میرا رخ اپنے گھر کی جانب نہ تھا۔ میں شروع ہی سے اس طرف بھاگ رہا تھا جدھر بازار کا اختتام تھا۔ اس غلطی کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔“

بوڑھا اتنا کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی خشک زبان لبوں پر پھیرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا۔

”مسعود! پانی کا ایک گھونٹ پلوانا۔“

مسعود خاموشی سے اُٹھا۔ اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں پڑے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کر لے آیا۔ بوڑھے نے گلاس لیتے ہی منہ سے لگا لیا اور ایک گھونٹ میں سارا پانی پی گیا۔ اور خالی گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں کیا بیان کر رہا تھا؟“

ایک لڑکے نے جواب دیا۔

”آپ بھاگ جا رہے تھے۔“

”میرے پیچھے کتب فروش

”چور چور“

کی آواز بلند کرتا چلا آرہا تھا جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ جیل کی آہنی سلاخیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ بے عزتی کے خیال سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ میں لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اُٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اس وقت میرے دماغ کی عجیب حالت تھی۔ ایک تُند دھواں سا میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا۔ آنکھیں فرطِ خوف سے اُبل رہی تھیں۔ اور کانوں میں ایک زبردست شور برپا تھا۔ جیسے بہت سے لوگ آہنی چادریں ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں۔ میں ابھی اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کتب فروش اور اسکے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ سینکڑوں خیالات پتھروں کی طرح میرے دماغ سے ٹکرا ٹکرا کر مختلف آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ جب انھوں نے مجھے پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنجہ نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے۔ میں بالکل خاموش تھا۔ وہ مجھے دُکان کی طرف کشاں کشاں لے گئے۔ جیل خانے کی کوٹھڑی اور عدالت کا منہ دیکھنا یقین تھا۔ اس خیال پر میرے ضمیر نے لعنت ملامت شروع کر دی۔ چونکہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اور میرے پاس اپنے ضمیر کو جواب دینے کے لیے کوئی الفاظ موجود نہ تھے۔ اس لیے میری گرم آنکھوں میں آنسو اُتر آئے اور میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔“

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دُھندلی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

”کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا۔ اپنی کتاب لے لی اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔“

بوڑھے نے اپنے آنسو کُھردرے کمبل سے خشک کیے۔

”خدا اُس کو جزائے خیر دے۔ میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا۔ مگر اس واقعہ کی والد اور اسکول کے لڑکوں کو خبر ہو گئی۔ والد مجھ پر سخت خفا ہُوئے لیکن انھوں نے بھی اخیر میں مجھے معاف کر دیا۔ دو تین روز مجھے اس ندامت کے باعث بخار آتا رہا اس کے بعد جب میں نے دیکھا میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اٹھا سکوں۔ تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ اس وقت سے لیکر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ہزاروں مصائب برداشت کیے ہیں۔ صرف اس کتاب کی چوری کی وجہ سے جو مجھے تادمِ مرگ نادم و شرمسار رکھے گی۔ اس آوارہ گردی کے دوران میں، میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں۔ ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا۔ مگر اُن پر نادم نہیں ہُوں۔ مجھے فخر ہے۔“

بوڑھے کی دُھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہو گئی۔ اور اس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔

”ہاں مجھے فخر ہے۔“

یہ لفظ اس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے۔ الاؤ میں آگ کا ایک شعلہ بُلند ہوا۔ اور ایک لمحہ فضا میں تھر تھرا کر وہیں سو گیا۔ بوڑھے نے شعلے کی جرأت دیکھی اور مسکرا دیا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”کہانی ختم ہو گئی اب تم جاؤ۔ تمہارے ماں باپ انتظار کرتے ہونگے۔“

مسعود نے سوال کیا۔

”مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے؟“

”فخر کیوں ہے؟“

۔بوڑھا مسکرا دیا۔

”اس لیے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں۔ اپنی مسروقہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں ہوتی میرے عزیز! بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”ہر وہ چیز جو تم سے چُرا لی گئی ہے، تمہیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقہ سے اپنے قبضہ میں لے آؤ۔ پر یاد رہے تمہاری کوشش کامیاب ہونی چاہیے۔ ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اُٹھانا عبث ہے۔“

لڑکے اٹھے اور بابا جی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازہ سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے کی نگاہیں ان کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا:۔

”کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی کھوئی ہُوئی چیز واپس لے سکیں۔“
بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی؟“

چوہے دان

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوچوہے دان

شوکت کو چُوہے پکڑنے میں بہت مہارت حاصل ہے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا ہے یہ ایک فن ہے جس کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے اور سچ پوچھیے تو جو جو ترکیبیں شوکت کو چُوہے پکڑنے کے لیے یاد ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کافی محنت کی ہے۔ اگر چوہے پکڑنے کا کوئی فن نہیں ہے تو اس نے اپنی ذہانت سے اسے فن بنا دیا ہے۔ اس کو آپ کوئی چوہا دکھا دیجیے، وہ فوراً آپ کو بتا دے گا کہ اس ترکیب سے وہ اتنے گھنٹوں میں پکڑا جائے گا اور اس طریقے سے اگر آپ اسے پکڑنے کی کوشش کریں تو اتنے دن لگ جائیں گے۔ چوہوں کی نسلوں اور ان کی مختلف عادات و اطوار کا شوکت بہت گہرا مطالعہ کر چکا ہے۔ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کس ذات کے چوہے جلدی پھنس جاتے ہیں اور کِس نسل کے چوہے بڑی مشکل کے بعد قابو میں آتے ہیں اور پھر ہر قسم کے چوہوں کو پھانسنے کی ایک سو ایک ترکیب شوکت کو معلوم ہے۔ موٹے موٹے اصول اس نے ایک روز مجھے بتائے تھے کہ چھوٹی چھوٹی چوہیاں اگر پکڑنا ہوں تو ہمیشہ نیا چوہے دان استعمال کرنا چاہیے۔ چوہے دان کی ساخت کسی قسم کی بھی ہو، اس کی کوئی پرواہ نہیں خیال اس بات کا رکھنا چاہیے کہ چوہے دان ایسی جگہ پر نہ رکھا جائے جہاں آپ نے چوہیا یا چوہیاں دیکھی تھیں۔ الماریوں کے پیچھے۔ ٹرنکوں کے نیچے، کہیں بھی جہاں آپ نے چوہیا نہ دیکھی ہو۔ چوہے دان رکھ دیا جائے اور اس میں تلی ہوئی مچھلی کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیا جائے۔ ٹکڑا بڑا نہ ہو۔ اگر چوہے دان کھٹ سے بند ہونیوالا ہے تو اس میں خاص طور پر بڑا ٹکڑا نہیں لگانا چاہیے کہ چوہیا اندر آ کر اس ٹکرے کا کچھ حصہ کتر کر باہر چلی جائے گی۔ ٹکڑا چھوٹا ہو گا تو وہ اسے اتارنے کی کوشش کرے گی اور یوں جھٹ پٹ پنجرے میں قید ہو جائے گی۔ ایک چوہیا پکڑنے کے بعد چوہے دان کو گرم پانی سے دھو لینا چاہیے۔ اگر آپ اسے اچھی طرح نہ دھوئیں گے تو پہلی چوہیا کی بُو اس میں رہ جائے گی جو دوسری چوہیوں کے لیے خطرے کے الارم کا کام دے گی۔ اس لیے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ ہر چوہے یا چوہیا کو پکڑنے کے بعد چوہے دان کو دھو لینا چاہیے۔ اگر گھر میں زیادہ چوہے چوہیاں ہوں اور ان سب کو پکڑنا ہو تو ایک چوہے دان کام نہیں دے گا۔ تین چار چوہے دان پاس رکھنے چاہئیں جو بدل بدل کر کام میں لائے جائیں چوہے کی ذات بڑی سیانی ہوتی ہے، اگر ایک ہی چوہے دان گھر میں رکھا جائے گا تو چوہے اس سے خوف کھانا شروع کر دینگے اور اس کے نزدیک تک نہیں آئیں گے۔ بعض اوقات ان تمام باتوں کا خیال رکھنے پر بھی چوہے چوہیاں قابو میں نہیں آتیں۔ اس کی بہت سی وجہیں ہوتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ سے پہلے جو مکان میں رہتا تھا اس نے اسی قسم کا چوہے دان استعمال کیا تھا جیسا کہ آپ کر رہے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے چوہے پکڑ کر باہر گلی یا بازار میں چھوڑ دیا ہو اور وہ چند دنوں کے بعد پھر واپس گھر آ گیا ہے۔ ایسے چوہے جو ایک بار چوہے دان میں پھنس کر پھر اپنی جگہ پر واپس آ جائیں اس قدر ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ بڑی مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ یہ چوہے دوسرے چوہوں کو بھی خبردار کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوتی ہیں اور چوہے بڑے اطمینان سے اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے ہیں اور آپ کا اور آپکے چوہے دان کا منہ چڑاتے رہتے ہیں۔ چوہے کے بِل کے پاس تو چوہے دان ہرگز ہرگز نہیں رکھنا چاہئے، اس لیے کہ اتنی بڑی چیز اپنے گھر کے پاس دیکھ کر جو پہلے کبھی نہیں ہوتی تھی چوہا فوراً چوکنا ہو جاتا ہے اور اس کو دال میں کالا کالا نظر آ جاتا ہے۔ جب کسی حیلے سے چوہے نہ پکڑے جائیں تو گردوپیش کی فضا کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ آس پاس کے لوگ کیسے ہیں، کس قسم کی چیزیں کھاتے ہیں اور ان کے گھروں کے چوہے کس چیز پر جلدی گرتے ہیں۔ یہ تمام باتیں معلوم کر کے آپکو تجربے کرنا پڑیں گے اور ایسی ترکیب ڈھونڈنا پڑے گی جسکے ذریعہ سے آپ اپنے گھر کے چوہے گرفتار کر سکیں۔ شوکت چوہے پکڑنے کے فن پر ایک طویل لکچر دے سکتا ہے۔ کتاب لکھ سکتا ہے مگر چونکہ وہ طبعاً خاموشی پسند ہے اس لیے اس کے متعلق زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔ صرف مجھے معلوم ہے کہ وہ اس فن میں کافی مہارت رکھتا ہے، محلے کے دوسرے آدمیوں کو اس کی مطلق خبر نہیں، البتہ اس کے پڑوسی اس کے یہاں سے کبھی کبھی چوہے دان عاریتاً ضرور منگایا کرتے ہیں اور اس نے اس غرض کے لیے ایک پرانا چوہے دان مخصوص کر رکھا ہے۔ پچھلی برسات کی بات ہے۔ میں شوکت کے یہاں بیٹھا تھا کہ اس کے پڑوسی خواجہ احمد صادق صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا بڑا لڑکا ارشد صادق آیا، میں نے جب اٹھ کر دروازہ کھولا تو اس نے کہنا شروع کیا۔

”ان کم بخت چوہوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اباجی سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ زہر منگوایئے ان کو مارنے کے لیے مگر انھیں اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی اور یہاں ہر روز میری کتابوں کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ آج الماری کھولی تو یہ بڑا چوہا میرے سر پر آن گرا۔ تمھیں کیا بتاؤں ان چوہوں نے مجھے کتنا تنگ کیا ہے۔ کسی کتاب کی جلد سلامت نہیں۔ بعض بڑی کتابوں کی جلد تو اس صفائی سے ان کم بختوں نے کتری ہے کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے آری سے کاٹ دی ہے۔“

میں ارشد کو شوکت کے پاس لے گیا اور کہا۔

”ارشد صاحب تشریف لائے ہیں۔ چوہوں کی شکایت لے کر آئے ہیں۔“

ارشد کرسی پر بیٹھ گیا اور پیشانی پر سے پسینہ پونچھ کر کہنے لگا۔

”شوکت صاحب، میں کیا عرض کروں۔ ابھی الماری کی تمام کتابیں میں باہر نکال کر آیا ہوں۔ ایک بھی ان میں ایسی نہیں جس پر چوہوں نے اپنے دانت تیز نہ کیے ہوں۔ باورچی خانہ موجود ہے، دوسری الماریاں ہیں جن میں ہر وقت کھانے پینے کی چیزیں پڑی رہتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میری کتابیں کُترنے میں ان کو کیا مزا آتا ہے۔ یعنی کاغذ اور دفتی بھلا کوئی غذا ہے۔ اجی صاحب ایک انبار کُترے ہوئے گتے اور دُھنکے ہوئے کاغذوں کا میں نے الماری میں سے نکالا ہے۔“

شوکت مسکرایا۔

”ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے گھر میں چوہے ہر روز سیندھ لگاتے پھریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

ارشد نے اس مذاق سے لُطف نہ اُٹھایا اس لیے کہ وہ واقعی بہت پریشان تھا۔

”شوکت صاحب، وہ معمولی چوہے تھوڑے ہیں۔ موٹے موٹے سنڈے ہیں جو کھلے بندوں پھرتے رہتے ہیں۔ میرے پر سر پر ایک آن پڑا۔ خدا کی قسم ابھی تک درد ہو رہا ہے۔“

شوکت اور میں دونوں کِھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ارشد بھی مسکرا دیا۔

”آپ تو دل لگی کر رہے ہیں اور یہاں غصہ کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔“

شوکت نے اٹھ کر ارشد کو سگرٹ پیش کیا۔

”اپنے دل کا غبار اس کے دھوئیں کے ساتھ باہر نکالیے اور مجھے بتایئے کہ میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

ارشد نے سگرٹ سلگایا اور کہا۔

”میں آپ سے چوہے دان مانگنے آیا تھا۔ امی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ شوکت کے گھر میں میں نے دو تین پڑے دیکھے ہیں۔“

شوکت نے فوراً نوکر کو آواز دی اور اُس ے کہا۔

”وہ چوہے دان جو تم نے کل گرم پانی سے دھو کر خوب صاف کیا تھا ارشد صاحب کے گھر دے آؤ اور دیکھو ان کے نوکر سے کہنا کہ اس الماری کے نیچے اس کونہ میں رکھے جہاں ارشد صاحب اپنی کتابیں رکھتے ہیں۔ اس الماری سے دور بھی نہیں۔ اس میں مچھلی یا تیل میں تلی ہوئی کسی چیز کا ٹکڑا لگا کر رکھ دیا جائے۔“

پھر ارشد سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آپ بھی اچھی طرح سُن لیجیے گا۔ بازار سے اگر پکوڑے مل جائیں تو ایک پکوڑا کافی رہے گا۔ اور جب چوہا پکڑا جائے تو خدا کے لیے اسے میرے گھر کے پاس نہ چھوڑ دیجیے گا اور بہت جگہیں آپکو مل جائیں گی جہاں سے وہ پھر واپس نہ آ سکے۔“

دیر تک ارشد ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ شوکت اسکو مزید ہدایات دیتا رہا۔ جب نوکر چوہے دان اس کے گھر پہنچا کر واپس آ گیا تو اس نے اجازت چاہی اور چلا گیا۔ اس واقعہ کے چار روز بعد ارشد میرے گھر آیا۔ میں اور وہ چونکہ اکٹھے کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ اسی لیے وہ میرے بے تکلف دوست ہیں، شوکت سے اس کا تعارف میں نے ہی کرایا تھا۔ آتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے مجھ سے کوئی راز کی بات تخلیہ میں کہنا چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“

”میں تمہیں ایک بڑی دلچسپ بات سنانے آیا ہوں مگر یہاں نہیں سناؤں گا تم باہر چلو۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔ راستے میں اس نے مجھے اپنی داستان سنانا شروع کی۔

”عجیب و غریب کہانی ہے جو میں تمہیں سنانے والا ہوں۔ بخدا ایسی بات ہُوئی کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ یعنی کسے یقین تھا کہ اتنی ضدی اور نفاست پسند لڑکی ایک چوہے دان کے ذریعہ سے میرے قابو میں آ جائے گی۔ اُسی چوہے دان کے ذریعہ سے جو اس روز تمہارے سامنے میں نے شوکت سے لیا تھا۔“

میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”کون سی لڑکی اُس چوہے دان میں پھنس گئی۔ لڑکی نہ ہوئی چوہیا ہو گئی۔ آخر بتاؤ تو سہی لڑکی کون ہے۔“

”اماں وہی سلیمہ جس کی نفاست پسندیوں کی بڑی دھوم ہے اور جس کی ضدی طبیعت کے بڑے چرچے ہیں۔“

میری حیرت اور زیادہ بڑھ گئی۔

”سلیمہ۔ جھوٹ؟“

”خدا کی قسم۔ جھوٹ بولنے والے پر لعنت۔ اور بھلا میں تم سے جھوٹ کیوں کہنے لگا۔ یہی سلیمہ، شوکت کے دئے ہُوئے چوہے دان کے ذریعہ سے میرے قابو میں آگئی اور بخدا یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسی آسانی سے پھنس جائے گی۔“

میں نے پھر اس سے حیرت بھرے لہجہ میں کہا۔

”لیکن یہ ہوا کیوں کر۔ تم مجھے پوری داستان سناؤ تو کچھ پتا چلے۔ چوہے دانوں سے بھی کبھی کسی نے لڑکیاں پھانسی ہیں۔ بڑی بے تُکی سی بات معلوم ہوتی ہے مجھے۔“

میں سلیمہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارے یہاں اس کا اکثر آنا جانا ہے۔ وہ صرف نفاست پسند ہی نہیں بلکہ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ انگریزی زبان پر اسے خوب عبور حاصل ہے۔ تین چار مرتبہ اُس سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تو میں نے معلوم کیا کہ ادب اور شعر کے متعلق اس کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ مصور بھی ہے، پیانو بجانے میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ اس کی ضدی اور نفاست پسند طبیعت کے بارے میں بھی چونکہ مجھے بہت کچھ معلوم ہے، اسی لیے مجھے ارشد کی یہ بات سن کر سخت تعجب ہوا۔ وہ تو کسی کو خاطر ہی میں لانیوالی نہیں۔ ارشد جیسے چُغد کو اُس نے کیسے پسند کر لیا۔ یہ معمّہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ارشد بے حد خوش تھا۔ اس نے میری طرف فتحمند نظروں سے دیکھا اور کہا۔

”میں تمھیں سارا واقعہ سنا دیتا ہوں۔ اس کے بعد کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت نہ رہے گی۔ قصّہ یہ ہے کہ پرسوں رات کو امی جان اور ابا جی اور دوسرے لوگ سب سینما دیکھنے چلے گئے۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ آرام کرسی میں ٹانگیں پھیلائے لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ ایک موٹا سا چوہا مجھے نظر آیا۔ اس کو دیکھنا تھا کہ مارے غصہ کے میرا خون کھولنے لگا۔ فوراً اٹھا اور اس کو پکڑنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اسے ہاتھ سے پکڑنا تو ظاہر ہے۔ بالکل محال تھا، میں کسی طریقے سے اس کو مار بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ کمرے میں بے شمار فرنیچر اور ٹرنک وغیرہ پڑے تھے۔ میں نے شوکت کے دیئے ہُوئے چوہے دان کا خیال کیا جس سے آٹھ چوہے ہم لوگ پکڑ چکے تھے مگر شوکت کی ہدایات کے مطابق اس کو گرم پانی سے دھونا ضروری تھا۔ مجھے کوئی کام تو تھا نہیں اور وقت بھی کافی تھا، چنانچہ میں نے خود ہی سماوار میں پانی گرم کیا اور چوہے دان کو دھونا شروع کر دیا۔ ابھی میں نے لوٹے سے گرم پانی کی دھار اس کے آہنی تاروں پر ڈالی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سلیمہ کھڑی ہے۔ میں نے کہا۔

”آیئے، آیئے۔“

وہ اندر چلی آئی اور کہنے لگی۔

”کیا کر رہے ہیں آپ؟“

میں نے جھینپ کر جواب دیا۔

”جی چوہے دان دھو رہا ہوں۔“

وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

”چوہے دان دھو رہے ہیں۔ یہ صفائی آخر کس لیے ہو رہی ہے۔ کوئی بڑا چوہا انسپکشن کے لیے تو نہیں آ رہا۔“

یہ سُن کر میری جھینپ دُور ہو گئی اور میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”جی ہاں۔ ایک بہت بڑا چوہا انسپکشن کے لیے آنا چاہتا ہے یہ صفائی اسی سلسلے میں ہو رہی ہے۔“

یہ کہہ کر ارشد خاموش ہو گیا۔ اس پر میں نے اس سے کہا۔

”سناتے جاؤ۔ رُکو نہیں۔ تمھاری داستان بہت دلچسپ ہے۔ ہاں تو پھر سلیمہ نے کیا کہا۔

”کچھ نہیں۔ میری بات سن کر وہ صحن ہی میں چوکی پر بیٹھ گئی اور کہنے۔

”آپ صفائی کیجیے۔ اس صفائی کی انسپکشن میں کروں گی۔ ہاں یہ تو بتایئے آج یہ سب لوگ کہاں گئے ہیں۔“

میں نے جواب دیا

”سینما گئے ہیں، میں بے کار بیٹھا تھا کہ ایک چوہا اپنے کمرے میں مجھے نظر آیا۔ میں کیا عرض کروں ہمارے گھر میں کس طرح بڑے بڑے موٹے سنڈے چوہے سیندھ مارتے پھرتے ہیں۔ میری کتابوں کا تو انھوں نے ستیاناس کر دیا ہے۔ اب ان کے ظلم وستم سے میرے اندر ایک انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ چوہے دان لے آیا ہوں اس سے ہر روز دو تین چوہے پکڑتا ہوں اور ان کو کالے پانی بھیج دیتا ہوں۔“

سلیمہ نے میری گفتگو میں دلچسپی ظاہر کی۔

”خوب، خوب۔ لیکن یہ تو بتایئے کالا پانی یہاں سے کتنی دور ہے۔“

میں نے کہا۔

”بہت دور نہیں۔ کوتوالی پاس ہی جو گندہ نالا بہتا ہے اسی کو فی الحال میں نے کالا پانی بنالیا ہے۔ چوہوں نے اس پر اعتراض نہیں کیا، کیونکہ اس موری کا پانی کالا ہی ہے۔“

ہم دونوں خوب ہنسے۔ پھر میں نے لوٹا اٹھایا اور چوہے دان کو برش کے ساتھ دھونا شروع کر دیا۔ جب چھینٹے اڑے تو میں نے سلیمہ سے کہا۔

”آپ یہاں سے اُٹھ جایئے، چھینٹے اُڑ رہے ہیں۔ ویسے بھی یہ میری بڑی بد تمیزی ہے کہ میں آپ کے سامنے ایسی غلیظ چیز صاف کرنے بیٹھ گیا ہوں۔“

اس نے فوراً ہی کہا۔ آپ تکلف نہ کیجیے اور اپنا کام کرتے چلے جایئے۔ چھینٹوں کے متعلق بھی آپ کوئی فکر نہ کریں۔“

جب میں نے چوہے دان اچھی طرح دھو کر صاف کر لیا تو سلیمہ نے پوچھا۔

”اچھا، اب آپ یہ بتایئے کہ اس کو دھونے کی کیا ضرورت تھی، بغیر دھوئے کیا آپ اس ظالم چوہے کو نہیں پکڑ سکتے۔“

میں نے کہا۔

”جی نہیں۔ اس سے پہلے چونکہ اس چوہے دان میں ہم ایک چوہا پکڑ چکے ہیں اور اُس کی بو اس میں ابھی تک باقی ہے اس لیے دھونا ضروری ہے۔ گرم پانی سے پہلے چوہے کی بُو غائب ہو جائے گی۔ اس لیے دوسرا چوہا آسانی کے ساتھ پھنس جائے گا۔“

میری یہ بات سن کر سلیمہ نے بالکل بچوں کی طرح کہا۔

”اگر چوہے دان میں چوہے کی بو رہ جائے تو دوسرا چوہا نہیں آتا۔“

میں نے اسکول ماسٹروں کا سا انداز اختیار کر لیا۔

”بالکل نہیں، اس لیے کہ چوہوں کی ناک بڑی تیز ہوتی ہے۔ آپ نے سنا نہیں عام طور پر یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی کی تو چوہے کی ناک ہے۔ یعنی اس کی قوتِ شامہ ّ بڑی تیز ہے۔ سمجھیں آپ؟“

سلیمہ نے میری طرف جب دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے ایک بہت بڑی بات اس سے کہہ دی ہے جس کو سن کر وہ بہت مرعوب ہو گئی ہے۔ اس کی نگاہوں میں مجھے اپنے متعلق قدر و منزلت کی جھلک نظر آئی۔ اس سے مجھے شہ مل گئی۔ چنانچہ وہ تمام باتیں جو میں نے شوکت سے اس روز سُنی تھیں۔ ایک لیکچر کی صورت میں دہرانا شروع کر دیں اور وہ۔“

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”یہ سب مجھے افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔“

”تم بھی عجیب قسم کے منکر ہو۔“

ارشد نے بگڑ کر کہا۔

”بھئی قسم خدا کی، اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہیں حیرت ضرور ہو گی، اس لیے کہ میں خود بہت متحیر ہُوں۔ سلیمہ جیسی پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ایسی فضول باتوں سے متاثر ہو گئی۔ یہ بات مجھے ہمیشہ متحیرّ رکھے گی، مگر بھئی حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس نے میری اوٹ پٹانگ باتیں بڑے غور سے سنیں جیسے اُسے دنیا کا کوئی راز نہفتہ بتا رہا ہُوں۔ واللہ یہ ذہین لڑکیاں بھی پرلے درجے کی سادہ لوح ہوتی ہیں۔ سادہ لوح نہیں کہنا چاہیے۔ خدا معلوم کیا ہوتی ہے۔ تم اُن سے کوئی عقل کی بات کہو تو بس بگڑ جائیں گی یہ سمجھیں گی کہ ہم نے اُن کی عقل و دانش پر حملہ کر دیا ہے اور جب اُن سے کوئی معمولی سی بات کہو جس سے ذہانت کا دُور سے تعلق بھی نہ ہو تو وہ یہ سمجھیں گی کہ اُن کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تم کسی فلسفہ دان اور بال کی کھال اُتارنے والی عورت سے کہو کہ خدا ایک ہے تو وہ نکتہ چینی شروع کر دے گی۔ اگر اُس سے یہ کہو دیکھو میں نے تمہارے سامنے ماچس کی ڈبیا سے یہ ایک تیلی نکالی ہے، یہ ہُوئی ایک تیلی، اب میں دوسری نکالتا ہُوں۔ میز پر ان تیلیوں کو پاس پاس رکھ کر جب تم اس سے یہ کہو گے، دیکھو، اب یہ دو تیلیاں ہو گئی ہیں تو وہ اس قدر خوش ہو گی کہ اٹھ کر تمہیں چُومنا شروع کر دے گی۔“

یہ کہہ کر ارشد خوب ہنسا۔ مجھے بھی ہنسنا پڑا اس لیے کہ بات ہی ہنسی پیدا کرنے والی تھی۔ جب ہم دونوں کی ہنسی کم ہوئی میں نے اُس سے کہا۔

”اب تم نے اپنی بقایا کہانی سناؤ اور ہنسی مذاق کو چھوڑو۔“

”ہنسی مذاق میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں بھائی“

ارشد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میں تو اس سے ہنسی مذاق ہی میں باتیں کر رہا تھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے سن رہی تھی۔ ہاں تو جب میں نے چوہے پکڑنے کے اصول اس کو بتا دیئے تو اور زیادہ بچہ بن کر اس نے مجھ سے کہا۔

”ارشد صاحب آپ تو فوراً چوہے پکڑ لیتے ہوں گے؟“

میں نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا۔

”جی ہاں، کیوں نہیں“

اس پر سلیمہ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا۔

”کیا آپ اس چوہے کو جو آپ نے ابھی ابھی دیکھا تھا میرے سامنے پکڑ سکتے ہیں؟“

اجی یہ بھی کوئی مشکل بات ہے، یوں چٹکیوں میں اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔“

سلیمہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

”تو چلیے، میرے سامنے اسے گرفتار کیجیے۔ میں سمجھتی ہوں آپ کبھی اس چوہے کو پکڑ نہیں سکیں گے۔“

میں یہ سُن کر یونہی مسکرا دیا۔

”آپ غلط سمجھتی ہیں۔ پندرہ نہیں تو بیس منٹ میں وہ چوہا اس چوہے دان میں ہو گا۔ اور آپ کی نظروں کے سامنے بشرطیکہ آپ اتنے عرصہ تک انتظار کر سکیں۔“

سلیمہ نے کہا۔

”میں ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں مگر میں آپ سے پھر کہتی ہوں کہ آپ ناکام رہیں گے؟۔ وقت مقرر کر کے آپ چوہے کو کیسے پکڑ سکتے ہیں؟“

۔ میں اس وقت عجیب و غریب موڈ میں تھا۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ تم خدا دکھا سکتے ہو تو میں فوراً کہتا، ہاں دکھا سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے بڑے فخریہ لہجہ میں سلیمہ سے کہا۔

”ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں ابھی آپکو وہ چوہا پکڑ کے دکھا دیتا ہوں مگر شرط باندھیے۔“

اس نے کہا میں ہر شرط باندھنے کے لیے تیار ہُوں، اس لیے کہ ہار آپ ہی کی ہو گی۔ اس پر خدا معلوم مجھ میں کہاں سے جرأت آ گئی جو میں نے اس سے کہا۔

”تو یہ وعدہ کیجیے کہ اگر میں نے چوہا پکڑ لیا تو آپ سے جو چیز طلب کروں گا آپ بخوشی دے دیں گی۔“

سلیمہ نے جواب دیا۔

”مجھے منظور ہے۔“

چنانچہ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چوہے دان میں صبح کی تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا لگایا اور اس کو اپنی کتابوں کی الماری سے دور صوفے کے پاس رکھ دیا۔ شرط ورط کا مجھے اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ لیکن میں دل میں یہ دعا ضرور مانگ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی چوہا ضرور پھنس جائے تاکہ میری سرخروئی ہو۔ نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت میں نے گپ ہانک دی۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ایک بار میرے جی میں آئی کہ اس سے کہہ دوں، میں تو آپ سے یونہی مذاق کر رہا تھا۔ چوہا پندرہ منٹ میں کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔ گاندھی جی کا ستیہ گرہ ہی ہوتا تو اُسے جب چاہے پکڑ لیتے مگر یہ تو چوہا ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں۔ مگر میں اس سے یہ نہ کہہ سکا۔ اس لیے کہ اس میں میری شکست تھی۔“

یہ کہہ کر ارشد نے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگایا اور مجھ سے پوچھا۔

”کیا خیال ہے تمہارا اس داستان کے متعلق؟“

میں نے کہا۔

”بہت دلچسپ ہے، مگر اس کا دلچسپ ترین حصّہ تو ابھی باقی ہے۔ جلدی جلدی وہ بھی سنا دو۔“

”کیا پوچھتے ہو دوست۔ وہ پندرہ منٹ جو میں نے انتظار میں گزارے ساری عمر مجھے یاد رہیں گے۔ میں اور سلیمہ کمرے کے باہر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ خدا معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ مگر میری بری حالت تھی۔ سلیمہ نے میری جیب گھڑی اپنی ران پر رکھی ہوئی تھی۔ میں بار بار جھک کر اس میں وقت دیکھ رہا تھا۔ دس منٹ گزر گئے مگر پاس والے کمرہ میں چوہے دان بند ہونے کی کھٹ نہ سنائی دی۔ گیارہ منٹ گزر گئے۔ کوئی آواز نہ آئی۔ ساڑھے گیارہ منٹ ہو گئے۔ خاموشی طاری رہی۔ بارہ منٹ گزرنے پر بھی کچھ نہ ہُوا۔ سوا بارہ منٹ ہو گئے، ساڑھے بارہ ہُوئے کہ دفعتاً کھٹ کی آواز بُلند ہُوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چوہے دان میرے سینے میں بند ہُوا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے میرے دل کی دھڑکن بند سی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی ہم دونوں اُٹھے۔ دوڑ کر کمرے میں گئے اور چوہے دان کے تاروں میں سے جب مجھے ایک موٹے چوہے کی تھوتھنی اور اس کی لمبی لمبی مونچھیں نظر آئیں تو میں خوشی سے اچھل پڑا۔ پاس ہی سلیمہ کھڑی تھی، اس کی طرف میں نے فتح مند نظروں سے دیکھا اور جھٹ پٹ اس کے حیرت سے کھلے ہُوئے ہونٹوں کو چُوم لیا۔ یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ سلیمہ چند لمحات تک بالکل خاموش رہی، لیکن اس کے بعد اس نے خفگی آمیز لہجہ میں مجھ سے کہا

”یہ کیا بیہودگی ہے؟“

اُس وقت خدا معلوم میں کیسے موڈ میں تھا کہ ایک بار میں نے پھر اسی افراتفری میں اس کا بوسہ لے لیا اور کہا۔

”اجی مولانا آپ نے شرط ہاری ہے۔“

اور۔ تیسری مرتبہ اس نے اپنے ہونٹ بوسے کے لیے خود پیش کر دیے۔ جس طرح چوہا ہاتھ آیا اسی طرح سلیمہ بھی ہاتھ آگئی، مگر بھئی میں شوکت کا بہت ممنون ہُوں۔ اگر میں نے چوہے دان کو گرم پانی سے نہ دھویا ہوتا تو چوہا کبھی نہ پھنستا۔“

یہ داستان سُن کر مجھے بہت لطف آیا۔ لیکن افسوس بھی ہُوا، اس لیے کہ شوکت اس لڑکی سلیمہ کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہے۔

حافظ حسین دین

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوحافظ حسین دین

حافظ حسین دین جو دونوں آنکھوں سے اندھا تھا، ظفر شاہ کے گھر میں آیا۔ پٹیالے کا ایک دوست رمضان علی تھا، جس نے ظفر شاہ سے اُس کا تعارف کرایا۔ وہ حافظ صاحب سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ گو اُن کی آنکھیں دیکھتی نہیں تھیں مگر ظفر شاہ نے یوں محسوس کیا کہ اُس کو ایک نئی بصارت مل گئی ہے۔ ظفر شاہ ضعیف الاعتقاد تھا۔ اُس کو پیروں فقیروں سے بڑی عقیدت تھی۔ جب حافظ حسین دین اُس کے پاس آیا تو اُس نے اُس کو اپنے فلیٹ کے نیچے موٹر گراج میں ٹھہرایا۔ اُس کو وہ وائٹ ہاؤس کہتا تھا۔ ظفر شاہ سید تھا۔ مگر اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مکمل سید نہیں ہے۔ چنانچہ اُس نے حافظ حسین دین کی خدمت میں گزارش کی کہ وہ اس کی تکمیل کر دیں۔ حافظ صاحب نے تھوڑی دیر بعد اپنی بے نُور آنکھیں گھما کر اُس کو جواب دیا۔

”بیٹا۔ تو پورا بننا چاہتا ہے تو غوث اعظم جیلانی سے اجازت لینا پڑے گی۔“

حافظ صاحب نے پھر اپنی بے نُور آنکھیں گھمائیں۔

”اُن کے حضور میں تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔“

ظفر شاہ کو بڑی نا اُمیدی ہوئی۔

”آپ صاحب کشف ہیں۔ کوئی مداوا تو ہو گا۔“

حافظ صاحب نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

”ہاں چلہ کاٹنا پڑے گا مجھے۔“

”اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اپنے اس خادم کے لیے کاٹ لیجیے۔“

”سوچوں گا۔“

حافظ حسین دین ایک مہینے تک سوچتا رہا۔ اس دوران ظفر شاہ نے اُن کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ حافظ صاحب کے لیے صبح اٹھتے ہی ڈیڑھ پاؤ بادام توڑتا۔ ان کے مغز نکال کر سردائی تیار کرتا۔ دوپہر کو ایک سیر گوشت بھنوا کے اُس کی خدمت میں پیش کرتا۔ شام کو بالائی ملی ہوئی چائے پلاتا۔ رات کو ایک مُرغ مسلم حاضر کرتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر حافظ حسین نے ظفر شاہ سے کہا۔

”اب مجھے آوازیں آنی شروع ہو گئی ہیں۔“

ظفر شاہ نے پوچھا۔

”کیسی آوازیں قبلہ۔“

”تمہارے متعلق۔“

”کیا کہتی ہیں۔“

”تم ایسی باتوں کے متعلق مت پوچھا کرو۔“

”معافی چاہتا ہوں۔“

حافظ صاحب نے ٹٹول ٹٹول کر مرغ کی ٹانگ اُٹھائی اور اُسے دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔

”تم اصل میں منکر ہو۔ آزمانا چاہتے ہو تو کسی کنوئیں پر چلو۔“

ظفر شاہ تھر تھرا گیا۔

”حضور میں آپ کو آزمانا نہیں چاہتا۔ آپ کا ہر لفظ صداقت سے لبریز ہے۔“

حافظ صاحب نے سر کو زور سے جنبش دی۔

”نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیں آزماؤ۔ کھانا کھالیں تو ہمیں کسی بھی کنوئیں پر لے چلو۔“

”وہاں کیا ہو گا قبلہ۔“

”میرا معمول آواز دے گا۔ وہ کنواں پانی سے لبالب بھر جائے گا اور تمہارے پاؤں گیلے ہوئے جائیں گے۔ ڈرو گے تو نہیں؟“

ظفر شاہ ڈر گیا تھا۔ حافظ حسن دین جس لہجے میں باتیں کر رہا تھا بڑا پر ہیبت تھا۔ لیکن اُس نے اس خوف پر قابو پا کر حافظ صاحب سے کہا۔

”جی نہیں۔ آپ کی ذاتِ اقدس میرے ساتھ ہو گی تو ڈر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سارا مرغ ختم ہو گیا تو حافظ صاحب نے ظفر شاہ سے کہا۔

”میرے ہاتھ دُھلواؤ۔ اور کسی کنوئیں پر لے چلو۔“

ظفر شاہ نے اُس کے ہاتھ دُھلوائے تولیے سے پونچھے اور اُسے ایک کنوئیں پر لے گیا جو شہر سے کافی دُور تھا ظفر شاہ چادر لپیٹ کر اُس کی منڈیر کے پاس بیٹھ گیا۔ مگر حافظ صاحب نے چلا کر کہا۔

”پانچ قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں پڑھنے والا ہوں۔ کنوئیں کا پانی لبالب بھر جائے گا۔ تم ڈر جاؤ گے۔“

ظفر شاہ ڈر کر دس قدم پیچھے ہٹ گیا۔ حافظ صاحب نے پڑھنا شروع کر دیا۔ رمضان علی بھی ساتھ تھا جس نے ظفر شاہ سے حافظ صاحب کا تعارف کرایا تھا۔ وہ دُور بیٹھا مونگ پھلی کھا رہا تھا۔ حافظ صاحب نے کنوئیں پر آنے سے پہلے ظفر شاہ سے کہا تھا کہ دو سیر چاول، ڈیڑھ سیر شکر اور پاؤ بھر کالی مرچوں کی ضرورت ہے جو اس کا معمول کھا جائے گا۔ یہ تمام چیزیں حافظ صاحب کی چادر میں بندھی تھیں۔ دیر تک حافظ حسین دین معلوم نہیں کس زبان میں پڑھتا رہا۔ مگر اُس کے معمول کی کوئی آواز نہ آئی۔ نہ کنوئیں کا پانی اوپر چڑھا۔ حافظ نے چاول، شکر اور مرچیں کنوئیں میں پھینک دیں۔ پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ چند لمحات سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد حافظ پر جذب کی سی کیفیت طاری ہوئی اور وہ بُلند آواز میں بولا۔

”ظفر شاہ کو کراچی لے جاؤ۔ اُس سے پانچ سو روپے لو اور گوجرانوالہ میں زمین الاٹ کرالو۔“

ظفر شاہ نے پانچ سو روپے حافظ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ اس نے یہ روپے اپنی جیب میں ڈال کر اُس سے بڑے جلال میں کہا۔

”ظفر شاہ۔ تو یہ روپے دے کر سمجھتا ہے مجھ پر کوئی احسان کیا۔“

ظفر شاہ نے سر تاپا عجز بن کر کہا۔

”نہیں حضور میں نے تو آپ کے ارشاد کی تعمیل کی ہے۔“

حافظ حسین دین کا لہجہ ذرا نرم ہو گیا۔

”دیکھو سردیوں کا موسم ہے، ہمیں ایک دُھسے کی ضرورت ہے۔“

”چلیے ابھی خرید لیتے ہیں۔“

”دو گھوڑے کی بوسکی کی قمیص اور ایک پمپ شو۔“

ظفر شاہ نے غلاموں کی طرح کہا۔

”حضور آپ کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔“

حافظ صاحب کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ پانچ سو روپے کا دُھسّہ۔ پچاس روپے کی قراقلی کی ٹوپی۔ بیس روپے کا پمپ شو۔ ظفر شاہ خوش تھا کہ اُس نے ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی خدمت کی۔ حافظ صاحب وائٹ ہاؤس میں سو رہے تھے کہ اچانک بڑبڑانے لگے۔ ظفر شاہ فرش پر لیٹا تھا۔ اُس کی آنکھ لگنے ہی والی تھی کہ چونک کر سننے لگا۔ حافظ صاحب کہہ رہے تھے

”حکم ہوا ہے۔ ابھی ابھی حکم ہوا ہے کہ حافظ حسین دین تم دریا راوی جاؤ اور وہاں چلہ کاٹو۔ چلہ کاٹو۔ وہاں تم اپنے معمول سے بات کر سکو گے۔“

ظفر شاہ، حافظ کو ٹیکسی میں دریائے راوی پر لے گیا۔ وہاں حافظ چھیالیس گھنٹے معلوم نہیں کیا کچھ پڑھتا رہا۔ اُس کے بعد اُس نے ایسی آواز میں جو اُس کی اپنی نہیں تھی کہا۔

”ظفر شاہ سے تین سو روپیہ اور لو۔ اپنے بھائی کی آنکھوں کا علاج کرو۔ تم اتنے غافل کیوں ہو۔ اگر تم نے علاج نہ کرایا تو وہ بھی تمہاری طرح اندھا ہو جائے گا۔“

ظفر شاہ نے تین سو روپے اور دیدیے۔ حافظ حسین دین نے اپنی بے نُور آنکھیں گھمائیں جس میں مسرت کی جھلک نظر آسکتی تھی۔ اور کہا

”ڈاک خانے میں میرے بارہ سو روپے جمع ہیں۔ تم کچھ فکر نہ کرو پہلے پانچ سو اور یہ تین سو۔ کُل آٹھ سو ہوئے۔ میں تمھیں ادا کر دُوں گا۔“

ظفر شاہ بہت متاثر ہوا۔

”جی نہیں۔ ادائیگی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔“

ظفر شاہ دیر تک حافظ کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے عوض حافظ نے چالیس دن کا چلہ کاٹا مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ ظفر شاہ نے ویسے کئی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ پورا سید بن گیا ہے اور اُس کی تطہیر ہو گئی ہے مگر بعد میں اُس کو مایوسی ہوئی کیونکہ وہ اپنے میں کوئی فرق نہ دیکھتا اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سمجھا کہ شاید اُس نے حافظ صاحب کی خدمت پوری طرح ادا نہیں کی۔ جس کی وجہ سے اُس کی اُمید بر نہیں آئی۔ چنانچہ اُس نے حافظ صاحب کو روزانہ ایک مرغ کھلانا شروع کر دیا۔ باداموں کی تعداد بڑھا دی۔ دودھ کی مقدار بھی زیادہ کر دی۔

ایک دن اُس نے حافظ صاحب سے کہا۔

”پیر صاحب۔ میرے حال پر کرم فرمایئے میری مراد کبھی تو پوری ہو گی یا نہیں۔“

حافظ حسین دین نے بڑے پیرانہ انداز میں جواب دیا

”ہو گی۔ ضرور ہو گی۔ ہم اتنے چلے کاٹ چکے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تم سے ناراض ہیں۔ تم نے ضرور اپنی زندگی میں کوئی گناہ کیا ہو گا۔“

ظفر شاہ نے کچھ دیر سوچا۔

”حضور۔ میں نے۔ ایسا کوئی گناہ نہیں کیا جو۔“

حافظ صاحب نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

”نہیں ضرور کیا ہو گا۔ ذرا سوچو۔“

ظفر شاہ نے کچھ دیر سوچا۔

”ایک مرتبہ اپنے والد صاحب کے بٹوے سے آٹھ آنے چرائے تھے۔“

”یہ کوئی اتنا بڑا گناہ نہیں۔ اور سوچو۔ کبھی تم نے کسی لڑکی کو بُری نگاہوں سے دیکھا تھا؟“

ظفر شاہ نے ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔

”ہاں پیر و مُرشد۔ صرف ایک مرتبہ۔“

”کون تھی وہ لڑکی؟“

”جی میرے چچا کی۔“

”کہاں رہتی ہے؟“

”جی اسی گھر میں۔“

حافظ صاحب نے حکم دیا۔

”بُلاؤ اُس کو۔ کیا تم اُس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”جی ہاں۔ ہماری منگنی قریب قریب طے ہو چکی ہے۔“

حافظ صاحب نے بڑے پر جلال لہجے میں کہا۔

”ظفر شاہ۔ بُلاؤ اس کو۔ تم نے مجھ سے پہلے ہی یہ بات کہہ دی ہوتی تو مجھے بیکار اتنا وقت ضائع نہ کرنا پڑتا۔“

ظفر شاہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ حافظ صاحب کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا اور پھر اپنی ہونے والی منگیتر سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ حافظ صاحب کو ملے۔ بادلِ ناخواستہ اُوپر گیا۔ بلقیس بیٹھی ناول پڑھ رہی تھی۔ ظفر شاہ کو دیکھ کر ذرا سمٹ گئی اور کہا۔

”آپ میرے کمرے میں کیسے آ گئے۔“

ظفر شاہ نے دبے دبے لہجے میں جواب دیا۔

”وہ۔ جو حافظ صاحب آئے ہوئے ہیں نا۔“

بلقیس نے ناول ایک طرف رکھ دیا۔

”ہاں ہاں۔ میں نے انھیں کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ کیا بات ہے۔“

”بات یہ ہے کہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

بلقیس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ اُن کی تو آنکھیں ہی نہیں۔“

وہ تم سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ بڑے صاحب کشف بزرگ ہیں۔ اُن کی بات سے ممکن ہے ہم دونوں کا بھلا ہو جائے۔“

بلقیس مسکرائی۔

”معلوم نہیں۔ آپ اتنے ضعیف الاعتقاد کیوں ہیں۔ لیکن چلیے۔ اندھا ہی تو ہے۔ اُس سے کیا پردہ ہے۔“

بلقیس ظفر شاہ کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں گئی۔ حافظ حسین دین بیٹھا چلغوزے کھا رہا تھا۔ جب اُس نے قدموں کی چاپ سُنی تو بولا

”آگئے ظفر شاہ۔“

ظفر شاہ نے تعظیماً جواب دیا

”جی ہاں حضور۔“

”لڑکی آئی ہے۔؟

”جی ہاں“

حافظ صاحب نے اپنی بے نُور آنکھوں سے بلقیس کو دیکھنے کی کوشش کی اور کہا۔

”بیٹھ جاؤ میرے سامنے۔“

بلقیس سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ حافظ صاحب نے ظفر شاہ سے کہا۔

”اب تمہاری مراد بر آئیگی۔ ہم لڑکی کو وظیفہ بتائیں گے۔ انشاء اللہ سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔“

ظفر شاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً پھل منگوائے اور بلقیس سے کہا۔ حافظ صاحب معلوم نہیں کتنی دیر لگائیں۔ ان کی خدمت کرنا نہ بھولنا۔“

حافظ صاحب نے کہا۔

”دیکھو ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ آج ہماری طبیعت چاہتی ہے کہ تمیں بھی خوش کر دیں۔ جاؤ بازار سے چار تولے نوشادر، ایک تولہ چونا، دس تولے شنگرف اور ایک مٹی کا کُوزا لے آؤ۔

جتنا اس کا وزن ہے اتنا ہی سونا بن جائے گا۔“

ظفر شاہ بھاگا بھاگا بازار گیا۔ اور یہ چیزیں لے آیا۔ جب اپنے وائٹ ہاؤس پہنچا تو کواڑ کھلے تھے اور اس میں کوئی نہیں تھا۔ اُوپر گیا تو معلوم ہوا کہ بی بی بلقیس بھی نہیں ہے۔

حامد کا بچہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوحامد کا بچہ

لاہور سے بابو ہر گوپال آئے تو حامد گھر کا رہانہ گھاٹ کا۔ انھوں نے آتے ہی حامد سے کہا۔

”لو بھئی فوراً ایک ٹیکسی کا بندوبست کرو۔“

حامد نے کہا۔

”آپ ذرا تو آرام کر لیجئے۔ اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں آئے ہیں۔ تھکاوٹ ہو گی۔“

بابو ہر گوپال اپنی دھن کے پکے تھے۔ نہیں بھائی مجھے تھکاوٹ واوٹ کچھ نہیں۔ میں یہاں سیر کی غرض سے آیا ہوں۔ آرام کرنے نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے دس دن نکالے ہیں۔ یہ دس دن تم میرے ہو۔ جو میں کہوں گا تمہیں ماننا ہو گا میں اب کے عیاشی کی انتہا کر دینا چاہتا ہوں۔ سوڈا منگواؤ۔“

حامد نے بہت منع کیا کہ دیکھئے بابو ہر گوپال صبح سویرے مت شروع کیجیے مگر وہ نہ مانے۔ بکس کھول کر جونی واکر کی بوتل نکالی اور اسے کھولنا شروع کر دیا۔

”سوڈا نہیں منگواتے تو لاؤ تھوڑا سا پانی لاؤ۔ کیا پانی بھی نہیں دو گے۔“

بابو ہر گوپال، حامد سے عمر میں بڑے تھے۔ حامد تیس کا تھا تو وہ چالیس کے تھے۔ حامد ان کی عزت کرتا تھا اس لیے کہ اس کے مرحوم باپ سے بابو صاحب کے مراسم تھے۔ اس نے فوراً سوڈا منگوایا اور بڑی لجاجت سے کہا۔

”دیکھئے مجھے مجبور نہ کیجیے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میری بیوی بڑی سخت گیر ہے۔“

مگر بابو ہر گوپال کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اور اسے ساتھ دینا ہی پڑا۔ جیسی کہ امید تھی، چار پیگ پینے کے بعد بابو ہر گوپال نے حامد سے کہا۔

”لو بھئی اب چلیں گھومنے۔ مگر دیکھو کوئی ایسی ٹیکسی پکڑنا جو ذرا شاندار ہو۔ پرائیویٹ ٹیکسی ہو تو بہت اچھا ہے۔ مجھے ان میٹروں سے نفرت ہے۔“

حامد نے پرائیویٹ ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ نئی فورڈ تھی۔ ڈرائیور بھی بہت اچھا تھا۔ بابو ہر گوپال بہت خوش ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنا چوڑا بٹوا نکالا کھول کر دیکھا۔ سو سو کے کئی نوٹ تھے اور اطمینان کا سانس لیا اور اپنے آپ سے کہا۔

”کافی ہیں۔ لو بھئی ڈرائیور اب چلو۔“

ڈرائیور نے اپنے سر پر ٹوپی کو ترچھا کیا اور پوچھا۔

”کہاں سیٹھ۔“

بابو ہر گوپال حامد سے مخاطب ہوئے

”بولو بھئی تم۔“

حامد نے کچھ دیر سوچ کر ایک ٹھکانہ بتایا۔ ٹیکسی نے ادھر کا رخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بمبئی کا سب سے بڑا دلال ان کے ساتھ تھا۔ اس نے مختلف مقامات سے مختلف لڑکیاں نکال نکال کر پیش کیں مگر حامد کو کوئی پسند نہ آئی وہ نفاست پسند تھا۔ صفائی کا شیدا تھا۔ یہ لڑکیاں سرخی پاؤڈر کے باوجود اس کو گندی دکھائی دیں۔ اس کے علاوہ ان کے چہروں پر کسبیت کی مہر تھی۔ یہ اسے بہت گھناؤنی معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت کو کسبی ہونے پر بھی عورت ہی رہنا چاہیے۔ اپنے عورت پن کو اپنے پیشے کے نیچے دبا نہیں دینا چاہیے۔ اس کے برعکس بابو ہر گوپال غلاظت پسند تھا۔ لاکھوں میں کھیلتا تھا۔ چاہتا تو بمبئی کا پورا شہر صابن پانی سے دھلوا دیتا مگر اپنی ذاتی صفائی کا اسے کچھ خیال نہیں تھا۔ نہاتا تھا تو بہت ہی تھوڑے پانی سے۔ کئی کئی شیو نہیں کرتا تھا۔ گلاس چاہے میلا چکٹ ہو، اٹھا کر اس میں فرسٹ کلاس وسکی انڈیل دیتا تھا۔ غلیظ بھکارن کو سینے کے ساتھ چمٹا کر سو جاتا تھا اور کہتا تھا

”لطف آ گیا۔ کیا چیز تھی۔“

حامد کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ بابو کس قسم کا انسان ہے۔ اوپر نہایت ہی قیمتی شیروانی ہے نیچے ایسی بنیان ہے کہ اس کو دیکھنے سے ابکائیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ رومال پاس ہیں لیکن کرتے کے دامن سے ناک کا بہتا ہوا رینٹھ صاف کر رہا ہے۔ غلیظ پلیٹ میں چاٹ کھا کر خوش ہو رہا ہے۔ تکیے کے غلاف میلے ہو کر بدبو چھوڑ رہے ہیں مگر اسے ان کو بدلوانے کا خیال تک نہیں آتا۔ حامد نے اس کے متعلق بہت غور کیا تھا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچا۔ اس نے کئی مرتبہ بابو ہر گوپال سے کہا۔

”بابو جی آپ کو غلاظت سے گھن کیوں نہیں آتی۔“

یہ سن کر بابو ہر گوپال مسکرا دیتے۔

”کیوں نہیں آتی۔ لیکن تمہیں تو ہر جگہ غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے۔ اب اس کا کیا علاج ہے۔“

حامد خاموش ہو جاتا اور دل ہی دل میں بابو ہر گوپال کی غلاظت پسندی پر کڑھتا رہتا۔ ٹیکسی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ دلال نے جب دیکھا کہ حامد انتخاب کے معاملے میں بہت کڑا ہے تو اس نے دل میں کچھ سوچا اور ڈرائیور سے کہا۔

”شیوا جی پارک کی طرف دباؤ۔ وہ بھی پسند نہ آئی تو قسم خدا کی بھڑواگیری چھوڑ دوں گا۔“

ٹیکسی شوا جی پارک کی ایک بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس رکی۔ دلال اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور بابو ہر گوپال اور حامد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ فرش کی ٹائلیں چمک رہی تھیں۔ فرنیچر پر گرد کا ذرہ تک نہیں تھا۔ ادھر دیوار پر سوامی وویکانند کی تصویر لٹک رہی تھی۔ سامنے گاندھی جی کی تصویر سوبھاش کا فوٹو بھی تھا۔ میز پر مرہٹی کی کتابیں پڑی تھیں۔ دلال نے ان کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ حامد گھر کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ چیزیں مختصر تھیں مگر قرینے سے رکھی گئی تھیں۔ فضا بڑی سنجیدہ تھی اس میں کسبیوں کا وہ بے شرم تیکھا پن نہیں تھا۔ حامد بڑی بے صبری سے لڑکی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ دوسرے کمرے سے ایک مرد نمودار ہوا۔ اس نے ہولے ہولے سرگوشیوں میں دلال سے باتیں کیں۔ بابو ہر گوپال اور حامد کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ابھی آتی ہے۔ نہا رہی تھی، کپڑے پہن رہی ہے۔“

یہ کہہ وہ چلا گیا۔ حامد نے غور سے کمرے کی چیزیں دیکھنا شروع کی۔ میز کے پاس کونے میں بڑی خوبصورت رنگین چٹائی پڑی تھی۔ میز پر کتابوں کے ساتھ دس پندرہ رسالے تھے۔ نیچے بڑے نازک چپل چمکیلے فرش پر پڑے تھے۔ کچھ اس انداز سے کہ ابھی ابھی ان سے پاؤں نکل کر گئے ہیں۔ سامنے شیشوں والی الماری میں قطار در قطار کتابیں تھیں۔ بابو ہر گوپال نے فرش پر جب اپنے سگرٹ کا آخری حصہ اپنی گر گابی کے نیچے دبایا تو حامد کو بہت غصہ آیا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے کہ دوسرے کمرے کے دروازے سے اس کے کانوں میں ریشمیں سر سراہٹ پہنچی۔ اس نے زاویہ بدل کر دیکھا۔ ایک گوری چٹی لڑکی، بالکل نئے کاشٹے میں ملبوس ننگے پیر آ رہی تھی۔۔ کاشٹے کا پلو اس کے سر سے کھسکا۔ سیدھی مانگ تھی۔ جب قریب آ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تو اس کے چمکیلے جوڑے میں حامد نے ایک پتا اڑسا ہوا دیکھا۔ پتے کا رنگ سفیدی مائل تھا۔ موٹے جوڑے میں جو بڑی صفائی سے کیا گیا تھا یہ پتا بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ حامد نے پرنام کا جواب اٹھ کر دیا۔ لڑکی شرماتی لجاتی ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی عمر حامد کے اندازے کے مطابق سترہ برس سے اوپر نہیں تھی۔ قد درمیانہ، رنگ گورا جس میں ہلکی ہلکی پیاری جھلک تھی۔ جس طرح اس کی ساڑھی نئی تھی اسی طرح وہ خود نئی معلوم ہوتی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھکا لیں۔ حامد کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ آہستہ آہستہ اس کے وجود میں سرایت کر رہی ہے۔ لڑکی بڑی صاف ستھری، بڑی اجلی تھی۔ بابو ہر گوپال نے حامد سے کچھ کہا تو وہ چونک پڑا جیسے اس کو کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہے

”کیا کہا بابو ہر گوپال؟“

بابو ہر گوپال نے کہا۔

”بات کرو بھئی۔“

پھر آواز دھیمی کر دی۔

”مجھے تو کوئی خاص پسند نہیں۔“

حامد کباب ہو گیا۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ڈھلا ہوا شباب اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ نکھری ہوئی بے دماغ جوانی۔ ریشم میں لپٹی ہوئی اس کی نظروں کے سامنے تھی جس کو وہ حاصل کر سکتا تھا۔ ایک رات کے لیے نہیں، کئی راتوں کے لیے، کیونکہ وہ قیمت ادا کر کے اپنائی جا سکتی تھی، لیکن حامد نے جب یہ سوچا تو اسے دکھ ہوا کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ لڑکی بکاؤ مال ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پھر اسے خیال کہ آیا اگر ایسا ہوتا تو اس کو حاصل کیسے کرتا۔ بابو ہر گوپال نے بڑے بھونڈے انداز میں پوچھا۔

”کیا خیال ہے بھئی۔“

”خیال؟“

حامد پھر چونکا۔ آپ کو تو پسند نہیں، لیکن میں۔“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بابو ہر گوپال بڑے دوست نواز تھے۔ اٹھے اور دلال سے کاروباری انداز میں پوچھا۔

”کیوں بھئی کیا دینا پڑے گا؟“

دلال نے جواب دیا۔

”چھوکری دیکھ لیجئے۔ ابھی تازہ تازہ دھندا شروع کیا ہے۔“

بابو ہر گوپال نے اس کی بات کاٹی۔

”تم اسے چھوڑے۔ معاملے کی بات کرو۔“

دلال نے بیڑی سلگائی، سو روپے ہوں گے۔ پورا دن رکھئے یا پوری رات رکھئے۔ ایک ڈیڑھیا کم نہیں ہو گا۔“

بابو ہر گوپال حامد سے مخاطب ہوئے۔

”کیوں بھئی۔“

حامد کو بابو ہر گوپال اور دلال کی گفتگو بہت ناگوار گزر رہی تھی۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس لڑکی کی توہین ہو رہی ہے۔ سو روپے میں یہ دھڑکتا ہوا شباب یہ دہکتی ہوئی جوانی۔ اس کو یہ سن کر بہت کوفت ہوئی کہ مرہٹی حسن کا جو یہ نادر نمونہ اس کے سامنے سانس لے رہا تھا اس کی قیمت صرف سو روپے ہے۔ مگر اس کوفت کے ساتھ ہی اس خیال نے اس کے دل میں چٹکی لی کہ سو روپے دے کر آدمی اس کو حاصل تو کر سکتا ہے۔ ایک دن یا ایک رات کے لیے لیکن پھر اس نے سوچا۔

”صرف ایک دن یا ایک رات کیلیے۔ اس کے ساتھ تو آدمی کو اپنی ساری عمر بتا دینی چاہیے۔ اس کی ہستی میں اپنی ہستی مدغم کر دینی چاہیے۔“

بابو ہر گوپال نے پھر پوچھا۔

”کیوں بھئی کیا خیال ہے؟“

حامد اپنا خیال ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بابو ہر گوپال مسکرایا۔ جیب سے بٹوہ نکالا اور سو کا ایک نوٹ دلال کو دے دیا۔

”ایک ڈیڑھیا کم نہ ایک ڈیڑھیا زیادہ۔ پھر وہ حامد سے مخاطب ہوا۔

”چلو بھئی۔ معاملہ طے ہو گیا۔“

حامد خاموش ہو گیا۔ دونوں نیچے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھے۔ دلال لڑکی لے کر آ گیا۔ وہ شرماتی لجاتی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ہوٹل میں ایک کمرے کا بندوبست کر کے بابو ہر گوپال اپنے لیے کوئی لڑکی تلاش کرنے چلا گیا۔ لڑکی پلنگ پر آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی۔ حامد کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ بابو ہر گوپال وسکی کی بوتل چھوڑ گیا تھا۔ آدھی کے قریب باقی تھی۔ حامد نے سوڈا منگوا کر ایک بہت بڑا پیگ لگایا۔ اس سے اس میں کچھ جرأت پیدا ہوئی۔ اس نے لڑکی کے پاس بیٹھ کر پوچھ۔

”آپ کا نام؟“

لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر جواب دیا۔

”لتا منگلاؤں کر۔“

بڑی پیاری آواز تھی۔ حامد نے ایک بڑا پیگ اپنے اندر انڈیلا اور لتا کے سر سے کاشٹے کا پلو ہٹا کر اس کے چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ لتا نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھپکائیں۔ حامد نے ساڑھی کا پلو بالکل نیچے گرا دیا۔ چست چولی کے کھلے گریبان سے اس کو لتا کے سینے کی ابھار کی ننھی سی دھڑکتی ہوئی جھلک دکھائی دی۔ حامد کا سارا وجود تھرا گیا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ چولی بن کر لتا کے ساتھ چمٹ جائے۔ اس کی میٹھی میٹھی گرمی محسوس کرے اور سو جائے۔ لتا ہندوستانی نہیں جانتی تھی۔ اس کو منگلاؤں سے آئے صرف دو مہینے ہوئے تھے۔ مرہٹی بولتی تھی۔ بڑی کرخت زبان ہے لیکن اس کے منہ میں یہ بڑی ملائم ہو گئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں حامد کی باتوں کا جواب دیتی تو وہ اس سے کہتا

”نہیں لتا، تم مرہٹی میں بات کرو۔ مجھے بہت چانگلی لگتی۔“

لفظ

”چانگلی“

سن کر لتا ہنس پڑتی اور صحیح تلفظ اس کو بتاتی، لیکن حامد چ اور سے کی درمیانی آواز پیدا نہ کر سکتا۔ اس پر دونوں کھکھلا کر ہنسنے لگتے۔ حامد اس کی باتیں نہ سمجھتا لیکن اس نہ سمجھنے میں اس کو لطف آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس کے ہونٹ چوم لیتا اور اس سے کہتا۔

”یہ پیارے پیارے بول جو تم اپنے منہ سے نکال رہی ہو میرے منہ میں ڈال دو۔ میں انھیں پینا چاہتا ہوں۔“

وہ کچھ نہ سمجھتی اور ہنس دیتی۔ حامد اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتا۔ لتا کی بانہیں بڑی سڈول اور گوری گوری تھیں ان پر چولی کی چھوٹی چھوٹی آستینیں پھنسی ہوئی تھیں۔ حامد نے ان کو بھی کئی بار چوما لتا کا ہر عضو حامد کو پیارا لگتا تھا۔ رات کو نو بجے حامد نے لتا کو اس کے گھر چھوڑا تو اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کیا۔ اس کے ملائم جسم کا لمس جیسے ایک دم چھال کی طرح اتر کر اس سے جدا ہو گیا۔ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح بابو ہر گوپال آئے۔ انھوں نے تخلیے میں اس سے پوچھا

”کیوں کیسی رہی؟“

حامد نے صرف اتنا کہا۔

”ٹھیک تھی۔“

”چلتے ہو پھر؟“

”نہیں مجھے ایک ضروری کام ہے۔“

”بکواس نہ کرو۔ میں نے تم سے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دس دن تم میرے ہو۔“

حامد نے بابو ہر گوپال کو یقین دلایا کہ اسے واقعی بہت ضروری کام ہے۔ پونے جا رہا ہوں۔ وہاں اس کو ایک آدمی سے مل کر اپنا کام کرانا ہے۔ بابو ہر گوپال انجام کار مان گئے اور اکیلے عیاشی کرنے چلے گئے۔ حامد نے ٹیکسی لی۔ بینک سے روپے نکلوائے اور سیدھا لتا کے ہاں پہنچا۔ وہ اندر نہا رہی تھی۔ کمرے میں ایک مرد بیٹھا تھا، وہی جس نے پہلے دن کہا تھا۔

”ابھی آتی ہے۔ نہا رہی تھی، کپڑے بدل رہی ہے۔“

حامد نے اس سے کچھ دیر باتیں کیں اور سو کا ایک نوٹ اس کے حوالے کر دیا۔ لتا آئی پہلے سے بھی زیادہ صاف ستھری اور نکھری ہوئی۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے پرنام کیا۔ حامد اٹھا اور اس مرد سے مخاطب ہوا۔

”میں چلتاہوں۔ تم لے آؤ انھیں۔ وقت پر چھوڑ جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گیا، لتا آئی اور حامد کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا لمس محسوس کر کے حامد کو بڑی راحت ہوئی۔ وہ اس کو وہیں ٹیکسی میں اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیتا مگر لتا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ شام کے ساڑھے سات بجے تک وہ اس کے ساتھ رہی۔ جب اس کے گھر چھوڑا تو ایسا محسوس کیا کہ اس کے دل کی راحت اس سے جدا ہو گئی ہے۔ رات بھر وہ بے چین رہا۔ حامد شادی شدہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو بچوں کا باپ تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ سخت حماقت کر رہا ہے۔ اگر اس کی بیوی کو پتہ چل گیا تو آفت برپا ہو جائے گی۔ ایک بار سلسلہ ہو گیا ٹھیک ہے، مگر یہ سلسلہ تو اب دراز ہونے کی طرف مائل تھا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب شواجی پارک کا رخ نہیں کریگا۔ مگر صبح دس بجے وہ پھر لتا کے ساتھ ہوٹل میں لیٹا تھا۔ پندرہ روز تک حامد بلاناغہ لتا کے ہاں جاتا رہا۔ اس کے بینک کے اکاؤنٹ میں سے دو ہزار روپے اڑ چکے تھے۔ کاروبار الگ اس کی غیر موجودگی کے باعث نقصان اٹھا رہا تھا۔ حامد کو اس کا کامل احساس تھا مگر لتا اس کے دل و دماغ پر بری طرح چھا چکی تھی۔ لیکن حامد نے ہمت سے کام لیا اور ایک یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس دوران میں بابو ہر گوپال اپنی میلی اور غلیظ عیاشیاں ختم کر کے لاہور واپس جا چکا تھا۔ حامد نے خود کو زبردستی اپنے کاروباری کاموں میں مصروف کر دیا اور لتا کو بھولنے کی کوشش کی۔ چار مہینے گزر گئے۔ حامد ثابت قدم رہا۔ لیکن ایک دن اتفاق سے اس کا گزر شیوا جی پارک سے ہوا۔ حامد نے غیر ارادی طور پر ٹیکسی والے سے کہا۔

”روک لو یہاں۔“

ٹیکسی رکی۔ حامد سوچنے لگا۔

”نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ ٹیکسی والے سے کہو چلے“!

مگر دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور اوپر چلا گیا۔ لتا آئی تو حامد نے دیکھا کہ وہ پہلے سے موٹی ہے۔ چھاتیاں زیادہ بڑھی ہیں۔ چہرے پر گوشت بڑھ گیا ہے۔ حامد نے سو روپے دیے اور اس کو ہوٹل میں لے گیا۔ یہاں اس کو جب معلوم ہوا کہ لتا حاملہ ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ گھبرا کر اس نے پوچھا۔

”یہ۔ یہ حمل کس کا ہے۔؟“

لتا کچھ نہ سمجھی۔ حامد نے اس کو بڑی مشکل سے سمجھایا تو اس نے سر ہلا کر کہا۔

”ہم کو مالوم نہیں۔“

حامد پسینہ پسینہ ہو گیا۔

”تمہیں بالکل معلوم نہیں۔“

لتا نے سر ہلایا۔

”نہیں۔“

حامد نے تھوک نگل کر پوچھا۔

”کہیں۔ میرا تو نہیں؟“

”مالوم نہیں۔“

حامد نے مزید استفسار کیا۔ بہت ہی باتیں کیں تو اسے معلوم ہوا کہ لتا کے لواحقین نے حمل گروانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ کوئی دوا اثر نہیں کرتی تھی۔ ایک دوا نے تو اسے بیمار کر دیا چنانچہ ایک مہینہ وہ بستر پر پڑی رہی۔ حامد نے بہت سوچا۔ ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آئی کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کرے اور بہت جلدی کرے کیونکہ بچے کی خاطر لتا کو گاؤں بھیجا جا رہا تھا۔ حامد نے اس کو گھر چھوڑا اور ایک ڈاکٹر کے پاس گیا جو اس کا دوست تھا اس نے حامد سے کہا۔

”دیکھو یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے۔ زندگی اور موت کا سوال در پیش ہوتا ہے۔“

حامد نے اس سے کہا۔

”یہاں میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ نطفہ یقیناً میرا ہے۔ میں نے اچھی طرح حسات لگایا ہے۔ اس سے بھی اچھی طرح دریافت کیا ہے۔ خدا کے لیے آپ سوچئے میری پوزیشن کیا ہے۔ میری اولاد۔ میں تو یہ سوچتے ہی کانپ کانپ جاتا ہوں۔ آپ میری مدد نہیں کریں گے تو سوچتا سوچتا پاگل ہو جاؤں گا۔“

ڈاکٹر نے اس کو دوا دے دی۔ حامد نے لتا کو پہنچا دی مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ حامد خوشخبری سننے کے لیے بے قرار تھا مگر لتا نے اس سے کہا کہ اس پر پہلے بھی کسی دوا نے اثر نہیں کیا تھا۔ حامد بڑی مشکلوں سے ایک اور دوا لایا مگر یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اب لتا کا پیٹ صاف نمایاں تھا۔ اس کے لواحقین اسے گاؤں بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن حامد نے ان سے کہا۔

”نہیں ابھی ٹھہر جاؤ۔ میں کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔“

بندوبست کچھ بھی نہ ہوا۔ سوچ سوچ کر حامد کا دماغ عاجز آگیا۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بابو ہر گوپال پر سو لعنتیں بھیجتا تھا۔ اپنے آپ کو کوستا تھا کہ کیوں اس نے حماقت کی۔ یہ سوچا تو لرز جاتا کہ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بھی اپنی ماں کی طرف پیشہ کریگی۔ ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اس کو لتا سے نفرت ہوگئی۔ اس کا حسن اس کے دل میں اب پہلے سے جذبات پیدا نہ کرنا۔ غلطی سے اس کا ہاتھ لتا سے چھو جاتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس نے انگاروں میں ہاتھ جھونک دیا ہے۔ اس کو اب لتا کی کوئی ادا پسند نہیں تھی۔ اس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس کا بچہ جننے سے پہلے پہلے مر جائے۔ وہ اور مردوں کے پاس بھی جاتی رہی تھی، کیا اسے حامد ہی کا نطفہ قبول کرنا تھا؟ حامد کے جی میں آئی کہ وہ اس کے سوجھے ہوئے پیٹ میں چھرا بھونک دے یا کوئی ایسا حیلہ کرے کہ اس کا بچہ پیٹ ہی میں مر جائے۔ لتا بھی کافی فکر مند تھی۔ اس کی کبھی خواہش نہیں تھی کہ بچہ ہو۔ اس کے علاوہ اس کو بہت بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس کو الٹیوں نے نڈھال کر دیا تھا۔ اب ہر وقت اس کے پیٹ میں اینٹھن سی رہتی تھی۔ مگر حامد سمجھتا تھا کہ وہ فکر مند نہیں ہے۔

”اور کچھ نہیں تو کم بخت میری حالت دیکھ کر ہی ترس کھا کر بچہ قے کر دے۔“

دوائیں چھوڑ کر ٹونے ٹوٹکے بھی کیے مگر بچہ اتنا ہٹ دھرم تھا اپنی جگہ پر قائم رہا۔ تھک ہار کر حامد نے لتا کو گاؤں جانے کی اجازت دے دی لیکن خود وہاں جا کر مکان دیکھ آیا۔ حساب کے مطابق بچہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پیدا ہونا تھا۔ حامد نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے کسی نہ کسی طرح مروا ڈالے گا، چنانچہ اس غرض سے اس نے بمبئی سے ایک بہت بڑے دادا سے راہ و رسم پیدا کی، اس کو خوب کھلاتا پلاتا رہا۔ اس پر اس کا کافی روپیہ خرچ ہوا۔ مگر حامد نے کوئی خیال نہ کیا۔“

وقت آیا تو اس نے اپنی ساری اسکیم دادا کریم کو بتا دی۔ ایک ہزار روپے طے ہوئے۔ حامد نے فوراً دے دیے۔ دادا کریم نے کہا۔

”اتنا چھوٹا بچہ مجھ سے نہیں مارا جائے گا۔ میں لا کر تمہارے حوالے کر دوں گا۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام۔ ویسے یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔ اس کی تم کچھ فکر نہ کرو۔“

حامد مان گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ بچے کو گاڑی کی پٹڑی پر رکھ دے گا۔ اپنے آپ کچلا جائے گا یا کسی اور ترکیب سے اس کا خاتمہ کر دے گا۔ دادا کریم کو ساتھ لے کر وہ لتا کے گاؤں آپہنچا۔ دادا کریم نے بتایا کہ بچہ پندرہ روز ہوئے پیدا ہو چکا ہے۔ حامد کے دل میں وہ جذبہ پیدا ہوا جو اپنے پہلے لڑکے کی پیدائش پر اس کو محسوس ہوا تھا مگر اس نے اس کو وہیں دبا دیا اور کریم سے کہا۔

”دیکھو آج رات یہ کام ہو جائے۔“

رات کے بارہ بجے ایک اجاڑ جگہ پر حامد کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب طوفان برپا تھا۔ وہ خود کو بڑی مشکلوں سے قاتل میں تبدیل کر چکا تھا۔ وہ پتھر جو اس کے سامنے پڑا تھا۔ بچے کا سر کچلنے کے لیے کافی تھا۔ کئی بار اسے اٹھا کر وہ اس کے وزن کا اندازہ کر چکا تھا۔ ساڑھے بارہ ہوئے تو حامد کو قدموں کی آواز آئی۔ حامد کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا جیسے سینے سے باہر آجائے گا۔ دادا کریم اندھیرے میں نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ پاس آکر اس نے حامد کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دے دی اور کہا۔

”میرا کام ختم ہوا۔ میں چلا۔“

یہ کہہ وہ چلا گیا۔ حامد بہت بری طرح کانپ رہا تھا۔ بچہ کپڑے کے اندر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ حامد نے اسے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر اپنے لرزے پر قابو پانے کی کوشش کی۔ جب یہ کچھ کم ہوا تو اس نے وزنی پتھر اٹھایا۔ ٹٹول کر سر دیکھا۔ پتھر زور سے پٹکنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا، بچے کو ایک نظر دیکھ تو لوں۔ پتھر ایک طرف رکھ کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیاسلائی نکالی اور ایک تیلی سلگائی۔ یہ اس کی انگلیوں ہی میں جل گئی۔ اس کی ہمت نہ پڑی۔ کچھ دیر سوچا۔ دل مضبوط کیا۔ دیاسلائی کی تیلی جلائی۔ کپڑا ہٹایا۔ پہلے سرسری نظر سے پھر ایک دم غور سے دیکھا۔ تیلی بجھ گئی۔ یہ کس کی شکل تھی؟۔ اس نے کہیں دیکھی تھی۔ کہاں؟۔ کب؟ حامد نے جلدی جلدی ایک تیلی جلائی اور بچے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے اس مرد کا چہرہ آگیا جس کے ساتھ لتا شیواجی پارک میں رہتی تھی۔ ہٹ تیری ایسی کی تیسی۔ ہو بہو وہی شکل۔ وہی ناک نقشہ! حامد نے بچے کو وہیں چھوڑا اور قہقہے لگاتا چلا گیا۔

حجِ اکبر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوحجِ اکبر

امتیاز اور صغیر کی شادی ہوئی تو شہر بھر میں دھوم مچ گئی۔ آتش بازیوں کا رواج باقی نہیں رہا تھا مگر دولہے کے باپ نے اس پرانی عیاشی پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ جب صغیر زیوروں سے لدے پھندے سفید براق گھوڑے پر سوار تھا، تو اس کے چاروں طرف انار چھوٹ رہے تھے۔ مہتابیاں اپنے رنگ برنگ شعلے بکھیر رہی تھیں۔ پٹاخے پھوٹ رہے تھے۔ صغیر خوش تھا۔ بہت خوش کہ اس کی شادی امتیاز سے طے پا گئی تھی جس سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔ صغیر نے امتیاز کو ایک شادی کی تقریب میں دیکھا۔ اس کی صرف ایک جھلک اسے دکھائی دی

تھی۔ مگر وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اور اس نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ اس کے علاوہ اور کسی کو اپنی رفیقہ ٔحیات نہیں بنائے گا، چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر نہ ہو جائے۔ دنیا اِدھر کی اُدھر نہ ہوئی۔ صغیر نے امتیاز سے ملنے کے راستے ڈھونڈ لیے۔ شروع شروع میں اس خوبرو لڑکی کے حجاب آڑے آیا، لیکن بعد میں صغیر کو اس کا التفات حاصل ہو گیا۔ صغیر بہت مخلص دل نوجوان تھا۔ اس میں ریاکاری نام کو بھی نہ تھی۔ اس کو امتیاز سے محبت ہو گئی تو اس نے یہ سمجھا کہ اسے اپنی زندگی کا اصل مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ امتیاز اسے قبول کرے گی یا نہیں۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا کہ اپنی محبت کے جذبے ہی کے سہارے ساری زندگی بسر کر دیتا۔ اِس کو جب امتیاز سے پہلی مرتبہ بات کرنے کا موقعہ ملا تو اس نے گفتگو کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کی،

”دیکھو لالی، میں ایک نامحرم آدمی ہوں۔ میں نے مجبور کیا ہے کہ تم مجھ سے ملو۔ اب اس ملاپ کا انجام نیک ہونا چاہیے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے علاوہ اور کوئی عورت زندگی میں نہیں آئے گی۔ یہ میرے ضمیر اور دل کی اکٹھی آواز ہے۔ تم بھی وعدہ کرو کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھے کوئی آزار نہیں پہنچاؤ گی اور میری موت کے بعد بھی مجھے یاد کرتی رہو گی۔ اس لیے کہ قبر میں بھی میری سوکھی ہڈیاں تمہارے پیار کی بھوکی ہوں گی“

امتیاز نے دھڑکتے ہوئے دل سے وعدہ کیا کہ وہ اس عہد پر قائم رہے گی۔ اس کے بعد ان دونوں میں چھپ چھپ کے ملاقاتیں رہیں۔ صغیر اس کو نکاح سے پہلے ہاتھ لگانا بہت بڑا گناہ سمجھتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں ان کا موضوع عشق و محبت نہیں ہوتا تھا۔ صغیر مطمئن تھا کہ امتیاز اس کی محبت کی دعوت قبول کر چکی ہے۔ اس پر اب اور زیادہ گفتگو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ویسے وہ اپنی محبوبہ سے ملنا اس لیے ضروری سمجھتا تھا کہ وہ اس کے عادات و خصائل سے واقف ہو جائے اور وہ بھی اس کو اچھی طرح جان پہچان لے تاکہ وہ اس کی جبلت کا اندازہ کر سکے، اور اس کو شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔ اس نے ایک دن امتیاز سے بڑے غیر عاشقانہ انداز میں کہا

”تازی میں اب بھی تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم نے مجھ میں کوئی خامی دیکھی ہے، اگر میں تمہارے معیار پر پورا نہیں اترا تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو، تم کسی بندھن میں گرفتار نہیں ہو۔ تم مجھے دُھتکار دو تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ میری محبت میرے لیے کافی ہے۔ میں اس کے اور ان ملاقاتوں کے سہارے کافی دیر تک جی سکتا ہوں“

امتیاز اس سے بہت متاثر ہوئی اس کا جی چاہا کہ صغیر کو اپنے گلے سے لگا کر رونا شروع کر دے، مگر وہ اسے ناپسند کرتا۔ اس لیے اس نے اپنے جذبات اندر ہی اندر مسل ڈالے۔ وہ چاہتی تھی کہ صغیر اس سے فلسفیانہ باتیں نہ کرے۔ لیکن کبھی کبھی اس طور پر بھی اس سے پیش آئے، جس طرح فلموں میں ہیرو، اپنی ہیروئن سے پیش آتا ہے۔ مگر صغیر کو ایسی عامیانہ حرکات سے نفرت تھی۔ بہر حال ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ پہلی رات کو حجلہ ٔعروسی میں جب صغیر داخل ہوا تو امتیاز چھینک رہی تھی۔ وہ بہت متفکر ہوا۔ امتیاز کو بلاشبہ زکام ہو رہا تھا، لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا خاوند اس معمولی سے عارضے کی طرف اتنا متوجہ ہو کہ اس کی تمام امنگوں کو فراموش کر دے۔ وہ سر تا پا سپردگی تھی۔ مگر صغیر کو اس بات کی تشویش تھی کہ امتیاز اس کی جان سے زیادہ عزیز ہستی علیل ہے، چنانچہ اس نے فوراً ڈاکٹر بلوایا۔ جو دوائیاں اس نے تجویز کیں بازار سے خرید کر لایا اور اپنی نئی نویلی دلہن کو جس کو ڈاکٹر کی آمد سے کوئی دلچسپی تھی نہ اپنے خاوند کی تیمار داری سے، اسے مجبور کیا کہ وہ انجکشن لگوائے اور چار چار گھنٹے کے بعد دوا پیے۔ زکام کچھ شدید قسم کا تھا، اس لیے چار دن اور چار راتیں صغیر اپنی دلہن کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ امتیاز چڑ گئی۔ وہ جانے کیا سوچ کر عروسی جوڑا پہنے صغیر کے گھر آئی تھی۔ مگر وہ بے کار اس کے زکام کو درست کرنے کے پیچھے پڑا ہوا تھا، جیسے دولہا دلہن کے لیے بس ایک یہی چیز اہم ہے، باقی اور باتیں فضول ہیں۔ تنگ آ کر ایک دن اس نے اپنے ضرورت سے زیادہ شریف شوہر سے کہا

”آپ چھوڑیے میرے علاج معالجے کو۔ میں اچھی بھلی ہوں“

پھر اس نے دعوت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں دُلہن ہوں۔ آپ کے گھر آئی ہوں، اور آپ نے اسے ہسپتال بنا دیا ہے“

صغیر نے بڑے پیار سے اپنی دلہن کا ہاتھ دبایا اور مسکرا کر کہا

”تازی، خدا نہ کرے کہ یہ ہسپتال ہو۔ یہ میرا گھر نہیں تمہارا گھر ہے“

اس کے بعد امتیاز کو جو فوری شکایت تھی رفع ہو گئی۔ اور وہ شیر و شکر ہو کر رہنے لگے۔ صغیر اس سے محبت کرتا تھا، لیکن اس کو ہمیشہ امتیاز کی صحت، اس کے جسم کی خوبصورتیوں اور اس کو تر و تازہ دیکھنے کا خیال رہتا۔ وہ اسے کانچ کے نازک پھولدان کی طرح سمجھتا تھا جس کے متعلق ہر وقت یہ خدشہ ہو کہ ذرا سی بے احتیاطی سے ٹُوٹ جائے گا۔ امتیاز اور صغیر کا رشتہ دوہرا تھا۔ دو بھائی اصغر حسین اور امجد حسین تھے۔ کھاتے پیتے تاجر۔ صغیر بڑے بھائی اصغر حسین کا لڑکا تھا، اور امتیاز امجد حسین کی بیٹی۔ اب یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ شادی سے پہلے دونوں بھائیوں میں کچھ اختلاف تھے جو اس کے بعد دور ہو گئے تھے۔ امتیاز کی دو بہنیں اور تھیں جو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ امتیاز کا بیاہ ہوا تو ان دونوں کی باری قدرتی طور پر آ گئی۔ وہ اپنے گھروں میں آباد بہت خوش تھیں۔ کبھی کبھی امتیاز سے ملنے آتیں اور صغیر کے اخلاق سے بہت متاثر ہوتیں۔ ان کی نظر میں وہ آئیڈیل شوہر تھا۔ دو برس گزر گئے، امتیاز کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا۔ دراصل صغیر چاہتا تھا اتنی چھوٹی عمر میں وہ اولاد کے بکھیڑوں میں نہ پڑے۔ ان دونوں کے دن ابھی تک کھیلنے کودنے کے تھے۔ صغیر اسے ہر روز سینما لے جاتا، باغ کی سیر

کراتا۔ نہر کے کنارے کنارے اس کے ساتھ چہل قدمی کرتا۔ اس کی ہر آسائش کا اسے خیال تھا۔ بہترین سے بہترین کھانے، اچھے سے اچھے باورچی۔ اگر امتیاز کبھی باورچی خانے کا رخ کرتی تو وہ اس سے کہتا

”تازی انگیٹھیوں پر پتھر کے کوئلے جلتے ہیں۔ اُن کی بُو بہت بُری ہوتی ہے اور صحت کے لیے بھی نامفید۔ میری جان تم اندر نہ جایا کرو، دونوکر ہیں۔ کھانے پکانے کا کام جب تم نے ان کے سپرد کر رکھا ہے تو پھر اس زحمت کی کیا ضرورت؟“

امتیاز مان جاتی۔ سردیوں میں صغیر کا بڑا بھائی اکبر جو نیروبی میں ایک عرصہ سے مقیم تھا اور ڈاکٹر تھا کسی کام کے سلسلے میں کراچی آیا تو اس نے سوچا کہ چلو لاہور صغیر سے مل آئیں۔ بذریعہ ہوائی جہاز پہنچا اور اپنے چھوٹے بھائی کے پاس ٹھہرا۔ وہ صرف چار روز کے لیے آیا کہ ہوائی جہاز میں اس کی سیٹ پانچویں روز کے لیے بک تھی۔ مگر جب اس کی بھابھی نے جو اس کی آمد پر بہت خوش ہوئی تھی اصرار کیا تو چھوٹے بھائی صغیر نے اس سے کہا

”بھائی جان آپ اتنی دیر کے بعد آئے ہیں کچھ دن اور ٹھہر جایئے۔ میری شادی میں آپ شریک نہیں ہوئے تھے، جتنے دن آپ فالتو ٹھہریں گے، انہیں جرمانہ سمجھ لیجیے گا“

امتیاز مسکرائی اور اکبر سے مخاطب ہوئی

”اب تو آپ کو ٹھہرانا ہی پڑے گا۔ اور پھر مجھے آپ نے شادی پر کوئی تحفہ بھی تو نہیں دیا۔ میں جب تک وصول نہیں کرلُوں گی، آپ کیسے جاسکتے ہیں اور آپ کو میں جانے بھی کب دوں گی“

دوسرے روز اکبر اس کو ساتھ لے کر گیا اور سچے موتیوں کا ایک ہار لے دیا۔ صغیر نے اپنے بھائی کا شکریہ ادا کیا۔ اس لیے کہ ہار بہت قیمتی تھا، کم از کم پانچ ہزار روپے کا ہو گا۔ اسی دن اکبر نے واپس نیروبی جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور صغیر سے کہا کہ وہ ہوائی جہاز میں اس کے ٹکٹ کا بندوبست کرے۔ اس لیے کہ اس کی لاہور شہر میں کافی واقفیت تھی۔ اکبر نے اس کو روپے دیے مگر اس نے برخوردارانہ انداز میں کہا

”آپ ابھی اپنے پاس رکھیے میں لے لوں گا“

اور ٹکٹ کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ اسے کوئی دقت نہ ہوئی، اس لیے کہ ہوائی جہاز سروس کا جنرل منیجر اس کا دوست تھا۔ اس نے فوراً ٹکٹ لے دیا۔ صغیر کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھا گپ لڑاتا رہا اس کے بعد گھر کا رُخ کیا۔ موٹر گراج میں بند کر کے وہ اندر داخل ہوا، لیکن فوراً باہر نکل آیا۔ گراج سے موٹر نکالی اور اس میں بیٹھ کر جانے کہاں روانہ ہو گیا۔ اکبر اور امتیاز دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آیا۔ انہوں نے موٹر کے آنے اور گراج میں بند کیے جانے کی آواز سنی تھی مگر انہوں نے سوچا کہ شاید ان کے کانوں کو دھوکا ہوا تھا۔ اس لیے کہ صغیر موجود تھا نہ اس کی موٹر۔ مگر وہ غائب کہاں ہو گیا تھا؟ اکبر کو واپس جانا تھا مگر اس نے پورا ایک ہفتہ انتظار کیا۔ ادھر ادھر کئی جگہ پوچھ گچھ کی۔ پولیس میں رپورٹ لکھوائی مگر صغیر کی کوئی سن گن نہ ملی۔ آخری دن جب کہ اکبر جارہا تھا، پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ پی بی ایل کے 10059 نمبر کی موٹر کار جس کے ایک خانے میں صغیر اختر کے نام کا لائسنس نکلا ہے، ہوائی اڈے کے باہر کئی دنوں سے پڑی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اکبر امجد حسین نام کے ایک آدمی نے آٹھ روز پہلے ہوائی جہاز میں نیروبی کا سفر کیا ہے۔ اکبر کی سیٹ نیروبی کے لیے بُک تھی۔ امتیاز سے رخصت لے کر جب وہ کینیا پہنچا تو اسے بڑی مشکلوں کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک صاحب جن کا نام اکبر امجد تھا ہوائی جہاز کے ذریعے سے یہاں پہنچے تھے۔ ایک ہوٹل میں دو روز ٹھہرے اس کے بعد چلے گئے۔ اکبر نے بہت کوشش کی مگر پتہ نہ چلا۔ اس دوران میں اس کو امتیاز کے کئی خط آئے۔ پہلے دو تین خطوں کی تو اس نے رسید بھیجی، اس کے بعد جو بھی خط آتا پھاڑ دیتا کہ اس کی بیوی نہ پڑھ لے۔ دس برس گزر گئے۔ امجد حسین، یعنی امتیاز کا باپ بہت پریشان تھا۔ بہت لوگوں کا خیال تھا کہ صغیر مر کھپ چکا ہے مگر امجد کا دل نہیں مانتا تھا۔ کہیں اس کی لاش ہی مل جاتی۔ خودکشی کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟۔ بڑا نیک، شریف اور برخوردار لڑکا تھا۔ امجد کو اس سے بہت محبت تھی۔ ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آتی تھی کہ اس کی بیٹی امتیاز نے کہیں اس جیسے ذکی الحس آدمی کو ایسی ٹھیس نہ پہنچائی ہو کہ وہ شکستہ دل ہو کر کہیں رُوپوش ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس نے امتیاز سے کئی مرتبہ اس بارے میں پوچھا مگر وہ صاف مُنکر ہو گئی۔ خدا اور رسول کی قسمیں کھا کر اس نے اپنے باپ کی تشفی کر دی کہ اس سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی۔ اکثر اوقات وہ روتی بھی تھی۔ اس کو صغیر یاد آتا تھا۔ اس کی نرم و نازک محبت یاد آتی تھی۔ اس کا وہ دھیما دھیما، نسیم سحری کا سلوک یاد آتا تھا جو اس کی فطرت تھی۔ امجد حسین کا ایک دوست حج کو گیا۔ واپس آیا تو اس نے اس کو یہ خوش خبری سنائی کہ صغیر زندہ ہے اور ایک عرصے سے مکے میں مقیم ہے۔ امجد حسین بہت خوش ہوا۔ اس کو اس کے دوست نے صغیر ہندی کا اتا پتا بتا دیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی امتیاز کو تیار کیا کہ وہ اس کے ساتھ حجاز چلے۔ فوراً ہوائی جہاز کے سفر کا انتظام ہو گیا۔ امتیاز جانے کے لیے تیار نہیں تھی، اس کو جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ بہر حال باپ بیٹی سرزمینِ حجاز پہنچے۔ ہر مقدس مقام کی زیارت کی۔ امجد حسین نے ایک ایک کونہ چھان مارا مگر صغیر کا پتہ نہ چلا۔ چند آدمیوں سے جو اس کو جانتے تھے، صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ آپ کی آمد سے دس روز پہلے، کیونکہ اسے کسی نہ کسی طریق سے معلوم ہو چکا تھا کہ آپ تشریف لا رہے ہیں، کھڑکی سے کودا اور گر کر ہلاک ہو گیا۔ مرنے سے چند لمحات پہلے اس کے ہونٹوں پر ایک لفظ کانپ رہا تھا۔ غالباً امتیاز تھا۔ اس کی قبر کہاں تھی۔ وہ کب اور کیسے دفن ہوا، اس کے متعلق صغیر کے جاننے والوں نے کچھ نہ بتایا۔ یہ ان کے علم میں نہیں تھا۔ امتیاز کو یقین آ گیا کہ اس کے خاوند نے خودکشی کرلی ہے۔ اس کو شاید اس کا سبب معلوم تھا، مگر اس کا باپ یہ ماننے سے یکسر منکر تھا۔ چنانچہ اس نے کئی بار اپنی بیٹی سے کہا

”میرا دل نہیں مانتا۔ وہ زندہ ہے۔ وہ تمہاری محبت کی خاطر اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک خدا اس کو موت کے فرشتے کے حوالے نہ کر دے۔ میں اس کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تمہاری جگہ اگر وہ میرا بیٹا ہوتا تو میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھتا“

یہ سن کر امتیاز خاموش رہی۔ وہ سرزمین حجاز سے بے نیلِ مرام واپس آ گئے۔ ایک برس اور گزر گیا۔ اس دوران میں امجد حسین بڑی مہلک بیماری، یعنی دل کے عارضے میں گرفتار ہوا اور وفات پا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی سے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ بات شاید بڑی اذیت دہ تھی کہ وہ خاموش رہا اور صرف سرزنش بھری نگاہوں سے امتیاز کو دیکھتے دیکھتے مر گیا۔ اس کے بعد امتیاز اپنی بہن ممتاز کے پاس راولپنڈی چلی گئی۔ ان کی کوٹھی کے سامنے ایک اور کوٹھی تھی۔ جس میں ایک ادھیڑ عمر کا مرد جو بہت تھکا تھکا سا دکھائی دیتا تھا دھوپ تاپتا اور کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ ممتاز اس کو ہر روز دیکھتی۔ ایک دن اس نے امتیاز سے کہا

”مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے یہ صغیر ہے۔ کیا تم نہیں پہچان سکتی ہو۔ وہی ناک نقشہ ہے، وہی متانت وہ سنجیدگی“

امتیاز نے اس آدمی کی طرف غور سے دیکھا، اور ایک دم چِلائی

”ہاں ہاں وہی ہے“

پھر فوراً رُک گئی

”لیکن وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ تو وفات پا چکے ہیں“

انہیں دنوں ان دونوں کی چھوٹی بہن شہناز بھی آ گئی۔ ممتاز اور امتیاز نے اس کو یہ قبل از وقت مُرجھایا اور افسردہ مرد دکھایا جس کی داڑھی کھچڑی تھی۔ اور اس سے پوچھا۔

”تم بتاؤ، اس کی شکل صغیر سے ملتی ہے یا کہ نہیں؟“

شہناز نے اس کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا

”شکل ملتی ہے۔ یہ خود صغیر ہے۔ سوفی صدی صغیر“

اور یہ کہہ کر وہ سامنے والی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ وہ شخص جو کتاب پڑھنے میں مشغول تھا، چونکا۔ شہناز جس نے شادی کے موقعے پر اس کی جوتی چرائی تھی، اسی پرانے انداز میں کہا

”جناب! آپ کب تک چھپے رہیں گے“

اس شخص نے شہناز کی طرف دیکھا اور بڑی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا

”آپ کون ہیں؟“

شہناز طرار تھی۔ اس کے علاوہ اس کو یقین تھا کہ جس سے وہ ہم کلام ہے وہ اس کا بہنوئی ہے۔ چنانچہ اس نے بڑے نوکیلے لہجے میں کہا

”جناب، میں آپ کی سالی شہناز ہوں“

اس شخص نے شہناز کو سخت ناامید کیا۔ اس نے کہا

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے“

اس کے بعد شہناز نے اور بہت سی باتیں کیں مگر اس نے بڑے ملائم انداز میں اس سے جو کچھ کہا، اس کا یہ مطلب تھا کہ تم ناحق اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔ میں تمہیں جانتا ہوں نہ تمہاری بہن کو جس کے متعلق تم کہتی ہو کہ میری بیوی ہے۔ میری بیوی، میری اپنی زندگی ہے اور میں ہی اس کا خاوند۔ شہناز اور ممتاز نے لاکھ سر پٹکا، مگر وہ شخص جس کا نام راولپنڈی میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا، مانتا ہی نہیں تھا کہ وہ صغیر ہے۔ اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی، سوائے کتابوں کے۔ لیکن شہناز اور ممتاز کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ امتیاز کے متعلق تمام معلومات حاصل کرتا ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا، اس پراسرار مرد کے نوکر کے ذریعے سے کہ وہ راتوں کو اکثر روتا ہے، نمازیں پڑھتا ہے اور دُعائیں مانگتا ہے وہ زندہ رہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کو جو اذّیت پہنچی ہے اس سے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہے۔ نوکر حیران تھا کہ انسان کی زندگی میں ایسی کون سی تکلیف ہو سکتی ہے جس سے وہ لُطف اٹھا سکتا ہے۔ سب باتیں امتیاز سنتی تھی اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ مر جائے۔ چنانچہ اس نے جب یہ سنا کہ وہ شخص جس کو امتیاز اچھی طرح پہچانتی تھی، اس کے نام سے قطعاً ناآشنا ہے تو اس نے ایک روز تولہ افیم کھالی اور یہ ظاہر کیا کہ اس کے سر میں درد ہے اور اکیلی آرام کرنا چاہتی ہے۔ وہ آرام کرنے چلی گئی۔ لیکن شہناز نے جب اس کو غنودگی کے عالم میں دیکھا تو اسے کچھ شبہ ہوا۔ اس نے ممتاز سے بات کی۔ اس کا ماتھا بھی ٹھنکا کمرے میں جا کر دیکھا تو امتیاز بالکل بے ہوش تھی۔ اس کو جھنجھوڑا مگر وہ نہ جاگی۔ شہناز دوڑی دوڑی سامنے والی کوٹھی میں گئی اور اس شخص سے جس کا نام راولپنڈی میں کسی کو معلوم نہیں تھا، سخت گھبراہٹ میں یہ اطلاع دی کہ اس کی بیوی نے زہر کھا لیا ہے، اور مرنے کے قریب ہے۔ یہ سن کر صرف اس نے اتنا کہا

”آپ کو غلط فہمی ہے، وہ میری بیوی نہیں ہے۔ لیکن میرے ہاں اتفاق سے ایک ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ آپ چلیے میں اسے بھیج دیتا ہوں“

شہناز گئی تو وہ اندر کوٹھی میں گیا، اور اپنے بھائی اکبر سے کہا

”یہ کوٹھی جو سامنے ہے، اس میں کسی عورت نے زہر کھالیا ہے۔ بھائی جان آپ جلدی جائیے اور کوشش کیجیے کہ بچ جائے“

اس کا بھائی جو نیروبی میں بہت بڑا ڈاکٹر تھا امتیاز کو نہ بچا سکا۔ دونوں نے جب ایک دوسرے کو دیکھا تو اس کا ردِ عمل بہت مختلف تھا۔ امتیاز فوراً مر گئی اور اکبر اپنا بیگ لے کر واپس چلا گیا۔

صغیر نے اس سے پوچھا۔

”کیا حال ہے مریضہ کا؟“

اکبر نے جواب دیا۔

”مر گئی“

صغیر نے اپنے ہونٹ بھینچ کر بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

”میں زندہ رہوں گا“

لیکن ایک دم سنگین فرش پر لڑکھڑانے کے بعد گرا اور۔ جب اکبر نے اس کی نبض دیکھی تو وہ ساکت تھی۔

حجامت

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹو حجامت

”میری تو آپ نے زندگی حرام کر رکھی ہے۔ خدا کرے میں مر جاؤں“

”اپنے مرنے کی دعائیں کیوں مانگتی ہو۔ میں مر جاؤں تو سارا قصہ پاک ہو جائے گا۔ کہو تو میں ابھی خود کشی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہاں پاس ہی افیم کا ٹھیکہ ہے۔ ایک تولہ افیم کافی ہو گی۔“

”جاؤ، سوچتے کیا ہو۔“

”جاتا ہوں۔ تم اٹھو اور مجھے۔ معلوم نہیں ایک تولہ افیم کتنے میں آتی ہے۔ تم مجھے اندازاً دس روپے دے دو۔“

”دس روپے؟“

”ہاں بھئی۔ اپنی جان گنوانی ہے۔ دس روپے زیادہ تو نہیں۔“

”میں نہیں دے سکتی۔“

”ضرور آپ کو افیم کھا کے ہی مرنا ہے؟“

”سنکھیا بھی ہو سکتا ہے۔“

”کتنے میں آئے گا؟“

”معلوم نہیں۔ میں نے آج تک کبھی سنکھیا نہیں کھایا۔“

”آپ کو ہر چیز کا علم ہے۔ بنتے کیوں ہیں؟“

”بنا تم مجھے رہی ہو۔ بھلا مجھے زہروں کی قیمتوں کے متعلق کیا علم ہو سکتا ہے“

”آپ کو ہر چیز کا علم ہے“

”تمہارے متعلق تو میں ابھی تک کچھ بھی نہ جان سکا“

”اس لیے کہ آپ نے میرے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں“

”یہ صریحاً تمہاری زیادتی ہے۔ پانچ برس ہو گئے ہیں۔ تم ان میں سے کوئی ایسا دن پیش کرو جب میں نے تمہارے متعلق نہ سوچا ہو“

”ہٹائیے۔ ان پانچ برسوں کے جتنے دن ہوتے ہیں، ان میں آپ مجھ سے یہی خرافات کہتے رہے ہیں۔“

”تم حقیقت کو خرافات کہتی ہو؟۔ میں اب کیا کہوں“

”جو کہنا چاہتے ہیں کہہ ڈالیے۔ آپ کی زبان میں لگام ہی کہاں ہے“

”پھر تم نے بد زبانی شروع کر دی“

”بد زبان تو آپ ہیں۔ میں نے ان پانچ برسوں میں، آپ سر پر قرآن اٹھا کر کہیے، کب آپ سے اس قسم کی گستاخی کی ہے؟ گستاخ ہوں گے آپ کے۔“

”رک کیوں گئی ہو۔ جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو“

”میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ آپ سے کوئی کیا کہے۔ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ آدمی کو تکلیف پہنچے، لیکن وہ اف بھی نہ کرے۔ میں تو ایسی زندگی سے گھبرا گئی ہوں“

”تم چاہتی کیا ہو، یہ بھی تو پتا چلے“

”میں کچھ نہیں چاہتی“

”پھر یہ گلے شکوے کیا معنی رکھتے ہیں؟“

’ان کے معنی آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔ انجان کیوں بنتے ہیں؟ ان گلے شکوؤں کے پیچھے کوئی بات تو ہو گی“

”کیا؟“

”میں کیا جانوں“

”یہ عجیب منطق ہے۔ خود ہی پھاڑتی ہو خود ہی رفو کرتی ہو۔ جو صحیح بات ہے اس کو بتاتی کیوں نہیں ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ ہر روز کے جھگڑے ہمیں کہاں لے جائیں گے“

”جہنم میں“

”وہاں بھی تو ہمارا ساتھ ہو گا“

”میں تو وہاں بالکل نہیں جاؤں گی“

”تو کہاں ہو گی تم؟“

”مجھے معلوم نہیں“

”تمہیں بہت سی باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ سب سے بڑی بات میری محبت ہے، جس کا احساس تمہیں ابھی تک نہیں ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یا میں نے اس کے اظہار میں بخل کیا ہے، یا تم میں وہ حس نہیں جو اس جذبے کو پہچان سکے“

”کیسے؟“

”یہ بھی کوئی بات ہے۔ ان پانچ برسوں میں ہر روز۔ ہر روز۔“

”یہی تو میری محبت کا ثبوت ہے۔“

”لعنت ہے ایسی محبت سے کہ آدمی تنگ آ جائے“

”محبت سے کون تنگ آ سکتا ہے؟“

”میری مثال موجود ہے“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟“

”میں نے کب اقرار کیا ہے“

”یہ اقرار ہی تو تھا“

”ہو گا“

”ہو گا نہیں۔ تھا۔ لیکن تم مانو گی نہیں۔ اس لیے کہ ضدی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کی نفسیات کیا ہیں۔ جب ان سے پیار کیا جائے تو گھبرا جاتی ہیں، اور جب ان سے ذرا بے اعتنائی برتی جائے تو برہم ہو جاتی ہیں“

”محض بکواس ہے“

”اس لیے کہ یہ پر خلوص خاوند کی زبان سے نکلی ہے“

”ہٹائیے۔ آپ کا خلوص میں دیکھ چکی ہوں“

”جب دیکھ چکی ہو تو ایمان کیوں نہیں لاتی ہو؟“

”مجھے تنگ نہ کیجیے، میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔“

”اپنے آپ کو بھی اچھا نہیں سمجھتی؟“

”خدا کی قسم۔ آج نہیں“

”کل تو اچھا سمجھو گی“

”مجھے کچھ معلوم نہیں“

”یہ عجیب بات ہے کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ مگر تمہیں معلوم نہیں ہوتا۔ یہ کیا سلسلہ ہے؟۔ تم صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو“

”تو سن لیجیے۔ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں“

”مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا ہے۔ میں نے تمہاری ہر آسائش کا خیال رکھا۔“

”لیکن ایک بات کا خیال نہیں رکھا“

”کس بات کا؟“

”آپ عقل مند ہیں۔ خود سمجھیے۔ میں کیوں بتاؤں“

”کوئی اشارہ تو کر دو“

”میں ایسی اشارہ بازیاں نہیں جانتی“

”تم نے ایسی گفتگو کہاں سے سیکھی ہے؟“

”آپ سے“

”مجھ سے؟۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ الزام تم نے مجھ پر کیوں لگایا ہے“

”آپ پر تو ہر الزام لگ سکتا ہے“

”مثال کے طور پر؟“

”میں آپ کو مثال نہیں دے سکتی۔ خدا کے لیے یہ گفتگو بند کیجیے، میں تنگ آ گئی ہوں۔ بس، میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے۔“

”کیا؟“

”یا اللہ میری توبہ! مجھے زیادہ تنگ نہ کیجیے۔ میرا جی چاہتا ہے اپنے سر کے بال نوچنا شروع کر دوں“

”میرا سر موجود ہے۔ تم اس کے بال بڑے شوق سے نوچ سکتی ہو“

”آپ کو تو اپنے بال بڑے عزیز ہیں“

”انسان کو اپنی ہر چیز عزیز ہوتی ہے“

”لیکن مردوں کے سر پر بالوں کے چھتے بھڑوں کے چھتے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ معلوم نہیں بال کٹوانے سے کیوں پرہیز کرتے ہیں“

”میں پرہیزی آدمی ہوں“

”اس قدر جھوٹ۔ ابھی پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ نے ایک پارٹی میں شراب پی تھی“

”لاحول ولا۔ میں نے تو صرف شیری کا ایک گلاس پیا تھا“

”وہ کیا بلا ہوتی ہے؟“

”بڑی بے ضرر قسم کی چیز ہے“

”تمہاری بدزبانیاں کہیں مجھے بھی بدزبان نہ بنا دیں“

”جیسے آپ بدزبان نہیں ہیں“

”بدزبان تمہارا باپ تھا۔ جانتی ہو۔ وہ ہر بات میں مغلظات بکتا تھا“

”میں کہتی ہوں میرے موئے باپ کے متعلق کچھ نہ کہئے۔ آپ بڑے واہیات ہوتے جارہے ہیں“

”واہیات کیسے ہوتا جارہا ہوں؟“

”میں نہیں جانتی“

”جاننے کے بغیر تم نے یہ فتویٰ کیسے عائد کردیا“

”میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اتنے بال کیوں بڑھا رکھے ہیں، مجھے وحشت ہوتی ہے“

”بس اتنی سی بات تھی جس کو تم نے بتنگڑ بنادیا۔ میں جارہا ہوں۔“

”کہاں؟“

”بس جارہا ہوں“

”خدا کے لیے مجھے بتادیجیے۔ میں خودکشی کرلوں گی“

”میں نُصرت ہیئرکٹنگ سیلون میں جارہا ہوں“

حسن کی تخلیق

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوحسن کی تخلیق

کالج میں شاہدہ حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کو اپنے حسن کا احساس تھا۔ اسی لیے وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی اور خود کو مغلیہ خاندان کی کوئی شہزادی سمجھتی۔ اس کے خدوخال واقعی مغلئی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ نورجہاں کی تصویر جو اس زمانے کے مصوروں نے بنائی تھی، اس میں جان پڑگئی ہے۔ کالج کے لڑکے اسے شہزادی کہتے تھے، لیکن اس کے سامنے نہیں، پر اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ اسے یہ لقب دیا گیا ہے۔ وہ اور بھی مغرور ہوگئی۔ کالج میں مخلوط تعلیم تھی۔ لڑکے زیادہ تھے اور لڑکیاں کم۔ آپس میں ملتے جلتے، لیکن بڑے تکلف کے ساتھ۔ شاہدہ الگ الگ رہتی۔ اس لیے کہ اس کو اپنے حسن پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے بھی بہت ہم گفتگو کرتی تھی۔ کلاس میں آتی تو ایک کونے میں بیٹھ جاتی اور بت سی بنی رہتی۔ بڑا حسین بت۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن پر گھنی پلکوں کی چھاؤں رہتی تھی، ساکت وصامت رہتیں۔ لڑکے اسے دیکھتے اور جی ہی جی میں بہت کڑھتے کہ یہ حسن خاموش کیوں ہے، اس قدر منجمد کس لیے ہے اسے تو متحرک ہونا چاہیے۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ بہت گورا جس میں تھوڑی سی غلط روی بھی گھلی ہوئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو شکر کی بنی ہوئی پتلی تھی جو دیوالی کے تہوار پر بکا کرتی ہیں۔ اس میں مٹھاس تھی، لیکن وہ ظاہر یہ کرنا چاہتی تھی کہ بڑی کڑوی کسیلی ہے۔ کالج میں اس کا رویہ ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ ہر وقت نیم کی نبولی بنی رہتی تھی۔

ایک دن اس کے ایک ہم جماعت لڑکے نے جرأت سے کام لے کر اس سے کہا۔

”حضور۔ خاکساری میں اپنی جگہ دے کر کبھی کسی کو سرفراز تو کریں“!

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن اس طالب علم کو پرنسپل نے بلایا اور اسے نکال باہر کیا۔ اس حادثے کے بعد تمام لڑکے محتاط ہوگئے۔ انھوں نے شاہدہ کو دیکھنا ہی چھوڑ دیا کہ مبادا ان کا وہی حشر ہو، جو اس طالب علم کا ہوا۔ شاہدہ اب بی۔ اے میں تھی۔ خوبصورت ہونے کے علاوہ کافی ذہین تھی۔ اس کے پروفیسر اس کی ذہانت اور خوبصورت سے بڑے مرعوب تھے۔ پرنسپل کی چہیتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کی بڑی بہن کے بڑے لڑکے کی بیٹی تھی۔ کالج میں چہ میگوئیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ شاہدہ کے متعلق قریب قریب ہر روز طالب علموں میں باتیں ہوتی تھیں۔ وہ اس کے متعلق کوئی بری رائے قائم نہیں کرپاتے تھے، اس لیے کہ اس کا کریکٹر بڑا مضبوط تھا۔ ٹک شاپ میں باتیں ہوتیں اور شاہدہ کا حسن زیر بحث ہوتا۔ سب سوچتے کہ یہ حسین قلعہ کون سر کرے گا۔ شاہدہ کو، جیسا کہ سب کو معلوم تھا، صرف خوبصورت چیزیں پسند تھیں۔ وہ کسی بدصورت چیز کو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ ایک دن کلاس میں ایک لڑکے کی رینٹھ بہہ رہی تھی۔ شاہدہ نے جب اس کی طرف دیکھا تو فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ وہ بڑی نفاست پسند تھی۔ اس کو وہ ہر چیز کھلی تھی جو بدنما ہو۔ کالج میں ایک لڑکی جمیلہ تھی۔ بڑی بدصورت، مگر شاہدہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین۔ اس کو وہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ ویسے وہ اس کی ذہانت کی قائل تھی اور کوئی رشک محسوس نہیں کرتی تھی۔ کالج کے سب لڑکے سوچتے تھے کہ شاہدہ اگر حسین نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ اس سے بات چیت تو کرسکتے۔ مگر وہ اپنے حسن کے غرور میں سرشار رہتی اور کسی کو منہ ہی نہیں لگاتی تھی۔ ایک دن کالج میں ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ ایک لڑکا جس کے والد کی تبدیلی ہوگئی تھی، اس کالج میں داخلہ لینے کے لیے آیا۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے اسے دیکھا اور ششدر رہ گئے۔ وہ شاہدہ سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کا نام شاہد تھا۔ اس کو داخلہ مل گیا۔ جس کلاس میں شاہدہ تھی، اسی میں شاہد تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب شاہد پہلے روز کلاس روم میں آیا تو شاہدہ موجود نہیں تھی۔ اس کو زکام ہوگیا تھا اور اس کے باعث اس نے دوروز کے لیے چھٹی لے لی تھی۔ دودن کے بعد جب شاہد کالج کے باغ میں ٹہل رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت، مگر

بے جان سی مورت آ رہی ہے۔ اس نے اپنی کتابیں بینچ پر رکھیں اور آگے بڑھا۔ شاہدہ نے اسے دیکھا۔ وہ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے اس کے قدم رک گئے۔ زمین گیلی تھی، کیچڑ سی ہو رہی تھی۔ شاہد جب اس کی طرف بڑھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ اس گھبراہٹ میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔ شاہد نے لپک کر اسے اٹھایا۔ شاہدہ کے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی، مگر اس نے مسکرا کر کہا۔

”شکریہ۔ آپ کون ہیں؟“

شاہد نے جواب دیا۔

”خادم“!

”آپ خادم تو دکھائی نہیں دیتے۔“

”کیا دکھائی دیتا ہوں۔ بعض اوقات صحیح شکلیں غلط دکھائی دیا کرتی ہیں۔“

شاہدہ کو یہ بات پسند آئی۔ اس کے ٹخنے میں درد ہو رہا تھا مگر وہ اسے چند لمحوں کے لیے بھول گئی۔

”آپ کا نام؟“

”شاہد“!

شاہدہ نے سوچا کہ شاید وہ اس کا نام سن چکا ہے اور شرارت کے طور پر شاہد بن رہا ہے۔

”آپ غلط کہہ رہے ہیں۔“

”آپ کالج کے رجسٹر سے اس کی تصدیق کر سکتی ہیں۔“

”آپ اس کالج میں پڑھتے ہیں؟“

”جی ہاں۔ آپ یہاں کیسے چلی آئیں؟“

”واہ۔ میں بھی تو یہیں پڑھتی ہوں۔“

”کس کلاس میں؟“

”بی اے میں؟“

”میں بھی تو بی اے میں ہوں۔“

”جھوٹ۔ آپ تو مالی معلوم ہوتے ہیں۔“

”اس شکل کے آدمی واقعی مالی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں نے ابھی تک کوئی پھول نہیں توڑا۔“

”پھول کیا توڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔ انھیں تو صرف سونگھنا چاہیے۔“

شاہد ایک لحظہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔

”میں آپ کو سونگھ رہا ہوں۔“

شاہدہ بھنا گئی۔

”آپ بڑے بدتمیز ہیں۔“

شاہد نے بینچ پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”میں نے آپ کو توڑا تو نہیں۔ صرف سونگھ لیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی پنکھڑیوں میں سے غرور کی بو آتی ہے۔ اوہ، معاف کیجیے گا، غرور میں کر سکتا ہوں لیکن مردوں کے ساتھ۔ میں بھی ایک پھول ہوں، پر آپ کلی ہیں۔ میں آپ سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

شاہدہ اپنا ٹخنہ پکڑے بیٹھی تھی۔ ایک دم کراہنے لگی۔

”ہائے۔ ہائے، بڑا درد ہو رہا ہے۔“

شاہد نے اس سے اجازت طلب کی۔

”کیا میں اسے دبا دوں؟“

”دبایئے۔ خدا کے لیے دبایئے۔“

شاہد نے اس کے موچ آئے ہوئے ٹخنے پر اس طور پر مساس کیا کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر شاہدہ کا درد دور ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد کالج میں وہ دونوں خالی پیریڈوں میں اکٹھے باہر جاتے اور باغ میں بیٹھ کر جانے کیا باتیں کرتے رہتے۔ شاید وہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ دونوں گیلی زمین پر پھسلیں اور ان کے دل کے ٹخنوں میں موچ آجائے اور وہ ساری زندگی ان کو سہلاتے رہیں۔ دونوں نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ بڑے اچھے نمبروں پر۔ شاہدہ کے نمبر شاہد کے مقابلے میں پانچ زیادہ تھے۔ اس نے اس کا بدلہ لینا چاہا۔

”شاہدہ! میں یہ پانچ نمبر ابھی لیے لیتا ہوں۔“

”کیسے“

شاہد نے اس کو پہلی مرتبہ اپنی گود میں اٹھایا اور اس کو پانچ مرتبہ چوم لیا۔ شاہدہ نے کوئی اعتراض نہ کیا، وہ بہت خوش ہوئی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے شاہد سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”ہمارے نمبر پورے ہو گئے۔ لیکن آج کے اس واقعے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کی میری شادی ہو جانی چاہیے۔ میں اپنے ہونٹ اب کسی اور کے ہونٹوں سے آلودہ نہیں کروں گی۔“

شاہد بہت خوش ہوا۔ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ اس کی دلی آرزو کبھی پوری ہو گی۔ اس نے اسی خوشی میں پانچ نمبر اور حاصل کر لیے اور شاہدہ سے کہا۔

”میری جان! میں اسی امید میں تو اب تک جیتا رہا ہوں۔“

شاہدہ کے والدین نے اس کی شادی کی ایک جگہ بات چیت کی، مگر شاہدہ نے صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی بدصورت مرد سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بہت جھگڑے ہوئے۔ آخر شاہدہ نے بتایا کہ وہ اپنے ہم جماعت شاہد کو، جو بہت خوش شکل ہے، پسند کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مرد کو اپنی رفاقت میں نہیں لے گی۔ اس کے ماں باپ شاہد کے والدین سے ملے۔ بڑے شریف اور متمول آدمی تھے۔ روشن خیال بھی۔ شاہد کو جب انھوں نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جا رہا تھا، لیکن اس کی خواہش تھی کہ پہلے شادی کرے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جائے تاکہ وہ بھی باہر کی دنیا دیکھے۔ جب والدین رضامند ہو گئے تو ان کی شادی ہو گئی۔ وہ بہت خوش تھا۔ پہلی رات شاید نے اپنی بیوی سے کہا۔

”ہمارا بچہ۔ لڑکی ہو یا لڑکا۔ جب پیدا ہو گا تو اسے دنیا دیکھنے آئے گی۔“

شاہدہ نے پوچھا۔

”کیوں؟“

شاہد ہنسا۔

”میری جان! تم اتنی حسین ہو۔ میں بھی کچھ بدشکل نہیں۔ ہمارا بچہ یقیناً ہم دونوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو گا۔“

ہنی مون منانے کے لیے وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ وہ یہاں چار مہینے رہے۔ اس کے بعد لندن چلے گئے۔ جہاں شاہد کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لینا تھی۔ شاہد کے باپ میاں ہدایت اللہ کی وہاں ایک کوٹھی تھی جو ان کی آمد سے پہلے ہی خالی کرا لی گئی۔ شاہدہ بہت خوش تھی اور شاہد بھی، اس لیے کہ وہ ایک بچے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ شاہد کہتا تھا۔

”ہمارا بچہ اتنا حسین اور خوبصورت ہو گا کہ اس کا جواب نہ ہو گا۔“

شاہدہ کہتی۔

”خدا نظر بد سے بچائے۔ ضرور گل گوتھنا سا ہو گا۔“

پورے دن ہوئے تو بچہ ہونے کے آثار پیدا ہوئے۔ شاہد نے اپنی بیوی کو میٹرنٹی ہوم میں داخل کرا دیا۔ لیبر وارڈ کے باہر شاہد بڑے اضطراب میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک ایسے بچے کی تصویر تھی جس کے خدوخال اس کے اور اس کی بیوی کے آپس میں بڑے حسین طور پر مدغم ہو گئے ہوں۔ لیبر وارڈ سے نرس باہر آئی۔ شاہد نے لپک کر اس سے پوچھا۔

”خیریت ہے؟“

”جی ہاں“!

”لڑکا ہوا یا لڑکی؟“

نرس پریشان سی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

”پتہ نہیں لڑکا ہے یا لڑکی۔ پر ہم نے ایسا بچہ کبھی نہیں دیکھا۔“

شاہد نے خوش ہو کر پوچھا۔

”بہت خوبصورت ہے نا؟“

نرس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”بڑی اگلی ہے۔ اس کے سر پر ایسا معلوم ہوتا ہے سینگ ہیں۔ دانت بھی ہیں۔ ناک بڑی ٹیڑھی ہے۔ دو آنکھیں ہیں پر ایک آنکھ ایسا لگتا ہے ماتھے پر بھی ہے۔ تم لوگ اتنے خوبصورت ہو کر کیسے بچے پیدا کرتا ہے؟“

شاہد اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے نہ گیا۔ لیکن دوسرے دن میٹرنٹی ہوم میں ٹکٹ لگا دی گئی کہ جو آدمی چاہے، اس عجیب الخلقت بچے کو دیکھ سکتا ہے۔

خالد میاں

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوخالد میاں

ممتاز نے صبح سویرے اٹھ کر حسب معمول تینوں کمرے میں جھاڑو دی۔ کونے کھدروں سے سگرٹوں کے ٹکڑے، ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں اور اسی طرح کی اور چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ جب تینوں کمرے اچھی طرح صاف ہو گئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی بیوی باہر صحن میں سو رہی تھی۔ بچہ پنگوڑے میں تھا۔ ممتاز ہر صبح سویرے اٹھ کر صرف اس لیے خود تینوں کمروں میں جھاڑو دیتا تھا کہ اس کا لڑکا خالد اب چلتا پھرتا تھا اور عام بچوں کے مانند، ہر چیز جو اس کے سامنے آئے، اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا تھا۔ ممتاز ہر روز تینوں کمرے بڑے احتیاط سے صاف کرتا مگر اس کو حیرت ہوتی جب خالد فرش پر اسے اپنے چھوٹے چھوٹے ناخنوں کی مدد سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لیتا۔ فرش کا پلستر کئی جگہ اکھڑا ہوا تھا۔ جہاں کوڑے کرکٹ کے چھوٹے چھوٹے ذرے پھنس جاتے تھے۔ ممتاز اپنی طرف سے پوری صفائی کرتا مگر کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا جو اس کا پلوٹھی کا بیٹا خالد جس کی عمر ابھی ایک برس کی نہیں ہوئی تھی اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیتا۔ ممتاز کو صفائی کا خبط ہو گیا تھا۔ اگر وہ خالد کو کوئی چیز فرش پر سے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتے دیکھتا تو وہ خود کو اس کا ملزم سمجھتا۔ اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوستا کہ اس نے کیوں بد احتیاطی کی۔ خالد سے اس کو پیار ہی نہیں عشق تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ جوں جوں خالد کی پہلی سالگرہ کا دن نزدیک آتا تھا اس کا یہ وہم یقین کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا کہ اس کا بیٹا ایک سال کا ہونے سے پہلے پہلے مر جائے گا۔ اپنے اس خوفناک وہم کا ذکر ممتاز اپنی بیوی سے بھی کر چکا تھا۔ ممتاز کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اوہام کا بالکل قائل نہیں۔ اس کی بیوی نے جب پہلی بار اس کے منہ سے ایسی بات سنی تو کہا۔

”آپ اور ایسے وہم۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا بیٹا سو سال زندہ رہے گا۔ میں نے اس کی پہلی سالگرہ کے لیے ایسا اہتمام کیا ہے کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔“

یہ سن کر ممتاز کے دل کو ایک دھکا سا لگا تھا۔ وہ کب چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا زندہ نہ رہے لیکن اس کے وہم کا کیا علاج تھا۔ خالد بڑا تندرست بچہ تھا۔ سردیوں میں جب نوکر ایک دفعہ اس کو باہر سیر کے لیے لے گیا تو واپس آکر اس نے ممتاز کی بیوی سے کہا۔

”بیگم صاحب، آپ خالد میاں کے گالوں پر سرخی نہ لگایا کریں۔ کسی کی نظر لگ جائے گی۔“

یہ سن کر اس کی بیوی بہت ہنسی تھی

”بے وقوف مجھے کیا ضرورت ہے سرخی لگانے کی۔ ماشاء اللہ اس کے گال ہی قدرتی لال ہیں۔“

سردیوں میں خالد کے گال بہت سرخ رہتے تھے مگر اب گرمیوں میں کچھ زردی مائل ہو گئے تھے اس کو پانی کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ وہ انگڑائی لے کر اٹھتا اور دودھ کی بوتل پی لیتا تو دفتر جانے سے پہلے ممتاز اس کو پانی کی بالٹی میں کھڑا کر دیتا۔ دیر تک وہ پانی کے چھینٹے اڑا اڑا کر کھیلتا رہتا۔ ممتاز اور اس کی بیوی خالد کو دیکھتے اور بہت خوش ہوتے۔ لیکن ممتاز کی خوشی میں غم ایک برقی دھکا سا ضرور ہوتا۔ وہ سوچتا

”خدا میری بیوی کی زبان مبارک کرے، لیکن یہ کیا یہ کہ مجھے اس کی موت کا کھٹکا رہتا ہے۔ یہ وہم کیوں میرے دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ یہ مر جائے گا۔ کیوں مرے گا؟۔ اچھا بھلا صحت مند ہے۔ اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ صحت مند۔ میں یقیناً پاگل ہوں۔ اس سے میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت دراصل اس وہم کا باعث ہے۔ لیکن مجھے اس سے اتنی زیادہ محبت کیوں ہے؟۔ کیا سارے باپ اسی طرح بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ کیا ہر بات کو اپنی اولاد کی موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے؟۔ مجھے آخر ہو کیا گیا ہے۔؟ ممتاز نے جب حسب معمول تینوں کمرے اچھی طرح صاف کر دیے تو وہ فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ صبح اٹھ کر، جھاڑو وغیرہ دے کر وہ گرمیوں میں ضرور آدھے گھنٹے کے لیے چٹائی پر لیٹا کرتا تھا۔ بغیر تکیے کے اس طرح اس کو لطف محسوس ہوتا تھا۔ لیٹ کر وہ سوچنے لگا۔

”پرسوں میرے بچے کی پہلی سالگرہ ہے۔ اگر یہ بغیر وعافیت گزر جائے تو میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یہ میرا وہم بالکل دور ہو جائے گا۔ اللہ میاں یہ سب تیرے ہاتھ میں ہے۔“

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دفعتہً اس نے اپنے ننگے سینے پر بوجھ سا محسوس کیا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا خالد ہے۔ اس کی بیوی پاس کھڑی تھی۔ اس نے کہا

”ساری رات بے چین سا رہا ہے سوتے میں جیسے ڈر ڈر کے کانپتا رہا ہے۔“

خالد، ممتاز کے سینے پر زور سے کانپا۔ ممتاز نے اس پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”خدا میرے بیٹے کا محافظ ہو“!

ممتاز کی بیوی نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔

”توبہ، آپ کو بس وہموں نے گھیر رکھا ہے۔ ہلکا سا بخار ہے، انشاء اللہ دور ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر ممتاز کی بیوی کمرے سے چلی گئی۔ ممتاز نے ہولے ہولے بڑے پیار سے خالد کو تھپکنا شروع کیا جو اس کی چھاتی پر اوندھا لیٹا تھا اور سوتے میں کبھی کبھی کانپ اٹھتا تھا۔ تھپکنے سے وہ جاگ پڑا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور باپ کو دیکھ کر مسکرایا۔ ممتاز نے اس کا منہ چوما۔

”کیوں میاں خالد کیا بات ہے۔ آپ کانپتے کیوں تھے۔“

خالد نے مسکرا کر اپنا اٹھا ہوا سر باپ کی چھاتی پر گرا دیا۔ ممتاز نے پھر اس کو تھپکانا شروع کر دیا۔ دل میں وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی عمر دراز ہو۔ اس کی بیوی نے خالد کی پہلی سالگرہ کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا۔ اپنی ساری سہیلیوں سے کہا تھا کہ وہ اس تقریب پر ضرور آئیں۔ درزی سے خاص طور پر اس کی سالگرہ کے کپڑے سلوائے تھے۔ دعوت پر کیا کیا چیز ہو گی، یہ سب سوچ لیا تھا۔ ممتاز کو یہ ٹھاٹ پسند نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو اور سالگرہ گزر جائے۔ خود اس کو بھی پتا نہ چلے اور اس کا بیٹا ایک برس کا ہو جائے۔ اس کو اس بات کا علم صرف اس وقت ہو جب خالد ایک برس اور کچھ دنوں کا ہو گیا ہو۔ خالد اپنے باپ کی چھاتی پر سے اٹھا۔ ممتاز نے اس سے محبت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”خالد بیٹا، سلام نہیں کرو گے ابا جی کو۔“

خالد نے مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اور اپنے سر پر رکھ دیا۔ ممتاز نے اس کو دعا دی

”جیتے رہو۔“

لیکن یہ کہتے ہی اس کے دل پر اس کے وہم کی ضرب لگی اور وہ غم و فکر کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ خالد سلام کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ دفتر جانے میں ابھی کافی وقت تھا۔ ممتاز چٹائی پر لیٹا رہا اور اپنے وہم کو دل و دماغ سے محو کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں باہر صحن سے اس کی بیوی کی آواز آئی۔

”ممتاز صاحب، ممتاز صاحب۔ اِدھر آیئے۔“

آواز میں شدید گھبراہٹ تھی۔ ممتاز چونک کر اٹھا۔ دوڑ کر باہر گیا۔ دیکھا کہ اس کی بیوی خالد کو غسل خانے کے باہر گود میں لیے کھڑی ہے اور وہ اس کی گود میں بل پہ بل کھا رہا ہے۔ ممتاز نے اس کو اپنی بانھوں میں لے لیا اور بیوی سے جو کانپ رہی تھی پوچھا

”کیا ہوا؟“

اس کی بیوی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”معلوم نہیں۔ پانی سے کھیل رہا تھا۔ میں نے ناک صاف کی تو دوہرا ہو گیا۔“

ممتاز کی بانھوں میں خالد ایسے بل کھا رہا تھا، جیسے کوئی اسے کپڑے کی طرح نچوڑ رہا ہے۔ سامنے چارپائی پڑی تھی۔ ممتاز نے اس کو وہاں لٹا دیا۔ میاں بیوی سخت پریشان تھے۔ وہ پڑا بل پہ بل کھا رہا تھا اور ان دونوں کے اوسان خطا تھے کہ وہ کیا کریں۔ تھپکایا، چوما، پانی کے چھینٹے مارے مگر اس کا تشنج دور نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد خود بخود دورہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور خالد پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ ممتاز نے سمجھا، مر گیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

”ختم ہو گیا۔“

وہ چلائی۔

”لاحول ولا۔ کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں۔ کنولشن تھی۔ ختم ہو گئی۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

خالد نے اپنی مرجھائی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ممتاز کی ساری دنیا زندہ ہو گئی۔ بڑے ہی درد بھرے پیار سے اس نے خالد سے کہا۔

”کیوں خالد بیٹا۔ یہ کیا ہوا آپ کو؟“

خالد کے ہونٹوں پر تشنج زدہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ممتاز نے اس کو گود میں اٹھالیا اور اندر کمرے میں لے گیا۔ لٹانے ہی والا تھا کہ دوسری کنولشن آئی۔ خالد پھر بل کھانے لگا۔ جس طرح مرگی کا دورہ ہوتا ہے، یہ تشنج بھی اسی قسم کا تھا۔ ممتاز کو ایسا محسوس ہوتا کہ خالد نہیں بلکہ وہ اس اذیت کے شکنجے میں کسا جارہا ہے۔ دوسرا دورہ ختم ہوا تو خالد اور زیادہ مرجھا گیا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دھنس گئیں۔ ممتاز اس سے باتیں کرنے لگا۔

”خالد بیٹے، یہ کیا ہوتا ہے آپ کو؟“

”خالد میاں، اٹھونا۔ چلو پھرو“

”خالدی۔ مکھن کھائیں گے آپ؟“

خالد کو مکھن بہت پسند تھا مگر اس نے یہ سن کر اپنا سر ہلا کر ہاں نہ کی، لیکن جب ممتاز نے کہا۔

”بیٹے، گلو کھائیں گے آپ؟“

تو اس نے بڑے نحیف انداز میں نہیں کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ ممتاز مسکرایا اور خالد کو اپنے گلے سے لگالیا پھر اس کو اپنی بیوی کے حوالے کیا اور اس سے کہا۔

”تم اس کا دھیان رکھو میں ڈاکٹر لے کر آتا ہوں۔“

ڈاکٹر ساتھ لے کر آیا تو ممتاز کی بیوی کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ اس کی غیر حاضری میں خالد پر تشنج کے تین اور دورے پڑ چکے تھے۔ ان کے باعث وہ بیجان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور کہا۔

”تردد کی کوئی بات نہیں۔ ایسی کنولشن بچوں کو عموماً آیا کرتی ہے۔ اس کی وجہ دانت ہیں۔ معدے میں کرم وغیرہ ہوں تو وہ بھی اس کا باعث ہو سکتے ہیں۔ میں دوا لکھ دیتا ہوں۔ آرام آجائے گا۔ بخار تیز نہیں ہے، آپ کوئی فکر نہ کریں۔“

ممتاز نے دفتر سے چھٹی لے لی اور سارا دن خالد کے پاس بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس کو دو مرتبہ اور دورے پڑے۔ اس کے بعد وہ نڈھال لیٹا رہا۔ شام ہو گئی تو ممتاز نے سوچا۔

”شاید اب اللہ کا فضل ہو گیا ہے۔ اتنے عرصے میں کوئی کنولشن نہیں آئی۔ خدا کرے رات اسی طرح کٹ جائے۔“

ممتاز کی بیوی بھی خوش تھی۔

”اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کل میرا خالد دوڑتا پھرے گا۔“

رات کو چونکہ مقررہ اوقات پر دوا دینی تھی، اس لیے ممتاز چارپائی پر نہ لیٹا کہ شاید سو جائے۔ خالد کے پنگوڑے کے پاس آرام کرسی رکھ کر وہ بیٹھ گیا اور ساری رات جاگتا رہا، کیونکہ خالد بے چین تھا۔ کانپ کانپ کر بار بار جاگتا تھا۔ حرارت بھی تیز تھی۔ صبح سات بجے کے قریب ممتاز نے تھرمامیٹر لگا کے دیکھا تو ایک سو چار ڈگری بخار تھا۔ ڈاکٹر بلایا۔ اس نے کہا

”تردد کی کوئی بات نہیں، برونکائٹس ہے میں نسخہ لکھ دیتا ہوں۔ تین چار روز میں آرام آجائے گا۔“

ڈاکٹر نسخہ لکھ کر چلا گیا۔ ممتاز دوا بنوالایا۔ خالد کو ایک خوراک پلائی مگر اس کو تسکین نہ ہوئی۔ دس بجے کے قریب وہ ایک بڑا ڈاکٹر لایا۔ اس نے اچھی طرح خالد کو دیکھا اور تسلی دی، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

سب ٹھیک نہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر کی دوا نے کوئی اثر نہ کیا۔ بخار تیز ہوتا گیا۔ ممتاز کے نوکر نے کہا۔

”صاحب، بیماری وغیرہ کوئی نہیں۔ خالد میاں کو نظر لگ گئی ہے میں ایک تعویذ لکھوا کر لایا ہوں۔ اللہ کے حکم سے یوں چٹکیوں میں اثر کرے گا۔“

سات کنوؤں کا پانی اکٹھا کیا گیا۔ اس میں یہ تعویذ گھول کر خالد کو پلایا گیا۔ کوئی اثر نہ ہوا۔ ہمسائی آئی۔ وہ ایک یونانی دوا تجویز کر گئی۔ ممتاز یہ دوا لے آیا مگر اس نے خالد کو نہ دی۔ شام کو ممتاز کا ایک رشتے دار آیا۔ ساتھ اس کے ایک ڈاکٹر تھا۔ اس نے خالد کو دیکھا اور کہا۔

”ملیریا ہے۔ اتنا بخار ملیریا ہی میں ہوتا ہے۔ آپ اس میں برف کا پانی ڈالیے۔ میں کونین کا انجکشن دیتا ہوں۔“

برف کا پانی ڈالا گیا۔ بخار ایک دم کم ہو گیا۔ درجہ حرارت اٹھانوے ڈگری تک آگیا۔ ممتاز اور اس کی بیوی کی جان میں جان آئی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں بخار بہت ہی تیز ہو گیا۔ ممتاز نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا۔ درجہ حرارت ایک سو چھ تک پہنچ گیا تھا۔ ہمسائی آئی۔ اس نے خالد کو مایوس نظروں سے دیکھا اور ممتاز کی بیوی سے کہا

”بچے کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا ہے۔“

ممتاز اور اس کی بیوی کے دل بیٹھ گئے۔ ممتاز نے نیچے کارخانے سے ہسپتال فون کیا۔ ہسپتال والوں نے کہا مریض لے آؤ۔ ممتاز نے فوراً تانگہ منگوایا۔ خالد کو گود میں لیا۔ بیوی کو ساتھ بٹھایا اور ہسپتال کا رخ کیا۔ سارا دن وہ پانی پیتا رہا تھا۔ مگر پیاس تھی کہ بجھتی ہی نہیں تھی۔ ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں اس کا حلق بے حد خشک ہو گیا۔ اس نے سوچا اتر کر کسی دکان سے ایک گلاس پانی پی لے، لیکن خدا معلوم کہاں سے یہ وہم ایک دم اس کے دماغ میں آن ٹپکا، دیکھو اگر تم نے پانی پیا تو تمہارا خالد مر جائے گا۔“

ممتاز کا حلق سوکھ کے لکڑی ہو گیا مگر اس نے پانی نہ پیا۔ ہسپتال کے قریب ٹانگہ پہنچا تو اس نے سگریٹ سلگایا۔ وہی کش لیے تھے تو اس نے ایک دم سگریٹ پھینک دیا۔ اس کے دماغ میں یہ وہم گونجا تھا

”ممتاز سگریٹ نہ پیو تمہارا بچہ مر جائیگا۔“

ممتاز نے ٹانگہ ٹھہرایا۔ اس نے سوچا۔

”یہ کیا حماقت ہے۔ یہ وہم سب فضول ہے۔ سگریٹ پینے سے بچے پر کیا آفت آسکتی ہے۔“

ٹانگے سے اتر کر اس نے سڑک پر سے سگریٹ اٹھایا۔ واپس ٹانگے میں بیٹھ کر جب اس نے کش لینا چاہا تو کسی نامعلوم طاقت نے اس کو روکا۔

”نہیں ممتاز، ایسا نہ کرو۔ خالد مر جائے گا۔“

ممتاز نے سگریٹ زور سے پھینک دیا۔ ٹانگے والے نے گُھور کے اس کو دیکھا۔ ممتاز نے محسوس کیا کہ جیسے اس کو اسکی دماغی کیفیت کا علم ہے اور وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اپنی خفت دور کرنے کی خاطر نے ٹانگے والے سے کہا۔

”خراب ہو گیا تھا سگریٹ“

یہ کہہ اس نے جیب سے ایک نیا سگرٹ نکالا۔ سلگانا چاہا مگر ڈر گیا۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ ادراک کہتا تھا کہ یہ اوہام سب فضول ہیں مگر کوئی ایسی آواز تھی۔ کوئی ایسی طاقت تھی جو اس کے منطق اس کے استدلال، اس کے ادراک پر غالب آجاتی تھی۔ ٹانگہ ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اس نے سگریٹ انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا۔ اس کو اپنے اوپر بہت ترس آیا کہ اوہام کا غلام بن گیا ہے۔ ہسپتال والوں نے فوراً ہی خالد کو داخل کر لیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا۔

”برونگو نمونیا ہے۔ حالت مخدوش ہے۔“

خالد بے ہوش تھا۔ ماں اس کے سرہانے بیٹھی ویران نگاہوں سے اسکو دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا۔ ممتاز کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ نل کھول کر اوک سے پانی پینے لگا تو پھر وہی وہم اس کے دماغ میں گونجا

”ممتاز، یہ کیا کر رہے ہو تم۔ مت پانی پیو۔ تمہارا خالد مر جائے گا۔“

ممتاز نے دل میں اس وہم کو گالی دی اور انتقاماً اتنا پانی پیا کہ اس کا پیٹ اپھر گیا۔ پانی پی کر غسل خانے سے باہر آیا تو اس کا خالد اسی طرح مرجھایا ہوا بے ہوش ہسپتال کے آہنی پلنگ پر پڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جائے۔ اس کے ہوش و حواس غائب ہو جائیں۔ خالد اچھا ہو جائے اور وہ اس کے بدلے نمونیا میں گرفتار ہو جائے۔ ممتاز نے محسوس کیا کہ خالد اب پہلے سے زیادہ زرد ہے۔ اس نے سوچا، یہ سب اس کے پانی پی لینے کا باعث ہے۔ اگر وہ پانی نہ پیتا تو ضرور خالد کی حالت بہتر ہو جاتی۔ اس کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے خود کو بہت لعنت ملامت کی مگر پھر اس کو خیال آیا کہ جس نے یہ بات سوچی تھی کہ وہ ممتاز نہیں کوئی اور تھا۔ اور کون تھا؟۔ کیوں اس کے دماغ میں ایسے وہم پیدا ہوتے تھے۔ پیاس لگتی تھی، پانی پی لیا۔ اس سے خالد پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ خالد ضرور اچھا ہو جائیگا۔ پرسوں اس کی سالگرہ ہے۔ انشاءاللہ خوب ٹھاٹ سے منائی جائے گی۔ لیکن فوراً ہی اس کا دل بیٹھ جاتا۔ کوئی آواز اس سے کہتی

”خالد ایک برس کا ہونے ہی نہیں پائے گا“

۔ ممتاز کا جی چاہتا کہ وہ اس آواز کی زبان پکڑ لے اور اسے گدی سے نکال دے مگر یہ آواز تو خود اس کے دماغ میں پیدا ہوتی تھی خدا معلوم کیسے ہوتی تھی۔ کیوں ہوتی تھی۔ ممتاز اس قدر تنگ آگیا کہ اس نے دل ہی دل میں اپنے اوہام سے گڑگڑا کر کہا۔

”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ کیوں تم مجھ غریب کے پیچھے پڑ گئے ہو“!

شام ہو چکی تھی۔ کئی ڈاکٹر خالد کو دیکھ چکے تھے۔ دوا دی جا رہی تھی۔ کئی انجکشن بھی لگ چکے تھے مگر خالد ابھی تک بے ہوش تھا۔ دفعتہً ممتاز کے دماغ میں یہ آواز گونجی

”تم یہاں سے چلے جاؤ۔ فوراً چلے جاؤ، ورنہ خالد مر جائے گا۔“

ممتاز کمرے سے باہر چلا گیا۔ ہسپتال سے باہر چلا گیا۔ اس کے دماغ میں آوازیں گونجتی رہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ان آوازوں کے حوالے کر دیا۔ اپنی ہر جنبش، اپنی ہر حرکت ان کے حکم کے سپرد کر دی۔ یہ اسے ایک ہوٹل میں لے گئیں۔ انھوں نے اس کو شراب پینے کے لیے کہا۔ شراب آئی تو اسے پھینک دینے کا حکم دیا۔ ممتاز نے ہاتھ سے گلاس پھینک دیا تو اور منگوانے کیلیے کہا۔ دوسرا گلاس آیا تو اسے بھی پھینک دینے کے لیے کہا۔ شراب اور ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے بل ادا کر کے ممتاز باہر نکلا۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔ صرف اس کا دماغ ہے جہاں شور برپا ہے۔ چلتا چلتا وہ ہسپتال پہنچ گیا۔ خالد کے کمرے کا رخ کیا تو اسے حکم ہوا؟

”مت جاؤ ادھر۔ تمہارا خالد مر جائے گا۔“

وہ لوٹ آیا۔ گھاس کا میدان تھا۔ وہاں ایک بنچ پڑی تھی۔ اس پر لیٹ گیا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ میدان میں اندھیرا تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کبھی کبھی کسی موٹر کے ہارن کی آواز اس خاموشی میں خراش پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی۔ سامنے اونچی دیوار میں ہسپتال کا روشن کلاک تھا۔ ممتاز، خالد کے متعلق سوچ رہا۔

”کیا وہ بچ جائے گا۔ یہ بچے کیوں پیدا ہوتے ہیں جنھیں مرنا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کیوں پیدا ہوتی ہے جسے اتنی جلدی موت کے منہ میں جانا ہوتا ہے۔ خالد ضرور۔“

ایک دم اس کے دماغ میں ایک وہم پھوٹا۔ بنچ پر سے اتر کر وہ سجدے میں گر گیا۔ حکم تھا اسی طرح پڑے رہو جب تک خالد ٹھیک نہ ہو جائے۔ ممتاز سجدے میں پڑا رہا۔ وہ دعا مانگنا چاہتا تھا مگر حکم تھا کہ مت مانگو۔ ممتاز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ خالد کے لیے نہیں، اپنے لیے دعا مانگنے لگا۔

”خدایا مجھے اس اذیت سے نجات دے۔ تجھے اگر خالد کو مارنا ہے تو مار دے، یہ میرا کیا حشر کر رہا ہے تو“

دفعتاً اسے آوازیں سنائی دیں۔ اس سے کچھ دور دور آدمی کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔“

”بچہ بڑا خوبصورت ہے۔“

”ماں کا حال مجھ سے تو دیکھا نہیں گیا۔“

”بیچاری ہر ڈاکٹر کے پاؤں پڑ رہی تھی۔“

”ہم نے اپنی طرف سے تو ہر ممکن کوشش کی۔“

”بچنا محال ہے۔“

”میں نے یہی کہا تھا ماں سے کہ دعا کرو بہن“!

ایک ڈاکٹر نے ممتاز کی طرف دیکھا جو سجدے میں پڑا تھا۔ اس کو زور سے آواز دی۔

”اے، کیا کر رہا ہے تو۔ اِدھر آ“

ممتاز اٹھ کر دونوں ڈاکٹروں کے پاس گیا۔ ایک نے اس سے پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

ممتاز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا۔

”میں ایک مریض۔“

ڈاکٹر نے سختی سے کہا۔

”مریض ہو تو اندر جاؤ۔ یہاں میدان میں ڈنٹر کیوں پیلتے ہو؟“

ممتاز نے کہا۔

”جی، میرا بچہ ہے۔ اُدھر اس وارڈ میں۔“

”وہ تمہارا بچہ ہے جو۔“

”جی ہاں۔ شاید آپ اسی کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ میرا بچہ ہے۔ خالد“

”آپ اس کے باپ ہیں؟“

ممتاز نے اپنا غم واندوہ سے بھرا ہوا سر ہلایا۔

”جی ہاں میں اس کا باپ ہوں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔

”آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ جائیے آپ کی وائف بہت پریشان ہیں۔“

جی اچھا۔ کہہ کر ممتاز وارڈ کی طرف روانہ ہوا۔ سیڑھیاں طے کر کے جب اوپر پہنچا تو کمرے کے باہر اس کا نوکر رو رہا تھا۔ ممتاز کو دیکھ کر اور زیادہ رونے لگا۔

”صاحب خالد میاں فوت ہو گئے۔“

ممتاز اندر کمرے میں گیا۔ اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ ایک ڈاکٹر اور نرس اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ممتاز پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ خالد آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سکون تھا۔ ممتاز نے اس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دل چیر دینے والے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”خالد میاں۔ گگو کھائیں گے آپ؟“

خالد کا سر نفی میں نہ ہلا۔ ممتاز نے پھر درخواست بھرے لہجے میں کہا۔“

خالد میاں۔ میرے وہم لے جائیں گے اپنے ساتھ؟“

ممتاز کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خالد نے سر ہلا کر ہاں کی ہے۔

خالی بوتلیں، خالی ڈبے

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو خالی بوتلیں، خالی ڈبے

یہ حیرت مجھے اب بھی ہے کہ خاص طور پر خالی بوتلوں اور ڈبوں سے مجرد مردوں کو اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟۔ مجرد مردوں سے میری مراد ان مردوں سے ہے جن کو عام طور پر شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یوں تو اس قسم کے مرد عموماً سنکی اور عجیب وغریب عادات کے مالک ہوتے ہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھیں خالی بوتلوں اور ڈبوں سے کیوں اتنا پیار ہوتا ہے؟۔ پرندے اور جانور اکثر ان لوگوں کے پالتو ہوتے ہیں۔ یہ میلان سمجھ میں آسکتا ہے کہ تنہائی میں ان کا کوئی تو مونس ہونا چاہیے، لیکن خالی بوتلیں اور خالی ڈبے ان کی کیا غمگساری کرسکتے ہیں؟ سنک اور عجیب وغریب عادات کا جواز ڈھونڈنا کوئی مشکل نہیں کہ فطرت کی خلاف ورزی ایسے بگاڑ پیدا کرسکتی ہے، لیکن اس کی نفسیاتی باریکیوں میں جانا البتہ بہت مشکل ہے۔ میرے ایک عزیز ہیں۔ عمر آپ کی اس وقت پچاس کے قریب قریب ہے آپ کو کبوتر اور کتے پالنے کا شوق ہے اور اس میں کوئی عجیب وغریب پن نہیں لیکن آپ کو یہ مرض ہے کہ بازار سے ہر روز دودھ کی بالائی خرید کرلاتے ہیں۔ چولھے پر رکھ کر اس کا روغن نکالتے ہیں اور اس روغن میں اپنے لیے علیحدہ سالن تیار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح خالص گھی تیار ہوتا ہے۔ پانی پینے کے لیے اپنا گھڑا الگ رکھتے ہیں۔ اس کے منہ پر ہمیشہ ململ کا ٹکڑا بندھا رہتا ہے۔ تاکہ کوئی کیڑا مکوڑا اندر نہ چلا جائے، مگر ہوا برابر داخل ہوتی رہے۔ پاخانے جاتے وقت سب کپڑے اتار کر ایک چھوٹا سا تولیہ باندھ لیتے ہیں اور لکڑی کی کھڑاؤں پہن لیتے ہیں۔ اب کون ان کی بالائی کے روغن، رگھڑے کی ململ، انگ کے تولیے اور لکڑی کی کھڑاؤں کے نفسیاتی عقدے کو حل کرنے بیٹھے! میرے ایک مجرو دوست ہیں۔ بظاہر بڑے ہی نورمل انسان۔ ہائی کورٹ میں ریڈر ہیں۔ آپ کو ہر جگہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے۔ چنانچہ ان کا رومال سدا ان کی ناک سے چپکا رہتا ہے۔ آپ کو خرگوش پالنے کا شوق ہے۔ ایک اور مجرد ہیں۔ آپ کو جب موقعہ ملے تو نماز پڑھنا شروع کردیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا دماغ بالکل صحیح ہے۔ سیاسیاتِ عالم پر آپ کی نظر بہت وسیع ہے۔ طوطوں کو باتیں سکھانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ملٹری کے ایک میجر ہیں۔ سن رسیدہ اور دولت مند۔ آپ کو حُقّے جمع کرنے کا شوق ہے۔ گڑگڑیاں، پیچواں، چموڑے، غرضیکہ ہر قسم کا حقہ ان کے پاس موجود ہے۔ آپ کئی مکانوں کے مالک ہیں، مگر ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہتے ہیں۔ بٹیریں آپ کی جان ہیں۔ ایک کرنل صاحب ہیں۔ ریٹائرڈ۔ بہت بڑی کوٹھی میں۔ اکیلے دس بارہ چھوٹے بڑے کتوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہر برانڈ کی وسکی ان کے یہاں موجود رہتی ہے۔ ہر روز شام کو چار پیگ پیتے ہیں اور اپنے ساتھ کسی نہ کسی لاڈلے کتے کو بھی پلاتے ہیں۔ میں نے اب تک جتنے مجردوں کا ذکر کیا ہے، ان سب کو حسبِ توفیق خالی بوتلوں اور ڈبوں سے دلچسپی ہے۔ میرے، دودھ کی بالائی سے خالص گھی تیار کرنے والے عزیز، گھر میں جب بھی کوئی خالی بوتل دیکھیں تو اسے دھو دھا کر اپنی الماری میں سجا دیتے ہیں کہ ضرورت کے وقت کام آئے گی۔ ہائی کورٹ کے ریڈر جن کو ہر جگہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے صرف ایسی بوتلیں اور ڈبے جمع کرتے ہیں، جن کے متعلق وہ اپنا پورا اطمینان کرلیں کہ اب ان سے بدبو آنے کا کوئی احتمال نہیں رہا۔ جب موقعہ ملے، نماز پڑھنے والے، خالی بوتلیں آب دست کے لیے اور ٹین کے خالی ڈبے وضو کے لیے درجنوں کی تعداد میں جمع رکھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق یہ دونوں چیزیں سستی اور پاکیزہ رہتی ہیں۔ قسم قسم کے حقے جمع کرنے والے میجر صاحب کو خالی بوتلیں اور خالی ڈبے جمع کرکے ان کو بیچنے کا شوق ہے اور ریٹائرڈ کرنل صاحب کو صرف وسکی کی بوتلیں جمع کرنے کا۔ آپ کرنل صاحب کے ہاں جائیں تو ایک چھوٹے، صاف ستھرے کمرے میں کئی شیشے کی الماریوں میں آپ کو وسکی کی خالی بوتلیں سجی ہوئی نظر آئیں گی۔ پرانے سے پرانے برانڈ کی وسکی کی خالی بوتل بھی آپ کو ان کے اس نادر مجموعے میں مل جائے گی۔ جس طرح لوگوں کو ٹکٹ اور سکے جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے، اسی طرح ان کو وسکی کی خالی بوتلیں جمع کرنے اور ان کی نمائش کرنے کا شوق بلکہ خبط ہے۔ کرنل صاحب کا کوئی عزیز، رشتہ دار نہیں۔ کوئی ہے تو اس کا مجھے علم نہیں۔ دنیا میں تن تنہا ہیں۔ لیکن وہ تنہائی بالکل محسوس نہیں کرتے۔ دس بارہ کتے ہیں ان کی دیکھ بھال وہ اس طرح کرتے ہیں جس طرح شفیق باپ اپنی اولاد کی کرتے ہیں۔ سارا دن ان کا ان پالتو حیوانوں کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ فرصت کے وقت وہ الماریوں میں اپنی چہیتی بوتلیں سنوارتے رہتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے، خالی بوتلیں تو ہوئیں۔ یہ تم نے خالی ڈبے کیوں ساتھ لگا دیے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ تجرو پسند مردوں کو خالی بوتلوں کے ساتھ ساتھ خالی ڈبوں کے ساتھ بھی دلچسپی ہو؟۔ اور پھر ڈبے اور بوتلیں، صرف خالی کیوں؟ بھری ہوئی کیوں نہیں؟۔ میں آپ سے شاید پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ مجھے خود اس بات کی حیرت ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے سوال اکثر میرے دماغ میں پیدا ہوچکے ہیں۔ باوجود کوشش کے میں ان کا جواب حاصل نہیں کرسکتا۔ خالی بوتلیں اور خالی ڈبے، خلا کا نشان ہیں اور خلا کا کوئی منطقی جوڑ تجرو پسند مردوں سے غالباً یہی ہوسکتا ہے کہ خود ان کی زندگی میں ایک خلا ہوتا ہے،

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا وہ اس خلا کو ایک اور خلا سے پُر کرتے ہیں؟۔ کتوں بلیوں خرگوشوں اور بندروں کے متعلق آدمی سمجھ سکتا ہے کہ وہ خالی خولی زندگی کی کمی ایک حد تک پوری کر سکتے ہیں کہ وہ بدل بہلا سکتے ہیں، ناز نخرے کر سکتے ہیں۔ دل چسپ حرکات کے موجب ہو سکتے ہیں، پیار کا جواب بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن خالی بوتلیں اور ڈبے دلچسپی کا کیا سامان بہم پہنچاتے ہیں؟ بہت ممکن ہے آپ کو ذیل کے واقعات میں ان سوالوں کا جواب مل جائے۔ دس برس پہلے میں جب بمبئی گیا تو وہاں ایک مشہور فلم کمپنی کا ایک فلم تقریباً بیس ہفتوں سے چل رہا تھا۔ ہیروئن پرانی تھی، لیکن ہیرو نیا تھا جو اشتہاروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں نوخیز دکھائی دیتا تھا۔ اخباروں میں اس کی کردار نگاری کی تعریف پڑھی تو میں نے یہ فلم دیکھا۔ اچھا خاصا تھا۔ کہانی جاذب توجہ تھی اور اس نئے ہیرو کا کام بھی اس لحاظ سے قابل تعریف تھا کہ اس نے پہلی مرتبہ کیمرے کا سامنا کیا تھا۔ پردے پر کسی ایکٹر یا ایکٹرس کی عمر کا اندازہ لگانا عام طور پر مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ میک اپ جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیتا ہے، مگر یہ نیا ہیرو بلاشبہ نوخیز تھا۔ کالج کے طالب علم کی طرح تر و تازہ اور چاق و چوبند۔ خوبصورت تو نہیں تھا مگر اس کے گٹھے ہوئے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر مناسب و موزوں تھا۔ اس فلم کے بعد اس ایکٹر کے میں نے اور کئی فلم دیکھے۔ اب وہ منجھ گیا تھا۔ چہرے کے خط و خال کی طفلانہ نرمائش، عمر اور تجربے کی سختی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا شمار اب چوٹی کے اداکاروں میں ہونے لگا تھا۔ فلمی دنیا میں اسکینڈل عام ہوتے ہیں۔ آئے دن سننے میں آتا ہے کہ فلاں ایکٹر کا فلاں ایکٹرس سے تعلق ہو گیا ہے۔ فلاں ایکٹرس، فلاں ایکٹر کو چھوڑ کر فلاں ڈائریکٹر کے پہلو میں چلی گئی ہے۔ قریب قریب ہر ایکٹر اور ہر ایکٹرس کے ساتھ کوئی نہ کوئی رومان جلد یا بدیر وابستہ ہو جاتا ہے، لیکن اس نئے ہیرو کی زندگی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ان بکھیڑوں سے پاک تھی، مگر اخباروں میں اس کا چرچا نہیں تھا۔ کسی نے بھولے سے حیرت کا بھی اظہار نہیں کیا تھا کہ فلمی دنیا میں رہ کر رام سروپ کی زندگی جنسی آلائشوں سے پاک ہے۔ میں نے سچ پوچھئے تو اس بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ مجھے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی نجی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فلم دیکھا۔ اس کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کی اور بس۔ لیکن جب رام سروپ سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے اس کے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ یہ ملاقات اس کا پہلا فلم دیکھنے کے تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔ شروع شروع میں تو وہ بمبئے سے بہت دور ایک گاؤں میں رہتا تھا، مگر اب فلمی سرگرمیاں بڑھ جانے کے باعث اس نے شیواجی پارک میں سمندر کے کنارے ایک متوسط درجے کا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اس سے میری ملاقات اسی فلیٹ میں ہوئی جس کے چار کمرے تھے، باورچی خانے سمیت۔ اس فلیٹ میں جو کنبہ رہتا تھا۔ اس کے آٹھ افراد تھے۔ خود رام سروپ۔ اس کا نوکر جو باورچی بھی تھا۔ تین کتے۔ دو بندر اور ایک بلی۔ رام سروپ اور اس کا نوکر مجرد تھے۔ تین کتوں اور ایک بلی کے مقابلے میں ان کی مخالف جنس نہیں تھی،۔ ایک بندر تھا اور ایک بندریا۔ دونوں اکثر اوقات ایک جالی دار پنجرے میں بند رہتے تھے۔ ان نصف درجن حیوانوں کے ساتھ رام سروپ کو والہانہ محبت تھی۔ نوکر کے ساتھ بھی اس کا سلوک بہت اچھا تھا مگر اس میں جذبات کا دخل بہت کم تھا۔ بندھے کام تھے جو مقررہ وقت پر مشین کی سی بے روح باقاعدگی کے ساتھ گویا خود بخود ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام سروپ نے اپنے نوکر کو اپنی زندگی کے تمام قواعد و ضوابط ایک پرچے پر لکھ کر دے دیے تھے جو اس نے حفظ کر لیے تھے۔ اگر رام سروپ کپڑے اتار کر، نیکر پہننے لگے تو اس کا نوکر فوراً تین چار سوڈے اور برف کی فلاسک شیشے والی تپائی پر رکھ دیتا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ صاحب رَم پی کر اپنے کتوں کے ساتھ کھیلیں گے اور جب کسی کا ٹیلی فون آئے گا تو کہہ دیا جائیگا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ رم کی بوتل یا سگریٹ کا ڈبہ جب خالی ہو گا تو اسے پھینکا یا بیچا نہیں جائیگا، بلکہ احتیاط سے اس کمرے میں رکھ دیا جائے گا جہاں خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار لگے ہیں۔ کوئی عورت ملنے کے لیے آئیگی تو اسے دروازے ہی سے یہ کہہ کر واپس کر دیا جائے گا کہ رات صاحب کی شوٹنگ تھی، اس لیے سو رہے ہیں۔ ملاقات کرنے والی شام کو یا رات کو آئے تو اس سے یہ کہا جاتا تھا کہ صاحب شوٹنگ پر گئے ہیں۔ رام سروپ کا گھر تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ عام طور پر اکیلے رہنے والے مجرد مردوں کا ہوتا ہے، یعنی وہ سلیقہ، قرینہ اور رکھ رکھاؤ غائب تھا جو نسائی لمس کا خاصا ہوتا ہے۔ صفائی تھی مگر اس میں کُھرا پن تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو مجھے بہت شدت سے محسوس ہوا کہ میں چڑیا گھر کے اس حصے میں داخل ہو گیا ہوں۔ جو شیر، چیتے اور دوسرے حیوانوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ کیونکہ ویسی ہی بو آرہی تھی۔ ایک کمرا سونے کا تھا، دوسرا بیٹھنے کا، تیسرا خالی بوتلوں اور ڈبوں کا۔ اس میں رَم کی وہ تمام بوتلیں اور سگریٹ کے وہ تمام ڈبے موجود تھے جو رام سروپ نے پی کر خالی کیے تھے۔ کوئی اہتمام نہیں تھا۔ بوتلوں پر ڈبے اور ڈبوں پر بوتلیں اوندھی سیدھی پڑی ہیں۔ ایک کونے میں قطار لگی ہے تو دوسرے کونے میں انباہ گرد جمی ہوئی ہے، اور باسی تمباکو اور باسی رَم کی ملی جلی تیز بو آرہی ہے۔ میں نے جب پہلی مرتبہ یہ کمرہ دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ ان گنت بوتلیں اور ڈبے تھے۔ سب خالی ہیں۔ میں نے رام سروپ سے پوچھا۔

”کیوں بھئی، یہ کیا سلسلہ ہے؟“

اس نے پوچھا۔

”کیسا سلسلہ؟“

میں نے کہا۔

”یہ۔ یہ کباڑ خانہ؟“

اس نے صرف اتنا کہا۔

”جمع ہو گیا ہے“!

یہ سن کر میں نے بولتے ہوئے سوچا۔

”اتنا!۔ اتنا کوڑا جمع ہونے میں کم از کم سات آٹھ برس چاہئیں۔“

میرا اندازہ غلط نکلا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا یہ ذخیرہ پورے دس برس کا تھا۔ جب وہ شیواجی پارک رہنے آیا تھا تو وہ تمام بوتلیں اور ڈبے اٹھوا کے اپنے ساتھ لے آیا تھا جو اس کے پرانے مکان میں جمع ہو چکے تھے۔ ایک بار میں نے اس سے کہا۔

”سروپ، تم یہ بوتلیں اور ڈبے بیچ کیوں نہیں دیتے؟۔ میرا مطلب ہے، اول تو ساتھ ساتھ بیچتے رہنا چاہئیں۔ پر اب کہ اتنا انبار جمع ہو چکا ہے اور جنگ کے باعث دام بھی اچھے مل سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں تمہیں یہ کباڑ خانہ اٹھوا دینا چاہیے“!

اس نے جواب میں صرف اتنا کہا۔

”ہٹاؤ یار۔ کون اتنی بک بک کرے“!

اس جواب سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے خالی بوتلوں اور ڈبوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن مجھے نوکر سے معلوم ہوا کہ اگر اس کمرے میں کوئی بوتل یا ڈبہ اِدھر کا اُدھر ہو جائے تو رام سروپ قیامت برپا کر دیتا تھا۔ عورت سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری، اس کی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ باتوں باتوں میں مَیں نے کئی بار اس سے دریافت کیا۔

”کیوں بھئی شادی کب کرو گے؟“

اور ہر بار اس قسم کا جواب ملا۔

”شادی کر کے کیا کروں گا؟“

میں نے سوچا، واقعی رام سروپ شادی کر کے کیا کرے گا؟۔ کیا وہ اپنی بیوی کو خالی بوتلوں اور ڈبوں والے کمرے میں بند کر دے گا؟۔ یا سب کپڑے اتار، نیکر پہن کر رم پیتے اس کے ساتھ کھیلا کرے گا؟۔ میں اس سے شادی بیاہ کا ذکر تو اکثر کرتا تھا مگر تصور پر زور دینے کے باوجود اسے کسی عورت سے منسلک نہ دیکھ سکتا۔ رام سروپ سے ملتے ملتے کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں کئی مرتبہ میں نے اڑتی اڑتی سنی کہ اسے ایک ایکٹرس سے جس کا نام شیلا تھا، عشق ہو گیا ہے۔ مجھے اس افواہ کا بالکل یقین نہ آیا۔ اول تو رام سروپ سے اس کی توقع ہی نہیں تھی۔ دوسرے شیلا سے کسی بھی ہوش مند نوجوان کو عشق نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ اس قدر بیجان تھی کہ دق کی مریض معلوم ہوتی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ ایک دو فلموں میں آئی تھی تو کسی قدر گوارا تھی مگر بعد میں تو وہ بالکل ہی بے کیف اور بے رنگ ہو گئی تھی اور صرف تیسرے درجے کے فلموں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے صرف ایک مرتبہ اس شیلا کے بارے میں رام سروپ سے دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

”میرے لیے کیا یہی رہ گئی تھی“!

اس دوران میں اس کا سب سے پیارا کتا اسٹالن نمونیہ میں گرفتار ہو گیا۔ رام سروپ نے دن رات بڑی جانفشانی سے اس کا علاج کیا مگر وہ جانبر نہ ہوا۔ اس کی موت سے اسے بہت صدمہ ہوا۔ کئی دن اس کی آنکھیں اشک آلود رہیں، اور جب اس نے ایک روز باقی کتے کسی دوست کو دے دیے تو میں نے خیال کہ اس نے اسٹالن کی موت کے صدمے کے باعث ایسا کیا ہے، ورنہ وہ ان کی جدائی کبھی برداشت نہ کرتا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس نے بندر اور بندریا کو بھی رخصت کر دیا تو مجھے کسی قدر حیرت ہوئی، لیکن میں نے سوچا کہ اس کا دل اب اور کسی کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ اب وہ نیکر پہن کر رم پیتے ہوئے صرف اپنی بلی نرگس سے کھیلتا تھا۔ وہ بھی اس سے بہت پیار کرنے لگی تھی، کیونکہ رام سروپ کا سارا دن التفات اب اسی کے لیے موقوف ہو گیا تھا۔ اب اس کے گھر سے شیر، چیتوں کی بو نہیں آتی تھی۔ صفائی میں کسی قدر نظر آجانے والا سلیقہ اور قرینہ بھی پیدا ہو چلا تھا، اس کے اپنے چہرے پر ہلکا سا نکھار آگیا تھا مگر یہ سب کچھ اس قدر آہستہ آہستہ ہوا تھا کہ اس کے نقطہ آغا کا پتا چلانا بہت مشکل تھا۔ دن گزرتے گئے۔ رام سروپ کا تازہ فلم ریلیز ہوا تو میں نے اس کی کردار نگاری میں ایک نئی تازگی دیکھی۔ میں نے اسے مبارک باد دی تو وہ مسکرا دیا

”لو، وسکی پیو“!

میں نے تعجب سے پوچھا۔

”وسکی؟“

اس لیے کہ وہ صرف رَم پینے کا عادی تھا۔ پہلی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں ذرا سکیڑتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”رم پی پی کر تنگ آگیا ہوں۔“

میں نے اس سے اور کچھ نہ پوچھا۔ آٹھویں روز جب اس کے ہاں شام کو گیا تو وہ قمیض پانجامہ پہنے، رم۔ نہیں، وسکی پی رہا تھا۔ دیر تک ہم تاش کھیلتے اور وسکی پیتے رہ۔ اس دوران میں مَیں نے نوٹ کیا کہ وسکی کا ذائقہ اس کی زبان اور تالو پر ٹھیک نہیں بیٹھ رہا، کیونکہ گھونٹ بھرنے کے بعد وہ کچھ اس طرح منہ بناتا تھا جیسے کسی ان چکھی چیز سے اس کا واسطہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا

"تمہاری طبیعت قبول نہیں کر رہی وسکی کو؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آہستہ آہستہ قبول کر لے گی۔"

رام سروپ کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ ایک روز میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ دیکھا، نیچے گراج کے پاس خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار کے انبار پڑے ہیں۔ سڑک پر دو چھکڑے کھڑے ہیں جن میں تین چار کباڑیئے ان کو لاد رہے ہیں، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ یہ خزانہ رام سروپ کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا تھا۔ آپ یقین جانئے۔ اس کو جدا ہوتے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں ایک عجیب قسم کا درد محسوس کیا۔ دوڑا اوپر گیا۔ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا میں نے اندر داخل ہونا چاہا تو نوکر نے خلافِ معمول راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"صاحب، رات شوٹنگ پر گئے تھے۔ اس وقت سو رہے ہیں۔"

میں حیرت سے اور غصے سے بوکھلا گیا۔ کچھ بڑبڑایا اور چل دیا۔ اسی روز شام کو رام سروپ میرے ہاں آیا۔ اس کے ساتھ شیلا تھی، نئی بنارسی ساڑھی میں ملبوس۔ رام سروپ نے اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا۔

"میری دھرم پتنی سے ملو۔"

اگر میں نے وسکی کے چار پیگ نہ پیئے ہوئے تو یقیناً یہ سن کر بے ہوش ہو گیا ہوتا۔ رام سروپ اور شیلا صرف تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ بنارسی ساڑھی میں شیلا کس سے مشابہ تھی۔ دبلے پتلے بدن ہلکے بادامی رنگ کی کاغذی سی ساڑھی۔ کسی جگہ پھولی ہوئی، کسی جگہ دبی ہوئی۔ ایک دم میری آنکھوں کے سامنے ایک خالی بوتل آ گئی، باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی۔ شیلا عورت تھی۔ بالکل خالی، لیکن ہو سکتا ہے ایک خلا نے دوسرے خلا کو پر کر دیا ہو۔

خدا کی قسم

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوخدا کی قسم

ادھر سے مسلمان اور ادھر سے ہندو ابھی تک آ جا رہے تھے۔ کیمپوں کے کیمپ بھرے پڑے تھے۔ جن میں ضرب المثل کے مطابق تل دھرنے کے لیے واقعی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ غلہ ناکافی ہے۔ حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہیں۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ اس کا ہوش کس کو تھا۔ ایک افراط و تفریط کا عالم تھا۔ سن اڑتالیس کا آغاز تھا۔ غالباً مارچ کا مہینہ۔ اِدھر اور اُدھر دونوں طرف رضاکاروں کے ذریعے سے

"مغویہ"

عورتوں اور بچوں کی برآمدگی کا مستحسن کام شروع ہو چکا تھا۔ سینکڑوں مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اس کارِ خیر میں حصہ لے رہی تھیں۔ میں جب ان کو سرگرم عمل دیکھتا تو مجھے بڑی تعجب خیز مسرت حاصل ہوتی، یعنی خود انسان انسان کی برائیوں کے آثار مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جو عصمتیں لٹ چکی تھیں۔ ان کو مزید لوٹ کھسوٹ سے بچانا چاہتا تھا۔ کس لیے؟۔ اس لیے کہ اس کا دامن مزید دھبوں اور داغوں سے آلودہ نہ ہو؟۔ اس لیے کہ وہ جلدی جلدی اپنی خون سے لتھڑی ہوئی انگلیاں چاٹ لے اور ہم اپنے ہم جنسوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر روٹی کھائے؟۔ اس لیے کہ وہ انسانیت کا سوئی دھاگا لے کر جب تک دوسرے آنکھیں بند کیے ہیں، عصمتوں کے چاک رفو کر دے؟۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن ان رضاکاروں کی جدوجہد پھر بھی قابل قدر معلوم ہوتی تھی۔ ان کو سینکڑوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہزاروں کھیکڑے تھے جو انھیں اٹھانے پڑتے تھے کیونکہ جنہوں نے عورتیں اور لڑکیاں اڑائی تھیں، سیماب پا تھے، آج اِدھر، کل اُدھر، ابھی اس محلے میں، ابھی اُس محلے میں اور پھر آس پاس کے آدمی بھی ان کی مدد نہیں کرتے تھے۔ عجیب عجیب داستانیں سننے میں آتی تھیں۔ ایک لیاژاں افسر نے مجھے بتایا کہ سہارن پور میں دو لڑکیوں نے پاکستان میں اپنے والدین کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ دوسرے نے بتایا کہ جب جالندھر میں زبردستی ہم نے ایک لڑکی کو نکالا تو قابض کے سارے خاندان نے اسے یوں الوداع کہی جیسے وہ ان کی بہو ہے، اور کسی دور دراز سفر پر جا رہی ہے۔ کئی لڑکیوں نے راستہ میں والدین کے خوف سے خودکشی کر لی، بعض صدموں کی تاب نہ لا کر پاگل ہو چکی تھیں، کچھ ایسی بھی تھیں جن کو شراب کی لت پڑ چکی تھی، ان کو پیاس لگتی تو پانی کی بجائے شراب مانگتیں اور ننگی ننگی گالیاں بکتیں۔ میں ان برآمد کی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق سوچتا تو میرے ذہن میں صرف پُھولے ہوئے پیٹ ابھرتے۔ ان پیٹوں کا کیا ہو گا؟ ان میں جو کچھ بھرا ہے اس کا

مالک کون ہے؟ پاکستان یا ہندوستان؟ اور وہ نو مہینوں کی بار برداری۔ اس کی اُجرت پاکستان ادا کرے گا یا ہندوستان؟ کیا یہ سب ظالم فطرت یہ بہی کھاتے میں درج ہو گا؟۔ مگر کیا اس میں کوئی صفحہ خالی رہ گیا ہے؟ بر آمدہ عورتیں آ رہی تھیں، بر آمدہ عورتیں جا رہی تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ یہ عورتیں مغویہ کیوں کہلائی جاتی تھیں؟۔ انھیں اغوا کب کیا گیا ہے؟۔ اغوا تو ایک بڑا رومانٹک فعل ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں روحوں کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں، لیکن یہ اغوا کیسا ہے کہ ایک نہتی کو پکڑ کر کوٹھری میں قید کر لیا۔ لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ منطق، استدلال اور فلسفہ بیکار چیزیں تھیں۔ ان دنوں جس طرح گرمیوں میں بھی دروازے اور کھڑکیاں بند کرتے سوتے تھے اسی طرح میں نے بھی، اپنے دل و دماغ کی بھی سب کھڑکیاں دروازے بند کر دیے تھے، حالانکہ انھیں کُھلا رکھنے کی زیادہ ضرورت اسی وقت تھی۔ لیکن میں کیا کرتا۔ مجھے کچھ سوجھتا نہیں تھا۔ بر آمدہ عورتیں آ رہی تھیں، بر آمدہ عورتیں جا رہی تھیں۔ یہ درآمد اور بر آمد جاری تھی۔ تمام تاجرانہ خصوصیات کے ساتھ! صحافی، افسانہ نگار اور شاعر اپنے قلم اٹھائے شکار میں مصروف تھے۔ لیکن افسانوں اور نظموں کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ فلموں کے قدم اُکھڑ اُکھڑ جاتے تھے۔ اتنے صید تھے کہ سب بوکھلا گئے تھے۔ ایک لیاژاں افسر مجھ سے ملا، کہنے لگا۔

”تم کیوں گُم سُم رہتے ہو؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے مجھے ایک داستان سنائی۔ مغویہ عورتوں کی تلاش میں ہم مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک شہر، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں۔ پھر تیسرے گاؤں، پھر چوتھے۔ گلی گلی، محلے محلے۔ کوچے کوچے۔ بڑی مشکلوں سے گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے۔ میں نے دل میں کہا۔

”کیسے گوہر۔ کیسے زاسفتہ۔ یا سفتہ؟ تمہیں معلوم نہیں، ہمیں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میں تمہیں ایک بات بتلانے والا تھا۔ ہم بارڈر کے اس پار سینکڑوں پھیرے کر چکے ہیں عجیب بات ہے کہ میں نے ہر پھیرے میں ایک مسلمان بڑھیا کو دیکھا۔ اُدھیر عمر کی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے جالندھر کی بستیوں میں دیکھا، پریشان حال۔ ماؤف دماغ، ویران ویران آنکھیں۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال، پھٹے ہوئے کپڑے، اسے تن کا ہوش تھا نہ من کا۔ لیکن اس کی نگاہوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ مجھے۔ بہن نے بتایا کہ یہ عورت صدمہ کے باعث پاگل ہو گئی ہے۔ پٹیالہ کی رہنے والی ہے۔ اس کی اکلوتی لڑکی تھی جو اسے نہیں ملتی، ہم نے بہت جتن کیے ہیں اسے ڈھونڈنے کے لیے ناکام رہے ہیں۔ غالباً بلوؤں میں ماری گئی ہے لیکن یہ بڑھیا نہیں مانتی۔ دوسری مرتبہ میں نے اس پگلی کو سہارن پور کے لاریوں کے اڈے پر دیکھا، اس کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ ابتر اور خستہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر موٹی موٹی پپڑیاں جمی تھیں، بال سادھوں کے سے بنے تھے۔ میں نے اس سے بات چیت کی اور چاہا کہ وہ اپنی موہوم تلاش چھوڑ دے۔ چنانچہ میں نے اس سے بہت سنگ دل بن کر کہا۔

”مائی تیری لڑکی قتل کر دی گئی تھی۔“

پگلی نے میری طرف دیکھا۔

”قتل؟۔ نہیں نہیں۔“

اس کے بعد لہجے میں فولادی تیقن پیدا ہو گئی۔

”اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔“

اور وہ چلی گئی، اپنی موہوم تلاش میں۔ میں نے سوچا ایک تلاش اور پھر موہوم! لیکن پگلی کو کیوں اتنا یقین تھا کہ اس کی بیٹی پر کوئی کرپان نہیں اٹھ سکتی۔ کوئی تیز دھار یا چُھرا اس کی گردن کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ کیا وہ امر تھی یا اس کی ماتا امر تھی۔ ماتا تو خیر امر ہوتی ہے۔ پھر کیا وہ اپنی ممتا ڈھونڈ رہی تھی۔ کیا اس نے اسے کہیں کھو دیا۔؟ تیسرے پھیرے پر پھر میں نے اسے دیکھا۔ اب وہ بالکل چیتھڑوں میں تھی، قریب قریب ننگی، میں نے اسے کپڑے دیے۔ لیکن اس نے قبول نہ کیے۔ میں نے اس سے کہا۔

”مائی میں سچ کہتا ہوں، تیری لڑکی پٹیالہ ہی میں قتل کر دی گئی تھی۔“

اس نے پھر اسی فولادی تیقن کے ساتھ کہا۔

”تو جھوٹ کہتا ہے۔“

میں نے اس سے اپنی بات منوانے کی خاطر۔

”نہیں میں سچ کہتا ہوں، کافی رو پیٹ لیا ہے تم نے۔ چلو میرے ساتھ میں تم کو پاکستان لے چلوں گا۔“

اس نے میری بات نہ سنی اور بڑبڑانے لگی۔ بڑبڑاتے بڑبڑاتے وہ ایک دم چونکی، اب اس کے لہجے میں تیقن فولاد سے بھی زیادہ ٹھوس تھا۔

”نہیں میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا“!

میں نے پوچھا۔

”کیوں؟“

بڑھیا نے ہولے ہولے کہا۔

”وہ خوبصورت ہے۔ اتنی خوبصورت کہ اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ اسے طمانچہ تک نہیں مار سکتا۔“

میں سوچنے لگ

”کیا وہ واقعی اتنی خوبصورت تھی۔ ؟ ہر ماں کی آنکھوں میں اس کی اولاد چندے آفتاب وچندے ماہتاب ہوتی ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی در حقیقت خوبصورت ہو۔ مگر اس طوفان میں کون سی خوبصورتی ہے جو انسان کے کُھر درے ہاتھوں سے بچی ہے۔ ہو سکتا ہے پگلی اس خیال خام کو دھوکا دے رہی ہے۔ فرار کے لاکھوں راستے ہیں۔ دکھ ایک ایسا چوک ہے جو اپنے گرد لاکھوں بلکہ کروڑوں سڑکوں کا جال بُن دیکھا ہے۔“

بارڈر کے اس پار کئی پھیرے ہوئے۔ ہر بار میں نے اس پگلی کو دیکھا۔ اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ بینائی کمزور ہو چکی تھی، ٹٹول کر چلتی تھی، مگر اس کی تلاش جاری تھی بڑی شد و مد سے۔ اس کا یقین اسی طرح مستحکم تھا کہ اس کی بیٹی زندہ ہے، اس لیے کہ اسے کوئی مار نہیں سکتا۔۔ بہن نے مجھ سے کہا کہ

”اس عورت سے مغزماری فضول ہے۔ اس کا دماغ چل چکا ہے بہتر یہی ہے کہ تم اسے پاکستان لے جاؤ اور پاگل خانہ میں داخل کرا دو۔“

میں نے مناسب نہ سمجھا کہ میں اس کی موہوم تلاش جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھی، میں اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے ایک وسیع و عریض پاگل خانے سے، جس میں وہ میلوں کی مسافت طے کر کے، اپنے پاؤں کے آبلوں کی پیاس بجھا سکتی تھی، اٹھا کر ایک مختصر سی چار دیواری میں قید کرانا نہیں چاہتا تھا۔ آخری بار میں نے اسے امرتسر میں دیکھا۔ اس کی شکستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے پاکستان لے جاؤں گا اور پاگل خانے میں داخل کرا دوں گا۔ وہ فرید کے چوک میں کھڑی اپنی نیم اندھی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ چوک میں کافی چہل پہل تھی۔ میں بہن کے ساتھ ایک دکان پر بیٹھا ایک مغویہ لڑکی کے متعلق بات چیت کر رہا تھا، جس کے متعلق ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ بازار صبونیاں میں ایک ہندو بنیے کے گھر موجود ہے۔ یہ گفتگو ختم ہوئی تو میں اٹھا کہ اس پگلی سے جھوٹ سچ کہہ کر اسے پاکستان جانے کے لیے آمادہ کروں کہ ایک جوڑا ادھر سے گزرا۔ عورت نے گھونگٹ کاڑھا ہوا تھا۔ چھوٹا سا گھونگٹ۔ اس کے ساتھ ایک سکھ نوجوان تھا۔ بڑا چھیل چھبیلا، بڑا تندرست اور تیکھے تیکھے نقشوں والا۔ جب یہ دونوں اس پگلی کے پاس سے گزرے تو نوجوان ایک دم ٹھٹک گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر عورت کا ہاتھ پکڑ لیا، کچھ اس اچانک طور پر کہ لڑکی نے اپنا چھوٹا سا گھونگٹ اٹھایا لٹھے کی دھلی ہوئی چادر پہ چوکھٹے میں مجھے ایک ایسا گلابی چہرہ نظر آیا جس کا حسن بیان کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔ میں ان کے بالکل پاس تھا، سکھ نوجوان نے اس حسن و جمال کی دیوی سے اس پگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

”تمہاری ماں“!

لڑکی نے ایک لحظے کے لیے پگلی کی طرف دیکھا اور گھونگٹ چھوڑ لیا اور سکھ نوجوان کا بازو پکڑ کر بھینچے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چلو“!

اور وہ دونوں سڑک سے ادھر ذرا ہٹ کر تیزی سے آگے نکل گئے۔ پگلی چلائی۔

”بھاگ بھری۔ بھاگ بھری۔“

وہ سخت مضطرب تھی۔ میں نے پاس جا کر پوچھا

”کیا بات ہے مائی؟“

وہ کانپ رہی تھی۔

”میں نے اس کو دیکھا ہے۔ میں نے اس کو دیکھا ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”کیسے؟“

اس کے ماتھے کے نیچے دو گڑھوں میں اس کی آنکھوں کے بے نور ڈھلے متحرک تھے۔

”اپنی بیٹی کو۔ بھاگ بھری کو“!

۔ میں نے پھر سے کہا۔

”وہ مر کھپ چکی ہے مائی“

اس نے چیخ کر کہا۔

”تم جھوٹ کہتے ہو۔“!

میں نے اسم مرتبہ اس کو پورا یقین دلانے کی خاطر کہا۔

”میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، وہ مر چکی ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ پگلی چوک میں ڈھیر ہو گئی۔

خط اور اُس کا جواب

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوخط اور اُس کا جواب

منٹو بھائی! تسلیمات! میر انام آپ کے لیے بالکل نیا ہو گا۔ میں کوئی بہت بڑی ادیبہ نہیں ہوں۔ بس کبھی کبھار افسانہ لکھ لیتی ہوں اور پڑھ کر پھاڑ پھینکتی ہوں۔ لیکن اچھے ادب کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کوشش میں کامیاب ہوں۔ میں اور اچھے ادیبوں کے ساتھ آپ کے افسانے بھی بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ آپ سے مجھے ہر بار نئے موضوع کی اُمید رہی اور آپ نے در حقیقت ہر بار نیا موضوع پیش کیا۔ لیکن جو موضوع میرے ذہن میں ہے وہ کوئی افسانہ نگار پیش نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ سعادت حسن منٹو بھی جو نفسیات اور جنسیات کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ موضوع آپ کی کہانیوں کے موضوعات کی قطار میں ہو اور کسی وقت بھی آپ اسے اپنی کہانی کے لیے منتخب کر لیں۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کہ ہو سکتا ہے، سعادت حسن منٹو ایسا بے رحم افسانہ نگار بھی اس موضوع سے چشم پوشی کر جائے۔ اس لیے کہ اس موضوع کو ننگا کرنے سے ساری قوم ننگی ہوتی ہے اور شاید منٹو قوم کو ننگا دیکھ نہیں سکتا۔ آپ کی عدیم الفرصتی کے پیش نظر میں اس خط کو الجھانا نہیں چاہتی اور صاف الفاظ میں کہہ دینا چاہتی ہوں کہ وہ موضوع ہے۔

”ہمارے ماحول کے مردوں کا کم عمر لڑکوں کے ساتھ غیر فطری تعلق۔“

مختصر الفاظ میں آپ کوئی بھی اصطلاح لے سکتے ہیں۔ میر البِ لباب یہی تھا۔ میں بہت عرصے سے سوچ رہی تھی کہ اس بارے میں آپ کو خط لکھوں اور آخر جرأت کر لی۔ سوائے منٹو کے اور کوئی اس موضوع کو بے نقاب نہیں کر سکتا۔ اگر میرے قلم میں زور ہوتا تو میں نے کبھی کی کہانی لکھی ہوتی۔ والسلام! آپ کی بہن (میں یہاں اصل نام نہیں دے رہا) نزہت شیریں بی، اے۔ جب مجھے یہ خط ملا تو میں سوچنے لگا کہ یہ لڑکی کون ہے؟ میں کہاں کا ماہر نفسیات اور جنسیات ہوں کہ اس نے مجھ سے رجوع کیا۔ جب یہ خط ملا تو اتفاق سے میرے دست جو علمِ نجوم اور دوست شناسی میں شغف رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ رمل اور جفر کے علم کے بھی طالب ہیں تو میں نے انہیں یہ خط پڑھنے کے لیے دیا اور کہا۔

”وارثی صاحب! میں نے اس کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ محفوظ ہے۔“

میرے ایک اور دوست جن کا نام دوست محمد ہے۔ ان سے میں اپنی رائے بیان کر چکا تھا۔ وارثی صاحب نے یہ خط پڑھا اور اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہا۔

”یہ عورت اگر واقعی عورت ہے اور شادی شدہ ہے۔ جو کہ ہونا چاہیے تو اس کے خاوند کو اغلام بازی کا شوق ہے۔“

میں نے دوست محمد سے یہی کہا تھا۔ اپنی بیوی سے بھی۔ مگر وہ مانتے نہیں تھے۔ میری بہت سی باتیں لوگ نہیں مانتے۔ میں پیغمبر نہیں ہوں، کوئی ولی بھی نہیں۔ لیکن اپنی استطاعت کے مطابق لوگوں کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ میں نے بھی وہی نتیجہ اخذ کیا تھا جو میرے دوست وارثی صاحب نے کیا۔ میں نے اُن سے اور دوست محمد سے مشورہ کیا کہ میں اس عورت کے خط کا کیا جواب دوں۔ وارثی صاحب نے کہا۔

”منٹو صاحب۔ آپ ہم سے پوچھتے ہیں؟ ایسے خطوں کا جواب دینا آپ ہی کا کام ہے۔“

میں نے ان سے پوچھا۔

”وارثی صاحب! میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔ میں کوئی ڈاکٹر حکیم نہیں۔ میں تو صاف صاف لفظوں میں، جو کچھ مجھے کہنا ہو گا، لکھ دُوں گا۔“

انہوں نے کہا۔

”تو لکھ دو“

”عورت ذات ہے۔ کیسے لکھوں؟“

”جب وہ لکھتی ہے کہ مردوں کا کم عمر لڑکوں کے ساتھ غیر فطری تعلق ہوتا ہے۔ تو آپ کیوں اس کے جواب میں ایسے ہی الفاظ میں مناسب و موزوں جواب نہیں دیتے“

میں نے ان سے کہا۔

”مجھے ایسے مناسب و موزوں الفاظ نہیں ملتے جن میں اس کا جواب لکھ سکوں۔“

اور یہ حقیقت ہے کہ میں خود کو عاجز سمجھ رہا تھا۔ دوست محمد نے کہا۔

”منٹو صاحب، آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ قلم پکڑیے اور جوابی خط لکھ ڈالیے۔“

میں نے قلم پکڑا اور لکھنا شروع کر دیا۔

”خاتون محترم! میں آپ کو اپنی بہن بنانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے کہ مجھ پر بہت سے فرائض عائد ہو جائیں گے۔ آپ میرے لیے خاتون محترم ہی رہیں گی۔ اس لیے کہ یہ رشتہ زیادہ مناسب و موزوں ہے۔ مجھے عورتوں سے ڈر لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کسی مرد کے بھیس میں عورت بنی ہوں۔ لیکن میں آپ کی تحریر پر اعتبار کر کے آپ کو ایک عورت تسلیم کرتا ہوں۔ آپ کے خط سے جو کچھ میں نے اخذ کیا ہے۔ وہ میں مختصراً عرض کیے دیتا ہوں۔ میں یقیناً بے رحم افسانہ نگار ہوں۔ میرے سامنے لاکھوں موضوعات پڑے ہیں اور جب تک میں زندہ ہوں، پڑے رہیں گے۔ سڑک کے ہر پتھر پر ایک افسانہ کندہ ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ اگر کسی خاص جیتے جاگتے موضوع پر لکھوں تو مقدمے کا خوف لاحق ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ مجھ پر اب تک چھ مقدمے چل چکے ہیں۔ فحش نگاری کے سلسلے میں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فحش نگار کیسے قرار دیا جاتا ہوں۔ جب کہ میں نے اپنی زندگی میں ایک بھی گالی کسی کو نہیں دی۔ کسی کی ماں بہن کی طرف بُری نظروں سے نہیں دیکھا۔ خیر یہ میرا اور قانون کا آپس کا جھگڑا ہے۔ آپ کو اس سے کیا واسطہ۔ میں یقیناً بے رحم افسانہ نگار ہوں (

جن معنوں میں آپ نے

”بے رحم“

استعمال کیا ہے) آپ نے جس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ میں شاید آپ کے پیش نظر موضوع سے چشم پوشی کر جاؤں تو یہ غلط ہے۔ میں علامہ اقبال مرحوم کے اس قول کا قائل ہوں کہ۔ اگر خواہی حیات اندر خطر زی میں نے تو اپنی ساری زندگی اس شعر کی تولید سے پہلے خطروں میں گزاری ہے اور اب بھی گزار رہا ہوں۔ جو موضوع آپ کے ذہن میں ہے، کوئی نیا نہیں ہے۔ اس پر عصمت چغتائی اپنے مشہور افسانے

”لحاف“

میں لکھ چکی ہے کہ ایک عورت کے خاوند کو اغلام بازی کی عادت تھی۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اس عورت نے دوسری عورتوں سے ہم جنسی شروع کر دی۔ جہاں مردوں میں ہم جنسیت ہے، وہاں عورتوں میں بھی ہے۔ میں آپ کو ایک زندہ مثال پیش کرتا ہوں۔ بیگم پارہ (فلم ایکٹرس) کو تو آپ جانتی ہوں گی۔ اس کا تعلق پروتما داس گپتا سے ہے۔ آپ لکھتی ہیں۔

”ہمارے ماحول کے مردوں کا کم عمر لڑکوں سے غیر فطری تعلق۔“

میں آپ سے عرض کروں، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، کوئی چیز غیر فطری نہیں ہوتی۔ انسان کی فطرت میں بُرے سا بُرا اور اچھے سے اچھا فعل موجود ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ انسان کا فلاں فعل غیر فطری ہے۔ انسان کبھی فطرت کے خلاف جا ہی نہیں جا سکتا، جو اس کی فطرت ہے، وہ اسی کے اندر رہ کر تمام اچھائیاں اور برائیاں کرتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں، آپ شادی شدہ ہیں یا کنواری۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی تلخ تجربہ ہوا ہے، جس کی بنا پر آپ نے مجھے یہ خط لکھا۔ امرد پرستی آج سے نہیں، ہزارہا سال سے قائم ہے۔ لیکن آج کل اس کا رجحان قریب قریب غائب ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں میدانِ عمل میں آ گئی ہیں۔ جب امرد پرستی زوروں پر تھی، تو اس وقت عورتیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی تھیں۔ مرد بھٹکتے بھٹکتے بقول آپ کے کم عمر لڑکوں سے غیر فطری تعلقات قائم کر لیتے تھے۔ مگر اب یہ رجحان بہت حد تک کم ہو گیا ہے۔ آپ عورت ہیں۔ اس لیے آپ کو معلوم نہیں کہ یہ کم عمر لونڈے اب آپ کے رقیب نہیں رہے۔ میں آپ سے ایک اور بات کہوں۔ جس چیز کی طلب ہو وہی منڈی میں آتی ہے۔ پہلے طلب چھوکروں کی تھی، اب چھوکریوں کی ہے۔ آپ یقیناً جانتی ہوں گی کہ آج کل حوّا کی بیٹیاں ٹانگے میں سوار شکار میں مصروف ہوتی ہیں؟۔ میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں۔ ایک زمانہ تھا (آج سے بیس بائیس برس پیچھے) جب لاہور میں ایک سکھ لڑکا ٹینی سنگھ ہوتا تھا۔ بڑا خوبصورت۔ اس کے خدوخال کے سامنے کسی بھی حسین لڑکی کے نقش ماند پڑ جاتے۔ اُس نے لاہور میں ایک قیامت بپا کر رکھی تھی۔ اس کے عاشق نے اس کو ایک موٹر کار لے دی، تا کہ اسے گورنمنٹ کالج جانے اور گھر تک آنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ میں اب آپ کو کتنے قصّے سناؤں۔ امرتسر میں (جہاں کا میں رہنے والا ہوں) میرا ایک ہندو دوست ہے۔ اچھی شکل وصورت کا تھا۔ ہم دونوں بیٹھک میں باتیں کر رہے تھے جو اندر گلی میں تھی۔ اس نے ایک دم مجھ سے چونک کر کہا۔

”یار باہر بہت شور ہو رہا ہے۔ چلو“

میں کانوں سے ذرا بہرا ہوں۔ مجھے شور ور کوئی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بہر حال میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم باہر نکلے تو بازار کی تمام دکانیں بند تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگرس کی کسی تحریک کے باعث ہڑتال ہو گئی ہے۔ چند غنڈے ہاتھ میں ہاکیاں لیے پھر رہے تھے۔ وہ ہمارے پاس آئے، ایک غنڈے کو میں نے پہچان لیا۔ بڑا خطرناک تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے میرے ہندو دوست منوہر سے کہا۔

”باؤ جی۔ آپ اندر چلے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔“

منوہر اور میں واپس گھر چلے آئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ

”یہ قصّہ کیا ہے، تو اس نے مجھے بتایا کہ دو آدمی اس سے عشق کرتے ہیں“

۔بڑا صاف گو تھا۔ ایک پٹرنگوں کے محلے کا تھا۔ دوسرا افرید کے چوک کا۔ منوہر پٹرنگ سے راضی تھا۔ اس لیے ان دونوں میں لڑائی ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شام تک گیارہ آدمی زخمی ہو کر ہسپتال میں تھے اور منوہر بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اب مجھے آپ سے یہ کہنا ہے۔ بلکہ پوچھنا ہے کہ آپ نے

”مردوں کا کم عمر لڑکوں سے غیر فطری تعلق کیسے جانا؟“

جیسا کہ میں نے اور میرے دوست وارثی صاحب نے سوچا ہے اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کا شوہر ایسے شغل کرتا ہو گا۔ آپ مجھے اس کے متعلق ضرور لکھیے گا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ شادی شُدہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو۔ دیکھیے میں آپ سے ایک بات عرض کروں۔ قریب قریب ہر لڑکا اپنی جوانی کے ایام میں ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ نے اپنے لڑکے کے متعلق ہی لکھا ہو۔ اسے تنبیہہ کر دینا کافی ہے۔ یا اُس کی شادی کر دینا چاہیے۔ کیونکہ ہر عادت پک کر طبیعت بن جاتی ہے۔ اور یہ ایک خوفناک چیز ہے۔ جنس کا احساس صرف بالغ آدمیوں ہی میں نہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں میں بھی ہوتا ہے۔ میں اس کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ کہ اردو زبان اس کی متحمل نہیں ہو گی۔ آپ نے جو مجھے چیلنج دیا ہے، قبول ہے۔ میں عرصے سے سوچ رہا تھا کہ جو موضوع آپ نے بتایا ہے، اس پر کوئی افسانہ لکھوں۔ اب یقیناً لکھوں گا، چاہے ایک مقدمہ اور چل جائے۔ آپ مجھے اپنے متعلق تفصیل سے لکھیے، تاکہ میں کوئی اندازہ کر سکوں۔ خاکسار سعادت حسن منٹو

خوابِ خرگوش

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوخوابِ خرگوش

ثُریا ہنس رہی تھی۔ بے طرح ہنس رہی تھی۔ اُس کی ننھی سی کمر اس کے باعث دہری ہو گئی تھی۔ اُس کی بڑی بہن کو بڑا غصہ آیا۔ آگے بڑھی تو ثُریا پیچھے ہٹ گئی۔ اور کہا

”جا میری بہن، بڑے طاق میں سے میری چوڑیوں کا بکس اُٹھا لا۔ پر ایسے کہ امی جان کو خبر نہ ہو۔“

ثُریا اپنی بڑی بہن سے پانچ برس چھوٹی تھی۔ بلقیس اُنیس کی تھی۔ ثریا نے جھنجھلاہٹ سے ہنستے ہوئے کہا۔

”اور جو میں نہ لاؤں تو؟“

بلقیس نے جل کر اُسے کہا۔

”ایک فقط تو مجھ اللہ ماری کا کام نہیں کرے گی نگوڑیاں ہمسائیاں چاہے تم سے اُپلے تک تھپوا لیں“

ثریا کو اپنی بہن پر پیار آ گیا۔ اُس کے گلے سے چمٹ گئی۔

”نہیں باجی، ہمسائیاں جائیں جہنم میں۔ میں تو تمہاری خدمت کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں چوڑیوں کا بکس ابھی لاتی ہوں۔“

ثریا یوں چٹکیوں میں بکس اُٹھا لائی اور بلقیس سے بڑے جاسوسانہ انداز میں کہا۔

”آپ ضرور سنیما دیکھنے جا رہی ہیں۔“

”ثریا تو اب زیادہ بک بک نہ کر۔ تیری قسم میں سنیما نہیں جا رہی۔“

ثریا نے بچپنے کے سے انداز سے پوچھا۔

”تو پھر یہ تیاریاں کیوں ہو رہی ہیں۔؟“

”یہ تو میرا امتحان لینے کیا بیٹھ گئی ہے۔ اور میں بے وقوف نہیں جو تیری ہر بات کا جواب دیے چلی جاؤں۔ سُن ساڑھے آٹھ بجے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ نئ چوڑیاں جائیں جہنم میں، نہیں پہنوں گی تو کون سا آفت کا پہاڑ ٹُوٹ پڑے گا۔ تیری بحث تو پھر ختم نہیں ہو گی کم بخت۔“

ثریا بے حد افسردہ ہو گئی۔ ننھی جان تھی۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُس نے اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ لیا

”آپ ناراض ہو گئیں مجھ سے۔؟“

”چل دُور ہو۔“

بلقیس اپنے آپ سے بلکہ ہر چیز سے بیزار ہو رہی تھی۔

”آج مجھے ضروری ایک کام سے باہر جانا ہے۔ پر مصیبت یہ ہے کہ امی جان اجازت نہیں دیں گی۔ کہیں گی متواتر تین شاموں سے تو باہر جا رہی ہے۔ اور میں اُن سے وعدہ کر چکی ہوں کہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جاؤں گی۔“

ثریا نے پوچھا

”کس سے؟“

بلقیس نے غیر ارادی طور پر جواب دیا۔

”لطیف صاحب سے“

یہ کہہ کر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ ثریا سوچنے لگی کہ یہ لطیف صاحب کون ہیں۔ اُن کے ہاں تو کبھی اس نام کا آدمی نہیں آیا تھا۔ ثریا نے اس شش و پنج میں اپنی بہن سے پوچھا

”یہ لطیف صاحب کون ہیں باجی۔؟“

”لطیف صاحب۔ مجھے کیا معلوم۔ کون ہیں ار۔ ار۔ سچ مچ یہ کون ہیں۔“

ایک دم سنجیدہ ہو کر

”ثُریا۔ تو نے آج کا سق یاد کیا؟ تو بہت وہ۔ ہو گئی ہے۔ اس لیے تو اوٹ پٹانگ سوال کرتی رہتی ہے۔“

ثُریا کی معصومیت کو ٹھیس پہنچی۔

”باجی میں نے کبھی کوئی واہیات بات نہیں کی۔ آپ نے کس لطیف صاحب سے ملنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔“

بلقیس اُس کی معصومیت سے تنگ آ گئی۔ جھنجھلا کر بولی۔

”خاموش رہ۔“

اتنے میں اندر صحن سے بلقیس کی ماں کی آواز سنائی دی

”بلقیس۔ بلقیس۔“

بلقیس کی آواز دب گئی۔ اُس نے ہولے لہجے میں اپنی بہن سے کہا

”لے یہ اکنی“

پرس میں سے اُس نے ایک اکنی نکال کر اُس کو دی

”املی لے لینا۔ ہر روز ایک آنہ دیا کروں گی تجھے املی کے لیے۔ اور دیکھ آدھی آج میرے لیے رکھ چھوڑنا۔ امی مجھے بُلا رہی ہیں۔ اور دیکھ جو باتیں ہوئی ہیں۔ ان کو نہ بتانا، لے وہ خود ہی آ رہی ہیں“

صحن کے آگے جہاں برآمدہ کے فرش پر بلقیس اپنی ماں کے قدموں کی چاپ سنتی ہے اور ثُریا سے کہتی ہے۔

”لے بھاگ اب یہاں سے۔“

بلقیس کی ماں آتی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت بہت غصیلی۔ اُس کے چہرے کے خدوخال سے صاف عیاں ہے کہ وہ ایک جابر ماں ہے۔ آتے ہی بلقیس کو ڈانتی ہے۔

”یہ جو میں دو گھنٹے سے تجھے بلا رہی ہوں تُو نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے کیا؟“

بلقیس مسکین بلی کی سی آواز میں جواب دیتی ہے۔

”نہیں تو۔“

بلقیس کی ماں کی آواز اور زیادہ بُلند ہو جاتی ہے۔

”اور یہ میں نے کیا سنا ہے۔“

”کیا امی جان؟“

”کہ تو پھر آج باہر جانا چاہتی ہے۔ شریف بہو بیٹیوں کی طرح تیرا گھر میں جی ہی نہیں لگتا۔ دیدے کا پانی ہی ڈھل گیا ہے۔“

بلقیس نے آنکھیں جھکا کر بڑی نرم و نازک آواز میں کہا۔

”آپ تو ناحق بگڑ رہی ہیں۔“

بلقیس کی ماں جہاں آرا غضبناک ہو گئی اور کہا

”ابھی ابھی ایک آدمی تمہاری کسی سہیلی کے یہاں سے آیا تھا۔ کہتا تھا کہ بی بی تیار رہیں۔ کالج کے جلسے میں جانا ہے۔“

بلقیس نے یوں جھوٹ موٹ کا اظہار کیا۔

”ہائے۔ جلسے میں؟۔ میں تو بالکل بھول ہی گئی تھی۔ یہ جلسہ بہت ضروری ہے امی جان۔ میں نہ گئی تو پرنسپل صاحبہ بہت بُرا مانیں گی۔ میرا خیال ہے مجھے فوراً تیار ہو جانا چاہیے۔“

ماں کو اس سے کام کرانا تھا۔ اُسے کالج کے جلسے جلوسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”تو چل میرے ساتھ اور بیٹھ کے میرے ساتھ آٹا گوندھ۔“

بلقیس نے اپنی سجاوٹ ایک نظر دیکھی اور بڑی پُر درد لہجے میں کہا۔

”لیکن امی جان“

ماں کا لہجہ کڑا ہو گیا۔

”نہیں آج میری ساتھ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ سمجھیں۔؟“

بلقیس نے ہار مان کر اپنی ماں سے کہا۔

”آٹا گوندھنے کے بعد تو مجھے اجازت مل جائیگی۔؟“

ماں زیرِلب مسکرائی۔

”دیکھوں گی۔ چل بیٹھ جا میرے سامنے۔“

بلقیس وہیں کمرے میں بیٹھنے لگی۔ مگر اُسے ایک دم خیال آیا کہ باورچی خانہ اور صحن باہر ہیں۔ یہاں وہ اپنی ماں کا سر آٹا گوندھے گی۔

”چلیے امی جان۔“

دونوں باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔ کچھ اس طرح جیسے آگے آگے پولیس کا سپاہی اور پیچھے ہتھکڑی لگا ملزم۔ اُس کی ماں ایک پیڑھی پر اپنا بھاری بھرکم جسم ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ گئیں کہ پیڑھی کو ضرب نہ پہنچے۔ پھر اُس نے بلقیس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ٹکر ٹکر میرا منہ کیا دیکھتی ہے، بیٹھ جا یہاں میرے سامنے“!

بلقیس گندے فرش پر ہی پیروں کے بل بیٹھ گئی اور منہ بنا کر پوچھا۔

”پانی کہاں ہے؟“

پانی پاس ہی پڑا تھا۔ اصل میں اُسے سجھائی کم دینے لگا تھا۔ سامنے پرات میں آٹے کی چھوٹی سی ڈھیری پڑی تھی۔ اس نے ڈھیری میں پاس پڑی گڑوی سے تھوڑا سا پانی بادل ناخواستہ ڈالا اور آٹے پانی کو ملا کر جلدی جلدی مکیاں مانے لگی۔ لیکن اُس نے دیکھا کہ سامنے صحن میں لگے کلاک کی سوئیاں بتا رہی تھی کہ آٹھ بجنے والے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اُس کی مکیاں تیز ہو جائیں مگر وہ اس سوچ میں غرق تھی کہ جہاں اُسے ساڑھے آٹھ بجے پہنچنا ہے کیا وہ یہ آٹا گوندھنے کے بعد پہنچ سکے گی۔ اُس کی ماں اُس کے سر پر کھڑی تھی۔ ایک دم چلائی۔

”بلقیس یہ مکیاں مار رہی ہے یا کسی کا سر سہلا رہی ہے۔“

بلقیس ابھی سوچ ہی رہی تھی کیا کہے اصل میں وہ یہ چاہتی تھی کہ اپنا گیلے آٹے سے بھرا ہاتھ مکا بنا کر یا اپنی ماں کے سر پر دے مارے یا اپنے سر پر۔ خود کو اتنا پیٹے کہ بے ہوش ہو جائے۔ لیکن اُسے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہاں پہنچنا تھا۔ اس لیے اُس نے جلدی جلدی آٹا گوندھا اور فارغ ہو گئی۔ ہاتھ دھو کر اُس نے ثُریا سے کہا۔

”جاؤ ایک ٹانگہ لے آؤ۔“

ثُریا چلی گئی۔ بلقیس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ لپ اسٹک دوبارہ لگائی۔ کسی قدر بکھرے ہوئے بالوں کو دُرست کیا اور کرسی پر بیٹھ کر بڑے اضطراب میں ٹانگ ہلانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ثُریا آ گئی۔ اس نے اپنی بڑی بہن سے کہا۔

”باجی ٹانگہ آ گیا ہے۔“

بلقیس کی ٹانگ ہلنا بند ہو گئی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بُرقع اُٹھایا ہی تھا کہ باہر صحن سے اُس کے بھائی کی آواز آئی۔

”بلی۔ بلی۔“

بلقیس نے کہا۔

”کیا ہے بھائی جان؟“

اُس کا بھائی خود اندر تشریف لے آیا اور اُس کے ہاتھوں میں اپنی قمیص دے کر کہا۔

”دھوبی کم بخت نے پھر دو بٹن غارت کر دیئے۔ مہربانی کر کے۔“

بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ دو بٹن اُس کے سر پر دو پہاڑ بن کر ٹُوٹ پڑے ہیں۔

”نہیں بھائی جان مجھے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے کالج کے جلسے میں پہنچنا ہے۔“

اُس کے بھائی نے بڑے اطمینان اور برادرانہ محبت سے کہا۔

”تم وقت پر پہنچ جاؤ گی۔ لو یہ دو بٹن ہیں۔ تم تو یُوں چٹکیوں میں ٹانگ دو گی۔“

”نہیں بھائی جان۔ وقت ہو گیا ہے۔ سوا آٹھ ہو چکے ہیں۔“

”امی جان نے تمھیں اجازت دے دی ہے۔“

”نہیں۔“

”تو بٹن ٹانک دو۔ اجازت میں لے دُوں گا۔“

”سچ۔؟“

”میں نے آج تک تم سے کوئی جھوٹی بات کہی ہے۔“

”لائیے۔“

بلقیس نے بٹن لیے اور سوئی میں دھاگہ پرو کر بٹن ٹانکنے شروع کر دیے۔ اُس کی انگلیوں میں بلا کی پھرتی تھی۔ دو منٹ سے کم عرصے میں اُس نے اپنے بھائی کی قمیص میں دو بٹن لگا دیے۔ وہ بہت ممنون وہ متشکر ہوا۔ باہر جا کر اُس نے اپنی ماں سے سفارش کی کہ وہ بلقیس کو کالج کے جلسے میں جانے کی اجازت دے دے۔ اس کی یہ سفارش سُن کر اُس کی ماں اُس پر برس پڑی۔

”تم دونوں آوارہ گرد ہو۔ گھر میں تمہارا جی ہی نہیں لگتا۔ تم کہاں جانے کی تیاریاں کر رہے ہو؟۔ دیکھو میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ نہ بلقیس کہیں جائے گی نہ تم۔ گھر میں بیٹھو اور کام کرو۔“

”لیکن امی جان، میں تو آپ ہی کے لیے باہر جا رہا ہوں۔“

”مجھے کیا تکلیف ہے کہ تم میرے لیے باہر جا رہے ہو۔ میرے لیے جب بھی تم گئے ڈاکٹر بُلانے کے لیے گئے۔“

”لیکن امی جان۔ آپ کے زیوروں کا بھی تو پتہ لینا ہے۔ جس سُنار کو آپ نے بننے کے لیے دیے تھے، وہ چار روز سے غائب ہے۔“

”ہائیں۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا۔ کہاں غائب ہو گیا ہے؟“

”اب جاؤں گا تو معلوم کروں گا۔“

”جاؤ جلدی جاؤ۔ اور مجھے اطلاع دو کہ وہ واپس آ گیا ہے کہ نہیں۔ میرا سونا اُس سے واپس لے آنا۔ ساڑھے چار تولے دو ماشے اور چار رتیاں ہے۔“

”بہت بہتر۔ بلقیس کو اب آپ اجازت دیجیے۔“

اُس کی ماں نے بادلِ ناخواستہ کہا کہ چلی جائے۔ مگر مجھے اس کا یہ ہر روز شام کا گھر سے باہر رہنا پسند نہیں۔ بلقیس کا بھائی زیرِ لب مسکرایا اور اندر جا کر اپنی بہن کو خوشخبری سُنائی کے امی جان سے جو اُس نے فراڈ کیا وہ چل گیا اور اُس کو اجازت مل گئی۔ بلقیس بہت خوش ہوئی۔ آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اُس نے اپنا برقعہ پہنا۔ باہر نکلنے ہی والی تھی کہ اُس کی ماں نے اُسے بُلایا اور اُس سے کہا۔

”دیکھو بلقیس تم جا تو رہی ہو، لیکن میرا ایک کام کرتی جاؤ۔“

بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کا ریشمی برقع لوہے کی چادر بن گیا ہے۔

”بتایئے امی جان۔“

”ایک خط لکھوانا تھا تم سے“

بلقیس نے ایک شکست خوردہ اور غلام کے مانند بدرجہ مجبوری ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

”لایئے لکھ دیتی ہوں۔“

بلقیس کی آنکھیں تو نہیں بلکہ اُس کے جسم کا رواں رواں رو رہا تھا۔ اُس نے خط مکمل کیا۔ باہر تانگہ کھڑا تھا۔ اُس میں بیٹھی اور اُسے جہاں پہنچنا تھا پہنچی۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کواڑوں کو غصے میں آکر زور سے دھکیلا۔ !وہ کھلے تھے، بلقیس گرتے گرتے بچی۔ اندر اُس کا دوست جس سے وہ ملنے آئی تھی۔ خوابِ خرگوش میں تھا۔ اُس نے اُس کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ بیدار نہ ہوا۔ آخری وہ جلی بھنی، بڑبڑاتی وہاں سے چلی گئی

”میری جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ یہاں ٹھہروں۔ میں اتنی مصیبت سے یہاں آئی اور جناب معلوم نہیں بھنگ پی کر سو رہے ہیں۔“

خود فریب

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوخود فریب

ہم نیو پیرس اسٹور کے پرائیویٹ کمرے میں بیٹھے تھے۔ باہر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس کا مالک غیاث اٹھ کر دوڑا۔ میرے ساتھ مسعود بیٹھا تھا اس سے کچھ دور ہٹ کر جلیل دانتوں سے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کے ناخن کاٹ رہا تھا اس کے کان بڑے غور سے غیاث کی باتیں سن رہے تھے وہ ٹیلی فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

”تم جھوٹ بولتی ہو۔ اچھا خیر آج دیکھ لیں گے۔ تو یہ کیا کہا، تمہارے لیے تو ہماری جان حاضر ہے۔ اچھا تو ٹھیک پانچ بجے۔ خدا حاف☆۔ کیا کہا؟۔ بھئی کہہ تو دیا کہ تمہیں مل جائے گی۔
“

جلیل نے میری طرف دیکھا۔

”منٹو صاحب عیش کرتا ہے یہ غیاث“!

میں جواب میں مسکرا دیا۔ جلیل انگلیوں کے ناخن اب تیزی سے کاٹنے لگا۔

”کئی لڑکیوں کے ساتھ اس کا ٹانکہ ملا ہوا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں ایک اسٹور کھول لوں۔ لیڈیز اسٹور۔ خواہ مخواہ پریس کے چکر میں پڑا ہوں۔ عورت کا سایہ تک بھی وہاں نہیں آتا۔ سارا دن گڑگڑاہٹیں سنو۔ اُلّو کے پٹھے قسم کے گاہکوں سے مغزماری کرو۔ یہ زندگی ہے؟“

میں پھر مسکرا دیا۔ اتنے میں غیاث آگیا۔ جلیل نے زور سے اس کے چوتڑوں پر دھپا مارا اور کہا۔

”سنایئے، کون تھی یہ جس کے لیے تو اپنی جان حاضر کر رہا تھا۔“

غیاث بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

”منٹو صاحب کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔“

جلیل نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں میں سے گھور کر غیاث کی طرف دیکھا اور کہا۔

”منٹو صاحب کو سب معلوم ہے۔ تم بتاؤ کون تھی؟“

غیاث نے اپنی نیلے شیشے والی عینک اتار کر اس کی کمانی ٹھیک کرنی شروع کی۔

”ایک نئی ہے۔ پرسوں آئی تھی، ٹیلی فون کرنے۔ کسی سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ فون کر چکی تو میں نے اس سے کہا، جناب فیس ادا کیجیے۔ یہ سن کر مسکرنے لگی۔ پرس میں ہاتھ ڈالکر اس نے دس روپے کا نوٹ نکالا اور کہا۔

”حاضر ہے“

۔ میں نے کہا

”شکریہ۔ آپ کا مسکرا دینا ہی کافی ہے۔ بس دوستی ہو گئی۔ ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھی رہی، جاتے ہوئے دس رومال لے گئی۔“

مسعود جو بالکل خاموش تھا غالباً اپنی بے کاری کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اٹھا۔

”بکواس ہے۔ محض خود فریبی ہے“

یہ کہہ کر اس نے مجھے سلام کیا اور چلا گیا۔ غیاث اپنی باتوں سے بہت خوش تھا۔ مسعود جب یکلخت بولا تو اس کا چہرہ کسی قدر مرجھا گیا۔ جلیل تھوڑی دیر کے بعد غیاث سے مخاطب ہوا۔

”کیا مانگ رہی تھی؟“

غیاث چونکا

”کیا کہا؟“

جلیل نے پھر پوچھا۔

”کیا مانگ رہی تھی؟“

غیاث نے کچھ توقف کے بعد کہا

”میڈن فورم بریسٹر“

جلیل کی آنکھیں عینک کے موٹے شیشوں کے عقب سے چمکیں۔

”سائز کیا ہے۔“

غیاث نے جواب دیا

”تھرٹی فور“!

جلیل مجھ سے مخاطب ہوا

”منٹو صاحب یہ کیا بات ہے انگیا دیکھتے ہی میرے اندر ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔“

میں نے مسکرا کر اس سے کہا

”آپ کی قوت متخیلہ بہت تیز ہے۔“

جیلیل کچھ نہ سمجھا اور نہ وہ سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے دماغ میں کھد بد ہو رہی تھی وہ اس لڑکی کے متعلق باتیں کرنا چاہتا تھا جس کے ساتھ غیاث نے ٹیلی فون پر باتیں کی تھیں۔ چنانچہ میرا جواب سن کرنے اس غیاث سے کہا۔

”یار ہم سے بھی تو ملاؤ اسے“

غیاث نے کمانی ٹھیک کر کے عینک لگائی

”کبھی یہاں آئے گی تو مل لینا“

کچھ نہیں یار تم ہمیشہ یہی غچے دیتے رہتے ہو۔ پچھلے دنوں جب وہ یہاں آئی تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟۔ جمیلہ۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے بات کرنی چاہی تو تم نے ہاتھ جوڑ کر مجھے منع کر دیا۔ میں اُسے کھا تو نہ جاتا“

یہ کہہ کر جمیل نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑ لیں۔ جلیل اور غیاث دونوں میں بچپنا تھا۔ دونوں ہر وقت لڑکیوں کے متعلق سوچتے رہتے تھے، خوبصورت، موٹی، دبلی، بھدی لڑکیوں کے متعلق۔ ٹانگے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے متعلق۔ پیدل چلتی اور سائیکل سوار لڑکیوں کے متعلق۔ جلیل اس معاملے میں غیاث سے بازی لے گیا تھا۔ دفتر سے کسی ضروری کام پر موٹر میں نکلتا، راستے میں کوئی ٹانگے میں بیٹھی یا موٹر میں سوار لڑکی نظر آجاتی تو اس کے پیچھے اپنی موٹر لگا دیتا۔ یہ اس کا محبوب ترین شغل تھا لیکن اس نے کبھی بدتمیزی نہ کی تھی۔ چھیڑ چھاڑ سے اسے ڈر لگتا تھا۔ جہاں تک گفتار کا تعلق ہے اسے غازی کہنا چاہیے۔ بڑے بڑے مضبوط قلعے سر کر چکا تھا۔ پرائیویٹ کمرے میں جب باہر اسٹور سے کوئی نسوائی آواز آتی تو غیاث اچھل پڑتا اور پردہ ہٹا کر ایک دم باہر نکل جاتا۔ مرد گاہکوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان سے اس کا ملازم نبٹتا تھا۔ دونوں اپنے کام میں ہوشیار تھے۔ اسٹور کس طرح چلایا جاتا ہے اس کو کیوں کر مقبول بنایا جاتا ہے، اس کا غیاث کو بڑا اچھا سلیقہ تھا اسی طرح جلیل کو پریس کے تمام شعبوں پر کامل عبور تھا لیکن فرصت کے اوقات میں وہ صرف لڑکیوں کے متعلق سوچتے تھے۔ خیالی اور اصلی لڑکیوں کے متعلق۔ اسٹور میں کسی دن جب کوئی بھی لڑکی نہ آتی تو غیاث اداس ہو جاتا۔ یہ اداسی وہ جلیل سے ٹیلی فون پر ان لڑکیوں کے متعلق باتیں کر کے دور کرتا جو بقول اسکے جال میں پھنسی ہوئی تھیں۔ جلیل اسے اپنے معرکے سناتا۔ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے۔ اسٹور میں کوئی گاہک آتا یا ادھر پریس میں کسی کو جلیل کی ضرورت ہوتی تو یہ دلچسپ سلسلہ گفتگو منقطع ہو جاتا۔ اس لحاظ سے نیو پیرس اسٹور بڑی دلچسپ جگہ تھی۔ جلیل دن میں دو تین مرتبہ ضرور آتا۔ پریس سے کسی کام کے لیے نکلتا تو چند منٹوں ہی کے لیے اسٹور سے ہو جاتا۔ غیاث سے کسی لڑکی کے بارے میں چھیڑ چھاڑ کرتا اور انگلی میں موٹر کی چابی گھماتا چلا جاتا۔ جلیل کو غیاث سے یہ گلہ تھا کہ وہ

”اپنی لڑکیوں“

کے متعلق انتہائی رازداری سے کام لیتا ہے ان کا نام تک نہیں بتاتا۔ چھپ چھپ کر اُن سے ملتا ہے اُن کو تحفے تحائف دیتا ہے اور اکیلے اکیلے عیش کرتا ہے یہی گلہ غیاث کو جلیل سے تھا۔ لیکن دونوں کے دوستانہ تعلقات ویسے کے ویسے قائم تھے۔ ایک روز اسٹور میں ایک سیاہ برقعے والی عورت آئی۔ نقاب الٹا ہوا تھا۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا آتے ہی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ غیاث جب اسکی طرف بڑھا تو اس نے برقعہ سے پسینہ پونچھ کر اس سے کہا۔

”پانی پلایئے ایک گلاس“

غیاث نے فوراً نوکر کو بھیجا ایک ٹھنڈا لیمن لے آئے۔ عورت نے چھت کے ساکن پنکھوں کو دیکھا اور غیاث سے پوچھا

”پنکھا کیوں نہیں چلاتے آپ؟“

غیاث نے سر تاپا معذرت بن کر کہا

”دونوں خراب ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔ میں نے آدمی بھیجا ہوا ہے“

عورت اسٹول پر سے اٹھی

”میں تو یہاں ایک منٹ نہیں بیٹھ سکتی“

یہ کہہ کر وہ شوکیسوں کو دیکھنے لگی

”آدمی خاک شوپنگ کر سکتا ہے اس دوزخ میں۔“

غیاث نے اٹک اٹک کر کہا

”مجھے افسوس ہے۔ آپ۔ آپ اندر تشریف لے چلیے۔ جس چیز کی آپ کو ضرورت ہو گی میں لا کر دوں گا۔ عورت نے غیاث کی طرف دیکھا

”چلیے“

غیاث تیز قدمی سے آگے بڑھا۔ پردہ ہٹایا اور اس عورت سے کہا

”تشریف لایئے۔“

عورت اندر کمرے میں داخل ہو گئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ غیاث نے پردہ چھوڑ دیا۔ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چند لمحات کے بعد غیاث نکلا۔ میرے پاس آ کر اس نے ہولے سے کہا

”منٹو صاحب کیا خیال ہے آپ کا اس لڑکی کے بارے میں؟“

میں مسکرا دیا۔ غیاث نے ایک خانے سے مختلف اقسام کی لپ اسٹکیں نکالیں اور اندر کمرے میں لے گیا۔ اتنے میں جلیل کی موٹر کا ہارن بجا اور وہ انگلی پر چابی گھماتا نمودار ہوا۔ آتے ہی اس نے پکارا

”غیاث۔ غیاث، آؤ بھئی سنو وہ کل والا معاملہ میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے۔“

پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اوہ منٹو صاحب، آداب عرض۔ غیاث کہاں ہے؟“

میں نے جواب دیا

”اندر کمرے میں“

”وہ میں نے سب ٹھیک کر دیا منٹو صاحب۔ ابھی ابھی پٹرول پمپ کے پاس ملی۔ پیدل جا رہی تھی میں نے موٹر روکی اور کہا جناب یہ موٹر آخر کس مرض کی دوا ہے اسے مزنگ چھوڑ کر آ رہا ہوں۔“

پھر اس نے کمرے کے پردے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

”غیاث باہر نکل بے“!

جلیل نے انگلی پر زور سے چابی گھمائی

”مصروف ہے۔ اب اس نے اندر مصروف ہونا شروع کر دیا ہے“

کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر پردہ اٹھایا۔ ایک دم اس کے جیسے بریک سی لگ گئی۔ پردہ اسکے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”سوری“

کہہ کر وہ الٹے قدم واپس آیا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں اس نے مجھ سے پوچھا

”منٹو صاحب کون ہے؟“

میں نے دریافت کیا

”کہاں کون ؟“

”یہ۔ یہ جو اندر بیٹھی لبوں پر لپ اسٹک لگا رہی ہے“

میں نے جواب

”معلوم نہیں گاہک ہے“!

جلیل نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے آنکھیں سکیڑیں اور پردے کی طرف دیکھنے لگا۔ غیاث باہر نکلا۔ جلیل سے

”ہلو جلیل“

کہا اور آئینہ اٹھا کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ دونوں دفعہ جب پردہ اٹھا تو جلیل کو اس عورت کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ میری طرف مڑ کر اس نے کہا۔ عیش کرتا ہے پٹھا، پھر اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پردہ اٹھا۔ عورت ہونٹوں کو چوستی ہوئی نکلی۔ جلیل کی نگاہوں نے اسکو اسٹور کے باہر تک پہنچایا پھر اس نے پلٹ کر کمرے کا رخ کیا۔ غیاث باہر نکلا۔ رومال سے ہونٹ صاف کرتا۔ دونوں ایک دوسرے سے قریب قریب ٹکرا گئے۔ جلیل نے تیز لہجے میں اس سے پوچھا

”یہ کیا قصہ تھا بھئی“

غیاث مسکرایا

”کچھ نہیں“

یہ کہہ کر اس نے رومال سے ہونٹ صاف کیے۔ جلیل نے غیاث کے چٹکی بھری

”کون تھی ؟“

”یار تم ایسی باتیں نہ پوچھا کرو“

غیاث نے اپنا رومال ہوا میں لہرایا۔ جلیل نے چھین لیا غیاث نے جھپٹا مار کر واپس لینا چاہا۔ جلیل پینترہ بدل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ رومال کھول کر اس نے غور سے دیکھا جگہ جگہ سرخ نشان تھے۔ عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس نے غیاث کو گھورا۔

”یہ بات ہے۔“

غیاث ایسا چور بن گیا۔ جس کو کسی نے چوری کرتے کرتے پکڑ لیا ہے

”جانے دو یار۔ ادھر لاؤ رومال۔“

جلیل نے رومال واپس کر دیا۔

”بتاؤ تو سہی کون تھی“

اتنے میں نوکر لیمن لے کر آ گیا۔ غیاث نے اسکو اتنی دیر لگانے پر جھڑکا

”کوئی مہمان آئے تو تم ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہو۔“

غیاث نے جلیل سے پوچھا۔

”یہ لیمن اسی کے لیے منگوایا گیا تھا۔“

”ہاں یار۔ اتنی دیر میں آیا ہے کم بخت۔ دل میں کہتی ہو گی پیاسا ہی بھیج دیا۔“

غیاث نے رومال جیب میں رکھ لیا۔ جلیل نے شوکیس پر سے لیمن کا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ پی گیا۔

”ہماری پیاس تو بجھ گئی۔ لیکن یار بتاؤ نا تھی کون ؟۔ پہلی ہی ملاقات میں تم نے ہاتھ صاف کر دیا۔ غیاث نے رومال نکال کر اپنے ہونٹ صاف کیے اور آنکھیں چمکا کر کہا۔

”چمٹ ہی گئی۔ میں نے کہا دیکھو ٹھیک نہیں۔ دکان ہے۔ زبردستی میرے ہونٹوں کا چما لے گئی۔“

ایک دم مسعود کی آواز آئی

”سب بکواس ہے۔ محض خود فریبی ہے۔“

غیاث چونک پڑا۔ مسعود اسٹور کے باہر کھڑا تھا اس نے مجھے سلام کیا اور چل دیا۔ جلیل فوراً ہی غیاث سے مخاطب ہوا۔

”چھوڑو یار تم یہ بتاؤ پھر کیا ہوا ؟۔ یار چیز اچھی تھی۔ کیا نام ہے ؟“

غیاث نے جواب نہ دیا۔ مسعود کی آواز کے اچانک حملے سے وہ بوکھلا سا گیا تھا۔ جلیل کو ایک دم یاد آیا کہ وہ تو ایک بہت ہی ضروری کام پر نکلا ہے۔ انگلی پر چابی گھما کر اس نے غیاث سے کہا

”لڑکی کے متعلق پھر پوچھوں گا۔ اچھا منٹو صاحب السلام علیکم“

اور چلا گیا۔ میں نے مسکرا کر غیاث سے پوچھا

”غیاث صاحب اتنی جلدی پہلی ہی ملاقات میں آپ نے۔“

غیاث جھینپ گیا میری بات کاٹ کر اس نے کہا

”چھوڑیئے منٹو صاحب۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ چلیے اندر بیٹھیں۔ یہاں گرمی ہے۔“

ہم اندر کمرے کی طرف چلنے لگے تو اسٹور کے باہر جلیل کی موٹر رکی۔ اس نے زور زور سے ہارن بجایا۔ غیاث نہ گیا تو وہ خود اندر آیا۔

”غیاث اندر آؤ۔ بس اسٹینڈ کے پاس ایک بڑی خوبصورت لڑکی کھڑی ہے۔“

غیاث اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں مسکرانے لگا۔ اس دوران میں جلیل نے بڑی مشکلوں سے اپنے باپ کو راضی کر کے ایک کرسچین لڑکی ملازم رکھ لی۔ اس کو وہ اپنی اسٹینو کہتا تھا۔ کئی بار موٹر میں اسکو اپنے ساتھ لایا، لیکن اس کو موٹر ہی میں بٹھائے رکھا۔ غیاث کو اس بات کا بہت غصہ تھا۔ ایک بار اس اسٹینو کے سامنے غیاث نے جلیل کو مذاق کیا تو وہ بہت سٹ پٹایا، اس کے کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ نظریں جھکا کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔ بقول جلیل کے یہ اسٹینو شروع شروع میں تو بڑی ریزرو رہی۔ لیکن آخر اس سے کھل ہی گئی۔

”بس اب چند دنوں ہی میں معاملہ پٹا سمجھو۔“

غیاث اب زیادہ تر جلیل سے اس اسٹینو کی باتیں کرتا۔ جلیل اس سے اس لڑکی کے متعلق پوچھتا جس نے چمٹ کر اس کو چوم لیا تھا تو غیاث عموماً یہ کہتا

”کل اس کا ٹیلی فون آیا۔ پوچھنے لگی آوٴں؟۔ میں نے کہا یہاں نہیں۔ تم وقت نکالو تو میں کسی اور جگہ کا انتظام کر لوں گا۔“

جلیل اس سے پوچھتا

”کیا کہا اس نے؟“

غیاث جواب دیتا۔

”تم اپنی اسٹینو کی سناؤ“

اسٹینو کی باتیں شروع ہو جاتیں۔ ایک دن میں اور غیاث دونوں جلیل کے پریس گئے مجھے اپنی کتاب کے گرد پوش کے ڈیزائن کے بارے میں دریافت کرنا تھا۔ دفتر میں اسٹینو ایک کونے میں بیٹھی تھی لیکن جلیل نہیں تھا۔ اسٹینو سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی باہر نکلا ہے۔ میں نے نوکر کو بھیجا کہ اس کو ہماری آمد کی اطلاع دے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جلیل آگیا۔ چک اٹھا کر اس نے مجھے سلام کیا اور غیاث سے کہا۔

”ادھر آؤ غیاث“

ہم دونوں باہر نکلے غیاث کو ایک کونے میں لے جا کر جلیل نے اُچھل کر غیاث سے کہا

”میدان مار لیا۔ ابھی ابھی تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے“

یہ کہہ کر وہ رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا

”معاف کیجیے گا منٹو صاحب“

پھر اس نے غیاث کو زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

”میں نے آج اس کو پکڑ لیا۔ بالکل اسی طرح۔ اور اسی جگہ۔ اس ٹریڈل کے پاس۔“

غیاث نے پوچھا۔

”کیسے؟“

جلیل جھنجھلا گیا

”ابے اپنی اسٹینو کو۔ قسم خدا کی مزا آگیا۔ یہ دیکھو“

اس نے اپنا رومال پتلون کی جیب سے نکال کر ہوا میں لہرایا۔ اس پر سرخی کے دھبے تھے۔ ایک دم مسعود کی آواز آئی

”بکواس ہے۔ محض خود فریبی ہے۔“

جلیل اور غیاث چونک اٹھے۔ میں مسکرایا۔ ٹریڈل کے توے پر سرخ روغن کی پتلی سی ہموار تہ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جگہ پونچھنے کے باعث کچھ خراشیں پڑگئی تھیں۔ 8جون1950ء

خودکشی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوخودکشی

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا' اس کے زہد و تقویٰ کے سب قائل تھے' اس نے بیس پچیس برس کی عمر میں شادی کی' اس زمانے میں اُس کے پاس دس ہزار کے قریب روپے تھے' شادی پر پانچ ہزار صرف ہوگئے' اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔ زاہد بہت خوش تھا' اُس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی' اُس کو اُس سے بے پناہ محبت ہوگئی' وہ بھی اُس کو دل و جان سے چاہتی تھی' دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔ ایک برس کے بعد اُن کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جو ماں پر تھی' یعنی ویسی ہی حسین' بڑی بڑی غلافی آنکھیں' ان پر لمبی پلکیں' مہین ابرو' چھوٹا سا لب دہن۔ اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اُس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کیے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے' وہ چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بتائے۔ زاہد دیر تک سوچتا رہا لیکن اُس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا جو وہ اپنی بیٹی کے لیے منتخب کرتا۔ اُس نے اپنی بیوی سے کہا

”اتنی جلدی کیا ہے۔ نام رکھ لیا جائے گا“

بیوی مصر تھی کہ نام ضرور رکھا جائے

”میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی“

وہ کہتا

”اس میں کیا حرج ہے۔ جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گل گوتھنی کے ساتھ ٹانک دیں گے“

”پر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں؟ ۔ مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے“

”فی الحال بیٹا کہہ دینا کافی ہے“

”یہ کافی نہیں ہے۔ میری بٹیا کا کوئی نام ہونا چاہیے“

”تم خود ہی کوئی منتخب کرلو“

تو تھوڑے دن انتظار کرو۔ میں اُردو کی لغت لاتا ہوں۔ اس کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا۔ یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا“

”میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سُنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں“

”نہیں میری جان' نکالتے ہیں۔ میرا ایک دوست ہے' اُس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اُردو کی لغت نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا“

”کیا نام تھا“

”نکہت“

”اس کے معنی کیا ہیں“

”خوشبو“

”بڑا اچھا نام ہے۔ نکہت۔ یعنی خوشبو“

”تو یہی نام رکھ لو“

زاہد کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی' ایک نظر دیکھا اور کہا

”نہیں۔ میں اپنی بٹیا کے لیے پُرانا نام نہیں چاہتی۔ کوئی نیا نام تلاش کیجیے۔ جایئے ڈکشنری لے آیئے“

”زاہد مسکرایا“

لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں“

زاہد کی بیوی بھی مسکرائی

”میرا پرس الماری میں پڑا ہے، اس میں جتنے روپے آپ کو چاہئیں، نکال لیجیے“

زاہد نے

”بہت بہتر“

کہا اور الماری کھول کر اُس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لغت خرید لے۔ وہ کئی کتب فروش دکانوں میں گیا۔ کئی لغت دیکھے، بعض تو بہت قیمتی تھے جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے ناقص۔ آخر اُس نے ایک لغت جس کی قیمت واجبی تھی خرید لیا اور راستے میں اُس کی ورق گردانی کرتا رہا تاکہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔ جب وہ انارکلی میں سے گزر رہا تھا تو اُس کو ایک دوست مل گیا، وہ اُسے اپنی بوٹوں کی دکان میں لے گیا۔ وہاں اُسے قریب قریب ایک گھنٹے تک بیٹھنا پڑا کیونکہ بہت دیر کے بعد اُس سے ملاقات ہوئی تھی جب اُس کے دوست کو دورانِ گفتگو میں پتہ چلا کہ زاہد کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجوری میں سے گیارہ روپے نکالے اور زاہد سے کہا:

”یہ اُس بچی کو دے دینا کہنا تمہارے چچا نے دیے ہیں۔ نام کیا رکھا ہے اس کا؟“

زاہد نے لغت کی طرف دیکھا جس کی جلد لال رنگ کی تھی

”ابھی تک کوئی اچھا نام سوجھا نہیں“

اُس کے دوست نے جوتے کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا:

”یار نام رکھنے میں دقّت ہی کیا پیش آتی ہے۔ ثمینہ ہے، شاہینہ ہے، نسرین ہے، الماس ہے“

زاہد نے جواب دیا

”یہ سب بکواس ہے“

اُس کے دوست نے جوتا ڈبے میں رکھا

”تو اب جو بکواس تم کرو گے وہ بھی ہم سُن لیں گے“

اس کے بعد اُٹھ کر اُس نے زاہد کو گلے سے لگایا۔ خدا اُس کی عمر دراز کرے۔ نام ہو نہ ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے“

زاہد جب دکان سے باہر نکلا تو اُس نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی نام میں کیا رکھا ہے۔ خیراتی کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی خیرات کرتا ہے، عیدن کیا بلا ہے۔ اور گھسیٹا۔ کیا اسے لوگ گھسیٹنا شروع کر دیں۔ اور یہ رُلدو۔ شبراتی؟ اُس کے جی میں آئی کہ لغت کسی گندی موری میں پھینک دے اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے

”میری جان! نام میں کچھ نہیں پڑا، بس یہ دُعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو۔“

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا، اُس نے سوچا کہ شاید یہ اُس کی پراگندہ خیالی کا باعث ہے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد اس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی، وہ چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچی کی پیشانی چومے۔ بغل میں لغت تھی۔ اِس کو اُس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی مگر اُس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا۔ اُس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی بہت بُری طرح ہانپنے لگا اور ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا اُس نے اس کو ٹھہرایا اور اس میں بیٹھ کر تانگے والے سے کہا:

”چلو مزنگ لے چلو۔ لیکن جلدی پہنچاؤ، مجھے وہاں ایک بڑا ضروری کام ہے“

مگر گھوڑا بہت ہی سست رفتار تھا، یا شاید زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کو عجلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت سست الفاظ کہے جو وہ برداشت کرتا گیا، آخر جب اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے زاہد کو تانگے سے اُتار دیا۔ ہائیکورٹ کے قریب، اس نے زاہد سے کرایہ بھی طلب نہ کیا۔ زاہد اور زیادہ پریشان ہوا، وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا، وہ کچھ دیر چوک میں کھڑا رہا، اتنے میں ایک پشاوری تانگہ آیا اس میں بیٹھ کر وہ مزنگ پہنچا۔ کرایہ ادا کیا اور گھر میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں، وہ دروازے کے پاس رُک گیا، ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی، مشکل ہی سے بچے گی بیچاری۔ تشنج کے یہ دورے بڑے خطرناک ہیں“

زاہد اُن عورتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دیوانہ وار اندر بھاگا اور اُس کے کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اُس کی بیوی رہتے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کی فلک شگاف چیخ سنی۔ اُس کی بٹیا دم توڑ چکی تھی، اور اُس کی بیوی بیہوش پڑی تھی۔ زاہد نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پردے کو بھول کر بے اختیار اندر چلی آئیں اور زاہد کو اُس کمرے سے باہر نکال دیا۔ ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موٹر تھی وہ ایک ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے زاہد کی بیوی کو ایک دو انجکشن لگائے جن سے وہ ہوش میں آ گئی۔ زاہد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا بغل میں لغت دبائے خلا میں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنی بچی کے لیے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔ بچی کو

دفنانے کا وقت آیا تو زاہد باہوش ہو گیا‘ اُس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں پڑی بچی کو اُٹھایا اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی سے تیار کرا لی گئی تھی۔ اُس میں اُس نے خود اُسے لٹایا اور اُس کے ساتھ لغت رکھ دی۔ لوگوں نے سمجھا‘ قرآن مجید ہے‘ انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ مُردوں کے ساتھ قرآن کون دفن کرتا ہے‘ یہ تو سراسر کفر ہے‘ لیکن ان میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا‘ بس آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ بچی کو دفنا کر جب گھر آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے‘ سرسام کی کیفیت ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا‘ اُس نے اچھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا

“حالت بہت نازک ہے۔ میں علاج تجویز کیے دیتا ہوں‘ لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا”

زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے لیکن اُس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا

“تکلیف کیا ہے؟”

ڈاکٹر نے جواب دیا

“بہت سی تکلیفیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھیں بہت صدمہ پہنچا‘ دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے۔ تیسری یہ کہ انھیں ایک سو پانچ ڈگری بخار ہے”

ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کیے‘ دو نسخے پلانے والی دواؤں کے لکھے اور چلا گیا۔ زاہد فوراً یہ سب چیزیں لے آیا‘ ٹیکے لگائے‘ دوائیں بڑی مشکل سے حلق میں ٹپکائی گئیں۔ لیکن مریضہ کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ دس پندرہ روز کے بعد اسے تھوڑا سا ہوش آیا‘ ہذیانی کیفیت بھی دُور ہو گئی۔ زاہد نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی پیاری حسین بیوی نے اُسے بلایا اور بڑی نحیف آواز میں کہا

“میرا اب آخری وقت آ گیا ہے۔ میں چند گھڑیوں کی مہمان ہوں۔”

زاہد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے‘

“کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ تمھیں خدانخواستہ اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا۔ زاہد کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا

“یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ میں مر گئی‘ کل دوسری آ جائے گی۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ اور۔ اور۔”

اُس نے ہچکی لی اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر اُس کی رُوح پرواز کر گئی۔ زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا‘ اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر وہ رات کو گھر سے باہر نکلا اور ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر ریلوے لائن کا رُخ کیا۔ رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب ایک گاڑی آتی تھی‘ وہ مغل پورہ کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ وہاں پٹڑی پر لیٹ جائے اور اُسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ گاڑی آئے گی تو اُس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مجھے لمبی عمر کی کوئی خواہش نہیں۔ یہ جتنی جلدی مختصر ہو‘ اتنا ہی اچھا ہے‘ میں اب اور زیادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔ جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اُسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی پیشانی پر ہوتی ہے‘ دکھائی دی۔ لیکن ابھی وہ دُور ہی تھی۔ اُس نے انتظار کیا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پٹڑی پر لیٹ جائے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آ گئی۔ زاہد آگے بڑھا مگر اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا اور پٹڑی کے عین درمیان کھڑا ہو گیا۔ گاڑی بڑی تیز رفتار سے آ رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ آدمی اُس کی جھپٹ میں آ جائے‘ وہ تیزی سے لپکا اور اُس آدمی کو دھکا دے کر پٹڑی کے اُس طرف گرا دیا۔ گاڑی دندناتی ہوئی گزر گئی۔ اُس آدمی سے زاہد نے کہا

“کیا تم خودکشی کرنا چاہتے تھے؟”

اُس نے جواب دیا:

“جی ہاں”

“کیوں؟”

“بس۔ صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا”

زاہد ناصح بن گیا

“بھائی میرے! زندگی زندہ رہنے کے لیے ہے‘ اس کو اچھی طرح استعمال کرو‘ خودکشی بہت بڑی بزدلی ہے۔ اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اُٹھو‘ اپنے صدموں کو بھول جاؤ۔ انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں تو خوشیوں سے کیا حظ اُٹھائے گا۔ چلو میرے ساتھ”

۲۵، مئی ۵۴ء

خودکشی کا اقدام

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوخودکشی کا اقدام

اقبال کے خلاف یہ الزام تھا کہ اُس نے اپنی جان کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرنے کی کوشش کی، گو وہ اس میں ناکام رہا۔ جب وہ عدالت میں پہلی مرتبہ پیش کیا گیا تو اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت سے مڈبھیڑ ہوتے وقت اس کی رگوں میں تمام خون خشک ہو کر رہ گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی تمام طاقت سلب ہو گئی ہے۔ اقبال کی عمر بیس بائیس برس کے قریب ہو گی مگر مُرجھائے ہوئے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی نے اُس کی عمر میں دس سال کا اضافہ کر دیا تھا اور جب وہ اپنی کمر کے پیچھے ہاتھ رکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ واقعی بوڑھا ہے۔ سُنا گیا ہے کہ جب شباب کے ایوان میں غربت داخل ہوتی ہے تو تازگی بھاگ جایا کرتی ہے۔ اس کے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں سے یہ عیاں تھا کہ وہ غربت کا شکار ہے اور غالباً حد سے بڑھی ہوئی مفلسی ہی نے اسے اپنی پیاری جان کو ہلاک کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کا قد کافی لمبا تھا جو کاندھوں پر ذرا آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس جھکاؤ میں اُس کے وزنی سر کو بھی دخل تھا جس پر سخت اور موٹے بال، جیل خانے کے سیاہ اور کھردرے کمبل کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جو بہت گہری اور اتھاہ معلوم ہوتی تھیں۔ جھکی ہوئی نگاہوں سے یہ پتا چلتا تھا کہ وہ عدالت کے سنگین فرش کی موجودگی کو غیر یقینی سمجھ رہا ہے اور یہ ماننے سے انکار کر رہا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ ناک پتلی اور تیکھی، اس کے ماتھے پر تھوڑا سا چکنا میل جما ہوا تھا جس کو دیکھ کر زنگ آلود تلوار کا تصور آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ جو کناروں پر ایک لکیر بن کر رہ گئے تھے۔ آپس میں سلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ شاید اس نے ان کو اس لیے بھینچ رکھا تھا کہ وہ اپنے سینے کی آگ اور دُھوئیں کو باہر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ میلے پائجامے میں اُس کی سوکھی ہوئی ٹانگیں اوپر کے دھڑ کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا دو خشک لکڑیاں تنور کے منہ میں ٹھنسی ہوئی ہیں۔ سینہ چوڑا چکلا تھا مگر ہڈیوں کے ڈھانچے پر جس کی پسلیاں پھٹے ہوئے گریبان میں سے جھانک رہی تھیں گوشت سانولے رنگ کی جھلی معلوم ہوتا تھا سانس کی آمد و شد سے یہ جھلی بار بار پھولتی اور دبتی تھی۔ پیروں میں کپڑے کا جاپانی جوتا تھا جو جگہ جگہ سے بے حد میلا ہو رہا تھا۔ دونوں جوتے انگوٹھوں کے مقام پر سے پھٹے ہوئے تھے ان سوراخوں میں سے اُس کے انگوٹھوں کے بڑھے ہوئے ناخن نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے وہ کوٹ پہنے ہوئے تھا جو اُس کے بدن پر بہت ڈھیلا تھا اس میلے اور سال خوردہ کوٹ کی خالی پھٹی ہوئی جیبیں بے جان مردوں کی طرح منہ کھولے ہوئے تھیں۔ وہ کٹہرے کے ڈنڈے پر ہاتھ رکھے اور سر جھکائے جج کے سامنے بالکل خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

”تم نے ۲۰ جون کو ہفتے کے دن مانانوالہ اسٹیشن کے قریب ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر اپنی جان ہلاک کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک شدید جرم کے مرتکب ہوئے۔ جج نے ضمنی کاغذات پڑھتے ہوئے کہا بتاؤ یہ جرم جو تم پر عائد کیا گیا ہے کہاں تک درست ہے؟“

”جرم“!

اقبال اپنے گہرے خواب سے گویا چونک سا پڑا لیکن فوراً ہی اس کا وزنی سر جو ایک لمحے کے لیے اُٹھا تھا پھر بیل کی پتلی ٹہنی کے بوجھل پھل کی طرح لٹک گیا۔

”بتاؤ یہ جرم جو تم پر عائد کیا گیا ہے کہاں تک درست ہے؟“

جج نے سکول کے استاد کی طرح وہی سوال دہرایا جو وہ اس سے پہلے ہزارہا لوگوں سے پوچھ چکا تھا۔ اقبال نے اپنا سر اُٹھایا اور جج کی طرف اپنی بے حس آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا پھر تھوڑی دیر کے بعد دھیمے لہجے میں کہا

”میں نے آج تک کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا“

عدالت کے کمرے میں کامل سکوت طاری تھا شاید اس کا باعث اقبال کا دشت نما سراپا تھا جس میں بلا کی ہیبت تھی، جج اُس کی نگاہوں کے خوفناک خلا سے خوف کھا رہا تھا۔ کورٹ انسپکٹر نے جو جنگلے سے باہر بلند کرسی پر بیٹھا تھا کمرے کے سکوت کے دہشت ناک اثر کو دور کرنے کے لیے یوں ہی دو تین مرتبہ اپنا گلا صاف کیا ریڈر نے جو پلیٹ فارم پر بچھے ہوئے تخت پر جو جج کے قریب بیٹھا تھا مثلوں کے کاغذات اِدھر اُدھر رکھتے ہوئے اپنی پریشانی اور ڈر دُور کرنے کی سعی کی۔ جج نے ریڈر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ریڈر نے کورٹ انسپکٹر کی طرف اور کورٹ انسپکٹر جواب میں اپنا حلق صاف کرنے کے لیے دو مرتبہ کھانسا جب کمرے کا خوف آمیز سکوت ٹُوٹا تو جج نے میز پر کہنیاں ٹکا کر سامنے پڑے ہوئے قلم دان کے ایک خانے میں سے لوہے کی چمکتی ہوئی پن نکال کر اپنے دانتوں کی ریخ میں گاڑتے ہوئے اقبال سے کہا:

”کیا تم نے خودکشی کا اقدام کیا تھا؟“

”جی ہاں“!

یہ جواب اقبال نے ایسے لہجے میں دیا کہ اس کی آواز ایک لرزاں سرگوشی معلوم ہوئی۔ جج نے فوراً ہی کہا

”تو پھر اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو؟“

”جرم“!

وہ پھر چونک پڑا اور تیز لہجے میں بولا“

آپ کس جرم کا ذکر کر رہے ہیں؟ اگر کوئی خدا ہے تو وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں ہمیشہ اس سے پاک رہا ہوں۔“

جج نے اپنے لبوں پر زور دے کر ایک بیمار مسکراہٹ پیدا کی تم نے خود کشی کا اقدام کیا اور یہ جرم ہے۔ اپنی یا کسی غیر کی جان لینے میں کوئی فرق نہیں۔ ہر صورت میں وار انسان پر ہوتا ہے۔ اقبال نے جواب دیا اس جرم کی سزا کیا ہے؟ یہ کہتے ہوئے اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسم ناچ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سان پر چاقو کی دھار تیز کرتے وقت چنگاریوں کی پھوار گر رہی ہے۔ جج نے جلدی سے کہا

”ایک دو یا تین ماہ کی قید۔“

اقبال نے یہی لفظ تول تول کر دہرائے، گویا وہ اپنے پستول کے میگزین کی تمام گولیوں کو بڑے اطمینان سے ایک نشانے پر خالی کرنا چاہتا ہے

”ایک دو یا تین ماہ کی قید!۔“

یہ لفظ دہرانے کے بعد وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد تیز و تند لہجے میں بولا

”آپ قانون صریحاً موت کو طویل بنانا چاہتا ہے ایک آدمی جو چند لمحات کے اندر اپنی دکھ بھری زندگی کو موت کے سکون میں تبدیل کر سکتا ہے آپ اُسے مجبور کرتے ہیں وہ کچھ عرصے تک اور دُکھ کے تلخ جام پیتا رہے۔ جو آسمان سے گرتا ہے آپ اُسے کھجور پر لٹکا دیتے ہیں آگ سے نکال کر کڑاہی میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ کیا قانون اسی ستم ظریفی کا نام ہے؟“

جج نے بارعب لہجے میں جواب دیا

”عدالت ان فضول سوالات کا جواب نہیں دے سکتی“

”عدالت ان فضول سوالات کا جواب نہیں دے سکتی، تو بتایئے وہ کن متین اور سنجیدہ سوالوں کا جواب دے سکتی ہے؟ اقبال کے ماتھے پر پسینے کے سرد قطرے لرزنے لگے“

کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ عدالت کے معنی کیا ہے؟۔ کیا عدالت بتا سکتی ہے کے ججوں اور مسجد کے مُلاؤں میں کیا فرق ہے جو مرنے والوں کے سرہانے رٹی ہوئی سورہ ِ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں؟ کیا عدالت بتا سکتی ہے کہ اس کے قوانین اور مٹی کے کھلونوں میں کیا فرق ہے؟۔ عدالت اگر ان فضول سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی تو اس سے کہیے کہ وہ ان معقول سوالوں کا جواب دے؟“

جج کے تیوروں پر خفگی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے تیزی سے کہا

”اس قسم کی بے باکانہ گفتگو عدالت کی توہین ہے جو ایک سنگین جرم ہے“

اقبال نے کہا

”تو گفتگو کا کوئی ایسا انداز بتایئے جس سے آپ کی نیک چلن عدالت کی توہین نہ ہو“

جج نے جھلا کر جواب دیا

”جو سوال تم سے کیا جائے صرف اُسی کا جواب دو، عدالت تمہاری تقریر سننا نہیں چاہتی“

”پوچھیے! آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

اقبال کے چہرے پر یاس کی دُھند چھا رہی تھی اور اس کی آواز اس گجر کی ڈوبتی ہوئی گونج معلوم ہوتی تھی جو رات کی تاریکیوں میں لوگوں کو وقت سے باخبر رکھتا ہے۔ یہ سوال کچھ اس انداز سے کیا گیا تھا کہ جج کے چہرے پر گھبراہٹ سی پیدا ہو گئی اور اُس نے ایسے ہی میز پر سے کاغذات اُٹھائے اور پھر وہیں کے وہیں رکھ دیئے اور دانت کی ریخ میں سے پن نکال کر

”پن کُشن میں گاڑتے ہوئے کہا

”تم نے اپنی جان لینے کی کوشش کی اس لیے تم از روئے قانون مستوجب سزا ہو۔ کیا اپنی صفائی میں تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو؟“

اقبال کے بے جان اور نیلے ہونٹ فرط حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے اُس نے کہا بیان! آپ کس قسم کا بیان لینا چاہتے ہیں؟ کیا میں سراپا بیان نہیں ہوں؟۔ کیا میرے گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ غربت کی دیمک میرے گوشت کو چاٹتی رہی ہے؟۔ کیا میری بے نُور آنکھیں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ میری زندگی کی بیشتر راتیں لکڑی اور تیل کے دُھوئیں کے اندر گزری ہیں؟ کیا میرا سوکھا ہوا جسم یہ بیان نہیں دے رہا کہ اُس نے کڑے سے کڑا دُکھ برداشت کیا ہے؟۔ کیا میری زرد بے جان اور کانپتی ہوئی اُنگلیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ وہ سازِ حیات کے تاروں میں اُمید افزا نغمہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں؟۔ بیان!۔ بیان!۔ صفائی کا بیان!۔ کس صفائی کا بیان؟۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا تھا اس لیے کہ مجھے جینے کی خواہش نہ تھی اور جسے جینے کی خواہش نہ ہو جو ہر جینے والے کو تعجب سے دیکھتا ہو کیا آپ اس سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اس سنگین عمارت میں آکر دو تین برس کی قید سے بچنے کے لیے جھوٹ بولے؟۔ جج صاحب آپ اُس سے بات کر رہے ہیں جس کی زندگی قید سے بدتر رہی ہے“!

جج پر زرد رُو اقبال کی بے جوڑ جذباتی گفتگو کچھ اثر نہ کر سکی اور چار پانچ پیشیوں کی یک آہنگ سماعت کے بعد اسے دو ماہ قید محض کا حکم سُنا دیا گیا سزا کا حکم مجرم نے بڑے اطمینان سے سُنا لیکن یکا یک اُس کے استخوانی چہرے پر زہریلی طنز کے آثار نمودار ہوئے اور اُس کے باریک ہونٹوں کے سرے بھنچ گئے، مسکراتے ہوئے اُس نے جج کو مخاطب کر کے کہا:

”آپ نے مقدمے کی تمام کارروائی میں بہت محنت کی ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مقدمہ کی روئداد کو آپ نے جس نفاست سے ان لمبے لمبے کاغذوں پر اپنے ہاتھوں سے ٹائپ کیا ہے وہ بھی داد کے قابل ہے اور آپ نے بات بات میں تعزیرات کی بھاری بھرکم کتاب سے دفعات کا حوالہ جس پھرتی سے دیا ہے اس سے آپ کے حافظے کی خوبی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قانون جہاں تک میں نے اندازہ کیا ہے ایک پردہ نشین خاتون ہے جس کی عصمت کے تحفظ کے لیے آپ لوگ مقرر کیے گئے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ آپ نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ ایک ایسی عورت کی حفاظت کررہے ہیں جسے ہر چالاک آدمی اپنی داشتہ بنا کر رکھ سکتا ہے۔“

”یہ لفظ عدالت کی توہین خیال کیے گئے اور اس جرم کے ارتکاب میں اقبال کی زندانی میں دو ماہ اور بڑھا دیئے گئے۔ یہ حکم سُن کر اقبال کے پتلے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اقبال نے زیرِلب کہا

”پہلے دو ماہ تھے، اب چار ہوگئے“

اور پھر جج سے مخاطب ہو کر پوچھا آپ کو تعزیرات ہند کے تمام دفعات ازبر یاد ہیں۔ کیا آپ مجھے کوئی اسی توہین کی قسم کا بے ضرر جرم بتاسکتے ہیں۔ جس کے ارتکاب سے آپ کی عدالت میری گردن جلاد کے حوالے کرسکے۔ میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ جہاں غریبوں کو جینے کے لیے ہوا کے چند پاکیزہ جھونکے بھی نصیب نہیں ہوتے اور جس کے بنائے قانون میری سمجھ سے بالاتر ہیں کیا آپ کا یہ قانون عجیب و غریب نہیں جس نے اس بات کی تحقیق کیے بغیر کہ میں نے خودکشی کا اقدام کیوں کیا، مجھے جیل میں ٹھونس دیا ہے؟۔ مگر ایسے سوال پوچھنے سے فائدہ ہی کیا۔ تعزیراتِ ہند میں غالباً ان کا کوئی جواب نہیں۔“

اقبال نے اپنے تھکے ہوئے مُردہ کاندھوں کو ایک جنبش دی اور خاموش ہوگیا۔ عدالت نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

خورشٹ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوخورشٹ

ہم دلی میں تھے۔ میرا بچہ بیمار تھا۔ میں نے پڑوس کے ڈاکٹر کاپڑیا کو بلایا وہ ایک کبڑا آدمی تھا۔ بہت پست قد، لیکن بے حد شریف۔ اس نے میرے بچے کا بڑے اچھے طریقے پر علاج کیا۔ اس کو فیس دی تو اس نے قبول نہ کی۔ یوں تو وہ پارسی تھا لیکن بڑی شستہ و رفتہ اردو بولتا تھا، اس لیے کہ وہ دلی ہی میں پیدا ہوا تھا اور تعلیم اس نے وہیں حاصل کی تھی۔ ہمارے سامنے کے فلیٹ میں مسٹر کھیش والا رہتا تھا۔ یہ بھی پارسی تھا۔ اسی کے ذریعے سے ہم نے ڈاکٹر کاپڑیا کو بلایا تھا۔ تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آیا تو اس سے ہمارے تعلقات بڑھ گئے۔ ڈاکٹر کے ہاں میرا اور میری بیوی کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ہماری ملاقات اپنے لڑکے سے کرائی اس کا نام ساوک کاپڑیا تھا۔ وہ بہت ہی ملنسار آدمی تھا۔ رنگ بے حد زرد ایسا لگتا تھا کہ اس میں خون ہے ہی نہیں۔ سنگر مشین کمپنی میں ملازم تھا۔ غالباً پانچ چھ سو روپے ماہوار پاتا تھا۔ بہت صاف ستھرا رہتا تھا۔ اس کا گھر جو ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا بہت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ مجال ہے کہ گرد و غبار کا ایک ذرہ بھی کہیں نظر آجائے۔ جب میں اور میری بیوی شام کو ان کے ہاں جاتے تو وہ اس کی بیوی خورشید جس کو پارسیوں کی زبان میں خورشٹ کہا جاتا تھا۔ بڑے تپاک سے پیش آتے اور ہماری خوب خاطر تواضع کرتے۔ خورشید یعنی خورشٹ لمبے قد کی عورت تھی۔ عام پارسیوں کی طرح اس کی ناک بدنما نہیں تھی، لیکن خوبصورت بھی نہیں۔ موٹی پکوڑا ایسی ناک تھی، لیکن رنگ سفید تھا اس لیے گوارا ہوگئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول تھا۔ خوش پوش تھی اس لیے اچھی لگی تھی۔ میری بیوی سے چند ملاقاتوں ہی میں دوستی ہوگئی۔ چنانچہ ہم ان کے ہاں اکثر جانے لگے۔ وہ دونوں میاں بیوی بھی ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے ہاں آجاتے تھے اور دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ ہم جب بھی ساوک کے ہاں گئے، ایک سکھ کو ان کے ہاں دیکھا۔ یہ سکھ ایک تنومند آدمی تھا۔ بہت خوش خلق۔ ساوک نے مجھے بتایا کہ سردار زور آور سنگھ اس کا بچپن کا دوست ہے۔ دونوں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ایک ساتھ انھوں نے بی اے پاس کیا۔ لیکن شکل و صورت کے اعتبار سے سردار زور آور سنگھ، ساوک کے مقابلے میں زیادہ معمر نظر آتا تھا۔ ساوک شاید خون کی کمی کے باعث بہت ہی چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں، لیکن سردار زور آور سنگھ چالیس کے اوپر معلوم ہوتا تھا۔ سردار زور آور سنگھ کنوارا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ اس نے گورنمنٹ سے کئی ٹھیکے لے رکھے تھے۔ اس کا باپ بہت پرانا گورنمنٹ کنٹریکٹر تھا۔ لیکن باپ بیٹے میں بنتی نہیں تھی۔ سردار زور آور سنگھ آزاد خیال تھا لیکن وہ اپنے باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا پر وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ البتہ اس کی ماں اس سے بہت پیار کرتی تھی جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ماں کا اکلوتا لڑکا تھا۔ تین لڑکیاں تھیں، وہ اپنے گھر میں آباد ہو چکی تھیں۔ اب اس کی خواہش تھی کہ وہ شادی کرلے اور اس کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائے، مگر اس وہ کے متعلق بات کرنے کیلیے تیار ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک دفعہ اس سے دریافت کیا۔

”سردار صاحب آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟“

اس نے مونچھوں کے اندر ہنس کر جواب دیا۔

”اتنی جلدی کیا ہے؟“

میں نے پوچھا۔

”آپ کی عمر کیا ہے؟“

اس نے کہا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میرے خیال کے مطابق آپ کی عمر غالباً چالیس برس ہو گی۔“

سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔

”آپ کا اندازہ غلط ہے“!

”آپ فرمایئے، آپ کی عمر کیا ہے؟“

سردار زور آور سنگھ پھر مسکرایا۔

”میں آپ سے بہت چھوٹا ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بھی۔ میں ابھی پرسوں انتیس اگست کو پچیس برس کا ہوا ہوں۔“

میں نے اپنے غلط اندازے کی معافی چاہی۔

”لیکن آپ کی شکل صورت سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی عمر پچیس برس ہے۔“

سردار زور آور سنگھ ہنسا۔

”میں سکھ ہوں۔ اور بڑا غیر معمولی سکھ۔“

یہ کہہ کر اس نے غور سے مجھے دیکھا،

”منٹو صاحب آپ حجامت کیوں نہیں کراتے۔ اتنے بڑے بالوں سے آپ کو وحشت نہیں ہوتی۔“

میں نے گردن پر ہاتھ پھیرا۔ بال واقعی بہت بڑھے ہوئے تھے۔ غالباً تین مہینے ہو گئے تھے جب میں نے بال کٹوائے تھے۔ سردار زور آور سنگھ نے بات کی تو مجھے سر پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔

”یاد ہی نہیں رہا۔ اب آپ نے کہا ہے تو مجھے وحشت محسوس ہوئی ہے۔ خدا معلوم مجھے کیوں بال کٹوانے یاد نہیں رہتے۔ یہ سلسلہ ہے ہی کچھ واہیات۔ ایک گھنٹہ نائی کے سامنے سر نیوڑھائے بیٹھے رہو۔ وہ اپنی خرافات بکتا رہے اور آپ مجبوراً کان سمیٹے سنتے رہیں۔ فلاں ایکٹرس ایسی ہے، فلاں ایکٹرس ویسی ہے۔ امریکہ نے ایٹم بم ایجاد کر لیا ہے۔ روس کے پاس اس کا بہت ہی تکڑا جواب موجود ہے۔ یہ ایٹلی کون ہے؟۔ اور وہ مسولینی کہاں گیا۔ اب میں اگر اس سے کہوں کہ جہنم میں گیا ہے تو وہ ضرور پوچھتا کہ صاحب کیسے گیا، کس راستے سے گیا۔ کون سے جہنم میں گیا۔“

میری اتنی لمبی چوڑی بات سن کر سردار زور آور سنگھ نے اپنی سفید پگڑی اتاری۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ اس کے کیس ندارد تھے۔ ان کے بجائے ہلکے خسخسی بال تھے۔ لیکن وہ پگڑی کچھ اس انداز سے باندھتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کیس ہیں اور ثابت و سالم ہیں۔ بڑی صفائی سے پگڑی اتار کر اس نے میری تپائی پر رکھی اور مسکرا کر کہا۔

”میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

میں نے اس کے بالوں کے متعلق کوئی بات نہ کی؛، اس لیے کہ میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ اس نے بھی ان کے متعلق کوئی بات نہ چھیڑی۔ پگڑی تپائی پر رکھ دینے کے بعد اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

”میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

اس کے بعد اُس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ اور کہا۔

”منٹو صاحب، خورشید کے لیے آپ کچھ کیجیے؟“

میں کچھ نہ سمجھا۔

”کون خورشید؟“

سردار زور آور سنگھ نے پگڑی اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی۔

”خورشید کا پڑیا کے لیے۔“

”میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”اس کو گانے کا بہت شوق ہے۔“

مجھے معلوم نہیں تھا۔ کہ خورشٹ گاتی ہے۔

”کیسا گاتی ہیں؟“

سردار زور آور سنگھ نے خورشٹ کی گائگی کے بارے میں اتنی تعریف کی کہ مجھے یہ سب مبالغہ معلوم ہوا۔

”منٹو صاحب بہت اچھی آواز پائی ہے۔ خصوصاً ٹھمری ایسی اچھی گاتی ہے کہ آپ وجد میں آجائیں گے۔ آپ کو ایسا معلوم ہو گا کہ خاص صاحب عبد الکریم کو سن رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ خورشید نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ بس جو ملا ہے قدرت سے ملا ہے۔ آپ آج شام کو آیئے۔ مسز منٹو بھی ضرور تشریف لائیں۔ میں خورشید کو بلاؤں گا۔ آپ ذرا اسے سنئے گا۔“

میں نے کہا۔

”ضرور، ضرور۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ گاتی ہیں۔“

سردار زور آور سنگھ نے سفارش کے طور پر کہا۔

”آپ ریڈیو اسٹیشن میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ خورشید کو ہر مہینے کچھ پروگرام مل جایا کریں۔ روپے کی اس کو کوئی خواہش نہیں ہے۔“

”لیکن اگر ان کو پروگرام ملے گا تو معاوضہ بھی ضرور ملے گا۔ گورنمنٹ ان کا معاوضہ کس کھاتے میں ڈالے گی؟“

یہ سن کر سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔

”تو ٹھیک ہے۔ لیکن اسے پروگرام ضرور دلوایئے گا۔ مجھے یقین ہے کہ سننے والے اسے بہت پسند کریں گے۔“

اس گفتگو کے بعد ہم تیسرے روز ساوک کے ہاں گئے۔ وہ موجود نہیں تھا لیکن ڈرائنگ روم میں سردار زور آور سنگھ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ پارسیوں میں سگرٹ پینا منع ہے، سکھ بھی سگرٹ نہیں پیتے، لیکن وہ بڑے اطمینان اور ٹھاٹ سے کش پہ کش لے رہا تھا۔ میں اور میری بیوی کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے سگرٹ پینا بند کر دیا۔ ایش ٹرے میں اس کی گردن مروڑ کر اس نے ہمیں خالص اسلامی انداز میں سلام کیا اور کہا۔

”خورشید کی طبیعت آج کچھ ناساز ہے۔“

خورشید کچھ دیر کے بعد آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت قطعاً ناساز نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ تو اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے کہا۔

”ذرا زکام تھا۔“

مگر اس کو زکام نہیں تھا۔ سردار زور آور سنگھ نے بڑے زور دار انداز میں خورشید سے اس کا حال پوچھا، زکام کے لیے کم از کم دس دوائیں تجویز کیں، پانچ ڈاکٹروں کے حوالے دیے، مگر وہ خاموش رہی، جیسے وہ اس قسم کی بکواس سننے کی عادی ہے۔ اتنے میں خورشید کا خاوند ساوک کا پڑیا آگیا۔ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی۔ مجھ سے اور میری بیوی سے اس نے معذرت چاہی، سردار زور آور سنگھ سے کچھ دیر مذاق کیا اور ہم سے چند منٹ کی رخصت لے کر اندر چلا گیا، اس لیے کہ اسے اپنی بچی کو دیکھنا تھا۔ اس کی پلوٹھی کی بچی بہت پیاری تھی۔ میاں بیوی کی بس یہی ایک اولاد تھی۔ قریباً ڈیڑھ سال کی تھی۔ رنگ باپ کی طرح زرد۔ کچھ نقش ماں پر تھے۔ باقی معلوم نہیں کس کے تھے۔ بہت ہنس مکھ تھی۔ ساوک اس کو گود میں اٹھا کر لایا اور ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ اس کو اپنی بچی سے بے حد پیار تھا۔ دفتر سے واپس آکر وہ سارا وقت اس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ میرا خیال ہے قریب قریب ہر ہفتے وہ اس کے لیے کھلونے لاتا تھا۔ شیشوں والی بڑی الماری تھی۔ جو ان کھلونوں سے بھری ہوئی تھی۔ سردار زور آور سنگھ کے متعلق بات چھڑی تو ساوک نے اس کی بہت تعریف کی۔ اس نے مجھ سے اور میری بیوی سے کہا۔

”سردار زور آور میرا بہت پرانا دوست ہے۔ ہم دونوں لنگوٹیے ہیں۔ اس کے والد صاحب اور میرے والد صاحب اسی طرح لنگوٹیے تھے۔ دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ پہلی جماعت سے لیکر اب تک ہم دونوں ہر روز ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں۔ بعض اوقات تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ہم اسکول ہی میں پڑھ رہے ہیں۔“

سردار زور آور سنگھ مسکراتا رہا۔ اس کے سر پر سکھوں کی بہت بڑی پگڑی تھی، مگر مجھے اس کے ہوتے ہوئے اس کے سر کی خسخسی بال نظر آرہے تھے۔ اور مجھے اپنے سر اپنے بالوں کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ سردار زور آور سنگھ کے پیہم اصرار پر خورشید نے باجا منگا کر ہمیں گانا سنایا۔ وہ کن سُری تھی، لیکن خورشید، اس کے خاوند، اور سردار زور آور سنگھ کی خاطر مجھے اس کے گانے کی مجبوراً تعریف کرنا پڑی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔

”ماشاء اللہ آپ خوب گاتی ہیں۔“

سردار زور آور سنگھ نے بڑے زور سے تالی بجائی اور کہا۔

”خورشید، آج تو تم نے کمال کر دیا ہے۔“

پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”اس کو آفتابِ موسیقی کا خطاب مل چکا ہے منٹو صاحب۔“

میں نے تو کچھ نہ کہا، لیکن میری بیوی نے پوچھا۔

”کب؟“

سردار زور آور سنگھ نے کہا۔

”اخبار کا وہ کٹنگ لانا۔“

خورشید اخبار کا کٹنگ لائی۔ کوئی خوشامدی قسم کا رپورٹر تھا جس نے چھ مہینے پہلے ایک پرائیویٹ محفل میں خورشید کا گانا سن کر اسے آفتابِ موسیقی کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ میں یہ کٹنگ پڑھ کر مسکرایا اور شرارتاً خورشید سے کہا۔

”آپ کا یہ خطاب غلط ہے“!

سردار زور آور سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔

”کیوں؟“

میں نے پھر شرارتاً کہا۔

”عورت کے لیے آفتاب نہیں۔ آفتابہ ہونا چاہیے۔ خورشید صاحبہ، آفتابِ موسیقی نہیں۔ آفتابہ موسیقی ہیں۔“

میرا مذاق سب کے سر پر سے گزر گیا۔ میں نے خدا کا شکر کیا، کیونکہ یہ مذاق کرنے کے بعد میں نے فوراً ہی سوچا تھا کہ اور کوئی نہیں تو سردار زور آور سنگھ ضرور اس کو سمجھ جائے گا، مگر وہ مسکرایا۔

”یہ اخبار والے ہمیشہ غلط زبان لکھتے ہیں۔ آفتاب کی جگہ آفتابہ ہونا چاہیے تھا۔ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔“

میں نے اور کچھ نہ کہا، اس لیے کہ مجھے احساس تھا کہ کہیں میرا مذاق فاش نہ ہو جائے۔ ساوک کچھ اور ہی خیالات میں غرق تھا۔ اس کو سردار زور آور سنگھ کی دوستی کے واقعات یاد آ رہے تھے۔

”مسٹر منٹو، ایسا دوست مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ اس نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ ہمیشہ میرے ساتھ انتہائی خلوص برتا ہے پچھلے دنوں میں ہسپتال میں بیمار تھا۔ اس نے نرسوں سے بڑھ کر میری خدمت کی۔ میرے گھر بار کا خیال رکھا۔ خورشید اکیلی گھبرا جاتی، مگر اس نے ہر طرح اس کی دلجوئی کی۔ میری بچی کو گھنٹوں کھلاتا رہا۔ اس کے علاوہ میرے پاس بیٹھ کر کئی اخبار پڑھ کر سناتا رہا۔ میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔“

یہ سن کر سردار زور آور سنگھ مسکرایا اور خورشید سے مخاطب ہوا۔

”خورشید آج تمہارا خاوند بہت سنٹی مینٹل ہو رہا ہے۔ میں نے کیا کیا تھا جو یہ میری اتنی تعریف کر رہا ہے۔“

ساوک نے کہا۔

”بکواس نہ کرو۔ تمہاری تعریف میں کر ہی نہیں سکتا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری دوستی پر مجھے ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بچپن سے لے کر اب تک تم ایک سے رہے۔ میرے ساتھ تمہارے سلوک میں کبھی فرق نہیں آیا۔“

میں نے سردار زور آور سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ یہ تعریفی کلمات یوں سن رہا تھا۔ جیسے ریڈیو سے خبریں۔ جب ساوک بول چکا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

”تو خورشید کو پروگرام مل جائیں گے نا؟“

میں نے چونک کر جواب دیا۔

”جی؟۔ میں کوشش کروں گا۔“

سردار زور آور سنگھ نے ذرا حیرت سے کہا۔

”کوشش ؟۔ یعنی ان کے لیے پروگرام حاصل کرنے کے لیے آپ کو کوشش کرنی پڑے گی۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کل صبح ان کو اپنے ساتھ لے جایئے۔ میرا خیال ہے ان کا گانا سنتے ہی میوزک ڈائریکٹر اسی مہینے میں ان کو کم از کم دو پروگرام دے دے گا۔“

میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی اور کہا۔

”یقیناً۔“

لیکن خورشید نے سردار زور آور سے کہا۔

”میں صبح نہیں جاسکتی۔ بے بی صبح کو میرے بغیر گھر میں نہیں رہ سکتی۔ دوپہر کو البتہ جاسکتی ہوں۔“

سردار زور آور سنگھ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”منٹو صاحب، واقعی بچی اس کو صبح بہت تنگ کرتی ہے۔ میں خود سے روز خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لے آؤں گا۔“

خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لانے کی نوبت نہ آئی۔ کیونکہ میں نے دوسرے روز ہی ایک دم ارادہ کیا کہ میں دلی چھوڑ کر بمبئی چلا جاؤں گا، چنانچہ میں اس سے اگلے دن استعفےٰ دے کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ میری بیوی مجھ سے کچھ دن بعد چلی آئی۔ ہم مسز خورشٹ کا پڑیا اور سردار زور آور سنگھ کو بھول گئے۔ میں ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا۔ بیماری کے باعث اتفاق سے ایک روز میں وہاں نہ گیا۔ دوسرے روز وہاں پہنچا تو گیٹ کیپر نے مجھے ایک کاغذ دیا کہ کل ایک صاحب آپ سے ملنے یہاں آئے تھے۔ وہ یہ دے گئے ہیں۔ میں نے رقعہ پڑھا۔ سردار زور آور سنگھ کا تھا۔ مختصر سی تحریر تھی، میں اور میری بیوی آپ سے ملنے یہاں آئے، مگر آپ موجود نہیں تھے۔ ہم تاج ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ اگر آپ تشریف لائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہو گی۔ مسز منٹو کو ضرور ساتھ لایئے گا۔“

کمرے کا نمبر وغیرہ درج تھا۔ میں اور میری بیوی اسی شام ٹیکسی میں تاج ہوٹل گئے۔ کمرہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ سردار زور آور سنگھ وہاں موجود تھا۔ ہم جب اندر کمرے میں داخل ہوتے تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے خسخسی بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ میری بیوی اس کی بیوی دیکھنے کے لیے بے قرار تھی، چنانچہ اس نے پوچھا۔

”سردار صاحب، آپ کی مسز کہاں ہیں۔“

سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔

”ابھی آتی ہیں۔ باتھ روم میں ہیں۔“

اس نے یہ کہا اور دوسرے کمرے سے خورشٹ نمودار ہوئی۔ میری بیوی اٹھ کر اس سے گلے ملی اور سب سے پہلا سوال اس سے یہ کیا۔

”بچی کیسی ہے خورشید۔“

خورشٹ نے جواب دیا۔

”اچھی ہے۔“

پھر میری بیوی نے اس سے پوچھا۔

”ساوک کہاں ہیں؟“

خورشٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ اور میری بیوی پاس پاس بیٹھ گئیں تو میں نے سردار زور آور سنگھ سے پوچھا۔

”سردار صاحب، آپ اپنی بیوی کو تو باہر نکالیے۔“

سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔ خورشٹ کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

”خورشید میری بیوی کو باہر نکالو۔“

خورشٹ میری بیوی سے مخاطب ہو کر مسکرائیں۔

”میں نے سردار زور آور سنگھ سے شادی کر لی ہے۔ ہم یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں۔“

میری بیوی نے یہ سنا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے۔ اٹھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”چلیے سعادت صاحب“

۔ اور ہم کمرے سے باہر تھے۔ خدا معلوم سردار زور آور سنگھ اور خورشٹ نے ہماری اس بدتمیزی کے متعلق کیا کہا ہو گا۔ 28 جولائی 1950ء

خوشبو دار تیل

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوخوشبو دار تیل

”آپ کا مزاج اب کیسا ہے؟“

”یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ اچھا بھلا ہوں۔ مجھے کیا تکلیف تھی۔“

”تکلیف تو آپ کو کبھی نہیں ہوئی۔ ایک فقط میں ہوں جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی تکلیف یا عارضہ چمٹا رہتا ہے۔“

”یہ تمہاری بد احتیاطیوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ورنہ آدمی کو کم از کم سال بھر میں دس مہینے تو تندرست رہنا چاہیے۔“

”آپ تو بارہ مہینے تندرست رہتے ہیں، ابھی پچھلے دنوں دو مہینے ہسپتال میں رہے۔ میرا خیال ہے اب پھر آپ کا وہیں جانے کا ارادہ ہو رہا ہے۔“

”ہسپتال میں جانے کا ارادہ کون کرتا ہے؟“

”آپ ایسے آدمی۔ اور کس کا دماغ پھرا ہے کہ وہ بیمار ہو کر وہاں پر جائے اور اپنے عزیزوں کی جان کا عذاب بن جائے۔“

”تو گویا میں اپنے سب رشتہ داروں کی جان کا عذاب بنا بیٹھا ہوں۔ میرا تو یہ نظریہ ہے کہ ہر رشتہ دار خود جان کا بہت بڑا عذاب ہوتا ہے“

”آپ کو تو رشتہ داروں کی کوئی پروا نہیں۔ حالانکہ وہی ہمیشہ آپ کے آڑے وقت میں کام آتے رہے ہیں۔“

”کون سے آڑے وقت میں کام آتے رہے ہیں۔“

”پچھلے برس جب آپ بیمار ہوئے۔ تو کس نے آپ کے علاج پر روپیہ خرچ کیا تھا۔“

”مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے تمہیں نے کیا ہو گا۔“

”آپ کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔ یا آپ جان بوجھ کر اپنے رشتہ داروں کی مدد کو فراموش کر رہے ہیں۔“

”میں اپنے کسی رشتہ دار کی امداد کا محتاج نہیں رہا، اور نہ رہوں گا۔ اچھا خاصا کما لیتا ہوں۔ کھاتا ہوں۔ پیتا ہوں۔“

”جتنا کھا سکتا ہوں کھاتا ہوں۔ جتنی پی سکتا ہوں پیتا ہوں۔“

”آپ کو معلوم نہیں کہ پینا حرام ہے۔“

”معلوم ہے۔ آج کل تو جینا بھی حرام ہے۔ مگر چچا غالب کہہ گئے ہیں۔“

مئے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

”یہ چچا غالب کون تھے۔ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔ میں نے تو آج پہلی مرتبہ ان کا نام سنا ہے۔“

”وہ سب کے چچا تھے۔ بہت بڑے شاعر۔“

”شاعروں پر خدا کی لعنت۔ بیڑا غرق کرتے ہیں لوگوں کا۔“

”بیگم! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ انہی کے دم سے تو زندگی کی رونق قائم ہے۔ یہ نہ ہوں تو چاروں طرف خشکی خشکی ہی نظر آئے۔ یہ لوگ پھول ہوتے ہیں۔ صاف و شفاف پانی کے دھارے ہوتے ہیں جو انسانوں کے ذہن کی آبیاری کرتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو ہماری زندگی بے نمک ہو جائے“

”بے نمک ہو جائے۔ کیسے بے نمک ہو جائے۔ یہاں نمک کی کوئی کمی ہے۔ جتنا چاہیے، لے لیجیے۔ اور وہ بھی سستے داموں پر۔ ان لوگوں کو جنہیں آپ شاعر کہتے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ان کو کھیوڑے کی کسی کان میں زندہ دفن کر دیا جائے، تا کہ وہ بھی نمک بن جائیں اور آپ ان کو چاٹتے رہیں۔“

”یہ آج تم نے کیسے پر پرزے نکال لیے۔“

”پر پرزوں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں۔ کہ جب آپ سے کوئی معاملے کی بات کرے تو آپ بھِنّا جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں۔ میں نے کبھی آپ کی ذات پر تو حملہ نہیں کیا۔ ہمیشہ سیدھی سادی بات کر دی۔“

”تمہاری سیدھی باتیں ہمیشہ ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ دو برس سے تم ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہو۔“

ان برسوں میں مجھے آپ نے کیا سکھ پہنچایا ہے۔“

”بھئی معاف کرو مجھے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ ساری رات ہی جاگتا رہا ہوں۔“

”کیا تکلیف تھی آپ کو؟ مجھے بھی تو کچھ اس کا علم ہو۔“

”تمہیں اگر اس کا علم بھی ہو جائے۔ تو اس کا مداوا کیا کرو گی۔“

”میں تو سخت نااہل ہوں۔ کسی کام کی بھی نہیں۔ بس ایک صرف آپ ہیں جو دنیا کی ساری حکمت جانتے ہیں۔“

”بھئی میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن عورت ذات ہمیشہ خود کو افضل سمجھتی ہے۔ حالانکہ وہ عام طور پر کم عقل ہوتی ہے۔“

”دیکھیے، آپ طعن طروز پر اتر آئے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔ تم نے چونکہ مجھے اُکسایا تو یہ لفظ میری زبان سے نکل گئے، ورنہ تم جانتی ہو کہ میں گفتگو کے معاملے میں بڑا محتاط رہتا ہوں۔“

”جی ہاں۔ رہتے ہوں گے۔ مجھ سے تو آپ نے ہمیشہ ہی نوکرانیوں کا سا سلوک کیا۔“

”یہ سراسر بہتان ہے۔ تُم تُو میری ملکہ ہو۔“

”آپ بادشاہ کیسے بن بیٹھے۔ آپ کی سلطنت کہاں ہے؟“

”میری سلطنت یہ میرا گھر ہے۔“

”اور آپ یہاں کے شہنشاہ ہیں۔“

”اس میں کیا شک ہے۔ تم نے طنزاً کہا ہے، لیکن حقیقت میں اس سلطنت کا حکمران میں ہی ہوں۔“

”حکمران تو میں ہوں۔ اس لیے کہ اس گھر کا سارا بندوبست مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ سب دیکھ بھال مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔“

”تم میری ملکہ ہو۔ اور ملکہ کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ نہیں رہنا چاہیے۔ اپنی ملکیت کا دھیان رکھنا چاہیے۔ اس لیے تم بھی یہاں کی حکمران ہو، اس لیے کہ تم اس کا نظم برقرار رکھتی ہو۔ نوکروں کی دیکھ بھال وغیرہ، اچھے سے اچھا کھانا پکوانا۔ سارا دن پلنگ پر لیٹی آرام کرتی رہتی ہو۔“

”میں تو جو آرام کرتی ہوں، سو کرتی ہوں۔ پر آپ مجھے یہ بتائیے۔“

”کیا۔“

”کچھ نہیں۔ آپ اس گھر کے حکمران ہیں۔ اب میں آپ سے کیا کہوں۔“

”تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، بلا خوف و خطر کہو۔ تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے۔“

”کہیں جہاں پناہ بگڑ نہ جائیں۔“

”مذاق برطرف رکھو۔ یہ بتاؤ تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“

”کہنا تو میں بہت کچھ چاہتی ہوں۔ مگر آپ میں ٹھنڈے دل سے سننے کا مادہ ہی کہاں ہے۔“

”مادہ تو تم ہو۔ میں نر ہوں۔“

”اب آپ نے واہیات قسم کی گفتگو شروع کر دی۔“

”کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ایسی باتیں بھی کر لینی چاہئیں۔ اس لیے کہ طبیعت میں انقباض پیدا نہ ہو۔“

”آپ کی طبیعت میں کئی دنوں سے انقباض ہے۔ سیدھے منہ کوئی بات ہی نہیں کرتے۔“

”میں تو چنگا بھلا ہوں۔ مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے نفس نے بہت اونچی پرواز کی ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو کوئی مسہل تجویز کر دو تا کہ تمہاری تشفی ہو جائے۔“

”میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”بھئی پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے۔ مجھے اب زیادہ تنگ نہ کرو۔“

”آپ تو ذرا سی بات پر تنگ آ جاتے ہیں۔“

”یہ ذرا سی بات ہے کہ تم نے مجھ سے اتنی بکواس کرائی۔ یہی وقت میں کہیں صرف کرتا تو کچھ فائدہ بھی ہوتا۔“

”کیا فائدہ ہوتا۔ بڑے لاکھوں کما لیے ہیں آپ نے، بغیر اس بکواس کے۔“

”کمائے تو ہیں۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ کہنا کیا چاہتی ہو۔“

”میں کہنا چاہتی تھی کہ جب سے نئی نوکرانی آئی ہے‘ آپ کی طبیعت کیوں خراب رہنے لگی ہے۔“

”نئی نوکرانی کو کوئی بیماری ہے۔“

”جی نہیں۔ بیماری تو نہیں۔ لیکن میں نے اسے آج رخصت کر دیا ہے۔“

”کیوں۔ وہ تو بڑی اچھی تھی۔“

”آپ کی نظروں میں ہو گی۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ بیس روپے ماہوار میں اتنے اچھے کپڑے کیسے پہن سکتی تھی۔ بالوں میں خوشبودار تیل کہاں سے ڈالتی تھی۔“

”مجھے کیا معلوم۔“

”آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ آپ کے بالوں سے بھی اسی تیل کی خوشبو آتی ہے۔ معلوم نہیں یہ تیل آپ نے کہاں چھپا رکھا ہے“!

خوشیا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوخوشیا

خوشیا سوچ رہا تھا۔ بنواری سے کالے تمباکو والا پان لے کر وہ اس کی دکان کے ساتھ اُس سنگین چبوترے پر بیٹھا تھا۔ جو دن کے وقت ٹائروں اور موٹروں کے مختلف پرزوں سے بھرا ہوتا ہے۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب موٹر کے پُرزے اور ٹائر بیچنے والوں کی یہ دکان بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کا سنگین چبوترہ خوشیا کے لیے خالی ہو جاتا ہے۔ وہ کالے تمباکو والا پان آہستہ آہستہ چبا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ پان کی گاڑھی تمباکو ملی پیک اس کے دانتوں کی ریخوں سے نکل کر اس کے منہ میں ادھر اُدھر پھسل رہی تھی۔ اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے خیالی دانتوں تلے پیس کر اس کی پیک میں گھل رہے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا۔ خوشیا پان کی پیک منہ میں پلپلا رہا تھا۔ اور اس واقعہ پر شور کر رہا تھا جو اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یعنی آدھ گھنٹہ پہلے۔ وہ اسے سنگین چبوترے پر حسبِ معمول بیٹھنے سے پہلے کھیت واڑی کی پانچویں گلی میں گیا تھا۔ بنگلور سے جو نئی چھوکری کانتا آئی تھی۔ اُسی گلی کے نکڑ پر رہتی تھی۔ خوشیا سے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر رہی ہے چنانچہ وہ اسی بات کا پتہ لگانے کے لیے وہاں گیا تھا۔ کانتا کی کھولی کا دروازہ اس نے کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی

”کون ہے؟“

اس پر خوشیا نے کہا۔

”میں خوشیا“

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھُلا خوشیا اندر داخل ہُوا۔ جب کانتا نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ تو خوشیا نے مُڑ کر دیکھا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے کانتا کو بالکل ننگا دیکھا۔ بالکل ننگا۔ ہی سمجھو۔ کیونکہ وہ اپنے انگ کو صرف ایک تولیے سے چھپائے ہُوئے تھی چھپائے ہُوئے بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ چھپانے کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ تو سب کی سب خوشیا کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھیں۔

”کہو خوشیا کیسے آئے؟۔۔۔۔۔ میں بس اب نہانے والی ہی تھی۔ بیٹھو بیٹھو۔۔۔۔۔۔ باہر والے سے اپنے لیے چائے کا تو کہہ آئے ہوتے۔۔۔۔۔۔ جانتے تو ہو وہ موا راما یہاں سے بھاگ گیا ہے۔“

خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں، چانک طور پر ننگا نہیں دیکھا تھا۔ بہت گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے؟ اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے دوچار ہو گئی تھیں۔ اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا۔

”جاؤ۔ جاؤ تم سنا لو، پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی۔

”پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ اندر سے کہہ دیا ہوتا میں پھر آ جاتا۔ لیکن جاؤ۔ تم نہا لو۔“

کانتا مسکرائی جب تم نے کہا خوشیا ہے۔ تو میں نے سوچا۔ کیا ہرج ہے۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو۔“

کانتا کی یہ مسکراہٹ، بھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی۔ اس وقت بھی کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔ اس کا جسم خوبصورت تھا۔ پہلی مرتبہ خوشیا کو معلوم ہوا کہ جسم بیچنے والی عورتیں بھی ایسا سڈول بدن رکھتی ہیں۔ اس کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ پر سب سے زیادہ تعجب اسے اس بات پر ہوا تھا کہ ننگ دھڑنگ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور اس کو لاج تک نہ آئی۔ کیوں؟ اس کا جواب کانتا نے یہ دیا تھا۔

”جب تم نے کہا خوشیا ہے۔ تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے۔ آنے دو۔“

کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ وہ اس کا دلال تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسی کا تھا۔ پر یہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے ننگی ہو جاتی۔ کوئی خاص بات تھی۔ کانتا کے الفاظ میں خوشیا کوئی اور ہی مطلب کرید رہا تھا۔ یہ مطلب بیک وقت اس قدر صاف اور اس قدر مبہم تھا کہ خوشیا کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس وقت بھی وہ کانتا کے ننگے جسم کو دیکھ رہا تھا، جو ڈھولکی پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس کی لڑھکتی ہوئی نگاہوں سے بالکل بے پروا! کئی بار حیرت کے عالم میں بھی اس نے اس کے سانولے سلونے بدن پر ٹوہ لینے والی نگاہیں گاڑی تھیں مگر اس کا ایک رواں تک بھی نہ کپکپایا تھا۔ بس سانولے پتھر کی مُورتی کی مانند کھڑی رہی۔ جو احساس سے عاری ہو۔

"بھئی! ایک مرد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مرد جس کی نگاہیں کپڑوں، میں بھی عورت کے جسم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو پرماتما جانے خیال ہی خیال میں کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی اور۔ اور اس کی آنکھیں ایسا سمجھ لو کہ ابھی لانڈری سے دُھل کر آئی ہیں۔ اس کو تھوڑی سی لاج تو آنی چاہیے تھی۔ ذرا سی سُرخی تو اس کے دیدوں میں پیدا ہونی چاہیے۔ مان لیا۔ کیسی تھی۔ پر کسبیاں یوں ننگی تو نہیں کھڑی ہو جاتیں۔"

دس برس اُس کو دلالی کرتے ہو گئے تھے۔ اور ان دس برسوں میں وہ پیشہ کرانے والی لڑکیوں کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر اُسے یہ معلوم تھا کہ پائے دھونی کے آخری سرے پر جو چھوکری ایک نوجوان لڑکے کو بھائی بنا کر رہتی ہے۔ اس لیے اچھوت کنیا کا ریکارڈ ہے کرتا مور کھ پیار پیار"

اپنے ٹوٹے ہوئے باجے پر بجایا کرتی ہے کہ اُسے اشوک کمار سے بہت بُری طرح عشق ہے۔ کئی من چلے لونڈے اشوک کمار سے اُس کی ملاقات کرانے کا جھانسہ دے کر اپنا اُلّو سیدھا کر چکے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا۔ کہ داور میں جو پنجابن رہتی ہے صرف اس لیے کوٹ پتلون پہنتی ہے کہ اُس کے ایک یار نے اس سے کہا تھا کہ تیری ٹانگیں تو بالکل اس انگریز ایکٹرس کی طرح ہیں جس نے

"مراکو عرف خونِ تمنّا"

میں کام کیا تھا۔ یہ فلم اُس نے کئی بار دیکھی۔ اور جب اس کے یار نے کہا کہ مارلین ڈیٹرچ اس لیے پتلون پہنتی ہے کہ اس کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں۔ اور ان ٹانگوں کا اس نے دو لاکھ کا بیمہ کرا رکھا ہے۔ تو اس نے بھی پتلون پہننی شروع کر دی۔ جو اس کے چوتڑوں میں بہت پھنس کر آتی تھی۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ

"مز گاؤں"

والی دکھشنی چھوکری صرف اس لیے کالج کے خوبصورت لونڈوں کو پھانستی ہے کہ اسے ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کا شوق ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکے گی، اس لیے کہ بانجھ ہے۔ اور اس کالی مدراسن کی بابت جو ہر وقت کانوں میں ہیرے کی بوٹیاں پہنے رہتی تھی اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کا رنگ کبھی سفید نہیں ہو گا۔ اور وہ ان دواؤں پر بیکار روپیہ برباد کر رہی ہے۔ جو آئے دن خریدتی رہتی ہے۔ اس کو ان تمام چھوکریوں کا اندر باہر کا حال معلوم تھا۔ جو اس کے حلقے میں شامل تھیں۔ مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک روز کانتا کماری جس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ وہ عمر بھر یاد نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے سامنے ننگی کھڑی ہو جائیگی۔ اور اس کو زندگی کے سب سے بڑے تعجب سے دوچار کرائے گی۔ سوچتے سوچتے اس کے منہ میں پان کی پیک اس قدر جمع ہو گئی تھی۔ کہ اب وہ مشکل سے چھالیا کے ان ننھے ننھے ریزوں کو چبا سکتا تھا۔ جو اس کے دانتوں کی ریخوں میں سے ادھر اُدھر پھسل کر نکل جاتے تھے۔ اس کے تنگ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبا دیا گیا ہے------- اُس کے مردانہ وقار کو دھکا سا پہنچا تھا جب وہ کانتا کے ننگے جسم کو اپنے تصور میں لاتا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اُس کا اپمان ہوا ہے۔ ایک دم اُس نے اپنے دل میں کہا۔

"بھئی یہ اپمان نہیں ہے تو کیا ہے------- یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور کہتی ہے اس میں حرج ہی کیا ہے؟------- تم خوشیا ہی تو ہو------- خوشیا نہ ہوا، سالا وہ بلا ہو گیا۔ جو اُس کے بستر پر ہر وقت اُونگھتا رہتا ہے------- اور کیا؟"

اب اسے یقین ہونے لگا کہ سچ مچ اس کی ہتک ہوئی ہے۔ وہ مرد تھا۔ اور اس کو اس بات کی غیر محسوس طریق پر توقع تھی۔ کہ عورتیں خواہ شریف ہوں یا بازاری اُس کو مرد ہی سمجھیں گی۔ اور اس کے اور اپنے درمیان وہ پردہ قائم رکھیں گی جو ایک مدت سے چلا آ رہا ہے۔ وہ تو صرف یہ پتہ لگانے کے لیے کانتا کے یہاں گیا تھا کہ وہ کب مکان تبدیل کر رہی ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ کانتا کے پاس اُس کا جانا یکسر بزنس سے متعلق تھا۔ اگر خوشیا کانتا کی بابت سوچتا کہ جب وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ تو وہ اندر کیا کر رہی ہو گی۔ تو اس کے تصوّر میں زیادہ سے زیادہ اتنی باتیں آ سکتی تھیں۔ سر پر پٹی باندھے لیٹ رہی ہو گی۔ بلّے کے بالوں میں سے پِسّو نکال رہی ہو گی۔ اُس بال صفا پوڈر سے اپنی بغلوں کے بال اڑا رہی ہو گی۔ جو اتنی باس مارتا تھا کہ خوشیا کی ناک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ پلنگ پر اکیلی بیٹھی تاش پھیلائے پیشینس کھیلنے میں مشغول ہو گی۔ بس اتنی چیزیں تھیں جو اس کے ذہن میں آتیں۔ گھر میں وہ کسی کو رکھتی نہیں تھی۔ اس لیے اس بات کا خیال ہی نہیں آ سکتا تھا۔ پر خوشیا نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کام سے وہاں گیا تھا۔ کہ اچانک کانتا---- یعنی کپڑے پہننے والی کانتا------- مطلب یہ کہ وہ کانتا جس کو وہ ہمیشہ کپڑوں میں دیکھا کرتا تھا۔ اس کے سامنے بالکل ننگی کھڑی ہو گئی------ بالکل ننگی ہی سمجھو۔ کیونکہ ایک چھوٹا سا تولیہ سب کچھ تو چھپا نہیں سکتا۔ خوشیا کو یہ نظارہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چھلکا اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے اور کیلے کا گودا پُرچ کر کے اُس کے سامنے آ گرا ہے۔ نہیں اُسے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔ جیسے----

جیسے وہ خود ننگا (ہو) گیا ہے۔ اگر بات یہاں تک ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خوشیا اپنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دُور کر دیتا۔ مگر یہاں مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ اُس لونڈیا نے مُسکرا کر یہ کہا تھا۔

”جب تم نے کہا۔ خوشیا ہے تو میں نے سوچا اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو“

۔۔۔۔۔۔ یہ بات اُسے کھائے جا رہی تھی۔

”سالی مُسکرا رہی تھی“

۔۔۔۔۔۔ وہ بار بار بڑبڑاتا جس طرح کانتا ننگی تھی اسی طرح کی مسکراہٹ خوشیا کو ننگی نظر آئی تھی یہ مسکراہٹ ہی نہیں اسے کانتا کا جسم بھی اس حد تک نظر آیا تھا۔ گویا اس پر رندا پھرا ہوا ہے۔ اسے بار بار بچپن کے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب پڑوس کی ایک عورت اس سے کہا کرتی تھی۔

”خوشیا بیٹا جا دوڑ کے جا، یہ بالٹی پانی سے بھر لا جب وہ بالٹی بھر کے لایا کرتا تھا تو وہ دھوتی سے بنائے پردے کے پیچھے سے کہا کرتی تھی“

اندر آ کے یہاں میرے پاس رکھ دے۔ میں نے منہ پر صابن ملا ہُوا ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا“

وہ دھوتی کا پردہ ہٹا کر بالٹی اس کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ اس وقت صابن کے جھاگ میں لپٹی ہوئی ننگی عورت اُسے نظر آیا کرتی تھی مگر اس کے دل میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”بھئی میں اُس وقت بچہ تھا۔ بالکل بھولا بھالا۔ بچے اور مرد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بچوں سے کون پردہ کرتا ہے۔ مگر اب تو میں پورا مرد ہوں۔ میری عمر اس وقت اٹھائیس برس کے قریب ہے۔ اور اٹھائیس برس کے جوان آدمی کے سامنے تو کوئی بوڑھی عورت بھی ننگی کھڑی نہیں ہوتی۔“

کانتا نے اسے کیا سمجھا تھا۔ کیا اس میں وہ تمام باتیں نہیں تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہوتی ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانتا کو یک بیک ننگ دھڑنگ دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا لیکن چور نگاہوں سے کیا اس نے کانتا کی اُن چیزوں کا جائزہ نہیں لیا۔ جو روزانہ استعمال کے باوجود اصلی حالت پر قائم تھیں۔ اور کیا تعجب کے ہوتے ہوئے اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دس روپے میں کانتا بالکل مہنگی نہیں۔ اور دسہرے کے روز بنک کا وہ منشی جو دو روپے کی رعایت نہ ملنے پر واپس چلا گیا تھا۔ بالکل گدھا تھا؟ ۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔ ان سب کے اوپر، کیا ایک لمحے کے لیے اس کے تمام پٹھوں میں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ پیدا نہیں ہو گیا تھا۔ اور اس نے ایک ایسی انگڑائی نہیں لینا چاہی تھی۔ جس سے اُس کی ہڈیاں چٹخنے لگیں؟ ۔۔۔۔۔۔ پھر کیا وجہ تھی کہ منگلور کی اس سانولی چھوکری نے اس کو مرد نہ سمجھا اور صرف ۔۔۔۔۔۔ صرف خوشیا سمجھ کر اس کو اپنا سب کچھ دیکھنے دیا؟ اُس نے غصّے میں آ کر پان کی گاڑھی پیک تھوک دی جس نے فٹ پاتھ پر کئی بیل بوٹے بنا دیے۔ پیک تھوک کر وہ اٹھا اور ٹرام میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ گھر میں اس نے نہا دھو کر نئی دھوتی پہنی جس بلڈنگ میں رہتا تھا اس کی ایک دکان میں سیلون تھا۔ اس کے اندر جا کر اُس نے آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر فوراً ہی کچھ خیال آیا۔ تو کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بڑی سنجیدگی سے اس نے داڑھی مونڈنے کے لیے حجام سے کہا۔

”آج چونکہ وہ دوسری مرتبہ داڑھی منڈوا رہا تھا۔ اس لیے حجام نے کہا۔

”ارے بھئی خوشیا بھول گئے کیا؟ صبح ہی میں نے ہی تو تمہاری داڑھی مونڈی تھی اس پر خُوشیا نے بڑی متانت سے داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔

”کھونٹی اچھی طرح نہیں نکلی ۔۔۔۔۔۔“

اچھی طرح کھونٹی نکلوا کر اور چہرے پر پوڈر ملوا کر وہ سیلون سے باہر نکلا۔ سامنے ٹیکسیوں کا اڈا تھا۔ بمبے کے مخصوص انداز میں اُس نے

”چھی چھی“

کر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور انگلی کے اشارے سے اُسے ٹیکسی لانے کے لیے کہا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے مڑ کر اس سے پوچھا۔

”صاحب کہاں جانا ہے صاحب؟“

ان چار لفظوں نے اور خاص طور پر

”صاحب“

نے خوشیا کو بہت مسرُور کیا۔ مُسکرا کر اس نے بڑے دوستانہ لہجہ میں جواب دیا۔

”بتائیں گے، پہلے تم“

اکپرا ہاؤس کی طرف چلو ۔۔۔۔۔۔ لیمنگٹن روڈ سے ہوتے ہوئے۔ سمجھے“!

ڈرائیور نے میٹر کی لال جھنڈی کا سر نیچے دبا دیا۔ ٹن ٹن ہوئی اور ٹیکسی نے لیمنگٹن روڈ کا رخ کیا۔ لیمنگٹن روڈ کا جب آخری سرا آ گیا۔ تو خوشیا نے ڈرائیور کو ہدایت دی

”بائیں ہاتھ موڑلو“

ٹیکسی بائیں ہاتھ مڑگئی۔ ابھی ڈرائیور نے گیئر بھی نہ بدلا تھا کہ خوشیا نے کہا یہ سامنے والے کھمبے کے پاس روک لیناذرا۔“

ڈرائیور نے عین کھمبے کے پاس ٹیکسی کھڑی کر دی۔ خوشیا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اور ایک پان والے کی دکان کی طرف بڑھا۔ یہاں سے اُس نے ایک پان لیا۔ اور اس آدمی سے جو کہ دکان کے پاس کھڑا تھا۔ چند باتیں کیں۔ اور اُسے اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا کر ڈرائیور سے کہا۔

”سیدھے لے چلو۔“

دیر تک ٹیکسی چلتی رہی۔ خوشیا نے جدھر اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے ادھر ہینڈل پھرا دیا۔ مختلف پُر رونق بازاروں میں سے ہوتے ہوئے ٹیکسی ایک نیم روشن گلی میں داخل ہوئی۔ جس میں آمدورفت بہت کم تھی۔ کچھ لوگ سڑک پر بستر جمائے لیٹے تھے۔ ان میں سے کچھ بڑے اطمینان سے چمپی کرا رہے تھے۔ جب ٹیکسی ان چمپی کرانے والوں کے آگے نکل گئی۔ اور ایک کاٹھ کے بنگلہ نمامکان کے پاس پہنچی۔ تو خوشیا نے ڈرائیور کو ٹھیرنے کے لیے کہا۔

”بس اب یہاں رک جاؤ۔ ٹیکسی ٹھہر گئی۔ تو خوشیا نے اس آدمی سے جس کو وہ پان والے کی دکان سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ آہستہ سے کہا۔

”جاؤ۔۔۔۔ میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔“

وہ آدمی بیوقوفوں کی طرح خوشیا کی طرف دیکھتا ہوا ٹیکسی سے باہر نکلا۔ اور سامنے والے چوبی مکان میں داخل ہو گیا۔ خوشیا جم کر ٹیکسی کے گدے پر بیٹھ گیا۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ایک دو کش لے کر باہر پھینک دی۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس لیے اسے ایسا لگا۔ کہ ٹیکسی کا انجن بند نہیں ہُوا اس کے سینے میں چونکہ پھڑ پھڑاہٹ سی ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ سمجھا کہ ڈرائیور نے بل بڑھانے کی غرض سے پٹرول چھوڑ رکھا ہے چنانچہ اس نے تیزی سے کہا۔

”یوں بیکار انجن چالو رکھ کر تم کتنے پیسے اور بڑھا لو گے ؟“

ڈرائیور نے مُڑ کر خوشیا کی طرف دیکھا اور کہا۔

”سیٹھ انجن تو بند ہے۔“

جب خوشیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تو اس کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیے۔ پھر ایکا ایکی سر پر وہ کشتی نما کالی ٹوپی پہن کر جو اب تک اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے ڈرائیور کا شانہ ہلایا اور کہا۔

”دیکھو، ابھی ایک چھوکری آئے گی۔ جونہی اندر داخل ہو تم موٹر چلا دینا۔۔۔۔ سمجھے۔۔۔۔۔۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ معاملہ ایسا ویسا نہیں۔“

اتنے میں سامنے چوبی مکان سے دو آدمی باہر نکلے۔ آگے آگے خوشیا کا دوست تھا اور اس کے پیچھے کانتا جس نے شوخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ خوشیا جھٹ اُس طرف کو سرک گیا۔ جدھر اندھیرا تھا۔ خوشیا کے دوست نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور کانتا کو اندر داخل کر کے دروازہ بند کر دیا۔ فوراً ہی کانتا کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ جو چیخ سے ملتی جلتی تھی

”خوشیا تم“

”ہاں میں۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں روپے مل گئے ہیں نا؟“

خوشیا کی موٹی آواز بُلند ہُوئی۔

”دیکھو ڈرائیور۔۔۔۔ جوہو لے چلو۔“

ڈرائیور نے سلف دبایا۔ انجن پھڑ پھڑانا شروع ہوا۔ وہ بات جو کانتا نے کہی۔ سنائی نہ دے سکی ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھی۔ اور خوشیا کے دوست کو سڑک کے بیچ حیرت زدہ چھوڑ کر نیم روشن گلی میں غائب ہو گئی۔ اس کے بعد کسی نے خوشیا کو موٹروں کی دکان کے سنگین چبوترے پر نہیں دیکھا۔

دس روپے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹودس روپے

وہ گلی کے اس نکڑ پر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اور اس کی ماں اسے چالی (بڑے مکان جس میں کئی منزلیں اور کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں) میں ڈھونڈ رہی تھی۔ کشوری کو اپنی کھولی میں بٹھا کر اور باہر والے سے کافی چائے لانے کے لیے کہہ کر وہ اس چالی کی تینوں منزلوں میں اپنی بیٹی کو تلاش کر چکی تھی۔ مگر جانے وہ کہاں مر گئی تھی۔ سنڈاس کے پاس جا کر بھی اس نے آواز دی۔

”اے سریتا۔ سریتا“!

مگر وہ تو چالی میں تھی ہی نہیں اور جیسا کہ اس کی ماں سمجھ رہی تھی۔ اب اسے پیچش کی شکایت بھی نہیں تھی۔ دوا پیے بغیر اس کو آرام آچکا تھا۔ اور وہ باہر گلی کے اس نکڑ پر جہاں کچرے کا ڈھیر پڑا رہتا ہے، چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے کھیل رہی تھی اور ہر قسم کے فکر و تردّد سے آزاد تھی۔ اس کی ماں بہت متفکر تھی۔ کشوری اندر کھولی میں بیٹھا تھا۔ اور جیسا کہ اس نے کہا تھا، دو سیٹھ باہر بڑے بازار میں موٹر لیے کھڑے تھے لیکن سریتا کہیں غائب ہی ہو گئی تھی۔ موٹر والے سیٹھ ہر روز تو آتے ہی نہیں، یہ تو کشوری کی مہربانی ہے کہ مہینے میں ایک دو بار موٹی اسامی لے آتا ہے۔ ورنہ ایسے گندے محلے میں جہاں پان کی پیکوں اور جلی ہوئی بیڑیوں کی ملی جلی بو سے کشوری گھبراتا ہے، سیٹھ لوگ کیسے آسکتے ہیں۔ کشوری چونکہ ہوشیار ہے اس لیے وہ کسی آدمی کو مکان پر نہیں لاتا بلکہ سریتا کو کپڑے وپڑے پہنا کر باہر لے جایا کرتا ہے اور ان لوگوں سے کہہ دیا کرتا ہے کہ

”صاحب لوگ آج کل زمانہ بڑا نازک ہے۔ پولیس کے سپاہی ہر وقت گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اب تک دو سو دھندا کرنے والی چھوکریاں پکڑی جاچکی ہیں۔ کورٹ میں میرا ابھی ایک کیس چل رہا ہے۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔“

سریتا کی ماں کو بہت غصہ آرہا تھا۔ جب وہ نیچے اتری تو سیڑھیوں کے پاس رام دئی بیٹھی بیڑیوں کے پتے کاٹ رہی تھی۔ اس سے سریتا کی ماں نے پوچھا۔

”تو نے سریتا کو کہیں دیکھا ہے۔ جانے کہاں مر گئی ہے، بس آج مجھے مل جائے وہ چار چوٹ کی مار دوں کہ بند بند ڈھیلا ہو جائے۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے پر سارا دن لونڈوں کے ساتھ کدکڑے لگاتی رہتی ہے۔“

رام دئی بیڑیوں کے پتے کاٹتی رہی۔ اور اس نے سریتا کی ماں کو جواب نہ دیا۔ دراصل رام دئی سے سریتا کی ماں نے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ وہ یونہی بڑبڑاتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی۔ جیسا کہ اس کا عام دستور تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اسے سریتا کو ڈھونڈنا پڑتا تھا اور رام دئی کو جو کہ سارا دن سیڑھیوں کے پاس پٹاری سامنے رکھے بیڑیوں پر لال اور سفید دھاگے لپیٹی رہتی تھی مخاطب کر کے یہی الفاظ دہرایا کرتی تھی۔ ایک اور بات وہ چالی کی ساری عورتوں سے کہا کرتی تھی۔

”میں تو اپنی سریتا کا کسی بابو سے بیاہ کروں گی۔ اسی لیے تو اس سے کہتی ہوں کہ کچھ پڑھ لکھ لے۔ یہاں پاس ہی ایک اسکول منسی پالٹی (میونسپلٹی) نے کھولا ہے۔ سوچتی ہوں اس میں سریتا کو داخل کرادوں، بہن اس کے پِتا کو بڑا شوق تھا کہ میری لڑکی لکھی پڑھی ہو۔“

اس کے بعد وہ ایک لمبی آہ بھر کر عام طور پر اپنے مرے ہوئے شوہر کا قصہ چھیڑ دیتی تھی۔ جو چالی کی ہر عورت کو زبانی یاد تھا۔ رام دئی سے اگر آپ پوچھیں کہ اچھا جب سریتا کے باپ کو جو ریلوائی میں کام کرتا تھا۔ بڑے صاحب نے گالی دی تو کیا ہوا تو رام دئی فوراً آپ کو بتادے گی کہ سریتا کے باپ کے منہ میں جھاگ بھر آیا۔ اور وہ صاحب سے کہنے لگا۔

”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔ سرکار کا نوکر ہوں۔ تم مجھ پر رعب نہیں جماسکتے۔ دیکھو اگر پھر گالی دی تو یہ دونوں جبڑے حلق کے اندر کر دوں گا۔“

بس پھر کیا تھا۔ صاحب تاؤ میں آگیا، اور اس نے ایک اور گالی سنادی۔ اس پر سریتا کے باپ نے غصے میں آکر صاحب کی گردن پر دھول جمادی کہ اس کا ٹوپ دس گز پر جا گرا اور اس کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ مگر پھر بھی وہ بڑا آدمی تھا آگے بڑھ کر اس نے سریتا کے باپ کے پیٹ میں اپنے فوجی بوٹ سے اس زور کی ٹھوکر ماری کہ اس کی تلی پھٹ گئی اور وہیں لائنوں کے پاس گر کر اس نے جان دے دی۔ سرکار نے صاحب پر مقدمہ چلایا۔ اور پورے پانچ سو روپے سریتا کی ماں کو اس سے دلوائے مگر قسمت بُری تھی۔ اس کو سٹہ کھیلنے کی چاٹ پڑ گئی۔ اور پانچ مہینے کے اندر اندر سارا روپیہ برباد ہو گیا۔ سریتا کی ماں کی زبان پر ہر قت یہ کہانی جاری رہتی تھی لیکن کسی کو یقین نہیں تھا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ چالی میں سے کسی آدمی کو بھی سریتا کی ماں سے ہمدردی نہ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ سب کے سب خود ہمدردی کے قابل تھے، کوئی کسی کا دوست نہیں تھا۔ اس بلڈنگ میں اکثر آدمی ایسے رہتے تھے جو دن بھر سوتے تھے اور رات کو جاگتے تھے۔ کیونکہ انھیں رات کو پاس والی مل میں کام پر جانا ہوتا تھا۔ اس بلڈنگ میں سب آدمی بالکل پاس رہتے تھے۔ لیکن کسی کو ایک دوسرے سے دلچسپی نہ تھی۔ چالی میں قریب قریب سب لوگ جانتے تھے کہ سریتا کی ماں اپنی جوان بیٹی سے پیشہ کراتی ہے لیکن چونکہ وہ کسی کے ساتھ اچھا بُرا سلوک کرنے کے عادی ہی نہ تھے، اس لیے سریتا کی ماں کو کوئی جھٹلانے کی کوشش نہ کرتا تھا جب وہ کہا کرتی تھی میری بیٹی کو تو دنیا کی کچھ خبر ہی نہیں۔ البتہ ایک روز صبح سویرے نل کے پاس جب تکارام نے سریتا کو چھیڑا تھا تو سریتا کی ماں بہت چیخی چلائی تھی۔ اس موئے گنجے کو تو کیوں سنبھال کے نہیں رکھتی۔ پرماتما کرے دونوں آنکھوں سے اندھا ہو جائے۔ جن سے اس نے میری کنواری بیٹی کی طرف بُری نظروں سے دیکھا۔ سچ کہتی ہوں۔ ایک روز ایسا فساد ہو گا کہ اس تیری سوغات کا مارے جوتوں کے سر پلپلا کر دوں گی۔ باہر جو چاہے کرتا پھرے یہاں اسے بھلے مانسوں کی طرح رہنا ہو گا۔ سنا“!

اور یہ سن کر تکارام کی بھینگی بیوی دھوتی باندھتے باندھتے باہر نکل آئی۔

”خبردار موئی چڑی جو تو نے ایک لفظ بھی اور زبان سے نکالا۔ یہ تیری دیوی تو ہوٹل کے چھوکروں سے بھی آنکھ مچولی کھیلتی ہے اور تو کیا ہم سب کو اندھا سمجھتی ہے کیا ہم سب جانتے نہیں کہ تیرے گھر میں نت نئے بابو کس لیے آتے ہیں۔ اور یہ تیری سریتا آئے دن بن سنور کر باہر کیوں جاتی ہے۔ بڑی آئی عزت آبرو والی۔ جا جا دور دفان ہو یہاں سے۔“

تکارام کی بھینگی بیوی کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ لیکن یہ بات خاص طور پر سب لوگوں کو معلوم تھی کہ گھانسلیٹ والا (مٹی کا تیل بیچنے والا) تیل دینے کے لیے آتا ہے تو وہ اسے اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا کرتی ہے۔ چنانچہ سریتا کی ماں نے اس خاص بات پر بہت زور دیا۔ وہ بار بار نفرت بھرے لہجے میں اس سے کہتی۔

”وہ تیرا یار گھانسلیٹ۔ دو دو گھنٹے اسے کھولی میں بٹھا کر کیا تو اس کا گھانسلیٹ سونگھتی رہتی ہے؟“

تکارام کی بیوی سے سریتا کی ماں کی بول چال زیادہ دیر تک بند نہ رہی تھی کیونکہ ایک روز سریتا کی ماں نے رات کو اپنی اس پڑوسن کو گھپ اندھیرے میں کسی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے پکڑ لیا تھا اور دوسرے ہی روز تکارام کی بیوی نے جب وہ رات کو پانے دھونی کی طرف سے آ رہی تھی۔ سریتا کو ایک جنٹلمین آدمی کے ساتھ موٹر میں بیٹھے دیکھ لیا۔ چنانچہ ان دونوں کا آپس میں سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے سریتا کی ماں نے تکارام کی بیوی سے پوچھا۔

”تو نے کہیں سریتا کو نہیں دیکھا؟“

تکارام کی بیوی نے بھینگی آنکھ سے گلی کے نکڑ کی طرف دیکھا۔

”وہاں گھورے کے پاس پٹواری کی لونڈیا سے کھیل رہی ہے۔“

پھر اس نے آواز دھیمی کر کے اس سے کہا۔

”ابھی ابھی کشوری اوپر گیا تھا کہ تجھ سے ملا؟“

سریتا کی ماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے کہا۔

”اوپر بٹھا آئی ہوں پر یہ سریتا ہمیشہ وقت پر کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ سوچتی نہیں۔ بس دن بھر کھیل کود چاہیے۔“

یہ کہہ کر وہ گھورے کی طرف بڑھی اور جب سیمنٹ کی بنی ہوئی موتری (پیشاب گاہ) کے پاس آئی تو سریتا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اس کی ماں نے خشم آلود لہجے میں اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

”چل گھر میں چل کے مَر۔ تجھے تو سوائے اچھل کود کے اور کوئی کام ہی نہیں۔“

پھر راستے میں اس نے ہولے سے کہا۔

”کشوری بڑی دیر سے آیا بیٹھا ہے، ایک موٹر والے سیٹھ کو بلایا ہے۔ چل تو بھاگ کے اوپر چل اور جلدی جلدی تیار ہو جا۔ اور سن۔ وہ نیلی جارجٹ کی ساڑھی پہن۔ اور دیکھ یہ تیرے بال بھی بہت بُری طرح بکھر رہے ہیں۔ تو جلدی تیار ہو۔ کنگھی میں کر دوں گی۔“

یہ سن کر کہ موٹر والے سیٹھ آئے ہیں، سریتا بہت خوش ہوئی۔ اسے سیٹھ سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ موٹر سے تھی۔ موٹر کی سواری اسے بہت پسند تھی۔ جب موٹر فراٹے بھرتی کھلی کھلی سڑکوں پر چلتی اور اس کے منہ پر ہوا کے طمانچے پڑتے، تو اس کے دل میں ایک ناقابلِ بیان مسرت ابلنا شروع ہو جاتی۔ موٹر میں بیٹھ کر اس کو ہر شے ایک ہوائی چکر دکھائی دیتی اور سمجھتی کہ وہ خود ایک بگولا ہے جو سڑکوں پر اڑتا چلا جا رہا ہے۔ سریتا کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی ہو گی۔ مگر اس میں بھنپا تیرہ برس کی لڑکیوں کا سا تھا۔ عورتوں سے ملنا جلنا اور ان سے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ سارا دن چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مصروف رہتی۔ ایسے کھیل جن کا کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ گلی کے کالے لُک پھرے فرش پر کھریا مٹی سے لکیریں کھینچنے میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور اس کھیل میں وہ اس انہماک سے مصروف رہتی۔ جیسے سڑک پر یہ ٹیڑھی بنگی لکیریں اگر نہ کھینچی گئیں تو آمد و رفت بند ہو جائے گی، اور پھر کھولی سے پرانے ٹاٹ اٹھا کر وہ اپنی ننھی ننھی سہیلیوں کے ساتھ کئی کئی گھنٹے ان کو فٹ پاتھ پر جھٹکنے صاف کرنے، بچھانے اور ان پر بیٹھنے کے غیر دلچسپ کھیل میں مشغول رہتی تھی۔ سریتا خوبصورت نہیں تھی۔ رنگ اس کا سیاہی مائل گندمی تھا۔ بمبئی کے مرطوب موسم کے باعث اس کے چہرے کی جلد ہر وقت چکنی رہتی تھی۔ اور پتلے پتلے ہونٹوں پر جو چیکو (ایک پھل جس کا رنگ گندمی ہوتا ہے) کے چھلکے دکھائی دیتے تھے، ہر وقت خفیف سی لرزش طاری رہتی تھی۔ اوپر کے ہونٹ پر پسینے کی تین چار ننھی ننھی بوندیں ہمیشہ کپکپاتی رہتی تھیں۔ اس کی صحت اچھی تھی۔ غلاظت میں رہنے کے باوجود اس کا جسم سڈول اور متناسب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر جوانی کا حملہ بڑی شدت سے ہوا ہے جس نے مخالف قوتوں کو دبا کے رکھ دیا ہے۔ قد چھوٹا تھا جو اس کی تندرستی میں اضافہ کرتا تھا۔ سڑک پر پھرتی سے ادھر ادھر چلتے ہوئے جب اس کی میلی گھگری اوپر کو اٹھ جاتی تو کئی راہ چلنے والے مردوں کی نگاہیں اس کی پنڈلیوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ جن میں جوانی کے باعث تازہ رندہ کی ہوئی ساگوان کی لکڑی جیسی چمک دکھائی دیتی تھی۔ ان پنڈلیوں پر جو بالوں سے بالکل بے نیاز تھیں۔ مساموں کے ننھے ننھے نشان دیکھ کر ان سنگتروں کے چھلکے یاد آ جاتے تھے جن کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں تیل بھرا ہوتا ہے اور جو تھوڑے سے دباؤ پر فوارے کی طرح اوپر اٹھ کر آنکھوں میں گھس جایا کرتا ہے۔ سریتا کی باہیں بھی سڈول تھیں۔ کندھوں پر ان کی گولائی موٹے اور بڑے بیڈھب طریقے پر سلے ہوئے بلاؤز کے باوجود باہر جھانکتی تھی۔ بال بڑے گھنے اور لمبے تھے۔ ان میں سے کھوپرے کے تیل کی بو آتی رہتی تھی۔ ایک موٹے کوڑے کے مانند اس کی چوٹی پیٹھ کو تھپکتی رہتی تھی۔ سریتا اپنے بالوں کی لمبائی سے خوش نہیں تھی کیونکہ کھیل کود کے دوران میں اس کی چوٹی اسے بہت تکلیف دیا کرتی تھی اور اسے مختلف طریقوں سے اس کو قابو میں رکھنا پڑتا تھا۔ سریتا کا دل و دماغ ہر قسم کے فکر و تردّد سے آزاد تھا۔ دونوں وقت اسے کھانے کو مل جاتا تھا۔ اس کی ماں گھر کا سب کام کاج کرتی تھی۔ صبح کو سریتا دو بالٹیاں بھر کر اندر رکھ دیتی اور شام کو ہر روز لیمپ میں ایک پیسے تیل بھروالاتی۔ کئی برسوں سے وہ یہ کام بڑی باقاعدگی سے کر رہی تھی۔ چنانچہ شام کو عادت کے باعث خود بخود اس کا ہاتھ اس پیالے کی طرف بڑھتا جس میں

پیسے پڑے رہتے تھے اور لیمپ اٹھا کر وہ نیچے چلی جاتی۔ کبھی کبھی یعنی مہینے میں چار پانچ بار جب کشوری سیٹھ لوگوں کو لاتا تھا۔ تو ان کے ساتھ ہوٹل میں یا باہر اندھیرے مقاموں پر جانے کو وہ تفریح خیال کرتی تھی۔ اس نے اس باہر جانے کے سلسلے کے دوسرے پہلوؤں پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ شاید یہ سمجھتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کے گھر میں بھی کشوری جیسے آدمی آتے ہوں گے اور ان کو سیٹھ لوگوں کے ساتھ باہر جانا پڑتا ہو گا۔ اور وہاں رات کو ورلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے بنچوں پر یا جوہو کی گیلی ریت پر جو کچھ ہوتا ہے سب کے ساتھ ہوتا ہو گا۔

چنانچہ اس نے ایک بار اپنی ماں سے کہا تھا۔

”ماں اب تو شانتا بھی کافی بڑی ہو گئی۔ اس کو بھی میرے ساتھ بھیج دونا۔ یہ سیٹھ جو اب آئے ہیں۔ ابلے انڈے کھانے کو دیا کرتے ہیں۔ اور شانتا کو انڈے بہت بھاتے ہیں۔“

اس پر اس کی ماں نے بات گول مول کر دی تھی۔

”ہاں ہاں کسی روز اس کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں گی۔ اس کی ماں پونہ سے واپس تو آجائے۔“

اور سریتا نے دوسرے روز ہی شانتا کو جب وہ سنڈاس سے نکل رہی تھی، یہ خوش خبری سنائی تھی۔

”تیری ماں پُونہ سے آجائے تو سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو بھی میرے ساتھ ورلی جایا کرے گی۔“

اور اس کے بعد سریتا نے اس کو رات کی بات کچھ اس طریقے پر سنانا شروع کی تھی جیسے اس نے ایک ہی پیارا سپنا دیکھا ہے۔ شانتا کو جو سریتا سے دو برس چھوٹی تھی یہ باتیں سن کر ایسا لگا تھا جیسے اس کے سارے جسم کے اندر ننھے ننھے گھنگھرو بج رہے ہیں۔ سریتا کی سب باتیں سن کر بھی اس کو تسلی نہ ہوئی تھی اور اس کا بازو کھینچ کر اس نے کہا تھا۔

”چل نیچے چلتے ہیں۔ وہاں باتیں کریں گے۔“

اور نیچے اس موتری کے پاس جہاں گردھاری بنیا نے بہت سے ٹاٹوں پر کھوپرے کے میلے ٹکڑے سکھانے کے لیے ڈال رکھے تھے، وہ دونوں دیر تک کپکپی کرنے والی باتیں کرتی رہی تھیں۔ اس وقت بھی جب کہ سریتا دھوتی کے پردے کے پیچھے نیلی جارجٹ کی ساڑھی پہن رہی تھی۔ کپڑے کے مس ہی سے اس کے بدن پر گدگدی ہو رہی تھی اور موٹر کی سیر کا خیال اس کے دماغ میں پرندوں کی سی پھڑ پھڑاہٹیں پیدا کر رہا تھا۔ اب کی بار سیٹھ کیسا ہو گا اور اسے کہاں لے جائے گا۔ یہ اور اسی قسم کے اور سوال اس کے دماغ میں نہیں آ رہے تھے۔ البتہ جلدی جلدی کپڑے بدلتے ہوئے اس نے ایک دو مرتبہ یہ ضرور سوچا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ موٹر چلے اور چند ہی منٹوں میں کسی ہوٹل کے دروازے پر ٹھہر جائے اور ایک بند کمرے میں سیٹھ شراب پینا شروع کر دیں اور اس کا دم گھٹنا شروع ہو جائے۔ اسے ہوٹلوں کے بند کمرے پسند نہیں تھے۔ جن میں عام طور پر لوہے کی دو چارپائیاں اس طور بچھی ہوتی تھیں گویا ان پر جی بھر کے سونے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ جلدی جلدی اس نے جارجٹ کی ساڑھی پہنی اور اس کی شکنیں درست کرتی ہوئی ایک لمحے کے لیے کشوری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”کشوری، ذرا دیکھو۔ پیچھے سے ساڑھی ٹھیک ہے نا؟“

اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ لکڑی کے اس ٹوٹے ہوئے بکس کی طرف بڑھی جس میں اس نے جاپانی سرخی رکھی ہوئی تھی۔ ایک دھندلے آئینے کو کھڑکی کی سلاخوں میں اٹکا کر اس نے دوہری ہو کر اپنے گالوں پر پوڈر لگایا۔ اور سرخی لگا کر جب بالکل تیار ہو گئی تو مسکرا کر کشوری کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ شوخ رنگ کی نیلی ساڑھی میں، ہونٹوں پر بے ترتیبی سے سرخی کی دھڑی جمائے اور سانولے گالوں پر پیازی رنگ کا پوڈر ملے وہ مٹی کا ایک ایسا کھلونا معلوم ہوئی جو دیوالی پر کھلونے بیچنے والوں کی دکان میں سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیا کرتا ہے۔ اتنے میں اس کی ماں آ گئی۔ اس نے جلدی جلدی سریتا کے بال درست کیے اور کہا۔

”دیکھو بٹیا اچھی اچھی باتیں کرنا۔ اور جو کچھ وہ کہیں مان لینا۔ یہ سیٹھ جو آئے ہیں نا بڑے آدمی ہیں موٹر ان کی اپنی ہے۔“

پھر کشوری سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اب تو جلدی سے لے جا اسے۔ بچارے کب کے کھڑے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔“

باہر بڑے بازار میں جہاں ایک کارخانے کی لمبی دیوار دور تک چلی گئی ہے۔ ایک پیلے رنگ کی موٹر میں تین حیدر آبادی نوجوان اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے کشوری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ موٹر آگے لے جاتے مگر مصیبت یہ ہے کہ دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی پیشاب کا سلسلہ بھی۔ جب گلی کے موڑ سے ان نوجوان کو جو موٹر کا ہینڈل تھامے بیٹھا تھا۔ کشوری نظر آیا تو اس نے اپنے باقی دو ساتھیوں سے کہا۔

”لو بھئی آ گئے۔ یہ ہے کشوری۔ اور۔ اور۔“

اس نے موٹر کی طرف نگاہیں جمائے رکھیں۔ اور۔ اور۔ ارے یہ تو بالکل ہی چھوٹی لڑکی ہے۔ ذرا تم بھی دیکھو نا۔ ارے بھئی وہ۔ وہ نیلی ساڑھی میں۔“

جب کشوری اور سریتا دونوں موٹر کے پاس آ گئے تو پچھلی سیٹ پر جو دو نوجوان بیٹھے تھے۔ انھوں نے درمیان میں سے اپنے ہیٹ وغیرہ اٹھا لیے۔ اور جگہ خالی کر دی کشوری نے آگے بڑھ کے موٹر کے پچھلے حصے کا دروازہ کھولا اور پھرتی سے سریتا کو اندر داخل کر دیا۔ دروازہ بند کر کے کشوری نے اس نوجوان سے جو موٹر کا ہینڈل تھامے تھا۔ کہا۔

”معاف کیجیے گا دیر ہو گئی۔ یہ باہر اپنی کسی سہیلی کے پاس گئی ہوئی تھی۔ تو۔ تو؟“

نوجوان نے مڑ کر سریتا کی طرف دیکھا۔ اور کشوری سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن دیکھو۔“

سرک کر موٹر کی اس کھڑی میں سے اس نے اپنا سر باہر نکالا اور ہولے سے کشوری کے کان میں کہا۔

”شور وور تو نہیں مچائے گی؟“

کشوری نے اس کے جواب میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”سیٹھ، آپ مجھ پر بھروسہ رکھیے۔“

یہ سن کر اس نوجوان نے جیب میں سے دو روپے نکالے اور کشوری کے ہاتھ میں تھما دیے۔

”جاؤ عیش کرو۔“

کشوری نے سلام کیا اور موٹر اسٹارٹ ہوئی۔ شام کے پانچ بجے تھے۔ بمبئی کے بازاروں میں گاڑیوں، ٹراموں، بسوں اور لوگوں کی آمد ورفت بہت زیادہ تھی۔ سریتا خاموشی سے دو آدمیوں کے بیچ میں دبکی بیٹھی رہی۔ بار بار اپنی رانوں کو جوڑ کر اوپر ہاتھ رکھ دیتی اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتی۔ وہ دراصل موٹر چلانے والے نوجوان سے کہنا چاہتی تھی۔

”سیٹھ جلدی جلدی موٹر چلاؤ۔ میرا تو یوں دم گھٹ جائے گا۔“

بہت دیر تک موٹر میں کسی نے ایک دوسرے سے بات نہ کی۔ موٹر والا موٹر چلاتا رہا۔ اور پچھلی سیٹ پر دونوں حیدرآبادی نوجوان اپنی اچکنوں میں وہ اضطراب چھپاتے رہے جو پہلی دفعہ ایک نوجوان لڑکی کو بالکل اپنے پاس دیکھ کر انھیں محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی نوجوان لڑکی جو کچھ عرصے کے لیے ان کی اپنی تھی یعنی جس سے وہ بلا خوف وخطر چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔ وہ نوجوان جو موٹر چلا رہا تھا۔ دو برس سے بمبئی میں قیام پذیر تھا اور سریتا جیسی کئی لڑکیاں دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی پیلی موٹر میں مختلف رنگ ونسل کی چھوکریاں داخل ہو چکی تھیں۔ اس لیے اسے کوئی خاص بے چینی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ حیدرآباد کے اس کے دو دوست آئے تھے، ان میں سے ایک جس کا نام شہاب تھا۔ جو بمبئی میں پوری طرح سیر و تفریح کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کفایت نے یعنی موٹر کے مالک نے ازراہ دوست نوازی کشوری کے ذریعہ سے سریتا کا انتظام کر دیا تھا۔ دوسرے دوست انور سے کفایت نے کہا کہ بھئی تمہارے لیے بھی ایک رہے تو کیا ہرج ہے۔ مگر اس میں چونکہ اخلاقی قوت کم تھی۔ اس لیے شرم کے مارے وہ یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں بھئی میرے لیے بھی ایک رہے۔ کفایت نے سریتا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ کشوری بہت دیر کے بعد یہ نئی چھوکری نکال کر لایا تھا۔ لیکن اس نئے پن کے باوجود اس نے ابھی تک اس سے دلچسپی نہ لی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک وقت میں صرف ایک کام کر سکتا تھا۔ موٹر چلانے کے ساتھ ساتھ وہ سریتا کی طرف دھیان نہیں دے سکتا تھا۔ جب شہر ختم ہو گیا اور موٹر مضافات کی سڑک پر چلنے لگی تو سریتا اچھل پڑی۔ وہ دباؤ جو اب تک اس نے اپنے اوپر ڈال رکھا تھا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور اڑتی ہوئی موٹر نے ایک دم اٹھا دیا۔ اور سریتا کے اندر بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ وہ سرتاپا حرکت بن گئی۔ اس کی ٹانگیں تھرکنے لگیں۔ بازو ناچنے لگے، انگلیاں کپکپانے لگیں اور وہ اپنے دونوں طرف بھاگتے ہوئے درختوں کو دوڑتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اب انور اور شہاب آرام محسوس کر رہے تھے۔ شہاب نے جو سریتا پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ ہولے سے اپنا بازو اس کی کمر میں حائل کرنا چاہا۔ ایک دم سریتا کے گدگدی اٹھی۔ تڑپ کر وہ انور پر جا گری۔ اور پیلی موٹر کی کھڑکیوں میں سے دور تک سریتا کی ہنسی بہتی گئی۔ شہاب نے جب ایک بار پھر اس کی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سریتا دوہری ہو گئی اور ہنستے ہنستے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ انور ایک کونے میں دبکا رہا اور منہ میں تھوک پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ شہاب کے دل ودماغ میں شوخ رنگ بھر گئے۔ اس نے کفایت سے کہا۔

”واللہ بڑی کراری لونڈیا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے زور سے سریتا کی ران میں چٹکی بھری۔ سریتا نے اس کے جواب میں انور کا ہولے سے کان مروڑ دیا۔ اس لیے کہ وہ اس کے بالکل پاس تھا۔ موٹر میں قہقہے ابلنے لگے۔ کفایت بار بار مڑ مڑ کر دیکھتا تھا۔ حالانکہ اسے اپنے سامنے چھوٹے سے آئینے میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ قہقہوں کے زور کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے موٹر کی رفتار بھی تیز کر دی۔ سریتا کا جی چاہا کہ باہر نکل کر موٹر کے منہ پر بیٹھ جائے جہاں لوہے کی اُڑتی ہوئی پری لگی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔ شہاب نے اسے چھیڑا، سو سنبھلنے کی خاطر اس نے کفایت کے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر دیں۔ کفایت نے غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ چوم لیے۔ ایک سنسنی سی سریتا کے جسم میں دوڑ گئی اور پھاند کر اگلی سیٹ پر کفایت کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اس کی ٹائی سے کھیلنا شروع کر دیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

اس نے کفایت سے پوچھا۔

”میرا نام“!

کفایت نے پوچھا۔

”میرا نام کفایت ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ سریتا نے اس کے نام کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نوٹ اپنی چولی میں اڑس کر بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

”تم بہت اچھے آدمی ہو۔ تمہاری یہ ٹائی بہت اچھی ہے۔“

اس وقت سریتا کو ہر شے اچھی نظر آرہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جو بُرے بھی ہیں اچھے ہو جائیں۔ اور۔ اور۔ پھر ایسا ہو، ایسا ہو۔ کہ موٹر تیز دوڑتی رہے اور ہر شے ہوائی بگولا بن جائے۔ ایک دم اس کا جی چاہا کہ گائے، چنانچہ اس نے کفایت کی ٹائی سے کھیلنا بند کر کے گانا شروع کر دیا۔ تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا سوئے ہوئے ہر دے کو جگایا کچھ دیر یہ فلمی گیت گانے کے بعد سریتا ایک دم پیچھے مڑی اور انور کو خاموش دیکھ کر کہنے لگی۔

”تم کیوں چپ چاپ بیٹھے ہو۔ کوئی بات کرو۔ کوئی گیت گاؤ۔“

یہ کہتی ہوئی وہ اچک کر پچھلی سیٹ پر چلی گئی اور شہاب کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔

”آؤ ہم دونوں گائیں۔ تمہیں یاد ہے وہ گانا جو دیویکا رانی نے گایا تھا۔ میں بن کے چڑیا بن کے بولوں رے۔ دیویکا رانی کتنی اچھی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی تھوڑی کے نیچے رکھ لیے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ اشوک کمار اور دیویکا رانی پاس پاس کھڑے تھے۔ دیویکا رانی کہتی تھی۔ میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے۔ اور اشوک کمار کہتا تھا۔ تم کہو نا۔“

سریتا نے گانا شروع کر دیا۔ میں بن کی چڑیا بن کے بولوں رے۔ شہاب نے بھدی آواز میں گایا۔

”میں بن کا پنچھی بن کے بن بن بولوں رے۔“

اور پھر باقاعدہ ڈوئٹ شروع ہو گیا۔ کفایت نے موٹر کا ہارن بجا کر تال کا ساتھ دیا۔ سریتا نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ سریتا کا باریک سر، شہاب کی پھٹی ہوئی آواز، ہارن کی پوں پوں، ہوا کی سائیں سائیں اور موٹر کے انجن کی پُھر پُھراہٹ یہ سب مل جل کر ایک آرکسٹرا بن گئے۔ سریتا خوش تھی، شہاب خوش تھا، کفایت خوش تھا۔ ان سب کو خوش دیکھ کر انور کو بھی خوش ہونا پڑا۔ وہ دل میں بہت شرمندہ ہوا کہ خواہ مخواہ اس نے اپنے کو قید کر رکھا ہے۔ اس کے بازوؤں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے سوئے ہوئے جذبات نے انگڑائیاں لیں اور وہ سریتا، شہاب اور کفایت کی شور افشاں خوشی میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ گاتے گاتے سریتا نے انور کے سر سے اس کا ہیٹ اتار کر اپنے سر پہن لیا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے سر پر کیسا لگتا ہے، اچک کر اگلی سیٹ پر چلی گئی اور ننھے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ انور سوچنے لگا کہ کیا موٹر میں وہ شروع ہی سے ہیٹ پہنے بیٹھا تھا۔ سریتا نے زور سے کفایت کی موٹی ران پر طمانچہ مارا۔

”اگر میں تمہاری پتلون پہن لوں۔ اور قمیض پہن کر ایسی ٹائی لگا لوں تو کیا پورا صاحب نہ بن جاؤں؟“

یہ سن کر شہاب کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے انور کے بازوؤں کو جھنجھوڑ دیا۔

”واللہ تم نرے چغد ہو۔“

اور انور نے تھوڑی دیر کے لیے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت بڑا چغد ہے۔ کفایت نے سریتا سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام“

سریتا نے ہیٹ کے فیتے کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے جماتے ہوئے کہا۔

”میرا نام سریتا ہے۔“

شہاب پچھلی سیٹ سے بولا۔

”سریتا تم عورت نہیں پھلجھڑی ہو۔“

انور نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر سریتا نے اونچے سروں میں گانا شروع کر دیا۔ پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں تج کے سب سن سا آر کفایت اور شہاب کے دل میں بیک وقت یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ موٹر یونہی ساری عمر چلتی رہے۔ انور پھر سوچ رہا تھا کہ وہ چغد نہیں ہے تو کیا ہے۔ پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں تج کے سب سن سا آر سنسار کے ٹکڑے دیر تک اڑتے رہے۔ سریتا کے بال جو اس کی چوٹی کی گرفت سے آزاد تھے۔ یوں لہرا رہے تھے جیسے گاڑھا دھواں ہوا کے دباؤ سے بکھر رہا ہے۔ وہ خوش تھی۔ شہاب خوش تھا، کفایت خوش تھا اور اب انور بھی خوش ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ گیت ختم ہو گیا۔ اور سب کو تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ جو زور کی بارش ہو رہی تھی۔ ایکا ایکی تھم گئی ہے۔ کفایت نے سریتا سے کہا۔

”کوئی اور گیت گاؤ۔“

شہاب پچھلی سیٹ سے بولا۔

”ہاں ہاں ایک اور رہے۔ یہ سینما والے بھی کیا یاد کریں گے۔“

سریتا نے گانا شروع کر دیا مورے آنگنا میں آئے آلی میں چال چلوں متوالی موٹر بھی متوالی چال چلنے لگی۔ آخر کار سڑک کے سارے پیچ ختم ہو گئے اور سمندر کا کنارا آ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ اور سمندر سے آنے والی ہوا خنکی اختیار کر رہی تھی۔ موٹر رُکی۔ سریتا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک بے مقصد دوڑتی چلی گئی۔ کفایت اور شہاب بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔ کھلی فضا میں، بے پایاں سمندر کے پاس، تاڑ کے اونچے اونچے پیڑوں تلے گیلی گیلی ریت پر سریتا سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بیک وقت فضا میں گھل مل جائے، سمندر میں پھیل جائے، اتنی اونچی ہو جائے کہ تاڑ کے درختوں کو اوپر سے دیکھے۔ ساحل کی ریت کی ساری نمی پیروں کے ذریعے سے اپنے اندر جذب کر لے اور پھر۔ اور پھر۔ وہی موٹر ہو اور وہی اڑانیں وہی تیز تیز جھونکے اور وہی مسلسل پوں پوں۔ وہ بہت خوش تھی۔ جب تینوں حیدر آبادی نوجوان ساحل کی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ کر بیئر پینے لگے تو کفایت کے ہاتھ سے سریتا نے بوتل چھین لیا۔

”ٹھہرو میں ڈالتی ہوں۔“

سریتا نے اس انداز سے گلاس میں بیئر انڈیلی کہ جھاگ ہی جھاگ پیدا ہو گئے۔ سریتا یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سانولے سانولے جھاگوں میں اس نے اپنی انگلی کھبوئی۔ اور منہ میں ڈال لی۔ جب کڑوی لگی تو بہت بُرا منہ بنایا۔ کفایت اور شہاب بے اختیار ہنس پڑے جب دونوں کی ہنسی بند ہوئی تو کفایت نے مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا۔ انور بھی ہنس رہا تھا۔ بیئر کی چھ بوتلیں کچھ تو جھاگ بن کر ساحل کی ریت میں جذب ہو گئیں اور کچھ کفایت، شہاب اور انور کے پیٹ میں چلی گئیں۔ سریتا گاتی رہی۔ انور نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور خیال کیا کہ سریتا بیئر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے سانولے گال سمندر کی نم آلود ہوا کے مس سے گیلے ہو رہے تھے۔ وہ بے حد مسرور تھی۔ اب انور بھی خوش تھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ سمندر کا سب پانی بیئر بن جائے اور وہ اس میں غوطے لگائے، سریتا بھی ڈبکیاں لگائے۔ دو خالیں بوتلیں لے کر سریتا نے ایک دوسرے سے ٹکرا دیں، جھنکار پیدا ہوئی اور سریتا نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ کفایت، شہاب اور انور بھی ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے سریتا نے کفایت سے کہا۔

”آؤ موٹر چلائیں۔“

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ خالی بوتلیں گیلی گیلی ریت پر اوندھی پڑی رہیں اور وہ سب بھاگ کر موٹر میں بیٹھ گئے۔ پھر وہی ہوا کے تیز تیز جھونکے آنے لگے۔ وہی مسلسل پوں پوں شروع ہوئی اور سریتا کے بال پھر دھوئیں کی طرح بکھرنے لگے۔ گیتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ موٹر ہوا میں آرے کی طرح چلتی رہی۔ سریتا گاتی رہی۔ پچھلی سیٹ پر شہاب اور انور کے درمیان سریتا بیٹھی تھی۔ انور اونگھ رہا تھا۔ سریتا نے شرارت سے شہاب کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سو گیا، سریتا نے جب انور کی طرف رخ کیا تو اسے ویسا ہی سویا ہوا پایا۔ ان دونوں کے بیچ میں سے اٹھ کر وہ اگلی سیٹ پر کفایت کے پاس بیٹھ گئی اور آواز دبا کر ہولے سے کہنے لگے۔ آپ کے دونوں ساتھیوں کو سُلا آئی ہوں۔ اب آپ بھی سو جائیے۔“

کفایت مسکرایا۔

”پھر موٹر کون چلائے گا۔“

سریتا بھی مسکرائی۔

”چلتی رہے گی۔“

دیر تک کفایت اور سریتا آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں وہ بازار آ گیا۔ جہاں کشوری نے سریتا کو موٹر کے اندر داخل کیا تھا۔ جب وہ دیوار آئی جس پر

”یہاں پیشاب کرنا منع ہے“

کے کئی بورڈ لگے تھے۔ تو سریتا نے کفایت سے کہا۔

”بس یہاں روک لو۔“

موٹر رُکی۔ پیشتر اس کے کہ کفایت کچھ سوچنے یا کہنے پائے۔ سریتا موٹر سے باہر تھی اس نے اشارے سے سلام کیا اور چل دی۔ کفایت ہینڈل پر ہاتھ رکھے غالباً سارے واقعہ کو ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سریتا کے قدم رُکے۔ مڑی اور چولی میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر کفایت کے پاس سیٹ پر رکھ دیا۔ کفایت نے حیرت سے نوٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”سریتا یہ کیا؟“

”یہ۔ یہ روپے میں کس بات کے لوں؟“

کہہ کر سریتا پُھرتی سے دوڑ گئی اور کفایت سیٹ کے گدے پر پڑے ہوئے نوٹ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ شہاب اور انور بھی نوٹ کی طرح سو رہے تھے۔

دُھواں

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹودُھواں

وہ جب اسکول کی طرف روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا، جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کیے ہُوئے بکرے تھے کھالیں اُتری ہُوئی تھیں، اور ان کے ننگے گوشت میں سے دُھواں اٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ پر یہ گوشت جسکو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں۔ پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اسکی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔ اس وقت سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی، لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دُھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہُوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا۔ جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہو۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے آوازیں مدھم تھیں۔ جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں، چپکے چپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اُٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔ مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کیے ہُوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دُھواں اُٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہُوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بُن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دُھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔ فضا میں اجلا پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دُھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہُوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔ مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہُوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے۔ کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔ مسعود نے جب سُنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہُوا۔ اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اُس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہُوا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دِقت ہُوئی تھی اس لیے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کُھدی ہُوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدّت، اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ۔ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا، چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سُنی تو اسے یہ بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا، جب سکتر صاحب کا جنازہ اُٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بِلبِلا اٹھیں گے۔ مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں اس میں رکھیں اور باقی بستہ اُٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔ راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کیے ہُوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا چھو کر دیکھے، چنانچہ آگے بڑھ کر اس نے انگلی سے بکرے کے اس حصّے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا، گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہُوئی۔ قصائی دکان کے اندر چُھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔ گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سُنائی تو اسے معلوم ہُوا کہ اس کے اباجی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔ چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں پڑا تھا۔ اس لیے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے اباجی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لُوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سُنتا رہا جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں

پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اُٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید دُھواں اُٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آگیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا۔

”امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ کھال اُتری ہوئی تھی اور ان میں سے دُھواں نکل رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔“

”اچھا۔“!

یہ کہہ کر اُس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

”ہاں اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔“

”اچھا۔“!

یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانہ سے باہر چلی گئ۔

”اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا۔“

”اچھا۔“

مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کیسے پھڑکتا تھا؟“

”یوں۔ یوں۔“

مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

”تو پھر کیا ہوا؟“

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

”پھر کیا ہونا تھا، میں نے تو ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔“

”گرم تھا۔ اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے۔“

”بتائیے۔“

”آؤ، میرے ساتھ آؤ۔“

”نہیں آپ پہلے بتائیے۔ کام کیا ہے۔“

”تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔“

”جی نہیں۔ آپ پہلے کام بتائیے۔“

”دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا۔ اچھے بھائی جو ہوئے۔ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

”یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں، کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔“

مسعود اُٹھ کھڑا ہُوا۔

”چلیے، لیکن یہ آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔“

”شاباش۔ شاباش۔“

اس کی بہن اُٹھ کھڑی ہُوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔ صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دُکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اُوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے بادل جُھکے ہُوئے تھے۔

”مسعود، آج ضرور بارش ہو گی۔“

یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔ جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئ تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔

”دیکھیے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔“

”بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لیے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آ کر جلدی کمر دباؤ ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔“

کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔ کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا، جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کیے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہیں تھا۔ ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اُس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بدولی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اِس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھینچی بھینچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔ ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ شاباش مسعود، شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح۔ شاباش میرے بھائی۔“

مسعود نے دیوار کا سہارا لیکر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لیکر اپنی بہن کی رانیں دبائے، چنانچہ اس نے کہا۔

”یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جایئے۔ میں آپکی ٹانگیں دبا دوں۔“

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گُدگُدی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔

”نا بھائی میرے گُدگُدی ہوتی ہے۔ تم اوٹ پٹانگ طریقے سے دباتے ہو۔“

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ نہیں، اب کی دفعہ میں پُورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔“

دیوار کا سہارا لیکر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے اپنے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر اِدھر اُدھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔ اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا

”کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟“

لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپکو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

”بس بس۔“

کلثوم تھک گئی۔

”بس بس۔“

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گُدگُدی کرنا شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے۔ لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔ جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کیے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اسکے گالوں کے ساتھ مس ہُوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور کبوتری پاس پاس پَر پھلائے بیٹھے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہُوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور نازبو کے ہرے ہرے پتے اُوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہُوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔ مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا۔ جن کا مطلب اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چُھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا، پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اُسے آ رہا تھا۔ بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کَس لیں اور اُن کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لیے

وہ باورچی خانہ میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا، ابھی اُس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اُٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی کیونکہ اب ہَوا بھی چل رہی تھی، مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہُوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی ٖشیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اسکے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دُکھن پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزا آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصّے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی، یہ چیز کیا تھی۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا۔ البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہُوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اسکا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔ دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اُٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آ نکلا۔ نہ کوئی باورچی خانہ میں تھا اور نہ صحن میں۔ اِدھر اُدھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی۔

”کون؟“

”جی میں ہُوں مسعود“!

اندر سے آواز آئی۔

”کیا کر رہے ہو؟“

”جی کھیل رہا ہوں۔“

”کھیلو۔“

پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا۔

”تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔ زیادہ شور نہ مچانا۔“

یہ سُن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لیے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اسکا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم وا۔ مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھی، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔ بملا کے بلاؤز کے بٹن کُھلے ہوئے تھے اور کلثوم اُس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔ مسعود کچھ سمجھ نہ سکا، اس کے دماغ میں دُھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا۔ جس نے کچھ دیر کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔ بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا، اور زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کُشتی لڑتا رہا۔ جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

دودا پہلوان

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹودودا پہلوان

اسکول میں پڑھتا تھا تو شہر کا حسین ترین لڑکا متصور ہوتا تھا۔ اس پر بڑے بڑے امرد پرستوں کے درمیان بڑی خونخوار لڑائیاں ہوئیں۔ ایک دو اسی سلسلے میں مارے بھی گئے۔ وہ واقعی حسین تھا۔ بڑے مالدار گھرانے کا چشم و چراغ تھا اس لیے اس کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ مگر جس میدان وہ کود پڑا تھا اس کو ایک محافظ کی ضرورت تھی جو وقت پر اس کے کام آ سکے۔ شہر میں یوں تو سینکڑوں بدمعاش اور غنڈے موجود تھے جو حسین و جمیل صلاحو کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تھے، مگر دودے پہلوان میں ایک نرالی بات تھی۔ وہ بہت مفلس تھا، بہت بدمزاج اور اکھڑ طبیعت کا تھا، مگر اس کے باوجود اس میں ایسا بانکپن تھا کہ صلاحو نے اس کو دیکھتے ہی پسند کر لیا اور ان کی دوستی ہو گئی۔ صلاحو کو دودے پہلوان کی رفاقت سے بہت فائدے ہوئے۔ شہر کے دوسرے غنڈے جو صلاحو کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب ہو سکتے تھے، دودے کی وجہ سے خاموش رہے۔ اسکول سے نکل کر صلاحو کالج میں داخل ہوا تو اس نے اوپر پرپرزے نکالے اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کی سرگرمیاں نیا رخ اختیار کر گئیں۔ اس کے بعد خدا کر کرنا ایسا ہوا کہ صلاحو کا باپ مر گیا۔ اب وہ اس کی تمام

جائیداد، املاک کا واحد مالک تھا۔ پہلے تو اس نے نقدی پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر مکان گروی رکھنے شروع کیے۔ جب دو مکان بک گئے تو ہیرامنڈی کی تمام طوائفیں صلاحو کے نام سے واقف تھیں۔ معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ ہیرامنڈی میں بوڑھی نائکائیں اپنی جوان بیٹیوں کو صلاحو کی نظروں سے چھپا چھپا کر رکھتی تھیں۔ مبادا وہ اس کے حسن کے چکر میں پھنس جائیں۔ لیکن ان احتیاطی تدابیر کے باوجود جیسا کہ سننے میں آیا ہے، کئی کنواری طوائف زادیاں اس کے عشق میں گرفتار ہوئیں اور الٹے رستے پر چل کر اپنی زندگی کے سنہرے ایام اس کے تلون کی نذر کر بیٹھیں۔ صلاحو کُھل کھیل رہا تھا۔ دودے کو معلوم تھا کہ یہ کھیل دیر تک جاری نہیں رہے گا۔ وہ عمر میں صلاحو سے دگنا بڑا تھا۔ اس نے ہیرامنڈی میں بڑے بڑے سیٹھوں کی خاک اڑتے دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہیرامنڈی ایک ایسا اندھا کنواں ہے جس کو دنیا بھر کے سیٹھ مل کر بھی اپنی دولت سے نہیں بھر سکتے۔ مگر وہ اس کو کوئی نصیحت نہیں دیتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جہاندیدہ ہونے کے باعث اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جو بھوت اس کے حسین و جمیل بابو کے سر پر سوار ہے، اسے کوئی ٹونا ٹوٹکا اتار نہیں سکتا۔ دودا پہلوان ہر وقت صلاحو کے ساتھ ہوتا تھا۔ شروع شروع میں جب صلاحو نے ہیرامنڈی کا رخ کیا تو اس کا خیال تھا کہ دودا بھی اس کے عیش میں شریک ہو گا مگر آہستہ آہستہ اسے معلوم ہوا کہ اس کو اس قسم کے عیش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس میں وہ دن رات غرق رہتا تھا۔ وہ گانا سنتا تھا، شراب پیتا تھا۔ طوائفوں سے فحش مذاق بھی کرتا تھا۔ مگر اس سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔ اس کا بابو رات رات بھر اندر کسی معشوق کو بغل میں دبائے پڑا رہتا اور وہ باہر کسی پہرے دار کی طرح جاگتا رہتا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ دودے نے اپنا گھر بھر لیا ہے۔ دولت کی لوٹ مچی ہے۔ اس میں اس نے یقیناً اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب صلاحو دادِ عیش دینے کو نکلتا تھا ہزاروں نوٹ دودے ہی کی تحویل میں ہوتے تھے۔ مگر یہ صرف اسی کو معلوم تھا کہ پہلوان نے ان میں سے ایک پائی بھی کبھی اِدھر اُدھر نہیں کی۔ اس کو صرف صلاحو سے دلچسپی تھی، جس کو اپنا آقا سمجھتا تھا اور یہ لوگ بھی جانتے تھے کہ دودا کس حد تک اس کا غلام ہے۔ صلاحو اس کو ڈانٹ ڈپٹ لیتا تھا۔ بعض اوقات شراب کے نشے میں اسے مارپیٹ بھی لیتا تھا مگر وہ خاموش رہتا۔ حسین و جمیل صلاحو اس کا معبود تھا۔ وہ اس کے حضور کوئی گستاخی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے دودا بیمار تھا۔ صلاحو رات کو حسبِ معمول عیش کرنے کے لیے ہیرامنڈی پہنچا۔ وہاں کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سننے کے دوران میں اس کی جھڑپ ایک تماش بین سے ہو گئی اور ہاتھا پائی میں اس کے ماتھے پر ہلکی سی خراش آ گئی۔ دودے کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے دیوار کے ساتھ ٹکر مار مار کر اپنا سارا سر زخمی کر لیا۔ خود کو بے شمار گالیاں دیں۔ بہت برا بھلا کہا۔ اس کو اتنا افسوس ہوا کہ دس پندرہ دن تک صلاحو کے سامنے اس کا سر جھکا رہا۔ ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا۔ اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ چنانچہ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ بہت دیر تک نمازیں پڑھ پڑھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا رہا۔ صلاحو کی وہ اس طرح خدمت کرتا تھا جس طرح پرانے قصے کہانیوں کے وفادار نوکر کرتے ہیں۔ وہ اس کے جوتے پالش کرتا تھا۔ اس کے پاؤں دابتا تھا۔ اس کے چمکیلے بدن پر مالش کرتا تھا۔ اس کے ہر آرام اور آسائش کا خیال رکھتا تھا جیسے اس کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ کبھی کبھی صلاحو ناراض ہو جاتا۔ یہ وقت دودے پہلوان کے لیے بڑی آزمائش کا وقت ہوتا تھا۔ دنیا سے بیزار ہو جاتا۔ فقیروں کے پاس جا کر تعویذ گنڈے لے لیتا۔ خود کو طرح طرح کی جسمانی تکلیف پہنچاتا۔ آخر جب صلاحو موج میں آ کر اسے بلاتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ دونوں جہان مل گئے ہیں۔ دودے کو اپنی طاقت پر ناز نہیں تھا، اسے یہ بھی گھمنڈ نہیں تھا کہ وہ چھری مارنے کے فن میں یکتا ہے۔ اس کو اپنی ایمانداری اور اپنے خلوص پر بھی کوئی فخر نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی اس بات پر بہت نازاں تھا کہ لنگوٹ کا پکا ہے۔ وہ اپنے دوستوں، یاروں کو بڑے فخر و امتیاز سے بتایا کرتا تھا کہ اس کی جوانی میں سینکڑوں مرد عورتیں آئیں، چلتروں کے بڑے بڑے منتر اس پر پھونکے مگر وہ۔ شاباش ہے اس کے استاد کو، لنگوٹ کا پکا رہا۔ یہ بڑ نہیں تھی۔ ان لوگوں کو جو دودے پہلوان کے لنگوٹیے تھے، اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا دامن عورت کی تمام آلائشوں سے پاک ہے۔ متعدد بار کوشش کی گئی کہ وہ گمراہ ہو جائے مگر ناکامی ہوئی۔ وہ ثابت قدم رہا۔ خود صلاحو نے کئی بار اس کا امتحان لیا۔ اجمیر کے عرس پر اس نے میرٹھ کی ایک کافر ادا طوائف انوری کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ دودے پہلوان پر ڈورے ڈالے۔ اس نے اپنے تمام گُر استعمال کر ڈالے مگر دودے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ عرس ختم ہونے پر جب وہ لاہور روانہ ہوئی تو گاڑی میں اس نے صلاحو سے کہا۔

”باؤ! بس اب میرا کوئی امتحان نہ لینا۔ یہ سالی انوری بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ تمہارا خیال تھا ورنہ گلا گھونٹ دیتا حرام زادی کا۔“

اس کے بعد صلاحو نے اس کا اور کوئی امتحان نہ لیا۔ دودے کے یہ تنبیہی الفاظ کافی تھے جو اس نے بڑے سنگین لہجے میں ادا کیے تھے۔ صلاحو عیش و عشرت میں بدستور غرق تھا۔ اس لیے کہ ابھی تین چار مکان باقی تھے۔ ہیرامنڈی کی تمام قابلِ ذکر طوائفیں ایک ایک کر کے اس کے پہلو میں آ چکی تھیں۔ اب اس نے چھوٹے جاموں کا دور شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران میں ایک دم کہیں سے ایک طوائف الماس پیدا ہو گئی جو ایک دم ساری ہیرامنڈی پر چھا گئی۔ ہاتھ لگائے میلی ہوتی ہے۔ پانی پیتی ہے تو اس کے شفاف حلق میں سے نظر آتا ہے۔ ہرنی کی سی آنکھیں ہیں جن میں خدا نے اپنے ہاتھ سے سرمہ لگایا ہے۔ بدن ایسا ملائم ہے کہ نگاہیں پھسل پھسل جاتی ہیں۔ صلاحو جہاں بھی جاتا ہے، اس پری چہرہ اور حور شمائل معشوقہ کے حسن و جمال کی باتیں سنتا تھا۔ دودے پہلوان نے فوراً پتہ لگایا اور اپنے بابو کو بتایا کہ یہ الماس کشمیر سے آئی ہے۔ واقعی خوب صورت ہے، ادھیڑ عمر کی ماں اس کے ساتھ ہے جو اس پر بہت کڑی نگرانی رکھتی ہے۔ اس لیے کہ وہ لاکھوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جب الماس کا مجرا شروع ہوا تو اس کے کوٹھے پر صرف وہی صاحبِ ثروت جاتے تھے جن کا لاکھوں کا کاروبار تھا۔ صلاحو کے پاس اب اتنی دولت نہیں تھی کہ وہ ان تکڑے دولت مند عیاشوں کا مقابلہ خم ٹھونک کے کر سکے۔ آٹھ دس مجروں ہی میں اس کی حجامت ہو جاتی۔ چنانچہ وہ اسی خیال کے تحت خاموش رہا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ دودا پہلوان اپنے بابو کی یہ بے چارگی دیکھتا تو اسے بہت دکھ ہوتا۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے پاس تھا ہی کیا۔ ایک صرف اس کی جان تھی مگر وہ

اس معاملے میں کیا کام دے سکتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر دودے نے ایک ترکیب سوچی جو یہ تھی کہ صلاحو، الماس کی ماں اقبال سے رابطہ پیدا کرے۔ اس پر یہ ظاہر ہے کہ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس طرح جب موقع ملے تو الماس کو اپنے قبضے میں کر لے۔ صلاحو کو یہ ترکیب پسند آئی۔ چنانچہ فوراً اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اقبال بہت خوش ہوئی کہ اس ڈھلتی عمر میں اسے صلاحو جیسا خوبرو چاہنے والا مل گیا۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اس دوران سینکڑوں مرتبہ الماس صلاحو کے سامنے آئی۔ بعض اوقات اس کے پاس بیٹھ کر باتیں بھی کرتی رہی اور اس کے حسن سے کافی متاثر ہوئی۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ اس کی ماں سے کیوں دلچسپی لے رہا ہے جب کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ لیکن اس کی یہ حیرت بہت دیر تک قائم نہ رہی۔ جب اس کو صلاحو کی حرکات و سکنات سے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ چال چل رہا ہے، اس انکشاف سے اسے خوشی ہوئی۔ اندرونی طور پر اس کے احساس جوانی کو بڑی ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ایک دن صلاحو کا ذکر آیا تو الماس نے اس کی خوبصورتی کی تعریف ذرا چٹخارے کے ساتھ بیان کی جو اس کی ماں اقبال کو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ ان دونوں میں خوب چخ چخ ہوئی۔ الماس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ صلاحو اسے بیوقوف بنا رہا ہے۔ اقبال کو بہت دکھ ہوا۔ یہاں اب بیٹی کا سوال نہیں تھا بلکہ رقیب کا یا موت کا۔ چنانچہ دوسرے روز جب صلاحو آیا تو اس نے سب سے پہلے اس سے پوچھا۔

”آپ کسے پسند کرتے ہیں، مجھے یا میری بیٹی الماس کو؟“

صلاحو عجب مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس کو بالآخر یہی کہنا پڑا

”تمہیں، میں تو صرف تمہیں پسند کرتا ہوں“

اور پھر اسے اقبال کو مزید یقین دلانے کے لیے اور بہت سی باتیں گھڑنا پڑیں۔ اقبال یوں تو بہت چالاک تھی مگر اس کو کسی حد تک یقین آ ہی گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی عمر کے ایسے موڑ پر پہنچ چکی تھی جہاں اسے چند جھوٹی باتوں کو بھی سچا سمجھنا ہی پڑتا تھا۔ جب یہ بات الماس تک پہنچی تو وہ بہت جزبز ہوئی۔ جونہی اسے موقع ملا، اس نے صلاحو کو پکڑ لیا اور اس سے سچ اگلوانے کی کوشش کی۔ صلاحو زیادہ دیر تک اس کی جرح برداشت نہ کر سکا۔ آخر اسے ماننا ہی پڑا کہ اسے اقبال سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل میں تو الماس کا حصول ہی اس کے پیش نظر ہے۔ یہ قبولوانے پر الماس کی تسلی ہوئی، مگر وہ لگاؤ جو اس کے دل و دماغ میں صلاحو کے متعلق پیدا ہوا تھا، غائب ہو گیا اور اس نے ٹھیٹ طوائف بن کر اپنی ماں کو سمجھایا کہ بچپنا چھوڑ دو اور اس سے میرے دام وصول کرو، تمہیں وہ کیا دے گا۔ اپنی لڑکی کی یہ عقل والی بات اقبال کی سمجھ میں آ گئی اور وہ صلاحو کو دوسری نظر سے دیکھنے لگی۔ صلاحو بھی سمجھ گیا کہ اس کا وار خالی گیا ہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ نیلام میں الماس کی سب سے بڑھ کر بولی دے۔ دودے پہلوان نے ادھر ادھر سے کرید کر معلوم کیا کہ الماس کی نتھنی اتر سکتی ہے اگر صلاحو پچیس ہزار روپے اس کی ماں کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔ صلاحو اب پوری طرح جکڑا جا چکا تھا۔ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ اس نے دو مکان بیچے اور پچیس ہزار روپے حاصل کر کے اقبال کے پاس پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اتنی رقم پیدا نہیں کر سکے گا۔ جب وہ لے آیا، تو وہ بوکھلا سی گئی۔ الماس سے مشورہ کیا تو اس نے کہا اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے اس سے کہو کہ ہمارے ساتھ کلیر شریف کے عرس پر چلے۔ صلاحو کو جانا پڑا اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پورے پندرہ ہزار روپے مجروں میں اڑ گئے۔ اس کی ان تماش بینوں پر جو عرس میں شریک ہوئے تھے، دھاک تو بیٹھ گئی مگر اس کے پچیس ہزار روپوں کو دیمک لگ گئی۔ واپس آئے تو باقی کا روپیہ آہستہ آہستہ الماس کی فرمائشوں کی نذر ہو گیا۔ دودا اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اقبال اور الماس، دونوں کا سر اڑا دے۔ مگر اسے اپنے بابو کا خیال تھا۔ اس کے دل میں بہت سی باتیں تھیں جو وہ صلاحو کو بتانا چاہتا تھا، مگر بتا نہیں سکتا تھا۔ اس سے اسے اور بھی جھنجھلاہٹ ہوتی۔ صلاحو بہت بری طرح الماس پر لٹو تھا۔ پچیس ہزار روپے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ اب وہ دس ہزار روپے اس مکان کو گروی رکھ کر اجاڑ رہا تھا جس میں اس کی نیک سیرت ماں رہتی تھی۔ یہ روپیہ کب تک اس کا ساتھ دیتا۔ اقبال اور الماس دونوں جونک کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس پر نالش ہوئی اور عدالت نے اسے قرقی کا حکم دے دیا۔ صلاحو بہت پریشان ہوا، اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی ایسا آدمی جو اسے قرض دیتا۔ لے دے کر ایک مکان تھا، سو وہ بھی گروی تھا اور قرقی آئی ہوئی تھی، اور بیلف صرف دودے پہلوان کی وجہ سے رُکے ہوئے تھے جس نے ان کو یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد روپے کا بندوبست کر دے گا۔ صلاحو بہت ہنسا تھا کہ دودا کہاں سے روپے کا بندوبست کرے گا۔ سو دو سو روپے کی بات ہوتی تو اسے یقین آ جاتا۔ مگر سوال پورے دس ہزار روپے کا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلوان کا بڑی بے دردی سے مذاق اڑایا تھا کہ وہ اس کو طفل تسلیاں دے رہا ہے۔ پہلوان نے یہ لعن طعن خاموشی سے برداشت کی اور چلا گیا۔ دوسرے روز آیا تو اس کا شنگرف ایسا چہرہ زرد تھا۔ ایسا معلوم تھا کہ وہ بستر علالت پر سے اٹھ کر آیا ہے۔ سر نیوڑھا کر اس نے اپنے ڈب میں سے رومال نکالا جس میں سو سو کے کئی نوٹ تھے اور صلاحو سے کہا

”لے باؤ۔ لے آیا ہوں۔“

صلاحو نے نوٹ گنے۔ پورے دس ہزار تھے۔ ٹکر ٹکر پہلوان کا منہ دیکھنے لگا۔

”یہ روپیہ کہاں سے پیدا کیا تم نے؟“

دودے نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

”ہو گیا پیدا کہیں سے۔“

صلاحو قرقی کو بھول گیا۔ اتنے سارے نوٹ دیکھے تو اس کے قدم پھر الماس کے کوٹھے کی طرف اٹھنے لگا۔ مگر پہلوان نے اسے روکا۔

”نہیں باؤ۔ الماس کے پاس نہ جاؤ۔ یہ روپیہ قرقی والوں کو دو۔“

صلاحو نے بگڑے ہوئے بچے کی مانند کہا۔

”کیوں ؟۔ میں جاؤں گا الماس کے پاس۔“

دودے نے کڑے لہجے میں کہا۔

”تو نہیں جائے گا“!

صلاحو طیش میں آگیا۔

”تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا“!

دودے کی آواز نرم ہو گئی۔

”میں تیرا غلام ہوں باؤ۔ پر اب الماس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

دودے کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی۔

”نہ پوچھ باؤ۔ یہ روپیہ مجھے اسی نے دیا ہے۔“

صلاحو قریب قریب چیخ اٹھا۔

”یہ روپیہ الماس نے دیا ہے۔ تمہیں دیا ہے ؟“

”ہاں باؤ۔ اسی نے دیا ہے۔ مجھ پر بہت دیر سے مرتی تھی سالی، پر میں اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ تجھ پر تکلیف کا وقت آیا تو میرے دل نے کہا دودے چھوڑ اپنی قسم کو۔ تیرا باؤ تجھ سے قربانی مانگتا ہے۔ سو میں کل رات اس کے پاس گیا اور۔ اور۔ اور اس سے یہ سودا کر لیا۔“

دودے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

دو قومیں

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹودو قومیں

مختار نے شاردا کو پہلی مرتبہ جھرنوں میں سے دیکھا۔ وہ اوپر کوٹھے پر کٹا ہوا پتنگ لینے گیا تو اسے جھرنوں میں سے ایک جھلک دکھائی دی۔ سامنے والے مکان کی بالائی منزل کی کھڑکی کھلی تھی۔ ایک لڑکی ڈونگا ہاتھ میں لیے نہا رہی تھی۔ مختار کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ لڑکی کہاں سے آگئی، کیونکہ سامنے والے مکان میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ جو تھیں، بیاہی جا چکی تھیں۔ صرف روپ کور تھی۔ اس کا پلپلا خاوند کالو مل تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے اور بس۔ مختار نے پتنگ اٹھایا اور ٹھٹھک کے رہ گیا۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی اس کے ننگے بدن پر سنہرے روئیں تھے۔ ان میں پھنسی ہوئی پانی کی ننھی ننھی بوندنیاں چمک رہی تھیں۔ اس کا رنگ ہلکا سانولا تھا، سانولا بھی نہیں۔ تانبے کے رنگ جیسا، پانی کی ننھی ننھی بوندنیاں ایسی لگتی تھیں جیسے اس کا بدن پگھل کر قطرے قطرے بن کر گر رہا ہے۔ مختار نے جھرنے کے سوراخوں کے ساتھ اپنی آنکھیں جما دیں اور اس لڑکی کے جو ڈونگا ہاتھ میں لیے نہا رہی تھی، دلچسپی اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی تھی گیلے سینے پر اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیاں جن پر پانی کے قطرے پھسل رہے تھے بڑی دلفریب تھیں۔ اس کو دیکھ کر مختار کے دل و دماغ میں سفلی جذبات پیدا نہ ہوئے۔ ایک جوان، خوبصورت، اور بالکل ننگی لڑکی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ مختار کے اندر شہوانی ہیجان برپا ہو جاتا، مگر وہ بڑے ٹھنڈے انہاک سے اسے دیکھ رہا تھا، جیسے کسی مصور کی تصویر دیکھ رہا ہے۔ لڑکی کے نچلے ہونٹ کے اختتامی کونے پر بڑا سا تل تھا۔ بے حد متین، بے حد سنجیدہ، جیسے وہ اپنے وجود سے بے خبر ہے، لیکن دوسرے اس کے وجود سے آگاہ ہیں، صرف اس حد تک کہ اسے وہیں ہونا چاہیے تھا جہاں کہ وہ تھا۔ بانھوں پر سنہرے روئیں پانی کی بوندوں کے ساتھ لپٹے ہوئے چمک رہے تھے اس کے سر کے بال سنہرے نہیں، بھوسلے تھے جنہوں نے شاید سنہرے ہونے سے انکار کر دیا جسم سڈول اور گدرایا ہوا تھا لیکن اس کو دیکھنے سے اشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مختار دیر تک جھرنے کے ساتھ آنکھیں جمائے رہا۔ لڑکی نے بدن پر صابن ملا۔ مختار تک اس کی خوشبو پہنچی۔ سلونے، تانبے جیسے رنگ والے بدن پر سفید سفید جھاگ بڑے سہانے معلوم ہوتے تھے۔ پھر جب یہ جھاگ پانی کے بہاؤ سے پھسلے تو مختار نے محسوس کیا جیسے اس لڑکی نے اپنا بلبلوں کا لباس بڑے اطمینان سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔ غسل سے فارغ ہو کر لڑکی نے تولیے سے اپنا بدن پونچھا۔ بڑے سکون اور اطمینان سے آہستہ آہستہ کپڑے پہنے۔ کھڑکی کے ڈنڈے پر دونوں ہاتھ رکھے اور سامنے دیکھا۔ ایک دم اس

کی آنکھیں شرماہٹ کی جھیلوں میں غرق ہو گئیں اس نے کھڑکی بند کر دی۔ مختار بے اختیار ہنس پڑا۔ لڑکی نے فوراً کھڑکی کے پٹ کھولے اور بڑے غصے میں جھرنے کی طرف دیکھا۔ مختار نے کہا

”میں قصوروار بالکل نہیں۔ آپ کیوں کھڑکی کھول کر نہا رہی تھیں۔“

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ غیض آلود نگاہوں سے جھرنے کو دیکھا اور کھڑکی بند کر لی۔ چوتھے دن روپ کور آئی۔ اس کے ساتھ یہی لڑکی تھی۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں سلائی اور کروشیے کے کام کی ماہر تھیں، گلی کی اکثر لڑکیاں ان سے یہ کام سیکھنے کیلیے آیا کرتی تھیں۔ روپ کور بھی اس لڑکی کو اسی غرض سے لائی تھی کیونکہ اس کو کروشیے کے کام کا بہت شوق تھا۔ مختار اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو اس نے روپ کور کو پرنام کیا۔ لڑکی پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ سمٹ سی گئی۔ مختار مسکرا کر وہاں سے چلا گیا۔ لڑکی روزانہ آنے لگی۔ مختار کو دیکھتی تو سمٹ جاتی۔ آہستہ آہستہ اس کا یہ ردعمل دور ہوا اور اس کے دماغ سے یہ خیال کسی قدر محو ہوا کہ مختار نے اسے نہاتے دیکھا تھا۔ مختار کو معلوم ہوا کہ اس کا نام شاردرا ہے۔ روپ کور کے چچا کی لڑکی ہے یتیم ہے۔ چیچو کی ملیاں میں ایک غریب رشتہ دار کے ساتھ رہتی تھی۔ روپ کور نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ انٹرنس پاس ہے۔ بڑی ذہین ہے، کیونکہ اس نے کروشیے کا مشکل سے مشکل کام یوں چٹکیوں میں سیکھ لیا تھا۔ دن گزرتے تھے۔ اس دوران میں مختار نے محسوس کیا کہ وہ شاردا کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہوا۔ جب مختار نے اس کو پہلی بار جھرنے میں سے دیکھا تھا تو اس وقت اس کے سامنے ایک نظارہ تھا بڑا فرحت ناک نظارہ۔ لیکن اب شاردا آہستہ آہستہ اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی، مختار نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ یہ محبت کا معاملہ بالکل غلط ہے، اس لیے کہ شاردا ہندو ہے۔ مسلمان کیسے ایک ہندو لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ مختار نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے محبت کے جذبے کو مٹا نہ سکا۔ شاردا اب اس سے باتیں کرنے لگی تھی مگر کھل کے نہیں اس کے دماغ میں مختار کو دیکھتے ہی یہ احساس بیدار ہو جاتا تھا کہ وہ ننگی نہا رہی تھی اور مختار جھرنے میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک روز گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں کسی عزیز کے چالیسویں پر گئی ہوئی تھیں۔ شاردا حسب معمول اپنا تھیلا اٹھائے صبح دس بجے آئی۔ مختار صحن میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ شاردا نے اس سے پوچھا۔

”بہن جی کہاں ہیں۔“

مختار کے ہاتھ کانپنے لگے۔

”وہ۔ وہ کہیں باہر گئی ہے۔“

شاردا نے پوچھا۔

”ماتا جی؟“

مختار اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”وہ۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی گئی ہیں۔“

”اچھا!‘ یہ کہہ کر شاردا نے کسی قدر گھبرائی ہوئی نگاہوں سے مختار کو دیکھا اور نمستے کر کے چلنے لگی۔ مختار نے اس کو روکا

”ٹھہرو شاردا“!

شاردرا کو جیسے بجلی کے کرنٹ نے چھو لیا۔ چونک کر رک گئی۔

”جی؟“

مختار چارپائی پر سے اٹھا

”بیٹھ جاؤ۔ وہ لوگ ابھی آ جائیں گے“!

”جی نہیں۔ میں جاتی ہوں“

یہ کہہ کر بھی شاردرا کھڑی رہی۔ مختار نے بڑی جرات سے کام لیا۔ آگے بڑھا۔ اس کی ایک کلائی پکڑی اور کھینچ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مختار اور شادرا دونوں کو ایک لحظے کے لیے بالکل پتا نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد دونوں لرزنے لگے۔ مختار نے صرف اتنا کہا۔

”مجھے معاف کر دینا“!

شاردرا خاموش کھڑی رہی۔ اس کا تانبے جیسا رنگ سرخی مائل ہو گیا۔ ہونٹوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی جیسے وہ چھیڑے جانے پر شکایت کر رہے ہیں۔ مختار اپنی حرکت اور اس کے نتائج بھول گیا۔ اس نے ایک بار پھر شاردرا کو اپنی طرف کھینچا اور سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ شاردا نے مزاحمت نہ کی۔ وہ صرف مجسمہ حیرت بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک سوال بن گئی تھی۔ ایک

ایسا سوال جو اپنے آپ سے کیا گیا ہو۔ وہ شاید خود سے پوچھ رہی تھی یہ کیا ہوا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟۔ کیا اسے ہونا چاہیے تھا۔ کیا ایسا کسی اور سے بھی ہوا ہے؟ مختار نے اسے چارپائی پر بٹھا لیا اور پوچھا

”تم بولتی کیوں نہیں ہو شادرا؟“

شادرا کے دوپٹے کے پیچھے اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مختار کو اس کا یہ سکوت بہت پریشان کن محسوس ہوا۔

”بولو شاردرا۔ اگر تمھیں میری یہ حرکت بری لگی ہے تو کہہ دو۔ خدا کی قسم میں معافی مانگ لوں گا۔ تمھاری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا میں نے کبھی ایسی جرات نہ کی ہوتی، لیکن جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ دراصل۔ دراصل مجھے تم سے محبت ہے۔“

شاردرا کے ہونٹ ہلے جیسے انھوں نے لفظ

”محبت“

ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختار نے بڑی گرمجوشی سے کہنا شروع کیا۔

”مجھے معلوم نہیں تم محبت کا مطلب سمجھتی ہو کہ نہیں۔ میں خود اس کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں رکھتا، صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمھیں چاہتا ہوں۔ تمھاری ساری ہستی کو اپنی اس مٹھی میں لے لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں اپنی ساری زندگی تمھارے حوالے کر دوں گا۔ شاردا تم بولتی کیوں نہیں ہو؟“

شاردا کی آنکھیں خواب گو ہو گئیں۔ مختار نے پھر بولنا شروع کر دیا۔

”میں نے اس روز جھرنے میں سے تمھیں دیکھا۔ نہیں۔ تم مجھے خود دکھائی دیں۔ وہ ایک ایسا نظارہ تھا جو میں تا قیامت نہیں بھول سکتا۔ تم شرماتی کیوں ہو۔ میری نگاہوں نے تمھاری خوبصورت چرائی تو نہیں۔ میری آنکھوں میں صرف اس نظارے کی تصویر ہے۔ تم اسے زندہ کر دو تو میں تمھارے پاؤں چوم لوں گا۔“

یہ کہہ کر مختار نے شاردرا کا ایک پاؤں چوم لیا۔ وہ کانپ گئی۔ چارپائی پر سے ایک دم اٹھ کر اس نے لرزاں آواز میں کہا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟۔ ہمارے دھرم میں۔“

مختار خوشی سے اچھل پڑا۔

”دھرم ورم کو چھوڑے۔ پریم کے دھرم میں سب ٹھیک ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے شاردا کو چومنا چاہا۔ مگر وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹی اور بڑے شرمیلے انداز میں مسکراتی بھاگ گئی۔ مختار نے چاہا کہ وہ اڑ کر ممٹی پر پہنچ جائے۔ وہاں سے نیچے صحن میں کودے اور ناچنا شروع کر دے۔ مختار کی والدہ اور بہن آ گئیں تو شاردا آئی۔ مختار کو دیکھ کر اس نے فوراً نگاہیں نیچی کر لیں۔ مختار وہاں سے کھسک گیا کہ راز افشانہ ہو۔ دوسرے روز اوپر کوٹھے پر چڑھا۔ جھرنے میں سے جھانکا تو دیکھا کہ شاردا کھڑکی کے پاس کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ مختار نے اس کو آواز دی۔

”شاردا۔“

شادرا چونکی۔ کنگھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گلی میں جا گری۔ مختار ہنسا۔ شاردرا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مختار نے اس سے کہا

”کتنی ڈرپوک ہو تم۔ ہولے سے آواز دی اور تمھاری کنگھی چھوٹ گئی۔“

شاردرا نے کہا۔

”اب لا کے دیجیے نئی کنگھی مجھے۔ یہ تو موری میں جا گری ہے۔“

مختار نے جواب دیا۔

”ابھی لاؤں۔“

شاردرا نے فوراً کہا۔

”نہیں نہیں۔ میں نے تو مذاق کیا ہے۔“

”میں نے بھی مذاق کیا تھا۔ تمھیں چھوڑ کر میں میں کنگھی لینے جاتا؟۔ کبھی نہیں“!

شاردرا مسکرائی۔

”میں بال کیسے بناؤں۔“

مختار نے جھرنے کے سوراخوں میں اپنی انگلیاں ڈالیں۔

”یہ میری انگلیاں لے لو“!

شاردرا ہنسی۔ مختار کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری عمر اس ہنسی کی چھاؤں میں گزار دے۔

”شاردا، خدا کی قسم، تم ہنسی ہو، میرا رؤاں رؤاں شادماں ہو گیا ہے۔ تم کیوں اتنی پیاری ہو؟۔ کیا دنیا میں کوئی اور لڑکی بھی تم جتنی پیاری ہو گی۔ یہ کم بخت جھرنے۔ یہ مٹی کے ذلیل پردے۔ جی چاہتا ہے ان کو توڑ پھوڑ دوں۔“

شاردا پھر ہنسی۔ مختار نے کہا۔

”یہ ہنسی کوئی اور نہ دیکھے، کوئی اور نہ سنے۔ شاردا صرف میرے سامنے ہنسنا۔ اور اگر کبھی ہنسنا ہو تو مجھے بلا لیا کرو۔ میں اس کے ارد گرد اپنے ہونٹوں کی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔“

شاردرا نے کہا۔

”آپ باتیں بڑی اچھی کرتے ہیں۔“

”تو مجھے انعام دو۔ محبت کی ایک ہلکی سی نگاہ ان جھرنوں سے میری طرف پھینک دو۔ میں اسے اپنی پلکوں سے اٹھا کر اپنی آنکھوں میں چھپا لوں گا۔“

مختار نے شاردا کے عقب میں دور ایک سایہ سا دیکھا اور فوراً جھرنے سے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو کھڑکی خالی تھا۔ شاردرا جا چکی تھی۔ آہستہ آہستہ مختار اور شاردرا دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ تنہائی کا موقعہ ملتا تو دیر تک پیار محبت کی باتیں کرتے رہتے۔ ایک دن روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالو مل کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مختار گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کو ایک کنکر لگا۔ اس نے اوپر دیکھا شاردا تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔ مختار اس کے پاس پہنچ گیا۔ پورا تخلیہ تھا۔ خوب گھل مل کے باتیں ہوئیں۔ مختار نے اس سے کہا۔

”اس روز مجھ سے گستاخی ہوئی تھی اور میں نے معافی مانگ لی تھی۔ آج پھر گستاخی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن معافی نہیں مانگوں گا“

اور اپنے ہونٹ شاردرا کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ شاردرا نے شرمیلی شرارت سے کہا۔

”اب معافی مانگئے۔“

”جی نہیں۔ اب یہ ہونٹ آپ کے نہیں۔ میرے ہیں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔“

شاردا نے نگاہیں نیچی کر کے کہا۔

”یہ ہونٹ کیا۔ میں ہی آپ کی ہوں۔“

مختار ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”دیکھو شاردا۔ ہم اس وقت ایک آتش فشاں پہاڑ پر کھڑے ہیں تم سوچ لو، سمجھ لو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا کہ تمہارے سوا میری زندگی میں اور کوئی عورت نہیں آئے گی۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ زندگی بھر میں تمہارا رہوں گا۔ میری محبت ثابت قدم رہے گی۔ کیا تم بھی اس کا عہد کرتی ہو“!

شاردرا نے اپنی نگاہیں اٹھا کر مختار کی طرف دیکھا۔

”میرا پریم سچا ہے۔“

مختار نے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور کہا۔

”زندہ رہو۔ صرف میرے لیے، میری محبت کے لیے وقف رہو۔ خدا کی قسم شاردا۔ اگر تمہارا التفات مجھے نہ ملتا تو میں یقیناً خود کشی کر لیتا۔ تم میری آغوش میں ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی خوشیوں سے میری جھولی بھری ہوئی ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔“

شاردا نے اپنا سر مختار کے کندھے پر گرا دیا۔

”آپ باتیں کرنا جانتے ہیں۔ مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں کہی جاتی۔“

دیر تک دونوں ایک دوسرے میں مدغم رہے۔ جب مختار وہاں سے گیا تو اس کی روح ایک نئی اور سہانی لذت سے معمور تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا دوسرے دن کلکتے چلا گیا جہاں اس کا باپ کاروبار کرتا تھا۔ آٹھ دن کے بعد واپس آیا۔ شاردا حسبِ معمول کروشیے کا کام سیکھنے مقررہ وقت پر آئی۔ اس کی نگاہوں نے اس سے کئی باتیں کیں۔ کہاں غائب رہے اتنے دن؟۔ مجھ سے کچھ نہ کہا اور کلکتے چلے گئے؟۔ محبت کے بڑے دعوے کرتے تھے؟۔ میں نہیں بولوں گی تم سے۔ میری طرف کیا دیکھتے ہو، کیا کہنا چاہتے ہو مجھ سے؟۔ مختار بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تنہائی نہیں تھی۔ وہ کافی طویل گفتگو اس سے کرنا چاہتا تھا۔ دو دن گزر گئے، موقعہ نہ ملا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں گونگی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر تیسرے روز شاردا نے اسے بلایا۔ مختار بہت خوش ہوا۔ روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالہ مل گھر میں نہیں تھے۔ شاردا سیڑھیوں میں ملی۔ مختار نے وہیں اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگانا چاہا، وہ تڑپ کر اوپر چلی گئی۔ ناراض تھی۔ مختار نے اس سے کہا۔

”دیکھ میری جان، میرے پاس بیٹھو، میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی باتیں جن کا ہماری زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔“

شاردا اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

”تم بات ٹالو نہیں۔ بتاؤ مجھے بتائے بغیر کلکتے کیوں گئے۔ سچ میں بہت روئی۔“

مختار نے بڑھ کر اس کی آنکھیں چومیں۔

”اس روز میں جب سے گیا تو ساری رات سوچتا رہا۔ جو کچھ اس روز ہوا اس کے بعد یہ سوچ بچار لازمی تھی۔ ہماری حیثیت میاں بیوی کی تھی۔ میں نے غلطی کی۔ تم نے کچھ نہ سوچا۔ ہم نے ایک ہی جست میں کئی منزلیں طے کرلیں اور یہ غور ہی نہ کیا کہ ہمیں جانا کس طرف ہے۔ سمجھ رہی ہو نا شاردا۔“

شاردا نے آنکھیں جھکالیں۔

”جی ہاں۔“

”میں کلکتے اس لیے گیا تھا کہ اباجی سے مشورہ کروں۔ تمھیں سن کر خوشی ہوگی میں نے ان کو راضی کرلیا ہے۔

”مختار کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ شاردا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا۔

”میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ میں اب تم سے شادی کرسکتا ہوں۔“

شاردا نے ہولے سے کہا۔

”شادی۔“

”ہاں شادی۔“

شاردا نے پوچھا۔

”کیسے ہو سکتی ہے ہماری شادی؟“

مختار مسکرایا۔

”اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ تم مسلمان ہو جانا“!

شاردا ایک دم چونکی۔

”مسلمان۔“

مختار نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”ہاں ہاں۔ اس کے علاوہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گھر والے بڑا ہنگامہ مچائیں گے لیکن میں نے اس کا انتظار کرلیا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے غائب ہو جائینگے سیدھے کلکتے چلیں گے۔ باقی کام اباجی کے سپرد ہے جس روز وہاں پہنچیں گے اسی روز مولوی بلا کر تمہیں مسلمان بنادیں گے۔ شادی بھی اسی وقت ہو جائے گی۔“

شاردا کے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیے۔ مختار نے اس کی طرف دیکھا۔

”خاموش کیوں ہو گئیں۔“

شاردا نہ بولی۔ مختار کو بڑی الجھن ہوئی۔

”بتاؤ شاردا کیا بات ہے؟“

شاردا نے بہ مشکل اتنا کہا۔

”تم ہندو ہو جاؤ۔“

”میں ہندو ہو جاؤں؟“

مختار کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ ہنسا

”میں ہندو کیسے ہو سکتا ہوں۔“

”میں کیسے مسلمان ہو سکتی ہوں۔“

شاردا کی آوار مدھم تھی۔

”تم کیوں مسلمان نہیں ہو سکتیں۔ میرا مطلب ہے کہ۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس کے علاوہ اسلام سب سے اچھا مذہب ہے۔ ہندو مذہب بھی کوئی مذہب ہے۔ گائے کا پیشاب پیتے ہیں۔ بت پوجتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ٹھیک ہے اپنی جگہ یہ مذہب بھی۔ مگر اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

”مختار کے خیالات پریشان تھے۔“

تم مسلمان ہو جاؤ گی تو بس۔ میرا مطلب ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

شاردرا کے چہرے کا تانبے جیسا زرد رنگ زرد پڑ گیا۔

”آپ ہندو نہیں ہونگے؟“

مختار ہنسا۔

”پاگل ہو تم؟“

شاردا کا رنگ اور زرد پڑ گیا۔

”آپ جائیے۔ وہ لوگ آنے والے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر سے اٹھی۔ مختار متحیر ہو گیا۔“

لیکن شاردا۔“

”نہیں نہیں جائیے آپ۔ جلدی جائیے۔ وہ آجائیں گے۔“

شاردا کے لہجے میں بے اعتنائی کی سردی تھی۔ مختار نے اپنے خشک حلق سے بہ مشکل یہ الفاظ نکالے

”ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

”شاردا تم ناراض کیوں ہو گئیں؟“

”جاؤ۔ چلے جاؤ۔ ہمارا ہندو مذہب بہت برا ہے۔ تم مسلمان بہت اچھے ہو۔

”شاردا کے لہجے میں نفرت تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ مختار اپنا اسلام سینے میں دبائے وہاں سے چلا گیا۔

دیکھ کبیرا رویا

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو دیکھ کبیرا رویا

نگر نگر ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ جو آدمی بھیک مانگے گا اس کو گرفتار کرایا جائے۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ لوگ خوشیاں منانے لگے کہ ایک بہت پرانی لعنت دور ہو گئی۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لوگوں نے پوچھا۔ اے جولاہے تو کیوں روتا ہے؟ کبیر نے رو کر کہا۔

”کپڑا جو چیزوں سے بنتا ہے۔ تانے اور پیٹے سے۔ گرفتاریوں کا تانا تو شروع ہو گیا پر پیٹ بھرنے کا پیٹا کہاں ہے؟“

ایک ایم اے۔ ایل ایل بی کو دو سو کھڈیاں الاٹ ہو گئیں۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایم اے۔ ایل ایل بی نے پوچھا۔

”اے جولاہے کے بچے تو کیوں روتا ہے؟۔ کیا اس لیے کہ میں نے تیرا حق غصب کر لیا ہے؟“

کبیر نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہارا قانون تمہیں یہ نکتہ سمجھاتا ہے کہ کھڈیاں پڑی رہنے دو، دھاگے کا جو کوٹا ملے اسے بیچ دو۔ مفت کی کھٹ کھٹ سے کیا فائدہ۔ لیکن یہ کھٹ کھٹ ہی جولاہے کی جان ہے“!

چھپی ہوئی کتاب کے فرمے تھے۔ جن کے چھوٹے بڑے لفافے بنائے جا رہے تھے۔ کبیر کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے وہ تین لفافے اٹھائے اور ان پر چھپی ہوئی تحریر پڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لفافے بننے والے نے حیرت سے پوچھا۔

”میاں کبیر تم کیوں رونے لگے؟“

کبیر نے جواب دیا۔

”ان کاغذوں پر بھگت سُورداس کی کویتا چھپی ہے۔ لفافے بنا کر اس کی بے عزتی نہ کرو۔“

لفافے بنانے والے نے حیرت سے کہا۔

”جس کا نام سُورداس ہے۔ وہ بھگت کبھی نہیں ہو سکتا۔“

کبیر نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ایک اونچی عمارت پر لکشمی کا بہت خوبصورت بت نصب تھا۔ چند لوگوں نے جب اسے اپنا دفتر بنایا تو اس بُت کو ٹاٹ کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ دفتر کے آدمیوں نے اسے ڈھارس دی اور کہا۔

”ہمارے مذہب میں یہ بت جائز نہیں۔“

کبیر نے ٹاٹ کے ٹکڑوں کی طرف اپنی نمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”خوبصورت چیز کو بدصورت بنا دینا بھی کسی مذہب میں جائز نہیں۔“

دفتر کے آدمی ہنسنے لگے۔ کبیر ڈھاریں مار مار کر رونے لگا۔ صف آرا فوجوں کے سامنے جرنیل نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”اناج کم ہے، کوئی پروا نہیں۔ فصلیں تباہ ہو گئی ہیں۔ کوئی فکر نہیں۔ ہمارے سپاہی دشمن سے بھوکے ہی لڑیں گے۔“

دو لاکھ فوجیوں نے زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ کبیر چلا چلا کے رونے لگا۔ جرنیل کو بہت غصہ آیا۔ چنانچہ وہ پکار اٹھا۔

”اے شخص، بتا سکتا ہے، تو کیوں روتا ہے؟“

کبیر نے رونی آواز میں کہا۔

”اے میرے بہادر جرنیل۔ بھوک سے کون لڑے گا۔“

دو لاکھ آدمیوں نے کبیر مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

”بھائیو، داڑھی رکھو مونچھیں کترواؤ اور شرعی پاجامہ پہنو۔ بہنو، ایک چوٹی کرو، سرخی سفیدہ نہ لگاؤ، برقع پہنو“!

۔بازار میں ایک آدمی چلا رہا تھا۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ چلّانے والے آدمی نے اور زیادہ چلّا کر پوچھا۔

”کبیر تو کیوں رونے لگا؟“

کبیر نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”تیرا بھائی ہے نہ تیری بہن، اور یہ جو تیری داڑھی ہے۔ اس میں تو نے وسمہ کیوں لگا رکھا ہے۔ کیا سفید اچھی نہیں تھی۔“

چلّانے والے نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ کبیر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایک جگہ بحث ہو رہی تھی۔

”ادب برائے ادب ہے۔“

”محض بکواس ہے، ادب برائے زندگی ہے۔“

”وہ زمانہ لد گیا۔ ادب، پروپیگنڈے کا دوسرا نام ہے۔“

”تمہاری ایسی کی تیسی۔“

”تمہارے اسٹالن کی ایسی کی تیسی۔“

”تمہارے رجعت پسند اور فلاں فلاں بیماریوں کے مارے ہوئے فلا بیئر اور بادلیئر کی ایسی کی تیسی“

کبیر رونے لگا بحث کرنے والے بحث چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک نے اس سے پوچھا۔

”تمہارے تحت الشعور میں ضرور کوئی ایسی چیز تھی جسے ٹھیس پہنچی۔“

دوسرے نے کہا۔

”یہ آنسو بورژوائی صدمے کا نتیجہ ہیں۔“

کبیر اور زیادہ رونے لگا۔ بحث کرنے والوں نے تنگ آ کر بیک زبان سوال کیا۔

”میاں، یہ بتاؤ کہ تم روتے کیوں ہو؟“

کبیر نے کہا۔

”میں اس لیے رویا تھا کہ آپ کی سمجھ میں آ جائے، ادب برائے ادب ہے یا ادب برائے زندگی۔“

بحث کرنے والے ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا۔

”یہ پرولتاری مسخرہ ہے۔“

دوسرے نے کہا۔

”نہیں یہ بورژوائی بہروپیا ہے۔“

کبیر کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ حکم نافذ ہو گیا کہ شہر کی تمام کسبی عورتیں ایک مہینے کے اندر شادی کر لیں اور شریفانہ زندگی بسر کریں۔ کبیر ایک چکلے سے گزرا تو کسبیوں کے اڑے ہوئے چہرے دیکھ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ ایک مولوی نے اس سے پوچھا۔

”مولانا۔ آپ کیوں رو رہے ہیں؟“

کبیر نے روتے ہوئے جواب دیا

”اخلاق کے معلّم ان کسبیوں کے شوہروں کے لیے کیا بندوبست کریں گے“

مولوی کبیر کی بات نہ سمجھا اور ہنسنے لگا۔ کبیر کی آنکھیں اور زیادہ اشک بار ہو گئیں۔ دس بارہ ہزار کے مجمع میں ایک آدمی تقریر کر رہا تھا۔

”بھائیو۔ بازیافتہ عورتوں کا مسئلہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس کا حل ہمیں سب سے پہلے سوچنا ہے اگر ہم غافل رہے۔ تو یہ عورتیں قحبہ خانوں میں چلی جائیں گی۔ فاحشہ بن جائیں گی۔ سن رہے ہو، فاحشہ بن جائیں گی۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان کو اس خوفناک مستقبل سے بچاؤ اور اپنے گھروں میں ان کے لیے جگہ پیدا کرو۔ اپنے اپنے بھائی، یا اپنے بیٹے کی شادی کرنے سے پہلے تمہیں ان عورتوں کو ہرگز ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ کبیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تقریر کرنے والا رُک گیا۔ کبیر کی طرف اشارہ کر کے اس نے بلند آواز میں حاضرین سے کہا۔

”دیکھو اس شخص کے دل پر کتنا اثر ہوا ہے۔“

کبیر نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”لفظوں کے بادشاہ، تمہاری تقریر نے میرے دل پر کچھ اثر نہیں کیا۔ میں نے جب سوچا کہ تم کسی مالدار عورت سے شادی کرنے کی خاطر ابھی تک کنوارے بیٹھے ہو تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔“

ایک دکان پر یہ بورڈ لگا تھا۔

”جناح بوٹ ہاؤس۔“

کبیر نے اسے دیکھا۔ تو زار و قطار رونے لگا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک آدمی کٹ مرا ہے۔ بورڈ پر آنکھیں جمی ہیں اور روئے جا رہا ہے۔ انھوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔

”پاگل ہے۔ پاگل ہے“!

ملک کا سب سے بڑا قائد چل بسا تو چاروں طرف ماتم کی صفیں بچھ گئیں۔ اکثر لوگ بازوؤں پر سیاہ بلے باندھ کر پھرنے لگے۔ کبیر نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سیاہ بلّے والوں نے اس سے پوچھا۔

”کیا دکھ پہنچا جو تم رونے لگے؟“

کبیر نے جواب دیا۔

”یہ کالے رنگ کی چندیاں اگر جمع کر لی جائیں تو سینکڑوں کی ستر پوشی کر سکتی ہیں۔“

سیاہ بلّے والوں نے کبیر کو پیٹنا شروع کر دیا۔ تم کمیونسٹ ہو، ففتھ کالمسٹ ہو۔ پاکستان کے غدار ہو۔“

کبیر ہنس پڑا۔

”لیکن دوستو، میرے بازو پر تو کسی رنگ کا بلّا نہیں۔“

دیوالی کے دِیے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹودیوالی کے دِیے

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دِیے ہانپتے ہوئے بچوں کے دل کی طرح دھڑک رہے تھے۔ مُنی دوڑتی ہوئی آئی۔ اپنی ننھی سی گھگری کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھائے چھت کے نیچے گلی میں موری کے پاس کھڑی ہو گئی۔

اس کی روتی ہوئی آنکھوں میں منڈیر پر پھیلے ہوئے دِیوں نے کئی چمکیلے نگینے جڑ دیے۔ اس کا ننھا سا سینہ دیے کی لو کی طرح کانپا، مسکرا کر اس نے اپنی مٹھی کھولی، پسینے سے بھیگا ہوا پیسہ دیکھا اور بازار میں دیے لینے کے لیے دوڑ گئی۔

چھت کی منڈیر پر شام کی خنک ہوا میں دیوالی کے دیے پھڑ پھڑاتے رہے۔ سریندر دھڑکتے ہوئے دل کو پہلو میں چھپائے چوروں کی مانند گلی میں داخل ہوا اور منڈیر کے نیچے بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ اس نے دِیوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ اسے ہوا میں اچھلتے ہوئے یہ شعلے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے رقصاں قطرے معلوم ہوئے۔

دفعتہً سامنے والی کھڑکی کھلی۔ سریندر سر تا پا نگاہ بن گیا۔ کھڑکی کے ڈنڈے کا سہارا لیکر ایک دوشیزہ نے جھک کر گلی میں دیکھا اور فوراً اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

کچھ اشارے ہوئے۔ کھڑکی چوڑیوں کی کھنکناہٹ کے ساتھ بند ہوئی اور سریندر وہاں سے مخموری کی حالت میں چل دیا۔ چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے دلہن کی ساڑھی میں ٹکے ہوئے تاروں کی طرح چمکتے رہے۔ سرجو کمہار لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور دم لینے کے لیے ٹھہر گیا۔ بلغم اس کی چھاتی میں سڑکیں کوٹنے والے انجن کی مانند پھر رہا ہے۔

گلے کی رگیں دمے کے دورے کے باعث دھونکنی کی طرح کبھی پھولتی تھیں کبھی سکڑ جاتی تھیں۔ اس نے گردن اٹھا کر جگمگ جگمگ کرتے دیوں کی طرف اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ دور۔ بہت دور۔ بہت سے بچے قطار باندھے کھیل کود میں مصروف ہیں۔ سرجُو کمہار کی لاٹھی منوں بھاری ہو گئی بلغم تھوک کر وہ پھر چیونٹی کی چال چلنے لگا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے جگمگاتے رہے۔ پھر ایک مزدور آیا۔ پھٹے ہوئے گریبان میں سے اس کی چھاتی کے بال برباد گھونسلوں کی تیلیوں کے مانند بکھر رہے تھے۔

دِیوں کی قطار کی طرف اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسمان کی گدلی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمک رہے ہیں۔ پھر اسے اپنے گھر کے اندھیارے کا خیال آیا اور وہ ان تھرکتے ہوئے شعلوں کی روشنی کنکھیوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے آنکھیں جھپکتے رہے۔ نئے اور چمکیلے بوٹوں کی چرچراہٹ کے ساتھ ایک آدمی آیا۔ اور دیوار کے قریب سگریٹ سلگانے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس کا چہرہ اشرفی پر لگی ہوئی مہر کے مانند جذبات سے عاری تھا۔ کالر چڑھی گردن اٹھا کر اس نے دِیوں کی طرف دیکھا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سی کٹھالیوں میں سونا پگھل رہا ہے۔ اس کے چرچراتے ہوئے چمکیلے جوتوں پر ناچتے ہوئے شعلوں کا عکس پڑ رہا تھا۔

وہ ان سے کھیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چھت کے منڈیر پر دیوالی کے دیے جلتے رہے۔ جو کچھ انھوں نے دیکھا، جو کچھ انھوں نے سنا، کسی کو نہ بتایا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور سب دیے ایک کر کے بُجھ گئے۔

ڈارلنگ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوڈارلنگ

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے۔ جب مشرقی اور مغربی پنجاب میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ کئی دن سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ آگ جو انجنوں سے نہ بجھ سکی تھی۔ اس بارش نے چند گھنٹوں ہی میں ٹھنڈی کر دی تھی۔ لیکن جانوں پر با قاعدہ حملے ہو رہے تھے اور جوان لڑکیوں کی عصمت بدستور غیر محفوظ تھی۔ ہٹے کٹے نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں باہر نکلتی تھیں اور اِدھر اُدھر چھاپے مار کر ڈری ڈبکی اور سہمی ہوئی لڑکیاں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔ کسی کے گھر پر چھاپہ مارنا اور اس کے ساکنوں کو قتل کر کے ایک جوان لڑکی کو کاندھے پر ڈال کر لے جانا بظاہر بہت ہی آسان کام معلوم ہوتا ہے لیکن ’س‘ کا بیان ہے کہ یہ محض لوگوں کا خیال ہے۔ کیونکہ اسے تو اپنی جان پر کھیل جانا پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو ’س‘ کا بیان کردہ واقعہ سناؤں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آپ کو متعارف کرا دوں۔ ’س‘ ایک معمولی جسمانی اور ذہنی ساخت کا آدمی ہے۔ مفت کے مال سے اس کو اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی عام انسانوں کو ہوتی ہے۔ لیکن مالِ مفت سے اس کا سلوک دلِ بے رحم کا سا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ایک عجیب و غریب ٹریجڈی کا باعث بن گیا۔ جس کا علم اسے بہت دیر میں ہوا۔ اسکول میں ’س‘ اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ ہر کھیل میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن کھیلتے کھیلتے جب نوبت لڑائی تک جا پہنچی تھی تو ’س‘ اس میں سب سے پیش پیش ہوتا۔ کھیل میں وہ ہر قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال کر جاتا تھا۔ لیکن لڑائی کے موقع پر اس نے ہمیشہ ایمانداری سے کام لیا۔ مصوری سے ’س‘ کو بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ لیکن کالج میں داخل ہونے کے ایک سال بعد ہی اس نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ تعلیم کو خیر باد کہہ کر سائیکلوں کی دکان کھول لی۔ فساد کے دوران میں جب اس کی دکان جل کر راکھ ہو گئی تو اس نے لوٹ مار میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انتقاماً کم اور تفریحاً زیادہ، چنانچہ اسی دوران میں اس کے ساتھ یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ جو اس کہانی کا موضوع ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ منوں پانی برس رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی تیز و تند بارش کبھی نہیں دیکھی۔ میں اپنے گھر کی برساتی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میرے سامنے لوٹے ہوئے مال کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ بے شمار چیزیں تھیں مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری دکان جل گئی تھی۔ مجھے اس کا بھی کوئی اتنا خیال نہیں تھا شاید اس لیے کہ میں نے لاکھوں کا مال تباہ ہوتے دیکھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، دماغ کی کیا کیفیت تھی۔ اتنے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے اور ہر چیز خشک ہے۔ جلے ہوئے مردنڈوں کی سی بو آ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں میں جلتا ہوا سگرٹ تھا۔ اس کے دھوئیں سے بھی کچھ ایسی ہی بو نکل رہی تھی۔ جانے کیا سوچ رہا تھا اور شاید کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ ایک دم بدن پر کپکپی سی دوڑ گئی اور جی چاہا کہ ایک لڑکی اٹھا کر لے آؤں۔ جونہی یہ خیال آیا۔ بارش کا شور سنائی دینے لگا اور کھڑکی کے باہر ہر چیز پانی میں شرابور نظر آنے لگی۔ میں اٹھا، سامنے لوٹے ہوئے مال کے ڈھیر سے سگرٹوں کا ایک نیا ڈبہ اٹھا کر میں نے برسانی پہنی اور نیچے اتر گیا۔“

”سڑکیں اندھیری اور سنسان تھیں۔ سپاہیوں کا پہرہ بھی نہیں تھا۔ میں دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اس دوران میں کئی لاشیں مجھے نظر آئیں۔ لیکن مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ گھومتا گھامتا میں سول لائنز کی طرف نکل گیا۔ لُک پھری ہوئی سڑک بالکل خالی تھی۔ جہاں جہاں بجری اکھڑی ہوئی تھی۔ وہاں بارش جھاگ بن کر اڑ رہی تھی۔ دفعتہً مجھے موٹر کی آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک چھوٹی سی موٹر بیبی آسٹن اندھا دھند چلی آ رہی تھی۔ میں سڑک کے عین درمیان میں کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اس انداز سے ہلانے لگا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ رک جاؤ۔
“

”موٹر بالکل پاس آگئی مگر اس کی رفتار میں فرق نہ آیا۔ چلانے والے نے رخ بدلا۔ میں بھی پینترہ بدل کر ادھر ہو گیا۔ موٹر تیزی سے دوسری طرف مڑ گئی۔ میں بھی لپک کر ادھر ہو لیا۔ موٹر میری طرف بڑھی مگر اب اس کی رفتار دھیمی ہو گئی تھی میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ سوچتا مجھے زور سے دھکا لگا اور میں اکھڑ کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔ جسم کی تمام ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں مگر مجھے چوٹ نہ آئی۔ موٹر کے بریک چیخے، پہیّے ایک دم پھسلے اور موٹر تیرتی ہوئی سامنے والے فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک درخت سے ٹکرائی اور ساکت ہو گئی۔ میں اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ موٹر کا دروازہ کھلا اور ایک عورت سرخ رنگ کا بھڑکیلا مومی رین کوٹ پہنے باہر نکلی۔ میری کڑکڑائی ہوئی ہڈیاں ٹھیک ہو گئیں اور جسم میں حرارت پیدا ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں مجھے صرف اس کا شوخ رنگ رین کوٹ ہی دکھائی دیا۔ لیکن اتنا اشارہ کافی تھا کہ اس مومی کپڑے میں لپٹا ہوا جو کوئی بھی ہے۔ صنفِ نازک میں سے ہے۔“

”میں جب اس کی طرف بڑھا تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ بارش کے لرزتے ہوئے پردے میں سے مجھے دیکھ کر بھاگی۔ مگر میں نے چند گزوں ہی میں اسے جا لیا جب ہاتھ اس کے چکنے زین کوٹ پر پڑا تو وہ انگریزی میں چلائی۔

”ہلپ ہلپ۔“

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور گود میں اٹھا لیا۔ وہ پھر انگریزی میں چلائی

”ہلپ ہلپ۔ ہی از کلنگ می۔“

میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

”آر یو اے انگلش وومن“

فقرہ منہ سے نکل گیا تو خیال آیا کہ اے کی جگہ مجھے این کہنا چاہیے تھا۔ اس نے جواب دیا۔

”نو۔“

انگریز عورتوں سے مجھے نفرت ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا

”دَن اِٹ از آل رائیٹ۔“

اب وہ اردو میں چلانے لگی۔

”تم مار ڈالو گے مجھے۔ تم مار ڈالو گے مجھے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس لیے کہ میں اس کی آواز سے، اس کی شکل و صورت اور عمر کا اندازہ لگا رہا تھا۔ لیکن ڈری ہوئی ہوئی آواز سے کیا پتہ چل سکتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر سے ہڈ ہٹانے کی کوشش کی۔ پر اس نے دونوں ہاتھ آگے رکھ دیے۔ میں نے کہا۔ ہٹاؤ اور سیدھا موٹر کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر اس کو پچھلی سیٹ پر ڈالا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گیر درست کر کے سلف دبایا تو انجن چل پڑا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ہینڈل گھمایا۔ گاڑی کو فٹ پاتھ پر سے اتارا اور سڑک میں پہنچ کر اکسلریٹر پر پیر رکھ دیا۔ موٹر تیرنے لگی۔ گھر پہنچ کر میں نے پہلے سوچا کہ اوپر برساتی ٹھیک رہے گی۔ لیکن اس خیال سے کہ لونڈیا کو اوپر لے جانے میں جھک جھک کرنی پڑے گی۔ اس لیے میں نے نوکر سے کہا۔ دیوانہ خانہ کھول دو۔ اس نے دیوان خانہ کھولا تو میں نے اسے گھپ اندھیرے ہی میں صوفے پر ڈال دیا۔ سارا رستہ خاموش رہی تھی۔ لیکن صوفے پر گرتے ہی چلانے لگی۔

”ڈونٹ کِل می۔ ڈونٹ کِل می پلیز۔“

مجھے ذرا شاعری سوجھی۔

”آئی وونٹ کِل یو۔ آئی وونٹ کِل یو ڈارلنگ۔“

وہ رونے لگی۔ میں نے نوکر سے کہا۔ چلے جاؤ۔ وہ چلا گیا۔ میں نے جیب سے دیا سلائی نکالی۔ ایک ایک کر کے ساری تیلیاں نکالیں مگر ایک بھی نہ سلگی۔ اس لیے کہ بارش میں ان کے مصالحے کا بالکل فالودہ ہو گیا تھا۔ بجلی کا کرنٹ کئی دنوں سے غائب تھا۔ اوپر برساتی میں ٹوٹے ہولے مال کے ڈھیر میں کئی بیٹریاں پڑی تھیں۔ لیکن میں نے کہا۔ اندھیرے ہی میں ٹھیک ہے، مجھے کون سی فوٹو گرافی کرنی ہے۔ چنانچہ برساتی اتار کر میں نے ایک طرف پھینک دی اور اس سے کہا۔

”لائیے میں آپ کا رین کوٹ اتار دوں۔“

میں نیچے صوفے کی جانب جھکا۔ لیکن وہ غائب تھی۔ میں بالکل نہ گھبر ایا۔ اس لیے کہ دروازہ نوکر نے باہر سے بند کر دیا تھا۔ گُھپ اندھیرے میں اِدھر اُدھر میں نے اسے تلاش کرنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بھڑ گئے اور تپائی کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑے۔ فرش پر لیٹے ہی لیٹے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جو گردن پر جا پڑا۔ وہ چیخی میں نے کہا۔

”چیختی کیوں ہو۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں۔“

اس نے پھر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ شاید اس کا پیٹ ہی تھا جس پر میرا ہاتھ پڑا۔ وہ دوہری ہو گئی۔ میں نے جیسا بھی بن پڑا اس کے رین کوٹ کے بٹن کھولنے شروع کر دیے۔ مومی کپڑا ابھی عجیب ہوتا ہے جیسے بوڑھے گوشت میں چکنی چکنی جھریاں پڑی ہوں۔ وہ روتی رہی اور ادھر ادھر لپٹ کر مزاحمت کرتی رہی۔ لیکن میں نے پورے بٹن کھول دیے اسی دوران میں مجھے معلوم وہ کہ وہ ساڑھی پہنے تھی۔ میں نے کہا یہ تو ٹھیک رہا۔ چنانچہ میں نے ذرا معاملہ دیکھا۔ خاصی سڈول پنڈلی تھی جس کے ساتھ میرا ہاتھ لگا۔ وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ میں پہلے ذرایوں ہی سلسلہ کر رہا تھا۔ پنڈلی کے ساتھ جب میرا ہاتھ لگا تو بدن میں چار سو چالیس والٹ پیدا ہو گئے۔ لیکن میں نے فوراً ہی بریک لگا دیے کہ سہج پکے سو میٹھا ہوئے۔ چنانچہ میں نے شاعری شروع کر دی۔

”ڈارلنگ۔ میں تمہیں یہاں قتل کرنے کے لیے نہیں لایا۔ ڈرو نہیں۔ یہاں تم زیادہ محفوظ ہو۔ جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ لیکن باہر لوگ درندوں کی طرح چیر پھاڑ دیں گے۔ جب تک یہ فساد ہیں تم میرے ساتھ رہنا۔ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، میں نہیں چاہتا۔ کہ تم گنواروں کے چنگل میں پھنس جاؤ۔“

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

”یو وونٹ کِل می؟“

میں نے فوراً ہی کہا۔

”نو سر۔“

وہ ہنس پڑی۔ مجھے فوراً ہی خیال آیا کہ عورت کو سر نہیں کہا کرتے۔ بہت خفت ہوئی۔ لیکن اس کے ہنس پڑنے سے مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔ معاملہ پٹا سمجھو، چنانچہ میں بھی ہنس پڑا۔

”ڈارلنگ، میری انگریزی کمزور ہے۔“

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

”اگر تم مجھے مارنا نہیں چاہتے تو یہاں کیوں لائے ہو؟“

سوال بڑا بے ڈھب تھا۔ میں نے جواب سوچنا شروع کیا۔ لیکن تیار نہ ہوا۔ میں نے کہا جو منہ میں آئے کہہ دو۔

”میں تمہیں مارنا بالکل نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ مجھے یہ کام بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اکیلا تھا۔“

وہ بولی۔

”تمہارا نوکر تمہارے پاس رہتا ہے۔“

میں نے بغیر سوچے سمجھے جواب دے دیا۔

”اس کا کیا ہے وہ تو نوکر ہے۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ میرے دماغ میں نیکی کے خیال آنے لگے میں نے کہا۔ ہٹاؤ چنانچہ اٹھ کر اس سے کہا۔

”تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ اٹھو۔“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک دم مجھے اس کی پنڈلی کا خیال آگیا اور میں نے زور سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔ اس کی گرم گرم سانس میری ٹھوڑی کے نیچے گھس گئی۔ میں نے اٹکل پچو اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر جما دیے۔ وہ لرزنے لگی۔ میں نے کہا۔

”ڈارلنگ ڈرو نہیں۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں۔“

”چھوڑ دو مجھے۔“

کی آواز میں عجیب و غریب قسم کی کپکپاہٹ تھی۔ میں نے اسے اپنی گرفت سے علیحدہ کر دیا۔ لیکن فوراً ہی اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ سڑک پر اسے اٹھاتے وقت مجھے محسوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کے کولہوں کا گوشت بہت ہی نرم تھا۔ ایک بات مجھے اور بھی معلوم ہوئی وہ یہ کہ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ میں نے اسے صوفے پر لٹا دیا اور بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”اگر اس میں کوئی قیمتی چیز ہے تو یقین رکھو یہاں بالکل محفوظ رہے گی۔ بلکہ چاہو تو میں بھی تمہیں کچھ دے سکتا ہوں۔“

وہ بولی۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

”لیکن مجھے چاہیے“

اس نے پوچھا۔

”کیا؟“

میں نے جواب دیا۔

”تم۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ میں فرش پر بیٹھ کر اس کی پنڈلی سہلانے لگا۔ وہ کانپ اٹھی۔ لیکن میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس نے جب کوئی مزاحمت نہ کی تو میں نے سوچا کہ مجبوری کی وجہ سے بیچاری نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا ہے۔ اس سے میری طبیعت کچھ کھٹی سی ہونے لگی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

”دیکھو میں زبردستی کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ تمہیں منظور نہیں ہے تو جاؤ۔“

یہ کہہ کر میں اٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ جو کہ دھک دھک کر رہا تھا۔ میرا بھی دل اچھلنے لگا۔ میں نے زور سے ڈارلنگ کہا اور اس کے ساتھ چمٹ گیا۔ دیر تک چوما چاٹی ہوتی رہی۔ وہ سسکیاں بھر بھر کے مجھے ڈارلنگ کہتی رہی۔ میں بھی کچھ اسی قسم کی خرافات بکتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے کہا۔

”یہ رین کورٹ اتار دو۔ بہت ہی واہیات ہے۔“

اس نے جذبات بھری آواز میں کہا۔

”تم خود ہی اتار دو ناں۔“

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور کوٹ اس کے بازوؤں میں سے کھینچ کر اتار دیا۔ اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

میں اس وقت اپنا حدود اربعہ بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”تمہارا ڈارلنگ“!

اس نے

”یو آر اے نوٹی بوائے“

کہا اور اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں میں اس کا بلاؤز اتارنے لگا تو اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور التجا کی۔

”مجھے ننگا نہ کرو ڈارلنگ، مجھے ننگا نہ کرو۔“

میں نے کہا۔

”کیا ہوا۔ اس قدر اندھیرا ہے۔“

”نہیں، نہیں“!

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ۔“

اس نے میرے دونوں ہاتھ اٹھا کر چومنے شروع کر دیے اور لرزاں آواز میں کہنے لگی۔

”نہیں نہیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔“

عجیب ہی سی بات تھی۔ لیکن میں نے کہا۔ چلو ہٹاؤ چھوڑو بلاؤز کو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا تو اس نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا

”تم ناراض تو نہیں ہو گئے؟“

مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ میں ناراض ہوں یا کیا کہوں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا

”نہیں نہیں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ تم بلاؤز نہیں اتارنا چاہتی ہو، نہ اتارو۔ لیکن۔“

اس سے آگے کہتے ہوئے مجھے شرم آ گئی۔ لیکن ذرا گول کر کے میں نے کہا۔

”لیکن کچھ تو ہونا چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ ساڑھی اتار دو۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے“

یہ کہتے ہوئے اس کا حلق سوکھ گیا۔ میں نے بڑے پیار سے کہا۔

”کس سے ڈر لگتا ہے۔“

”اسی سے۔ اسی سے“

اور اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ ڈرنے کی وجہ کوئی بھی نہیں۔

”میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔ لیکن اگر تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے تو جانے دو۔ دو تین دن یہاں رہو جب میری طرف سے تمہیں پورا اطمینان ہو جائے تو پھر سہی۔“

اس نے روتے روتے کہا۔

”نہیں نہیں۔“

اور اپنا سر میری رانوں پر رکھ دیا۔ میں اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے رونا بند کر دیا اور سوکھی سوکھی ہچکیاں لینے لگی۔ پھر ایک دم مجھے اپنے ساتھ زور کے ساتھ بھینچ لیا اور شدت کے ساتھ کانپنے لگی۔ میں نے اسے صوفے پر سے اٹھ کر فرش پر بٹھا دیا اور۔ کمرے میں دفعتہً روشنی کی لکیریں تیر گئیں۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پوچھا

”کون ہے؟“

نوکر کی آواز آئی۔

”لالٹین لے لیجیے“

میں نے کہا۔

”اچھا“

لیکن اس نے آواز بھینچ کر خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں۔“

میں نے کہا۔

”حرج کیا ہے۔ ایک طرف نیچی کر کے رکھ دوں گا۔“

چنانچہ میں نے اٹھ کر لالٹین لی اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اتنی دیر کے بعد روشنی دیکھی تھی۔ اس لیے آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اٹھ کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا

”بھئی اتنا بھی کیا ہے۔ تھوڑی دیر روشنی میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ جب تم کہو گی اسے گل کر دیں گے۔“

چنانچہ میں لالٹین ہاتھ ہی میں لیے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ساڑھی کا پلو سرکا کے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ میں نے کہا

”تم بھی عجیب و غریب لڑکی ہو۔ اپنے دولھے سے بھی پردہ۔“

یہ کہہ میں سمجھنے لگا کہ وہ میری دولہن ہے اور میں اس کا دولھا۔ چنانچہ اسی تصور کے۔ تحت میں نے اس سے کہا۔

”اگر ضد ہی کرنی ہے تو بھئی کرلو۔ ہمیں آپ کی ہر ادا قبول ہے۔“

ایک دم زور کا دھماکا ہوا۔ وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ کہیں بم پھٹا تھا۔ میں نے اس کو دلاسا دیا۔

”ڈرو نہیں۔ معمولی بات ہے“

۔ ایک دم مجھے خیال آیا جیسے میں نے اس کے چہرے کی جھلک دیکھی تھی۔ چنانچہ اس کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے کیا دیکھا۔ بہت ہی بھیانک صورت، گال اندر دھنسے ہوئے جن پر گاڑھا میک اپ تھپا تھا۔ کئی جگہوں پر سے اس کی تہہ بارش کی وجہ سے اتری ہوئی تھی اور نیچے سے اصلی جلد نکل آئی تھی جیسے کئی زخموں پر سے پھاہے اتر گئے ہیں۔ خضاب لگے خشک اور بے جان بال جن کی سفید جڑیں دانت دکھا رہی تھیں۔ اور سب سے عجیب و غریب چیز مومی پھول تھے جو اس نے اس کان سے اس کان تک ماتھے کے ساتھ ساتھ بالوں میں اڑسے ہوئے تھے۔ میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔ وہ بالکل ساکت کھڑی رہی۔ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں سنبھلا تو میں نے لالٹین ایک طرف رکھی اور اس سے کہا

”تم جانا چاہو تو چلی جاؤ“!

اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن جب دیکھا کہ میں اس کا رین کوٹ اور بیگ اٹھا رہا ہوں تو خاموش ہو گئی۔ میں نے یہ دونوں چیزیں اس کی طرف دیکھے بغیر اس کو دے دیں۔ وہ کچھ دیر گردن جھکائے کھڑی رہی۔ پھر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔“

یہ واقعہ سُنا کر میں نے ’س‘ سے پوچھا۔

”جانتے ہو وہ عورت کون تھی؟“

’س‘ نے جواب دیا۔

”نہیں تو۔“

میں نے اس کو بتایا۔

”وہ عورت مشہور آرٹسٹ مس ’م‘ تھی۔“

وہ چلایا۔

”مس ’م‘؟۔ وہی جس کی بنائی ہوئی تصویروں کی میں اسکول میں کاپی کیا کرتا تھا؟“

میں نے جواب دیا۔

”وہی۔ ایک آرٹ کالج کی پرنسپل تھی۔ جہاں وہ لڑکیوں کو صرف عورتوں اور پھولوں کی تصویر کشی سکھاتی تھی۔ مردوں سے اسے سخت نفرت تھی۔“

عزت جہاں کو آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ کون ہے جو اس لڑکی کے نام سے واقف نہیں۔ اگر آپ سوشلسٹ ہیں اور بمبئی میں رہتے ہیں تو آپ ضرور عزت سے کئی بار ملاقات کر چکے ہوں گے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس نے اپنی زندگی کے کئی برس اشتراکیت کی تحریک کی نشر و اشاعت میں صرف کیے ہیں اور حال ہی میں ایک غیر معروف آدمی سے شادی کی ہے۔ اس غیر معروف آدمی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ناصر سے میں اس زمانے کا واقف ہوں جب میں اس کو ناصو کہا کرتا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وہ میرا ہم جماعت تھا۔ میں تو اپنی تعلیم بیماری اور مفلسی کے باعث جاری نہ رکھ سکا مگر وہ صرف مفلس تھا۔ اس نے بی اے کا امتحان کسی نہ کسی طرح پاس کر لیا اور بمبئی کی ایک بہت بڑی مِل میں ملازم ہو گیا۔ میں ان دنوں بمبئی ہی میں تھا۔ جب وہ دلی کے ایک کارخانے میں کام کرتا کرتا بمبئی آیا اور مل میں ملازم ہوا۔ اس دوران میں اس سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن افسوس ہے کہ چند وجوہ کی بنا پر میں بمبئی میں اپنا قیام جاری نہ رکھ سکا اور مجھے مجبوراً دلی جا کر ایک نہایت ہی ذلیل ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ خیر! میں نے دلی کو دو برس کے بعد خیر باد کہا اور بمبئی شہر کا رخ کیا۔ جہاں میرے چند عزیز دوستوں کے علاوہ اب عزت جہاں بھی رہتی تھی۔ میں خود سوشلسٹ ہوں۔ سوشلزم پر میں نے سینکڑوں مضمون لکھے ہیں مگر وہ مضامین جو میں نے عزت جہاں کے قلم سے مختلف اخباروں میں پڑھے تھے، میرے دل و دماغ پر مرتسم ہو گئے تھے۔ خدا کے لیے کہیں یہ خیال نہ کیجیے گا کہ مجھے اس سے غائبانہ عشق تھا۔ دراصل مجھے اس لڑکی یا عورت کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا صرف اشتیاق تھا۔ اخباروں اور رسالوں میں اکثر اس کی سرگرمیوں کا حال پڑھ چکا تھا اور مجھے اس سے بے پناہ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تھا۔ اس سے ملوں، اس سے باتیں کروں اور جس طرح کالج اور اسکول کے نو گرفتارِ محبت لونڈے اپنے رومانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح میں اس سے اشتراکیت کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار کروں۔ ہم دونوں سیگل سے لے کر کارل مارکس تک اشتراکی فلسفے کی نشو و ارتقاء کی باتیں کرتے۔ لینن، لراتسکی اور اسٹالن کے مختلف نظریات پر گفتگو کرتے۔ میں ہندوستان کی سوشلسٹ تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ وہ بھی اپنے خیالات مجھے بتاتی۔ میں اسے ان نوجوانوں کی کہانیاں سناتا جو کارل مارکس کی کتاب محض اس لیے بغل میں دبائے پھرتے ہیں کہ انھیں دوسروں پر رعب گانٹھنا مقصود ہوتا ہے۔ میں اسے اپنے ایک دوست کی داستان سناتا جس کے پاس سوشلزم پر ہر وہ کتاب جو انگریزی زبان میں

چھپ چکی ہے۔ موجود ہے مگر وہ سوشلزم کی الف ب سے بھی واقف نہیں وہ کارل مارکس کا نام اس طرح لیتا ہے جس طرح لوگ اپنے قریبی رشتہ دار میونسپل کمشنروں کا لیتے ہیں۔ میں عزت کو بتاتا کہ اس کے باوجود وہ مخلص آدمی ہے جو سوشلزم کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔ پھر میں اس سے ان لڑکوں اور لڑکیوں کے متعلق بات چیت کرتا جو سوشلزم صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے ملنے اور جنسی تعلقات پیدا کرنے کا موقعہ ملے۔ میں اسے بتاتا کہ پچاس فیصدی لڑکے جو سوشلسٹ تحریک میں شامل ہوتے ہیں شہوت زدہ ہوتے ہیں۔ اپنی ہم جماعت لڑکیوں کو وہ یوں دیکھتے ہیں جیسے ان کی نگاہیں صدیوں کی بھوکی پیاسی ہیں اور اکثر لڑکیاں جو اس تحریک میں شامل ہوتی ہیں۔ سرمایہ داروں کی ہنگامہ پسند بیٹیاں ہوتی ہیں اپنی زندگی میں حادثے پیدا کرنے کے لیے یہ سوشلزم پر چند ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اس تحریک کی سرگرم کارکن بن جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو آہستہ آہستہ جنسی خواہشات کے خرابے کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور کچھ آزادی کی آخری حدود پر پہنچ کر ایک ایسی جذباتی چیز بن جاتی ہیں جو ملک کے نام نہاد لیڈروں کے کھیلنے کے کام آتی رہتی ہے۔ غرض یہ کہ عزت جہاں سے ہندوستان کی اشتراکی تحریک کے عواقب وعواطف پر سیر حاصل بحث کرنے کا خوب لطف آتا۔ اس کے مضامین سے میں اس کی ذہانت اور بیباک خیالی معلوم کرچکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری ہم خیال ہو گی۔ بمبئی آکر مجھے ایک دوست کے ہاں ٹھہرنا پڑا۔ کیونکہ مکان اور فرنیچر کا بندوبست کرتے کرتے مجھے کئی روز خوار ہونا تھا۔ بیوی کو میں دلی ہی چھوڑ آیا تھا۔ اس سے میں نے کہہ دیا تھا کہ جونہی مکان ملے گا۔ میں تمھیں بلالوں گا۔ میرے سب دوست کنوارے ہیں اور فلم ڈائریکٹر عورتوں کے متعلق آپ کا فلسفہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ آپ چونکہ اسٹوڈیو میں کسی ایکٹرس یا ایکٹر کی لڑکی سے تعلقات پیدا نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ضرورت کے وقت مختلف دلالوں کے ذریعے سے ایک لڑکی منگوا لیتے ہیں۔ رات بھر اسے اپنے پاس رکھتے ہیں اور صبح ہوتے ہی اسے رخصت کر دیتے ہیں۔ شادی اس لیے نہیں کرتے کہ ان کے خیال کے مطابق بیوی ان سے کبھی خوش نہیں رہے گی۔

”بھائی میں فلم ڈائریکٹر ہوں۔ دن کو شوٹنگ کروں گا تو دن بھر باہر رہوں گا رات کو شوٹنگ کروں گا تو رات بھر باہر رہوں گا۔ دن کو کام کرنے کے بعد رات کو اور رات کو کام کرنے کے بعد دن کو آرام کرنا ضروری ہے۔ بیوی مجھ سے اپنے سارے حقوق طلب کرے گی مجھے بتاؤ ایک تھکا ہوا آدمی یہ سارے حقوق کیسے پورے کرسکتا ہے۔ ہر روز ایک نئی لونڈیا اچھی ہے نیند آگئی تو اس سے کہا جاؤ سو رہو۔ اگر اس کی صحبت سے تنگ آگئے تو ٹیکسی کا کرایہ دیا اور چلتا کیا۔ عورت بیوی بنتے ہی ایک بڑا فرض بن جاتی ہے۔ میں چونکہ فرض شناس ہوں اس لیے شادی کا بالکل قائل نہیں۔“

جس دوست کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا ایک دن میں اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک لڑکی ڈھونڈنے گئے۔ دلال جو اس کا پرانا واقف تھا۔ ایک کے بجائے دو

”دکھشنی چھوکریاں“

لے آیا۔ میں بہت سٹپٹایا۔ مگر فوراً ہی میرے دوست نے کہا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ایک اور دو میں فرق ہی کیا ہے؟“

ٹیکسی واپس گھر کی طرف مڑی ہم سب یعنی میں، میرا دوست فلم ڈائریکٹر اور وہ دو کاشٹا پوش لڑکیاں تین سیڑھیاں طے کرکے تیسری منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ میں نے کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ہی ایک کرسی پر ناصر بیٹھا بڑے انہماک سے میرا اردو ٹائپ رائٹر دیکھ رہا تھا اور اس کے پاس ہی ایک عینک لگی عورت بیٹھی تھی جب اس نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا تو میں پہچان گیا۔ عزت جہاں تھی۔ میرا دوست ان اجنبیوں کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ لیکن دونوں

”دکھشنی چھوکریاں“

اندر کمرے میں داخل ہوچکی تھیں۔ اس لیے اس نے پردہ پوشی کی ضرورت بیکار سمجھی۔ میں نے اپنے دوست سے ناصر کا تعارف کرایا۔ ناصر نے جواب میں ہم دونوں سے اپنی بیوی کو متعارف کرایا۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے دوست سے جو اب سگرٹ سلگا رہا تھا۔ عزت جہاں کا مزید تعارف کرانے کی خاطر۔

”یہ ہندوستان بہت بڑی اشتراکی خاتون ہیں۔ تم نے ان کے مضامین ضرور پڑھے ہوں گے۔“

میرے دوست کو اشتراکیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس نام ہی سے ناواقف تھا۔ اس نے دونوں لڑکیوں کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”معاف فرمایئے گا۔ میں ابھی حاضر ہوا۔“

عزت جہاں کی آنکھیں ان لڑکیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے لباس، وضع قطع، غرضیکہ ہر چیز کا اچھی طرح جائزہ لے رہی تھی۔ جب وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور میرے دوست نے جرأت رندانہ سے کام لے کر دروازہ بند کر دیا۔ تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ناصر ہر روز مجھ سے کہتے تھے کہ چلو چلو۔ پر میں ان دنوں کچھ زیادہ مصروف رہی۔ اور۔ آپ تو اب یہیں تشریف لے آئے ہیں نا؟۔ مکان برا نہیں“!

اس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھ کر خوشنودی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا۔

”جی ہاں اچھا ہے۔ ہوادار ہے۔“

”ہوادار تو خاک بھی نہیں۔“

”بیچ کا دروازہ کھلا ہو تو بہت ہوا آتی ہے۔“

”ہاں شاید پہلے آرہی تھی۔“

دیر تک میں اور ناصر اور عزت جہاں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ عزت کے دل میں کُھد بُد ہو رہی ہے۔ میرا دوست جلدی حاضر ہونے کا وعدہ کر کے دو لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں کیا کر رہا تھا؟ غالباً وہ یہی معلوم کرنے کے لیے بیقرار تھی۔ نصف گھنٹہ گزرنے پر اس نے بڑے تکلف کے ساتھ مجھ سے کہا۔

”ایک گلاس پانی پلوا دیجیے۔“

فلیٹ کے دو راستے ہیں ایک سامنے سے۔ ایک پیچھے۔ میں نے درواز کھلوانا مناسب خیال نہ کیا۔ چنانچہ دوسرے راستے سے گلاس میں پانی لے کر آگیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ میاں بیوی دونوں کُھسر پُھسر کر رہے ہیں۔ عزت جہاں نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔

”آپ نے بہت تکلیف کی۔“

”جی نہیں۔ اس میں تکلیف کی بات ہی کیا ہے۔“

پانی پی کر اس نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑیں اور بناوٹی لہجے میں کہا۔

”اس فلیٹ کے غالباً دو راستے ہیں۔“

”جی ہاں۔“

کچھ دیر پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ بدل کر اشتراکیت کی طرف آگیا اور میں اور عزت دونوں سرخ ہو گئے۔ میں نے باتوں باتوں میں اشتراکیت کے متعلق اپنے نقطہ ءِ نظر کو واضح کیا۔

”اشتراکی کہتے ہیں کہ تمام انسانی ادارے مثال کے طور پر مذہب، تاریخ، سیاست وغیرہ سب ہمارے معاشی حالات سے اثر پذیر ہو کر معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ موجودہ نظامِ معیشت جس میں امیر اور غریب کا امتیاز ہے اور جس میں پیداوار کے تمام آلات ایک محدود اونچے طبقے کے ہاتھ میں ہیں انھیں صرف ذاتی فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے یہ ایک مضر اور تباہ کن ادارہ ہے جسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔ جب اس کا خاتمہ ہو جائے گا تو آپ کے خیال کے مطابق اشتراکی دور شروع ہو گا۔ جس میں تمام آلات پیداوار۔ یہی ہمارے معاشی حالات پر حاوی ہیں عوام کے قبضے میں آجائیں گے۔ عزت جہاں نے میری تائید کی۔

”جی ہاں۔“

”عوام کی قوت اور حکومت کی نمائندہ ایک خاص جماعتِ حاملہ ہو گی۔ جسے اشتراکی حکومت کہا جائے گا۔“

عزت جہاں نے پھر کہا۔

”جی ہاں۔“

”لیکن یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اشتراکی نظام میں بھی تمام قوت ایک محدود طبقے کے ہاتھ میں ہو گی۔ یہ نمائندہ جماعت اشتراکیوں کے فلسفے کے مطابق تمام لوگوں کی بہبودی کو مدارِ عمل بنائے گی۔ اس جماعت کو ذاتی اغراض اور شخصی منافع سے کوئی واسطہ نہ ہو گا اس کے اغراض عوام کے مقاصد کے مطابق ہوں گے۔ لیکن۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر وثوق سے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ محدود جماعت جو بظاہر عوام کی نمائندہ جماعت ہو گی۔ کچھ عرصے کے بعد سرمایہ داروں کی طرح ہر قسم کے ظلم و ستم ڈھائے گی۔ کیا یہ لوگ غاصب نہیں ہو سکتے۔ کچھ عرصے کی حکومت کے بعد کیا ان کے دل میں ذاتی اغراض پیدا نہیں ہوں گی؟“

عزت جہاں مسکرائی۔

”آپ تو باکونین کے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔“

میں نے جوش کے ساتھ کہا۔

”مانتا ہوں کہ کارل مارکس کے ساتھ ساری عمر لڑنے کے باوجود باکونین کسی نقطہ مفاہمت پر نہیں پہنچ سکا اور اپنے اخلاص کے باوجود کسی مدلل اور منظم فلسفے کی بنیاد نہیں ڈال سکا۔ لیکن اس کا یہ کہنا جھوٹ نہیں ہے کہ ڈیموکریسی بھی ایک بڑی جماعت کے دوسری چھوٹی جماعت پر جابرانہ نظام حکومت کا نام ہے۔ میں ایسے دورِ سیاست کا قائل ہوں جس کا سماج ہر قسم کی حکومت اور دباؤ سے آزاد ہو“

عزت پھر مسکرائی۔ تو آپ انارکزم چاہتے ہیں جو ایک ناقابل عمل چیز ہے۔ آپ کا باکونین اور کرویٹوکین دونوں مل کر اسے قابلِ قبول نہیں بنا سکتے۔؟"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اشتراکیت کے پاس بھی کوئی قابل عمل فلسفہ نہیں تھا۔ لوگ اسے دیوانوں کا ایک دھندلا سا خواب سمجھتے تھے۔ مگر انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اس کو ایک قابل عمل معاشرتی نظام کی صورت میں پیش کیا۔ ممکن ہے انارکزم کو بھی کوئی کارل مارکس مل جائے۔"

عزت جہاں نے بند دروازے کی طرف دیکھا اور جیسے اس نے میری بات سنی نہیں مجھ سے پوچھا۔

"آپ کے دوست وعدہ کر کے گئے تھے ابھی آئے نہیں؟"

میں نے بہتر سمجھا کہ اسے سب کچھ بتا دوں۔

"انھوں نے تکلف برتا تھا۔ ورنہ ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ نہیں آئیں گے۔"

عزت جہاں نے بڑے بھولے پن سے کہا۔

"کیوں؟"

میں ناصر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جو اب ہماری گفتگو میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

"دو لڑکیاں اس کے ساتھ ہیں انھیں چھوڑ کر وہ ایسی خشک محفل میں کیسے آسکتا ہے؟"

عزت نے یہ سن کر مجھ سے دریافت کیا۔

"یہ دو لڑکیاں فلم ایکٹرس تھیں؟"

"جی نہیں۔"

"دوست ہوں گی؟"

"جی نہیں۔ آج ہی جان پہچان ہوئی ہے۔"

اس کے بعد آہستہ آہستہ میں نے ساری بات بتا دی اور جنسیات کے بارے میں اپنے دوست کا نظریہ بھی اچھی طرح واضح کر دیا۔ بڑے غور سے میری تمام باتیں سن کر اس نے فتویٰ دینے کے انداز میں کہا۔

"یہ انارکزم کی بدترین قسم ہے۔ آپ کے دوست کے خیالات اگر عام ہو جائیں تو دنیا میں ایک اندھیر مچ جائے۔ عورت اور مرد کے تعلقات صرف۔ صرف بستر تک محدود ہو جائیں اور کیا؟۔ یہ آپ کے دوست جو کوئی بھی ہیں یہ عورت کو کیا سمجھتے ہیں۔ ڈبل روٹی، کیک یا بسکٹ۔ زیادہ سے زیادہ کافی یا چائے کی ایک گرم پیالی۔ پی اور جھوٹے برتنوں میں ڈال دی۔ لعنت ہے ایسی عورتوں پر جو یہ ذلت برداشت کر لیتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی میں جنسیات کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ کیا آپ کے یہ دوست بغیر عورت کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ انھیں ہر روز عورت کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟"

میں نے اپنے ذاتی خیال کا اظہار۔

"عورت کی ضرورت ہر مرد کو عمر کے ایک خاص حصے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس کو بعض زیادہ اہمیت دیتے ہیں بعض کم۔ میرا دوست ان بعض لوگوں میں سے ہے جو اس کو روزمرہ کی ایک ضرورت سمجھتے ہیں۔ اگر کھانا پینا اور سونا اہم تو اس کے نزدیک عورت بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی پر ہو مگر اس نے اپنی اس کمزوری کی کبھی پردہ پوشی نہیں کی۔"

عزت جہاں کے لہجے میں اور زیادہ تلخی پیدا ہو گئی۔

"پردہ پوشی نہیں کی۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ راستی پر ہیں۔ فاحشائیں کھلے بندوں اپنا جسم بیچتی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا وجود فطری ہے۔ چونکہ ہمارا نظام بالکل غلط اور غیر فطری ہے۔ اسی لیے ہمیں یہ چکلے نظر آتے ہیں۔ چونکہ آپ کے دوست کا نظام عصبی تندرست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورت اور روٹی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ روٹی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس جسمانی تعلق کے بغیر یقیناً زندہ رہ سکتا ہے"!

میں نے کہا۔

"جی ہاں زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی میں زندگی اور موت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ہر مرد کو عورت دستیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس کو دستیاب ہو سکتی ہے۔ وہ اسے اپنی ضروریاتِ زندگی میں شامل کر لیتا ہے۔"

ناصر کو اب اس گفتگو سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی بیزاری کا اظہار کر ہی دیا۔

”ہٹاؤ یار اس قصے کو۔ بہت وقت ہو گیا اور ہمیں یہاں سے پورے انیس میل دور جانا ہے۔ چلو عزت چلیں۔“

عزت نے اپنے خاوند کی بات سنی ان سنی کر دی اور مجھ سے کہا۔

”کچھ بھی ہو مگر آپ کے دوست اصل میں بہت ہی بد تمیز ہیں۔ یعنی اتنا بھی کیا کہ یہاں ہم تین آدمی بیٹھے ہیں اور آپ دوسرے کمرے میں۔ لاحول ولا قوۃ۔“

ناصر کو نیند آ رہی تھی۔

”ارے بھئی خدا کے لیے اب سلسلے کو ختم کرو۔ چلیں“!

عزت بھنا گئی۔

”ارے واہ۔ ارے واہ۔ یہ تو آہستہ آہستہ میرے خاوند ہی بن بیٹھے ہیں۔“

یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ناصر بھی ہنس دیا۔ ہم دونوں ہنسے تو عزت جہاں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

”اور کیا۔ یہ آہستہ آہستہ خاوند بننا ہی تو ہے۔ یعنی مجھ پر رعب جمایا جا رہا ہے۔“

اس کے بعد ناصر اور عزت تھوڑی دیر اور بیٹھے اور چلے گئے۔ پہلی ملاقات خاصی دلچسپ رہی۔ ہندوستان کی اشتراکی تحریک کے بارے میں گو مفصل طور میں عزت جہاں سے گفتگو نہ کر سکا۔ لیکن پھر بھی اس نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں نے سوچا کہ اس سے آئندہ ملاقاتیں بہت ہی فکر خیز ہوں گی۔ میں نے اپنا فلیٹ لے لیا۔ دلی سے بیوی بھی آ گئی تو عزت ایک بار پھر آئی۔ دونوں پہلی ہی ملاقات میں سہیلیاں بن گئی۔ چونکہ عزت جہاں کو ہر روز اپنے دفتر جانے کے لیے شہر آنا پڑتا تھا۔ اس لیے شام کو گھر لوٹتے ہوئے اکثر ہمارے ہاں آ جاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھے اور ہم ہیگل، کارل مارکس، اینجل، باکونین، کروپٹوکین اور تراتسکی کے متعلق باتیں کریں اور سوشلزم کے ہر دور کو سامنے رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ مگر میری بیوی اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ جاتی تھیں اور جانے کیا کیا باتیں شروع کر دیتی تھیں۔ اگر کبھی میں سوشلزم پر اسٹالن کی موجودہ جنگی پالیسی کے اثر کا ذکر چھیڑتا تو وہ میری بیوی سے سفید اون کا بھاؤ پوچھنا شروع کر دیتی۔ اگر میں ایم۔ این۔ رائے کی ریاکاری کی بات کرتا تو

”خاندان“

فلم کے کسی گیت کی تعریف شروع کر دیتی تھی اور اگر میں اسے اپنے پاس بٹھا کر روس کے موجودہ جنگی نظام پر گفتگو کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اٹھ کے باورچی خانے میں چلی جاتی اور میری بیوی کا ہاتھ بٹانے کی خاطر پیاز چھیلنے میں مشغول ہو جاتی۔ دن بھر وہ پاٹری کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ شام کو تھکی ہوئی گھر پہنچتی تھی جو دفتر سے بیس پچیس میل دور تھا۔ الیکٹرک ٹرین میں ایک ایک گھنٹے کا سفر اس کو دن میں دو دو مرتبہ کرنا پڑتا تھا۔ آتے اور جاتے ہوئے۔ اس کا خاوند مل میں ملازم تھا۔ مہینے میں پندرہ دن اسے رات کو ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔ لیکن عزت خوش تھی۔ میری بیوی سے کئی مرتبہ کہہ چکی تھی۔

”شادی کا مطلب صرف بستر نہیں اور خاوند کا مطلب صرف رات کا ساتھی نہیں۔ دنیا میں انسان صرف اسی کام کے لیے نہیں بھیجا گیام۔“

۔ اور میری بیوی اس کی اس بات سے بہت متاثر تھی۔ عزت جہاں اپنا کام بہت خلوص سے کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کی بے اعتنائیاں بری معلوم نہیں ہوتی تھیں وہ مجھ سے زیادہ میری بیوی کے پاس بیٹھنا اور اس سے بات چیت کرنا پسند کرتی تھی۔ مجھے اس کا مطلقاً خیال نہیں تھا۔ بلکہ میں سوچ رہا تھا کہ وہ بہت جلد میری بیوی کو جو متوسط طبقے کے سرمایہ داروں کی ذہنیت رکھتی تھی۔ اپنی ہم خیال بنا لے گی۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ میں اپنے دفتر سے جلد واپس آ گیا۔ غالباً دو عمل ہو گا میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ میری بیوی کے بجائے ناصر نے کھولا میں سیدھا اپنے میز کی طرف بڑھا۔ چونکہ حسبِ عادت مجھے اپنا بیگ رکھنا تھا۔ ناصر سامنے میرے پلنگ پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ادھر صوفے پر عزت جہاں لیٹی تھی۔ ناصر نے کہا۔

”بھئی مجھے بخار ہو رہا ہے۔“

میں نے عزت جہاں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”اور آپ۔؟“

عزت نے جواب دیا۔

”جی نہیں۔ میں ایسے ہی لیٹی ہوں۔“

”رقیہ کہاں ہے؟“

عزت نے جواب دیا۔

”دوسرے کمرے میں سو رہی ہیں۔“

”یہ کیا۔ ہر ایک سو رہا ہے۔“

میں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔

”رقیہ۔ رقیہ“

اندر سے نیند بھری آواز آئی۔

”جی“!

”ارے بھئی ادھر آؤ۔ کب تک سوئی رہو گی؟“

رقیہ آنکھیں ملتی آئی اور عزت کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ ناصر کمبل اوڑھے لیٹا رہا۔ میں اپنی بیوی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گہری نیند کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ کیونکہ رقیہ ہمیشہ گھوڑے بیچ کر سونے کی عادی ہے۔ اس کے بعد عزت اور میری بیوی کے درمیان کروشیے اور سلائیوں کی باتیں چھڑ گئیں۔ اسی دوران میں چائے آگئی۔ ناصر نے لیٹے لیٹے ایک پیالی پی لی۔ میں نے بخار دور کرنے کے لیے اسے اسپرو کی دو ٹکیاں دیں جو اس نے لے لیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک یہ لوگ بیٹھے رہے۔ اس کے بعد چلے گئے۔ رات کو سونے کے لیے جب میں پلنگ پر لیٹا تو حسبِ عادت میں نے اوپر کے تکیے کو دہرا کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نچلے تکیے کا غلاف ہی نہیں ہے۔ رقیہ سے جو میرے پاس کھڑی اپنے کپڑے تبدیل کر رہی تھی میں نے پوچھا۔

”اس تکیے پر غلاف کیوں نہیں چڑھایا۔“

رقیہ نے غور سے تکیے کی طرف دیکھا اور حیرت سے کہا۔

”ہائیں، سچ مچ یہ غلاف کدھر غائب ہو گیا۔ ہاں۔ وہ آپ کے دوست۔“

میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”کیا ناصر لے گیا؟“

”کیا معلوم؟“

رقیہ نے رک رک کر کہا۔

”ہائے کتنی شرم کی بات ہے۔ میں نے ابھی تک یہ بات آپ کو بتائی ہی نہیں تھی۔ میں اندر سو رہی تھی اور وہ آپ کے دوست اور اس کی بیوی۔ لعنت بھیجیے۔ بڑے بد تمیز نکلے۔“

دوسرے روز تکیے کا غلاف پلنگ کے نیچے سے ملا جس کو چوہوں اور کاکروچوں نے جگہ جگہ سے دھن ڈالا تھا اور اسپرو کی دو ٹکیاں جو میں نے ناصر کو بخار دور کرنے کے لیے دی تھیں۔ وہ بھی پلنگ کے نیچے سے مل گئیں!

ڈاکٹر شروڈکر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوڈاکٹر شروڈکر

بمبئی میں ڈاکٹر شروڈکر کا بہت نام تھا۔ اس لیے کہ عورتوں کے امراض کا بہترین معالج تھا۔ اس کے ہاتھ میں شفا تھی۔ اُس کا شفاخانہ بہت بڑا تھا ایک عالیشان عمارت کی دو منزلوں میں جن میں کئی کمرے تھے نچلی منزل کے کمرے متوسط اور نچلے طبقے کی عورتوں کے لیے مخصوص تھے۔ بالائی منزل کے کمرے امیر عورتوں کے لیے۔ ایک لیبارٹری تھی۔ اس کے ساتھ ہی کمپاؤنڈر کا کمرہ۔ ایکس رے کا کمرہ علیحدہ تھا۔ اس کی ماہانہ آمدن ڈھائی تین ہزار کے قریب ہو گی۔ مریض عورتوں کے کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا جو اُس نے ایک پارسن کے سپرد کر رکھا تھا جو اس کی ایک دوست کی بیوی تھی۔ ڈاکٹر شروڈکر کا یہ چھوٹا سا ہسپتال میٹرنٹی ہوم بھی تھا۔ بمبئی کی آبادی کے متعلق آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کتنی ہو گی۔ وہاں بے شمار سرکاری ہسپتال اور میٹرنٹی ہوم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر شروڈکر کا کلینک بھرا رہتا۔ بعض اوقات تو اسے کئی کیسوں کو مایوس کرنا پڑتا۔ اس لیے کہ کوئی بیڈ خالی نہیں رہتا تھا۔ اس پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بیویاں اور جوان لڑکیاں اس کے ہسپتال میں چھوڑ آتے تھے جہاں ان کا بڑی توجہ سے علاج کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر شروڈکر کے ہسپتال میں دس بارہ نرسیں تھیں۔ یہ سب کی سب محنتی اور پُر خلوص تھیں۔ مریض عورتوں کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کرتیں۔ ان نرسوں کا انتخاب ڈاکٹر شروڈکر نے بڑی چھان بین کے بعد کیا تھا۔ وہ بری اور بھدّی شکل کی کوئی نرس اپنے ہسپتال میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ چار نرسوں نے دفعتاً شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر بہت پریشان ہوا۔ یہ چاروں چلی گئیں۔ اُس نے مختلف

اخباروں میں اشتہار دیے کہ اسے نرسوں کی ضرورت ہے کئی آئیں ڈاکٹر شروڈ کرنے اُن سے انٹرویو کیا مگر اُسے اُن میں کسی کی شکل پسند نہ آئی۔ کسی کا چہرہ ٹیڑھا میڑھا۔ کسی کا قد انگشتا نے بھر کا۔ کسی کا رنگ خوفناک طور پر کالا۔ کسی کی ناک گز بھر لمبی۔ لیکن وہ بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ اُس نے اور اشتہار اخباروں میں دیے اور آخر اُس نے چار خوش شکل اور نفاست پسند نرسیں چُن ہی لیں۔ اب وہ مطمئن تھا چنانچہ اُس نے پھر دلجمعی سے کام شروع کر دیا۔ مریض عورتیں بھی خوش ہو گئیں۔ اس لیے کہ چار نرسوں کے چلے جانے سے اُن کی خبر گیری اچھی طرح نہیں ہو رہی تھی یہ نئی نرسیں بھی خوش تھیں کہ ڈاکٹر شروڈ کر اُن سے بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ انھیں وقت پر تنخواہ ملتی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہسپتال ہی انھیں مہیا کرتا۔ وردی بھی ہسپتال کے ذمے تھی۔ ڈاکٹر شروڈ کر کی آمدن چونکہ بہت زیادہ تھی اس لیے وہ ان چھوٹے موٹے اخراجات سے گھبراتا نہیں تھا۔ شروع شروع میں جب اُس نے سرکاری ہسپتال کی ملازمت چھوڑ کر خود اپنا ہسپتال قائم کیا تو اُس نے تھوڑی بہت کنجوسی کی، مگر بہت جلد اُس نے کھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ شادی کر لے۔ مگر اسے ہسپتال سے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ دن رات اس کو وہیں رہنا پڑتا۔ بالائی منزل میں اس نے ایک چھوٹا سا کمرہ اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا جس میں رات کو چند گھنٹے سو جاتا۔ لیکن اکثر اُسے جگا دیا جاتا جب کسی مریض عورت کو اس کی فوری توجہ کی ضرورت ہوتی۔ تمام نرسوں کو اُس سے ہمدردی تھی کہ اُس نے اپنی نیند اپنا آرام حرام کر رکھا ہے۔ وہ اکثر اس سے کہتیں

”ڈاکٹر صاحب آپ کوئی اسسٹنٹ کیوں نہیں رکھ لیتے“

ڈاکٹر شروڈ کر جواب دیتا

”جب کوئی قابل ملے گا تو رکھ لوں گا“

وہ کہتیں

”آپ تو اپنی قابلیت کا چاہتے ہیں۔ بھلا وہ کہاں سے ملے گا“

”مل جائے گا“

نرسیں یہ سُن کر خاموش ہو جاتیں اور الگ جا کر آپس میں باتیں کرتیں۔ ڈاکٹر شروڈ کر اپنی صحت خراب کر رہے ہیں ایک دن کہیں کولیپس نہ ہو جائے“

”ہاں ان کی صحت کافی گر چکی ہے۔ وزن بھی کم ہو گیا ہے“

”کھاتے پیتے بھی بہت کم ہیں“

”ہر وقت مصروف جو رہتے ہیں“

”اب انھیں کون سمجھائے“

قریب قریب ہر روز ان کے درمیان اِسی قسم کی باتیں ہوتیں۔ ان کو ڈاکٹر سے اس لیے بھی بہت زیادہ ہمدردی تھی کہ وہ بہت شریف النفس انسان تھا۔ اس کے ہسپتال میں سینکڑوں خوبصورت اور جوان عورتیں علاج کے لیے آتی تھیں مگر اُس نے کبھی اُن کو بُری نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا وہ بس اپنے کام میں مگن رہتا۔ اصل میں اُسے اپنے پیشے سے ایک قسم کا عشق تھا۔ وہ اس طرح علاج کرتا تھا جس طرح کوئی شفقت اور پیار کا ہاتھ کسی کے سر پر پھیرے۔ جب وہ سرکاری ہسپتال میں ملازم تھا تو اس کے آپریشن کرنے کے عمل کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ نشتر نہیں چلاتا بُرش سے تصویریں بناتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اُس کے کیے ہوئے آپریشن نوّے فیصد کامیاب رہتے تھے۔ اُس کو اِس فن میں مہارت تام حاصل تھی۔ اس کے علاوہ خود اعتمادی بھی تھی جو اُس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھی۔ ایک دن وہ ایک عورت کا جس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی بڑے غور سے معائنہ کر کے باہر نکلا اور اپنے دفتر میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ ایک بڑی حسین لڑکی بیٹھی ہے۔ ڈاکٹر شروڈ کر ایک لحظے کے لیے ٹھٹک گیا۔ اس نے نسوانی حسن کا ایسا نادر نمونہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا لڑکی نے کرسی پر سے اُٹھنا چاہا۔ ڈاکٹر نے اُس سے کہا

”بیٹھو بیٹھو“

اور یہ کہہ کر وہ اپنی گھومنے والی کُرسی پر بیٹھ گیا اور پیپر ویٹ پکڑ کر اُس کے اندر ہوا کے بلبلوں کو دیکھتے ہوئے اُس لڑکی سے مخاطب ہوا

”بتاؤ تم کیسے آئیں“

لڑکی نے آنکھیں جھکا کر کہا

”ایک پرائیویٹ بہت ہی پرائیویٹ بات ہے جو میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں“

ڈاکٹر شروڈ کرنے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں بھی بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا

”پرائیویٹ بات تم کر لینا۔ پہلے اپنا نام بتاؤ“

لڑکی نے جواب دیا

”میں۔ میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتی“

ڈاکٹر کی دلچسپی اس جواب سے بڑھ گئی

”کہاں رہتی ہو؟“

شولاپور میں

”۔ آج ہی یہاں پہنچی ہوں“

ڈاکٹر نے پیپر ویٹ میز پر رکھ دیا

”اتنی دور سے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے“

لڑکی نے جواب دیا

”میں نے کہا ہے نا کہ مجھے آپ سے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے“

اتنے میں ایک نرس اندر داخل ہوئی۔ لڑکی گھبرا گئی۔ ڈاکٹر نے اُس نرس کو چند ہدایات دیں جو وہ پوچھنے آئی تھی اور اُس سے کہا

”اب تم جاسکتی ہو۔ کسی نوکر سے کہہ دو کہ وہ کمرے کے باہر کھڑا رہے اور کسی کو اندر نہ آنے دے“

نرس

”جی اچھا“

کہہ کر چلی گئی۔ ڈاکٹر نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی کُرسی پر بیٹھ کر اُس حسین لڑکی سے مخاطب ہوا

”اب تم اپنی پرائیویٹ بات مجھے بتاسکتی ہو“

شولاپور کی لڑکی شدید گھبراہٹ اور اُلجھن محسوس کر رہی تھی اُس کے ہونٹوں پر لفظ آتے مگر واپس اُس کے حلق کے اندر چلے جاتے۔ آخر اُس نے ہمت اور جرأت سے کام لیا اور رُک رُک کر صرف اتنا کہا

”مجھ سے۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں بہت گھبرا رہی ہوں“

ڈاکٹر شروڈکر سمجھ گیا، لیکن پھر بھی اُس نے اُس لڑکی سے کہا

”غلطیاں انسان سے ہو ہی جاتی ہیں۔ تم سے کیا غلطی ہُوئی ہے۔“

لڑکی نے تھوڑے وقفے کے بعد جواب دیا

”وہی۔ وہی جو بے سمجھ جوان لڑکیوں سے ہوا کرتی ہیں“

ڈاکٹر نے کہا

”میں سمجھ گیا۔ لیکن اب تم کیا چاہتی ہو“

لڑکی فوراً اپنے مقصد کی طرف آگئی

”میں چاہتی ہوں کہ وہ ضائع ہو جائے۔ صرف ایک مہینہ ہوا ہے“

ڈاکٹر شروڈکر نے کچھ دیر سوچا، پھر بڑی سنجیدگی سے کہا

”یہ جرم ہے۔ تم جانتی نہیں ہو“

لڑکی کی بھوری آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو اُمڈ آئے

”تو میں زہر کھالوں گی“

یہ کہہ کر اس نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کو اس پر بڑا ترس آیا۔ وہ اپنی جوانی کی پہلی لغزش کر چکی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا لمحات تھے کہ اس نے اپنی عصمت کسی مرد کے حوالے کر دی اور اب پچھتا رہی ہے اور اتنی پریشان ہو رہی ہے۔ اس کے پاس اس سے پہلے کئی ایسے کیس آچکے تھے مگر اُس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ جیون ہتیا نہیں کر سکتا۔ یہ بہت بڑا گناہ اور جرم ہے۔ مگر شولاپور کی اُس لڑکی نے اس پر کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ اس کی خاطر یہ جرم کرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے اس کے لیے ایک علیحدہ کمرہ مختص کر دیا۔ کسی نرس کو اس کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ اس لڑکی کے راز کو افشا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسقاط بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب اُس نے دوائیں وغیرہ دے کر یہ کام کر دیا تو شولاپور

کی وہ مرہٹہ لڑکی جس نے آخر اپنا نام بتا دیا تھا بے ہوش ہو گئی جب ہوش میں آئی تو نقاہت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پی سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد گھر واپس چلی جائے مگر ڈاکٹر اسے کیسے اجازت دے سکتا تھا جب کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہی نہیں تھی اس نے مس للیتا کھمٹے کر سے (شولا پور کی اُس حسینہ کا یہی نام تھا) کہا

”تمھیں کم از کم دو مہینے آرام کرنا پڑے گا۔ میں تمہارے باپ کو لکھ دُوں گا کہ تم جس سہیلی کے پاس آئی تھیں وہاں اچانک طور پر بیمار ہو گئیں اور اب میرے ہسپتال میں زیر علاج ہو۔ تردّد کی کوئی بات نہیں“

للیتا مان گئی۔ دو مہینے ڈاکٹر شروڈکر کے زیرِ علاج رہی۔ جب رخصت کا وقت آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ گڑبڑ پھر پیدا ہو گئی ہے اُس نے ڈاکٹر شروڈکر کو اُس سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر مسکرایا

”کوئی فکر کی بات نہیں۔ میں تم سے آج شادی کرنے والا ہوں“

سعادت حسن منٹو ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۴ء

ڈائرکٹر کرپلانی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوڈائرکٹر کرپلانی

ڈائرکٹر کرپلانی اپنی بُلند کرداری اور خوش اطواری کی وجہ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بعض لوگ تو حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ ایسا نیک اور پاکباز آدمی فلم ڈائریکٹر کیوں بن گیا کیونکہ فلم کا میدان ایسا ہے جہاں جابجا گڑھے ہوتے ہیں ان دیکھے گڑھے، بے شمار دلدلیں، جن میں آدمی ایک دفعہ پھنسا تو عمر بھر باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ ڈائرکٹر کرپلانی کامیاب ڈائرکٹر تھا۔ اس کا ہر فلم باکس آفس ہٹ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سب فلم ساز اس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بیتاب رہتے۔ مگر وہ لالچی نہیں تھا۔ ایک فلم بنا کر وہ دو تین مہینے کے لیے پنچ گنی یا رونا ولہ چلا جاتا اور اپنے آئندہ فلم کی کہانی اور منظر نامے بڑے اطمینان سے تیار کرتا رہتا۔ وہ رہنے والا سندھ حیدر آباد کا تھا۔ سفید ٹول کی قمیص اور سفید زین کی پتلون کے علاوہ اور کوئی لباس نہیں پہنتا تھا۔ شام کو چھ بجے ایک بوتل بیئر کی پیتا لیکن اگر شوٹنگ رات کو ہو تو یہ بوتل اُس کے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ نشے کی حالت میں کام کرنا پسند نہیں کرتا تھا اس لیے کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ نشہ انسان کے ذہنی اعصاب کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ فلمی دنیا میں عشق معاشقے عام ہوتے ہیں۔ آج اگر ایک ایکٹرس کسی ڈائرکٹر کے پاس ہے تو دوسرے روز وہ کسی اور ڈائرکٹر کی بغل میں ہو گی۔ وہاں سے پھسل کر وہ شاید کسی نواب یا راجہ کی گود میں چلی جائے۔ سیلولائڈ کی یہ دنیا بڑی نرالی ہے۔ یہاں دُھوپ چھاؤں کی سی کیفیت رہتی ہے۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں۔ ایک ہی دن میں کئی وارداتیں ہوئی۔ ایک ایکٹرس اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی، پتی دیو صاحب جس سے ملتے اُس کے سامنے اپنی بدقسمتی کا رونا روتے۔ ایک ڈائرکٹر نے اپنی بیوی کو زہر دے کر مار ڈالا۔ دوسرے نے محبت کی ناکامی کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے خود کشی کر لی۔ ایک ایکٹرس کے حرامی بچہ پیدا ہوا۔ ڈائرکٹر کرپلانی یوں تو اسی دنیا میں رہتا تھا مگر سب سے الگ تھلگ۔ اس کو صرف اپنے کام سے غرض تھی۔ شوٹنگ ختم کی اور اپنے خوبصورت فلیٹ میں واپس چلا آیا۔ اسے کسی ایکٹرس سے جنسی تعلقات پیدا کرنے کی کبھی خواہش ہی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ مس۔ نے اس سے رغبت کا اظہار کیا، کرپلانی اُس کو علیحدہ کمرے میں ڈائلاگ کی ری ہرسل کرا رہا تھا کہ اس ایکٹرس نے اس سے بڑے دلبرانہ انداز میں کہا

”کرپلانی صاحب! آپ پر سفید کپڑے بہت پھبتے ہیں،۔ میں بھی اب سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز پہنا کروں گی۔“

کرپلانی نے جس کے دماغ میں اس وقت فلمائے جانے والے سین کے ڈائلاگ گھسے ہوئے تھے اُس سے کہا

”ہاں۔ مگر سفید چیزیں بہت جلد میلی ہو جاتی ہیں“

”تو کیا ہوا؟“

”ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن تمھیں کم از کم چودہ پندرہ ساڑھیاں اور اسی قدر بلاؤز بنوانے پڑیں گے“

ایکٹرس مسکرائی

”بنوالوں گی۔ آپ ہی لے دیں گے۔“

کرپلانی چکرا گیا۔

”میں۔ میں آپ کو کیوں لے کر دوں گا۔“

ایکٹرس نے کرپلانی کی قمیض کا کالر جو کسی قدر سمٹا ہوا تھا، بڑے پیار سے درست کیا

”آپ میرے لیے سب کچھ کریں گے۔ اور میں آپ کے لیے“

قریب تھا کہ وہ ایکٹرس کرپلانی کے ساتھ چمٹ جائے کہ اُس نے اُس کو پیچھے دھکیل دیا اور کہا

”خبر دار جو تم نے ایسی بے ہودہ حرکت کی“

دوسرے روز اُس نے اُس ایکٹرس کو اپنے فلم سے نکال باہر پھینکا۔ دو ہزار روپے اڈوانس لے چکی تھی۔ کرپلانی نے سیٹھ سے کہا کہ وہ روپے اُس کے حساب میں ڈال دے۔ سیٹھ نے پوچھا

”بات کیا ہے مسٹر کرپلانی“

کوئی بات نہیں ہے۔ واہیات عورت ہے میں اس کو پسند نہیں کرتا“

اتفاق کی بات ہے کہ وہ ایکٹرس سیٹھ کی منظورِ نظر تھی۔ سیٹھ نے جب زور دیا کہ وہ فلم کاسٹ میں موجود رہے گی تو کرپلانی دفتر سے باہر چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ کرِپلانی کی عمر یہی پینتیس برس کے قریب ہو گی۔ خوش شکل اور نفاست پسند تھا۔ اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اپنے خوبصورت فلیٹ میں اکیلا رہتا، جہاں اُس کے دو نوکر تھے۔ باورچی اور ایک دوسرا نوکر جو گھر کی صفائی کرتا تھا، اور آرام آسائش کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ان دونوں سے مطمئن تھا۔ اُس کی زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی۔ اُسے عورت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر اُس کے ہم عصر فلم ڈائرکٹروں کو سخت تعجب تھا کہ وہ عموماً رومانی فلم بناتا تھا جس میں مرد اور عورت کی پر جوش محبت کے مناظر ہوتے تھے۔ اُس کے دوست گنتی کے تھے ان میں سے ایک میں تھا جس کو وہ اپنا عزیز سمجھتا تھا۔ ایک دن میں نے اُس سے پوچھا

”کرپ، یہ کیا بات ہے کہ تم کبھی عورت کے نزدیک نہیں گئے، پر تمہارے فلموں پر عشق و محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تجربے کے بغیر تم ایسے مناظر کیوں کر لکھتے ہو، جس میں کیوپڈ ہوتا ہے یا اس کے تیر۔“

یہ سُن کر وہ مسکرایا

”آدمی تجربے کی بنا پر جو سوچے

”وہ ٹھس ہوتا ہے۔ پر تخیل کے زور سے جو کچھ سوچے، اُس میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ فلم سازی فریب کاری کا دوسرا نام ہے۔ جب تک تم اپنے آپ کو فریب نہ دو، دوسروں کو نہیں دے سکتے“

اُس کا یہ فلسفہ عجیب و غریب تھا۔ میں نے اس سے پوچھا

”کیا تم نے تخیل میں کوئی ایسی عورت پیدا کر لی ہے جس سے تم محبت کرتے ہو۔“

کرپلانی پھر مسکرایا

”ایک نہیں سینکڑوں۔ ایک عورت سے میرا کام کیسے چل سکتا ہے۔ مجھے عورت سے نہیں اس کے کردار سے دلچسپی ہے۔ چنانچہ میں ایک عورت اپنے تخیل میں پیدا کرتا ہوں اور اُس کو اُلٹ پلٹ کرتا رہتا ہوں۔“

”اُلٹ پلٹ سے تمہارا کیا مطلب ہے“

”یار تم بڑے کم سمجھ ہو۔ عورت کا جسمانی ڈھانچہ تو ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ پر اس کا کیریکٹر جداگانہ ہوتا ہے۔ کبھی وہ ماں ہوتی ہے کبھی چڑیل، کبھی بہن، کبھی مردانہ صفات رکھنے والی۔ سو ایک عورت میں تم سو روپ دیکھ سکتے ہو۔ اور صرف اپنے تخیل کی مدد سے۔ میں نے ایک روز اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے میز کا دراز کھولا کہ میرے پاس ماچس نہیں تھی، تو مجھے کاغذات کا ایک پلندہ نظر آیا، جو غالباً اس کے تازہ فلم کا منظر نامہ تھا۔ میں نے اُس کو اُٹھایا کہ شاید اس کے نیچے ماچس کی کوئی ڈبیا ہو۔ لیکن اس کے بجائے مجھے ایک فوٹو دکھائی دی جو ایک خوبصورت سندھی لڑکی کی تھی۔ میں اس فوٹو کو نکال کر غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ کرپلانی آ گیا اس نے میرے ہاتھ میں فوٹو دیکھی تو دیوانہ وار آگے بڑھ کر چھین لی اور اُسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے اُس سے معذرت طلب کی۔

”معاف کرنا کرپ۔ میں دیا سلائی تلاش کر رہا تھا کہ یہ فوٹو مجھے نظر آئی اور میں اسے دیکھنے لگا۔ کس کی ہے؟“

اُس نے یہ کہہ کر معاملہ گول کرنا چاہا

”کسی کی ہے“

میں نے پوچھا

”آخر کس کی؟۔ اس لڑکی کا کوئی نام تو ہو گا“

کرپلانی آرام کرسی پر بیٹھ گیا

“اس کے کئی نام ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ رادھا تھی۔ ناموں میں کیا پڑا ہے۔ یہ وہ لڑکی ہے جس سے میں نے عرصہ ہوا محبت کی تھی۔”

مجھے سخت حیرت ہوئی

“تم نے؟۔ تم نے محبت کی تھی”

“کیوں؟۔ میں کیا محبت نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب محبت کے نام ہی سے دُور بھاگتا ہوں لیکن جوانی کے دنوں میں ہر انسان کو ایسے لمحات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جب وہ دوسری صنف میں بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے”

میں جاننا چاہتا تھا کہ کرپلانی کو اس لڑکی سے کیسے عشق ہوا

“یہ کب کی بات ہے کرپ تم نے آج مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ تم کسی سے عشق لڑا چکے ہو۔ تمہارے عشق کا انجام کیا ہوا”

کرپلانی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا

“بہت افسوسناک”

“کیوں؟”

“میں اس سے محبت کرتا رہا، میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ میں دلچسپی لیتی ہے۔ آخر ایک دن جب میں نے اسے ٹٹولا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا لیکن میں نے اپنے دل میں اس بت کو بھی توڑ ڈالا جس کی میں پوجا کیا کرتا تھا۔ میں نے اُس کو بے شمار بد دُعائیں دیں کہ وہ مر جائے”

میں نے پوچھا

“کیا وہ مر گئی؟”

“ہاں اُسے مرنا ہی تھا، اس لیے کہ اُس نے مجھے مار ڈالا تھا۔ اُس کو ٹائی فائڈ ہوا اور ایک مہینے کے اندر اندر چل بسی۔”

“تمھیں اس کی موت کا افسوس نہ ہوا؟”

مجھے افسوس کیوں ہوتا۔ میری آنکھوں میں چند آنسو آئے، بہنے والے تھے کہ میں نے اُن سے کہا بے وقوفو کیوں خود کو ضائع کر رہے ہو۔ اور وہ میرا کہا مان کر واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے۔”

یہ کہتے ہوئے کرپلانی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے شاید وہی جو اس کا کہا مان کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب اس معاملے پر اور زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے چنانچہ میں اس سے رخصت لیے بغیر چلا گیا اس لیے کہ میرا خیال تھا کہ وہ تنہائی میں رہ کر اپنا جی ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے روز اُس سے ملاقات ہوئی تو وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ مجھے اپنے ساتھ اسٹوڈیو میں لے گیا وہاں چہک چہک کر مجھ سے اور اپنے ٹیکنیکل سٹاف سے باتیں کرتا رہا۔ یہ اس فلم کی شوٹنگ کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد کرپلانی ایڈیٹنگ میں قریب قریب ایک ماہ تک مصروف رہا۔ ریکارڈنگ ہوئی پرنٹ تیار ہوئے، فلم ریلیز ہوا اور بہت کامیاب ثابت ہوا۔ حسبِ دستور وہ پنچ گنی چلا گیا اور ڈیڑھ مہینے تک وہاں بڑی پُر سکون اور صحت افزا فضا میں اپنے آئندہ فلم کے لیے کہانی اور اُس کا منظر نامہ تیار کرتا رہا۔ اس کا ایک نئی فلم کمپنی سے کنٹریکٹ ہو چکا تھا کہانی بہت پسند کی گئی۔ اب کاسٹ چننے کا مرحلہ باقی تھا۔ سیٹھ چاہتا تھا کہ ہیروئن کے لیے کوئی نیا چہرہ لیا جائے۔ دراصل وہ پہلے ہی سے ایک خوش شکل لڑکی منتخب کر چکا تھا۔ اس کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ اس لڑکی کو ایک دم ہیروئن بنا دے۔ پر جب اس نے کہانی سنی تو اس کی ہیروئن میں اُس کو ہو بہو اُسی لڑکی کی شکل و شباہت اور چال ڈھال نظر آئی۔ اُس نے کرپلانی سے کہا

“میں نے ایک لڑکی کو ملازم رکھا ہے۔ آپ اسے دیکھ لیجیے۔ آپ کے فلم کے لیے بڑی مناسب ہیروئن رہے گی۔”

کرپلانی نے کہا

“آپ اُس کو بُلایئے میں دیکھ لُوں گا، کیمرہ اور ساؤنڈ ٹیسٹ لینے کے بعد اگر میرا اطمینان ہو گیا تو مجھے کوئی عذر نہیں ہو گا کہ اُسے ہیروئن کا رول دے دُوں۔”

دوسرے روز صبح دس بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔ کرپلانی کی یہ عادت تھی کہ صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر اسٹوڈیو آ جاتا اور ادھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ دس بجے تک وہ نئے اسٹوڈیو کی ہر چیز دیکھتا رہا ساڑھے دس بج گئے اس نے بیئر کی بوتل منگوائی مگر اسے نہ کھولا اس لیے کے اُسے یاد آ گیا کہ اُسے نئے چہرے کو دیکھنا ہے۔ گیارہ بج گئے، مگر سیٹھ کا دریافت کیا ہوا نیا چہرہ نمودار نہ ہوا۔ کرپلانی اُکتا گیا اس نے اپنی کہانی کے منظر نامے کی ورق گردانی شروع کر دی اس میں کچھ ترمیم کی اس دوران میں بارہ بج گئے، وہ صوفے پر لیٹ کر سونے ہی والا تھا کہ چپڑاسی نے کہا

“سیٹھ صاحب آپ کو سلام بولتے ہیں”

کرپلانی اُٹھا۔ سیٹھ کے دفتر میں گیا جہاں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ جب وہ سیٹھ کی کرسی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تو دم بخود ہو گیا۔ اس لڑکی کی شکل وصورت بالکل اس لڑکی کی سی تھی جس سے اُس نے عرصہ ہوا محبت کی تھی۔ سیٹھ باتیں کرتا رہا مگر کرپلانی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بہر حال اُس لڑکی کو ہیروئن کے رول کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ کرپلانی اُس لڑکی کو قریب قریب ہر روز دیکھتا اور اس کا اضطراب بڑھتا جاتا۔ ایک دن اُس نے ہمت سے کام لے کر اس سے پوچھا

”آپ کہاں کی رہنے والی ہیں“

لڑکی نے جواب دیا

”سندھ حیدر آباد کی۔ کرپلانی چکرا گیا۔

”سندھ حیدر آباد کی؟۔ آپ کا نام؟“

لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ سے کہا

”یشودھرا“

”آپ کی کوئی بہن ہے؟“

”تھی۔ مگر اس کا دیہانت ہو چکا ہے“

”کیا نام تھا ان کا؟“

”رادھا“!

کرپلانی نے سہ سنتے ہی اپنے دل کو پکڑ لیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اور دوسرے روز اچانک مر گیا۔

ڈرپوک

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوڈرپوک

میدان بالکل صاف تھا۔ مگر جاوید کا خیال تھا کہ میونسپل کمیٹی کی لالٹین جو دیوار میں گڑی ہے۔ اس کو گھور رہی ہے۔ بار بار وہ اس چوڑے صحن کو جس پر نانک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش بنا ہوا تھا، طے کر کے اس نکڑ والے مکان تک پہنچنے کا ارادہ کرتا جو دوسری عمارتوں سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ مگر یہ لالٹین جو مصنوعی آنکھ کی طرح ہر طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، اس کے ارادے کو متزلزل کر دیتی اور وہ اس بڑی موری کے اس طرف ہٹ جاتا جس کو پھاند کر وہ صحن کو چند قدموں میں طے کر سکتا تھا۔ صرف چند قدموں میں! جاوید کا گھر اس جگہ سے کافی دور تھا۔ مگر یہ فاصلہ بڑی تیزی سے طے کر کے یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے خیالات کی رفتار اس کے قدموں کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔ راستے میں اس نے بہت سی چیزوں پر غور کیا۔ وہ بیوقوف نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک بیسوا کے پاس جا رہا ہے۔ اور اس کو اس بات کا بھی پورا شعور تھا کہ وہ کس غرض سے اس کے یہاں جانا چاہتا ہے۔ وہ عورت چاہتا تھا۔ عورت، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ عورت کی ضرورت اس کی زندگی میں یک بیک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک زمانے سے یہ ضرورت اس کے اندر آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی رہی تھی۔ اور اب دفعتہً اس نے محسوس کیا تھا کہ عورت کے بغیر وہ ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ عورت اس کو ضرور ملنی چاہیے، ایسی عورت جس کی ران پر ہولے سے طمانچہ مار کر وہ اس کی آواز سن سکے۔ ایسی عورت جس سے وہ واہیات قسم کی گفتگو کر سکے۔ جاوید پڑھا لکھا ہوشمند آدمی تھا۔ ہر بات کی اونچ نیچ سمجھتا تھا۔ مگر اس معاملے میں مزید غور و فکر کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی، جو اس کے لیے نئی نہ تھی۔ عورت کی قربت حاصل کرنے کی خواہش اس سے پہلے کئی بار اس کے دل میں پیدا ہوئی اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انتہائی کوششوں کے بعد جب اسے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی زندگی میں سالم عورت کبھی نہیں آئے گی۔ اور اگر اس نے اس سالم عورت کی تلاش جاری رکھی تو کسی روز وہ دیوانے کُتے کی طرح راہ چلتی عورت کو کاٹ کھائے گا۔ کاٹ کھانے کی حد تک اپنے ارادہ میں ناکام رہنے کے بعد اب دفعتہً اس کے دل میں اس خواہش نے کروٹ بدلی تھی۔ اب کسی عورت کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے کا خیال اس کے دماغ سے نکل چکا تھا۔ عورت کا تصور اس کے دماغ میں موجود تھا۔ اس کے بال بھی تھے۔ مگر اب اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ان بالوں کو وحشیوں کی طرح کھینچے، نوچے، اکھیڑے۔ اب اس کے دماغ میں سے وہ عورت نکل چکی تھی جس کے ہونٹوں پر وہ اپنے ہونٹ اس طرح رکھنے کا آرزومند تھا۔ جیسے تتلی پھولوں پر بیٹھتی ہے، اب وہ ان ہونٹوں کو اپنے گرم ہونٹوں سے داغنا چاہتا تھا۔ ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کا خیال بھی اس کے دماغ میں نہیں تھا۔ اب وہ بلند آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسی باتیں جو اس کے موجودہ ارادے کی طرح ننگی ہوں۔ اب سالم عورت اس کے پیش نظر نہیں تھی۔ وہ ایسی

عورت چاہتا تھا جو گھس گھسا کر شکستہ حال مرد کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ ایسی عورت جو آدھی عورت ہو۔ اور آدھی کچھ بھی نہ ہو۔ ایک زمانہ تھا جب جاوید عورت کہتے وقت اپنی آنکھوں میں خاص قسم کی ٹھنڈک محسوس کیا کرتا تھا۔ جب عورت کا تصور اسے چاند کی ٹھنڈی دنیا میں لے جاتا تھا۔ وہ
”عورت“
کہتا تھا۔ بڑی احتیاط سے جیسے اس کو اس بے جان لفظ کے ٹوٹنے کا ڈر ہو۔ ایک عرصے تک وہ اس دنیا کی سیر کرتا رہا مگر انجام کار اس کو معلوم ہوا کہ عورت کی تمنا اس کے دل میں ہے۔ اس کی زندگی کا ایسا خواب ہے جو خراب معدے کے ساتھ دیکھا جائے۔ جاوید اب خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آیا تھا۔ بہت دیر تک ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو بہلاتا رہا۔ مگر اب اس کا جسم خوفناک حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے تصور کی شدت نے اس کی جسمانی حسیات کی نوک پلک کچھ اس طور پر نکالی تھی کہ اب زندگی اس کے لیے سوئیوں کا بستر بن گئی۔ ہر خیال ایک نشتر بن گیا اور عورت اس کی نظروں میں ایسی شکل اختیار کر گئی جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔ جاوید کبھی انسان تھا۔ مگر اب انسانوں سے اسے نفرت تھی، اس قدر کہ اپنے آپ سے بھی متنفّر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس طور پر کہ ایک عرصے تک اس کے خوبصورت خیال جن کو وہ اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجا کے رکھتا رہا تھا، غلاظت سے لتھڑے رہیں۔

”مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے لیکن غلاظت تو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اب جی یہ چاہتا ہے کہ اپنی روح اور جسم کے ہر ذرے کو اس غلاظت سے آلودہ کر دوں۔ میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے اب بدبودار اور متعفن چیزیں سونگھنے کے لیے بیتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پرانے خیالات کا چغہ اتار کر اس محلے کا رخ کیا ہے۔ جہاں ہر شے ایک پر اسرار تعفن میں لپٹی نظر آتی ہے۔ یہ دنیا کس قدر بھیانک طور پر حسین ہے“!

نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے تھا۔ لالٹین کی بیمار روشنی میں جاوید نے اس فرش کی طرف اپنی بدلی ہوئی نظروں سے دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ بہت سی ننگی عورتیں اوندھی لیٹی ہیں جن کی ہڈیاں جابجا ابھر رہی ہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس فرش کو طے کر کے نکڑ والے مکان کی سیڑھیوں تک پہنچ جائے اور کوٹھے پر چڑھ جائے مگر میونسپل کمیٹی کی لالٹین غیر مختتم ٹکٹکی باندھے اس کی طرف گھور رہی تھی۔ اس کے بڑھنے والے قدم رک گئے۔ اور وہ بھنا سا گیا۔ یہ لالٹین مجھے کیوں گھور رہی ہے۔ یہ میرے راستے میں کیوں روڑے اٹکاتی ہے۔“

وہ جانتا تھا کہ یہ محض واہمہ ہے اور اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی اس کے قدم رک جاتے تھے۔ اور وہ اپنے دل میں تمام بھیانک ارادے لیے موری کے اس پار رہ جاتا تھا، وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی کے ستائیس برسوں کی جھجک جو اسے ورثے میں ملی تھی، اس لالٹین میں جمع ہو گئی ہے۔ یہ جھجک جس کو پرانی کینچلی کی طرح اتار کر وہ اپنے گھر چھوڑ آیا تھا، اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی جہاں اسے اپنی زندگی کا سب سے بھدا کھیل کھیلنا تھا۔ ایسا کھیل جو اسے کیچڑ میں لت پت کر دے، اس کی روح کو ملوّث کر دے۔ ایک میلی کچیلی عورت اس مکان میں رہتی تھی۔ اس کے پاس چار پانچ جوان عورتیں تھیں جو رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں یکساں بھدے پن سے پیشہ کیا کرتی تھیں۔ یہ عورتیں گندی موری سے غلاظت نکالنے والے پمپ کی طرح چلتی رہتی تھیں۔ جاوید کو اس قحبہ خانے کے متعلق اس کے ایک دوست نے بتایا تھا جو حسن و عشق کی تلاش کئی مرتبہ اس قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔ جاوید سے وہ کہا کرتا تھا۔

”تم عورت عورت پکارتے ہو۔ عورت ہے کہاں؟۔ مجھے تو اپنی زندگی میں صرف ایک عورت نظر آئی جو میری ماں تھی۔ مستورات البتہ دیکھی ہیں اور ان کے متعلق سنا بھی ہے لیکن جب کبھی عورت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو میں نے مائی جیواں کے کوٹھے کو اپنا بہترین رفیق پایا ہے۔ بخدا مائی جیواں عورت نہیں فرشتہ ہے۔ خدا اس کو خضر کی عمر عطا فرمائے۔“

جاوید مائی جیواں اور اس کے یہاں کی چار پانچ پیشہ کرنے والی عورتوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ان میں سے ایک ہر وقت گہرے رنگ کے شیشے والا چشمہ پہنے رہتی ہے۔ اس لیے کہ کسی بیماری کے باعث اس کی آنکھیں خراب ہو چکی ہیں۔ ایک کالی کلوٹی لونڈیا ہے جو ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ اس کے متعلق جاوید جب سوچتا تو عجیب و غریب تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھچ جاتی۔

”مجھے ایسی ہی عورت چاہیے جو ہر وقت ہنستی رہے۔ ایسی عورتوں کو ہنستے ہی رہنا چاہیے۔ جب وہ ہنستی ہو گی تو اس کے کالے کالے ہونٹ یوں کھلتے ہوں گے۔ جیسے بدبودار گندے پانی میں میلے بلبلے بن بن کر اٹھتے ہیں۔“

مائی جیواں کے پاس ایک اور چھوکری بھی تھی۔ جو باقاعدہ طور پر پیشہ کرنے سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ اب ایک برس سے وہ اس مکان میں تھی، جہاں اٹھارہ برسوں سے یہی کام ہو رہا تھا۔ یہ اب پوڈر اور سرخی لگاتی تھی۔ جاوید اس کے متعلق بھی سوچتا۔

”اس کے سرخی لگے گال بالکل داغدار سیبوں کے مانند ہوں گے۔ جو ہر کوئی خرید سکتا ہے۔“

ان چار یا پانچ عورتوں میں سے جاوید کی کسی خاص پر نظر نہیں تھی۔ مجھے کوئی بھی مل جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے دام لیے جائیں اور کھٹ سے ایک عورت میری بغل میں تھما دی جائے۔ ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہونی چاہیے۔ کسی قسم کی گفتگو نہ ہو، کوئی نرم و نازک فقرہ منہ سے نہ نکلنے پائے۔ قدموں کی چاپ سنائی دے۔ دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو۔ روپے

کھنکھنائیں۔ اور آوازیں بھی آئیں مگر منہ بند رہے، اگر آواز نکلے تو ایسی جو انسانی آواز معلوم نہ ہو۔ ملاقات ہو بالکل حیوانوں کی طرح تہذیب و تمدن کے صندوق میں تالا لگ جائے۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسی دنیا آباد ہو جائے جس میں سونگھنے، دیکھنے اور سننے کی نازک حسیات زنگ لگے استرے کے مانند کند ہو جائیں۔ جاوید بے چین ہو گیا۔ ایک الجھن سی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی۔ ارادہ اس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا۔ کہ اگر پہاڑ بھی اس کے راستے میں ہوتے تو وہ ان سے بھڑ جاتا۔ مگر میونسپل کمیٹی کی ایک اندھی لالٹین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بجھا سکتا تھا۔ اس کی راہ میں بہت بُری طرح حائل ہو گئی تھی۔ اس کی بغل میں پان والے کی دکان کھلی تھی۔ تیز روشنی میں اس کی چھوٹی سی دکان کا اسباب اس قدر نمایاں ہو رہا تھا کہ بہت سی چیزیں نظر نہیں آتی تھیں۔ بجلی کے قمقمے کے ارد گرد مکھیاں اس انداز سے اڑ رہی تھیں جیسے ان کے پَر بوجھل ہو رہے ہیں۔ جاوید نے جب ان کی طرف دیکھا تو اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی سست رفتار چیز نظر آئے۔ اس کا کر گزرنے کا ارادہ جو وہ اپنے گھر سے لے کر یہاں آیا تھا ان مکھیوں کے ساتھ ساتھ بار بار ٹکرایا اور وہ اس کے احساس سے اس قدر پریشان ہوا کہ ایک ہلڑ سا اس کے دماغ میں مچ گیا۔

”میں ڈرتا ہوں۔ میں خوف کھاتا ہوں۔ اس لالٹین سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میرے تمام ارادے اس نے تباہ کر دیے ہیں۔ میں ڈرپوک ہوں۔ میں ڈرپوک ہوں۔ لعنت ہو مجھ پر۔“

اس نے کئی لعنتیں اپنے آپ پر بھیجیں مگر خاطر خواہ اثر پیدا نہ ہوا۔ اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے لیٹا رہا۔ گرمیوں کے دن تھے نصف رات گزرنے پر بھی ہوا ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ بازار میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ گنتی کی صرف چند دکانیں کھلی تھیں۔ فضا خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کوٹھے سے ہوا کے گرم جھونکے کے ساتھ تھکی ہوئی موسیقی کا ایک ٹکڑا اڑ کر ادھر چلا آتا تھا اور گاڑھی خاموشی میں گھل جاتا تھا۔ جاوید کے سامنے یعنی مائی جیواں کے قحبہ خانے سے ادھر ہٹ کر بڑے بازار میں جو دکانوں کے اوپر کوٹھوں کی ایک قطار تھی۔ اس میں کئی جگہ زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے بالمقابل کھڑکی میں تیز روشنی کے قمقمے کے نیچے ایک سیاہ فام عورت بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ اس کے سر کے اوپر بجلی کا بلب جل رہا تھا اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ سفید آگ کا ایک گولا ہے جو پگھل پگھل کر اس ویشیا پر گر رہا ہے۔ جاوید اس سیاہ فام عورت کے متعلق کچھ غور کرنے ہی والا تھا کہ بازار کے اس سرے سے جو اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔ بڑے بھدے نعروں کی صورت میں چند آوازیں بلند ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی جھومتے جھامتے شراب کے نشے میں چور نمودار ہوئے۔ تینوں کے تینوں اس سیاہ فام عورت کے کوٹھے کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور جاوید کے کانوں نے ایسی ایسی واہیات باتیں سنیں کہ اس کے تمام ارادے اس کے اندر سمٹ کر رہ گئے۔ ایک شرابی نے جس کے قدم بہت زیادہ لڑکھڑا رہے تھے، اپنے مونچھوں بھرے ہونٹوں سے بڑی بھدی آواز کے ساتھ ایک بوسہ نوچ کر اس کالی ویشیا کی طرف اچھالا اور ایک ایسا فقرہ کسا کہ جاوید کی ساری ہمت پست ہو گئی۔ کوٹھے پر برقی لیمپ کی روشنی میں اس سیاہ فام عورت کے ہونٹ ایک آبنوسی قہقہے نے وا کیے اور اس نے شرابی کے فقرے کا جواب یوں دیا جیسے ٹوکری بھر کوڑا نیچے پھینک دیا ہے۔ نیچے غیر مربوط قہقہوں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا اور جاوید کے دیکھتے دیکھتے وہ تینوں شرابی کوٹھے پر چڑھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نشست جہاں وہ کالی ویشیا بیٹھی تھی خالی ہو گئی۔ جاوید اپنے آپ سے اور زیادہ متنفر ہو گیا۔

”تم۔ تم۔ تم کیا ہو؟۔ میں پوچھتا ہوں، آخر تم کیا ہو۔ نہ تم یہ ہو، نہ وہ ہو۔ نہ تم انسان ہو نہ حیوان۔ تمہاری ذہانت و ذکاوت آج سب دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ تین شرابی آتے ہیں۔ تمہاری طرح ان کے دل میں ارادہ نہیں ہوتا۔ لیکن بے دھڑک اس ویشیا سے واہیات باتیں کرتے ہیں اور ہنستے، قہقہے لگاتے کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں۔ گویا پتنگ اڑانے جا رہے ہیں۔ اور تم۔ اور تم جو کہ اچھی طرح سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ یوں بیوقوفوں کی طرح بیچ بازار میں کھڑے ہو اور ایک بے جان لالٹین سے خوف کھا رہے ہو۔ تمہارا ارادہ اس قدر صاف اور شفاف ہے لیکن پھر بھی تمہارے قدم آگے نہیں بڑھتے۔ لعنت ہو تم پر۔“

جاوید کے اندر ایک لمحے کے لیے خود انتقامی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے قدموں میں جنبش ہوئی اور موری پھاند کر وہ مائی جیواں کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ لپک کر سیڑھیوں کے پاس پہنچ جائے کہ اوپر سے ایک آدمی اترا۔ جاوید پیچھے ہٹ گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش بھی کی لیکن کوٹھے پر سے نیچے آنے والے آدمی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس آدمی نے اپنا ململ کا کرتہ اتار کر کاندھے پر دھرا تھا۔ اور داہنی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا مسلا ہوا ہار لپیٹا تھا۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ جاوید کے وجود سے بے خبر وہ اپنے تہمد کو دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں تک اونچا کیے نانک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش طے کر کے موری کے اس پار چلا گیا اور جاوید نے سوچنا شروع کیا کہ اس آدمی نے اس کی طرف کیوں نہیں دیکھا۔ اس دوران میں اس نے لالٹین کی طرف دیکھا تو وہ اسے یہ کہتی معلوم ہوئی۔

”تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ تم ڈرپوک ہو۔ یاد ہے تمہیں پچھلے برس برسات میں جب تم نے اس ہندو لڑکی اندرا سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا تو تمہارے جسم میں سکت نہیں رہی تھی۔ کیسے کیسے۔ بھیانک خیال تمہارے دماغ میں پیدا ہوئے تھے۔ یاد ہے، تم نے ہندو مسلم فساد کے متعلق بھی سوچا تھا اور ڈر گئے تھے۔ اس لڑکی کو تم نے اسی ڈر کے مارے بھلا دیا اور حمیدہ سے تم اس لیے محبت نہ کر سکے کہ وہ تمہاری رشتہ دار تھی اور تمہیں اس بات کا خوف تھا کہ تمہاری محبت کو غلط نظروں سے دیکھا جائے گا۔ کیسے کیسے وہم تمہارے اوپر ان دنوں مسلط تھے۔ اور پھر تم نے بلقیس سے محبت کرنا چاہی۔ مگر اس کو صرف ایک بار دیکھ کر تمہارے سب ارادے غائب ہو گئے اور تمہارا دل ویسے کا ویسا بنجر رہا۔ کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہر بار تم نے اپنی بے لوث محبت کو آپ ہی شک کی نظروں سے دیکھا ہے۔ تمہیں اس بات کا کبھی پوری طرح یقین نہیں آیا کہ تمہاری محبت ٹھیک

فطری حالت میں ہے۔ تم ہمیشہ ڈرتے ہو۔ اس وقت بھی تم خائف ہو یہاں گھریلو عورتوں اور لڑکیوں کا سوال نہیں، ہندو مسلم فساد کا بھی اس جگہ کوئی خدشہ نہیں لیکن اس کے باوجود تم کبھی اس کوٹھے پر نہیں جاسکو گے۔ میں دیکھوں گی تم کس طرح اوپر جاتے ہو۔“

جاوید کی رہی سہی ہمت بھی پست ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا وہ واقعی پرلے حد درجے کا ڈرپوک ہے۔ بیتے ہوئے واقعات تیز ہوا میں رکھی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح اس کے دماغ میں دیر تک پھڑ پھڑاتے رہے اور پہلی مرتبہ اس کو اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اس کے وجود کی بنیادوں میں ایک ایسی جھجک بیٹھی ہوئی ہے جس نے اسے قابلِ رحم حد تک ڈرپوک بنادیا ہے۔ سامنے سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ تو جاوید اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ وہی جو گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک پہنتی تھی اور جس کے متعلق وہ کئی بار اپنے دوست سے سن چکا تھا۔ سیڑھیوں کے اختتامی چبوترے پر کھڑی تھی۔ جاوید گھبرا گیا، قریب تھا کہ وہ آگے سرک جائے کہ اس نے بڑے بھدے طریقے پر اسے آواز دی۔

”اجی ٹھہر جاؤ۔ میری جان گھبراؤ نہیں۔ آؤ۔ آؤ۔“

اس کے بعد اس نے پچکارتے ہوئے کہا۔

”چلے آؤ۔ آجاؤ۔“

یہ سن کر جاوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا تو اس کی پیٹھ میں دُم اُگ آئے گی جو ویشیا کے پچکارنے پر ہلنا شروع کردے گی۔ اس احساس سمیت اس نے چبوترے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مائی جیواں کے قحبے خانے کی اس عینک چڑھی لونڈیا نے کچھ اس طرح اپنے بالائی جسم کو حرکت دی کہ جاوید کے تمام ارادے پکے ہوئے بیروں کی مانند جھڑ گئے۔ اس نے پھر پچکارا

”آؤ۔ میری جان اب آبھی جاؤ۔“

جاوید اٹھ بھاگا۔ موری پھاند کر جب وہ بازار میں پہنچا تو اس نے ایک ایسے قہقہے کی آواز سنی جو خطرناک طور پر بھیانک تھا۔ وہ کانپ اٹھا۔ جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو اس کے خیالات کے ہجوم میں سے دفعتہً ایک خیال رینگ کر آگے بڑھا۔ جس نے اس کو تسکین دی۔

”جاوید، تم ایک بہت بڑے گناہ سے بچ گئے۔ خدا کا شکر بجالاؤ۔“

ڈھارس

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوڈھارس

آج سے ٹھیک آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ ہندو سبھا کالج کے سامنے جو خوبصورت شادی گھر ہے اس میں ہمارے دوست بشیشر ناتھ کی برات ٹھہری ہوئی تھی۔ تقریباً تین ساڑھے تین سو کے قریب مہمان تھے جو امر تسر اور لاہور کی نامور طوائفوں کا مجرا سُننے کے بعد اس وسیع عمارت کے مختلف کمروں میں فرش پر یا چارپائیوں پر گہری نیند سو رہے تھے۔ چار بج چکے تھے۔ میری آنکھوں میں بشیشر ناتھ کے ساتھ ایک علیحدہ کمرے میں خاص خاص دوستوں کی موجودگی میں پی ہوئی وسکی کا خمار ابھی تک باقی تھا۔ جب ہال کے گول کلاک نے چار بجائے تو میری آنکھ کھلی۔ شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا کیوں کہ پلکوں میں کچھ چیز پھنسی پھنسی معلوم ہوتی تھی۔ ایک آنکھ بند کرکے، اس خیال سے کہ دوسری آنکھ ابھی کچھ دیر سوتی رہے، میں نے ہال کے فرش پر نظر دوڑائی۔ سب سو رہے تھے۔ کچھ اوندھے، کچھ سیدھے اور کچھ چاقو سے بنے ہوئے۔ میں نے اب دوسری آنکھ کھولی اور دیکھا۔ رات کو پینے کے بعد جب ہم ہال میں آکر لیٹے تھے تو اصغر علی نے ضد کی تھی کہ وہ گاؤ تکیہ لے کر سوئے گا۔ گاؤ تکیہ مرے سر سے کچھ فاصلے پر پڑا تھا مگر اصغر موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا، حسبِ معمول رات بھر جاگتا رہا ہے اور اس وقت یہاں سے بہت دور رام باغ میں کسی معمولی ٹکھیائی کے میلے بستر پر سو رہا ہے۔ اصغر علی کے لیے شراب دیسی ہو یا انگریزی، ایک تیز گاڑی تھی جو اسے فوراً عورت کی طرف کھینچ کرلے جاتی تھی۔ شراب پینے کے بعد یوں تو ننانوے فی صد مردوں کو خوبصورت چیزیں اپنی طرف کھینچتی ہیں، لیکن اصغر جو نہایت اچھا فوٹو گرافر اور پینٹر تھا۔ جو رنگوں اور لکیروں کا صحیح امتزاج جانتا تھا، شراب پینے کے بعد ہمیشہ نہایت ہی بھونڈی تصویر پیش کیا کرتا تھا۔ میری پلکوں میں پھنسے ہُوئے خواب کے ٹکڑے نکل گئے اور میں نے اصغر علی کے متعلق سوچنا شروع کردیا جو خواب نہیں تھا۔ اس کے لمبے بالوں والے وزنی سر کا دباؤ گاؤ تکیے پر مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ کئی بار غور کرنے کے باوجود میں سمجھ نہ سکا تھا کہ شراب پی کر اصغر کا دل اور دماغ شل کیوں ہو جاتا ہے۔ شل تو نہیں کہنا چاہیے کیونکہ وہ خوفناک طور پر بیدار ہو جاتا تھا اور اندھیری سے اندھیری گلیوں میں بھی راستہ تلاش کرتا، وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کسی نہ کسی جسم بیچنے والی عورت کے پاس پہنچ جاتا۔ اس کے غلیظ بستر سے اٹھ کر جب وہ صبح نہادھو کر اپنے اسٹوڈیو پہنچتا اور صاف ستھری، تندرست جوان اور خوب صورت لڑکیوں اور عورتوں کی تصویر اُتارتا تو اس کی آنکھوں میں حیوانیت کی ہلکی سی جھلک بھی نہ ہوتی جو شرابی حالت میں ہر دیکھنے والے کو نظر آسکتی تھی۔ یقین مانیے شراب پی کر وہ

سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ اس کے دماغ سے خود احتسابی کچھ عرصے کے لیے بالکل مفقود ہو جاتی تھی۔ آدمی کتنا پی سکتا تھا! چھ، سات، آٹھ پیگ۔ مگر اس بظاہر بے ضرر سیال مادے کے چھ یا سات گھونٹ اسے شہوت کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیتے تھے۔ آپ وسکی میں سوڈا یا پانی ملا سکتے ہیں، لیکن عورت کو اس میں حل کرنا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شراب پی جاتی ہے۔ غم غلط کرنے کے لیے۔ عورت کوئی غم تو نہیں۔ شراب پی جاتی ہے۔ شور مچانے کے لیے۔ عورت کوئی شور تو نہیں۔ رات اصغر نے شراب پی کر بہت شور مچایا۔ شادی بیاہ پر چونکہ ویسے ہی کافی ہنگامہ ہوتا ہے اس لیے یہ شور دب گیا ورنہ مصیبت برپا ہوتی۔ ایک دفعہ وسکی سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا:

”میں بہت اونچا آدمی ہوں۔ اونچی جگہ بیٹھ کر پیوں گا۔“

میرا خیال تھا کہ رام باغ میں کسی اونچے کوٹھے کی تلاش میں چلا گیا ہے، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب دروازہ کھلا تو وہ ایک لکڑی کی سیڑھی لیے اندر داخل ہوا اور اسے دیوار کے ساتھ لگا کر سب سے اوپر والے ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور چھت کے ساتھ سر لگا کر پینے لگا۔ بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اور بشیشر نے اسے نیچے اتارا اور سمجھایا کہ ایسی حرکتیں صرف اس وقت اچھی لگتی ہیں جب کوئی اور موجود نہ ہو، شادی گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہے، اسے خاموش رہنا چاہیے۔ معلوم نہیں کیسے یہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی کیونکہ جب تک پارٹی جاری رہی، وہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا اپنے حصے کی وسکی پیتا رہا۔ یہ سوچتے سوچتے میں اُٹھا اور باہر بالکنی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہندو سبھا کالج کی لال لال اینٹوں والی عمارت صبح کے خاموش اندھیارے میں لپٹی ہوئی تھی۔ آسمان کی طرف دیکھا تو کئی تارے مٹیالے آسمان پر کانپتے ہوئے نظر آئے۔ مارچ کے آخری دنوں کی خُنک ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ میں نے سوچا چلو اوپر چلیں۔ کھلی جگہ ہے، کچھ دیر مرمر کے بنے ہوئے شہ نشین پر لیٹیں گے۔ سردی محسوس ہونے پر بدن میں جو تیز تیز جھرجھریاں پیدا ہوں گی، ان کا مزا آئے گا۔ لمبا برآمدہ طے کر کے جب میں سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اوپر سے کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ چند لمحات کے بعد اصغر نمودار ہوا اور مجھ سے کلام کیے بغیر پاس سے گزر گیا اندھیرا تھا میں نے سوچا شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں چنانچہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر میں نے چڑھنا شروع کیا۔ میری عادت ہے، جب کبھی میں سیڑھیاں چڑھتا ہوں تو اس کے زینے ضرور گنتا ہوں۔ میں نے دل میں چوبیس کہا اور دفعتہً مجھے آخری زینے پر ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ میں بوکھلا گیا کیونکہ قریب قریب ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔

”معاف کر دیجیے گا۔ اوہ، آپ“!

عورت شاردا تھی۔ ہماری ہمسائی ہرنام کور کی بڑی لڑکی جو شادی کے ایک برس بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ پیشتر اس کے میں اس سے کچھ اور کہوں، اس نے مجھ سے بڑی تیزی سے پوچھا۔

”یہ کون تھا جو ابھی نیچے گیا ہے؟“

”کون“!

”وہی آدمی جو ابھی نیچے اُتر کے گیا ہے۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں۔“

”جانتا ہوں۔“

”کون ہے؟“

”اصغر۔“

”اصغر“!

اس نے یہ نام اپنے دانتوں کے اندر جیسے کاٹ دیا اور مجھے، جو کچھ بھی ہُوا تھا اس کا علم ہو گیا۔

”کیا اس نے کوئی بدتمیزی کی ہے۔“

”بدتمیزی“!

شاردا کا دوہرا جسم غصے سے کانپ اٹھا۔

”لیکن میں کہتی ہوں اس نے مجھے سمجھا کیا۔“

یہ کہتے ہُوئے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اس نے۔ اس نے۔“

اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ میں عجیب الجھن میں پھنس گیا۔ سوچنے لگا اگر رونے کی آواز سن کر کوئی اوپر آ گیا تو ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ شاردا کے چار بھائی ہیں اور چاروں کے چاروں شادی گھر میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو تو ہر وقت دوسروں سے لڑائی کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اصغر علی کی اب خیر نہیں۔ میں نے اس کو سمجھانا شروع کیا:

”دیکھیے آپ روئیے نہیں۔ کوئی سُن لے گا۔“

ایک دم دونوں ہاتھ اپنے منہ سے ہٹا کر اس نے تیز آواز کہا۔

”سُن لے۔ میں سُنانا ہی تو چاہتی ہوں۔ مجھے آخر اس نے سمجھا کیا تھا۔ بازاری عورت۔ میں۔ میں۔“

آواز پھر اس کے حلق میں اٹک گئی۔

”میرا خیال ہے اس معاملے کو یہیں دبا دینا چاہیے۔“

”کیوں؟“

”بدنامی ہو گی۔“

”کس کی۔ میری یا اس کی؟“

”بدنامی تو اس کی ہو گی لیکن کیچڑ میں ہاتھ ڈالنے کا فائدہ ہی کیا ہے“!

یہ کہہ میں نے اپنا رومال نکال کر اسے دیا۔

”لیجیے آنسو پونچھ لیجیے۔“

رومال فرش پر پٹک کر وہ شہ نشین پر بیٹھ گئی۔ میں نے رومال اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”شاردا دیوی! اصغر میرا دوست ہے۔ اس سے جو غلطی ہوئی، میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔

”آپ کیوں معافی مانگتے ہیں؟“

”اس لیے کہ میں یہ معاملہ رفع دفع کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے آپ کہیں تو میں اسے یہاں لے آتا ہوں۔ وہ آپ کے سامنے ناک سے لکیریں بھی کھینچ دے گا۔“

نفرت سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

”نہیں۔ اس کو میرے سامنے مت لایئے گا۔ اس نے میرا اپمان کیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے پھر اس کا گلا رندھ گیا، اور شہ نشین کی مرمریں سل پر کہنیوں کے بل دوہری ہو کر اس نے مجروح جذبات کے اٹھتے ہوئے فوارے کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔ میں بوکھلا گیا۔ ایک جوان اور تندرست عورت میرے سامنے رو رہی تھی اور میں اسے چپ نہیں کرا سکتا تھا۔ ایک دفعہ اسی اصغر کی موٹر چلاتے چلاتے میں نے ایک کتے کو بچانے کے لیے ہارن بجایا۔ شامت اعمال ایسا ہاتھ پڑا کہ ہارن بس وہیں، آواز۔ ایک نہ ختم ہونے والا شور بن کے رہ گئی۔ ہزار کوشش کر رہا ہوں کہ ہارن بند ہو جائے مگر وہ پڑا چلا رہا ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں اور میں مجسم بے چارگی بنا بیٹھا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کوٹھے پر میرے اور شاردرا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن میری بے چارگی کچھ اس ہارن والے معاملے سے سوا تھی۔ میرے سامنے ایک عورت رو رہی تھی جس کو بہت دکھ پہنچا تھا۔ کوئی اور عورت ہوتی تو میں تھوڑی دیر اپنا فرض ادا کرنے کے بعد چلا جاتا، مگر شاردا ہمسائی کی لڑکی تھی اور میں اسے بچپن سے جانتا تھا۔ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ اپنی تین چھوٹی بہنوں کے مقابلے میں کم خوبصورت لیکن بہت ذہین۔ کروشیے اور سلائی کے کام میں چابک دست اور کم گو۔ جب پچھلے برس شادی کے عین ساڑھے گیارہ مہینوں بعد اس کا خاوند ریل کے حادثے میں مر گیا تھا تو ہم سب گھر والوں کو بہت افسوس ہوا تھا۔ خاوند کی موت کا صدمہ کچھ اور ہے، مگر یہ صدمہ جو شاردا کو میرے ایک واہیات دوست نے پہنچایا تھا، ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت بالکل مختلف اور بہت اذّیت دہ تھی۔ میں نے اس کو چپ کرانے کی ایک بار اور کوشش کی۔ شہ نشین پر اس کے پاس بیٹھ کر میں نے اس سے کہا:

”شاردا یوں روئے جانا ٹھیک نہیں۔ جاؤ! نیچے چلی جاؤ اور جو کچھ ہُوا ہے، اس کو بھول جاؤ۔ وہ کم بخت شراب پیے ہوا تھا۔ ورنہ یقین جانو اتنا برا آدمی نہیں۔ شراب پی کر جانے کیا ہو جاتا ہے اسے۔“

شاردا کا رونا بند نہ ہُوا۔ مجھے معلوم تھا اصغر نے کیا کیا ہو گا، کیونکہ عام مردوں کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے، جسمانی۔ لیکن پھر بھی میں خود شاردا کے منہ سے سننا چاہتا تھا کہ اصغر نے کس طور پر یہ بے ہودگی کی۔ چنانچہ میں نے اسی ہمدردانہ لہجے میں اس سے کہا۔

”معلوم نہیں اس نے تم سے کیا بدتمیزی کی ہے، لیکن کچھ نہ کچھ میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم اوپر کیا کرنے آئی تھیں۔“

شاردا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں نیچے کمرے میں سو رہی تھی، دو عورتوں نے میرے متعلق باتیں شروع کر دیں۔“

آواز ایک دم اس کے گلے میں رندھ گئی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“

شاردا نے اپنا منہ مرمریں سل پر رکھ دیا اور بہت زور سے رونے لگی۔ میں نے اس کے چوڑے کاندھوں پر ہولے ہولے تھپکی دی۔

”چپ کر جاؤ شاردا۔ چپ کر جاؤ۔“

روتے روتے، ہچکیوں کے درمیان اس نے کہا۔

”وہ کہتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں۔ اس ودوا کو یہاں کیوں بُلایا گیا ہے۔“

ودوا کہتے ہوئے شاردا نے اپنے آنسوؤں بھرے دوپٹے کا ایک کونہ منہ میں چبالیا۔

”یہ سن کر میں رونے لگی اور اوپر چلی آئی۔ اور۔“

یہ سُن کر مجھے بھی شدید دکھ ہوا۔ عورتیں کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ خاص طور پر بوڑھی۔ زخم تازہ ہوں، یا پرانے کیا مزے لے لے کر کریدتی ہیں۔ میں نے شاردا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پُرخلوص ہمدردی سے دبایا۔

”ایسی باتوں کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہیے۔“

وہ بچے کی طرح بلکنے لگی۔

”میں نے اوپر آکر یہی سوچا تھا اور سو گئی تھی۔ کہ آپ کا دوست آیا اور اس نے میرا دوپٹہ کھینچا۔ اور میرے کُرتے کے بٹن کھول کر۔“

اس کے کُرتے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔

”جانے دو شاردا۔ بھول جاؤ جو کچھ ہوا۔“

میں نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے آنسو پونچھنے شروع کیے۔ دوپٹے کا کونہ ابھی تک اس کے منہ تھا، بلکہ اس نے کچھ اور زیادہ اندر چبالیا تھا۔ میں نے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اس گیلے حصے کو اس نے اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے بڑے دکھ سے کہا:

”آپ کے دوست ودوا سمجھ کر ہی مجھ پر ہاتھ ڈالا ہو گا۔ سوچا ہو گا اس عورت کا کون ہے۔“

”نہیں نہیں شاردا، نہیں۔

”میں نے اس کا سر اپنے کندھے کے ساتھ لگالیا“

”جو کچھ اس نے سوچا، جو کچھ اس نے کیا لعنت بھیجو اس پر۔ چپ ہو جاؤ۔“

جی چاہا لوری دے کر اس کو سلا دوں۔ میں نے اس کی آنکھیں خشک کی تھیں لیکن آنسو پھر اُبل آئے تھے۔ دوپٹے کا کونہ جو اس نے پھر منہ میں چبالیا تھا، میں نے نکال کر انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے اور دونوں آنکھوں کو ہولے ہولے چوم لیا۔

”بس اب نہیں رونا۔“

شاردا نے اپنا سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے دھیرے دھیرے اس کے گال تھپکائے:

”بس، بس، بس“!

تھوڑی دیر کے بعد جب میں نیچے اترا تو مارچ کے آخری دنوں کی خنک ہوا میں، شہ نشین کی مرمریں سل پر، اصغر کی بے ہودگی کو بھول کر شاردا اپنا ململ کا دوپٹہ تانے خود کو بالکل ہلکی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے سینے میں تلاطم کے بجائے اب شیر گرم سکون تھا۔

راجو

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوراجو

سن اکتیس کے شروع ہونے میں صرف رات کے چند برفائے ہوئے گھنٹے باقی تھے۔ وہ لحاف میں سردی کی شدت کے باعث کانپ رہا تھا۔ پتلون اور کوٹ سمیت لیٹا تھا، لیکن اس کے باوجود سردی کی لہریں اُس کی ہڈیوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی سبز روشنی میں جو سردی میں اضافہ کر رہی تھی، زور زور سے ٹہلنا شروع کر دیا کہ اس کا دوران خون تیز ہو جائے۔ تھوڑی دیر یوں چلنے پھرنے کے بعد جب اُس کے جسم کے اندر تھوڑی سی حرارت پیدا ہو گئی تو وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سُلگا کر اپنے دماغ کو ٹٹولنے لگا۔ اس کا دماغ چونکہ بالکل خالی تھا، اس لیے اُس کی قوتِ سامعہ بہت تیز تھی۔ کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں، مگر وہ باہر گلی میں ہوا کی مدھم سے مدھم گنگناہٹ بڑی آسانی سے سن سکتا تھا۔

اس گنگناہٹ میں اُسے انسانی آوازیں سُنائی دیں۔ ایک دبی دبی چیخ دسمبر کی آخری رات کی خاموشی میں چابک کے اول کی طرح ابھری، پھر کسی کی التجائیہ آواز لرزی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے کھڑکی کی درز میں سے باہر کی طرف دیکھا۔ وہی۔ وہی لڑکی یعنی سوداگروں کی نوکرانی میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی۔ صرف ایک سفید بُنیان پہنے۔ لیمپ کی روشنی میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے بدن پر برف کی ایک پتلی سی تہہ جم گئی ہے۔ اُس کے بُنیان کے نیچے، اس کی بدنما چھاتیاں، ناریلوں کے مانند لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس انداز میں کھڑی تھی، گویا ابھی کشتی سے فارغ ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں دیکھ کر سعید کے صناعانہ جذبات کو دھچکا سالگا۔ اتنے میں کسی مرد کی بھنچی بھنچی آواز سنائی دی۔

”خدا کے لیے اندر چلی آؤ۔ کوئی دیکھ لے گا تو آفت ہی آجائے گی“

وحشی بلی کی طرح اس نے غرا کر جواب دیا۔

”میں نہیں آؤں گی۔ بس ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں آؤں گی۔“

سوداگر کے بچے نے التجا کے طور اُس سے کہا۔

”خدا کے لیے اونچے نہ بولو، کوئی سُن لے گا، راجو۔“

تو اُس کا نام راجو تھا۔ راجو نے اپنی لنڈوری چٹیا کو جھٹکا دے کر کہا۔

”سُن لے۔ ساری دنیا سُن لے۔ خدا کرے ساری دنیا سُن لے۔ اگر تم مجھے یوں ہی اپنے کمرے کے اندر آنے کو کہتے رہو گے، تو میں خود محلے بھر کو جگا کر سب کچھ کہہ دُوں گی۔“

راجو اُس کو نظر آرہی تھی، مگر وہ جس سے مخاطب تھی وہ اُس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اُس نے بڑی درز سے راجو کو دیکھا، اس کے بدن پر جھرجھری سی طاری ہو گی۔ اگر وہ ساری کی ساری ننگی ہوتی تو شاید اُس کے صناعانہ جذبات کو ٹھیس نہ پہنچتی۔ لیکن اُس کے جسم کے وہ حصے جو ننگے تھے، دوسرے مستور حصوں کو عریانی کی دعوت دے رہے تھے۔ راجو میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عورت کے متعلق اُس کے جذبات اپنے کپڑے اُتار رہے ہیں۔ راجو کی غیر متناسب بانھیں، جو کاندھوں تک ننگی تھیں، نفرت انگیز طور پر لٹک رہی تھیں۔ مردانہ بنیان اور گول گلے میں سے اُس کی نیم پختہ ڈبل روٹی ایسی موٹی اور نرم چھاتیاں، کچھ اس انداز سے باہر جھانک رہی تھیں، گویا سبزی ترکاری کی ٹُوٹی ہوئی ٹوکری میں سے گوشت کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہوں۔ زیادہ استعمال سے گھسی ہوئی پتلی بنیان کا نچلا گھیر اخود بخود اُوپر کو اُٹھ گیا (تھا) اور راجو کی ناف کا گڑھا، اُس کے خمیرے آٹے ایسے پھولے ہوئے پیٹ پر یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے کسی نے انگلی کھبو دی ہو۔ یہ نظارہ دیکھ کر اُس کے دماغ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔ اُس نے چاہا کہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بستر پر لیٹ جائے، اور سب کچھ بھول بھال کر سو جائے لیکن جانے کیوں، وہ سوراخ پر آنکھیں جمائے کھڑا رہا؟ راجو کو اس حالت میں دیکھ کر اُس کے دل میں کافی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ اسی نفرت کی وجہ سے اُس سے دلچسپی لے رہا تھا۔ سوداگر کے سب سے چھوٹ لڑکے نے جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ ہو گی، ایک بار پھر التجائیہ لہجے میں کہا۔

”راجو خدا کے لیے اندر چلی آؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی تمھیں نہیں ستاؤں گا۔ لو اب مان جاؤ۔ یہ تمہاری بغل میں وکیلوں کا مکان ہے، ان میں سے کسی نے دیکھا یا سُن لیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔“

راجو خاموش رہی لیکن تھوڑی دیر کے بعد بولی۔

”مجھے میرے کپڑے لا دو۔ بس اب میں تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی۔ تنگ آگئی ہوں۔ کل سے وکیلوں کے ہاں نوکری کر لوں گی۔ سمجھے؟۔ اب اگر تم نے مجھ سے کچھ اور کہا تو خدا کی قسم شور مچانا شروع کر دوں گی۔ میرے کپڑے چپ چاپ لا کے دے دو۔“

سوداگر کے لڑکے کی آواز آئی۔

”لیکن تم رات کہاں کاٹو گی؟“

راجو نے جواب دیا۔

”جہنم میں۔ تمھیں اس سے کیا۔ جاؤ تم اپنی بیوی کی بغل گرم کرو۔ میں کہیں نہ کہیں سو جاؤں گی۔“

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سچ مچ رو رہی تھی۔ سوراخ پر سے آنکھ ہٹا کر وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ راجو کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُسے عجیب قسم کا صدمہ ہوا تھا۔ اُس میں کوئی شک نہیں کہ اس صدمے کے ساتھ وہ نفرت بھی لپٹی ہوئی تھی جو راجو کو اس حالت میں دیکھ کر اُس کے دل میں پیدا ہوئی تھی، مگر غایت درجہ نرم دل ہونے کے باعث وہ پگھل سا گیا۔ راجو کی کھلاڑی آنکھوں میں جو شیشے کے مرتبان میں چمک دار مچھلیوں کی طرح سدا متحرک رہتی تھیں آنسو دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ انھیں تھپکا کر دلا سا دے۔ راجو کی جوانی کے چار قیمتی برس سوداگر بھائیوں نے معمولی چٹائی کی طرح استعمال کیے تھے ان برسوں میں تینوں بھائیوں کے نقش قدم کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ ان میں سے کسی کو اس بات کا خوف نہیں رہا تھا کہ کوئی ان کے پیروں کے نشان پہچان لے گا اور راجو کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے قدموں کے نشان دیکھتی تھی نہ دوسروں کے۔ اسے بس چلتے جانے کی دُھن تھی کسی بھی طرف۔ پر اب شاید اُس نے مُڑ کے دیکھا تھا۔ مُڑ کے اُس نے کیا دیکھا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ اُس کو معلوم نہیں تھا باہر سن تیس کی

آخری رات دم توڑ رہی تھی اور اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہاں کہاں گئی؟۔ کیا وہ اندر چلی گئی؟۔ کیا وہ مان گئی تھی؟۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ کس بات پر جھگڑی تھی؟۔ راجو کے کانپتے ہوئے نتھنے ابھی تک اُس کو نظر آرہے تھے۔ ضرور اس کے اور سوداگر کے لڑکے کے درمیان جن کا نام محمود تھا کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا جبھی تو وہ دسمبر کی خون منجمد کر دینے والی رات میں صرف ایک بنیان اور شلوار کے ساتھ باہر نکل آئی تھی اور اندر جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راجو کو دُکھی دیکھ کر اُس کے ایک نامعلوم جذبے کو تسکین پہنچی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں رحم کے جذبات بھی پیدا ہوئے تھے۔ کسی عورت سے اس نے کبھی ہمدری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ راجو کو دکھی دیکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ اُس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کر سکے۔ اُسے یقین تھا کہ اگر وہ راجو کے قریب ہونا چاہے گا تو وہ جنگلی گھوڑی کی طرح بدکے گی نہیں۔ راجو غلاف چڑھی عورت نہیں تھی۔ وہ جیسی بھی تھی دُور سے نظر آجاتی تھی۔ اُس کی بھدی اور موٹی ہنسی جو اکثر اُس کے مٹ میلے ہونٹوں پر بچوں کے ٹُوٹے ہوئے گھروندے کے مانند نظر آتی تھی اصلی ہنسی تھی۔ بڑی صحت مند۔ اور اب اُس کی بھونرے جیسی متحرک آنکھوں نے آنسو اُگلے تھے، تو ان میں کوئی مصنوعی پن نہیں تھا۔ راجو کو وہ ایک مدت سے جانتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے چہرے کے تمام خطوط تبدیل ہوئے تھے اور وہ غیر محسوس طریق پر لڑکی سے عورت بننے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تین سوداگر بھائیوں کو ہجوم نہیں سمجھتی تھی۔ یہ ہجوم اُسے پسند نہیں تھا اس لیے کہ ایک عورت کے ساتھ وہ صرف ایک مرد منسلک دیکھنے کا قائل تھا۔ مگر یہاں۔ یعنی راجو کے معاملے میں اُسے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے درمیان رُک جانا پڑتا تھا۔ اس واقعے کے دوسرے روز جب وہ جاگ رہا تھا لحاف اوڑھے لیٹا تھا کہ راجو آئی اُس نے کمرہ صاف کیا اُس نے یہ سمجھا کہ شاید جمعدار ہے۔ جو آج جلدی آگیا ہے۔

چنانچہ اُس نے لحاف کے اندر سے کہا۔

”دیکھو بھئی۔ گرد مت اُڑانا۔“

ایک نسوانی آواز اُس کو سنائی دی

”جی میں۔ جی میں میں تو۔“

اس نے لحاف اپنے سے جدا کیا اور دیکھا کہ راجو ہے۔ وہ بہت متحیر ہوا۔ چند لمحات وہ اُس کو دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد اُس سے مخاطب ہوا۔

”تم یہاں کیسے آئی ہو؟“

راجو نے جھاڑن اپنے کاندھے پر رکھا اور جواب دیا۔

”میں آج صبح یہاں آئی ہوں۔ سوداگروں کی نوکری میں نے چھوڑ دی ہے۔“

اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ بہر حال اُس نے اتنا کہہ دیا۔

”اچھا کیا۔ اب کیا تم نے ہمارے یہاں ملازمت اختیار کر لی ہے؟“

”جی ہاں“

۔ یہ اس کا مختصر جواب تھا۔ اُس کو راجو سے سخت نفرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے گھر میں اس کا کسی قسم کا دخل نہ ہو لیکن اس کی والدہ نے جو بہت رحمدل تھیں اور جنھیں نوکرانی کی ضرورت بھی تھی راجو کو ملازم رکھ لیا تھا۔ اُس کو بڑی اُلجھن محسوس ہوئی کہ وہ رات کا تماشا دیکھ چکا تھا۔ اُسے اُس سے نفرت تھی۔ اس قدر نفرت کو وہ چاہتا تھا کہ وہ اُس کی نظروں کے سامنے نہ آئے۔ مگر وہ آتی تھی۔ صبح ناشتہ لے کر آتی۔ شیو کا سامان لے کر آتی۔ دوپہر کا کھانا پیش کرتی۔ مگر اس کو یہ سب باتیں بہت ناگوار گزرتیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجو اُس سے اس قسم کا سلوک کرے۔ چنانچہ ایک دن اُس نے تنگ آکر اس سے کہا۔

”دیکھو راجو مجھے تمہاری ہمدردیاں پسند نہیں۔ میں اپنا کام خود کر سکتا ہوں۔ تم مہربانی کر کے تکلیف نہ کیا کرو۔“

راجو نے بڑی متانت سے کہا۔

”سرکار۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ میں تو آپ کی باندی ہوں۔“

وہ جھینپ سا گیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم نوکرانی ہو۔ بس اس کا خیال رکھو۔“

راجو نے تپائی کا کپڑا ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”جی مجھے ہر چیز کا خیال ہے۔ مجھے اس بات کا بھی خیال ہے کہ آپ مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔“

وہ لوٹ پوٹ گیا۔

”میں۔ میں تمھیں اچھی نظروں سے کیوں نہیں دیکھتا۔ یہ تم نے کیسے جانا؟“

راجو مسکرائی۔

”حضور آپ امیر آدمی ہیں۔ آپ کو ہم غریبوں کے دُکھ درد کا کوئی احساس نہیں ہو سکتا۔“

اُس کو راجو سے اور نفرت ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگا کہ یہ لڑکی جو اُس کے گھر میں اُس کی والدہ کی نرم طبیعت کی وجہ سے آ گئی ہے بہت واہیات ہے۔ راجو بڑی باقاعدگی سے کام کرتی رہی۔ اُس کا کوئی نقص نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ جب اُس کی شادی کا سوال اُٹھا تو وہ بہت مضطرب ہوا۔ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے والدین سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مجھے یہ جھنجھٹ ابھی نہیں چاہیے۔ اُس کے والدین نے بہت زور دیا کہ وہ شادی کر لے مگر وہ نہ مانا۔ اُسے کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی۔ ایک دن وہ گھر سے غائب ہو گیا۔ اُس کے ساتھ راجو بھی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ میاں بیوی بن چکے ہیں۔ سعادت حسن منٹو ۱۲ جنوری ۱۹۵۵ء

رام کھلاون

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹورام کھلاون

کھٹمل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی۔ میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا۔ میں نے اس تصویر سے اس کو پُر کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر دھوبی کا انتظار کرنے لگا۔ ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ ہفتے کی شام کو میرے دھلے ہوئے کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تھا۔ مجھے اسٹاک تو نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ مفلسی کے اس زمانے میں میرے صرف اتنے کپڑے تھے جو بمشکل چھ سات دن تک میری وضعداری قائم رکھ سکتے تھے۔ میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے میں ماہم جا رہا ہے۔ دھوبی شریف آدمی تھا۔ یعنی دھلائی نہ ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میری کپڑے لے آتا تھا، لیکن پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو میری نادہندگی سے تنگ آ کر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کر دے اور مجھے اپنی شادی کی بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لینا پڑے جو کہ ظاہر ہے بہت ہی معیوب بات ہوتی۔ کھولی میں مرے ہوئے کھٹملوں کی نہایت ہی مکروہ بُو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح دباؤں کہ دھوبی آ گیا۔

”ساب سلام۔“

کر کے اس نے اپنی گٹھڑی کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے میز پر رکھ دیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی۔ ایک دم چونک کر اس نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اور ایک عجیب اور غریب آواز حلق سے نکالی۔

”ہے ہے ہے ہیں؟“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے دھوبی؟“

دھوبی کی نظریں اس تصویر پر جمی رہیں۔

”یہ تو ساعید شالیم بالشٹر ہے؟“

”کون؟“

دھوبی نے میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا۔

”ساعید شالیم بالشٹر۔“

”تم جانتے ہو انھیں؟“

دھوبی نے زور سے سر ہلایا۔

”ہاں۔ دو بھائی ہوتا۔ ادھر کولابا میں ان کا کوٹھی ہوتا۔ ساعید شالیم بالشٹر۔ میں ان کا کپڑا دھوتا ہوتا۔“

میں نے سوچا یہ دو برس پہلے کی بات ہو گی کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی جان نے فجی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک بمبے میں پریکٹس کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

”دو برس پہلے کی بات کرتے ہو تم۔“

دھوبی نے زور سے سر ہلایا۔

”ہاں۔ ساعید شالیم بالشٹر جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی دیا۔ ایک دھوتی دیا۔ ایک کرتہ دیا۔ نیا۔ بہت اچھا لوگ ہوتا۔ ایک کا داڑھی ہوتا۔ یہ بڑا۔“

اس نے ہاتھ سے داڑھی کی لمبائی بتائی اور سعید بھائی جان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا:

”یہ چھوٹا ہوتا۔ اس کا تین بلوا لوگ ہوتا۔ دو لڑکا، ایک لڑکی۔ ہمارے سنگ بہت کھیلتا ہوتا۔ کولابے میں کوٹھی ہوتا۔ بہت بڑا۔“

میں نے کہا۔

”دھوبی یہ میرے بھائی ہیں۔“

دھوبی نے حلق سے عجیب و غریب آواز نکالی۔

”ہے ہے ہے ہیں؟۔ ساعید شالیم بالشٹر؟؟“

میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا۔

”یہ تصویر سعید حسن بھائی جان کی ہے۔ داڑھی والے محمد حسن ہیں۔ ہم سب سے بڑے۔“

دھوبی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی غلاظت کا جائزہ لیا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی بجلی لائٹ سے محروم۔ ایک میز تھا۔ ایک کرسی اور ایک ٹاٹ کی کوٹ جس میں ہزار ہا کھٹمل تھے۔ دھوبی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں ساعید شالیم بالشٹر کا بھائی ہوں۔ لیکن جب میں نے اس کو ان کی بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے سے جنبش دی اور کہا۔

”ساعید شالیم بالشٹر کولابے میں رہتا اور تم اس کھولی میں“!

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”دنیا کے یہی رنگ ہیں دھوبی۔ کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔ پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔“

”ہاں ساب۔ تم بروبر کہتا ہے۔“

یہ کہہ کر دھوبی نے گٹھڑی اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ مجھے اس کے حساب کا خیال آیا۔ جیب میں صرف آٹھ آنے تھے جو شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم تک آنے جانے کے لیے بمشکل کافی تھے۔ صرف یہ بتانے کے لیے میری نیت صاف ہے میں نے اسے ٹھہرایا اور کہا۔

”دھوبی۔ کپڑوں کا حساب یاد رکھنا۔ خدا معلوم کتنی دھلائیاں ہو چکی ہیں۔“

دھوبی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا۔

”ساب ہم حساب نہیں رکھتے۔ ساعید شالیم بالشٹر کا ایک برس کام کیا۔ جو دے دیا، لے لیا۔ ہم حساب جانتے ہی ناہیں۔“

یہ کہہ وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ بات چیت کامیاب رہی۔ میری شادی ہو گئی۔ حالات بھی بہتر ہو گئے اور میں سکینڈ پیر خان اسٹریٹ کی کھولی سے جس کا کرایہ نو روپے ماہوار تھا کلیئر روڈ کے ایک فلیٹ میں جس کا کرایہ پینتیس روپے ماہوار تھا، اٹھ آیا اور دھوبی کو ماہ بماہ باقاعدگی سے اس کی دھلائیوں کے دام ملنے لگے۔ دھوبی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا۔

”بیگم ساب۔ ساب کا بھائی ساعید شالیم بالشٹر بہت بڑا آدمی ہوتا۔ ادھر کولابہ میں رہتا ہوتا۔ جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا۔ تمہارا ساب بھی ایک دن بڑا آدمی بنتا ہوا۔“

میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سنا چکا تھا اور اس کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ مفلسی کے زمانے میں کتنی دریا دلی سے دھوبی نے میرا ساتھ دیا تھا۔ جب دے دیا، جو دے دیا۔ اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی۔ لیکن میری بیوی کو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ حساب نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا۔

”چار برس میرا کام کرتا رہا۔ اس نے کبھی حساب نہیں کیا۔“

جواب یہ ملا۔

”حساب کیوں کرتا۔ ویسے دوگنے چوگنے وصول کر لیتا ہو گا۔“

”وہ کیسے؟“

”آپ نہیں جانتے۔ جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ان کو ایسے لوگ بے وقوف بنانا جانتے ہیں۔“

قریب قریب ہر مہینے دھوبی سے میری بیوی کی چخ چخ ہوتی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہہ دیتا۔

”بیگم ساب۔ ہم حساب جانت ناہیں۔ تم جھوٹ ناہیں بولتے گا۔ ساعید شالیم بالشٹر جو تمہارے ساب کا بھائی ہوتا۔ ہم ایک برس اس کا کام کیا ہوتا۔ بیگم ساب بولتا دھوبی تمہارا اتنا پیسہ ہوا۔ ہم بولتا، ٹھیک ہے“!

ایک مہینے ڈھائی سو کپڑے دھلائی میں گئے۔ میری بیوی نے آزمانے کے لیے اس سے کہا۔

”دھوبی اس مہینے ساٹھ کپڑے ہوئے۔“

اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ بیگم ساب، تم جھوٹ ناہیں بولے گا۔“

میری بوی نے ساٹھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دام دیے تو اس نے ماتھے کے ساتھ روپے چھوا کر سلام کیا اور چلا گیا۔ شادی کے دو برس بعد میں دلی چلا گیا۔ ڈیڑھ سال وہاں رہا، پھر واپس بمبئی آگیا اور ماہم میں رہنے لگا۔ تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھوبی تبدیل کیے کیونکہ بے حد ایمان اور جھگڑالو تھے۔ ہر دھلائی پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی کپڑے کم نکلتے تھے، کبھی دلائی نہایت ذلیل ہوتی تھی۔ ہمیں اپنا پرانی دھوبی یاد آنے لگا۔ ایک روز جب کہ ہم بالکل بغیر دھوبی کے رہ گئے تھے وہ اچانک آگیا اور کہنے لگا۔ ساب کو ہم نے تک دن بس میں دیکھا۔ ہم بولا، ایسا کیسا۔ ساب تو دلی چلا گیا تھا۔ ہم نے ادھر بائی کھلہ میں تپاس کیا۔ چھاپہ والا بولا، اُدھر ماہم میں تپاس کرو۔ باجو والی چالی میں ساب کا دوست ہوتا۔ اس سے پوچھا اور آگیا۔“

ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔ کانگرس بر سر اقتدار آئی تو امتناعِ شراب کا حکم نافذ ہو گیا۔ انگریزی شراب ملتی تھی لیکن دیسی شراب کی کشید اور فروخت بالکل بند ہو گئی۔ ننانوے فی صدی دھوبی شراب کے عادی تھے۔ دن بھر پانی میں رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ ہمارا دھوبی بیمار ہو گیا۔ اس بیماری کا علاج اس نے اس زہریلی شراب سے کیا جو ناجائز طور پر کشید کر کے چھپے چوری بکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معدے میں خطرناک گڑبڑ پیدا ہو گئی جس نے اس کو موت کے دروازے تک پہنچا دیا۔ میں بے حد مصروف تھا۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو دس ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا۔ میری بیوی کو جب اس کی خطرناک بیماری کا علم ہوا تو وہ ٹیکسی لے کر اس کے گھر گئی۔ نوکر اور شوفر کی مدد سے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میری بیوی نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب؛، آپ سارا ثواب حاصل نہیں کر سکتے۔“

ڈاکٹر مسکرایا۔

”تو آدھا آدھا کر لیجیے۔“

ڈاکٹر نے آدھی فیس قبول کر لی۔ دھوبی کا باقاعدہ علاج ہوا۔ معدے کی تکلیف چند انجکشنوں ہی سے دور ہو گئی۔ نقاہت تھی، وہ آہستہ آہستہ مقوی دواؤں کے استعمال سے ختم ہو گئی۔ چند مہینوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتا تھا۔ بھگوان ساب کو ساعید شالیم بالشٹر بنائے۔ ادھر کولابے میں ساب رہنے کو جائے۔ باوا لوگ ہیں۔ بہت بہت پیسہ ہو۔ بیگم ساب دھوبی کو لینے آیا۔ موٹر میں۔ ادھر کلے (قلعے) میں بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس کے پاس میم ہوتا۔ بھگوان بیگم ساب کو خُس رکھے۔“

کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے۔ دھوبی بلاناغہ اتوار کو آتا رہا۔ اس کی صحت اب بہت اچھی تھی۔ اتنا عرصہ گزرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں بھولا تھا۔ ہمیشہ دعائیں دیتا تھا۔ شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی۔ شروع میں وہ کبھی کبھی اسے یاد کیا کرتا تھا۔ پر اب نام تک نہ لیتا تھا۔ سارا دن پانی میں رہنے کے بعد تھکن دور کرنے کے لیے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ حالات بہت زیادہ بگڑ گئے تھے۔ بٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان اور مسلمانوں کے علاقوں میں ہندو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہلاک کیے جانے لگے۔ میری بیوی لاہور چلی گئی۔ جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو میں نے دھوبی سے کہا۔

”دیکھو دھوبی اب تم کام بند کر دو۔ یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے، ایسا نہ ہو کوئی تمہیں مار ڈالے۔“

دھوبی مسکرایا۔

”ساب اپن کو کوئی نہیں مارتا۔“

ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہوئیں مگر دھوبی برابر آتا رہا۔ ایک اتوار میں گھر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کھیلوں کے صفحے پر کرکٹ کے میچوں کا اسکور درج تھا اور پہلے صفحات پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعداد و شمار۔ میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا کہ دھوبی آگیا۔ کاپی نکال کر میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کر دی تو دھوبی نے ہنس ہنس کے باتیں شروع کر دیں۔ ساعید شالیم بالشٹر بہت اچھا آدمی ہوتا۔ یہاں سے جاتا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا۔ تمہارا بیگم ساب بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا۔

باہر گام گیا ہے نا؟۔ اپنے ملک میں؟۔ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا اسلام بولو۔ موٹر لے کر آیا ہماری کھولی میں۔ ہم کو اتنا جلاب آنا ہوتا۔ ڈاکٹر نے سوئی لگایا۔ ایک دم ٹھیک ہو گیا۔ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا اسلام بولو۔ بولو رام کھلاون بولتا ہے، ہم کو بھی کاگج لکھو۔“

میں نے اس کی بات کاٹ کر ذرا تیزی سے کہا۔

”دھوبی۔ دارو شروع کر دی؟“

دھوبی ہنسا

”دارو؟۔ دارو کہاں سے ملتی ہے ساب؟“

میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے میلے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی اور سلام کر کے چلا گیا۔ چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے۔ لاہور سے تار پر تار آنے لگے کہ سب کچھ چھوڑو اور جلدی چلے آؤ۔ میں نے ہفتے کے روز ارادہ کر لیا کہ اتوار کو چل دوں گا۔ لیکن مجھے صبح سویرے نکل جانا تھا۔ کپڑے دھوبی کے پاس تھے۔ میں نے سوچا کرفیو سے پہلے پہلے اس کے ہاں جا کر لے آؤں، چنانچہ شام کو وکٹوریہ لے کر مہا کشمی روانہ ہو گیا۔ کرفیو کے وقت میں بھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس لیے آمد و رفت جاری تھیں۔ ٹریمیں چل رہی تھیں۔ میری وکٹوریہ پل کے پاس پہنچی تو ایک دم شور برپا ہوا۔ لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی یہ۔ ہجوم چھدرا ہوا تو دیکھا، دو بھینسوں کے پاس بہت سے دھوبی لاٹھیاں ہاتھ میں لیے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکٹوریہ والے نے انکار کر دیا۔ میں نے اس کو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل پڑا۔ جب دھوبیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک دھوبی سے پوچھا۔

”رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟“

ایک دھوبی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جھومتا ہوا اس دھوبی کے پاس آیا جس سے میں نے سوال کیا۔

”کیا پوچھت ہے؟“

”پوچھت ہے رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟“

شراب سے دھت دھوبی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا۔

”تم کون ہے؟“

”میں؟۔ رام کھلاون میرا دھوبی ہے۔“

”رام کھلاون تہار دھوبی ہے۔ تو کس دھوبی کا بچہ ہے۔“

ایک چلایا۔

”ہندو دھوبی یا مسلمین دھوبی کا۔“

تمام دھوبی جو شراب کے نشے میں چور تھے مکے تانتے اور لاٹھیاں گھماتے میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا۔ مسلمان ہوں یا ہندو؟۔ میں بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا۔ نزدیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا۔ جس کو مدد کیلیے پکارتا۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کر دی۔ رام کھلاون ہندو ہے۔ ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے۔ اس کی کھولی کہاں ہے۔ دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے۔ بہت بیمار تھا۔ ہم نے اس کا علاج کرایا تھا۔ ہماری بیگم۔ ہماری میم صاحب یہاں موٹر لے کر آئی تھی۔ یہاں تک میں نے کہا کہ تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا۔ دل ہی دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لیے کتنی نیچی سطح پر اتر آتا ہے اس احساس نے جرأت پیدا کر دی چنانچہ میں نے ان سے کہا

”میں مسلمین ہوں۔“

”مار ڈالو۔ مار ڈالو“

کا شور بلند ہوا۔ دھوبی جو کہ شراب کے نشے میں دھت تھا ایک طرف دیکھ کر چلایا۔

”ٹھہرو۔ اسے رام کھلاون مارے گا۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رام کھلاون موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لیے لڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ڈنڈا سر تک اٹھا کر گالیاں دیتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”رام کھلاون۔“

رام کھلاون دہاڑا۔

’’چپ کر بے رام کھلاون کے۔‘‘

میری آخری امید بھی ڈوب گئی۔ جب وہ میرے قریب آ پہنچا تو میں نے خشک گلے سے ہولے سے کہا۔

’’مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون ؟‘‘

رام کھلاون نے وار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا۔ ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑیں۔ ڈنڈا ہاتھ سے گرا کر اس نے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا۔

’’ساب‘‘!

پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا

’’یہ مسلمین نہیں۔ ساب ہے۔ بیگم ساب کا ساب۔ وہ موٹر لے کر آیا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ نے میر اجلاب ٹھیک کیا تھا۔‘‘

رام کھلاون نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ سب شرابی تھے۔ تُوتُو میں میں شرع ہوگئی۔ کچھ دھوبی رام کھلاون کی طرف ہوگئے اور ہاتھا پائی پر نوبت آگئی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب میرا اسامان تیار تھا۔ صرف جہاز کے ٹکٹوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلیک مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔ میں بہت بے قرار تھا۔ دل میں طرح طرح کے جذبات ابل رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آجائیں اور میں بندرگاہ کی طرف چل دوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر دیر ہوگئی تو میرا فلیٹ مجھے اپنے اندر قید کر لے گا۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا ٹکٹ آگئے۔ دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا۔

’’ساب سلام‘‘!

’’سلام‘‘

’’میں اندر آجاؤں ؟‘‘

’’آؤ‘‘

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ گٹھڑی کھول کر اس نے کپڑے نکال پلنگ پر رکھے۔ دھوتی سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا۔

’’آپ جارہے ہیں ساب ؟‘‘

’’ہاں‘‘

اس نے رونا شروع کر دیا۔ ساب، مجھے ماف کر دو۔ یہ سب دارو کا قصور تھا۔ اور دارو۔ دارو آج کل مفت ملتی ہے۔ سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو۔ مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب۔ ہم کو ماف کردو۔ ہم پیٔے لا تھا۔ ساعید شالیم بالشٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا۔ ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا۔ تمہارا بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا۔ جلاب سے ہم مرتا ہوتا۔ وہ موٹر لے کر آتا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اتنا پیسہ خرچ کرتا۔ ملک ملک جاتا۔ بیگم صاب سے مت بولنا۔ رام کھلاون۔‘‘

اس کی آواز گلے میں رُندھ گئی۔ گٹھڑی کی چادر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا تو میں نے روکا

’’ٹھہرو رام کھلاون۔‘‘

لیکن وہ دھوتی کا لانگ سنبھالتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

رامشگر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹو رامشگر

میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا آیا پرویز مجھے پسند ہے یا نہیں۔ کچھ دنوں سے میں اس کے ایک ناول کا بہت چرچاسُن رہا تھا۔ بوڑھے آدمی، جن کی زندگی کا مقصد دعوتوں میں شرکت کرنا ہے اس کی بہت تعریف کرتے تھے اور بعض عورتیں جو اپنے شوہروں سے بگڑ چکی تھیں اس بات کی قائل تھیں کہ وہ ناول مصنف کی آئندہ شاندار ادبی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ میں نے چند ریویو پڑھے۔ جو قطعاً متضاد تھے۔ بعض ناقدوں کا خیال تھا کہ مصنف ایسا معیاری ناول لکھ کر بہتر ناول نگاروں کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر یہ ناول نہ پڑھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں یہ خیال سما گیا ہے کہ کسی ایسی کتاب کو جو ادبی حلقوں میں ہلچل مچادے ایک سال ٹھہر کر پڑھنا چاہیے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ میعاد گزر جانے پر آپ اسے عموماً نظر انداز کر دیں گے۔ میری پرویز سے ایک دعوت میں ملاقات ہوئی۔ میری میزبان دو ادھیڑ عمر کی عورتیں تھیں۔ دعوت میں ایک جوان لڑکی بھی شریک تھی، جو غالباً

میزبان کی چھوٹی بہن تھی۔ اس کا نام عفت تھا۔ وہ خاصی تندرست اور قد آور تھی وہ ذرا زیادہ توانا اور لمبی ہوتی تو اور بھی بھلی معلوم ہوتی۔ پرویز بھی میرے پاس بیٹھا تھا۔ عمر یہی کوئی بائیس تیئس سال درمیانہ قد جسم کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ وہ ناٹا معلوم ہوتا۔ اس کی جلد سُرخ تھی جو اس کے چہرے کی ہڈیوں پر اکڑی ہوئی سی دکھائی دیتی تھی۔ ناک لمبی، آنکھیں نیلگوں اور سر کے بال بھورے رنگ کے۔ وہ بھورے رنگ کی جیکٹ اور گرے پتلون پہنے تھا۔ اُس کے لب و لہجے اور حرکات میں کوئی دلکشی نہ تھی اُسے صرف اپنی زُبان سے اپنی تعریف کرنے کی عادت تھی۔ اُسے اپنے ہمعصروں سے سخت نفرت تھی۔ اُس کی فطرت میں مزاح کی کمی نہ تھی۔ لیکن میں اُس سے پوری طرح محفوظ نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ تینوں عورتیں اُس کی ہر ایک بات پر یونہی لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ میں نہیں کہہ سکتا وہ ذہین تھا یا نہیں۔ اچھا ناول لکھ لینا کوئی ذہانت کی نشانی نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ ظاہری طور پر عام انسانوں سے ذرا مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے دو تین دن بعد اس کا ناول میرے ہاتھ لگا۔ میں نے اُسے پڑھا اُس میں آپ بیتی کا رنگ نمایاں تھا کرداروں کا تعلق درمیانے طبقہ کے ان لوگوں سے تھا جو تھوڑی آمدن ہونے پر بھی شاندار طریقے سے رہنے سہنے کی کوشش کرتے ہیں مزاح کا معیار بہت عامیانہ تھا۔ کیونکہ اس میں ان لوگوں کا صرف اس لیے منہ چڑایا گیا تھا کہ وہ غریب اور بوڑھے ہیں۔ پرویز کو اس بات کا قطعاً کوئی احساس نہ تھا کہ ان لوگوں کے مسائل کس درجہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس ناول کی مقبولیت کا سبب محبت کا وہ افسانہ ہے جو اُس کے پلاٹ کی جان ہے۔ انداز بیان میں کوئی ایسی پختگی نہ تھی۔ لیکن اُس کے مطالعے سے پڑھنے والے کے ذہن میں جنسیت کے شدید احساس کا پیدا ہو جانا یقینی تھا۔ میں نے پرویز کو کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھی اور ساتھ ہی لنچ پر بھی مدعو کیا۔ وہ بہت شرمیلا تھا۔ میں نے اُسے بیئر کا گلاس پیش کیا۔ اُس کی گفتگو سے مجھے احساس ہوا کہ اُس کے اندر ایک حجاب سا پیدا ہو گیا ہے جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا مجھے وہ آداب سے عاری نظر آیا۔ وہ فضول سی باتیں کہہ کر اپنی الجھن کو مٹانے کے لیے قہقہہ لگاتا۔ اس کا مقصد اپنے ہمعصروں کے خیالات کی شدید مخالفت کرنا تھا۔ وہ قابل نفرت انسان تھا۔ ایسے انسان دنیا سے کچھ لینا چاہتے ہیں۔ لیکن اُنھیں اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کے ہاتھ پھیلے نظر نہیں آتے۔ وہ شہرت حاصل کرنے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں۔ پرویز اپنے ناول کے متعلق خاموش تھا۔ پر جب میں نے اُس کی تعریف کی تو مارے شرم کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُسے اس کی اشاعت سے تھوڑے پیسے نصیب ہوئے تھے اور اب پبلشر اُسے آئندہ ناول لکھنے کے لیے کچھ رقم ماہانہ دے رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی ایسے پُرسکون مقام پر پہنچ کر اسے مکمل کرے جہاں زندگی کی ضروریات سستی میسر ہو سکیں۔ میں نے اُسے اپنے پاس چند دن بسر کرنے کی دعوت دی۔ اس دعوت نے اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دی۔

”میری موجودگی سے آپ کو تکلیف تو نہ ہو گی“

”قطعاً نہیں۔ میں تمہارے لیے خوراک اور ایک کمرے کا بندوبست کر دُوں گا۔

”شکریہ۔ میں آپ کو اپنے ارادے سے جلد مطلع کر دُوں گا۔“

یہ سچ ہے کہ اس وقت میں نے اسے دعوت دے دی۔ لیکن چار ہفتے گزرنے پر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ فضول انسان ہے اور اُسے اپنے پاس بلانا ٹھیک نہیں وہ یقیناً میری خاموش زندگی میں مخل ہو گا۔ اُس نے اپنے خط میں جو مجھے اُس نے چار ہفتوں کے بعد لکھا تھا اس میں مایوس دورِ زندگی کا ذکر کیا تھا اور اُسی کے زیرِ اثر میں نے اُسے تار دے کر بُلا لیا۔ وہ آیا اور بہت مسرور ہوا۔ شام کو ڈنر سے فارغ ہو کر باغ میں بیٹھے۔ اس نے اپنے ناول کا ذکر چھیڑا اس کا پلاٹ ایک نوجوان مصنف اور ایک مغنیہ کا رومان تھا۔ وہی پرانا تخیل۔ یہ ٹھیک ہے کہ پرویز کا ارادہ اس افسانے کو ایک نئے انداز سے لکھنے کا تھا اس نے اس کے متعلق بہت کچھ کہا اُسے ہرگز احساس نہ تھا کہ وہ اپنے ہی خوابوں کو افسانہ کی صورت دینا چاہتا تھا۔ ایک ایسے خیالی نوجوان کے خواب جو یونہی اپنے ذہن میں اپنی ذات سے محبت کرنے والی ایک حد درجہ حسین اور نازک محبوبہ کے تخیل کو پالتا ہے۔ مجھے یہ ناپسند نہ تھا کہ وہ اپنی قوتِ بیان سے خون کو گرما کر شاعرانہ رنگ دے رہا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ کیا تم نے کبھی کسی مغنیہ کو دیکھا“

”نہیں میں نے بہت سی آپ بیتیاں ضروری پڑھی ہیں۔ اور اُس کے ایک ایک نقطہ اور مختلف واقعات کو جانچنے کی کوشش کی ہے“

”اس سے کیا تمہارا مقصد پورا ہو گیا؟“

”غالباً“

اُس نے اپنی خیالی مغنیہ کو میرے سامنے پیش کیا۔ وہ جوان تھی حسین تھی مگر بڑی کائیاں۔ موسیقی اُس کی جان تھی۔ اُس کی آواز اور اُس کے خیالات موسیقی سے لبریز تھے وہ آرٹ کی مداح تھی۔ اور اگر کوئی گانے والی اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتی وہ اس کے گیت سن کر اُس کی خطا کو معاف کر دیتی بہت فیاض تھی۔ اور کسی کی دُکھ بھری داستان سُن کر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی۔ وہ گہری محبت کرنے والی تھی اور اپنے محبوب کی خاطر اگر ساری دُنیا سے ٹھن جائے تو اُسے پروانہ تھی۔

”کیوں نہ تمہاری مغنیہ سے ملاقات کرا دی جائے؟“

”کیسے؟“

”تم الماس کو جانتے ہو کیا“

”بے شک۔ میں نے اُس کا ذکر اکثر سُنا ہے۔“

”یہیں پاس ہی اُس کا مکان ہے۔ میں اُسے کھانے پر بُلاؤں گا۔“

”سچ ؟“

”اگر وہ تمہارے معیار پر پوری نہ اُترے تو مجھے الزام نہ دینا۔“

”میں واقعی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

الماس کس سے چھپی تھی۔ وہ فلموں کے لیے گانا ترک کر چکی تھی۔ لیکن اب بھی اُس کی آواز میں وہی لوچ تھی اور وہی ترنم۔ اُس سے میری ملاقات چند سال پہلے ہوئی۔ جو شیلے مزاج کی عورت تھی۔ اور گانے کے علاوہ اپنے محبت کے رومانوں کے سبب مشہور تھی۔ اکثر مجھے اپنی محبت کے انوکھے افسانے سُناتی اور مجھے یقین ہے کہ وہ سچائی سے خالی نہ تھے۔ اُس نے تین چار دفعہ اپنی شادی رچائی۔ کیونکہ ہر بار چند ہی ماہ بعد یہ رشتہ ٹُوٹ جاتا تھا۔ وہ لکھنؤ کی رہنے والی تھی بہت شستہ اُردو بولتی تھی۔ وہ مجرد آرٹ کی مداح تھی۔ لیکن اُسے ایک فریب سے تعبیر کرتی۔ اس لیے کہ یہ اُس کی آنکھوں میں بہت کھلتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس مغنیہ سے پرویز کی ملاقات میرے لیے تفریح کا باعث ہوگی۔ اُسے میرے ہاں کا کھانا پسند تھا۔ سبز رنگ کا نیم عریاں لباس پہنے آئی۔ گلے میں موتیوں کی مالا اُنگلیوں میں جگمگاتی انگوٹھیاں اور بانھوں میں ہیرے جڑی چوڑیاں تھی۔

”تم کتنی بھلی معلوم دیتی ہو۔ بہت بن ٹھن کے آئی ہو“

الماس نے کہا

”ضیافت ہی تو ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تمہارا دوست ایک ذہین مصنف ہے اور حسن پرست ہے۔“

میں نے اُسے شیری کا ایک چھوٹا گلاس پیش کیا۔ میں اُسے لمی کے نام سے پُکارتا اور وہ مجھے ماسٹر کہہ کر مخاطب کرتی۔ وہ پینیتس سال کی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے کے خطوط سے اُس کی صحیح عمر کا اندازہ مشکل تھا وہ کبھی اسٹیج پر بہت حسین دکھائی دیتی تھی اور اب اپنی لمبی ناک اور گوشت بھرے چہرے کے باوصف خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔“

وہ بے وقوف تھی۔ البتہ اُسے ایک خاص رنگ میں باتیں کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ جس سے لوگ پہلی ملاقات میں بہت متاثر ہوتے۔ یہ محض ایک تماشہ تھا۔ کیونکہ دراصل اُسے اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ڈرائنگ روم میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ نیچے باغ میں سنگترے کے پودوں سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ وہ ہمارے درمیان بیٹھی شیری کی تعریف کررہی تھی۔ بار بار اُس کی نگاہیں چاند کی طرف اُٹھتیں۔

”اللہ رے قدرت کی رنگینی اس وقت گانا کسے سوجھ سکتا ہے۔“

پرویز نے خاموشی سے اُس کے الفاظ سُنے۔ شیری کے دو گلاس نے اس پر نشہ طاری کر دیا تھا۔ بڑی باتونی تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ ایک ایسی عورت ہے جس سے دنیا نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ اُس کی زندگی حوادث کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد تھی۔ گانے کے جلسوں کے منیجر اُس سے فریب کرتے رہے۔ مختلف گویوں نے اُسے برباد کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے وہ محبوب جن کی خاطر اُس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اُسے ٹھکرا کر چل دیئے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن اپنی چالاکی اور ذہانت سے اُس نے سب کے منصوبے خاک میں مِلائے۔ میں حیران ہوں وہ کس طرح مجھے اپنے متعلق اپنی زبان سے یہ ہتک آمیز باتیں سناتی رہی۔ اسے ہرگز احساس نہ تھا کہ وہ خود اپنے عیار اور خود غرض ہونے کا اعتراف کر رہی ہے۔ میں نے نظریں چرا کر پرویز کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً اس کا اپنی خیالی مغنیہ سے مقابلہ کر کے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس عورت کا سینہ دل سے خالی تھا۔ جب وہ رخصت ہوئی تو میں نے پرویز سے کہا۔

”کہو پسند آئی ؟“

”بہت۔ بڑے کام کی چیز ہے۔“

”سچ ؟“

”میری مغنیہ ایسی ہی ہے۔ اسے کیا خبر کہ اس ملاقات سے پہلے میں اس کا ذہنی نقش تیار کر چکا ہوں“

میں نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آرٹ کی پرستار ہے۔ اُس کی رُوح میں کتنی پاکیزگی ہے۔ تنگ نظر انسان اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے ارادوں کی بلندی بالآخر اسے کامیاب بنا دیتی ہے۔ یقین جانو میری مغنیہ کی الماس زندہ تصویر ہے۔“

میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن لب تک آئی بات وہیں رُک گئی۔ پرویز نے اُس عورت میں اپنی خیالی مغنیہ کو اصل شکل میں دیکھ لیا تھا۔ دو تین دن کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ دن گزرتے گئے۔ پرویز کا دوسرا ناول شائع ہوا تو اسے وہ پہلی سی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ نقاد جنھوں نے اُس کے پہلے ناول کی بے جا تعریف کی تھی اب اسے یونہی کوسنے لگے۔ اپنی ذات یا ایسے انسانوں کے متعلق جنھیں ہم بچپن سے جانتے ہیں ناول لکھنا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن اپنے تخلیق کیے ہوئے کرداروں کو ناول میں جگہ دینا بڑا کام ہے۔ اُس کے ناول میں کافی رطب ویا

بس تھا۔ لیکن اُس کا رومان سے بھرا ہوا پلاٹ شدید جذبات کا مظہر تھا۔ اس دعوت کے بعد۔ ایک سال تک الماس سے ملنا نہ ہو سکا۔ وہ کلکتے میں رقص و سُرور کے دورے پر چلی گئی اور گرمیوں کے آخر میں لوٹی ایک دفعہ اس نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔ وہاں اس کی باورچن کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اُس پر برس پڑتی۔ لیکن اُس کے بغیر اُس کا گزارہ بھی نہ تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے اور چہرے کی جھریوں نے بڑھاپے کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ وہ انوکھی وضع کی عورت تھی اور اپنی مالکن کی رگ رگ سے واقف تھی۔ الماس نیلے لباس میں بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گلے میں مالا اور ہاتھوں میں چوڑیاں۔ جھول جھول کر اپنے سفر کے حالات سُنا رہی تھی۔ اس کی زبان میں لوچ تھی اور باتوں سے ظاہر تھا کہ اُسے اس دورے میں کافی رقم ہاتھ لگی ہے۔ اُس نے اپنی نوکرانی سے کہا۔

”میری باتیں سچی ہیں نا؟“

”ایک حد تک۔“

”کلکتے میں جس شخص سے ملاقات ہوئی تھی اُس کا کیا نام تھا؟“

”کونسا شخص؟“

”بے وقوف۔ جس سے میری ایک بار شادی ہوئی تھی“

نوکرانی نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”وہ سیٹھ جوہری“

”ہاں وہی کوئی قلاش تھا۔ احمق انسان مجھے ہیروں کی مالا دے کر واپس لینا چاہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ اُس کی ماں کی ملکیت تھی۔“

”بہتر ہوتا اگر تم سچ مچ لوٹا دیتیں۔“

”لوٹا دیتی! تم کیا پاگل ہو گئی ہو“!

پھر اُس نے مجھ سے کہا

”آؤ باہر چلیں۔ اگر میرے اندر کا جذبہ نرم نہ ہوتا تو میں اس بڑھیا کو کبھی کا نکال چکی ہوتی“

ہم دونوں باہر نکل کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ باغیچہ میں صنوبر کی شاخیں تاروں بھرے آسمان کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ ایکا ایکی الماس بول اٹھی

”تمہارا وہ پگلا دوست اور اُس کا ناول۔؟“

میں اس کا مفہوم جلدی نہ سمجھ سکا۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“

”پگلے نہ بنو۔ وہی حونق جس نے میرے متعلق ناول لکھا تھا“

”لیکن ناول سے تمہارا کیا تعلق؟“

”کیوں نہیں میں کوئی پگلی تھوڑی ہوں اُس نے مجھے ایک نسخہ بھیجنے کی بھی حماقت کی تھی۔“

”لیکن تم نے اسے شرفِ قبولیت بخشا ہو گا۔“

”مجھے کیا اتنی فرصت ہے کہ ٹکے ٹکے کے مصنفوں کو خط لکھتی پھروں۔ تمھیں کوئی حق نہ تھا کہ دعوت پر بُلا کر اُس سے میرا تعارف کراتے۔ میں نے صرف تمہاری خاطر دعوت قبول کی تھی۔ لیکن تم نے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ افسوس کہ اب پرانے دوستوں پر بھی اعتبار کرنا محال ہو گیا ہے۔ میں آئندہ تمہارے ساتھ کبھی کھانا نہ کھاؤں گی۔

”یہ تم کیا چھیڑ بیٹھی ہو۔ اس ناول میں گانے والی کے کردار کا خاکہ وہ تمہاری ملاقات سے پہلے تیار کر چکا تھا اور بھلا تمہاری اس سے مشابہت ہی کیا ہے“!

”کیوں نہیں میرے دوستوں کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ میری ہی تصویر ہے“

”پر تم کو اُس کا یقین کیوں ہے؟“

”اس لیے کہ میں نے ایک دوست کو یہ کہتے سُنا کہ یہ میری ہی کہانی ہے“

”لیکن ناول کی ہیروئین کی عمر تو صرف پچیس سال ہے“

”مجھ ایسی عورت کے لیے عمر کوئی چیز نہیں“

”وہ سراپا موسیقی ہے۔ فاختہ کی طرح خاموش اور بے غرض۔ کیا تمہاری بھی اپنے متعلق یہی رائے ہے؟“

”اور تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟“

”ناخن کی طرح سخت۔ سنگدل۔“

اُس نے مجھے ایک ایسے نام سے پکارا جسے عورتیں کسی شریف مرد کو مخاطب کرتے وقت بہت کم استعمال کرتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی لیکن یہ ظاہر تھا کہ وہ ناراض نہیں۔

”ہیرے کی انگوٹھی کی کہو۔ کیا میں نے اُسے یہ قصّہ سُنایا؟“

قصّہ یہ ہے کہ ایک بڑی ریاست کے شہزادے نے تحفے کے طور پر ایک ہیرا الماس کی نذر کیا۔ ایک شب دونوں میں تکرار ہو گئی اور گالی گلوچ تک نوبت پہنچی۔ اُس نے وہ انگوٹھی اُتار آگ میں پھینک دی۔ شہزادہ چھوٹے دل کا تھا۔ گھٹنوں کے بل ہو کر آگ میں انگوٹھی تلاش کرنے لگا۔ الماس بڑی نفرت آمیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ شہزادے کو انگوٹھی مل گئی لیکن وہ الماس سے چھن گئی۔ اس کے بعد وہ اس سے محبت نہ کر سکی۔ یہ واقعہ رنگین تھا۔ اور پرویز نے اس کا بڑے دلکش انداز میں ذکر کیا تھا۔

”میں نے تمھیں اپنا سمجھ کر یہ واقعہ سُنایا تھا۔ بھلا یہ کہاں کی شرافت ہے کہ اسے لوگوں کے پڑھنے کے لیے بیان کر دیا جائے۔“

”میں تو کئی بار یہی واقعہ دوسروں کی زُبانی سُن چکا ہوں۔ یہ تو بڑی پرانی حکایت ہے۔“

ایک لمحہ کے لیے اس نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”کئی بار ایسا ہوا ہے۔ میں غلط نہیں کہہ رہی۔ یہ ظاہر ہے کہ عورتیں غصیلی ہوتی ہیں اور مرد کمینہ فطرت، وہ ہیرا میں اب بھی تمھیں دکھا سکتی ہوں۔ اس واقعہ کے بعد مجھے اُسے دوبارہ چرانا پڑا۔ میں تمھیں اب اور واقعہ سُناتی ہوں۔ بڑا دلچسپ ہے لیکن دیکھو کسی کو سنا نہ دینا۔“

میں نے کہا

”سُناؤ ضرور سُناؤ۔ تمہاری زندگی کا ہر واقعہ دلچسپ ہوتا ہے“

”میں نے تمھیں کبھی موتیوں والا قصّہ نہیں سُنایا؟“

”میں یہ قصہ اس سے بیشتر سُن چکا ہوں“

موتیوں کا ایک بڑا دولت مند عرب تھا۔ وہ ایک مدت تک الماس پر لٹو رہا۔ ہم جس مکان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اس کا دیا ہوا تھا۔ الماس نے کہنا شروع کیا

”پون ہل پر بمبئی میں میرے راگ سے متاثر۔ ہو کر ایک عرب نے موتیوں کی مالا میرے گلے میں ڈالی۔ تم تو شاید اُسے نہیں جانتے“!

”نہیں“

”وہ کوئی اتنا بڑا نہ تھا۔ لیکن بڑا حاسد۔ ایک برطانوی افسر کی بات پر اُس سے ٹھن گئی۔ میں دنیا میں ایک ایسی عورت ہوں کہ ہر کسی کی رسائی ممکن ہے لیکن اپنی عزت کا کسے خیال نہیں۔ میں نے غصے میں وہ موتیوں کی مالا اُتار کر دہکتی ہوئی انگیٹھی میں پھینک دی۔ وہ چیخ اُٹھا کہ یہ تو پچاس ہزار روپوں کی چیز ہے۔ اُس کا رنگ زرد ہو گیا۔ میں نے ذرا تنک کر کہا

”صرف تمہاری محبت کی وجہ سے مجھے یہ مالا عزیز تھی“

اور منہ پھیر لیا۔“

”تم نے کتنی حماقت کی“

میں نے کہا۔

”چوبیس گھنٹے تک میں نے اُس سے کلام نہ کیا۔ اور جب ہم شملے پہنچے تو اُس نے فوراً ہی نئی موتیوں کی مالا خرید دی۔“

وہ زیر لب مسکرانے لگی

”تم نے کیا کہا تھا کہ میں بیوقوف ہوں؟۔ میں نے سچے موتیوں کی مالا تو وہیں بنک میں رکھ دی تھی اور ایک نقلی خرید کر لی۔ جسے میں نے انگیٹھی میں پھینک دیا۔“

وہ بچے کی طرح فرطِ مسرت سے ہنسنے لگی۔ یہ بھی اُس کا ایک فریب تھا۔

”مرد کتنے پگلے ہوتے ہیں“

اُس نے کہا وہ دیر تک ہنستی رہی۔ اور شاید اس وجہ سے اُس پر ایک مستی سی چھانے لگی۔

”میں گانا چاہتی ہوں پیانو تو بجاؤ“

الماس دھیمے سروں میں گانے لگی اور جونہی اُسے ہونٹوں سے نکلتی ہوئی آواز کا احساس ہوا وہ بے خود ہو گئی۔ گیت ختم ہوا۔ ماحول۔ پر ایک سکوت چھانے لگا وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر دریا کا نظارہ کرنے لگی۔ رات کا سماں دلفریب تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میری رانوں پر ایک کپکپی طاری ہو رہی ہے الماس پھر گانے لگی۔ یہ موت کا راگ تھا۔ وہ راگ رنگ کی محفلوں میں

اکثر اس کی نمائش کر چکی تھی۔ اُس کی سریلی آواز ساکن ہوا کو چیر کر پہاڑوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی اس کی آواز میں اتنا درد تھا کہ مجھ پر وجد طاری ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میری زبان گنگ ہو گئی۔ وہ بھی ابھی تک کھڑکی میں کھڑی باہر خلا میں دیکھ رہی تھی۔ کتنی عجیب عورت تھی۔ پرویز نے اُسے خوبیوں کا مجسمہ تصور کیا۔ لیکن مجھے وہ اپنی زندگی کی تمام تر نفرتوں سمیت پیاری تھی۔ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ مجھے ایسے لوگ کیوں پسند ہیں جو ضرورت سے زیادہ برے ہوتے ہیں۔ وہ قابل نفرت ضرور تھی۔ لیکن اُس کی ذات میں دلکشی اُس سے کہیں سوا تھی۔ سعادت حسن منٹو ۱۲/اکتوبر ۱۹۵۴ء

رَتی، ماشہ، تولہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹورَتی، ماشہ، تولہ

زینت اپنے کالج کی زینت تھی۔ بڑی زیرک‘ بڑی ذہین اور بڑے اچھے خدوخال کی صحتمند نوجوان لڑکی۔ جس طبیعت کی وہ مالک تھی اس کے پیشِ نظر اُس کی ہم جماعت لڑکیوں کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ کہ وہ اتنی مقدار پشد عورت بن جائے گی۔ ویسے وہ جانتی تھیں کہ چائے کی پیالی میں صرف ایک چمچ شکر ڈالنی ہے زیادہ ڈالدی جائے تو پینے سے انکار کر دیتی ہے قمیص اگر آدھا انچ بڑی یا چھوٹی سِل جائے تو کبھی نہیں پہنے گی۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنے خاوند سے بھی نپی تلی محبت کرے گی۔ زینت سے ایک لڑکے کو محبت ہو گئی وہ اس کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اُس کا اور زینت کا مکان آمنے سامنے تھا ایک دن اُس لڑکے نے جس کا نام جمال تھا اُسے کوٹھے پر اپنے بال خشک کرتے دیکھا تو وہ سر تاپا محبت کے شربت میں شرابور ہو گیا۔ زینت وقت کی پابند تھی صبح ٹھیک چھ بجے اُٹھتی۔ اپنی بہن کے دو بچوں کو سکول کے لیے تیار کرتی اس کے بعد خود نہاتی اور سر پر تولیہ لپیٹ کر اوپر کوٹھے پر چلی جاتی اور اپنے بال جو اُس کے ٹخنوں تک آتے تھے سکھاتی کنگھی کرتی اور نیچے چلی جاتی جوڑا وہ اپنے کمرے میں کرتی تھی۔ اس کی ہر حرکت اور اس کے ہر عمل کے وقت معین تھے۔ جمال گر صبح ساڑھے چھ بجے اُٹھتا اور حوائج ضروری سے فارغ ہو کر اپنے کوٹھے پر پہنچتا تو اُسے نا امیدی کا سامنا کرنا پڑتا اس لیے کہ زینت اپنے بال سکھا کر نیچے چلی گئی ہوتی تھی ایسے لمحات میں وہ اپنے بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرتا اور ادھر ادھر دیکھ کے واپس نیچے چلا جاتا اس کو سیڑھیاں اُترتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ ہر زینہ کنگھی کا ایک دندانہ ہے جو اُترتے ہوئے ایک ایک کر کے ٹوٹ رہا ہے۔ ایک دن جمال نے زینت کو ایک رقعہ بھیجا وقت پر وہ کوٹھے پر پہنچ گیا تھا جبکہ زینت اپنے ٹخنوں تک لمبے بال سکھا رہی تھی اس نے یہ تحریر جو خوشبودار کاغذ پر تھی روڑے میں لپیٹ کر سامنے کوٹھے پر پھینک دی زینت نے یہ کاغذی پیراہن میں ملبوس پتھر اُٹھایا۔ کاغذ اپنے پاس رکھ لیا اور پتھر واپس پھینک دیا۔ لیکن اُس کو جمال کی شوخیٔ تحریر پسند نہ آئی اور وہ سر تاپا فریاد بن گئی اُس نے لکھا تھا۔ زلف برہم سنبھال کر چلیے راستہ دیکھ بھال کر چلیے موسمِ گُل ہے اپنی بانھوں کو میری بانھوں میں ڈال کر چلیے موسمِ گل قطعاً نہیں تھا۔ اس لیے اس آخری شعر نے اُس کو بہت کوفت پہنچائی اس کے گھر میں کئی گملے تھے جن میں بوٹے لگے ہوئے تھے یہ سب کے سب مرجھائے ہوئے تھے جب اس نے یہ شعر پڑھا تو اس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ اس نے مُرجھائے بے گُل بُوٹے اکھاڑے اور اس کنستر میں ڈال دیا جس میں کوڑا کرکٹ وغیرہ جمع کیا جاتا تھا۔ ایک زُلف اس کی برہم رہتی تھی۔ لیکن راستہ دیکھ بھال کر چلنے کا سوال کیا پیدا ہوتا تھا زینت نے سوچا کہ یہ محض شاعرانہ تُک بندی ہے لیکن اس کے بال ٹخنوں تک لمبے تھے۔ اسی دن جب اس کو یہ رقعہ ملا تو نیچے سیڑھیاں اُترتے ہوئے جب ایک زینے پر اپنی ایک بھانجی کے کان سے گری ہوئی سونے کی بالی اُٹھانی پڑی تو وہ اس کی سینڈل سے اُلجھ گئے اور گرتے گرتے بچی۔ چنانچہ اُس دن سے اُس نے راستہ دیکھ بھال کر چلنا شروع کیا۔ مگر اس کی بانھوں میں بانھیں ڈال کر چلنے میں سخت اعتراض تھا۔ وہ اسے زیادتی سمجھتی تھی اس لیے کہ موسم گل نہیں تھا موسم گل بھی ہوتا تو اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ پھولوں سے بانہوں کا کیا تعلق ہے اس کے نزدیک بانہوں میں بانھیں ڈال کر چلنا بڑا واہیات بلکہ سوقیانہ ہے چنانچہ جب وہ دوسرے روز صبح ٦ بجے اُٹھی اور اپنی بھانجیوں کو اسکول کے لیے تیار کرنا چاہا تو اُسے معلوم ہوا کہ اتوار ہے اس کے دل و دماغ میں وہ دو شعر سوار تھے۔ اُس نے اُسی وقت تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بچیوں کو تیار کرے گی اس کے بعد نہائے گی اور اپنے کمرے میں جا کر جمال کا رقعہ پڑھ کر اُسے جی ہی میں کوسے گی مگر اتوار ہونے کے باعث اس کا یہ تہیہ درہم برہم ہو گیا۔ اُسے وقت سے پہلے غسل کرنا پڑا حالانکہ وہ اپنے روزمرہ کے اوقات کے معاملے میں بڑی پابند تھی۔ اُس نے غسل خانے میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا دو بالٹیوں سے پہلے نہاتی تھی دو بالٹیوں سے اب بھی نہائی۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس نے نہاتے وقت اپنی بانھوں کو دیکھا۔ جو سڈول اور خوبصورت تھیں پھر اُسے جمال کی بانھوں کا خیال آیا لیکن اس نے ان کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ قمیص کی آستینوں کے اندر چھپی رہتی تھیں ان کے متعلق وہ کیا رائے قائم کر سکتی تھی بہر حال وہ اپنے گدرائے ہوئے بازو دیکھ کر مطمئن ہو گئی اور جمال کو بھول گئی۔ غسل میں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ اس لیے کہ وہ اپنے حسن و جمال کے متعلق اندازہ کرنے بیٹھ گئی تھی اس نے کافی دیر غور کرنے پر یہ نتیجہ نکالا کہ وہ زیادہ حسین تو نہیں لیکن قبول صورت اور جوان ضرور ہے۔ جوان وہ بلاشبہ تھی۔ وہ چھوٹی مختصر سی ریشمی چیز جو اُس نے اپنے بدن سے اُتار کر لکس صابن کی ہوائیوں میں دھوئی تھی اُس کے سامنے ٹنگی تھی۔ یہ گیلی ہونے کے باوجود بہت سی چغلیاں کھا رہی تھی۔ اس کے بعد روڑے میں لپٹا ہوا ایک اور خط آیا اُس میں بے شمار اشعار تھے شعروں سے اُسے نفرت تھی اس لیے کہ وہ انھیں محبت کا عامیانہ ذریعہ سمجھتی تھی خط آتے رہے زینت وصول کرتی رہی لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ محبت کے شدید جذبے کی قائل نہیں تھی اس کو جمال پسند تھا اس لیے کہ وہ خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔

اُس کے متعلق وہ لوگوں سے بھی سُن چکی تھی کہ وہ بڑے اچھے خاندان کا لڑکا ہے شریف ہے اس کو اور کسی لڑکی سے کوئی واسطہ نہیں رہا غالباً یہی وجہ تھی ایک دن اُس نے اپنی نوکرانی کے دس سالہ بچے کے ہاتھ اس کو یہ رقعہ لکھ کر بھیج دیا۔

”آپ کی رقعہ نویسی پر مجھے اس کے سوا اور کوئی اعتراض نہیں کہ یہ شعروں میں نہ ہوا کرے مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی مجھے چاندی اور سونے کے ہتھوڑوں سے کُوٹ رہا ہے۔ یہ خط ملنے کے بعد جمال نے اشعار لکھنے بند کر دیے لیکن اُس کی نثر اُس سے بھی کہیں زیادہ جذبات سے پُر ہوتی تھی زینت کی طبع پر یہ بھی گراں گزرتی۔ وہ سوچتی یہ کیسا آدمی ہے وہ رات کو سوتی تو اپنا کمرہ بند کر کے قمیص اتار دیتی تھی اس لیے کہ اس کی نیند پر یہ ایک بوجھ سا ہوتا تھا۔ مگر جمال تو اُس کی قمیص کے مقابلے میں کہیں زیادہ بوجھل تھا۔ وہ اُسے کبھی برداشت نہ کر سکتی لیکن اُس کو اس بات کا مل احساس تھا کہ وہ اس سے والہانہ محبت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زینت نے جمال کو کئی موقع دیے کہ وہ اس سے ہمکلام ہو سکے وہ اس سے جب پہلی بار ملا تو کانپ رہا تھا۔ کانپتے کانپتے اور ڈرتے ڈرتے اُس نے ایک ناول بغیر عنوان کے اپنی جیب سے نکالا اور زینت کو پیش کیا اسے پڑھیے میں۔ میں۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور کانپتا لرزتا زینت کے گھر سے نکل گیا۔ زینت کو بڑا ترس آیا۔ لیکن اُس نے سوچا کہ اچھا ہوا۔ اس لیے کہ اُس کے پاس زیادہ وقت تخلیے کے لیے نہیں تھا۔ اس کے ابا ٹھیک ساڑھے سات بجے آنے والے تھے اور جمال سوا سات بجے چل دیا تھا۔ اس کے بعد جمال نے ملاقات کی درخواست کی تو زینت نے اسے کہلا بھیجا کہ وہ اس سے پلازہ میں شام کا پہلا شو شروع ہونے سے دس منٹ پہلے مل سکے گی۔ زینت وہاں پندرہ منٹ پہلے پہنچی جو سہیلی اُس کے ساتھ تھی اُس کو کسی بہانے اِدھر اُدھر کر دیا دس منٹ اس نے باہر گیٹ کے پاس جمال کا انتظار کیا جب وہ نہ آیا تو کسی تکدر کے بغیر وہاں سے ہٹی اور اپنی سہیلی کو تلاش کر کے اندر سینما میں چلی گئی۔ جمال اُس وقت پہنچا جب وہ فرسٹ کلاس میں داخل ہو رہی تھی زینت نے اُسے دیکھا اس کے ملتجی چہرے اور اس کی معافی کی خواستگار آنکھوں کو مگر اُس نے اُس کو گیٹ کیپر کی بھی حیثیت نہ دی اور اندر داخل ہو گئی شو چونکہ شروع ہو چکا تھا اس لیے اس نے اتنی نوازش کی کہ جمال کی طرف دیکھ کر گیٹ کیپر سے کہا

”معاف کیجیے گا ہم لیٹ ہو گئے“

جمال شو ختم ہونے تک باہر کھڑا رہا جب لوگوں کا ہجوم سینما کی بلڈنگ سے نکلا تو اس نے زینت کو دیکھا آگے بڑھ کے اس سے بات کرنا چاہی مگر اُس نے اُس کے ساتھ بالکل اجنبیوں سا سلوک کیا چنانچہ اُسے مایوس گھر لوٹنا پڑا۔ اُس کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ بال بنوانے اور نہا دھو کر کپڑے پہننے میں اسے دیر ہو گئی تھی۔ اُس نے رات کو بڑی سوچ بچار کے بعد ایک خط لکھا جو معذرت نامہ تھا۔ وہ زینت کو پہنچا دیا یہ خط پڑھ کر جب وہ مقررہ وقت پر کوٹھے پر آئی تو جمال نے اس کے تیوروں سے محسوس کیا کہ اسے بخش دیا گیا ہے۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ دیر تک جاری رہا زینت کو جمال سے شکایت رہتی کہ وہ خط بہت لمبے لکھتا ہے جو ضرورت سے زیادہ جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ وہ اختصار کی قائل تھی محبت اُس کو بھی جمال سے ہو چکی تھی مگر وہ اُس کے اظہار میں اپنی طبیعت کے موافق برتتی تھی آخر ایک دن ایسا آیا کہ زینت شادی پر آمادہ ہو گئی مگر ادھر دونوں کے والدین رضامند نہیں ہوتے تھے بہر حال بڑی مشکلوں کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا اور جمال کے گھر زینت دلہن بن کے پہنچ گئی حجلۂ عروسی سجا ہوا تھا ہر طرف پھول ہی پھول تھے جمال کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا عشق و محبت کا اُس نے چنانچہ عجیب و غریب حرکتیں کیں زینت کو سر سے پاؤں تک اپنے ہونٹوں کی سجدہ گاہ بنا ڈالا۔ زینت کو جذبات کا یہ بے پناہ بہاؤ پسند نہ آیا وہ اکتا گئی ٹھیک دس بجے سو جانے کی عادی تھی اُس نے جمال کے تمام جذبات ایک طرف جھٹک دیئے اور سو گئی۔ جمال نے ساری رات جاگ کر کاٹی زینت حسبِ معمول صبح ٹھیک چھ بجے اٹھی اور غسلخانے میں چلی گئی باہر نکلی تو اپنے ٹخنوں تک لمبے بالوں کا بڑی چابک دستی سے جوڑا بنانے میں مصروف ہو گئی اس دوران میں وہ صرف ایک مرتبہ جمال سے مخاطب ہوئی۔

”ڈارلنگ مجھے بڑا افسوس ہے۔“

جمال اس ننھے سے جملے سے ہی خوش ہو گیا جیسے کسی بچے کو کھلونا مل گیا ہو۔ اُس نے دل ہی دل میں اس فضا ہی کو چومنا شروع کر دیا جس میں زینت سانس لے رہی تھی وہ اُس سے والہانہ طور پر محبت کرتا۔ اس قدر شدید انداز میں کہ زینت کی مقدار پسند طبیعت برداشت نہیں کرتی تھی وہ چاہتی تھی کہ ایک طریقہ بن جائے جس کے مطابق محبت کی جائے۔ ایک دن اس نے جمال سے کہا۔ آپ مجھ سے یقیناً ناراض ہو جاتے ہوں گے کہ میری طرف سے محبت کا جواب تار کے سے اختصار سے ملتا ہے لیکن میں مجبور ہوں میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے آپ کی محبت کی میں قدر کرتی ہوں۔ لیکن پیار مصیبت نہیں بن جانا چاہیے آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ جمال نے بہت خیال رکھا۔ ناپ تول کر بیوی سے محبت کی مگر ناکام رہا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں میں ناچاقی ہو گئی۔ زینت نے بہت سوچا کہ طلاق ہی بہتر صورت ہے جو بدمزگی دُور کر سکتی ہے چنانچہ جمال سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اُس نے طلاق کے لیے جمال کو کہلوا بھیجا اس نے جواب دیا کہ مر جائے گا مگر طلاق نہیں دے گا۔ وہ اپنی محبت کا گلا ایسے بے رحم طریقے سے گھونٹنا نہیں چاہتا۔ زینت کے لیے جمال کی یہ محبت بہت بڑی مصیبت بن گئی تھی اُس نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت میں پہلے روز جب فریقین حاضر ہوئے تو عجیب تماشا ہوا جمال نے زینت کو دیکھا تو اس کی حالت غیر ہو گئی اُس کے وکیل نے مجسٹریٹ سے درخواست کی سماعت اور کسی تاریخ پر ملتوی کر دی جائے۔ زینت کو بڑی کوفت ہوئی وہ چاہتی تھی کہ جلد کوئی فیصلہ ہو۔ اگلی تاریخ پر جمال حاضر عدالت نہ ہوا۔ کہ وہ بیمار ہے۔ دوسرے مہینے کی تاریخ پر بھی وہ نہ آیا تو زینت نے ایک رقعہ لکھ کر جمال کو بھیجا کہ وہ اُسے پریشان نہ کرے اور جو تاریخ مقرر ہوئی ہے اس پر وہ ٹھیک وقت پر آئے۔ تاریخ سولہ اگست تھی رات سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی زینت حسبِ معمول صبح چھ بجے اٹھی نہا دھو کر کپڑے پہنے اور اپنے وکیل کے ساتھ تانگے میں عدالت پہنچ

گئی اُس کو یقین تھا کہ جمال وہاں موجود ہو گا اس لیے کہ اس نے اس کو لکھ بھیجا تھا کہ وقت پر پہنچ جائے۔ مگر جب اُس نے اِدھر اُدھر دنظر دوڑائی اور اسے جمال نظر نہ آیا تو اُس کو بہت غصہ آیا۔ مقدمہ اُس دن سر فہرست تھا۔ مجسٹریٹ نے عدالت میں داخل ہوتے ہی تھوڑی دیر کے بعد جمال اور زینت کو بلایا۔ زینت اندر جانے ہی والی تھی کہ اُس کو جمال کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا بالوں میں کیچڑ کپڑوں میں خون کے دھبے لڑکھڑاتا ہوا وہ اس کے پاس آیا اور معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ زینت مجھے افسوس ہے۔ میری موٹر سائیکل پھسل گئی اور میں۔“

جمال کے ماتھے پر گہرا زخم تھا جس سے خون نکل رہا تھا۔ زینت نے اپنا دوپٹہ پھاڑا اور پٹی بنا کر اس پر باندھ دی اور جمال نے جذبات سے مغلوب ہو کر وہیں عدالت کے باہر اس کا منہ چوم لیا۔ اُس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ بلکہ وکیل سے کہا کہ وہ طلاق لینا نہیں چاہتی مقدمہ واپس لے لیا جائے۔“

جمال دس دن ہسپتال میں رہا۔ اس دوران میں زینت اس کی بڑی محبت سے تیار داری کرتی رہی آخری دن جب جمال مشین پر اپنا وزن دیکھ رہا تھا تو اس نے زینت سے دبی زُبان سے پوچھا۔ میں اب تم سے کتنی محبت کر سکتا ہوں“

”زینت مسکرائی۔ ایک من۔“

جمال نے وزن کرنے والی مشین کی سوئی دیکھی اور زینت سے کہا۔

”مگر میرا وزن تو ایک من تیس سیر ہے۔ میں یہ فالتو تیس سیر کہاں غائب کروں“

زینت ہنسنے لگی۔

رحمتِ خداوندی کے پھول

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹورحمتِ خداوندی کے پھول

زمیندار، اخبار میں جب ڈاکٹر راتھر پر رحمت خداوندی کے پھول برستے تھے تو یار دوستوں نے غلام رسول کا نام ڈاکٹر راتھر رکھ دیا۔ معلوم نہیں کیوں، اس لیے کہ غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایم۔ بی بی۔ ایس میں تین بار فیل ہو چکا تھا۔ مگر کہاں ڈاکٹر راتھر، کہاں غلام رسول۔ ڈاکٹر راتھر ایک اشتہاری ڈاکٹر تھا جو اشتہاروں کے ذریعے سے قوتِ مردمی کی دوائیں بیچتا تھا۔ خدا اور اس کے رسول کی قسمیں کھا کھا کر اپنی دواؤں کو مجرب بتاتا تھا اور یوں سینکڑوں روپے کماتا تھا۔ غلام رسول کو ایسی دوائیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ شادی شدہ تھا، اور اس کو قوت مردمی بڑھانے والی چیزوں کی کوئی حاجت نہیں تھی، لین پھر بھی اس کے یار دوست اس کو ڈاکٹر راتھر کہتے تھے۔ اس کا یا کلپ کو اس نے تسلیم کرا لیا تھا۔ اس لیے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ یہ نہیں تھا۔ اس کے دوستوں کو یہ نام پسند آ گیا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ غلام رسول کے مقابلے میں ڈاکٹر راتھر کہیں زیادہ موڈرن ہے۔ اب غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر ہی کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس لیے کہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور نہ بننا چاہتا تھا۔ وہ ایک اطاعت مند بیٹے کی طرح اپنے ماں باپ کی خواہش کے مطابق میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ اتنے عرصے سے کہ اب کالج کی عمارت اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ کالج اس کے کسی بزرگ کا گھر ہے جہاں اس کو ہر روز سلام عرض کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ اس کے والدین مصر تھے کہ وہ ڈاکٹری پاس کرے۔ اس کے والد کو یقین تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اپنے بڑے لڑکے کے متعلق مولوی صباح الدین نے اپنی بیوی سے پیش گوئی کی تھی کہ وہ بیرسٹر ہو گا۔ چنانچہ جب اس کو ایل، ایل، بی پاس کرا کے لندن بھیجا گیا تو بیرسٹر بن کر ہی آیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی پریکٹس دوسرے بیرسٹوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔ گو ڈاکٹر راتھر تین مرتبہ ایم۔ بی بی۔ ایس کے امتحان میں فیل ہو چکا تھا، مگر اس کے بات کو یقین تھا کہ وہ انجام کار بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ڈاکٹر راتھر اپنے باپ کا اس قدر فرماں بردار تھا کہ اس کو بھی یقیناً تھا کہ ایک روز وہ لنڈن کے ہارلے اسٹریٹ میں بیٹھا ہو گا اور اس کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہو گی۔ ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ ایک خوبی یہ تھی کہ سادہ لوح تھا۔ لیکن سب سے بڑی برائی اس میں یہ تھی کہ پیتا تھا اور اکیلا پیتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے بہت کوشش کی کہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ ملائے لیکن یار دوستوں نے اس کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان کو اس کا ٹھکانا معلوم ہو گیا۔

”سیوائے بار‘ میں شام کو سات بجے پہنچ جائے مجبوراً ڈاکٹر راتھر کو نہیں اپنے ساتھ پلانا پڑتی۔ یہ لوگ اس کا گن گاتے، اس کے مستقبل کے متعلق بھی حوصلہ افزا باتیں کرتے۔ راتھر نشے کی ترنگ میں بہت خوش ہوتا اور اپنی جیب خالی کر دیتا۔ پانچ چھ مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اس کو اپنے باپ سے دو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ رہتا الگ تھا۔ مکان کا کرایہ بیس روپے ماہانہ تھا۔ دن اچھے تھے۔ روز راتھر کی بیوی کو فاقے کھینچنے پڑتے، لیکن پھر بھی اس کا ہاتھ تنگ ہو گیا اس لیے کہ راتھر کو دوسروں کو پلانا پڑتی تھی۔ ان دنوں شراب بہت سستی تھی۔ آٹھ روپے کی ایک بوتل۔ ادھر چار روپے آٹھ آنے میں ملتا تھا۔ مگر ہر روز ایک ادھار لینا، یہ ڈاکٹر راتھر کی بساط سے باہر تھا اس نے سوچا کہ گھر میں پیا کرے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ اس

کی بیوی فوراً طلاق لے لیتی اس کو معلوم ہی تھا کہ اس کا خاوند شراب کا عادی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو شرابیوں سے سخت نفرت تھی، نفرت ہی نہیں، ان سے بہت خوف آتا تھا۔ کسی کی سرخ آنکھیں دیکھتی تو ڈر جاتی، ہائے، ڈاکٹر صاحب، کتنی ڈراؤنی آنکھیں تھیں اس آدمی کی۔ ایسا لگتا تھا کہ شرابی ہے۔“

اور ڈاکٹر راتھر دل ہی دل میں سوچتا کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں، کیا پی کر آنکھوں میں سرخ ڈورے آتے ہیں؟۔ کیا اس کی بیوی کو اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ نظر نہیں آئیں؟۔ کب تک اس کا راز راز رہے گا؟۔ منہ سے بو تو ضرور آتی ہو گی۔ کیا وجہ ہے کہ اس کی بیوی نے کبھی نہیں سونگھی۔ پھر وہ یہ سوچتا

”نہیں“

میں بہت احتیاط برتتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ منہ پرے کر کے اس سے بات کی ہے۔ ایک دفعہ اس نے پوچھا تھا کہ آپ کی آنکھیں آج سرخ کیوں ہیں تو میں نے اس سے کہا تھا، دھول پڑی گئی ہے۔ اسی طرح ایک بار اس نے دریافت کیا تھا، یہ بو کسی ہے، تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا، آج سیگار پیا تھا۔ بہت بو ہوتی ہے کم بخت میں۔“

ڈاکٹر راتھر اکیلا پینے کا عادی تھا۔ اس کو ساتھی نہیں چاہیے تھے۔ وہ کنجوس تھا۔ اس کے علاوہ اس کی جیب بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ دوستوں کو پلائے اس نے بہت سوچا کہ ایسی ترکیب کیا ہو سکتی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی یہ مسئلہ کچھ اس طرح حل ہو کہ وہ گھر میں پیا کرے جہاں اس کے دوستوں کو شرکت کرنے کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر راتھر، پورا ڈاکٹر تو نہیں تھا، لیکن اس کو ڈاکٹری کی چند چیزوں کا علم ضرور تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ دوائیں بوتلوں میں ڈال کر دی جاتی ہیں۔ اور ان پر اکثر یہ لکھا ہوتا ہے۔

”شیک دی بوٹل بی فوریوز“

۔ اس نے اتنے علم میں اپنی ترکیب کی دیواریں استوار کیں۔ آخر میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہ سوچا کہ وہ گھر ہی میں پیا کرے گا۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ وہ دوا کی بوتل میں شراب ڈلوا کر گھر رکھ دے گا۔ بیوی سے کہے گا کہ اس کے سر میں درد ہے اور اس کے استاد ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے یہ نسخہ دیا ہے اور کہا ہے کہ شام کو ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک خوراک پانی کے ساتھ پیا کرے، انشاء اللہ شفا ہو جائے گی۔ یہ ترکیب تلاش کر لینے پر ڈاکٹر راتھر بے حد خوش ہوا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس نے ایک نیا امریکا دریافت کر لیا ہے، چنانچہ صبح سویرے اٹھ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

”نسیمہ، آج میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے پھٹ جائے گا۔ نسیمہ نے بڑے تردو سے کہا۔

”کالج نہ جائیے آج۔“

ڈاکٹر راتھر مسکرایا۔

”پگلی، آج تو مجھے ضرور جانا چاہیے۔ ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ صاحب سے پوچھوں گا۔ ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔“

”ہاں ہاں، ضرور جائیے۔ میرے متعلق بھی ان سے بات کیجیے گا۔“

نسیمہ کو سلان الرحم کی شکایت تھی جس سے ڈاکٹر راتھر کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر اس نے کہا۔

”ہاں ہاں بات کروں گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لیے کوئی نہایت ہی کڑی اور بدبودار دوا تجویز کر دیں گے۔“

”آپ خود ڈاکٹر ہیں، دوائیں مٹھائیاں تو نہیں ہوتیں۔“

”ٹھیک ہے، لیکن بدبودار دواؤں سے مجھے نفرت ہے۔“

”آپ دیکھیے تو سہی کیسی دوا دیتے ہیں۔ ابھی سے کیوں ایسی رائے قائم کر رہے ہیں آپ؟“

”اچھا“

کہہ کر ڈاکٹر راتھر اپنے سر کو دباتا کالج چلا گیا۔ شام کو وہ دوا کی بوتل میں وسکی ڈلوا کر لے آیا اور اپنی بیوی سے کہا۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ ضرور کوئی ایسی دوا لکھ کر دیں گے۔ جو بے حد کڑی اور بدبودار ہو گی۔ لو، ذرا سے سونگھو۔

”بوتل کا کارک اتار کر اس نے بوتل کا منہ اپنی بیوی کی ناک کے ساتھ لگا دیا۔ اس نے سونگھا اور ایک دم ناک ہٹا کر کہا۔

”بہت واہیات سی بو ہے۔“

”اب ایسی دوا کون پیے؟“

”نہیں نہیں۔ آپ ضرور پیئیں گے۔ سر کا درد کیسے دور ہو گا۔“

”ہو جائے گا اپنے آپ۔“

”اپنے آپ کیسے دور ہو گا۔ یہی تو آپ کی بری عادت ہے۔ دوا لاتے ہیں مگر استعمال نہیں کرتے۔“

”یہ بھی کوئی دوا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شراب ہے۔“

”آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انگریزی دواؤں میں شراب ہوا کرتی ہے۔“

”لعنت ہے ایسی دواؤں پر“!

ڈاکٹر راتھر کی بیوی نے خوراک کے نشان دیکھے اور حیرت سے کہا۔

”اتنی بڑی خوراک“!

ڈاکٹر راتھر نے بُرا سا منہ بنایا۔

”یہی تو مصیبت ہے“!

”آپ مصیبت مصیبت نہ کہیں، اللہ کا نام لے کر پہلی خوراک پئیں۔ پانی کتنا ڈالنا ہے۔“

ڈاکٹر راتھر نے بوتل اپنی بیوی کے ہاتھ سے لی اور مصنوعی طور پر بادل ناخواستہ کہا۔

”سوڈا منگوانا پڑے گا۔ عجیب و غریب دوا ہے۔ پانی نہیں سوڈا۔“

یہ سن کر نسیمہ نے کہا۔

”سوڈا اس لیے کہا ہو گا کہ آپ کا معدہ خراب ہے۔“

”خدا معلوم کیا خراب ہے۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے ایک خوراک گلاس میں ڈالی۔

”بھئی خدا کی قسم میں نہیں پیوں گا۔“

بیوی نے بڑے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”نہیں نہیں۔ پی جائیے۔ ناک بند کر لیجیے۔ میں اسی طرح فیور مکسچر پیا کرتی ہوں۔“

ڈاکٹر راتھر نے بڑے نخروں کے ساتھ شام کا پہلا پیگ پیا۔ بیوی نے اس کو شاباش دی اور کہا۔

”پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک۔ خدا کے فضل و کرم سے درد یوں چٹکیوں میں دور ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر راتھر نے سارا ڈھونگ کچھ ایسے خلوص سے رچایا تھا کہ اس کو محسوس ہی نہ ہوا کہ اس نے دوا کے بجائے شراب پی ہے، لیکن جب ہلکا سا درد اس کے دماغ میں نمودار ہوا تو وہ دل ہی دل میں خوب ہنسا۔ ترکیب خوب تھی۔ اس کی بیوی نے عین پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک گلاس میں انڈیلی۔ اس میں سوڈا ڈالا اور ڈاکٹر راتھر کے پاس لے آئی۔

”یہ لیجئے دوسری خوراک۔ کوئی ایسی بری بُو تو نہیں ہے۔“

ڈاکٹر راتھر نے گلاس پکڑ کر بڑی بد دلی سے کہا، تمہیں پینا پڑے تو معلوم ہو۔ خدا کی قسم شراب کی سی بُو ہے۔ ذرا سونگھ کر تو دیکھو“!

”آپ تو بالکل میری طرح ضد کرتے ہیں۔“

”نسیمہ، خدا کی قسم ضد نہیں کرتا۔ ضد کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، لیکن۔ خیر، ٹھیک ہے۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے گلاس منہ سے لگایا اور شام کا دوسرا پیگ غٹا غٹ چڑھا گیا۔ تین خوراکیں ختم ہو گئیں۔ ڈاکٹر راتھر نے کسی قدر افاقہ محسوس کیا، لیکن دوسرے روز پھر سر میں درد عود کر آیا۔ ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے کہا۔

”ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے کہا ہے کہ یہ مرض آہستہ آہستہ دور ہو گا، لیکن دوا کا استعمال برابر جاری رہنا چاہیے۔ خدا معلوم کیا نام لیا تھا انھوں نے بیماری کا۔ کہا تھا معمولی سر کا درد ہوتا تو دو خوراکوں ہی سے دور ہو جاتا۔ مگر تمہارا کیس ذرا سیریس ہے۔

”یہ سن کر نسیمہ نے تردد سے کہا۔

”تو آپ کو دوا اب باقاعدہ پینی پڑے گی۔“

”میں نہیں جانتا۔ تم وقت پر دے دیا کرو گی تو قہر درویش بر جان درویش پی لیا کروں گا۔“

نسیمہ نے ایک خوراک سوڈے میں حل کر کے اس کو دی۔ اس کی بو ناک میں گھسی تو متلی آنے لگی مگر اس نے اپنے خاوند پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ وہ پینے سے انکار کر دے گا۔ ڈاکٹر راتھر نے تین خوراکیں اپنی بیوی کے بڑے اصرار پر پیں۔ وہ بہت خوش تھی کہ اس کا خاوند اس کا کہا مان رہا ہے، کیونکہ بیوی کی بات ماننے کے معاملے میں ڈاکٹر بہت

بدنام تھا۔ کئی دن گزر گئے۔ خوراکیں پینے اور پلانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ ڈاکٹر راتھر بڑا مسرور تھا کہ اس کی ترکیب سود مند ثابت ہوئی۔ اب اسے دوستوں کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ہر شام گھر میں بسر ہوتی۔ ایک خوراک پیتا اور لیٹ کر کوئی افسانہ پڑھنا شروع کر دیا۔ دوسری خوراک عین پندرہ منٹ کے بعد اس کی بیوی تیار کر کے لے آتی۔ اسی طرح تیسری خوراک اس کو من مانگے مل جاتی۔ ڈاکٹر راتھر بے حد مطمئن تھا۔ اتنے دن گزر جانے پر اس کے اور اس کی بیوی کے لیے یہ دوا کا سلسلہ ایک معمول ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر راتھر اب ایک پوری بوتل لے آیا تھا۔ اس کا لیبل وغیرہ اتار کر اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔

”کیمسٹ میرا دوست ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ آپ ہر روز تین خوراکیں لیتے ہیں، دوا آپ کو یوں مہنگی پڑتی ہے۔ پوری بوتل لے جایئے۔ اس میں سے چھوٹی نشانوں والی بوتل میں ہر روز تین خوراکیں ڈال لیا کیجیے۔ بہت سستی پڑے گی اس طرح آپکو یہ دوا“!

یہ سن کر نسیمہ کو خوش ہوئی کہ چلو بچت ہو گئی۔ ڈاکٹر راتھر بھی خوش تھا کہ اس کے کچھ پیسے بچ گئے، کیونکہ روزانہ تین پیگ لینے میں اسے زیادہ دام دینے پڑے تھے۔ اور بوتل آٹھ روپوں میں مل جاتی تھی۔ کالج سے فارغ ہو کر ڈاکٹر راتھر ایک دن گھر آیا تو اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر راتھر نے اس سے کہا۔

”نسیمہ کھانا نکالو، بہت بھوک لگی ہے۔“

نسیمہ نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔

”کھانا۔ کیا آپ کھانا کھا نہیں چکے۔“

”نہیں تو۔“

”نسیمہ نے ایک لمبی، نہیں ' کہی۔

”آپ۔ کھانا کھا چکے ہیں۔ میں نے آپ کو دیا تھا۔“

ڈاکٹر راتھر نے حیرت سے کہا۔

”کب دیا تھا۔ میں ابھی ابھی کالج سے آ رہا ہوں۔“

نسیمہ نے ایک جمائی لی۔

”جھوٹ ہے۔ آپ کالج تو گئے ہی نہیں۔“

ڈاکٹر راتھر نے سمجھا، نسیمہ مذاق کر رہی ہے، چنانچہ مسکرایا۔

”چلو اٹھو، کھانا نکالو سخت بھوک لگی ہے۔“

نسیمہ نے ایک اور لمبی

”نہیں“

کہی۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔

”کب ؟۔ حد ہو گئی ہے۔ چلو اٹھو، مذاق نہ کرو۔

”یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی کا بازو پکڑا۔

”خدا کی قسم میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔“

نسیمہ کھکھلا کر ہنسی۔

”چوہے۔ آپ یہ چوہے کیوں نہیں کھاتے ؟“

ڈاکٹر راتھر نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“

نسیمہ نے سنجید گی اختیار کر کے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے خاوند سے کہا۔

”میں۔ میں۔ سر میں درد تھا میرے۔ آپکی دوا کی دو خو۔ خو۔ خوراکیں پی ہیں۔ چوہے۔ چوہے بہت ستاتے ہیں۔ ان کو مارنے والی گولیاں لے آیئے۔ کھانا؟۔ نکالتی ہوں کھانا۔“

ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے صرف اتنا کہا۔

”تم سو جاؤ، میں کھانا کھا چکا ہوں۔“

نسیمہ زور سے ہنسی۔

”میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔“

ڈاکٹر راتھر نے جب دوسرے کمرے میں جا کر مضطرب حالت میں زمیندار کا تازہ پرچہ کھولا تو اس کو ایک خبر کی سرخی نظر آئی۔ ڈاکٹر راتھر پر رحمت خداوندی کے پھول۔“

اس کے نیچے یہ درج تھا کہ پولیس نے اس کو دھوکا دہی کے سلسلے میں گرفتار کر لیا ہے۔ غلام رسول عرف ڈاکٹر راتھر نے یہ خبر پڑھ کر یوں محسوس کیا کہ اس پر رحمت خداوندی کے پھول برس رہے ہیں۔ 25جولائی1950ء

رشوت

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹورشوت

احمد دین کھاتے پیتے آدمی کا لڑکا تھا۔ اپنے ہم عمر لڑکوں میں سب سے زیادہ خوش پوش مانا جاتا تھا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بالکل خستہ حال ہو گیا۔ اس نے بی اے کیا اور اچھی پوزیشن حاصل کی۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے والد خان بہادر عطاء اللہ کا ارادہ تھا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں گے۔ پاسپورٹ لے لیا گیا تھا۔ سوٹ وغیرہ بھی بنوا لیے گئے تھے کہ اچانک خان بہادر عطاء اللہ نے جو بہت شریف آدمی تھے، کسی دوست کے کہنے پر سٹہ کھیلنا شروع کر دیا۔ شروع میں انہیں اس کھیل میں کافی منافع ہوا۔ وہ خوش تھے کہ چلو میرے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ ہی نکل آیا۔ مگر لالچ بری بلا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کی پشت پر چوگنی ہے۔ جیتتے ہی چلے جائیں گے۔ ان کا وہ دوست جس نے ان کو اس راستے پر لگایا تھا بار بار ان سے کہتا تھا:

”خان صاحب۔ ماشاء اللہ آپ قسمت کے دھنی ہیں۔ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالیں تو سونا بن جائے۔“

اور وہ اس قسم کی چاپلوسیوں کے ذریعے خان بہادر سے سو دو سو روپے اینٹھ لیتا۔ خان بہادر کو بھی کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی اس لیے کہ انہیں بغیر محنت کے ہزاروں روپے مل رہے تھے۔ احمد دین ذہین اور باشعور لڑکا تھا۔ اس نے ایک دن اپنے باپ سے کہا:

”ابا جی! یہ آپ نے جو سٹہ بازی شروع کی ہے۔ معاف کیجیے گا، اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔“

خان بہادر نے تیز لہجے میں اس سے کہا:

”برخوردار! تمہیں میرے کاموں میں دخل دینے کی جرأت نہیں ہونی چاہیے میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے۔ جتنا روپیہ آ رہا ہے، وہ میں اپنے ساتھ قبر میں لے کر نہیں جاؤں گا۔ یہ سب تمہارے کام آئے گا۔“

احمد دین نے بڑی معصومیت سے پوچھا:

”لیکن ابا جی، یہ کب تک آتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے کل کو یہ جانے بھی لگے۔“

خان بہادر بھِنّا گئے۔

”بکو مت۔ آتا ہی رہے گا۔“

روپیہ آتا رہا۔ لیکن ایک دن خان بہادنے کئی ہزار روپے کی رقم داؤ پر لگا دی۔ لیکن نتیجہ صفر نکلا۔ دس ہزار ہاتھ سے دینے پڑے۔ تاؤ میں آکر انہوں نے بیس ہزار روپے کا سٹہ کھیلا۔ ان کو یقین تھا کہ ساری کسر پوری ہو جائے گی۔ لیکن صبح جب انہوں نے اخبار دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ بیس ہزار بھی گئے۔ خان بہادر ہمت ہارنے والے نہیں تھے انہوں نے اپنا ایک مکان گروی رکھ کر پچاس ہزار روپے لیے، اور سب کا سب اللہ کا نام لے کر چاندی کے سٹے پر لگا دیے۔ اللہ نام تو خیر اللہ کا نام ہے۔ وہ چاندی اور سونے کی مارکیٹ پر کیا کنٹرول کر سکتا ہے۔ صبح ہوئی تو خان بہادر کو معلوم ہوا کہ چاندی کا بھاؤ ایک دم گر گیا ہے۔ ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ دل کے دورے پڑنے لگے۔ احمد دین نے ان سے کہا

”ابا جی۔ چھوڑ دیجیے اس بکواس کو۔“

خان بہادر نے بڑے غصے میں اپنے بیٹے سے کہا:

”تم بکواس مت کرو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے۔“

احمد دین نے مودّبانہ کہا: لیکن ابا جان۔ یہ جو آپ کو دل کی تکلیف شروع ہو گئی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟“

”مجھے کیا معلوم۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ ایسے عارضے انسان کو ہوتے ہی رہتے ہیں۔“

احمد دین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا:

”جی ہاں۔ انسان کو ہر قسم کے عارضے ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کوئی ایسی چیز کھالیں جس میں ہیضے کے جراثیم ہوں اور۔“

خان بہادر کو اپنے بیٹے کی یہ گفتگو پسند نہیں تھی۔

”تم چلے جاؤ یہاں سے۔ میرا مغز مت چاٹو۔ میں ہر چیز سے واقف ہوں۔“

احمد دین نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا:

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ کوئی انسان بھی ہر چیز سے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔“

احمد دین چلا گیا۔ خان بہادر اندرونی طور پر خود کو بہت بڑا چغد سمجھنے لگے تھے۔ لیکن وہ اپنے اس احساس کو اپنے لڑکے پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بستر پر لیٹے انہوں نے بار بار خود سے کہا:

”خان بہادر عطاء اللہ۔ تم خان بہادر بنے پھرتے ہو۔ لیکن اصل میں تم اوّل درجے کے بیوقوف ہو۔“

”تم اپنے بیٹے کی بات پر کان کیوں۔ نہیں دھرتے۔ جبکہ تم جانتے ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے صحیح ہے۔“

”جتنا روپیہ تم نے حاصل کیا تھا اُس سے دگنا روپیہ تم ضائع کر چکے ہو۔ کیا یہ درست ہے؟“

خان بہادر جھنجھلا گئے اور بڑبڑانے لگے:

”سب درست ہے۔ سب درست ہے۔ ایک میں ہی غلط ہوں لیکن میرا غلط ہونا ہی صحیح ہو گا۔ بعض اوقات غلطیاں بھی صحت کا سامان مہیا کر دیتی ہیں۔“

پندرہ دن بستر پر لیٹے اور علاج کرانے کے بعد جب وہ کسی قدر ہی تندرست ہوئے تو انہوں نے اپنا ایک اور مکان بیچ دیا۔ یہ پچیس ہزار روپے میں بکا۔ خان صاحب نے یہ سب روپے سٹے پر لگا دیے۔ ان کو پوری امید تھی کہ وہ اپنی اگلی پچھلی کسر پوری کر لیں گے مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور وہ ان پچیس ہزار روپوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ احمد دین پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے باپ کو کس طرح سمجھائے۔ وہ اس کی کوئی بات سنتے ہی نہیں تھے۔ احمد دین نے آخری کوشش کی۔ اور ایک دن جب اس کا باپ اپنے کمرے میں حقہ پی رہا تھا اور معلوم نہیں کس سوچ میں غرق تھا کہ اس سے ڈرتے ڈرتے مخاطب ہوا:

”اباجی۔“

خان بہادر صاحب سوچ میں اس قدر غرق تھے کہ انہوں نے اپنے لڑکے کی آواز ہی نہیں سُنی۔ احمد دین نے آواز کو ذرا بلند کیا:

”اباجی۔ اباجی“!

خان بہادر چونکے۔

”کیا ہے۔“

احمد دین کانپ گیا۔

”کچھ نہیں اباجی۔ مجھے۔ مجھے آپ سے ایک بات کہنا تھی“

خان بہادر نے حقے کی نڑی اپنے منہ سے جدا کی۔

”کہو کیا کہنا ہے۔“

احمد دین نے بڑی لجاجت سے کہا:

”مجھے یہ عرض کرنا ہے۔ یہ درخواست کرنا تھی۔ کہ۔ آپ سٹہ کھیلنا بند کر دیں۔“

حقے کا ایک زوردار کش لے کر وہ احمد دین پر برس پڑے۔

”تم کون ہوتے ہو مجھے نصیحت کرنے والے۔ میں جانوں میرا کام۔ کیا اب تک تمہارے ہی مشورے سے میں سارے کام کر تا رہا ہوں۔ دیکھو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ میرے معاملے میں کبھی دخل نہ دینا۔ مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں۔ سمجھے“!

احمد دین کی گردن جھکی ہوئی تھی:

”جی میں سمجھ گیا۔“

اور یہ کہہ کر وہ اپنے باپ کے کمرے سے نکل گیا۔ سٹے کی لت شراب کی عادت سے بھی کہیں زیادہ بری ہوتی ہے۔ خان بہادر اس میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے کہ جائیداد۔ سب کی سب اس خطرناک کھیل کی نذر ہو گئی۔ مرحوم بیوی کے زیور تھے۔ وہ بھی بک گئے۔ اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ان کے دل کے عارضے نے کچھ ایسی شکل اختیار کی کہ وہ ایک روز صبح سویرے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی دھم سے گرے اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر دم توڑ دیا۔ احمد دین کو ظاہر ہے کہ اپنے باپ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ وہ کئی دن نڈھال رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ بی اے پاس تھا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر اب سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے باپ نے ایک پھوٹی کوڑی بھی اس کیلیے نہیں چھوڑی تھی۔ مکان۔ جس میں وہ تنہا رہتا تھا۔ رہن تھا۔ یہاں سے اس کو کچھ عرصے کے بعد نکلنا پڑا گھر کی مختلف چیزیں بیچ کر اس نے چار پانچ سو روپے حاصل کیے اور ایک غلیظ محلے میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا مگر پانچ سو روپے کب تک اس کا ساتھ دے سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک برس تک بڑی کفایت شعاری سے گزارا کر لیتا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوتا۔ احمد دین نے سوچا:

”مجھے ملازمت کر لینی چاہیے! چاہے وہ کیسی بھی ہو۔ پچاس ساٹھ روپے ماہوار مل جائیں۔ تو گزارا ہو جائے گا۔“

اس کی ماں کو مرے اتنے ہی برس ہو گئے تھے جتنے اس کو جیتے‘ احمد دین نے حالانکہ اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ نہ اس کو دودھ پینا نصیب ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اکثر اس کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا۔ احمد دین نے ملازمت حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اتنے بے روزگار اور بے کار آدمی تھے کہ وہ خود کو اس بے روزگاری اور بے کاری کے سمندر میں ایک قطرہ سمجھتا تھا۔ لیکن اس احساس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری۔ اور اپنی تگ و دو جاری رکھی۔ بہت دنوں کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اگر کسی افسر کی مٹھی گرم کی جائے تو ملازمت ملنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ مٹھی گرم کرنے کا مسالا کہاں سے لاتا۔ ایک دفتر میں جب وہ ملازمت کے سلسلے میں گیا تو ہیڈ کلرک نے اس سے شفیقانہ انداز میں کہا:

”دیکھو برخوردار۔ یوں خالی خولی کام نہیں چلے گا۔ جس اسامی کے لیے تم نے درخواست دی ہے‘ اس کے لیے پہلے ہی دو سو پچاس درخواستیں وصول ہو چکی ہیں۔ میں بڑا صاف گو آدمی ہوں۔ پانچ سو روپے اگر تم دے سکتے ہو تو یہ ملازمت تمہیں یقیناً مل جائے گی۔“

اب احمد دین پانچ سو روپے کہاں سے لاتا۔ اس کے پاس بمشکل بیس یا تیس روپے تھے۔ چنانچہ اس نے ہیڈ کلرک سے کہا:

”جناب! میرے پاس اتنے روپے نہیں۔ آپ ملازمت دلوا دیجیے تنخواہ میں سے آدھی رقم آپ لے لیا کریں۔“

ہیڈ کلرک ہنسا۔

”تم ہمیں بیوقوف بناتے ہو۔ جاؤ، چلتے پھرتے بنو۔“

احمد دین بہت دیر تک چلتا پھرتا رہا۔ مگر اسے اطمینان سے کہیں بیٹھنے کا موقع نہ ملا۔ جہاں جاتا، رشوت کا سوال سامنے ہوتا۔ دنیا شاید رشوت ہی کی وجہ سے عالم وجود میں آئی ہے۔ شاید خدا کو کسی نے رشوت دی ہو اور اس نے یہ دنیا بنا دی ہو۔ احمد دین کے پاس جب پیسہ بھی نہ رہا تو مزدوری شروع کر دی۔ بوجھ اٹھاتا اور ہر روز دو روپے کما لیتا۔ مہنگائی کا زمانہ تھا۔ گو دونوں وقت کا کھانا بھٹیار خانے میں کھاتا لیکن اسے کافی خرچ برداشت کرنا پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آنہ بچ رہتا۔ احمد دین مزدوری کرتا۔ مگر اس کے دل و دماغ پر رشوت کا چکر گھومتا رہتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی لعنت تھی۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس سے کسی طرح نجات حاصل کرے۔ اور مزدوری چھوڑ کر کوئی ایسی ملازمت اختیار کرے جو اس کے شایانِ شان ہو۔ آخر وہ بی اے پاس تھا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ۔ اس نے سوچا کہ نماز پڑھنا شروع کر دے۔ خدا سے دعا مانگے کہ وہ اس کی سنے! چنانچہ اس نے باقاعدہ پانچ وقت کی نماز شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ایک وقت تک جاری رہا مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ اس دوران میں اس کے پاس تیس روپے جمع ہو چکے تھے۔ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ ڈاک خانے گیا تیس روپے کا پوسٹل آرڈر لیا اور لفافے میں ڈال کر ساتھ ہی ایک رقعہ بھی رکھ دیا جس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا:

”اللہ میاں۔ میں سمجھتا ہوں تم بھی رشوت لے کر کام کرتے ہو۔ میرے پاس تیس روپے ہیں جو تمہیں بھیج رہا ہوں۔ مجھے کہیں اچھی سی ملازمت دلوا دو۔ بوجھ اٹھا اٹھا کر میری کمر دوہری ہو گئی ہے۔“

لفافے پر اس نے پتہ لکھا:

”بخدمت جناب اللہ میاں۔ مالکِ کائنات“

چند روز بعد احمد دین کو ایک خط ملا جو

”کائنات“

اخبار کے ایڈیٹر کی طرف سے تھا۔ اس کا نام محمد میاں تھا خط کے ذریعے اس نے احمد دین کو بلایا تھا۔ وہ

”کائنات“

کے دفتر گیا جہاں مترجم کی حیثیت سے سو روپیہ ماہوار پر رکھ لیا گیا۔ احمد دین نے سوچا۔ آخر رشوت کام آ ہی گئی۔

ساڑھے تین آنے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوساڑھے تین آنے

”میں نے قتل کیوں کیا۔ ایک انسان کے خون میں اپنے ہاتھ کیوں رنگے، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جب تک میں اس کے تمام عواقب وعواطف سے آپ کو آگاہ نہیں کروں گا، آپ کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ مگر اس وقت آپ لوگوں کی گفتگو کا موضوع جرم اور سزا ہے۔ انسان اور جیل ہے۔ چونکہ میں جیل میں رہ چکا ہوں، اس لیے میری رائے نادرست نہیں ہو سکتی۔ مجھے منٹو صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ جیل، مجرم کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ مگر یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے۔ اور یہ لطیفہ نہیں کہ اس حقیقت کو جانتے پہچانتے ہوئے بھی ہزار ہا جیل خانے موجود ہیں۔ ہتھکڑیاں ہیں اور وہ ننگِ انسانیت بیڑیاں۔ میں قانون کا یہ زور پہن چکا ہوں۔“

یہ کہہ کر رضوی نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ اس کے موٹے موٹے حبشیوں کے سے ہونٹ عجیب انداز میں پھڑکے۔

”اس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھیں، جو قاتل کی آنکھیں لگی تھیں چمکیں۔ ہم سب چونک پڑے تھے۔ جب اس نے یکا یک ہماری گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہمارے قریب کرسی پر بیٹھا کریم ملی ہوئی کوفی پی رہا تھا۔ جب اس نے خود کو متعارف کرایا تو ہمیں وہ تمام واقعات یاد آ گئے جو اس کی قتل کی واردات سے وابستہ تھے۔ وعدہ معاف گواہ بن کر اس نے بڑی صفائی سے اپنی اور اپنے دوستوں کی گردن پھانسی کے پھندے سے بچا لی تھی۔ وہ اسی دن رہا ہو کر آیا تھا۔ بڑے شائستہ انداز میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”معاف کیجیے گا منٹو صاحب۔ آپ لوگوں کی گفتگو سے مجھے دلچسپی ہے۔ میں ادیب تو نہیں، لیکن آپ کی گفتگو کا جو موضوع ہے اس پر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ سکتا ہوں۔ پھر اس نے کہا۔

”میرا نام صدیق رضوی ہے۔ لنڈا بازار میں جو قتل ہوا تھا، میں اس سے متعلق تھا۔“

میں نے اس قتل کے متعلق صرف سرسری طور پر پڑھا تھا۔ لیکن جب رضوی نے اپنا تعارف کرایا تو میرے ذہن میں خبروں کی تمام سرخیاں ابھر آئیں۔ ہماری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ آیا جیل مجرم کی اصلاح کر سکتی ہے۔ میں خود محسوس کر رہا تھا۔ ہم ایک باسی روٹی کھا رہے ہیں۔ رضوی نے جب یہ کہا۔

”یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے۔

”تو مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا جیسے رضوی نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے۔ کریم ملی ہوئی کوفی کی پیالی ختم کر کے رضوی نے اپنی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ منٹو صاحب آدمی جرم کیوں کرتا ہے۔ جرم کیا ہے، سزا کیا ہے۔ میں نے اس کے متعلق بہت غور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر جرم کے پیچھے ایک ہسٹری ہوتی ہے۔ زندگی کے واقعات کا ایک بہت بڑا ٹکرا ہوتا ہے، بہت اچھا ہوا، ٹیڑھا میڑھا۔ میں نفسیات کا ماہر نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خود جرم سرزد نہیں ہوتا۔ حالات سے ہوتا ہے“!

نصیر نے کہا۔

”آپ نے بالکل درست کہا ہے۔“

رضوی نے ایک اور کافی کا آرڈر دیا اور نصیر سے کہا۔

”مجھے معلوم نہیں جناب، لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اپنے مشاہدات کی بنا پر عرض کیا ہے ورنہ یہ موضوع بہت پرانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو۔ فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ تھا۔ شاید کسی اور ملک کا ہو۔ آپ تو خیر جانتے ہی ہوں گے، جرم اور سزا پر اس نے کافی لکھا ہے۔ مجھے اس کی ایک تصنیف کے چند فقرے یاد ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”منٹو صاحب، غالباً آپ ہی کا ترجمہ تھا۔ کیا تھا؟۔ وہ سیڑھی اتار دو جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن میں سوچتا کہ وہ سیڑھی کون سی ہے۔ اس کے کتنے زینے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ سیڑھی ضرور ہے، اس کے زینے بھی ہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بے شمار ہیں، ان کو گننا، ان کا شمار کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے

”منٹو صاحب، حکومتیں رائے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد و شمار کرتی ہیں، حکومتیں ہر قسم کی شماری کرتی ہیں۔ اس سیڑھی کے زینوں کی شماری کیوں نہیں کرتیں۔ کیا یہ ان کا فرض نہیں۔ میں نے قتل کیا۔ لیکن اس سیڑھی کے کتنے زینے طے کر کے کیا۔ حکومت نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیا، اس لیے کہ قتل کا ثبوت اس کے پاس نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ

میں اپنے گناہ کی معافی کس سے مانگوں۔ وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اب میرے نزدیک نہیں ہیں، ان میں اور مجھ میں ایک برس کا فاصلہ ہے۔ میں اس فاصلے سے معافی مانگوں یا ان حالات سے جو بہت دور کھڑے میرا منہ چڑا رہے ہیں۔“

ہم سب رضوی کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ بظاہر تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کی گفتگو سے ثابت ہوا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ میں نے اس سے کچھ کہا ہوتا، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ اسی لیے میں اس کی گفتگو میں حائل نہ ہوا۔ اس کے لیے نئی کوفی آگئی تھی۔ اسے بنا کر اس نے چند گھونٹ پیے اور کہنا شروع کیا۔

”خدا معلوم میں کیا بکواس کر رہا ہوں، لیکن میرے ذہن میں ہر وقت ایک آدمی کا خیال رہا ہے۔ اس آدمی کا، اس بھنگی کا جو ہمارے ساتھ جیل میں تھا۔ اس کو ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔“

نصیر نے حیرت سے پوچھا۔ صرف ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر؟“

رضوی نے تخ آلود جواب دیا۔

”جی ہاں۔ صرف ساڑھے تین آنے کی چوری پر۔ اور جو اسکو نصیب نہ ہوئے، کیونکہ وہ پکڑا گیا۔ یہ رقم خزانے میں محفوظ ہے اور پھگو بھنگی غیر محفوظ ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ پھر پکڑا جائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا پیٹ پھر اسے مجبور کرے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے گُو مُوت صاف کرانے والے اس کی تنخواہ نہ دے سکیں، کیونکہ ہو سکتا ہے اس کو تنخواہ دینے والوں کو اپنی تنخواہ نہ ملے۔ یہ ہو سکتا ہے کا سلسلہ منٹو صاحب عجیب و غریب ہے۔ سچ پوچھئے تو دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ رضوی سے قتل بھی ہو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ تھوڑے عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ نصیر نے اس سے کہا۔

”آپ پھگو بھنگی کی بات کر رہے تھے۔؟“

رضوی نے اپنی چھدری مونچھوں پر سے کوفی رومال کے ساتھ پونچھی۔

”جی ہاں۔ پھگو بھنگی چور ہونے کے باوجود، یعنی وہ قانون کی نظروں میں چور تھا۔ لیکن ہماری نظروں میں پورا ایماندار۔ خدا کی قسم میں نے آج تک اس جیسا ایماندار آدمی نہیں دیکھا، ساڑھے تین آنے اس نے ضرور چرائے تھے، اس نے صاف صاف عدالت میں کہہ دیا تھا کہ یہ چوری میں نے ضرور کی ہے، میں اپنے حق میں کوئی گواہی پیش نہیں کرنا چاہتا۔ میں دو دن کا بھوکا تھا، مجبوراً مجھے کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اس سے مجھے پانچ روپے لینے تھے۔ دو مہینوں کی تنخواہ۔ حضور اس کا بھی کچھ قصور نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کے کئی گاہکوں نے اس کی سلائی کے پیسے مارے ہوئے تھے۔ حضور، میں پہلے بھی چوریاں کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے دس روپے ایک میم صاحب کے بٹوے سے نکال لیے تھے۔ مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ پھر میں نے ڈپٹی صاحب کے گھر سے چاندی کا ایک کھلونا چرایا تھا اس لیے کہ میرے بچے کو نمونیا تھا اور ڈاکٹر بہت فیس مانگتا تھا۔ حضور میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ میں چور نہیں ہوں۔ کچھ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے چوریاں کرنی پڑیں۔ اور حالات ہی ایسے تھے کہ میں پکڑا گیا۔ مجھ سے بڑے بڑے چور موجود ہیں لیکن وہ ابھی تک پکڑے نہیں گئے۔ حضور، اب میرا بچہ بھی نہیں ہے، بیوی بھی نہیں ہے۔ لیکن حضور افسوس ہے کہ میرا پیٹ ہے، یہ مر جائے تو سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے، حضور مجھے معاف کر دو۔ لیکن حضور نے اس کو معاف نہ کیا اور عادی چور سمجھ کر اس کو ایک برس قید بامشقت کی سزا دے دی۔“

رضوی بڑے بے تکلف انداز میں بول رہا تھا۔ اس میں کوئی تصنع، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آتے اور بہتے چلتے جا رہے ہیں۔ میں بالکل خاموش تھا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پی رہا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ نصیر پھر اس سے مخاطب ہوا۔

”آپ پھگو کی ایمانداری کی بات کر رہے تھے؟“

”جی ہاں۔“

رضوی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی۔

”میں نہیں جانتا قانون کی نگاہوں میں ایمانداری کیا چیز ہے، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے بڑی ایمانداری سے قتل کیا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ پھگو بھنگی نے بھی بڑی ایمانداری سے ساڑھے تین آنے چرائے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایماندار کو صرف اچھی باتوں سے کیوں منسوب کرتے ہیں، اور سچ پوچھیے تو میں اب یہ سوچنے لگا ہوں کہ اچھائی اور برائی ہے کیا۔ ایک چیز آپ کے لیے اچھی ہو سکتی ہے، میرے لیے بری۔ ایک سوسائٹی میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، دوسری میں بری۔ ہمارے مسلمانوں میں بغلوں کے بال بڑھانا گناہ سمجھا جاتا ہے، لیکن سکھ اس سے بے نیاز ہیں۔ اگر یہ بال بڑھانا واقعی گناہ ہے تو خدا ان کو سزا کیوں نہیں دیتا اگر کوئی خدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لیے تم یہ انسانوں کے قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھا دو۔ اور آسمانوں پر اپنی جیلیں خود بناؤ۔ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیونکہ اور کچھ نہیں تو کم از کم خدا تو ہو۔“

رضوی کی اس تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی خامکاری ہی اصل میں تاثر کا باعث بھی۔ وہ باتیں کرتا تھا تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ہم سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے دل ہی دل میں گفتگو کر رہا ہے۔ اس کی بیڑی بجھ گئی تھی، غالباً اس میں تمباکو کی گانٹھ اٹکی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ اس نے پانچ چھ مرتبہ اس کو سلگانے کی کوشش کی۔ جب نہ سلگی تو پھینک دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”منٹو صاحب، پھگو مجھے اپنی تمام زندگی یاد رہے گا۔ آپ کو بتاؤں گا تو آپ ضرور کہیں گے کہ جذباتیت ہے، لیکن خدا کی قسم جذباتیت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ وہ میرا دوست نہیں تھا۔ نہیں وہ میرا دوست تھا کیونکہ اس نے ہر بار خود کو ایسا ہی ثابت کیا۔“

رضوی نے جیب میں سے دوسری بیڑی نکالی مگر وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا۔

”شکریہ۔ منٹو صاحب، معاف کیجیے گا، میں نے اتنی بکواس کی ہے حالانکہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی اس لیے کہ ماشاء اللہ آپ۔“

میں نے اس کی بات کاٹی۔

”رضوی صاحب، میں اس وقت منٹو نہیں ہوں صرف سعادت حسن ہوں۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے۔ میں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔“

رضوی مسکرایا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ آپ کی بڑی نوازش ہے۔ پھر وہ نصیر سے مخاطب ہوا۔

”میں کیا کہہ رہا تھا۔“

میں نے اس سے کہا۔

”آپ پھگو کی ایمانداری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے۔“

”جی ہاں“

یہ کہہ کر اس نے میرا پیش کیا ہوا سگریٹ سلگایا۔

”منٹو صاحب، قانون کی نظروں میں وہ عادی چور تھا۔ بیڑیوں کے لیے ایک دفعہ اس نے آٹھ آنے چرائے تھے۔ بڑی مشکلوں سے، دیوار پھاند کر جب اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ قریب قریب ایک برس تک وہ اس کا علاج کراتا رہا تھا، مگر جب میرا ہم الزام دوست جر۔ جی بیس بیڑیاں اسکی معرفت بھیجتا تو وہ سب کی سب پولیس کی نظریں بچا کر میرے حوالے کر دیتا۔ وعدہ معاف گواہوں پر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے، لیکن جر۔ جی نے پھگو کو اپنا دوست اور ہمراز بنا لیا تھا۔ وہ بھنگی تھا، لیکن اس کی فطرت بہت خوشبودار تھا۔ شروع شروع میں جب وہ بر۔ جی کی بیڑیاں لے کر میری پاس آیا تو میں نے سوچا، اس حرامزادے چور نے ضرور ان میں سے کچھ غائب کر لی ہوں گی، مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ قطعی طور پر ایماندار تھا۔ بیڑی کے لیے اس نے آٹھ آنے چراتے ہوئے اپنے ٹخنے کی ہڈی تڑوالی تھی مگر یہاں جیل میں اس کو تمباکو کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا، وہ جر۔ جی کی دی ہوئی بیڑیاں تمام و کمال میرے حوالے کر دیتا تھا، جیسے وہ امانت ہوں۔ پھر وہ کچھ دیر ہچکچانے کے بعد مجھ سے کہتا، بابو۔ جی، ایک بیڑی تو دیجیے اور میں اس کو صرف ایک بیڑی دیتا۔ انسان بھی کتنا کمینہ ہے“!

رضوی نے کچھ اس انداز سے اپنا سر جھٹکا جیسے وہ اپنے آپ سے متنفر ہے۔

”جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھ پر بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وعدہ معاف گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جر۔ جی البتہ میرے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ اس کو رشوت دے دلا کر بہت آسانیاں مہیا تھیں۔ کپڑے مل جاتے تھے۔ صابن مل جاتا تھا۔ بیڑیاں مل جاتی تھیں۔ جیل کے اندر رشوت دینے کے لیے روپے بھی مل جاتے تھے۔ پھگو بھنگی کی سزا ختم ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے، جب اس نے آخری بار جر۔ جی کی دی ہوئی بیڑیاں مجھے لا کر دیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جیل سے نکلنے پر خوش نہیں تھا۔ میں نے جب اس کو مبارکباد دی تو اس نے کہا۔

”بابو۔ جی، میں پھر یہاں آجاؤں گا۔ بھوکے انسان کو چوری کرنی ہی پڑتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک بھوکے انسان کو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے۔ بابو۔ جی آپ بڑے اچھے ہیں، مجھے اتنی بیڑیاں دیتے رہے۔ خدا کرے آپ کے سارے دوست بری ہو جائیں۔ جر۔ جی بابو آپ کو بہت چاہتے ہیں۔“

نصیر نے یہ سن کر غالباً اپنے آپ سے کہا۔

”اور اس کو صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں سزا ملی تھی۔“

رضوی نے گرم کافی کا ایک گھونٹ پی کر ٹھنڈے انداز میں کہا۔

”جی ہاں صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں۔ اور وہ بھی خزانے میں جمع ہیں۔ خدا معلوم ان سے کس پیٹ کی آگ بجھے گی“!

رضوی نے کافی کا ایک اور گھونٹ پیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ہاں منٹو صاحب، اس کی رہائی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے دس روپوں کی اشد ضرورت تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے یہ روپے ایک سلسلے میں سنتری کو رشوت کے طور پر دینے تھے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کاغذ پنسل مہیا کر کے جرجی کو ایک خط لکھا تھا اور پھگو کے ذریعہ سے اس تک بھجوایا تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح دس روپے بھیج دے۔ پھگو ان پڑھ تھا۔ شام کو وہ مجھ سے ملا۔ جرجی کا رقعہ اس نے مجھے دیا۔ اس میں دس روپے کا سرخ پاکستانی نوٹ قید تھا۔ میں نے رقعہ پڑھا۔ یہ لکھا تھا۔ رضوی پیارے دس روپے بھیج تو رہا ہوں، مگر ایک عادی چور کے ہاتھ، خدا کرے تمہیں مل جائیں۔ کیونکہ یہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر جا رہا ہے۔“

میں نے یہ تحریر پڑھی تو پھگو بھنگی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کو ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر اس نے دس روپے چرائے ہوتے تو ساڑھے تین آنے فی برس کے حساب سے اس کو کیا سزا ملتی؟“

یہ کہہ کر رضوی نے کافی کا آخری گھونٹ پیا اور رخصت مانگے بغیر کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔ 26 جولائی 1950ء

سبز سینڈل

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوسبز سینڈل

”آپ سے اب میرا نباہ بہت مشکل ہے۔ مجھے طلاق دے دیجیے“

”لاحول ولا کیسی باتیں منہ سے نکال رہی ہو۔ تم میں سب سے بڑا عیب ایک یہی ہے کہ وقتاً فوقتاً تم پر ایسے دورے پڑتے ہیں کہ ہوش و حواس کھو دیتی ہو“

”آپ تو بڑے ہوش و حواس کے مالک ہیں۔ چوبیس گھنٹے شراب کے نشے میں دُھت رہتے ہیں“

”میں شراب ضرور پیتا ہوں لیکن تمہاری طرح بِن پیے مدہوش نہیں رہتا۔ واہی تباہی نہیں بکتا۔“

”گویا میں واہی تباہی بک رہی تھی“

”یہ میں نے کب کہا۔ لیکن تم خود سوچو یہ طلاق لینا کیا ہے“

”بس میں لینا چاہتی ہوں۔ جس خاوند کو اپنی بیوی کا ذرا بھر خیال نہ ہو اس سے طلاق نہ مانگی جائے تو اور کیا مانگا جائے؟“

”تم طلاق کے علاوہ اور سب چیزیں مجھ سے مانگ سکتی ہو“

”آپ مجھے دے ہی کیا سکتے ہیں؟“

”یہ ایک نیا الزام تم نے مجھ پر دھرا۔ تمہاری ایسی خوش نصیب عورت اور کون ہو گی۔ گھر میں۔“

”لعنت ہے ایسی خوش نصیبی پر“

”اس پر لعنت نہ بھیجو۔ معلوم نہیں تم کس بات پر ناراض ہو۔ لیکن میں تمھیں خلوصِ دل سے یقین دلاتا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے“

”خدا مجھے اس محبت سے پناہ دے“

”اچھا۔ چھوڑو ان جلی کٹی باتوں کو۔ بتاؤ، بچیاں اسکول چلی گئیں“

”آپ کو ان سے کیا دلچسپی ہے۔ اسکول جائیں یا جہنم میں۔ میں تو دُعا کرتی ہوں مر جائیں۔“

”کسی روز تمہاری زبان مجھے جلتے چمٹے سے باہر کھینچنا پڑے گی۔ شرم نہیں آتی کہ اپنی اولاد کے لیے ایسی بکواس کر رہی ہو۔“

”میں نے کہا میرے ساتھ ایسی بد کلامی نہ کیجیے۔ شرم آپ کو آنی چاہیے کہ ایک عورت سے جو آپ کی بیوی ہے اور جس کا احترام آپ پر فرض ہے اس سے آپ بازاری انداز میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اصل میں یہ سب آپ کی بُری سُوسائٹی کا قصور ہے“

”اور جو تمہارے دماغ میں خلل ہے اُس کی وجہ کیا ہے؟“

”آپ اور کون؟“

”قصوروار ہمیشہ مجھے ہی ٹھہراتی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تمھیں کیا ہو گیا ہے۔“

”مجھے کیا ہوا ہے۔ جو ہوا ہے صرف آپ کو ہوا ہے۔ ہر وقت میرے سر پر سوار رہتے ہیں۔ میں آپ سے کہہ چکی ہوں۔ مجھے طلاق دے دیجیے۔“

”کیا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھ سے اُکتا گئی ہو“

”تھو ہے آپ پر۔ مجھے کوئی ایسی ویسی عورت سمجھا ہے۔“

”طلاق لے کر کیا کرو گی؟“

”جہاں سینگ سمائے چلی جاؤں گی۔ محنت مزدوری کروں گی اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالوں گی“

”تم محنت مزدوری کیسے کر سکو گی۔ صبح نو بجے اٹھتی ہو۔ ناشتہ کر کے پھر لیٹ جاتی ہو۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کم از کم تین گھنٹے سوتی ہو۔ خود کو دھوکا تو نہ دو“

”جی ہاں، میں تو ہر وقت سوئی رہتی ہوں۔ آپ ہیں کہ ہر وقت جاگتے رہتے ہیں۔ ابھی کل آپ کے دفتر سے ایک آدمی آیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے افسر صاحب کو جب دیکھو میز پر سر رکھے انٹا غفیل ہوتے ہیں“

”وہ کون تھا اُلو کا پٹھا“

”آپ اپنی زُبان درست کیجیے“

”بھئی مجھے تاؤ آ گیا تھا۔ غصے میں آدمی کو اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا“

”مجھے آپ پر اتنا غصہ آ رہا ہے لیکن میں نے ایسا کوئی غیر مہذب لفظ استعمال نہیں کیا۔ انسان کو ہمیشہ دائرۂ تہذیب میں رہنا چاہیے۔ مگر یہ سب آپ کی بری سوسائٹی کی وجہ ہے جو آپ ایسے الفاظ اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں“

”میں تم سے پوچھتا ہوں، میری بُری سُوسائٹی کون سی ہے“

”وہ کون ہے جو خود کو کپڑے کا بہت بڑا تاجر کہتا ہے۔ اُس کے کپڑے آپ نے کبھی ملاحظہ کیے۔ بڑے ادنیٰ قسم کے اور وہ بھی میلے چکٹ۔ یوں تو وہ بی اے ہے، لیکن اس کی عادات و اطوار اٹھنا بیٹھنا ایسا واہیات ہے کہ گھن آتی ہے“

”وہ مرد مجذوب ہے“

”یہ کیا بلا ہوتی ہے“

”تم نہیں سمجھو گی۔ مجھے بیکار وقت ضائع کرنا پڑے گا“

”آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے۔ ہمیشہ ایک بات کرنے پر بھی ضائع ہو جاتا ہے“

”تم اصل میں کہنا کیا چاہتی ہو“

”میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ جو کہنا تھا، کہہ دیا۔ بس مجھے طلاق دے دیجیے تاکہ میری جان چھٹے۔ ان ہر روز کے جھگڑوں سے میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے“

”تمہاری زندگی تو محبت سے بھرے ہوئے ایک کلمے سے بھی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اس کا کیا علاج ہے؟“

”اس کا علاج صرف طلاق ہے“

”تو بُلاؤ کسی مولوی کو۔ تمہاری اگر یہی خواہش ہے تو میں انکار نہیں کروں گا۔“

”میں کہاں سے بُلاؤں مولوی کو“

”بھئی طلاق تم چاہتی ہو۔ اگر مجھے لینا ہوتی تو میں دس مولوی چٹکیوں میں پیدا کر لیتا۔ مجھ سے تم کو اس سلسلے میں کسی مدد کی توقع نہیں کرنی چاہیے تم جانو، تمہارا کام جانے“

”آپ میرے لیے اتنا کام بھی نہیں کر سکتے“

”جی نہیں“

”آپ تو اب تک یہی کہتے آئے ہیں کہ آپ کو مجھ سے بے پناہ محبت ہے“

”درست ہے۔ رفاقت کی حد تک۔ مفارقت کے لیے نہیں“

”تو میں کیا کروں“

”جو جی میں آئے کرو۔ اور دیکھو مجھے اب زیادہ تنگ نہ کرو۔ کسی مولوی کو بلوا لو۔ وہ طلاق نامہ لکھ دے میں اس پر دستخط کر دُوں گا۔“

”حق مہر کا کیا ہو گا؟“

”طلاق چونکہ تم خود طلب کر رہی ہو اس لیے اس کے مطالبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“

”واہ جی واہ“

“تمہارے بھائی بیرسٹر ہیں۔ ان کو خط لکھ کر پوچھ لو۔ جب عورت طلاق چاہے تو وہ اپنا حق مہر طلب نہیں کر سکتی”

“تو ایسا کیجیے کہ آپ مجھے طلاق دے دیں”

“میں ایسی بے وقوفی کیوں کرنے لگا۔ مجھے تو تم سے پیار ہے”

“آپ کے یہ چونچلے مجھے پسند نہیں۔ پیار ہوتا تو مجھ سے ایسا سلوک کرتے؟”

“تم سے میں نے کیا بدسلوکی کی ہے”

“جیسے آپ جانتے ہی نہیں۔ ابھی پرسوں کی بات ہے آپ نے میری نئی ساڑھی سے اپنے جوتے صاف کیے”

“خدا کی قسم نہیں”

“تو اور کیا فرشتوں نے کیے تھے”

“میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ کی تینوں بچیاں اپنے جوتوں کی گرد آپ کی ساڑھی سے جھاڑ رہی تھیں۔ میں نے ان کو ڈانٹا بھی تھا”

“وہ ایسی بدتمیز نہیں ہیں”

“کافی بدتمیز ہیں۔ اس لیے کہ تم ان کو صحیح تربیت نہیں دیتی ہو۔ اسکول سے واپس آئیں تو اُن سے پوچھ لینا کہ وہ ساڑھی کا ناجائز استعمال کر رہی تھیں یا کہ نہیں”

“مجھے ان سے کچھ پوچھنا نہیں ہے”

“تمہارے دماغ کو آج معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔ اصل وجہ معلوم ہو جائے تو میں کوئی نتیجہ قائم کر سکوں۔”

“آپ نتیجے قائم کرتے رہیں گے لیکن میں اپنا نتیجہ قائم کر چکی ہوں۔ بس آپ مجھے طلاق دے دیجیے۔ جس خاوند کو اپنی بیوی کا مطلقاً خیال نہ ہو اس کے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ”

“میں نے ہمیشہ تمہارا خیال رکھا ہے”

“آپ کو معلوم ہے کل عید ہے”

“معلوم ہے۔ کیوں؟۔ کل ہی تو میں بچیوں کے لیے بُوٹ لایا ہوں اور ان کے فراکوں کے لیے میں نے آج سے آٹھ روز پہلے تمھیں ساٹھ روپے دیے تھے”

“یہ روپے دے کر آپ نے بڑا میرے باپ پر احسان کیا”

“احسان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات کیا ہے”

“بات یہ ہے کہ ساٹھ روپے کم تھے۔ تین بچوں کے لیے آرگنڈی چالیس روپے میں آئی۔ فی فراک درزی نے سات روپے لیے۔ بتایئے آپ نے مجھ پر اور ان بچیوں پر کون سا کرم کیا”

“باقی روپے تم نے ادا کر دیے”

“ادا نہ کرتی تو فراک سلتے کیسے؟”

“تو یہ روپے مجھ سے ابھی لے لو۔ میرا خیال ہے ساری ناراضی اسی بات کی تھی”

“میں کہتی ہوں کل عید ہے”

“ہاں ہاں! مجھے معلوم ہے۔ میں دو مُرغ منگوا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ سویاں بھی۔ تم نے بھی کچھ انتظام کیا؟”

“میں خاک انتظام کروں گی”

“کیوں؟”

“میں چاہتی تھی کل سبز ساڑھی پہنوں۔ سبز سینڈل کے لیے آرڈر دے آئی تھی، آپ سے کئی مرتبہ کہا کہ جایئے اور چینیوں کی دکان سے دریافت کیجیے کہ وہ سینڈل ابھی تک بنے ہیں یا نہیں۔ مگر آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہو تو آپ وہاں جاتے”

“لاحول ولا۔ یہ جھگڑا سارا سبز سینڈل کا تھا؟۔ جناب آپ کے یہ سینڈل میں پرسوں ہی لے آیا تھا۔ آپ کی الماری میں پڑے ہیں۔ آپ تو سارا وقت سوئی رہتی ہیں۔ آپ نے الماری کھولی ہی نہیں ہو گی۔”

سعادت حسن منٹو ۱۱۔ اگست ۱۹۵۴ء

سجدہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوسجدہ

گلاس پر بوتل جھکی تو ایک دم حمید کی طبیعت پر بوجھ سا پڑ گیا۔ ملک جو اسکے سامنے تیسرا پیگ پی رہا تھا فوراً تاڑ گیا کہ حمید کے اندر روحانی کشمکش پیدا ہو گئی ہے۔ وہ حمید کو سات برس سے جانتا تھا، اور ان سات برسوں میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے جن کا مطلب اس کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا تھا، لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے لاغر دوست کے سینے پر کوئی بوجھ ہے ایسا بوجھ جس کا احساس شراب پینے کے دوران میں کبھی کبھی حمید کے اندر یوں پیدا ہوتا ہے جیسے بے دھیان بیٹھے ہوئے آدمی کی پسلیوں میں کوئی زور سے ٹہوکا دے دے۔ حمید بڑا خوش باش انسان تھا۔ ہنسی مذاق کا عادی، حاضر جواب، بذلہ سنج اس میں بہت سی خوبیاں تھیں جو زیادہ نزدیک آکر اسکے دوست ملک نے معلوم کی تھیں۔ مثال کے طور پر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بے حد مخلص تھا، اس قدر مخلص کہ بعض اوقات اس کا اخلاص ملک کے لیے عہد عتیق کا رومانی افسانہ بن جاتا تھا۔ حمید کے کردار میں ایک عجیب وغریب بات جو ملک نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ناآشنا تھیں۔ یوں تو ملک بھی رونے کے معاملے میں بڑا بخیل تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب کبھی رونے کا موقع آئے گا وہ ضرور رو دے گا۔ اس پر غم افزا باتیں اثر ضرور کرتی تھیں مگر وہ اس اثر کو اتنی دیر اپنے دماغ پر بیٹھنے کی اجازت دیتا تھا جتنی دیر گھوڑا اپنے تنتے ہوئے جسم پر مکھی کو۔ غموں سے دور رہنے والے اور ہر وقت ہنسی مذاق کے عادی حمید کی زندگی میں نہ جانے ایسا کون سا واقعہ الجھا ہوا تھا کہ وہ کبھی کبھی قبرستان کی طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ ایسے لمحات جب اس پر طاری ہوتے تو اس کا چہرہ ایسی رنگت اختیار کر لیتا تھا جو تین دن کی باسی شراب میں بے جان سوڈا گھولنے سے پیدا ہوتی ہے۔ سات برس کے دوران میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے مگر ملک نے آج تک اس سے ان کی وجہ دریافت نہ کی تھی۔ اس لیے نہیں کہ ان کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ ملک پرلے درجے کا سُست اور کاہل واقع ہوا تھا۔ اس خیال سے بھی وہ حمید کے ساتھ اس معاملے میں بات چیت نہیں کرتا تھا کہ ایک طول طویل کہانی اسے سننا پڑے گی اور اس کے چوتھے پیگ کا سارا سرور غارت ہو جائے گا۔ شراب پی کر لمبی چوڑی آپ بیتیاں سننا یا سنانا اس کے نزدیک بہت بڑی بدذوقی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کہانیاں سننے کے معاملے میں بہت ہی خام تھا۔ اسی خیال کی وجہ سے کہ وہ اطمینان سے حمید کی داستان نہیں سن سکے گا اس نے آج تک اُس سے اُن دوروں کی بابت دریافت نہیں کیا تھا۔ کرپارام نے حمید کے گلاس میں تیسرا پیگ ڈال کر بوتل میز پر رکھ دی اور ملک سے مخاطب ہوا

”ملک، اسے کیا ہو گیا ہے۔“

ملک خاموش رہا لیکن حمید مضطرب ہو گیا۔ اس کے اعصاب زور سے کانپ اٹھے۔ کرپارام کی طرف دیکھ کر اُس نے مسکرانے کی کوشش کی، اس میں جب ناکامی ہوئی تو اس کا اضطراب اور بھی زیادہ ہو گیا۔ حمید کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا اور اگر چھپانے کی کوشش کرتا تو اس کی وہی حالت ہوتی جو آندھی میں صرف ایک کپڑے میں لپٹی ہُوئی عورت کی ہوتی ہے۔ ملک نے اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور اس فضا کو جو کچھ عرصہ پہلے طرب افزا باتوں سے گونج رہی تھی اپنی بے محل ہنسی سے خوشگوار بنانے کے لیے اس نے کرپارام سے مخاطب ہو کر کہا۔

”کرپا۔ تم مان لو اسے اشوک کمار کا فلمی عشق ہو گیا ہے۔ بھئی یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کاسٹر آئل پی رہا ہے۔“

کرپارام، اشوک کمار کو اتنا ہی جانتا تھا جتنا کہ مہاراجہ اشوک اور اسکی مشہور آہنی لاٹھ کو۔ فلم اور تاریخ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ وہ انکے فوائد سے ضرور آگاہ تھا۔ کیونکہ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا۔

”مجھے اگر کبھی بے خوابی کا عارضہ لاحق ہو جائے تو میں یا تو فلم دیکھنا شروع کر دوں گا یا چکرورتی کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھنا شروع کر دوں گا۔“

وہ ہمیشہ حساب دان چکرورتی کو مورخ بنا کر اپنی مسرت کے لیے ایک بات پیدا کر لیا کرتا تھا۔ کرپارام چار پیگ پی چکا تھا۔ چار پیالہ پیگ، نشہ اس کے دماغ کی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا آنکھیں سکیڑ کر اس نے حمید کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ کیمرے کا فوکس کر رہا ہے۔

”تمہارا گلاس ابھی تک ویسے کا ویسا پڑا ہے۔“

حمید نے دردِ سر کے مریض کی سی شکل بنا کر کہا۔

”بس۔ اب مجھ سے زیادہ نہیں پی جائے گی۔“

”تم چُغد ہو۔ نہیں چُغد نہیں کچھ اور ہو۔ تمھیں پینا ہوگی۔ سمجھے، یہ گلاس اور اس بوتل میں جتنی پڑی ہے سب کی سب تمھیں پینا ہوگی۔ شراب سے جو انکار کرے وہ انسان نہیں حیوان ہے۔ حیوان بھی نہیں، اس لیے کہ حیوانوں کو اگر انسان بنا دیا جائے تو وہ بھی اس خوبصورت شے کو کبھی نہ چھوڑیں تم سُن رہے ہو ملک۔ ملک نے اگر یہ ساری شراب اس کے حلق میں نہ انڈیل دی تو میرا نام کرپارام نہیں گھسیٹارام آرٹسٹ ہے۔“

گھسیٹارام آرٹسٹ سے کرپارام کو سخت نفرت تھی صرف اس لیے کہ آرٹسٹ ہو کر اس کا نام گھسیٹارام تھا۔ ملک کا منہ سوڈا ملی وسکی سے بھرا ہوا تھا۔ کرپارام کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑا جس کے باعث اس کے منہ سے ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا۔

”کرپارام خدا کے لیے تم گھسیٹارام آرٹسٹ کا نام نہ لیا کرو۔ میری انتڑیوں میں ایک طوفان سا مچ جاتا ہے۔ لاحول ولا۔ میری پتلون کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ لو بھئی، حمید، اب تو تمھیں پینا ہی پڑے گی۔ کرپارام، گھسیٹارام بنے یا نہ بنے لیکن میں ضرور کرپارام بن جاؤں گا اگر تم نے یہ گلاس خالی نہ کیا۔ لو پیو۔ پی جاؤ۔ ارے میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔ یہ تمھارے چہرے پر یتامت کیسی برس رہی ہے۔ کرپارام اٹھو۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ زبردستی کرنا ہی پڑے گی۔“

کرپارام اور ملک دونوں اٹھے اور حمید کو زبردستی پلانے کی کوشش کرنے لگے۔ حمید کو روحانی کوفت تو ویسے ہی محسوس ہو رہی تھی، جب کرپارام اور ملک نے اس کو جھنجھوڑنا شروع کیا تو اس کو جسمانی اذّیت بھی پہنچی جس کے باعث وہ بے حد پریشان ہو گیا۔ اس کی پریشانی سے کرپارام اور ملک بہت محظوظ ہُوئے۔ چنانچہ انھوں نے ایک کھیل سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔ کرپارام نے گلاس پکڑ کر اس کے سر میں تھوڑی سی شراب ڈال دی۔ اور نائیوں کے انداز میں جب اس نے حمید کا سر سہلایا تو وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ اس کی آواز بھرّا گئی۔ اس کے سارے جسم میں تشنّج سا پیدا ہوا اور ایک دم کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے رونی اور مُردہ آواز میں کہا۔

”میں بیمار ہُوں۔ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔“

کرپارام اسے بہانہ سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنے کے لیے کوئی نیا طریقہ سوچنے ہی والا تھا کہ ملک نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے پرے ہٹا دیا۔

”کرپا، اس کی طبیعت واقعی خراب ہے۔ دیکھو تو رو رہا ہے۔“

کرپارام نے اپنی موٹی کمر جھکا کر غور سے دیکھا۔

”ارے۔ تم تو سچ مچ رو رہے ہو۔“

حمید کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، جس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

”کیا ہو گیا ہے تمھیں؟۔ خیر تو ہے؟“

”یہ تم رو کیوں رہے ہو؟“

”بھئی حد ہو گئی۔ ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔“

”کچھ سمجھ میں بھی تو آئے۔ کیا تکلیف ہے تمھیں؟“

ملک اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”بھئی مجھے معاف کر دو اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔“

حمید نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ جذبات کی شدت کے باعث اسکی قوتِ گویائی جواب دے گئی۔ تیسرے پیگ سے پہلے اسکے چہرے پر رونق تھی، اسکی باتیں سوڈے کے بُلبُلوں کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ تھیں مگر اب وہ باسی شراب کی طرح بے رونق تھا۔ وہ سکڑ سا گیا تھا۔ اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی بھیگی ہُوئی پتلون کی ہوتی ہے۔ کرسی پر وہ اس انداز سے بیٹھا تھا گویا وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔ اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو۔ ملک کو اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔

”حمید، لو اب خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ واللہ تمھارے آنسوؤں سے مجھے روحانی تکلیف ہو رہی ہے۔ مزا تو سب کِر کرا ہو ہی گیا تھا۔ مگر یوں تمھارے ایکا ایکی آنسو بہانے سے میں بہت مغموم ہو گیا ہوں۔ خدا جانے تمھیں کیا تکلیف ہے۔؟“

”کچھ نہیں، میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھے ایسی تکلیف ہو جایا کرتی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا۔

”اب میں اجازت چاہتا ہوں۔“

کرپارام بوتل میں بچی ہُوئی شراب کو دیکھتا رہااور ملک یہ ارادہ کرتا رہا کہ حمید سے آج پوچھ ہی لے کہ وقتاً فوقتاً اسے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں مگر وہ جا چکا تھا۔ حمید گھر پہنچا تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ کمرے میں چونکہ اس کے سوااور کوئی نہیں تھا اس لیے وہ رو بھی نہ سکتا تھا۔ اسکی آنسوؤں سے لبالب بھری ہُوئی آنکھوں کو کرسیاں اور میزیں نہیں چھلکا سکتی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس کوئی آدمی موجود ہو جس کے چھیڑنے سے وہ جی بھر کے رو سکے مگر ساتھ ہی اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ بالکل اکیلا ہو۔ ایک عجیب کشمکش اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دُور پڑا ہے۔ سامنے میز پر اس کی ایک پرانی تصویر چمکدار فریم میں جڑی رکھی تھی۔ حمید نے اداس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو سات برس اس تصویر اور اس کے درمیان تھان کی طرح کھلتے چلے گئے۔ ! ٹھیک سات برس پہلے برسات کے اِنہی دنوں میں رات کو وہ ریلوے رسٹوران میں ملک عبدالرحمن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اُس وقت کے حمید اور اِس وقت کے حمید میں کتنا فرق تھا۔ کتنا فرق تھا۔ حمید نے یہ فرق اس شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنی تصویر میں ایک ایسا آدمی نظر آیا جس سے ملے اس کو ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ اس نے تصویر کو غور دیکھا تو اُس کے دل میں یہ تلخ احساس پیدا ہوا کہ انسانیت کے لحاظ سے وہ اس کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ تصویر مں ہ جو حمید ہے اس حمید کے مقابلے میں بدرجہا افضل و برتر ہے جو کرسی پر سر نیوڑھائے بیٹھا ہے۔ چنانچہ اس احساس نے اُسکے دل میں حسد بھی پیدا کر دیا۔ ایک سجدے۔ صرف ایک سجدے نے اسکا ستیاناس کر دیا تھا۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے کا ذکر ہے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ رات کو ریلوے رسٹوران میں اپنے دوست ملک عبدالرحمن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حمید کو یہ شرارت سوجھی تھی کہ بغیر بُو کی شراب جن کا ایک پورا پیگ لیمونیڈ میں ملا کر اسکو پلا دے اور جب وہ پی جائے تو آہستہ سے اسکے کان میں کہے۔

”مولانا ایک پورا پیگ آپ کے ثوابوں بھرے پیٹ میں داخل ہو چکا ہے۔“

بیرے سے مل ملا کر اس نے اس بات کا انتظام کر دیا تھا کہ آرڈر دینے پر لیمونیڈ کی بوتل میں جن کا ایک پیگ ڈال کر ملک کو دے دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا کہ حمید نے وِسکی پی اور ملک بظاہر بے خبری کی حالت میں جن کا پورا پیگ چڑھا گیا۔ حمید چونکہ تین پیگ پینے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے پوچھا۔

”ملک صاحب، آپ یوں بیکار نہ بیٹھیے میں تیسرا پیگ بڑی عیاشی سے پیا کرتا ہوں۔ آپ ایک اور لیمونیڈ منگوا لیجیے۔“

ملک رضامند ہو گیا، چنانچہ ایک اور لیمونیڈ آ گیا۔ اس بیرے نے اپنی طرف سے جن کا ایک پیگ ملا دیا تھا۔ ملک سے حمید کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حمید اس شرارت سے باز رہتا مگر اُن دنوں وہ اس قدر زندہ دل اور شرارت پسند تھا کہ جب بیرا ملک کے لیے لیمونیڈ کا دوسرا گلاس لایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو وہ اس خیال سے بہت خوش ہُوا کہ ایک کے بجائے دو پیگ ملک کے پیٹ کے اندر چلے جائیں گے۔ ملک آہستہ آہستہ لیمونیڈ ملی جِن پیتا رہا اور حمید دل ہی دل میں اس کبوتر کی طرح گٹگٹاتا رہا جس کے پاس ایک کبوتری آ بیٹھی ہو۔ اس نے جلدی جلدی اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور ملک سے پوچھا۔

”اور پئیں گے آپ۔“

ملک نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا

”نہیں۔“

پھر اُس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔

”اگر تمھیں اور پینا ہے تو پیو، میں جاؤنگا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔“

اس مختصر گفتگو کے بعد دونوں اٹھے۔ حمید نے دوسرے کمرے میں جا کر بل ادا کیا۔ جب وہ رسٹوران سے باہر نکلے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حمید کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ وہ ملک پر اپنی شرارت واضح کر دے مگر اچھے موقع کی تلاش میں کافی وقت گزر گیا۔ ملک بالکل خاموش تھا اور حمید کے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ رہی تھی۔ بے شمار ننھی ننھی خوبصورت اور شوخ و شنگ باتیں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو ہو کر بُجھ رہی تھیں۔ وہ ملک کی خاموشی سے پریشان ہو رہا تھا اور جب اُس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا تو آہستہ آہستہ اُس کی طبیعت پر ایک افسردگی سی طاری ہو گئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اسکی شرارت اب دُم کٹی گلہری بنکر رہ گئی ہے۔ دیر تک دونوں بالکل خاموش چلتے رہے۔ جب کمپنی باغ آیا تو ملک ایک بنچ پر مفکرانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ چند لمحات ایسی خاموشی میں گزرے کہ حمید کے دل میں وہاں سے اُٹھ بھاگنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر اس وقت زیادہ دیر تک دبے رہنے کے باعث اس کی تمام تیزی اور طراری ماند پڑ چکی تھی۔ ملک بنچ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”حمید تم نے آج مجھے روحانی تکلیف پہنچائی ہے۔ تمھیں یہ شرارت نہیں کرنی چاہیے تھے۔“

اس آواز میں اور درد پیدا ہو گیا۔

”تم نہیں جانتے کہ تمہاری اس شرارت سے مجھے کس قدر روحانی تکلیف پہنچی ہے۔ اللہ تمھیں معاف کرے۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور حمید نے اپنے آپ کو بڑی شدت گناہگار محسوس کرنے لگا۔ معافی مانگنے کا خیال اس کو آیا تھا مگر ملک باغ سے نکل کر باہر سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ ملک کے چلنے جانے کے بعد حمید گناہ اور ثواب کے چکر میں پھنس گیا۔ شراب کے حرام ہونے کے متعلق اس نے جتنی باتیں لوگوں سے سنی تھیں سب کی سب اس کے کانوں میں بھنبھنانے لگیں۔

”شراب اخلاق بگاڑ دیتی ہے۔ شراب، خانہ خراب ہے، شراب پی کر آدمی بے ادب اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ شراب اسی لیے حرام ہے۔ شراب صحت کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ اس کے پینے سے پھیپھڑے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ شراب۔“

شراب، شراب کی ایک لامتناہی گردان حمید کے دماغ میں شروع ہو گئی۔ اور اس کی تمام بُرائیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ گئیں۔

”سب سے بڑی بُرائی تو یہ ہے۔“

حمید نے محسوس کیا۔

”کہ میں نے بے ضرر شرارت سمجھ کر ایک شریف آدمی کو دھوکے سے شراب پلا دی ہے۔ ممکن ہے وہ پکا نمازی اور پرہیز گار ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی میری ہے اور سارا گناہ میرے ہی سر ہو گا مگر اُسے جو روحانی تکلیف پہنچی ہے اس کا کیا ہو گا؟ واللہ باللہ میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اُسے تکلیف پہنچے۔ میں اس سے معافی مانگ لونگا اور۔ لیکن اس سے معافی مانگ کر بھی تو میرا گناہ ہلکا نہیں ہو گا۔ ایک میں نے شراب پی اُوپر سے اُسکو دھوکا دیکر پلائی۔“

وسکی کا نشہ اس کے دماغ میں جمائیاں لینے لگا جس سے اس کا احساس گناہ گھناؤنی شکل اختیار کر گیا۔

”مجھے معافی مانگنی چاہیے۔ مجھے شراب چھوڑ دینی چاہیے۔ مجھے گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنی چاہیے۔“

اس کو شراب شروع کیے صرف دو برس ہوئے تھے۔ ابھی تک وہ اُس کا عادی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اُس نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دوسری باتوں کے ساتھ اس پر بھی غور کیا۔

”میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤنگا۔ یہ کوئی ضروری چیز نہیں۔ میں اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔ دنیا کہتی ہے۔ دنیا کہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ منہ سے لگی ہوئی یہ چُھٹ ہی نہیں سکتی۔ میں اسے بالکل چھوڑ دوں گا۔ میں اس خیال کو غلط ثابت کر دونگا۔“

یہ سوچتے ہوئے حمید نے خود کو ایک ہیرو محسوس کیا۔ پھر ایک دم اُس کے دماغ میں خدا کا خیال آیا جس نے اسے تباہی سے بچا لیا تھا۔

”مجھے شکر بجالانا چاہیے کہ میرے سینے میں نور پیدا ہو گیا ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس کھائی میں پڑا رہتا۔“

وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ اوپر آسمان پر گدلے بالوں میں چاند صابن کے جھاگ لگے گالوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہوا خُنک تھی۔ فضا بالکل خاموش تھی۔ حمید پر خدا کے رعب اور شراب نوشی سے بچ جانے کے احساس نے رقت طاری کر دی۔ اس نے شکرانے کا سجدہ کرنا چاہا۔ وہیں پتھریلی زمین پر اس نے گھٹنے ٹیک کر اپنا ماتھا رگڑنا چاہا اس خیال سے کہ اسے کوئی دیکھ لے گا وہ کچھ دیر کے لیے ٹھٹک گیا مگر فوراً ہی یہ سوچ کر کہ یُوں خدا کی نگاہوں میں اس کی وقعت بڑھ جائے گی وہ ڈبکی لگانے کے انداز میں جُھکا اور اپنی پیشانی گلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھریلے فرش کے ساتھ جوڑ دی۔ جب وہ اُٹھا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑا آدمی محسوس کیا۔ اس نے جب آس پاس کی اونچی دیواروں کو دیکھا تو وہ اسے اپنے قد کے مقابلے میں بہت پست معلوم ہوئیں۔ اس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد اسی کمرے میں جہاں اب حمید بیٹھا اپنی سات برس کی پرانی تصویر پر رشک کھا رہا تھا۔ اس کا دوست ملک آیا۔ اندر آتے ہی اس نے اپنی جیب سے بلیک اینڈ وائٹ کا ادھا نکالا اور زور سے میز پر رکھ کر کہا

”حمید آؤ۔ آج پئیں اور خوب پئیں۔ یہ ختم ہو جائے گی تو اور لائیں گے۔“

حمید اس قدر متحیر ہُوا کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ملک نے دوسری جیب سے سوڈے کی بوتل نکالی، تپائی پر سے گلاس اٹھا کر اس میں شراب اُنڈیلی۔ سوڈے کی بوتل انگوٹھے سے کھولی، اور حمید کی متحیر آنکھوں کے سامنے وہ دو پیگ غٹاغٹ پی گیا۔ حمید نے تتلاتے ہوئے کہا۔

”لیکن۔ لیکن۔ اُس روز تم نے مجھے اِتنا بُرا بھلا کہا تھا۔“

ملک نے ایک قہقہہ بلند کیا۔

”تم نے مجھ سے شرارت کی۔ میں نے بھی اس کے جواب میں تم سے شرارتاً کچھ کہہ دیا۔ مگر بھئی ایمان کی بات ہے جو مزہ اس روز جن کے دو پیگ پینے میں آیا ہے زندگی بھر کبھی نہیں آئے گا۔ لو اَب چھوڑو اس قصے کو۔ وِسکی پیو۔ جِن وِن بکواس ہے۔ شراب پینی ہو تو وِسکی پینی چاہیے۔“

یہ سُن کر حمید کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ جو سجدہ اس نے گلی میں کیا تھا ٹھنڈے فرش سے نکل کر اس کی پیشانی پر چپک گیا ہے۔ یہ سجدہ بھوت کی طرح حمید کی زندگی سے چمٹ گیا تھا۔ اس نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے پھر پینا شروع کیا۔ مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہُوا۔ اُن سات برسوں میں جو اس کی پرانی تصویر اور اس کے درمیان کھلے ہُوئے تھے یہ ایک سجدہ بے شمار مرتبہ حمید کو اس کی اپنی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کر چکا تھا۔ اس کی خودی، اس کی تخلیقی قوت، اُس کی زندگی کی وہ حرارت جس سے حمید اپنے ماحول کو گرما کے رکھنا چاہتا تھا اس سجدے نے قریب قریب سرد کر دی تھی۔ یہ سجدہ اس کی زندگی میں ایک ایسی خراب بریک بن گئی تھی جو کبھی کبھی اپنے آپ اُس کے چلتے ہُوئے پہیوں کو ایک دھچکے کے ساتھ

ٹھہرادیتی تھی۔ سات برس کی پرانی تصویر اُس کے سامنے میز پر پڑی تھی۔ جب ساراواقعہ اس کے دماغ میں پوری تفصیل کے ساتھ دہرایاجاچکا تھاتواس کے اندر ایک ناقابل بیان اضطراب پیدا ہوگیا۔ وہ ایسامحسوس کرنے لگاجیسے اُسکوتے ہونے والی ہے۔ وہ گھبر اکر اُٹھااور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپناماتھار گڑناشروع کر دیاجیسے وہ اس سجدے کانشان مٹانا چاہتاہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تووہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر جُھکاکر اور کاندھے ڈھیلے کرکے اس نے تھکی ہُوئی آواز میں کہا۔

”اے خدا، میر اسجدہ مجھے واپس دیدے۔“

سراج

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوسراج

ناگپاڑہ پولیس چوکی کے اس طرف جو چھوٹاساباغ ہے۔ اس کے بالکل سامنے ایرانی کے ہوٹل کے باہر، بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر ڈھونڈو کھڑا تھا۔ دن ڈھلے، مقررہ وقت پر وہ یہاں آجاتااور صبح چار بجے تک اپنے دھندے میں مصروف رہتا۔ معلوم نہیں، اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر سب اسے ڈھونڈو کہتے تھے، اس لحاظ سے تو یہ بہت مناسب تھا کہ اس کا کام اپنے موکلوں کے لیے ان کی خواہش اور پسند کے مطابق ہر نسل اور ہر رنگ کی لڑکیاں ڈھونڈ تا تھا۔ یہ دھندہ وہ قریب قریب دس برس سے کر رہا تھا۔ اس دوران میں ہزاروں لڑکیاں اس کے ہاتھوں سے گزر چکی تھیں۔ ہر مذہب کی، ہر نسل کی، ہر مزاج کی۔ اس کا اڈہ شروع سے یہی رہا تھا۔ ناگپاڑہ پولیس چوکی کے اس طرف۔ باغ کے بالکل سامنے۔ ایرانی ہوٹل کے باہر بجلی کے کھمبے کے ساتھ۔ کھمبا اس کانشان بن گیا تھا۔ بلکہ مجھے تو وہ ڈھونڈو ہی معلوم ہو تا تھا۔ میں جب کبھی ادھر سے گزرتا اور میری نظر اس کھمبے پر پڑتی۔ جس پر جگہ جگہ چونے اور کتھے کی انگلیاں پونچھی گئی تھیں تو مجھے ایسا لگتا کہ ڈھونڈو کھڑا ہے اور کالے کانڈی اور سینکے لی سوپاری والا پان چبا رہا ہے۔ یہ کھمبا کافی اونچا تھا۔ ڈھونڈو بھی دراز قد تھا۔ کھمبے کے اوپر بجلی کے تاروں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ کوئی تار دور تک دوڑتا چلا گیا تھا اور دوسرے کھمبے کے تاروں کے الجھاؤ میں مدغم ہو گیا تھا۔ کوئی تار کسی بڈنگ میں اور کوئی کسی دکان میں چلا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کھمبے کی پہنچ دور دور تک ہے۔ وہ دوسرے کھمبوں سے مل کر گویا سارے شہر پر چھایا ہوا ہے۔ اس کھمبے کے ساتھ ٹیلیفون کے محکمے نے ایک بکس لگا رکھا تھا جس کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً تاروں کی درستی وغیرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ اکثر سوچتا تھا کہ ڈھونڈو بھی اسی قسم کا ایک بکس ہے جو لوگوں کی جنسی جانچ پڑتال کے لیے کھمبے کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کیونکہ اسے آس پاس کے علاقے کے علاوہ دور دور کے علاقوں کے ان تمام سیٹھوں کا پتا تھا جن کو وقفوں کے بعد یا ہمیشہ ہی اپنی جنسی خواہشات کے تنے ہوئے یا ڈھیلے تار درست کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اسے ان تمام چھوکریوں کا بھی پتا تھا جو اس دھندے میں تھیں۔ وہ ان کے جسم کے ہر خدوخال سے واقف تھا۔ ان کی ہر نبض سے آشنا تھا۔ کون کس مزاج کی ہے اور کس وقت اور کس گاہک کے لیے موزوں ہے۔ اس کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ لیکن ایک صرف اس کو سراج کے متعلق ابھی تک کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ ڈھونڈو کئی بار مجھ سے کہہ چکا تھا۔

”سالی کا مستک پھرے لا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا منٹو صاحب، کیسی چھوکری ہے۔ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولا۔ کبھی آگ، کبھی پانی۔ ہنس رہی ہے۔ قہقہے لگا رہی ہے۔ لیکن ایک دم رونا شروع کر دے گی۔ سالی کی کسی سے نہیں بنتی۔ بڑی جھگڑالو ہے۔ ہر پسنجر سے لڑتی ہے۔ سالی سے کئی بار کہہ چکا کہ دیکھ، اپنا مستک ٹھیک کر، ورنہ جان جہاں سے آئی ہے۔ انگ پر تیرے کوئی کپڑا نہیں۔ کھانے کو تیرے پاس ڈیڑھیا نہیں۔ مارا ماری اور دھاندلی سے تو میری جان کام نہیں چلے گا۔ پر وہ ایک تخم ہے۔ کسی کی سنتی ہی نہیں“

میں نے سراج کو ایک دو مرتبہ دیکھا ہے۔ بڑی دبلی پتلی لڑکی تھی مگر خوبصورت۔ اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے بیضوی چہرے پر صرف اپنی بڑائی جتانے کی خاطر چھائی ہوئی ہیں۔ میں نے جب اس کو پہلی مرتبہ کلیئر روڈ پر دیکھا تھا تو مجھے بڑی الجھن ہوئی تھی۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں سے کہوں کہ بھئی تم تھوڑی دیر کے لیے ذرا ایک طرف ہٹ جاؤ تاکہ میں سراج کو دیکھ سکوں۔ لیکن میری اس خواہش کے باوجود جو یقیناً میری آنکھوں نے اس کی آنکھیں تک پہنچا دی ہو گی، وہ اسی طرح اس کے سفید بیضوی چہرے پر چھائی رہیں۔ مختصر سی تھی، مگر اس اختصار کے باوجود بڑی جامع معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک صراحی ہے جس میں ایک حجم سے زیادہ پانی ملی ہوئی شراب بھرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نتیجے کے طور پر سیال چیز دباؤ کے باعث ادھر ادھر، تڑپ کر بہہ گئی ہے۔ میں نے پانی ملی ہوئی شراب اس لیے کہا ہے کہ اس میں تلخی تھی، وہ جو تیز و تند شراب کی ہوتی ہے، مگر ایسا لگتا تھا کسی دھوکے باز نے اس میں پانی ملا دیا ہے، تاکہ مقدار زیادہ ہو جائے۔ مگر سراج میں لسانیت کی جو مقدار تھی، ویسی کی ویسی موجود تھی اور اس جھنجھلاہٹ سے جو اس کے گھنے بالوں سے اس کی تیکھی ناک سے، اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اور اس کی انگلیوں سے، جو نقشہ نویسوں کی نوکیلی اور تیز تیز پنسلیں معلوم ہوتی تھیں، میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہر چیز سے ناراض ہے۔ ڈھونڈو سے۔ اس کھمبے سے جس کے ساتھ لگ کر وہ کھڑا رہتا تھا۔ ان گاہکوں سے جو اس کے لیے لائے جاتے تھے۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی جو اس کے سفید بیضوی چہرے پر قبضہ جمائے رکھتی تھیں۔ اس کی پتلی پتلی، نوکیلی انگلیاں جو نقشہ نویسوں کی پنسلوں کی طرح تیز تھیں۔ ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بھی ناراض ہے۔ شاید اس لیے کہ جو نقشہ سراج بنانا چاہتی تھی وہ نہیں بنا سکتی تھیں۔ یہ تو ایک افسنہ نگار کے تاثرات میں جو چھوٹے سے تل میں سنگِ اسود کی تمام سختیاں بیان کر سکتا ہے۔ آپ ڈھونڈو کی زبانی سراج کے متعلق سنیے اس نے مجھ سے ایک دن کہا۔

”منٹو صاحب۔ آج سالی نے پھر ٹنٹا کر دیا۔ وہ تو جانے کس دن کا ثواب کام آگیا اور آپ کی دعا سے یوں بھی ناگپاڑہ چوکی کے سب افسر مہربان ہیں، ورنہ کل ڈھونڈو اندر ہوتا۔ وہ دھمال مچائی کہ میں تو باپ رے باپ کہتا رہ گیا۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہوئی تھی؟“

”وہی جو ہوا کرتی ہے۔ میں نے لاکھ لعنت بھیجی اپنی ہشت پشت پر کہ حرامی جب تو اس چھوکری کو اچھی طرح جانتا ہے تو پھر کیوں انگلی لیتا ہے۔ کیوں اس کو نکال کر لاتا ہے۔ تیری ماں لگتی ہے یا بہن۔ میری تو کوئی عقل کام نہیں کرتی منٹو صاحب“!

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ ڈھونڈو نے کوفی ملی چائے پرچ میں انڈیلی اور سڑپ سڑپ پینے لگا۔

”اصل بات یہ ہے کہ سالی سے مجھے ہمدردی ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”کیوں؟“

ڈھونڈو نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔

”جانے کیوں۔ یہ سالا معلوم ہو جائے تو یہ روز کا ٹنٹا ختم نہ ہو۔“

پھر اس نے ایک دم پرچ میں پیالی اوندھی کر کے مجھ سے کہا۔

”آپ کو معلوم ہے۔ ابھی تک کنواری ہے۔“

یقین مانیے کہ میں ایک لحظے کے لیے چکرا گیا۔

”کنواری۔“

”آپ کی جان کی قسم“

میں نے جیسے اس کو اپنی بات پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا۔

”نہیں ڈھونڈو۔“

ڈھونڈو کو میرا یہ شک ناگوار معلوم ہوا۔

”میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا منٹو صاحب۔ سولہ آنے کنواری ہے۔ آپ مجھ سے شرط لگا لیجیے۔“

میں صرف اسی قدر کہہ سکا۔

”مگر ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔“

ڈھونڈو نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔

”ایسا کیوں ہونے کو نہیں سکتا۔ سراج جیسی چھوکری تو اس دھندے میں بھی رہ کر ساری عمر کنواری رہ سکتی ہے۔ سالی کسی کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی۔ مجھے اس کی ساری ہشٹری معلوم نہیں۔ اتنا جانتا ہوں۔ پنجابن ہے۔ لیمنگٹن روڈ پر میم صاحب کے پاس تھی۔ وہاں سے نکالی گئی کہ ہر پسینجر سے لڑاتی تھی۔ دو تین مہینے نکل گئے کہ مڈام کے پاس دس بیس اور چھوکریاں تھیں۔ پر منٹو صاحب کوئی کب تک کسے کھلاتا ہے۔ اس نے ایک دن تین کپڑوں میں نکال باہر کیا۔ یہاں سے فارس روڈ میں دوسری مڈام کے پاس پہنچی۔ وہاں بھی اس کا مستک ویسے کا ویسا تھا۔ ایک پسینجر کے کاٹ کھایا۔ دو تین مہینے یہاں گزرے۔ پر سالی کے مزاج میں تو جیسے آگ بھری ہوئی ہے اب کون اسے ٹھنڈا کرتا پھرے۔ پھر خدا آپ کا بھلا کرے، کھیت واڑی کے ایک ہوٹل میں رہی۔ پر یہاں بھی وہی دھمال۔ منیجر نے تنگ آکر چلتا کیا۔ کیا بتاؤں منٹو صاحب۔ نہ سالی کو کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا۔ کپڑوں میں جوئیں پڑی ہیں۔ سر دو دو مہینے سے نہیں دھویا۔ چرس کے ایک دو سگرٹ مل جائیں کہیں سے تو پھونک لیتی ہے۔ یا کسی ہوٹل سے دور کھڑی ہو کر، فلمی ریکارڈ سنتی رہتی ہے۔“

میرے لیے یہ تفصیل کافی تھی۔ اس کے رد عمل سے میں آپ کو آگاہ نہیں کرنا چاہتا کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے یہ نامناسب ہے۔ میں نے ڈھونڈو سے محض سلسلہ گفتگو قائم رکھنے کے لیے پوچھا۔

”تم اسے واپس کیوں نہیں بھیج دیتے۔ جب کہ اسے اس دھندے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کرایہ تم مجھ سے لے لو“!

ڈھونڈو کو یہ بات بھی ناگوار معلوم ہوئی۔

”منٹو صاحب کرائے سالے کی کیا بات ہے۔ میں نہیں دے سکتا۔“

میں نے ٹوہ لینی چاہی۔

”پھر اسے واپس کیوں نہیں بھیجتے؟“

ڈھونڈو کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ کان میں اڑے ہوئے سگرٹ کا ٹکڑہ نکال کر اس نے سلگایا اور دھوئیں کو ناک کے دونوں نتنھوں سے باہر پھینک کر اس نے صرف اتنا کہا۔

”میں نہیں چاہتا کہ وہ جائے۔“

میں نے سمجھا۔ الجھے ہوئے دھاگے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں آ گیا ہے۔

”کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟“

ڈھونڈو پر اس کا شدید ردعمل ہوا۔

”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں منٹو صاحب۔“

۔ پھر اس نے دونوں کان پکڑ کر کھینچے۔

”قرآن کی قسم میرے دل میں ایسا پلید خیال کبھی نہیں آیا۔ مجھے بس۔“

وہ رک گیا۔

”مجھے بس، کچھ اچھی لگتی ہے“!

میں نے بڑا صحیح سوال کیا۔

”کیوں؟“

ڈھونڈو نے بھی اس کا بڑا صحیح جواب دیا۔

”اس لیے۔ اس لیے کہ وہ دوسروں جیسی نہیں۔ باقی جتنی ہیں۔ سب پیس کی پیر ہیں۔ حرامی ہیں اول درجے کی۔ پر یہ جو ہے نا۔ کچھ عجیب و غریب ہے۔ نکال کے لاتا ہوں تو راضی ہو جاتی ہے۔ سودا ہو جاتا ہے۔ ٹیکسی یا وکٹوریہ میں بیٹھ جاتی ہے۔ اب منٹو صاحب، پیسنجر سالا موج شوق کے لیے آتا ہے۔ مال پانی خرچ کرتا ہے۔ ذرا دبا کے دیکھتا ہے۔ یا ویسے ہی ہاتھ لگا کے دیکھتا ہے۔ بس دھمال مچ جاتی ہے۔ مارا ماری شروع کر دیتی ہے۔ آدمی شریف ہو تو بھاگ جاتا ہے۔ پیے والا ہو۔ یا موالی ہو تو آفت۔ ہر موقعے پر مجھے پہنچنا پڑتا ہے۔ پیسے واپس کرنے پڑتے ہیں اور ہاتھ پیر الگ جوڑنے پڑتے ہیں۔ قسم قرآن کی صرف سراج کی خاطر۔ اور منٹو صاحب آپ کی جان کی قسم اسی سالی کی وجہ سے میرا دھندا آدھا رہ گیا ہے“

۔! میرے ذہن نے سراج کا جو عقبی منظر تیار کیا تھا، میں اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا ہے کہ جو کچھ ڈھونڈو نے مجھے بتایا وہ اس کے ساتھ ٹھیک طور پر جمتا نہیں تھا۔ میں نے ایک دن سوچا کہ ڈھونڈو کو بتائے بغیر سراج سے ملوں۔ وہ بائی کلہ اسٹیشن کے پاس ہی ایک نہایت واہیات جگہ میں رہتی تھی۔ جہاں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ آس پاس کا تمام فضلہ تھا۔ کارپوریشن نے یہاں غریبوں کے لیے جست کے بے شمار جھونپڑے بنا دیے تھے۔ میں یہاں ان بلند بام عمارتوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتا جو اس غلاظت گاہ سے تھوڑی دور ایستادہ تھیں۔ کیونکہ ان کا اس افسانے سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا نام ہی نشیب و فراز کا ہے۔ یا رفعتوں اور پستیوں کا۔ ڈھونڈو سے مجھے اس کے جھونپڑے کا اتا پتا معلوم تھا۔ میں وہاں گیا۔ اپنے خوش وضع کپڑوں کو اس ماحول سے چھپائے ہوئے۔ لیکن یہاں میری ذات متعلق نہیں۔ بہر حال میں وہاں گیا۔ جھونپڑے کے باہر ایک بکری بندھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو ممیائی۔ اندر سے ایک بڑھیا نکلی۔ جیسے پرانی داستانوں کے کرم خوردہ انبار سے کوئی کٹنی لاٹھی ٹیکتی ہوئی۔ میں لوٹنے ہی والا تھا کہ ٹاٹ کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے پردے کے پیچھے مجھے دو بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں۔ بالکل اسی طرح پھٹی ہوئی جس طرح وہ ٹاٹ کا پردہ تھا۔ پھر میں نے سراج کا سفیدی بیضوی چہرہ دیکھا اور مجھے ان غاصب آنکھوں پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں اندر کیا کام کر رہی تھی۔ فوراً سب چھوڑ چھاڑ کر باہر آئی۔ اس نے بڑھیا کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور مجھ سے کہا۔

”آپ یہاں کیسے آئے؟“

میں نے مختصراً کہا۔

”تم سے ملنا تھا۔“

سراج نے بھی اختصار ہی کے ساتھ کہا۔

”آؤ اندر“!

میں نے کہا۔

”نہیں میرے ساتھ چلیے۔“

اس پر کرم خوردہ داستانوں کی کرم خوردہ کٹنی بڑے دکاندارانہ انداز میں بولی۔

”دس روپے ہوں گے۔“

میں نے بٹوہ نکال کر دس روپے اس بڑھیا کو دے دیے اور سراج سے کہا۔

”آؤ سراج“

۔ !سراج کی بڑی بڑی آنکھوں نے ایک لحظے کے لیے میری نگاہوں کو راستہ دیا کہ اس کے چہرے کی سڑک پر چند قدم چل سکیں۔ میں ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ خوبصورت تھی۔ سکڑی ہوئی خوبصورتی۔ حنوط لگی خوبصورتی۔ صدیوں کی محفوظ و مامون اور مدفون کی ہوئی خوبصورتی۔ میں نے ایک لحظے کے لیے یوں محسوس کیا کہ میں مصر میں ہوں اور پرانے دفینوں کی کھدائی پر مامور کیا گیا ہوں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ سراج میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں ایک ہوٹل میں تھے۔ وہ میرے سامنے، اپنے غلیظ کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے بیضوی چہرے پر قبضہ مخالفانہ کیے تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے صرف سراج کے چہرے ہی کو نہیں، اس کے سارے وجود کو ڈھانپ لیا ہے کہ میں اس کے کسی روئیں کو بھی نہ دیکھ سکوں۔ بڑھیا نے جو قیمت بتائی تھی، میں نے ادا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے چالیس روپے اور سراج کو دیے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بھی اسی طرح لڑے جھگڑے، جس طرح وہ دوسروں کے ساتھ لڑتی جھگڑتی ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہ کی جس سے محبت اور خلوص کی بو آئے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی میں خائف تھا۔ وہ اتنی بڑی تھیں کہ میرے علاوہ میرے ارد گرد کی ساری دنیا بھی دیکھ سکتی تھیں۔ وہ خاموش تھی۔ واہیات طریقے پر اسے چھیڑنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے جسم اور ذہن میں غلط قسم کی حرارت ہو۔ چنانچہ نے وسکی کے چار پیگ پیے اور اس کو عام پیسنجروں کی طرح چھیڑا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میں نے ایک زبردست فضول حرکت کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بارود جو اس کے اندر بھری پڑی ہے، اس کو بھک سے اڑانے کے لیے یہ چنگاری کافی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ وہ کسی قدر پرسکون ہو گئی۔ اٹھ کر اس نے مجھے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے پھیلاؤ میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

”چرس کا ایک سگریٹ منگوا دو مجھے“!

”شراب پیو“!

”نہیں۔ چرس کا سگرٹ پیوں گی“!

میں نے اسے چرس کا سگرٹ منگوا دیا۔ اسے ٹھیٹ چرسیوں کے انداز میں پی کر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اب اپنا تسلط چھوڑ چکی تھیں۔ مگر اسی طرح جس طرح کوئی غاصب چھوڑتا ہے۔ اس کا چہرہ مجھے ایک اجڑی ہوئی، ایک برباد شدہ سلطنت نظر آیا۔ تاخت و تاراج ملک، اس کا ہر خط، ہر خال۔ ویرانی کی ایک لکیر تھی۔ مگر یہ ویرانی کیا تھی؟۔ کیوں تھی؟۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آبادیاں ہی ویرانوں کا باعث ہوتی ہیں۔ کیا وہ اسی قسم کی آبادی تھی جو شروع ہونے کے بعد کسی حملہ آور کے باعث ادھوری رہ گئی تھی اور آہستہ آہستہ اس کی دیواریں جو ابھی گز بھر بھی اوپر نہیں اٹھی تھیں کھنڈر بن گئی تھیں۔ میں چکر میں تھا، لیکن آپکو میں اس چکر میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں نے کیا سوچا، کیا نتیجہ برآمد کیا۔ اس سے آپ کو کیا مطلب۔ سراج کنواری تھا یا نہیں۔ میں اس کے متعلق جاننا نہیں چاہتا تھا۔ سلفے کے دھوئیں میں، البتہ اس کی محزون و مخمور آنکھوں میں مجھے ایک ایسی جھلک نظر آئی تھی جس کو میرا قلم بھی بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اس سے باتیں کرنا چاہیں مگر اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھ سے لڑے جھگڑے، مگر یہاں بھی اس نے مجھے ناامید کیا۔ میں اسے گھر چھوڑ آیا۔ ڈھونڈو کو جب میرے اس خفیہ سلسلے کا پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اس کے دوستانہ اور تاجرانہ جذبات دونوں بہت بری طرح مجروح ہوئے تھے۔ اس نے مجھے صفائی کا موقعہ نہ دیا۔ صرف اتنا کہا۔

”منٹو صاحب آپ سے یہ امید نہ تھی“!

اور یہ کہہ کر وہ کھمبے سے ہٹ کر ایک طرف چلا گیا۔ عجیب بات ہے کہ دوسرے روز شام کو وقتِ مقررہ پر وہ مجھے اپنے اڈے پر نظر نہ آیا۔ میں سمجھا شاید بیمار ہے۔ مگر اس سے اگلے روز بھی وہ موجود نہیں تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہاں سے میرا صبح شام آنا جانا ہوتا تھا۔ میں جب اس کھمبے کو دیکھتا۔ مجھے ڈھونڈو یاد آتا۔ میں بائی کلہ اسٹیشن کے پاس ہی جو واہیات جگہ تھی وہاں بھی گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے سراج کہاں ہے۔ مگر وہاں اب صرف وہ کرم خوردہ کٹنی رہتی تھی۔ میں نے اس سے سراج کے متعلق پوچھا تو وہ پوپلی مسکراہٹ میں لاکھوں برس کی پرانی جنسی کروٹیں بدل کر بولی۔

”وہ گئی۔ اور ہیں۔ منگواؤں“!

میں نے سوچا، اس کا کیا مطلب ہے۔ ڈھونڈو اور سراج دونوں غائب ہیں اور وہ بھی میری اس خفیہ ملاقات کے بعد۔ لیکن میں اس ملاقات کے متعلق اتنا متردو نہیں تھا۔ یہاں پھر میں اپنے خیالات آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا لیکن مجھے یہ حیرت ضرور تھی کہ وہ دونوں غائب کہاں ہو گئے۔ ان میں محبت کی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ڈھونڈو ایسی چیزوں سے بالاتر تھا۔ اس کی بیوی تھی بچے تھے اور وہ ان سے بے حد محبت کرتا تھا، پھر یہ سلسلہ کیا تھا کہ دونوں بیک وقت غائب تھے۔ میں نے سوچا۔ ہو سکتا ہے کہ اچانک ڈھونڈو کے دماغ میں یہ خیال آ گیا ہو کہ سراج کو واپس گھر جانا چاہیے۔ اس کے متعلق وہ پہلے فیصلہ نہیں کر سکا تھا، پر اب اچانک کر لیا ہو۔ غالباً ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک شام اچانک مجھے ڈھونڈو نظر آیا۔ اسی کھمبے کے ساتھ، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بڑی دیر کرنٹ فیل رہنے کے بعد ایک دم واپس آ گیا ہے اس کھمبے میں جان پڑ گئی۔ ٹیلی فون کے ڈبے میں بھی۔ چاروں طرف، اوپر تاروں کے پھیلے ہوئے جال، ایسا لگتا تھا آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میں اس کے پاس سے گزرا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں تھے۔ میں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ اس نے اپنے لیے کوفی ملی چائے اور میرے لیے سادہ چائے منگوائی اور پہلو بدل کر اس نے ایسی نشست قائم کی کہ جیسے وہ مجھے کوئی بہت بڑی بات سنانے والا ہے، مگر اس نے صرف اتنا کہا

”اور سناؤ منٹو صاحب۔“

””کیا سنائیں ڈھونڈو۔ بس گزر رہی ہے۔“

ڈھونڈو مسکرایا۔

”ٹھیک کہا آپ نے۔ بس گزر رہی ہے۔ اور گزرتی جائے گی۔ لیکن یہ سالا گزرتے رہنا یا گزرنا بھی عجیب چیز ہے۔ سچ پوچھیے تو اس دنیا میں ہر چیز عجیب ہے۔“

میں نے صرف اتنا کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو ڈھونڈو۔“

چائے آئی اور ہم دونوں نے پینا شروع کی۔ ڈھونڈو نے پرچ میں اپنی کوفی ملی چائے انڈیلی اور مجھ سے کہا۔

”منٹو صاحب۔ اس نے مجھے بتا دی تھی ساری بات۔ کہتی تھی، وہ سیٹھ جو تمہارا دوست ہے اس کا مستک پھرے لا ہے۔“

میں ہنسا۔

”کیوں؟“

”بولی۔ مجھے ہوٹل لے گیا۔ اتنے روپے دیے۔ پر سیٹھوں والی کوئی بات نہ کی۔“

میں اپنے اناڑی پن پر بہت خفیف ہوا۔

”وہ قصہ ہی کچھ ایسا تھا ڈھونڈو“

اب ڈھونڈو پیٹ بھر کے ہنسا۔

”میں جانتا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا کہ میں اس روز تم سے ناراض ہو گیا تھا۔“

اس کے اندازِ گفتگو میں ان جانے میں بے تکلفی پیدا ہو گئی۔

”پر اب وہ قصہ خلاص ہو گیا ہے“!

”کون سا قصہ؟“

”اس سالی کا سراج کا۔ اور کس کا؟“

میں نے پوچھا کیا۔

”کیا ہوا؟“

ڈھونڈو گنگنانے لگا۔

”جس روز آپ کے ساتھ گئی۔ واپس آ کر مجھ سے کہنے لگی۔ میرے پاس چالیس روپے ہیں۔ چلو مجھے لاہور لے چلو۔ میں بولا سالی، یہ ایک دم تیرے سر پر کیا بھوت سوار ہوا۔ بولی، نہیں۔ چل ڈھونڈو، تجھے میری قسم۔ اور منٹو صاحب، آپ جانتے ہیں۔ میں سالی کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا کہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں نے کہا چل۔ سو ٹکٹ کٹا کے ہم دونوں گاڑیوں میں سوار ہوئے۔ لاہور پہنچ کر ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ مجھ سے بولی۔ ڈھونڈو۔ ایک برخالا دے میں لے آیا۔ اسے پہن کر وہ لگی سڑک سڑک اور گلی گلی گھومنے۔ کئی دن گزر گئے۔ میں بولا۔ یہ بھی اچھی رہی ڈھونڈو۔ سراج سالی کا مستک تو پھرے لا تھا۔ سالا تیرا ابھی بھیجا پھر گیا جو تو اتنی دور اس کے ساتھ آ گیا۔ منٹو صاحب۔ آخر ایک دن اس نے ٹانگہ رکوایا اور

ایک آدمی کی طرف اشارہ کرکے مجھ سے کہنے لگی۔ ڈھونڈو۔ اس آدمی کو میرے پاس لے آ۔ میں چلتی ہوں واپس سرائے میں۔ میری عقل جواب دے گئی۔ میں ٹانگے سے اترا تو وہ غائب۔ اب میں اس آدمی کے پیچھے پیچھے۔ آپ کی دعا سے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے۔ میں آدمی آدمی کو پہچانتا ہوں۔ دو باتیں کیں اور میں تاڑ گیا کہ موج شوق کرنے والا ہے۔ میں بولا بمبئی کا خاص مال ہے۔ بولا، ابھی چلو۔ میں بولا۔ نہیں پہلے مال پانی دکھاؤ۔ اس نے اتنے سارٹ نوٹ دکھائے۔ میں دل میں بولا۔ چلو ڈھونڈو۔ یہاں بھی اپنا دھندا چلتا رہے۔ پر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ سراج سالی نے سارے لاہور میں اسی کو کیوں چُنا۔ میں نے کہا، چلتا ہے۔ ٹانگہ لیا اور سیدھا سرائے میں۔ سراج کو خبر کی۔ وہ بولی۔ ابھی ٹھہر۔ میں ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس آدمی کو جو اچھی شکل کا تھا اندر لے گیا۔ سراج کو دیکھتے ہی وہ سالا یوں بدکا جیسے گھوڑا۔ سراج نے اس کو پکڑ لیا۔“

ڈھونڈو نے یہاں پہنچ کر پیالی سے اپنی ٹھنڈی کوفی ملی چائے ایک ہی جرعے میں ختم کی اور بڑی سلگانے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

”سراج نے اس کو پکڑ لیا۔“

ڈھونڈو نے بلند آواز میں کہا۔

”ہاں جی۔ پکڑ لیا اس سالے کو۔ کہنے لگی۔ اب کہاں جاتا ہے۔ میرا گھر چھڑا کر تو مجھے اپنے ساتھ کس لیے لایا تھا۔ میں تجھ سے محبت کرتی تھی۔ تو نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ تُو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پر جب میں اپنا گھر بار، اپنا ماں باپ چھوڑ کر تیرے ساتھ بھاگ نکلی اور امرتسر سے ہم دونوں یہاں آئے۔ اسی سرائے میں آکر ٹھہرے تو رات ہی رات تو بھاگ گیا۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر۔ کس لیے لایا گیا تو مجھے یہاں۔ کس لیے بھگایا تھا تو نے مجھے۔ میں ہر چیز کے لیے تیار تھی۔ پر تو میری ساری تیاریاں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آ۔ اب میں نے تمہیں بلایا ہے۔ میری محبت ویسی کی ویسی قائم ہے۔ آ۔ اور منٹو صاحب، وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس سالے کے آنسو ٹپکنے لگے۔ رو رو کر معافیاں مانگنے لگا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں ڈر گیا تھا۔ میں اب کبھی تم سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔ قسمیں کھاتا رہا۔ جانے کیا بکتا رہا۔ سراج نے مجھے اشارہ کیا۔ میں باہر چلا گیا۔ صبح ہوئی تو میں باہر کھاٹ پر سو رہا تھا۔ سراج نے مجھے جگایا اور کہا۔ چلو ڈھونڈو۔ میں بولا۔ کہاں؟۔ بولی، واپس بمبئی۔ میں بولا۔ وہ سالا کہاں ہے۔ سراج نے کہا۔ سو رہا ہے۔ میں اس پر اپنا بُرخا ڈال آئی ہوں۔“

ڈھونڈو نے اپنے لیے دوسری کوفی ملی چائے کا آرڈر دیا تو سراج اندر داخل ہوئی۔ اس کا سفید بیضوی چہرہ نکھرا ہوا تھا اور اس پر اس کی بڑی بڑی آنکھیں دو گرے ہوئے سگنل معلوم ہوتی تھیں۔

سرکنڈوں کے پیچھے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوسرکنڈوں کے پیچھے

کون سا شہر تھا، اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ کو معلوم کرنے اور مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جگہ جو اس کہانی سے متعلق ہے، پشاور کے مضافات میں تھی۔ سرحد کے قریب۔ اور جہاں وہ عورت تھی، اس کا گھر جھونپڑا نما تھا۔ سرکنڈوں کے پیچھے۔ گھنی باڑھ تھی، جس کے پیچھے اس عورت کا مکان تھا، کچی مٹی کا بنا ہوا، چونکہ یہ باڑھ سے کچھ فاصلے پر تھا، اس لیے سرکنڈوں کے پیچھے چھپ سا گیا تھا کہ باہر کچی سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ سرکنڈے بالکل سوکھے ہوئے تھے مگر وہ کچھ اس طرح زمین میں گڑے ہوئے تھے کہ ایک دبیز پردہ بن گئے تھے۔ معلوم نہیں اس عورت نے خود وہاں پیوست کیے تھے یا پہلے ہی سے موجود تھے۔ بہر حال، کہنا یہ ہے کہ وہ آہنی قسم کے پردہ پوش تھے۔ مکان کہہ لیجئے یا مٹی کا جھونپڑا، صرف چھوٹی چھوٹی تین کوٹھڑیاں تھیں۔ مگر صاف ستھری۔ سامان مختصر تھا مگر اچھا۔ پچھلے کمرے میں ایک بہت بڑا نواڑی پلنگ تھا۔ اس کے ساتھ ایک طاقچہ تھا جس میں سرسوں کے تیل کا دیا رات بھر جلتا رہتا تھا۔ مگر یہ طاقچہ بھی صاف ستھرا رہتا تھا۔ اور وہ دیا بھی جس میں ہر روز نیا تیل اور بتی ڈالی جاتی تھی۔ اب میں آپ کو اس عورت کا نام بتادوں جو اس مختصر سے مکان میں جو سرکنڈوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اپنی جوان بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی۔ ایک یتیم لڑکی تھی جس کو اس نے بچپن سے گود لے کر پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی ناجائز لڑکی تھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ اس کی سگی بیٹی تھی۔ حقیقت جو کچھ بھی ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ خود بخود کوئی نہ کوئی رائے قائم کر لیجئے گا۔ دیکھیے، میں آپ کو اس عورت کا نام بتانا بھول گیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس کا نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیجیے، سکینہ، مہتاب، گلشن یا کوئی اور۔ آخر نام میں کیا رکھا ہے لیکن آپ کی سہولت کی خاطر میں اسے سردار کہوں گا۔ یہ سردار، ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت تھی۔ اس کے سرخ و سفید گالوں پر گو کسی قدر جھریاں پڑ گئی تھیں، مگر پھر بھی وہ اپنی عمر سے کئی برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ مگر ہمیں اس کے گالوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بیٹی، معلوم نہیں وہ اس کی بیٹی تھی یا نہیں، شباب کا بڑا دلکش نمونہ تھی۔ اس کے خدوخال میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ وہ فاحشہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی ماں اس سے پیشہ کراتی تھی اور خوب دولت کما رہی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لڑکی کو جس کا نام پھر آپ کی سہولت کی خاطر نواب رکھے دیتا ہوں، کو اس پیشے سے نفرت نہیں تھی۔ اصل میں اس نے آبادی

سے دور ایک ایسے مقام پر پرورش پائی تھی کہ اس کو صحیح ازدواجی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب سردار نے اس سے پہلا مرد بستر پر۔ نواڑی پلنگ پر متعارف کروایا تو غالباً اس نے یہ سمجھا کہ تمام لڑکیوں کی جوانی کا آغاز کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کسبیانہ زندگی سے مانوس ہوگئی تھی اور وہ مرد جو دور دور سے چل کر اس کے پاس آتے تھے اور اس کے ساتھ اس بڑے نواڑی پلنگ پر لیٹتے تھے، اس نے سمجھا تھا کہ یہی اس کی زندگی کا منتہٰی ہے۔ یوں تو وہ ہر لحاظ سے ایک فاحشہ عورت تھی، ان معنوں میں جن میں ہماری شریف اور مطہر عورتیں ایسی عورتوں کو دیکھتی ہیں، مگر سچ پوچھیے تو اس امر کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ اسکے متعلق غور بھی کیسے کر سکتی تھی جب کہ اس کو اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس کے جسم میں خلوص تھا۔ وہ ہر مرد کو جو اس کے پاس ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کرکے آتا تھا، اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے۔ اور وہ اس مرد کی ہر آسائش اس کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی۔ وہ اس کی کوئی ننھی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو شہر کے لوگوں کے تکلفات کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ قطعاً نہیں جانتی تھی کہ جو مرد اس کے پاس آتے ہیں، صبح سویرے اپنے دانت برش کے ساتھ صاف کرنے کے عادی ہیں اور آنکھیں کھول کر سب سے پہلے بستر میں چائے کی پیالی پیتے ہیں، پھر رفع حاجت کے لیے جاتے ہیں، مگر اس نے آہستہ آہستہ بڑے الہڑ طریقے پر ان مردوں کی عادات سے کچھ واقفیت حاصل کر لی تھی۔ پر اسے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ سب مرد ایک طرح کے نہیں ہوتے تھے۔ کوئی صبح سویرے اٹھ کر سگریٹ مانگتا تھا، کوئی چائے اور بعض ایسے بھی ہوتے جو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ کچھ ساری رات جاگتے رہتے اور صبح موٹر میں سوار ہو کر بھاگ جاتے تھے۔ سردار بے فکر تھی۔ اس کو اپنی بیٹی پر، یا جو کچھ بھی وہ تھی، پورا اعتماد تھا کہ وہ اپنے گاہکوں کو سنبھال سکتی ہے، اس لیے وہ افیم کی ایک گولی کھا کر کھاٹ پر سوئی رہتی تھی۔ کبھی کبھار جب اس کی ضرورت پڑتی۔ مثال کے طور پر جب کسی گاہک کی طبیعت زیادہ شراب پینے کے باعث یکدم خراب ہوئے تو وہ غنودگی کے عالم میں اٹھ کر نواب کو ہدایات دے دیتی تھی کہ اس کو اچار کھلا دے یا کوشش کرے کہ وہ نمک ملا گرم گرم پانی پلا کر قے کرادے اور بعد میں تھپکیاں دے کر سلا دے۔ سردار اس معاملے میں بڑی محتاط تھی کہ جونہی گاہک آتا، وہ اس سے نواب کی فیس پہلے وصول کر کے اپنے نیفے میں محفوظ کر لیتی تھی اور اپنے مخصوص انداز میں دعائیں دے کر کہ تم آرام سے جھولے جھولے، افیم کی ایک گولی ڈبیا میں سے نکال کر منہ میں ڈال کر سو جاتی۔ جو روپیہ آتا، اس کی مالک سردار تھی۔ لیکن جو تحفے تحائف وصول ہوتے، وہ نواب ہی کے پاس رہتے تھے۔ چونکہ اس کے پاس آنے والے لوگ دولت مند ہوتے، اس لیے وہ بڑھیا کپڑا پہنتی اور قسم قسم کے پھل اور مٹھائیاں کھاتی تھی۔ وہ خوش تھی۔ مٹی سے لپے پتے اس مکان میں جو صرف تین چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا۔ وہ اپنی دانست کے مطابق بڑی دلچسپ اور خوشگوار زندگی بسر کر رہی تھی۔ ایک فوجی افسر نے اسے گراموفون اور بہت سے ریکارڈ لا دیے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ ان کو بجا بجا کر فلمی گانے سنتی اور ان کی نقل اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اس کے گلے میں کوئی رس نہیں تھا۔ مگر شاید وہ اس سے بے خبر تھی۔ سچ پوچھیے تو اس کو کسی بات کی خبر بھی نہیں تھی اور نہ اس کو اس بات کی خواہش تھی کہ وہ کسی چیز سے باخبر ہو۔ جس راستے پر وہ ڈال دی گئی تھی، اس کو اس نے قبول کر لیا تھا۔ بڑی بے خبری کے عالم میں۔ سرکنڈوں کے اس پار کی دنیا کیسی ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی تھی سوائے اس کہ ایک کچی سڑک ہے جس پر ہر دوسرے تیسرے دن ایک موٹر دھول اڑاتی ہوئی آتی ہے اور رک جاتی ہے۔ ہارن بجتا ہے۔ اس کی ماں یا جو کوئی بھی وہ تھی، کھٹیا سے اٹھتی ہے اور سرکنڈوں کے پاس جا کر موٹر والے سے کہتی ہے کہ موٹر ذرا دور کھڑی کر کے اندر آجائے۔ اور وہ اندر آجاتا ہے اور نواڑی پلنگ پر اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاں آنے جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یہی پانچ چھ ہوں گے مگر یہ پانچ چھ مستقل گاہک تھے اور سردار نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ان کا باہم تصادم نہ ہو۔ بڑی ہوشیار عورت تھی۔ وہ ہر گاہک کے لیے خاص دن مقرر کر دیتی، اور ایسے سلیقے سے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ضرورت کے وقت وہ اس کا بھی انتظام کرتی رہتی کہ نواب ماں نہ بن جائے۔ جن حالات میں نواب اپنی زندگی گزار رہی تھی، ان میں اس کا ماں بن جانا یقینی تھا۔ مگر سردار دو ڈھائی برس سے بڑی کامیابی کے ساتھ اس قدرتی خطرے سے نبٹ رہی تھی۔ سرکنڈوں کے پیچھے یہ سلسلہ دو ڈھائی برس سے بڑے ہموار طریقے پر چل رہا تھا۔ پولیس والوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ بس صرف وہی لوگ جانتے تھے جو وہاں آتے تھے۔ یا پھر سردار اور اس کی بیٹی نواب، یا جو کوئی بھی وہ تھی۔ سرکنڈوں کے پیچھے، ایک دن مٹی کے اس مکان میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ایک بہت بڑی موٹر جو غالباً ڈوج تھی وہاں آ کے رکی۔ ہارن بجا۔ سردار باہر آئی تو اس نے دیکھا کوئی اجنبی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اجنبی نے بھی اس سے کچھ نہ کہا۔ موٹر دور کھڑی کر کے وہ اترا اور سیدھا ان کے گھر میں گھس گیا جیسے برسوں کا آنے جانے والا ہو۔ سردار بہت سٹپٹائی، لیکن دروازے کی دہلیز پر نواب نے اس اجنبی کا بڑی پیاری مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا اور اسے اس کمرے میں لے گئی جس میں نواڑی پلنگ تھا۔ دونوں اس پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ سردار آگئی۔ ہوشیار عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی کسی دولت مند گھرانے کا آدمی ہے۔ خوش شکل ہے، صحت مند ہے۔ اس نے اندر کوٹھڑی میں داخل ہو کر سلام کیا اور پوچھا۔

”آپکو ادھر کا راستہ کس نے بتایا؟“

اجنبی مسکرایا اور بڑے پیار سے نواب کے گوشت بھرے گالوں میں اپنی انگلی چبھو کر کہا۔

”اس نے؟“

نواب تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ایک ادا کے ساتھ کہا۔

”ہائیں۔ میں تو کبھی تم سے ملی بھی نہیں؟“

اجنبی کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔

”ہم تو کئی بار تم سے مل چکے ہیں۔“

نواب نے پوچھا۔

”کہاں۔ کب؟“

حیرت کے عالم میں اس کا چھوٹا سا منہ کچھ اس طور پر وا ہوا کہ اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا موجب ہو گیا۔ اجنبی نے اس کا گدگدا ہاتھ پکڑ لیا اور سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔ اپنی ماں سے پوچھو۔“

نواب نے بڑے بھول پن کے ساتھ اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ شخص اس سے کب اور کہاں ملا تھا۔ سردار سارا معاملہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ جو اس کے یہاں آتے ہیں، ان میں سے کسی نے اس کے ساتھ نواب کا ذکر کیا ہو گا اور سارا اتا پتا بتا دیا ہو گا چنانچہ اس نے نواب سے کہا۔

”میں بتا دوں گی تمہیں۔“

اور یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ کھٹیا پر بیٹھ کر اس نے ڈبیا میں سے افیم کی گولی نکالی اور لیٹ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ آدمی اچھا ہے گڑبڑ نہیں کرے گا۔ وثوق سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اغلب یہی ہے کہ اجنبی جس کا نام ہیبت خان تھا اور ضلع ہزارہ کا بہت بڑا رئیس تھا، نواب کے الہڑپن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے وقت سردار سے کہا کہ آئندہ نواب کے پاس اور کوئی نہ آیا کرے۔ سردار ہوشیار عورت تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا۔

”خان صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا آپ اتنا روپیہ دے سکیں گے کہ۔“

ہیبت خان نے سردار کی بات کاٹ کر جیب میں ہاتھ اور سو سو کے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اور نواب کے قدموں میں پھینک دی۔ پھر اس نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی انگلی سے نکالی اور نواب کو پہنا کر تیزی سے سرکنڈوں کے اس پار چلا گیا۔ نواب نے نوٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس دیر تک اپنی سجی ہوئی انگلی کو دیکھتی رہی جس پر کافی بڑے ہیرے سے رنگ رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی اور دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ چونکی اور سرکنڈوں کے پاس آئی، مگر اب گرد و غبار کے سوا سڑک پر کچھ نہ تھا۔ سردار نوٹوں کی گڈی اٹھا کر انھیں گن چکی تھی۔ ایک نوٹ اور ہوتا تو پورے دو ہزار تھے۔ مگر اس کو اس کا افسوس نہیں تھا۔ سارے نوٹ اس نے اپنی گھیرے دار شلوے کے نیفے میں بڑی صفائی سے اڑسے اور نواب کو چھوڑ کر اپنی کھٹیا کی طرف بڑھی اور ڈبیا میں سے افیم کی ایک بڑی گولی نکال کر اس نے منہ میں ڈالی اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی اور دیر تک سوتی رہی۔ نواب بہت خوش تھی۔ بار بار اپنی اس انگلی کو دیکھتی تھی جس پر ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ تین چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا ایک پرانا گاہک آیا جس سے سردار نے کہہ دیا کہ پولیس کا خطرہ ہے، اس لیے اس نے یہ دھندہ بند کر دیا ہے۔ یہ گاہک جو خاصا دولت مند تھا، بے نیل و مرام واپس چلا گیا۔ سردار کو ہیبت خان نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے افیم کھا کر پینک کے عالم میں سوچا تھا کہ اگر آمدن اتنی ہی رہے جتنی کہ پہلے تھی اور آدمی صرف ایک ہو تو بہت اچھا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقیوں کو آہستہ آہستہ یہ کہہ کر ٹرخا دے گی کہ پولیس والے اس کے پیچھے ہیں اور یہ نہیں دیکھ سکتی کہ ان کی عزت خطرے میں پڑے۔ ہیبت خان ایک ہفتے کے بعد نمودار ہوا۔ اس دوران میں سردار دو گاہکوں کو منع کر چکی تھی کہ وہ اب ادھر کا رخ نہ کریں۔ وہ اسی شان سے آیا جس شان سے پہلے روز آیا تھا۔ آتے ہی اس نے نواب کو اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا۔ سردار نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ نواب اسے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ہیبت خان اسے اس کوٹھڑی میں لے گیا جہاں نواڑی پلنگ تھا۔ اب کے سردار اندر نہ آئی اور اپنی کھٹیا پر افیم کی گولی کھا کر اونگھتی رہی۔ ہیبت خان بہت محظوظ ہوا۔ اس کو نواب کا الہڑپن اور بھی زیادہ پسند آیا۔ وہ پیشہ ور رنڈیوں کے چلتروں سے قطعاً ناواقف تھی۔ اس میں وہ گھریلو پن بھی نہیں تھا جو عام عورتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جو خود اس کی اپنی تھی۔ دوسروں سے مختلف۔ وہ بستر میں اس کے ساتھ اس طرح لیٹتی تھی، جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ لیٹتا ہے۔ اس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس کی ناک کے نتھنوں میں انگلیاں ڈالتا ہے، اس کے بال نوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سو جاتا ہے۔ ہیبت خان کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے لیے عورت کی یہ قسم بالکل نرالی، دلچسپ اور فرحت بخش تھی۔ وہ اب ہفتے میں دو بار آنے لگا تھا۔ نواب اس کے لیے ایک بے پناہ کشش بن گئی تھی۔ سردار خوش تھی کہ اس کے نیفے میں اڑسنے کے لیے کافی نوٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن نواب اپنے الہڑپن کے باوجود بعض اوقات سوچتی تھی کہ ہیبت خان ڈرا ڈرا سا کیوں رہتا ہے۔ اگر کچی سڑک پر سے، سرکنڈوں کے اس پار کوئی لاری یا موٹر گزرتی ہے تو وہ کیوں سہم جاتا ہے۔ کیوں اس سے الگ ہو کر باہر نکل جاتا ہے اور چھپ چھپ کر دیکھتا ہے کہ کون تھا۔ ایک رات بارہ بجے کے قریب سڑک پر سے کوئی لاری گزری۔ ہیبت خان اور نواب دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے سو رہے تھے کہ ایک دم ہیبت خان بڑے زور سے کانپا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نواب کی نیند بڑی ہلکی تھی۔ وہ کانپا تو وہ سر سے پیر تک یوں لرزی جیسے اس کے اندر زلزلہ آ گیا ہے۔ چیخ کر اس نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

ہیبت خان اب کسی قدر سنبھل چکا تھا۔ اس نے خود کو اور زیادہ سنبھال کر اس سے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں۔ میں شاید خواب میں ڈر گیا تھا۔“

لاری کی آواز دور سے رات کی خاموشی میں ابھی تک آرہی تھی۔ نواب نے اس سے کہا۔

”نہیں خان۔ کوئی اور بات ہے۔ جب بھی کوئی موٹر یا لاری سڑک پر سے گزرتی ہے، تمہاری یہی حالت ہوتی ہے۔“

ہیبت خان کی شاید یہ دکھتی رگ تھی جس پر نواب نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنا مردانہ وقار قائم رکھنے کے لیے بڑے تیز لہجے میں کہا۔

”بکتی ہو تم۔ موٹروں اور لاریوں سے ڈرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

نواب کا دل بہت نازک تھا۔ ہیبت خان کے تیز لہجے سے اس کو ٹھیس لگی اور اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ ہیبت خان نے جب اس کو چپ کرایا تو وہ اپنی زندگی کے ایک لطیف ترین خط سے آشنا ہوا اور اس کا جسم نواب کے جسم سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ ہیبت خان اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ خوبصورت تھا۔ اس کی بانھوں میں نواب نے پہلی بار بڑی پیاری حرارت محسوس کی تھی۔ اس کو جسمانی لذت کی الف بے اسی نے سکھائی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ یوں کہیے کہ وہ شے جو محبت ہوتی ہے، اس کے معانی اب اس پر آشکار ہو رہے تھے۔ وہ اگر ایک ہفتہ غائب رہتا تو نواب گراموفون پر دردیلے گیتوں کے ریکارڈ لگا کر خود ان کے ساتھ گاتی اور آہیں بھرتی تھی۔ مگر اس کو اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ ہیبت خان موٹروں کی آمد و رفت سے کیوں گھبراتا ہے۔ مہینوں گزر گئے۔ نواب کی سپردگی اور اس کے التفات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ادھر اس کی الجھن بڑھتی گئی کہ اب ہیبت خان چند گھنٹوں کے لیے آتا اور افراتفری کے عالم میں واپس چلا جاتا تھا۔ نواب محسوس کر رہی تھی کہ یہ سب کسی مجبوری کی وجہ سے ہے، ورنہ ہیبت خان کا جی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ٹھہرے۔ اس نے کئی مرتبہ اس سے اس بارے میں پوچھا۔

”مگر وہ گول کر گیا۔ ایک دن صبح سویرے اس کی ڈوج سرکنڈوں کے پار رکی۔ نواب سو رہی تھی۔ ہارن بجا تو چونک کر اٹھی۔ آنکھیں ملتی ملتی باہر آئی۔ اس وقت تک ہیبت خان اپنی موٹر دور کھڑی کر کے مکان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ نواب دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے اٹھا کر اندر کمرے میں لے گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا۔ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ پیار محبت کی باتیں۔ معلوم نہیں نواب کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنی زندگی کی پہلی فرمائش کی۔

”خان۔ مجھے سونے کے کڑے لا دو۔“

ہیبت خان نے اس کی موٹی موٹی گوشت بھری سرخ و سفید کلائیوں کو کئی مرتبہ چوما اور کہا۔

”کل ہی آجائیں گے۔ تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“

نواب نے ایک ادا کے ساتھ، مگر اپنے مخصوص الہڑ انداز میں کہا۔

”خان صاحب۔ جانے دیجیے۔ جان تو مجھے ہی دینی پڑے گی۔“

ہیبت خان یہ سن کر کئی بار اس کے صدقے ہوا۔ اور بڑا پر لطف وقت گزار کے چلا گیا، اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے دن آئے گا اور سونے کے کڑے اس کے نرم نرم ہاتھوں میں خود پہنائے گا۔ نواب خوش تھی۔ اس رات وہ دیر تک مسرت بھرے ریکارڈ بجا بجا کر اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں ناچتی رہی جس پر نواڑی پلنگ تھا۔ سردار بھی خوش تھی۔ اس رات اس نے پھر اپنی ڈبیا سے افیم کی ایک بڑی گولی نکالی اور اسے نگل کر سو گئی۔ دوسرے دن نواب اور زیادہ خوش تھی کہ سونے کے کڑے آنے والے ہیں اور ہیبت خان خود اس کو پہنانے والا ہے۔ وہ سارا دن منتظر رہی پر وہ نہ آیا۔ اس نے سوچا شاید موٹر خراب ہو گئی ہو۔ شاید رات ہی کو آئے۔ مگر وہ ساری رات جاگتی رہی اور ہیبت خان نہ آیا۔ اس کے دل کو، جو بہت نازک تھا، بڑی ٹھیس پہنچی۔ اس نے اپنی ماں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھی، بار بار کہا

”دیکھو، خان نہیں آیا، وعدہ کر کے پھر گیا ہے۔“

لیکن پھر وہ سوچتی اور کہتی

”ایسا نہ ہو، کچھ ہو گیا ہو“

اور وہ سہم جاتی۔ کئی باتیں اس کے دماغ میں آتی تھیں۔ موٹر کا حادثہ، اچانک بیماری، کسی ڈاکو کا حملہ۔ لیکن بار بار اس کو لاریوں اور موٹروں کی آوازوں کا خیال آتا تھا۔ جن کو سن کر ہیبت خان ہمیشہ بوکھلا جاتا تھا۔ وہ اس کے متعلق پہروں سوچتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں اس کا کوئی پرانا گاہک بھی نہ آیا، اس لیے کہ سردار ان سب کو منع کر چکی تھی۔ تین چار لاریاں اور دو موٹریں البتہ اس کچی سڑک پر سے دھول اڑاتی گزریں۔ نواب کا ہر بار یہی جی چاہا کہ دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے جائے اور ان کو آگ لگا دے۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو ہیبت خان کے یہاں آنے میں رکاوٹ کا باعث ہیں، مگر پھر سوچتی کہ موٹریں اور لاریاں رکاوٹ کا کیا باعث ہو سکتی ہیں، وہ اپنی

کم عقلی پر ہنستی۔ لیکن یہ بات اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ ہیبت خان جیسا تنومند مردان کی آواز سن کر سہم کیوں جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اس کے دماغ کی پیدا کی ہوئی دلیل جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ اور جب ایسا ہوتا تو بے حد رنجیدہ اور مغموم ہو جاتی اور گراموفون پر دردیلے ریکارڈ لگا کر سننا شروع کر دیتی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔ ایک ہفتے کے بعد دوپہر کو جب نواب اور سردار کھانا کھا کر فارغ ہو چکی تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کی سوچ رہی تھیں کہ اچانک باہر سڑک پر سے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ دونوں یہ آواز سن کر چونکیں کیوں کہ ہیبت خان کی ڈوج کے ہارن کی آواز نہیں تھی۔ سردار باہر لپکی کہ دیکھے کون ہے، پرانا آدمی ہوا تو اسے ٹرخا دے گی۔ مگر جب وہ سرکنڈوں کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک نئی موٹر میں ہیبت خان بیٹھا ہے۔ پچھلی نشست پر ایک خوش پوش اور خوبصورت عورت ہے۔ ہیبت خان نے موٹر کچھ دور کھڑی کی اور باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی پچھلی نشست سے وہ عورت۔ دونوں ان کے مکان کی طرف بڑھے۔ سردار نے سوچا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ عورت کے لیے تو ہیبت اتنی دور سے چل کر یہاں آتا ہے، پھر یہ عورت جو اتنی خوبصورت ہے، جوان ہے، قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہے، اس کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ہیبب خان اس خوبصورت کے ساتھ جس نے بیش قیمت زیور پہنے ہوئے تھے، مکان میں داخل ہو گیا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ اس کی طرف ان دونوں میں سے کسی نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ جب وہ اندر گئی تو ہیبت خان، نواب اور وہ عورت تینوں نواڑی پلنگ پر بیٹھے تھے اور خاموشی طاری تھی۔ عجیب قسم کی خاموشی۔ زیوروں سے لدی پھندی عورت البتہ کسی قدر مضطرب نظر آتی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔ سردار دہلیز کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر جب ہیبت خان نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سلام کیا۔ ہیبت خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ اس عورت کی ٹانگ ہلنا بند ہوئی اور وہ سردار سے مخاطب ہوئی۔

”ہم آئے ہیں۔ کھانے پینے کا تو بندوبست کرو۔“

سردار نے سرتاپا مہمان نواز بن کر کہا۔

”جو تم کہو، ابھی تیار ہو جاتا ہے۔“

اس عورت نے جس کے خدوخال سے صاف مترشح تھا کہ بڑی دھڑلے کی عورت ہے، سردار سے کہا۔

”تو چلو تم باورچی خانے میں۔ چولہا سلگاؤ۔ بڑی دیگچی ہے گھر میں؟“

”ہے“!

سردار نے اپنا وزنی سر ہلایا۔

”تو جاؤ اس کو دھو کر صاف کرو۔ میں ابھی آئی۔“

وہ عورت پلنگ پر سے اٹھی اور گراموفون کو دیکھنے لگی۔ سردار نے معذرت بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

”گوشت وغیرہ تو، یہاں نہیں ملے گا۔“

اس عورت نے ایک ریکارڈ پر سوئی رکھی

”مل جائے گا۔ تم سے جو کہا ہے، وہ کرو۔ اور دیکھو آگ کافی ہو۔“

سردار یہ احکام لے کر چلی گئی۔ اب وہ خوش پوش عورت مسکرا کر نواب سے مخاطب ہوئی۔

”نواب! ہم تمہارے لیے سونے کے کڑے لے کر آئے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا وینٹی بیگ کھولا اور اس میں سے باریک سرخ کاغذ میں لپٹے ہوئے کڑے نکالے جو کافی وزنی اور خوبصورت تھے۔ نواب اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش ہیبت خان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کڑوں کو ایک نظر دیکھا اور اس سے بڑی نرم و نازک مگر سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”خان یہ کون ہے؟“

اس کا اشارہ اس عورت کی طرف تھا۔ وہ عورت کڑوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

”میں کون ہوں۔ میں ہیبت خان کی بہن ہوں۔“

اور یہ کہہ کر اس نے ہیبت خان کی طرف دیکھا جو اس کے اس جواب پر سکڑ گیا تھا۔ پھر وہ نواب سے مخاطب ہوئی۔

”میرا نام ہلاکت ہے۔“

نواب کچھ نہ سمجھی۔ مگر وہ اس عورت کی آنکھوں سے خوف کھا رہی تھی جو یقیناً خوبصورت تھیں مگر بڑے خوفناک طور پر کھلی۔ ان میں جیسے آگ برس رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے سمٹی ہوئی، سہمی ہوئی نواب کی کلائیاں پکڑیں اور اس میں کڑے ڈالنے لگی۔ لیکن اس نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں اور ہیبت خان سے مخاطب ہوئی۔

”تم جاؤ ہیبت خان۔ میں اسے اچھی طرح سجا بنا کر تمہاری خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔“

ہیبت خان مبہوت تھا۔ جب وہ نہ اٹھا تو وہ عورت جس نے اپنا نام ہلاکت بتاتا تھا، ذرا تیزی سے بولی۔

”جاؤ۔ تم نے سنا نہیں؟“

ہیبت خان، نواب کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ مکان کے باہر جو بر آمدہ سا تھا، اس کے ایک کونے میں ٹاٹ لگا باورچی خانہ تھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سردار آگ سلگا چکی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور سرکنڈوں کے اس پار سڑک پر چلا گیا۔ اس کی حالت نیم دیوانوں کی سی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔ جب اس کو دور سے ایک لاری آتی ہوئی دکھائی دی تو اس نے سوچا کہ وہ اسے روک لے اور اس میں بیٹھ کر وہاں سے غائب ہو جائے۔ مگر جب وہ پاس آئی تو ایسی دھول اڑی کہ وہ اس میں غائب ہو گیا۔ اس نے آوازیں دیں، مگر گرد کے باعث اس کا حلق اس قابل ہی نہیں تھا کہ بلند آواز نکال سکے۔ گرد و غبار کم ہوا تو ہیبت خان نیم مردہ تھا۔ اس نے چاہا کہ سرکنڈوں کے پیچھے اس مکان میں جائے جہاں اس نے کئی دن اور کئی راتیں نواب کے الہڑ پہلو میں گزاری تھیں، مگر وہ نہ جا سکا۔ اس کے قدم ہی نہیں اٹھتے تھے۔ وہ بہت دیر تک کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ آئی تھی، اس کے ساتھ اس کے کافی پرانے تعلقات تھے، صرف اس بنا پر کہ بہت دیر ہوئی، وہ اس کے خاوند کی موت کا افسوس کرنے گیا تھا جو اس کا لنگوٹیا تھا۔ مگر اتفاق سے یہ ماتم پرسی ان دنوں کے باہمی تعلق میں تبدیل ہو گئی۔ خاوند کی موت کے دوسرے ہی دن وہ اس کے گھر میں تھا، اور اس عورت نے اس کو ایسے تحکم سے اندر بلا کر اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہے۔ ہیبت خان عورت کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ جب شاہینہ نے اس سے اپنے عجیب و غریب تحکم بھرے التفات کا اظہار کیا تو اس کے لیے یہی بڑی بات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہینہ کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے مرحوم خاوند کی، مگر اسے اس دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کو شاہینہ سے صرف یہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی زندگی کی سب سے پہلی عورت تھی۔ وہ اس کے تحکم کے نیچے شاید اس لیے دب کے رہ گیا تھا کہ وہ بالکل اناڑی تھا۔ بہت دیر تک وہ کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے مکان کی طرف بڑھا تو اس نے بر آمدے میں ٹاٹ لگے باورچی خانے میں سردار کو کچھ بھونتے ہوئے دیکھا۔ اندر اس کمرے کی طرف گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا تو دروازہ بند پایا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔ چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ کچے فرش پر اس کو سب سے پہلے خون ہی خون نظر آیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ پھر اس نے شاہینہ کو دیکھا جو دروازہ کے پٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا۔

”میں نے تمہاری نواب کو سجا بنا دیا ہے“!

ہیبت خان نے اپنے خشک گلے کو تھوک سے کسی قدر تر کر کے اس سے پوچھا

”کہاں ہے؟“

شاہینہ نے جواب دیا۔

”کچھ تو اس پلنگ پر ہے۔ لیکن اس کا بہترین حصہ باورچی خانہ میں ہے۔“

ہیبت خان پر اس کا مطلب سمجھے بغیر ہیبت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ وہیں دہلیز کے پاس کھڑا رہا۔ مگر اس نے دیکھا کہ فرش پر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکرے بھی ہیں اور۔ ایک تیز چھری بھی پڑی ہے۔ اور نواڑی پلنگ پر کوئی لیٹا ہے جس پر خون آلود چادر پڑی ہے۔ شاہینہ نے مسکرا کر کہا۔

”چادر اٹھا کر دکھاؤں۔ تمہاری سجی بنی نواب ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے سنگھار کیا ہے۔ لیکن تم پہلے کھانا کھا لو۔ بہت بھوک لگی ہو گی، سردار بڑا لذیذ گوشت بھون رہی ہے۔ اس کی بوٹیاں میں نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹی ہیں۔ ہیبت خان کے پاؤں لڑکھڑائے۔ زور سے چلایا۔

”شاہینہ تم نے یہ کیا کیا“!

شاہینہ مسکرائی۔

”جان من! یہ پہلی مرتبہ نہیں۔ دوسری مرتبہ ہے۔ میرا خاوند، اللہ اسے جنت نصیب کرے، تمہاری طرح ہی بے وفا تھا۔ میں نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پکا کر چیلوں اور کوؤں کو کھلایا تھا۔ تم سے مجھے پیار ہے، اس لیے میں نے تمہارے بجائے۔“

اس نے فقرہ مکمل نہ کیا اور پلنگ پر سے خون آلود چادر ہٹا دی۔ ہیبت خان کی چیخ اس کے حلق کے اندر ہی دھنسی رہی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ شاہینہ کار چلا رہی ہے اور وہ غیر علاقے میں ہیں۔

سُرمہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوسُرمہ

فہمیدہ کی جب شادی ہوئی تو اس کی عمر انیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا جہیز تیار تھا۔ اس لیے اس کے والدین کو کوئی دِقت محسوس نہ ہوئی۔ پچیس کے قریب جوڑے تھے اور زیورات بھی، لیکن فہمیدہ نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ سُرمہ جو خاص طور پر اُن کے یہاں آتا ہے، چاندی کی سرمے دانی میں ڈال کر اُسے ضرور دیں۔ ساتھ ہی چاندی کا سرمچو بھی۔ فہمیدہ کی یہ خواہش فوراً پوری ہوگئی۔ اعظم علی کی دکان سے سرمہ منگوایا۔ برکت کی دکان سے سرمے دانی اور سرمچو لیا اور اس کے جہیز میں رکھ دیا۔ فہمیدہ کو سرمہ بہت پسند تھا۔ وہ اس کو معلوم نہیں، کیوں اتنا پسند تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا رنگ بہت زیادہ گورا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ تھوڑی سی سیاہی بھی اس میں شامل ہو جائے۔ ہوش سنبھالتے ہی اُس نے سُرمے کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اُس کی ماں اُس سے اکثر کہتی۔

”فہمی۔ یہ تمھیں کیا خبط ہو گیا ہے۔ جب نہ تب آنکھوں میں سرمہ لگاتی رہتی ہو۔“

فہمیدہ مسکراتی۔

”امی جان۔ اس سے نظر کمزور نہیں ہوتی۔ آپ نے عینک کب لگوائی تھی؟“

”بارہ برس کی عمر میں۔“

فہمیدہ ہنسی۔

”اگر آپ نے سرمے کا استعمال کیا ہوتا، تو آپ کو کبھی عینک کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اصل میں ہم لوگ کچھ زیادہ ہی روشن خیال ہو گئے ہیں لیکن روشنی کے بدلے ہمیں اندھیرا ہی اندھیرا ملتا ہے۔“

اس کی ماں کہتی۔

”جانے کیا بک رہی ہو“

”میں جو کچھ بک رہی ہوں صحیح ہے۔ آج کل لڑکیاں نقلی بھویں لگاتی ہیں۔ کالی پنسل سے خدا معلوم اپنے چہرے پر کیا کچھ کرتی ہیں۔ لیکن نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ چڑیل بن جاتی ہیں۔“

اس کی ماں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

”جانے کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا“

فہمیدہ کہتی۔

”امی جان! آپ کو اتنا سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں صرف خاک ہی خاک نہیں۔ کچھ اور بھی ہے۔“

اس کی ماں اس سے پوچھتی۔

”اور کیا ہے؟“

فہمیدہ جواب دیتی۔

”بہت کچھ ہے۔ خاک میں بھی سونے کے ذرے ہو سکتے ہیں۔“

خیر۔ فہمیدہ کی شادی ہو گئی۔ پہلی ملاقات میاں بیوی کی بڑی دل چسپ تھی۔ جب فہمیدہ کا خاوند اس سے ہم کلام ہوا، تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں سیاہیاں تیر رہی ہیں۔ اُس کے خاوند نے پوچھا۔

”یہ تم اتنا سرمہ کیوں لگاتی ہو؟“

فہمیدہ جھینپ گئی اور جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے خاوند کو یہ ادا پسند آئی اور وہ اُس سے لپٹ گیا۔ لیکن فہمیدہ کی سرمہ بھری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کالے کالے آنسو بہنے لگے۔ اس کا خاوند بہت پریشان ہو گیا،

”تم رو کیوں رہی ہو؟“

فہمیدہ خاموش رہی۔ اُس کے خاوند نے ایک بار پھر پوچھا

”کیا بات ہے۔ آخر رونے کی وجہ کیا ہے۔ میں نے تمھیں کوئی دُکھ پہنچایا؟

”جی نہیں۔“

”تو پھر رونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“

”کوئی بھی نہیں۔“

اُس کے خاوند نے اس کے گال پر ہولے ہولے تھپکی دی اور کہا

”جان من جو بات ہے مجھے بتا دو۔ اگر میں نے کوئی زیادتی کی ہے تو اُس کی معافی چاہتا ہوں۔ دیکھو تم اس گھر کی ملکہ ہو۔ میں تمہارا غلام ہوں۔ لیکن مجھے یہ رونا دھونا اچھا نہیں لگتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سدا ہنستی رہو۔“

فہمیدہ روتی رہی۔ اس کے خاوند نے اس سے ایک بار پھر پوچھا

”آخر اس رونے کی وجہ کیا ہے؟“

فہمیدہ نے جواب دیا۔

”کوئی وجہ نہیں ہے، آپ پانی کا ایک گلاس دیجیے مجھے“

اس کا خاوند فوراً پانی کا ایک گلاس لے آیا۔ فہمیدہ نے اپنی آنکھوں میں لگا ہوا سرمہ دھویا۔ تولیے سے اچھی طرح صاف کیا۔ آنسو خود بخود خشک ہو گئے اس کے بعد وہ اپنے خاوند سے ہم کلام ہوئی۔

”میں معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو میں نے اتنا پریشان کیا۔ اب دیکھیے میری آنکھوں میں سرمے کی ایک لکیر بھی باقی نہیں رہی۔“

اس کے خاوند نے کہا ُمجھے سرمے پر کوئی اعتراض نہیں۔ تم شوق سے اس کو استعمال کرو۔ مگر اتنا زیادہ نہیں کہ آنکھیں ابلتی نظر آئیں۔“

فہمیدہ نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

”مجھے آپ کا ہر حکم بجا لانا ہے۔ آئندہ میں کبھی سرمہ نہیں لگاؤں گی۔“

”نہیں نہیں۔ میں تمھیں اس کے استعمال سے منع نہیں کرتا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔ میرا مطلب ہے کہ اس چیز کو بقدر کفایت استعمال کیا جائے۔ ضرورت سے زیادہ جو بھی چیز استعمال میں آئے گی، اپنی قدر کھو دے گی۔“

فہمیدہ نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی چاندی کی سرمے دانی اور چاندی کے سرمچو کو ہر روز نکال کر دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کہ یہ دونوں چیزیں اُس کی زندگی سے کیوں خارج ہو گئی ہیں، وہ کیوں ان کو اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دے سکتی۔ صرف اس لیے کہ اُس کی شادی ہو گئی ہے؟ صرف اس لیے کہ وہ اب کسی کی ملکیت ہو گئی ہے؟ یا ہو سکتا ہے کہ اس کی قوتِ ارادی سلب ہو گئی ہو۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ ایک برس کے بعد اس کے ہاں چاند سا بچہ آ گیا۔ فہمیدہ نڈھال تھی لیکن اسے اپنی کمزوری کا کوئی احساس نہیں تھا اس لیے کہ وہ اپنے لڑکے کی پیدائش پر نازاں تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑی تخلیق کی ہے۔ چالیس دنوں کے بعد اُس نے سرمہ منگوایا اور اپنے نومولود لڑکے کی آنکھوں میں لگایا۔ لڑکے کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ان میں جب سرمہ کی تحریر ہوئی تو وہ اور بھی زیادہ بڑی ہو گئیں۔ اس کے خاوند نے کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہ بچے کی آنکھوں میں سرمہ کیوں لگاتی ہے۔ اس لیے کہ اُسے بڑی اور خوب صورت آنکھیں پسند تھیں۔ دن اچھی طرح گزر رہے تھے۔ فہمیدہ کے خاوند شجاعت علی کو ترقی مل گئی تھی۔ اب اس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے کے قریب تھی۔ ایک دن اُس نے اپنے لڑکے، جس کا نام اس کی بیوی نے عاصم رکھا تھا، سرمہ لگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ وہ اُس کو بہت پیارا لگا، اس نے بے اختیار اُس کو اُٹھایا چوما چاٹا اور پلنگڑی پر ڈال دیا۔ وہ ہنس رہا تھا، اور اپنے ننھے منے ہاتھ پاؤں اِدھر اُدھر مار رہا تھا۔ اس کی سالگرہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فہمیدہ نے ایک بہت بڑے کیک کا آرڈر دے دیا تھا۔ محلے کے سب بچوں کو دعوت دی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے لڑکے کی پہلی سالگرہ بڑی شان سے منائی جائے۔ سالگرہ یقیناً شان سے منائی جاتی، مگر دو دن پہلے عاصم کی طبیعت ناساز ہو گئی اور ایسی ہوئی کہ اسے تشنج کے دورے پڑنے لگے۔ !اُسے ہسپتال لے گئے، وہاں ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا۔ تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ اسے ڈبل نمونیا ہو گیا ہے۔ فہمیدہ رونے لگی۔ بلکہ سر پیٹنے لگی

”ہائے میرے لال کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ ہم نے تو اُسے پھولوں کی طرح پالا ہے۔“

ایک ڈاکٹر نے اس سے کہا

”میڈم یہ بیماریاں انسان کے احاطہ اختیار میں نہیں۔ ویسے بحیثیت ڈاکٹر میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ بچے کے جینے کی کوئی امید نہیں۔“

فہمیدہ نے رونا شروع کر دیا۔

”میں توخود مر جاؤں گی۔ خدا کے لیے، ڈاکٹر صاحب! اسے بچالیجیے، آپ علاج کرنا جانتے ہیں۔ مجھے اللہ کے گھر سے اُمید ہے کہ میرا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔

”آپ اتنے ناامید کیوں ہیں؟“

میں ناامید نہیں۔ لیکن میں آپ کو جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا۔“

”جھوٹی تسلیاں، آپ مجھ کو کیوں دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بچہ زندہ رہے گا۔“

خدا کرے کہ ایسا ہی ہو“

مگر خدا نے ایسا نہ کیا اور وہ تین روز کے بعد ہسپتال میں مر گیا۔ فہمیدہ پر دیر تک پاگل پن کی کیفیت طاری رہی اس کے ہوش و حواس گم تھے کوئلے اٹھاتی انھیں پیستی اور اپنے چہرے پر ملنا شروع کر دیتی۔ اس کا خاوند سخت پریشان تھا۔ اُس نے کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ دوائیں بھی دیں لیکن خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ فہمیدہ کے دل و دماغ میں سرمہ ہی سرمہ تھا۔ وہ ہر بات کالک کے ساتھ سوچتی تھی۔ اُس کا خاوند اس سے کہتا

”کیا بات ہے تم اتنی افسردہ کیوں رہتی ہو“

وہ جواب دیتی

”جی، کوئی خاص بات نہیں۔ مجھے آپ سرمہ لا دیجیے“

اس کا خاوند اُس کے لیے سرمہ لے آیا، مگر فہمیدہ کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ وہ خود بازار گئی اور اپنی پسند کا سرمہ خرید کر لائی۔ اپنی آنکھوں میں لگایا اور سو گئی۔ جس طرح وہ اپنے بیٹے عاصم کے ساتھ سویا کرتی تھی۔ صبح جب اُس کا خاوند اٹھا اور اور اس نے اپنی بیوی کو جگانے کی کوشش کی تو وہ مردہ پڑی تھی اس کے پہلو میں ایک گڑیا تھی جس کی آنکھیں سرمے سے لبریز تھیں۔

سعادت حسن منٹو۱۱۔ دسمبر۱۹۵۴ء

سڑک کے کنارے

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوسڑک کے کنارے

”یہی دن تھے۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ دھلا ہوا، نتھرا ہوا۔ اور دھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی۔ سہانے خوابوں کی طرح۔ مٹی کی باس بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت میرے دل و دماغ میں رچ رہی ہے۔ اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑ پھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی۔“

”اسؔ نے مجھ سے کہا تھا۔ تم نے مجھے جو یہ لمحات عطا کیے ہیں یقین جانو۔ میری زندگی ان سے خالی تھی۔ جو خالی جگہیں تم نے آج میری ہستی میں پُر کی ہیں، ۔ تمہاری شکر گزار ہیں۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید وہ ہمیشہ ادھوری رہتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تم سے اور کیا کہوں۔ میری تکمیل ہو گئی ہے۔ ایسے مکمل طور پر کہ محسوس ہوتا ہے مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ اور وہ چلا گیا۔ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔“

”میری آنکھیں روئیں۔ میرا دل رویا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے لاکھ مرتبہ پوچھا کہ میری ضرورت اب تمھیں کیوں نہیں رہی۔ جبکہ تمہاری ضرورت۔ اپنی تمام شدتوں کے ساتھ اب شروع ہوئیہے۔ ان لمحات کے بعد جنھوں نے بقول تمہارے، تمہاری ہستی کی خالی جگہیں پُر کی ہیں۔“

اس نے کہا۔

”تمہارے وجود کے جس جس ذرے کی میری ہستی کی تعمیر و تکمیل کو ضرورت تھی، یہ لمحات چن چن کر دیتے رہے۔ اب کہ تکمیل ہو گئی ہے تمہارا میرا رشتہ خود بخود ختم ہو گیا ہے۔“

کس قدر ظالمانہ لفظ تھے۔ مجھ سے یہ پتھراؤ برداشت نہ کیا گیا۔ میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔ مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں نے اس سے کہا۔

”یہ ذرے جن سے تمہاری ہستی کی تکمیل ہوئی ہے، میرے وجود کا ایک حصہ تھے۔ کیا ان کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔ کیا میرے وجود کا بقایا حصہ ان سے اپنا ناطہ توڑ سکتا ہے؟۔ تم مکمل ہو گئے ہو۔ لیکن مجھے ادھورا کر کے۔ کیا میں نے اسی لیے تمھیں اپنا معبود بنایا تھا؟“

اس نے کہا۔

”بھونرے، پھولوں اور کلیوں کا رس چوس چوس کر شہید کشید کرتے ہیں، مگر وہ اس کی تلچھٹ تک بھی ان پھولوں اور کلیوں کے ہونٹوں تک نہیں لاتے۔ خدا اپنی پرستش کراتا ہے، مگر خود بندگی نہیں کرتا۔ عدم کے ساتھ خلوت میں چند لمحات بسر کر کے اس نے وجود کی تکمیل کی۔ اب عدم کہاں ہے۔ اس کی اب وجود کو کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک ایسی ماں تھی جو وجود کو جنم دیتے ہی زچگی کے بستر پر فنا ہو گئی تھی۔“

عورت روسکتی ہے۔ دلیلیں پیش نہیں کر سکتی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل اس کی آنکھ سے ڈھلکا ہوا آنسو ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

”دیکھو۔ میں رو رہی ہوں۔ میری آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں تم جا رہے ہو تو جاؤ، مگر ان میں سے کچھ آنسوؤں کو تو اپنے رومال کے کفن میں لپیٹ کر ساتھ لیتے جاؤ۔ میں تو ساری عمر روتی رہوں گی۔ مجھے اتنا تو یاد رہے گا کہ چند آنسوؤں کے کفن دفن کا سامان تم نے بھی کیا تھا۔ مجھ خوش کرنے کے لیے“!

اس نے کہا۔

”میں تمہیں خوش کر چکا ہوں۔ تمہیں اس ٹھوس مسرت سے ہمکنار کر چکا ہوں۔ جس کے تم سراب ہی دیکھا کرتی تھیں۔ کیا اس کا لطف اس کا کیف، تمہاری زندگی کے بقایا لمحات کا سہارا نہیں بن سکتا۔ تم کہتی ہو کہ میری تکمیل نے تمہیں ادھورا کر دیا ہے۔ لیکن یہ ادھورا پن ہی کیا تمہاری زندگی کو متحرک رکھنے کے لیے کافی نہیں۔ میں مرد ہوں۔ آج تم نے میری تکمیل کی ہے۔ کل کوئی اور کرے گا۔ میرا وجود کچھ ایسے آب و گل سے بنا ہے جس کی زندگی میں ایسے کئی لمحات آئیں گے جب وہ خود کو تشنہ تکمیل سمجھے گا۔ وہ تم ایسی کئی عورتیں آئیں گی جو ان لمحات کی پیدا کی ہوئی خالی جگہیں پُر کریں گی۔“

میں روتی رہی۔ جھنجھلاتی رہی۔ میں نے سوچا۔ یہ چند لمحات جو ابھی میری مٹھی میں تھے۔ نہیں۔ میں ان لمحات کی مٹھی میں تھی۔ میں نے کیوں خود کو ان کے حوالے کر دیا۔ میں نے کیوں اپنی پھڑ پھڑاتی روح ان کے منہ کھولے قفس میں ڈال دی۔ اس میں مزا تھا۔ ایک لطف تھا۔ ایک کیف تھا۔ تھا، ضرور تھا۔ اور یہ اس کے اور میرے تصادم میں تھا۔ لیکن۔ یہ کیا کہ وہ ثابت و سالم رہا۔ اور مجھ میں تریڑے پڑ گئے۔ یہ کیا، کہ وہ اب میری ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن میں اور بھی شدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ وہ طاقتور بن گیا ہے۔ میں نحیف ہو گئی ہوں۔ یہ کیا کہ آسمان پر دو بادل ہم آغوش ہوں۔ ایک رو رو کر برسنے لگا، دوسرا بجلی کا کوندا بن کر اس بارش سے کھیلتا، کڑکڑے لگاتا بھاگ جائے۔ یہ کس کا قانون ہے؟۔ آسمانوں کا؟۔ زمینوں کا۔ یا ان کے بنانے والوں کا؟ میں سوچتی رہی اور جھنجھلاتی رہی۔ دو روحوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار کر جانا۔ کیا یہ سب شاعری ہے۔ نہیں، دو روحیں سمٹ کر ضرور اس ننھے سے نکتے پر پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے۔ لیکن اس کائنات میں ایک روح کیوں کبھی کبھی گھائل چھوڑ دی جاتی ہے۔ کیا اس قصور پر کہ اس نے دوسری روح کو اس ننھے سے نکتے پر پہنچنے میں مدد تھی۔ یہ کیسی کائنات ہے۔ یہی دن تھے۔ آسمان کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ اور دھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی۔ اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑ پھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی۔ وہ موجود نہیں ہے۔ بجلی کا کوندا بن کر جانے وہ کن بدلیوں کی گریہ و زاری سے کھیل رہا ہے۔ اپنی تکمیل کر کے چلا گیا۔ ایک سانپ تھا جو مجھے ڈس کر چلا گیا۔ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر کیوں میرے پیٹ میں کروٹیں لے رہی ہے۔ کیا یہ میری تکمیل ہو رہی ہے؟ نہیں، نہیں۔ یہ کیسی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ تو تخریب ہے۔ لیکن یہ میرے جسم کی خالی جگہیں پُر ہو رہی ہیں۔ یہ جو گڑھے تھے کس ملبے سے پُر کیے جا رہے ہیں۔ میری رگوں میں یہ کیسی سرسراہٹیں دوڑ رہی ہیں۔ میں سمٹ کر اپنے پیٹ میں کس ننھے سے نکتے پر پہنچنے کے لیے پیچ و تاب کھا رہی ہوں۔ میری ناؤ ڈوب کر اب کن سمندروں میں ابھرنے کے لیے اٹھ رہی ہے۔؟ یہ میرے اندر دہتے ہوتے چولھوں پر کس مہمان کے لیے دودھ گرم کیا جا رہا ہے۔ یہ میرا دل میرے خن کو دھنک دھنک کر کس کے لیے نرم و نازک رضائیاں تیار کر رہا ہے۔ یہ میرا دماغ میرے حالات کے رنگ برنگ دھاگوں سے کس کے لیے ننھی منی پوشاکیں بن رہا ہے؟ میرا رنگ کس کے لیے نکھر رہا ہے۔ میرے انگ انگ اور روم روم میں پھنسی ہوئی ہچکیاں لوریوں میں کیوں تبدیل ہو رہی ہیں۔ یہی دن تھے۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ لیکن یہ آسمان اپنی بلندیوں سے اتر کر کیوں میرے پیٹ میں تن گیا ہے۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں کیوں میری رگوں میں دوڑتی پھرتی ہیں؟ میرے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کے محرابوں ایسی تقدیس کیوں آ رہی ہے؟ نہیں، نہیں۔ یہ تقدیس کچھ بھی نہیں۔ میں ان محرابوں کو ڈھا دوں گی۔ میں اپنے اندر تمام چولھے سرد کر دوں گی جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داڑیاں چڑھی ہیں۔ میں اپنے خیالات کے تمام رنگ برنگ دھاگے آپس میں الجھا دوں گی۔ یہی دن تھے۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ لیکن میں وہ دن کیوں یاد کرتی ہوں جن کے سینے پر سے وہ اپنے نقش قدم بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ لیکن یہ۔ یہ نقش قدم کس کا ہے۔ یہ جو میرے پیٹ کی گہرائیوں میں تڑپ رہا ہے۔؟۔ کیا یہ میرا جانا پہچانا نہیں۔ میں اسے کھرچ دوں گی۔ اسے مٹا دوں گی۔ یہ رسولی ہے۔ پھوڑا ہے۔ بہت خوفناک پھوڑا۔ لیکن مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پھاہا ہے۔ پھاہا ہے تو کس زخم کا؟۔ اس زخم کا جو وہ مجھے لگا کر چلا گیا تھا؟۔ نہیں نہیں۔ یہ تو ایسا لگتا ہے کسی پیدائشی زخم کے لیے ہے۔ ایسے زخم کے لیے جو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ جو میری کوکھ میں جانے کب سے سو رہا تھا۔ یہ کوکھ کیا؟۔ فضول سی مٹی کی ہنڈکلیا۔ بچوں کا کھلونا۔ میں اسے توڑ پھوڑ دوں گی۔ لیکن یہ کون میرے کان میں کہتا ہے۔

”یہ دنیا ایک چوراہا ہے۔ اپنا بھانڈا کیوں اس میں پھوڑتی ہے۔ یاد رکھ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی۔ انگلیاں۔ ادھر کیوں نہ اٹھیں گی، جدھر وہ اپنی ہستی مکمل کر کے چلا گیا تھا۔ کیا ان انگلیوں کو وہ راستہ معلوم نہیں۔ یہ دنیا ایک چوراہا ہے۔ لیکن اس وقت تو وہ مجھے ایک دوراہے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ادھر بھی ادھورا پن تھا۔ اُدھر بھی ادھورا پن۔ اِدھر بھی آنسو، اُدھر بھی آنسو۔ لیکن یہ کس کا آنسو، میرے سیپ میں موتی بن رہا ہے۔ یہ کہاں بندھے گا؟ انگلیاں اٹھیں گی۔ جب سیپ کا منہ کھلے اور موتی پھسل کر باہر چوراہے میں گر پڑے گا تو انگلیاں اٹھیں گی۔ سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی۔ اور یہ انگلیاں سنپولیاں بن بن کر ان دونوں کو ڈسیں گی اور اپنے زہر سے ان کو نیلا کر دیں گی۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ یہ گر کیوں نہیں پڑتا۔ وہ کون سے ستون ہیں جو اس کو تھامے ہوئے ہیں۔ کیا اس دن جو زلزلہ آیا تھا وہ ان ستونوں کی بنیادیں ہلا دینے کے لیے کافی نہیں تھا۔ یہ

کیوں اب تک میرے سر کے اوپر اسی طرح تنا ہوا ہے؟ میری روح پسینے میں غرق ہے۔ اس کا ہر مسام کھلا ہوا ہے۔ چاروں طرف آگ دہک رہی ہے۔ میرے اندر کٹھالی میں سونا پگھل رہا ہے۔ دھونکنیاں چل رہی ہیں۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ سونا، آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ابل رہا ہے۔ میری رگوں میں نیلی آنکھیں دوڑ دوڑ کر ہانپ رہی ہیں۔ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ کوئی آرہا ہے۔ کوئی آرہا ہے۔ بند کر دو۔ بند کر دو کواڑ۔ کٹھالی الٹ گئی ہے۔ پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہے۔ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ وہ آرہا ہے۔ میری آنکھیں مندرہی ہیں۔ نیلا آسمان گدلا ہو کر نیچے آرہا ہے۔ یہ کس کے رونے کی آواز ہے۔ اسے چپ کراؤ۔ اس کی چیخیں میرے دل پر ہتھوڑے مار رہی ہیں۔ چپ کراؤ۔ اسے چپ کراؤ۔ میں گود بن رہی ہوں۔ میں کیوں گود بن رہی ہوں۔ میری بانہیں کھل رہی ہیں۔ چولھوں پر دودھ ابل رہا ہے۔ میرے سینے کی گولائیاں پیالیاں بن رہی ہیں۔ لاؤ اس گوشت کے لوتھڑے کو میرے دل کے دھڑکتے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں میں لٹا دو۔ مت چھینو۔ مت چھینو اسے۔ مجھ سے جدا نہ کرو۔ خدا کے لیے مجھ سے جدا نہ کرو۔ انگلیاں۔ انگلیاں۔ اٹھنے دو انگلیاں۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ یہ دنیا چوراہا ہے۔ پھوٹنے دو میری زندگی کے تمام بھانڈے۔ میری زندگی تباہ ہو جائے گی؟۔ ہو جانے دو۔ مجھے میرا گوشت واپس دے دو۔ میری روح کا یہ ٹکڑا مجھ سے مت چھینو۔ تم نہیں جانتے یہ کتنا قیمتی ہے۔ یہ گوہر ہے جو مجھے ان چند لمحات نے عطا کیا ہے۔ ان چند لمحات نے جنہوں نے میرے وجود کے کئی ذرے چن چن کر کسی کی تکمیل کی تھی اور مجھے اپنا خیال میں ادھورا چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ میری تکمیل آج ہوئی ہے۔ مان لو۔ مان لو۔ میرے پیٹ کے خلا سے پوچھو۔ میری دودھ بھری ہوئی چھاتیوں سے پوچھو۔ ان لوریوں سے پوچھو، جو میرے انگ انگ اور روم روم میں تمام ہچکیاں سلا کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان جھولنوں سے پوچھو جو میرے بازوؤں میں ڈالے جا رہے ہیں۔ میرے چہرے کی زردیوں سے پوچھو جو گوشت کے اس لوتھڑے کے گالوں کو اپنی تمام سرخیاں چھپاتی رہی ہیں۔ ان سانسوں سے پوچھو، جو چھپے چوری اس کو اس کا حصہ پہنچاتے رہے ہیں۔ انگلیاں۔ اٹھنے دو انگلیاں۔ میں انھیں کاٹ ڈالوں گی۔ شور مچے گا۔ میں یہ انگلیاں اٹھا کر اپنے کانوں میں ٹھونس لوں گی۔ میں گونگی ہو جاؤں گی، بہری ہو جاؤں گی، اندھی ہو جاؤں گی۔ میرا گوشت، میرے اشارے سمجھ لیا کرے گا۔ میں اسے ٹٹول ٹٹول کر پہچان لیا کروں گی۔ مت چھینو۔ مت چھینو اسے۔ یہ میری کوکھ کی مانگ کا سیندھور ہے۔ یہ میری ممتا کے ماتھے کی بندیا ہے۔ میرے گناہ کا کڑوا پھل ہے؟۔ لوگ اس پر تھو تھو کریں گے؟۔ میں چاٹ لوں گی یہ سب تھوکیں۔ آنول سمجھ کر صاف کر دوں گی۔ دیکھو، میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میرے بھرے ہوئے دودھ کے برتن اوندھے نہ کرو۔ میرے دل کے دھڑکتے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں میں آگ نہ لگاؤ۔ میری بانھوں کے جھولوں کی رسیاں نہ توڑو۔ میرے کانوں کو ان گیتوں سے محروم نہ کرو جو اس کے رونے میں مجھے سنائی دیتے ہیں۔ مت چھینو۔ مت چھینو۔ مجھ سے جدا نہ کرو۔ خدا کے لیے مجھے اس سے جدا نہ کرو۔

لاہور 21 جنوری دھوبی منڈی سے پولیس نے ایک نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پایا اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ کسی سنگدل نے بچی کی گردن کو مضبوطی سے کپڑے میں جکڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تا کہ وہ سردی سے مر جائے۔ مگر وہ زندہ تھی۔ بچی بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

سگریٹ اور فاؤنٹین پن

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوسگریٹ اور فاؤنٹین پن

”میرا پارکر ففٹی ون کا قلم کہاں گیا۔“

”جانے میری بلا۔“

”میں نے صبح دیکھا کہ تم اُس سے کسی کو خط لکھ رہی تھیں اب انکار کر رہی ہو“

”میں نے خط لکھا تھا مگر اب مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں غارت ہو گیا۔“

”یہاں تو آئے دن کوئی نہ کوئی چیز غارت ہوتی ہی رہتی ہے مینٹل پیس پر آج سے دس روز ہوئے میں نے اپنی گھڑی رکھی صرف اس لیے کہ میری کلائی پر چند پھنسیاں نکل آئی تھیں دوسرے دن دیکھا وہ غائب تھی۔“

”کیا میں نے چرالی تھی۔“

”میں نے یہ کب کہا سوال تو یہ ہے کہ وہ گئی کہاں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے یہ گھڑی وہیں رکھی ہے اُس کے ساتھ ہی دس روپے آٹھ آنے تھے وہ تو رہے لیکن گھڑی جس کی قیمت دو سو پچھتر روپے تھی وہ غائب ہو گئی۔ تم پر میں نے چوری کا الزام کب لگایا۔؟“

”ایک گھڑی آپ کی پہلے بھی گم ہو گئی تھی۔“

”ہاں۔“

”میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ نے خود انھیں بیچ کھایا ہے“

”بیگم تم ایسی بے ہُودہ باتیں نہ کیا کرو مجھے وہ دونوں گھڑیاں بہت عزیز تھیں۔ جس کے علاوہ ان کو بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا تم جانتی ہو کہ میری آمدنی اللہ کے فضل سے کافی ہے بینک میں اس وقت میرے دس ہزار سے کچھ اُوپر روپے جمع ہیں گھڑیاں بیچنے کی ضرورت مجھے کیسے پیش آسکتی تھی۔“

”کسی دوست کو دے دی ہو گی“

”کیوں مجھے اِن کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو گھڑی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسا چھکڑا ہوں جس میں کوئی پہیہ نہیں وقت کا کچھ پتہ نہیں چلتا گھر میں کلاک ہے مگر وہ تمہاری طرح نازک مزاج ہے ذرا موسم بدلے تو جناب بند ہو جاتے ہیں پھر جب موسم ان کے مزاج کے موافق ہو تو چلنا شروع کر دیتے ہیں۔“

”یعنی میں کلاک ہوں۔“

”میں نے صرف تشبیہ کے طور پر کہا تھا۔ کلاک تو بہت کام کی چیز ہے“

”اور میں کسی کام کی چیز نہیں۔ شرم نہیں آتی آپ کو ایسی باتیں کرتے۔“

”میں نے تو صرف مذاق کے طور پر یہ کہہ دیا تھا تم خواہ مخواہ ناراض ہو گئی ہو۔“

”میں آج تک کبھی آپ سے خواہ مخواہ ناراض ہوئی ہوں آپ خود ایسے موقعے دیتے ہیں کہ مجھے ناراض ہونا پڑتا ہے۔“

”تو چلیے اب صلح ہو جائے۔“

”صلح ولح کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی ان برسوں میں آپ سے میں پندرہ ہزار مرتبہ صلح صفائی کر چکی ہوں مگر نتیجہ کیا نکلا ہے۔ وہی ڈھاک کے تین پات“

”ڈھاک کے تین پاتوں کو چھوڑو تم مجھے میرا پارکر قلم لا کے دے دو مجھے چند بڑے ضروری خط لکھنے ہیں۔“

”مجھے کیا پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے؟ لے گیا ہو گا کوئی اُٹھا کر۔ اب میں ہر چیز کا دھیان تو نہیں رکھ سکتی۔“

”تو پھر تم کس مرض کی دوا ہو“

”میں نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ آپ میری زندگی کا سب سے بڑا روگ ہیں“

”تو یہ روگ دُور کرو ہر روگ کا کوئی نہ کوئی علاج موجود ہوتا ہے“

”خدا ہی بہتر کرے گا یہ روگ یہ کسی حکیم یا ڈاکٹر سے دُور ہونیوالا نہیں“

”اگر تمہاری یہی خواہش ہے کہ مر جاؤں تو میں اس کے لیے تیار ہوں میرے پاس اتفاق سے اس وقت قاتل زہر موجود ہے میں کھا کر مر جاتا ہوں۔“

”مر جایئے۔“

”اِس کے لیے تو میں تیار ہوں تا کہ روز روز کی بک بک اور جھک جھک ختم ہو جائے۔“

”آپ تو چاہتے ہیں کہ اپنے فرائض سے چھٹکارا ملے۔ بیوی بچے جائیں بھاڑ میں آپ آرام سے قبر میں سوتے رہیں لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں کہ وہاں کا عذاب یہاں کے عذاب سے ہزار گنا زیادہ ہو گا۔“

”ہوا کرے۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر قائم ہوں۔“

”آپ کبھی اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہے“

”یہ سب جھوٹ ہے میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو اس پر قائم رہتا ہوں ابھی پچھلے دنوں میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں سگریٹ نہیں پیوں گا چنانچہ اب تک اس پر قائم ہوں۔“

”پاخانے میں سگریٹ کے ٹکڑے کہاں سے آتے ہیں۔“

”مجھے کیا معلوم۔ تم پیتی ہو گی۔“

”میں مجھے تو اس چیز سے سخت نفرت ہے“

”ہو گی مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر پاخانہ بھی کوئی ایسی معقول جگہ ہے جہاں پر سگریٹ پیے جائیں۔“

”چوری چھپے جو پینا ہوا پاخانے کے علاوہ اور موزوں و مناسب جگہ کیا ہو سکتی ہے آپ میرے ساتھ فراڈ نہیں کر سکتے۔ میں آپ کی رگ رگ کو پہچانتی ہوں۔“

”یہ تم نے مجھ سے آج ہی کہا کہ میں پاخانے میں چھپ چھپ کر سگریٹ پیتا ہوں“

”میں نے اس لیے اس کا ذکر آپ سے نہیں کیا تھا۔ آپ چونکہ تمباکو کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے سگریٹ نوشی آپ ترک نہیں کر سکتے لیکن یہ بہر حال بہتر ہے کہ آپ دو ایک سگریٹ دن میں پی لیتے ہیں جہاں آپ پچاس کے قریب پھونکتے تھے۔“

”میں نے ڈھائی برس میں ایک سگریٹ بھی نہیں پیا۔ بھنگی پیتا ہو گا۔“

”بھنگی گولڈ فلیک اور کریون اے نہیں پی سکتا۔“

”حیرت ہے“

”کس بات کی۔ حیرت تو مجھے ہے کہ آپ صاف انکار کر رہے ہیں مجھے بنا رہے ہیں“

”نہیں میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سگریٹ وہاں کون پیتا ہے“

”آپ کے سوا اور کون پی سکتا ہے مجھے تو اس کے دُھوئیں سے کھانسی ہو جاتی ہے مجھے تو اس سے سخت نفرت ہے معلوم آپ لوگ کس طرح دُھواں اپنے اندر کھینچتے ہو۔“

”خیر اس کو چھوڑو۔ میرا پارکر قلم مجھے دو۔“

”میرے پاس نہیں ہے“

”تمہارے پاس نہیں ہے تو کیا میرے پاس ہے آج صبح تم خدا معلوم کسے خط لکھ رہی تھیں تمہاری انگلیوں میں میرا ہی قلم تھا۔“

”تھا۔ لیکن مجھے کیا معلوم کہاں گیا۔ میں نے آپ کے میز پر رکھا ہو گا۔ اور آپ نے اُٹھا کر کسی دوست کو دے دیا ہو گا۔ آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔“

”دیکھو بیگم میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ قلم میں نے کسی دوست کو نہیں دیا ہو سکتا ہے کہ تم نے اپنی کسی سہیلی کو دے دیا ہو“

”میں کیوں اتنی قیمتی چیز کسی سہیلی کو دینے لگی۔ وہ تو آپ ہیں کہ ہزاروں اپنے دوستوں میں لُٹا دیتے ہیں۔“

”اب سوال یہ ہے کہ وہ قلم ہے کہاں مجھے چند ضروری خط لکھنے ہیں جاؤ میری جان ذرا تھوڑی سی تکلیف کرو ممکن ہے ڈھونڈنے سے مل جائے۔“

”نہیں ملے گا۔ آپ فضول مجھے تکلیف دینا چاہتے ہیں“

”تو ایسا کرو دوات اور پن ہولڈر لے آؤ۔“

”دوات تو صبح آپ کی بچی نے توڑ دی پن ہولڈر بھانجے کے بیٹے نے“

”اتنے پن ہولڈر تھے کہاں گئے۔“

”آپ ہی استعمال کرتے ہیں“

”میں نے آج تک پن ہولڈر کبھی استعمال نہیں کیا کبھی کبھی تم کیا کرتی ہو۔“

”آپ کی بچیاں آفت کی پتلیاں ہیں وہی توڑ پھوڑ کے پھینک دیتی ہوں گی۔“

”تم دھیان کیوں نہیں دیتیں“

”کس کس چیز کا دھیان رکھوں مجھے گھر کے کام کاج سے فرصت نہیں ہے“

”اسی لیے تو میری دو گھڑیاں غائب ہو گئیں۔ جب دیکھو لیٹی رہتی ہو۔ خدا معلوم گھر کا کام کاج لیٹے لیٹے کرتی ہو۔“

”گھر کا سارا کام تو آپ کرتے ہیں“

”میں اس کا دعوٰے نہیں کرتا بہر حال جو کچھ میں کر سکتا ہوں کرتا رہتا ہوں“

”کیا کرتے ہیں آپ؟“

”ہفتے میں ایک دو دفعہ مارکیٹ جاتا ہوں مرغی اور مچھلی خرید کر لاتا ہوں انڈے بھی کوئلے کا پرمٹ بھی حاصل کرتا ہوں گھی کا بندوبست کرتا ہوں اب میں اور کیا کر سکتا ہوں۔“

”مصروف آدمی ہوں دفتر میں جاتا ہوں وہاں نہ جاؤں تو مہینہ ختم ہونے کے بعد سات سو روپے کیسے آ سکتے ہیں۔“

”ان سات سو روپوں میں سے آپ مجھے کتنے دیتے ہیں“

”پورے سات سو روپے“

”ٹھیک ہے لیکن آپ اپنا گزارہ کس طرح کرتے ہیں۔؟“

”اللہ بہتر جانتا ہے“

”رشوت لیتے ہیں اور کیا ورنہ ساری تنخواہ مجھے دینے کے بعد آپ پانچ سو پچپن کے سگریٹ نہیں پی سکتے۔“

”میں نے سگریٹ پینے ترک کر دیے ہیں“

”آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔“

”میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ تم میرا پار کر قلم ذرا ڈھونڈ کے نکالو“

”میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس نہیں ہے۔“

”تو اور کس کے پاس ہے“

”مجھے کیا معلوم میں نے صبح خط لکھ کر سینٹل پیس پر رکھ دیا۔“

”وہاں تو اس کا نام و نشان نہیں“

”آپ نے کسی دوست کو بخش دیا ہو گا۔ گیارہ بجے آپ کے چند دوست آئے تھے۔“

”میرے دوست کہاں تھے۔ صرف ملاقات کرنے آئے تھے۔ میں تو ان کا نام بھی نہیں جانتا۔“

”میرا نام بھی آپ بھول گئے ہوں گے بتایئے کیا ہے۔“

”تمہارا نام۔ لیکن بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم۔ تم ہو۔ بس۔ ؟“

”ان پندرہ برسوں میں آپ کو میرا نام بھی یاد نہیں رہا میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کس قسم کے انسان ہیں۔“

”قسمیں پوچھو گی تو حیران رہ جاؤ گی ایک کروڑ سے زیادہ ہوں گی اب جاؤ میرا قلم ڈھونڈو۔“

”میں نہیں جانتی کہاں ہے۔“

”یہ قمیص تم نے نئی سلوائی ہے“

”ہاں۔“

”گریبان بہت خوبصورت ہے ارے یہ اس میں تو میرا قلم اٹکا ہوا ہے“

”سچ میں نے یہاں اُڑس لیا ہو گا۔ معاف کیجیے گا۔“

”ٹھہرو میں خود نکال لیتا ہوں۔ ممکن ہے تم قمیص پھاڑ ڈالو“

”یہ کیا گرا ہے“

”یہ کیا ہے۔ ارے یہ تو پانچ سو پچپن سگرٹوں کا ڈبہ ہے کہاں سے آگیا ہے۔“

سنتر پنچ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوسنتر پنچ

میں لاہور کے ایک اسٹوڈیو میں ملازم ہوا۔ جس کا مالک میرا بمبئی کا دوست تھا۔ اس نے میرا استقبال کیا۔ میں اس کی گاڑی میں اسٹوڈیو پہنچا تھا بغل گیر ہونے کے بعد اس نے اپنی شرافت بھری مونچھوں کو جو غالباً کئی دنوں سے ناتراشیدہ تھیں۔ تھرکا کر کہا:

”کیوں خواجہ! چھوڑ دی۔“

میں نے جواب دیا۔

”چھوڑنی پڑی۔“

اسٹوڈیو کا مالک جو اچھا فلم ڈائریکٹر بھی ہے (میں اسے سہولت کی خاطر گیلانی کہوں گا) مجھے اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرنے کے بعد اس نے چائے منگوائی جو نہایت ذلیل تھی' زبردستی پلائی۔ کئی سگریٹ اس دوران خود پھونکے اور مجھ سے پھنکوائے۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

”یار' چھوڑو اب چائے کی بکواس کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے آج اتنے برسوں کے بعد کیسے یاد کر لیا“

”بس ایک دن اچانک یاد آ گئے۔ بُلا لیا۔ بتاؤ اب صحت کیسی ہے۔“

”تمہاری دعا سے ٹھیک ہے۔“

میرے لہجے میں دوستانہ طنز تھا۔ وہ ہنسا۔

”واہ‘ میرے مولوی صاحب۔ میرا خیال ہے کہ جب سے تم خشک خشک ہوئے ہو۔ تمہاری ہر وقت شگفتہ رہنے والی طبیعت ٹھہرے پانی کی طرح ٹھہر گئی ہے۔“

”ہو گا ایسا ہی۔“

”ہو گا کیا۔ ہے ہی ایسا معاملہ۔ لیکن خدا نہ کرے‘ ایسی ذہانت جس کے سب معترف ہیں۔ اس کا بھی یہی حشر ہو۔ کیا تم اب بھی فلم کہانی کا ڈھانچہ تیار کر سکتے ہو۔ فرسٹ کلاس کہانی۔“

میں نے اس سے کہا:

”فرسٹ‘ سیکنڈ‘ انٹر اور تھرڈ میں نہیں جانتا۔ البتہ کہانی ضرور ہو گی۔ تم سوچتے ہو فرسٹ کی کہانی وہ اسکرین پر آتے ہی تھرڈ نہ بن جائے۔ یا تھرڈ جس کو تم نے ڈبوں میں بند کر کے گودام میں رکھ چھوڑا تھا۔ وہ گولڈن جوبلی فلم ثابت ہو۔ کیا درست نہیں۔ خیر اِن باتوں کو چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو۔“

اس نے مجھے ایک سگریٹ سلگا کر دیا اور سنجید گی سے کہا:

”دیکھو منٹو۔ میں ایک کہانی چاہتا ہوں۔ بڑا دلچسپ رومان ہو اور تم مجھے اس کا مفصل اسکیچ ایک ہفتے کے اندر اندر دے دو۔ کیونکہ میں فلم ڈسٹری بیوٹر سے کنٹریکٹ کر چکا ہوں تم بتاؤ کتنی دیر میں لکھ لو گے۔“

”فراغت سے ایک مہینے کے بعد۔“

سردیوں کا موسم تھا اس نے اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ بڑے زور کے ساتھ ملے۔ اس کے اس عمل سے دو چیزیں ظاہر ہوتی تھیں اول یہ کہ اس کے ہاتھ گرم ہو گئے ہیں۔ دوم یہ کہ اس کے سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے کہ اس کو کہانی وقت پر مل جائے گی اور وہ جو کہ میری طرح تیزی سے کام کرنے والا ہے‘ اسے وقت مقررہ کے اندر اندر ڈائریکٹ کر کے اس کے پرنٹ ڈسٹری بیوٹر کے حوالے کر دے گا اور کنٹریکٹ کی رو سے جو بقایا رقم اس کے نام نکلتی تھی‘ اسی وقت میز پر دھروا لے گا۔ اس نے چند لمحات غور کیا۔

”کل ہی کام شروع کر دے گا۔“

میں نے جواب دیا:

”کام تو میں شروع کر دوں۔ لیکن یہاں میرے لیے کوئی علیحدہ کمرہ ہونا چاہیے۔“

”ہو جائے گا۔“

”اور ایک اسسٹنٹ۔“

”مل جائے گا۔ تو کل سے آنا شروع کر دو گے۔“

میں نے اس سے کہا:

”دیکھو گیلانی۔ میرے گھر سے اور تمہارے اسٹوڈیو تک کا فاصلہ کافی ہے۔ تانگے میں آؤں تو قریب قریب ڈیڑھ گھنٹہ۔ بس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اس نے پوچھا

”کیوں۔“

”یعنی اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بس اسٹینڈ پر کھڑے رہو۔ خدا خدا کر کے پانچ نمبر کی بس آ گئی۔ مسافروں سے بھری ہوئی اور وہ بغیر ٹھہرے چل دی اور تم خود کو دنیا کا کم ترین انسان محسوس کرتے ہو۔ جی میں آتا ہے کہ خودکشی کر لو۔ یا پھر دنیا والوں کی بے رخی سے نجات حاصل کرنے کے لیے سنیاس دھار لوں۔“

گیلانی نے اپنی شرارت بھری مونچھیں تھرکائیں۔

”میں شرط بدنے کیلیے تیار ہوں کہ تم کبھی دنیا تیاگ نہیں سکتے جس دنیا میں ہر قسم کی شراب ملتی ہے۔ اور خوبصورت عورتیں بھی۔“

میں نے چڑ کر کہا:

”عورتیں جائیں جہنم میں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں بمبئی کے ہر اسٹوڈیو میں‘ جہاں میں نے کام کیا‘ ان سے دور ہی رہا۔“

”تم تو خیر اپنے وقت کے ڈون جو آن Donjyan ہو۔“

”مذاق اُڑاتے ہو تم خواجہ میرا۔“

میں نے سنجید گی کے ساتھ اس سے کہا:

”نہیں گیلانی ع یہ رُتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔ یا یوں کہہ لو ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ گیلانی مسکرایا۔

”خدائے بخشندہ تو بڑے عرصے سے تمہیں مرحوم و مغفور کر چکا ہے۔ تم بخشی ہوئی روح ہو۔“

میں نے کہا:

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں۔“

”فلسفہ مت بگھارو یار۔ یہ بتاؤ کیا ابھی تک تمہارے پاس وہ اردو ٹائپ رائٹر موجود ہے۔“

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ وہ ایکٹریس جس سے تم نے کلکتہ میں شادی کی تھی‘ ابھی تک تمہارے پاس موجود ہے۔“

گیلانی نے فخریہ انداز میں جواب دیا:

”موجود کیوں نہیں ہو گی۔ گویا تمہاری نظر میں ایکٹریس اور ٹائپ رائٹر میں کوئی فرق نہیں۔“

میں نے اس سے کہا:

”کیا فرق ہے۔ ایک فلم پر ٹائپ کرتی ہے۔ دوسری کاغذ پر۔ دونوں کسی وقت بھی بگڑ سکتی ہیں۔“

گیلانی میری ان باتوں سے تنگ آ گیا تھا۔ آخر میں نے اس کو دلاسا دیا۔

”یار‘ یہ سب مذاق تھا۔ تو میں کل آجاؤں۔ میرا مطلب ہے تم گاڑی بھیج دو گے ؟“

گیلانی صوفے پر سے اٹھا۔ اس کے ساتھ میں بھی۔ اس نے کہا:

”ہاں۔ ہاں بھئی۔ کب چاہیے تمہیں گاڑی۔“

”کوئی وقت بھی مقرر کر لو۔ ساڑھے نو بجے صبح۔“

”ٹھیک ہے۔“

”تم کاغذ وغیرہ آج ہی منگوا لینا۔ تاکہ میں اسٹوڈیو پہنچتے ہی کام شروع کر دُوں۔ اور تم سے الٹا نہ سنوں کہ دیکھو تم نے مجھے لیٹ ڈاؤن دیا۔ میرا اتنے ہزار روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔“

گیلانی نے بڑے پیار سے کہا:

”کیا بکتے ہو یار۔ میں تمہاری طبیعت سے کیا واقف نہیں۔ کبھی کبھی تم ڈبکی لگا جایا کرتے ہو۔“

میں نے اُس کو یقین دلایا:

”نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ تم مطمئن رہو۔ ہاں میرا ٹائپ رائٹر یہاں محفوظ تو رہے گا؟“

گیلانی کی عادت ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر چِڑ جاتا ہے۔

”محفوظ نہیں رہے گا تو کیا غنڈے اغواہ کرنے آجائیں گے۔ اپنے کسی عاشق کے ساتھ تمہاری مشین بھاگ نکلے گی۔“

میں بہت ہنسا۔ ہنستے ہنساتے ہم دونوں نے اسٹوڈیو کا چکر لگایا۔ اس کے بعد اس نے مجھے الوداع کہی اور میں اسی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ جہاں پہنچتے ہی میں نے ٹائپ رائٹر کی جھاڑ پونچھ کی۔ اس لیے کہ ایک مدت سے میں نے اسے استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ فلمی کہانی لکھنے کا اس دوران میں کوئی موقع ہی میسر نہ آیا۔ بِگڑا ہوا مکینک یا مستری آرٹسٹ بن جاتا ہے‘ یہ میرا اپنا ذاتی اختراع کردہ محاورہ ہے۔ گیلانی شروع شروع میں مکینک تھا۔ بگڑ کر وہ آرٹسٹ بن گیا‘ پر وہ محنتی تھا۔ جب وہ مستری تھا تو اسے زیادہ سہولتیں میسر نہیں تھیں لیکن جب کیمرہ قلی سے ترقی کرتا کرتا کیمرہ مین بن گیا تو اس نے کیمرے کے ہر پیچ کے متعلق اپنی خداداد ذہانت اور جستجو طلب طبیعت کی بدولت یہ دریافت کر لیا کہ ان کالوہے کے اس چوکھٹے میں اپنی اپنی جگہ کیا مصرف ہے۔ کیمرے کو وہ الٹا کرتا۔ کبھی سیدھا۔ کبھی اس کا گیٹ کھول کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اس سے اپنے مختلف سائز کے پیچ پُرزوں کے ذریعے بوس و کنار میں مشغول رہتا۔ فرصت کے اوقات۔ یعنی جب شوٹنگ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی سائیکل پر شہر پہنچتا اور سارا دن کباڑیوں کی دکانوں پر صرف کرتا۔ اس کو دنیا کے تمام کباڑیوں سے محبت ہے‘ اور ان کے کباڑ خانوں کو وہ بڑی مقدس جگہیں تصوّر کرتا تھا۔ وہ ان دُکانوں میں بیٹھ کر منصوبہ تیار کرتا رہتا کہ سلائی مشین کا ہینڈل جو بیکار پڑا ہے اگر لوہے کے فلائی ٹکڑے کے ساتھ ویلڈ کر دیا جائے اور اس کے فلاں کے اندر چھوٹے پنکھے جو نکڑ والی دکان میں موجود ہیں‘ لگا دیئے جائیں تو فرسٹ کلاس دھونکنی بن سکتی ہے۔ خدا معلوم وہ کیا کیا سوچتا تھا۔ ان دنوں دراصل ذہنی ورزش کر رہا تھا۔ یہ وہ تیاری تھی جو وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کیلیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایڈیٹنگ بھی اسی طرح سیکھی۔ آس پاس کی ہر ننھی سے ننھی شے کا مطالعہ کیا‘ اور آخر ایک دن اس نے اسٹوڈیو کی ایک فلم کی ایسی عمدہ ایڈیٹنگ کی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ سیٹھ نے سوچا۔ کہ اچھے کیمرہ مین تو مل جائیں گے مگر ایسا باکمال ایڈیٹر جو سیلولائیڈ کے چھوٹے بڑے

فیتے کے ٹکڑوں کو اس چابک دستی سے جوڑتا ہے کہ پھر اس میں مزید کتر بیونت ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ایڈیٹنگ ڈیپارٹ منٹ کا ہیڈ بنا دیا۔ تنخواہ اس کی وہی رہی جو بحیثیت کیمرہ مین تھی۔ وہ اپنا کام بڑی محنت اور تندہی سے کرتا رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ لیبارٹری سے بھی دلچسپی لیتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس نے اس کے کل پرزوں میں چند اصلاحات اور ترکیبیں پیش کیں جو بڑی رڈو کد کے بعد قبول کرلی گئیں۔ نتیجہ دیکھا گیا تو بڑا حوصلہ افزا تھا۔ سیٹھ نے ایک دن سوچا

”کیوں نہ گیلانی کو ایک فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے“

جب اس سے پوچھا:

”تم کوئی فلم ڈائریکٹ کرلوگے۔“

تو اس نے بڑی خود اعتمادی سے جواب دیا:

”ہاں سیٹھ۔ پر اس میں کوئی دخل نہ دے“!

کہانی آدھی گیلانی نے خود بنائی۔ آدھی اِدھر اُدھر کے منشیوں سے لکھوائی اور اللہ کا نام لے کر شوٹنگ شروع کردی۔ یہ فلم ختم ہوا اور نمائش کیلیے مقامی سینما ہاؤس میں پیش کیا گیا تو اس نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ اس کے بعد اس نے لاہور میں دو فلم بنائے۔ یہ بھی سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئے۔ ایک کلکتہ جا کر پھر بنایا۔ وہ بھی کامیاب تھا۔ یہاں وہ بمبئی پہنچا۔ کیونکہ وہاں کے فلمسازوں نے بڑی تگڑی تگڑی آفریں بھیجی تھیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس نے آفر قبول کرکے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے اور کہانی

”چن وے“

کا منظر نامہ خود لکھا۔ فلم بن گیا۔ اور اتنا بڑا باکس آفس ثابت نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ بٹوارے کے باعث دوسرے شہروں کے مانند بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے جس طرح دوسرے مسلمان ہجرت کر رہے تھے اس طرح گیلانی بھی بمبئی چھوڑ کر کراچی چلا گیا۔ یہاں سے وہ لاہور پہنچا اور ایک اسٹوڈیو کی داغ بیل رکھی۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے لے کر کیلیں ٹھوکنے والے تک کو اس کی ذاتی نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا۔ قصّہ مختصر کہ اسٹوڈیو تیار ہو گیا۔ لاہور کے مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ جب یہ اسٹوڈیو بنا تو ان کی جان میں جان آئی۔ چنانچہ یہاں شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اس کے بعد یہ چل نکلا۔ گیلانی اس دوران میں اسٹیج اور اِدھر اُدھر کے متعلقہ سامان کو درست اور مرمت کرانے میں مشغول رہا اس کا دست راست لاہور ہی کا ایک نوجوان سراج دین تھا۔ جو قریب قریب آٹھ برس سے اس کے ساتھ تھا۔ نے کہا ٹائپ رائٹر کی دال لے کر کھالو۔ اس کے بعد گیلانی نے خود میرے ٹائپ رائٹر کا معائنہ کیا اور فیصلہ صادر کر دیا کہ مشین میں کوئی نقص نہیں۔ مگر سراج اپنے تجربے کے بل بوتے پر مصر تھا۔

”نہیں حضور۔ یہ اب مرمت طلب ہو چکی ہے۔ بڑے اور چھوٹے رولر سب نئے لگوانے پڑیں گے۔ اوور ہالنگ ہو گی۔ اس کا کتا بھی ناقص ہو چکا ہے' وہ بھی پڑے گا۔“

”تمہاری ٹانگوں پر۔“

”آپ میر امذاق نہ اُڑائیے۔ اچھا۔ خیر آپ ہی صحیح کہتے ہیں“

یہ کہہ کر وہ اپنے گنجے سر پر ٹوپی درست کرتا ہوا چلا گیا۔ گیلانی نے اپنا خاص ٹول بکس منگوایا اور مشین کے سب پرزے الگ الگ کر کے رکھ دیے کوئی پرزہ پتھر پر گھسایا۔ کوئی ریگمال پر۔ کسی کے سریش لگائی۔ کسی کو تیل۔ اور ان کو دوبارہ فٹ کر کے فتح مندانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا:

”کیوں صاحب! ٹھیک ہو گئی یا نہیں۔“

میں نے ایسے ہی کہہ دیا

”ہاں' اب ٹھیک ہے۔“

گیلانی نے اپنے پاس کھڑے اسسٹنٹ کو بلایا:

”جاؤ اس اُلو کے پٹھے ایکسپرٹ سراج کو بلا کر لاؤ۔“

چند منٹ میں سراج حاضر ہو گیا۔ اس نے مشین چلائی تو دس پندرہ بار ٹپ ٹپ کرنے کے بعد ہی خاموش ہو گئی سراج نے گیلانی سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑے وقفے کے بعد گیلانی بڑے تحکمانہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوا

”اچھا تم اسے بناؤ۔ دیکھیں تم کیا تیر مارتے ہو۔“

مجھے اپنی پندرہ سالہ عزیز مشین کی اس درگت پر ترس آرہا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جب اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے پڑے تھے۔ دوسرے دن سراج نے اپنا ٹول بکس ریکارڈنگ میں سے منگوایا اور میری مشین پر اپنی ماہرانہ سرجری شروع کر دی۔ ضروری پرزے نکال کر اس نے علیحدہ رکھ لیے اور باقی حصّے پٹرول میں ڈال دیے اب ان کی چتا جلانے کیلیے صرف ماچس کی ایک تیلی ہی کافی تھی۔ میں خاموش رہا۔ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ کتے کے جبڑوں کو ایک پلاس کے ساتھ زور سے پکڑا اور میری طرف کرتے ہوئے بولا:

”لو دیکھ لو۔ میں نہ کہتا تھا۔ کتا کام نہیں کر رہا۔ اس کا تو سنتر پنچ ہی خراب ہے۔“

”سنتر پنچ۔“

”ہاں۔“

اور سراج ایک بار پھر اس کا سنتر پنچ ٹھیک کرنے لگا۔

سہائے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوسہائے

”یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں، ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہو گا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے، لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا ہے، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیے جاسکتے ہیں۔ مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں، روح میں ہوتا ہے۔ چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟“

ممتاز اس روز بہت ہی پر جوش تھا۔ ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ وہ ایک غیر متعین عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا۔ پاکستان، جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہم تینوں ہندو تھے۔ مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اسکا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اسی صدمے کے زیر اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔“

ممتاز نے اس سے پوچھا۔

”کیا کرو گے؟“

جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

”میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔“

”یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔“

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ کی۔ جگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روانگی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے۔

”میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے، میں تمہیں مار ڈالوں“

غالباً وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں۔ ممتاز کو جو کہ اس کا جگری دوست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتونی ہو گیا تھا۔ خاص طور پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے۔ صبح اٹھتے ہی اس نے پینا شروع کر دی۔ اسباب وغیرہ کچھ اس انداز سے باندھا اور بندھوایا جیسے وہ کہیں سیر و تفریح کے لیے جا رہا ہے۔ خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہنستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں ناقابلِ بیان مسرت محسوس کر رہا ہے، لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے جذبات چھپانے کیلیے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی یک لخت روانگی کے متعلق بات کروں۔ اشارۃً میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقعہ ہی نہ دیا۔ جگل تین چار پگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔ میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے۔ ڈاکٹروں کی فیسیں دینی تھیں۔ لانڈری سے کپڑے لانے تھے۔ یہ سب کام اس نے ہنستے کھیلتے کیے، لیکن جب اس نے ناکے کے ہوٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ برج موہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا۔

”یاد ہے برج۔ آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتلا تھا، گوبند نے ہمیں ایک روپیہ ادھار دیا تھا۔“

راستے میں ممتاز خاموش رہا۔ مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا، ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر، لیکن وہ کچھ ایسی پر خلوص تھیں کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصہ لیتے رہے۔ جب روانگی کا وقت قریب آیا تو جگل بھی شامل ہو گیا، لیکن جب ٹیکسی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو گئے۔ ممتاز کی نظریں بمبئی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہتیں۔ حتیٰ کہ ٹیکسی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی۔ بے حد بھیڑ تھی۔ ہزار ہار ریفیوجی جا رہے تھے۔ خوشحال بہت کم اور بدحال بہت زیادہ۔ بے پناہ ہجوم تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اس کی دیکھی بھالی نہیں۔ جو اس کے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔ جب کیبن میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرشے پر لے گیا۔ ادھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے، ممتاز دیر تک دیکھتا رہا، پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ یہ محض فریبِ نظر ہے۔ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا۔ لیکن یہ فریبِ نظر کس قدر دلکش ہے۔ یہ ملاپ“!

جگل خاموش رہا۔ غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چٹکیاں لے رہی تھی۔ میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔“

ممتاز نے جہاز کی بار سے برانڈی منگوائی، کیونکہ وہ صبح سے یہی پی رہا تھا۔ ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ریفیوجی دھڑا دھڑ جہاز میں سوار ہو رہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلا رہے تھے۔ جگل نے دفعتاً ایک ہی جرعے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا۔

”مجھے معاف کر دینا ممتاز۔ میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ پہنچایا تھا۔“

ممتاز نے تھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا۔

”جب تم نے کہا تھا میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔ کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا۔ نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔“

جگل نے اثبات میں سر ہلایا

”۔ لیکن مجھے افسوس ہچ“

”تم مجھے مار ڈالتے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا۔“

ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو۔ ایک مسلمان کو۔ ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔ وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرامزدگی کو نہیں بلکہ خود اس کو مار ڈالا ہے۔ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے۔ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا۔ لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا۔“

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

”ہو سکتا ہے، میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے، لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا۔ مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں۔ مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔ لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا۔ تم نے یہ خبر بمبئی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا۔ بتاؤ، تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟۔ اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔ میں تو یہ کہوں گا، مرنے والے کتے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار۔ بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے۔“

باتیں کرتے کرتے ممتاز بہت جذباتی ہو گیا۔ لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا۔ میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، یقین، دھرم، عقیدت۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے۔ جو چھرے، چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ میں نے اس سے کہا

”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔“

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے سے چبنی سے کہا۔

”نہیں بالکل ٹھیک نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے۔ لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اچھی طرح ادا نہیں کر سکا۔ مذہب سے میری مراد، یہ مذہب نہیں، یہ دھرم نہیں، جس میں ہم میں سے ننانوے فی صدی مبتلا ہیں۔ میری مراد اس خاص چیز سے ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے مقابلے میں جداگانہ حیثیت بخشتی ہے۔ وہ چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے۔ لیکن یہ چیز کیا ہے؟۔ افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر نہیں دکھا سکتا“

یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کیا

”لیکن اس میں وہ کون سی خاص بات تھی؟۔ کٹر ہندو تھا۔ پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی؟“

میں نے پوچھا۔

”کس کی؟“

”ایک بھڑوے کی۔“

ہم تینوں چونک پڑے۔ ممتاز کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا، اس لیے میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ایک بھڑوے کی؟“

ممتاز نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرفِ عام میں ایک بھڑوا تھا۔ عورتوں کا دلال۔ لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا۔“

ممتاز تھوڑی دیر کے لیے رک گیا، جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے۔ چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا

”اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔ کچھ سہائے تھا۔ بنارس کا رہنے والا۔ بہت ہی صفائی پسند۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پردے کا معقول انتظام تھا۔ چارپائیاں اور پلنگ نہیں تھے۔ لیکن گدیلے اور گاؤ تکیے موجود تھے۔ چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اجلے رہتے تھے۔ نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ صرف صفائی ہی نہیں، ہر کام۔ اور وہ سر سے بلا کبھی نہیں ٹالتا تھا۔ دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا۔ رات زیادہ گزر گئی ہے اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجیے۔ اگر کسی لڑکے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپاتا نہیں تھا۔ اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصے میں بیس ہزار روپے کما چکا ہے۔ ہر دس میں سے ڈھائی کمیشن کے لے لے کر۔ اسے صرف دس ہزار اور بنانے تھے۔ معلوم نہیں صرف دس ہزار اور کیوں، زیادہ کیوں نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور بزازی کی دکان کھولے گا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دکان کھولنے کا آرزومند کیوں تھا۔“

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا

”عجیب و غریب آدمی تھا۔“

ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی

”۔ میرا خیال تھا کہ وہ سر تا پا بناوٹ ہے۔ ایک بہت بڑا افراڈ ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو جو اس کے دھندے میں شریک تھیں۔ اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ یہ بھی اس وقت میرے لیے بعید از وہم تھا کہ اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹس کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کراتا تھا۔ اور یہ بات تو بالکل ناقابل یقین تھی کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔ اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا، مینہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں۔ میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جا کر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں۔ یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشنو ہیں۔ میں یہ سن کر دل ہی دل میں مسکرایا کہ مجھے بنا رہا ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرا دی تھی، لاہور سے خط لکھا ہے کہ داتا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی۔ اب اس نے سہائے کے لیے منت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جا کر بزازی کی دکان کھول سکے۔ یہ سن کر تو میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا، چونکہ میں مسلمان ہوں۔ اس لیے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے ممتاز سے پوچھا۔

”تمہارا خیال غلط تھا؟“

”بالکل۔۔ اس کے قول و فعل میں کوئی بعد نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو، بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں۔ مگر وہ ایک بہت ہی عمدہ انسان تھا۔“

جگل نے سوال کیا۔

”یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا“!

”اس کی موت پر“

یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے۔

”فسادات شروع ہو چکے تھے۔ میں علی الصبح اٹھ کر بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔ کرفیو کے باعث بازار میں آمد و رفت بہت ہی کم تھی۔ ٹریم بھی نہیں چل رہی تھی۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا، تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے ٹوکرے کے پاس گٹھڑی سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پاٹی والا (مزدور) سو رہا ہے۔ لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لوتھڑے دیکھے تو رک گیا۔ واردات قتل کی تھی، میں نے سوچا اپنا راستہ لوں، مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں پھر رک گیا آس

پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا، مگر خون کے دھبوں سے بھرا ہوا۔ میں اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا۔ اس کی ٹول کی سفید قمیض جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی۔ زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا۔ اس نے ہولے ہولے کراہنا شروع کر دیا تو میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے۔ ایک دو بار میں نے اس کو نامکمل نام سے بھی پکارا۔ میں اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم اس کے سارے بدن میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا۔

”آپ ؟۔ آپ ؟“

میں نے اس سے تلے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دی۔ وہ کیسے ادھر آیا۔ کس نے اس کو زخمی کیا۔ کب سے وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں ؟

”اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ جب میں نے سارے سوال کر ڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے۔ میرے دن پورے ہو چکے تھے۔ بھگوان کو یہی منظور تھا“!

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا، لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر، مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے، اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھا۔ میں ڈرپوک تو نہیں، لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا، ممکن ہے میں ہی پکڑا جاؤں، دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ پچھ کے لیے دھر لیا جاؤں گا۔ ایک بار خیال آیا، اگر میں اسے ہسپتال لے گیا تو کیا پتا ہے اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے۔ سوچے، مرنا تو ہے، کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا۔ میں ٹھہر گیا۔ نہ ٹھہرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے۔ میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا، گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں مجھے جانا ہے۔ اس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے بڑی مشکلوں سے اپنی قمیض کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا، مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا

”۔ نیچے بنڈی ہے۔ ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں۔ یہ۔ یہ سلطانہ کا مال ہے۔ میں نے۔ میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا۔ آج اسے۔ آج اسے بھیجنے والا تھا۔ کیونکہ۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ اسے دے دیجیے گا اور۔ کہئے گا فوراً چلی جائے۔ لیک۔ اپنا خیال رکھیے گا“!

ممتاز خاموش ہو گیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز، سہائے کی آواز میں جو جے ہسپتال کے فٹ پاتھ پر ابھری تھی، دور، اُدھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں مدغم تھے، حل ہو رہی ہے۔ جہاز نے وسل دیا تو ممتاز نے کہا۔

”میں سلطانہ سے ملا۔ اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔“

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ ہِل رہا تھا۔ میں جگل سے مخاطب ہوا۔

”کیا تمھیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز، سہائے کی روح کو بلا رہا ہے۔ ہم سفر بنانے کے لیے ؟“

جگل نے صرف اتنا کہا۔

”کاش، میں سہائے کی روح ہوتا“!

سو کینڈل پاور کا بلب

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوسو کینڈل پاور کا بلب

وہ چوک میں قیصر پارک کے باہر جہاں ٹانگے کھڑے رہتے ہیں۔ بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ خاموش کھڑا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے! یہی پارک جو صرف دو برس پہلے اتنی پُر رونق جگہ تھی اب اجڑی پچڑی دکھائی تھی۔ جہاں پہلے عورت اور مرد شوخ و شنگ فیشن کے لباسوں میں چلتے پھرتے تھے۔ وہاں اب بے حد میلے کچیلے کپڑوں میں لوگ ادھر ادھر بیم قصد پھر رہے تھے۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی مگر اس میں وہ رنگ نہیں تھا جو ایک میلے ٹھیلے کا ہوا کرتا تھا۔ آس پاس کی سیمنٹ سے بنی ہوئی بلڈنگیں اپنا روپ کھو چکی تھیں۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ ایک دوسرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے بیوہ عورتیں۔ وہ حیران تھا کہ وہ غازہ کہاں گیا۔ وہ سیندور کہاں اڑ گیا۔ وہ سر کہاں غائب ہو گئے جو اس نے کبھی یہاں دیکھے اور سنے تھے۔ زیادہ عرصہ کی بات نہیں، ابھی وہ کل ہو تو (دو برس بھی کوئی عرصہ ہوتا ہے) یہاں آیا تھا۔ کلکتے سے جب اسے یہاں کی ایک فرم نے اچھی تنخواہ پر بلایا تھا تو اس نے قیصر پارک میں کتنی کوشش کی کہ اسے کرائے پر ایک کمرہ ہی مل جائے مگر وہ ناکام رہا تھا۔ ہزار فرمائشوں کے باوجود۔ مگر اب اس نے دیکھا کہ جس

کنجڑے، جولاہے اور موچی کی طبیعت چاہتی تھی۔ فلیٹوں اور کمروں پر اپنا قبضہ جمارہا تھا۔ جہاں کسی شان دار فلم کمپنی کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ وہاں چولہے سلگ رہے ہیں۔ جہاں کبھی شہر کی بڑی بڑی رنگین ہستیاں جمع ہوتی تھیں۔ وہاں دھوبی میلے کپڑے دھو رہے ہیں۔ دو برس میں اتنا بڑا انقلاب! وہ حیران تھا۔ لیکن اس کو اس انقلاب کا پس منظر معلوم تھا۔ اخباروں کے ذریعہ سے اور ان دوستوں سے جو شہر میں موجود تھے۔ اسے سب پتہ لگ چکا تھا کہ یہاں کیسا طوفان آیا تھا۔ مگر وہ سوچتا تھا کہ یہ کوئی عجیب و غریب طوفان تھا جو عمارتوں کا رنگ و روپ بھی چوس کر لے گیا۔ انسانوں نے انسان قتل کیے۔ عورتوں کی بے عزتی کی۔ لیکن عمارتوں کی خشک لکڑیوں اور ان کی اینٹوں سے بھی یہی سلوک کیا۔ اس نے سنا تھا کہ اس طوفان میں عورتوں کو ننگا کیا گیا تھا۔ ان کی چھاتیاں کاٹی گئی تھیں۔ یہاں اس کے آس پاس جو کچھ تھا۔ سب ننگا اور جوبن بریدہ تھا۔ وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ جس کی مدد سے وہ اپنی رہائش کا کوئی بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ اس دوست نے اس سے کہا کہ تم قیصر پارک کے پاس جہاں تانگے کھڑے رہا کرتے ہیں میرا انتظار کرنا۔ دو برس ہوئے جب وہ ملازمت کے سلسلے میں یہاں آیا تو یہ ٹانگوں کا اڈا بہت مشہور جگہ تھی، سب سے عمدہ، سب سے بانکے ٹانگے صرف یہیں کھڑے رہتے تھے۔ کیونکہ یہاں سے عیاشی کا ہر سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ اچھے سے اچھا ریسٹورنٹ اور ہوٹل قریب تھا۔ بہترین چائے، بہترین کھانا اور دوسرے لوازمات بھی۔ شہر کے جتنے بڑے دلال تھے وہ یہیں دستیاب ہوتے تھے۔ اس لیے کہ قیصر پارک میں بڑی بڑی کمپنیوں کے باعث روپیہ اور شراب پانی کی طرح بہتے تھے۔ اس کو یاد آیا کہ دو برس پہلے اس نے اپنے دوست کے ساتھ بڑے عیش کیے تھے۔ اچھی سے اچھی لڑکی ہر رات کو ان کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اسکاچ جنگ کے باعث نایاب تھی مگر ایک منٹ میں درجنوں بوتلیں مہیا ہو جاتی تھیں۔ ٹانگے اب بھی کھڑے تھے مگر ان پر وہ کلغیاں، وہ پھندنے، وہ پیتل کے پالش کیے ہوئے سازوسامان کی چمک دمک نہیں تھی۔ یہ بھی شاید دوسری چیزوں کے ساتھ اڑ گئی تھی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ فروری کے دن تھے۔ شام کے سائے چھانے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو لعنت ملامت کی اور دائیں ہاتھ کے ویران ہوٹل میں موری کے پانی سے بنائی ہوئی چائے پینے کے لیے جانے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کو ہولے سے پکارا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اس کا دوست آ گیا۔ مگر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک اجنبی تھا۔ عام شکل و صورت کا، لٹھے کی نئی شلوار میں جس میں اب اور زیادہ شکنوں کی گنجائش نہیں تھی۔ نیلی پاپلین کی قمیض جو لانڈری میں جانے کے لیے بیتاب تھی۔ اس نے پوچھا

”کیوں بھئی۔ تم نے مجھے بلایا؟“

اس نے ہولے سے جواب دیا۔

”جی ہاں۔“

اس نے خیال کہ مہاجر ہے بھیک مانگنا چاہتا ہے۔

”کیا مانگتے ہو؟“

اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”جی کچھ نہیں۔“

پھر قریب آ کر کہا۔

”کچھ چاہیے آپ کو؟“

”کیا؟“

”کوئی لڑکی وڑکی۔“

یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے سینے میں ایک تیر سا لگا کہ دیکھو اس زمانے میں بھی یہ لوگوں کے جنسی جذبات ٹٹولتا پھرتا ہے۔ اور پھر انسانیت کے متعلق اوپر تلے اس کے دماغ میں بڑے حوصلہ شکن خیالات آئے۔ انہی خیالات کے زیر اثر اس نے پوچھا۔

”کہاں ہے؟“

اس کا لہجہ دلال کے لیے امید افزا نہیں تھا۔ چنانچہ قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

”جی نہیں آپ کو ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔“

اس نے اس کو روکا۔

”یہ تم نے کس طرح جانا۔ انسان کو ہر وقت اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو تم مہیا کر سکتے ہو۔ وہ سولی پر بھی۔ جلتی چتا میں بھی۔“

وہ فلسفی بننے ہی والا تھا کہ رک گیا۔

”دیکھو۔ اگر کہیں پاس ہی ہے تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے یہاں ایک دوست کو وقت دے رکھا ہے۔“

دلال قریب آگیا۔

“پاس ہی۔ بالکل پاس۔”

“کہاں؟”

“یہ سامنے والی بلڈنگ میں۔”

اس نے سامنے والی بلڈنگ کو دیکھا۔

“اس میں۔ اس بڑی بلڈنگ میں؟”

“جی ہاں۔”

وہ لرز گیا۔

“اچھا۔ تو۔؟”

سنبھل کر اس نے پوچھا۔

“میں بھی چلوں؟”

“چلیے۔ لیکن میں آگے آگے چلتا ہوں۔”

اور دلال نے سامنے والی بلڈنگ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ سینکڑوں روح شگاف باتیں سوچتا اس کے پیچھے ہولیا۔ چند گزوں کا فاصلہ تھا۔ فوراً طے ہو گیا۔ دلال اور وہ دونوں اس بڑی بلڈنگ میں تھے۔ جس کی پیشانی پر ایک بورڈ لٹک رہا تھا۔ اس کی حالت سب سے خستہ تھی، جگہ جگہ اکھڑی ہوئی اینٹوں، کٹے ہوئے پانی کے نلوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ اب شام گہری ہو گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں سے گزر کر آگے بڑھے تو اندھیرا شروع ہو گیا۔ چوڑا چکلا صحن طے کر کے وہ ایک صرف مڑا۔ عمارت بنتے بنتے رک گئی تھی۔ ننگی اینٹیں تھیں۔ چونہ اور سیمنٹ ملے ہوئے سخت ڈھیر پڑے تھے اور جابجا بجری بکھری ہوئی تھی۔ دلال نامکمل سیڑھیاں چڑھنے لگا کہ مڑ کر اس نے کہا۔

“آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں اب آیا۔”

وہ رک گیا۔ دلال غائب ہو گیا۔ اس نے منہ اوپر کر کے سیڑھیوں کے اختتام کی طرف دیکھا تو اسے تیز روشنی نظر آئی۔ دو منٹ گزر گئے تو دبے پاؤں وہ بھی اوپر چڑھنے لگا۔ آخری زینے پر اسے دلال کی بہت زور کی کڑک سنائی دی۔

“اٹھتی ہے کہ نہیں؟”

کوئی عورت بولی۔

“کہہ جو دیا مجھے سونے دو۔”

اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ دلال پھر کڑکا۔

“میں کہتا ہوں اٹھ۔ میرا کہا نہیں مانے گی تو یاد رکھ۔”

عورت کی آواز ئی۔

“تو مجھے مار ڈال۔ لیکن میں نہیں اٹھوں گی۔ خدا کے لیے میرے حال پر رحم کر۔”

دلال نے پچکارا۔

“اٹھ میری جان۔ ضد نہ کر۔ گزارہ کیسے چلے گا۔”

عورت بولی۔

“گزارہ جائے جہنم میں۔ میں بھوکی مر جاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کر۔ مجھے نیند آرہی ہے۔”

دلال کی آواز کڑی ہو گئی۔

“تو نہیں اٹھے گی۔ حرامزادی، سور کی بچی۔”

عورت چلانے لگی۔

“میں نہیں اٹھوں گی۔ نہیں اٹھوں گی۔ نہیں اٹھوں گی۔”

دلال کی آواز بھنچ گئی۔

”آہستہ بول۔ کوئی سن لے گا۔ لے چل اٹھ۔ تیس چالیس روپے مل جائیں گے۔“

عورت کی آواز میں التجا تھی دیکھ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں کتنے دنوں سے جاگ رہی ہوں۔ رحم کر۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کر۔“

”بس ایک دو گھنٹے کے لیے۔ پھر سو جانا۔ نہیں تو دیکھ مجھے سختی کرنی پڑے گی“

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کمرے میں جھانکا جس میں بڑی تیز روشنی آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس کے فرش پر ایک عورت لیٹی ہے۔ کمرے میں دو تین برتن ہیں، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دلال اس عورت کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس عورت سے کہا۔

”لے اب اٹھ۔ قسم خدا کی ایک دو گھنٹے میں آ جائے گی۔ پھر سو جانا۔“

وہ عورت ایک دم یوں اٹھی جیسے آگ دکھائی ہوئی چھچھوندر اٹھتی ہے اور چلائی۔

”اچھا اٹھتی ہوں۔“

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اصل میں وہ ڈر گیا تھا۔ دبے پاؤں وہ تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اس نے سوچا کہ بھاگ جائے۔ اس شہر ہی سے بھاگ جائے۔ اس دنیا سے بھاگ جائے۔ مگر کہاں؟“ پھر اس نے سوچا کہ یہ عورت کون ہے؟ کیوں اس پر اتنا ظلم ہو رہا ہے؟۔ اور یہ دلال کون ہے؟۔ اس کا کیا لگتا ہے اور یہ اس کمرے میں اتنا بلب جلا کر جو سو کینڈل پاور سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ کیوں رہتے ہیں۔ کب سے رہتے ہیں؟ اس کی آنکھوں میں اس تیز بلب کی روشنی ابھی تک گھسی ہوئی تھی۔ اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی تیز روشنی میں کون سو سکتا ہے؟۔ اتنا بڑا بلب؟۔ کیا وہ چھوٹا نہیں لگا سکتے۔ یہی پندرہ پچیس کینڈل پاور کا؟ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ دو سائے اس کے پاس کھڑے ہیں۔ ایک نے جو دلال کا تھا۔ اس سے کہا۔

”دیکھ لیجیے۔“

اس نے کہا۔

”دیکھ لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے نا؟“

ٹھیک ہے۔“

”چالیس روپے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”دے دیجیے۔“

وہ اب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جیب میں اس نے ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر دلال کے حوالے کر دیے۔

”دیکھ لو کتنے ہیں“!

نوٹوں کی کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی۔ دلال نے کہا۔

”پچاس ہیں۔“

اس نے کہا۔

”پچاس ہی رکھو۔“

”صاحب سلام۔“

اس کے جی میں آئی کہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کو دے مارے۔ دلال بولا۔

”تو لے جایئے اسے۔ لیکن دیکھیے تنگ نہ کیجیے گا اور پھر ایک دو گھنٹے کے بعد چھوڑ جایئے گا۔“

”بہتر۔“

اس نے بڑی بڈنگ کے باہر نکلنا شروع کیا جس کی پیشانی پر وہ کئی بار ایک بہت بڑا بورڈ پڑھ چکا تھا۔ باہر ٹانگہ کھڑا تھا۔ وہ آگے بیٹھ گیا اور عورت پیچھے۔ دلال نے ایک بار پھر سلام کیا اور ایک بار پھر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔ ٹانگہ چل پڑا۔ وہ اسے پاس ہی ایک ویران سے ہوٹل میں لے گیا۔ دماغ کو حتی المقدور اس تکدر سے جو اسے پہنچ چکا تھا نکال کر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا جو سر سے پیر تک اجاڑ تھی۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ بھی سارے کا سارا خمیدہ تھا جیسے وہ ایک ایسی عمارت ہے جو پل بھر میں گر جائے گی۔ وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”ذرا گردن تو اونچی کیجیے۔“

وہ زور سے چونکی۔

”کیا؟“

”کچھ نہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کوئی بات تو کیجیے۔“

اس کی آنکھیں سرخ بوٹی ہو رہی تھیں جیسے ان میں مرچیں ڈالی گئی ہوں۔ وہ خاموش رہی۔

”آپ کا نام؟“

”کچھ بھی نہیں؟“

اس کے لہجے میں تیزاب کی سی تیزی تھی۔

”آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟“

”جہاں کی بھی تم سمجھ لو۔“

”آپ اتنا روکھا کیوں بولتی ہیں۔“

عورت اب قریب قریب جاگ پڑی اور اس کی طرف لال بوٹی آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔

”تم اپنا کام کرو۔ مجھے جانا ہے۔“

اس نے پوچھا۔

”کہاں؟“

عورت نے بڑی روکھی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

”جہاں سے مجھے تم لائے ہو۔“

”آپ چلی جایئے۔“

”تم اپنا کام کرونا۔ مجھے تنگ کیوں کرتے ہو؟“

اس نے اپنے لہجے میں دل کا سارا درد بھر کے اس سے کہا۔

”میں تمہیں تنگ نہیں کرتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“

وہ جھلاّ گئی۔

”مجھے نہیں چاہیے کوئی ہمدرد۔“

پھر قریب قریب چیخ پڑی۔

”تم اپنا کام کرو اور مجھے جانے دو۔“

اس نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو اس عورت نے زور سے ایک طرف جھٹک دیا۔

”میں کہتی ہوں۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ میں کئی دنوں سے جاگ رہی ہوں۔ جب سے آئی ہوں۔ جاگ رہی ہوں۔“

وہ سر تا پا ہمدردی بن گیا۔

”سو جاؤ یہیں۔“

عورت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ تیز لہجے میں بولی۔

”میں یہاں سونے نہیں آئی۔ یہ میرا گھر نہیں۔“

”تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم آئی ہو؟“

عورت اور زیادہ خشمناک ہو گئی۔

”اف۔ بکواس بند کرو۔ میرا کوئی گھر نہیں۔ تم اپنا کام کرو ورنہ مجھے چھوڑ آؤ اور اپنے روپے لے لو اس۔ اس۔“

وہ گالی دیتی دیتی رہ گئی۔ اس نے سوچا کہ اس عورت سے ایسی حالت میں کچھ پوچھنا اور ہمدردی جتانا فضول ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

”چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

اور وہ اسے اس بڑی بلڈنگ میں چھوڑ آیا۔ دوسرے دن اس نے قیصر پارک کے ایک ویران ہوٹل میں اس عورت کی ساری داستان اپنے دوست کو سنائی۔ دوست پر رقت طاری ہو گئی۔

اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا:

”کیا جوان تھی؟“

اس نے کہا۔

”مجھے معلوم نہیں۔ میں اسے اچھی طرح بالکل نہ دیکھ سکا۔ میرے دماغ میں تو وقت یہ خیال آتا تھا کہ میں نے وہیں سے پتھر اٹھا کر دلال کا سر کیوں نہ کچل دیا۔“

دوست نے کہا۔

”واقعی بڑے ثواب کا کام ہوتا۔“

وہ زیادہ دیر تک ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ اس کے دل و دماغ پر پچھلے روز کے واقعہ کا بہت بوجھ تھا۔ چنانچہ چائے ختم ہوئی تو دونوں رخصت ہو گئے۔ اس کا دوست چپکے سے ٹانگوں کے اڈے پر آیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نگاہیں اس دلال کو ڈھونڈتی رہی مگر وہ نظر نہ آیا۔ چھ بج چکے تھے۔ بڑی بلڈنگ سامنے تھی چند گزوں کے فاصلے پر۔ وہ اس طرف چل دیا اور اس میں داخل ہو گیا۔ لوگ اندر آ جا رہے تھے۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے اس مقام پر پہنچ گیا۔ کافی اندھیرا تھا مگر جب وہ ان سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اسے روشنی دکھائی دی اوپر دیکھا اور دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر وہ آخری زینے پر خاموش کھڑا رہا۔ کمرے سے تیز روشنی آ رہی تھی۔ مگر کوئی آواز، کوئی آہٹ اسے سنائی نہ دی۔ آخری زینہ طے کر کے وہ آگے بڑھا۔ دروازے کے پٹ کھلے تھے۔ اس نے ذرا ادھر ہٹ کر اندر جھانکا۔ سب سے پہلے اسے بلب نظر آیا۔ جس کی روشنی اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ ایک دم وہ پرے ہٹ گیا تا کہ تھوڑی دیر اندھیرے کی طرف منہ کر کے اپنی آنکھوں سے چکاچوند نکال سکے۔ اس کے بعد وہ پھر دروازے کی طرف بڑھا مگر اس انداز سے کہ اس کی آنکھیں بلب کی تیز روشنی کی زد میں نہ آئیں۔ اس نے اندر جھانکا۔ فرش کا جو حصہ اسے نظر آیا۔ اس پر ایک عورت چٹائی پر لیٹی تھی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔ سو رہی تھی۔ منہ پر دوپٹہ تھا۔ اس کا سینہ سانس کے اتار چڑھاؤ سے ہل رہا تھا۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا۔ اس کی چیخ نکل گئی مگر اس نے فوراً ہی دبالی۔ اس عورت سے کچھ دور ننگے فرش پر ایک آدمی پڑا تھا۔ جس کا سر پاش پاش تھا۔ پاس ہی خون آلود اینٹ پڑی تھی۔ یہ سب اس نے ایک نظر دیکھا۔ اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ پاؤں پھسلا اور نیچے۔ مگر اس نے چوٹوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل اپنے گھر پہنچا اور ساری رات ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔

سودا بیچنے والی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوسودا بیچنے والی

سہیل اور جمیل دونوں بچپن کے دوست تھے۔ ان کی دوستی کو لوگ مثال کے طور پر پیش کرتے تھے۔ دونوں اسکول میں اکٹھے پڑھے۔ پھر اس کے بعد سہیل کے باپ کا تبادلہ ہو گیا اور وہ راولپنڈی چلا گیا۔ لیکن ان کی دوستی پھر بھی قائم رہی۔ کبھی جمیل راولپنڈی چلا جاتا اور کبھی سہیل لاہور آ جاتا۔ دونوں کی دوستی کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ حسن پسند تھے۔ وہ خوبصورت تھے۔ بہت خوبصورت لیکن وہ عام خوبصورت لڑکوں کی مانند بدکردار نہیں تھے۔ ان میں کوئی عیب نہیں تھا۔ دونوں نے بی اے پاس کیا۔ سہیل نے راولپنڈی کے گارڈن کالج اور جمیل نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بڑے اچھے نمبروں پر۔ اس خوشی میں انھوں نے بہت بڑی دعوت کی۔ اس میں کئی لڑکیاں بھی شریک تھیں۔ جمیل قریب قریب سب لڑکیوں کو جانتا تھا، مگر ایک لڑکی کو جب اس نے دیکھا، جس سے وہ قطعاً نا آشنا تھا، تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سارے خواب پورے ہو گئے ہیں۔ اس نے اس لڑکی کے متعلق، جس کا نام جمیلہ تھا، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سلمیٰ کی چھوٹی بہن ہے۔ سلمیٰ کے مقابلے میں جمیلہ بہت حسین تھی۔ سلمیٰ کی شکل و صورت سیدھی سادی تھی لیکن جمیلہ کا ہر نقش تیکھا اور دل کش تھا۔ جمیل اس کو دیکھتے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنے دل کے جذبات سے اپنے دوست کو آگاہ کر دیا۔ سہیل نے اس سے کہا۔

”ہٹاؤ یار۔ تم نے اس لڑکی میں کیا دیکھا ہے جو اس بری طرح لٹو ہو گئے ہو؟“

جمیل کو برا لگا:

”تمہیں حسن کی پرکھ ہی نہیں۔ اپنا اپنا دل ہے۔ تمہیں اگر جمیلہ میں کوئی بات نظر نہیں آئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے دکھائی نہ دی ہو۔“

سہیل ہنسا

”تم ناراض ہو رہے ہو۔ لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ تمہاری یہ جمیلہ برف کی ڈلی ہے، اس میں حرارت نام کو بھی نہیں۔ عورت کا دوسرا نام حرارت ہے۔“

”حرارت پیدا کر لی جاتی ہے۔“

”برف میں؟“

”برف بھی تو حرارت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔“

”تمہاری یہ منطق عجیب و غریب ہے۔ اچھا بھئی جو چاہتے ہو، سو کرو۔ میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو اس لیے کہ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ تم اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو۔“

دونوں میں ہلکی سی چخ ہوئی لیکن فوراً صلح ہو گئی۔ جمیل، سہیل کے مشورے کے بغیر اپنی زندگی میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ اس نے جب اپنے دوست پر یہ واضح کر دیا کہ وہ جمیلہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو سہیل نے اسے اجازت دے دی کہ جس قسم کی چاہے، جھک مار سکتا ہے۔“

سہیل راولپنڈی چلا گیا۔ جمیل نے جو جمیلہ کے عشق میں بری طرح مبتلا تھا، اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی، مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کی بڑی بہن سلمیٰ اس کو محبت کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس نے ان کے گھر آنا جانا شروع کیا تو سلمیٰ بہت خوش ہوئی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ جمیل اس کے جذبات سے واقف ہو چکا ہے اس لیے اس سے ملنے آتا ہے۔ چنانچہ اس نے غیر مبہم الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار شروع کر دیا۔ جمیل سخت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ جب وہ ان کے گھر جاتا تو سلمیٰ اپنی چھوٹی بہن کو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے کمرے سے باہر نکال دیتی اور جمیل دانت پیس کے رہ جاتا۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ سلمیٰ سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ کس غرض سے آتا ہے۔ اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ اس کی چھوٹی بہن سے محبت کرتا ہے۔ بے حد مختصر لمحات جو جمیل کو جمیلہ کی چند جھلکیاں دینے کے لیے نصیب ہوتے تھے، اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کئی باتیں کرنے کی کوشش کی اور یہ بار آور ثابت ہوا۔ ایک دن اسے جمیلہ کا رقعہ ملا، جس کی عبارت یہ تھی:

”میری بہن جس غلط فہمی میں گرفتار ہیں، اس کو آپ دور کیوں نہیں کرتے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ سے ملنے آتے ہیں لیکن باجی کی موجودگی میں آپ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ البتہ آپ باہر جہاں بھی چاہیں، میں آ سکتی ہوں۔“

جمیل بہت خوش ہوا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کون سی جگہ مقرر کرے اور پھر جمیلہ کو اس کی اطلاع کیسے دے۔ اس نے کئی محبت نامے لکھے اور پھاڑ دیے۔ اس لیے کہ ان کی ترسیل بڑی مشکل تھی۔ آخر اس نے یہ سوچا کہ سلمیٰ سے ملنے جائے اور موقع ملے تو جمیلہ کو اشارۃً وہ جگہ بتا دے، جہاں وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ قریب قریب ایک مہینے تک وہ سلمیٰ سے ملنے جاتا رہا مگر کوئی موقع نہ ملا۔ لیکن ایک دن جب جمیلہ کمرے میں موجود تھی اور سلمیٰ اسے کسی بہانے سے باہر نکالنے والی تھی، جمیل نے بڑی بے ربطی سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”لارنس گارڈن۔ پانچ بجے۔“

جمیلہ نے یہ سنا اور چلی گئی۔ سلمیٰ نے بڑی حیرت سے پوچھا

”یہ آپ نے کیا کہا تھا؟“

”تم ہی سے تو کہا تھا۔“

”کیا کہا تھا؟“

”لارنس گارڈن۔ پانچ بجے“

۔ میں چاہتا تھا کہ تم کل لارنس گارڈن میرے ساتھ چلو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایک پکنک ہو جائے۔“

سلمیٰ خوش ہو گئی اور فوراً رضامند ہو گئی کہ وہ جمیل کے ساتھ دوسرے روز شام کو پانچ بجے لارنس گارڈن میں ضرور جائے گی۔ وہ سینڈوچز بنانے میں مہارت رکھتی تھی، چنانچہ اس نے بڑے پیار سے کہا

”چکن سینڈوچز کا انتظام میرے ذمے رہا۔“

اسی شام کو پانچ بجے لارنس باغ میں جمیل اور جمیلہ سینڈوچ بنے ہوئے تھے۔ جمیل نے اس پر اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا تو جمیلہ نے کہا۔

”میں اس سے غافل نہیں تھی۔ پر کیا کروں، بیچ میں باجی حائل تھیں۔“

”تو اب کیا کیا جائے؟“

”ایسی ملاقاتیں زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکیں گی۔“

”یہ تو درست ہے۔ کل مجھے صرف اس ملاقات کی پاداش میں تمہاری باجی کے ساتھ یہاں آنا پڑے گا۔“

”اسی لیے تو میں سوچتی ہوں کہ اس کا کیا حل ہو سکتا ہے۔“

”تم حوصلہ رکھتی ہو؟“

”کیوں نہیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟۔ میں ابھی آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔ بتایئے، کہاں چلنا ہے؟“

”اتنی جلدی نہ کرو۔ مجھے سوچنے دو۔“

”آپ سوچ لیجیے۔“

”کل شام کو چار بجے تم کسی نہ کسی بہانے سے یہاں چلی آنا، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ اس کے بعد ہم راولپنڈی روانہ ہو جائیں گے۔“

’طوفان بھی ہو تو میں کل اس مقررہ وقت پر یہاں پہنچ جاؤں گی۔“

”اپنے ساتھ زیور وغیرہ مت لانا۔“

”کیوں؟“

”میں تمہیں خود خرید کے دے سکتا ہوں۔“

”میں اپنے زیور نہیں چھوڑ سکتی۔ باجی نے مجھے اپنی ایک بالی بھی آج تک پہننے کے لیے نہیں دی۔ میں اپنے زیور اس کے لیے چھوڑ جاؤں؟“

دوسرے دن شام کو سلمیٰ سینڈوچز تیار کرنے میں مصروف تھی کہ جمیلہ نے الماری میں سے اپنے زیور اور اچھے اچھے کپڑے نکالے، انھیں سوٹ کیس میں بند کیا اور باہر نکل گئی۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی۔ سلمیٰ سینڈوچز تیار کرتی رہی اور جمیل اور جمیلہ دونوں ریل میں سوار تھے جو راولپنڈی کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔ راولپنڈی پہنچ کر جمیل اپنے دوست سہیل کے پاس گیا جو اتفاق سے گھر میں اکیلا تھا۔ اس کے والدین ایبٹ آباد میں منتقل ہو گئے تھے۔ سہیل نے جب ایک برقعہ پوش عورت جمیل کے ساتھ دیکھی تو بڑا متحیر ہوا، مگر اس نے اپنے دوست سے کچھ نہ پوچھا۔ جمیل نے اس سے کہا

”میرے ساتھ جمیلہ ہے۔ میں اسے اغوا کر کے تمہارے پاس لایا ہوں۔“

سہیل نے پوچھا۔

”اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بڑا لمبا قصہ ہے۔ میں پھر کبھی سنا دوں گا۔“

پھر جمیل جمیلہ سے مخاطب ہوا۔

”برقع اتار دو اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ سہیل میرا عزیز ترین دوست ہے۔“

جمیلہ نے برقع اتار دیا اور شرمیلی نگاہوں سے جن میں کسی اور جذبے کی بھی جھلک تھی، سہیل کی طرف دیکھا۔ سہیل کے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے دوست سے مخاطب ہوا۔

”اب تمہارا ارادہ کیا ہے“

جمیل نے جواب دیا۔

”شادی کرنے کا۔ لیکن فوراً نہیں۔ میں آج ہی واپس لاہور جانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں کے حالات معلوم ہو سکیں۔ ہو سکتا ہے بہت گڑبڑ ہو چکی ہو۔ میں اگر وہاں پہنچ گیا تو مجھ پر کسی کو شک نہیں ہو گا۔ دو تین روز وہاں رہوں گا۔ اس دوران میں تم ہماری شادی کا انتظام کر دینا۔“

سہیل نے ازراہ مذاق سے کہا۔

”بڑے عقلمند ہوتے جا رہے ہو تم۔“

جمیل، جمیلہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”یہ تمہاری صحبت ہی کا نتیجہ ہے۔“

”تم آج ہی چلے جاؤ گے؟“

جمیل نے جواب دیا۔

”ابھی۔ اسی وقت۔ مجھے صرف اپنے اس سرمایہ حیات کو تمہارے سپرد کرنا تھا۔ یہ میری امانت ہے۔“

جمیل اپنی جمیلہ کو سہیل کے حوالے کر کے واپس لاہور آ گیا۔ وہاں کافی گڑبڑ مچی ہوئی تھی۔ وہ سلمیٰ سے ملنے گیا۔ اس نے شکایت کی کہ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ جمیل نے اس سے جھوٹ بولا۔

”مجھے سخت زکام ہو گیا تھا۔ افسوس ہے کہ میں تمہیں اس کی اطلاع نہ دے سکا، اس لیے کہ ہمارا ٹیلی فون خراب تھا اور نوکر کو امی جان نے کسی وجہ سے برطرف کر دیا تھا۔“

سلمیٰ جب مطمئن ہو گئی تو اس نے جمیل کو بتایا کہ اس کی بہن کہیں غائب ہو گئی ہے۔ بہت تلاش کی ہے مگر نہیں ملی۔ اپنے زیور کپڑے ساتھ لے گئی ہے۔ معلوم نہیں کس کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ جمیل نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ سلمیٰ اس سے بڑی متاثر ہوئی اور اسے مزید یقین ہو گیا کہ جمیل اسے محبت کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جمیل نے محض رواداری کی خاطر اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی نمناک آنکھیں پونچھیں اور مصنوعی محبت کا اظہار کیا۔ سلمیٰ اپنی بہن کی گمشدگی کا صدمہ کچھ دیر کے لیے بھول گئی۔ جب جمیل کو اطمینان ہو گیا کہ اس پر کسی کو بھی شبہ نہیں تو وہ ٹیکسی میں راولپنڈی پہنچا۔ بڑا بیتاب تھا۔ لاہور میں اس نے تین دن کانٹوں پر گزارے تھے۔ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے جمیلہ کا حسین چہرہ رقص کرتا رہتا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ جب اپنے دوست کے گھر پہنچا تو اس نے جمیلہ کو آواز دی۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی آواز سنتے ہی وہ اڑتی ہوئی آئے گی اور اس کے سینے کے ساتھ چمٹ جائے گی۔ مگر اسے ناامیدی ہوئی۔ اس کا دوست اس کی آواز سن کر آیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے ملے۔ جمیل نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا۔

”جمیلہ کہاں ہے؟“

سہیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جمیل بڑا مضطرب تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔

”یار۔ جمیلہ کو بلاؤ۔“

سہیل نے بڑے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

”وہ تو اسی روز چلی گئی تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”جب تم یہاں اسے چھوڑ کر گئے تو وہ دو تین گھنٹوں کے غائب ہو گئی۔ اسے غالباً تم سے محبت نہیں تھی۔“

جمیل پھر لاہور آیا۔ مگر سلمیٰ سے اسے معلوم ہوا کہ اس کی بہن ابھی تک غائب ہے، بہت ڈھونڈا مگر نہیں ملی۔ چنانچہ جمیل کو پھر راولپنڈی جانا پڑا تاکہ وہ اس کی تلاش وہاں کرے۔ وہ اپنے دوست کے گھر نہ گیا۔ اس نے سوچا کہ ہوٹل میں ٹھہرنا چاہیے۔ جہاں سے مطلوبہ معلومات حاصل ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ جب اس نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں کمرے کرائے پر لیا تو اس نے دیکھا کہ جمیلہ ساتھ والے کمرے میں سہیل کی آغوش میں ہے۔ وہ اسی وقت اپنے کمرے سے نکل آیا۔ لاہور پہنچا۔ جمیلہ کے زیورات اس کے پاس تھے، یہ اس نے بیمہ کرا کر اپنے دوست کو بھیج دیے اور صرف چند الفاظ ایک کاغذ پر لکھ کر ساتھ رکھ دیے۔

”میں تمہاری کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جمیلہ کو میرا سلام پہنچا دینا۔“

دوسرے دن وہ سلمیٰ سے ملا۔ وہ اس کو جمیلہ سے کہیں زیادہ خوب صورت دکھائی دی۔ وہ اپنی بہن کی گمشدگی کے غم میں رو رہی تھی۔ جمیل نے اس کی آنکھیں چومیں اور کہا

”یہ آنسو بیکار ضائع نہ کرو۔ انھیں ان اشخاص کے لیے محفوظ رکھو، جو ان کے مستحق ہیں۔“

”لیکن وہ میری بہن ہے۔“

”بہنیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ اسے بھول جاؤ۔“

جمیل نے سلمیٰ سے شادی کر لی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ گرمیوں میں مری گئے تو وہاں انھوں نے جمیلہ کو دیکھا جس کا حسن ماند پڑ گیا تھا اور نہایت واہیات قسم کا میک اپ کیے تھے، پنڈی پوائنٹ پر یوں چل پھر رہی تھی جیسے اسے کوئی سودا بیچنا ہے۔

سوراج کے لیے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوسوراج کے لیے

مجھے سن یاد نہیں رہا۔ لیکن وہی دن تھے۔ جب امرتسر میں ہر طرف

”انقلاب زندہ باد“

کے نعرے گونجتے تھے۔ ان نعروں میں، مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک عجیب قسم کا جوش تھا۔ ایک جوانی۔ ایک عجیب قسم کی جوانی۔ بالکل امرتسر کی گجریوں کی سی جو سر پر اوپلوں کے ٹوکرے اٹھائے بازاروں کو جیسے کاٹتی ہوئی چلتی ہیں۔ خوب دن تھے۔ فضا میں جو وہ جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کا اداس خوف سمویا رہتا تھا۔ اس وقت بالکل مفقود تھا۔ اب اس کی جگہ ایک بے خوف تڑپ نے لے لی تھی۔ ایک اندھا دھند جَست نے جو اپنی منزل سے ناواقف تھی۔ لوگ نعرے لگاتے تھے، جلوس نکالتے تھے اور سینکڑوں کی تعداد میں دھڑا دھڑ قید ہو رہے تھے۔ گرفتار ہونا ایک دلچسپ شغل بن گیا تھا۔ صبح قید ہوئے۔ شام چھوڑ دیے گئے، مقدمہ چلا۔ چند مہینوں کی قید ہوئی، واپس آئے، ایک نعرہ لگایا، پھر قید ہو گئے۔ زندگی سے بھرپور دن تھے۔ ایک ننھا سا بلبلہ پھٹنے پر بھی ایک بہت بڑا بھنور بن جاتا تھا۔ کسی نے چوک میں کھڑے ہو کر تقریر کی اور کہا۔ ہڑتال ہونی چاہیے، چلیے جی ہڑتال ہو گئی۔ ایک لہر اٹھی کہ ہر شخص کو کھادی پہننی چاہیے تاکہ لنکا شائر کے سارے کارخانے بند ہو جائیں۔ بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ شروع ہو گیا اور ہر چوک میں الاؤ جلنے لگے، لوگ جوش میں آکر کھڑے کھڑے وہیں کپڑے اتارتے اور الاؤ میں پھینکتے جاتے، کوئی عورت اپنے مکان کے شہ نشین سے اپنی ناپسندیدہ ساڑھی اچھالتی تو ہجوم تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنے ہاتھ لال کر لیتا۔ مجھے یاد ہے کوتوالی کے سامنے ٹاؤن ہال کے پاس ایک الاؤ جل رہا تھا۔ شیخو نے جو میرا ہم جماعت تھا جوش میں آکر اپنا ریشمی کوٹ اتارا اور بدیشی کپڑوں کی چتا میں ڈال دیا۔ تالیوں کا سمندر بہنے لگا۔ کیونکہ شیخو ایک بہت بڑے

”ٹوڈی بچے“

کا لڑکا تھا، اس غریب کا جوش اور بھی زیادہ بڑھ گیا، اپنی بوسکی کی قمیض اتار وہ بھی شعلوں کی نذر کر دی، لیکن بعد میں خیال آیا کہ اس کے ساتھ سونے کے بٹن تھے۔ میں شیخو کا مذاق نہیں اڑاتا، میرا حال بھی ان دنوں بہت دگرگوں تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سے پستول ہاتھ میں آجائے تو ایک دہشت پسند پارٹی بنائی جائے۔ باپ گورنمنٹ کا پنشن خوار تھا۔ اس کا مجھے کبھی خیال نہ آیا۔ بس دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کی کُھد بُد رہتی تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی فلاش کھیلنے کے دوران میں رہا کرتی ہے۔ اسکول سے تو مجھے ویسے ہی دلچسپی نہیں تھی مگر ان دنوں تو خاص طور پر مجھے پڑھائی سے نفرت ہو گئی تھی۔ گھر سے کتابیں لے کر نکلتا اور جلیانوالہ باغ چلا جاتا، اسکول کا وقت ختم ہونے تک وہاں کی سرگرمیاں دیکھتا رہتا یا کسی درخت کے سائے تلے بیٹھ کر دور مکانوں کی کھڑکیوں میں عورتوں کو دیکھتا اور سوچتا کہ ضرور ان میں سے کسی کو مجھ سے عشق ہو جائے گا۔ یہ خیال دماغ میں کیوں آتا۔ اس کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جلیانوالہ باغ میں خوب رونق تھی۔ چاروں طرف تنبو اور قناتیں پھیلی ہوئی تھیں، جو خیمہ سب سے بڑا تھا، اس میں ہر دوسرے تیسرے روز ایک ڈکٹیٹر بنا کے بٹھا دیا جاتا تھا۔ جس کو تمام والنٹیر سلامی دیتے تھے۔ دو تین روز یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روز تک یہ ڈکٹیٹر کھادی پوش عورتوں اور مردوں کی نمسکاریں ایک مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ وصول کرتا۔ شہر کے بنیوں سے لنگر خانے کے لیے آٹا چاول اکٹھا کرتا اور دہی کی لسّی پی پی کر جو خدا معلوم جلیانوالہ باغ میں کیوں اس قدر عام تھی، ایک دن اچانک گرفتار ہو جاتا۔ اور کسی قید خانے میں چلا جاتا۔ میرا ایک پرانا ہم جماعت تھا۔ شہزادہ غلام علی، اس سے میری دوستی کا اندازہ آپ کو ان باتوں سے ہو سکتا ہے کہ ہم اکٹھے دو دفعہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہو چکے تھے اور ایک دفعہ ہم دونوں گھر سے بھاگ کر بمبئی گئے، خیال تھا کہ روس جائیں گے مگر پیسے ختم ہونے پر جب فٹ پاتھوں پر سونا پڑا تو گھر خط لکھے، معافیاں مانگیں اور واپس چلے آئے۔ شہزادہ غلام علی خوبصورت جوان تھا۔ لمبا قد، گورا رنگ جو کشمیریوں کا ہوتا ہے۔ تیکھی ناک، کھلنڈری آنکھیں، چال ڈھال میں ایک خاص شان تھی جس میں پیشہ ور غنڈوں کی کجکلاہی کی ہلکی سی جھلک بھی تھی۔ جب وہ میرے ساتھ پڑھتا تھا تو شہزادہ نہیں تھا۔ لیکن جب شہر میں انقلابی سرگرمیوں نے زور پکڑا اور اس نے دس پندرہ جلسوں اور جلوسوں میں حصہ لیا تو نعروں گیندے کے ہاروں، جوشیلے گیتوں اور لیڈی والنٹیرز سے آزادانہ گفتگوؤں نے اسے ایک نیم رس انقلابی بنا دیا، ایک روز اس نے پہلی تقریر کی۔ دوسرے روز میں نے اخبار دیکھے تو معلوم ہوا کہ غلام علی شہزادہ بن گیا ہے۔ شہزادہ بنتے ہی غلام علی سارے امرتسر میں مشہور ہو گیا۔ چھوٹا سا شہر ہے، وہاں نیک نام ہوتے یا بدنام ہوتے دیر نہیں لگتی۔ یوں تو امرتسری عام آدمیوں کے معاملے میں بہت حرف گیر ہیں۔ یعنی ہر شخص دوسروں کے عیب ٹٹولنے اور کرداروں میں سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ لیکن سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے معاملے میں امرتسری بہت چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ان کو دراصل ہر وقت ایک تقریر یا تحریک کی ضرورت رہتی ہے۔ آپ انھیں نیلی پوش بنا دیجیے یا سیاہ پوش، ایک ہی لیڈر چولے بدل بدل کر امرتسر میں کافی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ تمام بڑے بڑے لیڈر جیلوں میں تھے اور ان کی گدیاں خالی تھیں۔ اس وقت لوگوں کو لیڈروں کی کوئی اتنی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ تحریک جو کہ شروع ہوئی تھی اس کو البتہ ایسے آدمیوں کی اشد ضرورت تھی جو ایک دو روز کھادی پہن کر جلیانوالہ باغ کے بڑے تنبو میں بیٹھیں۔ ایک تقریر کریں اور گرفتار ہو جائیں۔ ان دنوں یورپ میں نئی نئی ڈکٹیٹر شپ شروع ہوئی تھی ہٹلر اور مسولینی کا بہت اشتہار ہو رہا تھا۔ غالباً اس اثر کے ماتحت کانگرس پارٹی نے ڈکٹیٹر بنانے شروع کر دیے تھے۔ جب شہزادہ غلام علی کی باری آئی تو اس سے پہلے چالیس ڈکٹیٹر گرفتار ہو چکے تھے۔ جونہی مجھے معلوم ہوا کہ۔ اس طرح غلام علی ڈکٹیٹر بن گیا ہے تو میں فوراً جلیانوالہ باغ میں پہنچا۔ بڑے خیمے کے باہر والنٹیروں کا پہرہ تھا۔ مگر غلام علی نے جب مجھے اندر سے دیکھا تو بلا لیا۔ زمین پر ایک گدیلا تھا۔ جس پر کھادی کی چاندنی بچھی تھی۔ اس پر گاؤ

تکیوں کا سہارا لیے شہزادہ غلام علی چند کھادی پوش بنیوں سے گفتگو کر رہا تھا جو غالباً ترکاریوں کے متعلق تھی۔ چند منٹوں ہی میں اس نے یہ بات چیت ختم کی اور چند رضاکاروں کو احکام دے کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اس کی یہ غیر معمولی سنجید گی دیکھ کر میرے گدگدی سی ہو رہی تھی۔ جب رضاکار چلے گئے تو میں ہنس پڑا۔

”سنا بے شہزادے۔“

میں دیر تک اس سے مذاق کرتا رہا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ غلام علی میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی تبدیلی جس سے وہ باخبر ہے۔ چنانچہ اس نے کئی بار مجھ سے یہی کہا

”نہیں سعادت۔ مذاق نہ اڑاؤ۔ میں جانتا ہوں میرا سر چھوٹا اور یہ عزت جو مجھے ملی ہے بڑی ہے۔ لیکن میں یہ کھلی ٹوپی ہی پہنے رہنا چاہتا ہوں۔“

کچھ دیر کے بعد اس نے مجھے دہی کی لسی کا ایک بہت بڑا گلاس پلایا اور میں اس سے یہ وعدہ کر کے گھر چلا گیا کہ شام کو اس کی تقریر سننے کے لیے ضرور آؤں گا۔ شام کو جلیانوالہ باغ کھچا کھچ بھرا تھا۔ میں چونکہ جلدی آیا تھا۔ اس لیے مجھے پلیٹ فارم کے پاس ہی جگہ مل گئی۔ غلام علی تالیوں کے شور کے ساتھ نمودار ہوا۔ سفید بے داغ کھادی کے کپڑے پہنے وہ خوبصورت اور پُرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لحبلاہی کی جھلک جس کا میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس کی اس کشش میں اضافہ کر رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ بولتا رہا۔ اس دوران میں کئی بارے رونگٹے کھڑے ہوئے اور ایک دو دفعہ تو میرے جسم میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بم کی طرح پھٹ جاؤں۔ اس وقت میں نے شاید یہی خیال کیا تھا کہ یوں پھٹ جانے سے ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ خدا معلوم کتنے برس گزر چکے ہیں۔ بہتے ہوئے احساسات اور واقعات کی نوک پلک جو اس وقت وقت تھی، اب پوری صحت سے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ کہانی لکھتے ہوئے میں جب غلام علی کی تقریر کا تصور کرتا ہوں تو مجھے صرف ایک جوانی بولتی دکھائی دیتی تھی، جو سیاست سے بالکل پاک تھی۔ اس میں ایک ایسے نوجوان کی پُرخلوص بیباکی تھی جو ایک دم کسی راہ چلتی عورت کو پکڑ لے اور کہے

”دیکھو میں تمہیں چاہتا ہوں۔“

اور دوسرے لمحے قانون کے پنجے میں گرفتار ہو جائے اس تقریر کے بعد مجھے کئی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر وہ خادم دیوانگی، وہ سرپھری جوانی، وہ الھڑ جذبہ، وہ بے ریش و بروت للکار جو میں نے شہزادہ غلام علی کی آواز میں سنی۔ اب اس کی ہلکی سی گونج بھی مجھے کبھی سنائی نہیں دی۔ اب جو تقریریں سننے میں آتی ہیں۔ وہ ٹھنڈی سنجیدگی، بوڑھی سیاست اور شاعرانہ ہوشمندی میں لپٹی ہوتی ہیں۔ اس وقت دراصل دونوں پارٹیاں خامکار تھیں۔ حکومت بھی اور رعایا بھی۔ دونوں نتائج سے بے پروا، ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ حکومت قید کی اہمیت سمجھے بغیر لوگوں کو قید کر رہی تھی اور جو قید ہوتے تھے۔ ان کو بھی قید خانوں میں جانے سے پہلے قید کا مقصد معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک دھاندلی تھی مگر اس دھاندلی میں ایک آتشیں انتشار تھا۔ لوگ شعلوں کی طرح بھڑکتے تھے، بجھتے تھے، پھر بھڑکتے تھے۔ چنانچہ اس بھڑکنے اور بجھنے، بجھنے اور بھڑکنے نے غلامی کی خوابیدہ اداس اور جمائیوں بھری فضا میں گرم ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ شہزادہ غلام علی نے تقریر ختم کی تو سارا جلیانوالہ باغ تالیوں اور نعروں کا دہکتا ہوا الاؤ بن گیا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ جب میں اس سے الگ جا کر ملا اور مبارکباد دینے کے لیے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا تو وہ کانپ رہا تھا یہ گرم کپکپاہٹ اس کے چمکیلے چہرے سے بھی نمایاں تھی۔ وہ کسی قدر ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پُرجوش جذبات کی دمک کے علاوہ مجھے ایک تھکی ہوئی تلاش نظر آئی۔ وہ کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک دم اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے علیحدہ کیا اور سامنے چمبیلی کی جھاڑی کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کھادی کی بے داغ ساڑھی میں ملبوس۔ دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ شہزادہ غلام علی عشق میں گرفتار ہے۔ وہ اس لڑکی سے جسے میں نے چمبیلی کی جھاڑی کے پاس باادب کھڑی دیکھا تھا۔ محبت کر رہا تھا۔ یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی کیونکہ نگار کو بھی اس سے والہانہ لگاؤ تھا۔ نگار جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک مسلمان لڑکی تھی۔ یتیم! زنانہ ہسپتال میں نرس تھی اور شاید پہلی مسلمان لڑکی تھی جس نے امرتسر میں بے پردہ ہو کر کانگریس کی تحریک میں حصہ لیا۔ کچھ کھادی کے لباس نے کچھ کانگرس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باعث اور کچھ ہسپتال کی فضا نے نگار کی اسلامی خُو کو، اس تیکھی چیز کو جو مسلمان عورت کی فطرت میں نمایاں ہوتی ہے تھوڑا سا گھسا دیا تھا جس سے وہ ذرا ملائم ہو گئی تھی۔ وہ حسین نہیں تھی۔ لیکن اپنی جگہ نسوانیت کا ایک نہایت ہی دیدہ چشم منفرد نمونہ تھا۔ انکسار، تعظیم اور پرستش کا وہ ملا جلا جذبہ جو آدرش ہندو عورت کا خاصہ ہے نگار میں اس کی خفیف سی آمیزی نے ایک روح پرور رنگ پیدا کر دیا تھا۔ اس وقت تو شاید یہ کبھی میرے ذہن میں نہ آتا۔ مگر یہ لکھتے وقت میں نگار کا تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے نماز اور آرتی کا دلفریب مجموعہ دکھائی دیتی ہے۔ شہزادہ غلام علی کی وہ پرستش کرتی تھی اور وہ بھی اس پر دل و جان سے فدا تھا جب نگار کے بارے میں اس سے گفتگو ہوئی تو پتا چلا کہ کانگرس تحریک کے دوران میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے ملاپ سے وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔ غلام علی کا ارادہ تھا کہ قید ہونے سے پہلے پہلے وہ نگار کو اپنی بیوی بنا لے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ قید سے واپس آنے پر بھی وہ اس سے شادی کر سکتا تھا۔ ان دنوں کوئی اتنی لمبی قید نہیں تھی۔ کم سے کم تین مہینے اور زیادہ سے زیادہ ایک برس۔ بعضوں کو تو پندرہ بیس روز کے بعد ہی رہا کر دیا جاتا تھا تاکہ دوسرے قیدیوں کے لیے جگہ بن جائے۔ بہر حال وہ اس ارادے کو نگار پر بھی ظاہر کر چکا تھا اور وہ بالکل تیار تھی۔ اب صرف دونوں کو بابا جی کے پاس جا کر ان کا آشیر واد لینا تھا۔ بابا جی جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے بہت زبردست ہستی تھی۔ شہر سے باہر لکھ پتی صراف ہری رام کی شاندار کوٹھی میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یوں تو وہ اکثر اپنے آشرم میں رہتے جو انھوں نے پاس کے ایک گاؤں میں بنا رکھا تھا مگر جب کبھی امرتسر آتے تو ہری رام صراف ہی کی کوٹھی میں اترتے اور ان کے آتے ہی یہ کوٹھی بابا جی کے شیدائیوں کے لیے مقدس جگہ بن جاتی۔ سارا دن درشن کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ دن ڈھلے وہ کوٹھی سے باہر کچھ فاصلے پر آم کے پیڑوں کے جھنڈ میں ایک چوبی

تخت پر بیٹھ کر لوگوں کو عام درشن دیتے، اپنے آشرم کے لیے چندہ اکٹھا کرے۔ آخر میں بھجن وغیرہ سن کر ہر روز شام کو یہ جلسہ ان کے حکم سے برخاست ہو جاتا۔ باباجی بہت پرہیز گار، خدا ترس، عالم اور ذہین آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ اور اچھوت سب ان کے گرویدہ تھے اور انھیں اپنا امام مانتے تھے۔ سیاست سے گو باباجی کو بظاہر کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ پنجاب کی ہر سیاسی تحریک انھی کے اشارے پر شروع ہوئی۔ اور انھی کے اشارے پر ختم ہوئی۔ گورنمنٹ کی نگاہوں میں وہ ایک عقدۂ لاینحل تھے، ایک سیاسی چیستاں جسے سرکارِ عالیہ کے بڑے بڑے مدبر بھی نہ حل کر سکتے تھے۔ باباجی کے پتلے پتلے ہونٹوں کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ہزار معنی نکالے جاتے تھے مگر جب وہ خود اس مسکراہٹ کا بالکل ہی نیا مطلب واضح کرتے تو مرعوب عوام اور زیادہ مرعوب ہو جاتے۔ یہ جو امرتسر میں سول نافرمانی کی تحریک جاری تھی اور لوگ دھڑا دھڑ قید ہو رہے تھے۔ اس کے عقب میں جیسا کہ ظاہر ہے باباجی ہی کا اثر کار فرما تھا۔ ہر شام لوگوں کو عام درشن دیتے وقت وہ سارے پنجاب کی تحریک آزادی اور گورنمنٹ کی نت نئی سخت گیریوں کے متعلق اپنے پوپلے منہ سے ایک چھوٹا سا۔ ایک معصوم سا جملہ نکال دیا کرتے تھے، جسے فوراً ہی بڑے بڑے لیڈر اپنے گلے میں تعویذ بنا کر ڈال لیتے تھے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ان کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت تھی، ان کی آواز میں ایک جادو تھا اور ان کا ٹھنڈا دماغ۔ ان کا وہ مسکراتا ہوتا دماغ جس کو گندی سے گندی گالی اور زہریلی سے زہریلی طنز بھی ایک لحظے کے ہزارویں حصے کے لیے برہم نہیں کر سکتی تھی۔ حریفوں کے لیے بہت ہی الجھن کا باعث تھا۔ امرتسر میں باباجی کے سینکڑوں جلوس نکل چکے تھے مگر جانے کیا بات ہے کہ میں نے اور تمام لیڈروں کو دیکھا۔ ایک صرف ان ہی کو میں نے دور سے دیکھا نہ نزدیک سے۔ اسی لیے جب غلام علی نے مجھ سے ان کے درشن کرنے اور ان سے شادی کی اجازت لینے کے متعلق بات چیت کی تو میں نے اس سے کہا کہ جب وہ دونوں جائیں تو مجھے بھی ساتھ لیتے جائیں۔ دوسرے ہی روز غلام علی نے تانگے کا انتظام کیا اور ہم صبح سویرے لالہ ہری رام صراف کی عالیشان کوٹھی میں پہنچ گئے۔ باباجی غسل اور صبح کی دعا سے فارغ ہو کر ایک خوبصورت پنڈتانی سے قومی گیت سن رہے تھے۔ چینی کی بے داغ سفید ٹائلوں والے فرش پر آپ کھجور کے پتوں کی چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گاؤ تکیہ ان کے پاس ہی پڑا تھا۔ مگر انھوں نے اس کا سہارا نہیں لیا تھا۔ کمرے میں سوائے ایک چٹائی کے جس کے اوپر باباجی بیٹھے تھے اور فرنیچر وغیرہ نہیں تھا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سفید ٹائلیں چمک رہی تھیں۔ ان کی چمک نے قومی گیت گانے والی پنڈتانی کے ہلکے پیازی چہرے کو اور بھی زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ باباجی گو ستر بہتر برس کے بڈھے تھے مگر ان کا جسم (وہ صرف گیروے رنگ کا چھوٹا سا تہمد باندھے تھے) عمر کی جھریوں سے بے نیاز تھا۔ جلد میں ایک عجیب قسم کی ملاحت تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہر روز اشنان سے پہلے روغن زیتون اپنے جسم پر ملواتے ہیں۔ شہزادہ غلام علی کی طرف دیکھ کر وہ مسکرائے مجھے بھی ایک نظر دیکھا اور ہم تینوں کی بندگی کا جواب اسی مسکراہٹ کو ذرا طویل کر کے دیا اور اشارہ کیا کہ ہم بیٹھ جائیں۔ میں اب یہ تصویر اپنے سامنے لاتا ہوں تو شعور کی عینک سے یہ مجھے دلچسپ ہونے کے علاوہ بہت ہی فکر خیز دکھائی دیتی ہے۔ کھجور کی چٹائی پر ایک نیم برہنہ معمر جوگیوں کا آسن لگائے بیٹھا ہے۔ اس کی بیٹھک ہے، اس کے گنجے سر سے، اس کی اَدھ کھلی آنکھوں سے، اس کے سانولے ملائم جسم سے، اس کے چہرے کے ہر خط سے ایک پرسکون اطمینان، ایک بے فکر تیقن مترشح تھا کہ جس مقام پر دنیا نے اسے بٹھا دیا ہے۔ اب بڑے سے بڑا زلزلہ بھی اسے وہاں سے نہیں گرا سکتا۔ اس سے کچھ دور وادی کشمیر کی ایک نوخیز کلی، جھکی ہوئی، کچھ اس بزرگ کی قربت کے احترام سے، کچھ قومی گریت کے اثر سے کچھ اپنی شدید جوانی سے جو اس کی کھردری سفید ساڑھی سے نکل کر قومی گیت کے علاوہ اپنی جوانی کا گیت بھی گانا چاہتی تھی، جو اس بزرگ کی قربت کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ کسی ایسی تندرست اور جوان ہستی کی بھی تعظیم کرنے کی خواہشمند تھی جو اس کی نرم کلائی پکڑ کر زندگی کے دہکتے ہوئے الاؤ میں کود پڑے۔ اس کے ہلکے پیازی چہرے سے، اس کی بڑی بڑی سیاہ متحرک آنکھوں سے، اس کے کھادی کے کھردرے بلاؤز میں ڈھکے ہوئے متلاطم سینے سے اس معمر جوگی کے ٹھوس تیقن اور سنگین اطمینان کے تقابل میں ایک خاموش صدا تھی کہ آؤ، جس مقام پر میں اس وقت ہوں۔ وہاں سے کھینچ کر مجھے یا تو نیچے گرا دو یا اس سے بھی اوپر لے جاؤ۔ اس طرف ہٹ کر ہم تین بیٹھے تھے۔ میں، نگار اور شہزادہ غلام علی۔ میں بالکل چغد بنا بیٹھا تھا۔ باباجی کی شخصیت سے بھی متاثر تھا اور اس پنڈتانی کے بے داغ حسن سے بھی۔ فرش کی چمکیلی ٹائلوں نے بھی مجھے مرعوب کیا تھا۔ کبھی سوچتا تھا کہ ایسی ٹائلوں والی ایک کوٹھی مجھے مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ پھر سوچتا تھا کہ یہ پنڈتانی مجھے اور کچھ نہ کرنے دے، ایک صرف مجھے اپنی آنکھیں چوم لینے دے۔ اس کے تصور سے بدن میں تھرتھری پیدا ہوتی تو جھٹ اپنی نوکرانی کا خیال آتا جس سے تازہ تازہ مجھے کچھ وہ ہوا تھا۔ جی میں آتا کہ ان سب کو، یہاں چھوڑ کر سیدھا گھر جاؤں۔ شاید نظر بچا کر اسے اوپر غسل خانے تک لے جانے میں کامیاب ہو سکوں، مگر جب باباجی پر نظر پڑتی اور کانوں میں قومی گیت کے پرجوش الفاظ گونجتے تو ایک دوسری تھرتھری بدن میں پیدا ہوتی اور میں سوچتا کہ کہیں سے پستول ہاتھ آ جائے تو سول لائن میں جا کر انگریزوں کو مارنا شروع کر دوں۔ اس چغد کے پاس نگار اور غلام علی بیٹھے تھے۔ دو محبت کرنے والے دل، جو تنہا محبت میں دھڑکتے دھڑکتے اب شاید کچھ اکتا گئے تھے اور جلدی ایک دوسرے میں محبت کے دوسرے رنگ دیکھنے کے لیے مدغم ہونا چاہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ باباجی سے، اپنے مسلمہ سیاسی رہنما سے شادی کی اجازت لینے آئے تھے اور جیسا کہ ظاہر ہے ان دونوں کے دماغ میں اس وقت قومی گیت کے بجائے ان کی اپنی زندگی کا حسین ترین مگر اَن سُنا نغمہ گونج رہا تھا۔ گیت ختم ہوا باباجی نے بڑے مشفقانہ انداز سے پنڈتائی کو ہاتھ کے اشارے سے آشیر واد دیا اور مسکراتے ہوئے نگار اور غلام علی کی طرف متوجہ ہوئے۔ مجھے بھی انھوں نے ایک نظر دیکھ لیا۔ غلام علی شاید تعارف کے لیے اپنا اور نگار کا نام بتانے والا تھا مگر باباجی کا حافظہ بلا کا تھا۔ انھوں نے فوراً ہی اپنی میٹھی آواز میں کہا۔

”شہزادے ابھی تک تم گرفتار نہیں ہوئے؟“

غلام علی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”جی نہیں۔“

باباجی نے قلمدان سے ایک پنسل نکالی اور اس سے کھیلتے ہوئے کہنے لگے۔

”مگر میں تو سمجھتا ہوں۔ تم گرفتار ہو چکے ہو۔“

غلام علی اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ لیکن باباجی نے فوراً ہی پنڈ تانی کی طرف دیکھا اور نگار کی طرف اشارہ کر کے۔

”نگار نے ہمارے شہزادے کو گرفتار کر لیا ہے۔“

نگار محجوب سی ہو گئی۔ غلام علی کا منہ فرطِ حیرت کھلا کا کھلا رہ گیا اور پنڈ تانی کے پیازی چہرے پر ایک دعائیہ چمک سی آئی۔ اس نے نگار اور غلام علی کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے یہ کہہ رہی ہے۔

”بہت اچھا ہوا۔“

باباجی ایک بار پھر پنڈ تانی کی طرف متوجہ ہوئے۔

”یہ بچے مجھ سے شادی کی اجازت لینے آئے ہیں۔ تم کب شادی کر رہی ہو کمل؟“

تو اس پنڈ تانی کا نام کمل تھا۔ باباجی کے اچانک سوال سے وہ بوکھلا گئی۔ اس کا پیازی چہرہ سرخ ہو گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے جواب دیا۔

”میں تو آپ کے آشرم میں جا رہی ہوں۔“

ایک ہلکی سی آہ بھی ان الفاظ میں لپٹ کر باہر آئی۔ جسے باباجی کے ہشیار دماغ نے فوراً نوٹ کیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر جوگیانہ انداز میں مسکرائے اور غلام علی اور نگار سے مخاطب ہو کر کہنے گا۔

”تو تم دونوں فیصلہ کر چکے ہو۔“

دونوں نے دبی زبان میں جواب دیا۔

”جی ہاں۔“

باباجی نے اپنی سیاست بھری آنکھوں سے ان کو دیکھا۔

”انسان جب فیصلے کرتا ہے تو کبھی کبھی اُن کو تبدیل کر دیا کرتا ہے۔“

پہلی دفعہ باباجی کی بارعب موجودگی میں غلام علی نے انھیں اس کی الھڑ اور بیباک جوانی سے کہا۔

”یہ فیصلہ اگر کسی وجہ سے تبدیل ہو جائے تو بھی اپنی جگہ پر اٹل رہے گا۔“

باباجی نے آنکھیں بند کر لیں اور جرح کے انداز میں پوچھا۔

”کیوں؟“

حیرت ہے کہ غلام علی بالکل نہ گھبرایا۔ شاید اس دفعہ نگار سے جو اسے پرخلوص محبت تھی وہ بول اٹھی۔

”باباجی ہم نے ہندوستان کو آزادی دلانے کا جو فیصلہ کیا ہے، وقت کی مجبوریاں اسے تبدیل کرتی رہیں۔ مگر جو فیصلہ ہے وہ تو اٹل ہے۔“

باباجی نے جیسا کہ میرا اب خیال ہے کہ اس موضوع پر بحث کرنا مناسب خیال نہ کیا چنانچہ وہ مسکرا دیے۔ اس مسکراہٹ کا مطلب بھی ان کی تمام مسکراہٹوں کی طرح ہر شخص نے بالکل الگ الگ سمجھا۔ اگر باباجی سے پوچھا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس کا مطلب ہم سب سے بالکل مختلف بیان کرتے۔ خیر۔ اس ہزار پہلو مسکراہٹ کو اپنے پتلے ہونٹوں پر ذرا اور پھیلاتے ہوئے انھوں نے نگار سے کہا۔

”نگار تم ہمارے آشرم میں آ جاؤ۔ شہزادہ تو تھوڑے دنوں میں قید ہو جائے گا۔“

نگار نے بڑے دھیمے لہجے میں جواب۔

”جی اچھا۔“

اس کے بعد باباجی نے شادی کا موضوع بدل کر جلیانوالہ باغ کیمپ کی سرگرمیوں کا حال پوچھنا شروع کر دیا۔ بہت دیر تک غلام علی، نگار اور کمل گرفتاریوں، رہائیوں، دودھ، لسّی اور ترکاریوں کے متعلق باتیں کرتے رہے اور جو میں بالکل چغد بنا بیٹھا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ باباجی نے شادی کی اجازت دینے میں کیوں اتنی مین میخ کی ہے۔ کیا وہ غلام علی اور نگار کی محبت کو

شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں؟۔ کیا انھیں غلام علی کے خلوص پر شبہ ہے؟ نگار کو انھوں نے کیا آشرم میں آنے کی اس لیے دعوت دی کہ وہاں رہ کر وہ اپنے قید ہونے والے شوہر کا غم بھول جائے گی؟۔ لیکن باباجی کے اس سوال پر

“کمل تم کب شادی کر رہی ہو۔”

کمل نے کیوں کہا تھا کہ میں تو آپ کے آشرم میں جا رہی ہوں؟۔ آشرم میں کیا مرد عورت شادی نہیں کرتے؟۔ میرا ذہن عجب مخمصے میں گرفتار تھا۔ مگر اُدھر یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ لیڈی والنٹیرز کیا پانچ سو رضاکاروں کے لیے چپاتیاں وقت پر تیار کرلیتی ہیں؟ چولہے کتنے ہیں؟ اور توے کتنے بڑے ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک بہت بڑا چولہا بنالیا جائے اور اس پر اتنا بڑا توار کھا جائے کہ چھ عورتیں ایک ہی وقت میں روٹیاں پکا سکیں؟ میں یہ سوچ رہا تھا کہ پنڈ تانی کمل کیا آشرم میں جا کر باباجی کو بس قومی گیت اور بھجن ہی سنایا کرے گی۔ میں نے آشرم کے مرد والنٹیر دیکھے تھے۔ گروہ سب کے سب وہاں کے قواعد کے مطابق ہر روز اشنان کرتے تھے، صبح اٹھ کر داتن کرتے تھے، باہر کھلی ہوا میں رہتے تھے۔ بھجن گاتے تھے۔ مگر ان کے کپڑوں سے پسینے کی بو پھر بھی آتی تھی، ان میں اکثر کے دانت بدبودار تھے اور وہ جو کھلی فضا میں رہنے سے انسان پر ایک ہشاش بشاش نکھار آتا ہے۔ ان میں بالکل مفقود تھا۔ جُھکے جُھکے سے، دبے دبے سے۔ زرد چہرے، دھنسی ہوئی آنکھیں، مرعوب جسم۔ گائے کے نچڑے ہوئے تھنوں کی طرح بے حس اور بے جان۔ میں ان آشرم والوں کو جلیانوالہ باغ میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہی مرد جن سے گھاس کی بو آتی ہے۔ اس پنڈ تانی کو جو دودھ، شہد اور زعفران کی بنی ہے۔ اپنی کیچڑ بھری آنکھوں سے گھوریں گے۔ کیا یہی مرد جن کا منہ اس قدر متعفن ہوتا ہے۔ اس لوبان کی مہک میں لپٹی ہوئی عورت سے گفتگو کریں گے؟ لیکن پھر میں نے سوچا کہ نہیں ہندوستان کی آزادی شاید ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ میں ان

“شاید”

کو اپنی تمام حب الوطنی اور جذبہء آزادی کے باوجود نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ مجھے نگار کا خیال آیا جو بالکل میرے قریب بیٹھی تھی اور باباجی کو بتا رہی تھی کہ شلجم بہت دیر میں گلتے ہیں۔ کہاں شلجم اور کہاں شادی جس کے لیے وہ اور غلام علی اجازت لینے آئے تھے۔ میں نگار اور آشرم کے متعلق سوچنے لگا۔ آشرم میں نے دیکھا نہیں تھا۔ مگر مجھے ایسی جگہوں سے جن کو آشرم، ودیالہ جماعت خانہ، تکیہ، یا درسگاہ کہا جائے ہمیشہ سے نفرت ہے۔ جانے کیوں؟ میں نے کئی اندھ ودیالوں اور اناتھ آشرموں کے لڑکوں اور ان کے متنظموں کو دیکھا ہے۔ سڑک میں قطار باندھ کر چلتے اور بھیک مانگتے ہوئے۔ میں نے جماعت خانے اور درس گاہیں دیکھی ہیں۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پائجامہ، بچپن ہی میں ماتھے پر محراب، جو بڑے ہیں ان کے چہرے پر گھنی داڑھی۔ جو نوخیز ہیں ان کے گالوں اور ٹھڈی پر نہایت ہی بدنما موٹے اور مہین بال۔ نماز پڑھتے جا رہے ہیں لیکن ہر ایک کے چہرے پر حیوانیت۔ ایک ادھوری حیوانیت مصلے پر بیٹھی نظر آتی ہے۔ نگار عورت تھی۔ مسلمان، ہندو، سکھ یا عیسائی عورت نہیں۔ وہ صرف عورت تھی، نہیں عورت کی دعا تھی جو اپنے چاہنے والے کے لیے یا جسے وہ خود چاہتی ہے صدق دل سے مانگتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ باباجی کے آشرم میں جہاں ہر روز قواعد کے مطابق دعا مانگی جاتی ہے۔ یہ عورت جو خود ایک دعا ہے۔ کیسے اپنے ہاتھ اٹھا سکے گی۔ میں اب سوچتا ہوں تو بالاجی، نگار، غلام علی، وہ خوبصورت پنڈ تانی اور امرتسر کی ساری فضا جو تحریک آزادی کے رومان آفرین کیف میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا خواب جو ایک بار دیکھنے کے بعد جی چاہتا ہے آدمی پھر دیکھے۔ باباجی کا آشرم میں نے اب بھی نہیں دیکھا مگر جو نفرت مجھے اس سے پہلے تھی اب بھی ہے۔ وہ جگہ جہاں فطرت کے خلاف اصول بنا کر انسانوں کو ایک لکیر پر چلایا جائے میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ آزادی حاصل کرنا بالکل ٹھیک ہے! اس کے حصول کے لیے آدمی مر جائے، میں اس کو سمجھ سکتا ہوں، لیکن اس کے لیے اگر اس غریب کو ترکاری کی طرح ٹھنڈا اور بے ضرر بنا دیا جائے تو یہی میری سمجھ سے بالکل بالاتر ہے۔ جھونپڑوں میں رہنا، تن آسانیوں سے پرہیز کرنا، خدا کی حمد گانا، قومی نعرے مارنا۔ یہ سب ٹھیک ہے مگر یہ کیا کہ انسان کی اس حِس کو جسے طلبِ حسن کہتے ہیں آہستہ آہستہ مردہ کر دیا جائے۔ وہ انسان کیا جس میں خوبصورت اور ہنگاموں کی تڑپ نہ رہے۔ ایسے آشرموں، مدرسوں، ودیالوں اور مولیوں کے کھیت میں کیا فرق ہے۔ دیر تک باباجی، غلام علی اور نگار سے جلیانوالہ باغ کی جملہ سرگرمیوں کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں انھوں نے اس جوڑے کو جو کہ ظاہر ہے کہ اپنے آنے کا مقصد بھول نہیں گیا تھا۔ کہا کہ وہ دوسرے روز شام کو جلیانوالہ باغ آئیں گے اور ان دونوں کو میاں بیوی بنا دیں گے۔ غلام علی اور نگار بہت خوش ہوئے۔ اس سے بڑھ کر ان کی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی کہ باباجی خود شادی کی رسم ادا کریں گے۔ غلام علی جیسا کہ اس نے مجھے بہت بعد میں بتایا اس قدر خوش ہوا تھا کہ فوراً ہی سے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ شاید جو کچھ اس نے سنا ہے غلط ہے۔ کیونکہ باباجی کے منحنی ہاتھوں کی خفیف سی جنبش بھی ایک تاریخی حادثہ بن جاتی تھی۔ اتنی بڑی ہستی ایک معمولی آدمی کی خاطر جو محض اتفاق سے کانگرس کا ڈکٹیٹر بن گیا ہے۔ چل کے جلیانوالہ باغ جائے اور اس کی شادی میں دلچسپی لے۔ یہ ہندوستان کے تمام اخباروں کے پہلے صفحے کی جلی سرخی تھی۔ غلام علی کا خیال تھا باباجی نہیں آئیں گے۔ کیونکہ وہ بہت مصروف آدمی ہیں لیکن اس کا یہ خیال جس کا اظہار دراصل اس نے نفسیاتی نقطہ نگاہ سے صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ ضرور آئیں، اس کی خواہش کے مطابق غلط ثابت ہوا۔ شام کے چھ بجے جلیانوالہ باغ میں جب رات کی رانی کی جھاڑیاں اپنی خوشبو کے جھونکے پھیلانے کی تیاریاں کر رہی تھیں اور متعدد رضاکار دولہا دلہن کے لیے ایک چھوٹا تنبو نصب کر کے اسے چمیلی، گیندے اور گلاب کے پھولوں سے سجا رہے تھے۔ باباجی اس قومی گیت گانے والی پنڈ تانی، اپنے سیکرٹری اور لالہ ہری رام صراف کے ہمراہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے۔ اس کی آمد کی اطلاع جلیانوالہ باغ میں صرف اسی وقت پہنچی، جب صدر دروازے پر لالہ ہری رام کی

ہری موٹر رکی۔ میں بھی وہیں تھا۔ لیڈی والنٹیرز ایک دوسرے تنبو میں نگار کو دلہن بنا رہی تھیں۔ غلام علی نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ سارا دن وہ شہر کے کانگرسی بنیوں سے رضا کاروں کے کھانے پینے کی ضروریات کے متعلق گفتگو کرتا رہا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے چند لمحات کے لیے نگار سے تخلیے میں کچھ بات چیت کی تھی۔ اس کے بعد جیسا کہ میں جانتا ہوں، اس نے اپنے ماتحت افسروں سے صرف اتنا کہا تھا کہ شادی کی رسم ادا ہونے کے ساتھ ہی وہ اور نگار دونوں جھنڈا اونچا کریں گے۔ جب غلام علی کو باباجی کی آمد کی اطلاع پہنچی تو وہ کنوئیں کے پاس کھڑا تھا۔ میں غالباً اس سے یہ کہہ رہا تھا۔

”غلام علی تم جانتے ہو یہ کنواں، جب گولی چلتی تھی لاشوں سے لبالب بھر گیا تھا۔ آج سب اس کا پانی پیتے ہیں۔ اس باغ کے جتنے پھول ہیں۔ اس کے پانی نے سینچے ہیں۔ مگر لوگ آتے ہیں اور انھیں توڑ کر لے جاتے ہیں۔ پانی کے کسی گھونٹ میں لہو کا نمک نہیں ہوتا۔ پھول کی کسی پتی میں خون کی لالی نہیں ہوتی۔ یہ کیا بات ہے؟“

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے یہ کہہ کر اپنے سامنے، اس مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا جس میں کہا جاتا ہے کہ ایک نوعمر لڑکی بیٹی تماشا دیکھ رہی تھی اور جنرل ڈائر کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی۔ اس کے سینے سے نکلے ہوئے خون کی لکیر چونے کی عمر رسیدہ دیوار پر دھندلی ہو رہی تھی۔ اب خون کچھ اس قدر ارزاں ہو گیا کہ اس کے بہنے بہانے کا وہ اثر ہی نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کے چھ سات مہینے بعد جب میں تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارا ماسٹر ساری کلاس کو ایک دفعہ اس باغ میں لے گیا۔ اس وقت یہ باغ باغ نہیں تھا۔ اجاڑ، سنسان اور اونچی نیچی خشک زمین کا ایک ٹکڑا تھا جس میں ہر قدم پر مٹی کے چھوٹے بڑے ڈھیلے ٹھوکریں کھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیلا جس پر جانے پان کی پیک کے دھبے یا کیا تھا، ہمارے ماسٹر نے اٹھا لیا تھا اور ہم سے کہا تھا۔ دیکھو اس پر ابھی تک ہمارے شہیدوں کا خون لگا ہے۔ یہ کہانی لکھ رہا ہوں اور حافظے کی تختی پر سینکڑوں چھوٹی چھوٹی باتیں ابھر رہی ہیں مگر مجھے تو غلام علی اور نگار کی شادی کا قصہ بیان کرنا ہے۔ غلام علی کو جب باباجی کی آمد کی خبر ملی تو اس نے دوڑ کر سب والنٹیر اکٹھے کیے جنھوں نے فوجی انداز میں ان کو سیلوٹ کیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک وہ وہ غلام علی مختلف کیمپوں کا چکر لگاتے رہے۔ اس دوران میں باباجی نے جن کی مزاحیہ حس بہت تیز تھی۔ لیڈی والنٹیرز اور دوسرے ورکرز سے گفتگو کرتے وقت کئی فقرے چُست کیے۔ ادھر ادھر مکانوں میں جب بتیاں جلنے لگیں اور دھندلا اندھیرا سا جلیانوالہ باغ پر چھا گیا تو رضا کار لڑکیوں نے ایک آواز ہو کر بھجن گانا شروع کیا۔ چند آوازیں سریلی، باقی سب کن سری تھیں۔ مگر ان کا مجموعی اثر بہت خوشگوار تھا۔ باباجی آنکھیں بن کیے سن رہے تھے۔ تقریباً ایک ہزار آدمی موجود تھے۔ جو چبوترے کے ارد گرد زمین پر بیٹھے تھے۔ بھجن گانے والی لڑکیوں کے علاوہ ہر شخص خاموش تھا۔ بھجن ختم ہونے پر چند لمحات تک ایسی خاموشی طاری رہی جو ایک دم ٹوٹنے کے لیے بے قرار ہو۔ چنانچہ جب باباجی نے آنکھیں کھولیں اور اپنی میٹھی آواز میں کہا۔

”بچو، جیسا کہ تمھیں معلوم ہے۔ میں یہاں آج آزادی کے دو دیوانوں کو ایک کرنے آیا ہوں۔“

تو سارا باغ خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔ نگار دلہن بنی چبوترے کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کھادی کی ترنگی ساری میں بہت بھلی دکھائی دے رہی تھی۔ باباجی نے اشارے سے اسے بلایا اور غلام علی کے پاس بٹھا دیا۔ اس پر اور خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ غلام علی کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ جب اس نے نکاح کا کاغذ اپنے دوست سے لے کر باباجی کو دیا تو اس کا ہاتھ لرز گیا۔ چبوترے پر ایک مولوی صاحب بھی موجود تھے۔ انھوں نے قرآن کی وہ آیت پڑھی جو ایسے موقعوں پر پڑھا کرتے ہیں۔ باباجی نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایجاب و قبول ختم ہوا تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں دولھا دولہن کو آشیرواد دی اور جب چھوہاروں کی بارش شروع ہوئی تو انھوں نے بچوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر دس پندرہ چھوہارے اکٹھے کر کے اپنے پاس رکھ لیے۔ نگار کی ایک ہندو سہیلی نے شرمیلی مسکراہٹ سے ایک چھوٹی سی ڈبیا غلام علی کو دی اور اس سے کچھ کہا۔ غلام علی نے ڈبیا کھولی اور نگار کی سیدھی مانگ میں سیندور بھر دیا۔ جلیانوالہ باغ کی خنک فضا ایک بار پھر تالیوں کی تیز آواز سے گونج اٹھی۔ باباجی اس شور میں اٹھے۔ ہجوم ایک دم خاموش ہو گیا۔ رات کی رانی اور چمیلی کی ملی جلی سوندھی سوندھی خوشبو شام کی ہلکی پھلکی ہوا میں تیر رہی تھی۔ بہت سہانا سماں تھا۔ باباجی کی آواز آج اور بھی میٹھی تھی۔ غلام علی اور نگار کی شادی پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔ یہ دونوں بچے اب زیادہ تندہی اور خلوص سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کریں گے۔ کیونکہ شادی کا صحیح مقصد مرد اور عورت کی پر خلوص دوستی ہے۔ ایک دوسرے کے دوست بن کر غلام علی اور نگار یکجہتی سے سوراج کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔ یورپ میں ایسی کئی شادیاں ہوتی ہیں جن کا مطلب دوستی اور صرف دوستی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ قابل احترام ہیں جو اپنی زندگی سے شہوت نکال پھینکتے ہیں۔ باباجی دیر تک شادی کے متعلق اپنے عقیدے کا اظہار کرتے رہے۔ ان کا ایمان تھا کہ صحیح مزا صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب مرد اور عورت کا تعلق صرف جسمانی نہ ہو۔ عورت اور مرد کا شہوانی رشتہ ان کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ہزاروں آدمی کھاتے ہیں۔ اپنے ذائقے کی حس کو خوش کرنے کے لیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنا انسانی فرض ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کھاتے ہیں زندہ رہنے کے لیے۔ اصل میں صرف یہی لوگ ہیں۔ جو خورد و نوش کے صحیح قوانین جانتے ہیں۔ اسی طرح وہ انسان جو صرف اس لیے شادی کرتے ہیں کہ انھیں شادی کے مطہر جذبے کی حقیقت اور اس رشتے کی تقدیس معلوم۔ حقیقی معنوں میں ازدواجی زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ باباجی نے اپنے اس عقیدے کو کچھ اس وضاحت کچھ ایسے نرم و نازک خلوص سے بیان کیا کہ سننے والوں کے لیے ایک بالکل نئی دنیا کے دروازے کھل گئے۔ میں خود بہت متاثر ہوا۔ غلام علی جو میرے سامنے بیٹھا تھا۔ باباجی کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو جیسے پی رہا تھا۔ باباجی نے جب بولنا بند کیا تو اس نے نگار سے کچھ کہا۔ اس کے بعد اٹھ کر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں یہ اعلان کیا۔

”میری اور نگار کی شادی اسی قسم کی آدرش شادی ہو گی، جب تک ہندوستان کو سوراج نہیں ملتا۔ میرا اور نگار کا رشتہ بالکل دوستوں جیسا ہو گا۔“

جلیانوالہ باغ کی خنک فضا دیر تک تالیوں کے بے پناہ شور سے گونجتی رہی۔ شہزادہ غلام علی جذباتی ہو گیا۔ اس کے کشمیری چہرے پر سرخیاں دوڑنے لگیں۔ جذبات کی اسی دوڑ میں اس نے نگار کو بلند آواز میں مخاطب کیا۔

”نگار! تم ایک غلام بچے کی ماں بنو۔ کیا تمہیں یہ گوارا ہو گا؟“

نگار جو کچھ شادی ہونے پر اور کچھ باباجی کی تقریر سن کر بوکھلائی ہوئی تھی۔ یہ کڑک سوال سن کر اور بھی بوکھلا گئی۔ صرف اتنا کہہ سکی۔

”جی؟۔ جی نہیں۔“

ہجوم نے پھر تالیاں پیٹیں اور غلام علی اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔ نگار کو غلام بچے کی شرمندگی سے بچا کر وہ اتنا خوش ہوا کہ وہ بہک گیا اور اصل موضوع سے ہٹ کر آزادی حاصل کرنے کی پیچدار گلیوں میں جا نکلا۔ ایک گھنٹے تک وہ جذبات بھری آواز میں بولتا رہا۔ اچانک اس کی نظر نگار پر پڑی۔ جانے کیا ہوا۔ ایک دم اس کی قوت گویائی جواب دے گئی۔ جیسے آدمی شراب کے نشے میں بغیر کسی حساب کے نوٹ نکالتا جائے اور ایک دم بٹوہ خالی پائے۔ اپنی تقریر کا بٹوہ خالی پا کر غلام علی کو کافی الجھن ہوئی۔ مگر اس نے فوراً ہی باباجی کی طرف دیکھا اور جھک کر کہا۔

”باباجی۔ ہم دونوں کو آپ کا آشیرواد چاہیے کہ جس بات کا ہم نے عہد کیا ہے، اس پر پورے رہیں۔“

دوسرے روز صبح چھ بجے شہزادہ غلام علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ کیونکہ اس تقریر میں جو اس نے سوراج ملنے تک بچہ پیدا نہ کرنے کی قسم کھانے کے بعد کی تھی۔ انگریزوں کا تختہ الٹنے کی دھمکی بھی تھی۔ گرفتار ہونے کے چند روز بعد غلام علی کو آٹھ مہینے کی قید ہوئی اور ملتان جیل بھیج دیا گیا۔ وہ امرتسر کا اکیالیسواں ڈکٹیٹر تھا اور شاید چالیس ہزارواں سیاسی قیدی۔ کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اس تحریک میں قید ہونے والے لوگوں کی تعداد اخباروں نے چالیس ہزار ہی بتائی تھی۔ عام خیال تھا کہ آزادی کی منزل اب صرف دو ہاتھ ہی دور ہے۔ لیکن فرنگی سیاستدانوں نے اس تحریک کا دودھ ابلنے دیا اور جب ہندوستان کے بڑے لیڈروں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہوا تو یہ تحریک ٹھنڈی لسی میں تبدیل ہو گئی۔ آزادی کے دیوانے جیلوں سے باہر نکلے تو قید کی صعوبتیں بھولنے اور اپنے بگڑے ہوئے کاروبار سنوارنے میں مشغول ہو گئے۔ شہزادہ غلام علی سات مہینے کے بعد ہی باہر آ گیا تھا۔ گو اس وقت پہلا سا جوش نہیں تھا۔ پھر بھی امرتسر کے اسٹیشن پر لوگوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس کے اعزاز میں تین چار دعوتیں اور جلسے بھی ہوئے۔ میں ان سب میں شریک تھا۔ مگر یہ محفلیں بالکل پھیکی تھیں۔ لوگوں پر اب ایک عجیب قسم کی تھکاوٹ طاری تھی جیسے ایک لمبی دوڑ میں اچانک دوڑنے والوں سے کہہ دیا گیا تھا۔ ٹھہرو، یہ دوڑ پھر سے شروع ہو گی۔ اور اب جیسے یہ دوڑنے والے کچھ دیر ہانپنے کے بعد دوڑ کے مقام آغاز کی طرف بڑی بے دلی کے ساتھ واپس آ رہے تھے۔ کئی برس گزر گئے۔ یہ بے کیف تھکاوٹ ہندوستان سے دور نہ ہوئی تھی۔ میری دنیا میں چھوٹے موٹے کئی انقلاب آئے۔ داڑھی مونچھی اگی، کالج میں داخل ہوا۔ ایف اے میں دوبارہ فیل ہوا۔ والد انتقال کر گئے، روزی کی تلاش میں ادھر ادھر پریشان ہوا۔ ایک تھرڈ کلاس اخبار میں مترجم کی حیثیت سے نوکری کی، یہاں سے جی گھبرایا تو ایک بار پھر تعلیم حاصل کرنے کا خیال آیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوا اور تین ہی مہینے بعد دق کا مریض ہو کر کشمیر کے دیہاتوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ وہاں سے لوٹ کر بمبئی کا رخ کیا۔ یہاں دو برسوں میں تین ہندو مسلم فساد دیکھے۔ جی گھبرایا تو دلی چلا گیا۔ وہاں بمبئی کے مقابلے میں ہر چیز سست رفتار دیکھی۔ کہیں حرکت نظر بھی آئی تو اس میں ایک زنانہ پن محسوس ہوا۔ آخر یہی سوچا کہ بمبئی اچھا ہے۔ کیا ہوا ساتھ والے ہمسائے کو ہمارا نام تک پوچھنے کی فرصت نہیں۔ جہاں لوگوں کو فرصت ہوتی ہے۔ وہاں ریاکاریاں اور چالبازیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ دلی میں دو برس ٹھنڈی زندگی بسر کرنے کے بعد سدا متحرک بمبئی چلا آیا۔ گھر سے نکلے اب آٹھ برس ہو چلے تھے۔ دوست احباب اور امرتسر کی سڑکیں گلیاں کس حالت میں ہیں۔ اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا کسی سے خط و کتابت ہی نہیں تھی۔ جو پتہ چلتا۔ دراصل مجھے ان آٹھ برسوں میں اپنے مستقبل کی طرف سے کچھ بے پروائی سی ہو گئی تھی۔ کون بیتے ہوئے دنوں کے متعلق سوچے۔ جو آٹھ برس پہلے خرچ ہو چکا ہے۔ اس کا اب احساس کرنے سے فائدہ؟۔ زندگی کے روپے میں وہی پائی زیادہ اہم ہے جسے تم آج خرچنا چاہتے ہو یا جس پر کل کسی کی آنکھ ہے۔ آج سے چھ برس پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ جب زندگی کے روپے اور چاندی کے روپے سے جس پر بادشاہ سلامت کی چھاپ ہوتی ہے۔ پائی خارج نہیں ہوئی تھی۔ میں اتنا زیادہ قلاش نہیں تھا۔ کیونکہ فورٹ میں اپنے پاؤں کے لیے ایک قیمتی شو خریدنے جا رہا تھا۔ آرمی اینڈ نیوی اسٹور کے صرف ہارنبی روڈ پر جوتوں کی ایک دکان ہے جس کی نمائشی الماریاں مجھے بہت دیر سے اس طرف کھینچ رہی تھی۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے چنانچہ یہ دکان ڈھونڈنے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ یوں تو میں اپنے لیے ایک قیمتی شو خریدنے آیا تھا مگر جیسا کہ میری عادت ہے دوسری دکانوں میں سجی ہوئی چیزیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک اسٹور میں سگریٹ کیس دیکھے، دوسرے میں پائپ اسی طرح فٹ پاتھ پر ٹہلتا ہوا جوتوں کی ایک چھوٹی سی دکان کے پاس آیا اور اس کے اندر چلا گیا کہ چلو یہیں سے خرید لیتے ہیں، دکاندار نے میرا استقبال کیا اور پوچھا۔

”کیا مانگتا ہے صاحب۔“

میں نے تھوڑی دیر یاد کیا کہ مجھے کیا چاہیے۔

”ہاں۔ کریپ سول شو۔“

”ادھر نہیں رکھتا ہم۔“

مون سون قریب تھی۔ میں نے سوچا گم بوٹ ہی خرید لوں۔

”گم بوٹ نکالو۔“

”بابو والے کی دکان سے ملیں گے۔ ربڑ کی کئی چیز ہم ادھر نہیں رکھتا۔“

میں نے ایسے ہی پوچھا۔

”کیوں؟“

”سیٹھ کی مرضی۔“

یہ مختصر مگر جامع جواب سنکر میں دکان سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ ایک خوش پوش آدمی پر میری نظر پڑی جو باہر فٹ پاتھ پر ایک بچہ گود میں اٹھائے پھل والے سے سنگترہ خرید رہا تھا۔

میں باہر نکلا اور وہ دکان کی طرف مڑا۔

”ارے۔ غلام علی۔

”سعادت یہ کہہ کر اس نے بچے سمیت مجھے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ بچے کو یہ حرکت ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے رونا شروع کر دیا۔ غلام علی نے اس آدمی کو بلایا۔ جس نے مجھ سے کہا تھا کہ ربڑ کی کوئی چیز ادھر ہم نہیں رکھتا اور اسے بچہ دے کر کہا

”جاؤ اسے گھر لے جاؤ۔“

پھر وہ مجھ سے غاطب ہوا۔

”کتنی دیر کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملے ہیں۔“

میں نے غلام علی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ کھلا ہی، وہ ہلکا سا گنڈاپن جو اس کی امتیازی شان تھا۔ اب بالکل مفقود تھا۔ میرے سامنے آتشیں تقریریں کرنے والے کھادی پوش نوجوان کی جگہ ایک گھریلو قسم کا عام انسان کھڑا تھا۔ مجھے اس کی وہ آخری تقریر یاد آئی۔ جب اس نے جلیانوالہ باغ کی خنک فضا کو ان گرم الفاظ سے مرتعش کیا تھا۔

”نگار۔ تم ایک غلام بچے کی ماں بنو۔ کیا تمہیں یہ گوارا ہو گا“

۔ فوراً ہی مجھے اس بچے کا خیال آیا۔ جو غلام علی کی گود میں تھا۔ میں اس سے یہ پوچھا۔

”یہ بچہ کس کا ہے؟“

غلام علی نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔

”میرا۔ اس سے بڑا ایک اور بھی ہے۔ کہو، تم نے کتنے پیدا کیے۔“

ایک لحظے کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے غلام علی کے بجائے کوئی اور ہل بول رہا ہے۔ میرے دماغ میں سینکڑوں خیال اوپر تلے گرتے گئے۔ کیا غلام علی اپنی قسم بالکل بھول چکا ہے۔ کیا اس کی سیاسی زندگی اس سے قطعاً علیحدہ ہو چکی ہے۔ ہندوستان کو آزادی دلانے کا وہ جوش، وہ ولولہ کہاں گیا۔ اس بے ریش و بروت للکار کا کیا ہوا۔ نگار کہاں تھی؟۔ کیا اس نے دو غلام بچوں کی ماں بننا گوارا کیا۔ شاید وہ مر چکی ہو۔ ہو سکتا ہے۔ غلام علی نے دوسری شادی کر لی ہو۔

”کیا سوچ رہے ہو۔ کچھ باتیں کرو۔ اتنی دیر کے بعد ملے ہیں۔“

غلام علی نے میرے کاندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ میں شاید خاموش ہو گیا تھا۔ ایک دم چونکا اور ایک لمبی

”ہاں“

کر کے سوچنے لگا کہ گفتگو کیسے شروع کروں۔ لیکن غلام علی نے میرا انتظار نہ کیا اور بولنا شروع کر دیا۔

”یہ دکان میری ہے۔ دو برس سے میں یہاں بمبئی میں ہوں۔ بڑا اچھا کاروبار چل رہا ہے۔ تین چار سو مہینے کے بچ جاتے ہیں۔ تم کیا کر رہے ہو۔ سنا ہے کہ بہت بڑے افسانہ نویس بن گئے ہو۔ یاد ہے ہم ایک دفعہ یہاں بھاگ کے آئے تھے۔ لیکن یار عجیب بات ہے۔ اس بمبئی اور اس بمبئی میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ چھوٹی تھی اور یہ بڑی ہے۔“

اتنے میں ایک گاہک آیا۔ جسے ٹینس شو چاہیے تھا۔ غلام علی نے اس سے کہا۔

”ربڑ کا مال اِدھر نہیں ملتا۔ بازو کی دکان میں چلے جایئے۔“

گاہک چلا گیا تو میں نے غلام سے پوچھا۔

"ربڑ کا مال تم کیوں نہیں رکھتے میں بھی یہاں کریپ سول شو لینے آیا تھا۔"

یہ سوال میں نے یونہی کیا تھا۔ لیکن غلام علی کا چہرہ ایک دم بے رونق ہو گیا۔ دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"مجھے پسند نہیں۔"

"کیا پسند نہیں؟"

"یہی ربڑ۔ ربڑ کی بنی ہوئی چیزیں۔"

یہ کہہ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہا تو زور سے خشک سا قہقہہ لگایا۔

"میں تمہیں بتاؤں گا۔ ہے تو بالکل واہیات سی چیز، لیکن۔ لیکن میری زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔"

تفکر کی گہرائی غلام علی کے چہرے پر پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھیں جن میں ابھی تک کھلنڈراپن موجود تھا۔ ایک لحظے کے لیے دھندلی ہوئیں۔ لیکن پھر چمک اٹھیں۔

"بکواس تھی یار وہ زندگی۔ سچ کہتا ہوں سعادت میں وہ دن بالکل بھول چکا ہوں۔ جب میرے دماغ پر لیڈری سوار تھی۔ چار پانچ برس سے اب بڑے سکون میں ہوں۔ بیوی ہے بچے ہیں، اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے۔"

اللہ کے فضل و کرم سے متاثر ہو کر غلام علی نے بزنس کا ذکر شروع کر دیا کہ کتنے سرمائے اس نے کام شروع کیا تھا۔ ایک برس میں کتنا فائدہ ہوا۔ اب بنک میں اس کا کتنا روپیہ ہے۔ میں نے اسے درمیان میں ٹوکا اور کہا۔

"لیکن تم نے کسی واہیات چیز کا ذکر کیا تھا۔ جس کا تمہاری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔"

ایک بار پھر غلام علی کا چہرہ بے رونق ہو گیا۔ اس نے ایک لمبی ہاں کی اور جواب دیا۔

"گہرا تعلق تھا۔ شکر ہے کہ اب نہیں ہے۔ لیکن مجھے ساری داستان سنانی پڑے گی۔"

اتنے میں اس کا نوکر آ گیا۔ دکان اس کے سپرد کر کے وہ مجھے اندر اپنے کمرے میں لے گیا۔ جہاں بیٹھ کر اس نے مجھے اطمینان سے بتایا کہ اسے ربڑ کی چیزوں سے کیوں نفرت پیدا ہوئی۔

"میری سیاسی زندگی کا آغاز کیسے ہوا۔ اس کے متعلق تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میرا کیریکٹر کیسا تھا۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہے۔ ہم دونوں قریب قریب ایک جیسے ہی تھے۔ میرا مطلب ہے ہمارے ماں باپ کسی سے فخریہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارے لڑکے بے عیب ہیں۔ معلوم نہیں میں تم سے یہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ لیکن شاید تم سمجھ گئے ہو کہ میں کوئی مضبوط کیریکٹر کا مالک نہیں تھا۔ مجھے شوق تھا کہ میں کچھ کروں۔ سیاست سے مجھے اسی لیے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جھوٹا نہیں تھا۔ وطن کے لیے میں جان بھی دے دیتا۔ اب بھی حاضر ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کی سیاست، اس کے لیڈر سب ناپختہ ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں تھا۔ ایک لہر اٹھتی ہے۔ اس میں جوش، زور، شور سبھی ہوتا ہے۔ لیکن فوراً ہی بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک میرا خیال ہے کہ لہر پیدا کی جاتی ہے، خود بخود نہیں اٹھتی۔ لیکن شاید میں تمہیں اچھی طرح سمجھا نہیں سکا۔"

غلام علی کے خیالات میں بہت الجھاؤ تھا۔ میں نے اسے سگرٹ دیا۔ اسے سلگا کر اس نے زور سے تین کش لیے اور کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا ہندوستان کی ہر کوشش جو اس نے آزادی حاصل کرنے کے لیے کی ہے۔ غیر فطری نہیں۔ کوشش نہیں۔ میرا مطلب ہے اس کا انجام کیا ہر بار غیر فطری نہیں ہوتا رہا۔ ہمیں کیوں آزادی نہیں ملتی۔ کیا ہم سب نامرد ہیں؟ نہیں، ہم سب مرد ہیں۔ لیکن ہم ایسے ماحول میں ہیں کہ ہماری قوت کا ہاتھ آزادی تک پہنچنے ہی نہیں پاتا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے آزادی اور ہمارے درمیان کوئی چیز حائل ہے۔"

غلام علی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"بالکل۔ لیکن یہ کوئی پکی دیوار نہیں ہے۔ کوئی ٹھوس چٹان نہیں ہے۔ ایک پتلی سی جھلی ہے۔ ہماری اپنی سیاست کی، ہماری مصنوعی زندگی کی جہاں لوگ دوسروں کو دھوکا دینے کے علاوہ اپنے آپ سے بھی فریب کرتے ہیں۔"

اس کے خیالات بدستور الجھے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ اپنے گزشتہ تجربوں کو اپنے دماغ میں تازہ کر رہا تھا۔ سگرٹ بجھا کر اس نے میری طرف دیکھا اور بلند آواز میں کہا۔

"انسان جیسا ہے ایسے ویسا ہی ہونا چاہیے نیک کام کرنے کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ انسان اپنا سر منڈائے، گیروے کپڑے پہنے یا بدن پر راکھ ملے، تم کہو گے۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں اس کی اس مرضی ہی سے اس کی اس نرالی چیز ہی سے گمراہی پھیلتی ہے۔ یہ لوگ اونچے ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بالکل بھول جاتے ہیں

کہ ان کے کردار۔ ان کے خیالات اور عقیدے تو ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ لیکن ان کے منڈے ہوئے سر، ان کے بدن کی راکھ اور ان کے گیر دے کپڑے سادہ لوح انسانوں کے دماغ میں رہ جائیں گے۔"

غلام علی زیادہ جوش میں آگیا۔

"دنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی تعلیم تو لوگ بھول چکے ہیں۔ لیکن صلیبیں، دھاگے، داڑھیاں، کڑے اور بغلوں کے بال رہ گئے ہیں۔ ایک ہزار برس پہلے جو لوگ یہاں بستے تھے۔ ہم ان سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آج کے مصلح کیوں خیال نہیں کرتے کہ وہ انسان کی شکل مسخ کر رہے ہیں۔ جی میں کئی دفعہ آتا ہے۔ بلند آواز میں چلانا شروع کر دوں۔ خدا کے لیے انسان کو انسان رہنے دو۔ اس کی صورت کو تم بگاڑ چکے ہو، ٹھیک ہے۔ اب اس کے حال پر رحم کرو۔ تم اس کو خدا بنانے کی کوشش کرتے ہو، لیکن وہ غریب اپنی انسانیت بھی کھو رہا ہے۔ سعادت، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ یہ میرے دل کی آواز ہے۔ میں نے جو محسوس کیا ہے۔ وہی کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ غلط ہے تو پھر کوئی چیز درست اور صحیح نہیں ہے۔ میں نے دو برس، پورے دو برس دماغ کے ساتھ کئی کشتیاں لڑی ہیں۔ میں نے اپنے دل، اپنے ضمیر، اپنے جسم، اپنے روئیں روئیں سے بحث کی ہے۔ مگر اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کو انسان ہی رہنا چاہیے۔ نفس ہزاروں میں ایک دو آدمی ماریں۔ سب نے اپنا نفس مار لیا تو میں پوچھتا ہوں یہ کشتہ کام کس کے آئے گا؟"

یہاں تک کہہ کر اس نے ایک اور سگرٹ لیا اور اسے سلگانے میں ساری تیلی جلا کر گردن کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"کچھ نہیں سعادت۔ تم نہیں جانتے۔ میں نے کتنی روحانی اور جسمانی تکلیف اٹھائی ہے۔ لیکن فطرت کے خلاف جو بھی قدم اٹھائے گا۔ اسے تکلف برداشت کرنی ہی ہو گی۔ میں نے اس روز۔ تمہیں یاد ہو گا وہ دن۔ جلیانوالہ باغ میں اس بات کا اعلان کر کے کہ نگار اور میں غلام بچے پیدا نہیں کریں گے ایک عجیب قسم کی برقی مسرت محسوس کی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ اس اعلان کے بعد میرا سر اونچا ہو کر آسمان کے ساتھ جا لگا ہے۔ لیکن جیل سے واپس آنے کے بعد مجھے آہستہ آہستہ اس بات کا تکلیف دہ۔ بہت ہی اذیت رساں احساس ہونے لگا کہ میں نے اپنے جسم کا اپنی روح کا ایک بہت ہی ضروری حصہ مفلوج کر دیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے میں نے اپنی زندگی کے باغ کا سب سے حسین پھول مسل ڈالا ہے۔ شروع شروع میں اس خیال سے مجھے ایک عجیب قسم کا تسلی بخش فخر محسوس ہوتا رہا کہ میں نے ایسا کام کیا ہے جو دوسروں سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن دھیرے دھیرے جب میرے شعور کے مسام کھلنے لگے تو حقیقت اپنی تمام تلخیوں سمیت میرے رگ و ریشے میں رچنے لگی۔ جیل سے واپس آنے پر میں نگار سے ملا۔ ہسپتال چھوڑ کر وہ باباجی کے آشرم میں چلی گئی تھی۔ سات مہینے کے قید کے بعد جب میں اس سے ملا تو اس کی بدلی ہوئی رنگت، اس کی تبدیل شدہ جسمانی اور دماغی کیفیت دیکھ کر میں نے خیال کیا۔ شاید میری نظروں نے دھوکا کھایا ہے۔ لیکن ایک برس گزرنے کے بعد۔ ایک برس اس کے ساتھ۔"

غلام علی کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ہاں ایک برس اس کے ساتھ رہنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کا غم بھی وہی ہے جو میرا ہے۔ لیکن وہ مجھ پر ظاہر کرنا چاہتی ہے، نہ میں اس پر ظاہر کرنا چاہتی ہوں۔ ہم دونوں اپنے عہد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ایک برس میں سیاسی جوش آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کھادی کے لباس اور ترنگے جھنڈوں میں اب وہ پہلی سی کشش باقی نہ رہی تھی۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ اگر کبھی بلند ہوتا بھی تا تو اس میں وہ شان نظر نہیں آتی تھی۔ جلیانوالہ باغ میں ایک تنبو بھی نہیں تھا۔ پرانے کیمپوں کے کھونٹے کہیں کہیں گڑے نظر آتے تھے۔ خون سے سیاست کی حرارت قریب قریب نکل چکی تھی۔ میں اب زیادہ وقت گھر ہی میں رہتا تھا، اپنی بیوی کے پاس"

۔ ایک بار پھر غلام علی کے ہونٹوں پر وہی زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ میں بھی چپ رہا۔ کیونکہ میں اس کے خیالات کا تسلسل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چند لمحات کے بعد اس نے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور سگرٹ بجھا کر کہنے لگا۔

"ہم دونوں ایک عجیب قسم کی لعنت میں گرفتار تھے۔ نگار سے مجھے جتنی محبت ہے۔ تم اس سے واقف ہو۔ میں سوچنے لگا۔ یہ محبت کیا ہے؟۔ میں اس کو ہاتھ لگاتا ہوں تو کیوں اس کے رد عمل کو اپنی معراج پر پہنچنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں کیوں ڈرتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے گا۔ مجھے نگار کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ ایک روز جب کہ شاید میں بالکل صحیح حالت میں تھا، میرا مطلب ہے جیسا کہ ہر انسان کو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے انھیں چوم لیا۔ وہ میرے بازوؤں میں تھی۔ یوں کہو کہ ایک کپکپی تھی جو میرے بازوؤں میں تھی۔ قریب تھا کہ میری روح اپنے پر چھڑا کر پھڑ پھڑاتی ہوئی اونچے آسمان کی طرف اڑ جائے کہ میں نے۔ کہ میں نے اسے پکڑ لیا اور قید کر دیا۔ اس کے بعد بہت دیر تک۔ کئی دنوں تک اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میرے اس فعل سے۔ میرے اس بہادرانہ کارنامے سے میری روح کو ایسی لذت ملی ہے جس سے بہت کم انسان آشنا ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس میں ناکام رہا اور اس ناکامی نے جسے میں ایک بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہتا تھا۔ خدا کی قسم یہ میری دلی خواہش تھی کہ میں ایسا سمجھوں مجھے دنیا کا سب سے زیادہ دکھی انسان بنا دیا۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو۔ انسان حیلے بہانے تلاش کر لیتا ہے، میں نے بھی ایک راستہ نکال لیا۔ ہم دونوں سوجھ رہے تھے۔ اندر ہی اندر ہماری تمام لطافتوں پر پپڑی جم رہی تھی۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے غیر بن رہے تھے۔ نے سوچا۔ بہت دنوں کے غور و فکر کے بعد ہم اپنے عہد پر قائم رہ کر بھی۔ میرا مطلب ہے کہ نگار غلام بچے پیدا نہیں کرے گی۔"

یہ کہہ کر اس کے ہونٹوں پر تیسری بار وہ زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لیکن فوراً ہی ایک بلند قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ جس میں تکلیف دہ احساس کی چبھن نمایاں تھی۔ پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر وہ کہنے لگا۔

”ہماری ازدواجی زندگی کا یہ عجیب و غریب دور شروع ہوا۔ اندھے کو جیسے ایک آنکھ مل گئی۔ میں ایک دم دیکھنے لگا لیکن یہ بصارت تھوڑی دیر ہی کے بعد دھندلی ہونے لگی۔ پہلے پہل تو یہی خیال تھا۔ غلام علی موزوں الفاظ تلاش کرنے لگا۔

”پہلے پہل تو ہم مطمئن تھے۔ میرا مطلب ہے شروع شروع میں ہمیں اس کا قطعاً خیال نہیں تھا کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم نامطمئن ہو جائیں گے۔ یعنی ایک آنکھ تقاضا کرنے لگی کہ ”دوسری آنکھ بھی ہو۔ آغاز میں ہم دونوں نے محسوس کیا تھا جیسے ہم صحت مند ہو رہے ہیں، ہماری تندرستی بڑھ رہی ہے۔ نگار کا چہرہ نکھر گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ میرے اعضا سے بھی خشک سا تناؤ دور ہو گیا تھا جو پہلے مجھے تکلیف دیا کرتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہم دونوں پر عجیب قسم کی مردنی چھانے لگی۔ ایک برس ہی میں ہم دونوں ربڑ کے پتلے سے بن گئے۔ میرا احساس زیادہ شدید تھا۔ تم یقین نہیں کرو گے، لیکن خدا کی قسم اس وقت جب میں بازو کا گوشت چٹک میں لیتا تو بالکل ربڑ معلوم ہوتا۔ ایسا لگتا تھا کہ اندر خون کی نسیں نہیں ہیں۔ نگار کی حالت مجھ سے، جہاں تک میرا خیال ہے مختلف تھی۔ اس کے سوچنے کا زاویہ اور تھا، وہ ماں بننا چاہتی تھی۔ گلی میں جب بھی کسی کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے بہت سی آہیں چھپ چھپ کر اپنے سینے کے اندر دفن کرنا پڑتی تھیں۔ لیکن مجھے بچوں کا کوئی خیال نہیں تھا، بچے نہ ہوئے تو کیا ہے۔ دنیا میں لاکھوں انسان موجود ہیں جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ اس سے تسکین تو کافی ہو جاتی تھی مگر میرے ذہن پر جب ربڑ کا مہین مہین جالا تننے لگا تو میری گھبراہٹ بڑھ گئی۔ میں ہر وقت سوچنے لگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دماغ کے ساتھ ربڑ کا لمس چمٹ گیا۔ روٹی کھاتا تو لقمے دانتوں کے نیچے کچکچانے لگتے۔

”یہ کہتے ہوئے غلام علی کو پھریری آ گئی۔“

بہت ہی واہیات اور غلط چیز تھی۔ انگلیوں میں ہر وقت جیسے صابن سا لگا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ میری روح کا سارا رس نچڑ گیا ہے اور اس چھلکا سا باقی رہ گیا ہے، استعمال شدہ۔ استعمال شدہ۔ غلام علی ہنسنے لگا۔ شکر ہے کہ وہ لعنت دور ہوئی۔ لیکن سعادت، کن اذیتوں کے بعد۔ زندگی بالکل سوکھے ہوئے چھچھڑے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ساری حِسیں مردہ ہو گئی تھیں۔ لیکن لمس کی حس غیر فطری حد تک تیز ہو گئی تھی۔ تیز نہیں۔ اس کا صرف ایک رخ ہو گیا تھا۔ لڑکی میں، شیشے میں، لوہے میں، کاغذ میں، پتھر میں ہر جگہ ربڑ کی وہ مردہ، وہ ابکائی بھری ملائمی!!۔ یہ عذاب اور بھی شدید ہو جاتا جب میں اس کی وجہ کا خیال کرتا۔ میں دو انگلیوں سے اس لعنت کو اٹھا کر پھینک سکتا تھا، لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا مجھے کوئی سہارا مل جائے۔ عذاب کے اس سمندر میں مجھے ایک چھوٹا سا تنکا مل جائے جس کی مدد سے میں کنارے لگ جاؤں۔ بہت دیر تک میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ لیکن ایک روز جب کوٹھے پر دھوپ میں ایک مذہبی کتاب پڑھ رہا تھا، پڑھ کیا رہا تھا۔ ایسے ہی سرسری نظر دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک حدیث پر پڑی۔ خوشی سے اچھل پڑا۔ سہارا میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ میں نے بار بار وہ سطریں پڑھیں۔ میری خشک زندگی جیسے سراب ہونے لگی۔ لکھا تھا کہ شادی کے بعد میاں بیوی کے لیے بچے پیدا کرنے لازم ہیں۔ صرف اسی حالت میں ان کی پیدائش روکنے کی اجازت ہے۔ جب والدین کی زندگی خطرے میں ہو۔ میں نے دو انگلیوں سے اس لعنت کو اٹھایا اور ایک طرف پھینک دیا۔“

یہ کہہ وہ بچوں کی طرح مسکرانے لگا میں بھی مسکرا دیا۔ کیونکہ اس نے دو انگلیوں سے سگرٹ کا ٹکڑا اٹھا کر ایک طرف ایسے پھینکا تھا جیسے وہ کوئی نہایت ہی مکروہ چیز ہے۔ مسکراتے مسکراتے غلام علی دفعتہً سنجیدہ ہو گیا۔

”مجھے معلوم ہے سعادت۔ میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے تم اس کا افسانہ بنا دو گے۔ لیکن دیکھو میرا مذاق مت اڑانا۔ خدا کی قسم میں نے کچھ محسوس کیا تھا وہی تم سے کہا ہے۔ میں اس معاملے میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ لیکن میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فطرت کی خلاف ورزی ہرگز ہرگز بہادری نہیں۔ یہ کوئی کارنامہ نہیں کہ تم فاقہ کشی کرتے کرتے مر جاؤ، یا زندہ رہو۔ قبر کھو کر اس میں گڑ جانا اور کئی کئی دن اس کے اندر دم سادھے رکھنا، نوکیلی کیلوں کے بستر پر مہینوں لیٹے رہنا، ایک ہاتھ برسوں اوپر اٹھائے رکھنا، حتیٰ کہ وہ سوکھ سوکھ کر لکڑی ہو جائے۔ ایسے مداری پنے سے خدا مل سکتا ہے نہ سوراج۔ اور میں تو سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کو سوراج صرف اس لیے نہیں مل رہا کہ یہاں مداری زیادہ ہیں اور لیڈر کم۔ جو ہیں وہ قوانین فطرت کے خلاف چل رہے ہیں۔ ایمان اور صاف دلی کا برتھ کنٹرول کرنے کے لیے ان لوگوں نے سیاست ایجاد کر لی ہے اور یہی سیاست ہے جس نے آزادی کے رحم کا منہ بند کر دیا ہے۔“

غلام علی اس کے آگے بھی کچھ کہنے والا تھا کہ اس کا نوکر اندر داخل ہوا۔ اس کی گود میں شاید غلام علی کا دوسرا بچہ تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک خوشرنگ بیلون تھا۔ غلام علی دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹا۔ پٹاخے کی سی آواز آئی۔ بیلون پھٹ گیا اور بچے کے ہاتھ میں دھاگے کے ساتھ ربڑ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹکتا رہ گیا۔ غلام علی نے دو انگلیوں سے اس ٹکڑے کو چھین کر یوں پھینکا جیسے وہ کوئی نہایت ہی مکروہ چیز تھی۔

سونورل

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوسونورل

بشریٰ نے جب تیسری مرتبہ خواب آور دواسونورل کی تین ٹکیاں کھاکر خود کشی کی کوشش کی تو میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو سنکھیا موجود ہے۔ افیم ہے۔ ان سُموم کے علاوہ اور بھی زہر ہیں جو بڑی آسانی سے دستیاب ہیں، ہر بار سونورل، ہی کیوں کھائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خواب آور دوا زیادہ مقدار میں کھائی جائے تو موت کا باعث ہوتی ہے لیکن بشریٰ کا تین مرتبہ صرف اسے ہی استعمال کرنا ضرور کوئی معنی رکھتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا چونکہ دو مرتبہ دوا کھانے سے اس کی موت واقع نہیں ہوئی اس لیے وہ احتیاطاً اسے ہی استعمال کرتی ہے اور اسے اپنے اقدامِ خود کشی سے جو اثر پیدا کرنا ہوتا ہے، موت کے اِدھر اُدھر رہ کر کر لیتی ہے۔ لیکن میں سوچتا تھا کہ وہ اِدھر اُدھر بھی ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی سو فیصد محفوظ طریقہ نہیں تھا۔ تیسری مرتبہ جب اس نے بتیس گولیاں کھائیں تو اُس کے تیسرے شوہر کو جو پی ڈبلیو ڈی میں سب اوور سیر ہیں، صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب پتہ چلا کہ وہ فالج زدہ بھینس کی مانند بے حس و حرکت پلنگ پر پڑی تھی۔ اُس کو یہ خواب آور دوا کھائے غالباً تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ سب اوور سیر صاحب سخت پریشان اور لرزاں میرے پاس آئے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی، اس لیے کہ بشریٰ سے شادی کرنے کے بعد وہ مجھے قطعاً بھول چکے تھے۔ اس سے پہلے وہ ہر روز میرے پاس آتے اور دونوں اکٹھے بیئر یا وسکی پیا کرتے تھے۔ ان دنوں وہ مفلوک الحال تھے۔ سائیکل پر دفتر جاتے اور اسی پر گھر واپس آتے۔ مگر جب اُن کی بشریٰ سے دوستی ہوئی اور وہ اُس سے شادی کرکے اُسے اپنے گھر لائے تو نقشہ ہی بدل گیا۔ اُن کا بھی اور اُن کے گھر کا بھی۔ اب وہ بہت عمدہ سُوٹ پہنتے تھے۔ سواری کے لیے موٹر بھی آگئی۔ گھر بڑھیا سے بڑھیا فرنیچر سے آراستہ ہو گیا۔ ریس کھیلنے لگے۔ دیسی رم کے بجائے اب سکاچ وسکی کے دور ان کے یہاں چلتے تھے۔ بشریٰ بھی پینے والی تھی اس لیے دونوں بہت خوش رہتے تھے۔ سب اوور سیر قمر صاحب کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ بشریٰ ان سے غالباً پانچ برس بڑی تھی۔ کسی زمانے میں شاید اس کی شکل وصورت قابل قبول ہو۔ مگر اس عمر میں وہ بہت بھیانک تھی۔ چہرے کی جھریوں والی گال پر شوخ میک اپ، بال کالے کیے ہوئے، بند بند ڈھیلا جیسے اوس میں پڑی ہوئی پتنگ، ڈھلکا ہوا پیٹ، انگیا کے کرینوں سے اُوپر اُٹھائی ہوئی چھاتیاں۔ آنکھوں میں سُرمے کی بدخط تحریر۔ میں نے جب بھی اس کو دیکھا وہ مجھے نسوانیت کا ایک بھدا کارٹون ساد کھائی دی۔ قمر صاحب نے جیسا کہ ظاہر ہے اس میں اس کے سوا اور کیا خوبی دیکھی ہو گی کہ وہ مالدار تھی۔ اُس کا باپ پنجاب میں ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔ جس سے وراثت میں اس کو بہت زمینیں ملی تھیں۔ ان سے چھ سات سو روپیہ ماہوار کی مستقل آمدن ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بینک میں بھی اس کا دس، پندرہ ہزار روپیہ موجود تھا۔ اور قمر صاحب ایک معمولی سب اوور سیر تھے۔ بیوی تھی چھ بچے تھے، جن میں دو لڑکے تھے جو کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اُن کے گھر میں افلاس ہی افلاس تھا۔ ویسے شوقین مزاج تھے اور شاعر بھی۔ شام کو شراب بہت ضروری سمجھتے تھے اس لیے آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے بال بچوں کے لیے کیا بچتا ہو گا۔ قمر صاحب نے یوں تو ظاہر کیا تھا کہ وہ بشریٰ کو شرعی طور پر اپنے رشتہ مناکحت میں لا چکے ہیں لیکن مجھے شک تھا اور اب بھی ہے کہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ قمر صاحب بڑے ہوشیار اور چالاک آدمی ہیں۔ اپنی زندگی کے پچاس برسوں میں نا جانے وہ کتنے پاپڑ بیل چکے ہیں۔ سرد و گرم چشیدہ ہیں۔ گرگ باراں دیدہ ہیں۔ بشریٰ سے شادی کا جھنجھٹ پالنا کیسے منظور کر سکتے تھے۔ بشریٰ سے شادی کر کے قمر صاحب کے گھر میں حالت بہت حد تک سدھر چکی تھی۔ اُن کی تین بچیاں جو سارا دن آوارہ پھرتی رہتی تھیں عیسائیوں کے کسی سکول میں داخل کرا دی گئی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی کے کپڑے کے صاف ستھرے ہو گئے تھے۔ کھانا پینا بھی اب عمدہ تھا۔ میں خوش تھا کہ چلو اب ٹھیک ہے۔ دوسری شادی کی ہے، کچھ بُرا نہیں ہوا۔ بشریٰ کو ایک خاوند مل گیا ہے باسلیقہ اور ہوشیار ہے اور قمر صاحب کو ایک ایسی عورت مل گئی جو بد صورت سہی مگر مالدار تو ہے۔ مگر ان کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک مستحکم نہ رہا۔ کیونکہ ایک روز سننے میں آیا کہ ان کے درمیان بڑے زوروں کا جھگڑا ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کے دونوں نے سونورل کافی مقدار میں کھالی۔ کمرے میں فرش پر قمر صاحب بے ہوش پڑے تھے اور ان کی اہلیہ محترمہ پلنگ پر لاش کی مانند لیٹی تھیں۔ فوراً دونوں کو ہسپتال داخل کرایا گیا۔ جہاں سے وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر واپس آگئے مگر ابھی پندرہ روز بمشکل گزرے ہوں گے کہ پھر دونوں نے سونورل سے شغل فرمالیا۔ معلوم نہیں وہ ہسپتال پہنچائے گئے یا گھر میں ان کا علاج ہوا بہر حال بچ گئے۔ اس کے بعد غالباً ایک برس تک ان کے یہاں ایسا کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ لیکن ایک روز علی الصبح مجھے پتہ چلا کہ بشریٰ نے سونورل کی بتیس ٹکیاں کھالی ہیں۔ قمر صاحب سخت پریشان اور لرزاں تھے۔۔ ان کے حواس باختہ تھے۔ میں نے فوراً ہسپتال ٹیلی فون کیا اور ایمبولنس گاڑی منگوائی، بشریٰ کو وہاں پہنچایا گیا۔ ہاؤس سرجن اپنے کوارٹر میں تھے میں نے ان کو وہاں سے نکالا اور سارا ماجرا سُنا کر جلدی ہسپتال چلنے کے لیے کہا۔ ان پر میری عجلت طلب درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بڑے بے رحم انداز میں کہنے لگے۔

”منٹو صاحب مرنے دیجیے اس کو۔ آپ کیوں گھبرا رہے ہیں۔“

اُن کو معلوم تھا کہ بشریٰ اس سے پیشتر دو مرتبہ زہر خوری کے سلسلے میں ہسپتال آچکی ہے۔ میں نے ان سے بشریٰ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا اور تھوڑی دیر بعد واپس گھر چلا آیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے بشریٰ کا حدود اربعہ معلوم نہیں تھا اور اُس کی زندگی کے سابقہ حالات میرے علم سے باہر تھے۔ میری اس کی متعدد مرتبہ ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ وہ مجھے بھائی سعادت

کہتی تھی۔ اس کے ساتھ کئی دفعہ پینے پلانے کا اتفاق بھی ہو چکا تھا۔ اس کی ایک لڑکی پرویز تھی۔ اس کی تصویر میں نے پہلی مرتبہ اُس روز دیکھی جب وہ قمر صاحب کے گھر میں بحیثیت بیوی آئی۔ نیچے دو کمروں میں سامان وغیرہ سجایا جارہا تھا۔ میں نے دیکھا ایک قبول صورت جوان لڑکی کا فوٹو معمولی سے فریم میں مینٹل پیس پر پڑا ہے۔ جب بیئر کا دور چلا تو میں نے بشریٰ سے پوچھا کہ یہ فوٹو کس کا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اُس کی لڑکی پرویز کا ہے۔ جس نے خودکشی کرلی تھی۔ میں نے جب اس کی وجہ دریافت کی تو مجھے قمر صاحب اور بشریٰ سے جو باتیں معلوم ہوئیں، ان کو اگر کہانی کے انداز میں بیان کیا جائے تو کچھ اس قسم کی ہوں گی۔ پرویز بشریٰ کی پہلوٹھی کی لڑکی تھی جو اس کے پہلے خاوند سے پیدا ہوئی۔ وہ بھی کافی دولت مند زمیندار تھا۔ وہ مر گیا۔ مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ بشریٰ کا یہ پہلا خاوند جس کا نام اللہ بخش تھا اس سے شادی کے چند برسوں بعد ہی سخت متنفر ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کی زندگی ہی میں بشریٰ نے کسی اور شخص سے آنکھ لڑانا شروع کر دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بشریٰ کو اپنے خاوند کی نفرت اور حقارت سے بچنے کے لیے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ مرتے وقت اللہ بخش نے بشریٰ کو ایک کوڑی نہ دی۔ لیکن اپنی بچی پرویز کے لیے کچھ جائیداد الگ کر دی۔ بشریٰ نے دوسری شادی کرلی۔ چونکہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھی اس لیے پشاور کا ایک کامیاب بیرسٹر اُس کے دام میں گرفتار ہو گیا۔ اس سے اس کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ مگر اس دوسرے شوہر کے ساتھ بھی وہ زیادہ دیر تک جم کے نہ رہ سکی۔ چنانچہ اس سے طلاق حاصل کرلی۔ دراصل وہ آزاد زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ یہ بیرسٹر ابھی تک زندہ ہے۔ دونوں لڑکے جو اب جوان ہیں اُس کے پاس ہیں۔ یہ اپنی ماں سے نہیں ملتے۔ اس لیے کہ اس کا کردار اُنھیں پسند نہیں۔ یہ تو ہے بشریٰ کی زندگی کا مختصر خاکہ۔ اس کی بیٹی پرویز کی کہانی ذرا طویل ہے اس کا بچپن زیادہ تر دیہات کی کھلی فضاؤں میں گزرا۔ بڑی نرم و نازک بچی تھی۔ سارا دن سرسبز کھیتوں میں کھیلتی تھی۔ اس کا ہمجولی کوئی نہ تھا۔ مزارعوں کے بچوں سے میل جول اس کے والدین کو پسند نہیں تھا۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اُسے لاہور کے ایک ایسے سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا گیا جہاں بڑے بڑے امیروں کے بچے پڑھتے تھے۔ ذہین تھی۔ طبعیت میں جوہر تھا۔ جب سکول سے نکل کر کالج میں داخل ہوئی تو وہ ایک خوبصورت دوشیزہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جس کا مضطرب دل و دماغ ہر وقت آئیڈیل کی تلاش میں رہتا تھا۔ بہت سُریلی تھی۔ جب گاتی تو سننے والے اس کی آواز سے مسحور ہو جاتے۔ رقص بھی اُس نے سیکھا تھا۔ ناچتی تو دیکھنے والے مبہوت ہو جاتے۔ اس کے اعضا میں بلا کی لوچ تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب وہ ناچتی تو اُس کے اعضا کی خفیف سے خفیف حرکت بھی دیکھنے والوں سے ہم کلام ہوتی تھی۔ بہت بھولی بھالی تھی۔ اس میں وہی سادگی اور سادہ لوحی تھی جو گاؤں کے اکثر باشندوں میں ہوتی ہے۔ انگریزی سکول میں پڑھی تھی۔ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس کی سہیلیوں میں بڑی تیز، شریر اور کائیاں لڑکیاں موجود تھیں۔ مگر وہ ان سب سے الگ تھی۔ وہ بادلوں سے بھی اوپر اُس فضا میں رہتی تھی جو بڑی لطیف ہوتی ہے۔ اُس کو دھن دولت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے نوجوان کے خواب دیکھتی تھی جس کو معبود بنا کر اُس کی ساری زندگی عبادت میں گزر جائے۔ عشق و محبت کی جائے نماز پر وہ مجسم سجدہ تھی۔ اس کی ماں اسے ایبٹ آباد لے گئی تو وہاں مردوں اور عورتوں سے ملی جلی محفل منعقد ہوئی۔ پرویز کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا رقص دکھائے۔ اُس نے حاضرین پر نگاہ دوڑائی۔ ایک خوش پوش پٹھان نوجوان دُور کونے میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی۔ ایک لمحے کے لیے پرویز کی نظریں اُس پر رُک گئیں۔ نوجوان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے کچھ کہا اور پرویز جو انکار کرنے والی تھی سب کچھ بھول کر بڑے دلفریب انداز میں رقص کرنے لگی۔ اس دوران میں اُس نے اپنے لچکیلے اور گداز جسم کے بھاؤ اور ہر رنگ سے اپنی رُوح کے اندر چھپی ہوئی خواہشوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالا اور اُس پٹھان نوجوان کی محترم اور مسحور آنکھوں کے سامنے ترتیب وار سجا دیا۔ اس نوجوان کا نام یوسف غلزئی تھا۔ اچھے دولت مند قبیلے کا ہونہار فرد۔ فارغ التحصیل ہو کر اب بڑھ چڑھ کے ملکی سیاست میں حصہ لے رہا تھا۔ عورت اس کے لیے عجوبہ نہیں تھی۔ لیکن پرویز نے اُسے موہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی شادی بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی اور وہ میاں بیوی بن کر ایبٹ آباد میں رہنے لگے۔ پرویز بہت خوش تھی۔ اس قدر خوش کہ اس کا جی چاہتا تھا ہر وقت رقصاں رہے۔ ہر وقت اُس کے ہونٹوں سے سہانے اور سماعت نواز گیت چشموں کی طرح پھوٹتے رہیں۔ وہ یوسف تھا۔ تو پرویز اُس کی زُلیخا تھی۔ اُس کی عبادت میں دن رات مصروف رہتی تھی۔ اس نے اپنی طرف سے اس کے قدموں میں تمام نسائیت کا جوہر نکال کر ڈال دیا تھا۔ اُس سے زیادہ کوئی عورت کیا کر سکتی ہے۔ شروع شروع میں وہ بہت خوش رہی، اتنی خوش اور مسرور کہ اُسے یہ محسوس تک نہ ہوا کہ اسے ازدواجی زندگی بسر کرتے ہوئے پورے تین برس گزر چکے ہیں۔ اُس کے ایک بچی ہوئی مگر وہ اپنے یوسف کی محبت میں اس قدر مستغرق تھی کہ کبھی کبھی اُس کے وجود سے بالکل غافل ہو جاتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ جب یہ لڑکی پیدا ہوئی تو اُس نے یہ محسوس کیا کہ اُس کے پیٹ سے بچی کے بجائے یوسف نکلا ہے۔ اس کی محبت کو جنم دیا ہے۔ اس سے آپ پرویز کی والہانہ محبت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے معبود کے قدم ثابت نہ رہے۔ وہ طبعاً عیش پرست تھا۔ وہ مصری کی مکھی کی طرح نہیں بلکہ شہد کی مکھی کی طرح باغ کی ہر کلی کا رس چوسنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کروٹ بدل کر اور پرویز کی محبت کی زنجیریں توڑنے کے بعد وہ پھر اپنے پہلے اشغال میں مصروف ہو گیا۔ اس کے پاس دولت تھی، جوانی تھی، پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ ملکی سیاسیات میں سرگرم حصہ لینے کے باعث اس کا نام دن بہ دن روشن ہو رہا تھا۔ اُس کو پرویز کی والہانہ محبت یکسر جہالت پر مبنی دکھائی دی۔ وہ اُس سے اُکتا گیا۔ ہر وقت کی چوما چاٹی، منت منٹ کی بھینچا بھانچی اس کو سخت کھلنے لگی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پرویز اُسے مکڑی کی مانند اپنی محبت کے جالے میں بند کر دے جہاں وہ مر نڈا ہو جائے۔ اس کے بعد اُسے سفوف میں تبدیل کر کے نسوار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دے۔ پرویز کو جب معلوم ہوا کہ یوسف سالم کا سالم اُس کا نہیں تو اُسے سخت صدمہ ہوا۔ کئی دنوں تک وہ اس کے باعث گم سم اور نڈھال رہی۔ اُس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے آئیڈیل کو ہتھوڑوں کی ظالم ضربوں نے چکنا چور کر کے ڈھیر کر دیا ہے۔ اُس نے یوسف سے کچھ نہ کہا۔ اُس کی بے اعتنائیوں اور بے وفائیوں کا کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ طویل عرصے تک تنہائیوں میں رہ کر اس نے حالات پر غور کیا۔ یوسف

سے چھٹکارا حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کو معبود کا رتبہ عطا کرنے والی وہ خود تھی۔ خدا کو اس کا بندہ کیسے رد کر سکتا ہے۔ جب کہ وہ ایک بار صدقِ دل سے اُس کی خدائی تسلیم کر چکا ہو، اُس کے حضور ہر وقت سجدہ ریز رہا ہو۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یوسف کے لیے نہیں صرف اپنے اس جذبے کی خاطر، جس نے یوسف کو خدائی کا رتبہ بخشا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس کے ساتھ رہے گی۔ وہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لیے بھی تیار تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس بے چاری نے یوسف کی آغوش کے لیے ہر اس عورت کے لیے آسانیاں پیدا کیں جو اس میں تھوڑی دیر کے لیے حرارت محسوس کرنا چاہتی تھی۔ یہ بڑی بے غیرتی تھی۔ مگر اُس نے اپنے ٹوٹے پھوٹے آئیڈیل کو مکمل شکست وریخت سے بچانے کی خاطر فرار کا یہ عجیب و غریب راستہ اختیار کیا اور ہر قسم کی بے غیرتی برداشت کی۔ وہ اُس کی چند روزہ محبوباؤں سے بڑے پیار و محبت سے پیش آتی۔ اُن کی خاطر تواضع کرتی۔ ان کی عصمت باختہ تلون مزاجیوں کو سر آنکھوں پر رکھتی اور اُن کو اور اپنے خاوند کو ایسے موقع بہم پہنچاتی کہ اُس کی موجودگی ان کے عیش و عشرت میں مخل نہ ہو پاتی۔ ان عورتوں کے لیے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر وہ قسم قسم کے کھانے تیار کرتی، اس کا خاوند ان واہیات عورتوں کو خوش رکھنے کے لیے جب اُسے حکم دیتا کہ ناچے اور گائے تو وہ ضبط سے کام لے کر کسی بھی لمحے برس پڑنے والی مصنوعی آنکھیں خوش دکھاتی۔ زخمی دل پر بھاہے لگاتی۔ غم و غصے سے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹیں پیدا کرتی، مسرت و انبساط سے بھرے ہوئے گیت گاتی اور بڑے طربناک انداز میں رقص کرتی۔ اس کے بعد وہ تنہائی میں اس قدر روتی، اس قدر آہیں بھرتی کہ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ اب نہیں جیئے گی۔ مگر ایسے طوفان کے بعد اُس میں ایک نئی قوتِ برداشت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ یوسف کی دلالی میں اپنا منہ کالا کرنا شروع کر دیتی تھی اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ کالک نہیں بڑا ہی خوش رنگ غازہ ہے۔ اس دوران میں اُس کی ماں اُس سے ملنے کے لیے کئی مرتبہ آ چکی تھی۔ مگر اُس نے اپنے خاوند کے متعلق اُس سے کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ اپنے راز یا دُکھ میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان حالات میں وہ اپنے خاوند کی ذات کے ساتھ کسی اور کو کسی طریقے سے بھی وابستہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ یہ سوچتی کہ خاوند میرا ہے۔ وہ دُکھ بھی میرا ہے۔ جو وہ مجھے پہنچا رہا ہے وہ اگر دوسری عورتوں کو بھی اسی قسم کا دُکھ پہنچائے تو مجھے حسد ہو گا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس لیے میں خوش ہوں۔ بشریٰ ان دنوں فارغ تھی۔ یعنی اُس نے کوئی اپنا شوہر نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کا وقت سیر و تفریح میں گزر رہا تھا۔ دس پندرہ دن ایبٹ آباد پرویز کے ساتھ رہتی۔ یوسف کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ وہ گھنٹوں علیحدہ کمرے میں بیٹھے تاش کھیلنے میں گزارتے اور پرویز ان کی خاطر تواضع میں مصروف رہتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کی ماں زیادہ دیر تک اس کے پاس ٹھہرے تاکہ سوسائٹی کی ان عورتوں کا جو چکلے کی رنڈیوں سے بھی بدتر ہیں، اس گھر میں داخلہ بند رہے۔ مگر وہ ایک جگہ بہت عرصے تک ٹک کر نہیں رہ سکتی تھی۔ جب وہ چلی جاتی تو دوسرے تیسرے روز یوسف بھی اپنی پرانی ڈگر اختیار کر لیتا۔ پرویز دوسرا روپ دھار لیتی اور اپنے خاوند کی نت نئی سہیلیوں کے قدموں کے لیے پا انداز بن جاتی۔ اُس نے اس زندگی کو آہستہ آہستہ اپنا لیا ہے۔ اب اسے زیادہ کوفت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے خود کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا تھا کہ اُسے زندگی کے ڈرامے میں یہی رول ادا کرنا تھا جو وہ کر رہی تھی۔ چنانچہ اُس سے اُس کے دل و دماغ سے وہ کدورت جو پہلے پہلے بہت اذیت دہ تھی، قریب قریب ڈُھل گئی تھی، وہ خوش رہتی اور اپنی ننھی بچی کی طرف زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ ایک دن اُسے کسی ضروری کام سے اچانک لاہور جانا پڑا۔ دو دن کے بعد لوٹی تو شام کا وقت تھا۔ یوسف کا کمرہ بند تھا۔ مگر اس میں اُس کے مخمور قہقہوں کی آواز سُنائی دے رہے تھی۔ پرویز نے دروازے کی ایک درز سے جھانک کر دیکھا تو سرتاپا لرز گئی اُس کا پیازی رنگ ایک دم کاغذ کی مانند بے جان سفیدی اختیار کر گیا۔ یہ سارے واقعات مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے۔ بشریٰ نے مجھے جو کچھ بتایا اس سے مختلف تھا اس کا بیان ہے کہ دل ہی دل میں کڑھ کڑھ کر وہ اپنی جان سے بیزار ہو گئی تھی اُس نے یوسف کی خاطر بڑی سے بڑی ذلت قبول کرنا گوارا تو کر لیا تھا، مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک رات اُس نے شراب کے نشے میں بدمست اپنی کسی چہیتی کو آغوش میں لیے پرویز سے کہا کہ ناچے اور ننگی ناچے وہ اس کے کسی حکم کو نہیں ٹالتی تھی۔ یوسف اُس کا خدا تھا، چنانچہ اُس نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کا عریاں بدن رقصاں تھا۔ ناچ ختم ہوا تو اس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر زہر کھا لیا اور مر گئی۔ معلوم نہیں حقیقت کیا تھی لیکن جو کچھ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا یہ ہے کہ جب پرویز نے یوسف کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی، چنانچہ اُسی وقت وہ موٹر میں سیدھی ایک کیمسٹ کی دُکان پر گئی اور اُس نے سونورل کی پوری ڈبیہ طلب کی۔ قیمت ادا کرنے لگی تو اُسے معلوم ہوا کہ افراتفری کے عالم میں وہ اپنا پرس وہیں گھر پر بھول آئی ہے، چنانچہ اس نے کیمسٹ سے کہا کہ میں مسز یوسف غلزئی ہوں۔ پرس ساتھ نہیں لائی۔ بل بھجوا دیجیے گا۔ یوسف صاحب ادا کر دیں گے۔ گھر آ کے اُس نے خادمہ کو ڈبیہ کی ساری گولیاں دیں اور اس سے کہا اچھی طرح پیس کے لاؤ۔ یہ سفوف اُس نے گرم گرم دُودھ میں ڈالا اور پی گئی۔ تھوڑی دیر بعد نوکر آیا اور اُس نے پرویز سے کہا کہ آپ کی والدہ آئی ہیں یوسف صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔ پرویز کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ مگر ان میں غنودگی تھی۔ اس لیے کہ زہر کا اثر شروع ہو گیا تھا۔ منہ دھو کر اور بال سنوار کر وہ اندر گئی۔ اپنی ماں سے بغل گیر ہوئی اور یوسف کے ساتھ قالین پر بیٹھ گئی۔ ماں سے باتیں کرتے کرتے ایک دم پرویز کو چکر آیا اور وہ بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔ ماں نے تشویش کا اظہار کیا، اس لیے کہ اس کی بچی کا رنگ نیلا ہو رہا تھا۔ مگر یوسف نے جو نشے میں چور تھا، کسی قسم کے تردد کا اظہار نہ کیا اور بشریٰ سے کہا

”کچھ بھی نہیں ہوا اسے، بن رہی ہے۔“

پھر اُس نے بڑے زور سے پرویز کا شانہ جھنجھوڑا اور حاکمانہ کہا

”اُٹھ۔“

مجھے یہ ایکٹنگ پسند نہیں۔“

بشری نے بھی اُس کو آوازیں دیں اُس کو ہلایا جلایا۔ آخر ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ مگر وہ جب آیا تو پرویز اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ پرویز کی خود کشی کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں۔ لیکن اس کا جو پہلو مجھے معتبر ذرائع سے منکشف ہوا میری سمجھ میں آگیا تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا اور انتظار کر تا رہا کہ اس کی تصدیق کب ہوتی ہے۔ قمر صاحب بشریٰ کو ہسپتال سے واپس لائے تو میں ان سے ملا۔ ان کے پاس اب موٹر نہیں تھی۔ میں نے اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے شاعرانہ بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا

”جس کی تھی لے گئی“

میں نے پوچھا۔

”کیا مطلب ؟“

جواب ملا۔

”مطلب یہ کہ موٹر میری کب تھی۔ وہ تو ان محترمہ کی تھی۔ میں نے کچھ عرصہ سے اس کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ اپنی سائیکل پر دفتر جاتا اور اسی پر واپس آتا تھا۔ جب ان کو ضرورت ہوتی تو میں ڈرائیور کے فرائض ادا کرتا تھا۔“

میں کچھ کچھ سمجھ گیا

”کیا ناچاقی ہو گئی ؟“

”ہاں کچھ ایسا ہی سمجھیے۔ میں نے ان کو طلاق دے دی ہے۔“

بعد میں مجھے جب قمر صاحب سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ نکاح وکاح کوئی نہیں ہوا تھا۔ طلاق نامہ انھوں نے صرف اس لیے لکھا کہ لوگوں میں اس بات کی تشہیر نہ ہو کہ وہ غیر شرعی طور پر ان کے ساتھ قریب قریب دو برس رہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ ان کے درمیان جو فیصلہ کن لڑائی جھگڑا ہوا اُس کی وجہ یہ تھی کہ بقول قمر صاحب، ان کی محترمہ نے حیدر آباد کے ایک ادھیڑ عمر کے مہاجر رئیس سے جسمانی رشتہ قائم کر لیا تھا اس لیے اُن کے لیے قمر صاحب کی ذات میں وہ کشش ختم ہو گئی تھی جو کسی زمانے میں اُن کو نظر آتی تھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ جس کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ مجھے افسوس ہوا، اس لیے کہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ قمر صاحب نے اپنی تینوں ہونہار بچیوں کو سکول سے اُٹھالیا ہے خود گولڈ فلیک کے بدلے بگلے کے سستے سگریٹ پیتے ہیں پہلے تفریح کے اتنے سامان مہیا تھے، پر اب شُتر بے مہار کی طرح بے مطلب اِدھر اُدھر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ محترمہ بشریٰ کے متعلق انھوں نے مجھے بہت کچھ بتایا لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ جب علیحدگی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور حیدر آباد کے مہاجر رئیس صاحب نے بشریٰ کے ساتھ باقاعدہ راتیں گزارنا شروع کر رکھی تھیں تو اُن کو سونورل کی بتیس گولیاں کھا کر خود کشی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ بظاہر خطرناک فعل قمر صاحب کے اس اعتراض کا ردِ عمل معلوم ہوتا ہے جو ان کو بشریٰ کے چال چلن پر تھا۔ لیکن ایمان کی بات ہے کہ مجھے اس کے عقب میں ایسا کوئی دل شکن عنصر نظر نہیں آتا جو انسان کو موت کی گود میں سو جانے پر مجبور کر دے۔ اس پر قمر صاحب بھی کوئی روشنی ڈالنے سے معذور ہیں۔ ایک دن باتوں باتوں میں ان سے میں آخر پوچھ ہی بیٹھا

”سونورل کھانے کی روایت جو بشریٰ کی بیٹی پرویز نے قائم کی آپ نے اور بشریٰ نے جاری رکھی۔ لیکن آپ یہ بتائیے کہ وہ کونسی وجہ تھی جس نے اس غریب کو اتنے خطرناک اقدام کے لیے تیار کر دیا۔ آپ کئی بار مجھے بتا چکے ہیں کہ پرویز اپنے شوہر یوسف علزئی کی حرام کاریوں کی عادی ہو چکی تھی۔ بلکہ وہ خود اس معاملے میں اس کی معاونت کرتی تھی۔ کوئی عورت جب اس حد تک پہنچ کر داشتہ بن جائے، خرابے کی انتہا کو پہنچ کر ضمیر کی نہایت ہی خوفناک صورت اختیار کرے، خود کشی کو وہ زبوں ترین فعل سمجھے، اس کو کبھی اس کا خیال تک نہیں آسکتا۔ میرا اپنا خیال ہے، بلکہ یقین ہے کہ اس کی ماں بشریٰ نے جسے آپ محترمہ کہتے ہیں یوسف سے ایسے تعلقات پیدا کر لیے تھے جنھیں عام لوگ ناجائز کہتے ہیں“

قمر صاحب نے صرف ان الفاظ میں میری تصدیق کی

”یہ بالکل دُرست ہے۔ ایک دن شراب کے نشے میں بشریٰ نے اس کا اقرار کیا تھا اور بہت روئی تھی۔“

اُس دن شام کو معلوم ہوا کہ حیدر آباد کے مہاجر رئیس صاحب نے سونورل کی چوبیس گولیاں کھالی ہیں۔ بشریٰ نے حسب معمول بتیس کھائی تھیں۔ دونوں ہسپتال میں بے ہوش پڑے تھے۔ دوسرے روز رئیس صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چوبیس ہی میں ان کا کام تمام ہو گیا مگر بشریٰ بچ گئی۔ آج کل وہ مرحوم کا سوگ منا رہی ہے۔ جس شخص کے پاس اُس نے موٹر بیچی تھی وہ دن رات اُس کے پاس دل جوئی کے لیے موجود رہتا ہے۔

سونے کی انگوٹھی

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو سونے کی انگوٹھی

”چھتے کا چھتہ ہو گیا آپ کے سر پر۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بال نہ کٹوانا کہاں کا فیشن ہے۔“

”فیشن ویشن کچھ نہیں۔ تمہیں اگر بال کٹوانے پڑیں تو قدرِ عافیت معلوم ہو جائے۔“

”میں کیوں بال کٹواؤں“

”کیا عورتیں کٹواتی نہیں۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسی موجود ہیں جو اپنے بال کٹواتی ہیں۔ بلکہ اب تو یہ فیشن بھی چل نکلا ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح چھوٹے چھوٹے بال رکھتی ہیں۔“

”لعنت ہے ان پر۔“

”کس کی۔“

”خدا کی اور کس کی۔ بال تو عورت کی زینت ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عورتیں کیوں اپنے بال مردوں کی مانند بنوا لیتی ہیں‘ پھر پتلونیں پہنتی ہیں۔ نہ رہے ان کا وجود دنیا کے تختے پر۔“

”وجود تو خیر آپ کی اس بد دعا سے ان نیک بخت عورتوں کا دنیا کے اس تختے سے کسی حالت میں بھی غائب نہیں ہو گا۔ ویسے ایک چیز سے مجھے تم سے کُلّی اتفاق ہے کہ عورت کو پتلون جسے سلیکس کہتے ہیں‘ نہیں پہننی چاہیے۔ اور سگریٹ بھی نہ پینے چاہئیں“

”اور آپ ہیں کہ دن میں پورا ایک ڈبا پھونک ڈالتے ہیں۔“

”اس لیے کہ میں مرد ہوں۔ مجھے اس کی اجازت ہے“

”کس نے دی تھی یہ اجازت آپ کو۔ میں اب آئندہ سے ہر روز صرف ایک ڈبیا منگا کر دیا کروں گی۔“

”اور وہ جو تمہاری سہیلیاں آتی ہیں‘ ان کو سگریٹ کہاں سے ملیں گے؟“

”وہ کب پیتی ہیں۔“

”اتنا سفید جھوٹ نہ بولا کرو۔ ان میں سے جب بھی کوئی آتی ہے تم میرا سگریٹ کا ڈبا اٹھا کر اندر لے جاتی ہو۔ ساتھ ہی ماچس بھی۔ آخر مجھے آواز دے کر تمہیں بلانا پڑتا ہے اور میرا ڈبا مجھے واپس ملتا ہے اس میں سے پانچ چھ سگریٹ غائب ہوتے ہیں۔“

پانچ چھ سگریٹ۔ جھوٹ تو آپ بول رہے ہیں۔ وہ تو بیچاریاں مشکل سے ایک سگریٹ پیتی ہیں۔“

”ایک سگریٹ پینے میں انہیں مشکل کیا محسوس ہوتی ہے۔“

”میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ آپ کو تو اور کوئی کام ہی نہیں‘ سوائے بحث کرنے کے۔“

”ہزاروں کام ہیں۔ تم کون سے ہل چلاتی ہو۔ سارا دن پڑی سوئی رہتی ہو۔“

”جی ہاں۔ آپ تو چوبیس گھنٹے جاگتے اور وظیفہ کرتے رہتے ہیں۔“

”وظیفے کی بات غلط ہے۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں صرف رات کو چھ گھنٹے سوتا ہوں۔“

”اور دن کو۔“

”کبھی نہیں۔ بس آنکھیں بند کر کے تین چار گھنٹے لیٹا رہتا ہوں کہ اس سے آدمی کو بہت آرام ملتا ہے۔ ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔“

”یہ تھکن کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ کونسی مزدوری کرتے ہیں۔“

”مزدوری ہی تو کرتا ہوں۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں۔ اخبار پڑھتا ہوں۔ ایک نہیں سپر۔ پھر ناشتہ کرتا ہوں۔ نہاتا ہوں اور پھر تمہاری روز مرہ کی چخ چخ کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔“

”یہ مزدوری ہوئی۔ اور آپ یہ تو بتائیے کہ روز مرہ کی چخ چخ کا الزام کہاں تک درست ہے۔“

”جہاں تک اسے ہونا چاہیے۔ شروع شروع میں۔ میرا مطلب شادی کے بعد دو برس تک بڑے سکون میں زندگی گزر رہی تھی لیکن پھر ایک دم تم پر کوئی ایسا دورہ پڑا کہ تم نے ہر روز مجھ سے لڑنا جھگڑنا اپنا معمول بنا لیا۔ پتہ نہیں اس کی وجہ کیا ہے۔“

”وجہ ہی تو مردوں کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہتی ہے۔ آپ لوگ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔“

”مگر تم سمجھنے کی مہلت بھی دو۔ ہر روز کسی نہ کسی بات کا شوشہ چھوڑ دیتی ہو۔ بھلا آج کیا بات تھی جس پر تم نے اتنا چیخنا چلانا شروع کر دیا“

”گویا یہ کوئی بات ہی نہیں کہ آپ نے پچھلے چھ مہینوں سے بال نہیں کٹوائے! اپنی اچکنوں کے کالر دیکھیے۔ میلے چِیکٹ ہو رہے ہیں۔“

”ڈرائی کلین کرا لوں۔“

”پہلے اپنا سر ڈرائی کلین کرایے۔ وحشت ہوتی ہے اللہ قسم آپ کے بالوں کو دیکھ کر۔ جی چاہتا ہے مٹی کا تیل ڈال کر ان کو آگ لگا دوں۔“

”تاکہ میرا خاتمہ ہی ہو جائے۔ لیکن مجھے تمہاری اس خواہش پر کوئی بھی اعتراض نہیں۔ لاؤ باورچی خانے سے مٹی کے تیل کی بوتل۔ آہستہ آہستہ میرے سر میں ڈالو اور ماچس کی تیلی جلا کر اس کو آگ دکھا دو۔ خس کم جہاں پاک۔“

”یہ کام آپ خود ہی کیجیے۔ میں نے آگ لگائی تو آپ یقیناً کہیں گے کہ تمہیں کسی کام کا سلیقہ نہیں۔“

”یہ تو حقیقت ہے کہ تمہیں کسی بات کا سلیقہ نہیں۔ کھانا پکانا نہیں جانتی' سینا پرونا تمہیں نہیں آتا۔ گھر کی صفائی بھی تم اچھی طرح نہیں کر سکتیں' بچوں کی پرورش ہے تو اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔“

”جی ہاں۔ بچوں کی پرورش تو اب تک ماشاء اللہ' آپ ہی کرتے آئے ہیں' میں تو بالکل ہی نکمی ہوں۔“

”میں اس معاملے میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا۔ تم خدا کے لیے اس بحث کو بند کرو“

”میں بحث کہاں کر رہی ہوں۔ آپ تو معمولی باتوں کو بحث کا نام دے دیتے ہیں“

”تمہارے نزدیک یہ معمولی باتیں ہوں گی! تم نے میرا دماغ چاٹ لیا ہے۔ میرے سر پر ہمیشہ اتنے ہی بال رہے ہیں۔ اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اتنی فرصت نصیب نہیں ہوتی کہ حجام کے پاس جاؤں۔“

”جی ہاں۔ آپ کو اپنی عیاشیوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔“

”کن عیاشیوں سے۔“

”آپ کام کیا کرتے ہیں۔ کہاں ملازم ہیں۔ کیا تنخواہ پاتے ہیں۔ آپ کو تو ہر وہ کام بہت بڑی لعنت معلوم ہوتا ہے جس میں آپ کو محنت مشقت کرنی پڑے۔“

”میں کیا محنت مشقت نہیں کرتا۔ ابھی پچھلے دنوں اینٹیں سپلائی کرنے کا میں نے جو ٹھیکہ لیا تھا' جانتی ہو میں نے دن رات ایک کر دیا تھا۔“

”گدھے کام کر رہے تھے۔ آپ تو سوتے رہے ہوں گے۔“

”گدھوں کا زمانہ گیا۔ لاریاں کام کر رہی تھیں۔ اور مجھے ان کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ دس کروڑ اینٹوں کا ٹھیکہ تھا۔ مجھے ساری رات جاگنا پڑتا تھا۔“

”میں مان ہی نہیں سکتی کہ آپ ایک رات بھی جاگ سکیں۔“

”اب اس کا کیا علاج ہے کہ تم نے میرے متعلق ایسی غلط رائے قائم کر لی ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم ہزار ثبوت دینے پر بھی مجھ پر یقین نہیں کرو گی۔“

”میرا یقین آپ پر سے' عرصہ ہوا اٹھ گیا ہے۔ آپ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔“

”بہتان تراشی میں تمہاری ہم پلہ اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔“

”ٹھہریے۔ پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی دوست کے ہاں گئے تھے لیکن جب شام کو آپ نے تھوڑی سی پی۔ تو چہک چہک کر مجھے بتایا کہ آپ ایک ایکٹریس سے مل کر آئے ہیں۔“

”وہ ایکٹریس بھی تو اپنی دوست ہے۔ دشمن تو نہیں۔ میرا مطلب ہے اپنے ایک دوست کی بیوی ہے۔“

”آپ کے دوستوں کی بیویاں عموماً یا تو ایکٹریس ہوتی ہیں' یا طوائفیں“

”اس میں میرا کیا قصور۔“

”قصور تو میرا ہے۔“

”وہ کیسے۔“

”ایسے کہ میں نے آپ سے شادی کر لی۔ میں ایکٹریس ہوں نہ طوائف۔“

”مجھے ایکٹریسوں اور طوائفوں سے سخت نفرت ہے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ عورتیں نہیں سلیٹیں ہیں جن پر کوئی بھی چند حروف یا لمبی چوڑی عبارت لکھ کر مِٹا سکتا ہے۔“

”تو اس روز آپ کیوں اس ایکٹریس کے پاس گئے۔“

”میرے دوست نے بلایا۔ میں چلا گیا۔ اس نے ایک ایکٹریس سے جو پہلے چار شادیاں کر چکی تھی‘ نیا نیا بیاہ رچایا تھا مجھے اس سے متعارف کرایا گیا۔“

”چار شادیوں کے بعد بھی وہ خاصی جوان دکھائی دیتی تھی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ عام کنواری جوان لڑکیوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے اچھی تھی۔“

”وہ ایکٹریسیں کس طرح خود کو چست اور جوان رکھتی ہیں۔“

”مجھے اس کے متعلق کوئی زیادہ علم نہیں۔ بس اتنا سنا ہے کہ وہ اپنے جسم اور جان کی حفاظت کرتی ہیں۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ بڑی بدکردار ہوتی ہیں اول درجے کی فاحشہ۔“

”اللہ بہتر جانتا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔“

”آپ ایسی باتوں کا جواب ہمیشہ گول کر جاتے ہیں۔“

”جب مجھے کسی خاص چیز کے متعلق کچھ علم ہی نہ ہو تو میں جواب کیا دوں۔ میں تمہارے مزاج کے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔“

”دیکھئے! آپ میرے متعلق کچھ نہ کہا کیجیے۔ آپ ہمیشہ میری بے عزتی کرتے رہتے ہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔“

”میں نے تمہاری بے عزتی کب کی ہے۔“

”یہ بے عزتی نہیں کہ پندرہ برسوں میں آپ میرا مزاج نہیں جان سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں مخبوط الحواس ہوں۔ نیم پاگل ہوں‘ جاہل ہوں اجڈ ہوں۔“

”یہ تو خیر تم نہیں۔ لیکن تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے میرے بالوں کی بات کس غرض سے شروع کی۔ اس لیے کہ جب بھی تم کوئی بات شروع کرتی ہو اس کے پیچھے کوئی خاص بات ضرور ہوتی ہے۔“

”خاص بات کیا ہو گی۔ بس آپ سے صرف یہی کہنا تھا کہ بال اتنے بڑھ گئے ہیں‘ کٹوا دیجیے۔ حجام کی دکان یہاں سے کتنی دور ہے‘ زیادہ سے زیادہ دو سو گز کے فاصلے پر ہو گی۔ جایئے۔ میں پانی گرم کرتی ہوں۔“

”جاتا ہوں۔ ذرا ایک سگریٹ پی لوں۔“

”سگریٹ وگریٹ آپ نہیں پئیں گے۔ لیجیے اب تک۔ ٹھہریئے‘ میں ڈبا دیکھ لوں۔ میرے اللہ۔ بیس سگریٹ پھونک چکے ہیں آپ۔ بیس۔“

”یہ تو کچھ زیادہ نہ ہوئے۔ بارہ بجنے والے ہیں۔“

”زیادہ باتیں مت کیجیے۔ سیدھے حجام کے پاس جایئے۔ اور یہ اپنے سر کا بوجھ اتروایئے۔“

”جاتا ہوں۔ کوئی اور کام ہو تو بتا دو۔“

”میرا کوئی کام نہیں۔ آپ اس بہانے سے مجھے ٹالنا چاہتے ہیں۔“

”اچھا تو میں چلا۔“

”ٹھہریئے۔“

”ٹھہر گیا۔ فرمایئے۔“

”آپ کے بٹوے میں کتنے روپے ہوں گے۔“

”پانچ سو کے قریب۔“

تو یوں کیجیے۔ بال کٹوانے سے پہلے انارکلی سے سونے کی ایک انگوٹھی لے آیئے۔ آج میری ایک سہیلی کی سالگرہ ہے۔ دو ڈھائی سو روپے کی ہو۔“

”میری تو وہیں‘ انارکلی ہی میں حجامت ہو جائے گی۔ میں جاتا ہوں۔“

شاداں

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو شاداں

خان بہادر محمد اسلم خان کے گھر میں خوشیاں کھیلتی تھیں۔ اور صحیح معنوں میں کھیلتی تھی۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا۔ اگر بڑی لڑکی کی عمر تیرہ برس کی ہو گی تو چھوٹی کی یہی گیارہ ساڑھے گیارہ۔ اور جو لڑکا تھا گو سب سے چھوٹا مگر قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ اپنی بڑی بہنوں کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ تینوں کی عمر جیسا کہ ظاہر ہے اس دور سے گزر رہی تھی جب کہ ہر آس

پاس کی چیز کھلونا معلوم ہوتی ہے۔ حادثے بھی یوں آتے ہیں، جیسے ربڑ کے اڑتے ہوئے غبارے۔ ان سے بھی کھیلنے کو چاہتا ہے۔ خان بہادر محمد اسلم کا گھر خوشیوں کا گھر تھا۔ اس میں سب سے بڑی تین خوشیاں، اس کی اولاد تھیں۔ فریدہ، سعیدہ اور نجیب۔ یہ تینوں اسکول جاتے تھے جیسے کھیل کے میدان میں جاتے ہیں۔ ہنسی خوشی جاتے تھے۔ ہنسی خوشی واپس آتے تھے اور امتحان یوں پاس کرتے تھے جیسے کھیل میں کوئی ایک دوسرے سے بازی لے جائے۔ کبھی فریدہ فرسٹ آتی تھی، کبھی نجیب اور کبھی سعیدہ۔ خان بہادر محمد اسلم بچوں سے مطمئن، ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے انھوں نے محکمہ زراعت میں بتیس برس نوکری کی تھی۔ معمولی عہدہ سے بڑھتے بڑھتے وہ بلند ترین مقام پر پہنچ گئے۔ اس دوران میں انھوں نے بڑی محنت کی تھی، دن رات دفتری کام کیے تھے۔ اب وہ ستا رہے تھے۔ اپنے کمرے میں کتابیں لے کر پڑے رہتے اور ان کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ فریدہ، سعیدہ اور نجیب کبھی کبھی ماں کا کوئی پیغام لے کر آتے تو وہ اس کا جواب بھجوا دیتے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنا بستر وہیں اپنے کمرے میں لگا لیا تھا۔ دن کی طرح ان کی رات بھی یہیں گزرتی تھی۔ دنیا کے جھگڑے ٹنٹنوں سے بالکل الگ۔ کبھی کبھی ان کی بیوی جو ادھیڑ عمر کی عورت تھی ان کے پاس آجاتی اور چاہتی کہ وہ اس سے دو گھڑی باتیں کریں مگر وہ جلد ہی اسے کسی بہانے سے ٹال دیتے۔ یہ بہانہ عام طور پر فریدہ اور سعیدہ کے جہیز کے متعلق ہوتا

”جاؤ، یہ عمر چونچلے بگھارنے کی نہیں۔ گھر میں دو جوان بیٹیاں ہیں، ان کے دان دہیج کی فکر کرو۔ سونا دن بدن مہنگا ہو رہا ہے۔ دس بیس تولے خرید کر کیوں نہیں رکھ لیتیں۔ وقت آئے گا تو پھر چیخو گی کہ ہائے اللہ، خالی زیوروں پر اتنا روپیہ اٹھ رہا ہے۔“

یا پھر وہ کبھی اس سے یہ کہتے۔

”فرخندہ خانم۔ میری جان ہم بڑھے ہو چکے ہیں۔ تمھیں اب میری فکر اور مجھے تمھاری فکر ایک بچے کی طرح کرنی چاہیے۔ میری ساری پگڑیاں لیر لیر ہو چکی ہیں مگر تمھیں اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ ململ کے دو تھان ہی منگوا لو۔ دو نہیں چار۔ تمھارے اور بچیوں کے دوپٹے بھی بن جائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا چاہتی ہو؟۔ اور ہاں وہ میری مسواکیں ختم ہو گئی ہیں۔“

فرخندہ، خان بہادر کے پلنگ پر بیٹھ جاتی اور بڑے پیار سے کہتی۔

”ساری دنیا برش استعمال کرتی ہے۔ آپ ابھی تک پرانی لکیر کے فقیر بنے ہیں۔“

خان بہادر کے لہجے میں نرمی آجاتی۔

”نہیں فرخندہ جان۔ یہ برش اور ٹوتھ پیسٹ سب واہیات چیزیں ہیں۔“

فرخندہ کے ادھیڑ چہرے پر لکیروں کی کوڑیاں اور مولیاں سی بکھر جاتیں۔ مگر صرف ایک لحظے کے لیے خان بہادر اس کی طرف دیکھتے اور باہر صحن میں بچوں کی کھیل کود کا شور و غل سنتے ہوئے کہتے

”فرخندہ۔ تو کل ململ کے تھان آجائیں۔ اور لٹھے کے بھی۔“

لیکن فوراً ہی معلوم نہیں کیوں ان کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ جاتی اور وہ فرخندہ کو منع کر دیتے۔

”نہیں نہیں، لٹھا منگوانے کی ابھی ضرورت نہیں۔“!

باہر صحن میں بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے۔ سہ پہر کو شاداں عموماً ان کے ساتھ ہوتی۔ یہ گو نئی نئی آئی تھی۔ لیکن ان میں فوراً ہی گھل مل گئی تھی۔ سعیدہ اور فریدہ تو اس کے انتظار میں رہتی تھیں کہ وہ کب آئے اور سب مل کر

”لکن میٹی“

یا کِھدو“

کھیلیں۔ شاداں کے ماں باپ عیسائی تھے۔ مگر جب سے شاداں خان بہادر کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ فریدہ کی ماں نے اس کا اصلی نام بدل کر شاداں رکھ دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی اور اس کی بچیاں اس سے پیار کرنے لگی تھیں۔ شاداں صبح سویرے آتی تو فریدہ، سعیدہ اور نجیب اسکول جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوتے۔ وہ اس سے باتیں کرنا چاہتے مگر ماں ان سے کہتی

”بچو جلدی کرو۔ اسکول کا وقت ہو رہا ہے۔“

اور بچے جلدی جلدی تیاری سے فارغ ہو کر شاداں کو سلام کہتے ہوئے اسکول چلے جاتے۔ سہ پہر کے قریب شاداں جلدی جلدی محلے کے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر آجاتی اور فریدہ، سعیدہ اور نجیب کھیل میں مشغول ہو جاتے اور اتنا شور مچتا کہ بعض اوقات خان بہادر کو اپنے کمرے سے نوکر کے ذریعے سے کہلوانا پڑتا کہ شور ذرا کم کیا جائے۔ یہ حکم سن کر شاداں سہم کر الگ ہو جاتی، مگر سعیدہ اور فریدہ اس سے کہتیں

”کوئی بات نہیں شاداں۔ ہم اس سے بھی زیادہ شور مچائیں تو وہ اب کچھ نہیں کہیں گے۔ ایک سے زیادہ بار وہ کوئی بات نہیں کہا کرتے۔“

اور کھیل پھر شروع ہو جاتا۔ کبھی لکن میٹی، کبھی کِھدو اور کبھی لوڈو۔ لوڈو، شاداں کو بہت پسند تھی، اس لیے کہ یہ کھیل اس کے لیے نیا تھا۔ چنانچہ جب سے نجیب لوڈو لایا تھا، شاداں اسی کھیل پر مصر ہوتی۔ مگر فریدہ، سعیدہ اور نجیب تینوں کو یہ پسند نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوتا۔ بس وہ جو

”چٹو“

سا ہوتا ہے، اس میں پانسہ ہلاتے اور پھینکتے رہو اور اپنی گوٹیں آگے پیچھے کرتے رہو۔ شاداں کھلی کھلی رنگت کی درمیانے قد کی لڑکی تھی۔ اس کی عمر فریدہ جتنی ہو گی مگر اس میں جوانی زیادہ نمایاں تھی۔ جیسے خود جوانی نے اپنی شوخیوں پر لال پنسل کے نشان لگا دیے ہیں۔ محض شرارت کے لیے۔ ورنہ فریدہ اور سعیدہ میں وہ تمام رنگ، وہ تمام لکیریں، وہ تمام قوسیں موجود تھیں جو اس عمر کی لڑکیوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن فریدہ، سعیدہ اور شاداں جب پاس کھڑی ہوتیں تو شاداں کی جوانی زیر لب کچھ گنگناتی معلوم ہوتی۔ کھلی کھلی رنگت۔ پریشان بال اور دھڑکتا ہوا دوپٹہ جو کس کر اس نے اپنے سینے اور کمر کے ارد گرد باندھا ہوتا۔ ایسی ناک، جس کے نتھنے گویا ہوا میں انجانی خوشبو میں ڈھونڈنے کے لیے کانپ رہے ہیں۔ کان ایسے جو ذرا سی آہٹ پر چونک کر سننے کے لیے تیار ہوں۔ چہرے کے خدوخال میں کوئی خوبی نہیں تھی۔ اگر کوئی عیب گننے لگتا تو بڑی آسانی سے گن سکتا تھا، صرف اسی صورت میں اگر اس کا چہرہ اس کے جسم سے الگ کر کے رکھ دیا جاتا۔ مگر ایسا کیا جانا ناممکن تھا، اس لیے کہ اس کے چہرے اور اس کے بقایا جسم کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جس طرح چولی علیحدہ کرنے پر جسم کے آثار اس میں باقی رہ جاتے ہیں، اسی طرح اس کے چہرے پر بھی رہ جاتے اور اس کو پھر اس کی سالمیت ہی میں دیکھنا پڑتا۔ شاداں بے حد پھرتیلی تھی۔ صبح آتی اور یوں منٹا منٹی میں اپنا کام ختم کر کے یہ جا وہ جا۔ سہ پہر کو آتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کود میں مصروف رہتی۔ جب خان بہادر کی بیوی آخری بار چلا کر کہتی۔

”شاداں، اب خدا کے لیے کام تو کرو۔“

تو وہ وہیں کھیل بند کر کے اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ ٹوکرہ اٹھاتی اور دو دو زینے ایک جست میں طے کرتی کوٹھے پر پہنچ جاتی۔ وہاں سے فارغ ہو کر دھڑ دھڑ دھڑ نیچے اترتی اور صحن میں جھاڑو شروع کر دیتی۔ اس کے ہاتھ میں پھرتی اور صفائی دونوں چیزیں تھیں۔ خان بہادر اور اس کی بیوی فرخندہ کو صفائی کا بہت خیال تھا، لیکن مجال ہے جو شاداں نے کبھی ان کو شکایت کا موقع دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے کھیل کود پر معترض نہیں ہوتے تھے۔ یوں بھی وہ اس کو پیار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ روشن خیال تھے، اس لیے چھوت چھات ان کے نزدیک بالکل فضول تھی۔ شروع شروع میں تو خان بہادر کی بیوی نے اتنی اجازت دی تھی کہ لکن میٹی میں اگر کوئی شاداں کو چھوئے تو لکڑی استعمال کرے اور اگر وہ چھوئے تو بھی لکڑی کا کوئی ٹکڑا استعمال کرے، لیکن کچھ دیر کے بعد یہ شرط ہٹا دی گئی اور شاداں سے کہا گیا کہ وہ آتے ہی صابن سے اپنا ہاتھ منہ دھو لیا کرے۔ جب شاداں کی ماں کمانے کے لیے آتی تھی تو خان بہادر اپنے کمرے کی کسی چیز سے اس کو چھونے نہیں دیتے تھے، مگر شاداں کو اجازت تھی کہ وہ صفائی کے وقت چیزوں کی جھاڑ پونچھ بھی کر سکتی ہے۔ صبح سب سے پہلے شاداں، خان بہادر کے کمرے کی صفائی کرتی تھی۔ وہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہوتے۔ شاداں ہاتھ میں برش لیے آتی تو ان سے کہتی

”خان بہادر صاحب۔ ذرا برآمدے میں چلے جائیے“!

خان بہادر اخبار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے شاداں فوراً ان کے پلنگ کے نیچے سے ان کے سلیپر اٹھا کر ان کو پہنا دیتی اور وہ برآمدے میں چلے جاتے۔ جب کمرے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ ہو جاتی تو شاداں دروازے کی دہلیز کے پاس ہی سے کمر میں ذرا سا جھانکنے کا خم پیدا کر کے خان بہادر کو پکارتی

”آجائیے خان بہادر صاحب۔“

خان بہادر صاحب اخبار اور سلیپر کھڑکھڑاتے اندر آ جاتے۔ اور شاداں دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتی۔ شاداں کو کام پر لگے، دو مہینے ہو گئے تھے۔ یہ گزرے تو خان بہادر کی بیوی نے ایک دن یوں محسوس کیا کہ شاداں میں کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ اس نے سرسری غور کیا تو یہی بات ذہن میں آئی کہ محلے کے کسی نوجوان سے آنکھ لڑ گئی ہو گی۔ اب وہ زیادہ بن ٹھن کے رہتی تھی۔ اگر وہ پہلے کوری ململ تھی۔ تو اب ایسا لگتا تھا کہ اسے کلف لگا ہوا ہے۔ مگر یہ کلف بھی کچھ ایسا تھا جو ململ کے ساتھ انگلیوں میں چنا نہیں گیا تھا۔ شادان دن بدن تبدیل ہو رہی تھی۔ پہلے وہ اترن پہنتی تھی، پر اب اس کے بدن پر نئے جوڑے نظر آتے تھے۔ بڑے اچھے فیشن کے بڑے عمدہ سلے ہوئے۔ ایک دن جب وہ سفید لٹھے کی شلوار اور پھولوں والی جارجٹ کی قمیض پہن کر آئی تو فریدہ کو باریک کپڑے کے نیچے سفید سفید گول چیزیں نظر آئیں۔ لکن میٹی ہو رہی تھی۔ شاداں نے دیوار کے ساتھ منہ لگا کر زور سے اپنی آنکھیں میچی ہوئی تھیں۔ فریدہ نے اس کی قمیض کے نیچے سفید سفید گول چیزیں دیکھی تھیں۔ وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ جب شاداں نے پکارا

”چھپ گئے؟“

تو فریدہ نے سعیدہ کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے گئی اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس کے کان میں کہا۔

”سعیدہ۔ تم نے دیکھا، اس نے کیا پہنا ہوا تھا؟“

سعیدہ نے پوچھا۔

”کس نے؟“

فریدہ نے اس کے کان ہی میں کہا۔

”شاداں نے؟“

”کیا پہنا ہوا تھا؟“

فریدہ کی جوابی سرگوشی سعیدہ کے کان میں غڑاپ سے غوطہ لگا گئی۔ جب ابھری تو سعیدہ نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا اور ایک بھنچی بھنچی حیرت کی

”میں“

اس کے لبوں سے خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر نکلی۔ دونوں بہنیں کچھ دیر کھسر پھسر کرتی رہیں۔ اتنے میں دھماکا سا ہوا اور شاداں نے ان کو ڈھونڈ لیا۔ اس پر سعیدہ اور فریدہ کی طرف سے قاعدے کے مطابق چھم ڈھاڑ ہونا چاہیے تھی مگر وہ چپ رہیں۔ شاداں کی خوشی کی مزید چیخیں اس کے حلق میں رک گئیں۔ فریدہ اور سعیدہ کمرے کے اندھیرے کونے میں کچھ سہمی سہمی کھڑی تھیں شاداں بھی قدرے خوفزدہ ہو گئی۔ ماحول کے مطابق اس نے اپنی آواز دبا کر ان سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

فریدہ نے سعیدہ کے کان میں کچھ کہا، سعیدہ نے فریدہ کے کان میں۔ دونوں نے ایک دوسری کو کہنیوں سے ٹھوکے دیے۔ آخر فریدہ نے کانپتے ہوئے لہجے میں شاداں سے کہا۔

”یہ تم نے۔ یہ تم نے قمیض کے نیچے کیا پہن رکھا ہے“!

شاداں کے حلق سے ہنسی کے گول گول ٹکڑے نکلے۔ سعیدہ نے پوچھا۔

”کہاں سے لی تو نے یہ؟“

شاداں نے جواب دیا۔

”بازار سے؟“

فریدہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”کتنے میں؟“

”دس روپے میں“!

دونوں بہنیں ایک دم چلاتے چلاتے رک گئیں۔

”اتنی مہنگی“!

شاداں نے صرف اتنا کہا۔

”کیا ہم غریب دل کو اچھی لگنے والی چیزیں نہیں خرید سکتے؟“

اس بات نے فوراً ہی ساری بات ختم کر دی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد پھر کھیل شروع ہو گیا۔ کھیل جاری تھا۔ مگر کہاں جاری تھا۔ یہ خان بہادر کی بیوی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اب تو شاداں بڑھیا قسم کا تیل بالوں میں لگاتی تھی۔ پہلے ننگے پاؤں ہوتی تھی، پر اب اس کے پیروں میں اس نے سینڈل دیکھے۔ کھیل یقیناً جاری تھا۔ مگر خان بہادر کی بیوی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اگر کھیل جاری ہے تو اس کی آواز شاداں کے جسم سے کیوں نہیں آتی۔ ایسے کھیل بے آواز اور بے نشان تو نہیں ہوا کرتے۔ یہ کیسا کھیل ہے جو صرف کپڑے کا گز بنا ہوا ہے۔ اس نے کچھ دیر اس معاملے کے بارے میں سوچا، لیکن پھر سوچا کہ وہ کیوں بیکار مغزپاشی کرے۔ ایسی لڑکیاں خراب ہوا ہی کرتی ہیں اور کتنی داستانیں ہیں جو ان کی خرابیوں سے وابستہ ہیں اور شہر کے گلی کوچوں میں ان ہی کی طرح رُلتی پھرتی ہیں۔ دن گزرتے رہے اور کھیل جاری رہا۔ فریدہ کی ایک سہیلی کی شادی تھی۔ اس کی ماں خان بہادر کی بیوی کی منہ بولی بہن تھی۔ اس لیے سب کی شرکت لازمی تھی۔ گھر میں صرف خان بہادر تھے سردی کا موسم تھا۔ رات کو خان بہادر کی بیوی کو معاً خیال آیا کہ اپنی گرم شال منگوا لے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ نوکر بھیج دے مگر وہ ایسے صندوق میں پڑی تھی۔ جس میں زیورات بھی تھے، اس لیے اس نے نجیب کو ساتھ لیا اور اپنے گھر آئی۔ رات کے دس بجے چکے تھے۔ اسکا خیال تھا کہ دروازہ بند ہو گا، چنانچہ اس نے دستک دی۔ جب کسی نے نہ کھولا تو نجیب نے دروازے کو ذرا سا دھکا دیا۔ وہ کھل گیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے صندوق سے شال نکالی اور نجیب سے کہا۔

”جاؤ، دیکھو تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں۔ ان سے کہہ دینا کہ تم تو ابھی تھوڑی دیر کے بعد لوٹ آؤ گے، لیکن ہم سب کل صبح آئیں گے۔ جاؤ بیٹا“!

صندوق میں چیزیں قرینے سے رکھ کر وہ تالا لگا رہی تھی کہ نجیب واپس آیا اور کہنے لگا۔

”ابا جی تو اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔“

”اپنے کمرے میں نہیں ہیں؟۔ اپنے کمرے میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں؟

”خان بہادر کی بیوی نے تالا بند کیا اور چابی اپنے بیگ میں ڈالی۔

”تم یہاں کھڑے رہو، میں ابھی آتی ہوں“!

یہ کہہ کر وہ اپنے شوہر کے کمرے میں گئی جو کہ خالی تھا مگر بتی چل رہی تھی۔ بستر پر سے چادر غائب تھی۔ فرش دھلا ہوا تھا۔ ایک عجیب قسم کی بُو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ خان بہادر کی بیوی چکرا گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھا، مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک چیز تھی۔ اس نے رینگ کر اسے پکڑا اور باہر نکل کر دیکھا۔ خان بہادر کی موٹی مسواک تھی۔ اتنے میں آہٹ ہوئی۔ خان بہادر کی بیوی نے مسواک چھپالی۔ خان بہادر اندر داخل ہوئے اور ان کے ساتھ ہی مٹی کے تیل کی بو۔ ان کا رنگ زرد تھا جیسے سارا لہو نچڑ چکا ہے۔ کانپتی ہوئی آواز میں خان بہادر نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔ شال لینے آئی تھی۔ میں نے سوچا، آپ کو دیکھتی چلوں۔“

”جاؤ“!

خان بہادر کی بیوی چلی گئی۔ چند قدم صحن میں چلی ہو گی کہ اسے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ وہ بہت دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھی رہی پھر نجیب کو لے کر چلی گئی۔ دوسرے روز فریدہ کی سہیلی کے گھر خان بہادر کی بیوی کو یہ خبر ملی کہ خان بہادر گرفتار ہو گئے ہیں۔ جب اس نے پتا لیا تو معلوم ہوا کہ جرم بہت سنگین ہے۔ شاداں جب گھر پہنچی تو لہولہان تھی۔ وہاں پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کے ماں باپ اسے ہسپتال لے گئے۔ پولیس ساتھ تھی۔ شاداں کو وہاں ایک لحظے کے لیے ہوش آیا اور اس نے صرف

”خان بہادر“

کہا۔ اس کے بعد وہ ایسی بے ہوش ہوئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ جرم بہت سنگین تھا۔ تفتیش ہوئی۔ مقدمہ چلا۔ استغاثے کے پاس کوئی عینی شہادت موجود نہیں تھی۔ ایک صرف شاداں کے لہو میں لتھڑے ہوئے کپڑے تھے اور وہ دو لفظ جو اس نے مرنے سے پہلے اپنے منہ سے ادا کیے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اسغاثے کو پختہ یقین تھا کہ مجرم خان بہادر ہے، کیونکہ ایک گواہ ایسا تھا جس نے شاداں کو شام کے وقت خان بہادر کے گھر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ صفائی کے گواہ صرف دو تھے۔ خان بہادر کی بیوی اور ایک ڈاکٹر۔ ڈاکٹر نے کہا کہ خان بہادر اس قابل ہی نہیں کہ وہ کسی عورت سے ایسا رشتہ قائم کر سکے۔ شاداں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ نابالغ تھی۔ اس کی بیوی نے اس کی تصدیق کی۔ خان بہادر محمد اسلم خان بری ہو گئے۔ مقدمے میں انھیں بہت کوفت اٹھانی پڑی۔ بری ہو کر جب گھر آئے تو ان کی زندگی کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک صرف انھوں نے مسواک کا استعمال چھوڑ دیا۔

شادی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشادی

جمیل کو اپنا شیفر لائف ٹائم قلم مرمت کے لیے دینا تھا۔ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں شیفر کمپنی کا نمبر تلاش کیا۔ فون کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کے ایجنٹ میسرز ڈی، جے، سمتوئر ہیں جن کا دفتر گرین ہوٹل کے پاس واقع ہے۔ جمیل نے ٹیکسی اور فورٹ کی طرف چل دیا۔ گرین ہوٹل پہنچ کر اسے میسرز ڈی، جے، سمتوئر کا دفتر تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی۔ بالکل پاس تھا مگر تیسری منزل پر۔ لفٹ کے ذریعے جمیل وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی چوبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی، جس کی چھاتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں۔ جمیل نے قلم اس کی کھڑکی کے اندر داخل کر دیا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔ لڑکی نے قلم اس کے ہاتھ سے لے لیا، کھول کر ایک نظر دیکھا اور ایک چٹ پر کچھ لکھ کر جمیل کے حوالے کر دیا۔ منہ سے وہ بھی کچھ نہ بولی۔ جمیل نے چٹ دیکھی۔ قلم کی رسید تھی۔ چلنے ہی والا تھا کہ پلٹ کر اس نے لڑکی سے پوچھا۔

”دس بارہ روز تک تیار ہو جائے گا، میرا خیال ہے۔“

لڑکی بڑے زور سے ہنسی۔ جمیل کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔

”میں آپ کی اس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھا۔“

لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔

”مسٹر۔ آج کل وار ہے وار۔ یہ قلم امریکہ جائے گا۔ تم نو مہینے کے بعد پتا کرنا۔“

جمیل بوکھلا گا۔

”نو مہینے“!

لڑکی نے اپنے بریدہ بالوں والا سر ہلایا۔ جمیل نے لفٹ کا رخ کیا۔ یہ نو مہینے کا سلسلہ خوب تھا۔ نو مہینے۔ اتنی مدت کے بعد تو عورت گل گوتھنا بچہ پیدا کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ نو مہینے۔ نو مہینے تک اس چھوٹی سی چٹ کو سنبھالے رکھو۔ اور یہ بھی کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نو مہینے تک آدمی یاد رکھ سکتا ہے کہ اس نے ایک قلم مرمت کے لیے دیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مر کھپ ہی جائے۔ جمیل نے سوچا، یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ قلم میں معمولی سی خرابی تھی کہ اس کا فیڈر ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا۔ اس کے لیے اسے امریکہ کے ہسپتال میں بھیجنا صریحاً چالبازی تھی۔ مگر پھر اس نے سوچا، لعنت بھیجو اس قلم پر۔ امریکہ جائے یا افریقہ۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ بلیک مارکیٹ سے ایک سو پچھتر روپے میں خریدا تھا۔ مگر اس نے ایک برس اسے خوب استعمال بھی تو کیا تھا۔ ہزاروں صفحے کالے کر ڈالے تھے۔ چنانچہ وہ قنوطی سے ایک دم رجائی بن گیا۔ اور رجائی بنتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بے شمار دکانیں۔ وسکی تو ظاہر ہے نہیں ملے گی لیکن فرانس کی بہترین کونک برانڈی تو مل جائے گی، چنانچہ اس نے قریب والی شراب کی دکان کا رخ کیا۔ برانڈی کی ایک بوتل خرید کر وہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آ کے رک گیا۔ ہوٹل کے نیچے قد آدم شیشوں کا بنا ہوا قالینوں کا شوروم تھا۔ یہ جمیل کے دوست پیر صاحب کا تھا۔ اس نے سوچا چلو اندر چلیں۔ چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شوروم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے، جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا، اور ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔ برانڈی کی بوتل باریک کاغذ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ پیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا۔

”یار اس دلہن کا گھونگٹ تو کھولو۔ ذرا اس سے چھیڑ خانی تو کرو۔“

جمیل مطلب سمجھ گیا۔

”سو پیر صاحب گلاس اور سوڈے منگوا دیئے۔ پھر دیکھیے کیا رنگ جمتا ہے۔“

فوراً گلاس اور یخ بستہ سوڈے آ گئے۔ پہلا دور ہوا۔ دوسرا دور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک گجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے ہوٹل کا چھوکرا دو کے بجائے تین گلاس اٹھا لایا تھا۔ پیر صاحب کے گجراتی دوست نے بڑی صاف اردو میں چند ادھر ادھر کی باتیں کیں اور گلاس میں یہ بڑا پیگ ڈال کر اس کو سوڈے سے لبالب بھر دیا۔ تین چار لمبے لمبے گھونٹ لے کر انھوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا۔

”سگریٹ نکالو یار“!

پیر صاحب میں ساتوں عیب شرعی تھے۔ مگر وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ جمیل نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور قالین پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی لائٹر۔ اس پر پیر صاحب نے جمیل سے اس گجراتی کا تعارف کرایا

”مسٹر نٹور لال۔ آپ موتیوں کی دلالی کرتے ہیں۔“

جمیل نے ایک لحظے کے لیے سوچا، کوئلوں کی دلالی میں تو انسان کا منہ کالا ہوتا ہے۔ موتیوں کی دلالی میں۔ پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”مسٹر جمیل۔ مشہور سونگ رائٹر۔“

دونوں نے ہاتھ ملایا اور برانڈی کا نیا دور شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ بوتل خالی ہو گئی۔ جمیل نے دل میں سوچا یہ کم بخت موتیوں کا دلال بلا کا پینے والا ہے۔ میری پیاس اور سرور کی ساری برانڈی چڑھا گیا۔ خدا کرے اسے موتیا بند ہو۔ مگر جونہی آخری دور کے پیگ نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے، اس نے نٹور لال کو معاف کر دیا۔ اور آخر میں اس سے کہا۔

”مسٹر نٹور! اٹھیے، ایک بوتل اور ہو جائے۔“

نٹور لال فوراً اٹھا۔ اپنے سفید وگلے کی شکنیں درست کیں۔ دھوتی کی لانگ ٹھیک کی اور کہا۔

”چلیے“!

جمیل پیر صاحب سے مخاطب ہوا۔

”ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں۔“

جمیل اور نٹور نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دکان پر پہنچے۔ جمیل نے ٹیکسی روکی مگر نٹور نے کہا۔

”مسٹر جمیل۔ یہ دکان ٹھیک نہیں۔ ساری چیزیں مہنگی بیچتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

”دیکھو کولابہ چلو“!

کولابہ پہنچ کر نٹور، جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے گیا۔ جو برانڈ جمیل نے فورٹ سے لیا، وہ تو نہ مل سکا، ایک دوسرا مل گیا جس کی نٹور نے بہت تعریف کی کہ نمبر ون ہے۔ یہ نمبر ون چیز خرید کر دونوں باہر نکلے۔ ساتھ ہی بار تھی۔ نٹور رک گیا۔

”مسٹر جمیل! کیا خیال ہے آپ کا، ایک دو پیگ یہیں سے پی کر چلتے ہیں۔“

جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا، اس لیے کہ اس کا نشہ حالت نزع میں تھا۔ چنانچہ دونوں بار کے اندر داخل ہوئے۔ معاً جمیل کو خیال آیا کہ بار والے تو کبھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے۔

”مسٹر نٹور آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں۔ یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے۔“

نٹور نے زور سے آنکھ ماری۔

”سب چلتا ہے۔“

اور یہ کہہ کر ایک کیبن کے اندر گھس گیا۔ جمیل بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ نٹور نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس کو بھی آنکھ ماری۔

”دیکھو! دو سوڈے روجرز۔ ٹھنڈے۔ اور دو گلاس۔ ایک دم صاف“

بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فوراً سوڈے اور گلاس حاضر کر دیے۔ اس پر نٹور نے اسے دوسرا حکم دیا۔

”فسٹ کلاس چپس اور ٹومیٹو سوس۔ اور فسٹ کلاس کٹلس“!

بیرا چلا گیا۔ نٹور جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرایا۔ بوتل کا کارک نکالا اور جمیل کو گلاس میں اس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ خود اس سے کچھ زیادہ۔ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔ جمیل پیاسا تھا۔ ایک جرعے میں اس نے آدھا گلاس ختم کر دیا۔ سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لیے پھوں پھوں کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد چپس اور کٹلس آ گئے۔ جمیل صبح گھر سے ناشتہ کر کے نکلا تھا لیکن برانڈی نے اسے بھوک لگا دی۔ چپس گرم گرم تھے، کٹلس بھی۔ وہ پل پڑا۔ نٹور نے اس کا ساتھ دیا۔ چنانچہ دو منٹ میں دونوں پلیٹیں صاف! دو پلیٹیں اور منگوائی گئیں۔ جمیل نے اپنے لیے چپس بھی منگوائے۔ دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ بوتل کی تین چوتھائی غائب ہو چکی تھی۔ جمیل نے سوچا کہ اب پیر صاحب کے پاس جانا بے کار ہے۔ نشے خوب جم رہے تھے، سرور خوب گھٹ رہے تھے۔ نٹور اور جمیل دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایسے سواروں کو عام طور پر ایسی وادیوں میں جانے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، جہاں انھیں عریاں بدن حسین عورتیں ملیں۔ وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر بٹھالیں اور یہ جا، وہ جا۔ جمیل کا دل و دماغ اس وقت کسی ایسی وادی کے متعلق سوچ رہا تھا جہاں اس کی کسی ایسی خوبصورت عورت سے مڈ بھیڑ ہو جائے جس کو وہ اپنے تپتے ہوئے سینے کے ساتھ بھینچ لے، اس زور سے کہ اس کی ہڈیاں تک چیخ جائیں۔ جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے۔ مطلب ہے ایسے علاقے میں ہے جو اپنے برو تھلز (قحبہ خانے) کی وجہ سے ساری بمبئی میں مشہور ہے، جنھیں عیاشی کرنا ہوتی ہے وہ ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ شہر سے بھی جس لڑکی کو لک چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے، یہیں آتی ہے۔ ان معلومات کی بنا پر اس نے نٹور سے کہا۔

”میں نے کہا۔ وہ۔ وہ۔ میرا مطلب ہے، ادھر کوئی چھوکری وو کری نہیں ملتی؟“

نٹور نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انڈیلا اور ہنسا۔

”مسٹر جمیل! ایک نہیں ہزاروں۔ ہزاروں۔ ہزاروں۔“!

یہ ہزاروں کی گردان جاری رہتی اگر جمیل نے اس کی بات کاٹی نہ ہوتی۔

”ان ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم سمجھیں کہ نٹور بھائی نے کمال کر دیا۔“

نٹور بھائی مزے میں تھے۔ جھوم کر کہا۔

”جمیل بھائی۔ ایک نہیں ہزاروں۔ چلو، اس کو ختم کرو۔“

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا، آدھ گھنٹے کے اندر اندر ختم کر دیا۔ بل ادا کرنے اور بیرے کو تگڑی ٹِپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے۔ اندر اندھیرا تھا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ جمیل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک لحظے کے لیے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں تیز روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے نٹور سے کہا۔

”چلو بھئی“!

نٹور نے تلاشی لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا۔

”مال پانی ہے نا؟“

جمیل کے ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ نٹور کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دے کر اس نے کہا۔

”بہت۔ نٹور بھائی، بہت۔“

اور اس نے جیب سے پانچ نوٹ سو سو کے نکالے۔

”کیا اتنے کافی نہیں؟“

نٹور کی باچھیں کھل گئیں۔

”کافی۔ ؟ بہت زیادہ ہیں۔ چلو آؤ، پہلے ایک بوتل خرید لیں، وہاں ضرورت پڑے گی۔“

جمیل نے سوچا بات بالکل ٹھیک ہے، وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تو کیا کسی مسجد میں پڑے گی۔ چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی۔ ٹیکسی کھڑی تھی۔ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور اس وادی کی سیاحی کرنے لگے۔ سینکڑوں بروتھلز تھے۔ ان میں سے بیس پچیس کا جائزہ لیا گیا، مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی۔ سب میک اپ کی موٹی اور شوخ تہوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان معلوم نہ ہو۔ جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اکھڑے ہوئے پلستر کے ٹکڑوں پر بڑے اناڑی پن سے سرخی اور چونا لگایا گیا ہے۔ نٹور تنگ آ گیا۔ اس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی، وہ جمیل کا کندھا پکڑ کر کہتا۔

”جمیل بھائی، چلے گی“!

مگر جمیل بھائی اٹھ کھڑا ہوتا۔

”ہاں چلے گی۔ اور ہم بھی چلیں گے“!

دو جگہیں اور دیکھی گئیں مگر جمیل کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ سوچتا تھا کہ ان عورتوں کے پاس کون آتا ہے جو سؤر کے سوکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی ادائیں کتنی مکروہ ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کا انداز کتنا فحش ہے اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں یعنی ایسی عورتیں جو درپردہ پیشہ کراتی ہیں۔ جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ کہاں ہے جس کے پیچھے یہ دھندہ کراتی ہیں۔ جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہونا چاہیے، کہ نٹور نے ٹیکسی رکوائی اور اتر کر چلا گیا کہ ایک دم اسے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔ اب جمیل اکیلا تھا۔ ٹیکسی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

”یہاں کوئی بھڑوا ملے گا؟“

ڈرائیور نے جواب دیا۔

”ملے گا جناب“!

”تو چلو اس کے پاس“!

ڈرائیور نے دو تین موڑ گھومے اور ایک پہاڑی بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ دو تین مرتبہ ہارن بجایا۔ جمیل کا سر نشے کے باعث سخت بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کیسے اور کس طرح، مگر جب اس نے ذرا دماغ کو جھٹکا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھا ہے اور اس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی، جس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹی سی پھنسی تھی، اپنے بریدہ بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ جمیل نے اس کو غور سے دیکھا۔ سوچنے ہی والا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا مگر اس کے شعور نے اس کو مشورہ دیا کہ دیکھو یہ سب عبث ہے۔ جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پر برانڈی کی سالم بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کر لی کہ سب خیریت ہے۔ اس کا نشہ کسی قدر نیچے اتر گیا۔ اٹھ کر وہ اس گیسو بریدہ لڑکی کے پاس گیا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مسکرا کر اس سے کہا۔

”کہیے، مزاج کیسا ہے؟“

اس لڑکی نے کنگھی میز پر رکھی اور کہا۔

”کہیے آپ کا کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہوں“!

یہ کہہ کر اس نے لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔

”آپ کا نام؟“

”بتا تو چکی ایک دفعہ۔ آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے۔ جانے کہاں کہاں گھومتے رہے ہوں گے کہ بل اڑتیس روپے بنا جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص کا نام شاید نٹور تھا، آپ نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔“

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں، میں بھول جایا کرتا ہوں۔ یایوں سمجھیے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزا آتا ہے۔ وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اس نے ٹیکسی والے کا بل جو کہ اڑتیس روپے بنتا تھا، ادا کیا تھا۔ لڑکی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

”میرا نام تارہ ہے۔“

جمیل نے اس کو لٹا دیا اور اس سے مصنوعی پیار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیاس محسوس ہوئی تو اس نے تارہ سے کہا۔

”دو یخ بستہ سوڈے اور گلاس“!

تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں۔ جمیل نے بوتل کھولی۔ اپنے لیے ایک پیگ ڈال کر اس نے دوسرا تارہ کے لیے ڈالا۔ پھر دونوں پینے لگے۔ تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ تارہ کو چومنے چاٹنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب قصہ مختصر ہو جانا چاہیے۔

”کپڑے اتار دو“!

”سارے؟“

”ہاں سارے“!

تارہ نے کپڑے اتار دیے اور لیٹ گئی۔ جمیل نے اس کے ننگے جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا۔ جمیل کا نکاح ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کا بدن کیسا ہو گا۔ کیا وہ تارہ کی طرح اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اپنے سارے کپڑے اتار کر اس کے ساتھ لیٹ جائے گی؟ کیا وہ اس کے ساتھ برانڈی پیے گی؟ کیا اس کے بال کٹے ہوئے ہیں؟ پھر فوراً اس کا ضمیر جاگا جس نے اس کو لعنت ملامت شروع کر دی۔ نکاح کا یہ مطلب تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ صرف ایک مرحلہ باقی تھا کہ وہ اپنی سسرال جائے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے۔ کیا اس کے لیے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنی آغوش کی زینت بنائے۔ خم کے خم لنڈھاتا پھرے۔ جمیل بہت خفیف ہوا اور اسی خفت میں اس کی آنکھیں مندنا شروع ہو گئیں اور وہ سو گیا۔ تارہ بھی تھوڑی دیر کے بعد خواب غفلت کے مزے لینے لگی۔ جمیل نے کئی بے ربط، اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا، وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ جب اچھی طرح آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ الف ننگی لڑکی لیٹی ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اس کے دماغ کی دھند چیر کر نمودار ہونے لگے۔ وہ خود بھی الف ننگا تھا۔ بوکھلاہٹ میں اس نے الٹا پاجامہ پہن لیا، مگر اس کو احساس نہ ہوا۔ کرتا پہن کر اس نے جیبیں ٹٹولیں۔ نوٹ سب کے سب موجود تھے۔ اس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنا کر پیا۔ پھر اس نے تارہ کو ہولے سے جھنجھوڑا۔

”اٹھو“!

تارہ آنکھیں ملتی اٹھی۔ جمیل نے اس سے کہا

”کپڑے پہن لو“!

تارہ نے کپڑے پہن لیے۔ باہر گہری شام رات بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ جمیل نے سوچا، اب کُوچ کرنا چاہیے۔ لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، کیوں کہ بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل گئیں تھیں۔

”کیوں تارہ جب ہم لیٹے۔ میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس کے بعد کیا ہوا؟“

تارہ نے جواب دیا۔

”کچھ نہیں۔ آپ نے اپنے کپڑے اتارے اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے۔“

”بس؟“

”ہاں۔ لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑبڑائے اور کہا۔

”میں گنہگار ہوں۔ میں گنہگار ہوں۔“

یہ کہہ کر تارہ اٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی۔ جمیل بھی اٹھا۔ گناہ کا احساس دبانے کے لیے اس نے ڈبل پیگ اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیلا۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ تارہ نے پوچھا۔

”چلے؟“

”ہاں، پھر کبھی آؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ لوہے کی پیچ دار سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ بڑے بازار کی طرف اس کے قدم اٹھنے ہی والے تھے کہ ہارن بجا اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس نے کہا چلو، اچھا ہوا، یہیں مل گئی۔ پیدل چلنے کی زحمت سے بچ گئے۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

”کیوں بھائی خالی ہے؟“

ڈرائیور نے جواب دیا۔

”خالی ہے کا کیا مطلب۔ لگی ہوئی ہے“!

”تو پھر۔“

یہ کہہ کر جمیل مڑا، لیکن ڈرائیور نے اس کو پکارا۔

”کدھر جاتا ہے سیٹھ؟“

جمیل نے جواب دیا۔

”کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں۔“

ڈرائیور باہر نکل آیا۔

”مستک تو نہیں پھرے لا۔ یہ ٹیکسی تمہیں نے تو لے رکھی ہے“!

جمیل بوکھلا گیا۔

”میں نے؟“

ڈرائیور نے بڑے گنوار لہجے میں اس سے کہا۔

”ہاں تو نے۔ سالا دارو پی کر سب کچھ بھول گیا۔“

اس پر تُو تُو میں میں شروع ہوئی۔ ادھر ادھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ جمیل نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔

”چلو“!

ڈرائیور نے ٹیکسی چلائی۔

”کدھر؟“

جمیل نے کہا۔

”پولیس اسٹیشن“!

ڈرائیور نے اس پر جانے کیا واہی تباہی بکی۔ جمیل سوچ میں پڑ گیا۔ جو ٹیکسی اس نے لی تھی، اس کا بل جو اڑ تیس روپے تھا، اس نے ادا کر دیا تھا۔ اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن ٹپکی۔ گو وہ نشے کی حالت میں تھا مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی، اور نہ یہ ڈرائیور وہ ڈرائیور جو اسے یہاں لایا تھا۔ پولیس اسٹیشن پہنچے۔ جمیل کے قدم بہت بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ سب انسپکٹر جو اس وقت ڈیوٹی پر تھا، فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سر تا پا غلط تھی۔ جمیل یقیناً اس کی تردید کرتا مگر اس میں زیادہ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔

”جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیا قصہ ہے، جو ٹیکسی میں نے لی تھی، اس کا کرایہ میں نے اڑ تیس روپے ادا کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ یہ کون ہے اور مجھ سے کیسا کرایہ مانگتا ہے؟“

ڈرائیور نے کہا۔

”حضور انسپکٹر بہادر! یہ دارو پئے ہے۔“

اور ثبوت کے طور پر اس نے جمیل کی برانڈی کی بوتل میز پر رکھ دی۔ جمیل جھنجھلا گیا۔

”ارے بھئی! کون سؤر کہتا ہے کہ اس نے نہیں پی۔ سوال تو یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے۔“

سب انسپکٹر شریف آدمی تھا۔ کرایہ ڈرائیور کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا۔ اس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا۔ ڈرائیور بہت چیخا چلایا مگر سب انسپکٹر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے نکلوا دیا۔ پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسری ٹیکسی لائے۔ ٹیکسی آئی تو اس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے گھر چھوڑ آئے۔ جمیل نے لکنت بھرے لہجے میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔

”جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے؟“

سب انسپکٹر نے زور کا قہقہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مسٹر! اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے۔ یہ کولابہ پولیس اسٹیشن ہے۔ جاؤ، اب گھر جا کر سو جاؤ۔“

جمیل گھر جا کے کھانا کھائے اور کپڑے اتارے بغیر سو گیا۔ برانڈی کی بوتل بھی اس کے ساتھ سوتی رہی۔ دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اٹھا۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ سر میں جیسے بڑے بڑے وزنی پتھر تھے۔ منہ کا ذائقہ خراب۔ اس نے اٹھ کر دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پیے، چار پنچ پیالے چائے کے۔ تب کہیں شام کو جا کر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اس نے خود کو گزشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا۔ بہت لمبی زنجیر تھی۔ ان میں سے بعض کڑیاں تو سلامت تھیں، مگر بعض غائب۔ واقعات کا تسلسل شروع سے لے کر گرین ہوٹل اور وہاں سے لے کر کولابہ تک بالکل صاف تھا۔ اس کے بعد جب نٹور کے ساتھ خاص وادی کی سیاحی شروح ہوئی تھی، معاملہ گڈ مڈ ہو جاتا تھا۔ چند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بڑی واضح، مگر فوراً مبہم پرچھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اس لڑکی کے گھر پہنچا۔ اس کا نام جمیل کے حافظے سے پھسل کر جانے کس کھڈ میں جا گرا تھا۔ اس کی شکل و صورت اسے البتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی۔ وہ اس کے گھر کیسے پہنچا تھا۔ یہ جاننا بہت اہم تھا۔ اگر جمیل کا حافظہ اس کی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں۔ مگر بصد کوشش وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اور یہ ٹیکسیوں کا کیا سلسلہ تھا۔ اس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا، مگر وہ دوسری کہاں سے ٹپک پڑی تھی؟ سوچ سوچ کے جمیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر تھے، سب آپس میں ٹکرا ٹکرا کر چُور چُور ہو گئے ہیں۔ رات کو اس نے برانڈی کے تین پیگ پیے، تھوڑا سا ہلکا کھانا کھایا اور گزشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا۔ وہ ٹکڑے جو گم ہو گئے تھے، ان کو تلاش کرنا اب جمیل کا شغل ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس روز ہوا، من و عن اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائے اور یہ روز روز کی مغزپاشی دور ہو۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کا گناہ نامکمل رہ گیا۔ وہ سوچتا یہ ادھورا گناہ جانے گا کس کھاتے میں۔ وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اس کی بھی تکمیل ہو جائے۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ پہاڑی بنگلوں جیسا مکان جمیل کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے ایک دن سوچا کہ یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا! مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا۔ خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا۔ اس روز اس کے کم از کم ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ پیر صاحب سے اس نے نٹور کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اس روز کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے۔ غالباً موتیوں کے سلسلے میں۔ جمیل نے اس پر ہزار لعنتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کر دی۔ اس نے جب اپنے حافظے پر بہت زور دیا تو اسے بنگلے کی دیوار کے ساتھ پیتل کی ایک پلیٹ نظر آئی۔ اس پر کچھ لکھا تھا۔ غالباً۔ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر بیر ام جی۔ آگے جانے کیا۔ ایک دن کولابہ کی گلیوں میں چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اس کو جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ دورویہ اسی قسم کی بنگلہ نما عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے۔ کسی پر چار کسی پر پانچ۔ کسی پر تین۔ وہ ادھر ادھر غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا، مگر اس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صبح اس کی ساس کی طرف سے موصول ہوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہو گئی ہے۔ میں نے تاریخ مقرر کر دی ہے، آؤ اور اپنی دلہن کو لے جاؤ۔ اور وہ ادھر ایک نامکمل گناہ کو مکمل بنانے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جمیل نے کہا۔

”ہٹاؤ جی اس وقت۔ پھر نے دو مارا مارا۔ ایک دم اس نے اپنا داہنے ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ڈاکٹر ایم بیر ام جی۔ ایم ڈی۔ جمیل کانپنے لگا۔ یہ وہی بلڈنگ۔ بالکل وہی۔ وہی رنگ، وہی بل کھاتی ہوئی آہنی سیڑھیاں۔ جمیل بے دھڑک اوپر چلا گیا۔ اس کے لیے اب ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ کوریڈور سے نکل کر اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔ اسی لڑکے نے جو اس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔ جمیل نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”بیٹا، بائی جی ہیں؟“

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جی ہاں“!

”جاؤ، ان سے کہو، صاحب ملنے آئے ہیں۔“

جمیل کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔ لڑکا دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور تارہ نمودار ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہی جمیل نے پہچان لیا کہ وہ لڑکی ہے، مگر اب اس کی ناک پر پھنسی نہیں تھی۔

”نمستے“!

”نمستے! کہیے مزاج کیسے ہیں؟“

یہ کہہ کر اس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ جمیل نے جواب دیا۔

”اچھے ہیں۔ میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اس لیے آنہ سکا۔ کہو، پھر کیا ارادہ ہے؟“

تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”معاف کیجیے، میری شادی ہو چکی ہے۔“

جمیل بوکھلا گی۔

”شادی۔ کب؟“

تارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”جی، آج صبح۔ آیئے میں آپ کو اپنے پتی سے ملاؤں۔“

جمیل چکرا گیا اور کچھ کہے سنے بغیر کھٹا کھٹ نیچے اتر گیا۔ سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔ جمیل کا دل ایک لحظے کے لیے ساکت سا ہو گیا۔ تیز قدم اٹھاتا، وہ بڑے بازار کی طرف نکل گیا۔ معاً جمیل کو جاتے دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے کہا۔

”سیٹھ صاحب ٹیکسی“!

جمیل نے جھنجھلا کر کہا۔

”نہیں کم بخت، شادی“!

شاردا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشاردا

نذیر بلیک مارکیٹ سے وسکی کی بوتل لانے گیا۔ بڑک ڈاک خانے سے کچھ آگے بندر گاہ کے پھاٹک سے کچھ ادھر سگرٹ والے کی دکان سے اس کو اسکوچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی۔ جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل لی تو اس وقت گیارہ بجے تھے دن کے۔ یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔ بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بوری بندر کے اسٹینڈ سے ٹیکسی لے گا۔ ایک پیگ اس میں بیٹھ کر پیئے گا اور ہلکے ہلکے سرور میں گھر پہنچ جائے گا۔ بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا۔

”موسم دیکھ کتنا اچھا۔“

پھر وہ اسے وہ بھونڈا سا شعر سنائے گا کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند جو گناہ کیجیے ثواب ہے آج وہ کچھ دیر ضرور چخ کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی اور اس کے کہنے پر قیمے کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔ دکان سے بیس پچیس گز دور گیا ہو گا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا۔ نذیر کا حافظہ کمزور تھا۔ اس نے سلام کرنے والی آدمی کو نہ پہچانا، لیکن اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا، چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا۔

”کیوں بھئی کہاں ہوتے ہو۔ کبھی نظر ہی نہیں آئے۔“

اس آدمی نے مسکرا کر کہا۔

”حضور، میں تو یہیں ہوتا ہوں۔ آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے؟“

نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا۔

”میں اب جو تشریف لے آیا ہوں۔“

”تو چلیے میرے ساتھ۔“

نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا۔

”چلو۔“

اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔

”باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے۔“

یہ فقرہ سن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلال ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“

”کریم۔ آپ بھول گئے تھے“!

نذیر کو یاد آ گیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اس کے لیے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا۔ بڑا ایماندار دلال تھا۔ اس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے۔ کریم سے اس نے معذرت چاہی۔

”یار میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے۔ غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے۔“

”جی ہاں۔“

”تمہارا اڈہ تو پہلے گرانٹ روڈ کا ناکا ہوا کرتا تھا؟“

کریم نے بیڑی سلگائی اور ذرا فخر سے کہا۔

”میں نے وہ چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی دعا سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندا شروع کر رکھا ہے۔“

نذیر نے اس کو داد دی۔

”یہ بہت اچھا کیا تم نے؟“

کریم نے اور زیادہ فخریہ لہجے میں کہا۔

”دس چھوکریاں ہیں۔ ایک بالکل نئی ہے۔“

نذیر نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

”تم لوگ یہی کہا کرتے ہو۔“

کریم کو بُرا لگا۔

”قسم قرآن کی، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سور کھاؤں اگر وہ چھوکری بالکل نئی نہ ہو۔“

پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کی اور نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔

”آٹھ دن ہوئے ہیں جب پہلا پیسنجر آیا تھا۔ جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا ہو۔“

نذیر نے پوچھا۔

”کنواری تھی؟“

”جی ہاں۔ دو سو روپے لیے تھے اس پیسنجر سے؟“

نذیر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا۔

”لو، یہیں بھاؤ پکا کرنے لگے۔“

کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بُری لگی۔

”قسم قرآن کی، سور ہو جو آپ سے بھاؤ کرے آپ تشریف لے چلیے۔ آپ جو بھی دیں گے مجھے قبول ہو گا۔ کریم نے آپ کا بہت نمک کھایا ہے۔“

نذیر کی جیب میں اس وقت ساڑھے چار سو روپے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ موڈ بھی اچھا تھا۔ وہ چھ برس پیچھے کے زمانے میں چلا گیا۔ بن پئے مسرور تھا۔

”چلو یار آج تمام عیاشیاں رہیں۔ ایک بوتل کا اور بندوبست ہو جانا چاہیے۔“

کریم نے پوچھا۔

”آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل؟“

”پینتیس روپے میں۔“

”کون سا برانڈ ہے؟“

“جونی واکر”!

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔

“میں آپ کو تیس میں لادوں گا۔”

نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیے۔

“نیکی اور پوچھ پوچھ۔ یہ لو۔ مجھے وہاں بٹھا کر تم پہلا کام یہی کرنا۔ تم جانتے ہو، میں ایسے معاملوں میں اکیلا نہیں پیا کرتا۔”

کریم مسکرایا۔

“اور آپ کو یاد ہو گا۔ میں ڈیڑھ پیگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا۔”

نذیر کو یاد آگیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پیگ لیا کرتا تھا۔ یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرایا۔

“آج دور ہیں۔”

“جی نہیں۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں۔”

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا۔ جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر

“میرینا ہوٹل”

لکھا تھا۔ نام تو خوبصورت تھا۔ مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی۔ سیڑھیاں شکستہ۔ نیچے سوخوار پٹھان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر کرسچین آباد تھے۔ دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی۔ تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھی۔ چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈربے میں بیٹھی تھیں۔ کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی۔ ایک بڑا لیکن بے ہنگم سا کمرہ کھولا جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی۔ تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا، یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور کچھ نہیں، لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔ کریم نے آرام کرسی جو کہ بے حد میلی تھی، ایک اس سے زیادہ میلے کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا۔

“تشریف رکھئے، لیکن میں یہ عرض کر دوں۔ اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہو گا۔”

نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا۔

“دس روپے زیادہ ہیں یار؟”

کریم نے کہا۔

“بہت زیادہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے۔ سالا ہوٹل کا مالک ہی بنیا ہے۔ ایک پیسہ کم نہیں کرتا۔ اور نذیر صاحب موج شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پرواہ نہیں کرتے۔”

نذیر نے کچھ سوچ کر کہا۔

“تم ٹھیک کہتے ہو۔ کرایہ پیشگی دے دوں؟”

“جی نہیں۔ آپ پہلے چھوکری تو دیکھئے۔”

یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی۔ گھریلو قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی باندھے تھی۔ عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ خوش شکل تو نہیں تھی، لیکن بھولی بھالی تھی۔ کریم نے اس سے کہا۔

“بیٹھ جاؤ۔ یہ صاحب میرے دوست ہیں۔ بالکل اپنے آدمی ہیں۔”

لڑکی نظریں نیچے کیے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کریم یہ کہہ کر چلا گیا۔

“اپنا اطمینان کر لیجئے نذیر صاحب۔ میں گلاس اور سوڈا لاتا ہوں۔”

نذیر آرام کرسی پر سے اٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا۔

“آپ کا نام۔”

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا۔

“آپ کا نام کیا ہے جناب؟”

لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔

”شکنتلا۔“

اور نذیر کو شکنتلا یاد آ گئی۔ جس پر راجہ دشنیت عاشق ہوا تھا۔

”میرا نام دشنیت ہے۔“

نذیر مکمل عیاشی پر تُلا ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکرا دی۔ اتنے میں کریم آ گیا۔ اس نے نذیر کو سوڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں۔

”مجھے یاد ہے کہ آپ کو روجر کا سوڈا پسند ہے برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں۔“

نذیر بہت خوش ہوا۔

”تم کمال کرتے ہو“

پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔

”جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟“

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ کریم نے جواب دیا۔

”نذیر صاحب۔ یہ نہیں پیتی۔ آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے۔“

یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا۔

”یہ تو بہت بری بات ہے۔“

کریم نے وسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لیے ایک بڑا پیگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا۔

”آپ راضی کر لیجئے اسے۔“

نذیر نے ایک ہی جرعے میں گلاس ختم کیا۔ کریم نے آدھا پیگ پیا۔ فوراً ہی اُس کی آواز نشہ آلود ہو گئی۔ ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا۔

”چھوکری پسند ہے نا آپ کو؟“

نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے شکنتلا کی طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کا نام شکنتلا نہ ہوتا بہت ممکن ہے وہ اسے پسند کر لیتا۔ وہ شکنتلا جس پر راجہ دشنیت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا۔ بہت ہی خوبصورت تھی۔ کم از کم کتابوں میں یہی درج تھا کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ آہو چشم تھی۔ نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتلا کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھیں بُری نہیں تھیں۔ آہو چشم تو نہیں تھی، لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں۔ کالی کالی اور بڑی بڑی۔ اس نے اور کچھ سوچا اور کریم سے کہا۔

”ٹھیک ہے یار۔ بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے؟“

کریم نے آدھا پیگ اپنے لیے اور انڈیلا اور کہا۔

”سو روپے“!

نذیر نے سوچنا بند کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے“!

کریم اپنا دوسرا آدھا پیگ پی کر چلا گیا۔ نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ شکنتلا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھایا۔ زبردستی اس کو چوما۔ بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا۔ البتہ وسکی کا نشہ اچھا تھا۔ وہ اب تک چھ پیگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز بالکل بے کار گئی ہے اس لیے کہ شکنتلا بالکل الھڑ تھی۔ اس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔ نذیر ایک اناڑی تیراک کے ساتھ اِدھر اُدھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر اُکتا گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈربے میں مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آواز سن کر دوڑا آیا۔

”کیا بات ہے نذیر صاحب؟“

نذیر نے بڑی ناامیدی سے کہا۔

”کچھ نہیں یار۔ یہ اپنے کام کی نہیں ہے؟“

”کیوں؟“

”کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“

کریم نے شکنتلا کو الگ لے جا کر بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ سمجھ سکی۔ شرمائی، لجائی، دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کریم نے اس پر کہا۔

”میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔“

نذیر نے اس کو روکا۔

”جانے دو۔ کوئی اور لے آؤ۔

”لیکن اس نے فوراً ہی ارادہ بدل لیا۔

”وہ جو تمہیں روپے دیے تھے، اس کی بوتل لے آؤ اور شکنتلا کے سوا جتنی لڑکیاں اس وقت موجود ہیں انھیں یہاں بھیج دو۔ میرا مطلب ہے جو پیتی ہیں۔ آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہو گا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس“!

کریم نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں۔ نذیر نے ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا، کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہو گا۔ چنانچہ اس نے ان لڑکیوں کے لیے گلاس منگوائے اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دیا۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا اور شام کے چھ بجے تک ان لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا۔ بڑی فضول قسم کی باتیں، لیکن نذیر خوش تھا۔ جو کوفت شکنتلا نے پیدا کی تھی۔ دور ہو گئی تھی۔ آدھی بوتل باقی تھی، وہ ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔ پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ اس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے۔ سگرٹ والے کی دکان سے خریدنے کے بجائے اس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں، وہ تیس میں دے دیگا۔ چنانچہ وہ اس کے ہوٹل میں پہنچا۔ اتفاق سے کریم مل گیا۔ اس نے ملتے ہی بہت ہولے سے کہا۔

”نذیر صاحب، شکنتلا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے۔ آج صبح ہی گاڑی سے پہنچی ہے۔ بہت ہٹیلی ہے۔ مگر آپ اس کو ضرور راضی کر لیں گے۔“

نذیر کچھ سوچ نہ سکا۔ اس نے اپنے دل میں اتنا کہا۔

”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“

لیکن اس نے کریم سے کہا۔

”تم پہلے یار وسکی لے آؤ۔“

یہ کہہ کر اس نے تیس روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیے۔ کریم نے نوٹ لیکر نذیر سے کہا۔

”میں لے آتا ہوں۔ آپ اندر کمرے میں بیٹھے۔“

نذیر کے پاس صرف دس روپے تھے، لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھلوا کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وسکی کی بوتل لے کر ایک نظر شکنتلا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا۔ جاتے وقت دو روپے کریم کو دے دے گا۔ تین طرف سے کھلے ہوئے ہوادار کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور اپنی ٹانگیں رکھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی۔ کریم داخل ہوا۔ اس نے نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہولے سے کہا۔

”نذیر صاحب آ رہی ہے۔ لیکن آپ ہی رام کیجیے گا اُسے۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل وصورت قریب قریب شکنتلا سے ملتی تھی۔ تیوڑی چڑھائے، شکنتلا کے سے انداز میں سفید دھوتی پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑی بے پروائی سے اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لیجا کر

”آداب“

کہا اور لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اس سے لڑنے آئی ہے۔ چھ برس پیچھے کے زمانے میں ڈبکی لگا کر وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”آپ شکنتلا کی بہن ہیں۔“

اس نے بڑے تیکھے اور خفگی آمیز لہجے میں کہا۔

”جی ہاں۔“

نذیر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس لڑکی کو جس کی عمر شکنتلا سے غالباً تین برس بڑی تھی۔ بڑے غور سے دیکھا۔ نذیر کی یہ حرکت اس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ بڑے زور سے ٹانگ ہلا کر اس سے مخاطب ہوئی۔

”آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”جناب آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں؟“

وہ برس پڑی۔

”میں ناراض کیوں نہ ہوں۔ یہ آپ کا کریم میری بہن کو جے پور سے اڑا لایا ہے۔ بتایئے آپ میرا خون نہیں کھولے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی؟“

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر اُس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

”شکنتلا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں۔ بہت الھڑ ہے۔ مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ آپ شاید بُرا مانیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی ضروریات کو سمجھتی ہوں۔“

اس نے کچھ نہ کہا۔ نذیر نے اس سے دریافت کیا۔

”آپ کا نام۔“

شکنتلا کی بہن نے مختصراً کہا۔

”شاردا۔“

نذیر نے پھر اس سے پوچھا۔

”آپ کا وطن۔“

”جے پور۔“

اس کا لہجہ بہت تیکھا اور خفگی آلود تھا۔ نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا۔

”دیکھیے آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں، لیکن میرا کوئی قصور نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا

”یہ قصور البتہ میرا ہے۔ اس کی سزا میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔“

لڑکی کے ماتھے پر بیشمار تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اس نے تین چار مرتبہ زمین پر تھوکا۔ غالباً گالیاں دینے والی تھی، لیکن چپ ہو گئی۔ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی۔ نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے۔

”بتایئے، آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں۔“

”وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈربے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ لڑکی اٹھی نذیر نے اسے روکا۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

وہ ایک دم ماں بن گئی۔

”منی رو رہی ہے، دودھ کے لیے۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا۔ اتنے میں کریم وسکی کی بوتل اور سوڈے لیکر آ گیا۔ اس نے نذیر کے لیے چھوٹا ڈالا۔ اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”کچھ باتیں ہوئیں شاردا سے۔

”میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹا لیا ہو گا؟“

نذیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بڑی غصیلی عورت ہے“!

”جی ہاں۔ صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی۔ آپ ذرا اس کو رام کریں۔ شکنتلا خود یہاں آئی تھی۔ اس لیے کہ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے اور اس شاردا کا معاملہ بھی ایسا ہے۔ اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا تھا۔ اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے۔ آپ منا لیجیے نا اس کو؟“

نذیر نے اس سے کہا۔

”منانے کی کیا بات ہے؟“

کریم نے اس کو آنکھ ماری۔

”سالی مجھ سے تو مانتی نہیں۔ جب سے آئی ہے ڈانٹ رہی ہے۔“

اتنے میں شاردا اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی۔ کریم کو اس نے غصے سے دیکھا۔ اس نے آدھا پیگ پیا اور باہر چلا گیا۔ منی کو بہت زکام تھا۔ ناک بہت بری طرح بہہ رہی تھی۔ نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کا نوٹ دیکر کہا۔

”جاؤ، ایک وکس کی بوتل لے آؤ۔“

کریم نے پوچھا۔

”وہ کیا ہوتی ہے؟“

نذیر نے اس سے کہا۔

”زکام کی دوا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک پرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا۔

”کسی بھی اسٹور سے مل جائے گی۔“

”جی اچھا۔“

کہہ کر کریم چلا گیا۔ نذیر منی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ منی خوش شکل نہیں تھی۔ لیکن کم سنی کے باعث نذیر کے لیے دلکش تھی۔ اس نے اس کو گود میں لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی۔ سر میں ہولے ہولے انگلیاں پھیر کر اس کو سلا دیا اور شاردا سے کہا۔

”اس کی ماں تو میں ہوں۔“

شاردا مسکرائی۔

”لائیے، میں اس کو اندر چھوڑ آؤں۔“

شاردا اس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آ گئی۔ اب اس کے چہرے پر غصے کے آثار نہیں تھے۔ نذیر اسکے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے شاردا سے پوچھا۔

”کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں۔“

اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ شاردا نے غصے کا اظہار نہ کیا۔

”جواب دیجیے جناب؟“

شاردا خاموش رہی۔ نذیر نے اٹھ کر ایک پیگ پیا، تو شاردا نے ناک سکوڑ کر اس سے کہا۔

”مجھے اس چیز سے نفرت ہے۔“

نذیر نے ایک پیگ گلاس میں ڈالا۔ اس میں سوڈا حل کر کے اٹھایا اور شاردا کے پاس بیٹھ گیا۔

”آپ کو اس سے نفرت ہے کیوں؟“

شاردا نے مختصر سا جواب دیا۔

”بس ہے۔“

”تو آج سے نہیں رہے گی۔ یہ لیجیے۔“

یہ کہہ کر اس نے گلاس شاردا کی طرف بڑھا دیا۔

”میں ہر گز نہیں پیوں گی۔“

”میں کہتا ہوں، تم ہر گز انکار نہیں کرو گی۔“

شاردا نے گلاس پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر تک اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور ناک انگلیوں سے بند کر کے ساتھ گلاس غٹا غٹ پی گئے۔ قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔ دھوتی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ کے اس نے نذیر سے کہا۔

”یہ پہلی اور آخری بار ہے۔“

”لیکن میں نے کیوں پی؟“

نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا۔

”یہ مت پوچھو۔“

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا۔ کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔ کریم بہت خوش تھا۔ اس نے نذیر سے کہا۔

”آپ نے کمال کر دیا۔ آپ سے سو تو نہیں مانگتا، پچاس دے دیجیے۔“

نذیر شاردا سے بے حد مطمئن تھا۔ اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول چکا تھا۔ وہ اس کے جنسی سوالات کا سو فی صدی صحیح جواب تھی۔ اس نے کریم سے کہا۔

”میں کل ادا کر دوں گا۔ ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا۔ آج میرے پاس وسکی منگانے کے بعد صرف دس روپے باقی تھے۔“

کریم نے کہا۔

”کوئی واندہ نہیں ہے۔ میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملے طے کر لیا۔ حضور، میری جان کھا گئی تھی۔ اب شکنتلا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی“!

کریم چلا گیا۔ شاردا آئی۔ اس کی گود میں منی تھی۔ نذیر نے اُس کو پانچ روپے دیے لیکن شاردا نے انکار کر دیا۔ اس پر نذیر نے اس سے مکرما کر کہا۔

”میں اس کا باپ ہوں۔ تم یہ کیا کر رہی ہو۔“

شاردا نے روپے لے لیے۔ بڑی خاموشی کے ساتھ۔ شروع شروع میں وہ بہت باتونی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہا دے گی۔ مگر اب وہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ نذیر نے اس کی بچی کو گود میں لیکر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا۔

”لو بھئی شاردا، میں چلا۔ کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤنگا۔“

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آ گیا۔ شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کیے۔ ایک بوتل منگوائی اور شاردا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کو پینے کے لیے کہا تو وہ بولی۔

”میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا۔“

نذیر اکیلا پیتا رہا۔ صبح گیارہ بجے سے وہ شام کے ساتھ بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا۔ جب گھر لوٹا تو وہ بے حد مطمئن تھا پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن۔ شاردا اپنی واجبی شکل وصورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی۔ نذیر بار بار سوچتا تھا۔

”یہ کیسی عورت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش، مگر جسمانی طور پر ایسی پُر گو عورت نہیں دیکھی۔“

نذیر نے ہر دوسرے دن شاردا کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اس کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نذیر ساٹھ روپے کریم کو دیتا تھا۔ دس روپے ہوٹل والا لے جاتا تھا۔ باقی پچاس میں سے قریباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن کے وضع کر لیتا تھا مگر شاردا نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ دو مہینے گزر گئے۔ نذیر کے بجٹ نے جواب دے دیا۔ اس کے علاوہ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ شاردا اس کی ازدواجی زندگی میں بہت بُری طرح حائل ہو رہی ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ چاہتا کہ اس کے بجائے شاردا ہو۔ یہ بہت بری تھی۔ نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا اس لیے اس نے کوشش کی کہ شاردا کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا ہی سے کہا

”شاردا میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری جتنی جمع پونجی تھی ختم ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا، حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رخ نہ کروں۔“

شاردا نے یہ سنا تو خاموش ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

”جتنے روپے میرے پاس ہیں آپ لے سکتے ہیں۔ صرف مجھے جے پور کا کرایہ دے دیجیے تا کہ میں شکنتلا کو لے کر واپس چلی جاؤں۔“

نذیر نے اس کا پیار لیا اور کہا۔

”بکواس نہ کرو۔ تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ میرا روپیہ بہت خرچ ہو گیا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ ختم ہو گیا ہے میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا۔“

شاردا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ نذیر نے اُس کو بلایا۔ مگر وہ نہ آئی۔ کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا۔

”آپ یہ روپے لے لیجیے۔ اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجیے۔“

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیے۔ شاردا آئی۔ گود میں منی تھی۔ اُس نے آداب عرض کیا، اور کہا۔

”میں آج شام کو جے پور جا رہی ہوں۔“

نذیر نے پوچھا۔

”کیوں؟“

شاردا نے یہ مختصر جواب دیا۔

”مجھے معلوم نہیں“

اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ نذیر نے کریم سے کہا اسے بلا کر لائے۔ مگر وہ نہ آئی۔ نذیر چلا گیا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے بدن کی حرارت چلی گئی ہے۔ اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔ وہ چلی گئی، واقعی چلی گئی۔ کریم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا۔

”نذیر صاحب آپ نے کیوں اس کو جانے دیا؟“

نذیر نے اس سے کہا۔

”بھائی، میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں۔ ہر دوسرے روز پچاس ایک، دس ہوٹل کے، تیس بوتل، اور اوپر کا خرچ علیحدہ۔ میرا تو دیوالہ پٹ گیا۔ خدا کی قسم مقروض ہو گیا ہوں۔“

یہ سن کر کریم خاموش ہو گیا۔ نذیر نے اس سے کہا

”بھئی میں مجبور تھا، کہاں تک یہ قصہ چلاتا۔“

کریم نے کہا۔

”نذیر صاحب اس کو آپ سے محبت تھی۔“

نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی۔ وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاردا میں جسمانی خلوص ہے۔ وہ اس کے مردانہ سوالات کا بالکل صحیح جواب ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاردا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا، البتہ اس نے مختصر الفاظ میں اس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس کا خاوند عیاش تھا اور اس کو صرف اس لیے چھوڑ گیا تھا کہ دو برس تک اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ اس سے علیحدہ ہوا تو نو مہینے کے بعد منی پیدا ہوئی جو بالکل اپنے باپ ہے۔ شکنتلا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرے۔ کریم نے نذیر کو بتایا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنتلا سے پیشہ کرائے۔ کئی پیسنجر آتے تھے۔ ایک رات کے دو دو سو روپے دینے کے لیے تیار تھے۔ مگر شاردا نہیں مانتی تھی، کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی۔ کریم اس سے کہتا تھا۔

”تم کیا کر رہی ہو۔“

وہ جواب دیتی۔

”اگر تم بیچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔“

شاردا نے نذیر سے ایک بار اس کا فوٹو مانگا تھا۔ جو اس نے گھر سے لا کر اس کو دے دیا تھا۔ یہ وہ اپنے ساتھ جے پور لے گئی تھی۔ اس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب دونوں بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی۔ نذیر اس کو بولنے پر اکساتا مگر وہ کچھ نہ کہتی۔ لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا۔ وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔ وہ چلی گئی، نذیر کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ کیونکہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بُری طرح حائل ہو گئی تھی۔ اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا۔ کچھ دن گزرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔ شاردا کا جسمانی لمس اس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔ ٹھیک پندرہ دن کے بعد جب کہ نذیر گھر میں بیٹھا۔ دفتر کا کام کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے صبح کی ڈاک لا کر اسے دی۔ سارے خط وہی کھولا کرتی تھی۔ ایک خط اس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا۔

”معلوم نہیں گجراتی ہے یا ہندی۔“

نذیر نے خط لیکر دیکھا۔ اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہندی ہے یا گجراتی۔ الگ ٹرے میں رکھ دیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو وہ خط اٹھا کر اسے دیا۔

”ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے۔ تم تو ہندی اور گجراتی پڑھ سکتی ہو۔“

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا۔

”ہندی ہے“

اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا۔

”جے پور۔ پڑھیے نذیر صاحب۔“

اتنا پڑھ کر وہ رک گئی۔ نذیر چونکا۔ نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی۔

”آداب۔ آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے۔ مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں، آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔“

نعیمہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے کاغذ کا دوسرا رخ دیکھا۔

”کوئی شاردا ہے۔“

نذیر اٹھا۔ جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا۔

”خدا معلوم کون ہے۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوا لاؤں گا۔“

اس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ دیا اور چلا گیا۔ ایک دوست کے پاس جا کر اس نے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا۔ پہلے فقرے وہی رکھے۔ مضمون یہ تھا کہ بمبے سنٹرل پر شاردا اس سے ملی تھی۔ اس کو اتنے بڑے مصور سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔ شام کو گھر آیا اس نے نیا خط بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنا دی۔ بیوی نے شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا۔

”عرصہ ہوا ہے میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا۔ شاردا کو یہ دوست جانتا تھا۔ وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہوا۔ مصوری کا اسے بھی شوق تھا۔“

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آ گیا۔ اس کو بھی نذیر نے اسی طریقے سے گول کیا۔ اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے۔ ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس رکھے، صبح آ کر وہ اس سے پوچھ لیا کرے گا۔ تین خط اس نے اس طرح وصول کیے۔ اس کے بعد شاردا اس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی۔ شاردا بہت کم گو تھی، لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔ اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن اس کے خط اظہار سے پُر ہوتے تھے۔ گلے شکوے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں۔ نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے، اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب میں کیا لکھے، اس لیے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا۔ ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنا دیتا تھا اور نذیر کہہ دیتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“

شاردا بمبئی آنے کے لیے بے قرار تھی۔ لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ نذیر اس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے۔ اس نے ہوٹل کا سوچا۔ مگر خیال آیا، ایسا نہ ہو کہ راز فاش ہو جائے، چنانچہ اس نے شاردا کو لکھوا دیا کہ وہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔ اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے سے پہلے عجیب افراتفری مچی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے۔

”میں کچھ دیر وہاں رہونگی اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آ جاؤں گی، ورنہ آپ بھی وہیں چلے آیئے گا۔“

نذیر نے کچھ دیر اسے روکا۔ مگر جب اس کا بھائی لاہور جانے کے لیے تیار ہوا تو وہ اور اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس نے شاردا کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے۔ جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آ رہی ہے۔ اس تار کے مضمون کے مطابق وہ جے پور سے چل پڑی تھی۔ نذیر بہت سٹپٹایا۔ مگر اس کا جسم بہت خوش تھا۔ وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا۔ وہ دن پھر سے مانگتا تھا۔ جب وہ شاردا کے ساتھ چمٹا ہوتا تھا۔ صبح گیارہ بجے سے لیکر شام کے سات بجے تک اب روپے کے خرچ کا سوال ہی نہیں تھا۔ کریم بھی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔

”میں اپنے نوکر کو رازدار بنا لوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائیگا دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کر دیں گے۔ میری بیوی واپس آئی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہے گا۔“

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا۔ فرنٹیر میل آئی مگر شاردا، تلاش کے باوجود اسے نہ ملی۔ اس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رک گئی ہے۔ دوسرا تار بھیجے گی۔ اس سے اگلے روز وہ حسب معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا۔ وہ مہالکشمی اترتا تھا۔ گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے۔ اس نے زور سے پکارا۔

”شاردا“!

شاردا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”نذیر صاحب“!

”تم یہاں یہاں؟“

شاردا نے شکایتاً کہا۔

”آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی۔ پتا چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا۔

”تم یہاں ٹھہرو۔ میں دفتر سے چھٹی لیکر ابھی آتا ہوں۔“

شاردا کو بنچ پر بٹھا کر جلدی جلدی دفتر گیا۔ ایک عرضی لکھ کر وہاں چپڑاسی کو دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں دونوں نے کوئی بات نہ کی، لیکن ان کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے۔ گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا۔

”تم نہالو، میں ناشتے کا بندوبست کراتا ہوں۔“

شاردا نہانے لگی۔ نذیر نے نوکر سے کہا

”کہ اس کے ایک دوست کی بیوی آئی ہے۔ جلدی ناشتہ تیار کر دے۔ اس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی۔ ایک پیگ جو دو کے برابر تھا گلاس میں انڈیلا اور پانی میں ملا کر پی گیا۔ وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔ شاردا نہا دھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی۔ اس نے اِدھر اُدھر کی بے شمار باتیں کیں۔ نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے۔ وہ پہلے بہت کم گو تھی۔ اکثر خاموش رہتی تھی، مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ نذیر نے سوچا۔

”یہ محبت کیا ہے۔ اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی۔ اس کے ذریعے سے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں، مگر اب اس کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سنا رہی ہے۔“

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پیگ تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر، ناک بند کر کے وہ پیگ پی لیا۔ بُرا سا منہ بنایا۔ پانی لے کر کلی کی۔ نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے کیوں پی۔ اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا۔ نوکر کو بہت دور ایک کام پر بھیجا۔ دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔

”تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے۔ لو آ گئے ہیں پھر وہی دن، بلکہ راتیں بھی۔ ان دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں صرف دن ہوتے تھے۔ ہوٹل کے میلے کچیلے دن یہاں ہر چیز اجلی ہے۔ ہر چیز صاف ہے۔ ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں۔ کریم بھی نہیں۔ یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔ شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ زمانہ اس نے کیسے کاٹا۔ وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول باتیں، گلے، شکوے، آہیں۔ راتیں تارے گن گن کر کاٹنا۔ نذیر نے ایک اور پیگ پیا اور سوچا۔

”کون تارے گنتا ہے۔ گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کو۔ بالکل فضول ہے، بے ہودہ بکواس ہے۔“

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا گیا۔ بستر صاف تھا۔ شاردا صاف تھی۔ وہ خود صاف تھا۔ کمرے کی فضا بھی صاف تھی۔ لیکن کیا وجہ تھی، نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔ نذیر نے سوچا۔ شاید اس نے کم پی ہے۔ اٹھ کر اس نے ایک پیگ بنایا اور ایک ہی جرتے میں ختم کر کے شاردا کے ساتھ لیٹ گیا۔ شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔ وہی ہجر و فراق کی باتیں۔ وہی گلے شکوے۔ نذیر اکتا گیا اور اس اکتاہٹ نے اس کے جسم کو کند کر دیا۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بیکار ہو گئی ہے اس کے جسم کے جذبات اب وہ تیز نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ پھر بھی اس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔ فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنی بیوی کے پاس، مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے، اور اس کی بیوی لاہور میں تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا۔ اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے وہ دس روپے کرائے کے دے۔ کریم کو پچاس روپے ادا کرے اور چلا جائے۔ شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا، مگر وہ فضا نہیں تھی۔ وہ سودے بازی نہیں تھی۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں۔ وہ نہیں تھا۔ نذیر اپنے گھر میں تھا۔ اس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اس کے ساتھ سوتی تھی۔ یہ احساس کے تحت الشعور میں تھا، اسی لیے وہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وسکی خراب ہے، کبھی یہ سوچتا تھا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا۔ اور

کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچتا، اتنی دیر کے بعد ملی ہے۔ دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی، وہی پرانی شاردا بن جائے گی۔“

پندرہ دن گزر گئے، مگر نذیر کو شاردا وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی۔ اس کی بچی جے پور میں تھی۔ ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ نذیر اس کے زکام کے لیے، اس کی پھنسیوں کے لیے، اس کے گلے کے لیے دوائیں منگوایا کرتا تھا۔ اب یہ چیز نہیں تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ نذیر اس کو اور اسکی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔ ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری ہوئی چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ گئے تھے اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا تھا، ماں بننا کتنا اچھا ہے۔ اور یہ دودھ۔ مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں۔ کسی کو پالنا۔ اپنے بچے ہی کو سہی کتنی شاندار چیز ہے۔“

اب منی، شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ نامکمل تھی۔ اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں اب ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آبِ حیات۔ نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی۔ شاردا، اب وہ شاردا نہیں تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا وہی شاردا تھی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی۔ یعنی اتنی دیر جدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا۔ وہ روحانی طور پر بھی نذیر کو چاہتی تھی لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شادرا میں اب وہ پہلی سی کشش یا جو کچھ بھی تھا نہیں رہا۔ پندرہ دن لگاتار اس کے ساتھ گزارنے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی۔ اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا۔ صبح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔ بازار سے اون خرید کر اس کے لیے ایک سویٹر بن دیا۔ شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لیے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے۔ برف، تھرموس میں ڈالی ہوتی۔ صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی۔ پانی گرم کرا کے اس کو دیتی۔ وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کر دیتی۔ گھر کی صفائی کراتی۔ خود جھاڑو دیتی۔ نذیر اور بھی زیادہ اکتا گیا۔ رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے۔ مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے، اس لیے اکیلا سونا چاہتا ہے۔ شاردا دوسرے پلنگ پر سونے لگی۔ مگر یہ نذیر کے لیے ایک اور الجھن ہو گئی۔ وہ گہری نیند سوئی ہوتی اور وہ جاگتا رہتا۔ اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ یہ شاردا یہاں کیوں ہے؟۔ کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گزارے تھے، مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چمٹ گئی ہے۔ آخر اس کا انجام کیا ہو گا۔ محبت وغیرہ سب بکواس ہے۔ جو ایک چھوٹی سی بات تھی وہ اب نہیں رہی۔ اس کو واپس جے پور جانا چاہیے۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار کیے تھے، مگر ان کا اسکو احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوں کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا۔ شاردا اب اور بھی زیادہ بے کشش ہو گئی۔ وہ اس سے روکھا برتاؤ کرنے لگا، مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔ پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ جب نذیر نے دن گنے تو اس کو بہت الجھن ہوئی۔

”یہ عورت کیا پورا ایک مہینہ یہاں رہی ہے۔ میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں۔ اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو خط لکھتا ہوں، جیسے بڑا وفادار شوہر ہوں۔ جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے۔ میں کتنا بڑا فراڈ ہوں۔ ادھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں، ادھر شاردا سے۔ میں کیوں اس سے صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھئی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا، شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی؟“

وہ اس کے متعلق سوچتا مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں عجیب افراتفری پھیلی تھی۔ وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا۔ بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا، اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا۔ کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا۔ اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی۔

”میں بہت ذلیل ہوں۔ یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے۔ مجھے اس کی کب ضرورت تھی۔ یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی۔ جب اس نے تار بھیجا تھا۔ لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا۔“

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے۔ وہ اس کو اس بناوٹ سے اپنی بیوی سے جدا کرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی۔ اس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ روکھا ہو گیا۔ اس روکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملائم ہو گئی۔ اس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ لیکن نذیر کو اس کے اس رویے سے بہت الجھن ہوئی۔ وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔ ایک دن اس کی جیب خالی تھی۔ بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا، اس لیے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا۔

”بکواس نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگریٹ میرے سارے ختم ہیں۔“

دفتر کے پاس کی دکان سے اس کو گولڈ فلیک کا ڈبہ ملا۔ یہ سگریٹ اس کو ناپسند تھے مگر ادھار مل گئے تھے۔ اس لیے دو تین مجبوراً پینے پڑے۔ شام کو گھر آیا تو دیکھا۔ تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے۔ خیال کیا کہ خالی ہے۔ پھر سوچا شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں۔ کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ شاردا سے پوچھا۔

”یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟“

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اندر الماری میں پڑا تھا۔“

نذیر نے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا، شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا۔ نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر وہی جواب دیا۔ اندر الماری میں پڑا تھا۔“

نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا۔

”شاردا، تم بکواس کرتی ہو۔ تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں۔ میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لیے ہر روز سگریٹ خریدا کرو۔“

شاردا نے بڑے پیار سے کہا۔

”آپ بھول جاتے ہیں، اسی لیے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔“

نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصے سے کہا۔

”میرا دماغ خراب ہے۔ لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں۔“

شاردا کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا۔

”میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“

نذیر نے ایک لحظے کے لیے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں۔ اسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہیے اس لیے کہ وہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر فوراً ہی اس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غداری کر رہا تھا، چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”بکواس نہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں۔ کل صبح تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے دے دوں گا۔“

لیکن یہ کہہ کر نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا کمینہ اور رذیل ہے۔ شاردا نے کچھ نہ کہا۔

”رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی۔ ساری رات اس سے پیار کرتی رہی۔ نذیر کو اس سے الجھن ہوتی رہی مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا۔ صبح اٹھا تو ناشتے پر بے شمار لذیذ چیزیں تھی۔ پھر بھی اس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی۔ فارغ ہو کر وہ سیدھا بنک گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا۔ میں بنک جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آتا ہوں۔“

بنک کی وہ شاخ جس میں نذیر کا روپیہ جمع تھا بالکل نزدیک تھا۔ وہ دو سو روپے نکلوا کر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سب روپیہ شاردا کے حوالے کر دے گا اور اس کو ٹکٹ وغیرہ لے کر رخصت کر دے گا۔ مگر وہ جب گھر پہنچا تو اس کے نوکر نے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے۔ اس نے پوچھا۔

”کہاں؟“

نوکر نے بتایا۔

”جی مجھ سے انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ اپنا ٹرنک اور بستر ساتھ لے گئی ہیں“!

نذیر اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ تپائی پر اس کے پسندیدہ سگرٹوں کا ڈبہ پڑا ہے۔ بھرا ہوا“!

31جولائی1950ء

شانتی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشانتی

دونوں پیرے ژین ڈیری کے باہر بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چائے بہت گرم تھی۔ اس لیے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے موٹی بھوروں والی یہودن کی جانی پہچانی صورت تھی۔ یہ بڑا گول مٹول چہرہ، تیکھی ناک۔ موٹے موٹے بہت ہی زیادہ سرخی لگے ہونٹ۔ شام کو ہمیشہ درمیان والے دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ مقبول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلراج سے کہا۔

”بیٹھی ہے جال پھینکنے۔“

بلراج موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

”پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی مچھلی۔“

مقبول نے ایک پیسٹری منہ میں ڈالی۔

”یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے۔ کوئی دکان کھول کر بیٹھتی ہے۔ کوئی چل پھر کے سودا بیچتی ہے۔ کوئی اس طرح ریستورانوں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔ جسم بیچنا بھی ایک آرٹ ہے، اور میرا خیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے۔ یہ موٹی بھوؤں والی کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہو گی کہ وہ بکاؤ ہے۔“

بلراج مسکرایا۔

”کسی روز وقت نکالو کہ کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ نگاہوں ہی نگاہوں میں کیوں کر سودے ہوتے ہیں اس جنس کا بھاؤ کیسے چُکتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک مقبول کا ہاتھ پکڑا۔

”اُدھر دیکھو، اُدھر۔“

مقبول نے موٹی یہودن کی طرف دیکھا۔ بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا۔

”نہیں یار۔ اُدھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو۔“

مقبول نے ادھر دیکھا۔ ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا۔ ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ مقبول نے بلراج سے پوچھا۔

”کون ہے یہ لڑکی؟“

بلراج نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”اماں وہی ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب وغریب ہے۔“

مقبول نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔

”کون سی یار تم، تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو عجیب وغریب ہی ہوتی ہے۔“

بلراج مسکرایا۔

”یہ بڑی خاص الخاص ہے۔ ذرا غور سے دیکھو۔“

مقبول نے غور سے دیکھا۔ بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا۔ ہلکے بسنتی رنگ کی ساڑھی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاؤز۔ پتلی پتلی بہت ہی گوری بانھیں۔ لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی۔

”میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب وغریب لڑکی کو سرخی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ اب اور غور سے دیکھا ہے تو ساڑھی کی پہناوٹ میں بھی خامیاں نظر آئی ہیں۔ بال سنوارنے کا انداز بھی ستھرا نہیں۔“

بلراج ہنسا۔

”تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو۔ اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں پڑتی۔“

مقبول نے کہا۔

”جو اچھائیاں ہیں وہ اب بیان فرما دیجیے، لیکن پہلے یہ بتا دیجیے کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا۔“

لڑکی نے جب بلراج کو دیکھا تو مسکرائی۔ مقبول رک گیا۔

”مجھے جواب مل گیا۔ اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجیے۔“

سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ جو اس نے اپنے لیے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل کرتی ہے۔ پرسنل ہائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ محبت وحبت کی بالکل قائل نہیں۔ اس معاملے میں دل اس کا برف ہے۔“

بلراج نے چاہیے کا آخری گھونٹ پیا

”کہیے کیا خیال ہے؟“

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا۔

”جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہئیں۔ جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی۔ خود فریبی ہیں اگر یہ لڑکی کسی مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔“

”یہی میں نے سوچا تھا۔ میں تم سے کیا بیان کروں، روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے۔ اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں۔ ایک گھنٹہ ہو گیا۔ تم نے کھلی کوئی کام کی بات نہیں کی۔ میں چلی، اور یہ جا وہ جا۔ تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ ساڑھی کو ہاتھ مت لگاؤ میلی ہو جائے گی“

یہ کہہ کر بلراج نے سگریٹ سلگایا۔

”عجیب و غریب لڑکی ہے۔ پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں بائی گوڈ چکرا گیا۔ چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔ ففٹی سے ایک پیسہ کم نہیں ہو گا۔ جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں۔“

مقبول نے پوچھا۔

”نام کیا ہے اس کا۔“

”شانتی بتایا اس نے۔ کشمیرن ہے“

مقبول کشمیری تھا۔ چونک پڑا

”کشمیرن“!

”تمہاری ہم وطن۔“

مقبول نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ناک نقشہ صاف کشمیریوں کا تھا۔

”یہاں کیسے آئی؟“

”معلوم نہیں“!

”کوئی رشتے دار ہے اس کا؟“

مقبول لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔

”وہاں کشمیر میں کوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ یہاں بمبئی میں اکیلی رہتی ہے۔“

بلراج نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا

”ہاربنی روڈ پر ایک ہوٹل ہے، وہاں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ یہ مجھے ایک روز اتفاقاً معلوم ہو گیا ورنہ یہ اپنے ٹھکانے کا پتا کسی کو نہیں دیتی۔ جس کو ملنا ہوتا ہے یہاں پیرے ژین ڈیری میں چلا آتا ہے۔ شام کو پورے پانچ بجے آتی ہے یہاں“!

مقبول کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بیرے کو اشارے سے بلایا اور اس سے بل لانے کے لیے کہا۔ اس دوران میں ایک خوش پوش نوجوان آیا اور اس لڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ مبقول بلراج سے مخاطب ہوا۔

”اس سے کبھی ملاقات کرنی چاہیے۔“

بلراج مسکرایا۔

”ضرور ضرور۔ لیکن اس وقت نہیں۔ مصروف ہے۔ کبھی آ جانا یہاں شام کو۔ اور ساتھ بیٹھ جانا۔“

مقبول نے بل ادا کیا۔ دونوں دوست اٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے روز مقبول اکیلا آیا اور چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک پانچ بجے وہ لڑکی بس سے اتری اور پرس ہاتھ میں لٹکائے مقبول کے پاس سے گزری۔ چال بھدی تھی۔ جب وہ کچھ دور، کرسی پر بیٹھ گئی تو مقبول نے سوچا۔

”اس میں جنسی کشش تو نام کو بھی نہیں۔ حیرت ہے کہ اس کا کاروبار کیونکر چلتا ہے۔ لپ اسٹک کیسے بے ہودہ طریقے سے استعمال کی ہے اس نے۔ ساڑھی کی پہناوٹ آج بھی خامیوں سے بھری ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیسے ملے۔ اس کی چائے میز پر آ چکی تھی ورنہ اٹھ کر وہ اس لڑکی کے پاس جا بیٹھتا۔ اس نے چائے پینا شروع کر دی۔ اس دوران میں اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا۔ لڑکی نے دیکھا کچھ توقف کے بعد اٹھی اور مقبول کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مقبول پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن فوراً ہی سنبھل کر لڑکی سے مخاطب ہوا۔

”چائے شوق فرمائیں گی آپ۔“

"نہیں۔"

اس کے جوابوں کے اس اختصار میں روکھا پن تھا۔ مبقول نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"کشمیریوں کو تو چائے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔"

لڑکی نے بڑے بے ہنگم انداز میں پوچھا۔

"تم چلنا چاہتے ہو میرے ساتھ۔"

مقبول کو جیسے کسی نے اوندھے منہ گرا دیا۔ گھبراہٹ میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔

"ہا۔"

لڑکی نے کہا۔

"ففٹی روپیز۔ یس اور نو؟"

یہ دوسرا ریلا تھا مگر مبقول نے اپنے قدم جما لیے

"چلیے"!

مقبول نے چائے کا بل ادا کیا۔ دونو اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی۔ لڑکی بھی خاموش رہی۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے مقبول سے پوچھا۔

"کہاں جائے گا تم؟"

مقبول نے جواب دیا۔

"جہاں تم لے جاؤ گی۔"

"ہم کچھ نہیں جانتا۔ تم بولو کدھر جائے گا؟"

مقبول کو کوئی اور جواب نہ سوجھا تو کہا۔

"ہم کچھ نہیں جانتا"!

لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"تم کیسا آدمی ہے۔ خلی پیلی جوک کرتا ہے۔"

مقبول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا

"میں مذاق نہیں کرتا۔ مجھے تم سے صرف باتیں کرنی ہیں۔"

وہ بگڑ کر بولی

"کیا۔ تم تو بولا تھا ففٹی روپیز یس"!

مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ لو گھبراتی کیوں ہو۔"

اس نے نوٹ لے لیے۔

"تم جائے گا کہاں۔"

مقبول نے کہا۔

"تمہارے گھر۔"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں۔"

"تم کو بولا ہے نہیں۔ ادھر ایسی بات نہیں ہو گی۔"

مقبول مسکرایا۔

”ٹھیک ہے۔ ایسی بات ادھر نہیں ہو گی۔“

وہ کچھ متحیر سی ہوئی۔

”تم کیسا آدمی ہے۔“

”جیسا میں ہوں۔ تم نے بولا ففٹی روپیز یس کہ نو۔ میں نے کہا یس اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیے۔ تم نے بولا اُدھر ایسی بات نہیں ہو گی۔ میں نے کہا بالکل نہیں ہو گی۔ اب اور کیا کہتی ہو۔“

لڑکی سوچنے لگی۔ مقبول مسکرایا۔

”دیکھو شانتی، بات یہ ہے۔ کل تم کو دیکھا۔ ایک دوست نے تمہاری کچھ باتیں سنائیں جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں۔ آج میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ اب تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر تم سے باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔ کیا تمہیں یہ منظور نہیں۔“

”نہیں۔ یہ لو اپنے ففٹی روپیز۔“

لڑکی کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔

”تمہیں بس ففٹی روپیز کی پڑی ہے۔ روپے کے علاوہ بھی دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔ چلو، ڈرائیور کو اپنا اڈریس بتاؤ۔ میں شریف آدمی ہوں۔ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرونگا۔“

مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی۔ لڑکی متاثر ہوئی۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔

”چلو۔ ڈرائیور، ہاربنی روڈ“!

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیے۔

”یہ میں نہیں لوں گی۔“

مقبول نے اصرار نہ کیا۔

”تمہاری مرضی“!

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رکی۔ پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے تھے۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لیے مخصوص تھی۔ بڑی تنگ و تار جگہ تھی۔ چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بہت مختصر سامان تھا۔ لوہے کا ایک پلنگ جس پر اجلی چادر بچھی تھی۔ کونے میں ڈرسنگ ٹیبل۔ ایک اسٹول، اس پر ٹیبل فین۔ چار ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔ مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دونوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے۔ مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے اسے روکا۔

”نہیں۔ ادھر بیٹھنے کا اجازت نہیں۔ ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ کرسی پر بیٹھو یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔ شانتی نے اپنا پرس تکیے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا۔

”بولو۔ کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟“

مقبول نے شانتی کی طرف غور سے دیکھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانی بالکل نہیں آتی۔“

شانتی نے برا نہ مانا۔ صرف اتنا کہا۔

”مجھے مالوم ہے۔“

”اٹھو۔ مجھے لپ اسٹک دو میں تمہیں سکھاتا ہوں“

یہ کہہ کر مقبول نے اپنا رومال نکالا۔ شانتی نے اس سے کہا۔

”ڈرسنگ ٹیبل پر پڑا ہے، اٹھالو۔“

مقبول نے لپ اسٹک اٹھائی۔ اسے کھول کر دیکھا۔

”ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پونچھوں۔“

”تمہارے رومال سے نہیں۔ میرا لو۔“

یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کھولا اور ایک دھلا ہوا رومال مقبول کو دیا۔ مقبول نے اس کے ہونٹ پونچھے۔ بڑی نفاست سے نئی سرخی ان پر لگائی۔ پھر کنگھی سے اس کے بال ٹھیک کیے اور کہا۔

”لو اب آئینہ دیکھو۔“

شانتی اٹھ کر ڈرسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معائنہ کیا۔ پسندیدہ نظروں سے تبدیلی محسوس کی اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا۔

”اب ٹھیک ہے“

پھر پلنگ پر بیٹھ کر پوچھا۔

”تمہارا کوئی بیوی ہے؟“

مقبول نے جواب دیا۔

”نہیں۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ مقبول چاہتا تھا باتیں ہوں چنانچہ اس نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

”اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ تم کشمیر کی رہنے والی ہو۔ تمہارا نام شانتی ہے۔ یہاں رہتی ہو۔ یہ بتاؤ تم نے ففٹی روپیز کا معاملہ کیوں شروع کیا؟“

شانتی نے یہ بے تکلف جواب دیا۔

”میرا فادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے۔ میں وہاں ہوسپیٹل میں نرس تھا۔ ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا۔ میں بھاگ کر ادھر کو آ گئی۔ یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیز دیا۔ بولا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم گیا۔ بس کام چالو ہو گیا۔ ہم یہاں ہوٹل میں آ گیا۔ پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی۔ سب رنڈی لوگ ہے۔ کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔“

مقبول نے کرید کرید کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتا چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب اس کا ذکر آیا تو اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

”آئی ڈونٹ لائک۔ یِٹ از بیڈ۔“

اس کے نزدیک ففٹی روپیز کا معاملہ ایک کاروباری معاملہ تھا۔ سرینگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے۔ شانتی کو بہت غصہ آیا۔ نوٹ پھاڑ دیا۔ اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا۔ پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی۔ اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لیے بڑی محتاط رہتی تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا اسے بمبئی میں آئے ہوئے۔ اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچائے ہوتے مگر اس کو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی۔ پچھلی ریسوں پر اس کے پانچ ہزار اڑ گئے لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی۔

”ہم اپنا لوس پورا کر لے گا۔“

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سو روپے روزانہ کما لیتی تھی جو فوراً بنک میں جمع کرا دیے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ وہ نہیں کمانا چاہتی تھی۔ اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔ دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے پانی گھڑی دیکھی اور مقبول سے کہا۔

”تم اب جاؤ۔ ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا۔“

مقبول اٹھ کر جانے لگا تو اس نے کہا۔

”باتیں کرنے آؤ تو صبح کے ٹائم آؤ۔ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتی ہے۔“

مقبول نے

”اچھا“

کہا اور چل دیا۔ دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب مقبول شانتی کے پاس پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کرے گی مگر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی۔ مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران میں شانتی کو صحیح طریقے پر ساڑھی پہننی سکھائی۔ لڑکی ذہین تھی۔ جلدی سیکھ گئی۔ کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے۔ یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے۔ اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا۔ شباب بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی، ایک ایسے مقام پر ٹھہر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا۔

وہ خوبصورت تھی نہ بدصورت، عورت تھی نہ لڑکی۔ وہ پھول تھی نہ کلی۔ شاخ تھی نہ تنا۔ اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں اس نے غلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔ شانتی کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لیے مقبول نے اس سے ہر دوسرے تیسرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارت نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا جب شانتی نے اس سے کہا۔

”تم کوئی لڑکی مانگتا؟“

مقبول لیٹا ہوا تھا چونک کر اٹھا۔

”کیا کہا؟“

شانتی نے کہا۔

”ہم پوچھتی، تم کوئی لڑکی مانگتا تو ہم لا کر دیتا۔“

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا۔ کیوں اس نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے بتایا کہ مقبول اسے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے۔ اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جبکہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے۔ مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں مقبول کو عورت کی ضرورت ہے، کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔ مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ایک دم وہ اٹھی اور چلانے لگی

”ہم کچھ بھی نہیں ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم۔ جاؤ۔“

مقبول نے کچھ نہ کہا۔

”خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا۔“

متواتر ایک ہفتہ دوپیرے ژین ڈیری جاتا رہا۔ مگر شانتی دکھائی نہ دی۔ آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی۔ مقبول کرسی پر بیٹھ گیا۔ شانتی کے ہونٹوں پر سرخی پرانے بھدے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی پرانا تھا۔ ساڑھی کی پہناوٹ تو اور زیادہ بدزیب تھی۔ مقبول اس سے مخاطب ہوا۔

”مجھ سے ناراض ہو تم؟“

شانتی نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول نے تند لہجے میں پوچھا۔

”بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟“

شانتی خاموش رہی۔ مقبول نے غصے میں کہا۔

”جواب دو ورنہ یاد رکھو ماروں گا۔“

شانتی نے صرف اتنا کہا۔

”مارو۔“

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا۔ شانتی بلبلا اٹھی۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا۔ غصے میں اس کے ہونٹوں کی بھدی سرخی پونچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا۔ لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی۔ کنگھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”ساڑھی ٹھیک کرو اپنی۔“

شانتی اٹھی اور ساڑھی ٹھیک کرنے لگی مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا۔ مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا۔ جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا۔

”شانتی اٹھو۔ میں جا رہا ہوں۔“

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور چلائی۔

”نہیں نہیں۔ تم نہیں جا سکتے۔“

اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان میں کھڑی ہو گئی۔

”تم گیا تو مار ڈالوں گی۔“

وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گہری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے شانتی نے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیوڑھا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے آنسو بند ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔ مقبول نے اس کو پیار کیا۔ رونا بند کرنے کے لیے کہا تو وہ آنسوؤں میں اٹک اٹک کر بولی

”ادھر سرینگر میں۔ ایک آدمی نے۔ ہم کو مار دیا تھا۔ ادھر ایک آدمی نے۔ ہم کو زندہ کر دیا۔“

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کہا۔

”یہ لو اپنے ففٹی روپیز“!

شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھینک دیے۔ پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈرسنگ ٹیبل کا ایک دروازہ کھولا اور مقبول سے کہا۔

”ادھر آؤ۔ دیکھو یہ کیا ہے؟“

مقبول نے دیکھا۔ دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ مٹی بھر کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھالے۔

”ہم اب یہ نہیں مانگتا“!

مقبول مسکرایا۔ ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر چھوٹی سی چپت لگائی اور پوچھا:

”اب تم کیا مانگتا ہے“!

شانتی نے جواب دیا۔

”تم کو“

یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چمٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

”روؤ نہیں۔ تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے۔“

شانتی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشانتی

دونوں پیرے ژین ڈیری کے باہر بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چائے بہت گرم تھی۔ اس لیے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے موٹی بھوروں والی یہودن کی جانی پہچانی صورت تھی۔ یہ بڑا گول مٹول چہرہ، تیکھی ناک۔ موٹے موٹے بہت ہی زیادہ سرخی لگے ہونٹ۔ شام کو ہمیش درمیان والے دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ مقبول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلراج سے کہا۔

”بیٹھی ہے جال پھینکنے۔“

بلراج موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

”پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی مچھلی۔“

مقبول نے ایک پیسٹری منہ میں ڈالی۔

”یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے۔ کوئی دکان کھول کر بیٹھتی ہے۔ کوئی چل پھر کے سودا بیچتی ہے۔ کوئی اس طرح ریستورانوں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔ جسم بیچنا بھی ایک آرٹ ہے، اور میرا خیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے۔ یہ موٹی بھوؤں والی کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہو گی کہ وہ بکاؤ ہے۔“

بلراج مسکرایا۔

”کسی روز وقت نکالو کہ کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ نگاہوں ہی نگاہوں میں کیوں کر سودے ہوتے ہیں اس جنس کا بھاؤ کیسے چُکتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک مقبول کا ہاتھ پکڑا۔

”اُدھر دیکھو، اُدھر۔“

مقبول نے موٹی یہودن کی طرف دیکھا۔ بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا۔

”نہیں یار۔ اُدھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو۔“

مقبول نے ادھر دیکھا۔ ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا۔ ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ مقبول نے بلراج سے پوچھا۔

”کون ہے یہ لڑکی؟“

بلراج نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”اماں وہی ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب و غریب ہے۔“

مقبول نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔

”کون سی یار تم، تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو عجیب و غریب ہی ہوتی ہے۔“

بلراج مسکرایا۔

”یہ بڑی خاص الخاص ہے۔ ذرا غور سے دیکھو۔“

مقبول نے غور سے دیکھا۔ بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا۔ ہلکے بسنتی رنگ کی ساڑھی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاؤز۔ پتلی پتلی بہت ہی گوری بانھیں۔ لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی۔

”میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب و غریب لڑکی کو سرخی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ اب اور غور سے دیکھا ہے تو ساڑھی کی پہناوٹ میں بھی خامیاں نظر آئی ہیں۔ بال سنوارنے کا انداز بھی ستھرا نہیں۔“

بلراج ہنسا۔

”تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو۔ اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں پڑتی۔“

مقبول نے کہا۔

”جو اچھائیاں ہیں وہ اب بیان فرما دیجیے، لیکن پہلے یہ بتا دیجیے کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا۔“

لڑکی نے جب بلراج کو دیکھا تو مسکرائی۔ مقبول رک گیا۔

”مجھے جواب مل گیا۔ اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجیے۔“

سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ جو اس نے اپنے لیے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل کرتی ہے۔ پرسنل ہائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ محبت وحبت کی بالکل قائل نہیں۔ اس معاملے میں دل اس کا برف ہے۔“

بلراج نے چاہیے کا آخری گھونٹ پیا

”کہیے کیا خیال ہے؟“

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا۔

”جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہئیں۔ جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی۔ خود فریبی ہیں اگر یہ لڑکی کسی مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔“

”یہی میں نے سوچا تھا۔ میں تم سے کیا بیان کروں، روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے۔ اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں۔ ایک گھنٹہ ہو گیا۔ تم نے کھلی کوئی کام کی بات نہیں کی۔ میں چلی، اور یہ جا وہ جا۔ تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ ساڑھی کو ہاتھ مت لگاؤ میلی ہو جائے گی“

یہ کہہ کر بلراج نے سگریٹ سلگایا۔

”عجیب و غریب لڑکی ہے۔ پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں بائی گوڈ چکرا گیا۔ چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔ ففٹی سے ایک پیسہ کم نہیں ہو گا۔ جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں۔“

مقبول نے پوچھا۔

”نام کیا ہے اس کا۔“

”شانتی بتایا اس نے۔ کشمیرن ہے“

مقبول کشمیری تھا۔ چونک پڑا

”کشمیرن“!

”تمہاری ہم وطن۔“

مقبول نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ناک نقشہ صاف کشمیریوں کا تھا۔

”یہاں کیسے آئی؟“

”معلوم نہیں“!

”کوئی رشتے دار ہے اس کا؟“

مقبول لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔

”وہاں کشمیر میں کوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ یہاں بمبئی میں اکیلی رہتی ہے۔“

بلراج نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا

”ہاربنی روڈ پر ایک ہوٹل ہے، وہاں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ یہ مجھے ایک روز اتفاقاً معلوم ہو گیا ورنہ یہ اپنے ٹھکانے کا پتا کسی کو نہیں دیتی۔ جس کو ملنا ہوتا ہے یہاں پیرے ژین ڈیری میں چلا آتا ہے۔ شام کو پورے پانچ بجے آتی ہے یہاں“!

مقبول کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بیرے کو اشارے سے بلایا اور اس سے بل لانے کے لیے کہا۔ اس دوران میں ایک خوش پوش نوجوان آیا اور اس لڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ مبقول بلراج سے مخاطب ہوا۔

”اس سے کبھی ملاقات کرنی چاہیے۔“

بلراج مسکرایا۔

”ضرور ضرور۔ لیکن اس وقت نہیں۔ مصروف ہے۔ کبھی آجانا یہاں شام کو۔ اور ساتھ بیٹھ جانا۔“

مقبول نے بل ادا کیا۔ دونوں دوست اٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے روز مقبول اکیلا آیا اور چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک پانچ بجے وہ لڑکی بس سے اتری اور پرس ہاتھ میں لٹکائے مقبول کے پاس سے گزری۔ چال بھدی تھی۔ جب وہ کچھ دور، کرسی پر بیٹھ گئی تو مقبول نے سوچا۔

”اس میں جنسی کشش تو نام کو بھی نہیں۔ حیرت ہے کہ اس کا کاروبار کیونکر چلتا ہے۔ لپ اسٹک کیسے بے ہودہ طریقے سے استعمال کی ہے اس نے۔ ساڑھی کی پہناوٹ آج بھی خامیوں سے بھری ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیسے ملے۔ اس کی چائے میز پر آچکی تھی ورنہ اٹھ کر وہ اس لڑکی کے پاس جا بیٹھتا۔ اس نے چائے پینا شروع کر دی۔ اس دوران میں اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا۔ لڑکی نے دیکھا کچھ توقف کے بعد اٹھی اور مقبول کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مقبول پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن فوراً ہی سنبھل کر لڑکی سے مخاطب ہوا۔

”چائے شوق فرمائیں گی آپ۔“

”نہیں۔“

اس کے جوابوں کے اس اختصار میں روکھا پن تھا۔ مبقول نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”کشمیریوں کو تو چائے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔“

لڑکی نے بڑے بے ہنگم انداز میں پوچھا۔

”تم چلنا چاہتے ہو میرے ساتھ۔“

مقبول کو جیسے کسی نے اوندھے منہ گرا دیا۔ گھبراہٹ میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔

”ہاں۔“

لڑکی نے کہا۔

”ففٹی روپیز۔ یس اور نو؟“

یہ دوسرا ریلا تھا مگر مقبول نے اپنے قدم جما لیے

”چلیے“!

مقبول نے چائے کا بل ادا کیا۔ دونو اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی۔ لڑکی بھی خاموش رہی۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے مقبول سے پوچھا۔

”کہاں جائے گا تم؟“

مقبول نے جواب دیا۔

”جہاں تم لے جاؤ گی۔“

”ہم کچھ نہیں جانتا۔ تم بولو کدھر جائے گا؟“

مقبول کو کوئی اور جواب نہ سوجھا تو کہا۔

”ہم کچھ نہیں جانتا“!

لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”تم کیسا آدمی ہے۔ خلی پیلی جوک کرتا ہے۔“

مقبول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا

”میں مذاق نہیں کرتا۔ مجھے تم سے صرف باتیں کرنی ہیں۔“

وہ بگڑ کر بولی

”کیا۔ تم تو بولا تھا ففٹی روپیز یس“!

مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

”یہ لو گھبراتی کیوں ہو۔“

اس نے نوٹ لے لیے۔

”تم جائے گا کہاں۔“

مقبول نے کہا۔

”تمہارے گھر۔“

”نہیں۔“

”کیوں نہیں۔“

”تم کو بولا ہے نہیں۔ ادھر ایسی بات نہیں ہو گی۔“

مقبول مسکرایا۔

”ٹھیک ہے۔ ایسی بات ادھر نہیں ہو گی۔“

وہ کچھ متحیر سی ہوئی۔

”تم کیسا آدمی ہے۔“

”جیسا میں ہوں۔ تم نے بولا ففٹی روپیز یس کہ نو۔ میں نے کہا یس اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیے۔ تم نے بولا اُدھر ایسی بات نہیں ہو گی۔ میں نے کہا بالکل نہیں ہو گی۔ اب اور کیا کہتی ہو۔“

لڑکی سوچنے لگی۔ مقبول مسکرایا۔

”دیکھو شانتی، بات یہ ہے۔ کل تم کو دیکھا۔ ایک دوست نے تمہاری کچھ باتیں سنائیں جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں۔ آج میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ اب تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر تم سے باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔ کیا تمہیں یہ منظور نہیں۔“

”نہیں۔ یہ لو اپنے ففٹی روپیز۔“

لڑکی کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔

”تمہیں بس ففٹی روپیز کی پڑی ہے۔ روپے کے علاوہ بھی دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔ چلو، ڈرائیور کو اپنا اڈریس بتاؤ۔ میں شریف آدمی ہوں۔ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرونگا۔“

مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی۔ لڑکی متاثر ہوئی۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔

”چلو۔ ڈرائیور، ہاربنی روڈ“!

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیے۔

”یہ میں نہیں لوں گی۔“

مقبول نے اصرار نہ کیا۔

”تمہاری مرضی“!

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رکی۔ پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے تھے۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لیے مخصوص تھی۔ بڑی تنگ و تار جگہ تھی۔ چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بہت مختصر سامان تھا۔ لوہے کا ایک پلنگ جس پر اجلی چادر بچھی تھی۔ کونے میں ڈرسنگ ٹیبل۔ ایک اسٹول، اس پر ٹیبل فین۔ چار ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔ مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دونوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے۔ مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے اسے روکا۔

”نہیں۔ ادھر بیٹھنے کا اجازت نہیں۔ ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ کرسی پر بیٹھو یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔ شانتی نے اپنا پرس تکیے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا۔

”بولو۔ کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟“

مقبول نے شانتی کی طرف غور سے دیکھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانی بالکل نہیں آتی۔“

شانتی نے برا نہ مانا۔ صرف اتنا کہا۔

”مجھے مالوم ہے۔“

”اٹھو۔ مجھے لپ اسٹک دو میں تمہیں سکھاتا ہوں“

یہ کہہ کر مقبول نے اپنا رومال نکالا۔ شانتی نے اس سے کہا۔

”ڈرسنگ ٹیبل پر پڑا ہے، اٹھالو۔“

مقبول نے لپ اسٹک اٹھائی۔ اسے کھول کر دیکھا۔

”ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پونچھوں۔“

”تمہارے رومال سے نہیں۔ میرا لو۔“

یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کھولا اور ایک دھلا ہوا رومال مقبول کو دیا۔ مقبول نے اس کے ہونٹ پونچھے۔ بڑی نفاست سے نئی سرخی ان پر لگائی۔ پھر کنگھی سے اس کے بال ٹھیک کیے اور کہا۔

”لو اب آئینہ دیکھو۔“

شانتی اٹھ کر ڈرسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معائنہ کیا۔ پسندیدہ نظروں سے تبدیلی محسوس کی اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا۔

”اب ٹھیک ہے“

پھر پلنگ پر بیٹھ کر پوچھا۔

”تمہارا کوئی بیوی ہے؟“

مقبول نے جواب دیا۔

”نہیں۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ مقبول چاہتا تھا باتیں ہوں چنانچہ اس نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

”اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ تم کشمیر کی رہنے والی ہو۔ تمہارا نام شانتی ہے۔ یہاں رہتی ہو۔ یہ بتاؤ تم نے ففٹی روپیز کا معاملہ کیوں شروع کیا؟“

شانتی نے یہ بے تکلف جواب دیا۔

”میرا فادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے۔ میں وہاں ہوسپیٹل میں نرس تھا۔ ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا۔ میں بھاگ کر ادھر کو آگئی۔ یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیز دیا۔ بولا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم گیا۔ بس کام چالو ہو گیا۔ ہم یہاں ہوٹل میں آگیا۔ پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی۔ سب رنڈی لوگ ہے۔ کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔“

مقبول نے کرید کرید کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتا چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب اس کا ذکر آیا تو اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

”آئی ڈونٹ لائک۔ یِٹ از بیڈ۔“

اس کے نزدیک ففٹی روپیز کا معاملہ ایک کاروباری معاملہ تھا۔ سرینگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے۔ شانتی کو بہت غصہ آیا۔ نوٹ پھاڑ دیا۔ اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا۔ پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی۔ اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لیے بڑی محتاط رہتی تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا اسے بمبئی میں آئے ہوئے۔ اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچائے ہوتے مگر اس کو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی۔ پچھلی ریسوں پر اس کے پانچ ہزار اڑ گئے لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی۔

”ہم اپنا لوس پورا کر لے گا۔“

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سو روپے روزانہ کما لیتی تھی جو فوراً بنک میں جمع کرا دیے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ وہ نہیں کمانا چاہتی تھی۔ اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔ دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے پانی گھڑی دیکھی اور مقبول سے کہا۔

”تم اب جاؤ۔ ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا۔“

مقبول اٹھ کر جانے لگا تو اس نے کہا۔

”باتیں کرنے آؤ تو صبح کے ٹائم آؤ۔ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتی ہے۔“

مقبول نے

”اچھا“

کہا اور چل دیا۔ دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب مقبول شانتی کے پاس پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کرے گی مگر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی۔ مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران میں شانتی کو صحیح طریقے پر ساڑھی پہننی سکھائی۔ لڑکی ذہین تھی۔ جلدی سیکھ گئی۔ کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے۔ یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے۔ اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا۔ شباب بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی، ایک ایسے مقام پر ٹھہر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا۔ وہ خوبصورت تھی نہ بدصورت، عورت تھی نہ لڑکی۔ وہ پھول تھی نہ کلی۔ شاخ تھی نہ تنا۔ اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں اس نے غلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔ شانتی کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لیے مقبول نے اس سے ہر دوسرے تیسرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارت نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا جب شانتی نے اس سے کہا۔

”تم کوئی لڑکی مانگتا؟“

مقبول لیٹا ہوا تھا چونک کر اٹھا۔

”کیا کہا؟“

شانتی نے کہا۔

”ہم پوچھتی، تم کوئی لڑکی مانگتا تو ہم لا کر دیتا۔“

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا۔ کیوں اس نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے بتایا کہ مقبول اسے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے۔ اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جبکہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے۔ مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں مقبول کو عورت کی ضرورت ہے، کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔ مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ایک دم وہ اٹھی اور چلانے لگی

”ہم کچھ بھی نہیں ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم۔ جاؤ۔“

مقبول نے کچھ نہ کہا۔

”خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا۔“

متواتر ایک ہفتہ دوپہرے ڑین ڈیری جاتا رہا۔ مگر شانتی دکھائی نہ دی۔ آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی۔ مقبول کرسی پر بیٹھ گیا۔ شانتی کے ہونٹوں پر سرخی پرانے بھدے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی پرانا تھا۔ ساڑھی کی پہناوٹ تو اور زیادہ بدزیب تھی۔ مقبول اس سے مخاطب ہوا۔

”مجھ سے ناراض ہو تم؟“

شانتی نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول نے تند لہجے میں پوچھا۔

”بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟“

شانتی خاموش رہی۔ مقبول نے غصے میں کہا۔

”جواب دو ورنہ یاد رکھو ماروں گا۔“

شانتی نے صرف اتنا کہا۔

”مارو۔“

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا۔ شانتی بلبلا اٹھی۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا۔ غصے میں اس کے ہونٹوں کی بھدی سرخی پونچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا۔ لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی۔ کنگھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”ساڑھی ٹھیک کرو اپنی۔“

شانتی اٹھی اور ساڑھی ٹھیک کرنے لگی مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا۔ مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا۔ جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا۔

”شانتی اٹھو۔ میں جا رہا ہوں۔“

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور چلائی۔

”نہیں نہیں۔ تم نہیں جا سکتے۔“

اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان میں کھڑی ہو گئی۔

”تم گیا تو مار ڈالوں گی۔“

وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گہری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے شانتی نے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیوڑھا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے آنسو بند ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔ مقبول نے اس کو پیار کیا۔ رونا بند کرنے کے لیے کہا تو وہ آنسوؤں میں اٹک اٹک کر بولی

”ادھر سرینگر میں۔ ایک آدمی نے۔ ہم کو مار دیا تھا۔ ادھر ایک آدمی نے۔ ہم کو زندہ کر دیا۔“

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کہا۔

”یہ لو اپنے ففٹی روپیز“!

شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھینک دیے۔ پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کا ایک دروازہ کھولا اور مقبول سے کہا۔

”ادھر آؤ۔ دیکھو یہ کیا ہے؟“

مقبول نے دیکھا۔ دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ مٹی بھر کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھالے۔

”ہم اب یہ نہیں مانگتا“!

مقبول مسکرایا۔ ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر چھوٹی سی چپت لگائی اور پوچھا:

”اب تم کیا مانگتا ہے“!

شانتی نے جواب دیا۔

”تم کو“

یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چمٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

”روؤ نہیں۔ تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے۔“

شاہ دولے کا چوہا

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوشاہ دولے کا چوہا

سلیمہ کی جب شادی ہوئی تو وہ اکیس برس کی تھی۔ پانچ برس ہو گئے مگر اُس کے اولاد نہ ہوئی۔ اُس کی ماں اور ساس کو بہت فکر تھی۔ ماں کو زیادہ تھی کہ کہیں اس کا نجیب دوسری شادی نہ کر لے۔ چنانچہ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا مگر کوئی بات پیدا نہ ہوئی۔ سلیمہ بہت متفکر تھی۔ شادی کے بعد بہت کم لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو اولاد کی خواہش مند نہ ہو۔ اُس نے اپنی ماں سے کئی بار مشورہ کیا۔ ماں کی ہدایتوں پر بھی عمل کیا۔ مگر نتیجہ صفر تھا۔ ایک دن اُس کی ایک سہیلی جو بانجھ قرار دے دی گئی تھی۔ اس کے پاس آئی۔ سلیمہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ اُس کی گود میں ایک گل گوتھنا لڑکا تھا۔ سلیمہ نے اُس سے بڑے بینڈے انداز میں پوچھا

”فاطمہ تمہارے یہ لڑکا کیسے پیدا ہو گیا۔“

فاطمہ اُس سے پانچ سال بڑی تھی۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔

”یہ شاہ دولے صاحب کی برکت ہے۔ مجھ سے ایک عورت نے کہا کہ اگر تم اولاد چاہتی ہو تو گجرات جا کر شاہ دولے صاحب کے مزار پر منت مانو۔ کہو کہ حضور میرے جو پہلے بچہ ہو گا وہ آپ کی خانقاہ پر چڑھا دوں گی۔ اس نے یہ بھی سلیمہ کو بتایا کہ جب شاہ دولے صاحب کے مزار پر ایسی منت مانی جائے تو پہلا بچہ ایسا ہوتا ہے جس کا سر بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ فاطمہ کی یہ بات سلیمہ کو پسند نہ آئی اور جب اس نے مزید کہا کہ پہلا بچہ اس خانقاہ میں چھوڑ کر آنا پڑتا ہے تو اس کو اور بھی دُکھ ہوا۔ اس نے سوچا کون ایسی ماں ہے جو اپنے بچے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے۔ اُس کا سر چھوٹا ہو۔ ناک چپٹی ہو۔ آنکھیں بھینگی ہوں۔ لیکن ماں اُس کو گھورے میں نہیں پھینک سکتی وہ کوئی ڈائن ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن اُسے اولاد چاہیے تھی اس لیے وہ اپنی عمر سے زیادہ سہیلی کی بات مان گئی۔ وہ گجرات کی رہنے والی تو تھی ہی جہاں شاہ دولے کا مزار تھا۔ اُس نے اپنے خاوند سے کہا۔

”فاطمہ مجبور کر رہی ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ اس لیے آپ مجھے اجازت دے دیجیے۔“

اس کے خاوند کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

”جاؤ مگر جلدی لوٹ آنا۔“

وہ فاطمہ کے ساتھ گجرات چلی گئی۔ شاہ دولہ کا مزار جیسا کہ اُس نے سمجھا تھا کوئی عہد عتیق کی عمارت نہیں تھی۔ اچھی خاصی جگہ تھی۔ جو سلیمہ کو پسند آئی۔ مگر جب اُس نے ایک حجرے میں شاہ دولے کے چوہے دیکھے، جن کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا تھا اور ان کا دماغ بالکل ماؤف تھا تو کانپ کانپ گئی۔ ایک جوان لڑکی تھی پورے شباب پر مگر وہ ایسی حرکتیں کرتی تھی کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی کو بھی ہنسی آ سکتی تھی۔ سلیمہ اُس کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ہنسی مگر فوراً ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوچنے لگی اس لڑکی کا کیا ہو گا۔ یہاں کے مجاور اُسے کسی کے پاس بیچ دیں گے یا بندر بنا کر اُسے شہر بہ شہر پھرائیں گے۔ یہ غریب کی روزی کا ٹھیکرا بن جائے گی۔ اس کا سر بہت چھوٹا تھا۔ لیکن اُس نے سوچا کہ اگر سر چھوٹا ہے تو انسانی فطرت تو اتنی چھوٹی نہیں۔ وہ تو پاگلوں کے ساتھ بھی چمٹی رہتی ہے۔ اس شاہ دولے کی چوہیا کا جسم بہت خوبصورت تھا۔ اُس کی ہر قوس اپنی جگہ پر مناسب و موزوں تھی۔ مگر اُس کی حرکات ایسی تھیں جیسے کسی خاص غرض کے ماتحت اس کے حواس مختل کر دیے گئے ہیں۔ وہ اس طریقے سے کھیلتی پھرتی اور ہنستی تھی جیسے کوئی کوک بھرا کھلونا ہو۔ سلیمہ نے محسوس کیا کہ وہ اسی غرض کے لیے بنائی گئی ہے۔ لیکن ان تمام احساسات کے باوجود اُس نے اپنی سہیلی فاطمہ کے کہنے پر شاہ دولا صاحب کے مزار پر منت مانی کہ اگر اس کے بچہ ہوا تو وہ اُن کی نذر کر دے

گی۔ ڈاکٹری علاج سلیمہ نے جاری رکھا۔ دو ماہ بعد بچے کی پیدائش کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ مقررہ وقت پر اُس کے ہاں لڑکا ہوا، بڑا ہی خوبصورت۔ حمل کے دوران میں چونکہ چاند گرہن ہوا تھا اُس لیے اس کے داہنے گال پر ایک چھوٹا سا دھبا تھا جو بُرا نہیں لگتا تھا۔ فاطمہ آئی تو اُس نے کہا کہ اس بچے کو فوراً شاہ دولے صاحب کے حوالے کر دینا چاہیے۔ سلیمہ خود یہی مان چکی تھی۔ کئی دنوں تک وہ ٹال مٹول کرتی رہی۔ اس کی ممتا نہیں مانتی تھی کہ وہ اپنا لختِ جگر وہاں پھینک آئے۔ اُس سے کہا گیا تھا کہ شاہ دولے سے جو اولاد مانگتا ہے اُس کے پہلے بچے کا سر چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن اُس کے لڑکے کا سر کافی بڑا تھا۔ اور فاطمہ نے اس سے کہا۔

”یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تم بہانے کے طور پر استعمال کر سکو۔ تمہارا یہ بچہ شاہ دولے صاحب کی ملکیت ہے تمہارا اس پر کوئی حق نہیں۔ اگر تم اپنے وعدہ سے پھر گئیں تو یاد رکھو تم پر ایسا عذاب نازل ہو گا کہ ساری عمر یاد رکھو گی۔“

بادل نخواستہ سلیمہ کو اپنا پیارا گل گوتھنا سا بیٹا جس کے داہنے گال پر کالا دھبا تھا۔ گجرات جا کر شاہ دولے کے مزار کے مجاوروں کے حوالے کرنا پڑا۔ وہ اس قدر روئی۔ اُس کو اتنا صدمہ ہوا کہ بیمار ہو گئی۔ ایک برس تک زندگی اور موت کے درمیان معلق رہی۔ اُس کو اپنا بچہ بھولتا ہی نہیں تھا۔ خاص طور پر اُس کے داہنے گال پر کالا دھبا۔ جس کو اکثر چوما کرتی تھی۔ چونکہ وہ جہاں بھی تھا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس دوران میں اُس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے بچے کو فراموش نہ کیا۔ عجیب عجیب خواب دیکھتی۔ شاہ دولہ اُس کے پریشان تصور میں ایک بڑا چوہا بن کر نمودار ہوتا جو اُس کے گوشت کو اپنے تیز دانوں سے کترتا۔ وہ چیختی اور اپنے خاوند سے

”مجھے بچایئے! دیکھئے چوہا میرا گوشت کھا رہا ہے۔“

کبھی اس کا مضطرب دماغ یہ سوچتا کہ اس کا بچہ چوہوں کے بل کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ وہ اُس کی دُم کھینچ رہی ہے۔ مگر بل کے اندر جو بڑے بڑے چوہے ہیں انھوں نے اُس کی تھوتھنی پکڑ لی۔ اس لیے وہ اُسے باہر نکال نہیں سکتی۔ کبھی اُس کی نظروں کے سامنے وہ لڑکی آتی جو پورے شباب پر تھی اور جس کو اُس نے شاہ دولے صاحب کے مزار کے ایک حجرے میں دیکھا تھا۔ سلیمہ ہنسنا شروع کر دیتی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد رونے لگتی۔ اتنا روتی کے اس کے خاوند نجیب کو سمجھ میں نہ آتا کہ اُس کے آنسو کیسے خشک کرے۔ سلیمہ کو ہر جگہ چوہے نظر آتے تھے۔ بستر پر باورچی خانے میں۔ غسل خانے کے اندر۔ صوفے پر۔ دل میں کانوں میں بعض اوقات تو وہ یہ محسوس کرتی کہ وہ خود چوہیا ہے۔ اُس کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا ہے۔ وہ شاہ دولے کے مزار کے ایک حجرے میں اپنا چھوٹا بہت چھوٹا سر اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھائے ایسی حرکات کر رہی ہے کہ دیکھنے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔ اُس کی حالت قابل رحم تھی۔ اُس کو فضا میں دھبے ہی دھبے نظر آتے۔ جیسے ایک بہت بڑا گال ہے جس پر سورج بجھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کے جگہ جگہ جم گیا ہے۔ بخار ہلکا ہوا تو سلیمہ کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی نجیب بھی قدرے مطمئن ہوا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی بیوی کی علالت کا باعث کیا ہے۔ لیکن وہ ضعیف الاعتقاد تھا۔ اُس کو اپنی پہلی اولاد کو بھینٹ چڑھائے جانے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ جو کچھ کیا گیا تھا وہ اسے مناسب سمجھتا تھا۔ بلکہ وہ تو یہ سوچتا تھا کہ اس کے جو بیٹا ہوا تھا وہ اس کا نہیں شاہ دولے صاحب کا تھا۔ جب سلیمہ کا بخار اتر گیا اور اس کے دل و دماغ کا طوفان ٹھنڈا پڑ گیا تو نجیب نے اُس سے کہا

”میری جان۔ اپنے بچے کو بھول جاؤ۔ وہ صدقے کا تھا۔“

سلیمہ نے بڑے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔

”میں نہیں مانتی۔ ساری عمر اپنی ممتا پر لعنتیں بھیجتی رہوں گی کہ میں نے اتنا بڑا گناہ کیوں کیا کہ اپنا لختِ جگر اس کے مجاوروں کے حوالے کر دیا۔ یہ مجاور ماں تو نہیں ہو سکتے۔‘ ایک دن وہ غائب ہو گئی۔ سیدھی گجرات پہنچی۔ ساتھ آٹھ روز وہاں رہی۔ اپنے بچے کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ مگر کوئی اتا پتہ نہ ملا مایوس ہو کر واپس آ گئی۔ اپنے خاوند سے کہا۔

”میں اب اسے یاد نہیں کروں گی۔“

یاد تو وہ کرتی رہی۔ لیکن دل ہی دل میں اس کے بچے کے داہنے گال کا دھبا اُس کے دل کا داغ بن کر رہ گیا تھا۔ ایک برس کے بعد اُس کے لڑکی ہوئی۔ اس کی شکل اُس کے پہلوٹھی کے بچے سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اس کے داہنے گال پر داغ نہیں تھا اس کا نام اس نے مجیب رکھا کیونکہ اپنے بیٹے کا نام اُس نے مجیب سوچا تھا۔ جب وہ دو مہینے کی ہوئی تو اُس نے اس کو گود میں اٹھایا اور سرمہ دانی سے تھوڑا سا سرمہ نکال کر اس کے داہنے گال پر ایک بڑا سا تل بنا دیا اور مجیب کو یاد کر کے رونے لگی۔ اُس کے آنسو بچی کی گالوں پر گرے تو اُس نے اپنے دوپٹے سے پونچھے اور ہنسنے لگی۔ وہ کوشش کرنا چاہتی تھی کہ اپنا صدمہ بھول جائے۔ اس کے بعد سلیمہ کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اُس کا خاوند اب بہت خوش تھا۔ ایک بار سلیمہ کو کسی سہیلی کی شادی کے موقع پر گجرات جانا پڑا تو اُس نے ایک بار پھر مجیب کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ مگر اُسے ناکامی ہوئی۔ اس نے سوچا شاید مر گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے جمعرات کو فاتحہ خوانی بڑے اہتمام سے کرائی۔ اڑوس پڑوس کی سب عورتیں حیران تھی کہ یہ کس کی مرگ کے سلسلے میں اتنا تکلف کیا گیا ہے۔ بعض نے سلیمہ سے پوچھا بھی، مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شام کو اس نے اپنی دس برس کی لڑکی مجیبہ کا ہاتھ پکڑا۔ اندر کمرے میں لے گئی۔ سرے سے اُس کے داہنے گال پر بڑا سا دھبا بنایا اور اُس کو دیر تک چومتی رہی۔ وہ مجیب ہی کو اپنا گم شدہ مجیب سمجھتی تھی۔ اب اُس کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا، اس لیے کہ اُس کی فاتحہ خوانی کرانے کے بعد اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے تصور میں ایک قبر بنا لی تھی۔ جس پر وہ تصور ہی میں پھول بھی چڑھایا کرتی۔ اس کے تین بچے اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کو ہر صبح سلیمہ تیار کرتی۔ ان کے لیے ناشتہ بنواتی۔ ہر ایک کو بناتی سنوارتی۔ جب وہ چلے جاتے تو ایک لحظہ کے لیے

اسے اپنے مجیب کا خیال آتا کہ وہ اس کی فاتحہ خوانی کرا چکی تھی۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ پھر بھی اُس کو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ مجیب کے داہنے گال کا سیاہ دھبا اُس کے دماغ میں موجود ہے۔ ایک دن اُس کے تینوں بچے بھاگے بھاگے آئے اور کہنے لگے

”امی ہم تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔“

اُس نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

”کیسا تماشا؟“

اس لڑکی نے جو سب سے بڑی تھی کہا

”امی جان ایک آدمی ہے وہ تماشا دکھاتا ہے۔“

سلیمہ نے کہا۔

”جاؤ اُس کو بُلا لاؤ۔ مگر گھر کے اندر نہ آئے۔ باہر تماشا کرے۔“

بچے بھاگے ہوئے گئے اور اُس آدمی کو بُلا لائے اور تماشا دیکھتے رہے۔ جب یہ ختم ہو گیا تو مجیبہ اپنی ماں کے پاس گئی کہ پیسے دے دو۔ ماں نے اپنے پرس سے چونی نکالی اور باہر برآمدے میں گئی۔ دروازے کے پاس پہنچی تو شاہ دولہ کا ایک چوہا کھڑا عجیب احمقانہ انداز میں اپنا سر ہلا رہا تھا سلیمہ کو ہنسی آگئی۔ دس بارہ بچے اُس کے گرد جمع تھے جو بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ اتنا شور مچا تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ سلیمہ چونی ہاتھ میں لیے آگے بڑھی اور اُس نے شاہ دولے کے اُس چوہے کو دینا چاہی تو اُس کا ہاتھ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا۔ اُس چوہے کے داہنے گال پر سیاہ داغ تھا۔ سلیمہ نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا تھا۔ مجیبہ نے جو اُس کے پاس کھڑی تھی، اپنی ماں سے کہا۔

”یہ۔ یہ چوہا۔ امی جان اس کی شکل مجھ سے کیوں ملتی ہے۔ میں بھی کیا چوہیا ہوں۔“

سلیمہ نے اس شاہ دولے کے چوہے کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گئی۔ دروازے بند کر کے اُس کو چوما۔ اُس کی بلائیں لیں۔ وہ اس کا مجیب تھا۔ لیکن وہ ایسی احمقانہ حرکتیں کرتا تھا کہ سلیمہ کے غم واندوہ میں ڈُوبے ہوئے دل میں بھی ہنسی کے آثار نمودار ہو جاتے۔ اُس نے مجیب سے کہا۔

”بیٹے میں تیری ماں ہوں۔“

شاہ دولے کا چوہا بڑے بے ہنگم طور پر ہنسا۔ اپنی ناک کی رینٹھ آستین سے پونچھ کر اُس نے اپنی ماں کے سامنے ہاتھ پھیلایا

”ایک پیسہ۔“

ماں نے اپنا پرس کھولا۔ مگر اُس کی آنکھیں اپنی ساری نہریں، اس سے پہلے ہی کھول چکی تھیں۔ اُس نے سو روپے کا نوٹ نکالا اور باہر جا کر اُس آدمی کو دیا۔ جو اُس کو تماشا بنائے ہوئے تھا۔ اس نے انکار کر دیا کہ اتنی کم قیمت پر اپنی روزی کے ذریعے کو نہیں بیچ سکتا۔ سلیمہ نے اُسے بالآخر پانچ سو روپوں پر راضی کر لیا۔ یہ رقم ادا کر کے جب وہ اندر آئی تو مجیب غائب تھا۔ مجیبہ نے اُس کو بتایا کہ وہ پچھواڑے سے باہر نکل گیا ہے۔ سلیمہ کی کوکھ پکارتی رہی کہ مجیب واپس آجاؤ، مگر وہ ایسا گیا کہ پھر نہ آیا۔

شراب

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشراب

”آپ کے منہ سے بُو کیوں آرہی ہے“

”کیسی بو؟“

”جیسی پہلے آیا کرتی تھی۔ مجھے بنانے کی کوشش نہ کیجیے“

”لاحول ولا، تم بنی بنائی ہو، تمھیں کون بنا سکتا ہے“

”آپ بات ٹال کیوں رہے ہیں؟

”میں نے تو آج تک تمہاری کوئی بات نہیں ٹالی“

”لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آگیا ہے لیکن آپ کو کچھ فکر ہی نہیں“

”یہ تم نے اچھی کہی۔ تمہارے پاس کم سے کم بارہ ساڑھیاں پندرہ قمیضیں سولہ بلاؤز دس شلواریں اور پانچ بنیانیں ہوں گی اور تم کہتی ہو کہ لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آگیا ہے۔ تم عورتوں کی فطرت ہی یہی ہے کہ ہمیشہ ناشکری رہتی ہو“

”آپ بس مجھے ہر وقت یہی طعنہ دیتے ہیں۔ بتایئے ان پچھلے چھے مہینوں میں آپ نے مجھے کتنا روپیہ دیا ہے“

حساب تو میرے پاس نہیں لیکن اندازاً چھ سات ہزار روپے ہوں گے“

”چھ سات ہزار؟ آپ نے ان میں سے کتنے لیے“

”یہ مجھے یاد نہیں“

”آپ کو بھلا یہ کب یاد رہے گا۔ چور اُچکے ہیں اول درجے کے۔

”یہ تمہاری بڑی مہربانی ہے کہ تم نے مجھے اوّل درجے کا رتبہ بخشا۔ بس اب چپ رہو اور سو جاؤ“

”سو جاؤں؟“

نیند کس کم بخت کو آئے گی۔ جس کا شوہر ایسا گیا گزرا ہو۔ آپ کو کم از کم میرا نہیں تو اپنی ان بچیوں ہی کا کچھ خیال رکھنا چاہیے۔ ان کے تن پر بھی کپڑے نہیں“

ننگی پھرتی ہیں۔ ابھی دس روز ہوئے میں نے تمھیں ایک تھان پوپلین کا لا کر دیا تھا۔ اس سے تم نے تینوں بچیوں کے معلوم نہیں کتنے فراک بنائے۔ اب کہتی ہو کہ ان کے تن پر کپڑے ہی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ غلط بیانی کیوں ہوتی ہے۔ کل کو تم یہ شکایت کرو گی کہ تمہارے پاس کوئی جوتا کوئی سینڈل نہیں۔ حالانکہ تمہاری الماری میں کئی جوتے اور سینڈلیں پڑی ہیں۔ چار روز ہوئے تمہارے لیے واکنگ شو لے کر آیا تھا۔“

”بڑا احسان کیا تھا آپ نے مجھ پر۔“

”احسان کی بات نہیں۔ میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“

”آپ حقیقت بیان کر رہے ہیں، تو اس حقیقت کا انکشاف بھی کر دیجیے کہ آج آپ کے منہ سے بو کیوں آ رہی ہے“

”کیسی بو“

”اوہ۔ تو تمہارا مطلب ہے، میں نے شراب پی ہے“

”مطلب وطلب میں نہیں جانتی، جو بو آپ کے منہ سے میری ناک تک پہنچ رہی ہے صریحاً اسی خبیث چیز کی ہے“

”خواہ مخواہ تو کوئی شک نہیں کرتا۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”بھئی کسی کی بھی قسم لے لو۔ میں نے نہیں پی۔ نہیں پی۔۔ نہیں پی“

”آپ کا اُکھڑا اُکھڑا لہجہ چغلی کھا رہا ہے۔“

”اس لہجے کو جھونکو جہنم میں۔ میں نے نہیں پی۔“!

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ آپ نے کم از کم آدھی بوتل پی ہے۔“

”یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟“

”پندرہ برس ہوگئے ہیں آپ کے ساتھ زندگی گزارتے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی۔ آپ کو یاد ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے مجھے ٹیلی فون کیا تھا اور میں نے فوراً آپ کی آواز سے اندازہ لگا کر آپ سے کہا تھا کہ اس وقت آپ چار پیگ پیے ہوئے ہیں۔ کیا یہ جھوٹ تھا؟“

”نہیں۔ اُس دن میں نے واقعی چار پیگ پیے تھے۔“

”اب میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ نے آدھی بوتل پی رکھی ہے۔ اس لیے آپ ہوش میں ہیں“

”یہ عجیب منطق ہے۔“

”منطق ونطق میں نہیں جانتی۔ میں نے آپ کے ساتھ پندرہ برس گزارے ہیں میں اس دوران میں یہی دیکھتی رہی ہوں کہ آپ دو تین پیگ پئیں تو بہک جاتے ہیں اگر پوری بوتل یا اس کا نصف چڑھا جائیں تو ہوش مند ہو جاتے ہیں“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب بھی میں پیوں تو آدھے سے کم نہ پیوں“

”آپ کو تو مجھے ایک روز زہر پلانا پڑے گی تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے“

”کون سا قصہ۔ زُلیخا کا؟“

”زلیخا کی ایسی کی تیسی۔ میرا نام کچھ اور ہے۔ غالباً آپ اس نشے کے عالم میں بھول گئے ہوں گے“

”میں تمہارا نام کیسے بھول سکتا ہوں؟“

”بتائیے کیا نام ہے میرا؟“

”تمہارا نام۔ تمہارا نام؟۔ لیکن نام میں کیا پڑا ہے چلو آج سے زلیخا ہی سہی“

”اور آپ یوسف“!

”قسم خدا کی، آج تم نے طبیعت صاف کر دی میری۔ لو یہ سو روپے کا نوٹ۔ آج اپنے لیے کوئی چیز خرید لو۔“

”یہ نوٹ آپ پاس ہی رکھیے۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ایسے لمحات میں بہت فیاض ہو جایا کرتے ہیں۔

”کون سے لمحات میں؟“

”یہی لمحات جب آپ نے پی رکھی ہو“

”یہ پی پی کی رٹ تم نے کیا لگا رکھی ہے تم سے سو دفعہ کہہ چکا ہوں کہ پچھلے چھ مہینوں سے میں نے ایک قطرہ بھی نہیں پیا لیکن تم مانتی ہی نہیں۔ اب اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟“

”اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنا علاج کرائیے۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ لیجیے تا کہ وہ آپ کی اس بد عادت کو دُور کر سکے۔ آپ کبھی غور و فکر کریں تو آپ کو معلوم ہو کہ آپ کی صحت کتنی گر چکی ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کے رہ گئے ہیں۔ میں ساری رات روتی رہتی ہوں۔“

”صرف ایک دو منٹ رونا کافی ہے، ساری رات رونے کی کیا ضرورت ہے اور پھر اتنا پانی آنکھوں میں کہاں سے آ جاتا ہے جو ساری رات تکیوں کو سیراب کرتا ہے۔“

”آپ مجھ سے مذاق نہ کیجیے“

”میں مذاق نہیں کر رہا۔ ساری رات کوئی عورت، کوئی مرد رو نہیں سکتا۔ البتہ اونٹ یہ سلسلہ کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے کوہان میں کافی پانی جمع ہوتا ہے، جو آنسو بن بن کے ان کی آنکھوں سے ٹپک سکتا ہے۔ مگرمچھ ہیں، جن کے آنسو مشہور ہیں۔ یہ پانی میں رہتے ہیں اس لیے ان کو متواتر پانی بہانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ میں آبی حیوان یا جانور نہیں، اور نہ تم ہو“

”آپ تو فلسفہ بکھیرنے لگتے ہیں“

”فلسفہ کوئی اور چیز ہے، جس کے متعلق تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو گا۔ میں صرف ایسی باتیں بیان کر رہا تھا جو عام آدمی سوچ سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، مگر افسوس ہے کہ تم نے انھیں نہ سمجھا اور ان پر فلسفے کا لیبل لگا دیا۔“

”میں جاہل ہوں۔ بیوقوف ہوں۔ ان پڑھ ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ تسلیم ہے۔ جانے میری بلا کہ فلسفہ کیا ہے؟ میں تو صرف اتنا پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ کے منہ سے وہ گندی بو کیوں آ رہی ہے؟“

”میں کیا جانوں۔ ہو سکتا ہے، میں نے آج دانت صاف نہ کیے ہوں“

”غلط ہے ہم دونوں نے اکٹھے صبح غسل خانے میں دانتوں پر برش کیا تھا۔ ٹوتھ پیسٹ ختم ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً نوکر کو بھیجا اور وہ کولی نوس لے کر آیا۔“

”ہاں، ہاں مجھے یاد آیا“

”آپ ہوش ہی میں نہیں۔ آپ کی یاد کو اب کب تک جگاتی رہوں گی۔“

”یاد کو چھوڑو کل صبح تم ٹھیک پانچ بجے جگا دینا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“

”ضروری کام کیا ہے آپ کو؟ شراب کی بوتل کا بندوبست کرنا ہو گا۔“

”بھئی، مدت ہوئی میں اس چیز سے ناآشنا ہو چکا ہوں“

”آج تو آپ پوری طرح آشنا ہو کے آئے ہیں“

”یہ سراسر بہتان ہے۔ میں تمہاری قسم کھا کے۔“

”میری قسم آپ نہ کھائیے۔ آپ کیسی بھی قسم کھائیں، مجھے آپ کی کسی بات پر یقین نہیں آئے گا۔ اس لیے کہ شراب پینے کے بعد آپ کی کوئی بات قابل اعتماد نہیں ہوتی۔“

”یعنی تم ابھی۔“

”آپ کو یہ ہچکی شروع کیوں ہو گئی۔“

”ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ مجھے معلوم نہیں۔ شاید ڈاکٹروں کو بھی نہ ہو۔“

”پانی لاؤں؟“

”نہیں۔ اندر میری الماری میں گلیسرین پڑی ہے، وہ لے آؤ“

”اس سے کیا ہو گا۔“

”وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔“

”آپ نشے میں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ گلیسرین کا استعمال غلط ہو جائے“

”جاؤ۔ اُس کے چار قطرے فوراً ہچکی بند کر دیں گے۔“

”لیکن آپ کے منہ سے یہ بو کس چیز کی آ رہی ہے۔“

”میرے پیچھے۔ کیو۔ کیو۔ کیوں پڑی ہو؟ گلیسرین لاؤ۔“

”لاتی ہوں۔ یہ سب شراب پینے کی وجہ سے ہے۔“

”کس کم بخت نے پی ہے۔ اگر پی ہوتی تو یہ حال نہ ہوتا“

”لے آئی ہو گلیسرین“

”جی نہیں، وہاں آپ کی بوتل پڑی تھی۔ اُس میں سے یہ تھوڑی سی گلاس میں ڈال کر لے آئی ہوں۔ پانی کا گلاس بھی ساتھ ہے۔ آپ خود جتنا چاہیں اس میں ملا لیجیے۔ میرا خیال ہے گلیسرین سے آپ کو اتنا فائدہ نہیں پہنچے گا جتنا اس چیز سے۔“

شریفن

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشریفن

جب قاسم نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ تو اسے صرف ایک گولی کی جلن تھی جو اس کی دہنی پنڈلی میں گڑ گئی تھی۔ لیکن اندر داخل ہو کر جب اس نے اپنی بیوی کی لاش دیکھی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ قریب تھا کہ وہ لکڑیاں پھاڑنے والے گنڈاسے کو اٹھا کر دیوانہ وار نکل جائے اور قتل و گری کا بازار گرم کر دے کہ دفعتہً اسے اپنی لڑکی شریفن کا خیال آیا۔

”شریفن، شریفن“

اس نے بلند آواز میں پکارنا شروع کیا۔ سامنے دالان کے دونوں دروازے بند تھے۔ قاسم نے سوچا۔ شاید ڈر کے مارے اندر چھپ گئی ہو گی۔ چنانچہ وہ اس طرف بڑھا اور درز کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔

”شریفن، شریفن۔ میں ہوں تمہارا باپ۔“

مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ قاسم نے دونوں ہاتھوں سے کواڑ کو دھکا دیا۔ پَٹ کھلے اور وہ اوندھے منہ دالان میں گر پڑا۔ سنبھل کر جب اس نے اٹھنا چاہا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی۔ قاسم چیخ کیساتھ بیٹھا۔ ایک گز کے فاصلے پر ایک جوان لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ ننگی۔ بالکل ننگی گورا گورا سڈول جسم، چھت کی طرف اٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پستان۔ ایک دم قاسم کا سارا وجود ہل گیا۔ اس کی گہرائیوں سے ایک فلک شگاف چیخ اٹھی۔ لیکن اس کے ہونٹ اس قدر زور سے بھینچے ہوئے تھے کہ باہر نہ نکل سکی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ پھر بھی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ مردہ سی آواز اس کے منہ سے نکلی۔

”شریفن۔“

اور اس نے آنکھیں بند کیے دالان میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر کچھ کپڑے اٹھائے اور انھیں شریفن کی لاش پر گرا کر وہ یہ دیکھے بغیر ہی باہر نکل گیا کہ وہ اس سے کچھ دور گرے تھے۔ باہر نکل کر اس نے اپنی بیوی کی لاش نہ دیکھی۔ بہت ممکن ہے اسے نظر ہی نہ آئی ہو۔ اس لیے کہ اس کی آنکھیں شریفن کی ننگی لاش سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کونے میں پڑا ہوا لکڑیاں پھاڑنے والا گنڈاسا اٹھایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ قاسم کی دہنی پنڈلی میں گولی گڑی ہوئی تھی۔ اس کا احساس گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے دل و دماغ سے محو ہو گیا تھا۔ اس کی وفادار پیاری بیوی ہلاک ہو چکی تھی۔ اس کا صدمہ بھی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود نہیں تھا۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی تصویر آتی تھی۔ شریفن کی۔ ننگی

شریفن کی۔ اور وہ نیزے کی انی بن بن کر اس کی آنکھوں کو چھیدتی ہوئی اس کی روح میں بھی شگاف ڈال دیتی۔ گنڈاسا ہاتھ میں لیے قاسم سنسان بازاروں میں ابلتے ہوئے لاوے کی طرح بہتا چلا جا رہا تھا۔ چوک کے پاس اس کی مڈ بھیڑ ایک سکھ سے ہوئی۔ بڑا کڑیل جوان تھا۔ لیکن قاسم نے کچھ ایسے بک تکے پن سے حملہ کیا اور ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ تیز طوفان میں اکھڑے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آ رہا۔ قاسم کی رگوں میں اس کا خون اور زیادہ گرم ہو گیا۔ اور بجنے لگا۔ تڑ تڑ تڑ تڑ۔ جیسے جوش کھاتے ہوئے تیل پر پانی کا ہلکا سا چھینا پڑ جائے۔ دور سڑک کے اس پار اسے چند آدمی نظر آئے۔ تیر کی طرح وہ ان کی طرف بڑھا اسے دیکھ کر ان لوگوں نے

”ہر ہر مہادیو“

کے نعرے لگائے۔ قاسم نے جواب میں اپنا نعرہ لگانے کے بجائے انھیں ماں باپ کی موٹی موٹی گالیاں دیں اور گنڈاسا تانے ان میں گھس گیا۔ چند منٹوں ہی کے اندر تین لاشیں سڑک پر تڑپ رہی تھیں۔ دوسرے بھاگ گئے لیکن قاسم کا گنڈاسا دیر تک ہوا میں چلتا رہا۔ اصل میں اس کی آنکھیں بند تھیں۔ گنڈاسا گھماتے گھماتے وہ ایک لاش کے ساتھ ٹکرایا اور گر پڑا۔ اس نے سوچا کہ شاید اسے گرا لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے گندی گندی گالیاں دے کر چلانا شروع کیا۔

”مار ڈالو مجھے، مار ڈالو مجھے۔“

لیکن جب کوئی ہاتھ اسے گردن پر محسوس نہ ہوا اور کوئی ضرب اس کے بدن پر نہ پڑی تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ سڑک پر تین لاشوں اور اس کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک لحظے کے لیے قاسم کو مایوسی ہوئی۔ کیونکہ شاید وہ مر جانا چاہتا تھا لیکن ایک دم شریفن۔ ننگی شریفن کی تصویر اس کی آنکھوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر گئی اور اس کے سارے وجود کو بارود کا جلتا ہوا فلیتہ بنا گئی۔ وہ فوراً اٹھا۔ ہاتھ میں گنڈاسا لیا اور پھر کھولتے ہوئے لاوے کی طرح سڑک پر بہنے لگا۔ جتنے بازار قاسم نے طے کیے سب خالی تھے۔ ایک گلی میں وہ داخل ہوا۔ لیکن اس میں سب مسلمان تھے۔ اس کو بہت کوفت ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے لاوے کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ ایک بازار میں پہنچ کر اس نے اپنا گنڈاسا اونچا ہوا میں لہرایا اور ماں بہن کی گالیاں اگلنا شروع کیں۔ لیکن ایک دن اسے بہت ہی تکلیف دہ احسان ہوا کہ اب تک وہ صرف ماں بہن کی گالیاں ہی دیتا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً بیٹی کی گالی دینا شروع کی اور ایسی جتنی گالیاں اسے یاد تھیں سب کی سب ایک ہی سانس میں باہر لاٹ دیں۔ پھر بھی اس کی تشفی نہ ہوئی۔ جھنجھلا کر وہ ایک مکان کی طرف بڑھا۔ جس کے دروازے کے اوپر ہندی میں کچھ لکھا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ قاسم نے دیوانہ وار گنڈاسا چلانا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں کواڑ ریزہ ریزہ ہو گئے۔ قاسم اندر داخل ہوا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ قاسم نے اپنے سوکھے ہوئے حلق پر زور دے کر پھر گالیاں دینا شروع کیں۔

”باہر نکلو۔ باہر نکلو۔“

سامنے دالان کے دروازے میں چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ قاسم اپنے سوکھے ہوئے حلق پر زور دے کر گالیاں دیتا رہا۔ دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ قاسم کے ہونٹ بھینچ گئے۔ گرج کر اس نے پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

لڑکی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور جواب دیا۔

”ہندو۔“

قاسم تن کر کھڑا ہو گیا۔ شعلہ بار آنکھوں سے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جس کی عمر چودہ یا پندرہ برس کی تھی اور ہاتھ سے گنڈاسا گرا دیا۔ پھر وہ عقاب کی طرح جھپٹا اور اس لڑکی کو دھکیل کر اندر دالان میں لے گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے دیوانہ وار کپڑے نوچنے شروع کیے۔ دھجیاں اور چندیاں یوں اڑنے لگیں جیسے کوئی روئی دھنک رہا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ قاسم اپنا انتقام لینے میں مصروف رہا۔ لڑکی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس لیے کہ وہ فرش پر گرتے ہی بیہوش ہو گئی تھی۔ جب قاسم نے آنکھیں کھولیں تو اس کے دونوں ہاتھ لڑکی کی گردن میں دھنسے ہوئے تھے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ انھیں علیحدہ کر کے وہ اٹھا پسینے میں غرق اس نے ایک نظر اس لڑکی کی طرف دیکھا تاکہ اس کی اور تشفی ہو سکے۔ ایک گز کے فاصلے پر اس جوان لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ ننگی۔ بالکل ننگی۔ گورا گورا سڈول جسم چھت کی طرف اٹھے ہوئے چھوٹے پستان۔ قاسم کی آنکھیں ایک دم بند ہو گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ بدن پر گرم گرم پسینہ برف ہو گیا اور اس کی رگوں میں کھولتا ہوا لاوا پتھر کی طرح منجمد ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی تلوار سے مسلح مکان کے اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ دالان میں کوئی شخص آنکھیں بند کیے لرزتے ہاتھوں سے فرش پر پڑی ہوئی چیز پر کمبل ڈال رہا ہے۔ اس نے گرج کر اس سے پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

قاسم چونکا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ مسلح آدمی چلایا۔

”قاسم“!

قاسم ایک بار پھر چونکا۔ اس نے اپنے سے کچھ دور کھڑے آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ مسلح آدمی نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کیا کر رہے ہو تم یہاں؟“

قاسم نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے فرش پر پڑے ہوئے کمبل کی طرف ایارہ کیا اور کھوکھلی آواز میں صرف اتنا کہا۔

”شریفن۔“

جلدی سے آگے بڑھ کر مسلح آدمی نے کمبل ہٹایا۔ ننگی لاش دیکھ کر پہلے وہ کانپا، پھر ایک دم اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ

”بملا بملا“

کہتا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر نکل گیا۔

شغل

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشغل

یہ پچھلے دنوں کی بات ہے جب ہم برسات میں سڑکیں صاف کر کے اپنا پیٹ پال رہے تھے۔ ہم میں سے کچھ کسان تھے اور کچھ مزدوری پیشہ، چونکہ پہاڑی دیہاتوں میں روپے کا منہ دیکھنا بہت کم نصیب ہوتا ہے۔ اس لیے ہم سب خوشی سے چھ آنے روزانہ پر سارا دن پتھر ہٹاتے رہتے تھے۔ جو بارشوں کے زور سے ساتھ والی پہاڑیوں سے لڑھک کر سڑک پر آگرتے تھے۔ پتھروں کو سڑک پر سے پرے ہٹانا تو خیر اک معمولی بات تھی۔

ہم تو اس اُجرت پر ان پہاڑیوں کو ڈھانے پر بھی تیار تھے۔ جو ہمارے گردوپیش سیاہ اور ڈراؤنے دیوؤں کی طرح اکڑی کھڑی تھیں۔ دراصل ہمارے بازو سخت سے سخت مشقت کے عادی تھے۔ اس لیے یہ کام ہمارے لیے بالکل معمولی تھا۔ البتہ جب کبھی ہمیں سڑک کو چوڑا کرنے کے لیے پتھر کاٹنا ہوتے، تو رات کو ہمیں بہت تکان محسوس ہوتی تھی۔ پٹھے اکڑ جاتے اور صبح کو بیدار ہوتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ تمام پتھر جنھیں ہم گزشتہ روز کاٹتے اور پھوڑتے رہے ہیں۔ ہمارے جسموں پر بوجھ ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ ہمارا کام جو روز صبح سات بجے شروع ہوتا تھا۔ جب طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طلائی کرنیں چیڑ کے دراز قد درختوں سے چھن چھن کر ہمارے پاس والے نالے کے خشم آلود پانی سے اٹکھیلیاں کر رہی ہوتیں۔ اور آس پاس کی جھاڑیوں میں ننھے ننھے پرندے اپنے گلے پھلا پھلا کر چیخ رہے ہوتے۔ یوں کہیے کہ ہم قدرت کو اپنے خواب سے بیدار ہوتا دیکھتے تھے۔ صبح کی ہلکی پھلکی ہوا میں شبنم آلود سبز جھاڑیوں کی دلنواز سرسراہٹ نانے میں سنگریزوں سے کھیلتے ہُوئے کف آلود پانی کا شور۔ اور برسات کے پانی میں بھیگی ہُوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو، چند ایسی چیزیں تھیں۔ جو ہمارے سنگین سینوں میں ایک ایسی طاقت پیدا کر دیتی تھیں۔ جو زندگی کے اس دوزخ میں ہمیں بہشت کے خواب دکھانے لگتی۔ ہمیں ہر روز بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ یعنی سارا دن ہم سڑک کی موریوں اور پتھروں کو صاف کرتے رہتے تھے۔

یہ کام دلچسپ نہ تھا۔ مگر ہم نے اس کی ناخوشگوار یک آہنگی کو دور کرنے کے لیے ایک طریقہ ایجاد کر لیا تھا جب ہم سب اس پہاڑی کے نیچے جمع شدہ ملبے کو اپنے بیلچوں سے ہٹا رہے ہوتے جس کے سنگریزے ہر وقت سڑک پر گرتے رہتے تھے۔ تو ہم ایک سُر میں کوئی پہاڑی گیت شروع کر دیتے، ملبے کے پتھروں سے ٹکرا کر ہمارے بیلچوں کی جھنکار اس گیت کی تال کا کام دیتی تھی۔ یہ گیت اس افسردگی کو دُور کر دیتا، جو یہ غیر دلچسپ کام کرنے سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک اُس کے سُر ہماری چوڑی چھاتیوں میں سے نکلتے رہتے ہم محسوس تک نہ کرتے کہ اس دوران ہم نے ملبے کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کر لیا ہے۔ موٹر لاریوں کی آمدورفت سے بھی ہمارا دل بہلا رہتا تھا۔ جو رنگ برنگ مسافروں کو کشمیر سے واپس یا کشمیر کی طرف لے جاتی رہتی تھیں۔ جب کبھی کوئی لاری ہمارے پاس سے گزرتی تو ہم کچھ عرصہ کے لیے اپنی جھکی ہوئی کمریں سیدھی کر کے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور زمین پر اپنے بیلچے ٹیک کر اس کو سامنے والے موڑ کے عقب میں گم ہوتے دیکھتے رہتے۔ ان لاریوں کو اتنی دور تک دیکھتے رہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تھوڑا سستا لیں۔ مگر بعض اوقات ان لاریوں کی شاندار اسباب سے لدی ہوئی چھتیں اور ان کی کھڑکیوں سے مسافروں کے لہراتے ہوئے ریشمی کپڑوں کی ایک جھلک ہمارے دلوں میں ایک ناقابل بیان تلخی پیدا کر دیتی تھی۔ اور ہم اپنے آپ کو ان پتھروں کی طرح فضول اور ناکارہ تصوّر کرنے لگتے تھے۔ جن کو ہمارے بیلچوں کے دھکّے ادھر اُدھر ٹپکتے رہتے تھے۔ ان مسافروں کے طرح طرح کے لباس دیکھ کر جن پر یقیناً بہت سے روپے صرف آئے ہوں گے۔ ہم غیر ارادی طور پر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔ ہم میں سے اکثر کا لباس پٹّو کے تنگ پائجامے، گاڑھے کی قمیض اور لدھیانے کی صدری پر مشتمل تھا۔ سب کے پائجامے یا تو گھٹنوں پر سے گِھس گِھس کر اتنے باریک ہو گئے تھے کہ ان میں جسم کے بالوں کی پوری نمائش ہوتی تھی یا بالکل پھٹے ہوئے تھے۔ قمیضوں اور صدریوں کی بھی یہی حالت تھی۔ ان پر جگہ جگہ مختلف رنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ قریب قریب ہم سب کی قمیضوں کے بٹن غائب تھے۔ اس لیے سینے عام طور پر کھلے رہتے تھے۔ اور کام کرتے وقت ان پر پسینے کی بوندیں صاف نظر آتی تھیں۔ بارہ بجے کے قریب ہم کام چھوڑ کر کھانے کے لیے سڑک کے نیچے اُتر کر پیڑ کے سائے تلے بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کھانا ہم صبح کپڑے میں باندھ کر اپنے ساتھ لاتے تھے۔ ”تین ڈھوڈے“ (مکی کی موٹی روٹیاں) اور عام طور پر سرسوں کا ساگ ہوتا تھا جس کو

ہم اپنے بھُوکے پیٹ میں ڈالتے تھے۔ کھانے کے بعد ہم پانی عموماً نالے سے پیا کرتے تھے۔ اور جس روز بارش کی زیادتی کے باعث اس کا پانی زیادہ گدلا ہو جائے تو ہم دُور سڑک کے اُس پار چلے جایا کرتے تھے جہاں صاف پانی کا ایک چشمہ پھوٹتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم فوراً کام شروع کر دیتے تھے۔

مگر ہمارا جی چاہتا تھا کہ نرم نرم گھاس پر لیٹ کر تھوڑی دیر ستالیں اور پھر کام شروع کریں۔ مگر یہ کیونکر ہو سکتا تھا جب کہ ہمیں ہر وقت اس بات کا خیال رہتا تھا۔ کہ پورا کام کیے بغیر اُجرت نہ ملے گی۔ ہمارا مطمح نظر کام کرنا اور اس حیلے سے اپنا پیٹ پالنا تھا۔ اور چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہم میں سے کسی نے اگر اپنے کام میں ذرا سی سُست رفتاری یا بے دلی کا اظہار کیا تو تاش کی گڈی سے ناکارہ جوکر کی طرح باہر پھینک دیا جائے گا۔ اس لیے ہم دل لگا کر کام کیا کرتے تھے تاکہ ہمارے افسروں کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے افسر ہم پر بہت خوش تھے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ بڑے آدمی ٹھہرے اس لیے ان کا جائز و ناجائز طور پر خفا ہونا بھی درست ہوتا ہے۔ کبھی یہ لوگ ایسے ہی ہمارے کام کا معائنہ کرتے وقت اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہُوئے ہم پر برس پڑتے تھے۔ لیکن ہم جو ان کی بڑائی کو بخوبی سمجھتے تھے۔ مہاراج، مہاراج کہہ کر ان کا غصّہ سرد کر دیا کرتے۔ ہم جانتے تھے، کہ ان کا غصّہ بالکل بے جا ہے لیکن یہ احساس ہمارے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا نہیں کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ کوزشوں نے ہم کو بالکل مُردہ بنا رکھا ہے۔ یا پھر اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم کو یہ خوف دامن گیر رہتا تھا کہ اگر ہم اپنے موجودہ کام سے ہٹا دیئے گئے تو ہماری روزی بند ہو جائے گی۔ ہم اپنے کام سے مطمئن تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم تھوڑی مزدوری اور زیادہ کام کے مسئلے پر بہت کم غور کرتے تھے۔ اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ کام پڑھے لکھے آدمیوں کا ہے۔ اور ہم بالکل ان پڑھ اور جاہل تھے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری دنیا بالکل الگ تھلگ تھی جس کی سرحدیں پتھر توڑنے یا ان کو ہٹانے، بارہ بجے روٹی کھانے اور پھر کام کرنے اور اس کے بعد اپنے اپنے ڈیروں میں سو جانے تک ختم ہو جاتی تھیں۔ ہمیں ان حدود کے باہر کسی شے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنے کے دھندے میں ہم کچھ ایسی بُری طرح پھنس کر رہ گئے تھے کہ اس کے باہر نکل کر ہم کسی اور شے کی خواہش کرنا ہی بھول گئے تھے۔ ہمارے کام پر سڑکوں کے محکمے کی طرف سے ایک نگران مقرر تھا۔ جو دن کا بیشتر حصہ سڑک کے ایک طرف چارپائی بچھا کر بیٹھے رہنے میں وقت گزار دیتا۔ یہ ذات کا پنڈت تھا۔ اونچے طبقے کا امتیازی نشان سیندور کے تلک کی صورت میں ہر وقت اس کی سفید پیشانی پر چمکتا رہتا تھا۔ ہم اپنے نگران کو احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اوّل اس لیے کہ وہ برہمن تھا اور دوسرے اس لیے کہ ہم اس کے ماتحت تھے۔ چنانچہ ادھر اُدھر کے دوسرے کاموں کے علاوہ ہم باری باری دن میں کئی بار اس کے پینے کے لیے حُقہ تازہ کیا کرتے تھے اور آگ بنا کر اس کی چلمیں بھرا کرتے تھے۔ پنڈت کا کام صرف یہ تھا کہ صبح چارپائی پر اپنے گیروے رنگ کی کلف لگی پگڑی اور ریشمی کوٹ اتار کر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے ہماری حاضری لگائے۔ اور پھر ایک بڑے رجسٹر میں کچھ درج کرنے کے بعد ادھر اُدھر ٹہلتا رہے یا حقہ پیتا رہے وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا۔ البتہ جب کبھی معائنے کے لیے کسی افسر کی موٹر ادھر سے گزرتی تھی تو وہ اپنی چارپائی اٹھوا ہمارے پاس کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی اس چالاکی پر ہم دل ہی دل میں بہت ہنسا کرتے تھے۔ ایک روز جبکہ صبح سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اور ہم بارہ بجے کھانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول اپنے کام میں مشغول تھے۔ موٹر کے ہارن نے ہمیں چونکا دیا لاریوں کی نسبت ہم موٹروں کے دیکھنے کے بہت شائق تھے۔ اس لیے کہ ان میں ہماری بھُوکی نظروں کے دیکھنے کے لیے عجیب و غریب چیزیں نظر آتی تھیں۔ ہم کمریں سیدھی کر کے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں موٹر کے عقب سے سبز رنگ کی ایک چھوٹی موٹر نمودار ہوئی جب یہ ہمارے قریب پہنچی۔ تو ہم نے دیکھا کہ اس کی باڈی بارش کے ننھے ننھے قطروں کے نیچے چمک رہی ہے بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ پچھلی سیٹ پر جو دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک اپنی رانوں پر گراموفون رکھے بجا رہے تھے۔ جب یہ موٹر ہمارے مقابل آئی تو ریکارڈ کی آواز سڑک کے ساتھ والی پہاڑی کے پتھروں سے ٹکرا کر فضا میں گونجی۔ کوئی گا رہا تھا۔ نہ میں کسی کا، نہ کوئی میرا چھایا چاروں اور اندھیرا اب کچھ سوجھت ناہیں، موہے اب کچھ آواز میں بے حد درد تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ ہم شاید بحرِ ظلمات میں ڈُوب گئے۔ جب موٹر اپنی نیم وا کھڑکیوں سے اس گیت کے دردناک سُر بکھیرتی ہوئی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تو ہم سب نے ایک آہ بھر کر اپنا کام شروع کر دیا۔ شام کے قریب جب سُورج کی سرخ اور گرم ٹکیا پگھلے ہُوئے تانبے کا رنگ اختیار کر کے ایک سیاہ پہاڑی کے پیچھے چھپ رہی تھی۔ اور اس کی عنابی کرنیں دراز قد درختوں کی چوٹیوں سے کھیل رہی تھیں۔ سبز رنگ کی وہی موٹر اس طرف سے واپس آتی دکھائی دی۔ جدھر وہ دوپہر کو گئی تھی۔ جب ہم نے اس کے ہارن کی آواز سنی تو کام چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ ہمارے آگے سے گزر گئی۔ اور پھر دفعتہ ہم سے آدھی جریب کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ باجا جو اس میں بج رہا تھا۔ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پچھلی سیٹ سے ایک نوجوان دروازہ کھول کر باہر نکلا، اور اپنی پتلون کو کمر پر سے درست کرتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا، اور آہستہ آہستہ اس پل کی طرف روانہ ہو گیا، جو سامنے نالے پر بندھا ہوا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ وہ نالے کے پانی کا نظارہ کرنے کے لیے گیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر ادھر سے گزرنے والے مسافر کیا کرتے تھے۔ ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ابھی ہمیں اپنا کام شروع کیے پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو گا کہ پُل کی طرف سے تالی کی آواز بلند ہُوئی۔ ہم نے مُڑ کر دیکھا۔ پتلون پوش نوجوان سڑک کے ساتھ پتھروں سے چُنی ہوئی دیوار کے پاس کھڑا غالباً موٹر میں اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ سنگین منڈیر پر اس نوجوان سے کچھ دُور ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم میں سے ایک نے اپنے بیلچے کو بڑے زور سے موری کی گیلی مٹی میں گاڑتے ہُوئے کہا۔

”یہ رام دئی ہے“

کالونے جو اس کے پاس کھڑا تھا۔ دریافت کیا

”رام دئی؟“

”سنتو چمار کی لڑکی اور کون؟“

۔ اس کے لہجے میں بیلچے کے لوہے ایسی سختی تھی۔ ہم باقی چار حیران تھے کہ اس گفتگو کا مطلب کیا ہے۔ اگر وہ لڑکی جو منڈیر پر بیٹھی ہے۔ سنتو چمار کی لڑکی ہے، تو کون سی اہم بات ہے، کہ ہمارا ساتھی اس قدر تیز بول رہا ہے۔ ہم غور کر رہے تھے۔ کہ فضل نے جو ہم سب سے عمر میں بڑا تھا۔ اور نماز روزے کا بہت پابند تھا۔ اپنی داڑھی کھجلاتے ہوئے نہایت ہی مفکرانہ لہجے میں کہا:۔

”دنیا میں ایک اندھیر مچا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ خُدا معلوم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔“

یہ سُن کر ہم باقی تین اصل معاملے سے آگاہ ہو کر سب کچھ سمجھ گئے۔ اور اس احساس نے ہمارے دلوں میں غم اور غصّے کی ایک عجیب کیفیت طاری کر دی۔ تالی کی آواز سُن کر موٹر کی پچھلی نشست سے پتلون پوش کے ساتھی نے اپنا سر باہر نکالا۔ اور یہ دیکھ کر کہ اس کا دوست اُسے بلا رہا ہے۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اور ہمارے قریب سے گزرتا ہوا پُل کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہم بیوقوف بکریوں کی طرح اسے اپنے دوست کے پاس جاتا دیکھتے رہے۔ جب پتلون پوش نوجوان کا دوست اس کے پاس پہنچ گیا۔ تو وہ دونوں لڑکی کی طرف بڑھے۔ اور اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر کالو پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اور خشم آلود لہجے میں بولا:۔ بدمعاش۔۔۔۔۔۔۔۔۔“!

فضل نے سرد آہ بھری اور مغموم لہجے میں کہنے لگا۔

”جب سے یہ سڑک بنی ہے۔ اور ایسے بابوؤں کی آمدورفت زیادہ ہو گئی ہے۔ یہاں کے تمام علاقوں میں گندگی پھیل گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ سڑک بننے سے بہت آرام ہو گیا ہے۔ ہو گا مگر اس قسم کی بے شرمی کے نظارے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خدا بچائے“!

اس دوران میں پتلون پوش کے ساتھی نے لڑکی کو بازو سے پکڑ لیا۔ اور غالباً اس کو اُٹھ کر چلنے کے لیے کہا۔ مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ یہ دیکھ کر کالو سے نہ رہا گیا اور اس نے رام پرشاد سے کہا

”آؤ یہ لوگ تو اب دست درازی کر رہے ہیں۔“

کالو یہ کہہ کر اکیلا ہی اس جانب بڑھنے کو تھا۔ کہ ہم نے اسے روک دیا، اور یہ مشورہ دیا، کہ تمام معاملہ پنڈت کے گوش گزار کر دیا جائے۔ جو چارپائی پر سو رہا ہے اور پھر جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے۔ اس تجویز کو معقول خیال کر کے ہم سب پنڈت کے پاس گئے اور اسے جگا کر سارا قصّہ سنا دیا۔ اس نے ہماری گفتگو کو بڑی بے پروائی سے سُنا۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ اور ان دو نوجوانوں کی طرف دیکھ کر جو اب رام دئی کو خدا معلوم کس طریقے سے منا کر اپنے ساتھ لا رہے تھے کہا۔

”جاؤ تم اپنا کام کرو۔ میں ان سے خود دریافت کر لوں گا۔“

یہ جواب سن کر ہم بے چارگی کی حالت میں اپنے کام پر آ گئے۔ لیکن ہم سب کی نگاہیں رام دئی اور ان دو نوجوانوں پر جمی ہوئی تھی۔ جو اب پُل طے کر کے پنڈت کی چارپائی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ لڑکے آگے تھے۔ اور رام دئی تھکی ہوئی گھوڑی کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جب وہ سب پنڈت کے آگے سے گزرنے لگے۔ تو وہ چارپائی پر سے اٹھا۔۔۔۔۔۔۔ دو تین منٹ تک ان سے کچھ باتیں کرنے کے بعد وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ جب پنڈت، رام دئی اور وہ نوجوان ہمارے پاس سے گزرے۔ تو ہم نے دیکھا کہ نوجوانوں کے چہروں پر ایک حیوانی جھلک ناچ رہی ہے۔ اور پنڈت بڑے ادب سے ان کے ساتھ چل رہا ہے۔ رام دئی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ موٹر کے پاس پہنچ کر پنڈت نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا۔ پہلے پتلون پوش پھر رام دئی اور اس کے بعد دوسرا نوجوان موٹر میں داخل ہو گئے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے موٹر چلی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور ہم آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

”شیطان، مردود“!!

کالو نے بڑے اضطراب سے یہ دو لفظ ادا کیے۔ اتنے میں پنڈت آ گیا۔ اور ہم کو مضطرب دیکھ کر ایک مصنوعی آواز میں کہنے لگا۔ میں نے ان سے دریافت کیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں۔ اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہُوئے ہیں۔ تھوڑی دور لے جا کر اسے چھوڑ دیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔ امیر آدمی ہیں۔ ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔“

یہ کہہ کر پنڈت چلا گیا۔ ہم دیر تک خُدا معلوم کن گہرائیوں میں غرق رہے۔ کہ دفعتہ فضل کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ دو مرتبہ زور سے تھوک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گیلا کیا۔ اور بیلچے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا۔

”اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے“!

شکاری عورتیں

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشکاری عورتیں

میں آج آپ کو چند شکاری عورتوں کے قصّے سناؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی کبھی ان سے واسطہ پڑا ہو گا۔ میں بمبئی میں تھا۔ فلمستان سے عام طور پر برقی ٹرین سے چھ بجے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ لیکن اس روز مجھے دیر ہو گئی۔ اس لیے کہ

”شکاری“

کی کہانی پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ میں جب بمبئے سنٹرل کے اسٹیشن پر اترا، تو میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے باہر نکلی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا۔ اس کی چال بڑی انوکھی سی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ فلم کا منظر نامہ لکھ رہی ہے۔ میں اسٹیشن سے باہر آیا اور پل پر وکٹوریا گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ میں تیز چلنے کا عادی ہوں اس لیے میں دوسرے مسافروں سے بہت پہلے باہر نکل آیا تھا۔ وکٹوریا آئی اور میں اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے کوچوان سے کہا کہ آہستہ آہستہ چلے اس لیے کہ فلمستان میں کہانی پر بحث کرتے کرتے میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ وکٹوریا والا آہستہ آہستہ پُل پر سے اترنے لگا۔ جب ہم سیدھی سڑک پر پہنچے تو ایک آدمی سر پر ٹاٹ سے ڈھکا ہوا مٹکا اٹھائے صدا لگا رہا تھا۔

”قلفی۔ قلفی“!

جانے کیوں میں نے کوچوان سے وکٹوریہ روک لینے کے لیے کہا، اور اس قُلفی بیچنے والے سے کہا ایک قلفی دو۔ میں اصل میں اپنی طبیعت کا تکدر کسی نہ کسی طرح دور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے ایک دونے (پتوں کا پیالہ) میں قلفی دی۔ میں کھانے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی دھم سے وکٹوریا میں آن گھسا۔ کافی اندھیرا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہی گہرے رنگ کی سانولی لڑکی تھی۔ میں بہت گھبرایا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ دونے میں میری قلفی پگھلنا شروع ہو گئی۔ اس نے قلفی والے سے بڑے بے تکلّف انداز میں کہا

”ایک مجھے بھی دو۔“

اس نے دے دی۔ گہرے سانولے رنگ کی لڑکی نے اسے ایک منٹ میں چٹ کر دیا اور وکٹوریا والے سے کہا

”چلو۔“

میں نے اس سے پوچھا

”کہاں؟“

”جہاں بھی تم چاہتے ہو۔“

”مجھے تو اپنے گھر جانا ہے۔“

”تو گھر ہی چلو۔“

”تم ہو کون؟“

”کتنے بھولے بنتے ہو۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

”گھر جانا ٹھیک نہیں۔ اور یہ وکٹوریا بھی غلط ہے۔ کوئی ٹیکسی لے لیتے ہیں۔“

وہ میرے اس مشورے سے بہت خوش ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے نجات کیسے حاصل کروں۔ اسے دھکا دے کر باہر نکالتا تو اُودھم مچ جاتا۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ عورت ذات ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر کہیں وہ یہ واویلا نہ مچا دے کہ میں نے اس سے ناشائستہ مذاق کیا ہے۔ وکٹوریا چلتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ یہ مصیبت کیسے ٹل سکتی ہے۔ آخر ہم بے بی ہسپتال کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں ٹیکسیوں کا اڈہ تھا۔ میں نے وکٹوریا والے کو اس کا کرایہ ادا کیا اور ایک ٹیکسی لے لی۔ ہم دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے پوچھا

”کدھر جانا ہے صاحب؟“

میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے اس سے زیر لب کہا۔

”مجھے کہیں بھی نہیں جانا ہے۔ یہ لو دس روپے۔ اس لڑکی کو تم جہاں بھی لے جانا چاہو لے جاؤ۔“

وہ بہت خوش ہوا۔ دوسرے موڑ پر اس نے گاڑی ٹھہرائی اور مجھ سے کہا

”صاحب آپ کو سگریٹ لینے تھے۔ اس ایرانی کے ہوٹل سے سستے مل جائیں گے۔“

میں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ گہرے رنگ کی لڑکی نے کہا۔

”دو پیکٹ لانا۔“

ڈرائیور اس سے مخاطب ہوا۔

”تین لے آئیں گے۔“

اور اس نے موٹر اسٹارٹ کی اور یہ جاوہ جا۔۔ بمبئی ہی کا واقعہ ہے میں اپنے فلیٹ میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میری بیوی شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹن جو بڑے تیکھے نقشوں والی تھی، بے دھڑک اندر چلی آئی۔ میں نے سوچا شاید نوکری کی تلاش میں آئی ہے۔ مگر وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سُلگا کر مسکرانے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا

”کون ہو تم؟“

”تم پہچانتے نہیں۔“

”میں نے آج پہلی دفعہ تمہیں دیکھا ہے۔“

”سالا جھوٹ مت بولو۔ دو روز دیکھتا ہے۔“

میں بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد میرا نوکر فضل دین آ گیا۔ اس نے اس تیکھے نقشوں والی گھاٹن کو اپنی تحویل میں لے لیا۔۔ یہ واقعہ لاہور کا ہے۔ میں اور میرا ایک دوست ریڈیو اسٹیشن جا رہے تھے۔ جب ہمارا تانگہ اسمبلی ہال کے پاس پہنچا تو ایک تانگہ ہمارے عقب سے نکل کر آگے آ گیا۔ اس میں ایک برقع پوش عورت تھی جس کی نقاب نیم وا تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی شرارت ناچنے لگی۔ میں نے اپنے دوست سے جو پچھلی نشست پر بیٹھا تھا، کہا۔

”یہ عورت بد چلن معلوم ہوتی ہے۔“

”تم ایسے فیصلے ایک دم مت دیا کرو۔“

”بہت اچھا جناب۔ میں آئندہ احتیاط سے کام لوں گا۔“

برقع والی عورت کا تانگا ہمارے تانگے کے آگے آگے تھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں بڑا بزدل ہوں، لیکن اس وقت مجھے شرارت سُوجھی اور میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آداب عرض کر دیا۔ اس کے آدھ ڈھکے چہرے پر مجھے کوئی ردِّ عمل نظر نہ آیا جس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میرا دوست گٹکنے لگا۔ اس کو میری اس ناکامی سے بڑی مسرت ہوئی لیکن جب ہمارا ٹانگہ شملہ پہاڑی کے پاس پہنچ رہا تھا تو برقع پوش عورت نے اپنا ٹانگہ ٹھہرا لیا اور (میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا) وہ نیم اٹھی ہوئی نقاب کے اندر مسکراتی ہوئی آئی اور ہمارے ٹانگے میں بیٹھ گئی۔ میرے دوست کے ساتھ۔ میری سمجھ میں نہ آیا کیا کیا جائے۔ میں نے اس برقع پوش عورت سے کوئی بات نہ کی، اور ٹانگے والے سے کہا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن کا رُخ کرے۔ میں اسے اندر لے گیا۔ ڈائریکٹر صاحب سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

”یہ خاتون ہمیں رستے میں پڑی ہوئی مل گئی۔ آپ کے پاس لے آیا ہوں، اور درخواست کرتا ہوں کہ انہیں یہاں کوئی کام دلوا دیجیے۔“

انہوں نے اس کی آواز کا امتحان کرایا جو کافی اطمینان بخش تھا۔ جب وہ آڈیشن دے کر آئی تو اس نے برقع اتارا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس کے قریب ہو گی۔ رنگ گورا آنکھیں بڑی بڑی۔ لیکن اس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے شکر قندی کی طرح بھوبل میں ڈال کر باہر نکالا گیا ہے۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں چپڑاسی آیا۔ اس نے کہا کہ باہر ایک ٹانگہ والا کھڑا ہے، وہ کرایہ مانگتا ہے۔ میں نے سوچا شاید زیادہ عرصہ گزرنے پر وہ تنگ آ گیا ہے، چنانچہ میں باہر نکلا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے پوچھا

”بھئی کیا بات ہے۔ ہم کہیں بھاگ تو نہیں گئے۔“

وہ بڑا حیران ہوا

”کیا بات ہے سرکار۔“

”تم نے کہلا بھیجا ہے کہ میرا کرایہ ادا کرو۔“

”میں نے جناب کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔“

اس کے تانگے کے ساتھ ہی ایک دوسرا تانگہ کھڑا تھا۔ اس کا کوچوان جو گھوڑے کو گھاس کھلا رہا تھا، میرے پاس آیا اور کہا

”وہ عورت جو آپ کے ساتھ گئی تھی، کہاں ہے؟“

”اندر ہے۔ کیوں؟“

”جی اس نے دو گھنٹے مجھے خراب کیا ہے۔ کبھی ادھر جاتی تھی، کبھی ادھر۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ اسے کہاں جانا ہے۔“

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

”جی میں اپنا کرایہ چاہتا ہوں۔“

”میں اسے لے کر آتا ہوں۔“

میں اندر گیا۔ اس برقع پوش عورت سے جو اپنا برقع اتار چکی تھی، کہا۔

”تمہارا تانگے والا کرایہ مانگتا ہے۔“

وہ مسکرائی

”میں دے دوں گی۔“

میں نے اس کا پرس جو صوفے پر پڑا تھا، اٹھایا۔ اس کو کھولا۔ مگر اس میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ بس کے چند ٹکٹ تھے اور دو بالوں کی پنیں۔ اور ایک واہیات قسم کی لپ اسٹک۔ میں نے وہاں ڈائریکٹر کے دفتر میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ان سے رخصت طلب کی۔ باہر آکر اس کے تانگے والے کو دو گھنٹوں کا کرایہ ادا کیا، اور اس عورت کو اپنے دوست کی موجودگی میں کہا

”تمہیں اتنا تو خیال ہونا چاہیے تھا کہ تم نے تانگہ لے لیا ہے اور تمہارے پاس ایک کوڑی بھی نہیں۔“

وہ کھسیانی ہوگئی

”میں۔ میں۔ آپ بڑے اچھے آدمی ہیں۔“

”میں بہت برا ہوں۔ تم بڑی اچھی ہو۔ کل سے ریڈیو اسٹیشن آنا شروع کر دو۔ تمہاری آمدن کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ یہ بکواس جو تم نے شروع کر رکھی ہے، اسے ترک کرو۔“

میں نے اسے مزنگ کے پاس چھوڑ دیا۔ میرا دوست واپس چلا گیا۔ اتفاقاً مجھے ایک کام سے وہاں جانا پڑا۔ دیکھا کہ میرا دوست اور وہ عورت اکٹھے جا رہے تھے۔۔ یہ بھی لاہور ہی کا واقعہ ہے۔ چند روز ہوئے، میں نے اپنے دوست کو مجبور کیا کہ وہ مجھے دس روپے دے۔ اس دن بنک بند تھے۔ اس نے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن جب میں نے اس پر زور دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ دس روپے پیدا کرے۔ اس لیے کہ مجھے اپنی ایک علت پوری کرنا ہے، جس سے تم بخوبی واقف ہو، تو اس نے کہا

”اچھا‘ میرا ایک دوست ہے وہ غالباً اس وقت کافی ہاؤس میں ہو گا۔ وہاں چلتے ہیں امید ہے کام بن جائے گا۔“

ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر کافی ہاؤس پہنچے۔ مال روڈ پر بڑے ڈاک خانے کے قریب ایک ٹانگہ جا رہا تھا۔ اس میں ایک نسواری رنگ کا برقع پہنے ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس کی نقاب پوری کی پوری اٹھی ہوئی تھی۔ وہ ٹانگے والے سے بڑے بے تکلف انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ہمیں اس کے الفاظ سنائی نہیں دیے۔ لیکن اس کے ہونٹوں کی جنبش سے جو کچھ مجھے معلوم ہوتا تھا ہو گیا۔ ہم کافی ہاؤس پہنچے تو عورت کا تانگہ بھی وہیں رک گیا۔ میرے دوست نے اندر جا کے دس روپوں کا بندوبست کیا اور باہر نکلا۔ وہ عورت نسواری برقعے میں جانے کس کی منتظر تھی۔ ہم واپس گھر آنے لگے تو رستے میں خربوزوں کے ڈھیر نظر آئے۔ ہم دونوں تانگے سے اتر کر خربوزے پرکھنے لگے۔ ہم نے باہم فیصلہ کیا کہ اچھے نہیں نکلیں گے کیونکہ ان کی شکل و صورت بڑی بے ڈھنگی تھی۔ جب اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ نسواری برقع تانگے میں بیٹھا خربوزے دیکھ رہا ہے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا

”خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ آپ نے ابھی تک یہ نسواری رنگ نہیں پکڑا۔“

اس نے کہا

”ہٹاؤ جی۔ یہ سب بکواس ہے۔“

ہم وہاں سے اٹھ کر تانگے میں بیٹھے۔ میرے دوست کو قریب ہی ایک کیمسٹ کے ہاں جانا تھا۔ وہاں دس منٹ لگے۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ نسواری برقع اسی تانگے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ میرے دوست کو بڑی حیرت ہوئی

”یہ کیا بات ہے؟۔ یہ عورت کیوں بیکار گھوم رہی ہے؟“

میں نے کہا

”کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہو گی۔“

ہمارا تانگہ ہال روڈ کو مڑنے ہی والا تھا کہ وہ نسواری برقع پھر نظر آیا۔ میرے دوست گو کنوارے ہیں، لیکن بڑے زاہد۔ ان کو جانے کیوں اُکساہٹ پیدا ہوئی کہ اس نسواری برقعے سے بڑی بلند آواز میں کہا۔

”آپ کیوں آوارہ پھر رہی ہیں۔ آیئے ہمارے ساتھ۔“

اس کے تانگے نے فوراً رُخ بدلا اور میرا دوست سخت پریشان ہو گیا۔ جب وہ نسواری برقع ہم کلام ہوا تو اس نے اس سے کہا

”آپ کو تانگے میں آوارہ گردی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

میرے دوست نے اس نسواری برقعے سے شادی کر لی۔

شلجم

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشلجم

کھانا بھجوا دو میرا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے“

”تین بج چکے ہیں اس وقت آپ کو کھانا کہاں ملے گا۔؟

”تین بج چکے ہیں تو کیا ہوا۔ کھانا تو بہر حال ملنا ہی چاہیے۔ آخر میرا حصہ بھی تو اس گھر میں کسی قدر ہے۔

”کس قدر ہے۔“

”تو اب تم حسابدان بن گئیں جمع تفریق کے سوال کرنے لگیں مجھ سے“

”جمع تفریق کے سوال نہ کروں تو یہ گھر کب کا اُجڑ گیا ہوتا۔“

”کیا بات ہے آپ کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے کھانا ملے گا یا نہیں‘

”آپ ہر روز تین بجے آئیں تو کھانا خاک ملے گا۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ اگر آپ اس وقت کسی ہوٹل میں جائیں تو وہاں سے بھی آپ کو دال روٹی نہیں مل سکے گی مجھے آپ کا یہ وطیرہ ہر گز پسند نہیں“

”کون سا وطیرہ۔“

”یہی کہ آپ تین بجے تشریف لائے ہیں کھانا پڑا جھک مارتا رہتا ہے میں الگ انتظار کرتی رہتی ہوں مگر آنجناب خدا معلوم کہاں غائب رہتے ہیں“

”بھئی دنیا میں انسان کو کئی کام ہوتے ہیں میں صرف دو دن ہی تو ذرا دیر سے آیا۔

”ذرا دیر سے۔؟ ہر خاوند کو چاہیئے کہ وہ گھر میں بارہ بجے موجود ہو تاکہ اسے 1 بجے تک کھانا مل جائےٗ اس کے علاوہ اسے اپنی بیوی کا تابع فرمان ہونا چاہیے اس لیے یہی بہتر ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں جا رہے جہاں کے تمام نوکر اور بہرے اس کے تابع فرمان ہوں۔

”آپ کا ارادہ تو یہی ہے جب ہی تو آپ کئی دن سے پر تول رہے ہیں میں آپ سے کہتی ہوں ابھی چلے جایئے۔

”کھانا کھائے بغیر۔“

”جایئے ہوٹل میں آپ کو مل جائے گا۔

”لیکن تم نے تو ابھی کہا تھا کہ اس وقت کسی ہوٹل میں بھی دال روٹی نہیں ملے گی بات کر کے بھول جاتی ہو۔“

”میرا دماغ خراب ہو چکا ہے بلکہ کر دیا گیا ہے“

”یہ تو صحیح ہے کہ تمہارا دماغ خراب ہے لیکن یہ خرابی کس نے پیدا کی“

”خدا نہ کرے تم مرد۔ لیکن مجھے یہ تو بتاؤ“

میرے بغیر تمہارا گزارہ کیسے ہو گا۔“

”میں اپنی موٹر بیچ دُوں گی۔“

اس سے تمہیں کتنا روپیہ مل جائے گا۔“

”چھ سات ہزار تو مل ہی جائیں گے“

ان چھ سات ہزار روپوں میں تم کتنے عرصہ تک اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکو گی۔

”میں آپ کی طرح لکھ لُٹ اور فضول خرچ نہیں آپ دیکھیے گا میں ان روپوں میں ساری عُمر گزار دُوں گی میرے بال بچے اسی طرح پلیں گے جس طرح اب پل رہے ہیں۔ یہ“

”یہ ترکیب مجھے بھی بتادو مجھے یقین ہے کہ تمھیں کوئی ایسا منتر ہاتھ آگیا ہے جس سے تم نوٹ دُگنے بنا سکتی ہو ہر روز بٹوے سے نوٹ نکالے ان پر منتر پھونکا اور وہ دُگنے ہو گئے۔

”آپ میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ شرم آنی چاہیے آپ کو۔

”چلو ہٹاؤ اس قصے کو۔ کھانا دو مجھے۔“

”کھانا آپ کو نہیں ملے گا۔“

”بھئی آخر کیوں۔ میرا قصور کیا ہے“

”آپ کے قصور اور آپ کی خطائیں اگر میں گنوانا شروع کروں تو میری ساری عمر بیت جائے۔

”آپ نے اور کس نے میری جان کا روگ بنے ہوئے ہیں مجھے نہ رات کا چین نصیب ہے نہ دن کا۔ دن کا تم چھوڑو رات کا چین آپ کو نصیب کیوں نہیں۔ بڑے اطمینان سے سوئی رہتی ہیں جیسے محاورے۔ کے مطابق کوئی گھوڑے بیچ کر سو رہا ہو۔ اپنے گھوڑے بیچ کر آدمی کیسے سو سکتا ہے کتنا واہیات محاورہ ہے“

واہیات ہی سہی لیکن ابھی چند روز ہوئے تم نے گھوڑا اور اس کے ساتھ تانگہ بھی بیچ ڈالا تھا اور اُس دن تم رات بھر خراٹے لیتی رہی تھیں۔ مجھے تانگہ رکھنے کی کیا ضرورت تھی، جب کہ آپ نے مجھے موٹر لے دی تھی اور خراٹے بھرنے کا الزام بھی غلط ہے۔

”محترمہ جب آپ خواب خرگوش میں تھیں تو آپ کو کیسے پتہ چلتا کہ آپ خراٹے لیتی ہیں بخدا اس رات میں بالکل نہ سو سکا۔

”اس کا اوّل جھوٹ اور اس کا آخر جھوٹ“

”چلیے تمہاری خاطر اب مان لیا۔ اب کھانا دو۔“

”کھانا نہیں ملے گا آج۔ آپ کسی ہوٹل میں جایئے اور میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ وہیں بسیرا کر لیجیے۔

”تم کیا کرو گی۔“

”میں۔ میں مر تو نہیں جاؤں گی آپ کے بغیر۔“

”دیکھو بیگم اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اگر تم نے کھانا نہ دیا تو میں اس گھر کو آگ لگا دُوں گا غضب خدا کا میرے پیٹ کا بھوک کے مارے بُرا حال ہو گیا ہے اور تم واہی تباہی بک رہی ہو مجھے کل اور آج ایک ضروری کام تھا اس لیے مجھے دیر ہو گئی اور تم نے مجھ پر الزام دھر دیا کہ میں ہر روز دیر سے آتا ہوں کھانا دو مجھے ورنہ۔“

”آپ مجھے ایسی دھونس نہ دیں، کھانا نہیں ملے گا آپ کو“

”یہ میرا گھر ہے میں جب چاہوں آؤں جب چاہوں جاؤں تم کون ہو کہ مجھ پر ایسی سختیاں کرو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ تمہارا یہ مزاج تمہارے حق میں اچھا ثابت نہیں ہو گا۔“

”آپ کا مزاج میرے حق میں تو بڑا اچھا ثابت ہوا ہے۔ دن رات کڑھ کڑھ کے میرا یہ حال ہو گیا ہے۔“

”دس پاؤنڈ وزن اور بڑھ گیا ہے بس یہی حال ہوا ہے تمہارا۔ اور میں تمہاری زُود رنج اور چڑچڑی طبیعت کے باعث بیمار ہو گیا ہوں۔“

”کیا بیماری ہے آپ کو۔“

”تم نے کبھی پوچھا ہے کہ میں اس قدر تھکا تھکا کیوں رہتا ہے۔ کبھی تم نے غور کیا کہ سیڑھیاں چڑھتے وقت میرا سانس کیوں پھول جاتا ہے۔ کبھی تم کو اتنی توفیق ہوئی کہ میرا سر ہی دبائیں جو اکثر درد کے باعث پھٹنے کے قریب ہوتا ہے تم عجیب قسم کی رفیقۂ حیات ہو“

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ ایسا خاوند میرے پلے باندھ دیا جائے گا تو میں نے وہیں اپنے گھر پر ہی زہر پھانک لیا ہوتا۔“

”زہر تم اب بھی پھانک سکتی ہو۔ کہو تو میں ابھی لا دُوں“

”لے آیئے۔“

”لیکن مجھے پہلے کھانا کھلا دو“

”میں کہہ چکی ہوں وہ نہیں ملے گا آپ کو آج“

”کل سے تو خیر مل ہی جائے گا۔ اس لیے میں کوشش کرتا ہوں“

”آپ کیا کوشش کیجیے گا۔“

”خانساماں کو بُلاتا ہوں“

”آپ اُسے نہیں بلا سکتے۔“

”کیوں۔؟“

”بس میں نے کہہ جو دیا کہ آپ کو ان معاملوں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں“

”حد ہو گئی۔ اپنے گھر میں اپنے خانساماں کو بھی نہیں بلا سکتا۔

”نوکر کہاں ہے۔“

”جہنم میں۔“

”اس وقت میں بھی اُسی جگہ ہوں لیکن میں اس کو دیکھ نہیں پاتا ادھر ہٹو ذرا میں اسے تلاش کروں شاید مل جائے۔“

”اس سے کیا کہنا ہے آپ کو۔؟“

”کچھ نہیں۔ صرف اتنا کہوں گا کہ تم علیحدہ ہو جاؤ تمہارے بدلے میں اس گھر کی نوکری خود کیا کروں گا۔“

”آپ کر چکے۔“

”سلام حضور۔ بیگم صاحب سالن تیار ہے صاحب لگاؤں ٹیبل پر۔“

”تم دُور دفعان ہو جاؤ یہاں سے“

”لیکن بیگم صاحب آپ نے صبح جب خود باورچی خانے میں شلجم پکائے تو وہ سب کے سب جل گئے کہ آنچ تیز تھی اس کے بعد آپ نے آرڈر دیا کہ صاحب دیر سے آئیں گے اس لیے تم جلدی جلدی کوئی اور سالن تیار کر لو سو میں نے آپ کے حکم کے مطابق دو گھنٹوں کے اندر اندر دو سالن تیار کر لیے ہیں اب فرمائیں ٹیبل لگا دوں دونوں انگیٹھیوں پر دھرے ہیں ایسا نہ ہو آپ کے شلجموں کی طرح جل کر کوئلہ ہو جائیں۔ میں جاتا ہوں آپ جب بھی آرڈر دیں گی خادم ٹیبل لگا دے گا۔“

”تو یہ بات تھی۔“

”کیا بات تھی۔ میں اتنی دیر تک باورچی خانے کی گرمی میں جھلستی رہی اس کا آپ کو کچھ خیال ہی نہیں۔ آپ کو شلجم پسند ہیں تو میں نے سوچا خود اپنے ہاتھ سے پکاؤں کتاب ہاتھ میں تھی جس میں ساری ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے میں سو گئی اور وہ کم بخت شلجم جل بھُن کر کوئلہ بن گئے۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے۔“

”کوئی قصور نہیں۔“

”چلیے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں“

”یہاں تو بڑے بڑے مگرمچھ دوڑ رہے ہیں“

”ہر بات میں مذاق۔“

”مذاق برطرف۔ ذرا ادھر آؤ۔ میں تمہارے شلجم دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہیں وہ بھی کوئلہ نہیں بن گئے۔“

”کھانا کھانے کے بعد دیکھا جائے گا۔“

شہ نشین پر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشہ نشین پر

وہ سفید سلمہ لگی ساڑی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہُوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا انار چھوڑ دیا ہے۔ ساڑی کے تھرکتے ہُوئے ریشمی کپڑے پر جب جگہ جگہ سلمہ کا کام ٹمٹمانے لگتا تو مجھے جسم پر وہ تمام ٹمٹماہٹیں گدگدی کرتی محسوس ہوتیں۔۔۔۔۔۔ وہ خود ایک عرصہ سے میرے لیے گدگدی بنی ہوئی تھی۔ میں اس کو تقریباً دو سو مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ اور ان تمام درشنوں کے نقوش علیحدہ علیحدہ میرے دل و دماغ پر مرتسم ہیں۔ ایک بار میں نے اسے صحن میں تیتری کے پیچھے دوڑتے دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ میری نگاہوں کے سامنے آئی اور گزر گئی۔ اور جب کبھی میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے دل میں ایک ایسے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ جو ڈر کر ایکا ایکی اُڑ جائے۔ اسی طرح ایک روز میں نے اسے شہ

نشین پر دھوپ میں اپنے گیلے بال جھٹکتے دیکھا تھا۔ اور اب میں جس وقت اس تصویر کو اپنے ذہن کے پردے پر کھینچتا ہوں تو مجھے کبھی سیاہی نظر آتی ہے اور کبھی اُجالا۔ میں اس کو اتنا دیکھ چکا ہوں کہ اب میں اس کے سامنے آئے بغیر اسے جب چاہوں دیکھ سکتا ہوں۔ پہلے پہل مجھے اس کام میں دقّت محسوس ہوئی تھی مگر اب کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ ابھی کل شام کو جب مجھے ایک دوست کے یہاں بیٹھے بیٹھے اُسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ تو میں نے آنکھیں بند کیے بغیر اسے اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ ہو بہو ویسی تھی جیسی کہ وہ ہے اور اس بات کا نہ میرے دوست کو پتہ چلا اور نہ اس کی بہن کو جو میرے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اسے اپنے ذہن کی ڈبیا میں سے نکال کر دیکھا۔ اور فوراً ہی وہیں بند کر دیا۔ کسی کو معلوم تک نہ ہوا۔ کہ میں نے کیا کر دیا ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد میں نے یوں سلسلہ کلام شروع کیا۔ گویا میرا ذہن ایک لمحے کے لیے بھی غیر حاضر نہ ہوا تھا۔۔۔

”جی ہاں سوکھی ہوئی مچھلیوں سے سخت بُو آتی ہے۔ نہ جانے یہ لوگ انھیں کھاتے کس طرح ہیں۔ میری تو ناک۔۔۔۔۔“

اور اس کے بعد مختلف قسم کی ناکوں پر گفتگو شروع ہو گئی تھی۔ اس کی ناک مجھے بہت پسند ہے۔ میرے پاس ہلکے گلابی رنگ کا ٹی سیٹ ہے جو مجھے صرف اس لیے عزیز ہے کہ اس کی پیالیوں کی دستی اس کی ناک سے ملتی جلتی ہے۔ آپ ہنسیں گے۔ مگر۔۔۔۔ ایک روز صبح کو جب میں نے اسے قریب سے دیکھا تو میرے دل میں عجیب و غریب خواہش پیدا ہُوئی کہ اس کی ناک پکڑ کر اس کے ہونٹوں کا رس پی لُوں۔ اس کے ہونٹ مجھے پیارے لگتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر وقت نم آلود رہتے تھے۔ یہ نمی ان میں سنگترے کی لڑیوں کی مانند چمک پیدا کر دیتی تھی۔ ان کے چومنے کی خواہش اگر میرے دل میں پیدا ہوتی تھی تو اس کا باعث یہ نہ تھا۔ کہ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ اور لوگوں سے سُنا تھا کے عورتوں کے ہونٹ چومے جاتے ہیں۔۔۔۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا تو بھی میرے دل میں ان کو چومنے کی خواہش پیدا ہوتی اس کے ہونٹ ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ وہ ایک نامکمل بوسہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ میرے ہمسائے ڈاکٹر کی اکلوتی لڑکی تھی۔ سارا دن وہ نیچے اپنے باپ کی ڈسپنسری میں بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی جب میں اُسے بازار سے گزرتے ہوئے شیشوں میں سے دوائیوں کی الماری کے پاس کھڑی دیکھتا۔ تو مجھے وہ ایک لمبی گردن والی بوتل دکھائی دیتی جس میں کوئی خوش رنگ سیال مادہ اُبل رہا ہو۔ ایک روز میں ڈسپنسری میں ڈاکٹر صاحب سے دوا لینے کے لیے گیا۔ مجھے زکام کی شکایت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس سے کہا۔

”بیٹا! ان کے رومال پر یوکلپٹس آئیل کے چند قطرے ٹپکا دو۔“

اُس نے میرا رومال لیا۔ اور الماری میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر دوا کے قطرے ٹپکانے لگی۔ اس وقت میرے جی میں آئی کہ اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لوں اور کہوں۔ اس شیشی کو بند کر دیجیے اگر آپ اپنی آنکھوں کا ایک آنسو مجھے عنایت فرما دیں۔ تو میری بہت سی بیماریاں دُور ہو جائیں۔“

لیکن میں خاموش بیٹھا دوا کے ان کے سفید قطروں کی طرف دیکھتا رہا۔ جو میرے رومال میں جذب ہو رہے تھے۔ جب سے میں نے اُسے دیکھنا شروع کیا ہے۔ میری دلی خواہش رہی ہے کہ وہ روئے اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھوں۔ میں نے تصّور میں کئی مرتبہ اس کی آنکھوں کو نمناک دیکھا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میں اُسے سچ مچ روتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی گھنی پلکوں میں پھنسے ہوئے آنسو بہت اچھے معلوم ہوں گے۔ چق پر سے جب بارش کے قطرے رُک رُک کر نیچے پھسل رہے ہوں تو کتنے دلفریب دکھائی دیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے عورت کی آنکھوں میں آپ آنسو ضروری خیال نہ کریں۔ پر میں آنسوؤں کو ہٹا کر عورت کی آنکھوں کا تصّور ہی نہیں کر سکتا۔ آنسو آنکھوں کا پسینہ ہے اور مزدور کی پیشانی صرف اسی صورت میں مزدور کی پیشانی ہو سکتی ہے۔ جب اس پر پسینے کے قطرے چمک رہے ہوں۔ اور عورت کی آنکھیں صرف اسی صورت میں عورت کی آنکھیں ہو سکتی ہیں۔ جب آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہوں۔ وہ سفید سلمہ لگی ساڑی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا انار چھوڑ دیا ہے۔ ساڑی کے تھرکتے ہُوئے ریشمی کپڑے پر جگہ جگہ سلمے کا کام ٹمٹما رہا تھا۔ اور مجھے اپنے جسم پر گدگدی ہو رہی تھی۔ اس نے ایکا ایکی پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ گویا اس کو فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے علاوہ رات کی خاموشی میں کوٹھے پر کوئی اور متنفس بھی ہے۔۔۔۔ اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں دو موتی رول رہی تھیں۔۔۔۔۔ وہ رو رہی تھی۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ رو رہی تھی۔۔۔۔ میرے دیکھتے دیکھتے اور قبل اس کے کہ میں کچھ کر سکوں۔ اس کی آنکھوں سے اس کے شباب کے پہلے پسینے کے قطرے چھلکے اور۔۔۔۔ سنگین فرش پر پھسل گئے۔ وہ میری خلل انداز نگاہوں کی تاب نہ لا سکے۔ وہ دراصل چپ چاپ دوسروں کو خبر کیے بغیر نوزائیدہ بچوں کے مانند تھوڑی دیر ان دو نرم و نازک پنگوڑوں میں لیٹے رہنا چاہتے تھے۔ مگر میری نگاہوں کے شور سے مچل گئے۔ وہ رو رہی تھی۔ پر میں خوش تھا۔ اس کی نم آلود آنکھیں کہرے میں لپٹی ہوئی جھیلیں معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی پُر اسرار بڑی فکر خیز، پانی کی پتلی سی تہ کے نیچے اس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی۔ ان ننھی ننھی مچھلیوں کی مانند جھلملا رہی تھیں۔ جو پانی کے اوپر آنے سے ڈرتی ہوں۔ میں نے اس کو دیکھنا چھوڑ کر اس کی آنکھوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ جس طرح دسمبر کی سرد اور گیلی رات میں کھلی فضا کے اندر دو دیئے جل رہے ہوں۔ اس کی آنکھیں دُور سے بہت دور سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے ان کی طرف بڑھنا شروع کیا۔۔۔۔ دو آنسو بنے، گھنی پلکوں میں تھوڑی دیر پھنسے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے زرد گالوں پر ڈھلک گئے۔ داہنی آنکھ میں ایک اور آنسو بنا، باہر نکلا۔۔۔۔ گال کی ہڈی پر تھوڑی دیر کے لیے اس مسافر کی طرح جس کی منزل قریب ہو، ایک لحظے کے لیے ستایا اور پھسل کر تیزی سے اس کے لبوں کے ایک گوشے کے قریب سے ہو کر آگے دوڑنے والا ہی تھا کہ ہونٹوں کی نمی نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور وہ ایک پتلی سی دھار بن کر پھسل گیا۔ دُھلی ہُوئی آنکھوں سے اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اور پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

وہ جانتی تھی کہ میں کون ہُوں۔ اور یہ پوچھتے ہُوئے کہ میں کون ہُوں۔ وہ میرے بارے میں کچھ دریافت نہ کر رہی تھی۔ بلکہ وہ یہ پوچھ رہی تھی کہ وہ خود کون ہے۔ میں نے جواب دیا۔

”تم شیلا ہو۔“

اُس کے بھنچے ہُوئے ہونٹ ایک خفیف ارتعاش کے ساتھ کھلے اور وہ سسکیوں میں کہنے لگی۔

”شیلا---شیلا-----شی۔“

وہ شہ نشین پر بیٹھ گئی۔ وہ تھکی ہُوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ایکا ایکی اُسے کچھ خیال آیا اور جو خواب وہ دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے دماغ سے جھٹک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے لہجے میں کہنے لگی---مَیں-----مَیں-----کیا کہہ رہی تھی؟------مجھے کچھ نہیں ہوا-----میں اچھی ہوں---------اور میں یہاں کیسے چلی آئی؟“

میں نے اسے بڑے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”گھبراؤ نہیں شیلا-----تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا------ایسی باتیں نہ کہی جاتی ہیں اور نہ سُنی جاتی ہیں۔“

شیلا نے اس انداز سے میری جانب دیکھا۔ گویا میں نے اس کی کوئی چوری پکڑلی ہے کیسی باتیں؟-----کیسی باتیں؟-----کوئی بات بھی تو ہو“!

میں نے اس سے کہا۔

”پرسوں جب تم نیچے ڈسپنسری میں لال لال جِیب نکال کر طوطے سے کھیل رہی تھیں۔ اور تمہاری بلّوریں انگلیاں بوتلوں سے ٹکرا کر ایک عجیب قسم کی جھنکار پیدا کر رہی تھیں۔ اس وقت تم ایک نامکمل عورت تھیں۔ پر آج جبکہ تمہاری آنکھیں رو رہی ہیں۔ تم مکمل عورت بن گئی ہو۔ کیا تمہیں یہ فرق محسوس نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے۔ وہ چیز جو کل تھی آج تم میں نہیں ہے اور جو آج ہے کل نہ رہے گی۔ پر وہ داغ جو مسّرت کا گرم لوہا تمہارے دل پر لگا گیا ہے۔ ہمیشہ ویسے کا ویسا رہے گا-----یہ کتنی اچھی بات ہے-----تمہاری زندگی میں ایک ایسی چیز تو ہو گی۔ جو ساری کی ساری تمہاری ہو گی-----ایک ایسی چیز جس کی ملکیت پر کسی کو رشک نہیں ہو سکتا------کاش میرا دل تمہارا دل ہوتا-----کسی عورت کا دل ہوتا-----جو ایک ہی داغ کو کافی سمجھتا ہے-----عورت کے دل کی آبادی میں کئی ویرانے سما سکتے ہیں-----ویرانوں کا یہ ہجوم بجائے خود ایک آبادی ہے-------تم خوش قسمت ہو------وہ دن جس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑتا۔ تم نے بہت جلد دیکھ لیا-----تم خوش قسمت ہو۔“

وہ میری طرف اس مرغی کی طرح حیرت سے دیکھنے لگی جس نے پہلی بار انڈا دیا ہو۔ وہ اپنے کو ٹٹولنے لگی۔

”خوش قسمت!------میں خوش قسمت-------وہ کیسے؟------آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

میں نے جواب دیا۔

”جب پتنگ کٹ جائے اور کوٹھوں پر چڑھے ہُوئے لونڈے ڈور لُوٹنے کے لیے شور مچانا شروع کر دیں۔ تو کسی کے بتانے کی حاجت نہیں رہتی۔ کہ پتنگ کٹ گیا ہے---جو پتنگ تم نے ہوا کی بلندیوں میں اُڑایا تھا کہاں ہے؟-----کل تک اس کی ڈور تمہارے ہاتھ میں تھی، پر آج نظر نہیں آتی“!

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”------میں خوش قسمت ہوں“

-----آنسوؤں میں بھیگے ہُوئے لفظ اس کے مُنہ سے نکلے“

میں خوش قسمت ہُوں-----آپ ان لونڈوں سے جو ڈور لُوٹنے کے لیے کوٹھوں پر چڑھے رہتے ہیں، کم شور نہیں مچا رہے------“

آنسو اتنی تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے میری طرف اس بارش میں سے دیکھا اور کہا۔

”میری آنکھوں سے آنسو نکال کر آپ کس کا حلق تر کرنا چاہتے ہیں-----میں سب جانتی ہوں۔ یہ سوئیاں آپ مجھے کیوں چبھو رہے ہیں۔“

اُس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس کی عقل اس وقت اس چاقو کے پھل کی مانند تھی۔ جسے ضرورت سے زیادہ سان پر لگایا گیا ہو۔ میں نے اس سے بڑے اطمینان سے کہا۔

”جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کا مجھے علم ہے۔ اور اگر اس وقت میں تم سے یہ سب بھول جانے کے لیے کہتا۔ تم سے مصنوعی الفاظ میں ہمدردی کرتا۔ مداریوں کے مانند ایک ہاتھ میں تمہارا درد، تمہارا سارا غم لے کر چھُو منتر کے ذریعے سے غائب کر دیتا۔ تو تم یقیناً مجھے اپنا دوست مانتیں، پر میں ایسا نہیں کر سکتا-----دل تمہارا ہے اور جو بھی اس پر گزرا ہے وہ تمہارا ہے۔ میں کیوں تمہارے دل کو اس نعمت سے محروم کروں، کیوں تمہیں اس درد کو بھول جانے کے لیے کہوں جو تمہارا سرمایہءِ حیات ہے۔ اسی درد پر اسی دُکھ دینے والے واقعہ پر جو بیت چکا ہے تمہیں اپنی زندگی کے آنے والے دنوں کی بنیادیں استوار کرنا ہوں گی-----میں جھوٹ نہیں بولتا شیلا، پر اگر تم چاہتی ہو تو تمہاری تسکین کے لیے میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔ بولو میں کیا کہوں؟“

یہ سُن کر اس نے تیزی سے کہا۔

”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں“!

”میں جانتا ہوں-----۔ ایسے حالات میں کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہُوا کرتی-----۔ آگ کے اندر کودنے والے کھیل میں ہدایت دینے والے کی کیا ضرورت؟---۔ پریم کی ارتھی کو دوسرے کے کاندھوں سے کیا سروکار، یہ لاش تو زندگی بھر ہمیں اپنے ہی کاندھوں پر اُٹھائے پھرنا ہوگی-----۔“

وہ بیچ میں بول اُٹھی۔

”اُٹھاؤں گی----۔ آپ کو اس سے کیا-----۔ ایسی ایسی بھیانک باتیں سُنا کر آپ مجھے کس لیے ڈرانا چاہتے ہیں!------۔ میں نے اس سے محبت کی----۔ اور کیا میں اب بھی اُس سے محبت نہیں کرتی!-----۔ اُس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میرے ساتھ فریب کیا ہے، پر یہ فریب اور دھوکا بھی تو اُسی نے دیا ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں------۔ میں جانتی ہوں کہ اُس نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ لیکن پھر کیا ہُوا------۔ میں نے ایک بازی کھیلی اور ہار گئی----۔ آپ مجھے ڈرانا چاہتے ہیں، مجھے طعنے دینا چاہتے ہیں-----۔ مجھے------۔ مجھے، جسے اب موت تک کی پروا نہیں رہی-----۔ میں نے موت کا نام لیا ہے اور-----۔ دیکھیے آپ کے بدن پر کپکپی دوڑ گئی ہے، آپ موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر میری طرف دیکھیے میں موت سے نہیں ڈرتی“!

میں نے اس کی طرف دیکھا، اُس کے لبوں پر ایک زبردستی کی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی پتلی تہ کے نیچے ایک عجیب قسم کی روشنی جل رہی تھی۔ اور وہ خود کانپ رہی تھی ہولے ہولے۔ میں نے دوبارہ اس کو غور سے دیکھا۔ اور کہا۔

”موت سے ڈرتا ہُوں۔ اس لیے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تم موت سے نہیں ڈرتی، اس لیے کہ تمھیں زندہ رہنا نہیں آتا۔ جو شخص زندہ رہنے کا سلیقہ نہیں جانتے۔ اُن کے لیے زندہ رہنا بھی موت کے برابر ہے----۔ اگر تم مرنا چاہتی ہو تو بڑے شوق سے مر جاؤ۔“

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے کہنا شروع کیا۔

”تم مرنا چاہتی ہو۔ اس لیے کہ تم سمجھتی ہو کہ دُکھ کے اس پہاڑ کا بوجھ جو ایکا ایکی تم پر ٹوٹ پڑا ہے۔ تم سے اٹھایا نہ جائے گا----۔ یہ غلط ہے------۔ جب تم محبت کرنے کی طاقت رکھتی ہو۔ تو اس کی شکست کے صدمے برداشت کرنے کی بھی قوت رکھتی ہو----۔ وہ لذّت وہ حظ وہ مسّرت جو تم نے اس سے محبت کر کے حاصل کی، تمہاری زندگی کا عرق ہے اسے سنبھال کر رکھو۔ اور باقی تمام عمر ان چند گھونٹوں پر بسر کرو------۔ وہ مرد جس سے تم نے محبت کی، اتنا ضروری، اتنا اہم نہیں ہے، جتنی کہ تمہاری محبت ہے، جو اس سے تم کو ہے---۔ اس مرد کو بھول جاؤ، لیکن اپنی محبت کو یاد رکھو، اس کی یاد پر جیو-----۔ ان لمحات کی یاد پر جن کو حاصل کرنے کے لیے تم نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے توڑ ڈالی----۔ کیا تم ان لمحات کو بھول سکتی ہو، جس کی قیمت میں تم نے ایک بیش بہا موتی بہا دیا ہے----۔ ہرگز نہیں------۔ مرد ایسے لمحات کو بھول سکتا ہے بھول جاتا ہے۔ اس لیے کہ اُسے کوئی قیمت ادا نہیں کرنا پڑتی-----۔ پر عورتیں نہیں بھول سکتیں۔ جنھیں چند گھڑیوں کی فرصت کے لیے اپنی ساری زندگی چکنا چُور کر دینا پڑتی ہے----۔ تم مرنا چاہتی ہو!----۔ کیا تم اس سرائے میں اتنے مہنگے داموں پر کمرہ اٹھا کر بھی اس کو چھوڑ دینا چاہتی ہو-----۔ زندہ رہو------۔ نہیں نہیں اس زندگی کو استعمال کرو۔ ہمیں مرنا ضرور ہے۔ اسی لیے زندہ رہنا بھی ضروری ہے-----۔“

میری باتوں نے اس پر تھکان سی طاری کر دی۔ وہ نڈھال ہو کر شہ نشین پر بیٹھ گئی اور کہنے لگ۔

”میں تھک گئی ہوں-----۔“

”جاؤ، سو جاؤ----۔ آرام کرو اور دوسری مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود میں ہمت پیدا کرو-----۔“

یہ کہہ کر میں چلنے ہی کو تھا۔ کہ مجھے دفعتاً ایک خیال آیا اور اس خیال کے آتے ہی تھوڑی دیر کے لیے میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میں نے سوچا اگر اس نے اپنے آپ کو مار لیا تو----۔ اور یہ سوچتے ہوئے مجھے یہ خدشہ پیدا ہوا کہ مجھ میں ایک چیز کی کمی ہو جائے گی۔ چنانچہ میں پلٹا اور اس کے قریب جا کر اس سے التجائیہ لہجے میں کہا۔

”شیلا! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں---۔“

شیلا نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

”دیکھو شیلا، میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ خودکشی کے خیال سے باز آؤ----۔ تم زندہ رہو، ضرور زندہ رہو۔“

اُس نے میری بات سُنی اور پوچھا کیوں۔“

”کیوں؟-------۔ یہ تم مجھ سے کیوں پوچھتی ہو شیلا؟ تمہارا دل اچھی طرح جانتا ہے کہ میں تم سے التجا کر رہا ہوں-----۔ چھوڑو ان باتوں کو------۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور نہ مجھے اپنے آپ سے کوئی شکایت ہے----۔ بات یہ ہے۔ کہ میں نے جو بات شروع کی تھی۔ اب اُسے اختتام تک پہنچانا چاہتا ہوں----۔ میں خود غرض ہوں----۔

ہر انسان خود غرض ہے۔۔۔۔۔۔ میں تم سے التجا کر رہا ہوں کہ تم نہ مرو، جؤ۔۔۔۔۔۔ یہ خود غرضی ہے۔۔۔۔۔۔ تم زندہ ہو گی تو میری محبت جوان رہے گی۔۔۔۔۔۔ تمہاری زندگی کے ہر دور کے ساتھ میں اپنی محبت کو وابستہ دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ پر تمہاری اجازت سے۔۔۔۔۔۔“

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

”مجھے زندہ رہنا ہو گا۔“!

اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں نیچے اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

شہید ساز

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشہید ساز

میں گجرات کاٹھیاواڑ کا رہنے والا ہوں۔ ذات کا بنیا ہوں۔ پچھلے برس جب تقسیم ہندوستان پر ٹنٹا ہوا تو میں بالکل بیکار تھا۔ معاف کیجیے گا میں نے لفظ ٹنٹا استعمال کیا۔ مگر اس کا کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ اردو زبان میں باہر کے الفاظ آنے ہی چاہئیں۔ چاہے وہ گجراتی ہی کیوں نہ ہوں۔ جی ہاں میں بالکل بیکار تھا۔ لیکن کوکین کا تھوڑا سا کاروبار چل رہا تھا جس سے کچھ آمدن کی صورت ہو جاتی تھی۔ جب بٹوارہ ہوا اور ادھر کے آدمی ادھر اور اُدھر کے اِدھر ہزاروں کی تعداد میں آنے جانے لگے تو میں نے سوچا چلو پاکستان چلیں۔ کوکین کا نہ ہی کوئی اور کاروبار شروع کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑا اور راستے میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے دھندے کرتا پاکستان پہنچ گیا۔ میں تو چلا ہی اس نیت سے تھا کہ کوئی موٹا کاروبار کروں گا۔ چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی میں نے حالات کو اچھی طرح جانچا اور الاٹ منٹوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سکہ پالش مجھے آتا ہی تھا۔ چکنی چپڑی باتیں کیں۔ ایک دو آدمیوں کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور ایک چھوٹا سا مکان الاٹ کرا لیا۔ اس سے کافی منافع ہوا تو میں مختلف شہروں میں پھر کر مکان اور دکانیں الاٹ کرانے کا دھندا کرانے لگا۔ کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بھی چنانچہ الاٹ منٹوں کے سلسلے میں کافی تگ و دو کرنا پڑتی۔ کسی کے مسکہ لگایا۔ کسی کی مٹھی گرم کی، کسی کو کھانے کی دعوت، کسی کو ناچ رنگ کی، غرضیکہ بے شمار بکھیڑے تھے۔ دن بھر خاک چھانتا، بڑی بڑی کوٹھیوں کے پھیرے کرتا اور شہر کا چپہ چپہ دیکھ کر اچھا سا مکان تلاکرتا جس کے الاٹ کرانے سے زیادہ منافع ہو۔ انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ ایک برس کے اندر اندر میں نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کا بہترین کوٹھی۔ بینک میں بے اندازہ مال پانی۔ معاف کیجیے گا۔ میں کاٹھیاواڑ گجرات کا روز مرہ استعمال کر گیا۔ مگر کوئی واندہ نہیں۔ اردو زبان میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہونے چاہئیں۔ جی ہاں، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، نوکر چار، پیکارڈ موٹر بینک میں ڈھائی لاکھ روپے۔ کارخانے اور دکانیں الگ۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن میرے دل کا چین جانے کہاں اڑ گیا۔ یوں تو کوکین کا دھندا کرتے ہوئے بھی دل پر کبھی کبھی بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اب تو جیسے دل رہا ہی نہیں تھا۔ یا پھر یوں کہئے کہ بوجھ اتنا آن پڑا کہ دل اس کے نیچے دب گیا۔ پر یہ بوجھ کس بات کا تھا؟ آدمی ذہین ہوں، دماغ میں کوئی سوال پیدا ہو جائے تو میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی نکالتا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے (حالانکہ دل کا کچھ پتا ہی نہیں تھا) میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس گڑبڑ گھوٹالے کی وجہ کیا ہے؟ عورت؟۔ ہو سکتی ہے۔ میری اپنی تو کوئی تھی نہیں۔ جو تھی وہ کاٹھیاوار گجرات ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ لیکن دوسروں کی عورتیں موجود تھیں۔ مثال کے طور پر اپنے مالی ہی کی تھی۔ اپنا اپنا ٹیسٹ ہے۔ سچ پوچھیے تو عورت جوان ہونی چاہیے اور یہ ضروری نہیں کہ پڑھی لکھی ہو، ڈانس کرنا جانتی ہو۔ اپن کو تو ساری جوان عورتیں چلتی ہیں (کاٹھیاواڑ گجرات کا محاورہ ہے جس کا اردو میں نعم البدل موجود نہیں) عورت کا تو سوال ہی اٹھ گیا اور دولت کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ بندہ زیادہ لالچی نہیں جو کچھ ہے اسی پر قناعت ہے۔ لیکن پھر یہ دل والی بات کیوں پیدا ہو گئی تھی۔ آدمی ذہین ہوں۔ کوئی مسئلہ سامنے آجائے تو اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کارخانے چل رہے تھے۔ دکانیں بھی چل رہی تھیں۔ روپیہ اپنے آپ پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے الگ تھلگ ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دیر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لیے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔ کاٹھیاواڑ گجرات میں تو میں نے بیسیوں نیک کام کیے تھے۔ مثال کے طور پر جب میرا دوست پانڈو رنگ مر گیا تو میں نے اس کی رانڈ کو اپنے گھر ڈال لیا اور دو برس تک اس کو دھندا کرنے سے روکے رکھا۔ ونائک کی لکڑی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو اسے نئی خرید دی۔ تقریباً چالیس روپے اس پر اٹھ گئے تھے۔ جمنا بائی کو گرمی ہو گئی سالی۔ (معاف کیجیے گا) کچھ پتا ہی نہیں۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ چھ مہینے برابر اس کا علاج کراتا رہا۔ لیکن پاکستان آکر میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑبڑ کی یہی وجہ تھی۔ ورنہ اور سب ٹھیک تھا۔ میں نے سوچا۔ کیا کروں؟۔ خیرات دینے کا خیال آیا۔ لیکن ایک روز شہر میں گھوما تو دیکھا کہ قریب قریب ہر شخص بھکاری ہے۔ کوئی بھوکا ہے۔ کوئی ننگا۔ کِس کِس کا پیٹ بھروں، کس کس کا انگ ڈھانکوں؟۔ سوچا ایک لنگر خانہ کھول دوں لیکن ایک لنگر خانے سے کیا ہوتا اور پھر اناج کہاں سے لاتا؟ بلیک مارکیٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا کہ ایک طرف گناہ کر کے دوسری طرف کارِ ثواب کا مطلب ہی کیا ہے۔؟ گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر میں نے لوگوں کے دکھ درد سنے۔ سچ پوچھیے تو ہر شخص دکھی تھا۔ وہ بھی جو دکانوں کے تھڑوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی جو اونچی اونچی حویلیوں میں رہتے ہیں۔ پیدل چلنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کام کا کوئی جوتا نہیں۔ موٹر میں بیٹھنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیا ماڈل نہیں۔ ہر شخص کی شکایت

اپنی اپنی جگہ درست تھی۔ ہر شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ معقول تھی۔ میں نے غالب کی ایک غزل اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چتلے کر سے سنی تھی۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے کِس کی حاجت روا کرے کوئی۔ معاف کیجیے گا یہ اس کا دوسرا مصرعہ ہے اور ہو سکتا ہے پہلا ہی ہو۔ جی ہاں، میں کس کس کی حاجت روا کرتا جب سو میں سے سو ہی حاجت مند تھے۔ میں نے پھر یہ بھی سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں۔ ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں۔ لیکن میں نے مہاجرین کے کیمپوں میں جا جا کر جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو بالکل ہی نکما بنا دیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ جگار ہو رہی ہے (معاف کیجیے گا جُگار کا مطلب ہے جواء یعنی قمار بازی) گالیاں بک رہے ہیں اور فوگٹ یعنی مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ بھیج دینا ہر گز ہر گز نیکی کا کام نہیں۔ لیکن پھر نیکی کے کام کے لیے اور کون سا رستہ ہے؟ کیمپوں میں دھڑا دھڑ آدمی مر رہے تھے۔ کبھی ہیضہ پھوٹتا تھا کبھی پلیگ۔ ہسپتالوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ قریب تھا کہ ایک ہسپتال بنوا دوں مگر سوچنے پر ارادہ ترک کر دیا۔ پوری اسکیم تیار کر چکا تھا۔ عمارت کے لیے ٹینڈر طلب کرتا۔ داخلے کی فیسوں کا روپیہ جمع ہو جاتا۔ اپنی ہی ایک کمپنی کھڑی کر دیتا اور ٹنڈر اس کے نام نکال دیتا۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کھڑی کر دیتا اور پورے تیس ہزار بچا لیتا مگر یہ ساری اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بچا لیا گیا تو یہ جو زائد آبادی ہے وہ کیسے کم ہو گی۔ غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی فالتو آبادی کا ہے۔ لفڑا کا مطلب ہے جھگڑا، وہ جھگڑا جس میں فضیحتا بھی ہو۔ لیکن اس سے بھی اس لفظ کی پوری معنویت میں بیان نہیں کر سکا۔ جی ہاں غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی اس فالتو آبادی کا باعث ہے۔ اب لوگ بڑھتے جائیں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی۔ آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا۔ بارشیں زیادہ ہوں گی۔ اناج زیادہ اگے گا۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ ہسپتال بنانا ہر گز ہر گز نیک کام نہیں۔ پھر سوچا مسجد بنوا دوں۔ لیکن اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چلتے کر کا گایا ہوا ایک شعر یاد آ گیا نام منجور ہے تو فیج کے اسباب بنا۔ وہ منظور کو منجور اور فیض کو فیج کہا کرتی تھی۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔ کس کم بخت کو نام و نمود کی خواہش ہے۔ وہ جو نام اچھالنے کے لیے پل بناتے ہیں۔ نیکی کا کیا کام کرتے ہیں؟۔ خاک!۔ میں نے کہا نہیں یہ مسجد بنوانے کا خیال بالکل غلط ہے۔ بہت سی الگ الگ مسجدوں کا ہونا بھی قوم کے حق میں ہر گز مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ عوام بٹ جاتے ہیں۔ تھک ہار کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا۔ شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ جب ختم ہوا تو لوگوں میں بد نظمی پھیل گئی۔ اتنی بھگدڑ مچی کہ تیس آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں چھپی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے۔ میں نے سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اچانک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں۔ انھیں شہادت کا رتبہ ملتا ہے یعنی وہ رتبہ جس سے بڑا کوئی اور رتبہ ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگ مرنے کی بجائے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت بالکل کارت جاتی ہے۔ اگر وہ شہید ہو جاتے تو کوئی بات بنتی۔ میں نے اس باریک بات پر اور غور کرنا شروع کیا۔ چاروں طرف جدھر دیکھو خستہ حال انسان تھے۔ چہرے زرد، فکر و تردد اور غم روزگار کے بوجھ تلے پسے ہوئے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں بے جان چال۔ کپڑے تار تار ریل گاڑی کے کنڈم مال کی طرح یا تو کسی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پڑے ہیں یا بازاروں میں بے مالک مویشیوں کی طرح منہ اٹھائے بے مطلب گھوم رہے ہیں۔ کیوں جی رہے ہیں۔ کس کے لیے جی رہے ہیں اور کیسے جی رہے ہیں۔ اس کا کچھ پتہ نہیں۔ کوئی وبا پھیلی۔ ہزاروں لوگ مر گئے اور کچھ نہیں تو بھوک اور پیاس ہی سے گھل گھل رہے۔ سردیوں میں اکڑ گئے۔ گرمیوں میں سوکھ گئے۔ کسی کی موت پر کسی نے دو آنسو بہا دیے اکثریت کی موت خشک ہی رہی۔ زندگی سمجھ میں نہ آئی، ٹھیک ہے۔ اس سے حظ نہ اٹھایا، یہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ کس کا شعر ہے۔ اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چتلے کر کیا درد بھری آواز میں گایا کرتی تھی مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔ میرا مطلب ہے اگر مرنے کے بعد بھی زندگی نہ سدھری تو لعنت ہے سُسری پر۔ میں نے سوچا کیوں نہ بیچارے، یہ قسمت کے مارے، درد کے ٹھکرائے ہوئے انسان جو اس دنیا میں ہر اچھی چیز کے لیے ترستے ہیں۔ اس دنیا میں ایسا رتبہ حاصل کریں کہ جو وہ یہاں ان کی طرف نگاہ اٹھانا پسند نہیں کرتے۔ وہاں ان کو دیکھیں اور رشک کریں۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ عام موت نہ مریں بلکہ شہید ہوں۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ لوگ شہید ہونے کے لیے راضی ہوں گے؟ میں نے سوچا، کیوں نہیں۔ وہ کون مسلمان ہے جس میں ذوقِ شہادت نہیں۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی تو ہندوؤں اور سکھوں میں بھی یہ رتبہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے سخت ناامیدی ہوئی جب میں نے ایک مریل سے آدمی سے پوچھا۔

"کیا تم شہید ہونا چاہتے ہو؟"

تو اس نے جواب دیا۔

"نہیں۔"

سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص جی کر کیا کرے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھو بڑے میاں، زیادہ سے زیادہ، زیادہ سے زیادہ تم ڈیڑھ مہینہ اور جیو گے چلنے کی تم میں سکت نہیں۔ کھانستے کھانستے غوطے میں جاتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ بس دم نکل گیا۔ پھوٹی کوڑی تک تمہارے پاس نہیں۔ زندگی بھر تم نے سکھ نہیں دیکھا۔ مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اور جی کر کیا کرو گے۔ فوج میں تم بھرتی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے محاذ پر اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دینے کا خیال بھی عبث ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم کوشش کر کے یہیں بازار میں یا ڈیرے میں جہاں تم رات کو سوتے ہو، اپنی شہادت کا بندوبست کر لو۔ اس نے پوچھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

میں نے جواب دیا۔

”یہ سامنے کیلے کا چھلکا پڑا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ تم اس پر سے پھسل جاؤ۔ ظاہر ہے کہ تم مر جاؤ گے اور شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔“

یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہنے لگا۔

”میں کیوں آنکھوں دیکھے کیلے کے چھلکے پر پاؤں دھرنے لگا۔ کیا مجھے اپنی عزیز نہیں“

۔ اللہ اللہ کیا جان تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا جھریوں کی گٹھڑی!! مجھے بہت افسوس ہوا اور اس وقت اور بھی زیادہ ہوا۔ جب میں نے سنا کہ وہ کم بخت جو بڑی آسانی سے شہادت کا رتبہ اختیار کر سکتا تھا۔ خیراتی ہسپتال میں لوہے کی چارپائی پر کھانستا کھنکارتا مر گیا۔ ایک بڑھیا تھی منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ آخری سانس لے رہی تھی مجھے بہت ترس آیا۔ ساری عمر غریب کی مفلسی اور رنج و غم میں گزری تھی۔ میں اسے اٹھا کر ریل کے پاٹے پر لے گیا۔ معاف کیجیے گا۔ ہمارے یہاں پٹڑی کو پاٹا کہتے ہیں۔ لیکن جناب جونہی اس نے ٹرین کی آواز سنی۔ ہوش میں آ گئی اور کُوک بھرے کھلونے کی طرح اٹھ کر بھاگ گئی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ بنیا کا بیٹا اپنی دھن کا پکا ہوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا تھا۔ میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ مغلوں کے وقت کا ایک بہت بڑا احاطہ خالی پڑا تھا۔ اس میں ایک سو اکاون چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ بہت ہی خستہ حالت میں۔ میری تجربہ کار آنکھوں نے اندازہ لگا لیا کہ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کی چھتیں ڈھے جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساڑھے دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار مفلوک الحال آدمی بسا دیے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا۔ ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے۔ تیسرے مہینے جیسا کہ میرا اندازہ تھا۔ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آ رہیں اور سات سو آدمی جن میں بچے بوڑھے سبھی شامل تھے۔ شہید ہو گئے۔ وہ جو میرے دل پر بوجھ سا تھا کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ آبادی میں سے سات سو آدمی کم بھی ہو گئے۔ لیکن انھیں شہادت کا رتبہ بھی مل گیا۔ ادھر کا پلڑا بھاری ہی رہا۔ جب سے میں یہی کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسبِ توفیق دو تین آدمیوں کو جامِ شہادت پلا دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چتلے کر ایک شعر گایا کرتی تھی۔ لیکن معاف کیجیے گا وہ شعر یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ کچھ بھی ہو، کہنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کو جس کا وجود چھکڑے کے پانچویں پہیے کی طرح بے معنی اور بیکار تھا۔ جام شہادت پلانے کے لیے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے چھلکے گرانے پڑے لیکن موت کی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں شہادت کا بھی ایک دن مقرر ہے۔ دسویں روز جا کر وہ پتھریلے فرش پر کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا اور شہید ہوا۔ آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے دو لاکھ کا ہے۔ اس میں سے پچھتر ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ بیمہ بھی کرا لیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑاڑا دھڑام گر پڑے گی۔ کیونکہ مصالحہ ہی میں نے ایسا لگوایا ہے۔ اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔ خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ پرلے درجے کا گناہگار ہے جس کی شہادت اللہ تبارک تعالیٰ کو منظور نہیں تھی۔

شو شو

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشو شو

گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے۔ اور وہ شور برپا ہو رہا تھا۔ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں۔ تو دوسرے کمرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی سے بے سُری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لَے کی۔ بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل کے شہ نشینوں تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو۔ ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔ رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ دونوں ڈولیاں آئیں۔ اور گلی میں اس قدر شور برپا ہوا کہ الامان مگر وہ نظارہ بڑا روح افزا تھا۔ جب گلی کی سب شوخ و شنگ لڑکیاں باہر نکل آئیں۔ اور تیتریوں کی طرح ادھر اُدھر پھڑ پھڑانے لگیں۔ ساڑھیوں کی ریشمی سرسراہٹ۔ کلف لگی شلواروں کی کھڑ کھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں۔ ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں اونچی ایڑی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لہجے، پھڑکتی ہوئیں رگیں۔ اور پھر ان الّھڑ لڑکیوں کی آپس کی سرگوشیاں!۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حُسن و شباب اپنے قلم سے معانی لکھ رہا ہے! عباس میرے پاس کھڑا تھا۔ ہم دونوں عورتوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے دفعتہ عباس نے گلی کے نکڑ پر نظریں گاڑ کر کہا۔

”شو شو کہاں ہے؟“

میں نے جواب دیا۔

”مجھے اس وقت تمہارے سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں ہے۔“

میں اس ہجوم میں اس بھونرے کے مانند کھڑا تھا۔ جو پھولوں بھری کیاری دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس پھول پر بیٹھے۔ عباس نے رونی آواز میں کہا۔

”وہ نہیں آئی“!

”تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ باقی تو سب موجود ہیں۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔۔ دیکھو تو وہ نیلی ساڑھی میں کون ہے؟۔۔۔۔۔ شوشو۔“

میں نے عباس کا ہاتھ دبایا۔ عباس نے غور سے دیکھا۔ نیلی ساڑھی میں۔۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

”علاج کراؤ اپنی آنکھوں کا۔۔۔۔۔ چغد کہیں کے، یہ شوشو ہے؟“

”کیوں وہ نہیں ہے کیا؟“

میں نے پھر نیلی ساڑھی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایکا ایکی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں کچھ اس طور پر کہ اس کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ سنبھلی اور فوراً منہ سے لال جِیب نکال کر میرا منہ چڑایا۔ اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔۔۔۔۔۔ اس سہیلی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔ میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ عباس نے جو اپنا اطمینان کرنے کے لیے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ رہا تھا بلند آواز میں کہا۔

”بخدا تم اس کی توہین کر رہے ہو۔۔۔۔۔ گدھے کہیں کے۔۔۔۔۔ عورت کے معاملے میں نرے احمق ہو۔۔۔۔۔۔ کاٹھ کی کوئی پتلی نیلے رنگ میں لپیٹ لپاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دی جائے۔ تم اسی کی بلائیں لینا شروع کر دوگے۔“

یہ الفاظ اتنی اونچی آواز میں ادا کیے گئے تھے کہ اس نیلی ساڑھی والی نے سُن لیے جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو خود بخود ٹھٹک گئی۔ ایک لحظے کے لیے اس کے قدم رُکے۔ گویا ہم میں سے کسی نے اس کو مخاطب کیا ہے۔ پھر فوراً اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی خفت دور کرنے کے لیے اُس نے یونہی پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اور کہا۔

”ارے۔۔۔۔۔ امینہ تو کہاں اُڑ گئی؟“

!مجھے موقع ملا۔ میں جھٹ سے عباس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اسے اچھی طرح دبا کر اس سے کہا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔ مگر میرا نام محمد امین ہے۔۔۔ مجھے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں“!

جل ہی تو گئی۔ مگر ہم زیرِلب مُسکراتے آگے بڑھ گئے۔ چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ عباس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا۔

”شوشو ابھی تک نہیں آئی۔“

”تو میں کیا کروں۔۔۔۔۔ میرے سر پر نمدہ باندھ دیجیے۔ تو میں ابھی سرکار کے لیے اُسے تلاش کرکے لے آتا ہوں۔۔۔۔۔۔ آخر یہ کیا حماقت ہے بھئی۔ تم تماشا بھی دیکھنے دو گے یا کہ نہیں؟۔۔۔۔۔ اور پھر جناب یہ تو بتایئے۔ اگر وہ یہاں موجود بھی ہو تو آپ اس سے ملاقات کیونکر کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کوئی امریکی ناول نہیں پڑھ رہے۔ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے! عباس میری بات فوراً سمجھ گیا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھائے گلی سے نکل کر بازار میں چلے گئے۔ موڑ پر رام بھروسے پنواڑی کی دکان کھلی تھی۔ جو بجلی کے قمقمے کے نیچے سر جھکائے اُونگھ رہا تھا۔ ہم نے اس سے دو پان بنوائے اور وہیں بازار میں کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ دیر تک ہم ہندوستان میں مرد عورت کے درمیان جو اجنبیت چلی آرہی ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جب ایک بج گیا تو عباس جمائی لے کر اُٹھا اور کہنے لگا۔ بھئی اب نیند آرہی ہے۔۔۔۔۔ اس حسرت کو ساتھ لیے جا رہا ہوں کہ شوشو کو نہ دیکھ سکا۔ سچ کہتا ہوں امین وہ لڑکی۔۔۔۔۔۔ میں اب تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہے؟“

عباس نے اپنے گھر کا رخ کیا اور میں نے اپنے گھر کا۔ راستے میں سوچتا رہا کہ عباس نے شوشو جیسی معمولی لڑکی میں ایسی کونسی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جو ہر وقت اسی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ عباس کے مذاق کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بڑا اونچا ہے۔ مگر یہاں اسے کیا ہو گیا تھا؟۔۔۔۔۔۔ شوشو۔۔۔ شوشو۔۔۔ ارے یہ کیا؟۔۔۔۔۔ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا۔ تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چُوس رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ شوشو۔۔۔۔۔۔۔ ایک دو مرتبہ آپ بھی اسے دوہرایئے۔ ذرا جلدی جلدی۔۔۔ کیا آپ کو لذّت محسوس ہوئی؟۔۔۔۔۔۔ ضرور ہوئی ہو گی مگر کیوں؟۔۔۔۔۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں عباس کی محبوبہ شوشو کے بارے میں خوامخواہ کیوں غور کرنے لگا ہوں؟ اس میں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں جو غیر افروز ہو مگر۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔۔ یہ شوشو نام میں دلچسپی ضرور تھی۔ اور کیا کہا تھا میں نے لذت بھی“!

شوشو میں بانجو کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی ہے۔ آپ یہ نام پکاریئے تو ایسا معلوم ہو گا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر زور سے گز پھیر دیا ہے۔ شو شو۔۔۔۔۔ سوشیلا کا دوسرا نام ہے۔ یعنی اس کی بگڑی ہوئی شکل مگر اس کے باوجود اس میں کتنی موسیقی ہے۔۔۔۔۔۔ سوشیلا۔۔۔۔۔۔ شوشو۔۔۔۔۔۔۔ شوشو۔۔۔۔۔ سوشیلا۔۔۔۔۔ غلط۔۔۔۔۔۔ سوشیلا میں شوشو کی سی موسیقیت ہرگز نہیں ہو سکتی! فرنگی شاعر بائرن شکیل تھا۔ مگر اس میں وہ کون سی شے تھی۔ جو عورتوں

کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتی تھی؟ -------- اُس کا لنگڑا کر چلنا۔ گریٹا گاربو قطعاً خوش شکل نہیں ہے۔ مگر اس میں کون سی چیز ہے جو فلمی تماشائیوں پر جادو کا کام کرتی ہے؟ ------ اُس کا ذرا بگڑے ہوئے انگریزی لہجے میں باتیں کرنا------ یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات اچھی بھلی شے کو بگاڑنے سے اُس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے؟ -------- سوشیلا پندرہ برس کی ایک معمولی لڑکی ہے۔ جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ اس عمر میں ان تمام چیزوں کی مالک ہے۔ جو عام نوجوانوں کے سینے میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ مگر عباس کی نظروں میں یہ کوئی خوبی نہ تھی۔ عام نوجوانوں کی طرح عباس کا دل گھاس کی پتی کے مانند نہیں تھا۔ جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ ہی کانپنا شروع کر دیتی ہے------ خدا جانے وہ اس کی کس ادا پر مرتا تھا۔ جو میرے ذہن سے بالاتر تھی۔ میں نے سوشیلا کی شکل وصورت اور اس کی صناعانہ قدر وقیمت کے متعلق کبھی غور نہیں کیا تھا۔ مگر نہ جانے میں اُس روز اس کے متعلق کیوں سوچتا رہا۔ بار بار وہ میرے ذہن میں آ رہی تھی۔ اور ہر بار میں سوشیلا کو چھوڑ کر اس کے مختصر نام شوشو کی موسیقی میں گم ہو جاتا تھا۔ انہی خیالات میں غرق گلی کے موڑ پر پہنچ گیا۔ اور مجھے اس چیز کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے دفعتہ وہاں کی فضا کو غیر معمولی طور پر خاموش پایا۔ مکان میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کے باہر گلی کی دیوار کے ساتھ ایک برقی قمقمہ لٹک رہا تھا۔ جس کی چوندھیا دینے والی روشنی ساری گلی میں بکھری ہوئی تھی------ مجھے اس قمقمے کے

”تجرد“

پر بڑا ترس آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ اور وہ قمقمہ متحیّر معلوم ہوتا تھا۔ گھر میں داخل ہُوا۔ تو وہاں بھی خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی لرزاں صدا اور پھر ساتھ ہی اس کی ماں کی خواب آلود آواز سنائی دیتی تھی۔ ڈیوڑھی کے ساتھ والا کمرہ کھول کر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی تپائی پر

”رومان“

پڑا تھا۔ اُس کو اٹھا کر میں نے ورق گردانی شروع کی۔ ورق الٹتے الٹتے اختر کی غزل پر نظریں جم گئیں۔ مطلع کس قدر حسین تھا۔ نہ بھولے گا تراراتوں کو شرماتے ہُوئے آنا رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہُوئے آنا مجھے نیند آ گئی۔ کلاک کی طرف دیکھا۔ تو چھوٹی سوئی دو کے ہندسے کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اور اس کا اعلان کرنے کے لیے الارم میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا------ ٹن نن نن------ ٹن نن نن------ ن! دو بج گئے------ میں اُٹھا اور سونے کے ارادے سے سیڑھیاں طے کر کے اپنی خوابگاہ میں پہنچا۔ بہار کے دن تھے۔ اور موسم خنک۔ میری خوابگاہ کی ایک کھڑکی باہر کی گلی میں کھلتی ہے۔ جس کے پیازی رنگ کے ریشمی پردے میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے۔ میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور سبز رنگ کا قمقمہ روشن کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دُھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔ نیند اور بیداری کے درمیان ایک لحظہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی گنگناہٹ آئی۔ اس پر ملتی ہوئی پلکیں کھل گئیں۔ اور میں نے غنودگی دُور کرتے ہُوئے غور سے سننا شروع کیا۔ ساتھ والے کمرے میں کوئی بول رہا تھا۔ یکایک کسی کی دلکش ہنسی کی ترنم آواز بلند ہوئی۔ اور پھلجھڑی کے نورانی تاروں کے مانند پُرسکوت فضا میں بکھر گئی۔ میں بستر پر سے اُٹھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔

”دونوں دُلہنیں ماشاء اللہ بڑی خوبصورت ہیں۔“

”چندے آفتاب چندے ماہتاب“

غالباً دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے موضوع نے میری دلچسپی کو بڑھا دیا۔ اور میں نے زیادہ غور سے سُننا شروع کیا۔

”تلّے والی سُرخ ساڑھی میں نرگس کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی------ گورے گورے گالوں پر بکھری ہوئی مقیش------ جی چاہتا تھا۔ بڑھ کر بلائیں لے لوں۔“

”بچاری سمٹی جا رہی تھی۔“

”سر تو اٹھایا ہی نہیں اُس نے------ پر------“

”پر یہ شرم وحیا کب تک رہے گی------ آج رات------“

”آج رات------!

”اُوئی اللہ------ تو کیسی باتیں کر رہی ہے شوشو۔ اس کے ساتھ ہی کپڑے کی سرسراہٹ سُنائی دی۔ میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی------ شوشو------ تو ان میں سے ایک سوشیلا بھی تھی۔ میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی اور میں نے دروازے میں کوئی دراڑ تلاش کرنا شروع کی۔ کہ ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کو دیکھ بھی سکوں۔ ایک کواڑ کے نچلے تختے سے چھوٹی سی گانٹھ نکل گئی تھی۔ اور اس طرح چونی کے برابر سوراخ پیدا ہو گیا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے اس پر آنکھ جما دی۔ شوشو قالین پر بیٹھی بسکٹی رنگ کی ساڑھی سے اپنی ننگی پنڈلی کو ڈھانک رہی تھی۔ اس کے پاس عفّت شرمائی ہوئی سی گاؤ تکیے پر دونوں کہنیاں ٹیکے لیٹی تھی۔

”اس وقت اُن گوری چٹی دلہنوں پر کیا بیت رہی ہو گی؟“

شوشو یہ کہہ کر رُک گئی اور اپنی آواز دبا کر اُس نے عفّت کی چوڑیوں کو چھیڑ کر ان میں کھنکناہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”ذرا سوچو تو؟“

عفت کے گال ایک لمحے کے لیے تھر تھرائے۔

”کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شوشو۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔۔ گویا ان باتوں سے دلچسپی نہیں میری بنّو کو۔ بس میں ہو تو ابھی سے ابھی اپنی شادی رچالو۔“

عفّت نے سوشیلا کی بات کاٹ دی۔

”پر یہ دلہنوں کو کہاں لے گئے ہیں شوشو؟“

”کہاں لے گئے ہیں؟“

شوشو مسکرائی۔

”سمندر کی تہ میں جہاں جل پریوں کا راج ہے۔۔۔۔۔ کوہ قاف کے غاروں میں جہاں سینگوں والے جنّ رہتے ہیں۔۔۔۔۔“

چند لمحات کے لیے ایک پُر اسرار سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد شوشو پھر بولی۔

”کہاں لے گئے ہیں؟۔۔۔۔۔۔ لے گئے ہونگے اپنے اپنے کمروں میں“!

”بیچاریوں کو نیند کیسے آئے گی؟“

ایک لڑکی نے جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اور جس کا نام میں نہیں جانتا تھا۔ اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔ شوشو کہنے لگی۔

”بے چاریاں!۔۔۔۔۔ کوئی ذرا ان کے دل سے جا کر پوچھے کہ ان کی آنکھیں اس رت جگے کے لیے کتنی بے قرار تھیں؟“

”تو بہت خوش ہوں گی؟“

”اور کیا؟“

”پر میں نے یہ سُنا ہے کہ یہ لوگ بہت ستایا کرتے ہیں؟“

عفّت سوشیلا کے پاس سرک آئی۔

”میں پوچھتی ہوں“

تمہیں اندیشہ کس بات کا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔ جب تمہارے وہ ستانے لگیں گے تو نہ ستانے دینا انھیں۔۔۔۔۔ ہاتھ پیر باندھ دینا اُن کے۔۔۔۔۔۔ ابھی سے فکر میں کیوں گھلی جا رہی ہو۔“

”ہائیں ہائیں۔“

عفّت نے تیزی سے کہا۔

”تم کیسی باتیں کر رہی ہو شوشو۔ دیکھو تو میرا دل کتنے زور سے دھڑکنے لگا ہے“

!؟عفّت نے سوشیلا کا ہاتھ اٹھا کر دل کے مقام پر رکھ دیا۔

”کیوں؟“

شوشو نے عفّت کے دل کی دھڑکنیں غور سے سُنیں۔ اور بڑے پُر اسرار لہجے میں کہا۔

”جانتی ہوں کیا کہہ رہا ہے؟“

عفت نے جواب دیا۔

”نہیں تو؟“

”یہ کہتا ہے عفت بانو غزنوی دُلہن بننا چاہتی ہے!۔۔۔۔۔“

”ہٹاؤ جی، لاج تو نہیں آتی تمہیں۔

”عفت نے مسکرا کر کروٹ بدلی۔“

دل اپنا چاہتا ہے تمہارا اور خواہ مخواہ یہ سب کچھ میرے سر منڈھ رہی ہو۔“

پھر یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور سوشیلا سے پوچھنے لگی۔ "

ہاں، یہ تو بتاؤ شوشو تم بھلا کیسے آدمی سے شادی کرنا پسند کرو گی؟۔۔۔۔۔۔ میرے سر کی قسم، سچ سچ بتاؤ۔ مجھی کو ہائے ہائے کرو۔ اگر جھوٹ بولو"!

میں کیوں بتاؤں۔"

یہ کہہ کر سوشیلا نے تیزی سے اپنے سر کو حرکت دی۔ اور اس کا چہرہ (جو میری) نگاہوں سے پوشیدہ تھا، سامنے آگیا، میں نے غور سے دیکھا وہ مجھے بے حد حسین معلوم ہوئی۔ آنکھیں مست تھیں۔ اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہُوئے تھے۔ سر کے چند پریشان بال برقی روشنی سے منّور فضا میں ناچ رہے تھے۔ چہرے کا گندمی رنگ نکھرا ہُوا تھا۔ اور سینہ پر سے ساڑھی کا پلّو نیچے ڈھلک گیا تھا۔ ہولے ہولے دھڑک رہا تھا۔ چوڑے ماتھے پر سرخ بندیا بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ عفّت نے اصرار کیا۔

"تمہیں میرے سر کی قسم بتاؤ؟"

شوشو نے کہا۔

"پہلے تم بتاؤ۔"

"تو سنو، مگر کسی سے کہو گی تو نہیں۔"

یہ کہہ کر عفّت کچھ شرماسی گئی۔ میں چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی ایک ایسے نوجوان سے ہو۔۔۔۔۔۔۔ ایسے۔۔۔۔۔"

شوشو بولی۔

"توبہ اب کہہ بھی دو۔"

عفّت نے پیشانی پر سے بال ہٹائے اور کہا"

ایسے نوجوان سے ہو جس کا قد لمبا ہو جسم بڑے بھائی کی طرح سڈول ہو۔ انگلینڈ ریٹرنڈ ہو۔ انگریزی فر فر بولتا ہو۔۔۔۔۔۔ رنگ گورا اور نقش تیکھے ہوں۔ موٹر چلانا جانتا ہو۔ اور بیڈ منٹن بھی کھیلتا ہو۔"

شوشو نے پوچھا۔

"بس کہہ چکیں؟"

"ہاں عفّت نے نیم وا لبوں سے سوشیلا کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔

"میری دعا ہے کہ پرماتما تمہیں ایسا ہی پتی عطا فرمائیں"

سوشیلا کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا۔ اور لہجہ ایسا تھا۔ جیسے مندر میں کوئی مقدس منتر پڑھ رہی ہے۔ وہ لڑکی جو گفتگو میں بہت کم حصّہ لیتی تھی۔ بولی

"عفّت! اب شوشو کی باری ہے۔"

عفّت جو شوشو کی ساڑھی کا ایک کنارہ پکڑ کر اپنی انگلی کے گرد لپیٹ رہی تھی کہنے لگی۔

"بھئی اب تم بتاؤ ہم نے تو اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی۔"

شوشو نے جواب دیا۔

"سُن کے کیا کرو گی؟۔۔۔۔۔ میرے خیالات تم سے بالکل مختلف ہیں۔"

"مختلف ہوں یا ملتے ہوں۔ پر ہم سُنے بغیر تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں۔۔۔۔۔۔۔۔"

سوشیلا نے چھت کی طرف دیکھا۔ اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

"میں۔۔۔۔۔۔۔ پر تم مذاق اڑاؤ گی عفّت"!

"ارے۔۔۔۔۔ تم سناؤ تو؟"

سوشیلا نے ایک آہ بھری۔

"میرے سپنے عجیب و غریب ہیں عفّت"

۔۔۔۔۔۔ یہ میرے دماغ میں صابن کے رنگ برنگے بلبلوں کی طرح پیداہوتے ہیں۔ اور آنکھوں کے سامنے ناچ کر غائب ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ میں سوچتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر سوچتی ہُوں کہ میں کیوں سوچا کرتی ہوں۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے۔ اگر ہو جایا کرے تو کتنی اچھی بات ہے۔۔۔۔۔ لیکن پھر زندگی میں کیارہ جائے گا۔۔۔۔۔۔ خواہشیں اور تمنائیں کہاں سے پیداہوں گی۔۔۔۔۔۔ ہم جس طرح جی رہے ہیں ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ جانتی ہوں کہ جو کچھ مانگ رہی ہوں۔ نہیں ملے گا۔ مگر دل میں مانگ تو رہے گی۔۔۔۔۔ کیازندہ رہنے کے لیے یہی کافی نہیں؟“

عفّت اور دوسری لڑکی خاموش بیٹھی تھیں۔ شوشو نے پھر کہنا شروع کیا۔

”میں اپنا جیون ساتھی ایک ایسے نوجوان کو بنانا چاہتی ہوں۔ جو صرف عمر کے لحاظ سے ہی جوان نہ ہو، بلکہ اُس کا دل، اس کا دماغ۔۔۔۔۔۔ اُس کا رؤاں رؤاں جوان ہو۔۔۔۔۔ وہ شاعر ہو۔۔۔۔۔۔۔ میں شکل وصورت کی قائل نہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے شاعر چاہیے جو میری محبت میں گرفتار ہو کر سر تاپا محبت بن جائے۔ جس کو میری ہر بات میں حُسن نظر آئے۔۔۔۔۔۔ جس کے ہر شعر میں میری اور صرف میری تصویر ہو۔۔۔۔۔۔ جو میری محبت کی گہرائیوں میں گُم ہو جائے۔۔۔۔۔۔ میں اسے ان تمام چیزوں کے بدلے میں اپنی نسوانیت کا وہ تحفہ دوں گی۔ جو آج تک کوئی عورت نہیں دے سکی۔“

وہ خاموش ہوگئی۔ عفّت حیرت کے مارے اُس کا منہ تکنے لگی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ سوشیلا کی گفتگو کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکی۔ میں خود متحیّر تھا۔ کہ پندرہ سولہ برس کی اس دُبلی پتلی لڑکی کے سینے میں کیسے کیسے خیالات کروٹیں لے رہے ہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ دماغ میں گونج رہا تھا۔

”اگر وہ مجھے نظر آجائے“

یہ کہہ کر سوشیلا آگے بڑھی اور عفت کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔

”تو میں اس کے استقبال کے لیے بڑھوں اور اس کے ہونٹوں پر وہ بوسہ دوں۔ جو ایک زمانے سے میرے ہونٹوں کے نیچے جل رہا ہے۔“

اور شوشو نے عفّت کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جما دیے۔۔۔۔۔۔ اور دیر تک ان کو جمائے رکھا۔ تعجب ہے کہ عفّت بالکل ساکت بیٹھی رہی۔ اور معترض نہ ہوئی۔ جب دونوں کے لب ایک مدھّم آواز کے جُدا ہُوئے اور ان کے چہرے مجھے نظر آئے۔ تو ایک عجیب وغریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ جس کو الفاظ بیان ہی نہیں کر سکتے۔ عفّت اُس شہد کی مکھی کی طرح مسرور متعجب معلوم ہوتی تھی جس نے پہلی مرتبہ پھول کی نازک پتیوں پر بیٹھ کر اس کا رس چوسنے کی لذت محسوس کی ہو۔۔۔۔۔ اور سوشیلا۔۔۔۔۔ وہ اور زیادہ پر اسرار ہوگئی تھی۔

”آؤ اب سوئیں۔“

یہ خواب آلود اور دھیمی آواز عفت کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دی اور میں خیالات کے گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا۔ گندمی رنگ کی ننھی سی گڑیا، اپنے چھوٹے سے دماغ میں کیسے کیسے انوکھے خیالات کی پرورش کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اور وہ کون سا تحفہ اپنے دامنِ نسوانیت میں چھپائے بیٹھی تھی۔ جو آج تک کوئی عورت مرد کو پیش نہیں کر سکی؟۔۔۔۔۔ میں نے سوراخ میں سے دیکھا۔ شوشو۔ اور عفت دونوں ایک دوسری کے گلے میں باہیں ڈالے سو رہی تھیں۔ شوشو کے چہرے پر بال بکھرے ہُوئے تھے۔ اور اس کے سانس سے ان میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ وہ کس قدر تر وتازہ معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔ واقعی وہ اس قابل تھی کہ اس پر شعر کہے جائیں۔۔۔۔ لیکن عباس تو شاعر نہیں تھا؟۔۔۔۔۔۔ پھر پھر۔۔۔۔۔!

شیدا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشیدا

شیدے کے متعلق امرتسر میں یہ مشہور تھا کہ وہ چٹان سے بھی ٹکر لے سکتا ہے اس میں بلا کی پھرتی اور طاقت تھی گو تن وتوش کے لحاظ سے وہ ایک کمزور انسان دکھائی دیتا تھا لیکن امرتسر کے سارے غنڈے اس سے خوف کھاتے اور اُس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ فرید کا چوک، معلوم نہیں فسادات کے بعد اُس کی کیا حالت ہے عجیب وغریب جگہ تھی یہاں شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر اور حکیم بھی موچی اور جلاہے، جواری اور بدمعاش، نیک اور پرہیزگار سبھی یہاں بستے تھے۔ ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔ شیدے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوتی تھیں یعنی وہ اپنے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا جس پر اُس کے محلے والوں کو اعتراض ہو۔ اُس نے جتنی لڑائیاں لڑیں دوسرے غنڈوں کے محلے میں۔ وہ کہتا تھا اپنے محلے میں کسی دوسرے محلے کے غنڈے سے لڑنا نامردی کی نشانی ہے۔ مزا تو یہ ہے کہ دشمن کو اُس کی اپنی جگہ پر مارا جائے۔ اور یہ صحیح تھا۔ ایک بار پٹرنگوں سے اس کی ٹھن گئی۔ وہ کئی مرتبہ چوک فرید سے گزرے۔ بڑکیں مارتے، نعرے لگاتے شیدے کو گالیاں دیتے۔ وہ یہ سب سُن رہا تھا مگر اُس نے اُن سے بھڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رحمان

”ماندرو کی دُکان میں بیٹھا رہا۔ لیکن دو گھنٹوں کے بعد وہ پٹرنگوں کے محلے کی طرف روانہ ہوا۔ اکیلا۔ بالکل اکیلا اور پھر غیر مسلح۔ وہاں جا کر اس نے ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور پٹرنگوں کو جو اپنے کام میں مصروف تھے للکارا نکلو باہر۔ تمہاری۔ “

دس پندرہ پٹرنگ لاٹھیاں لے کر باہر نکل آئے اور جنگ شروع ہو گئی میرا خیال ہے شیدا گتکے اور نبوٹ کا ماہر تھا۔ اُس پر لاٹھیاں برسائی گئیں لیکن اس نے ایک بھی ضرب اپنے پر نہ لگنے دی ایسے پینترے بدلتا رہا کہ پٹرنگوں کی سٹی گم ہو گئی۔ آخر اُس نے ایک پٹرنگ سے بڑی چابکدستی سے لاٹھی چھینی اور حملہ آوروں کو مار مار کو ادھ موا کر دیا۔ دوسرے روز اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ دو برس قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ وہ جیل چلا گیا جیسے وہ اُس کا اپنا گھر ہے۔ اُس دوران میں اُس کی بوڑھی ماں وقتاً فوقتاً ملاقات کے لیے آتی رہی۔ وہ مشقت کرتا تھا لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں ہوتی تھی وہ سوچتا تھا کہ چلو ورزش ہو رہی ہے صحت ٹھیک رہے گی۔ اُس کی صحت باوجود اس کے کہ کھانا بڑا واہیات ہوتا تھا پہلے سے بہتر تھی اُس کا وزن بڑھ گیا تھا لیکن وہ بعض اوقات مغموم ہو جاتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری رات جاگتا رہتا۔ اس کے ہونٹوں پر پنجابی کی یہ بولی ہوتی کی کچیے تیری یاری مہناں مہناں ہو کے ٹُٹ گئی ایک برس گزر گیا مشقت کرتے کرتے۔ اب اُس کی افسردگی کا دور شروع ہوا۔ اُس نے مختلف بولیاں گانا شروع کر دیں مجھے ایک قیدی نے بتایا جو اُس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں تھا کہ وہ بولیاں گایا کرتا تھا۔ لبھ جان گے یار گواچ ٹھیکے لے لے پتّناں دے اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنا گُم شدہ محبوب مل جائے گا اگر تو دریا کے ساحل پر کشتیاں چلانے کا ٹھیکہ لے لے۔ گڈی کٹ جاندی جنھاں دی پریم والی مُنڈے لے جاندے اونہاں دی ڈور لُٹ کے یعنی جن کی محبت کا پتنگ کٹ جاتا ہے تو لڑکے بالے بڑا شور مچاتے ہیں اور اُن کی ڈور لُوٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں اب اور بولیوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان سب کا جو شیدے کے ہونٹوں پر ہوتی تھیں، ایک ہی قسم کا مفہوم ہے۔ اُس قیدی نے مجھ سے کہا ہم سمجھ گئے تھے کہ شیدا کسی کے عشق میں گرفتار ہے۔ کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اُسے آہیں بھرتے بھی دیکھا۔ مشقت کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہتا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی اور دنیا کی سیر کر رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا“

ڈیڑھ برس کے بعد جب شیدا خودکشی کا ارادہ کر چکا تھا اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی ختم کر دے کہ اُسے اطلاع ملی کہ ایک جوان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے۔ اُس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ اس کی تو صرف ماں تھی جو اُس سے اپنی ممتا کے باعث ملنے آجایا کرتی تھی۔ ملاقات کا انتظام ہوا۔ شیدا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ مسلح سپاہی۔ لڑکی کو بُلایا گیا شیدے نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ ایک بُرقع پوش عورت آہنی پنجرے کی طرف بڑھ رہی ہے اُس کو ابھی تک یہ حیرت تھی کہ یہ عورت یا لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ سفید برقع تھا جب وہ پاس آئی تو اُس نے نقاب اُٹھائی۔ شیدا چیخا“

تم۔ تم کیسے۔ “

زُلیخا جو کہ پٹرنگوں کی لڑکی تھی زار و قطار رونے لگی اُس کے حلق میں لفظ اٹک اٹک گئے

”میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ لیکن۔ لیکن مجھے۔ معاف کر دینا اتنی دیر کے بعد آئی ہوں۔ تم خدا معلوم۔ اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچتے ہو گے۔ “

شیدے نے سلاخوں کے ساتھ سر لگا کر کہا

”نہیں میری جان۔ میں تمہارے متعلق سوچتا ضرور رہا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ تم مجبور ہو، زُلیخا نے روتے ہوئے کہا

”میں واقعی مجبور تھی۔ لیکن آج مجھے موقع ملا تو میں آ گئی۔ سچ کہتی ہوں میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔ “

”یہ موقع تمھیں کیسے مل گیا؟“

زُلیخا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے

”میرے ابا کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل اُن کا چالیسواں تھا۔ “

شیدا مرحوم سے اپنی ساری مخاصمت بھول گیا

”خدا اُنھیں جنت بخشے۔ مجھے یہ خبر سُن کر بڑا افسوس ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”صبر کرو زُلیخا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں“

زُلیخا نے اپنے سفید بُرقعے سے آنسو پونچھے

”میں نے بہت صبر کیا ہے شیدے، اب اور کتنی دیر کرنا پڑے گا۔ تم یہاں سے کب نکلو گے ؟“

بس چھ مہینے رہ گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بہت پہلے ہی چھوڑ دیں گے۔ یہاں کے سب افسر مجھ پر مہربان ہیں۔ زُلیخا کی آواز میں محبت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا

”جلدی آؤ پیارے۔ مجھے اب تمہاری ہونے سے روکنے والا کوئی نہیں۔ خدا کی قسم اگر کسی نے تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اُس سے نپٹ لوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پھر اسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ سنتری نے کہا کہ وقت ختم ہو گیا۔ چنانچہ اُن کی ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ زلیخا روتی چلی گئی اور شیدا دل میں مسرت اور آنکھوں میں آنسو لیے جیل کے

اندر چلا گیا جہاں اُس کو مشقت کرنا تھی اُس دن اُس نے اتنا کام کیا کہ جیلر دنگ رہ گئے۔ دو مہینوں کے بعد اُسے رہا کر دیا گیا۔ اس دوران میں زُلیخا دو مرتبہ اس سے ملاقات کرنے آئی تھی۔ اس نے آخری ملاقات میں اُس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس تاریخ کو جیل سے باہر نکلے گا چنانچہ وہ گیٹ کے پاس برقع پہنے کھڑی تھی۔ دونوں فرطِ محبت میں آنسو بہانے لگے۔ شیدے نے تانگہ لیا دونوں اُس میں سوار ہوئے اور شہر کی جانب چلے۔ لیکن شیدے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زُلیخا کو کہاں لے جائے گا۔ زُلیخا تمھیں کہاں جانا ہے“

زُلیخا نے جواب دیا

”مجھے معلوم نہیں۔ تم جہاں لے جاؤ گے ‘وہیں چلی جاؤں گی“

شیدے نے کچھ دیر سوچا اور زلیخا سے کہا

”نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں تم اپنے گھر جاؤ۔ دنیا مجھے گنڈہ کہتی ہے لیکن میں تمھیں جائز طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے باقاعدہ شادی کروں گا۔“

زُلیخا نے پوچھا

”کب؟“

”بس ایک دو مہینے لگ جائیں گے۔ میں اپنی جوئے کی بیٹھک پھر سے قائم کرلوں اس عرصے میں اتنا روپیہ اکٹھا ہو جائے گا کہ میں تمہارے لیے زیور کپڑے خرید سکوں۔“

زُلیخا بہت متاثر ہوئی تم کتنے اچھے ہو شیدے۔ جتنی دیر تم کہو گے میں اس گھڑی کے لیے انتظار کروں گی جب میں تمہاری ہو جاؤں گی۔ شید ا ذرا جذباتی ہو گیا

”جانی، تم اب بھی میری ہو۔ میں بھی تمہارا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں جو کام ہو طور طریقے سے ہو۔ میں اُن لوگوں سے نہیں جو دوسروں کی جوان کنواری کو روغلا کر خراب کرتے ہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمہاری خاطر میں نے مار کھائی اور قریب قریب دو برس جیل میں کاٹے۔ خداوند پاک کی قسم کھا کے کہتا ہوں ہر وقت میرے ہونٹوں پر تمہارا نام رہتا تھا۔ زُلیخا نے کہا

”میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی لیکن تمہارے لیے میں نے ایک ہمسائی سے سیکھی اور بلاناغہ پانچوں وقت پڑھتی رہی۔ ہر نماز کے بعد دُعا مانگتی کہ خدا تمھیں ہر آفت سے محفوظ رکھے“

شیدے نے شہر پہنچتے ہی دوسرا تانگہ لے لیا اور زُلیخا سے جدا ہو گیا تاکہ وہ اپنے گھر جائے اور وہ اپنے۔ شیدے نے ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر ایک ہزار روپے پیدا کر لیے۔ ان سے اُس نے زلیخا کے لیے سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں بنوائیں۔ گلے کے لیے ایک نکلس بھی لیا۔ اب وہ پوری طرح لیس تھا۔ ایک دن وہ اپنے گھر میں اوپر پیڑھی پر بیٹھا کھانا کھانے لگا تھا کہ نیچے سے کسی عورت کے بین کرنے جیسی آواز آئی۔ وہ اسے پکار رہی تھی اور ساتھ ساتھ کوسنے بھی دے رہی تھی۔ شیدے نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا تو ایک بڑھیا تھی جو اُس کے محلے کی نہیں تھی اُس نے گردن اُٹھا کر اوپر دیکھا اور پوچھا کیا تم ہی شیدے ہو“

”ہاں ہاں“

”خدا کرے نہ رہو اس دُنیا کے تختے پر۔ تمہاری جوانی ٹُوٹے۔ تم پر بجلی گرے“

شیدے نے کسی قدر غصے میں بڑھیا سے پوچھا بات کیا ہے؟“

بڑھیا کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہو گیا

”میری بچی تم پر جان چھڑکے اور تمھیں کچھ پتا ہی نہیں“

شیدے نے حیرت سے اُس بڑھیا سے سوال کیا کون ہے تمہاری بچی؟“

”زُلیخا اور کون؟“

”کیوں کیا ہوا اُس کو؟“

بڑھیا رونے لگی

”وہ تم سے ملتی تھی، تم غنڈے ہو، اس لیے ایک تھانیدار نے زبردستی اُس کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا۔“

شیدے کے ہوش و حواس ایک لحظے کے لیے غائب ہو گئے۔ مگر سنبھل کر اُس نے بڑھیا سے پوچھا کیا نام ہے اس تھانیدار کا؟“

بڑھیا کانپ رہی تھی

”کرم داد۔ تم یہاں اُوپر مزے میں بیٹھے ہو بہت بڑے غنڈے بنے پھرتے ہو۔ اگر تم میں تھوڑی سی غیرت ہے تو جاؤ اور اُس تھانیدار کا سر گنڈا سے سے کاٹ کے رکھ دو“

شیدے نے کچھ نہ کہا کھڑکی سے ہٹ کر اُس نے بڑے اطمینان سے کھانا کھایا۔ پیٹ بھر کے دو گلاس پانی کے پیے اور ایک کونے میں رکھی ہوئی کلہاڑی لے کر باہر چلا گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اُس نے زُلیخا کے گھر دروازے پر دستک دی۔ وہی بڑھیا باہر نکلی۔ شیدے کے ہاتھ میں خون آلود کلہاڑی تھی اُس نے بڑے پُر سکون لہجے میں اُس سے کہا

”ماں۔ جو کام تم نے مجھ سے کہا تھا کر آیا ہوں۔ زُلیخا سے میرا سلام کہنا۔ میں اب چلتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ سیدھا کوتوالی گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ (۳۰؍مئی ۵۴ء(

شیر آیا شیر آیا دوڑنا

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوشیر آیا شیر آیا دوڑنا

اونچے ٹیلے پر گڈریے کا لڑکا کھڑا، دور گھنے جنگلوں کی طرف منہ کیے چلا رہا تھا

”شیر آیا شیر آیا دوڑنا۔“

بہت دیر تک وہ اپنا گلا پھاڑتا رہا۔ اس کی جوان بلند آواز بہت دیر تک فضاؤں میں گونجتی رہی۔ جب چلا چلا کر اس کا حلق سوکھ گیا تو بستی سے دو تین بڈھے لاٹھیاں ٹیکتے ہوئے آئے اور گڈریے کے لڑکے کو کان سے پکڑ کر لے گئے۔ پنچایت بلائی گئی۔ بستی کے سارے عقلمند جمع ہوئے اور گڈریے کے لڑکے کا مقدمہ شروع ہوا۔ فردِ جرم یہ تھی کہ اس نے غلط خبر دی اور بستی کے امن میں خلل ڈالا۔ لڑکے نے کہا۔

”میرے بزرگو، تم غلط سمجھتے ہو۔ شیر آیا نہیں تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ آ نہیں سکتا؟“

جواب ملا۔

”وہ نہیں آسکتا۔“

لڑکے نے پوچھا۔

”کیوں؟“

جواب ملا۔

”محکمہ جنگلات کے افسر نے ہمیں چٹھی بھیجی تھی کہ شیر بڈھا ہو چکا ہے۔“

لڑکے نے کہا۔

”لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے تھوڑے ہی روز ہوئے کایا کلپ کرایا تھا۔“

جواب ملا۔

”یہ افواہ تھی۔ ہم نے محکمہ جنگلات سے پوچھا تھا اور ہمیں یہ جواب آیا تھا کہ کایا کلپ کرانے کی بجائے شیر نے تو اپنے سارے دانت نکلوا دیے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے بقایا دن اہنسا میں گزارنا چاہتا ہے۔“

لڑکے نے جوش کے ساتھ کہا۔

”میرے بزرگو! کیا یہ جواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔“

سب نے بیک زبان ہو کر کہا۔

”قطعاً نہیں۔ ہمیں محکمہ جنگلات کے افسر پر پورا بھروسا ہے۔ اس لیے کہ وہ سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا ہے۔“

لڑکے نے پوچھا۔

”کیا یہ حلف جھوٹا نہیں ہو سکتا؟“

جواب ملا۔

”ہرگز نہیں۔ تم سازشی ہو، ففتھ کالمسٹ ہو، کمیونسٹ ہو، غدار ہو، ترقی پسند ہو۔ سعادت حسن منٹو ہو۔“

لڑکا مسکرایا۔

”خدا کا شکر ہے کہ میں وہ شیر نہیں جو آنے والا ہے۔ محکمہ جنگلات کا سچ بولنے والا افسر نہیں۔ میں۔“

پنچایت کے ایک بوڑھے آدمی نے لڑکے کی بات کاٹ کر کہا۔

”تم اسی گڈریے کے لڑکے کی اولاد ہو، جس کی کہانی سالہا سال سے سکولوں کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو اس کا ہوا تھا۔ شیر آئے گا تو تمہاری ہی تکا بوٹی اڑا دے گا۔“

گڈریے کا لڑکا مسکرایا۔

”میں تو اس سے لڑوں گا۔ مجھے تو ہر گھڑی اس کے آنے کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ تم کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ شیر آیا شیر آیا والی کہانی جو تم اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو آج کی کہانی نہیں۔ آج کی کہانی میں تو شیر آیا شیر آیا کا مطلب یہ ہے کہ خبر دار رہو۔ ہوشیار رہو۔ بہت ممکن ہے شیر کے بجائے کوئی گیدڑ دونوں نے نہیں ڈرتا، لیکن اس کی حیوانیت سے البتہ ضرور خائف رہتا ہوں اور اس حیوانیت کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو ہمیشہ تیار کھتا ہوں۔ میرے بزرگو، اسکولوں میں سے وہ کتاب اٹھا لو۔ جس میں شیر آیا شیر آیا والی پرانی کہانی چھپی ہے۔ اس کی جگہ یہ نئی کہانی پڑھاؤ۔“

ایک بوڑھے نے کھانستے کھنکارتے ہوئے کہا۔

”یہ لونڈا ہمیں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہمیں راہ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے۔“

لڑکے نے مسکرا کر کہا۔

”زندگی خط مستقیم نہیں ہے میرے بزرگو۔“

دوسرے بڈھے نے فرط جذبات سے لرزتے ہوئے کہا۔

”یہ ملحد ہے، یہ بے دین ہے، فتنہ پردازوں کا ایجنٹ ہے۔ اس کو فوراً زندان میں ڈال دو۔“

گڈریے کے لڑکے کو زندان میں ڈال دیا گیا۔ اسی رات بستی میں شیر داخل ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ باقی شیر نے شکار کر لیے۔ مونچھوں کے ساتھ لگا ہوا خون چوستا جب شیر زندان کے پاس سے گزرا تو اس نے مضبوط آہنی سلاخوں کے پیچھے گڈریے کے لڑکے کو دیکھا اور دانت پیس کر رہ گیا۔ گڈریے کا لڑکا مسکرایا۔

”دوست یہ میرے بزرگوں کی غلطی ہے ورنہ تم میرے لہو کا ذائقہ بھی چکھ لیتے۔“

شیرو

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوشیرو

چیڑ اور دیودار کے ناہموار تختوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا جسے چوبی جھونپڑا کہنا بجا ہے۔ دو منزلیں تھیں۔ نیچے بھٹیار خانہ تھا جہاں کھانا پکایا اور کھایا جاتا تھا۔ اور بالائی منزل مسافروں کی رہائش کے لیے مخصوص تھی۔ یہ منزل دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ایک کافی کشادہ تھا۔ جس کا دروازہ سڑک کی دوسری طرف کھلتا تھا۔ دوسرا کمرہ جو طول و عرض میں اس سے نصف تھا بھٹیار خانے کے عین اوپر واقع تھا۔ یہ میں نے کچھ عرصے کے لیے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ چونکہ ساتھ والے حلوائی کے مکان کی ساخت بھی بالکل اسی مکان جیسی تھی اور ان دونوں جگہوں کے لیے ایک ہی سیڑھی بنائی گئی تھی۔ اس لیے اکثر اوقات حلوائی کی کتیا اپنے گھر جانے کے بجائے میرے کمرے میں چلی آتی تھی۔ اس عمارت کے تختوں کو آپس میں بہت ہی بھونڈے طریقے سے جوڑا گیا تھا۔ پیچ بہت کم استعمال کیے گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کو لکڑی میں داخل کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے، کیلیں کچھ اس بے ربطی سے ٹھونکی گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا اس مکان کو بنانے والا بالکل اناڑی تھا۔ کیلوں کے درمیان فاصلہ کی یکسانی کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ جہاں ہاتھ ٹھہر گیا وہیں پر کیل ایک ہی ضرب میں چت کر دی گئی تھی۔ یہ بھی نہ دیکھا گیا تھا کہ لکڑی پھٹ رہی ہے یا کیل ہی بالکل ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ چھت ٹین سے پاٹی ہوئی تھی، جس کی قینچی میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کمرے کے باقی تختوں کی طرح چھت کی کڑیاں بھی رنگ اور روغن سے بے نیاز تھیں البتہ ان پر کہیں کہیں چڑیوں کی سفید بیٹیں سفیدی کے چھینٹوں کے مانند نظر آتی تھیں۔ میرے کمرے میں تین کھڑکیاں تھیں۔ درمیانی کھڑکی کی طول و عرض میں دروازے کے برابر تھی۔ باقی دو کھڑکیاں چھوٹی تھیں ان کے کواڑوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ مالک مکان کا کبھی ارادہ تھا کہ ان میں شیشے جڑائے، پر اب ان کے بجائے ٹین کے ٹکڑے اور لکڑی کے موٹے موٹے ناہموار ٹکڑے جڑے تھے۔ کہیں کہیں لندن ٹائمز اور ٹریبیون اخبار کے ٹکڑے بھی لگے ہُوئے تھے۔ جن کا رنگ دھوئیں اور بارش کی وجہ سے خستہ بسکٹوں کی طرح بھوسلا ہو گیا تھا۔ یہ کھڑکیاں جنگلی کی کنڈیاں ٹُوٹی ہوئیں تھیں۔ بازار کی طرف کھلتی تھیں اور ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ اس لیے کہ ان کو بند کرنے کے لیے کافی وقت اور محنت کی ضرورت تھی۔ کھڑکیوں میں سے دُور نظر ڈالنے پر پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ٹیڑھی بِنگی مانگ کی طرح

“کشتواڑ

اور

بھدروا”

جانے والی سڑک بل کھاتی ہُوئی چلی گئی اور آخر میں آسمان کی نیلاہٹ میں گھل مل گئی تھی۔ کمرے کا فرش خالص مٹی کا تھا جو کپڑوں کو چمٹ جاتی تھی اور دھوبی کی کوششوں کے باوجود اپنا گیروا رنگ نہ چھوڑتی تھی۔ فرش پر پان کی پیک کے داغ جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کونوں میں چچوڑی ہوئی ہڈیاں بھی پڑی رہتی تھیں جو ہر روز جھاڑو سے کسی نہ کسی طرح بچاؤ حاصل کر لیتی تھیں۔ اس کمرے کے ایک کونے میں میری چارپائی بچھی تھی جو بیک وقت میز، کرسی اور بستر کا کام دیتی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار پر چند کیلیں ٹنگی ہوئی تھیں ان پر میں نے اپنے کپڑے وغیرہ لٹکا دیئے تھے۔ دن میں پانچ چھ مرتبہ میں ان کو لٹکا تا رہتا تھا اس لیے کہ ہوا کی تیزی سے یہ اکثر گرتے رہتے تھے۔ کشمیر جانے یا وہاں سے آنے والے کئی مسافر اس کمرے میں ٹھہرے ہونگے۔ بعض نے آتے جاتے وقت تختوں پر چاک کی ڈلی یا پنسل سے کچھ نشانی کے طور پر لکھ دیا تھا۔ سامنے کھڑکی کے ساتھ والے تختے پر کسی صاحب نے یادداشت کے طور پر پنسل سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی 4/5/25ء سے دودھ شروع کیا اور ایک روپیہ پیشگی دیا گیا۔ اس طرح ایک اور تختے پر یہ مندرج تھا: دھوبی کو کل پندرہ کپڑے دیئے گئے تھے جن میں سے وہ دو کم لایا۔ میرے سرہانے کے قریب ایک تختے پر یہ شعر لکھا تھا۔ در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں اس کے نیچے

“علیم پنٹر”

لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نویسندہ کا نام ہو گا۔ یہی شعر کمرے کے ایک اور تختے پر لکھا تھا۔ مگر زرد چاک سے اس کے اوپر تاریخ بھی لکھ دی گئی تھی۔ ایک اور تختے پر یہ شعر مرقوم تھا۔ میرے گھر آئے عنایت آپ نے مجھ پر یہ کی میرے سر آنکھوں پر آؤ، تھی یہ کب قسمت میری اس سے دُور ایک کونے میں یہ مصرعہ لکھا تھا۔ ایک ہی شب گو رہے لیکن گلوں میں ہم رہے اس مصرعے کے پاس ہی اسی خط میں پنجابی کے یہ شعر مرقوم تھے تیرے باجہ نہ آسی قرار دل نوں، جذبہ پریم والا بے پناہ رہے گا لکھ اکھیاں تو ہوسیں دُور بانوا ے پر دلاں نوں دلاں نداراہ رہے گا تیرے میرے پیار دا رب جانے، مگونالے دا نیر گواہ رہے گا ترجمہ: تیرے بغیر میرے دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔ جذبۂ محبت بے پناہ رہے گا تو لاکھ میری آنکھوں سے دور ہو لیکن دل کو دل کی راہ رہے گی۔ تیرے اور میرے پریم کو صرف خدا جانتا ہے۔ لیکن

“مگونالہ”

کا پانی بھی اسکا گواہ رہے گا۔ میں نے اس اشعار کو غور سے پڑھا۔ ایک بار نہیں کئی بار پڑھا، نہ معلوم ان میں کیا جذبیت تھی کہ پڑھتے پڑھتے میں نے

“ہیر”

کی دلنواز دھن میں انھیں گانا شروع کر دیا۔ لفظوں کا روکھا پن یوں بالکل دُور ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لفظ پگھل کر اُس دُھن میں حل ہو گئے ہیں۔ یہ شعر کسی خاص واقعہ کے تاثرات تھے۔ مگونالہ ہوٹل سے ایک میل کے فاصلہ پر شہتوتوں اور اخروٹ کے درختوں کے بیچوں بیچ بہتا تھا۔ میں یہاں کئی بار ہو آیا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پانی میں غوطے لگا چکا تھا۔ اس کے ننھے ننھے پتھروں سے گھنٹوں کھیل چکا تھا لیکن یہ بانو کون تھی؟۔ یہ بانو جس کا نام کشمیر کے بگو گوشے کی یاد تازہ کرتا تھا۔ میں نے اس بانو کو اس پہاڑی گاؤں میں ہر جگہ تلاش کیا مگر ناکام رہا۔ اگر شاعر نے اس کی کوئی نشانی بتا دی ہوتی تو بہت ممکن ہے مگونالے ہی کے پاس اسکی اور میری مڈبھیڑ ہو جاتی۔ اس مگونالے کے پاس جس کا پانی میرے بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتا تھا۔ میں نے ہر جگہ بانو کو ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی۔ اس موہوم جستجو میں اکثر اوقات مجھے اپنی بیوقوفی پر بہت ہنسی آئی، کیونکہ بہت ممکن تھا کہ وہ اشعار سرے ہی سے مہمل ہوں اور کسی نوجوان شاعر نے اپنا من پرچانے کے لیے گھڑ دیئے ہوں مگر خدا معلوم کیوں مجھے اس بات کا دلی یقین تھا کہ بانو۔ وہ بانو جو آنکھوں سے دور ہونے پر بھی اس شاعر کے دل میں موجود ہے ضرور اس پہاڑی گاؤں میں سانس لے رہی ہے۔ سچ پوچھے تو میرا یقین اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بعض اوقات مجھے فضا میں اس کا تنفس گھلا ہُوا محسوس ہوتا تھا۔ مگونالے کے پتھروں پر بیٹھ کر میں نے اس کا انتظار کیا کہ شاید وہ ادھر آ نکلے اور میں اسے پہچان جاؤں لیکن وہ نہ آئی۔ کئی لڑکیاں خوبصورت اور بدصورت میری نظروں سے گزریں مگر مجھے بانو دکھائی نہ دی۔ مگونالے کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے ناشپاتی کے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں، اخروٹ کے گھنے درختوں میں پرندوں کی نغمہ ریزیاں اور گیلی زمین پر سبز اور ریشمیں گھاس، میرے دل و دماغ پر ایک خوش گوار تکان پیدا کر دیتی تھی اور میں بانو کے حسین تصور میں کھو جاتا تھا۔ ایک روز شام کو مگونالے کے ایک چوڑے چکلے پتھر پر لیٹا تھا خنک ہوا جنگلی بوٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میں بسی ہوئی چل رہی تھی۔ فضا کا ہر ذرّہ ایک عظیم الشان اور ناقابل بیان محبت میں ڈُوبا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ آسمان پر اُڑتی ہوئی ابابیلیں زمین پر رہنے والوں کو گویا یہ پیغام دے رہی تھیں۔

“اُٹھو، تم بھی ان بلندیوں میں پرواز کرو۔”

میں نیچر ان کی سحر کاریوں کا لیٹے لیٹے تماشا کر رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے خشک ٹہنیوں کے ٹُوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے مڑ کر دیکھا۔ جھاڑیوں کے پیچھے کوئی بیٹھا خشک ٹہنیاں توڑ رہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا، اور سلیپر پہن کر اس طرف روانہ ہو گیا کہ دیکھوں کون ہے۔ ایک لڑکی تھی جو خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا بنا کر باندھ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بھدی اور کن سری آواز میں

”ماہیا“

گا رہی تھی۔ میرے جی میں آئی کہ آگے بڑھوں اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہوں

”کہ خدا کے لیے نہ گاؤ۔ لکڑیوں کا گٹھا اُٹھاؤ اور جاؤ مجھے اذّیت پہنچ رہی ہے۔“

لیکن مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی، کیونکہ اس نے خود بخود گانا بند کر دیا۔ گٹھا اُٹھانے کی خاطر جب وہ مڑی تو میں نے اسے دیکھا اور پہچان لیا یہ وہی لڑکی تھی جو بھٹیار خانے کے لیے ہر روز شام کو ایندھن لایا کرتی تھی۔ معمولی شکل و صورت تھی۔ ہاتھ پاؤں بے حد غلیظ تھے۔ سر کے بالوں میں بھی کافی میل جم رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ میں جب اٹھ کر دیکھنے آیا تھا تو دل میں آئی کہ چلو اس سے کچھ باتیں ہی کر لیں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا

”یہ ایندھن جو تم نے اکٹھا کیا ہے! اسکا تمہیں جمّا کیا دیگا“

جمّا اس بھٹیار خانے کے مالک کا نام تھا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”ایک آنہ“

”صرف ایک آنہ۔“

”کبھی کبھی پانچ پیسے بھی دے دیتا ہے۔“

”تو سارا دن محنت کر کے تم ایک آنہ یا پانچ پیسے کماتی ہو۔“

اس نے گٹھے کی خشک لکڑیوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ نہیں، دن میں ایسے دو گٹھے تیار ہو جاتے ہیں۔“

”تو دو آنے ہو گئے۔“

”کافی ہیں“

”تمہاری عُمر کیا ہے؟“

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔

”تم وہی ہو نا جو بھٹیار خانے کے اوپر رہتے ہو۔“

میں نے جواب دیا،

”ہاں وہی ہُوں۔ تم مجھے کئی بار وہاں دیکھ چکی ہو۔“

”یہ تم نے کیسے جانا۔“

”اس لیے کہ میں نے تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔“

”دیکھا ہو گا“

یہ کہہ وہ زمین پر بیٹھ کر گٹھا اُٹھانے لگی۔ میں آگے بڑھا۔

”ٹھہرو میں اُٹھوا دیتا ہُوں۔“

گٹھا اُٹھواتے ہُوئے لکڑی کا ایک نوکیلا ٹکڑا اس زور سے میری انگلی میں چبھا کہ میں نے دونوں ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ سر پر رسی کو اٹکا کر گٹھے کو قریب قریب اُٹھا چکی تھی۔ میرے ہاتھ ہٹانے سے اس کا توازن قائم نہ رہا اور وہ لڑکھڑائی۔ میں نے فوراً اُسے تھام لیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا ہاتھ اس کی کمر سے لے کر اٹھے ہوئے بازو کی بغل تک گھسیٹتا چلا گیا وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ سر پر رسی کو اچھی طرح جمانے کے بعد اس نے میری طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھا اور چلی گئی۔ میری انگلی سے خون جاری تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر۔ اس پر باندھا اور مگونالے کی طرف روانہ ہو گا۔ اس پتھر پر بیٹھ کر میں نے اپنی زخمی انگلی کو پانی سے دھو کر صاف کیا اور اس پر رومال باندھ کر سوچنے لگا۔

”یہ بھی اچھی رہی بیٹھے بٹھائے اپنی انگلی لہولہان کر لی۔ خود ہی اٹھا لیتی میں نے بھلا یہ تکلف کیوں کیا۔“

یہاں سے میں اپنے ہوٹل، معاف کیجیے گا۔ بھٹیار خانے پہنچا اور کھانا وانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیر تک کھانا ہضم کرنے کی غرض سے کمرے میں مَیں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر کچھ دیر تک لالٹین کی اندھی روشنی میں ایک واہیات کتاب پڑھتا رہا۔ سچ پوچھئے تو ارد گرد ہر شے واہیات تھی۔ لال مٹی جو کپڑے کے ساتھ ایک دفعہ لگتی تھی تو دھوبی کے پاس جا کر بھی الگ نہ ہوتی تھی اور وہ آپس میں نہایت ہی بھونڈے طریقے پر جوڑے ہوئے تختے اور ان پر لکھے ہوئے غلط اشعار اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں جو ہر روز جھاڑو کی زد سے کسی نہ کسی طرح بچ کر میری چارپائی کے پاس نظر آتی تھیں۔ کتاب ایک طرف رکھ کر میں نے لالٹین کی طرف دیکھا۔ مجھے اس میں اور اس لکڑیاں چننے والی میں ایک گونہ مماثلت نظر آئی۔ کیونکہ لالٹین کی چمنی کی طرح اس لڑکی کا لباس بھی بے حد غلیظ تھا۔ مجھے اس کو بجھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ میں نے سوچا، تھوڑی ہی دیر میں دھوئیں کی وجہ سے یہ اس قدر اندھی ہو جائے گی کہ خود بخود اندھیرا ہو جائے گا۔ کھڑکیاں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ میں نے ان کو بھی نہ کھولا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات کے نو یا دس بج چکے تھے۔ سونے ہی والا تھا کہ بازار میں ایک کتا زور سے بھونکا جیسے اس کی پسلی میں یکایکی درد اُٹھ کھڑا ہوا ہے میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنتیں بھیجیں اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا مگر فوراً ہی نزدیک و دُور سے کئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں ایک عجیب و غریب سبتک قائم ہو گیا۔ اگر کوئی کتا ایک سُر چھیڑتا تو سبتک کے سارے سُر فضا میں گونجنے لگے۔ میری نیند حرام ہو گئی۔ دیر تک میں نے صبر کیا۔ لیکن مجھ سے نہ رہا گیا تو میں اُٹھا دوسرے کمرے میں گیا اور اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں اُترا اور جو پتھر میرے ہاتھ میں آیا مارنا شروع کر دیا۔ ایک دو پتھر کتوں کے لگے کیونکہ نہایت ہی مکروہ آوازیں بلند ہوئیں میں نے اس کامیابی پر اور زیادہ پتھر پھینکنے شروع کیے۔ دفعتہً کسی انسان کے

”اُف“

کرنے کی آواز سنائی دی۔ میرا ہاتھ وہیں پتھر بن گیا۔ آواز کسی عورت کی تھی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی، ادھر تیز قدمی سے گیا تو میں نے دیکھا کہ نیچے ایک لڑکی دوہری ہو کر کراہ رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سُن کر وہ کھڑی ہو گئی۔ بدلی کے پیچھے چھپے ہُوئے چاند کی دُھندلی روشنی میں مجھے اپنے سامنے وہی ایندھن چننے والی لڑکی نظر آئی۔ اس کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میری غفلت کے باعث اُسے اتنی تکلیف ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

”مجھے معاف کر دینا۔ لیکن تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟“

اس نے جواب دیا۔

”میں اوپر چڑھ رہی تھی۔“

”رات کو اس وقت تمہیں کیا کام تھا۔“ اس نے کرتے کی آستین سے ماتھے کا خون صاف کیا اور کہا

”اپنے کتے شیرو کو ڈھونڈ رہی تھی۔“

بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔

”اور میں تمام کتوں کا خون کر دینے کا تہیہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔“

وہ بھی ہنس دی۔

”کہاں ہے تمہارا شیرو؟“

”اللہ جانے کہاں گیا ہے۔ یوں ہی سارا دن مارا مارا پھرتا ہے۔“

”تو اب کیسے تلاش کرو گی۔“

”یہیں سڑک پر مل جائے گا کہیں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ اسے تلاش کروں؟“

نیند میری آنکھوں سے بالکل اُڑ چکی تھی اس لیے میں نے کہا کہ چلو کچھ دیر شغل رہے گا۔ لیکن اس نے سر ہلا کر کہا۔

”نہیں میں اسے آپ ہی ڈھونڈ لُوں گی۔ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہو گا۔“

”ابھی ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارے مکان کے پچھواڑے ہو گا۔“

”تو چلو مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے کیوں کہ میں پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔“

ہم دونوں بھٹیار خانے کے پچھواڑے کی جانب سے روانہ ہوئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کبھی کبھی بدن پر خوشگوار کپکپی طاری کر دیتی تھی۔ چاند ابھی تک بادل کے پیچھے چھپا ہُوا تھا۔ روشنی تھی مگر بہت ہی دُھندلی جو رات کی خنکی میں بڑی پُراسرار معلوم ہوتی تھی جی چاہتا تھا کہ آدمی کمبل اوڑھ کے لیٹ جائے اور اوٹ پٹانگ باتیں سوچے۔ سڑک طے کر کے ہم اوپر چڑھے اور بھٹیار خانے کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہ میرے آگے تھی۔ ایک دم وہ ٹھٹکی اور منہ پھیر کر عجیب و غریب لہجے میں اس نے کہا۔

“دُور دفان ہونامُراد”!

ایک موٹا تازہ کتا نمودار ہُوا اور اپنے ساتھ حلوائی کی کتیا کو گھسیٹتا ہوا ہمارے پاس سے گُزر گیا۔ دروازہ کھلا تھا میں اسے اندر اپنے کمرے میں لے گیا۔ لالٹین کی چمنی ابھی مکمل طور پر سیاہ نہیں ہُوئی تھی، کیوں کہ ایک کونے سے جو اس کالک سے بچ گیا تھا تھوڑی تھوڑی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ہم باہر نکلے۔ چاند اب بادل میں سے نکل آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نیچے سڑک پر اس کا کتا شیر و بڑے سے پتھر کے پاس بیٹھا اپنا بدن صاف کر رہا تھا۔ اس سے کچھ دُور حلوائی کی کتیا کھڑی تھی۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے پوچھا

“تمہارا نام کیا ہے؟”

اس نے جواب دیا۔

“بانو۔”

“بانو”!

۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اب اس نے پوچھا۔

“تمہارا نام کیا ہے۔”

میں نے جواب دیا۔

“شیرو۔”

صاحب کرامت

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوصاحب کرامت

چوہدری موجو بوڑھے برگد کی گھنی چھاؤں کے نیچے کھری چارپائی پر بڑے اطمینان سے بیٹھا اپنا چموڑا پی رہا تھا۔ دھوئیں کے ہلکے ہلکے بقے اس کے منہ سے نکلتے تھے اور دوپہر کی ٹھہری ہوئی ہوا میں ہولے ہولے گم ہو جاتے تھے۔ وہ صبح سے اپنے چھوٹے سے کھیت میں ہل چلاتا رہا تھا اور اب تھک گیا تھا۔ دھوپ اس قدر تیز تھی کہ چیل بھی اپنا انڈا چھوڑ دے مگر اب وہ اطمینان سے بیٹھا اپنے چموڑے کا مزہ لے رہا تھا جو چٹکیوں میں اس کی تھکن دور کر دیتا تھا۔ اس کا پسینہ خشک ہو گیا تھا۔ اس لیے ٹھہری ہوا اسے کوئی ٹھنڈک نہیں پہنچا رہی تھی مگر چموڑے کا ٹھنڈا ٹھنڈا لذیذ دھواں اس کے دل و دماغ میں ناقابل بیان سرور کی لہریں پیدا کر رہا تھا۔ اب وقت ہو چکا تھا کہ گھر سے اس کی اکلوتی لڑکی جیناں روٹی لسی لے کر آجائے۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتی تھی۔ حالانکہ گھر میں اس کا ہاتھ بٹانے والا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں تھی جس کو دو سال ہوئے موجو نے ایک طویل جھگڑے کے بعد انتہائی غصے میں طلاق دے دی تھی۔ اس کی جوان اکلوتی بیٹی جیناں بڑی فرماں بردار لڑکی تھی۔ وہ اپنے باپ کا بہت خیال رکھتی تھی۔ گھر کا کاج جو اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بڑی مستعدی سے کرتی تھی کہ جو خالی وقت ملے اس میں چرخہ چلائے اور پونیاں کاتے۔ یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ جو گنتی کی تھیں ادھر ادھر کی خوش گپیوں میں گزار دے۔ چوہدری موجو کی زمین واجبی تھی مگر اس کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا۔ ایک دور افتادہ جگہ پر جہاں سے ریل کا گزر نہیں تھا۔ ایک کچی سڑک تھی جو اسے دور ایک بڑے گاؤں کے ساتھ ملاتی تھی۔ چوہدری موجو ہر مہینے دو مرتبہ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اس گاؤں میں جاتا تھا۔ جس میں دو تین دکانیں تھیں اور ضرورت کی چیزیں لے آتا تھا۔ پہلے وہ بہت خوش تھا۔ اس کو کوئی غم نہیں تھا۔ دو تین برس اس کو اس خیال نے البتہ ضرور ستایا تھا کہ اس کے کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوتی، مگر پھر وہ یہ سوچ کر شاکر ہو گیا کہ جو اللہ کو منظو ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ مگر اب جس دن سے اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر میکے رخصت کر دیا تھا۔ اس کی زندگی سوکھا ہوا نیچہ سی بن کے رہ گئی تھی۔ ساری طراوت جیسے اس کی بیوی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ چوہدری موجو مذہبی آدمی تھا۔ حالانکہ اسے اپنے مذہب کے متعلق صرف دو تین چیزوں ہی کا پتہ تھا کہ خدا ایک ہے جس کی پرستش لازمی ہے۔ محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ جن کے احکام ماننا فرض ہے اور قرآن پاک خدا کا کلام ہے جو محمدؐ پر نازل ہوا اور بس۔ نماز روزے سے وہ بے نیاز تھا۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا جس میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ دس پندرہ گھر تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے دور دور۔ لوگ اللہ اللہ کرتے تھے۔ ان کے دل میں اس ذات پاک کا خوف تھا مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ قریب قریب ہر گھر میں قرآن موجود تھا۔ مگر پڑھنا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سب نے اسے احتراماً جزدان میں لپیٹ کر کسی اونچے طاق میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کی ضرورت صرف اسی وقت پیش آتی تھی۔ جب کسی سے کوئی سچی بات کہلوانی ہوتی تھی یا کسی کام

کے لیے حلف اٹھانا ہوتا تھا۔ گاؤں میں مولوی کی شکل اسی وقت دکھائی دیتی تھی۔ جب کسی لڑکے یا لڑکی شادی ہوتی تھی۔ مرگ پر جنازہ وغیرہ وہ خود ہی پڑھ لیتے تھے۔ اپنی زبان میں۔ چوہدری موجو ایسے موقعوں پر زیادہ کام آتا تھا۔ اس کی زبان میں اثر تھا۔ جس انداز سے وہ مرحوم کی خوبیاں بیان کرتا تھا اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کرتا تھا۔ وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔ پچھلے برس جب اس کے دوست دینو کا جوان لڑکا مر گیا تو اس کو قبر میں اتار کر اس نے بڑے موثر انداز میں یہ کہا تھا۔ ہائے، کیا شیں جوان لڑکا تھا۔ تھوک پھینکتا تھا تو بیس گز دور جا کے گرتی تھی۔ اس کی پیشاب کی دھار کا تو آس پاس کے کسی گاؤں کھیڑے میں بھی مقابلہ کرنے والا موجود نہیں تھا اور بنی پکڑنے میں تو جواب نہیں تھا اس کا۔ ہے گھسنی کا نعرہ مارنا اور دو انگلیوں سے یوں بنی کھولتا جیسے کرتے کا بٹن کھولتے ہیں۔ دینو یار، تجھ پر آج قیامت کا دن ہے۔ تو کبھی یہ صدمہ نہیں برداشت کرے گا۔ یارو اسے مر جانا چاہیے تھا۔ ایسا شیں جوان لڑکا۔ ایسا خوبصورت گبرو جوان۔ نیتی سنیاری جیسی سندر اور ہٹیلی ناری اس کو قابو کرنے کے لیے تعویذ دھاگے کراتی رہی۔ مگر بھئی مرحبا ہے دینو، تیرا لڑکا لنگوٹ کا پکا رہا۔ خدا کرے اس کو جنت میں سب سے خوبصورت حور ملے اور وہاں بھی لنگوٹ کا پکا رہے۔ اللہ میاں خوش ہو کر اس پر اپنی اور رحمتیں نازل کرے گا۔ آمین۔“

یہ چھوٹی سی تقریر سن کر دس بیس آدمی جن میں دینو بھی شامل تھا۔ ڈھاریں مار مار کر رو پڑتے تھے۔ خود چوہدری موجو کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ مر جو نے جب اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی تھی تو اس نے مولوی بلانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ تین مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق کہہ دو تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ قصہ اس طرح ختم کیا تھا۔ مگر دوسرے ہی دن اس کو بہت افسوس ہوا تھا۔ بڑی ندامت ہوئی تھی کہ اس نے یہ کیا غلطی کی۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مگر طلاق تک نوبت نہیں آتی۔ اس کو در گزر کرنا چاہیے تھا۔ پھاتاں اس کو پسند تھی۔ گو وہ اب جوان نہیں تھی، لیکن پھر بھی اس کو اس کا جسم پسند تھا۔ اس کی باتیں پسند تھیں۔ اور پھر وہ اس کی جیناں کی ماں تھی۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا جو واپس نہیں آسکتا تھا۔ چوہدری موجو جب بھی اس کے متعلق سوچتا تو اس کے چہیتے چموڑے کا دھواں اس کے حلق میں تلخ گھونٹ بن بن کے جانے لگتا۔ جیناں خوبصورت تھی۔ اپنی ماں کی طرح ان دو برسوں میں اس نے ایک دم بڑھنا شروع کر دیا تھا اور دیکھتے دیکھتے جوان مٹیار بن گئی تھی جس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ پھوٹ کے نکل رہی تھی۔ چوہدری موجو کو اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی تھی۔ یہاں پھر اس کی پھاتاں یاد آتی۔ یہ کام وہ کتنی آسان سے کر سکتی تھی۔ کھری کھاٹ پر چوہدری موجو نے اپنی نشست اور اپنا تہمد درست کرتے ہوئے چموڑے سے غیر معمولی لمبا کش لیا اور کھانسنے لگا۔ کھانسنے کے دوران میں کسی کی آواز آئی۔

”السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔“

چوہدری موجو نے پلٹ کر دیکھا تو اسے سفید کپڑوں میں ایک دراز ریش بزرگ نظر آئے۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص کہاں سے آگیا ہے۔ دراز ایش بزرگ کی آنکھیں بڑی بڑی اور بارعب تھیں جن میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ لمبے لمبے پٹے تھے۔ ان اور داڑھی کے بال کھچڑی تھے۔ سفید زیادہ اور سیاہ کم۔ سر پر سفید عمامہ تھا۔ کاندھے پر ریشم کا کاڑھا ہوا بسنتی رومال۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والا موٹا عصا تھا۔ پاؤں میں لال کھال کا نرم و نازک جوتا۔ چوہدری موجو نے جب اس بزرگ کا سراپا غور سے دیکھا۔ تو اس کے دل میں فوراً ہی اس کا احترام پیدا ہو گیا۔ چارپائی پر سے جلدی جلدی اٹھ کر وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”آپ کہاں سے آئے؟ کب آئے؟“

بزرگ کی کتری ہوئی شرعی لبوں میں مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”فقیر کہاں سے آئیں گے۔ ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ان کے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے جدھر حکم دیا چل پڑے۔ جہاں ٹھہرنے کا حکم ہوا وہیں ٹھہر گئے۔“

چوہدری موجو پر ان الفاظ کا بہت اثر ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر بزرگ کا ہاتھ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ چوما، آنکھوں سے لگایا۔

”چوہدری موجو کا گھر آپ کا اپنا گھر ہے۔“

بزرگ مسکرایا ہوا کھاٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے چاندی کی موٹھ والے اعصا کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس پر اپنا سر جھکا دیا

”اللہ جل شانہ، کو جانے تیری کون سی ادا پسند آگئی کہ اپنے اس حقیر اور عاصی بندے کو تیرے پاس بھیج دیا۔“

چوہدری موجو نے خوش ہو کر پوچھا۔

”تو مولوی صاحب آپ اس کے حکم سے آئے ہیں؟“

مولوی صاحب نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور کسی قدر خشم آلود لہجے میں کہا۔

”تو کیا ہم تیرے حکم سے آئے ہیں۔ ہم تیرے بندے ہیں یا اس کے جس کی عبادت میں ہم نے پورے چالیس برس گزار کر یہ تھوڑا بہت رتبہ حاصل کیا ہے۔“

چوہدری موجو کانپ گیا۔ اپنے مخصوص گنوار لیکن پر خلوص انداز میں اس نے مولوی صاحب سے اپنی تقصیر معاف کرائی اور کہا۔

”مولوی صاحب، ہم جیسے انسانوں سے جن کو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ہم گنہگار ہیں۔ ہمیں بخشوانا اور بخشنا آپ کا کام ہے۔“

مولوی صاحب نے اپنی بڑی بڑی سرمہ لگی آنکھیں بند کیں اور کہا۔

”ہم اسی لیے آئے ہیں۔“

چوہدری موجو زمین پر بیٹھ گیا اور مولوی صاحب کے پاؤں دبانے لگا۔ اتنے میں اس کی لڑکی جیناں آ گئی۔ اس نے مولوی صاحب کو دیکھا تو گھونگھٹ چھوڑ لیا۔ مولوی صاحب نے مندی آنکھوں سے پوچھا۔

”کون ہے چوہدری موجو؟“

”میری بیٹی مولوی صاحب۔ جیناں“!

مولوی صاحب نے نیم وا آنکھوں سے جیناں کو دیکھا اور موجو سے کہا۔

”ہم فقیروں سے کیا پردہ ہے۔ اس سے پوچھو۔“

”کوئی پردہ نہیں مولوی صاحب۔ پردہ کیسا ہو گا۔“

پھر موجو جیناں سے مخاطب ہوا۔‘

”یہ مولوی صاحب جیناں۔ اللہ کے خاص بندے۔ ان سے پردہ کیسا۔ اٹھا لے اپنا گھونگھٹ“!

جیناں نے اپنا گھونگھٹ اٹھا لیا۔ مولوی صاحب نے اپنی سرمہ لگی نظریں بھر کے اس کی طرف دیکھا اور موجو سے کہا۔

”تیری بیٹی خوبصورت ہے چوہدری موجو“!

جیناں شرما گئی۔ موجو نے کہا۔

”اپنی ماں پر ہے مولوی صاحب“!

”کہاں ہے اس کی ماں“

مولوی صاحب نے ایک بار پھر جیناں کی جوانی کی طرف دیکھا۔ چوہدری موجو سٹپٹا گیا کہ جواب کیا دے۔ مولوی صاحب نے پھر پوچھا۔

”اس کی ماں کہاں ہے چوہدری موجو۔“

موجو نے جلدی سے کہا۔

”مر چکی ہے جی“!

مولوی صاحب کی نظریں جیناں پر گڑی تھیں۔ اس کا ردعمل بھانپ کر انھوں نے موجو سے کڑک کر کہا۔

”تو جھوٹ بولتا ہے۔“

موجو نے مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور ندامت بھری آواز میں کہا۔

”جی ہاں۔ جی ہاں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ میں بڑا جھوٹا آدمی ہوں۔ میں نے اس کو طلاق دے دی تھی مولوی صاحب۔“

مولوی صاحب نے ایک لمبی ’ہوں‘ کی اور نظریں جیناں کی چدریا سے ہٹا لیں اور موجو سے مخاطب ہوئے۔

”تو بہت بڑا گناہگار ہے۔ کیا قصور تھا اس بے زبان کا؟“

موجو ندامت میں غرق تھا۔

”کچھ نہیں معلوم مولوی صاحب۔ معمولی سی بات تھی جو بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی۔ میں واقعی گنہگار ہوں۔ طلاق دینے کے دوسرے دن ہی میں نے سوچا تھا کہ موجو تو نے یہ کیا جھک ماری۔ پر اس وقت کیا ہو سکتا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔ پچھتاوے سے کیا ہو سکتا تھا مولوی صاحب۔“

مولوی صاحب نے چاندی کی موٹھ والا عصا موجو کے کاندھے پر رکھ دیا۔

”اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات بہت بڑی ہے۔ وہ بڑا رحیم ہے، بڑا کریم ہے۔ وہ چاہے تو ہر بگڑی بنا سکتا ہے۔ اس کا حکم ہوا تو یہ حقیر فقیر، ہی تیری نجات کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گا۔
“

ممنون و تشکر چوہدری موجو مولوی صاحب کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گیا اور رونے لگا۔ مولوی صاحب نے جیناں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی اشک رواں تھے۔

”ادھر آ لڑکی۔“

مولوی صاحب کے لہجے میں ایسا تحکم تھا۔ جس کو رد کرنا جیناں کے لیے ناممکن تھا۔ روٹی اور لسی ایک طرف رکھ کر وہ کھاٹ کے پاس چلی گئی۔ مولوی صاحب نے اس کو بازو سے پکڑا اور کہا۔

”بیٹھ جا۔“

جیناں زمین پر بیٹھنے لگی تو مولوی صاحب نے اس کا بازو اوپر کھینچا۔

”ادھر میرے پاس بیٹھ۔“

جیناں سمٹ کر مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر اس کو اپنے قریب کر لیا اور ذرا دبا کر پوچھا۔

”کیا لائی ہے تو ہمارے کھانے کے لیے۔“

جیناں نے ایک طرف ہٹنا چاہا مگر گرفت مضبوط تھی۔ اس کو جواب دینا پڑا۔

”جی۔ جی روٹیاں ہیں۔ ساگ ہے اور لسی۔“

مولوی صاحب نے جیناں کی پتلی مضبوط کمر اپنے ہاتھ سے ایک بار پھر دبائی

”چل کھول کھانا اور ہمیں کھلا۔“

جیناں اٹھ کر چلی گئی تو مولوی صاحب نے موجو کے کندھے سے اپنا چاندی کی موٹھ والا عصا ننھی سی ضرب کے بعد اٹھا لیا۔

”اٹھ موجو۔ ہمارے ہاتھ دھلا۔“

موجو فوراً اٹھا۔ پاس ہی کنواں تھا۔ پانی لایا اور مولوی صاحب کے ہاتھ بڑے مریدانہ طور پر دھلائے جیناں نے چارپائی پر کھانا رکھ دیا۔ مولوی صاحب سب کا سب کھا گئے اور جیناں کو حکم دیا کہ وہ ان کے ہاتھ دھلائے۔ جیناں عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ مولوی صاحب کی شکل و صورت اور ان کی گفتگو کا انداز ہی کچھ ایسا تحکم بھرا تھا۔ مولوی صاحب نے ڈکار لے کر بڑے زور سے الحمدللہ کہا۔ داڑھی پر گیلا گیلا ہاتھ پھیرا۔ ایک اور ڈکار لی اور چارپائی پر لیٹ گئے اور ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے جیناں کی ڈھلکی ہوئی چدریا کی طرف دیکھتے رہے۔ اس نے جلدی جلدی برتن سمیٹے اور چلی گئی۔ مولوی صاحب نے آنکھ بند کی اور موجو سے کہا۔

”چوہدری اب ہم سوئیں گے۔“

چوہدری کچھ دیر ان کے پاؤں دابتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ سو گئے ہیں۔ تو ایک طرف جا کر اس نے اپلے سلگائے اور چلم میں تمباکو بھر کے بھوکے پیٹ چھوڑا پینا شروع کر دیا۔ مگر وہ خوش تھا۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا کوئی بہت بڑا بوجھ دور ہو گیا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے مخصوص گنوار مگر مخلص انداز میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے اپنی جناب سے مولوی صاحب کی شکل میں فرشتہ رحمت بھیج دیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ مولوی صاحب کے پاس ہی بیٹھا رہے کہ شاید ان کو کسی خدمت کی ضرورت ہو، مگر جب دیر ہو گئی اور وہ سوتے رہے، تو وہ اٹھ کر اپنے کھیت میں چلا گیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کو اس بات کا قطعاً خیال نہیں تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ اس کو بلکہ اس بات کی بے حد مسرت تھی کہ اس کا کھانا مولوی صاحب نے کھایا اور اس کو اتنی بڑی سعادت ہوئی۔ شام سے پہلے پہلے جب وہ کھیت سے واپس آیا تو اس کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ مولوی صاحب موجود نہیں۔ اس نے خود کو بڑی لعنت ملامت کی کہ وہ کیوں چلا گیا۔ ان کے حضور بیٹھتا رہتا۔ شاید وہ ناراض ہو کر چلے گئے ہیں اور کوئی بددعا بھی دے گئے ہوں۔ جب چوہدری موجو نے یہ سوچا تو اس کی سادہ روح لرز گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ادھر ادھر مولوی صاحب کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملے۔ گہری شام ہو گئی۔ پھر بھی ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تھک ہار کر اپنے کو دل ہی دل میں کوستا اور لعنت ملامت کرتا۔ وہ گردن جھکائے گر کی طرف جا رہا تھا کہ اسے دو جوان لڑکے گھبرائے ہوئے ملے۔ چوہدری موجو نے ان سے گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو انھوں نے پہلے تو ٹالنا چاہا، مگر پھر اصل بات بتا دی کہ وہ گھرے میں دبا ہوا شراب کا گھڑا نکال کر پینے والے تھے کہ ایک نورانی صورت والے بزرگ ایک دم وہاں نمودار ہوئے اور بڑی غضب ناک نگاہوں سے ان کو دیکھ کر یہ پوچھا کہ وہ یہ کیا حرام کاری کر رہے ہیں۔ جس چیز کو اللہ تبارک تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے وہ اسے پی کر اتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں جس کا کوئی کفارہ ہی نہیں ان لوگوں کو اتنی جرات نہ ہوئی کہ کچھ بولیں۔ بس سر پاؤں رکھ کے بھاگے اور یہاں آ کے دم لیا۔ چوہدری موجو نے ان دونوں کو بتایا کہ وہ نورانی صورت والے واقعی اللہ کو پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ پھر اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اب جانے اس گاؤں پر کیا قہر نازل ہو گا۔ ایک اس نے ان کو چھوڑ چلے جانے کی بُری حرکت کی، ایک انھوں نے کہ حرام شے نکال کر پی رہے تھے۔

”اب اللہ ہی بچائے۔ اب اللہ ہی بچائے میرے بچو۔“

یہ بڑبڑاتا چوہدری موجو گھر کی جانب روانہ ہوا۔ جیناں موجود تھی، پر اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور خاموش کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس پر اور گاؤں پر ضرور کوئی خدائی آفت آئے گی۔ شام کا کھانا تیار تھا، جیناں نے مولوی صاحب کے لیے بھی پکار کھا تھا۔ جب اس نے اپنے باپ سے پوچھا کہ مولوی صاحب کہاں ہیں تو اس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”گئے۔ چلے گئے۔ ان کا ہم گنہگاروں کے ہاں کیا کام“!

جیناں کو افسوس ہوا کیونکہ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ وہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ نکالیں گے جس سے اس کی ماں واپس آجائے گی۔ پر وہ جا چکے تھے۔ اب وہ راستہ ڈھونڈے والا کون تھا۔ جیناں خاموشی سے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ کھانا ٹھنڈا ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈیوڑھی میں آہٹ ہوئی۔ باپ بیٹی دونوں چونکے۔ موجو اٹھ کے باہر گیا اور چند لمحات میں مولوی صاحب اور وہ دونوں اندر صحن میں تھے۔ دیے کی دھندلی روشنی میں جیناں نے دیکھا کہ مولوی صاحب لڑکھڑا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مٹکا ہے۔ موجو نے ان کو سہارے دے کر چارپائی پر بٹھایا۔ مولوی صاحب نے گھڑا موجو کو دیا اور لکنت بھرے لہجے میں کہا۔

”آج خدا نے ہمارا بہت کڑا امتحان لیا۔ تمہارے گاؤں کے دو لڑکے شراب کا گھڑا نکال کر پینے والے تھے کہ ہم پہنچ گئے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ ہم کو بہت صدمہ ہوا کہ اتنی چھوٹی عمر اور اتنا بڑا گناہ۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اسی عمر میں تو انسان رستے سے بھٹکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ان کا گناہ معاف کیا جائے۔ جواب ملا۔ جانتے ہو کیا جواب ملا؟“

موجو نے لرزتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں“!

”جواب ملا۔ کیا تو ان کا گناہ اپنے سر لیتا ہے۔ میں نے عرض کی۔ ہاں باری تعالیٰ۔ آواز آئی، تو جا یہ سارا گھڑا شراب کا تو پی۔ ہم نے ان لڑکوں کو بخشا“!

موجو ایک ایسی دنیا میں چلا گیا جو اس کے اپنے تخیل کی پیداوار تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”تو آپ نے پی۔“

مولوی صاحب کا لہجہ اور زیادہ لکنت بھرا ہو گیا۔

”ہاں پی۔ پی۔ ان کا گناہ اپنے سر لینے کے لیے پی۔ رب العزت کی آنکھوں میں سرخرو ہونے کے لیے پی۔ گھڑے میں اور بھی پڑی ہے۔ یہ بھی ہمیں پینی ہے۔ رکھ دے اسے سنبھال کے اور اور دیکھ اس کی ایک بوند ادھر ادھر نہ ہو۔“

موجو نے گھڑا اٹھا کر اندر کوٹھڑی میں رکھ دیا اور اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ واپس صحن میں آیا تو مولوی صاحب جیناں سے اپنا سر دبوا رہے تھے اور اس سے کہہ رہے تھے۔

”جو آدمی دوسروں کے لیے کچھ کرتا ہے، اللہ جل شانہ، اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تجھ سے بھی خوش ہے۔ ہم بھی تجھ سے خوش ہیں۔“

اور اسی خوشی میں مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اس کو اپنے گلے سے لگا لیا اور موجو سے کہا۔

”چوہدری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اٹھا ہے۔“

چوہدری سرتاپا ممنون و متشکر تھا۔

”یہ سب آپ کی دعا ہے۔ آپ کی مہربانی ہے۔“

مولوی صاحب نے جیناں کو ایک مرتبہ پھر اپنے سینے کے ساتھ بھنچا۔

”اللہ مہربان سو کل مہربان۔ جیناں ہم تجھے ایک وظیفہ بتائیں گے۔ وہ پڑھا کرنا۔ اللہ ہمیشہ مہربان رہے گا۔“

دوسرے دن مولوی صاحب بہت دیر سے اٹھے۔ موجو ڈر کے مارے کھیتوں پر نہ گیا۔ صحن میں ان کی چارپائی کے پاس بیٹھا رہا۔ جب وہ اٹھے تو ان کو مسواک، نہلایا دھلایا۔ اور ان کے ارشاد کے مطابق شراب کا گھڑا لا کر ان کے پاس رکھ دیا۔ مولوی صاحب نے کچھ پڑھا۔ گھڑے کا منہ کھول کر اس میں تین بار پھونکا اور دو تین کٹورے چڑھا گئے۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ کچھ پڑھا اور بلند آواز میں کہا

”ہم تیرے ہر امتحان میں پورے اتریں گے مولا۔“

پھر وہ چوہدری سے مخاطب ہوئے

”موجو جا۔ حکم ملا ہے ابھی جا اور اپنی بیوی کو لے آ۔ راستہ مل گیا ہے ہمیں۔“

موجو بہت خوش ہوا۔ جلدی جلدی اس نے گھوڑی پر زین کسی اور کہا کہ وہ دوسرے روز صبح سویرے پہنچ جائے گا۔ پھر اس نے جیناں سے کہا کہ وہ مولوی صاحب کی ہر آسائش کا خیال رکھے اور خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔ جیناں برتن مانجھنے میں مشغول ہو گئی۔ مولوی صاحب چارپائی پر بیٹھے اسے گھورتے اور شراب کے کٹورے پیتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے جیب سے موٹے موٹے دانوں والی تسبیح اٹھائی اور پھیرنا شروع کر دی۔ جب جیناں کام سے فارغ ہو گئی تو انھوں نے اس سے کہا۔

”جیناں دیکھو۔ وضو کرو۔“

جیناں نے بڑے بھولپن سے جواب دیا۔

”مجھے نہیں آتا مولوی جی۔“

مولوی صاحب نے بڑے پیار سے اس کو سرزنش کی۔

”وضو کرنا نہیں آتا۔ کیا جواب دے گی اللہ کو۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اس کو وضو کرایا اور ساتھ ساتھ اس انداز سے سمجھاتے رہے کہ وہ اس کے بدن کے ایک ایک کونے کھدرے کو جھانک جھانک کر دیکھ سکیں۔ وضو کرانے کے بعد مولوی صاحب نے جانماز مانگی۔ وہ نہ ملی تو پھر ڈانٹا، مگر اسی انداز میں۔ کھیس منگوایا اس کو اندر کی کوٹھڑی میں بچھایا اور جیناں سے کہا کہ باہر کی کنڈی لگا دے۔ جب کنڈی لگ گئی تو اس سے کہا کہ گھڑا اور کٹورا اٹھا کے اندر لے آئے۔ وہ لے آئی۔ مولوی صاحب نے آدھا کٹورا پیا اور آدھا اپنے سامنے رکھ لیا اور تسبیح پھیرنا شروع کر دی جیناں ان کے پاس خاموش بیٹھی رہی۔ بہت دیر تک مولوی صاحب آنکھیں بند کیے اسی طرح وظیفہ کرتے رہے، پھر انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ کٹورا جو آدھا بھرا تھا، اس میں تین پھونکیں ماریں اور جیناں کی طرف بڑھا دیا۔

”پی جاؤ اسے۔“

جیناں نے کٹورا پکڑ لیا مگر اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ مولوی صاحب نے بڑے جلال بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”ہم کہتے ہیں، پی جاؤ۔ تمہارے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔“

جیناں پی گئی، مولوی صاحب اپنی پتلی لبوں میں مسکرائے اور اس سے کہا

”ہم پھر اپنا وظیفہ شروع کرتے ہیں۔ جب شہادت کی انگلی سے اشارہ کریں تو آدھا کٹورہ گھڑے سے نکال کر فوراً پی جانا۔ سمجھ گئیں۔“

مولوی صاحب نے اس کو جواب کا موقعہ ہی نہ دیا اور آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ جیناں کے منہ کا ذائقہ بے حد خراب ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سینے میں آگ سی لگ گئی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیے۔ پر وہ کیسے اٹھ سکتی تھی۔ جلن کو حلق اور سینے میں لیے دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کے بعد ایک دم مولوی صاحب کی شہادت کی انگلی زور سے اٹھی۔ جیناں کو جیسے کسی نے ہپناٹزم کر دیا تھا۔ فوراً اس نے آدھا کٹورا بھرا اور پی گئی۔ تھوکنا چاہا مگر اٹھ نہ سکی۔ مولوی صاحب اسی طرح آنکھیں بند کیے تسبیح کے دانے کھٹا کھٹ پھیرتے رہے۔ جیناں نے محسوس کیا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے اور جیسے اس کو نیند آ رہی ہے پھر اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یوں محسوس کیا کہ وہ کسی بے داڑھی مونچھ والے جوان مرد کی گود میں ہے اور وہ اسے جنت دکھانے لے جا رہا ہے۔ جیناں نے جب آنکھیں کھولیں تو وہ کھیس پر لیٹی تھی۔ اس نے نیم وا مخمور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور یہاں کیوں لیٹی تھی، کب لیٹی تھی کے متعلق سوچنا شروع کیا تو اسے سب کچھ دھند میں لپٹا نظر آیا۔ وہ پھر سونے لگی۔ لیکن ایک دم اٹھ بیٹھی۔ مولوی صاحب کہاں تھے؟۔ اور وہ جنت؟ کوئی بھی نہیں۔ وہ باہر صحن میں نکلی تو دیکھا کہ دن ڈھل رہا ہے اور مولوی صاحب کھرے کے پاس بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ آہٹ سن کر انھوں نے پلٹ کر جیناں کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ جیناں واپس کوٹھڑی میں چلی گئی اور کھیس پر بیٹھ کر اپنی ماں کے متعلق سوچنے لگی۔ جس کو لانے اس کا باپ گیا ہوا تھا۔ پوری ایک رات باقی تھی۔ ان کی واپسی میں۔ اور سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کچھ پکایا ریندھا نہیں تھا۔ اس کے چھوٹے سے مضطرب دماغ میں بے شمار باتیں آ رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب نمودار ہوئے اور یہ کہہ کر چلے گئے۔

”مجھے تمہارے باپ کے لیے ایک وظیفہ کرنا ہے۔ ساری رات کسی قبر کے پاس بیٹھنا ہو گا۔ صبح آ جاؤں گا۔ تمہارے لیے بھی دعا مانگوں گا۔“

مولوی صاحب صبح سویرے نمودار ہوئے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں سرمے کی تحریر غائب تھی بے حد سرخ تھیں۔ ان کے لہجے میں لکنت تھی اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ۔ صحن میں آتے ہی انھوں نے مسکرا کر جیناں کی طرف دیکھا آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگایا۔ اس کو چوما اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جیناں ایک طرف کونے میں پیڑھی پر بیٹھ گئی اور گزشتہ دھندلے واقعات کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کو اپنے باپ کا بھی انتظار تھا۔ جس کو اس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ماں سے بچھڑے ہوئے اس کو دو برس ہو چکے تھے۔ اور جنت۔ وہ جنت۔ کیسی تھی وہ جنت!!۔ کیا وہ مولوی صاحب تھے؟۔ مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد اس سے مخاطب ہوئے۔

”جیناں، ابھی تک موجو نہیں آیا۔“

جیناں خاموش رہی۔ مولوی صاحب پھر اس سے مخاطب ہوئے۔

”اور میں ساری رات ایک ٹوٹی پھوٹی قبر پر سر نیوڑھائے سنسنان رات میں اس کے لیے وظیفہ پڑھتا رہا۔ کب آئے گا وہ؟۔ کیا وہ لے آئے گا تمہاری ماں کو۔“

جیناں نے صرف اس قدر کہا۔

”جی معلوم نہیں۔ شاید آتے ہی ہوں۔ آجائیں گے۔ اماں بھی آجائے گی۔ پر ٹھیک پتا نہیں۔“

اتنے میں آہٹ ہوئی۔ جیناں اٹھی۔ اس کی ماں نمودار ہوئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ موجو آیا تو اس نے مولوی صاحب کو بڑے ادب اور احترام کے ساتھ سلام کیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

”پھاتاں۔ سلام کرو مولوی صاحب کو۔“

پھاتاں اپنی بیٹی سے الگ ہوئی۔ آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھی اور مولوی صاحب کو سلام کیا۔ مولوی صاحب نے اپنی لال لال آنکھوں سے اس کو گھور کے دیکھا اور موجو سے کہا۔

”ساری رات قبر کے پاس تمہارے لیے وظیفہ کرتا رہا۔ ابھی ابھی اٹھ کے آیا ہوں۔ اللہ نے میری سن لی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

چوہدری موجو نے فرش پر بیٹھ کر مولوی صاحب کے پاؤں دابنے شروع کر دیے وہ اتنا ممنون و متشکر تھا کہ کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ بیوی سے مخاطب ہو کر اس نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا۔

”ادھر آ پھاتاں۔ تو ہی مولوی صاحب کا شکریہ ادا کر۔ مجھے تو نہیں آتا۔“

پھاتاں اپنے خاوند کے پاس بیٹھ گئی۔ پر وہ صرف اتنا کہہ سکی۔

”ہم غریب کیا ادا کر سکتے ہیں۔“

مولوی صاحب نے غور سے پھاتاں کو دیکھا۔

”موجو چوہدری، تم ٹھیک کہتے تھے۔ تمہاری بیوی خوبصورت ہے۔ اس عمر میں بھی جوان معلوم ہوتی ہے۔ بالکل دوسری جیناں۔ اس سے بھی اچھی۔ ہم سب ٹھیک کر دیں گے پھاتاں۔ اللہ کا فضل و کرم ہو گیا ہے۔“

میاں بیوی دونوں خاموش رہے۔ موجو مولوی صاحب کے پاؤں دباتا رہا۔ جیناں چولھا سلگانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب اٹھے۔ پھاتاں کے سر پر ہاتھ سے پیار کیا اور موجو سے مخاطب ہوئے۔

”اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے اور پھر اس کو اپنے گھر بسانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے، پھر جائز ہے۔“

موجو نے ہولے سے کہا۔

”میں سن چکا ہوں مولوی صاحب۔“

مولوی صاحب نے موجو کو اٹھایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”لیکن ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے غریب کو۔ اس سے بھول ہو گئی ہے۔ آواز آئی۔ ہم ہر روز سفارشیں کب تک سنیں گے تو اپنے لیے جو بھی مانگ ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے عرض کی، میرے شہنشاہ۔ بحر و بر کے مالک۔ میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا۔ تیرا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ موجو چوہدری کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ ارشاد ہوا۔ تو ہم اس کی محبت اور تیرے ایمان کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ ایک دن کے لیے تو اس سے نکاح کر لے۔ دوسرے دن طلاق دے کر موجو کے حوالے کر دے۔ ہم تیرے لیے بس صرف یہی کر سکتے ہیں کہ تو نے چالیس برس دل سے ہماری عبادت کی ہے۔“

موجو بہت خوش ہوا۔

”مجھے منظور ہے مولوی صاحب۔ مجھے منظور ہے“

اور پھاتاں کی طرف اس نے تمتمائی انکھوں سے دیکھا۔

”کیوں پھاتاں؟“

مگر اس نے پھاتاں کے جواب کا انتظار نہ کیا۔

”ہم دونوں کو منظور ہے۔“

مولوی صاحب نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ پڑھا۔ دونوں کے پھونک ماری اور آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں

”اللہ تبارک تعالیٰ۔ ہم سب کو اس امتحان میں پورا اتارے۔“

پھر وہ موجو سے مخاطب ہوا۔

”اچھا موجو۔ میں اب چلتا ہوں۔ تم اور جیناں آج کی رات کہیں چلے جانا۔ صبح سویرے آجانا۔“

یہ کہہ کر مولوی صاحب چلے گئے۔ جیناں اور موجو تیار تھے۔ جب شام کو مولوی صاحب واپس آئے تو انھوں نے ان سے بہت مختصر باتیں کیں۔ وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ آخر میں انھوں نے اشارہ کیا۔ جیناں اور موجو فوراً چلے گئے۔ مولوی صاحب نے کنڈی بند کر دی اور پھاتاں سے کہا۔

”تم آج کی رات میری بیوی ہو۔ جاؤ اندر سے بستر لاؤ اور چارپائی پر بچھاؤ۔ ہم سوئیں گے۔“

پھاتاں نے اندر کوٹھڑی سے بستر لا کر چارپائی پر بڑے سلیقے سے لگا دیا۔ مولوی صاحب نے کہا۔

”بی بی۔ تم بیٹھو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔“

یہ کہہ وہ کوٹھڑی میں چلے گئے۔ اندر دیا روشنی تھا۔ کونے میں برتنوں کے منارے کے پاس ان کا گھڑا رکھا تھا۔ انھوں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ تھوڑی سی باقی تھی۔ گھڑے کے ساتھ ہی منہ لگا کر انھوں نے کئی بڑے بڑے گھونٹ پیے۔ کاندھے سے ریشمی پھولوں والا بسنتی رومال اتار کر مونچھیں اور ہونٹ صاف کیے اور دروازہ بھیڑ دیا۔ پھاتاں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ کافی دیر کے بعد مولوی صاحب نکلے۔ ان کے ہاتھ میں کٹورا تھا۔ اس میں تین دفعہ پھونک کر انھوں نے پھاتاں کو پیش کیا۔

”لو اسے پی جاؤ۔“

پھاتاں پی گئی۔ قے آنے لگی تو مولوی صاحب نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔

”ٹھیک ہو جاؤ گی فوراً۔“

پھاتاں نے کوشش کی اور کسی قدر ٹھیک ہو گئی۔ مولوی صاحب لیٹ گئے۔ صبح سویرے جیناں اور موجو آئے تو انھوں نے دیکھا کہ صحن میں پھاتاں سو رہی ہے مگر مولوی صاحب موجود نہیں۔ موجو نے سوچا۔ باہر گئے ہوں گے کھیتوں میں۔ اس نے پھاتاں کو جگایا۔ پھاتاں نے غوں غوں کر کے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ پھر بڑبڑائی۔

”جنت۔ جنت۔“

لیکن جب اس نے موجو کو دیکھا تو پوری آنکھیں کھول کر بستر میں بیٹھ گئی۔ موجو نے پوچھا۔

”مولوی صاحب کہاں ہیں؟“

پھاتاں ابھی تک پورے ہوش میں نہیں تھی۔

”مولوی صاحب۔ کون مولوی صاحب۔ وہ تو۔ پتا نہیں کہاں گئے۔ یہاں نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“

موجو نے کہا۔

”میں دیکھتا ہوں انھیں باہر۔“

وہ جا رہا تھا کہ اسے پھاتاں کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ پلٹ کر اس نے دیکھا تکیے کے نیچے سے وہ کوئی کالی چیز نکال رہی تھی۔ جب پوری نکل آئی تو اس نے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“

موجو نے کہا۔

”بال۔“

پھاتاں نے بالوں کا وہ گچھا فرش پر پھینک دیا۔ موجو نے اسے اٹھا لیا اور غور سے دیکھا۔

”داڑھی اور پٹے۔“

جیناں پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ بولی

”مولوی صاحب کی داڑھی اور پٹے“

پھاتاں نے وہیں چارپائی سے کہا۔

”ہاں۔ مولوی صاحب کی داڑھی اور پٹے۔“

موجو عجیب چکر میں پڑ گیا۔

”اور مولوی صاحب کہاں ہیں؟“

لیکن فوراً ہی اس کے سادہ اور بے لوث دماغ میں ایک خیال آیا۔

”جیناں۔ پھاتاں، تم نہیں سمجھیں۔ وہ کوئی کرامات والے بزرگ تھے۔ ہمارا کام کر گئے اور یہ نشانی چھوڑ گئے۔“

اس نے ان بالوں کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور ان کو جیناں کے حوالے کر کے کہا۔

”جاؤ، ان کو کسی صاف کپڑے میں لپیٹ کر بڑے صندوق میں رکھ دو۔ خدا کے حکم سے گھر میں برکت ہی برکت رہے گی۔“

جیناں اندر کوٹھڑی میں گئی تو وہ پھاتاں کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے کہنے لگا۔

”میں اب نماز پڑھنا سیکھوں گا اور اس بزرگ کے لیے دعا کیا کروں گا جس نے ہم دونوں کو پھر سے ملا دیا۔“

پھاتاں خاموش رہی۔

عزت کے لیے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوعزت کے لیے

چونی لال نے اپنی موٹر سائیکل اسٹال کے ساتھ روکی اور گدی پر بیٹھے بیٹھے صبح کے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ سائیکل رکتے ہی اسٹال پر بیٹھے ہوئے دونوں ملازموں نے اسے نمستے کہی تھی۔ جس کا جواب چونی لال نے اپنے سر کی خفیف جنبش سے دے دیا تھا۔ سرخیوں پر سرسری نظر ڈال کر چونی لال نے ایک بندھے ہوئے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے فوراً دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی بی ایس اے موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ کیا اور یہ جاوہ جا۔ موڈرن نیوز ایجنسی قائم ہوئے پورے چار برس ہو چلے تھے۔ چونی لال اس کا مالک تھا۔ لیکن ان چار برسوں میں وہ ایک دن بھی اسٹال پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہر روز صبح اپنی موٹر سائیکل پر آتا، ملازموں کی نمستے کا جواب سر کی خفیف جنبش سے دیتا۔ تازہ اخباروں کی سرخیاں ایک نظر دیکھتا ہاتھ بڑھا کر بندھا ہوا بنڈل لیتا اور چلا جاتا۔ چونی لال کا اسٹال معمولی اسٹال نہیں تھا۔ حالانکہ امر تسر میں لوگوں کو انگریزی اور امریکی رسالوں اور پرچوں سے کوئی اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن موڈرن نیوز ایجنسی ہر اچھا انگریزی اور امریکی رسالہ منگواتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چونی لال منگواتا تھا۔ حالانکہ اسے پڑھنے وڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ شہر میں بہت کم آدمی جانتے تھے کہ موڈرن نیوز ایجنسی کھولنے سے چونی لال کا اصل مقصد کیا تھا۔ یوں تو اس سے چونی لال کو خاصی آمدن ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ وہ قریب قریب ہر بڑے اخبار کا ایجنٹ تھا۔ لیکن سمندر پار سے جو اخبار اور رسالے آتے بہت ہی کم تھے۔ پھر بھی ہر ہفتے ولائت کی ڈاک سے موڈرن نیوز ایجنسی کے نام سے کئی خوبصورت بنڈل اور پیکٹ آتے ہی رہتے۔ اصل میں چونی لال یہ پرچے اور رسالے بیچنے کیلیے نہیں بلکہ مفت بانٹنے کے لیے منگواتا تھا۔ چنانچہ ہر روز صبح سویرے وہ ان ہی پرچوں کا بنڈل لینے آتا تھا جو اس کے ملازموں نے باندھ کر الگ چھوڑے ہوتے تھے۔ شہر کے جتنے بڑے افسر تھے سب چونی لال کے واقف تھے۔ بعض کی واقفیت صرف یہیں تک محدود تھی کہ ہر ہفتے ان کے یہاں جو انگریزی اور امریکی پرچے آتے ہیں۔ شہر میں کوئی ایک موڈرن نیوز ایجنسی ہے۔ اس کا مالک چونی لال ہے۔ وہ بھیجتا ہے اور بل کبھی روانہ نہیں کرتا۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے مثال کے طور پر ان کو معلوم تھا کہ چونی لال کا گھر بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہے تو چھوٹا سا مگر بہت ہی نفیس طریقے پر سجا ہے۔ ایک نوکر ہے راما، بڑا صاف ستھرا اور سوفی صدی نوکر۔ سمجھدار، معمولی سا اشارہ سمجھنے والا جس کو صرف اپنے کام سے غرض ہے۔ دوسرے کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے اس سے اس کو دلچسپی نہیں۔ چونی لال گھر پر موجود ہو جب بھی ایک بات ہے۔ موجود نہ ہو جب بھی ایک بات ہے۔ مہمان کس غرض سے آیا ہے۔ یہ اس کو اُس کی شکل دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کبھی ضرورت محسوس نہیں ہو گی کہ اس سے سوڈے برف کے لیے کہا جائے یا پانوں کا آرڈر دیا جائے۔ ہر چیز خود بخود وقت پر مل جائے گی اور پھر تاک جھانک کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی کھٹکا نہیں کہ بات کہیں باہر نکل جائے گی۔ چونی لال اور اس کا نوکر راما دونوں کے ہونٹ دریا کے دریا پینے پر بھی خشک رہتے تھے۔ مکان بہت ہی چھوٹا تھا۔ بمبئی اسٹائل کا۔ یہ چونی لال نے خود بنوایا تھا۔ باپ کی وفات پر اسے دس ہزار روپیہ ملا تھا۔ جس میں سے پانچ ہزار اس نے اپنی چھوٹی بہن روپا کو دے دیے تھے اور جدی مکان بھی اور خود علیحدہ ہو گیا تھا۔ روپا اپنی ماں کے ساتھ اس میں رہتی تھی اور چونی لال اپنے بمبئے اسٹائل کے مکان میں۔ شروع شروع میں ماں بہن نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔ ساتھ نہ رہے تو کم از کم ان سے ملتا ہی رہے مگر چونی لال کو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنی ماں اور بہن سے نفرت تھی۔ دراصل اسے شروع ہی سے ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ باپ سے ضرور تھی کہ وہ تھانیدار تھا۔ لیکن جب وہ ریٹائر ہوا تو چونی لال کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی جس وقت اسے کالج میں کسی سے کہنا پڑتا کہ اس کے والد ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ہیں تو اسے بہت کوفت ہوتی۔ چونی لال کو اچھی پوشش اور اچھے کھانے کا بہت شوق تھا۔ طبیعت میں نفاست تھی۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس کے مکان میں ایک دفعہ بھی گئے۔ اس

کے سلیقے کی تعریف اب تک کرتے ہیں۔ این ڈبلیو آر کے ایک نیلام میں اس نے ریل کے ڈبے کی ایک سیٹ خریدی تھی۔ اس کو اس نے اپنے دماغ سے بہت ہی عمدہ دیوان میں تبدیل کروالیا تھا۔ چونی لال کو یہ اس قدر پسند تھا کہ اسے اپنی خوابگاہ میں رکھوایا ہوا تھا۔ شراب اس نے کبھی چھوئی نہیں تھی۔ لیکن دوسروں کو پلانے کا بہت شوق تھا۔ ایرے غیرے کو نہیں، خاص الخاص آدمیوں کو۔ جن کی سوسائٹی میں اونچی پوزیشن ہو۔ جو کوئی مرتبہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی وہ اکثر دعوت کرتا۔ کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں انھیں اپنے گھر میں جو اس نے خاص اپنے لیے بنوایا تھا۔ زیادہ پینے پر اگر کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو اسے کسی تردد کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ چونی لال کے پاس ایسی چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ جن سے نشہ کم ہو جاتا تھا۔ ڈر کے مارے کوئی گھر نہ جانا چاہے تو علیحدہ سجے سجائے دو کمرے موجود تھے۔ چھوٹا سا ہال تھا۔ اس میں کبھی کبھی مجرے بھی ہوتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ چونی لال کے اس مکان میں اس کے دوست کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں اپنی سہیلیوں سمیت رہے۔ لیکن اس نے ان کو مطلق خبر نہ ہونے دی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ البتہ جب اس کا کوئی دوست ان کی ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرتا تو چونی لال غیر متوقع طور پر بے تکلف ہو کر کہتا۔

”کیا کہتے ہو یار۔ مکان تمہارا اپنا ہے۔“

عام گفتگو میں وہ اپنے دوستوں کے اونچے مرتبے کے پیشِ نظر ایسا تکلف کبھی نہیں برتتا تھا۔ چونی لال کا باپ لالہ گردھاری لال عین اس وقت ریٹائر ہوا جب چونی لال تھرڈ ڈویژن میں انٹرنس پاس کر کے کالج میں داخل ہوا۔ پہلے تو یہ تھا کہ صبح شام گھر پہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ڈالیوں پر ڈالیاں آ رہی ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ تنخواہ بونس سیدھی بنک میں چلی جاتی تھی۔ لیکن ریٹائر ہونے پر کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ لالہ گردھاری لال کا نام جیسے بڑے آدمیوں کے رجسٹر سے کٹ گیا۔ یوں تو جمع پونجی کافی تھی۔ لیکن لالہ گردھاری لال نے بیکار مباش کچھ کیا کر، مکانوں کا سٹہ کھیلنا شروع کر دیا اور دو برسوں ہی میں آدھی سے زیادہ جائیداد گنوا دی، پھر لمبی بیماری نے آگھیرا۔ ان تمام واقعات کا چونی لال پر عجیب و غریب اثر ہوا۔ لالہ گردھاری لال کا حال پتلا ہونے کے ساتھ چونی لال کے دل میں اپنا پرانا ٹھاٹ اور اپنی پرانی ساکھ قائم رکھنے کی خواہش بڑھتی گئی اور آخر میں اس کے ذہن نے آہستہ آہستہ کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ بڑے آدمیوں کا بظاہر ہم جلیس تھا۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا۔ لیکن اصل میں وہ ان سے بہت دور تھا۔ ان کے رتبے سے، ان کی جاہ و منزلت سے البتہ اس کا وہی رشتہ تھا۔ جو ایک بُت سے پجاری کا ہو سکتا ہے یا ایک آقا سے ایک غلام کا۔ ہو سکتا ہے کہ چونی لال کے وجود کے کسی گوشے میں بہت ہی بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی جو وہیں کی وہیں دب گئی اور یہ صورت اختیار کر گئی۔ جواب اس کے دل و دماغ میں تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتا۔ اس میں انتہائی درجے کا خلوص تھا۔ کوئی بڑا آدمی اس سے ملے نہ ملے یہی کافی تھا کہ وہ اس کے دیے ہوئے امریکی اور انگریزی پرچے ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔ فسادات ابھی شروع نہیں ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقسیم کی بات بھی ابھی نہیں چلی تھی کہ چونی لال کی بہت دنوں کی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔ ایک بہت ہی بڑے افسر تھے۔ جس سے چونی لال کی جان پہچان نہ ہو سکی تھی۔ ایک دفعہ اس کے مکان پر شہر کی سب سے خوبصورت طوائف کا مجرا ہوا۔ چند دوستوں کے ہمراہ اس بڑے افسر کا شرمیلا بیٹا ہربنس بھی چلا آیا۔ چنانچہ جب چونی لال کی اس نوجوان سے دوستی ہو گئی تو اس نے سمجھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے باپ سے بھی راہ و رسم پیدا ہو ہی جائے گی۔ ہربنس جس نے تعیش کی زندگی میں نیا نیا قدم رکھا تھا بہت ہی الھڑ تھا۔ چونی لال خود تو شراب نہیں پیتا تھا۔ لیکن ہربنس کا شوق پورا کرنے کے لیے اور اسے شراب نوشی کے ادب آداب سکھانے کے لیے ایک دو دفعہ اسے بھی پینی پڑی۔ لیکن بہت ہی قلیل مقدار میں۔ لڑکے کو شراب پینی آ گئی۔ تو اس کا دل کسی اور چیز کو چاہا۔ چونی لال نے یہ بھی مہیا کر دی اور کچھ اس انداز سے کہ ہربنس کو جھینپنے کا موقع نہ ملے۔ جب کچھ دن گزر گئے تو چونی لال کو محسوس ہوا کہ ہربنس ہی کی دوستی کافی ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ لوگوں کی سفارشیں پوری کرا لیتا تھا۔ ویسے تو شہر میں چونی لال کے اثر و رسوخ کا ہر شخص قائل تھا۔ لیکن جب سے ہربنس اس کے حلقہ واقفیت میں آیا تھا اس کی دھاک اور بھی زیادہ بیٹھ گئی تھی۔ اکثر یہی سمجھتے تھے کہ چونی لال اپنے اثر و رسوخ سے ذاتی فائدہ اٹھاتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے لیے کبھی کسی سے سفارش نہیں کی تھی۔ اس کو شوق تھا دوسروں کے کام کرنے کا اور انھیں اپنا ممنونِ احسان بنانے کا بلکہ یوں کہیے کہ ان کے دل و دماغ پر کچھ ایسے خیالات۔ طارق کرنے کا کہ بھی کمال ہے۔ ایک معمولی سی نیوز ایجنسی کا مالک ہے لیکن بڑے بڑے حاکموں تک اس کی رسائی ہے۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن چونی لال حقیقت میں جو کچھ تھا بہت ہی کم آدمی جانتے تھے۔ ایک کو خوش کیجیے تو بہت سوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ چونی لال کے جہاں احسان مند تھے وہاں دشمن بھی تھے اور اس تاک میں رہتے تھے کہ موقعہ ملے اور اس سے بدلہ لیں۔ فسادات شروع ہوئے تو چونی لال کی مصروفیات زیادہ ہو گئیں۔ مسلمان اور ہندوؤں دونوں کے لیے اس نے کام کیا۔ لیکن صرف ان ہی کے لیے جن کا سوسائٹی میں کوئی درجہ تھا۔ اس کے گھر کی رونق بھی بڑھ گئی۔ قریب قریب ہر روز کوئی نہ کوئی سلسلہ رہتا۔ اسٹور روم جو سیڑھیوں کے نیچے تھا۔ شراب اور بیئر کی خالی بوتلوں سے بھر گیا تھا۔ ہربنس کا الھڑپن اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ اب اسے چونی لال کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑے آدمی کا لڑکا تھا۔ فسادات نے دستر خوان بچھا کر نت نئی چیزیں اس کے لیے چن دی تھیں۔ چنانچہ قریب قریب ہر روز وہ چونی لال کے مکان میں موجود ہوتا۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ چونی لال اپنے کمرے میں ریل گاڑی کی سیٹ سے بنائے ہوئے دیوان پر بیٹھا اپنے پستول پر انگلی گھما رہا تھا کہ دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ چونی لال چونک پڑا اور سوچنے لگا۔ بلوائی؟۔ نہیں!۔ راما؟۔ نہیں! وہ تو کئی دنوں سے کرفیو کے باعث نہیں آ رہا تھا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ہربنس کی سہمی ہوئی ڈری ہوئی آواز آئی۔ چونی لال نے دروازہ کھولا۔ ہربنس کا رنگ ہلدی کے گابھے کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ تک پیلے تھے چونی لال نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

”وہ۔ وہ۔“

آواز ہربنس کے سوکھے ہوئے گلے میں اٹک گئی۔ چونی لال نے اس کو دلاسا دیا۔

”گھبرایئے نہیں۔ بتایئے کیا ہوا ہے۔“

ہربنس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”وہ۔ وہ۔ لہو۔ بند ہی نہیں ہوتا لہو۔“

چونی لال سمجھا تھا کہ شاید لڑکی مر گئی ہے۔ چنانچہ یہ سن کر اسے ناامیدی سی ہوئی۔ کیونکہ وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کی پوری اسکیم اپنے ہوشیار دماغ میں تیار کر چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر جب اس کے گھر میں اس کے مہمان کسی مشکل میں گرفتار ہو جائیں چونی لال کا دماغ غیر معمولی طور پر مستعد ہو جاتا تھا۔ مسکرا کر اس نے ہربنس کی طرف دیکھا جو کہ لرز رہا تھا

”میں سب ٹھیک کیے دیتا ہوں۔ آپ گھبرایئے نہیں۔“

یہ کہہ اس نے اس کمرے کا رخ کیا۔ جس میں ہربنس تقریباً سات بجے سے ایک لڑکی کے ساتھ جانے کیا کرتا رہا تھا۔ چونی لال نے ایک دم بہت سی باتیں سوچیں۔ ڈاکٹر۔ نہیں۔ بات باہر نکل جائے گی۔ ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا سوال ہے اور یہ سوچتے ہوئے اسے عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس ہوتی کہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کے ننگ و ناموس کا محافظ ہے۔ راما؟۔ کرفیو کے باعث وہ کئی دنوں سے نہیں آ رہا تھا۔ برف؟۔ ہاں برف ٹھیک ہے۔ ریفرجریٹر موجود تھا۔ لیکن سب سے بڑی پریشانی چونی لال کو یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ایسے معاملوں سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن اس نے سوچا کچھ بھی ہو۔ کوئی نہ کوئی اوپائے نکالنا ہی پڑے گا۔ چونی لال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ساگوان کے اسپرنگوں والے پلنگ پر ایک لڑکی لیٹی تھی اور سفید چادر خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ چونی لال کو بہت گھن آئی۔ لیکن وہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے کروٹ بدلی اور ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔

”بھیا“!

چونی لال نے بھینچی ہوئی آواز میں کہا۔

”روپا“!

اور اس کے دماغ میں اوپر تلے سینکڑوں باتوں کا انبار سا لگ گیا۔ ان میں سب سے ضروری بات یہ تھی کہ ہربنس کو پتا نہ چلے کہ روپا اس کی بہن ہے چنانچہ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر روپا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل کر معاملے پر غور کرنے کیلیے دروازہ کی طرف بڑھا۔ دہلیز میں ہربنس کھڑا تھا۔ اس کا رنگ اب پہلے سے بھی زرد تھا۔ ہونٹ بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ چونی لال کو دوبدو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ چونی لال نے دروازہ بھیڑ دیا۔ ہربنس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ چونی لال خاموش تھا۔ اس کے چہرے کا کوئی خط بگڑا ہوا نہیں تھا۔ اصل میں وہ سارے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ اس قدر لعمق سے غور کر رہا تھا کہ وہ ہربنس کی موجودگی سے بھی غافل تھا۔ مگر ہربنس کو چونی لال کی غیر معمولی خاموشی میں اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ چونی لال اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ہربنس زور سے چیخا اور دوڑ کر اس میں داخل ہوا۔ بہت ہی زور سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریل گاڑی کی سیٹ والے دیوان پر سے پستول اٹھایا اور باہر نکل کر چونی لال کی طرف تان دیا۔ چونی لال پھر بھی کچھ نہ بولا وہ ابھی تک معاملہ سلجھانے میں مستغرق تھا۔ سوال ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا تھا۔ پستول ہربنس کے ہاتھ میں کپکپانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد فیصلہ ہو جائے۔ لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا تھا۔ دونوں چونی لال اور ہربنس کچھ دیر خاموش رہے۔ لیکن ہربنس زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکا۔ اس کے دل و دماغ میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک دم اس نے بولنا شروع کیا۔

”میں۔ میں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ۔ کہ یہ تمہاری بہن ہے۔ یہ ساری شرارت اس مسلمان کی ہے۔ اس مسلمان سب انسپکٹر کی۔ کیا نام ہے اس کا۔ کیا نام ہے اس کا۔ محمد طفیل۔ ہاں ہاں محمد طفیل۔ نہیں نہیں۔ بشیر احمد۔ نہیں نہیں محمد طفیل۔ وہ طفیل جس کی ترقی تم نے رکوائی تھی۔ اس نے مجھے یہ لڑکی لا کر دی اور کہا مسلمان ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تمہاری بہن ہے تو کیا میں اسے یہاں لے کر آتا۔ تم۔ تم۔ تم بولتے کیوں نہیں۔ تم بولتے کیوں نہیں۔“

اور اس نے چلانا شروع کر دیا۔

”تم بولتے کیوں نہیں۔ تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔ تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔ لیکن میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔“

چونی لال نے ہولے سے کہا۔

”گھبرایئے نہیں۔ آپ کے پتا جی کی عزت کا سوال ہے۔“

لیکن ہربنس چیخ چلا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول داغ دیا۔ تیسرے روز کرفیو ہٹنے پر چونی لال کے دو نوکروں نے موڈرن نیوز ایجنسی کا اسٹال کھولا۔ تازہ اخبار اپنی اپنی جگہ پر رکھے۔ چونی لال کے لیے اخباروں اور رسالوں کا ایک بنڈل باندھ کر الگ رکھ دیا مگر وہ نہ آیا۔ کئی راہ چلتے آدمیوں نے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم کیا کہ موڈرن نیوز ایجنسی کے مالک چونی لال نے اپنی سگی بہن کے ساتھ منہ کالا کیا اور بعد میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔

عِشق حقیقی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوعِشق حقیقی

عشق و محبت کے بارے میں اخلاق کا نظریہ وہی تھا جو اکثر عاشقوں اور محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ وہ رانجھے پیر کا چیلا تھا۔ عشق میں مر جانا اسکے نزدیک ایک عظیم الشان موت مرنا تھا۔ اخلاق تیس برس کا ہو گیا۔ مگر باوجود کوششوں کے اس کو کسی سے عشق نہ ہوا لیکن ایک دن انگرڈبرگ مین کی پکچر

”فور ہوم دی بل ٹونز“

کا میٹینی شو دیکھنے کے دوران میں اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس برقع پوش لڑکی سے وابستہ ہو گیا ہے۔ جو اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور سارا وقت اپنی ٹانگ ہلاتی رہی تھی۔ پردے پر جب سائے کم اور روشنی زیادہ ہوتی تو اخلاق نے اس لڑکی کو ایک نظر دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھے۔ ناک کی پھننگ پر چند بوندیں تھیں جب اخلاق نے اسکی طرف دیکھا تو اسکی ٹانگ ہلنا بند ہو گئی۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنے سیاہ برقعے کی جالی سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ یہ حرکت کچھ ایسی تھی کہ اخلاق کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس لڑکی نے اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں ہولے ہولے ہنسیں۔ اس کے بعد اس لڑکی نے نقاب اپنے چہرے سے ہٹا لیا۔ اخلاق کی طرف تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھا اور ٹانگ ہلا کر فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔ اخلاق سگرٹ پی رہا تھا۔ انگرڈبرگ مین اسکی محبوب ایکٹرس تھیں۔

”فور ہوم دی بل ٹولز“

میں اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ فلم کے آغاز میں جب اخلاق نے اسے دیکھا تو وہ بہت ہی پیاری معلوم ہوئی۔ لیکن ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی دیکھنے کے بعد وہ انگرڈبرگ مین کو بھول گیا۔ یوں تو قریب قریب سارا فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چلا مگر اس نے بہت ہی کم دیکھا۔ سارا وقت وہ لڑکی اس کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ اخلاق سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ ایک مرتبہ اس نے راکھ جھاڑی۔ تو اسکا سگریٹ انگلیوں سے نکل کر اس لڑکی کی گود میں جا پڑا۔ لڑکی فلم دیکھنے میں مشغول تھی اس لیے اس کو سگریٹ گرنے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اخلاق بہت گھبرایا۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اس کے برقعے پر سے اٹھایا اور فرش پر پھینک دیا۔ لڑکی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اخلاق نے فوراً کہا

”معافی چاہتا ہوں آپ پر سگریٹ گر گیا تھا۔“

لڑکی نے تیکھی تیکھی نظروں سے اخلاق کی طرف دیکھا اور بیٹھ گئی۔ بیٹھ کر اس نے اپنی سہیلی سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ دونوں ہولے ہولے ہنسیں اور فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئیں۔ فلم کے اختتام پر جب قائداعظم کی تصویر نمودار ہوئی تو اخلاق اٹھا۔ خدا معلوم کیا ہوا کہ اس کا پاؤں لڑکی کے پاؤں کے ساتھ ٹکرایا۔ اخلاق ایک بار پھر سر تا پا معذرت بن گیا۔

”معافی چاہتا ہوں۔ جانے آج کیا ہو گیا ہے۔“

دونوں سہیلیاں ہولے ہولے ہنسیں۔ جب بھیڑ کے ساتھ باہر نکلیں تو اخلاق ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ لڑکی جس سے اس کو پہلی نظر کا عشق ہوا تھا مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ اخلاق نے اسکی پرواہ نہ کی۔ اور ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کا مکان دیکھ کے رہے گا۔ مال روڈ کے فٹ پاتھ پر وائی ایم سی اے کے سامنے اس لڑکی نے مڑ کر اخلاق کی طرف دیکھا اور اپنی سہیلی کا ہاتھ پکڑ کر رک گئی۔ اخلاق نے آگے نکلنا چاہا تو وہ لڑکی اس سے مخاطب ہوئی

”آپ ہمارے پیچھے پیچھے کیوں آ رہے ہیں؟“

اخلاق نے ایک لحظہ سوچ کر جواب دیا۔

”آپ میرے آگے آگے کیوں جا رہی ہیں۔“

لڑکی کھکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنی سہیلی سے کچھ کہا۔ پھر دونوں چل پڑیں۔ بس اسٹینڈ کے پاس اس لڑکی نے جب مڑ کر دیکھا تو اخلاق نے کہا۔

”آپ پیچھے آ جائیے۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔“

لڑکی نے منہ موڑ لیا۔ انارکلی کا موڑ آیا تو دونوں سہیلیاں ٹھہر گئیں۔ اخلاق پاس سے گزرنے لگا تو اس لڑکی نے اس سے کہا۔

”آپ ہمارے پیچھے نہ آئیے۔ یہ بہت بری ہے۔“

لہجے میں بہت سنجید گی تھی۔ اخلاق نے

”بہت بہتر“

کہااور واپس چل دیا۔ اس نے مڑ کر بھی ان کو نہ دیکھا۔ لیکن دل میں اسکو افسوس تھا کہ وہ کیوں اس کے پیچھے نہ گیا۔ اتنی دیر کے بعد اس کو اتنی شدت سے محسوس ہوا تھا کہ اس کو کسی سے محبت ہوئی ہے۔ لیکن اس نے موقعہ ہاتھ سے جانے دیا۔ اب خدا معلوم پھر اس لڑکی سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ جب وائی ایم سی کے پاس پہنچا تو رک کر اس نے انار کلی کے موڑ کی طرف دیکھا۔ مگر اب وہاں کیا تھا۔ وہ تو اسی وقت انار کلی کی طرف چلی گئی تھیں۔ لڑکی کے نقش بڑے پتلے پتلے تھے۔ باریک ناک، چھوٹی سی ٹھوڑی، پھول کی پتیوں جیسے ہونٹ جب پردے پر سائے کم اور روشنی زیادہ ہوتی تھی تو اس نے اسکے بالائی ہونٹ پر ایک تل دیکھا تھا جو بے حد پیارا لگتا تھا۔ اخلاق نے سوچا تھا کہ اگر یہ تل نہ ہوتا تو شاید وہ لڑکی نامکمل رہتی۔ اس کا وہاں پر ہونا اشد ضروری تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم تھے جن میں کنوار پن تھا۔ چونکہ اس کو معلوم تھا کہ ایک مرد میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ اس لیے اُن کے ان چھوٹے چھوٹے قدموں میں ایک بڑی پیاری لڑکھڑاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا مڑ مڑ کر تو دیکھنا غضب تھا۔ گردن کو ایک خفیف سا جھٹکا دیکر وہ پیچھے اخلاق کی طرف دیکھتی اور تیزی سے منہ موڑ لیتی۔ دوسرے روز وہ انگر ڈبرگ مین کا فلم پھر دیکھنے گیا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ والٹ ڈزنی کا کارٹون چل رہا تھا کہ وہ اندر ہال میں داخل ہوا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا۔ گیٹ کیپر کی بیٹری کی اندھی روشنی کے سہارے اس نے ٹٹول ٹٹول کر ایک خالی سیٹ تلاش کی اور اس پر بیٹھ گیا۔ ڈزنی کا کارٹون بہت مزاحیہ تھا۔ ادھر ادھر کئی تماشائی ہنس رہے تھے۔ دفعتہً بہت ہی قریب سے اخلاق کو ایسی ہنسی سنائی دی جس کو وہ پہچانتا تھا۔ مڑ کر اس نے پیچھے دیکھا تو وہی لڑکی بیٹھی تھی۔ اخلاق کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لڑکی کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ شکل وصورت کے اعتبار سے وہ اس کا بھائی لگتا تھا۔ اسکی موجودگی میں وہ کس طرح بار بار مڑ کر دیکھ سکتا تھا۔ انٹرول ہو گیا۔ اخلاق کوشش کے باوجود فلم اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ روشنی ہوئی تو وہ اٹھا۔ لڑکی کے چہرے پر نقاب تھا۔ مگر اس مہین پردے کے پیچھے اسکی آنکھیں اخلاق کو نظر آئیں جن میں مسکراہٹ کی چمک تھی۔ لڑکی کے بھائی نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اخلاق نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس سے مخاطب ہوا

”ذرا ماچس عنایت فرمایئے۔“

لڑکی کے بھائی نے اس کو ماچس دیدی۔ اخلاق نے اپنا سگریٹ سلگایا اور ماچس اس کو واپس دیدی

”شکریہ“!

لڑکی کی ٹانگ ہل رہی تھی۔ اخلاق اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم کا بقایا حصہ شروع ہوا۔ ایک دو مرتبہ اس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکا۔ فلم ختم ہوا۔ لوگ باہر نکلنے شروع ہوئے۔ لڑکی اور اس کا بھائی ساتھ تھے۔ اخلاق ان سے ہٹ کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اسٹینڈرڈ کے پاس بھائی نے اپنی بہن سے کچھ کہا۔ ایک ٹانگے والے کو بلایا لڑکی اس میں بیٹھ گئی۔ لڑکا اسٹینڈرڈ میں چلا گیا۔ لڑکی نے نقاب میں سے اخلاق کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ٹانگہ چل پڑا۔ اسٹینڈرڈ کے باہر اس کے تین چار دوست کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کی سائیکل اس نے جلدی جلدی پکڑی اور ٹانگے کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ یہ تعاقب بڑا دلچسپ رہا۔ زور کی ہوا چل رہی تھی لڑکی کے چہرے پر سے نقاب اٹھ اٹھ جاتی۔ سیاہ جارجت کا پردہ پھڑ پھڑا کر اسکے سفید چہرے کی جھلکیاں دکھاتا تھا۔ کانوں میں سونے کے بڑے بڑے جھومر تھے۔ پتلے پتلے ہونٹوں پر سیاہی مائل سرخی تھی۔ اور بالائی ہونٹ پر تِل۔ وہ اشد ضروری تِل۔ بڑے زور کا جھونکا آیا تو اخلاق کے سر پر سے ہیٹ اتر گیا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ ایک ٹرک گزر رہا تھا۔ اس کے وزنی پہیے کے نیچے آیا اور وہیں چت گیا۔ لڑکی ہنسی اخلاق مسکرا دیا۔ گردن موڑ کر ہیٹ کی لاش دیکھی جو بہت پیچھے رہ گئی تھی اور لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اس کو تو شہادت کا رتب مل گیا۔“

لڑکی نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ اخلاق تھوڑی دیر کے بعد پھر اس سے مخاطب ہوا۔

”آپ کو اعتراض ہے تو واپس چلے جاتا ہوں۔“

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ انار کلی کی ایک گلی میں ٹانگہ رکا اور وہ لڑکی اتر کر اخلاق کی طرف بار بار دیکھتی نقاب اٹھا کر ایک مکان میں داخل ہو گئی۔ اخلاق ایک پاؤں سائیکل کے پیڈل پر اور دوسرا پاؤں دکان کے تھڑے پر رکھے تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ سائیکل چلانے ہی والا تھا کہ اس مکان کی پہلی منزل پر ایک کھڑکی کھلی۔ لڑکی نے جھانک کر اخلاق کو دیکھا۔ مگر فوراً ہی شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔ اخلاق تقریباً آدھ گھنٹہ وہاں کھڑا رہا۔ مگر وہ پھر کھڑکی میں نمودار نہ ہوئی۔ دوسرے روز اخلاق صبح سویرے انار کلی کی اس گلی میں پہنچا۔ پندرہ بیس منٹ تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ کھڑکی بند تھی۔ مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا کہ ایک فالسے بیچنے والا صدا لگاتا آیا۔ کھڑکی کھلی، لڑکی سر سے ننگی نمودا ہوئی۔ اس نے فالسے والے کو آواز دی۔

”بھائی فالسے والے ذرا ٹھہرنا“

پھر اسکی نگاہیں ایک دم اخلاق پر پڑیں۔ چونک کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ فالسے والے نے سر پر سے چھابڑی اتاری اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی سر پر دوپٹہ لیے نیچے آئی۔ اخلاق کو اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ شرمائی اور فالسے لیے بغیر واپس چلی گئی۔ اخلاق کو یہ ادا بہت پسند آئی۔ تھوڑا سا ترس بھی آیا۔ فالسے والے نے جب اس کو گھور کے دیکھا تو وہ وہاں سے چل دیا۔

“چلو آج اتنا ہی کافی ہے۔”

چند دن ہی میں اخلاق اور اس لڑکی میں اشارے شروع ہو گئے۔ ہر روز صبح نو بجے وہ انار کلی کی اس گلی میں پہنچتا۔ کھڑکی کھلتی وہ سلام کرتا وہ جواب دیتی، مسکراتی۔ ہاتھ کے اشاروں سے کچھ باتیں ہوتیں۔ اسکے بعد وہ چلی جاتی۔ ایک روز انگلیاں گھما کر اس نے اخلاق کو بتایا کہ وہ شام کے چھ بجے کے شو سینما دیکھنے جا رہی ہے۔ اخلاق نے اشاروں کے ذریعہ سے پوچھا۔

“کون سے سینما ہاؤس میں”

اس نے جواب میں کچھ اشارے کیے۔ مگر اخلاق نہ سمجھا۔ آخر میں اس نے اشاروں میں کہا۔

“کاغذ پر لکھ کر نیچے پھینک دو۔”

لڑکی کھڑکی سے ہٹ گئی۔ چند لمحات کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کاغذ کی ایک مڑوری سی نیچے پھینک دی۔ اخلاق نے اسے کھولا۔ لکھا تھا۔

“پلازا۔ پروین۔”

شام کو پلازا میں اسکی ملاقات پروین سے ہوئی۔ اس کے ساتھ اسکی سہیلی تھی۔ اخلاق اسکے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہوا تو پروین نے نقاب اٹھا لیا۔ اخلاق سارا وقت اس کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل دھک دھک کرتا تھا۔ انٹرول سے کچھ پہلے اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کانپ اٹھی۔ اخلاق نے فوراً ہاتھ اٹھا لیا۔ دراصل وہ اس کو انگوٹھی دینا چاہتا تھا، بلکہ خود پہنانا چاہتا تھا جو اس نے اسی روز خریدی تھی۔ انٹرول ختم ہوا تو اس نے پھر اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا وہ کانپی لیکن اخلاق نے ہاتھ نہ ہٹایا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد اس نے انگوٹھی نکالی اور اسکی ایک انگلی میں چڑھا دی۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ اخلاق نے اسکی طرف دیکھا۔ پیشانی اور ناک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔ فلم ختم ہوا تو اخلاق اور پروین کی یہ ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ باہر نکل کر کوئی بات نہ ہو سکی۔ دونوں سہیلیاں ٹانگے میں بیٹھیں۔ اخلاق کو دوست مل گئے۔ انھوں نے اُسے روک لیا لیکن وہ بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ پروین نے اس کا تحفہ قبول کر لیا تھا۔ دوسرے روز مقررہ اوقات پر جب اخلاق پروین کے گھر کے پاس پہنچا تو کھڑکی کھلی تھی۔ اخلاق نے سلام کیا۔ پروین نے جواب دیا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلی میں اسکی پہنائی ہوئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ تھوڑی دیر اشارے ہوتے رہے اس کے بعد پروین نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لفافہ نیچے پھینک دیا۔ اخلاق نے اٹھایا۔ کھولا تو اس میں ایک خط تھا۔ انگوٹھی کے شکریے کا۔ گھر پہنچ کر اخلاق نے ایک طویل جواب لکھا۔ اپنا دل نکال کر کاغذوں میں رکھ دیا۔ اس خط کو اس نے پھول دار لفافے میں بند کیا۔ اس پر سینٹ لگایا اور دوسرے روز صبح نو بجے پروین کو دکھا کر نیچے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اب اُن میں باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو گئی۔ ہر خط عشق و محبت کا ایک دفتر تھا۔ ایک خط اخلاق نے اپنے خون سے لکھا جس میں اس نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ اپنی محبت میں ثابت قدم رہے گا۔ اس کے جواب میں خونی تحریر ہی آئی۔ پروین نے بھی حلف اٹھایا کہ وہ مر جائے گی لیکن اخلاق کے سوا اور کسی کو شریک حیات نہیں بنائے گی۔ مہینوں گزر گئے۔ اس دوران میں کبھی کبھی کسی سینما میں دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھیں۔ مل کر بیٹھنے کا موقعہ انھیں نہیں ملتا تھا۔ پروین پر گھر کی طرف سے۔ بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وہ باہر نکلتی تھی یا تو اپنے بھائی کے ساتھ یا اپنی سہیلی زہرہ کے س ساتھ۔ ان دو کے علاوہ اس کو اور کسی کے ساتھ باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اخلاق نے اسے کئی مرتبہ لکھا کہ زہرہ کے ساتھ وہ کبھی اسے بارہ دری میں جہانگیر کے مقبرے میں ملے۔ مگر وہ نہ مانی۔ اسکو ڈر تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ اس اثنا میں اخلاق کے والدین نے اسکی شادی کی بات چیت شروع کر دی۔ اخلاق ٹالتا رہا جب انھوں نے تنگ آ کر ایک جگہ بات کر دی تو اخلاق بگڑ گیا بہت ہنگامہ ہوا۔ یہاں تک کہ اخلاق کو گھر سے نکل کر ایک رات اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں سونا پڑا۔ ادھر پروین روتی رہی۔ کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اخلاق دھن کا بہت پکا تھا۔ ضدی بھی پرلے درجے کا تھا۔ گھر سے باہر قدم نکالا تو پھر ادھر رخ تک نہ کیا۔ اس کے والد نے اس کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ ایک دفتر میں سو روپے ماہوار پر نوکری کر لی اور ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ جس میں نل تھا نہ بجلی۔ ادھر پروین اخلاق کی تکلیفوں کے دکھ میں گھل رہی تھی گھر میں جب اچانک اس کی شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اس پر بجلی سی گری۔ اس نے اخلاق کو لکھا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ لیکن پروین کو اس نے تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں۔ ثابت قدم رہ۔ عشق انکا امتحان لے رہا ہے۔ بارہ دن گزر گئے۔ اخلاق کئی بار گیا۔ مگر پروین کھڑکی میں نظر نہ آئی۔ وہ صبر و قرار کھو بیٹھا نیند اسکی غائب ہو گئی۔ اس نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ زیادہ ناغے ہوئے تو اس کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ برطرفی کا نوٹس ملا تو وہ سیدھا پروین کے مکان کی چل پڑا۔ پندرہ دنوں کے طویل عرصے کے بعد اُسے پروین نظر آئی وہ بھی ایک لحظے کے لیے۔ جلدی سے لفافہ پھینک کر وہ چلی گئی۔ خط بہت طویل تھا۔ پروین کی غیر حاضری کا باعث یہ تھا کہ اس کا باپ اسکو ساتھ گوجرانوالہ لے گیا تھا جہاں اسکی بڑی بہن رہتی تھی۔ پندرہ دن وہ خون کے آنسو روتی رہی۔ اس کا جہیز تیار کیا جا رہا تھا لیکن اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے لیے رنگ برنگے کفن بن رہے ہیں خط کے آخر میں لکھا۔ تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میری موت کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں ضرور کچھ کھا کے مر جاؤں گی۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ نہیں نہیں ایک اور راستہ بھی ہے۔ لیکن میں کیا اتنی ہمت

کرسکوں گی۔ تم بھی اتنی ہمت کر سکو گے۔ میں تمہارے پاس چلی آؤں گی۔ مجھے تمہارے پاس آنا ہی پڑے گا۔ تم نے میرے لیے گھر بار چھوڑا۔ میں تمہارے لیے یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ جہاں میری موت کے سامان ہورہے ہیں۔ لیکن میں بیوی بن کر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم شادی کا بندوبست کرلو۔ میں صرف تین کپڑوں میں آؤنگی۔ زیور وغیرہ سب اتار کر یہاں پھینک دوں گی۔۔ جواب جلدی دو، ہمیشہ تمہاری۔ پروین۔ اخلاق نے کچھ نہ سوچا، فوراًاس کو لکھا

”میری باہیں تمہیں اپنے آغوش میں لینے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ میں تمہاری عزت و عصمت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا۔ تم میری رفیقہ حیات بن کے رہو گی۔ زندگی بھر میں تمہیں خوش رکھوں گا۔“

ایک دوخط اور لکھے گئے اس کے بعد طے کیا کہ پروین بدھ کو صبح سویرے گھر سے سے نکلے گی۔ اخلاق ٹانگہ لے کر گلی کے نکڑ پر اس کا انتظار کرے۔ بدھ کو منہ اندھیرے اخلاق ٹانگے میں وہاں پہنچ کر پروین کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ اخلاق کا اضطراب بڑھ گیا۔ لیکن وہ آگئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ گلی میں نمودار ہوئی۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ جب وہ ٹانگے میں اخلاق کے ساتھ بیٹھی تو سرتاپا کانپ رہی تھی۔ اخلاق خود بھی کانپنے لگا۔ گھر پہنچے تو اخلاق نے بڑے پیار سے اس کے برقعے کی نقاب اٹھائی اور کہا

”میری دولہن کب تک مجھ سے پردے کرے گی۔“

پروین نے شرما کر آنکھیں جھکالیں، اس کا رنگ زرد تھا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ اخلاق نے بالائی ہونٹ کے تل کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں میں ایک بوسہ تڑپنے لگا۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس نے تل والی جگہ کو چوما۔ پروین نے نہ کی اس کے ہونٹ کھلے۔ دانتوں میں گوشت خورہ تھا۔ مسوڑھے گہرے نیلے رنگ کے تھے۔ گلے ہوئے۔ سڑاند کا ایک بھبکا اخلاق کی ناک میں گھس گیا۔ ایک دھکا سا اس کو لگا۔ ایک اور بھبکا پروین کے منہ سے نکلا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ پروین نے حیا آلود آواز میں کہا۔

”شادی سے پہلے آپ کو ایسی باتوں کا حق نہیں پہنچتا۔“

یہ کہتے ہوئے اسکے گلے ہوئے مسوڑھے نمایاں ہوئے۔ اخلاق کے ہوش وہواس غائب تھے دماغ سن گیا۔ دیر تک وہ دونوں پاس بیٹھے رہے۔ اخلاق کو کوئی بات نہیں سوجھتی تھی۔ پروین کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جب اس نے انگلی کا ناخن کاٹنے کے لیے ہونٹ کھولے تو پھر ان گلے ہوئے مسوڑوں کی نمائش ہوئی۔ بو کا ایک بھبکا نکلا۔ اخلاق کو متلی آنے لگی۔ اٹھا اور

”ابھی آیا“

کہہ کر باہر نکل گیا۔ ایک تھڑے پر بیٹھ کر اس نے بہت دیر سوچا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو لائل پور روانہ ہو گیا۔ جہاں اس کا ایک دوست رہتا تھا۔ اخلاق نے سارا واقعہ سنایا تو اس نے بہت لعن طعن کی اور اس سے کہا۔

”فوراًواپس جاؤ۔ کہیں بے چاری خودکشی نہ کرلے۔“

اخلاق رات کو واپس لاہور آیا۔ گھر میں داخل تو پروین موجود نہیں تھی۔ پلنگ پر تکیہ پڑا تھا۔ اس پر دو گول گول نشان تھے۔ گیلے! اس کے بعد اخلاق کو پروین کہیں نظر نہ آئی۔

5جون1950ء

عشقیہ کہانی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوعشقیہ کہانی

میرے متعلق عام لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ میں عشقیہ کہانیاں نہیں لکھتا۔ میرے افسانوں میں چونکہ عشق و محبت کی چاشنی نہیں ہوتی، اس لیے وہ بالکل سپاٹ ہوتے ہیں۔ میں اب یہ عشقیہ کہانی لکھ رہا ہوں تاکہ لوگوں کی یہ شکایت کسی حد تک دور ہو جائے۔ جمیل کا نام اگر آپ نے پہلے نہیں سنا تو اب سن لیجیے۔ اس کا تعارف مختصر طور پر کرائے دیتا ہوں۔ وہ میرا لنگوٹیا تھا۔ ہم اکٹھے اسکول میں پڑھے، پھر کالج میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ میں ایف اے میں فیل ہو گیا اور وہ پاس۔ میں نے پڑھائی چھوڑ دی مگر اس نے جاری رکھی۔ ڈبل ایم۔ اے کیا اور معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ صرف اتنا سننے میں آیا تھا کہ اس نے ایک پانچ بچوں والی ماں سے شادی کرلی تھی اور آبادان چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا یا وہیں رہا، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ جمیل بڑا عاشق مزاج تھا۔ اسکول کے دنوں میں اس کا جی بے قرار رہتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ مجھے ایسی گرفتاری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی سرگرمیوں جو عشق سے متعلق ہوتیں، برابر حصہ لیا کرتا تھا۔ جمیل دراز قد نہیں تھا مگر اچھے خدوخال کا مالک تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اسے خوبصورت نہ کہا جائے تو اس کے قبول صورت ہونے میں شک وشائبہ نہیں تھا۔ رنگ گورا اور سرخی مائل، تیز تیز باتیں کرنے والا، بلا کا ذہین، انسانی نفسیات کا طالب علم، بڑا صحت مند۔ اس کے دل و دماغ میں سن بلوغت تک پہنچنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی عشق کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو غالب کے اس شعر کا مفہوم اچھی طرح معلوم تھا عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش

غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے مگر اس کے برعکس وہ یہ آگ خود اپنی ماچس سے لگانا چاہتا تھا۔ اس نے اس کوشش میں کئی ماچسیں جلائیں۔ میرا مطلب ہے کہ کئی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار ہو جانے کے لیے نت نئے سوٹ سلوائے، بڑھیا سے بڑھیا ٹائیاں خریدیں، سینٹ کی سینکڑوں قیمتی شیشیاں استعمال کیں مگر یہ سوٹ، ٹائیاں اور سینٹ اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ میں اور وہ، دونوں شام کو کمپنی باغ کا رخ کرتے۔ وہ خوب سجا بنا ہوتا۔ اس کے کپڑوں سے بہترین خوشبو نکل رہی ہوتی۔ باغ کی روشوں پر متعدد لڑکیاں بدصورت، خوبصورت، قبول صورت محو خرام ہوتی تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے عشق کے لیے منتخب کرنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔

”سعادت! میں نے آخر کار ایک لڑکی چن ہی لی ہے۔ خدا کی قسم چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہے۔ میں کل صبح سیر کے لیے نکلا۔ بہت سی لڑکیاں مائی کے ساتھ اسکول جا رہی تھیں۔ ان میں ایک برقع پوش لڑکی نے جو اپنی نقاب ہٹائی تو اس کا چہرہ دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیا حسن و جمال تھا! بس میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ جمیل اب مزید تگ و دو چھوڑو، اس حسینہ ہی کے عشق میں تمہیں گرفتار ہونا چاہیے۔“

ہونا کیا

”تم ہو چکے ہو۔“

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر روز صبح اٹھ کر اس مقام پر جہاں اس نے اس کافر جمال حسینہ کو دیکھا تھا، پہنچ جایا کرے گا اور اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لیے اس کے ذہین دماغ نے بہت سے پلین سوچے تھے۔ ایک جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قابل عمل اور زود اثر تھا، اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ اس نے حساب لگا کر سوچا تھا کہ دس دن متواتر اس لڑکی کو ایک ہی مقام پر کھڑے رہ کر دیکھنے اور گھورنے سے اتنا معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یعنی وہ کیا چاہتا ہے۔ اس مدت کے بعد وہ اس کا ردعمل ملاحظہ کرے گا اور اس تجزیئے کے بعد کوئی فیصلہ مرتب کرے گا۔ یہ اغلب تھا کہ وہ لڑکی اس کا دیکھنا گھورنا پسند نہ کرے۔ مائی سے یا اپنے والدین سے اس کے غیر اخلاقی رویئے کی شکایت کر دے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ راضی ہو جاتی۔ اس کی ثابت قدمی اس پر اتنا اثر کرتی کہ اس کے ساتھ بھاگ جانے کو تیار ہو جاتی۔ جمیل نے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ شاید ضرورت سے زیادہ۔ اس لیے کہ دوسرے روز جب وہ الارم بجنے پر اٹھا تو اس نے اس مقام پر جہاں اس لڑکی سے اس کی پہلی مرتبہ مڈبھیڑ ہوئی تھی، جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”سعادت! میں نے یہ سوچا ہے کہ ہو سکتا ہے اسکول میں چھٹی ہو کیوں کہ جمعہ ہے۔ معلوم نہیں اسلامی اسکول میں پڑھتی ہے یا کسی گورنمنٹ اسکول میں۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اگر میں اسے زیادہ شدت سے گھورتا تو وہ بھنا جاتی۔ اس کے علاوہ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ دس دن کے اندر اندر مجھے اس کا ردعمل یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا۔ بفرض محال وہ رضامند ہو جاتی، میرا مطلب ہے مجھے بالمشافہ گفتگو کا موقع دے دیتی، تو میں اس سے کیا کہتا“!

میں نے کہا۔

”یہی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔“

جمیل سنجیدہ ہو گیا۔

”یار، مجھ سے کبھی کہا نہ جاتا۔ تم سوچو نا اگر یہ سن کر وہ میرے منہ پر تھپر دے مارتی کہ جناب آپ کو اس کا کیا حق حاصل ہے، تو میں کیا جواب دیتا۔ زیادہ سے زیادہ میں کہہ سکتا کہ حضور محبت کرنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے مگر وہ ایک اور تھپڑ میرے مار سکتی تھی کہ تم بکواس کرتے ہو، کون کہتا ہے کہ تم انسان ہو۔ قصہ مختصر یہ کہ جمیل اس حسین و جمیل لڑکی کی محبت میں خود کو اپنی تجزیہ خودی کے باعث گرفتار نہ کرا سکا۔ مگر اس کی خواہش بدستور موجود تھی۔ ایک اور خوبرو لڑکی اس کی تلاش کرنے والی نگاہوں کے سامنے آئی اور اس نے فوراً تہیہ کر لیا کہ اس سے عشق لڑانا شروع کر دے گا۔ جمیل نے سوچا کہ اس سے خط و کتابت کی جائے، چنانچہ اس نے پہلے خط کے کئی مسودے پھاڑنے کے بعد ایک آخری، عشق و محبت میں شرابور، تحریر مکمل کی، جو میں یہاں من و عن نقل کرتا ہوں: جان جمیل! اپنے دل کی دھڑکنیں سلام کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ حیران نہ ہویئے گا کہ یہ کون ہے جو آپ سے یوں بے دھڑک ہم کلام ہے۔ میں عرض کیے دیتا ہوں۔ کل شام کو سوا چھ بجے۔ نہیں، چھ بج کر گیارہ منٹ پر جب آپ امرت سینما کے پاس تانگے میں سے اتریں تو میں نے آپ کو دیکھا۔ بس ایک ہی نظر میں اُس نے مجھے مسحور کر لیا۔ آپ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکچر دیکھنے چلی گئیں اور میں باہر کھڑا آپ کو اپنی تصور کی آنکھوں سے مختلف روپوں میں دیکھتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد آپ باہر نکلیں۔ پھر زیارت نصیب ہوئی اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کا غلام ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو اور کیا لکھوں۔ بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کیا آپ میری محبت کو اپنے حسن و جمال کے شایان سمجھیں گی یا نہیں۔ اگر آپ نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں خودکشی نہیں کروں گا، زندہ رہوں گا تاکہ آپ کے دیدار ہوتے رہیں۔ آپ کے حسن و جمال کا پرستار جمیل یہ خط اس نے میرے گھر میں ایک خوشبودار کاغذ پر اپنی تحریر سے منتقل کیا تھا۔ لفافہ پھول دار اور خوشبودار تھا جس کو جمالیاتی ذوق نے پسند نہیں کیا تھا۔ چند روز کے بعد جمیل مجھ سے ملا تو معلوم ہوا کہ اس نے یہ خط اس لڑکی تک نہیں پہنچایا۔ اولاً اس لیے کہ عشق کا آغاز خط سے کرنا مناسب ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ اس خط کی تحریر بے ربط اور بے اثر ہے۔ اس نے خود کو لڑکی متصور کر کے یہ خط پڑھا اور اس کو بہت مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ ثالثاً اس لیے کہ تفتیش کرنے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ لڑکی ہندو ہے۔ یہ مرحلہ بھی شروع ہونے سے پہلے

ہی ختم ہو گیا۔ اس کے گھر میں میرا آنا جانا تھا۔ مجھ سے کوئی پردہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے پڑھائی یا گپ بازیوں میں مشغول رہتے۔ اس کی دو بہنیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی۔ ان سے بڑی بچگانہ قسم کی پر لطف باتیں ہوتیں۔ اس کی موسی کی ایک انتہا درجے کی سادہ لوح لڑکی عذرا تھی۔ عمر یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس ہو گی۔ اس کا ہم دونوں بہت مذاق اڑایا کرتے تھے۔ جمیل کی جب دوسری کوشش بھی بار آور ثابت نہ ہوئی تو وہ دو مہینے تک خاموش رہا۔ اس دوران میں اس نے عشق میں گرفتار ہونے کی کوئی نئی کوشش نہ کی۔ لیکن اس کے بعد اس کو ایک دم دورہ پڑا اور اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر پانچ چھ لڑکیاں اپنی عشق کی بندوق کے لیے نشانے کے طور پر منتخب کر لیں۔ پر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ صرف چار لڑکیوں کے متعلق مجھے اس کی عشقیہ مہم کے بارے میں علم ہے۔ پہلی نے جو اس کی دور دراز کی رشتے دار تھی، اپنی ماں کے ذریعے اس کی ماں تک یہ الٹی میٹم بھجوا دیا کہ اگر جمیل نے اس کو پھر بری نظر سے دیکھا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ دوسری غور سے دیکھنے پر چیچک کے داغوں والی نکلی۔ تیسری کی چھٹے، ساتویں روز ایک قصائی سے منگنی ہو گئی۔ چوتھی کو اس نے ایک لمبا عشقیہ خط لکھا جو اس کی موسی کی بیٹی عذرا کے ہاتھ آ گیا۔ معلوم نہیں کس طرح۔ پہلے جمیل اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا، اب اس نے اڑانا شروع کر دیا۔ اتنا کہ جمیل کا ناک میں دم آ گیا۔ جمیل نے مجھے بتایا۔

”سعادت! یہ عذرا جسے ہم بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح سمجھتے ہیں، سخت ظالم ہے، سب سمجھتی ہے۔ جس لڑکی کو میں نے خط لکھا تھا اور غلطی سے اپنے میز کے دراز میں رکھ کر یہ سوچنے میں مشغول تھا کہ وہ اس کا کیا جواب لکھے گی، یہ کم بخت جانے کیسے لے اڑی۔ اب اس نے میرا ناطقہ بند کر دیا۔ بعض اوقات ایسی تلخ باتیں کرتی ہے کہ مجھے رلاتی ہے اور خود بھی روتی ہے۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں۔“

اس سے بہت زیادہ تنگ آ کر اس نے اپنے عشق کی مہم اور تیز کر دی۔ اب کی اس نے چودہ لڑکیاں چنیں مگر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ان میں سے صرف ایک باقی رہ گئی۔ دس اس کے مکان سے بہت دور رہتی تھیں، جن کو ہر روز حتمی طور پر دیکھنے کے متعلق اس کا دل گواہی نہیں دیتا تھا۔ دو ایسی تھیں، جن کا خاندانی ہونے کے بارے میں اسے شبہ تھا۔ بارہ ہوئیں۔ تیرھویں نے ایک دن ایسی بری طرح گھورا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ چودھویں جو کہ چودھویں کا چاند تھی، ملتفت ہو جاتی مگر وہ کم بخت کمیونسٹ تھی۔ جمیل نے سوچا کہ اس کا التفات حاصل کرنے کے لیے وہ ضرور کمیونسٹ بن جاتا، کھادی کے کپڑے پہن کر مزدوروں کے حق میں دس بارہ تقریریں بھی کر دیتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کے والد صاحب ریٹائرڈ انجینئر تھے، ان کی پنشن یقیناً بند ہو جاتی۔ یہاں سے ناامیدی ہوئی تو اس نے سوچا کہ عشق بازی فضول ہے، شرافت یہی ہے کہ وہ کسی سے شادی کر لے۔ اس کے بعد اگر طبیعت چاہے تو اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے مجھے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنی امی جان اور اپنے ابا جان سے بات کرے۔ بہت دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے اس گفتگو کا مسودہ تیار کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی امی سے بات کی۔ وہ خوش ہوئیں۔ ادھر ادھر اپنے عزیزوں میں انھوں نے جمیل کے لیے موزوں رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ پڑوس میں خان بہادر صاحب کی لڑکی تھی۔ ایم۔ اے۔ بڑی ذہین اور طبیعت کی بہت اچھی۔ مگر اس کی ناک چپٹی تھی۔ خالہ کی بیٹی حسن آراء تھی پر بے حد کالی۔ صغریٰ تھی مگر اس کے والدین بڑے خسیس تھے۔ جہیز میں جتنے جوڑے جمیل کی ماں چاہتی تھی، اس سے وہ آدھے دینے پر بھی رضامند نہیں تھے۔ عذرا کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جمیل کی ماں نے بڑی کوششوں کے بعد راولپنڈی کے ایک معزز اور متمول خاندان کی لڑکی سے بات چیت طے کر لی۔ جمیل اپنی ناکام عشق بازیوں سے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے یہ بھی نہ پوچھا کہ شکل و صورت کیسی ہے۔ ویسے اس نے اپنے زندہ تصور میں اس کا اندازہ لگا لیا تھا اور مفصل طور پر سوچ لیا تھا کہ وہ اس کی محبت میں کس طرح گرفتار ہو گا۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ میں خوش تھا کہ جمیل کی شادی ہو رہی ہے۔ جس کا نام غالباً شریفہ تھا، اس کی منگنی ہو گئی۔ اس تقریب پر اسے سسرال کی طرف سے ہیرے کی انگوٹھی ملی، جو وہ ہر وقت پہنے رہتا تھا۔ اس پر اس نے ایک نظم بھی لکھی جس کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔ ایک برس تک سوچتا رہا کہ اسے اپنی دلہن کو کب اپنے یہاں لانا چاہیے۔ آدمی چونکہ آزاد اور روشن خیال قسم کا تھا اس لیے اس کی خواہش تھی کہ ماں باپ سے علیحدہ اپنا گھر بنائے۔ یہ کیسا ہونا چاہیے، اس میں کس ڈیزائن کا فرنیچر ہو، نوکر کتنے ہوں، ماہوار خرچ کتنا ہو گا، ساس کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہو گا، ان تمام امور کے بارے میں اس نے کافی سوچ بچار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی والے تنگ آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ رخصتی کا مرحلہ جلد از جلد طے ہو۔ جمیل اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ لیکن اس کی امی نے ایک تاریخ مقرر کر دی۔ کارڈ وارڈ چھپ گئے۔ ولیمے کی دعوت کے لیے ضروری سامان کا بندوبست کر لیا گیا۔ اس کے والد بزرگوار شیخ محمد اسماعیل صاحب ریٹائرڈ انجینئر بہت مسرور تھے مگر جمیل بہت پریشان تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے بننے والے گھر کا آخری نقشہ تیار نہیں کر سکا تھا۔ رخصتی کی تاریخ 9 اکتوبر کی صبح کو۔ منہ اندھیرے جمیل میرے پاس سخت اضطراب اور کرب کے عالم میں آیا اور اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کی موسی کی لڑکی عذرا نے جو بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح تھی، خودکشی کر لی ہے، اس لیے کہ اس کو جمیل سے والہانہ عشق تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکی کہ اس کے محبوب و معبود کی شادی کسی اور لڑکی سے ہو۔ اس ضمن میں اس نے جمیل کے نام خط لکھا۔

”جس کی عبارت بہت دردناک تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر یادگار کے طور پر اس کے پاس محفوظ ہو گی۔

عقل داڑھ

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹو عقل داڑھ

”آپ منہ سجائے کیوں بیٹھے ہیں؟“

”بھئی دانت میں درد ہورہاہے۔ تم توخواہ مخواہ۔“

”خواہ مخواہ کیا۔ آپ کے دانت میں کبھی درد ہوہی نہیں سکتا“

”وہ کیسے؟“

”آپ بھول کیوں جاتے ہیں کہ آپ کے دانت مصنوعی ہیں۔ جو اصلی تھے وہ تو کبھی کے رخصت ہوچکے ہیں“

لیکن بیگم بھولتی تم ہو۔ میرے بیس دانتوں میں صرف نو دانت مصنوعی ہیں باقی اصلی اور میرے اپنے ہیں۔ اگر تمھیں میری بات پر یقین نہ ہو تو میرا منہ کھول کر اچھی طرح معائنہ کر لو“

”مجھے یقین آگیا۔ مجھے آپ کی ہر بات پر یقین آجاتاہے۔ پرسوں آپ نے مجھے یقین دلایا کہ آپ سینما نھیں گئے تھے تو میں مان گئی پر آپ کے کوٹ کی جیب میں ٹکٹ پڑا تھا۔“

”وہ کسی اور دن کا ہو گا۔ میرا مطلب ہے آج سے کوئی دوڈھائی مہینے پہلے کا جب میں کسی دوست کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیاہوں گا۔ ورنہ تم جانتی ہو، مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم تو خیر ہر فلم دیکھتی ہو“

”خاک!۔ مجھے فرصت ہی کہاں ہوتی ہے“

”فرصت ہی فرصت ہے۔ بچیوں کو اسکول بھیجا۔ پھر سارا دن تم کیا کرتی ہو۔ نوکران کو اسکول سے لے آتا ہے۔ کھانا کھلا دیتاہے۔ تم یا تو اپنی کسی سہیلی یا رشتے دار کے ہاں چلی جاتی ہو یا میٹنی شو دیکھنے۔ شام کو پھر دورہ پڑتاہے اور چلی جاتی ہو پھر کوئی اور فلم دیکھنے“

”یہ سفید جھوٹ ہے“

”یہ سفید ہے نہ کالا۔ حقیقت ہے“!

”آپ کے دانت کا درد بھی کیا حقیقت ہے؟۔ چٹاخ پٹاخ باتیں کررہے ہیں“

سب سے بڑا درد تو تم ہو۔ اس کے سامنے دانت کا درد کیا حقیقت رکھتاہے“

تو آپ نے جس طرح اپنے دانت نکلوائے تھے اسی طرح مجھے بھی نکال باہر پھینکیے“

”مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ اس کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے“

”آپ جرأت کی بات نہ کریں۔ آپ کو مفت میں ایک نوکرانی مل گئی ہے جو دن رات آپ کی خدمت کرتی ہے اسے آپ برطرف کیسے کرسکتے ہیں“

غضب خدا کا۔ تم نے دن رات میری کیا خدمت کی ہے۔ پچھلے مہینے، مجھے جب نمونیہ ہو گیا تھا تو تم مجھے بیماری کی حالت ہی میں چھوڑ کر سیالکوٹ چلی گئی تھیں“

”وہ تو بالکل جدا بات ہے“

”جدا بات کیاہے؟“

”مجھے، آپ کو معلوم ہے اپنی عزیز ترین سہیلی نے بُلایا تھا کہ اُس کی بہن کی شادی ہورہی ہے“

”اور یہاں جو میری بربادی ہورہی تھی“

”آپ اچھے بھلے تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا تھا۔ اس نے میری تشفی کردی تھی کہ تشویش کی کوئی ضرورت نہیں۔ نمونیہ کا اٹیک کوئی اتنا سیریس نہیں۔ پھر پنسلین کے ٹیکے دیے جارہے ہیں۔ انشاء اللہ دو ایک روز میں تندرست ہو جائیں گے۔“

”تم سیالکوٹ میں کتنے دن رہیں“

”کوئی دس پندرہ دن“

”اس دوران میں تم نے مجھے کوئی خط لکھا؟۔ میری خیریت کے متعلق پوچھا؟“

”اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ آپ کو ایک سطر بھی لکھ سکتی“

”لیکن تم نے اپنی والدہ مکرمہ کو چار خط لکھے۔“!

”وہ تو بہت ضروری تھے“

”میں نے سب پڑھے ہیں“

”آپ نے کیوں پڑھے؟۔ یہ بہت بدتمیزی ہے“

”یہ بدتمیزی میں نے نہیں کی تمہاری والدہ مکرمہ نے مجھے خود ان کو پڑھنے کے لیے کہا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس قدر ضروری تھے“

”کیا ضروری تھے“

”بہت ضروری تھے۔ اس لیے کہ خاوند کے پھیپھڑوں کے مقابلے میں دلہن کے جہیز کی تفصیلات بہت اہم تھیں۔ اس کے بالوں کی افشاں۔ اس کے گالوں پر لگایا گیا غازہ۔ اس کے ہونٹوں کی سُرخی۔ اس کی زربفت کی قمیص۔ اور جانے کیا کیا۔ یہ تمام اطلاعیں پہچانا واقعی اشد ضروری تھا ورنہ دنیا کے تمام کاروبار رُک جاتے۔ چاند اور سورج کی گردش بند ہو جاتی۔ دلہن کے گھونگھٹ کے متعلق اگر تم نہ لکھتیں کہ وہ کس طرح بار بار جھنجھلا کر اُٹھا دیتی تھی تو میرا خیال ہے یہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھونگھٹ بن جاتی“

”آج آپ بہت بھونڈی شاعری کر رہے ہیں“

”بجا ہے۔ تمہاری موجودگی میں اگر غالبؔ مرحوم بھی ہوتے تو وہ اسی قسم کی شاعری کرتے“

”آپ میری توہین کر رہے ہیں“

”تم نالش کر دو۔ مقدمہ دائر کر دو۔“

”میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی“

”تو پھر کن چکروں میں پڑنا چاہتی ہو۔ مجھے بتا دو“

”آپ سے جو میری شادی ہوئی تو اس سے بڑا چکر اور کون ہو سکتا ہے۔ میرے بس میں ہو تو اس میں سے نکل بھاگوں۔“

”تمہارے بس میں کیا کچھ نہیں۔ تم چاہو تو آج ہی اس چکر سے نکل سکتی ہو“

”کیسے؟“

”یہ مجھے معلوم نہیں۔ تم ماشاءاللہ عقل مند ہو۔ کوئی نہ کوئی رستہ نکال لو تا کہ یہ روز روز کی بک بک اور جھک جھک ختم ہو۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود یہ چاہتے ہیں کہ مجھے نکال باہر کریں“

”لاحول ولا۔ میں خود باہر نکالے جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”کہاں رہیں گے آپ؟“

”کہیں بھی رہوں۔ کسی دوست کے ہاں کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا۔ یا شاید کسی ہوٹل میں چلا جاؤں۔ اکیلی جان ہو گی۔ میں تو بھئی فٹ پاتھ پر بھی سو کر گزارہ کر سکتا ہوں۔ کپڑے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اُن کو کسی لانڈری کے حوالے کر دُوں گا۔ وہاں وہ اس گھر کے مقابلے میں کہیں زیادہ محفوظ رہیں گے۔ شیشے کی الماریوں میں سجے ہوں گے۔ جب گئے ایک سوٹ نکلوایا اُس کی دُھلائی یا ڈرائی کلینگ کے پیسے ادا کیے اور خراماں خراماں۔“

”خراماں خراماں، کہاں گئے؟“

”کہیں بھی۔ لارنس گارڈن ہے۔ سینما ہیں۔ ریستوران ہیں۔ بس جہاں جی چاہا چلے گئے۔ کوئی پابندی تو نہیں ہو گی اُس وقت“

”یہاں میں نے آپ پر کون سی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں؟۔ کھلے بندوں جو چاہے کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو کبھی ٹوکا ہے؟“

”ٹوکا تو نہیں ہے۔ لیکن میرا ہر بار ایسا جھٹکا کیا ہے کہ مہینوں طبیعت صاف رہی“

”اگر طبیعت صاف رہے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ طبیعت ہمیشہ صاف رہنی چاہیے۔“

”مانتا ہوں کہ طبیعت ہمیشہ صاف رہنی چاہیے۔ مگر طبیعت صاف کرنے والے کو اتنا خیال ضرور مدنظر رکھنا چاہیے کہ وہ ضرورت سے زیادہ صاف نہ ہو جائے۔“

”آپ کے دانت میں درد ہو رہا تھا؟“

”وہ درد اب دل میں چلا گیا ہے۔“

”کیسے۔“

”آپ کی گفتگو ہر قسم کے کرشمے کر سکتی ہے۔ داڑھ میں شدت کا درد تھا لیکن آپ خدا معلوم کیوں تشریف لے آئیں اور مجھ سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا کہ وہ داڑھ کا درد دل میں منتقل ہو گیا۔

”میں یہ صرف پوچھنے آئی تھی کہ آپ کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے۔ بس اس اتنی بات کا آپ نے بتنگڑ بنا دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس کھوپڑی کے انسان ہیں۔“

”کھوپڑی تو مری ویسی ہے جیسی تمہاری یا دوسرے انسانوں کی۔ تمھیں اس میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے“

”فرق، ساخت کے متعلق کچھ محسوس نہیں ہوتا لیکن میں یہ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی کھوپڑی میں یقیناً کوئی نقص ہے“

”کس قسم کا؟“

”میں قسم کہاں بتا سکتی ہوں۔ کسی ڈاکٹر سے پوچھیے“

”پوچھ لوں گا۔ لیکن اب میرے دل میں درد ہو رہا ہے“

”یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ کا دل مضبوط ہے“

”تمھیں کیسے معلوم ہوا“

”آج سے دو برس پہلے جب آپ ہسپتال میں داخل ہوئے تھے تو آپ کا ایکس رے لیا گیا تھا۔“

مجھے معلوم نہیں“

”آپ کو اتنا ہوش ہی کہاں تھا۔ مجھے آپ کوئی نرس سمجھتے تھے۔ عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔“

”بیماری میں ہر خطا معاف کر دینی چاہیے۔ جب تم کہتی ہو کہ میں غشی کے عالم میں تھا تو بتاؤ میں صحیح باتیں کیسے کر سکتا تھا۔

”میں آپ کے دل کے متعلق کہہ رہی تھی۔ ہسپتال میں جب آپ کے پانچ چھ ایکس رے لیے گئے تو۔ ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ شخص صرف اپنے مضبوط دل کی وجہ سے جی رہا ہے۔ اس کے گردے کمزور ہیں۔ اس کی انتڑیوں میں ورم ہے۔ اس کا جگر خراب ہے۔ لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

”انھوں نے یہ کہا تھا کہ نہیں مرے گا، اس لیے کے اس کے پھیپھڑے اور دل صحیح حالت میں ہیں“

”دل میں تو خیر تم بس رہی ہو۔ پھیپھڑوں میں معلوم نہیں کون رہتا ہے“

”رہتی ہو گی، آپ کی کوئی۔“

”کون ؟۔“

”میں کیا جانوں“

”خدا کی قسم تمہارے سوا میں نے کسی اور عورت کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔“

”آنکھ جھکا کر دیکھا ہو گا۔“

”وہ تو خیر، دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ مگر کبھی بُرے خیال سے نہیں۔ بس ایک نظر دیکھا اور چل دیئے۔“

”لیکن ایک نظر دیکھنا کیا بہت ضروری ہے۔ شریعت میں لکھا ہے ؟“

”اس بحث کو چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کہنے کیا آئی تھیں۔ تمہاری عادت ہے کہ اپنا مطلب بیان کرنے سے پہلے تم جھگڑا ضرور شروع کر دیا کرتی ہو۔“

”مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا تھا۔“

”تو آپ تشریف لے جایئے۔ مجھے دفتر کے چند کام کرنے ہیں“

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”تو پھر تم خاموش بیٹھی رہو۔ میں کام ختم کر لوں تو جو تمھیں اول جلول بکنا ہے بک لینا۔ میری داڑھ میں شدت کا درد ہو رہا ہے“

”میں کس لیے آپ کے پاس آئی۔“

”مجھے کیا معلوم“

”میری عقل داڑھ نکل رہی ہے؟“

”خدا کا شکر ہے۔ تم کو اب کچھ عقل تو آجائے گی“

”بہت درد ہو رہا ہے“

”کوئی بات نہیں۔ اس درد ہی سے عقل آ رہی ہے“

سعادت حسن منٹو ۲۱/اکتوبر ۱۹۵۴ء

عورت ذات

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹو عورت ذات

مہاراجہ گ سے ریس کورس پر اشوک کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔ مہاراجہ گ کو ریس کے گھوڑے پالنے کا شوق ہی نہیں خبط تھا۔ اس کے اصطبل میں اچھی سے اچھی نسل کا گھوڑا موجود تھا۔ اور محل میں جس کے گنبد ریس کورس سے صاف دکھائی دیتے تھے۔ طرح طرح کے عجائب موجود تھے۔ اشوک جب پہلی بار محل میں گیا تو مہاراجہ گ نے کئی گھنٹے صرف کر کے اسکو اپنے تمام نوادر دکھائے۔ یہ چیزیں جمع کرنے میں مہاراجہ کو ساری دنیا کا دورہ کرنا پڑا تھا۔ ہر ملک کا کونہ کونہ چھاننا پڑا تھا۔ اشوک بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے نوجوان مہاراجہ گ کے ذوقِ انتخاب کی خوب داد دی۔ ایک دن اشوک گھوڑوں کے ٹپ لینے کے لیے مہاراجہ کے پاس گیا۔ تو وہ ڈارک روم میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشوک کو وہیں بلوالیا۔ سکیٹن ملی میٹر فلم تھے جہا مہاراجہ نے خود اپنے کیمرے سے لیے تھے۔ جب پروجیکٹر چلا تو پچھلی ریس پوری کی پوری پردے سے دوڑ گئی۔ مہاراجہ کا گھوڑا اس ریس میں ون آیا تھا۔ اس فلم کے بعد مہاراجہ نے اشوک کی فرمائش پر اور کئی فلم دکھائے۔ سوئٹزرلینڈ، پیرس، نیویارک، ہونولولو، ہوائی، وادی کشمیر۔ اشوک بہت محظوظ ہوا یہ فلم قدرتی رنگوں میں تھے۔ اشوک کے پاس بھی سکیٹن ملی میٹر کیمرہ اور پروجیکٹر تھا۔ مگر اس کے پاس فلموں کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا۔ دراصل اس کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اپنا یہ شوق جی بھر کے پورا کر سکے۔ مہاراجہ جب کچھ فلم دکھا چکا تو اس نے کیمرے میں روشنی کی اور بڑی بے تکلفی سے اشوک کی ران پر دھپا مار کر کہا۔

”اور سناؤ دوست۔“

اشوک نے سگریٹ سلگایا

”مزا آگیا فلم دیکھ کر“

”اور دکھاؤں“

”نہیں نہیں“

”نہیں بھئی ایک ضرور دیکھو۔ مزا آجائے گا تمہیں“

یہ کہہ کر مہاراجہ گ نے ایک صندوقچہ کھول کر ایک ریل نکالی اور پروجیکٹر پر چڑھا دی

”ذرا اطمینان سے دیکھنا“

اشوک نے پوچھا

”کیا مطلب؟“

مہاراجہ نے کمرے کی لائٹ اوف کر دی

”مطلب یہ کہ ہر چیز غور سے دیکھنا“

یہ کہہ کر اس نے پروجیکٹر کا سوئچ دبا دیا۔ پردے پر چند لمحات صرف سفید روشنی تھرتھراتی رہی، پھر ایک دم تصویریں شروع ہو گئیں۔ ایک الف ننگی عورت صوفے پر لیٹی تھی۔ دوسری سنگار میز کے پاس کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اشوک کچھ دیر خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک دم اسکے حلق سے عجیب و غریب آواز نکلی۔ مہاراجہ نے ہنس کر اس سے پوچھا

”کیا ہوا؟“

اشوک کے حلق سے آواز پھنس پھنس کر باہر نکلی

”بند کرو یار بند کرو۔“

”کیا بند کرو؟“

اشوک اٹھنے لگا مہاراجہ گ نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا

”یہ فلم تمہیں پورے کا پورا دیکھنا پڑے گا۔“

فلم چلتا رہا۔ پردے پر برہنگی منہ کھولے ناچتی رہی۔ مرد اور عورت کا جنسی رشتہ مادر زاد عریانی کے ساتھ تھرکتا رہا۔ اشوک نے سارا وقت بے چینی میں کاٹا۔ جب فلم بند ہوا اور پردے پر صرف سفید روشنی تھی تو اشوک کو ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا۔ پروجیکٹر کی بجائے اسکی آنکھیں پھینک رہی ہیں۔ مہاراجہ گ نے کمرے کی لائٹ اون کی اور اشوک کی طرف دیکھا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

اشوک کچھ سکڑ سا گیا تھا۔ ایک دم روشنی کے باعث اسکی آنکھیں بھینچی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے تھے۔ مہاراجہ گ نے زور سے اس کی ران پر دھپا مارا۔ اور اس قدر بے تحاشا ہنسا کہ اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اشوک صوفے پر سے اٹھا۔ رومال نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

”کچھ نہیں یار۔“

”کچھ نہیں کیا۔ مزا نہیں آیا“

اشوک کا حلق سوکھا ہوا تھا۔ تھوک نگل کر اس نے کہا۔

”کہاں سے لائے یہ فلم؟“

مہاراجہ نے صوفے پر لیٹتے ہوئے جواب دیا

”پیرس سے۔ پے ری۔ پے ری“!

اشوک نے سر کو جھٹکا سا دیا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا“

”کیا؟“

”یہ لوگ۔ میرا مطلب ہے کیمرے کے سامنے یہ لوگ کیسے۔“

”یہی تو کمال ہے۔ ہے کہ نہیں؟“

”ہے تو سہی۔“

یہ کہہ کر اشوک نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

”ساری تصویریں جیسے میری آنکھوں میں پھنس گئی ہیں۔“

مہاراجہ گ اٹھا۔

”میں نے ایک دفعہ چند لیڈیز کو یہ فلم دکھایا“

اشوک چلایا۔

”لیڈیز کو؟“

”ہاں ہاں۔ بڑے مزے لے لے کر دیکھا انھوں نے“

”غلط“

مہاراجہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”سچ کہتا ہوں۔ ایک دفعہ دیکھ کر دوسری دفعہ پھر دیکھا۔ بھینچتی، چلاتی اور ہنستی رہیں۔“

اشوک نے اپنے سر کو جھٹکا سا دیا

”حد ہو گئی ہے۔ میں تو سمجھتا تھا وہ۔ بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا، لیکن انھوں نے خوب لطف اٹھایا۔“

اشوک نے پوچھا

”کیا یورپین تھیں؟“

مہاراجہ گ نے کہا۔

”نہیں بھائی۔ اپنے دیس کی تھیں۔ مجھ سے کئی بار یہ فلم اور پروجیکٹر مانگ کر لے گئیں۔ معلوم نہیں کتنی سہیلیوں کو دکھا چکی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”اشوک کچھ کہتے کہتے رک گیا“

”کیا؟“

”ایک دو روز کے لیے یہ فلم دے سکتے ہو مجھے؟“

”ہاں ہاں لے جاؤ“!

یہ کہہ کر مہاراجہ نے اشوک کی پسلیوں میں ٹھونکا دیا۔

”سالے کس کو دکھائے گا۔“

”دوستوں کو“

”دکھا جس کو بھی تیری مرضی“!

یہ کہہ کر مہاراجہ گ نے پروجیکٹر میں سے فلم کا اسپول نکالا۔ اس کو دوسرے اسپول چڑھا دیا اور ڈبہ اشوک کے حوالے کر دیا۔

”لے پکڑ۔ عیش کر“!

اشوک نے ڈبہ ہاتھ میں لے لیا تو اس کے بدن میں جُھرجھری سی دوڑ گئی۔ گھوڑوں کے ٹپ لینا بھول گیا اور چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔ گھر سے پروجیکٹر لے جا کر اس نے کئی دوستوں کو یہ فلم دکھایا۔ تقریباً سب کے لیے انسانیت کی یہ عریانی بالکل نئی چیز تھی۔ اشوک نے ہر ایک کا ردعمل نوٹ کیا۔ بعض نے خفیف سی گھبراہٹ اور فلم کا ایک ایک انچ غور سے دیکھا۔ بعض نے تھوڑا سا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بعض آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود فلم کو تمام و کمال طور پر نہ دیکھ سکے۔ ایک برداشت نہ کر سکا اور اٹھ کر چلا گیا۔ تین چار روز کے بعد اشوک کو فلم لوٹانے کا خیال آیا تو اس نے سوچا کیوں نہ اپنی بیوی کو دکھاؤں چنانچہ وہ پروجیکٹر اپنے گھر لے گیا۔ رات ہوئی تو اس نے اپنی بیوی کو بلایا۔ دروازے بند کیے۔ پروجیکٹر کا کنکشن وغیرہ ٹھیک کیا۔ فلم نکالا۔ اس کو فِٹ کیا۔ کمرے کی بتی بجھائی اور فلم چلا دیا۔ پردے پر چند لمحات سفید روشنی تھرتھرائی۔ پھر تصویریں شروع ہوئی۔ اشوک کی بیوی زور سے چیخی۔ تڑپی۔ اچھلی۔ اسکے منہ سے عجیب و غریب آواز نکلیں۔ اشوک نے اسے پکڑ کر بٹھانا چاہا تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور چیخنا شروع کر دیا۔

”بند کرو۔ بند کرو“

اشوک نے ہنس کر کہا

”ارے بھئی دیکھ لو۔ شرماتی کیوں ہو“

”نہیں نہیں“

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا اشوک نے اسکو زور سے پکڑ لیا وہ ہاتھ جو اسکی آنکھوں پر تھا۔ ایک طرف کھینچا۔ اس کھینچا تانی میں دفعتہ اشوک کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ اشوک کے بریک سے لگ گئی۔ اس نے تو محض تفریح کی خاطر اپنی بیوی کو فلم دکھایا تھا۔ روتی اور بڑبڑاتی اسکی بیوی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اشوک چند لمحات بالکل خالی الذہن بیٹھا ننگی تصویریں دیکھتا رہا۔ جو حیوانی حرکات میں مشغول تھیں، پھر ایک دم اس نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اس احساس نے اسے خجالت کے سمندر میں غرق کر دیا۔ اس نے سوچا مجھ سے بہت ہی نازیبا حرکت سرزد ہوئی۔ لیکن حیرت ہے کہ مجھے اس کا خیال تک نہ آیا۔ دوستوں کو دکھایا تھا۔ ٹھیک تھا۔ گھر میں اور کسی کو نہیں، اپنی بیوی۔ اپنی بیوی کو۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ فلم چل رہا تھا۔ مادر زاد برہنگی مختلف آسن اختیار کرتی دوڑ رہی تھی۔ اشوک نے اٹھ کر سوئچ اوف کر دیا۔ پردے پر سب کچھ بجھ گیا۔ مگر اس نے اپنی انگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ اس کا دل و دماغ شرمساری میں ڈُوبا ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو چبھ رہا تھا کہ اس سے ایک نہایت ہی نازیبا۔ نہایت ہی واہیات حرکت سرزد ہوئی۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ وہ کیسے اپنی بیوی سے آنکھ ملا سکے گا۔ کمرے میں گُھپ اندھیرا تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر اس نے احساسِ ندامت کو مختلف خیالوں کے ذریعہ سے دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب

نہ ہوا۔ تھوڑی دیر دماغ میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا رہا۔ جب چاروں طرف سے سرزنش ہوئی تو زچ بچ ہو گیا۔ اور ایک عجیب سی خواہش اسکے دل میں پیدا ہوئی کہ جس طرح کمرے میں اندھیرا ہے اسی طرح اسکے دماغ پر بھی اندھیرا چھا جائے۔ بار بار اسے یہ چیز ستا رہی تھی۔

”ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔“

پھر وہ سوچتا

”بات اگر ساس تک پہنچ گئی۔ سالیوں کو پتہ چل گیا۔ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے یہ لوگ کہ ایسے گرے ہوئے اخلاق کا آدمی نکلا۔ ایسی گندی ذہنیت کہ اپنی بیوی کو۔“

تنگ آکر اشوک نے سگریٹ سلگایا۔ وہ ننگی تصویریں جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا اسکی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ان کے عقب میں اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آتا۔ حیران و پریشان، جس نے زندگی میں پہلی بار عفونت کا اتنا بڑا ڈھیر دیکھا ہو۔ سر جھٹک کر اشوک اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مگر اس سے بھی اس کا اضطراب دور نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا۔ ساتھ والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اسکی بیوی منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔ کافی دیر کھڑا سوچتا رہا۔ کہ اندر جا کر مناسب و موزوں الفاظ میں اُس سے معافی مانگے۔ مگر خود میں اتنی جرأت پیدا نہ کر سکا۔ دبے پاؤں لوٹا اور اندھیرے کمرے میں صوفے پر لیٹ گیا۔ دیر تک جاگتا رہا، آخر سو گیا۔ صبح سویرے اٹھا۔ رات کا واقع اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اشوک نے بیوی سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور ناشتہ کیے بغیر نکل گیا۔ آفس میں اُس نے دل لگا کر کوئی کام نہ کیا۔ یہ احساس اس کے دل و دماغ کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔

”ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔“

کئی بار اس نے گھر بیوی کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار نمبر کے آدھے ہندسے گھما کر ریسیور رکھ دیا۔ دوپہر کو گھر سے جب اس کا کھانا آیا۔ تو اس نے نوکر سے پوچھا

”میم صاحب نے کھانا کھالیا؟“

نوکر نے جواب دیا۔

”جی نہیں۔ وہ کہیں باہر گئے ہیں۔“

”کہاں؟“

”معلوم نہیں صاحب“!

”کب گئے تھے؟“

”گیارہ بجے“

اشوک کا دل دھڑکنے لگا۔ بھوک غائب ہو گئی۔ دو چار نوالے کھائے اور ہاتھ اٹھالیا۔ اسکے دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی۔ طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ گیارہ بجے۔ ابھی تک لوٹی نہیں۔ گئی کہاں ہے۔ ماں کے پاس؟ کیا وہ اسے سب کچھ بتا دیگی؟۔ ضرور بتائے گی۔ ماں سے بیٹی سب کچھ کہہ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے بہنوں کے پاس گئی ہو۔ سنیں گی تو کیا کہیں گی؟۔ دونوں میری کتنی عزت کرتی تھیں۔ جانے بات کہاں سے کہاں پہنچے گی۔ ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔“

اشوک آفس سے باہر نکل گیا۔ موٹر لی اور اِدھر اُدھر آوارہ چکر لگاتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے موٹر کا رخ گھر کی طرف پھیر دیا۔

”دیکھا جائے گا جو کچھ ہو گا۔“

گھر کے پاس پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب لفٹ ایک دھچکے کے ساتھ اوپر اٹھی تو اس کا دل اچھل کر اس کے منہ میں آگیا۔ لفٹ تیسری منزل پر رکی۔ کچھ دیر سوچ کر اُس نے دروازہ کھولا۔ اپنے فلیٹ کے پاس پہنچا تو اس کے قدم رک گئے۔ اس نے سوچا کہ لوٹ جائے۔ مگر فلیٹ کا دروازہ کھلا اور اس کا نوکر بیڑی پینے کے لیے باہر نکلا۔ اشوک کو دیکھ کر اس نے بیڑی ہاتھ میں چھپائی اور سلام کیا۔ اشوک کو اندر داخل ہونا پڑا۔ نوکر پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اشوک نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

”میم صاحب کہاں ہیں؟“

نوکر نے جواب دیا۔

”اندر کمرے میں؟“

”اور کون ہے؟“

”ان کی بہنیں صاحب۔ کولابے والے صاحب کی میم صاحب اور وہ پارٹی بائیاں“!

یہ سن کر اشوک بڑے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دھکا دیا۔ اندر سے اشوک کی بیوی کی پتلی مگر تیز آواز آئی

”کون ہے؟“

نوکر بولا

”صاحب“

اندر کمرے میں ایک دم گڑبڑ شروع ہو گئی۔ چیخیں بلند ہوئیں۔ دروازوں کی چٹخنیاں کھلنے کی آوازیں آئیں۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ ہوئی۔ اشوک کوری ڈور سے ہوتا پچھلے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پروجیکٹر چل رہا اور پردے پر دن کی روشنی میں دھندلی دھندلی انسانی شکلیں ایک نفرت انگیز مکانکی یک آہنگی کے ساتھ حیوانی حرکات میں مشغول ہیں۔ اشوک بے تحاشا ہنسنے لگا۔ 4جون1950ء

غسل خانہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوغسل خانہ

صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی سڑھیوں کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس میں کبھی اُپلے اور لکڑیاں کوئلے رکھے جاتے تھے۔ مگر اب اس میں نل لگا کر اس کو مردانہ غسل خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ فرش وغیرہ مضبوط بنا دیا گیا ہے تاکہ مکان کی بنیادوں میں پانی نہ چلا جائے۔ اس میں صرف ایک کھڑکی ہے جو گلی کی طرف کھلتی ہے۔ اس میں زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب یہ غسل خانہ میری زندگی میں داخل ہوا۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ غسل خانے انسانوں کی زندگی میں کیونکر داخل ہوسکتے ہیں۔ غسل خانہ تو ایسی چیز ہے جس میں آدمی داخل ہوتا ہے اور دیر تک داخل رہتا ہے۔ لیکن جب آپ میری کہانی سُن لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ غسل خانہ واقعی میری زندگی میں داخل ہُوا اور اس کا ایک اہم ترین جزو بن کے رہ گیا۔ یوں تو میں اس غسل خانے سے اس وقت کا متعارف ہوں جب اس میں اُپلے وغیرہ پڑے رہتے تھے اور میری بلی نے اس میں بھیگے ہُوئے چوہوں کی شکل کے چار بچے دیے تھے۔ ان کی آنکھیں دس بارہ روز تک مندی رہی تھیں چنانچہ جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی دیکھ کر میں نے امی جان سے کہا تھا۔

”امی جان میری بلی ٹیڈی نے جب بچے دیے تھے تو ان کی آنکھیں بند تھی اس کی کیوں کھلی ہوئی ہیں ء“

یعنی میں بچپن ہی سے اس غسل خانے کو جانتا ہُوں لیکن یہ میری زندگی میں اس وقت داخل ہوا۔ جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ایک بھاری بھر کم بستہ بغل میں دبا کر ہر روز اسکول جایا کرتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے میں نے اسکول سے گھر آتے ہوئے سردار ودھاوا سنگھ پھل فروش کی دکان سے ایک کابلی انار چُرایا۔ میں اور میرے دو ہم جماعت لڑکے ہر روز کچھ نہ کچھ اس دکان سے چرایا کرتے تھے لیکن بھائی ودھاوا سنگھ جو پھلوں کے ٹوکروں میں گھرا ایک بڑی سی پگڑی اپنے کیسوں پر رکھے سارا دن افیم کے نشے میں اونگھتا رہتا تھا کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم بڑی بڑی چیزیں نہیں چراتے تھے۔ کبھی انگور کے چند دانے اُٹھا لیے کبھی لوکاٹ کا ایک گُچھا لے اڑے۔ کبھی مٹھی بھر خوبانیاں اٹھائیں اور چلتے بنے۔ لیکن اس دفعہ چونکہ میں نے زیادتی کی تھی اس لیے پکڑا گیا۔ ایک دم بھائی ودھاوا سنگھ اپنی ابدی پینک سے چونکا اور اتنی پُھرتی سے نیچے اتر کر اس نے مجھے رنگوں ہاتھوں پکڑا کہ میں دنگ رہ گیا۔ ساتھ ہی میرے حواس باختہ ہو گئے۔ پہلے تو میں اس چوری کو کھیل سمجھا تھا لیکن جب میلی داڑھی والے سردار ووھاوا سنگھ نے اپنی پھولی ہوئی رگوں والے ہاتھ سے میری گردن ناپی تو مجھے احساس ہُوا کہ میں چور ہوں۔ بچپن ہی سے مجھے اس بات کا خیال رہا ہے کہ لوگوں کے سامنے میری ذلت نہ ہو۔ چنانچہ سرِ بازار جب میں نے خود کو ذلیل ہوتے دیکھا تو فوراً بھائی ووھاوا سنگھ سے معافی مانگ لی۔ آدمی کا دل بہت اچھا تھا۔ انار میرے ہاتھ سے چھین کر اس نے وہ میل جو اس کے خیال کے مطابق انار کو لگ گیا تھا اپنے کرتے سے صاف کیا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

”وکیل صاحب آئے تو میں ان سے کہونگا کہ آپ کے لڑکے نے اب چوری شروع کر دی ہے۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ سستے چھوٹ گئے۔ وکیل صاحب یعنی میرے ابا جی سردار ودھاوا سنگھ نہیں تھے۔ وہ نہ افیم کا نشہ کرتے تھے اور نہ انھیں پھلوں ہی سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں نے سوچا اگر اس کمبخت ودھاوا سنگھ نے ان سے میری چوری کا ذکر کر دیا تو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی امی جان سے کہیں گے۔

”کچھ سنتی ہو۔ اب تمہارے اس برخوردار نے چوری چکاری بھی شروع کر دی ہے۔ سردار ودھاوا سنگھ نے جب مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب آپکا لڑ کا انار اٹھا کے بھاگ گیا تھا تو خدا کی قسم میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے آج تک اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دی۔ لیکن اس نالائق نے میری ساری عزت خاک میں ملا دی ہے۔“

وہ مجھے دو تین طمانچے مار کر مطمئن ہو جاتے مگر امی جان کا ناک میں دم کر دیتے۔ اس لیے کہ وہ ہماری طرف داری کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کی اولاد (ہم چھ بیٹے تھے) سے کوئی چھوٹی سی لغزش ہو اور وہ آنگن میں اپنے گنجے سر کا پسینہ پونچھ پونچھ کر امی جان کو کوسنا شروع کر دیں جیسے سارا قصور ان کا ہے۔ کوسنے کے بعد بھی ان کا جی ہلکا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز کھانا نہیں کھاتے تھے اور دیر تک خاموش آنگن میں سیمنٹ لگے فرش پر اِدھر اُدھر ٹہلتے رہتے تھے۔ جس وقت بھائی ودھاوا سنگھ نے وکیل صاحب کا نام لیا میری آنکھوں

کے سامنے اباجی کا گنجا سر آگیا جس پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں ان کو ہمیشہ غصے کے وقت اس جگہ پر پسینہ آتا ہے۔ بستہ میری بغل میں بہت وزنی ہو گیا۔ ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ شرم کا وہ احساس جو چوری پکڑے جانے پر پیدا ہُوا مٹ گیا اور اس کی جگہ ایک تکلیف دہ خوف نے لے لی۔ اباجی کا گنجا سر۔ اس پر چمکتی ہوئی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں۔ آنگن کا سیمنٹ لگا فرش۔ اس پر ان کا غصے میں اِدھر اُدھر چھیڑے ہوئے ببر شیر کی طرح چلنا اور رک رک کر امی جان پر برسنا۔ سخت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا غسل خانے کے پاس ٹھہر کر میں نے ایک بار سوچا کہ اگر اس کمبخت پھل فروش نے سچ مچ اباجی سے کہہ دیا تو آفت ہی آجائے۔ دو تین روز کے لیے سارا گھر جہنم کا نمونہ بن جائے گا۔ اباجی اور سب کچھ معاف کر سکتے تھے۔ لیکن چوری کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ہمارے پرانے ملازم نبّو نے ایک بار دس روپے کا نوٹ امی جان کے پان دان سے نکال لیا تھا۔ امی جان نے تو اسے معاف کر دیا تھا لیکن اباجی کو جب اس چوری کا پتا چلا تو انھوں نے اسے نکال باہر کیا

”میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔“

ان کے یہ الفاظ میرے کانوں میں کئی بار گونج چکے تھے۔ میں نے اوپر جانے کے لیے زینے پر قدم ہی رکھا کہ ان کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ جانے وہ میرے بڑے بھائی ثقلین سے کیا کہہ رہے تھے لیکن میں یہی سمجھا کہ وہ بنو کو گھر سے باہر نکال رہے ہیں اور اس سے غصے میں یہ کہہ رہے ہیں

”میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔“

میرے قدم منوں بھاری ہو گئے۔ میں اور زیادہ سہم گیا اور اوپر جانے کے بجائے نیچے اُتر آیا۔ خدا معلوم کیا جی میں آئی کہ غسل خانے کے اندر جا کر میں نے صدقِ دل سے دعا مانگی کہ اباجی کو میری چوری کا علم نہ ہو۔ یعنی ودہاوا سنگھ ان سے اس کا ذکر کرنا بھول جائے۔ دعا مانگنے کے بعد میرے جی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ چنانچہ میں اوپر چلا گیا۔ خدا نے میری دعا قبول کی۔ ودہاوا سنگھ اور اس کی دکان ابھی تک موجود ہے۔ لیکن اس نے اباجی سے انار کی چوری کا ذکر نہیں کیا۔ غسل خانہ یہیں سے میری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ ایک بار پھر ایسی ہی بات ہوئی۔ میں زیادہ لطف لینے کی خاطر پہلی دفعہ بازار میں کھلے بندوں سگریٹ پیے جا رہا تھا کہ اباجی کے ایک دوست سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے سگرٹ میرے ہاتھ سے چھین کر غصّے میں ایک طرف پھینک دیا اور کہا۔

”تم بہت آوارہ ہو گئے ہو۔ بڑوں کا شرم و لحاظ اب تمہاری آنکھوں میں بالکل نہیں رہا۔ خواجہ صاحب سے کہہ کر آج ہی تمہاری اچھی طرح گوشمالی کراؤں گا۔“

انار کی چوری کے مقابلے میں کھلے بندوں سگریٹ پینا اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔ خواجہ صاحب یعنی میرے اباجی خود سگریٹ پیتے تھے مگر اپنی اولاد کے لیے انھوں نے اس چیز کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ ایک روز میرے بڑے بھائی کی جیب میں سے انھیں سگرٹ کی ڈبیا مل گئی تھی جس پر انھوں نے ایک تھپڑ لگا کر فیصلہ کن لہجے میں یہ الفاظ کہے تھے۔

”ثقلین اگر میں نے تمہاری جیب میں پھر سگریٹ کی ڈبیا دیکھی تو میں تمہیں اس روز گھر سے باہر نکال دوں گا۔ سمجھ گئے؟“

ثقلین سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ وہ ہر روز صرف ایک سگرٹ لاتا تھا اور پائخانے میں جا کر پیا کرتا تھا۔ میں ثقلین سے عمر میں تین برس چھوٹا ہُوں۔ ظاہر ہے کہ میرا سگریٹ پینا اور وہ بھی بازاروں میں کھلے بندوں۔ اباجی کسی طرح برداشت نہ کرتے۔ ثقلین کو تو انھوں نے صرف دھمکی دی تھی مگر مجھے وہ یقیناً گھر سے باہر نکال دیتے۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے غسل خانے میں جا کر صدق دل سے دعا مانگی کہ اے خدا اباجی کو میرے سگریٹ پینے کا کچھ علم نہ ہو۔ دُعا مانگنے کے بعد میرے دل پر سے خوف کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور میں اوپر چلا گیا۔ آپ کہیں گے کہ میں خاص طور پر غسل خانے میں داخل ہو کر ہی کیوں دعا مانگتا تھا۔ دعا کہیں بھی مانگی جا سکتی ہے۔ درست ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں دل میں اگر کوئی بات سوچوں تو اس کے ساتھ اور بہت سی غیر ضروری باتیں خود بخود آجاتی ہیں۔ میں نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دعا مانگی تھی مگر میرے دل میں کئی اوٹ پٹانگ باتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ دعا اور یہ باتیں غلط ملط ہو کر ایک بے ربط عبارت بن گئی تھی۔

”اللہ میاں۔ میں نے سگریٹ۔ بیڑا غرق ایک پوری ڈبیا سگرٹوں کی میرے نیکر کی جیب میں پڑی ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لی تو کیا ہو گا۔ کہیں ثقلین ہی نہ لے اڑے۔ اللہ میاں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سگریٹ پینے میں کیا برائی ہے؟ اباجی نے چھٹی جماعت سے پینے شروع کیے تھے۔ اللہ میاں۔ سگرٹ والے کے ساڑھے تیرہ آنے میری طرف نکلتے ہیں۔ ان کی ادائیگی کیسے ہو گی اور اسکول میں مٹھائی والے کے بھی چھ آنے دینا ہیں۔ مٹھائی اس کی بالکل واہیات ہے لیکن میں کھاتا کیوں ہوں؟۔ اللہ میاں مجھے معاف کر دے۔ جو سگریٹ اباجی پیتے ہیں ان کا مزا کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے۔ پان کھا کر سگریٹ پینے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اللہ میاں۔ اب کے نہر پہ جائیں گے تو سگریٹوں کا ڈبہ ضرور خریدیں گے۔ کب تک سگریٹ والا ادھار دیتا رہے گا۔ امی جان کا بٹوہ۔ اللہ میاں مجھے معاف کر دے۔“

میں دل ہی دل میں خاموش دعا مانگوں تو یہی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجھے غسل خانے کے اندر جانا پڑتا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں وہاں اپنے خیالات کو آوارہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ میلی چھت کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ سانس روکا اور ہولے ہولے دعا گنگنانا شروع کر دی۔ عجیب بات ہے کہ جو دعا میں نے اس غلیظ غسل خانے میں مانگی، قبول ہوئی۔ انار کی چوری کا اباجی کو کچھ علم نہ ہوا۔ سگریٹ پینے کے متعلق بھی وہ کچھ جان نہ سکے اس لیے کہ ان کا دوست اس روز شام کو کلکتے چلا گیا جہاں اس نے مستقل رہائش اختیار کر لی۔ غسل خانے سے میرا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا۔ جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان دینے کے دوران میں دعا مانگی اور وہ قبول ہُوئی۔ جیومیٹری کا پرچہ تھا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر تمام

پر اپوزیشنیں کتاب سے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیں اور دعا مانگی کہ کسی ممتحن کی نظر نہ پڑے اور میں اپنا کام اطمینان سے کر لوں۔ چنانچہ یہی ہُوا۔ میں نے پھاڑے ہُوئے اوراق نکال کر کاغذوں کے نیچے ڈیسک پر رکھ لیے اور اطمینان سے بیٹھا نقل کرتا رہا۔ ایک بار نہیں پچیسویں بار میں نے اس غسل خانے میں حالات کی نزاکت محسوس کر کے دُعا مانگی جو قبول ہوئی۔ میرے بڑے بھائی ثقلین کو اس کا علم تھا مگر وہ میری ضعیف الاعتقادی سمجھتا تھا۔ بھئی کچھ بھی ہو۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اس غسل خانے میں مانگی ہوئی دعا کبھی خالی نہیں گئی۔ میں نے اور جگہ بھی دعائیں مانگ کر دیکھی ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی قبول نہیں ہوئی۔ کیوں؟۔ اس کا جواب نہ میں دے سکتا ہوں اور نہ میرا بڑا بھائی ثقلین۔ ممکن ہے آپ میں سے کوئی صاحب دے سکیں۔ چند برس پیچھے کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ میرے چچا جان کی شادی تھی۔ آپ سنگاپور سے اس غرض کے لیے آئے تھے۔ چونکہ ان کا اور ہمارا گھر۔ بالکل ساتھ ساتھ ہے اس لیے جتنی رونق ان کے مکان میں تھی اتنی ہی ہمارے مکان میں بھی تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی کہیے کیونکہ لڑکی والے ہمارے گھر آ گئے تھے آدھی رات ڈھولک کے گیت گائے جاتے تھے۔ ہونے والی دلہن سے چھیڑ چھاڑ۔ عجیب و غریب رسمیں۔ تیل۔ مہندی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ۔ بچوں کی چیخ و پکار۔ الہڑ لڑکیوں کی نئی گرگابیوں اور سینڈلوں میں ایک چلت پھرت۔ اوٹ پٹانگ کھیل۔ غرض کہ ہر وقت ایک ہنگامہ مچا رہتا تھا۔ جب اس قسم کی خوشگوار افراتفری پھیلی ہو تو لڑکیوں کو چھیڑنے کا بہت لطف آتا ہے بلکہ یُوں کہیے کہ شادی بیاہ کے ایسے ہنگاموں ہی پر لڑکیوں کو چھیڑنے کا موقع ملتا ہے۔ ہمارے دور کے رشتہ دار شالباف تھے۔ ان کی لڑکی مجھے بہت پسند تھی۔ اس سے پہلے تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آ چکی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک رُکی ہوئی ہنسی ہے۔ نہیں۔ میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکا۔ اس کا سارا وجود کھلکھلا کر ہنس اُٹھتا اگر اس کو ذرا سا چھیڑ دیا جاتا۔ بالکل ذرا سا یعنی اس کو اگر صرف چُھو لیا جاتا تو بہت ممکن ہے وہ ہنسی کا فوارہ بن جاتی۔ اس کے ہونٹوں اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں۔ اس کی ناک کے ننھے ننھے نتھنوں میں۔ اس کی پیشانی کی مصنوعی تیوریوں میں۔ اس کے کان کی لووں میں ہنسی کے ارادے مرتعش رہتے تھے۔ میں نے اس کے چھیڑنے کا پورا تہیہ کر لیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیڑھیوں کی بتی خراب ہو گئی۔ بلب فیوز ہوا یا کیا ہوا بہر حال اچھا ہوا کیونکہ وہ بار بار کہیں نیچے آتی تھی اور کبھی اوپر جاتی تھی۔ میں غسل خانے کے پاس اندھیرے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اوپر جاتی یا نیچے آتی مجھ سے اسکی مڈبھیڑ ضرور ہوتی اور میں اندھیرے میں اس سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام کر جاتا۔ بات معقول تھی چنانچہ میں کچھ دیر دم سادھے اسکا منتظر رہا۔ اور اس دوران میں اپنی آنکھوں کو تاریکی کا عادی بناتا رہا۔ کسی کے نیچے اترنے کی آواز آئی۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ میں تیار ہو گیا۔ ابا جی تھے۔ انھوں نے پوچھا۔ کون ہے؟۔ میں نے کہا۔

”جی عباس“

۔انھوں نے اندھیرے میں ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر مارا اور کہا۔

”تمھیں شرم نہیں آتی۔ یہاں چھپ کر لڑکیوں کو چھیڑتے ہو۔ ثریا ابھی ابھی اپنی ایک سہیلی سے تمہاری اس بیہودہ حرکت کا ذکر کر رہی تھی۔ اگر اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا تو جانتے ہو کیا ہو گا؟۔ واہیات کہیں کے!۔ تمھیں اپنی عزت کا خیال نہیں اپنے بڑوں کی آبرو ہی کا کچھ لحاظ کرو۔ اور ثریا کی ماں نے آج ہی ثریا کے لیے تمھیں مانگا ہے۔ لعنت ہو تم پر۔“

کھٹ کھٹ کھٹ۔ کسی کے نیچے اُترنے کی آواز آئی۔ ابا جی نے میرے حیرت زدہ منہ پر ایک اور طمانچہ رسید کیا اور بڑبڑاتے چلے گئے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ ثریا تھی۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی اور حیا آلود غصے کے ساتھ یہ کہتی چلی گئی۔

”خبردار جو اب آپ نے مجھے چھیڑا۔ امی جان سے کہہ دونگی۔“

میں اور بھی زیادہ متحیر ہو گیا۔ دماغ پر بہت زور دیا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ اتنے میں غسل خانے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور ثقلین باہر نکلا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے تھے؟“

اس نے جواب دیا۔

”دُعا مانگ رہا تھا۔“

میں نے پوچھا۔

”کس لیے۔“

مسکرا کر اس نے کہا۔

”ثریا کو میں نے چھیڑا تھا۔“

میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ اس غسل خانے میں جو دعا مانگی جائے ضرور قبول ہوتی ہے۔

فرشتہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوفرشتہ

سرخ کھردرے کمبل میں عطاء اللہ نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کہرے کی دبیز چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جن کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے تھے۔ ایک لمبا، بہت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا دالان تھا یا شاید کمرہ تھا جس میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔ دور بہت دور، جہاں شاید کمرہ یا دالان ختم ہو سکتا تھا، ایک بہت بڑا تھا جس کا دراز قد چھت کو پھاڑتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ عطاء اللہ کو اس کا صرف نچلا حصہ نظر آرہا تھا جو بہت پُر ہیبت تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ موت کا دیوتا ہے جو اپنی ہولناک شکل دکھانے سے قصداً گریز کر رہا ہے۔ عطاء اللہ نے ہونٹ گول کرکے اور زبان پیچھے کھینچ کر اس پُر ہیبت بت کی طرف دیکھا اور سیٹی بجائی، بالکل اس طرح جس طرح کتے کو بلانے کے لیے بجائی جاتی ہے۔ سیٹی کا بجنا تھا کہ اس کمرے یا دالان کی دھندلی فضا میں ان گنت ڈُمیں لہرانے لگیں۔ لہراتے لہراتے یہ سب بہت بڑے شیشے کے مرتبان میں جمع ہو گئیں جو غالباً اسپرٹ سے بھرا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ مرتبان فضا میں بغیر کسی سہارے کے تیرتا، ڈولتا اس کی آنکھوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں اسپرٹ کے اندر اس کا دل ڈبکیاں لگا رہا تھا اور دھڑکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ عطاء اللہ کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی۔ اس مقام پر جہاں اس کا دل ہوا کرتا تھا، اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ رکھا اور بے ہوش ہو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا مگر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو کہرا غائب تھا۔ وہ دیو ہیکل بت بھی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور برف کی طرح ٹھنڈا۔ مگر اس مقام پر جہاں اس کا دل تھا، ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس آگ میں کئی چیزیں جل رہی تھیں، بے شمار چیزیں۔ اس کی بیوی اور بچوں کی ہڈیاں تو چیخ رہی تھیں، مگر اس کے گوشت پوست اور اس کی ہڈیوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ جھلسا دینے والی تپش میں بھی وہ یخ بستہ تھا۔ اس نے ایک دم اپنے برفیلے ہاتھوں سے اپنی زرد رو بیوی اور سوکھے کے مارے ہوئے بچوں کو اٹھایا اور پھینک دیا۔ اب آگ کے اس الاؤ میں عرضیاں کے پلندے کے پلندے جل رہے تھے۔ ہر زبان میں لکھی ہوئی عرضیاں۔ ان پر اس کے اپنے ہاتھ سے کیے ہوئے دستخط، سب جل رہے تھے، آواز پیدا کیے بغیر۔ آگ کے شعلوں کے پیچھے اسے اپنا چہرہ نظر آیا۔ پسینے سے۔ سرد پسینے سے تربتر۔ اس نے آگ کا ایک شعلہ پکڑا اور اس سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر ایک طرف پھینک دیا۔ الاؤ میں گرتے ہی یہ شعلہ بھیگے ہوئے اسفنج کی طرف رونے لگا۔ عطاء اللہ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت ترس آیا۔ عرضیاں جلتی رہیں اور عطاء اللہ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی زرد رو بیوی نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گندھے ہوئے آٹے کا تھال تھا۔ جلدی جلدی اس نے پیڑے بنائے اور آگ میں ڈالنا شروع کر دیے جو آنکھ جھپکنے کی دیر میں کوئلے بن کر سلگنے لگے۔ انھیں دیکھ کر عطاء اللہ کے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ جھپٹا مار کر اس نے تھال میں سے آخری پیڑا اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔ لیکن آٹا خشک تھا۔ ریت کی طرح۔ اس کا سانس رکنے لگا اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ اب اس نے ایک بے جوڑ خواب دیکھنا شروع کیا۔ ایک بہت بڑی محراب تھی جس پر جلی حروف میں یہ شعر لکھا تھا روزِ محشر کہ جاں گداز بود اولیں پرسش نماز بود وہ فوراً پتھریلے فرش پر سجدے میں گر پڑا۔ نماز بخشوانے کے لیے دعا مانگنا چاہی مگر بھوک اس کے معدے کو اس بری طرح ڈسنے لگی کہ بلبلا اٹھا۔ اتنے میں کسی نے بڑی بارعب آواز میں پکارا:

”عطاء اللہ“!

عطاء اللہ کھڑا ہو گیا۔ محرابوں کے پیچھے۔ بہت پیچھے، اونچے منبر پر ایک شخص کھڑا تھا۔ مادر زاد برہنہ، اس کے ہونٹ ساکت تھے مگر آواز آرہی تھی۔

”عطاء اللہ! تم کیوں زندہ ہو؟ آدمی صرف اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اسے کوئی سہارا ہو۔ ہمیں بتاؤ، کوئی ایسا سہارا ہے جس کا تمہیں سہارا ہو؟۔ تم بیمار ہو۔ تمہاری بیوی آج نہیں تو کل بیمار ہو جائے گی۔ وہ جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، بیمار ہوتے ہیں۔ زندہ درگور ہوتے ہیں۔ اس کا سہارا تم ہو جو بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ تمہارے بچے بھی ختم ہو رہے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے خود اپنے آپ کو ختم نہیں کیا۔ اپنے بچوں اور اپنی بیوی کو ختم نہیں کیا۔ کیا اس خاتمے کے لیے بھی تمہیں کسی سہارے کی ضرورت ہے؟۔ تم رحم و کرم کے طالب ہو۔ بے وقوف! کون تم پر رحم کرے گا۔ موت کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہیں مصیبتوں سے نجات دلائے۔ اس کے لیے یہ مصیبت کیا کم ہے کہ وہ موت ہے۔ کس کس کو آئے۔ ایک صرف تم عطاء اللہ نہیں ہو، تم ایسے لاکھوں عطاء اللہ اس بھری دنیا میں موجود ہیں۔ جاؤ، اپنی مصیبتوں کا علاج خود کرو۔ دو مریل بچوں اور ایک فاقہ زدہ بیوی کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس بوجھ سے ہلکے ہو جاؤ تو موت شرمسار ہو کر خود بخود تمہارے پاس چلی آئے گی۔“

عطاء اللہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔

”تم۔ تم سب سے بڑے ظالم ہو۔ بتاؤ، تم کون ہو۔ اس سے پیشتر کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو ہلاک کروں، میں تمہارا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں۔“

مادر زاد برہنہ شخص نے قہقہہ لگایا اور کہا

”میں عطاء اللہ ہوں۔ غور سے دیکھو۔ کیا تم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتے؟“

عطاء اللہ نے اس ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف دیکھا اور اس کی گردن جھک گئی۔ وہ خود ہی تھا، بغیر لباس کے۔ ان کا خون کھولنے لگا۔ فرش میں سے اس نے اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر ایک پتھر نکالا اور تان کر منبر کی طرف دیکھا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس میں سے لہو نکل رہا تھا۔ وہ بھاگا۔ پتھریلے صحن کو عبور کر کے جب باہر نکلا تو ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ ہجوم کا ہر فرد عطاء اللہ تھا۔ جس کا ماتھا لہولہان تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہجوم کو چیر کر وہ باہر نکلا۔ ایک تنگ و تاریک سڑک پر دیر تک چلتا رہا۔ اس کے دونوں کناروں پر حشیش اور تھوہر کے پودے اگے ہوئے تھے۔ ان میں کہیں کہیں دوسری زہریلی بوٹیاں بھی جمی تھیں۔ عطاء اللہ نے جیب سے بوتل نکال کر تھوہر کا عرق جمع کیا۔ پھر زہریلی بوٹیوں کے پتے توڑ کر اس میں ڈالے اور انھیں ہلاتا ہلاتا اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے کچھ فاصلے پر اس کا مکان تھا۔ شکستہ اینٹوں کا ڈھیر۔ ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے طاق میں مٹی کے تیل کی کُپی سے کافی روشنی نکل رہی تھی۔ اس مٹیالی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جھلنگی پلنگڑی پر اس کے دونوں مریل بچے مرے پڑے ہیں۔ عطاء اللہ کو بہت ناامیدی ہوئی۔ بوتل جیب میں رکھ کر جب وہ پلنگڑی کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ پھٹی پرانی گدڑی جو اس کے بچوں پر پڑی ہے، آہستہ آہستہ ہل رہی ہے۔ عطاء اللہ بہت خوش ہوا۔ وہ زندہ تھے۔ بوتل جیب سے نکال کر وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ دونوں لڑکے تھے۔ ایک چار برس، دوسرا پانچ کا۔ دونوں بھوکے تھے۔ دونوں ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے۔ گدڑی ایک طرف ہٹا کر جب عطاء اللہ نے ان کو غور سے دیکھا تو اسے تعجب ہوا کہ اتنے چھوٹے بچے اتنی سوکھی ہڈیوں پر اتنی دیر سے کیسے زندہ ہیں۔ اس نے زہر کی شیشی ایک طرف رکھ دی اور انگلیوں سے ایک بچے کی گردن ٹٹولتے ٹٹولتے۔ ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ ہلکی سی تڑاخ ہوئی اور اس بچے کی گردن ایک طرف لٹک گئی۔ عطاء اللہ بہت خوش ہوا کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کام تمام ہو گیا۔ اسی خوشی میں اس نے اپنی بیوی کو پکارا۔

”جیناں! جیناں۔ ادھر آؤ۔ دیکھو میں نے کتنی صفائی سے رحیم کو مار ڈالا ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس کو۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ زینب کہاں ہے؟۔ معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے؟۔ شاید بچوں کے لیے کسی سے کھانا مانگنے گئی ہو۔ یا ہسپتال میں اس کی خیریت دریافت کرنے۔ عطاء اللہ ہنسا۔ مگر اس کی ہنسی فوراً دب گئی، جب دوسرے بچے نے کروٹ بدلی اور اپنے مردہ بھائی کو بلانا شروع کیا۔

”رحیم۔ رحیم۔“

وہ نہ بولا تو اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی سیاہ پیالوں میں اس کی آنکھیں چمکیں۔

”ابا۔ تم آ گئے۔“

عطاء اللہ نے ہولے سے کہا۔

”ہاں کریم، میں آ گیا۔“

کریم نے اپنے استخوانی ہاتھ سے رحیم کو جھنجھوڑا۔

”اٹھو رحیم۔ ابا آ گئے ہسپتال سے۔“

عطاء اللہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”خاموش رہو۔ وہ سو گیا ہے۔“

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ ہٹایا۔

”کیسے سو گیا ہے۔ ہم دونوں نے ابھی تک کچھ کھایا نہیں۔“

”تم جاگ رہے تھے؟“

”ہاں ابا۔“

”سو جاؤ گے ابھی تم۔“

”کیسے؟“

”میں سلاتا ہوں تمہیں۔“

یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی سخت انگلیاں کریم کی گردن پر رکھیں اور اس کو مروڑ دیا۔ مگر تڑاخ کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ کریم کو بہت درد ہوا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”کچھ نہیں۔“

عطاء اللہ حیرت زندہ تھا کہ اس کا یہ دوسرا لڑکا اتنا سخت جان کیوں ہے۔

”کیا تم سونا نہیں چاہتے ؟“

کریم نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”سونا چاہتا ہوں۔ کچھ کھانے کو دے دو۔ سو جاؤں گا۔“

عطاء نے اللہ زہر کی شیشی اٹھائی۔

”پہلے یہ دوا پی لو۔“

”اچھا۔“

کریم نے اپنا منہ کھول دیا۔ عطاء اللہ نے ساری شیشی اس کے حلق میں انڈیل دی اور اطمینان کا سانس لیا۔

”اب تم گہری نیند سو جاؤ گے۔“

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

”ابا۔ اب کچھ کھانے کو دو۔“

عطاء اللہ کو بہت کوفت ہوئی۔

”تم مرتے کیوں نہیں۔ ؟“

کریم یہ سن کر سٹپٹا سا گیا۔

”کیا ابا“

”تم مرتے کیوں نہیں۔ میرا مطلب ہے، اگر تم مر جاؤ گے تو نیند بھی آ جائے گی تمہیں۔“

کریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے۔

”مارتا تو اللہ میاں ہے ابا۔“

اب عطاء اللہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

”مارا کرتا تھا کبھی۔ اب اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ چلو اٹھو۔“

پلنگڑی پر کریم تھوڑا سا اٹھا تو عطاء اللہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور سوچنے لگا کہ وہ اللہ میاں کیسے بنے۔ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر جب باہر گلی میں نکلا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان اس پر جھکا ہوا ہے۔ اس میں جا بجا مٹی کے تیل کی کپٹیاں جل رہی تھیں۔ اللہ میاں خدا جانے کہاں تھا۔ اور زینب بھی۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی تھی۔ کہیں سے کچھ مانگنے گئی ہو گی۔ عطاء اللہ ہنسنے لگا۔ لیکن فوراً اسے خیال آیا کہ اسے اللہ میاں بننا تھا۔ سامنے موری کے پاس بہت سے پتھر پڑے تھے۔ ان پر وہ اگر کریم کو دے مارے تو۔ مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ کریم اس کی گود میں تھا۔ اس نے کوشش کی کہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے اور سر سے اوپر لے جا کر پتھروں پر پٹک دے، مگر اسکی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے کچھ سوچا اور اپنی بیوی کو آواز دی

”جیناں۔ جیناں۔“

زینب معلوم نہیں کہاں ہے۔ کہیں وہ اس ڈاکٹر کے ساتھ تو نہیں چلی گئی جو ہر وقت اس سے اتنی ہمدردی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ وہ ضرور اس کے فریب میں آ گئی ہو گی۔ میرے لیے اس نے کہیں خود کو بیچ تو نہیں دیا۔ یہ سوچتے ہی اس کا خون کھول اٹھا۔ کریم کو پاس بہتی ہوئی بدرو میں پھینک کر وہ ہسپتال کی طرف بھاگا۔ اتنا تیز دوڑا کہ چند منٹ میں ہسپتال پہنچ گیا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ جب وہ اپنے وارڈ کے برآمدے میں پہنچا تو دو آوازیں سنائی دیں۔ ایک اس کی بیوی کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”تم دغاباز ہو۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اس سے جو کچھ تمہیں ملا ہے، تم نے اپنی جیب میں ڈال لیا ہے۔“

کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

”تم غلط کہتی ہو۔ تم اس کو پسند نہیں آئیں اس لیے وہ چلا گیا۔“

اس کی بیوی دیوانہ وار چلائی۔

”بکواس کرتے ہو۔ ٹھیک ہے کہ میں دو بچوں کی ماں ہوں۔ میرا وہ پہلا سا رنگ روپ نہیں رہا۔ لیکن وہ مجھے قبول کر لیتا اگر تم بھانجی نہ مارتے۔ تم بہت ظالم ہو۔ بہت کٹھور ہو۔“

اس کی آواز گلے میں رندھنے لگی۔

”میں کبھی تمہارے ساتھ نہ چلتی۔ میں کبھی ذلت میں نہ گرتی اگر میرا خاوند بیمار اور میرے بچے کئی دنوں کے بھوکے نہ ہوتے۔ تم نے کیوں یہ ظلم کیا؟“

اس مرد نے جواب دیا۔

”وہ۔ وہ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں خود تھا۔ جب تم میرے ساتھ چل پڑیں تو میں نے خود کو پہچانا۔ اور تم سے کہا کہ وہ چلا گیا ہے۔ وہ، جس کے لیے میں تمہیں لایا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا خاوند مر جائے گا۔ تمہارے بچے مر جائیں گے۔ تم بھی مر جاؤ گی۔ لیکن۔“

”لیکن کیا۔“

اس کی بیوی نے تیکھی آواز میں پوچھا۔

”میں مرتے دم تک زندہ رہوں گا۔ تم نے مجھے اس زندگی سے بچا لیا ہے جو موت سے کہیں زیادہ خوف ناک ہوتی۔ چلو آؤ۔ عطاء اللہ ہمیں بلا رہا ہے۔“

”عطاء اللہ یہاں کھڑا ہے۔“

عطاء اللہ نے بھینچی ہوئی آواز میں کہا۔ دو سائے پلٹے۔ اس سے کچھ فاصلے پر وہ ڈاکٹر کھڑا تھا جو زینب سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکا تھا۔

”تم“!

”ہاں، میں۔ تمہاری سب باتیں سن چکا ہوں۔“

یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

”جیناں۔ میں نے رحیم اور کریم دونوں کو مار ڈالا ہے۔ اب میں اور تم باقی رہ گئے ہیں۔“

زینب چیخی۔

”مار ڈالا تم نے! دونوں بچوں کو؟“

عطاء اللہ نے بڑے پر سکون لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے تمہیں بھی کوئی تکلیف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب موجود ہیں“!

ڈاکٹر کانپنے لگا۔ عطاء اللہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

”ایسا انجکشن دے دو کہ فوراً مر جائے۔“

ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا بیگ کھولا اور سرنج میں زہر بھر کے زینب کے ٹیکہ لگا دیا۔ ٹیکہ لگتے ہی وہ فرش پر گری اور مر گئی۔ اس کی زبان پر آخری الفا☆۔ میرے بچے۔

میرے بچے“

تھے، مگر اچھی طرح ادا نہ ہو سکے۔ عطاء اللہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

”چلو یہ بھی ہو گیا۔ اب میں باقی رہ گیا ہوں۔“

”لیکن۔ لیکن میرے پاس زہر ختم ہو گیا ہے۔“

ڈاکٹر کے لہجے میں لکنت تھی۔ عطاء اللہ تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہو گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے ڈاکٹر سے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں اندر اپنے بستر پر لیٹتا ہوں، تم بھاگ کر زہر لے کر آؤ۔“

بستر پر لیٹ کر سرخ کھردرے کمبل میں اس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کہرے کی چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جن کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے تھے۔ ایک لمبا، بہت ہی لمبا نہ ختم ہونے والا دالان تھا۔ یا شاید کمرہ جس میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔ دور، بہت دور ایک فرشتہ کھڑا تھا۔ جب وہ آگے بڑھنے لگا تو چھوٹا ہوتا گیا۔ عطاء اللہ کی چارپائی کے پاس پہنچ کر وہ ڈاکٹر بن گیا۔ وہی ڈاکٹر جو اس کی بیوی سے ہر وقت ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور اسے بڑے پیار سے دلاسا دیتا تھا۔ عطاء اللہ نے اسے پہچانا تو اٹھنے کی کوشش کی۔

”آیئے ڈاکٹر صاحب“!

مگر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ عطاء اللہ لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کہرا دور ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کا دماغ بھی صاف تھا۔ ایک دم وارڈ میں شور بلند ہوا۔ سب سے اونچی آواز جو چیخ سے مشابہ تھی، زینب کی تھی، اس کی بیوی کی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ عطاء اللہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ زینب کو آواز دینے کی

کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دھند پھر چھانے لگی اور وارڈ لمبا۔ بہت لمبا ہوتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد زینب آئی۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے عطاء اللہ کو جھنجوڑنا شروع کیا۔

”میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ میں نے اس حرام زادے کو مار ڈالا ہے۔“

”کس کو؟“

اسی کو مجھ سے اتنی ہمدردی جتایا کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں بچا لے گا۔ وہ جھوٹا تھا۔ دغاباز تھا، اس کا دل توے کی کالک سے بھی زیادہ کالا تھا۔ اس نے مجھے۔ اس نے مجھے۔
“

اس کے آگے زینب کچھ نہ کہہ سکی۔ عطاء اللہ کے دماغ میں بے شمار خیالات آئے اور آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

”تمہیں تو اس نے مار ڈالا تھا؟“

زینب چیخی۔

”نہیں۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔“

عطاء اللہ چند لمحے خلا میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زینب کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹایا۔

”تم ادھر ہو جاؤ۔ وہ آ رہا ہے۔“

”کون؟“

”وہی ڈاکٹر۔ وہی فرشتہ۔“

فرشتہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں زہر بھری سرنج تھی۔ عطاء اللہ مسکرایا۔

”لے آئے“!

فرشتے نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں، لے آیا۔“

عطاء اللہ نے اپنا لرزاں بازو اس کی طرف بڑھایا۔

”تو لگا دو۔“

فرشتے نے سوئی اس کے بازو میں گھونپ دی۔ عطاء اللہ مر گیا۔ زینب اسے جھنجوڑنے لگی۔

”اٹھو۔ اٹھو کریم، رحیم کے ابا، اٹھو۔ یہ ہسپتال بہت بری جگہ ہے۔ چلو گھر چلیں۔“

تھوڑی دیر کے بعد پولیس آئی اور زینب کو اس کے خاوند کی لاش پر سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے گئی!

فوبھا بائی

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوفوبھا بائی

حیدر آباد سے شہاب آیا تو اس نے بمبئی سنٹرل اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہلا قدم رکھتے ہی حنیف سے کہا۔

”دیکھو بھائی۔ آج شام کو وہ معاملہ ضرور ہو گا ورنہ یاد رکھو میں واپس چلا جاؤں گا۔“

حنیف کو معلوم تھا کہ

”وہ معاملہ“

کیا ہے۔ چنانچہ شام کو اس نے ٹیکسی لی۔ شہاب کو ساتھ لیا۔ گرانٹ روڈ کے ناکے پر ایک دلال کو بلایا اور اس سے کہا۔

”میرے دوست حیدر آباد سے آئے ہیں۔ ان کے لیے اچھی چھوکری چاوئے۔“

دلال نے اپنے کان سے اڑسی ہوئی بیڑی نکالی اور اس کو ہونٹوں میں دبا کر کہا۔

”دکنی چلے گی؟“

حنیف نے شہاب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شہاب نے کہا نہیں بھائی۔ مجھے کوئی مسلمان چاہیے“

”مسلمان؟“

دلال نے بیڑی کو چوسا

”چلیے“

اور یہ کہہ کر وہ ٹیکسی کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اس نے کچھ کہا۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہوئی اور مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی فورجٹ اسٹریٹ کی ساتھ والی گلی میں داخل ہوئی یہ گلی ایک پہاڑی پر تھی۔ بہت اونچان تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو فرسٹ گیئر میں ڈالا۔ حنیف کو ایسا محسوس ہوا کہ راستے میں ٹیکسی رک کر واپس چلنا شروع کر دیگی۔ مگر ایسا نہ ہوا دلال نے ڈرائیور کو اونچان کے عین آخری سرے پر جہاں چوک سا بنا تھا رکنے کے لیے کہا۔ حنیف کبھی اس طرف نہیں آیا تھا۔ اونچی پہاڑی تھی جس کے دائیں طرف ایک دم ڈھلان تھی۔ جس بلڈنگ میں دلال داخل ہوا اس کی طرف دو منزلیں تھیں حالانکہ دوسری طرف کی بلڈنگ سب کی سب چار منزلہ تھیں۔ حنیف کو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈھلان کے باعث اس بلڈنگ کی تین منزلیں نیچے تھیں جہاں لفٹ جاتی تھی۔ شہاب اور حنیف دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ انھوں نے کوئی بات نہ کی۔ راستے میں دلال نے اس لڑکی کی بہت تعریف کی تھی جس کو لانے وہ اس بلڈنگ میں گیا تھا۔ اس نے کہا تھا

”بڑے اچھے خاندان کی لڑکی ہے۔ اسپیشل طور پر آپ کے لیے نکال رہا ہوں۔“

دونوں سوچ رہے تھے یہ لڑکی کیسی ہوگی جو اسپیشل طور پر نکالی جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دلال نمودار ہوا وہ اکیلا تھا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا

”گاڑی واپس کرو“

یہ کہہ کر وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک چکر لے کر مڑی۔ تین چار بلڈنگ چھوڑ کر دلال نے ڈرائیور سے کہا

”روک لو“

پھر حنیف سے مخاطب ہوا

”آ رہی ہے۔ پوچھ رہی تھی کیسے آدمی ہیں، میں نے کہا نمبر ون“

دس پندرہ منٹ کے بعد ایک دم ٹیکسی کا دروازہ کھلا۔ اور ایک عورت حنیف کے ساتھ بیٹھ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ گلی میں روشنی کم تھی۔ اس لیے شہاب اور حنیف دونوں اس کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے کہا

”چلو“

ٹیکسی تیزی سے نیچے اترنے لگی۔ حنیف کے پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں کوئی معاملہ ہو سکے چنانچہ جیسا طے پایا تھا۔ وہ ڈاکٹر خاں صاحب کے ہاں چلے گئے وہ ملٹری ہاسپٹل میں متعین تھا اور اس کو وہیں دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ شہاب نے بمبئی آتے ہی اس کو فون کر دیا تھا کہ وہ حنیف کے ساتھ رات کو اسکے پاس آئے گا اور معاملہ ساتھ ہو گا، چنانچہ ٹیکسی ملٹری ہسپتال میں پہنچی۔ دلال سو روپیہ لے کر گرانٹ روڈ پر اتر گیا۔ راستے میں بھی شہاب اور حنیف اس عورت کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ کوئی خاص باتیں بھی نہ ہوئیں۔ شہاب نے جب اس سے اپنے ٹھیٹ حیدر آبادی لہجے میں پوچھا

”آپ کا اسمِ گرمی“

تو اس عورت نے کہا۔

”فوبھابائی“

”فوبھابائی؟“

حنیف سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسا نام ہے۔ ڈاکٹر خان ان کا انتظار کر رہا تھا سب سے پہلے شہاب کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں گلے ملے اور خوب ایک دوسرے کو گالیاں دیں۔ ڈاکٹر خان نے جب ایک جوان عورت کو دروازے میں دیکھا تو ایک دم خاموش ہو گیا۔

”آیئے آیئے“

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”ڈاکٹر خان۔ آپ؟“

اُس نے شہاب کی طرف دیکھا۔ شہاب نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ عورت نے کہا

”فوبھابائی“

ڈاکٹر خان نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“

فوبھابائی مسکرائی

”مجھے بھی خُفی ہوئی۔“

شہاب اور حنیف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر خان نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے دوستوں سے کہا

”آپ دوسرے کمرے میں چلے جایئے۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔“

شہاب نے جب فوبھابائی سے کہا

”چلیے تو اس نے ڈاکٹر خان کا ہاتھ پکڑ لیا، نہیں آپ بھی تشریف لایئے“

”آپ تشریف لے چلیے میں آتا ہوں“

یہ کہہ کر ڈاکٹر خان نے اپنا ہاتھ چُھڑا لیا۔ شہاب اور حنیف فوبھابائی کو اندر لے گئے۔ تھوڑی دیر گفتگو ہوئی تو اس کو معلوم ہوا کہ اسکی زبان موٹی تھی۔ وہ شین اور سین ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بدلے اس کے منہ سے فے نکلتی تھی۔ اس کا نام اس لحاظ سے شوبھابائی تھا۔ لیکن کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد ان کو پتہ چلا کہ شوبھا اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھی جے پور اس کا وطن تھا جہاں سے وہ چار سال ہوئے بھاگ کر بمبئی چلی آئی تھی۔ اس سے زیادہ اس نے اپنے حالات نہ بتائے۔ معمولی شکل و صورت تھی۔ آنکھیں بڑی نہیں تھیں۔ ناک بھی خوش وضع تھی۔ بالائی ہونٹ کے عین درمیان ایک چھوٹے سے زخم کا نشان تھا۔ جب وہ بات کرتی تو یہ نشان تھوڑا سا پھیل جاتا۔ گلے میں اس نے جڑاؤ نکلس پہنا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔ بہت ہی باتونی عورت تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ حنیف اور شہاب صرف ہوں ہاں کرتے رہے۔ پھر اس نے ان کے بارے میں پوچھنا شروع کیا کہ وہ کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں، کیا عمر ہے، فادی فدہ ہیں یا غیر فادی فدہ۔ حنیف اتنا دبلا کیوں ہے۔ فہاب نے دو مصنوعی دانت کیوں لگوائے ہیں۔ گوفت خورہ تھا تو اس کا علاج ڈاکٹر خاں سے کیوں نہ کرایا۔ فرماتا کیوں ہے۔ فعر کیوں نہیں گاتا۔ شہاب نے اسے کچھ شعر سنائے۔ شوبھا نے بڑے زوروں کی داد دی۔ شہاب نے یہ شعر سنایا کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں تو شوبھا اچھل پڑی۔

”واہ جناب صاحب واہ۔ بہت اچھا فعر ہے۔ اٹھتی جوانیاں ہیں۔ واہ وا“!

اس کے بعد شوبھا نے بے شمار شعر سنائے، بالکل بے جوڑے بے تکے۔ جن کا سر تھا نہ پیر۔ شعر سنا کر اس نے شہاب سے کہا

”فہاب صاحب۔ مزا آیا آپ کو“

شہاب نے جواب دیا۔

”بہت“

شوبھا نے سرما کر کہا

”یہ فعر میرے تھے۔ مجھے فاعری کا بہت فوق ہے“

شہاب اور حنیف دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔ اس کے بعد صرف ایک صحیح شعر شوبھا نے سنایا کبھی تو مرے درد دل کی خبر لے مرے درد سے آفنا ہونے الے یہ شعر حنیف کئی بار سن چکا تھا اور شاید پڑھ بھی چکا تھا۔ مگر شوبھا نے کہا۔

”حنیف صاحب یہ فعر بھی میرا ہے۔“

حنیف نے خوب داد دی۔

”مافا اللہ آپ تو کمال کرتی ہیں“

شوبھا چونکی۔

”معاف کیجیے گا، میری زبان میں تو کچھ خرابی ہے لیکن آپ نے کیوں مافا اللہ کے بدلے مافا اللہ کہا“

حنیف اور شہاب دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔ شوبھا بھی ہنسنے لگی۔ اتنے میں ڈاکٹر خان آ گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی شوبھا سے کہا

”کیوں جناب اتنی ہنسی کس بات پر آ رہی ہے۔“

زیادہ ہنسنے کے باعث شوبھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے رومال سے ان کو پونچھا اور ڈاکٹر خان سے کہا

”ایک بات ایسی ہوئی کہ ہم سب ہنف پڑے“

ڈاکٹر خان نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ شوبھا نے اس سے کہا

”آیئے بیٹھئے“

چارپائی کے ایک طرف سرک کر اس نے ڈاکٹر خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر شعر و شاعری ہو گئی۔ شوبھا نے لمبی لمبی چار بے تکی غزلیں سنائیں۔ سب نے داد دی، شہاب اکتا گیا۔ وہ معاملہ چاہتا تھا۔ حنیف اسکے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر بھانپ گیا۔ چنانچہ اس نے شہاب سے کہا

”اچھا بھئی میں رخصت چاہتا ہوں انشاءاللہ کل صبح ملاقات ہو گی۔“

وہ یہ کہہ کر کرسی پر سے اٹھا مگر شوبھا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا

”نہیں، آپ نہیں جا سکتے۔“

حنیف نے جواب دیا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں۔ بیوی میرا انتظار کر رہی ہو گی“

”اوہ! لیکن نہیں۔ آپ تھوڑی دیر اور ضرور بیٹھیں۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں“

شوبھا نے اصرار کیا۔ شہاب نے ایک جمائی لی

”بہت وقت ہو گیا ہے“

شوبھا نے مسکرا کر شہاب کی طرف دیکھا

”میں فاری رات آپ کے پاف ہوں“

شہاب کا تکدر دور ہو گیا۔ حنیف تھوڑی دیر بیٹھا، پھر رخصت لی اور چلا گیا۔ دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب شہاب آیا اور رات کی بات سنانے لگا، عجیب و غریب تھی تھی یہ فوبھا بائی۔ پیٹ پر بالشت بھر آپریشن کا نشان تھا۔ کہتی تھی کہ وہ ایک لکڑی والے سیٹھ کی داشتہ تھی اس نے ایک فلم کمپنی کھول دی تھی اسکے چیکوں پر دستخط شوبھا ہی کے ہوتے تھے۔ موٹر تھی جو اب تک موجود ہے۔ نوکر چاکر ہے۔ لکڑی والا سیٹھ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کے پیٹ کا آپریشن ہوا تو اس نے ایک ہزار روپیہ یتیم خانے کو دیا۔“

حنیف نے پوچھا۔

”یہ لکڑی والا سیٹھ اب کہاں ہے۔“

شہاب نے جواب دیا

”دوسری دنیا میں ٹال کھولے بیٹھا ہے۔ عورت خوب تھی یہ فوبھا بائی۔ میں دوسرے کمرے میں سو گیا۔ تو وہ ڈاکٹر خان کے ساتھ لیٹ گئی۔ صبح پانچ بجے خان نے اس سے کہا کہ اب جاؤ۔ شوبھا نے کہا

”اچھا میں جاتی ہوں، لیکن یہ میرے زیور تم اپنے پاس رکھ لو۔ میں اکیلی ان کے ساتھ باہر نہیں نکلتی۔“

حنیف نے پوچھا

”ڈاکٹر نے زیور رکھ لیے؟“

شہاب نے سر ہلایا

”ہاں۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ نقلی ہیں۔ مگر دن کی روشنی میں جب اس نے دیکھا تو اصلی تھے۔“

”اور وہ چلی گئی۔“

”ہاں چلی گئی۔ یہ کہہ کر وہ کسی روز آ کر اپنے زیور واپس لے جائے گی۔“

”یہ تم نے بڑے اچنبھے کی بات سنائی۔“

”خدا کی قسم حقیقت ہے“

شہاب نے سگریٹ سلگایا

”اسی لیے تو میں نے کہا یہ فوبھابائی عجیب وغریب عورت ہے۔“

حنیف نے پوچھا

”ویسے کیسی عورت تھی؟“

شہاب جھینپ سا گیا۔

”بھئی مجھے ایسے معاملوں کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ تم خان سے پوچھنا۔ وہ اکسپرٹ ہے۔“

شام کو دونوں خان سے ملے۔ زیور اس کے پاس محفوظ تھے۔ شوبھا لینے نہیں آئی تھی۔ خان نے بتایا

”میرا خیال ہے شوبھا، کسی دماغی صدمے کا شکار ہے“

شہاب نے پوچھا

”تمہارا مطلب ہے پاگل ہے؟“

خان نے کہا

”نہیں۔ پاگل نہیں ہے لیکن اس کا دماغ یقیناً نورمل نہیں ہے۔ بے حد مخلص عورت ہے۔ ایک لڑکا ہے اس کا جے پور میں اس کو برابر دو سو روپے ماہوار بھیجتی ہے۔ ہر تیسرے مہینے اس سے ملنے جاتی ہے۔ جے پور پہنچتے ہی برقع اوڑھ لیتی ہے وہاں اسے پردہ کرنا پڑتا ہے۔“

حنیف نے کہا۔

”یہ تم نے کیسے سمجھا کہ اس کا دماغ نورمل نہیں۔“

خان نے جواب دیا۔

”بھئی میرا خیال ہے۔ نورمل عورت ہوتی تو اپنے ڈیڑھ دو ہزار کے زیور ایک اجنبی کے پاس کیوں چھوڑ جاتی۔ اسکے علاوہ اس کو مورفیا کے انجکشن لینے کی عادت ہے“

شہاب نے پوچھا

”نشہ ہوتا ہے ایک قسم کا؟“

خان نے جواب۔

”بہت ہی خطرناک قسم کا۔ شراب سے بھی بدتر“!

”اسکی عادت کیسے پڑی اسے“

شہاب نے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا کر دوات پر رکھ دیا۔

”آپریشن ہوا تو بگڑ گیا۔ درد شدت کا تھا۔ اس کا احساس کم کرنے کے لیے ڈاکٹر مورفیا کے انجکشن دیتے رہے۔ تقریباً دو مہینے تک۔ بس عادت ہو گئی۔“

ڈاکٹر خان نے مورفیا اور اس کے خطرناک اثرات پر ایک لیکچر شروع کر دیا۔ ایک ہفتہ ہو گیا۔ شوبھا نہ آئی۔ شہاب واپس حیدر آباد چلا گیا۔ ڈاکٹر خان زیور لے کر حنیف کے پاس آیا کہ چلو دے آئیں۔ دونوں نے گرانٹ روڈ کے ناکے پر اُس دلال کو بہت تلاش کیا جو شہاب اور حنیف کو شوبھا کے مکان کے پاس لے گیا تھا مگر وہ نہ ملا۔ حنیف کو اتنا معلوم تھا کہ گلی کون سی ہے اور بلڈنگ کون سی ہے۔ ڈاکٹر خان نے کہا

”ٹھیک ہے۔ ہم پتا لگا لیں گے۔ یہ زیور میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ چوری ہو گئے تو کیا کروں گا۔ وہ تو عجیب بے پروا عورت ہے“

دونوں ٹیکسی میں وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر خان کو حنیف نے بلڈنگ بتا دی اور کہا

”میں نہیں جاؤں گی بھائی، تم تلاش کرو اسے“

ڈاکٹر خان اکیلا اس بلڈنگ میں داخل ہوا تو ایک دو آدمیوں سے پوچھا مگر شوبھا کا کچھ پتہ نہ چلا نیچے سے لفٹ اوپر کو آئی تو ہوٹل کا چھوکرا پیالیاں اٹھائے باہر نکلا خان نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ

”سب سے نچلی منزل کے آخری فلیٹ پر چلے جاؤ۔“

لفٹ کے ذریعہ سے خان نیچے پہنچا آخری فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑھیا عورت نے دروازہ کھولا۔ خان نے اس سے پوچھا

”شوبھا بائی ہیں؟“

بڑھا نے جواب دیا۔

”ہاں ہیں۔“

خان نے کہا

”جاؤ اس سے کہو ڈاکٹر خان آئے ہیں۔“

اندر سے شوبھا کی آواز آئی۔

”آیئے ڈاکٹر صاحب آیئے“

ڈاکٹر خان اندر داخل ہوا۔ چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ چمکیلے فرنیچر سے بھرا ہوا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ بڑھیا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فوراً ہی شوبھا کی آواز آئی

”ڈاکٹر صاحب اندر آجایئے۔ میں باہر نہیں آسکتی۔“

ڈاکٹر خان دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ شوبھا چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ ان نے اس سے پوچھا

”کیا بات ہے“

شوبھا مسکرائی

”کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب، تیل مالش کرا رہی تھی“

ڈاکٹر پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکالا جس میں زیور بندھے تھے کھول کر اسے پلنگ پر رکھ دیا

”کب تک میں تمہارے ان زیوروں کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ تم ایسی گئیں کہ پھر اُدھر کا رخ تک نہ کیا“

شوبھا ہنسی،

”مجھے بہت کام تھا۔ لیکن آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود آکے لے جاتی“

پھر اس نے بڑھیا سے کہا

”چائے منگاؤ، ڈاکٹر کے لیے“

ڈاکٹر نے کہا

”نہیں مجھے اب جانا ہے۔“

”کہاں؟“

”ہسپتال“

”ٹیکسی میں آئے ہیں آپ؟“

”ہاں“

”باہر کھڑی ہے“

ڈاکٹر نے سر کے اشارے سے ہاں کی۔

”تو آپ چلیے میں آتی ہوں

”یہ کہہ کر اس نے زیور تکیے کے نیچے رکھ دیے اور رومال ڈاکٹر خان کو دیدیا۔ ڈاکٹر خان حنیف کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا

”مل گئی؟“

ڈاکٹر مسکرایا

”مل گئی۔ آرہی ہے“!

پندرہ بیس منٹ کے بعد شوبھا نے تیزی سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر خان کے کمرے میں دیر تک فضول قسم کی شعر بازی ہوتی رہی۔ ہجر و وصال اور عشق و محبت کے بے شمار عامیانہ اشعار شوبھا نے سنائے اور انھیں اپنے نام سے منسوب کیا۔ ڈاکٹر خان اور حنیف نے خوب داد دی۔ شوبھا بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی

”یعقوب فیتھ گھنٹوں مجھ سے فعر فنا کرتے تھے۔ “

یعقوب فیتھ وہ لکڑی والا سیٹھ تھا جس نے شوبھا کے لیے ایک فلم کمپنی کھولی تھی۔ ڈاکٹر خان اور حنیف ہنس پڑے۔ شوبھا بھی ہنسنے لگی۔ ڈاکٹر خان اور شوبھا کی دوستی ہوگئی۔ شروع شروع میں تو وہ ہفتے میں دو بار آتی تھی۔ اب قریب قریب ہر روز آنے لگی۔ رات آتی۔ صبح سویرے چلی جاتی۔ شام کو بلاناغہ مورفیا کا انجکشن لیتی۔ ڈاکٹر انجکشن لگانے سے پہلے اس کے بازو پر بے حس کرنے والی دوا لگا دیتا تھا یہ ٹھنڈی ٹھنڈی چیز اسے بہت پسند تھی۔ تین مہینے گزرے تو شوبھا جے پور جانے کے لیے تیار ہوئی۔ موٹر اپنی ڈاکٹر خان کے حوالے کر دی کہ وہ اس کا دھیان رکھے۔ ڈاکٹر اسے اسٹیشن پر چھوڑنے گیا۔ دیر تک گاڑی میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ جب گاڑی چلنے لگی تو شوبھا نے ایک دم ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کہا

”مجھے کیوں ایک دم ایفا لگا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ “

ڈاکٹر خان نے کہا۔

”کیا ہونے والا ہے۔ “

شوبھا کے چہرے سے وحشت برسنے لگی

”معلوم نہیں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ “

ڈاکٹر خان نے اُسے دم دلاسا دیا گاڑی چل دی۔ دور تک شوبھا کا ہاتھ ہلتا رہا۔ جے پور سے شوبھا کے دو خط آئے جن سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ جب واپس آئے گی تو اس کے لیے بہت سے تحفے لائے گی۔ اس کے بعد ایک کارڈ آیا جس میں یہ لکھا تھا

”میری اندھیری زندگی میں صرف ایک دیا تھا وہ کل خدا نے بجھا دیا۔ بھلا ہو اس کا؟ “

حنیف نے یہ الفاظ پڑھے تو اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھلا ہو اس کا

”میں بے پناہ غم تھا۔ “

بہت عرصہ گزر گیا شوبھا کا کوئی خط نہ آیا۔ پورا ایک برس بیت گیا۔ ڈاکٹر خان کو اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ شوبھا اپنی موٹر اس کے حوالے کر گئی تھی۔ اس بلڈنگ میں گیا جس کی سب سے نچلی منزل میں وہ رہا کرتی تھی۔ فلیٹ پر کوئی اور ہی قابض تھا ایک دلال قسم کا آدمی۔ ڈاکٹر خان آخر تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔ موٹر اس نے ایک گراج میں رکھوا دی۔ ایک دن حنیف گھبرایا ہوا ہسپتال آیا اس کا چہرہ زرد تھا۔ ڈاکٹر خان کو ڈیوٹی سے ہٹا کر وہ ایک طرف لے گیا اور اس سے کہا

”میں نے آج شوبھا کو دیکھا۔ “

ڈاکٹر خان نے حنیف کا بازو پکڑ کر ایک دم پوچھا

”کہاں؟ “

”چوپاٹی پر۔ میں اسے بالکل نہ پہنچانتا کیونکہ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ “

ڈاکٹر خان کھوکھلی آواز میں بولا۔

”ہڈیوں کا ڈھانچہ “

حنیف نے سرد آہ بھری

”شوبھا نہیں تھی اس کا سایہ تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ بال پریشان اور گرد آلود۔ یوں چلتی تھی کہ اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہے۔ میرے پاس آئی اور کہا

”مجھے پانچ روپے دو۔ میں نے اسکو نہ پہچانا۔ پوچھا کیا کرو گی پانچ روپے لے کر۔ بولی مورفیا کا ٹیکہ لوں گی۔ ایک دم میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر زخم کا نشان موجود تھا۔ میں چلایا۔

”شوبھا۔ اس نے تھکی ہوئی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پوچھا، کون ہو تم۔ میں نے کہا حنیف۔ اس نے جواب دیا۔ میں کسی حنیف کو نہیں جانتی۔ میں نے تمہارا ذکر کیا کہ تم نے اسے بہت تلاش کیا، بہت ڈھونڈا۔ یہ سن کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور کہنے لگی، اس سے کہنا مت ڈھونڈے مجھے۔ میری طرف دیکھو۔ میں اتنی مدت سے اپنا کھویا ہوا لال ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ یہ ڈھونڈنا بالکل بیکار ہے۔ کچھ نہیں ملتا۔ لاؤ پانچ روپے دو مجھے۔ میں نے اسے پانچ روپے دیے اور کہا، اپنی موٹر تو لے جاؤ ڈاکٹر خان سے

”وہ قہقہے لگاتی ہوئی چلی گئی۔ “

خان نے پوچھا

”کہاں؟ “

حنیف نے جواب دیا

”معلوم نہیں۔ کسی ڈاکٹر کے پاس گئی ہو گی۔“

ڈاکٹر خان نے بہت تلاش کیا مگر شوبھا کا کچھ پتہ نہ چلا۔ 12 جون 1950ء

قادرا قصائی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوقادرا قصائی

عیدن بائی آگرے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی‘ یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں زہرہ جان نے اس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی‘ بڑی دُور دُور سے رئیس اس کا مجرا سننے کے لیے آتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا‘ اسے محبت ہوگئی‘ اُس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی کوئی تین سو کے قریب۔ ہفتے میں تین مرتبہ اُس کے پاس آتا، رات ٹھہرتا۔ صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔ جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور آگرے کے رہنے والے ہیں اُن کا یہ بیان ہے کہ اُس کا چاہنے والا ایک بڑھئی تھا مگر وہ اُسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ وہ بیچارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا مگر وہ اُسے دُھتکار دیتی۔ آخر ایک روز اُس بڑھئی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقعہ مل ہی گیا‘ پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رعب طاری تھا لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہا:

”زہرہ جان۔ میں غریب آدمی ہوں‘ مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر ادا پر سینکڑوں روپے نچھاور کرتے ہیں۔ لیکن تمھیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں“

زہرہ جان ہنسی‘ اس ہنسی سے بڑھئی کا دل مجروح ہو گیا

”تم ہنستی ہو۔ میری محبت کا مذاق اُڑاتی ہو‘ اس لیے کہ یہ کنگلے کی محبت ہے جو لکڑیاں چیر کر اپنی روزی کماتا ہے۔ یاد رکھو یہ تمہارے لاکھوں میں کھیلنے والے تمھیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے لیے موجود ہے“

زہرہ جان اُکتا گئی‘ اُس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اس سے کہا کہ بڑھئی کو باہر نکال دو‘ لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔ ایک برس کے بعد عیدن پیدا ہوئی۔ اس کا باپ عبداللہ تھا یا کوئی اور‘ اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا‘ بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نطفے سے ہے۔ کسی کے نطفے سے بھی ہو مگر بلا کی خوبصورت تھی۔ اِدھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی‘ اُدھر عیدن جوان ہوتی گئی‘ اُس کی ماں نے اُس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی‘ لڑکی ذہین تھی‘ کئی اُستادوں سے اُس نے سبق لیے اور اُن سے داد وصول کی۔ زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہو گئی‘ وہ اب اُس منزل سے گزر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے‘ وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدن کے سہارے جی رہی تھی‘ ابھی تک اُس نے اُس سے مجرا نہیں کرایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔ عیدن بائی کے حسن کے چرچے عام تھے۔ دُور دُور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے‘ وہ اپنے ایجنٹوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدن کی نتھنی اُتارنے کے لیے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے‘ مگر اُس کو اتنی جلدی نہیں تھی‘ وہ چاہتی تھی کہ مسّی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے۔ اس کی لڑکی لاکھوں میں ایک تھی‘ سارے شہر میں اُس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔ اُس کے حسن کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جمعرات کی شام کو اُس کے ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی‘ عشق پیشہ مرد اس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے۔ پھنسی پھنسی چولی میں گدرایا ہوا جوبن‘ سڈول بانہیں‘ مخروطی انگلیاں جن کے ناخنوں پر جیتا جیتا لہو‘ ایسا رنگ‘ ٹھمکا سا قد‘ گھنگریالے بال۔ قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی۔ آخر ایک روز زہرہ جان کی اُمید بَر آئی۔ ایک نواب عیدن پر ایسا لٹو ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مسّی کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا‘ کئی دیگیں پلاؤ اور متنجن کی چڑھائی گئیں۔ شام کو نواب صاحب اپنی بگھی میں آئے‘ زہرہ جان نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے‘ عیدن دولہن بنی ہوئی تھی‘ نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اُس کا مجرا شروع ہوا۔ پھٹ پڑنے والا شباب تھا جو محوِ نغمہ سرائی تھا۔ عیدن اُس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی‘ اُس کی ہر جنبش‘ ہر ادا‘ اس کے گانے کی ہر سُر زہد شکن تھی۔ نواب صاحب گاؤ تکیے کا سہارا لیے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا‘ وہ بہت گھبرائی‘ یہ وہی بڑھئی تھا۔ اُس کا عاشقِ راز‘ بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو جو بہت نفاست پسند تھے‘ ابکائیاں آنے لگیں۔ انھوں نے زہرہ جان سے کہا:

”یہ کون بد تمیز ہے؟“

بڑھئی مسکرایا‘

”حضور! میں ان کا عاشق ہوں“

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ مکدّر ہو گئی‘ زہرہ جان‘ نکالو اس حیوان کو باہر“

بڑھئی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اُس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی‘ نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے‘ عیدن بیہوش ہو گئی۔ بڑھئی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور لہو بھری آری اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبالِ جرم کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُسے عمر قید ہو گئی تھی۔ عیدن کو اپنی ماں کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ دو اڑھائی مہینے تک بیمار رہی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی مگر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اس کی تیمار داری صرف اُس کے استاد اور میراثی ہی کرتے تھے۔ وہ نواب اور رئیس جو اس پر اپنی جان چھڑکتے تھے‘ بُھولے سے بھی اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی۔ وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی چلی آئی۔ مگر اس کی طبیعت اتنی اُداس تھی کہ اس کا جی قطعاً مجرا کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے پاس بیس پچیس ہزار روپے کے زیورات تھے جن میں آدھے اس کی مقتول ماں کے تھے وہ انھیں بیچتی رہی اور گزارہ کرتی رہی۔ عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں‘ اس کو بڑا دُکھ ہوتا تھا جب وہ کوئی چُوڑی یا نکلس اونے پونے داموں بیچتی تھی۔ عجب عالم تھا‘ خون پانی سے بھی ارزاں ہو رہا تھا۔ مسلمان دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی جانیں محفوظ رہیں۔ عیدن نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ دہلی میں نہیں رہے گی۔ لاہور چلی آئے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کئی زیورات بیچ کر وہ لاہور پہنچ گئی لیکن راستے میں اس کی تمام بیش قیمت پشوازیں اور باقی ماندہ زیور اس کے اپنے بھائی مسلمانوں ہی نے غائب کر دیے۔ جب وہ لاہور پہنچی تو وہ لُٹی پٹی تھی۔ لیکن اس کا حسن ویسے کا ویسا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں للچائی ہوئی آنکھوں نے اُس کی طرف دیکھا مگر اس نے بے اعتنائی برتی۔ وہ جب لاہور پہنچی تو اس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہو گی؟ اُس کے پاس تو چنے کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے لیکن لڑکی ذہین تھی‘ سیدھی اُس جگہ پہنچی جہاں ان کی ہم پیشہ رہتی تھیں‘ یہاں اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ان دنوں لاہور میں روپیہ عام تھا‘ ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے‘ مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ ہیرا منڈی کے وارے نیارے تھے۔ عیدن کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اُس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اُس کی آواز جواب دے چکی ہوتی وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی اور اوندھے منہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔ یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا۔ عیدن اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا کرایے پر لے کر وہاں اُٹھ آئی‘ چونکہ جہاں وہ مقیم تھی‘ اس نائکہ کو اسے اپنی آدھی آمدن دینا پڑتی تھی۔ جب اُس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر مجرا کرنا شروع کیا تو اُس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی‘ اس نے کئی زیور بنا لیے‘ کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کرا لیے۔ اُسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا‘ اُس نے کم از کم دو کروڑ روپے کمائے تھے‘ خوبصورت تھا‘ اُس کے پاس تین کاریں تھیں‘ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدن کے حسن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے اپنی کھڑی سفید پیکارڈ اُس کے حوالے کر دی۔ اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم دو ڈھائی سو روپے اُس کی نذر ضرور کرتا۔ ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر میلی تھی‘ اُس نے عیدن سے پوچھا

”کیا بات ہے آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے“

عیدن نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا

”آج کل لٹھا کہاں ملتا ہے؟“

دوسرے دن اُس بلیک مارکیٹ بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیے‘ اُس کے تیسرے روز بعد اُس نے ڈھائی ہزار روپے دیے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔ عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا‘ جب وہ آگرے اور دلّی میں تھی تو اُسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا مگر لاہور میں اُسے قادرا قصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا۔ بغیر ریشے کے‘ ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔

”دُکان پر اپنا شاگرد بٹھا کر قادرا صبح سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہوتی‘ عیدن کے حوالے کر دیتا‘ اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔ بلیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام ظفر شاہ تھا‘ عیدن کے عشق میں بہت بُری طرح گرفتار ہو چکا تھا‘ اُس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائیداد‘ منقولہ اور غیر منقولہ اُس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے‘ اگر وہ اس سے شادی کر لے۔ مگر عیدن نہ مانی‘ ظفر شاہ بہت مایوس ہوا۔ اُس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اُس کی ہو جائے مگر ہر بار اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی‘ معلوم نہیں کہاں۔ ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے۔ یعنی شراب پی کر پیدل ہی چلا آ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سائیں۔ کے تکیے کے باہر عیدن ایک نہایت بدنما آدمی کے پاؤں پکڑے التجائیں کر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظر کرم کرو‘ میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں۔ تم اتنے ظالم کیوں ہو۔ اور وہ شخص جسے غور سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادرا قصائی ہے‘ اُسے دُھتکار رہا ہے۔

”جا۔ ہم نے آج تک کسی کنجری کو منہ نہیں لگایا۔ مجھے تنگ نہ کیا کر“

قادر اُسے ٹھوکریں مارتا رہا اور عیدن اُسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔ ۲۴، مئی ۵۴ء

قاسم

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوقاسم

باورچی خانہ کی مٹ میلی فضا میں بجلی کا اندھا سا بلب کمزور روشنی پھیلا رہا تھا۔ سٹوو پر پانی سے بھری ہوئی کیتلی دھری تھی۔ پانی کا کھولاؤ اور سٹوو کے حلق سے نکلتے ہوئے شعلے مل جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔ انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں راکھ میں سو گئی تھیں۔ دور کونے میں قاسم گیارہ برس کا لڑکا برتن مانجھنے میں مصروف تھا۔ یہ ریلوے انسپکٹر صاحب کا بوائے تھا۔ برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

”جی آیا صاحب! جی آیا صاحب!۔ بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔“

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انھیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا۔ اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام۔ یہ کیونکر ممکن تھا۔ سٹوو بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اُگل رہا تھا۔ کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھِل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابل مغلوب حملے کو محسوس کر کے اپنے جسم کو ایک جنبش دی۔ اور

”جی آیا صاحب“

گنگناتا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔ دیوار گیریوں پر چُنے ہوئے برتن سوئے ہوئے تھے۔ پانی کے نل سے پانی کی بوندیں نیچے میلی سل پر ٹپک رہی تھیں اور اداس آواز پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا پر غنودگی سی طاری ہے۔ دفعتہً آواز بلند ہوئی۔

”قاسم!۔ قاسم“!

”جی آیا صاحب“!

لڑکا ان ہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا بھاگا بھاگا اپنے آقا کے پاس گیا۔ انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا۔

”بیوقوف کے بچے آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔“

”ابھی لایا صاحب۔ ابھی لایا صاحب۔“

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لیے گیا ہی تھا کہ پھر اُسی کمرے سے آواز آئی۔

”قاسم۔ قاسم“!

”جی آیا صاحب“!

قاسم بھاگتا ہوا پھر اپنے آقا کے پاس گیا۔

”بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے۔ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لیکر آؤ۔ بس بھاگے جاؤ۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔“

”بہت اچھا صاحب۔“

قاسم بھاگا بھاگا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے، جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا، سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

”اب تم جاؤ۔ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو؟ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟“

”ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب“!

”برتن صاف کرنے کے بعد میرے دونوں کالے شو پالش کر دینا۔ مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے۔ ورنہ۔“

قاسم کو

”ورنہ“

کے بعد جملہ بخوبی معلوم تھا۔

”بہت اچھا صاحب“

کہہ کر وہ باورچی خانہ میں چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیئے۔ اب نیند اس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں، سر میں پگھلا ہوا سیسہ اتر رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

”جی آیا صاحب۔ جی آیا صاحب! بوٹ صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔“

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ نیند ضرور غلبہ پا کے رہے گی۔ پر ابھی برتنوں کو دھو کر انھیں اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا۔ جب اس نے یہ سوچا تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں آیا۔

”بھاڑ میں جائیں برتن اور چولھے میں جائیں شو۔ کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ سو جاؤں اور پھر چند لمحہ آرام کرنے کے بعد۔“

اس خیال کو باغیانہ تصور کر کے قاسم نے ترک کر دیا۔ اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آئی کہ ابلتا ہوا پانی اپنے سر پر انڈیل لے۔ اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کام میں حارج ہو رہی تھی نجات پا جائے۔ مگر پانی اتنا گرم تھا کہ اس کے بھیجے تک کو پگھلا دیتا۔ چنانچہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے باقی ماندہ برتن صاف کیے۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ آرام سے سو سکتا تھا اور نیند۔ وہ نیند، جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے اب بالکل نزدیک تھی۔ باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھا لیا اور لیٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ نیند اسے اپنے نرم نرم بازوؤں میں تھام لے اس کے کان

”شوشو“

کی آواز سے گونج اٹھے۔

”بہت اچھا صاحب۔ ابھی پالش کرتا ہوں۔“

قاسم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ابھی قاسم شُو کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبہ نے اسے وہیں سلا دیا۔ سورج کی لال لال کرنیں مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں۔ مگر قاسم سویا رہا۔ جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں اپنے کالے جوتوں کے پاس سویا دیکھا تو اسے ٹھوکر مار کے جگاتے ہوئے کہا۔

”یہ سور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے شو صاف کر لیے ہوں گے۔

”نمک حرام!۔ ابے قاسم۔“

”جی آیا صاحب“!

قاسم فوراً اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ میں جب اس نے پالش کرنے کا برش دیکھا اور رات کے اندھیرے کی بجائے دن کی روشنی دیکھی تو اس کی جان خطا ہو گئی۔

”میں سو گیا تھا صاحب! مگر۔ مگر شُو ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب۔“

یہ کہہ کر اس نے جلدی جلدی پالش کرنا شروع کر دیا۔ پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر بند کیا اور اسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

”قاسم“!

”جی آیا صاحب“!

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا۔ اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

”دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے اس لیے باورچی خانہ کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا۔ فرش دُھلا ہوا ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ تمھیں ڈرائنگ روم کی تصویریں، میزیں اور کرسیاں بھی صاف کرنا ہوں گی۔ سمجھے! خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار والا چاقو پڑا ہے، اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہا ہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے پہلے ہو جائے۔“

”بہت بہتر صاحب۔“

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانہ کا سارا کام ختم کر دیا۔ اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے وہ راکھ اڑ اڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکایک اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں سرخ برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گُھس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہو گئی۔ قاسم دہشت زدہ ہو گیا۔ اور اس وحشت ناک تصور کو دماغ سے جھٹک کر

”جی آیا صاحب، جی آیا صاحب“

کہتا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے تصور میں ایک اور منتظر رقص کرنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتہً آندھی چلنے لگی جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا۔ یہ دیو ان سب لڑکوں کو نگل گیا۔ قاسم نے خیال کہ وہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا۔ گو کہ قد و قامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا۔ قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔ ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کیا۔ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد وہ میز صاف کرنے کے لیے بڑھا تو اسے خیال آیا۔

”آج مہمان آرہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنا پڑیں گے۔ نیند کمبخت پھر ستائے گی۔ مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔“

وہ یہ سوچ رہا تھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا۔ اچانک اسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔ وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا بہت تیز ہے، چاقو کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے۔

”چاقو تیز دھار چاقو! یہی تمہاری مصیبت ختم کر سکتا ہے۔“

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ اب وہ شام کو برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا اور نیند۔ پیاری پیاری نیند اسے بآسانی نصیب ہو سکتی تھی۔ انگلی سے خون کی سرخ دھار بہہ رہی تھی۔ سامنے والی دوات کی سرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور منہ میں گنگنا رہا تھا۔

”نیند، نیند۔ پیاری نیند۔“

تھوڑی دیر بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنانخانہ میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ اور اپنی انگلی دکھا کر کہنے لگا۔

”دیکھیے بی بی جی“

”ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا؟۔ کم بخت، صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہو گا تو نے“!

قاسم مسکرا دیا۔

”بی بی جی۔ بس میز صاف کر رہا تھا کہ اس نے کاٹ کھایا۔“

”سؤر اب ہنستا ہے، ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں۔ پر اب یہ تو بتا کہ آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟“

قاسم اپنی فتح پر جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔ انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں چلا آیا۔ میز پر سے خون کے دھبے صاف کرنے کے بعد اس نے خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔ سامنے طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر قاسم نے مسرت بھرے لہجہ میں کہا۔

”اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے۔ اور ضرور صاف کرنے ہونگے۔ کیوں میاں مٹھو؟“

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانہ میں جھوٹے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا۔ انسپکٹر صاحب قاسم کی انگلی دیکھ کر بہت برسے اور جی کھول کر اسے گالیاں دیں۔ مگر اسے مجبور نہ کر سکے۔ شاید اس وجہ سے کہ ایک بار ان کی اپنی انگلی میں قلم تراش چبھ جانے سے بہت درد ہوا تھا۔ آقا کی خفگی آنے والی مسرت نے بھلا دی اور قاسم کودتا پھاندتا اپنے بستر پر جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنیکی زحمت سے بچا رہا۔ مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا۔ اب وہی مصیبت پھر نمودار ہو گئی۔

”قاسم۔ صاحب کی جُرابیں اور قمیض دھو ڈالو۔“

”بہت اچھا بی بی جی۔“

”قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے۔ پانی لا کر ابھی صاف کرو۔ دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے“!

”بہت اچھا صاحب۔“

”قاسم، شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں، انھیں نمک سے ابھی ابھی صاف کرو۔“

”ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔“

”قاسم، ابھی بھنگن آرہی ہے۔ تم پانی ڈالتے جانا۔ وہ سیڑھیاں دھو ڈالے گی۔“

”بہت اچھا صاحب۔“

”قاسم ذرا بھاگ کے ایک آنہ کا دہی تو لے آنا“!

”ابھی چلا بی بی جی۔“

پانچ روز اس قسم کے احکام سننے میں گزر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آگیا۔ ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا۔ پھر بھی علی الصباح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔ ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کا ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھا۔ اور ایک لمحہ کے بعد اس کی انگلی سے خون بہنے لگا۔ انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی اس حرکت پر سخت خفا ہوئے۔ چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا۔ مگر قاسم خوش تھا۔ ایک وقت روٹی نہ ملی۔ انگلی پر معمولی سا زخم آگیا۔ مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے تو نجات مل گئی۔ یہ سودا کیا بُرا ہے؟ چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہی بھر مار تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گزر گئے۔ اس عرصہ میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر انگلی زخمی کرلے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا تھا اور باورچی خانہ والی چھری کُند تھی۔ ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب قاسم کو ہر وقت باورچی خانہ میں رہنا پڑا۔ کبھی مرچیں پیستا، کبھی آٹا گوندھتا، کبھی کوئلے سلگاتا، غرض صبح سے لیکر شام تک اس کے کانوں میں

”ابے قاسم یہ کر! ابے قاسم وہ کر“!

کی صدا گونجتی رہتی۔ باورچی دو روز تک نہ آیا۔ قاسم کی ننھی سی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ ایک روز انسپکٹر صاحب نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا۔ جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اسے داڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز انگلی میں دور تک چلی گئی۔ جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔ قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا۔ سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا۔ بھاگا ہوا انسپکٹر صاحب کی بیوی کے پاس گیا۔

”بی بی جی، میری انگلی میں صاحب کا استر الگ گیا ہے۔“

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا تو فوراً معاملے کو سمجھ گئی۔ چپ چاپ اٹھی اور کپڑا نکال کر اس کی انگلی پر باندھ دیا اور کہا۔

”قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔“

”کیوں بی بی جی۔“

یہ صاحب سے پوچھنا۔ صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور پیلا پڑ گیا۔ چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے لوٹے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

”کیوں میاں یہ انگلی ہر روز زخمی کرنے کیا معنی؟“

قاسم خاموش کھڑا رہا۔

”تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اپنا بوریہ بستر دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے“!

”مگر۔ مگر صاحب۔“

”صاحب کا بچہ۔ بھاگ جا یہاں سے، تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا۔ اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔“

قاسم کو افسوس نہ ہوا بلکہ اسے خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے کچھ دیر کے لیے چھٹی مل گئی۔ گھر سے نکل وہ اپنی زخمی انگلی سے بے پروا سیدھا چوپاٹی پہنچا اور وہاں ساحل کے پاس ایک بنچ پر لیٹ گیا اور خوب سویا۔ چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم بد احتیاطی کے باعث سیپٹک ہو گیا۔ سارا ہاتھ سوج گیا۔ جس دوست کے پاس وہ ٹھہرا تھا اس نے اپنی دانست کے مطابق اس کا بہتر علاج کیا مگر تکلیف بڑھتی گئی۔ آخر قاسم خیراتی ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ جہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اب جب کبھی قاسم اپنا کٹا ہوا ٹنڈ منڈ ہاتھ بڑھا کر فلورا فاؤنٹین کے پاس لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اسے وہ بلیڈ یاد آجاتا ہے جس نے اسے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گدڑی رکھ کر فٹ پاتھ پر سو سکتا ہے۔ اس کے پاس ٹین کا ایک چھوٹا سا بھبھکا ہے جس کو کبھی نہیں مانجھتا، اس لیے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ برتن یاد آجاتے ہیں جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔

قبض

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوقبض

نئے لکھے ہُوئے مکالمے کا کاغذ میرے ہاتھ میں تھا۔ ایکٹر اور ڈائریکٹر کیمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے۔ شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس لیے کہ اسٹوڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا۔ ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا۔ کیونکہ شوٹنگ کے دوران میں جب ایکا ایکی اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی۔ تو کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بیکار ہو جاتا اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔ ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کیمرے کے پاس کھڑے سگرٹ پی رہے تھے اور میں ستانے کی خاطر کرسی پر ٹانگوں سمیت بیٹھا تھا۔ وہ یوں کہ میری دونوں ٹانگیں کرسی کی نشست پر تھیں اور میرا بوجھ نشست کی بجائے ان پر تھا۔ میری اس عادت پر بہت لوگوں کو اعتراض ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔ نینا جس کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں ڈائریکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”صاحب، وہ بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے پھر شور بند ہو جائے گا۔“

یہ روزمرہ کی بات تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور ان پر ٹھپے لگتے رہیں گے۔ چنانچہ ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹوڈیو سے باہر چلے گئے۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا۔ سقفی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں پڑیں تھیں ان کا درمیانی فاصلہ اصلی فاصلے پر کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور گیروے رنگ کے تھری پلائی وڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے پست قد دکھائی دیتے تھے۔ میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی

”السلام علیکم۔“

میں نے جواب دیا

”وعلیکم السلام“

اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی۔ میری آنکھوں میں

”تم کون ہو؟“

کا سوال تیرنے لگا۔ آدمی ہوشیار تھا، فوراً کہنے لگا۔

”جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہُوا ہُوں۔ میرا نام عبدالرحمن ہے۔ خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہُوں۔ آپکا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے۔“

میں نے کہا۔

”جی نہیں۔ میں پنجاب کا باشندہ ہُوں۔“

عبدالرحمن نے جیب سے عینک نکالی۔

”معاف فرمائیے گا، چونکہ ڈائریکٹر صاحب نے عینک اتار دینے کا حکم دیا تھا اس لیے۔“

اس دوران میں اُس نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکالی اور میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

”واللہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں، یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں۔ ماشاء اللہ کیا مکالمہ لکھا ہے۔ قلم توڑ دیا ہے واللہ۔ یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے؟“

عبدالرحمن نے جب یہ باتیں کیں تو اس کا قد بھی میری نظر میں تھری پلائی وڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا۔ میں نے روکھے پن کے ساتھ کہا۔

”جی نہیں۔“

وہ اور زیادہ لچکیلا ہو گیا۔

”عجب زمانہ ہے صاحب، جو اہلیتوں کے مالک ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ عجب اوٹ پٹانگ زبان بولتے ہیں یہاں کے لوگ، پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہوئے ہو گئے ہیں مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہو گیا ہوں۔ آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔“

اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ ملکر اس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں جو چہرے پر لگاتے وقت اسکے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔ میں نے جواب میں صرف

”جی ہاں“

کر دیا اور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور رواروی میں لکھے ہُوئے مکالموں پر نظر ثانی شروع کر دی۔ چند غلطیاں تھیں جن کو درست کرنے کے لیے میں نے اپنا قلم نکالا۔ عبدالرحمن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا۔ مجھے اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا۔

”فرمائیے۔“

اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا۔

”میں ایک بات عرض کروں۔“

”بڑے شوق سے۔“

”آپ اس طرح ٹانگیں اوپر کر کے نہ بیٹھا کریں۔“

”کیوں؟“

اس نے جھک کر کہا

”بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے۔“

”قبض؟“

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

”قبض کیسے ہو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر میرے جی میں آئی کہ اس سے کہوں

”میاں ہوش کی دوا لو۔ گھاس تو نہیں کھا گئے۔ مجھے اس طرح بیٹھتے بیس برس ہو گئے۔ آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائیگا۔“

مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بات بڑھ جائیگی اور مجھے بیکار کی مغز دردی کرنا پڑے گی۔ وہ مسکرایا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ گیا۔

”آپ نے مذاق سمجھا ہے حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے۔ مانیں نہ مانیں یہ آپکو اختیار ہے۔“

میں عجب مشکل میں پھنس گیا۔ اس کو اب میں کیا جواب دیتا۔ قبض۔ یعنی قبض ہو جائیگا۔ بیس برس کے دوران میں مجھے قبض نہ ہوا لیکن آج اس مسخرے کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائیگا۔ قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر بیٹھنے سے۔ جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں اس سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے۔ دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے ساتھ لگا دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑا رہنا پڑتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے۔ دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دُور کرتے ہیں مگر میں تو اسی طریقے سے دُور کرتا ہوں۔ کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ خواہ قبض کے بجائے مجھے سرسام ہو جائے۔ یہ ضد نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا انداز میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہُوں اکثر لوگوں کو میرے اس طرح بیٹھے کے انداز پر اعتراض رہا ہے۔ اس اعتراض کی وجہ نہ میں نے ان لوگوں سے کبھی پوچھی ہے اور نہ انھوں نے کبھی خود بتائی ہے۔ اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو میں اس معاملے میں اچھی طرح دلیل سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ کوئی آدمی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔ جب عبدالرحمن نے مجھ پر نکتہ چینی کی تو میں بھنّا گیا اور اس کا یُوں شکریہ ادا کیا جیسے کوئی یہ کہے۔

”لعنت ہو تم پر۔“

اس شکریہ کی رسید کے طور پر اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر میلی سی مسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا۔ اتنے میں ڈائریکٹر ہیرو اور ہیروئن آ گئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے سے عبدالرحمن کے قبض سے نجات حاصل ہوئی۔ اس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں۔ -1 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہُوا ہے بہت بڑا چغد ہے۔ -2 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہُوا ہے سخت بد تمیز ہے۔ -3 یہ ایکسٹرا جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پرلے درجہ کا مغز چاٹ ہے۔ -4 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے بے حد نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کچھ عرصے کے لیے زیادہ متحرک ہو جائے گی۔ میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں۔ آپ پوچھیں گے بھلا نفرت میں مہارت کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ ہر کام کرنے کے لیے ایک خاص سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے اور نفرت میں چونکہ شدت زیادہ ہے اس لیے اس کے عامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے۔ محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لیکر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے اور جنہوں نے کی ہے ان میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا۔ نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے۔ محبت میں مٹھاس ہے جو اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے جو دل کا قوام دُرست رکھتی ہے۔ میں تو اس بات کا قائل ہُوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنا چاہیے کہ اس میں محبت کرنے کا مزا ملے۔ شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اس سے سو فی صدی اتفاق ہے۔ یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں۔ اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے تو وہ یقیناً اس نفرت سے جو کہ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہو گی اور سچ پوچھیے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اگر ہمیں اس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا تو دنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی

ہوتی۔ میں نے عبدالرحمن سے نفرت کرنا شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہُوا، کہ میری اور اس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہوگئی۔ اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اس سے میری ملاقات ہوتی میں اس کی خیریت دریافت کرتا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ عبدالرحمن کا قد متوسط ہے اور بدن گُٹھا ہُوا۔ جب وہ نیکر پہن کر آتا تو اس کی بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے نئے کور کے چمڑے کی طرح چمکتا ہے۔ ناک موٹی جس کی کوٹھی اُبھری ہُوئی ہے۔ چہرے کے خطوط منگولی ہیں۔ ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شیطان لڑکے نے اپنے ڈسک کی لکڑی میں چاقو سے چھوٹا سا گڑھا بنا دیا ہے۔ پیٹ سخت اور اُبھرا ہو۔ حافظ قرآن ہے۔ چنانچہ بات بات میں آیتوں کے حوالے دیتا ہے۔ کمپنی کے دوسرے ایکسٹرا اس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انھیں احترام کے باعث چپ ہو جانا پڑتا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کو جب میری زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمن صاف زبان بولتا ہے اور غلطی نہیں کرتا تو انھوں نے اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا شروع کردیا۔ ایک ہی فلم میں اسے دس مختلف آدمیوں کے بھیس میں لایا گیا۔ سفید پوشاک پہنا کر اسے ہوٹل میں بیرا بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سر پر لمبے لمبے بال لگا کر اور چمٹا ہاتھ میں دے کر ایک جگہ اس کو سادھو بنایا گیا۔ چپڑاسی کی ضرورت محسوس ہُوئی تو اس کے چہرے پر گوند سے لمبی داڑھی چپکا دی گئی۔ ریلوے پلیٹ فارم پر بڑی مونچھیں لگا کر اس کو ٹکٹ چیکر بنا دیا گیا۔ یہ سب میری بدولت ہوا، اس لیے کہ مجھے اس سے نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ عبدالرحمن خوش تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ اتنا مقبول ہوگیا اور میں خوش تھا کہ دوسرے ایکسٹرا اس سے حسد کرنے لگے ہیں، میں نے موقعہ دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی، چنانچہ تیسرے مہینے اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہوگیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کمپنی کے پچیس ایکسٹراؤں کی آنکھوں میں وہ خار بن کے کھٹکنے لگا۔ لُطف یہ ہے کہ عبدالرحمن کو اس بات کی مطلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہُوا ہے اور میری سفارشوں کے باعث کمپنی کے دوسرے ڈائریکٹر اس سے کام لینے لگے ہیں۔ فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ میں وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو بھی ایڈٹ کرتا ہُوں۔ ایک روز میں نے اپنا اخبار عبدالرحمن کے ہاتھ میں دیکھا۔ جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کردی۔

”منشی صاحب۔ یہ رسالہ آپ ہی۔“

میں نے فوراً ہی جواب دیا۔

”جی ہاں۔“

”ماشاء اللہ، کتنا خوبصورت پرچہ نکالتے ہیں آپ۔ کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ آگیا۔ بہت دلچسپ ہے، اب میں ہر ہفتے خرید اکروں گا۔“

یہ اُس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھ پر بڑا احسان کر رہا ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر دیا، چنانچہ بات ختم ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد جبکہ میں اسٹوڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹُوٹی ہُوئی کرسی پر بیٹھا اپنے اخبار کے لیے ایک کالم لکھ رہا تھا۔ عبدالرحمن آیا اور بڑے ادب کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسکی طرف دیکھا اور پوچھا

”فرمایئے۔“

”آپ فارغ ہو جائیں تو میں۔“

”میں فارغ ہُوں۔ فرمایئے آپکو کیا کہنا ہے۔“

اس کے جواب اُس نے ایک رنگین لفافہ کو کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھا دی۔ تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی۔ اس لیے میں اسے روک نہ سکا۔ بعد میں جب مجھے اس بات کا احساس ہُوا کہ عبدالرحمن کو یہ ناگوار معلوم ہُوئی ہوگی تو میں نے کہا۔

”عبدالرحمن صاحب اتفاق دیکھیے میں صبح سے پریشان تھا کہ ٹائیٹل پیج کے بعد کا صفحہ کیسے پُر ہوگا۔ دو تصویروں کے بلاک مل گئے تھے۔ مگر ایک کی کمی تھی۔ اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا فوٹو میری طرف بڑھا دیا۔ بہت اچھا فوٹو ہے۔ بلاک بھی اس کا خوب بنے گا۔“

عبدالرحمن نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سکیڑ لیے۔

”آپ کی بڑی عنایت ہے۔ تو۔ تو کیا یہ تصویر چھپ جائے گی؟“

میں نے تصویر کو ایک نظر اور دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

”کیوں نہیں۔ اس ہفتے ہی کے لیے تو میں یہ کہہ رہا تھا۔“

اس پر عبدالرحمن نے دوبارہ شکریہ ادا کیا۔ پرچے میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا۔ جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔ تو۔ تو۔ معاف کیجیے۔ میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ملتا ہُوا چلا گیا۔ میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی، ایک ہاتھ میں بمبئی کی بھاری بھر کم ڈائرکٹری تھی جس پر چھپے ہوئے حروف بتا رہے تھے کہ سن سولہ کی یہ کتاب فوٹو گرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لیے ایک یا دو آنے میں خریدی ہوگی۔ دوسرے ہاتھ میں جو اوپر کو اُٹھا ہوا تھا ایک بہت بڑا پائپ تھا۔ اس پائپ کی ٹونٹی عبدالرحمن نے اس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا چائے کا پیالہ پکڑے ہے۔ لبوں پر چائے

کا گھونٹ پیتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہُوا کرتا ہے وہ تصویر میں اس کے ہونٹوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کُھل گئی تھیں، ناک کے نتھنے تھوڑے پھول گئے تھے۔ سینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ عبدالرحمن انگریزی لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔ میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق ایک تعریفی نوٹ کیساتھ پرچے میں چھپوا دیا۔ دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے غلیظ ریسٹوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبدالرحمن تازہ پرچہ جس میں اسکی تصویر چھپی تھی۔ ہاتھ میں لیے داخل ہُوا اور آداب عرض کر کے میری کرسی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے، آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے۔ بغل میں پرچہ دبا کر اس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے۔ شکریے کے کئی فقرے اس نے دل ہی دل میں بنائے ہونگے۔ مگر ناموزوں سمجھ کر انھیں منسوخ کر دیا ہو گا۔ جب میں نے اسے اس اُدھیڑ بُن میں دیکھا تو ماتم پرسی کے انداز میں اس سے کہا۔

”تصویر چھپ گئی آپ کی؟۔ نوٹ بھی پڑھ لیا آپ نے؟“

”جی ہاں۔ آپ۔ کی بڑی نوازش ہے۔“

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی میرا رنگ پیلا پڑ گیا۔ یہ درد بہت پرانا ہے۔ جس کے دورے مجھے اکثر پڑتے رہتے ہیں۔ میں اس کے دفیعے کے لیے سینکڑوں علاج کر چکا ہوں۔ مگر لاحاصل چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اُٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا۔ عبدالرحمن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہُوئے لہجہ میں کہا۔

”آپکے دشمنوں کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔“

میں اس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اس موذی مرض کا شکار ہوتے نہ دیکھ سکتا، چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہا۔

”کچھ نہیں، میں بالکل ٹھیک ہُوں۔“

”جی نہیں، آپ کی طبیعت ناساز ہے۔“

وہ سخت گھبرا گیا۔

”میں۔ میں۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ مطلق فکر نہ کریں۔ سینے میں معمولی سا درد ہے، ابھی ٹھیک ہو جائیگا۔“

”سینے میں درد ہے۔“

یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

”سینے میں درد ہے تو۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو قبض ہے اور قبض۔“

قریب تھا کہ میں بھنّا کر اس کو دو تین گالیاں سُنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔

”آپ۔ حد کرتے ہیں۔ آپ۔ سینے کے درد سے قبض کا کیا تعلق؟“

”جی نہیں۔ قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہے۔ آپکی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپکو پرانا قبض ہے اور جناب قبض کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو۔ جی نہیں، آپ جس کو بافراغت اجابت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو۔ سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں۔ قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ۔ دراصل آپکی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے۔“

عبدالرحمن چند لمحات کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنے لہجہ میں زیادہ چکناہٹ پیدا کر کے کہا۔

”آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہو گا۔ ایک معمولی سا علاج میرا بھی دیکھیے۔ خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دُور ہو جائیگا۔“

میں نے پوچھا۔

”کون سا مرض؟“

عبدالرحمن نے زور زور سے ہاتھ ملے

”یہی۔ یہی، قبض“!

لاحول ولا، اس بیوقوف سے کس نہ کہہ دیا کہ مجھے قبض ہے، صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پرانا ہے اور سب ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے۔ مگر یہ نیم حکیم خطرہ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے، قبض ہے، قبض ہے، کہیں ایسا نہ ہو میں اس کے سر پر غصے میں آ کر چائے کا پیالہ دے ماروں۔ عجب نامعقول آدمی

ہے، اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور کسی کی سُنتا ہی نہیں۔ غصے کے باعث میں بالکل خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی کا عبد الرحمن نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا۔ خدا معلوم اس نے کیا کیا کچھ کہا۔

”بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپ کے سُدّے پڑ گئے ہیں۔ آپ کو روز اجابت تو ہو جاتی ہے مگر یہ سُدّے باہر نہیں نکلتے۔ معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا اس لیے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ رطوبت یعنی وہ لیسدار مادّہ جو فضلے کو نیچے پھسلنے میں مدد دیتا ہے آپکے اندر بہت کم رہ گیا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپ کو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہو گا۔ قبض کھولنے کے لیے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوائیں بازار میں بِکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں۔ اس لیے کہ ان سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لیے آپ کو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے۔ یونانی دوائیں اوّل تو ہم لوگوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہیں دوسرے۔“

میں نے تنگ آکر اس سے کہا۔

”آپ چائے پئیں گے؟“

اور اس کا جواب سنے بغیر ہوٹل والے کو آرڈر دیا

”گُلاب، ان کے لیے ایک ڈبل چائے لاؤ۔“

چائے فوراً ہی آ گئی، عبد الرحمن کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا

”معاف کیجیے گا، مجھے ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ ایک سین کے متعلق بات چیت کرنا ہے۔ پھر کبھی گفتگو ہو گی۔“

یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبد الرحمن کی زبان پر منجمد ہو گئی اور میں رسٹوران سے باہر نکل گیا۔ درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہو گئی تھی، اس کی باتوں نے اس کی تکدر میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیوں اس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے۔ میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ میں مدقوق ہُوں جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہتے آئے ہیں۔ وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے سِل ہے۔ میری انتڑیوں میں ورم ہے۔ میرے معدے میں رسولی ہے، میرے دانت خراب ہیں۔ مجھے گٹھیا ہے مگر بار بار اس کا اس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا تھا کہ مجھے قبض ہو رہا ہے یعنی اگر مجھے واقعی قبض تھا تو اس کا احساس مجھے پہلے ہونا چاہیے تھا نہ کہ حافظ عبد الرحمن کو؟۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر میں ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھے ہیرو، ولن اور تین چار ایکسٹریسوں کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی۔ اس لیے سب کو چھٹی تھی۔ مجھے جب ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گزر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبد الرحمن کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ایک ایکسٹرا نے اس کے خلاف کافی زہر اُگلا۔ دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اڑایا۔ تیسرے نے اس کے مکالمہ ادا کرنے کی نقل اتاری۔ ہیرو کو حافظ عبد الرحمن کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے، ولن نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا۔

”بڑا واہیات آدمی ہے صاحب، کل ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایکٹنگ بالکل فضول ہے۔ آپ اس کو ایک بار ذرا ڈانٹ پلا دیجیے“

ڈائریکٹر صاحب مسکرا کر کہنے لگے

”تم سب کو اس کے خلاف شکایت ہے مگر اسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے۔“

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا۔

”وہ کیا۔“

ڈائریکٹر صاحب نے پہلی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا

”وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں اس کو کئی بار یقین دِلا چکا ہُوں کہ مجھے قبض وبض نہیں ہے لیکن وہ مانتا ہی نہیں، ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے۔ کئی علاج بھی مجھے بتا چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔

”وہ کیسے؟“

”یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور پھر اس کا علاج بتانے سے۔ وہ مجھے ممنون ہی تو کرنا چاہتا ہے ورنہ پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں۔ جن سے قبض دور ہو سکتا ہے۔ چونکہ مجھے وہ خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اس لیے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ جونہی مجھے قبض ہو وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر دے۔ آدمی دلچسپ ہے۔“

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

”ڈائریکٹر صاحب۔ آپ کے علاوہ حافظ صاحب کی نظرِ عنایت خاکسار پر بھی ہے۔ میں نے کل ان کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے۔ اس احسان کا بدلہ اُتارنے کے لیے ابھی ابھی ہوٹل میں انھوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان کے اس حملے سے بچ گیا اس لیے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔“

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہو گیا، یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اس کو پورے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ میں کئی پیٹنٹ دوائیں استعمال کر چکا ہُوں۔ مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہُوئی۔ اب میں سوچتا ہُوں کہ حافظ عبدالرحمن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقع دے ہی دُوں۔ کیا حرج ہے؟۔ مجھے اس سے محبت تو ہے نہیں۔

قدرت کا اصول

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوقدرت کا اصول

قدرت کا یہ اصول ہے کہ جس چیز کی مانگ نہ رہے‘ وہ خود بخود یا تو رفتہ رفتہ بالکل نابود ہو جاتی ہے‘ یا بہت کم یاب۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے سوچیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں سے کتنی اجناس غائب ہو گئی ہیں۔ اجناس کو چھوڑیئے‘ فیشن لے لیجیے۔ کئی آئے اور کئی دفن ہوئے‘ معلوم نہیں کہاں۔ دنیا کا یہ چکر بہر صورت اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ ایک آتا ہے‘ ایک جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لڑکیاں انگیا کا استعمال بہت معیوب سمجھتی تھیں‘ مگر اب یہ بہت ضروری سمجھا جاتا ہے کہ سہارا ہے۔ امریکہ اور انگلستان سے طرح طرح کی انگیاں آ رہی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں کہ ان میں کوئی اسٹریپ نہیں ہوتا۔ ایک انگیا جو سب سے قیمتی ہے

”میڈن فوم“

کہلاتی ہے اسے کوئی بُڑھیا بھی پہن لے تو جوان دکھائی دیتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ شدید انگیا نور جہاں فلم ایکٹریس نے

”چن وے“

میں پہنی تھی جس کی نمائش سے میرے جمالیاتی ذوق کو بہت صدمہ پہنچا تھا مگر میں کیا کرتا۔ ہر شخص کو اپنی پسند کی چیز کھانے اور پہننے کی آزادی ہے۔ تلون انسان کی فطرت ہے۔ وہ کبھی ایک چیز پر قائم نہیں رہتا اسی لیے اس کے گرد و پیش کا ماحول بھی بدلتا رہتا ہے اگر آج اسے مرغیاں مرغوب ہیں تو مارکیٹ میں لاکھوں مرغیاں ایک دم آ جائیں گی۔ لیکن جب اس کا دل ان سے اُکتا جائے گا۔ تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرغیاں یا تو انڈے دینا بند کر دیں گی۔ یا اسے سئیں گی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر لوگ پانی پینا بند کر دیں تو سارے کنویں خشک ہو جائیں۔ دریا اپنے کو بیکار سمجھ کر اپنا رُخ بدل لیں۔ میں آج سے پندرہ برس پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ آرگنڈی (جسے رفل کہا جاتا تھا) کی بنی بنائی قمیصوں کا رواج عورتوں میں عام تھا لیکن دو تین برسوں کے بعد یہ قمیصیں ایسے غائب ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اتنے برس گزر چکے تھے مگر اب یہ کپڑا جو حیوانوں کی کھال کے مانند اکڑا ہوتا تھا۔ کسی عورت کے بدن پر نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا بنانا یا تو یکسر بند کر دیا گیا ہے۔ یا بہت کم مقدار میں تیار کیا جاتا ہے۔ میں اب اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ہم جنسیت کا بازار پنجاب میں ہر جگہ گرم تھا۔ مردوں کی اکثریت اس غیر فطری فعل سے شغل فرماتی تھی۔ اور ایسے لڑکے بہ افراط موجود تھے جن کی ادائیں دیکھ کر نوخیز لڑکیاں بھی شرمائیں۔ ان کی چال ڈھال کچھ ایسی قیامت خیز ہوتی تھی کہ تعیش پسند مرد۔ اپنی عورتوں کو بھول جاتے تھے۔ میں اسی زمانے کا ذکر کر رہا ہوں۔ جب لڑکیوں کے بدلے ان کی مخالف جنس کا دور دورہ تھا۔ میں اپنے مکان کی بیٹھک میں اپنے ایک ہندو دوست کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا کہ باہر شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ امرتسر میں ہنگامے ہونا ان دنوں معمولی بات تھی۔ میں نے سوچا کہ ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے لیکن اپنے اس اندیشے کا ذکر ہندو دوست سے نہ کیا جو میرا ہم جماعت تھا۔ ہم دونوں گلی سے باہر نکلے۔ دیکھا کہ بازار میں سب دوکانیں بند ہیں۔ بڑی حیرت ہوئی کہ ماجرا کیا ہے۔ ہم گلی کے باہر کھڑے تھے کہ اتنے میں شہر کا ایک بہت بڑا غنڈا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ اس لیے کہ وہ مجھے پہچانتا تھا کہ میں ایک ذی اثر آدمی کا بیٹا ہوں۔ سلام کرنے کے بعد اس نے میرے دوست کی طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوا:

”میاں صاحب۔ بابو جی سے کہیے کہ یہاں کھڑے نہ رہیں۔ آپ انہیں اپنے مکان میں لے جائیں۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ جو خون خرابہ ہوا، اس کا باعث میرا دوست تھا‘ اس کے کئی طالب تھے۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ جن میں اس کی وجہ سے لڑائی ہوئی جس میں کئی آدمی زخمی ہوئے۔ شہر کا جو سب سے بڑا غنڈا تھا، چوتھے پانچویں روز اسے دوسری پارٹی نے اس قدر زخمی کر دیا کہ دس دن اسے ہسپتال میں رہنا پڑا جو اس کی غنڈا گردی کا سب سے بڑا ریکارڈ تھا۔ اہلِ لاہور اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ یہاں ایک لڑکا ٹینی سنگھ کے نام سے منسوب تھا۔ جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کے ایک پرستار نے اسے ایک بہت بڑی موٹر کار دے رکھی تھی۔ وہ اس میں بڑے ٹھاٹ سے آتا اور دوسرے لڑکے جو اسی کے زُمرے میں آتے تھے۔ بہت جلتے۔ مگر لاہور میں اس وقت ٹینی سنگھ کا ہی طوطی بولتا تھا۔ میں نے اس کو

دیکھا۔ واقعی خوبصورت تھا۔ اب یہ حال ہے کہ کوئی ٹینی سنگھ نظر نہیں آتا۔ کالجوں میں چلے جایئے وہاں آپ کو ایسا کوئی لڑکا نظر نہیں آئے گا جس میں نسوانیت کے خلاف کوئی چیلنج ہو، اس لیے کہ اب ان کی جگہ لڑکیوں نے لے لی ہے۔ قدرت نے ان کی انتہا کر دی۔

قرض کی پیتے تھے۔

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوقرض کی پیتے تھے۔

ایک جگہ محفل جمی تھی۔ مرزا غالب وہاں سے اُکتا کر اُٹھے۔ باہر ہوادار موجود تھا۔ اس میں بیٹھے اور اپنے گھر کا رخ کیا۔ ہوادار سے اتر کر جب دیوان خانے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ متھرا داس مہاجن بیٹھا ہے۔ غالب نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

”اخاہ! متھرا داس! بھئی تم آج بڑے وقت پر آئے۔ میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا“!

متھرا داس نے ٹھیٹ مہاجنوں کے انداز میں کہا۔

”حضور روپوں کو بہت دن ہو گئے۔ فقط دو قسط آپ نے بھجوائے تھے۔ اس کے بعد پانچ مہینے ہو گئے، ایک پیسہ بھی آپ نے نہ دیا۔“

اسد اللہ خان غالبؒ مسکرائے

”بھئی، متھرا داس دینے کو میں سب دے دوں گا۔ گلے گلے پانی دوں گا۔ دو ایک جائید اد ابھی میری باقی ہے۔“

”اجی سرکار! اس طرح بیوپار ہو چکا۔ نہ اصل میں سے نہ سود میں سے، پہلا ہی ڈھائی ہزار وصول نہیں ہوا۔ چھ سو چھپن سود کے ہو گئے ہیں۔“

مرزا غالبؒ نے حقے کی نے پکڑ کر ایک کش لیا۔

”لالہ، جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے، اس کو پہلے پانی دیتے ہیں۔ میں تمہارا درخت ہوں پانی دو تو اناج پیدا ہو۔“

متھرا داس نے اپنی دھوتی کی لانگ ٹھیک کی۔

”جی، دیوالی کو بارہ دن باقی رہ گئے ہیں۔ کھاتہ بند کیا جائے گا۔ آپ پہلے روپے کا اصل سُود ملا کر دستاویز بنا دیں تو آگے کا نام لیں۔“

مرزا غالبؒ نے حقے کی نَے ایک طرف کی

”لو، ابھی دستاویز لکھے دیتا ہوں۔ پر شرط یہ ہے کہ دو ہزار ابھی ابھی مجھے اور دو۔“

متھرا داس نے تھوڑی دیر غور کیا۔

”اچھا، میں اشٹام منگواتا ہوں۔ بہی ساتھ لایا ہوں۔ آپ منشی غلام رسول عرضی نویس کو بلالیں۔ پر سود وہی سوا روپیہ سینکڑہ ہو گا۔“

”لالہ کچھ تو انصاف کرو۔ بارہ آنے سود لکھوائے دیتا ہوں۔“

متھرا داس نے اپنی دھوتی کی لانگ دوسری بار دُرست کی۔

”سرکار بارہ آنے پر بارہ برس بھی کوئی مہاجن قرض نہیں دے گا۔ آج کل تو خود بادشاہ سلامت کو روپے کی ضرورت ہے۔“

ان دنوں واقعی بہادر شاہ ظفر کی حالت بہت نازک تھی، اس کو اپنے اخراجات کے لیے روپے پیسے کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔ بہادر شاہ تو خیر بادشاہ تھا لیکن مرزا غالب محض شاعر تھے۔ گو وہ اپنے شعروں میں اپنا رشتہ سپاہ گری سے جوڑتے تھے۔ یہ مرزا صاحب کی زندگی کے چالیسویں اور پینتالیسویں سال کے درمیانی عرصے کی بات ہے۔ جب متھرا داس مہاجن نے ان پر عدم ادائیگی قرضہ کے باعث عدالت دیوانی میں دعویٰ دائر کیا۔ مقدمے کی سماعت مرزا صاحب کے مربی اور دوست مُفتی صدر الدین آزردہ کو کرنا تھی۔ جو خود بہت اچھے شاعر اور غالبؒ کے مداح تھے۔ مُفتی صاحب کے مردھانے عدالت کے کمرے سے باہر نکل کر آواز دی۔

”لالہ متھرا داس مہاجن مدعی اور مرزا اسد اللہ خان غالب مدعا علیہ حاضر ہیں؟“

متھرا داس نے مرزا غالب کی طرف دیکھا اور مردھے سے کہا۔

”جی دونوں حاضر ہیں۔“

مِردھے نے روکھے پن سے کہا۔“

تو دونوں حاضرِ عدالت ہوں۔“

مرزا غالب نے عدالت میں حاضر ہو کر مفتی صدر الدین آزردہ کو سلام کیا۔ مفتی صاحب مسکرائے۔

"مرزا نوشہ، یہ آپ اس قدر قرض کیوں لیا کرتے ہیں۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

غالب نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

"کیا عرض کروں۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔"

مفتی صدر الدین مسکرائے:

"کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے۔"

غالب نے برجستہ کہا۔

"ایک شعر موزوں ہو گیا ہے مفتی صاحب۔ حکم ہو تو جواب میں عرض کروں۔"

"فرمایئے"!

غالبؔ نے مفتی صاحب اور متھرا داس مہاجن کو ایک لحظے کے لیے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی، ایک دن مفتی صاحب بے اختیار ہنس پڑے۔

"خوب، خوب۔ کیوں صاحب! رسی جل گئی، پر بل نہ گیا۔ آپ کے اس شعر کی میں تو ضرور داد دوں گا۔ مگر چونکہ آپ کو اصل اور سود، سب سے اقرار ہے۔ عدالت مدعی کے حق میں فیصلہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

مرزا غالبؔ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"مدعی سچا ہے، تو کیوں فیصلہ اس کے حق میں نہ ہو۔ اور میں نے بھی سچی بات نثر میں نہ کہی، نظم میں کہہ دی۔"

مفتی صدر الدین آزردہ نے کاغذات قانون ایک طرف رکھے اور مرزا غالب سے مخاطب ہوئے۔

"اچھا، تو زرِ ڈگری میں ادا کر دوں گا کہ ہماری آپ کی دوستی کی لاج رہ جائے۔"

مرزا غالبؔ بڑے خود دار تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب سے کہا۔

"حضور ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے متھرا داس کا روپیہ دینا ہے۔ میں بہت جلد ادا کر دوں گا۔"

مفتی صاحب مسکرائے۔

"حضرت، روپے کی ادائیگی، شاعری نہیں۔ آپ تکلّف کو بر طرف رکھیے۔ میں آپ کا مداح ہوں۔ مجھے آج موقع دیجیے کہ آپ کی کوئی خدمت کر سکوں۔"

غالبؔ بہت خفیف ہوئے۔

"لاحول ولا۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ مجھے کوئی سزا دے دیجیے کہ آپ صدر الصدور ہیں۔"

"دیکھو، تم ایسی باتیں مت کرو۔"

"تو اور کیسی باتیں کروں"

"کوئی شعر سنایئے۔"

"سوچتا ہوں۔ ہاں ایک شعر رات کو ہو گیا تھا۔ عرض کیے دیتا ہوں۔"

"فرمایئے"

"ہم اور وہ سبب رنج آشنا دشمن"

مُفتی صاحب نے اپنے قانونی قلم سے قانونی کاغذ پر یہ حروف لکھے

"ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے"

مفتی صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ یہ شعر آسانی سے سمجھ آسکنے والا نہیں۔ لیکن وہ خود بہت بڑے شاعر تھے۔ اس لیے غالبؔ کی دقیقہ بیانی کو فوراً سمجھ گئے۔ مرزا غالبؔ کچھ دیر خاموش رہے۔ غالباً ان کو اس بات پر بہت کوفت ہوئی تھی کہ مفتی صاحب اُن پر ایک احسان کر رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے ان سے پوچھا:

"حضرت آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

”جی کوئی خاص بات نہیں ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں ورنہ کیا بات کہ نہیں آتی

”آپ کو باتیں کرنا تو ماشاء اللہ آتی ہیں۔“

غالبؒ نے جواب دیا:

”جی ہاں۔ لیکن بنانا نہیں آتیں۔“

مفتی صدر الدین مسکرائے۔

”اب آپ جاسکتے ہیں۔ زرِ ڈگری میں ادا کر دوں گا۔“

مرزا غالبؒ نے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

”آج آپ نے دوستی کے تمسک پر مہر لگادی۔ جب تک زندہ ہوں، بندہ ہوں۔“

مفتی صدر الدین آزردہ نے ان سے کہا۔

”اب آپ تشریف لے جائیے۔ پر خیال رہے کہ روز روز زر ڈگری میں ادا نہیں کر سکتا، آئندہ احتیاط رہے۔“

مرزا غالبؒ تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں غرق ہوگئے۔ مفتی صاحب نے اُن سے پوچھا۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

مرزا غالبؒ چونک کر بولے۔

”جی! میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ شاید کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ موت کا ایک دن متعین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی مفتی صاحب نے ان سے پوچھا۔

”کیا آپ کو رات بھر نیند نہیں آتی؟“

مرزا غالبؒ نے مسکرا کر کہا۔

”کسی خوش نصیب ہی کو آتی ہو گی۔“

مفتی صاحب نے کہا۔

”آپ شاعری چھوڑیئے۔ بس آئندہ احتیاط رہے۔“

مرزا غالبؒ اپنے انگرکھے کی شکنیں درست کرتے ہوئے بولے

”آپ کی نصیحت پر چل کر ثابت قدم رہنے کی خدا سے دعا کروں گا۔ مفتی صاحب! مفت مفت کی زحمت آپ کو ہوئی۔ نقد اُسوائے

”شکر ہے“

کے اور کیا ادا کر سکتا ہوں۔ خیر خدا آپ کو دس گُنا دُنیا میں، اور ستّر گُنا آخرت میں دے گا۔“

یہ سُن کر مفتی صدر الدین آزردہ زیر لب مسکرائے۔

”آخرت والے میں تو آپ کو شریک کرنا محال ہے۔ دنیا کے دس گنے میں بھی آپ کو ایک کوڑی نہیں دوں گا کہ آپ مے خواری کیجیے۔“

مرزا غالبؒ ہنسے۔

”مے خواری کیسی مفتی صاحب“!

مے سے غرض نشاط ہے کِس روسیاہ کو اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے اور یہ شعر سُنا کر مرزا غالبؒ، عدالت کے کمرے سے باہر چلے گئے۔

قیمے کی بجائے بوٹیاں

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوقیمے کی بجائے بوٹیاں

ڈاکٹر سعید میرا ہمسایہ تھا۔ اس کا مکان میرے مکان سے زیادہ سے زیادہ دو سو گز کے فاصلے پر ہو گا۔ اس کی گراؤنڈ فلور پر اس کا مطب تھا۔ میں کبھی کبھی وہاں چلا جاتا۔ ایک دو گھنٹے کی تفریح ہو جاتی۔ بڑا بذلہ سنج ادب شناس اور وضعدار آدمی تھا۔ رہنے والا بنگلور کا تھا۔ مگر گھر میں بڑی شُستہ و رفتہ اردو میں گفتگو کرتا تھا۔ اس نے اردو کے قریب قریب تمام بڑے شعرا کا

مطالعہ کچھ ایسے ہی انہماک سے کیا تھا کہ جس طرح اس نے ایم بی بی ایس کورس کی جملہ کتابوں کا۔ میں کئی دفعہ سوچتا کہ ڈاکٹر سعید کو ڈاکٹر بننے کی بجائے کسی بھی مضمون میں ایم اے ایچ پی کی ڈگری حاصل کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ اس کی افتاد طبع کے لیے یہ نہایت موزوں و مناسب ہوتی۔ چنانچہ میں نے ایک روز اس سے کہا:

”ڈاکٹر صاحب! آپ نے یہ پروفیشن کیوں اختیار کیا؟“

”کیوں“

میں نے ان سے کہا:

”آپ اردو‘ فارسی زبان کے بڑے اچھے پروفیسر ہوتے۔ بڑے ہر دلعزیز۔ طالب علم آپ کے گرویدہ ہوتے۔“

وہ مُسکرایا:

”ایک ہی بات ہوتی۔ نہیں۔ زمین و آسمان کا فرق ہوتا میں یہاں اپنے مطب میں بڑے اطمینان سے بیٹھا ہر روز کم از کم سو سوا سو روپے بنا لیتا ہوں۔ اگر میں نے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کیا ہوتا تو مجھے کیا ملتا۔ زیادہ سے زیادہ چھ سات سو روپے ماہوار۔“

میں نے ڈاکٹر سے کہا:

”بڑی معقول آمدنی ہے۔“

”آپ اسے معقول کہتے ہیں۔ سو روپے کے قریب تو میرا اپنا جیب خرچ ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ کہ میں شراب پینے کا عادی ہوں‘ اور وہ بھی ہر روز۔ قریب قریب پچھتر روپے تو اس پر اٹھ جاتے ہیں۔ پھر سگریٹ ہیں۔ دوست یاروں کی تواضع ہے۔ یہ سب خرچ کیا ایک لیکچرر‘ پروفیسر‘ ریڈر یا پرنسپل کی تنخواہ پورا کر سکتی ہے؟“

میں قائل ہو گیا۔

”جی نہیں۔ آپ ڈاکٹر نہ ہوتے۔ ادیب ہوتے‘ مصور ہوتے۔“

میری بات کاٹ کر انہوں نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگا کر کہا:

”اور فاقہ کشی کرتا“

میں بھی ہنس پڑا۔ ڈاکٹر سعید کے اخراجات واقعی بہت زیادہ تھے‘ اس لیے کہ وہ کنجوس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے مطب سے فارغ ہو کر فرصت کے اوقات میں دوست یاروں کی محفل جمانے میں ایک خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ شادی شُدہ تھا۔ اس کی بیوی بنگلور ہی کی تھی جس کے بطن سے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ اس کی بیوی اردو زبان سے قطعاً نا آشنا تھی‘ اس لیے اسے تنہائی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھی چھوٹی لڑکی آتی اور اپنی ماں کا پیغام ڈاکٹر کے کان میں ہولے سے پہنچا دیتی اور پھر دوڑتی ہوئی مطب سے باہر نکل جاتی۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر سے میرا دوستانہ ہو گیا۔ بڑا بے تکلف قسم کا۔ اس نے مجھے اپنی گزشتہ زندگی کے تمام حالات و واقعات سنائے۔ مگر وہ اتنے دلچسپ نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے۔ اب میں نے باقاعدگی کے ساتھ ان کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ میں بھی چونکہ بوتل کا رسیا تھا۔ اس لیے ہم دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ ایک دو ماہ کے بعد میں نے محسوس کیا۔ کہ ڈاکٹر سعید الجھا سا رہتا ہے۔ اپنے کام سے اس کی دلچسپی دن بدن کم ہو رہی ہے۔ پہلے تو میں اسے ٹٹولتا رہا آخر میں نے صاف لفظوں میں اس سے پوچھا:

”یار سعید۔ تم آج کئی دن سے کھوئے کھوئے سے کیوں رہتے ہو“

ڈاکٹر سعید کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی:

”نہیں تو۔“

”نہیں تو کیا۔ میں اتنا گدھا تو نہیں کہ پہچان بھی نہ سکوں کہ تم کسی ذہنی اُلجھن میں گرفتار ہو۔“

ڈاکٹر سعید نے اپنا وسکی کا گلاس اُٹھایا اور ہونٹوں تک لے جا کر کہا:

”محض تمہارا واہمہ ہے۔ یا تم اپنی نفسیات شناسی کا مجھ پر رعب گانٹھنا چاہتے ہو۔“

میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ حالانکہ اس کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کے دل کا چور پکڑا جا چکا ہے۔ مگر اسے اپنی شکست کے اعتراف کا حوصلہ نہیں۔ بہت دن گزر گئے۔ اب وہ کئی کئی گھنٹے اپنے مطب سے غیر حاضر رہنے لگا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے، اس کی ذہنی پریشانی کا باعث کیا ہے‘ میرے دل و دماغ میں بڑی کھد بد ہو رہی تھی۔ اب اتفاقاً اگر اس سے ملاقات ہوتی تو میرا بے اختیار جی چاہتا کہ اس سے ایک بار پھر وہ سوالات کروں جن کے ٹل جواب سے میری ذہنی اُلجھن دور ہو اور ڈاکٹر سعید کے عقب میں جو کچھ بھی تھا، اس کی صحیح تصویر میری آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ مگر ایسا کوئی تخلیے کا موقع نہ ملا۔ ایک دن شام کو جب میں اس کے مطب میں داخل ہوا۔ تو اس کے نوکر نے مجھے روکا

”صاحب: ابھی اندر نہ جایئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھ رہے ہیں۔“

”تو دیکھا کریں۔“

نوکر نے مؤدبانہ عرض کی:

”صاحب۔ وہ۔ وہ۔ میرا مطلب ہے۔ کہ مریض‘ عورت ہے۔“

”اوہ۔ کب تک فارغ ہو جائیں گے۔ اس کے متعلق تمہیں کچھ معلوم ہے؟“

نوکر نے جواب دیا:

”جی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تقریباً ایک گھنٹے سے وہ بیگم صاحبہ کو دیکھ رہے ہیں۔“

میں تھوڑے توقف کے بعد مُسکرایا۔

”تو مرض کوئی خاص معلوم ہوتا ہے۔“

اور یہ کہہ کر میں نے غیر ارادی طور پر ڈاکٹر سعید کے کمرۂ تشخیص کا دروازہ کھول دیا۔ اور اندر داخل ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ سعید ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے ساتھ بیٹھا ہے‘ تپائی پر بیئر کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہیں‘ اور دونوں محو گفتگو ہیں‘ سعید اور وہ محترمہ مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔ میں نے ازرہِ تکلف ان سے معذرت طلب کی‘ اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ سعید پکارا
:

”کہاں چلے۔ بیٹھو۔“

میں نے سعید سے کہا:

”میری موجودگی شاید آپ کی گفتگو میں مخل ہو“

سعید نے اُٹھ کر مجھے کاندھوں سے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

”ہٹاؤ یار اس تکلف کو۔“

پھر اس نے ایک خالی گلاس میں میرے لیے بیئر انڈیلی اور اسے میرے سامنے رکھ دیا:

”لو‘ پیو۔“

میں نے دو گھونٹ بھرے تو سعید نے اس ادھیڑ عمر کی عورت سے جو لباس اور زیوروں سے کافی مالدار معلوم ہوتی تھی۔ تعارف کرایا۔

”سلمیٰ رحمانی۔ اور یہ میرے عزیز دوست سعادت حسن منٹو۔“

سلمیٰ رحمانی چند ساعتوں کے لیے مجھے بڑے غور اور تعجب سے دیکھتی رہی۔

”سعید۔ کیا واقعی یہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ جن کے افسانوں کے سارے مجموعے میں بڑے غور سے ایک نہیں‘ دو دو‘ تین تین مرتبہ پڑھ چکی ہوں۔“

ڈاکٹر سعید نے اپنا گلاس اٹھایا۔

”ہاں‘ وہی ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ خیال کیا کہ اس سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دوں۔ پر میں نے سوچا تم اس نام سے یقیناً واقف ہو گی۔ شیطان کو کون نہیں جانتا۔“

سلمیٰ رحمانی یہ سن کر پیٹ بھر کے ہنسی۔ اور اس کا پیٹ عام پیٹوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔ اس کے بعد مس سلمیٰ رحمانی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پڑھی لکھی عورت تھی۔ بڑے اچھے گھرانے سے متعلق تھی۔ تفتیش کیے بغیر مجھے اس کے متعلق چند معلومات حاصل ہو گئیں کہ وہ تین خاوندوں سے طلاق لے چکی ہے۔ صاحبِ اولاد ہے۔ جہاں رہتی ہے۔ اس گھر میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے اور ایک غسل خانہ ہے‘ وہاں اکیلی رہتی ہے۔ غیر منقولہ جائیداد سے اس کی آمدن چار پانچ سو روپے ماہوار کے قریب ہے۔ ہیرے کی انگوٹھیاں پہنتی ہے۔ ان انگوٹھیوں میں سے ایک میں نے دوسرے روز شام کو سعید کی انگلی میں دیکھی۔ تیسرے روز کو ڈاکٹر سعید کے مطب میں سلمیٰ رحمانی موجود تھی۔ دونوں بہت خوش تھے اور چہچہا رہے تھے۔ میں بھی ان کی بیئر نوشی میں شریک ہو گیا۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر سعید کے کمرۂ تشخیص سے کچھ دُور جو کمرے خالی پڑے رہتے ہیں‘ ان کی بڑی توجہ سے مرمت کرائی جا رہی ہے۔ ان کو سجایا بنایا جا رہا ہے۔ فرنیچر جب لایا گیا تو وہی تھا جو میں نے سلمیٰ رحمانی کے گھر دیکھا تھا۔ اتوار کو ڈاکٹر سعید کی چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ کواڑ بند رہتے تاکہ اس کو تنگ نہ کیا جائے۔ مجھے تو وہاں ہر وقت آنے جانے کی اجازت تھی۔ ایک اور چور دروازہ تھا۔ اس کے ذریعے میں اندر پہنچا۔ اور سیدھا ان دو کمروں کا رخ کیا جن کی مرمت کرائی گئی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو حسب توقع ڈاکٹر سعید کی بغل میں سلمیٰ رحمانی بیٹھی تھی۔ سعید نے مجھ سے کہا:

”میری بیوی سلمیٰ رحمانی سے ملو۔“

مجھے اس عورت سے کیا ملنا تھا۔ سینکڑوں بار مل چکا تھا۔ لیکن اگر کسی عورت کی شادی ہو تو اس کو کن الفاظ میں مبارکباد دینی چاہیے۔ اس کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر تھیں۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ لیکن کہنا بھی کچھ ضرور تھا۔ اس لیے جو منہ میں آیا باہر نکال دیا:

”تو آخر اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔“

میاں بیوی دونوں ہنسے۔ سعید نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ بیئر پیش کی اور ہم شادی کے علاوہ دنیا کے ہر موضوع پر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ میں شام پانچ بجے آیا تھا۔ گھڑی دیکھی تو نو بجنے والے تھے۔ میں نے سعید سے کہا:

”لو بھئی۔ میں چلا۔ باتوں باتوں میں اتنی دیر ہو گئی ہے، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔“

سعید کے بجائے سلمیٰ رحمانی۔ معاف کیجیے گا، سلمیٰ سعید مجھ سے مخاطب ہوئیں:

”نہیں، آپ نہیں جاسکتے۔ کھانا تیار ہے۔ اگر آپ کہیں تو لگوا دیا جائے۔“

خیر، سعید اور اس کی نئی بیوی کے پیہم اصرار پر مجھے کھانا کھانا پڑا۔ جو بہت خوش ذائقہ اور لذیذ تھا۔ دو برس تک ان کی زندگی بڑی ہموار گزرتی رہی۔ ایک دن میں ناسازئ طبیعت کے باعث بستر ہی میں لیٹا تھا کہ نوکر نے اطلاع دی:

”ڈاکٹر سعید صاحب تشریف لائے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”اندر۔ جاؤ، ان کو اندر بھیج دو۔“

سعید آیا تو میں نے محسوس کیا وہ بہت مضطرب اور پریشان ہے۔ اس نے مجھے کچھ پوچھنے کی زحمت نہ دی اور اپنے آپ بتا دیا کہ سلمیٰ سے اس کی ناچاقی شروع ہو گئی ہے، اس لیے کہ وہ خود سر عورت ہے، کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ میں نے صرف اس لیے اس سے شادی کر لی تھی کہ وہ اکیلی تھی۔ اس کے عزیز و اقربا اسے پوچھتے ہی نہیں تھے جب وہ بیمار ہوئی۔ اور یہ کوئی معمولی بیماری نہیں تھی۔ ڈپتھریا تھا جسے خناق کہتے ہیں۔ تو میں نے اپنا تمام کام چھوڑ کر اس کا علاج کیا اور خدا کے فضل و کرم سے وہ تندرست ہو گئی۔ پر اب وہ ان تمام باتوں کو پسِ پشت ڈال کر مجھ سے کچھ اس قسم کا سلوک کرتی ہے جو بے حد ناروا ہے۔“

تو آغاز کا انجام شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر سعید کا گھر میرے گھر کے بالکل پاس تھا، اس لیے ان کی لڑائیوں کی اطلاعات ہمیں مختلف ذریعوں سے پہنچتی رہتی تھیں۔ سلمیٰ کے ساتھ دو نوکرانیاں تھیں، بڑی تیز طرار اور ہٹی کٹی۔ ان دونوں کے شوہر تھے۔ وہ ایک طرح اس کے ملازم تھے۔ اس کے اشارے پر جان دے دینے والے۔ اور ڈاکٹر سعید بڑا نحیف اور مختصر مرد۔ ایک دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سعید اور سلمیٰ نے پی رکھی تھی کہ آپس میں دونوں کی چخ چخ ہو گئی۔ ڈاکٹر نے معلوم نہیں نشے میں کیا کہا کہ سلمیٰ آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے اپنی دونوں نوکرانیوں کو آواز دی۔ وہ دوڑی دوڑی اندر آئیں۔ سلمیٰ نے ان کو حکم دیا کہ ڈاکٹر کی اچھی طرح مرمت کر دی جائے، ایسی مرمت کہ ساری عمر یاد رکھے۔ یہ حکم ملنا تھا۔ کہ ڈاکٹر سعید کی مرمت شروع ہو گئی۔ ان دونوں نوکرانیوں نے اپنے شوہروں کو بھی اس سلسلے میں شامل کر لیا۔ لاٹھیوں، گھونسوں اور دوسرے تھرڈ ڈگری طریقوں سے اسے خُوب مارا پیٹا گیا کہ اس کا کچومر نکل گیا۔ افتاں و خیزاں بھاگا وہاں سے، اور اوپر اپنی پرانی بیوی کے پاس پہنچ گیا جس نے مستعد نرس کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اس نے ان دو کمروں کا رخ قریب قریب دو ماہ تک نہ کیا۔ اب وہ سلمیٰ سے کسی قسم کا رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہو گیا۔ سو ہو گیا۔ اب اس کو اپنے گھر سے بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اسے یہ محسوس ہوتا کہ یہ عورت جس سے میں نے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ کیوں ابھی تک اس کے سر پر مسلط ہے۔ اس کے گھر سے چلی کیوں نہیں جاتی۔ مگر اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک دو ماہ اور گزر گئے۔ اس دوران ڈاکٹر سعید کو معلوم ہوا کہ اس کا یوپی کے تاجر سے معاشقہ چل رہا ہے۔ یہ شخص صرف نام ہی کا تاجر تھا۔ اس کے پاس کوئی دولت نہیں تھی۔ صرف ایک مکان تھا۔ جو اس نے ہجرت کرنے کے بعد اپنے نام الاٹ کرا لیا تھا۔ دونوں ہر روز شام کو میرے یہاں آتے۔ شعر و شراب کی محفلیں جمتیں۔ اور میرے سینے پر مونگ دلتی رہتیں۔ ایک دن اس سے یہ کہے بغیر نہ رہا جا سکا۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں اس سے کہا۔

”اوّل تو تم نے یہ غلطی کی۔ کہ سلمیٰ سے شادی کی۔ دوسری غلطی تم یہ کر رہے ہو کہ اسے اپنے گھر سے باہر نہیں کرتے۔ کیا یہ اس کے باپ کا گھر ہے؟“

ڈاکٹر سعید کی گردن شرمساری کے باعث جھک گئی۔

”یار! چھوڑو اس قصّے کو۔“

”قصّے کو تو تم اور میں دونوں چھوڑنے کیلیے تیار ہیں۔ لیکن یہ قصّہ ہی تمہیں نہیں چھوڑتا۔ اور نہ چھوڑے گا۔ جبکہ تم کوئی بھی مردانہ وار کوشش نہیں کرتے۔“

وہ خاموش رہا۔ میں نے اس پر ایک گولہ اور پھینکا

”سچ پوچھو تو سعید۔ تم نامرد ہو۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو محترمہ کا قیمہ بنا ڈالتا۔ اصل میں تم ضرورت سے زیادہ ہی شریف ہو۔“

سعید نے نقاہت بھری آواز میں صرف اتنا کہا:

”میں بہت خطرناک مجرم بھی بن سکتا ہوں۔ تم نہیں جانتے“

میں نے طنزاً کہا:

”سب جانتا ہوں۔ اس سے اتنی مار کھائی۔ اتنے ذلیل ہوئے۔ میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ محترمہ تمہارے گھر سے جاتی کیوں نہیں۔ ؟اس پر اس کا اب کیا حق ہے ؟“

سعید نے جواب دیا:

”وہ چلی گئی ہے۔ اور اس کا سامان بھی۔ بلکہ میرا سامان بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“

میں بہت خوش ہوا:

”لعنت بھیجو اپنے سامان پر۔ چلی گئی ہے۔ بس ٹھیک ہے تم خوش تمہارا خدا خوش۔ چلو اسی خوشی میں وہ بیئر کی یخ بستہ بوتلیں پیئیں۔ جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ اس کے بعد کھانا کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔“

سلمٰے کے جانے کے بعد ڈاکٹر سعید کم از کم ایک ماہ تک کھویا کھویا سا رہا۔ اس کے بعد وہ اپنی نارمل حالت میں آگیا۔ ہر شام اس سے ملاقات ہوتی۔ گھنٹوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ کچھ دنوں سے میری طبیعت موسم کی تبدیلی کے باعث بہت مضمحل تھی۔ بستر میں لیٹا تھا کہ ڈاکٹر سعید کا ملازم آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں اور بُلا رہے ہیں۔ ایک ضروری کام ہے۔ میرا جی تو نہیں چاہتا تھا۔ کہ بستر سے اُٹھوں۔ مگر سعید کو نااُمید نہیں کرنا چاہتا تھا‘ اس لیے شیروانی پہن کر اس کے یہاں پہنچا۔ مکان کے باہر دیکھا۔ کہ چار دیگیں چڑھی ہیں۔ قصائی دھڑا دھڑ بوٹیاں کاٹ کاٹ کر صف کے ایک ٹکڑے پر پھینکے چلا جارہا ہے۔ آس پاس کے کئی آدمی جمع تھے۔ میں سمجھا شاید کوئی نذر نیاز دی جارہی ہے۔ میں نے گوشت کا وہ بڑا سا لوتھڑا دیکھا۔ جس پر کلہاڑی چلائی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ دو بانہیں تھیں۔ !بالکل انسانوں کی مانند۔ !میں نے پھر غور سے دیکھا۔ قطعی طور پر انسانی بانہیں تھیں۔ سمجھ میں نہ آیا۔ یہ قصہ کیا ہے قصائی کی چھری اور کلہاڑی چل رہی تھی۔ چار دیگوں میں پیاز سرخ کی جارہی تھی۔ اور میرا دل۔ دماغ ان دونوں کے درمیان پھنستا اور دھنستا چلا جارہا تھا۔ کہ ڈاکٹر سعید نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی پکارا:

”آیئے۔ آیئے۔ آپ کے کہنے کے مطابق قیمہ تو نہ بن سکا۔ مگر یہ بوٹیاں تیار کرالی گئی ہیں۔ ابھی اچھی طرح بھونی نہیں گئیں۔ ورنہ میں آپ کو ایک بوٹی پیش کرتا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ مرچ مصالحہ ٹھیک ہے یا نہیں“!

یہ سن کر پہلے مجھے متلی آئی۔ اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

کالی شلوار

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوکالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ ابنالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔

”دِس لیف۔ ویری بیڈ۔“

یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔ ابنالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے، اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی۔

”صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔“

اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی

”صاحب، تم ایک دم اُلو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے۔ سمجھا۔“

یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ اُن سے باتیں کرتی۔ یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔ مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہوگئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں، جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں، مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا۔

”بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے۔“

نہ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا۔

”دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔“

چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے وروازے بند کرکے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا۔

”لایئے ایک روپیہ دودھ کا۔“

اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں۔ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانہ میں گئی تو اس کے لیے کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں یہ زنجیر اس لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہُوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائی ڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا۔

”کیا ہوا؟۔ یہ چیخ تمہاری تھی؟“

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”یہ موا پاخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکہ ہُوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔“

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔ خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہُوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنٹس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہوگئی۔ اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لیے اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ ابنالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں ابنالہ آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا، چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔ خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چوں کہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہوگئی، چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔ خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔ کام چل نکلا، چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا ابنالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہوگئی، چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی آمدنی پہلے سے دوگنی ہوگئی۔ سلطانہ نے کانوں کے لیے بُندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوا لیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں، گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ ابنالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی

سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سُن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی۔ جس سے اسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔ ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دِقت محسوس ہوئی تھی پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔

”یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔“

یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں، مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں

”کوئلوں کی دوکان“

لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں

”شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے۔“

لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانہ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔ دوکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا۔

”کیا بات ہے خدا بخش، دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔“

خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا۔

”میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ۔“

وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔ بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا۔

”تم میری سنو اور چلو واپس انبالے میں یہاں کیا دھرا ہے؟۔ بھئی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔“

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔

”نہیں جانِ من، انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔“

سلطانہ چُپ ہو رہی، چنانچہ آخری کنگنی ہاتھ سے اتر گئی۔ بُچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دُکھ ہوتا تھا، پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔ جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دُکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت بُرا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسنان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکونی میں آکر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔ سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔

بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہُوئی تھیں۔ دُھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح اُبھری رہتی تھیں، اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دُھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دُھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اُٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گُھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جارہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جارہی ہے۔ نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائیگی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔ یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہُوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ ابنالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے ہیں جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جارہا ہے۔ سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا۔

”دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔“

مگر اُس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اُس کی تشفی کر دی۔

”جانِ من۔ میں باہر کچھ کمانےکی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔“

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرم کا مہینہ سر پر آرہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیض بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اُس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی، پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔ سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اُسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پُھرتی سے اوپر چلا آیا۔ سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا۔

”آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے۔“

وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہُوا۔ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟“

اس پر سلطانہ نے کہا۔

”یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔“

وہ یہ سُن کر پھر مسکرایا۔

”تمہیں غلط فہمی ہُوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہُوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔“

یہ کہہ اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا۔

”آپ جا رہے ہیں؟“

اس آدمی نے جواب دیا۔

”نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔“

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اُسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تو اس آدمی نے کہا۔

”میرا نام شنکر ہے۔“

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیض تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا۔

”فرمایئے۔“

شنکر بیٹھا تھا، یہ سُن کر لیٹ گیا۔

”میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے۔“

جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اُٹھ بیٹھا۔

”میں سمجھا، لو اب مجھ سے سُنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دیکر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔“

سلطانہ یہ سُن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔

”آپ کام کیا کرتے ہیں؟“

شنکر نے جواب دیا۔

”یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔“

”کیا؟“

”تم کیا کرتی ہو؟“

”میں۔ میں۔ میں کچھ بھی نہیں کرتی۔“

”میں بھی کچھ نہیں کرتا۔“

سلطانہ نے بھنا کر کہا۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔“

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی۔“

”جھک مارتی ہوں۔“

”میں بھی جھک مارتا ہوں۔“

”تو آؤ دونوں جھک ماریں۔“

”میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے لیے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔“

”ہوش کی دوا کرو۔ یہ لنگر خانہ نہیں۔“

”اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں۔“

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا۔

”یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں۔“

شنکر نے جواب دیا۔

”اُلو کے پٹھے۔“

”میں بھی الو کی پٹھی نہیں۔“

”مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور اُلو کا پٹھا ہے۔“

”کیوں؟“

اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔“

یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔ اس پر سلطانہ نے کہا۔

”تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اُڑاتے ہو۔“

شنکر مسکرایا۔

”ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہُوا کرتے۔ پنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں۔“

”جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔ بولو رہو گے؟“

”اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہُوں۔“

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

”تو جاؤ رستہ پکڑو۔“

شنکر آرام سے اُٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا۔

”میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہُوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔“

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اُس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دیکر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی، اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔ شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اُس سے پوچھا۔

”تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟“

خدا بخش تھک کر چُور چُور ہو رہا تھا، کہنے لگا۔

”پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہُوئے ہیں، انہی کے پاس ہر روز جاتا ہُوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔“

”کچھ انھوں نے تم سے کہا؟“

”نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہُوئے۔ پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا، خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی۔

”سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو۔ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں، نہ کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے، کچھ تم نے اسکی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں، گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بِک گئیں، اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟۔ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔“

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا۔

”پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے۔ خدا کے لیے اب ایسی دُکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے، کیا پتا ہے کہ کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم۔“

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا۔

”تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ مارو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے، اس کو میں کالا رنگوالوں گی۔ سفید نینوں کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا، یہ بھی قیض کیساتھ ہی کالا رنگوالیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے، سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔ دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔ میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔“

خدا بخش اُٹھ بیٹھا۔

”اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو۔ میں کہاں سے لاؤں گا۔ افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔“

”کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔“

”دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔“

”لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنہ گز مل جاتی تھی، اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟“

”اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔“

یہ کہہ کر خدا بخش اُٹھا۔

”لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ، میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔“

ہوٹل سے کھانا آیا دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ اِدھر اُدھر کمروں میں ٹہلتی رہی، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینوں کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کی دیکھی ہوئی فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہُوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی، جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہُوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آ کھڑی ہُوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہُوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہ اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔ جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہُوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اسکا اپنا گھر ہے، چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس سے کہا۔

”تم مجھے سو دفعہ بُلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہُوا کرتا۔“

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی، کہنے لگی۔

”نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔“

شنکر اس پر مسکرا دیا۔

”تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔“

”کیسی شرطیں؟“

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔

”کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟“

”نکاح اور شادی کیسی؟۔ نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔ چھوڑو ان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔“

”بولو کیا بات کروں؟“

”تم عورت ہو۔ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، اور کچھ بھی ہے۔“

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔

”صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

”جو دوسرے چاہتے ہیں۔“

شنکر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔“

”تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔“

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا۔

”میں سمجھ گئی ہوں۔“

”تو کہو، کیا ارادہ ہے۔“

”تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہُوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہو گی۔“

”تم غلط کہتی ہو۔ اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائینگی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔ تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟“

”سلطانہ ہی ہے۔“

شنکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔

”میرا نام شنکر ہے۔ یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں، چلو آؤ اندر چلیں۔“

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے، نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔

”شنکر میری ایک بات مانو گے؟“

شنکر نے جواباً کہا۔

”پہلے بات بتاؤ۔“

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔

”تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر۔“

”کہو کہو۔ رُک کیوں گئی ہو۔“

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا۔

”بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سُن ہی چکے ہو۔ قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دیدیا ہے۔“

شنکر نے یہ سن کر کہا۔

”تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔“

سلطانہ نے فوراً ہی کہا۔

”نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو۔“

شنکر مسکرایا۔

”میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں۔“

سلطانہ کے بُندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا۔

”کیا یہ بُندے تم مجھے دے سکتی ہو؟“

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔

”تم انھیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بُندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔“

اس پر شنکر نے کہا۔

”میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی، بولو، دیتی ہو۔“

”لے لو۔“

یہ کہہ کر سلطانہ نے بُندے اتار کر شنکر کو دے دیے۔ اس کے بعد افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔ سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہُوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا۔

”ساٹن کی کالی شلوار ہے۔ دیکھ لینا، شاید لمبی ہو۔ اب میں چلتا ہوں۔“

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہُوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔ سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہُوئی۔ بندوں اور اُس سودے کا جو افسوس اسے ہُوا تھا اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔ دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیض اور دوپٹہ لے کر آئی۔ تینوں کالے کپڑے اس نے جب پہن لیے تو دروازے پر دستک ہُوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”قمیض اور دوپٹہ تو رنگا ہُوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے۔ کب بنوائی؟“

سلطانہ نے جواب دیا۔

”آج ہی درزی لایا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں۔

”یہ بُندے تم نے کہاں سے لیے؟“

انوری نے جواب دیا۔

”آج ہی منگوائے ہیں۔“

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

کالی کلی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوکالی کلی

جب اُس نے اپنے دشمن کے سینے میں اپنا چھرا پیوست کیا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے کے زخم سے سرخ سرخ لہو کا چشمہ پھوٹنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں لہو کا چھوٹا سا حوض بن گیا۔ قاتل پاس کھڑا اس کی تعمیر دیکھتا رہا تھا۔ جب لہو کا آخری قطرہ باہر نکلا تو لہو کی حوض میں مقتول کی لاش ڈُوب گئی اور وہ پھر سے اُڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ننھے ننھے پرندے اُڑتے، چوں چوں کرتے حوض کے پاس آئے تو اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان کا باپ یہ لال لال پانی کا خوبصورت حوض کیسے بن گیا۔ نیچے تہ میں ایک قطرہ خون اپنے لہو کی آخری بوند جو اس نے چوری چوری اپنے دل کے خفیہ گوشے میں رکھ لی تھی تڑپنے لگی۔ اُس کا یہ رقص ایسا تھا جس میں زرق برق پشوازوں کا کوئی بھڑکیلا پن نہیں تھا، معصوم بچے کے سے چہل تھے۔ وہ اچھل کود رہی تھی اور اپنے دل ہی میں خوش ہو رہی تھی۔ اس کو اس بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ وہ چار چڑیاں جو حوض کے اُوپر بیقراری سے پھڑ پھڑاتی دائرہ بناتی اُڑ رہی ہیں ان کے دل ہانپ رہے ہیں اور بہت ممکن ہے وہ ہانپتے ہانپتے ان کے سینوں سے اُچھل کر حوض میں گر پڑیں۔ وہ اپنی خوشی میں مست تھی۔ اُوپر اُڑی ہوئی چڑیوں میں ایک چڑیا نے جو شکل و صورت کے اعتبار سے چڑا معلوم ہوتا تھا کہا

”تم رو رہی ہو؟“

چڑیا نے اپنی اڑان ہلکی کر دی، چنانچہ تیز ہوا میں لڑھکتے ہوئے اس نے اپنے ننھے سے نرم و نازک اور ریشم جیسے پر کو اپنی چونچ سے پھلا کر اپنی ایک آنکھ پونچھی اور جلدی سے اپنے دوسرے پروں کے اندر اس آنسو آلود پری کو چھپا لیا۔ دوسری آنکھ کے اس جل دیپ کو اس نے ایسے ہی ننھے سے مخملیں پر سے پھونک ماری، وہ فوراً راکھ بن کر حوض کی سرخ آنکھوں

میں سرمے کی تحریر بن کر تیرنے لگی۔ حوض کی یہ تبدیلی دیکھ کر باقی تین چڑیوں نے پلٹ کر چوتھی چڑیا کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں اس کی سرزنش کی اور ایک دم اپنے سارے پر سمیٹ لیے اور چشمِ زدن میں وہ حوض کے اندر تھیں۔ حوض کا لال لال پانی ایک لحظے کے لیے تھر تھرا اٹھا۔ اس نے زبردستی ان کی بند چونچوں میں اپنی بڑی چونچ سے اپنے خون کی ایک ایک بوند ڈالنے کی کوشش کی، جس طرح ماں باپ اپنے پیارے بچوں کے حلق میں چمچوں کے ذریعے سے دوا ٹپکاتے ہیں، مگر وہ نہ کھلیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے چنانچہ اس کی آنکھوں سے اتنا ہی سفید پانی بہہ نکلا جتنا اس حوض میں لال تھا۔ جو وہ قاتل اس ایک لال بوند کے بغیر، جو اس کے اوپر اڑ رہی تھی اور اس سفید پانی سمیت، جو وہ اس کے وجود میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے یہ سفید آنسو اور بہانے چاہے مگر وہ بالکل خشک تھے۔ ایک صرف اس کی آنکھوں کی بصارت باقی تھی۔ وہ اسی پر قانع ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے حوض کے پانی کا رنگ بدل رہا ہے۔ اس کے لیے یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی کہ جب قتل نہیں کیا گیا تھا۔ قتل کے بعد تو اُس نے سُنا تھا کہ سفید سے سفید خون بھی جیتا جاگتا سرخ ہو جاتا ہے۔ دن بدن حوض کا پانی نئی رنگ اختیار کرنے لگا شروع شروع میں تو وہ گرم گرم سرخ قرمزی تھا۔ تھوڑی دیر میں بھوسلا پن اس میں پیدا ہونے لگا یہ تبدیلی بڑی سست رفتار تھی۔ اُس نے سنا تھا کہ قدرت اٹل ہے وہ کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ سوچتا کہ یہ قدرت کیسی ہے جو اس کی اپنے عناصر سے تخلیق کی ہوئی چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اب اُسے کسی تصویر ساز کی پلیٹ بنا رہی ہے جس پر وہ ایک مرتبہ صاف اور شدھ رنگ لگا کر پھر اس پر سینکڑوں دوسرے رنگوں کی تہیں چڑھا دیتا ہے اور بہت مسرور ہوتا ہے۔ اس میں مسرت انگیز بات ہی کیا ہے اور اس بات کے لیے کہ ایک بے گناہ کو قتل کروا دینا؟۔ یہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ میں اگر اپنے قاتل کی جگہ ہوتا تو کیا کرتا؟۔ ہاں کیا کرتا؟ اسے اپنے ہاتھوں سے نقرئی تاروں والا ہار پہناتا۔ زربفت کی اس کی اچکن ہو، ہوخ سر تلے دار دستار اور اس طائر تازی پر سوار جس پر زربفت کی جھول ہو اور وہ اُس پر سوار ہو کر قدرت بانو کو دلھن بنا کر گھر لانے کے لیے روانہ ہو جائے۔ اس کے جلو میں صرف اس کے خون کے قطرے ہوں۔ وہ سوچتا کتنی شاندار سواری ہوتی جو آج تک کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ ایک بہت اونچے درخت پر اپنا گھونسلا بناتا جس میں حجلہ ءعروسی کو بٹھاتا۔ اس کا چہرہ حیا کے باعث رنگ برنگ کے پروں کے گھونگھٹ کی اوٹ میں ہوتا۔ وہ اس نقاب کو بہت ہولے ہولے اٹھاتا۔ جوں جوں نقاب اوپر اٹھتی، اس کا دل نفرت و حقارت سے لبریز ہوتا جاتا۔ اس کے انتقامی جذبے کی آگ اور زیادہ تیز ہوتی جاتی جیسے اس کی نقاب کے پر اس پر تیل نچڑ رہے ہوں لیکن وہ اس جذبے کو اپنے دل میں وہیں دبا دیتا جیسے وہ مرجھائے ہوئے پھولوں کی روکھی سوکھی اور بے کیف پتیاں ہیں جنھیں کئی ننھی ننھی ناگ سپنیوں نے پھونکیں مار مار کر ڈس دیا ہو۔ شبِ عروسی میں اس نے اپنی دُلہن سے بڑی پیار اور محبت بھری باتیں کیں، ایسی باتیں جن کو سننے کے بعد سب پرندوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ یہ ایسا کلام ہے جو اگر فرشتے اور حوریں بھی اپنے سازوں پر گائیں تو خود کو عاجز سمجھیں اور بربطوں کے تار جھنجھلا اُٹھیں کہ یہ نغمہ ہم سے کیوں ادا نہیں ہو سکتا۔ آخر کار فرشتوں نے اپنے حلق میں اپنی اپنی دُلہنوں کی مانگ کے سیندور بھر لیے اور مر گئے۔ حوروں نے اپنے بربط توڑ ڈالے اور ان کے باریک تاروں کا پھندا بنا کر خودکشی کر لی۔ اُس کو اپنے یہ افکار بہت پسند آئے تھے۔ اس لیے کہ یہ غیب سے آئے ہیں۔ چنانچہ اس نے گانا شروع کیا۔ اس کا الحان واقعی الہامی تھا۔ اگر پرندوں کے ہجوم کو وہ صرف چند نغمے سناتا تو وہ یقیناً بے خودی کے عالم میں زخمی طیور کے مانند پھڑ پھڑانے لگتیں اور اسی طرح پھڑ پھڑاتی پھڑ پھڑاتی قدرت کے اشجار کو پیاری ہو جاتیں۔ وہ اپنے تمام پتے اور اپنی کومل شاخوں کو نوچ کر ان کی لاشوں پر آرام سے رکھ دیتے۔ ادھر باغ کے سارے پھول اپنی تمام پتیاں ان پر نچھاور کر دیتے۔ کھلی اور ان کھلی کلیاں بھی خود کو اُن کی مجموعی تربت کی آرائش کے لیے پیش کر دیتیں۔ پھر تمام سرنگوں ہو کر انتہائی غم ناک سروں میں دھیمے دھیمے سروں میں شہیدوں کا نوحہ گاتیں۔ ساتوں آسمانوں کے تمام فرشتے اپنے اپنے آسمان کی کھڑکیاں کھول کر اس سوگ کے جشن کا نظارہ کرتے اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں جو ہلکی ہلکی پھوار کی صورت میں ان خاکی شہیدوں کی پھولوں سے لدی پھندی تربت کو نم آلودہ کر دیتیں تاکہ اس کی تازگی دیر تک رہے۔ سُنا ہے کہ یہ تربت دیر تک قائم رہی۔ پھول جب بالکل باسی ہو جاتے، پتے خشک ہو جاتے تو ان کی جگہ اپنے بدن سے نوچ نوچ کر آہستہ آہستہ اس تربت پر رکھ دیے جاتے۔ اُدھر دوسرے باغ میں جو اپنی خوبصورتی کے باعث تمام دنیا میں بہت مشہور تھا۔ ایک طاہر جس کا نام بلبل یعنی ہزار داستان ہے اپنے حسن اور اپنی خوش الحانی پر نازاں بلکہ یوں کہیے کہ مغرور تھا۔ باغ کی ہر کلی اس پر سو جان سے فدا تھی مگر وہ ان کو منہ نہیں لگاتا۔ اگر کبھی ازراہ تفریح وہ کبھی کسی کلی پر اپنی خوبصورت منقار کی ضرب لگا کر اُسے قدرت کے اصولوں کے خلاف پہلے ہی کھول دیتا تو اس غریب کا جی باغ باغ ہو جاتا، پر وہ شادی مرگ ہو جاتی۔ اور دل ہی دل میں دوسری کھلی ان کھلی کلیاں حسد اور رشک کے مارے جل بھن کر راکھ ہو جاتیں اور وہ کسی چٹان کی چوٹی کے سخت پتھر پر ہولے سے یوں بیٹھتا کہ اس پتھر کو اس کا بوجھ محسوس نہ ہو۔ اطمینان کر کے اس پتھر نے اُسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا ہے تو وہ موم کر دینے والا ایک حزنیہ نغمہ شروع کرتا۔ بہ فرط ادب اور تاثر کے باعث سرنگوں ہو جاتے۔ کلیاں سوچتیں کہ یہ کیا وجہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے التفات سے محروم رکھتا ہے۔ ہم میں سے اکثر جل جل کے بھسم ہو گئیں۔ پر اس کو ہماری کچھ پروا نہیں۔ ایک سفید کلی اپنے شبنمی آنسو پونچھ کر کہتی ہے

”ایسا نہ کہو بہن اس کو ہماری ہر ادا ناپسند ہے“

کالی کلی کہتی۔

”تو سفید جھوٹ بولتی ہے۔ میری طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر دیکھ۔ دونوں دیدے پھوڑ ڈالوں۔“

کاسنی کلی کو دُکھ ہوتا:

”ایسا کرو گی تو تم کہاں رہو گی؟“

سفید کلی طنزیہ انداز میں اس مغرور پرندے کی طرف سے جواب دیتی۔

”اس کے لیے دنیا کے تمام باغوں کی کلیوں کے منہ کھلے ہیں۔ وہ نیلے آسمان کے نیچے جہاں بھی چاہے اپنے حسین خیمے گاڑ سکتا ہے۔“

کالی کلی مسکراتی۔ یہ مسکراہٹ سنگ اسود کے چھوٹے سے کالے تریڑے کے مانند کھلتی۔

”سفید کلی نے ٹھیک کہا ہے۔ خواہ مجھے خوش کرنے کے لیے ہی کہا ہو۔ میں یہاں کا بادشاہ ہوں“

سفید کلی اور زیادہ نکھر گئی۔

”حضور! آپ شہنشاہ ہیں۔ اور ہم سب آپ کی کنیزیں۔“

کالی کلی نے زور سے اپنے پر پھڑ پھڑائے جیسے وہ بہت غصے میں ہے۔

”ہم میں مجھے شامل نہ کرو۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔“

جونہی کالی کلی کی زبان سے یہ گستاخانہ الفاظ نکلے، سب چڑیاں ڈر کے مارے پھڑ پھڑاتی ہوئی وہاں سے اُڑ گئیں۔ ایک صرف کالی کلی باقی رہ گئی۔ اُس نے آنکھ اٹھا کر بھی اس چٹان کو نہ دیکھا جس کے ایک کنگرے کی نوک پر وہ اکڑ کر کھڑا تھا۔ کالی کلی اس کے قدموں میں تھی۔ اپنی اس بے اعتنائی اور رعونت کے ساتھ۔ حسین و جمیل بلبل کو اس بے اعتنائی اور رعونت سے پہلی مرتبہ دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا، چٹان سے نیچے اُتر کر وہ ہولے ہولے جیسے ٹہل رہا ہے، کالی کلی کے قریب سے گزرا گویا وہ اس کا موقع دے رہا ہے کہ تم نے جو غلطی کی ہے درست کر لو۔ پر اُس نے اس فیاضانہ تحفے کو ٹھکرا دیا۔ اس پر بلبل اور جھنجھلایا اور مڑ کر کالی کلی سے مخاطب ہوا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے، تم نے مجھے پہچانا نہیں۔“

کالی کلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”ایسی تم میں کون سی خوبی ہے جو کوئی تمھیں یاد رکھے۔ تم ایک معمولی چڑے ہو، جو لاکھوں یہاں پڑے جھک مارتے ہیں“

بلبل سراپا عجز ہو گیا۔

”دیکھو، میں اس باغ کا تمام حسن تمہارے قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہوں“

کالی کلی کے ہونٹوں پر کالی طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”میں رنگوں کے بے ڈھب، بے جوڑ رنگوں کے ملاپ کو حسن نہیں کہہ سکتی۔ حسن میں یک رنگی اور یک آہنگی ہونی چاہیے۔“

”تم اگر حکم دو تو میں اپنی سرخ دم نوچ کر یہاں پھینک دوں گا۔“

”تمہاری سرخ دُم کے پر سرخاب کے پر تو نہیں ہو جائیں گے۔ رہنے دو اپنی دم میں۔ میری دُم دیکھتے رہا کرو، جو سنگ اسود کی طرح کالی ہے اور آبنوس کی طرح کالی اور چمکیلی۔“

یہ سُن کر وہ اور زیادہ جھنجھلا گیا اور سوچے سمجھے بغیر کالی کلی سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ کر معذرت طلب کرنے لگا،

”مجھے معاف کر دینا۔ باغ کی مغرور ترین حسینہ“!

کالی کلی چند لمحات بالکل خاموش رہی، پھر اُس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ رات کے گھپ اندھیرے میں اچانک دو دیے جل پڑے ہیں۔

”میں تمہاری کنیز ہوں پیارے بلبل“!

بُلبل نے چونچ کا ایک زبردست ٹھونگا مارا اور بڑی نفرت آمیز نا امیدی سے کہا۔

”جا، دُور ہو جا، میری نظروں سے۔ اور اپنے رنگ کی سیاہی میں ساری عمر اپنے دل کی سیاہی گھولتی رہ۔ سعادت حسن منٹو (دستخط) ۴ جنوری ۱۹۵۶ء (؟(

کبوتروں والا سائیں

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوکبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سرد دیہات کے تکیے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کُھدے ہوئے گڑھے میں بڑے بڑے اپلوں سے آگ لگا رہی ہے۔ صبح کے سرد اور مٹیالے دھندلکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھوں کو سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دوہرا کر کے، منہ قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے اُپلوں کے اندر پھونک

گھسیٹرنے کی کوشش کرتی ہے توزمین پر سے تھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہُوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آگئی ہے۔ اُپلوں کے اندر آگ سُلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔ مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سُلگا چکی ہے۔ یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اس کے پردادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے، ایک زمانے سے اُن کے قبضہ میں تھی۔ گاماسائیں کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی ایک تکیے کی مجاور تھی۔ گاماسائیں سارے گاؤں میں ہر دلعزیز تھا۔ ذات کا وہ کُمہار تھا مگر چونکہ اسے تکیے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ اس لیے اُس نے برتن بنانے چھوڑ دیئے تھے۔ لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں۔ بھنگ گھوٹنے کے لیے وہ سال بھر میں چھ کونڈیاں بنایا کرتا تھا جن کے متعلق بڑے فخر سے وہ یہ کہا کرتا تھا۔

”چوہدری لوہا ہے لوہا۔ فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاماسائیں کی یہ کونڈی دادا لے تو اس کا پوتا بھی اسی میں بھنگ گھوٹ کر پیے۔“

مرنے سے پہلے گاماسائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا جو اب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔ گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکیئے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے۔ گھوٹنے کے لیے گاماسائیں نہیں تھا پر اُس کے بہت سے چیلے چانٹے جو اَب سر اور بھویں منڈا کر سائیں بن گئے تھے، اس کے بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیواں کی سُلگائی ہُوئی آگ سُلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔ صبح اور شام کو تو خیر کافی رونق رہتی تھی، مگر دوپہر کو آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ اِدھر اُدھر کونے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی کابک تھے جن میں گاماسائیں کے ایک بہت پرانے دوست ابو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے۔ تکیئے کی دھوئیں بھری فضا میں ان سفید اور چتکبرے کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جس طرح تکیئے میں آنے والے لوگ شکل وصورت سے معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیواں کے بڑے لڑکے نے جھانجھ پہنا رکھے تھے بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔ مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبد الغفار تھا۔ اسکی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کر موقعہ دیکھنے کے لیے گاؤں میں آیا کرتا تھا اور گاماسائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی۔ جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اس کے نام میں تھانیداری کی بُو سُونگھ سکتی تھی مگر جب اس نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ خاصا تگڑا جوان تھا پر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برس میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا۔ یعنی ناک سے رینٹھ بہنے لگا اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا۔ پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی ہیں اور اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اسے ڈھارس ہُوئی کہ چلو یوں بھی تو کما ہی لے گا۔ کمانا ومانا کیا تھا۔ عبد الغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا، وہ کبھی اس لیے کہ اس کی ماں نے اس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی، جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ کبوتروں والا سائیں اسے اس لیے کہا جاتا تھا کہ اسے کبوتروں سے بہت پیار تھا۔ تکیئے میں جتنے کبوتر تھے ان کی دیکھ بھال ابو پہلوان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔ اس وقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹُوٹی ہُوئی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ باہر اس کی ماں آگ سُلگا رہی تھی۔ چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں اس لیے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے مگر تکیہ جو کہ گاؤں سے فاصلہ پر تھا ابھی تک آباد نہ ہوا تھا، البتہ دُور کونے میں مائی جیواں کی بکری زور زور سے ممیا رہی تھی۔ مائی جیواں آگ سُلگا کر بکری کے لیے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سُنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو اسے ایک اجنبی سر پر ٹھاٹا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا۔ پگڑی کے ایک پلو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا تھا۔ جب اس نے موٹی آواز میں

”مائی جیواں السلام علیکم“

کہا تو پگڑی کا کھردرا کپڑا اس کے منہ پر تین چار مرتبہ سکڑا اور پھیلا۔ مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کیے بغیر کہا

”وعلیکم السلام۔ آؤ بھائی بیٹھو۔ آگ تاپو۔“

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلگتی رہتی تھی۔ اجنبی اور وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیواں سے کہا۔

”ماں۔ اللہ بخشے گاماں سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا۔ اس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے بہت صدمہ ہوا۔ مجھے آسیب ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چمٹا تھا کہ اللہ کی پناہ، گاماسائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دُور ہو گئی۔“

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا۔

”میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں، ایک خاص بات کہنے کے لیے۔ اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اُس کی بات کوئی اور تو نہیں سُن رہا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا۔

”میں سُندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہُوں۔ پرسوں رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ مارنے والے ہیں۔ خون خرابہ ضرور ہو گا، اس لیے میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو دُور ہی رکھنا۔ میں نے سُنا ہے کہ گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا، ایسا نہ ہو کہ جوش مار اٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ تم ان کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو تو ٹھیک رہے گا۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ السلام علیکم۔“

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اُٹھا اور جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے باہر چلا گیا۔ سُندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا۔ اس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اُسی کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ بے شمار گیت اسکی بہادری اور بیباکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے۔ اس کا نام سُن کر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔ سُندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اس سے اپنی اچانک ملاقات کے من گھڑت قصے سُنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا۔ اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے۔ بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قد آور جوان ہے، بڑی بڑی مونچھوں والا۔ ان مونچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں ان کی مدد سے اُٹھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہو گا۔ بہر حال سب متفقہ طور پر اسکی طاقت اور بیباکی کے مُعترف تھے۔ جب مائی جیواں نے یہ سنا کہ سُندر جاٹ انکے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آرہا ہے تو اسکے آئے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکریہ ادا کر سکی۔ مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سُندر جاٹ کا ڈاکہ کیا معنی رکھتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب اس نے ساتھ والے گاؤں پر حملہ کیا تھا تو سکھی مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی تھی اور گاؤں کی سب سے سُندر اور چنچل چھوکری بھی ایسی گُم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ یہ بلا اب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں میں کسی اور کو نہ تھا۔ مائی جیواں نے سوچا کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے۔ چوہدری کے گھر خبر کر دے۔ لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے۔ پچھلے دنوں اس نے تھوڑا سا ساگ ان سے مانگا تھا تو انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ گھسیٹا رام حلوائی کو متنبہ کر دے۔ نہیں، وہ بھی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔ وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی۔ گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا۔ اس کے علاوہ اس نے سوچا اگر اس نے کسی کو ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا اور یوں سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی اور رحمان کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔ جب وہ سامنے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اسے عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا۔ اس کی یہ ہنسی آج خلافِ معمول معنی خیز تھی۔ مائی جیواں کو اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوشمندی کی نشانی ہے۔ جب وہ کوٹھڑی کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا۔

”ماں، یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟“

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا، اس لیے اس کی ماں جواب دیئے بغیر اندر چلی گئی اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی۔

”اے رحمان، اے رحمان اُٹھ اُٹھ۔“

بازو جھنجھوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور وہ جب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش آگیا تو اس کی ماں نے اس کو ساری بات سنا دی۔ رحمان کے تو اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بہت ڈرپوک تھا گو اس کی عمر اس وقت بائیس برس کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اُس میں ہمت اور شجاعت نام تک کو نہ تھی۔ سُندر جاٹ! اتنا بڑا ڈاکو، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا، پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لیے آرہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا بلکہ یوں کہیے کہ وہ اسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ رحمان کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بیباک شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ گاؤں کے سب جوان لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ بڑے بڑے ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑا دیتی تھی۔ چوہدری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دُور دُور سے اس کو نیچا دکھانے کے لیے آتے تھے مگر اس کی کلائی کسی سے بھی نہ مڑی تھی۔ وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا مگر اس کی یہ ساری اکڑفوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی جب اس نے دھان کے کھیت میں اس سے کہا۔

” فجے، گنڈا سنگھ کی کلائی مروڑ کر تُو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلہ میں کوئی آدمی نہیں رہا۔ آ میرے سامنے بیٹھ، میری کلائی پکڑ، ان دو انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ چھُڑا دُوں تو نیتی نام نہیں۔“

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اسکی طاقت اور شہزوری کے رُعب اور دبدبے میں آکر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائیگی۔ لیکن جب اس نے کئی آدمیوں کے سامنے اس کو مقابلے کی دعوت دی تو وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر پر چڑھ جاتی ہے اور اگر وہ اسکی دعوت قبول کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے۔ عورت ذات سے مقابلہ کرتے شرم تو نہیں آئی مردود کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے نیتی کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا۔ نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں، ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلائی فضل کی

گرفت سے آزاد ہوگئی۔ اس دن سے لیکر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔ ہاں، تو اس نیتی سے رحمان کو محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ ڈرپوک تھا اسی طرح اس کا پریم بھی ڈرپوک تھا۔ دُور سے دیکھ کر وہ اپنے دل کی ہوّس پوری کرتا تھا اور جب کبھی اس کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ حرفِ مدعا زبان پر لائے۔ مگر نیتی سب کچھ جانتی تھی۔ وہ کیا کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ پیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اس کے عشق میں گرفتار ہے، اس کے عشق میں کون گرفتار نہیں تھا؟ سب اس سے محبت کرتے تھے۔ اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ محبت کرنے کی خواہش البتہ اسکے دل میں اس قدر موجود تھی کہ بالکل اس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی جس کے متعلق ڈر رہا کرتا ہے کہ اب گِرا اور اب گِرا۔ وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان کی چوٹی پر پہنچ چکی تھی اور اب تمام گاؤں والے اس کی افتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی تھی۔ رحمان کو بھی اس اُفتاد کا یقین تھا مگر اس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں، نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔ جب رحمان دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہنچنے کے لیے تیار ہو کر تکیئے سے باہر نکلا تو اُسے راستے میں نیتی کا خیال آیا مگر اس وقت اُس نے یہ نہ سوچا کہ سُندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے۔ وہ دراصل نیتی کے تصور میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے پیار محبت کر رہا تھا کہ اسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا۔ البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا تو ایکا ایکی اس نے سوچا کہ نیتی کو تو بتا دینا چاہیے تھا کہ سندر جاٹ آرہا ہے۔ لیکن اب واپس کون جاتا۔ عبد الغفار یعنی کبوتروں والا سائیں تکیے سے باہر نکلا۔ اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کُرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ تکیے سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گزار دیتا تھا۔ شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو ان کے چلنے سے جو دھول اُڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آجاتی تھی۔ گاؤں اس کو پسند نہیں تھا۔ اجاڑ اور سنسان جگہوں سے اسے غیر محسوس طور پر محبت تھی یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے۔ جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کیلیے دعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے، نوجوان چھوکریاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے

''ماہیا''

کا دل کیسا ہے۔ عبد الغفار ان سوالیوں کو اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا اس لیے کہ اسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں، لیکن لوگ جو اس کے پاس سوال لیکر آتے تھے اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ عبد الغفار مختلف کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اس کنویں کے پاس پہنچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا۔ اس کنویں کی حالت بہت ابتر تھی۔ اس بوڑھے برگد کے پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر اس میں جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا کہ بہت سی مکڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بُن دیا ہے۔ اس کنویں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر غبد الغفار بیٹھ گیا اور دوسروں کی اُداس فضا میں اس نے اپنے وجود سے اور بھی اداسی پیدا کر دی۔ دفعتاً اُڑتی ہوئی چیلوں کی اُداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اُٹھی اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ نیتی گا رہی تھی ماہی مرے نے باگ لوایا چمپا، میوا خوب کِھلایا اَسی تے لوایاں کھٹیاں وے راتیں سون نہ دیندیاں اکھیاں وے اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی میرے چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے، اس میں ہر طرح کے پھول اُگائے ہیں، چمپا، میوا وغیرہ کھلائے ہیں۔ اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں۔ رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں۔ کتنی انکساری برتی گئی ہے۔ معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے، لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں اور پھر شب جوابی کا گلہ کِس خُوبی سے کیا گیا ہے۔ گو عبد الغفار میں نازک جذبات بالکل نہیں تھے پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اس کو چونکا دیا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے پہچان لیا تھا کہ یہ آواز نیتی کی ہے۔ گاتی گاتی نیتی کنویں کی طرف آنکلی۔ غفار کو دیکھ کر وہ دوڑی ہُوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

''اوہ، غفار سائیں۔ تم۔ اوہ، مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں۔ اور اس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں۔ دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بُوجھ لی اور۔ لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو۔ اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چُھپا تھوڑی رہتا ہے۔''

وہ اُس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ خلافِ معمول کبوتروں والا سائیں مسکرایا مگر نیتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی، اس کی نگاہیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں۔ کُھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردن اُٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا۔

''غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں۔ میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہُوں۔ تم میرے دل کا حال کیا سمجھو گے!۔ اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی۔ کیوں غفار سائیں۔ ارے تم بولتے کیوں نہیں۔ کچھ بولو۔ کچھ کہو۔ اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی۔ تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں۔ تم سُنتے سُنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی۔''

یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہوگئی اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھ گئی۔ اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایکا ایکی عبد الغفار سے پوچھا۔

“سائیں۔ میں کب تھکوں گی؟”

عبدالغفار کے منہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا۔ اس نے کنویں کے اندر جُھک کر دیکھتے ہُوئے جواب دیا۔

“بہت جلد۔”

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس پر نیتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا۔

“کب؟۔ کب؟۔ سائیں کب؟”

عبدالغفار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور ببول کے جُھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ نیتی کچھ دیر کنویں کے پاس سوچتی رہی پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا اُدھر چل دی۔ وہ رات جس میں سُندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آ رہا تھا۔ مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی۔ ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ رحمان کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا۔ ابو پہلوان کبھی کبھی تکیے میں آگ تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا، چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں ہی نے کھلایا تھا۔ تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اس کو ہلکی سی آہٹ بھی سُنائی نہ دی۔ جب رات گزر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سُندر جاٹ کی بابت سوچتی سوچتی سو گئی۔ چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوئی تھی اس لیے صبح بہت دیر کے بعد جاگی۔ کوٹھڑی سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ ابو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکیے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا۔

“ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ یہ موا بڑھاپا بڑا تنگ کر رہا ہے۔ صبح سوئی ہوں اور اب اُٹھی ہوں۔ ہاں تم سناؤ کل کہاں رہے ہو؟”

ابو نے جواب دیا۔

“گاؤں میں۔”

اس پر مائی جیواں نے کہا۔

“کوئی تازہ خبر سناؤ۔”

ابو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر اور جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا۔

“آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گام چمار کی وہ لونڈیا۔ کیا نام ہے اس کا؟۔ ہاں وہ نیتی کہیں بھاگ گئی ہے؟۔ میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا۔ حرامزادی نے سارا گاؤں سر پر اٹھا رکھا تھا۔”

“کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اُٹھا کر لے گیا ہے؟”

“جانے میری بلا۔ لیکن میرے خیال میں تو وہ خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔”

مائی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا۔ سُندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا پر ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سُندر جاٹ سے متعلق ہو جائے۔ چنانچہ وہ ان تمام لوگوں سے نیتی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ تکیے میں آتے جاتے رہے لیکن جو کچھ ابو نے بتایا تھا اس سے زیادہ اسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔ شام کو رحمان لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی ماں سے سُندر جاٹ کے ڈاکہ کے متعلق پوچھا۔ اس پر مائی جیواں نے کہا۔

“سندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا پر نیتی کہیں غائب ہو گئی ہے۔ ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔”

رحمان کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں دس کوس اور چلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا، اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر مائی جیواں نے تشویشناک لہجہ میں اس سے پوچھا۔

“کیا ہوا بیٹا۔”

رحمان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔

“کچھ نہیں ماں۔ تھک گیا ہوں۔”

“اور نیتی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟”

رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا۔ رحمان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا

“کیا کہا تھا اس نے تجھ سے؟”

عبد الغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔

”کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں۔ پر اب وہ تھک جائے گی۔“

رحمان نے تیزی سے پوچھا۔

”کیسے؟“

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہُوئی۔

”مجھے کیا معلوم؟۔ سُندر جاٹ جانے اور وہ جانے۔“

یہ سُن کر رحمان کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھا گئی اور مائی جیواں کی جُھریاں زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔

کتاب کا خلاصہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوکتاب کا خلاصہ

سردیوں میں انور ممٹی پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ اس کا چھوٹا بھانجا اس کے ساتھ تھا۔ چونکہ انور کے والد کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور وہ دیر سے واپس آنے والے تھے اس لیے وہ پوری آزادی اور بڑی بے پروائی سے پتنگ بازی میں مشغول تھا۔ پیچ ڈھیل کا تھا۔ انور بڑے زوروں سے اپنی مانگ پائی پتنگ کو ڈور پلا رہا تھا۔ اس کے بھانجے نے جس کا چھوٹا سا دل دھک دھک کر رہا تھا اور جس کی آنکھیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں انور سے کہا۔

”ماموں جان کھینچ کے پیٹ کاٹ لیجیے۔“

مگر وہ دھڑا دھڑ ڈور پلاتا رہا۔ نیچے کھلے کوٹھے پر انور کی بہن سہیلیوں کے ساتھ دھوپ سینک رہی تھی۔ سب کشیدہ کاری میں مصروف تھیں۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ انور کی بہن شمیم انور سے دو برس بڑی تھی۔ کشیدہ کاری اور سینے پرونے کے کام میں ماہر۔ اسی لیے گلی کی اکثر لڑکیاں اس کے پاس آتی تھیں اور گھنٹوں بیٹھی کام سیکھتی رہتی تھیں۔ ایک ہندو لڑکی جس کا نام بملا تھا بہت دور سے آتی تھی۔ اس کا گھر قریباً دو میل پرے تھا۔ لیکن وہ ہر روز بڑی باقاعدگی سے آتی اور بڑے انہاک سے کشیدہ کاری کے نئے نئے ڈیزائن سیکھا کرتی تھی۔ بملا کا باپ اسکول ماسٹر تھا۔ بملا ابھی چھوٹی بچی ہی تھی کہ اس کی ماں کا دیہانت ہو گیا۔ بملا کا باپ لالہ ہری چرن چاہتا تو بڑی آسانی سے دوسری شادی کر سکتا تھا مگر اس کو بملا کا خیال تھا، چنانچہ وہ رنڈوا ہی رہا اور بڑے پیار محبت سے اپنی بچی کو پال پوس کر بڑا کیا۔ اب بملا سولہ برس کی تھی۔ سانولے رنگ کی دبلی پتلی لڑکی۔ خاموش خاموش بہت کم باتیں کرنے والی۔ بڑی شرمیلی۔ صبح دس بجے آتی۔ آپا شیمم کو پرنام کرتی اور اپنا تھیلا کھول کر کام میں مشغول ہو جاتی۔ انور اٹھارہ برس کا تھا۔ اس کو تمام لڑکیوں میں سے صرف سعیدہ سے ہلکی سی دلچسپی تھی، لیکن یہ ہلکی سی دلچسپی کوئی اور صورت اختیار نہیں کر سکی تھی اس لیے کہ اس کی بہن اس کو لڑکیوں میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اگر وہ کبھی ایک لحظے کے لیے ان کے پاس آ بیٹھتا تو آپا شمیم فوراً ہی اس کو حکم دیتیں،

”انور اٹھو، تمہارا یہاں کوئی کام نہیں“

اور انور کو اس حکم کی فوری تعمیل کرنی پڑتی۔ بملا البتہ کبھی کبھی انور کو بلاتی تھی، ناول لینے کے لیے۔ اس نے شمیم سے کہا تھا۔

”گھر میں میرا جی نہیں لگتا۔ پتا جی باہر شطرنج کھیلنے چلے جاتے ہیں۔ میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ انور بھائی سے کہئے، مجھے ناول دے دیا کریں پڑھنے کے لیے۔“

پہلے تو بملا، شمیم کے ذریعے سے ناول لیتی رہی پھر کچھ عرصے کے بعد اس نے براہ راست انور سے مانگنے شروع کر دیے۔ انور کو بملا بڑی عجیب و غریب لڑکی لگتی تھی۔ یعنی ایسی جو بڑے غور سے دیکھنے پر دکھائی دیتی تھی۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں تو وہ بالکل غائب ہو جاتی تھی۔ بیٹھک میں جب وہ انور سے نیا ناول مانگنے آتی تو اس کو اس کی آمد کا اس وقت پتا چلتا جب وہ اس کے پاس آ کر دھیمی آواز میں کہتی۔

”انور صاحب۔ یہ لیجئے اپنا ناول۔ شکریہ۔“

انور اس کی طرف دیکھتا۔ اس کے دماغ میں عجیب و غریب تشبیہہ بُھدک اٹھتی۔

”یہ لڑکی تو ایسی ہے جیسے کتاب کا خلاصہ۔“

بملا اور کوئی بات نہ کرتی۔ پرانا ناول واپس کر کے نیا ناول لیتی اور نمستے کر کے چلی جاتی۔ انور اس کے متعلق چند لمحات سوچتا، اس کے بعد وہ اسکے دماغ سے نکل جاتی۔ لیکن انور نے ایک بات ضرور محسوس کی تھی کہ بملا نے ایک دو بار اس سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر کہتے کہتے رک گئی تھی۔ انور سوچتا۔

“کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے ؟”

اس کا جواب اس کا دماغ یوں دیتا۔

“کچھ بھی نہیں۔ مجھ سے وہ کیا کہنا چاہتی ہو گی بھلا؟”

انور ممٹی پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ پیچ ڈھیل کا تھا، خوب ڈور پلا رہا تھا۔ دفعتہً اس کی بہن شمیم کی گھبرائی ہوئی آواز۔

“انور۔ انور۔ اباجی آ گئے”!

انور کو اور کچھ نہ سوجھا۔ ہاتھ سے ڈور توڑی اور ممٹی پر سے نیچے کود پڑا۔ وہ کاٹا، وہ کاٹا کا شور بلند ہوا۔ انور کا گھٹنا بڑے زوروں سے چھل گیا تھا۔ ایک اس کو اس کا دکھ تھا اس پر اُس کے حریف فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔ لنگڑاتا لنگڑاتا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ گھٹنے کو دیکھا تو اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ بملا سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتارا، کنارے پر سے تھوڑا سا پھاڑا اور پٹی بنا کر انور کے گھٹنے پر باندھ دیا۔ انور اس وقت اپنے پتنگ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ میدان اس کے ہاتھ رہے گا۔ لیکن اس کے باپ کی بے وقت آمد نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اتنے بڑھے ہوئے پتنگ کا خاتمہ کر دے۔ حریفوں کے نعرے ابھی تک گونج رہے تھے۔ اس نے غصہ آمیز آواز میں اپنی بہن سے کہا۔

“اباجی کو بھی اسی وقت آنا تھا۔”

شمیم مسکرائی۔

“وہ کب آئے ہیں۔”

انور چلایا۔

“کیا کہا؟”

شمیم ہنسی۔

“میں نے تم سے مذاق کیا تھا۔”

انور برس پڑا۔

“میرا بیڑا غرق کرا کے آپ ہنس رہی ہیں۔ اچھا مذاق ہے۔ ایک میرا اتنا بڑھا ہوا پتنگ غارت ہوا۔ لوگوں کی آوازے سنے۔ اور گھٹنا الگ زخمی ہوا۔”

یہ کہہ کر انور نے اپنے گھٹنے کی طرف دیکھا۔ سفید ململ کی پٹی بندھی تھی۔ اب اس کو یہ یاد آیا کہ یہ پٹی بملا نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر اس کے باندھی تھی۔ اس نے شکر گزار آنکھوں سے بملا کو دیکھا اور اسکو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس کے زخم کے درد کو محسوس کر رہی ہے۔ بملا، شمیم سے مخاطب ہو۔

“آپ آپ نے بہت ظلم کیا۔ زیادہ چوٹ آ جاتی تو۔”

وہ کچھ اور کہتے کہتے رک گئی اور کشیدہ کاڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ انور کی نگاہ بملا سے ہٹ کر سعیدہ پر پڑی۔ سفید پلاوور میں وہ اسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ انور اس سے مخاطب ہوا۔

“سعیدہ تم ہی بتاؤ یہ مذاق اچھا تھا۔ ہنسی میں پھنسی ہو جاتی تو؟”

شمیم نے اسے ڈانٹ دیا۔

“جاؤ انور تمہارا یہاں کوئی کام نہیں۔”

انور نے ایک نگاہ سعیدہ پر ڈالی۔ بہت اچھا۔ کہہ کر اٹھا اور لنگڑاتا لنگڑاتا پھر ممٹی پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر پتنگ اڑائے۔ غصے میں کھینچ کے ہاتھ مار کر قریباً ایک درجن پتنگ کاٹے اور نیچے اتر آیا۔ گھٹنے میں درد تھا۔ بیٹھک میں صوفے پر لیٹ گیا اور اوپر کمبل ڈال لیا۔ تھوڑی دیر اپنی فتوحات کے متعلق سوچا اور سو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اس کو آواز سنائی دی جیسے کوئی اسے بلا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں، دیکھا سامنے بملا کھڑی تھی۔ مرجھائی ہوئی۔ کچھ سمٹی ہوئی۔ انور نے لیٹے لیٹے پوچھا

“کیا ہے بملا؟”

“جی، میں آپ سے کچھ۔”

بملا رک گئی۔

“جی میں آپ سے کوئی۔ کوئی نئی کتاب دیجیے۔”

انور نے کہا۔

“میرے گھٹنے میں زوروں کا درد ہے۔ وہ جو سامنے الماری ہے اسے کھول کر جو کتاب تمہیں پسند ہو لے لو۔”

بملا چند لمحات کھڑی رہی، پھر چونکی

”جی ؟“

انور نے اس کو غور سے دیکھا۔ اس دوپٹے کے پیچھے جس میں سے بملا نے پٹی پھاڑی تھی، بڑی مریل قسم کی چھاتیاں دھڑک رہی تھیں۔ انور کو اس پر ترس آیا۔ اس کی شکل وصورت، اس کے خدوخال ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ اس کو دیکھ کر انور کے دل ودماغ میں ہمیشہ رحم کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ اس کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ یہ کہا۔

”پٹی باندھنے کا شکریہ“!

بملا نے کچھ کہے بغیر الماری کا رخ کیا اور اسے کھول کر کتابیں دیکھنے لگی۔ انور کے دماغ میں وہ تشبیہہ پھر پھد کی

”یہ کتاب نہیں، کتاب کا خلاصہ ہے۔ بہت ہی ردی کاغذوں پر چھپا ہوا“!

بملا نے ایک بار انور کو کنکھیوں سے دیکھا مگر جب اسے متوجہ پایا تو اس کی طرف پیٹھ کرلی۔ کچھ دیر کتابیں دیکھیں۔ ایک منتخب کی، الماری کو بند کیا، انور کے پاس آئی اور

”میں یہ لے چلی ہوں“

کہہ کر چلی گئی۔ انور نے بملا کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر اس کو سعیدہ کے سفید پُل اوور کا خیال آتا رہا۔

”پل اوور پہننے سے جسم کے خط کتنے واضح ہو جاتے ہیں۔ سعیدہ کا سینہ اور اس بملا کی مریل چھاتیاں۔ جیسے ان کا دودھ الگ کر کے صرف پانی رہنے دیا گیا ہے۔ سعیدہ کے گھنگھریالے بال۔ کم بخت نے اپنے ماتھے کے زخم کے نشان کو چھپانے کا کیا ڈھنگ نکالا ہے۔ بل کھاتی ہوئی ایک لٹ چھوڑ دیتی ہے اس پر۔ اور بملا۔ جانے کیا تکلیف ہے اسے۔ آج بھی کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ مگر مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ شاید اس کا انداز ہی کچھ اس قسم کا ہو۔ ہمیشہ کتاب اسی طرح مانگتی ہے جیسے کوئی مدد مانگ رہی ہے۔ کوئی سہارا ڈھونڈ رہی ہے۔ سعیدہ ماشاء اللہ آج سفید پل اوور میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ یہ قیامت ڈھانا کیا بکواس ہے۔ قیامت تو ہر چیز کا خاتمہ ہے اور سعیدہ تو ابھی میری زندگی میں شروع ہوئی ہے۔ بملا۔ بملا۔ بھئی میری سمجھ میں نہیں آئی یہ لڑکی۔ باپ تو اس کو بہت پیار کرتا ہے۔ اسی کی خاطر اس نے دوسری شادی نہ کی۔ شاید ان کو کوئی مالی تکلیف ہو۔ لیکن گھر تو خاصا اچھا تھا۔ ایک ہی پلنگ تھا لیکن بڑا شاندار۔ صوفہ سیٹ بھی برا نہیں تھا۔ اور جو کھانا میں نے کھایا تھا اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔ سعیدہ کا گھر تو بہت ہی امیرانہ ہے۔ بڑے رئیس کی لڑکی ہے۔ اس ریاست کی ایسی تیسی۔ یہی تو بہت بڑی مصیبت ہے ورنہ۔ لیکن چھوڑو جی۔ سعیدہ جوان ہے، کل کلاں بیاہ دی جائے گی۔ مجھے خدا معلوم کتنے برس لگیں گے۔ پوری تعلیم حاصل کرنے میں۔ بی اے۔ بی اے کے بعد ولایت۔ میم ؟۔ دیکھیں !۔ لیکن سفید پل اوور خوب تھا“!

انور کے دماغ میں اسی قسم کے مخلوط خیالات آتے رہے، اس کے بعد وہ دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ دوسرے روز بملا نہ آئی مگر انور نے اس کی غیر حاضری کو کچھ زیادہ محسوس نہ کیا، بس صرف اتنا دیکھا کہ وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں نہیں ہے۔ شاید ہو، لیکن اگلے روز جب بملا آئی تو لڑکیوں نے اس سے پوچھا۔

”بملا تم کل کیوں نہ آئیں۔“

بملا اور زیادہ مرجھائی ہوئی تھی، اور زیادہ مختصر ہو گئی تھی جیسے کسی نے رندہ پھیر کر اس کو ہر طرف سے چھوٹا اور پتلا کر دیا ہے۔ اس کا سانولا رنگ عجب قسم کی دردناک زردی اختیار کر گیا تھا۔ لڑکیوں کا سوال سن کر اس نے انور کی طرف دیکھا جو گملوں میں پانی دے رہا تھا اور تھیلا کھول کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کل پتا جی۔ کل پتا جی بیمار تھے۔“

شمیم نے افسوس ظاہر کیا اور پوچھا۔

”کیا تکلیف تھی انھیں ؟“

بملا نے انور کی طرف دیکھا۔ چونکہ وہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس لیے نگاہیں دوسری طرف کرلیں اور کہا

”تکلیف۔ معلوم نہیں کیا تکلیف تھی“

پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اپنی چیزیں نکالیں۔

”میں تو نہیں سمجھتی۔“

انور نے لوٹا منڈیر پر رکھا اور بملا سے مخاطب ہوا

”کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیا ہوتا۔“

بملا نے انور کو بڑی تیز نگاہوں سے دیکھا۔

”ان کا روگ ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔“

انور کو ایسا محسوس ہوا کہ بملا نے اس سے یہ کہا ہے۔

"ان کا روگ تم سمجھ سکتے ہو۔"

وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سعیدہ کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ وہ بملا سے کہہ رہی تھی۔

"خالو جان کے پاس جائیں وہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ یوں چٹکیوں میں سب کچھ بتا دیں گے۔"

سعیدہ نے چٹکی بجائی تھی مگر بجی نہیں تھی۔ انور نے اس سے کہا

"سعیدہ تم سے چٹکی کبھی نہیں بجے گی۔ فضول کوشش نہ کیا کرو۔"

سعیدہ شرما گئی، آج کا پل اوور سیاہ تھا۔ انور نے سوچا۔

"کم بخت پر ہر رنگ کِھلتا ہے۔ لیکن کتنے پُل اوور ہیں اس کے پاس؟۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بنتی ہی رہتی ہے۔ سویٹروں اور پل اووروں کا خبط ہے۔ اس سے میری شادی ہو جائے تو مزے آجائیں، پل اوور ہی پل اوور۔ دوست یار خوب جلیں۔ لیکن یہ بملا کیوں آج راکھ کی ڈھیر سی لگتی ہے۔ سعیدہ شرما گئی تھی۔ یہ شرمانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ چٹکی بجانا سیکھ لے مجھ سے۔ مجھ سے نہیں تو کسی اور سے۔ لیکن بہترین چٹکی بجانے والا ہوں۔"

یہ سب کچھ اس نے ایک سیکنڈ کے عرصے میں سوچا۔ سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ انور نے اس سے کہا۔

"دیکھئے چٹکی یوں بجایا کرتے ہیں۔"

اور اس نے بڑے زور سے چٹکی بجائی۔ اتفاقاً اس کی نگاہ بملا پر پڑی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی مردنی طاری تھی۔ انور کے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھر آئے۔

"بملا تم پتا جی سے کہو کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لیں۔ ان کے سوا تمہارا اور کون ہے؟"

یہ سن کر بملا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زور سے دونوں ہونٹ بھینچے اور انتہائی ضبط کے باوجود زار و قطار روتی، برساتی کی طرف دوڑ گئی۔ ساری لڑکیاں کام چھوڑ کر اس کی طرف بھاگیں انور نے برساتی میں جانا مناسب نہ سمجھا اور نیچے بیٹھک میں چلا گیا۔ بملا کے بارے میں اس نے سوچنے کی کوشش کی مگر اس کے دماغ نے اسکی رہبری نہ کی۔ وہ بملا کے دکھ درد کا صحیح تجزیہ نہ کر سکا وہ صرف اتنا سوچ سکا کہ اس کو صرف اس بات کا غم ہے کہ اس کی ماں زندہ نہیں۔ شام کو انور نے اپنی بہن سے بملا کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"معلوم نہیں کیا دکھ ہے بیچاری کو۔ اپنے باپ کا بار بار ذکر کرتی تھی کہ ان کو جانے کیا روگ ہے اور بس"!

سعیدہ پاس کھڑی تھی۔ سیاہ پل اوور پہنے۔ اس کی جیتی جاگتی چھاتیاں آبنوسی گولوں کی صورت میں اس کے سفید نُنون کے دوپٹے کی پیچھے بڑا دلکش تضاد پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا لگا تھا جیسے سایہ بٹوں پر ان کی چمک چھپانے کے لیے کسی مکڑی نے مہین سا جالا بن دیا ہے۔ انور بملا کو بھول گیا اور سعیدہ سے باتیں کرنے لگا۔ سعیدہ نے اس سے کوئی دلچسپی نہ لی اور آپا شمیم کو سلام کر کے چلی گئی۔ انور بیٹھک میں کالج کا کام کرنے بیٹھا تو اسے بملا کا خیال آیا۔

"کیسی لڑکی ہے؟۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے پٹی باندھی۔ اپنا دوپٹہ پھاڑ کر۔ آج میں نے کہا، پتا جی کے سوا تمہارا کون ہے تو اس لیے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ اور جب میں گملوں میں پانی دے رہا تھا تو بملا کی اس بات سے کہ ان کا روگ ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا اس نے کیوں یہ محسوس کیا تھا کہ بملا نے اس کے بجائے اس سے یہ کہا ہے، ان کا روگ تم سمجھ سکتے ہو۔ لیکن میں کیسے سمجھ سکتا ہوں۔ کیا سمجھ سکتا ہوں۔ وہ مجھے ٹھیک طور پر سمجھاتی کیوں نہیں، یعنی اگر وہ کچھ سمجھانا ہی چاہتی ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تھا تو اس کی نگاہوں میں اتنی تیزی کیوں تھی۔ اب خیال کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میری ذہانت و فراست پر لعنت بھیج رہی تھی۔ لیکن کیوں؟۔ ہٹاؤ جی۔ سعیدہ۔ ہاں وہ سیاہ پل اوور۔ سفید نُنوں کا ہوائی دوپٹہ۔ اور۔ لیکن مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ جانے کس کا مال ہے۔ خیر کچھ بھی ہو۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر اس پر خوبصورتی ختم تو نہیں ہو گئی۔"

اگلے روز بملا نہ آئی۔ انور کے گھر میں سب متفکر تھے۔ دعائیں کرتے تھے کہ خدا اس کے باپ کو اس کے سر پر سلامت رکھے۔ شمیم کو بملا بے حد پسند تھی۔ اس لیے کہ وہ خاموشی پسند اور ذہین تھی۔ باریک سے باریک بات فوراً سمجھ جاتی تھی، چنانچہ وہ سارا دن وقفوں کے بعد اس کو یاد کرتی رہی۔ انور کی ماں نے تو انور سے کہا کہ وہ سائیکل پر جائے اور بملا کے باپ کی خیریت دریافت کر کے آئے۔ انور گیا۔ بملا ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اوندھی لیٹی تھی۔ سانس کا اتار چڑھاؤ تیز تھا۔ انور نے ہولے سے پکارا تو کوئی رد عمل نہ ہوا۔ ذرا بلند آواز میں کہا۔

"بملا۔"

تو وہ چونکی کروٹ بدل کر اس نے انور کو دیکھا۔ انور نے نمستے کی۔ بملا نے ہاتھ جوڑ کر اس کا جواب دیا۔ انور نے دیکھا کہ بملا کی آنکھیں میلی تھیں، جیسے وہ روتی رہی تھی اور اس نے اپنے آنسو خشک نہیں کیے تھے۔ پلنگ پر سے اٹھ کر اس نے انور کو کرسی پیش کی اور خود فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گئی۔ انور نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد

”وہاں سب کو بہت فکر تھی۔ پتا جی کہاں ہیں ؟“

بملا کے مرجھائے ہوئے ہونٹ کھلے اور اس نے کھوکھلی آواز میں صرف اتنا کہا

”پتا۔“!

انور نے پوچھا۔

”طبیعت کیسی ہے ان کی۔“

”اچھی ہے۔“

بملا کی آواز اس کی آواز نہیں تھی۔

”تم آج نہیں آئیں تو سب کو بڑی تشویش ہوئی۔ امی جان نے مجھ سے کہا، سائیکل پر جاؤ اور پتا لے کر آؤ۔ لالہ جی کہاں ہیں ؟“

”شطرنج کھیلنے گئے ہیں۔“

”تم آج کیوں نہیں آئیں ؟“

”میں ؟“

یہ کہہ کر بملا رک گئی۔ تھوڑے وقفے کے بعد بولی

”میں اب نہیں آسکوں گی،۔ مجھے۔ مجھے ایک کام مل گیا ہے۔“

انور نے پوچھا۔

”کیسا کام ؟“

بملا نے ایک آہ بھری

”کل ہی معلوم ہوا ہے۔ جانے کیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے کانپی۔

”ٹھیک ہے، جو کچھ بھی ہے ٹھیک ہے۔“

پھر وہ جیسے اپنے اندر ڈوب گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر انور نے اکتا کر پوچھا۔

”میں ان سے کیا کہوں ؟“

”بملا چونکی، کیا؟“

انور نے اپنے الفاظ دہرائے۔

”میں ان سے کیا کہوں ؟“

”اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سب کو نمستے“!

انور کرسی پر سے اٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر بملا کو نمستے کی۔ بملا نے اس کا جواب دیا مگر انور کھڑا رہا۔ بملا، خلا میں دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد انور اس سے مخاطب ہوا۔

”بملا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم نے مجھ سے کئی بار کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر کہہ نہ سکیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں۔“

بملا کے ہونٹوں پر ایک زخم خوردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انور اپنی بات مکمل نہ کر سکا، بملا اٹھی۔ کھڑکی کے ساتھ لگ کر اس نے نیچے بڑی بدرو کی طرف دیکھا اور انور سے کہا۔

”جو میں کہہ نہ سکی، تم سمجھ نہ سکے، اب کہنے اور سمجھنے سے بہت پرے چلا گیا ہے۔ تم جاؤ، میں سونا چاہتی ہوں۔“

انور چلا گیا۔ بملا پھر نہ آئی۔ قریباً دس مہینے بعد اخباروں میں یہ سنسنی پھیلانے والی خبر شائع ہوئی کہ بی سڑک کی بدرو میں ایک نوزائیدہ بچہ مرا ہوا پایا گیا۔ تحقیقات کی گئیں تو معلوم ہوا کہ بچہ لالہ ہری چرن اسکول ماسٹر کی لڑکی بملا کا تھا اور بچے کا باپ خود لالہ ہری چرن تھا۔ سب پر سکتہ چھا گیا۔ انور نے سوچا

”تو ساری کتاب کا خلاصہ یہ تھا۔“

کتے کی دعا

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو کتے کی دعا

”آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر یہ واقعہ جو میں آپ کو سنانے والا ہوں، بالکل صحیح ہے۔“

یہ کہہ کر شیخ صاحب نے بیڑی سلگائی۔ دو تین زور کے کش لے کر اسے پھینک دیا اور اپنی داستان سنانا شروع کی۔ شیخ صاحب کے مزاج سے ہم واقف تھے، اس لیے ہم خاموشی سے سنتے رہے۔ درمیان میں ان کو کہیں بھی نہ ٹوکا۔ آپ نے واقعہ یوں بیان کرنا شروع کیا۔

”گولڈی میرے پاس پندرہ برس سے تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کا رنگ سنہری مائل بھوسلا تھا۔ بہت ہی حسین کتا تھا جب میں صبح اس کے ساتھ باغ کی سیر کو نکلتا تو لوگ اسکو دیکھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لارنس گارڈن کے باہر میں اسے کھڑا کر دیتا۔

”گولڈی کھڑے رہنا یہاں۔ میں ابھی آتا ہوں“

یہ کہہ کر میں باغ کے اندر چلا جاتا۔ گھوم پھر کر آدھے گھنٹے کے بعد واپس آتا تو گولڈی وہیں اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے کھڑا ہوتا۔ اسپنیل ذات کے کتے عام طور پر بڑے اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوتے ہیں۔ مگر میرے گولڈی میں یہ صفات بہت نمایاں تھیں۔ جب تک اسکو اپنے ہاتھ سے کھانا نہ دوں نہیں کھاتا تھا۔ دوست یاروں نے میرا مان توڑنے کے لیے لاکھوں جتن کیے مگر گولڈی نے ان کے ہاتھ سے ایک دانہ تک نہ کھایا۔ ایک روز اتفاق کی بات ہے کہ میں لارنس کے باہر اسے چھوڑ کر اندر گیا تو ایک دوست مل گیا۔ گھومتے گھومتے کافی دیر ہو گئی۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنی کوٹھی لے گیا۔ مجھے شطرنج کھیلنے کا مرض تھا۔ بازی شروع ہوئی تو میں دنیا مافیا بھول گیا۔ کئی گھنٹے بیت گئے۔ دفعتہً مجھے گولڈی کا خیال آیا۔ بازی چھوڑ کر لارنس کے گیٹ کی طرف بھاگا۔ گولڈی وہیں اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے کھڑا تھا۔ مجھے اس نے عجیب نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہے

”دوست، تم نے آج اچھا سلوک کیا مجھ سے“

میں بے حد نادم ہوا چنانچہ آپ یقین جانیں میں نے شطرنج کھیلنا چھوڑ دی۔ معاف کیجیے گا۔ میں اصل واقعے کی طرف ابھی تک نہیں آیا۔ دراصل گولڈی کی بات شروع ہوئی تو میں چاہتا ہوں کہ اسکے متعلق مجھے جتنی باتیں یاد ہیں آپکو سنا دوں۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔ میرے مجرد رہنے کا ایک باعث اسکی محبت بھی تھی جب میں نے شادی نہ کرنے کا تہیہ کیا تو اس کو خصی کرا دیا۔ آپ شاید کہیں کہ میں نے ظلم کیا، لیکن میں سمجھتا ہوں۔ محبت میں ہر چیز روا ہے۔ میں اسکی ذات کے سوا اور کسی کو وابستہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ کئی بار میں نے سوچا اگر میں مر گیا تو یہ کسی اور کے پاس چلا جائے گا۔ کچھ دیر میری موت کا اثر اس پر رہے گا۔ اس کے بعد مجھے بھول کر اپنے نئے آقا سے محبت کرنا شروع کر دے گا جب میں یہ سوچتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ لیکن میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر مجھے اپنی موت کی آمد کا پورا یقین ہو گیا تو میں گولڈی کو ہلاک کر دوں گا۔ آنکھیں بند کر کے اسے گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔ گولڈی کبھی ایک لمحے کے لیے مجھ سے جدا نہیں ہوا تھا۔ رات کو ہمیشہ میرے ساتھ سوتا۔ میری تنہا زندگی میں وہ ایک روشنی تھی۔ میری بے حد پھیکی زندگی میں اسکا وجود ایک شیرینی تھا۔ اس سے میری غیر معمولی محبت دیکھ کر کئی دوست مذاق اڑاتے تھے۔

”شیخ صاحب گولڈی کتیا ہوتی تو آپ نے ضرور اس سے شادی کر لی ہوتی۔“

ایسے ہی کئی اور فقرے کسے جاتے لیکن میں مسکرا دیتا۔ گولڈی بڑا ذہین تھا اس کے متعلق جب کوئی بات ہوئی تو فوراً اس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ میرے ہلکے سے ہلکے اشارے کو بھی وہ سمجھ لیتا تھا۔ میرے موڈ کے سارے اتار چڑھاؤ اسے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے رنجیدہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ چہلیں شروع کر دیتا مجھے خوش کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا۔ ابھی اس نے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنا نہیں سیکھا تھا یعنی ابھی کم سن تھا کہ اس نے ایک برتن کو جو کہ خالی تھا۔ تھوتھنی بڑھا کر سونگھا۔ میں نے اسے جھڑکا تو دم دبا کر وہیں بیٹھ گیا۔ پہلے اس کے چہرے پر حیرت سی پیدا ہوئی تھی کہ ہیں یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ دیر تک گردن نیوڑھائے بیٹھا رہا۔ جیسے ندامت کے سمندر میں غرق ہے۔ میں اٹھا۔ اٹھ کر اسکو گود میں لیا۔ پیارا پچکارا۔ بڑی دیر کے بعد جا کر اسکی دم ہلی۔ مجھے بہت ترس آیا کہ میں نے خواہ مخواہ اسے ڈانٹا کیوں کہ اس روز رات کو غریب نے کھانے کو منہ نہ لگایا۔ وہ بڑا احساس کتا تھا۔ میں بہت بے پروا آدمی ہوں۔ میری غفلت سے اس کو ایک بار نمونیہ ہو گیا میرے اوسطان خطا ہو گئے۔ ڈاکٹروں کے پاس دوڑا۔ علاج شروع ہوا۔ مگر اثر ندارد۔ متواتر سات راتیں جاگتا رہا۔ اسکو بہت تکلیف تھی۔ سانس بڑی مشکل سے آتا تھا۔ جب سینے میں درد اٹھتا تو وہ میری طرف دیکھتا جیسے یہ کہہ رہا ہے۔

”فکر کی کوئی بات نہیں، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

کئی بار میں نے محسوس کیا کہ صرف میرے آرام کی خاطر اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسکی تکلیف کچھ کم ہے وہ آنکھیں میچ لیتا۔ تاکہ میں تھوڑی دیر آنکھ لگا لوں۔ آٹھویں روز خدا خدا کر کے اس کا بخار ہلکا ہوا اور آہستہ آہستہ اتر گیا۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو مجھے ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اسکی آنکھوں میں تیرتی نظر آئی۔

نمونیے کے ظالم حملے کے بعد دیر تک اس کو نقاہت رہی۔ لیکن طاقت ور دواؤں نے اسے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ ایک لمبی غیر حاضری کے بعد لوگوں نے مجھے اسکے ساتھ دیکھا تو طرح طرح کے سوال کرنے شروع کیے

”عاشق و معشوق کہاں غائب تھے اتنے دنوں“

”آپس میں کہیں لڑائی تو نہیں ہو گئی تھی“

”کسی اور سے تو نظر نہیں لڑ گئی تھی گولڈی کی“

میں خاموش رہا۔ گولڈی یہ باتیں سنتا تو ایک نظر میری طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتا کہ بھونکنے دو کتوں کو۔ وہ مثل مشہور ہے۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ کبوتر بہ کبوتر باز بہ باز۔ لیکن گولڈی کو اپنے ہم جنسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسکی دنیا صرف میری ذات تھی۔ اس سے باہر وہ کبھی نکلتا ہی نہیں تھا۔ گولڈی میرے پاس نہیں تھا۔ جب ایک دوست نے مجھے اخبار پڑھ کر سنایا۔ اس میں ایک واقعہ لکھا تھا۔ آپ سنیے بڑا دلچسپ ہے۔ امریکہ یا انگلستان مجھے یاد نہیں کہاں۔ ایک شخص کے پاس کتا تھا۔ معلوم نہیں کس ذات کا۔ اس شخص کا آپریشن ہونا تھا۔ اسکو ہسپتال لے گئے تو کتا بھی ساتھ ہو لیا۔ اسٹریچر پر ڈال کر اس کو آپریشن روم میں لے جانے لگے تو کتے نے اندر جانا چاہا۔ مالک نے اس کو روکا اور کہا، باہر کھڑے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ کتا حکم سن کر باہر کھڑا ہو گیا۔ اندر مالک کا آپریشن ہوا۔ جو ناکام ثابت ہوا۔ اسکی لاش دوسرے دروازے سے باہر نکال دی گئی۔ کتا بارہ برس تک وہیں کھڑا اپنے مالک کا انتظار کرتا رہا۔ پیشاب۔ پاخانے کے لیے کچھ وہاں سے ہٹتا۔ پھر وہیں کھڑا ہو جاتا۔ آخر ایک روز موٹر کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور بُری طرح زخمی ہو گا۔ مگر اس حالت میں بھی وہ خود کو گھسیٹتا ہوا وہاں پہنچا۔ جہاں اس کے مالک نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ آخری سانس اس نے اُسی جگہ لیا۔ یہ بھی لکھا تھا۔ کہ ہسپتال والوں نے اس کی لاش میں بُھس بھر کے اسکو وہیں رکھ دیا ہے جیسے وہ اب بھی اپنے آقا کے انتظار میں کھڑا ہے۔ میں نے یہ داستان سنی تو مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اول تو مجھے اسکی صحت ہی کا یقین نہ آیا، لیکن جب گولڈی میرے پاس آیا اور مجھے اسکی صفات کا علم ہوا تو بہت برسوں کے بعد میں نے یہ داستان کئی دوستوں کو سنائی۔ سناتے وقت مجھ پر ایک رقت طاری ہو جاتی تھی اور میں سوچنے لگتا تھا

”میرے گولڈی سے بھی کوئی ایسا کارنامہ وابستہ ہونا چاہیے۔ گولڈی معمولی ہستی نہیں ہے۔“

گولڈی بہت متین اور سنجیدہ تھا۔ بچپن میں اس نے تھوڑی شرارتیں کیں مگر جب اس نے دیکھا کہ مجھے پسند نہیں تو ان کو ترک کر دیا۔ آہستہ آہستہ سنجیدگی اختیار کر لی جو تادمِ مرگ قائم رہی۔

”میں نے تادمِ مرگ کہا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔“

شیخ صاحب رک گئے انکی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔ ہم خاموش رہے تھوڑے عرصے کے بعد انھوں نے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کہنا شروع کیا۔

”یہی میری زیادتی ہے کہ میں زندہ ہوں۔ لیکن شاید اس لیے زندہ ہوں کہ انسان ہوں۔ مر جاتا تو شاید گولڈی کی توہین ہوتی۔ جب وہ مرا تو رو رو کر میرا بُرا حال تھا۔ لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ میں نے اس کو مروا دیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اپنی موت کی آمد کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ ایسا پاگل نہیں جیسا کہ عام پاگل کتے ہوئے ہیں۔ اسکے مرض کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ اس کو سخت تکلیف تھی۔ جانکنی کا سا عالم اس پر طاری تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اسکو مروا دو۔ میں نے پہلے سوچا نہیں۔ لیکن وہ جس اذیت میں گرفتار تھا۔ مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں مان گیا وہ اسے ایک کمرہ میں لے گئے جہاں برقی جھٹکا پہنچا کر ہلاک کرنے والی مشین تھی۔ میں ابھی اپنے نحیف دماغ میں اچھی طرح کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ وہ اسکی لاش لے آئے۔ میری گولڈی کی لاش۔ جب میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تو میرے آنسو ٹپ ٹپ اس کے سنہرے بالوں پر گرنے لگے۔ جو پہلے کبھی گرد آلود نہیں ہوئے تھے۔ ٹانگے میں اسے گھر لایا۔ دیر تک اس کو دیکھا کیا۔ پندرہ سال کی رفافت کی لاش میرے بستر پر پڑی تھی۔ قربانی کا مجسمہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس کو نہلایا۔ کفن پہنایا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کروں۔ زمین میں دفن کروں یا جلادوں۔ زمین میں دفن کرتا تو اسکی موت کا ایک نشان رہ جاتا۔ یہ مجھے پسند نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے کیوں اس کو غرقِ دریا کرنا چاہا۔ میں نے اس کے متعلق اب بھی کئی بار سوچا ہے۔ مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ خیر میں نے ایک نئی بوری میں اسکی کفنائی ہوئی لاش ڈالی۔ دھو دھا کر بٹے اس میں ڈالے اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب بیڑی دریا کے درمیان میں پہنچی۔ اور میں نے بوری کی طرف دیکھا تو گولڈی سے پندرہ برس کی رفاقت و محبت ایک بہت ہی تیز تلخی بن کر میرے حلق میں اٹک گئی۔ میں نے اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بوری اٹھائی اور دریا میں پھینک دی۔ بہتے ہوئے پانی کی چادر پر کچھ بلبلے اٹھے اور ہوا میں حل ہو گئے۔ بیڑی واپس ساحل پر آئی۔ میں اتر کر دیر تک اس طرف دیکھتا رہا۔ جہاں میں نے گولڈی کو غرقِ آب کیا تھا۔ شام کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ پانی بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا جیسے وہ گولڈی کو اپنی گود میں سلا رہا ہے۔ یہ کہہ کر شیخ صاحب خاموش ہو گئے۔ چند لمحات کے بعد ہم میں سے ایک نے ان سے پوچھا۔

”لیکن شیخ صاحب آپ تو خاص واقعہ سنانے والے تھے۔“

شیخ صاحب چونکے۔ اوہ معاف کیجیے گا۔ میں اپنی رو میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ پندرہ برس ہو گئے تھے ہماری رفاقت کو۔ اس دوران میں کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ میری صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی، لیکن جس دن میں نے گولڈی کی پندرھویں سالگرہ منائی۔ اس کے دوسرے دن میں نے اعضا شکنی محسوس کی۔ شام کو

یہ اعضا شکنی تیز بخار میں تبدیل ہو گئی۔ رات سخت بے چین رہا۔ گولڈی جاگتا رہا۔ ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے مجھے دیکھتا رہا۔ پلنگ پر سے اتر کر نیچے جاتا۔ پھر آ کر بیٹھ جاتا۔ زیادہ عمر ہو جانے کے باعث اس کی بینائی اور سماعت کمزور ہو گئی تھی لیکن ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ چونک پڑتا اور اپنی دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا اور جیسے یہ پوچھتا۔

”یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں“

اس کو حیرت تھی کہ میں اتنی دیر تک پلنگ پر کیوں پڑا ہوں، لیکن وہ جلدی ہی ساری بات سمجھ گیا۔ جب مجھے بستر پر لیٹے کئی دن گزر گئے تو اس کے سالخوردہ چہرے پر افسردہ چھا گئی۔ میں اس کو اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتا تھا۔ بیماری کے آغاز میں تو میں اس کو کھانا دیتا رہا۔ جب نقاہت بڑھ گئی تو میں نے ایک دوست سے کہا کہ وہ صبح شام گولڈی کو کھانا کھلانے آ جایا کرے۔ وہ آتا رہا۔ مگر گولڈی نے اس کی پلیٹ کی طرف منہ نہ کیا۔ میں نے بہت کہا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ ایک مجھے اپنے مرض کی تکلیف تھی جو دور ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ دوسرے مجھے گولڈی کی فکر تھی جس نے کھانا پینا بالکل بند کر دیا تھا۔ اب اُس نے پلنگ پر بیٹھنا لینا بھی چھوڑ دیا۔ سامنے دیوار کے پاس سارا دن اور ساری رات خاموش بیٹھا اپنی دھندلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہتا۔ اس سے مجھے اور بھی دکھ ہوا۔ وہ کبھی ننگی زمین پر نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے بہت کہا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ وہ بہت زیادہ خاموش ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غم و اندوہ میں غرق ہے۔ کبھی کبھی اٹھ کر پلنگ کے پاس آتا۔ عجیب حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا اور گردن جھکا کر واپس دیوار کے پاس چلا جاتا۔ ایک رات لیمپ کی روشنی میں میں نے دیکھا۔ کہ گولڈی کی دھندلی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ اس کے چہرے سے حزن و ملال برس رہا تھا۔ مجھے بہت دکھ پہنچا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ لمبے لمبے سنہرے کان ہلاتا وہ میرے پاس آیا۔ میں نے بڑے پیار سے کہا۔

”گولڈی میں اچھا ہو جاؤں گا۔ تم دعا مانگو۔ تمہاری دعا ضرور قبول ہو گی۔“

یہ سن کر اس نے بڑی اداس آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر سر اوپر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے دعا مانگ رہا ہے۔ کچھ دیر وہ اس طرح کھڑا رہا۔ میرے جسم پر جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ ایک عجیب و غریب تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ گولڈی سچ مچ دعا مانگ رہا تھا۔ میں سچ عرض کرتا ہوں وہ سرتاپا دعا تھا۔ میں کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اسکی روح خدا کے حضور پہنچ کر گڑگڑا رہی ہے۔ میں چند ہی دنوں میں اچھا ہو گیا۔ لیکن گولڈی کی حالت غیر ہو گئی۔ جب تک میں بستر پر تھا وہ آنکھیں بند کیے دیوار کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ میں ہلنے جلنے کے قابل ہوا تو میں نے اسکو کھلانے پلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اسکو اب کسی شے سے دلچسپی نہیں تھی۔ دعا مانگنے کے بعد جیسے اسکی ساری طاقت زائل ہو گئی تھی۔ میں اس سے کہتا، میری طرف دیکھو گولڈی۔ میں اچھا ہو گیا ہوں۔ خدا نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے، لیکن وہ آنکھیں نہ کھولتا۔ میں نے دو تین دفعہ ڈاکٹر بلایا۔ اس نے انجکشن لگائے پر کچھ نہ ہوا۔ ایک دن میں ڈاکٹر لے کر آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔ میں اٹھا کر اسے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس کو برقی ضرب سے ہلاک کرا دیا۔ مجھے معلوم نہیں بابر اور ہمایوں والا قصہ کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن یہ واقعہ حرف بحرف درست ہے۔ 6جون1950ء

کھول دو

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوکھول دو

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر دو بجے کو چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ اِدھر اُدھر بھٹک گئے۔ صبح دس بجے۔ کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک متلاطم سمندر دیکھا تو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہو گئیں۔ وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا۔ لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔ گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے رگ و ریشے میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں۔ لوٹ، آگ۔ بھاگم بھاگ۔ اسٹیشن۔ گولیاں۔ رات اور سکینہ۔ سراج الدین ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔ پورے تین گھنٹے وہ

”سکینہ سکینہ“

پکارتا کیمپ میں خاک چھانتا رہا۔ مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتا نہ ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندلی سی مچی تھی۔ کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ماں۔ کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔ سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ اور گیا اور حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی۔ لیکن سوچتے سوچتے اس کا دماغ سکینہ کی ماں کی لاش پر جم جاتا۔

جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سوچ سکتا۔ سکینہ کی ماں مرچکی تھی۔ اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔ لیکن سکینہ کہاں تھی جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا

”مجھے چھوڑو اور سکینہ کو لے کر جلدی یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا مگر سکینہ نے چلا کر کہا تھا

”ابا جی۔ چھوڑیئے۔“

لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا نکالا۔ سکینہ کا وہی پٹہ تھا۔ لیکن سکینہ کہاں تھی؟ سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن تک لے آیا تھا؟ کیا وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار تھی؟۔ راستہ میں جب گاڑی روکی گئی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے تو کیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے؟ سراج الدین کے دماغ میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ سراج الدین نے رونا چاہا۔ مگر آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ چھ روز کے بعد جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو سراج الدین ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ آٹھ نوجوان تھے۔ جن کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔ سراج الدین نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا۔

”گورا رنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ مجھ پر نہیں اپنی ماں پر تھی۔ عمر سترہ برس کے قریب ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ بال سیاہ، دہنے گال پر موٹا سا تل۔ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ ڈھونڈ لاؤ۔ تمہارا خدا بھلا کرے گا۔“

رضاکار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہو گی۔ آٹھوں نوجوان نے کوشش کی۔ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر وہ امرتسر گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا۔ دس روز گزر گئے مگر انھیں سکینہ کہیں نہ ملی۔ ایک روز وہ اسی خدمت کے لیے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھ ہرٹہ کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی۔ اری کی آواز سن کر وہ بدکی اور بھاگنا شروع کر دیا۔ رضاکاروں نے موٹر رکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔ ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ دیکھا تو بہت خوبصورت تھی۔ دہنے گال پر موٹا تل تھا۔ ایک لڑکے نے اس سے کہا

”گھبراؤ نہیں۔ کیا تمہارا نام سکینہ ہے؟“

لڑکی کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب تمام لڑکوں نے اسے دم دلاسا دیا تو اس کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے۔ آٹھ رضاکار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی۔ اسے کھانا کھلایا۔ دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا۔ کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اور بار بار بانھوں سے اپنے سینے کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔ کئی دن گزر گئے۔ سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا رہتا۔ لیکن کہیں سے بھی اس کی بیٹی کا پتہ نہ چلا۔ رات کو وہ بہت دیر تک ان رضاکار نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا۔ جنھوں نے اس کو یقین دلایا تھا کہ اگر سکینہ زندہ ہوئی تو چند دنوں ہی میں وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ ایک روز سراج الدین نے کیمپ میں ان نوجوان رضاکاروں کو دیکھا۔ لاری میں بیٹھے تھے۔ سراج الدین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا۔

”بیٹا، میری سکینہ کا پتہ چلا؟“

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”چل جائے گا، چل جائے گا۔“

اور لاری چلا دی۔ سراج الدین نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعا مانگی اور اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ شام کے قریب کیمپ میں جہاں سراج الدین بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ سی ہوئی۔ چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔ اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بیہوش پڑی تھی۔ لوگ اسے اٹھا کر لائے ہیں۔ سراج الدین ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے سپرد کیا اور چلے گئے۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔ سراج الدین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔ سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا۔

”سکینہ“!

ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا۔

”کیاہے ؟“

سراج الدین کے حلق سے صرف اس قدر نکل سکا۔

”جی میں۔ جی میں۔ اس کا باپ ہوں“!

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا

”کھڑکی کھول دو۔“

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا۔

”زندہ ہے۔ میری بیٹی زندہ ہے“

۔ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔

کوٹ پتلون

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوکوٹ پتلون

ناظم جب باندرہ میں منتقل ہوا تو اُسے خوش قسمتی سے کرائے والی بلڈنگ میں تین کمرے مل گئے۔ اس بلڈنگ میں جو بمبئی کی زبان میں چالی کہلاتی ہے، نچلے درجے کے لوگ رہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی (بمبئی کی زبان میں) کھولیاں یعنی کوٹھڑیاں تھیں جن میں یہ لوگ اپنی زندگی جوں توں بسر کر رہے تھے۔ ناظم کو ایک فلم کمپنی میں بحیثیت منشی یعنی مکالمہ نگار ملازمت مل گئی تھی۔ چونکہ کمپنی نئی قائم ہوئی تھی اس لیے اسے چھ سات مہینوں تک ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ ملنے کا پورا تیقن تھا، چنانچہ اُس نے اس یقین کی بنا پر یہ عیاشی کی ڈونگری کی غلیظ کھولی سے اُٹھ کر باندرہ کی کرائے والی بلڈنگ میں تین کمرے لے لیے۔ یہ تین کمرے زیادہ بڑے نہیں تھے، لیکن اس بلڈنگ کے رہنے والوں کے خیال کے مطابق بڑے تھے، کہ انھیں کوئی سیٹھ ہی لے سکتا تھا۔ ویسے ناظم کا پہناوا بھی اب اچھا تھا کیونکہ فلم کمپنی میں معقول مشاہرے پر ملازمت ملتے ہی اِس نے کُرتہ پائیجامہ ترک کر کے کوٹ پتلون پہننا شروع کر دی تھی۔ ناظم بہت خوش تھا۔ تین کمرے اُس کے اور اس کی نئی بیاہتا بیوی کے لیے کافی تھے۔ مگر جب اُسے پتہ چلا کہ غسل خانہ ساری بلڈنگ میں صرف ایک ہے تو اُسے بہت کوفت ہوئی ڈونگری میں تو اس سے زیادہ دقت تھی کہ وہاں کے واحد غسل خانہ میں نہانے والے کم از کم پانچ سو آدمی تھے اور اس کو چونکہ وہ صبح ذرا دیر سے اُٹھنے کا عادی تھا، نہانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ یہاں شاید اس لیے کہ لوگ نہانے سے گھبراتے تھے یا رات پالی (نائٹ ڈیوٹی) کرنے کے بعد دن بھر سوئے رہتے اس لیے اسے غسل کے سلسلے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ غسل خانہ اس کے دروازے کے ساتھ بائیں طرف تھا۔ اس کے سامنے ایک کھولی تھی جس میں کوئی۔ معلوم نہیں کون رہتا تھا۔ ایک دن ناظم جب غسل خانے کے اندر گیا تو اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھا کہ اس میں سوراخ ہے غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی قدرتی درز نہیں بلکہ خود ہاتھ سے کسی تیز آلے۔ کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ کپڑے اُتار کے نہانے لگا تو اس کو خیال آیا کہ زون میں سے جھانک کر تو دیکھے۔ معلوم نہیں اسے یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ بہر حال اس نے اٹھ کر آنکھ اس سوراخ پر جمائی۔ سامنے والی کھولی کا دروازہ کھلا تھا۔ اور ایک جوان عورت جس کی عمر پچیس چھبیس برس کی ہو گی صرف بنیان اور پیٹی کوٹ پہنے یوں انگڑائیاں لے رہی تھی جیسے وہ ان دیکھے مردوں کو دعوت دے رہی ہے کہ وہ اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیں اور اس کی انگڑائیوں کا علاج کر دیں۔ ناظم نے جب یہ نظارہ دیکھا تو اس کا پانی سے ادھ بھیگا جسم تھر تھرا گیا۔ دیر تک وہ اسی عورت کی طرف دیکھتا رہا، جو اپنے مستور لیکن اس کے باوجود عریاں بدن کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اس کا مصرف ڈُھونڈنا چاہتی ہے۔ ناظم بڑا ڈرپوک آدمی تھا۔ نئی نئی شادی کی تھی، اس لیے بیوی سے بہت ڈرتا تھا۔ اس کے علاوہ اُس کی سرشت میں بدکاری نہیں تھی۔ لیکن غسل خانے کے اُس سوراخ نے اس کے کردار میں کئی سوراخ کر دیے۔ اس میں سے ہر روز صبح کو وہ اس عورت کو دیکھتا اور اپنے گیلے یا خشک بدن میں عجیب قسم کی حرارت محسوس کرتا۔ چند روز بعد اسے بعد اُسے محسوس ہوا کہ وہ عورت جس کا نام زبیدہ تھا اُس کو اس بات کا علم ہے کہ وہ غسل خانے کے دروازے کے سوراخ سے اُس کو دیکھتا ہے۔ اور کن نظروں سے دیکھتا ہے ظاہر ہے کہ جو مرد غسل خانے میں جاکر دروازے کی درز میں سے کسی ہمسائی کو جھانکے گا تو اُس کی نیت کبھی صاف نہیں ہو سکتی۔ ناظم کی نیت قطعاً نیک نہیں تھی۔ اُس کی طبیعت کو اس عورت نے جو صرف بنیان اور پیٹی کوٹ پہنتی اور اس وقت جب کہ ناظم نہانے میں مصروف ہوتا اس قسم کی انگڑائیاں لیتی تھی کہ دیکھنے والے مرد کی ہڈیاں چٹخنے لگیں، اس نے اسے اُکسا دیا تھا مگر وہ ڈرپوک تھا۔ اُس کی شریف فطرت اُس کو مجبور کرتی کہ وہ اُس سے زیادہ آگے نہ بڑھے۔ ورنہ اُسے یقین تھا کہ اس عورت کو حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ ایک دن ناظم نے غسل خانے میں سے دیکھا کہ زبیدہ مسکرا رہی ہے اُس کو معلوم تھا کہ ناظم اُس کو دیکھ رہا ہے۔ اُس دن اُس نے اپنے صحت مند ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ گالوں پر غازہ اور سُرخی بھی تھی۔ بنیان خلافِ معمول چھوٹی اور انگیا پہلے سے زیادہ چست۔ ناظم نے خود کو اس فلم کا ہیرو محسوس کیا جس کے وہ مکالمے لکھ رہا تھا۔ لیکن جونہی اپنی بیوی کا خیال آیا جو اس کے دولت مند بھائی کے گھر ورلی گئی ہوئی تھی وہ اسی فلم کا

ایکسٹرا بن گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اسے ایسی عیاشی سے باز رہنا چاہیے۔ بہت دنوں کے بعد ناظم کو معلوم ہوا کہ زبیدہ کا خاوند کسی مل میں ملازم ہے۔ چونکہ اُس کی اولاد نہیں ہوتی اس لیے پیروں فقیروں کے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ کئی حکیموں سے علاج بھی کرا چکا تھا۔ بہت کم زبان، اور داڑھی مونچھوں سے بے نیاز۔ پنجابی زبان میں ایسے مردوں کو

”کھودا“

کہتے ہیں معلوم نہیں کس رعایت سے، لیکن اس رعایت سے زبیدہ کا خاوند کھودا تھا کہ وہ زمین کا ہر ٹکڑا کھودتا کہ اِس سے اُس کا کوئی بچہ نکل آئے۔ مگر زبیدہ کو بچے کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ غالباً یہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی جوانی کی فکر کرے۔ جس کے بارے میں شاید اس کا شوہر غافل تھا۔ ناظم کے علاوہ اس بلڈنگ میں ایک اور نوجوان تھا۔ کنوارا۔ کنوارے تو یوں وہاں کئی تھے، مگر اس میں خصوصیت یہ تھی کہ وہ بھی کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ ناظم کو معلوم ہوا کہ وہ بھی غسل خانے میں سے زبیدہ کو جھانکتا ہے اور وہ اسی طرح سوراخ کے اس طرف اپنے مستور لیکن غیر مستور جسم کی نمائش کرتی ہے۔ ناظم پہلے پہل بہت جلا۔ رشک اور حسد کا جذبہ ایسے معاملات میں عام طور پر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ لازماً ناظم کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ لیکن یہ کوٹ پتلون پہننے والا نوجوان ایک مہینے کے بعد رخصت ہو گیا۔ اس لیے کہ اسے احمد آباد میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ ناظم کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ لیکن اُس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ زبیدہ سے بات چیت کر سکتا۔ غسل خانہ کے دروازے کے سُوراخ میں سے وہ ہر روز اُسی انداز میں دیکھتا اور ہر روز اُس کے دماغ میں حرارت بڑھتی جاتی۔ لیکن ہر روز سوچتا کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو اُس کی شرافت مٹی میں مل جائے گی۔ اسی لیے وہ کوئی تیز قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ اس کی بیوی ورلی سے آ گئی تھی۔ وہاں صرف ایک ہفتہ رہی۔ اس کے بعد اس نے غسل خانے میں سے زبیدہ کو دیکھنا چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ اُس کے ضمیر نے ملامت کی تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے اور زیادہ محبت کرنا شروع کر دی۔ شروع شروع میں اسے کسی قدر حیرت ہوئی مگر بعد میں اُسے بڑی مسرت محسوس ہوئی کہ اس کا خاوند اس کی طرف پہلے سے کہیں زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ لیکن ناظم نے پھر غسل خانے میں سے تاک جھانک شروع کر دی۔ اصل میں اُس کے دل و دماغ میں زبیدہ کا مستور مگر غیر مستور بدن سما گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی انگڑائیوں کے ساتھ کھیلے اور کچھ اس طرح کھیلے کے خود بھی ایک نہ ٹُوٹنے والی انگڑائی بن جائے۔ فلم کمپنی سے تنخواہ برابر وقت پر مل رہی تھی۔ ناظم نے ایک نیا سوٹ بنوا لیا تھا۔ اُس میں جب زبیدہ نے اُسے اپنی کھولی کے کھلے ہوئے دروازے میں سے دیکھا تو ناظم نے محسوس کیا کہ وہ اسے زیادہ پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اُس نے چاہا کہ دس قدم آگے بڑھ کر اپنے ہونٹوں پر اپنی تمام زندگی کی تمام مسکراہٹیں بکھیر کر کہے

”جناب سلام عرض کرتا ہوں۔“

ناظم یوں تو مکالمہ نگار تھا۔ ایسے فلموں کے ڈایلاگ لکھتا جو عشق و محبت سے بھرپور ہوتے تھے۔ مگر اس وقت اس کے ذہن میں تعارفی مکالمہ یہی آیا کہ وہ اُس سے کہے

”جناب! سلام کرتا ہوں۔“

اُس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ زبیدہ کلی کی طرح کھلی مگر وہ مُرجھا گیا۔ اُس کو اپنی بیوی کے خوف اور شرافت کے زائل ہونے کے احساس نے یہ بڑھائے ہوئے قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیا۔ اور اپنے گھر جا کر اپنی بیوی سے کچھ ایسی محبت سے پیش آیا کہ غریب شرما گئی۔ اسی دوران ایک اور کوٹ پتلون والا کرائے دار بلڈنگ میں آیا۔ اس نے بھی غسل خانے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ناظم کے لیے یہ دوسرا رقیب تھا مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد برقی ٹرین سے اُترتے وقت اُس کا پاؤں پھسلا اور ہلاک ہو گیا۔ ناظم کو اُس کی موت پر افسوس ہوا۔ مگر مشیتِ ایزدی کے سامنے کیا چارہ ہے اُس نے سوچا شاید خدا کو یہی منظور تھا کہ اُس کے راستے سے یہ روڑا ہٹ جائے۔ چنانچہ اُس نے پھر غسل خانے کے دروازے کے سُوراخ سے اور اپنے تین کمروں میں آتے جاتے وقت زبیدہ کو اُنھیں نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ لاہور میں ناظم کی بیوی کے کسی قریبی رشتہ دار کی شادی تھی۔ اس تقریب میں اُس کی شمولیت ضروری تھی۔ ناظم کے جی میں آئی کہ وہ اس سے کہہ دے کہ یہ تکلف اس سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ لیکن فوراً اُسے زبیدہ کا خیال آیا اور اُس نے اپنی بیوی کو لاہور جانے کی اجازت دے دی۔ مگر وہ فکر مند تھا کہ اُسے صبح چائے بنا کر کون دے گا۔ یہ واقعی بہت اہم چیز تھی۔ اس لیے کہ ناظم چائے کا رسیا تھا۔ صبح سویرے اگر اُسے چائے کی دو پیالیاں نہ ملیں تو وہ سمجھتا تھا کہ دن شروع ہی نہیں ہوا۔ بمبئی میں رہ کر وہ اس شے کا حد سے زیادہ عادی ہو گیا تھا۔ اُس کی بیوی نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا، آپ کچھ فکر نہ کیجیے۔ میں زبیدہ سے کہے دیتی ہوں کہ وہ آپ کو صبح کی چائے بھیجنے کا انتظام کر دے گی۔ چنانچہ اُس نے فوراً زبیدہ کو بلوایا اور اس کو مناسب و موزوں الفاظ میں تاکید کر دی کہ وہ اُس کے خاوند کے لیے چائے کی دو پیالیوں کا ہر صبح جب تک وہ نہ آئے انتظام کر دیا کرے۔ اس وقت زبیدہ پورے لباس میں تھی اور دوپٹے کے پلو سے اپنے چہرے کا ایک حصہ ڈھانپے کنکھیوں سے ناظم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ مگر کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے کسی قسم کا شبہ ہوتا۔ چند منٹوں کی رسمی گفتگو میں یہ طے ہو گیا کہ زبیدہ چائے کا بندوبست کر دے گی۔ ناظم کی بیوی نے اُسے دس روپے کا نوٹ پیشگی کے طور پر دینا چاہا مگر اُس نے انکار کر دیا اور بڑے خلوص سے کہا۔

”بہن اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے میاں کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ صبح جس وقت چاہیں، چائے مل جایا کرے گی۔“

ناظم کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ چائے ملے نہ ملے۔ لیکن زبیدہ تم مل جایا کرے۔ لیکن فوراً اُسے اپنی بیوی کا خیال آیا اور اُس کے جذبات سرد ہو گئے۔ ناظم کی بیوی لاہور چلی گئی۔ دوسرے روز صبح سویرے جبکہ وہ سو رہا تھا دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھا شاید اُس کی بیوی باورچی خانے میں پتھر کے کوئلے توڑ رہی ہے۔ چنانچہ کروٹ بدل کر اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن چند لمحات کے بعد پھر ٹھک ٹھک ہوئی اور ساتھ ہی مہین نسوانی آواز آئی۔

”ناظم صاحب۔ ناظم صاحب“

ناظم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُس نے زبیدہ کی آواز کو پہچان لیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ ایک دم چونک کر اُٹھا۔ دروزاہ کھولا زبیدہ دونوں ہاتھوں میں ٹرے لیے کھڑی تھی۔ اس نے ناظم کو سلام کیا اور کہا

”چائے حاضر ہے۔“

ایک لحظے کے لیے ناظم کا دماغ غیر حاضر ہوگیا۔ لیکن فوراً سنبھل کر اُس نے زبیدہ سے کہا

”آپ نے بہت تکلیف کی۔ لایئے یہ ٹرے مجھے دے دیجیے۔“

زبیدہ مسکرائی

”میں خود اندر رکھ دیتی ہوں۔ تکلیف کی بات ہی کیا ہے۔“

ناظم شب خوابی کا لباس پہنے تھا۔ دھاری دار پاپلین کا کرتا اور پائجامہ۔ یہ عیاشی اُس نے زندگی میں پہلی بار کی تھی۔ زبیدہ شلوار قمیص میں تھی۔ ان دونوں لباسوں کے کپڑے بہت معمولی اور سستے تھے مگر وہ اس پر سج رہے تھے۔ چائے کی ٹریک اُٹھائے وہ اندر آئی۔ اس کو تپائی پر رکھا اور ناظم کے چڑیا ایسے دل کو کہہ کر دھڑ کایا

”مجھے افسوس ہے کہ چائے بنانے میں دیر ہوگئی۔ دراصل میں زیادہ سونے کی عادی ہوں۔“

ناظم کرسی پر بیٹھ چکا تھا جب زبیدہ نے یہ کہا تو اُس کے جی میں آئی کہ ذرا شاعری کرے اور اُس سے کہے

”آؤ۔ سو جائیں۔ سونا ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔“

۔ لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی، چنانچہ وہ خاموش رہا۔ زبیدہ نے بڑے پیار سے ناظم کو چائے بنا کر دی۔ وہ چائے کے ساتھ زبیدہ کو بھی پیتا رہا۔ لیکن اُس کی قوت ہاضمہ کمزور تھی۔ اس لیے اس نے فوراً اس سے کہا

”زبیدہ جی آپ اور تکلیف نہ کریں۔ میں برتن صاف کرا کے آپ کو بھجوا دُوں گا۔“

ناظم کو اس بات کا احساس تھا کہ اُس کے دل میں جتنے برتن ہیں، زبیدہ کی موجودگی میں صاف کر دیے ہیں۔ برتن اُٹھا کر جب وہ چلی گئی تو ناظم کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ تھوتھا چنا بن گیا ہے جو گھنا بج رہا ہے۔ زبیدہ ہر روز صبح سویرے آتی۔ اُسے چائے پلاتی۔ وہ اُس کو اور چائے دونوں کو پیتا۔ اور اپنی بیوی کو یاد کر کے ڈر کے مارے رات کو سو جاتا۔ دس بارہ روز یہ سلسلہ جاری رہا۔ زبیدہ نے ناظم کو ہر موقع دیا کہ وہ اُس کی نہ ٹُوٹنے والی انگڑائیوں کو توڑ دے۔ لیکن ناظم خود ایک غیر مختتم! انگڑائی بن کے رہ گیا تھا۔ اُس کے پاس دو سُوٹ تھے مگر اُس نے چرنی روڈ کی اُس دکان سے جہاں اُس فلم کمپنی کا سیٹھ کاسٹیوم بنوایا کرتا تھا ایک اور سُوٹ سُلوایا اور اس سے وعدہ کیا کہ رقم بہت جلد ادا کر دے گا۔ گبرڈین کا یہ سُوٹ پہن کر وہ زبیدہ کی کھولی کے سامنے سے گزرا۔ حسبِ معمول وہ بنیان اور پیٹی کوٹ پہنے تھی۔ اُسے دیکھ وہ دروازے کے پاس آئی۔ مہین سی مسکراہٹ اُس کے سرخی لگے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور اُس نے بڑے پیار سے کہا

”ناظم صاحب آج تو آپ شہزادے لگتے ہیں۔“

ناظم ایک دم کوہ قاف چلا گیا۔ یا شاید اُن کتابوں کی دنیا میں جو شہزادوں اور شہزادیوں کے اذکار سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن فوراً وہ اپنے برق رفتار گھوڑے پر سے گر کر زمین پر اوندھے منہ آ رہا۔ اور اپنی بیوی سے جو لاہور میں تھی کہنے لگا سخت چوٹ لگی ہے۔ عشق کی چوٹ یوں بھی بڑی سخت ہوتی ہے، لیکن جس قسم کا عشق ناظم کا تھا۔ اس کی چوٹ بہت شدید تھی۔ اس لیے کہ شرافت اور اُس کی بیوی اُس کے آڑے آتی تھی۔ ایک اور چوٹ ناظم کو یہ لگی کہ اُس کی فلم کمپنی کا دیوالیہ پٹ گیا۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔ بس ایک دن جب وہ کمپنی گیا تو اُس کو معلوم ہوا کہ وہ ختم ہوگئی۔ اُس سے پانچ روز پہلے وہ سو روپے اپنی بیوی کو لاہور بھیج چکا تھا۔ سو روپے چرنی روڈ کے بزاز کے دینے تھے کچھ اور بھی قرض تھے۔ ناظم کے دماغ سے عشق پھر بھی نہ نکلا۔ زبیدہ ہر روز چائے لے کر آتی تھی۔ لیکن اب وہ سخت شرمندہ تھا کہ اتنے دنوں کے پیسے وہ کیسے ادا کرے گا۔ اُس نے ایک ترکیب سوچی کہ اپنے تینوں سوٹ جن میں نیا گبرڈین کا بھی شامل تھا گروی رکھ کر صرف پچاس روپے وصول کیے۔ دس دس کے پانچ نوٹ جیب میں ڈال کر ناظم نے سوچا کہ ان میں دو چار زبیدہ کو دے دے گا، اور اس سے ذرا کھلی بات کرے گا۔ لیکن دادر اسٹیشن پر کسی جیب کترے اُس کی جیب صاف کر دی۔ اُس نے چاہا کہ خودکشی کر لے ٹرینیں آ جا رہی تھیں پلیٹ فارم سے ذرا سا پھسل جانا کافی تھا۔ یوں چٹکیوں میں اُس کا کام تمام ہو جاتا۔ مگر اس کو اپنی بیوی کا خیال آ گیا جو لاہور میں تھی اور اُمید سے۔ ناظم کی حالت بہت خستہ ہوگئی۔ زبیدہ آتی تھی لیکن اُس کی نگاہوں میں اب وہ بات ناظم کو نظر نہیں آتی تھی۔ چائے کی پتی ٹھیک نہیں ہوتی تھی۔ دُودھ سے تو اُسے کوئی رغبت نہیں تھی لیکن پانی ایسا پتلا ہوتا تھا، اُس کے علاوہ اب وہ زیادہ سجی بنی نہ ہوتی تھی۔ غسل خانے میں جاتا اور اُسے دروازے کے سوراخ میں سے جھانکتا وہ نظر نہ آتی۔ لیکن ناظم خود بہت متفکر تھا۔ اس لیے کہ اُسے دو مہینوں کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ چرنی روڈ کے بزاز کے اور دوسرے لوگوں کے قرض کی ادائیگی بھی اس کے ذمہ تھی۔ چند روز میں ناظم کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا جو بہت بڑا بینک تھا فیل ہو گیا ہے۔ اس کی ٹانچ آنے والی تھی، مگر اس سے پہلے ہی اُس نے کرائے

والی بلڈنگ سے نقل مکانی کا ارادہ کر لیا۔ ایک شخص سے اس نے طے کیا کہ وہ اُس کا قرض ادا کر دے تو وہ اس کو اپنے تین کمرے دے دے گا۔ اُس نے اُس کے تینوں سوٹ واپس دلوا دیے۔ چھوٹے موٹے قرض بھی ادا کر دیے۔ جب ناظم غمناک آنکھوں سے

”کرائے والی بلڈنگ“

سے اپنا مختصر سامان اُٹھوا رہا تھا تو اس نے دیکھا زبیدہ نئے مکین کو جو شارک سکن کے کوٹ پتلون میں ملبوس تھا ایسی نظروں سے دیکھ رہی ہے، جن سے وہ کچھ عرصہ پہلے اسے دیکھا کرتی تھی۔

گرم سوٹ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوگرم سوٹ

گنڈا سنگھ نے چونکہ ایک زمانے سے اپنے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے۔ اس لیے پسینے کے باعث ان میں ایک عجیب قسم کی بُو پیدا ہو گئی تھی جو زیادہ شدّت اختیار کرنے پر اب گنڈا سنگھ کو کبھی کبھی اداس کر دیتی تھی۔ اس کو اس بدبو نے بھی اتنا تنگ نہیں کیا تھا جتنا کہ اب اس کے گرم سوٹ نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔ اپنے کسی دوست کے کہنے پر وہ امرتسر چھوڑ کر دہلی چلا آیا تھا۔ جب اس نے امرتسر کو خیرباد کہا تو گرمیوں کا آغاز تھا، لیکن اب کے گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی، گنڈا سنگھ کو یہ گرم سوٹ بہت ستا رہا تھا۔ اس کے پاس صرف چار کپڑے تھے۔ گرم پتلون، گرم کوٹ، گرم واسکٹ اور ایک سوتی قمیض۔ یہ گرم سوٹ اسے اس لیے دہلی کی شدید گرمیوں میں پہننا پڑتا تھا کہ اس کے پاس اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا اور سوٹ کے ساتھ کی واسکٹ اسے اس لیے پہننا پڑتی تھی کہ اسکے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ اسے احتیاط یا بد احتیاطی سے رکھ سکتا۔ یوں تو وہ اس واسکٹ کو یا کوٹ ہی کو دریبہ کلاں میں اپنے دوست کی دکان میں رکھ دیتا مگر وہاں اس نے پہلے روز ہی کئی چوہے دیکھے تھے۔ دہلی آنے کے دوسرے روز چاندنی چوک میں اس نے رس گُلے کھائے تھے۔ ان کا شیرہ جا بجا کوٹ اور واسکٹ پر گر پڑا تھا۔ اگر وہ یہ دونوں چیزیں اس دکان میں رکھ دیتا تو ظاہر ہے کہ جہاں شیرہ گرا تھا چوہے کپڑا کُتر جاتے اور گنڈا سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سوٹ جو اسے تین ستمبر 1939ء یعنی اس جنگ کے ابتدائی روز ملا تھا یوں بیکار چوہوں کی نذر ہو جائے۔ اس سوٹ کے ساتھ اتفاقیہ طور پر ایک ایسا دن منسوب ہو گیا تھا جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ گنڈا سنگھ کو چنانچہ اس لیے بھی اپنا سوٹ عزیز تھا کہ امرتسر میں جب اس نے اپنا یہ تاریخی سوٹ پہنا تھا تو دربار صاحب کے آس پاس اسکے جتنے ہاتھی دانت کا کام کرنے والے دوست رہتے تھے متحیر ہو گئے تھے۔ بلبیر نے جب اسے بازار میں دیکھا تھا تو متحرک خراد کو روک کر زور سے آواز دی تھی۔

”گنڈا سیاں گنڈا سیاں ذرا ادھر تو آ۔ یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

گنڈا سنگھ لباس کے معاملے میں از حد بے پروا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اپنے لباس کی طرف اس نے کبھی توجہ ہی نہ دی تھی۔ وہ پتلون اسی طرح پہنا کرتا تھا جس طرح کچھ پہنی جاتی ہے یعنی بغیر کسی تکلف کے۔ اُس کے متعلق اُس کے دوستوں میں یہ بات عام مشہور تھی کہ اگر تن ڈھکنا ضروری نہ ہوتا تو گنڈا سنگھ بالکل ننگا رہتا۔ چھ چھ مہینے تک وہ نہاتا نہیں تھا۔ بعض اوقات اس کے پیروں پر اس قدر میل جم جاتا تھا کہ اور میل جمنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ دور سے اگر آپ اسکے میلے پیروں کو دیکھتے تو یہی معلوم ہوتا کہ گنڈا سنگھ نے موزے پہن رکھے ہیں۔ گنڈا سنگھ کی غلاظت پسندی کی انتہا یہ تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کرتا تھا اور سردیوں میں ایک ایسا لحاف اوڑھ کر سوتا تھا کہ اگر کوئی اسے کوڑے پر پھینک دے تو صبح جب بھنگی کوڑا کرکٹ اٹھانے آتا تو یہ لحاف دیکھ کر اس کو بھی گِھن آجاتی، پر لطف یہ ہے کہ اس کی ان تمام غلاظتوں کے باوجود لوگ اس سے محبت کرتے تھے اور امرتسر میں تو آپ کو ایسے کئی آدمی مل جائیں گے جو اس کو محبت کی حد تک پسند کرتے ہیں۔ گنڈا سنگھ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس برس ہے۔ داڑھی اور مونچھوں کے بھوسلے بال اس کے چہرے کے دو تہائی حصے پر موبل آئل میں بھیگے ہوئے چیتھڑے کی طرح پھیلے رہتے ہیں۔ پگڑی کے نیچے اسکے کیسوں کی بھی یہی حالت رہتی ہے۔ کبھی کبھی جب اس کی پنڈلیاں کپڑا اٹھ جانے کے باعث ننگی ہو جاتی ہیں تو ان پر میل کھرنڈوں کی شکل میں جا بجا نظر آتا ہے، مگر لوگ ان تمام میلی اور گندی حقیقتوں سے باخبر ہونے پر بھی گنڈا سنگھ کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں اور اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے ہیں۔ امرت سر چھوڑ کر جب گنڈا سنگھ اپنے گرم سوٹ سمیت دہلی آیا تو اسے غیر شعوری طور پر معلوم تھا کہ یہاں بھی خود بخود اس کے دوست پیدا ہو جائیں گے۔ اگر اسکو اپنی غلاظت پسندیوں کا احساس ہوتا تو بہت ممکن ہے یہ احساس رکاوٹ بن جاتا اور دہلی میں اس کا کوئی دوست نہ بنتا۔ چند ہی دنوں میں بظاہر کسی وجہ کے بغیر آٹھ دس آدمی گنڈا سنگھ کے دوست بن گئے اور گنڈا سنگھ کو اس بات کا مطلق احساس نہ ہوا کہ اگر یہ آٹھ دس آدمی اس کے دوست نہ بنتے تو شہر دہلی میں وہ بھوکوں مرتا۔ روٹی کے مسئلے پر دراصل گنڈا سنگھ نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اور نہ اس نے کبھی یہ جاننے کی تکلیف کی تھی کہ دوسرے اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ کھانا، پینا اور سونا، یہ تین چیزیں ایسی تھیں جو گنڈا سنگھ کو چلتے پھرتے کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتی تھیں اور ایک زمانے سے چونکہ یہ چیزیں اسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ مل رہی تھیں اس لیے ان کے متعلق وہ کبھی سوچتا ہی نہیں تھا۔ چاوڑی میں ہربنس سے ملنے گیا تو وہاں صبح کا ناشتہ مل گیا۔ ہربنس کے یہاں سے آیا تو راستے میں احمد علی نے اپنی دکان پر ٹھہرا لیا اور کہا۔

”گنڈا سنگھ، بھئی تم خوب وقت پر آئے، میں نے دھنّا مل سے کچھ چاٹ منگوائی ہے، کھا کے جانا۔“

احمد علی کی دکان پر چاٹ کھانے کے بعد گنڈا سنگھ کے دل میں خیال آیا کہ چلو ہیم چندر سے ملنے چلیں ہیم چندر بہت اچھا افسانہ نگار ہے اور گنڈا سنگھ کے دل میں اسکی بہت عزت ہے۔ چنانچہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ دعوت دینے اور دعوت قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ کھانا آیا اور دونوں نے مل کر کھا لیا۔ یہاں سے جب گنڈا سنگھ تمار پور کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں باغ آ گیا۔ دھوپ چونکہ بہت کراری تھی، اس لیے گنڈا سنگھ جب کچھ دیر ستانے کے لیے نکلسن باغ کے ایک بنچ پر لیٹا تو پانچ بجے تک وہیں سویا رہا۔ آنکھیں مل کر اٹھا اور آہستہ آہستہ تمار پور کا رخ کیا جہاں اسکا دوست عبدالمجید رہتا تھا۔ چھ بجے کے قریب گنڈا سنگھ عبدالمجید کے گھر پہنچا۔ وہاں جنگ کی باتیں شروع ہوئیں، چنانچہ آٹھ بج گئے۔ عبدالمجید بہت ہوشیار آدمی تھا۔ ہندوستان کے ترقی پسند لٹریچر کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھیں مگر جنگ کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کوشش کرنے کے باوجود وہ چین اور جاپان، جاپان اور روس، روس اور جرمنی، جرمنی اور فرانس کے جغرافیائی رشتے کو نہ سمجھ سکا تھا۔ جب کبھی وہ دنیا کا نقشہ کھول کر اپنے سامنے رکھتا تو اس کی نگاہوں میں نقشے پر پھیلے ہوئے شہر اور ملک ایسے الجھاؤ کی صورت اختیار کر لیتے جو اکثر اوقات پتنگ اڑانے کے دوران میں اس کی ڈور میں پیدا ہو جایا کرتے تھے مگر گنڈا سنگھ کو دنیا کے جغرافیہ پر کافی عبور حاصل تھا۔ ایک بار اخبار پڑھ لینے کے بعد جنگ کا صحیح نقشہ اس کے ذہن میں آ جاتا تھا اور وہ بڑے سہل انداز میں لوگوں کو سمجھا سکتا تھا کہ جنگ کے میدان میں کیا ہو رہا ہے۔ عبدالمجید طبعاً نفاست پسند تھا، اس کو گنڈا سنگھ کی غلاظتیں بہت کھٹکتی تھیں مگر وہ مجبور تھا اس لیے کہ گنڈا سنگھ ہی ایک ایسا آدمی تھا جو اسے جنگ کے تازہ حالات سمجھا سکتا تھا۔ اگر عبدالمجید کو جنگی خبریں سننے اور ان پر تفصیلی بحث کرنے کی عادت نہ ہوتی جو ایک بہت بڑی کمزوری کی شکل اختیار کر چکی تھی تو وہ یقیناً اس آدمی سے کبھی ملنا پسند نہ کرتا جو کھانا کھانےکے بعد سالن سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کے کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں سے صاف کرتا تھا۔ ایک دفعہ عبدالمجید نے پردوں کو اس کے حملے سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنا تولیہ آگے بڑھا دیا اور کہا۔

”لو گنڈا سنگھ، اس سے ہاتھ صاف کر لو۔ کچھ دیر اگر ٹھہر سکو تو پانی اور صابن آ رہا ہے۔“

گنڈا سنگھ نے اس انداز سے تولیہ عبدالمجید سے لیا جیسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اور ایک منٹ میں اپنا منہ ہاتھ صاف کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا۔

”پانی وانی کی کوئی ضرورت نہیں، ہاتھ صاف ہی تھے۔“

عبدالمجید نے جب زہر کے گھونٹ پی کر اپنے تولیے کی طرف دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہُوا کہ منہ ہاتھ صاف کرنے کے بجائے کسی نے اس کے ساتھ سائیکل کی چین صاف کی ہے۔ عبدالمجید کی بیوی کو گنڈا سنگھ کی یہ مکروہ عادات سخت ناپسند تھیں۔ مگر وہ بھی مجبور تھی اس لیے کہ جس روز گنڈا سنگھ نہیں آتا تھا عبدالمجید اسے اپنے پاس بٹھا کر جنگ کے تازہ حالات پر ایک طویل لیکچر دینا شروع کر دیتا تھا جو اس امن پسند عورت کو طوعاً و کرہاً سارے کا سارا سننا ہی پڑتا تھا۔ گنڈا سنگھ ذہین آدمی تھا۔ ادب اور سیاست کے بارے میں اسکی معلومات اوسط آدمی سے بہت زیادہ تھیں۔ امرتسر میں اسکے اس گرم سوٹ کا سودا بھی ان معلومات کے ذریعے ہی سے ہوا تھا۔ محمد عمر ٹیلر ماسٹر کو جنگی خبریں سننے کا خبط تھا، چنانچہ گنڈا سنگھ نے جنگ کے ابتدائی حالات سنا سنا کر محمد عمر کو اس قدر مرعوب کیا کہ اس نے یہ گرم سوٹ (جو کسی گاہک نے 37ء میں تیار کرایا تھا اور دو برس سے اس کے پاس بیکار پڑا تھا چونکہ اس گاہک نے پھر کبھی شکل ہی نہیں دکھائی تھی) گنڈا سنگھ کے جسم پر فٹ کر دیا اور اس کے ساتھ پانچ روپے ماہوار کی چھ قسطیں مقرر کر لیں۔ ان چھ قسطوں میں سے صرف تین قسطیں گنڈا سنگھ نے ادا کی تھیں، باقی تین قسطوں کے لیے محمد عمر کئی بار تقاضا کر چکا تھا مگر ان رسمی تقاضوں کے علاوہ محمد عمر نے گنڈا سنگھ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ اس لیے کہ جنگ کے حالات دن بدن دلچسپ ہوتے جا رہے تھے۔ گنڈا سنگھ نے امرتسر کیوں چھوڑا۔ ایک لمبی کہانی ہے۔ دہلی میں جو اس کے نئے دوست بنے تھے اُن کو صرف اتنا معلوم تھا کہ امرتسر میں ایک پُرانے دوست کے کہنے پر وہ یہاں چلا آیا تھا کہ ملازمت تلاش کرے۔ دہلی آ کر گنڈا سنگھ ملازمت کی جستجو کرتا مگر یہ کم بخت گرم سوٹ اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اس قدر گرمی پڑ رہی تھی کہ چیل انڈا چھوڑ دے۔ کچھ دنوں سے گرمی کی انتہا ہو گئی تھی۔ لوگ سن سڑوک سے مر رہے تھے۔ گنڈا سنگھ کو موت کا اتنا خیال ہی نہیں تھا جتنا کہ اُسے اُس تکلیف کا خیال تھا جو گرمی کی شدت کے باعث اسے اٹھانا پڑ رہی تھی۔ بازاروں میں دُھوپ پگھلی ہوئی اگنی کی طرح پھیلی رہتی تھی۔ لُو اس غضب کی چلتی تھی کہ منہ پر آگ کے چانٹے سے پڑتے تھے۔ لُک پھری سڑکیں توے کے مانند تپتی رہتی تھیں۔ ان سب کے اوپر فضا کی وہ گرم گرم اداسی تھی جو گنڈا سنگھ کو بہت پریشان کرتی تھی۔ اگر اس کے پاس یہ گرم سُوٹ نہ ہوتا تو الگ بات تھی، شدید گرمیوں کا یہ موسم کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا پر اس سوٹ کی موجودگی میں جس کا رنگ اسکی بُھوسلی داڑھی سے بھی زیادہ گہرا تھا۔ اب ایک دن بھی دہلی میں رہنا اسے دشوار معلوم ہوتا تھا۔ اس سوٹ کا رنگ سردیوں میں بہت خوشگوار معلوم ہوتا تھا پر اب گنڈا سنگھ کو اس سے ڈر لگتا تھا۔ سوٹ کا کپڑا بہت کھردرا تھا، کوٹ کا کالر گھسنے کے باعث بالکل ریگ مار کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس سے گنڈا سنگھ کو بہت تکلیف ہوتی تھی یہ گھسا ہوا کالر ہر وقت اوپر نیچے ہو کر اسکی گردن کے بال مونڈتا رہتا تھا۔ ایک دو دفعہ جب غضب کی گرمی پڑی تو گنڈا سنگھ کے جی میں آئی کہ یہ گرم سوٹ اتار کر کسی ایسی جگہ پھینک دے کہ پھر اسے نظر نہ آئے مگر یہ سوٹ اگر وہ اتار دیتا تو اس کی جگہ پہنتا کیا۔ اس کے پاس تو اس سوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا۔ یہ مجبوری گرمی کے احساس میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی تھی اور بے چارہ گنڈا سنگھ تلملا کے رہ جاتا تھا۔ دہلی میں اس کے چند دوستوں نے اس سے پوچھا تھا

”بھئی گنڈا سنگھ تم یہ گرم سوٹ کیوں نہیں اتارتے کیا تمہیں گرمی نہیں لگتی؟“

گنڈا سنگھ چونکہ ذہین آدمی تھا۔ اس لیے اس نے یوں جواب دیا تھا۔

”گرم کپڑا گرمی کی شدت کو روکتا ہے اسی لیے میں یہ گرم سوٹ پہنتا ہُوں۔ سن اسٹروک کا اثر ہمیشہ گردن کے نچلے حصہ پر پڑتا ہے جہاں حرام مغز ہوتا ہے۔ اگر جسم کے اس حصے پر گرم کپڑے کی ایک موٹی سی تہہ جمی رہے تو سورج کے اس حملے کا بالکل خدشہ نہیں رہتا۔ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں انگریز وغیرہ سولر ہیٹ کے پچھلے حصے کے ساتھ ایک کپڑا لٹکا دیتے ہیں کہ لُو سے بچے رہیں۔ عرب میں سر کے لیے ایک خاص پہناوا مروج ہے۔ ایک بڑا سا رومال ہوتا ہے جو گردن کو ڈھانپے رہتا ہے۔ ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں شدید گرمی پڑتی ہے پگڑی کا استعمال اب تک چلا آرہا ہے۔ شملہ چھوڑنے کا دراصل مطلب یہی تھا کہ گردن لُو سے محفوظ رہے۔ مگر اب لوگوں نے شملہ چھوڑنا قریب قریب ترک کر دیا ہے اس لیے کہ اسے فصول سمجھا گیا ہے۔ اور بغیر شملہ چھوڑے پگڑی باندھنا جدید فیشن بن گیا ہے۔ میں خود اس فیشن کا شکار ہُوں۔“

یہ فاضلانہ جواب سُن کر اس کے دوست بہت مرعوب ہُوئے تھے، چنانچہ پھر کبھی انھوں نے گنڈا سنگھ سے اس کے سوٹ کے بارے میں استفسار نہ کیا تھا۔ گنڈا سنگھ جس کو اپنی معلومات کا مظاہرہ کرنیکا شوق تھا اس وقت یہ جواب دے کر بہت مسرور ہوا تھا مگر یہ مسرت فوراً ہی اس سوٹ کی تکلیف دہ گرمی نے غائب کر دی تھی۔ عبدالمجید تمار پور یعنی شہر کے مضافات میں رہتا تھا جہاں کھلی فضا میسر آسکتی ہے۔ ایک رات جب تازہ جنگی حالات پر تبصرہ کرتے کرتے دیر ہوگئی تو عبدالمجید نے گنڈا سنگھ کے لیے بر آمدے کے باہر ایک چارپائی بچھوا دی۔ کوٹ اور واسکٹ اتار کر وہ پتلون سمیت اس چارپائی پر صبح چھ بجے تک سویا رہا۔ رات بڑے آرام میں کٹی۔ کھلی فضا تھی اس لیے ساری رات خُنک ہوا کے جھونکے آتے رہے۔ گنڈا سنگھ کو یہ جگہ پسند آئی چنانچہ اس نے شام کو دیر سے آنا شروع کر دیا۔ عبدالمجید کی بیوی نے دس بارہ روز تک گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برداشت کیا۔ لیکن اس کے بعد اُس سے رہا نہ گیا۔ عبدالمجید سے اُس نے صاف صاف کہہ دیا۔

”اصغر کے ابا۔ اب پانی سر سے گُزر چکا ہے۔ میں اس موئے گنڈا سنگھ کا آنا یہاں بالکل پسند نہیں کرتی۔ مکان ہے یا سرائے ہے؟۔ یعنی وہ عین کھانے کے وقت آجاتا ہے، ادھر ادھر کی باتیں آپ سے کرتا ہے اور چارپائی بچھوا کر سو جاتا ہے۔ میں اُس کی غلاظتیں برداشت کرسکتی ہوں مگر اس کا یہاں سونا بالکل برداشت نہیں کرسکتی۔ سنا آپ نے۔ اگر کل وہ یہاں آیا تو میں خود اس سے کہہ دونگی کہ سردار صاحب، جنگ کے متعلق آپ باتیں کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کیجیے، کھانا حاضر ہے، تولیے، دروازوں کے پردے، گدیوں کے غلاف، یہ تمام چیزیں بڑے شوق سے منہ پونچھنے کے لیے استعمال کیجیے مگر رات کو آپ یہاں ہرگز نہیں سوسکتے۔ اصغر کے ابا، میں خدا کی قسم کھا کے کہتی ہوں میں بہت تنگ آگئی ہُوں۔“

عبدالمجید کو خود گنڈا سنگھ کا وہاں سونا بُرا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ اس کی بیوی پرلی طرف آنگن میں اکیلی پڑی رہتی تھی مگر وہ کیا کرتا جبکہ جنگ کی دلچسپ باتیں کرتے کرتے دیر ہو جاتی تھی اور گنڈا سنگھ بغیر کسی تکلیف کے جیسے کہ اس کا روزانہ کا معمول ہو۔ اس سے کہہ دیتا تھا۔

”بھائی عبدالمجید اب تم سو جاؤ۔ صبح اٹھ کر تازہ اخبار دیکھیں گے تو نئے حالات کا کچھ پتہ چلے گا۔“

یہ کہہ کر وہ بر آمدے میں سے چارپائی نکالتا اور باہر بچھا کر سو جاتا۔ جب عبدالمجید کی بیوی اس پر بہت برسی تو اس نے کہا۔

”جانِ من، میں خود حیران ہُوں کہ اس کو کس طرح منع کروں۔ یہاں دہلی میں اسکا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں۔ مجھے تو اب اس بات کا خوف لاحق ہو رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرے مکان کو اپنا اڈا بنالے گا۔ آدمی بے حد اچھا ہے، یعنی لائق ہے، ذہین ہے پر۔ کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹُوٹے۔“

یہ سن کر عبدالمجید کی بیوی نے کہا۔

”تو یہ ترکیب تم ہی سوچو۔ میں تو صاف گو ہوں، اگر مجھ سے کہو گے تو میں کھلے لفظوں میں اس سے کہہ دوں گی کہ تمہارا یہاں رہنا مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔“

عبدالمجید نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ وہ گنڈا سنگھ سے اپنی مشکلات اور مجبوریاں صاف لفظوں میں بیان کر دے گا۔ چنانچہ جب شام کو گنڈا سنگھ آیا تو جنگ کے تازہ حالات پر بحث شروع کرنے کے بجائے عبدالمجید نے اس سے کہا۔

”گنڈا سنگھ میں تم سے ایک بات کہوں۔ بُرا تو نہیں مانو گے۔“

گنڈا سنگھ نے ہمہ تن گوش ہو کر جواب دیا۔

”بُرا ماننے کی بات ہی کیا ہے۔ آپ کہیے۔“

اس پر عبدالمجید نے ایک مختصر سی رسمی تمہید شروع کی، پھر اس کے آخر میں کہا۔

”۔ بات یہ ہے کہ سردیوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کی رہائش کا انتظام کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس موسم میں گنجائش نکل آتی ہے مگر ان گرمیوں میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ مردوں کو اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ مستورات کو ہوتی ہے تم خود سمجھ سکتے ہو۔“

گنڈا سنگھ مطلب سمجھ گیا چنانچہ اس نے پہلی مرتبہ اپنی تکلیفیں بیان کرنا شروع کیں۔ بھائی عبدالمجید میں تمہاری مہربانیوں کا بہت شکر گزار ہوں۔ رات کاٹنے کے لیے یوں تو مجھے بہت جگہیں مل سکتی ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ایسی کھلی ہوا کہیں نہیں ملتی۔ سارا دن اس گرم سوٹ میں پگھلتا رہتا ہوں۔ چند راتیں جو میں نے تمہارے یہاں بسر کی ہیں، میں کبھی نہیں بھول

سکتا۔ مجھے تمہاری مجبوریوں اور تکلیفوں کا احساس اب ہُوا ہے اس لیے کہ جو آرام مجھے یہاں رات کو ملتا تھا اس قدر خوشگوار تھا کہ میں نے دوسرے پہلو پر کبھی غور ہی نہ کیا۔ تم میرے دوست ہو کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ اس گرم سوٹ سے مجھے نجات مل جائے، اس طور پر کہ یہ گرم سوٹ بھی میرے پاس رہے اور گرمیوں کا موسم بھی کٹ جائے۔ کیونکہ دو تین مہینے کے بعد پھر سردیاں آنے والی ہیں اور مجھے پھر اس سوٹ کی ضرورت ہو گی۔ سچ پوچھو تو اب میں دیوانگی کی حد تک اس سوٹ کی گرمی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ تم خود سمجھتے ہو“!

عبدالمجید سب سمجھ گیا، گنڈا سنگھ رخصت ہوا تو عبدالمجید نے اپنی بیوی سے بات چیت کی۔ دونوں دیر تک اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں اس کی بیوی نے کہا۔

”صرف ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ گنڈا سنگھ کو کسی ایسی جگہ بھیج دیا جائے جہاں گرمی نہ ہو۔“

یہ سن کر عبدالمجید نے کہا۔

”ٹھیک ہے پر اس کے لیے رقم کی ضرورت ہے، اگر میرے پاس فالتو روپے ہوتے تو کیا میں نے اسے ٹھنڈے کپڑے نہ بنوا دیئے ہوتے۔“

اس پر عبدالمجید کی بیوی نے کہا۔

”تم پوری بات تو سن لیا کرو۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اسے شملہ بھیج دیا جائے۔ میرا بھائی نصیر کل آنے والا ہے۔ اس سے کہہ دیں گے وہ گنڈا سنگھ کو بغیر ٹکٹ کے وہاں پہنچا دے گا۔ ایک دوبارہ وہ تمہیں بھی تو شملہ لے گیا تھا۔“

عبدالمجید یہ بات سُن کر اس قدر خوش ہُوا کہ اس نے اپنی بیوی کا منہ چُوم لیا۔

”بھئی کیا ترکیب سوچی ہے۔ یعنی سوٹ گنڈا سنگھ کے جسم پر ہی رہے گا اور وہ شملے پہنچ جائے گا۔ اس سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔“

دوسرے روز شام کو گنڈا سنگھ آیا تو عبدالمجید نے شملہ جانے کی رائے پیش کی۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہُوا۔ اس نے قطعاً نہ سوچا کہ شملے جا کر وہ بغیر روپے پیسے کے کس طرح گزارہ کرے گا۔ دراصل ایسی باتوں پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ تیسرے دن نصیر نے گنڈا سنگھ کو گاڑی میں سوار کر دیا اور گارڈ سے جو اس کا دوست تھا کہہ دیا تھا کہ وہ اسے بحفاظت تمام شملے پہنچا دے۔

گلگت خان

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوگلگت خان

شہباز خان نے ایک دن اپنے ملازم جہانگیر کو جو اُس کے ہوٹل میں اندر باہر کا کام کرتا تھا اُس کی سست روی سے تنگ آ کر برطرف کر دیا۔ اصل میں وہ سست رو نہیں تھا۔ اس قدر تیز تھا کہ اُس کی ہر حرکت شہباز خان کو غیر متحرک معلوم ہوتی تھی۔ شہباز خان نے اس کو مہینے کی تنخواہ دی۔ جہانگیر نے اس کو سلام کیا اور ٹکٹ کٹا کر سیدھا بلوچستان چلا گیا جہاں کوئلے کی کانیں نکل رہی تھیں۔ اُس کے اور کئی دوست وہیں چلے گئے تھے۔ لیکن اُس نے گلگت اپنے بھائی حمزہ خان کو خط لکھا کہ وہ شہباز خان کے یہاں ملازمت کر لے کیونکہ اُسے اپنا یہ آقا پسند تھا۔ ایک دن حمزہ خان' شہباز خان کے ہوٹل میں آیا اور ایک کارڈ دکھا کر اس نے کہا

”خوام ملازمت چاہتا ہے۔ امارے بھائی نے لکھا ہے، تم اچھا اور نیک آدمی ہے۔ خوام بھی اچھا اور نیک ہے۔ تم کتنا پیسا دے گا“

شہباز خان نے حمزہ خان کی طرف دیکھا۔ وہ جہانگیر کا بھائی کسی لحاظ سے بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ناٹا سا قد۔ ناک چوڑی چپٹی۔ نہایت بدشکل۔ شہباز خان نے اسے ایک نظر دیکھ کر اور جہانگیر کا خط پڑھ کر سوچا کہ اس کو نکال باہر کرے۔ مگر آدمی نیک تھا اس نے کسی سائل کو خالی نہیں جانے دیا تھا۔ حمزہ خان کو چنانچہ اس نے پندرہ روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور یہ ہدایت کر دی کہ جو کام اُس کے سپرد کیا جائے ایمانداری سے کرے۔ حمزہ خان نے اپنے بدنما ہونٹوں سے مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے شہباز خان کو یقین دلایا

”خان بادشاہ۔ ام تم کو کبھی تنگ نہیں کرے گا۔ جو کہے گا مانے گا“

شہباز خان یہ سُن کر خوش ہو گیا۔ حمزہ خان نے شروع شروع میں کچھ اتنا اچھا کام نہ کیا لیکن تھوڑے عرصے میں وہ سب کچھ سیکھ گیا۔ چائے کیسے بنائی جاتی ہے۔ شکر کے ساتھ گڑ کتنا ڈالا جاتا ہے۔ کوئلے والیوں سے کوئلے کیسے حاصل کیے جاتے ہیں اور مختلف گاہکوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھنا چاہیے۔ یہ اس نے سیکھ لیا۔ اس میں صرف ایک کمی تھی کہ وہ بے حد بدشکل تھا۔ بدتمیز بھی کسی حد تک تھا۔ اس لیے کہ اس کی شکل صورت دیکھ کر شہباز خان کے ہوٹل میں آنے جانے والے کچھ گھبرا سے جاتے۔ مگر جب گاہک آہستہ آہستہ اس کی بدصورتی سے مانوس ہو گئے تو انھوں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ بلکہ بعض لوگ تو اس سے دلچسپی لینے لگے اس لیے کہ وہ کافی دلچسپ چیز تھا۔ مگر اس دلچسپی سے حمزہ خان کو تسکین نہیں ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ محض ہنسی مذاق کی خاطر یہ لوگ جو ہوٹل میں چند گھنٹے گزارنے آتے ہیں اس سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ یوں حمزہ خان گلگت خان کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اس لیے کہ وہ کافی دیر گلگت میں رہا تھا اور اس ریاست کا ذکر بار بار کیا کرتا تھا۔ اس لیے ہوٹل میں آنے جانے والوں نے اس کا نام گلگت خان رکھ دیا، جس پر حمزہ خان

کو اعتراض نہیں تھا۔ حمزہ کے کیا معنی ہوتے ہیں، اس کو معلوم نہیں تھا بلکہ گلگت کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ شہباز خان کے ہوٹل میں آئے اس کے قریب قریب ایک برس ہو گیا۔ اس دوران میں اس نے محسوس کیا کہ اس کا مالک شہباز خان اس کی شکل صورت سے متنفر ہے یہ احساس اُسے کھائے جاتا تھا۔ ایک دن اُس نے ہوٹل کے باہر کتے کا پلا دیکھا جو اس سے بھی کہیں زیادہ بد صورت تھا۔ اُس کو اُٹھا کر وہ اپنی کوٹھری میں لے آیا جو اسے ہوٹل کی بالائی منزل پر رہنے سہنے کے لیے دی گئی تھی۔ یہ اتنی چھوٹی تھی کہ اگر کتے کا ایک اور پلا آجاتا تو وہ اس میں گلگت خان کے ساتھ سمانہ سکتا۔ اس کتے کے پلے کی ٹانگیں ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ تھوتھنی بڑی واہیات تھی۔ عجیب بات ہے کہ گلگت خان کی ٹانگیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کا نچلا دھڑ اس کے اوپر کے جسمانی حصے کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ بالکل اُس کے مانند یہ پلا بھی مسخ شدہ صورت کا تھا۔ گلگت خان اس سے بہت پیار کرتا۔ شہباز خان نے اس سے کئی مرتبہ کہا کہ میں اس کتے کے بچے کو گولی مار دُوں گا۔ مگر گلگت خان اس کو کسی بھی حالت میں اپنے سے جدا کرنے پر راضی نہیں تھا۔ اُس نے شروع شروع میں تو اپنے آقا سے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ آخر ایک روز اس سے صاف لفظوں میں اُس سے کہہ دیا

”خو، تم۔ ہوٹل کے مالک ہو۔ میرے دوست ٹن ٹن کے مالک نہیں ہو“

شہباز خان یہ سُن کر چپ ہو گیا۔ گلگت خان بڑا محنتی تھا۔ صبح پانچ بجے اُٹھتا دو انگیٹھیاں سُلگاتا سامنے والے نل سے پانی بھرتا اور پھر گاہکوں کی خدمت میں مصروف ہو جاتا۔ اس کا ٹن ٹن مہینوں بعد بڑا ہو گیا۔ وہ اس کے ساتھ کوٹھری میں سوتا تھا جو ہوٹل کی بالائی منزل پر تھی۔ سردیاں تھیں۔ اس لیے گلگت خان کو اپنے بستر میں اس کی موجودگی بُری نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ وہ خوش تھا کہ وہ اس سے اس قدر پیار کرتا ہے کہ رات کو بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ٹن ٹن نام گلگت خان کے ایک خاص گاہک نے رکھا تھا، جو اُس کی انتہائی بد صورتی کے باوجود اس سے دلچسپی لیتا۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ کتے کا وہ پلا جسے وہ سڑک پر سے اُٹھا کر اپنے پاس لے آیا تھا اور جس کی گردن میں اُس نے اپنی تنخواہ میں سے پیسے بچا کر ایک ایسا پٹا ڈالا تھا جس میں گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔ اس خاص گاہک نے جو غالباً کسی روزنامے کا کالم نویس تھا ان گھنگروؤں کی آواز سُن کر اس کا نام ٹن ٹن رکھ دیا۔ ٹن ٹن جب بڑا ہوا تو اس کی ٹانگیں اور بھی زیادہ چھوٹی ہو گئیں۔ گلگت خان کی بھی یہی حالت تھی۔ اس کی ٹانگیں بھی دن بہ دن مختصر ہو رہی تھیں۔ اُوپر کا دھڑ مناسب و موزوں انداز میں بڑھ گیا تھا۔ شہباز خان کو گلگت خان کا یہ حلیہ پسند نہیں تھا مگر وہ محنتی تھا۔ گدھے کی مانند کام کرتا۔ صبح پانچ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بارہ بجے تک ہوٹل میں رہتا۔ ایک گھڑی کے لیے بھی آرام نہ کرتا۔ لیکن اُس دوران میں وہ تین چار مرتبہ اوپر اپنی کوٹھری میں ضرور جاتا اور اپنے پیارے کتے کی جو اب بڑا ہو گیا تھا دیکھ بھال کرتا تھا اس کو ہوٹل کا بچا کچھا کھانا دیتا۔ پانی پلاتا اور پیار کر کے فوراً واپس چلا آتا۔ ایک دن اس کا ٹن ٹن بیمار ہو گیا۔ ہوٹل میں اکثر میڈیکل اسٹوڈنٹ آیا کرتے تھے کیونکہ اُن کا کالج نزدیک ہی تھا۔ گلگت خان نے ان میں سے ایک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر پیٹ کی شکایت ہو تو مریض کو بٹیر یا مرغ کا گوشت کھلانا چاہیے۔ فاقہ دینا سخت حماقت ہے۔ اس نے اپنے ٹن ٹن کو صبح سے کوئی چیز کھانے کو نہیں دی تھی۔ اس لیے کہ اس کو بد ہضمی تھی۔ مگر جب اس نے اس میڈیکل اسٹوڈنٹس کی بات سُنی تو اس نے اِدھر اُدھر کوئی مرغ تلاش کرنا شروع کیا مگر نہ ملا۔ محلہ ہی کچھ ایسا تھا جس میں کوئی مُرغ مرغیاں نہیں پالتا تھا۔ شہباز خان کو بٹیر بازی کا شوق تھا۔ اس کے پاس ایک بٹیر تھا جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ گلگت خان نے تنکوں کا بنا ہوا پنجرہ کھولا اور ہاتھ ڈال کر یہ بٹیر پکڑی۔ کلمہ پڑھ کر اُس کو ذبح کیا اور اپنے ٹن ٹن کو کھلا دیا۔ شہباز خان نے جب پنجرہ خالی دیکھا تو بہت پریشان ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بٹیر اس میں سے کیسے اڑ گئی۔ وہ تو اس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ کئی پالیاں اس نے بڑی شان سے جیتی تھیں۔ اس نے گلگت خان سے پوچھا تو اس نے کہا

”خو مجھے کیا مالوم۔ تمہارا بٹیر کدھر گیا۔ بھاگ گیا ہو گا کدھر“

شہباز خان نے جب زیادہ جستجو کی تو اُس نے دیکھا کہ اس کے ہوٹل کے سامنے جہاں بدرو تھی تھوڑا سا خون اور بچے ہوئے پر پڑے ہیں۔ یہ بلاشبہ اس کی بٹیر کے تھے وہ سر پیٹ کر رہ گیا اُس نے سوچا کوئی ظالم اس کو بھون کر کھا گیا ہے۔ بٹیر کے پر اُس کے جانے پہچانے تھے۔ اس نے ان کو بڑے پیار سے اکٹھا کیا اور اپنے ہوٹل کے پچھواڑے جہاں کھلا میدان تھا، چھوٹا سا گڑھا کھود کر انھیں دفن کر دیا، فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد اُس نے کئی غریبوں کو اپنے ہوٹل سے مُفت کھانا بھی کھلایا تاکہ مرحوم کی رُوح کو ثواب پہنچے۔ جب شہباز خان سے کوئی اس کی بٹیر کے متعلق پوچھا تو وہ کہتا

”شہید ہو گیا ہے“

گلگت خان یہ سنتا اور اپنے کان سمیٹے خاموش کام میں مشغول رہتا۔ اس کا ٹن ٹن اچھا ہو گیا۔ اس کو جو شکایت تھی رفع ہو گئی۔ گلگت خان بہت خوش تھا۔ اُس نے اپنے پیارے کتے کی صحت یابی پر دو بھکاریوں کو ہوٹل سے کھانا کھلایا۔ شہباز خان نے پوچھا کہ تم نے ان سے دام وصول کیوں نہیں کیے تو اس نے کہا

”کبھی کبھی خیرات بھی دے دینا چاہیے خان“

یہ سُن کر شہباز خان چپ ہو گیا۔ ایک دن مینا کا بچہ کہیں سے اُڑتا اُڑتا گلگت خان کے پاس آ گرا جب کہ وہ کالج کے کسی لڑکے کے لیے ناشتہ تیار کر کے لے جا رہا تھا اُس نے ناشتے کی ٹرے کو ایک طرف رکھا اور مینا کے بچے کو جو بے حد سہا ہوا تھا پکڑ کر اُس پنجرے میں ڈال دیا جس میں اس کے مالک شہباز خان کی بٹیر ہوتی تھی۔ مینا کو اُس نے سوا مہینے تک پالا پوسا۔ خاصی موٹی ہو گئی۔ خوب چہکتی تھی۔ ایک دن اس کا ٹن ٹن آ گیا۔ اس نے مینا کو دیکھا تو بے تاب ہو گیا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس تک رسائی ہو جائے اور وہ اُسے چبا ڈالے۔ گلگت خان نے

جب دیکھا کہ پنجرہ اوپر کھونٹی کے ساتھ ٹنگا ہے جہاں اس کا ٹن ٹن نہیں پہنچ سکتا۔ بڑی حسرت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا ہے تو اُس نے پنجرے میں سے مینا کو نکالا۔ اس کے پر نوچے۔ گردن مروڑی اور اپنے عزیز کتے کے سپرد کر دی۔ ٹن ٹن نے اس بے بال و پر پرندے کی لاش کو دو تین مرتبہ سونگھا بڑے زور کی ایک چھینک اس کے نتھوں سے باہر نکلی اور وہاں سے دوڑ گیا۔ گلگت خان کو بڑا صدمہ ہوا۔ اُسی دن اُس کو کالج کی وہ دو لڑکیاں جو باقاعدہ چائے پینے کے لیے آتی تھیں اور جن کا وہ خاص طور پر خیال رکھتا تھا آئیں۔ پہلے وہ اس سے ہنس ہنس کے باتیں کیا کرتی تھیں۔ مگر اب انھیں جانے کیا ہو گیا کہ وہ اس سے خفا خفا نظر آتی تھیں۔ ایک نے جو گلگت خان کو بہت پسند تھی اُس سے پوچھا

”تم نے مینا کیوں ماری؟“

گلگت خان ایک لحظے کے لیے بوکھلا سا گیا۔ لیکن سنبھل کر اُس نے جواب دیا

”، خوبی بی جی۔ ام نے اپنے کتے کو ڈالا تھا“

”خو حرام تخم نے اس کو سُونگھا اور چھوڑ دیا“

لڑکی نے کہا

”تو اس کو مارنے سے کیا فائدہ ہوا۔ تم نے پہلے بھی اس کو خان صاحب کی بٹیر ذبح کر کے دی تھی۔ کیا اس نے کھائی تھی؟“

گلگت خان نے بڑے فخر سے جواب دیا

”کھائی تھی۔ اس کی ہڈیاں بھی“

شہباز خان پاس کھڑا تھا۔ اُس نے جب یہ سُنا تو بڑے زور کی ایک دُھول اُس کی گردن پر جمائی

”تخم حرام۔ تم نے اب مانا ہے۔ پہلے کیوں انکار کرتا تھا۔“

گلگت خان خاموش رہا۔ دونوں لڑکیوں نے قہقہے لگائے۔ گلگت خان کو دھول کا اتنا خیال نہیں تھا لیکن لڑکیوں کے ان قہقہوں نے اس کے دل کو زخمی کر دیا۔ شہباز خان کو بہت غصہ تھا۔ گلگت خان کے دُھول جما کر وہ اس پر برس پڑا۔ جتنی گالیاں اُسے یاد تھیں اپنے نوکر پر صرف کر دیں۔ آخر میں اس سے کہا

”تم اس ٹن ٹن یا چن چن سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے۔ حرام خور۔ وہ بھی کوئی کتا ہے۔ تم سے زیادہ بد شکل ہے۔ اتنا بد شکل کہ اس کو دیکھ کر نفرت پیدا ہوتا ہے“

شہباز خان سے مار کھا کر اور اُس کی غصے کی ساری باتیں سُن کر گلگت خان اوپر اپنی کوٹھری میں گیا۔ اس کے کانوں میں کالج کی دونوں لڑکیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ کوٹھری کے ایک کونے میں اس کا ٹن ٹن لیٹا تھا۔ کچھ عجیب انداز سے ٹانگیں دیوار کے ساتھ لگائے۔ جو اس قدر ٹیڑھی تھیں کہ اور زیادہ ٹیڑھی ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ اس نے کچھ دیر غور کیا۔ اس کے بعد اپنا کمانی والا چاقو نکالا اور ٹن ٹن کی طرف بڑھا مگر اسے کوئی خیال آیا۔ کمانی والا چاقو بند کر کے اپنی جیب میں رکھا اور کتے کو بڑے پیار سے بُلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ جب گلگت خان اور ٹن ٹن ریلوے لائن کے پاس پہنچے تو گاڑی آ رہی تھی۔ گلگت خان نے اپنے پیارے کتے کو حکم دیا کہ وہ پٹڑی کے عین درمیان کھڑا ہو جائے۔ اس حیوان نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی۔ گاڑی پوری رفتار سے آ رہی تھی۔ ٹن ٹن پٹڑی میں کھڑا گلگت خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسی نگاہوں سے جن سے وفاداری ٹپک رہی تھی۔ گلگت خان نے ایک نظر اپنی طرف دیکھا اس نے محسوس کیا کہ اُس کا کتا اس سے کہیں زیادہ خوش شکل ہے۔ گاڑی قریب آئی تو اس نے ٹن ٹن کو دھکا دے کر پٹڑی سے باہر گرا دیا اور خود اس کی جھپٹ میں آ گیا۔ اُس کا بالکل قیمہ ہو گیا۔ کتے نے گوشت کے اس ڈھیر کو سُونگھا اور زور زور سے بڑی دردناک آواز میں رونے لگا۔ سعادت حسن منٹو ۶ جون ۱۹۵۴ء

گھوگا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوگھوگا

میں جب ہسپتال میں داخل ہوا تو چھٹے روز میری حالت بہت غیر ہو گئی۔ کئی روز تک بے ہوش رہا۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے لیکن خدا نے اپنا کرم کیا اور میری طبیعت سنبھلنے لگی۔ اس دوران کی مجھے اکثر باتیں یاد نہیں۔ دن میں کئی آدمی ملنے کے لیے آتے۔ لیکن مجھے قطعاً معلوم نہیں، کون آتا تھا، کون جاتا تھا، میرے بسترِ مرگ پر جیسا کہ مجھے اب معلوم ہوا، دوستوں اور عزیزوں کا جمگھٹا لگا رہتا، بعض روتے، بعض آہیں بھرتے، میری زندگی کے بیتے ہوئے واقعات دہراتے اور افسوس کا اظہار کرتے۔ جب میری طبیعت کسی قدر سنبھلی اور مجھے ذرا ہوش آیا تو میں نے آہستہ آہستہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ میں جنرل وارڈ میں تھا۔ دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کا پہلا بیڈ میرا تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی الماری تھی۔ جس میں خاص خاص دوائیں اور آلاتِ جراحی تھے، دیگر سامان بھی تھا۔ مثلاً گرم پانی اور برف کی ربڑ کی تھیلیاں، تھرمامیٹر، بستر کی چادریں، کمبل اور رُوئی وغیرہ۔ اس کے علاوہ اور بے شمار چیزیں تھیں، جن کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کئی نرسیں تھیں، صبح سات بجے سے دو بجے دوپہر تک۔ دو بجے سے شام کے سات بجے تک، چار چار نرسوں کی

ٹولی، اس وارڈ میں کام کرتی۔ رات کو صرف ایک نرس ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔ رات کو مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ یوں تو اکثر آنکھیں بند کیے لیٹا رہتا۔ لیکن کبھی کبھی نیم مُندی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ لیتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ان دنوں جو نرس رات کی ڈیوٹی پر ہوتی تھی، وہ اس قدر مختصر تھی کہ اسے کوئی بھی اپنے بٹوے میں ڈال سکتا تھا۔ گہرا سانولا رنگ، ہر عضو ایک خلاصہ، ہر خدوخال تمہید کی فوری تمت، انتہا درجے کی غیر نسوانی لڑکی تھی، معلوم نہیں، قدرت نے اس کے ساتھ اس قسم کا غیر شاعرانہ سلوک کیوں کیا تھا کہ وہ شعر تھی نہ رباعی، نہ قطعہ۔ البتہ استاد امام دین کی تُک بندی معلوم ہوتی تھی۔ ہر نرس کا کوئی نہ کوئی چاہنے والا موجود تھا، مگر اس غریب کا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نرسنگ کے پیشے کو باوجود اس کی موجودہ گراوٹوں کے احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس نرس سے جس کا نام مس جیکب تھا، بڑی ہمدردی تھی۔ اس سے کوئی مریض دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ ایک شام کو جب وہ آئی اور میرے بستر کے پاس سے گزری تو میں نے اپنی نحیف آواز میں اس سے کہا:

”السلام علیکم مس جیکب۔“

اُس نے میری آواز سن لی۔ فوراً رُک کر اس نے جواب دیا

”سلاما لیکم۔“

بس اس کے بعد میرا یہ دستور ہو گیا کہ جب وہ شام کو ڈیوٹی پر آتی تو وارڈ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کو میری السلام علیکم سُنائی دیتی۔ مجھے نیند آنا شروع ہو گئی تھی، لیکن صبح ساڑھے پانچ بجے جاگ جاتا۔

”مِس جیکب رات بھر کی جاگی ہوئی، مریضوں کے ٹمپریچر لینے میں مصروف ہوتی۔ جب میرے بستر کے پاس آتی تو میں پھر اسے سلام کرتا۔ السلام علیکم کا یہ سلسلہ بڑا دلچسپ ہو گیا، وہ اس لحاظ سے چڑ گئی کہ پہل میں کیوں کرتا ہوں۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ مجھ سے مسابقت لے جائے، مگر اسے ناکامی ہوئی، لیکن ایک روز صبح سویرے جب کہ زیادہ دیر تک جاگنے کے باعث میری آنکھ لگ گئی تھی۔ جب وہ میرا ٹمپریچر لینے کے لیے آئی، تو اس نے اپنی مہین پتلی آواز کو زوردار بنا کر کہا

”سلاما لیکم۔“

میں چونک پڑا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ مِس جیکب کا مختصر وجود میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ میں نے بڑی فراخ دلی سے اپنی شکست تسلیم کی اور اس کے مطابق مناسب و موزوں مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا کر کے جواب دیا۔

”وعلیکم السلام مس جیکب۔ آج تو آپ نے کمال کر دیا۔“

وہ بے حد خوش ہوئی، چنانچہ اس خوشی میں اس نے میرا دو مرتبہ ٹمپریچر لیا کہ پہلی دفعہ اس نے تھرمامیٹر اچھی طرح جھٹکا نہیں تھا۔ ایک رات جبکہ مجھے بالکل نیند آ رہی تھی اور میں بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا کہ دن ہونے میں کتنی دیر ہے۔ بارہ بجے کے قریب میں نے اپنی دُھندلی آنکھوں سے دیکھا کہ وارڈ کے وسط میں جو میز پڑا ہے، اس کے ساتھ کرسی پر مس جیکب اپنے تمام اختصار کے ساتھ بیٹھی ہے۔ اور ایک مریض جو موٹا تھا، اس سے ہم کلام ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ چونکہ خاموشی تھی، اس لیے میں اس کی گفتگو سُن سکتا تھا، وہ نرس سے بڑے یتیمانہ قسم کے عشق کا اظہار کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ پہلے وہ کچھ دیر چپڑاسیوں کے مانند جن کا صاحب اپنی مسند پر موجود ہو، کھڑا رہا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوا:

”نرس صاحبہ۔ کیا اس وقت آپ مجھے اسپرین کی گولی دے سکتی ہیں؟“

مس جیکب غالباً رپورٹ لکھنے میں مصروف تھی۔ اس نے اس موٹے مریض کی طرف دیکھا۔ قلم میز پر رکھ کر اُٹھی اور اس الماری میں سے جو میرے بستر کے قریب تھی، اسپرین کو ایک گولی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ رات کے دو بج گئے۔ میں جاگ رہا تھا لیکن میری آنکھیں بند تھیں۔ آہٹ ہوئی تو میں نے کروٹ بدل کر دیکھا کہ وہی موٹا مریض الماری کھول کر اسپرین کی گولیاں نکال رہا ہے، بالکل اس طرح جیسے کوئی چوری کر رہا ہے۔ میں نے کوئی مداخلت نہ کی۔ میں نے دوسرے دن نرس نعیمہ حق سے جو ہر صبح میرا بدن چھوٹے چھوٹے تولیوں سے کنکنے پانی میں صابن کہ ساتھ صاف کیا کرتی تھی، اور پرلے درجے کی شریر تھی، پوچھا کہ

”انیس نمبر کے بیڈ کا مریض کون ہے؟“

اس کا سانولا چہرہ سوال بن گیا۔

”آپ اُس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

میں نے اس سے کہا:

”تم جانتی ہو، میں افسانہ نگار ہوں، مجھے ہر شخص سے دلچسپی ہے، خواہ وہ مریض ہی کیوں نہ ہو؟“

”اس میں کیا بات ہے؟“

”جو تم میں ہے۔ تم شریر ہو، وہ چور ہے۔“

”نعیمہ حق کو میری یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔

”شرارت اور چوری کو آپ ایک ہی بات سمجھتے ہیں۔“

وہ میرے بالوں بھرے سینے پر تولیہ پھیر رہی تھی۔ میں نے اپنے کمزور ہاتھ سے اس کے گال پر ہولے سے چپت لگائی اور کہا:

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم میرے سوال کا جواب دو کہ انیس نمبر کے بیڈ کا جو مریض ہے اس کا کیا نام ہے ؟“

نعیمہ نے جواب دیا

”گھو گا۔“

”یہ کیا نام ہے ؟“

”بس ہے۔ ہم نے رکھ دیا ہے۔“

میں اس سے کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ نعیمہ نے اُبلی ہوئی سرنج پکڑی اور اس میں ایک سی سی وٹامن بی کمپلیکس ڈال کر سُوئی میرے سوکھے ہوئے بازو میں کھبو دی، مجھے سخت درد ہوا، اس لیے میں گھو گا کو بھول گیا۔ مگر اتنے میں عذرا آ گئی۔ یہ نرس نعیمہ سے چار سی سی آگے تھی۔ ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ انیس نمبر کے بیڈ کے مریض کا نام ان دونوں نے مل کر تجویز کیا ہے۔ عذرا نے پہلے میری خیریت پوچھی، پھر کہا:

”خیریت تو ہے آپ گھوگے کے متعلق پوچھ رہے تھے۔“

میں نے درد کے باعث ذرا تلخ لہجے میں کہا:

”گھو گا جائے جہنم میں۔ اور تم بھی اس کے ساتھ۔“

عذرا مسکرائی۔

”میں تو اس کے ساتھ جہنم کی آخری حد تک جانے کے لیے تیار ہوں۔“

نعیمہ نے پوچھا۔

”کیوں ؟“

عذرا نے جواب دیا۔

”وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“

نعیمہ نے عذرا کے چٹکی لی، اور بڑے زور سے کہا:

”وہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ چلو آؤ۔ ابھی فیصلہ کر لیں۔ گھو گا سے پوچھ لو، ابھی کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے دو مکان میرے نام لکھ دے گا۔“

عذرا نے مکھی مار چھڑی نعیمہ کے سر پر ماری۔

”وہ دو مکان کیا، دو اینٹیں بھی تمہارے نام نہیں لکھے گا۔ وہ گھو گا ہے۔ بہت بڑا گھو گا۔ تم اس کو ابھی تک نہیں پہچانی ہو۔“

اس کے بعد مجھے چند روز میں اس موٹے مریض کے متعلق عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔ جس کو نعیمہ اور عذرا نے گھوگے کا نام دے رکھا تھا۔ اس کا نام غلام محمد تھا۔ ماسٹر غلام محمد۔ بی اے، بی ٹی۔ کسی مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر، اس کو دمے کا مرض تھا، بڑی شدید قسم کا دمہ تھا۔ جب اسے دورہ پڑتا تو سارا وارڈ اس کے دھونکنی ایسے چلتے ہوئے سانسوں کے زیر و بم سے گھنٹوں گونجتا رہتا۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ نظر بازی سے نہ ٹلتا۔ اس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہو گئی، مگر کنوارا تھا۔ میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اس نے شادی اس لیے نہیں کی کہ وہ دمے کا مریض ہے۔ کسی لڑکی کی زندگی کیوں خراب کرے۔ اس کی دو بہنیں تھیں جو عمر میں اس سے کچھ چھوٹی تھیں۔ یہ بھی کنواری تھیں۔ ان کے متعلق مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ بڑی ہیلتھ وزیٹر ہے اور چھوٹی استانی۔ یہ دونوں بلاناغہ آتیں اور گھوگے کے پاس اپنے برقعوں سمیت ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر چلی جاتیں۔ وہ اس کے ناشتے اور دو وقت کے کھانے کے لیے پراٹھے اور سالن وغیرہ لایا کرتی تھیں۔ اس کو ایسے ٹیکے لگ رہے تھے جن سے اشتہا بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مریض زیادہ نہ کھائے تاکہ اس کا وزن نہ بڑھے مگر گھو گا بلاخور تھا۔ گھر سے جو آتا چٹ کر جاتا۔ پھر اس کے ساتھ والے بیڈ پر ایک بنگالی نوجوان تھا جو عرصے سے ٹائی فائیڈ میں گرفتار تھا۔ اُس کو بھوک نہیں لگتی تھی۔ گھو گا اس کا کھانا بھی اپنے پیٹ میں ڈال لیتا۔ مگر نعیمہ نے مجھے بتایا کہ ہسپتال سے جو اُسے مفت کھانا ملتا ہے، اس کے علاوہ وہ اِدھر اُدھر سے اور اکٹھا کرتا ہے اور اپنی بہنوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایک رات جبکہ مجھے نیند آنے ہی والی تھی، میں نے دیکھا کہ گھو گا دبے پاؤں چلا آ رہا ہے۔ رات کی نرس کسی دوسرے وارڈ کی نرس سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ گھوگے نے الماری کھولی اور اس میں کئی چیزیں نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیں۔ مجھے اس کی یہ حرکت بہت بُری معلوم ہوئی۔ لیکن میں اس سے کچھ نہ کہہ سکا اس لیے

کہ مجھے کوئی فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہر روز الماری میں سے چیزیں چُراتا اور میں اسے ٹوک نہ سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اسے دوائیں برابر ملتی ہیں تو وہ اور دوائیاں جو اس کے مرض دمے کا علاج نہیں تھیں، کیوں اس طریقے سے حاصل کرتا ہے؟ نعیمہ حق سے میں نے پوچھا تو اس نے مخصوص انداز میں گردن کو ایک خفیف سی جنبش دے کر اور اپنے سانولے ہونٹوں پر ان سے زیادہ گہرے رنگ کی مسکراہٹ پیدا کر کے کہا:

”جناب اتنے بڑے رائٹر بنے پھرتے ہیں، آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ جتنی دوائیاں اور انجکشن چُراتا ہے، اپنی بہن کو جو کہ ہیلتھ وزیٹر ہے، دے دیتا ہے۔ اس کو روزانہ بیڈ کے لیے ایک روپیہ دینا پڑتا ہے۔ بہت بڑا گھو گا ہے، اس لیے وہ اس خرچ کی کسریوں پوری کر لیتا ہے۔ بلکہ اس کو کچھ پروفٹ ہی ہوتا ہے۔“

نعیمہ کا یہ کہنا درست تھا۔ اس لیے کہ میری بیوی کے بیان سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ اس کو گھوگے سے سخت نفرت تھی۔ ہسپتال سے جو کچھ ملتا تو وہ اپنی بہن کے سپرد کر دیتا، کھانا بھی۔ ایک اور نرس رفیقہ تھی۔ وہ اس مریض کا نام بھی نہیں لینا چاہتی تھی۔ شکل صورت کی معمولی مگر جوان تھی۔ ہر وقت اپنے سفید فراک کو پیٹی کے نیچے کھینچتی اور پھر اپنے سینے کے اُبھاروں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی مگر کردار کے لحاظ سے وہ دوسری نرسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ مضبوط تھی، اس کو گھوگے سے اس لیے نفرت تھی کہ وہ اس سے بے معنی باتیں کرتا تھا۔ دراصل وہ ہر نرس سے بے معنی یا با معنی باتیں کرنے کا عادی تھا۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ پہلے اس نے کسی نرس سے رسمی بات چیت کی۔ اس کے بعد بستر پر سے اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ اس بھونڈے طور پر کہ وہ غریب اکتا گئی، اور اس نے جو دوا مانگی، الماری میں سے نکال کر اس کو دے دی کہ چھٹکارا ملے۔ قریب قریب ہر نرس اس سے متنفّر تھی۔ مجھے خود وہ بہت ناپسند تھا، میرے بستر کی طرف رخ کرتا تو میں چادر اوڑھ لیتا کہ اس کو یہ معلوم ہو کہ میں سو رہا ہوں۔ اس کا بات چیت کا انداز مجھے کَھلتا تھا، یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے کبھی برداشت نہ کیا۔ مجھ سے دو تین مرتبہ اس نے چند روپے بطور قرض لیے اور واپس نہ دیے۔ مجھے اس کا کوئی خیال نہ تھا۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یہ پندرہ روپے اس نے مجھ سے اس لیے حاصل کیے تھے کہ اس کو دس ایک خاص دوا کے لیے خرچ کرنا پڑے تھے جو ہسپتال میں نہیں تو میری طبیعت بہت مکدّر ہوئی اور میں نے دل ہی دل میں اس کو سینکڑوں گالیاں دیں۔ پھر تمام ڈاکٹروں پر اس کے ذلیل کردار کی وضاحت کر دی۔ وہ پہلے میری بتائی ہوئی باتیں نہ مانے۔ انہوں نے کبھی ایسا مریض دیکھا تھا نہ سنا۔ مگر نرسوں سے پوچھ گچھ کے بعد ان کو حقیقت معلوم ہو گئی اور انہوں نے گھوگے کو رخصت کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس کا علم تھا۔ چنانچہ میں نے محض اپنا دل ٹھنڈا کرنے کی خاطر اس کو اپنے پاس بُلایا اور کہا:

”سنا ہے آپ کل پرسوں جانے والے ہیں۔“

گھوگے نے اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور تعجب کا اظہار کیا

”بڑے ڈاکٹر صاحب نے تو مجھ سے کہا تھا کہ چُھٹی لے لو۔ اور میں ایک مہینے کی لے چکا ہوں۔“

میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ ایک مہینہ اور۔ تیس دن مزید۔ چوریوں کے۔ نرسوں کے پیچھے چلنے اور ہاتھ مَل مَل کے دوائیں مانگنے کے۔ بڑے ڈاکٹر صاحب بہت نرم دل تھے۔ میں نے سوچا یقیناً گھوگے نے اپنے مخصوص، لسوڑے کی لیس ایسے انداز میں ان کی منت خوشامد کی ہو گی اور انہوں نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے اس کو ایک ماہ اور ہسپتال میں رہنے کی اجازت دے دی ہو گی۔ مگر اُسی دن گھوگا انتہائی افسردگی کے عالم میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا

”میں کل جا رہا ہوں“

مجھے بڑی خوشی ہوئی:

”مگر ماسٹر صاحب آپ نے تو ایک مہینے کی چھٹی لی ہے، ابھی ابھی۔“

اُس نے آہ بھر کر جواب دیا:

”ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ تمہارا کافی علاج ہو چکا ہے۔ اب تم گھر میں آرام کرو۔“

میں نے کہا:

”یہ بہتر ہے“

لیکن گھوگے کا چہرہ بتا رہا تھا کہ گھر میں اسے چرانے کے لیے دوائیں نہیں ملیں گی۔ نرسیں بھی نہ ہوں گی، جھک مارے گا وہاں۔ میں صبح چار ساڑھے چار بجے کے قریب سویا۔ دس بجے آنکھ کُھلی۔ نعیمہ حق میرے پاس کھڑی تھی، دراصل اسی نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے کوئی خبر سنانا چاہتی ہے۔ مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ مکھی مار چھڑی سے میرے بستر پر چند غیر مری مکھیاں مارنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا:

”گھوگا گیا“

میں نے کہا۔

”ہاں سنا تھا کہ وہ جا رہا ہے۔“

نعیمہ کے سانولے ہونٹوں پر سکڑتی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اور وہ بھی گئی۔“

میں نے پوچھا۔

”کون“

نعیمہ نے جواب دیا۔

”وہ۔ مس جیکب۔ جس کے متعلق آپ کہا کرتے تھے کہ اتنی مختصر ہے کہ بٹوے میں سما سکتی ہے۔ لیکن گھوگے کے پاس تو کوئی بٹوہ نہیں تھا۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ مس جیکب کو گھوگے میں کیا نظر آیا یا گھوگے کو مس جیکب میں کیا خوبی دکھائی دی۔ لیکن تیسرے روز جیکب نائٹ ڈیوٹی پر تھی۔ جب وہ صبح میرے بستر کے قریب آئی تو میں نے زور سے اسلام علیکم کہا۔ اس نے چونک کر دھیمی آواز میں اس سلام کا جواب دیا اور میرا ٹمپریچر لیے بغیر چلی گئی۔ سات بجے جب دوسری نرسیں آئیں تو نعیمہ نے میرا بدن پونچھنے کے لیے گرم پانی تیار کرتے ہوئے اپنے سانولے ہونٹوں پر کنکنی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”گھوگے کے پاس بٹوہ نہیں تھا، اس لیے آپ کی مس جیکب واپس تشریف لے آئی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

نعیمہ نے گرم گرم پانی میں ترکیا ہوا تولیہ میرے بازو پر رکھ دیا،

”کچھ خاص تو نہیں ہوا۔ صرف مِس جیکب کے کانوں کی دو سونے کی بالیاں گم ہو گئی ہیں۔ شاید گھوگے کی بہن کے کان بُچے ہوں گے۔“

گورمکھ سنگھ کی وصیت

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوگورمکھ سنگھ کی وصیت

پہلے چھرا بھونکنے کی اِکادُکا وارادات ہوتی تھیں، اب دونوں فریقوں میں باقاعدہ لڑائی کی خبریں آنے لگی جن میں چاقو چھریوں کے علاوہ کرپانیں، تلواریں اور بندوقیں عام استعمال کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی دیسی ساخت کے بم پھٹنے کی اطلاع بھی ملتی تھی۔ امرتسر میں قریب قریب ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات دیر تک جاری نہیں رہیں گے۔ جوش ہے، جونہی ٹھنڈا ہوا، فضا پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی۔ اس سے پہلے ایسے کئی فساد امرتسر میں ہو چکے تھے جو دیرپا نہیں تھے۔ دس سے پندرہ روز تک مار کٹائی کا ہنگامہ رہتا تھا، پھر خود بخود فرو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پرانے تجربے کی بنا پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ آگ تھوڑی دیر کے بعد اپنا زور ختم کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ بلووں کا زور دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ ہندوؤں کے محلے میں جو مسلمان رہتے تھے بھاگنے لگے۔ اسی طرح وہ ہندو جو مسلمانوں کے محلے میں تھے اپنا گھر بار چھوڑ کے محفوظ مقاموں کا رخ کرنے لگے۔ مگر یہ انتظام سب کے نزدیک عارضی تھا، اس وقت تک کے لیے جب فضا فسادات کے تکدر سے پاک ہو جانے والی تھی۔ میاں عبدالحیی ریٹائرڈ سب جج کو تو سو فی صدی یقین تھا کہ صورتحال بہت جلد درست ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں تھے ان کا ایک لڑکا تھا گیارہ برس کا۔ ایک لڑکی تھی سترہ برس کی۔ ایک پرانا ملازم تھا جس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ مختصر سا خاندان تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میاں صاحب نے بطور حفظِ ماتقدم کافی راشن گھر میں جمع کر لیا تھا۔ اس طرح سے وہ بالکل مطمئن تھے کہ اگر خدانخواستہ حالات کچھ زیادہ بگڑ گئے اور دکانیں وغیرہ بند ہو گئیں تو انھیں کھانے پینے کے معاملے میں تردو نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن ان کی جوان لڑکی صغریٰ بہت متردد تھی۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ دوسری عمارتوں کے مقابلے میں کافی اونچا۔ اس کی ممٹی سے شہر کا تین چوتھائی حصہ بخوبی نظر آتا تھا۔ صغریٰ اب کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نزدیک دور کہیں نہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی پر اب وہ بھی بند ہو گئی تھی، اس لیے کہ جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔ رات کو اب کچھ اور ہی سماں ہوتا۔ گھپ اندھیرے میں آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھتے جیسے دیو ہیں جو اپنے منہ سے آگ کے فوارے سے چھوڑ رہے ہیں۔ پھر عجیب عجیب سی آوازیں آتیں جو ہرہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مل کر بہت ہی وحشت ناک بن جاتیں۔ صغریٰ باپ سے اپنے خوف وہراس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک بار گھر میں کہہ چکے تھے کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی باتیں اکثر درست ہوا کرتی تھیں۔ صغریٰ کو اس سے ایک گونہ اطمینان تھا۔ مگر جب بجلی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی نلوں میں پانی آنا بند ہو گیا تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ڈرتے ڈرتے رائے دی تھی کہ چند روز کے لیے شریف پورے اٹھ جائیں جہاں اڑوس پڑوس کے سارے مسلمان آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور کہا۔

”بیکار گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“

مگر حالات بہت جلدی ٹھیک نہ ہو جائے اور دن بدن بگڑتے گئے۔ وہ محلہ جس میں میاں عبدالحیی کا مکان تھا مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میاں صاحب پر ایک روز اچانک فالج گرا جس کے باعث وہ صاحبِ فراش ہو گئے۔ ان کا لڑکا بشارت بھی جو پہلے اکیلا گھر میں اوپر نیچے طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف رہتا تھا اب باپ کی چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور حالات کی نزاکت سمجھنے لگا۔ وہ بازار جو اُن کے مکان کے ساتھ ملحق تھا سنسنان پڑا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی ڈسپنسری مدت سے بند پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ڈاکٹر گورانداتامل تھے۔ صغریٰ نے شہ نشین سے دیکھا تھا کہ ان کی دکان میں بھی تالے پڑے ہیں۔ میاں صاحب کی حالت بہت مخدوش تھی۔ صغریٰ اس قدر پریشان تھی کہ اس کے ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ بشارت کو الگ لے جا کر اس نے کہا۔

”خدا کے لیے، تم ہی کچھ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں، مگر تم جاؤ۔ کسی کو بھی بلا لاؤ۔ ابا جی کی حالت بہت خطرناک ہے۔“

بشارت گیا، مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں نے اس نے ایک لاش دیکھی تھی، خون سے تربتر۔ اور پاس ہی بہت سے آدمی ڈھاٹے باندھے ایک دکان لوٹ رہے تھے۔ صغریٰ نے اپنے خوفزدہ بھائی کو سینے کے ساتھ لگایا اور صبر شکر کے بیٹھ گئی۔ مگر اُس سے اپنے باپ کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ میاں صاحب کے جسم کا داہنا حصہ بالکل سن ہو گیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ گویائی میں بھی فرق پڑ گیا تھا اور وہ زیادہ تر اشاروں ہی سے باتیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ صغریٰ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ روزے ختم ہونے والے تھے۔ صرف دو رہ گئے تھے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ عید سے پہلے پہلے فضا بالکل صاف ہو جائیگی مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید عید ہی کا روز روزِ قیامت ہو، کیونکہ ممٹی پر سے اب شہر کے قریب قریب ہر حصے سے دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو بم پھٹنے کی ایسی ایسی ہولناک آوازیں آتی تھیں کہ صغریٰ اور بشارت ایک لحظے کے لیے بھی سو نہیں سکتے تھے۔ صغریٰ کو یوں بھی باپ کی تیمارداری کے لیے جاگنا پڑتا تھا، مگر اب یہ دھماکے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کے اندر ہو رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مفلوج باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے وحشت زدہ بھائی کی طرف۔ ستر برس کا بڈھا ملازم اکبر تھا جس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات پر اپنی کوٹھڑی میں کھانستا کھنکارتا اور بلغم نکالتا رہتا تھا۔ ایک روز تنگ آ کر صغریٰ اس پر برس پڑی۔

”تم کس مرض کی دوا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو، میاں صاحب کی کیا حالت ہے۔ اصل میں تم پرلے درجے کے نمک حرام ہو۔ اب خدمت کا موقعہ آیا ہے تو دمے کا بہانہ کر کے یہاں پڑے رہتے ہو۔ وہ بھی خادم تھے جو آقا کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے۔“

صغریٰ اپنا جی ہلکا کر کے چلی گئی۔ بعد میں اس کو افسوس ہوا کہ ناحق اس غریب کو اتنی لعنت ملامت کی۔ رات کا کھانا تھال میں لگا کر اس کی کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا خالی ہے۔ بشارت نے گھر میں اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ وہ میاں صاحب کے لیے کچھ کرنے گیا ہے۔ صغریٰ نے بہت دعائیں مانگیں کہ خدا اُسے کامیاب کرے لیکن دو دن گزر گئے اور وہ نہ آیا۔ شام کا وقت تھا۔ ایسی کئی شامیں صغریٰ اور بشارت دیکھ چکے تھے۔ جب عید کی آمد آمد کے ہنگامے برپا ہوتے تھے جب آسمان پر چاند دیکھنے کے لیے ان کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ دوسرے روز عید تھی۔ صرف چاند کو اس کا اعلان کرنا تھا۔ دونوں اس اعلان کے لیے کتنے بے تاب ہوا کرتے تھے۔ آسمان پر چاند والی جگہ پر اگر بادل کا کوئی ہٹیلا ٹکڑہ جم جاتا تو کتنی کوفت ہوتی تھی انھیں مگر اب چاروں صرف دھوئیں کے بادل تھے۔ صغریٰ اور بشارت دونوں ممٹی پر چڑھے۔ دور کہیں کہیں کوٹھوں لوگوں کے سائے دھبوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے، مگر معلوم نہیں یہ چاند دیکھ رہے تھے یا جگہ جگہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ۔ چاند بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ دھوئیں کی چادر میں سے بھی نظر آ گیا۔ صغریٰ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدا اپنا فضل کرے اور اس کے باپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ بشارت دل ہی دل میں کوفت محسوس کر رہا تھا کہ گڑبڑ کے باعث ایک اچھی بھلی عید غارت ہو گئی۔ دن ابھی پوری طرح ڈھلا نہیں تھا۔ یعنی شام کی سیاہی ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی چارپائی چھڑکاؤ کیے ہوئے صحن میں بچھی تھی۔ وہ اس پر بے حس و حرکت لیٹے تھے اور دور آسمان پر نگاہیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ عید کا چاند دیکھ کر جب صغریٰ نے پاس آ کر انھیں سلام کیا تو انھوں نے اشارے سے جواب دیا۔ صغریٰ نے سر جھکایا تو انھوں نے وہ بازو جو ٹھیک تھا اٹھایا اور اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ صغریٰ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں، مگر انھوں نے تسلی دینے کی خاطر بمشکل اپنی نیم مفلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے۔

”اللہ تبارک و تعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا۔“

عین اسی وقت باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بشارت کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میاں صاحب صغریٰ سے مخاطب ہوئے۔

”دیکھو، کون ہے“!

صغریٰ نے سوچا کہ شاید بڈھا اکبر ہو۔ اس خیال ہی سے اس کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ بشارت کا بازو پکڑ کر اس نے کہا۔

”جاؤ دیکھو۔ شاید اکبر آیا ہے۔“

یہ سن کر میاں صاحب نے نفی میں یوں سر ہلایا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہیں۔

”نہیں۔ یہ اکبر نہیں ہے۔“

صغریٰ نے کہا۔

”تو اور کون ہو سکتا ہے ابا جی؟“

میاں عبد الحیی نے اپنی قوتِ گویائی پر زور دے کر کچھ کہنے کی کوشش کی کہ بشارت آ گیا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا۔ ایک سانس اوپر، ایک نیچے، صغریٰ کو میاں صاحب کی چارپائی سے ایک طرف ہٹا کر اس نے ہولے سے کہا۔

”ایک سکھ ہے“!

صغریٰ کی چیخ نکل گئی۔

”سکھ؟۔ کیا کہتا ہے؟“

بشارت نے جواب دیا۔

”کہتا ہے دروازہ کھولو۔“

صغریٰ نے کانپتے ہوئے بشارت کو کھینچ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور باپ کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف ویران نظروں سے دیکھنے لگی۔ میاں عبد الحیّ کے پتلے پتلے بے جان ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔

”جاؤ۔ گورمکھ سنگھ ہے“!

بشارت نے نفی میں سر ہلایا۔

”کوئی اور ہے؟“

میاں صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”جاؤ صغریٰ وہی ہے“!

صغریٰ اٹھی۔ وہ گورمکھ سنگھ کو جانتی تھی۔ پنشن لینے سے کچھ دیر پہلے اس کے باپ نے اس نام کے ایک سکھ کا کوئی کام کیا تھا۔ صغریٰ کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ شاید اس کو ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومالی سویوں کا ایک تھیلا لیکر آیا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا۔

”سردار جی، آپ یہ تکلیف نہ کیا کریں۔“

مگر وہ ہاتھ جوڑ کر جواب دیا کرتا تھا۔

”میاں صاحب واہگورو جی کی کرپا سے آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ یہ تو ایک تحفہ یہ جو میں جناب کی خدمت میں ہر سال لے کر آتا ہوں۔ مجھ پر جو آپ نے احسان کیا تھا۔ اس کا بدلہ تو میری سو پشت بھی نہیں چکا سکتی۔ خدا آپ خوش رکھے۔“

سردار گورمکھ سنگھ کو ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویوں کا تھیلا لاتے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ صغریٰ کو حیرت ہوئی کہ اس نے دستک سن کر یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہی ہو گا، مگر بشارت بھی تو اس کو سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا، پھر اس نے کیوں کہا کوئی اور ہے۔ اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ سوچتی صغریٰ ڈیوڑھی تک پہنچی۔ دروازہ کھولے یا اندر ہی سے پوچھے، اس کے متعلق وہ ابھی فیصلہ ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ صغریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل تمام اس نے حلق سے آواز نکالی ہے۔

”کون ہے؟“

بشارت پاس کھڑا تھا۔ اس نے دروازے کی ایک درز کی طرف اشارہ کیا اور صغریٰ سے کہا۔

”اس میں سے دیکھو؟“

صغریٰ نے درز میں سے دیکھا۔ گورمکھ سنگھ نہیں تھا۔ وہ تو بہت بوڑھا تھا، لیکن یہ جو باہر تھڑے پر کھڑا تھا جوان تھا۔ صغریٰ ابھی درز پر آنکھ جمائے اس کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صغریٰ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا تھا ویسا ہی جیسا گورمکھ سنگھ لایا کرتا تھا۔ صغریٰ نے درز سے آنکھ ہٹائی اور ذرا بلند آواز میں دستک دینے والا سے پوچھا۔

”کون ہیں آپ؟“

باہر سے آواز آئی۔

”جی۔ جی میں۔ میں سردار گورمکھ سنگھ کا بیٹا ہوں۔ سنتوکھ“!

صغریٰ کا خوف بہت حد تک دور ہو گیا۔ بڑی شائستگی سے اس نے پوچھا۔

”فرمایئے۔ آپ کیسے آئے ہیں؟“

باہر سے آواز آئی۔

”جی۔ جج صاحب کہاں ہیں۔“

صغریٰ نے جواب دیا۔

”بیمار ہیں۔“

سردار سنتوکھ سنگھ نے افسوس آمیز لہجے میں کہا۔

”اوہ۔ پھر اس نے کاغذ کا تھیلا کھڑکھڑایا۔

”جی یہ سویاں ہیں۔ سردار جی کا دیہانت ہو گیا ہے۔ وہ مر گئے ہیں“!

صغریٰ نے جلدی سے پوچھا۔

”مر گئے ہیں؟“

باہر سے آواز آئی۔

”جی ہاں۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹھا، میں جج صاحب کی خدمت میں پورے دس برسوں سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں۔ یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمہیں کرنا ہو گا۔ میں نے انھیں بچن دیا تھا۔ جو میں پورا کر رہا ہوں۔ لے لیجئے سویاں۔“

صغریٰ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سردار گورمکھ سنگھ کے لڑکے نے سویوں کا تھیلا آگے بڑھا دیا جو صغریٰ نے پکڑ لیا اور کہا۔

”خدا سردار جی کو جنت نصیب کرے۔“

گورمکھ سنگھ کا لڑکا کچھ توقف کے بعد بولا۔

”جج صاحب بیمار ہیں؟“

صغریٰ نے جواب دیا۔

”جی ہاں“!

”کیا بیماری ہے؟“

”فالج“

”اوہ۔ سردار جی زندہ ہوتے تو یہ انھیں یہ سُن کر بہت دکھ ہوتا۔ مرتے دم تک انھیں جج صاحب کا احسان یاد تھا۔ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں دیوتا ہے۔ اللہ میاں انھیں زندہ رکھے۔ انھیں میرا سلام۔“

اور یہ کہہ کر وہ تھرے سے اتر گیا۔ صغریٰ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ اسے ٹھہرائے اور کہے کے جج صاحب کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر دے۔ سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا سنتوکھ جج صاحب کے مکان سے تھڑے سے اتر کر چند گز کے آگے بڑھا تو چار ٹھاٹا باندھے ہوئے آدمی اس کے پاس آئے۔ دو کے پاس جلتی مشعلیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنستر اور کچھ دوسری آتش خیز چیزیں۔ ایک نے سنتوکھ سے پوچھا۔

”کیوں سردار جی، اپنا کام کر آئے؟“

سنتوکھ نے سر ہلا کر جواب دیا۔

”ہاں کر آیا۔“

اس آدمی نے ٹھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا۔

”تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا۔“

”ہاں۔ جیسے تمہاری مرضی“!

یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔ 5 اکتوبر 1951ء

گولی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوگولی

شفقت دوپہر کو دفتر سے آیا تو گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ عورتیں تھیں جو بڑے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ شفقت کی بیوی عائشہ ان کی مہمان نوازی میں مصروف تھی۔ جب شفقت صحن میں داخل ہوا تو اس کی بیوی باہر نکلی اور کہنے لگی۔

”عزیز صاحب کی بیوی اور ان کی لڑکیاں آئی ہیں۔“

شفقت نے ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

”کون عزیز صاحب۔“

عائشہ نے آواز دبا کر جواب دیا۔

”ہائے، آپ کے اباجی کے دوست۔“

”اوہ۔ عزیز چچا۔“

”ہاں، ہاں وہی۔“

شفقت نے ذرا حیرت سے کہا۔

”مگر وہ تو افریقہ میں تھے۔“

عائشہ نے منہ پر انگلی رکھی۔ ذرا آہستہ بات کیجیے۔ آپ تو چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ افریقہ ہی میں تھے، لیکن جو افریقہ میں ہو کیا واپس نہیں آ سکتا۔“

لو، اب تم لگیں مین میخ کرنے۔

”آپ تو لڑنے لگے، عائشہ نے ایک نظر اندر کمرے میں ڈالی۔“

عزیز صاحب افریقہ میں ہیں، لیکن ان کی بیوی اپنی لڑکی کی شادی کرنے آئی ہیں۔ کوئی اچھا بر ڈھونڈ رہی ہیں۔“

اندر سے عزیز کی بیوی کی آواز آئی۔

”عائشہ تم نے روک کیوں لیا شفقت کو۔ آنے دو۔ آؤ شفقت بیٹا، آؤ۔ تمہیں دیکھے اتنی مدت ہو گئی ہے۔“

”آیا چچی جان“

شفقت نے ہیٹ اسٹینڈ کی کھونٹی پر رکھا اور اندر کمرے میں داخل ہوا۔

”آداب عرض چچی جان۔“

عزیز کی بیوی نے اٹھ کر اس کو دعائیں دیں، سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئی۔ شفقت بیٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر دو گوری گوری لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ایک چھوٹی تھی، دوسری بڑی۔ دونوں کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ عزیز صاحب بڑے وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی یہ وجاہت ان لڑکیوں میں بڑے دلکش طور پر تقسیم ہوئی تھی۔ آنکھیں ماں کی تھیں۔ نیلی۔ بال بھورے اور کافی لمبے۔ دونوں کی دو چوٹیاں تھیں۔ چھوٹی کا چہرہ بڑی کے مقابلے میں زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ بڑی کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ ان کی ماں ان سے مخاطب ہوئی۔

”بیٹا سلام کرو بھائی کو۔“

چھوٹی نے اٹھ کر شفقت کو آداب عرض کیا۔ بڑی نے بیٹھے بیٹھے ذرا جھک کر کہا۔

”تسلیمات۔“

شفقت نے مناسب و موزوں جواب دیا۔ اس کے بعد عزیز صاحب اور افریقہ کے متعلق باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیروبی، ٹانگانیکا، دارالسلام، کراتینا، یوگنڈا، ان سب کی باتیں ہوئیں۔ کہاں کا موسم اچھا ہے، کہاں کا خراب ہے، پھل کہاں اچھے ہوتے ہیں۔ پھلوں کا ذکر چھیڑا تو چھوٹی نے کہا۔

”یہاں ہندوستان میں تو نہایت ہی ذلیل پھل ملتے ہیں۔“

”جی نہیں، بڑے اچھے پھل ملتے ہیں، بشرطیکہ موسم ہو۔“

شفقت نے اپنے ہندوستان کی آبرو بچانا چاہی۔

”غلط ہے۔“

چھوٹی نے ناک چڑھائی۔

”امی جان، یہ جو کل آپ نے مارکٹ سے مالٹے لیے تھے، کیا وہاں کے مچنگوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔“

لڑکیوں کی ماں بولی۔

”شفقت بیٹا یہ صحیح کہتی ہے۔ یہاں کے مالٹے وہاں کے مچنگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔“

عائشہ نے چھوٹی سے پوچھا۔

”طلعت، یہ مچنگا کیا ہوتا ہے۔ نام تو بڑا عجیب وغریب ہے۔“

طلعت مسکرائی۔

”آپ ایک پھل ہے۔ مالٹے اور میٹھے کی طرح۔ اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ اور رس۔ ایک نچوڑیئے۔ یہ گلاس جو تپائی پر پڑا ہے، لبالب بھر جائے۔“

شفقت نے گلاس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ پھل کتنا بڑا ہوگا۔

”ایک مچنگے سے اتنا بڑا گلاس بھر جاتا ہے؟“

طلعت نے بڑے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

”جی ہاں“!

شفقت نے یہ سن کر کہا۔

”تو پھل یقیناً بہت بڑا ہوگیا۔“

طلعت نے سر ہلایا۔

”جی نہیں۔ بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا۔ بس آپ کے یہاں کے بڑے مالٹے کے برابر ہوتا ہے۔ یہی تو اس کی خوبی ہے کہ رس ہی رس ہوتا ہے اس میں۔ اور امی جان وہاں کا اناس۔ بڑی روٹی کے برابر اس کی ایک قاش ہوتی ہے۔“

دیر تک اناس کی باتیں ہوتی رہیں۔ طلعت بہت باتونی تھی۔ افریقہ سے اس کو عشق تھا۔ وہاں کی ہر چیز اس کو پسند تھی۔ بڑی جس کا نام نگہت تھا بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے گفتگو میں حصہ نہ لیا۔ شفقت کو جب محسوس ہوا کہ وہ خاموش بیٹھی رہی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”آپ کو غالباً ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

نگہت نے اپنے ہونٹ کھولے۔

”جی نہیں۔ سنتی رہی ہوں بڑی دلچسپی سے۔“

شفقت نے کہا۔

”لیکن آپ بولیں نہیں۔“

عزیز کی بیوی نے جواب دیا۔

”شفقت بیٹا اس کی طبیعت ہی ایسی ہے۔“

شفقت نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔

”چچی جان۔ اس عمر میں لڑکیوں کو خاموشی پسند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہو۔

”پھر وہ نگہت سے مخاطب ہوا۔ جناب آپ کو بولنا پڑے گا۔“

نگہت کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”بول تو رہی ہوں بھائی جان۔“

شفقت مسکرایا۔

"تصویروں سے دلچسپی ہے آپ کو۔"

نگہت نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا۔

"جی ہے۔"

"تو اُٹھیے میں آپ کو اپنا البم دکھاؤں۔ دوسرے کمرے میں ہے۔

"یہ کہہ کر شفقت اٹھا۔

"چلیے۔"

عائشہ نے شفقت کا ہاتھ دبایا۔ پلٹ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا جسے شفقت نہ سمجھ سکا۔ وہ متحیر تھا کہ خدا معلوم کیا بات تھی کہ اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ دبایا اور اشارہ بھی کیا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ طلعت کھٹ سے اٹھی۔

"چلیے بھائی جان۔ مجھے دوسروں کے البم دیکھنے کا شوق ہے۔ میرے پاس بھی ایک کولکشن ہے۔"

شفقت، طلعت کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نگہت، خاموش بیٹھی رہی۔ شفقت، طلعت کو تصویریں دکھاتا رہا، حسب عادت طلعت بولتی رہی۔ شفقت کا دماغ کسی اور طرف تھا۔ وہ نگہت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ اس قدر خاموش کیوں ہے۔ تصویریں دیکھنے اس کے ساتھ کیوں نہ آئی۔ جب اس نے اس کو چلنے کے لیے کہا تو عائشہ نے اس کا ہاتھ کیوں دبایا۔ اس اشارے کا کیا مطلب تھا جو اس نے آنکھوں کے ذریعے کیا تھا۔ تصویریں ختم ہو گئیں۔ طلعت نے البم اٹھایا اور شفقت سے کہا۔

"باجی کو دکھاتی ہوں۔ ان کو بہت شوق ہے تصویریں جمع کرنے کا۔"

شفقت پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر ان کو شوق ہے تو وہ اس کے ساتھ کیوں نہ آئیں مگر طلعت البم اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ شفقت بڑے کمرے میں داخل ہوا تو نگہت بڑی دلچسپی سے البم کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ ہر تصویر اس کو مسرت پہنچاتی تھی۔ عائشہ لڑکیوں کی ماں سے باتیں کرنے میں مشغول دکھ رہی تھی۔ شفقت کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی دھند میں لپٹا تھا۔ اب بشاش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تصویریں جو آرٹ کا بہترین نمونہ تھیں اس کو راحت بخش رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں اب چمک تھی۔ لیکن جب ایک گھوڑے اور صحت مند عورت کی تصویر آئی تو یہ چمک ماند پڑ گئی۔ ایک ہلکی سی آہ اس کے سینے میں لرزی اور وہیں دب گئی۔ تصویریں ختم ہوئیں تو نگہت نے شفقت کی طرف دیکھا اور بڑے پیارے انداز میں کہا۔

"بھائی جان شکریہ"!

شفقت نے البم نگہت کے ہاتھ سے لیا اور مینٹل پیس پر رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں کُھد بُد ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑا اسرار اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس نے سوچا، شاید کوئی نامکمل رومان ہو، یا کوئی نفسیاتی حادثہ۔ چائے آئی تو شفقت، نگہت سے مخاطب ہوا۔

"اٹھیے، چائے بنائیے۔ یہ پرولج لیڈیز کا ہے۔"

نگہت خاموش رہی لیکن طلعت پھدک کر اٹھی۔

"بھائی جان میں بناتی ہوں۔"

نگہت کا چہرہ پھر دھند میں ملفوف ہو گیا۔ شفقت کا تجسس بڑھتا گیا۔ ایک بار جب اس نے غیر ارادی طور پر نگہت کو گھور کے دیکھا تو وہ سٹ پٹا سی گئی۔ شفقت کو دل ہی دل میں اس بات کا افسوس ہوا کہ اس نے کیوں ایسی نازیبا حرکت کی۔ چائے پر ادھر ادھر کی بے شمار باتیں ہوئیں۔ طلعت نے ان میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ ٹینس کا ذکر آیا تو اس نے شفقت کو بڑے فخریہ انداز میں جو شیخی کی حد تک جا پہنچا تھا، بتایا کہ وہ نیروبی میں نمبرون ٹینس پلیئر تھی اور پندرہ بیس کپ جیت چکی تھی۔ نگہت بالکل خاموش رہی اس کی خاموشی بڑی اداس تھی۔ صاف عیاں تھا کہ اس کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ خاموش ہے۔ ایک بات جو شفقت نے خاص طور پر نوٹ کی یہ تھی کہ عزیز کی بیوی کی ممتا کا رخ زیادہ تر نگہت کی طرف تھا۔ اس نے خود اٹھ کر بڑے پیار محبت سے اس کو کریم رول دیے۔ منہ پونچھنے کے لیے اپنا رومال دیا۔ اس سے کوئی بات کرتی تھی تو اس میں پیار بھی ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ باتوں کے ذریعے سے بھی اس کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیر رہی ہے یا اس کو چمکار رہی ہے۔ رخصت کا وقت آیا تو عزیز کی بیوی اٹھی، برقع اٹھایا، عائشہ سے گلے ملی۔ شفقت کو دعائیں دیں اور نگہت کے پاس جا کر آنکھوں میں آنسو لا دینے والے پیار سے کہا۔

"چلو بیٹا چلیں۔"

طلعت پھدک کر اٹھی۔ عزیز کی بیوی نے نگہت کا ایک بازو تھاما، دوسرا بازو طلعت نے پکڑا۔ اس کو اٹھایا گیا۔ شفقت نے دیکھا کہ اس کا نچلا دھڑ بالکل بے جان ہے۔ ایک لحظے کے لیے شفقت کا دل و دماغ ساکت ہو گیا جب وہ سنبھلا تو اسے اپنے اندر ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں پر ماں اور بہن کا سہارا لیے نگہت غیر یقینی قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر شفقت اور عائشہ کو آداب عرض کیا۔ کتنا پیارا انداز تھا۔ مگر اس کے ہاتھ نے شفقت کے دل پر جیسے گھونسہ مارا۔ سارا اسرار اس پر واضح ہو گیا تھا۔ سب سے پہلا خیال اس کے دماغ میں یہ آیا۔

”قدرت کیوں اتنی بے رحم ہے۔ ایسی پیاری لڑکی اور اسکے ساتھ اس قدر ظالمانہ بہیمانہ سلوک۔ اس معصوم کا آخر گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا اتنی کڑی دی گئی؟“

سب چلے گئے۔ عائشہ ان کو باہر تک چھوڑنے گئی۔ شفقت ایک فلسفی بن کر سوچتا رہ گیا، اتنے میں شفقت کے دوست آ گئے اور وہ بھی اپنی بیوی سے نگہت کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں ایسا مشغول ہوا کہ نگہت اور اس کے روگ کو بھول گیا۔ جب رات ہو گئی اور عائشہ نے اسے نوکر کے ذریعے سے کھانے پر بلوایا تو اسے افسوس ہوا کہ اس نے محض ایک کھیل کی خاطر نگہت کو فراموش کر دیا، چنانچہ اس کا ذکر اس نے عائشہ سے بھی کیا، لیکن اس نے کہا۔

”آپ کھانا کھایئے، مفصل باتیں پھر ہو جائیں گی۔“

میاں بیوی دونوں اکٹھے سوتے تھے۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی وہ کبھی رات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے، اور ان کی شادی کو قریب قریب چھ برس ہو گئے تھے، مگر اس دوران میں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ عائشہ میں کچھ قصور ہے جو صرف آپریشن سے دور ہو سکتا ہے، مگر وہ اس سے بہت خائف تھی۔ میاں بیوی بہت پیار محبت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔ رات کو وہ اکٹھے لیٹتے۔ حسب معمول جب ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے تو شفقت کو نگہت یاد آئی۔ اس نے ایک آہ بھر کر اپنی بیوی سے پوچھا۔

”عائشہ، نگہت بے چاری کو کیا روگ ہے؟“

عائشہ نے بھی آہ بھری اور بڑے افسوسناک لہجے میں کہا۔

”تین برس کی ننھی منی بچی تھی کہ تپِ محرقہ ہوا۔ نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا۔“

شفقت کے دل میں نگہت کے لیے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کی پیٹھ کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا اور کہا۔

”عائشہ، خدا کیوں اتنا ظلم ہے؟“

عائشہ نے کوئی جواب دنہ دیا۔ شفقت کو دن کے واقعات یاد آنے لگے۔ جب میں نے اس سے کہا تھا کہ چلو، میں تمہیں البم دکھاتا ہوں تو تم نے میرا ہاتھ اسی لیے دبایا تھا کہ۔“

”ہاں ہاں، اور کیا؟۔ آپ تو بار بار۔“

”خدا کی قسم مجھے معلوم نہ تھا۔“

”اس کو اس کا بہت احساس ہے کہ وہ اپاہج ہے۔“

”تم نے یہ کہا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ میرے سینے میں کسی نے تیر مارا ہے“

”جب وہ آئی، تو خدا کی قسم مجھے بہت دکھ ہوا۔ بے چاری کو پیشاب کرنا تھا۔ ماں اور چھوٹی بہن ساتھ گئیں۔ ازار بند کھولا۔ پھر بند کیا۔ کتنی خوب صورت ہے۔ بیٹھی ہو۔“

”تو خدا کی قسم بالکل پتا نہیں چلتا کہ فالج زدہ ہے۔“

”بڑی ذہین لڑکی ہے۔“

”اچھا؟“

”ماں کہتی تھی کہ اس نے کہا تھا کہ امی جان میں شادی نہیں کروں گی، کنواری رہوں گی“!

شفقت تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے انتہائی دکھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”تو اُس کو اس بات کا احساس ہے کہ اس سے شادی کرنے کے لیے کوئی رضامند نہیں ہو گا۔“

عائشہ نے شفقت کی چھاتی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

”شفقت صاحب کون شادی کرے گا ایک اپاہج سے؟“

”نہیں نہیں ایسا نہ کہو عائشہ“!

”اتنی بڑی قربانی کون کر سکتا ہے شفقت صاحب؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”خوبصورت ہے، اچھے کھاتے پیتے ماں باپ کی لڑکی ہے۔ سب ٹھیک ہے، مگر۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ لیکن۔“

”مردوں کے دل میں رحم کہاں؟“

شفقت نے کروٹ بدلی۔

”ایسا نہ کہو، عائشہ“

عائشہ نے بھی کروٹ بدلی۔ دونوں روبرو ہو گئے۔

”میں سب جانتی ہوں کوئی ایسا مرد ڈھونڈیئے جو اس بیچاری سے شادی کرنے پر آمادہ ہو۔“

”مجھے معلوم نہیں، لیکن۔“

”بڑی بہن ہے، غریب کو کتنا بڑا دکھ ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔“

”صحیح کہتی ہو تم“!

عائشہ نے ایک لمبی آہ بھری۔

”کیا بے چاری اسی طرح ساری عمر کڑھتی رہے گی۔“

”نہیں“!

یہ کہہ کر شفقت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”تمہیں اس سے ہمدردی ہے؟“

”کیوں نہیں؟“

”خدا کی قسم کھا کر کہو۔“

”ہائے، یہ بھی کوئی قسم کھلوانے کی بات ہے، ہر انسان کو اس سے ہمدردی ہونی چاہیے۔“

شفقت نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”تو میں نے ایک بات سوچی ہے؟“

عائشہ نے خوش ہو کر کہا۔

”کیا؟“

”مجھے ہمیشہ اس بات کا احساس رہا ہے تم بہت بلند خیال عورت ہو۔ آج تم نے میرے اس خیال کو ثابت کر دیا ہے۔ میں نے۔ خدا میرے اس ارادے کو استقامت بخشے۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں نگہت سے شادی کروں گا۔

لال ٹین

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹو لال ٹین

میرا قیام

”بٹوت“

میں گو مختصر تھا۔ لیکن گوناگوں روحانی مسرتوں سے پُر۔ میں نے اس کی صحت افزا مقام میں جتنے دن گزارے ہیں ان کے ہر لمحہ کی یاد میرے ذہن کا ایک جزو بن کے رہ گئی ہے۔ جو بھلائے نہ بھولے گی۔ کیا دن تھے!۔ بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے اور میں کئی کئی گھنٹے اس کے زیر اثر بے خود مدہوش رہتا ہوں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ

انسان اپنی گزشتہ زندگی کے کھنڈروں پر مستقبل کی دیواریں استوار کرتا ہے۔ ان دنوں میں بھی یہی کر رہا ہوں یعنی بیتے ہوئے ایام کی یاد کو اپنی مضمحل رگوں میں زندگی بخش انجکشن کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔ جو کل ہوا تھا اسے اگر آج دیکھا جائے تو اس کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ نظر آئے گا اور جو کل ہونا ہی ہے اسکے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ آج سے پورے چار مہینے کی طرف دیکھا جائے تو بٹوت میں میری زندگی ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا افسانہ جس کا مسودہ صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنا دوسرے انسانوں کی طرح میرے بس میں بھی نہیں۔ جب میں استقبال کے آئینہ میں اپنی آنے والی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتا ہوں تو اس میں مجھے حال ہی کی تصویر نظر آتی ہے اور کبھی کبھی اس تصویر کے پس منظر میں ماضی کے دھندلے نقوش نظر آجاتے ہیں۔ ان میں بعض نقش اس قدر تیکھے اور شوخ رنگ ہیں کہ شاید ہی انھیں زمانہ کا ہاتھ مکمل طور پر مٹا سکے۔ زندگی کے اس کھوئے ہوئے ٹکڑے کو میں اس وقت زمانہ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں جو شریر بچے کی طرح مجھے بار بار اس کی جھلک دکھا کر اپنی پیٹھ پیچھے چھپا لیتا ہے۔ اور میں اس کھیل ہی سے خوش ہوں۔ اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ ایسے واقعات کو جن کی یاد میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے میں عام طور پر دہراتا رہتا ہوں، تاکہ ان کی تمام شدت برقرار رہے۔ اور اس غرض کے لیے میں کئی طریقے استعمال کرتا رہتا ہوں۔ بعض اوقات میں یہ بیتے ہوئے واقعات اپنے دوستوں کو سنا کر اپنا مطلب حل کر لیتا ہوں۔ اگر آپ کو میرے ان دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ آپ سے یقیناً یہی کہیں گے کہ میں قصہ گوئی اور آپ بیتیاں سنانے کا بالکل سلیقہ نہیں رکھتا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ داستان سنانے کے دوران میں مجھے سامعین کے تیوروں سے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوا ہے کہ میرا بیان غیر مربوط ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ چونکہ میری داستان میں ہمواری کم اور جھٹکے زیادہ ہوتے ہیں اس لیے میں اپنے محسوسات کو اچھی طرح کسی کے دماغ پر منتقل نہیں کر سکتا اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں ایسا شاید ہی کر سکوں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں اکثر اوقات اپنی داستان سناتے سناتے جب ایسے مقام پر پہنچتا ہوں جسکی یاد میرے ذہن میں موجود نہ تھی اور وہ خیالات کی رو میں خود بخود بہہ کر چلی آئی تھی تو میں غیر ارادی طور پر اس نئی یاد کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بیان کا تسلسل یک لخت منتشر ہو جاتا ہے اور جب میں ان گہرائیوں سے نکل کر داستان کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا چاہتا ہوں تو عجلت میں وہ ٹھیک طور سے نہیں جڑتا۔ کبھی کبھی میں یہ داستانیں رات کو سوتے وقت اپنے ذہن کی زبانی خود سنتا ہوں، لیکن اس دوران میں مجھے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ میرے ذہن کی زبان بہت تیز ہے اور اس کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اتنی تفصیل کے ساتھ خود بخود بیان ہونا شروع ہو جاتے ہیں کہ طبیعت اکتا جاتی ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کی یاد کسی دوسرے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور اسکا احساس کسی دوسرے احساس کو اپنے ساتھ لے آتا ہے اور پھر احساسات و افکار کی بارش زوروں پر شروع ہو جاتی ہے۔ اور اتنا شور مچتا ہے کہ نیند حرام ہو جاتی ہے۔ جس روز صبح کو میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آئیں آپ سمجھ لیا کریں کہ ساری رات میں اپنے ذہن کی قصہ گوئی کا شکار بنا رہا ہوں۔ جب مجھے کسی بیتے ہوئے واقعے کو اس کی تمام شدتوں سمیت محفوظ کرنا ہوتا ہے تو میں قلم اُٹھاتا ہوں اور کسی گوشے میں بیٹھ کر کاغذ پر اپنی زندگی کے اس ٹکڑے کی تصویر کھینچ دیتا ہوں۔ یہ تصویر بھدی ہوتی ہے یا خوبصورت، اسکے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ادبی نقاد میری ان قلمی تصویروں کے متعلق کیا رائے مرتب کرتے ہیں۔ دراصل مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اگر میری تصویر کشی سقیم اور خام ہے تو ہوا کرے مجھے اس سے کیا اور اگر یہ ان کے مقرر کردہ معیار پر پورا اترتی ہے تو بھی مجھے اس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ میں یہ کہانیاں صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے۔ جس طرح عادی شراب خور دن ڈھلے شراب خانہ کا رخ کرتا ہے ٹھیک اسی طرح میری انگلیاں بے اختیار قلم کی طرف بڑھتی ہیں اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہُوں میرا روئے سخن یا تو اپنی طرف ہوتا یا ان چند افراد کی طرف جو میری تحریروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ادب سے دُور اور زندگی کے نزدیک تر ہُوں۔ زندگی۔ زندگی۔ آہ زندگی!!! میں زندگی زندگی پُکارتا ہُوں مگر مجھ میں زندگی کہاں؟۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی عمر کی پٹاری کھول کر اس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں اور جھاڑ پونچھ کر بڑے قرینے سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اس آدمی کی طرح جس کے گھر میں بہت تھوڑا سامان ہو ان کی نمائش کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے اپنا یہ فعل بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ میرے پاس اگر زیادہ نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر مجھ میں سفلہ پن پیدا ہو گیا ہے تو اس کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے۔ دنیا میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جنکی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور میری زندگی کے ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے۔ گو میرا شباب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے مگر میں ان دنوں کی یاد پر جی رہا ہوں جب میں جوان تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سارا بھی کسی روز جواب دے جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا، میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میرا انجام چشم فلک کو بھی نمناک کر دیگا۔ آہ خرابہ فکر کا انجام! وہ شخص جسے انجام کار اپنے وزنی افکار کے نیچے پس جانا ہے یہ سطور لکھ رہا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ایسی اور بہت سی سطریں لکھنے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہے۔ میں ہمیشہ مغموم و ملول رہا ہوں۔ لیکن شبیر جانتا ہے کہ بٹوت میں میری آہوں کی زردی اور تپش کے ساتھ ساتھ ایک خوش گوار مسرت کی سرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے اس کی نگاہوں میں میرے وجود کو ایک معمابنا دیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے وہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کوشش میں وہ میرے قریب بھی آجاتا تھا۔ مگر دفعتاً کوئی ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوتا جس کے باعث اسے پھر پرے ہٹنا پڑتا تھا اور اس طرح وہ نئی شدت سے مجھے پُراسرار اور کبھی پُرتصنع انسان سمجھنے لگتا۔ اکرام صاحب حیران تھے کہ بٹوت جیسی غیر آباد اور غیر دلچسپ دیہات میں پڑے رہنے سے میرا کیا مقصد ہے۔ وہ ایسا کیوں سوچتے تھے؟ اس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ ان کے پاس سوچنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اسی مسئلے پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ وزیر کا گھر ان کے بنگلے کے سامنے بلند پہاڑی

پر تھا اور جب انھوں نے اپنے نوکر کی زبانی یہ سنا کہ میں اس پہاڑی لڑکی کے ساتھ پہروں باتیں کرتا رہتا ہوں۔ تو انھوں نے یہ سمجھا کہ میری دکھتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ آگئی ہے اور انھوں نے ایک ایسا راز معلوم کر لیا ہے جس کے افشا پر تمام دنیا کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔ لوگوں سے جب وہ اس

“مسئلے”

پر باتیں کرتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے میں تعیش پسند ہُوں اور ایک بھولی بھالی لڑکی کو پھانس رہا ہوں اور ایک (دن) جب انھوں نے مجھ سے بات کی تو کہا۔

“دیکھیے یہ پہاڑی لونڈیا بڑی خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اس کے جال میں پھنس جائیں۔”

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں یا کسی اور کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وزیر کا کریکٹر بہت خراب تھا اور میرا کریکٹر بھی کوئی خاص اچھا نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ کیوں میری فکر میں مبتلا تھے اور پھر جو انکے من میں تھا صاف صاف کیوں نہیں کہتے تھے۔ وزیر پر میرا کوئی حق نہیں تھا اور نہ وہ میرے دباؤ میں تھی۔ اکرام صاحب یا کوئی اور صاحب اگر اس سے دوستانہ پیدا کرنا چاہتے تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ دراصل ہماری تہذیب و معاشرت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ عام طور پر صاف گوئی کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ کھل کر بات ہی نہیں کی جاتی اور کسی کے متعلق اگر اظہار خیال کیا بھی جاتا ہے تو غلاف چڑھا کر۔ میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور اس پہاڑی لونڈیا سے جسے بڑا خطرناک کہا جاتا، اپنی دلچسپی کا اعتراف کیا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے دل کی آواز کو دل ہی میں دبا دینے کے عادی تھے اس لیے میری سچی باتیں ان کو بالکل جھوٹی معلوم ہوئیں اور ان کا شک بدستور قائم رہا۔ میں انھیں کیسے یقین دلاتا کہ میں اگر وزیر سے دلچسپی لیتا ہوں تو اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی و حال تاریک ہے۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی اسی لیے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا۔ وزیر سے میری دلچسپی اس محبت کا ریہرسل تھی جو میرے دل میں اس عورت کے لیے موجود ہے جو ابھی میری زندگی میں نہیں آئی۔ میری زندگی کی انگوٹھی میں وزیر ایک جھوٹا نگینہ تھی لیکن یہ نگینہ مجھے عزیز تھا اس لیے کہ اس کی تراش، اس کا ماپ بالکل اس اصلی نگینہ کے مطابق تھا جس کی تلاش میں مَیں ہمیشہ ناکام رہا ہوں۔ وزیر سے میری دل بستگی بے غرض نہیں تھی اس لیے میں غرض مند تھا۔ وہ شخص جو اپنے غم افزا ماحول کو کسی کے وجود سے رونق بخشنا چاہتا ہو۔ اس سے زیادہ خود غرض اور کون ہو سکتا ہے؟۔ اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا اور خدا گواہ ہے کہ میں جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار میرا دل اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا۔ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے گھپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس!۔ مگر بٹوت میں اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی۔ وزیر کی لال ٹین! بھٹیارے کے یہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور شبیر ٹہلتے ٹہلتے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ بنگلہ ہوٹل سے قریباً تین جریب کے فاصلے پر تھا۔ رات کی خنک اور نیم مرطوب ہوا میں اس چہل قدمی کا بہت لطف آتا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑوں اور ڈھلوانوں پر مکئی کے کھیت رات کے دھندلکے میں خاکستری رنگ کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے۔ اور جب ہوا کے جھونکے مئی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اتر آئی ہیں اور ہولے ہولے ناچ رہی ہیں۔ آدھا راستہ طے کرنے پر جب ہم سڑک کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹے سے دو منزلہ چوبی مکان کے قریب پہنچتے تو شبیر اپنی مخصوص ڈُھن میں یہ شعر گاتا ہے ہر قدم فتنہ ہے قیامت ہے آسمان تیری چال کیا جانے یہ شعر گانے کی خاص وجہ یہ تھی۔ اس چوبی مکان کے رہنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میرے اور وزیر کے تعلقات اخلاقی نقطہ نگاہ سے ٹھیک نہیں، حالانکہ وہ اخلاق کے معانی سے بالکل ناآشنا تھے۔ یہ لوگ مجھ سے اور شبیر سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور میری نقل و حرکت پر خاص طور پر نگرانی رکھتے تھے۔ وہ تفریح کی غرض سے بٹوت آئے ہوئے تھے اور انھیں تفریح کا کافی سامان مل گیا تھا۔ شبیر اوپر والا شعر گا کر ان کی تفریح میں مزید اضافہ کیا کرتا تھا۔ اس کو چھیڑ چھاڑ میں خاص لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی رہائش گاہ کے عین سامنے پہنچ کر اس کو یہ شعر یاد آجاتا تھا اور وہ فوراً اسے بلند آواز میں گا دیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ یہ شعر کسی خاص واقعے یا تاثر سے متعلق نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے صرف یہی شعر یاد تھا، یا ہو سکتا ہے کہ وہ صرف اسی شعر کو گا سکتا تھا، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بار بار یہی شعر دہراتا۔ شروع شروع میں اندھیری راتوں میں سنسان سڑک پر ہماری چہل قدمی چوبی مکان کے چوبی ساکنوں پر (وہ غیر معمولی طور پر اجڈ اور گنوار واقع ہوئے تھے) کوئی اثر پیدا نہ کر سکی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ان کے بالائی کمرے میں روشنی نظر آنے لگی۔ اور وہ ہماری آمد کے منتظر رہنے لگے اور جب ایک روز ان میں سے ایک نے اندھیرے میں ہمارا رخ معلوم کرنے کے لیے بیٹری روشن کی میں نے شبیر سے کہا۔

“آج ہمارا رومان مکمل ہو گیا ہے۔”

مگر میں نے دل میں ان لوگوں کی قابلِ رحم حالت پر بہت افسوس کیا، کیونکہ وہ بیکار دو دو تین تین گھنٹے تک جاگتے رہتے تھے۔ حسبِ معمول ایک رات شبیر نے اس مکان کے پاس پہنچ کر شعر گایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ بیٹری کی روشنی حسب معمول چمکی اور ہم باتیں کرتے ہوئے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے، ہُو کا عالم تھا، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، آسمان ہم پر مرتبان کے ڈھکنے کی طرح جھکا ہوا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم کسی بند بوتل میں چل پھر رہے ہیں۔ سکوت اپنی آخری حد تک پہنچ کر متکلم ہو گیا تھا۔ بنگلے کے باہر برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز پر لیمپ جل رہا تھا اور پاس ہی پلنگ پر اکرام صاحب لیٹے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ شبیر نے دور سے ان کی طرف دیکھا اور دفعتاً سادھوؤں کا مخصوص نعرہ مستانہ الکھ نرنجن بلند کیا۔ اس غیر متوقع شور نے مجھے اور اکرام صاحب دونوں کو چونکا دیا۔ شبیر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر ہم دونوں برآمدے میں داخل ہو کر اکرام صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ میرا منہ سڑک کی جانب تھا۔ عین اس وقت جب میں نے حقہ کی نَے منہ میں دبائی۔ مجھے سامنے سڑک کے اوپر

تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر ایک متحرک سایہ نظر آیا اور اس کے بعد روشنی ایک جگہ ساکن ہوگئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وزیر کا بھائی اپنے کتے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ چنانچہ اُدھر دیکھنا چھوڑ کر میں شبیر اور اکرام صاحب کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول ہو گیا۔ دوسرے روز شبیر کے نعرہ بلند کرنے بعد پھر اخروٹ کے درخت کے عقب میں روشنی نمودار ہوئی اور سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ تیسرے روز بھی ایسا ہوا۔ چوتھے روز صبح کو میں اور شبیر چشمے پر غسل کو جا رہے تھے کہ اوپر سے ایک کنکر گرا، میں نے بیک وقت سڑک کے اوپر جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ وزیر سر پر پانی کا گھڑا اُٹھائے ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی اور شبیر سے کہنے لگی۔

”کیوں جناب، یہ آپ نے کیا وطیرہ اختیار کیا ہے کہ ہر روز ہماری نیند خراب کریں۔“

شبیر حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں وزیر کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ شبیر نے اس سے کہا

”آج آپ پہلیوں میں بات کر رہی ہیں۔“

وزیر نے سر پر گھڑے کا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں اتنی اتنی دیر تک لال ٹین جلا کر اخروف کے نیچے بیٹھی رہتی ہوں اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ چھوٹے منہ سے شکریہ ہی ادا کر دیں۔ بھلا آپ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے۔ یہ چوکیداری تو میرے ہی ذمے ہے۔ آپ ٹہلنے کو نکلیں اور اکرام صاحب کے بنگلے میں گھنٹوں باتیں کرتے رہیں اور میں سامنے لال ٹیشن لیے اونگھتی رہوں۔“

شبیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بھئی میں تو کچھ نہ سمجھا، یہ کس دھن میں الاپ رہی ہیں؟“

میں نے شبیر کو جواب نہ دیا اور وزیر سے کہا۔

”ہم کئی دنوں سے رات گئے اکرام صاحب کے یہاں آتے ہیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اخروٹ کے پیچھے تمہاری لال ٹیشن دیکھی، پر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم خاص ہمارے لیے آتی ہو۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ تم ناحق اپنی نیند کیوں خراب کرتی ہو؟“

وزیر نے شبیر کو مخاطب کر کے کہا۔

”آپ کے دوست بڑے ہی ناشکرے ہیں ایک تو میں ان کی حفاظت کروں اور اوپر سے یہی مجھ پر اپنا احسان جتائیں۔ ان کو اپنی جان پیاری نہ ہو پر“

۔ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور بات کا رُخ یوں بدل دیا۔

”آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں ان کے بہت دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر آپ انھیں کیوں نہیں سمجھاتے کہ رات کو باہر نہ نکلا کریں۔“

وزیر کو واقعی میری بہت فکر تھی۔ بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی تھی، جیسے وہ خود محفوظ و مامون ہے اور میں بہت سی بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہ ٹوکا تھا اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس شغل سے باز رکھوں جس سے وہ لطف اٹھاتی ہے، اس کی اور میری حالت بعینہٖ ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافر تھے جو ایک لق و دق صحرا میں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اسے میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی۔ تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے۔ میرا اور اس کا صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہم ہر شب مقررہ وقت پر ٹہلنے کو نکلتے۔ شبیر چوبی مکان کے پاس پہنچ کر شعر گاتا، پھر اکرام صاحب کے بنگلے سے کچھ دور کھڑے ہو کر نعرہ بلند کرتا، وزیر لال ٹین روشن کرتی اور اس کی روشنی کو ہوا میں لہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ شبیر اور اکرام صاحب باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ اور میں لال ٹین کی روشنی میں اس روشنی کے ذرے ڈھونڈھتا رہتا جس سے میری زندگی منور ہو سکتی تھی۔ وزیر جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی؟

لائسنس

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹو لائسنس

ابو کوچوان بڑا چھیل چھبیلا تھا۔ اس کا تانگہ گھوڑا بھی شہر میں نمبرون تھا۔ کبھی معمولی سواری نہیں بٹھاتا تھا۔ اس کے لگے بندھے گاہک تھے جن سے اس کو روزانہ دس پندرہ روپے وصول ہو جاتے تھے جو ابو کے لیے کافی تھے۔ دوسرے کوچوانوں کی طرح نشہ پانی کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیکن صاف ستھرے کپڑے پہننے اور ہر وقت بانکا بنے رہنے کا اسے بے حد شوق تھا۔ جب اس کا تانگہ کسی سڑک پر سے گھنگھرو بجاتا گزرتا تو لوگوں کی آنکھیں خود بخود اس کی طرف جاتیں۔

”وہ بانکا ابو جا رہا ہے۔ دیکھو تو کس ٹھاٹ سے بیٹھا ہے۔ ذرا پگڑی دیکھو کیسی ترچھی بندھی ہے۔“

ابو لوگوں کی نگاہوں سے یہ باتیں سنتا تو اس کی گردن میں ایک بڑا بانکا خم پیدا ہو جاتا اور اس کے گھوڑے کی چال اور زیادہ پرکشش ہو جاتی۔ ابو کے ہاتھوں نے گھوڑے کی باگیں کچھ اس انداز سے پکڑی ہوتی تھیں جیسے ان کو اسے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ گھوڑا اشاروں کے بغیر چلا جا رہا ہے۔ اس کو اپنے مالک کے حکم کی ضرورت نہیں۔ بعض وقت تو ایسا محسوس ہوتا کہ ابو اور اس کا گھوڑا چنی دونوں ایک ہیں، بلکہ سارا ٹانگہ ایک ہستی ہے اور وہ ہستی ابو کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ وہ سواریاں جن کو ابو قبول نہیں کرتا تھا دل ہی دل میں اس کو گالیاں دیتی تھیں۔ بعض بددعا بھی دیتی تھیں

”خدا کرے اس کا گھمنڈ ٹوٹے۔ اس کا ٹانگہ گھوڑا کسی دریا میں جا گرے۔“

ابو کے ہونٹوں پر جو ہلکی ہلکی مونچھوں کی چھاؤں میں رہتے تھے خود اعتمادسی مسکراہٹ ناچتی رہتی تھی۔ اس کو دیکھ کر کئی کوچوان جل بھن جاتے تھے۔ ابو کی دیکھا دیکھی چند کوچوانوں نے اِدھر اُدھر سے قرض لے کر تانگے بنوائے۔ ان کو پیتل کے سازوسامان سے سجایا مگر پھر بھی ابو کی سی شان پیدا نہ ہو سکی۔ ان کو وہ گاہک نصیب نہ ہو سکے جو ابو کے اور اس کے ٹانگے گھوڑے کے شیدا تھے۔ ایک دن دوپہر کو ابو درخت کی چھاؤں میں ٹانگے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ایک آواز اس کے کانوں میں بھنبھنائی۔ ابو نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک عورت ٹانگے کے بمب کے پاس کھڑی تھی۔ ابو نے اسے بمشکل ایک نظر دیکھا مگر اس کی تیکھی جوانی ایک دم اس کے دل میں کھب گئی۔ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی۔ سولہ سترہ برس کی۔ دبلی پتلی لیکن مضبوط۔ رنگ سانولا مگر چمکیلا۔ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں۔ سیدھی مانگ ستواں ناک۔ اس کی پُھننگ پر ایک چھوٹا سا چمکیلا تل۔ لمبا کرتا اور نیلا لاچا۔ سر پر چدریا۔

لڑکی نے کنواری آواز میں ابو سے پوچھا۔

”ویرا، ٹیشن کا کیا لوگے؟“

ابو کے ہونٹوں کی مسکراہٹ شرارت اختیار کر گئی۔

”کچھ نہیں۔“

لڑکی کے چہرے کی سنولاہٹ سرخی مائل ہو گئی۔

”کیا لوگے ٹیشن کا۔“

ابو نے اس کو اپنی نظروں میں سموتے ہوئے کہا۔

”تجھ سے کیا لینا ہے بھاگ بھریے۔ چل آ بیٹھ ٹانگے میں۔“

لڑکی نے گھبراتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے مضبوط سینے کو ڈھانکا حالانکہ وہ ڈھکا ہوا تھا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو تم۔“

ابو مسکرایا۔

”چل آ، اب بیٹھ بھی جا۔ لے لیں گے جو تو دے دیگی۔“

لڑکی نے کچھ دیر سوچا، پھر پائیدان پر پاؤں رکھ کر ٹانگے میں بیٹھ گئی

”جلدی لے چل ٹیشن۔“

ابو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”بڑی جلدی ہے تجھے سوہنیے۔“

ہائے ہائے، تو تو۔ لڑکی کچھ اور کہتے کہتے رک گئی۔ ٹانگہ چل پڑا۔ اور چلتا رہا۔ کئی سڑکیں گھوڑے کے سموں کے نیچے سے نکل گئیں۔ لڑکی سہمی بیٹھی تھی۔ ابو کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو لڑکی نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ٹیشن نہیں آیا ابھی تک؟“

ابو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”آجائے گا۔ تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

ابو نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”الھڑے۔ کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھتی۔ تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے۔ اس وقت ایک ہو گیا تھا جب ابو نے تیری طرف دیکھا تھا۔ تیری جان کی قسم تیرا غلام جھوٹ نہیں بولتا۔“

لڑکی نے سر پر پلو ٹھیک کیا۔ اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ ابو کا مطلب سمجھ چکی ہے۔ اس کے چہرے سے اس بات کا بھی پتہ چلتا تھا کہ اس نے ابو کی بات کا برا نہیں مانا۔ لیکن وہ اس کشمکش میں تھی کہ دونوں کا ٹیشن ایک ہو یا نہ ہو۔ ابو بانکا سجیلا تو ہے لیکن کیا وفادار بھی ہے۔ کیا وہ اپنا ٹیشن چھوڑ دے۔ جہاں اس کی گاڑی پتا نہیں کب کی جا چکی تھی۔ ابو کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔

”کیا سوچ رہی ہے بھاگ بھریئے۔“

گھوڑا مست خرامی سے دلکی چل رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ سڑک کے دو رویہ اُگے ہوئے درخت بھاگ رہے تھے۔ ان کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ گھنگھروں کی یک آہنگ جھنجھناہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ ابو گردن موڑے لڑکی کے سانولے حسن کو دل ہی دل میں چوم رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کی باگیں جنگلے کی سلاخ کے ساتھ باندھ دیں اور لپک کر پچھلی سیٹ پر لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ابو نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے

”دے دے اپنی باگیں میرے ہاتھ میں۔“

لڑکی نے صرف اتنا کہا۔

”چھوڑ بھی دے“

لیکن وہ فوراً ہی ابو کے بازوؤں میں تھی۔ اس کے بعد اس نے مزاحمت نہ کی۔ اس کا دل البتہ زور زور سے پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے خود کو چھڑا کر اڑ جانا چاہتا ہے۔ ابو ہولے ہولے پیار بھرے لہجے میں اسے کہنے لگا۔

”یہ ٹانگہ گھوڑا مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا، لیکن قسم گیارھویں والے پیر کی یہ بیچ دوں گا اور تیرے لیے سونے کے کڑے بنواؤں گا۔ آپ پھٹے پرانے کپڑے پہنوں گا، لیکن تجھے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ قسم وحدہ لاشریک کی، زندگی میں یہ میرا پہلا پیار ہے۔ تم میری نہ بنیں تو میں تیرے سامنے گلا کاٹ لوں گا اپنا“

پھر اس نے لڑکی کو اپنے سے علیحدہ کر دیا

”جانے کیا ہو گیا ہے مجھے۔ چلو تمہیں ٹیشن چھوڑ آؤں۔“

لڑکی نے ہولے سے کہا۔

”نہیں۔ اب تم مجھے ہاتھ لگا چکے ہو۔“

ابو کی گردن جھک گئی۔

”مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔“

”نبھالو گے اس غلطی کو؟“

لڑکی کے لہجے میں چیلنج تھا، جیسے کسی نے ابو سے کہا ہو۔

”لے جاؤ گے اپنا ٹانگہ اس ٹانگے سے آگے نکال کے۔“

اس کا جھکا ہوا سر اٹھا۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔

”بھاء بھریے۔“

یہ کہہ اس نے اپنے مضبوط سینے پر ہاتھ رکھا۔

”ابو اپنی جان دے دے گا۔“

لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”تو یہ ہے میرا ہاتھ۔“

ابو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”قسم اپنی جوانی کی۔ ابو تیرا غلام ہے۔“

دوسرے روز ابو اور اس لڑکی کا نکاح ہو گیا۔ وہ ضلع گجرات کی موچن تھی نام اس کا عنایت یعنی نیتی تھا۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آئی تھی۔ وہ اسٹیشن پر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ ابو اور اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی جو فوراً ہی محبت کی ساری منزلیں طے کر گئی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ ابو نے ٹانگہ گھوڑا بیچ کر تو نیتی کے لیے سونے کے کڑے نہیں بنوائے تھے لیکن اپنے جمع کیے پیسوں سے اس کو سونے کی بالیاں خرید دی تھیں۔ کئی ریشمی کپڑے بھی بنوا دیے تھے۔ لس لس کرتے ہوئے ریشمی لاچے میں جب نیتی، ابو کے سامنے آتی تو اس کا دل ناچنے لگتا۔

“قسم پنج تن پاک کی، دنیا میں تجھ جیسا سندر اور کوئی نہیں۔”

اور یہ کہہ وہ اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتا۔

“تو میرے دل کی رانی ہے۔”

دونوں جوانی کی مستیوں میں غرق تھے۔ گاتے تھے، ہنستے تھے، سیریں کرتے تھے، ایک دوسرے کی بلائیں لیتے تھے۔ ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا کہ دفعتاً ایک روز پولیس نے ابو کو گرفتار کر لیا۔ نیتی بھی پکڑی گئی۔ ابو پر اغواء کا مقدمہ چلا۔ نیتی ثابت قدم رہی لیکن پھر بھی ابو کو دو برس کی سزا ہو گئی۔ جب عدالت نے حکم سنایا تو نیتی ابو کے ساتھ لپٹ گئی۔ روتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا۔

“میں اپنے ماں باپ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی۔ گھر بیٹھ کر تیرا انتظار کروں گی۔”

ابو نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی

“جیتی رہ۔ ٹانگہ گھوڑا میں نے دینے کے سپرد کیا ہوا ہے۔ اس سے کرایہ وصول کرتی رہنا۔”

نیتی کے ماں باپ نے بہت زور لگایا مگر وہ ان کے ساتھ نہ گئی۔ تھک ہار کر انھوں نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ نیتی اکیلی رہنے لگی۔ دینا اسے شام کو پانچ روپے دے جاتا تھا جو اس کے خرچ کے لیے کافی تھے۔ اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں روزانہ پانچ روپے کے حساب سے جو کچھ جمع ہوا تھا وہ بھی اس کے پاس تھا۔ ہفتے میں ایک بار نیتی اور ابو کی ملاقات جیت میں ہوتی تھی جو کہ ان دونوں کے لیے بہت ہی مختصر تھی۔ نیتی کے پاس جتنی جمع پونجی تھی وہ ابو کو آسائشیں پہنچانے میں صرف ہو گئی۔ ایک ملاقات میں ابو نے نیتی کے بچے کانوں کی طرف دیکھا اور پوچھا

“بالیاں کہاں گئیں نیتی؟”

نیتی مسکرا دی اور سنتری کی طرف دیکھ کر ابو سے کہا

“گم ہو گئیں کہیں۔”

ابو نے قدرے غصے ہو کر کہا۔

“تم میرا اتنا خیال رکھا نہ کرو۔ جیسا بھی ہوں ٹھیک ہوں۔”

نیتی نے کچھ نہ کہا۔ وقت پورا ہو چکا تھا۔ مسکراتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ مگر گھر جا کر بہت روئی۔ گھنٹوں آنسو بہائے۔ کیونکہ ابو کی صحت بہت گر رہی تھی۔ اس ملاقات میں تو وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ گرانڈیل ابو اب گھل گھل کر آدھا ہو گیا تھا۔ نیتی سوچتی تھی کہ اس کو اس کا غم کھا رہا ہے۔ اس کی جدائی نے ابو کی یہ حالت کر دی ہے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دق کا مریض ہے اور یہ مرض اسے ورثے میں ملا ہے۔ ابو کا باپ ابو سے کہیں زیادہ گرانڈیل تھا۔ لیکن دق نے اسے چند دنوں ہی میں قبر کے اندر پہنچا دیا۔ ابو کا بڑا بھائی کڑیل جوان تھا مگر عین جوانی میں اس مرض نے اسے دبوچ لیا تھا۔ خود ابو اس حقیقت سے غافل تھا چنانچہ جیل کے ہسپتال میں جب وہ آخری سانس لے رہا تھا، اس نے افسوس بھرے لہجے میں نیتی سے کہا۔

“مجھے معلوم ہوتا کہ میں اتنی جلدی مر جاؤں گا تو قسم وحدہ لاشریک کی تجھے کبھی اپنی بیوی نہ بناتا۔ میں نے تیرے ساتھ بہت ظلم کیا۔ مجھے معاف کر دے۔ اور دیکھ میری ایک نشانی ہے، میرا ٹانگہ گھوڑا۔ اس کا خیال رکھنا۔ اور چنی بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنا۔ ابو نے تجھے پیار بھیجا ہے۔”

ابو مر گیا۔ نیتی کا سب کچھ مر گیا۔ مگر وہ حوصلے والی عورت تھی۔ اس صدمے کو اس نے برداشت کر ہی لیا۔ گھر میں تن تنہا پڑی رہتی تھی۔ شام کو دینا آتا تھا اور اسے دم دلاسا دیتا تھا اور کہتا تھا۔

“کچھ فکر نہ کرو بھابی۔ اللہ میاں کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی۔ ابو میرا بھائی تھی۔ مجھ سے جو ہو سکتا ہے خدا کے حکم سے کروں گا۔”

شروع شروع میں تو نیتی نہ سمجھی پر جب اس کے عدت کے دن پورے ہوئے تو دینے نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ یہ سن کر نیتی کے جی میں آئی کہ وہ اس کو دھکا دے کر باہر نکال دے مگر اس نے صرف اتنا کہا۔

“بھائی مجھے شادی نہیں کرنی۔”

اس دن سے دینے کے رویے میں فرق آ گیا۔ پہلے شام کو بلاناغہ پانچ روپے ادا کرتا تھا۔ اب کبھی چار دینے لگا۔ کبھی تین۔ بہانہ یہ کہ بہت مندا ہے۔ پھر دو دو تین تین دن غائب رہنے لگا۔ بہانہ یہ کہ بیمار تھا یا ٹانگے کا کوئی کل پرزہ خوب ہو گیا تھا۔ اس لیے جو نہ سکا۔ جب پانی سر سے نکل گیا تو نیتی نے دینے سے کہا۔

“بھائی دینے اب تم تکلیف نہ کرو۔ ٹانگہ گھوڑا میرے حوالے کر دو۔”

بڑی لیت و لعل کے بعد بالآخر دینے نے بادلِ ناخواستہ ٹانگا گھوڑا نیتی کی تحویل میں دے دیا۔ اس نے ماجھے کے سپرد کر دیا جو ابو کا دوست تھا۔ اس نے بھی کچھ دنوں کے بعد شادی کی درخواست کی۔ نیتی نے انکار کیا تو اس کی آنکھیں بدل گئیں۔ ہمدردی وغیرہ سب ہوا ہو گئی۔ نیتی نے اس سے ٹانگا گھوڑا واپس لیا اور ایک انجانے کوچوان کے حوالے کر دیا۔ اس نے تو حد ہی کر دی۔ ایک شام پیسے دینے آیا تو شراب میں دھت تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی نیتی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ نیتی نے اس کو خوب سنائیں۔ اور کام سے ہٹا دیا۔ آٹھ دس روز ٹانگا گھوڑا بیکار طویلے میں پڑا رہا۔ گھاس دانے کا خرچ علیحدہ۔ طویلے کا کرایہ علیحدہ۔ نیتی عجیب الجھن میں گرفتار تھی۔ کوئی شادی کی درخواست کرتا تھا، کوئی اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ کوئی پیسے مار لیتا تھا۔ باہر نکلتی تو لوگ بری نگاہوں سے گھورتے تھے۔ ایک رات اس کا ہمسایہ دیوار پھاند کے آ گیا اور دراز دستی کرنے لگا۔ نیتی سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی کہ کیا کرے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا۔

”کیوں نہ ٹانگا میں آپ ہی جوتوں۔ آپ ہی چلاؤں“

۔ابو کے ساتھ جب وہ سیر کو جایا کرتی تھی تو ٹانگا خود ہی چلایا کرتی تھی۔ شہر کے راستوں سے بھی واقف تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچا

”لوگ کیا کہیں گے؟“

۔اس کے جواب میں اس کے دماغ نے کئی دلیلیں دیں۔

”کیا حرج ہے۔ کیا عورتیں محنت مزدوری نہیں کرتیں۔ یہ کوئلے والیاں۔ یہ دفتروں میں جانے والی عورتیں۔ گھر میں بیٹھ کر کام کرنے والیاں تو ہزاروں ہوں گی۔ پیٹ کسی حیلے سے پالنا ہی ہے۔“

نیتی نے کچھ دن سوچ بچار کیا۔ آخر میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ٹانگہ خود چلائیگی۔ اس کو خود پر پورا اعتماد تھا، چنانچہ اللہ کا نام لے کر وہ طویلے پہنچ گئی۔ ٹانگا جوتنے لگی تو سارے کوچوان ہکا بکا رہ گئے۔ بعض مذاق سمجھ کر خوب ہنسے۔ جو بزرگ تھے انھوں نے نیتی کو سمجھایا کہ دیکھو ایسا نہ کرو۔ یہ مناسب نہیں مگر نیتی نہ مانی۔ ٹانگا ٹھیک ٹھاک کیا۔ پیتل کا ساز و سامان اچھی طرح چمکایا۔ گھوڑے کو خوب پیار کیا اور ابو سے دل ہی دل میں پیار کی باتیں کرتی طویلے سے باہر نکل گئی۔ کوچوان حیرت زدہ تھے، کیونکہ نیتی کے ہاتھ رواں تھے جیسے وہ ٹانگہ چلانے کے فن پر حاوی ہے۔ شہر میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا کہ ایک خوبصورت عورت ٹانگہ چلا رہی ہے۔ ہر جگہ اسی بات کا چرچا تھا۔ لوگ سنتے تھے تو اس وقت کا انتظار کرتے تھے جب وہ ان کی سڑک پر سے گزرے گا۔ شروع شروع میں تو مرد سواریاں جھجکتی تھیں مگر یہ جھجک تھوڑی دیر میں دور ہو گئی اور خوب آمدن ہونے لگی۔ ایک منٹ کے لیے بھی نیتی کا ٹانگہ بیکار نہ رہتا تھا۔ ادھر سوار اتری ادھر بیٹھی۔ آپس میں کبھی کبھی سواریوں کی لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ اس بات پر نیتی کو پہلے کس نے بلایا تھا۔ جب کام زیادہ ہو گیا تو نیتی نے ٹانگہ جوتنے کے اوقات مقرر کر دیے صبح سات بجے سے بارہ بجے، دوپہر دو سے چھ بجے تک۔ یہ سلسلہ بڑا آرام دہ ثابت ہوا۔ چنی بھی خوش تھا مگر نیتی محسوس کر رہی تھی کہ اکثر لوگ صرف اس کی قربت حاصل کرنے کیلیے اس کے ٹانگے میں بیٹھتے۔ بے مطلب بے مقصد اسے اِدھر اُدھر پھراتے تھے۔ آپس میں گندے گندے مذاق بھی کرتے تھے۔ صرف اس کو سنانے کیلیے باتیں کرتے تھے۔ اس کو ایسا لگا تھا کہ وہ تو خود کو نہیں بیچتی۔ لیکن لوگ چپکے چپکے اسے خرید رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ شہر کے سارے کوچوان اس کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ان تمام احساسات کے باوجود مضطرب نہیں تھی۔ اپنی خود اعتمادی کے باعث وہ پر سکون تھی۔ ایک دن کمیٹی والوں نے نیتی کو بلایا اور اس کا لائسنس ضبط کر لیا۔ وجہ یہ بتائی کہ عورت ٹانگہ نہیں چلا سکتی۔ نیتی نے پوچھا۔

”جناب، عورت ٹانگہ کیوں نہیں چلا سکتی۔“

جواب ملا۔

”بس، نہیں چلا سکتی۔ تمہارا لائسنس ضبط ہے۔“

نیتی نے کہا۔

”حضور، آپ گھوڑا ٹانگہ بھی ضبط کر لیں، پر مجھے یہ تو بتائیں کہ عورت کیوں ٹانگہ نہیں جوت سکتی، عورتیں چرخہ چلا کر اپنا پیٹ پال سکتی ہیں۔ عورتیں ٹوکری ڈھو کر روزی کما سکتی ہیں۔ عورتیں لینوں پر کوئلے چن چن کر اپنی روٹی پیدا کر سکتی ہیں۔ میں ٹانگہ کیوں نہیں چلا سکتی۔ مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں۔ ٹانگہ گھوڑا میرے خاوند کا ہے۔ میں اسے کیوں نہیں چلا سکتی۔ میں اپنا گزارہ کیسے کروں؟۔ حضور آپ رحم کریں۔ محنت مزدوری سے کیوں روکتے ہیں مجھے؟۔ میں کیا کروں، بتائے نا مجھے“

افسر نے جواب دیا۔

”جاؤ بازار میں جا کر بیٹھو۔ وہاں زیادہ کمائی ہے۔“

یہ سن کر نیتی کے اندر جو اصل نیتی تھی جل کر راکھ ہو گئی۔ ہولے سے

”اچھا جی“

کہہ کر وہ چلی گئی۔ اونے پونے داموں ٹانگہ گھوڑا بیچا اور سیدھی ابو کی قبر پر گئی۔ ایک لحظے کے لیے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں، جیسے بارش کے بعد چلچلاتی دھوپ نے زمین کی ساری نمی چوس لی تھی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ وا ہوئے اور وہ قبر سے مخاطب ہوئی۔

”ابو۔ تیری نیتی آج کمیٹی کے دفتر میں مر گئی۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ دوسرے دن عرضی دی۔ اس کو اپنا جسم بیچنے کا لائسنس مل گیا۔

لتیکارانی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹولتیکا رانی

وہ خوبصورت نہیں تھی۔ کوئی ایسی چیز اس کی شکل و صورت میں نہیں تھی جسے پرکشش کہا جاسکے، لیکن اس کے باوجود جب وہ پہلی بار فلم کے پردے پر آئی تو اس نے لوگوں کے دل موہ لیے اور یہ لوگ جو اسے فلم کے پردے پر ننھی منی اداؤں کے ساتھ بڑے نرم و نازک رومانوں میں چھوٹی سی تتلی کے مانند ادھر سے ادھر اور اُدھر سے اِدھر تھرکتے دیکھتے تھے، سمجھتے تھے کہ وہ خوبصورت ہے۔ اس کے چہرے مہرے اور اس کے ناز نخرے میں ان کو ایسی کشش نظر آتی تھی کہ وہ گھنٹوں اس کی روشنی میں مبہوت مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔ اگر کسی سے پوچھا جاتا کہ تمہیں لتیکارانی کے حسن و جمال میں کون سی سب سے بڑی خصوصیت نظر آتی ہے جو اسے دوسری ایکٹرسوں سے جداگانہ حیثیت بخشتی ہے تو وہ بلا تامل یہ کہتا کہ اس کا بھولپن۔ اور یہ واقعہ ہے کہ پردے پر وہ انتہا درجے کی بھولی دکھائی دیتی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس کے سوا کوئی اور خیال دماغ میں آہی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھولی ہے، بہت ہی بھولی۔ اور جن رومانوں کے پس منظر کے ساتھ وہ پیش ہوتی ان کے تانے بانے یوں معلوم ہوتا تھا کسی جولاہے کی الھڑ لڑکی نے تیار کیے ہیں۔ وہ جب بھی پردے پر پیش ہوئی، ایک معمولی ان پڑھ آدمی کی بیٹی کے روپ میں چمکیلی دنیا سے دور ایک شکستہ جھونپڑا ہی جس کی ساری دنیا تھی۔ کسی کسان کی بیٹی، کسی مزدور کی بیٹی، کسی کانٹا بدلنے والے کی بیٹی اور وہ ان کرداروں کے خول میں یوں سما جاتی تھی جیسے گلاس میں پانی۔ لتیکارانی کا نام آتے ہی آنکھوں کے سامنے، ٹخنوں سے بہت اونچا گھگھرا پہنے، کھینچ کر اوپر کی ہوئی ننھی منی چوٹی والی، مختصر قد کی ایک چھوٹی سی لڑکی آجاتی تھی جو مٹی کے چھوٹے چھوٹے گروندے بنانے یا بکری کے معصوم بچے کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہے۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، پھنسی پھنسی چولی میں بڑے شاعرانہ انکسار کے ساتھ سینے کا چھوٹا سا ابھار، معتدل آنکھیں، شریف سی ناک، اس کے سراپا میں یوں سمجھیے کہ دوشیزگی کا خلاصہ ہوگیا تھا جو ہر دیکھنے والے کی سمجھ میں آجاتا تھا۔ پہلے فلم میں آتے ہی وہ مشہور ہوگئی اور اس کی یہ شہرت اب تک قائم ہے حالانکہ اسے فلمی دنیا چھوڑے ایک مدت ہوچکی ہے۔ اپنی فلمی زندگی کے دوران میں اس نے شہرت کے ساتھ دولت بھی پیدا کی۔ اس نپے تلے انداز میں گویا اس کو اپنی جیب میں آنے والی ہر پائی کی آمد کا علم تھا اور شہرت کے تمام زینے بھی اس نے اسی انداز میں طے کیے کہ ہر آنے والے زینے کی طرف اس کا قدم بڑے وثوق سے اٹھا ہوتا تھا۔ لتیکارانی بہت بڑی ایکٹرس اور عجیب و غریب عورت تھی۔ اکیس برس کی عمر میں جب وہ فرانس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی تو اس نے فرانسیسی زبان کی بجائے ہندوستانی زبان سیکھنا شروع کردی۔ اسکول میں ایک مدراسی نوجوان کو اس سے محبت ہوگئی تھی، اس سے شادی کرنے کا وہ پورا پورا فیصلہ کر چکی تھی لیکن جب لنڈن گئی تو اس کی ملاقات ایک ادھیڑ عمر کے بنگالی سے ہوئی جو وہاں بیرسٹری پاس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لتیکا نے اپنا ارادہ بدل دیا اور دل میں طے کر لیا کہ وہ اس سے شادی کرے گی اور یہ فیصلہ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔ اس نے بیرسٹری پاس کرنے والے ادھیڑ عمر کے بنگالی میں وہ آدمی دیکھا جو اس کے خوابوں کی تکمیل میں حصہ لے سکتا تھا۔ وہ مدراسی جس سے اس کو محبت تھی جرمنی میں پھیپھڑوں کے امراض کی تشخیص و علاج میں مہارت حاصل کر رہا تھا۔ اس سے شادی کرکے زیادہ سے زیادہ اسے اپنے پھیپھڑوں کی اچھی دیکھ بھال کی ضمانت مل سکتی تھی، جو اسے درکار نہیں تھی۔ لیکن پر فلا رائے ایک خواب ساز تھا۔ ایسا خواب ساز جو بڑے دیرپا خواب بُن سکتا تھا اور لتیکا اس کے اردگرد اپنی نسوانیت کے بڑے مضبوط جالے تن سکتی تھی۔ پر فلا رائے ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ بہت محنتی، وہ چاہتا تو قانون کی بڑی سے بڑی ڈگری تمام طالب علموں سے ممتاز رہ کر حاصل کر سکتا تھا مگر اسے اس علم سے سخت نفرت تھی۔ صرف اپنے ماں باپ کو خوش رکھنے کی غرض سے وہ ڈنرز میں حاضری دیتا تھا اور تھوڑی دیر کتابوں کا مطالعہ بھی کر لیتا تھا۔ ورنہ اس کا دل و دماغ کسی اور ہی طرف لگا رہتا تھا۔ کس طرف؟ یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ دن رات وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ اس کو ہجوم سے سخت نفرت تھی، پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا سارا وقت قریب قریب تنہائی میں گزرتا۔ کسی چائے خانے میں یا اپنی بوڑھی لینڈ لیڈی کے پاس بیٹھا وہ گھنٹوں ایسے قلعے بناتا رہتا جن کی بنیادیں ہوتی تھیں نہ فصیلیں۔ مگر اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس سے کوئی نہ کوئی عمارت ضرور بن جائے گی جس کو دیکھ کر وہ خوش ہوا کرے گا۔ لتیکا جب پروفلا رائے سے ملی تو چند ملاقاتوں ہی میں اس کو معلوم ہوگیا کہ یہ بیرسٹری کرنے والا بنگالی معمولی آدمی نہیں۔ دوسرے مرد اس سے دلچسپی لیتے رہے تھے، اس لیے کہ وہ جوان تھی، ان میں سے اکثر نے اس کے حسن کی تعریف کی تھی، لیکن مدت ہوئی وہ اس کا فیصلہ اپنے خلاف کر چکی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ ان کی تعریف محض رسمی ہے۔ مدراسی ڈاکٹر جو اس سے واقعی محبت کرتا تھا اس کو صحیح معنوں میں خوبصورت سمجھتا تھا مگر لتیکا سمجھتی تھی کہ وہ اس کی نہیں اس کے پھیپھڑوں کی تعریف کر رہا ہے جو اس کے کہنے کے مطابق بے داغ تھے۔ وہ ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل و

صورت کی۔ جس میں ایک جاذبیت تھی نہ کشش، اس نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ وہ ادھوری سی ہے۔ اس میں بہت سی کمیاں ہیں جو پوری تو ہو سکتی ہیں مگر بڑی چھان بین کے بعد اور وہ بھی اس وقت جب اس کو خارجی امداد حاصل ہو۔ پر فلا رائے سے ملنے کے بعد لتیکا نے محسوس کیا تھا کہ وہ جو بظاہر سگرٹ پر سگرٹ پھونکتا رہتا ہے اور جس کا دماغ ایسا لگتا ہے، ہمیشہ غائب رہتا ہے اصل میں سگرٹوں کے پریشان دھوئیں میں اپنے دماغ کی غیر حاضری کے باوجود اس کی شکل وصورت کے تمام اجزاء بکھیر کر ان کو اپنے طور پر سنوارنے میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اس کے اندازِ تکلم، اس کے ہونٹوں کی جنبش اور اس کی آنکھوں کی حرکت کو صرف اپنی نہیں دوسروں کی آنکھوں سے بھی دیکھتا ہے، پھر ان کو الٹ پلٹ کرتا ہے اور اپنے تصور میں تکلم کا نیا انداز، ہونٹوں کی نئی جنبش اور آنکھوں کی نئی حرکت پیدا کرتا ہے۔ ایک خفیف سی تبدیلی پر وہ بڑے اہم نتائج کی بنیادیں کھڑی کرتا ہے اور دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔ لتیکا ذہین تھی، اس کو فوراً ہی معلوم ہو گیا تھا کہ پر فلا رائے ایسا معمار ہے جو اسے عمارت کا نقشہ بنا کر نہیں دکھائے گا۔ وہ اس سے یہ بھی نہیں کہے گا کہ کون سی اینٹ اکھیڑ کر کہاں لگائی جائے گی تو عمارت کا سقم دور ہو گا۔ چنانچہ اس نے اس کے خیالات و افکار ہی سے سب ہدایتیں وصول کرنا شروع کر دی تھیں۔ پر فلا رائے نے بھی فوراً ہی محسوس کر لیا کہ لتیکا اس کے خیالات کا مطالعہ کرتی ہے اور ان پر عمل کرتی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اس خاموش درس و تدریس کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ پر فلا رائے اور لتیکا دونوں مطمئن تھے، اس لیے کہ وہ دونوں لازم وملزوم سے ہو گئے تھے۔ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل تھا۔ لتیکا کو خاص طور پر اپنی ذہنی و جسمانی کروٹ میں پر فلا کی خاموش تنقید کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ وہ اس کے ناز و ادا کی کسوٹی تھا، اس کی بظاہر خلا میں دیکھنے والی نگاہوں سے اس کو پتہ چل جاتا کہ اس کی پلک کی کونسی نوک ٹیڑھی ہے۔ لیکن وہ اب یہ حقیقت معلوم کر چکی تھی۔ کہ وہ حرارت جو اس کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں میں ہے، اس کی آغوش میں نہیں تھی۔ لتیکا کے لیے یہ بالکل ایسی تھی جیسی کھری چارپائی۔ لیکن وہ مطمئن تھی، اس لیے کہ اس کے خوابوں کے بال و پر نکالنے کے لیے پر فلا کی آنکھوں کی حرارت ہی کافی تھی۔ وہ بڑی سیاق دان اور اندازہ گیر عورت تھی۔ اس نے دو مہینے کے عرصے ہی میں حساب لگا لیا تھا کہ ایک برس کے اندر اندر اس کے خوابوں کے تکمیل کی ابتداء ہو جائے گی۔ کیونکر ہو گی اور کس فضا میں ہو گی۔ یہ سوچنا پر فلا رائے کا کام تھا اور لتیکا کو یقین تھا کہ اس کا سدا متحرک دماغ کوئی نہ کوئی راہ پیدا کریگا۔ چنانچہ دونوں جب ہندوستان جانے کے ارادے سے برلن کی سیر کو گئے اور پر فلا کا ایک دوست انھیں اون فلم اسٹوڈیوز میں لے گیا تو لتیکا نے پر وفلا کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں کی گہرائیوں میں اپنے مستقبل کی صاف جھلک دیکھ لی۔ وہ ایک مشہور جرمن ایکٹرس سے محوِ گفتگو تھا مگر لتیکا محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کے سراپا کو کنیوس کا ٹکڑا بنا کر ایکٹرس لتیکا کے نقش و نگار بنا رہا ہے۔ بمبئی پہنچے تو تاج محل ہوٹل میں پر فلا رائے کی ملاقات ایک انگریز نائٹ سے ہوئی جو قریب قریب قلاش تھا۔ مگر اس کی واقفیت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ عمر ساٹھ سے کچھ اوپر، زبان میں لکنت، عادات و اطوار بڑی شستہ، پر فلا رائے اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ مگر لتیکا رانی کی اندازہ گیر طبیعت نے فوراً بھانپ لیا کہ اس سے بڑے مفید کام لیے جا سکتے ہیں، چنانچہ وہ نرس کی سی توجہ اور خلوص کے ساتھ اس سے ملنے جلنے لگی اور جیسا کہ لتیکا کو معلوم تھا ایک ڈن ڈنر پر ایک طرح خود بخود طے ہو گیا کہ اس فلم کمپنی میں جو پر فلا رائے قائم کرے گا۔ وہ دو مہمان جو سر ہاورڈ پسیکل نے مدعو کیے تھے ڈائرکٹر ہوں گے اور چند دن کے اندر اندر وہ تمام مراحل طے ہو گئے جو ایک لمیٹڈ کمپنی کی بنیادیں کھڑی کرنے میں در پیش آتے ہیں۔ سر ہاورڈ بہت کام کا آدمی ثابت ہوا۔ یہ پر فلا کا ردعمل تھا، لیکن لتیکا شروع ہی سے جانتی تھی کہ وہ ایسا آدمی ہے جس کی افادیت بہت جلد پر دہ ظہور پر آجائے گی۔ وہ جب اس کی خدمت گزاری میں کچھ وقت صرف کرتی تھی تو پر فلا حسد محسوس کرتا تھا، مگر لتیکا نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قربت سے بڈھا سر ہاورڈ ایک گونہ جنسی تسکین حاصل کرتا تھا، مگر وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ یوں تو وہ دو مالدار مہمان بھی اصل میں اسی کی وجہ سے اپنا سرمایہ لگانے کے لیے تیار ہوئے تھے اور لتیکا کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ لوگ صرف اسی وقت تک اہم تھے جب تک ان کا سرمایہ ان کی تجوریوں میں تھا، وہ ان دونوں کا تصور بڑی آسانی سے کر سکتی تھی جب یہ مارواڑی سیٹھ اسٹوڈیوز میں اس کی ہلکی سی جھلک دیکھنے کے لیے بھی ترسا کریں گے لیکن یہ دن قریب لانے کیلیے اس کو کوئی عجلت نہیں تھی، ہر چیز اس کے حساب کے مطابق اپنے وقت پر ٹھیک ہو رہی تھی۔ لمیٹڈ کمپنی کا قیام عمل میں آگیا۔ اس کے سارے حصے بھی فروخت ہو گئے۔ سر ہاورڈ پیسکل کے وسیع تعلقات اور اثر ورسوخ کی وجہ سے ایک پر فضا مقام پر اسٹوڈیو کے لیے زمین کا ٹکڑا بھی مل گیا۔ ادھر سے فراغت ہوئی تو ڈائرکٹروں نے پر فلا رائے سے درخواست کی کہ وہ انگلینڈ جا کر ضروری ساز وسامان خرید لائے۔ انگلینڈ جانے سے ایک روز پہلے پر فلا نے ٹھیٹ یورپی انداز میں لتیکا سے شادی کی درخواست کی جو اس نے فوراً منظور کر لی۔ چنانچہ اسی دن ان دنوں کی شادی ہو گئی۔ دونوں انگلینڈ گئے۔ ہنی مون میں دونوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایک دوسرے کے جسم کے متعلق جو انکشافات ہونے تھے وہ عرصہ ہوا ان پر ہو چکے تھے، ان کو اب دھن صرف اس بات کی تھی کہ وہ کمپنی جو انھوں نے قائم کی ہے اس کے لیے مشینری خریدیں اور واپس بمبئی میں جا کر کام پر لگ جائیں۔ لتیکا نے کبھی اس کے متعلق نہ سوچا تھا کہ پر فلا جو فلم سازی سے قطعاً ناواقف ہے۔ اسٹوڈیو کیسے چلائے گا۔ اس کو اس کی ذہانت کا علم تھا۔ جس طرح اس نے خاموشی ہی خاموشی میں صرف اپنی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں سے اس کی نوک پلک درست کر دی تھی۔ اسی طرح اس کو یقین تھا کہ وہ فلم سازی میں بھی کامیاب ہو گا۔ وہ اس کو جب اپنے پہلے فلم میں ہیروئن بنا کر پیش کرے گا تو ہندوستان میں ایک قیامت برپا ہو جائے گی۔ پر فلا رائے فلم سازی کی تکنیک سے قطعاً نا آشنا تھا۔ جرمنی میں صرف چند دن اس نے اوفا اسٹوڈیوز میں اس صنعت کا سرسری مطالعہ کیا تھا، لیکن جب وہ انگلینڈ سے اپنے ساتھ ایک کیمرہ مین اور ایک ڈائریکٹر لے کر آیا اور انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا پہلا فلم سیٹ پر گیا تو اسٹوڈیوز کے سارے عملے پر اس کی ذہانت اور قابلیت کی دھاگ بیٹھ گئی۔ بہت کم گفتگو کرتا تھا۔ صبح سویرے اسٹوڈیو آتا تھا اور سارا دن اپنے دفتر میں فلم کے مناظر اور مکالمے تیار کرانے میں مصروف رہتا تھا۔ شوٹنگ کا ایک پروگرام مرتب تھا جس کے مطابق کام ہوتا تھا، ہر شعبے کا

ایک نگران مقرر تھا جو پر فلا کی ہدایت کے مطابق چلتا تھا۔ اسٹوڈیو میں ہر قسم کی آوارگی ممنوع تھی۔ بہت صاف ستھرا ماحول تھا جس میں ہر کام بڑے قرینے سے ہوتا تھا۔ پہلا فلم تیار ہو کر مارکیٹ میں آگیا۔ پر فلارائے کی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں نے جو کچھ دیکھنا چاہتا تھا وہی پردے پر پیش ہوا۔ وہ زمانہ بھڑکیلے پن کا تھا۔ ہیروئن وہی سمجھی جاتی تھی جو زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہو۔ اونچی سوسائٹی سے متعلق ہو۔ ایسے رومانوں میں مبتلا ہو حقیقت سے جنھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ایسی زبان بولے جو اسٹیج کے ڈراموں میں بولی جاتی ہے۔ لیکن پر فلارائے کے پہلے فلم میں سب کچھ اس کا رد تھا۔ فلم بینوں کے لیے یہ تبدیلی، یہ اچانک انقلاب بڑا خوشگوار تھا، چنانچہ یہ ہندوستان میں ہر جگہ کامیاب ہوا اور لتیکارانی نے عوام کے دل میں فوراً ہی اپنا مقام پیدا کر لیا۔ پر فلارائے اس کامیابی پر بہت مطمئن تھا۔ وہ جب لتیکا کے معصوم حسن اور اس کی بھولی بھالی اداکاری کے متعلق اخباروں میں پڑھتا تھا تو اس کو اس خیال سے کہ وہ ان کا خالق ہے بہت راحت پہنچتی تھی۔ لیکن لتیکا پر اس کامیابی نے کوئی نمایاں اکثر نہیں کیا تھا۔ اس کی اندازہ گیر طبیعت کے لیے یہ کوئی غیر متوقع چیز نہیں تھی۔ وہ کامیابیاں جو مستقبل کی کوکھ میں چھپی ہوئی تھیں، کھلی ہوئی کتاب کے اوراق کی مانند اس کے سامنے تھیں۔ پہلے فلم کی نمائش عظمیٰ پر وہ کیسے کپڑے پن کر سینما ہال میں جائے گی۔ اپنے خاوند پر فلارائے سے دوسروں کے سامنے کس قسم کی گفتگو کرے گی۔ جب اسے ہار پہنائے جائیں گے تو وہ انھیں اتار کر خوش کرنے کے لیے کس کے گلے میں ڈالے گی۔ اس کے ہونٹوں کا کون سا کونہ کس وقت پر کس انداز میں مسکرائے گا یہ سب اس نے ایک مہینہ پہلے سوچ لیا تھا۔ اسٹوڈیو میں لتیکا کو ہر حرکت ہر ادا ایک خاص پلان کے ماتحت عمل میں آتی تھی۔ اس کا مکان پاس ہی تھا۔ سرہاورڈ پیسکل کو پر فلارائے نے اسٹوڈیو کے بالائی حصے میں جگہ دے رکھی تھی۔ لتیکا صبح سویرے آتی اور کچھ وقت سرہاروڈ کے ساتھ گزارتی، جس کو باغبانی کا شوق تھا۔ نصف گھنٹے تک وہ اس بڈھے الکن نائٹ کے ساتھ پھولوں کے متعلق گفتگو کرتی رہتی۔ اس کے بعد گھر چلی جاتی اور اپنے خاوند سے اس کی ضروریات کے مطابق تھوڑا سا پیار کرتی۔ وہ اسٹوڈیو چلا جاتا اور لتیکا اپنے سادہ میک اپ میں جس کا ایک ایک خط، ایک ایک نقطہ پر فلا کا بنایا ہوا تھا، مصروف ہو جاتی۔ دوسرا فلم تیار ہوا، پھر تیسرا، اسی طرح پانچواں، یہ سب کامیاب ہوئے اتنے کامیاب کہ دوسرے فلم سازوں کو انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے قائم کردہ خطوط پر بدرجہ مجبوری چلنا پڑا۔ اس نقل میں وہ کامیاب ہوئے یا ناکام، اس کے متعلق ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ لتیکا کی شہرت ہر نئے فلم کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ ہر جگہ انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا شہرہ تھا۔ مگر پر فلارائے کو بہت کم آدمی جانتے تھے۔ وہ جو اس کا معمار تھا، وہ جو لتیکا کا نصف بہتر تھا۔ لیکن پر لفانے کبھی اس کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا، اس کی خلا میں جھانکنے والی آنکھیں ہر وقت سگرٹ کے دھوئیں میں لتیکا کے نت نئے روپ بنانے میں مصروف رہتی تھیں۔ ان فلموں میں ہیرو کو کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پر فلارائے کے اشاروں پر وہ کہانی میں اٹھتا، بیٹھتا اور چلتا تھا۔ اسٹوڈیو میں بھی اس کی شخصیت معمولی تھی۔ سب جانتے تھے کہ پہلا نمبر مسٹر رائے کا اور دوسرا مسز رائے کا۔ جو باقی ہیں سب فضول ہیں۔ لیکن اس کا رد عمل یہ شرع ہوا کہ ہیرو نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ لتیکا کے ساتھ اس کا نام پردے پر لازم و ملزوم ہو گیا تھا۔ اس لیے اس سے اس نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ لتیکا سے اسے دلی نفرت تھی، اس لیے کہ وہ اس کے حقوق کی پرواہی نہیں کرتی تھی۔ اس کا اظہار بھی اس نے اب آہستہ آہستہ اسٹوڈیو میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اچانک پر فلارائے نے اپنے آئندہ فلم میں اس کو شامل نہ کیا۔ اس پر چھوٹا سا ہنگامہ برپا ہوا لیکن فوراً ہی دب گیا۔ نئے ہیرو کی آمد سے تھوڑی دیر اسٹوڈیو میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ لیکن یہ بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ لتیکا اپنے شوہر کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھی۔ لیکن اس سے اسے تبدیل کرانے کی کوشش نہ کی، جو حساب اس نے لگایا تھا اس کے مطابق تازہ فلم ناکام ثابت ہوا۔ اس کے بعد دوسرا بھی اور جیسا کہ لتیکا کو معلوم تھا، اس کی شہرت دبنے لگی اور ایک دن یہ سننے میں آیا کہ وہ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اخباروں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ لتیکا کا دامن حیرت ناک طور پر رومانس وغیہ سے پاک رہا تھا۔ لوگوں نے جب سنا کہ وہ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو اس کے عشق کی کہانیاں گھڑنی شروع کر دیں۔ پر فلارائے کو بہت صدمہ ہوا جو اس کے قریب تھے ان کا بیان ہے کہ وہ کئی بار بے ہوش ہوا۔ لتیکا کا بھاگ جانا اس کی زندگی کا بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس کا وجود اس کے لیے کینوس کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر وہ اپنے خوابوں کی تصویر کشی کرتا تھا۔ اب ایسا ٹکڑا اسے اور کہیں سے دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ غم کے مارے وہ نڈھال ہو گیا اس نے کئی بار چاہا کہ اسٹوڈیو کو آگ لگا دے اور اس میں خود کو جھونک دے۔ مگر اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت تھی جو اس میں نہیں تھی۔ آخر پرانا ہیرو آگے بڑھا اور اس نے معاملہ سلجھانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے لتیکا کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کیے کہ پر فلا بھونچکے رہ گیا۔ اس نے بتایا۔

”لتیکا ایسی عورت ہے جو محبت کے لطیف جذبے سے قطعاً محروم ہے۔ نئے ہیرو کے ساتھ وہ اس لیے نہیں بھگای کہ اس کو اس سے عشق ہے۔ یہ محض اسٹنٹ ہے۔ ایک ایسی چال ہے جس سے وہ اپنی تنزل پذیر شہرت کو تھوڑے عرصے کے لیے سنبھالا دینا چاہتی ہے اور اس میں اس نے اپنا شریک کار نئے ہیرو کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ میری طرح خود سر نہیں وہ اس کو اس طرح اپنے ساتھ لے گئی ہے جس طرح کسی نوکر کو لے جاتے ہیں۔ اگر اس نے مجھے منتخب کیا ہوتا تو اس کی اسکیم کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ میں کبھی اس کے احکام پر نہ چلتا۔ وہ اس وقت واپس آنے کے لیے تیار ہے، کیونکہ اس کے حساب کے مطابق اس کی واپسی میں بہت دن اوپر ہو گئے ہیں۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید میں یہ باتیں بھی اسی کے کہنے کے مطابق آپ کو بتا رہا ہوں۔“

دوسرے تخلیقی فن کاروں کی طرح پر فلارائے بھی پرلے درجے کا سکی تھا پرانے ہیرو کی یہ باتیں فوراً ذہن میں بیٹھ گئیں، لیکن جب لتیکا واپس آئی تو اس نے عاشق صادق کے سے گلے شکوے شروع کر دیے اور اس کو بے وفائی کا مجرم قرار دیا۔ لتیکا خاموش رہی۔ اس نے اپنی بے گناہی کے جواز میں کچھ نہ کہا۔ پرانے ہیرو نے اس کے متعلق جو باتیں اس کے شوہر سے کی تھیں، اس نے ان پر بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔ اس کے کہنے کے مطابق پرانے ہیرو کی تنخواہ دوگنی ہو گئی۔ اب وہ اس سے باتیں بھی کرتی تھی، لیکن ان کے درمیان وہ فاصلہ بدستور قائم

رہا۔ جس کی حدود شروع ہی سے مقرر کر چکی تھی۔ فلم پھر کامیاب ہوا۔ جو اس کے بعد پیش ہوا اسے بھی کامیابی نصیب ہوئی لیکن اس دوران میں انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے خطوط پر چل اور کئی ادارے فلم سازی کی نئی راہیں کھول چکے تھے۔ متعدد نئے چہرے جو لتیکا کے مقابلے میں کئی گنا پر کشش تھے، اسکرین پر پیش ہو چکے تھے۔ پرانے ہیرو کا خیال تھا کہ لتیکا ضرور اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی اور فلم ساز کی آغوش میں چلی جائے گی جو اس کے وجود میں نئے جزیرے دریافت کر سکے۔ لیکن بہت دیر تک کوئی قابل ذکر بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ اسٹوڈیو میں لتیکا کے متعلق ہر روز مختلف باتیں ہوتی تھیں۔ سب یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ خاوند کے ساتھ اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں۔ ان کے بارے میں کئی روایتیں مشہور تھیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی کہ وہ اپنے سائیں کے ساتھ خراب ہے۔ یہ روایت پرانے ہیرو سے تھی۔ اس کو یقین تھا کہ لتیکا اپنے سائیں رام بھروسے کے ذریعے سے اپنی جسمانی خواہشات پوری کرتی ہے اور اپنے خاوند پر فلا رائے سے اس کے تعلقات صرف نمائشی بستر تک محدود ہیں۔! پرانا ہیرو اپنے اس مفروضے کے جواز میں یہ کہتا تھا۔

”لتیکا جیسی عورت اس کے قسم کے تعلقات صرف ادنےٰ قسم کے نوکر ہی سے پیدا کر سکتی ہے جو اس کے اشارے پر آئے اور اشارے ہی پر چلا جائے۔ جس کی گردن اس کے احسان تلے دبی رہے۔ اگر وہ عشق و محبت کرنے کی اہلیت رکھتی تو نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ کر پھر واپس نہ آتی۔ یہ اس کا اسٹنٹ تھا اور اس کا پول کھل چکا ہے۔ تم یقین مانو کہ اس کے دن لد چکے ہیں اور سب جانتی ہے اور اچھی طرح سمجھتی ہے اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ مسٹر رائے کی تمام طاقتیں اسے بنانے اور سنوارنے میں ختم ہو چکی ہیں، اب وہ آم کی چسی ہوئی گٹھلی کے مانند ہے۔ اس میں وہ رس نہیں رہا جس سے وہ اتنی دیر امرت حاصل کرتی رہی تھی۔ تم دیکھ لینا، تھوڑے ہی عرصے کے بعد اپنی کایا کلپ کرانے کی خاطر وہ کسی اور فلم ساز کی آغوش میں چلی جائے گی۔“

لتیکا کسی اور فلم سازش کی آغوش میں نہ گئی! ایسا معلوم ہوتا کہ یہ موڑ اس کے بنائے ہوئے نقشے میں نہیں تھا۔ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ جانے کے بعد اس میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سرہاورڈ پیسکل کے ساتھ صبح سویرے باغبانی میں مصروف وہ ابھی اسی طرح نظر آتی تھی۔ اسٹوڈیو میں اس کے بارے میں جو باتیں ہوتی تھیں، اس کے علم میں تھیں، مگر وہ خاموش رہتی تھی، اس طرح پُر تمکنت طور پر خاموش! دو لفم اور بنے جو بہت بری طرح ناکام ہوئے۔ انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا روشن نام مدھم پڑنے لگا لتیکا پر اس کا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ اسٹوڈیو کا ہر آدمی جانتا تھا کہ مسٹر رائے سخت پریشان ہیں۔ پرانے ہیرو جو اپنا آقا کی قدر کرتا تھا اور اس کا ہم درد بھی تھا۔ کئی بار اسے رائے دی کہ وہ کمپنی کے بکھیڑوں سے الگ ہو جائے۔ فلم سازی کا کام اپنے شاگردوں کو سونپ دے اور خود آرام و سکون کی زندگی بسر کرنا شروع کر دے۔ مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ پر فلا رائے ایک بار پھر اپنی خواب ساز دماغ کی منتشر اور مضمحل قوتیں مجتمع کرنا چاہتا ہے اور لتیکا کے وجود کے ڈھیلے تانے بانے میں ایک نئے اور دیرپا خواب کے نقش ابھارنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ گھر کے نوکروں سے جو خبریں باہر آتی تھیں، ان سے پتہ چلتا تھا کہ مسٹر رائے کا مزاج بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ ہر وقت جھنجھلایا رہتا ہے کبھی کبھی غصے میں آ کر لتیکا کو گندی گندی گالیاں بھی دیتا ہے، مگر وہ خاموش رہتی ہے۔ رات کو جب مسٹر رائے کو شب بیداری کی شکایت ہوتی ہے تو وہ اس کا سر سہلاتی ہے، پاؤں دباتی ہے اور سُلا دیتی ہے۔ پہلے مسٹر رائے کبھی اصرار نہیں کرتے تھے کہ لتیکا ان کے پاس سوئے، پر اب وہ کئی بار راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسے ڈھونڈتے تھے اور اس کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ سوئے۔ پرانے ہیرو کو جب ایسی باتیں معلوم ہوتی تھیں تو اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔

”مسٹر رائے بہت بڑا آدمی ہے۔ لیکن افسوس کہ اس نے اپنا دماغ ایک ایسی عورت کے قدموں میں ڈال دیا جو کسی طرح بھی اس اعزاز کے قابل نہیں تھی۔ وہ عورت نہیں چڑیل تھی۔ میرے اختیار میں ہو تو میں اسے گولی سے اڑا دوں! سب سے بڑی ٹریجڈی تو یہ ہے کہ مسٹر رائے کو اب اس سے بہت زیادہ محبت ہو گئی ہے۔“

جو زیادہ گہرائیوں میں اترنے والے تھے، ان کا یہ خیال تھا کہ پر فلا رائے میں چونکہ اب لتیکا کا کوئی اور رنگ روپ دینے کی قوت باقی نہیں رہی، اس لیے وہ جنجھلا کر اس کو خراب کر دینا چاہتا ہے۔ اب تک وہ اسے ایک مقدس چیز سمجھتا رہا تھا جس پر اس نے گندگی اور نجاست کا ایک ذرہ تک بھی نہیں گرنے دیا تھا۔ مگر اب وہ اسے ناپاک کر دینا چاہتا ہے، غلاظت میں لتھیڑ دینا چاہتا ہے، تاکہ جب وہ کسی کے منہ سے یہ سنے کہ تمہاری لتیکا کو ہم نے فلاں فلاں نجاست سے ملوث کیا ہے تو اسے زیادہ روحانی کوفت نہ ہو۔ وہ پہلے خوابوں کی نرم و نازک دنیا میں بستا تھا، اب حقیقت کے پتھروں کے ساتھ اپنا اور لتیکا کا سر پھوڑنا چاہتا ہے۔ وقت گزرتا گیا، انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے بائیسویں فلم کی شوٹنگ جاری تھی، پر فلا رائے ایک بالکل نیا تجربہ کر رہا تھا۔ لیکن اسٹوڈیو کے آدمیوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس قسم کا ہے۔ رائے کے دفتر کی بتی رات کو دیر تک جلتی رہتی تھی۔ گھر جانے کے بجائے اب وہ اکثر وہیں سوتا تھا۔ کاغذوں کے انبار اس کی میز پر لگے رہتے تھے۔ جب اس کی ایش ٹرے صاف کی جاتی تو جلے ہوئے سگرٹوں کا ایک ڈھیر نکلتا۔ کہانی لکھی جا رہی تھی۔ مگر کس نوعیت کی۔ اسی کے سینریو ڈیپارٹمنٹ کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ درزی خان کے لوگ قریب قریب بیکار تھے۔ ایک دن لیتکا وہاں نمودار ہوئی اور اس نے اپنے لیے لمبی آستینوں والا سیاہ بلاؤز بنانے کا حکم دیا۔ کپڑا اس کی پسند کے مطابق آیا، ڈیزائن بھی اس نے خود منتخب کیا، اس کے ساتھ ہی اس نے سیاہ جارجٹ کی ساڑھی منگوائی، پھر ہیئر ڈریسر مس ڈی میلو سے اپنے نئے ہیئر اسٹائل کے متعلق مفصل بات چیت کی۔ یہ باتیں جب اسٹوڈیو میں عام ہوئیں تو لوگوں نے نئے فلم کے متعلق اپنی اپنی فکر کے مطابق اندازے لگائے۔ پرانے ہیرو کا یہ خیال تھا کہ مسٹر رائے شاید اپنی زندگی کی ٹریجیڈی پیش کریں گے لیکن جب پہلی شوٹنگ کی اطلاع بورڈ پر لگی اور سیٹ پر کام شروع ہوا تو لوگوں کو بڑی ناامیدی ہوئی۔ وہی پرانا ماحول تھا اور وہی پرانے ملبوسات۔ شوٹنگ حسب معمول بڑے ہموار طریقے پر جاری رہی، لیکن اچانک ایک دن اسٹوڈیو میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پر فلا رائے حسب معمول سیٹ پر نمودار ہوا۔ چند لمحات اس نے شوٹنگ دیکھی اور ایک دم

کیمرہ مین پر برس پڑا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ زور کا تھپڑ اس کے کان پر جڑ دیا۔ جس کے باعث وہ بے ہوش ہو گیا۔ پہلے تو اسٹوڈیو کے آدمی خاموش رہے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسٹر رائے پر دیوانگی طاری ہے تو انھوں نے مل کر اسے پکڑ لیا اسے گھر لے گئے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر بلائے گئے مگر پر فلا رائے کی دیوانگی بڑھتی گئی وہ بار بار لتیکا کو اپنے پاس بلاتا تھا مگر جب وہ اس کی نظروں کے سامنے آتی تھی تو اس کا جوش بڑھ جاتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے نوچ ڈالے، اتنی گالیاں دیتا تھا، ایسے ایسے برے ناموں سے اسے یاد کرتا تھا کہ سننے والے حیرت زدہ ایک دوسرے کا منہ تکتے لگنے تھے۔ پورے چار دن تک پر فلا رائے پر دیوانگی طاری رہی۔ بہت خطرناک قسم کی دیوانگی۔ پانچویں روز صبح سویرے جب کہ لتیکا سرہاورڈ پیسکل کے ساتھ باغبانی میں مصروف تھی اور دبی دبی زبان میں اپنے خاوند کی افسوسناک بیماری کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ اطلاع پہنچی کہ مسٹر رائے آخری سانس لے رہے ہیں۔ یہ سن کر لتیکا کو غوش آگیا۔ سرہاورڈ اور اسٹوڈیو کے دوسرے آدمی ان کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے کہ دوسری اطلاع پہنچی کہ مسٹر رائے سورگباش ہو گئے۔ دس بجے کے قریب جب لوگ ارتھی اٹھانے کے لیے کوٹھی پہنچے تو لتیکا نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بال پریشان تھے۔ سیاہ ساڑھی اور سیاہ بلاؤز پہنے ہوئے تھے۔ پرانے ہیرو نے اس کو دیکھا اور بڑی نفرت سے کہا۔

”کمبخت کو معلوم تھا کہ یہ سین کب شوٹ کیا جانے والا ہے۔“

لعنت ہے ایسی دوا پر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹولعنت ہے ایسی دوا پر

”آپ کو آج اتنی کھانسی کیوں آرہی ہے؟“

”موسم کی تبدیلی کی وجہ سے گلا خراب ہو گیا ہے“

”یہ سب بہانے ہیں۔ مجھے معلوم ہے اس کھانسی کی اصل وجہ کیا ہے“

”تو بتا دو“

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے، جبکہ آپ اس کا علاج خود کر سکتے ہیں مجھ سے آپ نے کبھی اپنی ذاتی معاملوں کے متعلق مشورہ لیا ہے؟“

”کب نہیں لیا۔ ابھی کل ہی میں نے تم سے پوچھ کر، بلکہ تمہیں دُکان پر لے جا کر اپنے لیے

”لوفر شو“

خریدا تھا۔ اور تم نے اپنی مرضی کے مطابق ایک سینڈل لی تھی۔ حالانکہ وہ مجھے سخت ناپسند تھی۔“

”آپ کو تو میری پسند کی ہر چیز ناپسند ہوتی ہے“

”تم غلط کہتی ہو۔ پچھلے دنوں تم نمائش سے اپنے لیے بلاؤز کا کپڑا لائی تھیں تو میں نے بہت پسند کیا تھا۔ اور تمہارے ذوق اور انتخاب کی تعریف کی تھی“

”زندگی میں ایک دفعہ تعریف کر دی تو بڑا احسان کیا“

”اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ معلوم نہیں آج تمہارا مزاج کیوں بگڑ گیا ہے“

”مجھے کھانسی کی شکایت ہے۔ ساری رات کھانستی رہی ہوں“

”میں رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ صرف تمہارے خراٹوں کی آواز کے سوا میں نے تمہارے حلق سے اور کسی قسم کی آواز نہیں سنی“

”آپ ایک عرصہ سے بہرے ہو چکے ہیں۔ آپ کے کانوں کے پاس کوئی لاکھ چِلاّئے، واویلا کرے، مگر آپ کو کبھی سنائی نہیں دے گا“

”یہ کیا گفتگو ہے؟۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو“

”میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ اور کہنا بھی چاہوں، تو آپ کان دھر کر سنیں گے کب“

”کیوں نہیں سنوں گا۔ مگر تم کچھ کہو تو۔ اب میں تمہارے دل کی بات کیسے بُوجھوں“

”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مگر یہاں یہ راہ سرے ہی سے غائب ہے“

”کیسی غائب ہو گئی یہ راہ، میرا مطلب ہے، تمہارا میرا کوئی رشتہ نہیں رہا“

”بس سمجھ لیجیے، کچھ ایسی ہی بات ہے“

”یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے، کہ مجھے جس بات کا وہم وگمان بھی نہیں، تم آج اس کا مجھ پر انکشاف کر رہی ہو۔ داناؤں نے ٹھیک کہا ہے کہ عورت کو سمجھنا کارے دارد والا معاملہ ہے“

”جی۔ وہ دانا بھی تو ایسے مرد تھے۔ بھولی بھالی عورت میں ایسا کون سا پیچ ہے، جو ان کی دانائی کو شکست دے گیا۔ وہ غریب تو ایک سیدھی سڑک ہے جس میں کوئی خم ہے نہ موڑ“

”درست ہے۔ لیکن اس سیدھی سڑک پر ہر روز کئی

”ایکسیڈنٹ“

ہوتے ہیں۔ ہزاروں مرد اس سیدھی سڑک پر چلتے چلتے ایسے پھسلتے ہیں کہ سیدھے قبرستان میں پہنچ جاتے ہیں“

”آپ کیوں نہیں پہنچے ابھی تک وہاں؟“

”عنقریب پہنچ جاؤں گا۔ اگر تمہارا روّیہ اسی قسم کا رہا“

”میرا روّیہ“

۔ کیوں؟۔ میں نے آپ سے کیا بد سلوکی کی ہے؟۔ نوکرانی کی طرح آپ کی خدمت کرتی رہی ہوں، کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں؟“

”انکار کرنے کی مجال ہی نہیں، اس لیے کہ یہ ڈر ہے کہ تم آتش فشاں پہاڑ کی مانند پھٹ پڑو گی۔ اور اتنا لاوا اُگلو گی کہ مجھے ایک لمحے کے اندر کوئلہ بنا کر رکھ دے گا۔“

”آتش فشاں پہاڑ تو آپ ہیں، جو آئے دن لاوا اُگلتے رہتے ہیں“

”یہ تمہارے اخبار کی نئی خبر ہے، جو میں تمہاری زُبان سے سن رہا ہوں۔ ورنہ اس سے پہلے۔“

”آپ اپنے اخبار میں یہی مضمون چھاپتے رہتے تھے کہ عورتیں آگ کھاتی ہیں، انگارے بکتی ہیں۔ اور یہ جو مردوں کو کھانسی آتی ہے اس کی وجہ بھی عورت ہے“

”لو، تم نے کھانسی کا نام لیا تو میرے گلے میں خارش شروع ہو گئی۔ اچھا، اب بات مت کرو۔ دوا کا ایک ڈوز پینے کے بعد کسی قدر طبیعت بحال ہو گئی ہے“

”خدا آپ کی طبیعت بحال رکھے۔ میری تو یہی دعا ہے“

”تمہاری دعاؤں ہی سے تو میں اب تک زندہ ہوں، ورنہ کب کا مر چکا ہوتا“

”آپ کی یہ طنزیہ گفتگو مجھے پسند نہیں۔ مہین مہین چٹکیاں لینے میں جانے آپ کو کیا مزہ آتا ہے؟“

”سارا مزہ تم لے جاتی ہو۔ مہین مہین چٹکیوں کا فن تم بہتر جانتی ہو۔ میں اس سے بالکل کورا ہوں“

”آپ تو ہر چیز سے کورے ہیں۔ کورے برتن کی طرح۔ لیکن دنیا بھر کی آلائشیں اس برتن کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں“

”آج تم فلسفہ چھانٹنے لگی ہو“

”یہ اگر فلسفہ ہے، تو آپ خدا معلوم کیا چھانٹتے ہیں؟“

”۔ مجھے پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہے“

”آپ دوا کیوں نہیں پیتے؟“

”مجھے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس میں بہت بُری بُو ہے“

”تو کیا ہوا۔ دوا آخر دوا ہوتی ہے۔ خوش ذائقہ ہو یا بد ذائقہ۔ اچھی بُو والی ہے یا بُری بُو والی۔ انسان کو پینی ہی پڑتی ہے۔“

”تم۔ تم اپنا لیکچر بند کرو۔ میں۔ میں۔ یا اللہ میری توبہ۔ یہ کھانسی بھی کیا بلا ہے۔ سارا وجود متزلزل ہو جاتا ہے“

”آپ نے بد پرہیزی کی ہو گی“

”کون سی بد پرہیزی؟“

”چاٹ کھانے کی آپ کو چاٹ ہے۔ باہر ہی باہر کھاتے رہے ہوں گے“

”باہر باہر میں نے اس قسم کی کوئی چیز نہیں کھائی“

”لیکن، گھر تو آپ ہر روز کھاتے رہے ہیں“

”یہ الزام تم مجھ پر کس شہادت کی بنا پر عائد کر رہی ہو؟“

”جناب جب پچھلے ہفتے سرگودھا گئی تھی، تو واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ آپ خود اپنے ہاتھ سے

”آلو چھولے“

تیار کر کے کھاتے رہے ہیں۔ املی، امچور، انار دانہ، سُرخ اور کالی مرچیں اس قدر ڈالی جاتی تھیں کہ آدمی کی زبان جل جائے“

”لیکن تمہاری زبان نہیں جلی، یہ جھوٹ بولتے ہوئے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔“

”میں آپ کے بارے میں ہر بات کے متعلق اچھی طرح جانتی ہوں۔ کھٹی چیزوں سے تو آپ کو خاص رغبت ہے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ عورتیں کھٹی چیزیں پسند کرتی ہیں۔ لیکن آپ ان سے کئی رطیاں آگے بڑھے ہوئے ہیں“

”۔ کھانسی کا دورہ پھر شروع ہو گیا۔“

”ہونا ہی تھا۔ دوا لاؤں؟“

”۔ نہیں۔ نہیں۔“

”نہیں آپ کو پینا پڑے گی۔“

”بھئی، میں کہہ چکا ہوں کہ اس کی بو بہت بری ہے۔ اس کے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کی۔ ڈاکٹر کی یہ ہدایت ہے کہ ایک ایک گھنٹے کے بعد خوراک پی جائے“

”تو آپ کو اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیے“

”خاک عمل کروں۔ جب کہ دوا مجھے پسند ہی نہیں۔ میں ہر گھنٹے کے بعد عذاب سہنے کے لیے تیار نہیں“

آپ جو کچھ بھی کہیں ٹھیک ہے، لیکن یہ دوا آپ کو ضرور پینا پڑے گی“

”اچھا بابا۔ میں ہارا، تم جیتیں۔ لاؤ گلاس“

”میں نے تیار کر رکھا ہے۔ لیجیے“

”برف ڈال دی تھی اس میں؟“

”جی ہاں۔ آپ تو پہلے پانی ملا کر پیتے رہے ہیں۔ لیکن سرگودھا جانے سے پہلے، آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ ہدایت تھی کہ یہ دوا کھارے سوڈے کے ساتھ پی جائے۔ چنانچہ میں نے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لاؤ، گلاس دو مجھے کہ زہر مار کر لوں“

”یہ لیجیے۔ مگر آپ کا ہاتھ کانپ رہا ہے“

”کانپنے دو۔ دوا پینے کے بعد ٹھیک ہو جائے گا“

”کھانسی بھی انشاء اللہ دُور ہو جائے گی“

”دیکھو جو اللہ کو منظور ہے۔ تو یہ، کیسی بُری بُو ہے اس کی۔ خوراک بھی اتنی بڑی ہے جو گھوڑوں کو دی جاتی ہو گی۔ بڑی بوتل میں بارہ کے نشان ہیں۔ یعنی دن میں بارہ مرتبہ اس واہیات چیز کو پانی یا سوڈے کے ساتھ ملا کر پیا جائے۔ یہ ڈاکٹر لوگ بھی عجیب قسم کے انسان ہیں۔ مریض کی نفسیات کے متعلق کچھ سوچتے ہی نہیں“

”نفسیات۔ یہ کیا چیز ہے“

”ٹھہرو۔ میں یہ دوا پی لوں، تو بتا دوں گا کہ یہ کیا چیز ہے“

”۔ آپ کہتے تھے کہ یہ دوا بہت بری ہے، لیکن آپ سارا گلاس یوں پی گئے، جیسے کوئی بڑا مزے دار شربت ہو“

”تو کیا کرتا۔ مجبوری میں، انسان کو ہر مشکل خندہ پیشانی سے برداشت کرنا پڑتی ہے“

”اب گیارہ بجے ہیں۔ بارہ بجے آپ کو پھر یہی دوائی پینا ہے“

”پیوں گا۔ میرا باپ بھی پیے گا۔ خدا اسے جنت نصیب کرے“

”اچھا، اب مجھے آرام کرنے دو۔ بارہ بجے اس واہیات دوا کی خوراک لے آنا، جسے میں زہر مار کر لوں گا“

”کیا آپ سونا چاہتے ہیں؟“

”نہیں۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب تک اس دوا کی بوتل ختم نہ ہو جائے“

”تو آپ لیٹے رہیں گے؟“

”نہیں۔ دوسرے کمرے میں جا کر کوئی کتاب یا رسالہ پڑھوں گا، جب تک بارہ بج جائیں گے“

”آپ کیا کھائیں گے؟“

”جو تم نے پکایا ہو گا۔ ویسے اگر گردے ہوں تو بہت اچھے رہیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تھا کہ بھنے ہوئے گردے تمہارے گردوں کو جو کسی قدر کمزور ہیں، تقویت بخشیں گے“

”میں ابھی منگوا کر تیار کیے دیتی ہوں“

”آخری ڈوز کہاں گئی؟“

”وہ میں نے اپنی ہمسائی کو دے دی۔ اس کو بھی کھانسی کی شکایت تھی“

”لیکن۔ میرا مطلب یہ ہے کہ۔ اسے کچھ فائدہ ہوا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ اس پر اس کا الٹا اثر ہوا ہے۔ دوا کی خوراک پینے کے بعد واہی تباہی بکنے لگی۔ غالبؔ اور میر کے شعر اپنے خاوند کو سناتی رہی“

”میں اتنے دنوں سے یہ دوائی پی رہا ہوں۔ غالبؔ کا سارا کلام مجھے حفظ ہے، لیکن میں نے آج تک تمہیں اس کا کوئی بھی شعر نہیں سنایا“

”شعر تو نہیں سنایا ہے۔ لیکن رات کو آپ اکثر سیاسیات پر لیکچر دیا کرتے ہیں“

”لیکچر۔ ہاں۔ میرا خیال ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس دوا میں شراب کا جزُ ہے“

”شراب کا جزُ قطعاً نہیں۔ اس کا ہر قطرہ شراب ہے“

”کیا مطلب؟“

”جی، ساری چالاکی کا علم ہو گیا۔ میری ہمسائی کے خاوند نے جب ڈاکٹر کو بلایا تو اس نے کہا کہ آپ کی عورت نے شراب پی ہے“

”تو لعنت ہے ایسی دوا پر“

ماتمی جلسہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوماتمی جلسہ

رات رات میں یہ خبر شہر کے اس کونے سے اس کونے تک پھیل گئی کہ اتاترک کمال مر گیا ہے۔ ریڈیو کی تھرتھراتی ہوئی زبان سے یہ سنسنی پھیلانے والی خبر ایرانی ہوٹلوں میں سٹے بازوں نے سنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاترک کی بڑائی میں گم ہو گئے۔ ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک سٹوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سن کر لرزاں آواز میں کہا۔

”مصطفٰے کمال مر گیا“!

اس کے ساتھی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔

”کیا کہا مصطفٰے کمال مر گیا“!

اس کے بعد دونوں میں اتاترک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔

”بڑے افسوس کی بات ہے، اب ہندوستان کا کیا ہو گا؟ میں نے سنا تھا یہ مصطفٰے کمال یہاں پر حملہ کرنیوالا ہے۔ ہم آزاد ہو جاتے، مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی۔ افسوس تقدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی! دوسرے نے جب یہ بات سنی تو اس کے روئیں بدن پر چیونٹیوں کے مانند سرکنے لگے۔ اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے دل میں جو پہلا خیال آیا، یہ تھا

”مجھے کل جمعہ سے نماز شروع کر دینی چاہیے۔“

اس خیال کو بعد میں اُس نے مصطفٰے کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور اس بڑائی میں تحلیل کر دیا۔ بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش کھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے پان کی پیک بڑی صفائی سے بجلی کے کھمبے پر پھینکی اور کہا۔

”میں مانتا ہوں، مصطفٰے کمال بہت بڑا آدمی تھا۔ لیکن محمد علی بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بمبئی میں تین چار ہوٹلوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے“!

دوسرے نے جو اپنی ننگی پنڈلیوں پر سے ایک کھردرے چاقو سے میل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔

”محمد علی کی موت پر تو بڑی شاندار ہڑتال ہُوئی تھی۔“

”ہاں بھئی تو کل ہڑ تال ہو رہی ہے کیا؟“

تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دیا۔ اس نے جواب دیا

”کیوں نہ ہو گی۔ ارے اتنا بڑا مسلمان مر جائے اور ہڑ تال نہ ہو۔“

یہ بات ایک راہ گیر نے سُن لی، اس نے دوسرے چوک میں اپنے دوستوں سے کہی اور ایک گھنٹے میں ان سب لوگوں کو جو دن کو سونے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں، معلوم ہو گیا کہ صبح ہڑ تال ہو رہی ہے۔ ابو قصائی رات کو دو بجے اپنی کھولی میں آیا۔ اس نے آتے ہی طاق میں سے بہت سی چیزوں کو ادھر ادھر الٹ پلٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیگچی میں پانی بھر کر اس کو اس میں ڈال کر گھولنا شروع کر دیا۔ اس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی ماندی ایک کونے میں ٹاٹ پر سو رہی تھی۔ برتن کی رگڑ سن کر جاگ پڑی۔ اس نے لیٹے لیٹے کہا۔

”آ گئے ہو؟“

”ہاں آ گیا ہوں۔“

یہ کہہ کر ابو نے اپنی قمیض اتار کر دیگچی میں ڈال دی اور اسے پانی کے اندر مسلنا شروع کر دیا۔ اس کی بیوی نے پوچھا۔

”پر یہ تم کیا کر رہے ہو“!

مصطفےٰ کمال مر گیا ہے، کل ہڑ تال ہو رہی ہے“!

اس کی بیوی یہ سن کر گھبراہٹ کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی

”کیا مارا ماری ہو گی؟۔ میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے بڑی تنگ آ گئی ہوں۔“

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال پر نہ جانے تو کب سنے گا“!

ابو جواب میں ہنسنے لگا۔

”اری پگلی۔ یہ ہندو مسلمانوں کا فساد نہیں۔ مصطفےٰ کمال مر گیا ہے۔ وہی جو بہت بڑا آدمی تھا۔ کل اس کے سوگ میں ہڑ تال ہو گی“!

”جانے میری بلا یہ بڑا آدمی کون ہے۔ پر یہ تُو کیا کر رہا ہے؟“

بیوی نے پوچھا

”سوتا کیوں نہیں ہے“!

قمیض کو کالا رنگ دے رہا ہوں۔ صبح ہمیں ہڑ تال کرانے جانا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے قمیض نچوڑ کر دو کیلوں کے ساتھ لٹکا دی جو دیوار میں گڑی ہُوئی تھیں۔“

دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لیے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سیاہ پوش مسلمان دکانداروں کی دکانیں بند کرا رہے تھے اور یہ نعرے لگا رہے تھے۔

”انقلاب زندہ باد“

”انقلاب زندہ باد“!

ایک ہندو نے جو اپنی دکان کھولنے کے لیے جا رہا تھا یہ نعرے سنے اور نعرے لگانیوالوں کو دیکھا تو چپ چاپ ٹرام میں بیٹھ کر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے ہندو اور پارسی دکانداروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیختے چلاتے اور نعرے مارتے دیکھا تو انھوں نے جھٹ پٹ اپنی دکانیں بند کر لیں۔ دس پندرہ سیاہ پوش گپیں ہانکتے ایک بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”دوست ہڑ تال ہُوئی تو خوب ہی پر ویسی نہیں ہُوئی جیسی محمد علی کے ٹیم پر ہُوئی تھی۔ ٹرامیں تو اسی طرح چل رہی ہیں۔“

اس ٹولی میں جو سب سے زیادہ جوشیلا تھا اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا تنک کر بولا۔

”آج بھی نہیں چلیں گی“!

یہ کہہ کر وہ اس ٹرام کی طرف بڑھا جو لکڑی کے ایک شیڈ کے نیچے مسافروں کو اُتار رہی تھی۔ ٹولی کے باقی آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سرخ گاڑی کے ارد گرد تھے۔ سب مسافر زبر دستی اُتار دیئے گئے۔ شام کو ایک وسیع میدان میں ماتمی جلسہ ہُوا۔ شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے۔ خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے باہر عارضی دکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا، چاٹ کے چنوں اور اُبلے ہُوئے آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔ جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس ہجوم میں کئی آدمی ایسے بھی چل پھر رہے تھے جو یہ معلوم کرنیکی کوشش میں مصروف تھے کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب گلے میں دُور بین لٹکائے اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہے تھے۔ دور سے اتنی بھیڑ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے وہ ابھی ابھی اپنے گھر سے نئی دور بین لے کر دوڑے دوڑے آرہے تھے اور اس کا امتحان لینے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے، میدان کے آہنی جنگلے کے پاس دو آدمی کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”بھئی یہ مصطفےٰ کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ میں جو صابن بنانے والا ہوں اس کا نام

”کمال سوپ“

رکھوں گا۔

”کیوں کیسا رہے گا؟“

دوسرے نے جواب دیا۔

”وہ بھی بُرا نہیں تھا جو تم نے پہلے سوچا تھا۔

”جناح سوپ“

۔ یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے“!

”نہیں، نہیں۔ کمال سوپ“

اچھا رہے گا۔ بھائی مصطفےٰ کمال اس سے بڑا آدمی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”آؤ چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے۔“

وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چل دیئے۔ جلسہ شروع ہوا۔ آغاز میں نظمیں گائی گئیں جن میں مصطفےٰ کمال کی بڑائی کا ذکر تھا پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے۔ آپ نے کمال اتاترک کی عظمت بڑی بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا شروع کی۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سنتے رہے۔ جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجتے

”مصطفےٰ کمال نے درہ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کے باہر نکال دیا۔“

یا کمال نے یونانی بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا۔“

تو

”اسلام زندہ باد“

کے نعروں سے میدان کانپ کانپ اٹھتا۔ یہ نعرے مقرر کی قوتِ گویائی کو اور تیز کر دیتے اور وہ زیادہ جوش سے اتاترک کمال کی عظیم الشان شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔ مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں ایک جوش و خروش پیدا کر رہا تھا۔

”جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقعہ موجود ہے برطانیہ کی گردن ٹرکی کے سامنے خم رہے گی۔ صرف ٹرکی ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا۔ اور صرف مصطفےٰ کمال ہی ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی۔ اس نے بہ نوک شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ ٹرکی کو یورپ کا مردِ بیمار کہا جاتا تھا۔ مگر کمال نے اسے صحت اور قوت بخش کر مردِ آہن بنا دیا۔“

جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بُلند ہُوئے تو

”انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد“

کے نعرے پانچ منٹ تک متواتر بلند ہوتے رہے۔ اس سے مقرر کا جوش بہت بڑھ گیا۔ اس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا

”کمال“

کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے ملک کے لیے وہ خدمات سر انجام دی ہیں جس کو بیان کرنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔ اس نے ٹرکی میں جہالت کا دیوالیہ نکال دیا۔ تعلیم عام کر دی۔ نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا۔ یہ سب کچھ اس نے تلوار کے زور سے کیا۔ اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی مگر وہ سرِ بازار پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ اس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی تُرک رومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اُٹھانا چاہی مگر یہ آواز ان کے گلے ہی میں دبا دی گئی۔ اس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان میں ہو تو بہت سے مُلّاؤں نے عدولِ حکمی کی مگر وہ قتل کر دیئے گئے۔ “

”یہ کُفر بکتا ہے۔ “

جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بُلند ہُوئی اور فوراً ہی سب لوگ مضطرب ہو گئے۔

”یہ کافر ہے جھوٹ بولتا ہے۔ “

کے نعروں میں مقرر کی آواز گُم ہو گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا۔ جلسے میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ اسٹیج پر مقرر کا ایک دوست اس کے ماتھے پر سے خُون پونچھ رہا تھا اور جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج رہی تھی۔

”مصطفٰے کمال زندہ باد، مصطفٰے کمال زندہ باد۔ “

مائی جنتے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومائی جنتے

مائی جنتے سلیپر ٹھپٹھپاتی، گھسٹتی کچھ اس انداز میں اپنے میلے چکٹ میں داخل ہوئی ہی تھی کہ سب گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ آ پہنچی ہے۔ وہ رہتی اسی گھر میں تھی جو خواجہ کریم بخش مرحوم کا تھا، اپنے پیچھے کافی جائیداد، ایک بیوہ اور دو جوان بچیاں چھوڑ گیا تھا، آدمی پرانی وضع کا تھا۔ جونہی یہ لڑکیاں نو دس برس کی ہوئیں ان کو گھر کی چار دیواری میں بٹھا دیا اور پہرہ بھی ایسا کہ وہ کھڑکی تک کے پاس کھڑی نہیں ہو سکتیں مگر جب وہ اللہ کو پیارا ہوا تو ان کو آہستہ آہستہ تھوڑی سی آزادی ہو گئی، اب وہُ لک چھپ کے ناول بھی پڑھتی تھیں۔ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے پوڈر اور لپ اسٹک بھی لگاتی تھیں۔ ان کے پاس ولایت کی سی ہوئی انگیا بھی تھیں۔ معلوم نہیں یہ سب چیزیں کہاں سے مل گئی تی ھ۔ بہر حال اتنا ضرور ہے کہ ان کی ماں کو جو ابھی تک اپنے خاوند کے صدمے کو بھول نہ سکی تھی، ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر قرآن مجید کی تلاوت اور پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی میں مصروف رہتی اور اپنے مرحوم شوہر کی رُوح کو ثواب پہنچاتی رہتی۔ گھر میں کوئی مرد نوکر نہیں تھا۔ مرحوم کے باپ کی زندگی میں، نہ مرحوم کے زمانے میں، یہ ان کی پرانی وضعداری کا ثبوت ہے۔ عام طور پر ایک یا دو ملازمائیں ہوتی تھیں جو باہر سے سودا سلف بھی لائیں اور گھر کا کام بھی کریں۔ دسویں جماعت خود مرحوم نے اپنی بچیوں کو پڑھا کر پاس کرائی تھی۔ کالج کی تعلیم کے وہ یکسر خلاف تھے، وہ ان کی فوراً شادی کر دینا چاہتے تھے مگر یہ تمنا ان کے دل ہی میں رہی، ایک دن اچانک فالج گرا اس موذی مرض نے ان کے دل پر اثر کیا اور وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر راہئ ملک عدم ہوئے۔ باپ کی وفات سے لڑکیاں بہت اُداس رہنے لگیں۔ انھوں نے ایک دن ماں سے التجا کی کہ وہ ان کو کسی کالج میں داخل کرا دیں، پر جب زیادہ اصرار ہوا اور انھوں نے کئی دن کھانا نہ کھایا تو اُس نے مجبوراً ان کو ایک زنانہ کالج میں داخل کرا دیا۔ مائی جنتے نے وعدہ کیا کہ ہر روز ان کو صبح کالج چھوڑ آئے گی۔ سارا وقت وہیں رہے گی اور جب کالج بند ہو گا تو انھیں اپنے ساتھ لے آیا کرے گی۔ اس نے اپنی مالکن سے یہ وعدہ کچھ ایسے پُرخلوص انداز میں کیا کہ وحیدہ بانو مرحوم خواجہ کریم بخش کی بیوہ کی یہ بیٹیاں نہیں خود اس کی جنی ہیں۔ اس نے بہو بیٹیوں کو پردے میں رکھنے کی حمایت میں اپنے انداز میں مولویوں کی طرح ایک لمبی چوڑی تقریر بھی کی لیکن پھر یہ کہا:

”تعلیم بھی ضروری ہے کہ اسلام اس سے منع نہیں کرتا، پر دیکھ بھال بہت ضروری ہے، جوان جہاں ہیں، ان پر بڑی کڑی نگرانی ہونی چاہیئے۔ میں تو ان کے پاس کوئی مکھّی بھی نہ پھٹکنے دُوں، کوئی ایسی ویسی شرارت کریں گی تو وہ کان اینٹھوں کہ بلبلا اُٹھیں گی اور یاد کریں گی کس بڑھیا سے پالا پڑا ہے۔ لیکن یہ کیوں کرنے لگیں شریف خاندان کی ہیں۔ روزے نماز کی پابند ہیں۔ اور بے سمجھ بھی نہیں، نیک و بد اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ دونوں لڑکیوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا، ایک برس کے فرق کے بعد ہی چھوٹی جس کا نام نسرین تھا، پیدا ہوئی تھی، بڑی کا نام پروین تھا، دونوں خوبصورت تھیں، چہرے مہرے سے خاصی اچھی۔ قد موزوں، شکل آپس میں کافی ملتی تھی، دونوں ہر وقت اکٹھی کھیلتیں مگر گڑیوں کا زمانہ عرصہ ہوا لَد چکا تھا، اب جوانی کی شرارتوں کے دن تھے۔ کالج میں جاتے ہی انھوں نے پرپرزے نکالے اور اِدھر اُدھر ان تتلیوں کی طرح جن کو کسی پھول کی تلاش ہو، ادھر ادھر پھڑ پھڑانا شروع کر دیا۔ مائی جنتے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ کالج کی بوڑھی چپڑاسن کے ساتھ اس وقت حقہ پیتی رہتی جو پاس ہی کوارٹر میں رہتی تھی، دونوں ہم عُمری کے باعث بہت جلد گہری سہیلیاں بن گئی تھیں۔ جب دونوں ایک ساتھ بیٹھتیں تو اُس زمانے کی باتیں چھڑ جاتیں جبکہ وہ بھی جوان تھیں، چپڑاسن کو کسی لڑکی سے رغبت یا محبت نہیں تھی۔ وہ مائی جنتے کو بڑی پرانی کہانیاں سُناتی، فلاں سن میں ایک بیرسٹر کی لڑکی کو حمل ہو گیا تھا جو بڑی مشکل سے گرایا گیا۔ پرنسپل صاحب کو دس ہزار روپے رشوت کے ملے کہ اس کا منہ بند رہے۔ پار سال ایک لڑکی جو بڑے اونچے گھرانے کی

تھی' اس سے دینیات کے مولوی صاحب کو عشق ہو گیا' چنانچہ موقع پا کر اس لونڈیا کو دبوچ لیا' پکڑے گئے اور کالج سے داڑھی اور برقعہ دونوں پولیس کے ہاتھوں میں' داڑھی تو پانچ سال کی قید بھگت رہی ہے۔ معلوم نہیں اس ریشمی برقعہ کا کیا ہوا۔ بوا' میں تو ایسی باتوں میں دھیان ہی نہیں دیتی۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ ان کتّیوں کے کارناموں پر اپنا وقت ضائع کروں"

مائی جنتے نے حُقّے کی نَے منہ سے الگ کر دی

"نہ بُوا' ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ وہ کیا کہاوت ہے کہ کونسا شہسوار ہے جو نہیں گرا۔ اور وہ کون سا پتّا ہے جو نہیں ہلا۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ ہم لوگوں کو خاموش ہی رہنا چاہیے اور اللہ میاں سے دُعا کرنی چاہیے کہ وہ کسی کی بہو بیٹی کو بُرے کاموں کی طرف نہ لے جائے' اُن کی عزت آبرو اپنے کرم سے سنبھالے رکھے"

چپڑاسن اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی کہ کتنی نیک عورت ہے۔ اس کو دل ہی میں بڑی ندامت ہوئی کہ اس نے اتنی لڑکیوں میں کیڑے ڈالے اور ان کے راز افشا کیے۔ اُس نے چنانچہ فوراً مائی جنتے سے معافی مانگی اور کانوں کو ہاتھ لگایا کہ آئندہ وہ ایسی باتوں سے دُور ہی رہے گی۔ کسی لڑکی کے بارے میں اسے کچھ پتہ بھی چل گیا تو وہ اپنی زبان بند رکھے گی۔ مائی جنتے نے اسے بڑی شاباشیاں دیں' اتنے میں کالج چھوٹ گیا' اس نے پروین اور نسرین کو ساتھ لیا اور گیٹ سے باہر جا کر اُس نے اُن سے کہا' آج تمھیں شام کو یہاں نہیں آنا پڑے گا؟"

پروین نے جواب دیا:

"ہمیں تو کسی نے نہیں کہا"

"اصل میں تم دونوں بہت بیوقوف ہو۔ دھیان سے ہر بات سُنا کرو۔ میں تمھیں کسی سے پوچھ کر بتادوں گی' گھر پہنچ کر مائی جنتے نے ان کے لیے چائے تیار کی اور بڑی پھرتی سے میز پر لگا دی۔ پھر وہ ان کی ماں کے پاس اپنی پیالی لے کر بیٹھ گئی اور چپڑاسن سے جو باتیں اس کی ہوئی تھیں' مِن وعَن سُنادیں۔ اُس نے آخر میں اس کو مشورہ دیا کہ پیدل آنا جانا ٹھیک نہیں۔ میرا خیال ہے آپ کسی ٹانگے کا بندوبست کر دیں تو ٹھیک رہے۔ پیدل چلو' تو کوئی غنڈہ کندھا ہی رگڑ دے بیٹیوں کے ساتھ۔ مائی جنتے کا یہ مشورہ بڑا معقول تھا چنانچہ ٹانگے کا بندوبست دوسرے ہی روز ہو گیا۔ مائی جنتے نے ایک ٹانگے والے سے مہینے بھر کا کرایہ طے کر لیا۔

"دوسرے تیسرے روز اپنی مالکن وحیدہ بانو کو یہ خبر سنائی کہ پڑوس میں دیوار کے ساتھ جو جگہ خالی ہوئی تھی' اس میں نئے کرایہ دار آن بسے ہیں"

وحیدہ بانو نے پوچھا:

"کون لوگ ہیں؟"

"جانے ہماری۔ ہوں گے کوئی ایرے غیرے' نتّھو خیرے۔ میں نے تو کسی سے پوچھا نہیں"

ایک دن دوسری طرف سے کوٹھے پر سے کسی شخص نے ایسے ہی جھانک کر ان کے صحن میں دیکھا۔ ایک ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مائی جنتے کہیں باہر گئی تھی' وحیدہ بیگم نے فوراً کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر محلے کے ایک چھوٹے سے لڑکے کو بُلایا اور کہا

"اگر پڑوس والے مکان میں جو نئے کرائے دار آئے ہیں ان میں کوئی عورت ہو تو ان سے کہو آپ کی ہمسائی بیگم صاحبہ آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ دو گھڑی کے لیے تشریف لے آیئے۔ بڑی مہربانی ہو گی"

لڑکا پیغام لے کر چلا گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دروازے پر دستک ہوئی' پروین اور نسرین اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں اس لیے اُس نے خود دروازہ کھولا۔ دہلیز پر ایک سفید برقع پوش خاتون کھڑی تھی' اس نے بڑے ملائم لہجے میں وحیدہ بیگم سے پوچھا

"کیا آپ ہی نے مجھے یاد فرمایا ہے؟"

وحیدہ بیگم نے جواب دیا' جی ہاں۔ تشریف لے آیئے"

وہ اندر چلی آئی' دونوں باہر بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئیں۔ وحیدہ بیگم کی سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے۔ دونوں چند لمحات ایک دوسرے کی شکل صورت اور کپڑے لتّوں کا جائزہ لیتی رہیں' آخر ہمسائی ہی نے مُہرِ خاموشی توڑی اور پوچھا:

"فرمایئے' آپ نے مجھے دولت خانے میں کیسے بُلایا"

اس پر وحیدہ بیگم کو اپنی شکایت کے اظہار کا موقع مل گیا اور اس نے بڑی بُردباری اور تحمل سے صبح کا حادثہ بیان کر دیا اور پوچھا

"وہ کون صاحبزادے ہیں جو اس طرح پرائے گھر میں تاک جھانک کرتے ہیں؟"

میر الڑکا ہے بہن۔ وہ تو ایسا نہیں۔ بڑا شر میلا ہے۔ چونکہ ہم نئے نئے اُٹھ کر یہاں آئے ہیں اسی لیے اس نے کوٹھے پر چڑھ کے دیکھا ہو گا کہ آس پاس کیا ہو گا۔ ویسے میں اس کو منع کر دوں گی کہ خبر دار تم نے اِدھر کیا کسی بھی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ بڑا برخوردار لڑکا ہے۔ ضرور میرے حکم کی تعمیل کرے گا‘ میں نے اگر اس کے باپ سے آپ کی شکایت کی تو وہ تو اُس کو مار مار کے کھال اُدھیڑ دیں گے۔ بڑے سخت گیر ہیں وہ وہ اس معاملے میں۔ ویسے مجھے افسوس ہے“

”نہیں‘ میں نے صرف آپ کے کانوں تک یہ بات پہنچائی تھی کہ بدمزگی نہ ہو۔ یہ کہہ کر وحیدہ بیگم اٹھی اور پکاری

”پروین‘۔ نسرین ادھر آؤ ذرا“

دونوں لپک کر باہر نکلیں‘ لیکن ایک نادیدہ عورت کو دیکھ کر ٹھٹھک گئیں‘ دوپٹے کے بغیر فوراً اندر بھاگیں اور دوپٹے اوڑھ کر باہر آئیں‘ نووارد عورت کو جھک کر سلام کیا اور اپنی ماں سے پوچھا:

”کیوں امی جان؟“

وحیدہ بیگم نے اپنی ہمسائی سے اپنی بیٹیوں کو متعارف کرایا۔ اس نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور ان کی خوبصورتی کی بڑی تعریف کی کہ ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہ تاب‘ پھر اُس نے کہا

”میرا سلیم بالکل انہی کی طرح شریف اور شر میلا ہے۔“

چند دنوں ہی میں وحیدہ اور ہمسائی جس کا نام نازلی بیگم تھا‘ بڑے گہرے مراسم ہو گئے‘ وحیدہ بیگم ان کے یہاں نہیں جاتی تھی۔ اس نے نازلی بیگم سے کہا

”میں سر آنکھوں پر آتی۔ سو سو دفعہ آتی‘ پر جب سے خواجہ صاحب کا انتقال ہوا ہے کہ میں نے دل میں قسم کھالی تھی اس گھر سے باہر ایک قدم نہ رکھوں گی۔ بہن دیکھو خدا کے لیے مجبور نہ کرنا“

اس اثناء میں کالج میں شام کئی فنکشن ہوئے‘ کبھی کوئی مباحثہ ہے‘ کبھی لینڈن شو ہے‘ کبھی مشاعرہ۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ پروین اور نسرین دونوں ان پروگراموں میں شامل ہوتی تھیں‘ مگر مائی جنتے ساتھ ہوتی اور ان کو لے کر بحفاظت واپس گھر آتی‘ خواہ جلدی خواہ دیر سے۔ عید سے چار روز پہلے سلیم واپس آیا‘ ساتھ اس کے اس کا بغلی دوست قادر تھا۔ نازلی بیگم نے اس کو مندرجہ بالا واقعہ کے بعد جب اُس نے اتفاقاً وحیدہ بیگم کے صحن کو ایک نظر دیکھ لیا‘ گوجرانوالہ بھیج دیا تھا جہاں اس کے والد کی آبائی اجداد و املاک تھیں۔ اس نے اب اسے خط لکھ کر بلایا تھا کہ عید سے پہلے پہلے یہاں لاہور چلے آؤ‘ وہ آ گیا اور ساتھ اپنے جگری دوست کو بھی لے آیا۔ گھر میں اسے سب جانتے تھے‘ اس لیے کہ وہ اکٹھے سکول اور کالج میں پڑھے‘ یہاں لاہور میں اُٹھ آنے کی صرف ایک وجہ تھی کہ سلیم کے والد اس کے لیے اپنے اثر و رسوخ سے کوئی اچھی ملازمت تلاش کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے روز شام کو قادر نے سلیم سے کہا

”چلو یار‘ آج عیاشی کریں۔ گوجرانوالہ میں کیا پڑا ہے“

سلیم نے پوچھا

”عیاشی کیسی؟“

قادر مسکرایا‘

”تم تو نرے کھرے چُغد۔ چلو آؤ باہر‘ تمھیں بتاتا ہوں۔ دیکھیں گے‘ قسمت میں کیا لکھا ہے“

دونوں دوست چلے گئے‘ اتنے میں وحیدہ بیگم کے پاس اس کی ہمسائی آئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنا حرف مدعا بیان کر دیا کہ وہ اپنے سلیم کے لیے نسرین کا رشتہ مانگنے آئی ہے۔ زیادہ حیل و حجت کوئی بھی نہ ہوئی‘ وحیدہ ان لوگوں کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی‘ چند رسمی باتیں ہوئیں اس کے بعد دونوں رضامند ہو گئیں کہ ان کا نکاح عید کی تقریبِ سعید پر ہو جائے اور رخصتی ایک ماہ کے بعد۔ رات کو سلیم دیر سے آیا مگر اس کی ماں نے کوئی باز پُرس نہ کی کیونکہ وہ خوش تھی کہ اتنی جلدی اس کے بیٹے کی شادی کا معاملہ نسرین ایسی حسین و جمیل اور باحیا لڑکی سے طے پا گیا۔ اُس نے چنانچہ سلیم کو یہ خوشخبری سنادی‘ وہ بھی بہت خوش ہوا۔ تجرّد کی زندگی اور بیکاری سے وہ تنگ آ گیا تھا‘ اس نے سوچا‘ روپیہ پیسہ باپ کے پاس کافی ہے‘ کیا پرواہ ہے‘ ملازمت کی فکر ہوتی رہے گی۔ اُس کا دوست واپس گوجرانوالہ چلا آیا‘ اس لیے کہ اس نے عید اپنے گھر منانا تھی۔ سلیم نے اپنی ماں سے کہا

”دیکھیے امی جان‘ میں نے آپ کی بات کتنی جلدی مان لی۔ اب آپ میری مانیے“

اُس کی ماں نے پوچھا:

”کیا بیٹا“!

”مجھے نسرین کی ایک جھلک دکھا دیجیے۔ خواہ وہ دور ہی سے کیوں نہ ہو“

اس کے لہجے میں التجا تھی“

میرا خیال ہے کہ وہ انکار کریں تو اس کا کوئی فوٹو ہی دکھا دیجیے۔ آخری وہ کل یا پرسوں میری ہونے والی ہے“

اس کی ماں کو سلیم کی یہ درخواست ناپسند نہ ہوئی

”میں پوری کوشش کروں گی بیٹا“

عید آگئی مگر تصویر نہ آئی۔ لیکن سلیم نے کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ نکاح کی رسم بخیر وخوبی ختم ہوگئی‘ جب وہ باہر نکلا تو اس کی ماں نے کواڑ ذرا سا کھولا اور اس کو آواز دی۔ وہ ٹھہر گیا‘ ہاتھ باہر نکال کر اس نے سلیم سے کہا:

”یہ لفافہ لے لو۔ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے“

سلیم سمجھ گیا۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا‘ اس میں تاب انتظار کیسے ہوتی۔ اس نے لفافہ وہیں کھڑے کھڑے کھولا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے تصویر باہر نکالی۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور تصویر پر پہلی نظر ڈالی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ تصویر اس کے کانپتے ہاتھوں سے گر پڑی۔ اتنے میں سامنے والا دروازہ جس میں سے اُس کی ماں نے ہاتھ نکالا تھا‘ کھلا اور بڑھیا نکلی۔

سلیم نے اس کو حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا

”مائی! تم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟۔ تو اُس رات تم ہی۔“

اُس نے اس سے اور زیادہ کچھ نہ کہا اور تصویر زمین ہی پر چھوڑ کر تیز قدموں سے اپنے ایک دوست ڈاکٹر جمیل کے پاس گیا اور ساری بات بتادی۔ جمیل نے اس کو ہسپتال میں داخل کرا دیا جہاں اِس کے جھوٹ موٹ کے مرض کا علاج ہوتا رہا۔ آخر ڈاکٹر جمیل نے سلیم کے والد کو بلا کر تخلیے میں کہا کہ یہ شادی نہ ہو‘ آپ کا لڑکا عورت کے قابل نہیں ہے۔ ۱۲ مئی ۵۴ء

مائی نانکی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومائی نانکی

اس دفعہ میں ایک عجیب سی چیز کے متعلق لکھ رہا ہوں۔ ایسی چیز جو ایک ہی وقت میں عجیب وغریب اور زبردست بھی ہے۔ میں اصل چیز لکھنے سے پہلے ہی آپ کو پڑھنے کی ترغیب دے رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں آپ کل کو نہ کہہ دیں کہ ہم نے چند پہلی سطور ہی پڑھ کر چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ وہ خشک سی تھیں۔ آج اس بات کو قریب قریب تین ماہ گزر گئے ہیں کہ میں مائی نانکی کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح جلدی سے اُسے لکھ دُوں تاکہ آپ بھی مائی نانکی کی عجیب و غریب اور پُر اسرار شخصیت سے واقف ہو جائیں۔ ہوسکتا ہے آپ اس سے پہلے بھی مائی نانکی کو جانتے ہوں۔ کیونکہ اسے کشمیر اور جموں کشمیر کے علاقے کے سبھی لوگ جانتے ہیں۔ اور لاہور میں سید مٹھا اور ہیرامنڈی کے گرد ونواح میں رہنے والے لوگ بھی۔ کیونکہ اصل میں وہ رہنے والی جموں کی ہے اور آج کل راجہ دھیان سنگھ کی حویلی کے ایک اندھیرے کونے میں رہتی ہے۔ لہٰذا بہت ممکن ہے کہ آپ بھی جموں یا ہیرامنڈی کے گرد ونواح میں رہتے ہوں اور مائی نانکی سے واقف ہوں۔ لیکن میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی عورتیں دیکھی ہیں اور بڑی بڑی زہریلی قسم کی عورتیں لیکن میں آج تک کسی سے اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا اُس عورت سے۔ جیسا کہ میں اُوپر لکھ چکا ہوں وہ جموں کی رہنے والی ہے۔ وہاں وہ ایک دایہ کا کام کرتی تھی۔ اور اس کے کہنے کے مطابق وہ جموں اور کشمیر کی سب سے بڑی دایہ تھی۔ وہاں کے سب سے بڑے ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے ہاں اس کا ہی چرچا رہتا تھا۔ اور جہاں کہیں کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا نہ ہوتا تو فوراً اُسے بُلایا جاتا۔ اس کے علاوہ وہاں کے بڑے بڑے راجے، مہاراجے، نواب، جج وکیل اور ملٹری کے بڑے بڑے افسر سب اس کے مداح اور مرید تھے۔ انھوں نے آج تک نہ کبھی اس کی بات ٹالی اور نہ اسے ناراض کیا۔ بلکہ جب بھی اُس کا جی چاہا اُس نے اُن سے ہزار ہا قسم کے کام نکالے۔ اس کے علاوہ وہ غالباً روزانہ اپنے کام سے تین چار سو روپے کے قریب کما لیتی تھی۔ روزانہ ان گنت بچے جناتی۔ ان میں کئی ایک مردہ۔ کئی ست ماہے اور باقی ٹھیک ٹھاک ہوتے۔ اس کے علاوہ وہاں اُس کا عالیشان مکان اور دو دکانیں تھیں۔ ایک طویلہ جس میں بارہ مہینے پانچ سات گائیں بھینسیں بندھی رہتیں۔ اس کا کنبہ جو ۲۵ افراد پر مشتمل تھا سب دُودھ مکھن کھاتے اور موج میں رہتے۔ کنبے کے لفظ پر ایک لطیفہ سنتے چلیے۔ اس کے کنبے کے سبھی آدمی اُس کے گھر کے نہیں تھے۔ ان پچیس افراد میں سے اس کا نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی، ماں نہ بہن صرف وہ ایک خود تھی یا اس کا شوہر اور باقی سب لڑکے لڑکیاں اُس نے دوسروں سے لے کر پالے ہوئے تھے۔ میں نے ایک روز اُس سے پوچھا کہ تم دوسروں کے بچے جناتی رہیں لیکن خود کیوں نہ جنا؟“

کہنے لگی

”ایک ہوا تھا میں نے اُسے مار دیا“

میں نے پوچھا

”کیوں؟“

کہنے لگی

”میری طبیعت کو اس کا رونا گوار گزرا تھا۔ بڑا خوبصورت تھا لیکن میں نے اُسے زمین پر رکھا اور اوپر سے لحاف اور رضائیوں کا ایک انبار گرا دیا اور وہ نیچے ہی دم گھٹ کے مر گیا۔“

میں اُس کی زُبانی اس کے حالات آپ کو بتا رہا تھا اُس کے علاوہ وہ کہتی کہ میرے پاس کم از کم پچیس تیس ہزار کی مالیت کا زیور بھی تھا۔ بقول اُس کے وہ بڑی موج میں رہ رہی تھی کہ اچانک ہندوستان تقسیم ہو گیا اور کشمیر میں قتل و غارت شروع ہوئی۔ ڈوگرے مسلمانوں کو چن چن کے قتل کرنے لگے۔ چنانچہ اسی افرا تفری میں اُس نے اپنا گھر چھوڑا کیونکہ اس کے محلے میں بھی قتل و خون اور عصمت دری شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اس بھاگ دوڑ میں اس کے گھر کے سبھی آدمی اسے چھوڑ گئے اور وہ اکیلی جان بچانے کو عیسائیوں کے محلے میں جا گھسی۔ آپ حیران ہوں گے وہ اس قیامت کے سمے میں بھی اپنا زیور اور گائے بھینس اور ضروری کپڑے اور سامان وغیرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی اور وہاں سکونت پذیر ہوئی۔ لیکن جس واقف کار کے ہاں وہ ٹھہری تھی اُسے دوسرے روز اُس نے کہا کہ مائی ہم کو بھی قتل کروانے کی ٹھانی ہے۔ تم اپنا زیور سامان اور گائے بھینس یہیں چھوڑ کر پاکستان چلی جاؤ۔ کیونکہ اگر یہ چیزیں کسی ڈوگرے نے دیکھ لیں تو تم کو ختم کر دے گا۔ چنانچہ وہ وہاں سے صرف اپنا دن رات کا رفیق حقہ اُٹھا کر باہر نکلی تھی کہ ساتھ والی عیسائن نے کہا

”مائی تم میرے گھر میں آ رہو۔ اگر کوئی تمھیں مارنے آیا تو پہلے ہم کو مارے گا۔ وہ رضامند ہو گئی لیکن اُسی شام کو جموں کے مہاراجہ کا بھیجا ہوا ایک سپاہی آیا اور اُس نے اُس عیسائن سے سوال کیا

”کیا دائی نانکی یہیں ہے“

عیسائن نے جواب دیا کہ نہیں وہ یہاں کہاں۔ سپاہی اور عیسائن کے سوال و جواب وہ خود اندر سُن رہی تھی اور وہ کہتی ہے کہ میں خود باہر آئی اور سپاہی سے کہا

”میں ہوں مہاراج۔ مائی نانکی میرا ہی نام ہے“

سپاہی کہنے لگا

”مہاراج کہتے ہیں نانکی یہیں ہمارے پاس رہے گی۔ پاکستان نہیں جائے گی اُس نے بتایا کہ سپاہی کا یہ فقرہ سُن کر مجھے جلال آ گیا اور میں نے آنکھیں لال کر کے کہا

”مہاراج سے کہو ہم نے آپ سے اور آپ کی رعایا سے بہت کچھ انعام لے لیا ہے۔ اب ہمیں اور سُکھ نہیں چاہیے اور دیکھو مہاراج سے جا کر کہہ دو کہ مائی نانکی پاکستان ضرور جائے گی کیونکہ اگر پاکستان نہیں جائے تو کیا جہنم میں جائے گی۔“

سپاہی یہ سُن کر واپس مہاراج کے پاس چلا گیا اور دوسرے ہی روز ملٹری کے ایک کرنل کی حفاظت میں مائی نانکی سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو رہی تھی۔ سرحد پر اُسے پتہ چلا کہ اُس کے کنبے کے پچیس افراد میں سے اٹھارہ جن میں لڑکے اور لڑکیاں تھیں شہید ہو چکے ہیں اور باقی کے تین لڑکے اور ایک بہو اور دو بچے پاکستان صحیح و سلامت جا چکے ہیں۔ وہ کہتی تھی میرے آنسو نہیں نکلے۔ میں نے اپنا بھرا ابھرا یا گھر دیا سات گائیں بھینسیں اور تیس ہزار کا زیور کشمیر کے ہندوؤں اور عیسائیوں نے چھین لیا۔ میرے اٹھارہ لاڈلے جن میں بڑے بڑے سورما تھے ان کافروں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ میں خود اُجڑی لیکن میرے آنسو نہیں نکلے۔ ہاں زندگی میں پہلی بار روئی وہ اس وقت جب میں نے مہاجرین کے کیمپ میں پاکستانیوں کو جوان لڑکیوں سے بدفعلی کرتے دیکھا اپنی بہو اور لڑکوں سمیت شہر بہ شہر پیٹ پالنے کی خاطر پھرتی رہی۔ آخر اپنے ایک عزیز کے ہاں جو کہ خوش قسمتی سے حویلی دھیان سنگھ میں رہتا تھا آ گئی اور اس کے لڑکے موچی گری کرنے لگے اُس کے متعلق وہ کچھ پہلے بھی جانتے تھے۔ جموں کی ٹھاٹ دار زندگی اور اس کے تمام حالات وہیں رہ گئے۔ لیکن جہاں تک میں نے اُسے یہاں جس غربت کی حالت میں دیکھا ہے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت ہی اونچے درجے کی عورت ہے۔ ایسی عورتیں بہت کم دنیا میں پیدا ہوتی ہیں۔ اُس کی ذات بہت ہی بلند اور بے مثال ہے۔ ۸۵ سال کی عمر ہونے کو آئی لیکن گھر کا سب کام کاج خود کرتی ہے۔ بیماری اور پریشانی میں بھی اس کا چہرہ پُر وقار اور پھول کی طرح کھلا رہتا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے غمگین نہیں ہوتی اور نہ کسی گہری سوچ میں غرق رہتی ہے۔ چوبیس گھنٹے ہنستی اور مسکراتی رہتی ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی بڑی بڑی بوجھل چیزیں خود اُٹھاتی ہے۔ بڑی اچھی باتیں سُناتی ہے۔ کسی بھی فقیر کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی۔ اور سب سے بڑی بات جو میں اب اُس کے متعلق بتانے لگا ہوں وہ یہ کہ وہ انتہا درجے کی غریب عورت ہوتے ہوئے بھی بڑے بڑے شہنشاہوں سے زیادہ امیر ہے۔ اس لیے کہ اس کا دل بادشاہ کا ہے۔ اگر محلے کی کسی عورت نے اس سے کچھ مانگ لیا تو بس بھر بھر کے دیتی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ خوش ہوتی جاتی ہے اور مجھے تو بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا شہنشاہ اپنی رعیت کو کائنات کی نعمتیں تقسیم کر رہا ہو۔ کھانے کے معاملے میں وہ بہت تیز ہے اور اس عمر میں بھی دن میں وہ چار وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ سارا سر سفید ہو گیا ہے لیکن اُس کے گالوں پر سُرخیاں ہنوز باقی ہیں۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ وہ ایک دفعہ کسی زچہ کو دیکھنے گئی تو اتفاق سے وہاں گھر والوں نے گھی، سوجی پستے بادام اور دوسرے میوے ملا کر ایک قسم کی چوری تیار کی تھی جو کہ تین چار سیر کے قریب ہو گی۔ شامت اعمال لڑکی کی ماں نانکی کو ذرا چکھ کے دیکھنے کو کہہ بیٹھی۔ بس اس کا کہنا تھا کہ نانکی نے برتن تھام لیا اور ساری چوری چٹ کر گئی۔ اتنا کچھ کھا چکنے کے بعد وہ کہتی تھی مجھے کچھ خبر بھی نہ ہوئی اور وہ وہاں سے اُٹھ کر دوسری زچہ کے ہاں گئی جہاں سے اس نے ایک سیر کے قریب حلوہ پوری کھایا اُسی طرح کے کئی اور واقعات وہ ہنس ہنس کے سُناتی ہے۔ جہاں تک لباس کا تعلق ہے وہ عام پنجابی لباس یعنی قمیص اور شلوار پہنتی ہے لیکن اس عام میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی قمیص کو ہمیشہ شلوار کے اندر کر کے ازار بند باندھتی ہے۔ میں نے اُس سے استفسار کیا تو وہ کہنے لگی۔

”تم ابھی بچے ہو۔ تمھیں کیا معلوم ہو۔“

اور میں خاموش ہو گیا۔ پاؤں میں وہ مردانہ جوتا پہنتی ہے اور جب آدھی رات کو سب سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ غسل خانے میں جاتی ہے تو اُس کے پاؤں کی آواز بہت ہی مہیب معلوم ہوتی ہے۔ اب ذرا سا اُس کے لڑکوں کے متعلق سُن لیجیے۔ اُس کے سب سے بڑے لڑکے کا نام حبیب اللہ ہے جس کی ایک دکان جوتیوں کی ہے اور نانکی کا کہنا ہے کہ اُس لڑکے کو اس نے بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا ہے اور وہی سب میں زیادہ خدمت گزار اور وفا شعار ہے وہ اُس کی خوب خدمت کرتا ہے اور نانکی اس پر بہت خوش ہے۔ حبیب اللہ اپنی سسرال کے مکان کی سب سے اوپر والی منزل کے دو کمروں میں ایک بیوی اور تین بچوں سمیت رہتا ہے۔ گرمیوں میں اُس کے بچوں کے پاؤں دھوپ میں جل جل جاتے ہیں اور سردیوں میں اوپر سکڑتے رہتے ہیں لیکن آج تک کبھی اس نے ماتھے پر بل نہیں ڈالا اور نہ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے بے خبر ہوئے ہیں بلکہ وہ اپنے دستور کے مطابق ہر اتوار کو نانکی کے لیے پانچ سات روپے کا پھل وغیرہ لے کر مسکراتا ہوا آتا ہے اور نانکی کی دُعائیں لے کر چلا جاتا ہے۔ اس سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد حسین ہے جو بجلی اور ریڈیو کا کام اچھی طرح جانتا ہے اور اُسے دفتر روزگار سے کم از کم پانچ دفعہ کارڈ بنوانے کے باوجود آج سات سال سے کوئی نوکری نہیں ملی۔ مائی نانکی نے بڑی کوشش کی کہ جیتے جی اپنے ان پالے ہوئے لڑکوں کی شادیاں کر کے جائے تاکہ بعد میں وہ دربدر نہ ہوں اور اسے بھی قبر میں آرام نصیب ہو۔ لیکن بقول اُسی کے، غریب کو مر کے بھی آرام نہیں ملتا۔ شاید اسی لیے ابھی تک اُس کی شادی کا کوئی بندوبست نہیں ہوا۔ ایک دو جگہ دریافت کرنے پر لڑکی والوں نے کہا کہ کم از کم دو تین زیور لڑکی کو ڈالو تب لڑکی ملے گی ورنہ نہیں لیکن دوسری طرف یعنی نانکی کے پاس تو صرف اللہ کا نام اور اپنا بیٹا ہی ہے۔ نانکی کا کہنا ہے کہ اس کا لڑکا محمد حسین عقل کے لحاظ سے تو کسی بڑے لیڈر کے برابر ہے لیکن اُس کی اکڑ ٹنڈے لاٹ کی طرح ہے۔ محمد حسین سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد یونس ہے جو خوبصورت اور دُبلا پتلا ہے اور اُس کی تعلیم سات جماعت تک ہے۔ سینکڑوں کام کرنے کی تجویزیں کر رہا ہے اور جن میں سب سے بڑی خواہش اُس کی یہ ہے کہ اُسے کوئی معمولی سی ملازمت مل جائے جہاں اسے صبح سے دوپہر تک کام کرنا پڑے اور شام کے وقت وہ کچھ پڑھ لے اور اس طرح اپنی تعلیم کو بڑھا سکے۔ لیکن آج تک اُس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ نانکی کا یہ خیال ہے کہ وہ جنات کی قوم سے ہے کیونکہ اُس میں غصے کا مادہ زیادہ ہے۔ مائی نانکی آج کل کچھ اداس اور غمگین سی رہنے لگی ہے ایک روز میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی

”بچے مجھے پاکستان نے بہت سی بیماریاں لگا دی ہیں۔ مجھے جموں میں کوئی بیماری نہیں تھی اور نہ کبھی میں نے کسی بات کے متعلق آج تک سوچا ہے۔ ہاں اپنی ساری زندگی میں ایک دفعہ میں نے ایک بات پر غور کیا تھا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے اصل میں قصہ یہ ہوا کہ جموں کی ایک باہمنی کے ہاں بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا بڑی بڑی کاریگر نرسوں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اور مصیبت یہ تھی کہ بچہ پیٹ میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا تھا اور ہمکتا بھی تھا۔ اس مشکل میں سبھی نے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ نانکی کو بُلاؤ۔ چنانچہ میں گئی اور دو ہاتھ لگانے سے ہی بچہ پیدا ہو گیا لیکن میرا رنگ اُڑ گیا اور اپنی جوانی میں میں پہلی بار سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو گئی۔“

یہاں تک کہہ کر وہ ذرا رکی۔ میں نے پوچھا

”کیوں؟“

کہنے لگی

”کیونکہ بچے کے دو سر چار آنکھیں اور دونوں سروں میں دو دو سینگ تھے۔ میں نے آنکھیں لال کرتے ہوئے براہمن سے کہا

”کیوں لالہ یہ کیا ظلم کیا تم نے۔ تم نے مجھے بتایا تک نہیں کہ یہ قصہ ہے۔ اگر میرے دل کی حرکت بند ہو جاتی تو؟“

اس پر لالہ جی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے کہ کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ جو جی چاہے لے لو۔ سو میں نے اُس سے سو روپے لیے۔ لیکن اب تو کئی اندیشے جان کو کھائے جا رہے ہیں بچہ سب سے زیادہ اس بات کو سوچتی ہوں کہ میں پاکستان کی خاطر اپنا بھرا ابھرا یا گھر لُٹا کر آئی۔ اٹھارہ آدمی شہید ہوئے اور تیس ہزار کی مالیت کا زیور بھی وہیں رہ گیا۔ اس بے بسی اور غربت کی حالت میں ہم یہاں آئے۔ لیکن پاکستان والوں نے میرے نام کوئی مکان الاٹ کیا اور نہ کوئی دُکان۔ آج تک نہ کہیں سے راشن ملا اور نہ ہی کچھ مالی امداد۔ باغ کا مالی جس نے پاکستان کو بڑی مشکلوں سے بنایا تھا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اب اُس کے بعد جتنے بھی ہیں آنکھیں بند کیے مست پڑے ہیں۔ اُن کو کیا خبر کہ ہم غریب کس حالت میں رہ رہے ہیں اس کی خبر یا ہمارے اللہ کو ہے یا ہمیں۔ اس لیے اب ہر دم اپنے اللہ سے یہی دُعا کرتی ہوں کہ ایک دفعہ پھر سے سب کو مہاجر کرتا کہ غیر مہاجر لوگوں کو پتہ چلے کہ مہاجر کس طرح ہوتے ہیں اتنا کہہ کر اُس نے حقے کی نے منہ میں دبالی۔ میں نے اُس سے کہا۔

”مائی پہلے تو لوگ ہندوستان سے مہاجر ہوئے تو پاکستان آگئے۔ اب اگر یہاں سے مہاجر ہو گئے تو کہاں جائیں گے“

وہ حقہ کی نے کو غصے سے جھٹک کر بولی

”جہنم میں جائیں گے۔ کوئی پروا نہیں۔ لیکن ان کو معلوم تو ہو جائے گا کہ مہاجر کس کو کہتے ہیں۔“

سعادت حسن منٹو ۲ نومبر ۱۹۵۴ء

مجید کا ماضی

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو مجید کا ماضی

مجید کی ماہانہ آمدن ڈھائی ہزار روپے تھی۔ موٹر تھی۔ ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ بیوی تھی۔ اس کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے میل جول تھا۔ مگر جب کبھی وہ وسکی کے تین چار پگ پیتا تو اسے اپنا ماضی یاد آجاتا۔ وہ سوچتا کہ اب وہ اتنا خوش نہیں جتنا کہ پندرہ برس پہلے تھا۔ جب اس کے پاس رہنے کو کوٹھی تھی، نہ سواری کے لیے موٹر۔ بیوی تھی نہ کسی عورت سے اس کی شناسائی تھی۔ ڈھائی ہزار روپے تو ایک اچھی خاصی رقم ہے۔ ان دنوں اس کی آمدن صرف ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ ساٹھ روپے جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ اس کی زندگی افتاں وخیزاں حالات کے ہوتے ہوئے بھی ہموار تھی۔ اب اسے بے شمار تفکرات تھے۔ کوٹھی کے۔ بیوی کے۔ بچوں کے۔ ان عورتوں کے جن سے ان کا میل جول تھا۔ انکم ٹیکس کا ٹنٹا الگ تھا۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا جدا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی الجھنیں تھیں جن سے مجید کو کبھی نجات ہی نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس زمانے کو اکثر یاد کرتا تھا جب اس کی زندگی ایسے تفکرات اور ایسی الجھنوں سے آزاد تھی۔ وہ ایک بڑی غریبی کی لیکن بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتا تھا۔ انکم ٹیکس زیادہ لگ گیا ہے۔ ماہروں سے مشورہ کرو۔ آفیسروں سے ملو۔ ان کو رشوت دو۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا چاؤ۔ بلیک مارکیٹ کرو۔ یہاں سے جو کماؤ اس کو وائٹ کرو۔ جھوٹی رسیدیں بناؤ۔ مقدموں کی تاریخیں بھگتو۔ بیوی کی فرمائشیں پوری کرو۔ بچوں کی نگہداشت کرو۔ یوں تو مجید کام بڑی مستعدی سے کرتا تھا اور وہ اپنی اس نئی ہنگامہ خیز زندگی میں رچ مچ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ناخوش تھا۔ یہ ناخوشی اسے کاروباری اوقات میں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کا احساس اس کو صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ فرصت کے اوقات میں آرام سے بیٹھ کر وسکی کے تین چار پیگ پیتا تھا۔ اس وقت بیتا ہوا زمانہ اس کے دل ودماغ میں ایک دم انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہو جاتا اور وہ بڑا سکون محسوس کرتا۔ لیکن جب اس بیتے ہوئے زمانے کی تصویر اس کے دل ودماغ میں محو ہو جاتی تو وہ بہت مضطرب ہو جاتا، پر یہ اضطراب دیرپا نہیں ہوتا تھا کیونکہ مجید فوراً ہی اپنی کاروباری الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ مجید نے جو کچھ بنایا تھا، اپنی محنت ومشقت سے بنایا تھا۔ کوٹھی، اس کا سازوسامان، موٹر غرضیکہ ہر چیز اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی تھی۔ اس کو اس بات کا بہت مان تھا کہ آسائش کے جتنے سامان ہیں، سب اس نے خود بنائے ہیں۔ اس نے کسی سے مدد نہیں لی، لیکن تفکرات اب زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ جو دس پندرہ عورتیں اس کے لیے وبال جان بن گئی تھیں۔ ایک سے ملو تو دوسری ناراض ہوتی تھیں۔ ٹیلی فون پہ ٹیلی فون آرہے ہیں۔ بیوی کا ڈر الگ، کاروبار کی فکر جدا۔ عجب جھنجٹ تھا۔ مگر وہ دن بھی تھے جب مجید کو صرف دو روپے روزانہ ملتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار جو اسے بڑی مشکل سے ملے تھے مگر دن عجیب انداز میں گزرتے تھے۔ بڑے دلچسپ تھے وہ دن۔ بڑی دلچسپ تھیں وہ راتیں جو لکڑی کے ایک بنچ پر گزرتی تھیں جس میں ہزارہا کھٹمل تھے، خدا معلوم کتنے عمر رسیدہ۔ کیونکہ وہ بنچ بہت پرانی تھی۔ اس کے مالک نے دس برس پہلے اس کو ایک دکاندار سے لیا تھا جو اپنا کاروبار سمیٹ رہا تھا۔ اس دکاندار نے گیارہ برس پہلے اس کا سودا ایک کباڑی سے کیا تھا۔ مجید کو جو مزا، جو لطف اس کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے میں آیا تھا اب اسے اپنے پر تکلف سپرنگوں والے پلنگ پر سونے میں نہیں آتا تھا۔ اب اسے ہزاروں کی فکر ہوتی تھی۔ اسوقت صرف دو روپے روزانہ کی۔ ان دنوں۔۔ پر سویا کرتا تھا۔ ہر چیز اس کو اپنی محسوس ہوتی تھی مگر اب اپنے بھی پرائے لگتے تھے۔ سینکڑوں حریف تھے کاروبار میں، عشق بازیوں میں، ہر جگہ، ہر مقام پر اس کا کوئی نہ کوئی حریف موجود ہوتا تھا۔ وہ زندگی عجیب وغریب تھی۔ یہ زندگی بھی عجیب وغریب تھی مگر دونوں میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ وہ تفکر سے آزاد تھی، یہ تفکر سے پُر۔ چھوٹی سے چھوٹی خوشی اس کے دل ودماغ میں ایک عرصے تک موجود رہتی۔ ایک عرصے تک اس کو شاداں وفرحاں رکھتی۔ چھ آنے دے کر ایک میل ٹیکسی میں بیٹھے تو یہ ایک بہت بڑی عیاشی تھی۔ بھکاری کو ایک پیسہ دیا تو بڑی روحانی مسرت محسوس کی۔ اب وہ سینکڑوں کی خیرات کرتا تھا اور کوئی روحانی مسرت محسوس نہیں کرتا تھا اس لیے کہ یہ محض نمائش کی خاطر ہوتی۔ اس زمانے میں اس کی عیاشیاں بڑی چھوٹی چھوٹی مگر بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ خود کو خوش کرنے کے لیے وہ بڑے نرالے طریقے ایجاد کر لیتا تھا۔ الیکٹرک ٹرین میں بیٹھے اور کسی گاؤں میں جا کر تاڑی پینے لگے۔ پتنگ لیا اور چوپاٹی پر بچوں کے ساتھ اڑانے لگے۔ دادر اسٹیشن پر صبح سویرے چلے گئے اور اسکول جانے والی لڑکیاں تاڑتے رہے۔ پل کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اینگلو انڈین لڑکیاں اسکرٹ پہنے اوپر چڑھتیں تو ان کی ننگی ٹانگیں نظر آتیں۔ اس نظارے سے اس کو بڑی طفلانہ سی مسرت محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی طویل فاصلے پیدل طے کرتا۔ گھر پہنچتا تو اسے خوشی ہوتی کہ اس نے اکنی یا دونی بچالی ہے۔ یہ اکنی یا دونی وہ کسی ایسی چیز پر خرچ کرتا جو اس کے روزانہ پروگرام میں نہیں ہوتی تھی۔ کسی لڑکی کو محبت بھرا خط لکھا اور جو پتا دماغ میں آیا لکھ کر پوسٹ کر دیا اور اس حماقت پر دل ہی دل میں خوب ہنسے۔ ایک انگلی کا ناخن بڑھا لیا اور کسی دکان سے ٹسٹ کرنے کے بہانے اس پر کیوٹکس لگا لیا۔ ایک دن صرف دوسروں سے مانگ مانگ کے سگریٹ پیے اور بے حد شرارت بھری خوشی محسوس کی۔ دفتر میں بنچ کے کھٹملوں نے زیادہ تنگ کیا تو ساری رات بازاروں میں گھومتے رہے اور بجائے کوفت کے راحت محسوس کی۔ جیب میں پیسے کم ہوئے تو دوپہر کا کھانا گول کر دیا اور یہ محسوس کیا کہ وہ کھا چکا ہے۔ اب یہ باتیں نہیں تھی۔ دفتر سے اس نے روپے کمانے کے ڈھنگ سیکھے۔ دولت آنے لگی تو یہ سب باتیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ اس کی یہ ننھی ننھی مسرتیں سب سونے اور چاندی کے نیچے دب گئیں۔ اب رقص وسرور کی محفلیں جملتی تھیں۔ مگر ان سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔ جو پل کے نیچے کھڑے ہو کر ایک خاص زاویے سے ننگی محرک ٹانگیں دیکھنے میں محسوس ہوتا تھا۔ اس کی راتیں پہلے بالکل

تنہا گزرتی تھیں۔ اب کوئی نہ کوئی عورت اس کے آغوش میں ہوتی مگر وہ سکون غائب تھا۔ وہ کنوارا سکون جس میں وہ رات بھر ملفوف رہتا تھا۔ اب اسے یہ فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ کہیں اس کی بیوی کو پتہ نہ چل جائے۔ کہیں یہ عورت حاملہ نہ ہو جائے۔ کہیں اس کو بیماری نہ لگ جائے۔ کہیں اس عورت کا خاوند نہ آن دھمکے۔ پہلے ایسے تفکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب اس کے پاس ہر قسم کی شراب موجود رہی تھی مگر وہ مزا، وہ سرور جو اسے پہلے ہر روز شام کو جاپان کی بنی ہوئی

”اب ہی بیئر“

پینے میں آتا تھا بالکل غائب ہی ہو گیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر چوپائی یا اپولو بندر کی سیر کی۔ خوب گھومے پھرے۔ نظاروں کا مزا لیا، آٹھ بجے تو گھر کا رخ کیا۔ کسی نل سے منہ دھویا اور بائی کھلہ پل کے پاس والی بار میں داخل ہو گئے۔ پارسی سیٹھ کی جو بہت ہی موٹا اور اس کی ناک بڑی بے ہنگم تھی، صاحب جی کہا

”کہم سیٹھ سوں حال چھے؟“

اس کو بس صرف اتنی گجراتی آتی تھی، مگر جب وہ کہتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی کہ وہ اتنے الفاظ بول سکتا ہے۔ سیٹھ مسکراتا اور کہتا۔

”سارو چھے، سارو چھے“

پھر وہ پارسی سیٹھ سے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر جنگ کی باتیں چھیڑ دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہاں سے ہٹ کر وہ کونے والی میز کے پاس بیٹھ جاتا۔ یہ اس کی محبوب میز تھی۔ اس کے اوپر کا حصہ سنگ مرمر کا تھا۔ بیرا اسے گیلے کپڑے سے صاف کرتا اور مجید سے کہتا۔

”بولو سیٹھ۔“

یہ سن کر مجید خود کو واقعی سیٹھ سمجھتا۔ اس وقت اس کی جیب میں ایک روپے چار آنے ہوتے۔ وہ بیرے کی طرف دیکھ کر بڑی شان سے مسکراتا اور کہتا۔

”ہر روز تم مجھ سے پوچھتے ہو سب جانتے ہو۔ لے آؤ جو پیا کرتا ہوں۔“

بیرا اپنی عادت کے مطابق جانے سے پہلے گیلے کپڑے سے میز صاف کرتا۔ پونچھ کر ایک گلاس رکھتا۔ ایک پلیٹ میں کابلی چنے، دوسری میں کھاری سینگ یعنی نمک لگی مونگ پھلی لاتا۔ مجید اس سے کہتا۔

”پاپڑ لانا تم ہمیشہ بھول جاتے ہو۔“

یہ چیزیں گرک کے طور پر بیئر کے ساتھ مفت ملتی تھیں۔ مجید نے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا کہ بیرے سے کابلی چنوں کی ایک اور پلیٹ منگوا لیتا تھا۔ چنے کافی بڑے بڑے ہوتے تھے۔ نمک اور کالی مرچ سے بہت مزیدار بن جاتے تھے۔ مونگ پھلی کی پلیٹ ہوتی تھی۔ یہ سب مل ملا کر مجید کا رات کا کھانا بن جاتے تھے۔ بیئر آتی تو وہ بڑے پر سکون انداز میں اس کو گلاس میں انڈیلتا۔ آہستہ آہستہ گھونٹ بھرتا۔ ٹھنڈی یخ بیئر اس کے حلق سے اترتی تو ایک بڑی عجیب فرحت اس کو محسوس ہوتی۔ اس کو ایسا لگتا کہ ساری دنیا کی ٹھنڈک اس کے دل و دماغ میں جمع ہو گئی ہے۔ وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا اور سوچتا۔ یہ پارسیوں کی ناک کیوں اتنی موٹی ہوتی ہے۔ اس قوم نے کیا قصور کیا ہے کہ خدا ان کی ناکوں سے بالکل غافل ہے۔ پرسوں ٹریم میں جو پارسن بیٹھی تھی۔ بڑا سڈول بدن خوبصورت آنکھیں۔ ابھرا ہوا سینہ بے داغ سفدی رنگ۔ ماتھا کشادہ۔ پتلے پتلے ہونٹ، لیکن یہ بڑی طوطے ایسی ناک اس کو دیکھ کر مجید کو بہت ترس آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ آیا ایسی کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ اس کی ناک ٹھیک ہو جائے۔ پھر اس کے دماغ میں مختلف اوقات پر دیکھی ہوئی خوبصورت اور جوان لڑکیاں تیرنے لگتی تھیں۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کا شباب بیئر میں گھول کر پی رہا ہے۔ دیر تک وہاں بیٹھا وہ اپنی زندگی کے حسین لمحات دہراتا رہتا۔ پندرہ دن ہوئے اپولو بندر پر جب تیز ہوا میں ایک یہودن لڑکی کا ریشمی اسکرٹ اٹھا تھا تو کتنی متناسب اور حسین ٹانگوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔ پچھلے اتوار ایرانی کے ہوٹل میں پائے کا شوربہ کتنا لذیذ تھا۔ کیسے چٹخارے لے لے کر اس نے اس میں گرم گرم نان بھگو کر کھایا تھا۔ رنگین فلم کتنا اچھا تھا۔ رقص کتنا دلفریب تھا ان عورتوں کا۔ آج صبح ناشتے کے بعد سگرٹ پی کر لطف آ گیا۔ ایسا لطف ہر روز آیا کرے تو مزے آ جائیں۔ وہ میاں بیوی جو اس نے دادر اسٹیشن پر دیکھے تھے، آپس میں کتنے خوش تھے کبوتر اور کبوتری کی طرح گٹک رہے تھے۔ کیکی مستری بڑا آدمی ہے۔ کل میں نے اسپرو مانگی تو اس نے مفت دیدی کہنے لگا۔

”اس کے دام کیا لوں گا آپ سے“

پچھلے ماہ اس نے وقت پر میری مدد بھی کی تھی۔ پانچ روپے اندھار مانگے۔ فوراً دے دیے اور کبھی تقاضا نہ کیا۔ ٹریم میں جب میں نے اس روز مرہٹی لڑکی کو اپنی سیٹ دی تو اس نے کتنی پیاری شکر گزاری سے کہا تھا۔

”تھینک یو۔“

پھر وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا۔ اس کے چہرے پر یہ بڑی ناک اس کو نظر آتی۔ مجید پھر سوچتا

”یہ کیا بات ہے، ان پارسیوں کی ناکوں کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا گیا ہے۔ کتنی کوفت ہو رہی ہے اس ناک سے۔“

فوراًہی اسے خیال آتا کہ یہ پارسی بڑا نیک آدمی ہے کیونکہ وہ اس کو ادھار دے دیتا تھا۔ جب اس کی جیب میں پیسے نہ ہوتے تو وہ کاؤنٹر کے پاس جاتا اور اس سے کہتا

”سیٹھ آج مال پانی نہیں۔ کل“!

سیٹھ مسکراتا۔

”کوئی واندہ نہیں۔“

یعنی کوئی حرج نہیں۔ پھر آجائیں گے۔ بیئر کی بوتل چودہ آنے میں آتی تھی۔ اس کو خالی کرکے اور پلیٹیں صاف کرکے وہ ہاتھ کے بڑے خوبصورت اشارے سے بیرے کو بل لانے کے لیے کہتا۔ بیرا بل لاتا تو وہ اسے ایک روپیہ دیتا اور بڑی شان سے کہا۔

”باقی دو آنے تم اپنے پاس رکھو۔“

بیرا سلام کرتا۔ مجید بے حد مسرور اور شادماں اٹھتا اور پارسی سیٹھ کو

”صاحب“

کہہ کر دفتر کی طرف روانہ ہوتا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے قدم رک جائے۔ پڑوس کی گلی میں ایک چھوٹی سی تاریک کھولی میں مس لینا رہتی تھی۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور ڈانسر تھی مگر اب بوڑھی ہوچکی تھی۔ یہودن تھی۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایستھر اور ہیلن۔ ایستھر سولہ برس کی تھی اور ہیلن تیرہ برس کی۔ دونوں رات کو اپنی ماں کے پاس ایک لمبا کرتہ پہنے لیٹی ہوتی تھیں۔ صرف ایک پلنگ تھا۔ مس لینا فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی۔ رات کو بیئر پی کر مس لینا کے ہاں جانا مجید کا معمول بن گیا۔ وہ باہر ہوٹل والے کو تین چائے کا آرڈر دے کر گلی میں داخل ہوتا اور مس لینا کی کھولی میں پہنچ جاتا۔ اندر ٹین کی کپی جل رہی ہوتی۔ ایستھر اور ہیلن قریب قریب نیم برہنہ ہوتیں۔ مجید پہنچتا تو زور سے پکارتا

”السلام علیکم۔“

ماں بیٹیاں ٹھیٹ عربی لہجے میں وعلیکم السلام کہتیں اور وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا اور مس لینا سے کہتا

”چائے کا آرڈر دے آیا ہوں۔“

ایستھر باریک آواز کہتی

”تھینک یو“

چھوٹی بستر پر لوٹیں لگانا شروع کردیتی۔ مجید کو اس کی آڑو آڑو جتنی چھاتیوں اور ننگی ٹانگوں کی کئی جھلکیاں دکھائی دیتیں جو اس کے مسرور و مخمور دماغ کو بڑی فرحت بخشتیں۔ باہر والا چائے لے کر آتا تو ماں بیٹیاں پینا شروع کردیتیں۔ مجید خاموش بیٹھا رہتا اس تنگ و تار ماحول میں ایک عجیب و غریب سکون اس کو محسوس ہوتا۔ وہ چاہتا کہ ان تینوں کا شکریہ ادا کرے۔ اس دھواں دینے والی کپی کا بھی شکریہ ادا کرے جو دھیمی دھیمی روشنی پھیلا رہی تھی۔ وہ لوہے کی اس کرسی بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا جس نے اس کو نشست پیش کی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر وہ ماں بیٹیوں کے پاس بیٹھتا۔ دونوں لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ ان کی خوبصورتی مجید کی آنکھوں میں بڑی پیاری نیند لے آتی۔ رخصت لے کر وہ اٹھتا اور جھومتا جھامتا اپنے دفتر میں پہنچ جاتا اور کپڑے بدل کر بینچ پر لیٹتا اور لیٹتے ہی خوشگوار اور پرسکون نیند کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔ فرصت کے اوقات میں وسکی کے تین چار پیگ پی کر جب مجید اس زمانے کو یاد کرتا تو کچھ عرصے کے لیے سب کچھ بھول کر اس میں محو ہو جاتا، نشہ کم ہوتا تو وہ بلیک مارکیٹ کے متعلق سوچنے لگتا۔ روپیہ کمانے کے نئے ڈھنگ تخلیق کرتا۔ ان عورتوں کے متعلق غور کرتا جن سے وہ جنسی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ مجید کا ماضی جنگ سے پہلے کی فضا میں گم ہو چکا تھا۔ ایک مدھم لکیر سی رہ گئی تھی جس کو مجید اب دولت سے پیٹ رہا تھا۔

محمودہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومحمودہ

مستقیم نے محمودہ کو پہلی مرتبہ اپنی شادی پر دیکھا۔ آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ اچانک اس کو دو بڑی بڑی۔ غیر معمولی طور پر بڑی آنکھیں دکھائی دیں۔ یہ محمودہ کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک کنواری تھیں۔ مستقیم، عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا تھا۔ محمودہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اسے قطعاً محسوس نہ ہوا کہ آرسی مصحف کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ اس کی دلہن کیسی تھی، یہ بتانے کے لیے اس کو موقع دیا گیا تھا۔ مگر محمودہ کی آنکھیں اس کی دلہن اور اس کے درمیان ایک سایہ مخملیں پردے کے مانندہ حائل ہو گئیں۔ اس نے چوری چوری کئی مرتبہ محمودہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں سب چہچہا رہی تھی۔ مستقیم سے بڑے زوروں پر چھیڑ خانی ہو رہی تھی۔ مگر وہ الگ تھلگ، کھڑکی کے پاس گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے، خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ بال تختیوں پر لکھنے والی سیاہی کے مانند کالے اور چمکیلے تھے۔ اس نے سیدھی مانگ نکال رکھی تھی جو اس کے بیضوی

چہرے پر بہت سجتی تھی۔ مستقیم کا اندازہ تھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے چنانچہ جب وہ اٹھی تو اس کی تصدیق ہو گئی۔ لباس بہت معمولی قسم کا تھا۔ دوپٹہ جب اس کے سر سے ڈھلکا اور فرش تک جا پہنچا تو مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا۔ بھرا بھرا جسم، تیکھی ناک، چوڑی پیشانی، چھوٹا سا لبِ دہان۔ اور آنکھیں۔ جو دیکھنے والے کو سب سے پہلے دکھائی دیتی تھی۔ مستقیم اپنی دلہن گھر لے آیا۔ دو تین مہینے گزر گئے۔ وہ خوش تھا، اس لیے کہ اس کی بیوی خوبصورت اور باسلیقہ تھی۔ لیکن وہ محمودہ کی آنکھیں ابھی نہیں بھول سکا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کی دل و دماغ پر مرتسم ہو گئی ہیں۔ مستقیم کو محمودہ کا نام معلوم نہیں تھا۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی، کلثوم سے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔

”وہ۔ وہ لڑکی کون تھی ہماری شادی پر۔ جب آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی، وہ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔“

کلثوم نے جواب دیا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اس وقت کئی لڑکیاں تھیں۔ معلوم نہیں آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔“

مستقیم نے کہا۔

”وہ۔ وہ جس کی یہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔“

کلثوم سمجھ گئی۔

”اوہ۔ آپ کا مطلب محمودہ سے ہے۔ ہاں، واقعی اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں، لیکن بری نہیں لگتیں۔ غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ بہت کم گو اور شریف۔ کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔“

مستقیم کو غیر ارادی طور پر ایک دھچکا سا لگا۔

”اس کی شادی ہو گئی کل؟“

”ہاں۔ میں کل وہیں تو گئی تھی۔ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ میں نے اس کو ایک انگوٹھی دی ہے؟“

”ہاں ہاں۔ مجھے یاد آ گیا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم جس سہیلی کی شادی پر جا رہی ہو، وہی لڑکی ہے، بڑی بڑی آنکھوں والی۔ کہاں شادی ہوئی ہے اس کی؟“

کلثوم نے گلوری بنا کر اپنے خاوند کو دیتے ہوئے کہا۔

”اپنے عزیزوں میں۔ خاوند اس کا ریلوے ورکشاپ میں کام کرتا ہے، ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے۔ سنا ہے بے حد شریف آدمی ہے۔“

مستقیم نے گلوری کلّے کے نیچے دبائی۔

”چلو، اچھا ہو گیا ہے۔ لڑکی بھی، جیسا کہ تم کہتی ہو، شریف ہے۔“

کلثوم سے نہ رہا۔ اسے تعجب تھا کہ اس کا خاوندہ محمودہ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔

”حیرت ہے کہ آپ نے اس کو محض ایک نظر دیکھنے پر بھی یاد رکھا۔“

مستقیم نے کہا۔

”اس کی آنکھیں کچھ ایسی ہیں کہ آدمی انھیں بھول نہیں سکتا۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟“

کلثوم دوسرا پان بنا رہی تھی۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ اپنے خاوند سے مخاطب ہوئی۔

”میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ مرد جانے کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔“

مستقیم نے مناسب خیال کہ اس موضوع پر اب مزید گفتگو نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ جواب مسکرا کر وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اتوار کی چھٹی تھی۔ حسب معمول اسے اپنی بیوی کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے جانا چاہیے تھا، مگر محمودہ کا ذکر چھیڑ کر اس نے اپنی طبیعت مکدر کر لی تھی۔ اس نے آرام کرسی پر لیٹ کر تپائی پر سے ایک کتاب اٹھائی جسے وہ دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ پہلا ورق نکالا اور پڑھنے لگا، مگر حرف گڈمڈ ہو کر محمودہ کی آنکھیں بن جائے۔ مستقیم نے سوچا۔

”شاید کلثوم ٹھیک کہتی تھی کہ اسے محمودہ کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے کسی اور مرد کو بھی نظر نہ آئے۔ ایک صرف میں ہوں جسے دکھائی دی ہے۔ پر کیوں۔ میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ میرے لیے پرکشش بن جائیں۔ ایک لحظے کی تو بات تھی۔ بس میں نے ایک نظر دیکھا اور وہ میرے دل و دماغ پر چھا گئیں۔ اس میں نہ ان آنکھوں کا قصور ہے، نہ میری آنکھوں کا جن سے میں نے انھیں دیکھا تھا۔“

اس کے بعد مستقیم نے محمودہ کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔

”تو ہو گئی اس کی شادی۔ چلو اچھا ہوا۔ لیکن دوست یہ کیا بات ہے کہ تمہارے دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے۔ کیا تم چاہتے تھے کہ ان کی شادی نہ ہو۔ سدا کنواری رہے، کیوں کہ تمہارے دل میں اس سے شادی کرنے کی خواہش تو کبھی پیدا نہیں ہوئی، تم نے اس کے متعلق کبھی ایک لحظے کے لیے بھی نہیں سوچا، پھر جلن کیسی۔ اتنی دیر تمہیں اسے دیکھنے کا کبھی خیال نہ آیا، پر اب تم کیوں اسے دیکھنا چاہتے ہو۔ بفرض محال دیکھ بھی لو تو کیا کر لو گے، اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لو گے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں نوچ کر اپنے بٹوے میں ڈال لو گے۔ بولو نا، کیا کرو گے؟“

مستقیم کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اصل میں اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر کچھ چاہتا بھی ہے تو کیوں چاہتا ہے۔ محمودہ کی شادی ہو چکی تھی، اور وہ بھی صرف ایک روز پہلے۔ یعنی اس وقت جب کہ مستقیم کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، محمودہ یقیناً دلہنوں کے لباس میں یا تو اپنے میکے یا اپنی سسرال میں شرمائی لجائی بیٹھی تھی۔ وہ خود شریف تھی، اس کا شوہر بھی شریف تھا، ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ بڑی خوشی کی بات تھی۔ مستقیم کی دلی خواہش تھی کہ وہ خوش رہے۔ ساری عمر خوش رہے۔ لیکن اس کے دل میں جانے کیوں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی اور اسے بے قرار بنا جاتی تھی۔ مستقیم آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اسے محمودہ کے متعلق قطعاً سوچنا نہیں چاہیے۔ دو برس گزر گئے۔ اس دوران میں اسے محمودہ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا اور نہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ اور اس کا خاوند بمبئی میں ڈونگری کی ایک گلی میں رہتے تھے۔ مستقیم گو ڈونگری سے بہت دور ماہم میں رہتا تھا، لیکن اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے محمودہ کو دیکھ سکتا تھا۔ ایک دن کلثوم ہی نے اس سے کہا۔

”آپ کی اس بڑی بڑی آنکھوں والی محمودہ کے نصیب بہت برے نکلے“!

چونک کر مستقیم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

کلثوم نے گلوری بنائے ہوئے کہا۔

”اس کا خاوند ایک دم مولوی ہو گیا ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوا؟“

”آپ سن تو لیجیے۔ ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ لیکن بڑی اوٹ پٹانگ قسم کی۔ وظیفے کرتا ہے، چلے کاٹتا ہے اور محمودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھتا رہتا ہے۔ گھر بار سے بالکل غافل ہو گیا ہے۔ داڑھی بڑھالی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی ہے۔ کام پر کبھی جاتا ہے، کبھی نہیں جاتا۔ کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔ وہ بے چاری کڑھتی رہتی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا نہیں، اس لیے فاقے کرتی ہے۔ جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے جواب یہ ہوتا ہے۔ فاقہ کشی اللہ تبارک و تعالیٰ کو بہت پیاری ہے۔“

کلثوم نے یہ سب کچھ ایک سانس میں کہا۔ مستقیم نے پندنیا میں سے تھوڑی سی چھالیا اٹھا کر منہ میں ڈالی۔

”کہیں دماغ تو نہیں جل گا اس کا؟“

کلثوم نے کہا۔

”محمودہ کا تو یہی خیال ہے۔ خیال کیا، اس کو یقین ہے۔ گلے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالے پھرتا ہے۔ کبھی کبھی سفید رنگ کا چولا بھی پہنتا ہے۔“

مستقیم گلوری لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور آرام کرسی میں لیٹ کر سوچنے لگا۔

”یہ کیا ہوا۔ ایسا شوہر تو وبال جان ہوتا ہے۔ غریب کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاگل پن کے جراثیم اس کے شوہر میں شروع ہی سے موجود ہوں گے جو اب ایک دم ظاہر ہوئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب محمودہ کیا کرے گی۔ اس کا یہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔ کچھ شادی کرنے لاہور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔ کیا محمودہ نے اپنے والدین کو لکھا ہو گا۔ نہیں، اس کے ماں باپ تو جیسا کہ کلثوم نے ایک مرتبہ کہا تھا اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ شادی اس کے چچا نے کی تھی۔ ڈونگری۔ ڈونگری میں شاید اس کی جان پہچان کا کوئی ہو۔ نہیں، جان پہچان کا کوئی ہوتا تو وہ فاقے کیوں کرتی۔ کلثوم کیوں نہ اسے اپنے یہاں لے آئے۔ پاگل ہوئے ہو مستقیم۔ ہوش کے ناخن لو۔“

مستقیم نے ایک بار پھر ارادہ کر لیا کہ وہ محمودہ کے متعلق نہیں سوچے گا، اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا، بے کار کی مغزپاشی تھی۔ بہت دنوں کے بعد کلثوم نے ایک روز اسے بتایا کہ محمودہ کا شوہر جس کا نام جمیل تھا، قریب قریب پاگل ہو گیا ہے۔ مستقیم نے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

کلثوم نے جواب دیا۔

”مطلب یہ کہ اب وہ رات کو ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوتا۔ جہاں کھڑا ہے، بس وہیں گھنٹوں خاموش کھڑا رہتا ہے۔ محمودہ غریب روتی رہتی ہے۔ میں کل اس کے پاس گئی تھی۔ بے چاری کو کئی دن کا فاقہ تھا۔ میں بیس روپے دے آئی کیوں کہ میرے پاس اتنے ہی تھے۔“

مستقیم نے کہا۔

”بہت اچھا کیا تم نے۔ جب تک اس کا خاوند ٹھیک نہیں ہوتا، کچھ نہ کچھ دے آیا کرو تا کہ غریب کو فاقوں کی نوبت نہ آئے۔“

کلثوم نے تھوڑے توقف کے بعد عجیب و غریب لہجے میں کہا۔

”اصل میں بات کچھ اور ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”محمودہ کا خیال ہے کہ جمیل نے محض ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وہ پاگل واگل ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ۔“

”وہ کیا؟“

”وہ۔ عورت کے قابل نہیں۔ نقص دور کرنے کے لیے وہ فقیروں اور سنیاسیوں سے ٹونے ٹوٹکے لیتا رہتا ہے۔“

مستقیم نے کہا۔

”یہ بات تو پاگل ہونے سے زیادہ افسوسناک ہے۔ محمودہ کے لیے تو یہ سمجھو کہ ازدواجی زندگی ایک خلا بن کر رہ گئی ہے۔“

مستقیم اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بیٹھ کر محمودہ کی حالت زار کے متعلق سوچنے لگا۔ ایسی عورت کی زندگی کیا ہوگی جس کا شوہر بالکل صفر ہو۔ کتنے ارمان ہوں گے اس کے سینے میں۔ اس کی جوانی نے کتنے کپکپا دینے والے خواب دیکھے ہوں گے۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے کیا کچھ نہیں سنا ہو گا۔ کتنی ناامیدی ہوئی ہو گی غریب کو، جب اسے چاروں طرف خلا ہی خلا نظر آیا ہو گا۔ اس نے اپنی گود ہری ہونے کے متعلق بھی کئی بار سوچا ہو گا۔ جب ڈونگری میں کسی کے ہاں بچہ پیدا ہونے کی اطلاع اسے ملتی ہو گی تو بے چاری کے دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہو گا۔ اب کیا کرے گی۔ ایسا نہ ہو خودکشی کر لے۔ دو برس تک اس نے کسی کو یہ راز نہ بتایا مگر اس کا سینہ پھٹ پڑا۔ خدا اس کے حال پر رحم کرے“!

بہت دن گزر گئے۔ مستقیم اور کلثوم چھٹیوں میں پنچ گنی چلے گئے۔ وہاں ڈھائی مہینے رہے۔ واپس آئے تو ایک مہینے کے بعد کلثوم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ وہ محمودہ کے ہاں نہ جا سکی۔ لیکن ایک دن اس کی ایک سہیلی جو محمودہ کو جانتی تھی، اس کو مبارک باد دینے کے لیے آئی۔ اس نے باتوں باتوں میں کلثوم سے کہا۔

”کچھ سنا تم نے۔ وہ محمودہ ہے نا، بڑی بڑی آنکھوں والی“!

کلثوم نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ ڈونگری میں رہتی ہے۔“

”خاوند کی بے پروائی نے غریب کو بری باتوں پر مجبور کر دیا۔“

کلثوم کی سہیلی کی آواز میں درد تھا۔ کلثوم نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

”کیسی بری باتوں پر؟“

”اب اس کے یہاں غیر مردوں کا آنا جانا ہو گیا ہے۔“

”جھوٹ“!

کلثوم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کلثوم کی سہیلی نے کہا۔

”نہیں کلثوم، میں جھوٹ نہیں کہتی۔ میں پرسوں اس سے ملنے گئی تھی۔ دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک نوجوان مرد جو میمن معلوم ہوتا تھا، باہر نکلا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اب اس سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی۔“

”یہ تم نے بہت بری خبر سنائی۔ خدا اس کو گناہ کے راستے سے بچائے رکھے۔ ہو سکتا ہے وہ میمن اس کے خاوند کا کوئی دوست ہو۔“

کلثوم نے خود کو فریب دیتے ہوئے کہا۔ اس کی سہیلی مسکرائی۔

”دوست، چوروں کی طرح دروازہ کھول کر بھاگا نہیں کرتے۔“

کلثوم نے اپنے خاوند سے بات کی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ کبھی رویا نہیں تھا پر جب کلثوم نے اسے یہ اندوہ ناک بات بتائی کہ محمودہ نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ محمودہ ان کے یہاں رہے گی، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

”یہ بڑی خوفناک بات ہے۔ تم ایسا کرو، ابھی جاؤ اور محمودہ کو یہاں لے آؤ“!

کلثوم نے بڑے روکھے پن سے کہا

”میں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی“!

”کیوں؟“

مستقیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بس، میری مرضی۔ وہ میرے گھر میں کیوں رہے۔ اس لیے کہ آپ کو اس کی آنکھیں پسند ہیں؟“

کلثوم کے بولنے کا انداز بہت زہریلا اور طنزیہ تھا۔ مستقیم کو بہت غصہ آیا، مگر پی گیا۔ کلثوم سے بحث کرنا بالکل فضول تھا۔ ایک صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کلثوم کو نکال کر محمودہ کو لے آئے۔ مگر وہ ایسے اقدام کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مستقیم کی نیت قطعاً نیک تھی۔ اس کو خود اس کا احساس تھا۔ دراصل اس نے کسی گندے زاویہ نگاہ سے محمودہ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ البتہ اس کی آنکھیں اس کو واقعی پسند تھیں۔ اتنی کہ وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گناہ کا راستہ اختیار کر چکی تھی۔ ابھی اس نے صرف چند قدم ہی اٹھائے تھے۔ اس کو تباہی کے غار سے بچایا جا سکتا تھا۔ مستقیم نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی، کبھی روزہ نہیں رکھا تھا، کبھی خیرات نہیں دی تھی۔ خدا نے اس کو کتنا اچھا موقع دیا تھا کہ وہ محمودہ کو گناہ کے رستے پر سے گھسیٹ کر لے آئے اور طلاق وغیرہ دلوا کر اس کی کسی اور سے شادی کرا دے۔ مگر وہ یہ ثواب کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بیوی کا دبیل تھا۔ بہت دیر تک مستقیم کا ضمیر اس کو سرزنش کرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کوشش کہ اس کی بیوی رضامند ہو جائے۔ مگر جیسا کہ مستقیم کو معلوم تھا، ایسی کوششیں لاحاصل تھیں۔ مستقیم کا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو کلثوم، محمودہ سے ملنے ضرور جائے گی۔ مگر اس کو ناامیدی ہوئی۔ کلثوم نے اس روز کے بعد محمودہ کا نام تک نہ لیا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ مستقیم خاموش رہا۔ قریب قریب دو برس گزر گئے۔ ایک دن گھر سے نکل کر مستقیم ایسے ہی تفریحاً فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے قصائیوں کی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی کھولی کے باہر، تھڑے پر محمودہ کی آنکھوں کی جھلک دیکھی۔ مستقیم دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ فوراً مڑ کر اس نے غور سے دیکھا۔ محمودہ ہی تھی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہ ایک یہودن کے ساتھ جو اس کھولی میں رہتی تھی، باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ اس یہودن کو سارا ماہم جانتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا کام عیاش مردوں کے لیے جوان لڑکیاں مہیا کرنا تھا۔ اس کی اپنی دو جوان لڑکیاں تھیں جن سے وہ پیشہ کرواتی تھی۔ مستقیم نے جب محمودہ کا چہرہ نہایت ہی بے ہودہ طور پر میک اپ کیا ہوا دیکھا تو وہ لرز اٹھا۔ زیادہ دیر تک یہ اندوہ ناک منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی۔ وہاں سے فوراً چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے کلثوم سے اس واقعے کا ذکر نہ کیا۔ کیوں کہ اس کی اب ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ محمودہ اب مکمل عصمت فروش عورت بن چکی تھی۔ مستقیم کے سامنے جب بھی اس کا بے ہودہ اور فحش طور پر میک اپ کیا ہوا چہرہ آتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس کا ضمیر اس سے کہتا

”مستقیم! جو کچھ تم نے دیکھا ہے، اس کا باعث تم ہو۔ کیا ہوا تھا اگر تم اپنی بیوی کی چند روزہ ناراضی اور خفگی برداشت کر لیتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ غصے میں آ کر اپنے میکے چلی جاتی۔ مگر محمودہ کی زندگی اس گندگی سے تو بچ جاتی جس میں وہ اس وقت دھنسی ہوئی ہے۔ کیا تمہاری نیت نیک نہیں تھی۔ اگر تم سچائی پر تھے اور سچائی پر رہتے تو کلثوم ایک نہ ایک دن اپنے آپ ٹھیک ہو جاتی۔ تم نے بڑا ظلم کیا۔ بہت بڑا گناہ کیا۔“

مستقیم اب کیا کر سکتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چڑیاں سارا کھیت چگ گئی تھیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرتے ہوئے مریض کو دم آخر آکسیجن سنگھانے والی بات تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد بمبئی کی فضا فرقہ وارانہ فسادات کے باعث بڑی خطرناک ہو گئی۔ بٹوارے کے باعث ملک کے طول و عرض میں تباہی اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے۔ کلثوم نے مستقیم کو مجبور کیا کہ وہ بھی بمبئی چھوڑ دے۔ چنانچہ جو پہلا جہاز ملا، اس کی سیٹیں بک کرا کے میاں بیوی کراچی پہنچ گئے اور چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔ ڈھائی برس کے بعد یہ کاروبار ترقی کر گیا، اس لیے مستقیم نے ملازمت کا خیال ترک کر دیا۔ ایک روز شام کو دکان سے اٹھ کر وہ ٹہلتا ٹہلتا صدر جا نکلا۔ جی چاہا کہ ایک پان کھائے۔ بیس تیس قدم کے فاصلے پر اسے ایک دکان نظر آئی جس پر کافی بھیڑ تھی۔ آگے بڑھ کر وہ دکان کے پاس پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ محمودہ پان لگا رہی ہے۔ جھلسے ہوئے چہرے پر اسی قسم کا فحش میک اپ تھا۔ لوگ اسے گندے گندے مذاق کر رہے تھے اور وہ ہنس رہی ہے۔ مستقیم کے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ قریب تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے کہ محمودہ نے اسے پکارا۔

”ادھر آؤ دلہا میاں۔ تمہیں ایک فسٹ کلاس پان کھلائیں۔ ہم تمہاری شادی میں شریک تھے!

”مستقیم بالکل پتھرا گیا۔

مرزا غالب کی حشمت خاں کے گھر دعوت

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹومرزا غالبؔ کی حشمت خاں کے گھر دعوت

جب حشمت خاں کو معلوم ہو گیا ہے کہ چودھویں (ڈومنی) اس کے بجائے مرزا غالبؔ کی محبت کا دم بھرتی ہے۔ حالانکہ وہ اس کی ماں کو ہر مہینے کافی روپے دیتا ہے اور قریب قریب طے ہو چکا ہے کہ اس کی مسی کی رسم بہت جلد بڑے اہتمام سے ادا کر دی جائے گی، تو اس کو بڑا تاؤ آیا۔ اس نے سوچا کہ مرزا نوشہ کو کسی نہ کسی طرح ذلیل کیا جائے۔ چنانچہ ایک دن مرزا کو رات کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ مرزا غالب وقت کے بڑے پابند تھے۔ جب حشمت خاں کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ گنتی کے چند آدمی چھولداری کے نیچے شمعوں کی روشنی میں بیٹھے ہیں۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ اُگالدان جابجا قالینوں پر موجود پڑے ہیں۔ غالب آئے، تعظیماً سب اٹھ کھڑے ہوئے اور ان سے معانقہ کیا اور حشمت خاں سے مخاطب ہوئے

”ہائیں۔ خاں صاحب یہاں تو سنّاٹا پڑا ہے۔ ابھی کوئی نہیں آیا؟“

حشمت خاں مسکرایا

”یوں کیوں نہیں کہتے کے اندھیرا پڑا ہے۔ چودھویں آئے تو ابھی چاندنی چھٹک جائے۔“

مرزا غالبؔ نے یہ چوٹ بڑے تحمل سے برداشت کی۔

”سچ تو یوں ہے کہ آپ کے گھر میں چودھویں کے دم سے روشنی ہے۔ ہتکڑیوں کی جھنکار اور آپ کی تیز رفتار کے سوا دھرا ہی کیا ہے؟“

حشمت خاں کھسیانا سا ہو گیا۔ اس کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اتنے میں دو تین اصحاب اندر داخل ہوئے جن کو حشمت خاں نے مدعو کیا تھا۔ آگے آیئے جناب جمیل احمد خاں صاحب۔ آیئے اور بھئی سرور خاں، تم نے بھی حد کر دی۔“

حشمت خاں کے ان مہمانوں نے جو اس کے دوست تھے، موزوں و مناسب الفاظ میں معذرت چاہی اور چاندنی پر بیٹھ گئے۔ حشمت خاں نے اپنے ملازم کو اپنی گرج دار آواز میں بلایا

”منے خاں“!

”بی چودھویں ابھی تک نہیں آئیں۔ کیا وجہ؟“

منے خاں نے عرض کی

”جی حضور، بہت دیر سے آئی ہیں، لال کمرے میں ہیں۔ سارے سماجی حاضر ہیں۔ کیا حکم ہے؟“

حشمت خاں طشتری میں سے پان کا چاندی اور سونے کے ورق لگا ہوا بیڑا اٹھایا اور اپنے نوکر کو دیا

”لو یہ بیڑا دے دو۔ محفل میں آ جائیں گانا اور ناچ شروع ہو۔“

مُنے خاں لال کمرے میں گیا۔ چودھویں، چُوڑی دار پائجامہ پہنے دونوں ٹخنوں پر گھنگھرو باندھے تیار بیٹھی تھی۔ اس نے اس سانولی سلونی جوانی کو بیڑا دیا۔ چودھویں نے اسے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھی، دونوں پاؤں فرش پر مار کر گھنگھروؤں کی نشست دیکھی اور سماجیوں سے کہا

”تم لوگ چلو اور لہرا بجانا شروع کرو۔ میں آئی۔“

سماجیوں نے حاضرین کو فرشی سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ طبلہ سارنگی سے ملنے لگا، لہرا بجنا شروع ہوا ہی تھا کہ چودھویں، لال کمرے ہی سے ناچتی تھرکتی محفل میں آئی۔ کورنش بجا لا کر ایک چھناکے کے ساتھ ناچنے لگی۔ جمیل احمد نے ایک توڑے پر بے اختیار ہو کر کہا

”بی چودھویں، کیا کیا ناچ کے انگوں میں بھاؤ لجاؤ بتا رہی ہو۔“

چودھویں نے جو کہ ایک نیا توڑا لے رہی تھی، اسے ختم کر کے تسلیم بجا لاتے ہوئے کہا

”حضور، آپ رئیس لوگ قدر دانی فرماتے ہیں ورنہ میں ناچنا کیا جانوں۔“

سرور خاں بہت مسرور تھے، کہا

”سچ تو یہ ہے، بی چودھویں تم ناچتی ہو تو معلوم ہوتا ہے پھل جھڑی پھوٹ رہی ہے۔“

جمیل احمد سرور خاں سے مخاطب ہوئے

”اماں گُل ریز نہیں کہتے۔“

پھر انہوں نے غالب کی طرف دیکھا

”کیوں مرزا نوشہ۔ صحیح عرض کر رہا ہوں نا؟“

غالبؔ نے تھوڑے توقف کے بعد چودھویں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا

”میں تو نہ پھل جھڑی کہوں گا اور نہ گُل ریز۔ بلکہ یوں کہوں گا کہ معلوم ہوتا ہے مہتاب پھوٹ رہی ہے۔“

جمیل احمد بولے

”واہ واہ۔ کیوں نہ ہو۔ شاعر ہیں ناشاعر، چودھویں کا ناچ اور مہتاب، نہ پھل جھڑی نہ گل ریز۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ“!

حشمت خاں نے اپنی مخصوص گرجدار آواز میں کہا

”ایک تو یوں ان بی صاحبہ کا دماغ چوتھے آسمان پر ہے، آپ لوگ اور ساتویں آسمان پر پہنچا رہے ہیں“

چودھویں ناچتے ہوئے ایک ادا سے حشمت خاں کو کہتی ہے،

”جی ہاں آپ کو تو بس کیڑے ڈالنے آتے ہیں۔“

حشمت خاں مسکراتا ہے اور اپنے دوستوں کی طرف دیکھتا ہے۔

”اچھا حضرات سُنیے۔ چودھویں جس وقت ناچتی ہے، معلوم دیتا ہے پانی پر مچھلی تیر رہی ہے۔“

پھر چودھویں سے مخاطب ہوتا ہے

”لے اب خوش ہوئیں“

چودھویں ناچنا بند کر دیتی ہے اور ننھی سی ناک چڑھا کر کہتی ہے،

”دماغ کہاں پہنچا ہے۔ سڑی بدبودار مچھلی۔ ڈور پار۔ نوج میں کیا مچھلی ہوں“

محفل میں فرمائشی قہقہے لگتے ہیں۔ حشمت خاں کو چودھویں کا جواب ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر چودھویں اس کے بگڑے ہوئے تیوروں کی کوئی پرواہ نہیں کرتی اور غالبؔ کو محبت کی نظر سے دیکھ کر ان کی یہ غزل بڑے جذبے کے ساتھ گانا شروع کرتی ہے یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں! وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی کم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں! چودھویں یہ غزل غالبؔ کی طرف رُخ کر کے گاتی ہے اور کبھی کبھی مسکرا دیتی ہے۔ غالبؔ بھی متبسم ہو جاتے ہیں۔ حشمت خاں جل بھن جاتا ہے اور چودھویں سے بڑے کڑے لہجے میں کہتا ہے

”ارے ہٹاؤ، یہ غزلیں وزلیں، کوئی ٹھمری دادرا گاؤ“

چودھویں غزل گانا بند کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کی طرف تھوڑی دیر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہے اور یہ ٹھمری الاپنا شروع کرتی ہے ع پیا بن ناہیں چین حشمت خاں کے سارے منصوبے خاک میں ملے جا رہے تھے۔ اپنی کرخت آواز میں جان محمد کو بُلاتا اور اس سے کہتا ہے

”وہ میرا صندوقچہ لانا۔“

جان محمد بڑے ادب سے دریافت کرتا ہے

”کون سا صندوقچہ حضور؟“

”ارے وہی، جس میں کل میں نے تمہارے سامنے کچھ زیورات لا کے رکھے ہیں۔“

گانا جاری رہتا ہے۔ اس دوران میں جان محمد صندوقچہ لا کر حشمت خاں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ غالبؔ کو جو چودھویں کا گانا سننے میں محو ہے ایک نظر دیکھ کر مسکراتا ہے۔ صندوقچہ کھول کر ایک جڑاؤ گلوبند نکال کر چودھویں سے مخاطب ہوتا ہے

”چودھویں۔ ادھر دیکھو۔ یہ گُلوبند کس کا؟“

چودھویں ایک ادا کے ساتھ جواب دیتی ہے

”میرا“

حشمت خاں، غالبؔ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہے اور صندوقچے سے جڑاؤ جھالے نکال کر چودھویں سے پوچھتا ہے،

”اچھا یہ جھالے کس کے“!

پھر وہی ادا، پر اب جو تصنع اختیار کر رہی تھی

”میرے“!

حاضرین یہ تماشا دیکھ رہے تھے، جن میں مرزا غالبؔ بھی شامل تھے۔ سب حیران تھے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ حشمت خاں اب کی کڑے نکالتا ہے

”چودھویں یہ کڑوں کی جوڑی کس کی؟“

چودھویں کی ادا بالکل بناوٹ ہو گئی

”میری“!

اب حشمت خاں بڑی خود اعتمادی سے اس سے سوال کرتا ہے،

”اچھا اب بتاؤ، چودھویں کس کی؟“

چودھویں توقف کے بعد ذرا آنچل کی آڑ لے کر دیکھتی ہے

”آپ کی“

غالبؔ خاموش رہتے ہیں۔ لیکن حشمت خاں جو شاید چودھویں کے آنچل کی اوٹ کا جواب سمجھ نہیں سکا تھا، مرزا سے کہا

”آپ بھی گواہ رہیے گا۔“

غالبؔ نے ذرا تیکھے پن سے جواب دیا

”سازشی مقدمے میں گواہی مجھ سے دلواتے ہو۔“

”تم نے نہیں سنا؟“

مرزا غالبؔ محفل سے اٹھ کر جاتے ہوئے حشمت خاں سے کہتے ہیں،

”کچھ دیکھا نہ کچھ سنا۔ اور دوسرے مجھی سے مقدمہ اور مجھی سے گواہی۔ غضب، اندھیر“!

غالبؔ کے جانے کے بعد محفل درہم برہم ہو جاتی ہے۔ چودھویں سے حشمت خاں گانا جاری رکھنے کے لیے کہتا ہے۔ صرف حکم کی تعمیل کے لیے وہ گاتی ہے، مگر اکھڑے ہوئے سروں میں۔ حشمت خاں دلی طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ شکست خوردہ ہے۔ آج کا میدان غالبؔ مار گئے۔ دوسرے روز صبح غالبؔ کا بھیجا ہوا آدمی مداری چودھویں کے گھر پہنچتا ہے اور چودھویں سے ملتا ہے۔ وہ اس کو پہچانتی تھی، اس لیے بہت خوش ہوتی ہے اور اس سے پوچھتی ہے

”کیوں میاں مردھے، کہاں سے آئے ہو؟“

”جی حبش خاں کے پھاٹک سے آیا ہوں۔ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب نے بھیجا ہے۔“

چودھویں کا دل دھڑکنے لگا

”کیوں کیا بات ہے؟“

”جی نہیں، انہوں نے یہ توڑا بھیجا ہے“

یہ کہہ کر مداری ایک توڑا چودھویں کو دیتا ہے، جسے وہ جلدی جلدی بڑے اشتیاق سے کھولتی ہے۔ اس میں سے زیورات نکلتے ہیں۔ مداری اس سے کہتا ہے

”بی بی جی گن کے سنبھال لیجیے اور ایک بات جو نواب صاحب نے کہی ہے، وہ سُن لیجیے۔“

”کیا کہا؟“

مداری تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد زبان کھولتا ہے۔

”انہوں نے کہا تھا۔ اپنے رئیس جمعدار حشمت خاں سے کہنا کہ جن مقدموں کا فیصلہ روپیہ پیسہ چڑھا کر بڑی آسانی سے اپنے حق میں ہو جائے، ان پر گواہوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔“

چودھویں گزشتہ رات کے واقعات کی روشنی میں مرزا نوشہ کی اس بات کو فوراً سمجھ جاتی ہے اور دانتوں سے اپنی مخروطی انگلیوں کے ناخن کاٹنا شروع کر دیتی ہے اور سخت پریشان ہو کر کہتی ہے

”وہی ہوا جو میں سمجھتی تھی۔ میاں مردھے، تم ذرا ٹھہرو، تو میں تم سے کچھ کہوں“

مداری چند لمحات سوچتا ہے

”لیکن بی بی جی نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ دیکھو مداری، یہ توڑا دے آنا۔ واپس نہ لانا اور فوراً چلے آنا۔“

چودھویں اور زیادہ مضطرب ہو جاتی ہے

”ذرا دم بھر ٹھہرو۔ سنو، ان سے کہنا۔ میں کیوں کر۔ ہاں یہ کہنا کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ لیکن سنا تم نے۔ کہنا میں مجبوری سے کہہ گئی۔ نہیں نہیں مردھے بابا کہنا، ہاں کیا؟۔ بس یہی کہ میرا قصور کچھ نہیں“

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

”لیکن سنا میاں مداری۔ تم اتنا ضرور کہنا کہ آپ خود تشریف لائیں، تو میں اپنے دل کا حال کہوں۔ اچھا تو یوں کہنا۔ زبانی عرض کروں گی۔ ہائے اور کیا کہوں۔ سنو میرا ہاتھ جوڑ کر سلام کہنا۔“

مداری اچھا اچھا کہتا چلا جاتا ہے۔ لیکن چودھویں اسے آنسو بھری آنکھوں سے سیڑھیوں کے پاس ہی روک لیتی ہے۔

”اے میاں مردھے۔ اے میاں مداری۔ کہنا میری جان کی قسم ضرور آیئے گا۔ کہنا میرا مردہ دیکھیے۔ چودھویں بدنصیب کو اپنے ہاتھ سے گاڑیئے جو نہ آیئے۔ دیکھو ضرور سب کچھ کہنا“

مداری چلا جاتا ہے۔ وہ روتی روتی بیٹھک میں آتی ہے اور گاؤ تکیے پر گر کر آنسو بہانے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جمعدار حشمت خاں آتا ہے اور معنی خیز نظروں سے اس کو دیکھتا ہے۔ چودہویں کو اس کی آمد کا کچھ احساس نہیں ہوتا، اس لیے وہ غم و اندوہ کے ایک اتھاہ سمندر میں تھپیڑے کھا رہی تھی۔ حشمت خاں اس کے پاس ہی مسند پر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر بھی چودھویں کو اس کی موجودگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بے خودی کے عالم میں وہ اُس کی طرف بالکل خالی نظروں سے دیکھتی ہے اور بڑبڑاتی ہے

”جانے وہ ان سے سب باتیں کہے گا بھی یا نہیں“

حشمت خاں جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا، کرخت آواز میں بولا

”میری جان مجھ سے کہی ہوتیں تو ایک ایک تمہارے مرزا نوشہ تک پہنچا دیتا۔“

چودھویں چونک پڑتی ہے، جیسے اس کو خوابوں کی دنیا میں کسی نے ایک دم جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس کی آنسو بھری آنکھیں دُھندلی ہو رہی تھیں۔ اسے صرف سیاہ نوکیلی مونچھیں دکھائی دیں، جن کا ایک ایک بال اس کے دل میں تکلوں کی طرح چُبھتا گیا۔ آخر اسے کوئی ہوش نہ رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی ایک چلتر ہے جو عام طور پر طوائفوں اور ڈومنیوں سے منسوب ہے۔ وہ زور زور سے قہقہے لگاتا رہا اور ڈومنی بے ہوشی کے عالم میں مرزا نوشہ کی خاطر مدارت میں فوراً مشغول ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کے بلانے پر آ گئے تھے۔

مس اڈنا جیکسن

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومس اڈنا جیکسن

۔کالج کی پرانی پرنسپل کے تبادلے کا اعلان ہوا، طالبات نے بڑا شور مچایا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی محبوب پرنسپل ان کے کالج سے کہیں اور چلی جائے۔ بڑا احتجاج ہوا۔ یہاں تک کہ چند لڑکیوں نے بھوک ہڑتال بھی کی، مگر فیصلہ اٹل تھا۔ ان کا جذباتی پن تھوڑے عرصے کے بعد ختم ہو گیا۔ نئی پرنسپل نے پرانی پرنسپل کی جگہ لے لی۔ طالبات نے شروع شروع میں اس سے بڑی نفرت و حقارت کا اظہار کیا مگر اس نے ان سے کچھ نہ کہا۔ حالانکہ اس کے اختیار میں سب کچھ تھا۔ وہ ان کو کڑی سے کڑی سزا دے سکتی تھی۔ ہر وقت اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیرتی رہتی۔ وہ سرتاپا تبسم تھی۔ کالج میں کھلی ہوئی کلی کی طرح آتی اور جب واپس جاتی تو دن بھر گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس میں مرجھاہٹ کے کوئی آثار نہ ہوتے۔ تھوڑے عرصے کے بعد۔ کالج کی طالبات اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ ہر وقت اس سے چمٹی رہتیں۔ ایک دن، جب کوئی جلسہ تھا، مس اڈنا جیکسن نے تقریر کی اور کہا۔

”میں بہت خوش ہوں کہ تم اب مجھ سے مانوس ہو گئی ہو۔ شروع شروع میں جیسا کہ میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتی تھیں، میری پیاری بچیو، میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔ مجھے یہاں میرے حاکموں نے بھیجا تھا۔ ایک دن آنے والا ہے جب تم سنجیدہ اور متین بن جاؤ گی۔ تمہاری گود میں بچے کھیلتے ہوں گے، تم سے بھی کہیں زیادہ شریر اور نٹ کھٹ۔ میں تمہاری پرنسپل ہوں۔ لیکن دل میں یہ خیال کبھی نہ لانا کہ میں کوئی ظالم عورت ہوں۔ میں تم سب سے محبت کرتی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ مجھ سے بھی کوئی محبت کرے۔“

یہ تقریر سن کر لڑکیاں بہت متاثر ہوئیں اور مس جیکسن کی محبت میں اور زیادہ گرفتار ہو گئیں۔ سب دل میں نادم تھیں کہ انھوں نے ایسی شریف اور شفیق پرنسپل کے آنے پر کیوں اعتراض کیا۔ ایک دن بی اے کی ایک لڑکی طاہرہ جس نے مس جیکسن کی آمد پر آوازے کسے تھے اور بڑے سخت الفاظ استعمال کیے تھے، پرنسپل کے کمرے میں تھی۔ طاہرہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ خوف و ہراس اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ پرنسپل کاغذات پر دستخط کر رہی تھی۔ بے حد منہمک تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے طاہرہ کی سسکیوں کی آواز سنی تو اس کو اس کی موجودگی کا علم ہوا۔ ایک دم چونک کر اس نے اپنا ننھا سا فونٹین پین ایک طرف رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے طاہرہ کو بلایا ہے۔

”کیا بات ہے طاہرہ؟“

طاہرہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"آپ۔ آپ ہی نے تو مجھے یہاں طلب فرمایا تھا"

ایک لحظے کے لیے مس جیکسن خالی الدماغ رہی، لیکن اسے فوراً یاد آ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ طاہرہ کے نام ایک مرد کا محبت نامہ پکڑا گیا تھا۔ یہ اس کی ایک سہیلی ناہید نے مس جیکسن کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ خط اس کی دراز میں محفوظ تھا۔ مس جیکسن کے مسکراتے ہوئے ہونٹ طاہرہ سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹا۔ یہ کیا پتا ہے؟"

اس کے بعد اس نے میز کا دراز کھول کر خط نکالا اور طاہرہ سے کہا

"لو۔ یہ تمہارا خط ہے پڑھ لو اور اگر چاہو تو مجھے ساری داستان سنا تاکہ میں تمہیں کوئی رائے دے سکوں۔"

طاہرہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کہے۔ پرنسپل مس جیکسن نے اٹھ کر اس کے کاندھے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا

"طاہرہ! شرماؤ نہیں۔ ہر لڑکی کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں۔"

طاہرہ نے رونا شروع کر دیا۔ بوڑھا چپڑاسی کسی کام سے اندر داخل ہوا تو مس جیکسن نے اس سے کہا۔

"نظام دین! ابھی تم باہر ٹھہرو۔ میں بلالوں گی تمہیں۔"

جب وہ چلا گیا تو مس جیکسن نے بڑے پیار سے طاہرہ سے کہا۔

"محبت ایک عظیم جذبہ ہے۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن تمہاری عمر کی لڑکیاں اکثر دھوکا کھا جایا کرتی ہیں۔ مجھے تمام واقعات بتا دو۔ میں تم سے عمر میں بہت بڑی ہوں مگر مجھ سے آج تک کسی نے محبت نہیں کی، لیکن میں نے کئی استوار اور نا استوار محبتیں دیکھی ہیں۔ بیٹا، مجھ سے گھبراؤ نہیں۔ بیٹھ جاؤ۔"

طاہرہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پرنسپل اپنی گھومنے والی کرسی پر نشست اختیار کرتے ہوئے اپنی شاگرد سے بولیں

"اب دیر نہ لگاؤ۔ بتا دو۔ مجھے بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔"

طاہرہ کچھ دیر ہچکچاتی رہی۔ لیکن اس کے بعد اس نے اپنا دل کھول کے اپنی پرنسپل کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بتایا کہ ایک نوجوان لیکچرار ہے جس سے وہ ٹیوشن لیتی ہے۔ قریب قریب ایک سال سے وہ باقاعدہ پانچ بجے اس کے گھر میں آ رہا ہے۔ اس کی باتیں بڑی دلفریب ہیں۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی خوب ہے۔ فارسی کے اشعار کا مطلب سمجھاتا ہے تو ایک نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ اس کی زبان میں غضب کی مٹھاس ہے۔ طاہرہ نے مزید بتایا کہ اس کے دل میں لیکچرار کے لیے جگہ پیدا ہو گئی۔ آہستہ آہستہ بے قرار رہنے لگی۔ اس کو ہر وقت اس کی یاد ستاتی۔ پانچ بجنے والے ہوتے تو اس کو یوں محسوس ہوتا کہ وہ مجسم گھڑی بن گئی ہے۔ اس کا رواں رواں ٹک ٹک کرنے لگتا۔ وہ اس سے زبانی تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، اس لیے کہ شرم و حیا اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس نے ایک رات لیکچرار کے نام خط لکھا۔ اس نے اپنی زندگی بھر میں ایسا خط کبھی نہیں لکھا تھا حالانکہ وہ اپنے خاندان میں خط لکھنے کے معاملے میں کافی مشہور تھی کہ ہر بات بڑے سلیقے سے لکھتی ہے، لیکن یہ خط لکھتے ہوئے اسے بڑی دقتیں پیش آئیں۔ القاب کیا ہو، مضمون کیسا ہونا چاہیے، پھر یہ سوال بھی اس کے درپیش تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ خط اس کے باپ کے حوالے کر دے۔ وہ ایک عرصے تک سوچتی رہی۔ اس کے دل میں کئی خدشے تھے لیکن آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خط ضرور لکھے گی۔ چنانچہ اس نے رائٹنگ پیڈ کے کئی کاغذ ضائع کر کے چند سطور اس لیکچرار کے نام لکھیں:۔

"آپ بڑے اچھے استاد ہیں۔ مجھے اس طرح پڑھاتے ہیں جیسے۔ جیسے آپ کو مجھ سے خاص لگاؤ ہے۔ ورنہ اتنی محنت کون استاد کرتا ہے۔ میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ ساری عمر آپ میرے استاد اور میں آپ کی شاگرد رہوں۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔"

یہ خط اس نے کئی دن اپنے پرس میں رکھا۔ اس کے بعد جرأت سے کام لے کر اس نے کاغذ کا یہ پرزہ اپنے استاد کی جیب میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈال دیا۔ دوسرے روز جب وہ شام کو ٹھیک پانچ بجے آیا تو اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ اسے سخت مایوسی ہوئی۔ دو گھنٹے کے بعد جب وہ چلا گیا تو اس نے بڑے چڑچڑے پن سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور اپنے کمرے میں جانے لگی۔ ایک کتاب اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ طاہرہ نے بڑی بے دلی سے اٹھائی تو اس کے اوراق میں سے کاغذ کا ایک ٹکڑا جھانکنے لگا۔ اس نے یہ ٹکڑا نکالا۔ اس پر چند الفاظ مرقوم تھے۔ طاہرہ کے زخمی جذبات پر مرہم کے پھاہے لگ گئے۔ اس کے استاد نے یہ لکھا تھا:

"مجھے تمہاری تحریر مل گئی ہے۔ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ زندگی بھر تمہارا استاد رہنے کا تو میں وعدہ نہیں کر سکتا لیکن خادم ضرور رہوں گا۔ میں استادی شاگردی سے تنگ آ گیا ہوں۔ تمہاری غلامی اس سے ہزار درجے بہتر ہو گی۔"

اس کے بعد دونوں میں کتابوں کے اوراق کی اوٹ میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ لیکن طاہرہ کے والدین کو یک لخت شہر چھوڑنا پڑا، اس لیے کہ اس کے باپ ظہیر کی تبدیلی کسی سلسلے میں دوسرے شہر میں ہو گئی۔ طاہرہ کو ہوسٹل میں داخل کر دیا گیا، جس کی سپرنٹنڈنٹ مس جیکسن تھی۔ اس کا قیام اسی ہوٹل میں تھا۔ کالج سے فارغ ہو کر آتی تو اپنے کمرے میں اکثر ناول

پڑھتی رہتی۔ عجیب عجیب قسم کے۔ ہوسٹل کی لڑکیاں اس کے پاس آتیں اور اس کے کئی ناول چرا کے لے جاتیں اور مزے لے لے کر پڑھتیں۔ پھر واپس وہیں پر رکھ دیتیں جہاں سے انھوں نے اٹھائے تھے۔ مس جیکسن کو لڑکیوں کی اس شرارت کا کوئی علم نہیں تھا۔ طاہرہ نے بھی کئی ناول پڑھے اور اس کا عشق اپنے استاد کے عشق سے بڑھتا گیا۔ وہ ہوسٹل سے باہر نکل نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے ایک خط لکھا اور اسے کسی نہ کسی طریقے سے اپنے استاد تک پہنچا دیا۔ یہ خط جو اس نوجوان لیکچرار نے جواب میں لکھا تھا، غلط ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ یعنی ناہید کے پاس جس کو طاہرہ سے صرف اس لیے بغض تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ یہ خط اس نے پرنسپل کے حوالے کر دیا۔ طاہرہ، جب اپنی ساری داستان سنا چکی جو مس جیکسن نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے سنی تو اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد طاہرہ سے کہا۔

”اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ جو فیصلہ فرمائیں گی، مجھے منظور ہو گا۔“

مس جیکسن اپنی کرسی پر سے اٹھیں اور کہا

”نہیں طاہرہ، محبت کے معاملے میں مجھے فیصلہ دینے کا اختیار نہیں۔ یہ مذہب سے بھی زیادہ مقدس جذبہ ہے۔ تم خود بتاؤ۔“

طاہرہ نے شرم سے بھری ہوئی آنکھیں جو نم آلود تھیں، جھکا کر صرف اتنا کہا

”میں ان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

مس جیکسن نے ٹھیٹ پرنسپلانہ انداز میں پوچھا۔

”کیا وہ بھی چاہتا ہے؟“

”اس نے ابھی تک اس خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن وہ۔“

”میں سمجھتی ہوں۔ وہ بھی تو تم سے محبت کرتا ہے۔ اسے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا تمہارے والدین رضامند ہو جائیں گے؟“

”ہرگز نہیں ہوں گے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ میری منگنی ایک جگہ کر چکے ہیں۔“

”کہاں؟“

”میرے خالہ زاد بھائی کے ساتھ۔“

”ہم کرسچینوں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔“

”ہمارے ہاں تو اکثر ایسا ہوتا ہے۔“

”خیر چھوڑو اس بات کو۔ کیا میں تمہارے اس لیکچرار کو اپنے پاس بلا کر اس سے مفصل بات چیت کروں؟ طاہرہ یہ زندگی بھر کا سوال ہے ایسا نہ ہو کوئی غلطی ہو جائے۔ میں عمر میں تم سے بہت بڑی ہوں۔ میں تمہیں صحیح مشورہ دوں گی۔ ایک مرتبہ تم مجھے اس سے مل لینے دو۔“

طاہرہ نے شکریہ ادا کیا۔

”آپ ضرور ملیے لیکن۔ اس سے کہہ دیجیے گا۔ کہ۔“

پرنسپل نے بڑی شفقت سے کہا۔

”رک کیوں گئی ہو۔ جو کچھ تم اس سے کہنا چاہتی ہو، مجھ سے کہہ دو۔“

”جی۔ بس صرف اتنا کہ اگر اس کے قدم مضبوط نہ رہے تو میں خودکشی کر لوں گی۔ عورت زندگی میں۔ صرف ایک ہی مرد سے محبت کرتی ہے۔“

محبت کا لفظ سنتے ہی پرنسپل مس اڈنا جیکسن کے دل کی جھریاں اور زیادہ گہری ہو گئیں۔ اس نے طاہرہ کے آنسو اپنے رومال سے بڑی شفقت کے ساتھ پونچھتے ہوئے رخصت کر دیا۔ اس کے بعد اس نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو اندر بلایا۔ اس نے بڑے ضروری کاغذات اس کے میز پر رکھے۔ اس نے سرسری نظر سے ان کو دیکھا۔ ایک کاغذ پر طاہرہ کے اس لیکچرار کے نام خط لکھا کہ وہ ازراہ کرم اس سے کسی وقت شام کو بورڈنگ ہاؤس میں ملے۔ یہ خط اس نے لفافے میں ڈالا، پتہ لکھا اور چپڑاسی سے کہا کہ فوراً سائیکل پر جائے اور یہ لفافہ لیکچرار صاحب کو پہنچا دے۔ چپڑاسی چلا گیا۔ شام کو مس اڈنا جیکسن اپنے کمرے میں بیٹھی پرچے دیکھ رہی تھی کہ نوکر نے اطلاع دی کہ ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ صاحب کون ہیں، چنانچہ اس نے نوکر سے کہا۔

"انھیں اندر لے آؤ"!

طاہرہ کا استاد ہی تھا جو اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ مس جیکسن نے اس کا استقبال کیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ جون کا مہینہ، سخت تپش تھی۔ مس جیکسن اس سے بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئی۔ نوجوان لیکچرار بہت متاثر ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مس اڈنا جیکسن طاہرہ کے بارے میں بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا۔ اس کو یہ مرض بہت دیر سے لاحق تھا۔ لیکچرار بہت فکر مند ہوا۔ گھر میں کوئی نوکر نہیں تھا، اس لیے کہ وہ چھٹی کر کے کہیں باہر سو رہے تھے۔ اس نے خود ہی جو اس کی سمجھ میں آیا، کیا۔ جب۔ کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کھلا تو لڑکیوں کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کی پرنسپل مس اڈنا جیکسن سے اس لیکچرار کی شادی ہو گئی ہے، جس کو طاہرہ سے محبت تھی۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ لیکچرار لطیف کی عمر پچیس برس کے قریب ہو گی اور مس اڈنا جیکسن کی لگ بھگ پچاس برس۔

مس ٹین والا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومس ٹین والا

اپنے سفید جوتوں پر پالش کر رہا تھا کہ میری بیوی نے کہا۔

"زیدی صاحب آئے ہیں"!

میں نے جوتے اپنی بیوی کے حوالے کیے اور ہاتھ دھو کر دوسرے کمرے میں چلا آیا جہاں زیدی بیٹھا تھا میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"ارے! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

زیدی نے اپنے چہرے کو شگفتہ بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بیمار رہا ہوں۔"

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بہت دُبلے ہو گئے ہو یار۔ میں نے تو پہلے پہچانا ہی نہیں تھا تمہیں۔ کیا بیماری تھی؟"

"معلوم نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

زیدی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا بیماری ہے؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔"

"کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔"

زیدی خاموش رہا تو میں نے پھر اس سے کہا۔

"کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ لیا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

زیدی پھر خاموش رہا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ اس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے زیدی! تمہارا نروس سسٹم خراب ہو گیا ہے وٹامن بی کے انجکشن لگانا شروع کر دو، بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پچھلے برس زیادہ وسکی پینے سے میرا یہی حال ہو گیا تھا، لیکن بارہ انجکشن لینے سے کمزوری دُور ہو گئی تھی۔ مگر تم کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کیوں نہیں لیتے؟"

زیدی نے اپنا چشمہ اُتار کر رومال سے صاف کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہُوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"کیا رات کو نیند نہیں آتی؟"

"بہت کم۔"

”دماغ میں خشکی ہو گی“!

”جانے کیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”دیکھو سعادت میں تمہیں ایک عجیب و غریب بات بتانے آیا ہوں۔ مجھے بیماری ویماری کچھ نہیں۔ رات کو نیند اس لیے نہیں آتی کہ میں ڈر تا رہتا ہوں۔“

”ڈرتے رہتے ہو۔ کیوں؟“

”بتاتا ہُوں۔“

یہ کہہ کر اس نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سُلگایا اور بجھی ہوئی تیلی کو توڑنا شروع کر دیا۔

”مجھے معلوم نہیں سُن کر تم کیا کہو گے۔ مگر یہ واقعہ یہ، بلے سے۔“

میں شاید مسکرا دیا تھا کیونکہ زیدی نے فوراً ہی بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”ہنسو نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ انسانی نفسیات سے تمہیں دلچسپی کافی ہے۔ شاید تم میرے ڈر کی وجہ بتا سکو۔“

میں نے کہا۔

”لیکن یہاں تو سوال ایک حیوان کا ہے۔“

زیدی خفا ہو گیا۔

”تم مذاق اُڑاتے ہو تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

”نہیں نہیں زیدی! مجھے معاف کر دو۔ میں پوری توجہ سے سُنوں گا، جو تم کہو گے۔“

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور نیا سگریٹ سلگانے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

”تمہیں معلوم ہے جہاں میں رہتا ہوں، دو کمرے ہیں پہلے کمرے کے اس طرف چھوٹی سی بالکنی ہے جس کے کٹہرے میں لوہے کی سلاخیں لگی ہیں۔ اپریل اور مئی کے دو مہینے چونکہ بہت گرم ہوتے ہیں اس لیے فرش پر بستر بچھا کر میں اس بالکنی میں سویا کرتا ہُوں۔ یہ جون کا مہینہ ہے۔ اپریل کی بات ہے میں صبح ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے لیے باہر نکلا دروازہ کھولا تو دہلیز کے پاس ایک موٹا بِلّا آنکھیں بند کیے لیٹا نظر آیا۔ میں نے جوتے سے اسے ٹہوکا دیا۔ اس نے ایک لحظے کے لیے آنکھیں کھولیں۔ میری طرف بے پروائی سے، جیسے میں کچھ بھی نہیں، دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے بڑا تعجب ہُوا چنانچہ میں نے بڑے زور سے اس کے ٹھوکر ماری۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ میری طرف پھر اسی نظر سے دیکھا اور اُٹھ کر کچھ دُور سیڑھیوں کے پاس لیٹ گیا۔ جس انداز سے اس نے چند قدم اُٹھائے تھے، اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے مرعوب نہیں ہُوا۔ مجھے سخت غصّہ آیا۔ آگے بڑھ کر اب کی میں نے زور سے ٹھوکر ماری۔ دس پندرہ زینوں پر وہ لڑکھڑاتا ہوا چلا گیا۔ جب چار پیروں پر سنبھلا تو اس نے نیچے سے اپنی پیلی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کوئی آواز پیدا کیے بغیر ایک طرف چلا گیا۔ تم دلچسپی لے رہے ہو یا نہیں؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں“!

زیدی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور سلسلہ کلام جاری کیا۔

”دفتر پہنچ کر میں سب کچھ بھول گیا لیکن شام کو جب گھر لوٹا اور کمرے کی دہلیز کے پاس پہنچا جہاں وہ بِلّا لیٹا ہُوا تھا تو صبح کا واقعہ دماغ میں تازہ ہو گیا۔ نہاتے، چائے پیتے، رات کا کھانا کھاتے کئی دفعہ میں نے سوچا۔ تین دفعہ میں نے اس کی پسلیوں میں زور سے ٹھوکر ماری، مجھ سے وہ ڈرا کیوں نہیں؟ میاؤں تک بھی نہ کی اس نے اور پھر کیا انداز تھا اس کے چلنے، آنکھیں بند کرنے اور کھولنے کا ایسا لگتا تھا جیسے اسے کچھ پرواہی نہیں۔ جب میں ضرورت سے زیادہ اس بلے کے بارے میں سوچنے لگا تو بڑی الجھن ہوئی۔ ایک معمولی سے حیوان کو اتنی اہمیت آخر میں کیوں دے رہا تھا، اس کا جواب نہ مجھے اس وقت ملا اور نہ اب، حالانکہ پورے تین مہینے گزر چکے ہیں۔“

اس قدر کہہ کر زیدی خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

”بس“!

”نہیں۔“

زیدی نے سگریٹ کو ایش ٹرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

”میں صرف تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ اس بِلّے کو میں نے اتنی اہمیت کیوں دی ہے، میں اتنا خوف کیوں کھاتا ہُوں۔ یہ معما ابھی تک مجھ سے حل نہیں ہو سکا۔ شاید تم مجھ سے بہتر سوچ سکو۔ “

میں نے کہا۔

”مجھے پورے واقعات معلوم ہونے چاہئیں۔ “

زیدی نے ایش ٹرے پر سے سگریٹ اُٹھایا اور ایک کش لے کر کہا۔

”میں بتا رہا ہوں۔ اس روز کے بعد کئی دن گزر گئے مگر وہ بلا نظر نہ آیا۔ شاید ہفتے کی رات تھی۔ میں باہر بالکنی میں سو رہا تھا۔ دو بجے کے قریب کمرے میں کچھ شور ہوا جس سے میری نیند کھل گئی۔ اٹھ کر روشنی کی تو میں نے دیکھا کہ وہی بِلا کھانے والی میز پر کھڑا ڈش کا سرپوش اُتار کر پڈنگ کھا رہا ہے۔ میں نے شُش، شُش کی مگر وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ میری طرف اس نے بالکل نہ دیکھا۔ میں نے چپل کا ایک پیر اٹھایا اور نشانہ تان کر زور سے مارا۔ چپل اس کے پیٹ پر لگا مگر وہ اس چوٹ سے بے پروا پڈنگ کھاتا رہا۔ میں نے غصے میں آکر مسہری کا ڈنڈا اٹھایا اور پاس جا کر اس کی پیٹھ پر مارا۔ اس نے اور زیادہ بے پروائی سے میری طرف دیکھا۔ بڑے آرام سے کرسی پر کودا۔ آواز پیدا کیے بغیر فرش پر اُترا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا بالکنی کے کٹہرے کی سلاخوں میں سے نکل کر چھجے پر کود گیا۔ میں حیران وہیں کھڑا رہا اور سوچنے لگا یہ کیسا حیوان ہے جس پر مار کا کچھ اثر ہی نہیں ہوا۔ سعادت! میں تم سے سچ کہتا ہوں بڑا خوفناک بلا ہے۔ یہ موٹا سر، رنگ سفید ہے، لیکن اکثر میلا رہتا ہے۔ میں نے ایسا غلیظ بلا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ “

زیدی نے ایش ٹرے میں سگریٹ بُجھایا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا۔

”بلّے بِلّیاں تو خود کو بہت صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ “

”رکھتے ہیں۔ “

زیدی اٹھ کھڑا ہوا۔

”لیکن یہ بلا شاید جان بوجھ کر خود کو غلیظ رکھتا ہے۔ لیٹتا ہے کوڑے کرکٹ کے پاس۔ کان سے لہو بہہ رہا ہے پر مجال ہے، اسے چاٹ کر صاف کرے۔ سر پھٹا ہوا ہے، پر اسے کچھ ہوش نہیں۔ بس، سارا دن مارا مارا پھرتا ہے۔ “

میں نے پوچھا:

”لیکن اس میں خوف کھانے کی کیا بات ہے؟ “

زیدی بیٹھ گیا:

”یہی تو میں خود دریافت کرنا چاہتا ہُوں۔ ڈر کی یوں تو ایک وجہ ہو بھی سکتی ہے۔ وہ یہ کہ دس پندرہ راتیں متواتر وہ مجھے جگاتا رہا۔ مجھ سے ہر دفعہ اس نے مار کھائی۔ بہت بری طرح پٹا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ میرے گھر کا رخ نہ کرتا کیونکہ آخر حیوانوں میں بھی عقل ہوتی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ کسی روز ایسا نہ ہو مجھ پر جھپٹ پڑے اور آنکھ وانکھ نوچ لے۔ سُننے میں آیا ہے کہ اگر کسی بلے یا بلی کو گھیر کر مارا جائے تو وہ ضرور حملہ کرتے ہیں۔ “

میں نے کہا۔

”ڈرنے کی یہ وجہ تو معقول ہے۔ “

زیدی پھر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

”لیکن اس سے میری تسکین نہیں ہوتی۔ “

میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔

”تم اس کے ساتھ محبت پیار سے تو پیش آکر دیکھو۔ “

”میں ایسا کر چکا ہوں۔ میرا خیال تھا اس قدر پٹنے پر وہ ہاتھ بھی نہیں لگانے دے گا۔ لیکن معاملہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ برعکس بھی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس نے میرے پیار کی بالکل پروا نہ کی۔ ایک روز میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ پاس آکر فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ یہ بڑھا ہوا ہاتھ میں نے اس کی پیٹھ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا۔ سعادت، تم یقین کرو وہ ویسے کا ویسا آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ پیار کا جواب بلے بلیلاں اکثر دُم ہلا کر دیتے ہیں لیکن اس کم بخت کی دُم کا ایک بال بھی نہ ہلا۔ میں نے تنگ آکر اس کے سر پر کتاب دے ماری چوٹ کھا کر وہ اُٹھا۔ بڑی بے پروائی، ایک نہایت ہی دل شکن بے اعتنائی سے میری طرف پیلی پیلی آنکھوں سے دیکھا اور بالکنی کے کٹہرے کی سلاخوں میں سے نکل کر چھجے پر کود گیا۔ بس اس دن سے چوبیس گھنٹے وہ میرے دماغ میں رہنے لگا ہے۔ “

یہ کہہ کر زیدی میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور زور زور سے اپنی ٹانگ ہلانے لگا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آتا تھا کہ زیدی کا خوف بے بنیاد نہیں۔ زیدی دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا۔

”میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے پاس آیا۔“

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد رکا اور ایش ٹرے میں بجھی ہوئی دیا سلائی اُٹھا کر اس کے ٹکڑے کرنے لگا۔

”اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔ ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو سمجھتا ہوں وہی بلا ہے۔ لیکن آٹھ روز سے وہ کہیں غائب ہے۔ معلوم نہیں کسی نے مار ڈالا ہے، بیمار ہے یا کہیں اور چلا گیا ہے۔“

میں نے کا۔

”تم کیوں سوچتے ہو۔ اچھا ہے جو غائب ہو گیا ہے۔“

”معلوم نہیں کیوں سوچتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ اس کم بخت کو بھول جاؤں مگر دماغ میں سے نکلتا ہی نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ صوفے پر سر کے نیچے گدی رکھ کر لیٹ گیا۔

”عجیب ہی قصّہ ہے کوئی اور سنے تو ہنسے کہ ایک بلے نے میری یہ حالت کر دی ہے۔ بعض اوقات مجھے خود ہنسی آتی ہے۔ لیکن یہ ہنسی کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔“

زیدی نے یہ کہا اور مجھے احساس ہوا کہ واقعی اپنی بے بسی پر ہنستے ہوئے اسے بہت تکلیف ہوتی ہوگی جو کچھ اس نے بیان کیا تھا، بظاہر مضحکہ خیز تھا۔ لیکن یہ بالکل واضح تھا کہ اس بلے کے وجود میں زیدی کی زندگی کا کوئی بہت ہی اذیت دہ لمحہ پوشیدہ تھا۔ ایسا لمحہ جو اسے اب بالکل یاد نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

”زیدی تمہارے ماضی میں کوئی ایسا حادثہ تو نہیں جس سے تم اس بلے کو متعلق کر سکو۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسی چیز، کوئی ایسا واقعہ جس سے تم نے خوف کھایا ہو اور اس چیز یا واقعے کی شباہت اس بلے سے ملتی ہو؟“

یہ کہہ کر میں نے سوچا کہ واقعے کی شباہت بلے سے کیسے مل سکتی ہے۔ زیدی نے جواب دیا۔

”میں اس پر بھی غور کر چکا ہوں۔ میرے حافظے میں ایسا کوئی واقعہ یا ایسی کوئی چیز نہیں۔“

میں نے کہا۔

”ممکن ہے کبھی یاد آجائے۔“

”ایسا ہو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر زیدی صوفے پر سے اُٹھا۔ چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور مجھے اور میری بیوی کو اتوار کی دعوت دے کر چلا گیا۔ اتوار کو میں اور میری بیوی سنٹا کروز گئے۔ میں نے شاید آپ کو پہلے نہیں بتایا۔ زیدی میرا پرانا دوست ہے۔ انٹرنس تک ہم دونوں ایک ہی اسکول میں تھے۔ کالج میں بھی ہم دو برس ایک ساتھ رہے۔ میں فیل ہو گیا اور وہ ایف اے پاس کر کے امرتسر چھوڑ کر لاہور چلا گیا جہاں اس نے ایم اے کیا اور چار پانچ برس بے کار رہنے کے بعد بمبئی چلا آیا۔ یہاں وہ ایک برس سے جہازوں کی ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد۔ ہم دیر تک نئے اور پرانے فلموں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ زیدی کی بیوی اور میری بیوی، دونوں

”بہت فلم دیکھو“

قسم کی عورتیں ہیں، چنانچہ اس گفتگو میں زیادہ حصّہ انہی کا تھا۔ دونوں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے ہی والی تھیں کہ بالکنی کے کٹہرے کی سلاخوں سے ایک موٹا بلا اندر داخل ہوا۔ میں نے اور زیدی نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔ زیدی کے چہرے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ وہی بلا ہے۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ سر پر کانوں کے پاس ایک گہرا زخم تھا جس پر ہلدی لگی ہوئی تھی۔ بال بے حد میلے تھے۔ چال میں جیسا کہ زیدی نے کہا تھا کہ ایک عجیب قسم کی بے پروائی تھی۔ ہم چار آدمی کمرے میں موجود تھے مگر اس نے کسی کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ جب میری بیوی کے پاس سے گزرا تو وہ چیخ اٹھی۔

”یہ کیسا بلا ہے۔ سعادت صاحب۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

میری بیوی نے جواب دیا۔

”پورا بدمعاش لگتا ہے۔“

زیدی نے بوکھلا کر کہا۔

”بدمعاش“

میری بیوی شرما گئی۔

”جی ہاں، ایسا ہی لگتا ہے۔“

زیدی کچھ سوچنے لگا۔ دونوں عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد زیدی اٹھا

”سعادت، ذرا ادھر آؤ۔“

مجھے بالکنی میں لے جا کر اس نے کہا۔

”معمہ حل ہو گیا ہے۔“

”کیسے؟“

”تمہاری بیوی نے حل کر دیا ہے۔ تم بھی سوچو کیا اس بلے کی شکل مس ٹین والے سے نہیں ملتی؟“

”مس ٹین والے سے“

”ہاں ہاں۔ اُس بدمعاش سے جو ہمارے اسکول کے باہر بیٹھا رہتا تھا۔ مصطفٰے جسے مس ٹین والا کہا کرتے تھے۔“

مجھے یاد آگیا۔ زیدی پر جو لڑکپن میں بہت خوبصورت تھا۔ مس ٹین والے کی خاص نظر تھی۔ لیکن میں سوچنے لگا بلے سے اس کی شکل کیسے ملتی ہے۔ نہیں ملتی تھی، اس کی چال میں بھی کچھ ایسے ہی بے پروائی تھی۔ سر اکثر پھٹا رہتا تھا۔ کئی دفعہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے لوگوں سے پٹوایا کہ وہ اسکول کے دروازے کے پاس نہ کھڑا رہا کرے، مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ ایک لڑکے کے باپ نے اسے ہاکی سے اتنا مارا، اتنا مارا کہ لوگوں کا خیال تھا ہسپتال میں مر جائے گا، مگر دوسرے ہی روز وہ پھر اسکول کے گیٹ کے باہر موجود تھا۔ یہ سب باتیں ایک لحظے کے اندر اندر میرے دماغ میں اُبھریں میں نے زیدی سے کہا

”تم ٹھیک کہتے ہو، مس ٹین والا بھی مار کھا کر خاموش رہا کرتا تھا۔“

زیدی نے جواب نہ دیا، اس کے لیے وہ کچھ یاد کر رہا تھا۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ پڑھنے کے لیے ایک دفعہ اکیلا کمپنی باغ چلا گیا ایک درخت کے نیچے بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اچانک مس ٹین والا نمودار ہُوا۔ ہاتھ میں ایک خط تھا مجھ سے کہنے لگا۔

”بابو جی، خط پڑھ دیجیے۔“

میری جان ہوا ہو گئی۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ مس ٹین والے نے خط میری ران پر بچھا دیا۔ میں اُٹھ بھاگا۔ اس نے میرا پیچھا کیا۔ لیکن میں اس قدر تیز دوڑا کہ وہ بہت پیچھے رہ گیا۔ گھر پہنچتے ہی مجھے تیز بخار چڑھا۔ دو دن تک ہذیانی کیفیت رہی۔ میری والدہ کا خیال تھا کہ جس درخت کے نیچے میں پڑھنے کے لیے بیٹھا تھا۔ آسیب زدہ تھا۔ زیدی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ بلا ہماری ٹانگوں میں سے گزر کر کٹہرے کی سلاخوں میں سے نکلا اور چھجے پر کود گیا۔ چھجے پر چند قدم چل کر اس نے مڑ کر پیلی پیلی آنکھوں سے ہماری طرف اپنی مخصوص بے پروائی سے دیکھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

”مس ٹین والا“!

زیدی جھینپ گیا۔

مس فریا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومس فریا

شادی کے ایک مہینے بعد سہیل پریشان ہو گیا۔ اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بچہ کم از کم تین سال کے بعد پیدا ہو گا مگر اب ایک دم یہ معلوم کر کے اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ جس بچے کا اس کو وہم و گمان بھی نہیں تھا اس کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی اتنی جلدی ماں بننے کا شوق نہیں تھا اور سچ پوچھیے تو وہ ابھی

خود بچہ تھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر کیا ہوتی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے عائشہ گڑیاں کھیلتی تھی اور صرف پانچ مہینے کی بات ہے کہ سہیل نے اسے گلی میں جنگلی بلی کی طرح نکمے چنوں پر خوانچے والے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ منہ لال کیے وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”تم نے مجھے کل بھی کھیلیں اسی طرح کم کر دی تھیں، تم بے ایمان ہو۔ میرے پیسے کیا مفت کے آتے ہیں جو میں تول میں ہر بار کم چیز لے لوں۔“

اور اس نے زبردستی جھپٹا مار کر مٹھی بھر نمکین چنے اس کے خوانچے سے اُٹھا لیے تھے۔ اب سہیل یہ منظر یاد کرتا اور سوچتا کہ عائشہ کی گود میں بچہ ہو گا جب وہ گھر جاتے ہوئے ٹرین کا سفر کرے گی تو اپنے اس ننھے کو اسی طرح دُودھ پلائے گی جس طرح ریل کے ڈبوں میں دوسری عورتیں پلایا کرتی ہیں۔ اس کی لڑکی یا لڑکا اسی طرح چُسر چُسر کرے گا۔ اسی طرح ہونٹ سکیڑ کر روئے گا، تو وہ عائشہ سے کہے گا۔

”بچہ رو رو کر ہلکان ہُوا جا رہا ہے اور تم کھڑکی میں سے باہر کا تماشہ دیکھ رہی ہو“

۔ اس کا تصور کرتے ہی سہیل کا حلق سوکھ جاتا ہے۔

”اس عمر میں بچہ ؟۔ بھئی میرا تو ستیاناس ہو جائے گا۔ ساری شاعری تباہ ہو جائے گی۔ وہ ماں بن جائے گی۔ میں باپ بن جاؤں گا۔ شادی کا باقی رہے گا کیا؟۔ صرف ایک مہینہ جس میں ہم دونوں میاں بیوی بن کے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اولاد کا سلسلہ کیوں میاں بیوی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اولاد بُری چیز ہے۔ بچے پیدا ہوں پر اس وقت جب ان کی خواہش کی جائے یہ نہیں کہ بن بُلائے مہمانوں کی طرح آن ٹپکیں۔ میں خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ کیسے کیسے حسین خیال میرے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ شروع شروع کے دن تو ایک عجیب قسم کی افراتفری میں گزرے تھے۔ اب ایک مہینے کے بعد سب چیزوں کی نوک پلک درست ہوئی تھی۔ اب شادی کا اصلی لطف آنے لگا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ آفت آ گئی۔ ابھی جانے کتنے اور ہوں۔“

سہیل پریشان ہو گیا۔ اگر دفعتہً آسمان سے کوئی جہاز بم برسانا شروع کر دیتا تو وہ اس قدر پریشان نہ ہوتا مگر اس حادثے نے اس کا دماغی توازن درہم برہم کر دیا تھا۔ وہ اتنی جلدی باپ نہیں بننا چاہتا تھا۔

”میں اگر باپ بن جاؤں تو کوئی ہرج نہیں مگر مصیبت یہ کہ عائشہ ماں بن جائے گی۔ اسکو اتنی جلدی ہرگز ہرگز ماں نہیں بننا چاہیے۔ وہ جوانی کہاں رہے گی اس کی جس کو میں اب بھی شادی ہونے کے بعد بھی کنکھیوں سے دیکھتا ہُوں اور ایک لرزش سی اپنے خیالات میں محسوس کرتا ہوں۔ اسکی تیزی و طراری کہاں رہے گی۔ وہ بھولا پن جو اب مجھے عائشہ میں نظر آتا ہے ماں بن کر بالکل غائب ہو جائے گا۔ وہ کھلنڈرا پن جو اس کی رگوں میں پھڑکتا ہے مُردہ ہو جائے گا۔ وہ ماں بن جائے گی، اور صابن کے جھاگ کی طرح اس کی تمام چلبلاہٹیں بیٹھ جائیں گی۔ گود میں ایک چھوٹے سے روتے پلے کو لیے کبھی وہ میز پر پیپر ویٹ اُٹھا کر بجائے گی، کبھی کنڈی ہلائے گی اور کبھی کن سری تانوں میں اوٹ پٹانگ لوریاں سنائے گی۔ واللہ میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔“

سہیل کو دیوانگی کی حد تک اس حادثے نے پریشان کر رکھا تھا۔ تین چار دن تک اس کی پریشانی کا کسی کو علم نہ ہوا۔ مگر اس کے بعد جب اس کا چہرہ فکر و تردّد کے باعث مُرجھا سا گیا تو ایک دن اُس کی ماں نے کہا

”سہیل کیا بات ہے، آج کل تم بہت اداس اداس رہتے ہو۔“

سہیل نے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں امی جان۔ موسم ہی کچھ ایسا ہے۔“

۔ موسم بے حد اچھا تھا۔ ہوا میں لطافت تھی۔ وکٹوریہ گارڈن میں جب وہ سیر کے لیے گیا تو اسے بیشمار پھول کھلے ہُوئے نظر آتے تھے۔ ہر رنگ کے ہریاول بھی عام تھے۔ درختوں کے پتے اب مٹیالے نہیں تھے۔ ہر شے دُھلی ہوئی نظر آتی تھی۔ مگر سہیل نے اپنی اداسی کا باعث موسم کی خرابی بتایا۔ ماں نے جب یہ بات سنی تو کہا۔

”سہیل تو مجھ سے چھپاتا ہے۔ دیکھ، سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔ عائشہ نے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ سہیل کے جی میں آئی کہ اپنی ماں سے کہہ دے۔

”ایسی ویسی بات ؟۔ امی جان اس نے ایسی بات کی ہے کہ میری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ مجھ سے پوچھے بغیر اس نے ماں بننے کا ارادہ کر لیا ہے۔“

مگر اس نے یہ بات نہ کہی اس لیے کہ یہ سن کر اس کی ماں یقینی طور پر خوش ہوتی۔

”نہیں امی۔ عائشہ نے کوئی ایسی بات نہیں کی وہ تو بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ آپ سے تو اسے بے پناہ محبت ہے۔ دراصل میری اداسی کا باعث۔ لیکن امی جان میں تو بہت خوش ہوں۔ یہ سن کر اس کی ماں نے دعائیہ لہجے میں کہا۔

”اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے عائشہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں تو اسے بالکل اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں۔ اچھا، پر سہیل یہ تو بتا اب میرے دل کی مراد کب پوری ہو گی۔“

سہیل نے مصنوعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہُوئے پوچھا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“

”تو سب سمجھتا ہے۔ میں پوچھتی ہوں کب تیرا لڑکا میری گود میں کھیلے گا۔ سہیل دل کی ایک آرزو تھی کہ تجھے دلہا بنتا دیکھوں، سو یہ آرزو خدا نے پوری کر دی۔ اب اس بات کی تمنا ہے کہ تجھے پھلتا پھولتا بھی دیکھوں۔“

سہیل نے اپنی ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”امی جان، آپ تو ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہیں، دو برس تک میں بالکل اولاد نہیں چاہتا۔“

”دو برس تک تُو۔ بالکل اولاد نہیں چاہتا، کیسے؟۔ یعنی تو اگر نہیں چاہے گا تو بچہ نہیں ہو گا؟۔ واہ، ایسا بھلا کبھی ہو سکتا ہے۔ اولاد دینا نہ دینا اس کے ہاتھ میں ہے اور ضرور دے گا۔ اللہ کے حکم سے کل ہی میری گود میں پوتا کھیل رہا ہو گا۔“

سہیل نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ کہتا بھی کیا۔ اگر وہ اپنی ماں کو بتا دیتا کہ عائشہ حاملہ ہو چکی ہے تو ظاہر ہے کہ سارا راز فاش ہو جاتا اور وہ بچے کی پیدائش روکنے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ شروع شروع میں اس نے سوچا تھا کہ شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے سُنا تھا کہ عورتوں کے حساب و کتاب میں کبھی کبھی ایسا ہیر پھیر ہو جایا کرتا ہے، ابھی تک یہ خیال اس کے دماغ میں جما ہوا تھا۔ اس کے موہوم ہونے پر بھی، اس کو امید تھی کہ چند ہی دنوں میں مطلع صاف ہو جائے گا۔ پندرہ بیس دن گزر گئے مگر مطلع صاف نہ ہوا، اب اسکی پریشانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ وہ جب بھولی بھالی عائشہ کی طرف دیکھتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی مداری کے تھیلے کی طرف دیکھ رہا ہے۔

”آج عائشہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ کتنی اچھی لگتی ہے لیکن مہینوں میں اس کا پیٹ پھول کر ٹھلیا بن جائے گا۔ ہاتھ پیر سُوج جائیں گے۔ ہوا میں عجیب عجیب خوشبوئیں اور بدبوئیں سونگھتی پھرے گی۔ قے کرے گی اور خدا معلوم کیا سے کیا بن جائے گی“!

سہیل نے اپنی پریشانی ماں سے چھپائے رکھی، بہن کو بھی پتہ نہ چلنے دیا مگر بیوی کو معلوم ہو ہی گیا۔ ایک روز سونے سے پہلے عائشہ نے بڑے تشویشناک لہجے میں اس سے کہا۔

”کچھ دنوں سے آپ مجھے بے حد مضطرب نظر آتے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟“

لُطف یہ ہے کہ عائشہ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ ایک دو بار اس نے سہیل سے کہا تھا کہ یہ اب کی دفعہ کیا ہو گیا ہے تو سہیل نے بات گول مول کر دی تھی اور کہا تھا کہ شادی کے بعد بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی ہی تبدیلی ہو گئی ہو۔“

مگر اب اسے سچی بات بتانا ہی پڑی۔

”عائشہ میں اس لیے پریشان ہوں کہ تم۔ تم اب ماں بننے والی ہو۔“

عائشہ شرما گئی۔

”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔“

”کیسی باتیں کرتا ہوں۔ اب جو حقیقت ہے میں نے تم سے کہہ دی ہے تمہارے لیے یہ خوشخبری ہو گی مگر خدا کی قسم اس نے مجھے کئی دنوں سے پاگل بنا رکھا ہے۔“

عائشہ نے جب سہیل کو سنجیدہ دیکھا تو کہا۔

”تو۔ تو۔ کیا سچ مچ؟۔“

”ہاں، ہاں۔ سچ مچ۔ تم ماں بننے والی ہو۔ خدا کی قسم جب میں سوچتا ہوں کہ چند مہینوں ہی میں تم کچھ اور ہی بن جاؤ گی تو میرے دماغ میں ایک ہل چل سی مچ جاتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اتنی جلدی بچہ پیدا ہو۔ اب خدا کے لیے تم کچھ کرو۔“

عائشہ یہ بات سن کر صرف محجوب سی ہو گئی تھی۔ حجاب کے علاوہ اس نے ہونے والے بچے کے متعلق کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ دراصل یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکی تھی کہ اسے خوش ہونا چاہیے یا گھبراہٹ کا اظہار کرنا چاہیے اس کو معلوم تھا کہ جب شادی ہُوئی ہے تو بچہ ضرور پیدا ہو گا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سہیل اتنا پریشان ہو جائے گا۔ سہیل نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔

”اب سوچتی کیا ہو۔ کچھ کرو تا کہ اس بچے کی مصیبت ٹلے۔“

عائشہ دل ہی دل میں ہونے والے بچے کے ننھے ننھے کپڑوں کے متعلق سوچ رہی تھی، سہیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کیا کہا؟“

”میں کہتا ہوں کچھ بندوبست کرو کہ یہ بچہ پیدا نہ ہو۔“

”بتایئے میں کیا کروں؟“

”اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے کیوں کہتا۔ تم عورت ہو۔ عورتوں سے ملتی رہی ہو۔ شادی پر تمہاری بیاہی ہُوئی سہیلیوں نے تمہیں کئی مشورے دیے ہونگے یاد کرو، کسی سے پوچھو۔ کوئی نہ کوئی ترکیب تو ضرور ہو گی۔“

عائشہ نے اپنے حافظہ پر زور دیا۔ مگر اسے کوئی ایسی ترکیب یاد نہ آئی مجھے تو آج تک کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پر میں پوچھتی ہُوں کہ اتنے دن آپ نے مجھ سے کیوں نہ کہا۔ جب بھی میں نے آپ سے اس بارے میں بات چیت کی آپ نے ٹال دیا۔“

”میں نے تمہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ شاید میرا واہمہ ہو، پر اب کہ بات بالکل پکی ہو گئی ہے۔ تمہیں بتانا ہی پڑا۔ عائشہ اگر اس کا کوئی علاج نہ ہوا تو خدا کی قسم بہت بڑی آفت آجائے گی۔ آدمی شادی کرتا ہے کہ چند برس ہنسی خوشی میں گُزارے، یہ نہیں کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں۔ جھٹ سے ایک بچہ پیدا ہو جائے۔ کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیتا ہُوں۔“

عائشہ نے جواب دماغی طور پر سہیل کی پریشانی میں شریک ہو چکی تھی۔

”کہا ہاں، کسی ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لینا چاہیے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ بچہ اتنی جلدی نہ ہو۔“

سہیل نے سوچنا شروع کیا۔ پولینڈ کا ایک ڈاکٹر اس کا واقف تھا، پچھلے دنوں جب شراب کی بندش ہوئی تھی تو وہ اس ڈاکٹر کے ذریعہ ہی سے وسکی حاصل کرتا تھا۔ پر اب وہ دیولالی میں نظر بند تھا۔ کیونکہ حکومت کو اس کی حرکات و سکنات پر شبہ ہو گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر اگر نظر بند نہ ہوتا تو یقیناً سہیل کا کام کر دیتا۔ اس پولستانی ڈاکٹر کے علاوہ ایک یہودی ڈاکٹر کو بھی وہ جانتا تھا جس سے اس نے اپنی چھاتی کے درد کا علاج کرایا تھا سہیل اس کے پاس چلا جاتا مگر اس کا چہرہ اتنا رعب دار تھا کہ وہ اس سے ایسی بات کے متعلق ارادے کے باوجود مشورہ نہ لے سکتا۔ یوں تو بمبئی میں ہزاروں ڈاکٹر موجود تھے مگر بغیر واقفیت اس معاملے کے متعلق بات چیت ناممکن تھی۔ بہت دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد معاً اس کو مس فریا کا خیال آیا جو ناگپاڑے میں پریکٹس کرتی تھی اور اس کا خیال آتے ہی مس فریا اس کے آنکھوں کے سامنے آگئی۔ موٹے اور بھاری جسم کی یہ کرسچین عورت عجیب و غریب کپڑے پہنتی تھی۔ ناگپاڑے میں کئی یہودی، کرسچین اور پارسی لڑکیاں رہتی ہیں۔ سہیل نے ان کو ہمیشہ چست اور شوخ رنگ لباسوں میں دیکھا تھا۔ سکرٹ گھٹنوں سے ذرا نیچی، ننگی پنڈلیاں، اونچی ایڑی کی سینڈل، سر کے بال کٹے ہُوئے، ان میں لہریں پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے، ہونٹوں پر گاڑی سرخی، گالوں پر اُڑے اُڑے رنگ کا غازہ، بھویں مونڈ کر تیکھی بنائی ہوئی۔ ان لڑکیوں کا بناؤ سنگھار کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ نگاہیں ان چیزوں کو پہلے دیکھتی تھیں جن سے عورت بنتی ہے۔ مگر مس فریا ٹخنوں تک لمبا ڈھیلا ڈھالا فراک پہنتی تھی۔ پنڈلیاں ہمیشہ موٹی جرابوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ شو پہنتی تھی بہت ہی پرانے فیشن کے بال کٹے ہُوئے تھے مگر ان میں لہریں پیدا کرنے کی طرف وہ کبھی توجہ ہی نہیں دیتی تھی، اس بے توجہی کے باعث اس کے بالوں میں ایک عجیب قسم کی بے جانی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ رنگ کالا تھا جو کبھی کبھی سنولاہٹ بھی اختیار کر لیتا تھا۔ عائشہ نے تھوڑی دیر تک بچے کی پیدائش کے متعلق غور کیا اور سہیل کے پہلو میں سو گئی۔ غور و فکر ہمیشہ اس کو سلا دیا کرتا تھا۔ عائشہ سو گئی مگر سہیل جاگتا رہا اور مس فریا کے متعلق سوچتا رہا۔ ٹھیک ایک برس پہلے انہی دنوں میں جب اس کے کمرے میں نہ یہ نیا پلنگ تھا جو عائشہ جہیز میں لائی تھی۔ اور نہ خود عائشہ تھی تو سہیل نے ایک بار مس فریا کو خاص زاویے سے دیکھا تھا۔ سہیل کی بہن کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ بچہ کب پیدا ہو گا۔ مس فریا کو بلایا گیا تھا۔ سہیل تازہ تازہ بمبئی آیا تھا۔ ناگپاڑے کی شوخ تیتریاں دیکھ دیکھ کر جو بالکل اس کے پاس سے پھڑ پھڑاتی ہوئی گزر جاتی تھیں اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ان سب کو پکڑ کر اپنی جیب میں رکھ لے مگر جب یہ خواہش پوری نہ ہُوئی اور وہ ناامیدی کی حد تک پہنچ گیا تو اسے مس فریا دکھائی دی۔ پہلی نظر میں سہیل کے جمالیاتی ذوق کو صدمہ سا پہنچا۔

”کیسی بے ڈول عورت ہے۔ لباس کیسا بیہودہ ہے اور قد۔ تھوڑے ہی دنوں میں بھینس بن جائے گی۔“

مس فریا نے اس روز کالے رنگ کی جالی دار ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جس میں تین چار شوخ رنگ کے پھندنے لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کیچڑ میں آلوچے گر پڑے ہیں۔ فراک جو ٹخنوں تک بڑے اُداس انداز میں لٹک رہا تھا چھپی ہُوئی جارجٹ کا تھا۔ پھول خوشنما تھے، کپڑا بھی اچھا تھا مگر بہت ہی بھونڈے طریقے پر سیا گیا تھا۔ مس فریا جب دوسرے کمرے سے فارغ ہو کر آئی تو اس نے سہیل سے انگریزی میں کہا۔

”غسل خانہ کدھر ہے۔ مجھے ہاتھ دھونے ہیں۔“

غسل خانے میں سہیل نے مس فریا کو بہت قریب سے دیکھا تو اسے نسوانیت کے کئی ذرّے اس کے ساتھ چمٹے ہُوئے نظر آئے۔ سہیل نے اب اسے پسند کرنے کی نیت سے دیکھنا شروع کیا۔

”بُری نہیں۔ آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میک اپ نہیں کرتی تو کیا ہوا۔ ٹھیک ہے۔ ہاتھ کیسے اچھے ہیں۔“

مس فریا کے بالائی ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ کام کرنے کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ سہیل نے جب انکی طرف دیکھا تو مس فریا اسے پسند آ گئی۔ پسینے کی یہ پھوارسی جو اس کی مونچھوں کی روئیں پر کپکپا رہی تھی اسے بہت ہی بھلی معلوم ہُوئی۔ سہیل کے جی میں آئی کہ وہ کچھ کرنا شروع کر دے جس سے اس کا سارا جسم عرق آلود ہو جائے۔ مس فریا جب ہاتھ پونچھ کر فارغ ہو گئی تو اس نے سہیل کی ماں سے کہا۔

”آپ ان کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے میں دوا تیار کر کے دے دوں گی اور استعمال کرنے کی ترکیب بھی سمجھا دوں گی۔“

ناگپاڑے تک جہاں وہ پریکٹس کرتی تھی، وکٹوریہ میں، سہیل نے اس سے کوئی خاص بات نہ کی۔ کونین کے متعلق اس نے چند باتیں دریافت کیں کہ ملیریا میں کتنی مقدار اسکی کھانی چاہیے۔ پھر اس نے دانتوں کی صفائی کے بارے میں اس سے کچھ معلومات حاصل کیں کہ اتنے میں وہ جگہ آ گئی جہاں مس فریا۔ ایم۔ بی بی۔ ایس کا بورڈ لٹکا رہتا تھا۔ پہلی منزل کے ایک کمرے میں مس فریا کا مطب تھا۔ اس کمرے کے دو حصے کیے گئے تھے، ایک حصے میں مس فریا کی میز تھی جہاں وہ عام طور پر بیٹھتی تھی۔ دوسرے حصّے میں اس کی ڈسپنسری تھی۔ ڈسپنسری کی دوالماریوں کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا تخت بھی تھا جس پر غالباً وہ مریض لٹا کر دیکھا کرتی تھی۔ مس فریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوپی اُتار دی اور ایک کیل پر لٹکا دی۔ سہیل اس بنچ پر بیٹھ گیا جو میز کے پاس بچھی تھی۔ ٹوپی اتار کر مس فریا نے نیم انگریزی اور نیم ہندوستان لہجہ میں آواز دی، چھوکرا۔ کمرے کے دوسرے حصّے سے ایک مریل سا آدمی نکل آیا اور کہنے لگا۔

”ہاں میم صاحب۔“

میم صاحب کچھ نہ بولیں اور دوا بنانے کے لیے اندر چلی گئیں۔ سہیل اس دوران میں سوچتا رہا کہ مس فریا سے کسی طرح دوستی پیدا کرنی چاہیے وہ تھوڑا سا وقت جو اسے ملا اسی سوچ بچار میں خرچ ہو گیا اور مس فریا دوا بنا کر لے آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے شیشی پر گوند سے لیبل چپکایا اور پڑیوں پر نمبر لگانے کے بعد کہا۔

”یہ دو دوائیں ہیں۔ پڑیا ابھی جا کر پانی کے ساتھ دے دیجیے اور اس میں سے ایک خوراک آدھے گھنٹے کے بعد پلا دیجیے گا۔ پھر ہر تیسرے گھنٹے کے بعد اسی طرح۔“

سہیل نے پڑیاں اٹھا کر جیب میں رکھ لیں۔ شیشی ہاتھ میں لے لی، اور مس فریا کی طرف کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ گھبرا گئی۔

”آپ بھول تو نہیں گئے۔“

سہیل نے اسی انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھولا نہیں مجھے سب کچھ یاد ہے۔“

مس فریا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

”تو۔ تو۔ ٹھیک ہے۔“

سہیل دراصل اپنے ارادہ کو مکمل کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ مس فریا نے چند کاغذات اٹھا کر میز کے ایک طرف رکھ دیے۔

”اس کے۔ اُس کے دام؟“

سہیل نے خاموشی سے بٹوہ نکالا۔

”کتنے ہوئے۔“

یہ کہہ کر اس نے پانچ کا نوٹ بڑھا دیا۔ مس فریا نے نوٹ لیا۔ میز کی دراز کھول کر اس میں رکھا۔ جلدی جلدی ریز گاری نکالی اور حساب کر کے باقی پیسے سہیل کی طرف بڑھا دیے۔ سہیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی سے کہا۔

”تمہارا ہاتھ کتنا خوبصورت ہے۔“

مس فریا تھوڑی دیر تک فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

سہیل نے بڑے ہی خام انداز میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا جیسے وہ اسٹیج پر عشقیہ پارٹ ادا کر رہا ہے۔

”میں تم سے محبت کرتا ہُوں۔“

سہیل کو جب مس فریا کے لہجے میں کُھردرا پن محسوس ہوا تو وہ چونکا اس نے لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ اینگلو انڈین اور کرسچین لڑکیاں فوراً ہی پھنس جایا کرتی ہیں۔ چنانچہ اسی سُنی سُنائی بات کے زیر اثر اس نے اتنی جرأت کی تھی مگر یہاں جب اسے معاملہ بالکل برعکس نظر آیا تو اس نے جلدی سے دوا کی شیشی اٹھائی اور کہا۔

”میں آپ سے معافی چاہتا ہوں دراصل مجھے آپ سے ایسی فضول باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ میں۔ میں نہ جانے کیا بک گیا۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔“

مس فریا اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اس کا غصّہ کچھ کم ہو گیا۔

”تم نے جو کچھ کیا ہے اس پر مجھے بے حد غصّہ آیا تھا۔ مگر میں اب تمہاری طرف دیکھتی ہُوں تو مجھے تم بہت ہی معصوم نظر آتے ہو۔ بیوقوفی کی حد تک معصوم، جاؤ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔“

سہیل سہم سا گیا۔ مس فریا کو وہ اسکول کی استانی سمجھنے لگا۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔“

مس فریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا نہ ہوئی جو سہیل چاہتا تھا کہ پیدا ہو۔

”جاؤ میں نے کہہ دیا کہ پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ دوا کسی اور جگہ سے نہ لینا۔ کل یہیں چلے آنا۔ اور دیکھو تم نے میرے آنے جانے کے پیسے نہیں دیے۔“

سہیل نے پوچھا۔

”کتنے ہوتے ہیں۔“

”بارہ آنے۔“

سہیل نے بارہ آنے میز پر رکھ دیے اور جب وہ بازار میں پہنچا تو اُس نے خیال کیا کہ وکٹوریہ والے کو تو وہ بارہ آنے ادا کر چکا تھا لیکن اس نے سوچا کہ چلو، بلا ٹل گئی ہے، کیا ہوا اگر بارہ آنے زیادہ چلے گئے۔ سہیل کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ امر تسر میں وہ کئی لڑکیوں سے ایسی اور اس سے بھی سخت جھڑکیاں کھا چکا تھا۔ چند گھنٹوں تک اس واقعہ کا سہیل پر بہت ہی زیادہ اثر رہا۔ لیکن جب وہ دوسرے دن مس فریا کے ہاں دوا لینے کے لیے گیا تو اس نے دوسرے گاہکوں کی طرح اس سے بات چیت کی تو وہ شرمندگی جس کا تھوڑا سا احساس باقی رہ گیا تھا دُور ہو گئی۔ دس بارہ روز تک وہ متواتر دوا لینے کے لیے مس فریا کے ہاں جاتا رہا۔ اس دوران میں کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے سہیل کے دماغ میں اس خفت انگیز واقعہ کی یاد تازہ ہوتی اس کے بعد اس کی بہن تندرست ہو گئی اور مس فریا اس عرصہ کے لیے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اب ایک دم بارہ تیرہ مہینے کے بعد سہیل کو اس کا خیال آیا اور اس نے اس سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا۔

”عورت کو روپے پیسے کا بہت لالچ ہے میرا خیال ہے کہ وہ ضرور اس معاملہ میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہو جائے گی اور پھر اس واقعہ کو اس بات سے کیا تعلق ہے۔ اگر وہ میرا کام کر دے گی تو میں اسے منہ مانگے دام ادا کر دوں گا۔“

دوسرے روز شام کو وہ مس فریا کے پاس گیا۔ سہیل کو دیکھ کر اس نے بڑے کاروباری انداز میں کہا۔

”بہت مدت کے بعد تشریف لائے۔“

سہیل شادی کے بعد اب کافی تبدیل ہو چکا تھا آرام سے بنچ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ اس دوران میں کوئی بیمار نہیں ہوا اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ مس فریا مسکرائی۔

”اب کیسے آنا ہوا۔“

سہیل نے جواب دیا۔

”میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا ہوں۔“

مس فریا نے اور زیادہ متوجہ ہو کر پوچھا۔

”آپ کی شادی ہو گئی۔“

”جی ہاں۔ ہو گئی۔“

”کب ہوئی۔“

”ایک مہینہ پہلے۔“

”صرف ایک مہینہ۔“

مس فریا نے کرسی پر اپنا پہلو بدلا۔

”کیسی ہے آپکی بیوی۔“

سہیل نے بالکل رسمی انداز میں جواب دیا۔

”بہت اچھی ہے۔“

”میر امطلب ہے کہ۔ کہ۔ خوبصورت ہے ؟۔ ضرور خوبصورت ہو گی۔ پنجاب کی لڑکیاں عام طور پر خوبصورت ہوتی ہیں۔“

سہیل نے فریا کی طرف دیکھا چہرے پر اس نے پوڈر لگار کھا تھا جس سے رنگ بہت ہی بدنما ہو گیا تھا۔ بال خشک اور بے جان تھے۔ فراک بھی نہایت بھونڈا تھا۔ جب اس نے عائشہ کا خیال کیا تو فریا اسے بھنگن معلوم ہُوئی۔ دل ہی دل میں وہ ہنسا اور پرانا بدلہ لینے کی خاطر اس نے کہا۔

”میری بیوی بہت خوبصورت ہے۔ تم اسے دیکھو گی تو پتہ چلے گا۔“

مس فریا نے شاید یہ بات نہ سنی، کیونکہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی

”تو ایک مہینے سے تم عیش کر رہے ہو۔“

سہیل نے پھر اسے جلانے کے لیے کہا

”انسان کو زندگی میں ایک بار ہی ایسا موقع ملتا ہے۔ کیوں نہ اس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔“

”ہاں، ہاں ضرور فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ مگر۔ مگر زیادہ نہیں۔ تم ضرور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوں گے۔“

مس فریا کے لہجے میں ایک عجیب قسم کی للچاہٹ تھی۔ سہیل کو اس گفتگو میں مزہ آنے لگا مسکرا کر اس نے کہا

”زیادہ سے زیادہ کیوں نہ اُٹھایا جائے۔ یہی وقت تو ہے کہ جی بھر کے لُطف اُٹھایا جائے بیوی اچھی ہو۔ طبعیتیں آپس میں مل جائیں۔ جوانی ہو۔ حالات ساز گار ہوں، موسم خوشگوار ہو تو۔

“

مس فریا مضطرب ہو گئی۔ یہ اضطراب چھپانے کی خاطر اس نے کہا۔

”آپ۔ آپ کس قسم کا مشورہ لینے کے لیے آئے ہیں۔“

”میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا تھا۔“

”مس فریا پھر اسی رو میں بہہ گئی۔“

میں۔ میں اسکو ضرور دیکھونگی۔ مجھے۔ مجھے خوشی ہو گی۔ کسے معلوم تھا کہ تم اتنی جلدی شادی کر لو گے۔ تمہاری زندگی میں۔ میر امطلب ہے کہ تمہاری زندگی میں ضرور ایک بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہو گی۔ سہیل نے جواب دیا۔

”تبدیلی۔ کوئی خاص تبدیلی پیدا تو نہیں ہوئی۔ میں پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ خاص فرق پڑ بھی کیا سکتا ہے۔ ہر حال میں خوش ہُوں، بہت ہی خوش ہُوں۔ شادی بہت اچھی چیز ہے ؟ مس فریا نے تھوک نگل کر کہا۔

”کیا شادی واقعی بہت اچھی چیز ہے ؟“

”بہت ہی اچھی چیز ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی شادی کر لو۔“

مس فریا نے میز پر سے رنگین تیلیوں کا بنا ہوا جاپانی پنکھا اُٹھایا اور جھلنا شروع کر دیا۔

”مجھے اپنی بیوی کے متعلق کچھ اور بتاؤ۔ یعنی تمہاری ازدواجی زندگی کیسے گزر رہی ہے۔ اسکے خیالات کیا ہیں۔“

فریا کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اسکے ہونٹ کچھ اس انداز سے باتیں کرتے وقت کھل رہے تھے کہ سہیل کو محسوس ہوا فریا کے چہرے پر منہ کے بجائے ایک زخم ہے جس کے ٹانکے اُدھڑ رہے ہیں۔ سہیل نے غور سے اسکی طرف دیکھا اور یوں دیکھتے ہُوئے وہ ایک برس پیچھے چلا گیا۔ جب اس نے بڑی نیک نیتی سے اس عورت میں چند خوبصورتیاں تلاش کی تھیں اور ان کا سہارا لے کر اس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی ایک نہایت ہی بھونڈی کوشش کی تھی۔ اب وہی عورت اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی پنکھا جھل کر اپنا اندرونی اضطراب ہلکا کر رہی تھی، ایک برس اس کے کالے چہرے اور خشک بالوں پر سے مزید سیاہی اور خشکی پیدا کیے بغیر گزر گیا تھا۔ مگر سہیل اب بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مس فریا نے اس سے کہا۔

”تم کتنے تبدیل ہو گئے ہو۔ اب تم پورے مرد بن چکے ہو۔“

سہیل نے فریا کی طرف دیکھا۔ اس کی مونچھوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر اب اس کے دل میں وہ پہلی سی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ مس فریا نے پنکھا میز پر رکھ دیا اور کہنیاں ٹیک کر سہیل کی طرف ان بلیوں کی طرح دیکھنے لگی جو موسم بہار میں لوٹ کر اُداس اداس آوازیں نکالا کرتی ہیں۔ سہیل نے پنکھے کی ایک اکھڑی ہُوئی تیلی نوچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مس فریا نے اسے آہستہ سے پکڑ کر کہا۔

”یاد ہے تمہیں، ایک دفعہ اسی طرح تم نے میرا ہاتھ دبایا تھا۔“

مس فریا کی آواز لرزاں تھی۔ سہیل نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بڑے خشک لہجہ میں کہا۔

”مس فریا۔ تمہاری یہ حرکت بہت ہی نازیبا ہے۔ دیکھو، پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا بٹوا لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا اور بارہ آنے نکال کر میز پر رکھ دیے۔

”یہ رہا تمہارے آنے جانے کا کرایہ۔“

سہیل جب نیچے اُترا تو بازار میں چلتے ہُوئے اس نے سوچا۔

”جب بچہ پیدا ہو گا تو میں اسے گود میں اٹھا کر مس فریا کے پاس ضرور آؤں گا اور فخر کے ساتھ کہوں گا، اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

سہیل بہت خوش تھا۔ جب اس نے مزا لینے کی خاطر یہ سارا واقعہ دھرایا تو آخر میں بارہ آنے آئے جو اس نے کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے نکال کر مس فریا کی میز پر رکھے تھے۔

”ارے۔ میں نے اسے بارہ آنے کیوں دیے۔ یہ کرایہ کس کا تھا؟“

سہیل جب اس کا جواب تلاش نہ کر سکا تو بے اختیار ہنس پڑا۔

مِس مالا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومِس مالا

گانے لکھنے والے عظیم گوبد پوری جب اے بی سی پروڈکشنز میں ملازم ہوا تو اس نے فوراً اپنے دوست میوزک ڈائریکٹر بھٹساوے کے متعلق سوچا جو مرہٹہ تھا اور عظیم کے ساتھ کئی فلموں میں کام کر چکا تھا۔ عظیم اس کی اہلیتوں کو جانتا تھا۔ سٹنٹ فلموں میں آدمی اپنے جوہر کیا دکھا سکتا ہے، بے چارہ گمنامی کے گوشے میں پڑا تھا۔ عظیم نے چنانچہ اپنے سیٹھ سے بات کی اور کچھ اس انداز میں کی کہ اس نے بھٹساوے کو بلایا اور اس کے ساتھ ایک فلم کا کنٹریکٹ تین ہزار روپوں میں کر لیا۔ کنٹریکٹ پر دستخط کرتے ہی اسے پانچ سو روپے ملے جو اس نے اپنے قرض خواہوں کو ادا کر دیے۔ عظیم گوبند پوری کا وہ بڑا شکر گزار تھا۔ چاہتا تھا کہ اس کی کوئی خدمت کرے، مگر اس نے سوچا، آدمی بے حد شریف ہے اور بے غرض۔ کوئی بات نہیں، آئندہ مہینے سہی۔ کیوں کہ ہر ماہ اسے پانچ سو روپے کنٹریکٹ کی رو سے ملنے تھے۔ اس نے عظیم سے کچھ نہ کہا۔ دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ عظیم نے دس گانے لکھے جن میں سے سیٹھ نے چار پسند کیے۔ بھٹساوے نے موسیقی کے لحاظ سے صرف دو۔ ان کے اس نے عظیم کے اشتراک سے دھنیں تیار کیں جو بہت پسند کی گئیں۔ پندرہ بیس روز تک ریہر سلیں ہوتی رہیں۔ فلم کا پہلا گانا کورس تھا۔ اس کے لیے کم از کم دس گویا لڑکیاں درکار تھیں۔ پروڈکشن منیجر سے کہا گیا۔ مگر جب وہ انتظام نہ کر سکا تو بھٹساوے نے مس مالا کو بلایا جس کی آواز اچھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پانچ چھ اور لڑکیوں کو جانتی تھی جو سر میں گا لیتی تھی۔ مس مالا کھانڈیکر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ کولہاپور کی مرہٹہ تھی۔ دوسروں کے مقابلہ میں اس کا اردو کا تلفظ زیادہ صاف تھا۔ اس کو یہ زبان بولنے کا شوق تھا۔ عمر کی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ لیکن اس کے چہرے کا ہر خدوخال اپنی جگہ پر پختہ۔ باتیں بھی اسی انداز میں کرتی کہ معلوم ہوتا اچھی خاصی عمر کی ہے، زندگی کے اتار چڑھاؤ سے باخبر ہے۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن کو بھائی جان کہتی اور ہر آنے والے سے بہت جلد گھل مل جاتی تھی۔ اس کو جب بھٹساوے نے بلایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کے ذمے یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ فوراً کورس کے لیے دس گانے والی لڑکیاں مہیا کر دے۔ وہ دوسرے روز ہی بارہ لڑکیاں لے آئی۔ بھٹساوے نے ان کا ٹیسٹ لیا۔ سات کام کی نکلیں۔ باقی رخصت کر دی گئیں۔ اس نے سوچا کہ چلو ٹھیک ہے۔ سات ہی کافی ہے۔ جگتاپ ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے مشورہ کیا، اس نے کہا کہ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ ایسی ریکارڈنگ کروں گا کہ لوگوں کو ایسا معلوم ہو گا بیس لڑکیاں گا رہی ہیں۔ جگتاپ اپنے فن کو سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے ریکارڈنگ کے لیے ساؤنڈ پروف کمرے کے بجائے سازندوں اور گانے والیوں کو ایک ایسے کمرے میں بٹھایا جس کی دیواریں سخت تھیں، جن پر ایسا کوئی غلاف چڑھا ہوا نہیں تھا کہ آواز دب جائے۔ فلم

”بے وفا“

کا مہورت اسی کورس سے ہوا۔ سینکڑوں آدمی آئے۔ ان میں بڑے بڑے فلمی سیٹھ اور ڈسٹری بیوٹرز تھے۔ اے، بی، سی پروڈکشنز کے مالک نے بڑا اہتمام کیا ہوا تھا۔ پہلے گانے کی دو چار ریہر سلیں ہوئیں، مس مالا کھانڈیکر نے بھٹساوے کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ سات لڑکیوں کو فرداً فرداً آگاہ کیا کہ خبردار رہیں اور کوئی مسئلہ پیدا نہ ہونے دیں۔ بھٹساوے پہلی ہی ریہرسل سے مطمئن تھا لیکن اس نے مزید اطمینان کی خاطر چند اور ریہر سلیں کرائیں، اس کے بعد جگتاپ سے کہا کہ وہ اپنا اطمینان کر لے، اس نے جب ساؤنڈ ٹریک میں یہ کورس پہلی مرتبہ ہیڈ فون لگا کر سنا تو اس نے خوش ہو کر بہت اونچا

”اوکے“

کہہ دیا۔ ہر ساز اور ہر آواز اپنے صحیح مقام پر تھی۔ مہمانوں کے لیے مائکروفون کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ ریکاڈنگ شروع ہوئی تو اسے اون کر دیا گیا۔ بھٹساوے کی آواز بھونپو سے نکلی۔ سونگ نمبر 1، ٹیک فرسٹ ریڈی، ون۔ ٹو۔ اور کورس شروع ہو گیا۔ بہت اچھی کمپوزیشن تھی۔ سات لڑکیوں میں سے کسی ایک نے بھی کہیں غلط سر نہ لگایا۔ مہمان بہت محظوظ ہوئے۔ سیٹھ، جو موسیقی کیا ہوتی ہے؟ اس سے بھی قطعاً نا آشنا تھا، بہت خوش ہوا، اس لیے کہ سارے مہمان اس کورس کی تعریف کر رہے تھے۔ بھٹساوے نے سازندوں اور گانے والیوں کو شاباشیاں دیں۔ خاص طور پر اس نے مس مالا کا شکریہ ادا کیا جس نے اس کو اتنی جلدی گانے والیاں فراہم کر دیں۔ اس کے بعد وہ جگتاپ ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے گلے مل رہا تھا کہ اے، بی، سی پروڈکشنز کے مالک سیٹھ رنچھوڑ داس کا آدمی آیا کہ وہ اسے بلا رہے ہیں، عظیم گوبندپوری کو بھی۔ دونوں بھاگے، اسٹوڈیو کے اس سرے پر گئے جہاں محفل جمی تھی۔ سیٹھ صاحب نے سب مہمانوں کے سامنے ایک سو روپے کا سبز نوٹ انعام کے طور پر پہلے بھٹساوے کو دیا۔ پھر دوسرا عظیم گوبندپوری کو، وہ مختصر سا باغیچہ جس میں مہمان بیٹھے تھے، تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ جب مہورت کی یہ محفل برخواست ہوئی تو بھٹساوے نے عظیم سے کہا

”مال پانی ہے چلو آوٹ ڈور چلیں“

عظیم اس کا مطلب نہ سمجھا۔

”آوٹ ڈور کہاں؟“

بھٹساوے مسکرایا۔

”مازے لگے (میرے لڑکے) موز شوک (موج شوق) کرنے جائیں گے۔ سو روپیہ تمہارے پاس ہے سو، ہمارے پاس۔ چلو“

عظیم سمجھ گیا۔ لیکن وہ اس کے موز شوک سے ڈرتا تھا، اس کی بیوی تھی، دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی، اس نے کبھی عیاشی نہیں کی تھی۔ مگر اس وقت وہ خوش تھا۔ اس نے اپنے دل سے کہا۔ چلو رے۔ دیکھیں گے کیا ہوتا ہے؟ بھٹساوے نے فوراً ٹیکسی منگوائی، دونوں اس میں بیٹھے اور گرانٹ روڈ پہنچے۔ عظیم نے پوچھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟ بھٹساوے“!

وہ مسکرایا۔

”اپنی موسی کے گھر“

اور جب وہ اپنی موسی کے گھر پہنچا تو وہ مس مالا کھانڈیکر کا گھر تھا۔ وہ ان دونوں سے بڑے تپاک کے ساتھ ملی، انھیں اندر اپنے کمرے میں لے گئی۔ ہوٹل سے چائے منگوا کر پلائی۔ بھٹساوے نے اس سے چائے پینے کے بعد کہا۔

”ہم موز شوک کے لیے نکلے ہیں، تمہارے پاس۔ تم ہمارا کوئی بندوبست کرو۔“

مالا سمجھ گئی وہ بھٹساوے کی احسان مند تھی۔ اس لیے اس نے فوراً مرہٹی زبان میں کہا جس کا یہ مطلب تھا کہ میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔ دراصل بھٹساوے عظیم کو خوش کرنا چاہتا تھا، اس لیے کہ اس نے اس کو ملازمت دلوائی تھی۔ چنانچہ بھٹساوے نے مس مالا سے کہا کہ وہ ایک لڑکی مہیا کر دے۔ مس مالا نے اپنا میک اپ جلدی جلدی ٹھیک کیا اور تیار ہو گئی۔ سب ٹیکسی میں بیٹھے۔ پہلے مس مالا پلے بیک سنگر شانتا کرناکرن کے گھر گئی مگر وہ کسی اور کے ساتھ باہر جا چکی تھی۔ پھر وہ انسویا کے ہاں گئی۔ مگر وہ اس قابل نہیں تھی کہ ان کے ساتھ ایسی مہم پر جا سکے۔ مس مالا کو بہت افسوس تھا کہ اسے دو جگہ ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کو امید تھی کہ معاملہ ہو جائے گا چنانچہ ٹیکسی گول پیٹھا کی طرف چلی۔ وہاں کرشنا تھی۔ پندرہ سولہ برس کی گجراتی لڑکی، بڑی نرم و نازک سُر میں گاتی تھی۔ مالا اس کے گھر میں داخل ہوئی اور چند لمحات کے بعد اس کو ساتھ لیے باہر نکل آئی۔ بھٹساوے کو اس نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا اور عظیم کو بھی۔ مالا نے ٹھیٹ دلالوں کے سے انداز میں عظیم کو آنکھ ماری اور گویا خاموش زبان میں اس سے کہا۔

”یہ آپ کے لیے ہے۔“

بھٹساوے نے اس پر نگاہوں ہی نگاہوں میں صادر کر دیا۔ کرشنا، عظیم گوبندپوری کے پاس بیٹھ گئی۔ چونکہ اس کو مالا نے سب کچھ بتا دیا تھا، اس لیے وہ اس سے چہلیں کرنے لگی۔ عظیم لڑکیوں کا سا حجاب محسوس کر رہا تھا۔ بھٹساوے کو اس کی طبیعت کا علم تھا۔ اس لیے اس نے ٹیکسی ایک بارک کے سامنے ٹھہرائی، صرف عظیم کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ نغمہ نگار نے صرف ایک دو مرتبہ پی تھی، وہ بھی کاروباری سلسلے میں۔ یہ بھی کاروباری سلسلہ تھا۔ چنانچہ اس نے بھٹساوے کے اصرار پر دو پیگ رم کے پیے اور اس کو نشہ ہو گیا۔ بھٹساوے نے ایک بوتل خرید کے اپنے ساتھ رکھ لی۔ اب وہ پھر ٹیکسی میں تھے۔ عظیم کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کا دوست بھٹساوے دو گلاس اور سوڈے کی بوتلیں بھی ساتھ لے آیا ہے۔ عظیم کو بعد میں معلوم ہوا کہ بھٹساوے پلے بیک سنگر کرشنا کی ماں سے یہ کہہ آیا تھا کہ جو کورس دن میں لیا گیا تھا، اس کے جتنے ٹیک تھے سب خراب نکلے ہیں اس لیے رات کو پھر ریکارڈنگ ہو گی۔ اس کی ماں ویسے کرشنا کو باہر جانے کی اجازت کبھی نہ دیتی۔ مگر جب بھٹساوے نے کہا کہ اسے اور روپے ملیں گے تو اس نے اپنی بیٹی سے کہا جلدی جاؤ اور فارغ ہو کر سیدھی یہاں آؤ۔ وہاں اسٹوڈیو میں نہ بیٹھی رہنا۔ ٹیکسی ورلی پہنچی، یعنی ساحلِ سمندر کے پاس۔ یہ وہ جگہ تھی، جہاں عیش پرست کسی نہ کسی عورت کو بغل میں دبائے آیا کرتے۔ ایک

پہاڑی سی تھی، معلوم نہیں مصنوعی یا قدرتی۔ اس پر چڑھتے۔ کافی وسیع و عریض سطح مرتفع قسم کی جگہ تھی۔ اس میں لمبے فاصلوں پر بنچیں رکھی ہوئی تھیں، جن پر صرف ایک ایک جوڑا بیٹھتا۔ سب کے درمیان ان لکھا سمجھوتا تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے کے معاملے میں مخل نہ ہوں۔ بھٹساوے نے جو کہ عظیم کی دعوت کرنا چاہتا تھا ورلی کی پہاڑی پر کرشنا کو اس کے سپرد کر دیا۔ اور خود مالا کے ساتھ ٹہلتا ٹہلتا ایک جانب چلا گیا۔ عظیم اور بھٹساوے میں ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ہو گا۔ عظیم جس نے غیر عورت کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ محسوس کیا تھا۔ جب کرشنا کو اپنے ساتھ لگے دیکھا تو اس کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ کرشنا ٹھیٹ مرہٹی لڑکی تھی، سانولی سلونی، بڑی مضبوط، شدید طور پر جوان اور اس میں وہ تمام دعوتیں تھیں جو کسی کھل کھیلنے والی میں ہو سکتی ہیں، عظیم چونکے نشے میں تھا، اس لیے وہ اپنی بیوی کو بھول گیا اور اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کرشنا کو تھوڑے عرصے کے لیے بیوی بنا لے۔ اس کے دماغ میں مختلف شرارتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ کچھ رم کے باعث اور کچھ کرشنا کی قربت کی وجہ سے۔ عام طور پر وہ بہت سنجیدہ رہتا تھا۔ بڑا کم گو۔ لیکن اس وقت اس نے کرشنا کے گدگدی کی۔ اس کو کئی لطیفے اپنی ٹوٹی پھوٹی گجراتی میں سنائے۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ زور سے بھٹساوے کو آواز دی اور کہا۔

”پولیس آ رہی ہے۔ پولیس آ رہی ہے۔“

بھٹساوے، مالا کے ساتھ آیا۔ عظیم کو موٹی سی گالی دی اور ہنسنے لگا وہ سمجھ گیا تھا کہ عظیم نے اس سے مذاق کیا ہے۔ لیکن اس نے سوچا، بہتر یہی ہے کسی ہوٹل میں چلیں، جہاں پولیس کا خطرہ نہ ہو۔ چاروں اٹھ رہے تھے کہ پیلی پگڑی والا نمودار ہوا۔ اس نے ٹھیٹ سپاہیانہ انداز میں پوچھا۔

”تم لوگ رات کے گیارہ بجے یہاں کیا کر رہا ہے؟ مالوم نہیں، دس بجے سے پیچھے یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے، کانون ہے۔“

عظیم نے سنتری سے کہا۔

”جناب اپن فلم کا آدمی ہے، یہ چھوکری، اس نے کرشنا کی طرف دیکھا۔ یہ بھی فلم میں کام کرتی ہے۔ ہم لوگ کسی برے خیال سے یہاں نہیں آئے، یہاں پاس ہی جو اسٹوڈیو ہے، اس میں کام کرتے ہیں، تھک جاتے ہیں تو یہاں چلے آتے ہیں کہ تھوڑی سی تفریح ہو گئی، بارہ بجے ہماری شوٹنگ پھر شروع ہونے والی ہے۔“

پیلی پگڑی والا مطمئن ہو گیا، پھر وہ بھٹساوے سے مخاطب ہوا۔

”تم ادھر کیوں بیٹھا ہے؟“

بھٹساوے پہلے گھبرایا۔ لیکن فوراً سنبھل کر اس نے مالا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور سنتری سے کہا۔

”یہ ہمارا وائف ہے، ہماری ٹیکسی نیچے کھڑی ہے۔“

تھوڑی سی اور گفتگو ہوئی اور چاروں کی خلاصی ہو گئی۔ اس کے بعد انھوں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر سوچا کہ کس ہوٹل میں چلیں۔ عظیم کو ایسے ہوٹلوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ جہاں آدمی چند گھنٹوں کے لیے کسی غیر عورت کے ساتھ خلوت اختیار کر سکے۔ بھٹساوے نے بیکار اس سے مشورہ کیا۔ چنانچہ اس کو فوراً ڈوک یارڈ کا سی ویو ہوٹل یاد آیا اور اس نے ٹیکسی والے سے کہا کہ وہاں لے چلو۔ سی ویو ہوٹل میں بھٹساوے نے دو کمرے لیے۔ ایک میں عظیم اور شانتا چلے گئے، دوسرے میں بھٹساوے اور مس مالا کھانڈیکر۔ کرشنا بدستور مجسم دعوت تھی، لیکن عظیم جس نے دو پیگ اور پی لیے تھے، فلسفی رنگ اختیار کر گیا تھا، اس نے کرشنا کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ اتنی کم عمر کی لڑکی نے گناہ کا یہ بھیانک رستہ کیوں اختیار کیا؟ خون کی کمی کے باوجود اس میں اتنی تپش کیوں ہے؟۔ کب تک یہ نرم و نازک لڑکی جو گوشت نہیں کھاتی اپنا گوشت پوست بیچتی رہے گی؟ عظیم کو اس پر بڑا ترس آیا، چنانچہ اس نے واعظ بن کر اس سے کہنا شروع کیا۔

”کرشنا معصیت کی زندگی سے کنارہ کش ہو جاؤ، خدا کے لیے اس راستے سے جس پر کہ تم گامزن ہو، اپنے قدم ہٹا لو، یہ تمہیں ایسے مہیب غار میں لے جائے گا، جہاں سے تم نکل نہیں سکو گی۔ عصمت فروشی انسان کا بدترین فعل ہے۔ یہ رات اپنی زندگی کی روشن رات سمجھو، اس لیے کہ میں نے تمہیں نیک و بد سمجھا دیا ہے۔“

کرشنا نے اس کا جو مطلب سمجھا وہ یہ تھا کہ عظیم اس سے محبت کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ چمٹ گئی اور عظیم اپنا گناہ و ثواب کا مسئلہ بھول گیا۔ بعد میں وہ بڑا نادم ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا تو بھٹساوے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ کچھ اس انداز سے جیسے اس کو بھڑوں کے پورے چھتے نے کاٹ لیا ہے اور ڈنگ اس کے جسم میں کھبے ہوئے ہیں۔ عظیم کو دیکھ کر وہ رک گیا، مطمئن کرشنا کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پیچ و تاب کھا کر عظیم سے کہا۔

”وہ سالی چلی گئی۔“

عظیم جو اپنی ندامت میں ڈوبا تھا، چونکا۔

”کون؟“

”وہی، مالا“

”کیوں؟“

بھڈساوے کے لہجے میں عجیب و غریب احتجاج تھا، ہم اس کو اتنا وخت چومتے رہے جب بولا کہ آؤ تو سالی کہنے لگی۔

”تم ہمارا بھائی ہے۔ ہم نے کسی سے شادی کرلی ہے۔

”۔ اور باہر نکل گئی کہ وہ سالا گھر میں آگیا ہو گا۔“

مسٹر حمیدہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومسٹر حمیدہ

رشید نے پہلی مرتبہ اس کو بس اسٹینڈ پر دیکھا۔ جہاں وہ شیڈ کے نیچے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ رشید نے جب اسے دیکھا تو وہ ایک لحظے کے لیے حیرت میں گم ہو گیا۔ اس سے قبل اس نے کوئی ایسی لڑکی نہیں دیکھی تھی جس کے چہرے پر مردوں کی مانند داڑھی اور مونچھیں ہوں۔ پہلے رشید نے سوچا کہ شاید اس کی نگاہوں نے غلطی کی ہے۔ عورت کے چہرے پر بال کیسے اگ سکتے ہیں۔ پر جب اس نے غور سے دیکھا تو اس لڑکی نے باقاعدہ شیو کر رکھی تھی اور سرمئی غبار اس کے گالوں اور ہونٹوں پر موجود تھا۔ رشید نے سمجھا کہ شاید ہیجڑا ہو، مگر نہیں۔ وہ ہیجڑا نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس میں ہیجڑوں کی سی مصنوعی نسوانیت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ مکمل عورت تھی۔ ناک نقشہ بہت اچھا تھا۔ کولہے چوڑے چکلے۔ کمر پتلی۔ سینہ جوانی سے بھرپور۔ بازو سڈول۔ غرضیکہ اس کے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر نسوانیت کا عمدہ نمونہ تھا۔ ایک صرف اس کی داڑھی اور مونچھوں نے سب کچھ غارت کر دیا تھا۔ رشید سوچنے لگا۔ قدرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک اچھی بھلی نوجوان خوبصورت لڑکی کو بد نما بنا دیا۔ رشید کے دماغ میں کئی خیال اوپر تلے آئے اور وہ بوکھلا گیا۔ وہ سوچتا تھا

”کیا اس لڑکی کی زندگی اجیرن ہو کے نہیں رہ گئی“!

”صبح اٹھ کر جب اسے استرا پکڑ کر شیو کرنا پڑتی ہو گی تو اسے کیا محسوس ہوتا ہو گا۔ کیا اس وقت اس کے جی میں جھنجھلا کر انتقامی خواہش پیدا نہ ہوتی ہو گی کہ وہ گھس کھدے کی طرح اپنے گال اور ہونٹ چھیل ڈالے۔“

”ایک عورت کے لیے یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ خارپشت کی مانند اس کے گالوں پر دوسرے روز نکیلے بال اُگ آئیں“

”اگر مردوں کے مانند عورتوں کے بھی داڑھی مونچھ اگتی تو کوئی حرج نہیں تھا پر یہاں ازل سے عورتیں ان بالوں سے بے نیاز ہی رہی ہیں۔“

”جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ عورتوں کے چہرے پر بالوں کا ہونا کوئی معیوب چیز نہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ یہ دیکھنے کے عادی نہیں۔“

”صنف نازک“ آخر صنفِ نازک ہے۔ اس میں شک نہیں۔“

اس لڑکی میں نسوانیت کے تمام جوہر موجود ہیں۔ پھر یہ داڑھی مونچھ کس لیے اگ آئی ہے۔ نظر بٹو کے طور پر۔ اس کی کوئی تشریح و توضیح تو ہونی چاہیے بیکار میں ایک خوبصورت شے کو بھونڈا بنا دیا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے“!

”اب ایسی لڑکی سے شادی کون کرے گا جو ہر روز صبح سویرے اٹھ کر اُسترا ہاتھ میں پکڑ کر شیو کر رہی ہو۔“

یہ لڑکی مونچھیں نہ مونڈے اور انہیں بڑھالے۔ تو کیا اس سے خوف نہیں آئے گا۔ آپ بے ہوش نہ ہوں۔ لیکن چند لمحات کیلیے آپ کے ہوش و حواس ضرور جواب دے جائیں گے۔ آپ اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں گے جہاں مونچھیں منڈی ہوں گی۔ مگر آپ کی صنف مقابل اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہی ہو گی۔“

بس آگئی۔ وہ لڑکی اس میں سوار ہو کر چلی گئی۔ رشید کو بھی اسی بس سے جانا تھا لیکن وہ اپنے خیالوں میں اس قدر غرق تھا کہ اس کو بس کی آمد کا پتہ چلا نہ اس کے جانے کا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ لڑکی کو ایک نظر اور دیکھنے کے لیے پلٹا تو وہ موجود نہیں تھی۔ اس کا ذہن اس قدر مضطرب تھا کہ اس نے اپنا کام ملتوی کر دیا اور گھر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر اس نے مزید سوچ بچار شروع کر دی۔ اس کو اس لڑکی پر بہت ترس آرہا تھا۔ بار بار قدرت کی بے رحمی پر لعنتیں بھیجتا تھا کہ اس نے کیوں نسوانیت کے اتنے اچھے اور خوبصورت نمونے کو خود ہی بنا کر اس پر سیاہی کا لیپ کر دیا۔ آخر اس میں کیا مصلحت تھی۔ اب اس شکل میں اس سے شادی کون کرے گا۔ قدرت نے کیا اس کے لیے کوئی ایسا مرد پیدا کر رکھا ہے جو اسے قبول کرلے گا۔ لیکن وہ سوچتا کہ قدرت اتنی دور اندیش نہیں ہو سکتی۔“

اس کی بہن آئی۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے رشید سے کہا

”بھائی جان۔ چلیے کھانا کھا لیجیے۔“

رشید نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر بھی بال ہیں

”سلیمہ۔“

”جی۔“

”کچھ نہیں۔ لیکن نہیں ٹھہرو۔ کیا تمہاری مونچھیں ہیں۔“

سلیمہ جھینپ گئی۔

”جی ہاں۔ بال اگتے ہیں۔“

رشید نے اس سے پوچھا

”تو۔ میرا مطلب ہے تمہیں الجھن نہیں ہوتی ان بالوں سے؟“

سلیمہ نے اور زیادہ جھینپ کر جواب دیا:

”ہوتی ہے بھائی جان“!

”تو انہیں تم کیسے صاف کرتی ہو۔ بلیڈ سے“!

”جی نہیں۔ ایک چیز ہے جسے بے بی ٹچ کہتے ہیں۔ اس کو تھوڑی دیر ہونٹوں پر گھسانا پڑتا ہے۔“

”تو بال اُڑ جاتے ہیں“!

”اُڑتے وڑتے خاک بھی نہیں۔ دوسرے تیسرے روز پھر نمودار ہو جاتے ہیں بڑی مصیبت ہے۔ بعض اوقات تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔“

”وہ کیوں۔“

سلیمہ نے دردناک لہجہ میں جواب دیا:

”تکلیف ہوتی ہے بہت۔ جب بال اُکھڑتے ہیں تو چھینکیں آتی ہیں۔ اور چھینکوں کے ساتھ آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے۔ معلوم نہیں اللہ میاں مجھے کن گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔“

رشید نے تھوڑے توقف کے بعد اپنی بہن سے پوچھا۔

”تمہاری کسی اور سہیلی کی بھی داڑھی اور مونچھیں ہیں۔“

”مونچھیں تو کئی لڑکیوں کی دیکھی ہیں پر داڑھی میں نے کبھی کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھی۔ ایک دو بال ٹھوڑی پر دیکھنے میں آئے ہیں جو وہ موچنے یا ہاتھ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ یہ آپ نے کیسی گفتگو آج شروع کر دی۔ چلیے کھانا کھا لیجیے۔“

رشید نے کچھ دیر سوچا۔

”نہیں۔ میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔ میرا معدہ ٹھیک نہیں ہے“

رشید کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے بالوں کی پڈنگ کھائی ہے جو ہضم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ اس کے سارے جسم پر تیز تیز نکیلے بال یوں رینگ رہے تھے جیسے خاردار چیونٹیاں۔

جب سلیمہ چلی گئی تو رشید نے پھر سوچنا شروع کر دیا۔ لیکن سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کے بال تو دُور نہیں ہو سکتے تھے۔ اس امر کا رشید کو کامل یقین تھا لیکن پھر بھی وہ سوچے چلا جا رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑا معمّا حل کر رہا ہے۔ رشید کو داخلے کی درخواست دینا تھی۔ اس نے بی اے کا امتحان راولپنڈی سے پاس کیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ لاہور میں کسی کالج میں داخل ہو جائے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کیلیے انگلستان چلا جائے جہاں اس کے والد پرائمری کونسل میں پریکٹس کرتے تھے۔ اس روز مونچھوں اور داڑھی والی لڑکی کے باعث نہ جا سکا۔ دوسرے روز وہ بس کے بجائے تانگے میں گیا۔ اس نے چونکہ بی اے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں پر پاس کیا تھا اس لیے اسے داخلے میں کوئی دِقت محسوس نہ ہوئی۔ وہ داڑھی مونچھوں والی لڑکی اب رشید کے دل و دماغ سے قریب قریب محو ہو چکی تھی۔ لیکن ایک دن اس نے اس کو کالج میں دیکھا۔ لڑکے اس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ ایک نے آوازہ کسا: مسٹر حمیدہ۔“

دوسرے نے کہا

”ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں۔ عورت کی عورت اور مرد کا مرد۔“

تیسرے نے قہقہہ لگایا:

”عجائب گھر میں رکھنا چاہیے تھا ایسی شخصیت کو۔“

اور وہ بیچاری خفیف ہو رہی تھی۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ رشید کو اس پر بہت ترس آیا۔ اس کے جی میں آئی کہ آگے بڑھ کر ان تمام لڑکوں کا سر پھوڑ دے جو اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر خاموش رہا۔ جب لڑکے چلے گئے' اور اس لڑکی نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں اُمڈے ہوئے آنسو خشک کیے تو وہ جرأت سے کام لے کر اس کے پاس گیا اور بڑے ملائم لہجے میں اس سے مخاطب ہوا:

”آپ یہاں کس کلاس میں پڑھتی ہیں۔“

اس نے تنگ آکر کہا:

”کیا آپ بھی میرا مذاق اڑانے آئے ہیں۔“

رشید نے اپنا لہجہ اور ملائم کر دیا۔“

جی نہیں۔ آپ مجھے اپنا دوست یقین کیجیے۔“

اس نے، جس کا نام حمیدہ تھا۔ نفرت کی نگاہوں سے رشید کو دیکھا۔

”مجھے کسی دوست کی ضرورت نہیں۔“

”یہ آپ کی زیادتی ہے۔ ہر شخص کو دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ کے مضطرب دماغ کو اپنی باتوں سے اور زیادہ مضطرب کر دوں۔ ویسے میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا دوست یقین کیجیے۔“

یہ کہہ کر رشید چلا گیا۔ اس کے بعد متعدد مرتبہ اس نے حمیدہ کو دیکھا جو بی اے میں پڑھتی تھی۔ سارے کالج میں اس کی داڑھی مونچھوں کے چرچے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لڑکوں کی آوازہ بازی کی عادی ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی بال نہیں ہے۔ وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ ایک دفعہ وہ شدید طور پر بیمار ہو گئی دس پندرہ دن تک بستر میں لیٹنا پڑا۔ رشید نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ اس کی بیمار پرسی کے لیے جائے مگر اس کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ مشتعل ہو جائے گی کیونکہ اسے کسی کی ہمدردی پسند نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی کشتی' ٹوٹی پھوٹی' جیسی بھی ہے اسے اس کے سوا اور کوئی کھینے والا نہ ہو۔ لیکن ایک دن مجبور ہو کر اس نے چپراسی کے ہاتھ ایک رقعہ رشید کے نام بھیجا۔ جس میں یہ چند الفاظ مرقوم تھے:

”رشید صاحب! میں بیمار ہوں۔ کیا آپ چند لمحات کے لیے میرے کمرے میں تشریف لا سکتے ہیں۔ ممنون و متشکر ہوں گی۔ حمیدہ“

رشید یہ رقعہ ملتے ہی ہوسٹل میں گیا۔ بڑی مشکلوں سے حمیدہ کا کمرا تلاش کیا۔ اندر داخل ہوا تو اس نے پہلے یہ سمجھا کہ کوئی مرد جس نے کئی دنوں سے شیو نہیں کی۔ کمبل اوڑھے لیٹا ہے۔ مگر اس نے اپنا ردِ عمل ظاہر نہ ہونے دیا۔ چارپائی کے ساتھ ہی کرسی پڑی تھی۔ رشید اس پر بیٹھ گیا۔ حمیدہ مسکرائی۔

”میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ مجھے بخار کے باعث بہت نقاہت ہو گئی ہے اور شیو نہیں کر سکی۔ کیا آپ میرے لیے یہ زحمت برداشت کر سکیں گے۔“

رشید نے کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا۔ شیو کا سامان کھڑکی کی سل پر موجود تھا۔ ٹین میں گرم پانی لا کر اس نے حمیدہ کے چہرے کے بال نرم کیے' صابن ملا۔ اچھی طرح جھاگ پیدا کی اور پھر پانچ منٹ کے اندر اندر شیو بنا ڈالی۔ پھر تولیے سے اس کا چہرہ خشک کیا اور شیو کا سامان صاف کرنے کے بعد وہیں رکھ دیا جہاں سے اس نے اٹھایا تھا۔ حمیدہ نے اپنا نحیف ہاتھ گالوں پر پھیرا۔ اور پھر رشید سے کہا۔

”شکریہ۔“

اب دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ رشید نے ایم اے اور حمیدہ نے بی اے پاس کر لیا۔ رشید کو فوراً بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ اب وہ ایک نہیں' روزانہ دو شیو بناتا تھا!

مسٹر معین الدین

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹومسٹر معین الدین

منہ سے کبھی جدا نہ ہونے والا سگار ایش ٹرے میں پڑا ہلکا ہلکا دھواں دے رہا تھا۔ پاس ہی مسٹر معین الدین آرام کرسی پر بیٹھے ایک ہاتھ اپنے چوڑے ماتھے پر رکھے کچھ سوچ رہے تھے، حالانکہ وہ اس کے عادی نہیں تھے۔ آمدن معقول تھی۔ کراچی شہر میں ان کی موٹروں کی دکان سب سے بڑی تھی۔ اس کے علاوہ سوسائٹی کے اونچے حلقوں میں ان کا بڑا نام تھا۔ کئی کلبوں کے ممبر تھے۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ صاحب اولاد تھے۔ لڑکا انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لڑکی بہت کمسن تھی، لیکن بڑی ذہین اور خوب صورت۔ وہ اس طرف سے بھی بالکل مطمئن تھے۔ لیکن اپنی بیوی کو۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسٹر معین الدین کی شادی کے متعلق چند باتیں بتا دی جائیں۔ مسٹر

معین الدین کے والد بمبئی میں ریشم کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ یوں تو وہ رہنے والے لاہور کے تھے مگر کاروباری سلسلے کے باعث بمبئی ہی میں مقیم ہو گئے تھے اور یہی ان کا وطن بن گیا تھا۔ معین الدین جوان کا اکلوتا بیٹا تھا، بظاہر عاشق مزاج نہیں تھا لیکن معلوم نہیں وہ کیسے اور کیونکر آدم جی باٹلی والی کی موٹی موٹی غلافی آنکھوں والی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا۔ لڑکی کا نام زہرہ تھا، معین سے محبت کرتی تھی، مگر شادی میں کئی مشکلات حائل تھیں۔ آدم جی باٹلی والا جو معین کے والد کا پڑوسی اور دوست بھی تھا، بڑے پرانے خیالات کا بوہرہ تھا۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی اپنے ہی فرقے میں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ زہرہ اور معین کا معاشقہ بہت دیر تک بے نتیجہ چلتا رہا۔ اس دوران میں معین الدین کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں بہت پہلے مر چکی تھی۔ اب کاروبار کا سارا بوجھ معین کے کندھوں پر آن پڑا، جس سے ان کو کوئی رغبت نہیں تھی۔ ادھر زہرہ کی محبت بھی تھی جو کسی حیلے بارآور ثابت ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ پھر ہندو مسلم فسادات تھے۔ معین ایک عجیب گڑبڑ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بے سوچے سمجھے ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ اپنا کاروبار سمیٹ کر اس کو کسی اچھے گاہک کے پاس بیچ ڈالے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اپنا سارا روپیہ کراچی کے بنک میں جمع کرا دیا اور زہرہ سے مل کر اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ وہ بمبئی چھوڑ کر کراچی جانا چاہتا ہے، مگر اکیلا نہیں، زہرہ اس کے ساتھ ہو گی۔ زہرہ فوراً مان گئی۔ ایک ہفتے کے بعد دونوں میاں بیوی بن کر کراچی کے ایک خوب صورت ہوٹل میں تھے۔ بمبئی میں زہرہ کے والدین پر کیا گزری۔ اس کا انھیں کچھ علم نہیں اور نہ انھیں اس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ دونوں اپنی محبت کی پیاس بجھانے میں مگن تھے۔ ان کو اس حادثے کی بھی خبر نہیں تھی کہ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ بہر حال جب لاکھوں انسانوں کا خون فرقہ وارانہ فسادات میں پانی کی طرح بہہ گیا اور کراچی میں پاکستان کے قیام کی خوشی میں چراغاں ہوا تو مسٹر معین اور مسز معین کو معلوم ہوا کہ وہ پاکستان میں ہیں۔ اور مسٹر آدم بھائی باٹلی والا اور مسز آدم بھائی باٹلی والا ہندوستان میں۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ اب وہ محفوظ تھے۔ جب افراط و تفریط کا عالم کسی قدر کم ہوا تو مسٹر معین نے اپنے بمبئی کے کاروبار کے حوالے سے ایک بہت بڑی دکان اپنے نام الاٹ کرا لی اور اس میں موٹروں کا کاروبار شروع کر دیا جو چند برسوں میں چل نکلا۔ اس دوران میں ان کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکا جب چار برس کا ہوا تو انھوں نے اس کو اپنے ایک دوست کے حوالے کر دیا جو انگلستان جا رہا تھا۔ مسٹر معین چاہتے تھے کہ اس کی تربیت وہیں ہو کیوں کہ کراچی کی فضا ان کے نزدیک بڑی گندی تھی۔ لڑکی جو اپنے بھائی سے ایک برس چھوٹی تھی، گھر ہی میں کھیلتی کودتی رہتی۔ اس کے لیے مسٹر معین نے ایک انگریز نرس مقرر کر رکھی تھی۔ اس بات پر زور دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ مسٹر معین کو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی۔ طبعاً وہ کم گو اور شریف طبیعت تھے۔ وہ زہرہ سے جب اپنی محبت کا اظہار کرتے تو بڑے مدھم سروں میں۔ بڑے وضع دار قسم کے آدمی تھے۔ کلبوں میں جاتے، زہرہ ان کے ساتھ ہوتی مگر وہ دوسرے ممبروں کی طرح بے وجہ ہنسی قہقہوں میں کبھی شامل نہ ہوتے۔ وسکی کے دو پیگ آہستہ آہستہ پیتے جیسے کوئی قرض ادا کر رہے ہیں۔ ناچ شروع ہوتا تو زہرہ کے ساتھ تھوڑی دیر ناچ کر گھر واپس چلے آتے جو انھوں نے ایک ہندو سے کراچی آنے کے بعد خرید لیا تھا۔ زہرہ کبھی کبھی اپنے خاوند کی اجازت سے دوسروں کے ساتھ بھی ناچ لیتی تھی۔ اس میں مسٹر معین کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ زہرہ ان کے ایک دوست مسٹر احسن سے جو ادھیڑ عمر کے بہت بڑے مالدار اور تاجر تھے، ضرورت سے زیادہ التفات برت رہی ہے تو ان کو بڑی الجھن ہوئی، مگر انھوں نے زہرہ پر اس کا اظہار کبھی نہ کیا۔ کیوں کہ وہ سوچتے تھے کہ احسن اور زہرہ میں عمر کا اتنا تفاوت ہے۔ پھر وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ یہ صرف رقابت کا جذبہ ہے جو ان کی اپنی محبت کی پیداوار ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی کہ سوسائٹی کے جن اونچے حلقوں میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا، اس میں بیویوں سے غیر مردوں کے التفات کو بری نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ اسے فیشن سمجھا جاتا تھا کہ ایک کی بیوی کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ناچے اور اس کی بیوی پہلے کے شوہر کے ساتھ، ایسی ادلا بدلی عام تھی۔ پہلے مسٹر احسن گاہے گاہے، جب کوئی پارٹی دی جائی تو، مسٹر معین کے ہاں آیا کرتے تھے مگر کچھ عرصے سے ان کا باقاعدہ آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی وہ آجاتے اور گھنٹوں زہرہ کے پاس بیٹھے رہتے۔ یہ انھیں اپنے ملازموں سے معلوم ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے زہرہ سے کچھ نہ کہا۔ دراصل ان کی زبان پر ایسے لفظ آتے ہی نہیں تھے جن سے وہ شکوک کا اظہار کریں۔ وہ مجبور تھے اس لیے کہ ان کی پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جہاں ایسے معاملوں میں لب کشائی معیوب خیال کی جاتی تھی۔ روشن خیالی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ خاموش رہیں۔ یوں تو انھوں نے ایک بڑے معرکے کا عشق کیا تھا مگر دماغ ان کا تاجرانہ تھا۔ دل اور دماغ میں کوئی اتنا بڑا فاصلہ تو نہیں ہوتا مگر موٹروں کا کاروبار کرتے کرتے اور دولت کے انبار سمیٹتے سمیٹتے بہت سا چاندی سونا ان دونوں کے درمیان ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جھگڑے ٹنٹوں سے انھیں نفرت تھی۔ وہ خاموش زندگی بسر کرنے کے قائل تھے جس میں کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ لڑکی تھی، وہ اپنی انگریز نرس کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔ جب ان کے دل میں اس کا پیار ابھرتا تو وہ اسے اپنے پاس بلا کر کچھ عرصے کے لیے اپنی گود میں بٹھاتے اور انگریزی میں پیار کر کے اسے پھر نرس کے حوالے کر دیتے۔ جب کاروبار سے فارغ ہو کر گھر آتے تو زہرہ کے ہونٹوں کا بوسہ لیتے اور ڈنر کھانے میں مشغول ہو جاتے۔ اگر مسٹر احسن ان سے پہلے وہاں موجود ہوتے تو وہ ان کو بھی ڈنر میں شامل کرا لیتے۔ ایسے موقعوں پر، ضرورت بے ضرورت، زہرہ مسٹر احسن کی خاطر داری کرتی۔ ان کی پلیٹ مختلف سالنوں سے بھر دیتی اور ان کو بڑے محبت بھرے انداز میں مجبور کرتی کہ وہ تکلف نہ کریں۔ جب وہ زہرہ کا یہ ناروا التفات دیکھتے تو ان کے دل اور دماغ کے درمیان سونے چاندی کے ڈھیر کچھ پگھل سے جاتے اور دونوں آپس میں سرگوشیاں کرنا شروع کر دیتے۔ مسٹر احسن رنڈوے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ کراچی میں موتیوں کے سب سے بڑے تاجر تھے۔ کروڑپتی۔ ہر سال مسٹر معین سے موٹروں کے نئے ماڈل خریدتے تھے۔ زہرہ کی سالگرہ پر انھوں نے دو بڑے قیمتی ہار تحفے کے طور پر دیے تھے۔ جب مسٹر معین نے انھیں قبول کرنے سے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں انکار کیا تھا تو مسٹر احسن نے کہا تھا۔

”مجھے صدمہ ہو گا اگر یہ ہار مسز معین کے گلے کی زینت نہ بنے۔“

یہ سن کر زہرہ نے دونوں ہار اٹھا کر مسٹر احسن کو دے دیے اور اس سے کہا

”لیجیے آپ اپنے ہاتھوں سے پہنا دیجیے۔“

جب ہار زہرہ کے گلے میں پہنا دیے گئے تو بوجہ مجبوری مسٹر معین کو اپنے دوست مسٹر احسن کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی کہ بحیرہ عرب کے پانیوں میں سیپیوں نے ان ہاروں کے موتی خاص طور پر زہرہ ہی کے لیے پیدا کیے تھے۔ ایش ٹرے میں رکھا ہوا سگار آہستہ آہستہ سلگ کر نصف کے قریب خاکستر اور سفید راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پاس ہی آرام کرسی پر مسٹر معین اسی طرح اپنے چوڑے ماتھے پر ایک ہاتھ رکھے گہری سوچ میں غرق تھے۔ وہ اتنا کبھی تردد نہ کرتے مگر اب ان کی عزت کا سوال در پیش تھا۔ آج انھوں نے اپنے کانوں سے ایسا مکالمہ سنا تھا۔ ظاہر ہے کہ زہرہ اور احسن کے درمیان جس نے سکون پسند طبیعت کو درہم برہم کر دیا تھا۔ چوڑے ماتھے پر ہاتھ رکھے وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ان کے کان بار بار وہ مکالمہ سن رہے تھے جو ان کی بیوی اور ان کے دوست کے درمیان بڑے کمرے میں ہوا تھا۔ دکان میں ایک موٹر کا سودا کرتے کرتے ان کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی، چنانچہ یہ کام منیجر کے حوالے کر کے وہ گھر روانہ ہو گئے تاکہ آرام کریں۔ کریپ سول شوز پہنے ہوئے تھے اس لیے کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ دروازے کے پاس پہنچے تو انھیں زہرہ کی آواز سنائی دی۔

”احسن صاحب! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ان سے طلاق حاصل کر لوں گی۔“

احسن بولے۔

”مگر کیسے۔ کیونکر؟“

”میں آپ سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالیں گے۔“

”تعجب ہے“!

”اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے آج تک میری ہر فرمائش پوری کی ہے۔ میں اگر ان سے کہوں کہ ان پانچ منزلوں سے نیچے کود جائیں تو وہ یقیناً کود جائیں گے۔“

”حیرت ہے۔“

”آپ کی حیرت دور ہو جائے گی جب میں کل ہی آپ کو طلاق نامہ دکھا دوں گی۔“

یہ مکالمہ سن کر مسٹر معین اپنی ناسازی طبع کو بھول گئے اور الٹے پاؤں واپس دکان پر چلے گئے، جہاں ابھی تک موٹر کا سودا طے ہو رہا تھا۔ مگر انھوں نے اس سے کوئی دلچسپی نہ لی اور اپنے دفتر میں چلے گئے۔ سگار سلگایا مگر ایک کش لینے کے بعد اسے ایش ٹرے میں رکھ دیا اور سر پکڑ کر آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ زہرہ نے جو کچھ کہا، وہ مسٹر معین کی غیرت کے نام پر ایک زبردست چیلنج تھا۔ انھوں نے اپنے چوڑے ماتھے پر سے ہاتھ اٹھایا اور ایش ٹرے میں سگار کو بجھا کر ایک نیا سگار نکالا اور اسے سلگایا۔ آہستہ آہستہ وہ ہونٹوں میں اسے گھمانے لگے۔ پھر ایک دم اٹھے اور دکان سے باہر نکل کر موٹر میں سوار ہوئے اور گھر کا رخ کیا۔ ان کے دوست مسٹر احسن جا چکے تھے۔ زہرہ اپنے کمرے میں سنگار میز کے پاس بیٹھی میک اپ کرنے میں مشغول تھی۔ جب اس نے آئینے میں معین کا عکس دیکھا تو بڑے مڑے ہونٹوں پر لپ اسٹک ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”آپ آج جلدی آ گئے۔“

”ہاں، طبیعت ٹھیک نہیں۔“

صرف اتنا کہہ کر وہ بڑے کمرے میں جا کر صوفے پر دراز ہو گئے۔ سگار ان کے ہونٹوں میں بڑی تیزی سے گھومنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد بنی ٹھنی زہرہ آئی۔ مسٹر معین نے اس کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اس کے حسن کا اعتراف کیا۔ یہ اعتراف وہ متعدد مرتبہ اپنے دل میں کر چکے تھے۔ دراز قد، بہت موزوں و مناسب گدرایا ہوا جسم، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، شربتی رنگ کی۔ اس پر ہر لباس سجتا تھا۔ بوہری لباس بھی جس سے معین کو سخت نفرت تھی۔ جب زہرہ پاس آئی اور اس نے ایک ادا کے ساتھ اپنے خاوند کا مزاج پوچھا تو وہ خاموش رہے۔ جب وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تو معین صوفے پر سے اٹھے اور منہ سے سگار نکال کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

”زہرہ! کیا تم مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہو؟“

زہرہ ایک لحظے کے لیے بوکھلا سی گئی۔ مگر فوراً ہی سنبھل کر اس نے اپنے خاوند سے پوچھا۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے تمہاری اور احسن کی گفتگو سن لی تھی۔“

معین کے لہجے میں غم و غصے کا شائبہ تک نہ تھا۔ زہرہ خاموش رہی۔ معین نے سگار کا ایک کش لیا اور کہا

"میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔"

زہرہ اٹھ کھڑی ہوں۔

"کیوں؟"

معین نے کچھ سوچا۔

"میں سوسائٹی میں اپنے نام اور اپنی عزت پر حرف آتا نہیں دیکھ سکتا۔"

"لیکن۔"

زہرہ اٹک گئی۔

"لیکن میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں۔"

"تو کوئی دوسری راہ تلاش کرنی چاہیے۔ طلاق میں کبھی نہیں دوں گا۔ اس لیے کہ میری عزت کا سوال ہے۔ ویسے مجھے تمہارے وعدے کا پاس ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ میاں بیوی تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ آخر زہرہ فکر مند لہجے میں بولی: ’’لیکن میں طلاق لیے بغیر اس سے شادی کیسے کر سکتی ہوں؟"

"کیا تم واقعی اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

زہرہ نے اثبات میں سر ہلایا تو معین نے اس سے سوال کیا:

"کیوں؟"

زہرہ خاموش رہی۔ معین نے ایک اور سوال کیا

"کیا اس لیے کہ تمہارے دل میں اب میری محبت نہیں ہے؟"

"میرے دل میں آپ کی محبت ویسی کی ویسی موجود ہے، اور اس کے لیے میں خدا کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ احسن کے ساتھ رہوں۔"

یہ کہہ کر زہرہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ معین نے اپنے منہ سے سگار نکالا اور کہا:

"تم اس کے ساتھ رہ سکتی ہو۔"

زہرہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مگر ایک شرط پر"

معین نے سگار ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا

"تم میرے پاس بھی رہا کرو گی۔ تاکہ لوگوں کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ ان کو ایسی باتیں بنانے کا موقع نہ ملے کہ معین چونکہ اپنی بیوی کی فرمائشیں پوری نہ کر سکا اس لیے اس نے طلاق لے کر ایک کروڑپتی سے شادی کر لی، یا یہ کہ معین کی بیوی بدکردار تھی اس لیے اس نے طلاق دے دی۔"

"بدکردار تو میں ہوں۔"

زہرہ نے اپنی موٹی موٹی غلافی آنکھیں ایک لحظے کے لیے جھکا لیں۔ معین نے اسے دلاسا دیا۔

"اس کا ثبوت صرف میرا اعتراف ہے جو میری زبان پر کبھی نہیں آئے گا۔ اس لیے کہ یہ میری اپنی عزت اور میرے ناموس پر حرف لانے کا موجب ہو گا۔ اس کے علاوہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو جاؤ۔"

یہ کہہ کر معین کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سینے کا سارا بوجھ اتر گیا ہے۔ زہرہ نے احسن کو ساری بات بتا دی۔ وہ راضی ہو گیا۔ چنانچہ زہرہ اس کے پاس کئی کئی دن رہنے لگی۔ احسن زہرہ کے جسمانی خلوص اور اس کے خاوند کے بے مثال ایثار سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے تھوڑے ہی عرصے کے بعد وصیت لکھ کر اپنی تمام جائیداد کی وارث زہرہ قرار دی۔ زہرہ نے اس کا ذکر اپنے خاوند سے نہ کیا۔ اس کے وقار کو صدمہ پہنچتا۔ وہ اپنی لڑکی کو دیکھنے اور معین سے ملنے کے لیے اکثر آتی اور بعض اوقات چند راتیں بھی وہیں گزارتی۔ میاں بیوی کی یہ نئی زندگی بڑی ہموار گزرتی رہی کہ اچانک ایک دن مسٹر احسن حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ میں سوسائٹی کی اونچی اونچی ہستیوں کی صف میں مسٹر معین بھی شریک تھے۔ انھوں نے اپنے مرحوم دوست کی مغفرت کے لیے صدق دل سے دعا کی اور گھر آ کر مناسب و موزوں الفاظ میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے زہرہ کو دلاسا دیا۔ زہرہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ گن گن کر احسن کی صفات بیان کر رہی تھی۔ آخر میں اس نے اپنے خاوند کو بتایا کہ وہ اپنی ساری جائیداد اس کے نام کر گیا ہے۔ یہ سن کر

مسٹر معین خاموش رہے اور زہرہ سے اس بارے میں کوئی استفسار نہ کیا۔ عدالت کے ذریعے جب زہرہ کو مرحوم احسن کی ساری جائیداد کا قبضہ مل گیا اور وہ خوش خوش گھر آئی تو دیکھا کہ ایک مولوی قسم کا آدمی صوفے پر بیٹھا ہوا ہے۔ ہاتھ میں اس کے ایک کاغذ ہے۔ اسکو ایک نظر دیکھ کر وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی:

”قبضہ مل گیا ہے۔“

مسٹر معین نے کہا۔

”بہت خوشی کی بات ہے۔“

پھر انھوں نے مولوی صاحب کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور زہرہ کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ لو“!

زہرہ نے کاغذ لے کر پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

مسٹر معین نے بڑے پر سکون لہجے میں جواب دیا۔

”طلاق نامہ۔“

زہرہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی:

”طلاق نامہ“!

”ہاں“

یہ کہہ کر معین نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چیک نکالا:

”یہ تمہارا حق مہر ہے۔ بیس ہزار روپے۔“

زہرہ اور زیادہ بھونچکی رہ گئی۔

”مگر۔ یہ سب کیا ہے؟“

”یہ سب یہ ہے کہ مجھے اپنی عزت اور اپنا ناموس بہت پیارا ہے۔ جب میری جان پہچان کے حلقوں کو یہ معلوم ہو گا کہ احسن تمہارے لیے ساری جائیداد چھوڑ کر مرا ہے تو کیا کیا کہانیاں گھڑی جائیں گی۔

”یہ کہہ کر وہ مولوی سے مخاطب ہوا:

”آیئے قاضی صاحب“!

قاضی اٹھا۔ جاتے ہوئے مسٹر معین نے پلٹ کر اپنی مطلقہ بیوی کی طرف دیکھا اور کہا:

”یہ بلڈنگ بھی تمہاری ہے۔ رجسٹری کے کاغذات تمہیں پہنچ جائیں گے۔ اگر تم نے اجازت دی تو میں کبھی کبھی تمہارے پاس آیا کروں گا۔ خدا حافظ“!

مسز ڈی سلوا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومسز ڈی سلوا

بالکل آمنے سامنے فلیٹ تھے۔ ہمارے فلیٹ کا نمبر تیرہ تھا۔ اس کے فلیٹ کا چودہ۔ کبھی کوئی سامنے کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو مجھے یہی معلوم ہوتا کہ ہمارے دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ اسی غلط فہمی میں جب میں نے ایک بار دروازہ کھولا تو اس سے میری پہلی ملاقات ہُوئی۔ یوں تو اس سے پہلے کئی دفعہ میں اسے سیڑھیوں میں، بازار میں اور بالکونی میں دیکھ چکی تھی مگر کبھی بات کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی۔

”تم نے سمجھا کوئی تمہارے گھر آیا ہے۔“

میں بھی جواب میں مسکرا دی۔ چند لمحات تک وہ اپنے دروازے کی دہلیز میں اور میں اپنے دروازے کی دہلیز میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے اور میں اس سے اچھی طرح واقف ہو گئی۔ اس کا نام میری یا خدا معلوم کیا تھا۔ مگر اس کے خاوند کا نام پی۔ این ڈِسلوا تھا چنانچہ میں اسے مسز ڈی سلوا ہی کہتی تھی۔ میں اسے میری ضرور کہتی مگر وہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑی

تھی۔ موٹے موٹے نقش، چھوٹی گردن، اندر دھنسی ہوئی ناک پکوڑا سی، سر چھوٹا جس پر کٹے ہوئے بال ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ آنکھیں دوات کے منہ کی طرح کھلی رہتی تھیں۔ معلوم نہیں سوتے میں انکی شکل کیسی ہوتی ہوگی؟ اس کا خاوند معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا۔ کسی دفتر میں کام کرتا تھا۔ جب شام کو گھر لوٹتا اور مجھے باہر بالکنی میں دیکھتا تو اپنے بھورے رنگ کا ہیٹ اتار کر مجھے سلام ضرور کرتا بے حد شریف آدمی تھا۔ مسز ڈی سلوا بھی بہت ملنسار اور با اخلاق عورت تھی۔ دونوں میاں بیوی پُر سکون زندگی بسر کرتے تھے۔ چار پانچ برس کا ایک لڑکا تھا اس کو دیکھ کر کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باپ چھوٹا ہو گیا ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں سکڑ گئی ہے ماں باپ دونوں کے نقش کچھ اس طرح اس بچے میں خلط ملط ہو گئے تھے کہ آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ماں پر ہے یا باپ پر۔ پانچ برس میں ان کے یہاں صرف یہی ایک بچہ تھا۔ مسز ڈی سلوا نے ایک روز مجھ سے کہا تھا۔

”ہمارا اماں بھی اس موافق بچہ دیا کرتا تھا۔ پانچ برس کے پیچھے ایک پہلے ہم ہوا۔ پانچ برس کے پیچھے ہمارا بھائی ہوا۔ اس کے پیچھے ہمارا ایک اور بہن۔“

پانچ برس کی قید چونکہ پوری ہو چکی تھی۔ اس لیے مسز ڈی سلوا اب پیٹ سے تھی اس کا خاوند بہت خوش تھا۔ مجھے مسز ڈی سلوا نے بتایا کہ اپنی ڈائری میں اس نے کئی تاریخیں لکھ رکھی ہیں۔ پہلے بچے کی پیدائش کی تاریخ۔ ہونے والے بچے کی پیدائش کی تاریخ کا اندازہ اور وہ سال جس میں کہ تیسرا بچہ پیدا ہو گا۔ یہ سارا حساب اس نے اپنی ڈائری میں درج کر رکھا تھا۔ مسز ڈی سلوا کہتی تھی کہ اس کے خاوند کو پانچ برس کی یہ قید اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک بچہ پیدا کرنے کے بعد وہ پانچ برس کے لیے کیوں چھٹی پر چلی جاتی ہے۔ مسز ڈی سلوا خود حیران تھی مگر اسے فخر سمجھتی تھی کہ وہ اپنی ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ میں بھی کم متحیر نہ تھی، سوچتی تھی یا الٰہی یہ پانچ برسوں کا چکر کیا ہے کیوں ان دونوں میں سے ایک گنتی نہیں بھول جاتا؟ قدرت نے کیا اس عورت کے اندر ایسی مشین لگا دی ہے کہ جب پانچ سال کے پانچ چکر ختم ہو جاتے ہیں تو کھٹ سے بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ ہمارے پڑوس میں ایک اور عورت بھی جو ڈیڑھ برس سے پیٹ سے تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اس کے رحم میں کوئی خرابی ہے۔ بچہ موجود ہے جو پیدا ہو جائے گا مگر اس کی نشو و نما تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد چونکہ رک جاتی ہے اس لیے ابھی تک اتنا بڑا نہیں ہوا کہ پیدا ہو سکے۔ امی جان جب مجھ سے یہ باتیں سُنتی تھیں تو کہا کرتی تھیں قیامت آنیوالی ہے خدا جانے دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے کبھی ایسی باتیں سننے میں نہیں آتی تھیں۔ عورتیں چُپ چاپ نو مہینے کے بعد بچے جن دیا کرتی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب کسی کے بچہ پیدا ہونے والا ہو تو سارے شہر کو خبر ہو جاتی ہے۔ مٹکا سا پیٹ لیے باہر جا رہی ہیں۔ سڑکوں پر گھوم رہی ہیں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں مگر کیا مجال کہ ان کو ذرا سی بھی حیا آ جائے۔ آج کل تو دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔ میں یہ سنتی تھی تو دل ہی دل میں ہنستی تھی۔ امی جان کا پیٹ بھی کئی بار پھول کر مٹکا بن چکا تھا اور یہ مٹکا لیے وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھیں ہر روز مارکیٹ جاتی تھیں مگر جب دوسروں کو دیکھتی تھیں یا ان کے متعلق باتیں سنتی تھیں تو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتی تھیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا انھیں فوراً نظر آ جاتا تھا۔ آدمی اگر اس مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو کیا اسے باہر آنا جانا بالکل بند کر دینا چاہیے۔ مٹکا سا پیٹ لیے بس گھر میں بیٹھے رہو۔ صوفے پر سے اٹھو چارپائی پر لیٹ جاؤ۔ چارپائی سے اٹھو تو کسی کرسی پر لیٹ جاؤ۔ مگر آفت تو یہ ہے کہ مٹکا سا پیٹ لیے بیٹھنے اور لیٹنے میں بھی تو تکلیف ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آدمی چلے پھرے تا کہ بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ یہ کیا کہ پیٹ میں بڑی سی فٹ بال ڈالے گھر کی چار دیواری میں قید رہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ امی جان حیا کیوں طاری کرنا چاہتی ہیں۔ بھئی اگر کوئی پیٹ سے ہے تو کیا اس کا قصور ہے؟ اس نے کوئی شرمناک بات کی ہے جو وہ شرم محسوس کرے۔ جب خدا کی طرف سے یہ مصیبت عورتوں پر عائد کر دی گئی کہ وہ ایک مقررہ مدت تک بچے کو پیٹ میں رکھیں تو اس میں شرمانے اور لجانے کی بات ہی کیا ہے اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سب کام چھوڑ کر آدمی بالکل نکما ہو جائے اس لیے کہ اُسے بچہ پیدا کرنا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا رہے۔ اب کیا اس کے لیے باہر آنا جانا موقوف کر دیا جائے۔ لوگ ہنستے ہیں تو ہنسیں، کیا ان کے گھر میں ان کی مائیں اور بہنیں کبھی پیٹ سے نہیں ہوں گی۔ بھئی، مجھے تو امی جان کی یہ منطق بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے اصل میں ان کی عادت یہ ہے کہ خواہ مخواہ ہر بات پر اپنا لیکچر شروع کر دیتی ہے خواہ کسی کو بُرا لگے یا اچھا۔ اپنی لڑکی کی بات ہو تو کبھی کچھ نہ کہیں گی۔ پچھلی دفعہ جب عارف میرے پیٹ میں تھا اور میں ہر روز اپولو بندر سیر کو جاتی تھی تو قسم لے لو جو ان کے منہ سے میرے خلاف کچھ نکلا ہو، پر اب چونکہ بات مسز ڈی سلوا کی تھی جو بیچاری صرف اتوار کی صبح گرجا میں نماز پڑھنے اور شام کو سودا سلف لانے کے لیے اپنے خاوند کے ساتھ باہر نکلتی تھی اس لیے امی جان کو

”تو یہ ہے بیوی، تو یہ ہے بیوی“

کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ پہلے بچے پر پیٹ زیادہ نہیں پھولتا، لیکن دوسرے بچے کو چونکہ پھیلنے کے لیے زیادہ جگہ مل جاتی ہے۔ اس لیے پیٹ بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ مسز ڈی سلوا لمبا سا چغہ پہنے جب گھر میں چلتی پھرتی تھی تو اس کا پیٹ بہت بد نما معلوم ہوتا تھا۔ قد اس کا چھوٹا تھا۔ پنڈلیاں جو بہت پتلی تھیں اور چغے کے نیچے آہستہ آہستہ حرکت کرتی تھیں۔ بہت ہی بھدی تصویر پیش کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھڑونچی پر مٹکا رکھا ہے سارا دن اس لمبے چغے میں وہ کارٹون بنی رہتی تھی۔ شروع شروع میں بیچاری کی بہت بُری حالت ہُوئی تھی۔ ہر وقت قے اور متلی۔ قلفی والے کی آواز سنتی تو تڑپ جاتی اس کو بلاتی لیکن جب کھانے لگتی تو فوراً ہی جی مالش کرنے لگتا۔ سارا دن لیمو چوستی رہتی۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اس کے یہاں گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بستر پر لیٹی ہے لیکن ٹانگیں اوپر اٹھا رکھی ہیں میں نے مسکرا کر کہا۔

”مسز ڈی سلوا اکسر سائز کر رہی ہو کیا۔“

جھنجھلا کر بولی۔

”ہم بہت تنگ آگیا ہے۔ یوں ٹانگیں اُوپر کرتا ہے تو ہمارا طبیعت کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

ٹھنڈی ٹھنڈی دیوار کے ساتھ پیر لگانے سے اسے کچھ تسکین ہوتی تھی۔ بعض اوقات اس کی طبیعت گھبراتی تھی تو زور زور سے میز کو یا بستر کو جہاں بھی وہ بیٹھی ہو مکھیاں مارنا شروع کر دیتی تھی۔ اور جب اس طرح گھبراہٹ کم نہیں ہوتی تھی تو تنگ آکر رونا شروع کر دیتی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آتی تھی۔ چنانچہ وہ تمام تکلیفیں جو مجھ پر بیت چکی تھیں بھول کر اس سے کہا کرتی تھی۔

”مسز ڈی سلوا جان بوجھ کر تم نے یہ مصیبت کیوں مول لی۔“

اس پر وہ بگڑ کر کہتی۔

”ہم نے کب لیا۔ پانچ برس کے پیچھے سالا یہ ہونے کو ہی مانگتا تھا۔“

میں کہتی۔

”تو مسز ڈی سلوا پانچویں سال تم بنگلور کیوں نہ چلی گئیں۔“

وہ جواب دیتی

”ہم چلا جاتا۔ سچ ہم جانے کو ایک دم تیار تھا پر یہ وار اسٹارٹ ہو گیا۔ ہم وہاں رہتا ہمارا صاحب یہاں رہتا۔ خرچ بہت ہوتا۔ سو یہ سوچ کر ہم نہ گیا اور سالا یہ آفت سر پر آن پڑا۔“

شروع شروع میں مسز ڈی سلوا کو یہ آفت معلوم ہوتی تھیں پر اب وہ خوش تھی کہ دوسرا بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ قے اور متلی ختم ہو گئی تھی۔ ٹانگیں اوپر کر کے لیٹنے کی اب ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک رہتی تھی۔ یہ سلسلہ صرف پہلے دو مہینے تک رہا تھا۔ اب اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ایک صرف کبھی کبھی پیٹ میں اینٹھن سی پیدا ہو جاتی تھی یا بچہ جب پیٹ میں پھرتا تھا تو اسے تھوڑے عرصے کے لیے بے چینی سی محسوس ہوتی تھی۔ مسز ڈی سلوا بالکل تیار تھی۔ چھوٹے چھوٹے فراک سِی کر اس نے ایک چھوٹے سے منے بیگ میں رکھ چھوڑے تھے۔ نہالچے پوتڑے بھی تیار تھے۔ اس کا خاوند لوہے کا ایک جھولا بھی لے آیا تھا۔ اس کے لیے مسز ڈی سلوا نے پرانے تکیوں کے روئی سے ایک گدا بھی بنا لیا تھا۔ غرض کہ سب سامان تیار تھا۔ اب مسز ڈی سلوا کو صرف کسی ہسپتال میں جا کر بچہ جن دینا تھا اور بس۔ مسٹر ڈی سلوا نے دو مہینے پہلے ہسپتال میں اپنی بیوی کے لیے جگہ بُک کر رکھی تھی پانچ روپے ایڈوانس دے دیے تھے تاکہ عین وقت پر گڑبڑ نہ ہو اور ہسپتال میں جگہ مل جائے۔ مسٹر ڈی سلوا بہت دور اندیش تھا۔ پہلے بچے کی پیدائش پر بھی اس کے انتظامات ایسے ہی مکمل تھے۔ مسز ڈی سلوا اپنے خاوند سے بھی کہیں زیادہ دور اندیش تھی جیسا کہ میں بتا چکی ہُوں اس نے ان نو مہینوں کے اندر اندر وہ تمام سامان تیار کر لیا تھا جو بچے کے پہلے دو برسوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ نیچے بچھانے کے لیے ربڑ کے کپڑے فیڈر، چسنیاں، جھنجھنے اور دوسرے جاپانی کھلونے اور اسی قسم کی اور چیزیں سب بڑی احتیاط سے اس نے ایک علیحدہ ٹرنک میں بند کر رکھی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ یہ ٹرنک کھول کر بیٹھ جاتی تھی اور ان چیزوں کو اور زیادہ قرینے سے رکھنے کی کوشش کرتی تھی دراصل وہ دن گنتی تھی کہ جلدی بچہ پیدا ہو اور وہ اسے گود میں لے کر کھلائے دودھ پلائے۔ لوریاں دے اور جھوے میں لٹا کر سلائے۔ پانچ برس کی تعطیل کے بعد اب گویا اس کا اسکول کھلنے والا تھا وہ اتنی ہی خوش تھی جتنا کہ طالب علم ایسے موقعوں پر ہُوا کرتے ہیں۔ ہماری بلڈنگ کے سامنے ایک پارسی ڈاکٹر کا مطب تھا۔ اس ڈاکٹر کے پاس مسز ڈی سلوا ہر روز نوکر کے ہاتھ اپنا قارورہ بھیجتی تھی، کہتے ہیں آخری دنوں میں قارورہ دیکھ کر ڈاکٹر بتا سکتے ہیں کہ بچہ کب پیدا ہو گا۔ مسز ڈی سلوا کا خیال تھا کہ دن پورے ہو گئے ہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر کہتا تھا کہ نہیں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔ ایک روز میں غسل خانے میں نہا رہی تھی کہ میں نے مسز ڈی سلوا کی گھبرائی ہوئی آواز سنی، پھر دروازہ کھلا اور مسز ڈی سلوا کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو مسز ڈی سلوا اپنے خاوند کا سہارا لے کر اُترنے والی تھی۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ میری طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی بوڑھی عورتوں کا سا انداز اختیار کر کے کہا۔

”ساتھ خیر کے جاؤ اور ساتھ خیر کے واپس آؤ۔“

مسٹر ڈی سلوا نے جب میری آواز سنی تو مسکرا کر اپنے بھورے رنگ کا ہیٹ اتار مجھے سلام کیا۔ میں نے اس سے کہا۔

”مسٹر ڈی سلوا جونہی بے بی ہو مجھے ضرور خبر دیجیے گا۔“

وہ مسکراہٹ جو مسٹر ڈی سلوا کے میلے ہونٹوں پر سلام کرتے وقت پیدا ہو چکی تھی، یہ سن کر اور پھیل گئی۔ سارا دن میرا دھیان مسز ڈی سلوا ہی میں پڑا رہا۔ کئی بار دروازہ کھول کر دیکھا مگر ہسپتال سے نہ تو نوکر ہی واپس آیا تھا نہ مسز ڈی سلوا کا خاوند، شام ہو گئی۔ خدا جانے یہ لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مجھے کچھ دنوں کے لیے ماہم جانا تھا جہاں میری بہن رہتی تھی۔ مجھے لینے کیلیے آدمی بھی آگیا مگر ہسپتال سے کوئی خبر نہ آئی۔ تیسرے روز ماہم سے جب میں واپس آئی تو اپنے گھر جانے کے بجائے میں نے مسز ڈی سلوا کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا کیا دیکھتی ہوں کہ مسز ڈی سلوا میرے سامنے کھڑی ہے۔ مٹکا سا پیٹ لیے میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”یہ کیا؟“

وہ مجھے اندر لے گئی اور کہنے لگی۔

”ہم کو درد ہوا تو ہم سمجھا ٹائم پورا ہُوا وہاں ہسپتال میں گیا اور جب نرس نے بیڈ پر لٹایا تو درد ایک دم غائب ہو گیا۔ ہم بڑا حیران ہُوا۔ نرس لوگ تو بڑا ہنسا بولا۔ اتنا جلدی تم یہاں کیوں آگیا۔ ابھی کچھ دن گھر پر اور ٹھہرو۔ پیچھے آؤ۔ ہم کو بہت شرم آیا۔“

اس کا یہ بیان سن کر میں بہت ہنسی وہ بھی ہنسی۔ دیر تک ہم دونوں ہنستے رہے۔ اس کے بعد اس نے مجھے سارا واقعہ تفصیل سے سُنایا کہ کس طرح ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ہسپتال گئی۔ وہاں ایک کمرے میں اسکے تمام کپڑے اتارے گئے۔ نام وغیرہ درج کیا گیا اور ایک بستر پر لٹا کر اسے نرسیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں جہاں سے کئی دفعہ اسے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ اس بستر پر وہ چار پانچ گھنٹے تک پڑی رہی اس دوران میں پہلے ایک نرس آئی اس نے اسے نہانے کو کہا۔ نہانے سے فارغ ہوئی تو ایک نرس آئی اس نے اسے انیما دیا۔ انیما دینے کے بعد تیسری نرس آئی جو اس کے انجکشن لگا گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر آئی اس نے پیٹ ویٹ دیکھا تو جھنجھلا کر کہا۔

”تم کیوں اتنی جلدی یہاں آگیا ہے۔ ابھی گھر جا کر آرام کرو۔“

سب نرسیں ہنسنے لگیں۔ وہ پانی پانی ہو گئی۔ کپڑے وپڑے پہن کر باہر نکل آئی جہاں اس کا خاوند کھڑا تھا۔ دونوں کو چونکہ ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور مسٹر ڈی سلوا نے اس دن کی چھٹی لے رکھی تھی اس لیے وہ ریگل سینما میں میٹنی شو دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ مسز ڈی سلوا کو سخت حیرت تھی کہ یہ ہوا کیا پچھلی دفعہ جب اس کے بچہ ہونے والا تھا تو وہ عین موقع پر ہسپتال پہنچی تھی۔ اب اس کا اندازہ غلط کیوں نکلا۔ درد ضرور ہُوا تھا اور یہ بالکل ویسا ہی تھا جو اسے پہلے بچے کی پیدائش سے تھوڑی دیر پہلے ہُوا تھا پھر یہ گڑبڑ کیوں ہو گئی؟ چھٹے روز شام کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب میں بالکنی میں بیٹھی تھی کہ مسز ڈی سلوا کا نوکر آیا۔ دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا کہنے لگا۔

”میم صاحب نے چُھٹّا مانگا ہے۔ وہ ہسپتال جا رہی ہے۔ میں نے جھپ پٹ دس روپے کی ریزگاری نکالی اور بھاگی بھاگی وہاں گئی۔ میاں بیوی دونوں تیار تھے۔ مسز ڈی سلوا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ درد کے مارے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میں نے اور اس کے خاوند نے سہارا دیکر اسے نیچے اتارا اور ٹیکسی میں بٹھا دیا۔

”ساتھ خیر کے جاؤ اور ساتھ خیر کے واپس آؤ۔“

کہہ میں اوپر گئی اور انتظار کرنے لگی۔ رات کے بارہ بجے تک میں سیڑھیوں کی طرف کان لگائے۔ بیٹھی رہی۔ مگر ہسپتال سے کوئی واپس نہ آیا۔ تھک ہار کر سو گئی۔ صبح اٹھی تو دھوبی آگیا اس سے پندرہ دھلائیوں کا حساب کرنے میں کچھ ایسی مشغول ہُوئی کہ مسز ڈی سلوا کا دھیان ہی نہ رہا۔ دھوبی میلے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر باہر نکلا۔ میں دروازے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے باہر نکل کر مسز ڈی سلوا کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا کیا دیکھتی ہوں کہ مسز ڈی سلوا کھڑی ہے مٹکا سا پیٹ لیے۔ میں نے قریب قریب چیخ کر پوچھا: مسز ڈی سلوا۔ پھر واپس آگئیں۔ جب اس کے پاس گئی تو وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ شرم سے اس کا چہرہ گہرے سانولے رنگ کے باوجود سرخ ہو رہا تھا۔ رک رک کر اس نے مجھ سے کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ درد بالکل پہلے کے موافق ہوتا ہے پر وہاں نرس لوگ کہتا ہے کہ جاؤ گھر جاؤ ابھی دیر ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟۔“

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بیچاری کی حالت قابل رحم تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مرتبہ نرسوں نے اُسے بہت بری طرح جھڑکا تھا۔ حیرت۔ شرم اور بوکھلاہٹ نے مل جل کر اس کو اس قدر قابل رحم بنا دیا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ تھوڑے عرصہ کے لیے انتہائی ہمدردی ہو گئی۔ میں دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس کو سمجھایا کہ اس میں شرم کی بات ہی کیا ہے۔ جب بچہ ہونے والا ہو تو ایسی غلط فہمیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ نرسوں کا کام ہے بچے جننا۔ ان کے پاس آدمی اسی لیے جاتا ہے کہ آسانی سے یہ مرحلہ طے ہو جائے۔ انھیں مذاق اُڑانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اور جب فیس وغیرہ دی جائے گی اور ایڈوانس دے دیا گیا ہے تو پھر وہ بے کار باتیں کیوں بناتی ہیں۔ مسز ڈی سلوا کی پریشانی کم نہ ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اس کا خاوند دفتر سے دو دفعہ چھٹی لے چکا تھا۔ بڑے صاحب سے لے کر چپراسی تک سب کو معلوم تھا کہ بچہ ہونے والا ہے۔ اب وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی طرح محلے میں سب کو معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا دوبار ہسپتال جا کر واپس آچکی ہے۔ کئی عورتیں اس کے پاس آچکی تھیں اور ان سب کو فرداً فرداً اسے بتانا پڑا تھا کہ بچہ ابھی تک پیدا کیوں نہیں ہُوا۔ ہر ایک سے اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ ایک پکی کرسچین عورت تھی، جھوٹ بولنے پر اسے سخت روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔ ساتویں روز جب میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پلنگ پر لیٹ کر قریب قریب سو چکی تھی۔ دفعتاً میرے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز آئی۔ یہ کیا؟۔ دوڑ کر میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے فلیٹ سے مسز ڈی سلوا کا نوکر گھبرایا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ اس کا رنگ فق تھا۔ کہنے لگا۔ میم صاحب، بے بی۔ میم صاحب بی بی۔ میں نے اندر جا کر دیکھا تو مسز ڈی سلوا نیم مدہوشی کی حالت میں پڑی تھی، بے چاری نے اب مزید ندامت کے خوف سے وہیں بچہ جن دیا تھا۔

مسز ڈی کوسٹا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومسز ڈی کوسٹا

نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔ میرے پیٹ میں اب پہلی سی گڑبڑ نہیں تھی۔ پر مسزڈی کوسٹا کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھی۔ چنانچہ میں آنے والے حادثے کی تمام ان جانی تکلیفیں بھول گئی تھی اور مسزڈی کوسٹا کی حالت پر رحم کھانے لگی تھی۔ مسزڈی کوسٹا میری پڑوسن تھی۔ ہمارے فلیٹ کی بالکنی اور اس کے فلیٹ کی بالکنی میں صرف ایک چوبی تختہ حائل تھا۔ جس میں بے شمار ننھے ننھے سوراخ تھے ان سوراخوں میں سے میں اور اللہ بخشے میری ساس ڈی کوسٹا کے سارے خاندان کو کھانا کھاتے دیکھا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کے ہاں سکھائی ہوئی جھینگا مچھلی پکتی اور اس کی ناقابلِ برداشت بُو ان سوراخوں سے چھن چھن کر ہم تک پہنچ جاتی تو میں اور میری ساس بالکنی کا رخ نہ کرتے تھے۔ میں اب بھی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنی بدبودار چیز کھائی کیونکر جاسکتی ہے، پر بابا کیا کہا جائے۔ انسان بری سے بری چیزیں کھا جاتا ہے۔ کون جانے۔ انھیں اس ناقابلِ برداشت بو ہی میں لطف آتا ہو۔ مسزڈی کوسٹا کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کے کٹے ہوئے بال جو اپنی سیاہی بالکل کھو چکے تھے اور جن میں بے شمار سفید دھاریاں پڑ چکی تھیں، اس کے چھوٹے سر پر گھسے ہوئے نمدے کی ٹوپی کی صورت میں پریشان رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ نیا بھڑکیلے رنگ کا بہت بھونڈے طریقے پر سلا ہوا فراک پہنتی تھی تو سر پر لال لال بندکیوں والا جال بھی لگا لیتی تھی۔ جس سے اس کے چھدرے بال اس کے سر کے ساتھ چپک جاتے تھے۔ اس حالت میں وہ درزیوں کا ایسا ماڈل دکھائی دیتی تھی جو نیلام گھر میں پڑا ہو۔ میں نے کئی بار اسے اپنے انہی بالوں میں لہریں پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف دیکھا ہے۔ اپنے چار بیٹوں کو جن میں سے ایک تازہ تازہ فوج میں بھرتی ہوا تھا اور اپنے آپ کو ہندوستان کے حکمرانوں کی فہرست میں شامل سمجھتا تھا۔ اور دوسرا جو ہر روز اپنی کلف لگی سفید پتلون استری کر کے پہنتا تھا اور نیچے آکر چھوٹی چھوٹی کرسچین لڑکیوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا۔ ناشتہ کرا دیا کرتی تھی اور اپنے بڈھے خاوند کو جو ریلوے میں ملازم تھا۔ بالکنی میں نکل کر ہاتھ کے اشارے سے

”بائی بائی“

کرنے کے بعد فارغ ہو جاتی تھی تو اپنے سر کے ناقابلِ گرفت بالوں میں لہریں پیدا کرنے والے کلپ اٹکا دیا کرتی تھی۔ اور ان کلپوں سمیت سوچا کرتی تھی کہ میرے ہاں بچہ کب پیدا ہو گا۔ وہ خود آدھے درجن بچے پیدا کر چکی تھی جن میں سے پانچ زندہ تھے۔ ان کی پیدائش پر بھی وہ یونہی دن گنا کرتی تھی یا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی اور بچے کو خود بخود پیدا ہونے کے لیے چھوڑ دیتی تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا تلخ تجربہ ضرور ہے کہ جو کچھ میرے پیٹ میں تھا، اس سے مسزڈی کوسٹا کو جس کا داہنا پیر اور اس کے اوپر کا حصہ کسی بیماری کے باعث ہمیشہ سوجا رہتا تھا، بہت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ دن میں کئی مرتبہ بالکنی میں سے جھانک کر وہ مجھے آواز دیا کرتی تھی اور گرائمر سے بے نیاز انگریزی میں، جس کا نہ بولنا اس کے نزدیک شاید ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کی ہتک تھی، مجھ سے کہا کرتی تھی

”میں بولی، آج تم کدھر گیا تھا۔“

جب میں اسے بتاتی کہ میں اپنے خاوند کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی۔ تو اس کے چہرے پر ناامیدی کے آثار پیدا ہو جاتے اور وہ انگریزی بھول کر بمبئی کی اردو میں گفتگو کرنا شروع کر دیتی جس کا مقصد مجھ سے صرف اس بات کا پتا لینا ہوتا تھا کہ میرے خیال کے مطابق بچے کی پیدائش میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا علم ہوتا تو میں یقیناً اسے بتا دیتی۔ اس میں حرج ہی کیا تھا۔ اس بیچاری کو خواہ مخواہ کی الجھن سے نجات مل جاتی اور مجھے بھی ہر روز اس کے نت نئے سوالوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے بچوں کی پیدائش اور اس کے متعلقات کا کچھ علم ہی نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ نو مہینے پورے ہو جانے پر بچہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ مسزڈی کوسٹا کے حساب کے مطابق نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔ میری ساس کا خیال تھا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں۔ لیکن یہ نو مہینے کہاں سے شروع کر کے پورے کر دیے گئے تھے، میں نے بہتیرا اپنے ذہن پر زور دیا، پر سمجھ نہ سکی۔ بچہ میرے پیدا ہونے والا تھا۔ شادی میری تھی۔ لیکن سارا بہی کھاتہ مسزڈی کوسٹا کے پاس تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ یہ میری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے۔ اگر میں نے کسی چھوٹی سی نوٹ بک میں، چھوٹی سی نوٹ بک میں نہ سہی۔ اس کاپی ہی میں جو دھوبی کے حساب کے لیے مخصوص تھی، سب تاریخیں لکھ چھوڑی ہوتیں تو کتنا اچھا تھا۔ اتنا تو مجھے یاد تھا اور یاد ہے کہ میری شادی ۲۶ اپریل کو ہوئی یعنی ۲۶ کی رات کو میں اپنے گھر کے بجائے اپنے خاوند کے گھر میں تھی۔ لیکن اس کے بعد کے واقعات کچھ اس قدر خلط ملط ہو گئے تھے کہ اس بات کا پتا لگانا بہت مشکل تھا اور مجھے تعجب اسی بات کا ہے کہ مسزڈی کوسٹا نے کیسے اندازہ لگا لیا تھا کہ نو مہینے پورے ہو چکے ہیں اور بچہ لیٹ ہو گیا ہے۔ ایک روز اس نے میری ساس سے اضطراب بھرے لہجے میں کہا۔

”تمہارے ڈاٹر اِن لا کا بچہ لیٹ ہو گیا ہے۔ پچھلے ویک (ہفتے) میں پیدا ہونا ہی مانگتا تھا۔“

میں اندر صوفے پر لیٹی تھی اور آنے والے حادثے کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ مسزڈی کوسٹا کی یہ بات سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی اور ایسا لگا کہ مسزڈی کوسٹا اور میری ساس دونوں پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں اور جس گاڑی کا انھیں انتظار تھا، لیٹ ہو گئی ہے۔ اللہ بخشے میری ساس کو اتنی شدت کا انتظار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کئی مرتبہ مسزڈی کوسٹا سے کہہ چکی تھی۔

”کوئی فکر کی بات نہیں، خدا اپنا فضل کرے گا۔ کچھ اوپر ہو جایا کرتے ہیں۔“

مگر مسزڈی کوسٹا نہیں مانتی تھی۔ جو حساب وہ لگا چکی تھی، غلط کیسے ہو سکتا تھا۔ جب مسزڈی سلوا کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے دور سے ہی دیکھ کہ کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔ چنانچہ چوتھے روز ہی مسزڈی سلوا ہسپتال جاتی نظر آئی۔ اور خود اس نے چھ بچے جنے تھے جن میں سے ایک بھی لیٹ نہ ہوا تھا۔ اور پھر وہ نرس تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس نے کسی ہسپتال میں دایہ گیری کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ مگر سب لوگ اسے نرس کہتے تھے۔ چنانچہ ان کے فلیٹ کے باہر چھوٹی سی تختی پر

”نرس ڈی کوسٹا“

لکھا رہتا تھا۔ اسے بچوں کی پیدائش کے اوقات معلوم نہ ہوتے تو اور کس کو ہوتے۔ جب کمرہ نمبر ۱۷ کے رہنے والے مسٹر نذیر کی ناک سوج گئی تھی تو مسز ڈی کوسٹا ہی نے بازار سے روئی کا بنڈل منگوایا تھا اور پانی گرم کر کے ٹکور کی تھی۔ بار بار وہ اس واقعے کو سند کے طور پر پیش کیا کرتی تھی۔ چنانچہ مجھے بار بار کہنا پڑتا تھا۔

”ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پڑوس میں ایسی عورت رہتی ہے جو خوش خلق ہونے کے علاوہ اعلیٰ نرس بھی ہے۔“

یہ سن کر وہ خوش ہوتی تھی اور اس کو یوں خوش کرنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا تھا کہ جب۔ صاحب کو تیز بخار چڑھا تھا تو مسز ڈی کوسٹا نے برف لگانے والی ربڑ کی تھیلی فوراً مجھے لا دی تھی۔ یہ تھیلی ایک ہفتہ تک ہمارے یہاں پڑی رہی اور ملیریا کے مختلف شکاروں کے استعمال میں آتی رہی۔ یوں بھی مسز ڈی کوسٹا بڑی خدمت گزار تھی۔ لیکن اس کی اس رضاکاری میں اس کی متجسس طبیعت کو کافی دخل تھا۔ دراصل وہ اپنے تمام پڑوسیوں کے ان رازوں سے بھی واقف ہونے کی آرزومند تھی جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔ مسز ڈی سلوا چونکہ مسز ڈی کوسٹا کی ہم مذہب تھی، اس لیے اس کی بہت سی کمزوریاں اس کو معلوم تھیں۔ مثلاً وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی کرسمس میں ہوئی اور بچہ جولائی میں پیدا ہوا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کی شادی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا ناچ گھروں میں جاتی ہے اور یوں بہت سا روپیہ کماتی ہے۔ اور یہ کہ وہ اب اتنی خوبصورت نہیں رہی جتنی کہ پہلے تھی چنانچہ اس کی آمدنی بھی پہلے کی نسبت کم ہو گئی ہے۔ ہمارے سامنے جو یہودی رہتے تھے، ان کے متعلق مسز ڈی سلوا کے مختلف بیان تھے۔ کبھی وہ کہتی تھی کہ موٹی موذیل جو رات کو دیر سے گھر آتی ہے، سٹہ کھیلتی ہے اور وہ ٹھنگنا سا بڈھا جو اپنی پتلون کے گیلسوں میں انگوٹھے اٹکائے اور کوٹ کاندھے پر رکھے صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کو لوٹتا ہے، موذیل کا پرانا دوست ہے۔ اس بڈھے کے متعلق اس نے کھوج لگا کر معلوم کیا تھا کہ صابن بناتا ہے جس میں سجی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک دن اس نے ہمیں بتایا کہ موذیل نے اپنی لڑکی کی جو بہت خوصورت تھی اور ہر روز نیلے رنگ کا

”جم“

پہن کر اسکول جاتی تھی، اس آدمی سے منگنی کر رکھی ہے جو ہر روز ایک پارسی کو موٹر میں لے کر آتا ہے۔ اس پارسی کے متعلق میں اتنا جانتی ہوں کہ اس کی موٹر ہمیشہ نیچے کھڑی رہتی تھی اور وہ موذیل کی لڑکی کے منگیتر سمیت رات وہیں بسر کرتا تھا۔ مسز ڈی کوسٹا کا بیان یہ تھا کہ موذیل کی لڑکی فلوری کا منگیتر پارسی کا موٹر ڈرائیور ہے اور یہ پارسی اپنے موٹر ڈرائیور کی بہن للی کا عاشق ہے جو اپنی چھوٹی بہن وائلٹ سمیت اسی فلیٹ میں رہتی تھی۔ وائلٹ کے متعلق مسز ڈی کوسٹا کی رائے بہت خراب تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ لونڈیا جو ہر وقت ایک ننھے سے بچے کو اٹھائے رہتی ہے، بہت بُرے کیریکٹر کی ہے۔ اور اس ننھے سے بچے کے متعلق اس نے ایک دن ہمیں یہ خبر سنائی تھی اور جیسا کہ مشہور کیا گیا ہے۔ وہ کسی پارسن کا لاوارث بچہ نہیں بلکہ خود وائلٹ کی بہن للّی کا ہے۔ بس مجھے اتنا ہی یاد رہا ہے کیونکہ جو شجرہ مسز ڈی کوسٹا نے تیار کیا تھا اتنا لمبا ہے کہ شاید ہی کسی کو یاد رہ سکے۔ صرف آس پاس کی عورتوں اور پڑوس کے مردوں تک مسز ڈی کوسٹا کی معلومات محدود نہیں تھیں۔ اسے دوسرے محلے کے لوگوں کے متعلق بھی بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے سُوجے ہوئے پیر کا علاج کرنے کی غرض سے باہر جاتی تو گھر لوٹتے ہوئے دوسرے محلوں کی بہت سی خبریں لاتی تھی۔ ایک روز جب مسز ڈی کوسٹا میرے بچے کی پیدائش کا انتظار کر کر کے تھک ہار چکی تھی، میں نے اسے باہر پھاٹک کے پاس اپنے دو بڑے لڑکوں، ایک لڑکی اور پڑوسن کی دو عورتوں کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھا۔ یہ خیال کر کے جی ہی جی میں بہت کڑھی کہ میرے بچے کے لیٹ ہو جانے کے متعلق باتیں کر رہی ہو گی۔ چنانچہ جب اس نے گھر کا رخ کیا تو میں جنگلے سے پرے ہٹ گئی۔ مگر اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ سیدھی اوپر چلی آئی۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر بالکنی ہی میں مونڈھے پر بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھتے ہی اس نے بمبئی کی اردو اور گرائمر سے بے نیاز انگریزی میں کہنا شروع کیا۔

”تم نے کچھ سنا؟۔ مہاتما گاندھی نے کیا کیا؟۔ سالی کانگرس ایک نیا قانون پاس کرانا چاہتی ہے۔ میرا فریڈرک خبر لایا ہے کہ بمبئی میں پروہشین ہو جائے گی۔ تم سمجھتا ہے پروہشین کیا ہوتی ہے؟“

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کیونکہ جتنی انگریزی مجھے آتی تھی۔ اس میں پروہشین کا لفظ نہیں تھا۔ اس پر مسز ڈی کوسٹا نے کہا۔

”پروہشین شراب بند کرنے کو کہتے ہیں۔ ہم پوچھتا ہے۔ اس کانگرس کا ہم نے کیا بگاڑا ہے کہ شراب بند کر کے ہم کو تنگ کرنا مانگٹی ہے۔ یہ کیسی گورنمنٹ ہے۔ ہم کو ایسی بات ایک دم اچھی نہیں لگٹی۔ ہمارا تہوار کیسے چلے گا۔ ہم کیا کرے گا۔ وسکی ہمارے تہواروں میں ہونا ہی مانگٹا ہے۔ تم سمجھتی ہونا؟ کرسمس کیسے ہو گا؟۔ کرسچین لوگ تو اس لاء کو نہیں مانے گا۔ کیسے مان سکتا ہے۔ میرے گھر میں چوبیس کلاک (گھنٹے) برانڈی کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ لاء پاس ہو گیا تو کیسے کام چلے گا۔ یہ سب کچھ گانڈھی کر رہا ہے۔ گانڈھی جو محمڈن لوگ کا ایک دم بیری ہے۔ سالا آپ تو پیتا نہیں اور دوسروں کو پینے سے روکتا ہے اور تمہیں مالوم ہے یہ ہم لوگوں کا میرا مطلب ہے گورنمنٹ کا بہت بڑا اینی می (دشمن) ہے۔“

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان کا سارا ٹاپو مسز ڈی کوسٹا کے اندر سما گیا ہے۔ وہ گوا کی رہنے والی کالے رنگ کی کرسچین عورت تھی۔ مگر جب اس نے یہ باتیں کیں تو میرے تصور نے اس پر سفید چمڑی منڈھ دی۔ چند لمحات کے لیے وہ یورپ سے آئی ہوئی تازہ تازہ انگریز عورت دکھائی دی جسے ہندوستان اور اس کے مہاتما جی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ سمندر کے پانی

سے نمک بنانے کی تحریک مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی۔ چرخہ چلانا اور کھادی پہننا بھی اسی نے لوگوں کو سکھایا تھا۔ اسی قسم کی اور بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں وہ کر چکا تھا۔ شاید اسی لیے مسز ڈی کوسٹا نے یہ سمجھا تھا کہ بمبئی میں شراب صرف اس لیے بند کی جا رہی ہے کہ

”انگریز لوگوں“

کو تکلیف ہو۔ وہ کانگرس اور مہاتما گاندھی کو ایک ہی چیز سمجھتی تھی۔ یعنی لنگوٹی۔ مہاتما گاندھی اور اس کی ہشت پشت پر لعنتیں بھیج کر مسز ڈی کوسٹا اصل بات کی طرف متوجہ ہوئی

”اور ہاں یہ تمہارا بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ چلو میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“

میں نے اس وقت بات ٹال دی مگر مسز ڈی کوسٹا نے گھر جاتے ہوئے پھر مجھ سے کہا۔

”دیکھو تم کو کچھ ایسا ویسا بات ہو گیا۔ تو پھر ہم کو نہ بولنا۔“

اس سے دوسرے روز کا واقعہ ہے۔ صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے مجھے خیال آیا۔ کئی دنوں سے میں نے مسز کاظمی کو ٹیلیفون نہیں کیا۔ اس کو بھی بچے کی پیدائش کا بہت خیال ہے۔ اس وقت فرصت ہے۔ اور نذیر صاحب کا دفتر جو ان کے گھر کے ساتھ ہی ملحق تھا، بالکل خالی ہو گا کیونکہ چھ بج چکے تھے۔ اٹھ کر ٹیلیفون کر دینا چاہیے۔ یوں سیڑھیاں اترنے اور چڑھنے سے ڈاکٹر صاحب اور تجربہ کار عورتوں کے مشورہ پر عمل بھی ہو جائے گا۔ جو یہ تھا کہ چلنے پھرنے سے بچہ آسانی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے سمیت اٹھی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب پہلی منزل پر پہنچی تو مجھے نرس ڈی کوسٹا کا بورڈ نظر آیا اور پیشتر اس کے کہ میں اس کے فلیٹ کے دروازے سے گزر کر دوسری منزل کے پہلے زینے پر قدم رکھوں، مسز ڈی کوسٹا باہر نکل آئی اور مجھے اپنے گھر لے گئی۔ میرا دم پھولا ہوا تھا اور پیٹ میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ربڑ کی گیند ہے جو کہیں اٹک گئی ہے۔ اس سے بڑی الجھن ہو رہی تھی میں نے ایک بار اس تکلیف کا ذکر اپنی ساس سے کیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ بچے کی ٹانگ وانگ ادھر ادھر پھنس جایا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ ٹانگ وانگ ہی ہلنے جلنے سے کہیں پھنس گئی تھی جس کے باعث مجھے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے مسز ڈی کوسٹا سے کہا۔ مجھے ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے اس لیے میں آپ کے یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔ اور بہت سے جھوٹے بہانے پیش کیے مگر وہ نہ مانی اور میرا بازو پکڑ کر اس نے زبردستی مجھے اس صوفے پر بٹھا دیا جس کا کپڑا بہت میلا ہو رہا تھا۔ مجھے صوفے پر بٹھا کر جلدی جلدی اس نے دوسرے کمرے سے اپنے دو چھوٹے لڑکوں کو باہر نکالا۔ اپنی کنواری جوان لڑکی کو بھی جو مہاتما گاندھی کی لنگوٹی سے کچھ بڑی نیکر پہنتی تھی، اس نے باہر بھیج دیا اور مجھے خالی کمرے میں لے گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے اس نے میری طرف اس افریقی جادوگر کی طرح دیکھا جس نے الہ دین کا چچا بن کر اسے غار میں بند کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اس پھرتی سے کیا کہ مجھے وہ۔ ایک بہت پُراسرار دکھائی دی۔ سُوجے ہوئے پیر کے باعث اس کی چال میں خفیف سا لنگڑا پن پیدا ہو گیا تھا، جو مجھے اس وقت بہت بھیانک دکھائی دی۔ میری طرف گھور کر دیکھنے کے بعد اس نے ادھر دیوار کی تینوں کھڑکیاں بند کیں۔ ہر کھڑکی کی چٹخنی چڑھا کر اس نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا اسے اس بات کا ڈر ہے کہ میں اٹھ بھاگوں گی۔ ایمان کی کہوں اس وقت میرا یہی جی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر بھاگ جاؤں۔ اس کی خاموشی اور اس کے کھڑکیاں، دروازے بند کرنے سے میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ آخر اس کا مطلب کیا تھا؟ وہ چاہتی کیا تھی، اتنے زبردست تخلیے کی کیا ضرورت تھی؟۔ اور پھر۔ وہ لاکھ پڑوسن تھی۔ اس کے ہم پر کئی احسان بھی تھے لیکن آخر وہ تھی تو ایک غیر عورت اور اس کے بیٹے۔ وہ مؤا فوجی اور وہ کلف لگی پتلون والا جو چھوٹی چھوٹی کرسچین لڑکیوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ پرائے پرائے۔ میں کئی عشقیہ ناولوں میں کٹنیوں کا حال پڑھ چکی تھی۔ جس انداز سے وہ ادھر ادھر چل پھر رہی تھی اور دروازے بند کر کے پردے کھینچ رہی تھی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ نرس ورس بالکل نہیں بلکہ بہت بڑی کٹنی ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باعث کمرے میں جس کے اندر لوہے کے چار پلنگ پڑے تھے، کافی اندھیرا ہو گیا تھا جس سے مجھے اور بھی وحشت ہوئی۔ مگر اس نے فوراً ہی بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے گی۔ پُراسرار طریقے پر اُس نے آتشدان سے ایک بوتل اٹھائی جس میں سفید رنگ کا سیّال مادہ تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

”اپنا بلاؤز اتارو۔ میں کچھ دیکھنا مانگتی ہوں۔“

میں گھبرا گئی۔

”کیا دیکھنا چاہتی ہو؟“

اوپر سے سب کچھ نظر آ رہا تھا، پھر بلاؤز اتروانے کا کیا مطلب تھا۔ اور اسے کیا حق حاصل تھا کہ وہ دوسری عورتوں کو یوں گھر کے اندر بلا کر بلاؤز اتروانے پر مجبور کرے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ مسز ڈی کوسٹا میں بلاؤز ہرگز ہرگز نہیں اتاروں گی۔ میرے لہجے میں گھبراہٹ کے علاوہ تیزی بھی تھی۔ مسز ڈی کوسٹا کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”تو۔ تو۔ پھر ہم کو مالوم کیسے پڑے گا کہ تمہارے گھر بچہ کب ہو گا۔ اس بوتل میں کھوپرے کا تیل ہے۔ یہ ہم تمہارے پیٹ پر گرا کر دیکھے گا۔ اس سے ایک دم مالوم ہو جائے گا کہ بچہ کب ہو گا۔ لڑکی ہو گی یا لڑکا۔“

میری گھبراہٹ دور ہوگئی۔ ڈی کوسٹا پھر مجھے مسز ڈی کوسٹا نظر آنے لگی۔ کھوپرے کا تیل بڑی بے ضرر چیز ہے۔ پیٹ پر اگر اس کی پوری بوتل بھی الٹ دی جاتی تو کیا حرج تھا۔ اور پھر ترکیب کتنی دلچسپ تھی۔ اس کے علاوہ اگر میں نہ مانتی تو مسز ڈی کوسٹا کو کتنی بڑی ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا۔ مجھے ویسے بھی کسی کی دل شکنی منظور نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں مان گئی۔ بلاؤز اور قمیض اتارنے میں مجھے کافی کوفت ہوئی مگر میں نے برداشت کرلی۔ غیر عورت کی موجودگی میں جب میں نے اپنا پھولا ہوا پیٹ دیکھا جس کے نچلے حصے پر اس طرح کے لال لال نشان بنے ہوئے تھے جیسے ریشمی کپڑے میں چُرسیں پڑ جائیں تو مجھے ایک عجیب قسم کا حجاب محسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ فوراً کپڑے پہن لوں اور وہاں سے چل دوں لیکن مسز ڈی کوسٹا کا وہ ہاتھ جس میں کھوپرے کے تیل کی بوتل تھی اٹھ چکا تھا۔ میرے پیٹ پر ٹھنڈے ٹھنڈے تیل کی ایک لکیر دوڑ گئی۔ مسز ڈی کوسٹا خوش ہوگئی۔ میں نے جب کپڑے پہن لیے تو اس نے مطمئن لہجہ میں کہا۔

”آج کیا ڈیٹ ہے؟ اگیارہ (گیارہ) بس پندرہ کو بچہ ہو جائے گا اور لڑکا ہو گا۔“

بچہ ۲۵ تاریخ کو ہوا لیکن تھا لڑکا۔ اب جب کبھی وہ میرے پیٹ پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ رکھتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسز ڈی کوسٹا نے کھوپرے کے تیل کی ساری بوتل انڈیل دی ہے۔

مسز گل

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومسز گل

میں نے جب اُس عورت کو پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے لیموں نچوڑنے والا کھٹکا دیکھا ہے۔ بہت دُبلی پتلی، لیکن بلا کی تیز۔ اس کا سارا جسم سوائے آنکھوں کے انتہائی غیر نسوانی تھا۔ یہ آنکھیں بڑی بڑی اور سرمئی تھیں جن میں شرارت، دغابازی اور فریب کاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میری اس کی ملاقات اُونچی سوسائٹی کی ایک خاتون کے گھر میں ہوئی جو پچپن برس کی عمر میں ایک جواں سال مرد سے شادی کے مرحلے طے کر رہی تھی۔ اس خاتون سے جس کو میں اپنی اور آپ کی سہولت کی خاطر مسز گُل کہوں گا میرے بڑے بے تکلف مراسم تھے۔ مجھے ان کی ساری خامیوں کا علم تھا اور انھیں میری چند کا۔ بہر حال ہم دونوں ایک دوسرے سے ملتے اور گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ مجھ سے انھیں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ انھیں افسانے پڑھنے کا شوق تھا اور میرے لکھے ہوئے افسانے ان کو خاص طور پر پسند آتے تھے۔ میں نے جب اس عورت کو جو صرف اپنی آنکھوں کی وجہ سے عورت کہلائے جانے کی مستحق تھی مسز گُل کے فلیٹ میں دیکھا تو مجھے یہ ڈر محسوس ہوا کہ وہ میری زندگی کا سارا رس ایک دو باتوں ہی میں نچوڑ لے گی لیکن تھوڑے عرصے کے بعد یہ خوف دُور ہو گیا اور میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ مسز گل کے متعلق میرے جو خیالات پہلے تھے سو اب بھی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ تین شادیاں کرنے کے بعد چوتھی شادی ضرور کریں گی۔ اس کے بعد شاید پانچویں بھی کریں اگر عمر نے اُن سے وفا کی مگر مجھے اس عورت کا جس کا میں اُوپر ذکر کر چکا ہوں ان سے کوئی رشتہ سمجھ میں نہ آسکا۔ میں اب اس عورت کا نام بھی آپ کو بتا دوں۔ مسز گُل نے اُسے رضیہ کہہ کر پکارا تھا۔ اس کا لباس عام نوکرانیوں کا سا نہیں تھا۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مسز گل کے مزارعوں کی کوئی بہو بیٹی ہے جو ان کی خدمت کے لیے کبھی کبھار آجایا کرتی ہے۔ یہ خدمت کیا تھی اس کے متعلق مجھے پہلے کوئی علم نہیں تھا۔ رضیہ کی آمد سے پہلے مسز گل کے ہاں بارہ تیرہ برس کی ایک لڑکی جمیلہ رہتی تھی۔ ان دنوں انھوں نے ایک پروفیسر سے شادی کر رکھی تھی۔ یہ پروفیسر جوان تھا۔ کم از کم مسز گل سے عمر میں پچیس برس چھوٹا۔ وہ جمیلہ کو بٹیا کہتے تھے اور اُس سے بڑا پیار کرتے تھے۔ یہ لڑکی بڑی پیاری تھی۔ رضیہ کی طرح دُبلی پتلی مگر اس کے جسم کا کوئی حصہ غیر نسوانی نہیں تھا اس کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا کہ وہ بہت جلد۔ معلوم نہیں اتنی جلد کیوں۔ جوان عورت میں تبدیل ہونے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ پروفیسر صاحب اُس کو اکثر اپنے پاس بُلاتے اور دوسرے تیسرے کام پر انعام کے طور پر اس کی پیشانی چومتے اور شاباشیاں دیتے۔ مسز گُل بہت خوش ہوتیں اس لیے کہ یہ لڑکی ان کی پروردہ تھی۔ میں بیمار ہو گیا۔ دو مہینے مری میں گزار کر جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ جمیلہ غائب ہے۔ شاید وہ مسز گل کی زمینوں پر واپس چلی گئی تھی۔ لیکن دو برس کے بعد میں نے اسے ایک ہوٹل میں دیکھا جہاں وہ چند عیش پرستوں کے ساتھ شراب پی رہی تھی۔ اُس وقت اس کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ اُس نے اپنی بلوغت (نیم بلوغت کہنا زیادہ بہتر ہو گا) کا زمانہ بڑی افراتفری میں طے کیا ہے جیسے کسی مہاجر نے فسادات کے دوران میں ہندوستان سے پاکستان کا سفر۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی اس لیے کہ جن کے ساتھ وہ بیٹھی تھی، میری جان پہچان کے نہیں تھے۔ نہ میں نے اس کا ذکر مسز گل سے کیا کیونکہ وہ جمیلہ کی اس حیرت ناک افتاد پر کوئی روشنی نہ ڈالتی۔ بات رضیہ کی ہو رہی تھی لیکن جمیلہ کا ذکر ضمناً آگیا۔ شاید اس لیے کہ اس کے بغیر مسز گل کے کردار کا عقبی منظر پورا نہ ہوتا۔ رضیہ سے جب میں نے باتیں شروع کیں تو اس کا لب ولہجہ اس کی آنکھوں کے مانند تیز فریب کار اور بے سبب رنج آشنا دشمن تھا۔ مجھے بالکل کوفت نہ ہوئی اس لیے کہ ہر نئی چیز میرے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ عام طور پر میں کسی عورت سے بھی خواہ وہ کمترین تر ہو، بے تکلف نہیں ہوتا۔ لیکن رضیہ کی آنکھوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بھی اس سے چند شریر باتیں کہوں۔ خدا معلوم میں نے اس سے کیا بات کہی کہ اُس نے مجھ سے پوچھا

“آپ کون ہیں؟”

میں نے جو کہ شرارت پر تُلا بیٹھا تھا۔ مسز گُل کی موجودگی میں کہا آپ کا ہونے والا شوہر۔”

وہ ایک لحظے کے لیے بھنا گئی مگر فوراً سنبھل کر مجھ سے مخاطب ہوئی

“میرا کوئی شوہر اب تک زندہ نہیں رہا”

میں نے کہا

“کوئی حرج نہیں۔ خاکسار کافی عرصے تک زندہ رہنے کا وعدہ کرتا ہے بشرطیکہ آپ کو کوئی عذر نہ ہو”

مسز گُل نے یہ چوٹیں پسند کیں اور ایک جھریوں والا قہقہ بلند کیا

“سعادت تم کیسی باتیں کرتے ہو”

میں نے جواباً مسز گُل سے کہا

“مجھے آپ کی یہ خادمہ بھا گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا قیمہ بنا کے کوفتے بناؤں جن میں کالی مرچ دھنیا اور پودینہ خوب رچا ہو۔”

میری بات کاٹ دی گئی۔ رضیہ اُچک کر بولی

“جناب۔ میں خود بڑی تیز مرچ ہوں۔ یہ کوفتے آپ کو ہضم نہیں ہوں گے۔ فساد مچا دیں گے آپ کے معدے کے اندر”

مسز گُل نے ایک اور جھریوں والا قہقہہ بلند کیا

“سعادت‘تم بڑے شریر ہو‘لیکن یہ رضیہ بھی کسی طرح تم سے کم نہیں۔”

مجھے چونکہ رضیہ کی بات کا جواب دینا تھا اس لیے میں نے مسز گُل کے اس جملے کی طرف توجہ نہ دی اور کہا

“رضیہ۔ میرا معدہ تم جیسی مرچوں کا بہت دیر کا عادی ہے”

یہ سُن کر رضیہ خاموش ہو گئی۔ معلوم نہیں کیوں؟ اُس نے مجھے دھوئی ہوئی مگر سرمگین آنکھوں سے کچھ ایسے دیکھا کہ ایک لحظے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری ساری زندگی دھوبنوں کے ہاں چلی گئی ہے۔ معلوم نہیں کیوں۔ لیکن اُس کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں اسے سڑکیں کوٹنے والا انجن بن کر ایسا دباؤں کہ چکنا چور ہو جائے۔ بلکہ اس کا سفوف بن جائے۔ یا میں اس کے سارے وجود کو اس طرح توڑوں مروڑوں اور پھر اس بھونڈے طریقوں سے جوڑوں کہ وہ کسی قدر نسوانیت اختیار کر لے مگر یہ خواہش صرف اس وقت پیدا ہوتی جب میں اُسے دیکھتا اُس کے بعد یہ غائب ہو جاتی۔ انسان کی خواہشات بالکل بلبلوں کے مانند ہوتی ہیں جو معلوم نہیں کیوں پیدا ہوتے ہیں اور کیوں پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ مجھے رضیہ پر ترس بھی آتا تھا۔ اس لیے کہ اُس کی آنکھیں جو الا دہکتی رہتی تھی اور اُس کے مقابلے میں اُس کا جسم آتش فشاں پہاڑ نہیں تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ مگر ان ہڈیوں کو چبانے کے لیے کتوں کے دانتوں کی ضرورت تھی۔ ایک دن اُس سے میری ملاقات مسز گُل کے فلیٹ کے باہر ہوئی جب کہ میں اندر جا رہا تھا۔ وہ ہمارے محلے کی جوان بھنگن کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ میں جب وہاں سے گزرنے لگا تو شرارت کے طور پر میں نے اُس کی شریر آنکھوں میں اپنی آنکھیں (معلوم نہیں میری آنکھیں کس قسم ہیں) ڈال کر بڑے عاشقانہ انداز میں پوچھا

“کہو بادشاؤ کیا ہو رہا ہے۔”

بھنگن کی گود میں اس کا پلوٹھی کا لڑکا تھا۔ اُس کی طرف دیکھ کر رضیہ نے مجھ سے کہا

“کوئی چیز کھانے کے لیے مانگتا ہے”

میں نے اس سے کہا:

“چند بوٹیاں تمہارے جسم پر ابھی تک موجود ہیں۔ دے دو اسے”

میں نے پہلی بار اُس کے دھوئے دیدوں میں عجیب و غریب قسم کی جھلک دیکھی جسے میں سمجھ نہ سکا۔ مسز گُل کے ہاں ان دنوں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ایک نئے نوجوان کی آمد و رفت تھی اس لیے کہ وہ پروفیسر سے طلاق لے چکی تھیں۔ یہ صاحب ریلوے میں ملازم تھے اور ان کا نام شفیق اللہ تھا۔ آپ کو دمے کی شکایت تھی اور مسز گل ہر وقت ان کے علاج و معالجے میں مصروف رہتیں۔ کبھی ان کو ٹکیاں دیتیں۔ کبھی انجکشن لگوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جاتیں۔ کبھی ان کے گلے میں دوائی لگائی جاتی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ اس عارضے میں گرفتار نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو کبھی نزلہ زکام ہوا ہو یا شاید کھانسی بھی آئی ہو۔ لیکن یہ مسز گل کا کمال تھا کہ اس غریب کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کو دمے کا عارضہ ہے۔

ایک دن میں نے اُس سے کہا

”حضرت، آپ کو یہ مرض تو بہت اچھا لگا۔ اس لیے کہ یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ آپ کبھی مر نہیں سکتے“

یہ سُن کر وہ حیران ہو گیا

”آپ کیسے کہتے ہیں کہ یہ مرض اچھا ہے“

میں نے جواب دیا

”ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کے دمے کا مریض مرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ میں نہیں بتا سکتا کیوں۔ آپ ڈاکٹروں سے مشورہ کر سکتے ہیں“

رضیہ موجود تھی اُس نے شریر کنکھیوں سے مجھے بہت گھور کے دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں اپنی مالکہ مسز گُل کی طرف مڑیں اور اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ شفیق اللہ نراکھرا چغد بنا بیٹھا تھا اُس نے ایک مرتبہ زخمی آنکھوں سے رضیہ کی طرف دیکھا اور وہ کُڑک مُرغی کی طرح ایک طرف دبک کے بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ دبلی ہو گئی ہے، لیکن اس کی آنکھیں بڑی متحرک تھیں۔ ان میں سُرمے کی قدرتی تحریر زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ شفیق اللہ دن بہ دن زرد ہوتا گیا۔ اس کو دمے کے علاج کے لیے دوائیں برابر مل رہی تھیں۔ ایک دن میں نے مسز گُل کے ہاتھ سے گولیوں کی بوتل لی اور ایک کیپسول نکال کر اپنے پاس رکھ لی۔ شام کو اپنے جاننے والے ایک ڈاکٹر کو دکھائی تو اُس نے ایک گھنٹے کے بعد کیمیاوی تجزیہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ دوا دمے کے لیے نہیں ہے بلکہ نشہ آور ہے یعنی مارفیا ہے۔ میں نے دوسرے روز شفیق اللہ سے اُس وقت جب کہ وہ مسز گُل سے یہی کیپسول لے کر پانی کے ساتھ نگل رہا تھا تو میں نے اُس سے کہا

”یہ آپ کیا کھاتے ہیں“

اس نے جواب دیا

”دمے کی دوا ہے“

”یہ تو مارفیا ہے“

مسز گُل کے ہاتھ سے، پانی کا گلاس جو اس نے شفیق اللہ کے ہاتھ سے واپس لیا تھا گرتے گرتے بچا۔ بڑے جھریوں آمیز غصے سے اُنھوں نے میری طرف دیکھ کر کہا کیا کہہ رہے ہو سعادت“

میں ان سے مخاطب نہ ہوا اور شفیق اللہ سے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

”جناب، یہ مارفیا ہے۔ آپ کو اگر اس کی عادت ہو گئی تو مصیبت پڑ جائے گی“

شفیق اللہ نے بڑی حیرت سے پوچھا

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا“

مسز گُل کے تیوروں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ناراض ہو گئی ہیں اور میری یہ گفتگو پسند نہیں کرتیں۔ رضیہ خاموش ایک کونے میں مسز گُل کے لیے حقہ تیار کر رہی تھی، لیکن اس کے کان ہماری گفتگو کے ساتھ چپکے ہوئے تھے ایسے کان جو بڑی ناخوشگوار موسیقی سننے کے لیے مجبور ہوں۔ مسز گُل اس دوران میں بڑی تیزی سے چار الائچیاں دانتوں کے نیچے یکے بعد دیگر دبائیں اور انھیں بڑی بے رحمی سے چباتے ہوئے مجھ سے کہا

”سعادت، تم بعض اوقات بڑی بے ہودہ باتیں کر دیتے ہو۔ یہ کیپسول مارفیا کے کیسے ہو سکتے ہیں“

میں خاموش ہو رہا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مارفیا کا انجکشن دیا جاتا ہے۔ میرے ڈاکٹر دوست کا تجزیہ غلط تھا۔ وہ کوئی اور دوا تھی لیکن تھی نشہ آور۔ میں پھر بیمار ہوا اور راولپنڈی کے ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ جب مجھے ذرا افاقہ ہوا تو میں نے اِدھر اُدھر گھومنا شروع کیا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ ایک آدمی شفیق اللہ کی حالت بہت نازک ہے۔ میں اس کے وارڈ میں پہنچا مگر یہ وہ شفیق اللہ نہیں تھا جسے میں جانتا تھا۔ اس نے دھتورا کھایا ہوا تھا۔ چند روز کے بعد اتفاقاً مجھے ایک اور وارڈ میں جانا پڑا جہاں میرا ایک دوست یرقان میں مبتلا تھا۔ میں جب اس وارڈ میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک بستر کے ارد گرد کئی ڈاکٹر جمع ہیں قریب گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ قریب المرگ مریض شفیق اللہ ہے۔ اُس نے مجھے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بڑی نحیف آواز میں کہا

”سعادت صاحب“

ذرا میرے پاس آیئے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں“

میں نے اپنے قریب قریب بہرے کان اس کی آواز سننے کے لیے تیار کر دیئے۔ وہ کہہ رہا تھا

”میں۔ میں مر رہا ہوں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہر۔ ہر ایک کو خبر دار کر دیجیے کہ وہ مسز گل سے بچا رہے۔ بڑی خطرناک عورت ہے“

اس کے بعد وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ ڈاکٹر نہیں چاہتے تھے کہ وہ کوئی بات کرے لیکن وہ معمر تھا چنانچہ اُس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے

”رضیہ مر گئی ہے۔ بے چاری رضیہ۔ اس غریب کے سپرد یہی کام تھا کہ وہ آہستہ آہستہ مرے۔ مسز۔ مسز گُل، اُس سے وہی کام لیتی تھی جو آدمی کوئلوں سے لیتا ہے۔ مگر وہ اُن کی آگ سے دوسروں کو گرمی پہنچاتی تھی تاکہ۔“

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ سعادت حسن منٹو ۸۔ مئی۔ ۱۹۵۴ء

مِصری کی ڈلی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومِصری کی ڈلی

پچھلے دنوں میری روح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ روح اس لیے کہ میں نے دفعتاً اپنے ماحول کی خوفناک ویرانی کو محسوس کیا تھا اور جسم اس لیے کہ میرے تمام پٹھے سردی لگ جانے کے باعث چوبی تختے کے مانند اکڑ گئے تھے۔ دس دن تک میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا رہا۔ پلنگ۔ اس چیز کو پلنگ ہی کہہ لیجئے جو لکڑی کے چار بڑے بڑے پائیوں، پندرہ بیس چوبی ڈونڈوں اور ڈیڑھ دو من وزنی مستطیل آہنی چادر پر مشتمل ہے۔ لوہے کی یہ بھاری بھر کم چادر نواڑ اور سُوتلی کا کام دیتی ہے۔ اس پلنگ کا فائدہ یہ ہے کہ کھٹمل دور رہتے ہیں اور یوں بھی کافی مضبوط ہے، یعنی صدیوں تک قائم رہ سکتا ہے۔ یہ پلنگ میرے پڑوسی سلیم صاحب کا عنایت کردہ ہے۔ میں زمین پر سوتا تھا چنانچہ انھوں نے مجھے یہ پلنگ جو انھیں کے کمرے کے ساتھ ملا تھا مجھے دے دیا۔ تاکہ میں سخت فرش پر سونے کے بجائے لوہے کی چادر پر آرام کروں۔ سلیم صاحب اور ان کی بیوی کو میرا بہت خیال ہے اور میں ان کا بہت ممنون ہوں۔ اگر میں معمولی سے معمولی چارپائی بھی بازار سے لیتا تو کم از کم چار یا پانچ روپے خرچ ہو جاتے۔ خیر، چھوڑیئے اس قصّے کو۔ میں یہ بات کر رہا تھا کہ پچھلے دنوں میری رُوح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ دس دن اور دس راتیں میں نے ایسے خلا میں بسر کیں جس کی تفصیل میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کہیں لٹکا ہُوں۔ لوہے کے پلنگ پر لیٹے لیٹے یوں بھی میرا جسم بالکل شل ہو گیا تھا۔ دماغ ویسے ہی منجمد تھا جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں۔ میں کیا عرض کروں، میری کیا حالت تھی۔ دس دن اس ہیبت ناک خلا میں رہنے کے بعد میرے جسم کی علالت دُور ہو گئی۔ دس کا عمل تھا۔ دھوپ سامنے کارخانے کی بُلند چمنی سے پہلو بچاتی کمرے کے فرش پر لیٹ رہی تھی۔ میں لوہے کے پلنگ پر سے اُٹھا تھکے ہُوئے جسم میں انگڑائی سے حرکت پیدا کرنے کی کوشش کے بعد جب میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کمرہ وہ نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دائیں ہاتھ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا میز ہمارے کمرے میں ہُوا کرتا تھا مگر اس کا پالش اتنا چمکیلا کبھی نہیں تھا اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی اس میں اتنی خوبیاں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں جو بڑا میز پڑا رہتا تھا وہ بھی مجھے نامانوس معلوم ہوا۔ اس کا بالائی ہشت پہلو تختہ چمک رہا تھا۔ دیوار پر پانچ چھ تصویریں آویزاں تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر میری نگاہ میں جم گئی۔ میں بڑھا اور اس کو قریب سے دیکھا۔ جدید فوٹو گرافی کا بہت عمدہ نمونہ تھا۔ ہلکے بُھوسلے رنگ کے کاغذ پر ایک جواں سال لڑکی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ بال کٹے ہُوئے تھے اور کانوں پر سے اِدھر کو اُڑ رہے تھے، سینہ سامنے سے ناف کے ننھے سے دباؤ تک ننگا۔ اس نرم و نازک عریانی کو اس کی گوری باہیں جو اسکے چہرے تک اُٹھی ہُوئی تھیں، چھپانے کی دلچسپ کوشش کر رہی تھیں۔ پتلی پتلی لمبے لمبے ناخنوں والی انگلیوں میں سے چہرے کی حیا چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ کہنیوں نے ننھے سے پیٹ کے اختتامی خط پر آپس میں جڑ کر ایک دل کش تکون بنا دی تھی جس میں سے ناف کا گدگدا گڑھا جھانک رہا تھا۔ اگر اس چھوٹے سے گڑھے میں ڈنڈی گاڑ دی جاتی تو اس کا پیٹ سیب کا بالائی حصّہ بن جاتا۔ میں دیر تک اس نیم عُریاں و نیم مستور شباب کو دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ تصویر کہاں سے آ گئی۔ اسی حیرت میں غرق میں غسل خانہ کی طرف بڑھا۔ کمرے کے چوتھے کونے میں نل کے نیچے فرش میں سل لگی ہُوئی ہے۔ اس کے ایک طرف چھوٹی سی منڈیر بنا دی گئی ہے۔ یہ جگہ جہاں جست کی ایک بالٹی، صابن دانی، دانتوں کے دو برش۔ داڑھی مونڈنے کے دو استرے، صابن لگانے کی دو کُوچیاں، منجن کی بوتل اور پانچ چھ استعمال شدہ اور زنگ آلود بلیڈ پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا غسل خانہ ہے۔ نذیر صاحب جن کا یہ کمرہ ہے، علی الصبح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ چنانچہ داڑھی مونڈ کر وہ فوراً ہی غسل سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ میں سویا رہتا ہُوں اور وہ مزے سے ننگے نہاتے رہتے ہیں۔ اس غسل خانے کی طرف جاتے ہُوئے میں نے ایک بار پھر تمام چیزوں پر نگاہ دوڑائی۔ اب مجھے وہ کسی قدر مانوس معلوم ہُوئیں۔ منڈیر پر میرا اُسترا اور گھسا ہُوا بُرش اسی طرح پڑا تھا جس طرح میں روز دیکھا کرتا تھا، بالٹی بھی بلاشک و شبہ وہی تھی جو ہر روز نگاہوں کے سامنے آتی تھیں۔ اس میں ڈونگا بھی وہی تھا جس میں جابجا گڑھوں میں میل جما رہتا تھا۔ منڈیر پر بیٹھ کر جب میں نے برش سے دانت گھسنے شروع کیے تو میں نے سوچا کمرہ وہی ہے جس میں ایک سو بیس راتیں میں گزار چکا ہوں۔ راتیں، میں نے غور کیا۔ معاملہ صاف ہو گیا۔ کمرے اور اس کی اشیا کے نامانوس ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے اُس میں صرف ایک سو بیس راتیں ہی گزاری تھیں۔ صبح سات یا آٹھ بجے جلدی جلدی کپڑے بدل کر جو میں ایک دفعہ باہر نکل جاتا تو پھر رات کو گیارہ بارہ بجے کے قریب ہی لوٹنا ہوتا تھا۔ اس صورت میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ مجھے کمرے کی ساخت اور اُس میں پڑی ہُوئی چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملتا اور پھر نہ کمرہ میرا ہے اور نہ اس کی کوئی چیز میری ملکیت ہے اور یہ بھی تو سچی بات ہے کہ بڑے شہر انسانیت کے مرقد و مدفن ہوتے ہیں۔ میں

جس ماحول میں چار مہینے سے زندگی بسر کر رہا ہوں، اس قدر یکساں اور یک آہنگ ہے کہ طبیعت بارہا اُکتا گئی ہے. جی چاہا ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر کسی ویرانے میں چلا جاؤں۔ صبح جلدی جلدی نہانا۔ پھر عجلت میں کپڑے پہن کر دفتر میں کاغذ کالے کرتے رہنا، وہاں سے شام کو فارغ ہو کر ایک اور دفتر میں چھ سات گھنٹے اسی اُکتا دینے والے کام میں مصروف رہنا اور رات کے گیارہ بارہ بجے اندھیرے ہی میں کپڑے اُتار کر سلیم کے دیئے ہُوئے آہنی پلنگ پر سونے کی کوشش کرنا۔ کیا یہ زندگی ہے؟ زندگی کیا ہے؟۔ یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُونی جُراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جُراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا۔ جب زندگی کے لمحات کٹتے محسوس ہُوں اور حافظے کی تختی پر کچھ نقش چھوڑ جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آدمی زندہ ہے اور اگر مہینوں گزر جائیں اور یہ محسوس تک نہ ہو کہ مہینے گزر گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان کی حسیات مُردہ ہوگئی ہیں۔ زندگی کی کتاب میں اگر اوپر تلے خالی اوراق ہی شامل ہوتے چلے جائیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے یا کہ نہیں، اس کی بابت میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن میں تو اس معاملے میں بہت حساس ہوں۔ زندگی کی یہ خالی کاپی جو ہمارے ہاتھ میں تھمائی گئی ہے، آخر اسی لیے تو ہے کہ اس کے ہر ورق کو ہم استعمال کریں، اس پر کچھ لکھیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے کوئی ایسی بات ہی نہیں ملتی جس کے متعلق میں کچھ لکھوں۔ لے دے کے میری اس کاپی میں صرف دو تین ورق ایسے ہیں جن پر میں نقش و نگار بنے دیکھتا ہوں۔ یہ ورق مجھے کتنے عزیز ہیں۔ اگر آپ ان کو نوچ کر باہر نکال دیں تو میری زندگی ایک بیاباں بن جائے گی۔ آپ یقین کیجیے، میری زندگی واقعی چٹیل میدان کی طرح ہے جس میں اُن بیتے ہُوئے دنوں کی یاد ایک خوبصورت قبر کی طرح لیٹی ہُوئی ہے۔ چونکہ میں نہیں چاہتا کہ اچھے دنوں کی یہ سہانی یاد مٹ جائے اس لیے میں اس قبر پر ہر وقت مٹی کا لیپ کرتا رہتا ہُوں۔ میرے سامنے دیوار پر ایک پرانا کلنڈر لٹک رہا ہے جس کے میلے کاغذ پر چیڑ کے لانبے لانبے درختوں کی تصویر چھپی ہے میں اسے ایک عرصے سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں۔ اسکے پیچھے، دور، بہت دور مجھے اپنی زندگی کے اس کھوئے ہوئے ٹکڑے کی جھلک نظر آرہی ہے۔ میں ایک پہاڑی کے دامن میں چیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔ بیگو بڑے بھولے پن سے گھٹنے ٹیک کر اپنا سر میرے قریب لاتی ہے اور کہتی ہے۔

”آپ مانتے ہی نہیں۔ سچ، میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ اب بھی یقین نہ آئیگا۔ یہ لیجیے میرے سر میں سفید بال دیکھ لیجیے۔“

چودہ برس کی دیہاتی فضا میں پلی ہوئی جوان لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ معلوم نہیں وہ کیوں اس بات پر زور دینا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ مجھ سے یہی بات کہہ چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جوان آدمیوں کو شباب کے دائرے سے نکل کر بڑھاپے کے دائرے میں داخل ہونے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ میرے دل میں بھی اس قسم کی خواہش کئی بار پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے متعدد بار سوچا ہے کہ میری کنپٹیوں پر اگر سفید سفید بال نمودار ہو جائیں تو چہرے کی متانت اور سنجیدگی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کنپٹیوں پر اگر بال سفید ہو جائیں تو چاندی کے مہین مہین تاروں کی طرح چمکتے ہیں اور دوسرے سیاہ بالوں کے درمیان بہت بھلے دکھائی دیتے ہیں، ممکن ہے بیگو کو یہی چاؤ ہو کہ اس کے بال سفید ہو جائیں اور وہ اپنی کم عمری کے باوجود بڈھی دکھائی دے۔ میں نے اُس کے خشک مگر نرم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی اور کہا۔

”تم کبھی بوڑھی نہیں ہوسکتیں۔“

اس نے سر اٹھا کر مجھ سے پوچھا۔

”کیوں؟۔ میں کیوں بوڑھی نہیں ہوسکتی۔“

”اس لیے کہ تم میں آس پاس کے درختوں، پہاڑوں اور ان میں بہتے ہوئے نالوں کی ساری جوانی جذب ہوگئی ہے۔“

وہ قریب سے قریب سرک آئی اور کہنے لگی۔

”جانے آپ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں۔ بھئی میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ درختوں اور پہاڑوں کی بھی کبھی جوانی ہوتی ہے۔“

”تمہاری سمجھ میں آئے نہ آئے پر میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔“

”بہت اچھا کیا آپ نے۔ پر آپ میرے بالوں میں اِس اِس طرح کرتے رہیں۔“

بیگو نے اپنے ہاتھ سے سر کو کھجلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔“

”بہت اچھا جناب۔“

کہہ میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کو تو مزا آہی رہا تھا، مجھے خود مزا آنے لگا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اُلجھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔ دیر تک میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے مزا لیتی رہی۔ پھر اس نے اپنی خمار آلود نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور نیند میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں اگر سو گئی تو؟“

”میں جاگتا رہوں گا۔“

نیم خوابیدہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پیدا ہوئی اور وہ زمین پر وہیں میرے سامنے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ بیگو سو رہی تھی مگر اس کی جوانی جاگ رہی تھی۔ جس طرح سمندر کی پُر سکون سطح کے نیچے گرم لہریں دوڑتی رہتی ہیں، اس طرح اس کے محوِ خواب جسم کی رگوں میں اس کی گرم گرم جوانی دوڑ رہی تھی۔ بائیں بازو کو سر کے نیچے رکھے اور ٹانگوں کو اکٹھا کیے وہ سو رہی تھی۔ اسکا ایک بازو میری جانب سرکا ہوا تھا۔ میں اس کی پتلی انگلیوں کی مخروطی تراش دیکھ رہا تھا کہ ان میں خفیف سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی جیسے مٹر کی پھلیاں ارتعاش پذیر ہو جائیں۔ یہ ارتعاش اس کی انگلیوں سے شروع ہوا اور اس کے سارے جسم پر پھیل گیا۔ جس طرح تالاب میں پھینکی ہوئی کنکری اس کی آبی سطح پر چھوٹا سا بھنور پیدا کرتی ہے اور یہ بھنور دائرے بناتا ہوا پھیلتا جاتا ہے، اسی طرح وہ کپکپاہٹ اس کی انگلیوں سے شروع ہو کر اس کے سارے جسم پر پھیل گئی۔ نہ جانے اس کی جوانی کیسے ارتعاش پیدا کرنیوالے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے نچلے ہونٹ کے کونوں میں خفیف سی تھرتھراہٹ کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سینے کے ابھار میں دل کی دھڑکنیں زندگی پیدا کر رہی تھیں۔ گریبان کے نچلے دو بٹن کھلے تھے، اس طرح جسم سے تھوڑی سی نقاب اُٹھ گئی تھی اور دو نہایت ہی پیاری قوسیں باہر جھانک رہی تھیں۔ سینے کی ننھی سی وادی میں دونوں طرف کے اُبھار بڑی خوبصورتی سے آپس میں گھل مل گئے تھے۔ میری نگاہ اس کے سینے پر کُرتے کی ایک طرف بنی ہوئی جیب پر رک گئی۔ اس میں خدا معلوم کیا کیا کچھ بیگو نے ٹھونس رکھا تھا کہ وہ ایک گیند سی بن گئی تھی۔ میرے دل میں دفعتاً یہ معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ آہستہ سے اس کی جیب کی تلاشی لینے کا ارادہ جب میں نے کیا تو وہ جاگ پڑی۔ سیدھی لیٹ کر اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں۔ لمبی لمبی پلکیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں تھرتھرائیں۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا، پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم نے انگڑائی لی اور کہا، آپ بڑے وہ ہیں؟“

”کیوں؟۔ میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ اُٹھ بیٹھی۔

”ابھی آپ نے کچھ کیا ہی نہیں میں سچ مچ سوگئی اور آپ نے مجھے جگانے تک کی تکلیف نہ کی۔ میں اگر ایسے ہی شام تک سوئی رہتی تو۔؟“

اس نے آنکھوں کی پتلیاں نچائیں اور دفعتاً کچھ یاد کر کے کہا۔

”ہائے میرے اللہ۔ میں اپنی جان ہیر کو بھول ہی گئی۔“

سامنے پہاڑی پر اگی ہوئی سبز جھاڑیوں کی طرف جب اس نے دیکھا تو اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی۔

”کتنی اچھی ہے میری ہیر۔“

اس کو اپنی بھینس کی فکر تھی جو ہمارے سامنے پہاڑی پر گھاس چر رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہاری ہیر تو موجود ہے پر رانجھا کہاں ہے؟“

”رانجھا؟“

اُس کے لب مسکراہٹ کے ساتھ کھلے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی اور پھر کھِل کھلا کر ہنس پڑی

”رانجھا۔ رانجھا۔ رانجھا۔“

اس نے یہ لفظ کئی مرتبہ دہرایا۔ میری ہیر کا رانجھا۔ مجھے کیا معلوم نگوڑا کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔

”تمہاری ہیر کا کوئی نہ کوئی رانجھا تو ضرور ہو گا۔ مجھ سے چھپانا چاہتی ہو تو یہ الگ بات ہے۔“

”اس میں چھپانے کی بات ہی کیا ہے۔“

بیگو نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

”اور اگر کوئی ہے تو ہیر کو معلوم ہو گا۔ جا کے اس سے پوچھ لیجیے۔ پر کان میں کہیے گا، آہستہ سے کہیے گا، بتاؤ تو تمہارا رانجھا کہاں ہے؟“

”میں نے پوچھ لیا۔“

”کیا جواب ملا؟“

”بولی، بیگو سے پوچھو، وہی سب کچھ جانتی ہے۔“

”جھوٹ۔ جھوٹ۔ اس کا اوّل جھوٹ اس کا آخر جھوٹ۔“

بیگو بچوں کی طرح اُچھل اُچھل کر کہنے لگی۔ “

میری ہیر تو بڑی شرمیلی ہے۔ ایسے سوالوں کا وہ کبھی جواب دے ہی نہیں سکتی۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس نے تو آپ کو غصے میں یہ کہا تھا، چلو ہٹو، کنواریوں سے ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔ “

” یہی کہا تھا اور اس کا جواب اس کو یوں ملا تھا، یہ تمہارا اتنا بڑا بچھڑا کہاں سے آ گیا ہے۔ کیا آسمان سے ٹپک پڑا تھا ؟ بیگو یہ بچھڑے والی دلیل سن کر لاجواب ہو گئی۔ مگر وہ چونکہ لاجواب ہونا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے بیکار چلانا شروع کر دیا۔

” جی ہاں آسمان ہی سے ٹپکا تھا اور سب چیزیں آسمان ہی سے تو آتی ہیں۔ نہیں، میں بھولی۔ اس بچھڑے کو تو میری ہیر نے گود لیا ہے۔ یہ اس کا بچہ نہیں کسی اور کا ہے۔ اب بتائیے آپ کے پاس کیا جواب ہے ؟ “

میں نے ہار مان لی اس لیے کہ میری نگاہیں پھر اس کی اُبھری ہوئی جیب پر پڑیں جس میں خدا معلوم کیا کیا کچھ ٹھسا ہوا تھا۔

” میں ہار گیا۔ آپ کی ہیر کنواری ہے، دنیا کی سب بھینسیں اور گائیں کنواریاں ہیں۔ میں کنوارا ہوں۔ آپ کنواری ہیں۔ لیکن یہ بتائیے کہ آپ کی اس کنواری جیب کو کیا ہو گیا ہے ؟ “

اس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دیکھی تو دانتوں میں انگلی دبا کر میری طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

” آپ کو شرم نہیں آتی۔ کیا ہوا ہے میری جیب کو۔ میری چیزیں پڑی ہیں اس میں۔ “

” چیزیں۔ اس سے تمہارا مطلب ؟ “

” آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ چیزیں پڑی ہیں میرے کام کی اور کیا میں نے پتھر ڈال رکھے ہیں۔ “

” تو جیب میں تمہارے کام کی چیزیں پڑی ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں یہ کام کی چیزیں کیا ہیں ؟ “

” آپ ہرگز نہیں پوچھ سکتے۔ اور اگر آپ پوچھیں بھی تو میں نہیں بتاؤں گی اس واسطے کہ آپ نے مجھے اپنے چمڑے کے تھیلے کی چیزیں کب دکھائی ہیں۔ مگر اگر آپ سے کہوں بھی تو آپ کبھی نہ دکھائیں گے۔ “

” میں ایک ایک چیز دکھانے کے لیے تیار ہوں۔ یہ رہا تھیلا۔ “

میں نے اپنا چرمی تھیلا اس کے سامنے رکھ دیا۔

” خود کھول کر دیکھ لو پر یاد رہے مجھے اپنی جیب کی سب چیزیں تمہیں دکھانا پڑیں گی۔ “

” پہلے میں اس تھیلے کی تلاشی تو لے لوں۔ “

یہ کہہ کر اس نے میرا تھیلا کھولا اور اس کی سب چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کیں۔ انگریزی کا ایک ناول، کاغذوں کا پیڈ، دو پنسلیں، ایک ربڑ، دس بارہ لفافے، آٹھ ایک ایک آنے والے اسٹامپ۔ دس بارہ خالی لفافے اور لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ۔ یہ میری

” چیزیں “

تھیں۔ “

جب وہ ایک ایک چیز اچھی طرح دیکھ چکی تو میں نے اس سے کہا۔

” اب اپنی جیب کا منہ ادھر کر دو۔ “

اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ تھیلے میں تمام چیزیں رکھنے کے بعد اس نے مجھ سے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

” اب اپنی جیب دکھائیے۔ “

میں نے اپنی جیب کا منہ کھول دیا۔ اور اس نے ہاتھ ڈال کر اس میں جو کچھ بھی تھا باہر نکال لیا، ایک بٹوہ اور چابیوں کا گُچھا تھا، جس میں چھوٹا سا چاقو بھی شامل تھا۔ یہ چاقو گُچھے میں سے نکال کر اس نے ایک طرف زمین پر رکھ دیا اور باقی چیزیں مجھے واپس دے دیں۔

” یہ چاقو میں نے لے لیا ہے۔ کھیرے کاٹنے کے کام آئے گا۔ “

” لے لو پر مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ میں جب تک تمہاری جیب کی ایک ایک چیز نہ دیکھ لوں چھوڑوں گا نہیں۔ “

” اگر میں نہ دکھاؤں تو ؟ “

” لڑائی ہو جائے گی۔ “

”ہو جائے۔ میں ڈر تھوڑی جاؤں گی۔“

یہ کہہ کر وہ فوراً ہی اپنے دوپٹے کا تنبو بنا کر اس میں چھپ گئی اور جیب میں سے کچھ نکالنے لگی۔ اس پر میں نے رعب دار آواز کہا۔

”دیکھو، یہ بات ٹھیک نہیں، تم کچھ چھپا رہی ہو۔“

”آپ مان لیجیے، میں سب کچھ دکھادوں گی۔ اللہ کی قسم سب چیزیں ایک ایک کر کے دکھادوں گی۔ یہ تو میں اپنے من سمجھوتے کے لیے کچھ کر رہی ہوں۔“

میں نے پھر رعب دار آواز میں کہا۔

”کیا کر رہی ہو۔ میں تمہاری سب چالا کیاں سمجھتا ہوں۔ سیدھے من سے تمام چیزیں دکھادو ورنہ میں زبردستی سب کچھ دیکھ لوں گا۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوپٹے سے باہر نکل آئی اور آگے بڑھ کر کہنے لگی۔

”دیکھ لیجیے“!

میں اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی والا تھا کہ اس کے تنے ہوئے سینے کو دیکھ کر رک گیا۔

”تم خود ہی ایک ایک چیز نکال کر مجھے دکھاتی جاؤ۔ لو اتنا لحاظ میں تمہارا کیے دیتا ہوں۔ یوں تمہاری ایمانداری بھی معلوم ہو جائے گی۔“

”نہیں، آپ خود نکالتے جایئے، بعد میں آپ کہیں گے میں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں۔“

”میں دیکھ جو رہا ہوں۔ تم نکالتی جاؤ۔“

”جیسے آپ کی مرضی“

یہ کر اس نے آہستہ سے اپنی جیب میں دو انگلیاں ڈالیں اور سرخ رنگ کے ریشمین کپڑے کا ایک ٹکڑا باہر نکالا۔ اس پر میں نے پوچھا۔

”کپڑے کا یہ بیکار سا ٹکڑا تم ساتھ ساتھ کیوں لیے پھرتی ہو؟“

”اجی آپ کو کیا معلوم، یہ بہت بڑھیا کپڑا ہے۔ میں اس کا رومال بناؤنگی۔ جب بن جائے گا تو پھر آپ دیکھیے گا۔ جی ہاں۔“

یہ کہہ کر اس نے کپڑے کا ٹکڑا اپنی جھولی میں رکھ دیا۔ پھر جیب سے کچھ نکالا اور بند مٹھی میرے بہت قریب لا کر کھول دی۔ سلولائڈ کے تین مستعمل کلپ، ایک چابی اور سیپ کے دو بٹن اس کی ہتھیلی پر مجھے نظر آئے۔ میں اس سے کہا۔

”یہ اپنی جھولی میں رکھ لو اور باقی چیزیں جلدی جلدی نکالو۔“

اس نے جیب میں جلدی جلدی ہاتھ ڈال کر باری باری یہ چیزیں باہر نکالیں۔ سفید دھاگے کی گولی اس میں پھنسی ہوئی زنگ آلود سوئی، لکڑی کی میلی کچیلی کنگھی، چھوٹا سا ٹوٹا ہوا آئینہ اور ایک پیسہ۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

”کوئی اور چیز باقی تو نہیں رہی؟“

”جی نہیں۔“

اس نے اپنے سر کو جنبش دی، میں نے سب چیزیں آپکے سامنے رکھ دی ہیں۔ اب کوئی باقی نہیں رہی۔

”غلط“

میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا۔

”تم جھوٹ بولتی ہو اور جھوٹ بھی ایسا بولتی ہو جو بالکل کچا ہو، ابھی ایک چیز باقی ہے۔“

جونہی یہ لفظ میرے منہ سے نکلے، غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں یک لخت اپنے دوپٹے کی طرف مڑیں۔ میں نے تاڑ لیا کہ اس نے کچھ چھپا رکھا ہے۔

”بیگو، سیدھے من سے مجھے یہ چیز دکھادو جو تم نے چھپائی ہے، ورنہ یاد رکھو وہ تنگ کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گی۔ گُدگُدی ایسی چیز ہے کہ۔“

گُدگُدی کے تصور ہی نے اس کے جسم کو اکٹھا کر دیا۔ وہ سکڑ سی گئی۔ اس پر میں نے ہوا میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں۔

”یہ انگلیاں ایسی گدگدی کر سکتی ہیں کہ جناب کو پہروں ہوش نہ آئے گا۔“

وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بُلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔

”نہیں، نہیں۔ خدا کے لیے کہیں ایسا کر بھی نہ دیجیے گا۔ میں مر جاؤں گی۔“

جب میں سچ مچ اپنے ہاتھ اس کے کندھوں تک لے گیا تو وہ بے تحاشا چیخنی، ہنستی اور سمٹتی سمٹاتی اُٹھی اور بھاگ گئی۔ دوپٹے میں سے کوئی چیز گری جو میں نے دوڑ کر اٹھالی۔ مِصری کی ایک ڈلی تھی جو وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ جانے کیوں؟

ملاقاتی

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو ملاقاتی

”آج صبح آپ سے کون ملنے آیا تھا“

”مجھے کیا معلوم میں تو اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔“

”آپ تو بس ہر وقت سوئے ہی رہتے ہیں آپ کو کسی بات کا علم نہیں ہوتا حالانکہ آپ سب کچھ جانتے ہوتے ہیں“

”یہ عجیب منطق ہے۔ اب مجھے کیا معلوم کون صبح سویرے تشریف لایا تھا کون آیا ہو گا۔ میرے ملنے والا یا کوئی اور شخص جسے سفارش کرانا ہو گی۔“

”آپ کی سفارش کہاں چلتی ہے۔ بڑے آئے ہیں گورنر کہیں کے۔“

”میں نے گورنری کا دعوےٰ کبھی نہیں کیا لیکن اِدھر اُدھر میری تھوڑی سی واقفیت ہے اس لیے دوست یار کبھی کبھی کسی رشتے دار کو یہاں لے آتے ہیں کہ سفارش کر دو“

”آپ بات ٹالنے کی کوشش نہ کیجیے۔ میری اس بات کا جواب دیجیے کہ صبح سویرے آپ سے ملنے کے لیے کون آیا تھا۔“

”بھئی کہہ تو دیا ہے کہ مجھے علم نہیں۔ میں اندر اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ تمھیں اتنا تو یاد ہونا چاہیے کہ رات بڑے بچے کو بخار تھا اور میں دیر تک جاگتا رہا اُس کے بعد اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور نو بجے تک سوتا رہا۔“

”میں تو اُوپر کوٹھے پر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس سے اُٹھ کر ملے ہوں۔“

”کسی سے کچھ پتہ بھی تو چلے“

”آپ کو پتہ چل جائے گا جب میں یہ گھر چھوڑ کر میکے چلی جاؤں گی“

”میری سمجھ میں نہیں آتا تمھیں ایکا ایکی کیا ہو جاتا ہے تمہارے دماغ میں یقیناً فتور ہے۔“

”فتور ہو گا آپ کے دماغ میں۔ میرا دماغ اچھا بھلا ہے دیکھیے میں آپ سے کہہ دوں آپ زبان سنبھال کر بات کیا کیجیے مجھ سے آپ کی یہ بدزُبانیاں برداشت نہیں ہو سکتیں۔“

”تم خود پرلے درجے کی بدزبان ہو کیا عورت کو اپنے شوہر سے اس طرح سے بات کرنی چاہیے۔“

”جو شوہر اس قابل ہو گا۔ اُس سے اس قسم کے لہجے میں گفتگو کرنا پڑے گی۔“

”بند کرو اس گفتگو کو۔ میں تمہاری اس روز روز کی چخ چخ سے تنگ آچکا ہوں تم تو میکے جاتی رہو گی۔ میں اس سے پہلے اس گھر سے نکل کر چلا جاؤں گا۔“

”کہاں۔“

”کسی جنگل میں“

”وہاں جا کر کیا کیجیے گا۔“

”سنیاسی بن جاؤں گا۔ تم سے چھٹکارا تو مل جائے گا۔ خدا کی قسم چند برسوں سے تم نے میرے ناک میں دم کر رکھا ہے بات بات پر نوک جھونک کرتی ہو آخر یہ سلسلہ کیا ہے جانے کون کم بخت صبح مجھ سے ملنے آیا تھا میرے دشمنوں کو بھی خبر نہیں خود کہتی ہو کہ تم کوٹھے پر تھیں تمھیں کیسے معلوم ہو گیا کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے کبھی تک کی بات بھی کیا کرو۔“

”آپ تو ہمیشہ تک کی بات کرتے ہیں ابھی کل ہی کی بات ہے۔ آپ دفتر سے آئے تو میں نے آپ کی سفید قمیص پر لال رنگ کا ایک دھبہ دیکھا میں نے پوچھا یہ کیسے لگا آپ سٹپٹا گئے مگر فوراً سنبھل کر ایک گھڑ دی کہ لال پنسل سے کھجا رہا تھا شاید یہ اُس کا نشان ہو گا۔ حالانکہ جب آپ نے قمیص اُتاری اور میں نے اس دھبے کو غور سے دیکھا تو وہ لپ اسٹک کا دھبہ تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے“

”جناب اس لال دھبے سے خوشبو بھی آرہی تھی۔ کیا آپکے دفتر کی لال پنسلوں میں خوشبو ہوتی ہے“

”عورت کا دُوسرا نام اپنے خاوند کی ہر بات کو شک کی نظروں سے دیکھنا ہے۔ کل صبح تم نے ہی میری اِس قمیص پر سینٹ لگایا تھا۔“

”لگایا ہو گا مگر وو دھبہ یقیناً لپ اسٹک کا تھا۔“

”یعنی آپ لپ اسٹک لگے ہونٹ میری قمیص چومتے رہے“

”آپ کو باتیں بنانا خوب آتی ہیں قمیص چومنے کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے“

کیا ہونٹ ویسے ہی قمیص سے نہیں چھو سکتے۔“

”چھو سکتے ہیں بابا۔ چھو سکتے ہیں تم یہ سمجھتی ہو کہ میں کوئی یوسف ہوں کہ لڑکیاں میرے حسن سے اس قدر متاثر ہوتی ہیں کہ غش کھا کر مجھ پر گرتی جاتی ہیں اور میں جھاڑو ہاتھ میں لیکر سڑکوں سے یہ کوڑا کرکٹ اُٹھاتا رہتا ہوں۔“

”مرد ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں“

”دیکھو تم عورت ذات کی خود عورت ہو کر توہین کر رہی ہو۔ کیا عورتیں اتنے ہی کمزور کردار کی ہیں کہ ہر مرد کے آگے پاانداز کی طرح بچھ جائیں خدا کے لیے کچھ تو اپنی صنف کا خیال کرو میں نے تو ہمیشہ عورت کی عزت کی ہے۔“

”عزت کرنا ہی تو آپ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جو بے چاری بھولی بھالی عورت کو آپ کے جال میں پھنسا لیتا ہے۔“

”میں کوئی چڑی مار نہیں جو جال بچھاتا رہے“

”آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں ورنہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ چڑی ماروں کے گرو ہیں۔“

”یہ رُتبہ آج تم نے بخشا ہے۔ آٹھ دس روز ہوئے مجھے کمینہ کہا گیا تھا آج چڑی ماروں کا گرو پرسوں یہ ارشاد ہو گا کہ تم ہٹلر ہو۔“

”وہ تو آپ ہیں۔ اس گھر میں چلتی کس کی ہے جو آپ کہیں وہی ہو گا۔ ہو کے رہے گا۔ میں تو تین میں ہوں نہ تیرہ میں“

”میں کہتا ہوں اب یہ فضول بکواس بند ہو جانی چاہیے میرا دماغ چکرا گیا ہے۔“

”دماغ آپ کا بہت نازک ہے۔ ذرا سی بات کرو تو چکرانے لگتا ہے۔ میں عورت ہوں میرا دماغ تو آج تک آپکی باتوں سے نہیں چکرایا۔“

”عورتیں بڑی سخت دماغ ہوتی ہیں یُوں تو انھیں صنف نازک کہا جاتا ہے مگر جب واسطہ پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان ایسی صنفِ کرخت دُنیا کے تختے پر نہیں۔“

”آپ حد سے بڑھ رہے ہیں“

”کیا کروں۔ تم جو میرا دماغ چاٹ گئی ہو تم اتنا تو سوچو کہ میں دفتر میں آٹھ گھنٹے جھک مار کر گھر آیا ہوں تھکا ہارا ہوں مجھے آرام کی ضرورت ہے اور تم لے بیٹھی ہو ایک فرضی قصّہ کہ تم سے ملنے کے لیے صبح سویرے کوئی آیا تھا۔ کون آیا تھا یہ بتا دو تو ساری جھنجھٹ ختم ہو۔“

”آپ تو بس بات ٹالنا چاہتے ہیں“

”کون خرذات بات ٹالنا چاہتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ کسی نہ کسی حیلے ختم ہو۔ لو اب بتا دو کون آیا تھا مجھ سے ملنے“

”ایک چڑیل تھی۔“

”وہ یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ میرا اُس سے کیا کام؟“

”یہ آپ اُسی سے پوچھیے گا۔“

”اب تو مجھ سے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ بتاؤ کون آیا تھا۔ لیکن تم تو کوٹھے پر سو رہی تھی۔“

”میں کہیں بھی سوؤں لیکن مجھے ہر بات کی خبر ہوتی ہے۔“

”اچھا بھئی میں تو اب ہار گیا نہا دھو کر کلب جاتا ہوں کہ طبیعت کا تکدر کسی قدر دُور ہو۔“

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ اُس سے ملنے جا رہے ہیں“

”خدا کی قسم آج میرا دماغ پاش پاش ہو جائے گا۔ میں کس سے ملنے جا رہا ہوں“

”اُسی سے“

”تمہارا مطلب ہے اُسی چڑیل سے“

”اب آپ سمجھ گئے۔ تو کلب جا کر آپ کو اور کس سے ملنا ہے مجھ سے“

”تم تو ہر وقت میرے سینے پر سوار رہتی ہو۔“

”اسی لیے تو آپ اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرنے جا رہے ہیں کسی دن مجھے زہر ہی کیوں نہیں دے دیتے تا کہ قصہ ہی ختم ہو۔“

”اتنی دیر میں تو پاگل نہیں ہوئی۔ لیکن آج ضرور ہو جاؤں گی۔“

”اس لیے کہ میں نے آپ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔“

”میری تو ہر رگ آج دُکھ رہی ہے تم نے مجھے اس قدر جھنجوڑا اور لتاڑا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ تم عورت نہیں ہو۔ لندھر پہلوان ہو۔“

”یہ سننا آپ سے باقی رہ گیا تھا۔ نہ رہے وہ چڑیل اس دُنیا کے تختے پر۔“

”پھر وہی چڑیل۔ دیکھو باہر ڈیوڑھی سے مجھے کسی عورت کی آواز سُنائی دی ہے“

”آپ ہی جا کر دیکھیے“

”لاحول ولا قوۃ عورتوں کو دیکھنا میرا کام نہیں۔ صرف تمہارا ہے۔“!

”نوکر سے کہتی ہوں“

”بی بی جی وہی بی بی آئی ہیں جو آج صبح آئی تھیں۔“

”میں چلتا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔ آپ ہی سے تو وہ ملنے آئی ہے“

۔

”اوہ ذکیہ۔ تم۔ تم۔ تم یہاں کب آئیں“

”ہوائی جہاز میں پہلے نیرولی سے کراچی پہنچی پھر وہاں سے یہاں ہوائی جہاز ہی میں آئی۔ اباجی باہر کھڑے ہیں“

”تم نے بھی حد کر دی ذکیہ۔ میں خود جاتی ہوں۔ اپنے اباجی کو لینے اتنی مدت ہو گئی ہے اُن کو دیکھے ہوئے“!

ملاوٹ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوملاوٹ

امرتسر میں علی محمد کی منیاری کی دکان تھی‘ چھوٹی سی مگر اس میں ہر چیز موجود تھی‘ اُس نے کچھ اس قرینے سے سامان رکھا تھا کہ ٹھنسا ٹھنسا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ امرتسر میں دوسرے دکاندار بلیک کرتے تھے مگر علی محمد واجبی نرخ پر اپنا مال فروخت کرتا تھا‘ یہی وجہ ہے کہ لوگ دُور دُور سے اس کے پاس آتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کرتے۔ وہ مذہبی قسم کا آدمی تھا‘ زیادہ منافع لینا اس کے نزدیک گناہ تھا‘ اکیلی جان تھی‘ اس کے لیے جائز منافع ہی کافی تھا۔ سارا دن دکان پر بیٹھتا‘ گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی‘ اس کو بعض اوقات افسوس ہوتا جب وہ کسی گاہک کو سنلائیٹ صابن کی ایک ٹکیہ نہ دے سکتا یا کیلی فورنین پوپی کی بوتل‘ کیونکہ یہ چیزیں اسے محدود تعداد میں ملتی تھیں۔ بلیک نہ کرنے کے باوجود وہ خوشحال تھا۔ اُس نے دو ہزار روپے پس انداز کر رکھے تھے‘ جوان تھا۔ ایک دن دکان پر بیٹھے بیٹھے اُس نے سوچا کہ اب شادی کر لینی چاہیے۔ بُرے بُرے خیال دماغ میں آتے ہیں‘ شادی کر لوں کہ زندگی میں لطافت پیدا ہو جائے گی‘ بال بچے ہوں گے‘ ان کی پرورش کے لیے میں اور زیادہ کمانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے والدین عرصہ ہوا‘ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے‘ اس کی کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ وہ بالکل اکیلا تھا‘ شروع شروع میں جبکہ وہ دس برس کا تھا‘ اس نے اخبار بیچنے شروع کیے‘ اس کے بعد خوانچہ لگایا‘ قلفیاں بیچیں‘ جب اس کے پاس ایک ہزار روپیہ جمع ہو گیا تو اس نے ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لے لی اور منیاری کا سامان خرید کر بیٹھ گیا۔ آدمی ایماندار تھا‘ اُس کی دکان تھوڑے ہی عرصے میں چل نکلی۔ جہاں تک آمدن کا تعلق تھا وہ اس سے بے فکر تھا مگر وہ چاہتا تھا گھر بسائے۔ اس کی بیوی ہو‘ بچے ہوں اور وہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرے‘ اس لیے کہ اس کی زندگی مشین ایسی بن گئی تھی‘ صبح دکان کھولتا‘ گاہک آتے انھیں سودا دیتا‘ شام کو دکان بند کرتا اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جو اس نے شریف پورہ میں لے رکھی تھی‘ سو جاتا۔ گنجے کا ہوٹل تھا اس میں وہ کھانا کھاتا‘ صرف ایک وقت‘ صبح ناشتہ جیمل سنگھ کے کٹڑے میں شابھے حلوائی کی دکان میں کرتا‘ دکان کھولتا اور شام تک اپنی گدی پر بیٹھا رہتا۔ اس کے اندر شادی کی خواہش شدت اختیار کرتی گئی لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملے میں اس کی مدد کون کرے۔ امرتسر میں اس کا کوئی دوست یار بھی نہیں تھا جو اس کے لیے کوشش کرتا۔ وہ بہت پریشان تھا‘ شریف پورہ کی کوٹھڑی میں رات کو سوتے وقت وہ کئی مرتبہ رویا کہ اس کے ماں باپ اتنی جلدی کیوں مر گئے‘ انھیں اور کچھ نہیں تو اس لیے زندہ رہنا چاہیے تھا کہ وہ اس کی شادی کا بندوبست کر جاتے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ شادی کیسے کرے‘ بہت دیر تک سوچتا رہا‘ اس دوران میں اس کے پاس تین ہزار روپے جمع ہو گئے‘ اس نے ایک چھوٹے سے گھر کو جو اچھا خاصا تھا کرایے پر لے لیا مگر رہتا وہ شریف پورے ہی میں تھا۔ ایک دن اس نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا جس میں لکھا تھا کہ شادی کے خواہشمند حضرات ہم سے رجوع کریں۔ بی اے پاس لیڈی ڈاکٹر‘ ہر قسم کے

رشتے موجود ہیں‘ خط و کتابت کیجیے یا خود آ کے ملیے۔ اتوار کو وہ دکان نہیں کھولتا تھا اُس دن وہ اس پتے پر گیا اور اس کی ملاقات ایک داڑھی والے بزرگ سے ہوئی۔ علی محمد نے مدعا بیان کیا‘ داڑھی والے بزرگ نے میز کا دراز کھول کر بیس پچیس تصویریں نکالیں اور اس کو ایک ایک کر کے دکھائیں کہ وہ ان میں سے کوئی پسند کرے۔ ایک لڑکی کی تصویر علی محمد کو پسند آ گئی‘ چھوٹی عمر کی اور خوبصورت تھی۔ اس نے شادیاں کرانے والے ایجنٹ سے کہا‘

”جناب۔ یہ لڑکی مجھے پسند ہے“

ایجنٹ مسکرایا

”تم نے ایک ہیرا چن لیا ہے“

علی محمد کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ لڑکی اس کی آغوش میں ہے‘ اس نے گنگنا شروع کر دیا

”بس۔ جناب آپ بات پکّی کر دیجیے‘ ایجنٹ سنجیدہ ہو گیا‘ دیکھو برخوردار!۔ یہ لڑکی تم نے چنی ہے‘ علاوہ حسین ہونے کے بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن تم سے زیادہ فیس نہیں مانگوں گا“

”آپ کی بڑی نوازش ہے۔ میں یتیم لڑکا ہوں۔ اگر آپ میرا یہ کام کر دیں تو آپ کو ساری عمر اپنا باپ سمجھوں گا“

ایجنٹ کے مونچھوں بھرے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی‘ جیتے رہو۔ میں تم سے صرف تین سو روپے فیس لوں گا‘ علی محمد نے بڑے متشکرانہ لہجے میں کہا

”جناب کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے منظور ہے“

یہ کہہ کر اس نے جیب سے تین نوٹ سو سو روپے کے نکالے اور اس بزرگوار کو دے دیے۔ تاریخ مقرر ہو گئی‘ نکاح ہوا‘ رخصتی بھی ہوئی‘ علی محمد نے وہ چھوٹا سا مکان کرایے پر لے رکھا تھا‘ اب سجا سجایا تھا‘ وہ اس میں بڑے چاؤ سے اپنی دلہن لے کر آیا‘ پہلی رات کا تصور معلوم نہیں‘ اس کے دل و دماغ میں کس قسم کا تھا مگر جب اس نے دلہن کا گھونگھٹ ہاتھوں سے اُٹھایا تو اس کو غش سا آ گیا۔ نہایت بدشکل عورت تھی۔ صریحاً اس مرد بزرگ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا‘ علی محمد لڑکھڑاتا کمرے سے باہر نکلا اور شریف پورے جا کر اپنی کوٹھڑی میں دیر تک سوچتا رہا کہ یہ ہوا کیا ہے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اس نے اپنی دکان نہ کھولی۔ دو ہزار روپے وہ اپنی بیوی کا حق مہر ادا کر چکا تھا‘ تین سو روپے اس ایجنٹ کو‘ اب اس کے صرف سات سو روپے تھے۔ وہ اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اس نے سوچا شہر ہی چھوڑ دے۔ ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا‘ اس نے فیصلہ کر ہی لیا‘ صبح دس بجے اس نے اپنی دکان ایک شخص کے پاس پانچ ہزار روپے میں یعنی اونے پونے داموں بیچ دی اور ٹکٹ کٹوا کر لاہور چلا آیا۔ لاہور جاتے ہوئے گاڑی میں کسی جیب کترے نے بڑی صفائی سے اس کے تمام روپے غائب کر دیے‘ وہ بہت پریشان ہوا۔ لیکن اس نے سوچا کہ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ لاہور پہنچا تو اس کی دوسری جیب میں جو کتری نہیں گئی تھی صرف دس روپے اور گیارہ آنے تھے اس سے اس نے چند روز گزارہ کیا لیکن بعد میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ اس دوران میں اس نے کہیں نہ کہیں ملازم ہونے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ اس قدر مایوس ہو گیا کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی‘ اس کے باوجود ایک رات وہ ریل کی پٹڑی پر لیٹ گیا‘ ٹرین آ رہی تھی مگر کانٹا بدلا اور وہ دوسری لائن پر چلی گئی کہ اسے ادھر ہی جانا تھا۔ اس نے سوچا کہ موت بھی دھوکا دے جاتی ہے چنانچہ اس نے خودکشی کا خیال چھوڑ دیا اور ہلدی اور مرچیں پیسنے والی ایک چکی میں بیس روپے ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں اسے پہلے ہی دن معلوم ہو گیا کہ دنیا دھوکا ہی دھوکا ہے‘ ہلدی میں پیلی مٹی کی ملاوٹ کی جاتی تھی‘ اور مرچوں میں سرخ اینٹوں کی۔ دو برس تک وہ اس چکی میں کام کرتا رہا‘ اس کا مالک ہر مہینے کم از کم سات سو روپے ماہوار کماتا تھا‘ اس دوران میں علی محمد نے پانچ سو روپے پس انداز کر لیے تھے‘ ایک دن اس نے سوچا جب ساری دنیا میں فریب ہی فریب ہے تو وہ بھی کیوں نہ فریب کرے۔ اس نے چنانچہ ایک علیحدہ چکی قائم کر لی اور اس میں مرچوں اور ہلدی میں ملاوٹ کا کام شروع کر دیا۔ اس کی آمدن اب کافی معقول تھی اس کو شادی کا کئی بار خیال آیا مگر جب اس کی آنکھوں کے سامنے اس پہلی رات کا نقشہ آیا تو وہ کانپ کانپ گیا۔ علی محمد خوش تھا اس نے فریب کاری پوری طرح سیکھ لی تھی‘ اس کو اب اس کے تمام گُر معلوم ہو گئے تھے‘ ایک من لال مرچوں میں کتنی اینٹیں پسنی چاہئیں‘ ہلدی میں کتنی زرد رنگ کی مٹی ڈالنی چاہیے اور پھر وہاں کا حساب‘ یہ اب اس کو اچھی طرح معلوم تھا۔ لیکن ایک دن اس کی چکی پر پولیس کا چھاپہ پڑا‘ ہلدی اور مرچوں کے نمونے بوتلوں میں ڈال کر مہر بند کیے گئے۔ اور جب کیمیکل ایگزامینر کی رپورٹ آئی کہ ان میں ملاوٹ ہے تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا لاہور میں کون تھا جو اس کی ضمانت دیتا۔ کئی دن حوالات میں بند رہا۔ آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور اس کو سو روپیہ جُرمانہ اور ایک مہینے کی قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ جرمانہ تو اس نے ادا کر دیا لیکن ایک مہینے کی قید بامشقت اسے بھگتنا ہی پڑی‘ یہ ایک مہینہ اس کی زندگی میں بہت کڑا وقت تھا۔ اس دوران میں وہ اکثر سوچتا تھا کہ اُس نے بے ایمانی کیوں کی‘ جبکہ اس نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا لیا تھا کہ وہ کبھی خراب کاری نہیں کرے گا۔ پھر وہ سوچتا کہ اسے اپنی زندگی ختم کر لینی چاہیے‘ اس لیے کہ وہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا‘ اس کا کردار مضبوط نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مر جائے تاکہ اس کا ذہنی اضطراب ختم ہو۔ جب وہ جیل سے باہر نکلا تو وہ مضبوط ارادہ کر چکا تھا کہ خودکشی کر لے گا تاکہ سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو۔ اس غرض کے لیے اُس نے سات روز مزدوری کی اور دو تین روپے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کیے۔ اُس کے بعد اس نے سوچا‘ کون سا زہر ہو گا جو کارآمد ہو سکتا ہے۔ اُس نے صرف ایک ہی زہر کا نام سُنا تھا جو بڑا قاتل ہوتا ہے۔ سنکھیا مگر یہ سنکھیا کہاں سے ملتی؟ اُس نے بہت کوشش کی‘ آخر اُسے ایک دکان سے سنکھیا مل گئی اس نے عشاء کی نماز پڑھی خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ وہ

ہلدی اور مرچوں میں ملاوٹ کرتا رہا' پھر رات کو سنکھیا کھائی اور فٹ پاتھ پر سو گیا۔ اُس نے سُنا تھا سنکھیا کھانے والوں کے منہ سے جھاگ نکلتے ہیں' تشنج کے دورے پڑتے ہیں' بڑا کرب ہوتا ہے مگر اسے کچھ بھی نہ ہوا' ساری رات وہ اپنی موت کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ صبح اُٹھ کر وہ اس دکاندار کے پاس گیا جس سے اس نے سنکھیا خریدی تھی اور اس سے پوچھا بھائی صاحب! یہ آپ نے مجھے کیسی سنکھیا دی ہے کہ میں ابھی تک نہیں مرا“

دکاندار نے آہ بھر کے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا:

”کیا کہوں میرے بھائی۔ آج کل ہر چیز نقلی ہوتی ہے۔ یا اُس میں ملاوٹ ہوتی ہے“

۱۹، مئی ۱۹۵۴ء

ملبے کا ڈھیر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوملبے کا ڈھیر

کامنی کے بیاہ کو ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا پتی دل کے عارضے کی وجہ سے مر گیا اور اپنی ساری جائیداد اس کے لیے چھوڑ گیا۔ کامنی کو بہت صدمہ پہنچا، اس لیے کہ وہ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کی ماں عرصہ ہوا اس کے باپ کو داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو کامنی اس کے پاس جا کر خوب روتی تا کہ اسے دم دلاسہ ملے۔ لیکن اُسے مجبوراً اپنے باپ کے پاس جانا پڑا جو کاٹھیاواڑ میں بہت بڑا کاروباری آدمی تھا۔ جب وہ اپنے پرانے گھر میں داخل ہوئی تو سیٹھ گھنشام داس باہر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ غالباً اپنے کاروبار کے متعلق سوچ رہے تھے۔ جب کامنی ان کے پاس آئی تو وہ حیران سے ہو کر رہ گئے۔

”کامنی“

کامنی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے، وہ اپنے پتا سے لپٹ گئی اور زارو قطار رونے لگی۔ سیٹھ گھنشام داس نے اس کو پچکارا اور پوچھا

”کیا بات ہے؟“

کامنی نے کوئی جواب نہ دیا اور روتی رہی۔ سیٹھ جی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیا ہے۔ انھوں نے صرف ایک ہی چیز کے متعلق سوچا کہ شاید میری بیٹی کے پتی نے اس سے کوئی زیادتی کی ہے جس کے باعث اس کو بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس سے پوچھا

”کیوں بیٹی۔ کیا رنچھوڑ نے کوئی ایسی ویسی بات کی ہے؟“

اس پر کامنی اور بھی زیادہ رونے لگی۔ سیٹھ گھنشام داس نے بہت پوچھا مگر کامنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر تنگ آ گئے اور جھنجھلا کر کہا

”مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم نے میرا آدھا گھنٹہ خراب کر دیا ہے۔ بولو کیا بات ہے؟“

کامنی نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور کہا

”ان کا دیہانت ہو گیا ہے“

سیٹھ گھنشام نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور پوچھا۔ کس کا؟“

کامنی نے ساڑھی کے پلو سے آنسو خشک کیے۔

”وہی جن سے آپ نے میرا ویاہ کیا تھا۔“

سیٹھ گھنشام سکتے میں آ گئے۔

”کب؟“

”پرسوں“

”تم نے مجھے اطلاع بھی نہ دی“

کامنی نے کہا

”میں نے آپ کو تار دیا تھا۔ کیا ملا نہیں آپ کو؟“

اس کے باپ نے تھوڑی دیر سوچا

”کل تار تو کافی آئے تھے۔ مگر مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ انھیں دیکھ سکوں۔ اب میں پیڑھی جار ہا ہوں۔ ہو سکتا ہے ان تاروں میں تمہارا تار بھی ہو“

کامنی دو دن اپنے باپ کے پاس رہی اس کے بعد واپسی بمبئی چلی آئی اور اپنے شوہر کی جائیداد اپنے نام منتقل کروانے میں مشغول ہو گئی۔ رنچھوڑ کا صرف ایک بھائی تھا مگر اس کا جائیداد پر کوئی حق نہیں تھا، اس لیے کہ وہ اپنا حصہ وصول کر چکا تھا۔ کامنی جب اس کام سے فارغ ہو گئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ کاٹھیاواڑ گجرات میں دس مکان، احمد آباد میں پانچ، بمبئی میں سات، ان کا کرایہ پر ماہ اُسے مل جاتا جو پانچ ہزار کے قریب ہوتا یہ سب روپے وہ اپنے منیم کے ذریعے سے وصول کرتی اور بینک میں جمع کرا دیتی۔ ایک برس کے اندر اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ جمع ہو گئے اس لیے کہ اُس کے شوہر نے بھی تو کافی جائیداد چھوڑی تھی۔ وہ اب بڑی مالدار عورت تھی۔ دولت کے نشے نے اُس کے سارے غم دُور کر دیے تھے۔ لیکن اُس کو کسی ساتھی کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ رات کو اکثر اسے نیند نہ آتی۔ گھر میں چار نوکر تھے جو اُس کی خدمت کے لیے چوبیس گھنٹے تیار رہتے۔ ہر قسم کی آسائش میسر تھی۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں خلا محسوس کرتی تھی۔ جیسے موٹر کا ٹائر تو ہے ثابت و سالم مگر اس میں ہوا کم ہے۔ پچک پچک جاتا ہے۔ ایک روز وہ بڑی افسردہ حالت میں باہر برآمدے میں لٹکے ہوئے پنگھوڑے پر بیٹھی تھی کہ اس کا منیم آیا۔ کامنی اسے صرف منیم جی کہتی تھی۔ وہ عام منیموں جیسا بڈھا اور جھڑوس نہیں تھا۔ اُس کی عمر یہی تیس برس کے قریب ہو گی۔ صاف ستھرا۔ دھوتی بڑے سلیقے سے باندھتا تھا۔ خوش شکل اور تندرست و توانا تھا۔ پہلی مرتبہ کامنی نے اُسے غور سے دیکھا اور جھولا جھولتے ہوئے اس کے پرنام کا جواب دیا اور اُس سے پوچھا۔

”کیوں منیم جی آپ کیسے آئے؟“

منیم نے اپنا بستہ جو اس کی بغل میں تھا نکالا۔ کھولنے ہی والا تھا کہ کامنی نے اس سے کہا

”رہنے دیجیے حساب کتاب، چلیے چائے پئیں“

دونوں اندر چلے گئے۔ چائے تیار تھی، گجراتی انداز کی۔ منیم کچھ جھینپا، اس لیے کہ وہ اس کا ملازم تھا اور دو سو روپے ماہوار لیتا تھا مگر کامنی نے اصرار کیا کہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھے۔ چائے کے ساتھ نمکین بسکٹ، کھاری سینگ (نمک لگی مونگ پھلی) اور دال مونٹھ اور کچھ اسی قسم کی تین چار چیزیں اور تھیں۔ کامنی غور سے منیم کو دیکھ رہی تھی جو پہلی مرتبہ اس نوازش سے دوچار ہوا تھا۔ کامنی نے چائے کا ایک گھونٹ پی کر اُس سے پوچھا

”منیم جی آپ کا نام کیا ہے؟“

نوجوان منیم کے ہاتھ سے بسکٹ گر کر چائے کی پیالی میں ڈبکیاں لگانے لگا

”جی میرا۔ میرا نام۔ رنچھوڑ داس ہے۔“

کامنی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔

”رنچھوڑ داس“

جی ہاں“

یہ تو میرے سورگ باشی پتی کا نام ہے“

منیم نے کہا

”مجھے معلوم ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اپنا نام بدل لوں گا“

کامنی نے ایک بار پھر منیم کو غور سے دیکھا

”نہیں نہیں۔ یہ نام مجھے پسند ہے۔“

چائے کا سلسلہ ختم ہوا تو منیم نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ ایک بلڈنگ پانچ منزلہ بنانے کا ٹھیکہ انھیں مل سکتا تھا۔ اُس نے کامنی سے کہا کہ اس سودے میں کم از کم پچاس ہزار روپے بلکہ اس سے زیادہ بچ جائیں گے۔ کامنی کے پاس کافی دولت موجود تھی اس کو کسی قسم کا لالچ نہیں تھا۔ لیکن منیم کے مشورے کو وہ نہ ٹال سکی۔ اس نے کہا

”ہاں منیم جی۔ میں یہ ٹھیکہ لینے کے لیے تیار ہوں اس لیے کہ آپ چاہتے ہیں“

منیم کی باچھیں کھل گئیں

”بائی جی۔ ٹھیکہ کیا ہے بس سونا ہی سونا ہے“

”سونا ہو یا لوہا۔ آپ کو روپیہ کتنا چاہیے؟“

”دس ہزار“

”کل دس ہزار؟“

”جی نہیں۔ یہ تو فوکٹ میں جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ رشوت میں۔ جب ٹھیکہ مل جائے گا تو ہم اُسے کسی اور کے حوالے کر دیں گے اور اپنے پیسے کھرے کر لیں گے“

کامنی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی

”ٹھیکہ مل جائے گا تو آپ اسے کسی دوسرے آدمی کے حوالے کیوں کریں گے؟“

منیم ہنسا۔

”بائی جی۔ یہ دنیا اسی طرح چلتی ہے۔ ہم محنت کیوں کریں۔ دس ہزار دیں گے۔ یہ کیا کم ہے اور سالا جس کو ہم دیں گے ہزاروں کمائے گا۔“

کامنی کے دماغ میں روپے پیسے نہیں تھے وہ بار بار منیم کو دیکھ رہی تھی۔ منیم کو بھی اس کا علم تھا کہ وہ اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے۔ تھوڑی دیر ٹھیکے بارے میں گفتگو ہوتی رہی لیکن بالکل ٹھس اور بے کیف۔ اچانک منیم نے کامنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کمرے میں لے گیا۔ منیم اور کامنی دیر تک اُس کمرے میں رہے۔ منیم اپنی دھوتی کا لانگ ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلا۔ بیڑی سلگا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں زرد رو کامنی آئی اور اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ منیم نے اس سے کہا

”بائی جی تو وہ دس ہزار کا چیک لکھ دیجئیے“

کامنی اُٹھی۔ اپنی ساڑھی کے پلو میں اُڑسے ہوئے چابیوں کے چھلے کو نکالا اور الماری کھول کر چیک بک نکالی اور دس ہزار روپے کا چیک کاٹ کر منیم کو دے دیا۔ منیم نے یہ چیک اپنی واسکٹ میں رکھا اور کامنی سے کہا

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔ کل کام ہو جائے گا“

دوسرے روز کام ہو گیا ٹھیکہ مل گیا اب اس کو ٹھکانے لگانے کا کام باقی رہ گیا تھا منیم کامنی بائی کے پاس آیا۔ دونوں کچھ دیر دوسرے کمرے میں رہے اس دوران میں سب باتیں ہو گئیں۔ اب یہ مرحلہ باقی رہ گیا کہ ٹھیکہ کس کے نام فروخت کیا جائے۔ کوئی ایسی پارٹی ہونی چاہیے کہ جو یک مشت روپیہ ادا کر دے۔ منیم ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے کافی دوڑ دھوپ کی آخر ایک پارٹی ڈُھونڈ نکالی جس نے دو لاکھ روپیہ یک مشت ادا کر دیا۔ اور بلڈنگ کا کام شروع ہو گیا۔ منیم نے جب دو لاکھ روپے کامنی کو دیے تو اسے کوئی خاص خوشی نہ ہوئی۔ البتہ وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ جہاں وہ دیر تک زیر تعمیر بلڈنگ کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ بلڈنگ کا کام دن رات جاری تھا۔ پانچ سو مزدور کام کر رہے تھے۔ پانچ منزلہ عمارت بن رہی تھی۔ اُدھر کامنی اور اُس کا منیم دوسرے کمرے میں کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ منیم بہت خوش تھا کہ اس نے بہت اچھا سودا کیا۔ دو لاکھ روپے بغیر کسی محنت کے وصول ہو گئے لیکن جس پارٹی نے یہ ٹھیکہ خریدا تھا اس کو اپنی دانست کے مطابق خسارہ ہی خسارہ نظر آ رہا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اسے زیادہ منافع کی اُمید نہیں تھی۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ بلڈنگ پانچوں منزل تک پہنچ گئی۔ پانچ سو مزدور دن رات عمارت سازی میں مصروف تھے۔ رات کو گیس کے لیمپ روشن کیے جاتے سیمنٹ اور بجری کو ملا کر مشین چلتی رہتی۔ مزدوروں میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی تھیں جو مردوں کے مقابلے میں بڑی تن دہی سے کام کرتی تھیں اپنے شیر خوار بچوں کو جو نیچے زمین پر پڑے ہوئے دودھ بھی پلاتیں اور سیمنٹ بجری اُٹھا کر پانچویں منزل تک پہنچاتیں۔ کامنی کے دوسرے کمرے میں ایک دن یہ طے ہوا کہ وہ شادی کر لیں۔ دوسرے دن صبح اخبار میں منیم نے پڑھا کہ وہ بلڈنگ جو تعمیر ہو رہی تھی ناقص مسالہ استعمال کرنے کے باعث اچانک گر گئی۔ پچاس مزدور نیچے دب گئے۔ اُن کی لاشیں نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ منیم کامنی کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ جب کامنی نے یہ خبر سنی تو اُس نے منیم کو دھکا دے کر ایک طرف کر دیا جیسے وہ ملبے کا ڈھیر ہے۔

ممد بھائی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوممدبھائی

فارس روڈ سے آپ اس طرف گلی میں چلے جائیے جو سفید گلی کہلاتی ہے تو اس کے آخری سرے پر آپ کو چند ہوٹل ملیں گے۔ یوں تو بمبئی میں قدم قدم پر ہوٹل اور ریستوران ہوتے ہیں مگر یہ ریستوران اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور منفرد ہیں کہ یہ اس علاقے میں واقع ہیں جہاں بھانت بھانت کی لونڈیاں بستی ہیں۔ ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ بس آپ یہی سمجھیے کہ بیس برس کے قریب، جب میں ان ریستورانوں میں چائے پیا کرتا تھا اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ سفید گلی سے آگے نکل کر

”پلے ہاؤس“

آتا ہے۔ ادھر دن بھر ہاؤ ہُو رہتی ہے۔ سینما کے شو دن بھر چلتے رہتے تھے۔ چمپیاں ہوتی تھیں۔ سینما گھر غالباً چار تھے۔ ان کے باہر گھنٹیاں بجا بجا کر بڑے ساعت پاش طریقے پر لوگوں کو مدعو کرتے۔

”آؤ آؤ۔ دو آنے میں۔ فسٹ کلاس کھیل۔ دو آنے میں“!

بعض اوقات یہ گھنٹیاں بجانے والے زبردستی لوگوں کو اندر دھکیل دیتے تھے۔ باہر کرسیوں پر چمپی کرانے والے بیٹھے ہوتے تھے جن کی کھوپڑیوں کی مرمت بڑے سائنٹیفک طریقے پر کی جاتی تھی۔ مالش اچھی چیز ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بمبئی کے رہنے والے اس کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں۔ دن کو اور رات کو، ہر وقت انھیں تیل مالش کی ضرورت محسوس ہوتی۔ آپ اگر چاہیں تو رات کے تین بجے بڑی آسانی سے تیل مالشیا بلا سکتے ہیں۔ یوں بھی ساری رات، آپ خواہ بمبئی کے کسی کونے میں ہوں، یہ آواز آپ یقیناً سنتے رہیں گے۔

”پی۔ پی۔ پی۔“

یہ ’پی‘ چمپی کا مخفف ہے۔ فارس روڈ یوں تو ایک سڑک کا نام ہے لیکن دراصل یہ اس پورے علاقے سے منسوب ہے جہاں بیسوائیں بستی ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس میں کئی گلیاں ہیں جن کے مختلف نام ہیں، لیکن سہولت کے طور پر اس کی ہر گلی کو فارس روڈ یا سفید گلی کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں جنگلا لگی دکانیں ہیں جن میں مختلف رنگ و سن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم بیچتی ہیں۔ مختلف داموں پر، آٹھ آنے سے آٹھ روپے تک، آٹھ روپے سے سو روپے تک۔ ہر دام کی عورت آپ کو اس علاقے میں مل سکتی ہے۔ یہودی، پنجابی، مرہٹی، کشمیری، گجراتی، بنگالی، اینگلو انڈین، فرانسیسی، چینی، جاپانی غرضیکہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ یہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں۔ معاف کیجیے گا، اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ بس عورتیں ہوتی ہیں۔ اور ان کو گاہک مل ہی جاتے ہیں۔ اس علاقے میں بہت سے چینی بھی آباد ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیا کاروبار کرتے ہیں، مگر رہتے اسی علاقے میں ہیں۔ بعض تو ریستوران چلاتے ہیں جن کے باہر بورڈوں پر اوپر نیچے کیڑے مکوڑوں کی شکل میں کچھ لکھا ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کیا۔ اس علاقے میں بزنس مین اور ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ ایک گلی ہے جس کا نام عرب سین ہے۔ وہاں کے لوگ اسے عرب گلی کہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس کی میں بات کر رہا ہوں، اس گلی میں غالباً بیس پچیس عرب رہتے تھے جو خود کو موتیوں کے بیوپاری کہتے تھے۔ باقی آبادی پنجابیوں اور رام پوریوں پر مشتمل تھی۔ اس گلی میں مجھے ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں سورج کی روشنی کا داخلہ بند تھا، ہر وقت بجلی کا بلب روشن رہتا تھا۔ اس کا کرایہ ساڑھے نو روپے ماہوار تھا۔ آپ کا اگر بمبئی میں قیام نہیں رہا تو شاید آپ مشکل سے یقین کریں کہ وہاں کسی کو کسی اور سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی کھولی میں مر رہے ہیں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ کے پڑوس میں قتل ہو جائے، مجال ہے جو آپ کو اس کی خبر ہو جائے۔ مگر وہاں عرب گلی میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو اڑوس پڑوس کے ہر شخص سے دلچسپی تھی۔ اس کا نام ممد بھائی تھا۔ ممد بھائی رام پور کا رہنے والا تھا۔ اول درجے کا پھکیت، گتکے اور بنوٹ کے فن میں یکتا۔ میں جب عرب گلی میں آیا تو ہوٹلوں میں اس کا نام اکثر سننے میں آیا، لیکن ایک عرصے تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں صبح سویرے اپنی کھولی سے نکل جاتا تھا اور بہت رات گئے لوٹتا تھا۔ لیکن مجھے ممد بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ کیوں کہ اس کے متعلق عرب گلی میں بے شمار داستانیں مشہور تھیں کہ بیس پچیس آدمی اگر لاٹھیوں سے مسلح ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سب کو چت کر دیتا ہے۔ اور یہ کہ اس جیسا چھری مار ساری بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ ایسے چھری مارتا ہے کہ جس کے لگتی ہے اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ سو قدم بغیر احساس کے چلتا رہتا ہے اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ہاتھ کی صفائی ہے۔ اس کے ہاتھ کی صفائی دیکھنے کا مجھے اشتیاق نہیں تھا لیکن یوں اس کے متعلق اور باتیں سن سن کر میرے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ میں اسے دیکھوں۔ اس سے باتیں نہ کروں لیکن قریب سے دیکھ لوں کہ وہ کیسا ہے۔ اس تمام علاقے پر اس کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑا دادا یعنی بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے تھے کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔ غریبوں کے دکھ درد کا شریک ہے۔ عرب گلی۔ صرف عرب گلی ہی نہیں، آس پاس جتنی گلیاں تھیں، ان میں جتنی نادار عورتیں تھی، سب ممد بھائی کو جانتی تھیں کیوں کہ وہ اکثر ان کی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ خود ان کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔ اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا تھا اور ان کی خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پہنتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا تانگہ تھا جس میں بڑا تندرست ٹٹو جُتا ہوتا تھا، اس کو وہ خود چلاتا تھا۔ ساتھ دو یا تین شاگرد ہوتے تھے، بڑے باادب۔ بھنڈی بازار کا ایک چکر لگا یا کسی درگاہ میں ہو کر وہ اس تانگے میں واپس عرب گلی آجاتا تھا اور کسی ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کے ساتھ گتکے اور بنوٹ کی باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔ میری کھولی کے ساتھ ہی ایک اور کھولی تھی جس میں مارواڑ کا ایک مسلمان رقاص رہتا تھا۔ اس نے مجھے ممد بھائی کی سینکڑوں کہانیاں سنائیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ ممد بھائی ایک لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ اس کو ایک مرتبہ ہیضہ ہو گیا تھا۔ ممد بھائی کو پتہ چلا تو اس نے فارس روڈ کے تمام ڈاکٹر اس کی کھولی میں اکٹھے کر دیے اور ان سے کہا

”دیکھو، اگر عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفایا کر دوں گا۔“

عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

”منٹو صاحب! ممد بھائی فرشتہ ہے۔ فرشتہ۔ جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو وہ سب کانپنے لگے۔ ایسا لگ کے علاج کیا کہ میں دو دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ ممد بھائی کے متعلق میں عرب گلی کے گندے اور واہیات ریستورانوں میں اور بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ ایک شخص نے جو غالباً اس کا شاگرد تھا اور خود کو بہت بڑا پھکیت سمجھتا تھا، مجھ سے یہ کہا تھا کہ ممد دادا اپنے نیفے میں ایک ایسا آبدار خنجر اڑس کے رکھتا ہے جو استرے کی طرح شیو بھی کر سکتا ہے اور یہ خنجر نیام میں نہیں ہوتا، کھلا رہتا ہے۔ بالکل ننگا، اور وہ بھی اس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر باتیں کرتے ہوئے، جھکتے ہوئے اس سے ذرا سی غلطی ہو جائے تو ممد بھائی کا ایک دم کام تمام ہو کے رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا

اشتیاق دن بدن میرے دل و دماغ میں بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں میں نے اپنے تصور میں اس کی شکل و صورت کا کیا نقشہ تیار کیا تھا، بہر حال اتنی مدت کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ایک قوی ہیکل انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا جس کا نام ممد بھائی تھا۔ اس قسم کا آدمی جو ہر کولیس سائیکلوں پر اشتہار کے طور پر دیا جاتا ہے۔ میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات کو دس بجے کے قریب کھانے والے سے فارغ ہو کر واپس آ کر فوراً سو جاتا تھا۔ اس دوران میں ممد بھائی سے کیسے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ کام پر نہ جاؤں اور سارا دن عرب گلی میں گزار کر ممد بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں، مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا اس لیے کہ میری ملازمت ہی بڑی واہیات قسم کی تھی۔ ممد بھائی سے ملاقات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انفلوائنزا نے مجھ پر زبردست حملہ کیا۔ ایسا حملہ کہ میں بوکھلا گیا۔ خطرہ تھا کہ یہ بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو جائے گا، کیوں کہ عرب گلی کے ایک ڈاکٹر نے یہی کہا تھا۔ میں بالکل تن تنہا تھا۔ میرے ساتھ جو ایک آدمی رہتا تھا، اس کو پونہ میں نوکری مل گئی تھی، اس لیے اس کی رفاقت بھی نصیب نہیں تھی۔ میں بخار میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس قدر پیاس تھی کہ جو پانی کھولی میں رکھا تھا، وہ میرے لیے ناکافی تھا۔ اور دوست یار کوئی پاس نہیں تھا جو میری دیکھ بھال کرتا۔ میں بہت سخت جان ہوں، دیکھ بھال کی مجھے عموماً ضرورت محسوس نہیں ہوا کرتی۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ کسی قسم کا بخار تھا۔ انفلوائنزا تھا، ملیریا تھا یا اور کیا تھا۔ لیکن اس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ میں بلبلانے لگا۔ میرے دل میں پہلی مرتبہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہو جو مجھے دلاسہ دے۔ دلاسہ نہ دے تو کم از کم ایک سیکنڈ کے لیے اپنی شکل دکھا کے چلا جائے تا کہ مجھے یہ خوشگوار احساس ہو کہ مجھے پوچھنے والا بھی کوئی ہے۔ دو دن تک میں بستر میں پڑا تکلیف بھری کروٹیں لیتا رہا، مگر کوئی نہ آیا۔ آنا بھی کسے تھا۔ میری جان پہچان کے آدمی ہی کتنے تھے۔ دو تین یا چار۔ اور وہ اتنی دور رہتے تھے کہ ان کو میری موت کا علم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پھر وہاں بمبئی میں کون کس کو پوچھتا ہے۔ کوئی مرے یا جیے۔ ان کی بلا سے۔ میری بہت بری حالت تھی۔ عاشق حسین ڈانسر کی بیوی بیمار تھی اس لیے وہ اپنے وطن جا چکا تھا۔ یہ مجھے ہوٹل کے چھوکرے نے بتایا تھا۔ اب میں کس کو بلاتا۔ بڑی نڈھال حالت میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود نیچے اتروں اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خیال کہ ہوٹل کا چھوکرا جسے بمبئی کی زبان میں 'باہر والا' کہتے ہیں، ہو گا۔ بڑی مریل آواز میں کہا۔

”آجاؤ“!

دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کا آدمی، جس کی مونچھیں مجھے سب سے پہلے دکھائی دیں، اندر داخل ہوا۔ اس کی مونچھیں ہی سب کچھ تھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کی مونچھیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی مونچھوں ہی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سارے وجود کو زندگی بخش رکھی ہے۔ وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی مونچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے میری کھاٹ کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین چار آدمی تھے، عجیب و غریب وضع قطع کے۔ میں بہت حیران تھا کہ یہ کون ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں۔ قیصر ولیم جیسی مونچھوں اور چھریرے بدن والے نے مجھ سے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا۔

”ومٹو صاحب! آپ نے حد کر دی۔ سالا مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟“

منٹو کا ومٹو بن جانا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میں اس موڈ میں بھی نہیں تھا کہ میں اس کی اصلاح کرتا۔ میں نے اپنی نحیف آواز میں اس کی مونچھوں سے صرف اتنا کہا۔

”آپ کون ہیں؟“

اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”ممد بھائی“!

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ممد بھائی۔ تو۔ تو آپ ممد بھائی بھائی ہیں۔ مشہور دادا“!

میں نے یہ کہہ تو دیا۔ لیکن فوراً مجھے اپنے بینڈے پن کا احساس ہوا اور رک گیا۔ ممد بھائی نے چھوٹی انگلی سے اپنی مونچھوں کے کرخت بال ذرا اوپر کیے اور مسکرایا۔

”ہاں ومٹو بھائی۔ میں ممد ہوں۔ یہاں کا مشہور دادا۔ مجھے باہر والے سے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو۔ سالا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم نے مجھے خبر نہ کی۔ ممد بھائی کا مستک پھر جاتا ہے، جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔“

میں جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا

”ارے۔ کیا نام ہے تیرا۔ جا بھاگ کے جا، اور کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا۔ سمجھ گئے نا اس سے کہہ کہ ممد بھائی تجھے بلاتا ہے۔ ایک دم جلدی آ۔ ایک دم سب کام چھوڑ دے اور جلدی آ۔ اور دیکھ سالے سے کہنا، سب دوائیں لیتا آئے۔“

ممد بھائی نے جس کو حکم دیا تھا، وہ ایک دم چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تمام داستانیں میرے بخار آلود دماغ میں چل پھر رہی تھیں۔ جو میں اس کے متعلق لوگوں سے سن چکا تھا۔ لیکن گڈ مڈ صورت میں۔ کیوں کہ بار بار اس کو دیکھنے کی وجہ سے اس کی مونچھیں سب پر چھا جاتی تھیں۔ بڑی خوفناک، مگر بڑی خوبصورت مونچھیں تھیں۔ لیکن ایسا

محسوس ہوتا تھا کہ اس چہرے کو جس کے خدوخال بڑے ملائم اور نرم ونازک ہیں، صرف خوفناک بنانے کے لیے یہ مونچھیں رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے بخار آلود دماغ میں یہ سوچا کہ یہ شخص درحقیقت اتنا خوفناک نہیں جتنا اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔ کھولی میں کرسی نہیں۔ میں نے ممد بھائی سے کہا وہ میری چارپائی پر بیٹھ جائے۔ مگر اس نے انکار کر دیا اور بڑے روکھے سے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کھڑے رہیں گے۔“

پھر اس نے ٹہلتے ہوئے۔ حالانکہ اس کھولی میں اس عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، کرتے کا دامن اٹھا کر پاجامے کے نیفے سے ایک خنجر نکالا۔ میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر لشک رہا تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ یہ خنجر نکال کر پہلے اس نے اپنی کلائی پر پھیرا۔ جو بال اس کی زد میں آئے، سب صاف ہو گئے۔ اس نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن تراشنے لگا۔ اس کی آمد ہی سے میرا بخار کئی درجے نیچے اتر گیا تھا۔ میں نے اب کسی قدر ہوش مند حالت میں اس سے کہا۔

”ممد بھائی۔ یہ چھری تم اس طرح اپنے۔ نیفے میں۔ یعنی بالکل اپنے پیٹ کے ساتھ رکھتے ہو اتنی تیز ہے، کیا تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟“

ممد نے خنجر سے اپنے ناخن کی ایک قاش بڑی صفائی سے اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

”ومٹو بھائی۔ یہ چھری دوسروں کے لیے ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے۔ سالی، اپنی چیز ہے، مجھے نقصان کیسے پہنچائے گی؟“

چھری سے جو رشتہ اس نے قائم کیا تھا وہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں یا باپ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے، یا بیٹی ہے۔ اس کا ہاتھ مجھ پر کیسے اٹھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر آ گیا۔ اس کا نام پنٹو تھا اور میں ومٹو۔ اس نے ممد بھائی کو اپنے کرسچیئن انداز میں سلام کیا اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جو معاملہ تھا، وہ ممد بھائی نے بیان کر دیا۔ مختصر، لیکن کڑے الفاظ میں، جن میں تحکم تھا کہ دیکھو اگر تم نے ومٹو بھائی کا علاج اچھی طرح نہ کیا تو تمہاری خیر نہیں۔ ڈاکٹر پنٹو نے فرمانبردار لڑکے کی طرح اپنا کام کیا۔ میری نبض دیکھی۔ سٹیتھو سکوپ لگا میرے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ مجھ سے میری بیماری کی تمام تفصیل پوچھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے نہیں، ممد بھائی سے کہا۔

”کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ ملیریا ہے۔ میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔“

ممد بھائی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پنٹو کی بات سنی اور خنجر سے اپنی کلائی کے بال اڑاتے ہوئے کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔ انجکشن دینا ہے تو دے، لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔“

ڈاکٹر پنٹو کانپ گیا۔

”نہیں ممد بھائی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ممد بھائی نے خنجر اپنے نیفے میں اڑس لیا۔

”تو ٹھیک ہے۔“

”تو میں انجکشن لگاتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی۔

”ٹھہرو۔ ٹھہرو۔“

ممد بھائی گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج فوراً بیگ میں واپس رکھی دی اور ممیاتے ہوئے ممد بھائی سے مخاطب ہوا۔

”کیوں؟“

”بس۔ میں کسی کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ کھولی سے باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔ ڈاکٹر پنٹو نے میرے کونین کا انجکشن کا لگایا۔ بڑے سلیقے سے، ورنہ ملیریا کا یہ انجکشن بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس سے فیس پوچھی۔ اس نے کہا

”دس روپے“!

میں تکیے کے نیچے سے اپنا بٹوہ نکال رہا تھا کہ ممد بھائی اندر آ گیا۔ اس وقت میں دس روپے کا نوٹ ڈاکٹر پنٹو کو دے رہا تھا۔ ممد بھائی نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے اور ڈاکٹر کو دیکھا اور گرج کر کہا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے کہا۔

”فیس دے رہا ہوں۔“

ممد بھائی ڈاکٹر پنٹو سے مخاطب ہوا۔

”سالے یہ فیس کیسی لے رہے ہو؟“

ڈاکٹر پنٹو بوکھلا ہو گیا۔

”میں کب لے رہا ہوں۔ یہ دے رہے تھے“!

”سالا۔ ہم سے فیس لیتے ہو۔ واپس کرو یہ نوٹ“!

ممد بھائی کے لہجے میں اس کے خنجر ایسی تیزی تھی۔ ڈاکٹر پنٹو نے مجھے نوٹ واپس کر دیا اور بیگ بند کر کے ممد بھائی سے معذرت طلب کرتے ہوئے چلا گیا۔ ممد بھائی نے ایک انگلی سے اپنی کانٹوں ایسی مونچھوں کو تاؤ دیا اور مسکرایا۔

”ومٹو بھائی۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس علاقے کا ڈاکٹر تم سے فیس لے۔ تمہاری قسم، اپنی مونچھیں منڈوا دیتا اگر اس سالے نے فیس لی ہوتی۔ یہاں سب تمہارے غلام ہیں۔“

تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”ممد بھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“

ممد بھائی کی مونچھیں تھر تھرائیں۔

”ممد بھائی کسے نہیں جانتا۔ ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے۔ اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی آئی ڈی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی رہتی ہے۔ کون آیا ہے، کون گیا ہے، کون اچھی حالت ہے، کون بری حالت میں۔ تمہارے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں۔“

میں نے ازراہ تفنن پوچھا۔

”کیا جانتے ہیں آپ؟“

سالا۔ ہم کیا نہیں جانتے۔ تم امرتسر کا رہنے والا ہے۔ کشمیری ہے۔ یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے۔ تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں، اسی لیے تم ادھر سے نہیں گزرتے۔ بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمہاری جان کو روتا ہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے سے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔“

میں پانی پانی ہو گیا۔ ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور مسکرا کہا۔

”ومٹو بھائی! کچھ فکر نہ کرو۔ تمہارے سب قرض چکا دیے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خبردار! اگر ومٹو بھائی کو تم نے تنگ کیا۔ اور ممد بھائی تم سے کہتا ہے کہ انشاء اللہ کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔“

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ بیمار تھا، کونین کا ٹیکہ لگ چکا تھا۔ جس کے باعث کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس کے خلوص کے نیچے اتنا دب چکا تھا کہ اگر مجھے کوئی نکالنے کی کوشش کرتا تو اسے بہت محنت کرنی پڑتی۔ میں صرف اتنا کہہ سکا۔

”ممد بھائی! خدا تمہیں زندہ رکھے۔ تم خوش رہو۔“

ممد بھائی نے اپنی مونچھوں کے بال ذرا اوپر کیے اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ ڈاکٹر پنٹو ہر روز صبح شام آتا رہا۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ فیس کا ذکر کیا مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

”نہیں، مسٹر منٹو! ممد بھائی کا معاملہ ہے میں ایک ڈیڑھیا بھی نہیں لے سکتا۔“

میں نے سوچا یہ ممد بھائی کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔ یعنی خوفناک قسم کا جس سے ڈاکٹر پنٹو جو بڑا خسیس قسم کا آدمی ہے، ڈرتا ہے اور مجھ سے فیس لینے کی جرات نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ اپنی جیب سے انجکشنوں پر خرچ کر رہا ہے۔ بیماری کے دوران میں ممد بھائی بھی بلاناغہ آتا رہا۔ کبھی صبح آتا، کبھی شام کو، اپنے چھ سات شاگردوں کے ساتھ۔ اور مجھے ہر ممکن طریقے سے ڈھارس دیتا تھا کہ معمولی ملیریا ہے، تم ڈاکٹر پنٹو کے علاج سے انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پندرہ روز کے بعد میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اس دوران میں ممد بھائی کے ہر خدوخال کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، وہ چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ عمر یہی پچیس تیس کے درمیان ہو گی۔ پتلی پتلی بانہیں، ٹانگیں بھی ایسی ہی تھیں۔ ہاتھ بلا کے پھرتیلے تھے۔ ان سے جب وہ چھوٹا تیز دھار چاقو کسی دشمن پر پھینکتا تھا تو وہ سیدھا اس کے دل میں کُھبتا تھا۔ یہ مجھے عرب کے گلی نے بتایا تھا۔ اس کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں، اس نے کسی کو قتل کیا تھا، میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چھری مار وہ اول درجے کا تھا۔ بنوٹ اور گتکے کا ماہر۔ یوں سب کہتے تھے کہ وہ سینکڑوں قتل کر چکا ہے، مگر میں یہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔ لیکن جب میں اس کے خنجر کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے تن بدن پر جھرجھری سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوفناک ہتھیار وہ کیوں ہر وقت اپنی

شلوار کے نیفے میں اڑسے رہتا ہے۔ میں جب اچھا ہو گیا تو ایک دن عرب گلی کے ایک تھرڈ کلاس چینی ریستوران میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنا وہی خوفناک خنجر نکال کر اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”ممد بھائی۔ آج کل بندوق پستول کا زمانہ ہے۔ تم یہ خنجر کیوں لیے پھرتے ہو؟“

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور کہا

”ومٹو بھائی! بندوق پستول میں کوئی مزا نہیں۔ انھیں کوئی بچہ بھی چلا سکتا۔ گھوڑا دبایا اور ٹھاہ۔ اس میں کیا مزا ہے۔ یہ چیز۔ یہ خنجر۔ یہ چھری۔ یہ چاقو۔ مزا آتا ہے نا، خدا کی قسم۔ یہ وہ ہے۔ تم کیا کہا کرتے ہو۔ ہاں۔ آرٹ۔ اس میں آرٹ ہوتا ہے میری جان۔ جس کو چاقو یا چھری چلانے کا آرٹ نہ آتا ہو وہ ایک دم کنڈم ہے۔ پستول کیا ہے۔ کھلونا ہے۔ جو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پر اس میں کیا لطف آتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ تم یہ خنجر دیکھو۔ اس کی تیز دھار دیکھو۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے انگوٹھے پر لب لگایا اور اس کی دھار پر پھیرا۔

”اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوتا۔ بس، یوں پیٹ کے اندر داخل کر دو۔ اس صفائی سے کہ اس سالے کو معلوم تک نہ ہو۔ بندوق، پستول سب بکواس ہے۔“

ممد بھائی سے اب ہر روز کسی نہ کسی وقت ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ممنون احسان تھا۔ لیکن جب میں اس کا ذکر کیا کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، یہ تو میرا فرض تھا۔ جب میں نے کچھ تفتیش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا وہ ایک قسم کا حاکم ہے۔ ایسا حاکم جو ہر شخص کی خبر گیری کرتا تھا۔ کوئی بیمار ہو، کسی کے کوئی تکلیف ہو، ممد بھائی اس کے پاس پہنچ جاتا تھا اور یہ اس کی سی آئی ڈی کا کام تھا جو اس کو ہر چیز سے باخبر رکھتی تھی۔ وہ دادا تھا یعنی ایک خطرناک غنڈہ۔ لیکن میری سمجھ میں اب بھی نہیں آتا کہ وہ کس لحاظ سے غنڈہ تھا۔ خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن نہیں دیکھا۔ ایک صرف اس کی مونچھیں تھیں جو اس کو ہیبت ناک بنائے رکھتی تھیں۔ لیکن اس کو ان سے پیار تھا۔ وہ ان کی اس طرح پرورش کرتا تھا جس طرح کوئی اپنے بچے کی کرے۔ اس کی مونچھوں کا ایک ایک بال کھڑا تھا، جیسے خارپشت کا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ممد بھائی ہر روز اپنی مونچھوں کو بالائی کھلاتا ہے۔ جب کھانا کھاتا ہے تو سالن بھری انگلیوں سے اپنی مونچھیں ضرور مروڑتا ہے کہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق یوں بالوں میں طاقت آتی ہے۔ میں اس سے پیشتر غالباً کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس کی مونچھیں بڑی خوفناک تھیں۔ دراصل مونچھوں کا نام ہی ممد بھائی تھا۔ یا اس خنجر کا جو اس کی تنگ گھیرے کی شلوار کے نیفے میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مجھے ان دونوں چیزوں سے ڈر لگتا تھا، نہ معلوم کیوں۔ ممد بھائی یوں تو اس علاقے کا بہت بڑا دادا تھا، لیکن وہ سب کا ہمدرد تھا۔ معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے، پر وہ ہر حاجت مند کی بروقت مدد کرتا تھا۔ اس علاقے کی تمام رنڈیاں اس کو اپنا پیر مانتی تھی۔ چونکہ وہ ایک مانا ہوا غنڈہ تھا، اس لیے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کی کسی طوائف سے ہوتا، مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔ میری اس کی بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ان پڑھ تھا، لیکن جانے کیوں وہ میری اتنی عزت کرتا تھا کہ عرب گلی کے تمام آدمی رشک کرتے تھے۔ ایک دن صبح سویرے، دفتر جاتے وقت میں نے چینی کے ہوٹل میں کسی سے سنا کہ ممد بھائی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے بہت تعجب ہوا، اس لیے کہ تمام تھانے والے اس کے دوست تھے۔ کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کے آدمی سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی جو ممد بھائی گرفتار ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اسی عرب گلی میں ایک عورت رہتی ہے، جس کا نام شیریں بائی ہے۔ اس کی ایک جوان لڑکی ہے، اس کو کل ایک آدمی نے خراب کر دیا۔ یعنی اس کی عصمت دری کر دی۔ شیریں بائی روتی ہوئی ممد بھائی کے پاس آئی اور اس سے کہا

”تم یہاں کے دادا ہو۔ میری بیٹی سے فلاں آدمی نے یہ برا کیا ہے۔ لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو۔“

ممد بھائی نے یہ موٹی گالی اس بڑھیا کو دی اور کہا۔

”تم چاہتی کیا ہو؟“

اس نے کہا

”میں چاہتی ہوں کہ تم اس حرامزادے کا پیٹ چاک کر دو۔“

ممد بھائی اس وقت ہوٹل میں سیس پاؤں کے ساتھ قیمہ کھا رہا تھا۔ یہ سن کر اس نے اپنے نیفے میں سے خنجر نکالا۔ اس پر انگوٹھا پھیر کر اس کی دھار دیکھی اور بڑھیا سے کہا۔

”جا۔ تیرا کام ہو جائے گا۔“

اور اس کا کام ہو گیا۔ دوسرے معنوں میں جس آدمی نے اس بڑھیا کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی، آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا کام تمام ہو گیا۔ ممد بھائی گرفتار تو ہو گیا تھا، مگر اس نے کام اتنی ہوشیاری اور چابک دستی سے کیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عینی شاہد موجود بھی ہوتا تو وہ کبھی عدالت میں بیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ دو دن حوالات میں رہا تھا، مگر اس کو وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پولیس کے سپاہی، انسپکٹر، سب انسپکٹر سب اس کو جانتے تھے۔ لیکن جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر باہر

آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا پہنچا ہے۔ اس کی مونچھیں جو خوفناک طور پر اوپر کو اٹھی ہوتی تھیں اب کسی قدر جھکی ہوئی تھیں۔ چینی کے ہوٹل میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے کپڑے جو ہمیشہ اجلے ہوتے تھے، میلے تھے۔ میں نے اس سے قتل کے متعلق کوئی بات نہ کی لیکن اس نے خود کہا

”ومٹو صاحب! مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ سالا دیر سے مرا۔ چھری مارنے میں مجھ سے غلطی ہوگئی، ہاتھ ٹیڑھا پڑا۔ لیکن وہ بھی اس سالے کا قصور تھا۔ ایک دم مڑ گیا اور اس وجہ سے سارا معاملہ کنڈم ہو گیا۔ لیکن مر گیا۔ ذرا تکلیف کے ساتھ، جس کا مجھے افسوس ہے۔“

آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ میرا ردعمل کیا ہو گا۔ یعنی اس کو افسوس تھا کہ وہ اسے بطریق احسن قتل نہ کر سکا، اور یہ کہ مرنے میں اسے ذرا تکلیف ہوئی ہے۔ مقدمہ چلنا تھا۔ اور ممد بھائی اس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں عدالت کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اس سے پہلے بھی قتل کیے تھے کہ نہیں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق نہیں وہ مجسٹریٹ، وکیل اور گواہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، اس لیے کہ اس کا سابقہ ان لوگوں سے کبھی پڑا نہیں تھا۔ وہ بہت فکرمند تھا۔ پولیس نے جب کیس پیش کرنا چاہا اور تاریخ مقرر ہو گئی تو ممد بھائی بہت پریشان ہو گیا۔ عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے کیسے حاضر ہوا جاتا ہے، اس کے متعلق اس کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بار بار وہ اپنی کرخت مونچھوں پر انگلیاں پھیرتا اور مجھ سے کہتا تھا۔

”ومٹو صاحب! میں مر جاؤں گا پر کورٹ نہیں جاؤں گا۔ سالی، معلوم نہیں کیسی جگہ ہے۔“

عرب گلی میں اس کے کئی دوست تھے۔ انھوں نے اس کو ڈھارس دی کہ معاملہ سنگین نہیں ہے۔ کوئی گواہ موجود نہیں، ایک صرف اس کی مونچھیں ہیں جو مجسٹریٹ کے دل میں اس کے خلاف یقینی طور پر کوئی مخالف جذبہ پیدا کر سکتی ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ اس کی صرف مونچھیں ہی تھیں جو اس کو خوفناک بناتی تھیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ ہر گز ہر گز

”دادا“

دکھائی نہ دیتا۔ اس نے بہت غور کیا۔ اس کی ضمانت تھانے ہی میں ہو گئی تھی۔ اب اسے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ مجسٹریٹ سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ ایرانی کے ہوٹل میں جب میری ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کو اپنی مونچھوں کے متعلق بڑی فکر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ان کے ساتھ اگر وہ عدالت میں پیش ہوا تو بہت ممکن ہے اس کو سزا ہو جائے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے تمام شاگرد حیران تھے، اس لے کہ وہ کبھی حیران و پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کو مونچھوں کی فکر تھی کیوں کہ اس کے بعض قریبی دوستوں نے اس سے کہا تھا۔

”ممد بھائی۔ کورٹ میں جانا ہے تو ان مونچھوں کے ساتھ کبھی نہ جانا۔ مجسٹریٹ تم کو اندر کر دے گا۔“

اور وہ سوچتا تھا۔ ہر وقت سوچتا تھا کہ اس کی مونچھوں نے اس آدمی کو قتل کیا ہے یا اس نے۔ لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا خنجر معلوم نہیں جو پہلی مرتبہ خون آشنا ہوا تھا یا اس سے پہلے کئی مرتبہ ہو چکا تھا، اپنے نیفے سے نکالا اور ہوٹل کے باہر گلی میں پھینک دیا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”ممد بھائی۔ یہ کیا؟“

”کچھ نہیں ومٹو بھائی۔ بہت گھوٹالا ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جانا ہے۔ یار دوست کہتے ہیں کہ تمہاری مونچھیں دیکھ کر وہ ضرور تم کو سزا دے گا۔ اب بولو، میں کیا کروں؟“

میں کیا بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی مونچھوں کی طرف دیکھا جو واقعی بڑی خوفناک تھیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا۔

”ممد بھائی! بات تو ٹھیک ہے۔ تمہاری مونچھیں مجسٹریٹ کے فیصلے پر ضرور اثر انداز ہوں گی۔ سچ پوچھو تو جو کچھ ہو گا، تمہار خلاف نہیں۔ مونچھوں کے خلاف ہو گا۔“

”تو میں منڈوا دوں؟“

ممد بھائی نے اپنی چہیتی مونچھوں پر بڑے پیار سے انگلی پھیری۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال ہے جو کچھ بھی ہو، وہ تم نہ پوچھو۔ لیکن یہاں ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ میں انھیں منڈوا دوں تاکہ وہ سالا مجسٹریٹ مہربان ہو جائے۔ تو منڈوا دوں ومٹو بھائی؟“

میں نے کچھ توقف کے بعد اس سے کہا۔

”ہاں، اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو منڈوا دو۔ عدالت کا سوال ہے اور تمہاری مونچھیں واقعی بڑی خوفناک ہیں۔“

دوسرے دن ممد بھائی نے اپنی مونچھیں۔ اپنی جان سے عزیز مونچھیں منڈوا ڈالیں۔ کیوں کہ اس کی عزت خطرے میں تھی۔ لیکن صرف دوسرے کے مشورے پر۔ مسٹر ایف، ایچ، ٹیگ کی عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ مونچھوں کے بغیر ممد بھائی بھائی پیش ہوا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی، لیکن مجسٹریٹ صاحب نے اس کو خطرناک غنڈہ قرار دیتے ہوئے تڑی پار یعنی صوبہ بدر کر دیا۔ اس کو صرف ایک دن ملا تھا جس میں اسے اپنا تمام حساب کتاب طے کر کے بمبئی چھوڑ دینا تھا۔ عدالت سے باہر نکل

کر اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی چھوٹی بڑی انگلیاں بار بار بالائی ہونٹ کی طرف بڑھتی تھیں۔ مگر وہاں کوئی بال ہی نہیں تھا۔ شام کو جب اسے بمبئی چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا، میری اس کی ملاقات ایرانی کے ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے دس بیس شاگرد آس پاس کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جب میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مونچھوں کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مغموم ہے۔ اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر میں نے اس سے کہا۔

”کیا بات ہے ممد بھائی؟“

اس نے جواب میں ایک بہت بڑی گالی خدا معلوم کس کو دی اور کہا۔

”سالا، اب ممد بھائی ہی نہیں رہا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ صوبہ بدر کیا جا چکا ہے۔

”کوئی بات نہیں ممد بھائی!۔ یہاں نہیں تو کسی اور جگہ سہی“!

اس نے تمام جگہوں کو بے شمار گالیاں دیں۔

”سالا۔ اپن کو یہ غم نہیں۔ یہاں رہیں یا کسی اور جگہ رہیں۔ یہ سالا مونچھیں کیوں منڈوائیں؟“

پھر اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے اس کو مونچھیں منڈوانے کا مشورہ دیا تھا، ایک کروڑ گالیاں دیں اور کہا۔

”سالا اگر مجھے تڑی پار ہی ہونا تھا تو مونچھوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا۔“

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔

”سالا تم کیسا آدمی ہے، ومٹو۔ ہم سچ کہتا ہے، خدا کی قسم۔ ہمیں پھانسی لگا دیتے۔ پر۔ یہ بے وقوفی تو ہم نے خود کی۔ آج تک کسی سے نہ ڈرا تھا۔ سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔“

یہ کہہ کر اس نے دوہتر اپنے منہ پر مارا۔

”ممد بھائی لعنت ہے تجھ پر۔ سالا۔ اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔ اب جا اپنی ماں کے۔“

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جو اس کے مونچھوں بغیر چہرے پر کچھ عجیب سے دکھائی دیتے تھے۔

ممّی

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوممّی

نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔ وہ پونہ میں کیسے آئی۔ کب سے وہاں تھی۔ اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات سے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون کون وابستہ ہے۔ اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ وہ پُونہ کے ہر ذرے سے وابستہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو۔ مگر پونہ میرے لیے وہی پونہ ہے اور اس کے وہی ذرے، اس کے تمام ذرے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں۔ اور ممی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔ اس سے میری پہلی ملاقات پونے ہی میں ہوئی۔ میں نہایت سست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں۔ آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھیے گا کہ میں عنقریب کنچن چنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لیے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کر کے وہیں کا ہو رہوں۔ خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ سکتے ہیں کہ جب پونے گیا تو بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں۔ ٹھہریئے میں حساب لگا لوں۔ آپ یہ سمجھ لیے کہ آٹھ برس سے بمبئی میں تھا۔ مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا ورکٹوریہ گارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا اس کے مالکوں سے ایک نکمی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دور کرنے کے لیے پونہ ہو آؤں۔ وہ بھی اس لیے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔ مجھے پربھات نگر جانا تھا۔ جہاں میرا فلموں کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم ٹانگہ لے چکے تھے۔ سست رو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ مگر میں اپنے دل سے کدورت دور کرنے کے لیے آیا تھا اس لیے مجھے پربھات نگر پہنچنے میں کوئی عجلت نہیں تھی۔ تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے یکوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں

پیچھے۔ ایک دو گرد سے اٹے ہوئے بازار افتاں و خیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہوگا، جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا۔ دھوپ واقعی تیز تھی۔ گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہوگا کہ پاس سے اسی ہونق ٹائپ کا ایک تانگہ گزرا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا

”اوئے منٹو گھوڑے“!

میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا ردعمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جُھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آرہی تھی۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔ چڈے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔

”اوئے منٹو گھوڑے“

کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اسی قسم کا نعرہ بلند کیا تھا، مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی جھریاں جھریاں ہوگئی۔ میں نے اپنا تانگہ رکوالیا۔ چڈے نے بھی اپنے کوچوان سے کہا کہ ٹھہر جائے پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا

”می جسٹ اے منٹ“

تانگے سے کود کر وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا

”تم؟۔ تم یہاں کیسے آئے ہو۔“

پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑے بے تکلفی سے میری پُر تکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا۔

”بھابی جان۔ آپ نے کمال کر دیا۔ اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”تم جا کہاں رہے ہو؟“

چڈے نے اونچے سروں میں کہا۔

”ایک کام سے جا رہا ہوں۔ تم ایسا کرو سیدھے۔“

وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا

”دیکھو صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ۔ کرایہ ورایہ مت لینا ان سے۔“

ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے نبٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا۔

”تم جاؤ۔ نوکر وہاں ہوگا۔ باقی تم دیکھ لینا۔“

اور وہ پھدک کر اپنے ٹانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی بلکہ یوں کہیے کہ وہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آپڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہوگیا تھا۔ اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فرلانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما قسم کی عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا

”چلیے صاحب۔“

میں نے پوچھا

”کہاں؟“

اس نے جواب دیا

”چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے۔“

”اوہ“

میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو وہ پونہ ہی کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ تکدر دور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود تھا، اس لیے دن رات اڑے گی۔ میں تانگے سے اتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا، وہ میں نے اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا

”چلو“!

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہو گا۔ چنانچہ اس نے حیل وحجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چل پڑی۔ بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا تھا۔ تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام بڑا کچا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا ہو سکتا ہے، جو فلموں کا ہیرو ہو، اور ایسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر تیسرے مہینے ملتی ہے اور وہ بھی قسطوں میں۔ مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو بیوی ہو، ایسے گندے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی، مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ چڈہ آ جائے تو اس کے ساتھ ہی پربھات نگر چلیں گے۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی قہر درویش برجان درویش دو تین دن گزار سکتی تھی۔ نوکر بھی عجیب لااُبالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے، مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہمیں دیکھے بغیر پاس سے گزر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چڈہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پر جب میں نے اس سے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذاتِ شریف چڈہ صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔ مجھے اور میری بیوی دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس سے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا مگ الماری کے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا

”رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے۔ معلوم نہیں کدھر گئے۔“

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں۔“

تیل لینے جانا، بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی، مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوجھلا گیا۔

”نہیں صاحب۔ میں۔ تلاس کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔“

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا کہ جیسے وہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈے کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چڈہ آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے مہمان ہیں۔ اور اس لحاظ سے ہماری خاطر داری اس پر لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا

”ویٹ از ویٹ۔ تو تم آ گئے اولڈ بوائے۔ چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی۔ آج شام کو۔“

میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھکھلا کر ہنسنے لگا۔

”بھابی جان، کہیں آپ نے اسے مولوی تو نہیں بنا دیا“

پھر اور زور سے ہنسا۔

”مولویوں کی ایسی تیسی، اٹھو منٹو۔ بھابی جان یہاں بیٹھی ہیں۔ ہم ابھی آ جائیں گے“!

میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی تو اب بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چڈہ کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی، چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں مہتہ جی کے سر چڑھ کے چڈے نے مبلغ دو سو روپے وصول کیے۔ اور ہم پون گھنٹے میں جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز طریقے پر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سالمگی اختیار کر گئی تھیں۔ ہر شے گرد آلود تھی، اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا۔ جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی بوہیمی فضا کی تکمیل کے لیے لازمی تھی۔ چڈے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا۔

”چین کے شہزادے۔ دو بوتلیں تھرڈ کلاس رم کی لے آؤ۔ میرا مطلب ہے تھری ایکس رم کی اور نصف درجن گلاس۔“

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین ہی کا نہیں۔ دنیا کے ہر بڑے ملک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس کا نام آجاتا، وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا۔ اس وقت کا چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔ چڈے نے ٹوٹے ہوئے سپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس رم کے استقبال میں چٹخارتے ہوئے کہا

”ڈیٹ از ڈیٹ۔ تو آفٹر آل تم ادھر آہی نکلے۔“

لیکن ایک دم متفکر ہو گیا۔

”یار، بھابی کا کیا ہو۔ وہ تو گھبر اجائے گی۔“

چڈہ بغیر بیوی کے تھا، مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ اس کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا، وہ کہا کرتا تھا۔

”یہ احساس کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کولڈ اسٹوریج میں ڈال دیتا ہوں۔“

رم فوراً ہی آگئی۔ اور گلاس بھی۔ چڈے نے چھ منگوائے تھے۔ اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ بقایا تین راستے میں ٹوٹ گئے تھے۔ چڈے نے ان کی کوئی پروانہ کی، اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے کنوارے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا

”تمہارے پونے آنے کی خوشی میں۔“

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیے۔ دوسرا دور شروع کر کے چڈہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آیا کہ میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا۔

”میں شور کرتا ہوں ان کی نیند کھل جائے گی۔ پھر ایسا کریں گے۔ ٹھہرو۔ پہلے میں چائے منگواتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی

”جمیکا کے شہزادے۔“

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آگیا۔ چڈے نے اس سے کہا۔

”دیکھو، ممی سے کہو، ایک دم فسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے۔ ایک دم“!

نوکر چلا گیا۔ چڈے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پیگ ڈال کر کہا۔

”میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پیگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھابی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے۔“

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آگئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڈے نے ٹی کوزی اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرت کا اظہار کیا۔

”می از اے جیول۔“!

اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھ سے کہا۔

”آؤ۔“

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چڈے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مودبانہ کہا۔

”حاضر ہے بیگم صاحب“!

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہ آیا، لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا اس لیے اس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ اِن سے اس کو کچھ فرحت پہنچی اور اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

”آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں“!

میں نے جواب نہ دیا مگر چڈے نے جھک کر بڑے ایماندارانہ طور پر کہا۔

”جی ہاں، یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے، لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔“

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھلکھلا کے ہنسا۔

”ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سؤر ہیں۔ جن پر ہر حرام شے حلال ہے!۔ چلیے، اب ہم آپ کو مسجد تک چھوڑ آئیں“!

میری بیوی کو پھر چڈے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چڈے ہی سے نفرت تھی، بلکہ یوں کہیے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی۔ اور چڈہ بالخصوص اسے بہت کھلتا تھا، اس لیے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حدود بھی پھاند جاتا تھا، مگر چڈے کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی ان ڈور گیم سمجھتا تھا جو لوڈو سے کئی گنا لایعنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے جلے بھنے تیوروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی۔

”کبابستان کے شہزادے۔ ایک عدد ٹانگہ لاؤ۔ رولز رائس قسم کا۔“

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڈہ۔ وہ غالباً دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جایا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس کنفیوشسانہ نصیحت کو پلے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ رولز رائس قسم کا ٹانگہ لے کر آگیا۔ ہم پربھات نگر روانہ ہو گئے۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا فلموں کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی، چڈے نے میری بیوی اس کے سپرد کی اور کہا

”خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی، بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے، یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”چلو منٹو، اسٹوڈیو میں تمہارے دوست کو پکڑیں۔“

چڈہ کچھ ایسی افراتفری میں مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو سمجھنے سوچنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری بیوی سوچتے ہی رہ گئی۔ ٹانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔

”یہ تو ہو گیا۔ اب کیا پروگرام ہے۔“

پھر کھکھلا کر ہنسا۔

”ممی۔ گریٹ ممی“!

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا، یہ ممی کس توتنخ آمون کی اولاد ہے، کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر طبعی موت مر گیا۔ تانگہ واپس اس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا، مگر چڈہ اس کو کبیدہ کاٹیج کہتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسے کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس کاٹیج میں کافی آدمی رہتے تھے حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اسی فلم کمپنیوں میں ملازم جو مہینے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر، کوئی اس کا نائب، کوئی نائب در نائب۔ ہر دوسرا، کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا کنٹرول کا زمانہ تھا۔ مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیزیں بھی جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھی۔ یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے۔ پکچر ضرور دیکھتے تھے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے ورنہ سٹہ۔ جیتتے شاذ و نادر تھے، مگر ہارتے ہر روز تھے۔ سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لیے موٹر گراج بھی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی۔ شیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید، محض یکسانیت توڑنے کے لیے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم نہیں، وہ کب آتا تھا۔ اور کب جاتا تھا، کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کاٹیج کے تمام ساکن فرصت کے اوقات میں پیار کرتے۔ شیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔ کاٹیج کا معزز حصہ چڈے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی ایکٹر تھے، مگر ہیرو نہیں تھے۔ ایک سعید تھا جس کا فلمی نام رنجیت کمار تھا۔ چڈہ کہا کرتا تھا۔

”سعیدہ کاٹیج اس خرذات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ اس کا نام کبیدہ کاٹیج ہی تھا۔

”خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڈہ کبھی کبھی اسے کچھوا کہا کرتا تھا، اس لیے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔ دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدر آباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں یہاں چلا آیا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لیے تھے، وہ بھی چڈے کے لیے، کہ اس پر ایک بڑے خونخواہ پٹھان کے قرض کی ادائیگی لازم ہو گئی تھی۔ ادبِ لطیف، قسم کی عمارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اس کا شُغل تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کاٹیج کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔ شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور برعکس نام نہند نامِ زنگی باکافور کی ضرب المثال کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ بڑے تین، یعنی چڈہ، سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال

رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں جب کاٹیج کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں سے ایک اٹھ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ باقی دو اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔ جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے، وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ کبھی بازار سے اس کو سودا سلف لا دیا۔ کبھی لانڈری میں اس کے کپڑے دھلنے دے آئے اور کبھی اس کے روتے بچے کو بہلا دیا۔ ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہ تھا۔ سب کے سب مسرور تھے، شاید اپنی کبیدگی پر، وہ اپنے حالات کی نامساعت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و فرحاں انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔ ہم کاٹیج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آ رہے تھے۔ چڈے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ بغیر گنے اس نے کچھ غریب نواز کو دیے اور کہا

”چار بوتلیں اسکاچ کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجیے گا۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔“

غریب نواز کے حیدر آبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈہ کھکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اس نے غریب نواز سے کہا۔

”یہ مسٹر ون ٹو ہیں۔ لیکن ان سے مفصل ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ رم پئے ہیں۔ شام کو اسکاچ آ جائے تو۔ لیکن آپ جائیے۔“

غریب نواز چلا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے ایک زور کی جمائی لی اور رم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ اس نے روشنی میں مقدار کا سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی۔

”قراقستان کے شہزادے۔“

جب وہ نمودار نہ ہوا تو اس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا۔

”زیادہ پی گیا ہے کم بخت“!

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکر مند ہو گیا۔

”یار، بھابی کو تم خواہ مخواہ یہاں لائے۔ خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔“

پھر اس نے خود ہی اپنے کو تسکین دی۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہو نگی وہاں؟“

میں نے کہا۔

”ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی“

اور میں نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ بُسے ہوئے گڑ کی طرح تھا۔ جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے اس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جس سے باہر کا خیر آباد حصہ نظر آتا تھا۔ اِدھر سے کسی نے باآواز بلند چڈہ کا نام لے کر پکارا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میوزک ڈائریکٹر ون کُترے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگولی ہے، حبشی ہے، آریہ ہے، یا کیا بلا ہے۔ کبھی کبھی اس کے کسی خدوخال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اس کے تقابل میں کوئی ایسا نقش نظر آ جاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا تھا۔ ویسے وہ مرہٹہ تھا، مگر شیواجی کی تیکھی ناک کی بجائے اس کے چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چپٹی ناک تھی جو اس کے خیال کے مطابق ان سروں کے لیے بہت ضروری تھی۔ جن کا تعلق براہ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلایا

”منٹو۔ منٹو سیٹھ؟“

چڈے نے اس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔

”سیٹھ کی ایسی تیسی۔ چل اندر آ“

وہ فوراً اندر آ گیا۔ اپنی جیب سے اس نے ہنستے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی اور تپائی پر رکھ دی۔

”میں سالا اُدھر ممی کے پاس گیا۔ وہ بولا۔ تمہارے فرینڈ آئے لا۔ میں بولا سالا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے۔ سالا مالوم نہ تھا منٹو ہے۔“

چڈے نے ون کُترے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمائی۔

”اب چیک کر سالے کے۔ تو رم لے آیا۔ بس ٹھیک ہے۔“

ون کترے نے اپنا سر سہلایا اور میرا خالی گلاس اٹھا کر اپنے لیے پیگ تیار کیا۔

”منٹو۔ یہ سالا آج ملتے ہی کہنے لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے۔ میں ایک دم کڑکا۔ سوچا کیا کروں۔“

چڑے نے ایک اور دھپا اس کے سر پر جمایا۔

”بیٹھ بے، جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہو گا۔“

”سوچا نہیں تو سالا یہ اتنی بڑی باٹلی کہاں سے آیا۔ تیرے باپ نے دیا مجھ کو۔“

ون کترے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چڑے نے اُس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اس سے پوچھا۔

”تو یہ تو بتا کہ ممی کیا بولی؟۔ بولی تھی؟۔ موذیل کب آئے گی؟۔ ارے ہاں۔ وہ پلیٹنم بلونڈ“!

ون کترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر چڑے نے میرا بازو پکڑ کر کہنا شروع کر دیا۔

”منٹو۔ خدا کی قسم کیا چیز ہے۔ سنا کرتے تھے کہ ایک شے پلیٹنم بلونڈ بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا۔ بال ہیں، جیسے چاندی کے معین مہین تار۔ گریٹ۔ خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ۔ ممی زندہ باد“!

پھر اس نے قہر آلود نگاہوں سے ون کترے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا۔

”کن کترے کے بچے۔ نعرہ کیوں نہیں لگاتا۔ ممی زندہ باد“!

چڑے اور ون کترے دونوں نے مل کر

”ممی زندہ باد“

کے کئی نعرے لگائے۔ اس کے بعد ون کترے نے چڑے کے سوالوں کا پھر جواب دینا چاہا مگر اس نے اسے خاموش کر دیا۔

”چھوڑو یار۔ میں جذباتی ہو گیا ہوں۔ اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں۔ جنھیں کالی گھٹا سے تشبیہہ دی جاتی رہی ہے۔ مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے۔“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”منٹو۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں۔ چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ معلوم نہیں پلیٹنم کا رنگ کیسا ہوتا ہے، کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی۔ کچھ عجیب ہی سا رنگ ہے۔ فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے۔“

ون کترے نے دوسرا پیگ ختم کیا۔

”اور اس میں تھوڑی سی تھری ایکس رم مکس کر دی جائے۔“

چڑے نے بھنا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی۔

”بکواس نہ کر۔“

پھر اس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”یار۔ میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں۔ ہاں۔ وہ رنگ۔ خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے۔ وہ تم نے دیکھا ہے۔ وہ جو مچھلیوں کے پیٹ پر ہوتا ہے۔ نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے۔ پومفریٹ مچھلی۔ اس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟۔ نہیں نہیں۔ سانپوں کے۔ وہ ننھے ننھے کھپرے۔ ہاں کھپرے۔ بس ان کا رنگ۔ کھپرے۔ یہ لفظ مجھے ایک ہندستوڑے نے بتایا تھا۔ اتنی خوبصورت چیز اور ایسا واہیات نام۔ پنجابی میں ہم انھیں چانے کہتے ہیں۔ اس لفاظ میں چنچناہٹ ہے۔ وہی۔ بالکل وہی جو اس کے بالوں میں ہے۔ لٹیں ننھی ننھی سنپولیاں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں۔“

وہ ایک دم اٹھا۔

”سنپولیوں کی ایسی تیسی، میں جذباتی ہو گیا ہوں۔“

ون کترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا۔

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

چڑے نے جواب دیا۔

”سنٹی منٹل۔ لیکن تو کیا سمجھے گا، بالاجی باجی راؤ اور نانا فرنویس کی اولاد۔“

ون کترے نے اپنے لیے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ سالا چڈہ سمجھتا ہے، میں انگلش نہیں سمجھتا ہوں۔ میٹری کولیٹ ہوں۔ سالا میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس سے۔“

چڈے نے چڑ کر کہا۔

”اس نے تجھے تان سین بنا دیا۔ تیری ناک مروڑ دی کہ نکوڑے سر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں۔ بچپن ہی میں اس نے تجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا۔ اور دودھ پینے کے لیے تو میاں کی ٹوڑی میں رویا کرتا تھا اور پیشاب کرتے وقت اڑانہ میں۔ اور تو نے پہلی بات پٹ وپیکی میں کی تھی۔ اور تیرا باپ۔ جگت استاد تھا۔ بجو باؤرے کے بھی کان کاٹتا تھا۔ اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے، اسی لیے تیرا نام کن کترے“!

اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”منٹو۔ یہ سالا جب بھی پیتا ہے۔ اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اس نے کیا احسان کیا اور اس نے اسے میٹریکولیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی اے کی ڈگری پھاڑ کے پھینک دوں۔“

ون کترے نے اس بوچھاڑ کی مدافعت کرنا چاہی مگر چڈے نے اُس کو وہیں دبا دیا۔

”چپ رہ۔ میں کہہ چکا ہوں کہ سنٹی مینٹل ہو گیا ہوں۔ ہاں، وہ رنگ۔ پومفریٹ مچھلی۔ نہیں نہیں۔ سانپ کے ننھے ننھے کھپرے۔ بس انہی کا رنگ۔ ممی نے خدا معلوم اپنی بین پر کونسا راگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا؟“

ون کترے سوچنے لگا۔

”پیٹی منگاؤ، میں بجاتا ہوں۔“

چڈہ کھکھلا کر ہنسنے لگا۔

”بیٹھ بے میٹری کولیٹ کے چاکولیٹ۔“

اس نے رم کی بوتل میں سے رم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا۔

”منٹو، اگر یہ پلٹینم بلونڈ نہ پٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر دھونی رما کر بیٹھ جائے گا۔“

اور اس نے گلاس خالی کر دیا۔ ون کترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کر دی۔

”منٹو، ٹلگی ایک چانگلی ہے۔“

میں نے کہا۔

”دیکھ لیں گے۔“

”آج ہی۔ آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے اور شری ایک سو آٹھ مہتا جی نے تمہاری وجہ سے وہ ایڈوانس دے دیا، ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ آج کی رات۔ آج کی رات۔“

چڈے نے بڑے بھونڈے سروں میں گانا شروع کر دیا:

”آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ“!

ون کترے بیچارہ اس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت کمار آ گئے۔ دونوں کے پاس اسکاچ کی دو دو بوتلیں تھیں۔ یہ انھوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے، مگر بے تکلف نہیں۔ اس لیے ہم دونوں نے تھوڑی سی، آپ کب آئے، آج ہی آیا، ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ٹکرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔ چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اس پلیٹنم بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے اسکاچ کے تین پیگ پئے تھے۔ نشے کے معاملے میں ان سب کی سطح اب ایک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لیے میرے جذبات معتدل تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت بری طرح فریفتہ تھے۔ جو ممی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب دانے کا نام فی لس تھا۔ پونے میں کوئی ہیئر ڈریسنگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیجڑہ نما لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اس پر گرم تھا کہ وہ حیدر آباد میں اپنے حصے کی جائیداد بیچ کر بھی اس داؤں پر لگانے کے لیے تیار تھا۔ چڈے کے پاس ترپ کا صرف ایک پتا تھا، اپنا قبول صورت ہونا۔ ون کترے کا بزعمِ خود یہ خیال تھا کہ اس کی پیٹی سن کر وہ پری ضرور شیشے میں اتر آئے گی۔ اور رنجیت کمار جارحانہ اقدام ہی کو کارگر سمجھتا تھا۔ لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھیے ممی کسی پر قربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پلیٹنم بلونڈ فی لس کو وہ عورت جسے میں نے چڈے کے ساتھ ٹانگے میں دیکھا تھا، کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔ فی لس کی باتیں کرتے کرتے چڈے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی اور مجھ سے کہا

”جہنم میں جائے یہ لونڈیا۔ چلو یار۔ بھابی وہاں کباب ہو رہی ہو گی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنٹی مینٹل نہ ہو جاؤں۔ خیر۔ تم مجھے سنبھال لینا۔“

اپنے گلاس کے چند آخری قطرے حلق میں ٹپکا کر اس نے نوکر کو آواز دی۔

”ممیوں کے ملک مصر کے شہزادے۔“

ممیوں کے ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا، جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کھود کھاد کے باہر نکالا ہے۔ چڈے نے اس کے چہرے پر رم کے چھینٹے مارے اور کہا۔

”دو عدد ٹانگے لاؤ۔ جو مصری رتھ معلوم ہوں۔“

ٹانگے آ گئے۔ ہم سب ان پر لد کر پربھات نگر روانہ ہوئے۔ میرا پرانا، فلموں کا ساتھی ہریش گھر پر موجود تھا۔ اس دور دراز جگہ پر بھی اس نے میری بیوی کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چڈے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا، چنانچہ یہ بہت کار آمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیض و غضب کا اظہار نہ کیا۔ اس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کے نفسیات کا ماہر تھا۔ بڑی پر لطف باتیں کیں، اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اس روز ہونے والی تھی میری بیوی نے پوچھا۔

”کوئی گانا فلما رہے ہیں آپ؟“

ہریش نے جواب دیا۔

”جی نہیں۔ وہ کل کا پروگرام ہے۔ میرا خیال ہے آپ کل چلیے گا۔“

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور دکھا دکھا کر عاجز آئی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا۔

”ہاں کل ٹھیک رہے گا۔ آج تو انھیں سفر کی تھکن بھی ہے۔“

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر پُر لطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا۔

”چلو یار۔ تم چلو میرے ساتھ“

اور میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا

”ان کو چھوڑو۔ سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔“

میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا

”ان سے اجازت لے لو۔“

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا۔

”میں نے بمبئے سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکیومنٹ کیس ساتھ لے چلیے، پر انھوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں۔ اب یہ کہانی کیا سنائیں گے۔“

ہریش نے کہا۔

”زبانی سنا دے گا“

پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہے کہ ہاں کہو جلدی۔ میں نے اطمینان سے کہا۔

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے“!

چڈے نے اس ڈرامے میں تکمیلی ٹچ دیا۔

”تو بھئی ہم چلتے ہیں۔“

اور وہ تینوں اٹھ کر سلام نمستے کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہریش نکلے۔ پربھات نگر کے باہر ٹانگے کھڑے تھے۔ چڈے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا۔

”راجہ ہریش چندر زندہ باد۔“

ہریش کے سوا ہم سب ممی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کو اپنی ایک سہیلی سے ملنے جانا تھا۔ یہ بھی ایک کاٹیج تھی۔ شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی مگر بہت صاف ستھری جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتا چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی سجی ہوئی تھی۔ پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قحبہ خانہ ہو گا، مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے۔ لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی، تو میں نے سوچا کہ گردو پیش شفقت نے اس کے گال تھپتھپائے اور کہا

”تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔“

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔ چڈے نے خوشی کا ایک اور نعرہ بلند کیا اور ون کترے سے کہا۔

”جنرل ون کترے۔ جاؤ ہیڈ کوارٹرز سے ساری توپیں لے آؤ۔“

ون کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ سعیدہ کاٹیج بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ اس کے چڈے کا نوکر تھا۔ چڈے نے اس کو دیکھا تو اُس کا استقبال کیا۔

”آؤ، آؤ۔ میرے کوہ قاف کے شہزادے۔ وہ۔ وہ سانپ کے کھپڑوں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا آ رہی ہے۔ تم بھی قسمت آزمائی کر لینا۔“

رنجیت کمار اور غریب نواز دونوں کو چڈے کی یہ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے، والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ چڈے کی بہت بے ہودگی ہے۔ اس بیہودگی کو انھوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ چڈہ حسبِ عادت اپنی ہانکتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے۔ میں ممی کے متعلق سوچتا رہا۔ ڈرائنگ روم میں، غریب نواز، رنجیت کمار اور چڈے بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کھلونے لینے گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ چڈہ مطمئن ہے کہ سب سے بڑھیا اور اچھا کھلونا اسے ملے گا، اس لیے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا اس لیے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے۔ شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹنم بلونڈ۔ اس کا تصور ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا۔ ہر فضا، ہر ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے۔ اس وقت جو موسیقی میرے دل کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس میں کوئی سُر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے، ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابلِ فہم اور یقینی تھی۔ میں نے جب اس کو تانگے میں چڈے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق واہیات خیال پیدا ہوئے۔ لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی جھریوں کی توہین ہے۔ اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڈے، غریب نواز اور ون کترے کے لیے موجود ہے۔ اور خدا معلوم اور کس کس کے لیے۔ باتوں باتوں میں چڈے سے میں نے پوچھا۔

”یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟“

”اس لیے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے۔ تمہارے اور میرے جیسے الو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم سر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں۔ جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور۔ اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے۔ ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں۔ اُلّو کے پٹھے ہیں۔ میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ بیساکھی کا میلہ تھا۔ تمہارے امرت سر میں۔ ایک صحت مند نوجوان نے۔ خالص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے، جس کی نئی جوتی اس کی لاٹھی پر بازی گری کر رہی تھی اوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا اور نہایت واہیات رنگوں میں لپی تپی ایک سیاہ فام ٹکھیائی کی طرف دیکھا، جس کی تیل میں چپڑی ہوئی بریاں، اس کے ماتھے پر بڑے بدنما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں میں ٹھوکا دے کر کہا۔ اوئے لہنا سیاں۔ ویخ اوئے اوپر ویخ۔ اسی تے پنڈ وچ مجھاں ای۔“

آخری لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر لیا، حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا۔

”اس جاٹ کے لیے وہ چڑیل ہی اس وقت کوہ قاف کی پری تھی۔ اور اس کے گاؤں کی حسین و جمیل مٹیاریں، بے ڈول بھینسیں۔ ہم سب چغد ہیں۔ درمیانے درجے کے۔ اس لیے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اول درجے کی نہیں۔ تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی۔ لیکن۔ لیکن فی لس۔ خاص الخاص درجے کی چیز ہے۔ وہ سانپ کے کھپروں۔“

ون کترے نے اپنا گلاس اٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا۔

”کھپرے۔ کھپرے۔ تمہارا مستک پھر گیا ہے۔“

چڈے نے ماتھے پر سے رَم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیے اور ون کترے سے کہا۔

”لے اب سنا۔ تیرا باپ سالا تجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔ میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے“!

وَن کُترے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”بائی گاڈ۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ میں فٹین ائرز کا تھا کہ اس نے میری شادی بنا دی۔“

چڈہ زور سے ہنسا۔

”تمہیں کارٹون بنا دیا اس سالے نے۔ بھگوان اُسے سورگ میں کیریل کی پیٹی دے کہ وہاں بھی اسے بجا بجا کر تمہاری شادی کے لیے کوئی خوبصورت حور ڈھونڈ تا رہے۔“

ون کترے اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”منٹو۔ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ میری وائف ایک دم بیوٹی فل ہے۔ ہماری فیملی میں۔“

”تمہاری فیملی کی ایسی تیسی۔ فی لس کی بات کرو۔ اُس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہو سکتا۔“

چڈے نے غریب نواز اور رنجیت کمار کی طرف دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے۔

”گن پاؤڈر پلوٹ کے بانیو۔ سن لو تمہاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی۔ میدان چڈے کے ہاتھ رہے گا۔ کیوں ویلز کے شہزادے؟“

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چڈے نے قہقہہ لگایا اور اس کو آدھا گلاس بھر کے دے دیا۔ غریب نواز اور رنجیت کمار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں گھل مل کے باتیں تو کر رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں علیحدہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرزِ گفتگو سے صاف عیاں تھا۔ ڈرائنگ روم میں اب بجلی کے بلب روشن تھے، کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈہ مجھ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں ممی کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ چڈے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رنجیت کمار کی طرف اور رنجیت کمار نے غریب نواز کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ ممی چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خطوط والوان کی۔ پولی، ڈولی، کِٹی، ایلما اور تھیلما۔ اور وہ ہیجڑا نما لڑکا۔ اس کو چڈہ سِسی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چڈے کے ساتھ۔ اس کا ایک بازو اس پلیٹنم بلونڈ کی پتلی کمر میں حمائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رنجیت کمار کا ردعمل نوٹ کیا۔ ان کو چڈے کی یہ نمائشی فتحمندانہ حرکت پسند نہیں آئی تھی۔ لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی برسی کہ ون کترے میٹری کولیشن امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پروانہ کی اور برابر بولتا رہا۔ جب اس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے نئے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ اِدھر دھانی ناکت اور ناتھئی تھئی کہ ون، ٹو، تھری بنا بنا کر اس کو توڑے بتا رہا تھا، ادھر چڈہ باقی لڑکیوں کے جھرمٹ میں انگریزی کے ننگے ننگے لمرک سنا رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے۔ ممی سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی۔ رنجیت کمار سگریٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نواز ممی سے بار بار کہتا تھا کہ روپے کم ہوں تو وہ اس سے لے لے۔ اسکاچ کھلی اور پہلا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شام ہونے کے لیے کہا گیا تو اس نے اپنے پلیٹمنی بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر انکار کر دیا کہ وہ وسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ چڈے نے بد دلی کا اظہار کیا تو ممی نے فی لس کے لیے ہلکا سا مشروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے کہا۔

”بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ۔“

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈہ خوش ہو گیا۔ اور اس نے اسی خوشی میں بیس پچیس اور لمرک سنائے۔ سب مزے لیتے رہے۔ میں نے سوچا، عریانی سے تنگ آ کر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہو گی، یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردعمل یقیناً ناشائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکشا پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل ایک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لیے نجات مل جاتی ہے۔ میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش جوان لڑکیوں میں گھلی ملی چڈے کے ننگے ننگے لمرک سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھریاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں۔ میں نے سوچا، آخر لوگ کیوں فرار کو برا سمجھتے ہیں۔ وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اس کا ظاہر گو بدنما تھا، لیکن باطن اس کا بے حد خوبصورت تھا۔ اس پر کوئی بناؤ سنگھار، کوئی غازہ، کوئی ابٹنا نہیں تھا۔ پولی تھی، وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی، اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کرا لی ہے۔ دو ٹکڑے تھے جو بظاہر بالکل بیکار معلوم ہوتے تھے، مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اور رنجیت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو نئے ڈریس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے فلم کمپنی سے اتنے روپے یک مشت ملنے کی ہرگز ہرگز امید نہیں تھی۔ ڈولی تھی وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کر دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسب معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کیے جا رہا تھا۔ تھیلما، ون کترے سے تانڈیو ناچ کے بڑے مشکل توڑے سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ون کترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اُس کے پیر کبھی ان کے بول ادا نہیں کر سکیں گے، مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا اور تھیلما بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ون کترے کا وقت ضائع کر رہی ہے، مگر بڑے شوق اور انہماک سے سابق یاد کر رہی تھی۔ ایلما اور کٹی دونوں پیے جا رہی تھیں اور آپس میں کسی آٹوی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلی ریس میں ان دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹپ دی تھی۔ وہ چڈہ فی لس کے سانپ کے کھپرے ایسے رنگ کے بالوں کو پگھلے ہوئے سونے کی رنگ کی اسکاچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔ فی لس کا ہیجڑہ نما دوست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اُس سے، کبھی سوڈا کھلواتی تھی۔ کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی۔ اس کی نگاہ سب پر تھی۔ اس بلی کی طرح، جو بظاہر آنکھیں بند کیے سستاتی ہے، مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔ اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا؟۔ ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔ غالب کہتا ہے قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟۔ قیدِ حیات اور بندِ غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا غرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے

نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس نجات کے لیے کون ملک الموت کا انتظار کرے۔ کیوں آدمی چند لمحات کے لیے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصہ نہ لے۔ ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اس کے پہلو میں ایسا دل تھا۔ جس میں ان سب کے لیے ممتا تھی۔ میں نے سوچا، شاید اس لیے اس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم نہ ہو۔ اس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی۔ اس نے اپنی شفقت اور محبت کے لیے چند آدمی چُن لیے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ ممی کو معلوم نہیں تھا۔ چڈہ ایک تکڑا پیگ فی لس کو پلا چکا تھا۔ چوری چھپے نہیں سب کے سامنے، مگر ممی اس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی۔ فی لس نشے میں تھی، ہلکے ہلکے سرور میں۔ جس طرح اس کے پالش کیے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ون کترے، تھیما کو توڑے سکھا سکھا کر اب اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ سالا اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چائلڈ ہڈ میں اس نے اس کی شادی بنا دی تھی۔ اسکی وائف بہت بیوٹی فل ہے۔ اور غریب نواز، ڈولی کو قرض دے کر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت کمار، پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایلما اور کٹی دونوں جہان بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں۔ تپائی کے ارد گرد 'فی لس' اس کا ہیجڑا نما ساتھی اور ممی بیٹھے تھے۔ چڈہ اب جذباتی نہیں تھا۔ فی لس اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا۔ اس کو حاصل کرنے کا عزم اس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا۔ ممی اس سے غافل نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد فی لس کا ہیجڑہ نما دوست اٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا۔ غریب نواز اور ایلما اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایلما اور کٹی نے آپس میں کسی مارگرٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں۔ ون کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فی لس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا، پھر تھیلما کی طرف جو اس کے پاس بیٹھی تھی اور اس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لیے باہر میدان میں لے گیا۔ ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڈے اور ممی میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڈے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح ممی سے بدزبانی کرنے لگا۔ فی لس نے دونوں میں مصالحت کی مہین مہین کوشش کی، مگر چڈا ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فی لس کو اپنے ساتھ سعیدہ کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اس ارادے سے باز آئے، مگر وہ اس کے لیے نہیں تھا۔ وہ بار بار ممی سے کہہ رہا تھا۔

”تم دیوانی ہو گئی ہو۔ بوڑھی دلالہ۔ فی لس میری ہے۔ پوچھ لو اس سے“

ممی نے بہت دیر تک اس کی گالیاں سنیں، آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا۔

”چڈہ، مائی سن۔ تم کیوں نہیں سمجھتے۔ شی از ینگ۔ شی از ویری ینگ“!

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی، ایک سرزنش تھی، ایک بڑی بھیانک تصویر تھی، مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ اس وقت اس کے پیش نظر صرف فی لس اور اس کا حصول تھا۔ میں نے فی لس کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی۔ بمشکل پندرہ برس کی۔ اس کا سفید چہرہ نقرئی بادلوں میں گھرا ہوا بارش کے پہلے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔ چڈے نے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی۔

”چڈہ۔ چھوڑ دو۔ فور گاڈز سیک۔ چھوڑ دو اسے۔“

جب چڈے نے فی لس کو اپنے سینے سے جدا نہ کیا تو ممی نے اس کے منہ پر ایک چانٹا مارا۔

”گٹ آوٹ۔ گٹ آوٹ“!

چڈہ بھونچکا رہ گیا۔ فی لس کو جدا کر کے اس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر رخصت لی اور چڈے کے پیچھے چلا گیا۔ سعیدہ کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون، قمیض اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑے میز پر سو گیا۔ صبح دیر سے اٹھا۔ گھڑی میں دس بجے رہے تھے۔ چڈہ صبح ہی صبح اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اس کی آواز سنی جو گراج سے باہر آ رہی تھی۔ میں رک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا

”وہ لاجواب عورت ہے۔ خدا کی قسم وہ لاجواب عورت ہے۔ دعا کرو کہ اس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گریٹ ہو جاؤ۔“

اس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی۔ معلوم نہیں اس کا رخ اس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا۔ میں نے زیادہ دیر وہاں رکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں پربھات نگر روانہ ہو گیا۔ میری بیوی کا مزاج معتدل تھا۔ ہریش گھر میں نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونے میں کافی تفریح ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دی جائے۔ رسماً اس نے ہمیں روکنا چاہا، مگر میں سعیدہ کاٹیج ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لیے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے۔ ہم چل دیے۔ راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں۔ جو کچھ ہوا تھا۔ میں نے اس کو من و عن سنا دیا۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ فی لس اس کی کوئی رشتہ دار ہو گی۔ یا وہ اسے کسی اچھی آسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی جبھی اس نے چڈے سے لڑائی کی۔ میں خاموش رہا۔ اس کی تردید کی نہ تائید۔ کئی دن گزرنے پر چڈے کا خط آیا، جس میں اس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا۔ اور اس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا۔

”میں اس روز حیوان بن گیا تھا۔ لعنت ہو مجھ پر“!

تین مہینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ چڈہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اس وقت ملاقات ہوئی، جب وہ گراج سے باہر نکل کر شیریں کے خوردسال بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنجیت کمار آگیا، کچھوے کی چال چلتا اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چڈہ اس رات کے بعد ممی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فی لس کو اس نے دوسرے روز ہی اپنے ماں باپ کے پاس بھجوادیا تھا۔ وہ اس ہیجڑہ نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی۔ رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونے میں رہتی تو وہ ضرور اسے لے اڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا۔ اسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔ چڈے کے متعلق یہ پتہ چلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت ناساز ہے۔ بخار رہتا ہے، مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا۔ سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کریں تو رنجیت کمار اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا، اس کا رخ گراج کی طرف تھا۔ میں غریب نواز سے گراج والی شیریں کے متعلق کچھ پوچھنے کے لیے خود کو تیار ہی کر رہا تھا کہ ون کترے سخت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اس سے معلوم ہوا کہ چڈے کو سخت بخار تھا، وہ اسے ٹانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بیہوش ہو گیا۔ میں اور غریب نواز باہر دوڑے۔ ٹانگے والے نے بیہوش چڈے کو سنبھالا ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اسکے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہو گا۔ میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔ اس نے ون کترے سے مشورہ کیا۔ وہ

”ابھی آتا ہوں“

کہہ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چڈے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا۔

”کیا ہوا میرے بیٹے کو؟“

ون کترے نے جب اسے بتایا کہ چڈہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصے کے ساتھ کہا

”تم کیسے لوگ ہو۔ مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔“

پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور ون کترے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈے کے پاس سہلانے کی، دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر بلانے چلی گئی۔ معلوم نہیں رنجیت کمار کو گراج میں کیسے پتہ چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو ون کترے نے اس کے بیہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دور ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے، جیسے چڈے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔ اس کی ہدایات کے مطابق چڈے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڈے کی زندگی میں خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ممی آئی۔ غریب نواز، ون کترے اور رنجیت کمار سے اس نے فرداً فرداً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڈہ اب آنکھیں کھول کر سن رہا تھا۔ ممی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا

”ممی، یو آر گریٹ“!

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڈے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا

”میرے بیٹے۔ میرے غریب بیٹے“!

چڈے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش اور کہا

”نہیں۔ تمہارا بیٹا اول درجے کا سکاؤنڈرل ہے۔ جاؤ اپنے مرحوم خاوند کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو“!

ممی نے چڈے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا

”فضول بکواس نہ کرو۔“

پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اٹھی اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”لڑکو۔ چڈہ بیمار ہے، اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے۔ سمجھے؟“

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈے کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ اتنی کونسی آفت آگئی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈہ بہت ضدی تھا۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ چڈہ ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے۔ یعنی پلیگ۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود ممی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔ علاج ہوتا رہا۔ پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی۔ اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ، مگر ممی نہ مانی۔ اس نے چڈے کو اسی حالت میں اٹھوایا اور اپنے گھر لے گئی۔ میں زیادہ دیر پونے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے سے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ روز کے بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈے کا ایک خط دیا جس صرف یہ لکھا تھا

”عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔“

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلافِ معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اسنے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا

”ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہوا کرتی ہیں۔“

میں نے چڈے کو دو تین خط لکھے، جن کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ممی نے اس کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوناولہ بھجوا دیا تھا۔ چڈہ وہاں بمشکل ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پونے پہنچا اتفاق سے میں وہیں تھا۔ پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ مگر اس کی غوغا پسند طبیعت اسی طرح زوروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا کہ جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا، اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بیکار معلوم ہوتی تھی۔ سعیدہ کاٹیج میں چڈے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ایل برادران یعنی عقیل اور شکیل کہیں اور اٹھ گئے تھے۔ کیونکہ انھیں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لیے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائریکٹر آگیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبعیت کا بہت شریف اور خدمت گزار تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر لوناولہ جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ لیا جائے۔ سین کے کمرے میں چونکہ جگہ خالی تھی، اس لیے اس نے وہیں اپنا ڈیرہ جما دیا تھا۔ رنجیت کمار کو کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو منتخب کر لیا گیا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوا تو اس کو دوسرا فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ چڈہ اپنی دو برس کی جمع شدہ تنخواہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ یک مشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا۔

”میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیگ میں مبتلا ہو جاؤ۔ ہیرو اور ڈائریکٹر بننے سے میرا تو خیال ہے یہی بہتر ہے۔“

غریب نواز تازہ تازہ حیدر آباد سے واپس آیا تھا۔ اس لیے سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفع الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گراج کے باہر الگنی سے ایسی قمیض اور شلواریں لٹک رہی تھیں جن کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خورد سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔ مجھے پونے میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پرانا فلموں کا ساتھی اب نئے فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کٹا مشٹنڈا تھا۔ چڈے نے اس کو حوصلہ دیا تھا

”کچھ پروا نہ کرو اس سالے کی۔ جس پنجابی ایکٹرس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو، وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت گرا کرتا ہے۔ بس اتنا کرو کہ سو روپے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بیس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص مشکلوں میں بہت کام آیا کریں گی۔“

ہریش ایک بوتل فی گلاس کے حساب سے چھ گالیاں پنجاب کے مخصوص لب و لہجے میں یاد کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔ ممی کے گھر حسب معمول محفلیں جمتی تھیں۔ پولی۔ ڈولی۔ کٹی۔ ایلما۔ تھیلما وغیرہ سب آئی تھیں۔ ون کترے بدستور تھیلما کو کتھا کلی اور تانڈیو ناچ کی تاتھئی اور دھانی ناکت کی ون ٹو تھری بنا بنا کر بتاتا تھا۔ اور وہ اسے سیکھنے کی پر خلوص کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز حسب توفیق قرض دے رہا تھا اور رنجیت کمار جس کو اب کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو کا چانس مل رہا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لے جاتا تھا۔ چڈے کے ننگے ننگے لمرک سن کر اسی طرح قہقہے برپا ہوتے تھے۔ ایک صرف وہ نہیں تھی۔ وہ جس کے بالوں کے رنگ کے لیے صحیح تشبیہہ ڈھونڈنے میں چڈے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ مگر ان محفلوں میں چڈے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی چڈے کی نظریں ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا۔

”چڈہ۔ یو آر اے ڈیمڈ بروٹ“!

یہ سن کر ممی زیر لب مسکرا دیتی تھی، جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہے۔

”ڈونٹ ٹوک روٹ۔“

ون کترے سے بدستور اس کی چخ چلتی تھی۔ سرور میں آکر جب بھی وہ اپنے باپ کی تعریف میں یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گنڈاسے سے کاٹ ڈالتا۔ وہ غریب چپ ہو جاتا اور اپنا میٹری کولیشن سرٹیفکیٹ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیتا۔ ممی، وہی ممی تھی۔ پولی کی ممی، ڈولی کی ممی، چڈے کی ممی، رنجیت کمار کی ممی۔ سوڈے کی بوتلوں، گزک چیزوں اور محفل جمانے کے دوسروں ساز و سامان کے انتظام میں وہ اسی پر شفقت انہاک سے حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی واہیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے۔ غازے اور سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ پلیک کے کیڑے ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ڈر کر، سمٹ کر، وہ ڈر گئے تھے۔ چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ اس پر ان جھریوں کا سایہ تھا۔ ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھیں۔ ون کترے کی خوبصورت بیوی کے جب اسقاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ تھیلما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارواڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو ممی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا۔ اور اس کو جہنم سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سنا دی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں۔ کٹی کو ایک معما حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا، تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دے دے، کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس نے کٹی سے کہا تھا

”تم اس وقت اسے دے دو۔ بعد میں لیتی رہنا“

اور مجھ سے اس نے پندرہ روز کے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں، دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔ رنجیت کمار سے زیادہ رغبت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ میوزک ڈائریکٹر سین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چڈہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی

”ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو۔“

چڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے یہ جواب دیتی تھی کہ

”مجھے یہ آدمی اوپرا اوپرا سا معلوم ہوتا ہے۔ فٹ نہیں بیٹھتا میری نظروں میں۔“

یہ سن کر چڈہ ہنس دیتا تھا۔ ممی کے گھر کی محفلوں کی پُر خلوص گرمی لیے میں واپس بمبئے چلا گیا۔ ان محفلوں میں زندگی تھی، بلا نوشی تھی، جنسیاتی رنگ تھا۔ مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح قابل فہم تھی۔ اسی طرح ابھری ہوئی۔ بظاہر اسی طرح کڈھب، بینڈی اور دیکھنے والے کو گومگو کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح، باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔ دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونے ٹیلیفون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔ ایک ہفتے کے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثہ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے۔ خون میں لت پت۔ چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش و حواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے میں رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آگئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہو گئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔ رام سنگھ، غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا، مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا

”بھاپا جی۔ مر گیا؟“

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا

”مجھے چھوڑ دیجیے، میں بھاگوں گا نہیں۔“

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر کو بھیج کر ممی کو بلوایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، بیانات، پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی۔ ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ چڈہ کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا۔ ممی نے اس سے کہا تھا

”بیٹا گھبراؤ نہیں، جو کچھ ہوا ہے سچ سچ بتا دو۔“

۔ اور اس نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیے تھے کہ سین نے اس کو پلے بیگ سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو خود بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا اور سین بہت اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آکر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کرتا رہا۔ مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اسقدر تنگ آگیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ واردات کی رات کو یہی ہوا۔ عدالت میں اس نے یہی بیان دیا۔ ممی موجود تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں، جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی ہمیشہ فتح ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے مگر ایک بڑی نجس چیز ہے۔ ایک خباثت کا، ایک غیر فطری سودے کا۔ رام سنگھ نے بڑی سادگی، بڑے بھولپن اور بڑے معصومانہ انداز میں سارے واقعات بیان کیے۔ مجسٹریٹ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڈے نے کہا

”اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے۔ اور اس کا سہرہ میری بڈھی ممی کے سر ہے“!

چڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹیج والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل بردارز شکیل اور عقیل دونوں واپس سعیدہ کاٹیج آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تاسیس و تعمیر کے لیے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پرانی فلم کمپنی میں کسی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرمائے میں سے چند سو باقی بچے ہوئے تھے جو انھوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انھوں نے یہ سب روپیہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا

”اب میں چار پیگ پی کر دعا کروں گا کہ وہ تمہاری ذاتی فلم کمپنی فوراً کھڑی کر دے۔“

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں ون کترے نے شراب پی کر خلافِ معمول اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے کٹی کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دو سو روپے قرض دیے اور رنجیت کمار سے اس نے کہا تھا

”تم ان بیچاری لڑکیوں کو یونہی جھانسے نہ دیا کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت صاف ہو، مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی۔ کچھ نہ کچھ دے دیا کرو“!

ممی نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا، اور سب کو یہ مشورہ دیا کہ اسے گھر واپس جانے کے لیے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے روز غریب نواز نے اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا۔ شیریں نے سفر کے لیے اس کو کھانا پکا کر دیا۔ اسٹیشن پر سب اس کو چھوڑنے گئے۔ ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں۔ جب مجھ ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سعیدہ کاٹیج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم تھا کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل و صورت ہزارہا قافلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسی جگہ تھی جو اپنا خلا خود ہی پُر کر دیتی تھی۔ میں جس روز وہاں پہنچا۔ شیرینی بٹ رہی تھی۔ شیریں کے گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ ون کترے کے ہاتھ میں گلیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لیے کہیں سے دو پیدا کیے تھے۔ ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لیے لے آیا تھا۔ چڈے نے آخری دو لڈو اس کے منہ میں ٹھونسے اور کہا

”تو یہ گلیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے۔ بڑا کمال کیا ہے تو نے۔ اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا، ہرگز کوئی بات نہ کرنا۔“

ون کترے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا

”سالے، میں اب کوئی پیئے لا ہوں۔ وہ تو دارو بولا کرتی ہے۔ ویسے بائی گاڈ۔ میری بیوی بڑی ہینڈسم ہے۔“

چڈے نے اس قدر بے تحاشا قہقہہ لگایا کہ ون کترے کو اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہو گئیں جو میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے ذریعے سے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لیے لکھ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڈے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ جائے پیدائش یعنی سعیدہ کاٹیج کی رعایت سے لڑکا مولودِ مسعود ہے۔ اس لیے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڈے کو پسند نہیں تھا لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔ اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار تینوں کی طبیعت کسی قدر بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے سوچا شاید خزاں کے موسم کی وجہ ہے۔ جب آدمی خواہ مخواہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحلال کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سین کے قل کی ٹریجڈی؟۔ معلوم نہیں۔ کیا وجہ تھی۔ لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے، بولتے تھے مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔ میں پربھات نگر میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا رہا۔ یہ مصروفیت پورے سات دن جاری رہی۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ اس دوران میں چڈے نے خلل اندازی کیوں نہیں کی۔ ون کترے بھی کہیں غائب تھا۔ رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس اتنی دور آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا تھا کہ شاید حیدر آباد چلا گیا ہو۔ اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں اس کے بڑی بڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔ میں اپنی کہانی کے ایک بڑے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڈہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا

”اس بکواس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے۔ “

اس کا اشارہ میری کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دو روز ہوئے وصول کی تھی۔

”ہاں۔ دوسرا ہزار پرسوں لیا ہے۔ “

”کہاں ہے یہ ہزار؟“

یہ کہتا چڈہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔

”میری جیب میں“!

چڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا۔

”آج شام کو ممی کے ہاں پہنچ جانا۔ ایک پارٹی ہے“!

میں اس پارٹی کے متعلق اس سے کچھ دریافت ہی کرنے والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا۔ میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا تھا۔ اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اپنی بیوی کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر سات بجے سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ گراج کے باہر الگنی پر گیلے گیلے پوتڑے لٹک رہے تھے۔ اور نل کے پاس ایل برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے غالباً ممی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے چڈے کے متعلق پوچھا تو عقیل نے کہا کہ وہ ممی کے گھر مل جائے گا۔ میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پولی کے ساتھ، رنجیت کمار، کٹی اور ایلما کے ساتھ اور ون کترے تھیلما کے ساتھ۔ وہ اس کو کتھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ چڈہ ممی کو گود میں اٹھائے ادھر ادھر کود رہا تھا۔ سب نشے میں تھے۔ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے چڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور نیم بدیشی آوازوں کا ایک گولہ سا پھٹا جس کی گونج دیر تک کانوں میں سرسراتی رہی۔ ممی بڑے تپاک سے ملی۔ ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اس نے کہا

”کس می ڈئر“!

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کرناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈہ ایک دم پکارا۔ بند کرو۔ اب شراب کا دور چلے گا۔ “

پھر اس نے نوکر کو آواز دی

”اسکاٹ لینڈ کے شہزادے۔ وسکی کی نئی بوتل لاؤ۔ “

اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں دھت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہو گئی۔ ممی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈے نے روک دیا اور کہا

”ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی۔ جانے دو، یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ “

محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی چڈے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی۔ ہر گلاس میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈے نے بے ربط سی تقریر شروع ہوئی

”لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ آپ سب جہنم میں جائیں۔ منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی۔ وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بکواس ہے۔ کنویں میں اترنے والے۔ کنوئیں میں اترنے والے“

اس نے ادھر ادھر دیکھا

”افسوس کہ یہاں کوئی ہندستوڑ نہیں۔ ایک حیدر آبادی ہے جو قاف کو خاف کہتا ہے اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی تو کہے گا، پرسوں آپ سے ملا تھا۔ لعنت ہو اس کے نظام حیدر آباد پر جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے۔ کروڑہا جواہرات ہیں، لیکن ایک ممی نہیں۔ ہاں۔ وہ کنوئیں میں اترنے والے۔ میں نے کیا کہا تھا کہ سب بکواس ہے۔ پنجابی میں جنھیں ٹوبھے کہتے ہیں۔ وہ غوطہ لگانے والے، وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیات کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں۔ “

سب نے زندہ باد کا نعر لگایا۔ چڈہ چیخا

”یہ سب سازش ہے۔ اس منٹو کی سازش ہے۔ ورنہ میں نے ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باہ کے نعرے کا اشارہ کیا تھا۔ تم سب مردہ باد۔ لیکن پہلے میں۔ میں۔ “

وہ جذباتی ہو گیا۔

”میں۔ جس نے اس رات اس۔ سانپ کے پیٹ کے کھپروں ایسے رنگ والے بالوں کی ایک لڑکی کے لیے اپنی ممی کو ناراض کر دیا۔ میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جو آسان سمجھتا تھا۔ لیکن نہیں۔ اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم۔ ایک ہی بوسے میں اس پلیٹنم بلونڈ کے کنوارپنے کا سارا عرق میں اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا۔ لیکن یہ ایک۔ یہ ایک نامناسب حرکت تھی۔ وہ کم عمر تھی۔ اتنی کم عمر، اتنی کمزور، اتنی کیریکٹر لس۔ اتنی“

اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”بتاؤ یار اسے اردو فارسی یا عربی میں کیا کہیں گے۔ کیریکٹر لس۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ وہ اتنی چھوٹی، اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی، یا اسے قطعاً بھول جاتی۔ ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا۔ مجھے اس کا دکھ ہوتا۔ اچھا ہوا کہ ممی نے اسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا۔ میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا۔ میں ایک پیگ اور پیتا ہوں۔“

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے اور سرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بولنے کے بعد چڈہ جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز کھونے کے لیے ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہے۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا۔

”کیا بات ہے چڈے؟“

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا

”کچھ نہیں۔ بات یہ ہے کہ آج وسکی میرے دماغ کے چوتڑوں پر جما کے لات نہیں مار رہی۔“

اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔ ون کترے نے تھلیما کو اٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گُنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین کی بات نکلی تو اس نے کہا

”مسٹر منٹو۔ وہ ایک دم ہلکٹ آدمی تھا۔ کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں۔ جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا۔“

گھڑی نے دو بجائے۔ چڈے نے جسٹر بگ بند کیا۔ کٹی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر ون کترے کے کدو ایسے سر پر دھپا مار کر

”بکواس بند کر بے۔ اٹھ۔ اور کچھ گا۔ لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکا راگ گایا۔“

ون کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہیں تھی۔ مُرکیوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی۔ لیکن جو کچھ گاتا تھا، پورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکوس میں اس نے اوپر تلے دو تین فلمی گانے سنائے جن سے فضا بہت اداس ہو گئی، ممی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت ہٹا لیتے تھے۔ غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا

”حیدر آباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے۔“

غریب نواز نے اپنے آنسو پونچھے اور ایلما کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ ون کترے نے گراموفون کے توے پر رکارڈ رکھ کر سوئی لگا دی۔ گھسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ کڈے نے ممی کو پھر گود میں اٹھالیا اور کود کود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ ان میراثیوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اونچے سروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتی ہیں۔ اس اچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے چڈے سے مخاطب ہو کر کہا۔

”بس، اب ختم“!

چڈے نے بوتل سے منہ لگایا، اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا۔

”چلو منٹو چلیں“!

میں نے اٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

”آج کوئی الوداع نہیں کہے گا“!

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون کترے کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے چڈے سے کہا۔

”ٹھہرو، دیکھیں کیا بات ہے،“

مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا۔

”اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے۔“

ممی کے گھر سے سعیدہ کاٹیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڈے نے کوئی بات نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اس سے اس عجیب وغریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا

”مجھے سخت نیند آرہی ہے“

اور بستر پر لیٹ گیا۔ صبح اٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ غریب نواز گراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا

”ممی چلی گئی“!

”کہاں“!

”معلوم نہیں“

یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رخ کیا۔ چڈہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا

”چلی گئی۔ صبح کی گاڑی سے اسے پونہ چھوڑنا تھا۔“

میں نے پوچھا۔

”مگر کیوں؟“

چڈے کے لہجے میں تلخی آگئی

”حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں۔ اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابل اعتراض تھیں۔ اس لیے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی۔ وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے۔ ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہوگئی اور اس کو تڑی پار کر دیا۔ شہر بدر کر دیا۔ وہ اگر قحبہ تھی۔ دلالہ تھی۔ اس کا وجود سوسائٹی کے لیے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے تھا۔ پونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو۔ چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا

”مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا۔ لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ پُونے سے چلی گئی ہے۔ مجھے ایسے جوانوں میں ایسی نجس اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی۔ میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں۔ زندہ باد ممی۔ زندہ باد! ۔ چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہوگی۔ ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔“

میں نے دیکھا، چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں۔

منتر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومنتر

ننھا رام۔ ننھا تو تھا، لیکن شرارتوں کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ چہرے سے بے حد بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا۔ کوئی خط یا نقش ایسا نہیں تھا جو شوخی کا پتہ دے۔ اس کے جسم کا ہر عضو بھدے پن کی حد تک موٹا تھا۔ جب چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فٹ بال لڑھک رہا۔ عمر بمشکل آٹھ برس کی ہوگی۔ مگر بلا کا ذہین اور چالاک تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور چالاکی کا پتا اس کے سراپا سے لگانا بہت مشکل تھا۔ مسٹر شنکر آچاریہ ایم اے، ایل ایل بی۔ رام کے پتا کہا کرتے تھے کہ

”منہ میں رام رام اور بغل میں چُھری“

والی مثال اس رام ہی کے لیے بنائی گئی ہے۔ رام کے منہ سے رام رام تو کسی نے سنا نہیں تھا۔ مگر اس کی بغل میں چھری کی بجائے ایک چھوٹی سی چھڑی ضرور ہوا کرتی تھی۔ جس سے وہ کبھی کبھی ڈگلس فیئر بینکس یعنی بغدادی چور کی تیغ زنی کی نقل کیا کرتا تھا۔ جب رام کی ماں یعنی مسز شنکر آچاریہ اس کے کان سے پکڑ کر اس کے باپ کے سامنے لائیں تو وہ بالکل خاموش تھا۔ آنکھیں خشک تھیں۔ اس کا ایک کان جو اس کی ماں کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے کان سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی ماں سے کھیل رہا ہے اور اپنے کان کو ماں کے ہاتھ میں دے کر ایک خاص قسم کا لطف اٹھا رہا ہے جس کو دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ جب رام مسٹر شنکر آچاریہ کے سامنے لایا گیا تو وہ آرام سے کرسی پر جم کر بیٹھ گئے کہ اس نالائق کے کان کھینچیں حالانکہ وہ اس کے کان کھینچ کھینچ کر کافی سے زیادہ لمبے کر چکے تھے اور اس کی شرارتوں میں کوئی فرق نہ آنے پایا تھا۔ وہ عدالت

میں قانون کے زور پر بہت کچھ کر لیتے تھے۔ مگر یہاں اس چھوٹے سے لونڈے کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلتی تھی۔ ایک مرتبہ مسٹر رام شنکر اچاریہ نے کسی شرارت پر اس کو پرمیشور کے نام سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا۔

”دیکھ رام، تو اچھا لڑکا بن جا، ورنہ مجھے ڈر ہے پرمیشور تجھ سے خفا ہو جائیں گے۔“

رام نے جواب دیا تھا۔

”آپ بھی تو خفا ہو جایا کرتے ہیں اور میں آپ کو منالیا کرتا ہوں۔“

اور پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے یہ پوچھا تھا

”بابو جی یہ پرمیشور کون ہیں“

مسٹر شنکر اچاریہ نے اسے سمجھانے کے لیے جواب دیا تھا۔

”بھگوان اور کون۔ ہم سب سے بڑے۔“

”اس مکان جتنے۔“

”اس سے بھی بڑے۔ دیکھو اب تو کوئی شرارت نہکیجیو، ورنہ وہ تجھے مار ڈالیں گے“!

مسٹر شنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے پر ہیبت طاری کرنے کے لیے پرمیشور کو اس سے زیادہ ڈراؤنی شکل میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال کر لیا تھا کہ اب رام سدھر جائے گا اور کبھی شرارت نہ کرے گا۔ مگر رام جو اس وقت خاموش بیٹھا تھا، اپنے ذہن کے ترازو میں پرمیشور کو تول رہا تھا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد جب اس نے بڑے بھولے پن سے کہا تھا۔

”بابو جی۔ آپ مجھے پرمیشور دکھا دیجیے۔“

تو مسٹر راما شنکر اچاریہ کی ساری قانون دانی اور وکالت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ کسی مقدمے کا حوالہ دینا ہوتا تو وہ اس فائل کو نکال کر دکھا دیتے یا اگر کوئی تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کے متعلق سوال کرتا تو وہ اپنی میز پر سے وہ موٹی کتاب اٹھا کر کھولنا شروع کر دیتے جس کی جلد پر ان کے اس لڑکے نے چاؤ سے بیل بوٹے بنا رکھے تھے مگر پرمیشور کو پکڑ کر کہاں سے لاتے جس کے متعلق انھیں خود اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا ہے، کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ جس طرح ان کو یہ معلوم تھا کہ دفعہ 379 چوری کے فعل پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ مارنے اور پیدا کرنے والے کو پرمیشور کہتے ہیں اور جس طرح ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کے قانون بنے ہوئے ہیں۔ اس کی اصلیت کیا ہے ٹھیک اسی طرح ان کو پرمیشور کی اصلیت معلوم نہ تھی۔ وہ ایم، اے، ایل، ایل، بی تھے۔ مگر یہ ڈگری انھوں نے نئی الجھنوں میں پھنسنے کے لیے نہیں بلکہ دولت کمانے کیلیے حاصل کی تھی۔ وہ رام کو پرمیشور نہ دکھا سکے اور نہ اس کو کوئی معقول جواب ہی دے سکے۔ اس لیے کہ یہ سوال ان سے اس طرح اچانک طور پر کیا گیا تھا کہ ان کا دل پریشان ہو گیا تھا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکے تھے۔

”جا رام، جا، میرا دماغ نہ چاٹ، مجھے بہت کام کرنا ہے۔“

اس وقت انھیں کام واقعی بہت کرنا تھا مگر وہ پرانی شکستوں کا بھول کر فوراً ہی اس نئے مقدمے کا فیصلہ کر دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے رام کی طرف خشم آلود نگاہوں سے دیکھ کر اپنی دھرم پتنی سے کہا۔

”آج اس نے کونسی نئی شرارت کی ہے۔ مجھے جلدی بتاؤ، میں آج اسے ڈبل سزا دوں گا۔“

مسز اچاریہ نے رام کا کان چھوڑ دیا اور کہا کہ

”اس موئے نے تو زندگی وبال کر رکھی ہے جب دیکھو ناچنا، تھرکنا، کودنا۔ نہ آئے کی شرم نہ گئے کا لحا☆۔ صبح سے مجھے ستا رہا ہے۔ کئی بار پیٹ چکی ہوں مگر یہ اپنی شرارتوں سے باز ہی نہیں آتا۔ نعمت خانے میں سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کھا گیا ہے۔ اب میں سلاد میں اس کا سر ڈالوں“

یہ سن کر مسٹر شنکر اچاریہ کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ رام کے خلاف کوئی سنگین الزام ہو گا۔ مگر یہ سن کر کہ اس نے نعمت خانے سے صرف دو کچے ٹماٹر نکال کر کھائے ہیں انھیں سخت ناامیدی ہوئی۔ رام کو جھڑکنے اور کوسنے کے لیے ان کی سب تیاری ایکا ایکی سرد پڑ گئی۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ اُن کا سینہ ایک دم خالی ہو گیا۔ جیسے ایک دفعہ ان کے موٹر کے پہیے کی ساری ہوا نکل گئی تھی۔ کچے ٹماٹر کھانا کوئی جرم نہیں، اس کے علاوہ ابھی کل ہی مسٹر شنکر اچاریہ کے ایک دوست نے جو جرمنی سے طب کی سند لے آئے تھے ان سے کہا تھا کہ اپنے بچوں کو کھانے کے ساتھ کچے ٹماٹر ضرور دیا کیجیے۔ کیونکہ ان میں کثرت سے وٹامنز ہیں مگر اب چونکہ وہ رام کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور ان کی بیوی کی بھی یہی خواہش تھی۔ اس لیے انھوں نے تھوڑی غور کرنے کے بعد ایک قانونی نکتہ سوچا اور اس انکشاف پر دل ہی دل میں خوش ہو کر اپنے بیٹے سے کہا۔

”میرے نزدیک آؤ اور جو کچھ میں تجھ سے پوچھوں سچ سچ بتا۔“

مسز راما شنکر اچاریہ چلی گئیں اور رام خاموشی سے اپنے باپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے پوچھا۔

”تو نے نعمت خانے سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کیوں کھائے۔“

رام نے جواب دیا۔

”دو کہاں تھے۔ ماتا جی جھوٹ بولتی ہیں۔“

”تو ہی بتا کتنے تھے؟“

”ڈیڑھ۔ ایک اور آدھا۔“

رام نے یہ الفاظ انگلیوں سے آدھے کا نشان بنا کر ادا کیے۔ دوسرے آدھے سے ماتا جی نے دوپہر کو چٹنی بنائی تھی۔“

”چلو ڈیڑھ ہی سہی، پر تو نے یہ وہاں سے اٹھائے کیوں؟“

رام نے جواب دیا۔

”کھانے کے لیے۔“

”ٹھیک ہے، مگر تو نے چوری کی۔“

مسٹر شنکر اچاریہ نے قانونی نکتہ کو پیش کیا۔

”چوری!۔ بابو جی میں نے چوری نہیں کی۔ ٹماٹر کھائے ہیں۔ مگر یہ چوری کیسے ہوئی۔“

یہ کہتا ہوا رام فرش پر بیٹھ گیا۔ اور غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ چوری تھی۔ دوسرے کی چیز کو اس کی اجازت کے بغیر اٹھالینا چوری ہوتی ہے“

مسٹر شنکر اچاریہ نے یوں اپنے بچے کو سمجھایا اور خیال کیا کہ وہ ان کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ رام نے فوراً کہا۔

”مگر ٹماٹر تو ہمارے اپنے تھے۔ میری ماتا جی کے۔“

مسٹر راما شنکر اچاریہ سٹپٹا گئے۔ مگر فوراً اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی،

”تیری ماتا جی کے تھے، ٹھیک ہے، پر وہ تیرے تو نہیں ہوئے، جو چیز ان کی ہے وہ تیری کیسے ہو سکتی ہے۔ دیکھ سامنے میز پر جو تیرا کھلونا ہے پڑا ہے، اٹھالا، میں تجھے اچھی طرح سمجھاتا ہوں۔“

رام اٹھا اور دوڑ کر لکڑی کا گھوڑا اٹھالایا اور اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔

”یہ لیجیے۔“

مسٹر راما شنکر اچاریہ بولے۔

”ہاں تو دیکھ، یہ گھوڑا تیرا ہے نا؟“

”جی ہاں۔“

”اب اگر میں اسے تیری اجازت کے بغیر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لوں۔ تو یہ چوری ہو گی۔“

پھر مسٹر راما شنکر نے مزید وضاحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اور میں چور۔“

”نہیں پتا جی، آپ اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو چور نہیں کہوں گا۔ میرے پاس کھیلنے کے لیے ہاتھی جو ہے۔ کیا آپ نے ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔ کل ہی منشی دادا نے لا کے دیا ہے۔ ٹھہریے، میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں۔“

یہ کہہ وہ تالیاں بجاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اور مسٹر راما شنکر اچاریہ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔ دوسرے روز مسٹر راما شنکر اچاریہ کو ایک خاص کام سے پونا جانا پڑا، اُن کی بڑی بہن وہیں رہتی تھی۔ ایک عرصے سے وہ چھوٹے رام کو دیکھنے کیلیے بے قرار تھی چنانچہ ایک پنتھ دو کاج کے پیش نظر مسٹر راما شنکر اچاریہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے مگر اس شرط پر کہ وہ راستے میں کوئی۔ شرارت نہ کرے گا۔ ننھا رام اس شرط پر بوری بند اسٹیفن کے پلیٹ فارم تک قائم رہ سکا۔ ادھر دکن کوئین چلی اور ادھر رام کے ننھے سے سینے میں شرارتیں مچلنا شروع ہو گئیں۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی چوڑی سیٹ پر بیٹھے اپنے ساتھ والے مسافر کا اخبار پڑھ رہے تھے اور سیٹ کے آخری حصے پر رام کھڑکی میں سے باہر

جھانک رہا اور ہوا کا دباؤ دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسے لے اڑے تو کتنا مزہ آئے۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اپنی عینک کے گوشوں سے رام کی طرف دیکھا اور اس کو بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا۔ تو چین بھی لینے دے گا یا نہیں۔ رام آرام سے بیٹھ جا کہتے ہوئے ان کی نظر رام کی نئی ٹوپی پر پڑی۔ جو اس کے سر پر چمک رہی تھی۔

”اسے اتار کر رکھ نالائق، ہوا سے اڑ جائے گی۔“

انھوں نے رام کے سر پر سے ٹوپی اتار کر اس کی گود میں رکھ دی۔ مگر تھوڑی کے بعد ٹوپی، پھر رام کے سر پر تھی۔ اور وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے دوڑتے ہوئے درختوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ درختوں کی بھاگ دوڑ رام کے ذہن میں آنکھ مچولی کے دلچسپ کھیل کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے سے اخبار دوہرا ہو گیا۔ اور ماسٹر راما شنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے کے سر کو پھر کھڑکی سے باہر پایا، غصے میں انھوں نے اس کا بازہ کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا کہ اگر تو یہاں سے ایک انچ بھی ہلا تو تیری خیر نہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے ٹوپی اتار کر اس کی ٹانگوں میں رکھ دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے اخبار اٹھایا اور وہ ابھی اس میں وہ سطر ہی ڈھونڈ رہے تھے جہاں سے انھوں نے پڑھنا چھوڑا تھا کہ رام نے کھڑکی کے پاس سرک کر باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ٹوپی اس کے سر پر تھی۔ یہ دیکھ کر مسٹر شنکر اچاریہ کو سخت غصہ آیا۔ ان کا ہاتھ بھوکی چیل کی طرح ٹوپی کی طرف بڑھا اور چشم زدن میں وہ ان کی سیٹ کے نیچے تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ رام کو سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مڑ کر اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا مگر ان کے ہاتھ خالی نظر آئے۔ اسی پریشانی میں اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اسے ریل کی پٹڑی پر بہت پیچھے ایک خالی کاغذ کا ٹکڑا اڑتا نظر آیا۔ اس نے خیال کیا کہ یہ میری ٹوپی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ باپ کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”بابو جی۔ میری ٹوپی“!

مسٹر شنکر اچاریہ خاموش رہے۔

”ہائے میری ٹوپی۔“

رام کی آواز بلند ہوئی۔ مسٹر شنکر اچاریہ کچھ نہ بولے۔ رام نے رونی آواز میں کہا: میری ٹوپی! اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

”گرا دی ہو گی تو نے۔ اب روتا کیوں ہے؟“

اس پر رام کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

”پر دھکا تو آپ نے ہی دیا تھا۔“

اس نے اتنا کہا اور رونے لگا۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے ذرا ڈانٹ پلائی تو رام نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ انھوں نے اسے چُپ کرانے کی بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ رام کا رونا صرف ٹوپی ہی بند کرا سکتی تھی۔ چنانچہ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے تھک ہار کر اس سے کہا۔

”ٹوپی واپس آجائے گی، مگر شرط یہ ہے کہ تو اسے پہنے گا نہیں“!

رام کی آنکھوں میں آنسو فوراً خشک ہو گئے۔ جیسے تپتی ہوئی ریت میں بارش کے قطرے جذب ہو جائیں۔ سرک کر آگے بڑھ آیا۔

”اسے واپس لا دیجیے۔“

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے کہا۔

”ایسے تھوڑی واپس آجائے گی۔ منتر پڑھنا پڑے گا۔“

کمپارٹمنٹ میں سب مسافر باپ بیٹے کی گفتگو سن رہے تھے۔

”منتر۔“

یہ کہتے ہوئے رام کو فوراً وہ قصہ یاد آگیا جس میں ایک لڑکے نے منتر کے ذریعے سے دوسروں کی چیزیں غائب کرنا شروع کر دی تھیں۔

”پڑھیے پتا جی“

یہ کہہ کر وہ خوب غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا منتر پڑھتے وقت مسٹر راما شنکر اچاریہ کے گنجے سر پر سینگ اُگ آئیں گے۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اس منتر کے بول یاد کرتے ہوئے جو انھوں نے بچپن میں

”اندر جال مکمل“

سے زبانی یاد کیا تھا کہا۔

”تو پھر شرارت تو نہ کرے گا؟“

”نہیں بابو جی۔“

رام نے جو منتر کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ اپنے باپ سے شرارت نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ کو منتر کے بول یاد آ گئے اور انھوں نے دل ہی دل میں اپنے حافظے کی داد دے کر اپنے لڑکے سے کہا۔

”لے اب تو آنکھیں بند کر لے۔“

رام نے آنکھیں بند کر لیں اور مسٹر راما شنکر اچاریہ نے منتر پڑھنا شروع کیا۔

”اونگ ناکام میشری، مد مدیش او تمارے بھرنیگ پر سواہ“

مسٹر راما شنکر اچاریہ کا ایک ہاتھ سیٹ کے نیچے آ گیا اور

”سواہ“

کے ساتھ ہی رام کی ٹوپی اسکی گدگدی رانوں پر آ گری۔ رام نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹوپی اس کی چپٹی ناک کے نیچے پڑی تھی۔ اور مسٹر راما شنکر اچاریہ کی نکیلی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے تھر تھرا رہا تھا۔ عدالت میں مقدمہ جیتنے کے بعد ان پر یہی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی۔

”ٹوپی آ گئی۔“

رام نے صرف اس قدر کہا، اور چپ ہو رہا اور مسٹر راما شنکر اچاریہ رام کو خاموش بیٹھنے کا حکم دے کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک خبر کافی دلچسپ اور اخباری زبان میں بے حد سنسنی خیز تھی۔ چنانچہ وہ منتر وغیرہ سب کچھ بھول کر اس میں ڈوب گئے۔ دکن کوئین بجلی کے پروں پر پوری تیزی سے اڑ رہی تھی۔ اس کے آہنی پہیوں کی یک آہنگ گڑگڑاہٹ اخبار کی سنسنی پیدا کرنے والے خبر کی ہر سطر کو بڑی سنسنی خیز بنا رہی تھی۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ یہ سطر پڑھ رہے تھے:

”عدالت پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک سنائی دیتی تھی۔ ملزم ایکا ایکی چلایا۔ بابو جی!۔“

عین اس وقت رام نے اپنے باپ کو زور سے آواز دی۔

”بابو جی“!

۔مسٹر راما شنکر اچاریہ کو یوں معلوم ہوا کہ زیر نظر سطر کے آخری الفاظ کاغذ پر اچھل پڑے۔ رام کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے ذرا تیزی سے کہا:

”کیا ہے؟“

اور عینک کے ایک گوشے میں سے ٹوپی کو سیٹ پر پڑا دیکھ کر اطمینان کر لیا۔ رام آگے سرک آیا اور کہنے لگا

”بابو جی! وہی منتر پڑھیے“!

”کیوں“!

یہ کہتے ہوئے مسٹر راما شنکر اچاریہ نے رام کی ٹوپی کی طرف غور سے دیکھا۔ جو سیٹ کے کونے میں پڑی تھی۔

”آپ کے کاغذ جو یہاں پڑے تھے، میں نے باہر پھینک دیے ہیں۔“

رام نے اس کے آگے کچھ اور بھی کہا۔ مگر مسٹر راما شنکر اچاریہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ بجلی کی سرعت کے ساتھ اٹھ کر انھوں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ مگر ریل کی پٹڑی کے ساتھ تتلیوں کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے کاغذوں کے پرزوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

”تو نے وہ کاغذ پھینک دیے ہیں جو یہاں پڑے تھے؟“

انھوں نے اپنے داہنے ہاتھ سے سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ رام نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آپ وہی منتر پڑھیے نا“!

مسٹر راما شنکر اچاریہ کو ایسا کوئی منتر یاد نہ تھا۔ جو سچ مچ کی کھوئی ہوئی چیزوں واپس لا سکے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ وہ کاغذات جو ان کے بیٹے نے پھینک دیے تھے یہ ایک نئے مقدمے کی نقل تھی۔ جس میں چالیس ہزار کی مالیت کے قانونی کاغذات پڑے تھے۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ ایم، اے، ایل، ایل، بی کی بازی ان کی اپنی چال ہی سے مات ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے اندر ان کو قانونی کاغذات کے بارے میں سینکڑوں خیالات آئے۔ ظاہر ہے کہ مسٹر راما شنکر اچاریہ کے مؤکل کا نقصان ان کا اپنا نقصان تھا۔ مگر اب وہ کیا کر سکتے تھے۔ صرف یہ کہ اگلے اسٹیشن پر اتر کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیں اور وہیں پندرہ میل تک ان کاغذوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ ملیں نہ ملیں ان کی قسمت۔ ایک لمحے کے

اندر اندر سینکڑوں باتیں سوچنے کے بعد بالآخر انھوں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر تلاش پر کاغذات نہ ملے تو وہ موکل کے سامنے سرے سے انکار ہی کر دیں گے کہ اُس نے ان کو کبھی کاغذات دیے تھے۔ اخلاقی اور قانونی طور پر سراسر ناجائز تھا مگر اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اس تسلی بخش خیال کے باوجود مسٹر راماشنکر اچاریہ کے حلق میں تلخی سی پیدا ہو رہی تھی۔ ایکا ایکی ان کے دل میں آئی کہ کاغذوں کی طرح وہ رام کو بھی اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیں۔ مگر اس خواہش کو سینے ہی میں دبا کر انھوں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب و غریب سا تبسم منجمد ہو رہا تھا۔

”اس نے ہولے سے کہا۔ بابو جی، منتر پڑھیے۔“

”چپ چاپ بیٹھا رہ ورنہ یاد رکھ گلا گھونٹ دوں گا“

۔ مسٹر شنکر اچاریہ بھنّا گئے۔ اس مسافر کے لبوں پر جو غور سے باپ بیٹے کی گفتگو سن رہا تھا۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ رام آگے سرک آیا۔

”بابو جی! آپ آنکھیں بند کر لیجیے۔ میں منتر پڑھتا ہوں۔“

مسٹر راماشنکر اچاریہ نے آنکھیں بند نہ کیں۔ لیکن رام نے منتر پڑھنا شروع کیا۔

”اونک میانگ شیانک۔ لومداگا۔ فرودما۔ سواہا“

اور سواہا کے ساتھ ہی مسٹر راماشنکر اچاریہ کی گوشت بھری ران پر ایک پلندہ آ گرا۔ ان کی ناک کا پانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے زور سے کانپا۔ رام کی چپٹی ناک کے گول اور لال نتھنے بھی کانپ رہے تھے۔

منظور

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹومنظور

جب اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا تو اس کی حلات بہت خراب تھی۔ پہلی رات اسے آکسیجن پر رکھا گیا۔ جو نرس ڈیوٹی پر تھی، اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مریض صبح سے پہلے پہلے مر جائے گا۔ اس کی نبض کی رفتار غیر یقینی تھی۔ کبھی زور زور سے پھڑپھڑاتی اور کبھی لمبے لمبے وقفوں کے بعد چلتی تھی۔ پسینے میں اس کا بدن شرابور تھا، ایک لحظے کے لیے بھی اسے چین نہیں ملتا تھا۔ کبھی اس کروٹ لیٹتا، کبھی اس کروٹ۔ جب گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ جاتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتا اور لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ رنگ اس کا ہلدی کی گانٹھ کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں۔ ناک کا بانسا برف کی ڈلی۔ سارے بدن پر رعشہ تھا۔ ساری رات اس نے بڑے شدید کرب میں کاٹی۔ آکسیجن برابر دی جا رہی تھی، صبح ہوئی تو اسے کسی قدر افاقہ ہوا اور وہ نڈھال ہو کر سو گیا۔ اس کے دو تین عزیز آئے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے اور چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے انھیں بتا دیا تھا کہ مریض کو دل کا عارضہ ہے جسے

”کورونری تھرمبوس“

کہتے ہیں۔ یہ بہت مہلک ہوتا ہے۔ جب وہ اٹھا تو اسے ٹیکے لگا دیے گئے۔ اس کے بدل میں بدستور میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ شانوں کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے جیسے رات بھر انھیں کوئی کوٹتا رہا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی دکھ رہی تھی مگر نقاہت کے باعث وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ویسے اس کو یقین تھا کہ اس کی موت دور نہیں، آج تو نہیں کل ضرور مر جائے گا۔ اس کی عمر بتیس کے قریب تھی۔ ان برسوں میں اس نے کوئی راحت نہیں دیکھی تھی جو اس وقت اسے یاد آتی اور اس کی صعوبت میں اضافہ کرتی۔ اس کے ماں باپ اس کو بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئے تھے۔ معلوم نہیں اس کی پرورش کس خاص شخص نے کی تھی۔ بس وہ ایسے ہی ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتا اس عمر تک پہنچ گیا اور ایک کارخانے میں ملازم ہو کر پچیس روپے ماہوار پر انتہا درجے کی افلاس زدہ زندگی گزار رہا تھا۔ دل میں ٹیسیں نہ اٹھتیں تو وہ اپنی تندرستی اور بیماری میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہ کرتا۔ کیونکہ صحت اس کی کبھی بھی اچھی نہیں تھی۔ کوئی نہ کوئی عارضہ اسے ضرور لاحق رہتا تھا۔ شام تک اسے چار ٹیکے لگ چکے تھے۔ آکسیجن ہٹا لی گئی تھی۔ دل کا درد کسی قدر کم تھا، اس لیے وہ ہوش میں تھا اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ بہت بڑے وارڈ میں تھا جس میں اس کی طرح اور کئی مریض لوہے کی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ نرسیں اپنے کام میں مشغول تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ نو دس برس کا لڑکا کمبل میں لپٹا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“

لڑکے نے بڑے پیار سے کہا۔ نئے مریض نے اس کے پیار بھرے لہجے سے متاثر ہو کر جواب دیا۔

”وعلیکم السلام۔“

لڑکے نے کمبل میں کروٹ بدلی۔

”بھائی جان! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

نئے مریض نے اختصار سے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“

لڑکے کا چہرہ اور زیادہ تمتما اٹھا۔

”آپ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

”میرا نام“!

نئے مریض نے مسکرا کر لڑکے کی طرف برادرانہ شفقت سے دیکھا۔

”میرا نام اختر ہے۔“

”میرا نام منظور ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک دم کروٹ بدلی اور اس نرس کو پکارا جو ادھر سے گزر رہی تھی۔

”آپ۔ آپا جان۔“

نرس رک گئی۔ منظور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔ نرس قریب آئی اور اسے پیار کر کے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسسٹنٹ ہاؤس سرجن آیا۔ منظور نے اس کو بھی سلام کیا۔

”ڈاکٹر جی، السلام علیکم۔“

ڈاکٹر سلام کا جواب دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے باتیں کرتا رہا جو ہسپتال کے بارے میں تھیں۔ منظور کو اپنے وارڈ کے ہر مریض سے دلچسپی تھی۔ اس کو معلوم تھا کس کی حالت اچھی ہے اور کس کی حالت خراب ہے۔ کون آیا ہے، کون گیا ہے۔ سب نرسیں اس کی بہنیں تھی اور سب ڈاکٹر اس کے دوست۔ مریضوں میں کوئی چچا تھا، کوئی ماموں اور کوئی بھائی۔ سب اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی شکل وصورت معمولی تھی۔ مگر اس میں غیر معمولی کشش تھی۔ ہر وقت اس کے چہرے پر تمتماہٹ کھیلتی رہتی جو اس کی معصومیت پر ہالے کا کام دیتی تھی۔ وہ ہر وقت خوش رہتا تھا۔ بہت زیادہ باتونی تھا، مگر اختر کو حالانکہ وہ دل کا مریض تھا اور اس مرض کے باعث بہت چڑچڑا ہو گیا تھا، اس کی یہ عادت کھلتی نہیں تھی۔ چونکہ اس کا بستر اختر کے بستر کے پاس تھا اس لیے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس سے گفتگو شروع کر دیتا تھا جو چھوٹے چھوٹے معصوم جملوں پر مشتمل ہوتی تھی:

”بھائی جان! آپ کے بھائی بہن ہیں؟“

”میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں۔“

”آپ کے دل میں اب درد تو نہیں ہوتا ہے۔“

”مجھے معلوم نہیں دل کا درد کیسا ہوتا ہے۔“

”آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ دودھ زیادہ پیا کریں“!

”میں بڑے ڈاکٹر جی سے کہوں، وہ آپ کو مکھن بھی دیا کریں گے۔“

بڑا ڈاکٹر بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ صبح جب راؤنڈ پر آتا تو کرسی منگا کر اس کے پاس تھوڑی دیر تک ضرور بیٹھتا اور اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا۔ اس کا باپ درزی تھا۔ دوپہر کو پندرہ بیس منٹ کے لیے آتا۔ سخت افراتفری کے عالم میں اس کے لیے پھل وغیرہ لاتا اور جلدی جلدی اسے کھلا کر اور اس کے سر پر محبت کا ہاتھ پھیر کر چلا جاتا۔ شام کو اس کی ماں آتی اور برقع اوڑھے دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ اختر نے اسی وقت اس سے دلی رشتہ قائم کر لیا تھا، جب اس نے اس کو سلام کیا تھا۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ دوسرے دن رات کی خاموشی میں جب اسے سوچنے کا موقع ملا تو اس نے محسوس کیا۔ اس کو جو افاقہ ہوا ہے، منظور ہی کا معجزہ ہے۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ وہ صرف چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ منظور نے اس کو بتایا تھا کہ جب اسے بستر پر لٹایا گیا تھا تو اس کی نبض قریب قریب غائب تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کئی مرتبہ دعا مانگی تھی کہ خدا اس پر رحم کرے۔ یہ اس کی دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ مرتے مرتے بچ گیا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا، اس لیے کہ اس کا مرض بہت مہلک تھا۔ بہر حال اب اس کے دل میں اتنی خواہش ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کچھ دن زندہ رہے تاکہ منظور سے اس کا رشتہ فوراً نہ ٹوٹ جائے۔ دو تین روز گزر گئے۔ منظور حسب معمول سارا دن چہکتا رہتا تھا۔ کبھی نرسوں سے باتیں کرتا، کبھی ڈاکٹروں سے، کبھی جمعداروں سے۔ یہ بھی اس کے دوست تھے۔ اختر کو تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وارڈ کی بدبودار فضا کا ہر ذرہ اس کا دوست تھے۔ وہ جس شے کی طرف دیکھتا تھا، فوراً اس کی دوست بن جاتی تھی۔ دو تین روز گزرنے کے بعد جب اختر کو معلوم ہوا کہ منظور کا نچلا دھڑ مفلوج ہے تو اسے سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن

اس کو حیرت بھی ہوئی کہ اتنے بڑے نقصان کے باوجود وہ خوش کیونکر رہتا ہے۔ باتیں جب اس کے منہ سے بلبلوں کے مانند نکلتی تھیں تو انھیں سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ گوشت پوست کا بے جان لوتھڑا ہے۔ اختر نے اس سے اس کے فالج کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اس لیے کہ اس سے ایسی بات کے متعلق پوچھنا بہت بڑی حماقت ہوتی، جس سے وہ قطعاً بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اسے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ منظور ایک دن جب کھیل کود کر واپس آیا تو اس نے ٹھنڈے پانی سے نہا لیا جس کے باعث ایک دم اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا۔ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا، انھیں بہت دکھ ہوا۔ شروع شروع میں حکیموں کا علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ٹونے ٹوٹکوں کا سہارا لیا مگر بے سود۔ آخر کسی کے کہنے پر انھوں نے اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا تاکہ باقاعدگی سے اس کا علاج ہوتا رہے۔ ڈاکٹر مایوس تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس کے جسم کا مفلوج حصہ کبھی درست نہ ہو گا مگر پھر بھی اس کے والدین کا جی رکھنے کے لیے وہ اس کا علاج کر رہے تھے۔ انھیں حیرت تھی کہ وہ اتنی دیر زندہ کیسے رہا ہے۔ اس لیے کہ اس پر فالج کا حملہ بہت شدید تھا، جس نے اس کے جسم کا نچلا حصہ بالکل ناکارہ کرنے کے سوا اس کے بدن کے بہت سے نازک اعضا جھنجھوڑ کر رکھ دیے تھے۔ وہ اس پر ترس کھاتے تھے اور اس سے پیار کرتے تھے، اس لیے کہ اس نے سدا خوش رہنے کا گر اپنی اس شدید علالت سے سیکھا تھا۔ اس کے معصوم دماغ نے یہ طریقہ خود ایجاد کیا تھا کہ اس کا دکھ دب جائے۔ اختر پر پھر ایک دورہ پڑا۔ یہ پہلے دورے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک تھا مگر اس نے صبر اور تحمل سے کام لیا اور منظور کی مثال سامنے رکھ کر اپنے دکھ درد سے غافل رہنے کی کوشش کی جس میں اسے کامیابی ہوئی، ڈاکٹروں کو اس مرتبہ تو سو فی صدی یقین تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی، مگر معجزہ رونما ہوا اور رات کی ڈیوٹی پر متعین نرس نے صبح سویرے اسے دوسری نرسوں کے سپرد کیا تو اس کی گرتی ہوئی نبض سنبھل چکی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ موت سے کشتی لڑتے لڑتے نڈھال ہو کر جب وہ سونے لگا تو اس نے نیم مندی ہوئی آنکھوں سے منظور کی دیکھا جو محو خواب تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اختر نے اپنے کمزور اور نحیف دل میں اس کی پیشانی کو چوما اور سو گیا۔ جب اٹھا تو منظور چہک رہا تھا۔ اسی کے متعلق ایک نرس سے کہہ رہا تھا۔

”آپا، اختر بھائی جان کو جگاؤ۔ دوا کا وقت ہو گیا ہے۔“

”سونے دو۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔“

”نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ انھیں دوا دیجیے۔“

”اچھا دے دوں گی۔“

منظور نے جب اختر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بہت خوش ہو کر باآواز بلند کہا۔

”السلام علیکم“!

اختر نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”وعلیکم السلام“!

”بھائی جان! آپ بہت سوئے۔“

”ہاں۔ شاید۔“

”نرس آپ کے لیے دوا لا رہی ہے۔“

اختر نے محسوس کیا کہ منظور کی باتیں اس کے نحیف دل کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ خود اسی کی طرح چہکنے چہکارنے لگا۔ اس نے منظور سے پوچھا۔

”اس مرتبہ بھی تم نے میرے لیے دعا مانگی تھی؟“

منظور نے جواب دیا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”میں روز روز دعائیں نہیں مانگا کرتا۔ ایک دفعہ مانگ لی، کافی تھی۔ مجھے معلوم تھا آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اس کے لہجے میں یقین تھا۔ اختر نے اسے ذرا سا چھیڑنے کے لیے کہا۔

”تم دوسروں سے کہتے رہتے ہو کہ ٹھیک ہو جاؤ گے، خود کیوں نہیں ٹھیک ہو کر گھر چلے جاتے۔“

منظور نے تھوڑی دیر سوچا۔

”میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بڑے ڈاکٹر جی کہتے تھے کہ تم ایک مہینے تک چلنے پھرنے لگو گے۔ دیکھیے نا اب میں نیچے اور اوپر کھسک سکتا ہوں۔“

اس نے کمبل میں اوپر نیچے کھسکنے کی ناکام کوشش کی۔ اختر نے فوراً کہا۔

”واہ منظور میاں واہ۔ ایک مہینہ کیا ہے۔ یوں گزر جائے گا۔“

منظور نے چٹکی بجائی اور خوش ہو کر ہنسنے لگا۔ ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں اختر پر دل کے دو تین دورے پڑے جو زیادہ شدید نہیں تھے۔ اب اس کی حالت بہتر تھی، نقاہت دور ہو رہی تھی۔ اعصاب میں پہلا سا تناؤ بھی نہیں تھا۔ دل کی رفتار ٹھیک تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ لیکن ان کا تعجب بدستور قائم تھا کہ وہ بچ کیسے گیا۔ اختر دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے بچانے والا کون ہے۔ وہ کوئی انجکشن نہیں تھا۔ کوئی دوائی ایسی نہیں تھی۔ وہ منظور تھا۔ مفلوج منظور، جس کا نچلا دھڑ بالکل ناکارہ ہو چکا تھا، جسے یہ خوش فہمی تھی کہ اسے کے گوشت پوست کے بے جان لوتھڑے میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اختر اور منظور کی دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ منظور کی ذات اس کی نظروں میں مسیحا کا رتبہ رکھتی تھی کہ اس نے اس کو دوبارہ زندگی عطا کی تھی اور اس کے دل و دماغ سے وہ تمام کالے بادل ہٹا دیے تھے جن کے سائے میں وہ اتنی دیر تک گھٹی گھٹی زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ اس کی قنوطیت رجائیت میں تبدیل ہو گئی تھی، اسے زندہ رہنے سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بالکل ٹھیک ہو کر ہسپتال سے نکلے اور ایک نئی صحت مند زندگی بسر کرنی شروع کر دے۔ اسے بڑی الجھن ہوتی تھی جب وہ دیکھتا تھا کہ منظور ویسے کا ویسا ہے۔ اس کے جسم کے مفلوج حصے پر ہر روز مالش ہوتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا تھا، اس کی خوش رہنے والی طبیعت شگفتہ شگفتہ تر ہو رہی تھی۔ یہ بات حیرت اور الجھن کا باعث تھی۔ ایک دن بڑے ڈاکٹر نے منظور کے باپ سے کہا کہ اب وہ اسے گھر لے جائے کیوں کہ اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ منظور کو صرف اتنا پتہ چلا کہ اب اس کا علاج ہسپتال کے بجائے گھر پر ہو گا اور بہت ٹھیک ہو جائے گا، مگر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اختر نے جب اس سے پوچھا کہ وہ ہسپتال میں کیوں رہنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”وہاں اکیلا رہوں گا۔ ابا دکان پر جاتا ہے، ماں ہمسائی کے ہاں جا کر کپڑے سیتی ہے، میں وہاں کس سے کھیلا کروں گا، کس سے باتیں کروں گا۔“

اختر نے بڑے پیار سے کہا۔

”تم اچھے جو ہو جاؤ گے منظور میاں۔ چند دن کی بات ہے پھر تم باہر اپنے دوستوں سے کھیلا کرنا۔ اسکول جایا کرنا۔“

“

نہیں نہیں۔“

منظور نے کمبل سے اپنا سدا اتمتمانے والا چہرہ ڈھانپ کر رونا شروع کر دیا۔ اختر کو بہت دکھ ہوا۔ دیر تک وہ اسے چمکارتا پچکارتا رہا۔ آخر اس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور اس نے کروٹ بدل لی۔ شام کو ہاؤس سرجن نے اختر کو بتایا کہ بڑے ڈاکٹر نے اس کی ریلیز کا آرڈر دے دیا ہے۔ وہ صبح جا سکتا ہے۔ منظور نے سنا تو بہت خوش ہوا۔ اس نے اتنی باتیں کیں، اتنی باتیں کیں کہ تھک گیا۔ ہر نرس کو، ہر اسٹوڈنٹ کو، ہر جمعدار کو اس نے بتایا کہ بھائی جان اختر جا رہے ہیں۔ رات کو بھی وہ اختر سے دیر تک خوشی سے بھرپور ننھی ننھی معصوم باتیں کرتا رہا۔ آخر سو گیا۔ اختر جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ منظور کب تک ٹھیک ہو گا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی دوا موجود نہیں جو اس پیارے بچے کو تندرست کر دے۔ اس نے اس کی صحت کے لیے صدق دل سے دعائیں مانگیں مگر اسے یقین تھا کہ یہ قبول نہیں ہوں گی، اس لیے کہ اس کا دل منظور کا سا پاک دل کیسے ہو سکتا تھا۔ منظور اور اسکی جدائی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ صبح اس کو وہ چھوڑ کر چلا جائے گا اور اپنی نئی زندگی تعمیر کرنے میں مصروف ہو کر اسے اپنے دل و دماغ سے محو کر دے گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ منظور کی

”السلام علیکم“

سننے سے پہلے ہی مر جاتا۔ یہ نئی زندگی جو اس کی عطا کردہ تھی، وہ کس منہ سے اٹھا کر ہسپتال سے باہر لے جائے گا۔ سوچتے سوچتے اختر سو گیا۔ صبح دیر سے اٹھا۔ نرسیں وارڈ میں ادھر ادھر تیزی سے چل پھر رہی تھیں۔ کروٹ بدل کر اس نے منظور کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ اس پر اس کی بجائے ایک بوڑھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ، لیٹا ہوا تھا۔ ایک لحظے کے لیے اختر پر سناٹا سا طاری ہو گیا۔ ایک نرس پاس سے گزر رہی تھی، اس سے اس نے قریب قریب چلا کر پوچھا۔

”منظور کہاں ہے۔“

نرس رکی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بڑے افسوسناک لہجے میں جواب دیا۔

”بیچارہ! صبح ساڑھے پانچ بجے مر گیا۔“

یہ سن کر اختر کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے سمجھا کہ یہ آخری دورہ ہے۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اسے ہسپتال سے رخصت ہونا پڑا۔ کیونکہ اس کی جگہ لینے والا مریض داخل کر لیا گیا تھا۔

مہتاب خاں

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومہتاب خاں

شام کو میں گھر بیٹھا اپنی بچیوں سے کھیل رہا تھا کہ دوست طاہر صاحب بڑی افراتفری میں آئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی آپ نے مینٹل پیس پر سے میرا فونٹین پن اُٹھا کر میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا کہ ہسپتال میں کسی ڈاکٹر کے نام ایک چٹ لکھ دیجیے۔“

مجھے کچھ پوچھنے کی فرصت بھی نہ دی گئی اور میں نے ایک ڈاکٹر کے نام رقعہ لکھنا شروع کر دیا۔ مضمون طاہر صاحب نے لکھوایا جس کا مطلب یہ تھا کہ حامل رقعہ خطرناک طور پر علیل ہے اس لیے اسے فوراً ہسپتال میں داخل کر لیا جائے۔ مجھ سے جو لکھوایا گیا۔ میں نے لکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد طاہر صاحب پھر تشریف لائے۔ مجھے تشویش تھی کہ جس مریض کی میں نے سفارش کی ہے وہ ہسپتال میں داخل ہو سکا ہے یا نہیں لیکن وہ بڑے مطمئن تھے۔ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے کہا

”جہنم میں جائے۔ میں نے آپ کی چٹ اُس کے لواحقین کو دے دی ہے۔“

یہ سُن کر میں خاموش ہو گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان سے پوچھا کہ

”یہ مہتاب خاں کون ہیں جن کو ہسپتال میں داخل کرانے کے لیے آپ اتنے بے تاب تھے؟“

طاہر صاحب مسکرائے

”اوّل درجے کا حرامی ہے“

اگر مہتاب خاں تیسرے درجے کا حرامی بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا لیکن مجھے اس سے فوراً دلچسپی پیدا ہو گئی چنانچہ میں نے اپنے دوست سے پوچھا

”اسے عارضہ کیا تھا؟“

طاہر صاحب نے جواب دیا

”عشق کا“

اس کے بعد اُنھوں نے خلاف معمول باتونی ہو کر مہتاب خاں کی داستان عشق سنانا شروع کر دی۔ آپ نے بتایا کہ مہتاب خاں کی عمر اٹھارہ اُنیس برس کے قریب ہے۔ جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے پٹھان ہے کافی ہٹا کٹا۔ مگر اس کی دونوں انکھوں میں لاسا لگا ہوا ہے۔ چوبرجی کے قریب اس کے بڑے بھائی کی چائے کی دکان ہے جہاں اُس سے کام لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ طاہر صاحب نے اُس نوجوان کے متعلق مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا۔

”منٹو صاحب یہ شخص عجیب و غریب ہے۔ مزاج اس قدر عاشقانہ ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہر وقت اپنے بھائی کے ہوٹل کے چولھے میں پنکھے سے کوئلے سلگاتا رہتا تھا مگر بازار میں ہر آنے جانے والی لڑکی کو ایسی نظروں سے دیکھتا کہ وہ اس پر اگر اُسی وقت نہیں تو تھوڑے عرصے میں ضرور عاشق ہو جائے گی اور بہت ممکن ہے گھر میں جا کر خودکشی کر لے“

اس تمہید کے بعد طاہر صاحب نے مجھے بتایا کہ مہتاب خاں ہوٹل سے باہر لوگوں کے لیے چائے لے جایا کرتا تھا ایک دن اُسے اسکول کی ایک استانی نے جو فزیکل انسٹرکٹرس تھی اور ہوٹل کے پاس ہی رہتی تھی چائے کی ٹرے لانے کے لیے کہا۔ اُس کے ہاں پہنچتے ہی وہ اس لڑکی پر عاشق ہو گیا لیکن مہتاب خاں کا بیان اس سے جدا ہے۔ اس نے طاہر صاحب اور اُن کے دوستوں سے ٹھیٹ پٹھانی لہجے میں کہا۔

”خو وہ رن جو اسکول میں پڑھاتی ہے، مجھے دیکھتے ہی گرم ہو گئی۔ خو ام خر بروہے جو اں ہے۔ دیکھو اب کیا ہو۔ جان کے لالے پڑ جائیں گے۔“

اُس کی جان کے لالے پڑے۔ وہ یوں کہ اس نے اپنے بھائی کے ہوٹل کے گلے سے پچاس روپے اڑا لیے اور کسی اور ہوٹل میں ٹھاٹ سے بیٹھ کر اپنے دوستوں کو یہ بات سنائی کہ مس مراد (یہ اس لڑکی کا نام ہے) بہت بڑی پیلے رنگ کی موٹر میں انارکلی سے گزر رہی تھی وہ ایک دکان پر کھڑا نسوار لے رہا تھا کہ عین اُس کے قریب اپنی موٹر رکوائی۔ باہر نکل کر سر بازار اُس سے ہاتھ ملایا اور اپنے پرس سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اُس کو دیئے اور یہ جا وہ جا۔ مہتاب خاں کا بیان تھا کہ جب مس مراد نے اُس سے ہاتھ ملایا تو وہ محبت کے شدید جذبے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُسی رات جب مہتاب خاں چوری کے پچاس روپے، کچھ ہوٹلوں میں باقی کے ہیرامنڈی میں خرچ کر چکا تھا اس کے بڑے بھائی نے جانے کس جگہ اُس کی گردن ناپی اور ایسے زور سے ناپی کہ وہ دو دن تک بِلبلاتا رہا لیکن اُس نے کسی پر یہ ظاہر نہ کیا (حالانکہ حقیقت کا علم ہوٹل میں ہر آنے جانے والے کو تھا) کہ اُس نے روپے چرائے تھے۔ وہ برابر یہی کہتا رہا کہ اُس کی جوانی اور اس کے حسن سے متاثر ہو کر وہ اُسے روپے دیتی رہتی ہے۔ دوسری مرتبہ اُس نے ساتھ والے دکاندار کے سو روپے چرائے اور انارکلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے دوستوں سے کہا کہ مس مراد نے اُسے یہ رقم عیش کرنے کے لیے دی ہے۔ وہ بہت مرعوب ہوئے لیکن دوسرے روز مہتاب خاں پکڑا گیا۔ چند روز حوالات میں رہا پھر

مقدمہ چلا چونکہ ثبوت کوئی نہ تھا اس لیے بری ہو گیا۔ اس حادثے کے بعد مس مراد کا اس سے عشق اور زیادہ بڑھ گیا بلکہ یوں کہیے کہ اب وہ اپنی روایتی عاشقانہ بے اعتنائی ترک کر کے اس کو ہر وقت یاد کرنے لگا۔ چولھا سلگاتے وقت یا صبح کو جھاڑو دیتے ہوئے وہ مس مراد کا نام لیتا۔ خو مس مُراد۔ تو ہی اماری مراد پوری کرے گی۔ اب اُس نے روپے پیسے کا سرقہ بند کر دیا، لیکن مکھن کی چوری شروع کر دی ہر روز وہ اپنے بھائی کے ہوٹل سے کم از کم مکھن کی دو ٹکیاں اڑا لیتا آس پاس کے جو اور ہوٹل تھے ان سے بھی وہ صرف مکھن ہی چراتا اور کھاتا تھا۔ ہر روز اس قدر مکھن کھانے کا یہ اثر ہوا کہ مہتاب خاں اچھا خاصا ڈیری فارم بن گیا۔ اُس کے بدن سے اُس کے منہ سے اس کے لباس سے مکھن ہی کی بو آنے لگی۔ وہ اپنی صحت بنا رہا تھا اس کا یہ کہنا تھا کہ ہر عورت صحت اور جوانی پر مرتی ہے لیکن طاہر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ ہر مکھن چور کرشن کنہیا نہیں بن سکتا اس کی آنکھیں ویسی کی ویسی چُندھی تھیں۔ اب کچھ مس مراد کے متعلق سُن لیجیے۔ طاہر صاحب نے جب ان کے حدود اربعے کے متعلق اِدھر اُدھر پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ اس کی ماں بھنگن ہے اور ابھی تک کوٹھے کماتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں لوگوں کا بول و براز اٹھاتی ہے۔ چونکہ وہ اور اس کا خاوند عیسائی ہو گئے تھے اس لیے اُن کی لڑکی مس مراد نے تھوڑی سی تعلیم حاصل کی اور ایک اسکول میں فزیکل انسٹرکٹرس ہو گئی۔ خوش شکل تھی اس لیے اس کے کئی چاہنے والے پیدا ہو گئے جو اُس کی تمام آسائشوں کا خیال رکھتے تھے۔ مہتاب خان اُس کے عشق میں بری طرح گرفتار تھا۔ ہوٹل میں کوئلے جلاتا اور آہیں بھرتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے یار دوستوں سے باتیں کرتا تو بڑے فخر سے اس بات کا اعلان کرتا کہ مس مراد اُس پر بہت بری طرح مرتی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مس مراد جو بے شمار عاشقوں کے درمیان گھری رہتی تھی اس کو مہتاب خاں کی موجودگی کا علم ہی کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس بے چارے کی حقیقت ہی کیا تھی۔ ایک دن مہتاب چائے کی ٹرے کر مس مراد کے یہاں گیا۔ جس جگہ وہ رہتی تھی وہاں ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ اس میں لوکاٹ کے بوٹے تھے۔ مہتاب کو یہ پھل بے حد پسند تھے۔ معلوم نہیں کیوں۔ ٹرے لے کر اندر گیا تو وہاں مس مراد کے دوست احباب بیٹھے لوکاٹیں کھا رہے تھے۔ مس مراد نے اسے چار پانچ دانے شاید اس لیے دیئے کہ موسم کا پہلا میوہ تھا۔ وہ خوش ہوا۔ واپس ہوٹل آیا تو اُس کا بڑا بھائی لوکاٹیں کھا رہا تھا۔ جو مس مراد کی دی ہوئی لوکاٹوں کے مقابلے میں زیادہ بڑی اور رسیلی تھی لیکن مہتاب یہ ماننے سے منکر تھا۔ قریب قریب چخ ہو گئی۔ اس کے بڑے بھائی نے تاؤ میں آ کر کہا: اگر تمھیں اپنی مس مراد کی لوکاٹیں پسند ہیں اور جیسا کہ تم کہتے ہو وہ تم پر مرتی ہے تو ایک بوٹا وہاں سے لے آؤ اور ہوٹل کے سامنے لگا دو“

رات بھر مہتاب خاں غائب رہا۔ اُس کے دوستوں کا خیال تھا کہ مس مراد نے بلا لیا ہو گا۔ اُس نے سو پچاس روپے بھیج دیئے ہوں گے۔ جس سے عیاشی کر رہا ہو گا۔ مگر صبح سڑک پر آنے جانے والے یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ اُس کے ہوٹل کے ساتھ جہاں ایک گڑھا تھا۔ لوکاٹ کا درخت لگا ہوا ہے۔ یہ اُس نے رات رات، وہاں سے جہاں مس مراد رہتی تھی اکھاڑا تھا۔ معلوم نہیں کتنی مشقت کرنی پڑی ہو گی اسے۔ اپنے دوستوں سے مگر اُس نے یہی کہا کہ مس مراد نے اُسے یہ بوٹا خود اپنے ہاتھوں سے عنایت کیا ہے اس لیے کہ وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہے۔ یہ بُوٹا چند دنوں کے اندر مرجھا گیا، لیکن اس کا چرچا کافی دیر تک رہا۔ طاہر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ وہ مہتاب خاں کی اس مداری پُنے سے خاصے متاثر ہوئے تھے، لیکن انھوں نے جب اپنی روایتی محکم پسندی سے کام لیتے ہوئے مہتاب سے کہا:

”تم بکواس کرتے ہو۔ ذرا آئینے میں اپنی شکل دیکھو، مس مراد کیا، تمھیں ایک ٹھیائی بھی کبھی منہ نہیں لگا سکتی۔“

یہ سُن کر اُس نے اپنا مکھن کھایا ہوا سینہ تان کر جواب دیا۔

”خو۔ تم کیسا بات کرتا ہے۔ خو تم نے وہ فلم نہیں دیکھا۔ نام تھا پرکھائیں۔ نہیں، پرچھائیں۔ خو، اُس میں ایک خوبرو لڑکی، ایک اندھے سے محبت کرتی تھی۔ ام اندھا نہیں ہے۔ آنکھیں توڑی سی خراب ہیں۔ پر اس سے کیا ہوا۔ مس مراد ام سے محبت کرتا ہے۔“

جیسا کہ طاہر صاحب کا کہنا ہے، یار لوگوں کی مہربانی سے مس مراد تک آخر یہ بات پہنچ گئی کہ مہتاب خاں، جس کی آنکھ میں پھولے ہیں اس سے بے پناہ عشق کرتا ہے۔ اس کا ردِ عمل خلاف توقع یہ ہوا کہ وہ اپنا مکان چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی اس لیے کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دوسرے چاہنے والے جو مہتاب کے مقابلے میں، آنکھوں کے نہیں عقل کے اندھے تھے، اس کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیں۔ جب مہتاب کو معلوم ہوا کہ مس مراد چلی گئی ہے تو اس کو اس قدر صدمہ ہوا کہ اس روز اس نے ہوٹل میں جتنی مکھن کی ٹکیاں تھیں سب کھا لیں۔ اس کے بعد اس کا غم جب اور زیادہ بڑھا تو مکھن کھانے کی مقدار بڑھ گئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کی توند بڑھ گئی۔ بڑا کاہل ہو گیا۔ چولھے میں کوئلے سلگاتے سلگاتے اونگھنے لگتا۔ بعض اوقات ایسی باتیں کرنا شروع کر دیتا کہ لوگوں کو یہ احساس ہوتا کہ وہ ماؤف الدماغ ہو گیا ہے۔ طاہر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اُسے ہوا ہوایا کچھ نہیں تھا۔ کشمیریوں کی زبان میں محض

”ڈام“

لگاتا تھا۔ جب کچھ دن گزرے تو اس نے شعر کہنے شروع کر دیئے مگر یہ شعر اُس کی اپنی تخلیق نہیں ہوتے تھے۔ اِدھر اُدھر فلمی گانوں کے بول توڑ مروڑ کر گنگنا دیتا، جس سے سننے والوں پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ جذب کی حالت تک پہنچ چکا ہے، یا بہت جلد پہنچنے والا ہے۔ اُس کا ایک شعر طاہر صاحب کو یاد تھا جو اُنھوں نے مجھے سُنا دیا۔ دو دلوں کو یہ دنیا جینے ہی نہیں دیتی میری پھٹی شلوار کو سینے ہی نہیں دیتی اُس کی شلوار جو کافی گھیرے دار تھی، یوں تو ہمیشہ پھٹی رہتی، پر جب سے اُس کی مس مراد آنکھوں سے اوجھل ہوئی تو وہ بالکل لیر لیر ہو گئی لیکن اُس کی مکھن خوری دن بدن بڑھتی گئی۔ اس کا چہرہ اور زیادہ سرخ ہو گیا۔ ایک دن طاہر صاحب نے اُس سے کہا۔

”تمہاری رگوں میں اتنا خون جمع ہو گیا ہے۔ کیوں نہیں اس میں چند اونس بلڈ بنک میں دے دیتے۔“

وہ فوراً مان گیا۔ ڈاکٹروں نے اُس کا خون لیا جو بڑا صحت مند تھا۔ اُس کے بعد وہ ایک مرتبہ اور ہسپتال گیا۔ اُس کا خون لینے کے لیے سب ڈاکٹر ہر وقت تیار تھے۔ ایک مرتبہ اُسے خاص طور پر بُلایا گیا کہ اُس کے تازہ تازہ خون کی ضرورت تھی۔ جب وہ ہسپتال پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ ایک مریض کے لیے اُس کے خون کی ضرورت ہے۔ اُسے کوئی عذر نہیں تھا۔ جب اسے فی میل وارڈ میں لے جایا گیا اور اُس کا خون مریض کے اندر داخل ہونے کا اہتمام کیا گیا تو اُس نے بستر پر دیکھا کہ مس مراد نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہے۔ مہتاب خاں کو معاً خیال آیا کہ شاید اسے چائے لانے کے لیے بُلایا گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے خود کو خالی ہاتھ محسوس کیا۔ لیکن جب اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے میز پر لٹایا گیا اور اُس کے خون کے کئی اونس مس مراد کے جسم میں داخل کیے گئے تو وہ کسی قسم کی نقاہت محسوس کیے بغیر اٹھا اور کہنے لگا

”خو، یہ امارا بہن ہے۔ اَم چلا۔

موتری

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوموتری

کانگرس ہاؤس اور جناح ہال سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پیشاب گاہ ہے جسے بمبئی میں

”موتری“

کہتے ہیں۔ آس پاس کے محلوں کی ساری غلاظت اس تعفن بھری کوٹھڑی کے باہر ڈھیریوں کی صورت میں پڑی رہتی ہے۔ اس قدر بدبو ہوتی ہے کہ آدمیوں کو ناک پر رومال رکھ کر بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس موتری میں دفعہ اسے مجبوراً جانا پڑا۔ پیشاب کرنے کے لیے ناک پر رومال رکھ کر، سانس بند کر کے، وہ بدبوؤں کے اس مسکن میں داخل ہوا فرش پر غلاظت بلبلے بن کر پھٹ رہی تھی۔ دیواروں پر اعضائے تناسل کی مہیب تصویریں بنی تھیں۔ سامنے کوئلے کے ساتھ کسی نے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

”مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا“

ان الفاظ نے بدبو کی شدت اور بھی زیادہ کر دی۔ وہ جلدی جلدی باہر نکل آیا۔ جناح ہال اور کانگرس ہاؤس دونوں پر گورنمنٹ کا قبضہ ہے۔ لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر جو موتری ہے، اسی طرح آزاد ہے۔ اپنی غلاظتیں اور عفونتیں پھیلانے کے لیے۔ آس پاس کے محلوں کا کوڑا کرکٹ اب کچھ زیادہ ہی ڈھیریوں کی صورت میں باہر پڑا دکھائی دیتا ہے۔ ایک بار پھر اسے مجبوراً اس موتری میں جانا پڑا۔ ظاہر ہے کہ پیشاب کرنے کے لیے۔ ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ بدبوؤں کے اس گھر میں داخل ہوا۔ فرش پر پتلے پاخانے کی پپڑیاں جم رہی تھیں۔ دیواروں پر انسان کے اولاد پیدا کرنے والے اعضا کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”مسلمان کی بہن کا پاکستان مارا“

کے نیچے کسی نے موٹی پنسل سے یہ گھناؤنے الفاظ تحریر کیے ہوئے تھے۔

”ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا“

اس تحریر نے موتری کی بدبو میں ایک تیزابی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ جلدی جلدی باہر نکل آیا۔ مہاتما گاندھی کی غیر مشروط رہائی ہوئی۔ جناح کو پنجاب میں شکست ہوئی۔ جناح ہال اور کانگرس ہاؤس دونوں کو شکست ہوئی نہ رہائی۔ ان پر گورنمنٹ کا اور اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر جو موتری ہے اس پر بدبو کا قبضہ جاری رہا۔ آس پاس کے محلوں کا کوڑا کرکٹ اب ایک ڈھیر کی صورت میں باہر پڑا رہتا ہے۔ تیسری بار پھر اسے اس موتری میں جانا پڑا۔ پیشاب کرنے کے لیے نہیں۔ ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ غلاظتوں کی اس کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ فرش پر کیڑے چل رہے تھے۔ دیواروں پر انسان کے شرمناک حصوں کی نقاشی کرنے کے لیے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

”مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا“

اور

”ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا“

کے الفاظ مدھم پڑ گئے تھے۔ مگر ان کے نیچے سفید چاک سے لکھے ہوئے یہ الفاظ ابھر رہے تھے۔

”دونوں کی ماں کا ہندوستان مارا“

ان الفاظ نے ایک لحظے کے لیے موتری کی بدبو غائب کر دی۔ وہ جب آہستہ آہستہ باہر نکلا تو اسے یوں لگا کہ اسے بدبوؤں کے اس گھر میں ایک بے نام سی مہک آئی تھی۔ صرف ایک لحظے کے لیے۔ (سن تصنیف 1945ء(

موج دِین

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوموج دِین

رات کی تاریکی میں سنٹرل جیل کے دو وارڈن بندوق لیے چار قیدیوں کو دریا کی طرف لیے جا رہے تھے جن کے ہاتھ میں کدالیں اور بیلچے تھے۔ پُل پر پہنچ کر انہوں نے گارد کے سپاہی سے ڈبیا لے کر لالٹین جلائی اور تیز تیز قدم بڑھاتے دریا کی طرف چل دیے۔ کنارے پر پہنچ کر انہوں نے بارہ دری کی بغل میں کدالیں اور بیلچے پھینکے اور لالٹین کی مدھم روشنی میں اس طرح تلاش شروع کی جیسے وہ کسی مدفون خزانے کی کھوج میں آئے ہیں۔ ایک قیدی نے لالٹین تھامے وارڈن کو داروغہ جی کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”داروغہ جی! یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے اگر حکم ہو تو کھدائی شروع کر دیں۔“

”دیکھنا۔ زمین نیچے سے پتھریلی نہ ہو، ورنہ ساری رات کھدائی میں گزر جائے گی۔ کم بخت کو مرنا بھی رات ہی کو تھا۔“

وارڈن نے تحکمانہ اور بیزاری کے لہجے میں کہا۔ قیدیوں نے کدالیں اور بیلچے اُٹھائے اور کھودنا شروع کیا۔ وارڈن بیزاری کے موڈ میں بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ قیدی زمین کھودنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ رفتہ رفتہ زمین پر کھدی ہوئی مٹی کا ڈھیر لگ گیا اور وارڈن نے قریب آ کر قبر کا معائنہ کیا۔ زمین چونکہ پتھریلی نہیں تھی۔ اس لیے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھا سگریٹ پینے لگا۔ جسے لگانے کے لیے اس نے لالٹین منگائی۔ کھدائی قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ وارڈن دو قیدیوں کو لیے جیل کی جانب چلا گیا اور بیس منٹ کے وقفے کے بعد کمبل میں لپٹی ہوئی قیدی کی لاش لے کر واپس آیا۔ دوسرا وارڈن جب تک سلیں جمع کر کے لایا تھا۔ ایک قیدی نے جو قتل کے جُرم کی پاداش میں سزا کاٹ رہا تھا۔ کُدالیں اور بیلچے اُٹھائے اور قبر کے سرہانے چند قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وارڈن نے بہت ہی برہم لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”او اُلّو کے پٹھے اپنے ابا کو لحد میں اُتارنے میں ان کی مدد کر“

قیدی نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

”داروغہ جی! لالٹین پکڑ تا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس معصوم اور بے گناہ کو ایک قاتل کے ہاتھ چھو جائیں۔“

وارڈن یہ سُن کر گرجا

”بے گناہ کے بچے۔ جاسوس کو معصوم کہتا ہے۔“

قاتل نے کہا۔

”داروغہ جی! میں قاتل ہوں۔ یہی احساس مجھے اس قیدی کی لاش چھونے سے روکتا ہے۔“

”جاسوس“

دفنایا جا چکا تھا۔ قیدی اور وارڈن جا چکے تھے۔ صبح آٹھ بجے پولیس کی معیت میں ڈپٹی کمشنر قبر پر آیا۔ جیل کے حکام کے بیانات لیے گئے اور ڈپٹی کمشنر صاحب عدالت تشریف لے گئے۔ پیشی کی پہلی مِسل جو اُٹھائی گئی، اس پر سرکار بنام موج دین لکھا تھا۔ اردلی نے تین مرتبہ کمرہ عدالت سے باہر نکل کر بلند آواز میں تین بار پکارا۔ بلکہ یوں کہیے کہ للکارا۔

”سرکار بنام موج دین۔ موج دین۔ موج دین ہے؟“

لیکن یہ آواز بدقسمتی سے اُس جاسوس قیدی کی قبر تک نہ پہنچ سکی۔ یا اگر پہنچی بھی ہو تو وہ تعمیل کے لیے نہ آیا۔ شاید یہ سمجھ کر کہ وہ اب ڈپٹی کمشنر کے قانون کی زد سے بہت دُور جا چکا ہے۔ اس جگہ جہاں کوئی اور قانون چلتا ہے۔ جہاں ڈپٹی کمشنر کے سمن کی بھی تعمیل نہیں ہو سکتی۔ ملزم چونکہ غیر حاضر تھا، اس لیے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر نے عدم حاضری ملزم کارروائی یک طرفہ کے لیے مِسل اٹھائی اور ریڈر سے جرم کی نوعیت دریافت کی۔

”جاسوسی“

منشی نے نمبرا کی کارروائی لکھتے ہوئے کہا۔

”ملزم رات کو سنٹرل جیل میں فوت ہو چکا ہے۔ مِسل داخل دفتر کر دی جائے۔“

ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا۔

”جاسوس“

کی سنٹرل جیل میں موت کی خبر شہر بھر میں اس لیے مشہور ہوگئی کہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر اور پولیس کے افسروں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ آزاد کشمیر حکومت کے نیک سیرت افسروں کی ہر طرف سے داد و تحسین دی جا رہی تھی۔ مجھے جب اس واقعہ کا علم ہوا تو مجھے ایک مہینہ پہلے کی ایک شام یاد آئی جب کہ میں دارالحکومت کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ڈاک گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ جس کے ذریعے سے میرے مرمت شُدہ جوتے راولپنڈی سے آنے والے تھے۔ گاڑی آنے میں خلافِ معمول دیر ہوئی۔ میں قریب قریب اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک گہرے سانولے رنگ کے آدمی نے جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”آپ بُوت ٹَیم سے بیٹھا کسی کا انتظار کرتا ہے؟“

اس نے مُسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

”بھئی عجیب مصیبت ہے۔ جوتا پھٹ جائے مظفر آباد میں، تو مرمت کے لیے راولپنڈی بھیجنا پڑتا ہے۔ یا اگر کوئی ڈرائیور مہربان ہو تو اسی کے ہاتھ بھیج دیتے ہیں۔ آج میں اپنے مرمت شدہ جوتوں کے انتظار میں تین گھنٹے سے بیٹھا ہوں اور کم بخت ڈاک گاڑی بھی آج ہی لیٹ ہوئی ہے۔ خیر کل سہی۔“

میں یہ کہہ کر اُٹھنے لگا تو اس نے مجھے چند منٹ مزید انتظار کرنے کے لیے کہا۔ میں اس اجنبی صورت کو دیکھتا رہا۔ جس کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔ جس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ بیڑی پر بیڑی پیے جا رہا تھا۔ اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھا بار بار باہر خلا میں دیکھتا تھا۔ میں ڈاک گاڑی کے انتظار میں ہر ایک ہارن پر کان دھرتا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے اس سے پوچھا۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”ہم بیٹھا ہے“

اس نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔

”نہیں، میرا مطلب ہے یہاں آپ کا کیا کاروبار ہے“

”کاروبار کچھ نہیں کرتا، کشمیر دیکھنے کا شوق تھا، چلا آیا۔“

”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”لاہور سے۔ لیکن میں مشرقی پاکستان کا ہوں، لاہور میں دینیات کی تعلیم پڑھتا ہوں۔“

مجھے گفتگو کے دوران میں اس نے بتایا کہ وہ جس ادارے میں زیر تعلیم ہے، خیراتی ادارہ ہے، جہاں کے اربابِ اعلیٰ رسید بُک چھاپ کر زیر تعلیم کم عمر بچوں کو چندے کی فراہمی کے لیے دوسرے شہروں میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ چونکہ کم عمر بچہ نہ تھا۔ اس لیے اس کو بڑی مشکلوں کے بعد

”سفیر“

بن کر آزاد کشمیر میں چندہ جمع کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس کی باتوں میں سادگی تھی۔ محض کشمیر دیکھنے کے شوق میں اس نے

”سفارت“

حاصل کی تھی۔ اس نے یہ بھی بتادیا کہ یتیم خانوں کے نام پر

”بِھک منگوں“

کا نام اداروں نے سفیر رکھا ہے۔ جمع شدہ چندہ ان کی جیبوں میں جاتا ہے اور

”سفیر“

کا گزارہ چڑھاوے کی دیگوں یا محلے والے کی خیرات پر ہوتا ہے۔ دینیات کی تعلیم مساجد میں دی جاتی ہے۔ مجھے اس کی باتیں سن کر بہت دکھ ہوا۔ واقعی وہ ہمدردی کے قابل تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس شہر میں نیا ہے اور کسی مسجد کا پتا بھی نہیں جانتا جہاں وہ رات بسر کر سکے۔ میں نے مسجد کا پتا دیا اور اس کے لیے روٹی منگوائی۔ وہ چونکہ بھوکا تھا، اس نے بِلا تکلف بجائے روٹی کے سادہ چاول کے لیے بیرے سے کہا۔

”ہم لاہور کی مسجد میں بھی لوگوں کا دیا کھاتے ہیں۔ اس لیے ادھر بھی ہم نے انکار نہیں کیا۔“

اس نے انتہائی سادگی سے کہا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ مجھ سے اجازت لے کر اس نے جیب سے لکھنے کے لیے پنسل اور کاغذ نکالا۔ اور اپنے گھر والوں کو بنگلہ زبان میں خط لکھنے لگا۔ میں جب تک فرمائشی گانے سنتا رہا۔ خط لکھنے کے بعد اس نے مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ

”میں نے گھر والوں کو لکھا کہ میں آزاد کشمیر آیا ہوں۔ اب یہیں رہوں گا۔ اگر پاکستان نے ہندوستان کے خلاف جہاد شروع کیا تو میں بھی اس میں حصّہ لوں گا اور کشمیر کو آزاد کراؤں گا۔
“

میں نے جواب میں ہندی مقبوضہ کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کیا۔ کشمیری مسلمانوں پر بھارتی ظلم و استبداد بیان کیا، جس سے وہ اور زیادہ متاثر ہوا۔

”پھر ہم لاہور واپس نہیں جائے گا۔ کل ان کو بھی خط لکھے گا۔ جہاد شروع ہونے تک ادھر ہی پان بیڑی کی چھابڑی لگائے گا۔“

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اتنی دیر میں ڈاک گاڑی آئی اور میں وہاں سے اُٹھ کر لاریوں کے اڈے کی طرف گیا۔ اور وہ میرے بتائے ہوئے راستے سے مسجد کی طرف گیا۔ اپنے جوتے ڈرائیور سے لے کر جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں سی آئی ڈی کے ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے آواز دی جو میرا واقف کار تھا۔ میں نے رسمی طور پر اس کی خیریت پوچھی۔ وہ مشکوک نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے مجھے اس

”کالے آدمی“

کے متعلق پوچھا کہ وہ کون ہے جو آپ کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ میں نے مختصراً کہا۔ بھئی بنگالی ہے، آزاد کشمیر دیکھنے کا شوق تھا۔ چلا آیا۔ نام موج دین ہے اور آج رات جامع مسجد میں گزارنے کے لیے گیا ہے۔

”لیکن وہ تو ہوٹل میں بیٹھا کچھ عجیب و غریب زبان میں خط لکھ رہا تھا۔ مجھے اس پر کچھ شُبہ بھی ہوا۔“

ہیڈ کانسٹیبل نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ وہ عجیب و غریب زبان نہیں۔ اس کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ ہاں تمہارے لیے اجنبی ہے۔ اتنے میں میرا مکان قریب آیا اور میں خدا حافظ کہہ کر گھر چلا گیا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ سی آئی ڈی والوں کو دن کی کارگزاری کی رپورٹ دوسرے روز صبح سویرے دفتر میں دینی پڑتی ہے اور اگر رپورٹ نہ دی گئی تو جواب طلبی ہوتی ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل صاحب بھی دن کی کارگزاری میں کچھ نہ کچھ دکھانا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے گھر جا کر حکومت کے

”صدر مقام“

میں ایک غیر ملکی

”جاسوس“

کی آمد کی رپورٹ اس طرح دی کہ دوسرے روز موج دین، پان فروشی کے لیے چونا کتھا خریدتا ہوا گرفتار کیا گیا۔ پان، چونا، کتھا وغیرہ بھی اس کی جاسوسی کی ایک کڑی بن گئی۔ اور سی آئی ڈی والوں نے مزید رپورٹ دے دی کہ

”جاسوس“

چونکہ پان کھانے کا عادی ہے، اس لیے یہ سٹاک خرید کر ہماری فوجوں کی پکٹوں کی پوزیشن دیکھنے پہاڑی علاقوں میں جا رہا ہے۔ موج دین کا چالان ہوا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر نے الزامات کی سنگینی کے تحت

”جاسوس“

کو پندرہ دن کے ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کر دیا۔ جہاں سے وہ سپیشل سٹاف میں منتقل ہوا۔ پندرہ دن کی میعاد گزر جانے پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے مزید ایک ہفتے کے ریمانڈ پر اس کو جوڈیشل (سنٹرل جیل) بھیج دیا۔ وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور

”جاسوس“

ہتھکڑیاں پہنے ڈپٹی کمشنر صاحب کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں وہ زار و قطار رویا۔ گڑگڑایا، منت سماجت کی، لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب نے مزید ایک ہفتے کا ریمانڈ دے کر سنٹرل جیل بھیج دیا۔ سنٹرل جیل میں اس کی آخری رات تھی جب کہ وہ ایک ستون سے بندھا رو رہا تھا، وہی قاتل قیدی جس نے اس کو دفناتے وقت چھونے سے انکار کیا۔ اس کے قریب آیا اور پوچھا۔

”جاسوس! تم ہر روز کیوں روتے ہو۔ یہ جگہ باہر والوں کی بہ نسبت بہت اچھی ہے۔ یہاں جھوٹ نہیں، مکر نہیں، بے ایمانی نہیں۔ روٹی ملتی ہے۔ اسکے مقابلے میں باہر دیکھو، کون لوگ ہیں۔ جنہوں نے تم ایسے بے گناہ کو بھی یہاں بھیجا، جو اقتدار کے لیے ایک کا نہیں، ہزاروں کا خون بہاتے ہیں جو دن دیہاڑے ڈاکے ڈالتے ہیں' جو اپنی ذات کے لیے وہ کام بھی کرتے ہیں جو شیطان بھی کرنے سے گریز کرتا ہے۔ مجھے دیکھو میں نے قتل کیا ہے محض ایک بے بس عورت کے ناموس کے تحفظ کے لیے۔ بہر حال مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اگر تم باہر جا کر خوش ہو تو خدا تمہیں آزاد کرائے گا۔“

موج دین نے قیدی کی باتیں سنیں اور بالکل خاموش بیٹھا رہا۔

”سُنا ہے بنگالی جادو جانتے ہیں۔ تم بھی جادو کے زور سے باہر جاؤ“

قیدی نے موج دین کو بہلانے کے لیے ازراہِ مذاق کہا۔

”ہاں، میں اس قید سے رہائی کا جادو جانتا ہوں۔ میں آج ہی یہاں سے بھاگ جاؤں گا، بہت دُور، جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے واپس نہیں لاسکتی۔“

اتنے میں کھانے کی گھنٹی بجی۔ قیدی اپنی تھالی لیے دال روٹی لینے گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد اچانک جیل کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی اور متواتر بجتی رہی۔ داروغہ جیل کئی وارڈنوں کے ساتھ جیل کے احاطہ میں داخل تھا اور

”جاسوس“

کے گلے سے رسی کا پھندا کھولا جو اس نے خود کشی کے لیے استعمال کیا تھا۔

”جاسوس“

بھاگ چکا تھا، اس کو رہائی مل گئی تھی۔

”بنگال کا جادو“

کام آیا تھا۔ موج دین کی لاش کے ارد گرد قیدیوں کا ہجوم تھا۔ داروغہ جیل نے چند ایک قیدیوں کو وہاں ٹھہرنے کا حکم دے دیا اور باقی سارے قیدی بارکوں میں چلے گئے۔ موج دین کے چہرے پر اب بھی مُسکراہٹ تھی۔ وہ اس قانون پر مسکرا رہا تھا جس نے اس کو جاسوس بنا کر محبوس کیا تھا۔“

موچنا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوموچنا

نام اس کا مایا تھا۔ ناٹے قد کی عورت تھی۔ چہرہ بالوں سے بھرا ہوا، بالائی لب پر تو بال ایسے تھے، جیسے آپ کی اور میری مونچھوں کے۔ ماتھا بہت تنگ تھا، وہ بھی بالوں سے بھرا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو موچنے کی ضرورت اکثر پیش آتی تھی۔ وہ راولپنڈی کے ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس سے قطع تعلق کیے اسے ایک زمانہ گزر چکا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہے، کہ وہیں اس کی شادی ہوئی۔ جب اس کی عمر سولہ برس کے قریب تھی۔ دو برس ہونے کو آئے تو اس کے خاوند کو شک گزرا کہ مایا کا چال چلن خراب ہے۔ محلے میں وہ ایک نہیں، تین آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی ہے۔ اس تگڈے عشق کے دوران میں مایا کو احساس ہوا کہ اس کا ماتھا تنگ ہے۔ اس کے بالائی لب اور ٹھوڑی پر بال ہیں جو بڑے بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک موچنا خرید لیا اور ان غیر ضروری بدنما بالوں کا صفایا کر دیا۔ لیکن وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دفعہ بال نوچنے کے بعد وہ ہمیشہ کیلیے ان سے نجات حاصل کرلے گی۔ اس کو موچنے سے ماتھے، ٹھوڑی اور بالائی لب کے بال اکھیڑنے میں بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ ایک ایک کر کے ہر بال کو موچنے کی گرفت میں لینا اور پھر اسے ایک ہی جھٹکے میں باہر نکالنا بہت مشکل کام تھا۔ مگر مایا دھن کی پکی تھی۔ یہ کام گو خود اس کے اپنے ہاتھ کر رہے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ درد کے مارے بلبلا اٹھتی تھی۔ جب سارا میدان صاف ہو گیا تو اس نے اطمینان کا بہت لمبا سانس لیا تھا۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وہ کم بخت دوسرے ہی روز پھر نمودار ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب انہوں نے اس کے چہرے کی جلد سے اپنا سر نکالا تو مایا سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا، کہ وہ ہر چوتھے پانچویں روز اپنے غیر ضروری بالوں کی صفائی کیا کرے۔ آہستہ آہستہ موچنا اس کی زندگی کا اہم ترین جزو بن گیا۔ وہ جہاں بھی جاتی موچنا اس کے ساتھ ہوتا۔ لیکن اس کے استعمال میں اسے ان دنوں سخت دِقت محسوس ہوتی جب کہ وہ کسی دوسرے کے گھر ہوتی۔ اپنے گھر میں بھی اسے سب کی نظر بچا کر کسی ایسی جگہ اپنے بال نوچنے پڑتے تھے، جہاں کسی کے گزرنے کا امکان نہ ہو۔ پھر بھی کوئی پتا کھڑکتا تو وہ بھڑک اٹھتی تھی، جیسے کوئی بہت بڑا گناہ کر رہی ہے۔

”منٹو صاحب میں اب سوچتا ہوں کہ اس سے ایسا کونسا گناہ سرزد ہوا تھا جو خدا نے اس کے مونچھیں اور داڑھی اگا دی تھیں۔ اس کا ماتھا اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ اس کی گھنی بھنوؤں کے ساتھ آ کے مل گیا تھا۔ اس کے سارے بدن پر بھی بال ہی بال تھے۔ معلوم نہیں کیوں۔ بال۔ روئیں نہیں۔ اچھے تکڑے بال۔ سیاہ۔ آپ یقیناً کہیے گا کہ پھر اس میں ایسی کونسی جاذبیت تھی کہ تم اس پر لٹو ہو گئے اور بہت دیر تک لٹو رہے۔ سو عرض ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

میں نے شکیل کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

”آپ اتنے بڑے شاعر ہیں، جب وہ آپ کے پاس تھی تو آپ نے بڑی خوبصورت غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ جن میں مایا کا پرتو لفظ لفظ میں ملتا ہے۔ جب وہ چلی گئی تو آپ نے پھر بڑی زہریلی زہریلی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ ان میں بھی مایا کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ آپ کا اس پر لٹو ہونے کا باعث کیا تھا؟“

شکیل نے ماتھے کا پسینہ پنسل سے ایک طرف ہٹا کر صاف کیا۔

”مایا۔ صرف مایا۔ اور۔ مایا کیا تھی۔ یہ خدا کی قسم میں نہیں جان سکا۔ میری شاعری پر لعنت بھیجیے کیونکہ وہ محض جذباتی تھی۔ اس میں بھی وہی مایا کار فرما تھی۔ جس پر میں بظاہر بے وجہ لٹو ہوا تھا۔ لیکن۔“

شکیل ایک لحظے کے لیے مناسب و موزوں الفاظ تلاش کرنے کے لیے رک گیا۔

”وہ بستر کی بہترین رفیق تھی۔“

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شکیل کا یہ بیان بہت حد تک دُرست تھا۔ مایا ایک نچی ہوئی مرغی تھی۔ اس کے مقابلے میں شکیل کی سہرے جلووں کی بیاہی عورت پٹھانی حسن کا بہترین نمونہ تھی۔ گو دہ بچوں کی ماں، مگر شاید وہ بستر کی اچھی رفیق نہیں تھی۔ مایا شادی شدہ تھی مگر اولاد سے محروم۔ اس کے راولپنڈی میں کئی سلسلے ہو چکے تھے، مگر ان سے بھی کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا تھا۔ اس کے ماتھے اس کے بالائی لب اور اس کی ٹھوڑی کے بال بڑھتے جا رہے تھے اور موچنے کے کام میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ راولپنڈی میں جب اس نے کھیل کھیلنا شروع کیا تو اس کا خاوند جو کہ ایک شریف آدمی تھا، متوسط درجے کا دوکاندار، غربت کا مالک، اور ہٹ کا پکا تو اس نے ایک دن مایا کو گھر سے باہر نکال دیا۔ مایا نے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ البتہ دوسرے دن میکے سے اپنے شوہر کو خط لکھا کہ وہ مہربانی کر کے اس کا موچنا بھیج دے۔ اس کے شوہر گنڈا سنگھ نے بصد مشکل موچنا تلاش کیا اور آئینہ سمیت مایا کو بھجوایا۔ مایا کے زیور وغیرہ اس کے پاس رہتے تھے، اسی کے پاس رہے۔ مایا نے ان کا مطالبہ کبھی نہ کیا۔ اس کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی روز وہ ایک مسلمان گھڑی ساز کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔ ایک برس کے اندر اندر اس نے مایا کو کئی زیور بنوا دیے۔ ایک گھڑی جو کسی گاہک کی تھی اس کی کلائی پر باندھ دی۔ یہ بہت بیش قیمت گھڑی تھی۔ جب گاہک نے اس کا مطالبہ کیا تو صاف مکر گیا۔ اس نے یہ کہا صریحاً غلطی ہوئی ہے، ورنہ شہاب الدین کی یہ دُکان۔ وہ عورت جس کی یہ گھڑی تھی کوئی شریف عورت تھی۔ یہ سن کر خاموش ہو کر چلی گئی۔ شہاب الدین باوجود اس کے کہ اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا، زبردستی خوش ہونے کی کوشش کرتا۔ جب گھر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مایا دیوی جس کا اسلامی نام اس نے حسب توفیق اور بقدر جذبات صغریٰ رکھا ہوا تھا پڑوسی کے گھر میں ہے، جو شہر کا چھٹا ہوا بد معاش تھا۔ اب شہاب الدین گھڑی ساز کے گھر سے مایا کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ پڑوس میں امین پٹرنگ کے یہاں چلی گئی معمولی سا جھگڑا ہوا تھا۔ مایا کے سارے کپڑے وہیں پڑے رہے، لیکن وہ اپنا موچنا ساتھ لیتی گئی۔ امین پٹرنگ بڑا نہنگ قسم کا آدمی تھا۔ اس نے مایا سے صاف صاف کہہ دیا۔

”دیکھو اگر تم نے پھر کوئی ایسا ویسا معاملہ کیا تو یاد رکھو میں تمہاری گردن اس چاقو سے کاٹ ڈالوں گا۔“

وہ ہر وقت اپنی جیب میں ایک بڑا خوفناک کمانی والا چاقو رکھتا تھا۔ مگر مایا اس سے بالکل خائف نہ ہوئی۔ امین پٹرنگ کا ایک نوجوان لڑکا یوسف تھا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ چند دنوں ہی میں اس نے اس نوجوان کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ امین کام پر جاتا تو یوسف کالج سے غیر حاضر ہو کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ آخر ایک روز بھانڈا پھوٹ گیا۔ باپ بیٹے کی مڈبھیڑ ہوئی۔ قریب تھا کہ وہ اس کے پیٹ میں اپنا کمانی والا چاقو بھونک کر اس کا خاتمہ کر دے کہ مایا نے حکمت عملی سے کام لے کر بیچ بچاؤ کرایا اور تین کپڑوں میں وہاں سے نکل گئی۔ سُنا ہے کہ امین پٹرنگ اس کے جانے کے بعد بہت دیر مغموم رہا۔ دوستوں میں وہ ہر وقت اس کی باتیں کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مایا سے اس کی اتفاقی ملاقات ہو جاتی تو اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ کپڑے رنگنے چھوڑ کر وہ سارا دن وارث شاہ کی

”ہیر“

سُنا کرتا تھا۔ مجھے صرف یہاں تک مایا کے متعلق معلوم تھا۔ چنانچہ مزید معلومات کے لیے میں نے شکیل سے جو کہ اپنی داستان بیان کر رہا تھا، پوچھا۔

”امین پٹرنگ کے بعد وہ کس کے پاس گئی؟“

شکیل نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا

”ہزاروں کے پاس۔ لاری ڈرائیور ہربنس سنگھ کے پاس، سینما اپریٹر مکند لال کے پاس۔ دیال سنگھ کالج کے ایک پروفیسر کے پاس۔ سٹار بیکری کے مالک حسین بخش کے پاس۔ ایکسٹرا سپلائر غلام محمد کے پاس۔“

شکیل کے ہونٹوں پر ابھی تک وہ زہر خند موجود تھا۔

”ایک برس میں۔ جو کہ اس نیک بخت کے لیے بہت بڑا عرصہ تھا۔ اور“

اس نے میری طرف بڑی معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جو کہ زخم خوردہ تھیں۔

”آپ کو معلوم ہے، ہر مرتبہ اپنے نئے یار سے جدا ہونے کے بعد اس نے ایک رقعہ لکھا جس میں یہ درخواست کی تھی کہ اس کا موچنا اس کو بھیج دیا جائے۔“

میں کباب ہو گیا۔ موچنے میں آخر ایسی کونسی بات تھی کہ مایا اور تمام چیزیں چھوڑ کر صرف اسی کی واپسی کی درخواست کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے شکیل سے پوچھا۔

”یہ موچنا سونے کا تھا۔ جڑاؤ تھا؟“

شکیل مسکرایا۔

”جی نہیں۔ معمولی لوہے کا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی قیمت چار آنے ہو گی۔ مگر وہ اس کا دائمی رفیق بن گیا تھا۔ کم بخت نے کسی مرد کو دائمی رفیق نہیں بنایا تھا۔ مگر یہ موچنا اس کا جیون ساتھی تھا“

امین پٹرنگ کو معلوم تھا کہ موچنا کہاں پڑا ہے۔ اس نے پہلے سوچا کہ گول کر دے اور لڑکے کو ایک دھول رسید کر کے رخصت کر دے۔ یا اس کے سر پر اُسترا پھروا کر واپس بھیج دے کہ موچنے نے اتنا کام کیا ہے کہ وہ اب کسی کام کا نہیں رہا۔ مگر پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے کارنس پر سے موچنا اٹھایا۔ اس کے دانتوں میں سے مایا کی بھوؤں کے چند بال نکالے اور ایک طرف پھینک دیے۔ امین پٹرنگ باوجود اس کے کہ بہت بڑا غنڈہ تھا، موچنے کو دیکھ کر موم ہو گیا۔ اس نے قاصد لڑکے کا سر منڈوانے کا خیال ترک کر دیا۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ وہ امین پٹرنگ کے بعد کس کے پاس گئی۔ لیکن شکیل نے مجھے فوراً بتا دیا۔

”منٹو صاحب وہ ایک مرد کی عورت نہ تھی۔ لیکن شاید یہ کہنا بھی درست نہیں۔ وہ ایسی میل تھی جو ہر اسٹیشن پر کوئلہ، پانی چاہتی ہے۔ امین کے بعد وہ اسسٹنٹ فلم ڈائریکٹر ہربنس سنگھ کے پاس تین مہینے رہی۔ پھر ساؤنڈ ریکارڈسٹ پی۔ این۔ آہوجہ کے پاس ایک ماہ اور چند دن۔ اس کے بعد۔ اس کے بعد“

میں نے پوچھا

”کس کے پاس؟“

شکیل نے شرما کے جواب دیا

”آپ کے اس خاکسار کے پاس، جسے داراشکوہ المعروف شکیل کہتے ہیں۔ لعنت ہو اس پر ہزار بار“

میں نے دریافت کیا

”آپ اس لعنت میں کیسے گرفتار ہوئے؟“

شکیل نے ٹھیٹ پشاوری لہجے میں کہا

”منٹو صاحب۔ وہ لعنت ایسی ہے کہ اس میں گرفتار ہوئے بنا کوئی نہیں رہ سکتا۔ آپ بڑے آہنی قسم کے مرد بنے پھرتے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اسے دیکھتے تو یقیناً اپنی ساری افسانہ نگاری بھول جاتے۔ اگر نہ بھولتے تو قلم کے بجائے موچنے سے افسانے لکھتے۔ یوں کہیے کہ آپ ادب کی مونچھوں کے بال اکھیڑنے میں ساری عمر صرف کر دیتے۔“

ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوتا، کیونکہ میں بھی امین، شکیل اور گنڈا سنگھ کی طرح ایک انسان ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ موچنے میں کیا خصوصیت تھی کہ وہ مایا کی زندگی کے ساتھ ایسی بُری طرح چپک گیا تھا۔ میں نے شکیل سے کہا

”تمہارا اس کا سلسلہ کتنی دیر تک قائم رہا؟“

شکیل نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ سلگایا۔

”قریب قریب دو برس تک“

اور۔ وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا

”اور منٹو صاحب آپ یقین مانیے، میں دنیا و مافیہا کو بھول گیا“

میں نے سوال کیا

”کیوں؟“

شکیل سوچنے لگا۔

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید۔ شاید اس کی مونچھوں کے بال۔ جو موچنے کے استعمال سے بڑے کھردرے ہو گئے تھے۔ وہ۔ وہ۔ بڑی حرارت پیدا کرتے تھے۔ اور اس کا جسم جو سر سے پیر تک بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ منٹو صاحب میں شاعر ہوں۔ میں نے ہمیشہ نرم اور چکنے بدن کی تعریف کی ہے، جس پر سے آدمی پھسل پھسل جائے۔ مگر مایا کی دوستی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب بکواس ہے، سارا مزہ اٹک اٹک جانے میں ہے۔ بس میں صرف اتنا جانتا ہوں“

میں سوچنے لگا۔ پھسل پھسل جانے اور اٹک اٹک جانے میں واقعی بہت بڑا نفسیاتی فرق ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اسے خود سمجھ سکتے ہیں۔ اگر نہیں سمجھ سکتے تو اس بکھیڑے میں نہ پڑیے۔ شکیل صاحب کی گفتگو کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مایا کو قریب قریب بھول چکے ہیں، مگر پھر بھی اس کی یاد تازہ رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔

”شکیل صاحب۔ دو برس تک آپ کا اور مایا کا سلسلہ رہا۔“

شکیل نے میری بات کاٹ کر کہا

”جی ہاں۔ دو برس تک۔“

میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ اپنے بچوں سے منہ موڑ لیا اور مایا کو اپنے سینے سے لگالیا۔ لیکن دو برس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ بے وفا ہے۔ ریاکار ہے“

میں نے پوچھا

”یہ آپ نے کیسے جانا؟“

شکیل نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

”جناب۔ وہ میرے ہمسائے شیخ اسماعیل گورنمنٹ کنٹریکٹر سے اپنا نیا سلسلہ قائم کر رہی تھی۔ مجھے اور کسی بات کا غصہ نہیں تھا منٹو صاحب، لیکن وہ سالا پچاس برس کا بوڑھا تھا۔ سات جوان لڑکیوں کا باپ۔ دو بیویوں کا خاوند۔ لیکن حیرت اس سالی پر بھی ہے کہ اسے کیا سوجھی؟“

شکیل نے یہ کہہ کر سگریٹ سلگانے کی کوشش کی، مگر اس سے سلگ نہ سکا۔ اس لیے کہ اس کے ہاتھ بہت بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لیا اور سلگا کر اس کو دیا

”وہ چلی گئی“

”جی ہاں میں نے اسے دھکے مار کر باہر نکال دیا“

شکیل نے زور کا ایک کش لیا، اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے پنسل پکڑ کر ایک نئی نظم لکھنے کے لیے تیار ہونے لگا جو غالباً مایا کی یاد کے بارے میں ہونے والی تھی۔

”جی ہاں چلی گئی۔ یہ اپنا موچنا چھوڑ گئی“

میں نے پوچھا

”اس نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا؟“

شکیل نے ایک اور کش لیا

”ایک نہیں، سینکڑوں مرتبہ۔ لیکن میں نے اسے واپس نہیں کیا۔ اس لیے کہ ایک صرف یہی چیز ہے جو اس کے اور میرے درمیان رہ گئی ہے۔ جب تک یہ موچنا میرے پاس ہے وہ ہمیشہ مجھ سے خط و کتابت کرتی رہے گی۔“

موذیل

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوموذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ۔ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں ترلوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی۔ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی مکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔ کرپال کور اور اس کا سارا خاندان۔ محلے میں تھا۔ جو کٹڑ مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا۔ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ۔ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر

موت کے کنوئیں کی طرف لے جاسکتا تھا۔ کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لیے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ نرنجن، یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اول تو یہاں سے اٹھ جاؤ، اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیا کرتا ہے۔ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرادیا۔

”تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں بمبئے ہے۔ بمبئے۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہا ہوں۔ بارہ برس سے۔“

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے۔ اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود زائل ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے پاس چھو منتر ہے۔ یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ۔ محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔ اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا۔ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو وہ بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کے بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔ صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کنگھر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سِکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنھیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔ ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ۔ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا، شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔ کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیریس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ۔ پھر بمبئی جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔ ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بُری نہیں تھی۔ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزار ہا دیے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔ کرپال کور کا سوچتے سوچتے وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو، گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے اے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈ بھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لباس سفید چغہ پہنے تھے۔ جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تین چوتھائی کے قریب نظر آرہی تھیں۔ بانھیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔ ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آرہی۔ جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چُغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی۔ بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں اور۔ جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل۔ ساری موذیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔ ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں سے اس معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرادی۔

”یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔“

اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوڑی ڈور سے باہر چلی گئی۔ ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانھوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گُھرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔ ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوتی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں

”گوڈے گوڈے“

دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔ ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لیے پر تکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔ ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔ جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی۔

”تم سکھ ہو۔ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔“

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا۔

”کون سی نازک باتیں۔ تمہارے پرانے یاروں کی؟“

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تنگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی۔

”یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔ ہاں وہ میرے یار ہیں۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔“

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا۔

”اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی“

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی۔

”تم سچ مچ سکھ ہو۔ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ۔ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کر لو۔ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔“

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ عام طور پر توہین اور ہتک کا ردعمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی۔ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔

”گوڈے گوڈے“

اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔ دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔

”موذیل۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو۔“

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا۔

”میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔“

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو۔ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔“

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔

”تم شیو اکرالو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو۔ تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے۔ تم خوبصورت ہو۔“

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیے۔

موذیل نے ایک دم

”پھوں پھوں“

کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی۔

”میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں۔ تم تکلیف نہ کرو۔“

ترلوچن چلایا۔

”موذیل۔“

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں۔

”خدا کی قسم۔ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی۔“

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی۔ اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔ ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔ جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی۔

”تمہارے بال بہت ملائم ہیں۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا۔ ترلوچن۔ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انھیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی۔“

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا۔

”میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔ تم کیوں اڑاتی ہو۔ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کر تا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں۔“

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔

”مجھے معلوم ہے۔“

”پھر۔“

ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کیے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔“

ترلوچن اچھل پڑا۔

”سچ“

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔

”ہاں“!

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

"تو۔ تو کب؟"

موذیل الگ ہٹ گئی۔

"جب۔ تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے"!

ترلوچن اس وقت 'جو ہو سو ہو' بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا۔

"میں کل ہی کٹوا دوں گا۔"

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔

"تم بکواس کرتے ہوئے ترلوچن۔ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔

"تم دیکھ لو گی۔"

"دیکھ لوں گی۔"

اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور

"پھوں پھوں"

کرتی باہر نکل گئی۔ ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا۔ وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیے اور داڑھی بھی منڈوا دی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیریس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔ بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آ جائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر کے دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی۔ پھر

"مائی ڈارلنگ ترلوچن"

کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔ اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا۔ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا۔

"نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔"

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ایسے ہی چلتا ہے۔"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا۔

"شادی کل ہو گی"!

"ضرور۔"

موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔ طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لیے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لیے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔ موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چل گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہیں رہے گی۔ ترلوچن پر کیا گزری؟۔ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بُھول گیا۔ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ

اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کد کڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی۔ وہ بے حیا تھی۔ بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے۔ جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہو گی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔ وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔ ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی۔

”تم سکھ ہو۔ مجھے تم سے نفرت ہے“!

۔ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈر ویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لیے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔ ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا وہ چڑ جاتی تھی۔

”یہ حیا ویا کیا بکواس ہے۔ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو۔ تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا۔ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو۔ تم سکھ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلکی سا انڈر ویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح مذہب میں شامل ہے۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈر ویئر میں چھپا بیٹھا ہے“!

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔ پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔ کرپا کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی۔ جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ خطرے میں تھی، وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔ ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری۔ اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟۔ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں۔ آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چیخ جائے گی۔ ترلوچن، پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا۔

”یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودا ہو گئی۔ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟“

۔موذیل نے ایک اور انگڑائی لی۔ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں۔ ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردعمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی۔

”تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟“

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔ موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔

”اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو سکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔“

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔

”بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟“

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا۔

”بیمار رہی ہو؟“

”نہیں۔“

موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

”پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟“

”میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔“

موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔

”تم گویا کہ۔ اب پھر۔ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔“

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔

”ہاں“!

”مبارک ہو۔“

موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔

”کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟“

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں“!

”مبارک ہو۔ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟“

”نہیں۔“

”یہ بہت بری بات ہے۔“

موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔

”ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا۔

”کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟“

”نہیں۔“

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے

”نہیں“

کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔ مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔

”تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔“

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا۔ موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے۔ بےوفا ہے۔ بےمروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا۔

”موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔

”وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟“

”اس کو ابھی تک معلوم نہیں۔ داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی۔ محض انتقامی طور پر۔ اسے کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں۔ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے“

ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔ موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی۔

”یہ بہت اچھا ہے۔ مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے۔ دیکھو، کس زور سے کاٹا ہے۔“

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

”کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”ابھی کچھ پتہ نہیں۔“

یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔ چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔

”ترلوچن۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟“

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی۔

”تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔ جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟“

”مشکل!۔ موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔ کسی بھی معاملے کی نزاکت۔ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔“

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔

”افسوس بی ڈیمڈ۔ سلی ایڈیٹ۔ تم یہ سوچو کہ تمہاری اُس۔ کیا نام ہے اس کا۔ اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے۔ تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے۔ تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ تم ایک سِلی قسم کے آدمی ہو۔ اور بہت ڈرپوک۔ مجھے نڈر مرد چاہیے۔ لیکن چھوڑو ان باتوں کو۔ چلو آؤ، تمہاری اس کور کو لے آئیں“!

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا۔ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا۔

”کہاں سے؟“

”وہیں سے، جہاں وہ ہے۔ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔“

”مگر سنو تو۔ کرفیو ہے۔“

”موذیل کے لیے نہیں۔ چلو آؤ۔“

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرح کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔ ترلوچن نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

موذیل نے کہا۔

”یہ تمہاری داڑھی۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔“

”ننگے سر“!

ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔

”میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔“

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔

”کیوں؟“

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔

”تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔“

”کیوں ٹھیک نہیں۔“

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔“

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔

”تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔ گدھے کہیں کے۔ اس کی جان کا سوال ہے۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کورکا، جس سے تم محبت کرتے ہو۔“

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔“

موذیل چڑ گئی۔

”اوہ، تمہاری محبت بی ڈیمڈ۔ میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہارے طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اس کی جان کو خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔ اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔“

ترلوچن نے کہا۔

”وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔“

”بہت اچھا کرتے ہو۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیے جاؤ گے۔“

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔

”مجھے اس کی پروا نہیں۔ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا“!

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاپ کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔

”گدھے۔ تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے۔ تمہاری وہ۔ کیا نام ہے اس بھڑوی کا۔ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔ تم سکھ۔ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو“!

ترلوچن بھنا گا۔

”بکواس نہ کرو“!

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔

”ڈارلنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی۔ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔

”تم کپڑے نہیں پہنو گی“!

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔

”نہیں۔ چلے گا اسی طرح۔“

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔ باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تنکڑی ٹانگیں چوڑی کیے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا۔

”تم بہت ذلیل ہو۔“

موذیل مسکرائی۔

”یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔“

پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔

”یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں“

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمدورفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔“

موزیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موزیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موزیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لیے خاموش رہا۔ ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کے دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موزیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہا ہے۔ چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔

”اے۔ کدھر جا رہا ہے۔“

ترلوچن سہم گیا۔ موزیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔

”اوہ، تم۔ ہم کو پچانا نہیں تم نے۔ موزیل۔“

پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔

”ادھر اس باجو۔ ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے۔“

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا۔

”لو پیو۔“

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موزیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا

”ہیر از لائٹ“!

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موزیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی۔ جس میں سے گزر کر انھیں۔ محلے جانا تھا۔ ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موزیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم سیپوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ موزیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موزیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اسے کہا۔

”ترلوچن ڈیئر۔ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں۔ تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔ سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔“

ترلوچن خاموش رہا۔ جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے۔ جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی، جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موزیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی۔ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لحظے کے لیے اس نے معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ چلو آؤ۔“

دونوں چلنے لگے۔ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا۔ کہ موزیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے زور سے اس کو آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا۔

”اے کیا کرتا ہے۔ اپنے بھائی کو مارتا ہے۔ ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔“

پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔

”کریم۔ اٹھاؤ، یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔“

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موزیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹہوکا دیا۔

”عیش کر سالی۔ عیش کر“

پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔ ترلوچن بڑبڑایا۔

”کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے“!

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔

”کوئی ذلیل حرکت نہیں۔ سب چلتا ہے۔ آؤ۔“

اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیے۔ یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا۔

”کس گلی میں جانا ہے؟“

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔

”تیسری گلی میں۔ نکڑ والی بلڈنگ“!

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی۔ ایک آدمی بڑے سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔

”موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔

”ترلوچن ڈیئر۔ یہ پگڑی اتار دو“!

ترلوچن نے جواب دیا۔

”میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا“!

موذیل جھنجھلا گئی۔

”تمھاری مرضی۔ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے“

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پر اسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا۔

”دیکھو، ایسا کرو۔ میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں۔ تم میرے پیچھے آنا۔ بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔ سمجھے۔ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔“

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں وہ بلڈنگ کے اندر تھے۔ سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا۔

”کون سا مالا؟“

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”دوسرا۔“

”چلو۔“

یہ کہہ وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔ دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔ ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی۔

”مہنگا سنگھ جی۔ مہنگا سنگھ جی“!

اندر سے مہین آواز آئی۔

”کون؟“

”ترلوچن“!

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی دونوں اندر داخل ہوئے۔ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا۔ جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔ ترلوچن سرخ ہو گیا۔ موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔

”ڈرو نہیں، ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے۔“

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہو گئی۔ ترلوچن نے اس سے کہا۔

”سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں۔ اور اپنی ماتا جی سے بھی۔ لیکن جلدی کرو۔“

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔

”اسے پکڑ لیا انھوں نے“!

ترلوچن نے پوچھا۔

”کسے؟“

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑ اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔

”پکڑ لیا تو اچھا ہوا۔ تم یہ کپڑے اتارو۔“

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آنا فانا اس کی قمیض اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانھوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی۔

”جاؤ، اسے لے جاؤ۔ لیکن ٹھہرو۔“

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیے اور اس سے کہا۔

”جاؤ۔ جلدی نکل جاؤ۔“

ترلوچن نے اس سے کہا۔

”آؤ۔“

مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانھوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

”تم جاتے کیوں نہیں ہو؟“

موذیل کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔ ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔

”اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔“

”جہنم میں جائیں وہ۔ تم اسے لے جاؤ۔“

”اور تم؟“

”میں آجاؤں گی۔“

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر انھوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔ کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔ موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا۔

”سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب سمجھ میں آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔“

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔

”دروازہ۔“

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی۔

”میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں۔ تم میرے پیچھے بھاگنا۔ میں اوپر چڑھ جاؤں گی۔ تم بھی اوپر چلے آنا۔ یہ جو لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔“

ترلوچن نے پھر پوچھا۔

”پھر؟“

موذیل نے کہا۔

”یہ تمہاری۔ کیا نام ہے اس کا۔ موقعہ پا کر نکل جائے۔ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔“

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔ سب بوکھلا گئے۔ اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اسکے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔ موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔ وہ جو لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا۔ اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی۔ پتھریلے فرش پر۔ ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستہ بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے ارد گرد جمع ہو گئے۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔ ترلوحن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی۔

”موذیل۔ موذیل۔“

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔ ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا۔

”جاؤ، دیکھو۔ میرا انڈرویئر وہاں ہے کہ نہیں۔ میرا مطلب ہے وہ۔“

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا۔

”تم سچ مچ سکھ ہو۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔“

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا

”یہ میاں بھائی ہے۔ لیکن بہت دادا قسم کا۔ میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔“

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے۔ موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا

”اوہ ڈیم اٹ۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔

”آل رائٹ ڈارلنگ۔ بائی بائی۔“

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔

”لے جاؤ اس کو۔ اپنے اس مذہب کو۔“

اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

موسم کی شرارت

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوموسم کی شرارت

شام کو سیر کے لیے نکلا اور ٹہلتا ٹہلتا اُس سڑک پر ہو لیا جو کشمیر کی طرف جاتی ہے۔ سڑک کے چاروں طرف چیڑ اور دیودار کے درخت، اونچی اونچی پہاڑیوں کے دامن پر کالے فیتے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے اس فیتے میں ایک کپکپاہٹ سی پیدا کر دیتے۔ میرے دائیں ہاتھ ایک اُونچا ٹیلہ تھا جس کے ڈھلوانوں میں گندم کے ہرے پودے

نہایت ہی مدھم سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے یہ سرسراہٹ کانوں پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں بند کر لو تو یوں معلوم ہوتا کہ تصور کے گدگدے قالینوں پر کئی کنواریاں ریشمی ساڑھیاں پہنے چل پھر رہی ہیں۔ ان ڈھلوانوں کے بہت اوپر چیڑ کے اونچے درختوں کا ایک ہجوم تھا۔ بائیں طرف سڑک کے بہت نیچے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کو جھاڑیوں نے گھیر رکھا تھا اس سے کچھ فاصلے پر پست قد جھونپڑے تھے۔ جیسے کسی حسین چہرے پر تل۔ ہوا گیلی اور پہاڑی گھاس کی بھینی بھینی باس سے لدی ہوئی تھی۔ مجھے اس سیر میں ایک ناقابلِ بیان لذت محسوس ہو رہی تھی۔ سامنے ٹیلے پر دو بکریاں بڑے پیار سے ایک دوسری کو اپنے ننھے ننھے سینگوں سے ریل رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر کُتے کا ایک پلّا جو کہ جسامت میں میرے بوٹ کے برابر تھا۔ ایک بھاری بھر کم بھینس کی ٹانگ سے لپٹ لپٹ کر اُسے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شاید بھونکتا بھی تھا۔ کیونکہ اُس کا منہ بار بار کھلتا تھا۔ مگر اُس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ میں یہ تماشا دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا کتے کا پلّا دیر تک بھینس کی ٹانگوں پر اپنے پنجے مارتا رہا۔ مگر اس کی ان دھمکیوں کا اثر نہ ہوا۔ جواب میں بھینس نے دو تین مرتبہ اپنی دم ہلا دی اور بس! ۔۔۔۔۔۔ لیکن ایکا ایکی جب کہ پلّا حملے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ بھینس نے زور سے اپنی دم ہلائی۔ کسی سیاہ سی چیز کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ اس انداز سے اُچھلا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں ان کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔ آسمان پر بادل کے سفید ٹکڑے پھیلے ہُوئے بادبان معلوم ہوتے تھے۔ جن کو ہوا ادھر سے اُدھر دھکیل رہی تھی۔ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قد آور درخت سنتری کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے بادل کا ایک ٹکڑا جھوم رہا تھا۔ بادل یہ دراز قد درخت اور پہاڑی۔۔۔۔۔۔ تینوں مل کر بہت بڑے جہاز کا منظر پیش کر رہے تھے۔ میں نیچر کی اس تصویر کشی کو بے خود ہو کر دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً لاری کے ہارن نے مجھے چونکا دیا۔ خیالوں کی دنیا سے اتر کر میں آوازوں کی دنیا میں آگیا۔ من کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مساموں کے سارے کان کھل گئے۔ میں فوراً سڑک کے ایک طرف ہٹ گیا۔ لاری پرکار کی طرح بڑی تیزی سے موڑ کے نصف دائرے پر گھومی اور ہوا ہوئی میرے پاس سے گزر گئی۔ ایک اور لاری گزرنے پر موڑ کے عقب میں پانچ چھ گائیں نمودار ہوئیں۔ جو سر لٹکائے ہولے ہولے چل رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا جب یہ میرے آگے سے گزر گئیں تو میں نے قدم اٹھایا اور موڑ کی جانب بڑھا۔ چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر جب میں سڑک کے بائیں ہاتھ والے ٹیلے کے ایک بہت بڑے پتھر کے آگے سے نکل گیا۔ جو موڑ پر سنگین پردے کا کام دے کر سڑک کے دوسرے حصّے کو بالکل اوجھل کیے ہوئے تھا۔ تو دفعتاً میری نظریں ایک خودرو پودے سے دوچار ہوئیں۔ وہ جوان تھی، اُس گائے کی طرح جوان، جس کے پٹھے جوانی کے جوش سے پھڑک رہے تھے۔ اور جو اس کے پاس سے اپنے اندر ہزاروں کپکپاہٹیں لیے گزر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ میں ٹھہر گیا۔ وہ ایک ننھے سے بچھڑے کو ہانک رہی تھی۔ دو تین قدم چل کر بچھڑا ٹھہر گیا اور اپنی جگہ پر ایسا جما کہ ہلنے کا نام نہ لیا۔ لڑکی نے بہتیرا زور لگایا۔ لاکھ جتن کیے وہ ایک قدم آگے نہ بڑھا اور کان سمیٹ کر ایسا خاموش ہوا۔ گویا وہ کسی کی آواز ہی نہیں سنتا۔ یہ تیور دیکھ لڑکی نے اپنی چھڑی سے کام لینا چاہا۔ مگر چیڑ کی پتلی سی ٹہنی کار آمد ثابت نہ ہُوئی۔ تھک ہار کر اس نے بڑی مایوسی اور انتہائی غصّے کی ملی جُلی حالت میں اپنے دونوں پاؤں زمین پر زور سے مارے اور کاندھوں کو جنبش دے کر اس انداز سے کھڑی ہو گئی۔ گویا اس حیوان سے کہنا چاہتی ہے۔

”لو اب ہم بھی یہاں سے ایک انچ نہ ہلیں گے۔ میں ابھی لڑکی کی اس پیاری حرکت کا مزا لینے کی خاطر ذہن میں دُہرانے ہی والا تھا کہ دفعتاً بچھڑا خود بخود اُٹھ بھاگا۔ وہ اُس تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا کہ اس کی کمزور ٹانگیں میز کے ڈھیلے پایوں کی طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔ لڑکی بچھڑے کی اس شرارت پر بہت متحیّر اور خشمناک ہُوئی۔ نہ جانے میں کیوں خوش ہُوا کہ اسی اثنا میں اُس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف ہم دونوں بیک وقت ہنس پڑے۔ فضا پر تاروں کا چھڑکاؤ سا ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے کے اندر اندر ہوا۔ اُس نے پھر میری طرف دیکھا۔ مگر اس دفعہ سوال کرنے والی لاج بھری آنکھوں سے۔۔۔۔۔۔ شاید اس کو اب اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس کی مسکراہٹ کسی غیر مرد کے تبسم سے جا ٹکرائی ہے۔ وہ گہرے سبز رنگ کا ڈوپٹہ اوڑھے ہُوئے تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کی ہریاول نے اپنی سبزی اُسی سے مستعار لی ہے۔ اس کی شلوار بھی اسی رنگ کی تھی۔ اگر وہ کُرتہ بھی اُسی رنگ کا پہنے ہوتی۔ تو دور سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ سڑک کے درمیان ایک چھوٹا سا درخت اُگ رہا ہے۔ ہوا کے ملائم جھونکے اس کے سبز دوپٹے میں بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے خود کو بیکار کھڑی دیکھ کر اور مجھ کو اپنی طرف گھورتے پا کر وہ بے چین سی ہو گئی۔ اور ادھر اُدھر یونہی دیکھا کہ جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ پھر اپنے دوپٹے کو سنوار کر اُس نے اُس طرف کا رُخ کیا۔ جدھر گائیں آہستہ آہستہ جا رہی تھیں۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ پتھروں کے پاس کھڑا تھا۔ جو سڑک کے کنارے کنارے دیوار کی شکل میں چُنے ہوئے تھے۔ جب وہ میرے قریب آئی۔ تو غیر ارادی طور پر اُس نے میری طرف نگاہیں اُٹھائیں لیکن فوراً سر کو جھٹک کر نیچے جھکا لیں۔ کولھے مٹکاتی اور چھڑی ہلاتی میرے پاس سے یوں گزری۔ جیسے کبھی کبھی میرا اپنا خیال میرے ذہن سے اپنا کاندھا رگڑ کر گزر جایا کرتا ہے۔ اس کے سلیپر جو غالباً اُس کے پاؤں میں کھُلے تھے۔ سڑک پر گھسٹنے سے شور پیدا کر رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر اُس نے اپنے قدم تیز کیے اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ بیس پچیس گز کے فاصلے پر وہ پتھروں سے چُنی ہُوئی دیوار پر پھُرتی سے چڑھی اور مجھے ایک نظر دیکھ کر دوسری طرف کود گئی۔ پھر دوڑ کر ایک جھونپڑے پر چڑھ کر منڈیر پر بیٹھ گئی۔ اس کی یہ حرکات۔۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔ میری طرف اُس کا تین بار دیکھنا۔۔۔۔۔۔ کیا اُس کی مسکراہٹ کے ساتھ میرے تبسّم کے کچھ ذرے تو نہیں چمٹ گئے تھے۔ اس خیال نے میری نبض کی دھڑکن تیز کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میرے پیچھے جھاڑیوں میں جنگل کے پنچھی گیت برسا رہے تھے۔ ہوا میں کھُلی ہوئی موسیقی مجھے کس قدر پیاری معلوم ہوئی۔ نہ جانے میں کتنے گھونٹ اس راگ ملی ہوئی ہوا کے غٹا غٹ پی گیا۔ جھونپڑے سے کچھ دُور جھاڑیوں کے پاس لڑکی کی گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ ان سے پرے پتھریلی پگڈنڈی پر ایک کشمیری مزدور گھاس کا گٹھا کمر پر لادے اوپر چڑھ رہا تھا۔ دُور۔۔۔۔۔۔ بہت دُور ایک ٹیلے سے دُھواں بل کھاتا ہوا آسمان کی نیلاہٹ میں گھل مِل رہا تھا۔ میرے گردوپیش پہاڑیوں کی بلندیوں پر ہرے ہرے چیڑوں اور سانولے پتھروں کے

چوڑے چکلے سینوں پر ڈُوبتے سورج کی زریں کرنیں سیاہ اور سنہرے رنگ کے مخلوط سائے بکھیر رہی تھیں کتنا سُندر اور سہانا سماں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو عظیم الشان محبت میں گِھرا ہوا پایا۔ وہ جوان تھی۔ اُس کی ناک اس پنسل کی طرح سیدھی اور ستواں تھی جس سے میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اُس جیسی آنکھیں بہت کم دیکھی ہیں اس پہاڑی علاقے کی ساری گہرائیاں ان میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ پلکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزری تھی تو دھوپ کی ایک لرزاں شعاع اس کی پلکوں میں الجھ گئی تھی۔ اس کا سینہ مضبوط اور کشادہ تھا۔ اس میں جوانی سانس لیتی تھی۔ کاندھے چوڑے باہیں گول اور گدراہٹ سے بھرپور، کانوں میں چاندی کے لمبے لمبے بُندے تھے۔ بال دیہاتیوں کی طرح سیدھی مانگ نکال کر گندھے ہوئے تھے جس سے اس کے چہرے پر وقار پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جھونپڑے کی مٹیالی چھت پر بیٹھی اپنی چھڑی سے منڈیر کوٹ رہی تھی میں سڑک پر کھڑا تھا

”کس قدر بیوقوف ہوں“

دفعتہ میں نے ہوش سنبھالا اور اپنے دل سے کہا۔ اگر کوئی مجھے اس طرح اُس کو گھورتا ہوا دیکھ لے تو کیا کہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

”یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟“

جب میں نے ان الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں کسی اور ہی خیال میں تھا۔ اس احساس پر مجھے ہنسی آگئی اور یونہی ایک بار اُس کو اور دیکھ کر سیر کے قصد سے آگے بڑھا۔ دو ہی قدم چل کر مجھے خیال آیا کہ یہاں بٹوت میں صرف چند روز قیام کرنا ہے کیوں نہ رخصت ہوتے وقت اُس کو سلام کر لوں۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے شاید میرے سلام کا ایک آدھ ذرّہ اسکے حافظے پر ہمیشہ کے لیے جم جائے“

میں ٹھہر گیا اور کچھ دیر منتظر رہنے کے بعد میں نے سچ مچ اُس کو سلام کرنے کے لیے اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف بڑھایا۔ مگر فوراً اس احمقانہ حرکت سے باخبر ہو کر ہاتھ کو یونہی ہوا میں ہلا دیا اور سیٹی بجاتے ہوئے قدم تیز کر دیئے۔ مئی کا گرم دن شام کی خنکی میں آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔ سامنے پہاڑیوں پر ہلکا سا دُھواں چھا گیا تھا، جیسے خوشی کے آنسو آنکھوں کے آگے ایک چادر سی تان دیتے ہیں۔ اس دھندلکے میں چیڑ کے درخت تحتِ شعور میں چھپے ہوئے خیالات معلوم ہوئے یہ ایک ہی قطار میں پھیلتے چلے گئے تھے۔ میرے پاس ہی ایک موٹا سا کوا اپنے سیاہ اور چمکیلے پر پھیلائے سستا رہا تھا۔ ہوا کا ہر جھونکا میرے جسم کے ان حصوں کے ساتھ چھو کر جو کپڑوں سے آزاد تھے ایک ایسی محبت کا پیغام دے رہا تھا جس سے میرا دل اس سے قبل بالکل نا آشنا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں، اور مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ وہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر یہ کہنا چاہتا ہے۔

”سوچتے کیا ہو۔ جاؤ محبت کرو“!

میں سڑک کے کنارے پتھروں کی دیوار پر بیٹھ گیا اور اس۔ اُس کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا کہ مبادا کوئی رہگزار سارا معاملہ تاڑ جائے۔ وہ اسی طرح سر جھکائے اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔ اسے کھیل میں کیا لطف آتا ہے؟۔ وہ ابھی تھکی نہیں؟ کیا اُس نے واقعی دوبارہ میری طرف مڑ کر دیکھا؟ کیا وہ جانتی ہے کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوں؟“

۔ آخری سوال کس قدر مضحکہ خیز تھا۔ میں جھینپ گیا۔ لیکن۔ لیکن اس کے باوجود اُس کو دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ ایک مرتبہ جب میں نے اس کو دیکھنے کے لیے اپنی گردن موڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کا منہ میری طرف ہے اور وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں مخمور ہو گیا۔ میرے اور اس کے درمیان گو فاصلہ کافی تھا مگر میری آنکھیں جن میں میرے دل کی بصارت بھی چلی آئی تھی، محسوس کر رہی تھیں کہ وہ سپنوں کا گھونگٹ کاڑھے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میری طرف۔ میری طرف! میرے سینے سے بے اختیار آہ نکل گئی۔ عجیب بات ہے کہ سکھ اور چین کا ہاتھ بھی درد بھرے تاروں پر ہی پڑتا ہے۔ اس آہ میں کتنی راحت تھی۔ کتنا سکون تھا۔ اس لڑکی نے جو میرے سامنے جھونپڑے کی چھت پر بیٹی تھی۔ میرے شباب کے ہر رنگ کو شوخ کر دیا تھا۔ میرے روئیں روئیں سے محبت پھوٹ رہی تھی۔ شعریت جو میرے سینے کے کسی نامعلوم کونے میں سوئی پڑی تھی، اب بیدار ہو چکی تھی۔ کہ دوشیزگی اور شعریت توام بہنیں ہیں؟ اگر اس وقت وہ مجھ سے ہمکلام ہوتی تو میں ایک لفظ تک اپنی زبان سے نہ نکالتا۔ خاموشی میری ترجمان ہوتی۔ میری گونگی زبان کتنی باتیں اس تک پہنچا دیتی۔ میں اس کو اپنی خاموشی میں لپیٹ لیتا۔ وہ ضرور متحیر ہوتی اور اس حالت میں بڑی پیاری معلوم ہوتی۔ اس خیال سے کہ راستے میں یوں بیکار کھڑے رہنا ٹھیک نہیں، میں دیوار پر سے اٹھا۔ میرے سامنے ٹیلے پر جانے کے لیے ایک پگڈنڈی تھی۔ اُوپر ٹیلے کے کسی پتھر پر بیٹھ کر میں اُسکو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ درختوں کی جڑوں اور جھاڑیوں کا سہارا لیکر میں نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ راستے میں دو تین بار میرا پاؤں پھسلا اور نوکیلے پتھروں پر گرتے گرتے بچا۔ ٹیلے پر جہاں پتھر نہیں تھا، کہیں کہیں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں آلو بوئے ہوئے تھے۔ اسی قسم کے ایک ننھے سے کھیت کو طے کر کے میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ میرے دائیں ہاتھ کو زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جس میں گندم اُگ رہی تھی۔ چڑھائی کی وجہ سے میرا دم پُھول گیا مگر شام کی ٹھنڈی ہوا نے یہ تکان فوراً ہی دُور کر دی۔ اور میں جس کام کے لیے آیا تھا، اس میں مشغول ہو گیا۔ اب وہ جھونپڑے کی چھت پر کھڑی تھی اور خدا معلوم وہ کیسی کیسی انوکھی آوازیں نکال رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان دونوں بکریوں کو سڑک پر چڑھنے سے روک رہی تھی، جو گھاس چرتی ہوئی آہستہ آہستہ اوپر کا رخ کر رہی تھیں۔ ہوا تیز تھی، گندم کے پکے ہُوئے خوشے خُرخُر کرتی ہُوئی بلی کی مونچھوں کی طرح تھر تھرا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ہوا کی سیٹیاں شام کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ مٹی کے ڈھیلوں کے ساتھ کھیلتا ہوا میں اس کی طرف بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ اب جھونپڑے پر بڑے عجیب انداز سے ٹہل رہی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے

اپنے سر کو جنبش دی۔ تو میں سمجھا کہ وہ میری موجودگی سے باخبر۔ مجھے دیکھ رہی ہے۔ میری ہستی کے سارے دروازے کھل گئے۔ جانے کتنی دیر میں وہاں بیٹھا رہا؟۔ ایکا ایکی بدلیاں گھر آئیں اور بارش شروع ہوگئی۔ میرے کپڑے بھیگ رہے تھے لیکن میں وہاں سے کیونکر جاسکتا تھا جبکہ وہ۔ وہیں چھت پر کھڑی تھی۔ اس خیال سے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ وہ صرف میری خاطر بارش میں بھیگ رہی ہے۔ یکا یک بارش تیز ہوگئی۔ وہ اٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر۔ ہاں، میری طرف نگاہ اٹھائے بغیر چھت پر سے نیچے اُتری اور دوسرے جھونپڑے میں داخل ہوگئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بارش کی بوندیں میری ہڈیوں تک پہنچ گئی ہیں۔ پانی سے بچاؤ کرنے کے لیے میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ مگر پتھر اور جھاڑیاں پناہ کا کام نہیں دے سکتی تھیں۔ ڈاک بنگلے تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے اور خیالات سب بھیک گئے۔ جب وہاں سے سیر کو نکلا تھا تو ایک خشک آدمی تھا، راستے میں موسم نے شاعر بنا دیا۔ واپس آیا تو بھیگا ہوا آدمی تھا۔ صرف بھیگا ہوا۔ بارش ساری شاعری بہالے گئی تھی!

موم بتی کے آنسو

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوموم بتی کے آنسو

غلیظ طاق پر جو شکستہ دیوار میں بنا تھا۔ موم بتی ساری رات روتی رہی تھی۔ موم پگھل گھل کر کمرے کے گیلے فرش پر اوس کے ٹھٹھرے ہوئے دھندلے قطروں کے مانند بکھر رہا تھا۔ ننھی لاجو موتیوں کا ہار لینے پر ضد کرنے اور رونے لگی۔ تو اس کی ماں نے موم بتی کے ان جمے ہوئے آنسوؤں کو ایک کچے دھاگے میں پرو کر اس کا ہار بنا دیا۔ ننھی لاجو اس ہار کو پہن کر خوش ہو گئی۔ اور تالیاں بجاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ رات آئی۔ میل بھرے طاقچے میں نئی موم بتی روشن ہوئی اور اس کی کانی کانی آنکھ اس کمرے کی تاریکی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے حیرت کے باعث چمک اٹھی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ اس ماحول کی عادی ہوگئی۔ تو اس نے خاموشی سے ٹکٹکی باندھ کر اپنے گردوپیش کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ننھی لاجو ایک چھوٹی سی کھٹیا پر پڑی سو رہی تھی۔ اور خواب میں اپنی سہیلی بندو سے لڑ رہی تھی کہ وہ اپنی گڑیا کا بیاہ اس کے گڈے سے کبھی نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ وہ بدصورت ہے۔“

لاجو کی ماں کھڑکی کے ساتھ لگی، خاموش اور نیم روشن سڑک پر پھیلی ہوئی کیچڑ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، سامنے بھٹیارے کی بند دکان کے باہر چبوترے پر انگیٹھی میں سے کوئلوں کی چنگاریاں ضدی بچوں کی طرح مچل مچل کر نیچے گر رہی تھیں۔ گھنٹہ گھر نے غنودگی میں بارہ بجائے، بارہ کی آخری پکار دسمبر کی سرد رات میں تھوڑی دیر تک کانپتی رہی اور پھر خاموشی کا لحاف اوڑھ کر سو گئی۔ لاجو کی ماں کے کانوں میں نیند کا بڑا سہانا پیغام گنگنایا۔ مگر اس کی انتڑیاں اس کے دماغ تک کوئی اور بات پہنچا چکی تھیں۔ دفعتہً سرد ہوا کے جھونکے سے گھنگھروؤں کی مدھم جھنجھناہٹ اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے یہ آواز اچھی طرح سننے کے لیے کانوں میں اپنی سماعت کی طاقت بھرنی شروع کر دی۔ گھنگھرو رات کی خاموشی میں مرتے ہوتے آدمی کے حلق میں اٹکے ہوئے سانس کی طرح بجنا شروع ہوگئے، لاجو کی ماں اطمینان سے بیٹھ گئی۔ گھوڑے کی تھکی ہوئی ہنہناہٹ نے رات کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اور ایک تانگہ لالٹین کے کھمبے کی بغل میں آکھڑا ہوا۔ تانگہ والا نیچے اترا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جس کی چِق اٹھی ہوئی تھی۔ اور تخت پر ایک دھندلا سایہ بھی پھیلا تھا۔ اپنے کھردرے کمبل کو جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر تانگے والے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ساڑھے تین روپے کا کریانہ تھا۔ اس میں اس نے ایک روپیہ چار آنے اپنے پاس رکھ لیے۔ اور باقی پیسے تانگے کی اگلی نشست کا گدا اٹھا کر اس کے نیچے چھپا دیے یہ کام کرنے کے بعد وہ کوٹھے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ لاجو کی ماں چندو سنیاری اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ مادھو تانگے والا اندر داخل ہوا اور دروازے کی زنجیر چڑھا کر اس نے چندو سنیاری کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”بھگوان جانتا ہے، مجھے تجھ سے کتنا پریم ہے۔ اگر جوانی میں ملاقات ہوتی تو یاروں کا تانگہ گھوڑا ضرور بکتا“!

یہ کہہ کر اس نے ایک روپیہ اس کی ہتھیلی میں دبا دیا۔ چندو سنیاری نے پوچھا۔

”بس؟“

”یہ لے۔ اور“

مادھو نے چاندی کی چونی اس کی دوسری ہتھیلی پر جما دی۔

”تیری جان کی قسم! بس یہی کچھ تھا میرے پاس“!

رات کی سردی میں گھوڑا بازار میں کھڑا ہنہناتا رہا۔ لالٹین کا کھمبا ویسے ہی اونگھتا رہا۔ سامنے ٹوٹے ہوئے پلنگ پر مادھو بیہوش لیٹا تھا۔ اس کی بغل میں چندو سنیاری آنکھیں کھولے پڑی تھی اور پگھلتے ہوئے موم کے ان قطروں کو دیکھ رہی تھی جو گیلے فرش پر گر کر چھوٹے چھوٹے دانوں کی صورت میں جم رہے تھے۔ وہ ایکا ایکی دیوانہ وار اٹھی اور لاجو کی کھٹیا کے پاس بیٹھ گئی۔ ننھی لاجو کے سینے پر موم کے دانے دھڑک رہے تھے۔ چندو سنیاری کی دھندلی آنکھوں کو ایسا معلوم ہوا کہ موم بتی کے ان جمے ہوئے قطروں میں اس کی ننھی لاجو کی جوانی کے

آنسو چھپ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس کا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھا اور لاجو کے گلے سے وہ ہار جدا ہو گیا۔ پگھلے ہوئے موم پر سے موم بتی کا جلتا ہوا دھاگا پھسل کر نیچے فرش پر گرا اور اس کی آغوش میں سو گیا۔ کمرے میں خاموشی کے علاوہ اندھیرا بھی چھا گیا۔

میرا اور اس کا انتقام

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومیرا اور اس کا انتقام

گھر میں میرے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ پتا جی کچہری میں تھے اور شام سے پہلے کبھی گھر آنے کے عادی نہ تھے۔ ماتا جی لاہور میں تھیں اور میری بہن بملا اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی تھی! میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب لیے اونگھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ پاربتی ہے۔ دروازے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے اس نے مجھ سے پوچھا۔

”موہن صاحب! بملا اندر ہے کیا؟“

جواب دینے سے پیشتر ایک لمحے کے لیے پاربتی کی تمام شوخیاں میری نگاہوں میں پھر گئیں اور جب میں نے سوچا کہ گھر میں کوئی متنفس موجود نہیں تو مجھے ایک شرارت سوجھی، میں نے جھوٹ بولتے ہوئے بڑی بے پروائی کے انداز میں کہا:۔

”اپنے کمرے میں بلاؤز ٹانک رہی ہے۔“

یہ کہہ کر میں دروازے سے باہر نکل آیا۔ بملا کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ جب میں نے گلی کے روشندان سے پاربتی کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ تو جھٹ سے دروازے میں داخل ہو کر اس کو بند کر دیا اور کنڈی چڑھا کر وہ قفل لگا دیا جو پاس ہی دیوار پر ایک کیل سے لٹک رہا تھا اور دروازے میں تالا لگانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور صوفے پر لیٹ کر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتا رہا۔ پاربتی کے کردار کا ہلکا سا نقشہ یوں کھینچا جا سکتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک شوخ چنچل اور شرمیلی لڑکی ہے۔ اگر اس گھڑی آپ سے بڑی بے تکلفی سے بات کر رہی ہے تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ اسے بالکل مختلف پائیں گے۔ شرارت اس کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے لیکن بعض اوقات اتنی سنجیدہ اور متین ہو جاتی ہے کہ اس سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ محلے بھر میں وہ اپنی قسم کی واحد لڑکی ہے۔ لڑکوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں اسے خاص لطف آتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا جواب میں معمولی سا مذاق بھی کر دے تو اسے سخت ناگوار گزرتا ہے۔ گلی کے نوجوانوں کے نازک جذبات سے کھیلنے میں اسے خاص لطف آتا ہے۔ بلی کی طرح وہ چاہتی ہے کہ چوہا اس کے پنجوں کے نیچے دبکا رہے اور وہ اس کو ادھر ادھر پٹخ پٹخ کر کھیلتی رہے جب اکتا جائے تو چھوڑ کر چلی جائے۔ کوٹھے پر چڑھ کر محلے کے لڑکوں کے پتنگ توڑ لینے میں اس کو خاص مہارت حاصل ہے۔ ہمارے گھر میں اکثر اس کا آنا جانا تھا۔ اس لیے مَیں اس کی شوخ طبیعت سے ایک حد تک واقف تھا۔ میرے ساتھ وہ کئی مرتبہ نوک جھونک کر چکی تھی۔ مگر میں دوسروں کی موجودگی میں جھینپ کر رہ جاتا تھا۔ مجھے اس سے نفرت نہ تھی۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شے بھی ایسی نہیں جس سے نفرت کی جا سکے۔ البتہ اس کی طبیعت کسی قدر الجھی ہوئی تھی اور اس کی حد سے زیادہ شوخی بعض اوقات میرے جذبات پر بہت گراں گزرتی تھی۔ اگر میں سب کے سامنے اس کی پھلجھڑی ایسی زبان کو (جس سے کبھی تیز و تند اور کبھی نرم و نازک شرارے نکلتے تھے) اپنی گویائی کی قوت پر زور دے کر بند کر سکتا تو مجھے یہ شکایت ہرگز نہ ہوتی۔ بلکہ اس میں خاص لطف بھی حاصل ہوتا مگر یہاں موجودہ نظام کی موجودگی میں اس قسم کے خواب کیونکر پورے ہو سکتے ہیں! پاربتی کے متناسب جسم میں جملہ خوبیاں بھری پڑی تھیں۔ دوشیزگی اس کے ہر عضو میں سانس لیتی تھی۔ آنکھوں میں دھوپ اور بارش کے تصادم ایسی چمک، گدرائے ہوئے جوبن کا دلکش ابھار، آواز میں صبح کی خاموش فضا میں مندر کی گھنٹیوں کی صدا ایسی حلاوت، اور چال۔ ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ اس کے خرام کا نقشہ پیش کیا جا سکے۔ گھر خالی تھا، دوسرے لفظوں میں میدان صاف تھا! اس لیے میں نے موقع بہت مناسب خیال کیا اور اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ میری عرصے سے خواہش تھی کہ اس پھسل جانے والی مچھلی کو ایک بار پکڑ کر اتنا ستاؤں۔ اتنا ستاؤں کہ رو دے اور کچھ عرصے کے لیے اپنی تمام شوخیاں بھول جائے۔ میں کمرے میں بیٹھا تھا کہ وہ حسب توقع گھبرائی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔

”دروازہ میں تالا لگا ہوا ہے۔“

میں بناوٹی حیرت سے مضطرب ہو کر یکایک اٹھ کھڑا ہو گیا۔

”کیا کہا؟“

”صدر دروازے میں تالا لگا ہوا ہے“!

”باہر سے گلی کے ان گندے انڈوں نے تالا لگا دیا ہو گا“!

یہ کہتا ہوا میں اس کے پاس آ گیا۔ اس پر پاربتی نے کہا۔

”نہیں، نہیں تالا تو اندر سے لگا ہوا ہے“!

”اندر سے۔ اور بملا کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں تو نہیں۔ کونے کونے میں دیکھ آئی ہوں۔ کہیں بھی نہیں ملی۔“

”تو پھر اسی نے شرارت کی ہے۔ جاؤ دیکھو باورچی خانے، غسل خانے میں یا اِدھر اُدھر کہیں چھپی ہو گی۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

یہ کہہ کر میں واپس مڑ کر صوفے پر لیٹ گیا اور وہ بملا کو ڈھونڈنے چلی گئی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد پھر آئی اور کہنے لگی۔

”میں نے تمام گھر چھان مارا۔ پرماتما جانے کہاں چھپی ہے۔ آج تک میرے ساتھ اس نے اس قسم کی شرارت نہیں کی لیکن آج جانے اُسے کیا سوجھی ہے؟“

پاربتی صوفے کے پیچھے کھڑی تھی میں نے اس کی بات سنی اور پاس پڑے ہوئے اخبار کے اوراق کھولتے ہوئے کہا۔

”مجھے خود تعجب ہو رہا ہے۔ صحن کے ساتھ والے کمروں میں جا کر تلاش کرو، وہیں کسی پلنگ کے نیچے چھپی بیٹھی ہو گی۔“

یہ سن کر پاربتی یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

”اسے میری شرارتوں کا علم نہیں۔ خیر سو سنار کی، ایک لوہار کی“!

اس کو مضطرب دیکھ کر میرا جی باغ باغ ہو رہا تھا۔ اس تیتری کو اپنی ہوشیاری پر کتنا ناز تھا! میں ہنسا، اس لیے کہ اس کے پھڑ پھڑانے والے پَر میری گرفت میں تھے اور میں بڑے مزے سے اس کے اضطراب کا تماشا کر سکتا تھا۔ میں اپنے ذہن میں اس ہونے والے ڈرامے کا تمام پلاٹ تیار کر چکا تھا اور اس پر عمل کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ پھر آئی۔ اس مرتبہ وہ سخت جھلائی ہوئی تھی۔ داہنے کان سے بہت نیچے بالوں کا ایک گچھا کلپ کی گرفت سے آزاد ہو کر ڈھلک آیا تھا۔ ساڑھی سر پر سے اتر گئی تھی اور وہ بار بار اپنے گرد بھرے ہاتھوں کو ایک ننھے رومال سے پونچھ رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے لیٹے لیٹے دریافت کیا۔

”کیوں کامیابی ہوئی کیا؟“

اس نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”نہیں، میں اب یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی ہوں۔“

”ہاں بیٹھو، میں ذرا اوپر ہو آؤں۔“

یہ کہہ کر میں اٹھا اور چلا گیا۔ بالائی منزل کی چھت پر میں پندرہ بیس منٹ تک ٹہلتا رہا۔ چابی میری جیب میں تھی۔ اس لیے معلوم تھا کہ پاربتی کسی صورت میں بھی گھر سے باہر نہیں نکل سکتی اور یہ احساس میرے دل میں ایک ناقابل بیان مسرت پیدا کر رہا تھا۔ میدان بالکل صاف تھا اور میں اس موقع سے پورا فورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ پاربتی کی دوسروں پر ہنسنے والی آنکھوں کی چمک ایک لمحے کے لیے ماند پڑ جائے اور اس کو معلوم ہو جائے کہ مرد کے پاس نسوانی شرارتوں کا بہت کڑا جواب ہے! یہ کھیل بہت خطرناک تھا۔ کیونکہ اس بات کا ڈر تھا کہ وہ پتا، ماتا جی یا بملا کو تمام بیتے ہوئے واقعات سنا دے گی۔ اس صورت میں گھر والوں کی نگاہوں میں میرے وقار کی تذلیل یقینی تھی۔ مگر چونکہ میرے سر پر اس دلچسپ انتقام کا بھوت سوار تھا۔ جو میں نے اس شوخ لڑکی کے لیے تجویز کیا تھا۔ اس لیے کچھ عرصے کے لیے یہ تمام چیزیں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ میں اپنے دل سے سوال کرتا تھا کہ نتیجہ کیا ہو گا۔ لیکن اس کا جواب میری پوزیشن کی صحیح تصویر دکھانے کی بجائے پاربتی۔ شکست خوردہ پاربتی کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا تھا۔ میں بے حد مسرور تھا۔ کچھ عرصہ بالائی منزل پر ٹہلنے کے بعد میں نیچے آیا۔ پاربتی کرسی پر بیٹھی سخت اضطراب کی حالت میں اپنی خوبصورت ٹانگ ہلا رہی تھی۔ جس پر ریشمی ساڑھی کا کپڑا ادھر ادھر تھرک رہا تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”کیوں بملا ملی۔“

”نہیں! میں نے ایک بار پھر سب کمروں کو چھان مارا ہے لیکن وہ ایسی غائب ہوئی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔“

میں مسکرا دیا۔

”چلو ہم دونوں مل کر اس کو ڈھونڈیں۔ تم اس قدر گھبرا گئی ہو۔ تم تو بڑی نڈر اور بیباک لڑکی ہو۔“

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں! لیکن مجھے بہت جلد گھر واپس جانا تھا۔“

پاربتی کے لبوں پر ایک نہایت ہی پیارا تبسم پیدا ہوا۔ ہم دونوں ایک عرصے تک نیچے صحن میں پلنگوں کے نیچے، چارپائیوں کے پیچھے، چیزوں کے ادھر ادھر پردوں کو ہٹا ہٹا کر بملا کو تلاش کرتے رہے۔ مگر وہ گھر پر ہوتی تو ملتی۔ آخر کار میں نے خود کو سخت متعجب ظاہر کرتے ہوئے پاربتی سے کہا۔

”حیرت ہے تمہیں بتاؤ آخر بملا گئی کہاں؟“

پاربتی جو بار بار جھکنے، اٹھنے اور بیٹھنے سے بہت تھک گئی تھی، اپنی پیشانی سے پسینہ کے ننھے ننھے قطروں کو پونچھتی ہوئی بولی۔

”میں کیا جانوں، زمین کھا گئی یا بھوت پریت اٹھا کر لے گئے، یہ آپ ہی کی بہن کی کارستانی ہے، خیر کوئی ہرج نہیں، میں بھی ایسا ستاؤں گی کہ عمر بھر یاد رکھے گی! بملا ہزار ہو مجھ سے اڑ کر کہاں جائے گی۔“

میں خاموش رہا اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت ہم ماتا جی کے کمرے میں تھے۔ پاربتی میرے سامنے ٹائیلٹ میز کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ قطعی طور پر خالی الذہن ہے۔ غیر ارادی طور پر وہ بار بار میز کے گول آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اور ٹانگوں پر سے اپنی ساڑھی کی شکنیں درست کر رہی تھی۔ دفعتہً کمرے کے مکمل سکوت سے باخبر ہو کر وہ سخت مضطرب ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

”موہن صاحب مجھے گھر جانا ہے، جتنا جلد جانا چاہتی ہوں اتنی دیر ہوتی جاتی ہے۔ بملا کے اب پَر لگ گئے ہیں۔ شاید میرے ہاتھوں اس کی شامت آئی ہے۔“

”ہاں، ہاں، مگر میں کیا کر سکتا ہوں، آپ جانیں اور وہ، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اور اگر آپ کو سچ مچ جلدی جانا ہے تو کہیے، میں آپ کی کمر میں رسی باندھ کر چھت سے لٹکا دوں، کہیے تو تالا توڑ دوں؟ اب آپ کی جو رائے ہو؟“

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور جواب دیا۔“

مجبوری ہے تالا توڑنا ہی پڑے گا۔“

لیکن۔ میں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تالا بہت بڑا ہے اور اسکو توڑنے کے لیے بہت سی دقتیں پیش آئیں گی۔ اس کے علاوہ ہتھوڑے کی چوٹوں کی آواز سن کر لوگ کیا کہیں گے؟“

یہ سُن کر وہ سنجیدہ ہو گئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی،

”لیکن مجھے گھر بھی تو جانا ہے لوگ کیا کہیں گے، ہم کسی غیر کے گھر میں سیندھ تھوڑی لگا رہے ہیں اپنے گھر کا تالا توڑ رہے ہیں۔“

”ہے ہے آج میں کس ساعت سے آئی تھی، اب کیا ہو گا۔ میں کس طرح جاؤں، ہائے رام کس بلا میں پھنس گئی“!

میرا وار خالی گیا۔ دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ وہ ماحول کی نزاکت سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے جس میں کہ وہ اس وقت موجود تھی۔ چنانچہ میں نے بات کو ذرا وضاحت سے بیان کیا۔

”ماتا جی لاہور گئی ہیں! پتا جی باہر ہیں اور بملا غائب ہے اس صورت میں۔“

میں یہ کہتے کہتے رک گیا اور پھر اس فقرے کو یوں پورا کر دیا۔

”تالا توڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔“

اب کی دفعہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ پاربتی کے سپید چہرے پر ہلکی سی سرخی چھا گئی اور ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے گالوں پر گلاب کی پتیاں بکھر گئی ہیں۔ وہ اپنی ریشمی ساڑھی میں سمٹی، کانپی، تھرائی، پارے کی طرح تڑپی اور کچھ کہتی کہتی خاموش ہو گئی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

”تم خود سوچ سکتی ہو۔ ویسے مجھے کوئی عذر نہیں“!

وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ میں اس کو مضطرب دیکھ کر بہت مسرور ہو رہا تھا! کل کی چلبلی شوخ و شنگ اور طرّار لڑکی جو بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی بجلی کی طرح چمکا کرتی تھی۔ آج دیے کی کرن بن کر رہ گئی تھی جو میری پھونک کے رحم پر تھی۔ ساحل کے پتھروں سے ٹکرا کر پلٹتی ہوئی لہر کی طرح اس نے اپنے آپ میں نئی تازگی پیدا کر کے کہا۔

”میری تو جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ چبا چبا کر باتیں کیے جا رہے ہیں۔“

”کون سی بات؟“

”یہی، یہی کہ لوگ کیا کہیں گے؟“

اُس نے اپنے شرمیلے جذبات پر پوری قوت سے قابو پاتے ہوئے کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور زیرِ لب گنگنانے لگا۔

”ماتا جی لاہور گئی ہیں، پتا جی باہر ہیں اور بملا گم ہے“!

”آپ کون سی نئی بات کر رہے ہیں! یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، سوال تو یہ ہے کہ بملا کہاں ہے؟“

”اوپر ہو گی اور کہاں؟“

”اوپر؟ اوپر کی خوب کہی۔ میں اوپر چپہ چپہ ڈھونڈ آئی ہوں۔“

”تم اسے نیچے ڈھونڈتی ہو گی۔ تو وہ دوسری سیڑھیوں سے اوپر چلی جاتی ہو گی۔ جب تم اوپر جاؤ گی تو وہ نیچے آجائے گی۔ یہ ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے اور۔“

”اس کا ایک علاج ہو سکتا ہے“

پاربتی نے اپنے داہنے گال پر انگلی سے ایک نہایت دلکش گڑھا بناتے ہوئے کہا۔

”میں اوپر جاتی ہوں اور آپ ایسا کیجیے کہ دوسری سیڑھیوں پر کھڑے ہو جائیے اور جونہی وہ نیچے اترے اسے پکڑ لیجیے۔“

”میں نے اس کی تجویز کو سنا اور کہا

”لیکن شاید وہ اصل میں یہاں موجود ہی نہ ہو گی۔“

”یہاں موجود نہ ہو“

میری بات سن کر پاربتی کا سر ضرور چکرا گیا۔ وہ کہنے لگی۔

”ہاں ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اگر ہوتی تو مل نہ جاتی؟“

”کیا ہو سکتا ہے وہ یہاں نہ ہو تو پھر دروازے کو تالا کس نے لگا دیا ہے۔ یہ کہیں آپ کی شرارت تو نہیں، سچ کہیے؟“

”مجھے کیا معلوم، میرا خیال ہے کہ بملا اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہو گی۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ صبح اپنی ساڑھی استری کر رہی تھی“!

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

پاربتی کی حیرت لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔

”اگر وہ کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے تو پھر تالا کس نے لگا ہے۔ یہ کیا شرارت ہے؟“

”حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپنی سہیلی ہی کے ہاں گئی ہے، اس لیے کہ جاتے وقت وہ سنتو کو ہمراہ لیتی گئی تھی، اب مجھے یاد آیا۔ باقی رہا میں، تو آپ ہی بتائیے، میں آپ کو کیوں قید کرنے لگا۔ پر اتنا ضرور کہوں گا کہ بڑی دلچسپ مچھلی جال میں پھنسی ہے۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ تو پھر۔ تو پھر۔ یہ شرارت۔“

وہ اپنے فقرے کو پورا نہ کر سکی۔

”ہاں یہ شرارت میں بھی تو کر سکتا ہوں۔“

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آپ کا خیال ہے کہ میں اس کا اہل نہیں؟۔ شاید میں نے آپ سے کسی وقت کا بدلہ لیا ہو۔“

پاربتی کی حالت عجیب و غریب تھی۔ بند بھاپ کی طرح وہ باہر نکلنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا، جیسے میرے سینے کے اسرار جاننا چاہتی ہے۔ لیکن میں ایک کامیاب ایکٹر کی طرح اپنا پارٹ نبھا رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھ کی پتلیوں کو نچاتے ہوئے دریافت کیا۔

”لیکن اس شرارت کی وجہ؟“

”مجھے معلوم نہیں“!

وہ خاموش ہو گئی۔ پھر یکایک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگی۔

”موہن صاحب! مجھے گھر جانا ہے“!

”مجھے معلوم ہے، پر یہ تو بتائیے، کیا کسی نے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے؟“

”تو دروازہ کھول دیجیے۔“

یہ کہنے کے بعد اس نے کچھ سوچا اور کہا۔

”لیکن آپ کس طرح کہہ رہے ہیں کہ تالا آپ نے لگایا ہے، کیا بملا واقعی یہاں نہیں ہے؟“

”مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں خود اسے رام گلی میں چھوڑ کر آیا ہوں اور میں نے ان ہاتھوں سے قفل لگایا ہے“

میری گفتگو کا انداز نہایت متین اور سنجیدہ تھا۔

”آپ نے قفل کیوں لگایا؟“

پاربتی نے نہایت تیزی سے دریافت کیا۔

”دیکھا میں نہ کہتی تھی، یہ آپ ہی کارستانی ہے۔“

”کیوں لگایا، اس لیے کہ میں نے لگا دیا۔ اور میں نے نہیں لگایا۔ اور میں نے نہیں لگایا میرے ہاتھوں نے لگایا ہے۔“

”یہ بھی کوئی بات ہے؟“

میں کرسی پر سے اٹھا اور جمائی لے کر کہا۔

”رات کو دیر تک باہر رہنے سے پوری نیند نہیں سو سکا۔ میرا خیال ہے، اب سونا چاہیے۔“

”چابی دے دیجیے، پھر آپ سو سکتے ہیں۔ ورنہ قیامت برپا کر دوں گی۔“

پاربتی نے سخت اضطراب کی حالت میں چابی کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

”چابی۔ چابی“

میں نے اپنی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

”مگر وہ تو گم ہو گئی ہو گی۔ نامعلوم کس نے اُڑن چُھو کر ڈالی۔ اب کیا ہو گا؟“

یہ سن کر پاربتی خشم آلود ہو کر بولی۔

”گم ہو گئی ہو گی۔“

یعنی آپ کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ گم ہو جائے گی۔ موہن صاحب! داہنے ہاتھ سے چابی نکال کر دے دیجیے، یہ شرارتیں جوان لڑکیوں کے ساتھ اچھی معلوم نہیں ہوتیں، ورنہ میرا نام پاربتی ہے پاربتی، مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھیے گا۔“

”چابی واقعی گم ہے“

!میں نے پہلی سی متانت کے ساتھ جواب دیا

”اور تمھیں اس قدر تیز ہونے کی ضرورت نہیں، بیکار تم مجھ پر اس قدر گرم ہو رہی ہو۔“

”چابی گم کہاں ہوئی۔ مجھے بھی تو معلوم ہو؟“

پاربتی اب ہوا سے لڑنا چاہتی تھی۔

”آخر آپ کی جیب سے کوئی جنات لے گیا۔“

”اگر تمھیں معلوم ہو جائے تو کیا کر لو گی، دروازہ بند ہے اور میں نے اسے گلی میں پھینک دیا ہے! لو اب صاف سنو میں دروازے کی درز سے دیکھا کہ جب میں نے گلی میں پھینکی تو کتے نے ہڈی سمجھ کر منہ میں دبوچ لیا اور نگل لیا۔ اب وہ کتا ڈھونڈا جائے، اس کا پیٹ چیرا جائے، تب کہیں ملے۔“

یہ سُن کر وہ جھلا کر رہ گئی اور زیادہ تیز آواز میں کہا۔

”آپ کو اس شرارت کا جواب دینا ہو گا؟“

”کسے؟“

”یہ بعد میں معلوم ہو جائے گا۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا۔

”تو پھر یہ بعد کی بات ہے اُس وقت دیکھا جائے گا۔ اب ہمیں حال پر غور کرنا ہے۔ کتے کے پیٹ میں کہیں کنجی گھل نہ گئی ہو۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ اور میں بھی چپ ہو گیا۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ وہ ٹائیلٹ میز کے قریب متحیر کھڑی تھی اور غالباً اپنی بے بسی پر کُڑھ رہی تھی۔

”آپ دروازہ نہیں کھولیں گے؟“

اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”دیکھیے مجھے نہ ستائیے، ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہو گا۔“

”میرے پاس چابی نہیں، اس لیے مجبور ہوں، ہاں البتہ شام کو دروازہ کھولا جا سکتا ہے اس لیے کہ شاید اس وقت تک تلاش کرنے پر مل جائے۔“

”اور میں اس وقت تک یہیں قید رہوں گی؟“

”نہیں، تم بڑی خوشی سے صحن میں، کمروں میں، کوٹھوں پر جہاں چاہو کود سکتی ہو، گا سکتی ہو، مجھے کوئی عذر نہیں۔“

”پرماتما جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“

وہ میری گفتگو کے انداز پر سخت حیرت زدہ تھی۔

”میں اچھا بھلا ہوں لیکن کبھی کبھی تفریح بھی تو ہونی چاہیے۔ کیا تم اس کی قائل نہیں ہو۔ کیا تم کبھی ایسا تفریح مذاق نہیں کرتیں۔“

”مجھے گھر جانا ہے موہن صاحب“!

اُس نے میرے سوال کا جواب دیا۔

”تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو، تمہیں گھر جانا ہے۔ گھر گیا پانی سے بھر اور اس میں بڑے بڑے کچھوؤں کا ڈر، لیکن بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”چابی دے دیجیے، بہت ستا چکے اب نہ ستائیے۔“

”دیوی جی، مجھے افسوس ہے کہ وہ کم بخت ناشدنی گم ہو گئی ہے۔“

”گم ہو گئی ہے، گم ہو گئی ہے، آپ نے یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ آپ چابی کیوں نہیں دیتے؟“

”میرے پاس نہیں ہے سرکار، کتے کے پیٹ میں ہے۔“

”موہن صاحب! لڑکیوں سے اس طرح کا مذاق نہیں کرتے۔ کتے کا پیٹ، آپ کی جیب ہے۔“

”اچھا تو یونہی ہو گا۔“

”یونہی ہو گا، چابی لائیے میں جانا چاہتی ہوں۔“

”میں ایک بار نہیں سو بار کہہ چکا ہوں کہ چابی میرے پاس نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے۔“

”چابی آپ کے پاس ہے، آپ کے پاس ہے، آپ کے پاس ہے“!

”میرے پاس نہیں، نہیں، نہیں ہے۔“

”نہیں آپ ہی کے پاس ہے، ہے، ہے۔“

اس نے

”ہے“

کو سو مرتبہ دہراتے ہوئے کہا۔

”اچھا نہیں تھی تو ہے۔“

”تو لائیے جیب سے نکالیے۔“

”میں نہیں دوں گا۔“

”آپ کو دینا پڑے گی۔“

”کوئی زور ہے؟“

”میں چلانا شروع کر دوں گی۔“

اس نے مجھ پر رعب گانٹھا۔

”بصد شوق۔“

میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”مگر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ناحق اپنا گلا پھاڑو گی، حلق تھکاؤ گی۔ کچھ بھی نہ ہو گا، روپیٹ کے دیکھ لو۔ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ اس کمرے میں کوئی روشندان نہیں۔ دروازوں پر جتنے پردے لٹک رہے ہیں سب کے سب دبیز ہیں۔ مجھے بچپن ہی میں اس کا کئی مرتبہ تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ یہاں سے بلند سے بلند آواز بھی باہر نہیں جا سکتی۔ ماتا جی احتیاطاً مجھے اس کمرے میں پیٹا کرتی تھیں۔ میں اس مار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے زور زور سے چلایا کرتا تھا کہ پتا جی میری آواز سن لیں مگر بے سود۔ تم بیکار چلاؤ گی۔“

پاربتی نے میری بات سنی اور ہارے ہوئے انسان کی طرح کہا۔

”لیکن آپ چابی نہیں دیں گے؟“

”مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نہیں“

”کیوں؟ اس کا سبب؟“

”پھر وہی مہمل سوال۔“

”آپ کا مذاق حد سے بڑھ رہا ہے۔“

اس نے اپنی ساڑھی کے گرتے ہوئے پلو کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”میں یہ سب معاملہ حرف بحرف جیسے کا تیسا بملا کو سنادوں گی۔“

”بڑے شوق سے، میں آج شام کو دہلی جارہا ہوں۔ اس کے علاوہ بیچاری بملا کر بھی کیا سکے گی؟“

”وہ آپ کے پتا جی سے شکایت کرے گی۔“

”میری ایک خشم آلود جھڑکی اس کی زبان بند کرنے کے لیے کافی ہو گی۔“

”تو میں خود اُن سے سب کچھ کہہ دوں گی۔“

”جو دل میں آئے کرلینا۔ اس وقت اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر دل میں بہت ڈرا۔ پتا جی گو نرم دل تھے۔ مگر اس قسم کی شرارت کا سُن کر ان کا رنجیدہ ہونا لازم تھا۔ بہر حال میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر پاربتی نے ان سے کہہ دیا تو میں سر جھکا کر ان کی لعن طعن سن لوں گا۔ دراصل میں کسی قیمت پر بھی اِدھر اُدھر کی چیزیں کتر کر جھٹ سے اپنے بل میں گھس جانے والی چوہیا کو اپنے دامِ انتقام سے باہر نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ میرے فرض سے آگاہ کرنے کی خاطر بولی۔

”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے گھر جانا ہے۔ بس دل لگی ہو چکی۔ اب کنجی سیدھے من سے نکالیے“

”تم نہیں جاسکتی ہو۔“

”یہ بھی عجیب سکھا شاہی ہے۔“

”ہاں اس مکان میں میرا راج ہے اور سامنے والے مکان پر تمہارا۔ اپنے مکان کی چھت پر تم سیوا جی ہو اور ہم تمہاری حکومت تسلیم کرتے رہے۔ تم نے ہزاروں مرتبہ چڑھے ہوئے پتنگوں کو کئی کئی ریل ڈور سمیت توڑ لیا ہے اور ہم خاموش رہے ہیں۔ آج ہماری بادشاہت میں ہو۔ اس لیے تمہیں دم مارنے کی مجال نہ ہونی چاہیے۔“

”میں نے آپ کے پتنگ کبھی نہیں توڑے، آپ غلط کہہ رہے ہیں۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو پاربتی، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت میرے ہاتھ بڑے بڑے اختیارات کی ڈور ہے، مردوں سے بات بات پر نوک جھونک کرنا تمہاری فطرت میں داخل ہو گیا ہے۔ مگر شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہم لوگ بڑے سخت گیر ہوتے ہیں۔ بُری طرح بدلہ لیتے ہیں سمجھیں“!

یہ سن کر وہ اور بھی گھبرا گئی۔

”میں جانتی ہوں۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے دوڑ کر دہلیز میں اس کا راستہ روک لیا۔

”تم کمرے میں ہی رہو گی؟“

”ہٹیے، مجھے جانے دیجیے۔“

اس نے میرے بازو کو جھٹکا دیا۔ میں وہیں پر جما رہا، یہ دیکھ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور سخت غصے کی حالت میں کہا۔

”آپ زبردستی کر رہے ہیں۔“

”ابھی تم نے زبردستی کا نصف بھی نہیں دیکھا۔“

”آپ مجھے نہیں جانے دیں گے؟“

”نہیں۔“

”میں رو دوں گی، موہن صاحب میں سر پیٹ لوں گی اپنا“

اور اس کی آنکھوں سے واقعی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اسی حالت میں وہ رونی آواز میں دھمکیاں دیتی ہوئی آگے بڑھی۔ مجھے دھکا کر اس نے دروازے سے باہر نکلنا چاہا۔ اس کشمکش اور پریشانی میں مضطرب دیکھ کر مجھے اس پر ترس آگیا۔ اور جب وہ تازہ حملے کے لیے آگے بڑھی۔ تو میں نے بڑے آرام سے اس کے گیلے ہونٹوں کو اپنے لبوں سے چُھو لیا۔ میرے لبوں کا اس کے ہونٹوں کو چُھونا تھا کہ آفت برپا ہوگئی۔ یہ سمجھیے کہ کسی نے آتشبازی کی چھچھوندر کو آگ دکھادی ہے۔ اس نے مجھے وہ موٹی موٹی گالیاں دیں کہ توبہ بھلی اور میرے سینے کو اپنے ہاتھوں سے دھڑادھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ آپ روتی جاتی تھی۔ آخر کار جب مجھے مار مار کر تھک گئی تو زمین پر بیٹھ کر سر کو گھٹنوں میں چھپا کر اور بھی زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا۔ نصف گھنٹے کی منت سماجت کے بعد اُس نے اپنی آنکھوں سے آنسو بہانے بند کیے۔ اس کے بعد میں نے جیب سے چابی نکالی اور صدر دروازہ کھول کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”دروازہ کُھلا ہے اور آپ جا سکتی ہیں۔“

اُس شام کو میں دہلی چلا گیا۔ اور پندرہ روز کے بعد واپس آیا۔ چونکہ گھر میں کسی نے اس شرارت کے متعلق مجھ سے استفسار نہ کیا۔ اس لیے معلوم ہوا کہ پاربتی نے میرا چیلنج قبول کر لیا ہے کہ وہ انتقام ضرور لے گی۔ ایک روز میں نے میز کا دراز کھول کر اپنی بڑی تصویر نکالی۔ اس لیے کہ مجھے اس کا فریم بنوانا تھا۔ یہ فوٹو خاکستری رنگ کے بڑے لفافے میں بند تھا۔ چنانچہ میں اس کو کھول دیکھے بغیر فریم ساز کے ہاں لے گیا۔ اس کی دکان پر میں نے ڈیڑھ گھنٹے کے غور و فکر کے بعد فریم کے لیے ایک لکڑی انتخاب کی اور کچھ ہدایات دینے کے بعد تصویر والا لفافہ دکاندار کو دے دیا۔ اس نے جب اُسے کھول کر دیکھا تو کھکھلا کر ہنس پڑا۔ میں نے جب تصویر پر نظر دوڑائی تو دیکھا۔ اس پر سیاہ پنسل سے مونچھیں اور داڑھی بنی ہوئی ہے۔ ناک پر ایک سیاہ گولا سا رکھا ہے اور چشمے کے شیشے بالکل سیاہ کر دیے گئے ہیں۔ یہ تصویر میری شبیہ تھی مگر اس مسخ حالت میں اس کو پہچاننا بہت دشوار تھا۔ پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا۔ سیواجی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپہ مار گئے تھے!

میرا نام رادھا ہے

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹومیرا نام رادھا ہے

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب اس جنگ کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ غالباً آٹھ نو برس پہلے کی بات ہے۔ جب زندگی میں ہنگامے بڑے سلیقے سے آتے تھے۔ آج کی کل طرح نہیں۔ بے ہنگم طریقے پر پے در پے حادثے برپا ہو رہے ہیں، کسی ٹھوس وجہ کے بغیر اس وقت میں چالیس روپیہ ماہوار پر ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا اور میری زندگی بڑے ہموار طریقے پر افتاں و خیزاں گزر رہی تھی۔ یعنی صبح دس بجے اسٹوڈیو گئے، نیاز محمد ولن کی بلیوں کو دو پیسے کا دُودھ پلایا۔ چالو فلم کے لیے چالو قسم کے مکالمے لکھے۔ بنگالی ایکٹرس سے جو اس زمانے میں بلبل بنگال کہلاتی تھی، تھوڑی دیر مذاق کیا اور دادا گورے کی جو اس عہد کا سب سے بڑا فلم ڈائریکٹر تھا، تھوڑی سی خوشامد کی اور گھر چلے آئے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، زندگی بڑے ہموار طریقے پر افتاں و خیزاں گزر رہی تھی اسٹوڈیو کا مالک ’ہرمزجی فرام جی‘ جو موٹے موٹے لال گالوں والا موجی قسم کا ایرانی تھا، ایک ادھیڑ عمر کی خوجہ ایکٹرس کی محبت میں گرفتار تھا۔ ہر نووارد لڑکی کے پستان ٹٹول کر دیکھنا اس کا شغل تھا۔ کلکتہ کے بو بازار کی ایک مسلمان رنڈی تھی جو اپنے ڈائریکٹر، ساونڈ ریکارڈسٹ اور اسٹوری رائٹر تینوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی تھی۔ اس عشق کا مطلب یہ تھا کہ ان تینوں کا التفات اس کے لیے خاص طور پر محفوظ رہے۔

”بن کی سندری“

کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ نیاز محمد ولن کی جنگلی بلیوں کو جو اس نے خدا معلوم اسٹوڈیو کے لوگوں پر کیا اثر پیدا کرنے کے لیے پال رکھی تھیں، دو پیسے کا دودھ پلا کر میں ہر روز اس

”بن کی سندری“

کے لیے ایک غیر مانوس زبان میں مکالمے لکھا کرتا تھا۔ اس فلم کی کہانی کیا تھی، پلاٹ کیسا تھا، اس کا علم جیسا کہ ظاہر ہے، مجھے بالکل نہیں تھا کیونکہ میں اس زمانے میں ایک منشی تھا جس کا کام صرف حکم ملنے پر جو کچھ کہا جائے، غلط ملط اُردو میں جو ڈائریکٹر صاحب کی سمجھ میں آجائے، پنسل سے ایک کاغذ پر لکھ کر دینا ہوتا تھا۔ خیر

”بن کی سندری“

کی شوٹنگ چل رہی تھی اور یہ افواہ گرم تھی کہ ویمپ کا پارٹ ادا کرنے کے لیے ایک نیا چہرہ سیٹھ ہرمزجی فرام جی کہیں سے لا رہے ہیں۔ ہیرو کا پارٹ راج کشور کو دیا گیا تھا۔ راج کشور راولپنڈی کا ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس کے جسم کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بہت مردانہ اور سڈول ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس کے متعلق غور کیا مگر مجھے اس کے جسم میں جو یقیناً کسرتی اور متناسب تھا، کوئی کشش نظر نہ آئی۔ مگر اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں بہت ہی دُبلا اور مریل قسم کا انسان ہوں اور اپنے ہم جنسوں کے متعلق سوچنے کا عادی ہوں۔ مجھے راج کشور سے نفرت نہیں تھی، اس لیے کہ میں نے اپنی عمر میں شاذ و نادر ہی کسی انسان سے نفرت کی ہے، مگر وہ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ اس کی وجہ میں آہستہ

آہستہ آپ سے بیان کروں گا۔ راج کشور کی زبان اس کالب ولہجہ جو ٹھیٹ راولپنڈی کا تھا۔ مجھے بے حد پسند تھا۔ میرا خیال ہے کہ پنجابی زبان میں اگر کہیں خوبصورت قسم کی شیرینی ملتی ہے تو راولپنڈی کی زبان ہی میں آپ کو مل سکتی ہے۔ اس شہر کی زبان میں ایک عجیب قسم کی مردانہ نسائیت ہے جس میں بیک وقت مٹھاس اور گھلاوٹ ہے۔ اگر راولپنڈی کی کوئی عورت آپ سے بات کرے تو ایسا لگتا ہے کہ لذیذ آم کا رس آپ کے منہ میں چوایا جارہا ہے۔ مگر میں آموں کی نہیں راج کشور کی بات کر رہا ہوں جو مجھے آم سے بہت کم عزیز تھا۔ راج کشور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ یہاں تک بات ختم ہو جاتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر مصیبت یہ ہے کہ اسے یعنی کشور کو خود اپنی صحت اور اپنے خوش شکل ہونے کا احساس تھا۔ ایسا احساس جو کم از کم میرے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ صحت مند ہونا بڑی اچھی چیز ہے مگر دوسروں پر اپنی صحت کو بیماری بنا کر عائد کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ راج کشور کو یہی مرض لاحق تھا کہ وہ اپنی صحت اپنی تندرستی، اپنے متناسب اور سڈول اعضا کی غیر ضروری نمائش کے ذریعے ہمیشہ دوسرے لوگوں کو جو اس سے کم صحت مند تھے، مرعوب کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں دائمی مریض ہوں، کمزور ہوں، میرے ایک پھیپھڑے میں ہوا کھینچنے کی طاقت بہت کم ہے مگر خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے آج تک اس کمزوری کا کبھی پروپیگنڈا نہیں کیا، حالانکہ مجھے اس کا پوری طرح علم ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح کہ اپنی طاقتوں سے اُٹھا سکتا ہے مگر ایمان ہے کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ خوبصورتی میرے نزدیک وہ خوبصورتی ہے جس کی دوسرے بلند آواز میں نہیں بلکہ دل ہی دل میں تعریف کریں۔ میں اس صحت کو بیماری سمجھتا ہوں جو نگاہوں کے ساتھ پتھر بن کر ٹکراتی رہے۔ راج کشور میں وہ تمام خوبصورتیاں موجود تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہونی چاہئیں۔ مگر افسوس ہے کہ اسے ان خوبصورتیوں کا نہایت ہی بھونڈا مظاہرہ کرنے کی عادت تھی۔ آپ سے بات کر رہا ہے اور اپنے ایک بازو کے پٹھے اکڑا رہا ہے، اور خود ہی داد دے رہا ہے۔ نہایت ہی اہم گفتگو ہو رہی ہے یعنی سوراج کا مسئلہ چھڑا ہے اور وہ اپنے کھادی کے کرتے کے بٹن کھول کر اپنے سینے کی چوڑائی کا اندازہ کر رہا ہے۔ میں نے کھادی کے کرتے کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ راج کشور پکا کانگرسی تھا، ہو سکتا ہے وہ اسی وجہ سے کھادی کے کپڑے پہنتا ہو، مگر میرے دل میں ہمیشہ اس بات کی کھٹک رہی ہے کہ اسے اپنے وطن سے اتنا پیار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی ذات سے تھا۔ بہت لوگوں کا خیال تھا کہ راج کشور کے متعلق جو میں نے رائے قائم کی ہے، سراسر غلط ہے اس لیے کہ اسٹوڈیو اور اسٹوڈیو کے باہر ہر شخص اس کا مداح تھا اس کے جسم کا، اس کے خیالات کا، اس کی سادگی کا، اس کی زبان کا جو خاص راولپنڈی کی تھی اور مجھے بھی پسند تھی۔ دوسرے ایکٹروں کی طرح وہ الگ تھلگ رہنے کا عادی نہیں تھا۔ کانگریس پارٹی کا کوئی جلسہ ہو تو راج کشور کو آپ وہاں ضرور پائیں گے۔ کوئی ادبی میٹنگ ہو رہی ہے تو راج کشور وہاں ضرور پہنچے گا اپنی مصروف زندگی میں سے وہ اپنے ہمسایوں اور معمولی جان پہچان کے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لیے بھی وقت نکال لیا کرتا تھا۔ سب فلم پروڈیوسر اس کی عزت کرتے تھے کیونکہ اس کے کیریکٹر کی پاکیزگی کا بہت شہرہ تھا۔ فلم پروڈیوسروں کو چھوڑیئے، پبلک کو بھی اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ راج کشور ایک بہت بلند کردار کا مالک ہے۔ فلمی دنیا میں رہ کسی شخص کا گناہ کے دھبوں سے پاک رہنا بہت بڑی بات ہے یوں تو راج کشور ایک کامیاب ہیرو تھا مگر اس کی خوبی نے اسے ایک بہت ہی اونچے رتبے پر پہنچا دیا تھا۔ ناگپاڑے میں جب شام کو پان والے کی دکان پر بیٹھتا تھا تو اکثر ایکٹر ایکٹرسوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ قریب قریب ہر ایکٹر اور ایکٹرس کے متعلق کوئی نہ کوئی اسکینڈل مشہور تھا مگر راج کشور کا جب بھی ذکر آتا، شام لال پنواڑی بڑے فخریہ لہجے میں کہا کرتا۔

”منٹو صاحب! راج بھائی ہی ایسا ایکٹر ہے جو لنگوٹ کا پکا ہے۔“

معلوم نہیں شام لال اسے راج بھائی کیسے کہنے لگا تھا اس کے متعلق مجھے اتنی زیادہ حیرت نہیں تھی، اس لیے کہ راج بھائی کی معمولی سے معمولی بات بھی ایک کارنامہ بن کر لوگوں تک پہنچ جاتی تھی۔ مثلاً باہر کے لوگوں کو اس کی آمدن کا پورا حساب معلوم تھا۔ اپنے والد کو ماہوار خرچ کیا دیتا ہے، یتیم خانوں کے لیے کتنا چندہ دیتا ہے، اس کا اپنا جیب خرچ کیا ہے یہ سب باتیں لوگوں کو اس طرح معلوم تھیں جیسے انھیں ازبر کرائی گئی ہیں۔ شام لال نے ایک روز مجھے بتایا کہ راج بھائی کا اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک ہے۔ اس زمانے میں جب آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، باپ اور اسکی نئی بیوی اسے طرح طرح کے دکھ دیتے تھے۔ مگر مرحبا ہے راج بھائی کا کہ اس نے اپنا فرض پورا کیا اور ان کو سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اب دونوں چھپر کھٹوں پر بیٹھے راج کرتے ہیں، ہر روز صبح سویرے راج اپنی سوتیلی ماں کے پاس جاتا ہے اور اس کے چرن چھوتا ہے۔ باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاتا ہے اور جو حکم ملے، فوراً بجالاتا ہے۔ آپ برا نہ مانیے گا، مجھے راج کشور کی تعریف و توصیف سن کر ہمیشہ الجھن سی ہوتی ہے، خدا جانے کیوں۔ میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، مجھے اس سے حاشا وکلّا نفرت نہیں تھی۔ اس نے مجھے کبھی ایسا موقع نہیں دیا تھا، اور پھر اس زمانے میں جب منشیوں کی کوئی عزت و وقعت ہی نہیں تھی وہ میرے ساتھ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کیا وجہ تھی، لیکن ایمان کی بات ہے کہ میرے دل و دماغ کے کسی اندھیرے کونے میں یہ شک بجلی کی طرح کوندجاتا کہ راج بن رہا ہے۔ راج کی زندگی بالکل مصنوعی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ میرا کوئی ہم خیال نہیں تھا۔ لوگ دیوتاؤں کی طرح اس کی پوجا کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں اس سے کڑھتا رہتا تھا۔ راج کی بیوی تھی، راج کے چار بچے تھے، وہ اچھا خاوند اور اچھا باپ تھا۔ اس کی زندگی پر سے چادر کا کوئی کونہ بھی اگر ہٹا کر دیکھا جاتا تو آپ کو کوئی تاریک چیز نظر نہ آتی۔ یہ سب کچھ تھا، مگر اس کے ہوتے ہوئے بھی میرے دل میں شک کی گدگدی ہوتی ہی رہتی تھی۔ خدا کی قسم مَیں نے کئی دفعہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کی کہ تم بڑے ہی واہیات ہو کہ ایسے اچھے انسان کو جسے ساری دنیا اچھا کہتی ہے اور جس کے متعلق تمہیں کوئی شکایت بھی نہیں، کیوں بے کار شک کی نظروں سے دیکھتے ہو۔ اگر ایک آدمی اپنا سڈول بدن بار بار دیکھتا ہے تو یہ کون سی بُری بات ہے۔ تمہارا بدن بھی اگر ایسا ہی

خوبصورت ہوتا تو بہت ممکن ہے کہ تم بھی یہی حرکت کرتے۔ کچھ بھی ہو، مگر میں اپنے دل و دماغ کو کبھی آمادہ نہ کر سکا کہ وہ راج کشور کو اسی نظر سے دیکھے جس سے دوسرے دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں دورانِ گفتگو میں اکثر اس سے الجھ جایا کرتا تھا۔ میرے مزاج کے خلاف کوئی بات کی اور میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا لیکن ایسی چپقلشوں کے بعد ہمیشہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور میرے حلق میں ایک ناقابل بیان تلخی رہی، مجھے اس سے اور بھی زیادہ الجھن ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی میں کوئی اسکینڈل نہیں تھا۔ اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری عورت کا میلا یا اُجلا دامن اس سے وابستہ نہیں تھا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وہ سب ایکٹرسوں کو بہن کہہ کر پکارتا تھا اور وہ بھی اسے جواب میں بھائی کہتی تھیں۔ مگر میرے دل نے ہمیشہ میرے دماغ سے یہی سوال کیا کہ یہ رشتہ قائم کرنے کی ایسی اشد ضرورت ہی کیا ہے۔ بہن بھائی کا رشتہ کچھ اور ہے مگر کسی عورت کو اپنی بہن کہنا اس انداز سے جیسے یہ بورڈ لگایا جا رہا ہے کہ سڑک بند ہے یا

”یہاں پیشاب کرنا منع ہے“

بالکل دوسری بات ہے۔ اگر تم کسی عورت سے جنسی رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتے تو اس کا اعلان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر تمہارے دل میں تمہاری بیوی کے سوا اور کسی عورت کا خیال داخل نہیں ہو سکتا تو اس کا اشتہار دینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی اور اسی قسم کی دوسری باتیں چونکہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اس لیے مجھے عجیب قسم کی الجھن ہوتی تھی۔

خیر !

”بن کی سندری“

کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ اسٹوڈیو میں خاصی چہل پہل تھی ہر روز ایکسٹرا لڑکیاں آتی تھیں۔ جن کے ساتھ ہمارا دن ہنسی مذاق میں گزر جاتا تھا۔ ایک روز نیاز محمد ولن کے کمرے میں میک اپ ماسٹر جسے ہم استاد کہتے تھے، یہ خبر لے کر آیا کہ ویمپ کے رول کے لیے جو نئی لڑکی آنے والی تھی، آگئی ہے اور بہت جلد اس کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس وقت چائے کا دور چل رہا تھا۔ کچھ اس کی حرارت تھی۔ کچھ اس خبر نے ہم کو گرما دیا۔ اسٹوڈیو میں ایک نئی لڑکی کا داخلہ ہمیشہ ایک خوشگوار حادثہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ ہم سب نیاز محمد ولن کے کمرے سے نکل کر باہر چلے آئے تاکہ اس کا دیدار کیا جائے۔ شام کے وقت جب سیٹھ ہرمزجی فرام جی آفس سے نکل کر عیسیٰ طبلچی کی چاندی کی ڈبیا سے دو خوشبودار تمبا کو والے پان اپنے چوڑے کلے میں دبا کر بلیئرڈ کھیلنے کے کمرے کا رخ کر رہے تھے کہ ہمیں وہ لڑکی نظر آئی۔ سانولے رنگ کی تھی، بس میں صرف اتنا ہی دیکھ سکا کیونکہ وہ جلدی جلدی سیٹھ کے ساتھ ہاتھ ملا کر اسٹوڈیو کی موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد مجھے نیاز محمد نے بتایا کہ اس عورت کے ہونٹ موٹے تھے۔ وہ غالباً صرف ہونٹ ہی دیکھ سکا تھا۔ استاد جس نے شاید اتنی جھلک بھی نہ دیکھی تھی، سر ہلا کر بولا۔

”ہونہہ۔ کنڈم“

۔یعنی بکواس ہے۔ چار پانچ روز گزر گئے مگر یہ نئی لڑکی اسٹوڈیو میں نہ آئی۔ پانچویں یا چھٹے روز جب میں گلاب کے ہوٹل سے چائے پی کر نکل رہا تھا، اچانک میری اور اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں ہمیشہ عورتوں کو چور آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ اگر کوئی عورت ایک دم میرے سامنے آجائے تو مجھے اس کا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ چونکہ غیر متوقع طور پر میری اسکی مڈبھیڑ ہوئی تھی، اس لیے میں اس کی شکل و شباہت کے متعلق کوئی اندازہ نہ کر سکا، البتہ پاؤں میں نے ضرور دیکھے جن میں نئی وضع کے سلیپر تھے۔ لیبارٹری سے اسٹوڈیو تک جو روش جاتی ہے، اس پر مالکوں نے بجری بچھا رکھی ہے۔ اس بجری میں بے شمار گول گول بٹیاں ہیں جن پر سے جوتا بار بار پھسلتا ہے۔ چونکہ اس کے پاؤں میں کھلے سلیپر تھے، اس لیے چلنے میں اسے کچھ زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اس ملاقات کے بعد آہستہ آہستہ مس نیلم سے میری دوستی ہو گئی۔ اسٹوڈیو کے لوگوں کو تو خیر اس کا علم نہیں تھا مگر اس کے ساتھ میرے تعلقات بہت ہی بے تکلف تھے۔ اس کا اصلی نام رادھا تھا۔ میں نے جب ایک بار اس سے پوچھا کہ تم نے اتنا پیارا نام کیوں چھوڑ دیا تو اس نے جواب دیا۔

”یونہی۔“

مگر پھر کچھ دیر کے بعد کہا۔

”یہ نام اتنا پیارا ہے کہ فلم میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔“

آپ شاید خیال کریں کہ رادھا مذہبی خیال کی عورت تھی۔ جی نہیں، اسے مذہب اور اس کے توہمات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح میں ہر نئی تحریر شروع کرنے سے پہلے کاغذ پر ’بسم اللہ‘ کے اعداد ضرور لکھتا ہوں، اسی طرح شاید اسے بھی غیر ارادی طور پر رادھا کے نام سے بے حد پیار تھا۔ چونکہ وہ چاہتی تھی کہ اسے رادھا نہ کہا جائے۔ اس لیے میں آگے چل کر اسے نیلم ہی کہوں گا۔ نیلم بنارس کی ایک طوائف زادی تھی۔ وہیں کا لب و لہجہ جو کانوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا میرا نام سعادت ہے مگر وہ مجھے ہمیشہ صادق ہی کہا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا

”نیلم! میں جانتا ہوں تم مجھے سعادت کہہ سکتی ہو، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اپنی اصلاح کیوں نہیں کرتیں۔“

یہ سن کر اس کے سانولے ہونٹوں پر جو بہت ہی پتلے تھے ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے جواب دیا۔

”جو غلطی مجھ سے ایک بار ہو جائے، میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔“

میرا خیال ہے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ عورت جسے اسٹوڈیو کے تمام لوگ ایک معمولی ایکٹرس سمجھتے تھے، عجیب و غریب قسم کی انفرادیت کی مالک تھی۔ اس میں دوسری ایکٹرسوں کا ساا وچھاپن بالکل نہیں تھا۔ اس کی سنجیدگی جسے اسٹوڈیو کا ہر شخص اپنی عینک سے غلط رنگ میں دیکھتا تھا، بہت پیاری چیز تھی۔ اس کے سانولے چہرے پر جس کی جلد بہت ہی صاف اور ہموار تھی، یہ سنجیدگی، یہ ملیح متانت موزوں و مناسب غازہ بن گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے اس کی آنکھوں میں اس کے پتلے ہونٹوں کے کونوں میں، غم کی بے معلوم تلخیاں گھل گئی تھیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس چیز نے اسے دوسری عورتوں سے بالکل مختلف کر دیا تھا۔ میں اس وقت بھی حیران تھا اور اب بھی ویسا ہی حیران ہوں کہ نیلم کو

”بن کی سندری“

میں ویمپ کے رول کے لیے کیوں منتخب کیا گیا اس لیے کہ اس میں تیزی و طراری نام کو بھی نہیں تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ اپنا واہیات پارٹ ادا کرنے کے لیے تنگ چولی پہن کر سیٹ پر آئی تو میری نگاہوں کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ دوسروں کا ردِ عمل فوراً تاڑ جاتی تھی۔ چنانچہ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

”ڈائریکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہارا پارٹ چونکہ شریف عورت کا نہیں ہے، اس لیے تمہیں اس قسم کا لباس دیا گیا ہے۔ میں نے ان سے کہا اگر یہ لباس ہے تو میں آپ کے ساتھ ننگی چلنے کے لیے تیار ہُوں۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”ڈائریکٹر صاحب نے یہ سُن کر کیا کہا؟“

نیلم کے پتلے ہونٹوں پر ایک خفیف سی پُر اسرار مسکراہٹ نمودار ہُوئی،

”انھوں نے تصور میں مجھے ننگی دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ بھی کتنے احمق ہیں۔ یعنی اس لباس میں مجھے دیکھ کر بے چارے تصور پر زور ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی“!

ذہین قاری کے لیے نیلم کا اتنا تعارف ہی کافی ہے۔ اب میں ان واقعات کی طرف آتا ہوں جن کی مدد سے میں یہ کہانی مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ بمبئی میں جون کے مہینے سے بارش شروع ہو جاتی ہے اور ستمبر کے وسط تک جاری رہتی ہے۔ پہلے دو ڈھائی مہینوں میں اس قدر پانی برستا ہے کہ اسٹوڈیو میں کام نہیں ہو سکتا۔

”بن کی سندری“

کی شوٹنگ اپریل کے اواخر میں شروع ہوئی تھی۔ جب پہلی بارش ہوئی تو ہم اپنا تیسرا اسیٹ مکمل کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا سین باقی رہ گیا تھا جس میں کوئی مکالمہ نہیں تھا، اس لیے بارش میں بھی ہم نے اپنا کام جاری رکھا۔ مگر جب یہ کام ختم ہو گیا تو ہم ایک عرصے کے لیے بے کار ہو گئے۔ اس دوران میں اسٹوڈیو کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھنے کا بہت موقع ملتا ہے۔ میں تقریباً سارا دن گلاب کے ہوٹل میں بیٹھا چائے پیتا رہتا تھا۔ جو آدمی بھی اندر آتا تھا تو سارے کا سارا بھیگا ہوتا تھا یا آدھا۔ باہر کی سب مکھیاں پناہ لینے کے لیے اندر جمع ہو گئی تھیں۔ اس قدر غلیظ فضا تھی کہ الاماں۔ ایک کرسی پر چائے نچوڑنے کا کپڑا پڑا ہے، دوسری پر پیاز کاٹنے کی بدبودار چھری پڑی جھک مار رہی ہے۔ گلاب صاحب پاس کھڑے ہیں اور اپنے ماس خورہ لگے دانتوں تلے بمبئی کی اُردو چبا رہے ہیں:

”تم ادھر جانے کو نہیں سکتا۔ ہم ادھر سے جا کے آتا۔ بہت لفڑا ہو گا۔ ہاں۔ بڑا واندا ہو جائیں گا۔ اس ہوٹل میں جس کی چھت کوروگٹیڈ اسٹیل کی تھی، سیٹھ ہرمزجی فرام جی، ان کے سالے ایڈل جی اور ہیروئنوں کے سوا سب لوگ آتے تھے۔ نیاز محمد کو تو دن میں کئی مرتبہ یہاں آنا پڑتا تھا کیونکہ وہ چُنی مُنی نام کی دو بلیلاں پال رہا تھا۔ راج کشور دن میں ایک چکر لگا جاتا تھا۔ جونہی وہ اپنے لمبے قد اور کسرتی بدن کے ساتھ دہلیز پر نمودار ہوتا، میرے سوا ہوٹل میں بیٹھے ہُوئے تمام لوگوں کی آنکھیں تمتما اُٹھتیں۔ اکسٹرا لڑکے اٹھ اٹھ کر راج بھائی کو کرسی پیش کرتے اور جب وہ ان میں سے کسی کی پیش کی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتا تو سارے پروانوں کی مانند اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس کے بعد دو قسم کی باتیں سُننے میں آتیں۔ اکسٹرا لڑکوں کی زبان پر پرانی فلموں میں راج بھائی کے کام کی تعریف کی، اور خود راج کشور کی زبان پر اس کے اسکول چھوڑ کر کالج اور کالج چھوڑ کر فلمی دنیا میں داخل ہونے کی تاریخ۔ چونکہ مجھے یہ سب باتیں زبانی یاد ہو چکی تھیں اس لیے جونہی راج کشور ہوٹل میں داخل ہوتا میں اس سے علیک سلیک کرنے کے بعد باہر نکل جاتا۔ ایک روز جب بارش تھمی ہوئی تھی اور ہرمزجی فرام جی کا السیشنکتا نیاز محمد کی دو بلیوں سے ڈر کر گلاب کے ہوٹل کی طرف دُم دبائے بھاگا آ رہا تھا۔ میں نے مولسری کے درخت کے نیچے بنے ہوئے گول چبوترے پر نیلم اور راج کشور کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ راج کشور کھڑا حسبِ عادت ہولے ہولے جھول رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے خیال کے مطابق نہایت ہی دلچسپ باتیں کر رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ نیلم سے راج کشور کا تعارف کب اور کس طرح ہوا تھا، مگر نیلم تو اسے فلمی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ہی اچھی طرح جانتی تھی اور شاید ایک دو مرتبہ اس نے مجھ سے برسبیل تذکرہ اس کے متناسب اور خوبصورت جسم کی تعریف بھی کی تھی۔ میں گلاب کے ہوٹل سے نکل کر ریکاڈنگ روم کے چھجے تک پہنچا تو راج کشور نے اپنے چوڑے کاندھے پر سے کھادی کا تھیلہ ایک جھٹکے کے ساتھ اتارا اور اسے کھول کر ایک موٹی کاپی باہر نکالی۔ میں سمجھ گیا۔ یہ راج کشور کی ڈائری تھی۔ ہر روز تمام کاموں سے فارغ ہو کر اپنی سوتیلی ماں کا اشیر واد لے کر راج کشور سونے سے پہلے ڈائری لکھنے کا عادی ہے۔ یوں تو اسے پنجابی زبان بہت عزیز ہے مگر یہ روزنامچہ انگریزی میں لکھتا ہے جس میں کہیں ٹیگور کے نازک اسٹائل کی اور کہیں

گاندھی کے سیاسی طرز کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کی تحریر پر شیکسپیئر کے ڈراموں کا اثر بھی کافی ہے۔ مگر مجھے اس مرکب میں لکھنے والے کا خلوص کبھی نظر نہیں آیا۔ اگر یہ ڈائری آپ کو کبھی مل جائے تو آپ کو راج کشور کی زندگی کے دس پندرہ برسوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے، اس نے کتنے روپے چندے میں دیے کتنے غریبوں کو کھانا کھلایا، کتنے جلسوں میں شرکت کی، کیا پہنا، کیا اُتارا۔ اور اگر میرا قیافہ درست ہے تو آپ کو اس ڈائری کے کسی ورق پر میرے نام کے ساتھ پینتیس روپے بھی نظر آجائیں گے جو میں نے اس سے ایک بار قرض لیے تھے اور اس خیال سے ابھی تک واپس نہیں کیے کہ وہ اپنی ڈائری میں ان کی واپسی کا ذکر کبھی نہیں کرے گا۔ خیر۔ نیلم کو وہ اس ڈائری کے چند اوراق پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ میں نے دُور ہی سے اس کے خوبصورت ہونٹوں کی جنبش سے معلوم کر لیا کہ وہ شیکسپیرین انداز میں پربھو کی حمد بیان کر رہا ہے۔ نیلم، مولسری کے درخت کے نیچے گول سیمنٹ لگے چبوترے پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کی ملیح متانت پر راج کشور کے الفاظ کوئی اثر پیدا نہیں کر رہے تھے۔ وہ راج کشور کی اُبھری ہوئی چھاتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے کرتے کے بٹن کھلے تھے، اور سفید بدن پر اس کی چھاتی کے کالے بال بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ اسٹوڈیو میں چاروں طرف ہر چیز دُھلی ہُوئی تھی۔ نیاز محمد کی دو بلیلاں بھی عام طور پر غلیظ رہا کرتی تھیں، اس روز بہت صاف ستھری دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں سامنے بنچ پر لیٹی نرم نرم پنجوں سے اپنا منہ دھو رہی تھیں۔ نیلم جارجٹ کی بے داغ سفید ساڑھی میں ملبوس تھی۔ بلاؤز سفید لنن کا تھا جو اس کی سانولی اور سڈول انھوں کے ساتھ ایک نہایت ہی خوشگوار اور مدھم سا تضاد پیدا کر رہا تھا۔ اتنی مختلف کیوں دکھائی دے رہی ہے؟ ایک لحظے کے لیے یہ سوال میرے دماغ میں پیدا ہوا اور ایک دم اس کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے اس کی نگاہ کے اضطراب میں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ نیلم محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بُلایا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ جب راج کشور چلا گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔

”آج آپ میرے ساتھ چلیے گا“!

شام کو چھ بجے میں نیلم کے مکان پر تھا۔ جونہی ہم اندر داخل ہُوئے اس نے اپنا بیگ صوفے پر پھینکا اور مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا۔

”آپ نے جو کچھ سوچا ہے غلط ہے۔“

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا۔

”تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے کیا سوچا تھا۔؟“

اس کے پتلے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”اس لیے ہم دونوں نے ایک ہی بات سوچی تھی۔ آپ نے شاید بعد میں غور نہیں کیا۔ مگر میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہم دونوں غلط تھے۔“

”اگر میں کہوں کہ ہم دونوں صحیح تھے۔“

اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تو ہم دونوں بیوقوف ہیں۔“

یہ کہہ کر فوراً ہی اس کے چہرے کی سنجیدگی اور زیادہ سنولا گئی۔

”صادق یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں بچی ہوں جو مجھے اپنے دل کا حال معلوم نہیں۔ تمہار خیال کے مطابق میری عمر کیا ہو گی؟“

”بائیس برس۔“

”بالکل درست۔ لیکن تم نہیں جانتے کہ دس برس کی عمر میں مجھے محبت کے معنی معلوم تھے۔ معنی کیا ہُوئے جی۔ خدا کی قسم میں محبت کرتی تھی۔ دس سے لے کر سولہ برس تک میں ایک خطرناک محبت میں گرفتار رہی ہُوں۔ میرے دل میں اب کیا خاک کسی کی محبت پیدا ہو گی۔“

یہ کہہ کر اس نے میرے منجمد چہرے کی طرف دیکھا اور مضطرب ہو کر کہا۔

”تم کبھی نہیں مانو گے میں تمہارے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دوں، پھر بھی تم یقین نہیں کرو گے میں تمھیں اچھی طرح جانتی ہُوں۔ بھئی خدا کی قسم، وہ مر جائے جو تم سے جھوٹ بولے۔ میرے دل میں اب کسی کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ۔“

یہ کہتے کہتے وہ ایک دم رک گئی۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا کیونکہ وہ گہرے فکر میں غرق ہو گئی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ

”اتنا ضرور“

کیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے پتلے ہونٹوں پر وہی خفیف پر اسرار مسکراہٹ نمودار ہُوئی جس سے اس کے چہرے کی سنجیدگی میں تھوڑی سی عالمانہ شرارت پیدا ہو جاتی تھی۔ صوفے پر سے ایک جھٹکی کے ساتھ اُٹھ کر اس نے کہنا شروع کیا۔

”میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ یہ محبت نہیں ہے اور کوئی بلا ہو تو میں کہہ نہیں سکتی صادق میں تمھیں یقین دلاتی ہوں۔“

میں نے فوراً ہی کہا۔

”یعنی تم اپنے آپ کو یقین دلاتی ہو۔“

وہ جل گئی۔

”تم بہت کمینے ہو۔ کہنے کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔ آخر تمہیں یقین دلانے کی مجھے ضرورت ہی کیا پڑی ہے۔ میں اپنے آپ کو یقین دلا رہی ہوں، مگر مصیبت یہ ہے کہ آ نہیں رہا۔ کیا تم میری مدد نہیں کرسکتے۔“

یہ کہہ کر وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور اپنے داہنے ہاتھ کی چھنگلیا پکڑ کر مجھ سے پوچھنے لگی۔

”راج کشور کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ میرا مطلب ہے تمہارے خیال کے مطابق راج کشور میں وہ کون سی چیز ہے جو مجھے پسند آئی ہے۔“

چھنگلیا چھوڑ کر اس نے ایک ایک کرکے دوسری انگلیاں پکڑنی شروع کیں۔

”مجھے اس کی باتیں پسند نہیں۔ مجھے اس کی ایکٹنگ پسند نہیں۔ مجھے اس کی ڈائری پسند نہیں، جانے کیا خرافات سُنا رہا تھا۔“

خود ہی تنگ آکر وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

”سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا ہوگیا ہے۔ بس صرف یہ جی چاہتا ہے کہ ایک ہنگامہ ہو۔ بلیوں کی لڑائی کی طرح شور مچے، دُھول اُڑے۔ اور میں پسینہ پسینہ ہو جاؤں۔“

پھر ایک دم وہ میری طرف پلٹی۔

”صادق۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں کیسی عورت ہُوں؟“

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بلیلاں اور عورتیں میری سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہی ہیں۔“

اس نے ایک دم پوچھا۔

”کیوں؟“

میں نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا۔

”ہمارے گھر میں ایک بلی رہتی تھی سال میں ایک مرتبہ اس پر رونے کے دورے پڑتے تھے۔ اس کا رونا دھونا سُن کر کہیں سے ایک بلا آجایا کرتا تھا۔ پھر ان دونوں میں اس قدر لڑائی اور خون خرابہ ہوتا کہ الاماں۔ مگر اس کے بعد وہ خالہ بلی چار بچوں کی ماں بن جایا کرتی تھی۔“

نیلم کا جیسے منہ کا ذائقہ خراب ہوگیا

”تھو۔ تم کتنے گندے ہو۔“

پھر تھوڑی دیر بعد الائچی سے منہ کا ذائقہ درست کرنے کے بعد اس نے کہا۔

”مجھے اولاد سے نفرت ہے۔ خیر ہٹاؤ جی اس قصے کو۔“

یہ کہہ کر نیلم نے پاندان کھول کر اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میرے لیے پان لگانا شروع کردیا۔ چاندی کی چھوٹی چھوٹی کلیوں سے اس نے بڑی نفاست سے چمچی کے ساتھ چونا اور کتھا نکال کر رگیں نکالے ہُوئے پان پر پھیلایا اور گلوری بنا کر مجھے دی۔

”صادق! تمہارا کیا خیال ہے؟“

یہ کہہ کر وہ خالی الذہن ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔

”کس بارے میں؟“

اس نے سروتے سے بھنی ہُوئی چھالیا کاٹتے ہوئے کہا۔

”اس بکواس کے بارے میں جو خواہ مخواہ شروع ہوگئی ہے۔ یہ بکواس نہیں تو کیا ہے، یعنی میری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔ خود ہی پھاڑتی ہُوں، خود ہی رفو کرتی ہُوں۔ اگر یہ بکواس اسی طرح جاری رہے تو جانے کیا ہو گا۔ تم جانتے ہو میں بہت زبردست عورت ہُوں۔“

”زبردست سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

نیلم کے پتلے ہونٹوں پر وہی خفیف پُراسرار مسکراہٹ پیدا ہُوئی۔

”تم بڑے بے شرم ہو۔ سب کچھ سمجھتے ہو مگر مہین مہین چٹکیاں لے کر مجھے اکساؤ گے ضرور۔“

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی سفیدی گلابی رنگت اختیار کر گئی۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں کہ میں بہت گرم مزاج کی عورت ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی

”اب تم جاؤ۔ میں نہانا چاہتی ہوں۔“

میں چلا گیا۔ اس کے بعد نیلم نے بہت دنوں تک راج کشور کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہا۔ مگر اس دوران میں ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات سے واقف تھے۔ جو کچھ وہ سوچتی تھی، مجھے معلوم ہو جاتا تھا اور جو کچھ میں سوچتا تھا اسے معلوم ہو جاتا تھا۔ کئی روز تک یہی خاموش تبادلہ جاری رہا۔ ایک دن ڈائریکٹر کرپلانی جو

”بن کی سندری“

بنا رہا تھا، ہیروئن کی ریہرسل سُن رہا تھا۔ ہم سب میوزک روم میں جمع تھے۔ نیلم ایک کرسی پر بیٹھی اپنے پاؤں کی جنبش سے ہولے ہولے تال دے رہی تھی۔ ایک بازاری قسم کا گانا مگر دھن اچھی تھی۔ جب ریہرسل ختم ہُوئی تو راج کشور کاندھے پر کھادی کا تھیلا رکھے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈائریکٹر کرپلانی، میوزک ڈائریکٹر گھوش، ساؤنڈ ریکارڈسٹ پی اے این موگھا۔ ان سب کو فرداً فرداً اس نے انگریزی میں آداب کیا۔ ہیروئن مس عیدن بائی کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور کہا۔

”عیدن بہن! کل میں نے آپ کو کرافرڈ مارکیٹ میں دیکھا۔ میں آپ کی بھابھی کے لیے موسمبیاں خرید رہا تھا کہ آپ کی موٹر نظر آئی۔“

جھولتے جھولتے اس کی نظر نیلم پر پڑی جو پیانو کے پاس ایک پست قد کی کرسی میں دھنسی ہُوئی تھی۔ ایک دم اس کے ہاتھ نمسکار کے لیے اٹھے یہ دیکھتے ہی نیلم اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

”راج صاحب! مجھے بہن نہ کہیے گا۔“

نیلم نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ میوزک روم میں بیٹھے ہُوئے سب آدمی ایک لحظے کے لیے مبہوت ہو گئے۔ راج کشور کھسیانا سا ہو گیا اور صرف اس قدر کہہ سکا۔

”کیوں؟“

نیلم جواب دیے بغیر باہر نکل گئی۔ تیسرے روز میں ناگپاڑے میں سہ پہر کے وقت شام لال پنواڑی کی دکان پر گیا تو وہاں اسی واقعے کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ شام لال بڑے فخریہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”سالی کا اپنا من میلا ہو گا۔ ورنہ راج بھائی کسی کو بہن کہے، اور وہ بُرا مانے۔ کچھ بھی ہو، اس کی مراد کبھی پوری نہیں ہو گی۔ راج بھائی لنگوٹ کے بہت پکے ہیں۔“

راج بھائی کے لنگوٹ سے میں بہت تنگ آ گیا تھا۔ مگر میں نے شام لال سے کچھ نہ کہا اور خاموش بیٹھا اس کی اور اس کے دوست گاہکوں کی باتیں سنتا رہا جن میں مبالغہ زیادہ اور اصلیت کم تھی۔ اسٹوڈیو میں ہر شخص کو میوزک روم کے اس حادثے کا علم تھا، اور تین روز سے گفتگو کا موضوع بس یہی چیز تھی کہ راج کشور کو مس نیلم نے کیوں ایک دم بہن کہنے سے منع کیا۔ میں نے راج کشور کی زبانی اس بارے میں کچھ نہ سنا مگر اس کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اس نے اپنی ڈائری میں اس پر نہایت پر دلچسپ تبصرہ لکھا ہے اور پرارتھنا کی ہے کہ مس نیلم کا دل و دماغ پاک و صاف ہو جائے۔ اس حادثے کے بعد کئی دن گزر گئے مگر کوئی قابل ذکر بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ نیلم پہلے سے کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی اور راج کشور کے کرتے کے بٹن اب ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ جس میں سے اس کی سفید اور ابھری ہوئی چھاتی کے کالے بال باہر جھانکتے رہتے تھے۔ چونکہ ایک دو روز سے بارش تھمی ہوئی تھی اور

”بن کی سندری“

کا چوتھے سیٹ کا رنگ خشک ہو گیا تھا، اس لیے ڈائریکٹر نے نوٹس بورڈ پر شوٹنگ کا اعلان چسپاں کر دیا۔ یہ سین جو اب لیا جانے والا تھا، نیلم اور راج کشور کے درمیان تھا۔ چونکہ میں نے ہی اس کے مکالمے لکھے تھے، اس لیے مجھے معلوم تھا کہ راج کشور باتیں کرتے کرتے نیلم کا ہاتھ چومے گا۔ اس سین میں چومنے کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ مگر چونکہ عوام کے جذبات کو اکسانے کے لیے عام طور پر فلموں میں عورتوں کو ایسے لباس پہنائے جاتے ہیں جو لوگوں کو ستائیں، اس لیے ڈائریکٹر کرپلانی نے پرانے نسخے کے مطابق دست بوسی کا یہ ٹچ رکھ دیا تھا۔ جب شوٹنگ شروع ہُوئی تو میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سیٹ پر موجود تھا۔ راج کشور اور نیلم، دونوں کا ردِ عمل کیا ہو گا، اس کے تصور ہی سے میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔ مگر سارا سین مکمل ہو گیا، اور کچھ نہ ہوا۔ ہر مکالمے کے بعد ایک تھکا دینے والی آہنگی کے ساتھ برقی لیمپ روشن اور گل ہو جاتے۔ اسٹارٹ اور کٹ کی آوازیں بلند ہوتیں اور شام کو جب سین کے کلائمکس کا وقت آیا تو راج کشور نے بڑے رومانی انداز میں نیلم کا ہاتھ پکڑا مگر کیمرے کی طرف پیٹھ کر کے اپنا ہاتھ چوم کر الگ کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ نیلم اپنا ہاتھ کھینچ کر راج کشور کے منہ پر ایک ایسا چانٹا جڑے گی کہ ریکارڈنگ روم میں پی این موگھا کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ مگر اس کے برعکس مجھے نیلم کے پتلے ہونٹوں پر ایک تحلیل شدہ مسکراہٹ دکھائی دی۔ جس میں عورت کے مجروح جذبات کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ مجھے سخت ناامیدی ہُوئی تھی میں نے اس کا ذکر نیلم سے نہ کیا۔ دو تین روز گزر گئے اور جب نے اس نے بھی مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ کہا۔ تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسے اس ہاتھ چومنے والی بات کی اہمیت کا علم ہی نہیں تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے ذکی الحس

دماغ میں اس کا خیال تک بھی نہ آیا تھا اور اس کی وجہ صرف ہو سکتی ہے کہ وہ اس وقت راج کشور کی زبان سے جو عورت کو بہن کہنے کا عادی تھا، عاشقانہ الفاظ سُن رہی تھی۔ نیلم کا ہاتھ چومنے کی بجائے راج کشور نے اپنا ہاتھ کیوں چوما تھا۔ کیا اس نے انتقام لیا تھا۔ کیا اس نے اس عورت کی تذلیل کرنے کی کوشش کی تھی، ایسے کئی سوال میرے دماغ میں پیدا ہوئے مگر کوئی جواب نہ ملا۔ چوتھے روز جب میں حسبِ معمول ناگپاڑے میں شام لال کی دکان پر گیا تو اس نے مجھ سے شکایت بھرے لہجے میں۔

”منٹو صاحب آپ تو ہمیں اپنی کمپنی کی کوئی بات سُناتے ہی نہیں۔ آپ بتانا نہیں چاہتے یا پھر آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا؟ پتا ہے آپ کو، راج بھائی نے کیا کیا؟“

اس کے بعد اس نے اپنے انداز میں یہ کہانی شروع کی کہ

”بن کی سندری“

میں ایک سین تھا جس میں ڈائریکٹر صاحب نے راج بھائی کو مس نیلم کا منہ چومنے کا آرڈر دیا لیکن صاحب کہاں راج بھائی اور کہاں وہ سالی ٹکھیائی۔ راج بھائی نے فوراً کہہ دیا

”نا صاحب میں ایسا کام کبھی نہیں کروں گا۔ میری اپنی پتنی ہے اس گندی عورت کا منہ چوم کر کیا میں اس کے پوتر ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ملا سکتا ہُوں۔“

بس صاحب فوراً ڈائریکٹر صاحب کو سین بدلنا پڑا اور راج بھائی سے کہا گیا کہ اچھا بھئی تم منہ نہ چومو ہاتھ چوم لو مگر راج صاحب نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ جب وقت آیا تو اس نے اس صفائی سے اپنا ہاتھ چوما کہ دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہُوا کہ اس نے اس سالی کا ہاتھ چوما ہے۔“

میں نے اس گفتگو کا ذکر نیلم سے نہ کیا، اس لیے کہ جب وہ اس سارے قصّے ہی سے بے خبر تھی، اسے خواہ مخواہ رنجیدہ کرنے سے کیا فائدہ۔ بمبئی میں ملیریا عام ہے۔ معلوم نہیں، کون سا مہینہ تھا اور کون سی تاریخ تھی، صرف اتنا یاد ہے کہ

”بن کی سندری“

کا پانچواں سیٹ لگ رہا تھا اور بارش بڑے زوروں پر تھی کہ نیلم اچانک بہت تیز بخار میں مبتلا ہو گئی۔ چونکہ مجھے سٹوڈیو میں کوئی کام نہیں تھا، اس لیے میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا اس کی تیمار داری کرتا رہتا۔ ملیریا نے اس کے چہرے کی سنولاہٹ میں ایک عجیب قسم کی درد انگیز زردی پیدا کر دی تھی۔ اس کی آنکھوں اور اس کے پتلے ہونٹوں کے کونوں میں جو ناقابل بیان تلخیاں گھلی رہتی تھیں، اب ان میں ایک بے معلوم بے بسی کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ کونین کے ٹیکوں سے اس کی سماعت کسی قدر کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اسے اپنی نحیف آواز اونچی کرنا پڑتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میرے کان بھی خراب ہو گئے ہیں۔ ایک دن جب اس کا بخار بالکل دور ہو گیا تھا، اور وہ بستر پر لیٹی نقاہت بھرے لہجے میں عیدن بائی کی بیمار پرسی کا شکریہ ادا کر رہی تھی نیچے سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ یہ آواز سن کر نیلم کے بدن پر ایک سرد جھرجھری سی دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے کا دبیز ساگوانی دروازہ کھلا اور راج کشور کھادی کے سفید کُرتے اور تنگ پاجامے میں اپنی پرانی وضع کی بیوی کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ عیدن بائی کو عیدن بہن کہہ کر سلام کیا۔ میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنی بیوی کو جو تیکھے تیکھے نقشوں والی گھریلو قسم کی عورت تھی، ہم سب سے متعارف کرا کے وہ نیلم کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ چند لمحات وہ ایسے ہی خلا میں مسکراتا رہا۔ پھر اس نے بیمار نیلم کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی مرتبہ اس کی ڈھلی ہوئی آنکھوں میں ایک گرد آلود جذبہ تیرتا ہوا پایا۔ میں ابھی پورح طرح متحیر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس نے کھلنڈرے آواز میں کہنا شروع کیا

”بہت دنوں سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی بیمار پرسی کے لیے آؤں، مگر اس کم بخت موٹر کا انجن کچھ ایسا خراب ہوا کہ دس دن کارخانے میں پڑی رہی۔ آج آئی تو میں نے (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے) شانتی سے کہا کہ بھئی چلو اسی وقت اُٹھو۔ رسوئی کا کام کوئی اور کرے گا، آج اتفاق سے رکھشا بندھن کا تہوار بھی ہے۔ نیلم بہن کی خیر و عافیت بھی پوچھ آئیں گے اور ان سے رکھشا بھی بندھوائیں گے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کھادی کے کُرتے سے ایک ریشمی پھندنے والا گجرا نکالا۔ نیلم کے چہرے کی زردی اور زیادہ درد انگیز ہو گئی۔ راج کشور جان بوجھ کر نیلم کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، چنانچہ اس نے عیدن بائی سے کہا۔ مگر ایسے نہیں۔ خوشی کا موقع ہے، بہن بیمار بن کر رکھشا نہیں باندھے گی۔ شانتی، چلو اُٹھو۔ ان کو لپ اسٹک وغیرہ لگاؤ۔ میک اپ بکس کہاں ہے؟“

سامنے مینٹل پیس پر نیلم کا میک اپ بکس پڑا تھا۔ راج کشور نے چند لمبے لمبے قدم اُٹھائے اور اسے لے آیا۔ نیلم خاموش تھی۔ اس کے پتلے ہونٹ بھینچ گئے تھے جیسے وہ چیخیں بڑی مشکل سے روک رہی ہے۔ جب شانتی نے پتی ورتا استری کی طرح اُٹھ کر نیلم کا میک اپ کرنا چاہا تو اس نے کوئی مزاحمت پیش نہ کی۔ عیدن بائی نے ایک بے جان لاش کو سہارا دیکر اٹھایا اور جب شانتی نے نہایت ہی غیر صناعانہ طریق پر اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانا شروع کی تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ نیلم کی یہ مسکراہٹ ایک خاموش چیخ تھی۔ میرا خیال تھا۔ نہیں، مجھے یقین تھا کہ ایک دم کچھ ہو گا۔ نیلم کے بھنچے ہُوئے ہونٹ ایک دھماکے کے ساتھ واہوں گے اور جس طرح برسات میں پہاڑی نالے بڑے بڑے مضبوط بند توڑ کر دیوانہ وار آگے نکل جاتے ہیں، اسی طرح نیلم اپنے رُکے ہُوئے جذبات کے طوفانی بہاؤ میں ہم سب کے قدم اکھیڑ کر خدا معلوم کن گہرائیوں میں دھکیل لے جائے گی۔ مگر تعجب ہے کہ وہ بالکل

خاموش رہی۔ اس کے چہرے کی درد انگیز زردی غازے اور سرخی کے غبار میں چھپتی رہی اور وہ پتھر کے بت کی طرح بے حس بنی رہی۔ آخر میں جب میک اپ مکمل ہو گیا تو اس نے راج کشور سے حیرت انگیز طور پر مضبوط لہجے میں کہا۔

”لائیے! اب میں رکھشا باندھ دوں۔“

ریشمی پھندنوں والا گجرا تھوڑی دیر میں راج کشور کی کلائی میں تھا اور نیلم جس کے ہاتھ کانپنے چاہئیں تھے بڑے سنگین سکون کے ساتھ اس کا تکمہ بند کر رہی تھی۔ اس عمل کے دوران میں ایک مرتبہ پھر مجھے راج کشور کی ڈھلی ہُوئی آنکھ میں ایک گرد آلود جذبے کی جھلک نظر آئی جو فوراً ہی اس کی ہنسی میں تحلیل ہو گئی۔ راج کشور نے ایک لفافے میں رسم کے مطابق نیلم کو کچھ روپے دیے جو اس نے شکریہ ادا کر کے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیے۔ جب وہ لوگ چلے گئے، میں اور نیلم اکیلے رہ گئے تو اس نے مجھ پر ایک اُجڑی ہُوئی نگاہ ڈالی اور تکیے پر سر رکھ کر خاموش لیٹ گئی۔ پلنگ پر راج کشور اپنا تھیلا بھول گیا تھا۔ جب نیلم نے اسے دیکھا تو پاؤں سے ایک طرف کر دیا۔ میں تقریباً دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ جب اس نے کوئی بات نہ کی تو میں رخصت لیے بغیر چلا آیا۔ اس واقعہ کے تین روز بعد میں ناگپاڑے میں اپنی نو روپے ماہوار کی کھولی کے اندر بیٹھا شیو کر رہا تھا اور دوسری کھولی سے اپنی ہمسائی مسز فرینڈیز کی گالیاں سن رہا تھا کہ ایک دم کوئی اندر داخل ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیلم تھی۔ ایک لحظے کے لیے میں نے خیال کیا کہ نہیں، کوئی اور ہے۔ اس کے ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے منہ سے خون نکل نکل کر بہتا رہا اور پونچھا نہیں گیا۔ سر کا ایک بال بھی صحیح حالت میں نہیں تھا۔ سفید ساڑھی کی بوٹیاں اُڑی ہوئی تھیں۔ بلاوز کے تین چار ہک کھلے تھے اور اس کی سانولی چھاتیوں پر خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ نیلم کو اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے پوچھا ہی نہ گیا کہ تمہیں کیا ہوا، اور میری کھولی کا پتہ لگا کر تم کیسے پہنچی ہو۔ پہلا کام میں نے یہ کیا کہ دروازہ بند کر دیا۔ جب میں کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھا تو اس نے اپنے لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹ کھولے اور کہا۔

”میں سیدھی یہاں آ رہی ہوں۔“

میں نے آہستہ سے پُوچھا۔

”کہاں سے؟“

”اپنے مکان سے۔ اور میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ اب وہ بکواس جو شروع ہُوئی تھی، ختم ہو گئی ہے۔“

”کیسے؟“

”مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی میرے مکان پر آئے گا۔ اس وقت جب اور کوئی نہیں ہو گا! چنانچہ وہ آیا۔ اپنا تھیلا لینے کے لیے۔“

یہ کہتے ہوئے اس کے پتلے ہونٹوں پر جو لپ اسٹک نے بالکل بے شکل کر دیے تھے، وہی خیف سی پر اسرار مسکراہٹ نمودار ہُوئی۔

”وہ اپنا تھیلا لینے آیا تھا۔ میں نے کہا چلیے، دوسرے کمرے میں پڑا ہے۔ میرا لہجہ شاید بدلا ہوا تھا کیونکہ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے کہا گھبرائیے نہیں۔ جب ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں تھیلا دینے کی بجائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی اور میک اپ کرنا شروع کر دیا۔“

یہاں تک بول کر وہ خاموش ہو گئی۔ سامنے میرے ٹوٹے ہوئے میز پر شیشے کے گلاس میں پانی پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر نیلم غٹا غٹ پی گئی۔ اور ساڑھی کے پلو سے ہونٹ پونچھ کر اس نے پھر اپنا سلسلہ کلام جاری کیا۔

”میں ایک گھنٹے تک میک اپ کرتی رہی۔ جتنی لپ اسٹک ہونٹوں پر تھپ سکتی تھی، میں نے تھوپی، جتنی سرخی میرے گالوں پر چڑھ سکتی تھی، میں نے چڑھائی۔ وہ خاموش ایک کونے میں کھڑا آئینے میں میری شکل دیکھتا رہا۔ جب میں بالکل چڑیل بن گئی تو مضبوط قدموں کے ساتھ چل کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

میں نے جب اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے نیلم کی طرف دیکھا تو وہ مجھے بالکل مختلف نظر آئی۔ ساڑھی سے ہونٹ پونچھنے کے بعد اس کے ہونٹوں کی رنگت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا لہجہ اتنا ہی دبا ہوا تھا جتنا سرخ گرم کیے ہُوئے لوہے کا، جسے ہتھوڑے سے کوٹا جا رہا ہے۔ اس وقت تو وہ چڑیل نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن جب اس نے میک اپ کیا ہو گا تو ضرور چڑیل دکھائی دیتی ہو گی۔ میرے سوال کا جواب اُس نے فوراً ہی نہ دیا۔ ٹاٹ کی چارپائی سے اٹھ کر وہ میرے میز پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

”میں نے اس کو جھنجوڑ دیا۔ جنگلی بلی کی طرح میں اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ اس نے میرا منہ نوچا، میں نے اُس کا۔ بہت دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کشتی لڑتے رہے۔ اوہ۔ اس میں بلا کی طاقت تھی۔ لیکن۔ لیکن۔ جیسا کہ میں تم سے ایک بار کہہ چکی ہوں۔ میں بہت زبردست عورت ہوں۔ میری کمزوری۔ وہ کمزوری جو ملیریا نے پیدا کی تھی، مجھے بالکل محسوس نہ ہوئی۔ میرا بدن تپ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ میری ہڈیاں سخت ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے اس سے بلیوں کی طرح لڑنا شروع کیا۔ مجھے معلوم نہیں کیوں۔ مجھے پتا نہیں کس لیے۔ بے سوچے سمجھے میں اس سے بھڑ گئی۔ ہم دونوں نے کوئی بھی ایسی بات زبان سے نہ نکالی جس کا مطلب کوئی دوسرا سمجھ سکے۔ میں چیختی رہی۔ وہ صرف ہوں ہوں کرتا رہا۔ اس کے سفید کھادی کے کرتے کی کئی بوٹیاں میں نے ان انگلیوں سے نوچیں۔ اس نے میرے بال، میری کئی لٹیں جڑ سے نکال ڈالیں۔ اس نے

اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ مگر میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ فتح میری ہو گی۔ چنانچہ وہ قالین پر مُردے کی طرح لیٹا تھا۔ اور میں اس قدر ہانپ رہی تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ میرا سانس ایک دم رک جائے گا۔ اتنا ہانپتے ہوئے بھی میں نے اس کے کرتے کو چندی چندی کر دیا۔ اس وقت میں نے اس کا چوڑا چکلا سینہ دیکھا تو مجھے معلوم ہُوا کہ وہ بکواس کیا تھی۔ وہی بکواس جس کے متعلق ہم دونوں سوچتے تھے اور کچھ سمجھ نہیں سکتے تھے۔“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے اُٹھ کھڑی ہُوئی اور اپنے بکھرے ہُوئے بالوں کو سر کی جنبش سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہنے لگی۔

”صادق۔ کم بخت کا جسم واقعی خوبصورت ہے۔ جانے مجھے کیا ہوا۔ ایک دم میں اس پر جھکی اور اسے کاٹنا شروع کر دیا۔ وہ سی سی کرتا رہا۔ لیکن جب میں نے اس کے ہونٹوں سے اپنے لہو بھرے ہونٹ پیوست کیے اور اُسے ایک خطرناک جلتا ہُوا بوسہ دیا تو وہ انجام رسیدہ عورت کی طرح ٹھنڈا ہو گیا میں اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ مجھے اُس سے ایک دم نفرت پیدا ہو گئی۔ میں نے پورے غور سے اس کی طرف نیچے دیکھا۔ اس کے خوبصورت بدن پر میرے لہو اور لپ اسٹک کی سرخی نے بہت ہی بدنما بیل بوٹے بنا دیے تھے۔ میں نے اپنے کمرے کی طرف دیکھا تو ہر چیز مصنوعی نظر آئی۔ چنانچہ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا کہ شاید میرا دم گھٹ جائے اور سیدھی تمہاری پاس چلی آئی۔“

یہ کہہ وہ خاموش ہو گئی۔ مردے کی طرح خاموش۔ میں ڈر گیا اس کا ایک ہاتھ جو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا، میں نے چھوا۔ آگ کی طرح گرم تھا۔

”نیلم۔ نیلم۔“

میں نے کئی دفعہ اسے زور زور سے پُکارا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر جب میں نے بہت زور سے خوف زدہ آواز میں نیلم کہا تو وہ چونکی، اور اُٹھ کر جاتے ہُوئے اس نے صرف اس قدر کہا۔

”سعادت میرا نام رادھا ہے“!

میرا اہم سفر

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹومیرا ہم سفر

پلیٹ فارم پر شہاب، سعید اور عباس نے ایک شور مچا رکھا تھا۔ یہ سب دوست مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے آئے تھے، گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ شہاب نے بڑھ کر پائدان پر چڑھتے ہوئے مجھ سے کہا:

”عباس کہتا ہے کہ گھر جا کر اپنی

”ان“

کی خدمت میں سلام ضرور کہنا۔“

”وہ تو پاگل ہے۔ اچھا خدا حافظ۔“

میں نے ان علیگی دوستوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے یہ الفاظ جلدی میں ادا کیے اور شہاب سے ہاتھ ملا کر دروازے بند کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ علی گڑھ اور اس کی حسین علمی فضا جس میں مَیں اس سے کچھ عرصہ پہلے سانس لے رہا تھا، اب مجھ سے ایک طویل عرصہ کے لیے دور ہو رہی تھی۔ میرا دل سخت مغموم تھا۔ شہاب اگرچہ کالج میں بہت تنگ کرتا تھا مگر اس سے جُدا ہونے کا مجھے اب احساس ہوا، جب میں نے دفعتہً خیال کیا کہ امرتسر میں مجھے اس ایسا دلچسپ دوست میسر نہ آ سکے گا۔ اسی خیال کے غم افزا اثر کے تحت میں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے اور اس عمل سے گویا اپنے ذہن سے اس تاریکی کو جھٹکتے ہُوئے جیب میں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک سگرٹ نکال کر اس کو سُلگایا اور اطمینان سے نشست پر ٹھکانے سے بیٹھ کر اپنے سامان کا جائزہ لیا اور پھر اپنے ساتھی کی طرف جو سیٹ کے آخری حصے پر بیٹھا تھا، پیٹھ کر کے سگرٹ سے دھوئیں کے چھلے بنانے کی بے سود کوشش میں مصروف ہو گیا۔ میں بالکل خالی الذہن تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟ سگرٹ کا دھواں جس کو میں اپنے منہ سے چھلوں کی صورت میں نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہوا کے تند جھونکوں کی تاب نہ لا کر کھڑکی کے راستے کسی تھرکتی ہوئی رقاصہ کی طرح تڑپ کر باہر نکل رہا تھا۔ میں بہت عرصہ تک سگرٹ کے اس لرزاں دھوئیں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ یہ رقص کی ایک تکمیل تھی۔

”رقص کی تکمیل۔“

یہ الفاظ دفعتہً میرے دماغ میں پیدا ہُوئے اور میں اپنے اس اچھوتے خیال پر بہت مسرور ہُوا۔

”کیا میں پاگل ہُوں؟“

گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر کھلے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ آہنی پٹڑیوں کا بچھا ہُوا جال بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پتھریلی روش کے آس پاس اُگے ہُوئے درخت ایک دوسرے کا تعاقب کرتے معلوم ہوتے تھے۔ میں

“رقص کی تکمیل”

اور ان درختوں کی بھاگ دوڑ کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ ان حیران کن الفاظ نے مجھے چونکا دیا جو غالباً میرے اس ہم سفر نے ادا کیے تھے جو سیٹ کے آخری حصے پر کونے میں بیٹھا تھا۔ اس نے یقیناً یہ عجیب سوال مجھ سے ہی پوچھا تھا۔

“کیا آپ مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں؟”

“جی ہاں، کیا میں پاگل ہوں؟”

اس نے ایک بار پھر مجھ سے دریافت کیا۔ ٹرین کی روانگی پر جب میں نے شہاب سے یہ کہا تھا۔

“وہ تو پاگل ہے۔ اچھا خدا حافظ۔”

تو شاید اس شریف آدمی نے یہ خیال کر لیا تھا کہ میں نے اسی کو پاگل کہا ہے۔ میں کھل کھلا کر ہنس پڑا اور نہایت مودبانہ لہجہ میں کہا:

“آپ کو غلط فہمی ہُوئی ہے حضرت، گاڑی چلتے وقت شاید میں نے اپنے کسی دوست کو پاگل کے نام سے پکارا تھا۔ وہ تو ہے ہی پاگل۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ آپکو خواہ مخواہ تکلیف ہُوئی۔”

یہ معقول دلیل سن کر میرا ہم سفر جو غالباً کچھ اور کہنے کے لیے ذرا آگے سرک رہا تھا خاموش ہو گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ معاملہ نہیں بڑھا۔ اتفاق سے میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ عموماً نکمی سے نکمی باتوں پر طیش آ جایا کرتا ہے۔ چونکہ اس سے قبل کئی مرتبہ دورانِ سفر میں میرا مسافروں سے جھگڑا ہو چکا تھا۔ اور میں اس کے تلخ نتائج سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے لازمی طور پر میں اس معاملہ کو اتنی جلدی بخیر وخوبی انجام پاتے دیکھ کر بہت خوش ہُوا۔ چنانچہ میں نے اس مسافر سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لیے اس سے ایسے ہی گفتگو شروع کی۔ رسمی گفتگو جو عام طور پر گاڑیوں میں مسافروں کے ساتھ کی جاتی ہے۔

“آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟”

میں نے اس سے دریافت کیا۔

“میں۔”

یہ کہتے ہوئے وہ کونے سے سرکتا ہوا اٹھ کر میرے مقابلہ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

“میں دہلی جا رہا ہوں۔ آپ کہاں اتریں گے؟”

“مجھے کافی طویل سفر کرنا ہے۔ امرتسر جا رہا ہوں۔”

“امرتسر۔”

“جی ہاں۔”

“مجھے یہ شہر دیکھنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔ اچھی بارونق جگہ ہے۔ کپڑے کی تجارت کا مرکز ہے۔ کیا آپ وہاں کالج میں پڑھتے ہیں؟”

“جی ہاں۔”

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اسکا سوال میرے نزدیک بہت غیر دلچسپ تھا، اس کے علاوہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے اپنے ہم سفر سے یہ کہا ہوتا کہ میں علی گڑھ کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں تو وہ کالج کی دلچسپیوں، اسکی عمارت اور اسکے خدا معلوم کن کن حصوں اور شعبوں کے متعلق مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ اس سے قبل میرے ساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ جب میرے ایک رفیق سفر نے سوال پُوچھ پُوچھ رات کی نیند مجھ پر حرام کر دی تھی۔

“کون سے کالج میں۔ میرے خیال میں وہاں کئی کالج ہیں۔”

اس نے مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے جھٹ سے جواب دیا۔

“خالصہ کالج میں۔”

“اچھا، وہی جو اینڈرسن نے تعمیر کرایا ہے۔”

“اینڈرسن نے، مگر وہ سکھوں کا کالج ہے حضرت۔”

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہے مسٹر، یہ اینڈرسن سِکھ ہو گیا تھانا۔ آپ نے غالباً سکھ ہسٹری کا مطالعہ نہیں کیا۔“

”شاید۔“

یہ کہہ میں نے گفتگو کو دلچسپ نہ پاتے ہوئے منہ موڑ لیا اور کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ گاڑی اب یو۔ پی کے وسیع میدانوں میں دندناتی ہُوئی چلی جارہی تھی۔ لوہے کے پہیوں کی وزنی جھنکار اور چوبی شہتیروں کی کھٹ کھٹ فضا میں ایک عجیب یک آہنگ شور برپا کر رہی تھی۔ اس شور کی صدائے بازگشت نے آس پاس کے دوڑتے ہُوئے کھمبوں اور درختوں سے ٹکرا کر شام کی خُنک ہَوا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ میں نے ایسے ہی کھڑکی میں سے اپنا بازو باہر نکالا۔ منہ زور گاڑی کی تیز رفتار کی وجہ سے ہوا کے زبردست دھکے نے میرے بازو کو ریلا دیکر پیچھے دبا دیا۔ میں نے ٹھنڈی ہوا کے اس دباؤ کو بہت پیارا محسوس کیا۔ چنانچہ میں کھیل میں مصروف ہو گیا اور اپنے ہم سفر اور اس کی گفتگو کو بالکل بھول گیا۔ ہوا کے دباؤ کی دلنوازی بہت مسرور کن تھی۔ تھوی دیر کے بعد میں اپنے اس کھیل سے اُکتا گیا۔ دراصل بار بار ہوا کو چیرنے سے میرا بازو تھک گیا تھا۔ اب میں نے مڑ کر میدانوں کی وسعت کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ۔ آتشیں سرخ کرنیں میدان کے گڑھوں میں بارش کے جمع شدہ پانیوں پر زرنگاری کا کام کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری زمین کے سینے پر کسی نے بڑے بڑے آئینے آویزاں کر دیئے ہیں۔ بجلی کے تاروں اور کھمبوں پر نیل کنٹھ اور ابابیلیں پُھدک رہی تھیں۔ یہ منظر بہت سہانا تھا۔

”کیا میں پاگل ہوں؟“

ان الفاظ نے ایک بار پھر ان رنگوں کو منتشر کر دیا جو میرے دل و دماغ پر ایک نہایت ہی پیاری تصویر کھینچ رہے تھے۔ میں چونک پڑا۔ میرے اسی ہم سفر نے مجھ سے یہ سوال دریافت کیا تھا۔ میں مڑا۔ وہ میری طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید میرے کانوں کو دھوکا ہُوا ہے میں نے اس سے کہا۔

”کیا ارشاد فرمایا آپ نے؟“

وہ ایک لمحہ خاموش رہا اور پھر اپنے سر کو جھکتے ہوئے کہا۔

”کچھ بھی نہیں، شاید آپ نہ بتا سکیں گے“!

اب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر غالباً بیس بائیس برس کے قریب ہو گی۔ داڑھی کمال صفائی سے مونڈی ہوئی تھی۔ اسکے گال گوشت سے بھرے ہوئے تھے، ان کی موٹائی میں بہت خفیف سا فرق تھا، جو صرف مجھ ایسا باریک بیں ہی دیکھ سکتا ہے۔ بال جن میں سے کسی اچھے اور بڑھیا تیل کی خوشبو آ رہی تھی، پیچھے کی طرف کنگھی کیے گئے تھے جس سے اس کی پیشانی بہت کشادہ ہو گئی تھی۔ وہ معمولی قسم کے کشمیرے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کلف شدہ کالر قمیض کے ساتھ لگا ہوا تھا مگر ٹائی موجود نہ تھی۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بولا:

”میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔“

میں اس کے رازدارانہ لہجہ سے بہت متحیر ہُوا۔ آخر وہ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتا ہے؟ یہ خیال کرتے ہوئے میں نے جھک کر گویا اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو کر کہا۔

”بصد شوق۔ فرمایئے۔“

”کیا میں پاگل ہوں۔“

میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ جواب کیا دوں۔ آپ ہی فرمایئے میں اس شخص کو کیا جواب دے سکتا تھا جو بظاہر نہایت ہی ہوشمند انسان معلوم ہوتا تھا۔ بالکل میری اور آپکی طرح۔

”آپ؟۔ آپ؟“

۔ میں نے تتلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں میں۔ آپ فرمایئے نا“

اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے دریافت کیا۔

”مگر کیوں؟ آپ بڑے ہوشمند انسان ہیں۔“!

”آپ اپنی رائے مرتب کرنے میں جلدی سے کام نہ لیجیے، پھر غور فرما کر جواب دیجیے، کیا میں واقعی پاگل ہُوں۔“

اس میں غور کرنے کی بات ہی کوئی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنے ہم سفر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔ دراصل میں دو چیزیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اولاً یہ کہ کہیں وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا۔ ثانیاً یہ کہ شاید اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ ظاہر کر دے کہ وہ سچ مچ پاگل ہی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے سنا تھا کہ عام طور پر پاگلوں کی آنکھوں میں سرخ دوڑے اُبھرے ہوتے ہیں۔ مگر وہ آنکھیں جو میری طرف دیکھ رہی تھیں، غیر معمولی طور پر سفید تھیں۔ ایسا معلوم تھا کہ وہ سفید چینی کی بنی ہُوئی ہیں۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

”آپ کو کسی نے بہت غلط طور پر شک میں ڈال دیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے خیال کیا کہ شاید کسی ڈاکٹر نے اس کو وہم میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آج کل کے سستے اور جاہل ڈاکٹر بغیر سوچے سمجھے نبض پر ہاتھ رکھ کر کسی کو دیوانہ کسی کو مدقوق اور کسی کو ضعفِ اعصاب کا مریض ٹھہرا دیتے ہیں۔

”میرا ابھی یہی خیال ہے۔ مگر آپ کو قطعی طور پر یقین ہے کہ میں واقعی پاگل نہیں ہُوں۔“

اس نے کہا۔

”قطعی طور پر۔ جس شخص نے آپ کو اس وہم میں مبتلا کیا ہے۔ میرے خیال میں وہ خود پاگل ہے۔“

”خیر وہ تو پاگل نہیں، اچھا بھلا ہے۔“

”وہ کون بزرگ ہیں؟“

”میرا اپنا باپ۔“

”آپ کا باپ۔“

”جی ہاں۔ وہ کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں، حالانکہ میں خود اس قسم کی کوئی علامت نہیں پاتا۔ آج سے ایک سال قبل اس کی نظروں میں میں پاگل نہ تھا۔ لیکن جونہی میری شادی ہوئی میرے باپ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ موہن دیوانہ ہے۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سسرال والوں نے ڈر کے مارے اپنی لڑکی کو گھر بلوا لیا۔ اب وہ اس کو میرے حوالے نہیں کرتے۔ یہ کس قدر رنج افزا بات ہے کہ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ دس پندرہ دن بھی بسر کرنے میسر نہیں ہُوئے۔“

یہ کہتے ہُوئے اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ واقعتاً وہ بہت مغموم ہے۔ میں بھی بہت متاثر ہُوا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے باپ نے اسے خواہ مخواہ پاگل بنا کر اس کی زندگی کیوں تلخ کر دی ہے۔

”مگر آپ کے والد صاحب نے یہ حرکت کیوں کی؟“

میں نے اس کی داستان میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”مسٹر، وہ یہودی ہے۔ پکا یہودی۔ اس کو صرف اپنے طلائی سکّوں سے غرض ہے اور بس۔ میں اس کے خون کا ایک حصّہ ہوں مگر یہ چیز اسکے دل پر اثر نہیں کر سکتی ہے۔ اگر اس نے مجھے پاگل بنایا ہے تو اس میں بھی کوئی بڑا راز مضمر ہے۔ وہ اس قدر نفس پرست ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی جائیداد اس کے اپنے لڑکے کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ دیکھیئے، میں نے تین سال ہُوئے بی۔ اے پاس کیا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ میں کوئی نوکری حاصل نہیں کر سکا ہوں مگر میرے باپ کو یہ تو چاہیے کہ وہ مجھے اچھا خرچ دے۔“

”یقیناً۔“

میں نے پُرزور تائید کی۔

”لیکن وہ مجھے صرف پانچ روپے ماہوار دیتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے میرے شباب کی تمام رنگینیوں پر اپنی ہوّس پرستیوں کی سیاہی الٹ دی ہے۔ میں آگرہ میں پڑا ہوں، میری بیوی دہلی میں ہے۔ میرے اس یہودی باپ نے میرے اور اس کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ میں اس سے بے حد محبت کرتا ہُوں۔ وہ خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے، مگر وہ مجبور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو۔ اب میں اُس کا فیصلہ کر دینا چاہتا ہوں، میں نے اپنی تین پتلونیں اور تین کوٹ بیچ دیئے ہیں۔ اب میں دہلی جا رہا ہوں۔ دیکھا جائے گا جو ہو گا۔“

”آپ اپنی بیوی کے پاس جا رہے ہیں۔“

میں نے اُس سے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔ میں گھر میں بغیر اجازت لیے داخل ہو جاؤں گا اور وہاں سے اپنی بیوی کو لیے بغیر ہر گز ہر گز نہ ٹلوں گا۔ اگر میں پاگل ہُوں، تو ہُوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ سوشیلا (یہ کہتے ہوئے ذرا سا جھینپ گیا) میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گی۔ میں نے اُس کے لیے نمائش میں سے ایک اونی سوئٹر خریدا ہے۔ وہ اس کو یقیناً پسند کرے گی۔ کیا آپ اُسے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟“

”اگر آپ کو ٹرنک وغیرہ کھولنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔“

میں نے جواب دیا۔

”نہیں صاحب، یہ تو میں نے قمیض کے اندر خود پہن رکھا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور کوٹ اتار دیا۔ پھر قمیض کو پتلون کی گرفت سے آزاد کر کے اُس نے اسے بھی اُتار دیا۔ وہ واقعی ایک رنگ برنگی فیتوں والا زنانہ سوئٹر پہنے ہوئے تھا۔

”کیا آپ کو پسند ہے؟۔ یہ میں نے اس لیے پہن رکھا ہے کہ اگر سوشیلا نے اس کو لینے سے انکار کر دیا تو میں اسے پہنے ہی رہوں گا۔“

اس زنانہ سوئٹر میں وہ کس قدر عجیب معلوم ہوتا تھا۔

نامکمل تحریر

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹونا مکمل تحریر

میں جب کبھی ذیل کا واقعہ یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چُبھنے لگتی ہیں۔ ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ جس کے باعث موسم خنک ہو گیا تھا۔ جب میں صبح سویرے غسل کے لیے ہوٹل سے باہر نکلا تو دُھلی ہوئی پہاڑیوں اور نہائے ہوئے ہرے بھرے چیڑوں کی تازگی دیکھ کر طبیعت پر وہی کیفیت پیدا ہُوئی جو خوبصورت کنواریوں کے جُھرمٹ میں بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ بارش بند تھی البتہ ننھی ننھی پھوار پڑ رہی تھی۔ پہاڑیوں کے اونچے اونچے درختوں پر آوارہ بدلیاں اونگھ رہی تھیں گویا رات بھر برسنے کے بعد تھک کر چُور چُور ہو گئی ہیں۔ میں چشمے کی طرف روانہ ہُوا۔ کاندھے پر تولیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں صابن دانی تھی، دوسرے میں نیکر۔ جب سڑک کا موڑ طے کرنے لگا تو آنکھوں کے سامنے دُھند ہی دُھند نظر آئی۔ بادل کا ایک بھولا بھٹکا ٹکڑا تھا جو شاید آسمانی فضا سے اُکتا کر اِدھر آنکلا تھا۔ اِس بادل نے سڑک کے دوسرے حصے کو آنکھوں سے بالکل اوجھل کر دیا تھا۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی سپیدی ہی سپیدی نظر آئی اور ایسا معلوم ہُوا کہ اوپر سے کوئی دُھنکی ہوئی روئی بکھیر رہا ہے۔ اتنے میں ہوَا کے تیز جھونکوں نے اس سپیدی میں ارتعاش پیدا کیا اور اِس دھند میں سے دُور مثال بخارات علیحدہ ہونے لگے اور میری ننگی باہوں سے مَس ہُوئے۔ برف سے اٹھتے ہُوئے دھوئیں کی سردی کے احساس سے وہی کیفت پیدا ہوتی ہے جو ان بخارات نے پیدا کی۔ اس بادل میں سے گزرتے وقت سانس کے ذریعے سے یہ سپید سپید بخارات میرے اندر داخل ہو گئے جس سے پھیپھڑوں کو بڑی راحت محسوس ہوئی۔ میں نے جی بھر کے اس سے لُطف اُٹھایا۔ جب بادل کے اس ٹکڑے کو طے کر کے میں باہر آیا تو آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ میرے چشمے کے شیشے کاغذ کے مانند سفید ہو گئے تھے۔ پھر ایکا ایکی مجھے سردی محسوس ہونے لگی اور جب میں نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو وہ شبنم آلود تکیے کی طرح گیلے ہو رہے تھے۔ میں غُسل خانے کے معاملے میں بے حد سست ہوں اور سردیوں کے موسم میں تو روزانہ غسل کا میں بالکل قائل نہیں۔ دراصل نہانے دھونے کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا ہے۔ غسل کا مطلب یہ ہے کہ غلاظت دُور کی جائے اور روز نہانے کا یہ مطلب ہوا کہ آدمی رات۔ میں غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ منہ دھو لیا جائے، پیر صاف کر لیے جائیں، سر کے بال دھو لیے جائیں اس لیے کہ یہ سب چیزیں جلدی میلی ہو سکتی ہیں۔ مگر ہر روز بدن کیوں صاف کیا جائے جب کہ یہ بہت دیر کے بعد میلا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو خیر میں نہانے کا مطلب سمجھ سکتا ہُوں مگر سردیوں میں اس کا کوئی مصرف مجھے نظر نہیں آتا۔ آخر کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہر روز صبح سویرے انسان غسل خانے میں جائے۔ سردی کے مارے پورے دو گھنٹوں تک دانت بجتے رہیں، انگلیاں سُن ہو جائیں، ناک برف کی ڈلی بن جائے۔ غسل نہ ہوا، اچھی خاصی مصیبت ہوئی۔ غسل کے بارے میں اب بھی میرا یہی خیال ہے، لیکن جس پہاڑی گاؤں کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہاں کی فضا ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ جو چیزیں مجھے اب مہمل نظر آتی ہیں یا اس سے پہلے نظر آیا کرتی تھیں وہاں بامعنی دکھائی دیتی تھیں۔ اس غسل ہی کو لیجیے۔ اس پہاڑی گاؤں میں جتنا عرصہ میں رہا ہر روز میرا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ نہاؤں اور دیر تک نہاتا رہوں۔ چشمے پر پہنچ کر میں نے کپڑے اتارے۔ نیکر پہنچی اور جب پانی کی اس گرتی ہوئی دھار کے پاس گیا جو پتھروں پر گر کر ننھے ننھے چھینٹے اُڑا رہی تھی تو پانی کی ایک سرد بوند میری پیٹھ پر آ پڑی۔ میں تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ جہاں بوند گری تھی اس جگہ گدگدی پرکار کی نوک کی طرح چُبھی اور سارے جسم پر پھیل گئی۔ میں سِمٹا، کانپا اور سوچنے لگا۔ مجھے واقعی نہانا چاہیے یا کہ نہیں۔ قریب تھا کہ میں باغی ہو جاؤں لیکن آس پاس نگاہ دوڑائی تو ہر شے نہائی ہوئی نظر آئی چنانچہ جو باغیانہ خیال میرے دماغ میں اس شریر بوند نے پیدا کیے تھے ٹھنڈے ہو گئے۔ سرد پانی کی گُدگُدیاں شروع شروع میں تو مجھے بہت ناگوار گزریں مگر جب میں جی کڑا کر کے دھار کے نیچے بیٹھ گیا تو وہ لطف آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ زور زور سے پانی کے چھینٹے اُڑانے سے سردی کی شدت کم ہو جاتی تھی، چنانچہ جب میں نے یہ گُر معلوم کر لیا تو پھر اس لطف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ سر پر پانی کی موٹی دھار نے عجیب کیفت پیدا کر دی۔ پھر جب پانی کے دباؤ سے بال پیشانی پر سے نیچے لٹک آئے اور انھوں نے آنکھوں اور منہ میں گھسنا شروع کر دیا تو زور زور سے پھونکیں مار کر ان کو ہٹانے کی ناکام سعی نے مزا اور بھی دوبالا کر دیا۔ کبھی کبھی ڈوب کر ابھرتے ہوئے آدمی کا احساس بھی مجھے ہوا اور میں نے سوچا کہ جو لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں انکو ایسی موت میں بے حد لُطف آتا ہو گا۔ چشمے کا پانی آنسوؤں کی طرح شفاف تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ارد گرد بُلبلوں اور پانی کے چھینٹوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ غسل سے فارغ ہو کر میں نے تولیے سے بدن پونچھا اور سردی کا احساس کم کرنے کے لیے دھیمے دھیمے سروں میں ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یہ سُریلی گنگناہٹ ہوا کے جھونکوں سے مرتعش ہو جاتی اور میں یہ سمجھتا کہ میرے بجائے کوئی اور آدمی بہت دُور گا رہا ہے، اس پر میں تولیے کو زیادہ زور کے ساتھ بدن پر ملنے لگتا۔ بدن خشک ہو گیا تو میں نے کپڑے پہنے۔ اس اثنا میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میرے عین اوپر بادل کا ایک اسفنج نما ٹکڑا چھتری کی طرح پھیلا ہُوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پہاڑی پر سے نیچے اترنا شروع کیا اور فوراً ہی کودتا پھاندتا سڑک میں اتر آیا۔ متوقع بارش سے بچنے کے لیے میں نے قدم تیز کر دیئے۔ لیکن ابھی سڑک پر بمشکل ایک جریب کا فاصلہ طے کرنے پایا تھا کہ

”اے بکری بکری“

کی آواز بلند ہُوئی پھر اس کے ساتھ ہی دور پہاڑیوں نے اس آواز کو دبوچ کر دوبارہ ہوا میں اچھال دیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بھی اس آواز کو گیند کی طرح دبوچ لوں اور ہمیشہ کے لیے اپنی جیب میں ڈال لوں۔ میں ٹھہر گیا۔ وہی مانوس دل نواز صدا تھی جو اس سے قبل میں کئی مرتبہ سُن چکا تھا۔ بظاہر

”اے بکری بکری“

تین معمولی لفظ ہیں اور کاغذ پر یہ کوئی ایسا تصور پیش نہیں کرتے جو انوکھا اور حسین ہو مگر واقعہ ہے کہ میرے لیے ان میں وہ سب کچھ تھا جو روح کو مسرُور کر سکتا ہے جو نہی یہ آواز میری سماعت سے مَس ہوتی مجھے یہ معلوم ہوتا کہ پہاڑ کی چھاتی میں سے صدیوں کی رُکی ہُوئی آواز نکلی ہے اور سیدھی آسمان تک پہنچ گئی ہے۔

”اے“

بالکل دھیمی آواز میں اور

”بکری بکری“

بلند اور فلک رس سُروں میں۔ ایک لمحہ کے لیے یہ نعرہ شباب پہاڑیوں کی سنگین دیواروں میں گونجتا ڈوبتا، ابھرتا، تھرتھراتا اور رباب کے تاروں کی آخری لرزش کی طرح کانپتا فضا میں گھل مل جاتا۔ کالی کالی بدلیاں چھا رہی تھیں۔ فضا نم آلود تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں اس نمی نے غنودگی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی میں نے اوپر پہاڑی پر اگی ہُوئی ہری ہری جھاڑیوں کی طرف دیکھا اور ان کے عقب میں مجھے دو تین سفید بکریاں نظر آئیں۔ میں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ ایک منہ زور بکری وزیر کو گھسیٹے لیے جا رہی تھی اور وہ اس کو ڈانٹ بتانے کے لیے

”اے، بکری بکری“

پکار رہی تھی۔ اس کا منہ غصہ اور زور لگانے کے باعث پگھلے ہُوئے تابنے کی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسی کو پوری طاقت سے کھینچنے میں اسکا سینہ غیر معلوم طور پر عریاں ہو گیا تھا۔ سر پیچھے جھکا یا تھا۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہُوئے تھے، سر پر سے دوپٹہ اُتر کر باہوں میں چلا آیا تھا۔ پیشانی پر سیاہ بالوں کی لٹیں بل کھاتی ہُوئی سنپولیاں معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک سبز جھاڑی کے پاس پہنچ کر بکری دفعتاً ٹھہر گئی اور اس کے نرم نرم پتوں کو اپنی تھوتھنی سے سونگھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر وزیر نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا اُترا ہُوا دوپٹہ ایک بڑے سے پتھر پر رکھ کر اس نے پاس والے درخت کے تنے سے بکری کے گلے میں بندھی ہُوئی رسی باندھی اور دوسرے پیڑ کی جھکی ہوئی ٹہنی پکڑ کر جھولا جھولنے لگی۔ میں جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ بازو اُوپر اُٹھانے کے باعث اس کی کھلی آستین نیچے ڈھلک آئی۔ کپڑے کے یہ چھلکے سے جب اترے تو اس کے بازو کندھوں تک عریاں ہو گئے۔ بڑی خوبصورت باہیں تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کو ہاتھی کے دو بڑے دانت اوپر کو اُٹھے ہُوئے ہیں۔ بے داغ، ہموار اور زندگی سے بھرپور۔ وہ جُھولا جُھول رہی تھی اور اس کے دونوں بازو کچھ اس انداز سے اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کر جائے گی۔ جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر میں اس کے سامنے آگیا۔ دفعتاً اس نے میری طرف نگاہیں اٹھائی۔ سٹ پٹائی، ٹہنی کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ گری، سنبھلی اور حلق میں سے ایک مدھم چیخ نکالتی دوڑ کر دوپٹہ لینے کے لیے پتھر کی طرف بڑھی۔ مگر دوپٹہ میری بغل میں تھا۔ اس نے دوپٹہ کی تلاش میں یہ جانتے بوجھتے کہ وہ میری بغل میں ہے، اِدھر اُدھر دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے اُبھر آئے۔ گال اور سرخ ہو گئے۔ اور وہ سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں بازوؤں کی مدد سے اس نے اپنے سینے کی شوخیوں کو چھپا لیا اور انھیں اور اور زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی وہ پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس پر بھی جب اسے اطمینان نہ ہوا تو اس نے گھٹنے اُوپر کر لیے اور بگڑ کر مجھ سے کہنے لگی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میرا دوپٹہ لایئے۔“

میں بڑھا اور بغل میں سے دوپٹہ نکال کر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ مجھے اس کے بیٹھنے کا انداز بہت پسند آیا۔ چنانچہ میں بھی اسی طرح اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وزیر جوان آوازوں کا ایک بہت بڑا انبار ہے اور میں۔ اور میں خدا معلوم کیا ہوں۔ اس کو ہاتھ لگاؤں گا تو وہ باجے کی طرح بجنا شروع ہو جائے گی۔ ایسے سُر اس میں سے نکلیں گے جو مجھے اُوپر بہت اُوپر لے جائیں گے اور زمین اور آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق کر دیں گے جہاں میں کوئی آواز سن نہ سکوں گا۔ وزیر نے مجھے جنگلی بلی کی طرح گُھور کر دیکھا گویا کہنا چاہتی ہے۔ ارے جاؤ یہاں دھرنا دے کر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ میں نے اُس کے اس خاموش حکم کی کوئی پرواہ نہ کی اور کہا:

”چشمے سے واپس آ رہا تھا کہ تمہاری آواز سنی بے اختیار کھنچا چلا آیا۔ وزیر۔ تمہاری یہ آواز مجھے یقیناً پاگل بنا دے گی۔ جانتی ہو پاگل آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔“

میری یہ بات سُن کر اس کو حیرت ہوئی۔

”یہ کیا پاگل پن ہے۔ میری آواز کسی کو کیوں پاگل بنانے لگی۔“

میں نے کہا۔

”جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو۔ دنیا میں یہ راگ راگنیاں کہاں سے آئی ہیں۔ لیکن چھوڑو اس قصے کو۔ یہ بتاؤ، میری ایک بات مانو گی؟“

”مان لوں گی، پر آپ یہ تو کہیئے بات کیا ہے؟“

”ایک دفعہ میری خاطر، اے، بکری بکری، کا نعرہ بُلند کر دو۔“

مجھے ہاتھ سے دھکا دے کر اس نے تیز لہجہ میں کہا۔

”یہ کیا پاگل پن ہے۔، بنانے کے لیے صرف ایک میں ہی رہ گئی ہوں۔“

”وزیر، بخدا میں تمہیں بنا نہیں رہا۔ مجھے تمہاری یہ آواز پسند ہے۔ جھوٹ کہوں تو۔ لے اب مان بھی جاؤ۔ ایک بار“!

”جی نہیں۔“

”میں تم سے التجا کرتا ہُوں۔“

”میں نے یہ آواز نہ کبھی نکالی ہے اور نہ اب نکالوں گی۔“

”میں ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں۔“

”یااللہ۔ یہ کیا مصیبت ہے۔“

وزیر نے اپنا بدن سکیڑ لیا۔

”اور اگر نہ مانوں تو۔ یعنی یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میں اسی وقت آپ کے کہنے پر بیکار چلانا شروع کر دوں۔ آپ تو خواہ مخواہ چھیڑ خانی کر رہے ہیں اور میں نگوڑی جانے کیا سمجھ رہی ہوں۔ بھئی ہو گا، ہمیں یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔“

”وزیر“!

میں نے بڑی سنجید گی کے ساتھ کہا۔

”میری طرف دیکھو۔ میرے چہرے سے تم اس بات کا اطمینان کر سکتی ہو کہ میں ہنسی مذاق نہیں کر رہا۔“

اس نے میرے چہرے کی طرف مصنوعی غور سے دیکھا اور میری ناک پر اُنگلی رکھ کر کہا۔

”آپکی ناک پر یہ ننھا سا تِل کتنا بھلا دکھائی دیتا ہے۔“

اُس وقت میرے جی میں آئی کہ اس پتھر پر جس پر وہ بیٹھی ہوئی ہے میں ناک گھسنا شروع کر دوں تا کہ وہ ننھا سا تل ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ وزیر نے میری طرف دیکھا تو وہ یہ سمجھی کہ میں روٹھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، چنانچہ اس نے فوراً اپنی بکریوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا۔

”بابا، آپ خفا نہ ہو جایئے۔ قریب تھا کہ وہ اپنی مخصوص آواز بلند کرے کہ ایکا ایکی جھجک اس پر غالب آگئی۔ بہت زیادہ شرما کر اس نے اپنی گردن جُھکالی

”پر میں پوچھتی ہُوں اس میں خاص بات ہی کیا ہے۔“

میں نے بگڑ کر کہا۔

”وزیر، تم اب باتیں نہ بناؤ۔“

دوسری طرف منہ کر کے اس نے ایکا ایکی بلند آواز میں

”اے بکری بکری“

پُکارا۔ اس کے بعد شرمیلی ہنسی کا ایک فوارہ سا اس کے منہ سے چھوٹ پڑا۔ میں بلندیوں میں پرواز کر گیا۔ کتنی صاف اور شفاف آواز تھی۔ دُھلی فضا میں اس کی گونج دیر تک دُور، نظر سے اوجھل ہو جانے والے پرندوں کے پروں کی طرح چمکتی رہی۔ پھر جذب ہو گئی۔ وزیر کی طرف میں نے دیکھا۔ اب وہ خاموش تھی۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر صاف تھا۔ آنکھیں نہاتی ہوئی چڑیوں کی طرح بے قرار تھیں۔ ہنسنے کے باعث ان میں آنسو بھر آئے تھے۔ ہونٹ اس انداز سے کُھلے ہوئے تھے کہ میرے ہونٹوں میں سرسراہٹ پیدا ہو گئی۔ خدا معلوم کیا ہوا میں نے وزیر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کا سر میری گودی میں ڈول آیا۔ لیکن ایکا ایکی زور سے وہ اپنا بازو میرے جھکے ہُوئے سر اور اپنے متحیر چہرے کے درمیان لے آئی اور دھڑکتے ہُوئے لہجہ میں کہنے۔

”ہٹایئے، ہٹایئے ان ہونٹوں کو“!

میری گود سے نکل کر وہ بھاگ گئی اور میرے ہونٹوں کی تحریر نامکمل رہ گئی۔ اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے، مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چُبھنے لگتی ہیں۔ یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر اٹکا رہے گا۔

نُطفہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹونُطفہ

”معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کی شخصیت در حقیقت ایسی ہی تھی جیسی آپ نے افسانے میں پیش کی ہے، یا محض آپ کے دماغ کی پیداوار ہے، پر میں اتنا جانتا ہوں کہ ایسے عجیب و غریب آدمی عام ملتے ہیں۔ میں نے جب آپ کا افسانہ پڑھا تو میرا دماغ فوراً ہی اپنے ایک دوست کی طرف منتقل ہو گیا۔ صادقے کی طرف۔ آپ کے بابو گوپی ناتھ اور اس میں بظاہر کوئی مماثلت نہیں ہے۔ لیکن میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے۔ آپ کے بابو گوپی ناتھ کو دولت وراثت میں ملی ہے۔ میرے صادقے کو اپنی محنت و مشقت اور ذہانت کے صلے میں۔ دونوں شاہ خرچ تھے۔ آپ کا بابو گوپی ناتھ بظاہر بدھو تھا۔ لیکن دراصل بہت ہوشیار اور باخبر آدمی تھا۔ میرا صادق اندر باہر سے بالکل ایک جیسا تھا۔ وہ بدھو تھا نہ چالاک۔ درمیانے درجے کی عقل و فہم کا آدمی تھا۔ اپنے کاموں میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار۔ حسب کا پکا۔ لیکن دین کے معاملے میں بڑا ابا اصول۔ آپ کے بابو گوپی ناتھ کو لُٹ جانے میں مزا آتا ہے۔ اسے دوسروں کو لوٹنے میں۔ بابو صاحب کو پیروں فقیروں کے تکیوں اور رنڈیوں کے کوٹھوں سے رغبت تھی۔ صادق کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر ان تمام تفاوتوں کے باوجود میں جب بھی بابو گوپی ناتھ کو صادق کے ساتھ کھڑا کرتا ہوں تو مجھے ان کے خدوخال ایک جیسے نظر آتے ہیں، جیسے وہ جڑواں ہیں۔ میں تجزیہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے آپ، جب صادق کا حال مجھ سے سنیں تو اس کو انسانوں کی کسی اور ہی صف میں کھڑا کر دیں۔ جس میں بابو گوپی ناتھ کی مونچھ کا ایک بال بھی نہ آسکا ہو، لیکن میں سمجھوں گا کہ آپ کے تجزیے میں غلطی ہوئی ہے اور میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اسے اس صف سے نکال کر اس صف میں شامل کر دیجیے جس میں آپ کا بابو گوپی ناتھ موجود ہے۔ میں افسانہ نگار نہیں۔ معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کے حالات آپ نے من و عن بیان کیے ہیں ان میں کچھ رد و بدل کیا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے بہت خوب ہے۔ اور کچھ اس افسانے میں ہے۔ اگر اس کے مطابق بابو گوپی ناتھ نہیں چلا تو لعنت ہے اس پر۔ اور اگر وہ ایسا ہی تھا جیسا کہ افسانے میں ہے تو اس پر خدا کی رحمت ہو۔ یقین مانیے ایسے لوگ پرستش کے قابل ہوتے ہیں۔ اور صادق کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس سے میری ملاقات دلی میں ہوئی۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ ٹھیکیداریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ صادقے کی پانچوں گھی میں تھیں اور سر محاورے کے مطابق کڑاہے میں۔ میل ملاپ اور اثر رسوخ کافی تھا اور شاہ خرچ تھا ہی۔ دس بیس پر تکلف دعوتیں کرتا اور ایک کنٹریکٹ اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ ایک بات ہے۔ بے شک اس نے بہت کمایا۔ دونوں ہاتھوں سے گورنمنٹ کا مال لوٹا۔ لیکن اس میں اس نے ان لوگوں کو برابر کا حصہ دیا جن کے ذریعے سے اس کو اس لوٹ کے مواقع بہم پہنچے تھے۔ اسی دوران میں اس کا گزر ان وادیوں میں ہوا جن کا بابو گوپی ناتھ ایک بہت بڑا زائر تھا۔ لیکن وہ ان میں بھٹکا نہیں۔ دوسروں کے ساتھ محض رواداری کی خاطر جاتا رہا اور واپس گھر آکر اپنے جوتوں کی گرد جھاڑ کر بیٹھ جاتا رہا۔ اس نے بوتل سے بھی تعارف حاصل کیا۔ مگر معانقے کی نوبت نہ آنے دی۔ ایک دو گھونٹ پی۔ صرف دوسروں کا ساتھ دینے کے لیے۔ ان کوٹھوں پر جہاں آپ کے بابو گوپی ناتھ کے قول کے مطابق دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ صادقے نے خود کو دھوکا دینے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ایک دو بار اسے اپنے ساتھیوں کی خوشی کے لیے رنڈیوں کا منہ چومنا پڑا تھا اور چند واہیات حرکتیں بھی کرنا پڑی تھیں، مگر اس نے ان سے کوئی لطف حاصل نہیں کیا تھا۔ وہ رنڈی کے متعلق کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اگر ملٹری کے نوجوانوں کے لیے رنڈیاں فراہم کرنے کا ٹھیکہ اسے مل جاتا تو وہ یقیناً ان کے متعلق بڑے غور و فکر سے سوچنا شروع کر دیتا۔ وہ کاروباری آدمی تھا۔ لیکن ایک دم حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ صادق وہ صادق ہی نہ رہا جنگ ختم ہوئی تو ٹھیکے بھی ختم ہو گئے۔ پھر مقدموں کا کچھ ایسا تانتا بندھا کہ صادق کچہریوں کے چکر میں پھنس گیا۔ جو دولت پیدا کی تھی، سب مقدموں کی نذر ہو گئی موٹر کے بجائے اب صادق ٹانگے پر ہوتا تھا یا سائیکل پر۔ پہلے نئے سا نیا سوٹ اس کے بدن پر ہوتا ہے۔ اب اسے کپڑوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہتی تھی پہلے اس کے خوشامدی دوست اسے نواب صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اب وہ صرف

”صادقا“

”اوئے صادقا۔“

رہ گیا تھا۔ مگر ان کی اس تبدیلی تخاطب کو صادق نے قطعاً محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کو اپنے مقدموں کی اتنی فکر تھی کہ وہ ایسی فروعات کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ کچہریوں کے اس چکر میں اس نے اپنی مرضی سے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھوڑے ہی عرصے میں بڑے دھڑلے کا شرابی بن گیا۔ اسی دوران میں اس کی ملاقات سرحد کے ایک خان سے ہوئی جس کو وہاں کی حکومت نے صوبہ بدر کر رکھا تھا۔ یہ ملاقات رنڈی کے ایک کوٹھے پر ہوئی۔ زندگی میں صادق پہلی مرتبہ کسی انسان کے خلوص سے متاثر ہوا۔ یہ خان اپنے علاقے کا بہت بڑا رئیس تھا۔ بالکل ان پڑھ مگر جاہل نہیں تھا۔ اس کا دل و دماغ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے پوری طرح روشن تھا۔ وہ ایک بہت بڑا انقلاب چاہتا تھا جو ظلم و ستم کو خس و خاشاک کی

طرح بہا کر لے جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ سرمائے کی لعنت سے دنیا آزاد ہو جائے۔ دنیا آزاد نہ ہو تو کم از کم اس کا صوبہ آزاد ہو جائے۔ ان خیالات کی پاداش میں وہ اپنے وطن سے باہر نکال دیا گیا۔ میں آپ کی طرح افسانہ نگار نہیں ہوں۔ مجھ سے حاشیہ آرائی نہیں ہوتی۔ خان کا کیریکٹر بھی کم دلچسپ نہیں۔ کسی زمانے میں وہ بڑا پر جوش سرخ پوش تھا۔ اس تحریک سے وابستہ ہو کر اس نے کئی مرتبہ جیل دیکھی۔ اپنی جائیداد میں سے ہزاروں روپے خرچ کیے۔ جب بٹوارہ ہوا تو وہ مسلم لیگی بن گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح سے اس کو والہانہ عشق ہو گیا۔ مسلم لیگ کی تنظیم کے لیے اس نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں، لیکن پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ وہ جو تعلیم یافتہ تھے، اس سے آگے بڑھ گئے اور بڑے بڑے منصبوں پر جا بیٹھے۔ خان جھنجھلا گیا۔ اس جھنجھلاہٹ میں اس نے اپنے غیض و غضب کا بڑا خام مظاہرہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا گیا۔ جس زمانے میں صادق کی ان سے ملاقات ہوئی، آپ کی حالت بالکل بچوں کی سی تھی۔ ان بچوں کی سی جن کو معمولی سی شرارت پر سخت گیر ماسٹر نے بنچ پر کھڑا کر دیا ہو یا مرغا بنا کر کلاس کے ایک کونے میں کان پکڑنے کا حکم دے دیا ہو۔ صادق جب بھی مجھ سے ان کی بات کرتا تو کہتا۔

”بڑا ایبیا آدمی ہے۔“

کچھ میں بھی اس خان کے متعلق جانتا ہوں۔ یہ واقع ہے کہ صرف

”ببیا“

ہی ایک ایسا لفظ ہے جو اس کی شخصیت کو پورے طور پر اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ وطن سے دور تھا۔ سینکڑوں میل دور۔ مگر وطن کی یاد اسے کبھی نہیں ستاتی تھی۔ اپنے گاؤں میں ایک چھوڑ دو بیویاں تھیں، مگر ان کے متعلق اس نے کبھی تردد کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ اس کو اس طرف سے کامل یقین تھا کہ زمینداری سے جو کچھ وصول ہوتا ہے، ان کے اخراجات کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ سات آٹھ سو روپیہ ماہوار اس کا منیجر وہاں سے روانہ کر دیتا تھا۔ جو اس کی واکسہال موٹر کے پٹرول اور اس کی شراب پر اٹھ جاتا تھا۔ گھر اس کا ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے پر تھا۔ صوبہ بدر ہونے کے بعد اس نے کچھ دیر اس منڈی کے مختلف کوٹھوں پر جھک ماری۔ آخر کار ایک کوٹھا منتخب کر کے وہاں مستقل طور پر اپنے ڈیرے جما دیے۔ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد خان صاحب کو محسوس ہوا کہ آپ کو اس کوٹھے کی رنڈی سے عشق ہو گیا ہے۔ آپ نے صادق کو اس راز سے بڑے ببیے پن کے ساتھ آگاہ کیا۔

”صادق۔ وہ رنڈی جس کے کوٹھے پر تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، ہمارے دل کے اندر گھس گئی ہے۔ اس کو بدر کرنے کی کوئی ترکیب تمہارے دماغ کے اندر آتی ہو تو ہم کو بتاؤ۔“

صادق نے اس کو بہت سی ترکیبیں بتائیں۔ جن پر خان صاحب نے عمل بھی کیا مگر وہ اپنے دل کے اندر سے اس رنڈی کو

”شہر بدر“

نہ کر سکے۔ آخر کار انھوں نے ایک بار پھر اسی ببیے پن کے ساتھ صادق سے کہا۔

”صادق۔ وہ رنڈی ہم پر سوار ہو گئی ہے۔ ہم اس کو اپنی بیوی بنا لے گا۔“

صادق نے ان کو بہت سمجھایا بجھایا۔ مگر خان صاحب عشق کے ہاتھوں مجبور تھے۔ رنڈی کو بھی وہ پسند آ گئے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ میاں بیوی بن گئے۔ رنڈی کے گھر والوں کو یہ رشتہ بالکل پسند نہ آیا۔ بڑی گڑبڑ ہوئی۔ آخر سمجھوتہ ہو گیا۔ رنڈی وہیں کوٹھے پر رہی اور خان صاحب اس کے شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہنے لگے۔ صادق نے مجھ سے کہا۔

”خان عجیب و غریب آدمی ہے۔ اتنے اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اخباری اور سیاسی دنیا میں نام رکھتا ہے، لیکن اسے کبھی اتنا خیال نہیں آتا کہ وہ ایک بدنام محلے میں رہتا ہے۔ ایک رنڈی جس کے ہزاروں گاہک تھے، اس کی بیوی ہے۔ مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ پٹھان ہو کر اس کی غیرت کہاں سو رہی ہے۔ سرحد میں دو بیویاں پڑی ہیں۔ اولاد موجود ہے مگر وہ کس اطمینان سے ہیرا منڈی کے کوٹھے میں ایک چچوڑی ہوئی ہڈی چوستا رہتا ہے۔ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا ہوں تو اس کے بے ریا چہرے پر ببیی سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ مجھ سے کہتا ہے۔ صادق۔ وہ لوگ ادھر راضی خوشی ہے۔ ہمیں کوئی تردد نہیں۔ اور یہ رنڈی بہت اچھا ہے۔ ہم سے محبت کرتا ہے۔ جو عورت ادھر ہوتا ہے نا، محبت کرنا نہیں جانتا۔ ناز نخرہ نہیں جانتا۔ اور مجھے یقین آ جاتا ہے۔ مجھے اس کی ہر بات کا یقین آ جاتا ہے۔“

اور یہ واقعہ ہے کہ صادق جس کو پہلے کسی بات کا یقین نہیں آتا تھا، اب اس خان کے کہنے پر چلتا تھا۔ جب وہ مقدموں سے فارغ ہوا تو اس کے کہنے پر اس نے ملٹری کی چھوڑی ہوئی بارکیں ڈھانے اور ان کا ملبہ اٹھوانے کا ٹھیکہ لے لیا۔ اس کام سے اسے نفرت تھی، مگر خان صاحب کے مشورے کو وہ کیسے ٹال سکتا تھا، چنانچہ ایک برس تک وہ کمہاروں اور ان کے گدھوں اور ملبے کے دھول غبار میں پھنسا رہا۔ لیکن اس میں اس نے کافی کمایا۔ خوشامدی دوست یار، پھر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ انھیں منہ نہیں لگائے گا، لیکن اس نے ان کو دھتکارنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ پہلے صرف دستر خوان پر ان کی شمولیت ہوتی تھی۔ اب بوتل میں بھی وہ اس کے شریک ہونے لگے۔ خان نے اس کو بتایا تھا کہ شراب بہت اچھی چیز ہے خصوصاً اس آدمی کے لیے جو صوبہ بدر کر دیا گیا ہو۔ بوتل سے منہ لگاتے ہی ایک نیا صوبہ اس کے دل و دماغ میں آباد ہو جاتا ہے۔ جس میں وہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک جہاں چاہے اسٹول پر کھڑا ہو کے باغیانہ سے باغیانہ تقریر کر سکتا ہے۔ سرمائے کی تمام لعنتوں سے اس کو پاک کر سکتا ہے۔ اور پھر رنڈی کا کوٹھا۔ اس سے بہترین گھر تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی گھریلو اور سگی قسم کی ہو تو آدمی اسے گالی نہیں دے سکتا۔ اگر رنڈی ہو تو گندی سے گندی گالی بھی اسے دی جا سکتی ہے۔ اس کی ماں کے سامنے۔ اس کی پھوپھی کے

سامنے۔ اس کی چچی کے سامنے۔ اور اگر اس کا کوئی باپ موجود ہو تو اس کے بھی سامنے۔ پھر وہ اسے اپنے مخصوص خام اور بیبے انداز میں روزمرہ زندگی میں گالی کی اہمیت بیان کرنے لگتا اور اسے بتاتا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ اگر آدمی اسے وقتاً فوقتاً اپنے اندر سے باہر نہ نکالے تو تعفن پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر دل و دماغ پر بہت برا اثر کرتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا۔ اور گھریلو گھر۔ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہاں سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اتنا ساز و سامان اور اتنے رشتے ہوتے ہیں کہ آدمی ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو پوری زندگی اسی کوشش میں بسر ہو جائے مگر یہاں رنڈی کے کوٹھے پر ایسی کوئی مشکل نہیں۔ اپنا ہولڈال اور ٹرنک اٹھاؤ، اچکن کاندھے پر ڈالو اور کسی ہوٹل میں جا کر بڑے اطمینان سے طلاق کا کاغذ لکھ کر روانہ کر دو۔ ایک بات اور بھی ہے۔ رنڈی کو سمجھنے میں اگر دقت محسوس ہو تو اس کو استعمال کرنے والے ایسے کئی آدمی موجود ہوں گے جن کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ پھر گانا بجانا مفت۔ عیاشی کی عیاشی، شادی کی شادی۔ جی اکتایا تو چھوڑ کے چلتے بنے۔ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ کوئی برا نہیں کہے گا۔ بلکہ وہ جو شریف ہیں مرحبا کہیں گے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا۔ رنڈی کو لعنتی کہیں گے جو چمٹ گئی تھی اور خداوند کریم کا شکر بجالائیں گے کہ اس نے اس سے نجات دلائی۔ اور رنڈی کی زندگی میں بھی کوئی زلزلہ نہیں آتا۔ اس کے لگے بندھے گاہک موجود ہوتے ہیں۔ تمہاری ٹھیکے داری ختم ہوتی ہے تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں کہ چلو ہمارا راستہ کھلا۔“

صادق کو خان رنڈی سے شادی کے فوائد اکثر بتاتا رہتا تھا۔ بوتل سے بڑے خلوص کے ساتھ منہ لگا کر اب اس نے رنڈیوں کے کوٹھوں پر بھی آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس نے ان میں وہ بات ابھی تک نہیں دیکھی تھی کے جن کے متعلق وہ اکثر اپنے پٹھان دوست سے سنا کرتا تھا۔ خان کو صادق کے دل کا حال اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کو پتا چل گیا تھا کہ وہ ہیرا منڈی سے اکتا گیا ہے۔ کاروبار اچھا ہے۔ آمدن کی معقول صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ اب اپنا گھر بنانا چاہتا ہے جس میں اس کی ایک عدد بیوی ہو۔ دس عدد بچے ہوں۔ کلوٹ ہوں، پوتڑے ہوں۔ چولھا ہو۔ چمٹا ہو۔ توا ہو۔ وہ پھل خریدے تو سیدھا گھر پہنچے۔ شراب کی بوتلوں کے بجائے، دودھ کی بوتلیں خریدے۔ میراثیوں اور بھڑووں کے بجائے شریف شریف لوگوں سے ملے۔ شروع شروع میں تو خان اپنے مخصوص انداز میں اسے ایسے واہیات اقدام سے روکنے کی نرم و نازک کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے محلے میں کسی سے کوئی مناسب و موزوں رشتہ ڈھونڈنے کے لیے کہا ہے تو اس کو بہت کوفت ہوئی۔

”صادق۔ یہ تم کیا حماقت کرنے والا ہے۔ شادی وادی ہرگز مت کرنا۔ یہ دنیا ایسی ہے جہاں کسی وقت بھی تم کو صوبہ بدر یا شہر بدر کر دیا جاسکتا ہے۔ میں اتنے برس کانگرس میں رہا ہوں۔ سرخ پوش تحریک چلانے میں اتنا کام میں نے کیا ہے کہ تم کو اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنی پولیٹیکل لائف میں صرف یہ سیکھا ہے کہ زندگی میں تم جس کو بھی شریک بناؤ، اٹیچی کیس کی طرح ہونی چاہیے۔ جس کو تم ہاتھ میں اٹھا کر چلتے ہو۔ یا اسے وہیں چھوڑ دو۔ وہ زیادہ قیمتی نہیں ہونی چاہیے۔ قیمتی چیزوں کو چھوڑ دینے کا برا غم رہتا ہے۔ سو برادر، تم شادی نہ کرو۔ باز آؤ اس خیال سے۔ وہ رنڈی جس کے پاس تم جاتے ہو، کیا بری ہے۔ اس سے عشق کرنا شروع کر دو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ تھوڑی سی پریکٹس کر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔
“

صادق نے گھریلو قسم کی عورت سے شادی کے حق میں اپنے دلائل پیش کیے مگر خان کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلی۔

”صادق، تم الو ہے۔ خدا کی قسم الو ہے۔ تم ہماری بات نہیں مانتا، جس کے پاس دو بیویاں ہیں۔ اپنے قبیلے کی۔ تم ہماری بات مانو۔ ہم تمہارا دوست ہے۔ پٹھان ہے۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ دنیا جس میں ہم جیسے مخلص آدمی کو صوبہ بدر کرنے والے حاکم موجود ہیں، اس میں رنڈی کے کوٹھے ہی کو اپنا گھر بنانا چاہیے۔ ہم کو تو یہاں بہت آرام ہے۔ تم بھی ہیرا منڈی میں اپنا گھر بنا لو اور آرام کرو۔“

صادق عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ مجھ سے مل کر وہ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا۔ وہ ہیرا منڈی کے سخت خلاف تھا مگر تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کا قائل ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ اب وہ خان کی کہی ہوئی باتیں یوں سناتا تھا جیسے اس کے دل کو لگ چکی ہیں۔ چنانچہ ایک روز اس نے مجھ سے کہا:

”میں نے ساری عمر ٹھیکے داری کی ہے۔ اور ٹھیکے داری سے بڑھ کے بے ایمانی کا اور کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ اس کا اول کھوٹ، اس کا آخر کھوٹ۔ یہ ایسا بازار ہے جس میں کوئی کھرا سکہ نہیں چل سکتا۔ سنا ہے ولایت میں ایسی مشینیں بنی ہیں جن میں اگر کھوٹے سکے ڈالے جائیں تو وہ باہر نکال دیتی ہیں۔ لیکن ٹھیکے داری ایسی مشین ہے جس میں اگر کھرے سکے ڈالے جائیں تو قبول نہیں کرے گی۔ فوراً باہر نکال دے گی۔ مجھے ساری عمر یہی کاروبار کرنا ہے کہ مجھے صرف یہاں آنا ہے۔ تو کیوں نہ میں ہیرا منڈی میں ہی اپنا گھر بناؤں۔ وہاں کھرے سکے چلتے ہیں، لیکن ان کے عوض جو مال ملتا ہے اس میں صرف کھوٹ ہی کھوٹ ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، میری روحانی تسکین کے لیے وہاں کی فضا اچھی رہے گی۔“

پھر ایک روز اس نے مجھے بتایا۔

”خان بہت خوش ہے۔ اسکی دونوں بیویاں وہاں سرحد میں اس کے گھر میں خوش ہیں۔ اس کی اولاد بھی خوش ہے۔ ان کی خیر خیریت کو اپنے منیجر کے ذریعے سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ یہاں ہیرا منڈی اس کی رنڈی بھی خوش ہے۔ اس کی ماں بھی خوش ہے۔ اس کی پھوپھی بھی خوش ہے، اس کے میراثی بھی خوش ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ خان خوش ہے۔ کبھی کبھی ان حاکموں کے خلاف ایک بیان اخباروں میں شائع کر دیتا ہے جس نے اس کو صوبہ بدر کیا تھا اور اپنی رنڈی کو سنا دیتا ہے۔ وہ بھی خوش ہو جاتی ہے۔ اس رات گانے بجانے کی محفل گرم ہوتی ہے اور خان مسند پر گاؤ تکیے کا سہارا لے کر یوں بیٹھتا ہے جس طرح ایک تماشبین۔ استاد صاحب اور میراثیوں سے اس طرح باتیں کرتا ہے جیسے اس نے نئی نئی

تماش بینی شروع کی ہے۔ اس کی رنڈی مجرا کرتی ہے اور وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کو دس روپے کا نوٹ دیتا ہے پھر پانچ کا۔ پھر دو کا پھر ایک روپے والا۔۔ اس کے بعد وہ محفل برخواست کر دیتا ہے اور اس رنڈی کے ساتھ سو جاتا ہے اور اس منکوحہ عورت کے ساتھ ایسی رات بستر کرتا ہے جو گناہ آلود ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں، یہ بڑے مزے کی چیز ہے۔“

لیکن جب اس رنڈی سے شادی کا سوال پیدا ہوا۔ یعنی خان صاحب نے سب معاملہ تیار کر دیا اور صرف ایجاب و قبول کی رسم باقی رہ گئی تو صادق پیچھے ہٹ گیا۔ خان آگ بگولا ہو گیا۔ میرے سامنے اس نے صادقے کو بہت لعن طعن کی۔

”تمہاری سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں صادق۔ تم الو کے پٹھے ہو۔ شریف عورت سے شادی کر کے خدا کی قسم تم پچھتاؤ گئے۔ یہ دنیا ایسی نہیں ہے۔ پروردگار کی قسم، جس میں شرافت سے شادی کی جائے۔ اس میں رنڈی اچھی رہتی ہے۔ تم شریف مت بنو۔ یاد رکھو اگر تم شریف بن گئے تو صوبہ بدر کر دیے جاؤ گے۔ تم ہیرا منڈی میں رہو۔ یہاں صرف ایک صوبہ ہے جس میں سے تم بدر نہیں کیے جاسکتے اس لیے کہ اس کے ساتھ کوئی حاکم اپنا رشتہ قائم نہیں کرے گا۔ تم گدھے ہو۔ اپنا گھر یہیں بناؤ۔ اس سے بہتر جگہ تمہیں اور کوئی نہیں مل سکتی۔“

صادق نے اپنے محلے میں ایک جگہ بات پکی کر لی تھی۔ جب خان نے اس کو سمجھایا بجھایا تو اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا لیکن وہ رنڈی سے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”میں نے اب شادی کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں خان کا کہنا ضرور مان لیتا مگر میرا دل نہیں مانتا۔ میں اب عیش کروں گا۔ ایک رنڈی کے پاس نہیں کئی رنڈیوں کے پاس جایا کروں گا۔“

اور اس نے متعدد رنڈیوں کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ اسے اب کئی ٹھیکے مل گئے تھے۔ اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ ہیرا منڈی سے جب وہ موٹر میں گزرتا تو چاروں طرف کوٹھوں پر رنگین مسکراہٹیں تیتریوں کی طرح اڑنے لگتیں۔ اب وہ پھر نواب صاحب تھا۔ ہیرا منڈی کا نواب صاحب۔ پورے تین برس تک وہ کھل کھیلتا رہا، میرا ل خیال ہے، یہ غالباً خان کی اس کوشش کا ردعمل تھا جو اس نے صادق کو اپنے قالب میں ڈھانے کے لیے کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے تجربات کا نچوڑ اس کے حلق میں ڈال کر اس کو اپنے جیسا بنا لے، مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صادق ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ وہ پورا اوباش بن گیا۔ جس راستے اس کو نفرت تھی، وہ اسی کا انتھک مسافر بن گیا۔ میں نے اس کو بارہا سمجھایا کہ دیکھو صادق باز آؤ۔ اپنی جوانی، اپنی صحت اور اپنی دولت یوں برباد نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانا۔ میری باتیں سنتا اور مسکرا دیتا۔

”میری دنیا، کھوٹ کی دنیا ہے۔ اس میں ایک بٹا سو حصہ سیمنٹ ہوتا ہے۔ باقی سب ریت۔ اور وہ بھی جس میں آدھی مٹی ہوتی ہے۔ میری ٹھیکہ داری میں جو عمارت بنتی ہے۔ اس کی عمر اگر کاغذ پر پچاس سال ہے تو زمین پر دس سال ہوتی ہے۔ میں اپنے لیے پختہ گھر کیسے تعمیر کر سکتا ہوں۔ رنڈیاں ٹھیک ہیں۔ میں نے سوسائٹی کے اس ملبے کا بھی ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ہر روز ایک نہ ایک بوری ڈھو کر ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔“

وہ بوریاں ڈھو ڈھو کر اپنی دانست میں ٹھکانے لگاتا رہا۔ میں نے اس سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ وہ بہت بدنام ہو چکا تھا۔ اسکو معلوم تھا کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ لیکن اس نے مجھے منانے کی کوشش نہ کی۔ ڈیڑھ برس کے ایک دن اچانک وہ میرے پاس آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہے مگر نہیں کہہ سکتا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کچھ کہنے آئے ہو۔“

اس نے جواب دیا۔

”ہاں۔ میں شادی کر رہا ہوں۔“

”کس سے؟“

”ایک رنڈی سے؟“

مجھے بہت غصہ آیا۔

”بکو نہیں۔“

اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میں مجبور ہو گیا ہوں۔“

میں چڑ گیا۔

”مجبوری کیسی۔“

صادق نے سر جھکا کر کہا۔

”اس کے نطفہ ٹھہر گیا ہے۔“

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ اس سے کیا کہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ صادقے نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور کہنا شروع کیا۔

”میں مجبور ہو گیا ہوں۔ شادی کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں۔“

صادق نے اس رنڈی سے شادی کرلی۔ مگر اس کے کوٹھے کو اس نے اپنا گھر نہ بنایا۔ ان لوگوں نے، یہ رنڈی جن کی روزی کا ٹھیکرہ تھی، بہت دنگا فساد کیا۔ مگر اس نے کوئی پرواہ قبول نہ کی۔ ہزاروں روپے پانی کی طرح بہادیے اور آخر کامیاب ہو گیا۔ اس رنڈی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے چھ مہینے بعد صادق کے دل میں جانے کیا آئی کہ اس نے رنڈی کو طلاق دے دی اور اس سے کہا۔

”تمہارا اصل مقام یہ گھر نہیں۔ ہیرا منڈی ہے۔ جاؤ اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کو شریف بنا کر میں تم لوگوں کے کاروبار کے ساتھ ظلم کرنا نہیں چاہتا۔ میں خود کاروباری آدمی ہوں۔ یہ نکتے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جاؤ، خدا میرے اس نطفے کے بھاگ اچھے کرے۔ لیکن دیکھو اسے نصیحت دیتی رہنا کہ کسی سے شادی کی غلطی کبھی نہ کرے۔ یہ غلط چیز ہے۔“

معلوم نہیں، جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، صادقے کے متعلق زیادہ ہے یا خان کے متعلق۔ بہر حال مجھے یہ دونوں اسی صف کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جس میں آپ کا بابو گوپی ناتھ موجود ہے۔ اور اس دنیا میں جہاں صوبہ بدر اور شہر بدر کیا جا سکتا ہو، ایسے آدمی ضرور موجود ہونے چاہئیں جن کو سوسائٹی اپنے اور اپنے بنائے ہوئے قوانین کے منہ پر طمانچے کے طور پر کبھی کبھی مار سکے۔

نعرہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹونعرہ

اُسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اُس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔ وہ ساتویں منزل سے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اُترا اور تمام منزلوں کا بوجھ اُس کے چوڑے مگر دُبلے کاندھے پر سوار ہوتا گیا۔ جب وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لیے اوپر چڑھ رہا تھا۔ تو اُسے محسوس ہوا تھا کہ اُس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے دل میں سوچا تھا۔ مالک مکان جسے سب سیٹھ کے نام سے پُکارتے ہیں اس کی بپتا ضرور سنے گا۔ اور کرایہ چکانے کے لیے اُسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا۔۔۔۔۔ بخش دے گا!۔۔۔۔۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی لیکن فوراً ہی اس کو اصلیت بھی معلوم ہو گئی تھی۔۔۔۔ وہ بھیک مانگنے ہی تو جا رہا تھا۔ اور بھیک ہاتھ پھیلا کر، آنکھوں میں آنسو بھر کے، اپنے دُکھ درد سُنا کر اور اپنے گھاؤ دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے۔۔۔۔۔! اُس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا۔ تو اُس نے اپنے غرور کو، اُس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ نکال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیا تھا۔ وہ اپنا دیا بُجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصول کیا کرتا تھا۔ اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں۔ اُس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی کی طرف بڑھا۔ دو بڑی بڑی آنکھوں نے اس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدّی سی آواز گونجی۔

”کیشو لال۔۔۔۔۔ کھولی پانچویں، دوسرا مالا۔۔۔۔۔۔ دو مہینوں کا کرایہ۔۔۔۔۔۔۔۔ لے آئے ہو کیا؟“

یہ سُن کر اس نے اپنا دل جس کے سارے پرانے اور نئے گھاؤ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہُوئے کرید کرید کر گہرے کر چکا تھا۔ سیٹھ کو دکھانا چاہا۔ اُسے پورا پورا یقین تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے دل میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ پر۔۔۔۔۔ سیٹھ جی نے کچھ سننا نہ چاہا۔ اور اس کے سینے میں ایک ہلڑ سا مچ گیا۔ سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لیے اُس نے اپنے وہ تمام دُکھ جو بیت چکے تھے۔ گزرے دنوں کی گہری کھائی سے نکال کر اپنے دل میں بھر لیے تھے اور ان تمام زخموں کی جلن جو مُدّت ہُوئی مِٹ چکے تھے۔ اُس نے بڑی مشکل سے اکٹھی اپنی چھاتی میں جمع کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو کیسے سنبھالے؟ اُس کے گھر میں بن بلائے مہمان آ گئے ہوتے وہ ان سے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہہ سکتا تھا۔ جاؤ بھئی میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بٹھا سکوں اور نہ میرے پاس روپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدارات کر سکوں۔ لیکن یہاں تو قصّہ ہی دوسرا تھا۔ اُس نے تو اپنے بھولے بھٹکے دُکھوں کو ادھر اُدھر سے پکڑ کر اپنے آپ سینے میں جمع کیا تھا۔ اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے؟ افراتفری میں اُسے کچھ پتہ نہ چلا تھا۔ کہ اس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی ہیں۔ پر جیسے جیسے اُس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ پہچاننے لگا کہ فلاں دُکھ فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد اُسے فلاں وقت پر ہوا تھا۔ اور جب یہ سوچ بچار ہوئی تو حافظے نے بڑھ کر وہ دُھند ہٹا دی۔ جو ان پر لپٹی ہوئی تھی۔ اور کل کے تمام دُکھ درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور اس نے اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیں۔ اُس نے سوچا، تھوڑے سے وقت میں اُس نے بہت کچھ سوچا۔ اس کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اُس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اُس پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اس کے میلے بدن سے چمٹ گئے۔ جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اُسے ان داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دُور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کُرسی پر بیٹھا دیکھ کر جس کے قلم کی جنبش کچھ کا کچھ کر سکتی تھی۔ وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کئی بار اُس خیال آیا۔ اور وہ سوچنے لگا۔ کہ اُسے کیا خیال آیا تھا۔ مگر وہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑ نہ کر سکا۔ وہ سخت گھبرا گیا تھا۔ اُس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا۔ کہ مالک مکان نے غصّے میں

آ کر اُسے گالی دی۔۔۔۔۔ گالی۔۔۔۔۔۔ یوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اُتر گیا۔ اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا۔ اُس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا جس طرح کسی گرم گرم جلسے میں کسی شرارت سے بھگدڑ مچ جایا کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اُس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اُس نے بہت جتن کیے کہ اس کے وہ دُکھ درد جو اس نے سیٹھ کو دکھانے کے لیے اکٹھے کیے تھے۔ چپ چاپ رہیں۔ پر کچھ نہ ہو سکا۔ گالی کا سیٹھ کے منہ سے نکلنا تھا کہ تمام دکھ بے چین ہو گئے۔ اور اندھا دھند ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ اب تو وہ یہ نئی تکلیف بالکل نہ سہ سکا۔ اور اس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی تپ رہی تھیں آنسو آ گئے جس سے ان کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور ان سے دُھواں نکلنے لگا۔ اُس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑے حد تک نگل چکا تھا۔ سیٹھ کے جھُریوں پڑے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ اپولو بندر پر نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے کا غرور۔۔۔۔۔ اُس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ اور ان کے سامنے نمک لگی مونگ پھلی کے وہ تمام دانے جو اُس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر برکھا کے باعث گیلے ہو رہے تھے، ناچنے لگے۔ اس کی آنکھیں ہنسیں، اس کا دل بھی ہنسا، یہ سب کچھ ہُوا۔ پر وہ کڑواہٹ دُور نہ ہُوئی۔ جو اُس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کر دی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر صرف زبان پر ہوتی تو وہ اسے تھوک دیتا مگر وہ تو بہت بُری طرح اس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔ اور نکالے نہ نکلتی تھی۔ اور پھر ایک عجیب قسم کا دُکھ جو اُس گالی نے پیدا کر دیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رونا فضول سمجھتی تھیں۔ اس کے سینے کے اندر اُتر کر آنسو بہا رہی ہیں۔ جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اُس کی چربی بھری گردن تھی۔ اور اُسے یوں لگا کہ کسی نے اُوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ چہرے کی حفاظت کے لیے بڑھا پر اس گالی کی ساری گرد اس پر پھیل چکی تھی۔۔۔۔ اب اس نے وہاں ٹھہرنا اچھا نہ سمجھا۔ کیونکہ کیا خبر تھی۔۔۔۔۔ کیا خبر تھی۔۔۔۔۔ اُسے کچھ خبر نہ تھی۔۔۔۔۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں کسی بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہا کرتی۔ وہ جب نیچے اترا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اُس کے کندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔ ایک نہیں، دو گالیاں۔۔۔۔ بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں جو اُس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اُس۔ اُس۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس گڑبڑ کا نام کیا رکھے، جو اس کے دل میں اور دماغ میں ان گالیوں نے مچا رکھی تھی۔ وہ کیسے اس تپ کو دُور کر سکتا تھا۔ جس میں وہ پھنکا جا رہا تھا۔ کیسے؟۔۔۔۔ پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ تو اس وقت ایک ایسا اکھاڑہ بنا ہُوا تھا جس میں بہت سے پہلوان کشتی لڑ رہے ہوں۔ جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا۔ کسی دوسرے خیال سے جو پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتا بھڑ جاتا۔ اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا۔ چلتے چلتے جب ایکا ایکی اُس کے دُکھ قے کی صورت میں باہر نکلنے کو تھے اس کے جی میں آئی۔ جی میں کیا آئی، مجبوری کی حالت میں وہ اس آدمی کو روک کر جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ کہنے ہی والا تھا۔

"بھیّا میں روگی ہوں"

مگر جب اُس نے اُس راہ چلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بجلی کا وہ کھمبا جو اس کے پاس ہی زمین میں گڑا تھا۔ اسے اس آدمی سے کہیں زیادہ حساس دکھائی دیا۔ اور جو کچھ وہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا۔ ایک ایک گھونٹ کر کے پھر نگل گیا۔ فٹ پاتھ پر چوکور پتھر ایک ترتیب کے ساتھ جُڑے ہُوئے تھے۔ وہ ان پتھروں پر چل رہا تھا۔ آج تک کبھی اُس نے ان کی سختی محسوس نہ کی تھی۔ مگر آج ان کی سختی اس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فٹ پاتھ کا ہر ایک پتھر جس پر اُس کے قدم پڑ رہے تھے۔ اُس کے دل کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔۔۔۔ سیٹھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گیا ہو گا کہ اس کا بند بند ڈھیلا ہو گیا۔ چلتے چلتے اُس کی ایک لڑکے سے ٹکر ہوئی۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا۔ کہ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے جھٹ اُس آدمی کی طرح جس کی جھولی سے بیر گر رہے ہوں۔ ادھر اُدھر ہاتھ پھیلائے اور اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہولے ہولے چلنا شروع کیا۔ اُس کا دماغ اس کی ٹانگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اُسے یہ محسوس ہوتا تھا۔ کہ اس کا نچلا دھڑ سارے کا سارا بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اور دماغ بہت آگے نکل گیا ہے۔ کئی بار اسے اس خیال سے ٹھہرنا پڑا کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہو جائیں۔ وہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا جس کے اس طرف سڑک پر پوں پوں کرتی موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے گاڑیاں، ٹرالیں، بھاری بھرکم ٹرک، لاریاں یہ سب سڑک کی کالی چھاتی پر دندناتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہُوا تھا۔ پر اس کے کانوں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے۔ جیسے ریل گاڑی کا انجن زائد بھاپ باہر نکال رہا ہے۔ چلتے چلتے ایک لنگڑے کُتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کُتے نے اس خیال سے کہ شاید اُس کا پیر کچل دیا گیا ہے۔

"چاؤں"

کیا اور پرے ہٹ گیا۔ اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اُسے پھر گالی دی ہے۔۔۔۔۔۔۔ گالی۔۔۔۔۔ گالی ٹھیک اسی طرح اُس سے اُلجھ کر رہ گئی تھی جیسے بیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا۔ اتنی ہی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے اس نمک لگی مونگ پھلی کا خیال نہیں تھا جو اس کے گھر میں برکھا کے باعث گیلی ہو رہی تھی اور نہ اسے روٹی کپڑے کا خیال تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی۔ اور ان تیس برسوں میں جن کے پرماتما جانے کتنے دن ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھُوکا نہ سویا تھا۔ اور نہ کبھی ننگا ہی پھرا تھا۔ اُسے صرف اس بات کا دُکھ تھا۔ کہ اُسے ہر مہینے کرایہ دینا پڑتا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے۔ اس بکرے جیسی داڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے دام

دے۔ شام کو تاڑی کی ایک بوتل کے لیے دوّئی پیدا کرلے۔ یا اس گنجے سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرے۔ مکانوں اور کرایوں کا فلسفہ اس کی سمجھ سے سدا اونچا رہا تھا۔ وہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تو سمجھتا تھا کہ زبردستی اس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے۔ اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دیتے رہنے کے بعد صرف دو مہینے کا حساب چکتا نہ کر سکا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار ہو گیا۔ کہ وہ اُسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو یہ تھی جو اُسے کھائے جا رہی تھی۔ اُسے ان بیس روپوں کی پروانہ تھی جو اُسے آج نہیں کل ادا کر دینے تھے۔ وہ ان دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا۔ جو ان بیس روپوں کے بیچ میں سے نکلتی تھیں۔ نہ وہ بیس روپے کا مقروض ہوتا اور نہ سیٹھ کے کٹھالی جیسے منہ سے یہ گندگی باہر نکلتی۔ مان لیا وہ دھنوان تھا۔ اس کے پاس دو بلڈنگیں تھیں۔ جن کے ایک سو چوبیس کمروں کا کرایہ اس کے پاس آتا تھا۔ پر ان ایک سو چوبیس کمروں میں جتنے لوگ رہتے ہیں۔ اُس کے غلام تو نہیں اور اگر غلام بھی ہیں تو وہ انھیں گالی کیسے دے سکتا ہے؟“

”ٹھیک ہے اُسے کرایہ چاہیے۔ پر میں کہاں سے لاؤں پانچ برس تک اُس کو دیتا ہی رہا ہوں۔ جب ہو گا، دے دوں گا۔ حالانکہ مجھے اس سے کہیں زیادہ ہولناک گالیاں یاد ہیں۔ پر میں نے سیٹھ سے بارہا کہا۔ کہ سیڑھی کا ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے۔ اُسے بنوا دیجیے۔ پر میری ایک نہ سُنی گئی۔ میری پھول سی بچی گری۔ اس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ میں گالیوں کے بجائے اسے بد دعائیں دے سکتا تھا۔ پر مجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا۔۔۔۔۔۔ دو مہینے کا کرایہ نہ چکانے پر میں گالیوں کے قابل ہو گیا۔ اس کو یہ خیال تک نہ آیا۔ کہ اس کے بچے اپولو بندر پر میرے تھیلے سے مٹھیاں بھر بھر کے مونگ پھلی کھاتے ہیں۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کہ اس دو بلڈنگوں والے سیٹھ کے پاس تھی۔ اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس اس سے بھی زیادہ دولت ہو گی، پر وہ غریب کیسے ہو گیا۔۔۔۔۔ اسے غریب سمجھ کر ہی تو گالی دی گئی تھی۔ ورنہ اس گنجے سیٹھ کی کیا مجال تھی۔ کہ کرسی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اُسے دو گالیاں سُنا دیتا۔ گویا کسی کے پاس دھن دولت کا نہ ہونا بہت بُری بات ہے۔ اب یہ اس کا قصور نہیں تھا۔ کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ سچ پوچھیے۔ تو اُس نے کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اُس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ پر پچھلے مہینے ایکا ایکی اس کی بیوی بیمار پڑ گئی اور اس کے دوا دارو پر وہ تمام روپے خرچ ہو گئے جو کرایے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ دواؤں پر روپیہ خرچ نہ کرتا لیکن یہاں تو اس کے ہونے والے بچے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھا۔ اس کو اولاد بہت پیاری تھی جو پیدا ہو چکی تھی اور جو پیدا ہونے والی تھی۔ سب کی سب اُسے عزیز تھی وہ کیسے اپنی بیوی کا علاج نہ کراتا؟۔۔۔۔۔۔ کیا وہ اس بچے کا باپ نہ تھا؟۔۔۔۔۔۔ باپ پِتا۔۔۔۔۔۔ وہ تو صرف دو مہینے کے کرائے کی بات تھی۔ اگر اُسے اپنے بچے کے لیے چوری بھی کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چوکتا۔۔۔۔۔۔ چوری۔ نہیں نہیں وہ چوری کبھی نہ کرتا۔۔۔۔۔ یوں سمجھیے کہ وہ اپنے بچے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر وہ چور کبھی نہ بنتا۔۔۔۔۔ وہ اپنی چھِنی ہُوئی چیز واپس لینے کے لیے لڑ مرنے کو تیار تھا۔ پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس وقت جب سیٹھ نے اُسے گالی دی تھی۔ آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبا دیتا اور اس کی تجوری میں سے وہ تمام نیلے اور سبز نوٹ نکال کر بھاگ جاتا۔ جن کو وہ آج تک لاجونتی کے پتّے سمجھا کرتا تھا۔۔۔۔۔ نہیں نہیں وہ ایسا کبھی نہ کرتا۔ لیکن پھر سیٹھ نے اسے گالی کیوں دی؟۔۔۔۔۔۔ پچھلے برس چوپاٹی پر ایک گاہک نے اُسے گالی دی تھی۔ اس لیے کہ دو پیسے کی مونگ پھلی میں چار دانے کڑوے چلے گئے تھے۔ اور اس کے جواب میں اس کی گردن پر ایسی دُھول جمائی تھی کہ دُور بنچ پر بیٹھے آدمیوں نے بھی اس کی آواز سُن لی تھی۔ مگر سیٹھ نے اُسے دو گالیاں دیں اور وہ چپ رہا۔۔۔۔۔۔ کیشو لال کھاری سینگ والا۔ جس کی بابت یہ مشہور تھا۔ کہ وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا۔۔۔۔ سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا۔۔۔۔۔۔ دوسری گالی دی تو بھی خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پُتلا ہے۔۔۔۔۔۔ پر مٹی کا پتلا کیسے ہُوا۔ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر خاموش رہا۔ اس لیے کہ وہ اپنا غرور نیچے چھوڑ آیا تھا۔۔۔۔ مگر اُس نے اپنا غرور اپنے سے الگ کیوں کیا؟ سیٹھ سے گالیاں لینے کے لیے؟ یہ سوچتے ہوئے اُسے ایکا ایکی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اُسے نہیں کسی اور کو گالیاں دی تھیں۔۔۔۔۔۔ نہیں، نہیں، گالیاں اُسے ہی دی گئی تھیں۔ اس لیے کہ دو مہینے کا کرایہ اُسی کی طرف نکلتا تھا۔ اگر اسے گالیاں نہ دی گئی ہوتی تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور یہ جو اس کے سینے میں ہُلّڑ سا مچ رہا تھا۔ کیا بغیر کسی وجہ کے اُسے دُکھ دے رہا تھا؟ اُسی کو دو گالیاں دی گئی تھیں۔ جب اُس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں۔ تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔۔۔۔۔۔ گالیاں۔۔۔۔۔۔ گالیاں۔ وہ جھنجلا گیا۔۔۔۔۔۔ وہ جتنی کوشش کرتا تھا۔ کہ ان گالیوں کی بابت نہ سوچے اتنی ہی شدت سے اُسے ان کے متعلق سوچنا پڑتا تھا۔ اور یہ مجبوری اسے بہت چڑچڑا بنا رہی تھی۔ چنانچہ اسی چڑچڑے پن میں اُس نے خواہ مخواہ دو تین آدمیوں کو جو اس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ دل ہی دل میں گالیاں دیں۔

”یوں اکڑ کے چل رہے ہیں جیسے ان کے باوا کا راج ہے“!

اگر اس کا راج ہوتا تو وہ سیٹھ کو مزا چکھا دیتا جو اُسے اوپر تلے دو گالیاں سُنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اُس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے وہ کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیے ہیں۔۔۔۔۔ سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا۔ اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپّا مارتا کہ بِلبلا اُٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے ہنستے اُس کا پیٹ دُکھنے لگتا پر اس وقت اُسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی۔ کیوں؟۔ وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپّا مار سکتا تھا۔ اسے کس بات کی رکاوٹ تھی؟۔۔۔۔۔۔ رکاوٹ تھی۔۔۔۔۔۔ رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سُن کر خاموش ہو رہا۔ اُس کے قدم رُک گئے۔ اس کا دماغ بھی

ایک دو پل کے لیے ستایا اور اس نے سوچا کہ چلو ابھی اس جھنجھٹ کا فیصلہ ہی کر دوں۔۔۔۔۔۔ بھاگا ہُوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مروڑ کر اس تجوری پر رکھ دوں۔ جس کا ڈھکنا مگر مچھ کے منہ کی طرح کھلتا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ کھمبے کی طرح زمین میں کیوں گڑ گیا تھا؟ سیٹھ کے گھر کی طرف پلٹا کیوں نہیں تھا؟۔۔۔۔۔ کیا اس میں جرأت نہ تھی؟ اس میں جرأت نہ تھی۔۔۔۔۔ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ اس کی ساری طاقت سرد پڑ گئی تھی۔۔۔۔ یہ گالیاں۔۔۔۔۔ وہ ان گالیوں کو کیا کہتا۔۔۔۔۔ ان گالیوں نے اس کی چوڑی چھاتی پر رولر سا پھیر دیا تھا۔۔۔۔ صرف دو گالیوں نے۔۔۔۔ حالانکہ پچھلے ہندو مُسلم فساد میں ایک ہندو نے اُسے مسلمان سمجھ کر لاٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور آدھ مُوا کر دیا تھا اور اُسے اتنی کمزوری محسوس نہ ہُوئی تھی۔ جتنی کہ اب ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔ کیشو لال کھاری سینگ والا جو دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا۔ کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑا۔ آج یوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے۔۔۔۔۔۔ اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا؟۔۔۔۔۔ دو گالیوں نے! گالیاں۔۔۔۔۔ گالیاں۔۔۔۔۔۔۔ کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی۔ کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے۔ باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اُس کے سامنے آئے اُس کے سر پر دے مارے، پر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔۔۔۔ اُس کا سینہ مُربے کا مرتبان تھوڑی تھا۔ ٹھیک ہے۔ لیکن پھر کوئی اور ترکیب بھی تو سمجھ میں آئے جس سے یہ گالیاں دُور دفان ہوں۔۔۔۔ کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کر اُسے دُکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؟ کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا؟۔۔۔۔۔ ہو گا۔ پر کسی کو اس کے دل کے حال کا کیا پتہ تھا۔ وہ کھلی کتاب تھوڑی تھا۔ اور نہ اُس نے اپنا دل باہر لٹکا رہا تھا۔ اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؟ نہ معلوم ہو!۔۔۔۔۔۔۔۔ پرماتما کرے کسی کو معلوم نہ ہو۔۔۔۔ اگر کسی کو اندر کی بات کا پتہ چل گیا۔ تو کیشو لال کھاری سینگ والے کے لیے ڈوب مرنے کی بات تھی۔۔۔۔ گالیاں سُن کر خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؟ معمولی بات نہیں بہت بڑی بات ہے۔۔۔۔۔۔ ہمالیہ پہاڑ جتنی بڑی بات ہے۔ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ اُس کا غرور مٹی میں مل گیا ہے۔ اُس کی ذلّت ہُوئی ہے۔ اس کی ناک کٹ گئی ہے۔۔۔۔۔ اس کا سب کچھ لُٹ گیا ہے چلو بھئی چھٹی ہوئی۔ اب تو یہ گالیاں اُس کا پیچھا چھوڑ دیں۔۔۔۔۔۔۔ وہ کمینہ تھا۔ رذیل تھا۔ نیچ تھا۔ گندگی صاف کرنے والا بھنگی تھا، کُتّا تھا۔۔۔۔۔۔ اُس کو گالیاں ملنا ہی چاہیے تھیں۔ نہیں نہیں، کسی کی کیا مجال تھی کہ اسے گالیاں دے اور پھر بغیر کسی قصور کے، وہ اسے کچا نہ چبا جاتا۔۔۔۔ اماں ہٹاؤ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔۔۔۔۔۔ تم نے تو سیٹھ سے یُوں گالیاں سنیں۔ جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔

”میٹھی میٹھی بولیاں تھیں، بڑے مزے دار گھونٹ تھے، چلو یہی سہی۔۔۔۔ اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ سچ کہتا ہُوں۔ دیوانہ ہو جاؤں گا۔۔۔۔ یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر اُدھر چل پھر رہے ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا بھگوان کی قسم مجھے اب زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کُتّے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا۔ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے۔ اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ مر جاؤں گا۔ سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا۔۔۔۔ مر جاؤں گا۔ سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا۔ اور میری رادھا ودھوا اور میرے بچے اناتھ ہو جائیں گے۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو گا کہ میں نے سیٹھ سے دو گالیاں سُنیں اور خاموش رہا۔ جیسے میرے منہ پر تالا لگا ہُوا تھا۔ میں لُولا، لنگڑا، اپاہج تھا۔۔۔۔ پرماتما کرے میری ٹانگیں اس موٹر کے نیچے آ کر ٹوٹ جائیں، میرے ہاتھ کٹ جائیں۔۔۔۔۔۔ میں مر جاؤں تاکہ یہ بک بک تو ختم ہو۔۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔۔۔ کوئی ٹھکانہ ہے اس دُکھ کا۔۔۔۔ کپڑے پھاڑ کر ننگا ناچنا شروع کر دوں۔۔۔۔۔ اس ٹرام کے نیچے سر دے دوں، زور زور سے چلانا شروع کر دوں۔۔۔۔۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟“

یہ سوچتے ہوئے اُسے ایکا ایکی خیال آیا کہ بازار کے بیچ کھڑا ہو جائے، اور سب ٹریفک کو روک کر جو اس کی زبان پر آئے بکتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کا سینہ سارے کا سارا خالی ہو جائے۔ یا پھر اس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں سے چلانا شروع کر دے۔

”مجھے بچاؤ۔۔۔۔ مجھے بچاؤ“!

اتنے میں ایک آگ بُجھانے والا انجن سڑک پر ٹن ٹن کرتا آیا اور اُدھر اس موڑ میں گُم ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر وہ اونچی آواز میں کہنے ہی والا تھا۔

”ٹھہرو۔۔۔۔۔ میری آگ بُجھاتے جاؤ۔“

مگر نہ جانے کیوں رک گیا۔ ایکا ایکی اُس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس رُکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ پھٹ جائے۔ لیکن جونہی اس کی رفتار بڑھی۔ اُس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے۔۔۔۔۔۔ دو مہینے کا کرایہ، اس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا۔۔۔۔۔۔ سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدّی آواز، اس کے گنجے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور۔۔۔۔ یہ موٹی گالی۔۔۔۔ پھر دوسری۔۔۔۔ اور اس کی خاموشی۔۔۔۔ یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑ تڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے قدم اور تیز کیے اور آگ کا یہ چکر اتنی تیزی سے گھومنا شروع ہُوا۔ کہ شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گئی۔ جو اس کے آگے آگے زمین پر اُچھلنے کودنے لگی۔ وہ اب دوڑنے لگا۔ لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نیا خیال بلند آواز میں چلایا۔

”تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کس سے بھاگ رہے ہو؟ تم بزدل ہو“!

اُس کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھنے لگے۔ بریک سی لگ گئی۔ اور وہ ہولے ہولے چلنے لگا۔۔۔۔۔ وہ سچ مچ بزدل تھا۔۔۔۔۔۔۔ بھاگ کیوں رہا تھا؟۔۔۔۔۔۔۔ اُسے تو انتقام لینا تھا۔۔۔۔ انتقام۔۔۔۔۔۔۔ یہ سوچتے ہُوئے اُسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہُوا۔ اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہُوئی۔ لہو۔۔۔۔ اُسے آسمان زمین سب لہو ہی میں رنگے ہُوئے نظر آنے لگے۔۔۔۔۔۔۔ لہو۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ سکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں لال ڈورے اُبھر آئے۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اور قدموں میں مضبوطی پیدا ہو گئی۔۔۔۔۔ اب وہ انتقام پر تُل گیا تھا! وہ بڑھا۔ آنے جانے والے لوگوں میں سے تیر کے مانند اپنا راستہ بناتا۔ آگے بڑھتا رہا۔ آگے۔۔۔۔۔ آگے! جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ جایا کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بجلی کے کھمبوں، دوکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے۔۔۔۔۔ آگے۔۔۔۔۔ بہت آگے! راستے میں ایک سینما کی رنگین بلڈنگ آئی۔ اُس نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور اس کے پاس سے بے پرواہ، ہَوا کے مانند بڑھ گیا۔ وہ بڑھتا گیا۔ اندر ہی اندر اُس نے اپنے ہر ذرّے کو ایک بم بنا لیا تھا۔ تاکہ وقت پر کام آئے مختلف بازاروں سے زہریلے سانپ کے مانند پھنکارتا ہوا وہ اپولوبندر پہنچا۔۔۔۔۔ اپولوبندر۔۔۔۔ گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے بے شمار موٹریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ ’پر‘ جوڑے کسی کی لاش کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ جب اُس نے خاموش سمندر کی طرف دیکھا۔ تو اُسے یہ ایک لمبی چوڑی لاش معلوم ہُوئی۔۔۔۔۔ اس سمندر کے اُس طرف ایک کونے میں لال لال روشنی کی لکیریں ہولے ہولے بل کھا رہی تھیں۔ یہ ایک عالی شان ہوٹل کی پیشانی کا برقی نام تھا۔ جس کی لال روشنی سمندر کے پانی میں گُدگُدی پیدا کر رہی تھی۔ کیشو لال کھاری سینگ والا اُس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر اُس نے اوپر دیکھا۔۔۔۔ سنگین عمارت کی طرف جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور۔۔۔۔۔۔ اس کے حلق سے ایک نعرہ۔۔۔۔۔ کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ پگھلے ہُوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا۔

”ہت تیری۔۔۔۔۔۔“!

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اُونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا۔ تو اُسے اس بات کا پورا یقین تھا۔ کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔ اور یہ نعرہ سُن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی۔ کہا۔

”پگلا ہے“!

نفسیات شناس

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹونفسیات شناس

آج میں آپ کو اپنی ایک پُر لطف حماقت کا قصّہ سُناتا ہوں۔ کرفیوں کے دن تھے۔ یعنی اس زمانے میں جب بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو چکے تھے۔ ہر روز صبح سویرے جب اخبار آتا تو معلوم ہوتا کہ متعدد ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ میری بیوی اپنی بہن کی شادی کے سلسلے میں لاہور جا چکی تھی۔ گھر بالکل سُونا سُونا تھا اسے گھر تو نہیں کہنا چاہیے۔ کیونکہ صرف دو کمرے تھے ایک غسلخانہ جس میں سفید چمکیلی ٹائلیں لگی تھیں اس سے کچھ اور ہٹ کر ایک اندھیرا سا باورچی خانہ اور بس۔ جب میری بیوی گھر میں تھی تو دو نوکر تھے۔ دونوں بھائی کم عمر تھے۔ ان میں سے جو چھوٹا تھا وہ مجھے قطعاً پسند نہیں تھا اس لیے کہ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ چالاک اور مکار تھا چنانچہ میں نے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُسے نکال باہر کیا اور اُس کی جگہ ایک اور لڑکا ملازم رکھ لیا جس کا نام افتخار تھا۔ رکھنے کو تو میں نے اُسے رکھ لیا لیکن بعد میں بڑا افسوس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوں اور کوئی افسانہ سوچ رہا ہوں کہ وہ باورچی خانہ سے بھاگا آیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

”صاحب آپ نے بُلایا مجھے۔“

میں حیران کہ اس خرذات کو میں نے کب بُلایا تھا چنانچہ میں نے شروع شروع تو اتنی حیرت کا اظہار کیا اور اس سے کہا۔ افتخار تمہارے کان بجتے ہیں میں جب آواز دیا کروں اُسی وقت آیا کرو۔ افتخار نے مجھ سے کہا۔ لیکن صاحب آپ کی آواز ہی سنائی دی تھی۔ میں نے اس سے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ نہیں میں نے تمھیں نہیں بُلایا تھا جاؤ اپنا کام کرو۔ وہ چلا گیا لیکن جب ہر روز چھ چھ مرتبہ آ کر یہی پوچھتا صاحب آپ نے بُلایا ہے مجھے تو تنگ آ کر اُس سے کہنا پڑتا۔ تم بکواس کرتے ہو تم ضرورت سے زیادہ چالاک ہو بھاگ جاؤ یہاں سے۔ اور وہ بھاگ جاتا۔ گھر میں چونکہ اور کوئی نہیں تھا اس لیے میرا دوست راجہ مہدی علی خان میرے ساتھ ہی رہتا تھا اُس کو افتخار کی مستعدی بہت پسند تھی۔ وہ اُس سے بہت متاثر تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا منٹو۔ تمہارا یہ ملازم کتنا اچھا ہے۔ ہر کام کتنی مستعدی سے کرتا ہے۔ میں نے اُس سے ہر بار یہی کہا۔ راجہ میری جان تم مجھ پر بہت بڑا احسان کرو گے۔ اگر اسے یہاں اپنے یہاں لے جاؤ مجھے ایسے مستعد نوکر کی ضرورت نہیں معلوم نہیں کہ راجہ کو افتخار پسند تھا تو اُس نے اُسے ملازم کیوں نہ رکھ لیا میں نے راجہ سے کہا۔

”دیکھو بھائی یہ لڑکا بڑا خطرناک ہے مجھے یقین ہے کہ چور ہے کبھی نہ کبھی میرے چونا ضرور لگائے گا۔“

راجہ میرا تمسخر اُڑاتا۔ تم فرائڈ بن رہے ہو۔ ایسا نوکر زندگی میں مشکل سے ملتا ہے تم نے اسے سمجھا ہی نہیں۔

”میں سوچ میں پڑ جاتا کہ میرا قیافہ یا اندازہ کہیں غلط تو نہیں۔ شاید راجہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے افتخار ایماندار ہو اور جو میں نے اس کی ضرورت سے زیادہ پھرتی اور چالاکی کے متعلق فیصلہ کیا ہے بہت ممکن ہے غلط ہو۔ مگر سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچتا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی درست ہے مجھے اپنے متعلق یہ حسن ظن ہے کہ انسانی نفسیات کا ماہر ہوں۔ آپ یقین مانیے افتخار کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی تھی دُرست نکلی۔ لیکن۔“

”یہ۔ لیکن ہی سارا قصہ ہے“

اور قصّہ یُوں ہے کہ میں جب بمبئی ٹاکیز سے واپس آیا کرتا تھا تو عادتاً ریل گاڑی کا ماہانہ ٹکٹ جو ایک کارڈ کی صورت میں ہوتا تھا جو سلولائیڈ کے کور میں بند رہتا تھا، اپنے میز کے ٹرے میں رکھا کرتا تھا جتنے روپے پیسے اور آنے جیب میں ہوتے وہ بھی اس ٹرے میں رکھ دیتا۔ اگر کچھ نوٹ ہوں تو میں وہ ٹکٹ کے سلولائیڈ کے کور میں اُڑس دیا کرتا۔ ایک دن جب میں بمبئی ٹاکیز سے واپس آیا تو میری جیب میں ساٹھ روپے کی مالیت کے چھ نوٹ دس دس کے تھے میں نے حسبِ عادت جیب میں سے ٹرین کا پاس نکالا اور سلولائڈ کور میں چھ نوٹ اڑسے اور برانڈی پینے لگا۔ کھانا کھانے کے بعد میں سو گیا۔ صبح جلدی بیدار ہوتا ہوں یعنی یہی کوئی ۵ بجے ساڑھے پانچ کے قریب اخبار آجاتے تھے اُن کا جلدی جلدی مطالعہ کرتے کرتے چھ بجے میں اُٹھ کر غسل کرتا اُس کے بعد پھر برانڈی پیتا اور کھانا کھا کر سو جاتا۔ اُس شام بھی ایسا ہی ہوا افتخار نے بڑی پھرتی سے میز پر کھانا لگایا جب میں کھا کر فارغ ہوا تو اس نے بڑی پھرتی سے برتن اُٹھائے۔ میز صاف کی اور مجھ سے کہا

”صاحب آپ کو سگریٹ چاہئیں۔“

میں نے اس سے بڑے درشت لہجے میں کہا۔ کہ

”سگریٹ تو مجھے چاہئیں۔ لیکن تم لاؤ گے کہاں سے جانتے نہیں ہو آج کرفیو ہے نو بجے سے صبح چھ بجے تک۔“

افتخار خاموش ہو گیا۔ میں حسبِ معمول صبح پانچ بجے اُٹھا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں نوکر سو رہے تھے۔ کرفیو کا وقت چھ بجے تک تھا۔ اس وقت کوئی اخبار نہیں آیا تھا۔ صوفے پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُکتا کر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو بازار سنسان تھا وہ بازار جو صبح تین بجے ہی ٹراموں کی کھڑکھڑاہٹ اور مل میں کام کرنیوالی عورتوں اور مردوں کی تیز رفتاری سے زندہ ہوتا تھا۔ کھڑکی ایک ہی تھی۔ اس کے پاس ہی میری میز پر جو ٹرے پڑی تھی میری نظر اتفاقیہ اس پر پڑی شام کو ہر روز میں اس میں اپنا ریل کا پاس اور روپے پیسے رکھا کرتا تھا اس لیے کہ یہ معاملہ عادت بن کر طبیعت بن گیا تھا۔ جب میں نے ٹرے کو اتفاقیہ دیکھا تو مجھے وہ پاس نظر نہ آیا جس کے کور میں میں نے دس دس کے چھ کرنسی نوٹ رکھے تھے پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید میں نے کاغذوں کے نیچے رکھ دیا ہو گا لیکن جب کاغذ اُٹھائے تو کچھ بھی نہ تھا۔ بڑی حیرت ہوئی۔ ایک ایک کاغذ اُلٹ پلٹ کیا مگر وہ پاس نہ ملا۔ دونوں نوکر باورچی خانے میں سو رہے تھے۔ میں بڑا متحیر تھا کہ یہ قصہ کیا ہے میں نے اگر گھر آنے سے پہلے شراب پی ہوتی تو میں سمجھتا کہ میرا حافظہ جواب دے گیا ہے یا جیب سے رومال نکالتے وقت مجھ سے وہ چھ نوٹ کہیں گر گئے۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا میں نے بمبئی ٹاکیز سے واپس گھر آتے ہوئے راستے میں ایک قطرہ بھی نہیں پیا تھا اس لیے کہ گھر میں برانڈی کی پوری بوتل موجود تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر تلاش شروع کی تو دیکھا میرا ریلوے پاس دس دس کے چھ نوٹوں سمیت میز کے نچلے دراز میں فائلوں کے نیچے پڑا ہے میں دیر تک سوچتا رہا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا اس لیے کہ میں نے اسے چھپا کر نہیں رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ افتخار کی حرکت ہے۔ جبکہ میں سو رہا تھا باورچی خانے کے کام سے فارغ ہو کر ٹرے میں وہ پاس دیکھا اور اس کو میز کے نیچے والی دراز میں فائلوں کے اندر چھپا دیا۔ رات کرفیو تھا اس لیے وہ باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی غالباً یہ اسکیم تھی کہ جب صبح کرفیو اُٹھے تو وہ پاس نوٹوں سمیت لے کر چھپت ہو جائے گا مگر میں بھی ایک کائیاں تھا میں نے پاس فائلوں کے نیچے سے اُٹھایا اور پھر ٹرے میں رکھ دیا تاکہ میں افتخار کی پریشانی دیکھ سکوں۔ مجھے مقررہ وقت پر بمبئی ٹاکیز جانا تھا چنانچہ حسبِ معمول میں نے کُرتہ اور پاجامہ نکالا پاجامہ میں ازار بند ڈالا اور تولیہ لے کر غسل خانے میں چلا گیا لیکن میرے دل و دماغ میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ اور وہ افتخار کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا مجھے یقین تھا کہ وہ میری میز کے نچلے دراز میں چھپایا ہوا پاس بڑے وثوق سے نکالے گا پھر جب اُسے نہیں ملے گا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھے گا۔ جب اُسے ناکامی ہو گی تو وہ اُٹھے گا اُس کی نظر ٹرے پر پڑے گی وہ کس قدر حیران ہو گا لیکن وہ پاس کو اُٹھائے گا اور اپنے قبضے میں اُڑس کر چلتا بنے گا۔ میں نے اپنے دماغ میں اسکیم بنائی تھی کہ غسل خانے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا رکھوں گا۔ غسل خانہ میرے کمرے کے بالکل سامنے تھا ذرا سا دروازہ کھلا رہتا اور میں تاک میں رہتا تو افتخار کو رنگے ہاتھوں پکڑ لینے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ میں جب غسل خانے میں داخل ہوا تو بہت مسرور تھا۔ بزعمِ خود نفسیاتی ماہر کی وجہ سے اور بھی زیادہ خوش تھا کہ آج میری قابلیت مُسلم ہو جائے گی۔ افتخار کو پکڑ کر میں راجہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ اسے پولیس کے حوالے کروں مجھے صرف اپنا دلی اور ذہنی اطمینان ہی تو مطلوب تھا۔ چنانچہ میں نے غسل خانے میں داخل ہو کر جب اپنے کپڑے اُتارے تو دروازہ ذرا سا کھلا رکھا۔ پانی کے دو ڈونگے اپنے بدن پر ڈال کر میں نے صابن ملنا شروع کیا اس کے بعد کئی مرتبہ جھانک کر کمرے کی طرف دیکھا مگر افتخار پاس لینے نہ آیا۔ لیکن مجھے یقین واثق تھا کہ وہ ضرور آئے گا اس لیے کہ اس وقت کرفیو اُٹھ چکا تھا۔ میں فوارے کے نیچے بیٹھا اور اُس کی تیز اور ٹھنڈی پھوار میں اپنا کام بھول گیا اور سوچنے لگا۔ افسانہ نگار ہونا بھی بہت بڑی لعنت ہے میں نے اسکیم کو افسانے کی شکل دینا شروع کر دی ساتھ ساتھ نہاتا بھی رہا اتنا مزا آیا کہ افسانے اور پانی میں غرق ہو گیا۔ میں نے پورا افسانہ صابن اور پانی سے دھو

دھا کر اپنے دماغ میں صاف کر لیا۔ بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ اس افسانے کا انجام یہ تھا کہ میں نے اپنے نوکر کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے اور میری نفسیات شناسی کی چاروں طرف دُھوم مچ گئی ہے۔ میں بہت خوش تھا چنانچہ میں خلافِ معمول اپنے بدن پر ضرورت سے زیادہ صابن ملا۔ ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کیا لیکن ایک بات تھی کہ افسانہ میرے دماغ میں اور زیادہ صاف اور زیادہ اُجلا ہوتا گیا جب نہا کر باہر نکلا تو میں اور بھی زیادہ خوش تھا۔ اب صرف یہ کرنا تھا کہ یہ قلم اُٹھاؤں اور یہ افسانہ لکھ کر کسی پرچے کو بھیج دُوں۔ میں خوش تھا کہ چلو ایک افسانہ ہو گیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں گیا میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں تو وہ معاملہ پڑا تھا۔ یعنی میر اریلوے کا پاس جس میں دس دس کے چھ نوٹ ملفوف تھے میں دوسرے کمرے میں کپڑے پہن رہا تھا۔ کپڑے پہن کر جب باہر نکلا تو یوں سمجھیے جیسے افسانوں کی دنیا سے باہر آیا۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ میری اسکیم کیا تھی۔ میز پر پڑی ٹرے کو دیکھا۔ میر اریلوے پاس دس دس کے چھ نوٹوں سمیت غائب تھا۔ میں نے فوراً اپنے شریف نوکر کو طلب کیا اور اُس سے پوچھا۔

”کریم افتخار کہاں ہے“

اس نے جواب دیا۔

”صاحب وہ کوئلے لینے گیا ہے۔“

میں نے صرف اتنا کہا

”تو اُس نے اپنا منہ کالا کر لیا ہے۔“

کریم نے اُس کی تلاش کی مگر وہ نہ ملا میں غسل خانے میں انسانی نفسیات کو صابن اور پانی سے دھوتا اور صاف کرتا رہا۔ مگر افتخار مجھے صاف کر گیا۔ اس لیے کہ اسی صبح جب میں بمبئی ٹاکیز کی برقی ٹرین میں روانہ ہوا تو میرے پاس، پاس نہیں تھا ٹکٹ چیکر آیا تو میں پکڑا گیا۔ مجھے کافی جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

نفسیاتی مطالعہ

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹونفسیاتی مطالعہ

مجھے چائے کے لیے کہہ کر، وہ ان کے دوست پھر اپنی باتوں میں غرق ہو گئے۔ گفتگو کا موضوع، ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیب تھا۔ شروع شروع میں تو یہ لوگ اردو کے افسانوی ادب پر طائرانہ نظر دوڑاتے رہے۔ لیکن بعد میں یہ نظر گہرائی اختیار کر گئی اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، گفتگو گرما گرم بحث میں تبدیل ہو گئی۔ میرے شوہر، ترقی پسند ہیں نہ رجعت پسند، لیکن بحث پسند ضرور ہیں، چنانچہ اپنے دوستوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ گرمجوش وہی نظر آتے تھے۔ وہ اس اندیشے کے یکسر خلاف تھے کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کا مستقبل تاریک ہے۔ بحث کے دوران میں ایک مرتبہ انھوں نے بالکل

”تم آج شام کو ساڑھی پہنو گی“

کے سے فیصلہ کن انداز میں اپنے دوست حبیب سے کہا۔

”تمھیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک زندہ رہے گی۔“

حبیب صاحب فوراً سر تسلیم خم کر دینے والے نہیں تھے، چنانچہ بحث جاری رہی، اور جب میں چائے تیار کرنے کے لیے اٹھی تو حفیظ اللہ صاحب جن کو سب اُلاّ کہہ کر پکارتے تھے پچیسواں سگریٹ پھونکتے ہوئے ترقی پسند ادب پر کریملن کے اشتمالی اثر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش شروع کرنے والے تھے۔ میں اٹھ کر باورچی خانے میں آئی تو نوکر غائب تھا اور چائے کا پانی چولہے پر دھرا بالکل غارت ہو چکا تھا۔ میں نے کیتلی کا پانی تبدیل کیا اور باہر نکل کر نوکر کو آواز دی۔ وہ جب آیا تو اس کے ہاتھ میں

”اداکار“

کا پرچہ تھا جس کے سرورق پر منورما کی نیم برہنہ تصویر چھپی ہوئی تھی۔ میں نے جھڑک کر پرچہ اس کے ہاتھ سے لیا۔

”جب دیکھو واہیات پرچے پڑھ رہا ہے۔ چائے کا پانی ابل ابل کر تیل بن چکا ہے اس کا کچھ خیال ہی نہیں۔ جاؤ، پیسٹری لے کر آؤ۔ منٹا منٹی میں آنا۔“

میں نے پرس میں سے ایک پانچ کا نوٹ اس کو دیا اور باورچی خانے میں لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر

”اداکار“

کی تصویریں دیکھنا شروع کر دیں۔ تصویریں دیکھ چکنے کے بعد میں سوال جواب پڑھ رہی تھی کہ پیسٹری آ گئی۔

”اداکار“

کا پرچہ میز پر رکھ کر میں نے سب دانے الگ الگ طشتریوں میں چنے اور نوکر سے یہ کہہ کر وہ دودھ گرم کر کے جلدی چائے لے آئے، واپس بڑے کمرے میں چلی آئی۔ جب اندر داخل ہوئی تو وہ اور ان کے دوست قریب قریب خاموش تھے۔ میں سمجھی، شاید ان کی گفتگو ختم ہو چکی ہے لیکن اُلاّ صاحب نے اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک اتار کر رومال سے آنکھیں صاف کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھابی جان سے پوچھنا چاہیے۔ شاید وہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں؟“

میں کرسی پر بیٹھنے والی تھی۔ یہ سن کر قدرے رک گئی۔ اب حبیب صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”تشریف رکھیے“!

میں بیٹھ گئی۔ میرے شوہر اپنی جگہ سے اٹھے اور بالکل

”اس کو سینا پرونا نہیں آتا“

کے سے انداز میں اپنے دوست اُلاّ سے کہا۔

”یہ اس معاملے پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتی۔“

”پوچھنا مجھے تھا۔“

حبیب صاحب نے ان سے پوچھا۔

”کیوں؟“

حسب عادت میرے شوہر گول کر گئے۔

”بس۔“!

پھر مجھ سے مخاطب ہوئے

”چائے کب آئے گی؟“

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”جب آپ مجھ سے روشنی ڈالنے کے لیے کہیں گے۔“

اُلاّ صاحب نے چشمہ ناک پر جمایا اور تھوڑا سا مسکرائے۔

”بات یہ ہے بھابی جان کہ۔ وہ ہیں نا آپ کی۔ میرا مطلب ہے۔“

حبیب صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔

”اُتے، خدا کی قسم تمھیں اپنا مطلب سمجھانے کا سلیقہ کبھی نہیں آئے گا۔“

یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”آپ یہ فرمائیے کہ آپ کا اپنی سہیلی بلقیس جہاں کے متعلق کیا خیال ہے؟“

سوال بڑا اوندھا سا تھا۔ میں جواب سوچنے لگی۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

اُلاّ صاحب نے حبیب صاحب کی پسلیوں میں اپنی کہنی سے ایک ٹھونکا دیا۔

”بھئی واللہ، اپنا مطلب واضح طور پر سمجھانے کا سلیقہ ایک فقط تمھیں ہی آتا ہے۔“

”ٹھہرو یار“

حبیب جھنجھلا گئے۔ انھوں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور جھنجھلاہٹ دور کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”ابھی ابھی بلقیس کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اردو کے موجودہ ادب میں اس خاتون کا جو رتبہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ان کا ایک خاص مقام ہے۔ افسانہ نگاری میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں وہ بہت آگے ہیں۔ جہاں تک نفسیات کے مطالعے کا تعلق ہے۔“

حبیب صاحب جیسے یہ کہنے کے لیے بیتاب تھے۔

”ان کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔“

”خاص طور پر مردوں کی جنسی نفسیات کا۔“

میرے شوہر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ حبیب نے مجھ سے مخاطب ہو کر میرے شوہر کے الفاظ دہرائے۔

”جی ہاں خاص طور پر مردوں کی جنسی نفسیات کا۔“

اور یہ کہتے ہوئے دو دفعتہً محجوب سے ہو گئے اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ مجھے ان پر کچھ ترس آیا چنانچہ میں نے ذرا بیباکی سے کہا

”آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

اُلاّ صاحب خاموش رہے۔ ان کی جگہ حبیب بولے۔

”چونکہ آپ بلقیس صاحبہ کی سہیلی ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ آپ ان کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔“

میں نے صرف اتنا کہا۔

”ایک حد تک“!

میرے شوہر نے کسی قدر بے چین ہو کہا۔

”بیکار ہے۔ بالکل بیکار ہے۔ عورتیں راز کی باتیں نہیں بتایا کرتیں، خاص طور پر جب وہ خود ان کی اپنی صنف سے متعلق ہوں۔“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”کیوں محترمہ، کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔“

میرا خیال ہے ایک حد تک درست کہہ رہے تھے، لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں چائے آگئی اور گفتگو تھوڑے عرصے کیلیے

”چائے کتنی۔ دودھ کتنا۔ شکر کتنے چمچ“

میں تبدیل ہو گئی۔ اُلاّ صاحب پانچویں کریم رول کی کریم اپنے ہونٹوں پر سے چوستے ہوئے پھر بلقیس جہاں کی طرف لوٹے اور بلند آواز میں کہا۔

”کچھ بھی ہو، یہ طے ہے کہ یہ محترمہ ہم مردوں کی جنسی نفسیات کو خوب سمجھتی ہے۔“

ان کا روئے سخن ہم سب کی طرف کم اور ساری دنیا کی طرف زیادہ تھا۔ میں ان کا یہ فیصلہ سن کر دل ہی دل میں مسکرائی۔ کیونکہ کم بخت بلقیس، اُلاّ صاحب کی جنسی نفسیات خوب سمجھتی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا۔

”تھپو۔ اگر یہ اُلاّ صاحب تمہارے شوہر نیک اختر کے دوست نہ ہوتے تو خدا کی قسم میں انھیں ایسے چکر دیتی کہ ساری عمر یاد رکھتے۔ اول درجے کے ریشہ خطمی انسان ہیں۔ اسٹریم لائنڈ عاشق۔“

مجھے معلوم نہیں بلقیس نے اُلاّ صاحب کے متعلق یہ رائے کیسے قائم کی تھی۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں گڈمڈ سی ہو رہی تھیں۔ اسٹریم لائنڈ عاشق کا کوئی خط مجھے ان کے چہرے پر نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا ایسے معاملے جانچنے کے لیے ایک خاص قسم کی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو قدرت نے صرف بلی ہی کو عطا کی تھی۔ اُلاّ صاحب نے جب مجھے گھورتے دیکھا تو سٹپٹا سے گئے۔ چھٹے کریم رول کی کریم بہت بری طرح ان کے ہونٹوں سے لتھڑ گئی۔

”معاف کیجیے گا۔“

یہ کہہ کر رومال سے اپنا منہ پونچھا۔

”کیا آپ کی سہیلی بلقیس کے بارے میں میرا خیال غلط ہے۔“

میں نے اپنے لیے دوسرا کپ بنانا شروع کر دیا۔

”میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

میرے شوہر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور بالکل

”شلجم بن جلائے تم کبھی نہیں پکا سکتیں“

کے سے انداز میں کہا۔

”یہ اس بارے میں کبھی کچھ کہہ نہیں سکیں گی“

میں نے غیر ارادی طور پر ان کی طرف دیکھا۔ بلی کی ان کے بارے میں یہ رائے تھی کہ بنتے بنتے بننے کے فن میں بڑی مہارت حاصل کر گئے ہیں۔ بے حد خشک ہیں اور یہ خشکی انھوں نے اپنے وجود میں ادھر ادھر سے ملبہ ڈال ڈال کر پیدا کی ہے بظاہر کسی عورت میں دلچسپی ظاہر نہیں کریں گے مگر ہر عورت کو ایک بار چور نظر سے ضرور دیکھیں گے۔ دفعتہً انھوں نے میری طرف چور نظر سے دیکھا۔ میں جھینپ گئی۔ اُلاّ صاحب اپنے ہونٹ تسلی بخش طور پر صاف کر چکے تھے۔ ایک پیٹس اٹھا کر وہ میرے شوہر سے مخاطب ہوئے۔

”یار تمہاری بیگم صاحبہ نے تو ہمیں بہت بری طرح ڈس اپائنٹ کیا ہے۔“

حبیب صاحب چائے کا آخری گھونٹ پی کر بولے

”درست ہے۔ لیکن اس معاملے میں بیوی کے بجائے خاوند کسی حد تک رہبری کر سکتا ہے۔“

اُلاّ صاحب نے پوچھا۔

”تمہارا مطلب ہے، بلقیس صاحبہ کے بارے میں؟“

”جی ہاں“

یہ کہہ کر حبیب صاحب اٹھے، میرے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”اپنی بیگم صاحبہ کے ذریعے سے آپ کو بلقیس کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو ضرور معلوم ہوا ہوگا۔“

میرے شوہر نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

”صرف اسی قدر کہ اس کا مطالعہ کتابی نہیں“

یہ کہہ کر انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

”کیوں سعیدہ؟“

میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔

”جی ہاں۔ اسے کتابوں کے مطالعے کا اتنا شوق نہیں“!

میرے شوہر نے ایک دم سوال کیا۔

”تم اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟“

مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں تھی، اس لیے میں نے اپنی معذوری ظاہر کر دی لیکن میں سوچنے لگی کہ جب بلقیس کا کام ہی لکھنا ہے، پھر اسے پڑھنے سے لگاؤ کیوں نہیں۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ نمائش میں گھومتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا۔

”بھپو، یہ نمائش نہیں ایک لائبریری ہے۔ زندہ اور متحرک کتابوں سے بھری ہوئی۔ غور تو کرو کتنے دلچسپ کردار چل پھر رہے ہیں۔“

سوچتے سوچتے مجھے اس کی اور بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ عورتوں کے مقابلے میں وہ مردوں سے کہیں زیادہ تپاک سے ملتی اور باتیں کرتی تھی۔ لیکن گفتگو کا موضوع ادب، شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، میرا خیال ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے مرد اس سے مل کر یقینی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہوں گے کہ بہت غیر ادبی قسم کی عورت ہے، کیونکہ عام طور پر وہ گفتگو کا رخ لٹریچر کی طرف آنے ہی نہیں دیتی تھی، لیکن اس کے باوجود اس سے ملاقات کرنے والے بہت خوش خوش جاتے تھے کہ انھوں نے اتنی بڑی ادبی شخصیت کے ایک بالکل نئے اور نرالے پہلو کی جھلک دیکھ لی ہے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں، بلی اپنی شخصیت کے اس بظاہر بالکل نئے اور نرالے پہلو کی جھلک خود دکھاتی تھی، بقدر ضرورت اور وہ بھی صرف اپنے ملاقاتیوں کے کردار کی صحیح جھلک دیکھنے کے لیے۔ میرے ساتھ اس کو اپنا یہ محبوب اور مجرب نسخہ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی کیونکہ بقول اس کے

”میں نے ایک نظر ہی میں تاڑ لیا تھا کہ تم بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی ہو۔“

میں بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی تو نہیں ہوں۔ لیکن شاید بلی نے یہ رائے اس لیے قائم کی تھی کہ میں نے اس کی بحث پسند، ضدی اور اڑیل طبیعت کے پیش نظر اس سے راہ و رسم بڑھانے سے پہلے ہی اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس کی طبیعت کے خلاف بالکل نہ چلوں گی۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے بعض افسانے جو بڑے ٹھیٹ قسم کے جنسیاتی یا نفسیاتی ہوتے تھے، میری سمجھ سے عام طور پر اونچے ہی رہتے تھے۔ وہ اکثر ایسے افسانوں کے متعلق پوچھا کرتی تھی

”کہو، بھپو، تم نے میرا فلاں افسانہ پڑھا۔“

اور پھر خود ہی کہا کرتی تھی۔

”پڑھا تو ضرور ہوگا، مگر سمجھ میں کیا آیا ہوگا۔ خاک۔ خدا کی قسم تم بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی ہو“!

میں یہ افسانے سمجھنے کی کوشش ضرور کرتی، مگر مجھے اس بات سے بڑی الجھن ہوتی کہ بلی عورت ہو کر ایسی گہرائیوں میں کود جاتی ہے، جن میں اترنے سے مرد بھی گھبرائیں۔ میں نے کئی دفعہ اس سے کہا

”تم کیوں ایسی باتیں لکھتی ہو کہ مرد بیٹھ کر تمہارے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑاتے ہیں۔“

مگر اس نے ہر بار جواب کچھ اسی قسم کا دیا۔

”اڑانے دو۔ میں ان کیڑوں کی کیا پروا کرتی ہوں۔ ایسی درگت بناؤں گی کہ یاد رکھیں گے“!

وہ کتنے مردوں کی درگت بنا چکی تھی، اس کا مجھے کوئی علم نہیں، لیکن میرٹھ کے ایک ادھیڑ عمر کے شاعر جو دو سال تک اسے عشقیہ خط لکھتے رہے تھے اور جسے دو سال تک یہ شہہ دیتی رہی تھی، انجام کار سب کچھ بھول کر ایک بہت ہی خفیہ خط میں اس کو اپنی بیٹی بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ مجبور کر دیے گئے تھے۔ اس نے مجھے ان کا آخری خط دکھایا تھا۔ خدا کی قسم مجھے بہت ترس آیا تھا بیچارے پر۔ اُلاّ صاحب دوسرا اپیٹس ختم کر چکے تھے۔ حبیب صاحب تفریحاً خالی پیالی میں چمچ ہلا رہے تھے۔ میں اٹھ کر چائے کے برتن جمع کرنے لگی تو اُلاّ صاحب نے رسمیہ طور پر کہا۔

”اتنی نفیس چائے کا بہت بہت شکریہ۔ مگر یہ گلہ آپ سے ضرور رہے گا کہ آپ نے بلقیس جہاں صاحبہ کی جنسیات نگاری پر کوئی روشنی نہ ڈالی۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ بڑے بڑے ماہر جنسیات بھی حیراں ہیں کہ ایک عورت میں اتنی گہری نگاہ کہاں سے آ گئی۔“

میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی، میرے شوہر نے ریسیور اٹھایا۔

”ہلو۔ ہلو۔ جی؟۔ جی جی۔ آداب عرض۔ جی ہاں ہے۔“

یہ کہہ کر انھوں نے مجھ سے کہا۔

”تمہارا فون ہے۔“

پھر جیسے دفعتہً یاد آیا ہو۔

”بلی ہے“!

اُلاّ صاحب، حبیب اور میں بیک وقت بولے۔

”بلقیس“!

میں نے بڑھ کر ریسیور لیا۔ گو بلقیس آنکھ سے اوجھل تھی، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ جانتی ہے کہ اس کے متعلق یہاں باتیں ہو رہی تھیں۔ اس احساس کے باعث میں بوکھلا گئی۔ جلدی جلدی میں اس سے چند باتیں کیں اور ریسیور رکھ دیا۔ اس نے مجھے اپنے یہاں بلایا تھا۔ محفل جمی رہی۔ میں گھر کے کام کاج سے جلدی جلدی فارغ ہو کر بلی کے ہاں روانہ ہو گئی۔ کوٹھی کے باہر بے شمار اسباب افراتفری کے عالم میں پڑا تھا، اس لیے کہ سفیدی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی، مگر اس کا سامان بھی درہم برہم تھا۔ میں ایک کرسی صاف کر کے اس پر بیٹھ گئی، بلی نے ادھر ادھر دیکھا اور مجھ سے کہا۔

”میں ابھی آئی۔“

چند منٹ کے بعد ہی وہ واپس آ گئی اور مجھ سے کچھ دور اسٹول پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔

”آج تمہارے متعلق بہت باتیں ہو رہی تھیں“!

”اوہ“!

اس نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔

”اُلاّ صاحب بھی تھے۔“

”اچھا“!

”میں نے انھیں بہت غور سے دیکھا، مگر مجھے ان میں اسٹریم لائنڈ عاشق کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔“

بلی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی، پھر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی؟“

”کیا؟“

”کوئی ایسی خاص نہیں۔“

لیکن اس کے لہجے نے چغلی کھائی کہ بات بہت خاص قسم کی ہے، چنانچہ میں نے فوراً سوچا کہ اس کے لیے خاص بات صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ کسی مرد کے عشق میں گرفتار ہو جانا۔

”آنکھ لڑ گئی ہے کسی سے؟“

بلقیس نے میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے جب اس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ مجھے بہت ہی متردد نظر آئی۔

”بات کیا ہے۔ آج تم میں وہ شگفتگی نہیں۔“

اس نے پھر مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

”شگفتگی؟۔ نہیں تو سفیدی ہو رہی ہے نا۔ ساری پریشانی اسی کی ہے“!

یہ کہہ کر وہ دانتوں سے اپنے ناخن کاٹنے لگی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ اس کو بہت ہی مکروہ سمجھتی تھی۔ چند لمحات خاموشی میں گزر گئے۔ میں بے چین ہو رہی تھی کہ وہ جلدی بات کرے، لیکن وہ خدا معلوم کن خیالات میں غرق تھی۔ بالآخر میں نے تنگ آ کر اس سے کہا۔

”کیا تم میر انفسیاتی مطالعہ تو نہیں کر رہی ہو۔ آخر کچھ کہو گی یا نہیں؟“

وہ بڑبڑائی۔

”نفسیاتی مطالعہ۔“

اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں ابھی اپنے تعجب کا اظہار بھی نہ کرنے پائی تھی کہ وہ اٹھ کر تیزی سے غسل خانے میں چلی گئی۔ بلی کی سدا تمسخر اڑانے والی آنکھیں اور آنسو؟۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا مگر اس کا رونا نہایت کرب آلود تھا۔ اور تو کچھ میری سمجھ میں نہ آیا۔ سینے کے ساتھ لگا اس کی ڈھارس دی اور کہا

”کیا بات ہے میری جان؟“

اس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے، لیکن تھوڑی دیر بعد ایک دم آنسو رک گئے۔ مجھ سے دور ہٹ کر وہ دریچے کے باہر دیکھنے لگی۔

”میں جانتی تھی کہ یہ کھیل خطرناک ہے، لیکن میں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ کیا دلچسپ اور مزیدار کھیل تھا“!

وہ دیوانوں کی طرح ہنسی۔

”بہت ہی مزیدار کھیل۔ ان کی فطری کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا، چند روز بے وقوف بنایا اور ایک افسانہ لکھ دیا۔ کس کا افسانہ۔ بلقیس جہاں کا۔ جنسی نفسیات کی ماہر کا۔“

اس نے پھر رونا شروع کر دیا اور مجھ سے لپٹ کر کہنے لگی۔

”بھپو۔ میری حالت قابل رحم“!

”کیا ہوا میری جان؟“

مجھ سے دور ہٹ کر وہ پھر دریچے کے باہر دیکھنے لگی۔

”بلقیس جہاں کا خاتمہ۔ کل اسی کمرے میں اس کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔“

”کیسے؟“

”یہ مجھ سے نہ پوچھو بھپو۔“

یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

”لیکن نہیں۔ میں تم سے نہیں چھپا سکتی۔ لو سنو۔ چند دنوں سے میں سفیدی کرنے والے مزدور کا مطالعہ کر رہی تھی۔ کل شام اسی وحشی نے اچانک۔“

بلقیس نے دھکا دے کر مجھے باہر نکال دیا اور غسل خانے کا دروازہ بند کر دیا۔ جب میں گھر پہنچی تو اُلاّ صاحب اور حبیب صاحب کے علاوہ اور صاحب بھی موجود تھے۔ بلقیس جہاں کی حیرت انگیز جنسی نفسیات نگاری گفتگو کا موضوع تھا۔

نِگّی

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹونِگّی

طلاق لینے کے بعد وہ بالکل نچنت ہو گئی تھی۔ اب وہ ہر روز کی واہنا کِل کِل اور مار کٹائی نہیں تھے۔ نِکی بڑے آرام و اطمینان سے اپنا گزر اوقات کر رہی تھی۔ یہ طلاق پورے دس برس کے بعد ہوئی تھی۔ نِکی کا شوہر بہت ظالم تھا۔ پرلے درجے کا نکھٹو اور شرابی کبابی۔ بھنگ چرس کی بھی لت تھی۔ کئی کئی دن بھنگڑ خانوں میں اور تکیوں میں پڑا رہتا تھا۔ ایک لڑکا ہوا تھا۔ وہ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ برس کے بعد ایک لڑکی ہوئی جو زندہ تھی اور اب نو برس کی تھی۔ نِکی سے اس کے شوہر گام کو اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اتنی کہ وہ اس کو مار پیٹ سکتا تھا۔ جی بھر کے گالیاں دے سکتا تھا۔ طبیعت میں آئے تو کچھ عرصے کے لیے گھر سے نکال دیتا تھا۔ اس کے علاوہ نِکی سے اس کو اور کوئی سروکار نہیں تھا۔ محنت مزدوری کی جب تھوڑی سی رقم نِکی کے پاس جمع ہوتی تھی تو وہ اس سے زبردستی چھین لیتا تھا۔ طلاق بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔ اس لیے کہ میاں بیوی کے نباہ کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ یہ صرف گام کی ضد تھی کہ معاملہ اتنی دیر لٹکا رہا اس کے علاوہ ایک بات یہ تھی کہ نِکی کے آگے پیچھے کوئی بھی نہ تھا۔ ماں باپ نے اس کو ڈولی میں ڈال کر گام کے سپرد کیا اور دو مہینے کے اندر اندر راہی ملک بقا ہوئے جیسے انھوں نے صرف اسی غرض کے لیے موت کو روک رکھا تھا۔ انھیں اپنی بیٹی کو ایک لمبی موت کے لیے گام کے حوالے کرنا تھا۔ بہت دور کے دو ایک رشتہ دار ہوں گے۔ مگر نِکی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انھوں نے خود کو اور زیادہ دور کر لیا تھا۔ گام کیسا ہے، یہ نِکی کے ماں باپ اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی بیٹی ساری عمر روتی رہے گی، یہ بھی ان کو اچھی طرح معلوم تھا۔ مگر انھیں تو اپنی زندگی میں ایک فرض سے سبکدوش ہونا تھا۔ اور ایسے سبکدوش ہوئے کہ سارا بوجھ نِکی کے ناتواں کاندھوں پر ڈال گئے۔ طلاق لینے سے نِکی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ کسی شریف سے نکاح کرنا چاہتی تھی۔ دوسری شادی کا اس کو کبھی خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ طلاق ہونے کے بعد وہ کیا کرے گی، کیا نہیں کرے گی، اس کے متعلق بھی نِکی نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اصل میں وہ ہر روز کی بک بک اور جھک جھک سے صرف ایک اطمینان کا سانس لینا چاہتی تھی۔ اس کے بعد جو ہونے والا تھا اس کو نِکی بخوشی برداشت کرنے کے لیے تیار تھی۔ لڑائی جھگڑے کا آغاز تو پہلے روز ہی سے ہو گیا تھا۔ جب نِکی دولہن بن کر گام کے گھر گئی تھی۔ لیکن طلاق کا سوال اس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب وہ گام کے سدھار کے لیے دعائیں مانگ مانگ کر عاجز آ گئی تھی اور اس کے ہاتھ اپنی یا اس کی موت کے لیے اٹھنے لگے تھے۔ جب یہ حیلہ بھی بے اثر ثابت ہوا تو اس نے اپنے شوہر کی منت سماجت شروع کی کہ وہ اسے بخش دے اور علیحدہ کر دے، مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ دس برس کے بعد تکیے میں ایک ادھیڑ عمر کی میراثن سے گام کی آنکھ لڑی اور ایک دن اس کے کہنے پر اس نے نِکی کو طلاق دے دی اور بیٹی پر بھی اپنا کوئی حق نہ جتایا۔ حالانکہ نِکی کو اس بات کا ہمیشہ دھڑکا رہتا تھا کہ اگر اس کا شوہر طلاق پر راضی بھی ہو گیا تو وہ بیٹی کبھی اس کے حوالے نہیں کرے گا۔ بہرحال نِکی نچنت ہو گئی۔ اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کرائے پر لے کر چین کے دن گزارنے لگی۔ اس کے دس برس اداس خاموشی میں گزرے تھے۔ دل میں ہر روز اس کے بڑے بڑے طوفان جمع ہوتے تھے مگر وہ خاوند کے سامنے اف تک نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ اسے بچپن ہی سے یہ تعلیم ملی تھی کہ شوہر کے سامنے بولنا ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا ہی نہیں جاتا۔ اب وہ آزاد تھی اس لیے وہ چاہتی تھی کہ اپنے دس برس کی بھڑاس کسی نہ کسی طرح نکالے۔ چنانچہ ہمسایوں سے اس کی اکثر لڑائی بھڑائی ہونے لگی۔ معمولی توں توں میں میں ہوتی جو گالیوں کی جنگ میں تبدیل ہو جاتی۔ نِکی پہلے جس قدر خاموش تھی۔ اب اسی قدر اس کی زبان چلتی تھی۔ منٹا منٹی میں وہ اپنے مدمقابل کی ساتوں پیڑھیاں پُن کر رکھ دیتی۔ ایسی ایسی گالیاں اور سٹھنیاں دیتی کہ حریف کے چھکے چھوٹ جاتے۔ آہستہ آہستہ سارے محلے پر نِکی کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہاں کاروباری قسم کے مرد رہتے تھے۔ جو صبح سویرے اٹھ کر کام پر نکل جاتے اور رات دیر سے گھر لوٹتے۔ سارے دن میں عورتوں میں جو لڑائی جھگڑا ہوتا۔ اس سے وہ مرد بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ ان میں سے شاید کسی کو پتا بھی نہیں تھا کہ نِکی کون ہے اور محلے کی ساری عورتیں اس سے کیوں دبتی ہیں۔ چرخہ کات کر، بچوں کے لیے گڑے گڑیاں بنا کر اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کام کر کے وہ گزر اوقات کے لیے کچھ نہ کچھ پیدا کر لیتی تھی۔ طلاق لیے اسے قریب قریب ایک برس ہو چلا تھا۔ اس کی بیٹی بھولی اب گیارہ کے لگ بھگ تھی اور بڑی سرعت سے جوان ہو رہی تھی، نِکی کو اس کے شادی بیاہ کی بہت فکر تھی۔ اس کے اپنے زیور تھے۔ جو ایک ایک کر کے گام نے چٹ کر لیے تھے۔ ایک صرف ناک کی کیل باقی رہ گئی تھی۔ وہ بھی گھس گھسا کر آدھی رہ گئی تھی۔ اسے بھولی کا پورا جہیز بنانا تھا اور اس کے لیے کافی روپیہ درکار تھا۔ تعلیم تھی، وہ اس نے اپنی طرف سے ٹھیک دی تھی۔ قرآن ختم کرا دیا تھا۔ معمولی حرف شناسی کر لیتی تھی۔ کھانا پکانا خوب آتا تھا۔ گھر کے دوسرے کام کاج بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ چونکہ نِکی کو اپنی زندگی میں بہت تلخ تجربہ ہوا تھا۔ اس لیے اس نے بھولی کو خاوند کا اطاعت گزار ہونے کے لیے کبھی اشارتاً بھی نہیں کہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی سسرال میں چھڑ کھٹ پر بیٹھی راج کرے۔ ماں کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا اس بپتا کا سارا حال بھولی کو معلوم تھا مگر ہمسایوں کے ساتھ جب نِکی کی لڑائی ہوتی تھی۔ تو وہ پانی پی پی کر اسے کوستی تھیں اور یہ طعنہ دیتی تھیں کہ وہ مطلقہ ہے جس کو خاوند نے صرف اس لیے علیحدہ کیا تھا کہ اس غریب کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اور بہت سی باتیں اپنی ماں کے کردار و اطوار کے متعلق اس کی سماعت میں آتی تھیں۔ مگر وہ خاموش رہتی تھی۔ بڑے بڑے معرکے کی لڑائیاں ہوتیں مگر وہ کان سمیٹے اپنے کام میں لگی رہتی۔ جب سارے محلے پر نِکی کی دھاک بیٹھ گئی تو کئی عورتوں نے مرعوب ہو کر اس کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ کئی اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ جب ان کی اپنی کسی پڑوسن سے لڑائی ہوتی تو نِکی ساتھ دیتی اور ہر ممکن مدد کرتی۔ اسکے بدلے میں اس کو کبھی قمیض کے لیے کپڑا مل جاتا تھا۔ کبھی پھل، کبھی مٹھائی اور کبھی کبھی کوئی بھولی کے لیے سوٹ بھی سلوا دیتا تھا۔ لیکن جب نِکی نے دیکھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن اسے محلے کی کسی نہ کسی عورت کی لڑائی میں شریک ہونا پڑتا ہے اور اس کے کام کاج کا حرج ہوتا ہے تو اس نے پہلے دبی زبان سے پھر کھلے لفظوں میں اپنا معاوضہ مانگنا شروع کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی فیس بھی مقرر کر لی۔ معرکے کی جنگ ہو تو پچیس روپے۔ دن زیادہ لگیں تو چالیس۔ معمولی چخ کے صرف چار روپے اور دو وقت کا کھانا۔ درمیانے درجے کی لڑائی کے پندرہ روپے۔ کسی کی سفارش ہو تو وہ کچھ رعایت بھی کر دیتی تھی۔ اب چونکہ اس نے دوسروں کی طرف سے لڑنا اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ اس لیے اُسے محلے کی تمام عورتوں اور ان کی بہو بیٹیوں کے

تمام فضیحتے یادرکھنے پڑتے تھے۔ ان کا تمام حسب ونسب معلوم کرکے اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر اس کو معلوم تھا کہ اونچی حویلی والی سوداگر کی بوی جو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی، ایک موچی کی بیٹی ہے اس کا باپ شہر میں لوگوں کے جوتے گانٹھتا پھرتا تھا اور اس کا خاوند جو جناب شیخ صاحب کہلاتا ہے معمولی قصائی تھا۔ اسکے باپ پر ایک رنڈی مہربان ہوگئی تھی۔ وہ اسی کے بطن سے تھا اور یہ اونچی حویلی اس طوائف نے اپنے یار کو بنوا کردی تھی۔ کس لڑکی کا کس کے ساتھ معاشقہ ہے۔ کون کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کون کتنے حمل گراچکی ہے۔ اس کا حساب سب نِکی کو معلوم تھا۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنے میں وہ کافی محنت کرتی تھی۔ کچھ مصالحہ اس کو اپنے موکلوں سے مل جاتا تھا۔ اسے اپنی معلومات کے ساتھ ملا کر وہ ایسے ایسے بم بناتی کہ مدمقابل کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ہوشیار وکیلوں کی طرح وہ سب سے وزنی ضرب صرف اسی وقت استعمال کرتی تھی۔ جب لوہا پوری طرح سرخ ہوتا۔ چنانچہ یہ ضرب سولہ آنے فیصلہ کن ثابت ہوتی تھی۔ جب وہ اپنے موکل کے ساتھ کسی محاذ پر جاتی تھی تو گھر سے پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کے جاتی تھی، طعنے مہنوں اور گالیوں اور سٹھنیوں کو مؤثر بنانے کے لیے مختلف اشیاء بھی استعمال کرتی تھی۔ مثال کے طور پر گھسا ہوا جوتا۔ پھٹی ہوئی قمیض۔ چمٹا۔ پھکنی وغیرہ وغیرہ۔ کوئی خاص تشبیہہ دینی ہو یا کوئی خاص الخاص اشارہ یا کہنایہ مطلوب ہو تو وہ اس غرض کے لیے کار آمد شے گھر ہی سے لے کر چلتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آج وہ جنتے کے لیے خیر اں سے لڑی ہے۔ تو دوڈھائی مہینے کے بعد اسی خیر اں سے ڈبل فیس لے کر اسے جنتے سے لڑنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ گھبراتی نہیں تھی۔ اسے اپنے فن میں اس قدر مہارت ہوگئی تھی اور اس کی پریکٹس میں وہ اتنی مخلص تھی کہ اگر کوئی فیس دیتا تو وہ اپنی بھی دھجیاں بکھیر دیتی۔ نِکی اب فارغ البال تھی۔ ہر مہینے اسے اب اتنی آمدن ہونے لگی تھی کہ اس نے پس انداز کرکے اپنی بیٹی بھولی کا جہیز بنانا شروع کردیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اتنے گہنے پاتے اور کپڑے لتے ہوئے گئے تھے کہ وہ کسی بھی وقت اپنی بیٹی کو ڈولی میں ڈال سکتی تھی۔ اپنے ملنے والیوں سے وہ بھولی کے لیے کوئی اچھاسا بر تلاش کرنے کی بات کئی مرتبہ کرچکی تھی۔ شروع شروع میں تو اس کو کوئی اتنی جلدی نہیں تھی، مگر بھولی سولہ برس کی ہوگئی۔ لوٹھا کی لوٹھا۔ قد کاٹھ کی چونکہ اچھی تھی۔ اس لیے چودھویں برس ہی میں پوری جوان عورت بن گئی تھی۔ سترھویں میں تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ چنانچہ اب نِکی کو دن رات اس کے بیاہ کی فکر ستانے لگی۔ نِکی نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ کوئی صاف انکار تو نہیں کرتا تھا۔ مگر دل سے حامی بھی نہیں بھرتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ہونہ ہو لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کی یہ صفت کہ لڑنے کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ دراصل اس کے آڑے آرہی تھی۔ بعض گھروں میں تو وہ خود ہی سلسلہ جنبانی نہ کرتی کہ اس کی کسی عورت کا اس نے کبھی ناطقہ بند کیا تھا۔ دن پر دن چڑھتے جارہے تھے۔ اور گھر میں پہاڑ سی جوان بیٹی کنواری بیٹھی تھی۔ نِکی کو اپنے پیشے سے اب گھن آنے لگی اس نے سوچا کہ ایسا ذلیل کام کیوں اس نے اختیار کیا۔ مگر وہ کیا کرتی، محلے میں آرام چین کی جگہ پیدا کرنے کے لیے اسے پڑوسنوں کا مقابلہ کرنا ہی تھا۔ اگر وہ نہ کرتی تو اسے دب کے رہنا پڑتا۔ پہلے خاوند کے جوتے کھاتی تھی، پھر ان کی پیزار کی غلامی کرنی پڑی۔ یہ عجیب بات تھی کہ برسوں دبیل رہنے کے بعد جب اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور مخالف قوتوں کا مقابلہ کرکے ان کو شکست دی، یہ قومیں جھک کر اس کی امداد کی طالب ہوئیں کہ دوسری قوتوں کو شکست دیں اور اُس کو اس امداد پر کچھ اس طرح راغب کیا گیا کہ اس کو چسکا ہی پڑ گیا۔ اس کے متعلق وہ سوچتی تو اس کا دل نہ مانتا تھا۔ کیوں کہ اس نے صرف بھولی کی خاطر اس پیشے کو جسے اب لوگ ذلیل سمجھنے لگے تھے اختیار کیا تھا۔ یہ بھی کم عجیب چیز نہیں تھی۔ نِکی کو روپے دے کر کسی عورت پر انگلی رکھ دی جاتی تھی۔ اور اس سے کہا جاتا تھا کہ وہ اس کی ساتوں پیڑھیاں پن ڈالے۔ اس کے آباؤ اجداد کی ساری کمزوریاں ماضی کے ملبے سے کرید کرید کر نکالے اور اس کے وجود پر چھید کردے۔ نِکی یہ کام بڑی ایمانداری سے کرتی وہ گالیاں جو ان کے منہ میں ٹھیک نہیں بیٹھی تھیں اپنے منہ میں بٹھائی۔ ان کی بہو بیٹیوں کے عیوب پر پردے ڈال کر وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں میں کیڑے ڈالتی۔ غلیظ سے غلیظ گالیاں اپنے ان موکلوں کی خاطر خود بھی کھاتی۔ پر اب کہ اس کی بیٹی کے بیاہ کا سوال آیا تھا وہ کمینی بیچ اور رذیل بن گئی تھی۔ ایک دو مرتبہ تو اس کے جی میں آئی کہ محلے کی ان تمام عورتوں کو جنہوں نے اس کی بیٹی کو رشتہ دینے سے انکار کردیا تھا۔ بیچ چوراہے میں جمع کرے اور ایسی گالیاں دے کہ ان کے دل کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں مگر وہ سوچتی کہ اگر اس نے یہ غلطی کردی تو غریب بھولی کا مستقبل بالکل تیرہ وتار ہو جائے گا۔ جب چاروں طرف سے مایوسی ہوئی تو نِکی نے شہر چھوڑنے کا ارادہ کرلیا ایک طرف یہی راستہ تھا۔ جس سے بھولی کی شادی کا کٹھن مرحلہ طے ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک روز بھولی سے کہا۔

”بیٹا، میں نے سوچا ہے کہ اب کسی اور شہر میں جارہیں۔“

بھولی نے چونک کر پوچھا۔

”کیوں ماں“!

”بس اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔“

نِکی نے اس کی طرف ممتا بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

”تیرے بیاہ کی فکر میں گھلی جارہی ہوں۔ یہاں بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ تیری ماں کو سب رذیل سمجھتے ہیں۔“

بھولی کافی سیانی تھی، فوراً نِکی کا مطلب سمجھ گئی اس نے صرف اتنا کہاں

”ہاں ماں“!

نِکی کو ان دو لفظوں سے سخت صدمہ پہنچا۔ بڑے دکھی لہجے میں اس نے بھولی سے سوا کیا۔

“کیا تو بھی مجھے رذیل سمجھتی ہے؟”

بھولی نے جواب نہ دیا اور آٹا گوندھنے میں مصروف ہوگئی۔ اُس دن نِکی نے عجیب عجیب باتیں سوچیں۔ اس کے سوال کرنے پر بھولی خاموش کیوں ہوگئی تھی۔ کیا وہ اسے واقعی رذیل سمجھتی ہے کیا وہ اتنا بھی نہ کہہ سکتی تھی کہ

“نہیں ماں”

کیا یہ باپ کے خون کا اثر تھا؟ بات میں سے بات نکل آتی اور وہ بہت بری طرح ان میں الجھ جاتی۔ اسے بیتے ہوئے دس برس یاد آتے۔ بیاہی زندگی کے دس برس جس کا ایک ایک دن مار پیٹ اور گالی گلوچ سے بھرا تھا۔ پھر وہ اپنی نظروں کے سامنے مطلقہ زندگی کے دن لاتی۔ ان میں بھی گالیاں ہی گالیاں تھیں جو وہ پیسے کی خاطر دوسروں کو دیتی رہی تھی۔ تھک ہار کر وہ بعض اوقات کوئی سہارا ٹٹولنے لگتی اور سوچتی، کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ طلاق نہ لیتی۔ آج بیٹی کا بوجھ گام کے کندھوں پر ہوتا۔ نکھٹو تھا۔ پرلے درجے کا ظالم تھا۔ عیبی تھا۔ مگر بیٹی کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔ یہ اس کے عجز کی انتہا تھی۔ پرانی ماریں، اور ان کے دبے ہوئے درد اب آہستہ آہستہ نِکی کے جوڑوں میں ابھرنے لگے۔ پہلے اس نے کبھی اُف تک نہیں کی تھی۔ بر اپ اٹھتے بیٹھتے ہائے ہائے کرنے لگی۔ اس کے کانوں میں ہر وقت ایک شور سا برپا ہونے لگا۔ جیسے ان کے پردوں پر وہ تمام گالیاں اور سٹھنیاں ٹکرا رہی ہیں جو ان گنت لڑائیوں میں اس نے استعمال کی تھیں۔ عمر اس کی زیادہ نہیں تھی۔ چالیس کے لگ بھگ تھی۔ مگر اب نِکی کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہے اس کی کمر جواب دے چکی ہے اس کی زبان جو قینچی کی طرح چلتی تھی۔ اب کُند ہوگئی ہے۔ بھولی سے گھر کے کام کاج کے متعلق معمولی سی بات کرتے ہوئے اس کو مشقت کرنی پڑتی تھی۔ نِکی بیمار پڑ گئی اور چارپائی کے ساتھ لگ گئی۔ شروع شروع میں تو وہ اس بیماری کا مقابلہ کرتی رہی۔ بھولی کو بھی اس نے خبر نہ ہونے دی کہ اندر ہی اندر کونسی دیمک اسے چاٹ رہی ہے۔ لیکن ایک دم وہ ایسی نڈھال ہوئی کہ اس سے اٹھا تک نہ گیا۔ بھولی کو بہت تشویش ہوئی۔ اس نے حکیم کو بلایا۔ جس نے نبض دیکھ کر بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، پرانا بخار ہے۔ علاج سے دور ہو جائیگا۔ علاج باقاعدہ ہوتا رہا۔ بھولی سعادت مند بیٹیوں کی طرح ماں کی ہر ممکن خدمت بجا لا رہی تھی۔ اس سے نِکی کے دکھی دل کو کافی تسکین ہوتی تھی۔ مگر مرض دور نہ ہوا۔ بخار پہلے سے تیز ہوگیا۔ اور آہستہ آہستہ نِکی کی بھوک غائب ہوگئی۔ جس کے باعث وہ بہت ہی لاغر اور نحیف ہوگئی۔ عورتوں میں ایک خداداد وصف ہوتا ہے کہ مریض کی شکل دیکھ کر ہی پہچان لیتی ہیں کہ وہ کتنے دن کا مہمان ہے ایک دو عورتیں جب بیمار پرسی کے لیے نِکی کے پاس آئیں تو انھوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بمشکل دس روز نکالے گی چنانچہ یہ بات سارے محلے کو معلوم ہوگئی۔ کوئی بیمار ہو۔ مرنے کے قریب ہو۔ تو عورتوں کے لیے ایک اچھی خاصی تفریح کا بہانہ نکل آتا ہے۔ گھر سے بن سنور کر نکلتی ہیں اور مریض کے سرہانے بیٹھ کر اپنے تمام مرحوم عزیزوں کو یاد کرتی ہیں ان کی بیماریوں کا ذکر ہوتا ہے وہ تمام علاج بیان کیے جاتے ہیں جو لا علاج ثابت ہوئے تھے۔ گفتگو کا رخ پلٹ کر قمیصوں کے نئے ڈیزائنوں کی طرف آجاتا ہے۔ نِکی ایسی باتوں سے بہت گھبراتی تھی۔ لیکن وہ خود چونکہ مریضوں کے سرہانے ایسی ہی باتیں کرتی رہی تھی اس لیے مجبوراً اسے یہ خرافات سننی پڑتی تھی۔ ایک روز جب محلے کی بہت سی عورتیں اس کے گھر میں جمع ہو گئیں تو اس احساس نے اس کو بہت مضطرب کیا کہ اب اس کا وقت آچکا ہے ان میں سے ہر ایک چہرے پر یہ فیصلہ مرقوم تھا کہ نِکی کے دروازے پر موت دستک دے رہی ہے۔ جو عورت آتی۔ اپنے ساتھ یہ کھٹ کھٹ لاتی تنگ آکر کئی دفعہ نِکی کے جی میں آئی کہ کنڈی کھول دے اور دستک دینے والے فرشتے کو اندر بلالے۔ ان بیمار پرس عورتوں کو سب سے بڑا افسوس بھولی کا تھا۔ نِکی سے وہ بار بار اس کا ذکر کرتیں کہ ہائے اس بیچاری کا کیا ہوگا۔ دنیا میں غریب کی صرف ایک ماں ہے۔ وہ بھی چلی گئی تو اس کا کیا ہوگا۔ پھر وہ اللہ میاں سے دعا کرتیں کہ وہ نِکی کی زندگی میں چند دنوں کا اضافہ کردے تاکہ وہ بھولی کی طرف سے مطمئن ہو کر مرے۔ نِکی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دعا بالکل جھوٹی ہے۔ انھیں بھولی کا اتنا خیال ہوتا تو وہ اس کے رشتے سے انکار کیوں کرتیں۔ صاف انکار نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ یہ دُنیاداری کے اصول کے خلاف تھا۔ مگر کسی نے حامی نہیں بھری تھی۔ وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں نِکی چارپائی پر پڑی تھی، بیمار پرس عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ بھولی نے ان کے بیٹھنے کا انتظام ایسا معلوم ہوتا ہے پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ پیڑھیاں کم تھیں، اس لیے اس نے کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھادی تھی۔ بھولی کے اس اہتمام و انتظام سے نِکی کو بڑا صدمہ پہنچا تھا گویا وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح اس کی موت کے استقبال کے لیے تیار تھی۔ بخار تیز تھا، دماغ تپا ہوا تھا۔ نِکی نے اوپر تلے بہت سی تکلیف دہ باتیں سوچیں تو بخار اور زیادہ تیز ہوگیا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ جلدی جلدی بے جوڑ باتیں کرنے لگی۔ بیمار پرس عورتوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ جو اٹھ کر جانے والی تھیں نِکی کا وقت قریب دیکھ کر بیٹھ گئیں۔ نِکی بکے جارہی تھی۔ ایسا معلوم تھا کہ وہ کسی سے لڑ رہی ہے۔

“میں تیری ہشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ جو کچھ تو نے میرے ساتھ کیا ہے۔ وہ کوئی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ میں نے اپنے خاوند کی دس برس غلامی کی۔ اس نے مار مار کر میری کھال اور ادھیڑ دی۔ پر میں نے اُف تک نہ کی۔ اب تو نے۔ اب تو نے مجھ پر یہ ظلم شروع کیے ہیں۔”

پھر وہ کمرے میں جمع شدہ عورتوں کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی۔

”تم۔ تم یہاں کیا کرنے آئی ہو۔ نہیں نہیں۔ میں کسی فیس پر بھی لڑنے کے لیے تیار نہیں۔ تم میں سے ہر ایک کے عیب وہی ہیں۔ پرانے۔ صدیوں کے پرانے جو کیڑے۔ جو کیڑے پھاماں میں ہیں وہی تم سب میں ہیں۔ تم میں سے قریب قریب ہر ایک کا خصم رنڈی باز ہے۔ جو بری بیماری پھاتو کے خاوند کو لگی ہے۔ وہی جنتے کے گھر والے کو چمٹی ہوئی ہے۔ تم سب کوڑھی ہو۔ اور یہ کوڑھ تم نے مجھے بھی دے دیا ہے۔ لعنت ہو تم سب پر خدا کی۔ خدا کی۔ خدا۔“

اور وہ ہنسنے لگتی۔

”میں اس خدا کو بھی جانتی ہوں۔ اس کی ہشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ کیا دنیا بنائی ہے تونے۔ یہ دنیا جس میں گام ہیں۔ جس میں پھاماں ہے جو اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسروں کے بستر گرم کرتی ہے۔ اور مجھے فیس دیتی ہے۔ بیس روپے گن کر میرے ہاتھ پر رکھتی ہے کہ میں نورفشاں کے پرانے یارانوں کا پول کھولوں۔ اور فشاں میرے پاس آتی ہے کہ نکی یہ پانچ زیادہ لو اور جاؤ امینہ سے لڑو۔ وہ مجھے ستاتی ہے۔ یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے تونے اپنی دنیا میں۔ میرے سامنے آ۔ ذرا میرے سامنے آ۔“

آواز نِکی کے حلق میں رکنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد گھنگرو بجنے لگا۔ تشنج سے وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی اور ہذیانی کیفیت میں چلا رہی تھی۔

”گام مجھے نہ مار۔ او گام۔ اور خدا مجھے نہ مار۔ او خدا۔ او گام“

او خدا او گام بڑبڑاتی آخر نِکی بیمار پرس عورتوں کے اندازے کے عین مطابق مر گئی۔ بھولی جو ان عورتوں کی خاطر داری میں مصروف تھی۔ پانی کا گلاس ہاتھ سے گرا کر دھڑا دھڑ اپنا سر پیٹنے لگی۔ 14-15 اکتوبر 1951ء

ننگی آوازیں

اکتوبر 10, 2015افسانہ، سعادت حسن منٹوننگی آوازیں

بھولو اور گاما دو بھائی تھے۔ بے حد محنتی۔ بھولو قلعی گر تھا۔ صبح دھونکنی سر پر رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں

”بھانڈے قلعی کرا لو“

کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کریانہ ضرور ہوتا۔ گاما خوانچہ فروش تھا۔ اس کو بھی دن بھر چھابڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا۔ تین چار روپے یہ بھی کما لیتا تھا۔ مگر اس کو شراب کی لت تھی۔ شام کو دینے کے بھٹیار خانے سے کھانا کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چہکتا۔ دینے کے بھٹیار خانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے اور اسی کے سہارے جیتا ہے۔ بھولو نے گاما سے جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب کی لت بہت بری ہے۔ شادی شدہ ہو، بیکار پیسہ برباد کرتے ہو۔ یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو بھابھی ٹھاٹ سے رہا کرے۔ ننگی بُچی اچھی لگتی ہے تمہیں اپنی گھر والی۔ گاما نے اس کان سنا۔ اس کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔ دونوں مہاجر تھے۔ ایک بڑی بلڈنگ کے ساتھ سرونٹ کوارٹر تھے۔ ان پر جہاں اوروں نے قبضہ جما رکھا تھا، وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر کو جو کہ دوسری منزل پر تھا اپنی رہائش کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ سردیاں آرام سے گزر گئیں۔ گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی۔ بھولو تو اوپر کوٹھے پر کھاٹ بچھا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی۔ اور اوپر پردے کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ایک گاما ہی کو یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔ کلّن کو ایک بات سوجھی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے ارد گرد ٹاٹ تان دیا۔ اس طرح پردے کا انتظام ہو گیا۔ کلّن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند دنوں ہی میں بانس وغیرہ گاڑ کر ٹاٹ اور کمبل جوڑ کر پردے کا انتظام کر دیا۔ یوں ہوا تو رک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹر کے دوزخ سے ہر حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔ اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب ہو گیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پائے گا۔ جب گاما کبھی اس کے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا نہ بھائی۔ میں اپنے نر دئے پنڈے پر جونکیں نہیں لگوانا چاہتا۔

”لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اوپر کھاٹ بچھا کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ دن ہی میں اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام کو دینے کے بھٹیار خانے میں اس نے اپنے بھائی سے کہا۔

”میری شادی کر دو، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

گاما نے جب یہ سنا تو اس نے کہا۔

”یہ کیا مذاق سوجھا ہے تمہیں۔“

بھولو بہت سنجیدہ ہو گیا۔

”تمہیں نہیں معلوم۔ پندرہ راتیں ہو گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے۔“

گاما نے پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں یار۔ دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ نیند کیا آئے گی خاک“!

گاما زور سے اپنی گھنی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرما گیا۔

”وہ جو کلن ہے، اس نے تو حد ہی کر دی ہے۔ سالا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی۔ بچے پڑے رو رہے ہیں مگر وہ۔“

گاما حسبِ معمول نشے میں تھا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چہک چہک کر بتایا کہ اس کے بھائی کو آج کل نیند نہیں آتی۔ اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ گئے۔ جب یہ لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا۔

”ہاں بھئی، کلن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے۔“

کوئی کہتا۔

”میاں مفت میں مزے لیتے ہو۔ ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو۔ سو فیصدی گالی بولتی۔“

بعض نے گندے گندے مذاق کیے۔ بھولو چڑ گیا۔ گاما صوفی حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا۔

”تم نے تو یار میرا مذاق بنا دیا ہے۔ دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا یہ جھوٹ نہیں۔ میں انسان ہوں۔ خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج بیس دن ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے۔ تم میری شادی کا بندوبست کر دو، ورنہ قسم پنج تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا۔ بھابھی کے پاس میرا پانسو روپیہ جمع ہے۔ جلدی کر دو بندوبست“!

گاما نے مونچھ مروڑ کر پہلے کچھ سوچا پھر کہا۔

”اچھا ہو جائے گا بندوبست۔ تمہاری بھابھی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے۔“

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات پکی ہو گئی۔ صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔ خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کاج جانتی تھی۔ ویسے صمد بھی شریف تھا۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو محنتی تھی۔ تندرست تھا۔ جون کے وسطے میں شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ صمد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔ شادی سے چار دن پہلے بھولو نے اپنی دہن کے لیے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ ٹاٹ خوب کر کس کر لگایا۔ چارپائیوں پر نئے کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔ شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کیے۔ رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کو عجیب سا لگا وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ یہ کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کر دیا۔ پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے میں تربتر ہو گیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔ کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا؟۔ کیا آس پاس کے لوگ یہ آوازیں سنیں گے۔ کیا وہ بھی اسی کے مانند راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں گے۔ کسی نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟ بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہتی کہ ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے، پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کی خاموشی میں ہلکی سی سرگوشی بھی دوسرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک کوٹھا ہے۔ اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے۔ اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے۔ سینکڑوں آنکھیں، سینکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ پوری تصویر بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ یہ ٹاٹ کا پردہ کیا ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے۔ وہ سامنے کلّن اپنی بیوی کی چھاتیاں دبا رہا ہے۔ وہ کونے میں اس کا بھائی گاما لیٹا ہے۔ تہہ بند کھل کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عبدو حلوائی کی کنواری بیٹی شاماں کا پیٹ چھدرے ٹاٹ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے۔ شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے مگر کہاں جاتا۔ اب تو وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صمد ضرور خودکشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزرتی۔ جو طوفان مچتا وہ الگ۔

”اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو۔ میرے ساتھی اور بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی۔ مجھے بھی“

۔ بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دلہن کی ڈولی گھر لے آیا۔ کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے بھولو اور گاما کو خوب مبارکبادیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے، انھوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لیے کئی کامیاب گُر بتائے۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھابھی نے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردوں کے نیچے بستر کا بندوبست کر دیا۔ گاما نے چار موتیے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیے۔ ایک دوست اس کے لیے جلیبیوں والا دودھ لے آیا۔ دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بے چاری

شرم کی ماری سر نیوڑھائے، گھونگٹ کاڑھے سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا نیا کرتا اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا جھل رہا تھا مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہی ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا۔ نیچے کوارٹر ہی میں رات کاٹے گا۔ مگر جب گرمی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دولھن سے چلنے کو کہا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے۔ کوئی اس کو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دولہن سمیت داخل ہو جائیگا اور صبح منہ ادھیرے نیچے اتر جائے گا۔ جب وہ کوٹھے پر پہنچا تو بالکل خاموش تھی۔ دولہن نے شرمائے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نقرئی گھنگھرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونک کر جاگ پڑی ہے۔ چارپائیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے، کھانسنے، کھنکارنے کی آوازیں اِدھر اُدھر ابھریں۔ دبی دبی سرگوشیاں اس تپی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بیوی سے بات کی تو پاس ہی کُھسر پُھسر شروع ہو گئی۔ دور کونے میں جہاں کلن کی جگہ تھی۔ وہاں چارپائی کی چرچوں چرچوں ہونے لگی۔

”یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی۔ عید حلوائی کی کنواری لڑکی شاداں نے دو تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھڑے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکراتا تو ایک چھناکا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چارپائی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔ بھولو اپنی دلہن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے۔ اور ساری چارپائیں چرچوں چرچوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھڑی سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاگتی رہی، پھر سو گئی۔ بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اس کو نیند نہ آئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں۔ آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔ اس کے دل میں بڑے ولولے تھے۔ بڑا جوش تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ نا آشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی راحت بخش گرمی، مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آوازیں۔ وہ تصویریں کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کر دیتیں۔ وہ خود کو ننگا محسوس کرتا۔ الف ننگا جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ صبح چار بجے کے قریب وہ اٹھا، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ کچھ سوچا۔ وہ جھجک جو اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی اس کو کسی قدر دور کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کافی تیز تھی۔ بھولو کی نگاہیں کونے کی طرف مڑیں۔ کلّن کا گھسا ہوا ٹاٹ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل ننگ دھڑنگ لیٹا تھا۔ بھولو کو بڑی گھن آئی۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کوٹھوں پر کیوں چلتی ہے چلتی ہے تو ٹاٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں، سب نوچ ڈالے اور ننگا ہو کے ناچنے لگے۔ بھولو نیچے اتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی رات کی سرگزشت پوچھی۔ پھوجے درزی نے اس کو دور ہی سے آواز دی،

”کیوں استاد بھولو، کیسے رہے، کہیں ہمارے نام پر بٹہ تو نہیں لگا دیا تم نے۔“

چھاگے ٹین ساز نے اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”دیکھو اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتا دو۔ ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔“

بالے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپا مارا۔

”کیوں پہلوان، کیسا رہا دنگل؟“

بھولو تو خاموش رہا۔ صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز کے بعد واپس آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند راتیں خاموش رہی تھی لیکن جب وہ اوپر سوئے تو وہی کھسر پھسر وہی چرچوں چرچوں، وہی کھانسنا کھنکارنا۔ وہی گھڑے کے ساتھ گلاس کے ٹکرانے کے چھناکے۔ کروٹوں پر کروٹیں، دبی دبی ہنسی۔ بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دولہن کو دیکھ لیتا اور دل میں کڑھتا، مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔“

سات راتوں تک یہی ہوتا رہا، آخر تنگ آ کر بھولو نے اپنی دولہن کو میکے بھیج دیا۔ بیس پچیس دن گزر گئے تو گاما نے بھولو سے کہا۔

”یار تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہو نئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے۔ تم اکیلے سوتے کیسے ہو۔“

بھولو نے صرف اتنا کہا۔

”ٹھیک ہے؟“

گاما نے پوچھا۔

”ٹھیک کیا ہے۔ جو بات ہے بتاؤ۔ کیا تمہیں پسند نہیں آئی عائشہ؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟“

بھولو بات گول کر گیا تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی۔ بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھابھی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاما سے کہہ رہی تھی۔

”تم جو کہتے ہو نا کہ بھولو کو عائشہ پسند نہیں، یہ غلط ہے۔“

گاما کی آواز آئی

”تو اور کیا بات ہے۔ بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔“

”دلچسپی کیا ہو۔“

”کیوں؟“

گاما کی بیوی کا جواب بھولہ نہ سن سکا مگر اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہے۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا۔

”نہیں نہیں۔ یہ تم سے کس نے کہا۔“

گاما کی بیوی بولی۔

”عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا۔ بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی۔“

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گامانے کہا۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا“!

بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہوگئی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ گئے تھے اکھیڑنے شروع کر دیے۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا۔ بات بڑھ گئی۔ کلن نے بانس، اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ بھولو چکرا کر گِرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔ اور وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

نواب سلیم اللہ خان

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹونواب سلیم اللہ خان

نواب سلیم اللہ خاں بڑے ٹھاٹ کے آدمی تھے۔ اپنے شہر میں ان کا شمار بہت بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ مگر وہ اوباش نہیں تھے، نہ عیش پرست، بڑی خاموش اور سنجیدہ زندگی بسر کرتے تھے۔ گنتی کے چند آدمیوں سے ملنا اور بس وہ بھی جو اُن کی پسند کے ہیں۔ دعوتیں عام ہوتی تھیں۔ شراب کے دور بھی چلتے تھے مگر حدِ اعتدال تک۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال کے قائل تھے۔ اُن کی عمر پچپن برس کے لگ بھگ تھی۔ جب وہ چالیس بھر کے تھے تو اُن کی بیوی دل کے عارضے کے باعث انتقال کر گئی ان کو بہت صدمہ ہوا۔ مگر مشیتِ ایزدی کو یہی منظور تھا۔ چنانچہ اس صدمے کو برداشت کر لیا۔ اُن کے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بالکل اکیلے تھے۔ بہت بڑی کوٹھی جس میں وہ رہتے تھے چار نوکر تھے جو اُن کی آسائش کا خیال رکھتے اور مہمانوں کی تواضع کرتے۔ اپنی بیوی کی وفات کے پندرہ برس بعد اچانک اُن کا دل اپنے وطن سے اُچاٹ ہو گیا انھوں نے اپنے چہیتے ملازم معظم علی کو بُلایا اور اُس سے کہا

”دیکھو کوئی ایسا ایجنٹ تلاش کرو جو ساری جائیداد مناسب داموں پر بکوادے۔“

معظم علی بہت حیران ہوا۔

”نواب صاحب! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ حضور کو کس بات کی کمی ہے جو اپنی ساری جائیداد بیچنا چاہتے ہیں۔ آپ کے سر پر کوئی قرض بھی نہیں۔“

نواب صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا

”معظم علی اس ماحول سے ہمارا جی اُکتا گیا ہے۔۔ ایک ایک گھڑی، ایک ایک برس معلوم ہوتی ہے۔ میں یہاں سے کہیں اور جانا چاہتا ہوں۔“

”کہاں جایئے گا حضور؟“

میرا خیال ہے بمبئ جاؤں گا۔ جب میں ولایت سے واپس آیا تھا تو مجھے یہ شہر پسند آیا تھا۔ اس لیے ارادہ ہے کہ میں وہیں جا کے رہوں۔ تم میری جائید اد فروخت کرنے کا بندوبست کرو۔
“

جائداد فروخت کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ ساڑھے دس لاکھ وصول ہوئے۔ نواب صاحب کے بنک میں دو اڑھائی لاکھ تھے۔ جو ساڑھے دس لاکھ وصول ہوئے وہ انھوں نے اپنے بنک میں جمع کروا دیے۔ اور نوکروں کو انعام واکرام دے کر رخصت کیا اور خود اپنا ضروری سامان لے کر بمبئ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر وہ تاج محل ہوٹل میں رہے۔ لیکن وہ کشادہ جگہ کے عادی تھے۔ اس لیے انھوں نے تھوڑے ہی عرصے کے بعد باندرہ میں ایک مکان خرید لیا اور اس کو مناسب وموزوں طریقے سے سجا کر اُس میں رہنے لگے۔ ایک دوماہ کے اندر اندر ہی ان کی وہاں کافی واقفیت ہو گئی۔ ریڈیو کلب کے ممبر بن گئے۔ جہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ ہر شام کو جمع ہوتے وہ برج کھیلتے اور اپنی نئی کار میں واپس آجاتے۔ اُن کو باہر کا کھانا پسند نہیں تھا۔ گھر میں وہ اپنی منشا کے مطابق کھانا پکواتے۔ باورچی اچھا مل گیا تھا اس لیے وہ اپنے دوستوں کو ایک ہفتے میں ضرور کھانے پر مدعو کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے سوچا کہ یہاں بمبئ میں اچھی سے اچھی گورنس مل سکتی ہے۔ عورتیں زیادہ تن دہی اور نفاست سے کام کرتی ہیں۔ ان میں ایک خاص سلیقہ اور قرینہ ہوتا ہے وہ گھر کی دیکھ بھال مردوں سے کہیں اچھی طرح کرتی ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ٹائمز آف انڈیا کے علاوہ اور کئی اخبارات میں اشتہار دیا کہ انھیں ایک اچھی گورنس کی ضرورت ہے۔ کئی درخواستیں آئیں۔ انھوں نے اُن کا انٹرویو بھی لیا، مگر کوئی پسند نہ آئی، بڑی چھچھوری اور بھڑکیلی قسم کی تھیں، جو آنکھیں مٹکا مٹکا اور کولھے ہلا ہلا کر باتیں کرتی تھیں۔ نواب صاحب نے ان سب کو بڑی شائستگی سے کہا

”میں اپنے فیصلے سے آپ کو بہت جلد مطلع کر دُوں گا۔ اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

جو آئی تھیں ایک ایک کر کے رخصت کر دی گئیں۔ نواب صاحب نے اپنا

”ہوانا“

سگار سُلگایا اور صوفے پر بیٹھ کر صبح کا پڑھا ہوا اخبار دوبارہ پڑھنے لگے۔ اتنے میں نوکر نے اطلاع دی کہ ایک اور عورت اسی ملازمت کے سلسلے میں آئی ہے۔ نواب صاحب نے اخبار تپائی پر رکھا اور کہا

”اس کو اندر بھیج دو۔“

وہ عورت اندر آئی۔ گوا کی رہنے والی تھی اس لیے اس کے خدوخال ٹھیٹ گوائی تھے۔ رنگ سانولا، مضبوط جسم، قد میانہ۔ اندر آتے ہی اُس نے نواب صاحب کو بڑی صاف اردو میں سلام عرض کیا۔ نواب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُس کو کرسی پیش کی۔ انگریزی ادب کے متعلق، موسم کے متعلق چند باتیں کیں پھر اُس سے پوچھا۔

”آپ پہلے بھی کہیں کام کر چکی ہیں؟“

اُس عورت نے جس کی عمر تیس برس کے قریب ہو گی۔ بڑی شائستگی سے جواب دیا:

”جی ہاں۔ دو تین جگہ بڑے اچھے گھرانوں میں۔ یہ اُن کی اسناد موجود ہیں۔“

یہ کہہ کر اُس نے اپنا پرس کھولا اور چند کاغذات نکال کر نواب صاحب کو دیے

”آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔“

نواب صاحب نے یہ کاغذات سرسری نظر سے دیکھ کر واپس کر دیے۔ اور اُس عورت سے پوچھا۔

”آپ کا نام؟“

”جی میرا نام مسز لوجوائے ہے۔“

”لوجوائے آپ کے۔“

”جی ہاں وہ میرے شوہر تھے۔“

نواب صاحب نے سگار کا لمبا کش لیا اور مسز لوجوائے سے کہا۔

”کیا کام کرتے ہیں؟“

مسز لوجوائے نے جواب دیا۔

”جی وہ فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے، مگر تین برس ہوئے لڑائی میں مارے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ پیشہ اختیار کیا۔“

سگار کے دُھوئیں میں سے نواب صاحب نے مسز لوجوائے کا آخری جائزہ لیا اور کہا آپ کب سے کام شروع کر سکتی ہیں۔“

”جی میں تو ابھی سے کر سکتی ہوں۔ مگر مجھے اپنا سامان لانا ہے۔ کل صبح حاضر ہو جاؤں گی۔“

”بہتر۔ فی الحال آپ کو سو روپیہ ماہوار ملے گا۔ اگر آپ کا کام اچھا ہوا تو اس میں اضافہ کر دیا جائے گا۔“

مسز لوجوائے نے مناسب و موزوں الفاظ میں نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے چلی گئی۔ نواب صاحب سوچنے لگے کہیں ان کا انتخاب غلط تو نہیں؟۔ لیکن وہ ایک مہینے کے امتحان کے بعد دوسرے مہینے کی تنخواہ دے کر اُسے بڑی آسانی سے برخاست کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں مسز لوجوائے صبح کس وقت آئی، لیکن نواب صاحب بیدار ہوئے تو دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ نواب صاحب نے سوچا کہ شاید ان کا بیرا ہوگا جو بیڈ ٹی لایا ہے۔ اُنھوں نے آواز دی

”دروازہ کھلا ہے، آجاؤ۔“

دروازہ کھلا اور مسز لوجوائے اندر داخل ہوئی۔ صبح کا سلام کیا

”چائے بیرا لا رہا ہے۔ میں نے آپ کے غسل کے لیے گرم پانی تیار کر دیا ہے۔ آپ چائے پی کر فارغ ہو جایئے اور غسل کر لیں، تو میں آپ کے کپڑے نکال کر تیار رکھوں گی۔ آپ کا وارڈروب کھلا ہے نا؟“

نواب صاحب نے جواب دیا

”ہاں کھلا ہے۔“

مسز لوجوائے نے وارڈروب کھولا۔ نواب صاحب کے سارے کپڑوں کا جائزہ لیا اور ان سے پوچھا

”میرا خیال ہے آپ گیبرڈین کا سوٹ پہنیں گے۔“

نواب صاحب نے ایک لحظے کے لیے سوچا۔

”ہاں میرا ارادہ بھی یہی سُوٹ پہننے کا تھا۔“

بیرا چائے لے آیا۔ اُسے پی کر وہ اُٹھے اور غسل خانہ میں چلے گئے۔ جس کی سفید ٹائلیں شیشے کے مانند چمک رہی تھیں۔ پہلے وہ کبھی اتنا صاف نہیں ہوا کرتا تھا۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے، اس لیے کہ صفائی میں یقیناً مسز لوجوائے کا ہاتھ تھا۔ غسل سے فارغ ہو کر وہ بیڈ روم میں آئے انھوں نے دیکھا کہ ان کے تمام کپڑے بستر پر پڑے تھے، سلیقے سے، ٹائی بھی وہی تھی جو خاص طور پر گیبرڈین کے سوٹ کے ساتھ پہنتے تھے۔ جب انھوں نے کپڑے پہن لیے تو مسز لوجوائے آئی اور نواب صاحب سے کہا

”چلیے تشریف لے چلیے۔ ناشتہ تیار ہے۔“

نواب صاحب ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ ناشتہ خود مسز لوجوائے نے لگایا۔ گردے تھے، پنیر تھا، بہت اچھے سینکے ہوئے ٹوسٹ، بالائی پوچڑ، انڈے اور ایک گلاس دودھ۔ مسز لوجوائے تھوڑے ہی عرصے میں نواب صاحب کے گھر پر چھا گئی۔ اُن کے دوستوں کو بھی اُس نے موہ لیا۔ اُس کو معلوم ہوتا کہ کون سی چیز اُن کے کس دوست کو مرغوب ہے۔ مرغ کا کون سا حصہ کس کو پسند ہے۔ کون سی شراب کس کس کو من بھاتی ہے۔ چنانچہ جب بھی دعوت ہوتی وہ کھانا خود میز پر لگاتی اور خود ہی فرداً فرداً سارے مہمانوں کو پیش بھی کرتی۔ اس کے کام کرنے کے انداز میں تمکنت تھی، مگر وہ بڑے ادب سے ہر ایک کے ساتھ پیش آتی۔ اُس میں پھرتی تھی مگر گلہریوں ایسی نہیں۔ ہر کام اپنے مقررہ وقت کے اندر اندر ہو جاتا۔ جب نواب صاحب کا کوئی دوست مسز لوجوائے کی تعریف کرتا تو وہ بڑے فخریہ انداز میں کہتے

”یہ انتخاب میرا ہے۔ سو عورتیں آئی تھیں۔ انٹرویو کے لیے لیکن میں نے سب میں سے اسی کو چنا۔“

مسز لوجوائے سے گھر کے نوکر بھی خوش تھے، اس لیے کہ ان کا کام بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ البتہ اتوار کو سارا بوجھ ان کے کندھوں پر آپڑتا تھا کہ مسز لوجوائے اُس دن چھٹی مناتی تھی۔ چرچ جاتی۔ وہاں اپنی سہیلیوں سے ملتی۔ اُن کے ساتھ پکچر دیکھنے چلی جاتی۔ اور کسی ایک سہیلی کے ہاں رات کاٹ کر صبح پھر ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتی۔ نواب صاحب کو اُس کی اتوار کی غیر موجودگی ضرور محسوس ہوتی، مگر وہ بااصول آدمی تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی نوکر کو چوبیس گھنٹے کا غلام بنا کے رکھا جائے۔ مسز لوجوائے اگر ہفتے میں ایک چھٹی کرتی تھی تو یہ اُس کا جائز حق تھا۔ دن بہ دن مسز لوجوائے نواب صاحب اور اُن کے تمام دوستوں کے دل میں گھر کرتی گئی۔ سب اُس کے شیدا تھے۔ ایک دن اُن میں سے ایک نے نواب صاحب سے کہا۔

”میری ایک درخواست ہے۔“

”فرمایئے۔“

”مسز لوجوائے اگر آپ مجھے عنایت فرمادیں تو میں ساری عمر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔۔ مجھے گورنس کی اشد ضرورت ہے۔“

نواب صاحب نے سگار کا کش لگایا اور زور سے نفی میں سر ہلایا

”نہیں قبلہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسی گورنس مجھے کہاں سے ملے گی۔“

اُن کے دوست نے چاپلوسی کے انداز میں کہا

”نواب صاحب آپ کی نگاہ انتخاب یقیناً اس سے بھی اچھی ڈھونڈ لے گی۔ ہم ایسی نگاہ کہاں سے لائیں؟“

نواب صاحب نے سگار کا دوسرا کش لگایا

”نہیں جناب۔ مسز لوجوائے کو میں کسی قیمت میں کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔“

ایک رات جب مسز لوجوائے صاحب کا شب خوابی کا لباس استری کر کے لائی تو انھوں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ جلدی سونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس سے کہا

”مسز لوجوائے میں آج دیر سے سوؤں گا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ سیکنڈ شو میں کوئی پکچر دیکھوں۔ تمہارے خیال میں کون سی اچھی پکچر آج کل شہر میں دکھائی جا رہی ہے؟“

مسز لوجوائے نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا

”میونٹی اون دی بونٹی کی بہت تعریف سُنی ہے۔ میٹرو میں چھ ہفتوں سے برابر رش لے رہی ہے۔“

نواب صاحب نے ازراہِ مہربانی اُس کو دعوت دی

”تم بھی ساتھ چلو گی۔“

”آپ کی بڑی نوازش ہے۔ آپ لے چلیں تو چلی چلوں گی۔“

نواب صاحب نے اُٹھ کر قدِ آدم آئینے میں اپنے آپ کا سر تا پا جائزہ لیا اور مسز جوائے سے مخاطب ہوئے:

”تو چلو۔ کھانا آج باہر ہی کھائیں گے۔“

مسز لوجوائے نے کہا

”اگر آپ اجازت دیں تو کپڑے تبدیل کر لوں۔ اس لباس میں آپ کے ساتھ جانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مجھے زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگیں گے۔ ابھی حاضر ہوئی۔“

تھوڑی دیر بعد جب وہ آئی تو بڑی سمارٹ دکھائی دے رہی تھی۔ نواب صاحب نے اُس سے کہا۔

”چلیے۔“

آگے آگے مسز لوجوائے تھیں۔ باہر صدر دروازے پر جا کر وہ رُک گئی۔ نواب صاحب سمجھ گئے کہ اب وہ خود کو ملازم نہیں سمجھتی۔ چاہتی ہے کہ اُس کے لیے دروازہ کھولا جائے۔ جیسا کہ انگریزی قاعدہ ہے کہ احتراماً وہ خواتین کے لیے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہیں۔ نواب صاحب نے دروازہ کھولا۔ مسز لوجوائے باہر نکلیں اُس کے بعد نواب صاحب۔ موٹر باہر کھڑی تھی۔ شوفر بھی موجود تھا لیکن نواب صاحب نے اُسے رخصت کر دیا۔ پہلے مسز لوجوائے کو بٹھایا۔ پھر آپ بیٹھے اور کار ڈرائیو کرنا شروع کر دی۔ جب موٹر میرین ڈرائیو سے گزر رہی تھی تو نواب صاحب مسز لوجوائے سے مخاطب ہوئے جو خاموش اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

”کس ہوٹل میں کھانا کھائیں۔“

”میرا خیال ہے ایروز سینما کے اُوپر جو ہوٹل ہے اچھا رہے گا۔ آپ کو وہاں اپنی پسند کی چیزیں مل جائیں گی۔“

نواب صاحب نے کہا

”بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ایسا کیوں نہ کریں۔ اوپر کھانا بڑے اطمینان سے کھائیں اور ایروز میں پکچر دیکھیں۔“

مسز لوجوائے نے تھوڑی دیر سوچا

”جی ہاں۔ ایروز میں ایک اچھی پکچر دکھائی جا رہی ہے۔ گڈ ارتھ۔ میری چند سہلیوں نے دیکھی ہے۔ بہت تعریف کر رہی تھیں۔ کہتی تھیں پال منی نے اس میں کمال کر دیا ہے۔“

نواب صاحب اور مسز لوجوائے ایروز پہنچے۔ اُوپر کی منزل پر لفٹ کے ذریعے سے پہنچے۔ ڈانسنگ ہال میں مشہور موسیقار بیتھون کی ایک سمفنی بجائی جا رہی تھی۔ نواب صاحب نے مینبو دیکھا اور کھانے کے لیے آرڈر دیا۔ جو کچھ دیر بعد سرد کر دیا گیا۔ لیکن اس سے پہلے وہ دو پیگ وسکی کے ختم کر چکے تھے اور مسز لوجوائے نے شیری کا ایک گلاس پیا تھا۔ وہ دونوں ہلکے ہلکے سُرور میں تھے۔ جب ڈنر سے فارغ ہوئے تو ڈانس شروع ہو گیا۔ نواب صاحب کو انگلستان کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب اُن کا دل جوان تھا اور انھوں نے انگریزی رقص کی باقاعدہ تعلیم لی تھی۔ اُس یاد نے انھیں اُکسایا کہ وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے ذرا ناچ لیں۔ چنانچہ انھوں نے مسز لوجوائے سے کہا

”کیا آپ میری پارٹنر بن سکتی ہیں۔“

مسز لوجوائے نے جواب دیا

”مجھے کوئی عذر نہیں۔“

دونوں دیر تک ناچتے رہے۔ نواب صاحب مسز لوجوائے کے قدموں کی روانی سے بہت متاثر ہوئے۔ یہ سلسلہ جب ختم ہوا تو پکچر دیکھنے چلے گئے۔ جب شو ختم ہوا تو گھر کا رخ کیا۔ رات کا وقت تھا میرین ڈرائیو کی وسیع و عریض سڑک پر جس کے ایک طرف سمندر رہے۔ اور ساحل کے ساتھ ساتھ بجلی کے قمقمے دوڑتے چلے گئے ہیں خنک ہوا کے جھونکے ان دونوں کے سُرور میں اضافہ کررہے تھے جب گھر پہنچے تو نواب صاحب نے مسز لوجوائے کے لیے دروازہ کھولا۔ اور غیر ارادی طور پر اُس کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر کے اندر داخل ہوئے۔ مسز لوجوائے نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ دوسرے روز خلافِ معمول نواب صاحب چھ بجے جاگے۔ ایک دم اُٹھ کر انھوں نے اپنے ساگوانی پلنگ کو اس طرح دیکھنا شروع کیا جیسے اُن کی کوئی چیز گم ہوگئی ہے اور وہ اسے تلاش کررہے ہیں۔ موسم سرد تھا۔ لیکن اُن کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ اُن کے تکیے کے ساتھ ایک تکیہ تھا جس پر مسز لوجوائے کے سر کا دباؤ موجود تھا۔ نواب صاحب دل ہی دل میں پشیمان ہوئے کہ انھوں نے جن کی لوگ اتنی عزت کرتے ہیں جن کا مقام سوسائٹی میں بہت اُونچا ہے یہ کیا ذلیل حرکت کی۔ اس قسم کے خیال اُن کے دماغ میں اُوپر تلے آرہے تھے اور ندامت کی گہرائیوں میں ڈوبتے چلے جارہے تھے کہ مسز لوجوائے اندر آئی اور اس نے حسبِ معمول بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

”جناب میں نے آپ کے غسل کے لیے گرم پانی تیار کر دیا ہے۔ بیرا آپ کی بیڈ ٹی لے کر آرہا ہے۔ آپ پی کر فارغ ہو جائیں تو غسل کے لیے تشریف لے جائیں میں اتنی دیر میں آپ کے کپڑے نکالتی ہوں۔“

نواب صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور بیڈ ٹی پیئے بغیر غسل خانے میں چلے گئے جہاں اُن کے لیے گرم پانی تیار تھا۔

نیا سال

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹونیا سال

کیلنڈر کا آخری پتا جس پر موٹے حروف میں 31 دسمبر چھپا ہوا تھا، ایک لمحہ کے اندر اسکی پتلی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ اب کیلنڈر ایک ٹنڈ منڈ درخت سا نظر آنے لگا۔ جسکی ٹہنیوں پر سے سارے پتے خزاں کی پھونکوں نے اُڑا دیے ہوں۔ دیوار پر آویزاں کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا۔ کیلنڈر کا آخری پتا جو ڈیڑھ مربع انچ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا، اس کی پتلی انگلیوں میں یوں کانپ رہا تھا گویا سزائے موت کا قیدی پھانسی کے سامنے کھڑا ہے۔ کلاک نے بارہ بجائے، پہلی ضرب پر انگلیاں متحرک ہوئیں اور آخری ضرب پر کاغذ کا وہ ٹکرا ایک ننھی سی گولی بنا دیا گیا۔ انگلیوں نے یہ کام بڑی بے رحمی سے کیا اور جس شخص کی یہ انگلیاں تھیں اور بھی زیادہ بے رحمی سے اس گولی کو نگل گیا۔ اس کے لبوں پر ایک تیزابی مسکراہٹ پیدا ہُوئی اور اس نے خالی کیلنڈر کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور کہا۔

”میں تمھیں کھا گیا ہوں۔ بغیر چبائے نِگل گیا ہُوں۔“

اس کے بعد ایک ایسے قہقہے کا شور بلند ہوا جس میں ان توپوں کی گونج دب گئی جو نئے سال کے آغاز پر کہیں دور داغی جارہی تھیں۔ جب تک ان توپوں کا شور جاری رہا، اس کے سوکھے ہوئے حلق سے قہقہے آتشیں لاوے کی طرح نکلتے رہے، وہ بے حد خوش تھا۔ بے حد خوش، یہی وجہ تھی کہ اس پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ اس کی مسرت آخری درجہ پر پہنچی ہوئی تھی، وہ سارے کا سارا ہنس رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں رو رہی تھیں اور جب اسکی آنکھیں ہنستیں تو آپ اس کے سکڑے لبوں کو دیکھ کر یہی سمجھتے کہ اس کی روح کسی نہایت ہی سخت عذاب میں سے گزر رہی ہے۔ بار بار وہ نعرہ بلند کرتا۔

”میں تمھیں کھا گیا ہُوں۔ بغیر چبائے نِگل گیا ہُوں۔ ایک ایک کر کے تین سو چھیاسٹھ دنوں کو، لیپ دن سمیت“!

خالی کیلنڈر اُس کے اس عجیب و غریب دعوے کی تصدیق کر رہا تھا۔ آج سے ٹھیک چار برس پہلے جب وہ اپنے کاندھوں پر مصیبتوں کا پہاڑ اُٹھا کر اپنی روٹی آپ کمانے کے لیے میدان میں نکلا تو کتنے آدمیوں نے اس کا مضحکہ اُڑایا تھا۔ کتنے لوگ اس کی

”ہمت“

پر زیرِ لب ہنستے تھے۔ مگر اس نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی تھی اور اسے اب بھی کسی کی کیا پروا تھی، اس کو صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس، دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔ اور اب بھی اسی چیز پر پابند تھا۔ وہ ان دنوں گدھوں کی سی مشقت کر رہا تھا۔ کُتّوں سے بڑھ کر ذلیل زندگی بسر کر رہا تھا مگر یہ چیزیں اس کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھیں۔ کئی بار اسے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ اس نے ہاتھ پھیلایا، لیکن ایک شان کے ساتھ۔ وہ کہا کرتا تھا۔

”یہ سب بھکاری جو سڑکوں پر جھولیاں پھیلائے اور کشکول بڑھائے پھرتے رہتے ہیں، گولی مار کر اڑا دینے چاہئیں۔ بھِیک لے کر یہ ذلیل کتے شکر گزار نظر آتے ہیں۔ حالانکہ انھیں شکریہ گالیوں سے ادا کرنا چاہیے۔ جو بھیک مانگتے ہیں وہ اتنے لعنتی نہیں جتنے کہ یہ لوگ جو دیتے ہیں۔ دان پُن کے طور پر۔ جنت میں ایک ٹھنڈی کوٹھڑی بُک کرانے والے سوداگر! اس کو کئی مرتبہ روپے پیسے کی امداد حاصل کرنیکی خاطر شہر کے دھنوانوں کے پاس جانا پڑا۔ اُس نے ان دولتمندوں سے امداد حاصل کی۔ انکی کمزوریاں انہی کے پاس بیچ کر!۔ اور اُس نے یہ

سودا کبھی اناڑی دکاندار کی خاطر نہیں کیا۔ آپ شہر کی صحت کے محافظ مقرر کیے گئے ہیں۔ لیکن در حقیقت آپ بیماریاں فراہم کرنے کے ٹھیکیدار ہیں۔ حکومت کی کتابوں میں آپ کے نام کے سامنے ہیلتھ آفیسر لکھا جاتا ہے، مگر میری کتاب میں آپ کا نام امراض فروشوں کی فہرست میں درج ہے۔ پرسوں مارکیٹ میں آپ نے سنگتروں کے دو سو ٹوکرے پاس کر کے بھجوائے جو طبی اصول کے مطابق صحت عامہ کے لیے سخت مضر تھے۔ دس روز پہلے آپ نے قریباً دو ہزار کیلوں پر اپنی آنکھیں بند کر لیں جن میں سے ہر ایک ہیضہ کی پُڑیا تھی۔ اور آج آپ نے اُس بوسیدہ اور غلیظ عمارت کو بچا لیا جہاں بیماریاں پرورش پاتی ہیں اور۔ اُسے عام طور پر آگے کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی تھی۔ اس لیے کہ اس کا سودا بہت کم گفتگو ہی سے طے ہو جاتا تھا۔ وہ ایک سستے اور بازاری قسم کے اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ جس کی اشاعت دو سو سے زیادہ نہ تھی۔ دراصل وہ اشاعت کا قائل ہی نہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا

”جو لوگ اخبار پڑھتے ہیں بے وقوف ہیں۔ اور جو لوگ اخبار پڑھ کر اس میں لکھی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ سب سے بڑے بیوقوف ہیں۔ جن لوگوں کی اپنی زندگی ہنگامے سے پُر ہو۔ اُن کو اِن چھپے ہُوئے چیتھڑوں سے کیا مطلب ؟“

وہ اخبار اس لیے نہیں نکالتا تھا کہ اسے مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ یا وہ اخبار کے ذریعے سے شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نہیں، بالکل نہیں۔ ایک دو گھنٹے کی مصروفیت کے سوا جو اس کے اخبار کی اشاعت کے لیے ضروری تھی وہ اپنا بقایا وقت ان خوابوں کی تعبیر دیکھنے میں گزارا کرتا تھا جو ایک زمانہ سے اس کے ذہن میں موجود تھے۔ وہ اپنے لیے ایک ایسا مقام بنانا چاہتا تھا جہاں اسے کوئی نہ چھیڑ سکے۔ جہاں وہ اطمینان حاصل کر سکے۔ خواہ وہ دو سیکنڈ ہی کا کیوں نہ ہو۔

”جنگ کے میدان میں فتح پر برلبِ گور ہی نصیب ہو۔ مگر ہو ضرور۔ اور اگر شکست ہو جائے، پٹنا پڑے تو بھی کیا ہرج ہے۔ شکست کھائیں گے لیکن فتح حاصل کرنیکی کوشش کرتے ہُوئے۔ موت ان کی ہے جو موت سے ڈر کر جان دیں، اور جو زندہ رہنے کی کوشش میں موت سے لپٹ جائیں زندہ ہیں۔ اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کم از کم اپنے لیے“!

دنیا اُس کے خلاف تھی۔ جو شخص بھی اس سے ملتا تھا اس سے نفرت کرتا تھا۔ وہ خوش تھا۔ نفرت میں محبت سے زیادہ تیزی ہوتی ہے۔ اگر سب لوگ مجھ سے محبت کرنا شروع کر دیں تو میں اس پہیے کے مانند ہو جاؤں جس میں اندر باہر، اوپر نیچے سب جگہ تیل دیا گیا ہو۔ میں کبھی اس گاڑی کو آگے نہ دھکیل سکونگا جسے لوگ زندگی کہتے ہیں۔ قریب قریب سب اس کے خلاف تھے۔ اور وہ اپنے ان مخالفین کی طرف یُوں دیکھا کرتا تھا گویا وہ موٹر کے انجن میں لگے ہُوئے پُرزوں کو دیکھ رہا ہے،

”یہ کبھی ٹھنڈے نہیں ہونے چاہئیں۔“

اور اس نے اب تک ان کو ٹھنڈا نہ ہونے دیا تھا۔ وہ اس الاؤ کو جلائے رکھتا تھا۔ جس پر وہ ہاتھ تاپ کر اپنا کام کیا کرتا تھا جس روز وہ اپنے مخالفین میں کسی نئے آدمی کا اضافہ کرتا۔ تو اپنے دل سے کہا کرتا تھا۔

”آج میں نے الاؤ میں ایک اور سوکھی لکڑی جھونک دی ہے جو دیر تک جلتی رہے گی۔“

اُس کے ایک مخالف نے جلسے میں اُس کے خلاف بہت زہر اُگلا۔ اسے بہت بُرا بھلا کہا۔ حتیٰ کہ اسے ننگی گالیاں بھی دیں۔ اس کے مخالف کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ سن کر اسے نیند نہ آئے گی۔ مگر اس کے برعکس وہ تو اس روز معمول کے خلاف بہت آرام سے سویا۔ اور اسے خود ساری رات آنکھوں میں کاٹنا پڑی۔ شب بھر اس کا ضمیر اسے ستاتا رہا۔ حتیٰ کہ صبح اٹھ کر وہ اس کے پاس آیا اور بہت بڑے ندامت بھرے لہجہ میں اس سے معذرت طلب کی۔

”مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ جیسے بلند اخلاق انسان کو برا بھلا کہا۔ گالیاں دیں۔ دراصل۔ دراصل میں نے یہ سب کچھ بہت جلد بازی میں کیا۔ سوچے سمجھے بغیر۔ مجھے اُکسایا گیا تھا۔ میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے معاف فرما دیں گے۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی“!

بُلند اخلاق!۔ اسے اس لفظ اخلاق سے بہت چِڑ تھی۔ اخلاق رُخِ انسانیت کا غازہ۔ اخلاق۔ اخلاق اخلاق۔ یعنی یہ نہ کرو، وہ نہ کرو کی بے معنی گردان۔ انسان کی آزادانہ سرگرمیوں پر بٹھایا ہوا سینسر! اس کو معلوم تھا کہ اسکے کمزور دل مخالف نے جھوٹ بولا۔ مگر نہ معلوم اس کے دل میں غصہ کیوں نہ پیدا ہوا۔ بخلاف اس کے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جو شخص اس کے سامنے بیٹھا معافی مانگ رہا ہے اس کی کوئی نہایت ہی عزیز شے فنا ہو گئی ہے۔ وہ غایت درجہ بے رحم تصور کیا جاتا تھا اور اصل میں وہ تھا بھی بے رحم، نرم و نازک جذبات سے اس کا سینہ بالکل پاک تھا۔ مگر اس پتھر پر سے کوئی چیز رینگتی ہُوئی نظر آئی۔ اسے اس شخص پر رحم آنے لگا۔

”آج تم روحانی طور پر مر گئے ہو۔ اور مجھے تمہاری اِس موت پر افسوس ہے“!

یہ سُن کر اس کے مخالف کو پھر گالیاں دینا پڑیں۔ مگر اُس کے کانوں تک کوئی آواز نہ پہنچ سکی۔ مُدت ہُوئی وہ اس کو کسی دور دراز قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔ چار برس سے وہ اسی طرح جی رہا تھا، زبردستی، دنیا کی مرضی کے خلاف۔ بہت سی قوتیں اس کو پسپا کر دینے پر تُلی رہتی تھیں۔ مگر وہ اپنے وجود کا ایک ذرّہ بھی جنگ کے بغیر ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جنگ، جنگ، جنگ۔ ہر مخالف قوت کے خلاف جنگ۔ رحم و ترحم سے ناآشنائی عشق و محبت سے پرہیز۔ امید، خوف اور استقبال سے بیگانگی۔ اور پھر جو ہو سو ہو! چار برس سے وہ زمانے کی تیز و تند ہوا میں ایک تناور اور مضبوط درخت کی طرح کھڑا تھا۔ موسموں کے تغیر و تبدل نے ممکن ہے اُس کے جسم پر اثر کیا ہو مگر اس کی روح پر ابھی تک کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔ وہ ابھی تک ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ آج سے چار برس پہلے تھی، فولاد کی طرح سخت، یہ سختی قدرت کی طرف سے عطا نہیں کی گئی تھی بلکہ خود اس نے پیدا کی تھی۔ وہ کہتا تھا۔

”نرم و نازک روح کو اپنے سینے میں دبا کر تم زمانے کی پتھریلی زمین پر نہیں چل سکو گے۔ جو پھول کی پتی سے ہیرے کا جِگر کاٹنا چاہے اسے پاگل خانے میں بند کر دینا چاہیے۔“

شاعرانہ خیالات کو اس نے اپنے دماغ میں کبھی داخل نہ ہونے دیا تھا اور اگر کبھی کبھار غیر ارادی طور پر وہ اس کے دماغ میں پیدا ہو جاتے تھے تو وہ ان

”حرامی بچوں“

کا فوراً گلا گھونٹ دیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔

”میں اُن بچوں کا باپ نہیں بننا چاہتا جو میرے کاندھوں کا بوجھ بن جائیں۔“

اس نے اپنے سازِ حیات سے ساری طربیں اُتار دیں تھیں۔ اس نے اس میں سے وہ تمام تار نوچ کر باہر نکال دیئے تھے جن میں سے نرم و نازک سُر نکلتے ہیں۔

”زندگی کا صرف ایک راز ہے اور وہ رجز ہے۔ جو آگے بڑھنے، حملہ کرنے، مرنے اور مارنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام راگنیاں فضول ہیں جو اعضاء پر تھکاوٹ طاری کرتی ہیں۔“

اس کا دل شباب کے باوجود عشق و محبت سے خالی تھا۔ اسکی نظروں کے سامنے سے ہزار ہا خوبصورت لڑکیاں اور عورتیں گزر چکی تھیں، مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اُس کے دل پر اثر نہ کیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔

”اس پتھر میں عشق کی جونک نہیں لگ سکتی“!

وہ اکیلا تھا، بالکل اکیلا۔ کھجُور کے اس درخت کے مانند جو کسی تپتے ہوئے ریگستان میں تنہا کھڑا ہو۔ مگر وہ اس تنہائی سے کبھی نہ گھبرایا تھا۔ دراصل وہ کبھی تنہا رہتا ہی نہ تھا۔

”جب میں کام میں مشغول ہوتا ہُوں تو وہی میرا ساتھی ہوتا ہے۔ اور جب میں اُس سے فارغ ہو جاتا ہوں تو میرے دوسرے خیالات و افکار میرے گردو پیش جمع ہو جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ اپنے دوستوں کے جمگھٹے میں رہتا ہو۔“

وہ اپنے دن یوں بسر کرتا تھا جیسے آم کھا رہا ہے۔ شام کو جب وہ بستر پر دراز ہوتا تھا تو ایسا محسوس کیا کرتا تھا کہ اس نے دن کو چُوسی ہوئی گٹھلی کے مانند پھینک دیا ہے۔ اگر آپ اُس کے کمرے کی ایک دیوار ہوتے تو کئی بار آپ کے ساتھ یہ الفاظ ٹکراتے جو کبھی کبھی سوتے وقت اس کی زبان سے نکلا کرتے تھے۔

”آج کا دن کتنا کھٹا تھا۔ اس برس کے ٹوکرے میں اگر بقایا دن بھی اسی قسم کے ہُوئے تو مزا آجائے گا“!

اور راتیں۔ خواہ تاریک ہوں یا منور۔ اس کی نظر میں داشتائیں تھیں۔ جن کو وہ روز طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی بھول جاتا تھا۔ چار برس سے وہ اسی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں ہتھوڑا لیے۔ زمانہ کا آہنی فیتہ اس کے سامنے سے گزر رہا ہے اور وہ اس فیتے پر ہتھوڑے کی ضربوں سے اپنا ٹھپہ لگائے جا رہا ہے۔ ایک دن جب گزرنے لگتا ہے تو وہ فیتے کو تھوڑی دیر کے لیے تھام لیتا ہے۔ اور پھر اسے چھوڑ کر کہتا ہے۔

”اب جاؤ، میں تمہیں اچھی طرح استعمال کر چکا ہوں۔“

بعض لوگوں کو افسوس ہُوا کرتا ہے کہ ہم نے فلاں کام فلاں وقت پر کیوں نہیں کیا۔ اور یہ پچھتاوا وہ دیر تک محسوس کیا کرتے ہیں۔ مگر اسے آج تک اس قسم کا افسوس یا رنج نہیں ہُوا۔ جو وقت سوچنے میں ضائع ہوتا ہے وہ اس سے بغیر سوچے سمجھے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ خواہ انجام کار اسے نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ اگر سوچ سمجھ کر چلنے ہی میں فائدہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نیکوکاروں کی زندگی تکلیفوں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی ہرگز نہ ہوتی، جو ہر کام بڑے غور و فکر سے کیا کرتے تھے۔ اگر سوچ بچار کے بعد بھی نقصان ہو۔ یا ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ غور و فکر میں پڑنے کے بغیر ہی نتائج کا سامنا کر لیا جائے۔ اسے ان چار برسوں میں ہزار ہا ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ صرف منہ ہی نہیں بلکہ اِن کو سر سے پیر تک دیکھنا پڑا تھا مگر وہ اپنے اصول پر اسی طرح قائم تھا جس طرح تُند لہروں میں ٹھوس چٹان کھڑی رہتی ہے۔ آج رات بارہ بجے کے بعد نیا سال اس کے سامنے آ رہا تھا۔ اور پرانے سال کو وہ ہضم کر گیا تھا۔ بغیر ڈکار لیے۔ نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدِ مقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔ اسی طرح وہ نئے سال کے مقابلے میں اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

”میں تم جیسے پہلوانوں کو پچھاڑ چکا ہوں۔ اب تمہیں بھی چاروں شانے چت گرا دونگا۔“

جی بھر کر خوشی منانے کے بعد وہ نئے کیلنڈر کی طرف بڑھا جو میلی دیوار پر اوپر کی طرف سمٹ رہا تھا۔ تاریخ نما سے اس نے اوپر کا کاغذ ایک جھٹکے سے علیحدہ کر دیا اور کہا۔

”ذرا نقاب ہٹاؤ تو۔ دیکھو تمہاری شکل کیسی ہے۔ میں ہُوں تمہارا آقا۔ تمہارا مالک۔ تمہارا سب کچھ“!

یکم جنوری کی تاریخ کا پتہ عریاں ہو گیا۔ ایک قہقہہ بُلند ہُوا اور اس نے کہا:۔

”کل رات تم فنا کر دیئے جاؤ گے“!

نیا قانون

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹونیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔ پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے سپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی۔ تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی

”دیکھ لینا گاما چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔“

جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا۔ کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا۔ ولایت میں اور کہاں؟“

اسپین کی جنگ چھڑی۔ اور جب ہر شخص کو پتہ چل گیا۔ تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حقہ پی رہے تھے۔ دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے کسی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔ اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حُقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری۔ اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا:۔

”یہ کسی پیر کی بدُعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چُھریاں چلتی رہتی ہیں۔ اور میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا۔ اور اس درویش نے جل کر یہ بدُعا دی تھی۔ جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے۔ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں“

یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور پھر حقّے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔

”یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں۔ تو کچھ نہ ہو گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہو گی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا۔ کہ پیر نے یہ بدُعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔“

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنّفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کُتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سُرخ وسپید چہرے کو دیکھتا۔ تو اُسے متلی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلّی گل گل کر جھڑ رہی ہو! جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا۔ تو سارا دن اس کی طبیعت مکّدر رہتی۔ اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگرٹ پیتے یا حُقے کے کش لگاتے ہوئے اس ”گورے“ کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

”۔۔۔۔۔۔۔۔“ یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا

”آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔۔۔۔۔“

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

”شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی۔۔۔۔۔۔۔ جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ بالکل مُردار، ایک دھپّے کی مار اور گٹ پٹ یوں بک رہا تھا۔ جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی۔ کہ ملعون کی کھوپڑی کے پُرزے اڑادوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے“

۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا۔ اور ناک کو خاکی قمیض سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

”قسم ہے بھگوان کی ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں۔ رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے۔ تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے“

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں۔ اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ سُنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟“

”ہر چیز تو نہیں بدلے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی؟“

”کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“

”یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔ ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا۔ اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارداڑیوں کی طرف دیکھتا۔ اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا چل بیٹا۔۔۔۔۔۔ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھادے“

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی۔ اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چُوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا۔

”ہمت تیری ایسی تیسی۔“

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا۔ تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا۔ اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“

بار بار گونج رہا تھا۔ اور اس کے تمام جسم میں مسّرت کی ایک لہر دوڑ رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی“

۔۔۔۔ غریبوں کی کُھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل۔۔۔۔۔ نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہو گا۔“

وہ بے حد مسرور تھا، خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں۔۔۔۔۔۔۔ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بِلّوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔ جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈے میں داخل ہوا۔ تو استاد منگو بڑھ کر اُس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا“

لا ہاتھ ادھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تیری اس گنجی کھوپری پر بال اُگ آئیں۔“

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے۔۔۔۔۔۔۔ مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا“

تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔ استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اس نے روس والے بادشاہ ”کو انڈیا ایکٹ“ یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا۔ اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ اُنھیں ”روس والے بادشاہ“ کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سُرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں ”روس والے بادشاہ“ اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا۔ کہ فلاں شہر میں بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

”جدید آئین کا دوسرا حصّہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آسکا۔ فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سُنی نہ دیکھی گئی۔ سیاسی نظریہ سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں“!

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس لیے استاد منگو صرف اُوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اُس نے کہا۔

”یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔“

چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

”ٹوڈی بچے“!

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں ”ٹوڈی بچہ“ کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ”ٹوڈی بچے“ کی تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا:

”نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر۔۔۔۔۔۔۔۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔“

”ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“

”وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔“

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ وہ اس کو ایسی چیز

”سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو“

نیا قانون۔۔۔۔۔۔۔

!وہ دن میں کئی بار سوچتا یعنی کوئی نئی چیز!

اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ ساز آجاتا۔ جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نِکل کی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی ”نئے قانون“ کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔ پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے گی۔ آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا۔ اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اُٹھا اور اصطبل میں جا کر گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی۔۔۔۔۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔ اس نے صبح کے سرد دُھندلکے میں کئی تنگ اور کُھلے بازاروں کا چکر لگایا۔ مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی۔ اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی۔ اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں یکم مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی۔۔۔۔۔۔ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن اُستاد منگو مایوس نہیں تھا۔

”ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں“

اس خیال سے اُسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔

”ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟“

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا۔ تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے مَیلے مَیلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔ تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں۔ اور اب لوگوں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔۔۔۔۔۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ جب اُستاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری سے گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی بار اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا:

”تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچّہ جن دے گی؟“

اُستاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا خواہش مند تھا بلکہ متجسّس تھا۔ اس کی بیوی گنگاوئی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔

”ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور پیاس سے نڈھال ہو رہے ہو۔“

کچھ بھی ہو مگر اُستاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بیقرار نہیں تھا۔ جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا، ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلا کرتا تھا۔ لیڈروں کی عظمت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور اُن کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک، وہ بڑا آدمی تھا۔ اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں۔ تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔ انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا۔ اور دل میں خیال کیا:

”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔“

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا۔ اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا۔ اور پچھلی نشست کے گدّے پر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔۔ جب اُستاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی۔ یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا۔ تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔ گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سُست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔ وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ وہ اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اُسے بُلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ”گورا“ کھڑا نظر آیا۔ جو اُسے ہاتھ سے بُلا رہا تھا۔ جیسا کہ بیان کی جا چکا ہے۔ استاد منگو کو گوروں سے بیحد نفرت تھی۔ جب اُس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا۔ تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا۔ ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔“

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے ٹانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا،

”صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟“

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا، صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھچ گیا۔ اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا، اور اپنے اندر اس نے اس ”گورے“ کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔ جب ”گورے“ نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگرٹ سُلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں۔ اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔ استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے ”گورے“ کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے۔ اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے، گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گورے نے سگریٹ کا دُھواں نگلتے ہوئے کہا

”جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟“

”وہی ہے“

یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے۔ اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

”وہی ہے۔“

اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دُہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا۔ کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی، اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا۔ بلکہ اس کے پُرزے اُڑا دیئے ہوتے، مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا۔

”کہاں جانا مانگتا ہے؟“

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔ گورے نے جواب دیا۔

”ہیرا منڈی“

”کرایہ پانچ روپے ہو گا۔ استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔ یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلاّیا۔ پانچ روپے۔ کیا تم۔۔۔۔۔؟“

”ہاں، ہاں، پانچ روپے۔“

یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔

”کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟“

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔ گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اُوپر کو اُٹھا اور چشمِ زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا۔ اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی۔ اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں۔ تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس کی چیخ پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:۔

”پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔۔۔۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

”ہے بچہ؟“

لوگ جمع ہو گئے۔ اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا اس کی چوڑی چھاتی پھولی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔“

”وہ دن گزر گئے۔ جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ اب نیا قانون ہے میاں۔۔۔۔۔۔۔ نیا قانون“!

اور بیچارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔ استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ”نیا قانون نیا قانون“ چلاّتا رہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

”نیا قانون، نیا قانون۔ کیا بک رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔ قانون وہی ہے پرانا“!

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

ہارتا چلا گیا

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوہارتا چلا گیا

لوگوں کو صرف جیتنے میں مزا آتا ہے۔ لیکن اسے جیت کر ہار دینے میں لطف آتا ہے۔ جیتنے میں اسے کبھی اتنی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن ہارنے میں البتہ اسے کئی دفعہ کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ شروع شروع میں بینک کی ملازمت کرتے ہوئے جب اسے خیال آیا کہ اس کے پاس بھی دولت کے انبار ہونے چاہئیں تو اس کے عزیز و اقارب اور دوستوں نے اس خیال کا مضحکہ اڑایا تھا مگر جب وہ بینک کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی چلا گیا تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی روپے پیسے سے مدد کرنا شروع کر دی۔ بمبئی میں اس

کے لیے کئی میدان تھے مگر اس نے فلم کے میدان کو منتخب کیا۔ اس میں دولت تھی۔ شہرت تھی۔ اس میں چل پھر کر وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ سکتا تھا۔ اور دونوں ہی ہاتھوں سے لٹا بھی سکتا تھا۔ چنانچہ ابھی تک اسی میدان کا سپاہی ہے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ اس نے کمایا اور لٹا دیا۔ کمانے میں اتنی دیر نہ لگی۔ جتنی لٹانے میں۔ ایک فلم کے لیے گیت لکھے۔ لاکھ روپے دھروا لیے۔ لیکن ایک لاکھ روپوں کو رنڈیوں کے کوٹھوں پر، بھڑووں کی محفلوں میں، گھوڑ دوڑ کے میدانوں اور قمار خانوں میں ہارتے ہوئے اسے کافی دیر لگی۔ یک فلم بنایا۔ دس لاکھ کا منافع ہوا۔ اب اس رقم کو ادھر ادھر لٹانے کا سوال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنے ہر قدم میں لغزش پیدا کرلی۔ تین موٹریں خرید لیں۔ ایک نئی اور دو پرانی جن کے متعلق انھیں اچھی طرح علم تھا کہ بالکل ناکارہ ہیں۔ یہ اس کے گھر کے باہر گلنے سڑنے کے لیے رکھ دیں جو نئی تھی۔ اس کو گیراج میں بند کرادیا۔ اس بہانے سے کہ پٹرول نہیں ملتا۔ اس کے لیے ٹیکسی ٹھیک تھی۔ صبح لی۔ ایک میل کے بعد رکوالی کسی قمار خانے میں چلے گئے۔ وہ اڑھائی ہزار روپے ہار کر دوسرے روز باہر نکلے ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھے اور گھر چلے گئے اور جان بوجھ کر کرایہ ادا کرنا بھول گئے۔ شام کو باہر نکلے اور ٹیکسی کھڑی دیکھ کر کہا۔

”ارے نابکار، تو ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ چل میرے ساتھ دفتر۔ تجھے پیسے دلوادوں۔ دفتر پہنچ کر پھر کرایہ چکانا بھول گئے اور۔ اوپر تلے دو تین فلم کامیاب ہوئے جتنے ریکارڈ تھے سب ٹوٹ گئے۔ دولت کے انبار لگ گئے۔ شہرت آسمان تک جا پہنچی۔ جھنجھلا کر اس نے اوپر تلے دو تین ایسے فلم بنائے۔ جن کی ناکامی اپنی مثال آپ ہو کے رہ گئی۔ اپنی تباہی کے لیے کئی دوسروں کو بھی تباہ کر دیا۔ لیکن فوراً ہی آستینیں چڑھائیں جو تباہ ہوگئے۔ ان کو حوصلہ دیا۔ اور ایک ایسا فلم تیار کر دیا جو سونے کی کان ثابت ہوا۔ عورتوں کے معاملے میں بھی ان کی ہار جیت کا یہی چکر کار فرما رہا ہے۔ کسی محفل سے یا کسی کوٹھے پر سے ایک عورت اٹھائی۔ اس کو بنا سنوار کر شہرت کی اونچی گدی پر بیٹھا دیا اور اس کی ساری نسوانیت مسخر کرنے کے بعد اسے ایسے موقعے بہم پہنچائے کہ وہ کسی دوسرے کی رگدن میں اپنی بائیں حمائل کر دے۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور بڑے بڑے عشق پیشہ خوبصورت جوانوں سے مقابلہ ہوا۔ سر دھڑ کی بازیاں لگیں۔ سیاست کی بساطیں بچھیں۔ لیکن وہ ان تمام خار دار جھاڑیوں میں ہاتھ ڈال کر اپنا پسندیدہ پھول نوچ کرلے آیا۔ دوسرے دن ہی اس کو اپنے کوٹ میں لگایا اور کسی رقیب کو موقع دے دیا کہ وہ جھپٹا مار کرلے جائے۔ ان دنوں جب وہ فارس روڈ کے ایک قمار خانے میں لگاتار دس روز سے جارہا تھا۔ اس پر ہارنے ہی کی دھن سوار تھی۔ یوں تو اس نے تازہ تازہ ایک بہت ہی خوبصورت ایکٹرس ہاری تھی اور دس لاکھ روپے ایک فلم میں تباہ کر دیے تھے۔ مگر ان دو حادثوں سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوئی تھی۔ یہ دو چیزیں بہت ہی اچانک طور پر اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ اس کا اندازہ اس دفعہ غلط ثابت ہوا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ روز فارس روڈ کے قمار خانے میں ناپ تول کر ایک مقررہ رقم ہار رہا تھا۔ ہر روز شام کو اپنی جیب میں دو سو روپے ڈال کر وہ پون پل کا رخ کرتا۔ اس کی ٹیکسی ٹکھائیوں کی جنگلہ لگی دوکانوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتی اور وہ جا کر بجلی کے ایک کھمبے کے پاس رک جاتی۔ اپنی ناک پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک اچھی طرح جماتا۔ دھوتی کی لانگ ٹھیک کرتا اور ایک نظر دائیں جانب دیکھ کر جہاں لوہے کے جنگلے کے پیچھے ایک نہایت ہی بد شکل عورت ٹوٹا ہوا آئینہ رکھے سنگار میں مصروف ہوتی اوپر بیٹھک میں چلا جاتا۔ دس روز سے وہ متواتر فارس روڈ کے اس قمار خانے میں دو سو روپیہ ہارنے کے لیے آرہا تھا۔ کبھی تو یہ روپے دو تین ہاتھوں ہی میں ختم ہو جائے اور کبھی ان کو ہارتے ہارتے صبح ہو جاتی۔ گیارھویں روز بجلی کے کھمبے کے پاس جب ٹیکسی رکی تو اس نے اپنی ناک پر موٹے موٹے شیشوں پر والی عینک جما کر اور دھوتی کی لانگ ٹھیک کر کے ایک نظر دائیں جانب دیکھا تو اسے ایک دم محسوس ہوا کہ وہ دس روز سے اس بد شکل عورت کو دیکھ رہا ہے حسب دستور ٹوٹا ہوا آئینہ سامنے رکھے لکڑی کے تخت پر بیٹھی سنگار میں مصروف تھی۔ لوہے کے جنگلے کے پاس آکر اس نے غور سے اس ادھیڑ عمر کی عورت کو دیکھا۔ رنگ سیاہ، جلد چکنی، گالوں اور ٹھوڑی پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے سوئی سے گندھے ہوئے دائرے جو چمڑی کی سیاہی میں قریب قریب جذب ہوگئے تھے۔ دانت بہت ہی بد نما، مسوڑھے پان اور تمباکو سے گلے ہوئے۔ اس نے سوچا اس عورت کے پاس کون آتا ہو گا؟۔ لوہے کے جنگلے کی طرف جب اس نے ایک قدم اور بڑھایا تو وہ بد شکل عورت مسکرائی۔ آئینہ ایک طرف رکھ کر اس نے بڑے ہی بھونڈے پن سے کہا۔

”کیوں سیٹھ رہے گا؟“

اس نے اور زیادہ غور سے اس عورت کی طرف دیکھا جسے اس عمر میں بھی امید تھی کہ اس کے گاہک موجود ہیں۔ اس کو بہت حیرت ہوئی۔ چنانچہ اس نے پوچھا

”بائی تمہاری کیا عمر ہو گی؟“

یہ سن کر عورت کے جذبات کو دھکا سا لگا۔ منہ بسور کر اس نے مراٹھی زبان میں شاید گالی دی۔ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اس سے کہا۔

”بائی مجھے معاف کر دو۔ میں نے ایسے ہی پوچھا تھا۔ لیکن میرے لیے بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ ہر روز تم سج دھج کر یہاں بیٹھتی ہو۔ کیا تمہارے پاس کوئی آتا ہے؟“

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر اپنی غلطی محسوس کی اور اس نے بغیر کسی تجسس کے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

عورت جو پردہ ہٹا کر اندر جانے والی تھی رک گئی۔

”گنگو بائی۔“

”گنگو بائی۔ تم ہر روز کتنا کما لیتی ہو؟“

اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ گنگو بائی لوہے کے سلاخوں کے پاس آ گئی۔

”چھ سات روپے۔ کبھی کچھ بھی نہیں۔“

”چھ سات روپے اور کبھی کچھ بھی نہیں۔“

گنگو بائی کے یہ الفاظ دہراتے ہوئے ان دو سو روپوں کا خیال آیا جو اس کی جیب میں پڑے تھے اور جن کو وہ صرف ہار دینے کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اسے معاً ایک خیال آیا۔

”دیکھو گنگو بائی۔ تم روزانہ چھ سات روپے کماتی ہو۔ مجھ سے دس لے لیا کرو۔“

”رہنے کے؟“

”نہیں۔ لیکن تم یہی سمجھ لینا کہ میں رہنے کے دے رہا ہوں“

یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر سلاخوں میں سے اندر گزار دیا۔

”یہ لو۔“

گنگو بائی نے نوٹ لے لیا۔ لیکن اس کا چہرہ سوال بنا ہوا تھا۔

”دیکھو گنگو بائی، میں تمہیں ہر روز اسی وقت دس روپے دے دیا کروں گا لیکن ایک شرط پر“

”سرت؟“

”شرط یہ ہے کہ دس روپے لینے کے عبد تم کھانا وانا کھا کر اندر سو جایا کرو۔ رات کو میں تمہاری بتی جلتی نہ دیکھوں۔“

گنگو بائی کے ہونٹوں پر عجیب و غریب مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”ہنسو نہیں۔ میں اپنے وچن کا پکا رہوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ اوپر قمار خانے میں چلا گیا۔ سیڑھیوں میں اس نے سوچا مجھے تو یہ روپے ہارنے ہی ہوتے ہیں۔ دو سو نہ سہی ایک سو نوے سہی۔“

کئی دن گزر گئے۔ ہر روز حسبِ دستور اس کی ٹیکسی شام کے وقت بجلی کے کھمبے کے پاس رکتی۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلتا۔ موٹے شیشوں والی عینک میں سے دائیں جانب گنگو بائی کو آہنی سلاخوں کے پیچھے تخت پر بیٹھی دیکھتا۔ اپنی دھوتی کی لانگ ٹھیک کرتا جنگلے کے پاس پہنچتا اور دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر گنگو بائی کو دے دیتا۔ گنگو بائی اس نوٹ کو ماتھے سے چھو کر سلام کرتی اور وہ ایک سو نوے ہارنے کے لیے اوپر کوٹھے پر چلا جاتا۔ اس دوران میں دو تین مرتبہ روپیہ ہارنے کے بعد جب وہ رات کو گیارہ بجے یا دو تین بجے نیچے اترا تو اس نے گنگو بائی کی دکان بند پائی۔ ایک دن حسبِ معمول دس روپے دے کر جب وہ کوٹھے پر گیا تو دس بجے ہی فارغ ہو گیا۔ تاش کے پتے کچھ ایسے پڑے کہ چند گھنٹوں ہی میں ایک سو نوے روپوں کا صفایا ہو گیا۔ کوٹھے سے نیچے اتر کر جب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تو اس نے کیا دیکھا کہ گنگو بائی کی دکان کھلی ہے اور وہ لوہے کے جنگلے کے پیچھے تخت پر یوں بیٹھی ہے جیسے گاہکوں کا انتظار کر رہی ہے ٹیکسی میں سے باہر نکل کر وہ اس کی دکان کی طرف بڑھا۔ گنگو بائی نے اسے دیکھا تو گھبرا گئی لیکن وہ پاس پہنچ چکا تھا۔

”گنگو بائی یہ کیا؟“

گنگو بائی نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بہت افسوس ہے تم نے اپنے وچن پورا نہ کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا۔ رات کو میں تمہاری بتی جلتی نہ دیکھوں۔ لیکن تم یہاں اس طرح بیٹھے ہو۔“

اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ گنگو بائی سوچ میں پڑ گئی۔

”تم بہت بری ہو۔“

یہ کہہ کر وہ واپس جانے لگا۔ گنگو بائی نے آواز دی۔

”ٹھہرو سیٹھ۔“

وہ ٹھہر گیا۔ گنگو بائی نے ہولے ہولے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کرتے ہوئے کہا۔

”میں بہت بُری ہوں۔ پر یہاں چانگلی بھی کون ہے؟۔ سیٹھ تم دس روپے دے کر ایک کی بتی بجھاتے ہو۔ ذرا دیکھو تو کتنی بتیاں جل رہی ہں۔“

اس نے ایک طرف ہٹ کر گلی کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہوی جنگلہ لگی دکانوں کی طرف دیکھا۔ ایک نہ ختم ہونے والی قطار تھی اور بے شمار بتیاں رات کی کثیف فضا میں سُلگ رہی تھیں۔

”کیا تم یہ سب بتیاں بجھا سکتے ہو؟“

اس نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے پہلے گنگوبائی کے سر پر لٹکتے ہوئے روشن بلب کو دیکھا۔ پھر گنگوبائی کے مٹمیلے چہرے کو اور گردن جھکا کر کہا۔

”نہیں۔ گنگوبائی۔ نہیں۔“

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھا تو اس کی جیب کی طرح اس کا دل بھی خالی تھا۔ شیر آیا شیر آیا دوڑنا اونچے ٹیلے پر گڈریئے کا لڑکا کھڑا، دور گھنے جنگلوں کی طرف منہ کیے چلا رہا تھا۔

”شیر آیا شیر آیا دوڑنا۔“

بہت دیر تک وہ اپنا گلا پھاڑ تا رہا۔ اس کی جوان بلند آواز بہت دیر تک فضاؤں میں گونجتی رہی۔ جب چلّا چلّا کر اس کا حلق سوکھ گیا تو بستی سے دو تین بڈھے لاٹھیاں ٹیکتے ہوئے آئے اور گڈریئے کے لڑکے کو کان سے پکڑ کر لے گئے۔ پنچائت بلائی گئی۔ بستی کے سارے عقلمند جمع ہوئے اور گڈریئے کے لڑکے کا مقدمہ شروع ہوا۔ فردجرم یہ تھی کہ اس نے غلط خبر دی اور بستی کے امن میں خلل ڈالا۔ لڑکے نے کہا۔

”میرے بزرگو، تم غلط سمجھتے ہو۔ شیر آیا نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ آ نہیں سکتا؟“

جواب ملا۔

”وہ نہیں آ سکتا۔“

لڑکے نے پوچھا۔

”کیوں؟“

جواب ملا۔

”محکمہ جنگلات کے افسر نے ہمیں چٹھی بھیجی تھی کہ شیر بڈھا ہو چکا ہے“

لڑکے نے کہا۔

”لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے تھوڑے ہی روز ہوئے کایا کلپ کرایا تھا۔“

جواب ملا۔

”یہ افواہ تھی۔ ہم نے محکمہ جنگلات سے پوچھا تھا اور ہمیں یہ جواب آیا تھا کہ کایا کلپ کرانے کی بجائے شیر نے تو اپنے سارے دانت نکلوا دیے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے بقایا دن اہنسا میں گزارنا چاہتا ہے۔“

لڑکے نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

”میرے بزرگو، کیا یہ جواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔“

سب نے بیک زبان ہو کر کہا۔

”قطعاً نہیں۔ ہمیں محکمہ جنگلات کے افسر پر پورا بھروسہ ہے۔ اس لیے کہ وہ سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا ہے۔“

لڑنے کے پوچھا۔

”کیا یہ حلف جھوٹا نہیں ہو سکتا؟“

جواب ملا۔

”ہر گز نہیں۔ تم سازشی ہو، ففتھ کالمسٹ ہو، کمیونسٹ ہو، غدار ہو، ترقی پسند ہو۔ سعادت حسن منٹو ہو۔ لڑکا مسکرایا۔

”خدا کا شکر ہے کہ میں وہ شیر نہیں جو آنے والا ہے۔ محکمہ جنگلات کا سچ بولنے والا افسر نہیں۔ میں۔“

پنچائت کے ایک بوڑھے آدمی نے لڑکے کی بات کاٹ کر کہا۔

”تم اسی گڈریئے کے لڑکے کی اولاد ہو جس کی کہانی سالہا سال سے اسکولوں کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو اس کا ہوا تھا۔ شیر آئے گا تو تمہاری ہی تِکا بوٹی اڑا دے گا۔“

گڈریئے کا لڑکا مسکرایا۔

”میں تو اس سے لڑوں گا۔ مجھے تو ہر گھڑی اس کے آنے کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ تم کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ شیر آیا شیر آیا والی کہانی جو تم اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو آج کی کہانی نہیں۔ آج کی کہانی میں تو شیر آیا شیر آیا کا مطلب یہ ہے کہ خبردار رہو۔ ہوشیار رہو۔ بہت ممکن ہے شیر کے بجائے کوئی گیدڑ ہی ادھر چلا آئے مگر اس حیوان کو بھی تو روکنا چاہیے۔“

سب لوگ کھکھلا کر ہنس پڑے۔

”کتنے ڈرپوک ہو تم۔ گیدڑ سے ڈرتے ہو“

گڈریئے کے لڑکے نے کہا۔

”میں شیر اور گیدڑ دونوں سے نہیں ڈرتا۔ لیکن ان کی حیوانیت سے البتہ ضرور خائف رہتا ہوں اور اس حیوانیت کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو ہمیشہ تیار رکھتا ہوں۔ میرے بزرگو، اسکولوں میں سے وہ کتاب اٹھالو۔ جس میں شیر آیا شیر آیا والی پرانی کہانی چھپی ہے۔ اس کی جگہ یہ نئی کہانی پڑھاؤ۔ ایک بڈھے نے کھانستے کھنکارتے ہوئے کہا۔

”یہ لونڈا ہمیں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہمیں راہِ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے۔“

لڑکے نے مسکرا کر کہا۔

”زندگی خطِ مستقیم نہیں ہے میرے بزرگو۔“

دوسرے بڈھے نے فرطِ جذبات سے لرزتے ہوئے کہا۔

”یہ ملحد ہے۔ یہ بے دین ہے، فتنہ پردازوں کا ایجنٹ ہے۔ اس کو فوراً زنداں میں ڈال دو۔“

گڈریئے کے لڑکے کو زندان میں ڈال دیا گیا۔ اسی رات بستی میں شیر داخل ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ باقی شیر نے شکار کر لیے۔ مونچھوں کے ساتھ ہوا خون چوستا سب شیر زندان کے پاس سے گزرا تو اس نے مضبوط آہنی سلاخوں کے پیچھے گڈریئے کے لڑکے کو دیکھا اور دانت پیس کر رہ گیا۔ گڈریئے کا لڑکا مسکرایا۔

”دوست یہ میرے بزرگوں کی غلطی ہے۔ ورنہ تم میرے لہو کا ذائقہ بھی چکھ لیتے۔“

ہتک

اکتوبر 10, 2015افسانہ،سعادت حسن منٹوہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ جی کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چُور، گھر واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہیں پر ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا۔ جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔ وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے، اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے۔ اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکّوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے! اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا اڈھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور کچھ اس

”بیوڑا“

کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔ وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا۔ جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے نُچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔ کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا۔ اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا۔ تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔ اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کے پِن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگ اڑ رہے تھے۔ پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی۔ جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہِز ماسٹر زوائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا، اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بُری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے۔ جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔ ان تصویروں سے ذرا ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ کی تصویر جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم

میں جڑائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا، تیل کی ایک پیالی دھری تھی۔ جو دِیے کو روشن کرنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دِیا پڑا تھا۔ جس کی لَو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر روئی کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔ جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے۔ جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ مادھو پونے سے آکر سوگندھی پر دھاوے بولتا ہے تو کہا تھا۔

”اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟۔ یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے۔“

”ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے، مزے الگ رہے، تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے۔ سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کچھ بات ضرور ہے۔ جو تجھے بھا گیا ہے۔ سات سال۔ سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔“

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا۔

”سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر۔ تیرے انگ پر سے یہ کپڑا ابھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار۔ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا۔ تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کپ چائے اور افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ سمجھیں! بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان۔ اس سالی کانگرس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے، بھگوان کی قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔“

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا۔

”نیچے سے ان بمب کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر، انگیا پہنے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی۔“

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔

”جمنا تو سب کو اپنے مری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تُو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ۔ ارے ہاں، کل کی بات تجھے سناؤں رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا۔ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی۔ ارے وہ تو ڈرنے لگا۔ سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کر کرا ہو گیا!۔ وہ ڈر گیا! میں نے کہا چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو۔ تین بجنے والے ہیں، اب دن چڑھ آئے گا۔ بولا۔ روشنی کرو۔ روشنی کرو۔ میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا۔ بولا لائٹ۔ لائٹ!۔ اس کی بھینچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔

”بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی“!

۔ اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی۔ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا، تجھے شرم نہیں آتی مردوے“!

۔ وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی!۔ وہ پھر گھبرانے لگا۔ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی، کبھی اندھیرا کبھی اجالا، کبھی اجالا، کبھی اندھیرا۔ ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا۔ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے۔ جو یوں مفت دے گیا۔ جمنا تو بالکل الھڑ ہے۔ بڑے بڑے گُر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لیے“!

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی۔

”اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو، ان گنت باتیں کرو۔ اسے چھیڑو ستاؤ، اس کے گدگدی کرو۔ اس سے کھیلو۔ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ۔ اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور رقم بھی بچی رہے گی۔ ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن۔ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے۔ سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آجاتے تھے جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیے ہیں۔ سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جونہی کوئی نرم نازک بات۔ کوئی کومل بولی۔ اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا۔ مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے۔ ایسی تھکن جو انھیں جھنجھوڑ کر۔ اسے مار کر سلانے پر مجبور

کردے! ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہو جانے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے۔ وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے!۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا! اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔ بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی، اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزا یاد کرتی تھی۔ سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے۔ جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ کبھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے! یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی آنکھ مچولی ہی تو تھی!۔ کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا۔ بس یونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لیے بے شمار گُر یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی۔ اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی! ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔

”سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔“

اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر بھی کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جارہا ہے۔ پریم۔ کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کردے۔ کبھی کبھی جب پریم کیے جانے کا جذبہ اُس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود ہی میں لے کر تھپتھپانا شروع کردے اور لوریاں دے کر اسے گود ہی میں سلادے۔ پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا۔ وہ محبت کر سکتی تھی۔ اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔

”سوگندھی۔ تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا“!

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اُس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں، اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑے سات روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے۔ اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا! بتا ہی کیوں نہیں دیں!۔ سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔

”تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے۔ اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟۔ چھی چھی چھی۔ دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟۔ اب ان ساڑھے سات روپوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا۔ جو میں لے ہی نہیں سکتا۔ مجھے عورت چاہیے پر تجھے کیا اس وقت اسی گھڑی مرد چاہیے؟۔ مجھے تو کوئی عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں!۔ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی روپے دلال میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور۔ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پُونے میں حوالدار ہوں، مہینے میں ایک بار آیا کروں گا۔ تین چار دن کے لیے۔ یہ دھندا چھوڑ۔ میں تجھے خرچ دے دیا کروں گا۔ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔؟“

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا۔

”سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا۔ اور پانی کا یہ گھڑا۔ دیکھنا کتنا میلا ہے اور یہ۔ یہ چیتھڑے۔ یہ چندیاں۔ اف کتنی بُری باس آتی ہے، اٹھا کے باہر پھینک ان کو۔ اور تو نے اپنے بالوں کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ اور۔ اور۔“

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے، اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے جس میں گھریلو پن آسکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک غلاظت کو محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا۔

”دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے۔ ٹھہر میں تیرے واسطے دوالاتا ہوں۔“

مادھو کتنا اچھا تھا اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔ مہینے میں ایک بار مادھو پُونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا۔

”دیکھ سوگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا۔ تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔“

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا کہ

”تو یہ کیا ٹر ٹر کیا کرتا ہے، ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟“

اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔

”یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں“

۔ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن سوگندھی خوش تھی جس کو اصل سونا نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔ اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے سامنے ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی۔ دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کے ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلّو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑ رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کُلی کی۔ اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔

”رام لال؟“

رام لال جو باہر دستک دیتے ہوئے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا۔

”تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں کہاں مر گئی تھی؟“

۔ پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا۔

”اندر کوئی ہے تو نہیں؟“

جب سوگندھی نے کہا۔

”نہیں۔ تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔

”تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟۔ بھئی حد ہو گئی ہے کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا۔ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ۔ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ چل چل ایک دم جلدی کر۔“

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ سوگندھی نے تپائی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔

”رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔“

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔

”تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔“

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام سے چھوتے ہوئے غلط فہمی دور کر دی۔

”وہ بات نہیں رام لال!۔ ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں۔ بہت پی گئی۔“

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔

”تھوڑی بچی ہو تو لا۔ ذرا ہم بھی منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔“

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔

”بچائی ہوتی تو یہ مواسر میں درد ہی کیوں ہوتا۔ دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔“

رام لال نے جواب دیا۔

”نہیں بھئی وہ اندر نہیں آسکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کی ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت وطن جانا تھا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا اس لیے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا۔

”بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مر دپُونے سے آنے ہی والا ہے میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔“

مادھو پونا سے آنے والا تھا۔ مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہولی۔ گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی۔ بالکل خاموش تھی گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آرہی تھی۔ کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی۔ سوگندھی کو ایسا لگا کہ اسکے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اُسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بوجھل ہو رہی ہے۔ آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھتے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔

”لیجیے وہ آ گئی۔“

”بڑی اچھی چھوکری ہے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کیے۔“

پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”سوگندھی، ادھر آؤ سیٹھ جی بلاتے ہیں۔“

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے

”اونہہ“

نکلا۔ پھر ایک موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا۔ سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس

”اونہہ“

کا کیا مطلب تھا۔ جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟۔ کیا؟ رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔

”پسند نہیں کیا تجھے۔ دو گھنٹے مفت میں ہی برباد کیے۔“

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موٹر۔ کہاں تھا وہ سیٹھ۔ تو

”اونہہ“

کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا۔ اُس کی۔ گالی اس کے پیٹ کے اندر اٹھی اور زبان کی نوک پر آکر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی، موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی۔ اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ

”اونہہ“

ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے۔

”او سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی۔ بس ایک منٹ کے لیے۔ وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی رات کے پچھلے پہر کی ہلکی ہلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑھی اور اس کی ریشمی سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بُری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے۔ کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر ”اونہہ اونہہ ‘کر رہی تھی۔ گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے۔ پر۔ پر۔ یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور۔ یہ بازار۔ اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک۔ یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حدِ نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اُسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔ اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا۔ اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دُکھنے لگے، اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو۔ ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔ کیا یہ درد تھا؟۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔ یہ کیا تھا؟۔ لعنت! یہ تو وہی

”اونہہ“

تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی تھی اور کبھی پھیلتی تھی۔ گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی، رام لال دلّال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا

”سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا“!

اُسے۔ اُسے۔ صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی تو کیا ہوا؟۔ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی۔ وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا۔ کتنی بُری صورت تھی اس کی۔ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟۔ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟۔ ٹھیک ہے، پر سوگندھی۔ تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ تو نے اس کو ٹھکرایا نہیں تھا۔ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔ اونہہ۔ اس

”اونہہ“

کا اور مطلب ہی کیا ہے؟۔ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔ اونہہ۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے۔ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو۔ دس روپے اور یہ عورت۔ خچّر کیا بُری ہے۔ سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا، کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کی بانہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو۔ صرف ایک بار۔ وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔ موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔

”اونہہ“

کی آواز آئے اور وہ۔ سوگندھی اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور۔ اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے۔ اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے۔ جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔ رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔

”تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟۔ آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔ پھڑ پھڑ پھڑ۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟ سوگندھی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا۔ ارے یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔ اس کا دل۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو! آج ہی روگ لگ گیا تھا اسے۔ اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا۔ بالکل اسے گھسے

ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رک جاتا ہے۔ رات کٹی گِن گِن تارے کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔ آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا کتنے سُندر ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے۔ پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کودا۔

”یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے۔ کیا بھول گئی ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟“

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا۔ جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گُھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی، اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں۔ تو وہ خود ان کی گولائی اور گدگداہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔ بڑی ملنسار تھی، بڑی رحمدل تھی۔ پچھلے دنوں جب کرسمس میں وہ کول پیٹھا میں رہا کرتی تھی، ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے کوٹ اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے حیدر آباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس دے دیے تھے۔

”مجھ میں کیا برائی ہے؟“

سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری۔ ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔ جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بُری نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے۔ کوئی۔ کوئی۔ اس وقت اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔

”سوگندھی! کون کہتا ہے، تو بُری ہے، جو تجھے بُرا کہے وہ آپ بُرا ہے“

۔ نہیں یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔

”سوگندھی تو بہت اچھی ہے“!

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے، اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں

”ماں“

بن رہا ہے۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟۔ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چُوس لے۔ تھوڑی دیر کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی۔ ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں، اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے۔ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟۔ وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے۔ اور جو کچھ اس کے اندر اُبل رہا ہے ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو۔ کیسے ہو؟ سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکتی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس کی طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ موٹر پھر ایک بار آئے اور۔ اور۔

”نہ آئے۔ بلا سے۔ میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں۔ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے۔ چل سوگندھی گھر چل۔ ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا۔ فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سیٹھ اور اس کی موٹر کی ایسی تیسی۔“

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا، اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔ اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا۔ قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر، باہر بازار میں منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی

نے اس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں۔ اس سیٹھ نے۔ پرماتما کرے۔ سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بد دعا دے، مگر سوچا، بد دعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرّے پر لعنتیں لکھ دیتی۔ اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا۔ کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی۔

”یہی لینے آیا تھا نا تو؟۔ لے دام دیے بنا لے جا اسے۔ یہ جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ تُو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا۔“

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر اس سیٹھ سے ایک بار۔ صرف ایک بار۔ اس کی مڈ بھیڑ ہو جائے تو یہ کرے۔ نہیں یہ نہیں۔ یہ کرے۔ یوں اس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں۔ لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی۔ بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی! کنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چڑ چڑاہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کنڈی کھولی گئی اور دروازے نے جمائی لی، سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔ مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا۔

”آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا۔ صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صبح اٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا، جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے۔ وکٹوریہ گارڈن تک ہو آئی ہو گی تو؟۔ کیوں؟“

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی۔ اس لیے وہ کہہ دیا کرتے تھے۔ مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا۔ اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور مادھو سے کہنے لگی۔

”میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی۔“

مادھو بڑا اسٹپٹایا۔ انتظار؟۔

”تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں۔“

سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کُھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا۔ اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سوجی نے کہا، چلو کہیں باہر گھوم آئیں۔ اور۔“

مادھو خوش ہو کر بولا۔

”اور میں آ گیا۔ بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟“

سوگندھی نے جواب دیا۔

”چار بجے کے قریب۔“

مادھو کرسی سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔

”اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا۔ جیسے تو پھولوں والی ساڑھی۔ ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے تیرے ہاتھوں میں۔ کیا تھا تیرے ہاتھوں میں!۔ ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی۔ اور کہا۔

”مادھو تو چنتا کیوں کرتا ہے؟۔ لے یہ تھیلی۔ ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟“

۔ سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا۔ کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے!۔ بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے اب بیس تیس روپے ہوں تو۔ انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے۔ تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔“

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا، مادھو سے کہنے لگی۔

”مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟۔ بیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ بس بس اب جانے دے۔ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا۔ کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے۔ واپس کب جائے گا تو؟“

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی تو اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا۔

”دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا۔ اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو۔ زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔“

”پچاس“!

یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی۔ جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر پکار رہی تھی۔

”ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا“!

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ سوگندھی کھکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چُبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔

”کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟“

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہءِ صفائی کی تھی۔“

اس کی۔ منشی پالٹی کے داروغہ کی۔ ذرا دیکھ تو اس کا تھوبڑا۔ کہتا تھا، ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی۔ اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔ یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی! مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا۔

”رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی۔ تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی۔“

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا۔

”ہی ہی۔“

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

”اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے؟۔ بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا۔ کیوں مادھو؟“

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور پھر ہنسا۔

”ہی ہی۔“

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا، جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔ زور کا قہقہہ لگا کر اس نے

”اونہہ“

کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے تو کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر کہا۔

”اچھا کیا؟ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔“

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

”تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ایسی کون سی چیز ہے جو کسی کو پسند آسکتی ہے۔ تیری پکوڑا ایسی ناک۔ یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا۔ یہ تیرے سُوجے ہوئے نتھنے۔ یہ تیرے بڑھے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟۔ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ۔ پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے۔ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی بُرا۔“

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔

”دیکھ سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کر دیا ہے۔ اب میں تجھ سے آخری بار کہتا ہوں۔“

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”اگر تونے پھر سے دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تونے پھر کسی کو اپنے یہاں بلایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پُونا سے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟“

مادھو چکرا گیا۔ سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔

”میں بتاتی ہوں۔ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا۔ اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا۔ اور جیسا تجھے معلوم ہے۔ ڈھائی روپے دلال کے۔ باقی رہے ساڑھے سات۔ ہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپیوں میں مَیں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا۔ جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا۔ تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت اور مجھے تیری۔ پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سُن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں۔ یہ تونے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟“

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اُڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔

”سوگندھی“!

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ یہ

”چیتھڑے، یہ چندیاں۔ اف کتنی بُری باس آتی ہے، اٹھا کے باہر پھینک ان کو۔“

مادھو چلایا۔

”سوگندھی۔“

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔

”سوگندھی کے بچّے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟۔ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا اگبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں۔ کُتے، کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟۔ بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟۔ میں کہتی ہوں تو ہے کون؟۔ چور یا گٹھ کترا؟۔ اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ بلاؤں پولیس کو۔ پُونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو۔ یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں۔“

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔

”سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

”میری ماں کا سر۔ تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔ بھاگ یہاں سے، ورنہ۔“

سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کُتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور سے ہنسنے لگی۔ مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔

”خبردار۔ پڑی رہنے دے وہیں۔ تو جا، تیرے پُونہ پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔“

یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دُم ہلاتا سوگندھی کے پاس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا۔ تو سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی۔ مگر بے سُود، وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پُر کرتی تھی۔ ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کُتّے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

ہرنام کور

اکتوبر 10, 2015 افسانہ، سعادت حسن منٹو ہرنام کور

نہال سنگھ کو بہت ہی الجھن ہو رہی تھی۔ سیاہ و سفید اور پتلی مونچھوں کا ایک گچھا اپنے منہ میں چوستے ہوئے وہ برابر دو ڈھائی گھنٹے سے اپنے جوان بیٹے بہادر کی بابت سوچ رہا تھا۔ نہال سنگھ کی ادھیڑ مگر تیز آنکھوں کے سامنے وہ کھلا میدان تھا جس پر وہ بچپن میں بنٹوں سے کبڈی تک تمام کھیل کھیل چکا تھا۔ کسی زمانے میں وہ گاؤں کا سب سے نڈر اور جیالا جوان تھا۔ کماد اور مکئی کے کھیتوں میں نے اس کئی ہٹیلی مٹیاروں کو کلائی کے ایک ہی جھٹکے سے اپنی مرضی کا تابع بنایا۔ تھوک پھینکتا تھا تو پندرہ گز دور جا کے گرتی تھی۔ کیا رنگیلا سجیلا جوان تھا۔ لہریا پگڑی باندھ کر اور ہاتھ میں چھوی لے کر جب میلے ٹیلے کو نکلتا تو بڑے بوڑھے پکار اٹھتے۔

”کسی کو سندر جاٹ دیکھنا ہے تو سردار نہال سنگھ کو دیکھ لے۔“

سندر جاٹ توڈاکو تھا۔ بہت بڑا ڈاکو جس کے گانے ابھی تک لوگوں کی زبان پر تھے لیکن نہال سنگھ ڈاکو نہیں تھا۔ اس کی جوانی میں دراصل کرپان کی سی تیزی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں اس پر مرتی تھیں۔ ہرنام کور کا قصہ تو ابھی گاؤں میں مشہور تھا کہ اس بجلی نے کیسے ایک دفعہ سردار نہال سنگھ کو قریب قریب بھسم کر ڈالا تھا۔ نہال سنگھ نے ہرنام کور کے متعلق سوچا تو ایک لحظے کے لیے اس کی ادھیڑ ہڈیوں میں بیتی ہوئی جوانی کڑ کڑا اٹھی۔ کیا تیلی چھمک جیسی نار تھی۔ چھوٹے چھوٹے لال ہونٹ جن کو وہ ہر وقت چوستی رہتی۔ ایک روز جب کہ بیریوں کے بیر پکے ہوئے تھے۔ سردار نہال سنگھ سے اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ زمین پر گرے ہوئے بیر چن رہی تھی اور اپنے چھوٹے چھوٹے لال ہونٹ چوس رہی تھی۔ نہال سنگھ نے آوازہ کسا۔ کیہڑے یار دا تتا ددھ پیتا۔ سڑ گیّاں لال بلّیاں؟ ہرنام کور نے پتھر اٹھایا اور تان کر اس کو مارا۔ نہال سنگھ نے چوٹ کی پروانہ کی اور آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ لیکن وہ بجلی کی سی تیزی سے مچھی کی طرح تڑپ کر الگ ہو گئی اور یہ جاوہ جا۔ نہال سگھ کو جیسے کسی نے چاروں شانے چت گرا دیا۔ شکست کا یہ احساس اور بھی زیادہ ہو گیا۔ جب یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ نہال سنگھ خاموش رہا۔ اس نے دوستوں دشمنوں سب کی باتیں سنیں پر جواب نہ دیا۔ تیسرے روز دوسری بار اس کی مڈ بھیڑ گوردوارہ صاحب سے کچھ دور بڑ کی گھنی چھاؤں میں ہوئی۔ ہرنام کور اینٹ پر بیٹھی اپنی گرگابی کو کیلیں اندر ٹھونک رہی تھی۔ نہال سنگھ کو پاس دیکھ کر وہ بدکی۔ پر اب کے اس کوئی پیش نہ چلی۔ شام کو جب لوگوں نے نہال سنگھ کو بہت خوش خوش اونچے سروں میں۔ فی ہرنام کورے، اونارے۔ گاتے سنا تو ان کو معلوم ہو گیا۔ کون سا قلعہ سر ہوا ہے۔ لیکن دوسرے روز نہال سنگھ زنا بالجبر کے الزام میں گرفتار ہوا اور تھوڑی سی مقدمے بازی کے بعد اسے چھ سال کی سزا ہو گئی۔ چھ سال کے بجائے نہال سنگھ کو ساڑھے سات کی قید بھگتنی پڑی۔ کیونکہ جیل میں اسکا دو دفعہ جھگڑا ہو گیا تھا۔ لیکن نہال سنگھ کو اس کی کچھ پروانہ تھی۔ قید کاٹ کر جب گاؤں روانہ ہوا اور ریل کی پٹڑی طے کر کے مختلف پگڈنڈیوں سے ہوا ہوا گوردوارے کے پاس سے گزر کر بڑ کے گھنے درخت کے قریب پہنچا تو اس نے کیا دیکھا کہ ہرنام کور کھڑی ہے۔ اور اپنے ہونٹ چوس رہی ہے۔ اس سے پیشتر کہ نہال سنگھ کچھ سوچنے یا کہنے پائے۔ وہ آگے بڑھی اور اس کی چوڑی چھاتی کے ساتھ چمٹ گئی۔ نہال سنگھ نے اس کو اپنی گود میں اٹھالیا اور گاؤں کے بجائے کسی دوسری طرف چل دیا۔ ہرنام کور نے پوچھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

نہال سنگھ نے نعرہ لگایا۔

”جو بولے سو نہال ست سری اکال۔“

دونوں کھکھلا کر ہنس پڑے۔ نہال سنگھ نے ہرنام کور سے شادی کر لی اور چالیس کوس کے فاصلے پر دوسرے گاؤں میں آباد ہو گیا۔ یہاں بڑی منتوں سے چھ برس کے بعد بہادر پیدا ہوا اور بیساکھی کے روز جب کہ وہ ابھی پورے ڈھائی مہینے کا بھی نہیں ہوا تھا۔ ہرنام کور کے ماتا نکلی اور وہ مر گئی۔ نہال سنگھ نے بہادر کی پرورش اپنی بیوہ بہن کے سپرد کر دی جس کی چار لڑکیاں تھیں چھوٹی چھوٹی۔ جب بہادر آٹھ برس کا ہوا تو نہال سنگھ اسے اپنے پاس لے آیا۔ چار برس ہو چلے تھے کہ بہادر اپنے باپ کی نگرانی میں تھا۔ شکل صورت میں وہ بالکل اپنی ماں جیسا تھا اسی طرح دبلا پتلا اور نازک۔ کبھی کبھی اپنے پتلے پتلے لال لال ہونٹ چوستا تو نہال سنگھ اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ نہال سنگھ کو بہادر سے بہت محبت تھی۔ چار برس اس نے بڑے چاؤ سے نہلایا دھلایا۔ ہر روز دہی سے خود اس کے کیس دھوتا۔ اسے کھلاتا۔ باہر سیر کے لیے لے جاتا۔ کہانیاں سناتا۔ ورزش کراتا مگر بہادر کو ان چیزوں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اداس رہتا۔ نہال سنگھ نے سوچا اتنی دیر اپنی پھوپھی کے پاس جو رہا ہے۔ اس لیے اداس ہے۔ چنانچہ پھر اس کو اپنی بہن کے پاس بھیج دیا اور خود فوج میں بھرتی ہو کر لام پر چلا گیا۔ چار برس اور گزر گئے۔ لڑائی بند ہوئی اور نہال سنگھ جب واپس آیا تو وہ پچاس برس کے بجائے ساٹھ باسٹھ برس کا لگتا تھا۔ اس لیے اس نے جاپانیوں کی قید میں ایسے دکھ جھیلے تھے کہ سن کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ اب بہادر کی عمر نہال سنگھ کے حساب کے مطابق سولہ کے لگ بھگ تھی مگر وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا چار برس پہلے تھا۔ دبلا پتلا۔ لیکن خوبصورت۔ نہال سنگھ نے سوچا کہ اس کی بہن نے بہادر کی پرورش دل سے نہیں کی۔ اپنی چار لڑکیوں کا دھیان رکھا جو بچھیریوں کی طرح ہر وقت آنگن میں کڈ کڑے لگاتی رہتی ہیں۔ چنانچہ جھگڑا ہوا اور وہ بہادر کو وہاں سے اپنے گاؤں لے گیا۔ لام پر جانے سے اس کے کھیت کھلیان اور گھر بار کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے نہال سنگھ نے ادھر دھیان دیا اور بہت ہی تھوڑے عرصہ میں سب ٹھیک ٹھاک کر لیا اس کے بعد اس نے بہادر کی طرف توجہ دی۔ اس کے لیے ایک بھوری بھینس خریدی۔ مگر نہال سنگھ کو اس بات کا دکھ ہی رہا کہ بہادر کو دودھ، دہی اور مکھن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جانے کیسی اوٹ پٹانگ چیزیں اسے بھاتی تھیں۔ کئی دفعہ نہال سنگھ کو غصہ آیا مگر وہ پی گیا۔ اس لیے کہ اسے اپنے لڑکے سے بے انتہا محبت تھی۔ حالانکہ بہادر کی پرورش زیادہ تر اس کی پھوپھی نے کی تھی مگر اس کی بگڑی ہوئی عادتیں دیکھ کر لوگ یہی کہتے تھے کہ نہال سنگھ کے لاڈ پیار نے اسے خراب کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم

عمر نوجوانوں کی طرح محنت مشقت نہیں کرتا۔ گو نہال سنگھ کی ہرگز خواہش نہیں تھی کہ اس کا لڑکا مزدوروں کی طرح کھیتوں میں کام کرے اور صبح سے لے کر دن ڈھلنے تک ہل چلائے۔ واہگوروجی کی کرپا سے اس کے پاس بہت کچھ تھا۔ زمینیں تھیں۔ جن سے کافی آمدن ہو جاتی تھی۔ سرکار سے جواب پنشن مل رہی تھی۔ وہ الگ تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی خواہش تھی۔ دلی خواہش تھی کہ بہادر کچھ کرے۔ کیا؟ یہ نہال سنگھ نہیں بتا سکتا تھا۔ چنانچہ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ بہادر سے کیا چاہتا ہے۔ مگر ہر بار بجائے اس کے کہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ اس کی بیتی ہوئی جوانی کے دن ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتے اور وہ بہادر کو بھول کر اس گزرے ہوئے زمانے کی یادوں میں کھو جاتا۔ لام سے آئے نہال سنگھ کو دو برس ہو چلے تھے۔ بہادر کی عمر اب اٹھارہ کے لگ بھگ تھی۔ اٹھارہ برس کا مطلب یہ ہے کہ بھرپور جوانی۔ نہال سنگھ جب یہ سوچتا تو جھنجھلا جاتا۔ چنانچہ ایسے وقتوں میں کئی دفعہ اس نے اپنا سر جھٹک کر بہادر کو ڈانٹا۔

”نام تیرا میں نے بہادر رکھا ہے۔ کبھی بہادری تو دکھا۔“

اور بہادر ہونٹ چوس کر مسکرا دیتا۔ نہال سنگھ نے ایک دفعہ سوچا کہ بہادر کی شادی کر دے۔ چنانچہ اس نے اِدھر اُدھر کئی لڑکیاں دیکھیں۔ اپنے دوستوں سے بات چیت بھی کی۔ مگر جب اسے جوانی یاد آئی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ نہیں، بہادر میری طرح اپنی شادی آپ کرے گا۔ کب کرے گا۔ یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کہ بہادر میں ابھی تک اس نے وہ چمک نہیں دیکھی تھی۔ جس سے وہ اندازہ لگاتا کہ اس کی جوانی کس مرحلے میں ہے۔ لیکن بہادر خوبصورت تھا۔ سندر جاٹ نہیں تھا۔ لیکن سندر ضرور تھا۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں، پتلے پتلے لال ہونٹ، ستواں ناک، پتلی کمر۔ کالے بھونرا ایسے کیس مگر بال بہت ہی مہین۔ گاؤں کی جوان لڑکیاں دور سے اسے گھور گھور کے دیکھتیں۔ آپس میں کانا پھوسی کرتیں مگر وہ ان کی طرف دھیان نہ دیتا۔ بہت سوچ بچار کے بعد نہال سنگھ اس نتیجے پر پہنچا۔ شاید بہادر کو یہ تمام لڑکیاں پسند نہیں اور یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ہر نام کور کی تصویر آ گئی۔ بہت دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کو ہٹا کر اس نے گاؤں کی لڑکیاں لیں۔ ایک ایک کر کے وہ ان تمام کو اپنی آنکھوں کے سامنے لایا مگر ہر نام کور کے مقابلے میں کوئی بھی پوری نہ اتری۔ نہال سنگھ کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔

”بہادر میرا بیٹا ہے۔ ایسی ویسیوں کی طرف تو وہ آنکھ اٹھا بھی نہیں دیکھے گا۔“

دن گزرتے گئے۔ بیریوں کے بیر کئی دفعہ پکے۔ مکئی کے بوٹے کھیتوں میں کئی دفعہ نہال سنگھ کے قد کے برابر جوان ہوئے۔ کئی ساون آئے مگر بہادر کی یاری کسی کے ساتھ نہ لگی اور نہال سنگھ کی الجھن پھر بڑھنے لگی۔ تھک ہار کر نہال سنگھ دل میں ایک آخری فیصلہ کر کے بہادر کی شادی کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک گڑبڑ شروع ہو گئی۔ بھانت بھانت کی خبریں گاؤں میں دوڑنے لگیں۔ کوئی کہتا انگریز جا رہا ہے۔ کوئی کہتا روسیوں کا راج آنے والا ہے۔ ایک خبر لاتا کانگرس جیت گئی ہے۔ دوسرا کہتا نہیں ریڈیو میں آیا ہے کہ ملک بٹ جائے گا۔ جتنے منہ، اتنی باتیں۔ نہال سنگھ کا تو دماغ چکرا گیا۔ اسے ان خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو اسے اس جنگ سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس میں وہ پورے چار برس شامل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آرام سے بہادر کی شادی ہو جائے اور گھر میں اس کی بہو آ جائے۔ لیکن ایک دم جانے کیا ہوا۔ خبر آئی کہ ملک بٹ گیا ہے۔ ہندو مسلمان الگ الگ ہو گئے ہیں بس پھر کیا تھا چاروں طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ چل چلاؤ شروع ہو گیا اور پھر سننے میں آیا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے جا رہے ہیں۔ سینکڑوں لڑکیاں اغواء کی جا رہی ہیں۔ لاکھوں کا مال لوٹا جا رہا ہے۔ کچھ دن گزر گئے تو پکی سڑک پر قافلوں کا آنا جانا شروع ہوا۔ گاؤں والوں کو جب معلوم ہوا تو میلے کا سماں پیدا ہو گیا۔ لوگ سو سو، دو دو سو کی ٹولیاں بنا کر جاتے۔ جب لوٹتے تو ان کے ساتھ کئی چیزیں ہوتیں۔ گائے، بھینس، بکریاں، گھوڑے، ٹرنک، بستر اور جوان لڑکیاں۔ کئی دنوں سے یہ سلسلہ جاری تھا۔ گاؤں کا ہر جوان کوئی نہ کوئی کارنامہ دکھا چکا تھا حتیٰ کہ کھیا کانا ٹا اور کبڑا لڑکا دریام سنگھ بھی۔ اس کی پیٹھ پر بڑا کوہان تھا۔ ٹانگیں ٹیڑھی تھیں، مگر یہ بھی چار روز ہوئے پکی سڑک پر سے گزرنے والے ایک قافلے پر حملہ کر کے ایک جوان لڑکی اٹھا لایا تھا۔ نہال سنگھ نے اس لڑکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خوبصورت تھی۔ بہت ہی خوبصورت تھی۔ لیکن نہال سنگھ نے سوچا کہ ہر نام کور جتنی خوبصورت نہیں ہے۔ گاؤں میں کئی دنوں سے خوب چہل پہل تھی۔ چاروں طرف جوان شراب کے نشے میں دھت بولیاں گاتے پھرتے تھے۔ کوئی لڑکی بھاگ نکلتی تو سب اس کے پیچھے شور مچاتے دوڑتے کبھی لوٹے ہوئے مال پر جھگڑا ہو جاتا تو نوبت مرنے مارنے پر آ جاتی۔ چیخ و پکار تو ہر گھڑی سنائی دیتی تھی۔ غرضیکہ بڑا مزیدار ہنگامہ تھا۔ لیکن بہادر خاموش گھر میں بیٹھا رہتا۔ شروع شروع میں تو نہال سنگھ بہادر کی اس خاموشی کے متعلق بالکل غافل رہا۔ لیکن جب ہنگامہ اور زیادہ بڑھ گیا اور لوگوں نے مذاقیہ لہجے میں اس سے کہنا شروع کیا

”کیوں سردار نہال سیاں، تیرے بہادر نے سنا ہے بڑی بہادریاں دکھائی ہیں؟“

تو وہ پانی پانی ہو گیا۔ چوپال پر ایک شام کو یرقان کے مارے ہوئے حلوائی بشیشر نے دون کی پھینکی اور نہال سنگھ سے کہا۔

”دو تو میرا گنڈا سنگھ لایا ہے۔ ایک میں لایا ہوں بند بوتل، اور یہ کہتے ہوئے بشیشر نے زبان سے پٹاخے کی آواز پیدا کی جیسے بوتل میں سے کاگ اڑتا ہے۔

”نصیبوں والا ہی کھولتا ہے ایسی بند بوتلیں سردار نہال سیاں۔“

نہال سنگھ کا جی جل گیا۔ کیا تھا بشیشر اور کیا تھا گنڈا سنگھ ؟ ایک یرقان کا مارا ہوا، دوسرا تپ دق کا۔ مگر جب نہال سنگھ نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ کیونکہ جو کچھ بشیشر نے کہا حقیقت تھی۔ بشیشر اور اس کا لڑکا گنڈا سنگھ کیسے بھی تھے۔ مگر تین جوان لڑکیاں، ان کے گھر میں واقعی موجود تھیں اور چونکہ بشیشر کا گھر اس کے پڑوس میں تھا۔ اس لیے کئی دنوں سے نہال سنگھ ان تینوں لڑکیاں کے مسلسل رونے کی آواز سن رہا تھا۔ گوردوارے کے پاس ایک روز دو جوان باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

”نہال سنگھ کے بارے میں تو بڑی باتیں مشہور ہیں۔“

”ارے چھوڑ۔ بہادر تو چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا ہے۔“

نہال سنگھ سے اب نہ رہا گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے بہادر کو بہت غیرت دلائی اور کہا۔

”تو نے سنا لوگ کیا کہتے پھرتے ہیں۔ چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا ہے تو۔ قسم واہگورو جی کی، تیری عمر کا تھا تو سینکڑوں لڑکیاں میری ان ٹانگوں۔“

نہال سنگھ ایک دم خاموش ہو گیا۔ کیونکہ شرم کے مارے بہادر کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ باہر نکل کر وہ دیر تک سوچتا چلا گیا اور سوچتا سوچتا کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اس کی ادھیڑ مگر تیز آنکھوں کے سامنے وہ کُھلا میدان تھا۔ جس پر برنٹوں سے لے کر کبڈی تک تمام کھیل کھیل چکا تھا۔ بہت دیر تک نہال سنگھ اس نتیجے پر پہنچا کہ بہادر شرمیلا ہے اور یہ شرمیلا پن اس میں غلط پرورش کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں اپنی بہن کو بہت گالیاں دیں اور فیصلہ کیا کہ بہادر کے شرمیلے پن کو کسی نہ کسی طرح توڑا جائے اور اس کے لیے نہال سنگھ کے ذہن میں ایک ہی ترکیب آئی۔ خبر آئی کہ رات کو کچی سڑک پر سے ایک قافلہ گزرنے والا ہے۔ اندھیری رات تھی۔ جب گاؤں سے ایک ٹولی اس قافلے پر حملہ کرنے کیلیے نکلی تو نہال سنگھ بھی ٹھاٹھا باندھ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ حملہ ہوا۔ قافلے والے نہتے تھے۔ پھر بھی تھوڑی سی جھپٹ ہوئی۔ لیکن فوراً ہی قافلے والے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ حملہ کرنیوالی ٹولی نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ لیکن نہال سنگھ کو مال و دولت کی خواہش نہیں تھی۔ وہ کسی اور ہی چیز کی تاک میں تھا۔ سخت اندھیرا تھا گو گاؤں والوں نے مشعلیں روشن کی تھیں مگر بھاگ دوڑ اور لوٹ کھسوٹ میں بہت سی بجھ گئی تھیں۔ نہال سنگھ نے اندھیرے میں کئی عورتوں کے سائے دوڑتے دیکھے مگر فیصلہ نہ کر سکا کہ ان میں سے کس پر ہاتھ ڈالے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور لوگوں کی چیخ و پکار مدھم پڑنے لگی تو نہال سنگھ نے بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑنا شروع کیا۔ ایک دم تیزی سے ایک سایہ بغل میں گٹھڑی دبائے اس کے سامنے سے گزرا۔ نہال سنگھ نے اس کا تعاقب کیا۔ جب پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی ہے اور جوان۔ نہال سنگھ نے فوراً اپنے گاڑھے کی چادر نکالی اور اس پر جال کی طرح پھینکی۔ وہ پھنس گئی۔ نہال سنگھ نے اسے کاندھوں پر اٹھا لیا اور ایک ایسے راستے سے گھر کا رخ کیا کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ مگر گھر پہنچا تو بتی گُل تھی۔ بہادر اندر کوٹھری میں سو رہا تھا۔ نہال سنگھ نے اسے جگانا مناسب خیال نہ کیا۔ کواڑ کھولا۔ چادر میں سے لڑکی نکال کر اندر دھکیل، باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ پھر زور زور سے کواڑ پیٹے۔ تاکہ بہادر جاگ پڑے۔ جب نہال سنگھ نے مکان کے باہر کھٹیا بچھائی۔ اور بہادر اور اس لڑکی کی مڈبھیڑ کی کپکپاہٹ پیدا کرنے والی باتیں سوچنے کیلیے لیٹنے لگا تو اس نے دیکھا کہ بہادر کی کوٹھڑی کے روشن دانوں میں دیے کی روشنی ٹمٹما رہی ہے۔ نہال سنگھ اچھل پڑا۔ اور ایک لحظے کیلیے محسوس کیا کہ وہ جوان ہے۔ کماد کے کھیتوں میں مٹیاروں کو کلائی سے پکڑنے والا نوجوان۔ ساری رات نہال سنگھ جاگتا رہا اور طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا۔ صبح جب مُرغ بولنے لگے تو وہ اٹھ کر کوٹھڑی میں جانے لگا۔ مگر ڈیوڑھی سے لوٹ آیا۔ اس نے سوچا کہ دونوں تھک کر سو چکے ہوں گے اور ہو سکتا ہے۔ نہال سنگھ کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی اور وہ کھاٹ پر بیٹھ کر مونچھوں کے بال منہ میں ڈال کر چوسنے اور مسکرانے لگا۔ جب دن چڑھ گیا اور دھوپ نکل آئی تو اس نے اندر جا کر کنڈی کھولی۔ سٹرپٹر کی آوازیں سی آئیں۔ کواڑ کھولے تو اس نے دیکھا کہ لڑکی چارپائی پر کیسری دوپٹہ اوڑھے بیٹھی ہے۔ پیٹھ اس کی طرف تھی۔ جس پر یہ موٹی کالی چٹیا سانپ کی طرح لٹک رہی تھی۔ جب نہال سنگھ نے کوٹھڑی کے اندر قدم رکھا تو لڑکی نے پاؤں اوپر اٹھا لیے اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ طاق میں دیا ابھی تک جل رہا تھا۔ نہال سنگھ نے پھونک مار کر اسے بجھایا اور دفعتہً اسے بہادر کا خیال آیا۔ بہادر کہاں ہے ؟۔ اس نے کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ دو قدم آگے بڑھ کر اس نے لڑکی سے پوچھا۔

”بہادر کہاں ہے ؟“

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک دم سٹرپٹر سی ہوئی اور چارپائی کے نیچے سے ایک اور لڑکی نکلی۔ نہال سنگھ ہکّا بکّا رہ گیا۔ لیکن اس نے دیکھا۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ جو لڑکی چارپائی سے نکل کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر دوڑ گئی تھی۔ اس کے داڑھی تھی، منڈی ہوئی داڑھی۔ نہال سنگھ چارپائی کی طرف بڑھا لڑکی جو کہ اس پر بیٹھی تھی اور زیادہ سمٹ گئی مگر نہال سنگھ نے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اس کا منہ اپنی طرف کیا۔ ایک چیخ نہال سنگھ کے حلق سے نکلی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”ہرنام کور“!

زنانہ لباس، سیدھی مانگ، کالی چٹیا۔ اور بہادر ہونٹ بھی چوس رہا تھا۔

والد صاحب

توفیق جب شام کو کلب میں آیا تو پریشان سا تھا۔ دو بار ہارنے کے بعد اس نے جمیل سے کہا۔

”لو بھئی میں چلا۔“

جمیل نے توفیق کے گورے چٹے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔

”اتنی جلدی؟“

ریاض نے تاش کی گڈی کے دو حصے کر کے انھیں بڑے ماہر انداز میں پھینٹنا شروع کیا۔ اسکی نگاہیں تاش کے پھڑ پھڑاتے پتوں پر تھیں۔ لیکن روئے سخن توفیق کی طرف تھا۔ توفی، آج تم پریشان ہو۔ خلاف معمول اوپر تلے دو بار ہارے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج شام کو ہسپتال میں نرس مارگرٹ نے تمہارے رومانس کو پوٹا سیم برومائڈ پلا دیا۔“

جمیل نے ایک بار پھر غور سے توفیق کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”کیوں توفی آج ٹمپریچر کیسا رہا؟“

نصیر اپنی کرسی پر سے اٹھا۔ توفیق کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ نکالا۔ اور زور کا کش لے کر کہنے لگا سب بکواس ہے۔ توفی نے آج تک جتنے رومانس لڑائے ہیں۔ سب بکواس تھے۔ یہ نرس مارگرٹ کا قصہ تو بالکل من گھڑت ہے۔ مری کی ٹھنڈی ہواؤں سے یہاں لاہور کی گرمیوں میں آنے کے باعث سرسام ہو گیا ہے۔“

توفیق اٹھ کھڑا ہوا

”بکو نہیں“!

نصیر ہنسا

”اگر نہیں ہوا تو آج کل میں ہو جائے گا۔ بتاؤ تمہارے ابا کب تک ہسپتال میں رہیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ توفیق کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ توفیق نے اپنے کلف لگے ململ کے کرتے کی ڈھیلی آستینوں کو اوپر چڑھا دیا اور جمیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا

”چلو چلیں۔ میری طبیعت یہاں گھبرا رہی ہے۔“

جمیل اٹھا

”بھئی توفی، تم کوئی بات چھپا رہے ہو۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔“

”گڑبڑ کچھ نہیں۔ نصیر کی بکواس سے کون ہے جس کی طبیعت نہیں گھبراتی۔ توفیق نے جیب سے باجا نکالا اور منہ کے ساتھ لگا کر بجانا شروع کر دیا۔ نصیر نے اپنی ٹانگیں میز پر پھیلا دیں اور زور سے کہا

”بکواس ہے۔ سب بکواس ہے۔ یہ دھن جو تم بجا رہے ہو رشید عطرے کی ہے۔ اور رشید عطرے کی کوئی دھن سن کر آج تک کوئی اینگلو انڈین یا کرسیچین نرس بے ہوش نہیں ہوئی۔ بہتر ہو گا اگر تم رومال پر تھوڑا سا کلوروفام چھڑک کر لے جاؤ۔“

ریاض نے تاش کی گڈی رکھ دی اور نصیر کی ٹانگیں ایک طرف ریل دیں۔

”کچھ بھی ہو۔ لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ توفی جہاں اپنی گاڑی کا ہارن بجائے تو لڑکیاں سن کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔“

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبائی

”اور سائیکل کی گھنٹی بجائے تو آسمان سے فرشتے اترنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ اسکی کھانسی کی آواز سن کر باغِ جناح کی ساری بلبلیں اپنی نغمہ سرائی بھول گئی تھیں۔ بڑا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ماسٹر غلام حیدر نے پورا ایک مہینہ ان کو ریہرسل کرائی۔ تب جا کر وہ کہیں ٹوں ٹاں کرنے لگیں۔“

توفیق کے سوا باقی سب ہنسنے لگے۔ نصیر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ اٹھ کر توفیق کے پاس آ گیا۔ اس کے کلف لگے ململ کے کرتے کی ایک شکن درست کی اور کہا۔

”مذاق برطرف۔ لو اب بتاؤ ہسپتال کی لونڈیا سے تمہارا معاملہ کہاں تک پہنچا؟۔ میں تو سمجھتا ہوں وہیں کا وہیں ہو گا۔ ایک شریف آدمی اپنڈے سائٹس کا آپریشن کرائے پڑا ہے۔ مقررہ اوقات پر یہ تمہاری نرس صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ جناب صرف ایک دفعہ صبح اور ایک دفعہ شام وہاں جا سکتے ہیں۔ مریض، اور وہ بھی قبلہ والد صاحب۔ وہ مریض اپنڈے سائٹس اور تم مریض عشق۔“

ریاض نے قریب قریب گا کر کہا۔

”مریضِ عشق پر رحمت خدا کی۔“

نصیر کی رگِ مذاق پھڑک اٹھی۔ اور مریضِ عشق پر جب خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ تو وہ بینڈ ماسٹر بن جاتا ہے۔ آج توفی کا منہ باجا بجا رہا ہے۔ خدا کی رحمت شاملِ حل رہی تو کل سیکسو فون بجائے گا۔ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ دوسرے مریضانِ عشق شامل ہو جائیں گے۔ پھر یہ براتوں کے ساتھ منہ میں کلارنٹ دبائے فلمی ٹیونیں بجایا کرے گا۔ ہیرا منڈی سے گزرتے ہوئے اس کی کلارنٹ کا منہ اونچا ہو جایا کرے گا۔ گال دھونکنی کی طرح پھولیں گے۔ گلے کی رگیں ابھر آئینگی۔ اور رنڈیاں کوٹھوں پر سے اس پر رحمت خداوندی کے پھول برسائیں گی“

توفیق تنگ آ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر نصیر سے کہنے لگا

”خدا کے لیے یہ بھانڈپنا بند کرو۔“

نصیر نے جمیل کی طرف دیکھا

”لو صاحب ہم بھانڈ ہو گئے۔ دنیا بھر کی نقلیں یہ اتاریں۔ زمانے بھر کی خرافات یہ بکیں۔ اور بھانڈ ہم کہلائیں۔ یہ تو آج انھیں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے دیکھ کر میں نے چھیڑ خانی شروع کر دی کہ شائد اسی حیلے اُکسیں، منہ سے بولیں۔ سر سے کھیلیں۔ ورنہ جائے استاد خالی است، کجا دام رام کجا ٹیں ٹیں“

یہ کہہ کر اس نے توفیق کے کلف لگے ململ کے کُرتے کی شکن درست کی

”بھئی توفیق ذرا چہکو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“

توفیق نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ ایک سلگایا اور کش لیتا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر سے تاش کی گڈی اٹھائی اور پیشنیں کھیلنے لگا۔ لیکن نصیر نے لپک کر پتے اٹھا لیے۔

”یہ بڈھے جرنیلوں کا کھیل ہے جو زندگی میں کئی بار اپنی تمام کشتیاں جلا چکے ہوں۔ تم اتنے مایوس کیوں ہو گئے ہو۔ مارگرٹ نہ سہی کوئی اور سہی۔“

یہ کہہ کر وہ جمیل اور ریاض سے مخاطب ہوا۔

”یارو بتاؤ یہ فنالہ کون ہے؟۔ خوبصورت ہے؟۔ چندے آفتاب چندے مہتاب ہے؟۔ پانی پیتی ہے تو گردن میں سے دکھائی دیتا ہے؟“

جمیل توفیق کے پاس بیٹھ گیا، وہ فارسی کا محاورہ ہے۔ لیلی بنظرِ مجنوں باید دید۔ مارگرٹ بنظرِ توئی باید دید۔ کیوں توفی؟“

توفیق خاموش رہا۔

”میں پوچھتا ہوں، خوبصورت ہے؟۔ اس کے بدن سے آنڈو فارم کی بھینی بھینی بو آتی ہے؟۔ اسکی گردن دیکھ کر گردن توڑ بخار ہوتا ہے یا نہیں؟“

نصیر یہ کہتا کہتا میز پر بیٹھ گیا۔

”مینڈکیوں کو جو زکام ہوتا ہے اس کا علاج تو وہ ضرور جانتی ہو گی۔ خدا کے لیے مجھ اس سے ملاؤ۔ ورنہ مجھ پر ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگیں گے۔“

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا۔

”ریاض اس کو کئی مرتبہ دیکھ چکا ہے۔“

”ریاض کے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کو تو اندھ عورتا ہے۔“

نصیر مسکرایا۔

”جمیل نے پوچھا یہ اندھ عورتا کیا ہے؟“

نصیر نے ریاض کے چشمہ لگے چہرے کو گھور کے دیکھا اور جمیل کو جواب دیا۔

”جناب یہ ایک بیماری کا نام ہے۔ اس کے مریض عورتوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ چاہے اصلی پتھر کا چشمہ لگائیں۔“

ریاض مسکرا دیا۔ شاید اسی لیے مجھے مارگرٹ میں وہ حسن نظر نہ آیا۔ جس کی تعریف میں توفی نے زمین و آسمان کے قلابے ملا رکھے تھے۔ توفیق نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر ریاض سے صرف اتنا پوچھا

”کیا وہ حسین نہیں تھی؟“

ریاض نے جواب دیا۔

”ہرگز نہیں۔ صاف ستھری لڑکی البتہ ضرور ہے۔“

”لانڈری سے تازہ تازہ آئی ہوئی شلوار کی طرح؟

”نصیر ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ریاض بول پڑا۔

”ہاں یار۔ ایک لڑکی اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ ان کپڑوں میں اچھی لگتی تھی۔ میں اور توفی موٹر میں تھے۔ توفی ڈرائیو کر رہا تھا۔ موٹر ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو اسٹیئرنگ توفی کے ہاتھوں کے نیچے پھسلا۔ لڑکی دیکھ کر ہمیشہ اسکی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے سامنے دیکھا تو وہ شلوار قمیض پہنے مٹکتی چلی آ رہی تھی۔ توفی نے موٹر عین اسکے پاس روکی اور کہا۔ گڈ مورننگ۔ وہ مسکرائی۔ لکھنوی انداز سے دایاں ہاتھ ماتھے تک لے گئی۔ اور کہا۔ آداب عرض۔ جیسا لباس ویسی بولی۔ لونڈیا ہے چالاک۔ توفی ابھی کوئی فقرہ موزوں کر رہا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے مگر تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ توفی نے فقرے کو چوڑا اور سینے پر دو ہتڑ مار کر کہا۔ مار ڈالا۔ اتنے میں مارگرٹ کا عکس بیک ویو مرر میں نمودار ہوا۔ توفی نے بڑے تھیٹری انداز میں ایک عدد چما اس کی طرف پھینکا اور موٹر اسٹارٹ کر دی۔“

تمہاری اس گفتگو سے ثابت کیا ہوا؟ نصیر نے اپنے گھنگھریالے بالوں کا ایک گچھا مروڑتے ہوئے کہا۔ بات یہ ہے کہ جب تک یہ خاکسار بقلمِ خود اس لونڈیا کو نہیں دیکھے گا کچھ بھی ثابت نہیں ہو گا۔ جھوٹ بولوں تو توفی ہی کا منہ کالا ہو۔“

توفیق خاموش سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ جمیل نے اپنی کرسی ذرا آگے بڑھائی اور ریاض سے پوچھا۔

”اچھا بھئی یہ بتاؤ توفی نے کبھی اسے موٹر کی سیر نہیں کرائی۔“

ریاض نے جواب دیا

”ایک دفعہ اس نے کہا تھا تو اس سے مجھے یاد نہیں رہا۔ اس نے کیا جواب دیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ توفی کو کھل کے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ ٹمپریچر لینے یا ٹیکہ لگانے کے لیے آتی ہے تو باپ کی موجودگی میں یہ اس سے کیا بات کر سکتا ہے۔ پھر بھی اشاروں کنایوں میں کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ ادائیں آج صرف اسی لیے ہیں کہ اس کے ابا جان دو تین دنوں ہسپتال چھوڑنے والے ہیں کیونکہ زخم اب بالکل بھر چکا ہے۔ کیوں توفی؟“

توفیق نے صرف اتنا کہا۔

”مجھے ستاؤ نہیں یار۔“

اور اٹھ کر باہر باغ میں چلا گیا۔ نصیر نے اپنی ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑی اور چہرے پر گہری فکرمندی کے نشانات پیدا کر کے کہا۔

”کہیں لمڈے کو اِسک تو نہیں ہو گیا۔“

”توفی اور عشق۔ دو متضاد چیزیں ہیں۔“

ریاض کرسی پر سے اٹھا۔ اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”کوئی اور ہی چیز ہوئی ہے جناب کو۔ میرا خیال ہے لاہور میں اس کا جی لگ گیا تھا۔ والد ٹھیک ہو گئے ہیں تو اب اسے واپس مری جانا پڑے گا۔“

”بکواس ہے“

نصیر چلایا

”کوئی اور ہی بات ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی دریافت کر کے آتا ہوں۔“

نصیر اٹھ کر باہر چلنے لگا تو جمیل نے اس سے پوچھا۔

”کس سے دریافت کرنے چلے ہو۔“

نصیر مسکرایا۔ گھوڑے کے منہ سے۔ انگریزی میں فروم دی ہارس ماؤتھ“!

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے پوچھا۔ ہاں بھئی ریاض، یہ سلسلہ کیا ہے۔ توفی ایک دن بہت تعریف کر رہا تھا۔ اس مارگرٹ کی۔ کہتا تھا کہ معاملہ پٹا سمجھو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہی ہو گا۔ میرا مطلب ہے ایسا کون سا چتوڑ گڑھ کا قلعہ یہ جو توفی کو سر کرنا ہے۔ ایک دن کورس ڈور میں کافی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے؟“

”کیا؟“

”میں نے پاکٹ بک میں نوٹ کی ہوئی ہیں۔ کسی روز پڑھ کے تمہیں سناؤں گا“

جمیل کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”مذاق کرتے ہو یار۔ سناؤ۔ کوئی اور بات سناؤ۔ میرا مطلب ہے، یہ بتاؤ کہ میں کبھی اس نرس کو دیکھ سکتا ہوں۔“

”جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ ہسپتال چلے جاؤ، فیملی وارڈ میں تمہیں نظر آجائے گی۔ لیکن کیا کرو گے دیکھ کہ تمہارا قد بہت چھوٹا ہے۔ وہ تم سے پوری ایک بالشت اونچی ہے۔“

اس قد نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ بہتیرے علاج کروا چکا ہوں۔ ایک سوئی برابر اونچا نہیں ہوا۔ اچھا، میں نے کہا، ریاض۔ باپ کی موجودگی میں توفی اس سے اشارے بازی کیسے کرتا ہو گا۔ نہیں، لڑکا ہوشیار ہے“!

ریاض نے تاش کی گڈی اٹھائی اور پتے پھینٹنے شروع کیے

”اچھی خاصی مصیبت ہے۔ ہر وقت یہی دھڑکا کہ والد دیکھ نہ لے، تاڑ نہ جائے۔ کہتا تھا جونہی ان کی نگاہیں میری طرف اٹھتی تھیں، میں نظریں نیچی کر لیتا تھا۔ جب وہ آتی تھی تو دس پندرہ منٹوں میں غریب کو صرف تین چار موقعے آنکھ لڑانے کو ملتے تھے۔“

جمیل نے پوچھا۔

”ڈی ایس پی ہیں نا توفی کے ابا جان“

”ہاں بھائی۔ باپ ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ اوپر سے ڈی ایس پی۔“

جمیل نے آہ بھری۔

”میرے تمام رومانس غارت کرنے والے میرے ابا جان ہیں۔ حج سے پہلے ان کی غارت گردی اتنے زوروں پر نہ تھی، پر جب سے آپ خانہ کعبہ سے واپس تشریف لائے ہیں۔ آپ کی غارت گردی عروج پر ہے۔ سوچتا ہوں شادی کر لوں۔ ایک لڑکا پیدا کروں اور بیٹھا اس سے اپنا انتقام لیتا رہوں۔“

ریاض مسکرایا۔

”حج کرنے جاؤ گے ؟“

”ایک نہیں دس دفعہ۔ صاحب زادے کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے میز پر زور سے مکا مارا۔ آواز کے ساتھ ہی نصیر داخل ہوا۔ ریاض اور جمیل دونوں اسکی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ نصیر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ جمیل کے دماغ میں کُھد بُد ہونے لگی۔

”کچھ دریافت کیا؟“

”سب کچھ“

نصیر کا جواب مختصر تھا۔ ریاض نے پوچھا

”توفی کہاں ہے ؟“

نصیر نے جواب دیا۔

”چلا گیا ہے“

”کہاں“

یہ سوال ریاض نے کیا۔

”واپس مری۔“

نصیر کا یہ جواب سن کر ریاض اور جمیل دونوں بیک وقت بولے

”مری واپس“

”جی ہاں۔ مری واپس چلا گیا ہے۔“

اپنی موٹر میں۔ ہسپتال سے سیدھا یہاں کلب آیا۔ یہاں سے سیدھا مری روانہ ہو گیا ہے۔ نصیر نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔ جمیل بے چین ہو گیا۔

”آخر ہوا کیا؟“

نصیر نے جواب دیا۔

”حادثہ“!

جمیل اور ریاض دونوں بولے

"کیسا حادثہ؟"

"بتاتا ہوں"

یہ کہہ کر نصیر نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی جس میں کوئی سگریٹ نہیں تھا۔ ڈبیا ایک طرف پھینک کر وہ ریاض اور جمیل سے مخاطب ہوا۔

"معاملہ بہت سنگین ہے؟"

جمیل نے ریاض سے کہا۔

"میرا خیال ہے توفی پکڑا گیا ہو گا"!

ریاض نے کہا

"معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔ آدمی کب تک کسی کی آنکھوں میں دُھول جھونک سکتا ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی ہے۔ فوراً تاڑ گیا ہو گا۔ لیکن نصیر تم بتاؤ۔ توفی نے تم سے کیا کہا۔"

"بتاتا ہوں۔ ایک سگریٹ دینا جمیل"

جمیل نے اس کو ایک سگریٹ دیا اسے سلگا کر اس نے بات شروع کی، باپ کی موجودگی میں اس کی نرس سے اشارہ بازی ہوتی تھی۔ یہ تم لوگوں کو معلوم ہے۔ یہ سلسلہ اشارے بازی کا بہت دنوں سے جاری تھا۔ توفی اس میں خاصا کامیاب رہا تھا۔ باپ کی موجودگی کے باعث اسے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا وہ ذرا گردن گھماتے تو یہ فوراً اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا۔ ان دقتوں کے باوجود اس نے لڑکی سے ربط بڑھا ہی لیا۔ اور ڈیوٹی کے روز شام کو وہ اسے ایک مرتبہ سینما بھی لے گیا۔"

جمیل گٹکا

"واہ"!

ریاض نے کہا۔

"مجھ سے اُس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

نصیر نے سگریٹ کا کش لیا۔

"سینما میں وہ خوب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔ نرس کو توفی کا چنچل پنا بہت پسند آیا۔ پرسوں کی ملاقات میں آج کی شام طے ہوئی کہ وہ توفی کے ساتھ دور تک موٹر میں سیر کرنے چلے گی۔ اور توفی اپنی عادت سے مجبور ہو کر اگر کوئی شرارت کرنا چاہے گا تو وہ بُرا نہیں مانے گی۔"

جمیل پھر گٹکا

"واہ"!

ریاض نے اسے ٹوکا۔

"خاموش رہو جمیل۔"

نصیر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔

"پرسوں کی ملاقات میں جو کچھ طے ہوا تھا، میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ توفی بہت خوش تھا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ ایک بہت بڑا میدان مارنے والا تھا۔ آج دن بھر وہ اسکیمیں بناتا رہا۔ پٹرول کا انتظام اس نے کر لیا۔ کرم الٰہی نے اسے چھ کوپن دے دیے تھے۔ اسی کی پرمٹ پر بیئر کی چھ بوتلیں بھی حاصل کر لی تھیں جو غالباً ابھی تک امتیاز کے فرجڈیئر میں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ توفی کی اسکیم یہ تھی کہ چنیوٹ کے پل تک چلیں گے۔ حسن و عشق کے دریا چناب کی لہریں ہوں گے۔ موسم بھی خوشگوار ہو گا۔ گلاس راستے میں خرید لیں گے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر اڑے گی۔ خوب سرور جمیں گے۔ لیکن۔"

یہ کہہ کر نصیر ایک دم خاموش ہو گیا۔ جمیل نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"سارا معاملہ غارت ہو گیا؟"

نصیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سارا معاملہ غارت ہو گیا۔"

جمیل نے اور زیادہ بے چین ہو کر پوچھا۔

”کیسے ؟“

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبائی اور کہا

”پروگرام یہ تھا کہ وہ شام کو چھ بجے ہسپتال جائے گا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنے باپ کے پاس بیٹھے گا۔ اس دوران میں جب مارگرٹ آئے تو وہ سیر کی بات پکی کرلے گا۔ بات پکی ہو جائے گی تو وہ سیدھا امتیاز کے ہاں جائے گا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے گا۔ بیئر کی ایک بوتل پیے گا۔ باقی پانچ موٹر میں رکھے اور جو جگہ مقرر ہوئی ہوگی وہاں مارگرٹ سے جاملے گا۔ دل و دماغ سخت بے چین تھا۔ گھر سے وقت سے کچھ پہلے ہی نکل آیا۔ ہسپتال پہنچا۔ موٹر ایک طرف کھڑی کی۔ وارڈ کی طرف چلا۔ سیڑھیاں طے کیں اوپر پہنچا۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہے۔“

نصیر ایک دم رک گیا۔ جمیل اور ریاض دونوں بیک وقت بولے

”کیا دیکھتا ہے۔؟“

”دیکھتا ہے کہ۔ ٹھہرو“

نصیر تھوڑی دیر کے لیے رکا۔

”میں توفی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماگرٹ پلنگ پر جُھکی ہوئی ہے اور والد صاحب۔ اور والد صاحب اس کے ہونٹ چوس رہے ہیں۔“

جمیل اور ریاض قریب قریب اچھل پڑے

”سچ ؟“

نصیر نے جواب دیا۔

”دروغ بر گردنِ راوی“

جمیل جس کے دل و دماغ پر حیرت مسلط تھی بڑبڑایا

”کمال کر دیا۔ ڈی ایس پی صاحب نے۔“

ریاض نے نصیر سے پوچھا۔

”توفی نے کیا کیا؟“

نصیر نے جواب دیا۔

”آنکھیں نیچی کرلیں اور چلا آیا۔“

جمیل، ریاض سے مخاطب ہوا

”میرے والد صاحب قبلہ کبھی ایسے نظارے کا موقعہ دیں تو مزا آجائے۔ پتہ نہیں توفی کیوں اس قدر پریشان تھا؟“

نصیر نے کہا

”توفی کی والدہ صاحبہ اُس کے ساتھ تھیں۔ توفی نے مجھ سے کہا میں تو نظریں نیچی کر کے چلایا۔ لیکن امی جان دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔ جمیل نے پر افسوس لہجے میں کہا۔

”قبلہ والد صاحب کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی“!

2جون1950

وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے

حوا کی ایک بیٹی کے چند خطوط جو اس نے فرصت کے وقت محلے کے چند لوگوں کو لکھے۔ مگر اُن وجوہ کی بنا پر پوسٹ نہ کیے گئے جو اِن خطوط میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ (نام اور مقام فرضی ہیں) پہلا خط مسز کرپلانی کے نام خاتونِ مکّرم آداب عرض۔ معاف فرمایئے گا۔ میں یہ سطور بغیر تعارف کے لکھ رہی ہُوں۔ مگر مجھے چند ضروری باتیں آپ سے کہنا ہیں۔ آپ کو میں ایک عرصے سے جانتی ہُوں۔ ہر روز صبح ساڑھے آٹھ بجے جب میں بستر سے اُٹھ کر بالکنی میں آتی ہُوں۔ تو آپ کو بازار میں سیر سے واپس آتے دیکھا کرتی ہوں۔ مجھے تعجب ہے کہ مسٹر

کرپلانی جنھیں ساڑھے آٹھ بجے گھر سے دفتر پہنچنے کے لیے نکل جانا ہوتا ہے۔ صرف ایک بڑھی نوکرانی کی موجودگی اور آپکی غیر حاضری میں ناشتہ کیسے کرتے ہیں، کپڑے کیوں کر تبدیل کرتے ہیں اور پھر آپکا بچہ بھی تو ہے۔ اس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیر آپ کی صحت کے لیے مفید ہے۔ مگر اس سیر کا اثر آپ کے شوہر پر کیا پڑے گا، کیا آپ نے اس کی بابت کبھی غور کیا ہے؟۔ میں نے پرسوں مسٹر کرپلانی کو دیکھا۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ آپ نے سر پر ہیٹ اُلٹا لگا رکھا تھا اور اگر میری نگاہوں نے دھوکا نہیں دیا تو ان کے بوٹ کا ایک تسمہ کھلا ہُوا تھا۔ جو بار بار ان کے پاؤں میں الجھ رہا تھا۔ کل بھی آپ کی حالت ایسی ہی تھی۔ ان کی پتلون شکنوں سے بھرپور تھی اور ٹائی کی گرہ بھی دُرست نہیں تھی۔ اگر آپ کی صبح کی سیر اسی طرح جاری رہی۔ تو مجھے اندیشہ ہے ایک روز مسٹر کرپلانی اس افراتفری میں دفتر کا رخ کریں گے کہ راہ چلتی عورتوں کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں گی۔ اور ہاں، دیکھیے کل آپ نے جو ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ آپکی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسز اڈوانی نے یہ ساڑھی پچھلی دیوالی پر خریدی تھی۔ دوسروں کے کپڑے پہننا بہت معیوب ہے۔ آپکے پاس کم از کم بیس ساڑیاں موجود ہیں۔ مسز اڈوانی کی ساڑھی مستعار لے کر آپ نے کیوں پہنی۔ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔ ایک بات اور۔ وہ یہ کہ آپ کو بغیر آستینوں کا بلاؤز اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کے کاندھوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت ہے۔ جسکی نمائش آنکھوں پر بہت گراں گزرتی ہے۔ آپکے جسم کا یہ عیب آستینوں والے بلاؤز میں چھپ جاتا ہے۔ اس لیے آپکو ہمیشہ اسی تراش کا بلاؤز پہننا چاہیے۔ اونچی ایڑی کا شو آپ کیوں پہنتی ہیں؟۔ آپ کا قد ماشاء اللہ کافی اُونچا ہے۔ پرسوں آپ نے غیر معمولی اونچی ایڑی کا سینڈل پہن رکھا تھا۔ معاف فرمایئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے پیروں کے ساتھ اسٹول بندھے ہوئے ہیں۔ اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر آپ آسانی سے چل بھی نہیں سکتیں۔ خواہ مخواہ کیوں اپنے آپ کو تکلیف دیتی ہیں۔ آپ کی۔

—

دوسرا خط مسز اڈوانی کے نام محترم بہن تسلیمات۔ میں نے پچھلے دنوں آپ کو باندرہ کے میلے پر چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ آپ نے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بورڈر کے بغیر۔ بلاؤز کالی ساٹن کا تھا۔ کھلے گلے کا، آستینوں کے بغیر۔ گلے پر زرد رنگ کی سائٹ کا پائپنگ تھا اور سامنے سینے پر اسی رنگ کا پھول۔ پاؤں میں آپکے سنہری سینڈل تھی۔ چھاتا سیاہ رنگ کا تھا جس کی مونٹھ زرد رنگ کے سلولائیڈ کی تھی۔ کالے بالوں میں پیلا ربن تھا۔ سیاہی اور زردی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپ کے ذوق کی میں بے حد معترف ہوں۔ رنگوں کے صحیح التزام کا آپ خوب سلیقہ رکھتی ہیں۔ مگر کل آپ جب بَس پر سے اُتریں تو مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ نے کالی ساڑھی کے ساتھ بُھوسلے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا ہے آپ کے بالوں میں نیلا ربن گندھا ہے اور جوتا سفید کینوس کا پہن رکھا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی اعلیٰ ذوق رکھنے والی خاتون نے کیوں کر ایسے بھونڈے لباس میں باہر نکلنا گوارا کیا۔ اور پھر غضب یہ ہے کہ آپ بَس میں کہیں دُور گئی تھیں۔ آئندہ اگر میں نے آپ کو ایسے بے تکے لباس میں دیکھا تو مجھے اتنا صدمہ ہوگا کہ میں بیان نہیں کر سکوں گی۔ ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کی نوکرانی اتنا سنگھار کیوں کرتی ہے؟ اس کی عمر میرے انداز کے مطابق اٹھارہ برس ہے۔ بظاہر وہ کنواری ہے۔ اس عمر میں اور خاص کر کنوارپنے میں اس کا یوں بن کر سنور کر سودا سلف لینے باہر بازار نکلنا اتنا خطرناک نہیں۔ جتنا کہ اس کا آپکے گھر میں اپنے سنگھار پر توجہ دینا ہے۔ آپ عموماً گھر سے باہر رہتی ہیں۔ اور مسٹر اڈوانی چونکہ دفتر نہیں جاتے۔ اس لیے وہ اکثر گھر ہی میں رہتے ہیں۔ آپ کی غفلت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے۔ اگر آپ چشمہ پہنا کریں تو یہ عیب بالکل دُور ہو جائے گا۔ کیونکہ شیشوں میں سے یہ معمولی فرق نظر نہ آئے گا۔ ہاں، یہ آپ اپنی سہیلیوں کو اپنی ساڑھیاں پہننے کے لیے کیوں دے دیا کرتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بدعت معاشرتی نقطۂ نظر سے بہت بُری ہے۔ اس کے علاوہ سہیلیاں خواہ کتنی ہی محتاط ہوں۔ مستعار کپڑے کو نہایت بے دردی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں اگر آپ کو یقین نہ ہو تو اس سفید ساڑھی کو غور سے دیکھیے جو آپ نے ایک روز مسز کرپلانی کو پہننے کے لیے دی تھی۔ اس کا تلِے کا کام کئی جگہ سے اکھڑ گیا ہے۔ بازار میں چلتے وقت آپ بار بار ساڑھی کا پلو نہ سنبھالا کریں۔ مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ آپکی۔

—

تیسرا خط مسٹر ایوب خان انسپکٹر پولیس کے نام مکّرمی محترمی۔ سلام مسنون کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دن میں دو بار اپنی داڑھی منڈوانا چھوڑ دیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ نارمل آدمی کی داڑھی کے بال نارمل حالت میں اتنی جلدی کبھی نہیں اُگتے۔ پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے اور وہاں سے شام کو آتے ہُوئے آپ کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ سیلون میں داخل ہو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو MANIA ہو گیا ہے۔ اگر آپکا دماغی توازن درست ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دن میں دو بار صبح و شام اپنی داڑھی پر اُسترا پھرائیں۔ کیا سیلون کا نائی آپ کی اس عجیب و غریب عادت پر زیرِ لب کبھی نہیں مسکرایا۔ اور پھر یہ آپ اپنے سر کے بال کس طور سے کٹواتے ہیں؟۔ واللہ بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ گردن سے لے کر کھوپڑی کے بالائی حصے تک آپ بالوں کا بالکل صفایا کرا دیتے ہیں اور کانوں کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن بہت بھدی ہے اور آپ کے سر کے نچلے حصے پر پھوڑوں کے نشان ہیں جو صرف بال ہی چھپا سکتے ہیں اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ بار بار بال مونڈنے سے آپ کی گردن موٹی ہو جائے گی۔ آپ کے کان بہت بڑے ہیں۔ جس فیشن کی حجامت کا آپ کو شوق ہے۔ اس سے یہ اور بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ قلمیں رکھیں۔ اور کانوں کے قریب سے بال زیادہ نہ کٹوائیں۔ گردن پر اگر آپ تھوڑے سے بال اُگنے دیں تو کوئی ہرج نہیں۔ اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ہاتھ میں چھڑی لے کر جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو دماغ میں اس خیال

کو جگہ نہ دیا کریں کہ ہر اسکول جانے والی لڑکی آپکو دیکھ رہی ہے۔ کسی شائستہ مذاق لڑکی کی آنکھیں آپ کی طرف نہیں اُٹھ سکتیں۔ اس لیے کہ آپ اپنے کاندھوں پر ایسا بھونڈا سر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ جس کو آپ کے ایجاد کردہ فیشن نے اور بھی زیادہ بدنما بنا رکھا ہے۔ بار بار آپ اپنے کوٹ سے کیا جھاڑا کرتے ہیں؟ کیا گردو غبار کے ذرّے صرف آپ ہی کے کوٹ پر آبیٹھتے ہیں۔ یا پھر آپ حد سے زیادہ نفاست پسند ہیں؟ کسی نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ چالیس برس کے ہونے پر بھی آپ کنوارے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ میرا مشورہ لیجیے۔ اور دن میں دو بار سیلون میں جا کر داڑھی منڈوانا چھوڑ دیجیے۔ خدا آپ کی حالت پر رحم کرے۔ آپکی مخلص۔

—

چوتھا خط مِس ڈی سِلوا کے نام ڈیئر مِس ڈی سِلوا۔ تمہاری حالت پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ تم روز بروز موٹی ہو رہی ہو۔ اگر تمہارا موٹاپا اسی رفتار سے بڑھتا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تم کسی مرد کے قابل نہ رہو گی۔ اسکول جانے کیلیے جب تم
”جم“
پہن کر گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اس کرسمس پر تم ڈانس کیسے کر سکو گی۔ ایک دو قدموں ہی میں تمہارا پسینہ چھوٹ جائے گا۔ اور تمہارا ساتھی کیوں کر تمہاری بانہوں کو حسب منشا حرکت میں لاسکے گا۔ تمہاری بغلوں کے نیچے اس قدر گوشت جمع ہو رہا تھا کہ تم ڈانس کرنے کے بالکل قابل نہیں رہی ہو۔ خدا کے لیے اپنا علاج کرو اور اس موٹاپے کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرو۔ ایک نصیحت میری اور سُن لو۔ شام کو تم ہر روز ٹیرس پر اکیلی جاتی ہو۔ اور سامنے والے مکان پر ڈی کوسٹا کے بڑے لڑکے کو اشارے کرتی رہتی ہو۔ اوّل تو یہ شریف لڑکیوں کا کام نہیں۔ دوسرے یہ اشارے چربی بھرے گوشت کے مانند بھدے اور بے لذّت ہوتے ہیں۔ تم جیسی موٹی لڑکیوں کو ایسی اشارہ بازی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اشارہ ایک لطیف یعنی باریک اور پتلی چیز کا نام ہے۔ تمہارے اشارے، اشارے نہیں ہوتے۔ ان کے لیے مجھے کوئی اور نام تلاش کرنا ہو گا۔ جس لونڈے کے ساتھ تم رومان لڑانا چاہتی ہو۔ اسکے متعلق بھی سُن لو۔ وہ ایک آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ ڈھائی مہینے سے کالی کھانسی میں مبتلا ہے۔ ماں باپ نے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اسکے پاس صرف تین پتلونیں ہیں۔ جن کو بدل بدل کر پہنتا ہے۔ ہر روز اپنی قمیض اور پتلون پر وہ دو بار استری کرتا ہے تاکہ باہر کے لوگوں کی نظر میں اس کی وضع داری قائم رہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے نفرت ہے۔ تم اپنی پنڈلیوں کے بال استرے سے نہ مونڈا کرو۔ بال اڑانے کے سب پوڈر اور سب کریمیں بھی فضول ہیں۔ بال ہمیشہ کے لیے کبھی غائب نہیں ہو سکتے اس لیے تم اپنی پنڈلیوں پر ظلم نہ کرو۔ بال رہنے دو اور لمبی جُرابیں پہنا کرو۔ تمہارا دوست آج دوپہر کو اپنا پھٹا ہُوا جُوتا خود مرمت کر رہا تھا۔ تمہاری خیر خواہ۔

—

پانچواں خط کو شلیا دیوی کے نام شریمتی کو شلیا دیوی۔ نمسکار اس میں کوئی شک نہیں۔ اپنے گھر میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ آرام دہ سے آرام دہ لباس پہنے اور تکلّفات سے آزاد رہے۔ مگر دیوی جی آپ ململ کی باریک دھوتی پہن کر اس آزادی سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہیں اور پھر یہ دھوتی آپ کچھ اس
”بے تکلفی“
سے پہنتی ہیں کہ جب آپ اتفاق سے نظر آجائیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ آپ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ روشنی کے سامنے کھڑے ہونے سے آپکی ململ کی دھوتی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ آپ کی عمر اس وقت چوالیس برس کے قریب ہے۔ عمر کی اس زیادتی نے آپکے جسم کو بالکل ڈھیلا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باریک دھوتی میں سے آپکی بھدی ٹانگوں کی نمائش آنکھوں پر
”گویا سنجبنی“
بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ کے فلیٹ کا دروازہ عام طور پر کھلا رہتا ہے اور میں نے اکثر آپ کو باورچی خانہ کے پاس یہی باریک دھوتی پہنے دیکھا ہے اگر آپ کو اس کا استعمال ترک نہیں کرنا ہے تو براہ کرم اپنے فلیٹ کا دروازہ بند رکھا کریں۔ آپ کی۔

—

چھٹا خط مسٹر سعید حسن جرنلسٹ کے نام جناب من۔ تسلیم۔ آپ ہر روز صبح بالکونی میں پتلون پہنتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل کمیونزم کی بدترین مثال ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ ضرور شرمسار ہونگے۔ اور آئندہ سے پتلون شریف آدمیوں کی طرح اپنے کمرے میں پہنا کریں گے۔ مخلص۔ مکرر:۔ آپ کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ سیلون آپ کے مکان کے نیچے ہے۔ ہمت کر کے آج ہی کٹوا دیں۔

—

ساتواں خط مِسز قاسمی کے نام خاتونِ مکرم۔ السلام علیکم۔ میں بہت عرصے سے آپکو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی مگر چند در چند وجوہ کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ میں نے سُنا ہے کہ دو گھروں میں نفاق پیدا کرنے کے لیے آپ کو بہت سے گُر زبانی یاد ہیں۔ مسز اڈوانی اور مسز کرپلانی کے درمیان ایک دفعہ آپ ہی کی کوششوں سے رنجش پیدا ہُوئی تھی۔ اور پچھلے دنوں سیٹھ گوپال داس کی لڑکی پشپا کے بارے میں آپ نے جو افواہیں مشہور کی تھیں ان سے سیٹھ گوپال داس اور سیٹھ رام داس کے خاندانوں میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مجھے آپکی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ ابھی تک آپ کے اور مسز قانون گو کے درمیان کشید گی پیدا کیوں نہیں ہُوئی۔ اب تک آپ نے جس عورت کو اپنی سہیلی بنایا ہے اس سے تیسرے چوتھے مہینے آپ کی تُو تُو مَیں مَیں ضرور ہوتی ہے۔ لیکن مسز قانون گو سے آپ کی دوستی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ جو کئی برسوں کے برابر ہیں۔ میں اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتی۔ اس مہینے میں مسز قانون گو سے آپکی چخ چخ ضرور ہونی چاہیے۔ آپ کو اپنی روایات برقرار رکھنی چاہئیں۔ ہاں یہ ضرور بتایئے کہ آپ کہاں پیدا ہُوئی تھیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ پنجاب کی رہنے والی ہیں۔ مگر آپ کا چہرہ نیپالیوں اور تبتیوں سے کیوں ملتا جلتا ہے؟ آپکی ناک بالکل نیپالیوں کی طرح چپٹی ہے۔ اور گالوں کی ہڈیاں بھی انہی کی طرح ابھری ہُوئی ہیں، البتہ آپکا قد ان کی طرح پست نہیں۔ آپ نے عید پر جو ساڑھی پہنی تھی۔ مجھے پسند نہیں آئی۔ آپ کا ذوق نہایت فضول ہے۔ اگر آپ بھڑکیلے اور شوخ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے انتخاب کیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ لمبے قد کی عورتوں کو کھڑی لکیروں کی قمیض نہیں پہننی چاہیے۔ اس سے وہ اور لمبی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح آپ کو

”پف سیلوز“

کا بلاؤز بھی نہیں پہننا چاہیے۔ کیونکہ لمبے قد کی عورتوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہوتا۔ اور پھر آپ تو ویسے ہی دُبلی پتلی ہیں۔ آپکے کاندھے پر بلاؤز کے اُٹھے ہُوئے

”پف“

بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ آپکی خیر اندیش۔

—

آٹھواں خط مِس راجکماری ایکٹرس کے نام مِس راجکماری مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم عورت نہیں ہو۔ سوٹ کیس ہو۔ تم سے نفرت کرنیوالی۔

—

نواں خط مسٹر صالح بھائی کنٹریکٹر کے نام جناب صالح بھائی صاحب۔ تسلیم۔ مجھے آپکے خلاف کوئی شکایت نہیں لیکن پھر بھی میں آپکو پسند نہیں کرتی۔ نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ آپکو دیکھ کر میرے دل میں غیظ و غضب پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی شکل و صورت بھی کوئی خاص بُری نہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ کو میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہُوں۔ آپ کے چہرے پر یتیمی برستی ہے، آپکی چال بھی نہایت واہیات ہے۔ آپکی ہمدرد۔

—

دسواں خط مِس رضیہ صلاح الدین کے نام ڈیئر مِس رضیہ۔ سلام مسنون۔ تم ابھی ابھی پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہو۔ پہلے ساڑھی پہننے کی عادت اختیار کرو پھر اس لباس میں باہر نکلو۔ تمہیں یہ لباس پہننے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو تماشہ نہ بناؤ۔ تمہاری خیر خواہ۔

وہ لڑکی

سوا چار بج چکے تھے لیکن دھوپ میں وہی تمازت تھی جو دوپہر کو بارہ بجے کے قریب تھی۔ اس نے بالکنی میں آکر باہر دیکھا تو اسے ایک لڑکی نظر آئی جو بظاہر دھوپ سے بچنے کے لیے ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اتنا سانولا کہ وہ درخت کی چھاؤں کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ سریندر نے جب اس کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی قربت چاہتا ہے، حالانکہ وہ اس موسم میں کسی کی قربت کی بھی خواہش نہ کر سکتا تھا۔ موسم بہت واہیات قسم کا تھا۔ سوا چار بج چکے تھے۔ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لیکن موسم نہایت ذلیل تھا۔ پسینہ تھا کہ چوٹا جا رہا تھا۔ خدا معلوم کہاں سے مساموں کے ذریعے اتنا پانی نکل رہا تھا۔ سریندر نے کئی مرتبہ غور کیا تھا کہ پانی اس نے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں میں صرف ایک گلاس پیا ہو گا مگر پسینہ بلا مبالغہ چار گلاس نکلا ہو گا۔ آخر یہ کہاں سے آیا! جب اس نے لڑکی کو درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے دیکھا تو اس نے سوچا کہ دنیا میں سب سے خوش یہی ہے جسے دھوپ کی پرواہ ہے نہ موسم کی۔ سریندر پسینے میں لت پت تھا۔ اس کی بنیان اس کے جسم کے ساتھ بہت بری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ وہ کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے بدن پر کسی نے موبل آئل مل دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب اس نے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا تو اس کے جسم میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کے پسینے کے ساتھ گھل مل جائے، اس کے مساموں کے اندر داخل ہو جائے۔ آسمان خاکستری تھا۔ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ بادل

ہیں یا محض گرد و غبار۔ بہر حال، اس گرد و غبار یا بادلوں کے باوجود دھوپ کی جھلک موجود تھی اور وہ لڑکی بڑے اطمینان سے پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی ستا رہی تھی۔ سریندر نے اب کی غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا مگر نقش بہت تیکھے کہ وہ سریندر کی آنکھوں میں کئی مرتبہ چبھے۔ مزدور پیشہ لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھکارن ہو۔ لیکن سریندر اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ اصل میں وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ آیا اس لڑکی کو اشارہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ گھر میں وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کی بہن مری میں تھی۔ ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ ایک بھائی، اس سے چھوٹا، وہ بورڈنگ میں رہتا تھا۔ سریندر کی عمر ستائس اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ اس سے قبل وہ اپنی دو ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں سے دو تین مرتبہ سلسلہ لڑا چکا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، لیکن موسم کی خرابی کے باوجود سریندر کے دل میں یہ خواہش ہو رہی تھی کہ وہ پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاس جائے یا اسے اوپر ہی سے اشارہ کرے تاکہ وہ اس کے پاس آجائے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پسینے میں غوطہ لگائیں اور کسی نامعلوم جزیرے میں پہنچ جائیں۔ سریندر نے بالکنی کے کٹہرے کے پاس کھڑے ہو کر زور سے کھنکارا مگر لڑکی متوجہ نہ ہوئی۔ سریندر نے جب کئی مرتبہ ایسا کیا اور کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا تو اس نے آواز دی۔

”ارے بھئی۔ ذرا ادھر دیکھو“!

مگر لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ اپنی پنڈلی کھجلاتی رہی۔ سریندر کو بہت الجھن ہوئی۔ اگر لڑکی کی بجائے کوئی کتا ہوتا تو وہ یقیناً اس کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھتا۔ اگر اسے اس کی یہ آواز ناپسند ہوتی تو بھونکتا مگر اس لڑکی نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ اگر سنی تھی تو ان سنی کر دی تھی۔ سریندر دل ہی دل میں بہت خفیف ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار بلند آواز میں اس لڑکی کو پکارا۔

”اے لڑکی“!

لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ جھنجھلا کر اس نے اپنا ململ کا کرتا پہنا اور نیچے اترا۔ جب اس لڑکی کے پاس پہنچا تو وہ اسی طرح اپنی ننگی پنڈلی کھجلا رہی تھی۔ سریندر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور شلوار نیچی کر کے اپنی پنڈلی ڈھانپ لی۔ سریندر نے اس سے پوچھا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

لڑکی نے جواب دیا۔

”بیٹھی ہوں۔“

”کیوں بیٹھی ہو؟“

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”لو، اب کھڑی ہو گئی ہوں“!

سریندر بوکھلا گیا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“

لڑکی کا چہرہ اور زیادہ سنولا ہو گیا۔

”تم چاہتے کیا ہو؟“

سریندر نے تھوڑی دیر اپنے دل کو ٹٹولا۔

”میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ چلو تو بڑی مہربانی ہو گی۔“

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر عجیب و غریب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”مہربانی۔ کاہے کی مہربانی۔ چلو“!

اور دونوں چل دیے۔ جب اوپر پہنچے تو لڑکی صوفے کی بجائے فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی پنڈلی کھجلانے لگی۔ سریندر اس کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ لیکن اس میں وہ تمام قوسیں اور وہ تمام خطوط موجود تھے جو ایک جوان لڑکی میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کے کپڑے میلے تھے، لیکن اس کے باوجود اس کا مضبوط جسم اس کے باہر جھانک رہا تھا۔ سریندر نے اس سے کہا۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ ادھر صوفے پر بیٹھ جاؤ“!

لڑکی نے جواب میں صرف اس قدر کہا۔

”نہیں“!

سریندر اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔

”تمہاری مرضی۔ لو اب یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور درخت کے نیچے تم اتنی دیر سے کیوں بیٹھی تھیں؟“

”میں کون ہوں اور درخت کے نیچے میں کیوں بیٹھی تھی۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں۔“

لڑکی نہ یہ کہہ کر اپنی شلوار کا پائنچہ نیچے کر لیا اور پنڈلی کھجلانا بند کر دی۔ سریندر اس وقت اس لڑکی کی جوانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ اس کا اور ان دو ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں کا مقابلہ کر رہا تھا جن سے اس کا دو تین مرتبہ سلسلہ ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے مقابلے میں ڈھیلی ڈھالی تھیں، جیسے برسوں کی استعمال کی ہوئی سائیکلیں۔ لیکن اس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کسا ہوا تھا۔ سریندر نے ان ادھیڑ عمر کی نوکرانیوں سے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود اس کو کھینچ کر اپنی کوٹھڑیوں میں لے جاتی تھیں۔ مگر سریندر اب محسوس کرتا تھا کہ یہ سلسلہ اس کو اب خود کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کی تکنیک سے قطعات ناواقف تھا۔ بہر حال۔ اس نے اپنے ایک بازہ کو تیار کیا اور اسے لڑکی کی عمر میں حمائل کر دیا۔ لڑکی نے ایک زور کا جھٹکا دیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم؟“

سریندر ایک بار پھر بوکھلا گیا۔

”میں۔ میں۔ کچھ بھی نہیں۔“

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”آرام سے بیٹھے رہو“!

سریندر آرام سے بیٹھ گیا۔ مگر اس کے سینے میں ہلچل اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے ہمت سے کام لے کر لڑکی کو پکڑ کر اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ لڑکی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر سریندر کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ فرش پر چت گر پڑی۔ سریندر اس کے اوپر تھا۔ اس نے دھڑا دھڑ اس کے گہرے سانولے ہونٹ چومنے شروع کر دیے۔ لڑکی بے بس تھی۔ سریندر کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر پھینک نہیں سکتی تھی۔ بوجہ مجبوری وہ اس کے گیلے بوسے برداشت کرتی رہی۔ سریندر نے سمجھا کہ وہ رام ہو گئی ہے، چنانچہ اس نے مزید درازدستی شروع کی۔ اس کی قمیض کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلانے بند کر دیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مدافعت کو اب فضول سمجھا ہے۔ سریندر کو اب یقین ہو گیا کہ میدان اسی کے ہاتھ رہے گا، چنانچہ اس نے درازدستی چھوڑ دی اور اس سے کہا۔

”چلو آؤ، پلنگ پر لیٹتے ہیں۔“

لڑکی اٹھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ دونوں پلنگ پر لیٹ گئی۔ ساتھ ہی تپائی پر ایک طشتری میں چند مالٹے اور ایک تیز چھری پڑی تھی۔ لڑکی نے ایک مالٹا اٹھایا اور سریندر سے پوچھا۔

”میں کھا لوں؟“

”ہاں ہاں۔ ایک نہیں سب کھا لو“!

سریندر نے چھری اٹھائی اور مالٹا چھیلنے لگا، مگر لڑکی نے اس سے دونوں چیزیں لے لیں۔

”میں خود چھیلوں گی“!

اس نے بڑی نفاست سے مالٹا چھیلا۔ اس کے چھلکے اتارے۔ پھانکوں پر سے سفید سفید جھلی ہٹائی۔ پھر پھانکیں علیحدہ کیں۔ ایک پھانک سریندر کو دی، دوسری اپنے منہ میں ڈالی اور مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے پاس پستول ہے؟“

سریندر نے جواب دیا۔

”ہاں۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟“

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر پھر وہی عجیب و غریب مسکراہٹ نمودار ہوئی

”میں نے ایسے ہی پوچھا تھا۔ تم جانتے ہو نا کہ آج کل ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔“

سریندر نے دوسرا مالٹا طشتری میں سے اٹھایا۔

”آج سے ہو رہے ہیں۔ بہت دنوں سے ہو رہے ہیں۔ میں اپنے پستول سے چار مسلمان مار چکا ہوں۔ بڑے خونی قسم کے“!

”سچ؟“

یہ کہہ کر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے ذرا وہ پستول تو دکھانا“!

سریندر اٹھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اپنے میز کا دراز کھولا اور پستول لے کر باہر آیا۔

”یہ لو۔ لیکن ٹھہرو“!

اور اس نے پستول کا سیفٹی کیچ ٹھیک کر دیا کیوں کہ اس میں گولیاں بھری تھیں۔ لڑکی نے پستول پکڑا اور سریندر سے کہا۔

”میں بھی آج ایک مسلمان ماروں گی“

یہ کہہ کر اس نے سیفٹی کیچ کو ایک طرف کیا اور سریندر پر پستول داغ دیا۔ وہ فرش پر گر پڑا اور جان کنی کی حالت میں کراہنے لگا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”وہ چار مسلمان جو تم نے مارے تھے، ان میں میرا باپ بھی تھا۔“!

یزید

سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ بالکل اسی طرح جس موسم میں خلافِ معمول چند دن خراب آئیں اور چلے جائیں۔ یہ نہیں کہ کریم داد، مولا کی مرضی سمجھ کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے اس طوفان کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ مخالف قوتوں کے ساتھ وہ کئی بار بھڑا تھا۔ شکست دینے کے لیے نہیں، صرف مقابلہ کرنے کے لیے نہیں۔ اس کو معلوم تھا کہ دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ مگر ہتھیار ڈال دینا وہ اپنی ہی نہیں ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا۔ سچ پوچھیے تو اس کے متعلق یہ صرف دوسروں کا خیال تھا اُن کا، جنہوں نے اسے وحشی نما انسانوں سے بڑی جاں بازی سے لڑتے دیکھا تھا۔ ورنہ اگر کریم داد سے اس بارے میں پوچھا جاتا، کہ مخالف قوتوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنا کیا وہ اپنی یا مرد کی توہین سمجھتا ہے۔ تو وہ یقیناً سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسے آپ نے اُس سے حساب کا کوئی بہت ہی مشکل سوال کر دیا ہے۔ کریم داد، جمع، تفریق اور ضرب تقسیم سے بالکل بے نیاز تھا۔ سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ لوگوں نے بیٹھ کر حساب لگانا شروع کیا کہ کتنا جانی نقصان ہوا، کتنا مالی، مگر کریم داد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا باپ رحیم داد اس جنگ میں کام آیا ہے۔ اس کی لاش خود کریم داد نے اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی۔ اور ایک کنوئیں کے پاس گڑھا کھود کر دفنائی تھی۔ گاؤں میں اور بھی کئی وارداتیں ہوئی تھیں سینکڑوں جوان اور بوڑھے قتل ہوئے تھے، کئی لڑکیاں غائب ہو گئی تھیں۔ کچھ بہت ہی ظالمانہ طریقے پر بے آبرو ہوئی تھی۔ جس کے بھی یہ زخم آئے تھے، روتا تھا، اپنے پھوٹے نصیبوں پر اور دشمنوں کی بے رحمی پر، مگر کریم داد کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ اپنے باپ رحیم داد کی شہ زوری پر اسے ناز تھا۔ جب وہ پچیس تیس، برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح بلوائیوں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا، اور کریم داد کو اس کی موت کی خبر ملی تھی تو اس نے اس کی روح کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا تھا۔

”یار تم نے یہ ٹھیک نہ کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک ہتھیار اپنے پاس ضرور رکھا کرو۔“

اور اس نے رحیم داد کی لاش اٹھا کر، کنویں کے پاس گڑھا کھود کر دفنا دی تھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ کے طور پر صرف یہ چند الفاظ کہے ہوئے

”گناہ ثواب کا حساب خدا جانتا ہے۔ اچھا تجھے بہشت نصیب ہو“!

رحیم داد جو نہ صرف اس کا باپ تھا بلکہ ایک بہت بڑا دوست بھی تھا بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ لوگ جب اس کی افسوسناک موت کا ذکر کرتے تھے تو قاتلوں کو بڑی گالیاں دیتے تھے، مگر کریم داد خاموش رہتا تھا۔ اس کی کئی کھڑی فصلیں تباہ ہوئی تھیں۔ دو مکان جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ مگر اُس نے اپنے ان نقصانوں کا کبھی حساب نہیں لگایا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف اتنا کہا کرتا تھا۔

”جو کچھ ہوا ہے۔ ہماری اپنی غلطی سے ہوا ہے۔“

اور جب کوئی اس سے اس غلطی کے متعلق استفسار کرتا تو وہ خاموش رہتا۔ گاؤں کے لوگ ابھی سوگ میں مصروف تھے کہ کریم داد نے شادی کر لی۔ اسی مٹیار جیناں کے ساتھ جس پر ایک عرصے سے اس کی نگاہ تھی۔ جیناں سوگوار تھی۔ اس کا شہتیر جیسا کڑیل جوان بھائی بلووں میں مارا گیا تھا۔ ماں، باپ کی موت کے بعد ایک صرف وہی اس کا سہارا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیناں کو کریم داد سے بے پناہ محبت تھی، مگر بھائی کی موت کے غم نے یہ محبت اس کے دل میں سیاہ پوش کر دی تھی، اب ہر وقت اس کی سدا مسکراتی آنکھیں نمناک رہتی

تھیں۔ کریم داد کو رونے دھونے سے بہت چڑ تھی۔ وہ جیناں کو جب بھی سوگ زدہ حالت میں دیکھتا تو دل ہی دل میں بہت کڑھتا۔ مگر وہ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا نہیں تھا، یہ سوچ کر کہ عورت ذات ہے۔ ممکن ہے اس کے دل کو اور بھی دکھ پہنچے، مگر ایک روز اس سے نہ رہا گیا۔ کھیت میں اس نے جیناں کو پکڑ لیا اور کہا۔

”مردوں کو کفنائے دفنائے پورا ایک سال ہو گیا ہے اب تو وہ بھی اس سوگ سے گھبرا گئے ہوں گے۔ چھوڑ میری جان! ابھی زندگی میں جانے اور کتنی موتیں دیکھنی ہیں۔ کچھ آنسو تو اپنی آنکھوں میں جمع رہنے دیں۔“

جیناں کو اس کی یہ باتیں بہت ناگوار معلوم ہوئی تھیں۔ مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اس لیے اکیلے میں اس نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر اس کی ان باتوں میں معنی پیدا کیے اور آخر خود کو یہ سمجھنے پر آمادہ کر لیا کہ کریم داد جو کچھ کہتا ہے ٹھیک ہے۔ !شادی کا سوال آیا تو بڑے بوڑھوں نے مخالفت کی۔ مگر یہ مخالفت بہت ہی کمزور تھی۔ وہ لوگ سوگ منا منا کر اتنے نحیف ہو گئے تھے کہ ایسے معاملوں میں سو فیصدی کامیاب ہونے والی مخالفتوں پر بھی زیادہ دیر تک نہ جمے رہ سکے۔ چنانچہ کریم داد کا بیاہ ہو گیا۔ باجے گاجے آئے، ہر رسم ادا ہوئی اور کریم داد اپنی محبوبہ جیناں کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔ فسادات کے بعد قریب قریب ایک برس سے سارا گاؤں قبرستان سا بنا تھا۔ جب کریم داد کی برات چلی اور خوب دھوم دھڑکا ہوا تو گاؤں میں کئی آدمی سہم سہم گئے۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ کریم داد کی نہیں، کسی بھوت پریت کی برات ہے۔ کریم داد کے دوستوں نے جب اُس کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا۔ ہنستے ہنستے ہی اس نے ایک روز اس کا ذکر اپنی نئی نویلی دلہن سے کہا تو وہ ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔ کریم داد نے جیناں کی سُوہے چوڑے والی کلائی اپنے ہاتھ میں لی، اور کہا۔

”یہ بھوت تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ چمٹا رہے گا۔ رحمان سائیں کی جھاڑ پھونک بھی اتار نہیں سکے گی۔“

جیناں نے اپنی مہندی میں رچی ہوئی انگلی دانتوں تلے دبا کر اور ذرا شرما کر صرف اتنا کہا۔

”کیمے، تجھے تو کسی سے بھی ڈر نہیں لگتا۔“

کریم داد نے اپنی ہلکی ہلکی سیاہی مائل بھوری مونچھوں پر زبان کی نوک پھیری اور مسکرا دیا۔

”ڈر بھی کوئی لگنے کی چیز ہے“!

جیناں کا غم اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ کریم داد اس کی جوانی کا نکھار دیکھتا تو بہت خوش ہوتا اور جیناں سے کہتا۔

”خدا کی قسم جیناں، تو پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ اگر تو اتنی خوبصورت اپنے ہونے والے بچے کے لیے بنی ہے تو میری اس سے لڑائی ہو جائیگی۔“

یہ سن کر جیناں شرما کر اپنا ٹھلیا سا پیٹ چادر سے چھپا لیتی۔ کریم داد ہنستا اور اسے چھیڑتا۔

”چھپاتی کیوں ہو اس چور کو۔ میں کیا جانتا نہیں کہ یہ سب بناؤ سنگھار صرف تم نے اسی سؤر کے بچے کے لیے کیا ہے۔“

جیناں ایک دم سنجیدہ ہو جاتی۔

”کیوں گالی دیتے ہو اپنے کو؟“

کریم داد کی سیاہی مائل بھوری مونچھیں ہنسی سے تھر تھرانے لگتیں۔

”کریم داد بہت بڑا سؤر ہے۔“

چھوٹی عید آئی۔ بڑی عید آئی، کریم داد نے یہ دونوں تہوار بڑے ٹھاٹ سے منائے۔ بڑی عید سے بارہ روز پہلے اس کے گاؤں پر بلوائیوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا باپ رحیم داد اور جیناں کا بھائی فضل الٰہی قتل ہوئے تھے، جیناں ان دونوں کی موت کو یاد کر کے بہت روتی تھی! مگر کریم داد کی صدموں کو یاد نہ رکھنے والی طبیعت کی موجودگی میں اتنا غم نہ کر سکی، جتنا اسے اپنی طبیعت کے مطابق کرنا چاہیے تھا۔ جیناں کبھی سوچتی تھی تو اس کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنی زندگی کا اتنا بڑا صدمہ کیسے بھولتی جا رہی ہے۔ ماں باپ کی موت اس کو قطعاً یاد نہیں تھی۔ فضل الٰہی اس سے چھ سال بڑا تھا۔ وہی اس کا باپ تھا وہی اس کی ماں اور وہی اس کا بھائی۔ جیناں اچھی طرح جانتی تھی کہ صرف اسی کی خاطر اس نے شادی نہیں کی۔ اور یہ تو سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ جیناں ہی کی عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دی تھی۔ اس کی موت جیناں کی زندگی کا یقیناً بہت ہی بڑا حادثہ تھا۔ ایک قیامت تھی، جو بڑی عید سے ٹھیک بارہ روز پہلے اس پر یکا یک ٹوٹ پڑی تھی۔ اب وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی تو اس کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اسکے اثرات سے کتنی دور ہوتی جا رہی ہے۔ محرم قریب آیا تو جیناں نے کریم داد سے اپنی پہلی فرمائش کا اظہار کیا اسے گھوڑا اور تعزیئے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ ان کے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی۔ چنانچہ اس نے کریم داد سے کہا۔

”میں ٹھیک ہوئی تو لے چلو گے مجھے گھوڑا دکھانے؟“

کریم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تم ٹھیک نہ بھی ہوئیں تو لے چلوں گا۔ اس سؤر کے بچے کو بھی“!

جیناں کو یہ گالی بہت ہی بُری لگتی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر بگڑ جاتی تھی۔ مگر کریم داد کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا پر خلوص تھا کہ جیناں کی تلخی فوراًہی ایک ناقابل بیان مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی تھی اور وہ سوچتی کہ سؤر کے بچے میں کتنا پیار کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کی افواہیں ایک عرصے سے اڑ رہی تھی۔ اصل میں تو پاکستان بنتے ہی بات گویا ایک طور پر طے ہو گئی تھی کہ جنگ ہو گی۔ اور ضرور ہو گی۔ کب ہو گی، اس کے متعلق گاؤں میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کریم داد سے جب کوئی اس کے متعلق سوال کرتا، تو وہ یہ مختصر سا جواب دیتا۔

”جب ہونی ہو گی ہو جائے گی۔ فضول سوچنے سے کیا فائدہ“!

جیناں جب اس ہونے والی لڑائی بھڑائی کے متعلق سنتی، تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ وہ طبعاً بہت ہی امن پسند تھی۔ معمولی تُوتُو میں میں سے بھی سخت گھبراتی تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ بلوؤں میں نے اس نے کئی کشت و خون دیکھے تھے اور انہی میں اس کا پیارا بھائی فضل الٰہی کام آیا تھا۔ بے حد سہم کر وہ کریم داد سے صرف اتنا کہتی۔

”کیمے، کیا ہو گا“!

کریم داد مسکرا دیتا۔

”مجھے یا معلوم۔ لڑکا ہو گا لڑکی۔“

یہ سن کر جیناں بہت ہی زِچ پچ ہوتی مگر فوراًہی کریم داد کی دوسری باتوں میں لگ کر ہونے والی جنگ کے متعلق سب کچھ بھول جاتی۔ کریم داد طاقت ور تھا، نڈر تھا، جیناں سے اس کو بے حد محبت تھی۔ بندوق خریدنے کے بعد وہ تھوڑے ہی عرصے میں نشانے کا بہت پکا ہو گیا تھا۔ یہ سب باتیں جیناں کو حوصلہ دلاتی تھیں، مگر اس کے باوجود ترنجنوں میں جب وہ اپنی کسی خوف زدہ ہجولی سے جنگ کے بارے میں گاؤں کے آدمیوں کی اڑائی ہوئی ہولناک افواہیں سنتی، تو ایک دم سُن سی ہو جاتی۔ بختو دائی جو ہر روز جیناں کو دیکھنے آتی تھی۔ ایک دن یہ خبر لائی کہ ہندوستان والے دریا بند کرنے والے ہیں۔ جیناں اس کا مطلب نہ سمجھی۔ وضاحت کے لیے اس نے بختو دائی سے پوچھا۔

”دریا بند کرنے والے ہیں؟۔ کون سے دریا بند کرنے والے ہیں۔“

بختو دائی نے جواب دیا۔

”وہ جو ہمارے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں۔“

جیناں نے کچھ دیر سوچا اور ہنس کر کہا۔

”موسی تم بھی کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو، دریا کون بند کر سکتا ہے۔ وہ بھی کوئی موریاں ہیں۔“

بختو نے جیناں کے پیٹ پر ہولے ہولے مالش کرتے ہوئے کہا۔

”بی بی مجھے معلوم نہیں۔ جو کچھ میں نے سنا تمہیں بتا دیا۔ یہ بات اب تو اخباروں میں بھی آ گئی ہے۔“

”کون سی بات؟“

جیناں کو یقین نہیں آتا تھا۔ بختو نے اپنے جھریوں والے ہاتھوں سے جیناں کا پیٹ ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”یہی دریا بند کرنے والی“

پھر اس نے جیناں کے پیٹ پر اس کی قمیض کھینچی اور اٹھ کر بڑے ماہرانہ انداز میں کہا۔

”اللہ خیر رکھے تو بچہ آج سے پورے دس روز کے بعد ہو جانا چاہیے“!

کریم داد گھر آیا، تو سب سے پہلے جیناں نے اس سے دریاؤں کے متعلق پوچھا۔ اس نے پہلے بات ٹالنی چاہی، پر جب جیناں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا تو کریم داد نے کہا۔

”ہاں کچھ ایسا ہی سنا ہے۔“

جیناں نے پوچھا۔

”کیا؟“

”یہی کہ ہندوستان والے ہمارے دریا بند کر دیں گے۔“

”کیوں؟“

کریم داد نے جواب دیا۔

”کہ ہماری فصلیں تباہ ہو جائیں۔“

یہ سن کر جیناں کو یقین ہو گیا کہ دریا بند کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس نے صرف اتنا کہا۔

”کتنے ظالم ہیں یہ لوگ۔“

کریم داد اس دفعہ کچھ دیر کے بعد مسکرایا۔

”ہٹاؤ اس کو۔ یہ بتاؤ موسی بختو آئی تھی۔“

جیناں نے بے دلی سے جواب دیا۔

”آئی تھی“!

”کیا کہتی تھی؟“

”کہتی تھی آج سے پورے دس روز کے بعد بچہ ہو جائے گا۔“

کریم داد نے زور کا نعرہ لگایا۔

”زندہ باد۔“

جیناں نے اسے پسند نہ کیا اور بڑبڑائی۔

”تمہیں خوشی سوجھتی ہے جانے یہاں۔ کیسی کربلا آنے والی ہے۔“

کریم داد چوپال چلا گیا۔ وہاں قریب قریب سب مرد جمع تھے۔ چودھری نتھو کو گھیرے، اس سے دریا بند کرنے والی خبر کے متعلق باتیں پوچھ رہے تھے، کوئی پنڈت نہرو کو پیٹ بھر کے گالیاں دے رہا تھا۔ کوئی بد دعائیں مانگ رہا تھا۔ کوئی یہ ماننے ہی سے یکسر منکر تھا کہ دریاؤں کا رخ بدلا جاسکتا ہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ اسے ٹالنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ مل کر مسجد میں دعا مانگی جائے۔ کریم داد ایک کونے میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ ہندوستان والوں کو گالیاں دینے میں چودھری نتھو سب سے پیش پیش تھا۔ کریم داد کچھ اس طرح بار بار اپنی نشست بدل رہا تھا جیسے اسے بہت کوفت ہو رہی ہے۔ سب بک زبان ہو کر یہ کہہ رہے تھے۔ کہ دریا بند کرنا بہت ہی اوچھا ہتھیار ہے۔ انتہائی کمینہ پن ہے۔ رذالت ہے۔ عظیم ترین ظلم ہے۔ بدترین گناہ ہے۔ یزید پن ہے۔ کریم داد دو تین مرتبہ اس طرح کھانسا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہے۔ چودھری نتھو کے منہ سے جب ایک اور لہر موٹی موٹی گالیوں کی اٹھی تو کریم داد چیخ پڑا۔

”گالی نہ دے چودھری کسی کو۔“

ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری نتھو کے حلق میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی، اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریم داد کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صافہ ٹھیک کر رہا تھا۔

”کیا کہا؟“

کریم داد نے آہستہ مگر مضبوط آواز میں کہا۔

”میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو۔“

حلق میں پھنسی ہوئی ماں کی گالی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نتھو نے بڑے تیکھے لہجے میں کریم داد سے کہا۔

”کسی کو؟ کیا لگتے ہیں۔ وہ تمہارے؟“

اس کے بعد وہ چوپال میں جمع شدہ آدمیوں سے مخاطب ہوا۔

”سنا تم لوگوں نے۔ کہتا ہے گالی نہ دو کسی کو۔ پوچھو اس سے وہ کیا لگتے ہیں اس کے؟“

کریم داد نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

”میرے کیا لگتے ہیں؟۔ میرے دشمن لگتے ہیں۔“

چودھری کے حلق سے پھٹا پھٹا سا قہقہہ بلند ہوا۔ اس قدر زور سے کہ اس کی مونچھوں کے بال بکھر گئے۔

”سنا تم لوگوں نے۔ دشمن لگتے ہیں۔ اور دشمن کو پیار کرنا چاہیے۔ کیوں برخوردار؟“

کریم داد نے بڑے برخوردانہ انداز میں جواب دیا۔

”نہیں چودھری۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پیار کرنا چاہیے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ گالی نہیں دینی چاہیے۔“

کریم داد کے ساتھ ہی اس کا لنگوٹیا دوست میراں بخش بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”کیوں ؟“

کریم داد صرف میراں بخش سے مخاطب ہوا۔

”کیا فائدہ ہے یار۔ وہ پانی بند کر کے تمہاری زمینیں بنجر بنانا چاہتے ہیں۔ اور تم انھیں گالی دے کہ یہ سمجھتے ہو کہ حساب بیباق ہوا۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے۔ جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو۔“

میراں بخش نے پوچھا۔

”تمہارے پاس جواب ہے ؟“

کریم داد نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

”سوال میرا نہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کا ہے۔ اکیلا میرا جواب سب کا جواب نہیں ہو سکتا۔ ایسے معاملوں میں سوچ سمجھ کر ہی کوئی پختہ جواب تیار کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دن میں دریاؤں کا رخ نہیں بدل سکتے۔ کئی سال لگیں گے۔ لیکن یہاں تو تم لوگ گالیاں دے کر ایک منٹ میں اپنی بھڑاس نکال باہر کر رہے ہو۔“

پھر اس نے میراں بخش کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

”میں تو اتنا جانتا ہوں یار کہ ہندوستان کو کمینہ ، رذیل اور ظالم کہنا بھی غلط ہے۔“

میراں بخش کے بجائے چودھری نتھو چلایا۔

”لو اور سنو ؟“

کریم داد، میراں بخش ہی سے مخاطب ہوا۔

”دشمن سے میرے بھائی رحم و کرم کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔ لڑائی شروع اور یہ رونا رویا جائے کہ دشمن بڑے بور کی رفلیں استعمال کر رہا ہے۔ ہم چھوٹے بم گراتے ہیں، وہ بڑے گراتا ہے۔ تو اپنے ایمان سے کہو یہ شکایت بھی کوئی شکایت ہے۔ چھوٹا چاقو بھی مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور بڑا چاقو بھی۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔“

میراں بخش کی بجائے چودھری نتھو نے سوچنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی جھنجھلا گیا۔

”لیکن سوال یہ ہے کہ وہ پانی بند کر رہے ہیں۔ ہمیں بھوکا اور پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔“

کریم داد نے میراں بخش کے کاندھے سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور چودھری نتھو سے مخاطب ہوا۔

”چودھری جب کسی کو دشمن کہہ دیا تو پھر یہ گِلا کیسا کہ وہ ہمیں بھوکا پیاسا مارنا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بھوکا پیاسا نہیں مارے گا۔ تمہاری ہری بھری زمینیں ویران اور بنجر نہیں بنائے گا تو کیا وہ تمہارے لیے پلاؤ کی دیگیں اور شربت کے مٹکے وہاں سے بھیجے گا۔ تمہاری سیر ، تفریح کے لیے یہاں باغ بغیچے لگائے گا۔“

چودھری نتھو بھنا گیا۔

”یہ تُو کیا بکواس کر رہا ہے ؟“

میراں بخش نے بھی ہولے سے کریم داد سے پوچھا۔

”ہاں یار یہ کیا بکواس ہے ؟“

”بکواس نہیں ہے میراں بخشا۔“

کریم داد نے سمجھانے کے انداز میں میراں بخش سے کہا۔

”تو ذرا سوچ تو سہی کہ لڑائی میں دونوں فریق ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، پہلوان جب لنگر لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں اتر آئے تو اسے ہر داؤ استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔“

میراں بخش نے اپنا گھٹا ہوا سر ہلایا۔

”یہ تو ٹھیک ہے“!

کریم داد مسکرایا۔

”تو پھر دریا بند کرنا بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے لیے یہ ظلم ہے، مگر ان کے لیے روا ہے۔“

”رواکیا ہے۔ جب تیری جِیب پیاس کے مارے لٹک کر زمین تک آجائے گی تو میں پھر پوچھوں گا کہ ظلم روا ہے یا ناروا۔ جب تیرے بال بچے اناج کے ایک ایک دانے کو ترسیں گے تو پھر بھی یہ کہنا کہ دریا بند کرنا بالکل ٹھیک تھا۔“

کریم داد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔

”میں جب بھی کہوں گا چودھری۔ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ صرف وہ ہمارا دشمن ہے۔ کیا ہم اس کے دشمن نہیں۔ اگر ہمارے اختیار میں ہوتا، تو ہم نے بھی اس کا دانہ پانی بند کیا ہوتا۔ لیکن اب کہ وہ کر سکتا ہے، اور کرنے والا ہے تو ہم ضرور اس کا کوئی توڑ سوچیں گے۔ بیکار گالیاں دینے سے کیا ہوتا ہے۔ دشمن تمہارے لیے دودھ کی نہریں جاری نہیں کرے گا چودھری نتھو۔ اس سے اگر ہو سکا تو وہ تمہارے پانی کی ہر بوند میں زہر ملا دے گا، تم اسے ظلم کہو گے، وحشیانہ پن کہو گے اس لیے کہ مارنے کا یہ طریقہ تمہیں پسند نہیں۔ عجیب سی بات ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن سے نکاح کی سی شرطیں بندھوائی جائیں۔ اس سے کہا جائے کہ دیکھو مجھے بھوکا پیاسا نہ مارنا، بندوق سے اور وہ بھی اتنے بور کی بندوق سے، البتہ تم مجھے شوق سے ہلاک کر سکتے ہو۔ اصل بکواس تو یہ ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔“

چودھری نتھو جھنجھلاہٹ کی آخری حد تک پہنچ گیا۔

”برف لا کے رکھ میرے دل پر۔“

”یہ بھی میں ہی لاؤں۔“

یہ کہہ کر کریم داد ہنسا۔ میراں بخش کے کاندھے پر تھپکی دے کر اٹھا اور چوپال سے چلا گیا۔ گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر سے بختو دائی باہر نکلی۔ کریم داد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پوپلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”مبارک ہو کیمے۔ چاند سا بیٹا ہوا ہے، اب کوئی اچھا سا نام سوچ اس کا؟“

”نام؟“

کریم داد نے ایک لحظے کے لیے سوچا۔

”یزید۔ یزید“!

بختو دائی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کریم داد نعرے لگاتا اندر گھر میں داخل ہوا۔ جیناں چارپائی پر لیٹی تھی۔ پہلے سے کسی قدر زرد، اس کے پہلو میں ایک گل گوتھنا سا بچہ چپڑ چپڑ انگوٹھا چوس رہا تھا۔ کریم داد نے اس کی طرف پیار بھری فخریہ نظروں سے دیکھا اور اس کے ایک گال کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”اوئے میرے یزید“!

جیناں کے منہ سے ہلکی سی متعجب چیخ نکلی۔

”یزید؟“

کریم داد نے غور سے اپنے بیٹے کا ناک نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں یزید۔ یہ اس کا نام ہے۔“

جیناں کی آواز بہت نحیف ہو گئی۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیمے؟۔ یزید“

کریم داد مسکرایا۔

”کیا ہے اس میں؟ نام ہی تو ہے“!

جیناں صرف اس قدر کہہ سکی۔

”مگر کس کا نام؟“

کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو۔ اُس نے دریا کا پانی بند کیا تھا۔ یہ کھولے گا“!

4اکتوبر1951ء